سالنامہ ۲

[illegible]تی شاعر[illegible]

[illegible] ورلڈ ڈیموکریسی

مقالے

پروفیسر احتشام حسین — علی جواد زیدی

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ — عرش ملسیانی

نظمیں

سردار جعفری — سلمہ جاوید

جاں نثار اختر — اسلم پرویز

اختر الایمان — بمل کرشن اشک

ساغر نظامی — وقار خلیل

سلام مچھلی شہری — راج نرائن راز

غلام ربانی تاباں — [illegible]

علی جواد زیدی — فرحت کاکوروی

حسرت جے پوری — یوسف ندیم

زکیہ سلطانہ نیر — بسمل سعیدی

مخمور سعیدی — شاہد ماہلی

[illegible] — [illegible]

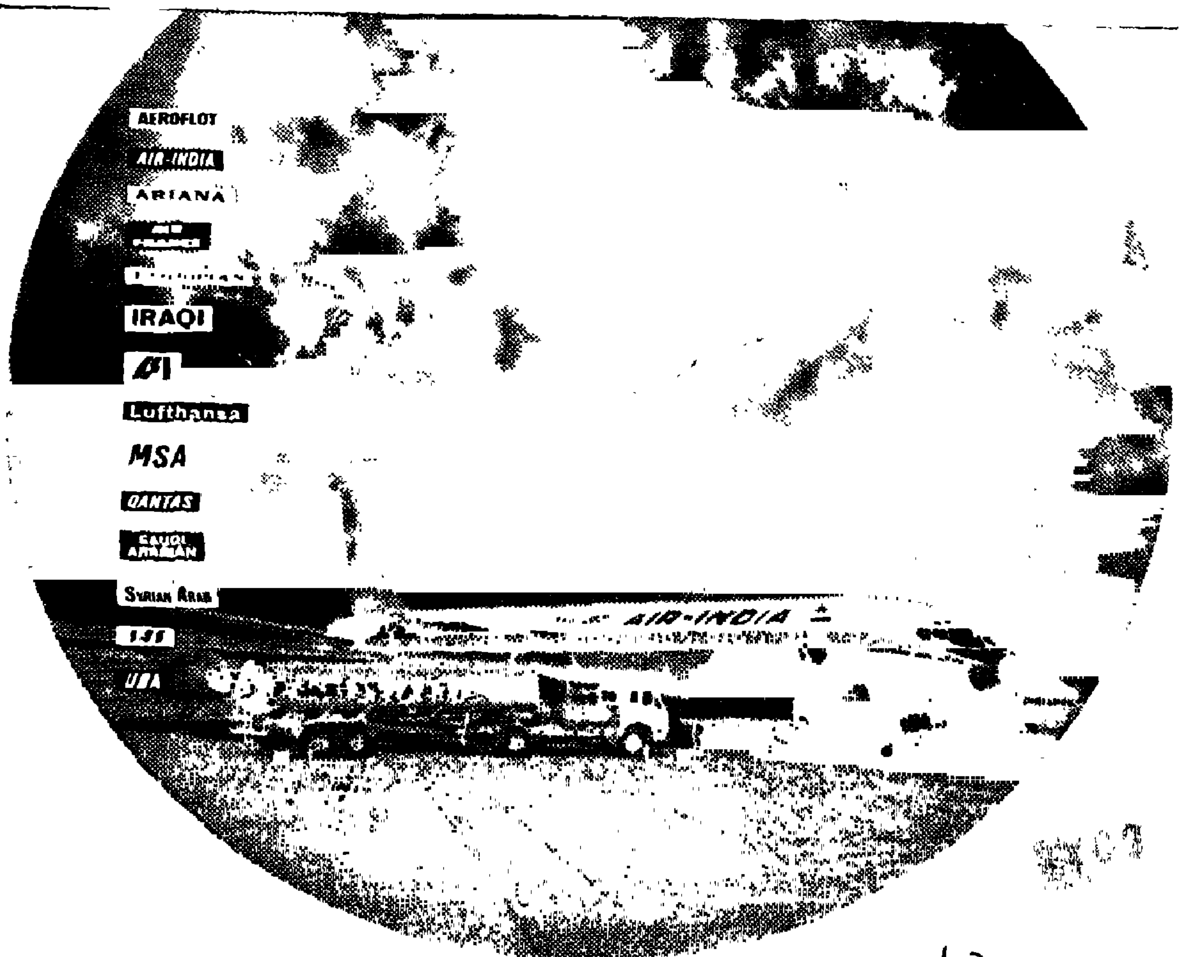
رفعت سروش — اشتاق [illegible]

[illegible] — نعیم [illegible] قادری

[illegible] — [illegible]

[illegible] — ڈاکٹر [illegible]

[illegible] — [illegible] ہاشمی



124686
2.8.95

KEEPING A NATION ON THE MOVE

Many airlines of international repute avail of INDIANOIL's expert refuelling service. In the growth of India's transport and communications, INDIANOIL has been playing a distinct role. But that is not to belittle its contribution to the nation's agriculture and industry. In a short span of a decade, INDIANOIL has emerged as the biggest oil refining and marketing organisation in India—meeting more than half of the nation's total requirements of petroleum products.

With a chain of refineries processing indigenous crude, a vast pipeline transportation system, and a countrywide storage and distribution network, INDIANOIL has ensured an uninterrupted flow of oil for India's defence and development.

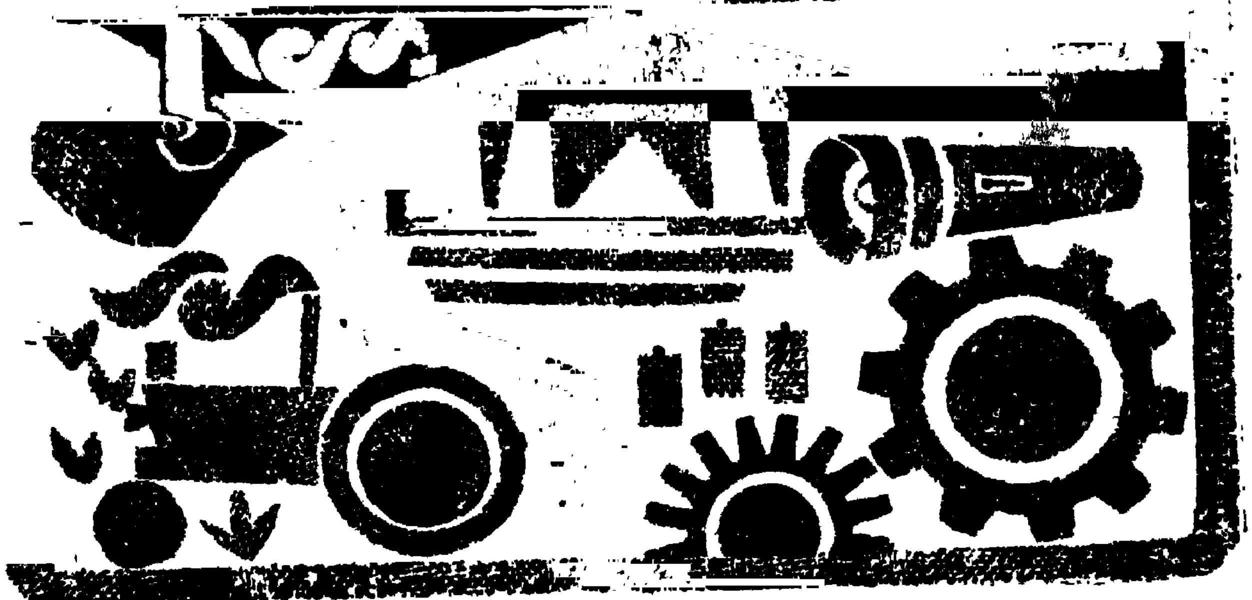
As part of the nation's planned development INDIANOIL ceaselessly strives to take the country towards self-reliance and self-sufficiency in petroleum.

INDIANOIL

—a national trust for economic prosperity

INDIAN OIL CORPORATION LIMITED

اپنے محدود ذرائع سے.....



بھارت کو اپنے سبھی محاذوں پر لڑنے کے لئے ہمارا تعاون

ترقی کی راہ پر چلنے والا بھارت جیسے جیسے قدم اٹھا رہا ہے ہم بھی اپنا تعاون دے رہے ہیں۔ خوراک محاذ پر یونین کاربائیڈ کیڑے مکوڑے کا خاتمہ کرنے والی دوائی اور پولیتھین فلم دیتا ہے جس کے ذریعہ کسانوں کو زیادہ اور بڑھیا قسم کی فصل پیدا کرنے میں مدد ملتی ہے۔ گھر کے محاذ پر ہم آپکے لئے طرح طرح کی استعمال ہونے والی اشیاء جیسے بیٹری اور فلیش لائٹ سے لیکر پولیتھین سے بنے رنگین ڈبے تک مہیا کرتے ہیں۔ ادویات، روغن، کپڑا، لوہا فولاد اور ربڑ بنانے کیلئے خام مال اور کیمیائی اشیاء بھی مہیا کرتے ہیں۔ برآمد کے محاذ میں یونین کاربائیڈ پانچوں براعظموں میں اپنے لئے نئی منڈیاں تلاش کر رہا ہے اور اسکی بنی ہوئی اشیاء پچاس سے زائد ممالک میں جن میں ریاستہائے متحدہ امریکہ بھی شامل ہے بھیجی جاتی ہیں۔ ان کاموں میں چند ایک میں جنکی یونین کاربائیڈ انڈیا لمیٹڈ نے بھارت کے لوگوں کا معیار زندگی بلند کرنے کیلئے بنیاد ڈالی ہے اس طرح ہم اپنے محدود ذرائع سے بھارت کی مدد کرتے ہیں تاکہ وہ سبھی محاذوں پر اپنی لڑائی لڑ سکے۔

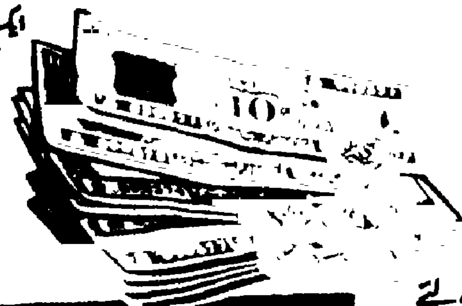
UNION CARBIDE

sowing the seeds of progress

عورتوں کے لئے ایک نیا موقع

ایک نئی بچت اسکیم جس کا افتتاح پردھان منتری شریمتی اندرا گاندھی نے یکم اپریل کو کیا تھا، آپ کو ایک جز وقتی کام مہیا کرتی ہے۔ "مہلا پردھان کشیتریہ بچت یوجنا" نامی اس اسکیم کے ذریعہ آپ

- اپنے کنبے کی آمدنی بڑھا سکتی ہیں۔
- اپنے فالتو وقت کا سودمند استعمال کرسکتی ہیں۔
- سماجی میل جول کا دائرہ وسیع کرسکتی ہیں۔
- قومی خدمت انجام دے سکتی ہیں۔



اس طرح آپ جتنی رقم اکٹھی کریں گی اس پر آپ کو 2½ فیصدی کمیشن ملے گا۔

مہلا بچت پردھان کی حیثیت میں آپ کا کام ہوگا:

اپنے علاقے کی گھریلو عورتوں سے ملنا
انھیں باقاعدہ بچت کرنے پر آمادہ کرنا
ہر مہینے ان کی بچت کی رقوم اکٹھی کرنا
اور انھیں مقررہ ڈاک خانہ میں جمع کرادینا۔

ملک بھر کے شہروں اور بڑے بڑے قصبوں میں مہلا بچت پردھان کی ضرورت ہے۔

تفصیلات کے لئے حسب ذیل پتہ پر لکھیے:

نیشنل سیونگز کمشنر
پوسٹ بکس [illegible]
ناگپور



ماہنامہ سیکولر ڈیموکریسی

سالنامہ ۱۹۷۲ء

قومی شاعری نمبر

[redacted]

سی آئی اے اور جن سنگھ

گذشتہ ماہ ہم نے قارئین "سیکولر ڈیموکریسی" کو اطلاع دی تھی کہ ہندوستانی سیاست کا مطالعہ کرنے والوں میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ جن سنگھ کی پالیسی کے ڈانڈے امریکہ کے ہندوستان دشمن حلقوں کی پالیسی سے مل جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے یہ بات قرینِ قیاس سمجھی جاتی ہے کہ ہو نہ ہو اس پارٹی کی پالیسی بنانے میں بھی سی۔ آئی۔ اے جیسی کسی خفیہ ایجنسی کا ہاتھ ہو۔

یہ بات کسی سے چھپی ہوئی نہیں کہ امریکہ کی خفیہ ایجنسی سی۔ آئی۔ اے کا کام دوسرے ملکوں کے بارے میں اطلاعات فراہم کرنے اور وہاں کے حالات جاننے تک محدود نہیں۔ یہ خفیہ ایجنسی اس بات کی بھی کوشش کرتی ہے کہ دوسرے ملکوں کی حکومتیں امریکی حکومت کی مرضی کے مطابق کام کریں اگر کسی ملک میں ان کو ایسے حالات بنتے دکھائی دیتے ہیں جن میں امریکی حکومت کی پالیسی یا مفاد کو دھکا پہنچنے کا خدشہ ہوتا ہے تو یہ ایجنسی وہاں کی حکومت کے لئے مشکلات پیدا کرتی ہے اور کئی صورتوں میں وہاں کے سربراہوں کے جان تک سے مار ڈالنے میں بھی گریز نہیں کرتی جنوبی ویت نام کے سابق صدر ڈیئم صاحب سی۔ آئی۔ اے کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی تھے لیکن جب سی۔ آئی۔ اے کو محسوس ہوا کہ وہ ان کے راستے میں رکاوٹ بن رہے ہیں تو ان کا پتہ صاف کر دیا۔ ایران میں مصدق حکومت کا تختہ الٹنے میں بھی اس ایجنسی کا ہاتھ تھا۔ کانگو میں لومبا اور انڈونیشیا میں سوکارنو کی حکومتیں بھی اس کی ریشہ دوانیوں کا شکار ہوئیں۔ اور یہ تمام باتیں مصدقہ ہیں۔ خود امریکی اخباروں میں ان کارروائیوں کی تفصیلات شائع ہو چکی ہیں۔ حال ہی میں واشنگٹن پوسٹ کے نامہ نگار جیک اینڈرسن نے جو انکشافات کئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ایجنسی گذشتہ ہند و پاک جنگ کے دوران ہند کے خلاف رہی۔ سی۔ آئی۔ اے کا نشانہ اگر صحیح ٹھکانے پر لگ جاتا تو ہندوستان پاکستان کے خلاف جنگ آزمائی کے الزام سے بچ سکتا تھا لیکن ایک طرف ہندوستانی قیادت کی راسخ الاعتقادی اور سیاسی ادراک اور دوسری طرف بنگلہ دیش کے آزادی پسند عوام کے جذبۂ حریت نے ان کو بروئے کار نہ آنے دیا۔

سی۔ آئی اے دوسرے ملکوں کے اندر جو کچھ بھی کرتی ہے اس کے لئے کارکن امریکہ سے نہیں لاتی۔ واقعات نے ثابت کیا ہے کہ وہ انھیں ملکوں میں ایسی تحریکوں کی پشت پناہی شروع کر دیتی ہے جو مقامی حالات کا فائدہ اٹھا کر اور ان کو بگاڑ کر حکومت وقت کا قافیہ تنگ کر دیتی ہیں جس سے یا تو ان حکومتوں کو امریکہ کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے یا ان کا تختہ اُلٹ جاتا ہے جن تحریکوں کی سرپرستی سی۔ آئی۔ اے کرتی ہے ان میں شامل ہونے والے عام ممبروں کو پتہ بھی نہیں ہوتا کہ وہ کس کے آلہ کار بن رہے ہیں۔ یہ ایجنسی تو ان کے سربرآوردہ لیڈروں میں سے چند ایسے لوگوں کو اپنی گرفت میں لیتی ہے جو اس کی مشینری پر اسی طرح قبضہ کئے ہوئے ہوتے ہیں جیسے سنڈیکیٹ والوں نے کانگریس کی مشینری پر قبضہ کر رکھا تھا یا جس طرح آر۔ ایس۔ ایس کے لیڈروں نے جن سنگھ کو اپنی مٹھی میں کیا ہوا ہے۔ اس قسم کے قابض لیڈر حصولِ اقتدار یا کسی دوسرے لالچ میں آکر اپنی تحریکوں کو ایسے راستے پر ڈال دیتے ہیں جس سے ملک میں افراتفری پھیل جاتی ہے۔

ان ہی باتوں کے پس منظر میں جب جن سنگھ اور آر ایس ایس کے موجودہ کردار پر نظر پڑتی ہے تو شک کی گنجائش ہوتی ہے۔ ان دونوں جماعتوں کے لیڈروں اور اخباروں کا سی آئی۔ اے سے متعلق وزیراعظم کے بیانات پر جو ردِ عمل ہوا وہ بھی قابلِ غور ہے۔ آر۔ ایس۔ ایس کے رسوائے زمانہ گورو گولوالکر جی نے فرمایا کہ وہ تو ایک عرصے سے سی۔ آئی۔ اے کی کارروائیوں کی نشاندہی کر رہے تھے لیکن ان کی پرانی تقاریر میں کہیں اس بات کا ذکر نہیں ملتا۔ انھوں نے غیر ملکی سازشوں کا ذکر ضرور بار بار کیا ہے لیکن ان کی شکایت یا تو عیسائی مشینریوں کے خلاف رہی کہ وہ ہندوستان کے لوگوں کو عیسائیت کی طرف راغب کر کے اس ملک کو کمزور کر رہے ہیں یا پھر مسلمان ان کے غیظ و غضب کا شکار رہے جن کو وہ پاکستان کا ایجنٹ بتلاتے رہے ہیں۔ گورو گولوالکر نے کبھی اس بات کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا کہ سی آئی اے یہاں کی سیاسیات یا معاشیات کو پراگندہ کرنے کیلئے کوشاں ہے گورو جی محض اس بات پر زور دیتے رہے ہیں کہ ہندوستان میں سیکولر نہیں ہندو حکومت ہونی چاہیئے اور اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ سی آئی اے یا امریکہ نے کبھی اس بات پر اعتراض کیا ہو یا اس کی مخالفت کی ہو۔ اس قسم کا مشورہ بیشک دیا ہو کہ محض ہندوں ہندو راشٹروادکے نام پر جمہوری ہندوستان کی حکومت پر قابض نہیں ہو سکتے۔ یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ جن سنگھ کے قیام اور حال ہی میں مسلم پرسنل لا کے متعلق گورو جی کے بیان کے پیچھے اسی قسم کا کوئی مشورہ کار فرما ہو۔

جن سنگھ کے لیڈروں کا ردِ عمل عام طور پر یہ ہوا کہ اگر حکومت سمجھتی ہے کہ سی آئی اے کی کارروائیاں تیز ہو رہی ہیں تو اس بات کی عدالتی تحقیقات ہونی چاہیئے۔ یعنہ یہی بات جن سنگھ کے لیڈر ہر فرقہ وارانہ فساد کے بعد کہا کرتے ہیں جب ان پر یہ الزام عائد ہوتا ہے کہ وہ فرقہ وارانہ جذبات بھڑکا کر ایسی فضا پیدا کرتے ہیں جن سے فسادات برپا ہوتے ہیں وہ گواہیوں وغیرہ کے قانون کی دسترس سے باہر ہوتی ہیں۔ سی آئی اے جیسا خفیہ محکمہ جس کا بیشتر کام زبانی ہوتا ہے اور جو ہمیشہ پردے کے پیچھے سے تار کھینچتا ہے کیونکہ عدالتی کارروائی کی پکڑ میں آئے گا؟ اس کا جواب تو جن سنگھ کے نیتا ہی دے سکتے ہیں۔ اس ضمن میں یہ بھی قابل غور ہے کہ عدالت میں ثبوت پیش کرتے وقت حکومت کو وہ گواہان اور ثبوت سامنے لانے پڑیں گے جن کے کھل جانے کے بعد حکومت کی مدافعتی کارروائی کے امکانات تاریک ہو جائیں گے۔

سی آئی اے کی سرگرمیاں ہندوستان میں نئی نہیں ہیں۔ یہ ایجنسی جب سے بنی ہے اس ملک میں کام کر رہی ہوگی۔ آجکل اسکی اہمیت خصوصاً اس لئے بڑھ گئی ہے کہ گذشتہ چند برسوں سے اسے اپنے مقاصد میں پے در پے شکستوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ امریکی حکومت میں یہ احساس شدت پکڑ گیا ہے کہ شریمتی اندرا گاندھی انکی رضا و مرضی کے مطابق چلنے کو تیار نہیں اور انھیں اس قسم کے لیڈر سے خاص چڑ ہے جو اپنی روایات اپنے خیالات اور اپنے ملک کے مفاد کو کسی طاقتور ملک کی رضا و مرضی سے زیادہ ترجیح دے۔ اسی بات کو بھانپ کر غالباً وزیراعظم نے ملک کو اس کے خطرناک ارادوں سے آگاہ کیا ہے۔ سی آئی اے کی کوشش ہے کہ ملک کی سماجی و اقتصادی مشکلات میں اضافہ ہو۔ قانون و امن کمزور ہوں عوام میں بد دلی اور احساسِ بحران پیدا ہو اور بڑھے۔ ہر وطن دوست کا فرض ہے کہ ان رجحانات کا مقابلہ کرے اور ان کو پھیلانے والی تحاریک پر نظر رکھے۔ غیر ملکی ایجنسیوں اور ان کی سازشوں کا مقابلہ کرنے کا یہی واحد جمہوری طریقہ ہے۔

سیکولر ڈیموکریسی

[redacted]

وحشی فرشتے



مدن لال نے کہا "آپ باربار جبلپور کیوں جاتی ہیں؟ کوئی کام ہمیں کیوں نہیں بتاتیں؟"

میں نے انھیں بتلایا کہ وہاں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان جو نفرت اور شکوک کی دیوار کھڑی کردی گئی ہے اسے گرانے کی کوشش میں ہوں۔

مدن لال بولے "آپ وہاں عرصے سے جا کر بیٹھی ہوئی ہیں اگر مجھے لے چلتیں تو میں فوراً یہ سب کام کرواسکتا تھا!"

مجھے ان کی بات پر یقین تو کیا آنا؟ پر ویسے ہی پوچھ لیا وہ کیسے ٹھیک کرتے؟

مدن لال نے وہاں کی باتیں بیان کیں، میں نے وہاں جو جو کیا تھا وہ بھی بتایا۔

میں نے حیرت سے پوچھا "آپ یہ سب کیسے جانتے ہیں؟"

انھوں نے کہا "جن لوگوں نے یہ سب کیا ہے میں انھیں کو جانتا ہوں۔ وہ سب بھی آپ کے کام سے متاثر ہیں۔ لیکن آپ کے پاس کیسے آئیں؟ آپ مجھے لے چلتیں تو میں انھیں سے سب کام ٹھیک کروا دیتا۔"

میں نے دل ہی دل میں کرایہ وغیرہ کے خرچہ کا حساب لگایا اور کہا۔

"آپ چلئے!"

ہم جبلپور پہنچے۔ مدن لال ان سے الگ ملنے چلے گئے۔ دوسرے دن وہ ایک نوجوان کو لے کر آئے الگ کانفرنس ہوئی۔ وہ حضرت بولے۔ "ہمارے یہاں تو صلاح یہ ہوتی رہی کہ ہم آپ کو ختم کیسے کریں پر آپ کی گفتگو سے ہم مجبور ہوگئے تھے۔ اور اب مدن لال نے آکر آپ کو 'ماں' کہہ دیا ہے اس لئے ہم آپ کے پاس آگئے۔ ہمیں اب کوئی ڈر بھی نہیں ہے۔ کہئے آپ کیا چاہتی ہیں؟"

میں نے کہا "یہ سب کیسے ہوا اور آپ سب اس میں کس طرح شامل ہوئے؟ پہلے تو یہی معلوم کرنا چاہتی ہوں!"

نوجوان نے کہا "مہذب' طبقہ ہمیں غنڈہ کہتا ہے۔ غنڈے کیسے بنتے ہیں۔ آپ جانتی ہیں کہ ہم کتنی ہی کوشش کریں شریف نہیں ہوسکتے۔ کبھی ملازم ہو جاتے ہیں تو پولیس ہماری 'ہسٹری شیٹ' دکھا کر الگ کروا دیتی ہے۔ ہر تیج تہوار پر ہمیں بند کرا دیتی ہے تاکہ ہم ہمیشہ ان کے چنگل میں پھنسے رہیں۔ جوا کھیلتے ہیں تازیئے نکلتے ہیں تو تازیئے والوں سے حفاظت کے لئے ہندو دوکانداروں سے امن وامان رکھنے کے لئے پیسہ لیتے ہیں۔ اسی طرح رام لیلا پر رام لیلا کمیٹی سے اور مسلمان دوکانداروں سے پیسے وصول کرتے ہیں۔ اگر کوئی نہیں دیتا تو بعد میں ہوش آنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اس کی دوکان پہ سے جلسہ پر پتھر یا جوتا پھینکا گیا تھا۔ بازار والے ہم سے تھر تھر کانپتے ہیں۔ یہ جلیبی والا جب تک کانگریس کا وزیر نہیں بنا تھا ہاتھ بھی جوڑتا تھا اور مفت میں ناشتہ وغیرہ بھی کرواتا تھا۔ اگر ہم اکٹھے کسی میلے ویلے میں چلے جاتے ہیں تو بازار وغیرہ بند کر دیئے جاتے ہیں! پر یہ سب کیا ہم صرف اپنے لئے کرتے ہیں؟ کہیں مالک مکان کی مدد سے اکٹھے کئے جاتے ہیں تو کہیں مل مالک کے اشارے پر! ہمیں پولیس کو بھی تو کما کر دینا ہوتا ہے! ہمیں ایسے ہی رکھا جاتا ہے 'مہذب سماج' ہمیں آباد نہیں ہونے دیتا۔ اس کو بھی ہماری ضرورت ہے۔ بہن جی! ہم ایسے ہی لوگ ہیں۔" اس نے ٹھنڈی سانس لی، اور اپنی داستان جاری رکھتے ہوئے کہا۔

فلاں تاریخ کو شہر کے باعزت لوگ ہمارے پاس آئے اور بولے آج مسلمان ہندوؤں پر حملہ کرنے والے ہیں کیا تم لوگ سوتے رہوگے؟ کیا بہو بیٹیوں کی عزت نہیں بچاؤگے؟ کیا اوشا بھارگو کا بدلہ نہیں لوگے؟۔

ہم نے کہیں بھی حملہ کی تیاری نہیں دیکھی تھی لیکن چونکہ وہ کہنے والے بڑے لوگ تھے مہذب اور باوقار لوگ تھے۔ پولیس کے داروغہ بھی ان کی ہاں میں ہاں کرتے تھے اس لئے بھلا ہم کیوں نہ مانتے۔ ہم باتوں میں آکر حرکت میں آگئے۔ لاٹھی، بم، ہاکیاں، بندوقیں جو بھی ملا جمع کرنے لگے۔ محلہ کے مسلمان، ہماری بھاگ دوڑ دیکھ کر سامنے جمع ہونے لگے۔ انھیں جمع ہوتے دیکھ کر ادھر کے لوگ بھی جمع ہونے لگے۔ دن ڈھلتے ڈھلتے دونوں طرف مجمع اکٹھا ہوگیا۔ 'مہذب' سماج نے خبر دی کہ مسلمان رات کو ۹ بجے ایک گولا چھوٹنے پر حملہ کریں گے۔

ہم تیار تھے۔

سینما ختم ہوا اور بھیڑ آگئی۔ ایک گولا چھوٹا۔ ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اپنے ساتھ ایک بڑا ہجوم لے کر مسلم محلہ پر ٹوٹ پڑے۔ ہمارا بندوقچی سب سے آگے تھا۔ دوسری طرف سے پتھر چلنے لگے۔ کوئی بندوق بھی چلی۔ ہم بھاگ کھڑے ہوئے۔ پیچھے مڑے، پیچھے بندوقیں تانے پولیس آرہی تھی کڑک کر بولی۔ آگے بڑھو ورنہ ہم گولی چلا دیں گے۔ ہم چکر میں پڑ گئے۔ آگے آگے ہم پیچھے پیچھے پولیس

اور ان کے پیچھے لوٹنے والوں کی بھیڑ۔

اب اور ہم سے نہ پوچھئے آگے کا حال تو آپ نے دیکھا اور سن ہی لیا۔

نوجوان کے آنسو ٹپک رہے تھے۔ اس نے کہا "ہماری 'غنڈہ برادری' میں کسی بہو بیٹی کی طرف دیکھا تک نہیں جاتا۔ لیکن یہ 'مہذب' سماج کے راستے ہیں۔ لیکن آخر کار یہ سب تو ہم نے ہی کیا ہے؟ نہیں تو کیا یہ 'مہذب' سماج کر سکتا تھا۔

اب آپ کیا چاہتی ہیں وہ بھی کہہ ڈالئے۔"

میں نے اپنے آنسو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "مجھ میں گاندھی جی جیسی روحانی قوت تو ہے نہیں جو کہوں کہ اپنے جرم کا اعتراف کرکے پھانسی پر لٹک جائیے۔ میں تو آپ سے صرف یہی درخواست کروں گی کہ آئندہ آپ کے ہاتھوں سے ایسے غلط کام نہیں ہونے پائیں۔"

اس نے کہا "ہمارے ساتھی آپ سے ملنے کو بے قرار ہیں لیکن آپ کو اکیلے آنا پڑے گا۔"

میں نے ان کی یہ دعوت بخوشی منظور کرلی لیکن میرے ساتھی میرے تنہا جانے پر کسی طرح تیار نہ ہوئے اور ایک کو اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت لے کر ہم لوگ وہاں پہنچے۔

چائے اور ناشتہ کیا۔

اور پھر کسی ایسی سازش میں نہ پھنسنے کا وعدہ لیا۔ ان "غنڈوں" کی گاڑی نے لائن بدل لی۔

اس کے بعد جب ہم لوگ گئے تو معلوم ہوا کہ وہ بہت جوش و خروش کے ساتھ اور محنت سے اپنے ہاتھوں سے اجڑے ہوئے لوگوں کو اجڑے گھروں میں آباد کر رہے تھے۔

یہ وہ لوگ تھے جنھیں مہذب سماج آباد نہیں ہونے دیتا۔

محبت کا پیغام

تہاڑ گاؤں میں مسلمانوں کا مہاجر کیمپ بن گیا

سیکولر ڈیموکریسی

تھا۔ مدراس ملٹری حفاظت کر رہی تھی۔ لوگ بہت خوف زدہ تھے۔ دور سے بیچ بیچ کی خیالی بھیڑ دیکھتے رہتے تھے۔ میں پہنچی تو بہت خوف زدہ معلوم ہوئے۔ میں وہیں رک گئی۔ فوجیوں نے اپنے ساتھ میرا خیمہ بھی لگا دیا۔ اندرا جی کو پیغام بھیجا، وہ بھی پہنچیں۔ میرے لئے کھانے پینے کا سامان بھی لائیں۔

جب وہاں سے لوٹے تو میں نے گاندھی جی سے کہا "آپ ایک بار تہاڑ چلئے۔"



وہ پروگرام کے بارے میں سوچنے لگے پھر کہا "شام کو تو پوجا کا وقت ہو جاتا ہے۔"

میں نے کہا "آپ تو کہیں بھی پوجا کر لیتے ہیں تہاڑ میں ہی پوجا کر لیجئے۔"

انھوں نے کہا "کوئی ناراض آدمی مجھے مار دے تو؟"

میں نے کہا "نہیں مار سکتا۔"

وہ مسکرا کر بولے "مارے گا تو تو کیا کرے گی کیا بچا لے گی؟"

میں نے پختہ یقین سے کہا "بچا نہیں سکوں گی تو ساتھ مر تو سکوں گی۔"

کیا معلوم تھا کہ یہ باتیں صرف کہنے کی ہوتی ہیں۔

گاندھی جی بولے "کل پروگرام بنائیں گے۔"

دوسرے دن میں پہنچی، تو گاندھی جی آرام کر رہے تھے۔ میں باہر بیٹھ گئی۔ اور اندر دیکھتی رہی، جہاں سے لیٹے ہوئے گاندھی جی کے پیر نظر آ رہے تھے۔

ایک صاحب جو اپنے آپ کو وہاں کا ٹھیکیدار سمجھتے تھے، بولے "آپ انھیں تہاڑ لے جانا چاہتی ہیں؟"

میں نے کہا "جی ہاں۔"

وہ میرے ساتھ الجھتے رہے، بحث کرتے رہے۔

بعد میں ہم دونوں گاندھی جی کے جاگنے پر ان کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ گاندھی جی نے پوچھا "تیری ان سے بات ہوئی؟"

میں نے کہا "جی ہاں۔"

"انھوں نے کیا کہا؟"

میں بولی "انھوں نے کہا گاندھی جی کو وہاں کیوں لے جاتی ہو؟ پہلے اپنی حکومت اور جواہر لال جی سے پوچھئے وہ مسلمانوں کو رکھنا بھی چاہتے ہیں یا نہیں۔

"تو نے کیا جواب دیا؟"

میں نے بتایا کہ "اس بات سے میرا کیا مطلب؟ میں کیوں پوچھوں؟ میں چاہتی ہوں کہ یہ رہیں اور گاندھی جی بھی چاہتے ہیں کہ یہ رہیں۔"

"انھوں نے کیا کہا؟"

"انھوں نے کہا 'ان کے پاس وقت نہیں ہے'۔"

"تو نے کیا کہا؟"

میں نے کہا "وہ آج پروگرام بنائیں گے جب وقت ہوگا جائیں گے۔"

"پھر انھوں نے کیا کہا؟"

انھوں نے کہا "پٹرول نہیں ہے۔"

میں نے کہا "میرے پاس کوپن ہے۔"

"پھر کیا کہا؟"

انھوں نے کہا "جب وہ لوگ ہندوستان میں رہنا ہی نہیں چاہتے تو آپ انھیں کیوں لے جاتی ہیں۔"

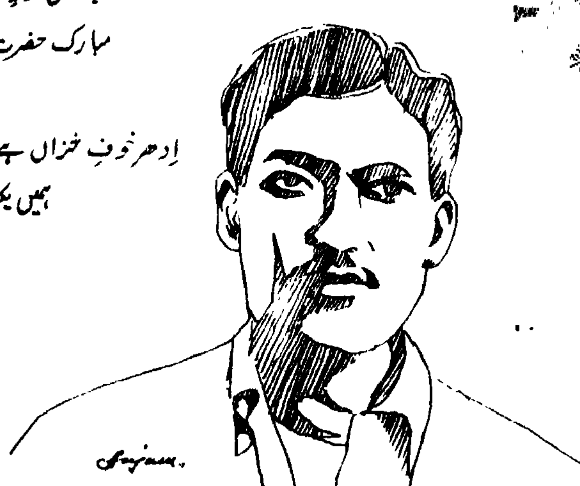
"پھر تو نے کیا کہا؟"

میں نے کہا "وہ رہیں چاہے نہ رہیں۔ چلے جائیں گے تو بھی ان کے دل میں یہ تو رہے کہ کسی نے ہمدردی دکھائی اور کہا کہ نہ جاؤ۔"

گاندھی جی فوراً بولے "لڑکی ٹھیک کہتی ہے "میں تو وہاں ضرور جاؤں گا۔"

وہ تہاڑ گئے۔ محبت کا پیغام لے کر۔

اشفاق اللہ خان شہید



دو غزلیں بخطِ مصنف

سبھی سامانِ عشرت تھے مزے سے اپنی کٹتی تھی
وطن کے عشق نے ہم کو ہوا کھلوائی زنداں کی

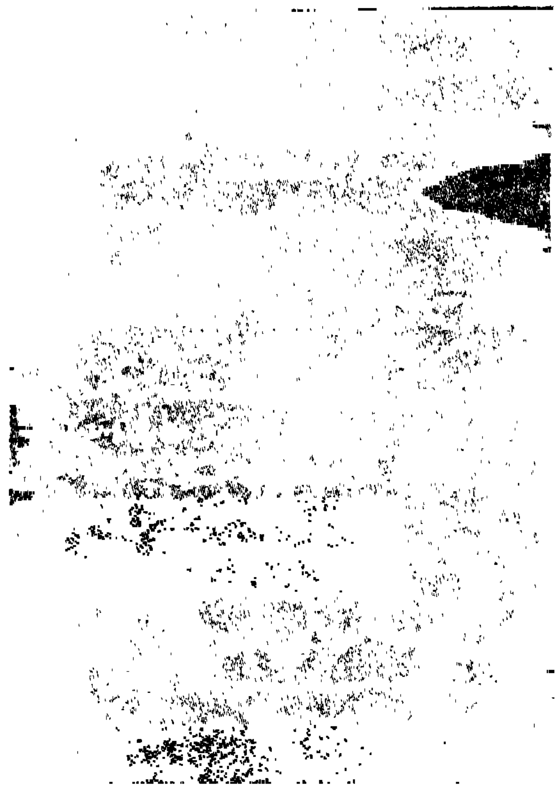
خدا واقف ہے جیسی بھی گذرتی ہے گذرتی ہے
سنو مت داستاں اے یار تم بیمارِ ہجراں کی

مثالِ قیس دیوانہ کسی لیلےٰ کی خاطر میں
نہیں ٹھوکریں کھایا کیا کوہ و بیاباں کی

بحمد للہ چمک اٹھا ستارہ میری قسمت کا
کہ تقلید حقیقی کی عطا شاہ و شہیداں کی

جبہ سائی درِ حضرت کی حسرت اپنا ایماں ہے
مبارک حضرتِ واعظ کو خواہش باغِ رضواں کی

اِدھر خوفِ خزاں ہے آشیاں کا غم اُدھر دل کو
ہمیں یکساں ہے تفریحِ چمن اور قید زنداں کی



بہار آئی ہوئی شوخی جنونِ فتنہ ساماں کی
الٰہی خیر کرنا تو مرے جیب و گریباں کی

یہ جذباتِ حریت کہیں مٹنے سے مٹتے ہیں
عبث کی دھمکیاں دار و رسن کی اور زنداں کی

وہ گلشن جو کبھی آباد تھا گزرے زمانے میں
میں شاخِ خشک ہوں ہاں ہاں اسی اُجڑے گلستاں کی

نہیں تم سے شکایت ہم صفیرانِ چمن مجھ کو
مری تقدیر ہی میں ہے قفس اور قید زنداں کی

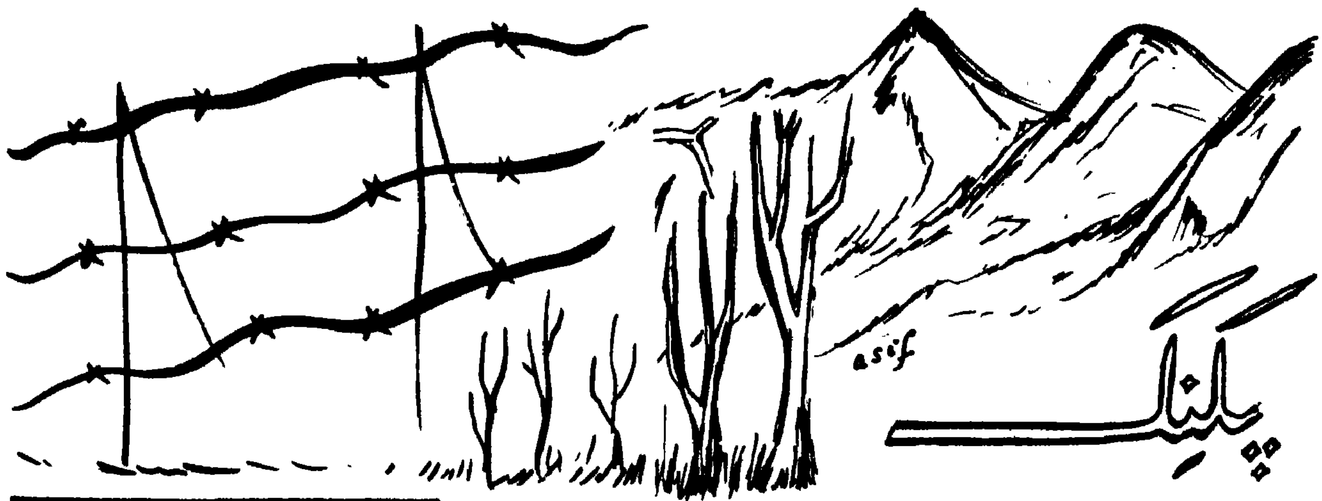
کرو ضبطِ محبت گر تمہیں ہے دعوٰیِ الفت
خموشی صاف بتلاتی ہے یہ تصویرِ جاناں کی

یونہی لکھا تھا قسمت میں چمن پیرائے عالم نے
کہ فصلِ گل میں گلشن چھوٹ کر ہے قید زنداں کی

زمیں دشمن زماں دشمن جو اپنے تھے پرائے ہیں
سنوگے داستاں کیا تم مرے حالِ پریشاں کی

یہ جھگڑے اور بکھیڑے میٹ کر آپس میں مل جاؤ
یہ تفریقِ عبث ہے تم میں ہندو اور مسلماں کی





پکنک

اختر الایمان

سماں سہانا تھا ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے۔۔
بدن کو تازگی ملتی تھی، روح میں جیسے
اضافہ ہوتا سا محسوس ہو رہا تھا مجھے
فضا میں اُڑتے ہوئے مست اَبر کے ٹکڑے
یہ لگ رہا تھا بہاروں کے ہیں فرستادے
خیال آیا کہ موسم کا لطف لیں سب دوست
مرے تو جانتے ہیں بھینے کو آج کھل کے جئیں
عظیم شہر کی آلودہ اس فضا سے پرے
کہیں بھی مل کے چلیں، ساتھ بیٹھیں، کھائیں پئیں
مرا پڑوسی بڑا پیارا آدمی تھا اسے
گلی میں آن کے آواز دی "غلام رسول"!
معاً مجھے یاد آیا میرا پیارا ہمسایہ
اب اس جہاں میں نہیں بن چکا ہے، وقت کی دھول
جو پچھلے سال اچانک بھڑک اٹھے تھے یہاں
وہ فرقہ واری فسادات کھا گئے اس کو!

نفرتوں کی سپر

وہ نفرتوں کی سپر رکھ کے دل پہ آتے ہیں
وہ بد نصیب وہ محرومِ دردِ انسانی
انھیں ملی ہی نہیں چشمِ تر کی تابانی
نہ اس کی بات میں لکنت نہ آنکھ میں نم ہے
نہ ذوق چاک گریباں نہ چاک دامانی
لبوں پہ نعرۂ وحشت نگاہ برہم ہے
قلم ہے ہاتھ میں، تلوار دستِ قاتل میں
بس اپنا جوہرِ تبلیغِ زباں دکھاتے ہیں
بہائے خون و کفن کر کے مسکراتے ہیں
انھیں خبر نہیں اک چیز زخمِ دل بھی ہے
کہ جس سے ہوتی ہے تہذیبِ نفسِ انسانی

سردار جعفری

ہم ایک ہیں

جاں نثار اختر



اے وطن! اے مری گنگا کی، ہمالہ کی زمیں
سیکڑوں سال فروزاں ہیں تری یادوں کے ساتھ
یہ نہیں ہے کہ نظارے ہی حسیں ہوں تیرے
حسنِ تہذیب بھی ہے حسنِ خداداد کے ساتھ

کتنے سورج ترے ماتھے سے اُگے کیا کہیے
اب بھی ذروں میں نہاں جن کی چمک لگتی ہے
کتنی تہذیبوں کے گلزار کھلے ہیں تجھ میں
تیری دھرتی کوئی ست رنگ دھنک لگتی ہے

کتنی دھاراؤں کے سنگم سے بنی یہ دھارا
کتنی صدیوں کی کہانی یہ فضا کہتی ہے
موج در موج کوئی جذبِ نہاں ہے کیا ہے!
یا تہہِ آب کوئی سرسوتی بہتی ہے

کوئی رشتہ ہے مگر فکر کی یک جہتی کا
ایک ہی رنگ میں ہر ذہن ڈھلا ہے برسوں
بادہ کش بھول نہ جائیں گے کہ میخانے میں
مئے وحدت کا کوئی دور چلا ہے برسوں

بت کدوں میں نظر آجاتے ہیں مسجد کے نقوش
عکس مسجد میں بھی مل جاتے ہیں بت خانوں کے
یہ جو پیوند پہ پیوند لگا رکھے ہیں
یہی انداز حسیں ہیں ترے دیوانوں کے

ایک ہی گیت میں سنگیت میں ڈھلنے کے لئے
پردۂ روح سے نکلی تھیں صدائیں چھن کر
جنبشیں ہاتھ کی یکساں سی نظر آتی تھیں
ساز کی لے، کہیں رنگوں کی لکیریں بن کر

قلب بے چین تھے اک رنگ میں ڈھل جانے کو
کونسا دل تھا جو چاہت کا پرستار نہ تھا
اپنی ہر ایک خوشی بانٹ لیا کرتے تھے
کوئی تہوار کسی ایک کا تہوار نہ تھا

کوئی بھی گھر ہو دِوالی کے دیئے جلتے تھے
عید بھر دیتی تھی سینوں میں اُجالے کیا کیا
رنگ ہولی کا ہر ایک دل میں بکھر جاتا تھا
چہرے چہرے پہ دمک اُٹھتے تھے لالے کیا کیا

جن کے ہاتھوں نے لکھی تھی جو تاریخ تری
اس کو کیا نام دیں؟ سوچی ہوئی تہمت کے سوا
اپنے ہر پیار کو نفرت میں بدلنا چاہا
کیا پکاریں اسے چالاک سیاست کے سوا

اے وطن! ہم تری تاریخ لکھیں گے پھر سے
تیری تاریخ ہے دل جوئی و دل داری کی
تیری تاریخ محبت کی، وفا کی تاریخ
تیری تاریخ اخوت کی روا داری کی

تیری تاریخ صداقت کی حسیں قدروں کی
دل کے رشتوں کی، مروت میں بسی نظروں کی
تیری تاریخ ہے بھگتی کے امر نغموں کی
تیری تاریخ ہے خود درشٹی کے آدرشوں کی

تیری تاریخ ہے قرآں کا گیتا کا ورق
آشتی، امن، اہنسا کے اصولوں کا سبق
دہر سے اپنا مقابل کوئی اب تک نہ اٹھا
کوئی گوتم، کوئی چشتی، کوئی نانک نہ اٹھا

تفرقہ باز سیاست نے بہت کھیل رچے
اپنا آدرش تھا پر جان سے پیارا ہم کو
تو نے دیکھا ہے کہ ہم مل کے اٹھے مل کے بڑھے
تو نے جب چونک کے اک بار پکارا ہم کو

جل اٹھے تیرے لئے ہم کسی جنگل کی طرح
برق پر برق گراتے ہوئے بادل کی طرح
خون اعدا سے سلگتی ہوئی مشعل کی طرح

آج آزاد ہیں ہم، ذہن ہمارا آزاد
تنگ جذبات کے گھیروں سے نکل آئے ہیں
جو فرنگی کی سیاست نے کبھی بوئے تھے
ان تعصب کے اندھیروں سے نکل آئے ہیں

کچھ اندھیروں کے پرستار اگر ہیں بھی تو کیا
روشنی ہو تو اندھیروں کی کہاں چلتی ہے
سیکڑوں سال کے ماتھے پہ دمک ہے جس کی
اپنے سینوں میں وہی شمعِ حسیں جلتی ہے

ایک ہے اپنا وطن، ایک زمیں، ایک ہیں ہم
ایک ہے فکر و عمل، ایک یقیں، ایک ہیں ہم
کون کہتا ہے کہ ہم ایک نہیں، ایک ہیں ہم

ے ہندی اور ایرانی طرزِ تعبیر کے ملاپ کی طرف
اشارہ ہے جو آگے چل ہندوستانی فنِ تعمیر کہلایا۔
ے موسیقی اور مصوری میں جو رجحان ہندوؤں
مسلمانوں کے باہمی اشتراک سے وجود پذیر ہوا
کی طرف اشارہ ہے۔

چراغِ نوا

اتحادِ ملک اے اہلِ وطن وہ ساز ہے
جس کا ہر نغمہ حیاتِ قوم کی آواز ہے

ہیں ابھی اپنے تصور میں ہزاروں منزلیں
دورِ تعمیر و ترقی کا ابھی آغاز ہے

آج ویرانوں کے دامن میں بھی رقصاں ہے بہار
جذبۂ سعی و عمل کا یہ حسیں اعجاز ہے

گلشنِ امید میں اِٹھلا رہی ہے زندگی
زندگی کی جلوہ سامانی پہ ہم کو ناز ہے

نفرت و تفریق کا دل پر نہ آنے دو غبار
سب کی خاطر اِرتقا کا ضوفشاں در باز ہے

ظلمتِ فرقہ پرستی کو مٹانا ہے ہمیں
یہ تقاضائے وطن، یہ وقت کی آواز ہے

دوستانِ امنِ عالم ہیں ہمارے ہم نوا
نغمہ سنجانِ وفا کا ایک ہی انداز ہے

عزمِ محکم سے رواں ممتاز ہے یہ کارواں
عزمِ محکم ہی ہماری زندگی کا راز ہے



عزیز ممتاز مرزا

غلام ربانی تاباں



ایک غزل

سینکڑوں عصری مسائل میں اُلجھ کر رہ گئے
ورنہ تاباں حسرتِ تعمیر بھی رکھتے ہیں ہم

آج کی مجبوریاں، معذوریاں اپنی جگہ
دل میں فردا کی حسیں تصویر بھی رکھتے ہیں ہم

علم و دانش بے حقیقت دستِ محنت کے بغیر
خواب بھی رکھتے ہیں ہم، تعبیر بھی رکھتے ہیں ہم

اہلِ دل کرتے ہیں جن سے ماہ و پرویں کا شکار
اپنے ترکش میں کچھ ایسے تیر بھی رکھتے ہیں ہم

رفتہ رفتہ جو بدل دے خود زمانے کا مزاج
شوق کے جذبوں میں وہ تاثیر بھی رکھتے ہیں ہم

اپنے قاتل آپ ہیں، اپنے مسیحا آپ ہیں
زہر بھی رکھتے ہیں ہم، اکسیر بھی رکھتے ہیں ہم

غلام ربانی تاباں

کیفی اعظمی

بہروپنی

ایک گردن پہ سیکڑوں چہرے
اور ہر چہرے پر ہزاروں داغ
اور ہر داغ بند دروازہ
روشنی اِن سے آ نہیں سکتی
روشنی اِن سے جا نہیں سکتی

تنگ سینہ ہے حوضِ مسجد کا
دل وہ دونا پجاریوں کے بعد
چاٹتے رہتے ہیں جسے کُتّے
کُتّے دونا جو چاٹ لیتے ہیں
دیوتاؤں کو کاٹ لیتے ہیں

جانے کس کوکھ نے جنا اس کو
جانے کس صحن میں جوان ہوئی
جانے کس دیش سے چلی کم بخت
ویسے یہ ہر زبان بولتی ہے
زخم کھڑکی کی طرح کھولتی ہے
اور کہتی ہے جھانک کر دل میں
تیرا مذہب ترا عظیم خدا
تیری تہذیب کے حسین صنم
سب کو خطروں نے آج گھیرا ہے
بعد ان کے جہاں اندھیرا ہے

سرد ہو جاتا ہے لہو میرا
بند ہو جاتی ہیں کھُلی آنکھیں
ایسا لگتا ہے جیسے دنیا میں
سبھی دشمن ہیں کوئی دوست نہیں

مجھ کو زندہ نگل رہی ہے زمیں

ایسا لگتا ہے راکھشس کوئی
ایک گاگر کمر میں لٹکا کے
آسماں پر چڑھے گا آخرِ شب
نور سارا نچوڑ لائے گا
میرے تارے بھی توڑ لائے گا

یہ جو دھرتی کا پھٹ گیا سینہ
اور باہر نکل پڑے ہیں جلوس
مجھ سے کہتے ہیں "تم ہمارے ہو"
میں اگر ان کا ہوں تو میں کیا ہوں
میں کسی کا نہیں ہوں اپنا ہوں

مجھ کو تنہائی نے دیا ہے جنم
میرا سب کچھ اکیلے پن سے ہے
کون پوچھے گا مجھ کو میلے میں
ساتھ جس دن قدم بڑھاؤں گا
چال میں اپنی بھول جاؤں گا

یہ اور ایسے ہی چند اور خیال
ڈھونڈنے پر بھی آج تک مجھ کو
جن کے ماں باپ کا ملا نہ سراغ
ذہن میں یہ اُنڈیل دیتی ہے
مجھ کو مٹھی میں بھینچ لیتی ہے

چاہتا ہوں کہ قتل کر دوں اسے
وار لیکن جب اس پہ کرتا ہوں
میرے سینے پہ زخم اُبھرتے ہیں
میرے ماتھے سے خوں ٹپکتا ہے
جانے کیا میرا اس کا رشتہ ہے

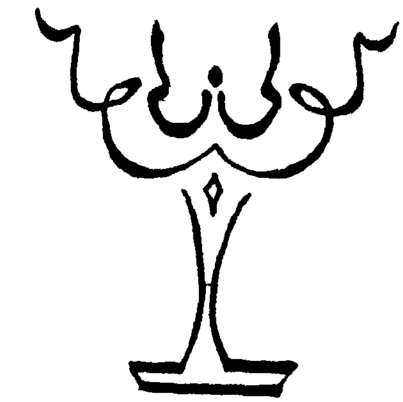
آندھیوں میں اذان دی میں نے
سنکھ پھونکا اندھیری راتوں میں
گھر کے باہر صلیب لٹکائی
ایک اک در سے اس کو ٹکرایا
شہر سے دور جا کے پھینک دیا

اور اعلان کر دیا کہ اٹھو
برف سی جم گئی ہے سینوں پر
گرم بوسوں سے اس کو پگھلا دو
کر لو جو بھی گناہ وہ کم ہے
آج کی رات جشنِ آدم ہے

یہ مری آستین سے نکلی
دوڑ کے رکھ دیا چراغ پہ ہاتھ
مل دیا پھر اندھیرا چہرے پر
ہونٹ سے دل کی بات لوٹ گئی
در تک آ کے برات لوٹ گئی

اس نے مجھ کو الگ بلا کے کہا
آج کی زندگی کا نام ہے خوف
خوف ہی وہ زمین ہے جس میں
فرقے اُگتے ہیں فرقے پلتے ہیں
دھارے ساگر سے کٹ کے چلتے ہیں
خوف جب تک دلوں میں باقی ہے
صرف چہرہ بدلتے رہنا ہے
صرف لہجہ بدلتے رہنا ہے
کوئی مجھ کو مٹا نہیں سکتا
جشنِ آدم منا نہیں سکتا





ہولی

علی جواد زیدی

(۱۹۴۲ء کے تاریخی واقعات سے متاثر ہوکر)

پہلے زمانہ اور تھا سے اور تھی، دور اور تھا
وہ ہولیاں ہی اور تھیں، وہ ٹولیاں ہی اور تھیں
وہ ہولیاں ہی اور تھیں
لیکن، مرے پیرِ مغاں
کل تو نیا انداز تھا
اک روز کا تھا خاتمہ تھا، اک دور کا آغاز تھا
تیرے وفاداروں نے جب کھیلیں گلابی ہولیاں
نکلے بناکر ٹولیاں
ہنستے چلے، گاتے چلے
اپنے گلابی رنگ سے، دنیا کو نہلاتے چلے
مسجد سے منہ موڑے ہوئے
مندر کا سنگِ آستاں چھوڑے ہوئے
گرجا سے کتراتے ہوئے
جیسے کہ ہوں روحانیت کی زندگانی ہی سے گھبرائے ہوئے
دورِ وفاداری کا یہ انجام تھا
فکرِ گنہگاری کا تازہ، دلربا پیغام تھا

تیرے ہی کوچے میں یہ سب عہدِ وفا توڑے گئے
رشتے نئے جوڑے گئے
اور پھر گنہگاروں نے کیا رندانہ ہنگامے کئے
اس وقت ان کو یاد تھا، بس ایک ترسانا ترا
مفلس وفاداروں کو للچانا ترا
جب میکدے کی گود میں
تیری جفا، تیری سزا کے نام پر ساغر چلے
سوکھے ہو کاسے لبالب بھر چلے
سب اپنے لب تر کر چلے
پھر توڑ دیں وہ پیالیاں، جن میں سراپی آئے تھے
شیشے چھنا چھن، چھن، چھنا چھن ٹوٹتے
اور رند لذت لوٹتے
ٹوٹے ہوئے شیشوں کا اک انبار تھا
شیشوں کے اس انبار میں اک وہ بھی کہنہ جام ہے
جس کو سکندر کے قوی ہیکل جواں
بھاگے تھے پورس کی زمیں پر چھوڑ کر

ان میں وہ کاسے بھی ہیں جن کو عرب لے آئے تھے
اپنی عبا سے ڈھانک کر
پینے سے پہلے دیکھتے تھے محتسب کو جھانک کر
لیکن، کبھی
پینے سے باز آتے نہ تھے، فاتح جو تھے
ان میں ہیں ایسے جام بھی
جن پر پٹھانوں کے قوی ہاتھوں کے دھندلے سے نشان
کچھ آج بھی موجود ہیں
اور ان نشانوں میں ہے خوں، مفتوح ہندوستان کا
اور ان میں ہے وہ جام بھی، جن کو مغل لے آئے تھے
تاتار سے، قندھار سے، کابل سے، رکناباد سے
مفتوح ہندوستان میں
جن کو وہ اپنے قصرِ عالیشاں میں چھلکاتے رہے
تیغوں سے کھنکاتے رہے
اور وہ حسین نازک سبک، ہلکی صراحی کس کی ہے
پیرس کے میخانوں میں یہ مشہور تھی
لایا تھا اک تاجر اسے جو بعد میں فاتح بنا
یہ ہلکے شیشوں کے گلاس اور یہ نئے ہلکے سے "پگ"
جن پر لکھا ہے یہ بنے تھے ملکِ ہندوستان میں
اور حال کی صدیوں میں جو چلتے رہے
پینے کو مل جاتی تھی، پی لیتے تھے ہم
لیکن تہی دستی کا یہ عالم تھا دل جلتے رہے
ہم آج گھبرا ہی گئے
اور ان سبھی شیشوں کو چکنا چور کر ڈالا دفورِ جوش میں
چھن چھن، چھنا چھن توڑ کر!
جیسے کہ بربادی کی دیوی چھم چھما چھم ناچتی
ہولی منانے کے لئے میخانے میں آ ہی گئی
ٹوٹے ہوئے شیشوں کے اس انبار پر
ہم نے جلائی آگ یوں

زر دشت کا پاکیزہ دل سچائیوں پر ہنس دیا
جیسے کہ یہ کہنے لگا
"جلنے دو، جلنے دو یوں ہی، شیشے پگھلنے دو یوں ہی"
تیرے وفاداروں نے یوں پیرِ مغاں!
شب بھر جلائیں ہولیاں
نعرے وہ مستانہ لگے اس جوش میں
دل گر پڑے احساس کی آغوش میں
اور بول اٹھے تسلیم اے پیرِ مغاں جاتے ہیں ہم
کل پھر پلٹ کر آئیں گے
اس وقت اس میخانے میں ساماں ہوں گے دوسرے
تیرے پرانے ذہن کے معیار توڑے جائیں گے
تعمیرِ نو کی جائے گی
لیکن ہمارے ساغور دہ، مہرباں، پیرِ مغاں!
تجھ کو برا لگتا ہے کیوں
غیروں کا کیا، تیرا بھی کیا؟
یہ میکدہ ہم سب کا ہے پنچایتی
تو کیا ہے، تیرا خوف کیا؟
کہہ تو دیا پیرِ مغاں! کل پھر پلٹ کر آئیں گے
ہرگز نہ ہم باز آئیں گے
کس کو ڈراتا ہے کہ تم اس کی سزا پا جاؤ گے؟
گاتے تھے ہم، گاتے ہیں ہم، گائیں گے ہم
ہرگز نہ باز آئیں گے ہم
جو عمر بھر پیتے تھے پیتے جائیں گے
جھیلیں گے جیتے جائیں گے
پیروں میں ہے زنجیر، لیکن ٹوٹ بھی سکتی ہے یہ
ہاں آج ہستی قید ہے، کل چھوٹ بھی سکتی ہے یہ
گانے دے، گانے دے ہمیں
دھومیں مچانے دے ہمیں
شیشے کو شیشے سے ٹکرانے دے ہمیں

چھن چھن چھنا چھن کی صدا
بڑھنے دے بڑھنے دے ابھی
ہم مست و بے خود ناچتے، گاتے، جلاتے، توڑتے
ہنستے رہیں، چلتے رہیں
اور تو بھی خود، پیرِ مغاں!
ہولی کے نغمے سن ذرا! اور دیکھ اپنی آنکھ سے
تیرے وفاداروں نے کیا کھیلیں گلابی ہولیاں!!!

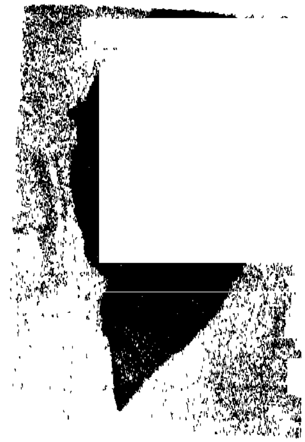
منہ میکدے سے موڑ کر ہولی کی یہ ٹولی چلی
گلزار میں
سبزے، لچکتی ڈالیاں، گنجان، پیاری جھاڑیاں
پانی کی سینچی کیاریاں، کانٹوں میں—— پتیاں
یہ سب سہی، لیکن یہاں، وہ شے کہاں
جس کے لئے مشہور ہے انگور ناب
ہاں کیا کہا پیرِ مغاں؟
تلواروں کے نیچے پھول ہیں، ان میں سے دو اک
چن بھی لوں
خالی ہیں گلدستے مرے
تجھ کو نہیں معلوم ابھی
خالی یہ گلدستے ترے خالی ہی رہ جائیں گے اب
پھولوں نے ٹھانی ہے کہ شاخوں ہی پہ مرجھائیں گے اب
اور تیرے کمروں میں نہ وہ آئیں گے اب
منہ بند کلیاں، اب کہاں؟
جو اپنی سندر، موہنی مسکان کر دیں رائگاں
اور اپنا گلشن چھوڑ دیں سینے میں خوشبوئیں لئے
اور اجنبی ماحول میں
طاقِ نظر کی کانپتی زینت بنیں
کلیوں کے منہ اب کھل چکے، منہ بند کلیاں
اب کہاں؟

کلیاں کہاں، یہ پھول ہیں
خاکِ چمن کی گود میں آرامِ جاں یہ پھول ہیں
آتش زباں یہ پھول ہیں
اور دیکھ تو یہ پھول کتنے شوخ ہیں
جو ٹوٹ کر شاخوں سے گر جاتے ہیں تیری راہ میں
اے دل شکن پیرِ مغاں!
آ، دیکھ ان کی جرأتیں
یہ چاہتے ہیں روک دیں گلزار میں راہیں تری
تیرے لئے چارہ کیا اب رہ گیا
ان بے حیا پھولوں کی آنکھوں کا تو پانی بہہ گیا
اب یہ ہیں ان کی ہمتیں، روکیں گے تیرے راستے
تو بھی خدا کے واسطے
ان کو کچل دے پیس دے
ورنہ خدا نا خواستہ
کلیاں نہیں کانٹے ہیں یہ
کانٹوں سے بھی بدتر ہیں، نشتر ہیں یہ، خنجر ہیں یہ
گلزار میں تیرے قدم کچھ آج تو آئے نہیں
تو نے انھیں سبزوں پہ کی ہے مے کشی
صدیوں سے تیرا دور ہے
گلزار پر حق ہے ترا
یہ کون ہیں جو روک دیں گلزار میں راہیں تری

تو ڈر گیا پیرِ مغاں!
کتنا بھیانک خواب تھا
تعبیر کچھ بھی ہو مگر
تیرے وفاداروں نے، کل
کس آن سے کس بان سے کس شان سے
کھیلیں گلابی ہولیاں

[redacted]

غزل کی دھرتی



سلام مچھلی شہری

——میں سوچتا ہوں کہ آکاش ایک ماں کی طرح
اگر ستاروں کو سینے سے ہے لگائے ہوئے
ہزاروں طرح کے پھولوں کو یہ زمین اگر...
ہے اپنے پیار کی آغوش میں چھپائے ہوئے
تو یہ زمین جو مندر ہے، کعبۂ دل ہے
یہاں بھی بات کدورت کی ہو یہ مشکل ہے

کماری[1] پاؤں کی چھاگل تو کاشمر بندی
سجی سجائی ہے اب بھی ہمالیہ کی دلہن
ہے ایک ہاتھ میں بنگال چوڑیوں کی طرح
تو دوسرے میں مہاراشٹر اک حسیں کنگن
نویدِ فکر یہ آرائشِ جمال بھی ہے
لباس و رنگ میں یک جہتیِ خیال بھی ہے

میں پوچھتا ہوں مرے دور کے کلاکارو!
کہ تم کو شور ہے مرغوب یا ترانۂ دل
لبوں میں شور، ستاروں میں شور، ذہن میں شور
خدا کے واسطے چھیڑو کوئی فسانۂ دل
یہ کون کہتا ہے حالات سازگار نہیں
فضا جو خود نہ بنالے وہ حسن کار نہیں

خدا گواہ کہ اس سرزمیں سے دنیا کو
پیامِ وحدتِ جذبات و فکر ملتا تھا
فسانۂ ہر جلوہ ہو یا ترانۂ نور
اسی چمن، اسی مندر کا ذکر ملتا تھا
مرے وطن کے نئے دور کی فضائیں بھی
فضائے تازہ کی مہکی ہوئی ہوائیں بھی
یہی پکار رہی ہیں کہ روشنی لے لو
نئے پیالے ہیں صہبائے زندگی لے لو

رباب ہاتھ میں ہے جستجوئے نغمہ کیا
ہزار گیت ہیں بکھرے ہوئے کوئی گالو
فضائے خلد میں رہ کر فضا بنانا کیا
فضائیں خود ہی یہ کہتی ہیں ہم کو اپنالو
جدا چمن سے چمن کی فضا نہیں ہوتی
خیال و فکر کی خوشبو فنا نہیں ہوتی

غرض یہ ہند جدھر اور جس طرح دیکھیں
حسیں لتاؤں، شگفتہ کنول کی دھرتی ہے
الگ الگ ہیں مضامین شعر پھر بھی سلام
ہمارا دیس مرقع غزل کی دھرتی ہے ۔۔۔

---
[1] راس کماری۔

زمین کی آواز

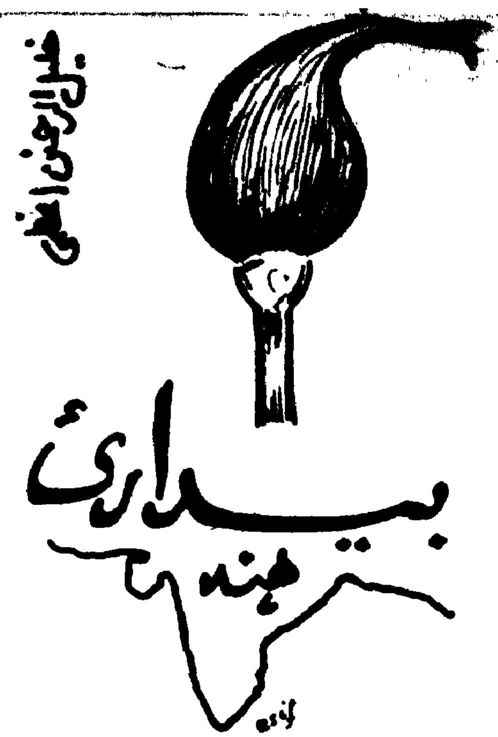
علی سردار جعفری

زمین ناچ رہی تھی کہ کٹ گئی زنجیر
چمک رہے تھے فضاؤں میں آفتاب کے پھول
ہزار امیدوں، امنگوں کے ہاتھ پھیلا کر
نگاہ چُننے ہی والی تھی اپنے خواب کے پھول
ہوا تھا جشن کا آغاز ہی کہ ظلمت نے
اٹھائی صبح پرستوں کے بیچ میں دیوار
دو پارہ کر دیا دستِ خزاں نے رخِ بہار
سحر دو نیم ہوئی، آفتاب ٹوٹ گیا
نظر کا خون ہوا اور خواب ٹوٹ گیا
زمیں کے درد نے زخموں کے ہونٹ سے یہ کہا
کہ نورِ صبح کے قاتل تمہارے قاتل ہیں
نہ باندھنے دو انھیں نفرتوں کے تنگ حصار
اٹھے نہ صبح کے سینے پہ رات کی دیوار

ہمارا درد ہے دردِ زمیں، غمِ انساں
ہمارا دین ہے پیغامِ عشق، امنِ جہاں
ہمیں خبر ہے کہ ہے جنگ بُزدلی کا شعار
ہمیں خبر ہے کہ ہے جنگ موت کا ہتھیار

یہ مُسکراتے ہوئے پھول کی طرح بچے
یہ لہلہاتے ہوئے کھیت، جھومتی فصلیں
یہ کارخانوں کے دل کی حیات بخش پکار
یہ صنعتیں کہ ہے جن سے ہنروروں کا وقار
یہ علم و فکر کے معبد، یہ فن کے بُت خانے
یہ زندگی کا اجنتا، یہ دل کا تاج محل
یہ ڈالتے ہوئے سیاروں پر کمند انساں
زمیں نے پالا ہے ان کو بڑے جتن کے ساتھ
یہ ہم سے پوچھ رہے ہیں کہ "کیا زمیں نے ہمیں
جتن سے پالا ہے اس واسطے کہ قتل ہوں ہم؟"
زمیں کے درد کی رکھنی ہے آج لاج ہمیں
کہ نفرتوں نے محبت پہ بڑھ کے وار کیا
ستم نے تنگ پھر اپنا سیہ حصار کیا
اندھیرے جمع ہیں صبحوں کے قتل کرنے کو
تعصبات کے شعلوں سے اٹھ رہا ہے دھواں
توہمات کی لو ظلمتوں میں پلتی ہے
جہالتوں کے دیئے نفرتیں اُگلتے ہیں
ہوس کے سینوں میں پھنکارتا ہے رات کا ناگ
یہ ناگ نور کی نہروں کا خون پی لے گا

زمین زخموں کے ہونٹوں سے دے رہی ہے پیام
کہ تیغ چھین لو قاتل سے، اور اس سے کہو
کہ احترام کرے دردِ خاک و انساں کا



بیداری ہند

خلیل الرحمن اعظمی

اِس گنبدِ نیلگوں کے نیچے
ہر روز خلا کی وسعتوں میں
رتھ پر اپنے سوار ہو کر
سورج آتا ہے اور زمیں کے
چہرے کے نقوش ہیں اُبھرتے

کرنوں میں نہا کے ہیں نکھرتے
اصنام حسیں، جنھیں اجنتا
صدیوں سے ہے گود میں چھپائے
پڑتی ہے یہی شعاعِ رنگیں
سانچی کے عظیم معبدوں پر
رُکتی ہے کنارکا کے اوپر
لیتے ہیں جہاں پہ سانس اب بھی
بن بن کے بتانِ ماہ پیکر
ریتیلی زمیں پہ سرد پتھر
ہے دیکھتی چشم مرمریں سے
گرتے ہوئے اشکِ شبنمیں کو
ٹکراتی ہیں گاہ یہ ضیائیں
جناروں سے اس مناکشی کے
اڑتی ہوئی بدلیاں جہاں پر
پھیلائے ہوئے پروں کو اپنے
ڈوبی ہوئی کہر میں پڑی ہیں

ملتے کی نہیں یہ شان و شوکت
بے مثل یہ پاک سرزمیں ہے
اس سازِ سکوت میں فسوں ہے
بیداری روح پہ سکوں ہے
اُڑتا ہے ہوا میں آج دیکھو
آزادیٔ ہند کا پھریرا
پھر ابرِ کرم اٹھا ہے ہر سو
بھر جائیں گے کوہ و دشت و دریا
پیاسا نہ رہے گا آج کوئی۔
جی بھر کے پیئے گی آج جنتا
منزل کی طرف چلو رفیقو!
ہر ذرہ ہے یہ پیام دیتا

ہاں آگے بڑھے چلو عزیزو
جس سمت نوائے زندگی ہو
جس سمت کہ امن و شانتی ہو
یک جہتی و آشتی ہو بس جا
ہر اک کو نصیب سرخوشی ہو
جنّت کا رہے نہ ہم کو ارماں
دھرتی اتنی بدل گئی ہو
قصّہ نہ ہو رام راج کوئی
آنکھ اپنی اب اس کو دیکھتی ہو
آشا کے کھلے ہوں پھول ہر سو
ہر سمت بسنت آ گئی ہو
ہر رنج کو ہم بُھلا چکے ہوں
دُکھ کی تصویر مٹ چلی ہو

آؤ سنو گیت اب خوشی کے
دا تو در اور مہانَدی کے
رقصاں ہے صدائے برق و فولاد
ویرانے بھی ہو رہے ہیں آباد
پنجاب ہو یا کہ آندھرا ہو
درگاپور ہو کہ ہو بھلائی
ہر سمت مشین گا رہی ہے
آیا اب عہدِ آہنی ہے
دوشیزۂ کوہسار بھی اب
دلہن کی طرح سے سج رہی ہے
ماتھے پہ چمک رہا ہے جھومر
سچ مچ کی کوئی یہ مکشی ہے
لب پر نہیں کوئی آہ و فریاد
اب غم کی بساط اُٹھ رہی ہے

قدموں میں ہے اپنے فتح و نصرت
ہر لحظہ ہے جشنِ عہدِ نو کا
لہراتی ہیں بنسری کی تانیں
آنکھوں میں بسا ہے پھر کنہیا
اغیار کا حال اب زبوں ہے
جو اپنا عدو ہے سرنگوں ہے
جاگو جاگو مرے رفیقو!
سورج نکلا ہے اس کی کرنیں
اپنی روحوں میں آج بھر لو
ہاتھوں میں اب اپنے جام اُٹھاؤ
اس جام میں حرّیت کی مے ہے
جی بھر کے اُچھالو اور پی لو
یہ کیسی ہوائیں چل رہی ہیں

اب دور نہیں وہ لمحۂ عیش
ویرانوں کے بھاگ پھر کھلیں گے
ٹپ ٹپ ٹپکیں گی رس کی بوندیں
برکھا امرت کی خوب ہو گی

(اڑیا سے ترجمہ)

[redacted]

گمشدہ آدرش



گاندھی جی کی یاد میں

محمود سعیدی

وہ سایہ
جو تپتے ہوئے راستوں پر سفر کرنے والوں کو تابِ سفر بخشتا تھا
جو شعلوں کو شبنم بنا دینے والی پُر افسوں نظر بخشتا تھا

وہ خوشبو
جو بنجر زمینوں کی مشکل مسافت کو آساں بنائے ہوئے تھی
جُھلستی فضاؤں کو گلشن بہ داماں بنائے ہوئے تھی

وہ جھونکا صبا کا
جو انگلی پکڑ کر ہماری
بہاروں کے خیموں کی جانب لئے جا رہا تھا
کئی خواب رنگیں ——
شگفتی نگاہوں کو دِکھلا رہا تھا

وہ آدرش اپنا
محبت، مساوات، آزادی و امن جیسے،
کئی نام جس کے
سنے ہم نے ——
شام و سحر زندگی بخش پیغام جس کے
وہ سایہ، وہ خوشبو، وہ جھونکا صبا کا
گزرتے ہوئے وقت کے پھیلے صحرا میں جانے کہاں کھو گیا ہے
وہ آدرش اپنا ——
ہمیں جس نے بیداریِ دل کی دولت عطا کی
ہمارے تجاہل کی بڑھتی ہوئی دھند میں منہ چھپا کر
کہیں سو گیا ہے ...

میرا خیمہ آگ جب



عمیق حنفی

کہاں کھو گئے؟ کہاں گم ہوئے؟ کہاں چل دیئے؟
وہ شاداب سرگم بھرے اور مہکتے ہوئے شعر
بہکتے، چھلکتے، چھلکتے، دل و جاں کی گہرائیوں میں اترنے کی خاطر
مرے کان پر دستکیں دے کے ٹھہرے
مرے لب پہ آکر رُکے

دل و جاں کی گہرائیوں سے فضا میں اُبھرنے کی خاطر
مگر چیختے اور بلکتے ہوئے خون کے شور میں کھو گئے
انھیں اجگرِ دورِ شعلہ نفس کھا گیا
دہکتی ہوئی آگ میں
سسکتی ہوئی راکھ میں
اسی آتش و خوں کے طوفاں میں ڈوبے
کہ جس نے مجھے دونوں آنکھوں کے ساحل پہ لاکر کھڑا کر دیا
مساوات کے سب ترانے اخوت کے نغمے گلوں ہی میں اَٹکے ہوئے رہ گئے
نگاہوں کی وسعت کتابوں کے اوراق کی حد سے آگے نہ نکلی
کتابوں کے اوراق کو نفرتوں کی بھڑکتی ہوئی آگ نے اک سیہ حاشیہ دے دیا
ہر سمت شیطان کا قہقہہ گونج اٹھا
جو شاداب سرگم بھرے اور مہکتے ہوئے میرے اشعار کو کھا گیا
مگر قہقہہ یعنی شیطان کا قہقہہ میرے اشعار کے دبلے پتلے بدن کی رگوں میں رواں
شرر بار تیزاب کی قوتوں کو کہاں جانتا تھا
جسے میں نے گنگا و زمزم کو اک کاسۂ سر میں حل کر کے حاصل کیا تھا
تو شیطان کے قہقہے کی رگیں پھٹ رہی ہیں گلا کٹ رہا ہے
مرے شعر نے اژدہے کی نسوں کو سرنگیں بنا کر اڑا ہی دیا ہے

زبیر رضوی

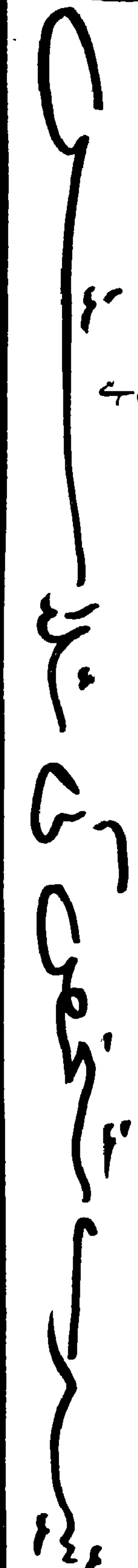
جب کسی صبح
اخبار کی سیاہ سرخیاں
کسی گاؤں، قصبے، شہر یا بستی میں
ہندو مسلم فساد کی خبریں سناتی ہیں
چائے کی پیالی میں نیم کی کڑواہٹیں گھل جاتی ہیں
آنگن میں ٹھمکتی ہوئی معصوم مسکراہٹیں سہم جاتی ہیں
بیوی کے ہاتھ سے تازہ دودھ کی بوتل گر کر ٹوٹ جاتی ہے

میں ہمیشہ کی طرح
واقعات کی نوعیت جاننے کی بجائے
اخبار کے کالم میں
مرنے والی دو لاشوں کے درمیان
ایک ایسے تیسرے شخص کی لاش تلاش کرتا ہوں
جو میری طرح فرقہ واریت کا دشمن ہے

لیکن
ہمیشہ ہی
مرنے والی دو لاشوں کے درمیان
اُس تیسرے شخص کی لاش نہیں ملتی !!



سیلولائڈ ہیومکریسی









سندر بن کے دو سندر پنچھی
اک پنجرے سے آزاد ہوئے
اور ہوا میں اُڑنے لگے
اُڑتے اُڑتے
جانے ان کے من میں کیسا کھوٹ سمایا
آپس میں اِک دوسرے پر وہ جھپٹ پڑے
اور یوں دونوں پنکھ بکھیر
گھائل ہو کر دھرتی پر پھر آن گرے
ایک شکاری کتا ان کے پیچھے لپکا
کچھ بچوں نے پنکھ پکڑ کر
ان کو خوب جھنجھوڑا
جانے کیسے
ساری بلاؤں سے چھٹکارا پا کر
دونوں پنکھ بکھیر
گرتے پڑتے آخر پھر اک بار اُڑے
اور اک اونچے سے پربت کی چوٹی پر جا بیٹھے
دیر تلک اِک دوسرے سے وہ
پربت کی چوٹی پر بیٹھے
آپس میں کچھ کہتے رہے کچھ سنتے رہے
اور جب
دونوں کے من کی
سب گرد چھٹی تو
دونوں اپنے پَر پھیلا کر
ہوا میں پھر اک بار اڑے
اور خوب اونچے وہ اڑتے گئے

اسلم پرویز



رفعت سروش

عروسِ یکجہتی

— ایک مونولاگ —

میں یکجہتی ہوں
قومی اتحاد اور ایکتا کا پیکرِ رنگیں
وطن ہندوستاں میرا
یہاں ہر اہلِ فن ہے ترجماں میرا
یہاں کا ہر بشر ہے پاسباں میرا

مجھے تاریخ نے خود اپنے ہاتھوں سے سنوارا ہے
عوامی قوتوں نے روپ کو میرے نکھارا ہے
مجھے اکبر نے تاجِ خسروی بخشا
جہانگیر اور خرم نے کیا سکہ مرا جاری
ظفر نے تاج ٹھکرا دیا میری محبت میں
وہ ٹیپو ہوں، کہ نانا فرنویس وہ لکشمی بائی
سبھی نے حق کے پرچم کو اٹھایا میری الفت میں
مری خاطر شہیدانِ وطن نے خوں بہایا ہے
مجھے میرے وطن کے سورماؤں نے سجایا ہے

سنوارا ہے مجھے کس پیار سے، کتنی محبت سے
کہ نانک کی صدا ہوں میں
کہ چشتی کی نوا ہوں میں
لبِ خسرو پہ میرا ذکر آ کر بن گیا نغمہ
کبیر و غالب و ٹیگور نے میری حیاتِ جاوداں کے زمزمے گائے
فضاؤں میں وطن کی
میرے حسن و ارتقا کے گیت لہرائے

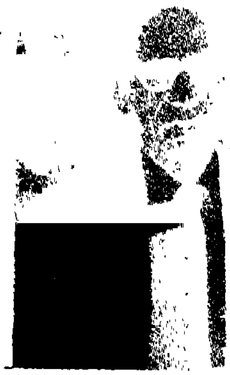
ہزاروں آندھیاں آئیں مرا گلشن جلانے کو
وطن کے پاسبانوں نے بچایا آشیانے کو
وہ دادا بھائی نوروجی، تلک اور گوکھلے، گاندھی
بھگت سنگھ، بوس، آزاد و جواہرلال، مولانا حسین احمد
سبھی مشفق رہے میرے، سبھی محسن رہے میرے
سبھی نے آبیاری کی مری کشتِ تمنا کی
سبھی نے بانکپن بخشا مرے دل کی امنگوں کو
رواداری کے چشمے ان کے فیضِ نو سے جاری
دلوں کی مملکت میں اب بھی ہے ان کی عملداری

زمین و آسماں بدلے
مگر کچھ اور نکھرا انقلاباتِ جہاں سے حسن میرا، دلکشی میری
میں یکجہتی ہوں
قومی اتحاد اور ایکتا کا پیکرِ رنگیں
میں ناقوس و اذاں کی روح ہوں، وحدت مرا مسلک
مجھے سب مذہبوں سے پیار ہے، میں سب کا آئینہ
میں روحِ گیتا و قرآں
مرا مسکن دلِ انساں

ہر اک لب پر رواں میری عقیدت کے ترانے ہیں
زبانِ عہدِ حاضر پر مرے دلکش فسانے ہیں
عروسِ زندگی ہوں میں، درخشاں میرا مستقبل
میں انسانوں کے زریں خواب کا حاصل

شمیم کرہانی

ندی کی آواز



حسین ناگن سی ایک ندی
نہ جانے کتنے ہزار سالوں سے بہہ رہی ہے
کوئی کہانی سی کہہ رہی ہے

مرے کنارے پڑے ہوئے تھرتھرا رہے ہیں
حیاتِ گوتم کے شاہ پارے
اشوک کی شانتی کے کتبے
وہ ہار سنجوگتا نے ڈالا جو پرتھوی راج کے گلے میں
وہ نرم کو اگھڑا جو طوفان میں سہارا تھا سوہنی کا
جو سلے کے مہوال کی خوشی کو ندی میں غرقاب ہو گیا تھا
وہ ٹوٹا پھوٹا ستار جس پر غریب میرا نے اپنے گردھر کے گیت گائے
وہ بین جس پر جہان تُلسی نے اپنے رگھوپت کے راگ چھیڑے
کبیر کا عارفانہ بربط
جو ہم کو دیتا تھا یہ سندیسہ کہ رام و رحمان ایک ہی ہیں
سب ایک اللہ کے ہیں بندے یہ سارے انسان ایک ہی ہیں
یہی کنارا ہے وہ کنارا
کہ جس پہ تاریخ زندگی کے حسیں نظارے چمک چکے ہیں
عظیم اکبر کے آسمانِ وفا کے تارے چمک چکے ہیں
جمالِ ممتاز کے پجاری کا مرمریں خواب جلوہ گر ہے
یہ تاج محلوں کی رہ گزر ہے
ہر ایک پیاسے کو میرے ساحل نے ساغر رنگ و بو دیا ہے
مرے ہی پاکیزہ جل میں اکثر نمازیوں نے وضو کیا ہے
مرے کنارے ہر ایک مسجد ہر ایک مندر کی نقرئی بتیاں جلی ہیں
مری رواداریوں کی لہروں میں مختلف کشتیاں چلی ہیں
ادھر سے گزرا ہے عارفوں کا گروہ اکثر
سنبھالے اپنے عمل کے ہاتھوں میں اپنی ہستی کا سبز پرچم
وہ سبز پرچم کہ جس کے آنچل میں چاند تارے مچل رہے تھے
خدائے واحد کے پاک نغمے ہوا میں کروٹ بدل رہے تھے
نوائے شنکر سے دل کے شیشوں میں شعلۂ عشق ڈھل رہے تھے
فقیر نانک کے سوزِ دل سے چراغ راہوں میں جل رہے تھے
پیامِ چشتی کی روشنی میں ملے جُلے پاؤں چل رہے تھے
یہ متحد پاؤں کے نشاں ہیں
ہوا کے ناسازگار ہاتھوں نے خاک سی ڈال دی ہے لیکن
یہ سارے نقشِ دوامِ الفت ابھی حسیں ہیں ابھی جواں ہیں
چلے چلیں اس ڈگر پہ ہم تم تو یہ ڈگر حاصلِ سفر ہے
اسی ڈگر کی اندھیری وادی کے پار ہی منزلِ سحر ہے



سید احتشام حسین

قومی شاعری کے مطالعہ کے چند اہم پہلو

قومی شاعری شاعری کی کوئی صنف نہیں۔ نہ باعتبار ہیئت اور نہ بہ اعتبار معنی۔ اس کا شعوری ذکر جہاں تک اردو کا تعلق ہے، زیادہ سے زیادہ سو سال پر محیط ہے اور وہ بھی کسی ایسے متعین اور قطعی مفہوم میں نہیں جسے اس کے آج کے سیاسی تصور سے جوڑا جا سکے۔ آزاد، حالی، شبلی کی تحریروں میں قوم کا لفظ کبھی ملک، کبھی مذہب، کبھی گروہ اور کبھی ان سب کے ملے جلے تصور پر حاوی ہے۔ سرسید نے بھی اپنی بالغ نظری کے باوجود اس لفظ کو مختلف مفاہیم میں استعمال کیا ہے۔ یہی حال مولانا نذیر احمد کا ہے۔ ان کی تحریروں میں اس کا مفہوم سیاق و سباق کے مطالعہ کی مدد ہی سے متعین کیا جا سکتا ہے۔ وطن دوستی اور حُبِ وطن سے قوم پرستی تک ایک طویل فکری سفر ہے۔ مغربی سیاسی افکار میں تو یہ لفظ عام ہو چکا تھا اور اس کے اثرات زندگی کے ہر شعبے پر پڑ رہے تھے۔ لیکن ہندوستان میں جس نظامِ زندگی کی پرورش اور پرداخت ہوئی تھی اس میں قوم کا سیاسی تصور پروان نہ چڑھ سکا۔ اس لئے ہندوستان کی کسی زبان کی شاعری یا ادب میں وہ عناصر پیدا نہ ہو سکے جنھیں موجودہ مفہوم میں قومی کہا جا سکے۔ تاہم شعر و ادب کا کوئی دور ایسا نہیں ہے جس کی تخلیقات میں بنیادی طور پر وہ روح تلاش نہ کی جا سکے جسے کسی نہ کسی معنی میں قومی نہ کہہ سکیں۔ ادب اور تہذیبی یا اجتماعی زندگی کے رشتہ کے انکار کا محرک سیاسی مفاد ہے۔ اس لئے مخصوص قسم کے سیاسی مفادات کو برقرار رکھنے والے قومی شاعری یا قومی ادب کے تصور ہی کو غیر ادبی قرار دیتے ہیں۔ ہاں اگر یہ صورت لاشعوری نسلی اظہار کے طور پر دکھائی دے تو اس سے انکار کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ کیونکہ اس کا تعلق قیاس اور ماضی کے نسلی اور قومی خیالات سے ہوتا ہے جنھیں غیر شعوری اور تہ نشین سمجھ کر شعوری کوششوں سے تلاش کیا جاتا ہے۔ اکثر ایسی تلاش شاعر اور ادیب کے بجائے خود اپنے نفسیاتی انتشار کی تلاش ہوتی ہے جو ادب کو محض لفظی بازی گری اور غیر شعوری محرکات یا اعصابی رگی کا گورکھ دھندا نہیں قرار دیتا۔ اسے زندگی کے ظاہر و باطن کا ہر پہلو ادب کے اندر ہی نظر آ سکتا ہے جس میں قومی زندگی کے نشیب و فراز، قومی انتشار اور خوابوں یا امنگوں کی تصویر کشی بھی شامل ہے۔

اردو شعر و ادب اس سے مستثنیٰ نہیں اگرچہ اس حقیقت کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ اردو نے کوئی ہومر، والمیکی، ویاس، ورجل، فردوسی، شکسپیر یا امرا القیس نہیں پیدا کیا جن کی تخلیقات فطرت اور سماج کا آئینہ بن جاتیں۔ اردو شاعری کا آغاز دو تہذیبی میلانات کے متضاد اور مشترک عناصر کی جدلیاتی کش مکش کے درمیان ہوا اور اس کے اندر قومی شعور کے ارتقا کو اسی روشنی میں دیکھنا چاہیئے جس ادب کے ابتدائی نمونے امیر خسرو اور دوسرے صوفیوں کے یہاں ملتے ہیں ان میں قطعاً اس اشتراک کا اظہار ہونا چاہیئے جس میں بنتے ہوئے قومی شعور کے اولین نقوش نظر آتے ہیں۔ ان نقوش کا مطالعہ لسانیاتی، فکری، مذہبی، عوامی اور ادبی ہر سطح پر کیا جا سکتا ہے۔ قومی شعور کے ارتقا میں آگے بڑھنے اور پیچھے ہٹنے کا عمل برابر جاری رہتا ہے۔ ہند اور اسلامی تاریخ کی ابتدائی صدیوں میں اس کی ایک شکل وہ بھی تھی جو شریعت اور حکومت یا حصولِ اقتدار کے لئے مسلسل تصادم کی شکل میں ظاہر ہوتی تھی اور ادب اکثر و بیشتر اس کش مکش میں آزاد خیالی اور ترقی کا ساتھ دیتا تھا۔ یہ اثر اتنا گہرا اور وسیع تھا کہ آج تک شیخ و برہمن، دیر و حرم، میکدہ و مسجد، گناہ و ثواب، مذہبی ظاہر پرستی اور آزاد خیالی کے تلازموں کی شکل میں باقی ہے۔ یہ اس جذباتی ہم آہنگی اور اتحادِ انسانیت کی جستجو تھی جس کی منزل علاقہ، مذہب، زبان، فرقہ، گروہ کی چھوٹی چھوٹی وفاداریوں سے آگے ہوتی ہے۔ یہ اس شعورِ قومیت سے مختلف ہے جو رجعت پرستی، استحصال اور جارحیت کا لبادہ اوڑھ کر ظاہر ہوتا ہے اور جس کی وجہ سے بعض انسانیت دوست اور وسیع النظر مفکروں اور فلسفیوں نے قومیت اور قوم پرستی کی مخالفت کی ہے۔ احساس یک رنگی اور باہمی مفاد کے لئے ارتقائی جد و جہد اور جارحیت کے لئے اتحاد میں فرق ہوتا ہے۔ اس کے مختلف پہلو اٹھارہویں، انیسویں اور بیسویں صدی کے یورپ کی تاریخ میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ایسی ہی قوم پرستی کی سرحد نسل پرستی سے مل جاتی ہے۔ اور نازی ازم کی شکل اختیار کرتی ہے لیکن وہ قوم پرستی جو بیرونی استحصال

کے خلاف اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے پیدا ہوتی ہے اس کی نوعیت ترقی پسندانہ اور انسانی ہوتی ہے۔ اس کی تصویریں ویت نام، تھائی لینڈ اور افریقہ کے ابھرتے ہوئے قومی شعور میں نظر آتی ہیں۔ ہر جگہ کے ادب میں قوم پرستی کا اظہار وہاں کے قومی مقاصد کے تابع رہا ہے اور ایسے ادب کا مطالعہ کرنے میں اس کو ملحوظ رکھنا ضروری ہوگا۔

اردو شاعری کے دورِ آغاز میں قومی شعور صوفیائے کرام کی تحریروں میں ظاہری مذہب پرستی کی باڑھ کو کند کرنے، باہمی رواداری اور میل جول کی تلقین کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اس سے آگے بڑھ کر دکنی شعروادب میں فکری اختلاط، لسانی لین دین، ملکی رسم و رواج سے دل چسپی، ہندوستانی مناظرِ فطرت سے لگاؤ کی صورت میں نمایاں ہوا۔ کوئی شخص ان میں کسی قسم کا واضح قومی شعور تلاش کرنا چاہے تو اسے مایوسی ہوگی لیکن جب وہ معراج العاشقین، شکار نامہ، کلمۃ الحقائق، ارشاد نامہ، سب رس، کلیات قلی قطب شاہ، گلشنِ عشق، پھلبن، کلیاتِ ولی، بوستانِ خیال کا مطالعہ کرے گا تو اس کے لئے یہ کہنا ناممکن ہو جائے گا کہ یہ چیزیں ہندوستان کی فضا کو منعکس نہیں کرتیں یا ان کی تصنیف عرب، یورپ یا افریقہ میں ہو سکتی تھی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ جو شاعر جس علاقہ، تہذیب، اور عہد سے تعلق رکھتا ہے اگر اس کی خوشبو اور جھلک اس کی تخلیقات میں نہ دکھائی دے تو اس کے مصنوعی اور بے اثر ہونے کا احساس ہوگا تیرھویں، چودھویں صدی سے اٹھارویں صدی تک ہندوستان میں قوم کا تصور سیاسی نہیں تھا لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ زندگی ہر قسم کے قومی شعور سے خالی تھی۔ اس کا اظہار مختلف شکلوں میں ہوتا ہی رہتا تھا یہاں تک کہ اردو شاعری کا وہ زریں کلاسکی دور جس نے سودا، میر اور غالب کو جنم دیا اس احساس سے خالی نہ تھا کہ ان کا وطن ہندوستان ہے جس کی تہذیبی زندگی ایک خاص شکل میں ارتقا پذیر ہو رہی ہے اور وہ روایت پروان چڑھ رہی ہے جو یہاں کے بسنے والوں کو ایک ہی لڑی میں منسلک کرنا چاہتی ہے۔ سماجی زندگی کے اس زوال پذیر ماحول میں بھی یہ احساس ایک پُرامید خواب بن کر مختلف عقائد کو ایک سطح پر دیکھنا چاہتا تھا۔ اس ملک نے گزشتہ صدیوں میں ایک دو نہیں ہزاروں کبیر، نانک، دادو دیال جائسی، قطبن، ملا داود، ولی، سراج اور میر ملک کے گوشے گوشے میں پیدا کئے تھے جو کثرت میں وحدت کی تلاش کر رہے تھے اور کعبہ و سومنات کے چراغوں میں ایک ہی نور دیکھتے تھے۔ ایک کثیر المذاہب سماج میں ہم آہنگی کا یہ شعور قوم پرستی کا ایک اہم عنصر کہا جا سکتا ہے۔

انیسویں صدی میں جب غیر ملکی حکومت کے قدم مستحکم ہو گئے، جب نئی تعلیم، نئے مادی حالات نئے سماجی ماحول اور نئے تہذیبی رشتوں نے یگانگت اور ہم آہنگی کے احساس کو اور زیادہ نمایاں کیا۔ قومی شعور اس وقت سے کیفیاتی اور کمیاتی دونوں حیثیتوں سے بدلا ہوا نظر آنے لگا اور طرح طرح سے ظاہر ہوا کیونکہ ادیب اور شاعر زندگی تہذیب اور قومی مسائل کے مختلف تصورات رکھتے تھے، خود ان کے سماجی اور طبقاتی رشتے تھے جن سے ان کا شعور متعین ہوتا تھا، جن کی روشنی میں وہ مستقبل، حال اور ماضی کو دیکھتے تھے جن کی مدد سے وہ اپنے گرد و پیش کے حقائق کو سمجھتے تھے اور اپنے پرانے فکری رشتوں سے باہر نکلنے کی کوشش کرتے تھے۔ نئی مذہبی اصلاحی تحریکیں بھی اسی شعور کا نتیجہ تھیں اور بدلے ہوئے حالات میں مکمل طور پر نہ سہی، کسی حد تک پھر اس ذہنی اقتدار کو علما، کے اندر محدود کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن جو زندگی بن رہی تھی، اس میں سیاسی اور سماجی روابط نے قیادت دوسروں کے ہاتھ میں پہونچا دی تھی۔ چنانچہ غدر کے بعد سرسید، آزاد، حالی اور نذیر احمد فکری رہنماؤں کی حیثیت سے بھی سامنے آئے اور ان کی ادبی تخلیقات کا گہرا مطالعہ یہ واضح کر دے گا کہ مغرب کے لبرل افکار نے ان کو ایک خاص طرح سے متاثر کیا تھا۔ ان میں سے ہر ایک کے یہاں ایک ہی انداز کا قومی شعور تلاش کرنا غلط ہوگا لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکے گا کہ ان کے طرزِ فکر پر زبردست سیاسی تخریب و تعمیر کی پرچھائیاں پڑ رہی تھیں ہندوستان کے سے پس ماندہ لیکن ابھرتے ہوئے ملک میں قومی شعور جامد نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کے وسیع طول و عرض، کثیر آبادی، مختلف مفادات اور گوناگوں ذہنی اور جذباتی پس منظر میں مختلف مدارج کے ذہن وجود میں آ رہے تھے جن کے رشتے الگ الگ تھے۔ سب سے زیادہ اہم اثر مغربی افکار کا تھا جو قومی مفادات کو بھی اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ اگرچہ اردو شاعری اردو ادب اپنی قدیم روایتوں سے رشتہ توڑنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکا تھا اور یہ ہو بھی نہیں ہو سکتا تھا لیکن نئے حالات سے مطابقت پیدا کرنے کی طرف تیزی سے قدم بڑھا رہا تھا، ہندوستان کی دوسری زبانوں کے مقابلہ میں اسے ایک آسانی بھی تھی، وہ یہ کہ اس کا ادبی سرمایہ بہت جلد مذہب کی گرفت سے آزاد ہو گیا تھا اور ایک مخصوص قسم کی سیکولرازم کی فضا اس میں سانس لیتی معلوم ہوتی تھی۔ تاہم قومی سیاست کے انتشار میں سارے اہم ادیب اور شاعر، صحافی اور معلم، مذہبی رہنما اور سماجی کارکن ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ سرسید پین اسلامزم کی اس لہر سے تقریباً بے خبر تھے جو جمال الدین افغانی کے ذریعہ ہندوستان میں بھی پہنچ چکی تھی اور جسے اقبال کے مغرب سے تربیت پائے ہوئے ذہن نے قبول کر لیا، حالانکہ فکرِ اقبال پر سرسید کے اثرات کے نقوش بھی گہرے ہیں۔ جن خیالات کی آمیزش نے اقبال کا ذہن بنایا ان سے ان کے دوسرے ہمعصروں کا ذہن خالی تھا اس لئے قومی شعور کا جو تصور ان کے یہاں نظر آئے گا وہ چکبست یا سرور جہان آبادی، غلام بھیک نیرنگ یا آغا حشر کے یہاں کیسے مل سکتا ہے؛ اسلام کے ملت کے تصور، پین اسلامزم کا تصور، ہندوستان کے قومی تصور سے جس نقطۂ نظر کی تخلیق ہوئی وہ اقبال ہی کی شاعری کے لئے مخصوص تھا۔

برطانوی لبرل سیاست کے تحت مذہبی آزادی کے اعلان کے پردے میں جس طرح فرقہ پرستی کو فروغ ہوا اس کا لازمی نتیجہ تھا ہندو سیاست، مسلم سیاست اور قومی سیاست کی تین واضح شکلوں کا رونما ہونا۔ اگرچہ اردو شاعری اول الذکر دونوں قسم کی سیاستوں کی ترجمانی سے خالی نہیں ہے لیکن اس کا اصل اور چوکھا رنگ مشترک

(باقی صفحہ ۳۲ پر)



ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

اردو غزل میں ہندوستانی تلمیحات

اردو شاعری میں مشترک ہندوستانی تہذیب کا اظہار جس جس طرح ہوا ہے تلمیحوں کا استعمال اس کی روشن تصویر پیش کرتا ہے۔ تلمیحیں ماضی کی وہ روایات ہیں جن کے مطالب ہمارے سماجی وجود میں اچھی طرح رچ گئے ہیں۔ الفاظ اور اصطلاحوں کی طرح یہ بھی زبان کے فکری جزو ہیں۔ تلمیحیں زیادہ تر دیومالا کے قصے، کہانیوں مذہبی تاریخی واقعوں، لوک روایتوں اور کلاسکی شعرا کی طویل نظموں یا قدیم ناٹکوں وغیرہ کی کتابوں سے لی جاتی ہیں۔ ان کی حیثیت رمز و اشارہ یا علامت کی سی ہے جس کی مدد سے ایک پورا واقعہ یا مکمل منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ بلاغت کی جان ہے۔ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنی ادا کرنے کی جیسی صلاحیت تلمیح میں ہے۔ الفاظ کی دیگر اقسام میں نہیں ان کی یہ معنی خیزی ہمیں تکرار اور یکسانیت سے بچاتی ہے اور زبان و بیان کا لطف بڑھاتی ہے۔ ان سے کسی خصوص زبان کے بولنے والوں کے مذہبی عقائد، رسم و رواج اور حالات و واقعات پر روشنی پڑتی ہے اور اس کے تمدن کے درجہ بدرجہ ارتقا کا نقشہ دیکھا جا سکتا ہے۔

مسلمانوں کے ہندوستان آنے کے بعد مقامی اثرات کے تحت خال خال ہندی تلمیحوں کا ذکر اردو شاعری میں بار پانے لگا۔ یہ تلمیحیں دکنی شاعری میں کافی مقبول ہوئیں لیکن دہلوی دور کی غزل میں ایرانی اثرات کے غلو کی وجہ سے یہ رنگ معدوم سا ہو گیا اور پھر ایک ڈیڑھ صدی کے بعد لکھنوی شاعری میں اس کی واضح جھلک دکھائی دینے لگی۔ یہ درست ہے کہ اردو شاعروں نے ہندوستانی دیومالا کو بہت کم برتا ہے اور وہ ہندی تلمیحوں کا ذکر عربی اور ایرانی تلمیحوں کی طرح زیادہ اعتماد اور فراوانی کے ساتھ بھی نہیں کرتے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اردو غزل اس سلسلے میں مقامی اثرات سے یکسر خالی نہیں۔ اس نے جس حد تک ممکن ہو سکا، ہندی تلمیحوں کو قبول کیا ہے اور خود کو ہندوستانی نہج پر ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔

اردو شاعری کو اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں ہندی تلمیحوں کا ایک بہت بڑا حصہ صرف ہوا ہے۔ خاص طور پر اردو مثنویوں نے اپنے اندر مقامی اثرات کو بڑی حد تک جذب کیا ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اردو غزل بھی جو سراسر فارسی روایت کی دین ہے، کس طرح اور کس حد تک ہندی تلمیحوں کو اپنے دائرے میں سمو کر چلتی ہے۔ یہاں اردو غزل کے اشعار کی روشنی میں صرف انھیں ہندی تلمیحوں کا ذکر کرنا مقصود ہے جو بالعموم غزل میں مروج و مستعمل رہی ہیں زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ہم ہندی کی ان تلمیحوں کو اردو کی ادبی تلمیحوں میں شمار کرتے ہیں۔ یہ تمام ہندی تلمیحیں ہندوستانی دیومالا، ہندو مذہبی روایتوں، عقیدوں لوک قصوں اور کہانیوں سے ماخوذ کی گئی ہیں۔ اب یہاں ہم چند تلمیحوں کی صراحت، ان کے تہذیبی پس منظر اور اصل قصے کی روشنی میں پیش کریں گے۔

سری رام چندر

ولی:
تب کا مشتاق جی ہے لچھمن سوں
کشن سوں جب کر رام راہی ہے

گرچہ لچھمن ترا ہے رام ولے
اے صنم تو کسی کا رام نہیں

سراج:
نین راون ہیں ارجن بال پلکیں اور بھویں بھیم کی
ہمارے دل کی دکھ نگری کے راجہ رام چندر ہو

ان اشعار میں "رام" یا "رام چندر" سے ہندوؤں کے اوتار "سری رام چندر" مراد ہیں۔ انھیں وشنو کا ساتواں اوتار مانا گیا ہے۔ یہ اجودھیا کے راجہ دشرتھ کے سب سے بڑے بیٹے اور ولی عہد تھے۔ حسن و جمال سے بہرہ ور اور سپہ گری، تیراندازی اور شہسواری میں طاق تھے۔ راجہ جنک کی بیٹی سیتا کو انھوں نے سوئمبر میں پرسرام کی کمان توڑ کر حاصل کیا۔ راجہ دشرتھ اپنی زندگی ہی میں رام چندر کو تخت نشین کر دینا چاہتے تھے لیکن سوتیلی ماں کی سازش سے انھیں چودہ برس کے لئے جلاوطن ہونا پڑا۔ ان کے چھوٹے بھائی لچھمن اور ان کی رفیقۂ حیات سیتا جی ان کے ہمراہ جنگل گئیں۔ جلاوطنی کے تیرہ سال تو عافیت سے گزر گئے۔ چودھویں سال لنکا کا راجہ راون سیتا جی کو زبردستی اٹھا لے گیا۔ نتیجے کے طور پر رام چندر جی اور راون میں جنگ ہوئی جس میں راون مارا گیا۔

چودہ سال کی میعاد ختم ہونے کے بعد رام چندر، لچھمن اور سیتا جی کے ساتھ اجودھیا واپس آئے۔ اس

دوران راجہ دشرتھ کا انتقال ہو چکا تھا۔ رام چندر جی جیسا کے راجہ بنے اور عدل و انصاف کا ایسا نقشہ قائم کیا کہ آج تک لوگ "رام راجیہ" کے گن گاتے ہیں۔

رام چندر جی کی زندگی کے تمام واقعات رشی بالمیکی نے ہندوؤں کی مشہور مذہبی کتاب رامائن میں لکھے ہیں۔ یہ واقعات تاریخی ہیں یا نہیں۔ اس سلسلے میں کوئی ثبوت نہیں۔ اتنا تو ظاہر ہے کہ رام چندر کا کردار پیش کرنے سے ہندو رشیوں کا مقصد ہندوستانی ملکی روح کی اخلاقی قوتوں کی تہذیب کرنا تھا۔ رام چندر جی اطاعت، فرمانبرداری خوش خلقی اور رحمدلی جیسے اوصاف کی تشخیص ہیں۔ ان کی شجاعت اور جرأت بھی مثالی درجہ رکھتی ہے۔ راست گوئی، صداقت، وفاشعاری اور وعدہ ایفائی میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ وشنو کے اس اوتار سے بدی کی قوتوں کا استیصال اور نیکی کی قوتوں کا فروغ ہوا۔ رام کی کشش اور ہمہ گیر شخصیت میں شعلہ و شبنم کے تمام اوصاف جمع ہو گئے ہیں۔ سراج کے شعر میں تلمیحاً اس طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ولی کے اشعار میں رام کا ذکر رعایت لفظی کے تحت آیا ہے۔

لچھمن:۔

لچھمن رام چندر جی کے چھوٹے بھائی تھے۔ یہ جلا وطنی کے دوران میں رام چندر جی کے ساتھ رہے۔ رامائن میں ان کی بلادرانہ اطاعت گزاری، فرمانبرداری اور وفاشعاری پر خاص طور سے زور دیا گیا ہے۔

راون:۔

راون لنکا کا ظالم اور جابر راجہ تھا۔ قد و قامت میں دیو ہیکل، نہایت بھیانک اور دہشت ناک تھا۔ اس کے بیس ہاتھ اور دس سر بتائے جاتے ہیں۔ قد مثل مینار کے تھا۔ یہ جب چلتا تو زمین کانپتی، پہاڑ لرزتے اور ہاتھی سہم جاتے تھے۔ بڑے بڑے دیوتا اس کے مطیع اور فرمانبردار تھے۔ دولت کا دیوتا کوبیر اس کا خازن تھا۔ پانی کا دیوتا ورن اس کا بہشتی، ہوا کا دیوتا وایو اس کا فراش اور آگ کا دیوتا اگنی اس کا باورچی تھا۔ اس کے محل سونے کے تھے۔ اسی کی بدولت "سونے کی لنکا" آج تک مشہور۔

ہے۔ دولت اور اقتدار کے نشہ نے راون کو ناعاقبت اندیش، بدخو و غلط اور خودسر بنا دیا تھا۔

راون کی بہن سروپ نکھا نے ایک دن اتفاقاً رام چندر جی کو جب وہ جنگل میں جلاوطنی کے دن گزار رہے تھے، دیکھ لیا اور ان پر فریفتہ ہو گئی۔ لچھمن کو یہ بات ناگوار گزری اور اس نے رام چندر جی کے اشارے پر سروپ نکھا کے ناک کان کاٹ لئے۔ سروپ نکھا جلی بھنی اپنے بھائی راون کے پاس آئی اور اسے رام چندر کے خلاف ورغلایا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے سیتا جی کے حسن و جمال کی تصویر کچھ اس انداز سے کھینچی کہ راون بے اختیار ہو اٹھا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ راون نے دھوکے اور فریب کا جال پھیلایا۔ اور ایک دن رام چندر جی کی غیر موجودگی میں سیتا جی کو جنگل سے اٹھا لایا۔ غرض راون نے اپنی شامت خود مول لی۔

رام چندر جی نے سیتا جی کو راون کی قید سے چھڑانے کے لئے لنکا پر فوج کشی کی۔ یہ جنگ رامائن کا بنیادی موضوع ہے۔ رامائن میں راون بدی اور راجندر جی نیکی کی قوتوں کے مظہر ہیں۔ بالآخر نیکی کا بول بالا ہوا راون مارا گیا اور سونے کی لنکا جل کر راکھ کا ڈھیر ہو گئی۔

اشعار ذیل میں جوشش نے راون کے دس سروں کی طرف اور میر نے راون کے اس عبرت ناک انجام کی طرف اشارہ کیا ہے۔

میر:۔

آتش عشق نے راون کو جلا کر مارا
گرچہ لنکا سا تھا اس دیو کا گھر پانی میں

جوشش:۔

دو حضم دیں کہ جو دس سر کا ہوئے جوں راون

جان صاحب:۔

نام کیا لنکا میں کرتی سامری سے میں سوا
مجھ سی جادوگر نہاں ہوتیں اگر راون کے ساتھ

یقین کا ایک شعر ہے:۔

خوش آتی ہے مجھے کب زندگی لیکن یقین آخر
مرے اس دام میں پھنسنے کا ہے وہ سنہرن باعث

سنہرن

یہاں سنہرن سے مراد دھوکے اور فریب کا وہ سنہرا ہرن ہے جس کی بدولت راون سیتا جی کو زبردستی اٹھا لے جانے میں کامیاب ہوا تھا۔ اصل قصہ یوں ہے کہ ماریچ، راون کا ایک قدیم جاں نثار راکشس تھا۔ سیتا جی کو اٹھا لانے کے لئے راون نے اسے جادو کے زور سے ایک خوبصورت ہرن کی شکل میں تبدیل کیا۔ اور رام چندر جی کے جھونپڑے کے نواح میں اسے گھومنے پھرنے کے لئے چھوڑ دیا اس ہرن کا رنگ سونے جیسا تھا۔ سینگ ہیرے کے، چہرہ یاقوت کا، اور کان کنول کے پھول معلوم ہوتے تھے۔ جسم سورج کی شعاعوں کا اور کھال قوس و قزح کے رنگوں کی طرح جاذب اور دل فریب نظر آتی تھی۔ اس کے جسم کے بڑے بڑے داغ دور سے چاند اور سورج کی طرح روشن معلوم ہوتے تھے۔ سیتا جی نے جوں ہی اس ہرن کو دیکھا اسے زندہ یا مردہ حاصل کرنے کی تمنا میں بے قرار ہو اٹھیں۔ رام چندر جی کو بھی پسند آیا۔ اور وہ لچھمن کو سیتا جی کے پاس رہنے کی تلقین کر کے خود جھونپڑے سے نکل گئے۔

ہرن دھوکے اور فریب کا تھا۔ رام چندر جی جتنا اس کا تعاقب کرتے وہ دور ہو جاتا کبھی وہ چھلانگیں مارتا ہوا قریب آ جاتا اور پھر پلک جھپکتے ہی غائب ہو جاتا۔ اس تگ و دو میں رام چندر جی اپنے جھونپڑے سے بہت دور نکل آئے۔ اور تھک کر ایک پیڑ کے سائے میں آرام کرنے لگے۔ ابھی یہ بیٹھے ہی تھے کہ سنہرن پھر ظاہر ہوا۔ اب کے راجندر جی نے تاک کر ایسا تیر جمایا کہ ہرن ڈھیر ہو گیا۔ تیر لگتے ہی راکشس ماریچ اپنی اصل شکل میں ظاہر ہوا۔ بہروپ کا راز کھل گیا۔ لیکن فوراً ہی اس نے ایک اور چال چلی اور رام چندر جی کی آواز سے ملتی جلتی آواز میں زور زور سے "ہائے سیتا" "ہائے لچھمن" پکارنا شروع کیا۔ سیتا جی یہ آوازیں سن کر سخت گھبرائیں اور سمجھیں کہ شاید رام چندر جی پر کوئی آفت نازل ہوئی ہے۔ چنانچہ لچھمن کو ان کی خبر لانے کے لئے کہا۔ لچھمن سیتا جی کو اکیلا چھوڑ کر جانے کو تیار نہ تھے لیکن جب سیتا جی نے برہم ہو کر انہیں بزدلی اور کم ہمتی کے طعنے دیئے تو لچھمن جی کو جھونپڑے سے جاتے ہی

بنی۔ اُدھر باون موقع کی تاک میں تھا سیتا جی کو اکیلا
دیکھ کر انھیں زبردستی اٹھا لے جانے میں کامیاب ہوگیا۔

کرشن، رادھا اور گوپیاں۔

انشا:۔ سانولے تن پہ غضب دھج ہے بسنتی شال کی
جی میں ہے کہہ بیٹھئے اب جے کنہیا لال کی

ہے خیال یوں تمہارے چاہ ذقن کے اندر
جس روپ ہو کنہیا آب جمن کے اندر

وزیر:۔ ہوا دھوپ میں بھی نہ کم حسن یار
کنہیا بنا وہ جو سنولا گیا

برق:۔ عجب بانکے کنہیا نوجواں سلطان عالم میں
حسین جانِ جہاں، جانِ جہاں سلطان عالم میں

جان صاحب:۔ تل نہیں مانگ میں زناخی کے
یہ کنہیا کھڑا ہے گوکل میں

امانت:۔ سانولے تن پہ قبا ہے جو ترے بھاری ہے
لالہ کہتا ہے چمن میں کہ یہ گردھاری ہے

ان اشعار میں کنہیا یا گردھاری سے کرشن مراد ہیں۔ جو وشنو کے آٹھویں اوتار مانے گئے ہیں۔ ہندو دیوتاؤں کے زمرے میں سری کرشن عموماً اپنے روحانی کردار سانولے پن اور بنسری کی دھن سے پہچانے جاتے ہیں۔ اوپر جو شعر پیش کئے گئے ان میں سری کرشن کے جسم و جمال کے یہ پہلو خاص طور پر نمایاں ہیں۔

سری کرشن بیٹے تھے واسدیو اور دیوکی کے جن کا تعلق متھرا کے حکمراں چاند ونش خاندان سے تھا۔ مگر اس زمانے میں چاند ونشیوں کی کسی لغزش کی بنا پر متھرا کی حکومت ایک راکشس کے ہاتھ آگئی تھی کنس نہایت ظالم جابر اور سنگدل راجہ تھا۔ رعیت اس سے سخت نالاں تھی کنس کے ظلم و ستم جب حد سے گزرنے لگے تو پنڈتوں نے پیش گوئی کی کہ واسدیو کا آٹھواں بیٹا کنس کو قتل کرے گا اور متھرا کو اس کے قہر و جبر سے نجات دلوائے گا۔

کنس نے پیش بندی کے طور پر واسدیو اور دیوکی کو قید میں ڈال دیا اور سات سال تک ان دونوں کی جتنی اولادیں ہوئیں انھیں یکے بعد دیگرے مرواتا رہا آٹھویں سال سری کرشن پیدا ہوئے۔ ان کے ظہور میں آتے ہی قید کی زنجیریں ڈھیلی پڑ گئیں۔ اور دربان سو گئے۔ واسدیو نے اسے قدرت کا اشارہ سمجھا اور راتوں رات جمنا کو پار کرکے گوکل گئے اور وہاں کے ایک چرواہے نندلال کی بیٹی سے جو اس رات پیدا ہوئی تھی کرشن کو بدل آئے۔ دوسرے دن کنس نے اس بچی کو واسدیو کی اولاد سمجھ کر قتل کروا دیا لیکن سری کرشن گوکل میں نندلال کے گھر محفوظ رہے۔ بعد میں جب کنس کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے کرشن کے مروا دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ سری کرشن نے بڑے ہو کر کنس کو ہلاک کیا اور متھرا میں پھر سے عدل و انصاف کا دور شروع ہوا۔

اس سے ظاہر ہے کہ سری کرشن کا تعلق بھی بدی اور نیکی کی اس ابدی کش مکش سے ہے جس کی ایک جھلک رام چندر جی کے ذکر میں اوپر دیکھی جا چکی ہے بھگوان وشنو کو مثبت قوتوں کی فتح و فروغ کے لئے مختلف اوتار اختیار کرکے بار بار دنیا میں ظاہر ہونا پڑتا ہے۔ سری کرشن وشنو کا ایسا ہی آٹھواں اوتار تسلیم کئے جاتے ہیں۔

سری کرشن کی شخصیت کا یہ ارتقا تاریخ اور تہذیب کی ضرورتوں کے تحت درجہ بدرجہ ہوا ہے۔ اپنشدوں میں کرشن کا ذکر برائے نام ملتا ہے۔ مہابھارت میں وہ ایک مرکزی کردار بن کر سامنے آتے ہیں اور عقیدۂ عمل (کرم یوگ) کی تلقین کرتے ہیں۔ چار چھ صدیوں کے بعد پرانوں میں ان کی شخصیت کا جمالی پہلو اہمیت حاصل کرنے لگتا ہے۔ یہاں وہ مسلک عشق (بھگتی یوگ) کا ایسا عقیدہ پیش کرتے ہیں جس کے لئے ہندوستانی روح ایک مدت سے تڑپ رہی تھی۔ آگے چل کر بھگتی یوگ کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ چونکہ وشنوؤں نے کرشن ہی کو بھگتی کو موضوع قرار دے دیا۔ شری کرشن کی مقبولیت میں حیرت انگیز اضافہ ہوا۔

شری کرشن کے سانولے پن سے شبہ ہوتا ہے کہ یہ کسی دراویڑی دیوتا کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ واقع یہ ہے کہ کرشن کا اوتار اور فلسفی کا تصور آریوں ہی کے ذہن اور روح کا رہینِ منت ہے۔ لیکن پانچویں صدی عیسوی تک جب دراویڑیوں کی بڑی تعداد ہندو مذہب قبول کر چکی تھی، ان کے روحانی اور ذہنی تقاضوں کا ساتھ دینے کے لئے کرشن کی شخصیت کو زیادہ وسیع اور ہمہ گیر بنانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کرشن کے جمالی پہلو کی نشو و نما اس دور کی چیز ہے۔ اس کی بنیاد قدیم راجپوتوں کے ایک مقامی دیوتا پر جسے وہ اپنے مویشیوں (اور گئوں) کا نگہبان سمجھ کر پوجتے تھے، رکھی گئی۔ گوبند، گوپال، گوردھن اور گردھاری کے ناموں سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ غرض اس طرح سے کرشن کی ذات میں دونوں قوموں کے بہترین تصورات کو باہم مربوط، مزین اور محکم کر دیا گیا۔ بدھ مت کے مقابلے میں ہندو مذہب کے فروغ میں بھی اس تصور کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔

کرشن بھگتی میں گوپیاں حقیقت کی راہ پر چلنے والی مجاہد اور سالکہ ہیں۔ ان کے دل جلوۂ حق کے لئے بے تاب و بے قرار ہیں۔ کرشن کی بنسری کا نغمہ حقیقت کی آواز ہے جو ان کے دلوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور انھیں دین و دنیا اور نام و نمود کے قیود سے بلند و بے نیاز کر دیتی ہے۔ کرشن خدائے مطلق یا نفس کلی ہے۔ رادھا روح انسانی یا محدود نفس انفرادی ہے۔ جمنا کا کنارہ جس پر عشق و محبت کا کھیل کھیلا جاتا ہے انسان کا دل ہے جمنا، بندرابن اور برج کی جغرافیائی نوعیت کو بھی سب پرکرشن کے معتقد اس بات کے قائل ہیں کہ عشق و محبت کا سرچشمہ انسان کا دل ہے۔ اور اس کی گہرائیوں میں یہ کھیل ابد تک کھیلا جاتا رہے گا۔

کرشن بھگتی کے اس رنگ اور رس کی جھلک اردو غزل میں بھی ملتی ہے۔ اس سلسلے میں محمد قلی قطب شاہ کے یہ شعر اس پایہ کے ہیں کہ انھیں چندی داس کے بہترین اشعار کے مقابلے میں پیش کر سکتے ہیں۔

سکی سنیہہ کے نہالاں پھل کھلے ہیں
کہ باس آ سنیہہ کی جمنا سے آئی

{ اے سکھی! محبت کے پھولوں میں بہار آئی ہے اور جمنا کا کنارا ان کی خوشبو سے مہک رہا ہے۔ }

(باقی صفحہ ۵ پر)

جنگ آزادی مجاہد شعرا

علی جواد زیدی

اردو میں سیاسی اور سماجی حالات سے متاثر ہوکر نظم ونثر کی شکل میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ جب میں اپنی کتاب "اردو میں قومی شاعری کے سو سال" مرتب کر رہا تھا تو میں نے یہ بات شدت سے محسوس کی کہ شاید ہی کوئی اور زبان قومی شاعری کا اتنا مربوط اور ضخیم سرمایہ فراہم کر سکے۔ ابتدا میں ایسی غزلیں ملیں گی جن میں دلی اور قومی جذبات اشاروں میں نظم کئے گئے ہیں لیکن بعد میں قصیدوں، مثنویوں، شہر آشوبوں اور نظموں میں بات کھل کے کہی جانے لگی تھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد سے یہ غیر منقطع سلسلہ ۱۹۴۷ء تک برابر چلا آتا ہے۔ آزادی کے بعد بندشیں ٹوٹ گئیں اور قومی شاعری کا وہ روپ رنگ بدل گیا جو غلامی کی تاریکیوں میں ابھرا تھا۔ اب خود تنقیدی اور تعمیری جذبات اس کے قومی محرک بن گئے ہیں۔

یہاں ۱۹۴۷ء کے پہلے کی قومی شاعری ہی پیش نظر ہے۔ قومی شاعری کرنے والوں میں تین طرح کے لوگ نظر آتے ہیں۔ ایک وہ جو قومی شاعر بھی تھے اور خود منزل دار و رسن سے بھی گزرے، دوسرے وہ جنھوں نے خود جنگ آزادی میں کوئی حصہ نہیں لیا لیکن ان کی شاعری میں قومی شاعری کا پرجوش اظہار ہوا ہے، تیسرے گروہ میں وہ شعراء ہیں جنھوں نے قومی شاعری تو نہیں کی لیکن آزادی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ گئے۔ یہاں صرف پہلے اور تیسرے گروہوں کا ذکر کیا گیا ہے کیونکہ یہی مجاہدین آزادی تھے۔ وہ جو صرف قومی شاعر تھے اور امتحان گاہ زندان و دار سے نہیں گزرے یا جنھوں نے ہوا کا رخ پہچان کر پرواز خیال کی سمت متعین کی ان سے سروکار نہیں ہے۔

پہلی جنگ آزادی سے قبل بھی کچھ سیاسی اشعار مل جاتے ہیں۔ سراج الدولہ نے جب انگریز افواج کے ہاتھوں جام شہادت پیا تو راجہ رام نرائن موزوں نے اس کی وطن دوستی کو غزل کے اس شعر میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیا ؂

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دِوانہ مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

مصحفی نے برطانوی حکمرانوں کے ظلم اور لوٹ کھسوٹ پر علی الاعلان چوٹ کی ؂

ہندوستاں کی دولت وحشمت جو کچھ کہ تھی
ظالم فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

غالباً یہ شعر اٹھارویں صدی کے ثلث آخر میں کہا گیا ہوگا۔ اس وقت بھی یہ احساس ہو چلا تھا کہ انگریز ہندوستانیوں کو اقتصادی طور پر تباہ کر رہے ہیں جرأت کی طرح باشعور طبقہ یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ ؂

کہیے انھیں امیر اب اور نہ وزیر
انگریزوں کے ہاتھ یہ قفس میں ہیں اسیر
جو کچھ وہ پڑھائیں سو یہ منہ سے بولیں
بنگالے کی مینا ہیں یہ پورب کے امیر

شاہ عالم ثانی کی بے دست و پائی سے اکثر شاعر متاثر ہوئے، لیکن کمال نے سب سے زیادہ کھل کر احتجاج کیا۔ ؂

اسی سے سمجھو، رہا سلطنت میں کیا رتبا
ہو جب کہ محل سراؤں میں گوروں کا پہرا
نہ شاہ ہے نہ وزیر، اب فرنگی ہیں مختار

انیسویں صدی میں اردو صحافت نے جنم لیا اور دانشور طبقوں میں ایک نئی سیاسی وحدتِ خیال جنم لینے لگی۔ ان اخبارات کا ہماری قومی بیداری اور قومی ادب کی تشکیل میں بڑا ہاتھ ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بھی ان اخبارات کا اہم کردار رہا ہے۔ مہتمم "صادق الاخبار" کو سرکار برطانیہ کے خلاف خبریں شائع کرنے کے جرم میں تین سال قید بامشقت کی سزا ملی اور مولوی محمد باقر کو جو دلی کے "اردو اخبار" کے ایڈیٹر تھے پھانسی کے تختے پر چڑھنا پڑا۔ منیر شکوہ آبادی کے خلاف ایک سراسر جھوٹا مقدمہ کھڑا کر کے کالے پانی کی سزا دے دی گئی۔ مولوی محمد باقر کے صاحبزادے مولوی محمد حسین آزاد نے جنگ آزادی شروع ہوتے ہی "فتح افواج شرق" کی تاریخ مئی ۱۸۵۷ء میں لکھ کر دلی اخبار میں چھپوا دی۔ ان کے خلاف وارنٹ جاری ہوگیا تھا لیکن وہ کسی طرح بچ نکلے۔

اگرچہ اودھ میں واجد علی شاہ اختر اور دلی میں بہادر شاہ ظفر دونوں ہی انگریزوں کے ہاتھوں میں

کھلونا بنے ہوئے تھے لیکن آزادی کی عوامی تحریک چل پڑی تو سارا ملک چونک اٹھا اور عوام و خواص میں ایک نیا وطنی اور قومی احساس بیدار ہو گیا۔ واجد علی شاہ اختر اور بہادر شاہ ظفر اس وطنی احساس کی علامت بن گئے۔ دونوں کی معزولی، قید اور جلاوطنی نے کتنے شاعروں کو گرمایا اور کتنے ہی وطن پرستوں کو بے تاب کیا۔ لکھنؤ سے آغا حجو شرف نے مناجات کی۔

مدد کیجئے لکھنؤ لٹ گیا
خبر لیجئے لکھنؤ لٹ گیا
یہ تقدیر، بھولے ہیں اللہ کو
نکالا ہے واجد علی شاہ کو
عطا کیجئے ان کو پھر تخت و تاج
ملے راج پھر ان، راجیں بہ راج

اور خود واجد علی شاہ اختر اپنے محبوب شہر لکھنؤ سے رخصت ہوتے وقت یوں نوحہ خواں ہوئے ؎

سارے اب شہر سے ہوتا ہے یہ اختر رخصت
آگے بس اب نہیں کہنے کی ہے مجھ کو فرصت
ہو نہ برباد مرے ملک کی یارب خلقت
در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

دلی کی تباہی پر دلی ہی نہیں پورے ملک نے نالہ و شیون کیا۔ "فغان دہلی" کے نام سے ایک پورا مجموعہ ہی مرتب ہو گیا۔ مرزا قربان علی بیگ سالک نے اس کی منظر کشی یوں کی ہے ؎

کسی کے لب پہ ہے نالہ کسی کی چشم ہے تر
کسی کا چاک گریباں ہے اور کوئی مضطر
کسی کا ہاتھ ہے دل پر، کوئی ہے تھامے جگر
غرض کہ رنج سے خالی نہیں ہے کوئی بشر

بجائے زمزمہ ہر جائے شیون غم ہے
محل عیش تھا یا اب سرائے ماتم ہے

بہادر شاہ ظفر نے بے شمار غزلیں اور نظمیں لکھیں جو آج تک دلوں میں کسک پیدا کرتی ہیں۔ بعض کے بارے میں شبہ کا اظہار کیا گیا ہے کہ انھیں کی ہیں بھی یا نہیں لیکن اکثر انھیں کی ہیں۔ ان کی نہ بھی ہوں تو ان کے دل کی آواز ضرور ہیں۔ چند شعر جو ایام اسیری دلی کے معلوم ہوتے ہیں مطالعہ کرنے کے قابل ہیں۔

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں غم ستم کا میں کیا بیاں، مرا سینہ غم سے فگار ہے

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں، نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکے میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں

"قیدِ فرنگ" میں ۱۸۵۷ء سے پہلے بھی تھے۔ وہ قید آزادی نما تھی۔ کم از کم دل کے بہلانے کو لال قلعے کی آزاد فضا تھی۔ بعد میں اس کا سلسلہ رنگون تک پہنچا اور وہیں جان جانِ آفریں کے سپرد کی۔ "قید فرنگ" کے بارے میں ان کا ایک بند نقل کرنے کے قابل ہے۔ ؎

جائیں نکل فلک کے احاطے سے ہم کہاں
ہووے گا سر پہ چرخ بھی جائیں گے ہم جہاں
کوئی بلا ہے خانۂ زنداں یہ آسماں
چھٹنا محال اس سے ہے جب تک ہے جاں میں جاں
جو آ گیا ہے اس محل تیرہ رنگ میں
قید حیات سے ہے وہ قید فرنگ میں

بہادر شاہ ظفر خاندان تیمور کے واحد شاعر نہیں تھے جنھیں مرحلۂ دار و رسن سے گزرنا پڑا۔ ان میں مرزا غلام محی الدین اشکی (شاگرد غالب و آزردہ) اور شاہزادہ مرزا رحیم الدین ایجاد بھی ہیں۔ اول الذکر دوسرے شاہزادوں کے ساتھ شہید ہوئے اور آخر الذکر نے پھانسی پائی۔ اسی طرح مرزا خضر سلطان خضر بہادر شاہ ظفر کے چھوٹے بیٹے کو بھی ہڈسن نے گولی ماری، شہ رگ چیر کر خون پیا، لاش بے کفن لٹکائے رکھی اور سر کاٹ کر بوڑھے قیدی باپ کے سامنے پیش کیا۔ ظفر نے منہ پھیر کر کہا "الحمد اللہ تیمور کی اولاد ایسی ہی سرخرو ہو کر باپ کے سامنے آتی ہے"۔ شہادت کے وقت خضر کی عمر ۲۶ سال کی تھی۔ یہ وہی خضر ہیں جنکی ولادت پر غالب نے کہا تھا۔

شعر:۔

خضر سلطان کو رکھے خالق اکبر سرسبز
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

شاہزادے مرزا پیارے رفعت گورگانی انگریز کی فتح دلی کے بعد فرار ہو کر الور میں پناہ گزین ہوئے تھے مخبروں کی اطلاع دہی پر گرفتار ہوئے اور راستے میں گولی مار دی گئی۔ بہادر شاہ کے داماد مرزا عزیز الدین گورگانی سرور بہادر گڑھ سے گرفتار ہو کر دلی آئے اور یہاں پھانسی پائی۔ جنرل بخت خاں کی فوج کے کرنل اور بہادر شاہ ظفر کی پوتی کے شوہر مرزا بختیار شاکی کو فوجی کمیشن کے حکم سے گوروں نے باڑھ مار کر شہید کیا۔ شاہ عالم ثانی کے پوتے مرزا غیاث الدین شور کو پھانسی دی گئی یہی حال مرزا محمود شاہ محمود اور مرزا قمر الدین شیدا، ظفر کے دو اور دامادوں کا بھی ہوا۔ شاہ عالم ثانی کے ایک اور پوتے مرزا عالی بخت عالی نے بھی انگریزوں کے ہاتھوں شہادت پائی مرزا خدا بخش قیصر شاہ عالم ثانی کے نواسے ۱۸۵۷ء میں سن رسیدہ تھے کہ ہوش و حواس بھی درست نہ رہے تھے بہادر شاہ ظفر کے بھتیجے مرزا کالے کی مخبری پر بے قصور پھانسی پائی۔

شہید اور مجاہد شعراء میں صرف شاہزادے ہی نہیں تھے۔ ان میں مولوی فیض احمد رسوا بدایونی اور مولوی کفایت علی کافی مرادآبادی، مرزا عباس علی بیگ عباس (نادر) دہلوی، رفیع علی خاں تعلی مرادآبادی، کرنل امیر خاں عرف کلے خاں ضبط گولنداز، حکیم محمد حسین ضیا شاہجہانپوری نواب شیر علی خاں عاجز، خان بہادر خاں معروف بریلوی مولوی اشرف علی نفیس بدایونی، ناصر خاں ناصر فرخ آبادی مولوی نسیم اللہ نسیم کولی، نواب غضنفر حسین خاں سعید فرخ آبادی، نواب ظفر یار خاں راسخ لکھنوی، مرزا عاشور بیگ مختائی دہلوی کی طرح کے مجاہدین بھی تھے جنھوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی تنظیم و استحکام میں عملی حصہ لیا۔ اور آخر میں یا تو پھانسی پائی یا گولیوں کا نشانہ بنے۔ ان کے تفصیلی تذکرے تاریخ وغیرہ کی کتابوں میں متفرق طور پر اور ۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء مولفہ امداد صابری میں یکجائی طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان لوگوں کے کارناموں نے یہ ثابت

کر دکھایا کہ اردو کے غزل گو شعراء کے دلوں میں بھی جذبۂ قومی اور یقین کی حرارت موجود تھی۔ انھوں نے اس جذبے کا اظہار قلم سے نہیں بلکہ سیف و علم کے سائے میں کیا۔

ہم میں سے اکثر نے نسبتاً بہت آزاد فضا میں زندگی کی باشعور گھڑیاں گزاری ہیں۔ بہتوں کو یہ اندازہ بھی نہ ہوگا کہ کاروانِ آزادی کس طرح منزل بہ منزل آگے بڑھا ہے۔ ۱۹۲۰ء کے بعد کانگریس کی تنظیم اور جذبۂ قومی کے زور شور کے باعث انقلاب تک کی بات کھل کر کہی جانے لگی تھی لیکن ۱۸۵۷ء کے آس پاس معاملہ کچھ اور تھا۔ عباس بیگ عبّاس (نادر) کو اس شعر پر مرحلۂ دار پیش آگیا۔

آخر بھی جھک گئے ترے خالوں کے سامنے
گوروں کے پاؤں اٹھ گئے کالوں کے سامنے

اس شعر کو باغیانہ قرار دیا گیا اور انھیں باندہ میں پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ تختۂ دار پر چڑھتے وقت یہ شعر پڑھا جو آج تک زبان زد خلائق ہے ؎

دنیا کے جو مزے ہیں ہرگز وہ کم نہ ہوں گے
چرچے یہی رہیں گے، افسوس ہم نہ ہوں گے

بدایوں کے منشی بدرالاسلام عباسی مشہور بھی شاعر تھے اور ان کی نظم کا یہ مصرع بغاوت کے زمانے میں ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر چڑھ گیا تھا ؎

سر کمپنی کا کاٹ کے بکا پاؤ آنے میں

کہتے ہیں کہ اسی مصرع پر موت کی سزا پائی۔

جنگ آزادی کے زمانے میں امام بخش صہبائی کی شہادت نے علمی اور ادبی حلقوں میں تلاطم برپا کر دیا تھا صہبائی کے ساتھ ان کے خاندان کے اکیس افراد گولیوں کا نشانہ بنے اور لاشیں دریا میں پھنکوا دی گئیں ان کا مکان کھود کے زمین کے برابر کر دیا گیا۔ جب ہی تو آزردہ کا قلم چیخ اٹھا ؎

کیونکہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے وجہ جو صہبائی ہو

اور اکبر الہ آبادی نے یوں درد مشترک کا اظہار کیا۔

نوجوانوں کو ہوئیں پھانسیاں بے جرم و قصور
مار دیں گولیاں پایا جنھیں کچھ زور آور

سیکولر ڈیموکریسی

دہی صہبائی جو تھے صاحب قول فیصل
ایک ہی ساتھ ہوئے قتل پدر اور پسر

۱۸۵۷ء کے معرکوں میں جو شاعر گولیوں سے مارے گئے ان میں آغا، بسمل، عزیز، فوق، ایجاد، رند، حامی، منشی، میکش، اور عاجز کا نام آتا ہے۔ یہ سلسلہ انھیں پر ختم نہیں ہوا بلکہ رام پرشاد بسمل تک اس جذبۂ شہادت کے وارث ہوئے۔ رام پرشاد بسمل کی یہ غزل تو قومی ترانہ بن گئی تھی ؎

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

شہید اشفاق اللہ خاں بھی شاعر تھے اور ان کا کچھ قومی کلام ہندی میں شائع بھی ہو چکا ہے۔ جن شاعروں کو کالے پانی کی سزا ملی ان میں منیر شکوہ آبادی کا نام نمایاں ہے اور انھوں نے کئی قصیدوں اور مثنویوں میں اس جلاوطنی اور ظلم آفرینی کی داستانیں لکھی ہیں۔ نواب شیفتہ کو سات سال کی قید کی سزا ملی۔ بعد میں جلد رہا ہو گئے۔ مولانا حسرت موہانی کئی بار جیل گئے اور انھوں نے مشقِ سخن کے ساتھ چکی کی مشقت بھی جاری رکھی۔ احمق پھپھوندوی، جمیل مظہری، فراق گورکھپوری، مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری، گوپی ناتھ امن، میلارام وفا، اسلم لکھنوی، دیاکشن گنجو، اور ایسے ہی کتنے افراد ہیں جنھوں نے قلمی جہاد کے ساتھ ساتھ قید فرنگ کی سزائیں بھی بھگتیں۔ راقم الحروف کو بھی جی چاہے تو اسی صف میں شامل کر لیجئے۔ کتنے ہی اور ہوں گے جن کے نام سے ہم آج واقف نہیں ہیں۔ کاش ہندستان کے ارباب تحقیق اس طرف بھی متوجہ ہوں۔

[redacted]

نہیں حال دہلی سنانے کے قابل
یہ قصہ ہے رونے رلانے کے قابل
اجاڑے لٹیروں نے وہ قصر اس کے
جو تھے دیکھنے اور دکھانے کے قابل
نہ گھر ہے نہ در ہے رہا اک ظفر ہے
فقط حال دہلی سنانے کے قابل
(بہادر شاہ ظفر)

بقیہ صفحہ ۲۶

قومی شعور کی ترجمانی میں نمایاں ہوتا ہے یہی وہ حقیقت ہے جو ہزار پردوں کو چیر کر باہر آتی ہے اور ہر آزمائش کے موقع پر کھری ثابت ہوتی ہے۔ چاہے وہ مذہب کی اصلاحی دور کی شاعری ہو، چاہے اسلام کے ملی تصور کی، چاہے مسلمانوں کو قومی شعور کا جز بنانے والی ادبی تخلیقات ہوں، چاہے تنگ نظری اور علیحدگی پسندی کا پرزور دینے والی تحریک سے پیدا ہونے والی تحریریں، جب بھی فیصلہ کن انداز میں محاکمہ کیا جائے گا اردو کا بنیادی رنگ قومی یک جہتی، جذباتی ہم آہنگی اور وطن دوستی ہی قرار پائے گا۔ تفرقہ پسند اور رجعت پرست عناصر کبھی اردو شعر و ادب میں اپنی واضح جگہ نہیں بنا سکے۔ یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کو ان خارزاروں سے نہیں گزرنا پڑا جن سے اردو کے ادیب گزرے۔ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، سکھ ہوں یا عیسائی مذہب پرست ہوں یا لامذہب، سیاسی شعور کو اہمیت دینے والے ہوں یا ادب اور سیاست کو ایک دوسرے سے الگ رکھنے والے، ہر ایک کے یہاں تنوع کے ساتھ ساتھ قومی شعور کا ایک وسیع النظر باب کھلا ہوا ملے گا جب وطن آزادی، اشتراکیت، قومی ہم آہنگی، امن، اتحاد باہمی، رواداری، ماحول کی ترجمانی، یعنی قومی شعور کے مختلف عناصر اور گوناگوں پہلو ہندوستان کی زبانوں میں سب سے پہلے اردو ہی میں ملیں گے۔ اس کے تاریخی اور فکری اسباب میں جن سے بحث کرنے کی یہ جگہ نہیں ہے۔ جس بات کو سب سے زیادہ اہمیت دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اردو ادب ہر دور میں قومی شعور کی ترجمانی کرتا رہا ہے اگرچہ اس کے انداز مختلف رہے ہیں کیونکہ قومی شعور ایک ارتقا پذیر تصور ہے اور اس کی تصویر ہر ادیب اور شاعر کے انفرادی تصور ہی کے آئینہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس رنگا رنگی میں جو حسن ہے وہ بھی ہندوستان کی اس سیکولر زندگی کا آئینہ دار ہے جہاں مذہب، زبان، فرقہ، سیاسی عقائد، طرزِ بود و ماند، معاشی تفریق کے باوجود ایک نفسیاتی احساس ہے جو بنیادی قومی شعور پیدا کرتا ہے۔

[redacted]

اردو شاعری میں یکجہتی کی روایت

۔ کرشن ملیانی

اردو زبان بذاتِ خود ہی قومی یک جہتی کی پیداوار ہے۔ یہ کسی اور ملک سے دَرآمد کی گئی اور نہ اسے کسی نے کسی پر ٹھونسا۔ مغلیہ سلطنت کے زمانے میں ہندوستان کے باشندے جب آپس میں ملے اور بالخصوص لشکر میں جب ان کا ایک دوسرے سے واسطہ ہوا تو فارسی بولنے والوں اور ہندوستان کی بولی یعنی ہندی بولنے والوں میں اختلاط بڑھا۔ اس اختلاط سے یہ زبان پیدا ہوئی۔ اس کی بنیاد تو اس سے پہلے بھی پڑ چکی تھی۔ دکنی زبان میں بکثرت ہندی کے الفاظ داخل ہو گئے تھے۔ قلی قطب شاہ کے کلام کو دیکھو تو بعض جگہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کلام ہندی کا ہی ہے خیر یہ بات بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچی کہ ہندوؤں نے جہاں فارسی کو اپنایا تھا وہاں اس مخلوط زبان کو بھی اپنا لیا۔ لشکری زبان کا نام اردو قرار دینا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ بہت سی بولیاں بولنے والوں کے اختلاط سے بنی ہوگی۔ اس کی تاریخ تو بڑی پرانی ہے لیکن اٹھارویں اور انیسویں صدی میں اردو کو بڑا فروغ حاصل ہوا —— زبان یوں بنی کہ افعال اور حروفِ ربط تو ہندی کے رہے۔ اسمار اور صفات میں فارسیت آجاتی تھی۔

یہ بحث بڑی طویل ہے اسے تو یہیں چھوڑتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے آثار کہاں تک ہیں۔ یہ قصہ بھی طولانی ہے۔ اور اگر صرف فہرست ہی دی جائے تو اتنی طویل ہو جائے کہ سنبھالے نہ سنبھلے۔ اس لئے محض زمانۂ حال کے ذکر پر اکتفا کی جاتی ہے۔ جہاں ہندو شعرا نے نعت، منقبت اور سلام لکھے۔ وہاں مسلمان شعرا نے ہندو اوتاروں کی مدح کی۔ اکابر کی مدح میں تو کسی نے تمیز نہیں کی کہ کون کس مذہب سے متعلق ہے۔ اسی طرح مقاماتِ مقدسہ کا ذکر کرتے وقت بھی یہی حال تھا۔

زیادہ پرانی مثالیں دینا تو بے سود رہے گا۔ ایک نظیر اکبر آبادی ہی کو لیجئے جس کے یہاں نہ جانے کتنے ہندو موضوعات کو نظم کیا گیا ہے۔ بسنت اور ہولی تو خیر موسمی تیوہار ہیں لیکن انھوں نے دیوالی اور راکھی پر بھی نظمیں کہی ہیں۔ 'کنہیا جی کی راس' ایک مسدس بلکہ ترجیع بند ہے۔ ترجیع یہ ہے ؎

ہر آن گوپیوں کا یہی لکھ بلاس ہے
دیکھو بہار ریس آج کنہیا کی راس ہے

اور نظموں کے عنوان میں جنم کنہیا جی، ہر کی تعریف' درگا جی کے درشن، بھیروں کی تعریف، مہادیو کا بیاہ ہر کی تعریف میں لکھا ہے ع

میں کیا کیا وصف کہوں یارو اس شیام برن اوتاری کے

اور کنہیا کے بال پن کی نظم یوں چلتی ہے ع

یارو سنو یہ دودھ کے لٹیا کا بال پن

گورو نانک کی مدح میں ایک دل چسپ ترجیع بند کا پہلا بند یہ ہے ؎

ہیں کہتے نانک شاہ جنھیں وہ پورے ہیں آگاہ گرو
وہ کامل رہبر جگ میں ہیں

مقصود، مراد، امید سبھی بر لاتے ہیں دل خواہ گرو
نت لطف و کرم سے کرتے ہیں ہم لوگوں کا نرباہ گرو
اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو
سب سیس نوا ارداس کرو اور ہردم بولو واہ گرو

لطف یہ ہے کہ جن کے باب میں نظم ہے انھیں کے شایانِ شان الفاظ بھی ہیں 'ارداس' کا لفظ سکھ مذہب میں ایک خاص لفظ ہے۔ یہ برارتھنا، درخواست وغیرہ کے معنی میں عام استعمال ہوتا ہے۔ غالباً اس کی اصل عرض داشت ہے۔

حسرت موہانی تو خود متھرا جاتے تھے۔ ان کا قول تھا کہ کرشن کا پیغام پیغامِ عمل ہے۔ ایسے ثقہ شاعر کے شعر بھی اس ضمن میں ملاحظہ فرمایئے۔

متھرا کہ نگر ہے عاشقی کا — دم بھرتی ہے آرزو اسی کا
پیغام حیاتِ جاوداں کا — ہر نغمہ ہے کرشن بانسری کا

وہ نورِ سیاہ تھا کہ حسرت
سرچشمہ فروغِ آگہی کا

برج بھاشا میں بھی انھوں نے کرشن کی مدح کی ہے۔

من توسے پریت لگائی کنہائی
کا ہو اور کی سرت اب کاہے کا آئی

گوکل ڈھونڈ بندرا بن ڈھونڈ
برسانے لگ گھوم کے آئی
تن، من، دھن سب وار کے حسرت
متھرا نگر چل دھونی رمائی

حسرت بندۂ خلوص تھے۔ جہاں انھیں نیکی نظر آئی وہ اس پر فدا ہو گئے۔ حج بیت اللہ کے لئے تو وہ اکثر جاتے ہی تھے۔ متھرا اور بندرابن کا چکر بھی لگاتے تھے۔ ان کے بعد حفیظ جالندھری کی مشہور و معروف نظم کرشن کنہیا کے عنوان سے ہے جو انھوں نے غالباً ۱۹۲۰ء کے دو تین سال بعد کہی تھی۔ نظم میں ہندی الفاظ کی آمیزش اور اس پر حفیظ کا ترنم۔ جہاں بھی وہ یہ نظم پڑھتے محفل جھوم اٹھتی۔ دو تین ٹکڑے ملاحظہ فرمایئے۔

دنیا سے نرالا — وہ طرفہ نظارے
یہ بانسری والا — یاد آگئے سارے
گوکل کا گوالا — جمنا کے کنارے

بت خانے اندر — وہ گوپیوں کے ساتھ
خود حسن کا بت گر — ہاتھوں میں دیئے ہاتھ
بت بن گیا آکر — رقصاں ہوا برج ناتھ
بلرام کا بھیا
متھرا کا بسیا
بندرا میں کنہیا

حفیظ کا اتنا ہی ذکر کافی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ اہم ذکر تو اقبال کا ہے۔ ان کی دو نظمیں رام اور نانک پر ہیں۔ کس عقیدت سے رام کی تعریف کی ہے ؎

لبریز ہے شرابِ حقیقت سے جامِ ہند
سب فلسفی ہیں خطۂ مغرب کے رامِ ہند
ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند

گرونانک کے پیغامِ توحید سے متاثر ہو کر اقبال نے گوتم بدھ سے نظم کا آغاز کیا ہے۔ وہ قدرتی طور پر بدھ کی تعلیمات سے متاثر نظر آتے ہیں۔ جاوید نامے میں بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔ اقبال فرماتے ہیں کہ بدھ کے فلسفے کو لوگوں نے نظر انداز کر دیا اور خیالی فلسفوں میں گرفتار رہے۔ آخری شعر میں مدح نانک اس انداز سے کی ہے ؎

پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مردِ کامل نے جگایا خواب سے

بھرتری ہری کے ایک اشلوک کا ترجمہ بالِ جبریل کے صفحۂ اول کی زینت ہے ؎

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

خواجہ دل محمد نے گیتا اور جپ جی صاحب کا منظوم ترجمہ کیا۔ نفیس خلیلی مرحوم رامائن اور مہابھارت کے بند بڑی شان جلالی سے سناتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چکبست اور سرور بول رہے ہیں۔

یہ تو ایک سرسری خاکہ اور اچٹتی سی نظر ہے ورنہ کہانی بہت لذیذ ہے اور اس قابل ہے کہ ختم نہ کی جائے۔

اب ذرا دیکھئے ہندو شعراء کا حال۔ روزِ اول سے ہی سے ہندو شعراء کے فارسی اور اردو کے دواوین اٹھا کر دیکھئے۔ سب کا انداز یہی تھا کہ حمد، نعت اور منقبت کے بعد کلام شروع کرتے۔ مسلمان تقریبوں پر ہندوؤں کی بے شمار نظمیں ہیں۔ عید، شب برات، محرم وغیرہ، مرثیہ گو اور نعت گو بھی بہت ہوئے ہیں۔ سلام بھی لاتعداد کہے گئے ہیں۔ تھوڑے ہی زمانے کی بات ہے کہ دیو رام کوثری محض نعت ہی کہتے تھے اور نانک لکھنوی مرثیے میں طاق تھے۔ آخر الذکر تو بالکل اُمّی تھے لیکن زبان مادری تھی مشاعرے لوٹ لیتے تھے۔ پیارے صاحب رشید کے شاگرد بھی ہو گئے تھے۔ پہلا مرثیہ نواب اکرام اللہ خاں کے امام باڑے میں پڑھا۔ اور دوسرا مولانا سید تقی صاحب مرحوم کے امام باڑے میں۔ مجمع کثیر تھا۔ ہندو، مسلمان، شیعہ، سنّی سب شریک تھے۔ بڑی شہرت پائی۔

دکن میں مہاراجہ کشن پرشاد شاد کے علاوہ اور بہت سے ہندو شعراء نعت، مرثیہ اور سلام کہتے تھے۔ ادھر چندر پرکاش جوہر بجنوری ایک زمانے سے نعتیں کہہ رہے ہیں اور ان کی نعتیں مقبول بھی ہیں۔ جگن ناتھ آزاد کا بھی نعتیہ کلام ہے اور ان کی مشہور نظم "بھارت کے مسلمان" کا ایک زمانے میں بڑا شور تھا۔ پنڈت ہری چند اختر نے ایک ہی نعت کہی لیکن وہ پیشہ ور نعت گوؤں کی نعتوں سے زیادہ مقبول ہوئی۔ اس کے چند اشعار ذیل میں درج ہیں

اک عرب نے آدمی کا بول بالا کر دیا
آدمیت کا غرض ساماں مہیا کر دیا
کس نے قطروں کو ملایا اور دریا کر دیا
کس نے ذروں کو اٹھایا اور صحرا کر دیا
کس کی حکمت نے یتیموں کو کیا درِّ یتیم
اور غلاموں کو زمانے بھر کا مولا کر دیا

پنڈت بھو رام جوش ملسیانی داغ کے واحد زندہ شاگرد ہیں۔ ان کی قادر الکلامی کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ انھوں نے ایک بے بدل سلام کہا ہے۔ ردیف کتنی مشکل ہے لیکن موصوف نے اسے پانی کر دیا ہے ؎



لو آگئے عباس دلاورِ لبِ دریا
لو تیغِ عدو رہ گئی کٹ کر لبِ دریا
پانی بھی کسی کو نہ دیا اہلِ ستم نے
پیاسے تھے بہتّر کے بہتّر لبِ دریا
دشمن کی صفیں درہم و برہم تھیں کچھ ایسی
شبیر پہنچ جاتے تھے اکثر لبِ دریا

یہ اردو شاعری کی رواداری ہے کہ ہندو جب سلام یا نعت کہتا ہے تو اتنی عقیدت میں ڈوب کر کہتا ہے کہ مسلمان بھی حیران رہ جائے۔

راقم کا ایک مجموعۂ نعت کوئی پندرہ بیس سال ہوئے آہنگِ حجاز کے نام سے شائع ہوا تھا۔ مولانا عبدالماجد دریاآبادی نے اس کا دیباچہ لکھا تھا اور نعتوں کے باب میں اچھی رائے قائم کی تھی۔ اس کا یہاں درج کرنا خود ستائی ہوگی۔ یہاں تک نعت گوئی اور دوسری اصنافِ سخن کا تعلق ہندوؤں سے وابستہ ہے۔ اس کے علاوہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنی قومی زندگی میں ہمیشہ اتحادِ عمل دکھایا ہے۔ مہاتما گاندھی، جواہر لال اور لال بہادر شاستری کی موت پر مسلمانوں نے بڑی دل گداز نظمیں لکھی ہیں۔ ہندو شعرا نے بھی مولانا آزاد، رفیع احمد قدوائی اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے مرثیے دل سے کہے ہیں۔ یہ لوگ متاعِ قوم تھے اس لئے کسی ایک فرقے یا مذہب سے وابستہ کیسے رہ سکتے تھے۔ ہندو اور مسلمانوں کے علاوہ عیسائیوں، سکھوں اور دوسری قوموں نے بھی اردو شاعری میں قومی یک جہتی کو فروغ دیا ہے۔

اصل میں یہ موضوع مسلسل مطالعے کا طالب ہے اور ایک اچھی بڑی کتاب کا موضوع ہے [redacted]

رنگوں کا اختلاط ہے قوسِ قزح کی جان

اس رُت میں لال رنگ ہے اک شعلگی لئے
پیلا ہے زعفران کی مہک، دل کشی لئے
نیلا عروسِ نو کی طرح چھب نئی لئے
دھانی نظر نواز ہے، اک تازگی لئے
نارنج رنج دور کرے، سرخوشی لئے
ہے رنگ کاسنی کا ادا شرمئی لئے

ہر رنگ کا مزاج الگ، مدعا جُدا
ہر رنگ میں ہے ذوق کسی ترجمان کا
ہر رنگ سے ہے رازؔ فضا کتنی دِل رُبا
پہنے قدم قدم پہ ہے، دھرتی نئی قبا

رنگوں کی برہمی سے ہیں آثار بدنما
اپنا وجود کب کوئی کھوتا ہے یوں بھلا
میں سوچتا ہوں رازؔ یہی بات بارہا
صرف ایک ہی کرن سے جو رنگوں کا ہے ظہور
پھر ان میں برہمی کا ہے آخر جواز کیا؟

ایک نظم

راج نرائن راز

نہیں ——
ہرگز نہیں —— دھرتی یہ مرے خواب زاروں کی

مری خواہش تھی
—— اس دھرتی کی رونق ہوں
گلاب و نسترن
بیلا —— چنبیلی —— کاسنی —— سورج مکھی —— گل داؤدی —— گیندا

جُدا ہر پھول کی رنگت
جُدا ہر پھول کی خوشبو
مگر ہر پھول ہو، اک دوسرے کے رنگ میں ڈوبا

——————

کیا تم نے مگر یہ کیا ——
کہ پیدا کر دیئے
ہم رنگ —— ہم صورت، یہ جھرمٹ زرد پھولوں کے
گلاب و نسترن
بیلا —— چنبیلی —— کاسنی —— سورج مکھی کو
کھاد میں شورا دیا
سینچا ہے تم نے گرم پانی سے

ان خودغرضوں کا ٹھکانہ [illegible]

[illegible]



کئی نیتا اِدھر سے رات گزرے
تھے کچھ گدرائے کچھ ناٹے تھے قد کے
میں ان میں سے کئی کو جانتا تھا
لڑکپن سے انھیں پہچانتا تھا
تھے پچکے گال گو بچپن میں ان کے
پٹاری میں ہوں جوں انگور رکھے
مگر اب پھول کر کُپّا ہوئے تھے
نوکیلے توند تھے آگے کو نکلے
عقب میں سب کے دو طبلے بندھے تھے
پہلوانوں سے بازی لے گئے تھے
نوکیلی ٹوپیاں کھدّر کی پہنے
تھے لگتے اصل ممبر کانگریس کے
ترنگے ہاتھ میں جھنڈے لئے تھے
مگر اندر سے گودے اور کے تھے
نہ جانے کون سی چکّی کا پیسا
انھیں آٹا برابر مل رہا تھا
تھا علمیت کا غازہ ان کا خالی
جہالت کی تھی چہروں پر بحالی
وہ اپنے گھر کی ڈیوڑھی تک پڑھے تھے
پڑھے اتنا ہی جتنا کڑھے تھے
دیہاتی یہ مادر زاد ایسے
کہ سارے دن دیہاتی بستے تھے
یہ سب کھدّر میں کفنائے ہوئے تھے

ٹکٹ لینے یہاں آئے ہوئے تھے
پتہ چلتا تھا یہ باتوں سے ان کی
اسمبلی میں کئی سیٹیں ہیں خالی
جو بے حد قیمتی کھدر ڈھلے تھے
وہ انگریزوں کے پٹھو رہ چکے تھے
غلامی میں جرائم کر چکے تھے
مگر اب قوم کے لیڈر بنے تھے
بغل والے سے اک جھلّا کے بولا
سُنت ہو کا ستا پرساد دادا
ٹکس ہم کا اگر اب کی نہ ملیہے
تو ہوئے جو بھی وہ ہم کر گجرئیے
دہن پر دھان گرا ای بار جھانسا
ہمو بہتر نہ گر ہم تاک کا ٹا
کہت ہیں ہم سے تم کتنا پڑھے ہو
ہو جب ان پڑھ تو پھر کاہے کھڑے ہو
چسر نجی لال جو ڈپٹی بنے ہیں
بھلا بتلاؤ کے کیس تک پڑھے ہیں
بہت کڑیا نیاں ہم ہو دیا ہے
کہ جیلن تک ما ہم چوری کیا ہے
گلامی ما جو اندولن ہوا تھا
تو ہم کا بھی سپاہے گوا تھا
ہمو کا ڑاسے آجادی کے کھونٹے
ہمو کھا وا ہے چوراہن پہ جوتے
گئے تھے جیل جب ہم پہلی بریا
تو ہم کا بھی تو اک کمبل ملا تھا
کہو جلیا سے کوئی کچھ ہے لاوا
ہمے پہلے سے کمبل گھوما وا
کرپسن کا ہے یو انجام سب پر
کہ کاٹت ہیں رکم سب بن کے ممبر
بڑی رسوت ستانی چل رہی ہے
فلت فاکن پہ جنتا چل رہی ہے
مُلا یو کام ہے اوپر سے جاری
ہمیں پر کاہے کا ٹت ہو سواری

وبھارت تک اسی پر چل رہی ہے
ہر اک پھنگی ما رسوت چل رہی ہے
سیاست کے کرسے وہ کا ہے درسن
ہو آجادی ما جیکی پتلی گردن
ہمیں کا دیکھ کیوں سب جل بجھے ہیں
سبھی کے بیل بدھیا پل رہے ہیں
جنھیں ہم نہیں تنہا کھسریلا
وبھارت تک ماہے لاکھن کا دھندا
بھلا کیکی ہے ہم بٹیا بھگاوا
جو ٹکٹس ہم نہیں اب تک ہے پاوا
بھگائن دو نہریاں گو مراری
مُلا ٹکٹس ہو ان ہی کا جاری
کسم ہے موڑ کے تہرے بستا دن
انھیں پاتن ما اب رکھی ہے ان بن
مُلا اس کی ٹکس لے کے رہبا
کہ ہم کا رسے کا ہے بھاری ساکرجا
وجیرا ایسے بھی دنیا میں بنے ہیں
کرت بیوپار جو پکڑے گئے ہیں
کتی کا نجی ہوج ما کالی سی گیا
ہو ہوسنے کو تی دو بچھڑن کی میّا
وجیرؤ کا گھماتن راتی راتا
مُلا یو راج سارا کُھل گوا تھا
جبھی جب بھور تو نکسا تھا الٹا
بھارت کا وہاں پُھوا بندھا تھا
تو آجادی ما رسوت تک نہ کھائیں
کہو وہ جا کے مسجد ما اجان دیں
کرپسن کی نہ جو تانیں لگا ئے
وہ گھنٹے جا کے مندر ما بجاوے
یہاں تو اب یہی ہوتا رہے گا
کہ ہوتی ہے یہاں بس دھن کی پوجا
الٰہی سب وجیرن کا بچاوے
کئے کی ان کی جنتا کو سزا دے

ہم ایک ہیں

کرشن موہن

پھر ہو گیا ہے متحد اپنا وطن ہندوستاں   تنظیم میں مشغول ہیں پھر مرد و زن، پیر و جواں
سارے مذاہب ہیں یہاں، رہِ وفا کے ترجماں   ہمدرد ہیں ایک جہت ہیں، یک دل ہیں اہلِ کارواں
ظاہر میں ہیں ہم مختلف لیکن دلوں میں ایک ہیں   اپنا چلن ہے باصفا، اپنے عزائم نیک ہیں

اس دیش کو پہلے دیا نانک نے پیغامِ وفاق   ہر دل میں نغمہ گر ہوا سازِ وفا و اتفاق
اکبر نے باشانِ شہی پھر داستانِ دل کہی   اس کے خوش آئیں عہد میں رخشندہ یک جہتی رہی
پھر رہ نما کتنے یہاں آتے رہے، جاتے رہے   مطلب ہم آہنگی کا وہ سب کو سمجھاتے رہے
گاندھی نے پھر آکر دیا یک جہت ہونے کا سبق   تھی اس کی ساری زندگی درسِ وفا، پیغامِ حق
آزاد کے ایثار سے چہرہ دُوئی کا فق ہوا   سردار کے آہنگ سے نفرت کا سینہ شق ہوا
اس نے نفاق و بغض کا، ایسے مٹایا ہے قلق   اپنی کتابِ قوم کا مربوط ہے اب ہر ورق
سندیش وحدت کا دیا بھارت کو پھر قدوائی نے   کتنے مسائل حل کئے اس بے غرض شیدائی نے
پھر مشعلِ راہ وفا نہرو ہماری جان تھا   مذہب تھا تنظیمِ وطن، حُبِّ وطن ایمان تھا
کچھ دن ہوا جلوہ نما، پھر لعلِ تابندہ یہاں   جس نے خلوصِ قلب سے، باندھا محبت کا سماں
اب ایکتا کا مان ہے چاہت کی شکتی اندرا   ہے سربسر صدق و صفا اور دیش بھگتی اندرا

ہر دم پیے رہتے ہیں ہم یک جہتی و اُلفت کی مے   مسلک ہمارے ہیں کئی، منزل ہماری ایک ہے
ہندو سہی، مسلم سہی، ہندوستانی ہیں سبھی   عیسائی ہوں یا پارسی، گمرہ نہیں ہوں گے کبھی

یک جہت و ہم آہنگ ہیں تعمیر میں اہلِ وطن
یہ وحدتِ قومی رہے ہر دم دلوں میں موجزن



قوم کے راہی سے خطاب

نسرین چوہدری

ذرہ نہیں تو غیرتِ حسن انتساب بن   یہ چاند تارے ماند ہوں وہ آفتاب بن
عالم غریقِ کیف ہو ایسی شراب بن   المختصر کہ ایک مکمل شباب بن
تاریکیٔ خیال کو روشن بنا دے تو
اس ایکتا کی راہ پہ دل کو بچھا دے تو

گاہے سہانی رات کے تاروں میں ہو عیاں   اک پیار بن کے گاہے بہاروں میں ہو عیاں
بن بن کے آس درد کے ماروں میں ہو عیاں   گاہے فسردہ دل کی پکاروں میں ہو عیاں
پیدا ہر ایک شے میں جوانی کی شان کر
تو اپنی ایکتا سے زمانہ جوان کر

ذرّوں کو رشکِ مہرِ درخشاں بنا کے تو   تاروں میں اک حسین شبستاں بنا کے تو
سازِ سکوتِ دل کو پریشاں بنا کے تو   ہر چیز کو جہاں کی غزل خواں بنا کے تو
مردہ دلوں کو مست بناتا ہوا نکل
یوں گیت اپنے پیار کے گاتا ہوا نکل

ویرانۂ حیات کی راہوں کو چھوڑ کر   یعنی شبِ فراق کی آہوں کو چھوڑ کر
فرقِ حیا کی زرّیں کلاہوں کو چھوڑ کر   چُپ چُپ کسی کی نیچی نگاہوں کو چھوڑ کر
ہر سادگی کو غیرتِ حسنِ نگار کر
تو آج اپنی قوم پہ سب کچھ نثار کر

راہی خدا کے واسطے یہ حالتیں بدل   جو مسخ کی گئیں ہیں تری صورتیں بدل
کردار کو سنبھال بری عادتیں بدل   آپس کے بھید بھاؤ مٹا فطرتیں بدل
جینے کا جب مزا ہے کہ انسان ایک ہوں
اس پیار کی ڈگر پہ ارادے بھی نیک ہوں

ٹھکرا دے موج موج کو ساحل ہی جان کر   مشکل کو سہل کر مگر مشکل ہی جان کر
حاصل نکال شوق کا حاصل ہی جان کر   محفل میں جا ہر ایک کی محفل ہی جان کر
اے راہ رو جوان ارادے لئے ہوئے
جی اپنے دل میں قوم کا جذبہ لئے ہوئے

کیا ہم فرقہ پرست ہیں؟

نازش پرتاپ گڑھی



ہیں خود اپنے ہی دکھ درد سے نیم جاں
ہم کو فرقہ پرستی کی فرصت کہاں

ہم جفا کش ہیں، ہم لوگ مزدور ہیں — نفرت و کینہ و بغض سے دور ہیں
ہیں کبھی نغمہ خواں اور کبھی خوں فشاں — ہم میں ہندو کہاں، ہم مسلماں کہاں
شیام کا ایک سے رحمان سے کام ہے — اک موکل صمد دوسرا رام ہے
کفر و ایماں سے بچ کر کہاں جائیں ہم — اور بچتے رہے بھی تو کیا کھائیں ہم
ہم جو دیہی کسان اور دہقان ہیں — دھرم، مذہب کے جھگڑوں سے انجان ہیں
ہم محرم میں تاشہ بجاتے بھی ہیں — ہولی آئے تو مل جل کے گاتے بھی ہیں
گاؤں کا گاؤں آپس میں بھائی بہن — ایک کنبے کے ہیں رحمت اور رام دھن
ہم میں لڑ مرنے کا کوئی امکاں نہیں — کھیت ہندو نہیں، ہل مسلماں نہیں
خواب میں بھی کبھی ہم نہ پہونچے وہاں — پیدا ہوتے ہیں سانپ اور سپیرے جہاں

ہم کو فرقہ پرستی کی فرصت کہاں

یہ تو کچھ اہلِ دولت کا بیوپار ہے — کچھ جہالت مآبوں کا کردار ہے
چند اہلِ سیاست کا یہ کام ہے — جن کے ذہنوں کو مذہب کا سرسام ہے
جن کو دنیا نے بخشے نہیں درد و غم — جن پہ ٹوٹے نہیں زندگی کے ستم
جو وفادار قوم و وطن کے نہیں — ہیں چمن ہی میں لیکن چمن کے نہیں

کچھ شرارت پسندوں نے دھندا کیا — ایک مچھلی نے تالاب گندا کیا
چند فتنہ طرازوں کی ہے داستاں — قوم ورنہ ہے اک جسم اور ایک جاں

ہم کو فرقہ پرستی کی فرصت کہاں

دوستو! ہم سب آدم کی اولاد ہیں — اور صدیوں سے اک ساتھ آباد ہیں
سخت تر معرکے تھے جو سر کر چکے — کتنے ہی کام اک ساتھ ہم کر چکے
ایک سا درد ہے، ایک سے غم بھی ہیں — جن فضاؤں میں تم ہو وہیں ہم بھی ہیں
کفر ہو تم نہ ہم صرف ایمان ہیں — تم بھی انسان ہو، ہم بھی انسان ہیں
ایک مایا ہے اور ایک ہی شان ہے — ایک بھگوان ہے، ایک رحمان ہے
ایک رستہ ہے اور ایک ہیں مرحلے — ایک دھرتی پر ایک آسماں کے تلے
ایک ہی ملک کے رہنے والے ہیں ہم — ایک ہی چاند کے گرد ہالے ہیں ہم
ایک ہی لَو کی مانند جلنا بھی ہے — ایک ہی لے میں ہم سب کو ڈھلنا بھی ہے
ایک ہی جام سے سب کو پینا بھی ہے — ایک ہی ساتھ مرنا بھی، جینا بھی ہے
ہم پہ چھائی ہیں آلام کی بدلیاں — دور کرنی ہیں غم کی پرچھائیاں

دے رہا ہے صدا کب سے ہندوستاں
ہم کو فرقہ پرستی کی فرصت کہاں

بسمل سرشش / رہتک

دامن نہ بھگونا اہلِ وطن

جب یہ بودا تن مٹی ہو دامن نہ بھگونا اہلِ وطن
اے اہلِ وطن میں تم کو وطن کے دامن میں مل جاؤں گا

یہ دھرتی میری دھرتی ہے یہ امبر میرا امبر ہے
ہر غنچہ ہے میرا پیمانہ، ہر پھول ہی میرا ساغر ہے
ہر شاخ سرہانہ ہے میرا، یہ سبزہ میرا بستر ہے
ان پودوں میں میرا دل ہے ان پیڑوں میں میرا گھر ہے
کلیوں، پھولوں، کانٹوں والوں میں گلشن میں مل جاؤں گا
دامن نہ بھگونا اہلِ وطن۔

چاہو گے اگر پا لو گے مجھے ٹھاکر سنگھ کی تصویروں میں
ٹیگور کے ہنس مکھ گیتوں میں، موتی کی جواں تقریروں میں
غالب کی، میر کی غزلوں میں، نہرو کی حسیں تحریروں میں
جو باپو اکثر کہتا تھا، ان خوابوں کی تعبیروں میں
میں تو رو، میرا، امرتا کے بھولے پن میں مل جاؤں گا
دامن نہ بھگونا اہلِ وطن۔

ہنس ہنس کے تمہیں دیکھو گے بنگال کی نٹ کھٹ ناروں میں
پنجاب کی چنچل، جان و دل وارا ہو غزل مٹیاروں میں
کشمیر کی کومل کلیوں میں، ہمتا چل کی گلسناروں میں
اس چُنری میں، اس چہرے میں، دل والوں میں دلداروں میں
جس آنگن بچے کھیلیں گے اس آنگن میں مل جاؤں گا
دامن نہ بھگونا اہلِ وطن۔

جب چاند لرزتی پرچھائیں دیکھے گا کبھی گنگا جل میں
جب کوئی کنواری باندھے گی دہکے ہوئے آنسو آنچل میں
جب پت جھڑ زہر سمو دے گی چاہت کی پنپتی کونپل میں
جب کوئی کوی بنجر دھرتی دیکھے گا برستے بادل میں
سوکھے بن میں، جلتے تن میں، دکھیا من میں مل جاؤں گا
دامن نہ بھگونا اہلِ وطن۔

مل جاؤں گا میں تم کو شامِ ہجراں کی بھری برساتوں میں
اربابِ صعوبت کی چپ میں، احبابِ طرب کی باتوں میں
خواہش کے روپہلے سپنوں میں، عشرت کی سنہری راتوں میں
جب دامنِ دل آ جائے گا تنہائی کے پیلے ہاتھوں میں
جس درپن میں منہ دیکھو گے، اس درپن میں مل جاؤں گا
دامن نہ بھگونا اہلِ وطن

جب یہ بودا تن مٹی ہو دامن نہ بھگونا اہلِ وطن
اے اہلِ وطن میں تم کو وطن کے دامن میں مل جاؤں گا

قومی یکجہتی

اے۔ مسیحی

کشتیاں ہیں مختلف دھاروں پہ ساحل ایک ہے
اپنی اپنی راہ پر رہرو ہیں، منزل ایک ہے
ایک ہی گرمی سے گرمایا ہوا ہے سب کا خون
اپنا اپنا دل ہے لیکن جذبۂ دل ایک ہے
ایک فصلِ گل میں جیسے مختلف رنگوں کے پھول
رنگ شمعوں کے جدا ہیں، رنگِ محفل ایک ہے

لاکھ مجنوں ہیں مگر ہے ایک اندازِ جنوں
کتنی ہی لیلائیں ہیں ان سب کا محمل ایک ہے
مشرق و مغرب کہاں کے کیا جنوب اور کیا شمال
مختلف سمتوں کا مرکز ماہِ کامل ایک ہے
مشترک شیخ و برہمن میں ہے اقرارِ وجود
کفر ہو، اسلام ہو، دونوں کا حاصل ایک ہے
ایک ذاتِ پاک کے چاہے ہزاروں نام ہوں
دین میں اور دھرم میں وہ ذات شامل ایک ہے
"ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں"
ملتیں کتنی بھی ہوں، ایمان بتمل ایک ہے

سکو ...

ذکیہ سلطانہ نیّر

جو دل ایک ہے تو جہاں ایک ہے

خیال ایک ہے اور ہے دل بھی ایک　　جنونِ تمنّا کا حاصل بھی ایک
ہے اک ساربان اور محمل بھی ایک　　ہے رستہ بھی ایک اور منزل بھی ایک
سفر ایک ہے کارواں ایک ہے
جو دل ایک ہیں تو جہاں ایک ہے

اشارے بیاں ہیں نگاہیں کلیم　　گلوں کی زباں ہے مہکتی شمیم
کرن کی زباں ہے سحر کی نسیم　　ہزاروں زبانیں سہی اے ندیم
محبت کی لیکن زباں ایک ہے
جو دل ایک ہیں تو جہاں ایک ہے

زمیں ایک ہے ایک اپنا گگن　　ہے ایک آشیاں ایک اپنا چمن
ہے سمتوں سے آزاد اپنا چمن　　کہاں کا شمال اور کہاں کا دکن
بہر سمت ہندوستاں ایک ہے
جو دل ایک ہیں تو جہاں ایک ہے

خلاؤں میں قائم ہیں بیدار ہیں　　محبت کے پھولوں کا اک ہار ہیں
یہ اک ربطِ مرکز سے سرشار ہیں　　ہزاروں ستارے ضیا بار ہیں
فلک پر مگر کہکشاں ایک ہے
جو دل ایک ہیں تو جہاں ایک ہے

سو اربابِ بیداد ہیں تاک میں　　زمانے کے جلّاد ہیں تاک میں
جہاں بھر کے شدّاد ہیں تاک میں　　ہر اک سمت صیّاد ہیں تاک میں
ہمارا ہمارا آشیاں ایک ہے
جو دل ایک ہیں تو جہاں ایک ہے

کسی کے لبوں پر ہے جامِ نسیم　　کوئی دامنِ گل میں مستِ شمیم
کوئی طورِ گلشن کا بانکا کلیم　　ہیں گلچیں تو لاکھوں یہاں اے ندیم
مگر باغ میں باغباں ایک ہے
جو دل ایک ہیں تو جہاں ایک ہے

بہار ایک ہے گلستاں ایک ہے　　چمن ایک ہے آشیاں ایک ہے
زباں ایک اپنا بیاں ایک ہے　　جو سوچو تو دردِ نہاں ایک ہے
سنو تو ہر اک داستاں ایک ہے
جو دل ایک ہیں تو جہاں ایک ہے

کہیں ہے گلاب اور کہیں یاسمن　　کہیں نسترن ہے کہیں نسترن
الگ ہے ہر اک پھول کا بانکپن　　جدا ہے ہر ایک پھول کا پیرہن
مگر پھر بھی یہ گلستاں ایک ہے
جو دل ایک ہیں تو جہاں ایک ہے

یہ اشعار ہندوستان میں مقیم ایک پاکستانی جنگی قیدی نے ہمیں ارسال کئے ہیں۔

ادارہ

مختلف مذہب میں رہ کر ایک تھے اس دیس میں
وہ حقیقی بھائی چارہ اک فسانہ بن گیا
جس وطن کو ہم نے اپنے خون سے سینچا رفیق
وہ وطن اپنے لئے اب جیل خانہ بن گیا

معجزہ ذروں کی یکجہتی کا

محمد سلیم جاوید

ذرّے
بکھرے ہوئے یہ سطحِ زمیں کے ذرّے
ان کی افتاد کا تجزیہ و اندازہ کریں
یہ جو ہو جاتے ہیں باہم پیوست
راہ میں کوہِ گراں ایک بنا دیتے ہیں

امتزاج ان کا جو ہو جائے بحُسن و خوبی
اک حسیں ماہ میں نور کا پیکر بن جائے
کرم و جود و سخا کا مہرِ انور بن جائے
عدل و انصاف و محبت کے خصائص لے کر
سارے عالم کی ہر اک شے سے وہ بہتر بن جائے

اور جب
پھیلتے ہیں دامنِ وسعت لے کر
تا حدِّ نظر بنتے ہیں صحرائے عظیم
انھیں ذرّات سے
یہ پیکرِ انساں بھی ہے



غزل

— ۶ دسمبر کے المیہ اور فسادات کے پس منظر میں —

قتلِ مہتاب پہ ہنگامہ مچایا جائے
روشنی کے لئے سورج کو جلایا جائے

خندۂ گل پہ جراحت کا گماں ہوتا ہے
کیوں نہ ہر زخم کو آئینہ دکھایا جائے

کچھ تو فرزانگیٔ عشق کا پندار رکھے
پھر وہی حرفِ جنوں لکھ کے مٹایا جائے

میرے معبود! جو تو چاہے تو آجائے بہار
اک بکھرے گھر کو خرابہ نہ بنایا جائے

چشمِ تاریخ میں روشن تو ہے انساں کا وقار
اور ادھر لوگ بضد ہیں کہ بجھایا جائے

وقار خلیل
اجالے قتل نہ ہوں

لرز رہا ہے وطن اور سلگ رہا ہے چمن
ہر ایک چہرے پہ جیسے لکھی ہوئی ہو تھکن
یہ روز روز کے جھگڑے، یہ نفرتوں کا چلن
تمام ظلم و تشدد، نہ روشنی نہ کرن

اجالے قتل نہ ہوں روشنی کی بات چلے
لباس لالہ و گل میں کلی کلی چٹکے

وہ سرزمیں کہ گلستانِ رنگ و بو کہئے
وہ سرزمیں کہ جسے زلفِ مشک بو کہئے
وہ سرزمیں کہ اجالوں کی آرزو کہئے
وہ سرزمیں کہ جسے شہرِ جستجو کہئے

وہ سرزمینِ تمنّا، وہ شہرِ دیدہ و دل
وہ میرا ہند، وہ مہتابِ شعلہ خو چمکے

آج شب باہر نہ نکلو

[illegible]



آج شب باہر نہ نکلو
چل رہی ہیں ہر طرف خونی ہوائیں
نفرتوں کے چھائے ہیں ابر ہر سو
وحشتوں کا ہے اندھیرا
کھڑکیوں کو بند کر لو
ان پہ احساسات کے پردے چڑھا دو
میز سے اخلاق کے کاغذ ہٹا دو

پھاڑ دو انسانیت کی سب کتابیں
علم کی شمعیں بجھا دو
بند کر لو انگلیوں سے کان اپنے
شاہراہیں چیختی ہیں
ہر گلی کوچے سے آہیں آ رہی ہیں
پھر رہے ہیں ہر طرف خونی درندے
اپنے کمرے کو خود اپنی قبر سمجھو
آج شب باہر نہ نکلو

خون تو ایک ہے

اظہار اثر



"قتل کر دو اسے یہ ملیچھ ہے، مسلمان ہے"
"مار ڈالو یہ ہندو ہے بے دین ہے
دشمنِ جان و ایمان ہے"
خنجروں نے چمکدار ہونٹوں پہ پھیری زباں
تلملا کر گریں دو طرف بجلیاں
دو جگر دوز چیخیں فضاؤں میں لہرا گئیں
سارے عالم کو تھرا گئیں
خون بہنے لگا
ایک کافر کا خون
ایک مومن کا خون
خون جو سرخ تھا
خون جو گرم تھا
خون ہندو نہ تھا
خون مسلم نہ تھا
خون تو ایک تھا
ایک ہی طور تھا
ایک ہی رنگ تھا

خون کے گرم دھارے بڑھے
ایک کافر کا خون
ایک مومن کا خون
دونوں دھارے گلے مل گئے
کفر و ایماں کی تفریق جاتی رہی
اور انسانیت!
قالبوں سے الگ مسکراتی رہی
دیکھ کر یہ سماں
دھرم اور دین کے رہنما دم بخود رہ گئے
اک برہمن نے گھبرا کے اک مولوی سے کہا
"مولوی جی مساجد میں جا کر نمازیں پڑھو
اپنے اللہ کے واسطے کچھ کرو
کچھ دعائیں کرو
خون سے خون کیوں مل گیا؟
ایک ہندو کا خوں
ایک مسلم کا خوں
یہ ہے پاپ ہے

دھرم کا ستیاناش ہے"
مولوی نے کہا
"جا کے مندر میں پنڈت جی پوجا کرو
دیوتاؤں کو راضی کرو
اپنے بھگوان کے واسطے کچھ کرو
خون کا رنگ بدلو کسی طور بھی
ورنہ اسلام خطرے میں ہے
دھرم ہندو کا مسلم کا ایمان خطرے میں ہے
لیکن انسان کا خون بہتا رہا
خون ہنستا رہا
خون روتا رہا
خون ہندو نہ تھا
خون مسلم نہ تھا
خون تو ایک تھا
خون تو ایک ہے
خون انسان ہے

[illegible]

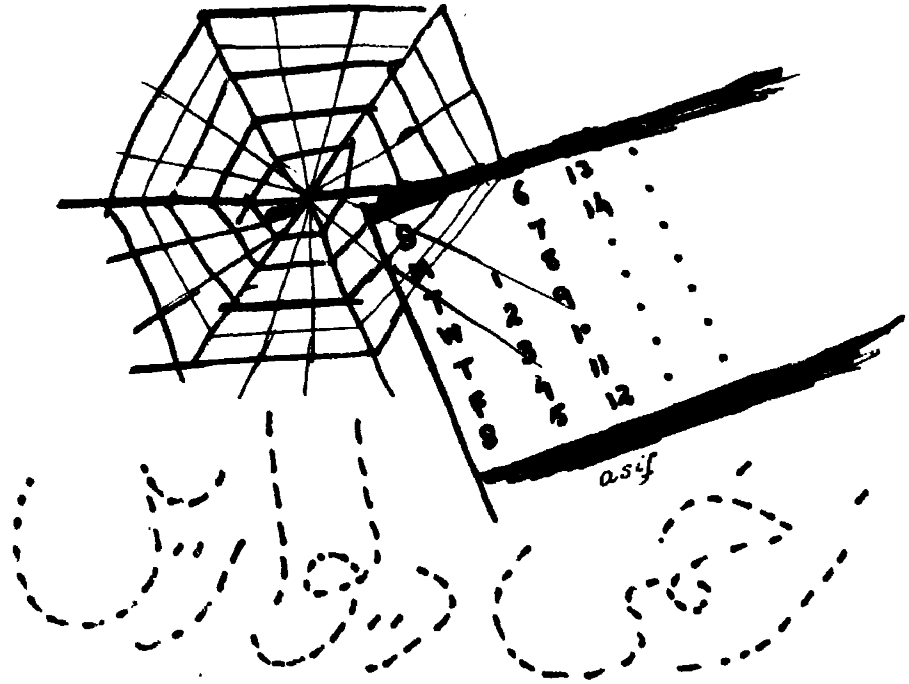
دے مجھے پیار ہی پیار

ساغر نظامی



دے مجھے پیار ہی پیار !
ساقیا آج مجھے آتشِ سیال نہ دے
دے مجھے پیار ہی پیار
یک جہتی و مستی نہیں مے خانے میں   بادۂ سرخ نہیں خون ہے پیمانے میں
خطِ مینا میں چھپی ہے تلوار
دے مجھے پیار ہی پیار
ساقیا آج مجھے آتشِ سیال نہ دے
مالی ہے بہت پیار کی برکھا کر دے   آج ساغر میں مرے پیار کا امرت بھر دے
ساقیا صدیوں کے اس زہر کو مار
دے مجھے پیار ہی پیار
ساقیا آج مجھے آتشِ سیال نہ دے
نکہتِ گل، پیار ہے خوشبو کی کمند   پیار کنولوں کی مہک پیار ہے چمپا کی سوگند
زندگی پیار کی خوشبو کی شکار
دے مجھے پیار ہی پیار
کلی شاخیں ہیں چمن ہیں پھل ہیں   ایک بہتی ہوئی ندی ہی کا نرمل جل ہیں
کیسے سمجھاؤں یہ اسرار !؟
یہی دھرم، ایک نظامِ تہذیب   ایک زبان، ایک بیاں ایک سے اپنی ترکیب
پھر ہے کیوں بیچ میں دیوار ؟
دے مجھے پیار ہی پیار

پیار رستے ہوئے زخموں کیلئے مرہم ہے   پیار امرت ہے خود آگاہ ہے جامِ جم ہے
پیار بھگوان ہے بھگوان ہے پیار
دے مجھے پیار ہی پیار
پیار کے بیج بکھیروں گا زمانے بھر میں   نئے گلزار اُگاؤں گا زمانے بھر میں
مہک اٹھے گی ہر اک من میں بہار
دے مجھے پیار ہی پیار
مسجد و دیر و کلیسا میں بکھیروں گا اسے   اپنی بہکی ہوئی دنیا میں بکھیروں گا اسے
اپنے جنگل کو کروں گا گلزار
دے مجھے پیار ہی پیار
پیار کی شبنمِ تازہ نے جلا ڈالے ہیں خار   پیار کی بادِ صبا خاک کو کرتی ہے بہار
کیا بھلا پیار کے آگے تلوار
دے مجھے پیار ہی پیار
صدیوں سے آگ جو پھیلی ہی بجھانی ہے مجھے   آج انگاروں پہ اک بزم سجانی ہے مجھے
دے مجھے مہکے ہوئے ہار
سے نازک ہے مری جان !
اور ہے وقت کو اصرار مسلسل اصرار
دے مجھے پیار ہی پیار
ساقیا آج مجھے آتشِ سیال نہ دے
دے مجھے پیار ہی پیار



فصیح اکمل قادری



میں نے اس سال کوئی خواب نہیں دیکھا ہے
لُٹ چکی سالِ گزشتہ ہی متاعِ تعبیر
زندگی کے لئے لازم تو نہیں ہے تقویم
اک کلنڈر سے بدل تو نہیں سکتی تقدیر

اپنے کمرے سے گئے سال کے پارینہ ورق
میں نے کس طرح اتارے ہیں بتاؤں کیسے
ایک دو زخمِ بدن ہوں تو چھپا بھی لوں انھیں
خون آلودہ لباسوں کو چھپاؤں کیسے

ہر کلنڈر سے چمکتی ہوئی تصویر مٹی
پیرہن تار ہوئے نوکِ سناں ٹوٹ گئی
کہیں ٹیگور کی تصویر گری لہرا کر
کہیں اقبال کی تخیل گراں ٹوٹ گئی

بدھ کی تصویر شکستہ تھی کئی جگہوں سے
رام کے چہرے پہ لہریں تھیں پشیمانی کی
میں نے طاقوں میں سجائے تھے جو مرمر کے صنم
ان کا انجام نہ سوچا بڑی نادانی کی

غالب و میر کی آنکھوں سے رواں تھے آنسو
سُور و تلسی کی جگہ خالی تھی دیواروں پر
نانک و چشتی نے منہ پھیر لیا تھا آخر
بجلیاں کوند رہی تھیں کہیں تلواروں پر

کرشن کے ہاتھ سے بنسی گری رادھا لرزی
گوپیاں روتی ہوئی لوٹ گئیں جمنا سے
ڈر کے شنکر سے ہم آغوش ہوئی پاروتی
خون کی دھار جو لہرا کے چلی گنگا سے

مسجدیں ٹوٹیں تو کاشی کے کلس کانپ گئے
لکھنؤ خون میں ڈوبا تو اودھ روئی
میں نے دیکھا جو لرزنے لگا سنگم کا ورق
کیسی نسبت تھی کہ کشمیر کی ممتا روئی

اتفاقاً جو نظر اُٹھ گئی گاندھی کی طرف
خون میں ڈوبا ہوا پیکرِ معصوم ملا
ہاتھ سے روکے ہوئے خون کے فوارے کو
اِس زمانے کا مسیحا مجھے مظلوم ملا

گر پڑا نہرو کی تصویر سے قدموں میں گلاب
پتیاں کچلیں تو دل ٹوٹ گئے سینوں میں
نیزہ برداروں کے قدموں کو کہاں یہ احساس
دھرتی کٹتی ہے تو خاک اُڑتی ہے آئینوں میں

لہلہاتے ہوئے کھیتوں سے اُٹھے جب شعلے
بھوک کی فصلیں اُٹھیں راکھ کے انباروں سے
گاؤں شہروں کو چلے جھولیاں پھیلائے ہوئے
کالے حرفوں کا دھواں پھیلا ہے اخباروں سے

یہ دھواں کنس بنا پیکرِ راون میں ڈھلا
گوڈسے کی کہیں تصویر بنا دی اس نے
روپ قاتل کا بھرا اور کہیں جلاد بنا
ایک اک پیار کی تصویر جھپا دی اس نے

میرے کمرے میں نئے سال کی رعنائی کہاں
ایک اک روزن و در پر ہے دھوئیں کا پہرا
میں نے اس سال کوئی خواب نہیں دیکھا ہے
میری بھی فکر و نظر پر ہے دھوئیں کا پہرا

میں نئے سال کی تصویر سجا بھی دوں اگر
زخم یہ کاغذی پیکر سے نہیں چھپ سکتے
ایک دو خون کے دھبے تو چھپا سکتا ہوں
اتنے داغ ایک کلنڈر سے نہیں چھپ سکتے

رنگ و نور

جعفری عسکری

چہار سمت سے ہوائیں، خنجر و سناں لے بڑھا کریں
ہزار خوں کی ندیاں چڑھا کریں
پہاڑ بن کے ظلمتیں گرا کریں!
تو کیا ہوا
تلاشِ امن و زیست کے لئے
نشان ہائے رنگ و نور کے لئے
حصارِ ظلم و جور کے ادھر چلو!
کدورتیں دلوں سے بے نشان ہو چکیں جہاں!
شعور مختلف ہیں گو
مگر امنگ ایک ہے!
لہو کا رنگ ایک ہے!!

نشان ہائے رنگ و نور ایک ہیں
کہ رنگِ خوں بھی ایک ہے!
تو پھر بتاؤ کس لئے
سیاہ فام جلد پر
سفید و زرد جسم پر
یہ داغ ہائے زخم پر
سبھوں کے رنگ ایک ہیں
لہو کا رنگ ایک ہے!!
چہار سمت ۔

یہ مقامِ اوج ہے انسان کا

عقیل ہاشمی

ہند کی تاریخ ——
گویا ایک بحرِ بے کنار
کون جانے کتنے ہیں اس میں غلامی کے بھنور
سیکولر ڈیموکریسی

صدیوں پہلے کے انہی کھنڈروں میں اے ہمدم سنو
روح فرسا داستانیں دفن ہیں کتنی یہاں
گوتم و نانک کی اس دھرتی پہ اے میرے ندیم
قہر ٹوٹے آسمانی بے شمار
پھر سویرا دیکھنا ایسے ہوا
عزم مستحکم سے اٹھی ایک موجِ انقلاب
وجہِ آزادی بنی تقدیر سے اس کی حیات
پیکرِ صبر و ثبات
جانتا تھا جو تشدد کو گنہ، ظلم و عذاب
جبر و قوت کی نگاہوں کا وہ کانٹا
ان گنت دہقاں کی جوت
دل، جفاکش محنتی مزدور کا
پھول سے معصوم بچوں کا نگہبان
اس کا ثانی ہو نہیں سکتا کوئی نعم البدل
صاف جس نے پڑھ لیا
مایوس چہروں کی جبیں کا حرف حرف

آفتابِ ظلم سے جھلسے ہوئے زن و رجال ——!!!
وقت کے دھاروں نے دیکھا
استعجاب و کرب سے
خاک کے پتلوں نے لیں جو انگڑائیاں
بے خطر بے تیغ، ناموس وطن کے واسطے
چل پڑا لے کر ہزاروں قافلے
امن عالم کے لئے حق کے لئے وہ تشنہ کام
دے گیا درسِ اخوت
قومِ نو کو یہ پیام
ایک ہو جاؤ تو ہو جاؤ گے اک دن سرفراز
اے بختیار
حکمرانی، کامرانی شادمانی کی قسم
آگہی اپنے وطن کی جاں نثاری کی قسم
جان لو ہے یہ یقینی آسمانی افتخار
فی الحقیقت
یہ مقامِ اوج ہے "انسان" کا

کیا ہم انسان ہیں؟

• رشمی الاحسانی

ہر شمر کو ملعون و شرربار کہے جاؤ
بے خوف ہلاکو کو بھی خونخوار کہے جاؤ
چنگیز کو بے درد و ستم گار کہے جاؤ
نادر کو بھی اس دور کا بدکار کہے جاؤ

تم ذکرِ مسولینی پہ ہنستے رہو دن رات
اور شان سے ہٹلر کو بھی کہتے رہو بدذات

نمرود کی آقائی و طاقت پہ ہنسو تم
فرعون کے بھی کرّو رعونت پہ ہنسو تم
شدّاد کی خودساختہ جنّت پہ ہنسو تم
راون کی شقاوت پہ خباثت پہ ہنسو تم

انسان خدائی کا علم دار رہا ہے
سوچو تو یہ کس درجہ بدکار رہا ہے

جے چند کی مکّاری پہ تھوکو تو بجا ہے
صادق کی سی غدّاری پہ تھوکو تو بجا ہے
جعفر کی بھی عیّاری پہ تھوکو تو بجا ہے
ناتھو کی جفاکاری پہ تھوکو تو بجا ہے

ہر ظالم و جابر کو ستم گار کہے جاؤ
ہر مفسد و بدکار کو غدّار کہے جاؤ

کیا آج کا انسان ستم گار نہیں ہے ؟
چنگیز سے بھی زیادہ یہ خونخوار نہیں ہے ؟
بڑھ چڑھ کے ہلاکو سے شرربار نہیں ہے ؟
اِس دور کے انسان کا بھی کردار نہیں ہے ؟

یہ اب بھی ستم گاری میں یکتائے زماں ہے
مکّاری و خونخواری میں یکتائے زماں ہے

یہ وید کا انجیل کا قرآن کا قاتل
یہ امن و مساوات کے عنوان کا قاتل
کیا خوب کہ ہندو کا مسلمان کا قاتل
اس دور کا انسان ہے انسان کا قاتل

کس منہ سے تم اُن لوگوں کو خونخوار کہوگے ؟
چنگیز و ہلاکو کو ستم گار کہوگے ؟

انسان کا لہو تم بھی بہاتے رہے بے کار
کل تم پہ بھی تھوکیں گے محبت کے پرستار
وہ امن و مساوات کے ہوں گے جو طلبگار
سر پیٹ کے رہ جائیں گے اس دور پہ سو بار

ہے کون سا وہ زخم جو تم نے نہ دیا ہو ؟
ہے کون سا وہ جرم جو تم نے نہ کیا ہو ؟

تاریخ میں کل تم کو بھی جلّاد لکھیں گے
کاہے کو غلامو! تمہیں آزاد لکھیں گے
ہر حال میں تم کو ستم ایجاد لکھیں گے
سچ ہے جو تمہیں بانیٔ بیداد لکھیں گے
کس منہ سے وہ انسان کہیں گے تمہی سوچو؟
ہے جھوٹ جو شیطان کہیں گے تمہی سوچو؟

اہلِ کتاب

ایک سیمینار کی رپورٹ

عبداللطیف اعظمی

اس ماہ کی ۲۰ اور ۲۱ کو غالب اکیڈیمی (حضرت نظام الدین، نئی دہلی) ایک دوروزہ سیمینار منعقد ہوا تھا جس کے داعی اردو کے مشہور محققین جناب مالک رام صاحب ڈاکٹر عابد رضا بیدار تھے۔ سیمینار کا عنوان تھا "اہلِ کتاب کے مسائل"۔ اس کے افتتاح کے لئے جناب بدرالدین طیب جی حیدرآباد سے تشریف لائے تھے۔ اپنی نوعیت کا یہ پہلا سیمینار نہیں تھا کہ اس کے بارے میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش ہو۔ اس سے پہلے اسی ہال میں اسلام، ہندوستانی مسلمانوں اور اردو کے مختلف مسائل پر متعدد سیمینار منعقد ہو چکے ہیں، جن میں مختلف مکاتیب خیال کے مسلمانوں نے شرکت کی ہے اور اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اور اگر گنجائش ہو بھی سکتی تھی تو جناب بدرالدین طیب جی کے افتتاحی مضمون کے بعد کوئی گنجائش باقی نہیں تھی۔

مگر اس مرتبہ ایک ممتاز اور معزز شخصیت کی طرف سے یہ سوال اٹھایا گیا کہ اس سیمنار کی غرض و غایت، سیاسی ہے یا علمی۔ اور جب داعیوں کی طرف سے، دورانِ سوال ہی میں، فوری جواب دیا گیا کہ سیاسی نہیں خالص علمی ہے تو موصوف نے فرمایا کہ اس کے لئے یہ مناسب وقت نہیں تھا۔ مسلمان یونہی زخم خوردہ ہیں۔ یہ بحث نمک پاشی کا کام دے گی اور خواہ مخواہ کے شبہات سر اٹھائیں گے اور مسلمانوں میں غلط فہمیاں پیدا ہوں گی۔ اگرچہ داعیوں کی طرف سے بہت تفصیل کے ساتھ ایسی وضاحت کردی گئی کہ ان کی نیتوں کے بارے میں اور نہ سیمنار کے مقصد کے بارے میں کسی غلط فہمی کی گنجائش باقی نہیں رہی مگر ان بزرگ کو مطمئن نہیں ہونا تھا نہیں ہوئے

دل چسپ بات یہ ہے کہ اس سیمنار کا جن صاحب نے افتتاح فرمایا وہ حیدرآباد سے اسی غرض سے تشریف لائے تھے یعنی بدرالدین طیب جی، جن صاحب نے اعتراض کیا ان کا تعلق حیدرآباد سے ہے یعنی جناب محمد یونس سلیم صاحب جو مرکزی حکومت میں قانون کے نائب وزیر رہ چکے ہیں اور داعیوں کے علاوہ، دورانِ سیمنار میں یونس سلیم صاحب کا جن صاحب نے جواب دیا وہ بھی حیدرآبادی ہیں اور جیسا کہ انھوں نے سیمنار میں بیان کیا، اس سیمنار میں شرکت کی غرض سے اتنا طویل سفر کرکے تشریف لائے تھے یعنی جناب ڈاکٹر ہاشم امیر علی صاحب، جنھوں نے قرآن مجید کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے اور اس لحاظ سے قرآن پر ان کی نظر ہے۔ بہرحال یہ سیمنار حسب پروگرام دو دن جاری رہا۔ بہت سے مقالے پڑھے گئے اور ان پر عالمانہ بحث و گفتگو ہوئی۔ یہ ضرور تھا کہ بعض مضامین اور بعض تبصرے یا اعتراضات معیار سے گرے ہوئے تھے۔ خاص طور پر وہ مضمون جس میں ہندوؤں کی مقدس کتابوں اور مقدس شخصیتوں پر نامناسب اعتراضات کئے گئے تھے مگر اس قسم کی خامیاں ہر سیمنار میں ہوتی ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔

اس سیمنار کے چند دنوں کے بعد ۸ اکتوبر کی اشاعت میں موقر روزنامہ "الجمعیۃ" میں اس سیمنار کے بارے میں، اس کا نام لئے بغیر ایک اداریہ شائع ہوا ہے جس میں اسی طرح کے شبہات و خدشات کا اظہار کیا گیا جیسے سیمنار میں کئے گئے تھے۔ عنوان ہے "نئے شوشے، نئی اُپج"۔ ابتدا یوں ہوتی ہے "ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ تو چلی جا رہی ہے۔ اسلام اور اسکی روایات سے چھیڑ چھاڑ تو کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ ہمارے لئے یہ بلت زیادہ قابلِ توجہ ہے کہ گزشتہ چند سالوں سے اس چھیڑ چھاڑ کے لئے مسلمانوں ہی کو آگے کیا گیا ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کچھ اشارے دوسری طرف سے دیئے جاتے ہیں اور ہمیں فوراً احساس ہو جاتا ہے کہ آئندہ ان لقموں کو خود مسلمانوں کے منہ سے اُگلوایا جائے گا۔"

ظاہر ہے یہ اداریہ "الجمعیۃ" کے چیف ایڈیٹر مولانا محمد عثمان فارقلیط صاحب نے لکھا ہوگا۔ مولانا اسلام کے داعیوں اور مبلغوں اور اسلامی روایات اور تہذیب کے حامیوں اور مویدوں میں سے ہیں۔ اگر واقعی مولانا کو اسلام اور اس کی تعلیمات عزیز ہیں تو انھیں سوچنا چاہیئے تھا کہ انھوں نے اوپر کے اقتباس میں جس بے بنیاد بدگمانی کا اظہار کیا ہے اس کے لئے اسلام میں قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ آگے چل کر مولانا نے مزید بدگمانیوں کا اظہار کیا ہے اور ان مسلمانوں کی نیت اور کردار پر غیر اسلامی حملے کئے ہیں جن کے افکار و خیالات سے مولانا کو اتفاق نہیں ہے۔ اس کے بعد سوال کرتے ہیں "اگر ہندوؤں کو اہل کتاب تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟" سیمنار کے منتظموں سے یہ سوال کرنے سے پہلے مولانا کو خود اپنے سے یہ سوال کرنا چاہیئے تھا کہ ایک طویل عرصے سے وہ اداریئے لکھ رہے ہیں ان کا کیا نتیجہ نکلا ہے؟ ابھی حال ہی میں موجودہ اناجیل پر مولانا کا ایک مضمون ہفتہ روزہ صدق جدید میں چھپا ہے۔ آخر اس کا مقصد کیا ہے؟ اگر مولانا کی یہ تحقیق مان لی جائے کہ موجودہ انجیلیں بعد میں مرتب کی گئی ہیں اور یہ کلام الٰہی نہیں ہیں تو اس سے کیا نتیجہ نکلے گا؟ دنیا میں بڑے بڑے سیمنار منعقد ہوتے ہیں اور علمی تحقیق و تفتیش اور خیالات کا تبادلہ اور ایک دوسرے کی رایوں سے استفادہ ان کا مقصد ہوتا ہے۔ یہی مقصد اس چھوٹے سے سیمنار کا تھا جو اہلِ کتاب کے مسائل پر منعقد ہوا تھا۔

قرآن میں یہود و نصاریٰ کو واضح طور پر اہلِ کتاب کہا گیا ہے۔ اس لئے ان کے اہلِ کتاب ہونے میں بظاہر کوئی شبہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ سوال صرف یہ تھا کہ یہود و نصاریٰ کے علاوہ دنیا میں بالخصوص ہندوستان میں

دوسری قوموں کو کس میں شمار کیا جائے گا، اہلِ کتاب میں یا کفار اور مشرکین میں؟ مگر سیمینار میں بعض لوگوں نے موجودہ یہود و نصاریٰ کو بھی اہلِ کتاب ماننے سے انکار کر دیا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ یہود و نصاریٰ کی آسمانی کتابیں اب وہ نہیں رہیں جو آنحضرت ؐ کے عہد میں تھیں۔ روزنامہ "الجمعیۃ" کے فاضل اداریہ نگار نے بھی اسی خیال کی تائید کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:-

"اسلام نے صرف یہود اور عیسائیوں کو اہلِ کتاب میں شامل کیا ہے۔ اور یہود و عیسائی بھی وہ جو اپنے اپنے پیغمبروں کی اصل تعلیم پر قائم رہے۔ آج کل کے یہود اور نصاریٰ کو قرآن پاک کی رو سے اہل کتاب قرار دینا صحیح نہیں ہے، کیونکہ یہ دونوں اپنے پیغمبروں کی اصل تعلیم سے ہٹ گئے ہیں۔ ہم عیسائیوں کو اہل کتاب کی بجائے پولوسی قرار دیتے ہیں۔ سینٹ پال (پولوس) نے ایک نیا مذہب ایجاد کیا اور اس میں اسکندریہ کے فلاسفروں کے خیالات شامل کئے اور لوگوں نے ان خیالات کو مان کر عیسائیت قبول کر لی۔ یہود بھی اہلِ کتاب نہیں بلکہ وہ صیہونی ہیں۔ انھوں نے اپنی اصل کتابوں (توریت، زبور) کے بجائے دوسری کتابیں تصنیف کیں اور ایک نئے مذہب کے پیرو بن گئے۔"

فاضل اداریہ نگار نے مذکورہ بالا اقتباس میں جو کچھ فرمایا ہے اس کے لئے ان کے پاس یقیناً معقول دلائل ہوں گے، مگر افسوس کہ انھوں نے اس اداریے میں انھیں بیان نہیں فرمایا شاید اس لئے کہ انھوں نے ایک روزنامے کا اداریہ لکھا تھا، کوئی تحقیقی مقالہ نہیں، مگر چونکہ خاکسار کو اور مجھ جیسے اور بہت سے لوگوں کو موصوف کے ان خیالات سے اتفاق نہیں ہے اس لئے بڑی عنایت ہوگی اگر وہ اپنے دلائل بھی لکھ دیں۔

فاضل اداریہ نگار نے موجودہ یہود و نصاریٰ کو دو وجہوں سے اہلِ کتاب ماننے سے انکار کیا ہے۔ ایک یہ کہ وہ "اپنے پیغمبروں کی اصل تعلیم سے ہٹ گئے ہیں" دوسرے یہ کہ "سینٹ پال نے ایک نیا مذہب ایجاد کیا اور لوگوں نے ان خیالات کو مان کر عیسائیت قبول کر لی"۔ پہلی بات صحیح ہو سکتی ہے مگر خود مسلمانوں میں کتنے ہیں جو اسلام کی اصل تعلیمات پر قائم ہیں؟ آج کل ہندوستانی سیاست میں ایک نئی اصطلاح "نام کے مسلمان" رائج ہو گئی ہے جو سیکولر اور قوم پرست مسلمانوں کے لئے ہر اس مسلمان کے لئے جو مسلمانوں کی سماجی اصلاح کا حامی ہو، استعمال کی جاتی ہے۔ اگر کوئی مسلمان کہے کہ ہندوستان میں جو مسلم پرسنل لا رائج ہے وہ اصلاح طلب ہے اس پر زمانے کے تقاضوں کے مطابق نظر ثانی کرنی چاہیئے تو قدامت پرست کہیں گے کہ یہ مطالبہ کرنے والے "نام کے مسلمان" ہیں یہاں تک کہ اگر کوئی مسلمان مسلم یونیورسٹی ایکٹ کی حمایت کر دے جس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں تو اسے بھی "نام کا مسلمان" کہا جائے گا ایسے نام کے مسلمانوں کی تعداد کروڑوں تک پہنچ سکتی ہے اس سے کہیں زیادہ تعداد ان مسلمانوں کی ہوگی جو مذہبی اصطلاح میں "نام کے مسلمان" ہیں ـــــ قبر پرست ہیں تو ہم پرست ہیں، نماز نہیں پڑھتے، روزہ نہیں رکھتے، غیر مسلموں میں شادی بیاہ کو جائز سمجھتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ کیا ایسے مسلمانوں کو مسلمان نہیں کہیں گے؟ "الجمعیۃ" کے فاضل اداریہ نگار یا کسی مولانا کا جواب کچھ ہو، مگر مردم شماری میں ایسے مسلمانوں کا شمار "مسلمانوں" میں ہوتا ہے اور اسی بنا پر مسلمانوں کی تعداد متعین ہوتی ہے اور پارلیمنٹ وغیرہ میں نمائندگی اور دوسرے حقوق ملتے ہیں۔

دوسری دلیل کے متعلق گذارش یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ اس کو صحیح نہیں سمجھتے، کہتے ہیں کہ یہ اغیار کے الزامات ہیں۔ اس سیمینار میں ایک امریکن پادری مسٹر پال جیکسن بھی شریک تھے، جو آج کل جامعہ ملیہ میں تاریخ میں ریسرچ کر رہے ہیں۔ جب سیمینار میں بعض حضرات نے یہ خیال ظاہر کیا کہ یہود و نصاریٰ کی آسمانی کتابیں جو آج کل پائی جاتی ہیں، وہ نہیں ہیں جو آنحضرت ؐ کے عہد مبارک میں موجود تھیں، جن کی بنا پر انھیں اہلِ کتاب کہا گیا تھا: اس وقت میری درخواست پر مسٹر پال جیکسن نے ایک مختصر مگر معلومات افزا اور مدلل تقریر کی اور انھوں نے کہا کہ موجودہ کتابیں وہی ہیں جو آنحضرت صلعم کے زمانے میں تھیں۔

بہر حال قرآن نے یہود اور نصاریٰ کو واضح طور پر بار بار اہل کتاب کہا ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قرآن کے نزول کے وقت، قرآن کے ارشاد کے مطابق دنیا میں کوئی ایسی آسمانی کتاب موجود نہیں تھی جو مکمل طور پر کلامِ الٰہی کہی جا سکے۔ اور جس میں معنوی اور لفظی تحریف نہ کی گئی ہو۔ پھر بھی قرآن نے یہود و نصاریٰ کو اہل کتاب کہا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن کی اس اصطلاح "اہلِ کتاب" کا مطلب صرف یہ ہے کہ جس قوم میں کبھی کوئی نبی یا رسول مبعوث ہوا ہو اور اس کے پاس کوئی آسمانی کتاب ہو، چاہے وہ اصلی حالت میں نہ ہو اور اس میں لفظی اور معنوی تحریف کر دی گئی ہو، مگر وہ قوم اصطلاحی طور پر اہل کتاب ہے اور وہ ان تمام حقوق کی مستحق ہے جو اسلام کی تعلیمات اور احکام کے لحاظ سے اہل کتاب کو حاصل ہیں بعض علمائے اسلام نے ہندوؤں کو اہل کتاب تسلیم بھی کیا ہے اور بعض نے شبیہ اہل کتاب لکھا ہے۔ مگر نتیجے کے لحاظ سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس سیمینار میں ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے جو مضمون پڑھا تھا اور جو ماہنامہ "سیکولر ڈیموکریسی" اردو (بابت ماہ اکتوبر) میں چھپ بھی چکا ہے اس میں انھوں نے لکھا ہے کہ "اسلام جب ایران پہنچا، اور یہ ہندوستان سے پہلے کی بات ہے تو اسلام کے دو عظیم فقہا عمرؓ اور علیؓ نے اپنی عقل استعمال کر کے ایران کے مجوسی کو اہلِ کتاب قرار دے دیا۔ بنیاد صاف تھی، ان لوگوں کے پاس ایک کتاب موجود تھی اور ایک رسول کا تصور جو زرتشت کی صورت میں انھیں ملا تھا ـــــ اسلام جب ہندوستان میں آیا تو نوعمر سالار نے جس طرح ہر محاذ پر بے مثال قوتِ فیصلہ کا مظاہرہ کیا تھا یہاں بھی اس نے حکم دے دیا، اس لئے کہ ایران کی مثال اس کے سامنے تھی کہ ہندوؤں کو وہی حیثیت حاصل ہے جو اہل ایران کو اور ان کے معابد کو بھی وہی حیثیت ہے جو مجوسی آتشکدوں کی" آگے چل کر ڈاکٹر بیدار نے لکھا ہے کہ "اکبر کی رانی جودھا بائی، جہانگیر کی ماں، تاریخ میں کہیں کوئی تذکرہ نہیں ملتا کہ جودھا بائی نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ جودھا بائی کا بیٹا جہانگیر جب تخت نشین ہوا تو

اسلامی ورثہ کے امینوں میں سے کسی نے یہ اعتراض نہیں کیا کہ مسلمان اور کافر کا نکاح ناجائز ہے اس لئے یہ لڑکا بھی ناجائز ہے (اور اس لئے اس کی تخت نشینی بھی باطل)۔ یہ زمانہ وہ تھا جب مجدد الف ثانی جیسے جلیل القدر عالم موجود تھے۔ پھر اکبر کے پرپوتے اورنگ زیب عالمگیر جیسے مسلم بادشاہ کی بیوی، اودے پوری بیگم کے اسلام لانے کے بارے میں کوئی ثبوت موجود نہیں، نہ کہیں سے یہ اطلاع مل سکی کہ باپ کی مجبوری سے شادی کرنے کے بعد جب وہ خود مالک الملک ہوا تو اس نے اپنی بیگم کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا ہو، کیا اس کا مطلب یہ نہیں لیا جا سکتا کہ پورے عہد میں غیر مسلم اہل ہند کے بارے میں کچھ نہ کچھ ایسا تصور موجود رہا کہ یہ اہل کتاب ہیں؟"

راقم الحروف نے اپنے مختصر مضمون میں جو سیمنار کے دوسرے دن پڑھا گیا۔ یہ عرض کیا تھا کہ قرآن میں اہل کتاب، مشرک اور کافر کے الفاظ اپنے عمومی معنی و مفہوم میں استعمال نہیں ہوئے ہیں، بلکہ اصطلاح کے طور پر استعمال ہوئے ہیں اور ان کا تعلق صرف اسی زمانے کے عربوں سے ہے۔ دوسری قوموں کو، جن سے عرب ناواقف تھے، نہ تو مشرک کہا جا سکتا ہے اور نہ کافر۔ میں نے دلیل یہ دی تھی کہ مسلمانوں کے نزدیک یہ مسلّم ہے کہ قرآن مجید میں صرف وہی تلمیحات، تشبیہات، واقعات، حکایات اور محاورات استعمال کئے گئے ہیں جن سے عرب واقف تھے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح ہوگا کہ عرب جن قوموں، مذہبوں، اور علاقوں اور ملکوں سے واقف نہیں تھے۔ ان کا قرآن میں ذکر بھی نہیں ہے، ان کی طرف اشارہ بھی نہیں ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر دوسری قوموں اور ملتوں کو کس خانے میں رکھا جائے گا؟ یہیں پر اجتہاد کی ضرورت پڑتی ہے اور ہمارے علما نے مجوسیوں اور ہندوؤں وغیرہ کو اہل کتاب یا کسی نے غایت احتیاط کی بنا پر شبیہ اہل کتاب کہا ہے۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس فیصلے کو ہم تسلیم نہ کرلیں۔

مولانا شہاب الدین ندوی (؟) ... صاحب کا ایک مضمون "کیا ہندو اہل کتاب ہیں؟" سیکولرزم ... بابت ... ماہ اکتوبر میں شائع ہوا ہے۔ جو زیر بحث موضوع پر بہت اچھا ہے۔ مگر چونکہ مضمون اس سیمنار میں نہیں پڑھا گیا تھا، اس لئے اس کا یہاں ذکر کرنا مناسب نہیں ہوگا۔

ہندوستان میں ایسے عالم اور اسکالر شاذ و نادر ملیں گے، جنہیں اپنے مذہب کے علاوہ دوسرے مذاہب کا گہرا مطالعہ ہو۔ اگر تمام مذاہب کے تقابلی مطالعہ کا نہیں تو کم از کم اہم مذاہب کے تقابلی مطالعہ کی ابھی تک ٹھوس بنیاد نہیں پڑی ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے ہندوستان میں صرف ایک پٹیالہ یونیورسٹی ہے جس میں چند اہم مذاہب کے تقابلی مطالعہ کے لئے ایک شعبہ قائم ہے۔ اگر ملک میں حقیقی قومی یک جہتی اور جذباتی ہم آہنگی قائم کرنی ہے تو ضرورت ہے کہ زیادہ سے زیادہ یونیورسٹیوں میں مذاہب کے تقابلی مطالعہ کا انتظام کیا جائے۔ یونیورسٹیوں سے زیادہ عربی مدارس میں اس کی ضرورت ہے۔ عربی مدارس کا حال یہ ہے کہ جو مدرسہ مسلمانوں کے جس فرقے یا مکتب خیال کا ہے وہاں صرف اسی فرقے یا مکتب خیال کے نقطۂ نظر کے مطابق تعلیم دی جاتی ہے۔ مثلاً اگر احناف کا مدرسہ ہے تو وہاں صرف احناف کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کی جائے گی، اسی طرح اہل حدیث کے مدرسوں میں اہل حدیث کے خیالات و افکار کی۔ مسلم یونیورسٹی میں تو شعبۂ دینیات کے دو حصے ہیں، سنیوں کا الگ اور شیعوں کا الگ۔ مشرق و مغرب کے متعلق کپلنگ کا یہ فقرہ بہت مشہور ہے کہ دونوں کبھی نہ مل سکیں گے۔ مگر یہ دونوں شاید کبھی مل جائیں، لیکن مسلمانوں کے دو بڑے فرقوں ——— سنی اور شیعہ ——— کے درمیان عقائد اور مذہبی خیالات کی جو وسیع خلیج حائل ہے شاید وہ کبھی کم نہ ہو سکے گی۔ ان مدرسوں میں جو تعلیم دی جاتی ہے اس میں اس پر زور دیا جاتا ہے صرف ہم حق پر ہیں، دوسرے غلط راستے پر۔ ان حالات میں ان مدارس کے فارغ التحصیل طلبا کی جو معلومات اور ذہنیت ہوگی وہ ظاہر ہے۔ اس سیمنار میں صرف ملک رام صاحب ایک ایسے دانش ور مجھے نظر آئے جن کو مختلف مذاہب پر گہری نظر ہے اور ان کا نقطۂ نظر کسی حد تک معروضی ہے۔

ہم مسلمانوں کا خیال بلکہ عقیدہ ہے کہ مستشرقین نے اسلام کی تعلیمات کو مسخ کرکے پیش کیا ہے اور اسلام کے ساتھ ان کا رویہ معاندانہ ہے، مگر خود ہم مسلمانوں کا رویہ دوسرے مذاہب کے ساتھ کیسا ہے؟ اس پر غور کرنے کی ہمیں کبھی توفیق نہیں ہوئی۔ میں نے اس مضمون کے شروع میں مولانا فارقلیط صاحب کے مضمون کا ذکر کیا ہے جو "صدق جدید" میں موجودہ اناجیل کے بارے میں شائع ہوا ہے۔ جب میں نے اس مضمون کو امریکن نوجوان پادری مسٹر پال جیکسن کو دکھایا تو اس کو پڑھنے کے بعد ان کا وہی ردعمل تھا جو ہمارا مستشرقین کے بارے میں ہے۔

آج کل تقریر اور تحریر کی آزادی پہلے کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ اب نہ تو قلم پر حکومت کا جبر ہے اور نہ عوام کا۔ اگر ہم قلم کے فساد سے بچنا چاہتے ہیں تو مذاہب کے تقابلی مطالعہ کا جلد سے جلد انتظام کرنا چاہیئے اور ایسی فضا پیدا کرنی چاہیئے کہ ہم ایک دوسرے کے مذہب اور جذبات و احساسات کا احترام کرنا سیکھیں۔ ہر شخص کو اپنے مذہب کی تعریف اور تبلیغ و اشاعت کی بھرپور اجازت ہونی چاہیئے

بقیہ صفحہ ۲۹

گلے ہاتھ دے کھیلے تاریاں سوں کھیل
جسوں کھیلے ہیو او سرفراز ہے
{اس رنگ کی اس فضامیں پیا جسکے گلے میں
باہیں ڈال ہے وہی سرفراز ہے}
پیا سوں کھیلی نیہہ اسے بال پن سوں
تورس رنگ سوں او گڑبھر یا منع بھلولے
{مجھے پیلے سے لڑکپن سے محبت ہے۔ یہ رنگیلا
سانولا مجھے ہمیشہ بھاتا ہے}

ولی :-
کرشن کی گوپیاں کی نہیں ہے یہ نسل
رہیں سب گوپیاں وہ نقل یہ اصل

سودا :-
نہیں ہے گھر کوئی ایسا جہاں اس کو نہ دیکھا ہو
کنہیا سے نہیں کچھ کم صنم میرا وہ ہرجائی

انشا :-
رادھکا کو چین کیا آوے کنہیا جی بغیر
ہے نور بصر مردمک دیدہ میں پنہاں یوں جیسے کنہیا
سو اشک کے قطروں سے پڑا کھیلے ہے جمرٹ اور آنکھوں میں جھمٹ

شور :-
گوپیوں کا کیوں نہ ہوئے کنج گلیوں میں ہجوم
کوچہ بندی کر رہی ہے بانسری والے کی گونج

کرشن کی بنسری ہندوستانی شعر و ادب میں ضرب المثل کا درجہ رکھتی ہے۔ اردو کے غزل گو بھی اس سے ناواقف نہیں :-

ولی :- تیرے بن رات دن پھرتیاں ہوں بن بن کشن کے مانند
ایس کے مکھ اپر رکھ کر نگاہ کی بانسلی انکھیاں

نہ ہوئے کیوں شور دل کی بانسلی میں
ملاحت کا سلونا کان پہنچا

چھپا ہوں میں صدائے بانسلی میں
کرتا جاؤں پری رو کی گلی میں
ترے غم میں دل سوراخ سوراخ
کیا پیدا صدائے بانسلی کون

انشا :-
جاوے وہ صنم برج کو تو آپ کنہیا
جھٹ سامنے ہو مرلی کی دھن ندر پکڑ کر

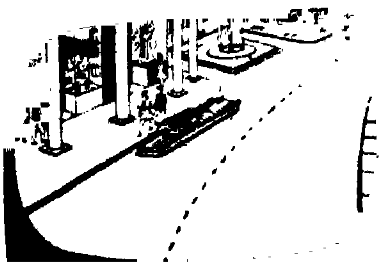
محسن :-
اے ستم تو وہ کنہیا ہے بلائیں لوں اگر
بانسلی کی طرح نالاں ہوں سراپا انگلیاں

داغ :-
صور محشر کو بھی اس کے مست
بانسری کی بھنک سمجھتے ہیں

اردو شاعری میں ہندوستان تلمیحوں کی بہت سی مزید مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ یہاں اختصار کے پیش نظر ان کی صرف ایک جھلک دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

[redacted]

DEVELOPMENT AT A GLANCE



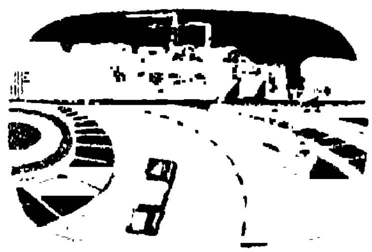
1 Delhi Development Authority is engaged in the transformation of the National Metropolis.

2. A massive social housing programme for the low and middle income groups has already made a headway. About 10,000 flats in different residential areas have been constructed and over 19,000 more have been planned.



3 About 1000 independent houses were given away to the community service personnel (dhobis, barbers, domestic servants and cobblers etc.) at a subsidised price of Rs. 2,200. DDA gave Rs. 1,100 as subsidy to each allottee. Allotment of Janta Houses for the people of Delhi (income not exceeding Rs. 3,000 per year) has already been taken in hand in a big way.

4. Residential plots are developed and given away to the people for building houses. About 25,000 plots, which include 15,000 residential, 5,000 commercial and over 4,500 industrial, have been developed.



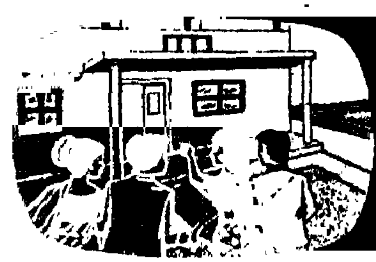
5. For rehabilitating the squatters, 14 jhuggi jhonpri colonies in different parts of Delhi have been developed, about 50,000 families have been rehabilitated.

6. Under the beautification scheme scores new parks have been laid in different areas which not long before were squalid slums. As many as 5 lakh tree saplings have been planted on road sides and other green areas of Delhi.



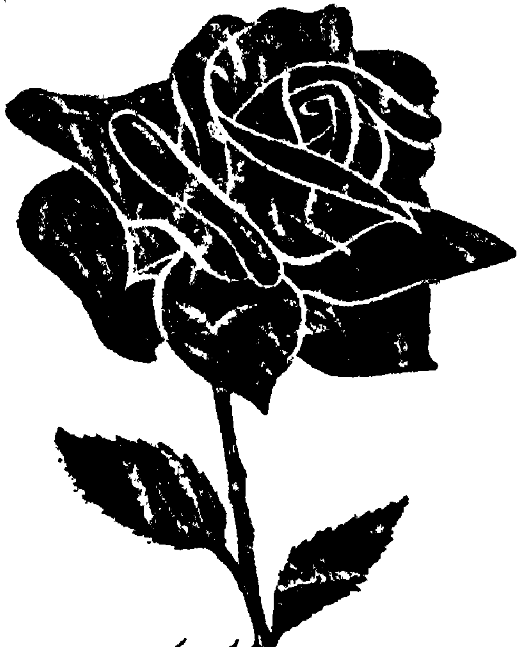
7. A new subzi mandi has been developed in Azadpur. A big cycle market is being constructed at Jhandewalan.

8. Modern Shopping centres are being developed at Kalkaji and Pusa Road. A new Interstate Bus Terminal is under construction near Kashmere Gate. Two major truck terminals have been developed at G.T. Road and Rohtak Road.



Issued by
THE PUBLIC RELATIONS MANAGER

DELHI DEVELOPMENT AUTHORITY,
VIKAS BHAWAN,
NEW DELHI-1.



جو آنکھ پرکھ رکھتی ہے
اچھے گلاب چُن سکتی ہے

یہ قصّہ ہے این۔ ایس۔ سی کا

ہم بے وجہ اپنے گُن نہیں گاتے۔ گلاب بہرحال! گلاب..... اور گلاب ہے۔ اور اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ این۔ ایس۔ سی کے بیج بڑی صفائی اور سائنٹیفک طریقوں سے تیار کئے جاتے ہیں۔ ان بیجوں کی تیاری میں غیر معمولی ریسرچ سے کام لیا جاتا ہے پھر ہمارے بیجوں کو پرکھنے کی جدید ترین لیبارٹری میں ان کی جانچ ہوتی ہے [illegible] کے بیجوں نے، جو بین الاقوامی معیار پر پورے اترتے ہیں، ہندوستان کے سبز انقلاب میں نمایاں حصّہ لیا ہے۔

ہمارے تیار کئے ہوئے بہتر بن بیج کسی بھی ملک کے دیہی اقتصادی حالات کی ضروریات کو پورا کر سکتے ہیں۔

اس پتہ سے رابطہ قائم کیجئے۔

نیشنل سیڈز کارپوریشن لمیٹڈ

ایکسپورٹ ڈویژن

ایف ۴۴ اے۔ ساؤتھ ایکسٹینشن، پارٹ ۱۔ نئی دہلی۔ ۴۹ (انڈیا)



انہوں نے آزادی کی جنگ جیتی

آؤ! ہم بھارت کی تعمیر و ترقی کے

انقلاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں

davp 78/120

اگلا بچہ ہونے سے پہلے

ذرا سوچئے



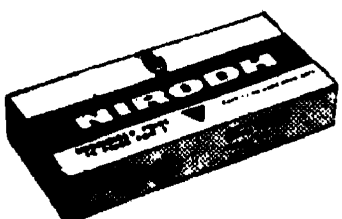
کیا آپ اس بچے
کی صحیح دیکھ بھال
نہیں کرنا چاہیں گے ؟

اس کے روشن مستقبل کیلئے اعلیٰ تعلیم کی شروعات اور باقی سبھی ضرورتوں کو پورا کرنے کا انتظام... لیکن اگر بچہ جلد ہو گیا تو یہ سب کچھ کرنا آپ کے لئے مشکل ہوگا۔ آپ اس پریشانی سے ضرور بچنا چاہیں گے۔

نِرودھ کی مدد سے اب آپ اگلے بچے کی پیدائش کو تب تک ٹال سکتے ہیں، جب تک آپ اسکی پوری دیکھ ریکھ کرنے لائق نہیں ہو جاتے۔

نِرودھ مردوں کیلئے ہے۔ ربڑ سے بنا حمل روکنے کا یہ آسان ذریعہ برسوں سے ساری دنیا میں مقبول ہے۔ آپ بھی نِرودھ استعمال کیجئے۔

نِرودھ ہر جگہ ملتا ہے۔ سرکاری رعایتی دام، 15 پیسے میں 3



جب تک نہ چاہیں تب تک نہ پائیں سنتان

▼ نِرودھ

لاکھوں میں مقبول، بے ضرر اور آسان

کریانہ فروشوں، دوافروشوں، پنساریوں، پان و سگریٹ کی دکانوں وغیرہ کے یہاں بکتا ہے۔

davp 71/460

دلی کو بہتر اور خوبصورت بنانے کے لئے

آیئے

عہد کریں

۱ بجلی کی موجودہ کمی کے پیشِ نظر میں انفرادی طور پر اپنے بس بھر بجلی کے خرچ میں کفایت کروں گا۔ اور اس بات کی کارگر کوشش کروں گا کہ جن انجمنوں سے میں منسلک ہوں وہ بھی بجلی کے استعمال میں کفایت کریں گی۔

۲ میں انفرادی طور سے اور جن تنظیموں سے منسلک ہوں ان کے ذریعے اناج کی بربادی اور پارٹیوں اور سماجی تقریبات میں اشیائے خوراک کو برباد ہونے سے بچانے کی کوشش کروں گا۔

۳ میں خود اور مجھ سے منسلک اداروں اور تنظیموں کے ذریعے بلا وجہ بڑھتی ہوئی قیمتوں اور تجارت میں ذخیرہ اندوزی، مہنگائی اور بدعنوانی کو ختم کرنے کے لئے کارگر قدم اُٹھاؤں گا۔

۴ میں حتی الامکان تشدد، فرقہ واریت اور سماج کے ناپسندیدہ عناصر کے ذریعے پبلک املاک کو تباہی سے نجات دلانے کی کوشش کروں گا۔

۵ مجھ سے منسلک اداروں اور تنظیموں کے ذریعے غریبی ہٹانے، ذات کے فرق کو مٹانے اور سماجی، اقتصادی نابرابری دور کرنے کی اسکیموں کے تئیں جذبہ پیدا کرنے اور انھیں عملی جامہ پہنانے کی پوری پوری کوشش کروں گا۔

۶ میں دلی شہر کو سماجی، اقتصادی اور خوشگوار ماحول کے پیشِ نظر اسے بہتر بنانے کی کوششوں میں اپنا بھرپور تعاون دوں گا۔

صنعت، تجارت، سوشل ورک، تعلیم اور لیبر اور دیگر اہم شعبوں سے متعلقہ سبھی اشخاص اور انجمنوں سے اپیل ہے کہ وہ اپنی مادرِ وطن کی راجدھانی کی عظمت و شوکت، صحت مند سماجی فلاح اور خوشگوار ماحول پیدا کرنے کے لئے مندرجہ بالا حلف اٹھائیں۔

آپ سے یہ بھی درخواست ہے کہ اس "عہد کریں" کو کاٹ لیں اور اس پر دستخط کرنے کے بعد چیف ایگزیکیٹو کونسلر شری رادھا رمن (دلی انتظامیہ) اولڈ سیکریٹریٹ کو روانہ کریں۔ یہ عہد سادہ کاغذ پر بھی لیا جا سکتا ہے۔

صاف اور نمونے کی راجدھانی بنانے میں آپ بھی اپنا تعاون دیں

دلی انتظامیہ دلی



Grainman is with the Nation at all times...





...IN PLENTY ...IN SCARCITY

In times of plenty the grower need no longer be afraid of producing more and more . . .
Food Corporation provides him a ready market for his surplus . . . right through the year and at fair price too.

In times of scarcity the consumer need no longer be afraid of soaring prices and shortages . . . Food Corporation ensures steady supply at a reasonable price.

Planned procurement, storage, movement, distribution and building up a reserve of foodgrains helps in the battle against hoarding and profiteering.

To serve the farmer and the consumer through these operations at all times is our business and privilege.

FOOD CORPORATION OF INDIA

naa/FC-0170

Regd. No. R N. 16241/68. Regd. No. D—1820

Published and Printed by N. N. Pandey for Qaumi Ekta Trust, at Vishnu Offset Printers, Pataudi House, Delhi-6. **Registered Office** : 19-A, Theatre Communication Building, Connaught Circus,

سیکولر ڈیموکریسی

ماہنامہ

سیکولر ڈیموکریسی

دسمبر ۱۹۷۲ء

شمارہ ۱۳

مشاورت بورڈ

• ایڈیٹرز
سبھدرا جوشی
ڈی۔ آر۔ گوئل
خلیق انجم

• جنرل منیجر
راجندر کمار

• بزنس منیجر
جی۔ ایل۔ ملہوترا

• دفتر کا پتہ
۱۹۔ اے۔ تھیٹر کمیونیکیشن بلڈنگ
کناٹ سرکس، نئی دہلی ۱

• ٹیلیفون ۴۳۳۸۳

ہمارے نمائندے

• مسز کمل سانیال
۱۔ ڈوور روڈ کلکتہ

• شری ایم۔ این صدیقی
نوبت ولا پلاٹ نمبر ۵۶۔۵۷
جوہو ولے پارلے ہاؤسنگ سکیم
نارتھ ساؤتھ روڈ نمبر ۱
آف ارلا برج اندھیری (ویسٹ)
بمبئی۔ ۵۸ (اے۔ ایس)

• شری روپ نرائن پانڈے
ڈی۔ ۲۸، شانتی پتھ
تلک نگر جے پور ۴

• شریمتی خدیجہ عالم خوندمیری
۱۵/۱۱۔ ۱۱۔ ۱۶، سلیم نگر
حیدر آباد۔ ۳۶

• ڈاکٹر معین شاکر
ڈیپارٹمنٹ آف پولیٹکل سائنس
مرہٹواڑہ یونیورسٹی اورنگ آباد

• شری بی۔ این پانڈے
۱۳۸۔ آزاد سکوائر
ساؤتھ ملکہ الہ آباد

• سردار سریندر سنگھ سندھو
پی ایس ۳۴/۲۔ لاڈووالی روڈ۔ جالندھر

• سردار اقبال سنگھ
سیکٹر ۱۸۔ اے
کوارٹر نمبر ۲۴۵۹ چنڈی گڑھ

• شری این۔ کے سنگھ
کھادی گرام اُدیوگ سنگھ۔ مرادپور، پٹنہ ۳

اگلے شمارے میں

مسلم پرسنل لا پر ہنگامہ آرائی	دہلی میں اردو کی حالت
مسلم سیاست میں ایک نیا شوشہ	ایک جائزہ
ڈی۔ آر۔ گوئل	خلیق انجم

نشرح

م۔ ن۔ انداز شی

پرسنل لا کی سیاست

گزشتہ کئی مہینوں سے مسلم اخبارات اور بعض قائدین نے "مسلم پرسنل لا خطرے میں" کا نعرہ بڑے زور شور سے لگانا شروع کر دیا ہے۔ سیاسی گورکھ دھندوں سے دور اور اپنی روز مرہ زندگی کے مسائل سے مجبور غریب مسلمان پریشان ہو کر سوچتا ہے کہ ماجرا کیا ہے۔ اگر وہ پوچھتا ہے کہ میاں یہ خطرہ کس جانب سے آ رہا ہے۔ کیا حکومت نے اس قسم کی کوئی تحریک کی ہے؟ تو جواب ملتا ہے کہ تم ان باتوں کو نہیں سمجھتے۔ یہ حکومت سیکولرازم کے نام پر مسلمانوں کی حیثیت ختم کر دینا چاہتی ہے۔

"لیکن" وہ پھر سوال کرتا ہے "آپ لوگ ابھی سال بھر پہلے تک تو کہا کرتے تھے کہ سیکولرازم میں ہی اقلیتوں کی بقا ہے۔ اقلیتوں اور خصوصاً مسلمانوں کا مفاد اسی میں ہے کہ ہندوستان میں سیکولر طاقتیں مضبوط ہوں"۔ عام مسلمان کو پھر خیال آنے لگتا ہے کہ جب جب سیکولر طاقتیں مضبوط ہوئیں اس کی زندگی، عزت اور آبرو زیادہ محفوظ ہوئی۔ آزادی آنے کے بعد جب بھی اس کے لئے خطرہ بڑھا ہے تو وہ وہی سال ہیں جب اس قسم کے لوگوں کو سیاسی میدان میں کمزوری محسوس ہوئی۔ جب جواہر لال نہرو کی گرفت سیاست پر مضبوط تھی تو فرقہ وارانہ فسادات کا نام و نشان نہیں تھا۔ جیسے ہی یہ گرفت کمزور ہوئی فسادات کا سلسلہ شروع ہو گیا اور تب تک چلتا رہا جب تک ان کی بیٹی نے اپنی سیاسی حیثیت کو داؤں پر لگا کر رجعت پرستوں کے خلاف جہاد نہیں کیا اور ان کو شکست فاش نہیں دی۔ اس معاملے میں کہیں دو رائیں نہیں کہ گزشتہ چند سالوں میں اندرا جی کی طاقت اور فرقہ وارانہ فسادات کے گراف مخالف سمتوں میں چلتے صاف نظر آتے ہیں۔ اگر اندرا جی سیاست پر چھائی ہوئی ہیں جیسا کہ ۱۹۷۱ء کے پورے سال کے دوران وہ تھیں تو فسادات کا نام تک نظر نہیں آیا باوجود اس بات کے کہ بنگلہ دیش کی تحریک کے کئی پہلوؤں کو الگ الگ اُچھال کر فرقہ پرست جماعتوں نے فرقہ وارانہ امن کو آگ لگانے کی بار بار کوشش کی۔

جن سنگھ، آر ایس ایس اور ان کے اخبارات نے کبھی کہا کہ مشرقی بنگال سے ہندوؤں کو نکالنے کی سازش ہو رہی ہے۔ کبھی کہا کہ سندھ میں باقی ہندوؤں کا قافیہ تنگ کیا جا رہا ہے۔ ہندو لڑکیوں کو عرب ممالک میں برآمد کرنے کی افواہوں کو پھیلا کر اشتعال انگیزی کی حدوں کو بھی پار کر گئے۔ بیچ بیچ میں یہ بھی کہا گیا کہ بنگلہ دیش کے قائدین اور اراکین حکومت میں صرف مسلمان شامل ہیں۔

مسلمانوں میں اسی ذہنیت کے علمبرداروں نے کہنا شروع کیا کہ حکومت ہند پاکستان کے ٹکڑے کرنے کی کوشش کر رہی ہے کہ بنگلہ دیش میں غیر بنگالی مسلمانوں پر بے پناہ مظالم ڈھائے جا رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

ہندوستان دشمن غیر ملکی اخبارات اور دیگر ایجنسیوں نے ان خبروں کو خوب اچھالا اور ان کی تشہیر کی۔ بہت سے تو ایسے بھی تھے کہ اپنی اشتعال انگیزی پر عقیدہ رکھتے ہوئے پیشین گوئیاں کرنے لگے کہ ہندوستان کے لوگ بنگلہ دیش سے آنے والے شرنارتھیوں کا بوجھ برداشت کرنے کی بجائے یہاں سے مسلمانوں کو نکالنا شروع کر دیں گے اور جلد ہی اس ملک میں خانہ جنگی کی صورت پیدا ہو جائے گی۔ غالباً تقسیم ہندوستان کو شہ دینے والی اور تقسیم کے ساتھ ہی تبادلۂ آبادی کی حمایت کرنے والی رجعت پرست سامراج وادی طاقتیں اس امید میں تھیں کہ جو ۱۹۴۷ء میں نہیں ہو سکا وہ ۱۹۷۱ء میں مکمل ہو جائے گا یعنی ہندوستان اور پاکستان میں مذہب کی بنیاد پر آبادی کا بٹوارہ مکمل ہو جائے گا۔

ان سب باتوں پر جب نگاہ جاتی ہے تو مسلمان خدا کا شکر ادا کرتا ہے کہ یہ ناپاک ارادے بروئے کار نہیں آ سکے۔ ۱۹۴۷ء میں کیا تباہی ہوئی تھی جو اب نہ ہوتی۔ اس تباہی کو روکنے میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طاقت اور اشرف المخلوقات کی خداداد عقل کا مظاہرہ کس نے کیا؟ یہ بات ذہن میں آتے ہی فسادات کی تباہی سے بچنے کی خواہش اندرا گاندھی کے لئے جذبۂ تشکر سے بھر جاتا ہے۔

جیسے ہی کسی مسلمان کو ان تمام حالات پر غور کرنے کی فرصت ہوتی ہے اس کے دماغ میں سوال اُبھر کے آتا ہے کہ یہ جو لوگ آجکل پرسنل لا پر منڈلانے والے کسی خطرے کا ہوا دکھا رہے ہیں۔ ان میں کتنی سچائی اور خلوص ہے۔ یہ بھی خیال آتا ہے کہ ان کے ذہن میں کوئی چھپی ہوئی ذاتی غرض تو نہیں۔ کیونکہ اگر وہ ان کی بات سنے اور اس کے مطابق عمل کرے تو اس کے پاؤں اس راستے پر چلنے لگتے ہیں جو اسے اندرا گاندھی سے دور لے جاتا ہے۔ اسی وقت اس کے ذہن میں یہ بات بھی آتی ہے کہ اندرا گاندھی کے خلاف شور و غوغا جس قدر تیز ہوتا ہے ملک میں تشدد کے واقعات بڑھتے جاتے ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات کا ناگ بھی پھن اُٹھا کر پھنکارتا نظر آتا ہے۔

نظر غائر سے اگر دیکھا جائے تو یہ پرسنل لا کا مسئلہ ایک سلسلے کی کڑی ہے جس کے ذریعے اقلیتی فرقوں کے لوگوں کو ان طاقتوں سے الگ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے جنھوں نے گزشتہ تین برسوں میں یعنی ۱۹۶۹ء میں کانگریس کی تقسیم کے بعد فرقہ پرستی اور رجعت پرستی کے خلاف جہاد شروع کر رکھا ہے۔ جو وعدے انھوں نے کئے تھے ان کو پورا کرنے کے لئے کچھ وقت تو لگتا ہی ہے اور لگے گا۔ دنگے فساد بہت حد تک بند ہو گئے لیکن ان کے پیچھے جو طاقتیں کام کرتی ہیں ان کا قلع قمع آنکھ جھپکتے ہی ہو جائے گا یہ سوچنا غلط ہے۔ اسی طرح غریبی ہٹانے کے

سیکولر ڈیموکریسی

لئے بھی پروگرام بنتا ہے اور وہ قدم بقدم عمل میں لایا جاتا ہے۔

جو لوگ جمہوری سیاست میں پٹ چکے ہیں ان کے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ وعدوں کو پورا کرنے کے لئے صحیح اقدامات کا موقع ہی حکومت کو نہ دیں لہٰذا وہ عوام کو بہکانے کے لئے طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلاتے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر لوگوں کو تشدد پر اکساتے ہیں۔

پرسنل لاء کا معاملہ بھی ایسے ہی اٹھایا گیا ہے حکومت کی طرف سے بارہا یقین دہانی کرائی جا چکی ہے کہ اس میں کسی بھی تبدیلی کا تب تک سوال پیدا نہیں ہوتا جب تک خود مسلمان اس تبدیلی پر متفق نہ ہوں آج اگر ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت اس بات کے خلاف ہے کہ تبدیلی نہ ہو تو اس بارے میں ہراساں ہونے کی کوئی بات نہیں۔ تبدیلی نہیں ہوگی لیکن وقت کے ساتھ خیالات میں تبدیلی کے امکان کو قطعاً نظر انداز نہیں کیا جا سکتا خصوصاً اس وقت جب تک ان ملکوں میں بھی تبدیلیاں ہو رہی ہیں جہاں اہل اسلام اکثریت کی حیثیت رکھتے ہیں اور جہاں کی حکومتیں اسلامی اصولوں کو مانتی ہیں۔

رہا سوال ان لوگوں کا جو آج مانگ کر رہے ہیں کہ مسلم پرسنل لا میں تبدیلی ہو۔ جہاں تک ان کی آواز اٹھانے کا تعلق ہے ان کو حق ہے ویسے ہی جیسے جمہوریت میں کسی بھی فرد کو ہوتا ہے۔ ان کی آواز اثر انداز تبھی ہوگی جب متعلقہ لوگوں کی اکثریت ان کا ساتھ دے گی۔ لہٰذا جو لوگ کسی قسم کی تبدیلی چاہتے ہیں ان کو حکومت کے دروازے کھٹکھٹانے کی بجائے عوام کی طرف رجوع کرنا چاہیئے اور ان کے جذبات احساسات اور خیالات کے ساتھ مطابقت پیدا کر کے ہی آگے بڑھنا چاہیئے۔

جو لوگ ایسی آوازوں سے بدک جاتے ہیں اور ایسے لوگوں کو حکومت کی آواز سمجھتے ہیں۔ ان کے بارے میں ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ انھیں اپنی دلیل پر یقین نہیں۔ اگر وہ برحق ہیں تو کوئی ان کو شکست نہیں دے سکتا اور اگر وہ اپنے میں کمی پاتے ہیں تو اپنے خیالات کو درست کرنے کے لئے انھیں تیار ہونا چاہیئے۔ قائل کرنے اور قائل ہونے کے لئے تیار رہنے کو ہی جمہوری مزاج کہا جاتا ہے۔ جمہوریت میں اس سے فرار کی نہ گنجائش ہے نہ اس کی کوشش کرنی چاہیئے۔ وہ لوگ جو موجودہ مسلم پرسنل لا کو انسانیت کے لئے بہترین پرسنل لا سمجھتے ہیں انھیں اپنی بات دوسروں کو سمجھانی چاہیئے۔ اختلاف رکھنے والوں کی دلیل کا جواب نہ دے کر حکومت کو معتوب قرار دینا مناسب نہیں۔ اس میں خلوص کی کمی جھلکتی ہے۔

مسلم عوام کو بھی سمجھنا چاہیئے کہ اس مسئلہ کو لے کر جو لوگ حکومت پر گالی گلوچ کرتے ہیں اور وزیر اعظم اندرا گاندھی کو مسلمانوں کا دشمن قرار دیتے ہیں ان کو مسلم پرسنل لا کی حمایت سے اتنی دلچسپی نہیں جتنا اندرا گاندھی کے مخالف فضا تیار کرنے میں۔

مبارک اقدام

قابل صد تحسین ہیں گجرات کے وزیر اعلیٰ اور مرکزی وزیر برسل و رسائل شری ہیم وتی نندن بہوگنا جنھوں نے حال ہی میں ایسے معرکۃ الآرا فیصلے کئے ہیں جو ہندوستان میں سیکولرازم کی تعمیر میں تاریخی اہمیت کے حامل ہوں گے۔ وزیر اعلیٰ شری گھنشیام بھائی اوجھا کی قیادت میں گجرات کی کابینہ نے فیصلہ کیا ہے کہ سرکاری تقریبات پر کسی قسم کی مذہبی رسومات ادا نہیں کی جائیں گی۔ اسی طرح شری بہوگنا نے اپنے ماتحت محکموں میں حکم جاری کر دیا ہے کہ کوئی سرکاری تقریب مذہبی رسم سے شروع نہ کی جائے۔

بمبئی میں ایک ٹیلی فون ایکس چینج کی رسم افتتاح پر شری بہوگنا پہنچے تو دیکھا کہ پوجا پاٹھ ہو رہا ہے۔ اس کے بعد ان کو تلک لگایا جانے لگا تو انھوں نے انکار کر دیا۔ اپنی افتتاحی تقریر میں شری بہوگنا نے تفصیل سے بتایا کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا۔ پوجا پاٹھ شروع ہو چکا تھا اس لئے انھوں نے اس کو بند نہیں کیا۔ کیونکہ اس سے ممکن ہو سکتا تھا کہ کچھ لوگوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچتی۔ لیکن بحیثیت نمائندہ حکومت شری بہوگنا نے تلک نہیں لگوایا کیونکہ اس سے حکومت کا تعلق کسی خاص ایک مذہب سے ظاہر ہو سکتا تھا اور یہ بات سیکولر حکومت کے اصول کے خلاف ہے۔

شری بہوگنا نے اپنی تقریر میں نہایت درست فرمایا کہ ان کا اقدام مذہب کے خلاف ہرگز نہیں۔ ان کو مذہب سے اتنی ہی محبت ہے جتنی کسی اور کو۔ وہ جس مذہب کو مانتے ہیں اس کے اصولوں اور رسموں کی پابندی بھی کرتے ہیں۔ لیکن وہ اپنے ذاتی مذہب کو حکومت کے کاموں میں مداخلت کی اجازت نہیں دے سکتے۔ اس ملک میں بہت سے مذہبوں کو ماننے والے لوگ ہیں۔ حکومت میں ان سب کا برابر کا حصہ ہے۔ ان کی تعداد کچھ بھی ہو۔ حکومت کے کاموں میں کسی ایک مذہب کی رسمیں ملنے سے دیگر مذاہب کے لوگوں کا حصہ اس میں کم دکھائی دیتا ہے مذہب کا کوئی بھی سچا شیدائی اس قسم کی تفریق و تمیز کو واجب اور مناسب نہیں سمجھے گا۔

شری بہوگنا نے بمبئی میں جو کیا وہ آج کے حالات میں ایک جرأت کا کام کہا جاتا ہے کیونکہ عام طور پر حکومت کے ارکان رواج کے دھارے میں بہنا قابل اعتراض نہیں سمجھتے حالانکہ ان کا یہ فعل بھارت کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہے۔ لہٰذا شری بہوگنا کو اگر مبارکباد کا مستحق سمجھا جاتا ہے تو بڑی بات نہیں۔ ہمیں معلوم ہوا کہ ان کو یہ بھی سجھاؤ دیا گیا کہ سبھی مذہبوں کی رسمیں کیوں نہ ساتھ ساتھ منائی جائیں لیکن انھوں نے اس کا نہایت معقول اور مدلل جواب دیتے ہوئے ہندوستانی سیکولرازم کی تشریح و وضاحت بھی کی۔ انھوں نے جواب دیا کہ اول تو اس میں وقت بہت لگے گا جب کہ کسی بھی مذہب کو کسی رسم یا رسومات سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے اس بات کا فیصلہ کون کرے گا کہ جو رسومات ادائیگی کے لئے چن لی گئیں وہ اس ملک میں مانے جانے والے سبھی مذاہب کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ہندوستانی سیکولرازم مذہب کے خلاف نہیں لیکن سیاست اور حکومت کے کاموں میں مذہب کا دخل قبول نہیں کرتا کیونکہ ایسا کرنے سے دونوں کا نقصان ہو سکتا ہے۔

کیا ہم امید کریں کہ گجرات کے علاوہ دوسری ریاستی حکومتیں اور مرکز کے دیگر وزراء بھی اس قابل تقلید اقدام پر غور کریں گے۔

[redacted]

پاکستانی سیاست — اُصولی یا جذباتی؟

ہمارا سیاسی مبصر

موجودہ دور میں جب کہ عالمی سیاست، سیاسی فلسفوں اور الگ الگ اندازِ فکر کے دائروں میں ہے، ہمارے پڑوسی ملک پاکستان کی سیاسی شطرنج ذاتیات اور جذبات کے زیرِ اثر ہے۔ پاکستان کی موجودہ مشکلات اور گذشتہ سال کے بھیانک واقعات کا سبب یہی ہے۔

بلکہ یوں کہیے کہ برصغیر کی بدقسمتی ہے کہ اس مرض کی تشخیص و علاج کی بجائے اسے صحت مندی کا نام دیا جا رہا ہے۔ آج کے دور میں یہ کہنا کہ کسی ملک کی اندرونی سیاست کا اثر پڑوسی ملکوں پر نہیں پڑتا، نہ صرف غلط ہوگا بلکہ غیر دانش مندانہ بھی۔ سیاسی وبا کے جراثیم دیگر وباؤں کے جراثیم سے کہیں زیادہ خطرناک اور مہلک ہوتے ہیں۔ ان سے بچاؤ اور ان کی روک تھام کا انتظام ضروری ہے۔ گذشتہ سال کے واقعات نے جہاں پاکستان کو مختصر کر دیا، وہاں ہند پر بھی اقتصادی بوجھ ڈالا۔ معاملہ پاکستان کی داخلی سیاست کا تھا لیکن ہند اس سے محفوظ نہ رہ سکا۔ ان واقعات کے پیشِ نظر ہند کے جمہوری عوام کے مفاد کا تقاضا ہے کہ پاکستانی سیاست پر نظر سے اس کا جائزہ لیا جائے تاکہ جمہوریہ ہند رجعت پرستی اور شخصیت پرستی کے جراثیم سے محفوظ رہ سکے۔

آج سے چوتھائی صدی پہلے پاکستان اس برصغیر کے غیر منقسم سیاسی نظام کا حصہ تھا، اس لئے برادرانہ رشتے جن کی جڑیں اس دھرتی کی کوکھ میں دور تک چلی گئی ہیں، نظرانداز نہیں کئے جا سکتے، بلکہ ان کا احترام قدرتی بھی ہے۔ یہی احترام ہند کے عوام کے دلوں میں وہ جذبۂ خلوص بن کے دھڑکتا ہے جس کے تحت وہ آرزومند ہیں کہ پاکستان میں بھی صحت مند جمہوری نظام قائم ہو تاکہ وہاں استحصال کا دور کم ہو سکے اور کروڑوں عوام کی تقدیر کے فیصلے کسی اصول کی بنا پر ہوں، نہ کہ ذاتی پسند ناپسند یا خوش فہمیوں اور بدگمانیوں کی بنا پر۔ ظاہر ہے کہ یہ بےلوث اور پاک جذبۂ خلوص ہے لیکن اسے بھی پاکستان کے چند عناصر تعصب کی عینک سے دیکھیں گے اور "اسلام خطرہ میں ہے" کا نعرہ بلند کریں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس شرانگیزی پر غصہ کی بجائے ترس آتا ہے۔ مریض کی بات پر غصہ کرنے سے کیا حاصل؟ وہاں بیشتر فیصلے اسی طرح ہوتے ہیں۔ اسے وقت کی ستم ظریفی کہیے کہ ۲۵ برس پہلے جو ملک اسلام کے تحفظ و فروغ کے جواز پر وجود میں آیا تھا وہاں آج بھی اسلام محفوظ نہیں ہے۔ رہ رہ کے ان خیالی خطروں کا اعلان ہوتا رہتا ہے کہ جو اسلام کو اسلامی جمہوریہ میں درپیش ہیں۔ یہاں یہ بحث مقصود نہیں کہ مذہب کو قومیت کی بنیاد قرار دینا غلط تھا یا صحیح ـــــ گذشتہ سال کے واقعات نے اور بنگلہ دیش کے وجود نے اس سوال کا بھرپور جواب دے دیا ہے۔ فی الحال دیکھنا یہ ہے کہ مذہب جو انسان کا ذاتی عقیدہ ہونا چاہیئے جب سماج اور سیاسی نظام کی دہلیز پار کر لیتا ہے تو کیا ہوتا ہے؟ اس کا واضح عکس پاکستان کے رگ و ریشہ میں ہے۔ جب اس پر نظر جاتی ہے تو ہندوستانی دلوں میں اطمینان اور فخر کے جذبات ابھرتے ہیں کہ سیکولر طرزِ حیات اپنا کر ہندوستانی قوم غیر صحت مند طرزِ فکر اور طرزِ عمل سے محفوظ ہو گئی۔ شکر کا مقام ہے کہ مذہب خطرہ میں ہے کی آوازوں پر یہاں بہت کم لوگ توجہ دیتے ہیں۔ یہ تو جملہ معترضہ تھا، بات پاکستانی سیاست کی چل رہی تھی۔

پاکستان کی ۲۵ سالہ تاریخ میں ان گنت واقعات ہیں جن کو مذہبی تعصب، نقلی نعروں اور ذاتی پسند، ناپسند نے جنم دیا ہے۔ شاید ہی کوئی اور ایسا ملک ہو جہاں شہید، غازی اور غدار اور کافر کے القاب اس قدر تیزی اور فراخ دلی سے چسپاں کئے جائیں اور اتارے جائیں۔ ایسا نہ صرف ذاتی مفاد کی خاطر کیا جاتا ہے، بلکہ اسلام کا نام اور اس کے اصولوں کی تشریح بھی جب جی چاہا بدل لی جاتی ہے۔ ابھی پانچ چھ برس پہلے ایوب غازی تھے اور اس کے بعد یہ عزت یحییٰ خاں کے نام سے وابستہ رہی۔ اب صدر بھٹو پر تمام عظمتیں نچھاور کی جا رہی ہیں پچھلے برس کے آغاز میں ہند کا ہوائی جہاز اغوا کرنے اور لاہور ہوائی اڈے پر اسے تباہ کرانے والے ہوائی قزاقوں کو غازی قرار دے کر پاکستان میں جگہ جگہ ان کے جلوس نکالے گئے۔ اب اگر ان پر مقدمہ چل رہا ہے تو یہ عین امید کے مطابق ہے جنرل ٹکا خاں جو بلوچستان کے تباہ کار اور بنگلہ دیش کے قاتل کے طور پر مشہور رہوئے آج پاکستان کے آرمی چیف ہیں۔ خدا جانے یہ شرف انھیں کب تک حاصل رہے

سنا ہے ان پر ماؤ اور چاؤ این لائی کی رحمتوں کے سائے ہیں۔ جانے کب چین والے ڈکا خاں اور صدر بھٹو میں سے صرف ایک کو چننے کا ارادہ کرلیں۔

اگر اسلامی اصولوں کی بنا پر پاکستان کے تمام سیاسی مسائل کا حل تلاش کیا جائے تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ اسلامی جمہوریہ میں ایسا ہونا کوئی غیر قدرتی بات نہیں۔ لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ اسلام کا محض نام استعمال ہوتا ہے۔ ۲۵ برس بعد بھی پاکستان کے ساتھ اسلام کا رشتہ محض نعروں تک ہی محدود ہے۔ ورنہ عالم یہ ہے کہ تقریباً سبھی کو اپنی اپنی غرض سے مطلب ہے۔ ابھی حال ہی میں پاکستان کی اسلام پسند پارٹیوں نے فیصلہ کیا کہ وہ متحد ہو جائیں لیکن مسئلہ یہاں آ اٹکا کہ اس کا سربراہ کون ہو۔ سبھی کو اپنا اپنا لالچ تھا۔ لہٰذا یہ فیصلہ ہوا کہ سربراہ کا انتخاب لاٹری سے کیا جائے۔ اسلام کے بارے میں جو معمولی سا علم رکھتے ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اسلام کی رو سے جوا حرام ہے۔ لیکن اسلامی جمہوریہ کی اسلام پسند پارٹیاں اپنا سربراہ چننے کے لئے جوئے کا سہارا لیتی ہیں۔ اس سے زیادہ اسلام کی تضحیک کیا ہو سکتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ تحریکِ پاکستان کی تہہ میں بھی اسلام کی محبت کارفرما نہ تھی، بلکہ اقتدار کی ہوس تھی جس کے لئے اسلام کا نام استعمال کیا گیا۔ ذاتی مفادات تھے جنہیں مذہب کی مخمل میں لپیٹ لیا گیا۔ اگر پاکستان واقعی اسلام کے اصولوں کو عوام کی زندگی میں ڈھالنے کے لئے بنا ہوتا تو آج وہاں عام مسلمانوں کی حالت دگرگوں نہ ہوتی، گزشتہ سال بنگلہ دیش کے مسلمانوں کا قتلِ عام نہ ہوتا، مسلمان ماؤں، بہنوں بیٹیوں کی عصمتیں مسلمانوں ہی کے ہاتھوں نہ لٹتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کی عام زندگی میں اسلام کے سائن بورڈ تو ہیں لیکن کارکردگی کی نوعیت کیا ہے اس کا ذکر نہ ہی کیا جائے تو اچھا ہے۔

حال ہی میں پاکستان کے دو صحافی ہندوستان آئے تھے یہاں سے وہ بنگلہ دیش بھی گئے۔ شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ ملاقات کی غرض سے ان کے بارے میں پاکستانی کالم نویس عبدالقادر حسن اپنے مضمون "اندرا گاندھی کے حضور میں دو پاکستانی صحافی" میں لکھتے ہیں:۔

"پاکستان کے دو صحافی بھارت گئے ہیں نجی اللہ اور مظہر علی خاں۔ نجی اللہ صدر صاحب کے ذاتی عملہ میں ہیں اور غالباً افسر تعلقاتِ عامہ قسم کی چیز ہیں۔ وہ کسی اخبار میں ملازم نہیں ہیں اور اس طرح انھیں اخبار نویس نہیں کہا جا سکتا۔ اس سے قبل وہ ڈھاکہ کے اخبار آبزرور کے راولپنڈی میں نمائندے تھے۔ صدر پاکستان سے گزارش ہے کہ خدا کے لئے باعزت اور باحمیت لوگوں کو بھارت بھیجیں۔ ان لوگوں کو بھیجیں جو پاکستانی شرم و حیا بھی تھوڑی بہت رکھتے ہوں۔"

یہ لب و لہجہ محض صحافیوں کے باہمی تعلقات تک ہی محدود نہیں، سیاسی معاملات میں اس کا رنگ کچھ اور بھی گہرا ہے۔

۱۲ر اکتوبر کے نوائے وقت کا اداریہ ایسے ہی لہجہ سے ہم آہنگ ہے — "ان دونوں صحافیوں میں سے ایک تحریکِ پاکستان کا اس وقت سے مخالف ہے جب کہ وہ ابھی طالب علم تھا اور جس کی سیاسی نظریاتی اور جغرافیائی وفاداری آج بھی ملک سے باہر ہے۔ دوسرا ایک بنگالی ہے جو اسلام آباد میں بیٹھ کر علاقائیت کا زہر پھیلاتا رہا۔ جس کی زبان اور قلم ہمیشہ مغربی پاکستان کے خلاف استعمال ہوئی کس قدر بدقسمتی ہے کہ اب ان دونوں کو شرف نمائندگی حاصل ہو گیا۔" سید نجی اللہ کو مدیر نوائے وقت نے محض اس لئے بنگالی ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ بنگالیوں کے خلاف پاکستان میں ناراضگی کا جذبہ ہے۔ سید نجی اللہ درحقیقت بنگلور کے رہنے والے ہیں۔ خطا ان کی یہ ہے کہ وہ ڈھاکہ کے آبزرور کے نمائندے رہے ہیں۔

اصولی اختلافات میں دلیل و منطق کا دخل ہوتا ہے لیکن پاکستان میں ہونے والی سیاسی بحثوں اور قضیوں میں دلیل و منطق شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔ پاکستان میں شخصی سیاست کے دور دورہ سے نوائے وقت کے مدیر بھی نالاں ہیں، ان کے ۱۳ر اکتوبر کے شمارے کے اداریہ کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:۔

"ہمارے وابستگانِ اقتدار و سیاست اگر شخصی سیاست کے جال سے نکلیں اور ذاتی انا و مفاد کی بجائے ملک و ملت کی وسیع تر مفادات کو ملحوظ رکھنے کا اہتمام کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ باہمی اتحاد و یقین کی فضا میں ہم وفاقی پارلیمانی نظام کی برکات سے مستفیض نہ ہو سکیں۔"

ایک اور اقتباس دیکھئے:۔

"اختلاف جمہوریت کی روح ہے اور حکومت سے اختلاف کو وطن سے دشمنی پر محمول نہیں کرنا چاہیئے۔ ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ وابستگان اقتدار و اختیار کے ملک میں جمہوریت لانے کے دعووں کے باوجود اس بنیادی اصول کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی کہ تعاون کا مطلب اپوزیشن کی مکمل سپردگی یا سپراندازی نہیں ہونا چاہیئے۔"

مدیر نوائے وقت کی دلیل کے جواب میں پاکستان کے وزیر نشریات و اطلاعات مولانا کوثر نیازی اسلام کو ڈھال بنا لیتے ہیں۔ کراچی میں علماء سے خطاب کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں "اپوزیشن اور حکمراں پارٹی کے تصورات جمہوریت کے مغربی تصور سے مستعار لئے گئے ہیں۔ اسلام اس طرح کی صف بندی اور اختلافات کی اجازت نہیں دیتا۔" مطلب یہ کہ ہر احتجاج کرنے والی آواز کو اسلام کی رو سے کچل دیا جانا چاہیئے تاکہ ذاتی اقتدار و اختیار سلامت رہے۔

پاکستانی سیاست اصولی نہیں ذاتی ہے۔ یہ ثابت کرنے کے لئے ایک ہی حالیہ مثال کافی ہے۔ چند ہفتے پہلے میاں محمود علی قصوری پاکستان کے وزیر قانون تھے۔ اس کے علاوہ انھیں پاکستان کی قومی اسمبلی میں لیڈر آف دی ہاؤس اور پیپلز پارٹی کے وائس چیئرمین ہونے کا شرف حاصل رہا ہے۔ ان کے استعفےٰ کی خبر اُڑی تو گورنر پنجاب غلام مصطفےٰ کھر نے ان کے خلاف دھمکی آمیز بیان دیا۔ جس کا ردِ عمل یہ ہوا کہ میاں صاحب نے اسلام آباد لوٹنے سے انکار کر دیا۔ کسی بھی جمہوری نظام میں اصولی اختلاف پر استعفےٰ دینا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ صدر بھٹو نے استعفےٰ منظور کر لیا۔ لیکن سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کے چند دن بعد ہی میاں محمود علی قصوری، ان کے دو صاحبزادوں خورشید محمود قصوری اور عمر محمود قصوری کو قتل کے مقدمہ

میں پھانس دیا گیا۔ یہ قتل قصور میں نو ماہ پہلے ہوا تھا۔ پاکستان میں قصوری صاحب کی شرافت اور متانت کے لوگ قائل ہیں۔ ان کے دونوں صاحبزادے انھیں کی طرح معزز وکیل ہیں۔ یہ تو غنیمت ہوا کہ پنجاب ہائی کورٹ کے نئے چیف جسٹس سردار محمد اقبال نے گرفتاری سے پہلے ہی ان کی ضمانتیں منظور کر دیں۔

میاں صاحب سینیئر مرکزی وزیر ہونے کے علاوہ آئینی کمیٹی کے چیئرمین بھی تھے۔ حکومت کی اس گھناؤنی حرکت پر ان کے غم و غصہ کا اندازہ ان کے اس بیان سے کیا جا سکتا ہے "یہ عجیب اتفاق ہے کہ جب بھی کوئی پاکستان پیپلز پارٹی کی ہائی کمان کی نظروں سے گرا فوراً یہ کھوج نکالا گیا کہ وہ مجرم پیشہ ہے۔ میں یہ کہنا چاہوں گا کہ ایسی چالیں نہ ماضی میں کامیاب ہوئی ہیں اور نہ ہی اب ہو سکیں گی۔ ایسی چالیں انھیں کو لے ڈوبیں گی جو ان کی پشت پر ہیں۔ وابستگانِ اقتدار و اختیار نے انتہا تو اس وقت کی جب میرے اور میرے بیٹوں کو ایک ایسے قتل کے مقدمہ میں ملوث کرنے کی کوشش کی جو کئی ماہ قبل ہوا تھا۔ ہمارا قصور صرف یہ تھا کہ مقتول کی لاش ہماری اراضی سے ملی تھی۔ مقتول کے ایک عورت سے ناجائز تعلقات تھے۔ مقتول کے باپ نے جن لوگوں پر شبہ کیا تھا پولیس نے تفتیش کے بعد انھیں بے گناہ قرار دیا اور چھوڑ دیا تھا۔ اب اسی مقدمے کو ازسرِ نو چلانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ نو ماہ میں وزیر قانون رہا، اس وقت کچھ نہیں کہا گیا۔ استعفےٰ بار بار نامنظور کیا گیا اور وجہ یہ بتائی گئی کہ قومی خدمت کے لئے میرا اس عہدے پر رہنا لازمی ہے۔ لیکن وزارت چھوڑنے کے بعد قتل کے ایک جھوٹے مقدمے میں ملوث کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ حکومت کا یہ رویہ افسوسناک اور جمہوری اصولوں کے خلاف ہے۔"

یہ پاکستانی سیاست کی ستم ظریفی ہی تو ہے کہ ایک شخص جو تا حال مرکزی حکومت میں ممتاز وزیر تھا اس کا استعفےٰ منظور کرتے ہی یہ دریافت کر لیا گیا کہ اس کے قصبے میں ہوئے نو ماہ پیشتر ایک قتل کی واردات میں اس کا ہاتھ ہے۔ اگر واقعی میاں صاحب اس قتل میں کسی طرح سے بھی ملوث ہیں تو مقدمہ نو ماہ کے بعد چلانے کی نوبت کیوں آئی؟

پاکستان کی شخصی سیاست کی جان ہیں خریدے ہوئے صحافی اور مدیر۔ حال ہی کے چند انکشافات جو عدالتی کارروائی کے دوران ہوئے پاکستان کے جمہوریت پسند حلقوں کو جگانے کے لئے کافی ہیں۔ پاکستان فیڈریشن آف جرنلسٹس کی فیڈرل ایگزیکٹیو کونسل نے حکومت پاکستان سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ ایسے صحافیوں کے ناموں کا اعلان کرے کہ جو مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے خفیہ فنڈ سے تنخواہیں یا معاوضے حاصل کرتے رہے ہیں یا ابھی تک حاصل کر رہے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ حکومت پاکستان اس مطالبے کو قابل توجہ سمجھتی بھی ہے کہ نہیں۔

پاکستان ٹائمز کے ۲۲ اکتوبر کے شمارے میں کالم نویس ایچ۔ کے۔ برکی کے خصوصی مضمون میں بھی پاکستان کی شخصی سیاست کے چرچے ہیں۔ یہ اقتباس دیکھئے:۔

"مصیبت یہ ہے کہ گزشتہ بیس برس کی افراتفری کے دوران معززین نے عموماً اور بڑے مفاد پرستوں نے خصوصاً خود کو حیوانی بھوک اور عادات میں مبتلا کر لیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کا حقائق سے عبرت حاصل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ ایسے عناصر کے مفادات کی حفاظت کے لئے صحافی طوائفوں کی طرح ان کے ترجمان بنے پھرتے ہیں۔ اور ایسے فاشسٹ طرز کے مشورے دینے میں پیش پیش ہیں کہ جو بھی ان کے کھوکھلے نعروں کی حقیقت بے نقاب کرے، اسے خاموش کر دیا جائے۔ ماضی میں ہمیشہ ایسا ہوا کہ جس کسی نے بھی اصولوں کو اپنایا، اسے طویل عرصے تک دستورِ زبان بندی کا شکار رہنا پڑا۔"

صدر بھٹو نے برسرِ اقتدار آتے ہی "زندگی"، "اردو ڈائجسٹ" اور "پنجاب پنچ" کے مدیروں اور ناشروں کو مارشل لاء کے ضابطوں کی رو سے جرمانے اور سزا کے ذریعے خاموش کر دیا۔ فوجی عدالت نے ڈاکٹر اعجاز حسین قریشی اور الطاف حسین قریشی کو ایک ایک لاکھ روپے جرمانے کی سزا دی۔ مجیب الرحمٰن شامی، حسین نقی اور مظفر قادر پر لاکھ لاکھ روپیہ جرمانہ کیا گیا۔ اب سننے میں آیا ہے کہ پاکستان کے ایڈووکیٹ جنرل ایم۔ بی۔ زمان نے سپریم کورٹ کو یقین دلایا ہے کہ حکومت کا ان جرمانوں کی وصولی کا کوئی ارادہ نہیں۔

ہند کے سیکولر جمہوری ماحول میں رہنے والے کسی بھی شخص کو پاکستان سیاست کے اتار چڑھاؤ بڑے عجیب لگیں گے، کیونکہ وہاں بیشتر سیاسی موڑ سیاسی اصولوں کی بجائے جذبات کے اتار چڑھاؤ سے جنم لیتے ہیں۔ مصلحت کا جب بھی تقاضا ہوا کسی کو پاکستان کا غدار اور اسلام کا دشمن قرار دیدیا گیا۔ یوں تو پاکستان کی سیاست میں کئی سازشوں کی گونج ہے لیکن راولپنڈی سازش کیس، لیاقت علی خاں کا قتل، مارشل لاء نظام کی سازشیں، اگرتلہ سازش کیس، اور لندن پلان کا ذکر اب بھی پاکستانی اخباروں میں آ نکلتا ہے۔ لندن پلان تو صدر بھٹو کی کابینہ کے رکن مولانا کوثر نیازی کے زرخیز ذہن کی تازہ اختراع ہے جس کی گونج ابھی تک دھیمی نہیں ہوئی۔ کراچی کے ہفت روزہ اخبارِ جہاں کے ممتاز کالم نویس حبیب الرحمٰن (راولپنڈی) پاکستانی سیاست کے ان غیر صحت مند رجحانات سے نالاں ہیں "ہو یہ رہا ہے کہ پہلے تو نام نہاد لندن پلان کے نام پر ایک دوسرے کے خلاف خوب کیچڑ اچھالا گیا۔ لندن پلان کے جواب میں لاڑکانہ پلان کا ذکر چھیڑا گیا۔ اس کے بعد میاں محمود علی قصوری کے استعفے کو الزام اور جوابی الزام کی دھمکیوں اور جوابی دھمکیوں کے لئے استعمال کیا گیا۔" (اخبارِ جہاں۔ ۲۵ اکتوبر)

لندن پلان کا نشانہ تھے خان عبدالولی خاں اور بلوچستان کے وزیر اعلیٰ سردار عطاء اللہ خاں مینگل۔ اب ولی خاں بھی لندن میں اپنی آنکھوں کے علاج کے بعد پاکستان لوٹ آئے ہیں۔ ان کی آمد سے پہلے ان کے ساتھی لندن پلان کی پول کھولتے رہے۔ ۵ نومبر کو لارما کے قبرستان میں ایک جلسے میں اپنی تقریر کے دوران انھوں نے لندن پلان کے بارے میں کہا "اس حقیقت کے باوجود کہ اس قسم کے مذموم پروپیگنڈے سے ملک دو حصوں میں تقسیم ہو چکا ہے، ایک لاکھ کے قریب پاکستانی فوج بھارت کی قید میں ہیں اور ملک کی معیشت تباہ ہو چکی ہے۔ یہ مذموم پروپیگنڈے بند نہیں ہوئے ہیں۔"

اس سے پہلے کوئٹہ میں بلوچ اسٹوڈینٹس آرگنائزیشن

کی تیسری سالانہ کنونشن کے اختتامیہ اجلاس میں سردار عطاء اللہ خاں مینگل لندن پلان کو لغو قرار دے چکے ہیں۔ "ایسا پلان بنانے کے لئے مجھے لندن جانے کی کیا ضرورت تھی؟ خان عبدالولی خاں سے تو میں اپنے ہی ملک میں جب چاہوں اور جتنی بار چاہوں مل سکتا ہوں"۔

لندن پلان کی ناکامی اور بے بنیادی کا اعتراف بالآخر خود صدر بھٹو کو کرنا پڑا اور ہر سانس لندن پلان کا کا ذکر کرنے والے ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات تین چار روز بعد اسے یکلخت بھول گئے۔ لیکن ذاتی سیاست خاموش نہ بیٹھی اور اکتوبر کے وسط میں انگریزی اور اردو کے چند روزناموں میں تحریک اتحادِ پاکستان (لاہور) کے نام سے ولی خاں کے خلاف اشتہار چھپنے لگے جن میں انھیں پنجاب کا دشمن ظاہر کیا گیا۔ ان اشتہارات میں پھر لندن پلان کا ذکر نکل آیا۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہ اشتہارات اس وقت شائع کئے گئے جب آئینی سمجھوتہ کی راہیں تلاش کی جارہی تھیں۔ نیشنل عوامی پارٹی کے قائم مقام صدر اجمل خٹک اور نیپ صوبہ سرحد کے صدر محمد افضل خاں نے اس اشتہار بازی کی سخت مذمت کرتے ہوئے کہا کہ ایسی جعلی انجمنیں سرکاری دماغ کی اختراع ہیں اور ایوب اور یحییٰ کے زمانے میں ایسی ہی انجمنوں نے ملک کو تباہی کے دہانے پر پہنچایا۔

بدقسمتی سے پاکستانی صحافت بھی اکثر ایسے سازشی ذہنوں کی آلہ کار بن جاتی ہے۔ لاہور ہوائی اڈے پر نیپ کے لیڈر اور بلوچستان کے گورنر غوث بخش بزنجو دو قومی نظریہ، اسلامی نظریہ اور قومیتوں کے مسئلہ پر سوالوں کا جواب دیتے ہوئے کہہ بیٹھے کہ یہ پرانے فرسودہ سوال ہیں نئے تقاضوں کی بات کیجئے۔ پاکستان کے چند اخباروں نے بس انھیں پکڑ ہی تو لیا" بزنجو نے اسلام کو فرسودہ قرار دیا"۔ ایسی سرخیاں جمائی گئیں کہ صفائی پیش کرتے کرتے بزنجو صاحب کی حالت خراب ہوگئی۔

پچھلے ۲۵ برسوں میں پاکستانی سیاست نے مذہبی جذبات کو اس قدر ابھارا ہے کہ اسلام اور پاکستان نظریہ کے نام سے کسی کی بھی عزت اتر سکتی ہے۔ حال ہی میں خود صدر بھٹو اس کا شکار ہوگئے۔ ۲۶ر اکتوبر کی صبح جب وہ لاہور سے لائلپور جاتے ہوئے شیخوپورہ ریلوے اسٹیشن پر پہنچے تو طلبا نے "افغان زندہ باد اور پیپلز پارٹی مردہ باد" کے نعرے بلند کئے۔ صدر بھٹو نے بمشکل چار منٹ تقریر کی کہ ان کی آواز نعروں میں دب گئی۔ طلبا کو شکایت یہ تھی کہ ان کے کالج میں مسجد نہیں ہے (نوائے وقت۔ ۲۷ر اکتوبر)

ظاہر ہے کہ محض اتنا سا گلہ اس ہنگامے کی بنیاد نہ ہو سکتا تھا کہ جس نے صدر پاکستان کو بھی اپنی لپیٹ میں لینے سے دریغ نہ کیا۔ معلوم ہوا ہے کہ اس مظاہرے کے پیچھے پاکستان پیپلز پارٹی کے باغی عناصر اور دائیں بازو کی اسلام پسند پارٹیوں کا ہاتھ تھا۔

جذباتی سیاست کی بیماری پاکستان کے ساتھ ساتھ اس کی نوآبادی نام نہاد آزاد کشمیر میں بھی پھیل گئی ہے۔ اس کی چوبیسویں سالگرہ کی تقریبات ہنگاموں کی نذر ہوگئیں مظفرآباد میں صدر سردار عبدالقیوم کی تقریر اکھڑ گئی اور میرپور میں ان کے معاون غلام احمد رضا کی تقریر کے دوران طلبا نے "کشمیر بنے گا ہندوستان" کے نعرے لگائے۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستانی مقبوضہ کشمیر کی پس ماندگی اور غریبی کو دور کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ انھیں روشن مستقبل کے سرابوں سے بہلایا گیا ہے۔ وہاں کے عوام اب ان سرابوں کی حقیقت جاننے لگے ہیں۔ (روزنامہ امروز۔ ۳۰ر اکتوبر)

اسلام دشمنی اور پاکستان دشمنی کے الزامات اتنے سہل اور کارآمد ہیں کہ پاکستان کے سیاسی رہنما انھیں ایک دوسرے کے خلاف فراخدلی سے استعمال کرتے ہیں۔ ۲۹ر اکتوبر کو ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن کیمبلپور سے خطاب کرتے ہوئے تحریکِ استقلال پاکستان کے سربراہ ریٹائرڈ ائر مارشل اصغر خان نے صدر بھٹو اور ان کی جماعت کو ان سے نوازا "پیپلز پارٹی کے قائد پر ملک کے دو ٹکڑے کرنے کی ذمہ داری ہے۔ ایک ایسی جماعت اور ایک ایسا شخص جس نے ملک کے دو ٹکڑے کئے ہوں اس سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ ملک کے باقی حصے کو بچا رکھے گا"۔

صفر خاں آج کل بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کی مخالفت میں پیش پیش ہیں۔ حالانکہ وہ پہلے پاکستانی سیاسی رہنما تھے جنھوں نے جنوری میں حکومت پاکستان کو مشورہ دیا تھا کہ وہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرلے۔ کس اصول نے ان کے رویہ میں تبدیلی پیدا کی۔ وہ خود بھی نہیں جانتے۔ پاکستان میں کس کا، کب، کس مسئلہ پر رخ بدل جائے گا، کہنا مشکل ہے۔ خود صدر بھٹو اپنے موقف میں بار بار ردو بدل کرنے کے لئے مشہور ہیں۔ اس میں ان کا زیادہ قصور نہیں ہے۔ پاکستانی سیاست کا مزاج ہی ایسا ہے۔ پاکستان میں جو اصولوں کو اپناتا ہے وہ میاں محمود علی قصوری اور معراج محمد خاں کی طرح استعفیٰ دینے پر مجبور ہو جاتا ہے یا مختار رانا کی طرح زندان میں پناہ حاصل کرتا ہے۔ پھر احمد رضا قصوری کی طرح پارٹی سے نکال بھی دیئے جاتے ہیں۔

اصغر خاں کی تحریک استقلال کے جنرل سکریٹری ملک غلام جیلانی جو ان دنوں علاج کی غرض سے لندن گئے ہوئے ہیں۔ پاکستان کی جذباتی سیاست سے دور ہیں۔ اس لئے ان کا لب و لہجہ صحت مند ہے۔ انھوں نے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے پر زور دیتے ہوئے کہا "اگر اندرا گاندھی کی جگہ میں ہوتا تو لاکھوں پناہ گزینوں کی واپسی کے لئے فوجی طاقت کے استعمال میں جو ۲۴ گھنٹے کی تاخیر بھی نہ کرتا۔ اندرا گاندھی ایک تجربہ کار سیاستداں ہیں۔ اسی وجہ سے وہ دس ماہ تک اس امید پر ضبط و تحمل سے کام لیتی رہیں کہ پاکستان مسئلہ کا کوئی سیاسی حل تلاش کرے گا۔ پاکستانی رہنما اپنے مخصوص مفادات کی خاطر بھارت کا ہوّا کھڑا کرنے میں مصروف ہیں"۔ اصغر خان اور ملک غلام جیلانی ایک ہی جماعت کے رہنما ہیں لیکن دونوں کا لب و لہجہ کس قدر مختلف ہے۔ خدا جانے لندن سے لوٹنے کے بعد ملک جیلانی اپنے موقف پر قائم رہ سکیں گے یا نہیں۔

پاکستانی سیاست کی مسلسل تمثیل کے دو اور کردار بڑے دلچسپ ہیں۔ خان عبدالقیوم خاں اور حیات محمد خاں شیرپاؤ۔ قیوم مسلم لیگی ہیں لیکن صدر بھٹو کے حلیف کی حیثیت سے مرکزی وزارت داخلہ پر قبضہ جمائے ہیں۔ پیپلز پارٹی کے شیرپاؤ بھی صدر بھٹو کی مرکزی کابینہ کے رکن ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ صوبہ سرحد کی اسمبلی میں حزب مخالف کے لیڈر بھی ہیں۔ یہ دو رُخا رول بھی پاکستانی سیاست کی خصوصیت ہے یہ دونوں حضرات اٹھتے بیٹھتے اس تاک میں ہیں کہ صوبہ سرحد

اور بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیۃ العلمائے اسلام کی مخلوط حکومتیں کسی طرح ٹوٹ جائیں اور اقتدار ان کے ہاتھوں میں آجائے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان جماعتوں پر کوئی بھی الزام دے سکتے ہیں۔ چند روزہ لندن پلان کی دھوم کے دوران یہ دونوں حضرات خوب کھل کھیلے۔ اب یہ شملہ سمجھوتہ میں عمل درآمد میں تاخیر جس کی ذمہ داری بھٹو حکومت پر ہے کے لئے (نیپ) اور جمعیت کو ملزم گردانتے ہیں۔ حال ہی میں عبدالقیوم خاں نے راولپنڈی میں کہا "اگر شملہ معاہدہ پر عمل درآمد نہیں ہوا تو اس کے ذمہ دار بھی ہمارے اپنے بعض لوگ ہیں جو بھارت کو ہٹ دھرمی پر آمادہ کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو نہیں چاہتے کہ ہمارے مسائل حل ہوجائیں۔ جمہوریت کے بعض نام نہاد علمبرداروں نے یہ کہہ کر کہ صدر بھٹو اعتماد کے قابل نہیں غیر ملکیوں کے ذہنوں میں بھی برا اثر قائم کردیا۔" عبدالقیوم خاں کا یہ وار عبدالولی خاں پر ہے جنھوں نے ہندوستان اسٹنڈرڈ کلکتہ کے نامہ نگار کو انٹرویو دیتے ہوئے بھٹو صاحب کے بارے میں ایسا تاثر دیا تھا۔

جب سے صدر بھٹو نے لائلپور میں بنگلا دیش کو تسلیم کرنے کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ دائیں بازو کی اسلام پسند پارٹیاں خاصی سرگرم ہوگئی ہیں۔ جماعت اسلامی کے سابق امیر مولانا مودودی جنھوں نے جماعت کی رہنمائی ۲ نومبر کو میاں طفیل محمد کو سونپ دی۔ اس مسئلہ پر جو رخ اختیار کئے ہیں ان کا ذکر امروز کے ۵ نومبر کے شمارے میں ظہیر بابر نے اپنے کالم "رفتارِ وطن" میں یوں کیا ہے "جماعت اسلامی کے سابق امیر مولانا مودودی نے بنگلا دیش کے مسئلے کو ذاتی رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ یہ جماعت اسلامی کا معروف اسلوب ہے وہ شخصیت شکنی کو سب سے موثر حربہ سمجھتی ہے اور اس کے استعمال میں انتہائی فراخدل ہے۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آخر وہ کون سا طریقہ ہے جو بنگلا دیش کو پھر سے مشرقی پاکستان بنا سکتا ہے اور پاکستان کا وہی آئین، اقتصادی اور جغرافیائی نقشہ بحال کرسکتا ہے جو اگست ۱۹۴۷ء سے دسمبر ۱۹۷۱ء تک قائم رہا؟ جماعت اسلامی اور دائیں بازو کی دوسری جماعتیں صرف یہ مشورہ دیتی ہیں کہ انتظار کریں مگر انتظار کا بھی کوئی جواز ہونا چاہیئے۔ ایک سال ہونے کو آیا ہے انتظار جاری ہے مگر اب تک اس کا نتیجہ کیا نکلا ہے؟

ہم جذباتی نعروں اور اساطیری بیانوں سے دل بہلا کر بہت کچھ گنوا چکے ہیں اور ہم میں مزید نقصان برداشت کرنے کی سکت نہیں ہے۔ ہمیں اب سنجیدگی سے سوچنا چاہیئے کہ ہم کیا کریں اور دنیا میں کیا کچھ کرسکتے ہیں۔ ہم محض ایک نمائشی اور نمائش پسند قوم بن کر سلامت نہیں رہ سکتے۔"

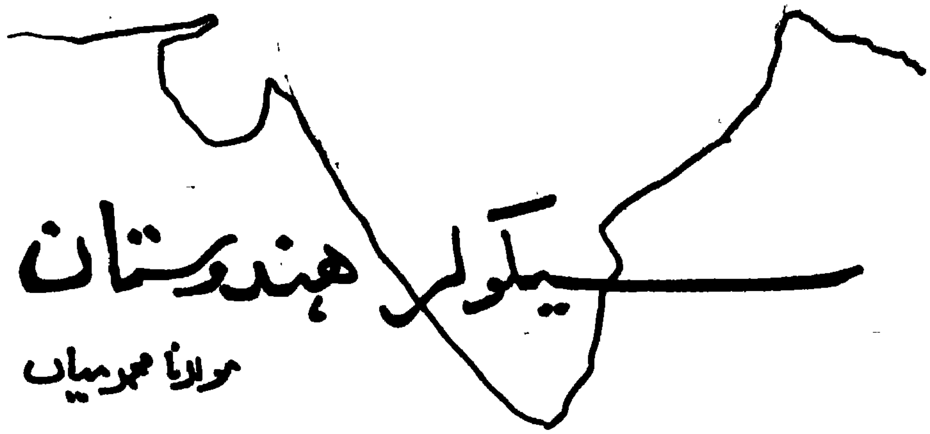
دائیں بازو کی جماعتوں کی پوری بنیاد ہی ماضی پرستانہ جذباتی نعروں پر ہے وہ کیوں کر عوام کو سنجیدگی سے سوچنے دیں گی؟ جماعت اسلامی کے نئے امیر طفیل محمد نے جماعت کے مرکزی دفتر کی تعمیر کے آغاز پر ایک مسجد کا سنگِ بنیاد رکھنے کی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے ۵ نومبر کو کہا۔ " بنگلا دیش حکومت لادین سوشلسٹ نظام اپنانے کا اعلان کرچکی ہے اس لئے ہم بنگلا دیش کے ساتھ کسی قسم کی بات چیت کے حق میں نہیں ہیں۔ مشرقی پاکستان کا وہی حل تسلیم کیا جائے گا جو محب وطن افراد اور اسلام پسند جماعتوں کو قابل قبول ہوگا۔ چند لوگ ہمیں کمزور سمجھتے ہیں لیکن جب وقت آیا اور ہم نے اقتدار سنبھالنے کا ارادہ کرلیا تو یہ لوگ تو کیا امریکہ بھارت اور روس بھی مل کر ہماری طاقت کے سامنے ایک منٹ نہیں ٹھہر سکیں گے۔"

میاں طفیل محمد کی تقریر کے دوران "بچہ بچہ کٹ مرے گا، بنگلا دیش نہیں بنے گا" کے نعرے بلند ہوتے رہے پاکستانی عوام بھی کس قدر سادہ لوح ہیں کہ اسلام کا نام آتے ہی یہ بھی نہ سوچا کہ بنگلا دیش تو کب کا بن چکا، اسے دنیا کے ۹۵ ملک تسلیم بھی کرچکے ہیں۔ اپنی زندگی کے پہلے دس ماہ میں بنگلا دیش نے اپنے لئے آئین بھی ترتیب دے لیا جو ۱۶ دسمبر کے دن وہاں نافذ ہوجائے گا (۱۶ دسمبر کو پچھلے سال پاکستانی فوجوں نے بنگلا دیش میں ہتھیار ڈالے تھے) ۷ مارچ ۱۹۷۳ء کو بنگلا دیش میں نئے انتخاب ہوں گے۔ کاش پاکستانی عوام کو اس کے سچے رہنما یہ احساس دلا سکیں کہ بنگلا دیش کہاں سے کہاں آگے نکل گیا جب کہ پاکستان کا نیا آئین ابھی زیر ترتیب ہے اور نئے انتخابات کی بات سوائے شکست خوردہ ائیر مارشل اصغر خاں کے کوئی کرتا ہی نہیں لیکن سوال تو یہ ہے کہ سچے رہنما ہیں کہاں؟ وہ اصول ہیں کہاں کہ جن کی بنا پر پاکستان ایک صحت مند قوم بن کے اپنا صحیح اور جائز مقام حاصل کرسکے آئے دن مذہب اور اسلامی نظریہ کی نکیل ڈال کر کوئی پاکستانی قوم کو اِدھر لے جاتا ہے، کوئی اُدھر۔

صدر بھٹو اور ان کی جماعت جنھیں حقیقت پسندی کا دعویٰ ہے خود جذباتی نعروں کے سائے میں پناہ ڈھونڈنے میں مصروف ہیں۔ نیشنل عوامی پارٹی کمزور ہے اور جمعیتہ العلماء اسلام کا سہارا لینے پر مجبور ہے۔ جذباتی نعروں اور اسلام کے نام پر پچھلے ۲۵ برس پاکستان کو جہاں لے آئے ہیں، اگر یہی عالم رہا تو مستقبل، حال سے کہیں زیادہ تکلیف دہ اور حوصلہ شکن ہوگا۔ ستم یہ ہے کہ پاکستانی رہنما جذباتی نعروں کی پٹیاں اپنے عوام اور اپنی آنکھوں پر باندھ کر دلوں کو بہلا رہے ہیں کہ اندھیرے انھیں نگلیں گے نہیں۔

جس قوم کی نظروں میں یحییٰ خاں جیسا شخص شراب چھوڑنے، روزہ رکھنے اور قربانی کے لئے دُنبہ پالنے سے شرابی، عیاش اور غدار سے یکلخت صوفی اور صلح بن سکتا ہے اس قوم کے لئے سوائے ہمدردی کے کوئی کر بھی کیا سکتا ہے؟ کب تک پاکستانی عوام مذہب کے مصنوعی چہروں کا فریب کھاتے رہیں گے؟ تیرگی کا یہ طلسم کون توڑے گا؟ اور کب؟

[redacted]



سیکولر ہندوستان

مولانا محمد میاں

مولانا ابوالکلام آزاد یہ کہتے ہوئے فخر محسوس کیا کرتے تھے کہ دستور ساز اسمبلی نے بنیادی طور پر منظور کرلیا ہے کہ "ہندوستان سیکولر جمہوریہ" ہوگا۔

مولانا آزاد کے نزدیک یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔ وہ اس کو کرشمۂ قدرت کہا کرتے تھے۔ مولانا کا یہ فخر صحیح تھا۔ کیونکہ سیکولر جمہوریہ اگرچہ سیاسی دنیا میں سب سے زیادہ مقبول اور قابلِ قدر نظامِ حکومت ہے۔ مگر ہندوستان کا جو مزاج نامعلوم مدت سے بنا ہوا تھا اور دو قومی نظریہ اور اس کی بنا پر مطالبۂ تقسیم کی کامیابی نے اس میں جو غضب آلود تلخی پیدا کر دی تھی۔ اس کے لئے اس طرح کا نظام نہ دل کش تھا نہ قابلِ قدر، بلکہ ایک طرح کا چیلنج تھا۔

۱۔ شہری حقوق میں یکسانیت کو وہ کب برداشت کرسکتے ہیں جو طبقاتی تفاوت اور اونچ نیچ کو مذہبی اصول کی حیثیت دیتے ہیں۔

۲۔ کہا جا سکتا ہے کہ انگریزی دور اور اس سے پہلے مسلمانوں کے دور حکومت میں ہندوستانیوں کو چین اور امن حاصل تھا۔ لیکن کیا ہندوستانیوں کو نظام حکومت کے بارے میں رائے کی آزادی بھی حاصل تھی؟ کیا ان کو یہ حق تھا کہ اپنی آزادیٔ رائے سے صوبائی اور مرکزی حکومت کی تشکیل کرسکیں یا اس کے برخلاف ان کو اقتدار کے تابع فرمان رہنا پڑتا تھا اور اقتدار کا مدار فوجی طاقت پر تھا۔

۳۔ یہ صورت جس کو آپ شاہنشاہیت یا سامراجی طرز کہہ سکتے ہیں آج آپ کے نزدیک قابلِ نفرت بلکہ قابلِ لعنت ہے۔ لیکن جہاں صدہا سال بلکہ ہمیشہ سے یہی رواج رہا ہو وہاں قوم کا یہی مزاج بن جاتا ہے۔ ایک طبقہ صاحبِ اقتدار ہوتا ہے دوسرا اقتدار پرست۔ بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستانی عوام کا یہی مزاج بن چکا تھا۔

۴۔ اس مصنوعی یا حقیقی مزاج کے ساتھ جب مذہبی رنگ کا جذبہ یہ بھی ہو کہ حکومت ایک مخصوص نسلی گروہ کا حصہ ہے فوجی خدمات بھی اسی کا طرۂ امتیاز ہے۔ دوسرے نسلی گروہ خاص قسم کے بموجب ملک کے کاروبار میں حصہ لیں گے لیکن اقتدارِ اعلیٰ کی باگ ڈور وہ نہیں سنبھال سکتے اور کچھ گروہ ایسے بھی ہوں گے جو خدمت گزاری کے علاوہ ملک کی دوسری خدمات میں حصہ بھی نہیں لے سکتے۔ تو ظاہر ہے کہ یہ مزاج اور یہ جذبہ "جمہوریت" کو برداشت نہیں کرسکتا۔

۵۔ اب تک عام غلط فہمی یہ ہے کہ ہر ایک بالغ کو رائے دینے کا حق حاصل ہو جمہوریت صرف یہی نام ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ جمہوریت نہیں ہے۔ یہ صرف تشکیل جمہوریت کی صورت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جمہوریت یعنی حقیقی جمہوریت کا تعلق ووٹر کے ووٹ سے نہیں بلکہ اس کے ذہن، جذبے اور طرزِ عمل سے ہے۔

۶۔ رنگ و نسل کا کوئی تفاوت اونچ نیچ پیدا کرے شہری حقوق سب کے یکساں ہوں، ہر ایک فرد کو ترقی کا موقع کا ہو معیارِ ترقی قابلیت ہو۔ ہر ایک فرد کو رائے اور ضمیر کی آزادی حاصل ہو۔ ہر ایک فرقہ اپنے رسم و رواج میں آزاد ہو۔ کسی فرقہ کو دوسرے پر بالادستی حاصل نہ ہو۔ حکومت صرف منصف اور محافظ ہو۔ نہ کسی فرقہ کی معاون و مددگار ہو۔ نہ کسی کی مخالف۔ یہ ہے جمہوریت اور اسی کو جائزہ عملی پہنانے کا نام ہے سیکولرازم۔ مگر کیا تسلطائی مزاج اس کو برداشت کرسکتا ہے۔ کیا جمہوریت تسلطیت کی حریف اور اس کے لئے چیلنج نہیں ہوتی ہے؟

۷۔ یہ چیلنج کس کی طرف سے ہوسکتا ہے؟ اس کی ذمہ داری کس پر ہوتی ہے؟ بلاشبہ یہ چیلنج قوم پرور نیشنلسٹ ہندوؤں اور مسلمانوں کی طرف سے جس کی قیادت مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد کر رہے تھے اور اسی وجہ سے سب سے پہلے مہاتما گاندھی کو اس قربان گاہ پر قربان ہونا پڑا۔ لیکن سیاسی جدوجہد میں اس چیلنج کی ذمہ دار مذہبی اقلیتیں ہیں جن میں سب سے زیادہ باوزن مسلم اقلیت ہے جس کے لئے حوصلہ کی بات یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اقلیت نہ سمجھے بلکہ ایک ایسی طاقت سمجھے جس کے دامن میں تمام اقلیتیں پناہ لئے ہوئے ہیں جس کا یقین یہ ہے کہ ہندوستان صرف اکثریت کا نہیں بلکہ ہندوستانی سب کا مشترک وطن ہے۔ اس کے مفادات سب کے لئے ہیں اس کی ذمہ داریاں سب پر مشترک ہیں۔

اب خلاصہ کلام یہ نکلتا ہے کہ مسلمان جمہوریۂ ہند کی ایک ایسی طاقت ہیں جو جمہوریت اور سیکولرازم کے علمبردار اور تمام اقلیتوں کو اپنی پناہ میں لئے ہوئے ہیں۔ جمہوریت اور

سیکولرازم کے اصول پر ملک کی تعمیر ان کا نصب العین ہے یہ تعمیر انھیں کے ذریعہ ہوسکتی ہے اور وہی اسکے معاون ہوسکتے ہیں

مہاتما گاندھی کی قربانی اپنی جگہ پر بہت زیادہ قابل قدر بلکہ مشعل راہ ہے۔ مگر کیا اس میں شک ہے کہ ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں مسلمان اپنی قربانیاں پیش کرچکے ہیں اور پیش کرنے پر آمادہ ہیں۔ گزشتہ پچیس سال میں ہندوستان کے طول وعرض میں کتنے بلوے ہوئے محتاط شمار پانچ ہزار سے کم نہیں۔ اس میں شہید ہونے والے مسلمانوں کی تعداد اس سے کئی گنا زیادہ اور تباہ ہونے والی املاک کی قیمت ارب کے ہندسے سے بھی آگے۔

وجہ نزاع اور بنا مخاصمت کیا ہے۔ صرف یہ کہ ایک بہت بڑے گروہ کا جس کو بہت کچھ ذرائع اور وسائل حاصل ہیں۔ عقیدہ یہ ہے کہ ہندوستان صرف ایک فرقہ کا ملک ہے۔ صرف اسی فرقہ کو یہاں حکومت کرنے کا حق ہے۔ یہ گروہ صرف مسلمانوں اور عیسائیوں جیسی اقلیتوں کو دیس نکالا دینا نہیں چاہتا بلکہ وہ کانگریس جیسی سیکولر جماعتوں کو بھی غاصب سمجھتا ہے کہ یہاں صرف ایک فرقہ کی حکومت ہونی چاہیئے وہاں کانگریس جیسی جماعتیں سیکولرازم اور سوشلزم وغیرہ لارہی ہیں جو سراسر غاصبانہ تصرف ہے۔

یہ گروہ صرف مسلمانوں کا دشمن نہیں بلکہ ان سب کا دشمن ہے جو ہندوستان میں متحدہ قومیت کو ترقی دینا سوشلزم کو کامیاب بنانا چاہتے ہیں۔ اس گروہ کا مقابلہ کرنا صرف مسلمانوں کا فرض نہیں ہے بلکہ ان سب کا فرض ہے جو فرقہ پرستانہ تنگ نظری کو ملک کے لئے تباہ کن سمجھتے ہیں۔ اگرچہ صورت حال یہ ہے کہ اب تک اس گروہ کی تمام تخریب کاریوں اور فساد انگیزیوں کا نشانہ صرف مسلمان ہیں مسلمان قربانیاں پیش کرنے سے نہیں گھبراتے بالخصوص اسی صورت میں کہ ان کی قربانیاں صرف ان کے لئے نہیں ہیں بلکہ ملک کی تمام اقلیتوں کے لئے ہیں اور ان تمام پارٹیوں کے لئے ہیں جو انسانی بھائی چارہ، مساوات اور ترقی پذیر نظریات کی حامی ہیں اور ملک کو سدابہار سرسبز گلدستہ دیکھنا چاہتی ہیں فرقہ وارانہ تنگ نظری کے گڑھے میں ڈالنا نہیں چاہتیں۔

مہاتما گاندھی کہا کرتے تھے کہ مسلمانوں کا وجود ہندوؤں کے بقا اور برتری کی ضمانت ہے کیونکہ ہندوؤں میں بہت سے فرقے ہیں جن کے عقائد اور رجحانات ایک دوسرے کے برعکس ہیں مسلمان نہ رہیں تو یہ اندرونی فرقے ایک دوسرے کے مقابل جنگجو فرقے بن جائیں نہ ان میں ظاہری یکجہتی باقی رہے نہ وہ اکثریت قائم رہے جس کی وجہ سے ان کو تمام ملک میں برتری حاصل ہے۔

مسلمانوں کے جذبۂ ایثار میں امنگ پیدا ہو جاتی ہے جب وہ محسوس کرتے ہیں کہ ناعاقبت اندیش فرقہ پرستوں کی طرف سے جو مصیبتیں ان کو اٹھانی پڑ رہی ہیں اور جو قربانیاں وہ پیش کر رہے ہیں وہ خود ان کے لئے بھی ہیں جو ان کو بھینٹ چڑھانا چاہتے ہیں۔

جب مسلمان سیکولر جمہوریہ کے معمار ہیں تو تعمیر ملک کا وہ نقشہ کامیاب ہوگا جو یہ معمار تیار کریں گے۔ ان کے تیار کردہ نقشے کی خوبی یہ ہے کہ اس میں گلدستہ ملک کا ہر ایک پھول سدابہار ہے۔ اس میں سیکولر کا رنگ سیاہ نہیں ہے۔ جو لامذہبیت کی تصویر ہو۔ یا صرف اکثریت کے رنگ کو قومی دھارا بتاتا ہو۔ اس نقشہ میں جمہوریت کی ایسی صورت نمایاں دکھائی گئی جس میں ہر فرد کو رائے کی آزادی ہے۔ اور ہر فرقہ کو بھی آزادی ہے۔ کہ وہ اپنے مذہب اپنے کلچر اور اپنی تہذیب کو باقی رکھ سکتا ہے اور جہاں تک اس کے امکان میں ہو ترقی دے سکتا ہے۔ اس میں مسلمانوں یا کسی بھی فرقہ کے پرسنل لا کو ختم نہیں کیا گیا۔ گلدستہ کی رنگ برنگی کو اسی شکل میں ظاہر کیا گیا ہے کہ ہر فرقہ اپنے امتیازات اور خصوصیات کے ساتھ جلوہ افروز ہو رہا ہے خصوصیات کو ختم کر دینے اور ان کی صورت بگاڑ دینے کو سیکولرازم نہیں بتایا گیا۔ اس میں سیکولرازم کو مذہب کا نہیں بلکہ فرقہ واریت کا مخالف دکھایا گیا ہے یعنی یہ کہ نظام حکومت ہر ایک فرقہ واریت سے آزاد ہو وہ نہ کسی فرقے کے مذہبی رجحانات میں مداخلت کرے اور نہ کسی فرقہ کو یہ حق دے کہ وہ دوسرے کو مرعوب اور مغلوب کر سکے

یہ ہے وہ نقشہ جو حضرات علماء اور قوم پرور مسلمانوں کا نصب العین ہے منزل کٹھن راستہ دشوار، فضا مخالف، موسم خراب۔ ہر طرف سے آندھیاں اٹھ رہی ہیں۔ طوفان آرہے ہیں مگر قوم پرور ہندو مسلمانوں کا کارواں چل رہا ہے اور چلتا رہے گا یہاں تک کہ منزل مقصود پر پہنچے۔

امید کی کرن

گزشتہ چند سال میں دو انقلاب آئے۔ ایک انقلاب یہ تھا کہ کانگریس کے دو ٹکڑے ہوگئے۔ دوسرا انقلاب یہ تھا کہ پارلیمنٹ توڑی گئی۔ پارلیمنٹ کا انتخاب ازسرِنو ہوا۔

دونوں انقلابوں کی سربراہ وزیر اعظم تھیں کامیابی انھیں کو حاصل ہوئی مگر اس سربراہ کے برابر اس کی مدد کے لئے کون کھڑے تھے فخرالدین علی احمد اور جگ جیون رام۔ اس طرح کے انقلاب اور بھی آئیں گے۔ مسلمانوں کا اصول کار وہی رہنا چاہیئے جو گزشتہ پچیس سال سے رہا یعنی جمہوریت پسند ترقی پذیر عنصر کی امداد۔ اسی صورت سے ملک ترقی کر سکتا ہے اور خود ان کی ترقی کا راستہ بھی یہی ہے۔

بیرون ہند

غالباً ۱۹۳۱ء میں گاندھی جی کا وہ بیان اخبارات میں شائع ہوا تھا جس میں لارڈ ارون وائسرائے ہند کو جواب دیتے ہوئے مہاتما گاندھی نے کہا تھا:۔

> "ہماری جدوجہد صرف ہندوستان کی آزادی کے لئے نہیں ہے بلکہ ہماری جدوجہد دنیا کی تمام کمزور اور پس ماندہ قوموں کے لئے ہے ہم ہندوستان کی آزادی اس لئے چاہتے ہیں کہ دنیا کی پس ماندہ اور کمزور قوموں کی امداد کر سکیں"۔

ریشمی رومال والی تحریک تاریخ آزادی کی مشہور تحریک ہے مگر ہندوستان کو اس تحریک سے کوئی بڑا فائدہ نہیں اٹھا سکا۔ البتہ اس تحریک کا فائدہ افغانستان کو پہنچا کہ اس تحریک کے سلسلہ میں جو ولولہ اور نظم افغانوں میں پیدا ہوگیا تھا اس نے میدان جنگ میں برطانیہ کو شکست دے کر اپنا استقلال تسلیم کرا لیا۔

[redacted]

مسلمان جو آزادی کی تحریک میں شہید ہو گئے

پریم کرشن منڈن

کاکوری سازش کیس کے عظیم شہید اشفاق اللہ (۱۹۰۰ء — ۱۹۲۷ء) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں پھانسی چڑھنے والے سب سے پہلے مسلمان تھے۔ اس سلسلے میں خود انھوں نے کہا تھا کہ "مسلمانوں میں، میں ہی شاید وہ خوش نصیب ہوں کہ جسے کسی انقلابی سازش کیس میں پھانسی پر لٹکایا جائے گا۔" ان دنوں جب وہ لاہور میں خفیہ طور سے پناہ گزیں تھے، کیدار ناتھ سہگل نے ان کے روبرو یہ تجویز پیش کی کہ انھیں خفیہ طور پر پوری حفاظت کے ساتھ برطانوی سرکار کی سرحدوں سے باہر لے جایا جا سکتا ہے۔ تب بھی انھوں نے یہی کہا "بھئی! کسی مسلمان کو بھی پھانسی کے تختے پر پہنچنے دو۔ میں یہاں سے فرار نہیں ہونا چاہتا۔"



اشفاق اللہ، اتر پردیش کے ضلع شاہجہانپور میں اکتوبر ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اپنے طالب علمی کے زمانے ہی میں وہ انقلاب پسندوں کی طرف مائل ہوئے اور ان کے ساتھی بن گئے۔ کاکوری میل کو لوٹنے کے جرم میں انھیں اگست ۱۹۲۵ء کو گرفتار کیا گیا۔ اور ۱۸ دسمبر ۱۹۲۷ء کو وہ فیض آباد جیل میں ہنستے ہنستے پھانسی کے پھندے میں جھول گئے۔ اشفاق اللہ کا یہ دعویٰ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ بنیادی طور پر انقلابی تحریک میں حصہ لینے کے جرم میں تختۂ دار تک پہنچنے والے وہ پہلے مسلمان ہیں۔ تاہم ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی قومی تحریک میں ان سے پیشتر بھی کئی مسلمان تمام تر جواں مردی کے ساتھ پھانسی کے تختہ پر قدم رکھ چکے تھے۔ اگر وہابی تحریک کو درگزر کر دیا جائے تو ۱۹۲۱ء کی عدم تعاون تحریک کے دوران کئی کیسوں میں مسلمانوں کو پھانسی دی گئی۔ اتر پردیش کے چورا چوری کیس میں عبداللہ عرف سکتی، لال محمد اور نظر علی کو پھانسی کی سزا دی گئی۔ ان قوم پرست مسلمانوں کو چورا چوری کیس کے دیگر افراد کے ساتھ کب اور کہاں پھانسی دی گئی، اس کا کہیں خاطر خواہ ذکر نہیں ملتا۔

عبداللہ، ضلع گورکھپور کے ایک قصبہ راجدھانی کے رہنے والے تھے، اور کاشت کاری کرتے تھے۔ لال محمد چورا نامی گاؤں کے رہنے والے تھے اور کسان تھے۔ ان کے والد کا نام حکیم تھا۔ نظر علی قصبہ ڈمری خورد کے کسان تھے اور والد کا نام حسین تھا۔

ان وقتوں کے دستاویزوں کے حساب سے نظر علی نے ۴ فروری کی صبح ڈمری خورد میں ہونے والے اجلاس سے لے کر تھانے کے جلانے کے حادثے تک عوام کی رہنمائی کی تھی۔ وکیل صفائی کا کہنا تھا کہ نظر علی پر لگائے گئے الزامات کے لئے ایک دوسرے نظر علی ذمہ دار تھے کہ جنھیں پولیس نے تھانہ جلائے جانے سے پہلے گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ اور حقیقت بھی یہی تھی

اتر پردیش کے لکھیم پور کھیری شہر کے درزی حبیب اللہ کے بیٹے نصیر الدین عرف فوجی کو جولائی ۱۹۲۰ء میں پھانسی دیئے جانے کا بھی ذکر ملتا ہے۔ انھوں نے لکھیم پور کھیری کے انگریز مجسٹریٹ پر تلوار سے حملہ کر کے اسے ہلاک کر دیا تھا۔

مسلمانوں نے آزاد ہند فوج میں بھی اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر ملک کی آزادی کے لئے جدوجہد کی ہے۔ اس جدوجہد کے دوران کافی مسلمان سپاہی اور افسران مارے گئے اور کچھ مسلمان پھانسی پر بھی چڑھے۔ ایسے شہیدوں میں کیرل کے ضلع تریویندرم کے محمد عبدالقادر بھی ہیں کہ جنھیں ۱۰ ستمبر ۱۹۴۳ء کو پھانسی دی گئی تھی۔ ان پر آزاد ہند فوج کے لئے جاسوسی کرنے کا الزام تھا۔ وہ ۱۹۴۲ء کے شروع میں ایک آبدوز کے ذریعہ ملایا سے کالیکٹ پہنچے تھے۔ وہیں انھیں گرفتار کیا گیا اور پھانسی دی گئی تھی۔ اسی طرح آزاد ہند فوج کے محمد عطا جاسوسی کرنے میں مہارت حاصل کرنے کے بعد خفیہ طور پر ہندوستان آئے اور انقلابیوں سے تعلق قائم کیا۔ دھوکہ سے وہ بھی گرفتار ہو گئے اور مقدمہ چلائے جانے کے بعد ۱۹۴۲ء میں انھیں بھی پھانسی دے دی گئی۔

۱۹۲۱ء کی عدم تعاون تحریک کے دوران ضلع ناسک کے مالے گاؤں میں ۲۵ اور ۲۶ مارچ کو ہندوستانی عوام اور پولیس میں جھگڑا ہو گیا تھا۔ شراب کی دوکانوں پر کئے گئے دھرنے کو ختم کرنے کے لئے پولیس نے گولی چلائی۔ اس کے بعد توڑ پھوڑ کی کارروائیوں میں ایک کانسٹبل مارا گیا۔ اس حادثہ کے سلسلے میں گرفتاریاں ہوئیں اور بعد میں مقدمہ چلا اور کچھ لوگوں کو پھانسی دی گئی۔ اس کیس میں جن مسلمانوں کو پھانسیاں دی گئیں ان کے نام اس طرح ہیں۔

سلیمان شاہ :— (۱۸۸۱ء — ۱۹۲۲) آپ مالیگاؤں کے رجن مومن کے بیٹے تھے۔ آٹھویں جماعت تک تعلیم حاصل کی تھی اور ہوٹل چلاتے تھے۔ انھوں نے گاؤں میں خلافت تحریک کے دوران میں حصہ لیا تھا۔ پولیس کے گولی چلانے والے کیس میں گرفتار کئے گئے اور سزا سنائی جانے کے بعد ۶ جولائی ۱۹۲۲ء کو یروداجیل میں پھانسی چڑھ گئے۔

بدھو فریدن :— (۱۸۸۲ء — ۱۹۲۲) آپ مالیگاؤں

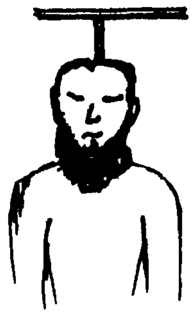
کے فریدون کے بیٹے تھے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد جلاہے کا کام کرتے رہے۔ پولیس کے گولی چلائے جانے والے کیس میں گرفتار ہوئے اور سزائے موت پانے پر ۶؍جولائی ۱۹۲۲ء کو یرودا جیل میں پھانسی چڑھے۔

محمد شعبان بھکاری:۔ (۱۹۲۲ء - ۱۸۸۳ء)

مالیگاؤں کے ایک صاحب بھکاری کے فرزند تھے۔ ساتویں جماعت تک پڑھنے کے بعد کپڑے کا کاروبار کرتے تھے۔ مذکورہ بالا کیس ہی میں توڑ پھوڑ کی کارروائیوں میں حصہ لینے کے الزام میں انھیں بھی ۶؍جولائی ۱۹۲۲ء یرودا جیل میں پھانسی دے دی گئی۔

اسریل اللہ رکھا:۔ (۱۹۲۲-۱۸۹۲ء) مالے گاؤں کے اللہ رکھا کے بیٹے اسریل اللہ رکھا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد نوکری کرتے تھے۔ آپ گاؤں میں خلافت تحریک کے مہتمم اور رہنما تھے۔ قتل و ہنگامہ کرنے کے الزام میں انہیں ۶؍جولائی ۱۹۲۲ء کو یرودا جیل میں پھانسی دے دی گئی۔

محمد عبدالغفور:۔ (۱۹۲۳ء - ۱۸۸۶ء) آپ بھی ناسک ضلع کے شکور مومن کے گھر پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد پہلوانی کرنے لگے۔ ۱۹۲۱ء میں تحریک عدم تعاون کے وقت خلافت تحریک کی رہنمائی کی ۱۰؍جنوری ۱۹۲۳ء کو پھانسی چڑھ گئے۔



یہ تو ان مسلمانوں کا ذکر تھا جو شہید اشفاق اللہ سے پہلے پھانسی کے تختہ پر چڑھے۔ اشفاق اللہ کے بعد جن مسلمانوں کو پھانسی دی گئی۔ ان کی تفصیل اس طرح ہے۔

عبدالرسول:۔ (۱۹۳۱-۱۹۱۰ء) مہاراشٹر کے شعلہ پور کے باشندے قربان حسین ان کے والد تھے۔ آپ نے اپنے شہر کی مزدور تحریک میں حصہ لیا اور بعد میں ۱۹۳۰ء کے سول نافرمانی کی تحریک میں کود پڑے۔ ۸؍مئی ۱۹۳۰ء کو شعلہ پور کے پولیس تھانے پر حملے میں حصہ لیا۔ گرفتار کئے جانے کے بعد قتل و ہنگامہ کے الزام میں پھانسی کی سزا دی گئی۔ آپ ۱۲؍جنوری ۱۹۳۱ء کو یرودا جیل میں پھانسی کے تختہ پر چڑھے۔

حسین احمد قربان:۔ آپ بھی شعلہ پور کے رہنے والے تھے۔ ۱۹۳۰ء کے سول نافرمانی کی تحریک میں حصہ لیا اور جزوی ستیہ گرہ کے منتظم اور رہنما رہے۔ لوٹ مار کے واقعہ میں گرفتار کئے گئے اور ۱۲؍جنوری ۱۹۳۱ء کو یرودا جیل میں پھانسی چڑھے۔

بہت ممکن ہے کہ ان مسلمانوں کے علاوہ اور بھی کئی مسلمان اپنے ملک کی آزادی کے لئے پھانسی پر چڑھے ہوں۔ لیکن یہ بتانا مزید تحقیق طلب ہے۔

[redacted]

پارلیمنٹ میں محترمہ چندرا جوشی کی اردو کے مسائل پر تقریر

لنگوسٹک مائنورٹیز کمشنر کی رپورٹ ہمارے سامنے ہے۔ اس پر غور کرتے وقت سب سے پہلے میں وزیر محترم کا دھیان اس بات کی طرف دلانا چاہتی ہوں کہ مجھے ایسا لگتا ہے کہ آزادی کو آئے ہوئے اتنے سال ہوگئے لیکن ابھی تک جتنا دھیان اِس سوال کی طرف جانا چاہیئے تھا اتنا نہیں گیا۔ لنگوسٹک

مائنورٹیز کی رپورٹ بار بار ایوان کے سامنے پیش ہوتی ہے اور شاید یہ بارہویں رپورٹ ہے۔ بار بار کہا جاتا ہے کہ لنگوسٹک مائنورٹیز کمشنر نے جو سفارشیں کی ہیں وہ اسٹیٹوں کو بھیج دی گئیں ہیں۔ لیکن میں سوچتی ہوں کہ کبھی ہماری ہوم منسٹری کو جائزہ یہ لینا چاہیئے کہ آج تک جتنی رپورٹوں میں سفارشیں کی گئیں ہیں اُن میں سے کتنی پر عمل ہوا اور کتنے پر عمل نہیں ہوا۔ اگر اسی طریقے سے لوگوں کی شکایتیں بنی رہیں تو جیسا کہ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ایک دفتر سے پانچ دفتر بنا دیئے گئے ہیں، میرا ایسا خیال ہے کہ اگر ابھی تک بارہ شکایتیں تھیں تو پانچ دفتروں کی شکایتیں ساٹھ ضرور ہو جائیں گی۔ اور پھر ان کو حل کرنے والا کوئی طریقہ نہیں۔

میرا ایسا خیال ہے کہ اتنے اہم موضوع پر چاہے وہ لنگوسٹک مائنورٹی کا سوال ہو یا چاہے زبان کا سوال سینٹر میں کوئی سوال ایجوکیشن سے تعلق رکھتا ہے کوئی ہوم منسٹری سے، لیکن جب وہ اسٹیٹ میں پہنچتا ہے تو وہ کسی بھی منسٹری سے تعلق نہیں رکھتا۔ اور کوئی ان کا حال پوچھنے والا نہیں ہوتا۔ کوئی ان کو نافذ کرنے والا نہیں ہے۔ میں سوچتی ہوں کہ ایسا کوئی انتظام ہونا چاہیئے جس سے اسٹیٹ میں بھی کسی خاص وزیر پر اس بات کی ذمہ داری

ڈالی جائے اور اسی طرح وہاں بھی لنگوسٹک مائنورٹی کے مسئلوں کی دیکھ بھال کے لئے کوئی وزیر ذمہ داری لے۔ اگر ایسا کیا جائے تو مائنورٹیز کے کاموں کی طرف کچھ قدم بڑھائے جا سکتے ہیں، نہیں تو جیسے آج تک اتنی سفارشیں ہوئیں اور سفارشیں ہو جائیں گی۔ لیکن جیسا کہ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ کتنے ہی صوبے ایسے ہیں جہاں پر مشکلات ویسی ہی کی ویسی ہیں۔

ابھی ہمارے ایک ساتھی نے آپ کے سامنے آسام کا مسئلہ پیش کیا۔ جہاں معاملہ بہت بگڑ گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ معاملہ اور بھی بگڑ جائے لیکن پریشانی اور ناراضگی ہمارے آسام کے لوگوں میں یا بنگال کے لوگوں میں ہی نہیں ہے۔ اور مقامات پر بھی ہے۔ سینٹر میں بھی یہ کام کوئی منسٹر خود اپنے ذمہ لے۔ تبھی ہم اس طرف آگے [illegible] سکتے ہیں۔ کیونکہ صوبوں میں کوئی بھی اس پر فوری طور پر عمل کرنے والا نہیں۔

دوسری بات آپ کے سامنے یہ رکھنا چاہتی ہوں کہ لنگوسٹک مائنورٹیز کا سوال اور زبانوں کا سوال اس کمیشن کے سامنے ضرور ہے پر جو سرکار یا ہوم منسٹری کی ملازمتوں میں بھرتی کرنے کی پالیسی ہے کہ نوکری کس کو دینی ہے اور کیسے دینی ہے؟ اس سوال کا اس سے گہرا تعلق ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ تعلق اس کمیشن کے دائرہ اختیارات میں نہ ہو۔ اس لئے انھوں نے اس کا ذکر اس رپورٹ میں نہیں کیا۔ لیکن وزیر محترم کو یہ بھی دیکھنا چاہیئے اور ایوان کو بھی یہ سوچنا چاہیئے کہ اگر آپ کہیں کسی زبان کو پڑھنے کی سہولت دیں بھی دیں اور اگر اسکول اور یونیورسٹی میں کسی زبان کو پڑھانے کی سہولت فراہم کی

کردیں مگر اس زبان کے لوگوں کو نوکری نہیں ملے تو اس زبان کو پڑھنے سے کیا فائدہ ہوگا؟ اس سے تو لوگ بے روزگار ہو جائیں گے اور جو تھوڑا بہت روزگار کرنے کا طریقہ ان کے سامنے ہوگا وہ بھی ان سے چھوٹ جائے گا۔ اس لئے صرف یہ ہی نہ ہو کہ آپ ان کے پڑھنے کا انتظام کریں بلکہ ان کو نوکری میں ٹھیک حصہ ملے۔ اس کا انتظام بھی ہوم منسٹری کو کرنا چاہیئے اور اس کی دیکھ بھال بھی کرنی چاہیئے۔

شری رام سہائے پانڈے:۔

وہ کافی کر رہے ہیں۔

شریمتی سبھدرا جوشی:۔

یہ آپ کا خیال ہے میرا نہیں۔ اس لئے اس بات کا بھی ہوم منسٹری کو خیال کرنا چاہیئے، چاہے وہ کمیشن کے دائرہ اختیار میں ہو یا نہ ہو۔

میں ایک بات کا اور ذکر کرنا چاہتی ہوں۔ یہاں بہت سی بھاشاؤں کے ساتھ ٹھیک سے برتاؤ نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر اردو کا مسئلہ لیجیئے۔ جیسا کہ لنگوسٹک مائنورٹی کی رپورٹ میں بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اردو کا ایک خاص مقام ہے۔ بھلے ہی وہ مقام تعداد کے لحاظ سے نہ ہو لیکن اردو کی ایک تاریخی جگہ ہے۔ اردو ہندوستان کی زبان ہے اس میں کسی کو کوئی شک نہیں، لیکن اس سب کے باوجود اس کے ساتھ امتیاز برتا جاتا ہے۔ آج ایسے کچھ ہی لوگ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ سنسکرت ہماری مادری زبان ہے یا سنسکرت ہمیں آتی ہے پھر بھی اس کے لئے خاص کوششیں کی جاتی ہیں اور اس کا خاص طور سے ذکر کیا جاتا ہے اور کئی جگہوں پر اسے لازمی زبان کی حیثیت سے پڑھایا جاتا ہے۔ اس کے لئے یونیورسٹی قائم کی جاتی ہے مگر اردو کے لئے جو کئی کروڑ لوگوں کی زبان ہے جتنے قدم اٹھانے چاہئیں وہ تو الگ رہے اسے صرف زندہ رکھنے کی بھی کوشش نہیں کی جا رہی۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ زبان کو مذہب کے ساتھ جوڑتے ہیں۔ اسی طرح اردو کے بارے میں بھی لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے اور ہندی و سنسکرت ہندوؤں کی۔ بدقسمتی سے کچھ اقلیتی لوگ بھی ایسا ہی سمجھنے لگے ہیں۔ کچھ مسلمان بھائی بھی ایسا ہی سوچتے ہیں کہ اردو ان کی زبان ہے اور ہندی و سنسکرت ہندوؤں کی زبان ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ مذہب اور زبان کو ایک دوسرے سے جوڑ کے بے انصافی کرتے ہیں۔ لیکن پھر بھی اس کا دھیان ضرور رکھنا چاہیئے اور اگر اسے کسی خاص مذہب کی زبان مان بھی لیا جائے تو اور بھی زیادہ ضروری ہے کہ اس کی دیکھ بھال اچھی طرح سے کی جائے۔ پنجاب میں ہم لوگوں نے دیکھا ہے کہ سکھوں کے ساتھ بھی ایک زبان کو جوڑ دیا گیا تھا، جو کہ بہت بڑی بے انصافی تھی۔ پنجاب میں ہندی اور پنجابی کا بھی یہی حال کیا گیا۔ وہاں مذہب کے ساتھ زبان کو جوڑنے والے فرقہ پرست لوگوں نے جو حال کیا اور اس کو ایسی شکل دے دی کہ جیسے پنجابی صرف سکھوں کی زبان ہے اور ہندی وہاں پر صرف ہندوؤں کی زبان ہے۔

[illegible]
[illegible]
[illegible]

میں پنجاب کی رہنے والی ہوں اور دوسرے بھی جو پنجاب کے رہنے والے لوگ ہیں وہ اس بات کو اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ پنجاب کے لوگوں کا ہندی کے ساتھ کبھی تعلق نہیں تھا، ہندی سے وہ کبھی واقف نہیں تھے۔ پنجاب کے لوگ لکھنے کے کام میں تو اردو استعمال کرتے تھے اور بولتے پنجابی تھے۔ ہندی کا کوئی استعمال نہیں تھا۔ ہم لوگ وہاں پر ہندی اس لئے جانتے تھے کہ لڑکیوں کو آریہ سماج کے اسکولوں میں پڑھایا جاتا تھا۔ اور وہاں ہندی پڑھائی جاتی تھی۔ ہمارے گھروں میں بھائیوں کو ہندی نہیں آتی تھی۔ پھر مذہب کے ساتھ جب زبان کو جوڑ دیا گیا۔ وہاں جو فرقہ پرست ہندو تھے وہ بھی کہنے لگے کہ پنجابی سکھوں کی زبان ہے اور اس کے ساتھ ساتھ جو فرقہ پرست سکھ تھے وہ بھی کہنے لگے کہ پنجابی ہماری بھاشا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امرتسر جیسی جگہ پر لوگ کہنے لگے کہ ہماری بھاشا ہندی ہے اور ہمارا پنجابی سے کوئی تعلق نہیں۔

لیکن پنجابی صرف اس لئے بچ گئی کہ وہ ایک علاقہ کی زبان تھی۔ بدقسمتی سے اردو کو کوئی ٹھکانہ نہیں ملا۔ اس کے ساتھ جو سلوک ہونا چاہیئے تھا نہیں ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو اردو جانتے تھے ان کو بھی زبردستی یہ کہنا پڑا کہ ہماری مادری زبان صرف ہندی ہے۔ ہم اردو نہیں جانتے۔ اسی طرح سے لوگوں نے یہ بھی کہا کہ ہم پنجابی نہیں جانتے۔ یہی آج بھی ہو رہا ہے۔

کہا یہ جاتا ہے کہ یہ فیصلہ ہو گیا ہے کہ جو شخص چاہے اردو میں درخواست دے سکتا ہے۔ اسے منظور کیا جائے گا۔ اور اس کا جواب بھی اردو میں دیا جائے گا۔ میں چاہتی ہوں کہ وزیر محترم دریافت کریں کہ کیا ایسا ہوتا ہے؟ میرے پاس ایسے لوگ ہندی میں عرضیاں لاتے ہیں جو ہندی نہیں جانتے اور جب میں پوچھتی ہوں کہ اس میں کیا لکھا ہے پڑھ کر سنایئے تو کہتے ہیں کہ ہم ہندی نہیں جانتے۔ ہم نے ہندی میں عرضی لکھوائی ہے۔ عرضی نویس نے عرضی لکھ کر جس جگہ انگوٹھا لگانے کو کہا ہم نے لگا دیا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ چونکہ سرکاری دفتر ہندی میں درخواست مانگتے ہیں اس لئے ہم نے ہندی ہی میں لکھوائی ہے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا ہے کہ کسی نے درخواست ہندی میں لکھوائی اس پر انگوٹھا لگا دیا یا دستخط کر دیئے اور دفتر میں داخل کر دی۔ انھوں نے لکھوایا کچھ تھا عرضی نویس نے لکھا کچھ، اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے شہری ہوتے ہوئے بھی وہ پاکستانی شہری بنا دیئے گئے۔ کیونکہ ان درخواستوں میں نہ جانے کیوں یہ لکھ دیا گیا تھا کہ ہم پاکستانی ہیں۔ کیا غلط سلط لکھ دیا گیا۔

اردو پڑھانے کا انتظام

جو سفارشیں لنگوسٹک مائنورٹیز کمشنر کی ہیں اس پر کس طرح عمل کیا جاتا ہے؟ اسے بھی دیکھنا چاہیئے۔ اسکولوں میں اردو پڑھانے کا کوئی انتظام نہیں ہوتا۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ اردو پڑھانے کا انتظام ہے۔ لیکن میں آپ کو ایک مثال دینا چاہتی ہوں۔ دہلی میں اردو ٹیچرس ٹریننگ

کے لئے پانچ سیٹیں رکھی گئی تھیں۔ اب وہ اردو والوں کے لئے نہیں بلکہ تمام غیر ہندی والوں کے لئے ریزرو کر دی گئی ہیں۔ ان پانچ میں سے مشکل سے ایک سیٹ اردو جاننے والوں کو دی جاتی ہے۔ بے شمار اسکول ایسے ہیں جہاں اردو ٹیچرس کی جگہ ہیں لیکن پڑھانے والے ایسے لوگ رکھے گئے ہیں جنھیں اردو نہیں آتی۔ اس طرح کے ٹیچر جب پڑھاتے ہیں تو ظاہر ہے کہ طالب علموں کا معیار کچھ زیادہ بلند نہیں ہو سکتا۔ میں وزیر محترم سے درخواست کرتی ہوں کہ وہ اس کی معلومات کریں اور انکوائری کریں۔

میں دہلی کی ایک مثال اور دیتی ہوں۔ دہلی کے اردو اسپیکنگ ایریا ہی کا اسکول بلبل خانے کا ہے جس میں اردو بولنے والے بچے پڑھتے ہیں لیکن اس اسکول میں چالیس فیصدی سے زیادہ ایسے ٹیچرس ہیں جن کا اردو سے کوئی تعلق نہیں اور وہ اردو نہیں جانتے۔ وہاں بچوں کی کیا حالت ہوتی ہوگی۔ وزیر محترم خود اس کا اندازہ کریں۔

ٹیکسٹ بکس کی بات بھی رپورٹ میں کہی گئی ہے اس میں یہ کہا گیا ہے کہ جب تک ٹیکسٹ بکس کا انتظام نہیں ہوتا ہے تب تک پڑھائی کیسے ہو سکتی ہے؟ میں جانتی ہوں کہ سبھی بھاشاؤں کے ساتھ یہ دقت ہے لیکن دہلی کے ڈائرکٹر آف ایجوکیشن نے یہ کہا تھا کہ ہم جولائی ۷۲ء تک اردو کی تمام نصابی کتابیں دے دیں گے لیکن آج تک دہلی میں اردو کی ٹیکسٹ بکس دیئے جانے کی کوئی خبر نہیں ہے کب تیار ہوں گی اور کب بچوں کو دی جائیں گی کچھ پتہ نہیں۔

دس اور چالیس کا فارمولہ

دس اور چالیس کا جو فارمولا ہے اس پر بھی عمل نہیں کیا جاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی ایسوسی ایشن نہیں ہے جو دس کو یا چالیس بچوں کو اکٹھا کرے کہ اسکول میں جائے۔ ماں باپ ایک بچے کو لے جاتے ہیں اور پرنسپل صاحب یا ماسٹر صاحب کہہ دیتے ہیں کہ آپ کا تو ایک ہی بچہ ہے اگر دس بچے ہوتے تو ہم اردو ٹیچر کا انتظام کر دیتے۔ پھر دوسرا بچہ جاتا ہے تو اسے بھی یہی جواب ملتا ہے کہ تم ایک ہو دس ہوتے تو انتظام کر دیتے یہی حال تیسرے بچے کا ہوتا ہے۔ اب ایک بچہ ایک ہی ہوگا دس نہیں ہو سکتا۔ پرنسپل صاحب اتنی تکلیف گوارہ نہیں کرتے کہ کوئی ایسا رجسٹر رکھیں جس میں ایسے بچوں کے نام درج کئے جائیں اس لئے نہ دس بچے اکٹھے ہوں گے نہ چالیس۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اردو ٹیچر ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے دس اور چالیس کے اس فارمولے پر قطعی عمل نہیں ہو پاتا۔ میرے خیال سے فارمولا یہ ہونا چاہیئے کہ جہاں کسی زبان کے پڑھنے والے بچے ہوں وہاں پہلے ہی سے ٹیچر کا انتظام کر دیا جائے۔ فرض کر لیجئے کہ کم بچے ہیں تو وہ یا دوسرے لوگ دوسری بھاشا پڑھ لیں یا اور بچے اس بھاشا میں دلچسپی لیں تو کسی کو کوئی نقصان نہیں ہوگا اس لئے جو فارمولا آپ نے بنایا ہے اس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

۱۹۶۱ء میں چیف منسٹرز کی کانفرنس ہوئی تھی جس میں فیصلہ ہوا تھا کہ اگر کسی علاقے میں مائنورٹی کے لوگوں کی تعداد ساٹھ فی صدی ہو تو ان کی زبان کو دوسری زبان تسلیم کیا جائے۔ ساٹھ فیصدی کا مائنورٹیز سے کیا تعلق ہے۔ ۱۹۶۱ء کے اس فارمولے پر بھی نظر ثانی کی ضرورت ہے جس طرح سے مذہب اور زبان کا کوئی تعلق نہیں ہے اسی طرح بولنے والوں کی تعداد بھی بہت زیادہ اہم نہیں ہے۔ اگر گنتی سے آپ اس چیز کو الگ نہیں کرتے ہیں تو اس کا نتیجہ آپ نے ابھی دیکھ ہی لیا۔ منسٹر کمشنر کی رپورٹ ابھی کچھ مہینے پہلے آئی ہے اس میں لکھا تھا کہ ہندو اتنے ہیں مسلمان اتنے ہیں وغیرہ۔ معلوم نہیں کہ یہ اعداد و شمار دینا ان کے دائرہ اختیار میں تھا یا نہیں۔ انھوں نے حساب لگا کر بتایا تھا کہ اتنے برس میں اس مذہب کے لوگوں کی آبادی اتنی بڑھ جائے گی اور اس مذہب کے لوگوں کی اتنی کم ہو جائے گی۔ میں کہوں گی کہ جو زبانیں اپنے آئین میں شامل کریں ان کا پڑھنے والا ہو یا جاننے والا ہو یا ان میں دلچسپی لینے والا ہو تو آبادی کی گنتی کئے بغیر اس کو پڑھنے کی سہولت ملنی چاہیئے اور اس زبان کی ترقی ہونی چاہیئے۔ اردو کی مثال میں نے خاص طور پر اس لئے دی ہے کیونکہ میں خاص طور سے اس کے مسائل سے واقف ہوں لیکن یہ سوال سبھی زبانوں کا ہے۔ اور وہ گمبھیر ہے۔ چونکہ ہم اس کو اس آدھار پر نہیں لیتے ہیں اور اس کو وہ ترجیح نہیں دیتے جو دینی چاہیئے۔ اس واسطے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کبھی آسام میں مصیبت آتی ہے اور کبھی کہیں اور۔

میں آخر میں ایک بات اور عرض کرنا چاہتی ہوں کہ آپ یہ بھی دیکھیں کہ کہاں کہاں اور کس کس زبان میں سرکاری نوٹیفیکیشن ہوتا ہے۔ مجھے مدھیہ پردیش کے بارے میں معلوم ہے، اتر پردیش کے بارے میں معلوم ہے پھر مائنورٹی کے لوگوں پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ قومی دھارے میں نہیں آتے۔ جب ان غریبوں کو معلومات ہی نہیں ہوتیں ہیں تو وہ غریب آئیں کیسے؟ سیاسی جماعتوں سے بھی میری درخواست ہے کہ اپنا کام کرتے ہوئے انھیں لسانی اقلیتوں کا خیال رکھنا چاہیئے۔ اپنے پروپیگنڈے کا لٹریچر ان کی زبان میں پہنچانا چاہیئے جب تک ایسا نہیں ہوگا ہم لسانی اقلیتوں کے ساتھ انصاف نہیں کر سکیں گے۔

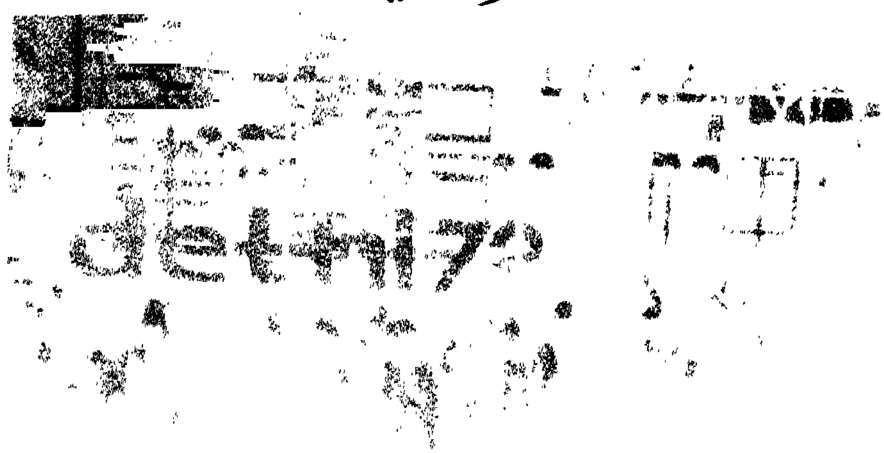
ایشیا ۷۲

دہلی کی صنعتی ترقی ایک نظر میں

دیکھنے کے لئے

ایشیا ۷۲ کے دہلی پویلین میں

تشریف لائیے



نفیس دست کاری، ہاتھ کے بنے رنگا رنگ کپڑے، بجلی اور الیکٹرونک کا عمدہ ساز و سامان اور بہت اعلیٰ مشینری

ان کے علاوہ اور بہت سی

بے مثال اور دل چسپ چیزوں

کی نمائش

دہلی کے کارخانے آپ کی تمام گھریلو ضروریات کو پورا کرتے ہیں

ڈائرکٹریٹ آف انفارمیشن اور پبلسٹی نے جاری کیا

مشترکہ سول کوڈ کی مخالفت

گرو گولوالکر کی نئی چال

— اصغر علی —

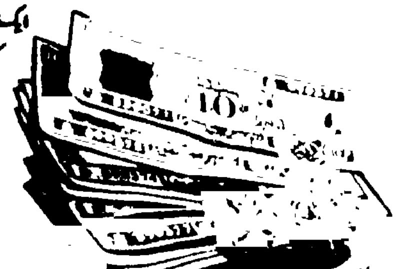
فرقہ واریت نے اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لئے گرگٹ کی طرح رنگ بدلنا شروع کر دیا ہے۔ آزادی سے پہلے اس نے دو قومی نظریئے کا روپ دھارا اور ہندو مسلم دشمنی فرقہ پرستوں کے لئے اپنے اپنے "مذہب" کے بچاؤ کا مقدس فریضہ بن گئی۔ سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والے اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ فرقہ پرستی کا تعلق مذہب سے کم اور سیاست سے زیادہ ہے۔ بدلتے ہوئے سیاسی تقاضوں کے ساتھ فرقہ پرستی کے رنگ بھی بدلتے رہتے ہیں۔ جب بھی ملک کے پچھلے ہوئے عوام کو لے کر آگے کی طرف بڑھنا چاہتا ہے، فرقہ پرست ایک نیا پینترا بدلتے ہیں اور ملک میں بحرانی صورت پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کے اعمال کا کچا چٹھا ہمارے سامنے ہے۔ جب دیش کو انگریزوں سے آزاد کرانے کی تحریک زوروں پر تھی اور عوام بدیشی آقاؤں سے نجات حاصل کرنے کے لئے اپنا سب کچھ داؤں پر لگائے ہوئے تھے، فرقہ پرست لیڈر ملک کا بٹوارہ کرانے کے لئے جوڑ توڑ کر رہے تھے اور سیاسی چالیں چل رہے تھے۔ یہ انگریزوں کے ہاتھ میں سیاسی مہرے بن کر ان کی شاطرانہ چالوں کا آلۂ کار بننا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں ملک دو ٹکڑے ہو کر آزاد ہوا اور کانگریسی سیاست کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ فرقہ واریت کا درجۂ حرارت بھی کم زیادہ ہوتا رہا۔

اس تمہید کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ ہم اس مضمون میں آر۔ ایس۔ ایس کے نظریاتی قائد شری گولوالکر کے ایک تعجب خیز حالیہ بیان کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔ ایک ذاتی ملاقات میں گرو جی نے مشترکہ سول کوڈ پر سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ میرے خیال میں قومی یک جہتی کے احساس کو بڑھاوا دینے کے لئے مشترکہ سول کوڈ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ "میرے منہ سے یہ بات سن کر" گرو جی نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "آپ میں سے کئی لوگوں کو تعجب ہوگا مگر یہ میرا خیال ہے اور میں جس بات میں سچائی دیکھتا ہوں وہی کہتا ہوں"۔ گرو گولوالکر کا یہ بیان سن کر بعض لوگوں کو واقعی حیرت ہو سکتی ہے۔ لیکن فرقہ واریت کے سیاسی تجزیہ پر نظر رکھنے والوں کے لئے یہ کوئی غیر متوقع بات نہیں ہے ہم یہاں اس بات کا تجزیہ کرنا چاہتے ہیں کہ گرو گولوالکر جی جو مسلمانوں کو زبردستی ہندیانے پر تُلے نظر آتے ہیں اور ان سے یہ مطالبہ کرتے رہے ہیں کہ وہ اپنے غیر ملکی مذہب اور اس کے قوانین و روایات کو ترک کر کے ہندو مذہب اور اس کی روایات کا احترام کرنا سیکھیں، اب کیوں مشترکہ سول کوڈ کی مخالفت کر رہے ہیں اور وہ مسلمانوں کے شرعی قوانین میں کیوں مداخلت نہیں چاہتے؟ کیا گرو جی کا ہردیہ پریورتن (دل میں تبدیلی) ہو گیا ہے؟ کیا اب وہ مسلمانوں کو ہندیانے کا تصور ترک کر چکے ہیں اور انھیں اپنے مذہبی روایات کے احترام کی آزادی کے ساتھ ہندوستان کا برابر درجہ رکھنے والے شہری مان لینے پر آمادہ ہیں؟ اس گتھی کو سلجھانا ضروری ہے۔

۱۹۶۷ء سے ملک میں ایک تبدیلی کی لہر پیدا ہوئی اور ہندوستان کے عوام میں سماج واد کے نظریئے کی مقبولیت بڑھنے لگی۔ عوام کی انھیں سماج وادی امنگوں کے دباؤ سے حکومت کو ۱۹۶۹ء میں بینکوں کو قومی ملکیت میں لینا پڑا۔ رجعت پرست طاقتوں پر یہ زبردست چوٹ تھی۔ اور وہ ترقی پسند اقدامات کی مخالفت اپنے پرانے آزمودہ حربے سے کرنا چاہتے تھے۔ فرقہ واریت ہندوستان کے فاشسٹوں کا آزمودہ حربہ ہے۔ بینکوں کو قومیانے کے بعد ہی احمد آباد میں زبردست فساد کرایا گیا اور ہندوستانی مسلمانوں سے

عورتوں کے لئے ایک نیا موقع

ایک نئی بچت اسکیم، جس کا افتتاح پردھان منتری شریمتی اندرا گاندھی نے یکم اپریل کو کیا تھا، آپ کو ایک معجز وقتی کام مہیا کرتی ہے۔ "مہلا پردھان کشیتریہ بچت یوجنا" نامی اس اسکیم کے ذریعہ آپ



- اپنے کنبے کی آمدنی بڑھا سکتی ہیں۔
- اپنے فالتو وقت کا سود مند استعمال کر سکتی ہیں۔
- سماجی میل جول کا دائرہ وسیع کر سکتی ہیں۔
- قومی خدمت انجام دے سکتی ہیں۔

مہلا بچت پردھان کی حیثیت میں آپ کا کام ہوگا:

اپنے علاقے کی گھریلو عورتوں سے ملنا
انھیں باقاعدہ بچت کرنے پر آمادہ کرنا
ہر مہینے ان کی بچت کی رقوم اکٹھی کرنا
اور انھیں مقررہ ڈاک خانہ میں جمع کرا دینا۔

اس طرح آپ جتنی رقم اکٹھی کریں گی اس پر آپ کو 2½ فیصدی کمیشن ملے گا۔

ملک بھر کے شہروں اور بڑے بڑے قصبوں میں مہلا بچت پردھان کی ضرورت ہے۔

تفصیلات کے لئے حسب ذیل پتہ پر لکھیے:

نیشنل سیونگز کمشنر
پوسٹ بکس 36
ناگپور



davp 78/79

ہندیائے جانے کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ جن سنگھ نے اقلیتوں کو ہندیانے کی ایک تجویز بھی منظور کر ڈالی۔ ہندیائے جانے سے ان کی کیا مراد تھی۔ یہ تو جن سنگھ کے نیتا بھی ٹھیک سے نہیں سمجھا سکے لیکن ہندیائے جانے کی اس تجویز کا قابل عمل حصہ اقلیتوں سے ہندو دیوتاؤں کو مقدس سمجھنے، ہندو مذہبی روایات کا احترام کرنے اور خصوصاً اپنے پرسنل لا کو ترک کر کے مشترکہ سول کوڈ کا مطالبہ کرتا تھا۔ جن سنگھی نیتا چاروں طرف سے مسلمانوں کو مشترکہ سول کوڈ ماننے پر مجبور کرنے کا شور مچانے لگے اور آبادی کے اعداد و شمار سے اپنے زعم میں یہ ثابت کرنے لگے کہ اگر مسلمانوں کو ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت قائم رہی اور انھوں نے خاندانی منصوبہ بندی پر بھی عمل نہ کیا تو بہت جلد انکی آبادی ہندوؤں کی آبادی سے بڑھ جائے گی۔ ہندوستان کے غریب اور پچھلے ہوئے عوام کو مذہب کے خانوں میں بانٹ کر آپس میں کشت و خون کرانے کے لئے رجعت پرست طاقتوں نے ان حربوں کو استعمال کیا۔ مگر عوام ان کی چالوں کو سمجھ چکے تھے اور اب وہ ان کا شکار ہونا نہیں چاہتے تھے پھر بھی عوام کی پس ماندگی اور دقیانوسی سے فائدہ اٹھا کر کہیں کہیں فرقہ وارانہ دنگے فساد کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ مگر عوام کی غریبی اور معاشی مشکلات اپنی جگہ پر تھیں۔ اس لئے دن بدن سماج وادی جڑیں مضبوط ہوتی گئیں اور رجعت پرست طاقتوں کو عام چناؤ میں منہ کی کھانی پڑی۔

رجعت پرستوں کا متحدہ محاذ

جب فرقہ پرستوں کی یہ چال بھی ناکام ہو گئی تو انہیں نئی ترکیبیں سوچنی پڑیں۔ ترقی پسند طاقتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے رجعت پرست طاقتوں نے متحدہ محاذ بنانے میں ہی اپنی خیریت سمجھی۔ ہندو فرقہ پرست اور مسلم فرقہ پرست چاہے کتنا ہی ایک دوسرے کو گالیاں دیں، ان کا مقصد ایک ہی ہے۔ سماج واد کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنا۔ یہ ایک دوسرے کو خوب اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ ہندو فرقہ پرست اگر ایک طرف ہندوستان میں ہندو قوم پرستی کا نظریہ پھیلا کر سرمایہ داروں کی لوٹ جاری رکھنا چاہتے ہیں تو دوسری طرف مسلم فرقہ پرست اور خاص طور سے جماعت اسلامی، حکومت الٰہی کا پرچار کر کے مسلمانوں کو ترقی پسند سیاسی تحریکوں اور اداروں سے الگ تھلگ رکھنا چاہتی ہے۔

مولانا مودودی کی

ہندوستانی مسلمانوں کو ہدایت

مولانا مودودی نے جو جماعت اسلامی کے نظریاتی قائد اور اس کے بانی ہیں، ۱۰ مئی ۱۹۴۷ء میں پاکستان جاتے ہوئے اپنے ماننے والوں سے کہا تھا "جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے میں ان کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ آج کل کی غیر مذہبیت (سیکولرزم) اور قومی جمہوریت کا تصور قطعاً ان کے مذہب کے خلاف ہے۔ اگر تم لوگ (مسلمان) ان کے آگے اپنا سر جھکاؤ گے تو یہ قرآن کی تعلیم کی خلاف ورزی ہوگی۔ اگر تم ان میں حصہ لوگے (سیکولر حکومت میں۔ اور اسے چلانے میں ساتھ دوگے تو تم اپنے رسول سے بے وفائی کروگے۔ اور اس کا جھنڈا ہاتھ میں اٹھاؤ گے تو یہ خدا کے خلاف بغاوت کا جھنڈا اٹھانے کے برابر ہوگا۔"

گرو جی اگر ہندوستان میں ہندو راشٹر قائم کرنا چاہتے ہیں تو مولانا مسلمانوں کو یہاں کی سیکولر حکومت میں حصہ لینے سے روکتے ہیں بلکہ وہ گرو جی کا ہندوستان میں ہندو راشٹر قائم کرنے کا حق بھی تسلیم کرتے ہیں۔ قادیانیوں کے خلاف لاہور کے فساد میں مولانا پیش پیش تھے۔ اور گرفتاری کے بعد ان پر مقدمہ چلایا گیا تھا۔ مقدمے میں جرح کرتے ہوئے جسٹس منیر نے ان سے پوچھا کہ ہندوستان میں ہندو راج قائم کرنے کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ تو مولانا نے کہا۔

> "اگر ہندوستان میں ہندو راج قائم ہو اور وہاں کے مسلمانوں کے ساتھ منو کے قانون کے مطابق شودروں اور ملیچھوں کا سا بھی برتاؤ کیا جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اگر مسلمانوں کو ہندوستان کی شہریت سے بھی محروم کر دیا جائے تو یہ قابل اعتراض نہیں۔"

مولانا کی اس بات کا شاید کئی مسلمانوں کو یقین نہ آئے مگر یہ اتنا ہی سچ ہے جتنا گرو گولوالکر جی کا مشترکہ سول کوڈ کے خلاف حالیہ بیان۔ دونوں طرف سے زور سیکولرزم کی مخالفت پر ہے۔ جن سنگھ نے مسلمانوں کے خلاف پچھلے چند سالوں میں پرسنل لا کے معاملے میں بڑا جارحانہ پروپیگنڈا کیا۔ مگر رجعت پرستوں کی حالیہ شکست نے انھیں اپنے موقف کا دوبارہ جائزہ لینے پر مجبور کر دیا۔ گرو گولوالکر جی نے اس بات کو سمجھ لیا کہ اب ہمیں مسلم پرسنل لا کی مخالفت نہیں کرنی چاہیئے بلکہ مشترکہ سول کوڈ کی، جو ایک ترقی پسند قدم ہے، مخالفت کرنا ضروری قرار دینا چاہیئے۔ سیکولرازم دونوں کا مشترک دشمن ہے اور مشترکہ سول کوڈ چونکہ سیکولرازم کی بنیاد پر کھڑا ہے اس لئے اس کی مخالفت کرنا ہی چاہیئے۔ یہ بات الگ ہے کہ ماضی قریب میں سیاسی مجبوریوں کی وجہ سے ہم نے اس کی حمایت کر دی تھی۔ اب تو رجعت پرست طاقتوں کو سماج وادی تحریک کا مقابلہ کرنے کے لئے متحدہ محاذ بنانا ہی پڑے گا اور اس سمت میں گرو جی کا مشترکہ سول کوڈ کے خلاف بیان پہلا اہم قدم ہے۔ اب جن سنگھ نے بھی ہندیانے کا نعرہ وقتی طور پر ترک کر دیا ہے۔ کہیں کہیں تو وہ حکومت سے محض سیاسی مخالفت کی بنا پر مسلمانوں کے لئے مگرمچھ کے آنسو بہانے لگتے ہیں۔ بہار میں بنگلہ دیش کے بہاری مسلمانوں کو بچانے کے لئے کنوینشن تک میں شریک ہو گئے۔ یہ کنوینشن رجعت پسند مسلمانوں کی طرف سے کیا گیا تھا اور جن سنگھ کی یہ بناوٹی ہمدردی اقلیتوں میں رجعت پرستی کی تحریک کو مضبوط بنانے کے لئے دکھائی جا رہی ہے۔ مسلم مجلس کے ڈاکٹر فریدی کی بھی آج کل آر۔ ایس۔ ایس کے ایک اہم لیڈر ناناجی دیش مکھ سے گاڑھی چھن رہی ہے۔ اگر ان فرقہ پرستوں کے دلوں کو ٹٹولا جائے تو ان پر محنت کش عوام دشمنی کی کالک پُتی ہوئی نظر آئے گی۔

صبحِ کاذب

— گوپال متّل —

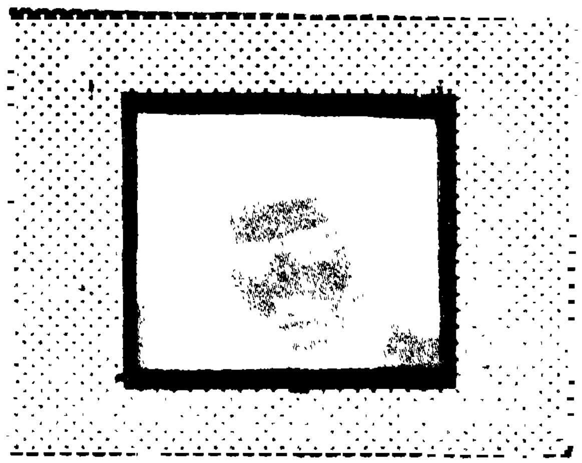


یہ جو اک نور کی ہلکی سی کرن پھوٹی ہے
کون کہتا ہے اسے صبحِ درخشاں اے دوست
مجھ کو احساس ہے، باقی ہے شبِ تار ابھی
لیکن اے دوست مجھے رقص تو کر لینے دے
کم سے کم نور نے اُٹھا تو ہے اک بار نقاب
ایک لمحے کو تو ٹوٹا ہے طلسمِ شبِ تار۔

اس سے ثابت تو ہوا صبح بھی ہو سکتی ہے
پردۂ ظلمتِ شب چاک بھی ہو سکتا ہے
صبحِ کاذب بھی تو ہے اصل میں دیباچۂ صبح
صبحِ کاذب بھی تو ہے صبحِ درخشاں کی نوید
ایک اعلان، کہ ہنگامِ وداعِ شب ہے
قافلہ نورِ سحر کا ہے بہت ہی نزدیک
جلد ہونے کو ہے خورشید درخشاں کی نمود

صبحِ آزادی

شاہد میر



عمل کے ساز پر جب نغمہ ہائے حریت بکھرا گئے ہر سو
مقدس جذبۂ حبِّ وطن ——
سرِ سر —— بنا —— ہر گوشۂ ارضِ وطن پھیلا
فسانہ حریت کا چھڑ گیا جب ہر جہت یارو!
ہتھیلی میں لئے سر اٹھ گئے کردار کے غازی

محابس۔ گولیاں۔ کوڑے۔ مشقت اور بربادی
مرے پُرکھوں نے بے حد و نہایت رنج و غم پائے
وطن کے واسطے لاکھوں نے جب اپنا بہایا خوں

تو پھر تاریخ بدلی ——
اور سینتالیس کی پندرہ اگست آئی
معاً آزاد ہونے کی نویدِ جاں فزا سن کر
دیارِ ہند میں ہر سو ہوا جشنِ چراغاں —— اور پھر
چھلکائے ہر گام لاکھوں جامِ آزادی

یہ آزادی نہ بخشش ہے نہ خلعت ——
بلکہ یہ تو اک امانت ہے
لہو سے اپنے قومِ ہند نے سینچا تھا جو پودا
اسی اک رفتگانِ وقت کے —— تاریخ و ورثہ کو ——
امانت اور عظمت کو —— کہا جاتا ہے آزادی

وفورِ جوش سے ہر رنگ مناؤ جشنِ آزادی
نہ بھولو یہ مگر کیا حصۂ اسلاف تھا اس میں؟
بلا جہد و سعی ہم پاسباں ہیں اک "گلستاں" کے
ہمارا فرض کیا ہے واضحاً اہلِ چمن سن لیں
ہمیں اس کی حفاظت کر کے
تو آئندہ نسلوں کو یہ عظمت یہ امانت ——
سونپ دینی ہے



۱

اے انجمنِ لالہ و گل حسن کی تفسیر
جنت کا تو ہے عکس کہ جنت تری تصویر
اے وادیٔ کشمیر

جلوہ ترا محبوبِ شہنشاہِ جہاں گیر
اقبال کی تخیل ترے دام کی نخچیر
اے وادیٔ کشمیر

ہر قطرۂ باراں ہے ترا کیف کا سیلاب
ہر ذرۂ خاکی ہے ترا حسن کی تصویر
اے وادیٔ کشمیر

شاداب چٹانوں میں یہ بہتے ہوئے دریا
بچ بچ کے یہ دریا ہیں کہ ہے عالم تصویر
اے وادیٔ کشمیر

فرقت زدہ عاشق سے معشوق سے جیسے
یوں ابرِ سیہ مست ہے ندی سے بغل گیر
اے وادیٔ کشمیر

جھرنوں کی ہے آواز کہ ہے اذنِ خموشی
سبزے کی خموشی ہے کہ ہے عالم تصویر
اے وادیٔ کشمیر

۲

تہذیب کے چہرے پہ بھی تاباں ہے ترا نور
فطرت کے مناظر ہی نہیں ہیں تری تصویر
اے وادیٔ کشمیر

تو ہند کے ماتھے پہ ہے اک تاجِ درخشاں
اور تاج بھی وہ تاج کہ ہے مایۂ توقیر
اے وادیٔ کشمیر

نہرو ہے ترے معدنِ معنی کا جواہر
چکبست ترے جلوۂ صد رنگ کی تنویر
اے وادیٔ کشمیر

سپرو کی زباں تیرے تمدن کا نمونہ
ملا کا سخن تیری ہواؤں کی ہے تاثیر
اے وادیٔ کشمیر

تحریرِ اثر میں ہے اثر تیری ہوا کا
ناظر کی زباں میں تری شیریں تقریر
اے وادیٔ کشمیر

حسرت ہو کہ مہجور غنی ہو کہ ہو اقبال
تیرے قلمِ کیف کی اک شوخیٔ تحریر
اے وادیٔ کشمیر

۳

چاروں طرف اس واسطے کہسار کھڑے ہیں
دیکھے نہ تری سمت کوئی دشمنِ بے پیر
اے وادیٔ کشمیر!

کہتی ہیں عدو سے یہ سیہ پوش چٹانیں
ٹکرائے گی کیا ہم سے تری خامیٔ تدبیر
اے وادیٔ کشمیر!

دشمن وہ ترا کوئی نیا ہو کہ پرانا
تو اُس کے مقابل میں ہے سونتی ہوئی شمشیر
اے وادیٔ کشمیر

کیوں اس کا تجھے خوف ہو کیوں اس کا تجھے ڈر
وہ چال نئی ہو کہ پرانی کوئی تزویر
اے وادیٔ کشمیر

۴

جو ڈل پہ چمکتا ہے پہاڑوں سے اُبھر کر
بن جا اسی خورشیدِ جہاں تاب کی تنویر
اے وادیٔ کشمیر

مہکے ترے باغوں کا شباب اور زیادہ
کچھ اور فزوں تیری بہاروں کی ہو تاثیر
اے وادیٔ کشمیر

آباد ہو کچھ اور ترا درد دلوں میں
کچھ اور دماغوں میں ہو پختہ تری توقیر
اے وادیٔ کشمیر

تاثیر وہ اک تری ہواؤں کو ملی ہے
جو خاک کو تریاق کرے زہر کو اکسیر
اے وادیٔ کشمیر

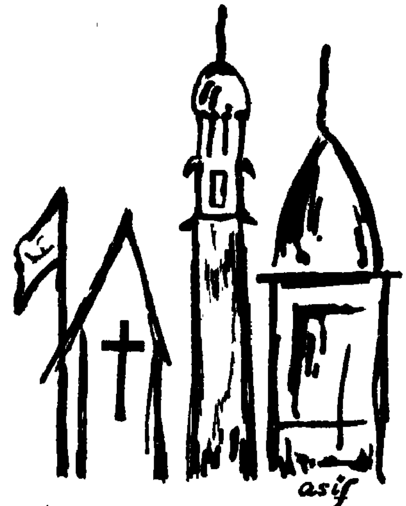
۵

چاندی کے ہیں نالے ترے سونے کے ہیں کہسار
اے کاش! اسی طرح ہو روشن تری تقدیر
اے وادیٔ کشمیر

اللہ کرے جلد وہ دن آئے کہ جس دن
چمکے تری دنیا پہ مرے فکر کی تنویر
اے وادیٔ کشمیر



اتحاد زندہ باد



ساحر بھوپالی

دھوم ہے جمہوریت کی از زمیں تا آسماں   چپّے چپّے کو بنا دو ہند کے جنّت نشاں
بچّہ بچّہ ملک کا ہے آج اس کا پاسباں   زندہ باد ہندوستاں ، پائندہ باد ہندوستاں

راس آئے یہ زمانہ حُریت کا ہند کو !
ہو مبارک دور یہ جمہوریت کا دوستو!

بوجھ آزادی کا اب مل کر اٹھانا ہے تمہیں   کام جو مشکل ہے وہ کرکے دکھانا ہے تمھیں
قوم کے ہر فرد کو جینا سکھانا ہے تمہیں   جھیل کر صدموں پہ صدمے مسکرانا ہے تمھیں

سُن کے گر سمجھو تو یہ سو بات کی اک بات ہے
دل نہ ہو روشن تو پھر دن بھی اندھیری رات ہے

خون سے سینچو چمن کو اور اَمر پاؤ بہار   قوم پر اپنی فدا ہر دم رہو دیوانہ وار
لاج اگر بھارت کی رکھنا ہے تو ہو جاؤ نثار   کھول کر کانوں کو سُن لو وقت کی ہے یہ پکار

قوم کی سیوا سے ہرگز منہ نہ اپنا موڑنا
جان بھی جائے مگر تم ایکتا مت چھوڑنا

آج قائم یہ ہمالہ ایکتا کے دم سے ہے   ذرّہ ذرّہ مل کے صحرا ایکتا کے دم سے ہے
قطرہ قطرہ مل کے دریا ایکتا کے دم سے ہے   آدمی کا بول بالا ایکتا کے دم سے ہے

مٹ گئی وہ قوم بھی جس نے کہ چھوڑا اتحاد،
زندہ باد اے اتحاد! اے وجہ ہستی زندہ باد!

ایکتا جس قوم میں ہے بے جگر ہے ایسی قوم   ساری دنیا کے لئے اک راہ بر ہے ایسی قوم
جذبۂ قومی ہے جس میں باا‌ثر ہے ایسی قوم   جس کے قبضے میں ہے یہ طاقت اَمر ہے ایسی قوم

کوئی فتنہ اس کے آگے سر اُٹھا سکتا نہیں
کوئی ایسی قوم کو ہرگز مٹا سکتا نہیں



کیا یہ کہنا ٹھیک ہے کہ زیادہ بچے ہوں تو مستقبل میں آمدنی بھی زیادہ ہوگی؟

اکثر کہا جاتا ہے کہ ہر بچّہ اپنے ساتھ دو ہاتھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ آدمی کھاتا پیتا تو ساری عمر ہے لیکن خوراک پیدا کرنے کا کام زندگی کے کچھ حصّے میں ہی کر سکتا ہے۔

نئے طریقوں سے ہم پیداوار بڑھا سکتے ہیں لیکن ان طریقوں کے استعمال کے لئے بہتر تعلیم اور مہارت کی ضرورت ہے۔

ایک تعلیم یافتہ شخص زندگی میں بالآخر زیادہ کامیاب رہتا ہے۔

اگر آپ کے زیادہ بچے ہوں گے تو آپ کو اُنھیں اچھی تعلیم اور بہتر خوراک دینے میں دقّت پیش آئے گی۔

محدود تعداد میں پڑھے لکھے اور صحت مند بچے زیادہ تعداد میں اَن پڑھ اور کمزور بچوں کی نسبت زیادہ کما سکیں گے۔

davp 76/304

فرقہ پرستی کے جراثیم

۔ بصیر نعیمی ۔

جب بھی فرقہ پرستی کا ذکر آتا ہے ہمارے ہندوستانی دانش ور سارا الزام انگریزوں کے سر تھوپ کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ چلو ہم نے فرقہ پرستی کے جنم پر روشنی ڈال دی۔ اپنے جرم کو دوسرے کے سر منڈنے سے انصاف کا تقاضا تو پورا نہیں ہو جاتا ہے۔ بعض باہمت صحافی اور لیڈر چند سیاسی پارٹیوں کو فرقہ پرستی کا جنم داتا بنا کر تمام الزامات سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ کسی نے کہا کہ جن سنگھ اور آر۔ ایس۔ ایس قسم کی جماعتیں ہندوستان میں فرقہ پرستی کا زہر اگل رہی ہیں۔ یہ جماعتیں اپنے مقصد کے لئے معصوم ہندوستانیوں کی زندگیوں سے کھیل رہی ہیں۔ یہ بات کسی حد تک درست ہو سکتی ہے لیکن فرقہ پرستی کی تمام تر ذمہ داری ان جماعتوں پر عائد کر دینا درست نہیں ہے۔ دوسری طرف کچھ لوگ مسلم لیگ جیسی جماعتوں کو فرقہ پرستی کی بنیاد بتاتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ہندو اور مسلمان دونوں کی چند ایسی جماعتیں ہیں جو فرقہ پرستی کا بیج بو رہی ہیں۔ لیکن اگر ہم غور سے دیکھیں تو ان جماعتوں کا اثر عوام پر بالکل اسی طرح پڑتا ہے جس طرح نزلہ زکام یا کھانسی کے جراثیم کمزور لوگوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ مرض کے بارے میں ڈاکٹر بتاتے ہیں کہ انسان کے جسم میں نزلہ یا زکام کے جراثیم موجود ہوتے ہیں اور جب ان جراثیم پر باہری ماحول یعنی خراب آب و ہوا کا اثر پڑتا ہے تو یہ طاقت ور ہو جاتے ہیں اور انسان بیمار ہو جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان کے جسم میں اگر بیماری کے جراثیم پہلے سے موجود نہ ہوں اور انسان کا جسم مکمل طور پر صحت یاب اور تندرست ہو تو خراب موسم اس پر ذرا بھی اثر انداز نہیں ہو سکتا ہے اور وہ بیمار نہیں ہو سکتا۔

بالکل یہی حالت فرقہ پرستی کے جراثیم کی بھی ہے اگر انسان کے جسم میں پہلے سے ہی فرقہ پرستی کے جراثیم نہ ہوں تو ان بدنام جماعتوں کا پیدا کردہ زہریلا ماحول ان پر ذرا بھی اثر نہیں کر سکتا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ فرقہ پرستی کے جراثیم ابتدا سے ہی عوام کے جسموں میں موجود ہوتے ہیں اور بدنام جماعتیں صرف ان جراثیم کو طاقت پہنچا کر عوام کو فرقہ پرستی کا مریض بنا دیتی ہیں۔ اور یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ابتدا میں انسانی جسم میں یہ جراثیم کس طرح پیدا ہوئے؟

بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو وہ انتہائی معصوم ہوتا ہے اس کو برے بھلے کی ذرا بھی تمیز نہیں ہوتی ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتا ہے یا محسوس کرتا ہے وہی سب کچھ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک مشہور فلاسفر غالباً ڈیکارٹس نے لکھا ہے کہ "بچہ کا ذہن ایک سادہ سلیٹ کی مانند ہوتا ہے اس پر کچھ بھی لکھا جا سکتا ہے اور ایک بار اس سلیٹ پر جو کچھ لکھ دیا جاتا ہے انھیں نقوش پر بچہ زندگی کے مراحل طے کرتا ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ یہ نقوش گہرے ہوتے جاتے ہیں۔" بچہ جو کچھ بھی ابتدائی دور میں سیکھتا ہے اسے تاعمر فراموش نہیں کر پاتا ہے۔ اور انھیں تاثرات کو اپنی آنے والی زندگی کے لئے مشعل راہ بناتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ بچہ کا ذہن اچھی اور نیک باتوں کے مقابلہ میں برائی کی سمت جلد راغب ہو جاتا ہے مثال کے طور پر اسے عبادت کے طریقے بار بار سکھائے جاتے



ہیں یا مذہبی باتیں بار بار ذہن نشین کرائی جاتی ہیں اور بچہ بمشکل تمام ان کو سیکھ پاتا ہے اس کے مقابلہ میں گھر کے باہر گندی باتیں یا فلمی گانے اسے جلد یاد ہو جاتے ہیں اور اپنے ننھے سے ذہن پر زور ڈال کر وہ ان کا مطلب بھی نکالنا چاہتا ہے۔

آیئے اب ذرا دیکھیں کہ ہندوستان میں بچہ کی تعلیم کس طرح شروع ہوتی ہے؟ ابتدائی کتب جو حکومت کی منظور شدہ ہوتی ہیں۔ ان کے مضامین پر شاید حکومت کے نامزد نمائندے زیادہ غور نہیں کرتے ہیں۔ بچہ جب کتاب کھولتا ہے تو پڑھتا ہے کہ "کئی سال پہلے ہندوستان پر ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ اس مسلمان بادشاہ کا نام جلال الدین محمد اکبر تھا۔ اکبر بہت اچھا بادشاہ تھا اس کے دور میں ہندو مسلم ایک ساتھ مل جل کر رہتے تھے وغیرہ وغیرہ۔" یہ پڑھ کر بچہ کے ذہن میں مسلمان بادشاہ کا ایک اچھا خاکہ بنتا ہے۔ اس کے بعد وہ اگلا مضمون پڑھتا ہے کہ "مہارانا پرتاپ وہ بہادر ہندو تھے جنھوں نے اپنے ملک کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ بادشاہ ان کے خون کا پیاسا تھا۔ مہارانا پرتاپ جنگلوں میں چھپ کر رہتے تھے وطن کی آزادی کے لئے انھوں نے اپنا خون بہا دیا۔ وغیرہ وغیرہ۔" یہ پڑھ کر بچہ کا ننھا سا ذہن کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ایک طرف وہ مسلمان بادشاہ کی بہادری کی کہانی پڑھتا ہے دوسری طرف ایک ہندو وطن پرست کی اسی سے جنگ کرنے کے بارے میں پڑھتا ہے اور سوچنے لگتا ہے تو کیا مسلمان بادشاہ ہندوستان کا دشمن تھا؟

اور پھر جب وہ شیوا جی یا امر سنگھ راٹھور کی بہادری کی کہانیاں پڑھتا ہے تو یہ بات اس کے ذہن میں نقش ہو جاتی ہے کہ ہندو ہمیشہ مسلمانوں سے لڑتے رہے اور مسلمانوں نے سدا ہندوؤں پر مظالم ڈھائے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مہارانا پرتاپ اور شیوا جی ہندوستان کے مایہ ناز سپوت تھے اور ان کے بارے میں بچوں کو ضرور بتانا چاہیئے لیکن ان جانبازوں کو فرقہ پرستی کے لباس میں پیش کرنا ایک عظیم خطرہ ہے جو آگے چل کر تمام نسل کو تباہ کر سکتا ہے۔ اس لئے بہتر ہے کہ ہندو

مسلمانوں کے بزرگوں کی داستانوں کو اس طرح ہرگز نہ پیش کیا جائے جس سے دونوں میں اختلاف نظر آئے بچہ کے ذہن میں اگر ابتدا ہی سے یہ بات بیٹھ جائے کہ ہندو مسلم تو ہمیشہ سے ہی ایک دوسرے کے دشمن رہے ہیں۔ اس لئے مسلمانوں سے یا ہندوؤں سے لڑنا بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلنے کے مترادف ہے تو اس کا جو نتیجہ ہوگا وہ سامنے ہے۔ اور یہ ہماری لاپرواہی ہے کہ ابتدائی کتب میں ایسے کتنے ہی اسباق نظر آتے ہیں جو ہندو مسلم اختلاف کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان اسباق کو پڑھ کر جو انسان جوان ہوا ہو اس پر اگر بدنام جماعتوں کے لیڈروں کی فرقہ پرستی سے بھری تقاریر جلد اثر کر دیتی ہیں تو اس میں تعجب کیسا؟

دوسری بات ہمارے قومی ترانے سے تعلق رکھتی ہے۔ قومی ترانہ کسی بھی ملک کا ہو دل پر اثر کرتا ہے اور انسان حب وطن کے جذبے سے سرشار ہو جاتا ہے۔ ہمارا قومی ترانہ بھی دل پر اثر کرتا ہے۔ لیکن ایک بچہ جب "جن گن من ......" سنتا ہے تو پورے غور سے اس کے مطلب کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ترانے میں ایک لفظ "سندھ" آتا ہے بچہ جب ہندوستان کے نقشے میں سندھ تلاش کرتا ہے تو اسے کہیں نظر نہیں آتا ہے۔ وہ اپنے بزرگوں سے سوال کرتا ہے اور بزرگ کہہ دیتے ہیں کہ بیٹا سندھ ہندوستان میں نہیں پاکستان میں ہے۔ یہ سن کر بچہ غور و خوض کے سمندر میں ڈوب جاتا ہے کہ ایک ایسا علاقہ جو ہمارے ملک میں نہیں ہے مگر اس کا نام ہمارے قومی ترانے میں آتا ہے۔ اور پھر بچہ جب پاکستان کی کہانی سنتا ہے تو اس کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ہندوستان کے مسلمان اپنا حصّہ پاکستان کی شکل میں لے چکے تو پھر وہ ہندوستان میں کیوں رہتے ہیں؟ اس سوال کا جواب اگر غیر جانب داری سے نہ دیا جائے تو نتیجہ فرقہ پرستی کے جراثیم کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور اگر بچہ کے ذہن میں یہ بات گھر کر جائے کہ مسلمانوں نے وطن کے ٹکڑے کر دیئے ہیں اور اب ان کا ہندوستان پر کوئی حق نہیں ہے تو وہ جب بھی قومی ترانہ سنے گا "سندھ" کے لفظ پر اس کے دل پر ایک تیر سا لگے گا اور پاکستان وجود میں آنے کی دردناک کہانی اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے گی اسی کے ساتھ مسلمانوں سے نفرت کا زہر اس کے دل میں جوالا مکھی کی طرح اُبل پڑے گا اور اس طرح سے ہمارا قومی ترانہ ہی ہمارے لئے فرقہ پرستی کی بنیاد بن جاتا ہے۔ کتنے لطف کی بات ہے کہ وہ لوگ جو مسلمانوں پر الزام لگاتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمان ہندوستان میں رہ کر پاکستان کے گیت گاتے ہیں وہ خود ہی ہندوستانی قومی ترانے کے ذریعہ پاکستان کے ایک علاقے سے خود کو منسوب کرتے ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ جب بھی کہیں فساد ہوتا ہے تو گھروں میں عام طور پر اس موضوع پر بحث ہوتی ہے۔ بچہ بھی اس بحث کو سنتا ہے اور جب ان فسادات کی کہانی کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا ہے تو بچہ کا معصوم دل یہ مظالم سن کر لرز اٹھتا ہے اور اس کے ذہن میں دوسرے فرقہ کے لئے نفرت کا بیج پڑ جاتا ہے اور وقت کے ساتھ اس بیج سے کونپل پھوٹ کر پودا بنتا ہے اور پھر درخت۔ آگے چل کر اس درخت کی شاخیں پورے وجود پر چھا جاتی ہیں۔

ایک طرف جہاں ہماری حکومت کا فرض ہے کہ وہ تمام فرقہ پرست جماعتوں اور اخباروں پر پابندی عائد کرے وہاں دوسری طرف اس کو ابتدائی جراثیم کو روکنے کے لئے بھی کوئی ٹھوس قدم اٹھانا چاہیئے۔ اگر ابتدا سے ہی بچہ کے ذہن میں فرقہ پرستی کے جراثیم کی پیدائش کو روک دیا جائے تو فرقہ پرست جماعتوں کی تقاریر کا اتنا زیادہ اثر لوگوں پر نہیں پڑے گا جتنا کہ اب پڑتا ہے۔ اور اگر ابتدائی تعلیم کی خامیوں کو بھول کر صرف فرقہ پرست جماعتوں پر ہی پابندی عائد کی جائے تو ایسا ہی ہے جیسے کسی درخت کی جڑ میں پانی دینے کے بجائے اس کے پتوں پر پانی ڈالا جائے وہ درخت بھلا کیا پھلے پھولے گا جس کی جڑ میں پانی کی ایک بوند بھی نہ پہنچے۔

اس سلسلہ میں ابتدائی کتب سے ایسے تمام اسباق نکال دیئے جائیں جن سے ذرا بھی فرقہ پرستی کی بو آتی ہو ان کی جگہ قومی یک جہتی کے متعلق اسباق شامل ہونے چاہیئے ایسے بزرگوں کی کہانیاں منتخب ہونی چاہئیں جن کا مقصدِ حیات قومی یکجہتی تھا جیسے مہاتما گاندھی، سرسید احمد خاں پنڈت جواہر لال نہرو وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ پرائمری اسکولوں میں حکومت کی طرف قومی یک جہتی پر لکھی گئی کتب تقسیم ہونی چاہیئے۔ ہندوستان سے شائع ہونے والے بچوں کے رسالوں کے لئے لازمی ہو کہ وہ ایک دوسرے کے بزرگوں کے بارے میں معلوماتی مضامین شائع کریں اور اپنے رسالوں میں قومی یکجہتی پر مبنی کہانیاں شامل کریں۔

فلموں کا بھی ذہنوں پر بہت اثر پڑتا ہے اس لئے فلموں کے لئے بھی یہ لازم قرار دیا جائے کہ ایک فلم میں ہندوستان میں بسنے والے زیادہ سے زیادہ فرقوں کی ترجمانی کی جائے۔ ایک فلم جس کے کردار ہندو ہوں اس میں ایک اچھا مسلم کردار اور جس فلم میں مسلم کردار ہوں اس میں ایک اچھا ہندو کردار بھی شامل کیا جائے فلم جس میں سینکڑوں کردار ہوتے ہیں ان میں اگر ہندو مسلم سکھ عیسائی پارسی وغیرہ تمام کردار پیش کئے جائیں تو قومی یک جہتی کو تقویت پہنچ سکتی ہے۔ ایسی تمام فلموں پر بھی پابندی عائد ہونی چاہیئے جن میں کسی مسلمان کو ہندو کا یا کسی ہندو کو مسلمان کا دشمن دکھایا گیا ہو چاہے اس کا تعلق تاریخ ہی سے کیوں نہ ہو۔

بہتر تو یہ ہے کہ تاریخ سے ایسے تمام واقعات و کردار نکال دیئے جائیں جو فرقہ پرستی کی تعلیم دیتے ہوں۔ سرکاری اسکولوں میں کسی ایک مذہب یا دھرم کی تعلیم تمام بچوں کو نہ دی جائے۔ اس سے آپسی اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔ مذہبی تعلیم گھروں پر یا پرائیویٹ اداروں ہی تک محدود رہنی چاہیئے جس طرح ہم جنسیات کے موضوع پر بچوں کے سامنے گفتگو سے احتراض کرتے ہیں اسی طرح فسادات جیسے کے موضوع پر بھی بچوں کے سامنے گفتگو نہ کریں۔

اگر ابتدا سے ہی بچہ کے ذہن کو فرقہ پرستی کے زہر سے دور رکھا جائے تو آنے والے دور میں فرقہ پرستی دور ہو سکتی ہے۔ اور یہی ایک ایسا راستہ ہے جو ہندوستان سے فرقہ پرستی کی وبا کو ختم کر سکتا ہے۔ اگر ہم نے اس گمبھیر مسئلہ کو سلجھانے کی کوشش نہ کی اور اس میں الجھ کر رہ گئے تو پھر یہی کہا جائے گا کہ ؎

اپنی ہستی کا بھی انسان کو عرفاں نہ ہوا
خاک پھر خاک تھی اوقات سے آگے نہ بڑھی

[redacted]

اہلِ کتاب کا مسئلہ



عبداللطیف اعظمی

موقر ماہنامہ "سیکولر ڈیموکریسی" کی پچھلی اشاعت بابت ماہ نومبر میں میرا ایک مضمون "اہل کتاب۔ ایک سمینار کی رپورٹ" شائع ہوا ہے۔ یہ مضمون بنیادی طور پر ایک سمینار کی بحث و گفتگو کی معروضی رپورٹ ہے، جیسا کہ عنوان سے بھی ظاہر ہے، مگر موقر روزنامہ "الجمعیۃ" کے مدیر شہیر مولانا محمد عثمان فارقلیط نے، جو اردو کے بزرگ ترین صحافیوں میں سے ہیں اور جن کی میرے دل میں بڑی قدر و منزلت ہے، غلطی سے اپنے اس اداریہ کا جواب سمجھ لیا جو ۸ر اکتوبر کے شمارے میں شائع ہوا ہے اور ساتھ ہی اس کا جواب دینا بھی ضروری سمجھا، چنانچہ میرے مختصر مضمون کا دو اداریوں کے ذریعہ جواب دیا ہے، جو ۱۲ر اور ۱۳ر نومبر کی اشاعتوں میں شائع ہوئے ہیں۔ پہلے اداریے کا عنوان ہے "اہل کتاب ـــ ایک قابل غور مسئلہ" دوسرے کا عنوان ہے "تحقیقات کی نادر مثالیں"۔ مگر پُر لطف بات یہ ہے کہ بات جہاں تھی وہیں رہی، نہ کوئی بات صاف ہوئی اور نہ ایک انچ بھی آگے بڑھی۔ مولانا نے سمینار میں شرکت کرنے والوں کے بارے میں لکھا ہے کہ "ایک فضول مسئلے پر دماغ سوزی کی"۔ اگر مولانا کے نزدیک یہ مسئلہ واقعی فضول تھا تو انھیں تین تین اداریے لکھنے کی ضرورت کیا تھی؟ معاملات یہیں پر ختم نہیں ہوگئے ہیں۔ مولانا نے اپنے قارئین سے کہا ہے کہ "کوئی اہلِ علم کچھ لکھنا چاہیں تو اسے "الجمعیۃ" کے صفحات میں ضرور جگہ دی جائے گی"۔ مجھے بھی بڑی خوشی ہوگی اگر اس مسئلے پر کوئی اہلِ علم لکھیں اور صحافتی انداز میں نہیں جس طرح مولانا فارقلیط نے لکھا ہے بلکہ علمی اور معروضی انداز میں۔ لکھنے والے صاحب "سیکولر ڈیموکریسی" کے مضامین ضرور ملاحظہ فرمائیں جو اکتوبر کے شمارے میں شائع ہوئے ہیں اور سمینار کی وہ رپورٹ بھی جو "سیکولر ڈیموکریسی" کے سالنامہ میں شائع ہوئی ہے۔

قرآن توریت اور انجیل کی تصدیق کرتا ہے

اہل کتاب کے مسئلے پر ۲ر اور ۳ر اکتوبر کو حضرت نظام الدین (نئی دہلی) میں جو سمینار منعقد ہوا تھا اس میں مسلم اور ہندو اسکالر اور علمار کے علاوہ ایک امریکی عیسائی پادری، مسٹر پال جیکسن نے بھی شرکت کی تھی۔ موصوف نے سمینار کے شروع ہونے سے پہلے مجھ سے پوچھا کہ اس سمینار میں کن مسائل پر بحث و گفتگو ہوگی؟ انھوں نے فرمایا کہ میں نے اخبار میں سمینار کا موضوع دیکھ کر یہ سمجھا کہ عیسائیوں کے بارے میں گفتگو ہوگی اس لئے میں آیا ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ یہود و نصاریٰ کو تو ہر مسلمان اہل کتاب سمجھتا ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے، اصل مسئلہ یہ ہے کہ دوسری قوموں کو جن کی آسمانی کتابوں کا قرآن میں ذکر نہیں ہے ان کو کس میں شمار کیا جائے، آیا اہل کتاب میں یا مشرکین اور کفار میں؟ مگر مجھے سخت تعجب ہوا جب بعض لوگوں نے یہود و نصاریٰ کو بھی اہل کتاب ماننے سے انکار کر دیا۔ سمینار میں جن لوگوں نے یہ مسئلہ اٹھایا تھا کہ یہود و نصاریٰ بھی اہل کتاب نہیں ہیں، ان کا روایتی علمار میں شمار نہیں ہوتا ہے۔ سمینار کے چند دنوں کے بعد ۶ر اکتوبر کا "صدق جدید" لکھنؤ موصول ہوا تو اس میں مولانا محمد عثمان فارقلیط صاحب کا مضمون "موجودہ انجیلوں کی اصل کہاں ہے؟" نظر سے گزرا تو اور زیادہ حیرت ہوئی، کیونکہ مولانا فارقلیط کا شمار روایتی علمار میں ہوتا ہے اور ان کے بارے میں یہ نہیں سوچا جا سکتا تھا کہ قرآن کریم کی تعلیمات پر ان کی نظر نہیں ہوگی۔ اسی لئے سمینار کی رپورٹ لکھتے ہوئے میں نے اس مضمون کا بھی ذکر ضروری سمجھا۔ کچھ اس لئے کہ سمینار کے فوراً بعد شائع ہوا تھا، زیادہ تر اس لئے کہ سمینار کے موضوع سے اس کا تعلق تھا۔ مگر جب مولانا فارقلیط صاحب نے میرے مضمون کا جواب دیا تو اس مضمون کو نظر انداز کرتے ہوئے اس مضمون کا ذکر فرمایا جو صدق جدید ہی میں ۱۲ر اپریل اور ۵ر مئی ۱۹۷۴ء کی اشاعتوں میں شائع ہوا تھا اور جس کا عنوان تھا "کیا قرآن کریم موجودہ اناجیل کا مصدق ہے؟" اتفاق سے مولانا کا یہ مضمون میری نظر سے نہیں گزرا تھا، ان کے حوالے کے بعد میں نے اسے پڑھا اور اس کو پڑھنے کے بعد زیادہ آسانی اور صفائی کے ساتھ مولانا کا ذہن سمجھ میں آگیا۔ ان مضامین میں مولانا کا انداز بالکل مناظرانہ ہے۔ جواب بالکل متروک ہو چکا ہے اور جسے کسی لحاظ سے بھی آج اچھا نہیں سمجھا جاتا، نیز مولانا کی معلومات کم از کم پچاس سال پرانی ہیں، حالات اور خیالات میں بڑی تبدیلی آئی ہے، مسلمانوں کے بھی اور عیسائیوں کے بھی، مگر مولانا ان سے بالکل بے خبر معلوم ہوتے ہیں۔ مگر سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ قرآن کریم میں متعدد آیتیں ہیں جن میں صاف صاف کہا گیا ہے کہ قرآن، توریت، انجیل اور قرآن سے قبل جتنی الہامی کتابیں نازل ہوئی ہیں ان سب کی تصدیق کرتا ہے، لیکن مولانا نے اپنے مضمون میں ان میں سے کسی آیت کا ذکر نہیں کیا ہے اور ثابت یہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ "قرآن کریم موجودہ اناجیل کا مصدق" نہیں بلکہ "مکذب" ہے" اس تحقیق انیق کا اختتام ان الفاظ پر ہوا ہے "پس عیسائی صاحبان کا یہ دعویٰ کہ قرآن کریم موجودہ اناجیل کا مصدق ہے، غلط ثابت ہوا اور ثابت ہوا تو یہ کہ قرآن کریم موجودہ اناجیل کا مکذب ہے"۔ مولانا نے اتنا بڑا فیصلہ کر دیا اور اپنے اس فیصلے کو قرآن حکیم کی طرف منسوب کر دیا، مگر ان آیتوں میں سے کسی کا بھی پورے مضمون میں ذکر کرنے کی زحمت نہیں فرمائی جن میں قرآن حکیم نے توریت، انجیل اور گزشتہ تمام آسمانی کتابوں کی تصدیق

کی ہے۔ ان متعدد آیتوں میں سے صرف تین آیتوں کے ترجمے ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں۔ یہ ترجمے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تفسیر "تفہیم القرآن" سے ماخوذ ہیں قوسین کی عبارت راقم الحروف کی ہے ملاحظہ ہو۔

(۱) سورۂ بقرہ، آیت نمبر ۴۱

(بنی اسرائیل سے خطاب کرتے ہوئے) "اور میں نے جو کتاب بھیجی ہے اس پر ایمان لاؤ۔ یہ اس کتاب کی تائید میں ہے جو تمہارے پاس پہلے سے موجود تھی۔"

(تفہیم۔ جلد اول۔ صفحہ ۶۷)

(۲) سورۂ بقرہ۔ آیت ۹۱

"حالانکہ وہ (قرآن) حق ہے اور اس تعلیم کی تصدیق و تائید کر رہا ہے جو ان کے ہاں (بنی اسرائیل) پہلے سے موجود تھی۔" (تفہیم۔ جلد اول، صفحہ ۹۴)

(۳) سورۂ آل عمران، آیت ۳

"اس نے (اللہ) تم پر یہ کتاب (قرآن) نازل کی جو حق لے کر آئی ہے اور ان کتابوں کی تصدیق کر رہی ہے جو پہلے سے آئی ہوئی تھیں، اس سے پہلے وہ انسانوں کو ہدایت کے لئے توریت اور انجیل نازل کر چکا ہے۔"

(تفہیم۔ جلد اول، صفحہ ۲۳۱)

مذکورہ بالا تینوں آیتوں سے صاف واضح ہے کہ نہ صرف توریت اور انجیل کی بلکہ نزولِ قرآن سے قبل جتنی اور دنیا کے کسی حصے میں بھی کوئی آسمانی کتاب نازل ہوئی ہے، ان سب کی قرآن حکیم تائید و تصدیق کرتا ہے بلکہ مولانا مودودی کے الفاظ میں تصدیق کر رہا ہے۔ مگر مولانا فارقلیط فرماتے ہیں کہ قرآن موجودہ اناجیل کی صریح نہیں تکذیب کرتا ہے۔ ایسا شاید انھوں نے اس لئے لکھا ہے کہ ان کے خیال میں موجودہ اناجیل وہ نہیں ہے جو نزولِ قرآن کے وقت تھیں۔ مگر جیسا کہ میں اپنے پچھلے مضمون میں لکھ چکا ہوں کہ مسٹر پال جیکسن اس کی تردید کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ مولانا مودودی سورۂ آلِ عمران آیت نمبر ۵۰ کی تفسیر کے سلسلے میں لکھتے ہیں "یہ بات کہ علیہ السلام وہی دین لے کر آئے تھے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دوسرے انبیاء نے پیش کیا تھا اور اگر الوقت اناجیل میں بھی واضح طور پر نہیں ملتی ہے۔ مثلاً متی کی روایت کے مطابق پہاڑی کے وعظ میں مسیح علیہ السلام صاف فرماتے ہیں:۔

"یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں، منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں۔" (۵ : ۱۷)

(تفہیم القرآن۔ صفحہ ۲۵۳)

لیکن بفرضِ محال مولانا فارقلیط کی یہ نادر تحقیق مان لی جائے کہ موجودہ اناجیل وہ نہیں ہیں جو آنحضرت کے زمانے میں تھیں تو جب نزولِ قرآن کے وقت جو چیز تھی ہی نہیں قرآن اس کا مکذب کیونکر ہو سکتا ہے؟

شبہ اہل کتاب اور مشرک و کافر کی مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے جو تعریف کی ہے اسے بھی ملاحظہ فرمالیں۔ مولانا مرحوم نے سیرۃ النبی حصہ چہارم میں ان کی حسب ذیل تعریف کی ہے۔

سانپ

آوارہ سلطان پوری

کچھ کتابوں کے حوالے اور کچھ عقلی دلیل
ایک مولانا نے اپنے وعظ میں ثابت کیا
آج کا انسان بالکل سانپ کی مانند ہے
ہو چکی مجلس تو اُن سے پوچھ بیٹھا ایک شخص
آپ نے جو کچھ کہا وہ ٹھیک ہے لیکن حضور
بھول کر بھی سانپ سانپوں کو کبھی ڈستے نہیں

"شبہ اہلِ کتاب۔ یعنی وہ لوگ جو قرآن اور توریت و انجیل و زبور کو نہیں مانتے، مگر وہ خود اپنے لئے کسی آسمانی کتاب پر ایمان لانے کے مدعی ہیں جیسے صابی جو ایک آسمانی کتاب کے دعوے کے باوجود ستاروں کو پوجتے تھے اور مجوسی یعنی پارسی جو ایک آسمانی کتاب کا دعویٰ کرتے ہیں اور ساتھ ہی سورج اور آگ اور دیگر مظاہر قدرت کی پرستش کرتے ہیں۔ ترکستان اور سندھ کے موقع پر علمائے اسلام نے انھیں پر قیاس کر کے ہندوؤں اور بودھوں وغیرہ کو بھی اسی صف میں داخل کیا۔"

"کفار اور مشرکین۔ جن کے پاس نہ کوئی آسمانی کتاب ہے اور نہ وہ کسی دین الٰہی کی طرف منسوب ہیں۔"

(صفحہ ۴۷۰ و ۴۷۱ مطبوعہ ۱۹۳۲ء)

مولانا فارقلیط اور ان لوگوں کی توجہ جو ہندوؤں کو مشرکوں اور کافروں میں شمار کرتے ہیں۔ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث رحمۃ اللہ علیہ کے ایک فتوے کی طرف منعطف کرانا چاہتا ہوں جس میں انھوں نے فرمایا ہے کہ ہندو بنیادی طور پر موحد تھے۔ مگر بعد میں ان میں شرک اور بت پرستی رائج ہو گئی۔ جس طرح مسلمانوں کے بعض فرقوں اور افراد میں شرک اور ضلالت پیدا ہو گئی ہے۔ فتوے کے آخر میں وہ لکھتے ہیں:۔

"الغرض ہندوؤں کے اوتار مظاہر حق تھے، خواہ وہ انسانوں میں سے رہے ہوں یا وہ از قبیل شیر و ماہی رہے ہوں۔ جیسے عصائے موسیٰ اور ناقۂ صالح، لیکن قوم کے عوام اپنی کم فہمی کے سبب مظہر اور ظاہر میں فرق نہ کر سکے اور سب کو معبود بنا لیا اور اس طرح گمراہی اور ضلالت میں جا پڑے۔ یہی حالت مسلمانوں کے بہت سے فرقوں کی ہے جیسے تعزیہ بنانے والے، مزارات کے مجاور اور جلالی و مداری فرقے کے لوگ۔"

(مجموعۂ فتاویٰ عزیزی مطبوعہ ماہ شوال ۱۳۱۱ھ صفحہ ۱۴۱)

شاہ عبدالعزیز محدث کا یہ فتویٰ مذاہبی فکر کی راہ میں ایک نیا موڑ پیش کرتا ہے، خاص کر ان کا یہ ارشاد قابل غور ہے کہ ہر ملک و قوم میں نبی اسی ملک کے حالات اور قومی روایات کے مطابق مبعوث ہوتا ہے اور اسی کے مطابق مذہبی کتاب نازل ہوئی ہے۔

[redacted]

پاکستانی صحافی

نجی اللہ

سے ایک گفتگو

(ادارہ)

ہندوستان میں کچھ مسلمان ایسے بھی ہیں جو اپنے درد کا درماں پاکستان کو سمجھتے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ کسی نے سوال کیا۔ نجی اللہ صاحب نے سوال ختم ہونے سے پہلے ہی جواب دینا شروع کر دیا۔

" ایسے کچھ لوگ، تو دنیا میں ہر جگہ ہوتے ہیں۔ اگر کچھ ہندوستانی مسلمان پاکستان کی طرف دیکھتے ہیں۔ تو کچھ ہندوستانیوں پر یہ الزام بھی تو ہے کہ وہ اور دوسرے ملکوں کی طرف دیکھتے ہیں۔ اسی طرح پاکستان میں بھی کچھ ایسے ہو سکتے ہیں جن کی ہمدردیاں ہندوستان کے ساتھ ہوں۔ یہ ہمدردیاں یہاں کے لوگوں کو پاکستانی حکومت سے نہیں اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جن ہندوستانیوں کے رشتہ دار بنگلہ دیش میں تھے انھیں بنگلہ دیش سے ہمدردی ہے اور جن کے پاکستان میں ہیں انھیں پاکستان سے ہے۔ یہی حال پاکستانی باشندوں کا ہے۔"

یہ گفتگو سیکولر ڈیموکریسی کے دفتر میں ۷ نومبر ۱۹۸۲ء کی شام کو ہو رہی تھی۔ جہاں پاکستانی صحافی نجی اللہ صاحب کو چائے پر مدعو کیا گیا تھا۔ نجی اللہ صاحب اپنے دو ہندوستانی دوستوں آل انڈیا ریڈیو دہلی کے اردو نیوز ریڈر مصطفٰی علی اکبر اور مشہور مزاح نگار جناب مجتبیٰ حسین کے ساتھ تشریف لائے تھے۔ ان کے استقبال کے لئے محترمہ سبھدرا جوشی، ڈی۔ آر گوئل، سیکولر ڈیموکریسی انگریزی کے نائب مدیر جناب کیلاش ناتھ سیٹھ، سیکولر ڈیموکریسی ہندی کے ایڈیٹر ادھیر صاحب اور اردو ایڈیشن کے ایڈیٹر ڈاکٹر خلیق انجم موجود تھے۔ گفتگو کی ابتدا رسمی گفتگو سے ہوئی۔ کب تشریف لائے؟ کب تشریف لے جائیں گے؟ یہاں آپ کی صحت کیسی رہی؟ وغیرہ وغیرہ۔ پھر گفتگو کا رخ سیاست کی طرف مڑ گیا۔ اور ابتدا ہندوستانی اور پاکستانی عوام کے رویّے سے شروع ہوئی۔ پاکستانی حکومت کا ہندوستانی مسلمانوں کی طرف کیا رویّہ ہے؟ گوئل صاحب نے سوال کیا۔

نجی اللہ صاحب چند لمحے سوچ کر بولے فوجی حکومت سے پہلے اور اس کے بعد حکومت کا رویّہ وہی رہا ہے جو پڑوس کے ملک کے باشندوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ البتہ فوجی حکومت ہندوستانی مسلمان کو اپنے ذاتی مفاد کے لئے استعمال کرتی رہی ہے۔ انھیں یہ بات بھی ناگوار تھی کہ کچھ پاکستانیوں کو ہندوستان سے کسی طرح کی دل چسپی ہو۔ میں آپ کو مثال دیتا ہوں۔ کچھ عرصہ پہلے ہندوستان کے ایک شہر میں فساد ہوا تھا۔ کچھ لوگ پاکستان میں ہجرت کرنا چاہتے تھے۔ اتفاق سے انھیں دنوں یحییٰ خاں سے میری ملاقات ہوئی۔

میں نے پوچھا آپ نے ان مہاجرین کے بارے میں کیا سوچا؟

انھوں نے جواب دیا کہ میں حکم دے چکا ہوں کہ اگر کوئی سرحد پار کرتا ہوا دیکھا جائے تو اسے گولی سے اڑا دیا جائے پاکستانی حکومت کا پہلے سے آباد ہندوستانی مہاجرین کی طرف ہی کون سا اچھا رویہ تھا جو ان کی طرف ہوتا۔ اگر کوئی پاکستانی سرکاری ملازم ہندوستانی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تو اسے دفتر سے باقاعدہ اجازت لینی پڑتی تھی۔ اجازت نہ ملنے کی صورت میں اس کے سامنے صرف دو ہی راستے ہوتے شادی نہ کرے یا استعفٰی دے۔ اس سلسلے میں اور بھی ظلم ہوتے رہے ہیں مثلاً فوجی حکمرانوں نے ایک فارم جاری کیا تھا جو تقرر سے پہلے ہر سرکاری ملازم کو بھرنا پڑتا تھا۔ اس میں اس طرح کے سوال تھے جس سے یہ معلوم کیا جا سکتا تھا کہ امیدوار کے کتنے رشتہ دار ہندوستان میں ہیں۔ اگر یہ تعداد زیادہ ہوتی یا امیدوار کے بالکل قریبی رشتہ دار ہندوستان میں ہوتے تو اسے ملازمت نہ دی جاتی۔ ایک جرنلسٹ نے احتجاج کیا تو اسے جیل جانا پڑا لیکن اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ سرکاری ملازم کو تقرر سے پہلے کی بجائے تقرر کے بعد یہ فارم بھرنا پڑتا لیکن کچھ ہندوستانی مسلمان تو پاکستان کی طرف دیکھتے ہیں۔ کسی نے سوال کیا کہ بھائی پچپن کروڑ کی آبادی میں "کچھ" کی کیا اہمیت ہے؟

نجی اللہ صاحب نے ناراضگی کے لہجہ میں جواب دیا ان لوگوں کی جتنی تعداد ہے اس سے زیادہ تعداد تو ان لوگوں کی ہوگی جو ہندوستان کے پاگل خانوں میں ہیں۔ تو کیا آپ ان کو بھی اہمیت دیں گے۔ پھر کچھ لوگوں سے کس نے کہا ہے کہ پاکستان کی طرف دیکھے۔ پاکستان نے تو کبھی ان کی پرواہ کی ہے اور نہ کرے گا۔ اور ظاہر ہے کیوں کرے۔ اس کے اپنے مسائل ہی کیا کم ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کو خود اپنا راستہ ڈھونڈنا چاہیئے اور وہ راستہ صرف ہندوستان سے وفاداری ہے۔

اس سلسلے میں ایک بحث اور چھڑ گئی اور وہ یہ کہ حال ہی میں ایک ہندوستانی نامہ نگار پاکستان ہو کر آئے ہیں انھوں نے یہاں کر یہ انکشاف کیا کہ وہاں ایک بڑی زبردست تحریک چل رہی ہے اور وہ ہے اردو صوبہ کی۔ ہندوستان سے گئے ہوئے مہاجرین خود کو ہند پاکستانی کہتے ہیں۔ اور اردو صوبے کی مانگ کرتے ہیں۔ نجی اللہ صاحب کی توجہ ان حالات کی طرف دلائی گئی تو اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے بولے بھئی مجھے پاکستان سے آئے ہوئے لگ بھگ

ایک مہینہ ہوگیا ہے۔ اس عرصہ میں یہ عظیم انقلاب آگیا ہو تو میں کچھ کہہ سکتا۔ میرے سامنے تو اس قسم کی کوئی تحریک تھی نہیں۔ ممکن ہے اس طرح کے خیال رکھنے والے چار آدمی ہوں چار ہزار ہوں یا ممکن ہے چالیس ہزار ہوں۔ مگر پاکستان کی آبادی کئی کروڑ ہے یہ اخبار نویسوں کی ہاتھ کی صفائی ہے اور کچھ نہیں۔

اس دوران میں چائے آگئی۔ سب لوگ چائے پینے میں مصروف ہوگئے اور کچھ دیر کے لئے موضوعِ سخن بدل گیا لطیفہ بازی کا ماحول بن گیا۔ سب لوگ اپنی صحافت کی زندگی کے دل چسپ لطیفے سناتے رہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں قہقہوں سے محفل زعفران زار ہوتی رہی۔ جب لوگ لطیفے سناتے سناتے اور ہنستے ہنستے تھک گئے تو پھر سیاست کی طرف رخ ہوا۔ اس دفعہ خلیق انجم صاحب نے سوال کیا۔ کیا آپ کے خیال سے شملہ معاہدہ کامیاب ہوگا۔

نجی اللہ صاحب نے بغیر کچھ سوچے جواب دیا جی ہاں ہوگا۔ بالکل ہوگا۔ اور اس لئے ہوگا کہ برصغیر کے ملکوں کے سامنے اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ پھر نجی اللہ صاحب سنجیدگی سے بولنے لگے۔ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ شملہ معاہدہ کا بھی وہی حشر ہوگا جو اس سے پہلے تاشقند معاہدہ کا ہوا تھا۔ مگر اس وقت کے اور اب کے حالات بالکل مختلف ہیں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اب ہندوستان پاکستان میں نہ دوستی ہوگی اور نہ جنگ۔ البتہ ایک سرد جنگ جاری رہے گی۔ مگر خود آپ کا کیا خیال ہے؟ کسی نے سوال کیا۔

میں نے ابھی تو عرض کیا تھا کہ شملہ معاہدہ کامیاب ہوگا۔ دراصل میرا ہمیشہ سے یہ خیال رہا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں دشمنی رہے گی یا دوستی۔ اب میرا عقیدہ ہے کہ دشمنی کے دن ختم ہوگئے ہیں۔ دیر ہو سکتی ہے لیکن حالات معمول پر آئیں گے ضرور ـــــ اور دوستی ہوگی۔

ہندوستان اور پاکستان کی لڑائی پر گفتگو کرتے ہوئے بہت دل چسپ انداز میں انھوں نے ایک قصہ سنایا۔ کہنے لگے مشکل یہ آپڑی ہے کہ سرحد کے دونوں طرف سپاہی لڑ رہے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے چچازاد بھائی ہیں۔ مذہب مختلف ہو سکتے ہیں مگر خون تو ایک ہے پھر لڑیں گے کیسے؟ اور اگر لڑیں گے بھی تو دو چار دن۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران میں سرحد پر ایک پاکستانی کمانڈر سے ملا۔ وہاں کئی دن سے لڑائی بند تھی۔ میں نے کہا آپ لوگ حملہ کیوں نہیں کرتے؟ کمانڈر نے بڑے بے بس ہو کر جواب دیا۔ ہمارے



بیٹھے ہوئے دائیں سے بائیں:- محترمہ سعدرا جوشی اور نجی اللہ
کھڑے ہوئے، کیلاش ناتھ سیٹھ، خلیق انجم، ادھیر جی، ڈی، آر، گوئل۔

سپاہی کیسے لڑیں گے۔ سرحد کے دوسری طرف سے بھی "اللہ اکبر" آتا ہے۔

سیکولر ڈیموکریسی (انگریزی) کے سب ایڈیٹر کیلاش ناتھ سیٹھ نے سوال کیا کہ آپ کو ہندوستان آئے ہوئے ایک مہینہ ہو چکا ہے کیا آپ نے کبھی محسوس کیا کہ ہندوستانیوں کا رویہ آپ سے بدلا ہوا ہے؟

جی نہیں، بالکل نہیں۔ لوگ میری بڑی خاطر تواضع کرتے ہیں۔ مجھے یہاں کبھی اجنبی ہونے کا احساس نہیں ہوتا۔ اور دل چسپ بات یہ ہے کہ لوگ مجھے پسند کرتے ہیں لیکن شاید پاکستان کو نہیں اور یہی حال پاکستان میں ہندوستانیوں کا ہے۔

صدر بھٹو یہ اصرار کیوں کر رہے ہیں کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے سے پہلے شیخ مجیب الرحمٰن سے ایک ملاقات ضروری ہے؟ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے سے پہلے شیخ مجیب کے ساتھ ایک دفعہ چائے پینا چاہتے ہیں؟

حسب دستور قہقہہ لگا کر انھوں نے سنجیدگی سے گفتگو شروع کر دی۔ جہاں تک میرا خیال ہے صدر بھٹو ایمانداری سے بہت جلد بنگلہ دیش کو تسلیم کرنا چاہتے ہیں لیکن جمہوری نظام کی کچھ اپنی دشواریاں ہوتی ہیں۔ آپ جمہوریت کے مزے پچیس سال سے لے رہے ہیں۔ آپ تو ان دشواریوں سے بخوبی واقف ہیں۔ پاکستان میں اگر بہت سے لوگ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے حق میں ہیں تو کچھ اسے تسلیم نہیں کرنا چاہتے۔ یا کم سے کم اس مسئلہ پر صدر بھٹو کو پریشان کرنا چاہتے ہیں۔ مثلاً تحریک استقلال کے سربراہ ائیر مارشل اصغر خاں سب سے پہلے پاکستانی تھے جنھوں نے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے لئے آواز بلند کی تھی۔ اور اب خود ہی اس کے سب سے بڑے مخالف ہیں۔ دائیں بازو کی بھی کچھ سیاسی پارٹیاں بنگلہ دیش کو تسلیم نہیں کرنا چاہتیں صدر بھٹو کوئی فوجی حکمراں تو ہیں نہیں کہ جو چاہیں کر دیں۔ کوئی ان سے پوچھنے والا نہیں۔ انہیں ایسا کرنے سے پہلے ملک میں ایک سازگار فضا بنانی ہوگی اور ظاہر ہے کہ وہ اس کام میں مصروف ہیں۔

اس سلسلے میں پاکستان کی جماعت اسلامی کا کیا رول ہے؟

ان کا رول؟...... نجی اللہ صاحب نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ بہت دل چسپ ہے وہ بنگلہ دیش کو ایسی کنواری لڑکی سمجھتے ہیں جسے کچھ لوگ اٹھا کر لے گئے تھے۔ اور اب بچے سمیت واپس آئی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ بنگلہ دیش میں ایک چھوٹی سی اقلیت نے ہندوستان کے ساتھ مل کر بنگلہ دیش بنا لیا ہے۔

کیا آپ کا بھی یہی خیال ہے؟ کیلاش ناتھ سیٹھ صاحب نے پوچھا۔

جناب میں اس وقت زبانی کچھ کہوں تو بعد میں مکر بھی سکتا ہوں۔ مشرقی بنگال میں جو حالات پیدا ہوئے تھے میں اپنی تحریروں کے ذریعہ حکومت کی توجہ ان کی طرف مبذول کرا رہا تھا اور ۱۹۵۶ء سے یہ کام کر رہا تھا۔ بنگلہ دیش کے وجود میں آنے سے کچھ عرصہ پہلے میں نے دو تین دفعہ وضاحت کے ساتھ لکھا تھا کہ مشرقی پاکستان ہاتھ سے گیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہندوستان نے مدد دی، لیکن اس کی تمام تر ذمہ داری پاکستانی فوجی حکمرانوں پر ہے۔ میں نے اس موضوع پر ایک بار یحییٰ خاں سے گفتگو کی تھی۔ انھوں نے مجھے صرف اتنا جواب دیا تھا کہ ہمیں اپنی طاقت پر پورا بھروسہ ہے۔ مار مار کر ٹھیک کر دیں گے۔ انھوں نے مارا تو سہی مگر بنگالی ٹھیک نہیں ہوئے۔ فوجی حکمراں نہ صرف خود غلط راستے پر چلے بلکہ انھوں نے پوری قوم کو غلط راستے پر چلایا۔ پاکستان کا ایک مخصوص ذہن بنانے کی پوری ذمہ داری اسی طبقے کی ہے۔ پاکستانی ذہن کا نام تھا اسلام، ہندوستان دشمنی، فوجی احساس برتری، یہ احساس اتنا پختہ ہو چکا تھا کہ اگر کبھی کوئی اس کے خلاف کہتا تو لوگ اس پر ہنستے تھے میں نے جب بھی اس ذہن کے خلاف آواز بلند کی مورد عتاب ہوا۔ اور مجھے جیل تک جانا پڑا۔

پاکستان میں عام انتخابات کب تک ہوں گے؟ خلیق انجم صاحب نے سوال کیا۔

ان میں ابھی کچھ دن لگیں گے لیکن زیادہ نہیں۔ انھوں نے اعلان کیا ہے کہ ۷ مارچ ۱۹۷۳ء کو بنگلہ دیش میں عام انتخابات ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ پاکستان بھی لگ بھگ اسی زمانے میں الیکشن کرانے پر مجبور ہے۔ صدر بھٹو کو الیکشن کرانے سے پہلے چار مسئلے حل کرنے ہیں۔

۱۔ جنگی قیدی واپس آ جائیں۔

۲۔ فوجیں اپنی اپنی سرحد پر واپس چلی جائیں۔

۳۔ پانچواں پنج سالہ پلان تیار ہو جائے۔

۴۔ ملک کا آئین بن جائے۔

ان میں سے پلان اور آئین تو خود پاکستان کے اختیار میں ہے اس لئے بہت جلد تیار ہو جائیں گے لیکن باقی دو مسئلوں کے حل کے لئے ہم لوگوں کو ہندوستان کی طرف دیکھنا ہوگا۔

نہ جانے کیا موضوع چھڑا کہ بات پھر فوجی حکمرانوں پر آ گئی۔ دیکھئے۔ نجی اللہ صاحب نے بتانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا کہ ۱۹۴۷ء، ۱۹۵۱ء تک پاکستان وہی کچھ کرنے کی کوشش کرتا تھا جو ہندوستان کرتا تھا۔ کیونکہ عوام کو مطمئن کرنے کا اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا لیکن پاکستان کے سیاسی حالات بدلتے ہی اس رویے میں بھی تبدیلی آ گئی۔ دفتری نظام، ملٹری اور سیاست ان تینوں شعبوں کے لوگ میدان میں کود گئے۔ ذاتی مفاد کو پورا کرنے میں یہ ایک دوسرے سے بازی لے جانے لگے۔ ۱۹۵۶ء کا ایک واقعہ سنئے۔ ایک آئی سی ایس افسر کی گاڑی سے سونا برآمد ہوا کسی اخبار میں یہ خبر شائع کرنے کی جرأت نہیں تھی۔ میں نے اس واقعہ کی تفصیلات شائع کیں تو مجھے بلا کر یہ کہا گیا کہ اگر اپنی خیریت چاہتے ہو تو آئندہ کے لئے اس قسم کی حرکتوں سے باز آ جاؤ۔

فوجی حکمرانوں نے جب اقتدار ہاتھ میں لیا تو رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ یہاں مجھے ہندوستان سے شکایت ہے۔ مجھے یہاں آ کر احساس ہوا کہ ہندوستانیوں میں عام تاثر یہ ہے کہ فوجی حکمرانوں نے صرف مشرقی بنگال پر ظلم و ستم کیا بلکہ مغربی پاکستان کے عوام بھی اس ظلم و ستم میں فوجی حکمرانوں کے مددگار تھے۔ یہ ایک ایسا تاثر ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ پاکستان کے دونوں حصوں میں فوجی حکمرانوں کا ظلم یکساں برتا۔ اور یہ دونوں ان کے چنگل سے آزاد ہونے کی کوشش کرتے رہے۔

آپ نے وہاں کے عوام کی حالت پر نظر نہیں کی اور فوجی حکمرانوں سے اس طرح کے تعلقات قائم کئے۔ بہتر اگر آپ چاہتے تو بہت پہلے پاکستان کے دونوں حصے فوجی حکمرانوں کی گرفت سے آزاد ہو جاتے۔ اور اس وقت برصغیر میں وہ تلخی نہ ہوتی جو آج ہے۔ اب ہندوستان کا فرض ہے کہ پاکستان میں جمہوری نظام کی تقویت کے لئے کوشش کرے۔ اس میں پورے برصغیر کا بھلا ہے۔

پاکستان میں مقیم بنگالیوں کے بارے میں اخبارات میں جو کچھ آ رہا ہے وہ کہاں تک صحیح ہے؟ کیلاش ناتھ سیٹھ صاحب نے سوال کیا۔

محض حاشیہ آرائی۔ نجی اللہ صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ بھئی جو حالت یہاں پاکستانیوں کی ہے وہی وہاں بنگالیوں کی ہے۔ ان دونوں بے چاروں کا قصور کیا ہے۔ جون تک تو حکومت کی باقاعدہ اجازت سے بنگالی بینکاک اور کابل کے ذریعہ بنگلہ دیش جا رہے تھے پھر حکومت نے یہ رویہ اختیار کر لیا کہ جس کو جانا ہے جاؤ، ہم نہیں دیکھتے۔ یہی رویہ بنگلہ دیش کی حکومت کا ہے۔ اور اس سلسلے میں جو قصے سنائے جا رہے ہیں وہ تو صرف زیب داستاں کے لئے ہیں۔ مثلاً پاکستان کے ایک بہت بڑے افسر کی بیوی اور ان کے بچے جو بنگلہ دیش میں رہ گئے تھے وہ دو تین مہینے ہوئے پاکستان پہنچے۔ پاکستان میں ان کے بنگلہ دیش سے فرار ہونے اور راستے کے خطرناک سفر کے ایسے ایسے قصے شائع ہوئے کہ رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ حال ہی میں میں جب ڈھاکے میں شیخ مجیب سے ملا تو اس واقعہ کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے ہنستے ہوئے بتایا کہ ہمیں اس خاندان کے بارے میں ایک ایک بات معلوم تھی۔ ہمیں یہ بھی معلوم تھا کہ وہ کب اور کس راستے سے بنگلہ دیش سے جا رہے ہیں مگر ہم انھیں روکنا چاہتے ہی نہیں تھے۔

نجی اللہ صاحب پانچ بجے تشریف لائے تھے۔ اور اب آٹھ بج رہے تھے۔ انھیں یاد آ گیا کہ آٹھ بجے کہیں مدعو ہیں اس لئے وہ اچانک کھڑے ہو گئے اور اس طرح یہ دل چسپ محفل برخاست ہو گئی۔

[redacted]

متحدہ قومیت کی تشکیل کا مسئلہ

۔ قمر اعظم ہاشمی ۔

موجودہ ترقی یافتہ دنیا کے لئے قومیت کا تصور غیر معروف نہیں ہے۔ تصور قومیت کی تمام محدودیت، تنگ دامانی اور کم بصری کو محسوس کرتے ہوئے ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ موجودہ دنیا کے تمام ممالک اپنے اپنے یہاں اپنی قومیتوں کو فروغ دینے میں لگے ہیں۔ روح اور مادے کا ارتقا بھی قومیت کی تشکیل میں رکاوٹیں دحائل کر سکا۔ قومیت، مذہب اور سائنس پر بھی غالب آچکی ہے۔ ایک متعین اور بالخصوص خطۂ ارض میں رہنے والے لوگ رنگ، نسل، مذہب زبان اور کلچر میں اختلاف و تضاد کے باوجود ایک خاص قومیت کے حامل ہیں۔ گویا تمام امتیازی نظریات اور نظریاتی اختلافات آغوشِ قومیت میں پہنچ کر ایک ہیں۔ ایک ملک اور ایک نسل۔ ایک ملک اور ایک مذہب، ایک ملک اور ایک زبان، ایک ملک اور ایک کلچر کے نظریات غیر موثر اور تقریباً ناقابل عمل ثابت ہو چکے ہیں۔ ایک ملک اور ایک قومیت کا جذبہ ایک ہمہ گیر موثر تصور کی حیثیت سے کافی آگے بڑھا اور مقبول ہوا ہے مختلف النسل، مختلف المذاہب اور مختلف اللسان ملک کی قومی وحدت کی سب سے بڑی مثال ہندوستان ہے۔ جہاں حد تو یہ ہے کہ ایک ہی وقت میں متضاد موسمی کیفیتیں پائی جاتی ہیں۔ جتنی زبانیں یہاں بولی جاتی ہیں۔ یہاں جتنے مذاہب ہیں، جتنی نسلیں اور کلچر یہاں ہیں غالباً دنیا کے کسی اور ایک ملک میں موجود نہیں پھر بھی یہاں کے تمام لوگ "ہندوستانی" ہونے کی حیثیت سے ایک ہیں۔ ان سب کی قومیت ایک ہے، ہندوستانی۔ اس مہذب دنیا میں زندہ رہنے کے لئے کسی نہ کسی قومیت سے اپنا رشتہ جوڑنا ہوگا۔ اگر آپ قومیت کی سند سے بے نیاز ہیں تو دنیا کا کوئی ملک اپنی سرزمین پر آپ کا بوجھ برداشت کرنے کو آمادہ نہ ہوگا۔ ہندوستانی قومیت کا یہ ایک اہم وصف ہے کہ اس کی وجہ سے کسی مذہب کے ترک و اختیار یا کسی زبان کے رد و قبول پر کوئی حرف نہیں آتا، نقطۂ نظر اور طرزِ عمل کی مکمل آزادی اور اس آزادی کے دستوری تحفظات موجود ہیں۔ ہر ایک مذہبی، تہذیبی اور لسانی اکائی کو اپنے انفرادی وقار کی حفاظت کا حق تو حاصل ہے مگر اس تحفظ کے لئے ایسی تمام اکائیوں کو اپنے اوپر بھروسہ کر کے سرگرم عمل ہونا پڑے گا انہیں اپنا امتیازی وجود عزیز ہے تو اس کا عملی ثبوت بھی فراہم کرنا ہوگا۔ یہ مذہبی اور تہذیبی اکائیاں اپنے آپسی اختلافات و تضادات کے باوجود متحدہ ہندوستانی قومیت کے خال و خط میں دل آویز اور پرکشش رنگ آمیزی کرتی رہی ہیں اور کر سکتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ جذبۂ قومیت کو مذہبی شعور سے کوئی دشمنی نہیں۔ اس لئے ایک سچا مسلمان پکا ہندوستانی ہے تو میرے لئے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں۔

جس ملک میں مختلف مذاہبوں، زبانوں، نسلوں اور طبقوں کے لوگ ہوں وہاں ایک قومی کردار کی تشکیل کا معاملہ فطری طور پر کچھ پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ کردار سازی کے ایک خاص قومی پیمانے میں اگر سب کو ڈھالنا مقصود ہے تو پھر اس کے لئے ایک ایسے قومی رویہ کو فروغ دینا ہوگا جس کے اندر پر خلوص رواداری ہو جس کی علامتیں مفاہمانہ ہوں اور جس میں ایثار اور وسیع النظری موجود ہوں تحریری بیانات اور تقریری یقین دہانیوں کی جگہ عملی طور پر وہ طریقہ کار اختیار کرنا ہوگا جس سے تمام مذہبی، لسانی اور نسلی اکائیوں کے اندر تحفظ اور اعتماد کی فضا پیدا ہو سکے، ایک ایسا خوشگوار ماحول بنے جس میں سب ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کریں۔ ہمہ گیر قومی قدروں کی ترویج اس نہج پر کی جائے کہ ایک پائیدار ملی تنظیم پیدا ہو سکے اور قومی سطح پر تمام ہندوستانیوں کا وقار یکساں رہے۔ عملی طور پر ہر شعبۂ حیات میں قومی اتحاد کے تصور کی نفی کرنا اور میدانوں میں کھوکھلی تقریروں کے ذریعہ قومی اتحاد کے نعرے بلند کرنا تختہ پر بیٹھ کر بحرانکا حل کو طے کرنے کے مترادف ہے۔ گمراہوں اور بداخلاقیوں کے سمندر میں اخلاقیات اور سچائیوں کا ایک فرضی جزیرہ بسا لینا آسان تو ہے مگر اسے سمندر کی تند لہروں سے کتنی دیر تک بچایا جا سکتا ہے؟ اکثریتی فرقہ کے آمرانہ جبر اور اقلیتی فرقہ کی مظلومانہ سپردگی کا نام قومی اتحاد نہیں ہے۔ قومی اتحاد کے قیام کی لڑائی جنگ آزادی سے بھی کٹھن اور دشوار گزار ہے۔ آزادی کی لڑائی بیرونی حملہ آوروں سے لڑی گئی تھی، غیر ملکی اقتدار کے جبر و تشدد کے خلاف پرچم بلند کیا گیا تھا اور قومی اتحاد کے قیام کی لڑائی ہمیں اپنے آپ سے لڑنی ہے۔ ہمارے اندر جو نفرت جو عصبیت جارحیت پسند منافرت اور مفاد پرست خود غرضی چھپی بیٹھی ہے ہمیں اس کے خلاف پرچم بلند کرنا ہے۔ اس کے لئے صرف جذبے کی ضرورت نہیں، کشادہ قلبی اور بڑے حوصلے کی ضرورت ہے۔ اپنے موروثی مزاج کے خلاف آواز بلند کرنا ہمت کا کام ہے اور یقیناً صبر و ایثار کی یہاں شدید ضرورت ہے قومی اتحاد کے تشکیلی مرحلوں میں سے ہر طرح کے شک اور خوف کے احساس کو ختم کرنا ہمارا پہلا فرض ہے۔ جب تک یہ دونوں عناصر مختلف فرقوں کے درمیان موجود رہیں گے اس وقت تک قومی اتحاد کے خواب کی کبھی تعبیر سامنے نہ آسکے گی اور یہ عناصر دراصل ہماری عصبیت، منافرت اور خود غرضی کی پیداوار ہیں۔ تعداد کی کثرت کے زعم میں قومی اتحاد کے نقطۂ نظر کو قومی انضمام کی شکل نہیں دی جا سکتی۔ اس طرح کی کوشش ملک و قوم کے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔

جہاں تک ہندوستانی مسلمانوں کا سوال ہے انھوں نے اپنے ملک سے محبت اور گہرے تعلق کا عملی ثبوت ہر دور میں پیش کیا ہے۔ برسرِ اقتدار تھے جب بھی اور بے اقتدار ہو گئے اس وقت بھی۔ اب سے لگ بھگ ۵۰۰ برس پہلے بلبن، خلجی، اور تغلق جیسے ذی شان بادشاہوں کے زمانے میں بھی عام مسلمانوں نے ہندوستان کو اپنے وطن ہی کا درجہ دیا۔ مسلم بادشاہوں نے نہ جبراً اپنے مذہب کو ہندوستانیوں پر مسلط کیا اور نہ اپنی زبان کو تمام ہندوستانیوں کے لئے کبھی لازمی قرار دیا۔ اس دور میں بھی مسلم ادیبوں اور شاعروں نے ہندوستان کی زبان اور کلچر سے قربت حاصل کی اور یہاں کی زبان میں یہیں کے موضوعات پر شاعری بھی کی اور ہندوستانیوں کے ذہن و فکر کی تعریفیں بھی کیں۔ امیر خسرو فارسی، عربی اور ترکی کے علاوہ سنسکرت کے بھی مستند عالم تھے اور انھوں نے ابتدائی ہندوی زبان میں شاعری بھی کی۔ امیر خسرو کے بعد سے عہد غالب تک ہندوی اور سنسکرت کے بڑے بڑے مسلم شعراء اور فنکار منظرِ عام پر آئے۔ مسلمانوں کی کشادہ دلی اور وسیع النظری کی مثال اس سے بہتر اور کیا ہو سکتی ہے کہ انھوں نے محکوموں کی دلداری ہی نہیں کی رواداری کی شاندار روایتیں قائم کیں اس کا ثبوت مسلم بادشاہوں کے طرزِ عمل سے بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ جنھوں نے اپنی فراخدلی اور انصاف پسندی سے بھی انحراف نہیں کیا۔ ڈاکٹر عابد حسین قومی تہذیب کا مسئلہ میں لکھتے ہیں "سلاطین دہلی نے تو اتنی رواداری برتی کہ صرف قانونِ عام اپنا جاری کیا اور شخصی و مذہبی امور میں ہندوؤں کے دھرم شاستر کے اصول کو جاری رکھا اور اس کے نفاذ میں مدد دینے کے لئے مرکزی عدالت اور صوبوں کی عدالتوں میں پنڈت مقرر کئے۔"

جناب جگن ناتھ آزاد "ہندوستان کے تہذیبی عناصر اور اردو" کے عنوان میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"ہمارے ملک میں مسلمان بادشاہوں کا دورِ حکومت باطنی یک رنگی اور اندرونی وسعت کی ایک تصویر ہے۔ ان بادشاہوں کے دور میں نہ ہندو مسلم نفاق کا کوئی سراغ ملتا ہے نہ حکومت کے خلاف فرقہ وارانہ احتجاج کا۔ نہ ہی اس بات کا کہ ملک کے کسی حصے سے ہندو آبادی ہجرت کر کے ملک سے باہر چلی گئی ہو۔ نہ ہی اس دور کے ہندو راجاؤں، مہاراجاؤں کی ریاستوں سے مسلمانوں نے کبھی نقل مکانی کیا۔"

"ادبی اور قومی تذکرے" میں کشن پرشاد کول تفصیل کے ساتھ تاریخی حقائق کو ہندوستانی کے لسانی ماحول کی تشکیل کے پس منظر میں پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اکبر اور اس کے جانشینوں کے ملک اور حکومت کے احکام و قواعد کے ذریعہ سے اور اونچے درجے کے مسلمان اور ہندوؤں کے اتفاق و یک جہتی سے جو فائدے اسی زمانے میں ملک کو ہوئے ان سے قطع نظر کر کے اگر ہم اپنی نگاہیں اونچی اٹھاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہندو مسلمانوں کے عوام الناس کے میل جول سے بھی ہم نے دفاعی، اخلاقی اور روحانی سطح پر اونچی جگہ پائی تھی۔"

انگریزوں کے خلاف علم جہاد اٹھانے میں بھی مسلمانوں نے پہل کی اور پوری قوت کے ساتھ ان غیر ملکی لٹیروں کے ظلم و استبداد کا مقابلہ کیا گیا۔ ملک کے مسلمان غداروں کے خلاف اظہار نفرت کے طور پر اقبال جیسے شاعر نے بھی ننگ ملت، ننگ دین کے ساتھ ننگ وطن کی ترکیب استعمال کی ہے۔ وطنیت کا یہ شدید احساس تمام مسلمانوں کے دل میں موجزن تھا۔ آزادی کی تحریک کی ابتداء ۱۸۵۷ء سے ہوئی۔ تاریخ شاہد ہے کہ لال قلعہ کے حکمراں بہادر شاہ ظفر کے ساتھ دہلی کے ہزاروں مسلم خاندان تباہ و برباد کر دیئے گئے۔ بظاہر جنگ آزادی ختم ہو گئی تھی اور انگریزوں کا اعتماد اپنی طاقت پر جم چکا تھا، حقیقتاً صورت حال کچھ مختلف تھی۔ انیسویں صدی کے اختتام ہی سے ایک فیصلہ کن لڑائی کے امکانات کا جائزہ لیا جانے لگا تھا اور بیسویں صدی کی ابتدا سے ایسی تمام سمتوں میں عملی اقدامات کئے جانے لگے۔ ریشمی رومال کی تحریک، وہابی تحریک، خلافت تحریک، خاکسار تحریک، مسلمانوں کی ان تمام تحریکوں میں چند ہی جو نمایاں حیثیت رکھتی ہیں جنھوں نے ملک کی آزادی میں حصہ لیا ہے اسیرِ مالٹا شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا محمد علی جوہر، مولانا محمد میاں انصاری، مولانا شوکت علی وغیرہ سے لے کر مولانا مظہر الحق، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر انصاری، رفیع احمد قدوائی، اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں تک چلے آئیے یہاں سے وہاں تک سینکڑوں مسلم مجاہدینِ آزادی ملیں گے جنھوں نے اپنی تمام زندگی ملک کو زنجیرِ غلامی سے نجات دلانے کی کوشش کی نذر کر دی۔ (یہ اور بات ہے کہ آزادی کی سلور جوبلی کے موقع پر بھی ہم ان میں سے کسی کو یاد نہ کریں) انگریزوں نے اپنے اقتدار کی سالمیت کے لئے ہندو مسلم نفاق و نفرت کو ہوا دے رکھی تھی۔ ان میں سے بیشتر سربراہوں نے آزادی کی جنگ بھی لڑی اور ان دونوں فرقوں کے درمیان محبت اور اتحاد کی فضا بھی قائم رکھی۔ اور ایسے تمام اختلافات کو ختم کرنے کی عملی کوششیں کیں۔ منٹو مارلے ریفارمز کی مخالفت کرنے میں بھی مسلم سربراہوں نے کسی مصلحت کو راہ نہ دی۔ ہندوستان آئین میں ان اصلاحی تبدیلیوں کے ذریعہ ریاستی اسمبلیوں اور مرکزی کونسل کے لئے طریقہ انتخاب رائج کیا گیا تھا مگر حق رائے دہندگی کو صرف محدود ہی نہیں رکھا گیا بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں نمایاں فرق پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تھی ہندو رائے دہندگان کے لئے ضروری قرار دے دیا گیا تھا کہ یا تو ان کی سالانہ آمدنی تین لاکھ روپے ہو یا وہ تیس سال پرانے گریجویٹ ہوں جب کہ مسلمان رائے دہندگان کے لئے صرف تیس ہزار روپے سالانہ آمدنی یا تین سال پرانا گریجویٹ ہونے ہی کی شرط کافی سمجھی گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ اصلاحی تبدیلی سو فیصد مسلمانوں کے حق میں تھی اور انگریزوں کے پیشِ نظر مقصد صرف یہ تھا کہ ہندو اور مسلمان کے فرق کو ہندوستان میں شدت کے ساتھ محسوس کرا دیا جائے۔

بے شبہ مسلمانوں کے جذباتی اور انتہا پسند حلقے نے اس کا خیر مقدم کیا لیکن ساتھ ساتھ سنجیدہ اور باشعور مسلم سربراہوں نے اس کی پر زور مخالفت بھی کی۔ بہرحال اس حقیقت سے انکار کرنے کی کوئی گنجائش نہیں کہ مسلمانوں کے دورِ اقتدار میں فرقہ واریت کا روگ تھا ہی نہیں۔ انگریزوں نے ہوسِ اقتدار کی تسکین کے لئے ہندوستانی عوام کو دو بڑے فرقوں میں تقسیم کر کے ان دونوں کے درمیان نفرت اور حقارت کی خلیج حائل کر دی۔ کانگریس کے لاہور اجلاس منعقدہ ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء تک آتے آتے جس میں آزادیٔ کامل کا مطالبہ کیا گیا پورے ملک میں ہندو مسلمان کا فرق نمایاں ہو چکا تھا اور اچھی طرح محسوس کیا جانے لگا تھا۔ اسی کے آس پاس ایک

سال کے بعد صورت حال اور تشویشناک ہو گئی۔ گوپی ناتھ آمن اپنے مضمون "جنگ آزادی کا سپاہی ـــــ نہرو" میں لکھتے ہیں کہ:۔

"مہاتما گاندھی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے ولایت گئے لیکن وہاں فرقہ پرست ہندوؤں اور مسلمانوں کی کش مکش کی وجہ سے (جسے انگریزوں نے اور ہوا دی) مسئلہ حل نہ ہوسکا اور گاندھی جی ہندوستان واپس آئے اور جیسا کہ انھوں نے کہا مایوسی اور شرم کے ساتھ واپس آئے کیونکہ نہ فرقہ پرست ہندو ان کی بات ماننے کو تیار تھے اور نہ فرقہ پرست مسلمان۔"

۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۵ء تک کے وقفہ میں فرقہ واریت کی یہ دیوار کچھ اور اونچی ہو گئی۔ کانگریس اور مسلم لیگ کی کش مکش کو انگریز ہر ممکن طریقے پر پیچیدہ اور سنگین بناتے رہے۔ اس آزمائشی دور ابتدا میں ہندوؤں کے ساتھ مسلم سربراہوں کا ایک بڑا حلقہ قومی اتحاد کے لئے کام کرتا رہا۔ اس حلقے میں کانگریس کے سربراہوں کے علاوہ علمائے ملت بھی دوش بدوش تھے۔ یہ مسلمانوں کا وہ حلقہ تھا جس کے اندر مفاہمت، متانت اور حریت پسندی بھی تھی اور جس کا قومی شعور بھی پختہ تھا اور غیر جذباتی بھی۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے اپنی تاریخی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے ہندو بھائیوں پر اعتماد کرکے شانہ بہ شانہ ہوکر آزادی کی لڑائی میں ولولہ و ایثار کے ساتھ حصہ لیا۔ دوسری طرف ہندوؤں کا وہ طبقہ جو صرف فرقہ پرست ہی نہیں تھا احیائے ماضی کے جوش میں مسلمانوں کے وجود کا بھی دشمن ہو چکا تھا، اپنے اثرات میں وسعت پیدا کر رہا تھا۔ دراصل ہندوؤں میں احیائے ماضی کی تحریک ۱۸۶۷ء میں بنارس سے اٹھی تھی جس کا فی الفور مقصد یہ تھا کہ سرکاری عدالتوں اور دفاتر میں اردو زبان اور فارسی رسم الخط کو خلع کرکے سنسکرت آمیز ہندی رائج کی جائے۔ سرسید کی اصلاحی تحریک کا پہلا دور بھی عام ہندوستانیوں سے متعلق تھا لیکن ہندوؤں کی جداگانہ تہذیب و زبان کی تحریک کے ردعمل میں انھوں نے بھی اپنی اصلاحی تحریک کو خاص طور پر مسلمانوں سے وابستہ کر دیا۔ بہرحال ہندو اور مسلمان فرقہ وارانہ جنون میں مبتلا کئے گئے۔ اس کے باوجود قومی اتحاد کے علم بردار ملت پسند اور باشعور مسلم سربراہوں کی کوششوں سے ۱۹۳۷ء میں عام انتخابات کے موقع پر مسلمانوں کی زبردست اکثریت نے مسلم لیگ کو ووٹ نہیں دیا۔ عام طور پر انھوں نے کانگریس امیدواروں کو ووٹ دیئے۔ مگر وزارتوں کی تشکیل کے بعد ہندو اور مسلمان کے اس متحدہ محاذ کا شیرازہ منتشر کرنے میں انتہا پسند لوگوں نے ہی سابقت کی۔ در پردہ اس میں ان کے انگریز آقاؤں کی سازش بھی کارفرما تھی۔ ڈاکٹر عابد حسین قومی تہذیب کا مسئلہ میں رقم طراز ہیں:۔

"چنانچہ ۱۹۳۷ء کے عام انتخابات میں مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت نے مسلم لیگ کو ووٹ نہیں دیا۔ بلکہ عموماً کانگریس کو اور بعض صوبوں میں آزاد امیدواروں کو لیکن عام انتخابات کے بعد جب کانگریس نے اکثر صوبوں میں اپنی وزارتیں بنائیں تو قوم پرور مسلمانوں کو یہ شکایت ہوئی کہ ان کو بہت کم جگہیں ملیں۔ اس سے زیادہ اہم عام مسلمانوں کو یہ شکایت تھی کہ کانگریسی حکومت نے ان کے تہذیبی حقوق پامال کر ڈالے... مسلمانوں کے ساتھ کانگریس کا رویہ واقعی بہت کچھ بدل گیا تھا۔ اگرچہ یہ تبدیلی غیر محسوس طور پر ہوئی تھی اس کی سب سے نمایاں علامت یہ تھی کہ کانگریسی حکومتوں نے کانگریس کی پالیسی پر جس کا وہ باضابطہ اعلان کر چکی تھی کہ ہندی اور اردو کی قدر مشترک ہندوستانی زبان کو دیوناگری اور فارسی دونوں خطوں کے ساتھ قومی زبان بنایا جائے گا۔ کئی صوبوں میں عمل نہیں کیا۔ اور عام طور پر اردو کو دبانے کی کوشش کی۔"

کچھ عرصہ تک یہ وزارتیں چلیں۔ دوسری جنگ عظیم اور اس کے بعد ۱۹۴۲ء کی تحریک کا درمیانی وقفہ شدید انتشار میں گذرا۔ ۱۹۴۶ء میں لارڈ ویول اور مسٹر جناح کی گفتگو کے نتیجہ میں کانگریس اور مسلم لیگ کی ملی جلی وزارت بنی۔ ہندوؤں میں احیائے ماضی کے بڑھتے ہوئے میلان اور فرقہ پرستوں کی تنگ و تاریک ذہنیت نے ایک بار پھر اپنا رنگ دکھایا۔ جس کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے اس طبقہ کو بھی مایوسیوں کا شکار ہونا پڑا۔ جو قومی اتحاد کے لئے خلوص کے ساتھ اب تک سرگرم عمل تھا۔ عام ہندوؤں میں غلط یا صحیح پوری کامیابی کے ساتھ یہ پروپگنڈا کیا جاتا رہا کہ انگریزوں سے قبل مسلمانوں نے اپنے دور اقتدار میں ہندوؤں پر طرح طرح کے ظلم ڈھائے اور زیادتیاں کیں۔ مسلمانوں کو ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۶ء تک کے وقفے میں کچھ ایسے تجربات سے سابقہ پڑا کہ ان کے درمیان بھی فرقہ پرست مسلم قیادت کے اثرات بڑھ گئے۔ ہندوؤں کے اندر نسلی انتقام کا جوش تھا اور مسلمانوں کے اندر اپنے غیر محفوظ مستقبل کے اندیشے۔ عدم تحفظ کا یہ احساس اتنا شدید تھا کہ مسلمان جہاں جس صوبے میں بالکل اقلیتی حیثیت رکھتے تھے وہاں بھی مسلم لیگ کے نعرے گونجنے لگے۔ ان کی قوت جائزہ نے بھی کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ خوفناک مایوسیوں اور اندیشوں نے اس طرح ان کا محاصرہ کیا کہ وہ بے سوچے سمجھے اس صوبے سے بھی نعرۂ لیگ کا خیر مقدم کرنے لگے جسے یا جس کے کسی حصہ کو کبھی بھی پاکستان نہ ہونا تھا۔ فرقہ پرست ہندوؤں کے لئے مسلمانوں کے اس مریضانہ جذباتی ردعمل نے طاقتور غذا کا کام انجام دیا اور ان کے حوصلے اور زیادہ بلند ہو گئے۔ اس ہنگامی ردعمل کو انھوں نے اپنا مستقل پیمانۂ معیار بنا لیا۔ آخرکار ملی جلی وزارت کی ناکامی نے ملک پر تقسیم کا عمل جراحی کیا۔ پروفیسر احتشام حسین "فرقہ پرستی اور ادیب" میں تحریر کرتے ہیں:۔

"ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک ساتھ مل کر رہنے سے انکار کیا اور برطانوی سیاست نے انھیں اس طرح آمنے سامنے لا کھڑا کیا کہ کلکتہ، بمبئی، نواکھالی، بہار، گڑھ مکتیشر اور پنجاب میں خون کی ندیاں بہیں مگر دلوں کی کدورت دور نہ ہوئی۔ پھر ہندوستان کو آزادی ملی اور پھر خون کی ہولی کھیلی گئی۔ صدیوں کے بنے بنائے گھر اجڑنے لگے۔ صدیوں کی ہمسائیگی اور محبت کے رشتے آن کی آن میں کٹ گئے اور قرآن، گیتا اور گرنتھ صاحب کے شیدائی، دودھ پلاتی ماؤں کی چھاتیاں کاٹنے لگے۔ بچوں کو ماؤں کی گود میں ذبح کرنے لگے۔ بیٹیوں کو باپ کے سامنے عصمت دری ہونے لگی اور ظلم و ستم کے وہ طریقے ایجاد کئے گئے جن کا درندوں نے کبھی خواب بھی نہ دیکھا ہوگا۔" مگر اب تک فرقہ پرستوں کی طبیعت نہ بھری تھی، ان کی تلواروں کی پیاس نہ بجھ سکی تھی اور جب کبھی انھیں موقع ملا فساد کے شعلے کو ہوا دیتے رہے۔ یہ مواقع اس دور میں کثرت سے ملتے رہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

(باقی اگلے شمارے میں)

فرقہ پرستی کے خلاف جدوجہد اور ہم

ابراہیم یوسف قاسمی

" فرقہ پرستی کا خاتمہ ضروری ہے"۔

" سبھدرا جوشی فرقہ پرستی کے خلاف زبردست جدوجہد کررہی ہیں"۔

" سامپردائکتا ورودھی کمیٹی کا کام قابلِ تعریف ہے"۔

" سیکولر ڈیموکریسی کے مضامین فرقہ پرستی کے خلاف ماحول بنا رہے ہیں"۔

یہ اور اس قسم کے سیکڑوں کلمات ہم روزانہ پڑھے لکھے اور سیاسی و سماجی شعور رکھنے والے ہندو مسلم حلقوں میں سن سکتے ہیں۔

مگر سوال یہ ہے کہ فرقہ پرستی جیسی منظّم لعنت کے خلاف ایک طویل اور صبر آزما جنگ میں فتح کے لئے کیا یہ صرف چند جملے کافی ہیں؟ یا اس سے آگے عملی اقدامات کی ضرورت ہے؟ ہے اور ضرور ہے، کیونکہ فرقہ پرستی ایک ایسی سماجی اور سیاسی بیماری ہے جس کے خاتمے کے لئے فرقہ پرستی کے مخالف عوام کو مشترکہ محاذ بنانا ہوگا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سامپردائکتا ورودھی کمیٹی کی مسلسل جدوجہد بنگلہ دیش کے قیام، حالیہ عام انتخابات میں سیکولر جماعتوں کی تاریخی کامیابی اور آخر میں " تعزیرات ہند (ضابطہ فوجداری) ترمیمی قانون ۷۲ء" جسے ۳ جون ۱۹۷۲ء کو پارلیمنٹ نے منظوری دیدی اور جس کے ذریعہ فرقہ پرستی پھیلانے والی جماعتوں اور نیم فوجی تنظیموں کے خلاف کارروائی کے وسیع اختیارات انتظامیہ کو حاصل ہوتے ہیں۔ اس بل کو پیش کرنے کی

سیکولر ڈیموکریسی

تحریک محترمہ سبھدرا جوشی صاحبہ کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس سے ہندوستان کی فرقہ پرست جماعتوں کو زبردست دھکا لگا ہے۔ مگر یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ملک کی بدنام ترین فاشسٹ فرقہ پرست جماعتیں جو برسوں سے دونوں فرقوں کے بھولے بھالے عوام کو مذہب کے نام پر مشتعل کرکے اپنی سیاسی مفادات کی دوکانیں چمکا رہی ہیں اتنی آسانی سے اپنی شکست تسلیم کرکے خاموش ہوجائیں گی۔

اور واقعہ یہ ہے کہ ہم اس وقت اپنی قومی تاریخ کے ایسے نازک دور سے گزر رہے ہیں جب کہ ملک کی جنونی فرقہ پرست طاقتیں قوم پرست جمہوریت نواز سیکولر عناصر سے فیصلہ کن معرکے کی تیاری کررہی ہیں اور اپنے ہم نواؤں کو متحد کررہی ہیں۔

مسلم یونیورسٹی بل کے خلاف مسلم مجلس، جماعت اسلامی، مسلم لیگ، تعمیرِ ملت، اتحاد المسلمین اور عوامی تنظیم کی تحریک اور تاریخ ساز شملہ معاہدہ کے خلاف جن سنگھ، آر۔ ایس۔ ایس اور ہندو مہاسبھا کی جدوجہد اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں تاکہ ہندو مسلم عوام کی توجہ ادھر مبذول کرائی جائے اور انھیں سیکولر طاقتوں سے علیحدہ کرکے اپنا اُلّو سیدھا کیا جائے۔

اس لئے اب وقت آگیا ہے کہ ہندوستان کے وہ تمام لوگ جو سیکولرزم پر یقین رکھتے اور فرقہ پرستی کو ختم کرنا چاہتے ہیں اور اس طرح ایک پُرامن خوش حال سماج کی تعمیر میں مدد کرنا چاہتے ہیں پورے یقین، حوصلہ عزم اور توانائی کے ساتھ متحد ہوجائیں۔

اب فرقہ پرستی کے خلاف ایک ایسے مضبوط محاذ کی ضرورت ہے جس میں دانشور، ادیب، شاعر، فنکار، صحافی، مزدور، صنعت کار، کسان، ملازم، طالب علم، اور سماجی و سیاسی کارکن شامل ہوں، کیونکہ فرقہ پرستی کے خلاف طویل جنگ سیمناروں، ادبی جلسوں، مشاعروں، ثقافتی پروگراموں، اخباروں، کارخانوں، تجارتی اداروں، کھیتوں دفتروں، کالج و اسکولوں اور سیاسی و سماجی تنظیموں کی وساطت سے لڑی جارہی ہے اور لڑی جاتی رہے گی۔

فرقہ پرستی کے خلاف جنگ کے مشترکہ محاذ میں شمولیت آپ کا ہمارا اور سب کا مشترکہ مقدس فرض ہے اور وطنی محبت نیز سیکولرزم کے چراغ کو روشن رکھنے کے عزم کا سب سے بڑا ثبوت بھی۔

اس سلسلے میں سماج کے سبھی طبقوں کو تعاون کرنا چاہیئے اور مشترکہ کوششوں سے فرقہ پرستوں کے چیلنج کا جواب دینا چاہیئے کیونکہ یہ چیلنج ہندوستان کے کروڑوں امن پسند جمہوریت دوست اور قومی یک جہتی کے حامیوں کو دیا گیا ہے۔

میں یہاں مختصراً سماج کے مختلف طبقات کی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلاؤں گا کہ وہ اس صبر آزما طویل جدوجہد میں کس طرح مدد کرسکتے ہیں؟

دانش وروں، ادیبوں، شاعروں، اور

فن کاروں کا فرض ہے کہ وہ فرقہ پرستی کے خلاف مؤثر آواز اٹھائیں۔ چوں کہ ان کی تخلیقات براہ راست عوام تک پہنچتی ہیں۔ اس لئے وہ اپنی آواز عوام تک پہنچا سکتے ہیں۔

دانش ور اور ادیب اپنی تصانیف میں قومی یک جہتی کے موضوعات کو اولیت دیں اور شاعر اپنی نظموں اور غزلوں میں اسے موضوع سخن بنائیں۔

فن کار قومی یک جہتی کے موضوعات پر ثقافتی پروگرام ترتیب اور دیگر فلمساز فلم بناکر یہ خدمت انجام دے سکتے ہیں۔

صحافی

رائے عامہ تیار کرنا جمہوری نظامِ صحافت کے منصب کی سب سے اہم ذمہ داری ہے۔

ہمارے صحافیوں کو اپنی اس ذمہ داری کا احساس کرنا چاہیئے۔ انھیں اپنے اخبارات کے ذریعے کھل کر فرقہ پرستی، فرقہ پرست تنظیموں اور فرقہ پرست اخبارات پر تنقید کرنی چاہیئے اور اس کے ہولناک نتائج سے اپنے قارئین کو آگاہ کرنا چاہیئے۔ اس ملک کے بعض اخبارات مسلسل فرقہ وارانہ جذبات کو بھڑکانے اور کشیدگی کو بڑھانے میں نمایاں رول ادا کرتے ہیں۔ فسادات کے مواقع پر بھی ایسے اخبارات غیر محتاط رویہ اختیار کرکے فسادات کی سنگینی میں اضافہ کرتے ہیں۔ ان اخبارات کے پروپیگنڈے کا مؤثر جواب دینے کے لئے صاف ذہن صحافیوں کو میدان میں آنا چاہیئے۔ وہ فرقہ وارانہ کشیدگی کے مواقع پر عوام تک بروقت محتاط انداز میں خبریں پہنچا کر کشیدگی کو کم کرسکتے ہیں۔

مزدور

مزدور ہمارے سماج کا اہم جزو ہیں۔ انھیں فرقہ پرستی کے خلاف صف آرا ہوجانا چاہیئے۔

فرقہ پرستی کا زہر اب مزدوروں میں بھی پھیلتا جارہا ہے کیونکہ جن سنگھ کے زیر اثر مزدور سنگھ کے اثرات بڑھانے کی منظم جدوجہد کی جارہی ہے اور اب مزدور یونینوں پر بھی اس کی وساطت سے جن سنگھ کی گرفت مضبوط ہوتی جارہی ہے۔ اس کا ثبوت راوڑکیلا، جمشید پور اور احمد آباد جیسے صنعتی شہروں کے فسادات سے ملتا ہے۔

سیکولر ذہن کے مزدور رہنماؤں کو اس طرف توجہ کرنی چاہیئے اور اپنی تمام یونینوں کو غیر فرقہ وارانہ بنیادوں پر منظم کرنا چاہیئے اور سیکولر جماعتوں سے وابستگی اختیار کرنی چاہیئے۔ مزدوروں میں وسیع بنیادوں پر فرقہ پرست مخالف تحریکات کا فروغ بھی مزدوروں میں فرقہ پرستی کے اثرات کو کم کرنے میں معاون ہوگا۔

صنعت کار

ہندوستان میں عام رجحان ہے کہ صنعت کاروں کا ایک قابل لحاظ طبقہ فرقہ پرست تنظیموں کو خاص مالی امداد دیتا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ فرقہ پرست جماعتوں کو ملک کے صنعت کاروں، تاجروں اور سرمایہ داروں کی پوری پشت پناہی حاصل ہے۔

اب وقت آگیا ہے کہ سیکولرزم کے علمبردار اس خطرناک رجحان کا مقابلہ کریں اور صنعت کاروں وتاجروں میں سیکولرزم کے نظریات کو پھیلائیں۔

دوسری بات یہ کہ ملک کی اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کو یہ واجب شکایت ہے کہ ان پر عملاً صنعتوں کے دروازے بند کردیئے گئے ہیں۔ یہ صورت حال تشویشناک ہے جس پر صنعت کاروں کو کما حقہ توجہ کرنی چاہیئے۔

صنعتی اداروں میں اقلیتی افراد کو زیادہ سے زیادہ نمائندگی دے کر قومی یک جہتی کے کاز کو تقویت پہنچائی جاسکتی ہے۔

کسان

ہندوستان کے دیہات اپنی ایکتا اور بھائی چارے کے لئے منفرد حیثیت رکھتے ہیں اور آج بھی حیثیت بعض غنیمت ہے۔ مگر اب فرقہ پرست تحریکات اپنے دائرۂ اثر کو دیہات تک وسیع کرتی جارہی ہیں۔ کسانوں کو ان تحریکات سے باخبر رہ کر اس خطرے کا سد باب کرنا چاہیئے اگر بیدار مغز کسان رہنما اس سلسلے میں جدوجہد کریں تو گاؤں کا روائتی یک جہتی کا ماحول برقرار رکھا جاسکتا ہے اور فرقہ پرستوں کو بے اثر بنایا جاسکتا ہے۔

ملازم

ملازمین سرکاری مشینری کے پرزے ہوتے ہیں اور ان کے نظریات کے مطابق ہی انتظامیہ کی تصویر بنتی ہے۔ جس قدر صاف ذہن کے سرکاری ملازمین ہوں گے اسی قدر انتظامیہ صاف ستھرا اور تعصبات سے بالاتر ہوگا۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ مناسب جانچ پڑتال نہ ہونے کے باعث بڑی تعداد میں نیم فوجی جماعتوں کے تربیت یافتہ اور فرقہ پرست تحریکات سے ذہنی لگاؤ اور ہمدردی رکھنے والے افراد ہر سطح پر سرکاری اور نیم سرکاری ملازمتوں میں داخل ہوگئے ہیں جس کی وجہ سے ایڈمنسٹریشن میں فرقہ وارانہ امتیاز برتے جانے کی شکایات عام ہیں۔

اسی طرح فسادات کے مواقع پر سرکاری ملازمین کے جانبدارانہ رویئے کی متعین شکایات سامنے آئی ہیں۔

اس لئے سرکاری ایڈمنسٹریشن کی تطہیر ضروری ہے۔ سرکاری ملازمین مذہب کی بنیاد پر امتیاز کی پالیسی ختم کریں اور کشیدگی کے مواقع پر لا اینڈ آرڈر برقرار رکھنے کے لئے سخت اقدامات کریں۔

اگر ایسے ملازمین کے رویے کی شکایات ہوں تو دوسرے صاف ذہن کے ملازمین اس رجحان کا مقابلہ کریں اور اس ذہنیت کو پنپنے کا موقع نہ دیں۔ اگر ایسا ہوگیا تو ایڈمنسٹریشن میں تعصب اور فسادات داستانِ پارینہ بن جائیں گے۔

طالب علم

طالب علم کسی بھی ملک کا سب سے قیمتی سرمایہ اور اس ملک کے مستقبل کے معمار بھی ہوتے ہیں۔

ہمارے ملک کا المیہ ہے کہ یہاں طالب علموں کی ہمہ جہتی ترقی اور انھیں معاشرے کا کارآمد جزو بنانے کی کوششوں کے بجائے انھیں سیاسی پارٹیوں نے اپنے سیاسی مفادات کے حصول کا آلۂ کار بنایا ہے۔

اس لئے اب فرقہ پرست جماعتوں نے طلبا میں اپنے کام کو کافی منظم کرلیا ہے۔ جن سنگھ کے زیر اثر "ودیارتھی پریشد" شمالی ہندوستان کی کئی یونیورسٹیوں میں خاص مضبوط پوزیشن کی مالک ہے۔ اسی طرح آر۔ ایس۔ ایس کا طلبا میں خاصا اثر ہے۔

انہی خطوط پر خالی خالی مقامات پر "مسلم یوتھ آرگنائزیشن" "اسلامک اسٹڈی سرکل اور اسلامک اسٹوڈنٹ آرگنائزیشن" جیسی تنظیمیں بھی مسلم طلبا کو مذہب کے نام پر جمع کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ان تنظیموں کو جماعت اسلامی کی حمایت حاصل ہے۔

ان حالات میں ترقی پسند طلبا کا فرض ہے کہ وہ طلبا میں فرقہ پرستی کے بڑھتے ہوئے اثرات کو روکنے کی کوشش کریں۔ اپنے اسٹڈی سرکل بنائیں اور ایسی تنظیمیں قائم کریں جس سے سیکولرزم اور جمہوریت کے اعلیٰ اصولوں کو تقویت ملے۔

اس کام کے لئے سمپوزیم سیمنار اور فرقہ پرستی مخالف لٹریچر سے مدد لی جائے۔

سماجی و سیاسی کارکن

سیاسی اور سماجی کارکن ہی سماج اور سیاست کا رخ متعین کرتے ہیں۔

اس لئے اس ضمن میں ان کی بڑی ذمہ داریاں ہیں جسے پورا کرکے وہ اس عظیم مشن کو کامیابی سے ہمکنار کرسکتے ہیں

سماجی کارکن ایسی تنظیمیں بنائیں جو بلا امتیاز مذہب و ملت عوامی خدمت اور ایک مثالی پرامن سماج کی تشکیل کو اپنا نصب العین قرار دیں۔

انفرادی طور پر بھی سماجی کارکن اپنے حلقۂ ہائے اثر میں قومی یک جہتی کے حصول کیلئے عملی اقدامات کریں۔

سیاسی کارکن وقت کی پکار کو سنیں سیکولر جماعتوں سے وابستہ کارکنوں کا فرض ہے کہ وہ سیکولر جماعتوں کو زیادہ سے زیادہ مضبوط و مستحکم بنائیں۔ اپنے سارے اختلافات بھلا کر خلوص و عزم مستحکم کے ساتھ عوام کے مسائل کو حل کرنے کی کوششوں میں مصروف ہوجائیں اور ساتھ ہی ساتھ سیکولرزم اور جمہوریت کے نظریات کی تلقین کریں۔

اس طرح عوام کا اعتماد حاصل کرکے فرقہ وارانہ جماعتوں کو ہمیشہ کے لئے ختم کیا جاسکتا ہے اور سیکولر جماعتوں کو تقویت مل سکتی ہے۔

حرف آخر

یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ آزادی کے بعد فرقہ پرستی کے خلاف سب سے زیادہ منظم جدوجہد کا آغاز۔ بیباک سیاسی رہنما، اقلیتوں کے حقوق کی سب سے بڑی

کمیٹی کے شائع کردہ لٹریچر نے فرقہ پرستی کے نظریاتی قلعوں پر بڑے زبردست حملے کئے ہیں اور فرقہ پرستانہ رجحانات کا بڑی بے باکی اور بے خوفی سے پردہ فاش کیا ہے۔

اسی طرح کمیٹی کا آرگن "سیکولر ڈیموکریسی" بھی ایک منفرد ماہنامہ ہے جو ملک کی تین بڑی زبانوں میں ایسا مواد پیش کرتا ہے جو فرقہ پرست تحریکات کے افکار و نظریات کو سمجھنے میں معاون ہوتا ہے۔

قومی ایکتا ٹرسٹ کی تشکیل بھی فرقہ پرستی کے خلاف صف آرائی کے لئے ہوئی ہے اور یہ بلاشبہ ایک اہم کام ہے۔

مگر یہ صرف سبھدرا جوشی یا ان کے چند رفقائے کار کا کام نہیں بلکہ آپ، کا ہمارا سب کا کام ہے سب کا فرض اور سب کی ذمہ داری ہے۔ ہم سب کو چاہیئے کہ فرقہ پرستی کے خلاف اس محاذ میں شامل ہوجائیں۔ کمیٹی کی شاخیں ہر مقام پر قائم ہوں اور انھیں مضبوط بنایا جائے، اس کے پروگراموں کو کامیاب بنایا جائے۔

کمیٹی کا شائع کردہ لٹریچر اور "سیکولر ڈیموکریسی" ہر تعلیم یافتہ کے ہاتھوں تک پہنچے۔ یہ بہت ضروری ہے۔

اس کام میں اہل ثروت مالی، اہل قلم قلمی، اور

محافظ اور سیکولرزم کی علمبردار محترمہ سبھدرا جوشی (ایم. پی) نے کیا ہے۔ ان کی قیادت میں "سامپردائکتا ورودھی کمیٹی" نے اپنے قیام ۱۹۶۲ء سے آج تک اس میدان میں جو عظیم خدمات انجام دی ہیں وہ اپنی قومی تاریخ کا روشن باب ہیں۔

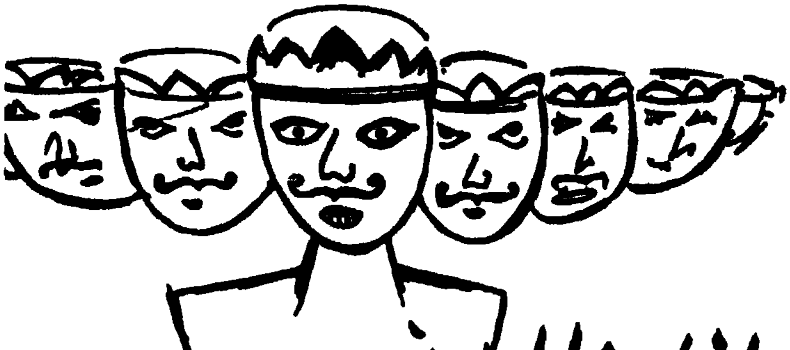
اس کمیٹی کے مخلص اراکین نے ملک کے مختلف حصوں میں فرقہ پرستی کے خلاف فضا بنانے کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔

کارکن عملی تعاون کرکے کمیٹی کو مضبوط بنائیں۔

اگر ہم فرقہ پرستی کے خلاف مشترکہ طور پر عزم کے ساتھ صف آرا ہوجائیں تو یقیناً فرقہ پرستی کی سیاہ رات ڈھلے گی اور امن و یک جہتی کا سورج طلوع ہوگا جس کی روشنی میں ہم ایک خوشحال، ترقی پذیر، سیکولر اور سوشلسٹ ہندوستان کی تعمیر کرسکیں گے۔

[redacted]





راون جلا نہیں

راون زندہ ہے۔

راون زندہ ہیں۔

سارے راون زندہ ہیں۔

راون مرا نہیں ہے۔

راون جلا نہیں ہے۔

راون اب بھی موجود ہے۔

ایک کہانی ہے۔ کہ ایک رام تھے۔ اب رام نہیں ہیں۔ رام نہ جانے کون تھے؟ کہاں سے آئے تھے؟ کہاں چلے گئے ــــ؟

کہانی یہ بھی ہے کہ وہ راجہ دشرتھ کے لڑکے تھے؟ ان کی ایک ماں تھیں ــــ کوشلیہ؟ کیا پتہ۔ ہم تو بس رام جانتے ہیں۔ اور ان کی غرضِ تخلیق کو۔ یعنی راون کا خاتمہ ــــ اس کے علاوہ ساری باتیں ــ کہانی تھیں؟ لیکن باتیں کہانی کب ہوتی ہیں؟ باتیں تو سچی ہوتی ہیں۔

اور سچ یہ ہے کہ ایک رام تھے جو راون کو مارنے اور لنکا کو فتح کرنے آئے تھے۔ اور اسی لئے رام یا تو خود۔ یا کوئی اور جوان سے بھی بڑا تھا۔ رام کو اس کے لئے تیار کر رہا تھا۔ تجربوں کی کسوٹی پر پرکھنے کے لئے حالات کی بھٹی میں تپایا جا رہا تھا۔ تاکہ جو میل ہو۔ اگر ہو تو۔ وہ بھٹی میں ختم ہو جائے۔ اگر کوئی موہ، کوئی لگاؤ ہو، جو اپنے معینہ مقصد کے خلاف ہو تو اسے ختم کر کے رام مکمل رام صرف رام بن کر سامنے آئیں۔ تاکہ راون سے جیت سکیں۔ اس لئے کہ راون مکمل تاریکی تھا۔ اب رام کو مکمل نور بن جانا تھا۔ راون غلاظت تھا تو رام کو لطیف ہونا چاہیئے۔ راون طاقت ور تھا تو رام کو اکیلا رہنا چاہیئے۔ راون صاحبِ اقتدار و حکومت تھا۔ تو رام کو حکومت چھوڑ کر جنگل جنگل بھٹکنا ہوگا ــــ اس لئے کہ رام جب تک راون کے بالکل برعکس نہ ہوں گے تب تک راون سے بھرپور ٹکر کیسے ہوگی؟ نور و ظلمت اپنی پوری طاقت کے سامنے کس طرح آئیں گے اور راون کا خاتمہ کیسے ہوگا ــــ؟؟

اس لئے رام تجربات سے گزر رہے تھے۔

ساری کہانیاں کہتی ہیں۔

سب لوگ کہتے ہیں۔

تلسی داس لکھتے ہیں۔

ہم بھی سمجھتے ہیں۔

تم بھی یقین رکھتے ہیں۔

کہ رام نے ۱۴ برس کا بن باس منظور کیا تھا!

ایسا نہ کہو! رام کو غصہ آ جائے گا۔

رام نے ۱۴ برس کا بن باس نہیں لیا تھا۔

رام کی ساری زندگی بن باس میں گزری۔

رام ساری زندگی، جانوروں، پرندوں، دریاؤں، پہاڑوں پھولوں اور پھلوں سے باتیں کرتے رہے۔ آدمی تھے کہاں؟؟

ان کا بن باس اسی وقت شروع ہو گیا تھا جب وشوامتر انھیں لے کر گھر سے نکلے تھے۔ تربیت حاصل کرنے۔ تعلیم حاصل کرنے، انہیں بھٹی میں تپانے کے لئے۔ تاکہ سونا کندن بن جائے۔ وشوامتر نے رام کو خوب سیر کرائی۔ اور ایک امتحان لیا۔ رام کا پہلا امتحان۔ دیکھیں قوت اعتماد آئی کہ نہیں۔ جنک کے دربار میں اصل کمان نہیں۔ مصائب اور آنے والے حالات کی کمان تھی۔ وہ مراد کا بند دروازہ تھی جسے رام نے توڑ دیا۔ اور کامیاب ہوئے۔ لیکن ابھی بہت سے امتحان باقی تھے۔ دیکھیں تو کہیں حکومت اور راجیہ کی خواہش رام کو فرض کی تکمیل سے روک تو نہیں دیتی ــــ ایثار، قربانی اور اطاعت کا جذبہ جوان ہوا کہ نہیں۔ اب زندگی کے اصل جنگل میں بھٹکنے کی قوت آ گئی کہ نہیں۔ دیکھیں تو سہی یہ سیتا پاؤں میں زنجیر ڈال پاتی ہیں یا نہیں۔ اس لئے کہ رام کو لچھمن، ان کے دوسرے روپ کے ساتھ ہی سیتا کی بھی ضرورت تھی۔ بھلا راون کیسے اٹھا کر لے جاتا؟ جنگ کا ظاہری سبب کیسے پیدا ہوتا۔ دیکھیں اب رام کے قدم لڑکھڑاتے ہیں یا نہیں۔

لیکن رام غرضِ تخلیق سے واقف تھے۔ سارے امتحانات میں کامیاب ہوئے۔

جنگل جنگل بھٹکے۔

بھوکے پیاسے چلتے رہے۔

تخت و تاج ٹھکراتے رہے۔

لیکن ــــ عزت نفس کو نہ جانے دیا۔

لیکن غرضِ تخلیق کی تکمیل میں لگے رہے۔

اور ایک دن رام نے ــــ

راون کو مار ڈالا ــــ

لنکا کو فتح کر لیا۔

راکھشسوں کی طاقت ختم کر دی۔ اور ——
دنیا نے سکھ چین کی سانس لی۔
اب ظلم ختم ہو گیا۔ اب کسی کا استحصال نہ ہو سکے
گا۔ اب کوئی غلام نہ بنے گا۔ سب عزت سے زندہ رہیں گے۔
تمام جشن منایا گیا۔
رام نام کی جے جے کار ہوئی۔
کہ رام امتحان میں پورے اترے۔
رام نے اپنا فرض ادا کیا۔
راون کو مار ڈالا۔
راون سے نجات دلائی۔
لنکا جل کر راکھ ہوئی۔
ساری دنیا میں خبر پھیل گئی۔ اب کوئی راون نہیں
ہے۔ اب کوئی کمبھ کرن نہیں ہے۔ اب میگھ ناتھ نہیں آئے گا۔
لیکن لنکا میں سوگ تھا۔
راکھشس رو رہے تھے۔
سب پہاڑوں میں جا چھپے۔
اور رام اجودھیا واپس آئے۔ ان کا استقبال
ہوا۔ جے کار ہوئی۔ مبارک سلامت کا شور ہوا۔ رام راجیہ
قائم ہوا۔
لیکن پہاڑیوں میں چھپے راکھشس روتے رہے
بھٹکتے رہے۔
ایک دن —— ایک راکھشس نے خواب میں
دیکھا ... کہ ——
کمبھ کرن آیا ہے۔ اور کہہ رہا ہے۔
بھگوڑو! میں مرا نہیں ہوں۔ زندہ ہوں۔ زندہ
رہوں گا۔
دوسرے نے خواب میں دیکھا میگھ ناتھ آیا ہے اور کہہ رہا ہے
بزدلو! میں مرا نہیں ہوں۔ زندہ ہوں۔ زندہ
رہوں گا۔
پھر سارے راکھشسوں نے خواب میں دیکھا۔ لنکا کا راجہ راون
آیا ہے اور کہہ رہا ہے۔
بہادرو! تم خوف زدہ نہ ہو میں مرا نہیں ہوں۔
لنکا جلی نہیں ہے۔ میں زندہ ہوں۔ زندہ رہوں گا۔ لنکا ہر شہر

میں پھیلی رہے گی۔ میری موت صرف رام راجیہ
کی مختصر مدت تک ہے۔ میں بہت جلد واپس آؤں گا۔ بس
میرا جسم، میرا چہرہ —— دوسرا ہوگا۔ لیکن تم تو اپنے ہو۔
مجھے پہچان لوگے۔ تم سب میرا ساتھ دینے کے لئے تیار رہنا
—— آج۔ اسی وقت تم سب میرا گاڑھا، سیاہ خون پی
لو۔ اتنا پیو کہ تمہیں نشہ آ جائے۔ پھر میرا سارا گوشت کھاؤ۔
اتنا کھاؤ کہ تمہیں نیند آ جائے۔ باقی بچے خون کو سمندروں
دریاؤں، ندیوں اور کنوؤں میں بہا دو۔ میرا کچھ گوشت
جانوروں کو کھلانا، کچھ پرندوں کو، اور کچھ پہاڑوں پر
رکھ دینا۔ کچھ کھیتوں میں دفن کر دینا۔ اور باقی جنگلوں میں
پھینک دینا۔ پھر رام راجیہ کے بعد آنے والے زمانوں میں
دیکھنا کہ میں کس شان سے ظاہر ہوتا ہوں۔ پھر ہم ہی آزاد
ہوں گے اور سب قیدی۔ اس وقت کہیں بھی کوئی رام
نہ ہوگا۔ لچھمن اور سیتا نہ ہوں گے۔ ہم اور تم ہوں گے۔
اور تب کبھی بھی ہمیں کوئی نہ مار سکے گا۔ کوئی نہ جلا سکے گا
اور کبھی پھر رام راجیہ نہ قائم ہو سکے گا کہ رام راجیہ ہماری
موت ہے۔
پہاڑی پر سوئے تمام راکھشسوں کی نیندیں
کھل گئیں۔ سب نے محسوس کیا کہ ان کا پیٹ بھرا ہوا ہے
اور ان کی باچھوں سے خون ٹپک رہا ہے۔ تازہ خون ——
جب سب نے پانی میں اپنی اپنی صورت دیکھی اپنے کو
ہی نہ پہچان سکے۔ تب ایک جشن اور ہوا۔
راون کی جے جے کار ہوئی۔
مبارک سلامت کا شور ہوا۔
اور سارے راکھشس بکھر گئے۔ اور ہر گلی، ہر کھیت
ہر دیہات، ہر شہر، ہر گھر، ہر محلہ، ہر قوم، ہر نسل اور ہر ملک و
تمام براعظم میں پہنچ گئے۔ لیکن انھیں کوئی بھی نہ پہچان سکا۔
راون کو بھی کوئی نہ پہچان سکا۔
ہر سال رام کی لنکا فتح کا جشن منایا جاتا رہا۔ رام
کی جے جے کار ہوتی رہی۔ اور راون مسکراتا رہا کہ اب اسے
کون مار سکتا ہے۔ اب کہاں لچھمن و سیتا؟ اب تو ہم سب
راون ہیں ——
ہاں یہ سچ ہے۔ کہانی نہیں کہ ——

راون اب بھی زندہ ہے۔
راون مرا نہیں ہے۔
اس لئے ——
راون کو مارو۔
راون کو جلادو۔
لنکا کو پھونک دو۔
راکھشسوں کو پہچان لو۔
ورنہ —— ہم سب راکھشس ہو جائیں گے۔
تب رام کہاں سے آئیں گے؟ کیسے آئیں گے؟
اس لئے کہ ——
رام کو آنا ہے۔
رام آئیں گے ضرور آئیں گے۔ یقین جانو۔
لیکن ——
اب تو رام کے کام کو آسان کر دو۔
اب تو انھیں بن باس اور امتحان کی سزا نہ دو۔
اب لچھمن اور سیتا کو پھر سے جنگل میں نہ جانے دو۔
اب تم پہلے سے ہی راون کو ختم کر دو۔ میگھ ناتھ
اور کمبھ کرن کو مار ڈالو۔ لنکا کو مسمار کر دو۔
تاکہ ——
رام کو سکون ملے۔
رام آسانی سے رام راجیہ استھاپت کر سکیں۔
سیتا کے پیروں میں چھالے نہ پڑیں۔
انھیں کسی راون کے باغ میں اسیر نہ ہونا پڑے۔
اچھا —— اگر اس بار راون نہیں مرا ہے۔ لنکا
نہیں جلی ہے۔ کمبھ کرن زندہ ہے۔ میگھ ناتھ بچ گیا ہے۔ تو
کوئی بات نہیں۔ اگلے سال سہی۔ ان سب کو جلا دینا۔
انھیں مار ڈالنا۔ ہرگز زندہ نہ چھوڑنا نہیں تو راکھشس پھر
اپنا عمل آزادی سے دہرانے لگیں گے۔
اس لئے کہ راون ابھی مرا نہیں ہے۔ راون
ابھی مرے نہیں ہیں۔
راون اب بھی موجود ہے۔ راون اب بھی زندہ
ہیں۔

[redacted]

کتابوں کی باتیں

ہم عصروں پر غالب کا اثر ——— ظفرادیب

قیمت: دس روپے

ناشر ——— قصرِ اردو ——— اردو بازار ——— دہلی ۶

غالب سے متعلق اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اب اس میدان میں زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ لیکن ظفرادیب کی یہ کتاب یقیناً غالبیات میں ایک اضافہ ہے۔ بہت کم لوگ ہیں جو ذاتی زندگی کے نامساعد حالات کے باوجود اس لگن، خلوص اور محنت کے ساتھ کام کرتے ہوں جیسا ظفرادیب کرتے ہیں۔

ابتدائی ابواب میں غالب کے سوانح بیان کر کے ان کی شخصیت اور سیرت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ہمارے خیال سے غالب کے سوانح لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں تھی، کیونکہ اس موضوع پر کئی اہم اور مستند کتابیں پہلے ہی سے موجود ہیں۔

کتاب کا اہم حصہ ان ابواب کے بعد شروع ہوتا ہے یعنی جہاں سے کتاب کے اصل موضوع پر بات شروع ہوتی ہے۔

غالب نے کس کس طرح اپنے معاصرین کو متاثر کیا ہے۔ اس پر چند مضامین ضرور شائع ہوئے ہیں لیکن اس موضوع پر مستقل تصنیف ظفرادیب ہی نے پیش کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ظفرادیب کا کام بہت مشکل تھا مومن، آزردہ، صہبائی، ذوق اور بہادر شاہ ظفر جیسے قدآور اور صاحبِ طرز شاعروں کے کلام پر غالب کا اثر ڈھونڈ نکالنا آسان کام نہیں تھا۔ اس کے لئے وسعتِ مطالعہ اور اعلیٰ درجے کی سخن فہمی اور گہرے تنقیدی شعور کی ضرورت تھی۔ کیونکہ یہ تمام معاصرین اس عہد کے ذہین ترین شعرا میں شمار ہوتے ہیں اور ان میں سے کوئی بھی بزعمِ خود غالب سے کم نہیں۔ ظاہر ہے کہ شعوری طور پر غالب کا اثر انھوں نے ہرگز قبول نہ کیا ہوگا کیونکہ ان پر اس سے بڑا کوئی الزام عائد نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ غالب سے متاثر ہیں۔ غالب کا جو کچھ بھی اثر ان پر تھا۔ غیر شعوری اور نادانستہ طور پر تھا اسی لئے اس اثر کی جھلکیاں ان کے کلام میں کہیں کہیں نظر آتی ہیں ظفرادیب نے محض شعری ذوق کے سہارے اس اثر کو دکھانے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ انھوں نے پہلے غالب اور پھر ہر شاعر کی شاعرانہ خصوصیات کا تفصیلی جائزہ لے کر مدلل طریقوں سے اپنی بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے انھوں نے ایسے اشعار کی نشاندہی بھی کی ہے جنھیں اگر دیوانِ غالب میں شامل کر لیا جاتا تو وہ غالب ہی کی تصنیف شمار ہوتے۔ مثلاً:-

ہے اعتماد مرے بختِ خفتہ پر کیا کیا\
ورنہ خواب کہاں چشمِ پاسباں کے لئے (مومن)

کہاں وہ عیشِ اسیری، کہاں وہ امنِ قفس\
ہے بیمِ برق بلا، روز آشیاں کے لئے (مومن)

میں اور ذوقِ بادہ کشی لے گئیں مجھے\
یہ کم نگاہیاں تری بزمِ شراب میں (آزردہ)

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں\
واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں (ذوق)

کیا ذکر کچھ کلام میں واعظ کے ہو مزا\
محفل میں ذکر بادہ و ساغر کے بغیر

"غالب پر معاصرین کا اثر" غالبیات میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے جس کے لئے ظفرادیب مبارکباد کے مستحق ہیں۔

سید جعفر عباس

بیگانہ ——— البرٹ کامو

مترجم:- عبدالحئ

نصرت ——— پبلشرز ——— لکھنؤ ——— ۱۹۶۷ء

بیگانہ فرانسیسی مصنف البرٹ کامو کے مشہور ناول L'Etranger کا اردو ترجمہ ہے۔ ایسے بین الاقوامی ادب کا ترجمہ اردو کے لئے نیک فال ہے۔ اس کے لئے مترجم اور ناشر دونوں ہی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

کامو کا تعلق فرانس کے ایک نچلے طبقہ کے خاندان سے تھا۔ یہ خاندان الجزائر میں آباد تھا۔ کامو کی پیدائش اور پرورش الجزائر میں ہوئی۔ کامو کی ماں ایک برتن دھونے والی عورت تھی۔ ان سب حقائق کے باوجود کامو الجزائر کے عرب باشندوں کے مقابلے میں

الجزائر کی یورپی اقلیت کا ایک فرانسیسی باشندہ تھا۔ جو اپنے دل میں الجزائر کی تمام تر ترتیب رکھنے کے باوجود الجزائر کی عرب اکثریت کے درمیان فرانسیسی اقلیت کا ایک اجنبی سا فرد تھا۔ کامو کے زیر بحث ناول L'Etranger کا اس حقیقت سے بہت گہرا تعلق ہے۔

انقلابِ فرانس کے بعد فرانس میں یہ اصول اپنایا گیا تھا کہ یورپی نسل کے بچوں کے لئے تعلیم کے مساوی مواقع فراہم کئے جائیں گے۔ اس اصول کا فائدہ کامو کو بھی پہنچا۔ چنانچہ اس نے فرانس کے تعلیمی معیار کے مطابق جو فرانس اور الجزائر دونوں جگہ رائج تھا تعلیم حاصل کی۔ بیس اکیس برس کی عمر میں کامو نے کیمونسٹ پارٹی میں شامل ہو کر عملی سیاست میں بھرپور حصہ لینا شروع کر دیا۔ پچیس سال کی عمر میں صحت کی خرابی کے سبب کامو فرانس کے تعلیمی ڈھانچہ کا وہ آخری امتحان پاس نہ کر سکا جس کی بنا پر اسے اعلیٰ سرکاری ملازمت مل سکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک Intellect Worker بنتے بنتے ایک Intellectual بن گیا۔ اگرچہ کامو کے مزاج سے یہ بعید نہیں کہ وہ امتحان پاس کرنے کے بعد بھی شاید Intellectual ہی رہتا۔

کامو کی تصانیف کے تین مدارج متعین کئے گئے ہیں جن میں سے اس کے ناول L'Etranger کا تعلق پہلے درجے سے ہے۔ یہی کامو کا پہلا ناول بھی ہے اس سلسلے میں دو اور کتابیں ایک ڈرامہ Caligula اور ایک فلسفیانہ مضمون The Myth of Sisyphus ہے جس میں Absurdity کے مفہوم سے بحث کی گئی ہے۔

زیر بحث ناول کو سمجھنے کے لئے ناول کے ہیرو مرسال کے سماجی اور سیاسی، سیاق و سباق پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ وہ الجزائر جس میں کامو کی پرورش ہوئی ضابطہ کی رو سے فرانسیسی ری پبلک کا ایک اٹوٹ حصہ تھا لیکن تاریخی اور سماجی حقائق کی رو سے الجزائر فرانس کی ایک کالونی ہی تھا۔ کامو کا خاندان کامو کی پیدائش سے نصف صدی پہلے سے وہاں آباد تھا۔ الجزائر میں آباد یہ فرانسیسی باشندے اپنی مادرِ وطن الجزائر کو فرانس کا ہی ایک حصہ سمجھتے تھے ان کے یہ احساسات الجزائر کی عرب اکثریت کے احساسات کے منافی تھے۔ چنانچہ فرانسیسی نژاد الجیرین کامو کے احساسات الجیرین عربوں کے احساسات سے جن کی حیثیت نوآبادیاتی غلاموں کی سی ہے ہم آہنگ ہوتے نظر نہیں آتے۔ کامو ایک French Algeria کا خواب دیکھتا ہے۔ جب کہ عرب فرانسیسی تسلط سے آزاد الجزائر کے تصور میں غلطاں ہیں۔ یہی وہ تضاد ہے جہاں کامو اجنبی سا نظر آتا ہے۔

ناول کا ہیرو مرسال الجزائر میں ایک کلرک کے عہدے پر فائز ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ خود کامو بھی اپنے طالب علمی کے زمانے میں اسی طرح کلرک رہ چکا تھا اور مرسال خود اس کا اپنا قلمی نام تھا جو وہ صحافت میں استعمال کرتا تھا اس کے علاوہ کامو نے ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ L'Etranger کی تشکیل تین کرداروں سے ہوتی ہے جن میں ایک عورت اور دو مرد ہیں اور ان دو مردوں میں ایک وہ خود ہے۔

ناول کے ہیرو کو بعض ناقدین اینٹی ہیرو قرار دیتے ہیں۔ مرسال کو ہیرو قرار دینے والے لوگوں کا خیال ہے کہ وہ حق گو انسان ہے اور کبھی جھوٹ نہیں بولتا خواہ اس کے لئے اسے پھانسی پر ہی کیوں نہ چڑھنا پڑے۔ مرسال کے بارے میں خود کامو کا بھی یہی خیال ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مرسال اپنے دوست ریمانڈ کے لئے کئی بار جھوٹ بولا ہے۔ دراصل مرسال صرف اپنے ذاتی احساسات کے بارے میں کبھی جھوٹ نہیں بولتا اور اس کے لئے اسے جان دینے سے بھی گریز نہیں۔ بے پناہ ذہانت اور بے پناہ حسیت کے پندار کے سبب وہ آخر دم تک خدا کے وجود سے بھی مستقل مزاجی کے ساتھ منکر رہتا ہے۔ مرسال کی حسیت کا یہ روپ صرف الجزائر کی عرب اکثریت کے لئے ہی نہیں بلکہ خود فرانس اور دنیا کی کسی بھی Established سوسائٹی کے لئے بھی اسی قدر اجنبی ہے۔

زیر نظر ترجمہ جو "بیگانہ" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس میں بعض امور کی طرف توجہ کی ضرورت ہے L'Etranger چونکہ ایک عام ناول نہیں اس لئے اردو کے قاری کو کامو کی مخصوص معنویت سے روشناس کرانے کی ضرورت تھی، جو نہیں کیا گیا۔ مترجم نے تو اس سلسلے میں ایک لفظ بھی نہیں لکھا اور ناشر نے بھی صرف اس قدر لکھا ہے جتنا کہ انگریزی ترجمہ کے فلیپ پر چھپا نظر آتا ہے۔ مترجم کے بقول یہ ناول براہ راست فرانسیسی زبان سے ترجمہ کیا گیا ہے لیکن کتاب کے پہلے ہی صفحہ پر لکھا ہے "بیگانہ البرٹ کامو کے مشہور ناول Outsider کا اردو روپ"۔ کامو کے ناول کا فرانسیسی نام L'Etranger ہے۔ جس کا لفظی ترجمہ The Stranger ہے۔ انگریزی میں یہ ناول پہلے اسی نام سے اور بعد میں The Outsider کے نام سے ترجمہ ہوا۔ براہ راست ترجمہ کرنے والے مترجم کے نزدیک یہ ناول L'Etranger (The Stranger) ہے نہ کہ 'Outsider' نہ معلوم کیوں مترجم نے ترجمہ کے لئے بول چال کی عامیانہ زبان کا انتخاب کیا ہے جس سے موضوع کی سنجیدگی کو صدمہ پہنچتا ہے۔ اس ناول میں مصنف نے Flash Back کی تکنیک سے کام لیا ہے اور ناول کا تمام تر متن گویا ناول کے ہیرو مرسال کی Loud Thinking پر مبنی ہے جو اس وقت ایک ایسے عالم میں ہے جہاں موت اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی ہے۔ لہٰذا بول چال کی عامیانہ زبان کا انتخاب اس موقعہ کے لئے درست نہیں البتہ آخری صفحات میں یہ عیب دور ہو گیا ہے اور ناول (ترجمہ) کی زبان کے اعتبار سے بھرپور متانت کے ساتھ اختتام پذیر ہوتا ہے۔

طباعت نفیس اور قیمت مناسب ہے۔

اسلم پرویز

سیکولر ڈیموکریسی کے اکتوبر کے شمارے میں ڈاکٹر عابد رضا بیدار اور مولانا مہر محمد خاں شہاب نے اہلِ کتاب کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ قابلِ قدر ہے۔ یہ ہماری قومی ضرورت ہے کہ جس طرح اسلام نے اپنے دورِ اول میں دوسرے مذہبوں کو ماننے والے پڑوسیوں کے ساتھ قائم ہونے والے سماجی تعلقات کے بارے میں وسعتِ نظر اور روشن خیالی سے کام لیا تھا۔ اسی طرح ہم اپنے ہندو اہلِ وطن کے سلسلے میں بھی کریں۔

مجھے اس بات سے قطعی اتفاق ہے کہ ہندو اہلِ کتاب ہیں۔ وید عرفِ عام کے مطابق الہامی کتاب ہے اور ان کا احترام ہندوستانی مسلمانوں کے لیے بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا ہندوؤں کے لئے۔ ہندوؤں میں بت پرستی کی ترویج بہت بعد کی ہے مگر اس سے ان کی وحدت پرستی کی بنیاد اسی طرح نہیں مل سکتی جس طرح مسلمان بزرگوں کے مزاروں اور تعزیوں کو پوجنے کے بعد بھی مسلمان ہی کہلاتا ہے۔ اسی طرح ہندوؤں کو اسلامی اصطلاح کے مطابق کافر بھی نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ کافر کے معنی ہیں وہ آدمی جو اپنے باپ دادا سے سنی ہوئی باتوں کے سوائے کوئی بات سننے اور قبول کرنے کو تیار ہی نہ ہو اور جدت و اصلاح کو سرے سے ٹھکرائے اور اس کی جاہلانہ مخالفت کرے جیسے کفارِ مکہ تھے۔ جن کے بارے میں قرآن مجید میں ختم اللہ علیٰ قلوبھم وعلیٰ سمعھم وعلےٰ ابصارھم غشاوۃ کہا گیا ہے (اللہ نے ان کے دلوں پر مہریں لگا دی ہیں اور ان کے کانوں اور آنکھوں پر پردے ڈال دیئے ہیں) ہندوستان کا ہندو اس زمرے میں ہرگز نہیں آتا جو ایک ہزار سال سے اسلام کو برداشت کر رہا ہے۔ اگرچہ اسلام کے گمراہ نام لیواؤں نے اسلام کے نام پر اس پر بے حد ظلم بھی کئے جس نے ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کی بڑی تعداد کو اسلام کے حوالے کیا ہے اور جو آج بھی اسلام کو سمجھنے اور قبول کرنے کو تیار ہے۔ لہٰذا ہندو اہلِ کتاب بھی ہیں اور کافر کی تعریف میں بھی نہیں آتے ہیں ان کا مشرک ہونا بھی ضروری نہیں۔ ہندوستانی مسلم بزرگانِ سلف کا عمل بھی اسی پر رہا ہے۔ اس لئے انھوں نے جابر و ظالم مسلم فرمانرواؤں کے ظلم سے ان کو بچایا اور اس فرض کی انجام دہی میں شاہی عتاب کی بھی ہرگز پرواہ نہ کی۔ دوسرے عنوان سے یہی کام ہمارے زمانے میں گاندھی جی نے انجام دیا۔

بنیادی طور پر قرآن مسلمہ اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) کا سب سے شدید مخالف ہے۔ اس نے صاف کہا ہے کہ ولن ترضیٰ عنك الیھود ولن نصاریٰ حتیٰ تتبع ملتھم (یہود و نصاریٰ تم سے اس وقت تک ہرگز رضامند نہ ہوں گے جب تک تم ان کی غلامی قبول نہ کرلوگے) لیکن مذہبی، سیاسی، سماجی اور اقتصادی ضرورتوں کی وجہ سے مسلمانوں کو ان کا تعاون حاصل کرنے کی ضرورت پیش آئی تو انھوں نے اس سے پس و پیش نہ کیا جو ان کے عملی تدبر کی دلیل ہے۔

میرے نزدیک مسلمانوں اور ہندوؤں کے سماجی تعلق کے بارے میں اسلامی فقہ کو سامنے رکھنا مناسب نہیں۔ اس سلسلے میں ہمیں براہ راست قرآن سے رجوع کرنا چاہیئے۔ وہ اس سلسلہ میں بہتر رہنمائی کر سکتا ہے۔ بفرضِ محال اگر کٹر اور اُجڈ مسلمان ہندوؤں کو اہلِ کتاب مان لے تب بھی اس سے کوئی سماجی فائدہ نہ ہوگا کیونکہ فقہ اسلامی اہلِ قرآن اور اہلِ کتاب کو برابر کا درجہ نہیں دیتی اور آج انسانوں کی درجہ بندی پاپ ہے۔ مسلمان جس تعلیم کی وجہ سے سب سے زیادہ تباہ ہوئے ہیں وہ یہی ہے کہ صرف اسلام ہی سچا دین ہے۔ صرف مسلمان ہی قابلِ نجات ہیں باقی سب دین اور ان کے ماننے والے گمراہ اور ناری ہیں وغیرہ۔ اسی طرح مسلمانوں میں ایک قسم کی رعونت پیدا ہوگئی ہے جیسی بگڑے ہوئے جاگیرداروں کے بچوں میں ہوتی ہے اور وہ انکو گھن کی طرح کھائے جا رہی ہے۔ حالانکہ اسلام کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ اللہ ساری جہانوں کا پروردگار ہے۔ اس کا کوئی فیض محدود نہیں لامحدود ہے۔ اس کے نزدیک سب انسان برابر ہیں اور اس کے دربار میں وہی باعزت ہے جس کے اعمال زیادہ اچھے ہیں۔ لہٰذا میرے نزدیک اس زمانے میں کتابی اور غیر کتابی کی بحث بہت پرانی ہوگئی ہے۔ اس سے نہ کوئی نتیجہ نہ کچھ حاصل۔

ہم جس دور میں ہیں اس کے بارے میں اقبال نے صحیح کہا ہے۔ ؎

آفتاب تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

مذہب اپنا اپنا کام کر چکے۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے دور میں اچھا کام کیا۔ اگرچہ ان کی باہمی آویزش اور جدال و قتال سے دنیا کو شدید نقصان بھی پہنچا۔ یہ دور سوشلزم کا دور ہے اور دنیا کے سارے سیاسی اقتصادی سماجی اور تہذیبی مسائل سوشلزم ہی حل کر رہا ہے اور وہی حل کرے گا۔ اس لئے اب ضرورت ہے کہ فضول بحثوں میں پڑنے کی بجائے ساری قوت اور توانائی سوشلزم کی ترویج و اشاعت میں صرف کی جائے۔ جو لوگ مذہب کو ماننا چاہیں وہ اپنے گھروں اور عبادت گاہوں کے اندر مانتے رہیں مگر قومی اور بین الاقوامی

زندگی میں اس کا قطعی نام نہ لیا جائے تاکہ دنیا جلد از جلد مفلسی، سماجی ناانصافی، ہر قسم کی اونچ نیچ کے تصور ذہنی پستی اور غلامی سے نجات حاصل کرے اور نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا کے لوگ ایک ہو جائیں۔ ہندو، مسلمان، عیسائی اور بودھ وغیرہ کی ساری تفرقیں مٹ جائیں۔ کالے اور گورے برابر ہو جائیں مشرق و مغرب ایک ہو جائیں اور ہم غالب کا یہ شعر والہانہ جذب و شوق سے گانے کے قابل ہو جائیں۔

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

اس حقیقت سے تو شاید ہی کوئی انکار کرے کہ دنیا کے باشندوں کی اکثریت مذہب سے بے نیاز ہو چکی ہے اور اب مذہب کی وابستگی ان لوگوں تک ہی محدود ہے جو یا تو بھولے بھالے ہیں یا جو مذہب کو خدا کی مخلوق کی اقتصادی اور سماجی لوٹ کے لئے ڈھال کے طور پر استعمال کرتے ہیں یا جن کی روٹی روزی کا وسیلہ ہی مذہب ہے۔ ایسی حالت میں دنیا کے مسائل کو حل کرنے کے لئے مذہب کا نام لینا یا اس سے کام لینا کس طرح درست اور مفید ہو سکتا ہے

رئیس الدین فریدی
ایڈیٹر "آزاد ہند" کلکتہ

اہل کتاب اور ہمارے علماء

مکرمی!

"سیکولر ڈیموکریسی" میں اہل کتاب پر مقالے شائع کرنے پر آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ آپ کی وجہ سے ملک کے بہت سے اخباروں اور رسالوں نے اس موضوع کے خلاف اور حق میں دونوں طرح لکھا ہے۔ اہم بات یہ نہیں ہے کہ کتنے لوگ ہمارے خلاف یا ہمارے حق میں لکھتے ہیں اہم بات یہ ہے کہ کتنے لوگ مسئلے سے واقف ہوئے، اور انھوں نے اس کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ اسلام کبھی دنیا کا انتہائی ترقی پسند مذہب تھا۔ آہستہ آہستہ ان حضرات کا شکار ہو گیا جو خود تو کچھ جانتے نہیں، اور اگر کوئی دوسرا بولے تو اس خوف سے سخت ترین مخالفت کرتے ہیں کہ کہیں مذہب پر سے ان کی اجارہ داری نہ ختم ہو جائے۔

کچھ دن ہوئے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی ترمیمی بل کے سلسلے میں سرسید کو علیہ الرحمۃ کہنے والے اور ان کی بنائی ہوئی یونیورسٹی کے لئے جان کی بازی لگانے والوں میں وہ حضرات بھی شامل تھے جنھوں نے کبھی سرسید کو کافر اور مرتد قرار دیا تھا۔ اور جس شدت سے آج علیگڑھ کی موافقت کر رہے ہیں اس سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ علیگڑھ کی مخالفت کی تھی۔ آج دنیا علامہ اقبال کو مسلم فلسفی شاعر کی حیثیت سے جانتی ہے۔ ان حضرات نے اقبال کو بھی نہیں بخشا اور ان پر بھی کفر کا فتویٰ لگا کر انھیں دوزخ میں بھیجنے کا حکم دے دیا تھا۔

میں نے یہ چند باتیں اپنے اُن خیالات کو پیش کرنے کے لئے لکھی ہیں جو اہل کتاب پر مخالفت اور موافقت میں لکھے جانے والے مضامین پڑھ کر میرے ذہن میں آئے ہیں۔

کیا اسلام چھوئی موئی کا پیڑ ہے جسے ہاتھ لگاؤ تو مُرجھا جائے گا۔ اگر فرض کرو ایمانداری سے کوئی اسلام کے بارے میں کچھ کہتا ہے جس سے علماء کو اختلاف ہے تو کیا اس کا مطلب ہے کہ ہم کہنے والے کی نیت پر شبہ کریں۔ اسے حکومت کا چمچہ قرار دیں یا پھر ٹھنڈے دل سے اس بات پر غور کر کے اس کا علمی سطح پر جواب دیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ جو علماء اندر سے کھوکھلے نہیں ہوتے وہ کبھی شخصیت شکنی جیسی حرکتوں پر نہیں اترتے۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنی کی "متحدہ قومیت اور اسلام" بڑی زبردست بحث ہوئی تھی۔ بعض لوگوں نے حضرت مولانا کی شان میں نازیبا کلمات بھی کہے تھے۔ لیکن مولانا چونکہ صحیح معنوں میں عالم تھے اس لئے انھوں نے کسی کی ذات پر کبھی حملہ نہیں کیا معاف کیجئے اگر میں عرض کروں کہ اسلام کو سب سے بڑا خطرہ ان حضرات سے ہے جو اسلام سے قطعی ناواقف ہیں لیکن اسلام پر اپنی اجارہ داری باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ ایک سچا اور کھرا عالم ہمیشہ شائستہ اور مہذب زبان میں بحث و مباحثہ کے لئے تیار رہتا ہے۔ وہ اگر دوسروں کی غلطیاں کی نشاندہی کرتا ہے تو بڑی فراخدلی سے اپنی غلطیاں بھی تسلیم کرتا ہے اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ پڑھا لکھا ہوتا ہے۔

آخر میں ایک بات اور — اگر ہندوستانی مسلمانوں کو اپنا مستقبل بنانا ہے تو انھیں ایسی قیادت بھی تلاش کرنی ہوگی جو روشن فکر ہو۔ مذہب کی سچی روح کو سمجھتی ہو۔ اور نئے حالات کے تقاضوں سے بخوبی واقف ہو۔

آپ کا
فصیح اکمل قادری
رہبر کارنر۔ ترکمان گیٹ۔ دہلی

پی۔اے۔سی کے مظالم

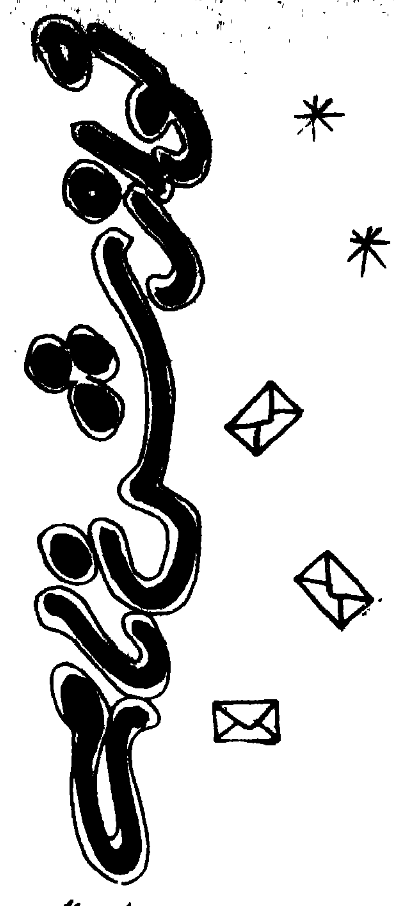
مکرمی!

کچھ دن ہوئے دہلی میں پی۔ اے۔ سی۔ والوں نے کچھ لوگوں کو مارا پیٹا تھا۔ ایک دن یہ خبر پڑھی۔ اور دوسرے دن خبر پڑھی کہ پی۔ اے۔ سی کے چھ سات افراد گرفتار کر لئے گئے اور کچھ کو معطل کر دیا گیا۔ فیروزآباد اور بنارس میں پی۔ اے۔ سی والوں نے قتل و غارت گری کی تھی اور آپ نے حق گوئی سے کام لیتے ہوئے ان کے خلاف "قصہ دو شہروں کے جلنے کا" کے عنوان سے تفصیلی رپورٹ بھی لکھی تھی اور آپ نے بڑی وضاحت سے بیان کیا تھا کہ پی۔ اے۔ سی والوں نے کس کس طرح معصوموں کو قتل کیا۔ اور ان کے گھروں کو نذر آتش کیا۔ سیکولر ڈیموکریسی میں یہ رپورٹ پڑھ کر ہمیں یقین تھا کہ حکومت یقیناً کوئی نہ کوئی قدم اٹھائے گی اور پی۔ اے۔ سی کے کچھ نہ کچھ افراد ضرور گرفتار ہوں گے۔ مگر افسوس ہے کہ حکومت یوپی کے کان تک جوں تک نہ رینگی۔

آپ کا
مجتبیٰ حسین
سکندرآباد (آندھرا پردیش)

تیری آواز میں شامل میری آواز بھی ہے
(ادارہ)

ایس ایم پانڈے نے قومی ایکتا ٹرسٹ کے لئے [illegible] پریس سے چھپوا کر شائع کیا
رجسٹرڈ آفس: A-۱۹ [illegible] بلڈنگ، کناٹ سرکس، نئی دہلی۔ ایڈیٹر: ڈی آر گوئل



اہلِ کتاب کا مسئلہ بے وقت کی راگنی

دسمبر کے "سیکولر ڈیموکریسی" میں کئی ایسے مسئلے زیرِ بحث آئے ہیں جن کے بارے میں اظہارِ خیال کرنے کو دل چاہتا ہے لیکن یہاں میں صرف دو مسئلوں سے متعلق کچھ عرض کروں گا۔

آپ نے اپنے اداریئے میں مسلمانوں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ بدستور شریمتی اندرا گاندھی کا ساتھ دیتے رہیں کیونکہ یہی ان کے مفاد میں ہے۔ میری ناچیز رائے میں افراد کو زیرِ بحث لانے کی بجائے اداروں یا جماعتوں کو پیشِ نظر رکھ کر گفتگو کرنا زیادہ مناسب ہے، اس لئے میں ایسا ہی کر رہا ہوں۔ ۱۹۷۱ء کے انتخابات کے نتیجے میں کانگریس کو مرکز میں اور اس سال کے آغاز میں منعقد ہونے والے انتخابات کے نتیجے میں اکثر ریاستوں میں جو اقتدار حاصل ہوا تھا اس میں اب تک کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے لیکن اس کے باوجود ملک کے مختلف حصوں ــــ میسور، مہاراشٹر، یوپی، وغیرہ میں فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ ایک دفعہ پھر شروع ہو گیا ہے۔ اور اس دفعہ خاص بات یہ ہے کہ مسلمان بجائے راشٹریہ سیوک سنگھ یا اسی طرح کی کسی دوسری جماعت کے براہِ راست پولیس کے مظالم کا نشانہ بن رہے ہیں ــــ فیروز آباد اور بنارس کی حد تک تو خود آپ نے بھی زبردست احتجاج کیا ہے۔ اس صورت میں مسلمانوں کا اعتماد کانگریس پر کیسے بحال رہ سکتا ہے اور وہ کانگریس کے کسی لیڈر کے ہاتھ مضبوط کرنے کا حوصلہ کیسے کر سکتے ہیں؟ کیا فیروز آباد، بنارس یا تو ناری کے کسی ایک بھی خطا کار افسر کو ادنیٰ سزا ملی ہے؟ پھر کیا کانگریس ہائی کمان نے ریاستی سرکار یا اس کے وزیر اعلیٰ سے اس مجرمانہ بے عملی کے لئے باز پرس کرنے کی زحمت گوارا کی ہے؟ ظاہر ہے کہ ان سوالات کا جواب پر زور نفی میں ہے۔ پھر مسلمان اس لیڈر شپ کے حلقہ بگوش کیسے رہ سکتے ہیں جو ان کے خون کی ارزانی کی خاموش تماشائی بنی ہوئی ہے اور اس وقت بنی ہوئی ہے جب اس خون سے خود اس کے کارندوں کے ہاتھ رنگین ہیں؟

دوسرا مسئلہ جس کے بارے میں اظہارِ خیال کرنا چاہتا ہوں ہندوؤں کا اہل کتاب ہونے یا نہ ہونے کا ہے۔ میرے نزدیک ہمارے بعض دانش وروں کو بے وقت کی راگنی چھیڑنے میں خاص ملکہ حاصل ہے اور یہ مسئلہ اسی ضمن میں آتا ہے۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اس وقت اس مسئلہ کی عملی افادیت کیا ہے۔ اگر سب مسلمان اس پر متفق ہو جائیں (جو کبھی نہیں ہو سکتا) کہ ہندو اہلِ کتاب ہیں تب بھی اس سے عملاً کیا فائدہ حاصل ہوگا؟ میری ناقص رائے میں یہ ایسا ہی "علمی مسئلہ" ہے جیسا کبھی یہ تھا (اور بعضوں کے نزدیک اب بھی ہے) کہ میلاد میں ذکرِ ولادتِ مبارک کے وقت سامعین کو کھڑا ہونا چاہیئے یا نہیں۔ اس بارے میں مجھے رئیس الدین فریدی صاحب کے مراسلے کے اس حصے سے پورا اتفاق ہے جس میں انھوں نے کہا ہے کہ بجائے ان امور پر بحث کرنے کے ہمیں اپنی ساری صلاحیتیں سوشلزم (اور میرے نزدیک سیکولرازم بھی) کی ترویج پر صرف کرنی چاہئیں کہ ہمارے مسائل کا حل اسی میں مضمر ہے۔ آج کی دنیا میں قرونِ وسطیٰ کی مذہبی اصطلاحوں پر غور و فکر کرنے سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں ہے۔ ہندوؤں کو اہلِ کتاب ماننے کے بعد بھی ہندو مسلم مناقشات تو مٹیں گے نہیں۔ کیونکہ عیسائیوں اور یہودیوں کو عام طور سے اہلِ کتاب تسلیم کرنے کے باوجود مسلمانوں کے اور ان کے درمیان صدیوں سے چلی آرہی چپقلشیں کہاں مٹی ہیں؟ اس مسئلے کا ایک عملی رُخ یہ ہے کہ مسلمان مرد تو اہل کتاب کی لڑکیوں سے شادی بیاہ کر سکتے ہیں لیکن مسلمان لڑکیاں ان کے مردوں سے نہیں کر سکتی ہیں۔ کیا یہ صورتِ حال سیکولرازم کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے یا آج کے ہندوستان میں ہندوؤں کے لئے قابلِ قبول ہو سکتی ہے؟

دراصل یہ ساری بحث ایک سیکولر ریاست کے شہریوں کے لئے قطعاً بے محل اور لاحاصل ہے کیونکہ اس کا تعلق مذہبی ریاست سے ہے۔ کسی مذہب کے ماننے والوں کو اسلامی ریاست میں اہلِ کتاب کا درجہ دینے کا مطلب یہ تھا کہ ان کے ساتھ دوسرے غیر مسلموں کے مقابلے میں بہتر سلوک کیا جاتا تھا اور یہی اس مسئلے کی عملی افادیت تھی۔ کسی بھی مذہبی ریاست میں دوسرے مذاہب کے پیروؤں کے ساتھ خود اس مذہب کے ماننے والوں کا سا برتاؤ تو ممکن نہیں ہوتا ہے اس لئے یہ سوال اٹھتے تھے کہ انھیں کیا مراعات دی جائیں اور کس بنیاد پر؟ آج یہ تصورات ہی بدل گئے ہیں اور خاص طور سے ہندوستان جیسے ملک میں تو ان کی بالکل ہی گنجائش نہیں ہے۔ پھر اس طرح کی لایعنی بحثوں سے کیا حاصل ہے؟ تعجب ہے کہ وہ حضرات بھی جو بالعموم سیکولر نقطۂ نظر سے گفتگو کرنے کے عادی ہیں ابھی تک ان ہی اصطلاحات میں سوچتے ہیں جس کا تعلق قرونِ وسطیٰ کے سیاسی اور معاشرتی نظام سے ہے۔ ہم اس طرزِ فکر سے جتنی جلدی اپنا دامن چھڑا لیں اتنا ہی اچھا ہے۔

ریاض الرحمٰن شیروانی

اہل کتاب کا مسئلہ

موقر ماہنامہ "سیکولر ڈیموکریسی" کی پچھلی اشاعت

میں ــــ بابت ماہ دسمبر ۱۹۷۲ء ــــ اہل کتاب کے مسئلہ پر ایک مختصر مضمون شائع ہوا ہے۔ روزنامہ "الجمعیۃ" کے محترم مدیر مولانا محمد عثمان فارقلیط صاحب نے پھر جواب دینے کی کوشش کی ہے جو "الجمعیۃ" کے ۱۰ دسمبر کے شمارے میں "سیکولر ڈیموکریسی کا ایک مضمون" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ مولانائے محترم کا یہ چوتھا مضمون ہے۔ مگر بجائے اس کے کہ زیر بحث مسئلہ واضح ہوتا اور الجھ گیا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ کیا مولانا اصل مسئلے کو سمجھتے نہیں؟ یا سمجھتے ہیں، مگر الجھانے میں جو فائدہ ہے وہ سلجھانے میں نہیں؟ میرے خیال میں دونوں باتیں صحیح ہیں۔ مولانا اس دور کی یادگار ہیں جب ہندوستان میں مناظروں کا زور تھا، ہندوؤں اور مسلمانوں میں اور مسلمانوں اور عیسائیوں میں دل چسپ اور شدید مناظرے ہوا کرتے تھے۔ مولانا فارقلیط غالباً ان لوگوں میں سے ہیں جو عیسائیوں سے مناظرے کیا کرتے تھے۔ لفظ "فارقلیط" جواب مولانا کے نام کا لازمی جزو ہے شاید اسی ذوق و شوق کی یادگار ہے مگر ان کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ انہیں کتابوں تک محدود ہے جو مسلمانوں نے عیسائیوں کی مخالفت میں لکھی ہیں۔ اس لئے ان کا مطالعہ نہ تو وسیع ہو سکتا ہے اور نہ گہرا۔ مگر وہ تنگ نظر مسلمانوں کی بہترین نمائندگی کر سکتے ہیں۔ تقریباً یہی انداز ان کا سیاست میں بھی ہے۔ جمعیۃ العلماء کی سیاسی پالیسی کی وجہ سے انہیں پوری طرح پھیلنے کا موقع نہیں ملتا، مگر جہاں اور جب موقع ملا، جماعت اسلامی کے ترجمان "دعوت" کے اداریوں کو مات کر دیتے ہیں۔

صاف ذہن کے مسلمانوں کے نزدیک یہود و نصاریٰ تو یقینی طور پر اہل کتاب ہیں۔ اصل مسئلہ ہندوستان کی قوموں کا ہے جو دنیا کی قدیم ترین اور مہذب ترین قوموں میں سے ہیں۔ بہت سے عالموں اور دانشوروں نے قرآن اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ہندوؤں کو اہل کتاب میں شمار کیا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح صابئیوں کو اہل کتاب کی صف میں شامل کیا گیا حالانکہ وہ ستاروں کو پوجتے تھے اور مجوسیوں کو بھی اہل کتاب کا مرتبہ دیا گیا اگرچہ وہ سورج اور آگ اور دیگر مظاہر قدرت کی پرستش کرتے ہیں۔ مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے فتوے کے مطابق جس کا حوالہ ہم اپنے پچھلے مضمون میں دے چکے ہیں، ہندو موحد تھے مگر بعد میں ان میں اسی طرح کا بگاڑ پیدا ہو گیا جس طرح مسلمانوں کے بعض فرقوں، قبر پرستوں، تعزیہ داروں وغیرہ میں ہوا۔

ہر گروہ اور ہر فرقے کا دعویٰ یہ تھا کہ صرف اسی کا مذہب سچا ہے اور کوشش ہوتی تھی کہ صرف انہیں کے مذہب کی بالادستی قائم ہو۔ مگر اب حالات بدل گئے ہیں۔ طویل تجربے کے بعد لوگ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دنیا اور دلوں میں سکون اور شانتی صرف اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب برتری اور سچائی کے یہ دعوے ترک کر دیئے جائیں اور تسلیم کر لیا جائے کہ ہر مذہب اپنی جگہ سچا ہے۔

آزادی کے بعد یہاں حالات میں جو خوشگوار تبدیلیاں آئی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے باہمی اختلافات اور جھگڑے بہت کم ہو گئے ہیں مگر اب بھی بہت بڑی تعداد ایسی موجود ہے جن کے دلوں سے دوسرے مذاہب سے تعصب اور نفرت کم نہیں ہوئی ہے۔ ہمارے کہنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ دوسرے فرقوں میں یہ عیب اور برائی نہیں ہے ہے اور ضرور ہے، مگر اس وقت ہمارے مخاطب صرف مسلمان ہیں اس لئے ہم صرف انہیں کا ذکر رہے ہیں۔ ہماری خواہش اور کوشش ہے کہ ہندوستانی مسلمان دنیا کے بالخصوص ہندوستان کے بدلے ہوئے حالات اور اپنے فائدے اور نقصان کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ جماعت اسلامی ہو یا مولانا فارقلیط اگر وہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان میں اسلام یا اسلامی تہذیب کی بالادستی کسی صورت اور نوعیت میں بھی قائم ہو سکتی ہے تو ان کی بھول ہے۔ اسی طرح ہمارا ملی اور قومی فائدہ اس میں نہیں ہے کہ ہندوستان کی دوسری تمام قوموں اور فرقوں کو کافر اور مشرک کہیں، نیز ہندوستان کا اگر کوئی فرقہ مسلمانوں کو ملیچھ اور ناپاک سمجھتا ہے تو یہ بھی اس کی بھول اور غلطی ہے۔ نظام الدین (نئی دہلی) میں اہل کتاب کے مسئلے پر جو سیمنار منعقد ہوا تھا، اس کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ مختلف فرقوں اور جماعتوں کے دلوں سے ایک دوسرے کے خلاف نفرت اور تعصب کے جذبات کو ختم کیا جائے اور ان میں رواداری میل جول، بھائی چارہ اور اخوت و مساوات کے جذبات پیدا کئے جائیں۔ اگر ہندوؤں کا دعویٰ ہے کہ ان کے پاس بھی الہامی کتاب ہے اور ان کے یہاں بھی نبی اور اوتار آئے تو اس کو تسلیم کر لینے میں قرآنی تعلیمات کی نفی نہیں ہوگی بلکہ یہ عمل اس کے عین مطابق ہوگا۔

عبداللطیف اعظمی

قمر اعظم ہاشمی کا مضمون فرقہ پرستانہ ہے

I

"سیکولر ڈیموکریسی" کا شمارہ ۱۳ بابت ماہ دسمبر ۱۹۷۲ء میں جناب قمر اعظم ہاشمی کا مضمون "متحدہ قومیت کی تشکیل کا مسئلہ" نظر سے گزرا۔ پڑھ کر مایوسی ہوئی کہ متحدہ قومیت کی تاریخ میں ہندو ارباب حل و عقد ہمیشہ مخل اور سنگ راہ رہے اور یہ ایک طرفہ تماشا مضمون کے پورے خدوخال پر محیط ہے۔ میں نے بار بار پڑھا اور بغور پڑھا مگر کہیں ہندو حضرات کی فراخدلی کا شائبہ تک نظر نہیں آیا۔ غور طلب بات یہ ہے کہ اس یک طرفہ تماشے میں صرف ہندو اور انگریز حضرات ہی تھے یا مسلم بھی، اور نیز یہ کہ سرسید کس قدر وسیع مشرب اور کشادہ دل تھے؟ جب کہ ان کے پورے کارنامے میں فرقہ پرستی، رجعت پسندی اور طبقہ بندی کا اثر غالب و نمایاں ہے۔

انوار حسین

مدیر معاون "مومن دنیا"

II

"متحدہ قومیت کی تشکیل کا مسئلہ" اول تو فرقہ پرستانہ اور زہریلا مقالہ ہے اور دوسرے انتہائی سطحی انداز میں لکھا گیا "سیکولر ڈیموکریسی" جو مسلم ذہن کو ایک نیا موڑ دے رہا ہے اس کے شایانِ شان نہیں۔ اسے جماعت اسلامی یا مسلم لیگ کے کسی رسالے میں شائع ہونا چاہیئے تھا۔

اصغر علی بمبئی

ہماری اپنی ایک پالیسی اور نقطہ نظر ہے۔ لیکن ہم اپنے مخالف مکتبہ خیال کو بھی اظہار کا موقع دیتے ہیں۔ قمر اعظم ہاشمی صاحب کے مقالے سے خود ہمیں بھی اختلاف ہے آپ اپنے اختلافات تفصیل سے لکھیں تو ہم انہیں ضرور شائع کریں گے۔

(ادارہ)

ماہنامہ

سیکولر ڈیموکریسی

جنوری ۱۹۷۳ء

شمارہ ۱۴

مشاورت بورڈ

[illegible]

ایڈیٹرز

سبھدرا جوشی

ڈی۔ آر۔ گوئل

خلیق انجم

جنرل منیجر

راجندر کمار

بزنس منیجر

جی۔ ایل۔ ملہوترا

دفتر کا پتہ

۱۹-اے۔ تھیٹر کمیونی کیشن بلڈنگ

کناٹ سرکس، نئی دہلی ۱

ٹیلیفون ۴۳۳۸۴

ہمارے نمائندے

- مسز کمل سانیال
  ۱۔ ڈوور روڈ کلکتہ
- شری ایم۔ این صدیقی
  نوبت ولا پلاٹ نمبر ۵۶-۵۷
  جو ہو ولے پارلے ہاؤسنگ سکیم
  نارتھ ساوتھ روڈ نمبرا
  آف ارلا برج اندھیری (ویسٹ)
  بمبئی۔ ۵۸ (اے۔ ایس)
- شری روپ نرائن پانڈے
  ڈی۔ ۲۸، شانتی پتھ
  تلک نگر جے پور۔ ۴
- شریمتی خدیجہ عالم خوندمیری
  ۱۱/۱۵-۱۱-۱۶، سلیم نگر
  حیدرآباد۔ ۳۶
- ڈاکٹر معین شاکر
  ڈیپارٹمنٹ آف پولیٹکل سائنس
  مرہٹواڑہ یونیورسٹی اورنگ آباد
- شری بی۔ این پانڈے
  ۱۴۸- آزاد سکوائر
  ساؤتھ ملکہ الہ آباد
  سردار سریندر سنگھ سندھو
  پی ایل ۳۳/۲۔ لاڈووالی روڈ جالندھر
- سردار اقبال سنگھ
  سیکٹر ۱۸۔ اے
  کوارٹر نمبر ۵۰۹ چنڈی گڑھ
- شری این۔ کے سنگھ
  [illegible]

اگلے شمارے میں

- دستورِ ہند میں سیکولرازم کا تصور
- مسلمانوں کی علیحدہ تنظیم کے تجربے

مسلم سیاست میں توازن کی ضرورت

یوں تو ابتدا ہی سے ہندوستان کی مسلم سیاست خاصی انتہاپسند رہی ہے۔ لیکن آزادی کے بعد اس میں اعتدال کی بجائے غیر معمولی شدت پیدا ہو گئی ہے۔ مسلمان عام طور سے جذباتی ہے۔ وہ ٹھنڈے دل سے مسئلہ پر غور کرنے کا عادی نہیں۔ اور فرقہ پرست مسلم رہنما اپنے فرقے کی اس کمزوری سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ معتدل اور متوازن باتیں کرکے مسلمانوں میں مقبولیت حاصل کرنا بہت مشکل ہے اس لئے جب کبھی مسلمانوں سے متعلق کوئی مسئلہ ابھرتا ہے فوراً جماعت اسلامی، مسلم لیگ، اور حد تو یہ ہے کہ جمعیتا لعلماء کے رہنما "اسلام خطرے میں" کے نعرے بلند کرنے لگتے ہیں۔ اور حکومت کو دھمکی دیتے ہیں کہ ایسا کرنے سے پہلے ہماری لاشوں سے گزرنا پڑے گا۔ علیگڈھ یونیورسٹی ایکٹ کے وقت بالکل یہی ہوا۔ تمام فرقہ پرست مسلم سیاسی جماعتوں نے مل کر ایک ہنگامہ پیدا کر دیا۔ اصل مسئلہ کیا ہے؟ حکومت کیا چاہتی ہے؟ طالب علموں کا مفاد کس میں ہے؟ کسی رہنما نے نہیں سوچا۔ ہڑتالیں کی گئیں، مظاہرے کئے گئے اور وہی فرسودہ اور بے معنی نعرے لگائے گئے کہ علیگڈھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ منظور کرنے سے پہلے حکومت کو ان کی لاشوں پر سے گزرنا پڑے گا۔

اس طرح کی جذباتی باتوں سے مسئلہ الجھتا ہے سلجھتا نہیں۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ ترمیمی ایکٹ میں جو چند خامیاں تھیں، اس ہنگامے میں ان کی طرف کسی کی توجہ نہیں گئی۔ تقریباً یہی معاملہ مسلم پرسنل لا کا ہے۔ سستی قسم کی شہرت حاصل کرنے والے مسلم رہ نما اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پر سنجیدگی سے غور کرنے کی بجائے محض جذباتی نعرے لگا کر اپنی دکانیں چمکانے میں مصروف ہیں۔

فسادات کے مسئلے کو لیجئے بلا امتیاز مذہب و ملت کوئی بھی صاف ذہن کا ہندوستانی ایسا نہیں ہوگا کہ ان فسادات کی مذمت نہ کرے۔ لیکن کیا مسلم رہ نماؤں نے یہ سوچنے کی زحمت گوارہ کی ہے کہ ۶۷۔ ۱۹۶۹ء میں جتنے فسادات ہوئے تھے۔ اس کے بعد کے زمانے میں ان کے عشر عشیر بھی نہیں ہوئے۔ یہ کیسے ممکن ہوا؟ کیا صرف اس لئے کہ مسلم فرقہ پرست رہ نماؤں نے شور و غل مچایا تھا یا اس لئے کہ سیکولر طاقتوں نے جہاد کیا تھا۔ ہمارا خیال ہے کہ مسلمانوں کو حقیقت کو سمجھ کر سیکولر طاقتوں کو اور زیادہ مضبوط کرنا چاہیئے تاکہ فسادات کے سلسلے میں جو کمی رہ گئی ہے اسے بھی دور کیا جاسکے

ہندوستانی مسلمانوں کے مقصد کے لئے صرف ہندوستانی مسلمان ہی کوشاں نہیں ہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ سیکولر ہندو اس سلسلے میں کہیں زیادہ جہاد کر رہا ہے۔ اور اس کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ جن سنگھ جیسی فرقہ پرست جماعت بھی اس پر مجبور ہو گئی ہے کہ اگر کچھ نہیں تو کم سے کم غیر فرقہ پرستانہ سیاست کا لبادہ ہی اوڑھ لے۔ کیا مسلمانوں اور خاص طور سے مسلم رہ نماؤں کا یہ فرض نہیں کہ ان طاقتوں کی ہمت افزائی کریں جو مسلمانوں کے لئے فرقہ پرست ہندوؤں سے مقابلہ کر رہے ہیں۔

مسلمانوں کی ملازمت کا مسئلہ بھی اہم ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی تعداد ان کی آبادی کے تناسب سے بہت کم ہے۔ لیکن یہ حقائق بھی نظرانداز نہیں کرنے چاہئیں کہ کچھ عرصے سے مسلمانوں کی حالت کو بہتر بنانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ دو سال پہلے تک C R P میں مسلمان صرف ایک فی صدی تھے اور آج ان کی تعداد پانچ فیصدی ہے۔ بنگال پولیس میں مسلمانوں کی تعداد غیر معمولی طور پر بڑھ رہی ہے۔ یہ خود بخود نہیں ہو رہا ہے بلکہ حکومت کی شعوری کوششوں کا نتیجہ ہے۔ فرقہ پرست مسلم رہ نما اپنے ذاتی مفاد کی وجہ سے ہر چیز کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ حکومت نے اردو کی ترقی اور فروغ کے لئے گجرال صاحب کے زیر صدارت کمیٹی برائے فروغ اردو قائم کی ہے۔ ابھی اس کی رپورٹ تیار بھی نہیں ہوئی کہ فرقہ پرستوں نے اس کے مقاصد بیان کرنے بھی شروع کر دیئے۔ عام طور سے یہ الزام لگایا جا رہا ہے کہ یہ کمیٹی اردو کا رسم الخط بدلنے کے لئے قائم کی گئی ہے۔ اس طرح کی اختراع پردازیوں اور الزام تراشیوں سے ہوتا یہ ہے کہ کوئی شخص ان مسلم رہ نماؤں کی باتوں پر سنجیدگی سے غور نہیں کرتا۔ اور دوسرے سیکولر اور صاف ذہن کے غیر مسلم پر بھی اس کا اثر کچھ زیادہ اچھا نہیں ہوتا۔ بغیر سوچے سمجھے جذباتی ہو کر بے بنیاد بات کہنے کی ایک مثال یہ ہے کہ مولانا اسعد مدنی نے کلکتہ کے کانگریس سیشن میں بیان دیا کہ ۹۹ فی صدی فسادات پولیس کراتی ہے۔ آج سے دو سال پہلے ان کا بیان تھا کہ ۹۹ فی صدی فسادات کی ذمہ داری جن سنگھ اور آر ایس ایس پر ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان کا یہ بیان درست ہے یا پہلا۔ ہمارے خیال سے حقیقت نہ یہ ہے اور نہ وہ۔ اس کے بین بین ہے۔

مسلم مسائل سے ذاتی فائدہ حاصل کرنے کی بجائے ضرورت اس بات کی ہے کہ مسئلہ کے تمام پہلوؤں کو ٹھنڈے دل اور سنجیدگی سے دیکھ کر ایک متوازن رائے قائم کی جائے۔ خود مسلمانوں کو بھی سوچنا ہوگا کہ اب تک کی محض جذباتی سیاست سے انھیں کیا ملا ہے؟

جذباتی اور غیر متوازن مسلم فرقہ پرست رہنما مسلمانوں کو جتنا نقصان پہنچا رہے ہیں اتنا فرقہ پرست ہندو بھی نہیں پہنچا سکتے۔

[redacted]

سیکولر ڈیموکریسی

گوش معنی شنو ہوا خاموش

احتشام صاحب مرحوم

خلیق انجم

ہر بڑے ادیب کی وفات پر کچھ اس قسم کے رسمی الفاظ سے تعزیت کی جاتی ہے کہ مرحوم ایک عظیم انسان تھے۔ ایک فن کار تھے۔ ان کی وفات سے ادب میں ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جو کبھی پُر نہ ہو سکے گا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن احتشام صاحب مرحوم کے بارے میں صرف ایسے رسمی فقرے لکھ دینے سے دل کو تسلی نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ وہ واقعی ایک عظیم انسان تھے اور وہ واقعی ایک بلند پایہ عالم تھے۔ وہ علم کو علم کے لئے حاصل کرتے تھے۔ سماجی عزت اور وقار کے لئے نہیں۔ بعض لوگ صرف سرکاری حلقوں میں مقبول ہوتے ہیں اور بعض عوام میں۔ احتشام صاحب اپنی متوازن اور بے لوث شخصیت کی وجہ سے ہر حلقہ میں غیر معمولی عزت اور احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔

اردو تنقید اپنی ابتدا ہی سے ادب کی دوسری اصناف کے ساتھ پروان چڑھی۔ اردو کے سب سے پہلے نقاد الطاف حسین حالی بنیادی طور پر شاعر تھے۔ ان کی بہترین تنقید مقدمہ شعر و شاعری ان کے دیوان کی مرہونِ منت ہے۔ یعنی انھوں نے اپنے دیوان کا مقدمہ لکھا تھا جو بعد میں بذات خود اردو کا بیش قیمت تنقیدی سرمایہ بن گیا۔ حالی سے لے کر مجنوں گورکھپوری، نیاز فتحپوری، رشید احمد صدیقی تک تقریباً یہی حال رہا۔ وہ بنیادی طور پر مؤرخ افسانہ نگار یا شاعر ہوتے تھے۔ اور محض ثانوی طور

پر تنقیدی مضامین بھی لکھ لیتے تھے۔ ترقی پسند تحریک کی ایک دین یہ بھی ہے کہ اس نے اردو میں تنقید نگاری کو ایک الگ صنف کی حیثیت سے فروغ دیا۔ اس تحریک کے زیر اثر جو نقاد پیدا ہوئے ان کی فہرست بہت مختصر ہے۔ اور صفِ اول کے نقاد صرف تین ہوئے۔ احتشام حسین صاحب، آلِ احمد سرور اور ممتاز حسین۔ ان میں ممتاز حسین تو کمیونزم کے فقیہہ بن گئے۔ اور ان کی تحریریں خشکی اور الجھاؤ کا شکار ہو گئیں۔ اس کے علاوہ جو کچھ انھیں کہنا تھا وہ بہت جلد کہہ کر فارغ ہوئے۔ احتشام صاحب اور سرور صاحب نے عملی تنقید میں کارِ نمایاں کئے اور اس تحریک کے دوش بدوش چلتے رہے۔ کچھ سال پہلے سرور صاحب اور بعض دوسرے ترقی پسند نقاد جدیدیت سے متاثر ہو کر ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کے رشتے تلاش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گئے کہ جدیدیت ترقی پسند تحریک ہی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ ترقی پسندوں میں احتشام صاحب واحد نقاد ہیں جن کے قدم کبھی نہیں ڈگمگائے۔ انھوں نے ابتدا ہی میں اپنے لئے جو راستہ منتخب کیا تھا زندگی کے آخری سانس تک اسی پر چلتے رہے۔ ان کے نقطۂ نظر سے اختلاف ممکن ہے جو خود ان کی زندگی میں.......... ہوتا رہا ہے۔ لیکن ان کی ایمانداری اور ان کے خلوص پر ان کے سخت سے سخت نقاد نے بھی حرف گیری نہیں کی۔ انھوں نے ایک طویل عرصہ ایسا گزارا ہے جب پہلے سامراجی حکومت اور پھر خود ہندوستانی حکومت کی نظر میں اپنے سیاسی عقائد کی وجہ سے مشکوک رہے۔ لیکن محض مادی فوائد کی وجہ سے انھوں نے نہ صرف یہ کہ کبھی اپنے مسلک کو نہیں بدلا۔ بلکہ کبھی اسے چھپانے کی بھی کوشش نہیں کی۔

ترقی پسندوں میں صرف احتشام صاحب اور سرور صاحب ہی ایسے نقاد ہیں جن کی تنقیدوں کا بہت بڑا حصہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔

احتشام صاحب ایک سچے عالم تھے جب تک موضوع کے تمام پہلوؤں پر ہر ممکن مواد کا مطالعہ نہ کر لیتے ہرگز قدم نہ اٹھاتے۔ تنقید تو ظاہر ہے ان کا



میدان تھا لیکن دوسرے موضوعات پر بھی ان کی تحریروں کی یہی خوبی ہے۔ جان بیمز کی کتاب "ہندوستانی لسانیات کا خاکہ" کے اردو ترجمے پر ان کا مقدمہ اور اردوئے معلیٰ میں شائع ہونے والا ایک مضمون "ہند آریائی زبانیں" میرے اس دعوے کا ثبوت ہیں۔ ان دونوں مقالوں کو پڑھنے والا ہرگز یہ یقین نہیں کر سکتا کہ لسانیات میں انھوں نے باقاعدہ تربیت حاصل نہیں کی تھی۔ انھوں نے لسانیات میں جو کچھ علم حاصل کیا وہ محض ان کے ذاتی شوق، غیر معمولی ذہانت اور علمی بصیرت کی دین ہے۔ انھوں نے اردو لسانیات میں جو اضافہ کیا وہ بہت سے تربیت یافتہ ماہرین لسانیات بھی نہیں کر سکے۔ ترقی اردو بورڈ کی طرف سے گریرسن کی Linguistic Survey of India کی اردو سے متعلق جلد کے ترجمے کی ذمہ داری انھیں سونپی گئی تھی۔ افسوس ہے کہ اس کام کی ابتدا بھی نہ ہو سکی کہ وہ چل بسے۔

احتشام صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۵۹ء میں دہلی میں ہوئی تھی۔ اس ملاقات کے بعد ان سے بے شمار ملاقاتیں ہوئیں۔ اور ہر ملاقات میں دل میں ان کی عزت پہلے سے زیادہ ہو جاتی تھی۔ جب کبھی دیر تک ان کے ساتھ نشست رہتی تو وہ فلسفہ، سماجیات، تاریخ اور انگریزی ادب کی بعض کتابوں کا ضرور ذکر کرتے۔ مقصد ان کا یہ ہوتا تھا کہ ہم ان کا مطالعہ کریں لیکن بات ہمیشہ یوں شروع کرتے "آپ نے ہوٹو مور کی سوشیالوجی تو ضرور پڑھی ہوگی۔" پھر اس کتاب کے بارے میں کچھ اس طرح گفتگو کرتے کہ ہم (میں اور ڈاکٹر اسلم پرویز) پہلی فرصت میں وہ کتاب ضرور پڑھتے۔ جن دو عالموں کی منکسر المزاجی نے مجھے غیر معمولی طور سے متاثر کیا ہے ان میں سے ایک تو مولانا امتیاز علی عرشی اور دوسرے احتشام صاحب مرحوم تھے۔ جب کبھی وہ زبانی یا تحریری طور پر کسی سے اختلاف کرتے تو ہمیشہ اس رکھ رکھاؤ اور انداز کے ساتھ کہ دوسرے کو ناگوار نہ گزرے۔ میں نے ان دونوں حضرات کو کبھی معمولی سے معمولی ادیب کے بارے میں بھی سخت الفاظ استعمال کرتے ہوئے نہیں سنا۔ جب کبھی ایسے ادیب کی کسی تحریر کا ذکر آتا تو احتشام صاحب صرف اتنا کہتے "ان کا یہ خیال ہے میرا ذاتی خیال یہ ہے۔" پھر تفصیل سے اس موضوع پر بحث کرتے۔ اس بحث و مباحثہ کے ضمن میں وہ جس طرح بے شمار کتابوں کے زبانی حوالے دیتے تھے وہ قاضی عبدالودود کے علاوہ انہی کا حصہ تھا۔

ان کی عظمت کا ایک ثبوت یہ بھی تھا کہ وہ کبھی کسی کو محض اس لئے چھوٹا نہیں سمجھتے تھے کہ وہ عمر میں چھوٹا ہے یا اس کی سماجی حیثیت کچھ کم ہے۔ ایک دفعہ اردو کے ایک معتبر ادیب باہر سے تشریف لائے ہوئے تھے۔ میرے ساتھ ان کا قیام تھا۔ دہلی کے ایک ایسے صاحب نے جو ادبی اعتبار سے تو مجھ جیسے حقیر کے مقابلے میں بھی کمتر ہیں لیکن جن کی سماجی حیثیت مجھ سے کہیں زیادہ تھی میرے برگزیدہ مہمان سے یہ کہہ دیا کہ آپ خلیق کے ہاں کیسے ٹھہرے۔ یہ آپ کے شایان شان نہیں۔ اتفاق سے انھیں دنوں احتشام صاحب دہلی تشریف لائے ہوئے تھے میں اسلم پرویز اور وہ صاحب احتشام صاحب سے ملنے گئے۔ ان صاحب نے یہ قصہ احتشام صاحب کو بھی سنایا۔ کچھ دیر تک وہ خاموش رہے۔ . . . چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ احتشام صاحب کو یہ بات ناگوار گزری ہے۔ لیکن اولاً کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن جب اور کچھ دیر تک یہ موضوع چلتا رہا تو ان سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ بے ساختہ کہہ اٹھے کہ وہ صاحب گدھے ہیں کچھ اور بات کیجئے۔

میں نے پچھلے بارہ تیرہ برسوں میں انھیں صرف دو بار غصہ میں دیکھا تھا۔ ایک تو اس وقت جس کا ذکر میں ابھی کر چکا ہوں۔ اور دوسرے جب دو تین سال پہلے ایک خاتون کا پروفیسر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ وہ خاتون پروفیسر تو کجا لیکچرر ہونے کے قابل نہیں تھیں۔ ستم یہ ہوا کہ ان کے مقابلے میں ایک مشہور ترقی پسند نقاد کو رد کر دیا گیا تھا۔ احتشام صاحب سے جب اس موضوع پر گفتگو ہوئی تو میرے اور ڈاکٹر اسلم پرویز کے علاوہ اور بھی چند حضرات موجود تھے۔ خاموش بیٹھے سب لوگوں کی گفتگو سنتے رہے بہت دیر بعد بہت غصہ اور دکھ کے ساتھ بولے "اگر یہی روش رہی تو تمام یونیورسٹیاں جاہلوں سے بھر جائیں گی۔" اور پھر موضوع بدل دیا۔

احتشام صاحب کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ جس سے ایک بار ملتے اسے ہمیشہ یاد رکھتے۔ دہلی تشریف لاتے تو اگر میں ان سے اکیلے ملنے جاتا تو سب سے پہلے اسلم پرویز کے بارے میں پوچھتے۔ خیریت سے ہیں؟

آج کل کیا کر رہے ہیں؟ اس کے بعد ہی کوئی اور بات ہوتی۔

احتشام صاحب ایک حقیقی عالم کی طرح کبھی جوڑ توڑ نہیں کرتے تھے۔ ان کے بعض ہم عصروں کی زندگی کا بڑا حصہ صاحب اقتدار لوگوں کی خوشنودی حاصل کرنے میں گزرتا ہے۔ لیکن احتشام صاحب نے اپنی ساری زندگی علمی مشاغل میں گزار دی۔ ان کے ایک صاحبزادے جعفر عباس نے دہلی یونی ورسٹی سے اردو میں ایم۔ اے کیا اور فرسٹ کلاس فرسٹ حاصل کی۔ چونکہ میرے طالب علم رہے ہیں اس لئے ان کی ملازمت کے لئے مجھے خاص پریشانی تھی۔ ترقی اردو بورڈ میں کچھ جگہیں نکلیں۔ میں نے احتشام صاحب سے درخواست کی کہ آپ فلاں صاحب سے کہہ دیں تو تقرر ہو جائے گا۔

مسکرانے لگے۔ میں نے پھر بات دہرائی۔ کہنے لگے بھئی وہ میرا بچہ ہے، میں اس کی طرف سے بہت پریشان ہوں۔ مگر کسی سے کیسے کہہ سکتا ہوں۔ یہ تو غلط بات ہے۔ آپ اس کے استاد ہیں یہ ذمہ داری آپ کی بھی ہے۔

ابھی یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ ترقی اردو بورڈ کے انچارج شہباز حسین صاحب تشریف لے آئے۔ سوچا موقع اچھا ہے۔ میں نے شہباز صاحب سے کہا کہ حضرت آپ کے ہوتے ہوئے جعفر عباس بے روزگار پھر رہے۔ میری یہ بات احتشام صاحب کو ناگوار گزری۔ اور انھوں نے فوراً موضوع بدل دیا۔ بظاہر یہ بات بہت معمولی تھی لیکن ایسی معمولی باتوں کے لئے بھی انسان کو فرشتہ بننا پڑتا ہے۔

پچھلے اکتوبر میں ترقی اردو بورڈ کے تحت علیگڑھ میں لسانی اصطلاحات کا پانچ روزہ سیمنار ہوا تھا۔ مجھے چونکہ علم تھا کہ احتشام صاحب بھی تشریف لائیں گے۔ اس لئے میں اپنے ساتھ وہ پیش لفظ لے گیا جو مکتبہ جامعہ سے شائع ہونے والے ڈپٹی نذیر احمد کے ناول ابن الوقت کے لئے لکھا تھا مقصد یہ تھا کہ ایک بار احتشام صاحب کی نظر سے گزر جائے۔ پہلے ہی دن میں نے ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ بغیر کچھ بولے انھوں نے اپنے کاغذوں میں اسے بھی رکھ لیا۔ دو تین دن بعد سیمنار ختم ہوا۔ تو ہم لوگ باہر نکلے۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا۔

"آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔" اور ایک طرف لے گئے۔ جب ہم سب لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تو انھوں نے وہ پیش لفظ واپس کرتے ہوئے کہا۔ "اس کے بارے میں جو میرے خیالات تھے وہ آخری صفحے پر لکھ دیئے ہیں۔"

شاید انہیں یہ خیال تھا کہ اگر اور لوگوں کو یہ علم ہوا کہ میں نے احتشام صاحب سے مشورہ لیا ہے تو شاید یہ بات مجھے پسند نہ آئے اس لئے وہ مجھے بالکل الگ لے گئے تھے۔ میں ان کے اس انداز پر ہنس پڑا۔ اور عرض کیا قبلہ میرے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا خوشی کی بات ہوگی کہ آپ کی شاگردی کا فخر حاصل کروں۔ لیکن اس واقعہ سے میرے دل میں ان کی کتنی عزت بڑھی وہ شاید بیان نہ کر سکوں۔

احتشام صاحب کا آخری مقالہ سیکولر ڈیموکریسی اردو (سالنامہ ۱۹۷۲ء) میں شائع ہوا۔ ان کی کچھ آخری تصویریں لینے کا فخر بھی مجھے ہی حاصل ہے۔ محترمہ سبھدرا جوشی اور ڈی۔ آر۔ گوئل صاحب سے ان کے بہت دوستانہ مراسم تھے۔ اس لئے اکثر ہمارے دفتر آتے تھے۔ ایک شام وہ دفتر آئے تو میں نے فرمائش کی کہ قومی شاعری پر ایک مقالہ لکھ دیجئے۔ فرمانے لگے الٰہ آباد جا کر بھیج دوں گا۔ میں نے گزارش کی کہ پرچہ پریس جا رہا ہے۔ پھر بے انتہا طرح ہنس کر فرمانے لگے کہ آپ ضد کرتے ہیں تو میں رات کو لکھ دوں گا۔ دوسرے دن تین صفحے کا نامکمل مضمون ملا۔ ایک چھوٹا سا خط منسلک تھا جس میں احتشام صاحب نے لکھا تھا کہ رات میری طبیعت خراب ہو گئی تھی الٰہ آباد جاتے ہی باقی مضمون بھیج دوں گا۔ دو تین دن میں باقی مضمون بھی لکھ دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس رات ان کی طبیعت شدید طور پر خراب ہو گئی تھی۔ چونکہ وعدہ کیا تھا جب تک جسم نے ساتھ دیا لکھتے رہے۔

آخر میں ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ کر دوں

الٰہ آباد یونی ورسٹی کے ایک تعزیتی جلسہ میں یونیورسٹی کے ڈین آف فیکلٹی نے اس حقیقت کا انکشاف کیا کہ وفات سے کچھ عرصہ پہلے مرحوم کو یونیورسٹی کی وائس چانسلرشپ پیش کی گئی تھی لیکن ان کی استغنا پسندی نے اسے قبول نہیں کیا۔

اسی طرح کہا جاتا ہے کہ چند ماہ پہلے یو۔ پی کی گورنرشپ کے لئے ان کا نام تجویز ہوا تھا۔ لیکن یہ علم و فضل کا شیدائی اقتدار کے جال میں نہیں پھنسا اور بالآخر ایک عالم کی حیثیت سے اس نے وفات پائی۔

راکیش ایک شعلہ

رفعت سروش

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں نیا نیا بمبئی سے دہلی آیا تھا۔ کوئی بارہ سال پہلے وودھ بھارتی کے دفتر میں شرت اور میں ایک ہی کمرے میں بیٹھتے تھے۔ ان دنوں ان کی افسانہ نگاری شباب پر تھی اور ہندی افسانہ اکثر موضوع بحث رہتا تھا۔ راجندر یادو، موہن راکیش اور ستیندر شرت اس وقت نوجوان ہندی افسانہ نگاروں کی صف اول میں تھے۔ کملیشور اتنے زیادہ مشہور نہیں ہوئے تھے ——— راجندر یادو سے تو میری ملاقات بہت پرانی تھی مگر راکیش سے ملاقات نہ ہوئی تھی۔

ایک دن ہمارے کمرے میں ایک کھلتے ہوئے ہنستے ہوئے چہرے اور دمکتی ہوئی آنکھوں والا نوجوان داخل ہوا اور شرت نے بڑی گرمجوشی اور نہایت بے تکلفی سے اس کا استقبال کرتے ہوئے راکیش سے میرا تعارف کرایا۔

سیکولر ڈیموکریسی

موہن راکیش سے پہلی ہی ملاقات میں مجھے احساس ہوا کہ وہ نہایت ہشاش بشاش، خوش گفتار سادہ مزاج بے تکلف اور درویشانہ مزاج کا مالک ہے درویشانہ اس لئے نہیں کہ اس نے گیروا کپڑے پہن رکھے ہوں، اور تیاگ اور بیراگ کی باتیں کرتا ہو۔ بلکہ وہ جس کا مسلک یہ ہو ‒

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

اور بعد کو جو ملاقاتیں راکیش سے ہوئیں اور اس کی جو زندگی سامنے آئی، وہ اس شعر کی تفسیر ہی کہی جا سکتی ہے۔ اور آخر میں تو وہ اقبال کی اس کسوٹی پر پورا اترا ‒

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

اس نے اعلیٰ درجے کی شہرت پائی، اچھی ملازمتیں حاصل کیں اور اعزازات حاصل کئے۔ مگر اسی روش پر چل کر۔ ع

میرا طریق امیری نہیں فقیری ہے

اس کا پورا نام مدن موہن گگلانی راکیش تھا۔

۸ جنوری ۱۹۲۵ء کو سرزمین پنجاب میں پیدا ہوا، اور ۳ دسمبر ۱۹۷۲ء کو دہلی میں اپنے قرار دل کو قرار دے کے میں کامیاب ہو گیا۔ تقریباً ۴۸ سال کی زندگی میں اس نے وہ تمام منزلیں طے کر لیں جو ہندوستان کے فن کاروں اور مصنفوں کی قسمت ہوتی ہیں۔

فاقہ مستی، زندگی کی کشمکش اور ازدواجی زندگی کی الجھنیں ——— بحیثیت ادیب کے اعلیٰ درجہ کی شہرت۔ اپنے وقت کے تمام ذرائع نشر و اشاعت میں امتیازی شان۔ چاہے ریڈیو ہو، ٹیلی ویژن ہو، اسٹیج ہو یا فلم ہو۔ یا کتب و رسائل کی دنیا ——— راکیش نے ان سب پر دسترس حاصل کی۔ ٹائمز آف انڈیا کے ہندی کہانیوں کے ماہنامے 'سارکا' کے وہ ایڈیٹر رہے۔ ریڈیو اور ٹیلیویژن والے ان کی تخلیقات کو پیش کرنا اپنا اعزاز کہتے تھے ——— اسٹیج کی دنیا میں تو انھوں نے نئے تجربات کئے اور جے شنکر پرساد کے بعد ہندی اسٹیج کو نئی عظمتوں اور رفعتوں سے ہمکنار کیا۔ اور بہت سے ڈرامے لکھے۔ جن میں 'آدھے ادھورے' ان کے فن ڈرامہ نگاری کی معراج ہے اور اسی ڈرامے نے ان کی عظمت بحیثیت ڈرامہ نگار کے، ملک کے با اقتدار حلقوں میں بھی منوائی۔ ان کو سنگیت ناٹک اکیڈمی کا ایوارڈ ملا۔ اور اس ڈرامے کو رام شیو پوری نے فلمایا بھی ہے۔

ملک نے اس گوہر تابدار کے جوہر کو جلد ہی پہچان لیا۔ یہاں ملک سے مراد ارباب حکومت ——— اور ملک کے عوام تو اس کو بہت پہلے اپنا محبوب ادیب مان چکے تھے۔ اس کو نہرو فیلوشپ دی گئی۔ اسے فلم سنسر بورڈ کا ممبر بنایا گیا۔ اسے فلم فائنَنس کارپوریشن کی ڈائرکٹری کا اعزاز بخشا گیا۔

مگر ان سب اعزازات کو پانے کے لئے اس نے کسی کے در پر جبہ سائی نہیں کی۔ اس نے وقت کے سامنے

گھٹنے نہیں ٹیکے۔ اس نے خوشامد نہیں کی ——— اور اب ان منزلوں سے آگے ——— بہت آگے چلا گیا ——— اس کا اس طرح اٹھ جانا، گویا زبانِ حال سے کہہ رہا ہے کہ میں وقت اور مصلحتوں کی بندشوں سے آزاد ہوں۔

ہاں وہ بندشوں سے آزاد تھا۔ اور اس کا پورا کردار اس کا گواہ ہے۔ وہ ایک قدامت پسند گھرانے کا پروردہ تھا جہاں گوشت لہسن، پیاز بھی کھانا منع تھا۔ مگر وہ ان بندشوں اور روڑھی وار پر ہنس کر ان کو توڑنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔

جب اس کی شادی ہوئی اور وطن والے الٰہ آباد اسٹیشن پر بارات کا استقبال کرنے پہنچے تو خود ہی اپنا رہبر تھا۔ بارات میں صرف موہن راکیش (معہ اپنے بستر اور سوٹ کیس کے) تھا اور لڑکی والے محوِ حیرت رہ گئے۔ لوگ انقلاب کی باتیں کرتے ہیں۔ مگر ذاتی زندگی میں روایتوں سے بندھے رہتے ہیں۔ راکیش جو کچھ کہتا تھا وہی کرتا تھا۔ اس نے روایتوں کے تمام بندھن توڑ کر اور جہیز اور بارات کے تکلفات میں نہ پھنسے۔ اب یہ اور بات ہے کہ اس کی وہ شادی کامیاب نہ ہوئی اور آخر اس نے پہلی بیوی کو طلاق دے کر اپنے لئے دوسری شریک حیات ڈھونڈ لی۔

آزادہ روی کا یہی تقاضا تھا کہ وہ سرکاری نوکری چھوڑ آیا۔ کیونکہ وہاں اسے کچھ خاص بندشوں میں جینا پڑتا تھا۔ ان خاص "بندشوں" کو کچھ وہی لوگ جان سکتے ہیں جنہیں پرائیویٹ اداروں میں ملازمت ——— چاہے وہ ایڈیٹری ہی کیوں نہ ہو ——— کرنے کا موقعہ ملا ہے۔

مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ موہن راکیش آج کے اینگری نوجوان کی طرح تھا ——— نہیں ——— وہ روایت کا احترام کرتا تھا۔ اس کے لباس، نشست و برخاست اور تقریر وغیرہ ——— ہر بات سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اسے خواہ مخواہ توڑ پھوڑ پسند نہیں۔ وہ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے اپنے آپ کو تولنا اپنا شعار سمجھتا تھا اور اگر اس کی کوئی خوبی اسے ہم عصروں میں ممتاز کرتی ہے تو یہی کہ وہ "فیشن ایبل جدید" نہیں تھا۔ اس نے روایت کے حسن کو سمجھا تھا۔ اسے اپنے افسانوں، ناول اور ڈرامہ میں برتا۔ جہاں محسوس کیا روایت کو نیا موڑ دے کر اسے اور خوبصورت بنایا۔ اور جب ضرورت محسوس



موہن راکیش

کی تو اسے توڑ بھی دیا۔ مگر اس طرح نہیں کہ اسے بجائے قلم کار کے 'جلاد' کہا جائے۔

وہ ہندی ادب کی اس پرخلوص پیڑھی سے تعلق رکھتے تھے جنہوں نے دورِ غلامی میں آنکھیں کھولیں اور جن کے سامنے کسی نہ کسی شکل میں "مقصدیت" رہی اس لئے اس مقصدیت اور معنویت کو وہ نت نئے تجربے کرنے کے باوجود نہیں چھوڑ سکے۔

ان کے فن کی اہم خصوصیت اس کا ہندستانی پن ہے۔ اور صاف ظاہر ہے کہ وہ مغربی اقدار سے نہ مرعوب تھے نہ ان کی نقالی کرتے تھے۔ اور آخر میں تو انہوں نے اپنا راستہ خود بنا لیا تھا۔ جو اب آنے والی نسلوں کے لئے کھلا ہوا ہے۔

وہ ایک سچے قلم کار تھے۔ اپنی دوسری بیوی کا آنا تھا کہ انہوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ میری زندگی میں پہلا نمبر میرے قلم کا ہے، دوسرا نمبر ہے میرے دوستوں کا ——— اور تیسرا نمبر پر تم ہو۔ سوچ لو نمبر ۳ بننا تمہیں منظور ہے یا نہیں؟ اگر منظور ہے تو میرے دل کے دروازے کھلے ہیں ورنہ ....

اپنے فن اور قلم سے اتنی محبت، آج کتنے لوگوں کے دلوں میں ہے۔ وہ اپنی تحریر کو ذریعہ معاش نہیں ——— سادھنا سمجھتے تھے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ ان کی روٹی بھی اسی سادھنا میں لکھی تھی۔ لیکن راکیش کو کبھی پیسے کا لالچ نہ تھا پیسے نہ ہونے تو چار مینار سگریٹ پی لی اور پیسے آگئے تو سگار پیا اور یاروں کو بلایا۔ رہے ہمیشہ خوش۔ یاروں کے یار ہمان کی ہر دلعزیزی کا یہ عالم تھا کہ ان کے احباب ان پر جان چھڑکتے تھے۔

ایک بار قرول باغ میں ایک غنڈے نے ان پر قاتلانہ حملہ کیا۔ وہ مانا ہوا غنڈہ تھا۔ ہر دسترس سے آزاد۔ دہلی میں ایسے واقعات اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ مگر جب راکیش کے دوستوں کو معلوم ہوا تو فوراً ٹی ہاؤس میں ہنگامی میٹنگ ہوئی اور ادیبوں کا ایک وفد اسی وقت کے وزیر داخلہ شری لال بہادر شاستری کے پاس پہنچا۔ وہ خود راکیش کے فن کے قدردانوں میں سے تھے۔ فوراً کارروائی کی گئی اور وہ غنڈا جو اپنے آپ کو ہر دسترس سے آزاد سمجھتا تھا ——— اگلے ہی دن گرفتار کر لیا گیا۔

اگر موت موہن راکیش پر علی الاعلان حملہ کرتی تو شاید اس کے قدردان اور دوست اس سے بھی دست و گریباں ہو جاتے۔ مگر وہ بزدل چوروں کی طرح آئی اور بغیر مدافعت کا موقع دیئے اس کے دل میں گھس گئی اور راکیش کے پاس کوئی چارہ نہ رہا سوائے اسے گلے سے لگا لینے کے۔

راکیش کے فن کا سفر کہانی سے ناول اور ناول سے ڈرامہ کی طرف تھا۔ ڈرامے میں ان کو اپنی منزل صاف نظر آتی تھی۔ اور یہاں کے فن کے جوہر ڈرامہ نگاری ہی میں کھلے۔ ان کے کردار جدید ہندوستان کے منقلب سماج کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ "آدھے ادھورے" میں تو ہر چہرہ اور ہر تصویر پوری اور بھرپور ہے۔

راکیش کا سفر ابھی ختم نہیں ہوا۔ ہاں اس کا بوجھ اس نوجوان نسل پر آپڑا ہے جو اس کے کرداروں سے زندگی کی رمق حاصل کرتی تھی۔ وہ بیتاب شعلہ تو بجھ گیا مگر اس کے ادھورے کام کو پورا کرنا نئی نسل کا کام ہے

امن کے خلاف سازشیں

ہمارے سیاسی مبصر کے قلم سے

ہمارا برصغیر ۲۵ سال کشیدگی اور تناؤ کے اندھیروں کی زد میں پھڑپھڑانے کے بعد شملہ معاہدہ کی ننھی شمع کے اجالے کو امن کی صبح سمجھ بیٹھا اور اس یقین کی چھاؤں میں سستانے لگا کہ اب تو اس کے مقدر میں اجالے ہی اجالے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ ایک ننھا خوش آئند آغاز تھا، ہوا کا پہلا جھونکا جس سے حبس کو قدرے کم تو کیا مگر وہ اپنے آپ میں بھی کچھ نہ تھا بہت کچھ اس کے بعد کرنا لازم تھا اور رفتارِ عمل سے بہت سے تقاضے تھے۔

خدا خدا کر کے وہ منزل آئی ہے کہ فوجوں کی واپسی عمل میں آگئی۔ جموں و کشمیر میں کنٹرول لائن کے تعین سے متعلق مذاکرات ایسے اُلجھے کہ سُلجھتے سُلجھتے توبہ کروا ڈالی۔ پاکستانی پنجاب اور جموں کے علاقے کو جو سرحد الگ کرتی ہے اس کے مغربی کونے میں ایک گاؤں تھاکو چک نے برصغیر کے دیرپا امن کی تمام آرزوؤں، امنگوں کی راہ روک لی۔ پونے دو مربع میل کا یہ چھوٹا سا ٹکڑا اتنی اہمیت کا حامل ہوا کہ چلتے مذاکرات جوں کے توں رکے رہے۔ صدر بھٹو نے تھاکو چک سے پاکستانی فوج ہٹانے کا معاملہ اپنے لئے اصول کا سوال بنا لیا اور پھر خود ہی پیش کش کر دی کہ اس گاؤں کے بدلے میں کوئی اور گاؤں مل جانے کی صورت میں وہ اپنی فوج ہٹانے کے لئے تیار ہیں۔ درحقیقت تھاکو چک سے پاکستانی فوج کا انخلا ہند کے لئے اصول کا سوال تھا کیونکہ بین الاقوامی سرحد کے پار ہند کے علاقے میں پاکستانی فوج کی موجودگی کا کوئی جواز نہ تھا۔ پاکستان کی طرف سے اصول کا تذکرہ تو محض لفاظی تھی، دراصل صدر بھٹو چاہتے تھے کہ اقوام متحدہ میں بنگلہ دیش کے داخلہ پر بحث تک فوجوں کی واپسی نہ ہوسکے اور پاکستان کو ہند کے خلاف الزام تراشی اور اسے بدنام کرنے کا موقع مل جائے۔ اُدھر بنگلہ دیش کے داخلہ کے سوال پر دو قراردادیں منظور ہوئیں اور اِدھر سات دسمبر کو لاہور میں جنرل مانک شاہ اور جنرل ٹکا خان کی ملاقات پاکستان کو آدھے مربع میل سے کم علاقہ مل جانے سے تصفیہ کی منزل تک آ پہنچی۔ اس ذکر کا مقصد یہ تھا کہ صدر بھٹو کی حکمت عملی کی طرف اشارہ ہوسکے۔

بہرحال نقشوں اور دستاویزوں پر دستخط ہونے کے بعد گیارہ دن کے اندر اندر دونوں ملکوں کی فوجیں اپنے اپنے علاقے میں لوٹ آئیں اور سرحد پر تناؤ قدرے کم ہوا۔ شملہ سمجھوتے پر مزید عمل درآمد کے لئے دیگر اقدامات ابھی تشنہ ہیں۔ شملہ میں صدر بھٹو نے ہند کے رہ نماؤں کو یہ اشارہ دیا تھا کہ وہ اگست میں پاکستان کی قومی اسمبلی سے بنگلہ دیش تسلیم کروا لیں گے۔ چاؤ این لائی کی سرپرستی کے دوام کے لئے جو رخ صدر بھٹو نے بدلے وہ کسی سے چھپے نہیں۔ بات بدلنے کا صدر بھٹو کا اپنا ہی انداز ہے جس پر خود پاکستان کے سیاسی رہ نما انگشت بدنداں ہیں لیکن وہ کیا کریں؟ ان جیسی یا ان سے ٹکر لینے والی کوئی اور شخصیت بھی تو نہیں ہے۔ پاکستان میں۔ خود ہند کے رہ نماؤں کو اس بات کا پورا احساس ہے کہ برصغیر کے مسائل کے لئے انہیں صدر بھٹو ہی سے بات کرنا ہوگی۔ ہند کی نظر میں برصغیر کا سب سے اہم مسئلہ ہے۔ برصغیر میں دیرپا امن کا قیام لیکن برصغیر میں اب دو کی بجائے تین ملک ہیں۔ ان میں سے بنگلہ دیش ہند کے ساتھ متفق ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی چاہتا ہے کہ چار لاکھ بنگالی جو جنگ آزادی کے دوران میں پاکستان میں رہ گئے تھے جلد از جلد وطن واپس لوٹ سکیں۔ پاکستان کے لئے اس وقت اہم ترین مسئلہ ہے پاکستانی جنگی قیدیوں کی واپسی، جس کے لئے اس نے انسانیت کے واسطے اور جنیوا کنونشن کے حوالے دے کر ہند کو بدنام کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ جہاں تک جنگی قیدیوں کی واپسی کا سوال ہے ہند نے ۶۱۱ ہندوستانی جنگی قیدیوں کی واپسی کے عوض مغربی محاذ پر ہتھیار ڈالنے والے ۵۴۲ پاکستانی جنگی قیدی رہا کر دیئے۔ لیکن اس سے پاکستان کے لئے یہ مسئلہ کچھ شدت اور اختیار کر گیا۔ ہند سے پاکستان نے بار بار یہ تقاضا کیا ہے کہ تمام جنگی قیدی واپس کر دیئے جائیں۔ ہند کی مشکل یہ ہے کہ مشرقی محاذ کے جنگی قیدیوں نے ہند اور بنگلہ دیش کی افواج کی مشترکہ کمان کے آگے ہتھیار ڈالے تھے اس لئے ان کی رہائی کے لئے بنگلہ دیش کی رضامندی ناگزیر ہے۔ دوسری جانب حکومت بنگلہ دیش جنگی جرائم کے مرتکب جنگی قیدیوں کے خلاف مقدمات چلانے کا مصمم ارادہ کئے ہوئے ہے جس کا ذکر وزیر اعظم شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کی حکومت کے نمائندے کئی بار کر چکے ہیں۔ پاکستانی جنگی قیدیوں کی واپسی میں تاخیر کے لئے ہند کو ہی الزام دیئے جا رہا ہے اور اس مسئلہ کے حل کے لئے جو فرض خود اسے سرانجام دینا ہے اس کا ذکر وہاں کم کم ہے۔ نومبر کے وسط کے بعد سے بنگلہ دیش کے نام سوال پاکستان میں بھرپور انداز سے ابھرا ہے۔ صدر بھٹو کو اس بات کا احساس ہو گیا ہے کہ ان کی سفارتی کوششیں اور بیرونی دباؤ استعمال کرنے کے ارادے کام نہ آئیں گے اور جنگی قیدیوں کی واپسی کے لئے انہیں بنگلہ دیش کو تسلیم کرنا ہی ہوگا، لیکن پاکستان کے اندرونی حالات اور چین اور امریکہ کا دباؤ انہیں ایسا کرنے نہیں دیتا۔ وہ فیصلہ کرنے کا ارادہ بار بار کرتے ہیں، توڑ دیتے ہیں۔

چین اور امریکہ اس برصغیر میں اپنا اثر و رسوخ برقرار رکھنے کے لئے یہ نہیں چاہتے کہ ہند ایک اہم طاقت بن کر اُبھرے۔ چین کو اشتراکی ہونے کا دعویٰ تو ہے لیکن عملاً اس کا انداز سامراج کا سا ہے ورنہ کسی بھی اشتراکی ملک کے لئے سوشلزم پر اعتقاد رکھنے والے دو ممالک ہند اور بنگلہ دیش

کی مخالفت کرنے اور پاکستان کا ساتھ دینے کا جواز نہیں ہو سکتا ہے کہ کوئی یہ کہے کہ صدر بھٹو کا پاکستان بھی تو اسلامی سوشلزم قائم کرنا چاہتا ہے لیکن نہ تو وہ سوشلزم ہی ہے اور نہ ہی اسلامی۔ چین کے اصولوں کی آزمائش تو بنگلہ دیش کی جنگ آزادی کے دوران ہو گئی جب اس نے عوامی جنگ آزادی کی مخالفت کی اور یحییٰ کی فوجی آمریت کا ساتھ دیا اور اس کے مداح یہاں تک کہ مولانا بھاشانی بھی دانتوں تلے انگلی دبا کے رہ گئے۔ اصل بات یہ ہے کہ چین کے یہ خلاف از اصول اقدامات کا باعث وہ خوف ہے جو اس نے روس جیسے خوف کی صورت میں خود پر مسلط کر رکھا ہے۔

اب امریکی رول کو لیجئے۔ ویت نام میں ندامت کا منہ دیکھنے کے بعد اس کا ارادہ ہے کہ برصغیر میں کچھ ایسی چال چلی جائے کہ امریکیوں کی زندگیاں خطرہ میں ڈالے بغیر ہتھیاروں اور جنگی ساز و سامان کی فروخت کا وسیلہ بن جائے۔ امریکہ نواز حلقے پاکستان میں یہ تاثر پیدا کرنے کی کوششوں میں خوب زور شور سے مصروف ہیں کہ جب امریکہ ویت نام سے اپنی گلو خلاصی کرانے میں کامیاب ہو گا، تب پاکستان کو خاصا اسلحہ مل سکے گا۔ چین اور امریکہ سے مالی اور جنگی امداد کا لالچ پاکستان کو کوئی آزادانہ فیصلہ کرنے سے روکے ہوئے ہے۔ امریکہ کی بدنام زمانہ ایجنسی سی آئی اے۔ پاکستان، ہند اور بنگلہ دیش میں بیک وقت تخریبی سرگرمیوں میں مصروف ہے۔ ہند میں اس کی سرگرمیوں پر خاصی تنقید ہوئی ہے۔ پاکستان کے صحت مند اور باشعور عناصر ایسی سرگرمیوں سے باخبر ہیں۔ پاکستان کے کثیر الاشاعت اردو ہفت روزہ اخبار جہاں کے ۲۹ نومبر کے شمارے میں راولپنڈی سے حبیب الرحمٰن صاحب "مرکزی دارالحکومت سے ایک خط" کالم میں لکھتے ہیں:۔

"پاکستان کو امریکی گندم کا محتاج بنانے کی ضرورت اس لئے تھی کہ ایک طرف تو پاکستان کے سیدھے سادے اور بھولے بھالے عوام کے دلوں میں امریکہ سے محبت اور عقیدت پیدا ہو جائے۔ دوسری طرف امریکی گندم کی قیمت سے جمع شدہ پی۔ ایل۔ ۴۸۰ فنڈ کے ذریعہ پاکستان کی داخلی سیاست میں امریکی دخل اندازی کی راہیں پوری طرح کھل جائیں۔ اس سارے کھیل میں ہاتھ بٹانے والوں کو جو مراعات حاصل ہوئیں ان کا زندہ ثبوت وہ عالی شان محل ہیں جو ملک کے مختلف شہروں میں تعمیر ہوئے اور جن کے مالکوں میں بھاری اکثریت افسر شاہی کے ایک خاص گروپ کے ارکان، ان کی بیگمات۔ صاحبزادگان اور صاحبزادیاں شامل ہیں۔ ان عشرت کدوں میں سے کسی ایک کی قیمت کی بھی مکمل طور پر جانچ پڑتال کی جائے تو یہ ثابت کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی کہ یہ دستِ طیب کا کرشمہ ہے..... ویت نام میں جنگ بندی کی کوششوں کے آغاز کے بعد سے پاکستان میں امریکی لابی معاہدۂ شملہ کے خلاف سرگرم عمل ہو گئی اور یہ سرگرمیاں حالیہ دنوں میں عروج کو جا پہنچی۔ میں یہ عرض کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ جنگ بازوں کے ان پاکستانی ایجنٹوں سے پوری طرح نمٹنا بھی ضروری ہے، جو زندگی کے ہر شعبے میں پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اگر کسی کو ان ایجنٹوں کی موجودگی کا یقین نہیں آتا تو انھیں یقین دلانے کے لئے اپنے اسی دوست کے شکریہ کے ساتھ جس نے امریکی سفارت خانے کے ذریعے لاکھوں روپے کی تقسیم کی دستاویز کے فوٹو سنبھال رکھے ہیں میں آج یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ان ایجنٹوں کو باقاعدہ نمبر دیئے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک بزرگ جن کا پیشہ وکالت ہے انھیں (۱۶ا-۴۹۴) کہا جاتا ہے، جن کے بارے میں میرے متذکرہ بالا دوست کی اطلاع یہ ہے کہ موصوف کو عریاں فلمیں مہیا کی جاتی ہیں تاکہ وہ اپنے دولت کدے پر ایسے با اثر اصحاب کی تسکین نگاہ کا اہتمام کر سکیں جو وقت ضرورت کام آ سکتے ہیں۔ اس ایجنٹ نمبر ۱۹ کو حال ہی میں ایک چھوٹے سے مقدمے کی وکالت کے عنوان سے ۵۰ ہزار روپے کا نذرانہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ آج کل ان صاحب کی خاص دلی آرزو یہ نظر آتی ہے کہ وکلا کے جلسے میں اس نقطۂ نظر کی وکالت فرمائیں کہ پاکستان کو بھارت اور بنگلہ دیش سے صلح کی بجائے جنگ کی پالیسی اختیار کرنی چاہیئے۔"

روز نامہ امروز کے اسٹاف رپورٹر نے لاہور سے خبر دی ہے کہ ملک کی دائیں بازو کی بعض سیاسی جماعتوں نے بنگلہ دیش کی مخالفت کے بہانے ملک کے مختلف حصوں خصوصاً پنجاب میں بدامنی پھیلانے کا منصوبہ بنایا ہے۔ اس منصوبے کی تکمیل کے لئے طلبہ کو کافی مقدار میں اسلحہ فراہم کر دیا گیا ہے۔ اسلامی جمعیت طلبا کے زیر اہتمام ۱۷ دسمبر کو لاہور میں پنجاب کے طلبہ کا کنونشن اس منصوبے کی پہلی کڑی ہے۔ اس کنونشن کے تمام اخراجات بعض مفاد پرست عناصر برداشت کر رہے ہیں۔ بعد ازاں ملنے والی خبروں سے پتہ چلا کہ اس کنونشن کے لئے اسلامی جمعیت طلبہ کو ۵۰ ہزار روپیہ دیا گیا۔ اسٹوڈنٹ لیڈر راشد بٹ اور دوسرے کئی طالب علم رہنماؤں نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ یہ رقم سامراجی ایجنٹوں کی طرف سے دی گئی ہے انھوں نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ طلبہ کو سامراجی اثر و رسوخ سے محفوظ رکھا جائے اور ایسی سرگرمیوں کی روک تھام کی جائے۔

کنونشن کے لئے یہ رقم دست طیب کا عطیہ تھی۔ حکومت پاکستان کے فیصلوں پر اثر انداز ہونے کے لئے اسلحہ اور جنگی سامان کا لالچ اور ملک کی داخلی سیاست کو ہموار کرنے کے لئے دست طیب کی کرم فرمائیاں ـــــــ یہ امریکی تاجرانہ سامراج کا پرانا دھندہ ہے اس کے وارد و طریقہ ہیں۔ بنگلہ دیش میں رائے عامہ کو ہند اور سوویت روس کے خلاف کرنے کے لئے سی آئی اے سرگرم عمل ہے اس کی سرگرمیوں میں تخریبی منصوبے بھی شامل ہیں۔ وہاں کے ترقی پسند حلقوں کی رائے میں پٹ سن کے کارخانوں میں آتش زنی کے واقعات کے پیچھے سی آئی اے کا ہاتھ ہے۔

صدر بھٹو کو جب یہ احساس ہو گیا کہ جنگی قیدیوں کی واپسی کے لئے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنا ناگزیر ہے تو وہ عوام سے ربط کا سلسلہ شروع کرنے صوبہ سرحد گئے۔ اس سے امریکہ نواز رجعت پرست حلقوں میں بے چینی پھیلی۔ یکم دسمبر کو امیر جماعت اسلامی میاں طفیل محمد کا ہوائی دورہ شروع ہو گیا اور یکم دسمبر ہی کو لیاقت باغ راولپنڈی میں پیپلز پارٹی کے کنونشن کے آخری عوامی جلسے میں صدر بھٹو کی تقریر کے دوران نہ صرف "بنگلہ دیش نامنظور" کے نعرے لگائے گئے بلکہ پیپلز پارٹی کے کارکنوں کے ساتھ تصادم بھی ہوئے اور کئی ہوائی فائر بھی۔ اس کے بعد جوابی کارروائی کا سلسلہ تیز ہو گیا۔ لاہور، لائلپور اور ملتان میں جماعت سے متاثر طلبہ ہنگاموں پر اتر آئے۔

درحقیقت بنگلہ دیش تو ایک بہانہ ہے۔ رجعت پرست طاقتیں اقتدار پر نظر جمائے ہوئے ہیں۔ نوائے وقت کے ۲۹ نومبر کے اداریے میں ان کی سرگرمیوں کا ذکر یوں کیا گیا ہے:۔

"جمعیت العلمائے پاکستان کے سربراہ مولانا شاہ احمد نورانی (ممبر نیشنل اسمبلی) کی صدارت میں چھ سیاسی جماعتوں کے نمائندوں کا ایک اجلاس لاہور میں منعقد ہوا اس میں مسلم لیگ، جمہوری پارٹی، جمعیت اہلِ حدیث، جماعت اسلامی، جسٹس پارٹی اور جمعیت العلمائے پاکستان کے نمائندوں نے "پاکستان کو درپیش خطرات اور ملکی تحفظ و استحکام کے لئے" ان جماعتوں میں اشتراک عمل کا فیصلہ کیا۔ ان جماعتوں کے نزدیک خطرات کے ساتھ سب سے بڑا خطرہ بنگلہ دیش کو تسلیم کیا جانا ہے۔ یہی جماعتیں اگر انتخابات میں ان خطرات کا اندازہ کر لیتیں جو ان کی ہار کے بعد متوقع تھے اور شخصی اور گروہی انا کی سطح سے اٹھ کر اسی جذبے کے ساتھ تھوڑے سے ایثار سے کام لے کر متحد و متفق ہو جاتیں تو پاکستان کی تاریخ ہی مختلف ہوتی۔"

نوائے وقت کی ہمدردی ان رجعت پرست جماعتوں کے ساتھ ہے ان کے علاوہ ریٹائرڈ ائر مارشل اصغر خاں کی تحریکِ استقلال بھی انھیں حلقوں سے وابستہ ہے۔ یہ حلقے چند جگہوں پر طلبہ کے مظاہرے کروا کر انھیں عوامی تحریک کا نام دینے لگے اور رد کلار کو بھی اس میں الجھا لیا گیا جمہوری پارٹی کے رہنماؤں نوابزادہ نصراللہ خاں ریٹائرڈ میجر جنرل سرفراز خاں، رانا نذرالرحمٰن وغیرہ نے ایک مشترکہ بیان میں حزبِ مخالف اور خصوصاً طلبہ کے خلاف اختیار کی نئی سرکاری پالیسی کی مذمت کی۔ مسلم لیگ کے سکریٹری جنرل ملک قاسم نے ایک بیان میں کہا "گولیوں سے حق و انصاف پر مبنی مقصد کو کچلا نہیں جاسکتا" جماعت اسلامی کے مولانا فتح محمد نے اپنے بیان میں کہا "بنگلہ دیش نامنظور کی عوامی تحریک سے موجودہ حکومت بوکھلا گئی ہے"۔ (نوائے وقت ۱۲ دسمبر) لیکن مولانا مودودی کے بیان سے ان طاقتوں کے مقاصد عیاں ہوگئے۔ مولانا نے کہا "پولیس کی طرف سے گرفتار کئے جانے والے افراد درحقیقت مسز اندرا گاندھی کی حراست میں ہیں جس کی خواہش کو اس طریقے سے پورا کیا جا رہا ہے۔ نئے پاکستان میں حالات کی صورت حال بڑی افسوسناک ہے۔ نئی دہلی کی مرضی نہ صرف بھارت بلکہ پاکستان میں جو کہ مسلمانوں کا وطن ہے بھی مسلمانوں پر مسلط ہونے لگی ہے۔"

ویسے پاکستان کے رجعت پرست عناصر اکثر واویلا کرتے ہیں کہ ان کے ملک کے داخلی معاملات میں ہند کی طرف سے دخل دیا جا رہا ہے اور اب زبردستی ہند کو ملوث کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

حالات کی ستم ظریفی کہ صدر بھٹو نے مسلم لیگی عبدالقیوم خاں کو اپنی کابینہ میں وزارت کا عہدہ پیش کیا لیکن قیوم لیگ کی مجلس عاملہ نے اپنے ایک اجلاس میں بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کی مخالفت کی اور عبدالقیوم خاں کو متنبہ کیا کہ انھیں جماعت کی طرف سے بنگلہ دیش تسلیم کرنے کا اعلان کرنے کا کوئی اختیار نہیں۔ ادھر صدر بھٹو بنگلہ دیش تسلیم کرنے کے حق میں رائے عامہ ہموار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ادھر اسلام پسند اور رجعت پرست ان کوششوں کو تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں رکھ رہے۔ طرح طرح کی اختراع، طرح طرح کے اشتعال انگیز نعرے تخریبی مقاصد کے لئے استعمال کئے جا رہے ہیں۔ جمعیت العلمائے پاکستان کے مولانا شاہ احمد نورانی نے حیدرآباد میں تقریر کرتے ہوئے کہا "بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے سے پنجاب دیش، سندھو دیش، آزاد بلوچستان اور پختونستان قائم ہو جائیں گے اور اس طرح نظریۂ پاکستان ختم ہو جائے گا۔"

منگورہ میں میاں طفیل محمد نے ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا "بنگلہ دیش کا مسئلہ اس لئے اٹھایا جا رہا ہے کہ عوام کی توجہ آئین سے ہٹ جائے اور پاکستان کو بدستور سرزمین بے آئین رکھنے کا جواز میسر آسکے۔ حکومت کا کہنا غلط ہے کہ بنگالی عوام خود علیحدگی چاہتے تھے۔ الشمس اور البدر کے پچاس ہزار نوجوانوں نے جو ہماری فوج کی مدد کر رہے تھے ابھی تک ہتھیار نہیں ڈالے۔" میاں طفیل محمد کے بیان سے سامراجی سازش اور بھی بے نقاب ہو جاتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ بنگلہ دیش کے تخریب کار عناصر کے ساتھ پاکستانی جماعت اسلامی کا رابطہ امریکی حلقوں کی معرفت قائم ہے۔ جہاں تک پاکستان کی داخلی سیاست کا تعلق ہے اس میں دائیں بازو کے عناصر میں جماعت اسلامی ہی ایک باقاعدہ جماعت کے طور پر کام کر رہی ہے، دوسری رجعت پرست جماعتوں کا اثر و رسوخ یا تو بکھرا بکھرا ہے یا کاغذ تک محدود ہے لیکن بیانات شائع کرنے کے لئے تو کاغذی جماعتیں بھی استعمال کی جاسکتی ہیں۔ یوں تو اب خاکسار تحریک کسی گنتی میں نہیں رہی لیکن اس تحریک کے قائم مقام سربراہ آغا اشہر نے بھی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک بیان داغ دیا "کوئی فردِ واحد تو کیا قومی اسمبلی بھی بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کی مجاز نہیں ہے۔ اس وقت بھی مشرقی پاکستانیوں کی بھاری اکثریت متحد پاکستان کی حامی ہے اور انھوں نے ڈھاکہ انتظامیہ کے خلاف ہتھیار اٹھا رکھے ہیں۔ اگر بنگلہ دیش کو تسلیم کیا گیا تو اس سے مشرقی پاکستان کے حریت پسندوں پر ضربِ کاری لگے گی۔" پاکستانی سیاست داں خوابوں کی دنیا میں رہنے کے اس قدر عادی ہوگئے ہیں کہ دن رات تسکینِ دل کے لئے بنگلہ دیش کی تباہی کے خواب دیکھتے رہتے ہیں۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ شیخ مجیب اس ملک کے واحد محبوب عوامی رہنما ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ مارچ کے عام انتخابات کے بعد خواب پرست یہ یقین کرنے پر مجبور ہو جائیں کہ وہ محض خوابوں پر تکیہ کئے ہوئے تھے۔

حال ہی میں تحریکِ استقلال کے سربراہ ائر مارشل اصغر خاں نے بھی ایک بیان دیا ہے۔ اصغر خاں آجکل جماعت اسلامی کے چہیتے بنے ہوئے ہیں۔ انھوں نے کہا ہے۔

"صدر بھٹو بنگلہ دیش کو عوام سے تسلیم کرانے میں بری طرح ناکام رہے ہیں اس لئے وہ جمہوری روایت کے مطابق مستعفی ہو جائیں۔ بھٹو صاحب نے جو رابطہ عوام مہم چلائی ہے وہ ناکام ہو چکی ہے چنانچہ اب وہ یہ کہنے لگے ہیں کہ بنگلہ دیش کی منظوری وہ قومی اسمبلی سے حاصل کریں گے پہلے وہ کہتے تھے کہ اس کی منظوری عوام دیں گے، لیکن عوام نے کہیں بھی اس کی منظوری نہیں دی۔"

ادھر صدر بھٹو عوامی منظوری سے ہٹ کر قومی اسمبلی کی طرف متوجہ ہوئے اُدھر جماعت اسلامی کی طرف سے دھمکیاں دی جانے لگیں کہ بنگلہ دیش تسلیم کرنے کی حمایت کرنے والے قومی اسمبلی کے ممبروں کا گھیراؤ کیا جائے گا بنیادی غلطی دراصل صدر بھٹو سے ہوئی ہے انھیں یہ خود اعتمادی

کچھ زیادہ ہی ہے کہ وہ عوام کو جدھر چاہیں ادھر موڑ لیں۔ انتخابات میں انھوں نے اسلام پسندوں کو شکست دی لیکن تب ان کے وعدے محض وعدے ہی تھے انھیں عوام وعدوں کو حقیقت میں ڈھالنے کا موقعہ دینا چاہتے تھے۔ اب صورت حال کچھ مختلف ہے۔ انھیں یہ مسئلہ قومی اسمبلی ہی میں پیش کرنا چاہیئے تھا۔ امریکی اثر و رسوخ کا تقاضا ہے کہ برصغیر میں کشیدگی بنی رہے۔ ورنہ امریکی خود بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے بعد پاکستان کو ایک بار تو مشورہ دیتا کہ اسے بنگلہ دیش کو تسلیم کر لینا چاہیئے۔ اول تو امریکہ اور چین بھٹو حکومت پہ دباؤ ڈالیں گے کہ برصغیر میں صورت حال کے معمول پر نہ آنے دیا جائے۔ اگر صدر بھٹو اس دباؤ کا اثر قبول نہیں کریں گے تو امریکہ نواز رجعت پرست عناصر کے ذریعہ مزید دباؤ ڈالا جائے گا۔ یہ سلسلہ شروع ہو چکا ہے اور اسلام پسند رجعت پرست عناصر کا صدر بھٹو کے خلاف گٹھ جوڑ انھیں سازشوں کی ایک کڑی ہے۔ صدر بھٹو اپنی اس شہرت سے کئی بار بہت فائدہ اٹھاتے ہیں کہ وہ بات بدلنے میں بہت ماہر ہیں جب کوئی ان کی باتوں میں تضاد کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ برصغیر کے تضادات کی طرف انگلی اٹھا دیتے ہیں۔ شملہ سے وہ پاکستان لوٹے تو ان کی زبان پر امن کے تذکرے تھے۔ مہینہ بھر بعد ہی انھوں نے کبھی امن اور کبھی جنگ کے خطرے کی باتیں شروع کر دیں۔ اقوام متحدہ میں ان کے نمائندے سلطان محمد خاں نے تو کھلم کھلا جنگ کے امکانات کا ذکر کیا۔ اگست کے بعد سے وہ امریکی نواز تصادم پسند حلقوں کی خوشنودی کے لئے اپنا رویہ سخت کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ۳۰ نومبر کو اپنی پارٹی کی کنوینشن میں ایک تقریر میں انھوں نے کہا۔

"اگر میری حکومت رہی اور میں نے بھارت سے انتقام نہ لیا تو آپ میرا گریبان پکڑ لیں"۔ اس کے بعد یکم دسمبر کو لیاقت باغ میں انھوں نے ایک بھاری اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے لوگوں کی "چینی، آٹا اور گھی" کی آوازیں سن کر کہا "مجھے معلوم ہے کہ لوگوں کی ضروریات کیا ہیں میں ان کی مشکلات سے بے خبر نہیں ہوں۔ لوگ چاہتے ہیں ضروریات زندگی کم قیمت پر ملیں، دوسری طرف ملک کو مزید طیاروں اور ٹینکوں کی ضرورت ہے۔ آپ خود فیصلہ کریں کہ کس چیز کو اولیت حاصل ہونی چاہیئے"۔ اب یہ خبر ملی ہے کہ پاکستان نے صدر بھٹو کے عہد میں جنگی تیاریوں پر اتنا خرچ کیا ہے جتنا کہ اس سے پہلے ایک سال میں کبھی نہیں کیا گیا۔

امریکی اثر انتظامیہ سے کہیں زیادہ پاکستانی فوج میں ہے اسی لئے فوجی آمریت کے دوران دست غیب کی رحمتیں کچھ زیادہ ہی رہیں۔ گذشتہ جنگ میں شکست کے بعد فوج کے حوصلے پست ہو گئے تھے۔ اس کی پھر پیٹھ ٹھونکی جا رہی ہے۔ اس کام کے لئے ٹکا خاں سے بہتر کون آدمی انھیں مل سکتا ہے؟ پاکستان لوٹنے والے جنگی قیدیوں سے خطاب کرتے ہوئے جنرل ٹکا خاں نے کہا "پاکستان کی مسلح افواج کے حوصلے بہت بلند ہیں وہ آج بھی اس حقیقت کو ثابت کر سکتی ہیں کہ وہ دنیا کی بہترین فوج ہیں"۔ یہ احساس ان میں بھرنے کا ماضی میں نتیجہ یہ ہوا کہ گذشتہ برس برصغیر انتہائی تکلیف دہ دور سے گزرا اور ترانوے ہزار پاکستانی افسر اور فوجی جنگی قیدی بنے۔ درحقیقت یہ احساس بھرم اور خوش فہمی سے زیادہ کچھ نہیں لیکن تصادم پسند اسے بھی حربے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

بظاہر چین نواز صدر بھٹو اپنے دل میں امریکہ کے لئے بھی محبت رکھتے ہیں۔ ملک کے امریکہ نواز رجعت پرستوں کے لئے ان کے اختلافات کی وجہ محض اقتدار ہی ہے۔ اپنے مخالفوں کے ساتھ نہلے پہ دہلا کا سا سلوک کرتے ہوئے ان کی پارٹی نے کیمبل پور، جہلم، گجرات اور راولپنڈی سے ایک لاکھ لوگ اکٹھے کئے، جن میں عمر رسیدہ عورتیں اور مرد بھی شامل تھے، ۲۰ ہزار لوگ تو جنگی قیدیوں کے رشتہ دار تھے۔ ۸ دسمبر کو ان کا جلوس نکلا بنگلہ دیش تسلیم کرنے کے حق میں، کئی عورتیں تو رو رہی تھیں، سینہ کوبی کر رہی تھیں اور نعرے لگا رہی تھیں صدر بھٹو نے جنگی قیدیوں کی واپسی میں تاخیر کے سبب پیدا ہونے والی بے چینی کو اپنے مخالفوں کے خلاف استعمال کیا، حالانکہ ائیر مارشل (ریٹائرڈ) نور خاں نے کہا "ایسے مظاہروں سے فوج کا حوصلہ متاثر ہو سکتا ہے۔ یہ جذباتی سیاست ہے سپاہی یا اس کے خاندان کو سینہ کوبی اور مظاہروں کے ذریعے قومی مفادات پہ سودے بازی کا کوئی حق نہیں"۔

حقیقت یہ ہے کہ آج برصغیر میں دیرپا امن کے قیام کا انحصار دو اہم مسئلوں کے حل پر ہے۔ ایک تو ہے پاکستانی جنگی قیدیوں کی واپسی کا اور دوسرا پاکستان کی طرف سے بنگلہ دیش کو تسلیم کیا جانا۔ اگر پاکستان دوسرا اقدام لے لے تو اس سے نہ صرف اس کے اور بنگلہ دیش کے تعلقات معمول پہ آ سکیں گے بلکہ ہند کے ساتھ تعلقات بھی بہتر ہو سکیں گے۔ ہند کی امن دوستی کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ اس نے جنگ کے بعد چھ سات ماہ کے اندر پاکستانی علاقے واپس کرنے کا معاہدہ کر لیا جب کہ اسرائیل نے امن دشمنی کا ثبوت دیتے ہوئے گذشتہ پانچ سال سے عرب علاقوں پہ قبضہ کر رکھا ہے مختصر یہ کہ ہند نے امن کے لئے بھرپور کوشش کی ہے۔ غالباً صدر بھٹو بھی امن ہی کے خواہاں ہیں۔ کیونکہ پرامن حالات میں ہی ان کا اقتدار قائم رہ سکتا ہے۔ لیکن جب بھی وہ فوجی تیاریوں اور جنگ کے امکانات کا ذکر کرتے ہیں تو شاید ان کا مقصد امریکی نواز اور رجعت پرست پروپیگنڈے سے متاثر عوام کو خوش کرنا ہوتا ہے۔

صدر بھٹو کی کوششوں کی کامیابی کی راہ جماعت اسلامی، اصغر خاں وغیرہ روکے ہوئے ہیں۔ جوابی ملک گیر مہم میں امیر جماعت میاں طفیل محمد بھرپور وار کر رہے ہیں بلکہ ان کی کئی تقریروں میں صدر بھٹو کے لئے انتباہ بھی ہے جیسا کہ ۳ دسمبر کو ایبٹ آباد میں تقریر کرتے ہوئے میاں طفیل محمد نے کہا "جو لوگ ملک کی نظریاتی اور جغرافیائی سرحدوں کے خلاف سازشوں میں مصروف ہیں، انھیں بہت جلد عوامی عتاب کا نشانہ بننا پڑے گا۔ اسلام اور پاکستان کے خلاف جو بیرونی اور اندرونی سازشیں کی جا رہی ہیں ان میں پاکستان کے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کی سازش بھی شامل ہے"۔ اسی تقریر میں امیر جماعت نے الزام لگایا "صدر بھٹو کی موجودہ ملک گیر مہم کا مقصد یہ ہے کہ اختیار و اقتدار کی آہنی گرفت میں قوم کی گردن جکڑ کر بھارت کی کالی دیوی کے آگے جھکا دی جائے۔ شملہ معاہدہ دستاویز ذلت ہے"۔

اس تقریر سے جماعت اسلامی کے ذہن کا اندازہ ہوتا ہے اور اس ذہن کی چابی دست غیب کے قبضہ میں ہے۔ وہ دست غیب ان داتا بھی تو ہے۔ اس دباؤ کو صدر بھٹو بھی محسوس

کر رہے ہیں. پارٹی کنونشن میں. ۳۰ر نومبر کی تقریر کا یہ اقتباس اس سمت کی طرف اشارہ کرتا ہے "ہمارے ملک کو دس لاکھ ٹن گندم سالانہ کی کمی کا سامنا ہے۔ اس کمی کو ہم ساڑھے آٹھ لاکھ ٹن گندم امریکہ سے لے کر پورا کر رہے ہیں۔ ہم اپنی آزادی اور ملکی مفادات کو فروخت کر کے کوئی سودا نہ کریں گے۔ لیکن یہ بھی درست نہیں ہے کہ ایک طرف ہم امریکہ سے گندم حاصل کریں اور دوسری طرف ہائے امریکہ، ہائے امریکہ کے نعرے لگائیں" مطلب یہ کہ صدر بھٹو اپنی قوم کو یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ وہ ساڑھے آٹھ لاکھ ٹن گندم کے عوض "ہائے امریکہ" کی بجائے "واہ امریکہ" کے نعرے لگائے۔

پاکستان کی موجودہ سیاسی صورت حال میں بات ساری اقتدار کی ہے اور اس بات میں سامراجی طاقتوں کی دخل اندازی کے امکانات بلکہ کئی جگہ ثبوت بھی موجود ہیں۔ یہ دخل اندازی برصغیر کے امن کے لئے زہر قاتل ہے۔ اسی وجہ سے وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے برصغیر کے ممالک کو پرخلوص مشورہ دیا ہے کہ وہ برصغیر کی زندگی اور مفادات پر بیرونی طاقتوں کو اثر انداز نہ ہونے دیں۔

پاکستان کے کئی سیاسی رہنما نظریۂ پاکستان کا واسطہ دے کر عوام کو گمراہ کرنے کی کوششوں میں ابھی تک معروف ہیں۔ ہند نے تو شروع ہی سے یہ موقف اپنایا کہ وہ پاکستان کے وجود کو پورے خلوص کے ساتھ تسلیم کر کے اچھے پڑوسی کی طرح پرامن طور پر رہنا چاہتا ہے۔ لیکن نظریۂ پاکستان نہ صرف غیر قدرتی ہے بلکہ خود پاکستان کے عوام کے لئے مضر ہے۔ ۲۵ برس کی کم عمری میں یہ نظریہ غلط ثابت ہو گیا جب بنگلہ دیش کے عوام نے مذہب کے نام پر استحصال برداشت کرنے سے انکار کر دیا۔ کشمیر کے بارے میں بھی پاکستان کا موقف اسی نظریہ کی اُپج ہے۔ اور اس خطہ پر بھی اس کا وہی حشر ہو گا جو بنگلہ دیش میں ہوا۔ اس برس ۱۴ر مارچ کو دو ہندوستانی صحافیوں کے ساتھ بات چیت کے دوران صدر بھٹو نے کہا:-

"کشمیر کے لئے کئی بار ہم جنگ لڑ چکے ہیں۔ فوجی کارروائی کے ذریعہ ہم اس مسئلہ کو حل نہیں کر سکتے۔ انقلاب کی کوئی بھی تحریک باہر سے وہاں پیدا نہیں کی جا سکتی کسی بھی تحریک کو اسی دہرتی سے جنم لینا ہوگا"

کشمیر کے سوال پر پاکستان نے بار بار برصغیر کے امن کو مجروح کیا ہے، لیکن کشمیر کے جس علاقہ پر اس کا جارحانہ قبضہ ہے اس کے بارے میں پاکستان کے ممتاز اردو ہفت روزہ 'اخبار جہاں' کے ۶ر دسمبر کے اداریئے میں جو انکشاف اور اعتراف کیا گیا ہے' وہ نظریۂ پاکستان کے کھوکھلا ہونے کا واضح ثبوت ہے۔ اخبارِ جہاں لکھتا ہے:-

"اب ہم مستقبل کے لئے جن عظیم منصوبوں اور ایک ہزار میل دور جاکر دوبارہ اپنی سرزمین کو حاصل کرنے کے جو خواب دیکھ رہے ہیں اگر ان کو اپنے گذشتہ ۲۵ سالہ رویے کی روشنی میں دیکھیں اور خود جائزہ لیں کہ کیا اس رویے سے ہم اپنے ساتھ ملحقہ علاقوں میں سے بھی کسی علاقہ کو دوبارہ حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں چہ جائیکہ ہم ایک ہزار میل دور پہنچ سکیں — یہ حقیقت تلخ سہی مگر کیوں نہ اس کا اعتراف کیا جائے کہ کشمیر کا وہ حصہ جسے ہم آزاد دیکھتے ہیں اور جس کی تعمیر و ترقی پاکستان کی ذمہ داری تھی۔ وہاں کون سی ترقی ہوئی اور وہاں کے عوام کو ایسی کونسی سہولتیں بہم پہنچائیں کہ کشمیر کے دوسرے حصے کے بھائی اس کی ترقی سے متاثر ہوتے"

برصغیر کے امن کا تقاضا یہ ہے کہ پاکستان جذباتیت کی جکڑ سے آزاد ہو خواہ وہ جذباتیت مذہبی ہو یا سیاسی کیونکہ اسی جذباتیت کا فائدہ اٹھا کر بیرونی طاقتیں اس امن کو تباہ کرنے کے درپے ہیں تاکہ ان کا اثر و رسوخ یا غلبہ اس برصغیر میں قائم ہو سکے۔ بنگلہ دیش کو تسلیم کر کے پاکستان اپنے جنگی قیدیوں کی واپسی کو ممکن بنا سکتا ہے اور صرف دلیل، منطق اور خلوصِ نیت کے ذریعے دیگر مسائل حل کر سکتا ہے۔ صدر بھٹو کو اقتدار سے محبت سہی وہ تو اصغر خاں اور میاں طفیل محمد کو بھی ہے جو انتخابات یا کسی دوسرے ذریعے سے اقتدار حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں اور دست غیب کی سرپرستی کے سہارے کرتے رہیں گے لیکن صدر بھٹو اقتدار سے محبت کے ساتھ برصغیر کے امن اور اس کے عوامی مفادات کو بھی عزیز رکھتے ہیں۔ اگر وہ باشعور سیاست دان نہ ہوتے تو ان سے ایسی توقع کرنا بیکار تھی لیکن وہ نہ صرف یہ کہ باشعور ہیں انھیں عوام دوستی کا دعویٰ بھی ہے۔ انھیں چاہئے کہ مسز گاندھی اور شیخ مجیب کے ساتھ اشتراک و تعاون کے پرخلوص رابطے قائم کریں اور برصغیر کے دائمی امن کو نہ صرف ممکن بنائیں بلکہ اس امن کو بیرونی طاقتوں کے پنجوں سے محفوظ رکھیں۔



سرکاری ملازمتوں کے لئے اکثر مقابلے کے امتحان ہوتے رہتے ہیں. کیا آپ کو ان امتحانوں کا علم ہے؟ کیا آپ نے کبھی یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ آپ مقابلے کے کسی امتحان میں شریک ہونے کے اہل ہیں؟ اگر آپ نے اب تک ایسا نہیں کیا تو بے روزگاری کی وجہ خود آپ کی لاپرواہی بھی ہو سکتی ہے۔

ہم 'سیکولر ڈیموکریسی' کے فروری کے شمارے سے امتحانی مقابلہ سروس شروع کر رہے ہیں۔ ہر شمارے میں اُس مہینے میں ہونے والے امتحان کی مکمل معلومات فراہم کی جائیں گی۔ اس کے علاوہ بھی کچھ ایسی ملازمتوں کی تفصیلات پیش کی جائیں گی۔ جن کے لئے آپ درخواست دے سکتے ہیں۔ اگر آپ کسی بھی امتحانی مقابلہ کے بارے میں ذاتی معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں لکھئے۔ ہم بغیر کسی معاوضے کے آپ کی خدمت کریں گے۔ اس پتے پر خط لکھئے:-

یہ تو شرما حقیقت

محترمہ سعیدہ اے چشتی

ہندوستانی مسلمانوں کے اندازِ فکر اور رویے پر فرقہ پرستوں کو تو بے انتہا اعتراضات ہیں۔ بعض بہت صاف ذہن کے سیکولر اور ترقی پسند لوگ بھی کچھ ایسے اعتراضات کرتے ہیں جن کا ہم سے جواب نہیں بن پڑتا۔ اس کی شاید اصل وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اصل مسائل سے ہمارے اسکالر اور کچھ حد تک حکومت ناواقف ہے۔ مسلمانوں کی عام بے چینی کی وجہ اقتصادی طور سے ان کی پس ماندگی ہے۔ کچھ تو خود مسلمان تعلیمی اعتبار سے پچھڑے ہوئے ہیں اور کچھ ان کے خلاف امتیاز برتا جاتا ہے۔ پرائیویٹ فرموں میں اگر ان کے ساتھ اس قسم کے برتاؤ ہوں تو اس کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن اگر سرکاری سطح پر ایسا کیا جائے تو یقیناً حد درجہ قابلِ مذمت چیز ہے۔

پچھلے دنوں پارلیمنٹ میں ایک سوال کیا گیا کہ سنٹرل سکریٹریٹ میں کل کتنے ملازم ہیں اور ان میں مسلمانوں کی تعداد کیا ہے؟ وزارت داخلہ کے اسٹیٹ منسٹر شری رام نواس مردھا نے جو اعداد و شمار پیش کئے وہ حسب ذیل ہیں۔

پہلی مئی ۱۹۷۱ء کو حاصل کی گئیں معلومات کے مطابق اعداد و شمار

سنٹرل سکریٹریٹ سروس	ملازمین کی کل تعداد	مسلم ملازمین کی تعداد
(i) سلیکشن گریڈ	۱۴۰	۲
(ii) گریڈ I	۳۴۵	۵
(iii) سیکشن آفیسر	۱۶۶۶	۱۲
(iv) اسسٹنٹ	۴۵۰۷	۱۹
سنٹرل سکریٹریٹ سٹینوگرافر سروس		
(i) سلیکشن گریڈ	۱۳۰	۰
(ii) گریڈ I	۱۹۵	۰
(iii) گریڈ II	۱۹۵۴	۷
(iv) گریڈ III	۱۳۲۹	۱
سنٹرل سکریٹریٹ کلیریکل سروس		
(i) اپر ڈویژن کلرک	۲۵۱۱	۹
(ii) لوئر ڈویژن کلرک	۶۵۸۵	۳۰

کلاس فور ملازمین کا تعلق سنٹرل سکریٹریٹ سے نہیں ہوتا۔

سنٹرل سکریٹریٹ کے تحت کام کرنے والی وزارتوں اور مختلف شعبوں میں یہ تعداد حسب ذیل ہے۔

کلاس فور	۵۳۸۱	۳۹

دو سال پہلے بھی یہ اعداد و شمار بتائے گئے تھے۔ جو حسب ذیل تھے۔

سنٹرل سکریٹریٹ سروس	ملازمین کی کل تعداد	مسلم ملازمین کی تعداد
(i) سلیکشن گریڈ	۱۲۰	۱
(ii) گریڈ	۳۹۲	۲
(iii) سیکشن آفیسر گریڈ	۱۵۹۹	۱۱
(iv) اسسٹنٹ	۴۵۸۲	۱۹
سنٹرل سکریٹریٹ سٹینوگرافر سروس		
(i) گریڈ I	۱۲۹	۰
(ii) گریڈ II	۲۰۸۹	۵
سنٹرل سکریٹریٹ کلیریکل سروس		
(i) اپر ڈویژن گریڈ	۲۷۰۸	۱۱
(ii) لوئر ڈویژن گریڈ	۷۹۹۱	۳۳

گریڈ فور ملازمین چونکہ سنٹرل سکریٹریٹ سے متعلق نہیں ہوتے اس لئے ان کے بارے میں معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔

ان اعداد و شمار سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دو سال میں بھی حالت کچھ بہتر نہیں ہو سکی۔ ممکن ہے بعض لوگ کہیں کہ اس کی وجہ مسلمانوں میں تعلیم کی کمی ہے۔ تو میں عرض کروں گی کہ چلئے مسلمان افسر بننے کے قابل نہیں تو کلرک اور چپراسی تو بن سکتا ہے لیکن اسے یہ بھی نہیں بنایا جاتا۔

فرقہ پرست جماعتیں مسلمانوں کی اسی دکھتی رگ سے فائدہ اٹھاتی ہیں۔ مسلمانوں کے سو فی صدی سیکولر ہونے کے راستے میں یہ حقیقت حال سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ حکومت اس مسئلہ کی طرف توجہ کرے گی اور ملازمتیں دیتے وقت یہ ذہن میں ضرور رکھے گی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد ۱۲٪ ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلمان مقابلے کے امتحانوں میں بہت کم بیٹھتے ہیں لیکن انہیں اس طرف راغب کرنا بھی حکومت کا فرض ہے۔

نوٹ ۱۔ پہلی اگست ۱۹۶۹ء سے سی۔ ایس۔ ایس کا گریڈ تھری وجود میں آیا ہے۔ ان کے تحت لوئر ڈویژن کلرک اور اپر ڈویژن کلرک سٹینو ٹائپسٹ کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

۲۔ ان اعداد و شمار میں شعبۂ ترقی صنعت شامل نہیں ہے۔

۱۹۹۱ء میں کچھ کانگریسی ممبران پارلیمنٹ ایک جگہ جمع تھے۔ جبلپور کے فساد کا ذکر چھڑا۔ کیونکہ اس وقت کا تازہ معاملہ یہی تھا۔ طرح طرح کی خبریں جبل پور سے آرہی تھیں صحیح علم تو کسی کو بھی نہ تھا۔ سرکاری حلقے بھی صرف اسی حد تک واقف تھے۔ جتنا کہ وہاں کے فرقہ پرست اخبارات اور متعصب پریس شائع کر رہا تھا یا مدھیہ پردیش کے لیڈران ظاہر کرنا پسند کرتے تھے۔ مگر تھوڑا بہت اندازہ سب کو ہو گیا تھا کہ حالات بہت تشویشناک ہیں۔ جانی و مالی نقصان اس سے بہت زیادہ ہے جتنا ظاہر کیا جا رہا ہے اور شاید خبروں پر بلیک آؤٹ ہے۔

سبھدرا نے وہاں جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اور تب جنرل شاہ نواز نے ایک خط نکالا۔ جو پروفیسر مہیش دت مصرا نے ان کو بھیجا تھا۔ اس میں جبلپور کے فساد کی ہلاکت انگیزی کا مختصر مگر خوفناک نقشہ کھینچا گیا تھا۔ وہ خود اپنے مکان میں مقید تھے۔ اور پنڈت نہرو سے شاہ نواز کے ذریعہ اپیل کی تھی کہ جلد تحقیقات کرائیں، خود دیکھیں اور مجرموں کو قرار واقعی سزا دیں۔ اس معاملہ کو مدھیہ پردیش سرکار اور آفیسر پر نہ چھوڑ دیں۔

حیرت تو اس پر ہوئی کہ خود پارٹی کے بہت سے ممبران بھی اس خط کو اہمیت دینے پر تیار نہ تھے بلکہ جبلپور پہنچ کر جب ہم نے پروفیسر سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو تو ہمارے میزبان کو بھی اتنے چھوٹے آدمی سے ملاقات کی خواہش پر اعتراض تھا کہ وہ اسلئے سیدھے خط لکھتا اور بدحواسی کی باتیں کرتا ہے۔ بہر حال یہ نشست کسی قدر برہمی اور اعتراضات کی بوچھاڑ میں ختم ہو گئی۔

اور اس کے دوسرے تیسرے دن سبھدرا جوشی نے کہا کہ ہمیں بذات خود ضرور جا کر حالات کا جائزہ لینا چاہیئے۔ ہم کو متوجہ کرنے، اکسانے اور اس سفر پر تیار کرنے میں بڑا ہاتھ ہاؤس کے اس خاموش کمزور ممبر محمد علی کا تھا۔ وہ غریب خود بُنکر برادری سے تعلق رکھنے کی وجہ سے بیک ورڈ کلاس میں گنا جاتا تھا اور جبل پور کے اونچے مالدار طبقہ اور چوٹی کے لیڈران سے کھل کر بات بھی نہ کر سکتا تھا۔

آخر کار محمد علی کو ساتھ لے کر ہم لوگ جبلپور کے ارادہ سے روانہ ہوئے۔ راستہ ہی سے پنڈت نہرو کو معذرت کا ایک مشترکہ خط ہم دونوں کے دستخط سے روانہ کر دیا گیا۔ کہ ہم صحیح حالات جاننے اور سمجھنے کے لئے جا رہے ہیں۔ ہمیں آپ کی مدد اور حمایت کی ضرورت ہے۔ اتنا وقت نہ تھا کہ اجازت لیتے یا مل کر روانہ ہوتے اس کی معافی چاہتے ہوئے یہ استدعا ہے کہ اگر ہمارے جانے اور جبلپور میں قیام پر کسی کو اعتراض ہو تو آپ حمایت کیجئے بلکہ ہمیں اپنا فرستادہ سمجھئے۔ کیونکہ آپ کا نام لئے بغیر ہر جگہ گھسنا اور سب کچھ دیکھنا حتی کہ ان کی امداد و بحالی میں حصہ لینا ہمارے لئے ناممکن ہو جائے گا۔

خدا پنڈت جی پر رحمت نازل کرے انھوں نے یہی کیا۔ ہر معترض کو ڈانٹا اور آخر تک کسی کو یہ نہ بتایا کہ ہم لوگ ان کے بھیجے ہوئے نہ تھے۔

بات یہ تھی کہ اپنی اہمیت کا سکہ آفیسر پر بٹھانے کے لئے صرف پارلیمنٹ کی ممبری اور شناختی کارڈ کافی نہ ہوگا یہ اندازہ پہلے ہی ہو گیا تھا۔ اور ہم نے پھر خوب خوب ان کا نام استعمال کیا۔ بے دھڑک آتش نمرود میں کود پڑے۔

ہمارا پہلا پڑاؤ ساگر میں محمد شفیع صاحب بیڑی سوداگر کے گھر پر ہوا۔ جہاں نچلے حصہ اور پورے کمپاؤنڈ میں پناہ گزینوں کی بھیڑ تھی۔

آگ کا دریا

بیگم انیس قدوائی

پناہ گزینوں کے کئی کیمپ تھے اور سب افراتفری کے شکار تھے۔ ان میں جمعیۃ العلما کے والنٹیر اور جماعت اسلامی کے ورکر ریلیف کا سامان پہنچا رہے تھے۔ انھیں میں ہم کو ماسٹر ظہور بخش بھی ملے نیم پاگل (جو سنا ہے بعد کو پورے پاگل ہو گئے) پھٹے کثیف کپڑے پہنے دیوانوں کی طرح گھوم رہے تھے۔ ان کی تباہ لڑکیاں اور بہت سی دوسری عورتیں وہاں زمین پر بیٹھی ہوئی بیڑیاں بنا رہی تھیں۔ شفیع صاحب نے بتایا کہ میں نے ان سب کو کام مہیا کر دیا ہے تاکہ مزدوری کر کے اپنا پیٹ پال سکیں، بیچاری تعلیم یافتہ لڑکیاں۔

محمد شفیع صاحب نے ہم کو بتایا کہ یہاں بالکل گاندھی جی کی ستیہ گرہ پر عمل کیا گیا ہے۔ کسی مسلمان نے نہ کسی کو مارا، نہ بدلہ لینے کی کوشش کی۔ ہر چیز تباہ ہوتی رہی اور وہ صرف بھاگتے یا فریاد کرتے رہے۔ پولیس بلوائیوں کی ساتھی تھی۔ اور یہ سب سن کر میں سوچ میں پڑ گئی کہ یہ بہادری تھی کہ ایسا، اسے عدم تشدد کہا جائے یا بزدلی۔

ظہور بخش صاحب نے اپنا جلا ہوا مکان دکھایا اس میں اوپر سے نیچے تک کتابوں کے ڈھیر تھے۔ گھر میں دو زینے تھے۔ جگہ کی قلت، کتابوں کی کثرت، شاید متوسط حیثیت رکھنے کی وجہ سے ایک طرف کی سیڑھیوں کو کتابوں کی الماری کے طور پر استعمال کر لیا گیا۔ جلی ہوئی کتابیں ایک دوسرے سے گتھی ہوئی مجلد سیاہ اوراق "شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد" کا نقشہ پیش کر رہی تھیں۔ اور ظہور بخش صاحب رو رو کر سنا رہے تھے کہ "زندگی کا سارا سرمایہ لٹ چکا ہے۔ میں نے ان سب سے ہاتھ جوڑ کے خوشامد کی کہ مجھے مار ڈالو مگر ان کو نہ جلاؤ۔ ارے ان میں تمہاری مقدس کتاب وید بھی ہے، گیتا بھی ہے، بائبل بھی ہے اور قرآن بھی۔ مگر بلوائیوں نے مجھے دھکے مارے کہ بڑا پنڈت بنا گھومتا ہے۔ مار دو اسے۔ اور دیکھ لو اب سب ختم ہو چکا ہے۔" ع

گھر جلا سامنے اور ہم سے بجھایا نہ گیا

یہ وہی ظہور بخش تھے جن کی کتابیں صوبے کے نصاب میں شامل تھیں۔ جو سنسکرت اور ہندی کے بڑے ودوان سمجھے جاتے تھے۔ ان کے علم اور دیش بھگتی کی سارا مدھیہ پردیش قدر کرتا تھا۔ اور آج۔ ع

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں

کالے خاں بیڑی مرچنٹ کی عالی شان عمارت۔ فخرو بھائی و عیسیٰ بھائی کی فیکٹریاں، عالی شان مسجدیں،

سب ملبہ کا ڈھیر تھیں۔ جن کی تباہی میں بم، بارود، پٹرول مٹی کا تیل، سب کچھ استعمال ہوا تھا۔ اُجڑے ہوئے بازار اور برباد شدہ مکانات قیامت کا منظر پیش کر رہے تھے ریلیف ورک کرنے والوں میں مقامی لوگ اکا دکا تھے۔ دہلی و بھوپال کے کئی جانے پہچانے چہرے کام کر رہے تھے۔ ان میں محمد مسلم صاحب ایڈیٹر دعوت سے بھی ملاقات ہوئی۔ فسادیوں کے پردے میں چند سرمایہ دار فیکٹریوں کے مالک بھی جھانکتے ہوئے دکھائی دیئے۔ اگر چہ وہ اب غریبوں میں شامل ہو کر حکومت کا دست و بازو بنے ہوئے تھے۔

مگر اسی دن شام کو ہمیں جبل پور بھی پہنچنا تھا۔ کیونکہ جھگڑے کی جڑ وہیں تھی۔ یعنی وہ نوجوان جوڑا جس میں سے ایک اپنے کو جلا کر خودکشی کر چکی تھی اور دوسرا اس وقت جیل میں تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ لڑکی شاید حاملہ تھی اور اس کا باپ اس کی شادی طے کرنے کے لئے الٰہ آباد یا کسی اور جگہ گیا ہوا تھا۔ لڑکی نے رسوائی کے ڈر سے جان دے دی۔

دوسری افواہ یہ بھی تھی کہ وہ مسلمان نوجوان شادی شدہ تھا۔ والدین ایسے شخص سے اس کا ملنا جلنا پسند نہ کرتے تھے، دوسری جگہ شادی پر بضد تھے۔ فریق ثانی سے بھی کوئی یقینی امداد نہیں مل رہی تھی۔ اس لئے مایوس ہو کر لڑکی نے زندگی کا خاتمہ کر لیا۔ بہر حال حقیقت حال کچھ بھی ہو۔ کوئی بات بھی آن ہونی یا عجیب ہونی نرالی نہ تھی۔ مگر صرف اس واقعہ نے مدھیہ پردیش کے پانچ ضلعوں میں ہندو مسلم فساد کی آگ بھڑکا دی۔ اور ہر جگہ بیک وقت اور پورے پلان و تیاریوں کے مطابق ہوا۔

سیٹھ گووند داس گھر پر موجود نہ تھے۔ لیکن ہم لوگ "مان نہ مان میں تیرا مہمان" بن ہی گئے۔ اور ان کی بیٹی سے اپنی خاطر مدارات کرا ہی لی۔

جس کمرہ میں ہمیں ٹھہرایا گیا اس کے ارد گرد کئی کمرے تھے۔ مگر سب خالی۔ رات میں سونے سے پہلے محمد علی صاحب سے کہا گیا کہ وہ دوسرے کمرے میں آرام کریں مگر وہ اس پر مصر رہے کہ یہیں سوئیں گے۔ بھدرا جوشی نے ناگواری کے ساتھ کہا عجیب آدمی ہیں اتنا بھی لحاظ نہیں کہ ہم دونوں عورتیں ہیں۔ آخر دوسرے کمرے میں کیوں نہیں جاتے۔ مگر محمد علی کی خاموشی ہزار باتوں کا جواب بنی رہی اور ہمیں بادل ناخواستہ ان کو کمرہ میں جگہ دینی پڑی۔

ابھی نیند سے ہماری آنکھ اچھی طرح بند بھی نہ ہوئی تھی کہ کھٹ کھٹ شروع ہو گئی۔ دیکھا تو ہر دروازہ کھڑکی محمد علی صاحب مقفل کر رہے ہیں۔ گرمیوں کے دن تھے۔ لاکھ کہا حبس ہو جائے گا۔ ایک سلاخیں لگی ہوئی کھڑکی تو کھلی رکھئے نہ مانے۔ آہستہ سے بس اتنا جواب دیا یہاں بہت خطرہ ہے نہ انہیں ہماری ہنسی کی پرواہ ہوئی۔ نہ مذاق سمجھے۔ پارلیمنٹ کا ممبر اپنے صوبہ کے لیڈر کے گھر میں بھی خطرہ محسوس کر رہا تھا۔

دوسرے دن ضلع کانگریس کمیٹی کے سکریٹری کی رہ نمائی میں ہم نے دورہ شروع کیا۔ شہر سنسان تھا۔ لوگ سہمے ہوئے تھے۔ محفوظ محلوں میں مسلمانوں نے از خود کیمپ بنا لئے تھے بھلے ہندو بھائی مدد کرنا چاہتے تھے۔ در پردہ کہتے بھی تھے۔ مگر ان کا خود جان و مال خطرے میں تھا۔ اور کانگریسی عوام کے ساتھ اس بحث میں الجھے ہوئے تھے۔ کہ "پہلا حملہ کس نے کیا؟ اشتعال انگیزی کدھر سے ہوئی؟ کیا اصلی مجرم مسلمان ہیں؟"

یہاں حالات ساگر سے مختلف تھے۔ ساگر کی یک طرفہ غارت گری اور مسلمانوں کی ستیہ گرہ کے ثبوت یہاں نہیں تھے۔ اکثر مقامات پر مسلمانوں نے اور ان کے غنیشیے ہندو دوستوں نے جم کر مقابلہ کیا تھا۔ زخمیوں میں ڈاکٹر، انجینئر اور وکیل بھی تھے انھوں نے اپنے بچاؤ میں ایک آدھ جگہ گولی بھی چلائی تھی۔ اور اس وقت اپنی حفاظت میں بھی پیش پیش تھے۔ وہ پولیس کی نظروں سے اپنے افراد کو بچانے کا بندوبست بھی کر رہے تھے اور آپسی چندہ سے اپنا بوجھ بھی اٹھا رہے تھے سرکاری اور سرمایہ دارانہ امداد یہاں برائے نام تھی۔ ایک کمیونسٹ ورکر سے بھی ہم ملے۔ جو ان محلوں میں رہبری اور ہمت افزائی کا کام کر رہا تھا اور پولیس اس کی تلاش میں تھی۔

تباہی و بربادی کے نشانات اتنے وسیع پیمانے پر مل رہے تھے کہ ہمیں دور دراز دیہاتوں تک جانا پڑا۔ اور تب ہم نے محسوس کیا کہ یہاں تو ہم سب کو ان تمام پروگریسیو افراد کو جم کر لڑنا پڑے گا۔ جو فرقہ پرستی کے اس بھیانک مظاہرے کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنا چاہتے ہیں۔ افواہوں کا زور تھا۔ لوگ مصیبت کے ماروں سے دور بھاگ رہے تھے۔ اب بھی مکانات پر نشانات لگائے جا رہے تھے اور کسی وقت پھر کالی ماتا مندر پر سرخ بلب جلا کر خونی ہنگامہ برپا کر سکتی تھی۔ ہم نے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو خط لکھ دیا۔ پنڈت نہرو کو رپورٹ بھیجدی۔ اور پھر غلام بھائی بیڑی والے نے اپنی ایک گاڑی مع پٹرول اور ڈرائیور کے ہمارے لئے مخصوص کر دی۔ اور سبھدرا نے اعلان کر دیا کہ "میں بچوں کے لئے سیٹی بگل بیچنے والے کی طرح اب ہر چوراہے پر امن و انسانیت کا بگل بجاؤں گی۔" لوگ ساتھ آتے گئے اور قافلہ بنتا گیا۔ وہ بھی پنڈت جی کا نام سن کر آئے۔ جو آنا نہیں چاہتے تھے اور وہ بھی جن کے دل کو لگی ہوئی تھی۔ ان میں دو نوجوان ملہوترہ اور باجپئی آخر تک ہمارے ساتھ کام کرتے رہے۔ جرنلسٹ سے بھی بحث و مباحثہ ہوا۔ مسلم نوجوانوں کی بھی ہمت بندھ گئی۔ حصار سے باہر آ گئے۔

اس بیچ میں عید آ گئی۔ مسلمان عید کی نماز کے لئے عیدگاہ جانے ڈرتے تھے۔ مگر سوال یہ تھا کہ اول تو یہ نماز گھر پر ہوتی نہیں۔ دوسرے اگر ایک بار خوف کی وجہ سے گھر پر پڑھ لی تو یہ حق بھی ختم ہوتا ہے اور حکومت کی ذمہ داری بھی۔ ابھی معلوم نہیں ملک کے کس کس حصہ میں کیا کیا ہوا اور کتنی بار خوف کی اس منزل سے ان کو گزرنا پڑے۔

سوچتے سوچتے مولانا برہان الحق یاد آئے۔ مگر ان سے مل کر بڑی مایوسی ہوئی۔ مولانا دیوتا کی طرح اپنے ہم نشینوں میں خاموش بیٹھے رہے۔ اور ان کے اسسٹنٹ سے ہماری ترش و تلخ گفتگو ہوتی رہی۔ دیوبندی و بریلوی کی نماز بھلا ایک ساتھ کیسے ہو سکتی تھی۔ دیوبندی کے سروں پر تو مولانا حفظ الرحمٰن صلح و مصالحت کا ڈنڈا لئے کھڑے تھے۔ یہاں تو مولانا بولتے ہی نہ تھے۔ وہ کسی طرح عیدگاہ جانے پر تیار ہی نہ ہوئے۔

اور پھر ڈپٹی منسٹر جگ موہن داس آئے اور ان سے معقول انتظام کی درخواست کی گئی۔ طے یہ ہوا کہ

دیوبندی جماعت کو لے کر سمبو راجو جی ایک عیدگاہ کو جائیں گی اور بریلوی جماعت کے ساتھ میں دوسری عیدگاہ پہنچوں گی۔ کمیونسٹ پارٹی کے پاس صدو والنٹیر محلوں میں پہرہ دیں گے۔ جب ان انتظامات کی خبر پہنچی تو مولانا برہان الحق بھی امامت کے لئے تشریف لائے۔ اور اس دن عید کی نماز میں نے بھی ان کے پیچھے ادا کی۔

جمعیۃ العلما، جماعت اسلامی، مقامی کانگریس کمیٹی اور مسلم ریلیف کمیٹیاں امداد و بحالی کا کام کر رہی تھیں۔ مگر اوس چاٹنے سے کہیں پیاس بجھتی ہے۔ ریلیف کے لئے ریاستی حکومت سے لڑنے جھگڑنے بھوپال بھی جانا پڑتا۔ اور کئی بار جبل پور کا چکر بھی لگایا۔ ہمارے بعد سوشیلا نائر گئیں۔ خود اندرا جی کو پنڈت نہرو نے بھیجا اور ایک نو عمر ماں جب مجمع میں کھڑی ہو کر اپنی ڈیڑھ سالہ بچی کی پولیس کے ہاتھوں موت کی داستان سنانے لگی تو اندرا جی بھی رو دیں۔

بہت جلد ساری بات کھل کر سامنے آگئی۔ آر۔ ایس۔ ایس اور جن سنگھ کے فرینڈ والنٹیئر اپنے جھوٹے پروپیگنڈے میں ناکام ہو کر ہمارے جانی دشمن بن گئے۔ پبلک میٹنگ میں گڑبڑ کرنے کی ہر کوشش بیکار کر دی جاتی۔ کیونکہ کانگریسی بھی ہمت باندھ چکے تھے۔ اور نوجوانوں کا گروہ شرپسندوں کی پٹائی کرنے پر تل گیا تھا۔ عوام نے اپنے دشمنوں کو پہچان لیا تھا۔ ہر سیاسی شعبدہ گری کا پردہ فاش کر دیا جاتا تھا۔

جلد ہی خود کانگریس صدر سنجیوا ریڈی نے طویل دورہ کیا۔ اور پھر پنڈت جی خود تشریف لائے۔ ملبہ کو صاف کرنے اور سیاہی کو سفیدی پوت کر ستھرا کرنے کے باوجود ظلم و بربریت کے آثار مٹائے نہ جا سکے۔ جبل پور کے مکانوں دکانوں اور فرقہ پرستی کی اندھی طاقت پکار پکار کر اعلان کرتی رہی۔

اس وقت سینکڑوں بے گناہ جیل میں تھے۔ آغا عبدالجبار صاحب کے گھر پر مولانا حفظ الرحمن نے میٹنگ بلائی۔ مولانا رو رہے تھے اور کہہ رہے تھے "میں سارے ہندوستان میں بھیک مانگوں گا اور اس کیس کو لڑوں گا۔" اور تب ایک مخلص مگر چالاک ساتھی نے ایک معاملہ کے طے ہونے کی ہمیں خبر دی۔ کہ اگر فی آدمی ۲۵ روپے ہم خرچ کر سکیں تو تین سو کے لگ بھگ اشخاص جیل سے رہا کرائے جا سکتے ہیں کیونکہ ذمہ دار افسران میں ایک ایسا بھلا رشوت خور بھی ہے جسے جلد راضی کیا جا سکتا ہے۔ ہم سب تو پس و پیش میں پڑ گئے مگر مولانا نے چھوٹتے ہی حامی بھر لی۔ روپیہ گن دیا گیا اور دوسرے دن ۲۹۰ آدمی چھوٹ کر گھر آ گئے۔ حالانکہ گھر باقی ہی نہ تھے مگر بیوی بچے تو تھے ہی۔

انھیں دنوں ایک غنڈہ کی کہانی بھی ہماری زبانی سن کر اخبارات نے شائع کی۔ جس نے پورے محلہ کو اپنی داداگیری کی پناہ میں لے کر بچا دیا تھا۔ مگر شرپسند اور پولیس والوں نے مل کر مع اس کے ساتھیوں کے جیل پہنچا دیا اور تب محلہ تہس نہس ہو سکا۔

ڈپٹی کمشنر متحیر ہو گیا جب ہم نے ...... اس سے جیل میں ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ غنڈہ ٹیپیکل غنڈہ تھا۔ پولیس پہرہ داروں کے سامنے کہہ رہا تھا۔ ان لوگوں کو تو ہم ہزار روپیہ مہینہ دیتے تھے۔ محلہ لٹنے نہیں دیا تھا۔ اس لئے ہمیں پکڑوا دیا۔ پوچھا کوئی تکلیف ہے؟ جواب دیا کچھ نہیں بجے (مزہ) میں ہیں، بہت آرام ہے۔ بہت سفارش و کوشش کے بعد وہ گروہ رہا ہوا۔ اور دہلی پنڈت جی کی خدمت میں بھی باریاب ہوا۔

ایک سال تک مقدمہ چلتا رہا۔ گواہیاں گذرتی رہیں اور یہ ثبوت مہیا کیا جاتا رہا کہ پہلے حملہ کرنے والے مسلمان تھے یا ہندو؟ مرنے والوں نے اپنا مرڈر خود کیا۔ یا کوئی غیبی ہاتھ ان کی ہتھیا کر گیا۔ جلے ہوئے مکان، دکانیں، فیکٹریاں، مسجدیں، ملکیت مالکان نے خود نذر آتش کیں۔ یا قدرتی بجلی گری۔ وکلار بحث کرتے رہے۔ جمعیۃ العلماء پیسہ دیتی رہی ہم لوگ دوڑتے رہے۔

سروپا گاؤں کی وہ پہاڑی جس پر ایک چھوٹا سا گاؤں آباد تھا۔ شاید ہمیں کبھی نہ بھول سکے گی۔ وہاں اب کوئی متنفس باقی نہ تھا البتہ مویشی تیار فصل کو چر رہے تھے جہاں ہمیں ایک خون آلود لوہے کا بھالا ملا تھا اور اس سے چھید کر ایک ماہ کے بچے کو اٹھا لیا گیا تھا۔ مگر معصوم خون اب بھی بربریت کا گواہ بن کر جم گیا تھا۔ قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے اس جلے ہوئے کھنڈر کے ایک کونے میں گھر کی پلی ہوئی مرغی جو اس زمانے میں انڈوں پر بیٹھی ہوئی تھی اس وقت اپنے ننھے چوزوں کو پروں میں سمیٹے ہوئے [illegible] زندگی نے دوسرے روپ میں موت پر فتح پالی تھی اور ان تمام واقعات کا چشم دید گواہ اس خاندان کا ایک بارہ سالہ بچہ تھا جس نے درخت پر بیٹھ کر سب کچھ دیکھا تھا۔

سروے کے کارکن زخمیوں کے انتظامات میں بالکل مفید ثابت نہ ہوئے۔ اور یہ سب ہماری طاقت سے باہر تھا۔ اس لئے ہم نے صرف مقدمات اور ریلیف سے سروکار رکھا۔ مشکل یہ تھی کہ بیس کیمپوں میں اس وقت لوگ پیش پیش ہو رہے تھے جو دراصل امن چاہتے ہی نہ تھے۔ پنڈت نہرو کی آمد پر ہم نے کوشش کی کہ وہ تمام مصیبت زدگان کو ان سے ملا دیا جائے۔ اور ان کے کلیم سرکار تک پہنچ جائیں۔

اسی مجمع سے ایک ہاتھ نمودار ہوا اور اس نے مجھے ایک اشتہار تھما دیا جو شاید ایک دن پہلے شہر میں تقسیم ہوا تھا اس کا عنوان تھا "خون کا بدلہ خون"۔

وہی لڑکی کے مرنے کی داستان بے عزتی کا قصہ، مسلمانوں کے خلاف اشتعال انگیزی۔ وغیرہ۔ مگر ایک خاص بات یہ تھی کہ پنڈت نہرو پر کھلا حملہ تھا۔ ان کی ہندو دشمنی کا ذکر اور بے حد زہریلا پروپیگنڈہ ان کے خلاف کیا گیا تھا۔

اشتہار سی آئی ڈی آفیسر کو دیدیا گیا۔ اعلیٰ افسروں نے غالباً پولیس کے انتظامات کر لئے۔ ہماری آخری روانگی بڑی ہنگامہ خیز تھی۔ مفسدین کو یہ توقع ہی نہ تھا کہ ہم اب نہ آئیں گے۔ ان کی اسکیم فیل ہو چکی تھی۔ ہندو مسلمان سب ان "پیران پارسا" کو پہچان چکے تھے۔ اس لئے انھوں نے اسٹیشن پر ریل میں، ریسٹ ہاؤس میں ہر جگہ ہم سے بحث و مباحثہ کیا۔ اور آخر کار اپنی ریزرو سیٹ کے کوٹے اس ریل گاڑی کے ڈبے سے باہر نکال کر ہمیں پھینک دینے پڑے۔

اپنے قاتل آپ ہیں، اپنے مسیحا آپ ہیں
زہر بھی رکھتے ہیں ہم اکسیر بھی رکھتے ہیں ہم
(غلام ربانی تاباں)



رام پرساد بسمل

آزادیٔ ہند کی تاریخ شہیدوں کے خون سے رنگین ہے۔ کچھ نام تاریخ کے اندھیروں سے ابھر کر سامنے آگئے۔ ورنہ ان گنت شہیدوں میں بیشتر کو مادر وطن نے اپنی چھاتی سے اس طرح لگایا کہ آنے والی نسلوں کو ان کے نام و نشان کا بھی پتہ نہیں۔

انگریزی اثر و اقتدار کے خلاف ہندوستان کے سپوتوں کی یہ جدوجہد تقریباً دو صدی تک جاری رہی ــــ انگریز اپنی ریشہ دوانیوں اور چالبازیوں سے آخر اس منزل تک آگئے جب ۱۸۵۷ء میں ملک گیر پیمانے پر سرفروشانِ وطن نے مسلح بغاوت کی اور انقلاب کی تاریخ کو اپنے خون سے رنگ دیا۔ اب یہ الگ بات ہے کہ سیاسی سوجھ بوجھ کی کمی اور کچھ غداروں کی وجہ سے یہ بغاوت جس قدر بڑے پیمانے پر ہوئی تھی اسی قدر ناکام ہوئی۔ اور اسی قدر خطرناک نتائج برآمد ہوئے کہ انگریزی تسلط پہلے سے زیادہ قائم ہوگیا۔ اس وقت تک کمپنی کی حکومت تھی، اب ہندوستان باقاعدہ تاجِ برطانیہ کے سائے میں آگیا ــــ غلام ہوگیا۔

دورِ غلامی میں انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کرنا اور انگریز کے خلاف آواز اٹھانا اتنا آسان نہیں رہا جتنا اس جنگِ آزادی سے پہلے تھا۔ انگریز ہندوستانی قوم کی بیداری، اتحاد اور سرفروشی کا تجربہ کر چکا تھا اس لئے اس نے ہر آنے والے خطرے کے لئے مستقبل کی گود میں پرورش پانے والی ہر بغاوت کے لئے اپنے آپ کو تیار کر لیا تھا اور اس کا شعار ہندوستان کو لوٹنا کھسوٹنا اور ہندوستانیوں کو آپس میں لڑا کر ان کی قوت کو کمزور کرنا تھا ــــ اور ضرورت پڑنے پر بے دریغ مشین گنوں سے باغیوں کو بھون ڈالنا تھا۔

۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستانی قوم کے جان و مال پر انگریز کا قبضہ تھا اور روحِ آزادی کسی بے بس پنچھی کی طرح قفس میں تڑپ رہی تھی۔ آزادی کی جدوجہد دو شکلوں میں ہوئی ــــ ایک مسلح بغاوت کے ذریعہ، اور دوسری عدم تشدد کے ذریعے ــــ بیسویں صدی کے آغاز کے وقت یہ دونوں رجحان ملک میں موجود تھے مگر یہ ان دونوں کی منزل ایک تھی اور دونوں راستوں پر چلنے والوں کی قربانیوں کو ایک دوسرے پر فوقیت دینے کی کوشش کرنا ان کے خلوص اور جذبۂ آزادی پر شک کرنے کے مترادف ہے۔

رام پرساد بسمل کا تعلق اس جانباز اور سرفروش طبقے سے تھا جس کا سلسلہ ٹیپو سلطان اور جھانسی کی رانی سے ملتا ہے جو اپنی قوت اور اسلحہ کو انگریز کے خلاف استعمال کرتے ہوئے آزادی کی راہ میں شہید ہوگئے۔

جب بیسویں صدی کا پہلا سورج اپنی انقلابی کرنیں بکھیرتا ہوا ہمالہ پر نمودار ہوا اس وقت رام پرساد بسمل کی عمر صرف تین سال کی تھی ــــ وہ ایک ایسے چراغ تھے جو غریبی کی آندھیوں میں ٹمٹما رہا تھا۔ کہنے کو دادا، دادی، ماں، باپ سب تھے مگر یہ کنبہ افلاس کا شکار تھا اور اس زہر کا ذائقہ چکھ رہا تھا جو انگریز کی غلامی نے ہندوستانی عوام کے لئے عام کر دیا تھا۔ اگر اس ماحول میں بغاوت کا مسئلہ پروان نہ چڑھتا تو کیوں؟

بسمل کے دادا اپنے بال بچوں سمیت ریاست گوالیار کے ایک گاؤں سے ترکِ وطن کر کے شاہجہاں پور آ بسے تھے۔ یہ گاؤں چمبل گھاٹی میں واقع تھا اور اگر ایک طرف یہاں ظالم زمین داروں نے اپنے ظلم کی انتہا کر رکھی تھی تو دوسری طرف اس کے ردِ عمل کے طور پر کسان اس قدر پرجوش اور باغی مزاج کے تھے کہ وہ اگر لگان نہ دینا چاہتے تو کسی کی مجال نہیں تھی جو ان سے ایک پائی بھی وصول کر سکے۔ جذبۂ بغاوت کا وہ خون بسمل کی رگوں میں بھی موجزن تھا۔

شوخی اور شرارت سے بچپن کے دن گزارنے کے بعد اوائلِ شباب میں ہی بسمل کو آزادیٔ وطن کے کاموں سے دلچسپی پیدا ہوگئی اور اپنے ہم عمروں میں وہ بے حد مقبول ہوگئے۔ اردو، ہندی اور انگریزی کی معمولی تعلیم حاصل کی مگر وہ مکتب اور اسکول کی سرحدیں بہت جلد پھلانگ کر عملی میدان میں کود پڑے۔

اس زمانے میں کانگریس میں گرم اور ٹھنڈے دل کے نیتاؤں میں لاگ رہتی تھی۔ انڈین نیشنل کانگریس

کے سالانہ اجلاس کے موقعہ پر لکھنؤ میں ان کی دلیری اور ضد کی وجہ سے لوک مانیہ تلک کا شاندار استقبال ہوا۔ صدر کانگریس سے زیادہ شاندار استقبال —— جب موقع پرست لیڈروں نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ لوک مانیہ تلک کی سواری شہر میں نہ نکالیں تو بسمل اور ان کے ساتھی اپنے من پسند نیتا کے استقبال کے لئے کمربستہ ہو گئے۔ ان کی رہنمائی صرف ان کا جوش و خروش کر رہا تھا۔ بسمل موٹر کے آگے لیٹ گئے اور گاڑی کو نہ چلنے دیا۔ لوک مانیہ تلک کو موٹر سے اتار کر نوجوانوں نے ایک گھوڑا گاڑی میں بٹھایا اور اس گاڑی کو اپنے ہاتھوں سے کھینچا —— ایسا شاندار جلوس نکالا کہ ٹھنڈے دل کے نیتاؤں کے ارادوں پر اوس پڑ گئی۔

اس جرأت مندانہ اقدام نے رام پرساد بسمل کو بے حد ممتاز کر دیا اور خفیہ طور پر کرانتی کاری دل میں کام کرنے والوں نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور بہت جلد وہ اس دل کے نیتاؤں میں گنے جانے لگے۔ مگر نمائشی نیتا نہیں، کام کے نیتا۔ وہ گفتار کے نہیں، کردار کے غازی تھے جو کہا وہی کیا اسی لئے انھوں نے جگہ جگہ نیتا گیری کے خلاف اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

"نیتاگیری کا بھوت ایسا بھیانک ہوتا ہے کہ جب یہ بھوت آدمی کی کھوپڑی پر سوار ہوتا ہے سب کام چوپٹ ہو جاتا ہے اور وہ بجائے کام کرنے کے دوسروں کی عیب جوئی میں وقت ضائع کرتا ہے۔"

رام پرشاد بسمل اس پر عمل کرتے تھے اور "کرانتی کاری دل" میں انھوں نے اپنا خون دل صرف کر کے گرمی اور حرارت پیدا کی —— وہ صاحب سیف وقلم تھے۔ ان کے ایک ہاتھ میں قلم تھا اور دوسرے میں پستول۔ قلم کی قوت کو انھوں نے پستول حاصل کرنے کے لئے استعمال کیا اور پستول سے قلم اور اہل قلم اور اہل وطن کی آبرو بچائی۔

کرانتی کاری دل کو مضبوط کرنے کے لئے دونوں کی ضرورت تھی۔ اس کے لئے انھوں نے کتابیں لکھیں اور چھپوائیں۔

اردو سے ان کو شغف ضرور تھا۔ اردو شعروشاعری سے انھیں لگاؤ تھا۔ مگر ان کے قلم کے جوہر دراصل ہندی نثر میں ہی کھلے —— انھوں نے یکے بعد دیگرے کئی کتابیں لکھیں جو ضبط ہوتی گئیں "امریکہ کو سوادھینتا کیسے ملی"، "بالشیوکوں کی کرتوت"، "من کی لہر"، "کرانتی کاری جیون" یہ سب کتابیں ان کی ہندی تصنیفات ہیں اور جیل کی کوٹھری میں انھوں نے "آتم کتھا" لکھی —— اس کے برعکس اردو میں نہ ان کی کسی کتاب کا تذکرہ ان کی خود نوشت سوانح عمری میں ہی ہے اور نہ ان کے اشعار ہی دستیاب ہیں۔ ہاں وہ مشہور انقلابی غزل ان کے نام منسوب ہے "سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے"۔ بہرحال وہ غزل رام پرساد بسمل کی ہو یا نہ ہو مگر اس جذبہ کی غزل ضرور ہے جو بسمل کے دل میں ہوتا۔

بسمل کے قلم کی کاوشوں کو اس نظر سے پرکھنا بھی نہیں چاہئے کہ انھوں نے کیا لکھا؟ اور کیا نہ لکھا، کیونکہ ان کا مقصد خدمت ادب نہیں، خدمت وطن تھا۔ اور اس خدمت وطن کی راہ میں جہاں جہاں وسیلۂ ادب آیا انھوں نے اس کا استعمال کیا۔ ان کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ان کی زندگی، ان کے وسائل، ان کا قلم، ان کے جسم و جان، سب کچھ آزادی وطن کے لئے تھے۔ اور وطن کے لئے شہادت، اور ملک کے گوشے گوشے میں انگریزوں کے خلاف جذبۂ بغاوت کو عام کر دینا ہی ان کا کارنامہ ہے۔

ان کے انقلابی کارناموں میں "کاکوری کیس" سب سے نمایاں ہے۔ لکھنؤ کے قریب کاکوری میں چلتی ٹرین کو روک کر دس سرفروشوں کے ساتھ بسمل کا سرکاری خزانے کو لوٹ لینا ان کی ذہانت اور تنظیمی قابلیت کا بین ثبوت ہے۔

یہ واقعہ ۹ اگست ۱۹۲۵ء کو پیش آیا۔ اور اس میں بسمل کے ساتھ اشفاق اللہ خاں، راجندر لاہڑی، روشن سنگھ، چندر شیکھر آزاد اور دیگر جوشیلے نوجوان تھے۔ اول الذکر تین لوگوں کو بسمل کے ساتھ ہی پھانسی کی سزا ہوئی تھی۔

کاکوری کیس میں جہاں ہندوستان کی بغاوت اور انقلاب کی تاریخ دہرائی گئی وہاں ساتھیوں کی غداری کی تاریخ بھی دہرائی گئی۔ اور ڈکیتی میں شریک دس نوجوانوں میں سے ایک بنارسی لال نے غداری کا یہ تاریخی فرض و نبھایا اور پولیس کے مخبر بن کر ہندوستان بھر میں انقلابی تحریک کے رہنماؤں کی گرفتاریاں کرائیں اور اس طرح انگریز سرکار اس بغاوت کے طوفان کو وقتی طور پر ہی، دبانے میں کامیاب ہو گئی۔

بسمل کو قید و بند کی صعوبتوں سے گزر کر پھانسی کے تختہ تک آنا پڑا۔ اور آخر یہ مادر وطن کا بہادر سپوت ۳۰ سال کی بھری جوانی میں انگریزی راج کے خلاف نفرت کا اظہار کرتا ہوا ۱۹ دسمبر ۱۹۲۷ء کو گورکھپور جیل میں جام شہادت نوش کر کے امر ہو گیا۔

گورکھپور جیل میں اگر بسمل اپنی سوانح حیات نہ



جس ستنا سر سرو شتم

لکھتے تو ان کی زندگی کے بہت سے گوشوں پر پردہ پڑا رہتا۔ اس "آتم کتھا" کی روشنی میں ان کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے جہاں بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں۔ مثلاً شاعری والی بات۔ وہاں اور بہت سے انکشافات بھی ہوتے ہیں جو خصوصاً آج آزاد ہندوستان میں، جب کہ ہم جدید ہندوستان کی تعمیر کر رہے ہیں، زیادہ اہم ہیں۔ اس بات کے ثبوت میں ان کی آتم کتھا کے صفحات اقتباس کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں۔

سب سے پہلی بات جو ابھر کر سامنے آتی ہے وہ یہ کہ وہ حالات کے چکر میں آکر کرانتی کاریوں کے دل میں آ پھنسے تھے ورنہ مزاج کے اعتبار سے وہ "مصلح قوم" کے قسم کے آدمی ہوتے۔ "دیکیتھرائن" کی زندگی کو وہ مثالی زندگی مانتے تھے، جو گرام سدھار کا دلدادہ تھا اور دن بھر گاؤں میں کپڑے سیتا۔ جوتے گانٹھتا۔ اور رات کو گاؤں والوں کو اُپدیش دیا کرتا۔ انھوں نے بڑی تڑپ سے لکھا ہے۔

"میں خود بھی ایسی زندگی گزارنا چاہتا تھا، مگر کرانتی کاریوں کے چکر میں پھنس گیا"

وہ پکے آریہ سماجی تھے اور ان کی عوام سے رابطہ کی زندگی کا آغاز در اصل آریہ سماج ہی کے وسیلے سے ہوا تھا۔ مگر زندگی ان کو دور، بہت دور، آگے —— اور آگے لے گئی لیکن آخر عمر میں وہ اپنی پھانسی کی کوٹھری کو "سادھنا گپھا" ہی سمجھتے ہیں۔ گویا سادھو بن جانے کی تمنا آخر عمر تک ان کے دل میں تھی، بلکہ شدید تر ہو گئی تھی۔

قابل داد بات تو یہ ہے کہ وہ پکے آریہ سماجی ہو کر اپنے عقائد کو ہندو مسلم اتحاد کے حق میں رکاوٹ نہیں سمجھتے تھے۔ اور چوں کہ ان کی فکر اور عمل میں خلوص تھا اس لئے انھوں نے ایسا کر دکھایا۔ اشفاق اللہ خاں وارثی سے ان کی دوستی ضرب المثل تھی۔ کس قدر زریں ہیں یہ خیالات۔

"انگریز سرکار نے اشفاق اللہ خاں کو میرا داہنا ہاتھ قرار دیا ہے۔ جب اشفاق خاں کٹر مسلمان ہو کر کٹر آریہ سماجی رام پرساد بسمل کے انقلابی کارناموں میں داہنا ہاتھ بن سکتے ہیں تو کیا ہندوستان کی آزادی کے نام پر ہندو مسلمان اپنے اپنے چھوٹے چھوٹے فائدے چھوڑ کر ایک نہیں ہو سکتے؟"

انھوں نے بڑے فخر سے کہا ہے کہ

"ہندو مسلم ایکتا ہی ہم لوگوں کی یادگار رہے آخری خواہش ہے۔ چاہے یہ خواہش کتنی ہی دشواریوں سے کیوں نہ پوری ہو"

رام پرساد بسمل نوجوانی کی موت مرے۔ شاندار موت مرے۔ اور نوجوانوں کے لئے ایک مثال چھوڑ گئے۔ مگر نوجوانوں کے نام ان کا آخری پیغام —— دہشت، تشدد اور مار کاٹ کا پیغام نہیں، بلکہ ان کا آخری پیغام وہی ہے جس کے دائرے اس تحریک سے ملتے ہیں جس پر چل کر ہندوستان کو بسمل کی شہادت کے بیس سال بعد آزادی حاصل ہوئی۔

بسمل کا آخری پیغام نوجوانوں کو اپنے قلب و روح پر کندہ کر لینا چاہیئے۔

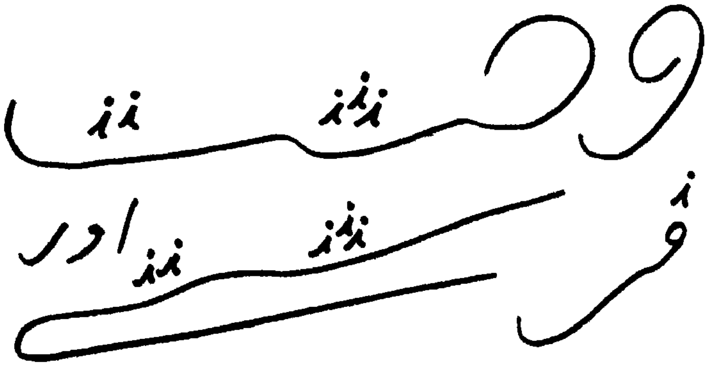
"نوجوانوں کو میرا آخری سندیش یہی ہے کہ وہ ریوالور اور پستول رکھنے کی خواہش کو تیاگ کر —— سچے دیش بھگت بنیں۔ مکمل آزادی ان کا مقصد ہو اور وہ سچے اور حقیقی انقلابی بننے کی کوشش کرتے رہیں اور سچے پریم سے کام کریں"

اس خواہش کا اظہار رام پرساد بسمل نے گورکھپور جیل کی کوٹھری میں ۱۹ دسمبر ۱۹۲۷ء کو کیا تھا۔ اپنی موت سے صرف تین دن پہلے —— ان کی موت کے بعد یہ آواز جیل کی کوٹھری کی دیواریں اور سلاخیں پھلانگ کر ہندوستان کے گوشے گوشے میں پہنچی۔ اور جب عدم تشدد کی راہ پر چل کر ہندوستان انقلاب کے راستے سے گزرا تو یقیناً رام پرساد بسمل کی روح کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا ہو گا۔

رام پرساد بسمل بیسویں صدی کی اس روح کا نام ہے جس کا سفر ہے بے قراری سے قرار کی طرف —— تشدد سے عدم تشدد کی طرف —— اور جہاں دیدگی سے خود آگہی کی طرف۔

[redacted]

آخری کھنہ



محترمہ سجدرا جوشی

ہمن جی مجھے ـــــ گاؤں ایک بار لے چلو۔ ایک صاحب پیروں پر گر گئے۔ اس عجیب مانگ پر کچھ جھنجھلاتے ہوئے میں نے کہا "کیسی بات کرتے ہیں۔ اتنی آفت آ رہی ہے اور آپ گاؤں لے جانے کو کہتے ہیں؟"

ایسی خواہشوں کا اظہار اکثر لوگ کرتے تھے ـــ اچانک دنگے کی وجہ سے گھر بار چھوڑ کر لوگوں کو جان بچانے کی خاطر بھاگنا پڑا۔ پناہ ملتے ہی بے چارے سوچتے تھے کہ واپس ایک بار گھر جا کر دو چار برتن بھانڈے لے آئیں۔ ہم سوچتے تھے جو ایک بار بچ کر کہیں پہنچ گیا ہے اسے کم سے کم وہاں بچا لیا جائے، یہی بات بڑی ہے۔ انھیں لیکر واپس سامان کی تلاش کے لئے واپس جانے سے خطرناک اور کیا ہو سکتا ہے۔

تہاڑ گاؤں میں مسلمان پناہ گزینوں کا کیمپ بنا ہوا تھا۔ مدراس فوج کا ایک دستہ کیمپ کی حفاظت کر رہا تھا۔

میرے جھانکنے پر وہ صاحب کچھ پیچھے ہٹ گئے!

دوسرے دن پھر وہی، پھر میرا وہی جواب۔ اب وہ صاحب منہ بسور کر روتے ہوئے بولے "ہم لوگ بھاگ آئے۔ گاؤں والوں نے کہا تم لوگ جاؤ۔ عورتوں بچوں کو چھوڑ جاؤ۔ انھیں ہم بچا لیں گے۔ مجھے ان کو لانا ہے۔"

میں نے کہا "میں گاڑی کا اور پولیس کا ـــــ نہیں فوج کا (پولیس پر سے ہمارا یقین اٹھ گیا تھا) انتظام کر کے لے چلوں گی۔"

روز کی وہی مانگ ـــــ جب میں جاتی وہ دور سے بھاگتا ہوا جیپ کے پاس آ جاتا "کیا آج چلیں گی؟"



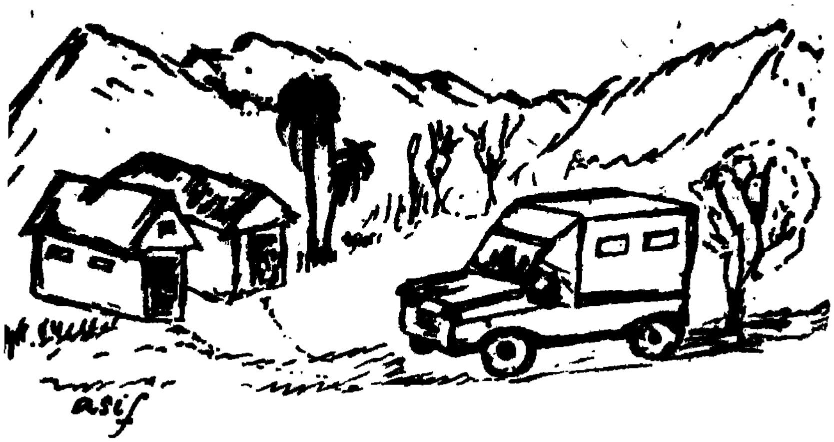
وہ پوچھتا۔

گاندھی جی تہاڑ گئے۔ وہ گاندھی جی کے پاس دوڑ کر آیا۔ وہی پیروں پر گرنا وہی مانگ ـــ

جہاں جانا تھا وہ گاؤں باڑھ کے پانی سے گھرا تھا۔ فساد کے فوراً بعد جمنا میں باڑھ آ گئی تھی۔ جمنا شاید یہ سوچتی تھی کہ اپنے پجاریوں کا یہ پاپ بھی وہ دھو ڈالے۔

حفاظت کا انتظام بھی نہیں ہو پایا۔ دن پہ دن بیت گئے۔ ایک دن بیوی بچوں کی فکر کرنے والا آدمی نہیں آیا۔ انتظام کر کرا کے میں گاؤں جانے کے لئے وہاں پہنچی۔ ان بیوی بچوں کی فکر میری رگ رگ میں سما گئی تھی۔ وہ آدمی دوڑ کر نہیں آیا۔ میں ناامیدی اور ناراضگی سے چاروں طرف دیکھتی رہی پھر میں نے لوگوں سے پوچھا "وہ صاحب کہاں ہیں؟" لوگوں نے گاؤں کے ایک کنارے کی طرف اشارہ کر دیا۔ آج مجھے ان بیوی بچوں کو لا کر اس خاندان کو اکٹھا کرنا تھا۔ جلدی اور بے صبری کی وجہ سے پیر نیچے نہیں پڑ رہے تھے۔ اور ایک صاحب یہ ہیں کہ انھیں آج ہی پیڑ کے نیچے جا کر بیٹھنا تھا۔

ایک پیڑ کے نیچے کھاٹ پر وہ بیٹھے تھے۔ سر دونوں ہاتھ سے تھامے ہوئے! ایک اور صاحب پاس بیٹھے تھے۔ "جلدی چلئے ـــــ جلدی چلئے" کہتے ہوئے میں ان کے پاس پہنچی۔ اس نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا



میں نے کہا "اچھے آئے آپ کے گاؤں چل رہے ہیں!"

پھر کہا ـــــ میں نے پھر کہا۔ اس نے کہا "اب کوئی فائدہ نہیں سب ختم ہوگیا۔"

"اپنا حال کیا بتاؤں ـــــ کیا بیتی مجھ پر ـــ"

اس نے اشارے سے دوسرے صاحب کو بولنے کو کہا۔

ان صاحب نے کہا "میں اس گاؤں سے آیا ہوں! جب فساد ہوا تو ہم لوگوں نے مسلمانوں سے کہا کہ مرد لوگ بھاگ جاؤ ہم عورتوں بچوں کو بچالیں گے یہ یہاں آگئے ـــــ دو دن ہوئے سنگھ پارٹی ہمارے گاؤں میں آئی انھوں نے کہا۔

"تم نے اپنے گاؤں میں مسلمان چھپا رکھے ہیں۔"

ہم نے کہا "نہیں۔"

انھوں نے کہا "ہمیں خبر مل گئی ہے۔ نکالو انھیں۔ نہیں تو ہم سارا گاؤں جلا دیں گے۔"

ہم نے کہا "مسلمان بھاگ گئے ہیں عورتوں بچوں کو ہم نے ہندو بنالیا ہے۔"

انھوں نے کہا "چلے بنانے ہندو ـــــ انھیں ہمارے حوالے کرو ـــــ"

ان کے پاس لاٹھیاں، بلم، بندوقیں تھیں۔

"ہم نے کہا "وہ ہمارے گاؤں کی بیہاں ہیں بچے ہیں، ہندو ہیں یا مسلمان۔"

"تمہیں کیا ـــ؟ لیکن بہن جی ہماری کوئی سنوائی نہیں ہوئی۔ کئی گھنٹے ہمارے پنچوں کی ان سے بحث ہوئی آخر فیصلہ ہوا۔ اچھا سب نہیں تو کچھ لوگ انھیں دے دیئے جائیں تاکہ گاؤں بچ جائے۔ اس بدنصیب کے گھر والے انھیں لوگوں میں تھے جن سے انھوں نے اپنی خون کی پیاس بجھائی ـــــ رات بھر گاؤں کے کنارے سے چیخنے اور کراہنے کی آوازیں آتی رہیں۔

جب سنگھ پارٹی چلی گئی تو میں چھپ کر دیکھنے گیا۔ سب ختم تھا۔ یہ بچہ الگ پڑا تھا بچ گیا تھا میں لے آیا ہوں۔ اس بدقسمت سے کہتا ہوں بھائی تم اپنا وطن چھوڑ کر جا رہے ہو۔ اب رہ کر بھی کیا کروگے۔ یہ بچہ میری طرف سے بھینٹ لے جاؤ۔ کبھی میں تمہارا پڑوسی تھا۔



اپنا خون

"ہمارا لڑکا جیل میں جا رہا ہے۔ ہم پاکستان جا رہے ہیں۔ ہمارے لڑکے کو چھڑوا کر ہمارے ساتھ کر دیا جائے۔" بوڑھے باپ نے کہا۔

دہلی کے پرانے قلعہ میں مسلمان پناہ گزینوں کا کیمپ بنا ہوا تھا۔ ہم لوگ وہاں جایا کرتے تھے لوگوں کو تسلی دے کر گھروں میں واپس لوٹنے کے لئے اصرار کرتے تھے۔ ایک خاندان کے ساتھ بُری بیتی۔ ایک نوجوان کی پتنی رہ گئی تھی اپنے ماں باپ کے پاس۔ کھڑکی گاؤں میں نوجوان کچھ لوگوں کی مدد سے قلعے سے لوٹا۔ گاؤں سے اپنی پتنی کو بھگا کر ساتھ پاکستان لے جانے کو۔ پتنی کے ماں باپ، ان کا خاندان، دوست، رشتہ دار، سب گاؤں میں تھے۔ وہ لوگ ہرگز پاکستان نہیں جانا چاہتے تھے۔ اپنی لڑکی کو بھی نہیں بھیجنا چاہتے تھے چاہے اس کا پتی چلا جائے۔ رپورٹ ہوگئی۔ پاکستان جانے والے کے ساتھ کس کو ہمدردی تھی؟ لڑکا پکڑ لیا گیا۔

بوڑھا چاہتا تھا کہ اسے پہلے کھڑکی گاؤں لے جائیں تاکہ اپنے سمدھیوں سے مل کر کچھ صلح صفائی ہو جائے ہم لوگ ان صاحب کے ساتھ ایسے لوگوں کو لے کر جا اثر ڈالنے کا دعویٰ کرتے تھے، کھڑکی گاؤں پہنچے۔ وہاں کے مسلمان بھی جمع ہوگئے۔ رشتہ دار بھی اکٹھا ہوگئے اور کانفرنس شروع ہوگئی۔ نہ جانے کیا کیا مشکلیں اور دقتیں تھیں کہ گھنٹوں میٹنگیں ہوئیں۔ آخر فیصلہ سنایا گیا کہ گاؤں سے سب مسلمان کیمپ میں چلے جائیں گے۔ سب رپورٹ اور مقدمے واپس لے لیں گے اور کیمپ سے پاکستان چلے جائیں گے۔ نہ کسی کی بیوی چھٹے نہ کسی کی لڑکی۔

اس اعلان سے گاؤں میں ماتم چھا گیا۔ سب گاؤں کے ہندو مسلمان جمع ہوگئے۔ التجاؤں و ترغیبوں کا سلسلہ اور بحث و مباحثہ شروع ہوگیا۔ کچھ نہ چلی تو سب رونے لگے۔ گھروں سے سامان نکال کر باہر رکھ دیا گیا

بیل جمع کر دیئے گئے تاکہ لوگ خرید لیں۔ لوگوں نے رو رو کر کہا کہ ہم نہیں لے سکتے تم سب کے بغیر ہم کیا کریں گے آخر مجبوری۔ تاکہ برسوں کے پڑوسی خالی ہاتھ گاؤں سے نہ چلے جائیں۔ لوگوں نے ڈھور خریدنے شروع کر دیئے۔

دور چارپائی پر ایک بوڑھا بیٹھا تھا۔ جس نے کہا تھا چاہے سب چلے جائیں میں نہیں جاؤں گا۔ اس نے کہا کب سے میرے بزرگ یہاں تھے، یہیں مرے اور یہیں کی انھوں نے مٹی پائی۔ کیا میں ان کو چھوڑ جاؤں ؟ لڑکا ان صاحب کے پاس کھڑا تھا اور کہہ رہا تھا کہ ابا جان ہمیں یہاں کسی صورت میں نہیں رہنا۔ کیوں نہیں رہنا؟ اس کی وہ سینکڑوں وجوہات بیان کر رہا تھا۔ بوڑھا سر ہلا کر انکار کر رہا تھا۔ گاؤں کے لوگ چپ چاپ یہ نظارہ دیکھ رہے تھے۔ آخر بوڑھا ہار گیا۔ بوڑھا گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھا اور اپنے بیٹے سے بولا اپنے جانور کھول لا۔ ان بھائیوں سے جو ملتا ہے لے لے۔ وہ دوڑ دوڑ کر انتظام کرنے لگا۔

ٹرک تیار ہو گئے۔ کیسا دردناک نظارہ تھا؟ گاؤں کے ہندو اپنے مسلمان پڑوسیوں سے گلے مل مل کر رو رہے تھے۔ عورتیں منہ ڈھکے ایک طرف جمع تھیں۔ جانے کو تیار کھڑی تھیں باقی کواڑوں کے پیچھے کھڑی آنسو پونچھ رہی تھیں۔

کہاں مسلم لیگ کیا ہندو مہاسبھا کیا آزادی کا آنا اور کہاں پاکستان کا بننا، ان نازک دل والے پڑوسیوں کے لئے یہ سب کہاں تھا؟

لوگ ٹرک پر بیٹھ گئے لیکن ایک دم کھلبلی مچ گئی۔ بوڑھا جو سب سے آخر میں کھڑے ہو کر ٹرک پر چڑھا تھا اپنے لڑکے کو پکار رہا تھا۔ اس کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ اپنے باپ کے گائے بیل بیچ کر تمام پیسے لے کر وہ غائب ہو گیا۔ لوگ چاروں طرف دوڑے۔ آوازیں لگائیں لیکن ناکام لوٹ آئے۔ لڑکا باپ کو کنگال کر پاکستان جانے کے لئے ٹرک پر بٹھا کر پیسے لے چمپت ہوا۔

باپ نے سر پیٹ لیا۔ بولا ان پڑوسیوں کو دیکھو اور اپنی اولاد کو دیکھو۔

کچھ دیر میں ٹرک چلا گیا۔

تنہا لیکن پہاڑ

باپو ہم آزادی کے لئے جیل گئے، بھوکے مرے، تکلیف اٹھائی۔ آزادی آئی اور ہماری بربادی ہو گئی۔ ہمارا کیا قصور ہے ؟

گاندھی جی نے مسکرا کر کہا "مولانا مسلمان ہونا کوئی قصور ہی نہیں ؟ مجھ سے پوچھتے ہو کیا قصور ہے !

مولانا بقاء اللہ نے مسکرانے کی کوشش کی اور کہا "ہاں یہ تو میں بھول ہی رہا تھا"

وہ چپ چاپ سر جھکا کر بیٹھ گئے۔

گاندھی جی نے پوچھا "مولانا کانگریس کے کہنے سے تم جیل گئے ؟"

وہ بولے ——— جی ہاں۔

کانگریس کہتی تو لاٹھی کھاتے ؟

جی ہاں۔

کانگریس کہتی تو گولی کے سامنے سینہ تان دیتے؟

جی ہاں۔

کانگریس کہتی تو پھانسی کے تختہ پر چڑھ جاتے ؟

کیوں نہیں باپو ——— ضرور چڑھ جاتا۔

گاندھی جی نے کہا ——— تو مولانا آپ پانی پت لوٹ جائیں اور وہاں رہیں۔ آج کانگریس کی یہی مانگ



ہے! چاہے آپ کو کوئی رکھنا چاہے یا نہ رکھنا چاہے چاہے کوئی کھانا دے یا نہ دے۔ چاہے کوئی جان کی حفاظت کرے یا نہ کرے! مولانا اگر آپ پاکستان چلے جائیں گے تو دنیا کہے گی کہ کانگریس نے ہندوستان کے دو قومی نظریہ کو تسلیم کر لیا۔ اس طرح دیش کا نقصان ہوگا اور اگر یہیں مارے جاؤ گے تو دیش کا بھلا ہو جائے گا۔

مولانا نے گاندھی جی کو خدا حافظ کہا اور چلے گئے پانی پت میں رہنے کو۔

پانی پت پنجاب کے مسلمانوں کے شرن لینے کا مرکز بن گیا تھا۔ مسلمان چلے گئے۔ مولانا کے اڑوسی پڑوسی رشتہ دار گھر کے لوگ سب کے سب لوگ سب گئے مولانا نہ گئے دیش کا بھلا کرنے کو رہ گئے۔

پاکستان میں پانی پت کے شرنارتھی آ گئے کسی کے بچے مارے گئے، کسی کے بھائی کسی کے باپ، کسی کی



پتنی چھن گئی، کسی کی لڑکی لُٹ گئی۔ روتے بلکتے مسلمان کے ہاتھ سے پٹ کر، لُٹ کر سینکڑوں میلوں سے بھٹک کر گرتے پڑتے، مسلمان کے نام سے خوف کھاتے ہزاروں لوگ پانی پت پہنچے۔

پاکستان سے دور، مسلمانوں سے دور پانی پت شہر میں سامنے مسلمان بوڑھا کھڑا تھا۔ سفید بال سفید داڑھی، سفید کپڑے، پاکستان میں نہتے اور بے قصور لوگوں پر ظلم کے زہر کو شیو جی کی طرح پی جانے کے لئے مولانا بقاء اللہ نے انھیں گلے سے لگا لیا۔

متحدہ قومیت کی تشکیل کا مسئلہ

(دوسری قسط)

قمر اعظم ہاشمی

بدرالدین طیب جی نے "پنڈت جی میری نظر میں" تقسیم کی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے مغربی پنجاب سے آنے والے ان غیر مسلم فساد زدہ پناہ گزینوں کا نقشہ اس طرح پیش کیا ہے جو دہلی کے وسط میں کیمپوں میں ٹھہرے ہوئے تھے :-

"ہم وہاں پہنچے تو ہمیں دور متوسط کے میدان جنگ کا نقشہ نظر آیا۔ کئی ہزار فوجی میدان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھیں سرخ تھیں، ان کے ہاتھوں میں تلوار، درانتیاں اور دوسرے زرعی اوزار تھے، وہ غصہ سے پاگل اور انتقام لینے کے لئے بے چین ہو رہے تھے اور اس فکر میں تھے کہ انہیں کچھ مل جائے جس پر وہ اپنا غصہ اتار سکیں"

ظاہر ہے کہ ان کے غصہ کا نشانہ ہندوستان کے مسلمان تھے۔ پناہ گزینوں کا یہ ستم رسیدہ قافلہ ملک کے جس گوشے میں گیا اس نے اپنے جذبۂ انتقام کی تسکین کی صورت نکالی۔ احساس میں اس درد ناکی اور جذبے میں اتنی تیزی پیدا ہو چکی تھی کہ اکثر محض افواہوں کو حقیقت بنا کر قتل و غارت اور لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کیا گیا۔

تقسیم کے کچھ دنوں کے بعد ہوش و حواس بجا ہوئے تو ہندوستانی مسلمانوں نے نئی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنا محاسبہ کیا۔ قوم پرور مسلم لیڈروں نے ان کربناک مایوسیوں کے عالم میں بھی اپنے حوصلوں کو پست نہ ہونے دیا انھوں نے مسلمانوں کی بچی کھچی طاقتوں کو سمیٹنا اور ان کے جذباتی ہیجان میں توازن پیدا کرنے کی جد و جہد شروع کی ادھر تمام ہندوؤں اور مسلمانوں کے اندر دو مختلف انداز احساس اور نہج فکر تھا۔ پاکستان کے عالم وجود میں آجانے کے بعد بھی فرقہ پرست ہندوؤں کے لئے اپنا محاذ سنبھالے رکھا، بلکہ ان کے گروہ کو ہندوستان کے اقتدار پر قبضہ جمانے کے لئے اب اور اچھا خاصا موقع ہاتھ لگا۔ سیدھے سادے ان پڑھ ہندوؤں کو یہ معمولی سی بات سمجھا دینا بہت آسان تھا کہ چونکہ پاکستان بن گیا اس لئے مسلمانوں کی اب ہندوستان میں گنجائش نہیں۔ عام انتخابات کے دنوں میں بھی پاکستان کے وجود کے زور ہی پر یہ الیکشن لڑتے اور کامیاب ہوتے رہے جب جب انھوں نے ہندوستان میں رہے سہے مسلمانوں کا "بھارتیہ کرن" کرنے کا نعرہ لگایا تبادلۂ آبادی کا مشورہ دیا ان کی مقبولیت بڑھی، فرقہ پرست ہندو لیڈروں نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ عام لوگوں کو ان کے بنیادی مسائل سے ہٹائے رکھا اور انھیں فرقہ وارانہ جذبات کی کمزور کشتی میں بٹھا کر زندگی کے تند و تیز طوفانوں میں دھکیلتے رہے

ملک کی سب سے بڑی برسراقتدار سیاسی جماعت کانگریس سے سر ٹکرانے کا بھی ایک ذریعہ تھا۔ مگر بتدریج تقسیم کا زخم مندمل ہوتا گیا اور جیسے جیسے تعلیم بڑھتی گئی۔ عام ہندوؤں میں متحدہ قومیت کی اہمیت و افادیت کا احساس پنپنے لگا اور ان کی جذباتیت کی آنچ دھیمی ہونے لگی۔ اس طرف ہندوستان میں بچے کچھے مسلمانوں کے اندر کچھ دنوں محرومی اور پسپائی کا احساس سرگرم عمل رہا۔ جو لوگ تقسیم کے مصائب میں مبتلا ہوئے تھے اور جنھوں نے تقسیم کی ہولناکیاں دیکھی یا سنی تھیں ان کے اندر فطری طور پر اعصابی اضمحلال، خوف و ہراس اور دہشت و سراسیمگی پیدا ہوئی۔ ان کے لئے ہر آنے والا لمحہ تشویشناک اور مشکوک تھا۔ جن کے اندر نقل مکانی کی قوت اور صلاحیت تھی وہ راہ فرار اختیار کر چکے تھے یا ایک ایسے خطۂ ارض کی طرف بھاگ چکے تھے جس کے صرف نام ہی (یعنی پاکستان) سے وہ ایک سطحی جذباتی لگاؤ رکھتے تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت یہیں قیام پذیر رہی اور انھوں نے مایوسانہ خود سپردگی کی کیفیت میں تن بہ تقدیر اپنے وطن ہی میں مرنے یا جینے کا فیصلہ کر لیا۔ رفتہ رفتہ جذباتی ہیجان میں کمی آنے لگی۔ تمام پاکستان کے حامی اور اپنے صوبے میں اقلیتی حیثیت رکھنے والے مسلمان فریب طلسم سے باہر آچکے تھے۔ افسوس، ندامت، مایوسی اور خوف کے مشترکہ عناصر کے احساس نے مصلحت اور مفاہمت کی راہ اپنائی چونکہ فسادات نے قوم پرور مسلمانوں کے دل و جگر زخمی کر دیئے تھے اس کے لازمی طور پر ان کے اندر بھی عدم تحفظ کا احساس کارفرما تھا اس کے باوجود انھوں نے اپنے وطن کو چھوڑنا کبھی گوارا نہ کیا۔

آج ہمیں دکھ اور افسوس ہوتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ قومی یکجہتی کی تمام تبلیغ محض اقلیتی فرقہ میں کی جاتی ہے تقسیم ملک اور حصول آزادی کے پچیس برسوں کے بعد بھی مختلف فرقوں کے مابین اجتماعیت و ہم آہنگی پیدا نہ ہو سکی جو انگریزوں کے وقت میں اور اس سے بھی پہلے مسلمانوں کے عہد اقتدار میں تھی یقیناً اس کی بڑی ذمہ داری اکثریتی فرقہ کے سر ہے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ۵۴ کروڑ کی ہندو آبادی کے لئے ۶ کروڑ کی مسلمان

آبادی کا ایک بہت بڑا طبقہ [illegible] سلوک کے ذریعہ اعتماد میں لینا ایک مشکل کام تھا۔ ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں نے یقیناً اپنی قسمت ہندوستان سے وابستہ کر رکھی ہے۔ یہ وہی ہیں جو اب تنگ ذہنی اور جذباتی تصادمات میں مبتلا رہے۔ پہلا کام ان کی قوت اعتماد کو بحال کرنا تھا۔ ممکن ہے ان کے اندر فرقہ پرست لوگ بھی ہوں لیکن تبدیل شدہ حالات میں ایک نہایت جراحت زدہ اقلیتی طبقہ کی فرقہ پرستی ہرگز جارح نہیں ہو سکتی۔ اکثریتی فرقہ کا وہ طبقہ جو ۱۹۴۷ء میں احیائے ماضی کی تحریک لے کر اٹھا تھا اب بھی موجود ہے۔ تقسیم کے بعد راسخ العقیدہ ہندو ہی نہیں ہندوؤں کے ایک بڑے روشن خیال طبقہ نے بھی ہندوستان میں مسلمانوں کے وجود اور مسائل کو غیر ضروری سمجھ کر نظر انداز کیا۔ یہ ہندوستانی مسلمان ذہنی اور جذباتی الجھنوں میں تو گرفتار تھے ہی، زمینداری کے خاتمہ نے معاشی طور پر انھیں اور پریشان کر دیا۔ روزگار کی ضرورتیں بڑھتی چلی گئیں اور معاشی اطمینان و آسودگی کے امکانات معدوم ہوتے چلے گئے۔ مالی دقتوں کے سبب مناسب تعلیم کے دروازے بھی ان کے لئے گویا مسدود ہو گئے۔ جہالت اور غربت کی وجہ سے ان کا سماجی وقار بھی برقرار نہ رہ سکا گویا ہندوستانی قومیت کے جسم کا یہ عضو سوکھتا ہی چلا گیا۔ اس کی حفاظت اور مناسب نشو و نما کی طرف معقول توجہ نہ کی گئی۔ اس نو آزاد ملک کی باگ ڈور کانگریس کے ہاتھوں میں تو تھی لیکن خود کانگریس میں فرقہ پرست عناصر موجود تھے۔ گاندھی جی کی شہادت کے بعد ان فرقہ پرستوں کی تنظیموں نے منظم منصوبوں کے تحت کام کرنا شروع کر دیا۔ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں چونکہ ان کا مقصد اقتدار کی کرسی پر بیٹھے رہنا یا اسے حاصل کرنا تھا اس لئے فرقہ پرستی کے زہریلے جراثیم کو یہ تیزی سے پھیلاتے رہے۔ کبھی ہندوستانی مسلمانوں کو نام بدلنے کی ہدایت کی گئی، کبھی ان کی عورتوں سے برقعے اتارنے کی فرمائش کی گئی اور کبھی انھیں ملک بدر کرنے کی سازشی تحریکیں چلائی گئیں۔ جب کبھی ہندوستانی مسلمانوں نے اپنے انفرادی تہذیبی وجود کی مدافعت کی کوششیں کیں فسادات کے شعلے بھڑکا دیئے گئے۔ آزادی کے بعد کے حالات کے مطالعہ سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے جب جب فسادات ہوئے اور یہ فسادات گزشتہ ۲۰ برسوں میں مسلسل ہوتے رہے ہیں تب تب مسلمانوں میں اضطراب آمیز شکوک و شبہات بڑھتے ہی گئے۔ انھیں اپنی نسلوں کے تاریک مستقبل کی فکر گھن کی طرح کھاتی رہی۔ کانگریس کے غیر فرقہ پرست برسر اقتدار حلقہ نے مداوائے غم کی کوشش کی بھی تو معاملہ آنسو پونچھنے سے آگے نہ بڑھا۔ مذہبی، لسانی اور تہذیبی سطح پر ان مسلمانوں کو مکمل اعتماد میں لینے کی پرخلوص کوشش اکثریتی فرقہ نے بہت کم کی۔ اس کے برعکس ان سے وفاداری کے ثبوت مانگے گئے اور انھیں ہمیشہ مشکوک نظروں سے دیکھا گیا۔ میرے نزدیک عظیم ہندوستانی قومیت کی اصل طاقت اس میں مضمر ہے کہ ہندوستان کے تمام لوگ مذہب، زبان اور نسل کے امتیاز و فرق کے باوجود ایک ایسے ملک گیر قومی معاشرے کی تعمیر کریں جس کے مذہبی، لسانی اور نسلی دائرے میں سب آزاد بھی ہوں اور قومیت کے ایک وسیع حلقہ میں محصور بھی، جہاں مذہب، زبان یا نسل کی وجہ سے نفرت و حقارت کا کوئی گوشہ امکان نہ ہو اور مختلف نسل کے لوگ، مختلف مذہب کے پیرو، مختلف زبانیں بولتے ہوں اور ایک قومی صف میں کھڑے ہوں۔ کثرت میں وحدت کا یہی تصور ہندوستانی قومیت کو پائیدار حسن بخش سکتا ہے۔ بصورت دیگر بقول ڈاکٹر عابد حسین "تہذیب اور زبان کا اشتراک متحدہ قومیت کا مضبوط اور پائیدار بنانے کے لئے کتنا ہی ضروری کیوں نہ ہو اسی اشتراک کے لئے اقلیتوں کی زندہ زبانوں اور تہذیبوں کا خون کرنے کی کوشش ان کے اندر ایسی شدید بے چینی اور بے اعتمادی پیدا کر دے گی کہ جس قدر قومی وحدت اس وقت موجود ہے وہ اور اس کے ساتھ ملک کا امن اور آزادی بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ ...... مذہبی اور نسلی اقلیتوں کو اکثریت پر اعتماد نہیں کہ وہ ان کے سیاسی، معاشی اور تہذیبی حقوق کا احترام کرے گی۔ اگر اکثریت نے دانشمندی اور دور اندیشی سے کام لے کر اقلیتوں کے شبہات اور شکایتوں پر پوری توجہ اور ان کو دور کرنے کی پوری کوشش نہ کی تو یہ کمزوری جو بظاہر ایک چھوٹی سی چیز معلوم ہوتی ہے کشتی کے چھوٹے سے سوراخ کی طرح پوری کشتی کو ڈبو سکتی ہے۔"

آزادی کے ان ۲۵ برسوں میں ایک نئی نسل بالغ اور باشعور ہو کر منظر عام پر آ چکی ہے۔ نئی نسل کی نفسیات فطری طور پر اس نسل [illegible] مختلف ہے۔ اس نسل [illegible] پسندی اور اصلاحی جھنجھلاہٹ [illegible] پائی ہے جہاں خوشگوار اور محفوظ مستقبل کے لئے امید کی کوئی کرن نہ تھی لیکن اس کے اندر مصلحت بینی نہیں، حقیقت پسندی ہے۔ مایوسی نہیں، حوصلہ ہے۔ پسپائی نہیں، بلند ہمتی ہے۔ خوف نہیں، بیباکی ہے۔ یہ نسل نہ آزادی کی لڑائی میں شریک تھی اور نہ تقسیم کے مطالبہ میں فریق۔ اس نے جنگ آزادی کے قصے سنے، تقسیم کی ہولناکیوں کی درد انگیز داستانیں سنیں، بزرگوں کی قربانیوں کے واقعات اس سے کہے گئے۔ اس نئی اور خالص ہندوستانی نسل نے صبر و استقلال کے ساتھ منتشر تنکوں کو سمیٹنا شروع کیا۔ اپنے انفرادی نیز اجتماعی اور قومی مستقبل کی تعمیر کے لئے نئے خطوط متعین کئے اور اس نے ماضی کی تلخیوں کو ساغر امروز کی شیرینی میں تبدیل کر دینے کا عزم کیا۔ لیکن باشعور ہو جانے کے بعد جب اس نے اپنی عقل کی روشنی میں اپنے ناگوار حسی اور جذباتی انتشار کے اسباب کا جائزہ لیا تو اس کے گرد و پیش میں پھیلی ہوئی ریاکارانہ تنگ نظریوں اور متعصبانہ نفرتوں نے اس کی نوخیز اور معصوم شخصیت میں گرہیں ڈال دیں۔ ڈاکٹر محمد حسن "خون دل کی کشید" میں قلم طراز ہیں۔

"فرقہ واریت محض فساد کا نام نہیں، فساد کا ایک حصہ ہے اور وہ بھی صرف اس وقت ممکن ہوتا ہے جب فرقہ وارانہ ذہنیت کی پرورش بہت پہلے سے اور بہت انتظام اور توجہ کے ساتھ کی جاتی رہی ہو۔ جاگیردارانہ دقیانوسیت سے ہمارے طبقے کے گٹھ جوڑ نے ہمیں دو اوزاروں سے بولنا سکھایا ہے اور منافقت اور دوغلاپن ہمارے قومی کردار کا حصہ بنتا جا رہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ فرقہ وارانہ ذہنیت کے پروان چڑھانے کا سارا انتظام ہمارے سیکولر اقتدار کی سرپرستی میں ہوتا ہے۔ ہمارے بچوں کو جو تاریخ پڑھائی جاتی ہے وہ ایک فرقہ کو غاصب اور دوسرے کو مظلوم کی شکل میں پیش کرتی ہے۔"

یہی وہ میلان ہے جس نے نئی نسل کی [illegible] مشکوک بنا کر رکھ دیا ہے۔ یہ میلان ہندوستان کی عظیم الشان قومیت کی روح کی [illegible] ہے

متحدہ قومیت کی تشکیل کے جذبے شریک ہوں۔ اب یہ غور ضروری ہے، ضروری یہ ہے کہ ایک ایسا توازن اور مفاہمت روا اختیار کیا جائے کہ تمام فرقے خود کو محفوظ تصور کریں اور سب میں اتحاد کی گرمی اور چمک پیدا ہو جب تک مذہبی، نسلی اور لسانی آمریت کسی گوشۂ خیال میں موجود ہوگی اور ذات پات کی تنگ نظری اور عصبیت قومی معاشرے میں موجود ہوگی۔ ہندوستان کی متحدہ قومیت کے خواب کی تعبیر نہ مل سکے گی۔ اخوت اور اخلاق کے اصول اور قومی اتحاد کے نعرے بامعنی اسی وقت ہوں گے کہ عملی طور پر ان کا مظاہرہ کیا جائے۔ ڈاکٹر وحید اختر نے "جمہوریت کے بنیادی تصورات" میں بڑے پتے کی بات لکھی ہے:—

"ہمارے ملک میں ریاکاری تہذیب کی سب سے بڑی قدر بن گئی ہے جس کا اظہار ہر شخص کرتا ہے۔ لوگ زبانوں سے اعلیٰ اقدار کی بات کرتے ہیں اور عمل سے اس کی نفی۔ یہ سیاست میں بھی ہوتا ہے مذہب میں بھی اور تعلیم و تدریس میں بھی ہمارے ملک میں تقسیم کے وقت اور اس کے بعد سے آج تک تنگ نظری، ذات پات کی تفریق، سماجی اونچ نیچ کی وسیع ترخلیج، مذہبی فسادات، لوٹ مار، بہیمیت اور قتل کے ایسے مناظر سامنے آتے رہتے ہیں کہ وہ تمام فلسفے اور ان کے حقائق کو نظر انداز کر کے اعلیٰ اقدار کو اپنانے کے کھوکھلے بلند بانگ دعوے کرتے ہیں اب بھی ان کا بدل نہیں کر سکے۔"

اس [illegible] معیار کی بات کی [illegible] معاشرہ کی [illegible] سے ملتا ہے [illegible] کے لئے لازمی ہے کہ اس کے اندر خود اعتمادی اور کسی طرح کا احساس کمتری نہ ہو۔ محفوظ اور مامون [illegible] اور ہندوؤں اور مسلمانوں کا اشتراک [illegible] تو خود کو ایک متحدہ قومی تہذیب [illegible] تیار ہونے [illegible] مسلمان [illegible] ہندوستان میں صرف ایک [illegible] نہیں ہے [illegible] کر اس [illegible]

[illegible]

ہوتے اور ایک دوسرے کے جذبہ و فکر کا لحاظ و احترام کرتے۔ ایک بڑا طبقہ زبردستی چھوٹے طبقہ کی زبان تراش لے، اس کی تہذیبی انفرادیت چھین لے اور اس کی مذہبی روایتوں کو دفن کردے اور ہر طرح سے اسے مغلوب کر کے بلند بانگ نعرہ لگائے کہ اتحاد قائم ہو گیا غلط تفسیر اتحاد ہے۔ اقلیتی فرقہ کے صبر و ایثار اور اکثریتی فرقہ کی فیاضی اور کشادہ قلبی کے نتیجہ میں جو محبت سے بھرا ہوا دل اور رواداریوں سے پُر دماغ منظر عام پر آئے گا وہی قومی دل اور قومی دماغ ہوگا اور یہی دماغ رکھنے والے لوگ قومی کردار کے حامل ہوں گے اور انہیں کے عملی اشتراک و جذبۂ تعاون سے پیدا ہونے والا ماحول قومی ماحول ہوگا جس میں پرورش پاکر قومی تہذیب اپنے خاکے میں مناسب اور دلکش رنگ بھرے گی۔ آزادی سے اب تک کے واقعات و مسائل اس کی شہادت دے سکتے کافی ہیں کہ متحدہ قومیت کی تشکیل کے لئے معقول اقدامات کئے ہی نہیں گئے۔ بلکہ نفرت و حقارت، بغض و کینہ، تنگ نظری اور عصبیت کے جو بیج خاص طور پر تقسیم کے آس پاس کے دنوں میں فرقہ پرست ہندوؤں اور مسلمانوں کے سہارے انگریزوں نے ڈالے تھے اس کے کمزور پودے کی نشوونما کے لئے خوراک فراہم کی جاتی رہی جس کا نتیجہ ہوا کہ بالکل نئی نسل کے ذہنوں میں بھی شکوک پیدا ہو گئے۔

قومی اتحاد کا قیام اور قومی تہذیب کی تشکیل واقعی ضروری ہے تو اکثریتی فرقہ کو احساس برتری اور احساس تفوق کی بلند سیڑھیوں سے پھر نیچے آنا ہوگا اقلیتی فرقہ کا اعتماد بحال کرنا ہوگا اور تب اگلی منزلیں طے کرنی ہوں گی جلد بازی اور سرعت پسندی کے بجائے دانش مندی اور تدبر کا ثبوت دینا ہوگا تاکہ کمتری کا احساس کسی میں نہ پیدا ہو اور پھر کوئی "انجمن آرا" کا طبقہ ابھرے۔ ہندوستانی مسلمانوں کو اقتصادیات، لسانیات اور اخلاقیات کے محاذوں پر سہارا دینے کا فرض اکثریتی فرقہ ہی کو انجام دینا ہے۔ خاص طور پر اس کی اس جماعت کو جو برسراقتدار ہے اور جو مسلمانوں پر "علیحدگی پسند" ہونے کا الزام مہمل اور فضول ہے۔ علیحدگی پسندی بذات خود کوئی مرض نہیں ہے علامت ہے انتشار ہے اور خارجی کیفیت ہے

اس مایوسی، خوف اور شک کی جو گزشتہ ۴۵ برسوں کے واقعات و تجربات کے ردعمل میں پیدا ہوئی ہے۔ ۴۷ء کے بعد ظہور میں آنے والی ہندوستانی نسل کی جذباتی کیفیتوں اور ذہنی صلاحیتوں کو اب بھی اس بیماری سے نجات دلائی جا سکتی ہے۔ کیونکہ پیش روؤں کے برعکس اس کے اندازِ فکر میں زیادہ وسعت اور طرزِ احساس میں زیادہ حقیقت پسندی ہے اس نے اپنے آزاد وطن میں آنکھیں کھولی ہیں، آزاد ماحول میں پرورش پائی ہے، اس نے پیدا ہوتے ہی ہندوستان اور پاکستان کو دو الگ الگ ممالک کی حیثیت سے دیکھا اور بچپن ہی سے یہ نقش (جو اب نقش کالحجر ہو چکا ہے) اس کے شعور کی تمام تہوں پر قائم ہوتا گیا کہ ہندوستان اس کا وطن ہے اور پاکستان، افغانستان ہی کی طرح ایک پڑوسی ملک۔ حالانکہ فرقہ پرستوں نے اس کے احساس و فکر کی معصومیت پر بھی بار بار "پاکستانی" ہونے کا الزام عاید کر کرکے اس کے اندر الجھنیں پیدا کرنے کی کوششیں کیں لیکن جیسے جیسے یہ نسل فکر و شعور کے ارتقائی مرحلے طے کرتی گئی اس کے اندر بے خوفی، غیر مصلحت پسندانہ وطن دوستی، وفاداری، حقیقت پسندی اور بے نیازانہ خلوص پیدا ہوتا گیا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی اس نئی نسل کو بہت آسانی سے ایک دوسرے سے بے حد قریب لایا جا سکتا ہے۔ ان کے درمیان عملی اشتراک کا جذبہ اور رواداری اور بھائی چارگی کا پائیدار رشتہ قائم کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ مذکورہ محاذوں (یعنی اقتصادی، لسانی، مذہبی اور اخلاقی) پر ایثار اور تحمل کے ساتھ کام کیا جائے۔ قومی اتحاد کے قیام کی یہ لڑائی بڑی ہے کیونکہ اس جنگ کی ابتدا ہم سب کو اپنی ذات، اپنے گھر اور اپنے ماحول سے کرنی ہوگی۔ ایک دوسرے کے احساس و جذبہ کا احترام اور مسائل کا لحاظ کرنے کا شعور پنپنا شروع ہو گیا تو پھر ایک متحدہ قومیت کی تشکیل کے لئے ماحول سازگار ہوتا چلا جائے گا اور اس میں زیادہ دن نہیں لگیں گے۔ یہ صحیح ہے کہ اس لڑائی میں ہندوستانی مسلمانوں کی نئی، نوجوان اور باشعور نسل کو بھی ہندوؤں کی نئی نسل کے ساتھ اپنے حصہ کا فرض ادا کرنا ہے۔ انہیں خوف و شک اور ہر طرح کے احساس کمتری سے بے نیاز ہو کر بے باکی اور جرأت کے ساتھ نئے قومی معاشرے

عورتوں کے لئے ایک نیا موقع

ایک نئی بچت اسکیم جس کا افتتاح پردھان منتری شریمتی اندرا گاندھی نے یکم اپریل کو کیا تھا، آپ کو ایک جزوقتی کام مہیا کرتی ہے۔ "مہلا پردھان کشیتریہ بچت یوجنا" نامی اس اسکیم کے ذریعہ آپ

- اپنے کنبے کی آمدنی بڑھا سکتی ہیں۔
- اپنے فالتو وقت کا سود مند استعمال کر سکتی ہیں۔
- سماجی میل جول کا دائرہ وسیع کر سکتی ہیں۔
- قومی خدمت انجام دے سکتی ہیں۔



مہلا بچت پردھان کی حیثیت میں آپ کا کام ہوگا:

اپنے علاقے کی گھریلو عورتوں سے ملنا
انھیں باقاعدہ بچت کرنے پر آمادہ کرنا
ہر مہینے ان کی بچت کی رقوم اکٹھی کرنا
اور انھیں مقررہ ڈاک خانہ میں جمع کرا دینا۔

اس طرح آپ جتنی رقم اکٹھی کریں گی اس پر آپ کو ½2 فیصدی کمیشن ملے گا۔

ملک بھر کے شہروں اور بڑے بڑے قصبوں میں مہلا بچت پردھان کی ضرورت ہے۔

تفصیلات کے لئے حسب ذیل پتہ پر لکھیے:

شنل سیونگز کمشنر
پوسٹ بکس [illegible]
ناگپور



کی تعبیر کرلی ہوگی۔ منہ چھپا کر ایک گوشے میں بیٹھا رہنا، فرضی پیشین گوئیوں کے پردہ ظہور پر آنے کے انتظار میں عمر گزارنا ناز برداری کی توقع کرنا اور خود فراموشیوں کی پُر فریب وادیوں میں پناہ ڈھونڈھنا بے حد مہلک ہے اور بزدلانہ احساس، پسپائی کی غمازی۔ اب تک ہم حق تلفیوں کا رونا روتے رہے ہیں مگر حق طلبی کے لئے نظم و ضبط کے ساتھ کبھی کوششیں نہیں کی گئیں۔ موجودہ نقشہ عمل میں کوتاہ دستی، محرومی اور دراز دستی، خاد کامی کی دلیل ہے۔ عملی سرگرمیوں کے تمام دائروں میں وسعت پیدا کرنا ضروری ہے۔ جہاں ہر شخص اپنے مسائل کی ڈور کو سلجھانے میں لگا ہو وہاں ہمدردی اور دلداری کے دو بول ہی بڑے قیمتی ہوتے ہیں۔ چھوٹی بڑی واقعاتی تبدیلیوں کا جذباتی ردِ عمل وقتی طور پر سہارے دے سکتا ہے لیکن اس کی بنیاد پر بہتر مستقبل کی عمارت نہیں کھڑی کی جاسکتی۔ موجوں کی خوفناکی سے گھبرا کر زیرِ دریا تیرنے والے مدفون دریا ہو جاتے ہیں۔ حقائق تازہ کا مقابلہ کرنے اور موجوں کا طمانچہ کھانے ہی میں آئندہ کے خوشگوار امکانات روپوش ہیں امتیازی انفرادی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی ہندوستانی قومیت کے شعور کو زیادہ سے زیادہ روشن، مفید اور پُر اثر بنالینا کوئی بہت مشکل کام نہیں (گزشتہ ۲۵ برسوں کے اندر دو مرتبہ باضابطہ پاکستان سے ہماری جنگیں ہوچکی ہیں۔ یہ جنگیں نئی نسل کے حق میں مفید ثابت ہوئی ہیں۔ ان جنگوں نے آپ ہی یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں پر قوم دشمنی یا غداری کا الزام لگانا ایک صریح ظلم ہے۔ اس کی وجہ سے ان فرقہ پرستوں کے حوصلے پست ہوئے ہیں جو اپنا پنجۂ سخت اور دنداں تیز لئے مسلمانوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ اس ملک سے ان کا تعلق، ربط اور وفاداری بغیر کسی دلیلِ مزید کے ثابت اور مقبول ہے۔ اس صورت حال کا خاطر خواہ فائدہ اٹھانے کے لئے مسلم عوام کو پورے حوصلہ اور اُمنگ کے ساتھ میدانِ عمل میں آجانا چاہیئے۔ جہالت اور غربت کو دور کرنا سب سے اہم کام ہے۔ یہ دو مہلک بیماریاں دور ہوگئیں یا کم از کم ان کا پھیلاؤ بھی رک جائے تو ایک بڑا کام ہوگا۔ ملک کی دوسری تمام ترقی پسند، روشن خیال اور وسیع النظر قوتوں سے قریب آکر انھیں اپنے اعتماد میں لے کر ان کی امداد و معاونت کے ذریعہ ان مسئلوں پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی نئی نسل کا ایک بڑا تعلیم یافتہ حلقہ اس حقیقت کو اچھی طرح محسوس کرنے لگا ہے کہ مذہب، زبان، نسل یا علاقائیت قومی اتحاد کے قیام میں رکاوٹ نہیں ہے۔ ان عناصر کو آلۂ کار بنا کر رکاوٹیں دراصل وہ سیاسی جماعتیں حائل کرتی ہیں جنھیں اپنے چھوٹے موٹے مقاصد پیارے ہیں۔ عوام میں مقبولیت حاصل کرنے کے ہر جائز اور ناجائز، مفید اور نقصان رساں حربے کو استعمال کرنا جن کا شیوہ ہے۔ ملک کے اس نئے حلقہ عوام نے اپنی بنیادی ضرورتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سماجی برابری کی برادرانہ اور روادارانہ فضا پیدا کرنے کی کوشش پیدا کی تو یقیناً ہمارے قومی کردار کی تشکیل صحیح خطوط پر ہونے لگے گی؟

نوناری اور بھنی، فرقہ پرستی کے شکار۔ بقیہ صفحہ ۴۶

کی پولیس پہنچ گئی۔ اور بھنی میں فیروز آباد کے واقعات دہرائے گئے۔

گاؤں والوں کا کہنا ہے کہ پی اے سی نے انھیں مار پیٹ کر زبردستی بھنی کے اندر ڈھکیلا۔ وکیل احمد کی بندوق پر قبضہ کیا۔ اور پھر لوٹ مار اور آتش زنی کا بازار گرم ہوگیا۔ پانچ بجے شام تک یہ ڈرامہ کھیلا گیا۔

اتر پردیش ہوم منسٹری کے منسٹر آف اسٹیٹ مسٹر آر۔ کے گوسوامی نے بھنی کے بارے میں یہ بیان دیا تھا کہ "یہ کہنا مشکل ہے کہ کون حملہ آور تھا اور کون مزاحمت کر رہا تھا؟ دونوں حلقے ایک دوسرے سے گتھے ہوئے تھے" میں مسٹر گوسوامی سے درخواست کروں گا کہ وہ خود موقعۂ واردات پر پہنچ کر حالات کا اندازہ کریں کہ حقائق کیا ہیں؟

فرقہ پرست عناصر نے ان دونوں موقعوں سے حسب سابق فائدہ اٹھایا۔ اعظم گڑھ سے شائع ہونے والا ہندی روزنامہ "دیول" نے فرقہ پرست عناصر کی آواز بن کر اشتعال انگیز تحریریں شائع کیں۔ یہ سلسلہ اب تک جاری ہے اور پورے علاقے میں کشیدگی کا باعث ہے۔

جب نوناری سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے، جن سنگھ کے ایک ایم۔ ایل۔ اے، رام بچن یادو سرائے میر میں اپنی اشتعال انگیز تقریریں کر رہے تھے اور اگلے روز بھی اسی کام میں مصروف رہے۔

جن سنگھ کا ایک اور کارکن بھنی سے پہلے "ہندو عورت کی عزت بچاؤ" کے نام پر تحریک چلائے ہوئے تھا۔

حکومت اتر پردیش نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور سپرنٹنڈنٹ کے تبادلے کا مطالبہ رد کر دیا ہے۔ صرف عدالتی تحقیقات کرائی جا رہی ہیں۔ لیکن مندرجہ بالا حالات کی روشنی میں کیا ان حکام کی موجودگی میں، جو خود واقعات میں ملوث ہیں، غیر جانبدار تحقیقات کی گنجائش ہوسکے گی؟ حکومت اگر اقلیتی فرقہ میں اعتماد بحال کرنا چاہتی ہے تو ضلع کے تمام حکام کا تبادلہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ڈی۔ آر۔ گوئل

مسلم پرسنل لا پر ہنگامہ آرائی

"مسلم پرسنل لا کے تحفظ کے لئے کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کیا جائے گا"

(دعوت ۲۰، دسمبر ۱۹۸۲ء)

"مسلم پرسنل لا کے سلسلے میں سرکاری مداخلت برداشت نہ کی جائے گی"

(ایضاً)

اس قسم کی چیختی ہوئی سرخیاں دے کر بمبئی میں ۲۷، ۲۸ دسمبر ۸۲ء کو منعقدہ مسلم پرسنل لا کنونشن کی رپورٹیں اردو اخبارات میں شائع کی گئیں۔ سرخیاں دیکھ کر ہی تاثر ہوتا ہے کہ شاید گورنمنٹ کی طرف سے مسلم پرسنل لا میں کسی تبدیلی کے لئے تحریک ہو رہی ہے اور اس کی مزاحمت کے لئے اہل قرآن و سنت کو کمربستہ ہونے کی ضرورت ہے۔

بہت سے اخبارات اور بہت سی تنظیموں نے گزشتہ کئی مہینوں سے ملک بھر کے مسلمانوں میں اسی قسم کا پروپیگنڈہ کیا ہے، جگہ جگہ جلسے کئے گئے، اخبارات میں مضامین لکھے گئے جن میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی کہ مسلمانوں کی انفرادیت کو ختم کرنے کے لئے کوئی سازش کی جا رہی ہے جس کے پیچھے حکومت کا ہاتھ ہے۔

یہ تمام شور و غوغا مسلمانوں کے اندر سیاسی پس ماندگی اور عام مایوسی کی علامت ہے ورنہ اس سے پہلے کہ یہ نام نہاد قائدین مسلم عوام کے جذبات کی سوداگری کا یہ نیا سلسلہ شروع کرتے ان سے سوال کیا جاتا کہ وہ کونسی وجہ ہے جو آپ کو یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور کرتی ہے کہ مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کی جانے والی ہے۔

اس صورت حال کو دیکھ کر ایک قصہ یاد آتا ہے کہ ایک بڑھیا اپنے گھر میں مغموم صورت بیٹھی تھی۔ پڑوسن پاس سے گزری تو پوچھا بہن ایسا منہ بنا کر کیوں بیٹھی ہو؟ بڑھیا نے جواب دیا ایسے ہی۔ اپنے بیٹے کا خیال آگیا۔ دونوں میں باتیں چل پڑیں اور سلسلہ گریہ وزاری تک پہنچ گیا۔ گاؤں کے دوسرے لوگ بھی آتے جاتے وہاں بیٹھنے لگے۔ کسی نے معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ واقعہ کیا ہے۔ جو بھی آیا منہ بسور کر بیٹھ گیا۔ عورتیں گلے مل مل کر رونے لگیں۔ نظارہ ایسا بندھ گیا جیسے واقعتاً کوئی موت ہو گئی ہو۔ اتنے میں بڑھیا کا بیٹا گھر آیا اور پوچھنے لگا کیا ہوا؟ اس کا یہ سوال سبھی نے دہرایا۔ جواب کسی کے پاس بھی نہیں تھا۔

غالباً یہی بات پرسنل لا کے معاملے میں ہو رہی ہے سبھی بڑھ چڑھ کر اس کی حفاظت میں بیان بازی کر رہے ہیں کوئی یہ جاننے کی کوشش نہیں کرتا کہ آخر ماجرا کیا ہے

بمبئی میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا کنونشن کا افتتاح کرتے ہوئے سورت کی عربی اکیڈیمی کے ناظم ڈاکٹر وائی نجم الدین نے حکومت کے اس اعلان کا خیر مقدم کیا کہ وہ اس وقت تک مذہبی اقلیتوں خاص طور پر مسلمانوں کے شرعی اور مذہبی امور مداخلت نہیں کرے گی جب تک کوئی اقلیت خود اس میں تبدیلی کی خواہشمند نہ ہو۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ ہم حکومت کے اس موقف کی حمایت کرتے ہیں اور اس معاملے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتے۔

جس اعلان کا خیر مقدم کیا گیا وہ کوئی نیا نہیں حکومت کی طرف سے بار بار اس بات کی یقین دہانی کروائی گئی ہے۔ اس کے باوجود یہ ملک گیر تحریک برائے تحفظ قانون شرعیہ کس لئے؟ بمبئی کی یہ کنونشن کس لئے؟ افسوس کا مقام یہ ہے کہ وہ جماعتیں اور افراد جو خود کو فرقہ واریت کے مخالف کہتے ہیں۔ انھوں نے بھی یہ سوال اٹھانے کی زحمت گوارہ نہیں کی اور مسلمانوں کے اندر خوف و ہراس پیدا کر کے ان میں فرقہ بندی کے رجحانات کو فروغ دینے میں دلچسپی رکھنے والی سیاسی پارٹیوں اور گروہوں کو کھل کھیلنے کی اجازت دی۔

۲

آر۔ ایس۔ ایس کے گرو شری گولوالکر کا وہ بیان جس میں انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کے پرسنل لا میں تبدیلی کی کوئی ضرورت نہیں۔ نہ ہی یکساں سول کوڈ کی ضرورت ہے۔ اس بیان سے مسلم قیادت کے ایک حلقے کی حالت اس پیاسے دیہاتی جیسی ہو گئی جس کو کٹورہ اور پانی ملا تو وہ پانی پی پی کر بیمار پڑ گیا۔ شری گولوالکر کے معنی و موقف اور ان کے پیروکاروں کے طرز عمل کو بھلا کر یہ حلقہ اچھل کر اس نتیجے پر آپہنچا کہ مسلم پرسنل لا اور مسلمانوں کی انفرادیت کو آر۔ ایس۔ ایس اور جن سنگھ سے نہیں بلکہ اندرا گاندھی کی حکومت سے خطرہ ہے۔ وہ بھول گئے کہ یہی بزرگ ہیں جنھوں نے شہریت کے لئے یہ شرط پیش کی تھی کہ تمام غیر ہندو، ہندو طرز زندگی اور طرز معاشرت قبول کریں۔ انھیں کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے جن سنگھ کے انڈیانائزیشن Indianisation کا ریزولیوشن پاس ہو گیا تھا۔ وہ یہ بھی بھول گئے کہ یہ گولوالکر جیسے ہندو میرج ایکٹ کے بھی خلاف تھے اور آج تک کانگریس حکومت کو اس بات کے لئے گردن زدنی قرار دیتے ہیں کہ یہ ہندوستان میں ہندو دھرم شاستروں کے مطابق قانون نہیں بناتی اور ہندوؤں اور غیر ہندوؤں کو یکساں حقوق دیتی ہے۔

شری گولوالکر کے موقف کی حمایت جب مولانا مودودی کے پیروکار کرتے ہیں تو بات سمجھ میں آتی ہے کیونکہ مولانا موصوف نے خود تقسیم کے وقت فرمایا تھا کہ ہندوستان میں ہندو حکومت قائم ہونی چاہیئے اور پاکستان میں اسلامی حکومت۔ ان کی جماعت اس بات پر زور دیتی رہی ہے کہ "مسلمانوں کو ہندوستان کی سیاسیات وغیرہ میں کوئی حصہ نہیں مانگنا چاہیئے۔ ان کو دیگر ہندوستانیوں سے الگ رہ کر اپنے موقف کا پرچار کرتے جانا چاہیئے اور وہ وقت قریب لانے کی کوشش کرنی چاہیئے جب جماعت اسلامی کے اصولوں کے مطابق حکومت قائم کی جا سکے۔

مسلمانوں کی قیادت حاصل کرنے کے لئے بیقرار ان ناعاقبت اندیش لیڈروں نے دماغی توازن اس حد تک کھو دیا کہ حکومت کے موقف اور حمید دلوائی کی قماش کے لوگوں کے بیانات میں بھی تمیز نہ کر پائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کانگریسی حکومتوں نے بھی دلوائی جیسے لوگوں کو سمجھنے میں تغافل اور تاخیر سے کام لیا اور وہ لوگ کچھ عرصے تک عوام میں خود کو حکومت کے منظور نظر کے طور پر پیش کرنے میں کامیاب ہو گئے لیکن وہ مسلم رہنما جنھوں نے نہایت کامیابی سے دلوائی صاحب اور ان کے ساتھیوں کا پردہ اکابرین حکومت کے روبرو فاش کیا ہے جنھوں نے ان کی لکھی ہوئی کتابوں اور مضامین کا حوالہ دے کر ان کو مرکزی حکومت کی کچھ کمیٹیوں میں عمل دخل کرنے سے روکا اور آر۔ ایس۔ ایس کے اخبارات میں ان کے مضامین اور ان کی ذات کی مدح سرائی دیکھی ہے ان کو حمید دلوائی کی مانگ اور حکومت کے موقف میں فرق کرنا چاہیئے تھا۔ حمید دلوائی، اے۔ بی۔ شاہ وغیرہ کچھ لوگ گزشتہ چند برسوں سے دھڑا دھڑ مضامین لکھتے آ رہے ہیں کہ جب تک مسلم پرسنل لا کی جگہ یکساں سول کوڈ نافذ نہیں کیا جائے گا تب تک ہندو مسلمانوں میں نفرت کی خلیج بڑھتی جائے گی اور فسادات کا سلسلہ جاری رہے گا ان کے اس طرز خیال سے نہ تو ملک کے جمہوریت نواز طبقے کو ہمدردی رہی ہے اور نہ ہی حکومت کو بلکہ مذہبی اقلیتوں کے شرعی اور مذہبی امور میں نامداخلت کا بیان حکومت نے انھیں تحریروں اور مانگوں کو مد نظر رکھتے ہوئے دیا تھا۔

ان تمام حقائق کو بالائے طاق رکھتے ہوئے سیاسی اغراض سے متاثر رہنما یہ ثابت کرنے کے درپے ہیں کہ حکومت پرسنل لا میں تبدیلی لانا چاہتی ہے لہٰذا وہ حمید دلوائی کی قماش کے لوگوں کو بھی حکومت کا نمائندہ قرار دے دیتے ہیں۔ ایک قطعاً غیر سرکاری ادارے انڈین انسٹی ٹیوٹ میں ہوئے پرسنل لا سے متعلق ایک سیمینار کو حکومت کی تحریک سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اس سیمینار کے پہلے اور بعد حکومت کا اس معاملے میں رویہ بالکل صاف کر دیا گیا تھا۔ اس سیمینار میں کچھ لوگوں نے مختلف اسلامی ممالک میں جو تبدیلیاں یا اصلاحات عمل میں لائی گئی ہیں ان کا ذکر کیا۔ بجائے ان کو منطق اور دلیل کی کسوٹی پر پرکھنے کے جوشیلے اعلان جاری کئے گئے کہ ہندوستان کے مسلمان کسی دوسرے ملک کی مثال سے رہنمائی حاصل نہیں کریں گے۔ وہ تو قرآن و حدیث کو ہی اپنا رہنما مانیں گے اس کو ہم دلیل نہ کہہ کر جوشیلا اعلان اس لئے کہہ رہے ہیں کہ باوجود اس کی سطحی معقولیت کے اس دلیل کی بنیاد کوئی منطقی تجزیہ نہیں۔ اعلان جاری کرنے والوں نے یہ ثابت نہیں کیا کہ مراقش، ٹیونس، انڈونیشیا، ایران اور پاکستان کے اندر اس سلسلے میں جو اقدامات کئے گئے ہیں وہ کیونکر کتاب رسول کے احکامات کے خلاف ہیں۔

اسی قسم کی ذہنیت کا اظہار ان علماء کے بارے میں کیا گیا جنھوں نے خیال ظاہر کیا کہ مسلم پرسنل لا کی تشکیل جس طور سے انگریز کے دور حکومت میں ہوئی اور عملی طور پر آج جو اس کی صورت بن گئی ہے وہ احکام قرآنی کے عین مطابق نہیں لہٰذا یہ کمزوری دور کرنے کے لئے حکومت کو مناسب کارروائی کرنی چاہیئے۔ یہ بات حیدرآباد کے دانشوروں نے ایک بیان میں کہی تھی۔ مرکزی نائب وزیر داخلہ جناب محسن صاحب نے بھی اس بات کی ضرورت کی نشاندہی کی ہے لیکن قرآن اور سنت کے نام پر سیاست کرنے والوں نے ان کے پرخلوص موقف کو بھی غلط رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ اعلان کیا کہ مسلم پرسنل میں ایک شوشے کی تبدیلی بھی برداشت نہیں کی جائے گی عقیدے کی پختگی قابل احترام ہے مگر سوال یہ ہے کہ تبدیلی کس قانون میں مطلوب ہے۔ قانون شرعیہ میں تبدیلی کا داعی تو ان میں سے کوئی نہیں۔ اس کو انگریزی حکومت نے جس صورت میں پیش کیا ہے اس کی اصلاح البتہ یہ لوگ چاہتے ہیں۔

تحریک تحفظ کے مجاہدوں نے جو رویہ اختیار کر رکھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پرسنل لا کے متعلق کسی قسم کی بھی رائے زنی کو شجر ممنوعہ سمجھتے ہیں۔ شدت جذبات میں وہ اس حد تک پہنچ جاتے ہیں کہ جو لوگ قرآنی احکام کی پابندی نہیں کرتے اور جو لوگ وقت کے تقاضوں کے نام پر ان میں کوئی اصلاح یا تبدیلی کے حق میں رائے دیتے ہیں وہ دائرۂ اسلام میں ہی شامل نہیں کئے جا سکتے۔ وہ اپنے پاک ذہن کو ذرا سوچنے کی زحمت دیں تو ان کو معلوم ہوگا کہ ان کے بیان کے مطابق اگر دائرۂ اسلام سے اخراج کا سلسلہ شروع ہو گیا تو اس دائرے کی وسعت کیا رہ جائے گی اور دامنِ اسلام کو یوں تنگ کر کے وہ کس کی خدمت کریں گے۔ یہ رویہ دقیانوسیت اور تعصب سے تعبیر کیا جائے تو بجا نہ ہوگا۔ غیر جمہوری تو یہ ہے ہی جمہوریت میں ہر شخص کو اپنے رائے کے اظہار کی آزادی ہوتی ہے۔ یہ شرط البتہ ہوتی ہے کہ آزادی خیال و اظہار کا استعمال اس طریقے سے کیا جائے کہ دوسرے کی دلآزاری نہ ہو۔ مسلم قانون شرعیہ کے متعلق اظہار رائے یا یہ کہنا کہ اس میں تبدیلی کی ضرورت ہے باعثِ دلآزاری نہیں سمجھنا چاہیئے۔ کسی بھی مذہب میں اگر کوئی قباحت کسی کو نظر آتی ہے تو وہ اس کی نشاندہی ضرور کرے گا دلآزاری اسے اسی صورت میں کہا جائے گا جب مناسب آداب کو ملحوظ خاطر نہیں رکھا جائے گا۔ تہذیب و آداب کی حدود کے اندر رہتے ہوئے اگر کوئی نکتہ چینی کرے تو جمہوریت میں یہ حق دینا ہی پڑے گا۔ کسی کو مذہب یا زبان کے اختلاف کی بنیاد پر غدار کہنا جیسے آر۔ ایس۔ ایس والے کہتے ہیں اس حق کا غلط استعمال ہے اور جرم ہے لیکن مذہب یا زبان کے متعلق فلسفیانہ یا عاقلانہ بحث کے حق سے کسی کو محروم نہیں کیا جا سکتا۔

اس جمہوری حق کا تحفظ اقلیتی فرقوں کے افراد کے لئے زیادہ ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر ان کے اپنے عقائد و خیالات کی اشاعت و تشہیر میں دقت ہوگی اور تمام تر پروپیگنڈہ اور تعلیم اکثریتی گروہ کی رضا و رغبت کے مطابق ڈھل جائیں گے جو کسی صورت بھی مناسب نہیں۔ جمہوریت اور سیکولرازم کا اسی لئے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اسی لئے اس اصول کو اقلیتوں اور ان کے حقوق کی بہترین ڈھال سمجھا جاتا ہے۔

۳

جب افتتاح کرنے والے بزرگ نے اعلان کر دیا کہ اس سلسلے میں 'ہمیں اور کچھ نہیں چاہیئے' تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر بمبئی کی کنونشن کا انعقاد، اخباری کالموں میں قلمی جہاد اور شہر شہر قصبے قصبے 'مسلم پرسنل لا خطرے میں' اور 'اسلام خطرے میں' کے نعروں کے کیا معنی؟ ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی صدر کل ہند مسلم مجلس نے خود فرمایا ہے کہ "میں سمجھتا ہوں کہ

سرکار کوئی قانون ایسا نہیں بنائے گی جو پرسنل لا میں مداخلت کے مترادف ہو۔ اس کے باوجود بھی مسلمانوں میں خطرے کا احساس کیوں جگایا جا رہا ہے؟

ان سوالات کے جواب کا اشارہ جماعت اسلامی کے اخبار "دعوت" کے ۲۵ دسمبر کے پرچے کے صفحہ اول پر چھپے ایک مضمون "بمبئی کا مبارک اجتماع" سے ملتا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے "اس موقع پر جب کہ ہماری ملت کے تقریباً سب ہی سوچنے سمجھنے والے حضرات اس کنونشن میں جمع ہونے والے ہیں یقیناً ان کے ذہن میں یہ سوال فطری طور پر اٹھے گا کہ ملت کے مشترک مسائل اور امور کے بارے میں غور کرنے کے لئے ایک مشترکہ تنظیم یا فورم تشکیل دیا جائے۔"

دوسرے الفاظ میں مسلم پرسنل لا کے تحفظ کی تحریک اور بمبئی کا اجتماع اس غرض سے کئے جا رہے ہیں کہ مسلمانوں کو مذہب کی بنیاد پر دیگر ہندوستانیوں سے الگ ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے تاکہ سیاسی اغراض کے لئے اس کا استعمال کیا جائے۔ اس کی صورت اگلے پیراگراف میں اور واضح ہو جاتی ہے جس میں کہا گیا ہے "ہم سب کو یاد ہے کہ مسلم مجلس مشاورت اسی فورم یا تنظیم کی ایک شکل تھی جو آج بھی زندہ ہے البتہ اسے زیادہ طاقتور، مضبوط اور موثر بنانے کی ضرورت ہے۔"

اس سلسلے میں جماعت اسلامی کے اقدامات کی کچھ اطلاعات بھی ملی ہیں۔ وہ لوگ اس کوشش میں ہیں کہ بمبئی کے اجتماع کے بعد یا تو مسلم مجلس مشاورت کو دوبارہ زندہ کریں یا اسی قسم کی کوئی نئی جماعت قائم کریں۔ بمبئی میں ایک بورڈ بن گیا ہے۔ جماعت کی کوشش ہے کہ اس کا صدر دفتر دلی میں لے آئیں اور اس پر پوری طرح غلبہ حاصل کرکے ویسی ہی ایک جماعت منظم کریں جیسی آر۔ ایس۔ ایس نے جن سنگھ کی صورت میں کی ہے۔ جماعت اسلامی کے اندر آج کل غالب رجحان یہ ہے کہ سیاست پر اثر انداز ہونا چاہئے اور کانگریس کو شکست دینی چاہئے۔ یا یوں کہنا چاہئے کہ ۱۹۶۷ء کے انتخابات سے پہلے مسلم سیاست کو جو موڑ مسلم مجلس مشاورت کے ذریعے دیا گیا تھا وہی موڑ پھر سے دینے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔

جماعت کی سرگرمیوں کے متعلق ان اطلاعات میں مندرجہ بالا مضمون کے پیش نظر زیادہ گنجائش نہیں رہ جاتی۔ اس مضمون کے کچھ اقتباسات مزید وضاحت میں مددگار ثابت ہوں گے۔ مجلس کے بارے میں مضمون نگار صاحب فرماتے ہیں کہ "جب ۱۹۶۴ء میں مسلمان اکابر ندوۃ العلما میں جمع ہوئے تو ایک فورم تشکیل دینے کا فیصلہ ضروری سمجھا گیا جس نے کافی مدت تک مسلمانوں کے دلوں کو گرمائے رکھا جو ان کے لئے ڈھارس بنا رہا اور دوسروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مضبوطی سے بات کرنے کا یہ پلیٹ فارم قوت حاصل کرنے لگا لیکن اس میں بعض اسباب کی بنا پر جمود پیدا ہوا اور اس کے اثرات مضمحل ہونے لگے۔"

جمود کیوں پیدا ہوا؟ اثرات کیوں مضمحل ہوئے؟ وجوہات پر نظر ڈالنے کی بجائے مضمون جوش پیدا کرنے کی کوشش پیدا کرتا ہے "سوال دراصل یہ ہے کہ چلنے والوں سے غلطیاں ہوں گی اور بار بار ہوں گی۔ وہ شکست بھی کھائیں گے اور ناکامیوں سے دوچار بھی ہوں گے مگر زندہ گروہوں کا خاصہ یہ ہرگز نہیں رہا کہ وہ ہار مان کر بیٹھ جائیں یا غلطیوں کی تلافی کرنے کے لئے آمادہ نہ ہوں۔ جن گروہوں کی کوئی منزل ہوتی ہے انھیں بہرحال اس سے پیار ہونا چاہئے اور ناکامی کی پرواہ کئے بغیر ہمت سے آگے بڑھنا چاہئے۔"

ان اقتباسات سے یہی ظاہر نہیں ہوتا کہ جماعت اسلامی، مسلم مجلس مشاورت یا اسی قسم کی کسی دوسری جماعت کو سیاست کے میدان میں داخل کرنا چاہتی ہے۔ اس میں اس کے مطمح نظر پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ فورم کی تشکیل محض اس لئے نہیں کہ کسی فوری مسئلے کا حل تلاش کیا جائے بلکہ اس لئے کہ یہ مسلمانوں کو بطور ایک گروہ کے کسی "منزل" کی طرف "ناکامی کی پرواہ کئے بغیر" آگے بڑھاتا رہے یعنی مسلمانوں کو الگ سیاسی گروہ کی صورت میں منظم ہونا چاہیئے تاکہ وہ "دوسروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر" مضبوطی سے بات کر سکیں۔ غالباً اسی لئے ۱۹۶۷ء کے انتخابات کے بعد دعوت کے ایڈیٹر محمد مسلم صاحب نے لکھنؤ میں جن سنگھ اسمبلی پارٹی کے لیڈر شری رام پرکاش گپتا سے بات کی تھی۔

اس وقت بیل منڈھے نہیں چڑھی تھی کیونکہ اس کے بعد مجلس مشاورت ہی مضمحل نہیں ہوئی اس کے ساتھ جن سنگھ پر بھی زوال آ گیا۔ اس کے بعد عوامی سیاست میں جو انقلاب آیا اس کا مقابلہ کرنے کی سکت نہ جماعت میں تھی نہ مجلس میں لہٰذا ان تمام عناصر نے مصلحتاً خاموشی اختیار کر لی۔ تعمیری دور کی مشکلات کا فائدہ اٹھا کر اب پھر سے اپنا بکھرا شیرازہ جمع کرنے کی کوشش شروع کی گئی ہے جس کی ایک کڑی ہے آر۔ ایس۔ ایس کے لیڈروں کے صلح کل بیانات اور دوسری کڑی ہے مسلمانوں کی علیحدہ تنظیم۔ ظاہر ہے اس کا ردعمل فرقہ وارانہ سیاست ابھارے گا۔ جماعت اسلامی اور آر۔ ایس۔ ایس دونوں فرقہ وارانہ ماحول میں پنپتے ہیں اس لئے دونوں مل جل کر فتنہ جگانے کی فکر میں ہیں۔

مجلس کی ناکامی کی سیدھی سادی وجہ یہ تھی کہ جس مقصد کا اعلان کرکے اس کو قائم کیا گیا تھا وہ تو حل نہیں ہوا۔ مقصد تو تھا فرقہ وارانہ فسادات کا سدباب لیکن مجلس کی سیاست کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیکولر طاقتوں کو زک پہنچی اور ۱۹۶۷ء کے انتخابات کے بعد فسادات کی تعداد اور شدت میں اضافہ ہو گیا۔ اس میں کمی تب ہوئی جب ۱۹۶۹ء کے بعد اندرا گاندھی نے سیکولر قوتوں میں ایک نئی روح پھونکی۔ اب جماعت اسلامی اور اس کے حواری اگر دوبارہ وہی تجربہ کرنا چاہتے ہیں تو کون ذی ہوش مسلمان ان کا ساتھ دے گا؟

جماعت اسلامی کی خاص "منزل" سے اختلاف رکھنے والے لوگوں کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ وہ اس کے جذباتی نعروں کی ہمنوائی کرکے اس کی شرارت کو ختم نہ کر سکیں گے۔ انھیں حالات کو سیدھے طور پر عوام کے سامنے رکھنا ہوگا اور علیحدہ تنظیم کی فرقہ وارانہ سیاست کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا ہوگا۔ استدلال و ادراک سے کام کرنے والے گروہوں اور افراد کو بھی اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ ان کا استدلال ہیجان میں اضافہ نہ کرے۔ منطق و استدلال اگر تعصب کو شہ دیں تو منطق نہیں کہلا سکتے۔ اصلاح پسند اور اصلاح کے مخالفین اگر عقلی بحث کرنا چاہیں تو انھیں ہیجان کم کرنے کو اپنا مقدم فرض سمجھنا چاہیئے۔ اکابرین حکومت کو بھی احتیاط برتنی چاہیئے کہ وہ غلط قسم کے نعرے بازوں کے ہم پلہ نظر نہ آئیں۔ مسئلہ اس وقت اصلاحی نہیں سیاسی نوعیت کا ہے۔

دہلی میں اردو کی حالت

[illegible]

پچھلے ۲۵ برسوں میں اگر کسی کو صرف وعدوں پر زندہ رکھا گیا ہے تو وہ اردو ہے۔ ہندوستان آزاد ہونے پر ہندوستان کی تمام اہم زبانوں کو علاقائی زبان تسلیم کرکے ہر ایک کو اس کے علاقے کی سرکاری اور تعلیمی زبان بنا دیا گیا جس کی وجہ سے ان زبانوں کو ترقی اور فروغ کے پورے مواقع فراہم ہوگئے ہیں۔ صرف اردو ہی وہ بدنصیب زبان تھی جو اپنے حق سے محروم رہی۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ اردو اور ہندی کا علاقہ مشترکہ تھا۔ آزادی سے قبل ہی زبان کو قوم پرستی کا جزو بنالیا گیا تھا۔ یعنی اگر ہندو ہے تو اس کی مادری زبان ہندی ہے اور مسلمان ہے تو اردو۔ بہت کم لوگ تھے جو زبان کی اس عصبیت کا شکار نہیں ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آزادی کے بعد جمہوری نظام کی سب سے پہلی شکار اردو ہوئی۔ جو اکثریت چاہے گی وہ ہوگا۔ چونکہ اردو ہندوستان کی ترقی یافتہ ترین زبانوں میں سے ایک تھی۔ اس لئے کشمیری کے ساتھ اردو کو بھی جموں اور کشمیر کی سرکاری زبان بنادیا گیا۔ وہاں صورت حال یہ ہے کہ جموں کے اسکولوں میں ہندی اور ڈوگری پڑھائی جاتی ہے۔ کشمیر میں کشمیری اور لداخ میں لداخی۔ دفتروں میں سارا کام انگریزی میں ہوتا ہے۔ گویا اردو صرف برائے نام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو کو اس کے وطن یعنی دلّی، یوپی، پنجاب، بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان، اور آندھرا پردیش سے نکال کر کشمیریوں پر تھوپنا کسی طرح سے جائز نہیں ہے۔ اگرچہ مرکزی حکومت نے اردو کی فروغ کے لئے چند اقدامات ضرور اٹھائے ہیں۔ ان میں ترقی اردو بورڈ کا قیام بھی شامل ہے لیکن صوبوں میں اردو کی ترقی یا کسی طرح کی سہولتیں فراہم کرنے کا تو خیر سوال ہی نہیں۔ اسے ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی رہی ہے۔

دہلی میں اردو پر جو بیت رہی ہے۔ میں اس کا مختصر سا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔ اس وقت دہلی میں اسکولوں کی تعداد حسب ذیل ہے۔

پرائمری	۳۲
ہائر سکنڈری	۵

ان اسکولوں کے بے شمار مسائل ہیں۔ جن کی طرف دہلی کے شہریوں نے بارہا ذمہ داران حکومت کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ بے شمار وفد ہوم منسٹر سے لے کر نیچے تک کے افسروں سے ملے ہیں۔ لیکن ہمیشہ بہت سے وعدوں اور خالی ہاتھوں کے ساتھ واپس آئے ہیں ان اسکولوں کے مسائل بدستور ہیں۔

[illegible]

دہلی میں کم سے کم تین لاکھ اردو بولنے والے ہیں جن کے لئے یہ اسکول قطعًا ناکافی ہیں۔ جب بھی اس کمی کی شکایت کی جاتی ہے تو جواب یہ ملتا ہے کہ 'جگہ آپ دلا دیجئے۔ ہم ابھی اسکول کھول دیتے ہیں'۔ ظاہر ہے کہ لوکل دہلی میں جگہ ملنی آسان نہیں ہے۔ پھر بھی چند سر پھرے ایسی جگہ تلاش کرکے بتا دیتے ہیں جہاں اسکول کے لئے عمارت بنائی جاسکتی ہے۔ اس موقع پر دہلی ایڈمنسٹریشن او دہلی کارپوریشن کے ذمہ داران فورًا ایک باقاعدہ فائل بنا دیتے ہیں۔ لیکن پھر ان کی ساری ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ کلاں محل ایک پرانی عمارت ہے جس میں ایک دو نہیں سات آٹھ اسکول کھولے جاسکتے ہیں۔ یہ عمارت دہلی ایڈمنسٹریشن کے ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ کے قبضہ میں ہے۔ تیرہ چودہ سال گزر گئے ہیں یہاں اردو میڈیم اسکول بنانے کے پروگرام صرف فائلوں کی حد تک محدود رہتے ہیں۔

ہاں اس علاقے میں لڑکیوں کے لئے ایک ہندی میڈیم اسکول کی ضرورت تھی۔ اس لئے کلاں محل کے ایک گوشے میں ایک شاندار عمارت تعمیر کردی گئی اور اردو والے شکل دیکھتے رہ گئے۔

قصاب پورہ کے علاقے میں اردو بولنے والوں کی تعداد لگ بھگ ایک لاکھ ہے۔ لیکن وہاں ایک بھی سرکاری اردو میڈیم پرائمری اسکول نہیں ہے۔ بار بار توجہ دلانے کے باوجود ہماری دہلی سرکار وہاں ایک بھی اسکول کھولنے سے معذور ہے۔ دہلی میں تین ہائر سکنڈری اسکول لڑکوں کے ہیں اور دو لڑکیوں کے۔ لڑکوں کے تمام اسکول پرائیوٹ ادارے چلاتے ہیں۔ ان کی جو مالی حالت ہے وہ کسی سے چھپی نہیں۔ وہاں بدنظمی کی وجہ سے طالب علموں کے نتائج کی اصل وجوہ جاننے کی سرکار نے کبھی کوشش نہیں کی۔

[illegible]

اگر کام کرنے کے سینکڑوں طریقے ہیں تو نہ کرنے کے ہزاروں ہیں۔ دہلی کے اسکولوں میں اساتذہ کا مسئلہ "کام نہ کرنے کی پالیسی" کا شکار ہے۔ اردو میڈیم ہائر سکنڈری اسکولوں میں جہاں اردو اساتذہ کا تقرر دہلی سرکار کے ہاتھ میں ہے۔ ہندی میڈیم اساتذہ کی تعداد چالیس فی صدی کے قریب ہے۔

جب طالب علم اساتذہ کی بات ہی نہ سمجھیں گے تو تعلیم کا سلسلہ کیسے چلے گا۔ اس طرف جب ذمہ داران کی توجہ دلائی جاتی ہے تو فرمایا جاتا ہے کہ اردو تربیت یافتہ اساتذہ نہیں ملتے۔ اگر اردو تربیت یافتہ اساتذہ کی واقعی ضرورت ہے تو پھر ایک تو یہ ہے کہ بعض اردو ٹیچر ہندی اسکولوں میں ہیں انھیں اردو اسکولوں میں منتقل کیوں نہیں کیا جاتا۔ دوسرے اردو اساتذہ کی تربیت کا انتظام کیوں نہیں کیا جاتا؟ ان سوالوں کا ظاہر ہے کوئی جواب نہیں۔

بعض بڑی مضحکہ خیز چیزیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ کہ اردو میڈیم کے ہائر سکنڈری اسکولوں کی

پرنسپل ایسی مقرر کی جاتی ہیں جو اردو سے قطعاً نا واقف ہوں۔ ظاہر ہے کہ اردو کے مسائل سے انھیں کوئی ہمدردی نہیں ہوتی۔ بار بار احتجاج کے باوجود صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

اب دہلی سرکار یہ چاہتی ہے کہ بچے اردو نہ پڑھیں تو اسے اردو میڈیم اسکول بند کر دینے چاہئیں۔ اس طرح وہ صرف ایک بار ہدف ملامت ہوگی۔ لیکن اردو میڈیم اسکول کھول کر اردو کی کتابیں فراہم نہ کرنے سے ہر سال سینکڑوں بچوں کی زندگی خراب ہوتی ہے۔ اس بیان میں ہرگز مبالغہ نہیں ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ بعض کلاسوں کی کتابیں اردو میں فراہم کر دی جاتی ہیں اور بعض کی نہیں اور یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی کلاس کی بعض کتابیں بازار میں ملتی ہیں اور بعض نہیں۔ اب طالب علم کو نہ ہندی میں عبور حاصل ہوتا ہے اور نہ اردو میں۔ ایک طالب علم جو فرض کیجئے پانچویں کلاس تک تاریخ اردو میں پڑھتا ہے۔ اچانک چھٹی کلاس میں اسے ہندی پڑھنی پڑتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ اور وہ یا تو فیل ہو جاتا ہے یا بہت کم نمبروں سے پاس ہوتا ہے۔

یہاں صرف ایک مثال دینا کافی ہے پچھلے سال آٹھویں کلاس کا حساب نصاب بدل دیا گیا۔ نئی کتابیں صرف ہندی میں فراہم کی گئیں۔ اس کلاس کے طالب علم اب تک حساب اردو میں پڑھتے آ رہے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پونسٹھ طالب علموں میں چھپن فیل ہوئے۔ فیل ہونے سے ماں باپ کی جیب پر جو بوجھ پڑا اور طالب علم پر جو نفسیاتی اثر ہوا۔ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ کیا یہ جرم دنیا کے کسی بھی جرم سے کم ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ اردو میڈیم سے پڑھنے والے طالب علموں کی تعداد دہلی میں غیر معمولی طور سے کم ہے۔ اس لئے پبلشر اردو کی کتابیں چھاپنا پسند نہیں کرتے۔ ایسی صورت میں حکومت کا فرض ہے کہ وہ اردو کی کتابیں خود شائع کرے۔ کیونکہ ہر بچے کا یہ آئینی حق ہے کہ وہ اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرے اور حکومت کا فرض ہے کہ اس مقصد کے لئے تمام سہولیات فراہم کرے اگر دہلی میں اردو کی کتابیں شائع کرنے پر حکومت کا دو تین لاکھ بلکہ دس لاکھ روپیہ بھی خرچ ہو جائے تو کونسا آسمان ٹوٹ پڑے گا؟ اور کون سا حکومت کا بجٹ فیل ہو جائے گا۔

دہلی ایڈمنسٹریشن میں کوئی ایسا شعبہ ہونا تو کجا ایسا افسر بھی نہیں ہے جو اردو میڈیم اسکولوں سے متعلق ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ دہلی ایڈمنسٹریشن نے یہ مسئلہ اس طرح حل کر لیا ہے کہ کبھی ان کی طرف توجہ ہی نہیں کرتی۔ بلکہ نہیں ہے، جو نئے اسکول بنائے جائیں اور تربیت یافتہ اساتذہ نہیں ہیں جو اسکولوں میں مقرر کئے جائیں۔ پبلشر نہیں ہیں جو اردو کی نصابی کتابیں شائع کریں۔ لیجئے سب مسائل حل ہو گئے۔

پچھلے جون میں محترمہ سبھدرا جوشی ایک وفد لے کر دہلی ایڈمنسٹریشن کے ذمہ داران کے پاس گئی تھیں اور اردو میڈیم اسکولوں کے تمام مسائل سے آگاہ کیا تھا انھیں یقین دلایا گیا کہ دو تین مہینوں میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن افسوس ہے کہ کچھ ٹھیک نہ ہوا۔

سڑکوں کے نام عام طور پر ہندی میں ہیں۔ اگر کہیں اردو میں بھی لکھا گیا ہے، تو جان بوجھ کر اس نام کی ہجے اس طرح لکھی گئی ہے کہ پڑھنے والے کو ہنسی آئے مثلاً شیواجی کو "شی واجی" لکھا جاتا ہے۔ غالباً دہلی کارپوریشن اور دہلی ایڈمنسٹریشن کو یقین کامل ہے کہ سب اردو والے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ورنہ ممکن نہیں کہ ان دفتروں میں اتنی اردو جاننے والے نہ ہوں کہ سڑکوں کے نام صحیح لکھے جا سکیں۔ سرکاری اطلاعات اور نوٹس سب ہندی میں جاری کئے جاتے ہیں جس کی وجہ سے اردو والے بالکل جاہل بن کر رہ گئے ہیں۔ دہلی میں اردو کا مقام کیا ہے؟ یہ اگر جاننا ہے تو الیکشن کے دنوں میں دہلی کی سڑکوں پر گھومئے۔ کوئی بھی سیاسی جماعت ہو۔ کانگریس ہو یا جن سنگھ، کیمونسٹ پارٹی ہو یا سوشلسٹ پارٹی، سب کے تقریباً ستر فی صدی اشتہار اردو ہی میں شائع ہوتے ہیں۔ یعنی وہ زبان جو بقول ذمہ داران مر گئی ہے۔ اور اب جس کے پڑھنے والے ہی نہیں رہے۔ جب الیکشن کا وقت آتا ہے تو زندہ ہو جاتی ہے۔ اگر یہ اشتہار صرف مسلم محلوں میں ہوں تو ہم یہ مان لیں کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ لطف یہ ہے کہ ان علاقوں کی دیواریں بھی اردو اشتہارات سے بھری ہوتی ہیں جہاں مسلمان جاتا بھی نہیں۔

آخر میں ایک اور حقیقت کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ اردو والوں اور اردو کے شاعروں اور ادیبوں کو بعض سرکاری ذمہ داران دوسرے درجہ کا شہری سمجھتے ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ اردو مر گئی۔ اردو ختم ہو گئی۔ کے باوجود آج بھی دہلی میں اگر کسی زبان کا مشاعرہ غیر معمولی طور سے کامیاب ہوتا ہے تو وہ اردو کا۔ ۲۴ جنوری کو لال قلعہ میں جو ہندی، پنجابی اور اردو کے مشاعرے ہوتے ہیں۔ ان میں صرف اردو کا مشاعرہ ٹکٹ سے ہوتا ہے۔ باقی مشاعروں میں مفت پاس تقسیم کئے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود اردو مشاعرے میں سامعین کی تعداد غیر معمولی طور سے زیادہ ہوتی ہے لیکن چونکہ اردو مشاعرے کے شاعر اردو کے ہوتے ہیں اور وہ دوسرے درجے کے شہری ہیں، اس لئے ان کے ساتھ امتیاز برتنا ضروری تھا چنانچہ سات آٹھ سال پہلے تک اردو شاعر کو دس روپے اور ہندی کوی کو پچاس روپے دیئے جاتے تھے۔ ایک سال جب اردو شاعروں نے پر زور احتجاج کیا تو یہ امتیاز ختم کیا گیا۔

مرکزی حکومت نے کچھ عرصہ ہوا ایک کمیٹی برائے فروغ اردو بنائی ہے۔ جس کے صدر مسٹر شری آئی۔ کے۔ گجرال ہیں۔ ہمیں اس کمیٹی کے ارکان سے توقع ہے کہ پچھلے پچیس برسوں میں اردو پر جو مظالم ہوئے ہیں وہ ان کا مداوا کریں گے اور ہر صوبے میں مستقل طور پر ایسے شعبے کھولیں گے جو اردو کے مسائل کا سرکاری سطح پر حل تلاش کریں۔

روحِ اتحاد

رضا امروہوی

نئے ادب کے تقاضے، نئے پیام لئے
میں بارگاہِ خلوص و وفا میں آیا ہوں
مرے جلو میں اخوت، مرے جلو میں وفا
میں اتحاد کے پرچم کو ہوں اٹھائے ہوئے
اور اس حسین سے پرچم کی سرسراہٹ میں
رواں دواں ہیں تبسم کے قافلے کتنے
ہر ایک قافلہ ہے اتحاد کی بنیاد
نقوشِ ماضی و عہدِ رواں کا آئینہ
اس آئینہ میں ہے قوموں کا ایک مستقبل
یہ ایک جذبہ ہے تاریخ ہے امانت ہے
میں ایک شاعرِ رنگیں نوائے دوراں ہوں
نقیب ہوں میں محبت کا عہدِ حاضر میں

مری نوا کو نہ سمجھو نوائے کم مایہ
مری نوا میں ہے پنہاں دھنک کی رنگینی
یہ رنگ بھرتی ہے اخلاص کے اجالوں میں
یہ نور دیتی ہے الفت کے آبگینوں کو
مری نوا تو ہے دراصل اتحاد کی روح
یہ اپنے خون کی وحدت کا منظرِ دل کش
یہ رنگ و نسل کے ہر اختلاف سے بالا
یہ ایک خاص امانت ہے عہدِ رفتہ کی
یہ اپنی جہدِ مسلسل کا قصرِ لافانی
یہ آج قوم و وطن کا ہے ایک شیرازہ
میں ایک شاعرِ رنگیں نوائے دوراں ہوں
نقیب ہوں میں محبت کا عہدِ حاضر میں

مری نوا میں ترنم، مری نوا میں حیات
مری حیات، نئی نسل کی پیامی ہے
مری حیات ہے اک روشنی کا مینارہ
جہاں سے پیار کے بہتے ہیں سینکڑوں ساگر
یہ پیار ورثہ ہے اسلاف کے تمدن کا
میں گنگا جمنی تمدن سے پیار کرتا ہوں
یہ پیار نسلوں کی تہذیب کا ہے اِک سنگم
مری نوا ہے ثقافت کا اتحاد لئے
مری نوا تو حقیقت میں دل کی دھڑکن ہے
جو آج اہلِ وطن کی رگوں میں پنہاں ہے
میں ایک شاعرِ رنگیں نوائے دوراں ہوں
نقیب ہوں میں محبت کا عصرِ حاضر میں

[redacted]

اگلا بچہ ہونے سے پہلے
ذرا سوچیے

کیا آپ اس بچے
کی صحیح دیکھ بھال
نہیں کرنا چاہیں گے ؟



اس کے روشن مستقبل کیلئے اعلیٰ تعلیم کی شروعات اور باقی سبھی ضرورتوں کو پورا کرنے کا انتظام... لیکن اگر بچہ جلد ہو گیا تو یہ سب کچھ کرنا آپ کے لئے مشکل ہوگا۔ آپ اس پریشانی سے ضرور بچنا چاہیں گے۔

نِرودھ کی مدد سے اب آپ اگلے بچے کی پیدائش کو تب تک ٹال سکتے ہیں، جب تک آپ اسکی پوری دیکھ ریکھ کرنے لائق نہیں ہو جاتے۔

نِرودھ مردوں کیلئے ہے۔ ربڑ سے بنا حمل روکنے کا یہ آسان ذریعہ برسوں سے ساری دنیا میں مقبول ہے۔ آپ بھی نِرودھ استعمال کیجئے۔

نِرودھ ہر جگہ ملتا ہے۔ سرکاری رعایتی دام، 15 پیسے میں 3



جب تک نہ چاہیں تب تک نہ پائیں سنتان

▼ نِرودھ

لاکھوں میں مقبول، بے ضرر اور آسان

کریانہ فروشوں، دوا فروشوں، پنساریوں، پان و سگریٹ کی دکانوں وغیرہ کے یہاں بکتا ہے۔

davp 71/440

دہلی یونیورسٹی
طلبا کا مستقبل
سیاست کاروں کے نرغے میں

ہمارے نامہ نگار کا دورہ



دہلی یونی ورسٹی کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ اتنے لمبے عرصے کے لئے یونی ورسٹی بند ہوئی ہے۔ اس سیشن کے آغاز سے ہی یونیورسٹی کے حالات بگڑنے شروع ہو گئے تھے۔ یونی ورسٹی اسٹوڈینٹس یونین کے چناؤ میں، ودیارتھی پریشد (جن سنگھ کی طلبا پر مشتمل تنظیم) کے چناؤ جیتنے سے کئی مسائل پیدا ہو گئے۔ میٹروپولیٹن کے انتخابات میں جن سنگھ کی بھرپور شکست کے بعد، جب کسی نہ کسی طرح ودیارتھی پریشد کو اسٹوڈینٹس یونین میں مقام حاصل ہو گیا تو سب سے پہلے ڈی۔ ٹی۔ سی۔ کی بسوں کے خلاف اندولن شروع کرنے کی دھمکی دی گئی۔ جب عام طلبا پر اس نعرے بازی کا کوئی اثر نہ ہوا تو پھر دوسرے طریقوں سے مشکلات پیدا کرنے کی کوششیں شروع ہوئیں۔

بد قسمتی سے دہلی انجینئرنگ کالج اور آرٹس کالج میں ہڑتال چل رہی تھی۔ اس ہڑتال کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی غرض سے جن سنگھ نے جلسے جلوس کا پروگرام بنا لیا۔

دراصل ان واقعات کی ذمہ داری ودیارتھی پریشد پر ہے۔ اپنے سیاسی مقاصد کے لئے طلبا کے مستقبل سے کھیلنے کا یہ طریقہ بہت غلط ہے۔ جہاں تک طلبا کو معطل کئے جانے کا معاملہ ہے، وہ تحقیقات کے مطابق ناجائز نہیں ثابت ہوا اس لئے اس اقدام کو غلط نہیں کہا جا سکتا۔

اسی سلسلے میں، بی کام کے طالب علم آنند پرکاش

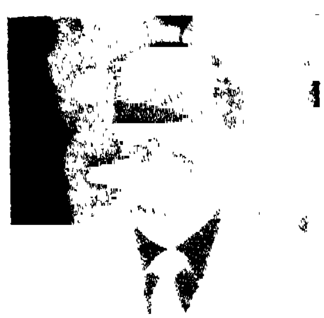
دہلی یونیورسٹی کے طلبا اپنے مسائل حل کرنا چاہتے ہیں یا جن سنگھ اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کرنا چاہتی ہے

۱۴ ر ۱۵ ر نومبر کو تشدد کی وارداتوں سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ مسائل کو پر امن طریقے پر حل کرنے کی بجائے توڑ پھوڑ کے واقعات سے اس حلقے کو زیادہ دلچسپی ہے

۱۶ ر نومبر سے یونی ورسٹی بند ہے۔ جب بھی یونی ورسٹی کھولنے کی بات کی جاتی ہے تو ودیارتھی پریشد کے نیتا اپنی کارگزاریوں کے ذریعہ ہنگامی ماحول پیدا کرنے کی دھمکی دیتے ہیں۔ اب ۲ ر جنوری کو یونی ورسٹی کھلنے کا اعلان کیا گیا ہے۔ تشدد کے مذکورہ واقعات کی بنا پر چار طلبا کو معطل کر دیا گیا ہے۔

دہلی یونی ورسٹی میں وائس چانسلر کے دفتر کے باہر طلبا کا دھرنا جاری ہے۔ اس جگہ کا جائزہ لینے سے یہ احساس نہیں ہوتا کہ طلبا نے کسی مسئلے پر پوری توجہ کے ساتھ وائس چانسلر کے دفتر پر دھرنا دیا ہوا ہے بلکہ غیر سنجیدگی کا ماحول نظر آتا ہے۔

یونی ورسٹی کے واقعات کا جائزہ لیتے ہوئے سب سے پہلے تاریخ (آنرز) کے طالب علم، انوپم مدگل سے



ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ:۔

"طلبا کی تنظیم کی راہ نمائی صحیح ہاتھوں میں نہیں ہے۔ اپنے مطالبات منوانے کے لئے تشدد کا سہارا لینا صحیح نہیں ہے۔ یونی ورسٹی میں جو کچھ ہوا ہے کم سے کم میں تو اسے ہرگز پسند نہیں کرتا۔

بہت سے بھی بات ہوئی۔ ان کا کہنا تھا ــــ

"یونی ورسٹی کے واقعات میں سیاست کا دخل ہے۔ اسٹوڈینٹس یونین کے چناؤ کے بعد سے ہی ودیارتھی پریشد کے لیڈروں نے اپنی کامیابی کے سبب یونی ورسٹی کے ذمہ داران کے سامنے اپنی مانگیں نہیں پیش کیں، بلکہ اس بارے میں انھیں دھمکی دی۔ اگر یہ مانگیں صحیح بھی ہیں، اور ہو بھی سکتی ہیں، تو انھیں سلجھانے کی کوشش نہیں کی گئی ایک ایک کر کے کئی مطالبات پیش کئے گئے۔ آخر میں طلبا کی معطلی کے احکامات واپس لئے جانے کی ہی بات باقی رہ گئی تو پھر کن مطالبات کے لئے یہ سب کچھ ہنگامہ خیزی ہوئی؟ حقیقت تو یہ ہے کہ اس ہنگامہ خیزی کا مقصد دراصل جان بوجھ کر انتشار پھیلانے کی کوشش کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔"

اندر پرستھ کالج کی طالبہ کماری نیلم نے اپنے خیالات ظاہر کرتے ہوئے کہا ــــ

"کچھ لوگ اپنی نیتا گیری چلانے کے لئے یونیورسٹی کی پُر امن فضا کو بگاڑے ہوئے ہیں۔ باقی طلبا و طالبات

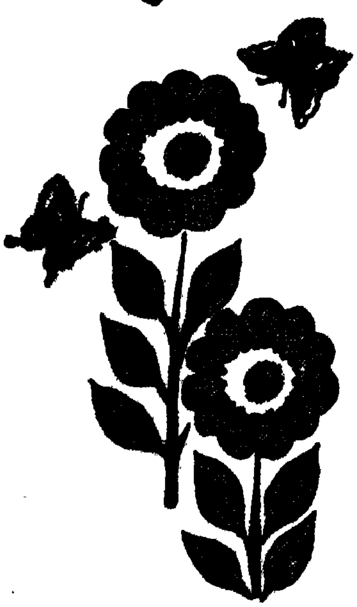


آپ کا انمول بچّہ

آپ کا پیارا بچہ۔
آپ اُس کی خواہش پوری کرنے کے لئے آسمان کے تارے بھی
توڑ کر لانے کو تیار ہیں۔
لیکن اگر آپ کے بچے زیادہ ہوں تو کیا آپ اُن کی
خواہشوں اور ضرورتوں کو پورا کر سکیں گے ؟

دوسرا بچّہ تین سال بعد

اپنے قریب کے فیملی ویلفیئر پلاننگ سینٹر سے
صلاح لیجئے۔





کو مجبوراً ان کا ہتھیار بننا پڑتا ہے۔ اس سال شروع سے ہی حالات خراب ہو گئے تھے۔ کچھ لوگوں نے بسوں کو نشانہ بنایا ـــــ جس کے سبب، بس سروس اور بھی خراب ہو گئی۔ جو مانگیں پُرامن طریقے پر منوائی جا سکتی ہوں، ان کے لئے اتنا طوفان اٹھانا، کوئی ضروری نہیں تھا۔ لیکن طلبا کے ان لیڈروں کو طلبا کے مسائل سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے اپنے مطالبات منوانے کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ سب کی لکھائی پڑھائی بند ہو جائے۔ ہمارا تعلیمی سال خراب ہو گا، اور ان سیاست دانوں کا کچھ بھی نہ بگڑے گا۔"

پولیٹکل سائنس (آنرز) کی طالبہ کماری عامرہ فیروز نے یونی ورسٹی کی موجودہ صورت حال کو ملک کے تمام نوجوانوں اور طلبا کے لئے ایک خطرہ قرار دیتے ہوئے بتایا ـــــ :

"بہت سے طلبا کو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ ان کے وہ کون سے مطالبات ہیں جن کے لئے وہ یونیورسٹی



کا ماحول بگاڑے بیٹھے ہیں:

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملک کی رجعت پرست طاقتیں، طلبا کو ورغلانے اور اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنے میں مصروف ہیں۔ ودیارتھی پریشد کی کارگزاریوں سے اس کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ یہ صورت حال صرف دہلی یونی ورسٹی کے لئے ہی نہیں بلکہ تمام ملک کے طلبا کے لئے ایک خطرہ ہے۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ طلبا کے تعلیمی نقصان کو محسوس نہ کرتے ہوئے، ان حلقوں نے طلبا کے مفاد کے مطابق کسی نتیجے پر پہنچنے کی بجائے اندولن جاری رکھنے کا تہیہ کیا ہوا ہے۔

ایم۔ اے پولیٹکل سائنس کے ایک اور طالب علم اعجاز حسن نے کہا ـــــ

"یہ تمام ہنگامے طلبا میں گھس آنے والے سیاسی غنڈوں کی جانب سے کئے گئے ہیں۔ کچھ سیاسی حلقے دو طرح اپنا مطلب نکالنا چاہتے ہیں ـــــ ایک تو بدنظمی کی فضا پیدا کر کے یونی ورسٹی کے ذمہ داران کو غیر موثر بنانے کی کوشش، اور دوسرے ابتدا سے ہی نوجوانوں



میں اور طلبا میں اپنے لئے جگہ حاصل کرنے کی جستجو ـــــ حقیقت تو یہ ہے کہ طلبا کے جو مطالبات ہیں وہ اتنے ناگزیر نہیں ہیں۔ یونی ورسٹی کے طلبا کی پوری تعداد کو سماج کے ذمہ دار حلقوں اور طلبا کے خاندانوں کو اس صورت حال کا جائزہ لینا چاہیئے۔ اور خود طلبا میں یہ احساس پیدا ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی تعلیم اور تعلیمی معیار کی ضروریات پر غور کریں ـــــ اور خود کو سیاسی حلقوں کا آلۂ کار نہ بننے دیں۔"

یونی ورسٹی کیمپس میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کیفے، لائبریری، اور سڑک پر کہیں ایک آدھ چہرہ نظر آ رہا تھا۔ ایک ماہ سے زیادہ عرصہ ہونے والا ہے کہ موریس نگر میں بسوں کی آمد و رفت بند پڑی ہے۔

موریس نگر کے بس اسٹاپ پر ایک دوست نظر آئے جو لیکچرار ہیں۔ میں نے ان سے کہا ـــــ

"مزے تو آپ لوگوں کے ہیں، مفت کی تنخواہ کھا رہے ہیں۔"

انھوں نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ کچھ دیر بعد سیاست پر بحث شروع کر دی۔ اس گفتگو میں بہت سی باتوں کی وضاحت ہو گئی۔ ان کا کہنا تھا ـــــ کیمپس کے کئی کالج ہیں جن میں ہندو کالج، ہنس راج کالج اور رام جس کالج خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کالجوں میں اسٹوڈینٹ یونین کے چناؤ کے موقع پر کئی اساتذہ نے ودیارتھی پریشد کی تحریک چلائی۔ یہ وہ لوگ ہیں جن میں سے بیشتر کسی نہ کسی روپ میں آر۔ ایس۔ ایس سے وابستہ ہیں۔ انہی رجعت پسند حلقوں کی وجہ سے ڈاکٹر راج کو استعفےٰ دینا پڑا تھا۔ اب چونکہ ودیارتھی پریشد کا یونین پر تسلط ہے، اس لئے یہ بات قرین قیاس ہے کہ طلبا کے اندولن کی رہ نمائی جن سنگھ کر رہی ہے۔"

میرے پاس ان باتوں کا کوئی جواب نہ تھا۔ آخر ان حقائق کو کس طرح رد کیا جا سکتا ہے؟ جو شواہد کے مطابق بالکل صحیح ہیں۔

ڈاکٹر گوپال راٹھور ایک کالج میں پڑھاتے ہیں ان سے اس آندولن کے بارے میں تفصیل سے بات چیت ہوئی۔ انھوں نے بتایا ـــــ

"جو لوگ ودیارتھی پریشد سے واقف ہیں انھیں یہ بات بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ لوگ جمہوری طریقہ کار کے نام پر کس طرح اہم مسائل کو رد کرتے ہوئے نئے مسائل پیدا کرنے میں ماہر ہیں۔ جو صورت حال آج پیدا کی گئی ہے، اس کے لئے ٹیچرس کی ہڑتال کے وقت سے کوشش کی جا رہی تھی۔ لیکن اس وقت ان کے ہاتھ میں طاقت نہیں تھی، اس لئے ناکام رہے۔ اسٹوڈینٹ

یونین کے چناؤ میں کامیاب ہو جانے کے بعد انھیں حلقوں



نے انتشار اور بدنظمی پھیلانے کی کوشش کی۔ یونین کے چناؤ میں براہ راست ووٹنگ کے مطالبے کو بالائے طاق رکھ دیا۔ اور اس طرح صورت حال کو بگاڑنے کے جتن شروع کر دیئے۔ دہلی انجینئرنگ کالج کے مسئلے کو لیکچرس کونسل نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ تو انہی حلقوں نے معاملے کو الجھانے کی کوششیں کیں۔ ظاہر ہے اس کے بعد توڑ جوڑ کی کارروائیوں میں باہر کے وہ لوگ بھی شامل ہو گئے، جن کا تعلق جن سنگھ سے ہے۔ ودیارتھی پریشد میں ان خاندانوں سے تعلق رکھنے والے لڑکوں کا تسلط ہے جو رجعت پرست ہیں، اور اپنے مقاصد کے لئے یہ سب کام کرتے ہیں۔ یہ لوگ نجی اداروں کی نگرانی میں چلنے والے کالجوں کو یونی ورسٹی کے ماتحت کئے جانے کی مانگ نہیں کرتے۔ کیونکہ ایسے کالجوں سے خود ان کے اپنے مقاصد وابستہ ہیں۔ اگر ٹیچروں نے اپنا اندولن ختم نہ کیا ہوتا تو اسی وقت صورت حال خراب ہو جاتی، اور اس کا الزام اساتذہ پر منڈھ دیا جاتا۔ چند جن سنگھی ٹیچروں نے ٹیچروں کی ہڑتال واپس لئے جانے کے اعلان پر اسی لئے غم و غصہ کا اظہار کیا تھا، کیونکہ یہ موقع ان کے ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ یہی جن سنگھی ٹیچر تھے جنھوں نے اساتذہ کی نئی یونین بنانے کے لئے اسی وقت سے کوششیں شروع کیں تاکہ اپنے مزاج اور مقاصد کے مطابق تحریک چلا سکیں جہاں تک اساتذہ کی یونین اور اس کے نقطۂ نظر کا سوال ہے یہ یونین، جن سنگھ کے سماج دشمن منصوبوں کی کبھی ہمنوا نہیں ہو سکتی۔ اسی بات کا اندازہ کر لینے کے بعد پھوٹ ڈالنے کی کوششیں شروع ہوئیں۔"

دیال سنگھ کالج کے استاد ڈاکٹر کرشن بہاری مشر نے یونی ورسٹی کی موجودہ صورت حال کے بارے میں کہا:۔

"اس بات کو ہر شخص جانتا ہے کہ ٹیچر فورم اور ودیارتھی پریشد کا جن سنگھ سے تعلق ہے۔ انھیں جن سنگھ کی جانب سے احکامات دیئے جاتے ہیں اور ان پر یہ عمل کرتے ہیں۔ موجودہ حالات کو پیدا کرنے کے لئے درپردہ تیاریاں کی گئیں۔ اکیڈمک کونسل میں جن سنگھی اساتذہ نے اپنے مقاصد کے مطابق کارروائی کی۔ انجینئرنگ کالج کو آلۂ کار بنا کر صورت حال جان بوجھ کر بگاڑی گئی۔ جن سنگھ نے اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لئے اس طرح کے مسائل پیدا کئے۔ ——— دہلی پرشاسن اور مرکزی حکومت کے خلاف ہنگامہ کرنے کے لئے ودیارتھی پریشد نے جن سنگھ کے اشارے پر یونی ورسٹی کو نشانہ بنایا۔

ان تمام لوگوں سے ملاقات اور گفت و شنید کے بعد میں یونی ورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر سروپ سنگھ سے ان کی قیام گاہ پر ملاقات کے لئے پہنچا۔ میں نے انھیں اپنے مقصد سے باخبر کیا۔ ڈاکٹر صاحب کسی سیاسی نوعیت کے سوال کا جواب دینے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ یونیورسٹی کے واقعات کے بارے میں انھوں نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ———

"کچھ عرصے سے طلبا کے مطالبات کے نام پر یونیورسٹی کو بہت سے مسائل سے دوچار ہونا پڑا ہے کچھ باتیں تو ایسی ہیں، جو یونیورسٹی کے ذمہ داران اور ان کے حلقۂ اختیار سے باہر ہیں۔ مثال کے لئے راجدھانی میں ٹرانسپورٹ کا مسئلہ ہے جس سے طلبا کو دشواریاں پیش آ رہی ہیں۔

یونی ورسٹی میں اس کے لئے اندولن اور مظاہروں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ لیکن پر امن احتجاج کبھی نہیں کیا جاتا۔ ۱۴ر نومبر کو دوپہر بعد اور ۱۵ر نومبر کی شام کو یونیورسٹی کے دفاتر پر حملہ کیا گیا۔ اس وقت پولیس کا ایک بھی کرم چاری وہاں نہیں تھا۔ اس وقت کے حملے کو کیا کہا جائے؟ کیا یہ پر امن مظاہرہ تھا؟ اس وقت پولیس بھی موجود نہیں تھی کہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ پولیس کو دیکھ کر طلبا مشتعل ہو گئے۔ مجھے یقین ہے کہ اس بات سے کوئی بھی انکار نہیں کرے گا کہ تشدد کے ماحول میں یونی ورسٹی کو صحیح طور پر چلایا جانا ممکن نہیں ہے۔ جب تک سختی کے ساتھ تشدد کی کارروائیوں کو ختم نہیں کیا جائے گا اس وقت تک یونی ورسٹی میں اکیڈمک ماحول کا برقرار رہنا ممکن نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہمیں ان طلبا کو معطل کرنے کے احکامات جاری کرنے پڑے۔ جن پر ۱۴ر اور ۱۵ر نومبر کی تشدد آمیز کارروائیوں کی ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ میں نے جودھپور یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر، پروفیسر وی۔ وی۔ جان۔ یونی ورسٹی کے صلاح کار، پروفیسر جے۔ پی ایس۔ اوبرائے اور لا فیکلٹی کے ڈین کے۔ بی۔ رستوگی کی ایک کمیٹی مقرر کی تھی۔ جسے ان طلبا پر عائد ہونے والے الزامات کی جانچ کا کام سونپا گیا تھا۔ صرف ایک طالب علم نے وجہ بتاؤ نوٹس کا جواب دیا۔ جب کہ باقی طلبا نے وائس چانسلر کی جانب سے ان کے خلاف کی جانے والی کارروائی کو چیلنج کیا۔

کچھ لوگ طلبا کی معطلی کے احکامات واپس لینے کی مانگ کر رہے ہیں۔ لیکن یہ لوگ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ اس سے یونی ورسٹی کے عام ماحول پر مستقبل میں بہت بُرا اثر پڑے گا۔ یونی ورسٹی جن ہنگامہ خیزیوں کا محور بن گئی تھی۔ اُس صورت حال کو کوئی بھی وائس چانسلر برداشت نہیں کر سکے گا۔ اگر ایسے حالات میں وہ کوئی کارروائی نہیں کرتا تو اس کا مطلب ہے کہ وہ اپنے مقاصد اور ذمہ داری سے چشم پوشی کر رہا ہے۔"

میں اس بات کو پوری طرح واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر معطل ہونے والے طلبا یہ محسوس کرتے ہیں کہ اصولی بنیادوں پر ان کے مسئلے پر دوبارہ غور ہونا چاہیئے تو وہ یونی ورسٹی کے ذمہ داران کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کر سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یونی ورسٹی کے ذمہ دار اراکین ان کے معاملے پر ہمدردانہ غور و فکر کریں گے۔

کتابوں کی یادیں

رنگِ گل ——— عظمت عبدالقیوم

ناشر شالیمار پبلیکیشنز حیدرآباد قیمت چھ روپے

پاکیزگیٔ بیان عظمت کی خصوصیت ہے

'رنگ گل' محترمہ عظمت عبدالقیوم کا دوسرا مجموعۂ کلام ہے۔ اس سے قبل ان کا پہلا مجموعۂ کلام زرِ گل کے نام سے ۶۴ء میں شائع ہو چکا ہے جو ادبی حلقوں میں کافی مقبول ہوا تھا۔ زیرِ نظر مجموعہ کے ۳۱ صفحات زرِ گل کے بارے میں ناقدین اور شعرا کی رایوں پر مشتمل ہیں جس میں نیاز فتحپوری سے لے کر ڈاکٹر وزیر آغا تک شامل ہیں۔ عبدالقادر سروری صاحب نے زرِ گل پر رائے دیتے ہوئے عظمت صاحبہ کی اس خود اعتمادی کو سراہا تھا جس کے تحت اس میں مقدمہ یا تعارف کی رسم اٹھا دی گئی تھی۔ لیکن زیرِ نظر مجموعے میں ان تمام رایوں اور تبصروں کو کیوں شامل کر دیا گیا یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ آتی رائیں کچھ غیر ضروری معلوم ہوتی ہیں بصوصیت کے ساتھ معاصرات سپاس گزاری کے طور پر خط شامل کیا گیا ہے وہ مجموعے میں بالکل بے جوڑ معلوم ہوتا ہے۔

جہاں تک عظمت صاحبہ کی شاعری کا تعلق ہے اس میں روایتی خصوصیات کے ساتھ ایک خاص قسم کی پاکیزگی ہے۔ وہ بنیادی طور پر غزل کی شاعر ہیں۔ غزل اپنے موضوع اور بیان کے لحاظ سے بڑی نازک صنف سخن ہے خصوصیت کے ساتھ ایک خاتون کے لئے اس کی راہ کافی دشوار ہے۔ عاشقانہ مضامین، حادثات دل کا تذکرہ، غم جاناں کی حکایت، یا کاکل و رخسار اور بادہ و ساغر کے پردے میں زندگی اور غم دوراں کا بیان ایک خاتون کے قلم سے بڑی احتیاط کا

عظمت کی دو غزلیں

کوئی منزل نہ کوئی جادہ ہے
اے غم دہر کیا ارادہ ہے
تیری فردوس سے بھی اے واعظ
ظرف میکش کہیں کشادہ ہے
عہد حاضر میں اعتبارِ وفا
آرزو کا فریب سادہ ہے
صبح کے جسم پر بہاروں کا
ایک رنگین سا لبادہ ہے
اب زمانے سے اور کیا مانگوں
دولتِ غم بہت زیادہ ہے
منزلِ مہرو ماہ تو گزری
اے جنوں اور کیا ارادہ ہے
آج بھی ہے مجھے خوشی عظمت
آج بھی غم مرا زیادہ ہے

ہر حادثے میں خواب ہنر ڈھونڈتے رہو
کوئی چراغ راہ گزر ڈھونڈتے رہو
اک اک ورق الٹ کے شب انتظار کا
نام تجلیات سحر ڈھونڈتے رہو
مانگو کسی خیال سے پھولوں کا بانکپن
دل کے قریب کوئی نظر ڈھونڈتے رہو
یوں ہی مزاج اہل وفا پوچھتے چلو
یوں ہی خلوص دیدۂ تر ڈھونڈتے رہو
تاریکیاں ہزار سہی خندہ زن مگر
تاریکیوں میں شمس و قمر ڈھونڈتے رہو
جس کی نظر میں ہو کوئی منزل نہ راستہ
ایسا کوئی مذاق سفر ڈھونڈتے رہو
عظمت جو بار بار ملی اور بچھڑ گئی
وہ روشنیٔ قلب و نظر ڈھونڈتے رہو

مطالبہ کرتا ہے ذرا سی لغزش یا بیان کی بے باکی ابتذال کا الزام لگا سکتی ہے لیکن عظمت صاحبہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ انھوں نے غزل جیسی کافر صنف کو اپنانے کے باوجود اس الزام سے اپنے دامن کو بچائے رکھا ہے۔ ان کی غزلوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے ہر موضوع پر شعر کہے ہیں۔ حادثہ، قلب و نظر کا ذکر ہو یا فراق کے کرب کی داستان، زندگی کی کج ادائی کا تذکرہ ہو یا غم حیات پر فتح پانے کا جذبہ، زندگی کو حسین تر دیکھنے کی خواہش ہو یا شکست اور غم سے اسے سنوارنے کی کوشش ہر موضوع کو انھوں نے بڑے ستھرے انداز اور سلیقے کے ساتھ نظم کیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

مانگو کسی خیال سے پھولوں کا بانکپن
دل کے قریب کوئی نظر ڈھونڈتے رہو

یوں ہی مزاج اہل وفا پوچھتے چلو
یوں ہی خلوص دیدۂ تر ڈھونڈتے رہو

تجربات غم سے عظمت کو ملا ہے شعور فن یہ انداز غزل
جب پھول کوئی کھلتا ہے یہاں بنتا ہے ترا ہی پیراہن
جب ساز کوئی بجتا ہے یہاں تیری ہی صدا ہو جاتی ہے
تجدید عہد شوق کی تمہید تو ہیں
ان کے لبوں پر اب ہے ملازم دیکھئے

عظمت صاحبہ کی غزلوں سے یہ چند منتخب اشعار ان کی شاعرانہ مہارت، مضامین پر ان کی گرفت اور ان کے پاکیزہ انداز بیان کو پیش کرنے کے لئے کافی ہیں۔ مجموعے کے آخر میں چند ناصحانہ نظمیں اور آصف ہفتم کے انتقال پر ایک مرثیہ شامل ہے۔ مجموعی طور پر محترمہ عظمت عبدالقیوم رنگ گل کی اشاعت پر مبارکباد کی مستحق ہیں۔ مجموعہ طباعت کاغذ اور جلد کے اعتبار سے بھی اچھا ہے۔

شارب ردولوی

پا بہ جولاں ——— صغرا مہدی

ناولستان۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

صغرا مہدی کا تعلق نئی نسل سے ہے۔ اس حقیقت سے ان کے ناول 'پا بہ جولاں' کا بہت گہرا تعلق ہے۔ کچھ اور

کہنے سے قبل میں اپنی بات کی وضاحت کے لئے یہاں ناول کے سلسلے میں ای ایم فورسٹر کے چند الفاظ نقل کرنا چاہتا ہوں:۔

"......if the novelist sees himself differently he will see his characters differen_tly and a new system of lighting will result."

ناول نگار نئی نسل کے اس طبقہ کی ایک فرد ہیں جو اپنے اور اپنے گرد و پیش کے مسائل کو ایک عصری زاویہ نگاہ سے دیکھتا ہے اور غالباً یہی وہ زاویہ نگاہ ہے جس کے لئے فورسٹر نے differently کا لفظ استعمال کیا ہے۔ زیر نظر ناول کا مرکزی کردار صہبا ہے جسے ناول نگار نے differently دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

'پابہ جولاں' ایک سماجی ناول ہے۔ لیکن 'سماجی ناول' ایک ایسی لوز ترکیب ہے جو نذیر احمد سے لے کر آج کے نئے سے نئے ناول کے بارے میں استعمال کی جا سکتی ہے۔ بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے ایک مخصوص ناول نگار کا بحیثیت ایک فرد کے سماج کی جانب کیا رویہ ہے۔ اسی رویہ کی بنا پر ہم مختلف قسم کے ناولوں میں امتیاز کرتے ہیں۔

آج کا ذی ہوش نوجوان شاید دو قسموں میں بٹا ہوا ہے۔ ایک قسم تو وہ ہے جو PROBLEMATIC INTELLECTUALISM کا شکار ہے اور دوسری قسم وہ ہے جو INTELLECTUAL PROBLEMS میں گرفتار ہے۔ پہلی قسم میں معدودے چند دیوانوں کا ہی نام لیا جا سکتا ہے اور دوسری قسم کے لوگوں میں جن کی فہرست خاصی طویل ہو سکتی ہے۔ صغرا مہدی کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔

ناول کا پلاٹ ہندوستان کے ایک مسلم گھرانے کے گرد گھومتا ہے۔ متوسط درجہ کے شریف گھرانوں کی طرح اس گھرانے کے بھی اپنے مسائل ہیں۔ میاں بیوی کی آپس کی نا چاقی اور ساس بہو کی باہمی عداوت نے خاندان کا شیرازہ بکھیر دیا ہے جس سے بچوں کی نفسیات پر بہت گہرا اثر پڑا ہے۔ ملک کے بدلتے ہوئے سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات میں ہر طرف ایک افراتفری مچی ہوئی ہے۔ کھوکھلی قسم کی خوشیوں کے پیچھے نوجوان دیوانہ وار وطن کو خیرباد کہہ کر غیر ممالک میں آباد ہو رہے ہیں۔ قدریں اور رشتے دم توڑ رہے ہیں۔ معاشرے کی اس بگڑتی ہوئی حالت میں بہت کچھ دخل اگلی نسل کے سفاکانہ رویہ کا بھی ہے۔ زندگی سطحیت کا شکار ہے اس کشاکش میں مسلم گھرانوں کی حالت کچھ زیادہ ہی ناگفتہ بہ ہے۔ پاکستان بہت سے پژمردہ اور مفلوک الحال مسلم گھرانوں کے سامنے ایک راہ فرار کی طرح موجود ہے جانے کب کون پاکستان چلا جائے اور اچھے خاصے خاندان کا شیرازہ بکھر جائے۔ ایک سیکولر سماج میں نئے ذہن کے لوگوں کے کچھ اور مطالبے بھی ہیں لیکن سماج سیکولر ہے تو کیا سماج والے تو سیکولر نہیں مگر ہر شخص یہ بات سوچتا بھی کب ہے اور جو سوچتا ہے وہی خود کو 'پابہ جولاں' محسوس کرتا ہے۔

ناول کا مرکزی کردار صہبا ہے جس کے ذریعہ ناول نگار نے مسائل کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ صہبا کے علاوہ باقی تمام کردار انتہائی مظلوم ہونے کے باوجود نقوا با کی طرح معصوم ہیں یا ممی آپا کی طرح غافل یا خالد کی طرح 'بکار خویش ہشیار'۔ ناول کا دوسرا اہم کردار صہبا کی سہیلی مدحو کا بھائی تبن ہے جو خود صہبا کے لئے ایک چیلنج بن کر سامنے آتا ہے یہ وہ Situation ہے جہاں پہنچ کر خود ناول نگار بھی PUZZLE ہے حتیٰ کر اسی CONFUSION میں ناول ختم ہو جاتا ہے۔

تکنک کے اعتبار سے شاید ہم صغرا مہدی کے ناول کو اپ ٹو ڈیٹ نہ کہہ سکیں لیکن اس میں شک نہیں کہ ناول کا CONTENT انتہائی ریچ ہے لیکن یہ کامپلمنٹ کیا کم ہے کہ اردو ناول کے باوا آدم نذیر احمد نے اپنے ناولوں کے ذریعہ جن قدروں پہ اصرار کیا تھا صغرا مہدی کی صہبا ان کے خلاف صریحاً جہاد کرتی نظر آتی ہے۔

بعض ناولوں کی خامی یہ ہوتی ہے کہ ناول نگار Situation کو اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے اور جہاں جیسے چاہتا ہے اسے ٹوِسٹ کر دیتا ہے۔ بعض اوقات پلاٹ کے بہت زیادہ مربوط ہونے سے بھی از خود ایسا ہو جاتا ہے۔ "پابہ جولاں" کا پلاٹ اس اعتبار سے مربوط نہیں ہے اور شاید اسی لئے ناول نگار کو ہر جگہ Situation کو اپنے ہاتھ میں نہیں لینا پڑا۔ البتہ کہیں کہیں ایسا ہوا بھی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ آل بی کے کردار کا جواز یہی ہے۔ آل بی کے ذریعہ ناول نگار نے خاندانی مسائل کی Situation کو جس طرح سنبھالا ہے وہ شاید دوسری طرح ممکن نہ تھا آل بی کا کردار یوں اہم ہو جاتا ہے کہ ان کے بغیر صہبا شاید اپنے مقاصد کو واضح نہ کر پاتی بلکہ اتی، ابا، ممی آپا اور خالد کے مسائل میں الجھ کر رہ جاتی۔

میں نے تبصرے کے شروع میں INTELLECTUAL PROBLEMS کا ذکر کیا تھا یہاں میں اسی سلسلے میں ناول کے چند اقتباسات درج کرنا چاہتا ہوں۔

"تم آج کل کے نوجوانوں سے بالکل مختلف ہو تم مجھے اپنا سایہ نہیں بناؤ گے۔ تمہارے ساتھ رہ کر میں اپنی شخصیت بنا سکوں گی، اپنی انفرادیت باقی رکھ سکوں گی۔"

"ہمارے ملک میں شادی کے سلسلے میں صاحب معاملہ کی حیثیت تو ثانوی ہوتی ہے اس کے علاوہ اس پر ماں باپ، روایات، مذہب، رسم و رواج کا پاس الگ ہوتا ہے۔"

"ہمارے نوجوانوں میں اس کا عام رجحان ہے کہ دوسرے ملکوں میں بس جاؤ اور ہر طرح کے مسائل سے فرار حاصل کرو چاہے وہ خاندانی ہوں یا ملکی۔"

"ان کا آئیڈیل تو نذیر احمد کی اصغری ہے اور وہ میں نہیں بن سکتی۔"

بحیثیت مجموعی ناول بہت خوب ہے زبان صاف شستہ اور رواں ہے طباعت کو مزید بہتر بنانے کی ضرورت تھی۔ ناول کے نام اور موضوع کے اعتبار سے گرد پوش کی تصویر میں کوئی مناسبت نظر نہیں آتی۔

نوناری اور سبھنی

فرقہ پرستی کے شکار

ہمارے خصوصی نامہ نگار کے قلم سے

گزشتہ ماہ ۱۵ر نومبر کو اعظم گڑھ ضلع کے ایک گاؤں نوناری میں فرقہ وارانہ فساد ہوا جس میں اقلیتی فرقے کے تقریباً ایک سو سات گھروں کو لوٹا گیا ـــــ پختہ مکانوں کو خاکستر کر دیا گیا۔ قیمتی سامان، روپے، زیورات، کپڑے اور اناج کے علاوہ فسادیوں نے مکانوں کے دروازے اور کھڑکیاں تک لوٹ لیں۔ تیار فصلوں کو بھی لوٹا گیا یا انھیں تباہ کر دیا گیا۔ لٹیروں نے مویشیوں پر بھی ہاتھ صاف کیا۔ اور بیل گاڑیوں یا کھیتی باڑی کے آلات جیسے وہ چیزیں جو وہ اپنے ساتھ نہ لے جا سکے۔ انھیں نذرِ آتش کر دیا۔ اس فساد کے سبب تقریباً ایک کروڑ کی ملکیت کا نقصان ہوا۔

نوناری کے اس فساد کے ستائیس دن بعد ۱۲ر دسمبر کو اعظم گڑھ ضلع کے ہی ایک دوسرے گاؤں سبھنی میں بھی اسی طرح کا واقعہ ہوا۔ یہاں بھی اقلیتی فرقے کے تقریباً ایک سو مکان لوٹے گئے اور ۳۴ کو آگ لگا دی گئی۔ گنجان آبادی کے سبب ہندوؤں کے بھی دو مکانات نذرِ آتش ہو گئے۔

ہمارے نامہ نگار نے ۲۴ر اور ۲۵ر دسمبر کو ان علاقوں کا دورہ کیا۔ اتنے دن گزر جانے کے باوجود بھی ان دو دور افتادہ دیہاتوں میں نارمل زندگی کے آثار نظر نہ آئے۔ سبھنی میں نوناری کے مقابلے میں کم ہنگامہ آرائی ہوئی۔ اس لئے کم سے کم اس دیہات میں حالات معمول پر اب تک آ جانے چاہیئے تھے۔ لیکن مقامی ایڈمنسٹریشن اور پی۔ اے۔ سی کی شرارت آمیز کارروائیوں کی وجہ سے ابھی تک صورت حال معمول پر نہیں آئی ہے۔ جہاں تک نوناری کا معاملہ ہے، وہاں اتنا بھیانک ہنگامہ ہوا ہے کہ ۴۰ دن بعد بھی یہ دیہات تباہی اور بربادی کی ویرانوں میں ترمرد پڑا ہوا ہے۔ قرب و جوار کے دوسرے دیہاتوں میں بھی کشیدگی موجود ہے ـــــ حالانکہ افسران وعدہ کر رہے ہیں کہ ان علاقوں میں پولیس گشت جاری ہے۔ اور حالات پوری طرح کنٹرول میں ہیں۔ لیکن جیسا کہ ایک مقامی سیاسی کارکن نے بتایا، پورا اعظم گڑھ ضلع کشیدگی اور تناؤ کے ایک آتش فشاں سے دوچار ہے اور کسی بھی وقت یہ لاوا پھٹ سکتا ہے۔ اور اقلیتی فرقے کا مالی اور جانی نقصان ہو سکتا ہے۔ بعض شرارت پسند اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کے لئے پوری کوشش کر رہے ہیں۔

تقسیم کے ہنگامہ خیز دور میں اعظم گڑھ میں فسادات نہیں ہوئے تھے۔ لیکن آزادی کے بعد یہ پرامن فضا برقرار نہیں رہی۔ خاص طور پر چھٹی اور ساتویں دہائی میں اعظم گڑھ کے دیہات میں فسادات کی وبا پھیلتی رہی۔ گزشتہ ایک سال کے دوران، سبھنی کا ہنگامہ اس نوعیت کا تیسرا ہنگامہ ہے، تاہم دیگر مقامات کے برعکس یہ ہنگامے مسلمانوں اور ہریجنوں کے درمیان ہوئے ہیں۔

اس کا ایک سبب یہ ہے کہ ملک کے دیگر علاقوں کی نسبت، اعظم گڑھ کا اقتصادی اور سماجی پس منظر مختلف ہے۔ یہاں کے سابق زمیندار اور متمول کسان، مسلمان ہیں ہندوؤں میں زمیندار اور مالدار لوگوں کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ چھوٹے کسانوں اور بے زمین مزدوروں کی بڑی تعداد ہریجنوں پر مشتمل ہے۔ جیسا کہ ایک کمیونسٹ کارکن کا بیان ہے "اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کا ایک طبقہ اس علاقے کے ہریجنوں اور کاشت کاروں کو فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا کرنے کے لئے اکساتا رہا ہے، اور انھیں مالدار مسلمانوں سے اپنے حقوق لینے کی تلقین کرتا رہتا ہے۔ یہی طبقاتی کشیدگی فرقہ وارانہ کشیدگی کا روپ اختیار کر گئی ہے۔"

ضلع اعظم گڑھ کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ یہاں کے دیہاتوں میں رہنے والے متمول اور متوسط طبقے کے مسلمان گھرانوں سے زیادہ تر لوگ روزگار کی خاطر ملیشیا، سنگاپور اور بمبئی وغیرہ چلے جاتے ہیں اور کچھ دولت کما کر اپنے دیہات واپس آتے ہیں۔ جہاں پکے مکانات بنا کر خوشگوار زندگی گزارنا شروع کر دیتے ہیں۔

چونکہ زیادہ تر مسلمان، زمیندار گھرانوں کے سبب یا ملایا سے کمائے ہوئے پیسے کے سبب آسودہ حال ہیں، اس لئے پولیس اور انتظامیہ کے افسران نے ان علاقوں کو اپنی شکارگاہ تصور کیا ہوا ہے۔ سرائے میر مبارک پور، تروا، مادھوبار اور اعظم گڑھ کے کسی کوتوالی یا پولیس اسٹیشن میں اپنے تبادلہ کے لئے بھاری رشوتیں دی جاتی ہیں۔

ہریجن، جو بہت زمانے سے پس ماندہ طبقہ میں شامل ہیں اور اعظم گڑھ کے مختلف علاقوں میں بے زمین مزدوروں کے طبقہ میں شامل ہیں، ان کا شدت کے ساتھ استحصال کیا جاتا رہا ہے اور وہ شدید نوعیت کے انسانی مصائب کا شکار ہیں۔ اب سے کچھ عرصہ پہلے تک انھیں ۳۰ یا ۴۰ پیسے روزانہ یا ۵۰۰ گرام اناج مزدوری ملتی تھی۔ ٹریڈ یونین کے طرز کی کچھ سرگرمیوں کے سبب اب اس طبقہ کی حالت کچھ بہتر ہوئی ہے۔ اور دو روپے یومیہ یا دو کلو اناج روزانہ کے حساب سے معاوضہ ملتا ہے۔

شمالی ہندوستان کے دیگر علاقوں کی طرح یہاں بھی زمینی جھگڑے بہت ہوتے ہیں۔ اور ان جھگڑوں کے سبب آئے دن ہنگامے اور قتل کی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں۔

سیاسی اعتبار سے یہاں کوئی سرگرمی نہیں ہے یہاں کے صاحبان اثر میں سیاست داں نہیں بلکہ وہ لوگ شامل ہیں جو طبقاتی بنیادوں پر یا تو ٹھاکر ہیں یا برہمن یا یادو یا ہریجن ـــــ یا پھر مسلمان۔ اس طرح کے سیاسی اور سماجی پس منظر نے دونوں فرقوں میں فرقہ پرست عناصر پیدا کر دیئے ہیں۔

نوناری، اعظم گڑھ سے ۳۵ کلو میٹر ہے۔ ۲۵۰ مکانوں میں سے ۱۱۹ مسلمانوں کے ہیں۔ اور باقی نچلے طبقے کے ہندوؤں کے ہیں۔ مسلمان خوش حال اور مالدار ہیں۔ ان کے رشتہ دار سنگاپور، ملایا اور بمبئی سے اپنے عزیزوں کو مالی امداد دیتے رہتے ہیں۔ ہندوؤں سے چھوت چھات برتی جاتی ہے اور وہ گاؤں کے باہر چمار ٹولی میں رہتے ہیں۔

رائے دہندگی اور گرام پنچایتوں کے الیکشن کے سبب سیاسی اور سماجی بیداری کی ایک لہر ہریجنوں میں

ہو رہا ہے۔ پچھلے بعد جب کافی ہو رہا تھا اور سیاست میں حصہ لیکر اپنا مضبوط گروہ بنا لیا ہے۔ ان کا لیڈر ایک بھاٹ سیتارام تھا جو کسی خاص سیاسی جماعت سے وابستگی کے بغیر مختلف جماعتوں اور لوگوں سے ہریجنوں کے لئے امداد حاصل کر لیتا تھا۔ نوناری میں اس نے مسلمانوں کے خلاف ایک تحریک قائم کر دی تھی۔ ایک بار ان ہریجن مزدوروں نے اپنی اجرت میں اضافے کے لئے ہڑتال کی، اور گزشتہ ایک سال سے ان لوگوں نے زمین مالکوں کا بائیکاٹ کیا ہوا تھا جن سنگھ جو جاگیردارانہ مزاج کی حامل ہے اور عام حالات میں مزدور دشمن رویہ رکھتی ہے ___ سیتارام کو مسلمانوں کے خلاف اس کے ایجی ٹیشن میں پوری طرح مدد کرتی رہی۔

گزشتہ مارچ میں ہریجنوں اور مسلمانوں کے درمیان ایک جھگڑا ہوا۔ پولیس نے ایک موقع پر جب کہ مسلمان مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے تقریباً ستر مسلمانوں کو گھیر لیا۔ سرِ عام ان کی بے عزتی کی۔ بھاٹ اور چماروں نے بھی پولیس کا ساتھ دیا۔ پولیس کو بھاری رقمیں دے کر چالیس کے قریب آدمیوں نے اپنی جان چھڑائی۔ باقی لوگوں کو ہتھکڑیاں ڈال کر سات میل دور پولیس اسٹیشن پہنچایا گیا۔ اس کیس میں پولیس نے ۱۳ افراد کے خلاف چارج شیٹ تیار کیا ___ اور اس واقعہ سے پولیس کے بارے میں اقلیتی فرقہ خوف اور غم و غصہ کا شکار ہو گیا۔

۱۴ نومبر کو نوناری میں ہریجن کلیان پریشد کی ایک میٹنگ بلائی گئی۔ جس میں باہر کے کچھ لیڈر بھی آنے والے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مسلمان مالکان زمین نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر سیتارام سے اپنا بدلہ لینا چاہا۔ سیتارام پر حملہ کر کے یا اسے مار کر یہ لوگ، مزدوروں پر اپنی برتری قائم کرنا چاہتے تھے۔ ۱۴ نومبر کی رات کو سیتارام پر حملہ ہوا۔ سیتارام اور اس کا بھائی بسنتو جو پشپا نگر انٹر کالج کا طالب علم تھا دونوں قتل کر دیئے گئے۔ صبح کے وقت گاؤں کے قریب لوگ جمع ہونے شروع ہو گئے۔ پشپا نگر سے کالج کے طلبا بھی نوناری پہنچ گئے۔ پھر تقریباً دس ہزار کا مجمع نوناری کی طرف بڑھنا شروع ہوا۔ آٹھ بجے کے قریب سرائے میر پولیس اسٹیشن پر اطلاع موصول ہوئی اور ساڑھے نو بجے پی اے سی کے آٹھ نوجوانوں اور پانچ کانسٹیبلوں پر مشتمل ایک پولیس پارٹی موقع پر پہنچ گئی۔ اس نے کیا کیا۔ یہ پوری طرح معلوم نہیں ہو سکا۔ گاؤں کے مسلمان، مجمع اور پولیس سے بچنے کے لئے گاؤں سے فرار ہو گئے۔ عورتیں بچے اور کچھ بوڑھے گاؤں میں دو مکانوں میں چھوڑ دیئے گئے۔ لوٹ مار اور آتش زنی کے واقعات کا سلسلہ صبح سے شام تک جاری رہا۔

حالات کے جائزے سے واضح ہوا کہ انتظامیہ پر غفلت برتنے کا الزام عاید ہوتا ہے۔ نیز ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا رویہ بھی خاص طور پر توجہ طلب ہے۔ کیونکہ مجسٹریٹ صاحب ہنگامے کے چھ دن بعد موقعۂ واردات پر پہنچے اور اس سے پہلے انہیں موقعۂ واردات پر پہنچنے کے لئے وقت نہیں مل سکا۔ نوناری میں چونکہ پہلے سے کشیدگی موجود تھی اس لئے پی۔ اے۔ سی کا ایک یونٹ وہاں مامور کیا گیا تھا۔ لیکن حیرت ناک بات ہے کہ ہنگامے سے تین دن پہلے اس یونٹ کو واپس بلا لیا گیا تھا۔ علاوہ ازیں پی اے سی کی فورس ہنگامے والے دن شام پانچ بجے نوناری پہنچی۔ جب کہ تمام دن لوٹ مار اور آتش زنی کے واقعات جاری رہے۔ بتایا جاتا ہے کہ ذمہ داران کو دوپہر سے پہلے ہی فساد کی اطلاع موصول ہو چکی تھی۔

اس وقت جب کہ نوناری آگ کے شعلوں میں گھرا ہوا تھا ضلع کے حکام ایک ریاستی وزیر کے خیر مقدم میں مصروف تھے۔ سرائے میر پولیس اسٹیشن کا جو انچارج صبح نوناری کے لئے روانہ ہوا تھا اسے دس ہزار کا مجمع دیکھ کر دل کا دورہ پڑ گیا اور فوراً اسپتال پہنچا دیا گیا۔ تاہم پولیس اسٹیشن کے روزنامچے میں جو اس شام اندراجات کئے گئے ان پر انچارج کے دستخط موجود ہیں۔ یہ واقعہ بھی حیرت انگیز ہے۔

سیتارام کے قتل میں تین مسلمان اور تین 'یادو' ہندوؤں کو شامل بنایا جاتا ہے۔ یہ بات سپرنٹنڈنٹ نے مسلم مجلس کے مسٹر حبیب احمد اور بی کے ڈی کے سیتارام دویدی کو ایک انٹرویو میں بتائی۔ اسی طرح کا ایک بیان راج نرائن نے بھی دیا ہے جنہوں نے سیتارام کی بیوی سے تحقیقات کی تھیں۔ تاہم ایف۔ آئی۔ آر میں صرف مسلمانوں کے نام ہی درج کئے گئے ہیں۔

اسی طرح بدعنوانیاں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں بھی کی گئی ہیں۔ خاص طور پر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے بیانات متضاد اور قابل اعتراض ہیں۔

بھنی، اعظم گڑھ سے ۲۷ میل کے فاصلے پر واقع ہے ۱۲۵ مکانات کے اس چھوٹے سے گاؤں میں تقریباً سو مکانات مسلمانوں کے ہیں اور باقی ہندوؤں کے۔ نوناری کے مقابلے میں بھنی کے مسلمان غریب ہیں اور ان کی آمدنی کے وسائل بھی محدود ہیں۔ گاؤں کا سب سے بڑا زمین مالک ٹھاکر رام بچن سنگھ ہے جس کے پاس تقریباً ۱۲۵ ایکڑ زمین ہے۔

۱۰ دسمبر کی شام کو گاؤں کے کچھ لڑکوں نے دوسرے گاؤں کی ایک برہمن لڑکی سے چھیڑ چھاڑ کی۔ تاہم لڑکی کو ایک ہندو لڑکے نے چھڑا لیا۔ اس ہندو لڑکے کو مارا پیٹا گیا۔ اس واقعہ کی اطلاع کے بعد گاؤں کے پردھان کی اطلاع کے مطابق پنچایت نے لڑکوں اور ان کے والدین کو سرزنش کی۔ بات اسی مرحلے پر ختم ہو سکتی تھی۔ لیکن ۱۱ دسمبر کو بھنی میں تحقیقات کے لئے پولیس پہنچ گئی۔ پولیس پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ اس نے ہندو لڑکی کی دست درازی سے متعلق کیس کے نام پر رشوت لینی چاہی۔ حالانکہ لڑکی اور اس کے باپ نے اس قسم کی کسی حرکت سے انکار کیا۔

اسی دوران میں فرقہ پرست عناصر نے افواہیں پھیلانی شروع کیں کہ نوناری میں مسلمانوں نے خود اپنے مکانوں کو آگ لگائی ہے۔ بھنی میں ایک ہندو لڑکی کی عصمت دری کی گئی ہے۔ اور ہندو لڑکے کو مسلمانوں نے پیٹا ہے۔ ان افواہوں کے ذریعہ فضا خراب کرنے کی کوششیں شروع ہوئیں۔

صبح کے وقت گاؤں کے قریب مجمع جمع ہونا شروع ہوا۔ پولیس کو اطلاع دی گئی۔ چھ کانسٹیبلوں اور ایک انسپکٹر پر مشتمل ایک پارٹی موقع پر پہنچ گئی۔ ضلع حکام کو واقعہ کی اطلاع نہیں دی گئی تھی۔ اور یہ مختصر سی پولیس پارٹی مجمع کو کنٹرول کرنے کے لئے ناکافی تھی۔ تاہم خود گاؤں والوں نے ٹھاکر رام بچن سنگھ کے ساتھ مل کر غنڈوں کا مقابلہ کیا۔ گاؤں کے ایک مسلمان مسٹر وکیل احمد نے اپنی بندوق سے غنڈوں کا مقابلہ کیا۔ ڈھائی بجے تک یہ ہنگامہ جاری رہا۔ پھر پی اے سی

(باقی صفحہ ۳۱)



این این پانڈے نے قومی ایکتا ٹرسٹ کے لئے وشنو آفسٹ پریس سے چھپوا کر شائع کیا
رجسٹرڈ آفس:- A-۱۹، تھیٹر کمیونی کیشن بلڈنگ، کناٹ سرکس، نئی دھلی۔ ایڈیٹر:- ڈی آر گوئل

سیکولر ڈیموکریسی

وقت کی قیمت

آج کے بیوپار میں

سب سے زیادہ ہے

وقت کے ساتھ ساتھ ہم نے آرڈر ملنے اور مال سپلائی کرنے کا وقفہ بہت کم کر دیا ہے۔ ایم۔ایم۔ٹی۔سی کو اس بات کا فخر ہے کہ اس نے دیش کی صنعتی ترقی میں اہم اور آسانی سے دستیاب نہ ہونے والی معدنیات جیسے تانبہ، جست، سیسہ، ٹن، نکل، المونیم، پیلیڈیم، پلاٹنیم، سٹین لیس اسٹیل وغیرہ امپورٹ کرکے اور سپلائی کرکے بہت اہم کامیابی حاصل کی ہے۔ ایم۔ایم۔ٹی۔سی کے ذریعہ اکسپورٹ میں بھی بہت ترقی ہوئی ہے۔ وزاگاپٹنم اور پرادیپ جیسی بڑی بندرگاہوں کو میکانکی بنایا گیا ہے۔ جس سے غیر ملکی گاہکوں کو معدنیات جلدی اور زیادہ تعداد میں سپلائی ہوسکا ہے۔

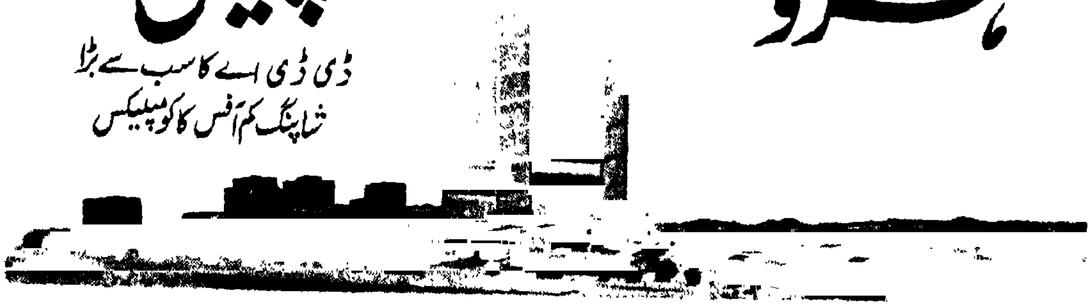
دی۔ایم۔ایم۔ٹی۔سی

ایکسپریس بلڈنگ، بہادر شاہ ظفر مارگ، نئی دہلی



نہرو پلیس

ڈی ڈی اے کا سب سے بڑا
شاپنگ کم آفس کامپلیکس



سینما پلاٹ اور دوسرے پلاٹوں کی فروخت

دوسرے دور میں پلاٹوں کی فروخت کے بعد ڈی۔ ڈی۔ اے ڈسٹرکٹ شاپنگ سینٹر ساؤتھ دہلی میں ایک سینما پلاٹ اور آٹھ کئی منزلہ پلاٹ نیلام کرنے کا اعلان کرنے میں خوشی محسوس کرتی ہے۔ نیلام ۱۳ فروری ۱۹۷۳ء کو ۱۱ بجے دہلی وکاس بھون، اندر پرستھ اسٹیٹ نئی دہلی میں ہوگا۔ اس اسکیم کی اہم خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

(الف) مقام

یہ ڈسٹرکٹ سینٹر آؤٹر رنگ روڈ (جسے چراغ دہلی، کالکا جی روڈ کہا جاتا ہے) اور کیلاش کالونی کو جانے والے لنک روڈ کے چوراہے پر واقع ہے۔ اس علاقے کے قریب کیلاش کالونی، گریٹر کیلاش کالکا جی، اور ڈی ڈی اے کی اسکیموں کے تحت سے والی بے شمار نئی کالونیاں ہیں۔

(ب) علاقہ

دکانوں اور دفتروں کے لئے ۱۰۱/۲۵ ہیکٹر ۱۰۱/۲۵ ہیکٹر کا ایک بہت بڑا ڈسٹرکٹ زمین ہے جس کی تفصیلات حسب ذیل ہے

I ۹۸ پلاٹ ایسے ہیں جس پر ڈی ڈی اے کے تعمیری کنٹرول کے ساتھ چار سے لیکر بیس منزل تک مکان بنائے جاسکتے ہیں۔

II تین سینما پلاٹ، ایک سینما گھر میں ایک ہزار سے لیکر بارہ سو تک آدمی بیٹھ سکتے ہیں۔

III ہوٹل کے لئے جگہیں ہیں۔

IV ورکشاپ، موٹر گیرج، فائر اسٹیشن اور دوسری اہم سروسیں۔ اور

V کلچرل کامپلیکس، کھلے تھیٹر، میوزم، لائبریریاں اور آرٹ گیلیریاں۔

(ج) قدرتی مناظر

اس تمام علاقے کو اور اس کے آس پاس کے علاقے کو بہت خوب صورت بنایا جائے گا۔ یہ کام شروع کر دیا گیا ہے۔ پارک ہوگا۔ ڈی۔ ڈی۔ اے جسے ایک باغ اور تفریحی مقام بنانے میں مصروف ہے۔

(د) گاڑی کھڑی کرنے کی جگہ

موجودہ اور آئندہ ضروریات کو پورا کرنے کے لئے گاڑیاں کھڑی کرنے کی جگہ کا انتظام مرکز میں کیا گیا ہے۔

(ر) فروخت

تیسرے دور میں ڈی۔ ڈی۔ اے کھلے نیلام کے ذریعہ ایک سینما پلاٹ اور آٹھ کئی منزلہ (۴ سے کر ۹ منزلہ تک) عمارتوں کے پلاٹ ۱۳ فروری ۱۹۷۳ء کو صبح گیارہ بجے فروخت کرے گی۔

ایک بلاک کے تمام پلاٹوں پر ڈی۔ ڈی اے خود کئی منزلہ شاپ کم آفس کومپلیکس بنا رہی ہے۔ اس کومپلیکس کا سنگ بنیاد ۱۳ نومبر ۱۹۷۲ء کو رکھا جا چکا ہے۔

پلاٹوں اور اسکیم کے بارے میں مکمل تفصیلات اس کتابچے میں ملاحظہ فرمائیں۔ جو دس روپے دے کر ڈی۔ ڈی۔ اے کے دفتر سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

(س) مشورہ

جن لوگوں نے کمرشل علاقوں میں پہلے پلاٹ خریدنے کے مواقع گنوا دیئے۔ اور آج کل رہائشی جگہوں، تجارتی مقاصد کے لئے استعمال کرکے ماسٹر پلان کی خلاف ورزی کر رہے ہیں انھیں مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھائیں۔

(جگ موہن)
(وائس چیئرمین)

DelHi
DEVELOPMENT AUTHORITY

Issued by Public Relation Manager
Adv. No. 461-H/72-73.

ماہنامہ

سیکولر ڈیموکریسی

فروری ۱۹۷۳ء

شمارہ ۱۵

ایڈیٹرز

سبھدرا جوشی

ڈی۔ آر۔ گوئل

خلیق انجم

جنرل منیجر

راجندر کمار

بزنس منیجر

جی۔ ایل۔ ملہوترا

دفتر کا پتہ

۱۹۔ اے۔ تھیٹر کمیونی کیشن بلڈنگ

کناٹ سرکس، نئی دہلی ۱

ٹیلیفون ۴۳۳۸۳

ہمارے نمائندے

- مسز کمل سانیال
  ۱۔ ڈوور روڈ کلکتہ
- شری ایم۔ این صدیقی
  نوبت ولا پلاٹ نمبر ۵۶۔۵۷
  جوہو ولے پارلے ہاؤسنگ سکیم
  نارتھ ساؤتھ روڈ نمبر ۱
  آف ارلا برج اندھیری (ویسٹ)
  بمبئی۔ ۵۸ (اے۔ ایس)
- شری روپ نرائن پانڈے
  ڈی۔ ۲۸، شانتی پتھ
  تلک نگر جے پور ۴
- شریمتی خدیجہ عالم خوندمیری
  ۱۱/۱۵۔ ۱۱۔ ۱۶، سلیم نگر
  حیدرآباد۔ ۳۶
- ڈاکٹر معین شاکر
  ڈیپارٹمنٹ آف پولیٹکل سائنس
  مرہٹواڑہ یونیورسٹی اورنگ آباد
- شری بی۔ این پانڈے
  ۱۴۸۔ آزاد سکوائر
  ساؤتھ ملکہ الہ آباد
- سردار سریندر سنگھ سندھو
  پی این ۲/۳۲۔ لاڈو والی روڈ جالندھر
- سردار اقبال سنگھ
  سیکٹر ۱۸۔ اے
  کوارٹر نمبر ۵۹۴ چنڈی گڑھ
- شری این۔ کے سنگھ
  کھادی گرام اُدیوگ سنگھ۔ مرادپور، پٹنہ ۴

اگلے شمارے میں

● مسلمانوں کی علیحدہ تنظیم کے تجربے

شرح

اہلِ وطن۔ ہوشیار!

گزشتہ دو تین برسوں میں جس تیزی کے ساتھ جن سنگھ نے اپنے نعرے بدلے ہیں سیاسی مبصروں کو گنتی رکھنی مشکل ہو رہی ہے۔ اس سے بھی زیادہ مشکل یہ ہے کہ جن سنگھ کے مختلف لیڈر مختلف باتیں کہتے ہیں۔ ان حالات کو دیکھ کر پنڈت جواہرلال نہرو کے وہ الفاظ یاد آتے ہیں جو انھوں نے گوروگولوالکر کے ایک خط کے جواب میں لکھے تھے انھوں نے کہا تھا کہ آر۔ایس۔ایس کے لیڈروں کے قول و فعل میں کوئی مطابقت نہیں ہوتی۔ یہ لوگ کہتے کچھ ہیں اور عمل کرتے ہیں اسکے قطعاً برعکس۔ لہٰذا ان کے ساتھ سنجیدگی سے معاملہ کرنا ناممکن ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ان لوگوں کی باتوں کا بھی خیال آتا ہے جو آر۔ایس۔ایس سے متعلق رہے ہیں اور ہیں اور جن سے وہاں ہونے والی سیاسی تربیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ لوگ اس پر یقین کرتے ہیں کہ سیاست میں اصول نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ ان کے خیال میں سیاسی سچ اور معمولی سچ دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ سیاست میں سچ اس بات کو ماننا چاہیئے جس سے حصولِ اقتدار میں مدد ملے۔ حقیقت وہ ہے جو پارٹی کی کامیابی کی ضمانت ہو۔ باقی سب جھوٹ۔

اسی ذہن کی عکاسی ہوتی ہے اس رول میں جو جن سنگھ ادا کر رہا ہے۔ جب آر۔ایس۔ایس کی قلعی کسی معاملے میں کھل جاتی ہے مثلاً جب ان کی کٹر فرقہ پرستی، مسلم دشمنی، ہریجن دشمنی، یا جمہوریت دشمنی کا مظاہرہ ہو جاتا ہے تو جن سنگھ کے لیڈر عوام میں آکر کہتے ہیں کہ ہمارا آر۔ایس۔ایس سے کوئی تعلق نہیں لیکن جونہی آر۔ایس۔ایس کے خلاف پارلیمنٹ یا پارلیمنٹ کے باہر کوئی تحریک ہوتی ہے تو یہی لوگ اس کے حق میں نبرد آزما ہو جاتے ہیں۔ آر۔ایس۔ایس کی پریڈوں میں شامل ہوتے ہیں۔ اٹل بہاری باجپئی جیسے یہی لوگ گوروگولوالکر کے آگے سر جھکاتے ہیں اور ان کے احکام بجالانے کے لئے کمربستہ رہتے ہیں۔

جب سے جن سنگھ پارٹی بنی ہے اس وقت سے خارجہ پالیسی پر اس کی نکتہ چینی یہ رہی کہ یہ غیر جانبدارانہ کیوں ہے۔ امریکہ پرست کیوں نہیں۔ جن سنگھ کے لیڈروں نے بارہا یہ بات دہرائی کہ ہندوستان اور امریکہ کو تو قدرتی طور پر دوست ہونا چاہیئے چین کے ساتھ ۱۹۶۲ء میں لڑائی ہوئی تو جن سنگھی دھواں دھار تقریریں کر رہے تھے کہ ہندوستان کو امریکی بلاک میں شامل ہونا چاہیئے۔ گوروگولوالکر بھی اپنا غیر سیاسی ثقافتی نقاب بالائے طاق رکھ کر دہلی کے میدانوں میں گرجنے لگے اور امریکہ کی دوستی کی تعریف کرنے لگے۔ اگر یہ لوگ سیاسی حالات سے مکمل ناواقفیت نہیں رکھتے تو ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ خود امریکہ بھی چین کے خلاف ہندوستان کی مدد کرنے کو تیار نہیں تھا لیکن یہ مدعی سست کے چست گواہ اپنے کام میں لگے ہوئے تھے کیونکہ اس سے ہندوستان کی صحیح پالیسی اور اسکے خالق جواہرلال نہرو کو بدنام کرنے میں مدد ملتی تھی۔ بار بار دہائی دی جاتی تھی کہ دنیا میں ہندوستان اکیلا پڑ گیا غیر جانبدارانہ پالیسی کی وجہ سے کوئی ہمارا دوست نہیں لیکن غیر جانبداری کو قائم رکھتے ہوئے بھی جب روس کے ساتھ دوستی کا معاہدہ ہو گیا اور ہندوستان کے دشمنوں کا پتہ پانی ہونے لگا تو یہی جن سنگھی غیر جانبداری کی لیلی کے قیس بن گئے۔

خارجہ پالیسی ہی کے سلسلے میں دوسرا کمال یہ ہوا کہ چین جس کے ساتھ جن سنگھ کی ازلی دشمنی تھی اور جہاں کی ہر چیز انکو اپنے خلاف اور اپنی دشمنی نظر آتی تھی جب امریکہ سے دوستی گانٹھنے لگا تو ان کو بھی اس میں خوبیاں نظر آنے لگیں۔

ان واقعات کو پیش کرنے سے ہمارا مقصد محض جن سنگھ کے سیاسی کردار اور ذہنیت کو اجاگر کرنا تھا کیونکہ حال ہی میں ان کے کچھ لیڈروں کے ایسے بیانات آئے ہیں جن سے رائے عامہ میں غلط فہمی کا امکان ہو سکتا ہے۔

اول تو آندھرا اور تلنگانہ کو الگ کرنے کا مسئلہ ہی لیجئے اپنی پیدائش سے ہی جن سنگھ اس بات کے خلاف تھی کہ زبانوں کی بنیاد پر ریاستوں کی تشکیل ہو۔ لسانی ریاستوں کے پیچھے جو جمہوری اصول اور احساس کار فرما تھا وہ جن سنگھ کیلئے قابلِ اعتنا نہیں تھا جن سنگھ تو ڈکٹیٹرانہ حکومت چاہتا تھا جس میں مرکز کی مرضی تمام ریاستوں اور علاقوں پر زبردستی ٹھونسی جائے۔ مضبوط مرکز کے نام سے جس پالیسی پر جن سنگھ کاربند تھا اسکے اندر جن کو یہ خوبی نظر آتی تھی کہ مرکز میں اقلیتی فرقوں کی نمائندگی مقابلتاً کم رہے گی اور جن سنگھ جس تہذیب و تمدن کا شیدائی ہے اسکے مطابق ہندو حکومت کے قیام کے امکانات زیادہ روشن رہیں گے۔ یہ نظریہ سراسر غیر جمہوری تھا اور اسے جمہوری طاقتوں نے مسترد کر دیا اس کے بعد چند سال پیشتر جب علیحدہ تلنگانہ کی تحریک چلی تو جن سنگھ اس کے خلاف رہی۔ گجرات اور مہاراشٹر کے معاملے میں بھی یہی رویہ تھا۔ پنجاب اور ہریانہ کو الگ کرنے کا معاملہ آیا تو جن سنگھی بہادروں نے پنجاب میں خون کی ندیاں بہانے کا تہیہ کر لیا اور چاندنی چوک میں سکھوں کی دکانیں جلانے سے گریز نہ کیا۔ ناگالینڈ کی علیحدہ ریاست بنائی گئی تو اسے لندن اسکول کی عیسائی پرستی سے تعبیر کیا۔ کیرل میں ملاپورم کا الگ ضلع ہی بنایا تو ملک بھر میں شور مچایا کہ ایک چھوٹا پاکستان بنا دیا گیا ہے۔ اب جو یکایک علیحدگی کی تحریک سے محبت اور وابستگی کا دورہ جن سنگھ کو پڑا ہے تو یہ خیال آنا لازمی ہے کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ ملک کے ان تمام لوگوں کا چاہے وہ علیحدہ ریاستیں بنانے کے حق میں ہوں یا خلاف۔ یہ فرض ہے کہ اس تبدیلی کے پیچھے کار فرما حرکت اور طاقت کو پہچاننے کی کوشش کریں۔

دوسرا مسئلہ ہے مسلم پرسنل لا کا۔ جن سنگھی مسلمانوں کو آج تک اس لئے گردن زدنی قرار دیتے رہے کہ وہ اپنا پرسنل لا الگ کیوں رکھتے ہیں۔ ہندوؤں کو بھڑکانے کی کوشش کرتے رہے کہ کانگریس سرکار مسلم پرستی کی وجہ سے مسلم پرسنل لا کو تبدیل نہیں کرتی لیکن گزشتہ چند مہینوں میں جب مسلمانوں کے اندر کچھ فرقہ پرور اور شر پسند عناصر نے خواہ مخواہ یہ افواہ پھیلانی شروع کی کہ پرسنل لا میں تبدیلی کی کوشش کی جا رہی ہیں تو انڈیا نا ٹیشن کے خالق گولوالکر صاحب نے پرسنل لا کے حق میں بیان دے دیا۔

تیسرا سوال لیجئے اردو کا۔ اردو کے ساتھ جو سلوک ہو رہا تھا اسکے متعلق سینکڑوں شکایتیں تھیں جن کو دور کرنے کیلئے جمہوریت نواز حلقوں میں تحریکیں چلیں۔ گورنمنٹ کی طرف سے ایک خصوصی کمیٹی وزیر اطلاعات کی صدارت میں بنائی گئی تاکہ اردو کو فروغ دینے کیلئے خاطر خواہ انتظامات کئے جا سکیں۔ جن سنگھ اردو کو ملک بدر کرنا چاہتی تھی۔ بہار میں جب جن سنگھ حکومت میں آیا تو اردو کو ثانوی زبان قرار دینے کی مانگ کی مخالفت کرتے ہوئے رانچی کا فساد برپا کیا۔ اردو کے حقوق مانگنے والوں کو گولوالکر صاحب اور ان کے چیلوں نے پاکستانی قرار دیا، سانپ کے بچے کہا اور اب اٹل بہاری صاحب فرماتے ہیں کہ اردو کو ثانوی زبان قرار دیا جائے۔

ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں یہ مصرعہ غالب کا ذہن میں آ جاتا ہے اور یہ بھی خیال آتا ہے کہ یو۔پی کے انتخابات سر پر ہیں۔ ہمارا یقین ہے کہ جمہوری ہندوستان اس بازیگری سے ہوشیار رہے گا۔

اک چراغ اور بجھا

غلام احمد فرقت کاکوری بھی چل بسے، اور وہ بھی، دیارِ غربت کی ایسی فضا میں، جہاں انھوں نے اپنے ان رفیقوں اور دوستوں کو نم دیدہ و غم دیدہ ہونے دیا۔ جن کو وہ ہمیشہ ہنساتے تھے ——

اپنے فن کو ابدی احساس بنا دینا، اور ہنسانے والوں کو، پہلی اور آخری بار افسردگی اور غم و اندوہ سے محفوظ رکھنا شاید ان کا آخری طنزیہ اظہار تھا —— ۱۲ جنوری کو جھریا کے ایک مشاعرے سے واپس ہوتے ہوئے، ریل کے تھرڈ کلاس کمپارٹمنٹ میں انھوں نے زندگی سے اپنا طنز انگیز رشتہ ختم کر دیا۔ سفر میں وہ تنہا تھے۔ اس لئے اجنبی ٹھہرے۔ پوسٹ مارٹم ہوا اور لاش کو ریلوے پولیس کے حکام نے بنارس کے ایک مسلم ادارے کے سپرد کر دیا۔ اس ادارے کے ذریعہ ہی ان کی تجہیز و تکفین کر دی گئی۔

بعد میں لوگوں کو معلوم ہوا کہ فرقت صاحب تھے۔ جو اکسٹھ برس کی عمر تک، احباب کی محفلوں میں، مشاعروں میں، طنز و مزاح کے ذریعہ ہمیشہ دوسروں کو ہنساتے رہے۔ کسی کو رُلانا انھوں نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ شاید اسی لئے آخری وقت اور آخری موقع پر انھوں نے، اپنے عزیزوں پرسانوں اور شناساؤں سے اجتناب کیا، اور عالمِ غربت میں ایک اجنبی بن کر آخرت کے سفر پر چل پڑے۔

فرقت صاحب کی وفات کا یہ اندوہ ناک ڈراما، حادثہ مجھے جارج اورویل کا ایک مقولہ یاد دلا رہا ہے۔ آرویل نے کہیں لکھا ہے: طنز نگار، ہمارے عہد میں، وہ پہلا اجنبی انسان ہے جس نے خود اپنی شخصیت کو فراموشی کے نقاب میں چھپا کر، دوسروں کے لئے ہنسی کے مواقع فراہم کئے ہیں۔ خود طنز نگار کی زندگی ایک المیہ مزاح (Tregi-Comedy) ہے۔ فرقت صاحب نے جس عالمِ اجنبیت میں اپنی زندگی کی نقاب کو اتارا ہے وہ بیک وقت ان کے فن کے لئے ایک نیا انکشاف بھی ہے اور ان کی شخصیت کا ایک المیہ پہلو بھی۔ انھوں نے زندگی کو اپنے طنز کا ہدف نہ بنایا۔ لیکن بالآخر زندگی کو ان پر طنز کرنے کا پہلا موقع میسر آگیا۔ فن —— اور خصوصاً طنز نگاری زندگی سے شدید کشاکش کا دوسرا نام ہے۔ اس کش مکش اور کشاکش میں فن تو نہیں، لیکن فن کار پر زندگی نے بڑے بھرپور طنز کے ساتھ قابو پایا۔



فرقت صاحب کو میں نے پہلی بار اس وقت دیکھا تھا، جب ان کی شخصیت بظاہر طنز و مزاح کا پتہ دینے والی نہیں تھی۔ اینگلو عربک اسکول کے صدر دروازے کے اوپر ایک چھوٹے سے کمرے میں وہ تاریخ کی کلاس کو پڑھاتے تھے۔ میری کلاس بھی برابر کے کمرے میں لگتی تھی۔ فرقت صاحب کی کلاس کے مختصر سے طلبا، بڑے احترام اور خاموشی کے ساتھ کلاس روم میں داخل ہوتے۔ اور فرقت صاحب، بے حد سنجیدگی، خاموشی اور انہماک کے ساتھ کلاس روم میں داخل ہوکر، دروازہ بند کر دیتے۔ کافی دن بعد مجھے معلوم ہوا کہ برابر کی یہ سنجیدہ طلبا اور سنجیدہ استاد والی کلاس دراصل فرقت صاحب کی ہے۔ جہاں وہ ہسٹری کے پیریڈ لیتے ہیں۔

مجھے بچپن سے ہی ادب کے مطالعے کا شوق تھا۔ فرقت صاحب کی کتاب ناروا کا پر زور تذکرہ میں نے کئی مضامین میں دیکھا تھا۔

اسکول میں میرا ان سے کوئی تعارف تو نہ ہوا، لیکن وہ جب بھی سامنے آجاتے، میں عقیدت و احترام کے ساتھ انھیں دیر تک دیکھتا رہتا اور اپنے دوستوں اور ہم جماعتوں کو ان کی ادبی شخصیت کے بارے میں بتایا کرتا تھا۔

۱۹۵۰ء کے بعد کا وہ زمانہ گزرا —— اینگلو عربک اسکول کے اس دور کے تقریباً دس سال بعد، میں نے فرقت صاحب کو مشاعروں میں دیکھا۔ وہ سنجیدہ اور بارعب شخصیت، جو پہلے صرف ایک طنز نگار کی تھی۔ اب مزاح نگار کا روپ اختیار کر چکی تھی۔ فرقت صاحب سے مشاعرے کے عوام جس طرح کے ہلکے پھلکے مزاح کے متقاضی تھے، انھیں اس کی تکمیل کرنی پڑتی تھی۔ لیکن رسائل میں شائع ہونے والے ان کے طنزیہ مضامین میں، اب بھی وہ نشتریت موجود تھی، جس سے فرقت صاحب کا عہد، سماج اور اس سماج میں غیر حقیقی

عوامل اور نا انصافیوں کے ایک وسیع و عریض سلسلہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

غالب کی صد سالہ یادگار کے موقع پر اجمیر میں ایک سیمینار اور مشاعرہ منعقد کیا گیا تھا۔ فرقت صاحب مشاعرے میں مدعو تھے، اور مجھے سیمینار میں شرکت کرنی تھی۔ فرقت صاحب کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے کا مجھے پہلی بار موقع ملا تھا کیونکہ ہم دونوں ہی ایک کمرے میں مقیم تھے۔ فرقت صاحب دمہ کے مریض تو تھے ہی، انھیں بے خوابی کی بھی شکایت تھی۔ رات کے وقت میں ایک کتاب لئے ہوئے لیٹا تھا۔ فرقت صاحب نے پوچھا "کیا پڑھ رہے ہو؟"

میں نے کہا "شیکسپیئر کا کنگ لیئر ہے۔ ایک نئے نقاد نے اسے مرتب کیا ہے۔ آج کے Perspective میں کنگ لیئر کے کرداروں کی تشریح کی ہے"۔

فرقت صاحب بہت زور سے ہنسے۔ میں نے تعجب کے ساتھ ان کی طرف دیکھا۔ کہنے لگے "اماں کنگ لیئر میں مجھے تو ایک ہی کردار ایسا معلوم ہوتا ہے، جسے آج کے پس منظر میں دیکھا جا سکتا ہے اور وہ ہے مسخرے کا"۔

میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی، لیکن انھوں نے اپنے بستر سے اٹھ کر کتاب میرے ہاتھ سے لے لی، اور بڑی دیر تک ورق گردانی کرتے رہے۔ پھر میرے پاس آئے اور ایک صفحہ پر انگلی رکھ کر کہا "اماں ذرا پڑھو ——— اور دیکھو مجھے تو یہ کردار خود اپنی زندگی سے بہت قریب نظر آتا ہے میں نے ایک بار کنگ لیئر پڑھا تھا۔ تب سے ہی اس مکالے کو زبانی یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں"۔

فرقت صاحب کے اصرار پر میں نے ان سطروں کو پڑھا۔ اور مسکرا کر کتاب کو بند کیا اور سرہانے رکھ کر لیٹ گیا۔

آج فرقت صاحب کے بارے میں لکھنے بیٹھا تو یہ واقعہ یاد آ گیا۔ کنگ لیئر کو اٹھا کر، وہ سطریں تلاش کیں جن کی جانب فرقت صاحب نے اجمیر میں اشارہ کیا تھا۔ کنگ لیئر کی ان سطور میں، لیئر، کنٹ اور مسخرے کے درمیان گفتگو ہو رہی ہے۔ کنٹ، لیئر کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ "عالی جاہ! یہ شخص مسخرہ نہیں ہے"۔

اس جملے پر مسخرے نے جو جواب دیا ہے اسی کی جانب فرقت صاحب نے اشارہ کیا تھا۔ اس جملے کا ترجمہ میں یہاں درج کر رہا ہوں۔

"مسخرہ! نہیں ——— سچ ہے امراء اور بڑے لوگ مجھے مسخرہ کب رہنے دیتے ہیں؟ اگر مجھے مسخرے پن کا اجارہ مل جائے تو وہ اس میں بھی حصہ چاہتے ہیں اور بیگمیں بھی ——— مجھ ہی کو سارے مسخرے پن کا مالک نہیں رہنے دیتیں۔ اس میں سے بھی خود اپنے لئے کچھ چھینے بغیر نہیں رہتیں"۔

کنگ لیئر کے اس مکالمہ میں خود فرقت صاحب کی اپنی فنی زندگی کے بعض حقائق موجود ہیں۔ مشاعروں کے سامعین نے، اور فرقت صاحب سے اپنے نام مزاحیہ خطوط لکھوانے والے بعض مدیروں نے ان سے طنز کی وہ نشتریت، وہ Wit چھین لینی چاہی جو ہنسانے سے زیادہ خون کے آنسو رلا سکتی تھی۔ تاہم بعض موضوعات پر ان کا قلم تلوار کی چمچماتی ہوئی دھار بنا رہا۔

اردو زبان اور تہذیبی قدروں کا زوال، ان کے وہ خاص موضوعات تھے، جن پر لکھتے ہوئے، وہ ہمیشہ اپنے مخصوص اور انفرادی طنزیہ اسلوب کو انتہائی برجستگی کے ساتھ استعمال کرتے رہے۔

اجمیر کے علاوہ رامپور، اور لکھنؤ میں بھی فرقت صاحب کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا موقع ملا۔ انھیں اپنی زندگی کی جفاکشی پر بڑا ناز تھا۔ بڑے فخر کے ساتھ بتاتے تھے کہ میں نے اخبار اور کتابیں بیچ کر، ٹیوشن پڑھا کر، اپنی زندگی بنائی ہے۔ صبح روزانہ ٹھنڈے پانی سے نصف گھنٹے تک غسل کرتا ہوں۔ برفانی ہواؤں اور سخت سردیوں میں بھی، میں ٹھنڈے پانی کے نلکے کے نیچے بیٹھ کر موسم سے انتقام لیا کرتا ہوں، شیو ہر روز بناتا ہوں۔ لیکن صابن کبھی استعمال نہیں کرتا۔

فن اور زندگی کو ایک دوسرے کا لازمی اور تکمیلی عنصر بنانے کے لئے انھوں نے صبر آزما حالات سے گزر کر، ایک ایسی روش کو اپنا لیا تھا جس میں بظاہر دوئی موجود نہیں تھی۔ لیکن زندگی اور فن کی وحدت کو قائم رکھنے کے لئے انھیں مسلسل ایک کش مکش سے دوچار رہنا

خلیق میاں!
کیا سیکولر ڈیماکریسی ہی کی محدود [illegible]
[illegible]
[illegible]
اور آپ کا مقدمہ ابھی پیش نہیں ہوا ہے۔
بہر صورت مجھے اسکا کوئی [illegible]
[illegible]
[illegible]
کیا نام [illegible] کوئی سیاسی آدمی ہی ہوگا۔
بہ کو پیار

پڑا۔ اس کش مکش کے نقوش ان کے طنزیہ مضامین میں بہت نمایاں ہیں۔ اپنی شعری تخلیقات میں، وہ اپنی فنی نقطۂ نظر سے زیادہ عوام کے مطالبات اور ان کی تسکین و تشفی کا سامان فراہم کرنے کی جستجو کرتے ہیں۔

اسے زبان و ادب کی عدم تربیت کہیئے یا عام پبلک کے مزاج کا ابتذال کہ مشاعروں میں، وہ اپنی پسند اور مزاج کی بجائے دوسری چیزیں سنایا کرتے تھے۔ اس قربانی کے باوجود فرقت صاحب جس طرح اجنبیت اور غربت کے عالم میں اپنے آخری سفر پر روانہ ہوئے۔ وہ واقعہ تمام اردو والوں کے لئے شدید ترین افسوس اور رنج و ندامت کا حامل ہے۔ ایک ایسا فن کار ——— ایک ایسا معلم ایک ایسا تہذیبی ناقد، جس نے اپنے فن کو زندگی کا تکمیلی عنصر بنایا، اپنی ضعیف العمری لاغری، دائم المریضی کے عالم میں، کم از کم ایسے معاشی مرحلے پر تو ہونا چاہیئے تھا کہ اس کے ساتھ موسم سرما کے ایک طویل سفر کے لئے ایک Escort میسر رہتا۔

بہر حال، اب تو عالم غربت کی یہ موت بھی فرقت صاحب کا ایک اور طنزیہ شاہکار بن گئی ہے ——— اب تو فرقت صاحب سوچ رہے ہوں گے کہ اللہ بڑا بادشاہ ہے ——— یا طنز نگار جس کا نام غلام احمد فرقت ہے۔

مسلم پرسنل لاء کنونشن

چند سوالات

ڈاکٹر عالم خوندمیری

پچھلے سال یعنی ۱۹۷۲ء، دسمبر کے آخری تاریخوں میں جو اجتماع "کل ہند مسلم پرسنل لا کنونشن" کے نام سے منعقد ہوا، اس کے بارے میں یہ طے کرنا مشکل ہے کہ وہ کہاں تک ایک مذہبی اجتماع تھا اور کس حد تک یہ کنونشن ایک خالص سیاسی اجتماع تھا؟ جب کبھی کسی "غیر عالم" نے مسلم پرسنل لا کے بارے میں گفتگو کی، علماء نے متفقہ طور پر آواز بلند کی کہ صرف علماء دینِ متین اور "وارثینِ انبیاء کرام" کو اس مسئلے پر رائے دینے کا حق ہے۔ لیکن اس اجتماع کی خصوصیت یہ تھی کہ معدودے چند معروف علما کے علاوہ کئی "غیر عالم" اور خالص سیاسی حیثیت رکھنے والے مخالف کانگریس مسلم زعماء اور "غیر جماعتی سیاسی قائدین" شریک تھے۔ بیشتر تقریریں ایسی تھیں جو تنظیمی کانگریس، سوا تنترا یا راج نرائن سوشلسٹ پارٹی کے پلیٹ فارم سے بھی کی جا سکتی تھیں۔ مثلاً مجلسِ تعمیرِ ملت کے نائب صدر نے فرمایا۔

"بنگلہ دیش کی فتح نے وزیر اعظم کو مغرور بنا دیا ہے وہ مسلم پرسنل لا کے مسئلے کو آسان سمجھتی ہیں۔ ہماری نگاہیں ہیں اور ان کے اقتدار کا نشہ ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی ہم نے گھور کر دیکھا کیسی کیسی ہستیوں کے ہوش اڑ گئے ...... ہندوستانی مسلمان ترائن اور پانی پت کی جنگ کو تازہ کر سکتے ہیں۔"

(رہنمائے دکن۔ ۳ جنوری ۷۳ء)

مجلس اتحاد المسلمین کے قائد نے فرمایا:۔

"...... وزیر اعظم، غریبی ہٹاؤ کا نعرہ لگاتی تھیں (؟) لیکن اب وہ مذہب ہٹاؤ کا نعرہ لگا رہی ہیں۔ اور ردِ عمل کے طور پر ہم اندرا ہٹاؤ کا نعرہ لگائیں گے (جس پر نعرۂ تکبیر بلند ہوا)۔"

(رہنمائے دکن۔ ۳ جنوری ۷۳ء)

آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے جنرل سکریٹری نے طرح لگاتے ہوئے ارشاد فرمایا:۔

"مسلمانوں سے چھیڑ چھاڑ کی یہ کوشش بہت پرانی ہے اور حکومت (Slow Poising) کے ذریعے ہمارے وجود کو خطرہ پہنچانا چاہتی ہے۔"

(رہنمائے دکن۔ ۳ جنوری ۷۳ء)

حیدرآباد کے ایک ممتاز واعظ مولانا حمید الدین عاقل کی گہرافشانی کا ایک نمونہ....

"جو لوگ مسلم پرسنل لا میں ترمیم چاہتے ہیں ان کی مثال کتوں کی سی ہے جو اپنے مالک سے تو حق وفا ادا کرتے ہیں لیکن دوسروں پر آوازیں لگاتے ہیں۔"

(رہنمائے دکن۔ ۳ جنوری ۷۳ء)

مولانا عتیق الرحمٰن صدر مسلم مجلس مشاورت نے انتباہ دیا کہ "پرسنل لا میں تبدیلی کی بات کرنے والے اسا مسلمانوں کے خلاف بغاوت کر رہے ہیں" (مولانا نصـ مجتہدی) رہنمائے دکن۔ ایضاً

یقین ہے کہ یہ مولانا صاحب 'بغاوت' کے سے بخوبی واقف ہیں۔

تقریباً تمام تقریروں کے ماحصل امور یہ۔ کہ (ایک) مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کا مشورہ اسلام۔

بھی حکومت کے خلاف اعلان جنگ کرتے ہوئے حکومت کو مشورہ دیا کہ "وہ اخلاق کی زبان سمجھے۔ حقائق کو محسوس کرے۔ اگر حکومت ہماری نرم اور شستہ زبان کو نہیں سمجھنا چاہتی تو ہم طاقت کی زبان سے سمجھائیں گے۔"

(رہنمائے دکن۔ ایضاً)

ایک غیر معروف مولانا نے اصلاح پسندوں کو

خلاف ہے۔ (دو) حکومت ہند کو کسی قسم کی تبدیلی کا اختیار نہیں ہے۔ (تین) جو لوگ مروجہ قانون یعنی شریعت ایکٹ ۱۹۳۷ء اور مسلم فسخ نکاح ایکٹ ۱۹۳۹ء میں ترمیم کا مشورہ دیتے ہیں وہ اسلام دشمن ہیں اور (چار) اسلام نے علماء کو ایک ادارے کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے۔

جذبات کی رو میں بہہ جانا آسان ہے اور دلیل

کے جواب میں طنز سے کام لینا مشکل نہیں، لیکن مسائل پر سنجیدگی سے غور کرنے والوں کو اس طرح خاموش نہیں کیا جاسکتا۔ اگر یہ بات صحیح ہے کہ مروجہ مسلم پرسنل لا اسلام کا جزلاینفک ہے تو یہ بھی ثابت کرنا ہوگا کہ طلاق کے مروجہ طریقہ، یعنی ایک ہی نشست میں تین مرتبہ طلاق کہہ دینا اور نکاح کی ذمہ داریوں سے گلوخلاصی حاصل کرلینا اسلام کا جزلاینفک ہے یا ایک سے زیادہ عورتوں سے

نکاح کرنے کی اجازت نہ صرف قطعی اور مطلق ہے بلکہ اسلام کی بنیادوں میں سے ایک ہے۔ یا پھر وراثت کے تمام تفصیلی قوانین جو رواج میں ہیں، آخری حکم رکھتے ہیں اور ان امور میں فقہا کا اختلاف اُمت کے لئے کبھی اور کسی منزل پر رہنمائی نہیں کرسکتا۔ جن افراد نے مختلف موقعوں پر مروجہ پرسنل لا میں ترمیم کا مشورہ دیا ہے۔ انھوں نے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہا کہ ان امور میں ترمیم کی گنجائش ہے مثلاً طلاق کا مروجہ طریقہ خود تاریخ کی پیداوار ہے۔ اسلام کا جزلاینفک نہیں۔ خود مسلم فسخ نکاح ایکٹ (۱۹۳۹) نے ہندوستانی اسلام کے مروجہ طریقوں کے برخلاف اور بعض صورتوں میں فقہ حنفی سے تجاوز کرتے ہوئے مسلم عورتوں کو چند حقوق عطا کروائے جو اس ملک میں رائج نہیں تھے اگر مسلم عورتوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے طلاق کے مروجہ طریقے پر پابندی عائد کرنے کا مشورہ خلافِ اسلام ہے تو اس کا آغاز خود اسلام کے خلاف کیوں نہیں تھا جب کہ تاریخ کے ایک خاص طریقے پر اس کی اجازت دی گئی۔ اگر قانونی تفریق (Legal Separation) کا طریقہ مروجہ طریقے کے اور مصالحت کی کوشش مروجہ رسم کے

مقابلے میں اخلاقی شعور کے تقاضوں کی تکمیل کرتا ہے قدرتی انصاف کے قریب تر ہے اور اسلام کے خلاف نہیں تو اس کی سفارش کرنے والے، اسلام دشمن کیسے ٹھہرے؟

اسی طرح یہ ثابت کرنا آسان نہیں کہ وہ تمام ادارے اور طریقے جنھیں اسلام نے جائز قرار دیا تھا۔ عملی طور پر ہمیشہ جاری رہتے ہیں۔ اعتذار پسند مصنفین کتنی ہی کوشش کریں، کہ اسلام نے غلامی کے ادارے کو ممنوع قرار دیا تھا سلف نے ایک مدت تک اسے جائز اور روا رکھا اور اسلامی سماج میں یہ ادارہ صدیوں تک برقرار رہا، لیکن آج نہ صرف عصری اخلاقی شعور، اس کے لئے یہ ناگوار ہے بلکہ قانوناً بھی کئی ملکوں میں یہ ادارہ ممنوع ہے۔ اگر علمائے کرام اور محافظِ اسلام، سیاسی رہنما، اسلام کے اصولوں سے وفادار ہیں تو انھیں اس ادارے پر قانونی امتناع کی مخالفت کرنی چاہیئے! یہ کہا جاسکتا ہے کہ غلامی کو روا تو

رکھا گیا تھا لیکن یہ اسلام کی آزادی پسند روح کے مغایر ہے۔ یہاں یہ عرض کرنا ہوگا کہ تعدد ازدواج کی اجازت کی بھی اسی طرح تعبیر کی جاسکتی ہے۔ سلف کا عمل نہ غلامی کے جواز کے لئے سند ہے اور نہ تعدد ازدواج کی 'حکمت' پر دلالت کرتا ہے۔ ہمارے علمائے کرام اور مسلم زعما، اس بات کو فراموش کرجاتے ہیں کہ جہاں زمانے اور تاریخ کی حرکت، واقعی فرائض اور واجبات کی تکمیل میں خارج نہیں ہوتی وہیں، مباحات اور جائز امور پر یہی حرکت اثر انداز ہوتی رہتی ہے۔ سماجی اور معاشی ادارے زماں بستہ ہوتے ہیں اور قیدِ مکان و قیام سے بے نیاز نہیں

رہتے۔ ایک اور مثال! اسلام نے وراثت کے چند خاص اصول مقرر کئے ہیں لیکن جاگیرداری دور میں زمین کی ملکیت پر وراثت کا قانون اثر انداز نہ ہوسکا، اس کا سبب انسانی سرشت کی خرابی نہیں تھی بلکہ زمین کی ملکیت کے چند لازمی اصول تھے، زمین کو تقسیم در تقسیم سے بچانے کے لئے بڑے لڑکے کی وراثت ہی ایک قابلِ عمل طریقہ تھا، سلف نے بھی اس کو روا رکھا۔ مروج قانون میں ترمیم کی خواہش کرنے والوں کی دلیل یہ ہے کہ اسلامی قوانین ہمیشہ حرکت پذیر رہے ہیں اور حرکت کا قانون آج بھی اسی طرح اہم ہے جیسا کہ اسلام کے اولین دور میں تھا، عقوبات اور معاملات کے قوانین میں ہمیشہ تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں اور اسلامی سماج نے ان تبدیلیوں کے خلاف بہت کم احتجاج کیا ہے۔ اسی طرح قوانین شخصیہ بھی مختلف فقہی مکاتب میں، مختلف ہیں اور ان میں مزید اختلاف کی گنجائش ہے۔ ایک تغیر پذیر سماج میں، مسلمان اپنے آپ کو تغیرات سے بے نیاز نہیں رکھ سکتے۔ ایک اشتراکی معاشرے کی تشکیل، معاملات کے پورے نظام کو بدل دے گی اور ایک ایسے نظام میں مسلمان شریعت سے صرف اخلاقی بصیرت حاصل کرسکیں گے، واقعی قانون سازی کا عمل، معاشی اور سماجی تقاضوں کا پابند ہوگا۔ آج کے دور میں مرد اور عورت کی مساوات، قانونی، سماجی اور اخلاقی مساوات ـــــ ایک مسلّم اصول بن گئی ہے، اسلامی سماج اس اصول سے انحراف نہیں کرسکتا، خصوصاً ایک کثیر مذاہبی سماج میں یہ بات مشکل ہے کہ مختلف گروہوں کے لئے مختلف اخلاقی اصولوں کی روشنی میں قانون سازی کی جائے۔ قوانین شخصیہ، اتنے شخصی نہیں ہیں کہ سماج اور ریاست ان کو اپنے دائرۂ عمل سے غیر متعلق قرار دے دیں، عقدِ نکاح، صرف ایک مذہبی رسم نہیں ہے بلکہ ایک سماجی فعل بھی ہے اور سماج کے مسلمہ اصولوں سے شادی کا ادارہ بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ پاکستان میں مولانا مودودی کی جماعت اسلامی نے اشتراکیت کے خلاف اس بنا پر احتجاج کیا تھا کہ اسلام نے انفرادی ملکیت کو جائز قرار دیا ہے لیکن صرف اس 'جواز' کی بنا پر ہندوستانی مسلمان، اشتراکیت کے قیام کے خلاف مزاحمت

کرنے میں حق بجانب قرار نہیں دیئے جاسکیں گے۔ کسی بھی "جائز امر پر قانونی پابندی" کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس شرعی طور پر جائز امر کو شرعی طور پر ناجائز امر قرار دیا جا رہا ہے بلکہ اس کا صرف یہ مطلب ہے کہ عصری سماجی تقاضوں کی روشنی میں اس جائز امر پر پابندی عائد کی جارہی ہے، عصری سماجی تقاضے ابدی نہیں ہوتے، اکثر صورتوں میں اخلاقی یا قانونی جواز صرف ایک "امکان" کی جانب اشارہ کرتا ہے۔

اب رہا یہ امر کہ ہندوستان کی پارلیمنٹ کو مسلم شخصی امور کی حد تک قانون سازی کا حق ہے یا نہیں۔ اس کا جواب تو یہ ہے کہ خود ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۹ء کے قوانین انگریزوں کے دور کی مجلس قانون ساز کے منظور کئے ہوئے ہیں اور اسی حکومت نے انہیں نافذ کیا تھا۔ مسلم وقف ایکٹ کو اسی پارلیمنٹ نے وضع کیا ہے۔ ایک مقتدر اعلیٰ پارلیمنٹ کے دائرۂ عمل سے کسی سماجی ادارے کو مستثنیٰ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ دستور نے عقیدے کی حد تک ریاست کو عدم مداخلت کا پابند کیا ہے۔ دنیوی امور اور سماجی ادارے (Secular affairs) جن کا تعلق مذہب سے بھی ہوسکتا ہے، پارلیمنٹ اور ریاست کے عمل سے آزاد نہیں رہ سکتے۔ عصری دنیا میں خاندان اور سماج کا ربط، بہ نسبت، پچھلی دنیا کے زیادہ گہرا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی مذہب خاص صورتوں میں یا عام حالات میں والدین کو اولاد کو سخت سزا دینے کی اجازت دے یا شوہروں کو بیویوں کو سزا دینے یا انہیں ان کی مرضی کے خلاف بند کر دینے کا مجاز قرار دے لیکن، سماج اور ریاست، ان حقوق کی مزاحمت کریں۔ یہ ناممکن ہے بدبختی سے مسلمانوں کے قانونی، سماجی اور سیاسی تصورات قرون وسطیٰ کی سماجی زندگی کے تقاضوں کے آفریدہ رہے ہیں، اور ایک مدت ہوئی کہ تخلیقی فکر کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ اس امر میں شک ہے کہ ہمارے علما، جن کی اکثریت ابھی تک قرون وسطیٰ کے تصورات میں اسیر ہے عصری تقاضوں کو سمجھنے میں کامیاب رہے گی۔ پارلیمنٹ کے حق اور اختیار کا مسئلہ ایک بہتر تخلیقی بصیرت کا مطالبہ کرتا ہے۔ مسلمانوں کو اس مسئلے پر اس انداز سے نہیں سوچنا چاہیئے کہ وہ ایک غیر مسلم سماج میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں بلکہ انہیں اس طرح سوچنا چاہیئے کہ وہ ایک آزاد اور جمہوری ریاست میں اقتدار میں برابر کے شریک ہیں۔ اس ملک میں مسلمانوں کا سیاسی، معاشی اور سماجی مستقبل، اسی تصور کے قائم و برقرار رہنے میں پوشیدہ ہے۔ کسی بھی پارلیمنٹ کا اقتدار اعلیٰ، اخلاقی اصولوں کے اقتدار کا مغائر نہیں ہوتا۔ مذہب، جو ایک وسیع تر اخلاقی ضمیر عطا کرتا ہے، پارلیمنٹ کا اقتدار اس ضمیر کی نفی نہیں کرتا بلکہ ایک جمہوری پارلیمنٹ، اس ضمیر کی واقعی عملی تکمیل کے اسباب فراہم کرتی ہے۔ کسی بھی مذہبی گروہ کے لئے پہلے طے کرنا ضروری ہے کہ اس کے مذہب (یا دین) نے کس قسم کے اخلاقی ضمیر کی نشاندہی کی ہے۔ مسلم پرسنل لا کے بارے میں ہندوستان کی جمہوری حکومت نے جس نوع کی احتیاط کا ثبوت دیا ہے وہ از خود اس امر کی شہادت ہے کہ یہ جمہوری حکومت، شہریوں کے اخلاقی ضمیر کی آزادانہ نشوونما کی آرزومند ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ کوئی گروہ اپنے افراد کے اخلاقی ضمیر کے نشوونما پر پابندی عاید کردے اور ایسی رکاوٹیں پیدا کردے جو افراد کو ایک ایسے اخلاقی اور قانونی نظام کا پابند کردیں جس کا راست تعلق اعلیٰ اصولوں سے نہیں بلکہ ایک خاص دور میں ان اعلیٰ اصولوں کی تعبیر اور ان کا عمل آوری سے تھا۔

اس کنونشن کا حاصل یہی تھا کہ چند علماء (اور خصوصاً جماعت اسلامی کے رہنما) اور غیر مذہبی، غیر فرقہ وارانہ جمہوری سیاست پر یقین نہ رکھنے والے سیاسی قائدین نے ایک متحدہ محاذ تشکیل دینے میں کامیابی حاصل کرلی۔ اب جمہوریت پسند مسلمانوں کے لئے فکری مسئلہ ہے کہ کیا یہ متحدہ محاذ ایک جمہوری اور غیر مذہبی ریاست میں کوئی معنویت رکھتا ہے

اگر علمائے کرام اپنے حقوق اور اختیارات کے بارے میں اس انداز سے سوچیں کہ جیسے انہیں یہ حقوق ابدی طور پر حاصل ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے دوسرے مذاہب کی عصری تاریخ سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ اسلام نے منظم کلیسا کا تصور تو پیش نہیں کیا لیکن عملاً ہمارے علما نے کلیسائی اقتدار حاصل کرلیا جب تک قرون وسطیٰ کی طرز کی حکومتیں قائم رہیں، علما کو قانون کی تعبیر کرنے والوں اور اس دور کے دستوری ڈھانچے میں قوانین کے نفاذ کے اختیارات رہے لیکن یہ تاریخی عمل تھا۔ ایک دینی یا مذہبی تقاضہ نہیں تھا۔ عصری پیچیدہ سماج میں یہ ممکن نہیں کہ علماء اپنے اس تاریخی حق پر اصرار کریں، خود عقیدے کی حد تک، علماء کا اثر کم ہوتا جارہا ہے اور تعلیم یافتہ طبقہ اکثر اپنی بصیرت کی روشنی میں، اپنے عقیدے کا تعین کرتا ہے۔ عصری ریاست کی معاشی اور سماجی تنظیم نے علماء کے دائرۂ اثر کو محدود کر دیا ہے اور اب صرف شخصی قوانین کی حد تک ان کے فتاویٰ کو اہمیت حاصل ہے۔ شاید علمائے کرام اس آخری شعبے پر اپنی گرفت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں اور اسی کو عام زبان میں "مفادِ حاصلہ" کا نام دیا جاتا ہے۔ ایک عام مسلمان، علما سے رائے لئے بغیر بیع و شریٰ کے کاروبار انجام دیتا ہے اور بینکوں اور انشورنس کمپنیوں سے استفادہ کرتا ہے، دیوانی مقدمات میں نئے دور کے وکلاء اور مصنفین کی آواز، علما کے مقابلے میں زیادہ اثر انداز ہوتی اور فیصلہ کن ہوتی ہے۔ سیاست میں علما تقریباً بے دخل ہوچکے تھے۔ یہ اندیشہ محض ایک وہم نہیں ہے کہ علماء، پرسنل لا کے نام پر اپنی سیاسی اور فکری گرفت کو مضبوط کرنا چاہتے ہیں اور اقلیت کے مفاد کے نام پر امت کا ایک "مفادِ حاصلہ" بنے رہنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

اس کنونشن کا حاصل یہی تھا کہ چند علماء (اور خصوصاً جماعت اسلامی کے رہنما) اور غیر مذہبی، غیر فرقہ وارانہ جمہوری سیاست پر یقین نہ رکھنے والے سیاسی قائدین نے ایک متحدہ محاذ تشکیل دینے میں کامیابی حاصل کرلی۔ اب جمہوریت پسند مسلمانوں کے لئے فکری مسئلہ ہے کہ کیا یہ متحدہ محاذ ایک جمہوری اور غیر مذہبی ریاست میں، کوئی معنویت رکھتا ہے؟

[redacted]

بمبئی کا مسلم پرسنل لا کنونشن

ایک معروضی جائزہ

عبداللطیف اعظمی

گزشتہ سال دسمبر کی آخری تاریخوں میں بمبئی میں مسلم پرسنل لا کے بارے میں ایک نام نہاد کنونیشن منعقد ہوا، جس کے بارے میں بڑے زور شور کے ساتھ دعویٰ کیا گیا ہے کہ آزاد ہندوستان میں اتنا عظیم اور کامیاب کنونیشن کبھی منعقد نہیں ہوا۔ میں نے ابھی ابھی اس کنونیشن کو "نام نہاد" کہا ہے میں نے اس لفظ کو اس معنی میں استعمال نہیں کیا ہے جس معنی میں فرقہ پرست مسلمان قوم پرور اور سیکولر مسلمانوں کے بارے میں استعمال کرتے ہیں، بلکہ اس کے حقیقی اور لغوی معنی میں استعمال کیا ہے، یعنی اس اجتماع میں جسے کنونیشن کے نام سے موسوم کیا گیا تھا، مسلم پرسنل لا کے تمام پہلوؤں پر علمی انداز میں بحث و گفتگو یعنی مذاکرے کا موقع نہیں دیا گیا۔ کچھ عرصہ پہلے اس مسئلے پر دارالعلوم دیوبند میں غور و خوض اور مختصر تبادلۂ خیال کے بعد ایک سوال نامہ جاری کیا گیا تھا اور قوم و ملک سے وعدہ کیا گیا تھا کہ اس سوال نامے کے جوابات مو ل ہونے کے بعد انھیں باقاعدہ مرتب کیا جائے گا اور پھر ایک بڑے اور نمایندے جلسے میں بحث و گفتگو کے بعد کوئی فیصلہ کیا جائے گا۔ مگر جب بمبئی میں کنونیشن منعقد کیا گیا تو پہلی کوشش یہ کی گئی کہ صرف انھیں لوگوں کو مدعو کیا جائے جو مسلم پرسنل لا میں ترمیم و تبدیلی کے حامی نہ ہوں۔ اور اگر کسی نے از خود ڈیلی گیٹ بننے کی کوشش کی تو پوری چھان بین کے بعد صرف انھیں کو ڈیلی گیٹ بنایا گیا جو مدعوئین کی مکمل تائید کر سکیں۔ دوسری کوشش یہ کی گئی کہ بجائے مسلم پرسنل لا پر بحث و گفتگو کے، ڈیلی گیٹوں کے سامنے صرف ایک تجویز رکھی جائے اور وہ تجویز بھی ایسی ہو کہ کوئی شخص اس کی مخالفت یا اس میں کوئی ترمیم پیش کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ مثلاً اصل مسئلے کی طرف سے لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لئے مسلم پرسنل لا کے بجائے بار بار شریعت یا احکام شرع اسلامی کے الفاظ استعمال کئے گئے۔ ظاہر ہے کون مسلمان شریعت میں کسی قسم کی تبدیلی کی حمایت و تائید کرے گا۔ جمعیۃ العلماء کے ایک اہم عالم دین سے جو دارالعلوم دیوبند کے جلسے میں شریک تھے۔ میں نے دریافت کیا کہ آیا وہ بمبئی جا رہے ہیں یا نہیں۔ اور جب انھوں نے اثبات میں جواب دیا تو میں نے پوچھا۔ انھوں نے فرمایا کہ بحث مسئلے پر وہاں کوئی تبادلۂ خیال نہیں ہوگا بلکہ ایک تجویز پیش کی جائے گی اور میں محض ہاتھ اٹھانے والوں میں اپنے کو نہیں رکھنا چاہتا۔ اسی حلقے کے ایک اور مصنف اور عالم دین ہیں جنھوں نے شرکت فرمائی۔ کنونیشن کے دوران ایک نجی صحبت میں انھوں نے فرمایا کہ مسلم پرسنل لا میں بہت سی خرابیاں ہیں، جنھیں بہرحال ٹھیک کرنے کی ضرورت ہے۔ بمبئی کے ایک بزرگ نے جن کا قوم پرور مسلمانوں میں شمار ہوتا ہے، فرمایا: "مولانا! اپنا یہ خیال اپنے پاس ہی رکھئے یہاں ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ دہلی کے متعدد ڈیلیگیٹوں کا بیان ہے کہ مولانا صاحب ایسا خاموش ہوئے کہ ڈیلیگیٹوں کے کسی جلسے میں کچھ نہ بولے۔ البتہ بعد میں انھوں نے اپنے ایک مضمون میں مسلم پرسنل لا کی خرابیوں کا ذکر کیا ہے۔

عام طور پر علمائے اسلام جدید مسائل اور دوسری قوموں کی معاشرتی زندگی اور ان کے تاریخی حالات سے بہت کم واقف ہوتے ہیں، الا ماشاء اللہ۔ اس کے برعکس واقعات کو توڑ موڑ کر یا سیاق و سباق سے الگ کر کے بیان کرنے میں انھیں بڑی مہارت حاصل ہوتی ہے۔ اس کی ایک عبرتناک مثال کنونیشن کے خطبۂ صدارت میں ملے گی۔ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم مولانا قاری محمد طیب صاحب جیسے جید عالم فرماتے ہیں، ذرا ملاحظہ فرمائیے! "آج بھی اس ملک میں ایسے فرقے ہیں جو ۸۰، ۸۰ بیویاں رکھتے ہیں اور سماج ان کے بارے میں چوں تک نہیں کرتا۔ بقول بابو لیکھ چندر اور بابو گریندر ناتھ دت اس ملک میں ایسے کامن برہمن بھی ہیں جن کی ۵۰، ۵۰ اور سو سو بیویاں ہیں، ان میں سے ہر شخص کے پاس ایک نوٹ بک رہتی ہے جس میں وہ اپنی بیویوں کی ولدیت اور گاؤں کا نام لکھ لیتے ہیں اور پھر بھی انھیں پشیمانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ جس سے وہ ایک اجنبی سمجھ کر ملتے ہیں وہ ان کی بیوی یا لڑکا ہوتا ہے۔"

اگر یہ صحیح ہے تو نہ جانے کس زمانے کی بات ہے لیکن مولانا نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ گویا آجکل کی بات ہے۔ دوسرے مولانا نے اس واقعہ کا اس طرح ذکر کیا ہے گویا اس طرح کی گھنونی باتیں صرف ہندو سماج میں ہوتی ہیں اور مسلم سماج اس عیب سے ہمیشہ پاک رہا ہے۔ مولانا نے یہ ارشاد فرماتے ہوئے یہ خیال نہیں فرمایا کہ اگر کوئی شخص حیدرآباد اور رام پور کے نوابوں کی عیاشیوں کے حوالے سے کہے کہ مسلمان خاندانوں میں یہ عام رواج ہے تو کیا مولانا اس کی تردید کر سکیں گے؟ حیدرآباد اور رامپور کے محلوں کے واقعات ہمارے دور اور زمانے سے تعلق رکھتے ہیں، مگر ہندوستان کی آزادی سے پہلے کے ہیں، مگر ابھی حال میں اردو و انگریزی کے تمام اخبارات میں ایک دلچسپ اور عبرتناک خبر بہت تفصیل سے شائع ہوئی تھی کہ اردن کے شاہ حسین نے اپنی چوتھی انگریزی بیوی کو طلاق دیکر ایک نوخیز لڑکی سے شادی کی ہے، ابھی حال ہی میں ہندوستان کی ملت اسلامیہ کے ایک ممتاز رکن کا انتقال ہوا تو ان کے پس ماندگان کی تفصیل میں درج تھا کہ انھوں نے تین بیوائیں چھوڑی ہیں۔ اب اگر کوئی شخص ان دو واقعات کی بنیاد پر لکھے کہ ہر مسلمان تین تین، چار چار بیویاں رکھتا ہے اور جب ان میں سے ایک بیوی پرانی ہو جاتی ہے تو اس کو طلاق دے دیتا ہے اور کسی نوخیز لڑکی سے شادی کر لیتا ہے تو کیا مولانا طیب صاحب اس کا منہ بند کر سکیں گے یا اس کا قلم روک سکیں گے؟ مولانا قاری محمد طیب صاحب سے زیادہ مجھے اس پر تعجب ہے کہ بیشتر مسلم اخبارات نے اس خطبے کو نقل کیا ہے، مگر نہ تو کسی نے اس حصے کو حذف کیا اور نہ اس کی تردید کی اور نہ بمبئی کے اس "شاندار" اجتماع میں کوئی حق گو تھا جو اس کی تردید کر سکتا۔

اگر چہ بمبئی کے مخصوص مسلمانوں کے اجتماع میں اس کی پوری کوشش کی گئی اور اس میں کامیابی ہوئی کہ مسلم پرسنل لا میں ترمیم و اصلاح کی حمایت میں

ایک آواز بھی بلند نہیں ہوئی۔ ایک خطرے کے پیش نظر کہ ممکن ہے زبان بندی کے باوجود کوئی شخص منتظمین کے اس حصار کو توڑ بیٹھے تو اس آواز کو مجمع سے باہر جانے سے روکنے کے لئے ریڈینس کی روایت کے مطابق ۳۰ دسمبر کو پریس کانفرنس میں اعلان کیا گیا کہ ڈیلی گیٹ کے اجلاس بند کمرے میں ہوں گے اور پریس کے کسی شخص کو شرکت کی اجازت نہیں ہوگی۔ مگر اس کنونشن کے بعد اردو کے ان ہی اخبارات میں جو مسلم پرسنل لا میں ترمیم و اصلاح کے سخت خلاف ہیں، جو مضامین شائع ہوئے ہیں ان میں مسلم پرسنل لا کی خرابیوں کو تسلیم کیا گیا ہے اور ترمیم و اصلاح کی حمایت کی گئی ہے۔ انتہائی اختصار کے ساتھ ذیل میں یہ خیالات پیش کئے جاتے ہیں:۔

مولانا شاہ معین الدین ندوی ایڈیٹر معارف فرماتے ہیں: "بعض ملکوں نے شریعت کے اصولوں کی روشنی میں پرسنل لا کے غلط استعمال کو روکا ہے اور اس سے پیدا شدہ خرابیوں کو دور کیا ہے۔ اس قسم کی اصلاح ہندوستان میں بھی کی جا سکتی ہے"۔

مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی ایڈیٹر برہان تبدیلی و اصلاح کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "انسانی اجتماع و تمدن کے ارتقا کے ساتھ سماجی قدروں اور خیر و شر و نفع و ضرر کے معیاروں میں تبدیلی پیدا ہوتی رہتی ہے اور کوئی قانون جس کا بنیادی مقصد انسانوں کی فلاح و بہبود ہو ان چیزوں سے صرف نظر نہیں کر سکتا، اسی بنا پر یہ لچک شریعت اسلام میں موجود ہے اور اس میں اس بات کی صلاحیت بدرجہ اتم ہے کہ سماج میں حالات خواہ کسی قسم کے بھی پیدا ہوں شریعت ان سے عہدہ برآ ہو سکتی اور ان کی تلافی کر سکتی ہے"۔

جماعت اسلامی کے امیر مولانا محمد یوسف کا ایک طویل مضمون روزنامہ دعوت مورخہ ۲۵ جنوری میں شائع ہوا ہے جس میں "مسلمانوں کے کرنے کے کام" کے ذیلی عنوان کے تحت امیر جماعت اسلامی فرماتے ہیں "علماء اور مسلم ماہرین قانون کا ایک بورڈ تشکیل دیا جائے جو موجودہ قوانین پر کتاب و سنت اور فقہ اسلامی کی روشنی میں (مسلم پرسنل لا پر) نظرثانی کرے اور یہ دیکھے کہ موجودہ حالات و ضروریات کے تحت کتاب و سنت اور فقہ اسلامی کے دائرے کے اندر موجودہ قوانین میں کیا اصلاح ہو سکتی ہے تاکہ شریعت کا منشا بھی پورا ہو اور مسائل بھی حل ہوں۔ مسلم پرسنل لا کو دفعہ وار مدون کیا جائے تاکہ اس سے استفادے میں آسانی ہو۔ شرعی پنچایتیں قائم کی جائیں جو اسلامی عدالتوں کی عدم موجودگی میں فسخ، خلع اور دوسرے اور مسائل کے سلسلے میں فیصلے کریں"۔

بمبئی کے نام نہاد کنونشن سے بہت پہلے جمعیت اسلامی کے مرکز (دہلی) میں ۶ اکتوبر ۲ ۱۹ء کو ایک جلسہ کیا گیا تھا جس میں اڑیسہ ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس جناب خلیل احمد صاحب نے مسلم پرسنل لا پر ایک تقریر کی تھی اس تقریر میں موصوف نے فرمایا تھا "ہماری سماجی زندگی ایک جگہ ٹھہری ہوئی نہیں ہے بلکہ رواں دواں ہے اس لئے فطری بات ہے کہ ہمارے قانون کو بھی متحرک ہونا چاہیئے ایسا نہ ہو تو جمود پیدا ہو جائے گا۔ میں اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ پرسنل لا میں تبدیلی لائی جا سکتی ہے"۔ تقریر کے آخر میں فرمایا کہ "جہاں تک اسلامی پرسنل لا کا سوال ہے یہ بات صحیح نہیں ہے کہ وہ تمام تر اسلامی معیار کے مطابق ہے ہمارے یہاں بھی مسلم پرسنل لا کے نام سے جو قانون تیار کیا گیا وہ فی الاصل شرعی قانون نہیں بلکہ اینگلو محمڈن قانون ہے اس کے کچھ خاص خاص اجزا تو خالص شکل میں ہیں، باقی بدل گئے ہیں"۔

اوپر میں نے علمائے اسلام اور ایک سابق چیف جسٹس کے جو خیالات پیش کئے ہیں، وہ قریب قریب وہی ہیں جو مجھ جیسے ترمیم و نظرثانی کے حامی کہا کرتے ہیں۔

مسلمانوں کی پس ماندگی کے اسباب

مسلم پرسنل لا میں ترمیم و اصلاح کے مخالفین اکثر کہا اور لکھا کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے اور بہت سے مسائل ہیں۔ ترمیم اور اصلاح کے حامی اور حکومت اس طرف توجہ کیوں نہیں کرتے۔ ڈاکٹر یوسف نجم الدین نے بھی بمبئی کے مسلم پرسنل لا کنونشن میں کچھ اسی قسم کی بات کہی ہے۔ انھوں نے فرمایا ہے "مسلمانوں کی سماجی اور تعلیمی پسماندگی اور کمتری کا حقیقی سبب مسلم پرسنل لا نہیں ہے، سبب اور کچھ ہیں"۔ یہ تو کوئی بھی نہیں کہتا کہ مسلمانوں کی معاشی، سماجی اور تعلیمی پس ماندگی کا واحد سبب مسلم پرسنل لا ہے، مگر جہاں اس کے اور بہت سے اسباب ہیں وہاں ایک بڑا اور اہم سبب یہ بھی ہے کہ مسلمان خاندانی منصوبہ بندی کے قائل نہیں ہیں اور اس کی ضرورت اور فائدے کو تسلیم نہیں کرتے اگر وہ خاندانی منصوبہ بندی کو تسلیم کر لیں گے تو انھیں یہ بھی سوچنا پڑے گا کہ محدود اولاد کی صورت میں بہ یک وقت ایک سے زائد شادی اسی صورت میں ممکن ہے جب پہلی بیوی بانجھ ہو۔ ترمیم و اصلاح کے مخالف اور رجعت پرست مسلمان اکثر یہ بھی کہا کرتے ہیں کہ مسلمانوں میں عملاً ایک سے زیادہ شادی کا رواج بالکل نہیں ہے۔ اگر ان کا یہ بیان اخلاص اور حقیقت پر مبنی ہے تو شادی پر پابندی سے وہ گھبراتے کیوں ہیں؟ لیکن اس سے قطع نظر کہ ایک سے زائد شادی کے واقعات کتنے فیصدی ہیں اور ایسے واقعات مسلمانوں میں زیادہ ہیں یا غیر مسلموں میں۔ ہمیں اس کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ یہ صورت حال ہماری ترقی اور سماجی فلاح و بہبود کے خلاف ہے۔ مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ان کی اولاد زیادہ ہوتی ہے اور مالی حالت ایسی نہیں ہوتی کہ سب کو اعلیٰ تعلیم دلا سکیں۔ ان میں کوئی ایسی سوسائٹی بھی نہیں ہے جو ضرورت مند طالب علموں کو اتنی مالی امداد کر سکیں کہ وہ کم از کم ایم۔ اے تک پڑھ سکیں۔ مسلم اوقاف کی حالت بھی ناقابل اطمینان ہے۔ مسلمان لڑکیوں میں تعلیم کا رواج بڑھ رہا ہے، مگر بڑی تعداد نجی طور پر امتحانات دیتی ہے اور چونکہ گھر پر تعلیم کا معقول انتظام نہیں ہوتا اس لئے ان کا تعلیمی معیار اتنا پست ہوتا ہے کہ یونیورسٹیوں اور ٹریننگ کالجوں میں ان کو داخلہ نہیں ملتا مسلمانوں کی ذہنی پستی اور تعلیمی و معاشی اور سماجی پسماندگی کے بہت سے اسباب ہیں جن پر مسلمانوں کو سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر مسلمان مسلم پرسنل لا کو زمانہ کے تقاضوں کے مطابق نہیں کریں گے تو اس میں کسی اور کا نہیں ان کا اور صرف ان کا نقصان ہے۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم

ہمارے سیاسی مبصر کے قلم سے

" جب ہم لوگ اپنا سب کچھ چھوڑ کر پاکستان آئے تو ہم نے یہ سوچا بھی نہ تھا کہ ہم ایک ایسی زمین پر قدم رکھ رہے ہیں جہاں پر ہمیں غیر اور اچھوت سمجھا جائے گا۔ ہم نے ایک ایسے پاکستان کا انتخاب کیا تھا جس نے اردو کو اپنی قومی زبان، انڈو اسلامک تہذیب کو اپنی تہذیب اور پاکستان کو ایک واحد قومیت چُنا تھا لیکن آج ہمیں ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جہاں ہمیں بتایا جاتا ہے کہ مغربی پاکستان سندھی، بلوچی، پٹھان اور پنجابی —— ان چار قوموں کی سرزمین ہے۔ ہم اس حقیقت کو کس طرح نظر انداز کر سکتے ہیں کہ ہم اردو بولنے والے لوگ ہی حقیقتاً پاکستان کے سچے خالق ہیں؟ اور آج ہمیں پاکستان میں دوسرے بڑے لسانی فرقے کا درجہ ملنا چاہیئے۔ پنجابیوں کے بعد ہم پاک ہندوستانیوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ ہمارے مطالبے میں کوئی برائی نہیں کہ ہمیں پاکستان کی پانچویں قوم سمجھا جائے اور ہمارا صوبہ وہ علاقہ ہو جہاں ہماری واضح اکثریت ہے۔"

(ممتاز شاعر اور کالم نویس رئیس امروہوی
جنگ کراچی)

" خود کو پاک ہندوستانی کہنے والے یہ لوگ ہندوستانی ایجنٹ ہیں۔ انھیں ان تمام لوگوں کے ساتھ جن کے پاس ہندوستانی پاسپورٹ ہیں واپس ہندوستان دھکیل دینا چاہیئے۔"

(سندھی روزنامہ 'ہلال' پاکستان)

" ہم پر ہندوستانی ایجنٹ ہونے کے الزام لگائے جاتے ہیں۔ دنیا جانتی ہے کہ ہم نے پاکستان کے لئے کیا کیا ہے۔ ہمیں اس بات کو تسلیم کرنے میں کوئی شرم نہیں کہ ہمارے کنبے بٹے ہوئے ہیں۔ سرحد کے دوسری طرف ہمارے سینکڑوں رشتہ دار اور دوست ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہماری وفاداری بھی بٹی ہوئی ہے جس طرح سرحد کے اس پار ہمارے بھائی بہن ہندوستان کے وفادار شہری ہیں اسی طرح ہم وفادار پاکستانی ہیں۔"

(تنقید نگار اور سیاسی مبصر سید محمد نقوی)

" اگر اردو بولنے والوں کو ان کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے اور ہندوستان انھیں واپس لینے پر راضی ہو جائے تو ایک ہی رات میں کراچی کی آبادی ستر فیصد کم ہو جائے گی۔"

(پیر احمد بخش۔ ہلال پاکستان)

بظاہر یہ مکالمے سے معلوم ہوتے ہیں لیکن یہ الفاظ اس بحث کے آئینہ دار ہیں جس میں ہند سے پاکستان جا بسنے والے لوگوں سے صفائی طلب کی جا رہی ہے جن کی زبان اردو ہے۔ اس تلخ حقیقت کو اگر یہ لوگ آج سے ۲۵، ۳۰ برس پہلے جانتے تو قیام پاکستان کے لئے آواز بلند کرنے سے پہلے دس بار سوچتے۔ برصغیر ہند کا وہ خطہ کہ جسے پاکستان یعنی برصغیر کے مسلمانوں کے لئے دارالمومنین ہونا تھا، وہ پاکستان جسے مسلمانوں کی آرزوؤں، اُمنگوں کا گہوارہ ہونا چاہیئے جب وجود میں آیا تو اسے آباد کرنے کے لئے اپنے گھر بار چھوڑ کر جانے والے وہاں پاکستانی بلکہ مہاجر بن کر گئے اور مہاجر سے پاکستانی نہ ہو سکے۔ جانا پہچانا ماحول چھوڑ کر نئی جگہوں کو چمن سمجھ کر گئے لیکن آشیاں بندی ہونے تک اپنے ہی وطن عزیز میں غریب الوطن ہو کر رہ گئے۔ اسلامی راج کا جو تصور لئے وہ گئے تھے وہ ان کے ذہنوں میں سمٹا سمٹا دھندلانے لگا، حقیقت میں ڈھلنا اس تصور کا مقدر نہ تھا۔ پاکستانی بننے کے لئے ہندوستانیت کو ترک کرنا منظور کیا لیکن

چوتھائی صدی پاکستان بنے رہنے کے بعد بھی انھیں ان کے ہم وطن و ہم قوم آج بھی ہندوستانی سمجھتے ہیں بلکہ غیر وفاداری کا الزام بھی دیتے ہیں۔ پاکستان کے تصور کے لئے صدیوں کے رشتوں سے منہ موڑ کر جانے والوں کا یہ عالم ہے کہ ع

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم

تقسیم وطن کے دور کے فرقہ وارانہ جنون کے زخم لئے جب پاکستان کے یہ شیدائی پاکستان پہنچے تو مہاجر کے لقب سے نوازے گئے، جو زخم نئے ہم وطنوں کی نوازشوں نے ہمدردی کی چلمن کے سائے میں انھیں بخشے ان کا عکس سعادت حسن منٹو نے "کھول دو" میں اتارا ہے۔ اس دور کو تو یہ کہہ کر ٹالا جاسکتا ہے کہ وہ افراتفری کا، بدنظمی کا دور تھا، پاکستان تب نوزائیدہ تھا۔ اس میں تب اتنی سکت نہ تھی کہ اپنی پناہ میں ان کا تحفظ کر سکے۔ لیکن آج جبکہ پاکستان کی عمر چوتھائی صدی سے کچھ اوپر ہی ہو چلی ہے، اب بھی پاکستان کے یہ بیٹے بیٹیاں ویسے محفوظ نہیں ہیں جیسے کہ اپنے چمن میں اہل چمن ہوا کرتے ہیں۔ یوں تو پاکستان کا پورا چمن ان کا ہے لیکن حق کسی بھی شاخ پر نہیں۔ ابھی پاکستان بنے چھ برس بھی نہ ہوئے تھے کہ قادیانیوں پر وار ہو گیا۔ قادیانیوں کے خلاف تعصب اور نفرت کی آگ اس قدر تیز کی گئی کہ مولویوں نے انھیں غیر مسلم قرار دے کر سرکاری عہدوں کے نااہل ٹھہرایا۔ ان کے خلاف لوٹ مار اور آتش زنی کا اتنا بازار گرم ہوا کہ لاہور اور دیگر مقامات پر فسادات کے انسداد کے لئے مارشل لاء نافذ کرنا پڑا۔ دارالسلام پاکستان میں مسلمانوں نے مسلمانوں کے خون سے اس لئے ہاتھ رنگے کہ موخرالذکر قادیانی فرقہ سے تعلق رکھنے کے گنہگار تھے۔ خود میاں ممتاز علی دولتانہ جو آج کل پاکستان کے سفیر مقیم لندن ہیں اور تب مغربی پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے۔ اس قادیانی کُش تحریک کے سرپرستوں میں شامل تھے۔ ۱۹۵۳ء کے ان فسادات کے وجوہ کی تحقیقات کا کام دو ممتاز ججوں محمد منیر اور ایم۔ آر کیانی کو سونپا گیا۔ منیر رپورٹ میں علماء پر مذہب کے بارے میں غلط رجحانات پیدا کرنے کا الزام دیا گیا۔ ججوں کو چھپے ڈھنگ سے یہ اعتراف بھی کرنا پڑا کہ مذہب کو ریاست کی بنیاد قرار دینے سے جتنے مسائل حل ہوئے ہیں اس سے کہیں زیادہ مسائل اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ بہرحال اسلامی مملکتِ پاکستان میں مسلمان پاکستانیوں کے ایک فرقہ کو جنّت کے بدلے جہنم کے شعلوں کا تحفہ نصیب ہوا۔

اس آغاز کے بعد چھوٹے بڑے مرحلے آتے رہے لیکن مہاجر پاکستانیوں نے امید کا دامن تھامے رکھا۔ کبھی تو جنّتِ اسلام زمین پر اُترے گی۔ اسی امید کی چھاؤں میں مہاجر سابق مشرقی پاکستان اور موجودہ بنگلہ دیش کے علاقے میں جا بسے۔ بنگلہ دیش کی لہو میں ڈوبی صبحِ آزادی کے بعد غیر بنگالی پاکستانی جو بے گھر اور مہاجر بن کر دامنِ پاکستان کے مشرقی حصے میں بسنے گئے تھے، ایک بار پھر بے گھر اور بے سہارا ہوئے۔ ان لاکھوں انسانوں کا وطنِ نو ان کے لئے پردیس بن گیا۔ اگر ان کے پاکستان جانے کے بارے میں کوئی تصفیہ ہو گیا تو ایک بار پھر ان کی پیشانیوں پر لفظ مہاجر داغا جائے گا۔ اسلام کے دامن میں نئے وطن کی تشکیل کی آرزو نے بار بار انھیں رُسوا کیا۔ ان بدنصیبوں کے مقابلے میں جو مہاجر خود کو موجودہ پاکستان میں پاکر اپنی خوش نصیبی پر نازاں اور مطمئن تھے انھیں جولائی ۱۹۷۲ء کے خونیں واقعات نے آدبوچا۔ سرزمینِ سندھ ان کے لئے شعلہ زار بن گئی۔ کراچی کے علاقہ لیاقت آباد کو فوج کے حوالے کر دیا گیا۔ (نوائے وقت۔ ۹ر جولائی ۱۹۷۲ء)

حیدر آباد میں سندھ یونیورسٹی کے پروفیسروں پر حملہ، سندھ کے اندرونی علاقوں میں لوٹ مار جاری ہے۔ (۱۲ر جولائی ۱۹۷۲ء) سندھ کے اندرونی علاقوں سے اردو بولنے والے ہزاروں کی تعداد میں کراچی منتقل ہونے لگے۔ ٹرینیں اردو کے حامیوں سے لدی ہوئی کراچی پہنچ رہی ہیں (۱۳ر جولائی) سندھ کی گلیوں میں نعشیں پڑی ہیں (۱۳ر جولائی) شملہ سمجھوتہ کی منظوری کے لئے ۱۰ر جولائی کو قومی اسمبلی کا اجلاس شروع ہونا تھا تاکہ برصغیر میں دیرپا امن کے امکانات روشن ہوں۔ ان امکانات کے روشن ہونے سے پہلے ہی سندھ سے خون میں نہائی ہوئی سُرخیاں اخباروں کی پیشانیوں پر آبیٹھیں، ذہنوں میں تاریکیاں اُنڈیلنے لگیں۔ برصغیر کے مسلمانوں کے وطن، اسلامی مملکت پاکستان میں ان مسلمانوں کو کیا ملا جو اس کی تعمیر کے لئے اپنے گھروں رشتہ داروں اور دوستوں کو چھوڑ کر گئے تھے۔ "یونیورسٹی میں پستولوں اور سلاخوں سے مسلح دو سو طلبہ نے حملہ کر کے اپنے پروفیسروں ڈاکٹر نسیم نقوی، ڈاکٹر اعجاز ملک، پروفیسر ریاض پال، اور پروفیسر فاروقی، یہاں تک کہ بیگم فاروقی کو سخت زخمی کر دیا۔"

"ہالا میں تقریباً دو ہزار مشتعل افراد نے جن کی قیادت مخدوم زمان آف ہالہ کا بیٹا سائیں گل کر رہا تھا مین بازار کی ۳۵ دکانیں لوٹ لیں۔ تمام اردو کے بکسٹال نذرِ آتش کر دیئے گئے۔"

سندھ میں مہاجروں، پنجابیوں اور دوسرے تمام نئے سندھیوں کی جائیدادوں کے لوٹنے اور انھیں بھاری جانی و مالی نقصان پہنچائے جانے کی اطلاعات متواتر موصول ہو رہی ہیں۔ نئے سندھیوں کی عورتوں اور بیٹیوں کو بےعزت کیا جا رہا ہے۔ یہ سلوک سندھیوں نے مہاجروں کے

نہ کیوں کیا؟ اقتصادی مسائل کی پیچیدگیاں اس کے پیچھے کارفرما تھیں۔ لیکن اسلامی راج میں تو اقتصادی مسائل کا حل اسلام کی محبت کے ذریعے کرنے کا تصور کیا گیا تھا ۲۵ برس کے بعد بھی یہ مسائل نہ صرف بنے رہے بلکہ اور پیچیدہ ہوگئے۔ نتیجتاً پاکستان میں مسلمانوں کا لہو بہتا رہا۔ اس درد کو صحافی ریڈیہ اے بٹلیری تک کے دل نے محسوس کیا۔ "اس میں کوئی شک نہیں کہ سندھ میں ہوئی خونریزی سے قوم کو ناقابلِ تلافی نقصان ہوا ہے۔ نہ صرف یہ کہ جان ومال کا بھاری نقصان ہوا ہے بلکہ سندھ کی سماجی زندگی کے دو طبقوں کے درمیان نفرت کی خلیج اور وسیع اور گہری ہوگئی۔" (نوائے وقت۔ ۲۳ر جولائی ۱۹۷۲ء)

ڈاکٹر سید عبداللہ نے قلم اٹھایا "گزشتہ ۲۵ برسوں میں قومی صدمے اتنے آچکے ہیں کہ اب برداشت کی قوت قریباً ختم ہوچکی ہے۔ کیا یہ وہی سندھ ہے جس کے اسلامی جوش اور مذہبی عصبیت کو مثالی حیثیت حاصل تھی۔ اے خدا! یہ کیا ہوگیا ہے کہ اب اسی سرزمین کے کچھ فرزند ایک مردہ تہذیب موئن جو دڑو پر فخر کرکے اسلام کے بارے میں وہ وہ باتیں کہتے ہیں جن کا قلم پر لانا بھی ہمارے لئے ممکن نہیں۔"

(نوائے وقت۔ ۲۹ر جولائی)

اخبار کے اسی شمارے کا اداریہ بھی کچھ اسی انداز کا لہجہ لئے ہوئے ہے۔ "یہ بڑی ہی تکلیف دہ حقیقت ہے کہ بھارت جہاں دو درجن کے قریب لسانی قومیتیں آباد ہیں اور چھوٹے بڑے جداگانہ تہذیبی و ثقافتی طبقوں کی تعداد ایک سو کے قریب ہے وہاں تو ایک قوم ــــ بھارتی یا ہندوستانی قوم ــــ بن گئی ہے، لیکن ہم ابھی تک چار قومیتوں کے چکر میں اُلجھے ہوئے ہیں اور مسلمان ہونے کے باوجود ایک قوم نہیں بن سکے۔"

وہی ہندوستان کہ جہاں اسلام کو غیر محفوظ تصور کرکے قیامِ پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اسی ہندوستان کی سیکولر جمہوریت کی چھاؤں میں تمام مذاہب، تمام طبقے نسبتاً چین کی زندگی بسر کر رہے ہیں، لیکن پاکستان جانے والوں پر جو گزری اس کی داستانوں سے وہاں کے اخبارات اور جرائد بھرے پڑے ہیں۔ پاکستان آج ایک حقیقت ہے اس سے کسی کو انکار نہیں۔ لیکن اس حقیقت سے بھی کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ مذہب کسی ملک یا کسی ریاست کی بنیاد کے طور پر مسائل کا حل نہیں کرسکتا۔ اس حقیقت کو بھی جھٹلانا ممکن نہیں ہے کہ تمام پاکستانیوں میں سے وہ پاکستانی جو مہاجر بن کر ہندوستان سے گئے سب سے زیادہ نقصان میں رہے۔ پاکستان کے لئے سب سے زیادہ قربانیاں دینے والے سرزمین پاکستان میں ابھی تک ظلم کا شکار ہو رہے ہیں کہیں ان کے جذبۂ حب الوطنی پر شک کی انگلیاں اُٹھ رہی ہیں۔ کہیں انھیں فرزندِ زمین، مہاجر کہہ کر دوسرے درجہ کا شہری گردانتے ہیں۔ ہندوستان سے پاکستان جانے والے ان لوگوں میں جو ذی شعور ہیں حساس ہیں یقیناً دل میں سوچتے ہوں گے ہم نے پایا کیا اور کھویا کیا؟ پایا بہت کم، کھویا بہت زیادہ۔ کیا یہی وہ پاکستان ہے جس کے تصور کی خاطر آگ اور خون کی راہوں سے گزرے؟

ہر علاقہ، ہر طبقہ کا اپنا اپنا مزاج ہوتا ہے وہ ان کی انفرادیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اب جب کہ پاکستان بنے ۲۵ برس ہوگئے۔ اس بات کا جائزہ لینے میں کوئی ڈر نہیں کہ قیامِ پاکستان سے جو توقعات برصغیر کے مسلمانوں نے فرقہ پرستی کے غلبہ میں آکر وابستہ کی تھیں، ان کا حشر کیا ہوا؟ اس سے یہ بحث مطلوب نہیں کہ پاکستان بننا چاہیئے تھا یا نہیں۔ پاکستان تو بن چکا۔ اگر پاکستان مستحکم رہے تو ہندوستان کو نہ صرف خوشی ہوگی بلکہ برصغیر میں دیرپا امن کا قیام زیادہ ممکن ہوگا۔ جائزہ صرف اس سمت میں لیا جائے کہ جو ہندوستانی مسلمان پاکستان چلے گئے تھے انھیں کیا وہ حاصل ہوا کہ جس کی خاطر وہ اپنا وطن چھوڑ گئے۔ اب تک کے حالات یہ گواہی دیتے ہیں کہ ان کی حالت اُن پودوں کی سی ہے جو ایک زمین سے اُکھڑ کر دوسری زمین کی کوکھ میں جڑیں اتارنے کی کوشش کرتے رہے ہیں اس امید میں کہ اس چمن میں شاخ شاخ پھول زیادہ محفوظ اور ثمر ور ہوگی۔ ان کی یہ کوشش تاحال جاری ہے لیکن وہ زمین ہے کہ ان جڑوں کو اپنانے سے انکار کر رہی ہے۔ آخر یہ کیسا وطن ہے کہ جس کے شہری ہوکر بھی وہ خود کو غریب الوطن سمجھنے پر مجبور ہیں؟ یہ کیسا ماحول ہے کہ جسے اپنا سمجھنے کی ہر کوشش کے باوجود اجنبیت کا احساس کم ہونے میں نہیں آتا۔

"آگ اور خون کے سمندر سے گزرتے ہوئے یہاں تک پہنچنے میں کیا کیا سانحے پیش آئے زبان گنگ ہے، سانحے سنتے سنتے۔ ایک سانحہ ہوتو بتا بھی دیں مگر یہاں پر سانحہ پر سانحہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وطن پاکستان نہیں سانحستان ہے۔"

(انوار الحق، پریمئر کالج ناظم آباد۔

اخبارِ جہاں۔ ۱۳ر ستمبر ۱۹۷۲ء)

"۱۴ر اگست۔ ہماری آرزوؤں اور اُمنگوں کا دن۔ جب ہمیں اپنے خوابوں کی تعبیر ملی۔ مگر آج نہ جانے کیوں یوں لگتا ہے جیسے پاکستان کے ۲۵ برس ہم سے سوال کرتے ہے ہوں کہ تمہارا وہ مقصد کیا ہوا جس کے لئے تم نے پاکستان حاصل کیا؟ یقین نہیں آتا کہ یہ پاکستان میرا پاکستان ہے کہ جو ایک اسلامی ریاست کے نام پر بنایا گیا۔ لیکن یہ کون سا ملک ہے؟" (خالدہ۔ کراچی۔

اخبارِ جہاں۔ ۱۳ر ستمبر ۱۹۷۲ء)

سندھ کے لسانی فسادات میں اپنے گھربار چھوڑ کر آنے والے پنجابیوں کی امداد اور بحالی کے لئے حکومت پنجاب نے ہر ممکن مدد دینے کا اعلان کیا۔ سندھ میں بسنے والے ۴ا لاکھ پنجابیوں کے لئے حکومت پنجاب فکر مند ہوئی پٹھانوں اور بلوچوں کی فکر ان کی صوبائی حکومتوں نے کی لیکن سندھ میں بسنے والے ۴۵ لاکھ اردو بولنے والوں کا پرسان حال کوئی نہ ہوا۔ تصفیہ کی راہ نکالنے کے لئے صدر بھٹو کے زیر صدارت نئے اور پرانے سندھیوں کا جو اجلاس ۸ر جولائی کو ہوا اس میں عوامی لیگ کے قاضی فیض محمد نے نئے سندھیوں

(بقیہ صفحہ ۳۱)

فرقہ وارانہ فساد کیوں؟ اور کب تک؟

ایس منیر نیازی

بنگلہ دیش کی آزادی کے بعد ہندوستان کے بیشتر لیڈروں نے بڑے ہی اطمینان اور فخر کے ساتھ کہا تھا کہ جناح کا دو قومی نظریہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ہندوستان سے بھی اب فرقہ وارانہ فسادات کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لیکن اس کے فوراً بعد ہی میسور اور کیرالا میں اور ابھی حال ہی میں اتر پردیش میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات نے یہ خوش فہمی ختم کر دی ہے۔

سوال یہ نہیں ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات کون کر رہا ہے۔ سوال یہ بھی نہیں ہے کہ ان فسادات میں مسلمان مرے یا ہندو۔ سوال صرف اتنا ہے کہ آخر یہ فسادات کیوں ہوتے ہیں؟ اور کب تک ہوتے رہیں گے؟ اگر صرف اس "کیوں" کا جواب تلاش کر لیا جائے تو "کب تک" کا جواب بھی اپنے آپ مل جائے گا۔

کیوں؟

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ایک نئے ہندوستان نے جنم لیا جس میں نہ کوئی راجہ تھا اور نہ پرجا، کوئی حاکم تھا نہ محکوم۔ ہندوستان کی صدیوں کی تاریخ میں یہ ایک نئی بات تھی جس کے لئے ذہنی طور پر نہ ہندو تیار تھے اور نہ مسلمان۔ کی غلامی کے بعد آزاد ماحول میں انھیں کس طرح رہنا ہے؟ آزادی نے انھیں کیا ذمہ داریاں دی ہیں؟ بدلتے ہوئے حالات میں ان کے حدود کہاں تک ہیں؟ اس کا احساس نہیں نہ تو ۱۵ اگست کو ہوا تھا اور نہ تو آج ۲۵ سال بعد ہی ہو سکا ہے۔ مختصر طور پر کہہ سکتے ہیں کہ بیشتر ہندو اور مسلمان دونوں ہی آزاد ہندوستان میں خود کو ہم آہنگ نہیں کر پائے ہیں، نہ تو سیاسی طور پر اور نہ سماجی طور پر۔

ہندوؤں کا اندازِ فکر

آزادی ملی تو ہندوؤں کی اکثریت نے محسوس کیا کہ سینکڑوں سال کی غلامی کے بعد ہندو آزاد ہوئے ہیں وہ انگریزوں ہی کے نہیں بلکہ مغلوں کے دور حکومت کو بھی اپنی غلامی کا ہی دور سمجھتے ہیں۔ غیر شعوری طور پر ہی سہی لیکن وہ محسوس کرنے لگے کہ اب ہندوستان کے حاکم ہندو ہیں، ٹھیک اسی طرح جس طرح اس سے قبل انگریز اور اس سے بھی قبل مسلمان تھے۔ حکومت میں مسلمانوں کی ساجھے داری ان کی اپنی خواہش کے برعکس تھی۔ پھر ایک حاکم قوم ہی کی طرح انھوں نے محسوس کرنا شروع کر دیا کہ وہی اس میں سب سے برتر ہیں۔ ان کی زبان، ان کا کلچر اور ان کا رہن سہن سب سے افضل ہے۔ غیر ہندوؤں کو ان کے نقش قدم پر چلنا چاہئے اور جو لوگ ان کی برتری تسلیم نہیں کرتے وہ صرف ان کے ہی نہیں بلکہ ملک کے بھی دشمن اور غدار ہیں۔ اسی کسوٹی کو سامنے رکھ کر گولوالکر نے "شدھی کرن" اور مدھوک نے "بھارتیہ کرن" کے نعرے لگائے ہیں۔ اسی جذبے کے تحت ہندو دھرم کو "دھرم" نہ کہہ کر "راشٹر" کہنے کی مہم چلائی جاتی ہے اور مانگ کی جاتی ہے کہ سبھی ہندوستانی قومیت کے لحاظ سے اپنے کو "ہندو" کہیں۔

مسلمانوں کا اندازِ فکر

دوسری طرف مسلمان بھی ہندوستان کے بدلے ہوئے سیاسی ماحول سے اپنے کو ہم آہنگ نہیں کر سکے ہیں۔ ہندوؤں کی اکثریت کی طرح مسلمانوں کی اکثریت بھی اس ذہنی فتور میں مبتلا ہے کہ ہندوستان میں مغلوں کے دورِ اقتدار میں سبھی مسلمان حاکم اور سبھی ہندو محکوم تھے۔ اس احساس نے کہ جن لوگوں پر انھوں نے سینکڑوں سال تک حکومت کی تھی وہی اب ان کے حاکم بن گئے ہیں انھیں قنوطیت کا شکار بنا دیا ہے۔ آزاد ہندوستان میں انھوں نے اپنی حیثیت ایک محکوم ہی کی سمجھ رکھی ہے۔ یعنی وہ پہلے انگریزوں کے پرجا تھے اور اب ہندوؤں کے ہیں۔ اقتدار میں ساجھے داری اور مساوات کو وہ محض فراڈ اور نمائش سمجھتے ہیں۔ اس غلط اندازِ فکر ہی کی وجہ سے وہ محسوس کرتے ہیں کہ وزیروں سے لے کر صدر کے عہدے تک مسلمانوں کی تقرری محض ایک دکھاوا ہے۔ انھیں خدشہ ہے کہ ہندو دھیرے دھیرے ان کی انفرادیت کو ختم کر کے انھیں اپنے اندر ضم کر لینے کی سازش کر رہے ہیں گولوالکر اور مدھوک جیسے ہندو لیڈروں نے اپنے قول و فعل سے ان کے اس شبہ کو مزید تقویت پہنچائی ہے۔

خطرناک نتائج

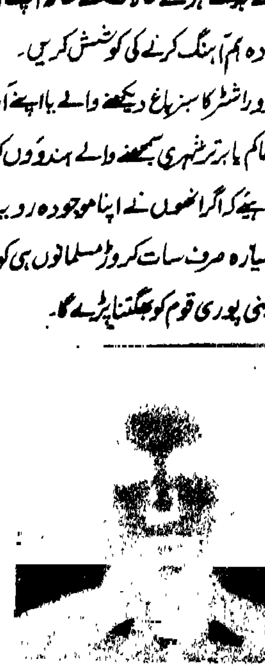
ہندوؤں اور مسلمانوں کے اس اندازِ فکر نے انھیں آزادی کے بعد ایک دوسرے سے قریب لانے کی بجائے ان کے درمیان اور زیادہ دوری پیدا کی ہے۔ ایک دوسرے کے تئیں شک و شبہ گھٹنے کی بجائے بڑھا ہے۔ ڈر، خوف، نفرت اور شبہ کے اس ماحول نے پورے ملک میں زیر زمین بارودی سرنگیں بچھا دی ہیں۔ جن کا اگرچہ اوپر سے کچھ پتہ نہیں چلتا لیکن جہاں بھی ماچس کی ایک تیلی جلا کر پھینک دیجئے کہ اچانک دھماکے شروع ہو جاتے ہیں۔ پھر لوگ حیران ہونے لگتے ہیں کہ یہ سب کچھ یوں اچانک کیسے ہو گیا؟ کل تک جو ایک دوسرے کے اچھے پڑوسی تھے ایک دوسرے کا خون بہانے پر کیوں تل گئے؟ لیکن سچ پوچھا جائے تو یہ سب کچھ اچانک نہیں ہوتا۔ نفرت کی یہ بارودی سرنگ ملک کے ہر

صوبے، ہر شہر اور ہر گاؤں میں پہلے ہی سے موجود ہے جس کے کسی بھی وقت پھٹ پڑنے کے لئے بس اتنی سی افواہ کافی ہے کہ مسلمانوں نے چوری سے گائے ذبح کر دی ہے یا ہندوؤں نے مسجد کے سامنے باجا بجا دیا ہے یا کسی مسلمان غنڈے نے کسی ہندو لڑکی کا یا کسی ہندو غنڈے نے کسی مسلمان لڑکی کا اغوا کر لیا ہے۔

ہندو کیا کریں؟

ہم نے یہ تو معلوم کر لیا کہ فسادات کیوں ہوتے ہیں۔ لیکن اب دوسرا سوال یہ آتا ہے کہ یہ کب تک ہوتے رہیں گے؟ اس کا جواب میرے پاس یہ ہے کہ جب تک فرقہ پرست ہندوؤں کا اپنی حاکمیت کا احساس اور فرقہ پرست مسلمانوں کا اپنی محکومیت کا احساس ختم نہیں ہو جاتا اور دونوں کو زبانی ہی نہیں بلکہ عملی طور پر بھی اس کا یقین نہیں دلا دیا جاتا کہ وہ اقتدار کے ساجھے دار ہیں اس وقت تک یہ سلسلہ ختم نہیں ہو سکتا خواہ کتنی ہی کانفرنسیں کی جائیں۔ بیانات دیئے جائیں یا تقریریں کی جائیں۔ پولیس اور فوج کے ذریعہ اس پر عارضی طور پر تو قابو پایا جا سکتا ہے لیکن مستقل حل ان کے پاس بھی نہیں ہے۔ اس سلسلے میں بنیادی ضرورت یہ ہے کہ ہندو رواداری اور وسیع النظری سے کام لیں اور ملک کے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کریں۔

ہندو راشٹر کا سبز باغ دیکھنے والے یا اپنے آپ کو ہندوستان کا حاکم یا برتر شہری سمجھنے والے ہندوؤں کو یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ اگر انھوں نے اپنا موجودہ رویہ نہیں بدلا تو اس کا خمیازہ صرف سات کروڑ مسلمانوں ہی کو نہیں بلکہ انھیں بھی یعنی پوری قوم کو بھگتنا پڑے گا۔



آسی بہاری

مسلمان کیا کریں؟

دوسری طرف مسلمانوں کو بھی اس خول کو توڑ کر باہر آنا ہوگا جس میں انجانے خطرات کا خوف دلا کر ان کے نام نہاد اور غلط رو رہنماؤں نے بند کر رکھا ہے انہیں خوابوں کی دنیا سے باہر نکل کر زندگی کے ٹھوس حقائق کا سامنا کرنا ہوگا۔ انھیں نئے حالات کے مطالبات کو سمجھنا اور ان کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کرنی ہوگی اور اس میں کوئی دو رائے نہیں ہو سکتیں کہ آج کے حالات کا تقاضہ ہے کہ مسلمان اپنے آپ کو اس ماحول کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں۔ جو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد وجود میں آیا ہے۔ اپنی انفرادیت کے زعم میں اگر انھوں کے ملک کے بقیہ ۴۸ کروڑ عوام سے الگ تھلگ رہ کر زندگی گزارنی چاہی تو وہ اپاہج بن کر رہ جائیں گے۔ انھیں قومی دھارے میں شامل ہونے کی بات سن کر بدکنے کی پرانی عادت چھوڑنی ہوگی کیونکہ یہ نہ کوئی انہونی بات ہے نہ غیر فطری۔ مسلمان اگر اپنے رہن سہن، رسم و رواج بلکہ کسی حد تک اپنے کچھ مذہبی عقیدوں کا بھی تجزیہ کریں تو انھیں پتہ چلے گا کہ اکثریتی فرقہ کی کتنی ہی چیزیں غیر شعوری طور پر ان کی زندگی میں اس طرح سے رچ بس گئی ہیں کہ اگر وہ اب انھیں نکالنا بھی چاہیں تو نہیں نکال سکتے۔ مسلمانوں کو اپنی کچھ ضدیں اور نازک مزاجیاں بھی ترک کرنی ہوں گی۔ مثال کے طور پر کیا اس سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان مسلمانوں کے ۹۰،۹۵ فیصد آباو اجداد ہندو ہی تھے۔ پھر اس تاریخی حقیقت کو مان لینے سے گریز کیوں ہے کہ ہندوؤں کے پوروج ہمارے بھی پوروج ہیں؟ کیا یہ بات مضحکہ خیز نہیں کہ مسجد کی بغل میں طوائف کا کوٹھا تو برداشت کر لیا جاتا ہے (بنارس کے مشہور تجارتی مرکز دال منڈی میں، جہاں مسلمان تاجروں کی تعداد تقریباً ۹۵ فیصد ہے، لب سڑک ایک ایسی مسجد ہے جس کی بغل میں بالکل ملا ہوا ایک طوائف کا کوٹھا بھی ہے) لیکن اگر ہندوؤں کا کوئی مذہبی جلوس ادھر سے باجا بجاتے ہوئے گزرنا چاہیں تو اسلام خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ ہولی کے دن اکثر صرف اس بات پر جھگڑا ہو جایا کرتا ہے کہ کسی مسلمان پر رنگ پڑ گیا۔ سوچنے کی بات ہے کہ جس رنگ کو آئے دن مسلم گھروں میں بھی بڑے شوق کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے وہی سال کے صرف ایک دن ہولی کے روز ناپاک کیوں مان لیا جاتا ہے؟ پھر اس بات کو بھی سوچنا چاہیئے کہ جب ملک کے ۴۸ کروڑ عوام مست ہو کر رنگ پاشی کر رہے ہیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ سات کروڑ بقیہ لوگوں پر اس کا ایک بھی چھینٹا نہ پڑنے پائے۔ بظاہر یہ چھوٹی موٹی باتیں ہیں لیکن وقت پڑے وقت یہی بارود کا کام کر جاتی ہیں۔

حکومت کیا کرے؟

جس طرح حکومت عوام کے تعاون کے بغیر اپنے کسی عظیم مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتی، اسی طرح کوئی بھی بڑا کام حکومت کے تعاون کے بغیر آسانی سے پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ فسادات کی روک تھام کے سلسلے میں حکومت کی طرف سے مؤثر اور سخت اقدامات نہایت ضروری ہیں گزشتہ ۲۵ سال کے دوران ملک میں چھوٹے بڑے سینکڑوں فسادات ہو چکے ہیں جن سے صاف پتہ چلتا ہے کہ روک

تمام کے لئے جس قدر سخت اور موثر کارروائی کی ضرورت ہے وہ نہیں کی گئی ہے۔ سرکاری عملہ کو اس معاملہ میں جس قدر غیر جانب دار ہونا چاہیئے وہ نہیں ہیں۔

مسلمانوں کو بھی اس خول کو توڑ کر باہر آنا ہوگا جس میں [illegible] کا خوف دلا کر ان کے نام نہاد [illegible] رہنماؤں نے بند کر رکھا ہے۔ انھیں خوابوں کی دنیا سے باہر نکل کر زندگی کے ٹھوس حقائق کا سامنا کرنا ہوگا۔

ایسی بہت سی شکایتیں موصول ہوئی ہیں کہ فسادات کے دوران پولیس نے کھلے عام کسی ایک فریق کا ساتھ دیا اور لوٹ مار میں حصہ لیا۔

پولیس میں جس پر امن وامان کی ذمہ داری ہے ایسے لوگوں کو ہرگز نہیں لیا جانا چاہیئے جن کی ذہنیت فرقہ وارانہ ہو یا جن کا تعلق کسی فرقہ پرست جماعت سے ہو۔

فساد کی روک تھام کے سلسلے میں مندرجہ ذیل اقدامات سے مدد مل سکتی ہے:۔

۱۔ جس علاقہ میں فساد ہو اس کے لئے وہاں کے سرکاری حکام کو ذمہ دار قرار دیا جائے۔

۲۔ تمام فرقہ پرست جماعتوں پر پابندی عائد کر دی جائے۔

۳۔ اشتعال انگیز تحریکوں شائع کرنے والے اخبارات اور رسائل ضبط کر لئے جائیں۔

۴۔ ہندوستان کی مروجہ تاریخ کو رد کر کے اسے نئے سرے سے مرتب کیا جائے۔

۵۔ جن لوگوں کے خلاف فرقہ وارانہ منافرت کے الزامات ثابت ہو جائیں ان کی جائیدادیں ضبط کر لی جائیں اور انھیں الیکشن لڑنے کے حق سے محروم کر دیا جائے۔

[illegible]

وہ نہیں ہیں۔

فرقہ پرست جماعتوں کا مقابلہ "بیلٹ باکس" کے ذریعہ کرنے کی بات جمہوری مزاج کے عین مطابق ہے لیکن دشواری یہ ہے کہ ہمارے ملک میں فرقہ پرستی نے اتنی مضبوطی کے ساتھ اپنے قدم جمالئے ہیں کہ اس کے خاتمہ کے لئے صرف "بیلٹ باکس" کارگر نہیں ہو سکتے۔

[redacted]

تم کہاں ہو
تمہیں اندازہ نہیں ہے شاید
یہ وہ رستہ ہے جو مقتل کی طرف جاتا ہے
میری آواز سنو
رہزنِ مرگ کے حلقے سے بچو
اپنی ہستی کی تہیں کھول کر جینا سیکھو
اور بے مہر اندھیروں کو نہ تحریر کرو

ایک ہی راہِ طلب کبھی آدرش بھی ایک
ایک ہی منزلِ مقصود تھی نظروں میں کبھی
ہمدم و ہم نفس و ہمسر و ہمدوش تھے ہم
جادۂ شوق میں آگے کوئی دیوار نہ تھی

رشتۂ درد کہیں ٹوٹتا ہے
جانے کیوں آج یہ رہ رہ کے گماں ہوتا ہے
تنگ نظروں نے تمہیں اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے
اور تم بھول گئے
عہدِ وفا، جوشِ جنوں

میری آواز سنو
پھر مری جانب دیکھو
ہاتھ سے ہاتھ ملاؤ
وہی مانوس حرارت دے دو
بڑھ کے سینے سے لگاؤ مجھے پہلے کی طرح
اور پھر دونوں اسی راہ پر سرشار چلیں
سایۂ امن و محبت ہے جہاں
دوستی، یک جہتی، پیار کی جنت ہے جہاں

علیگڑھ کا ایک واقعہ مجھے یاد ہے جس میں دو مسلمان نوجوانوں نے اپنے ہندو پڑوسیوں کو بچانے کی کوشش میں جان دے دی۔ یہ واقعہ جن کے ساتھ ہوا وہ ہمارے نزدیکی جان پہچان کے لوگ تھے۔ اس لئے اس واقعہ کی سچائی کے متعلق کوئی سوال نہیں اٹھایا جاسکتا۔

محمود اور رمضان

شکنتلا بریماہی

جن کے ساتھ یہ واقعہ ہوا ان کا نام مانک لال بھائی تھا۔ وہ پہلے کانپور میں رہتے تھے۔ لیکن کلکتے سے سیٹھ لکھی رام جی کے تیل کے کارخانے میں ایک اچھی نوکری ملنے کی وجہ سے کلکتہ چلے آئے تھے۔ ۱۲ اگست ۱۹۴۶ء کو انھوں نے کارخانے کے پاس ہی لب سڑک ایک مکان کرائے پر لے لیا۔ ان کے گھر میں کل چار افراد تھے۔ وہ خود، ان کی اہلیہ، ایک سولہ سال کی لڑکی اور ایک اٹھارہ سال کا لڑکا۔ ان لوگوں کے لئے یہ مکان کافی تھا۔

1 انھیں نئے مکان میں گئے ہوئے چار دن ہی ہوئے تھے کہ سولہ اگست آ پہنچا۔ مسلم لیگ کی طرف سے ہڑتال کا اعلان ہوا۔ اس ہڑتال کا زور مانک لال بھائی جی کے مکان کے آس پاس زیادہ تھا کیونکہ اس علاقے میں زیادہ تر دکانیں مسلمانوں ہی کی تھیں۔ مانک لال جی کے مکان کے نچلے دونوں حصوں میں بھی مسلمان ہی تھے۔

مکان کے ساتھ ایک بنیان کی دوکان تھی جس پر رمضان اور محمود دو بھائی بیٹھا کرتے تھے۔ ان کا سیاسی جھکاؤ تو مسلم لیگ کی طرف ہی تھا لیکن ان کی شرافت جانتے لوگوں کا بھی من موہ لیتی تھی۔ ۱۶ اگست کو صبح ہی انھوں نے اوپر آکر مانک لال بھائی سے کہا کہ اگر آج شام تک کے لئے آپ کہیں چلے جائیں تو اچھا ہوگا۔ لیکن مانک لال بھائی جی بڑے نڈر آدمی تھے۔ انھوں نے جواب دیا "ارے ایسی کیا بات ہے؟ آپ سب لوگ ہیں ہی، پھر ہمیں کیا خطرہ ہے؟"

دونوں بھائیوں نے کچھ دیر تک ان سے اصرار کیا اور پھر چپ چاپ واپس چلے گئے۔ اُن کے جاتے ہی مانک بھائی چھجے پر کرسی ڈال کر باہر کا تماشہ دیکھنے لگے۔ دوپہر کے دو بجے تھے۔ ہوا میں کچھ گرمی سی محسوس ہونے لگی تھی۔ تین بجے کے قریب ہڑتالیوں کے ایک بڑے جلوس نے راہ چلتے ہندو مسافروں کو مارنا شروع کر دیا۔

اور کچھ مکانوں، دکانوں کو نذرِ آتش کر دیا۔ کچھ ہی دیر میں اس جلوس کا ایک حصہ مانک لال بھائی کے مکان کے سامنے آپہنچا۔ اس وقت محمود اور رمضان دونوں بھائی اپنی بند دکان پر بیٹھے تھے۔ ان کو دیکھ کر جلوس آگے بڑھ گیا۔ اب محمود اور رمضان نے اوپر جاکر مانک لال بھائی سے پھر درخواست کی کہ وہ کہیں دوسری جگہ چلے جائیں، ابھی موقعہ ہے اور ہم آپ کو نکال سکتے ہیں۔ لیکن یا تو مانک لال بھائی کے سر پر 'ہونی' سوار تھی یا پھر انھیں باہر جانے کی بجائے گھر پر رہنا زیادہ محفوظ محسوس ہوا۔ اس لئے انھوں نے دونوں بھائیوں کو یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ آپ کے رہتے ہوئے ہمیں کوئی خطرہ نہیں۔

اس وقت مانک لال بھائی نے شاید ہی یہ سوچا تھا کہ اس رسمی جواب سے دونوں بھائی اپنے اوپر کتنی ذمہ داری محسوس کر رہے تھے۔

دوپہر تو کسی طرح کٹ گئی اور شام ہوگئی۔ پانچ بجے کے قریب مانک بھائی نے محسوس کیا کہ ایک جلوس پھر ان کے مکان کی طرف آرہا ہے۔ ان کا لڑکا اور لڑکی جلوس کو دیکھنے باہر چھجے پر جا کھڑے ہوئے۔ جلوس نے بھی ان بچوں کو دیکھا اور فوراً ہی آوازیں آنے لگیں کہ یہ تو ہندو ہیں۔ انھیں نیچے لاؤ۔ یہ کافر کے بچے یہاں کیسے زندہ ہیں؟"

مکان کے نچلے حصے میں جو مسلمان کرایہ دار تھے انھوں نے بھیڑ کو سمجھانا چاہا، لیکن مذہب کے دیوانے، کبھی ایسی بیکار بات سنا نہیں کرتے۔ رمضان اور محمود اس وقت کسی اور جگہ گئے ہوئے تھے۔ اس لئے بھیڑ اوپر کی منزل پر پہنچ گئی اور دروازے کو ڈنڈوں سے پیٹنے لگی۔ یہ دیکھ کر مانک لال بھائی نے دروازہ کھول دیا اور کڑک کر بولے "کیا بات ہے؟ اتنا شور کیوں مچاتے ہو؟ ہم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟"

بھیڑ میں سے ایک آدمی نے چیخ کر کہا "پکڑو سالے کو، بڑا شریف بنا پھرتا ہے۔ مار ڈالو۔"

لیکن کسی دوسرے شخص نے اس غنڈے کا اوپر اٹھا ہوا ہاتھ تھام کر کہا "نہیں۔ ان سے تو پیسہ لینا ہے۔ مار کر ہم کو کیا ملے گا۔"

مانک لال بھائی نے پانچ سو روپے دے کر اس بھیڑ سے جان بچائی۔ بھیڑ کے وہاں سے جانے کے بعد ہی محمود گھر لوٹا اور راستے میں خبر لینے کے لئے وہ مانک لال بھائی کے گھر بھی پہنچا۔ پورا واقعہ سن کر اسے بہت دکھ پہنچا۔ اب مانک لال بھائی جانے کے لئے بھی تیار تھے لیکن اب سواری ملنا ناممکن تھا۔ آخر یہی فیصلہ ہوا کہ اب تو گھر میں ہی بیٹھا جائے۔

رات ہوتے ہی محمود پھر آیا اور اس نے مانک لال بھائی کے گھر ہی سونے کا ارادہ ظاہر کیا۔ لیکن ایسے کشیدہ حالات میں مانک لال بھائی نے محمود کو اس کے خاندان سے دور رکھنا زیادتی سمجھا اور اسے گھر واپس بھیج دیا۔ اس طرح جب پورے کلکتہ میں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے گلے پر جنوانوں کی طرح چھری چلا کر اپنے اپنے مذہب کی حفاظت کر رہے تھے۔ اس وقت مانک لال بھائی اور رمضان اور محمود کے درمیان اس طرح کی محبت بھری کھینچا تانی چل رہی تھی۔ حالانکہ دونوں کے بیچ کوئی پہلی گہری جان پہچان بھی نہیں تھی۔

یہ رات مانک لال بھائی نے جاگتے ہی کاٹی۔ اور جوں جوں سورج چڑھتا گیا توں توں مارو۔۔۔ کاٹو کی آوازیں

[redacted]

اور بے بس لوگوں کی چیخ و پکار بھی بڑھتی گئی۔ آج ہندوؤں نے اپنے جوہر دکھانے شروع کر دیئے تھے۔ دلیل یہ تھی کہ بلوائی مسلمانوں سے اپنی حفاظت کا صرف یہی علاج ہے۔ لیکن تماشہ یہ تھا کہ بلوائی مسلمان اپنے علاقے میں جن ہندوؤں کو نقصان پہنچا سکتے تھے اور پہنچا رہے تھے وہاں اِن "ویر ہندوؤں" میں سے کوئی جھانکتا بھی نہیں تھا اور اپنے علاقے میں گھرے ہوئے جن اکا دکا مسلمانوں پر یہ اپنی بہادری دکھا رہے تھے وہ مسلمان چاہتے ہوئے بھی ہندوؤں کو قطعی نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے۔ بلوہ پسند مسلمان خود بھی یہی چاہتے تھے تاکہ ان غدار مسلمانوں کا منہ بند کر سکیں۔ جو انھیں لوٹ مار کرنے سے منع کرتے تھے۔ اس وقت دونوں اطراف کے غنڈوں کی چاندی تھی۔ اور وہ اس ناجائز موقعہ سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا لینا چاہتے تھے۔ اس لئے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں ایسی افواہوں کا زور تھا جن سے باہمی دنگے فساد کی اصلی نوعیت سے کئی گنا زیادہ دہشت پھیلی تھی۔ ایسی افواہوں سے دونوں طرف کے لوگوں میں جوش اور انتقام کی آگ زیادہ سے زیادہ بھڑکانے کا کام لیا جا رہا تھا۔ جو لوگ ان افواہوں کو تسلیم کرنے سے منکر تھے انھیں غدار قرار دے دیا گیا

اس دن مانک لال بھائی کے مکان پر ایک اور حملہ ہوا اور اس نے اپنے کپڑے اور برتن دے کر اپنی جان بچائی وہ سمجھ گئے کہ اب جان بچانا بہت مشکل ہے۔

اسی دن یعنی ۱۱ اگست کو پانچ بجے ایک ہجوم پھر مانک لال بھائی کے مکان پر پہنچا۔ دروازے پر ہتھوڑے پڑنے لگے۔ نچلی منزل میں رہنے والے مسلمان ہجوم کی خوشامد کر رہے تھے لیکن انھیں ڈانٹ کر چپ کرا دیا گیا۔ اور وہ الگ کھڑے ہو گئے۔

مانک لال بھائی نے یہ سوچ کر کہ دروازہ بالآخر ٹوٹ ہی جائے گا خود ہی کھول دیا۔ ان کی سولہ سال کی بیٹی اپنے باپ کی حفاظت کے لئے مانک لال بھائی کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ اسے دیکھ کر مذہب کے دیوانے فحش کلامی پر اتر آئے مانک لال بھائی بے بسی سے سب کچھ سن رہے تھے۔ چند ہی لمحوں کے بعد غنڈوں نے آپس میں فیصلہ کیا کہ پہلے اس بڈھے کو ٹھکانے لگایا جائے، عورتوں کا بٹوارہ بعد میں ہو جائے گا جب ہجوم مانک لال بھائی کو باہر کھینچنے لگا تو اسی وقت دو مسلمان نوجوان ہجوم کو چیرتے ہوئے آگے بڑھے اور گرجتی ہوئی آواز میں کہا "خبردار، جو کسی نے ہاتھ اٹھایا۔ مال چاہیئے تو مال لے جاؤ۔ لیکن تم ان معصوم انسانوں پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتے"۔

وہ محمود اور رمضان تھے جو مانک لال بھائی کے گھر پر حملہ ہونے کی خبر سن کر اپنے گھر سے بھاگ آئے تھے۔

اب محمود اور ہجوم میں بحث ہونے لگی۔ محمود قرآن شریف کے حوالے پر حوالے دے رہا تھا کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے کس طرح اپنے پڑوسیوں اور دوسرے مذہب کے لوگوں سے اچھا برتاؤ کرنے کا سبق دیا ہے اور ہجوم ہندوؤں کے ظلموں کی مثالیں دے رہا تھا۔ محمود کہتا تھا کہ جن ہندوؤں نے ظلم کیا ہے۔ ان سے لڑو۔ وہ تمہارا ساتھ دے گا۔ محمود کے دلائل سن کر ہجوم جھلا اٹھا۔ کچھ نوجوانوں نے فوراً لوہے کی موٹی سلاخوں سے محمود کی پٹائی شروع کر دی اور وہ نیچے گر گیا۔ مذہب کے کام میں جو رکاوٹ ڈالے بھلا اسے زندہ رہنے کا کیا حق ہے۔ کچھ ہی دیر میں محمود کی لاش خون میں لت پت فرش پر پڑی تھی۔

رمضان نے اپنے بھائی کو اس طرح سے گرتے دیکھا تو سمجھ لیا کہ اگر اس نے بھی ہجوم کو روکنے کی کوشش کی تو اس کا بھی یہی انجام ہوگا۔ اس نے اندر داخل ہو کر ماں، بیٹی اور بیٹے کو کمرے میں بند کر دیا اور خود اس دروازے کے سامنے جم کر کھڑا ہو گیا۔ ہجوم جیسے ہی آگے بڑھا اس نے اپنے راستے میں رمضان کو حائل دیکھا۔ لیکن دین دھرم کے دیوانے ایسی رکاوٹوں کو کب خاطر میں لاتے ہیں۔

فوراً ہی رمضان پر بھی وار ہونے لگے اور کچھ ہی وقت میں وہ بھی اپنے بھائی سے جا ملا۔ مانک لال بھائی کا سب خاندان باندھ لیا گیا۔ انھیں نیچے سڑک پر لایا گیا تاکہ تڑپا تڑپا کر ان کی جان لی جائے۔ کم سے کم ایک دوسرے کے قتل کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔ بہادری کا جذبہ اس وقت اپنی انتہا پر تھا۔

مانک لال بھائی اور ان کا خاندان سڑک پر کھڑے کر دیئے گئے۔ اب بحث اس بات پر تھی کہ پہلے کسے ٹھکانے لگایا جائے... باپ کو یا بیٹے کو؟ ماں اور بیٹی کو تو قتل کرنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ انھیں تو صرف یہ تماشہ دکھانا تھا۔

یہ بحث کسی فیصلے پر پہنچی ہی تھی کہ فوجی دستے کی گاڑیوں کی گڑگڑاہٹ گونج اٹھی۔ اور گولیوں کی آوازیں فضا کو چیرنے لگیں۔ بس ان آوازوں کا آنا تھا کہ مذہب کے دیوانے ویر بھاگ کھڑے ہوئے۔ رمضان اور محمود کے سمجھانے پر اور قرآن شریف کے حوالے پر جو راہ راست دیکھنے سے منکر تھے ان کی بہادری کا تمام جوش بندوق کی ایک گولی کی آواز پر ہی ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس طرح مانک لال بھائی اور ان کا خاندان موت سے ہمکنار ہو کر بھی بچ گیا۔

فوجیوں نے انھیں اپنی گاڑی میں بٹھا لیا۔ لیکن مانک لال بھائی کی بیوی گاڑی سے اتر گئی اور اپنے مکان کی طرف بھاگی۔ فوجیوں نے اسے روکنا چاہا تو اس نے کہا کہ اس کے دو بیٹوں کی لاشیں تو اوپر ہی پڑی ہیں۔ ارے انھیں ایک بار آنکھ بھر کر تو دیکھ لینے دو"۔ اس نے کہا۔

فوجیوں کو رحم آ گیا اور وہ پورے خاندان کو اوپر لے گئے۔ وہاں پہنچ کر پورا خاندان محمود اور رمضان کی لاشوں کے ساتھ لپٹ کر اس طرح بلک بلک کر رونے لگا کہ در و دیوار تک پسیجتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ نچلی منزل کے مسلمان پڑوسی حیران تھے کہ جب پورا خاندان بچ گیا ہے تو پھر وہ ہائے ہائے کیوں کر رہے ہیں۔ انھوں نے سوچا کہ شاید اپنے مالی نقصان پر آہ و بکا کر رہے ہیں۔ ہاں نقصان بھی ہی....... لیکن یہ تو انھیں بعد میں معلوم ہوا کہ ان کے نقصان کی نوعیت کیا تھی اور وہ مال کتنا قیمتی تھا۔

محمود کی دکان آج بھی وہیں ہے۔ اس پر محمود اور رمضان کی پیاری صورتیں اب دکھائی نہیں دیتیں لیکن جب وہاں سے کوئی گزرتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کہہ رہا ہو "مسلمان کیسے ہوتے ہیں اور اسلام کیا ہے اس کا اندازہ ان لوگوں سے مت لگاؤ جو اس وقت تمہارے عزیزوں کی عزت اور جان لینے پر تلے ہوئے تھے۔ اسلام کی تعلیم کا ایک مختصر سا خاکہ ہم نے اپنے خون سے کھینچا ہے اور سچ جانئے...... اسلام کی سچی اور حقیقی تعلیم یہی ہے۔



وحشت اور فرشتے

سعید راجوشی

ہم جمشید پور کے ایک گاؤں میں پہنچے۔ گاؤں کے بہت سے مکانوں کے جلے ہوئے مناظر سے ہم کو بہت صدمہ پہنچا۔ مُردہ ہڈیاں، لمبے بال، خون آلود دیواریں، یہ سب انسانی مصیبتوں کی داستان بیان کر رہی تھیں۔ زخمیوں کی چیخ و پکار سے کہیں زیادہ تیز وہاں کا سنّاٹا تھا۔

یہ سب کچھ آدِی واسیوں کے سبب ہوا جنھوں نے کچھ نہ سنایا خموشی اختیار کی۔ کسی نے ان تک پہنچنے یا ان سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔ جارحیت اور خطرہ کے اس غار میں پھنس کر ہم نے ان سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ سخت مشکلات کے بعد ہم آدِی واسیوں کے ایم۔ ایم۔ سی سے مل پائے۔ ہم نے آدِی واسیوں کے گاؤں کا دورہ کرنے کی خواہش ظاہر کی۔

اس نے سختی سے نفی میں جواب دیا۔

"تم وہاں نہیں جاسکتیں۔ میں اس معاملے میں مجبور ہوں۔ جب فسادات شروع ہوئے تو میں نے ان کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن آدِی واسیوں نے اس کا جواب مجھ کو کمرہ بند کرتے ہوئے دیا۔ جب مجھ کو رہا کیا گیا تو حالات قابو سے باہر ہو چکے تھے۔"

اس کے بعد ہم سے پرانی ایم۔ ڈی۔ ڈی کو پکڑا اور اُس سے اُن کے گاؤں میں لے چلنے کی درخواست کی۔ وہ یہ کہتے ہوئے راضی ہو گیا کہ وہ اِس مقصد کے لئے صرف دو گھنٹے کے اندر اندر واپس آجائے گا۔ ایسا معلوم ہوا کہ اس لمحہ اس کی گھڑی کی سوئیاں رُک گئی ہیں۔

ہم اس گاؤں میں کافی اداس بیٹھے ہوئے تھے کہ گاؤں کے کچھ سردار آپہنچے۔ انھوں نے ہم سے کہا۔

"ہم نے سنا ہے کہ کچھ لوگ فسادات کے مرتکب ہم کو بتلاتے ہیں اور جس کا آپ کو یقین ہے؟"

موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم نے کہا "الزام کسی پر بھی عاید ہوتا ہو لیکن قتل و غارت گری روکنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ سرپنچ ہونے کی حیثیت سے لوگ تمہاری سنیں گے۔"

"ہم ایسا ہی کریں گے جیسا کہ آپ چاہتے ہیں۔" انھوں نے کہا۔

"آدِی واسیوں کے گاؤں میں چل کر ان سے بات کرتے ہیں۔ جب آپ اپنے خیالات کا اظہار کریں گے تو وہ سنیں گے۔"

کچھ دیر تک تو انھوں نے مختلف عذر پیش کرتے ہوئے ٹالنے کی کوشش کی۔ "مثلاً سورج غروب ہو گیا ہے، اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے، واپسی میں بہت مشکل پیش آئے گی، جنگل بہت گھنا ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ دیکھتے ہوئے کہ ہم کسی طرح ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں تو وہ راضی ہو گئے۔

ہمارے پہنچتے ہی بہت سے آدِی واسی ہمارے چاروں طرف جمع ہو گئے۔ اس جگہ ہم لوگوں کو دیکھ کر وہ چکرا گئے۔ میں نے پوچھا "تم لوگ تیر کمان سے مسلح کیسے گھوم رہے ہو؟"

دراصل تیر کمان جیسا ہتھیار تو وہ لوگ عموماً اپنے ساتھ رکھتے ہیں لیکن اچانک اس طرح کا سوال سن کر انھوں نے کہا "مسلمان ہم کو قتل کرتے ہیں، ہم اِن سے اپنی حفاظت کرتے ہیں۔"

"کون مارا گیا؟" میں نے پوچھا۔

"ہر جگہ انھوں نے قتل کئے۔"

"کہاں کون مارا گیا؟ آدمی اور گاؤں کا نام بتاؤ تاکہ ہم آگے بڑھیں اور معلومات کریں۔"

انھوں نے ہکّا بکّا ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ ہمت کر کے ان میں سے ایک نے کہا "ہم نے سنا ہے کہ انھوں نے بہت سے گاؤں تباہ کر دیئے۔ اور کتنے ہی آدمیوں کو مار ڈالا۔ پولیس نے سب مسلمانوں کو گرفتار کر لیا ہے جو کہ تھانے میں نظر بند ہیں۔ شاید ان کو رہا کیا جا رہا ہے۔ یہ کانگریسی لوگ ان کی رہائی کے لئے کوشش کر رہے ہیں۔"

"کیا تم ہمارے ساتھ چل کر خود دیکھو گے؟" میں نے معلوم کیا۔

لاپرواہی سے جواب دیتے ہوئے انھوں نے اس لئے منع کر دیا کہ وہ وہاں جا کر اپنی جانیں ضائع کرنا نہیں چاہتے۔ میں نے کہا "میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔"

ایک عورت نے کہا "میں چلوں گی۔ ان بزدلوں

کو یہیں رہنے دو۔"

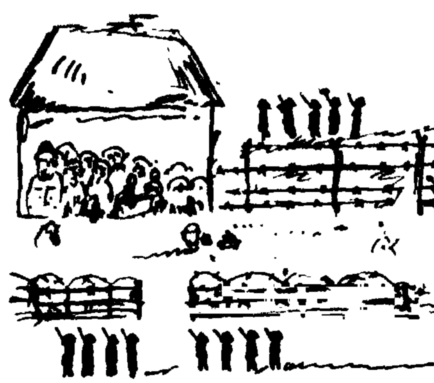
اب کچھ اور آدِ واسی بھی چلنے کیلئے راضی ہو گئے۔

ہم تھانے پہنچے۔ جہاں ایک اجنبی حاضر ہوا۔

بڑی بے رحمی سے پٹائی کے بعد، اپنی جائیداد لُٹ جانے کے بعد، کچھ عزیزوں کی جانیں ضائع ہو جانے کے بعد، بہت سے مسلمانوں نے تھانہ کی چہار دیواری میں پناہ لی تھی جھلسا دینے والی دھوپ میں ان کی حالتِ زار قابلِ رحم تھی۔

جو آدِ واسی ہمارے ساتھ آئے تھے وہ فاصلے سے ایک دوسرے کو تکتے رہ گئے۔ پھر آہستہ آہستہ وہ نزدیک آئے اور اچانک ان کی آنکھوں میں پچھتاوے کے آنسو اُمڈ آئے۔ انھوں نے اصرار کیا کہ مسلمان اپنے گاؤں کو واپس جانے چاہئیں۔

آنکھوں سے اُمڈے ہوئے طوفان نے نفرت، شک خوف اور دشمنی کو دھو ڈالا۔



دولت اور مذہب

پرانی عیدگاہ کے آس پاس قرول باغ کی رِج پر ہزاروں مسلمان پناہ گزینوں کا کیمپ تھا۔ کڑکتی دھوپ تھی۔ نیچے تپتی ہوئی چٹانیں، اوپر آگ برساتا آسمان۔ چاروں طرف ان کی حفاظت کے لئے فوج کا پہرا تھا۔ پہرے کے اُس پار پاکستان سے نکالے گئے شرنارتھی جو وہاں کی ظلم و ستم کے زندہ ثبوت تھے۔ دنگا کرنے والوں کی پھیلائی ہوئی نفرت، کہانیاں، افواہیں۔

بھلے لوگوں کا خیال تھا کہ یہ مسلمان ہندوؤں کو مار رہے تھے، حملہ کر رہے تھے۔ پاکستان کا ساتھ دیکر آزاد بھارت کے ساتھ غداری کر رہے تھے اس لئے انھیں یہاں فوج کے پہرے میں گھیر رکھا ہے۔

ہم لوگ وہاں پہنچے۔ کچھ جاننے والے لوگ دوڑ دوڑ کر ملنے آئے۔ کچھ دہلی کلاتھ مِل کے کاریگر تھے جنھوں نے وہاں اپنے ہندو ساتھی کاریگروں کے ساتھ مل کر کندھے سے کندھا لگا کر کئی سال مزدور تحریک چلائی تھی۔ سبھائیں کی تھیں، مل کر گیٹ پر سرمایہ داری کے خلاف تقریریں کی تھیں اور تقریریں سن کر دوسروں کی آواز سے آواز ملا کر نعرے لگائے تھے، ہڑتال و مظاہرے کے راستے میں ہندو ساتھیوں کے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر لوہے کی دیوار کی طرح کھڑے ہو گئے تھے۔ خیر چھوڑیئے ان باتوں کو۔

آج وہ اس میدان میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ پڑے تھے۔ مِل کے ایک ہندو افسر نے سرِ عام اعلان کر دیا تھا اگر مسلمان کاریگروں کا خاتمہ نہ کر دوگے تو میں مسلمان ہو جاؤں گا۔ ایسی خطرناک دھمکی کا اثر کیسے نہ ہوتا؟ یونین توڑنے کا ایسا موقع پھر کہاں ہاتھ آنا تھا۔ مسلمان کاریگر مارے گئے، کچھ بھگا دیئے گئے کوئی خاندان سمیت، کوئی بچوں سمیت اور کوئی اپنی بیوی کھو کر اس میدان میں اپنی جان بچا کر پڑے ہوئے تھے۔

یہ سب اس انتظار میں تھے کہ گاندھی جی کی ہمدردی اور نہرو جی کی اجازت کب پہنچے گی راحت لے کر۔ لوگ کیمپ کے اندر ریجھے گھما رہے تھے۔ بچے، عورتیں، پھٹے چیتھڑوں میں دھوپ سے بچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ادھر اُدھر برتن پڑے تھے۔ کہیں کہیں اینٹیں جوڑ کر چولہے پر کھانا بنانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

ایک چولہے کے پاس بڑا سا مٹی کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ میں ٹھوکر کھا کر گرتے گرتے بچی۔ معاف کیجئے معاف کیجئے سب بول پڑے۔ وہ کہنے لگے کہ ہمارے بھائی مر گئے، دنگے میں زخمی ہو گئے۔ دھوپ برداشت نہ کر سکے۔ قبرستان تو ہم لوگ پہنچ نہیں سکتے تھے، مٹی کھودنے کا سامان بھی نہیں تھا ہاتھوں سے مٹی بٹور بٹور کر یہیں اوپر ڈال دی ہے۔

یہی سب کچھ گھوم پھر کر دیکھ رہی تھی۔ دہلی کلاتھ مِل کے مزدور پہچان پہچان کر آنکھوں میں آنسو بھر بھر کر ادب سے سلام کر رہے تھے۔ ہمارے یونین کے ممبر تھے۔ ان کے ساتھ کتنی بار قدم ملا کر سماج واد کی طرف بڑھانے کا وعدہ کیا تھا آج ان کی غمگین آنکھیں بربادی میں سماج واد تلاش کر رہی تھیں۔

کچھ لوگ دوڑے ہوئے آئے اور کہنے لگے کہ ہمیں پہاڑ گنج لے چلئے، ہم جلدی میں بھاگ آئے، لیکن ہمارے بچے ابھی وہیں ہیں۔ ہم لوگوں نے دوڑ بھاگ کی دوسرے دن مدراس فوج کے کچھ جوان لے کر ہم ان لوگوں کو پہاڑ گنج لے گئے۔ گلیوں میں لاشوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے جو گل چکی تھیں ان میں کیڑے پڑ گئے تھے۔ مارے بدبو کے ایک قدم آگے بڑھانا مشکل تھا۔ ہمارے ساتھ حکیم خلیل الرحمٰن تھے۔ وہ ہمارے رومالوں پر بار بار عطر ڈال رہے تھے۔ چاروں طرف جلی ہوئی، گری ہوئی عمارتیں تھیں۔ ایک بڑی عمارت سامنے آگئی۔ کئی منزلی تھی۔ صرف دیواروں کا ڈھانچہ کھڑا تھا اوپر سب سے اوپر کانگریس کا ترنگا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ نیچے ایک بورڈ لگا تھا جس میں ہندی اور اردو میں لکھا تھا۔ "ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی ÷ یہ سب ہیں بھائی بھائی" جھنڈے اور بورڈ پر آنچ بھی نہ آئی تھی۔ یہ اس کانگریسی خاندان کا آخری پیغام تھا۔

جو بچوں کو نکالنے گئے تھے۔ انھوں نے کہہ دیا وہاں کوئی نہیں ہے۔ تب ہم نے ان سے کہا کہ آپ اپنے نام بتا بتا کر آوازیں دیں تاکہ ان گھروں میں کوئی زندہ ہو تو نکال لے چلیں۔ آوازیں لگنی شروع ہوئی۔

ایک گھر میں سے بھوت کی طرح ایک آدمی نکلا۔ کواڑ پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ خوف اور نقاہت سے قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ ہم نے سہارا دیا۔ سوالات کئے۔ اس کے ہونٹ ہلتے تھے، آواز نہیں نکل رہی تھی۔ اسے جھنجھوڑا گیا۔ کان میں زور زور سے چلائے، تو اس کی آواز واپس آئی۔ ہم نے پوچھا اور کوئی زندہ ہے تو بلاؤ۔ اس نے کہا کوئی نہیں ہے۔ ہم لوگوں نے کہا ڈھونڈو، آوازیں دو، آپ کو کیسے معلوم کہ

ان گھروں میں کوئی نہیں؟ اس جلتی پھرتی لاش نے کہا کہ میں رات کو کچھ کھانے کی تلاش میں اِن گھروں میں گھومتا رہا۔ کچے چاول اور اناج چبا تا رہا۔

آواز لگاتے ہوئے ایک مکان کے سامنے پہنچے۔ دروازے کے سامنے اتنی لاشیں تھیں کہ ہم دور کھڑے رہے آواز لگتی رہی۔ تھوڑی دیر میں دیکھا ایک بہت بوڑھی عورت آکر چوکھٹ پکڑکر کھڑی ہوگئی۔ ہمارے ساتھ گئے لوگ آگے بڑھے۔ لاشوں پر پیر رکھ کر اور آگے بڑھے۔ دو چار پہنچ گئے۔ ایک چیخ مار کر گر گیا۔ پیر پڑتے ہی لاشیں ہلیں۔ نیچے سے ایک نے سر نکالا۔ پھر اندر کر لیا۔ فوج کے سپاہی آگے بڑھے۔ لاشوں کے نیچے سے آدمی کو نکالا جو آہٹ سنتے ہی خوف سے لاشوں کے نیچے دُبک جاتا تھا۔ رات کو زندگی کی تلاش میں گھومتا تھا۔

بوڑھی عورت کو اٹھا کر باہر لائے۔ وہی حال اس کا۔ ہونٹ ہلتے تھے آواز نہیں نکلتی تھی۔ ہلا ہلا کر ٹھیک کی گئی مسلمان ساتھیوں نے اپنے نام بتائے۔ بوڑھیا پوری طرح ہوش میں آگئی، بولی:-

"مجھے ذرا واپس اس گھر میں لے چلو میں اپنا قرآن شریف اٹھا لاؤں"۔ ایسے وقت اور کیا مانگتی۔ اس کے ہم مذہب اسے لے گئے۔ ہم لوگ باہر کھڑے تھے۔ دس منٹ بعد وہ عورت روتی چیختی دروازے پر پھر پہنچی" میں لٹ گئی برباد ہوگئی، میرا سب کچھ انھوں نے چھین لیا"۔

پلک جھپکتے ہی فوجی گھر کے اندر تھے۔ سب کو پکڑ کر باہر لے آئے۔

بڑھیا نے حالات سمجھ لئے تھے اور قرآن شریف کا نام لے کر گھر کا جمع روپیہ لینے گئی تھی۔ ساتھ جانے والوں نے لپٹ کر چھین لیا۔

مدراسی فوجی نے اپنی بندوق چھیننے والے کے سر سے لگا دی۔ کہا" اتنی لاشیں آس پاس پڑی ہیں تیری اور ڈال دوں گا۔ مسلمان ہوکر بھی اپنے مذہب والوں سے ایسا کرتا ہے واپس کر دو اس کی تھیلی"۔

اس نے کانپتے ہاتھوں سے تھیلی لوٹا دی، اور ہکلاتی ہوئی آواز میں بولا" حضور! مصیبت میں اور پیسے کے معاملے میں ہم مذہب کی کیا بات؟"



ہندوستان کے دستور میں سیکولرازم کا تصور

شہباز حسین

ہندوستان کے دستور کے نفاذ کے بعد سے سیکولرازم، سیکولر ریاست، سیکولر انداز نظر وغیرہ کی باتیں عام ہوگئی ہیں۔ مگر سیکولرازم کا مطلب کیا ہے؟

سیکولر اندازِ نظر یا سیکولرازم کے بارے میں عام طور پر ہمارے ملک کے لوگوں کو خصوصاً مسلمانوں کو بڑی غلط فہمی ہے۔ وہ اس سے ایسا اندازِ فکر مراد لیتے ہیں جو سرے سے مذہب کا اور اس کی اعلیٰ قدر و قیمت کا منکر ہو۔ مگر دراصل سیکولرازم لازمی طور پر مذہب کا مخالف یا اس سے بیگانہ نہیں ہے۔

دستور کو سیکولرازم کی کسوٹی پر پرکھنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس کسوٹی کا ہی تعین کر لیا جائے۔ پھر ہم صحیح نتیجے اخذ کر سکیں گے۔ موٹے طور پر ہم سیکولرازم کی یہ تعریف کر سکتے ہیں۔

"سیکولرازم علم صحیح یا سائنس کو اعتقادی یا مافوق طبعی مفروضات کے دخل سے آزاد کر کے اس کی بنا مشاہدے تجربے اور عقل پر رکھتا ہے۔" انسائکلو پیڈیا برٹینکا کے مطابق "سیکولرازم کا مطلب ہے غیر روحانی" جس کا مذہب یا روحانی باتوں سے کوئی تعلق نہ ہو۔" کوئی بھی چیز جس کا تعلق مذہب سے نہ ہو۔" غرض یہ کہ سیکولر یا سیکولرازم سے مراد وہ انداز نظر ہے جس میں مذہب کو کسی قسم کا کوئی دخل نہ ہو۔ اس کا منطقی نتیجہ نفی مذہب کی صورت میں نہیں نکلتا بمقصد صرف یہ ہے کہ فرد یا قوم یا مملکت کے سامنے کسی چیز کو پسند کرنے یا ناپسند کرنے کی وجہ مذہب نہ ہو۔ مذہب کسی فرد یا فرقے کا اپنا نجی اور ذاتی معاملہ ہے اور سماج اور حکومت اسے اس بات کی پوری اجازت دیتی ہے کہ وہ اپنی پسند کے مذہب یا عقیدے پر عمل کرے مگر کسی مخصوص مذہب یا عقیدے کو ماننے کی وجہ سے وہ افضل یا کمتر نہیں ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سیکولرازم اس شعر

جدا دین ہو سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

کی نفی ہے اور دین و سیاست کو جدا کرنے کا مدعی ہے کیونکہ دنیا کو اپنی نجات اسی بات میں نظر آتی ہے۔

اسی طرح ہم سیکولر ریاست سے کیا مراد لیتے ہیں؟ موٹے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سیکولر ریاست سے ایک ایسی ریاست مراد ہے جو فرد اور جماعت کو مذہبی آزادی کی ضمانت دیتی ہے۔ کسی شہری سے بلا امتیاز مذہب و ملت صرف شہری کی حیثیت سے سروکار رکھتی ہے۔ دستوری لحاظ سے کسی خاص مذہب سے تعلق نہیں رکھتی اور وہ کسی مذہبی معاملے میں دخل دیتی ہے اور نہ کسی خاص مذہب کو ترقی اور بڑھاوا دینے کی کوشاں رہتی ہے۔

قبل اس کے کہ ہم اس کسوٹی پر ہندوستان کے دستور کو رکھیں، اگر سیکولرازم کے تصور کے آغاز و ارتقا کا ایک سرسری جائزہ لے لیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔

سیکولرازم کا تصور کسی خلا میں پیدا نہیں ہوا بلکہ تاریخی عوامل نے اس کی نشو و نما کی ہے۔ اس کے سب سے اولین نشانات ہمیں حضرت عیسیٰؑ کے اس پیغام سے ملتے ہیں "جو چیز سیزر کی ہے وہ سیزر کو دو اور جن چیزوں کا تعلق خدا سے ہے وہ خدا کے حوالے کرو۔" رومی سلطنت کے حکمران سیزر اپنی عیسائی رعایا سے مذہبی وفاداری کے طالب تھے اور جو لوگ مذہبی معاملوں میں ان کے احکام پر عمل نہیں کرتے تھے وہ ظلم و ستم کا نشانہ بنتے تھے۔ اسی فضا میں یہ ایک بالکل نئی آواز گونجی جس میں دنیاوی اور دینی معاملات میں فرق کیا گیا تھا۔ اس وقت کی رومی اور یونانی سلطنت میں ریاست سے مذہب کی علیحدگی کا کوئی تصور نہیں ملتا۔ ریاست یا بادشاہ ہی مختارِ کل تھا اور وہ اپنی رعایا کی زندگی کے ہر شعبے پر اثر انداز تھا جس میں اس کا مذہب یا عقیدہ بھی شامل تھا۔

یونان کے شہر، جو اضافۂ آبادی سے چھوٹی موٹی ریاستیں بن گئے، خود مذہبی نوعیت رکھتے تھے اور کسی مشہور مندر کے اردگرد بسے ہوئے تھے۔ جہاں دیوتا کا سب سے بڑا مندر ہوتا تھا، وہی جگہ دارالخلافہ بھی ہوتی تھی۔ روم کے شہنشاہ بذات خود خدا تھے اور ریاست کی شہریت حاصل کرنے کے لئے ان کی پرستش ایک شرط کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس طرح یورپ میں مسیحیت کے فروغ کے ساتھ ساتھ یہ تصور زور پکڑتا گیا کہ حکومت یا ریاست اپنے شہریوں سے صرف دنیاوی معاملات میں سروکار رکھتی ہے اور دینوی معاملات میں اس کو دخل دینے کا کوئی اختیار نہیں۔ پانچویں صدی عیسوی میں اس تصور نے باضابطہ شکل اختیار کر لی اور پوپ گلاسیس اوّل نے واضح طور پر حد بندی کر دی کہ مذہب اور ریاست کے دو الگ الگ دائرے ہوں گے جن میں ایک دوسرے کو مداخلت کا کوئی اختیار نہ ہوگا۔

نظری طور پر یہ مسئلہ طے تو پا گیا۔ مگر اسے عمل میں آنے میں سینکڑوں برس لگے۔ ریاست اور مذہب کے دو الگ الگ خانے بن گئے مگر ایک میں دوسرے کی مداخلت جاری رہی۔ یورپ کی غالب آبادی رومن کیتھولک عقیدے کی پیرو تھی۔ جو لوگ اس سے انحراف کرتے تھے حکومت وقت ان پر طرح طرح کے مظالم ڈھاتی تھی۔ تمام معاشی اور سیاسی

سرگرمیاں مذہبی تعلیمات کے زیر سایا تھیں۔ مشہور سائنسدانوں کو مذہبی کٹرپن کی وجہ سے سخت مصائب جھیلنے پڑے۔ مگر سولہویں صدی عیسوی کے بعد سے حالات میں تبدیلی آنے لگی۔ نئے نئے ملک دریافت ہونے لگے۔ دوسرے ملکوں اور مذہب کے لوگوں سے واسطہ پڑا۔ رومن کیتھولکوں کی اجارہ داری ختم ہوئی اور یہ تصور کہ رومن کیتھولک ہی دنیا کا واحد "سچا مذہب ہے"، ماند پڑنے لگا۔ بین الاقوامی تجارت اور کاروبار کے فروغ نے بھی اس ضرورت پر زور دیا کہ مذہبی معاملوں میں رواداری سے کام لیا جائے تاکہ کیتھولک اور یہودی، چینی اور پروٹسٹنٹ کسی تجارتی مرکز میں ایک دوسرے کے ساتھ بیوپار کر سکیں۔ خود رومن کیتھولک چرچ میں اصلاح کی تحریک شروع ہوئی اور بہت سے فرقے بن گئے۔ اب چونکہ آبادی کئی مذہبوں اور عقیدوں میں بٹ گئی تھی، اس لئے حکومت کے لئے یہ ممکن نہیں رہا کہ وہ کسی خاص مذہب کو سرکاری مذہب کا درجہ دیدے۔ اگر کہیں کسی ریاست نے ایسی کوشش کی بھی تو اس کا نتیجہ بہت بُرا ہوا اور ملک خانہ جنگی اور بدامنی کا شکار ہوگیا۔ لہٰذا مذہبی رواداری کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔ اسی لئے یورپ کی اس زمانے کی تحریروں میں مفکروں اور فلسفیوں نے اس بات کی مخالفت کی ہے کہ حکومت کوئی خاص مذہب اپنی رعایا پر عائد کرے۔ کیونکہ ملک کا امن اور خوش حالی اولین حیثیت رکھتا ہے، مذہب نہیں۔ رفتہ رفتہ دوسرے مذہبوں کے تئیں رواداری کا جذبہ پیدا ہوا اور یورپ میں حکومتوں نے دو طرح کا رویہ اپنایا۔ پہلی صورت میں تو یہ کیا گیا کہ کسی مذہب یا عقیدے کو سرکاری مذہب کا درجہ دیدیا گیا اور اسے حکومت نے عطیات اور مراعات دیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے معاملوں کی نگرانی بھی اپنے ہاتھوں میں رکھی۔ بقیہ دوسرے فرقوں یا عقیدوں کو مذہبی آزادی دیدی گئی۔ مگر انھیں وہ مراعات حاصل نہیں تھیں جو سرکاری طور سے تسلیم شدہ چرچ کو حاصل تھیں۔ پہلے کی مثال برطانیہ ہے جہاں چرچ آف انگلینڈ سرکاری طور سے تسلیم شدہ چرچ ہے۔ دوسرے ملکوں نے یہ طریقہ اپنایا کہ کسی مخصوص عقیدے کے چرچ کو سرکاری حیثیت نہیں دی بلکہ تمام عقیدوں کو مساوی درجہ دیا اس کے تحت تمام مذہبی گروہوں کو اپنی مرضی پر چلنے اور اپنے طریقے سے عبادت کرنے کی یکساں آزادی دی گئی۔ اس کی مثال ہالینڈ ہے۔ ہندوستان میں بھی یہی صورت اپنائی گئی ہے۔

ڈاکٹر کے۔ ایم۔ پانیکر لکھتے ہیں:-

" صاف ظاہر ہے کہ ہماری نئی جمہوری، اشتراکی اور سیکولر ریاست کی تعمیر قدیم ہندوستان یا ہندو فلسفے کے ڈھانچے پر نہیں ہوئی ہے" بلکہ در حقیقت یورپ کے ڈیڑھ سو سالہ تجربات کی روشنی میں ہندوستان نے اس انداز فکر کو اپنایا ہے۔ بہرحال یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ سیکولرازم کا تصور سراسر مغرب کی دین ہے۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہندوستان میں سیکولر ریاست کا قیام کانگریس کی کوششوں کا رہین منت ہے۔ بیسویں صدی کے شروع میں تھوڑے عرصے کے لئے کانگریس میں انتہا پسند طبقے کا جو مذہبی احیاء کا داعی تھا غلبہ ضرور رہا مگر اس کا اثر جلد ہی ختم ہوگیا۔

۱۹۲۰ء میں گاندھی جی ایک نئی آواز کے ساتھ اُبھرے۔ وہ بنیادی طور سے ایک مذہبی آدمی تھے مگر مذہبی رواداری کا مکمل نمونہ تھے۔ گاندھی جی نے ہندو مسلم ایکتا کے لئے زبردست کوششیں کیں اور بار بار اعلان کیا کہ میری نظروں میں تمام مذاہب کی یکساں عزت اور وقعت ہے۔ وہ صرف مذہبی برابری کے داعی نہیں تھے بلکہ معاشی اور سیاسی انصاف کے بھی خواہاں تھے۔ مہاتما گاندھی کے ساتھ ساتھ جواہرلال نہرو، سبھاش چندر بوس، مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے بہت سے رہنما اُبھرے جن کا مسلک مذہبی رواداری اور انسانی بھائی چارہ تھا۔ ہندوستان کے سیکولرازم کو دو دھاروں نے سینچا ہے۔ ایک تو وہ دھارا تھا جو قدیم ہندوستان کی مذہبی رواداری اور فکری آزادی کا تھا اور دوسرا دھارا مغربی ممالک کے حاصل کردہ تجربے اور عقلی اور سائنسی علوم سے نکلا تھا۔ اول الذکر کے علم بردار مہاتما گاندھی تھے اور موخرالذکر کے مظہر جواہرلال نہرو۔ جدید ہندوستان کو فکری اور جذباتی لحاظ سے جس قدر ان دونوں رہنماؤں نے متاثر کیا ہے اتنا کسی اور نے نہیں کیا ہے۔ دونوں نے کانگریس کو صحیح راستے پر رکھا اور اس کے قدم بھٹکنے نہیں دیئے حتٰی کہ ۱۹۳۱ء میں کانگریس نے اپنے کراچی کے اجلاس میں یہ قرارداد منظور کی " تمام مذہبوں کے بارے میں ریاست غیر جانب دار رہے گی"۔ اسی طرح ۱۹۵۰ء کا دستور اس وعدے کی تکمیل ہے جو بیس سال پہلے کانگریس نے کیا تھا۔

ہندوستان میں سیکولر ریاست کا قیام ایک غیر معمولی کارنامہ ہے۔ خصوصاً اس صورت میں جب کہ ملک کی تقسیم مذہبی بنیادوں پر ہوئی تھی اور ردعمل، نفرت اور عیر رواداری کی فضا موجود تھی۔ ان وقتی وجوہ کے علاوہ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ہندوستان میں تین عظیم مذاہب کا دور دورہ رہا ہے۔ ہندوازم اسلام اور مسیحیت۔ عام لوگوں کی زندگی میں، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، مذہب کو بے حد دخل ہے اور پیدائش سے لے کر موت تک بیسیوں رسمیں اور مذہبی احکام موجود ہیں جن پر ملک کی اکثریت اب بھی عمل پیرا ہے۔ اسی لئے ڈاکٹر رادھا کرشنن لکھتے ہیں۔

" یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوگی کہ ہماری حکومت سیکولر ہے جب کہ ہمارے کلچر کی جڑیں روحانی قدروں میں پیوست ہیں۔ سیکولرازم سے مراد مذہب سے لاتعلقی۔ خدا سے انکار یا دنیاوی عیش و آرام پر زور دینا نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد یہ اعلان کرنا ہے کہ تمام روحانی قدریں عالم گیر اور آفاقی ہیں اور مختلف طریقوں سے انہیں حاصل کیا جاتا ہے"۔

دستور کی مسودہ کمیٹی کے چیرمین ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیدکر نے دستور ساز اسمبلی میں کہا تھا کہ اس جدید زمانے میں کوئی بالکل نیا یا اچھوتا دستور بنانا ممکن نہیں ہوگا صرف اس بات کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ ہندوستان کے مخصوص حالات کے پیش نظر کچھ باتوں کو دستور میں شامل کر لیا جائے حکومت ہند کا قانون (۱۹۳۵ء) دستور کے ڈھانچے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ برطانیہ، امریکہ، کنیڈا، ایران اور آسٹریلیا کے دستور کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے اور مفید دفعات اخذ کی گئیں۔

جو دستور اپنی آخری شکل میں منظور ہوا ہے اس میں کہیں بھی سیکولر کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا ہے اور نہ اس

میں امریکی دستور کی پہلی ترمیم کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ اور نہ ٹرکی کے دستور (۱۹۴۵ء) کی دفعہ ۲ کی طرح یہ لکھا گیا ہے کہ ترکی ایک سیکولر ریاست ہوگی۔ دستور پر بحث کے دوران دستور ساز اسمبلی میں دو بار یہ کوشش کی گئی کہ ریاست کی نوعیت کو ظاہر کرنے کے لئے سیکولر کا لفظ شامل کر دیا جائے۔ پہلی ترمیم یہ پیش کی گئی کہ دستور کے مسودے کی دفعہ ۱ کو اس طرح رکھا جائے "ہندوستان سیکولر وفاقی اور اشتراکی ریاستوں کا مجموعہ ہوگا"۔ دوسری ترمیم میں ایک نئی دفعہ بڑھانے کی درخواست کی گئی تھی۔ وہ دفعہ یہ تھی "چونکہ ہندوستان ایک سیکولر ریاست ہے اس لئے کسی مذہب یا عقیدے سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوگا"۔ دونوں ترمیموں کے محرک پروفیسر کے۔ ٹی۔ شاہ تھے۔ مگر ڈاکٹر امبیدکر نے اسے منظور نہیں کیا۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ دستور کی پوری روح سیکولر ہے لہٰذا الفاظ کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس کے ماسوا حکومت سماجی اصلاحات کے لئے قانون بنانا چاہتی تھی لہٰذا دفعہ ۲۵ کی موجودگی میں لفظ "سیکولر" کی شمولیت سے ٹکراؤ پیدا ہو جاتا۔

اب ہم دستور کی دفعات پر نظر ڈالیں گے۔

ہندوستان کے دستور نے فرد اور جماعت (مشترک عقائد، رسومات اور نظریے کی حامل) دونوں کو مذہبی آزادی دی ہے۔ دستور کی دفعہ ۲۵ (الف) میں کہا گیا ہے "امن عامہ، اخلاق اور صحت اور اس حصے کی دوسری دفعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے تمام افراد ضمیر کی آزادی (یعنی اپنی پسند کے مذہب یا عقیدے کو اپنانے کی آزادی) کے حقدار ہیں اور انھیں اس مذہب یا عقیدے کو ماننے، اس پر چلنے اور اس کی تبلیغ کرنے کا حق حاصل ہے"۔ دستور میں دی گئی یہ آزادی صرف ہندوستان کے شہریوں کے لئے محدود نہیں ہے بلکہ غیر ملکیوں کے لئے بھی ہے جس کی مثال ہندوستان کی عیسائی مشنریاں ہیں۔ اس طرح دستور نے نہ صرف کسی مذہب کو ماننے کی آزادی دی ہے بلکہ اس پر عمل کرنے کے سلسلے کی جو خارجی صورتیں ہیں، ان پر عمل کرنے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے مذہب کی تشہیر اور تبلیغ کو پوری آزادی بخشی ہے۔

مذہبی جماعتوں اور اقلیتوں کے افراد کی بعض مخصوص ضرورتیں ہوتی ہیں۔ دستور کی دفعہ ۲۶ میں انھیں ایسے حقوق عطا کئے گئے ہیں۔

"امن عامہ، اخلاق اور صحت کو منظور رکھتے ہوئے ہر مذہبی اقلیت یا اس کے کسی حصے کو مندرجہ ذیل حقوق حاصل ہوں گے۔

الف:۔ مذہبی مقاصد اور دان خیرات کے لئے ادارے قائم کرنا اور انھیں چلانا۔

ب:۔ مذہبی امور کے سلسلے میں اس کا انتظام اور انصرام اپنے ہاتھوں میں رکھنا۔

ج:۔ منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد خریدنا اور رکھنا۔

د:۔ قانون کے مطابق ایسی جائیداد کا انتظام کرنا"۔

اس طرح مذہبی اقلیتوں کو اپنے ادارے قائم کرنے انھیں چلانے، ان کا انتظام کرنے اور ان کی مالی حالت بہتر بنانے کے لئے جائیداد خریدنے اور پھر ان کا انتظام کرنے کا پورا پورا حق دیا گیا ہے۔ مذہب و ثقافت کے تحفظ کا بھی موقع دیا گیا ہے۔

دفعہ ۳۰ میں کہا گیا ہے:۔

۱:۔ "تمام اقلیتوں، خواہ وہ مذہبی ہوں یا لسانی، اپنی مرضی کے تعلیمی ادارے کھولنے اور چلانے کی مجاز ہیں۔

۲:۔ حکومت تعلیمی اداروں کو امداد دینے کے سلسلے میں کسی ایسے تعلیمی ادارے سے اس وجہ سے امتیاز نہیں برتے گی کہ اس کا انتظام کسی اقلیت کے ہاتھوں میں ہے خواہ وہ اقلیت مذہبی ہو یا لسانی"۔

سیکولر ریاست کی دوسری شرط یہ ہے کہ شہریت فرد کو محض ایک فرد کی حیثیت سے دی جائے۔ کسی جماعت یا فرقے سے تعلق رکھنے کی بنیاد پر نہیں۔ ریاست اپنے شہریوں پر چند ذمہ داریاں اور فرائض عائد کرتی ہے اور اس کے عوض میں اسے حقوق اور مراعات کی ضمانت دیتی ہے۔ فرد اور ریاست کا یہی رشتہ شہریت کو معنی و مفہوم بخشتا ہے ہندوستان کے دستور میں فرد اور ریاست کے تعلق سے متعلق بہت سی دفعات ہیں مگر اس مضمون میں ہمارا سروکار صرف انہی دفعات سے ہے جن میں شہریت عطا کرنے کے سلسلے میں مذہب کو کوئی جگہ نہ دی گئی ہو۔

دفعہ ۱۴ میں ہر شہری کو ضمانت دی گئی ہے کہ سبھی قانون کی نظروں میں مساوی درجہ رکھتے ہیں اور سبھوں کو قانون کا یکساں تحفظ حاصل ہے۔ پھر دفعہ ۱۵ (الف) میں کہا گیا ہے "حکومت مذہب، نسل، ذات یا جائے پیدائش کی بنیاد پر کسی شہری سے کوئی تفریق نہیں برتے گی"۔ پھر اس عام اصول کا تین خصوصی باتوں پر اطلاق کیا گیا ہے:۔

(۱) حکومت کے تحت نوکری پانا یا کسی عہدے پر مقرر کیا جانا (۲) سرکاری تعلیمی اداروں میں داخلہ اور (۳) مجالس قانون ساز کے لئے ووٹ دینا یا اس کا ممبر بننا۔

دفعہ ۱۶ (الف) حکومت کے تحت نوکری پانے یا کسی عہدے پر مقرر کئے جانے کے لئے تمام شہریوں کو یکساں مواقع حاصل ہوں گے۔

(ب) حکومت کے تحت کوئی بھی ملازمت پانے یا کسی عہدے پر مقرر ہونے کے لئے مذہب، نسل، ذات، جنس خاندان یا رہائش کی بنیاد پر کسی شہری کے خلاف کوئی امتیاز نہیں برتا جائے گا۔

(۵) اس دفعہ میں کہی گئی باتوں کا کسی ایسے رائج قانون پر اثر نہیں پڑے گا جس کے تحت کسی مذہبی یا کسی فرقے کے نام پر کئے گئے ادارے کی دیکھ بھال کے لئے کسی فرد یا مجلس انتظامیہ کے ممبروں کا کسی خاص مذہب یا کسی خاص اقلیتی فرقے سے تعلق رکھنا ضروری ہے۔

دفعہ ۲۸ (الف)۔ کسی ایسے تعلیمی ادارے میں جسے حکومت چلاتی ہو، کسی قسم کی مذہبی تعلیم نہیں دی جائے گی (ا) مگر اس دفعہ میں کہی گئی بات سرکار کے زیر انتظام کسی ادارے پر لاگو نہیں ہوگی جو کسی وقف کے تحت کھولا گیا ہو اور جس میں یہ شرط ہو کہ اس ادارے میں مذہبی تعلیم دی جائے۔ (۳) سرکار سے منظور شدہ یا سرکاری امداد پانے والے کسی ادارے میں دی جانے والی مذہبی تعلیم میں اگر کوئی شخص چاہے تو شریک نہیں ہو سکتا ہے۔ اگر وہ بالغ ہے تو اپنی مرضی سے اور اگر نابالغ ہے تو اپنے سرپرست کی اجازت سے اگر چاہے تو ایسی تعلیم میں شرکت کر سکتا ہے۔

دفعہ ۲۹ (ب) کسی شہری کو مذہب، نسل، ذات یا

زبان یا ان میں سے کسی ایک کی وجہ سے کسی ایسے تعلیمی ادارے میں جسے حکومت چلاتی ہو یا امداد دیتی ہو داخل کرنے سے انکار نہیں کیا جائے گا۔

اس طرح دستور نے تعلیمی، لسانی اور تہذیبی امور سے متعلق کسی بھی امتیاز کی کوئی گنجائش نہیں رکھی ہے۔ اور مذہب یا عقیدے، نسل یا جنس کو تعلیم یا ملازمت کے سلسلے میں کوئی وقعت نہیں دی ہے۔ اور ہر فرد کو محض فرد کی حیثیت سے یکساں حقوق دیئے ہیں۔ یہی رویہ سیاسی حقوق کے سلسلے میں بھی اپنایا گیا ہے دفعہ ۳۲۵ میں درج ہے۔

"پارلیمنٹ کے دونوں ایوان یا کسی ایوان یا ریاستی مجلس قانون ساز کے ممبروں کا انتخاب کرنے کے لئے ہر علاقائی انتخابی حلقے کے ووٹروں کی ایک عام فہرست ہوگی۔ اور مذہب، نسل، ذات یا جنس یا ان میں سے کسی ایک کی بنیاد پر کسی شخص کو ایسی انتخابی فہرست میں شامل ہونے سے باز نہیں رکھا جائے گا۔"

جمہوریت میں سیاسی اختیار اور اقتدار کا سرچشمہ ووٹ ہے۔ دستور نے تمام بالغوں کو ووٹ دینے کا حق عطا کر دیا ہے اور اس کے لئے کسی قسم کی کوئی شرط عائد نہیں کی ہے۔ ۱۹۰۹ء میں جداگانہ انتخاب کا جو طریقہ رائج کیا گیا تھا وہ بالآخر تقسیم ملک پر منتج ہوا۔ دستور نے بجا طور پر ایسی تمام باتوں کا خاتمہ کر دیا ہے۔

سیکولرازم کی تیسری شرط ریاست سے مذہب کی علیحدگی کی طرف بھی دستور نے بڑا نمایاں قدم اٹھایا ہے۔ اس سلسلے میں دفعہ ۲۷ کی عبارت قابل غور ہے۔

"کسی شخص کو کوئی ایسا ٹیکس ادا کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا جس کی آمدنی خاص طور سے کسی مذہب کی ترقی یا کسی خاص مذہب یا کسی خاص مذہبی گروہ کی دیکھ بھال یا بہتری کے لئے خرچ کی جائے۔"

اس کے ماسوا دستور میں ایسی کوئی دفعہ نہیں ہے جس میں کسی مذہب کو سرکاری درجہ دیا گیا ہے۔ اس طرح ہندوستان کا دستور ملک کی قدیم روایات اور جدید تصور دونوں کی ہم آہنگی سے ایک مثالی سیکولر دستور بن گیا ہے جس کے تحت تمام لوگوں کے ساتھ (ان کے مذہب اور عقیدے سے قطع نظر) یکساں اور مساوی سلوک کیا گیا ہے اور سبھوں کو یکساں حقوق دیئے گئے ہیں۔ ہمارا دستور صحیح معنوں میں ہمارے سیکولر انداز نظر کا عکاس اور مظہر ہے۔

چند سطور میں ہندوستان سیکولرازم کے مستقبل پر بھی ایک نظر ڈالی جائے۔

ملک کے بعض طبقے اس بات کے مدعی ہیں کہ ہندوستان ایک سیکولر ریاست نہیں ہے۔ ڈاکٹر وید پرکاش لوتھرا اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے The concept of the Secular State and India میں اسی نتیجے پر پہنچے ہیں۔ مگر سیکولرازم کی خالص شکل اس دنیا میں کہیں موجود نہیں ہے۔ امریکہ میں بھی نہیں۔ بات یہ ہے کہ ایک فرد کسی ریاست کا شہری ہوتا ہے اور وہی فرد کسی مذہب یا عقیدے کا پیرو بھی ہوتا تھا۔ ہر موقع پر ایک ہی شخص کو اپنے دو الگ الگ روپ میں حد فاصل قائم رکھنا مشکل ہوتا ہے پھر جمہوریت میں منظم گروہوں کا خیال کرنا ہی پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک میں جس کی غالب اکثریت کا مذہب ہندو ازم ہے کوئی ایسا منظم مذہبی ادارہ موجود نہیں ہے جو سماجی اور مذہبی اصلاحات کو نافذ کر سکے۔ لہٰذا لامحالہ حکومت کو ایسے قوانین بنانے پڑے ہیں جو بادی النظر میں حکومت کے دائرے میں نہیں ہے۔

ایک دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ سیکولرازم کے فروغ سے مذہب کی اعلیٰ اور ارفع قدروں کو نقصان پہنچے گا۔ مذہب سے بیزاری فیشن بن گئی ہے۔ مذہبی تعصب اور مذہبی تنگدلی یقیناً قابل مذمت ہے۔ مگر مذہب سے مکمل انحراف نئی نسل کو نراج، مادیت اور ہماری تہذیب کی اعلیٰ قدروں سے منحرف کر رہی ہے۔ ایک ہندوستانی مفکر نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ "ہندوستان ایک سیکولر ریاست ہے مگر ہندوستان کے عوام سیکولر نہیں ہیں۔ ان پر مذہب کا بڑا گہرا اثر ہے اور وہ اس بات کے خواہش مند ہیں کہ خدا کرے ہندوستانی عوام مذہب سے بیزاری کی حد تک سیکولر نہ بنیں۔" ڈاکٹر سمپورنانند بھی اپنے مضمون "سیکولرازم ان انڈیا" میں سیکولرازم کی محدود اور کٹر تعبیر سے احتراز کا مشورہ دیتے ہیں۔

بہرحال اس مضمون میں سارے پہلوؤں کا جائزہ لینے کی گنجائش نہیں ہے۔ پھر بھی آخر میں یہ عرض کرتا ہوں کہ ہندوستان میں سیکولرازم کا پودا ضرور پروان چڑھے گا کیونکہ سیکولرازم کا تصور مغرب زدہ رہنماؤں کا مسلط کردہ نہیں ہے بلکہ اس کی جڑیں ہماری تاریخ میں پیوست ہیں قدیم ہندوستان ہو یا متوسط دور کا ہندوستان، یہاں مذہبی تنگ نظری سے کام نہیں لیا گیا اور رواداری مفاہمت اور بھائی چارے کی فضا قائم رہی۔ مذہبی معاملوں میں انگریزوں کی انگریزوں کی غیر جانب داری اور قانون اور انتظامی معاملات میں اصلاحات نے ایک مشترک شہریت کا احساس پیدا کرنے میں مدد دی۔ ایسے سرکاری اسکول تقریباً ایک صدی سے قائم ہیں جن میں مذہبی تعلیم لازمی نہیں رہی ہے انڈین نیشنل کانگریس کی پوری تحریک قوم پرستانہ اور سیکولر جذبات کی حامل تھی اور ہندوستان کا سیکولر دستور براہ راست اس کی دین ہے۔

ہندوستان کی اکثریت کا مذہب ہندو ازم ہے جو مجموعی لحاظ سے سیکولرازم کے فروغ کے لئے سازگار ہے۔ قدیم ہندوستان میں مذہبی آزادی کسی مصلحت یا سیاسی ضرورت کے پیش نظر نہیں دی گئی تھی بلکہ یہ جذبہ ہندو فلسفے میں جاری و ساری تھا۔

بڑی تعداد میں اقلیتوں کا وجود سیکولرازم کی بقا کا ضامن ہے۔ کسی بھی سیکولر ریاست میں وہاں کی اقلیتیں سیکولرازم کی سب سے بڑی پشت پناہ ہوتی ہے اور ہندوستان کی اقلیتوں کو بجا طور سے اس کا احساس ہے۔

ہندوستان میں جدیدیت اور ایک آفاقی کلچر دبے پاؤں چلا آ رہا ہے ملک کی صنعتی ترقی سائنس اور ٹکنالوجی کا دور دورہ، تعلیم میں اضافہ اور اعلیٰ تعلیم کے بڑھتے ہوئے مواقع نجی اور عوامی زندگی کو سیکولر بنا رہے ہیں۔

لہٰذا اس بات کا خدشہ بہت کم ہے کہ ہندوستان سے سیکولرازم کا خاتمہ ہو جائے گا۔ سیکولرازم کا مطلب یہ ہوگا کہ ہندوستان گاندھی اور جواہر سے منحرف ہو جائے جس کا امکان فی الحال بالکل نہیں۔

ہے یہ وار کیا "مسلمان پنجابی اور مہاجر برسوں سے سندھیوں کا استحصال کر رہے ہیں۔"

سندھ پنجابی مہاجر پٹھان محاذ اپنے حق میں بس اتنا ہی کہہ سکا "نئے سندھیوں کو بے دخل کر کے ان کی زمینیں آپس میں تقسیم کرنے کا جواز پیدا کیا جا رہا ہے۔" سندھ میں مہاجر فسادات کا شکار ہوتے رہے اور پنجاب میں مہاجر یہ نعرہ لگاتے رہے۔ "شہدائے اردو زندہ باد۔ قاتلو جواب دو، خون کا حساب دو۔"

۱۰ جولائی کو سندھ میں پاکستان کے دفاع، تحفظ عامہ اور سلامتی کی خاطر ڈیفنس آف پاکستان رولز کی دفعہ ۴۵ (الف) اور دفعہ ۲۱۳ کے تحت خبروں اور مضامین کی اشاعت پر سنسر لگ جانے کی وجہ سے نوائے وقت اپنے اداریے میں پاکستان کو مینارہ بابل نہ بنانے کی اپیل تو کر سکا لیکن مہاجروں کے حق میں کچھ نہ کہہ سکا۔ "بڑے دکھ کی بات ہے کہ نہ صرف کراچی کے خونیں ہنگامے مزید شدت و وسعت اختیار کر گئے بلکہ لسانی تنازعہ کی یہ آگ بعض دوسرے شہروں میں بھی پھیل گئی اور کراچی، حیدرآباد کے بعد نواب شاہ دادو میرپور وغیرہ بھی اس کی لپیٹ میں آ گئے۔" (۱۱ جولائی ۷۲ء)

البتہ جنگ نے اپنے ۲۸ جولائی کے اداریے میں اتنا ضرور کہا "کچھ مقتدر حضرات کا بیان ہے کہ علیحدہ قومیت کی بنیاد زبان اور زمین ہے یعنی اگر ایک زبان بولنے والے لوگ ایک خاص علاقے میں رہتے ہیں تو انھیں علیحدہ قومیت تصور کیا جانا چاہیئے۔ یہ تصور خاص طور پر آج کل کے بھارتی علاقوں سے آئے ہوئے لوگوں کو قومیت کے قواعد سے خارج کرنے کے لئے کھڑا کیا گیا ہے۔" پاکستان اردو تحریک کے کنوینر نواب مظفر حسین خان نے سندھ حکومت پر یہ الزام لگایا کہ زبان کی آڑ میں اردو داں طبقوں پر ملازمتوں کے دروازے بند کئے جا رہے ہیں۔ سندھ اسمبلی میں یہ قرارداد پیش کی گئی تھی کہ اردو داں طبقہ تین ماہ کے اندر اندر سندھی سیکھ لے ورنہ ملازمتوں سے برطرف کر دیا جائے گا۔ ۲۵ برس پہلے پاکستان بنوانے والے مہاجر اب پاکستان میں اپنے لئے جغرافیائی حدود کی تلاش میں ہیں تاکہ فرزند زمین کہلا سکیں۔ اردو کے حامیوں نے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی (سابق وائس چانسلر جامعہ کراچی) کے مکان پر ایک اجتماع میں یہ مطالبہ کیا کہ سندھ کو دو صوبوں ـــــ شمالی اور جنوبی سندھ میں تقسیم کر دیا جائے۔ ان کے مطالبے کا ایک انداز یہ بھی تھا کہ اردو کو سندھ کی سرکاری زبان بنایا جائے ورنہ سندھ کو دو حصوں میں تقسیم کر کے کراچی اور حیدرآباد پر مشتمل اردو کے حامیوں کے لئے علیحدہ صوبہ بنایا جائے۔

حُریت کراچی کے مطابق کراچی صوبہ محاذ کا ایک وفد جنوری کے تیسرے ہفتہ میں اسلام آباد گیا ہے تاکہ مطالبہ کے حق میں قومی اسمبلی کے ممبروں کی حمایت حاصل کر سکے۔ محاذ کے کنوینر آزاد بن حیدر کا کہنا ہے کہ کونسل مسلم لیگ اور تحریک استقلال نے مطالبہ کی حمایت کا اعلان کر دیا ہے۔ ادھر اردو قومی کونسل نے حکومت سندھ پر زور دیا ہے کہ وہ زبان، ملازمتوں میں نمائندگی اور غیر سندھیوں کی اقتصادی بحالی کے بارے میں راول پنڈی سمجھوتے کے مطابق عمل درآمد کرے۔

سندھ میں تو خیر سے ۵۲ لاکھ اردو بولنے والے ہیں مل کر اپنے تحفظ کے لئے آواز اٹھا سکتے ہیں۔ لیکن جو پنجاب صوبہ سرحد اور بلوچستان میں رہ رہے ہیں وہ تو بکھرے بکھرے ہیں، کچھ کہہ بھی نہیں سکتے۔ مہاجر ہونے کے بوجھ تلے چپ چاپ وقت کاٹ رہے ہیں۔ صرف اردو بولنے والے مہاجر ہی نہیں ہندوستان کی دیگر زبانیں بولنے والے بھی مہاجر سے پاکستانی نہ بن سکے۔ پاکستانی بننے گئے تھے لیکن قیام پاکستان کے ۲۵ برس بعد بھی صرف مہاجر ہو کر رہ گئے۔ اس کے مقابلے میں ہندوستان میں شرنارتھی اور پناہ گزین برسوں پرانے الفاظ ہیں، برسوں سے کسی نے سنے بھی نہیں۔ البتہ ۱۹۷۱ء میں یحییٰ شاہی کے ظلم و ستم سے بچ کر بنگالی ہند میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے تب ضرور برسوں بعد یہ الفاظ سننے میں آئے۔ نہ صرف یہ کہ ہندوستان سے پاکستان چلے جانے والے مسلمانوں کو کچھ حاصل نہ ہوا، پورے پاکستان بھر میں مایوسی کے سائے ہیں۔ جب پورا ماحول ہی یاس انگیز ہو تو کسی ایک طبقہ یا عنصر کی خوشی اور آسودگی کیا معنی؟ البتہ جن لوگوں نے اسلام کے اصولوں کی محبت کی بجائے اقتدار، مال و زر اور عیاشی کو اپنی منزل بنایا، انھیں ضرور اپنے کام سے کام ہے، انھیں یاس سے کیا لینا؟ لیکن ایسے ہی لوگوں نے پاکستان کو کہاں پہنچا دیا ہے۔ نوائے وقت کا ۲۴ دسمبر ۱۹۷۲ء کا اداریہ اسی عکس کا حامل ہے "اس ملک کا کوئی بھی باشعور محب وطن شہری یہ پسند نہیں کرتا کہ اس وقت جبکہ پاکستان اپنی تاریخ کے سب سے بڑے المیئے سے دوچار ہے، یہاں تشدد لاقانونیت اور ہنگامہ و فساد کے بھتنوں کو اپنی منحوس شکلیں دکھانے کا موقعہ ملے چہ جائیکہ یہاں گھر گھر اور گلی گلی خون بہنے یا موت کی سیاست یا میدان جنگ کا انتخاب کرنے کی باتیں

وائس چانسلر جامعہ کراچی) کے مکان پر ایک اجتماع ہوا یہ مطالبہ کیا کہ سندھ کو دو صوبوں میں شمالی اور جنوبی سندھ میں تقسیم کر دیا جائے۔ ان کے مطالبے کا ایک انداز یہ بھی تھا کہ اردو کو سندھ کی سرکاری زبان بنایا جائے ورنہ سندھ کو دو حصوں میں تقسیم کر کے کراچی اور حیدرآباد پر مشتمل اردو کے حامیوں کے لئے علیحدہ صوبہ بنایا جائے۔

کی جائیں۔ اس قسم کی باتیں انتشار و افراتفری بلکہ خانہ جنگی کو جنم دیتی ہیں اور تاریخ گواہ ہے کہ جن ملکوں میں انتشار و خانہ جنگی ہوئی یا طوائف الملوکی پھیلی، وہاں سب سے زیادہ نقصان ہمیشہ عوام کو پہنچا اور وہ سالہا سال تک مصائب و آلام کی چکی میں پستے رہے۔ رہے سہے پاکستان میں اس وقت حالات بڑی تشویشناک اور اضطراب انگیز صورت اختیار کر رہے ہیں۔" جس پاکستان کے لئے برصغیر کے مسلمانوں نے تقسیم کے تکلیف دہ مرحلوں سے گزرنا منظور کیا اس کا نام ضرور اسلامی مملکت یا مملکت خداداد ہے، لیکن اس کا ماحول اسلامی اصولوں سے بے نیاز رہے۔ مذہبی نقطۂ نظر سے قطع نظر کم سے کم اتنا تو ہونا چاہیئے تھا کہ وہ لوگ جنھوں نے پاکستانی بننے کا فیصلہ کیا وہی امن و چین کی زندگی بسر کرتے۔ ۲۵ برس تو ایسا نہیں ہوا! اس کا گلہ تو عدالت انصاف کے سابق جج چودھری ظفر اللہ خان کو بھی ہے۔ "ہمارے ہر قول و فعل میں تضاد ہے۔ ہم عمل کے معاملے میں سنجیدہ نہیں ہیں۔ ہم نے پاکستان کا مطالبہ اسی مقصد کے لئے کیا تھا کہ اس خطۂ زمین میں اللہ کا نام روشن کریں گے اور اسلام کی تعلیمات اپنائیں گے۔ مگر ہمارا عمل اس کے برعکس رہا۔ پاکستان نے اپنے عہد و پیمان کو جھٹلا کر دوسروں کی نظر میں اپنے آپ کو گرا لیا۔" ایسے حالات میں مہاجر پاکستانیوں کے دلوں اور

ذہنوں میں کمی کا احساس ہونا قدرتی ہے، جو تاریخ اور جو ماضی انھیں تنگ نظر مفاد پرست عناصر پیش کرتے ہیں وہ نہیں اپنی لگتے ہیں۔ رہ رہ کر ان میں سے بہت سوں کی نظر اس تاریخ اور ماضی کی طرف اٹھتی ہے جس کا رشتہ ہندوستان سے ہے۔ ہو سکتا ہے ان کی نئی نسل اس کمی کے تکلیف دہ احساس سے آزاد ہو سکے، کیونکہ اس نسل نے ہندوستان کو ابھی طرح سے دیکھا بھی تو نہیں ہے۔ انھیں سیکولر جمہوری نظام کی برکتوں کا اندازہ بھی تو نہیں ہے۔ لیکن جب بھی سرحد کے آر پار آنے جانے کی پابندیاں ختم ہوں گی تو کئی کنبے جو بٹے ہوئے ہیں آئیں جائیں گے اسی صورت میں کسی نہ کسی حد تک یہ کمی کہیں نہ کہیں کھٹکتی ضرور رہے گی۔

پاکستان میں اردو بولنے والوں کی ایک مشکل ان کی اردو سے محبت کی وجہ سے بھی ہے۔ اردو پاکستان کی قومی زبان تو ہو گئی لیکن ابھی تک اس میں تشنگی قائم ہے جس کے بارے میں ممتاز صحافی سید محمد تقی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

" پاکستان کے متجانس قوم بننے کی سعی تین عوامل کو حرکت میں لاکر کی جاسکتی ہے، مشترک مذہب، مشترک جغرافیہ اور مشترک زبان ـــــ مشترک مذہب ایک زندہ حقیقت ہے اس میں اضافے کی گنجائش نہیں ہے، یہی حال مشترک جغرافیئے کا ہے کہ وہ بہر حال اپنی جگہ موجود ہے اور اس کی کمی بیشی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ مشترکہ زبان کا عنصر ابھی تک پوری طرح عمل میں نہیں آسکا۔"

(مشرق۔ پشاور۔ یکم اگست)

اردو بولنے والوں کی ایک مشکل یہ بھی ہے کہ انھیں دہلی اور لکھنؤ کے لب ولہجہ سے لگاؤ ہے اور یہ لگاؤ پاکستان کے ماحول میں دباؤ کی زد میں ہے۔ اردو کا روایتی انداز کراچی میں تو کسی حد تک محفوظ کرنا ممکن ہے لیکن دوسرے صوبوں میں جہاں اردو والے بکھرے بکھرے ہیں ایسا ممکن نہیں ہے۔ لاہور میں ایک نیا انداز اُبھر رہا ہے۔ لاہوری اردو ارتقا کی منزلوں میں ہے۔ لاہوری اردو کی حمایت میں سہیل بخاری کی تازہ کتاب " اردو کا روپ" اس نئے لب ولہجہ کی ترجمان ہے۔ دہلی اور لکھنؤ کے لہجہ سے مہاجر پاکستانیوں کا لگاؤ ہی شاید انھیں آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس باقاعدگی کے ساتھ سننے کی طرف مائل کرتا ہے۔ ہندوستان کی یادوں سے دل بہلانے کی کئی راہیں ہیں ان کے لئے۔ حال ہی میں اسلام آباد میں اردو کے ممتاز نقاد سید احتشام حسین کی وفات کی خبر سنتے ہی پاکستان میں جگہ جگہ تعزیتی جلسے ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی، حلقہ ارباب ذوق، انجمن ترقی اردو، پاکستان رائٹرز گلڈ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، ادارۂ یادگار غالب، انجمن ترقی پسند مصنفین، ارباب قلم ـــــ سب نے احتشام صاحب کو خلوص وعقیدت سے یاد کیا۔

اردو پاکستان کی قومی زبان تو ہے لیکن اسے برصغیر کے رشتوں سے آزاد کرنے کی کوششیں کی جارہی ہے جو اردو والوں کے لئے تشویش اور ذہنی کرب کا باعث ہے۔ مغربی ایشیا کے ساتھ بندھ جانے کی چند پاکستانی عناصر کی کوششوں کا اندازہ لاہور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے اس مطالبے سے ہو سکتا ہے کہ پاکستان میں عربی کو دوسری

اردو بولنے والوں کی ایک مشکل یہ بھی ہے کہ انھیں دہلی اور لکھنؤ کے لب ولہجہ سے لگاؤ ہے اور یہ لگاؤ پاکستان کے ماحول میں دباؤ کی زد میں ہے۔ اردو کا روایتی انداز کراچی میں تو کسی حد تک محفوظ کرنا ممکن ہے لیکن دوسرے صوبوں میں جہاں اردو والے بکھرے بکھرے ہیں ایسا ممکن نہیں ہے۔

لازمی زبان قرار دیا جائے اور کرنسی روپے کی بجائے دینار میں تبدیل کر دی جائے۔ اس قسم کے تنگ نظر مطالبات سے اردو بولنے والے پاکستانیوں کو ہوتی ہے۔ کیوں کہ پاکستان کے الگ قومی وجود کا پورا پورا احترام کرتے ہوئے ہندوستان کے ساتھ رابطوں کے حق میں ہیں کیوں کہ ان میں کمی کی صورت میں پاکستان میں سب سے زیادہ انھیں کو ہی جذباتی اور روحانی نقصان پہنچتا ہے کیونکہ ہند کے ساتھ خوشگوار تعلقات کی کمی میں اب وہ خود کو غیر محفوظ سمجھنے لگے ہیں۔ اس پاکستان میں جہاں خان عبدالغفار خاں جیسے محب وطن کے بارے میں قیوم مسلم لیگ کے جنرل سکریٹری ضیاء عباس جیسے لوگ بادشاہ خان کو غداری کے الزام میں کھلے عام پھانسی دیئے جانے کے مطالبے کر سکتے ہیں، وہاں حب الوطنی کے لئے کونسا ثبوت، کونسی شہادت معتبر سمجھی جائے گی؟

ہندوستان کے ساتھ رابطوں کا تصور، پاک ہندوستانیوں کے لئے تحفظ کا تصور ہے۔ کراچی میں ممتاز ادیبوں اور دانشوروں نے پاک ہند کلچرل ایسوسی ایشن کی تنظیم بنائی ہے۔ کراچی ہی میں ایک نئی سیاسی جماعت پاکستان کانگریس پارٹی کے نام سے وجود میں آئی ہے۔ یہ سیاسی جماعت پاکستانی سیاست کو سیکولر اور ترقی پسند رخ دینے کی کوشش کرے گی۔ اس جماعت نے یہ مطالبہ کیا ہے کہ صدیقیہ کا نام پھر سے گاندھی نگر رکھا جائے۔ پاکستان کانگریس پارٹی کا اعتقاد ہے کہ پاکستانی عوام کی جمہوری امنگوں، ملک کے سیاسی استحکام اور اقتصادی ترقی کے تقاضوں کی خاطر ہندوستان کے ساتھ برادرانہ تعلقات استوار کرنا از حد ضروری ہے۔

ہندوستان سے پاکستان چلے جانے والوں کے دلوں میں ہندوستان کا جو تصور اور جو پر خلوص محبت بھری یادیں آج بھی دھڑکتی ہیں ان کی ترجمانی رئیس امروہوی نے اپنی نظم میں کی ہے جس کا ایک ایک عکس برصغیر کے صدیوں پرانے رشتوں کی گرمجوشی کا حامل ہے۔ پاکستان جا کے بھی ہندوستان سے برسوں بچھڑ کر بھی یادیں ہیں کہ رہ رہ کر جاگ اٹھتی ہیں ؎

یہ ہندیوں سے کہنا اے ہند جانے والے
بھولے سے بھی نہیں ہم تم کو بھلانے والے
منکر نہ ہو سکیں گے اس سے زمانے والے
ہم پاک و ہند والے، ہیں اک گھرانے والے
ربطِ خواص لے جا، شوقِ عوام لے جا
او ہند جانے والے میرا سلام لے جا
اے ہند کی بہارو! تم کو سلام پہنچے
بچھڑے ہوئے نظارو! تم کو سلام پہنچے
بھارت کے چاند تارو! تم کو سلام پہنچے
برسوں کے بعد یارو! تم کو سلام پہنچے
او ہند جانے والے میرا سلام لے جا

مسٹر جناح اور حکیم اجمل خاں — فنر براک وے کی نظر میں

عتیق صدیقی

ہماری نئی نسل کے کم ہی لوگوں کو اس کا احساس ہوگا کہ ہماری آزادی کی جدوجہد میں بہت سے انگریزوں نے بھی ہمارا ساتھ دیا تھا، اور ہماری جدوجہدِ آزادی کی حمایت کی تھی۔ ان ہی میں ایک برطانوی مزدور لیڈر مسٹر فنر براک وے (FENNER BROCKWAY) بھی تھے، جو اب لارڈ فنر براک وے ہیں۔ ان کا تعلق برطانیہ کی لیبر پارٹی سے تھا اور اب بھی ہے۔ جواہر لال نہرو کی لندن کی طالب علمی کے زمانے میں جو لوگ ان کے خیالات پر اثر انداز ہوئے تھے ان میں فنر براک وے بھی تھے۔

فنر براک وے برطانوی لیبر پارٹی کے اہم لیڈر ہی نہیں، ممتاز مصنف بھی ہیں۔ ہندوستان، برطانیہ اور بین الاقوامی مسائل پر انھوں نے متعدد کتابیں بھی لکھی ہیں۔

انڈین نیشنل کانگریس اور انڈین ٹریڈ یونین کانگریس کے سالانہ جلسوں میں شرکت کے لئے ۱۹۲۷ء کے اواخر میں ایک برطانوی مزدور تنظیم کے نمائندے کی حیثیت سے وہ ہندوستان آئے تھے۔ کانگریس کے اجلاس میں شرکت کے لئے وہ مدراس گئے اور وہاں پہنچتے ہی موٹر کے ایک حادثے میں شدید مجروح ہوئے۔ نیشنل کانگریس اور ٹریڈ یونین کانگریس دونوں کے اجلاسوں میں شریک نہ ہو سکے۔ مدراس کے ایک اسپتال میں طویل مدت تک صاحب فراش رہنے کے بعد جب صحت یاب ہو کر وہ باہر نکلے تو ہندوستان کے سربرآوردہ لیڈروں سے انھوں نے ملاقاتیں کیں اور ان ملاقاتوں کے تاثرات اپنی ڈائری میں قلم بند کئے۔

فنر براک وے کی INSIDE LEFT ان کی ڈائری کے اقتباسات پر مشتمل ہے جس میں ایک باب سفر ہندوستان کے لئے مخصوص کیا گیا۔ اسی باب کے دو اقتباسات اس وقت پیش کئے جا رہے ہیں جن میں پہلے کا تعلق مسٹر محمد علی جناح سے اور دوسرے کا حکیم اجمل خاں سے ہے۔ حکیم اجمل خاں کے سلسلے میں مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین کا بھی برسبیل تذکرہ ذکر کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۴۲ء میں لندن کے ایک مشہور اور ترقی پسند ناشر وکٹر گولنز نے شائع کی تھی۔

مسٹر جناح کے متعلق فنر براک وے نے ۱۹۲۷ء میں جن تاثرات کا اظہار کیا تھا۔ بظاہر وہ بڑے حیرت ناک معلوم ہوتے ہیں، کیونکہ کانگریس سے بے تعلق ہو جانے کے باوجود اس وقت وہ کٹر نیشنلسٹ سمجھے جاتے تھے اور سنٹرل اسمبلی میں حکومت کے خلاف موتی لال نہرو کی سوراج پارٹی کا ساتھ دیا کرتے تھے۔ فنر براک وے اور مسٹر جناح کی اس ملاقات کا اتفاقاً وہی زمانہ تھا جب سائمن کمیشن ہندوستان کا دورہ کر رہا تھا اور مسٹر جناح بھی کانگریس کے ساتھ مل کر سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کی تحریک کی پرزور حمایت کر رہے تھے۔

مسٹر جناح

مسلمان لیڈروں سے ملنے اور ان کا نقطۂ نظر جاننے کی میں نے خصوصی کوشش کی۔ ...

مسٹر ایم۔ اے جناح بمبئی میں امیروں کی بستی، مالا بار ہل، کی ایک وسیع عمارت میں رہتے ہیں، جہاں سے سمندر صاف نظر آتا ہے۔ ... ہندوستان کے جن لیڈروں سے میں ملا ہوں، ان میں مسٹر جناح سب سے زیادہ انگریزیت مآب ہیں! ان کا رنگ گندمی ہے۔ وہ ٹکسالی انگریزی بولتے ہیں اور خاص انگریزی لباس پہنتے ہیں۔ وہ ذہین چہرے مہرے اور ذہین دماغ کے مالک ہیں۔ ان کی نیشنلزم کا سرچشمہ غرور کا جذبہ ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ خود اور ان کے دوست بیش تر برطانوی افسروں سے زیادہ قابل ہیں جو ان پر حکمرانی کے لئے بھیجے جاتے ہیں۔ ان کے ماتحت رہنا وہ پسند نہیں کرتے۔



لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سماجی بحران کے وقت جناح ہندوستانی عوام کا نہیں، بلکہ حکمراں طبقے کا ساتھ دیں گے۔ اور ہندوستانی عوام کو دو حصوں میں بانٹنے کے لئے مسلم مسئلہ کھڑا کر دیں گے۔

مسٹر جناح اس سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کے بھی حامی ہیں، جو سات برطانوی دیوتاؤں پر مشتمل ہے اور جسے مسٹر بالڈون (وزیر اعظم برطانیہ) نے ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لئے بھیجا ہے۔ لیکن مسٹر جناح کی مخالفت کی وجہ یہ ہے کہ ان کے جیسے ہندوستانی سیاست دانوں کو اس کمیشن میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔

مسٹر جناح کو میں ایک ذہین بیرسٹر اور خود پرست ہی کہہ سکتا ہوں۔ وہ ہندوستان کے سر جان سائمن ہیں۔

حکیم اجمل خاں

ہندوستان کے دوسرے مسلمان لیڈروں سے میری ملاقات ایک ناقابل فراموش لنچ پر ہوئی۔ ... میز کے گرد چیدہ مسلمان دانش ور تھے — حکیم اجمل خاں، جو فلاسفر اور اسکالر ہیں، ڈاکٹر حسین، جو دلی کی ایک یونیورسٹی (جامعہ ملیہ اسلامیہ) کے پرنسپل ہیں، انھوں نے یاد دلایا کہ برلن میں ایک امن کے جلسے میں وہ مجھ سے مل چکے تھے، مولانا ابوالکلام آزاد، جو کانگریس کے ایک سابق صدر ہیں اور ...



حکیم جی، جن کی معلومات بے حد وسیع ہیں، ان کا خیال ہے کہ سرمایہ اور شہنشاہیت کے تصادم کی وجہ سے دوسری عالم گیر جنگ ناگزیر ہے۔ انھوں نے یہ پیش گوئی بھی کی کہ محکوم قومیں بغاوت کریں گی اور سوویت روس ان کی مدد کرے گا۔

ان مسلمان لیڈروں نے مجھے بتایا کہ مسٹر جناح کی مسلم لیگ کے علاوہ اور بھی مسلم جماعتیں ملک میں ہیں اور انھیں اس قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہے کہ انگریزوں کو ملک سے نکال دینے کے بعد ہندو ان پر ظلم و زیادتی کریں گے۔

جنگم باڑی مٹھ بنارس میں
اکبر اعظم
کے فرامین اور دیگر اسناد

جلال الدین

بنارس میں "جنگم باڑی مٹھ" شیو کے بھگتوں کا ایک مرکزی ادارہ ہے اور وہاں ان کے عالی شان مندر موجود ہیں بنارس کے علاوہ الہ آباد، اریل، چنار اور گیا میں بھی ان کے متعدد مندر ہیں۔ جن کا انتظام مرکزی مٹھ کے زیرِ نگرانی ہوتا ہے۔ یہ ادارہ نہ صرف شمالی ہند بلکہ پورے ملک کے ان قدیم ترین اداروں میں سے ایک ہے جو مسلسل اپنی ماضی کی روایات پر قائم ہیں۔ اس مٹھ کی عظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ تمام مغل بادشاہوں اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں اور اورنگ زیب اور دیگر حکام کے فرامین و حکم نامے اور پروانے وغیرہ موجود ہیں۔ جن کی رو سے اس ادارے کو معافی کی اراضیات اور باغات وغیرہ ان کے اخراجات کی کفالت کے لئے وقف کی گئی ہیں جو آج بھی موجود ہیں۔

مغل بادشاہوں سے قبل سلاطین اور دیگر ہندو راجاؤں کے عہد میں بھی اس ادارے کو معافیاں ملتی رہی ہیں مگر افسوس کہ سوائے ایک "دان پتر" کے دیگر تمام دستاویزیں قبل از عہد اکبری ناپید ہو چکی ہیں۔ اکبر کے عہد کی ایک ایسی بھی سند ہے جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ مسلمان سلاطین کے عہد میں معافیاں دی جاتی رہی ہیں۔

اکبر کے فرامین کے تذکرہ کرنے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس ادارے کی سب سے قدیم دستاویز "دان پتر" کا مفصل جائزہ لیا جائے جو گوناگوں اہمیت کا حامل ہے۔ دراصل اسی دستاویز کی بنا پر بعد کی تمام معافیاں دی گئی ہیں۔

یہ "دان پتر" مہاراجہ جے نند دیو کاشی نریش نے ۶۳۱ سمبت یا ۳۱۴، ہجری میں جاری کیا تھا جس میں "۸۰۰ سو قدم زمین پورب و پچھم اور ۸۰۰ سو قدم اُتر و دکھن" بطور معافی گوسوامی ملک ارجن کو اخراجات کی کفالت اور گایوں کے چرانے کے لئے گنگا کے کنارے دی گئی تھی۔ یہ دستاویز سنسکرت اور مقامی بولی کے ملے جلے الفاظ میں دیوناگری رسم خط میں درج ہے۔ دستاویز کا سائز ۶"x۹" ہے۔ کاغذ کافی بوسیدہ ہو چلا ہے۔ دفتی نما موٹا کاغذ ہے جس کے ریشے مثل جاذب کے ابھرے ہوئے ہیں۔ جوڑائی میں کاغذ پھٹ کر الگ ہو چلا ہے لیکن اس کی پشت پر کپڑا چسپاں کر کے اصل متن کو قائم رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بوسیدگی کی ہی وجہ سے اس کی اصل عبارت کو مہاراجہ پربھو نارائن سنگھ نے تانبے کی پلیٹ پر کندہ کرا کے اس کے نیچے اپنی تصدیقی شہادت و دستخط بھی کندہ کرا دیئے ہیں تاکہ اگر اصل "دان پتر" ضائع ہو جائے تو یہ ثبوت موجود رہے۔

اس "دان پتر" کی قدامت کے اثبات میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس عہد میں زمین کی پیمائش کا کوئی خاص پیمانہ ایجاد نہ ہوا تھا بلکہ صرف "قدم" سے زمین کو ناپ کر معافی دی گئی ہے۔

عام طور سے صنعت کاغذ سازی کے متعلق یہ نظریہ مسلم ہو چکا ہے کہ مسلمان کاغذ سازی کا فن ہندوستان میں اپنے ساتھ لائے اور انھوں نے ہی اس کے استعمال کو عام کیا۔ مسلمانوں نے یہ فن ۷ ویں ۸ ویں صدی عیسوی میں چین سے سیکھا۔ اس کے بعد وسط ایشیا کے تجارتی مرکزوں سے پھیل کر یورپ وغیرہ میں عام ہوا۔ ہندوستان میں کاغذ کے استعمال کا پتہ ۹ ویں اور ۱۰ ویں صدی عیسوی میں چلتا ہے اور وہ بھی بہت کم۔ اس طرح یہ کاغذ ہندوستان کا قدیم ترین کاغذ کہا جا سکتا ہے۔ اگر یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ جائے

تو دنیا کی قدیم ترین دستاویزوں میں اس "دان پتر" کا شمار ہوگا لیکن یہ موضوع ابھی تشنہ ہے اس کاغذ کی سائنٹفک طریقہ سے تحقیق کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ نیشنل آرکائیوز آف انڈیا اور نیشنل میوزیم کے ذمہ داران کو اس کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔

یہاں پر اکبر کے صرف تین فرامین کا تذکرہ کیا جاتا ہے جس میں دو فرامین کی رو سے ۴۸۰ بیگھہ زمین پرگنہ بنارس وغیرہ میں بطور "مدد معاش" دی گئی ہے ان میں سے ایک فرمان میں زمین کی پیمائش کے متعلق راجہ ٹوڈرمل کی "اصلاح" کا بھی ذکر ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ زمین کی اصلاحات کی ابتداء اس زمانہ میں ہو رہی تھی۔ معافی کی ان زمینوں کے علاوہ بعض اضافے بھی اس عہد میں ہوئے ہیں تیسرے فرمان کی رو سے دو باغات ایک اریل (الہ آباد) اور پیاگ (الہ آباد) میں دو مندروں کے ساتھ وقف کئے گئے ہیں۔ یہ فرمان ۹۸۲ھ ۱۵۷۵ء کا جاری کردہ ہے۔

پہلے دو فرمان کی تاریخ اجراء ضائع ہو چکی ہے لیکن بعض ظاہری شواہد، خط تحریر اور مہروں وغیرہ سے یہ ظاہر ہے کہ ایک فرمان تو ۹۸۲ھ سے قبل جاری کیا گیا تھا اور دوسرا اس کے بعد۔ ان فرامین کی نقول درج ذیل ہیں۔

نقل فرمان جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی

ہوالغنی

فرمان جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی

(طغریٰ)

(مہر)

جلال الدین محمد اکبر

بادشاہ غازی

چوں بموجب سند حکام سابق موازی چہارصد و دہشتاد بیگہ زمین مزروع ..... در محال ..... بنام ..... جنگم ..... بنا برآں فرمان عالی شان واجب الاذعان شرف اصدار یافت ..... بمشارٌ الیہ متعلق است ..... بنام مہو حنمل ..... و عاملان و جہ داریان و قانون گویان سرکار بنارس بر حقیقت مقرر و تغیر و تبدیل ..... آں راہ ندہند و در استمرار و استقرار ایں حکم کوشیدہ بعلت مالوجہات و اخراجات و عوارضات چوں قنلغہ و پیش کش و ساروی ..... و قانون گوئی ..... و کل تکالیف دیوانے ..... مزاحمت نرسانند۔

(تاریخ ضائع شدہ ہے)

مذکور الصدر فرمان کی رو سے سرکار بنارس میں ۴۸۰ بیگھہ قابل زراعت زمین "جنگم" وغیرہ کو بطور "مدد معاش" دی گئی ہے اور سرکاری عملے کو ہدایت دی گئی ہے کہ اس زمین کو بغیر کسی تبدیلی کے معافی دار مذکور کے حوالے کر دیا جائے اور زمین کو ہر قسم کے ٹیکسوں سے معاف سمجھا جائے۔

دوسرے فرمان کی نقل درج ذیل ہے۔ جو ۴ ذی قعد ۹۸۲ھ کو جاری کیا گیا ہے۔

ہوالغنی

فرمان جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی

(طغریٰ)

(مہر)

راستی موجب رضائے خداست

جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی

کس ندیدم کہ گم شد از راہ راست

گماشتہائی حاکم و شقدار و متصدیان مہمات قصبہ پیاگ و اریل بدانند کہ چوں راجپور دیو و جماعت جنگم در قصبۂ مذکورہ متوطن اند و دو گنبد معہ باغ یکے در پیاگ ویکے در اریل دارند چوں بموقف عرض رسانیدند کہ بعضے از مردم آنجا بر ایشان بجہتہ مزاحمت میرسانیدہ اند می باید کہ چوں بر مضمون فرمان عالی شان اطلاع یابند احدی را نگذارند کہ بجہتہ کمال ایشان مزاحمت رساند و گنبد ہائے ایشان را متصرف شور و نوعے کنند کہ ایشان بفراغ بال بدعاگوئی دوام دولت ابد مقرون اشتغال نمایند بریں موجب عمل نمودہ تخلف نورزند۔

تحریراً فی التاریخ ۴ ذیقعد ۹۸۲ھ

اس فرمان میں الہ آباد کا نام "قصبۂ پیاگ" درج ہے غالباً اس وقت تک اس کا نام "الہ باس" "الہ آباد" نہیں تھا۔

فرمان کے متن سے ظاہر ہے کہ "راجپور دیو و جماعت جنگم" جو کہ قصبہ اریل و پیاگ (الہ آباد) میں مقیم ہیں اور ان کے مندروں کے اخراجات کی کفالت کے لئے دو الگ الگ باغات وقف ہیں بعض افراد بلاوجہ اس سے مزاحمت کرتے ہیں جس کی اطلاع انہوں نے بادشاہ کو پہنچائی نتیجہ کے طور پر یہ فرمان جاری ہوا کہ اس فرمان کے پہنچتے ہی ایسا انتظام کریں کہ کوئی بھی شخص ان کی پرسکون زندگی میں بلاوجہ خلل اندازی نہ کرے تاکہ معافی داران مذکور سلطنت کی بقاء کے لئے دعاگو رہیں۔ ہدایاتِ مذکورہ پر عمل کو لازم جان کر اس سے انحراف نہ کریں۔

اس فرمان سے یہ بھی ظاہر ہے کہ اس کے جاری ہونے سے قبل مندر سے متعلقہ دونوں باغ کسی دوسرے فرمان کے مطابق دیئے گئے تھے اور یہ فرمان محض ان افراد کی تنبیہہ و تادیب کے لئے جاری کیا گیا تھا جو ان کی پرسکون زندگی میں مزاحمت کر رہے تھے۔

فرمان کو جاری کرنے کی تاریخ عربی کلنڈر کے مطابق ۴ ذی قعد ۹۸۲ھ درج ہے۔ لیکن بعد کے دیگر فرامین میں ایرانی کلنڈر یعنی ماہ و روز کا مسلسل استعمال ملتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی "الٰہی" سن کا بھی اندراج ہوتا ہے۔ اکبر نے ایرانی یا زرتشتی اثرات کو قبول کر کے فرامین و سرکاری دستاویزوں میں عربی کلنڈر کا استعمال موقوف کر دیا تھا۔

تیسرے فرمان کی نقل درج ذیل ہے۔

ہوالغنی

فرمان جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی

(طغریٰ)

(مہر)

جلال الدین محمد اکبر

بادشاہ غازی

چوں سابقاً بموجب فرمان عالی شان موازی چہارصد دہشتاد بیگہ زمین از پرگنہ ..... بنارس وغیرہ در وجہ مدد معاش ..... ملک ارجن و جنگم مقرر بودہ در نیولا کہ بعرض اشرف اقدس رسید کہ حکم جہاں مطاع .....

خریف میچی سیل ...... جملہ آراضی مذکور موازی رو بیست بیگہ ...... بطناب بانس از ...... محل سابق حسب الصلاح عمدۃ الملک رکن السلطنۃ راجہ ٹوڈر مل ...... مشارٌ الیہا مقرر باشد کہ حاصلات آنرا سال بسال متصرف شدہ وبدعاگوئی دوام دولت اشتغال نمایند می باید کہ حکام وکرد ریاں وجاگیرداران حال واستقبال پرگنہ مذکور .... زمین .... از محل قدیم پیمودہ وچک بستہ بتصرف رو گذارند وبعلت مال، وجہات وسایر عوارضات چوں قنلغہ پیشکش و دہ ...... ومحصلانہ وجریبانہ وتکرار زراعت وکل تکالیف دیوانی ..... مزاحمت (نرسانند) وہر سالہ درین باب بر دانچہ مجدد طلب ندارند واگر در محل دیگر چیزے داشتہ باشند آنرا اعتبار نکنند۔

(تحریر فی التاریخ۔ ضائع شدہ)

اس فرمان میں یہ ہدایت ہے کہ حسب سابق "ملک ارجن و جنگم وغیرہ" کو موجودہ ۴۸۰ بیگھہ "مدد معاش" کی زمین پرگنہ بنارس میں دی جائے جو ایک دیگر شاہی فرمان کی رو سے دی گئی۔ معافی داران مذکور نے بادشاہ سے مزید زمین کے لئے درخواست کی تھی۔ لہٰذا راجہ ٹوڈر مل کے مشورے سے ۲۰۰ بیگھہ زمین مزید دی گئی ہے اور ان کے تصرف میں دیئے جانے کی ہدایت کی گئی ہے۔

زمین کی پیمائش کے لئے "بطناب بانس" کا لفظ استعمال ہوا ہے جس سے یہ ثابت ہے کہ "الٰہی" گز کا اجرا اس وقت نہیں ہوا تھا۔

ایک دیگر سند جو کئی اعتبار سے اہم ہے اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مٹھ مغلوں سے قبل "سلاطین" کے عہد میں بھی موجود تھا۔ اور اس ادارے کے معافی داروں کے پاس متعدد اسناد و فرامین موجود رہتے۔ یہ سند ایک طرح کا تصدیق نامہ ہے جس میں ایک غلط فہمی کا ازالہ کیا گیا ہے جو درج ذیل ہے۔

اللہ اکبر

این ذکر یست در بیان آنکہ چوں موازی یکصد ہفت و دہشت بیگہ بموجب فرامین مطاع لصیغۂ مفوضہ در وجہ مدد معاش ملک ارجن جنگم باڑی پرگنہ حویلے بنارس مقرر است و در جمیع اسناد نام ملک ارجن مرقوم است در نمولا کہ رائے پیمانند ...... کہ درین تحقیق زائچہ فوسے وفراری میکرد برین معاملہ تعجب نمود کہ در اسناد سلاطین سابق و بندگان حضرت، ملک ارجن ...... یقین است کہ آں شخص تاحال می وقائم نباشد جماعت جنگم نمودند کہ در سلسلۂ ماہرکہ کلاں باشد ۔ نام مقام ارجن بروش متوتی و از آنچہ فتوحات از اطراف می رسد ہمہ راجع کردہ صرف مایحتاج جمیع فقرا ایں سلسلہ می کند چوں ازیں معنی قاضی ومفتی واہالی و موالی تصدیق نمودند آراضی مذکور تصدق فرق بندگان حضرت وشاہزادہ عالمیاں بموجب فرمان عالی شان بملک ارجن جنگم بدستور سابق مقرر داشتند ایں چند کلمہ بطریق تصدیق قلمی شد تا ثانی الحال موجب اعتماد گردد۔

(مہر مدور پڑھی نہیں جاسکی)

تحریر فی التاریخ (ضائع شدہ)

(مہر گواہ معہ دستخط)

متعدد ہندی میں دستخط

(دستخط دیگر)

اس تصدیق نامے پر متعدد مہریں ثبت ہیں۔ ان کے اندر جو سن پڑھا جاتا ہے اسے ظاہر ہے کہ یہ دستاویز عہد اکبری ہی سے متعلق ہے۔ جس میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ تمام قدیم اسناد میں معافی کی جائداد میں صرف ایک شخص کے نام درج ہیں جس کا نام "ملک ارجن مل جنگم" ہے اور یہ ناممکن ہے کہ وہ شخص قدیم زمانے سے اس وقت تک زندہ چلا آیا ہو۔ اس معاملے کی وضاحت "جماعت جنگمان" نے اس طرح کی ہے کہ ان میں سے معمر ترین شخص کو ہی وہ متولی مقرر کرتے ہیں اور اس کا نام "ملک ارجن مل جنگم" ہوتا ہے۔ اس کے مرنے کے بعد دوسرے معمر ترین شخص کو متولی مقرر کرتے ہیں اور اسے بھی اسی نام سے پکارتے ہیں۔ اس سند سے اس بات کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ مغلوں کے عہد سے پہلے سلاطین کے عہد میں بھی ان کو معافی کی زمینیں ملتی رہی ہیں اور یہ سلسلہ قائم رہا ہے۔ لہٰذا اکبر کے عہد میں اس کی تصدیق ہوجانے پر قدیم روایات کو برقرار رکھا گیا ہے۔

لہ یہ فرامین و دستاویزات نومبر ۱۹۶۶ء میں الہ آباد ہائی کورٹ کے جشن صد سالہ کے موقع پر نمائش میں پہلی مرتبہ منظر عام پر آئے تھے۔ نمائش کے خاتمہ پر بنارس واپس کر دیئے گئے۔ اب وہ منتظمین کے پاس محفوظ ہیں۔

کہ نیشنل آرکائیوز آف انڈیا میں غالباً ۸ ویں صدی عیسوی کا ایک کاغذ موجود ہے۔ وہاں کے ایک آفیسر نے اس کی جو ظاہری ہئیت، بوسیدگی اور سائز وغیرہ بتایا ہے اس سے اس دستاویز میں کافی مماثلت ہے۔

سہ ایک دوسری دستاویز "حکم نامہ نامہ بیرم خاں" میں لفظ "قصبہ پیاگ" کا استعمال ہوا ہے۔ یہ حکم نامہ ۹۶۶ھ کا جاری کردہ ہے جو الہ آباد میوزیم میں محفوظ ہے۔ لفظ "قصبہ" سے ظاہر ہے کہ الہ آباد کی آبادی اکبر کے ابتدائی عہد میں بہت کم تھی گو کہ پیاگ (پریاگ) میں تیرتھ راج ہونے کی وجہ سے کمبھ و دیگر اشنان کے مواقع پر تیرتھ یاتریوں کا زبردست اجتماع ہوتا ہے۔ یہ یاتری عارضی قیام کے بعد اپنے مقامات کو لوٹ جاتے تھے۔ الہ آباد ایک شہر کی حیثیت سے اس وقت نمودار ہوا جب اکبر نے قلعہ تعمیر کر کے فوج کا مرکز بنا دیا۔

کہ یہ قابل ذکر ہے کہ اکبر نے اس شہر کا نام "الہ باس" رکھا تھا نہ کہ "الہ آباد"۔ عہد اکبری کے تمام فرامین و مخطوطات میں "الہ باس" ہی درج ہے لفظ "باس" کا استعمال برج بھاشا کا اثر ہے۔ جو ان دنوں فارسی زبان سے آنکھیں ملانے لگی تھی۔

ھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ راجہ ٹوڈر مل کی اصلاحات زمین و پیمائش کا نفاذ اسی سال یا قریب ترین زمانے میں ہوا تھا۔ اس فرمان سے اجرا کی قریبی تاریخ معلوم کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

کچھ لوگ تو اپنی کوشش سے طوفان کی زد سے بچ نکلے
کچھ لوگ مگر ملاحوں کی ہمت کے سہارے ڈوب گئے

کاروانِ دانش

قصہ رات کا :- انور عظیم
تبصرہ نگار :- ڈاکٹر رشید موسوی

ارشاد نامہ :- مرتبہ۔ محمد اکبر الدین صدیقی
کلیات ممنون :- مرتبہ۔ محمد اکبر الدین صدیقی
تبصرہ نگار :- ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

قصہ رات کا ـــــــــ انور عظیم

ناشر: مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر۔ نئی دہلی قیمت: بارہ روپے صفحات ۲۹۵

تقسیم ہند کے بعد افسانہ نگاروں کی جو نئی نسل منظر عام پر آئی ان میں انور عظیم کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ان افسانہ نگاروں کا اندازِ بیان اور موضوعات ان سے قبل کے افسانہ نگاروں سے قدرے مختلف ہے۔ ان کی نظر اپنے مخصوص ماحول کے واقعات اور کرداروں کی پیش کشی کے علاوہ ساری دنیا کی سیاسی کشمکش، معاشی الجھنوں اور اخلاقی قدروں پر بھی ہوتی ہے۔ زندگی ان کے نزدیک محض تلخیوں اور محرومیوں کا نام نہیں ہے بلکہ حسن و دلکشی اور رعنائی کا مرقع بھی ہے۔

انور عظیم نے اپنے افسانوں میں خارجی ماحول اور کردار کی داخلی کیفیات کی پیش کشی میں تیکھا لب و لہجہ اختیار کیا ہے جس میں حقیقت اور تخیل کا خوشگوار میل ایک شاعرانہ کیفیت پیدا کرتا ہے۔ اپنے جن افسانوں میں انھوں نے معاشی زندگی کے تضاد اور طبقاتی کشمکش کو موضوع بنایا ہے۔ ان میں ایک بلند آدرش کی گونج تو سنائی دیتی ہے لیکن بسا اوقات یہ گونج پروپیگنڈے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ انور عظیم کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک خاص ماحول کو اپنے افسانوں کا پس منظر بنا کر زندگی سے متعلق اپنے مخصوص تصورات کو طنزیہ علامتوں اور اشاروں میں پیش کرتے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب "قصہ رات کا" انور عظیم کے سترہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ان افسانوں میں عام طور پر مصنف نے سماج کے مخصوص طبقہ کی روزمرہ زندگی کی تلخیوں اور رعنائیوں کو خوبصورت امتزاج کے ساتھ پیش کیا ہے۔ افسانہ "آزردہ ستاروں کا ہجوم"، "آگ کا دریا" کی مصنفہ کے نام معنون کیا ہے۔ اس افسانے کا اندازِ بیان، موضوع اور کینوس ایک بڑی حد تک قرۃ العین کے افسانوں سے مشابہ ہے۔ دن بھر کی تھکا دینے والی تگ و دو کے بعد سیاست داں، فلاسفر، ڈپلومیٹ، طالب علم اور فرسٹیڈ مرد و خواتین "پربلا سرکار" کے فلیٹ میں جمع ہوتے ہیں۔

"جہاں کی سرشار زندگی میں بات بات پر ٹھنڈی سانس بھری جاتی ہے اور آنکھیں مسکراتے مسکراتے بھیگ جاتی ہیں۔ بات بات پر جام سے جام ٹکرائے جاتے ہیں" ـــــ اور پھر یہاں ہر فرد اپنے مصنوعی خول سے باہر اصلی رنگ میں ظاہر ہونے لگتا ہے۔ تہذیب اور اخلاق کی کھوکھلی قدروں کی نقاب کے پردے سے عیاش ذہنیت اپنے مکروہ چہروں سمیت نکل پڑتی ہیں۔

افسانہ "درد کا ساحل کوئی نہیں" منظر کشی اور ماحول نگاری کے علاوہ نفسیاتی تجزیے کے اعتبار سے خوبصورت افسانہ کہا جا سکتا ہے۔ "بیت جھڑ کی شام" کی طرح اداس موسیقی کمرے میں یوں گھل رہی تھی جس طرح ہونٹوں کے لاپ میں دلوں کی آگ گھلتی ہے" ـــــ افسانے کی شروعات ان لفظوں سے ہوتی ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار مس سلمیٰ جلیس ہے جو بچپن میں صرف ستو کہلاتی تھی۔ ہمیشہ سے ضدی تھی۔ وہ دس گیارہ سال کی ہوگی، برسات کی شام تھی، باغ میں آم کے درختوں میں جھولا ڈالا گیا تھا رشتے کی بہنیں جھولا جھول رہی تھیں اور باری باری سے ہاتھوں اور پیروں میں مہندی لگوا رہی تھیں۔ آخر میں اس کے لئے مہندی نہیں بچی تھی۔ کسی کی چھڑائی ہوئی مہندی اس کی ہتھیلیوں پر رکھنے کی کوشش کی گئی تو وہ بھاگ کھڑی ہوئی اور آم کے درخت کے نیچے چھپ کر سوچتی رہی "کیا میں مہندی بناجی نہیں سکتی ـــ ؟" وہ رات بھر اپنی چارپائی پر پڑی روتی رہی اور صبح کے وقت جب سب کی آنکھ کھلی تو وہ بخار میں پھنک رہی تھی۔ اس واقعہ کو برسوں بیت گئے تھے۔ مگر اکثر زندگی میں یہی محسوس ہوا تھا کہ کوئی اس کی ہتھیلیوں پر کسی کی چھڑائی ہوئی مہندی لگانے کی کوشش کر رہا ہے اور وہ ہاتھ جھٹک کر الگ ہو گئی تھی۔ اس لئے یونی ورسٹی کے زمانے میں کئی نوجوان صرف اس لئے بڑی شان سے ریجکٹ ہو گئے تھے کہ وہ پہلے کسی اور سے پروپوز کر کے ریجکٹ ہو چکے تھے۔ اگر کوئی ایسا مل جاتا اسے جو بالکل کورا گھڑا ہوتا اس کی زندگی کا رنگ ہی کچھ اور ہوتا اور وہ اپنی ہتھیلیوں پر سچا چوکھا رنگ چاہتی تھی۔ ویسے وہ کہتی کچھ اور تھی ـــــ "اونہہ! شادی میں کیا رکھا ہے؟ شادی تو سبھی کرتے ہیں یہ ان کے لئے ضروری بھی ہے جن کے دماغ میں بھوسا بھرا ہوا ہے۔" لیکن وہ اپنی اس خواہش کو دبا نہیں سکتی تھی۔ اس محرومی کا احساس اسے شدت سے تھا کہ کسی نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ نہیں تھاما۔ وہ اس جگہ پہنچ جاتی ہے جہاں کوئی راستہ نہیں آتا، جہاں سے کوئی راستہ نہیں نکلتا۔ جدید معاشرے کی آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی چکا چوند ماحول میں زندگی گزارنے والی سلمیٰ جلیس کی زندگی کا خلا کبھی پُر نہ ہو سکا۔ وہ زندگی بھر تنہا بھٹکتی رہی ـــــ!! انور عظیم نے سلمیٰ جلیس کے ذہن اور جذبات کا مطالعہ بہت ہی گہری نظر سے کیا ہے۔ اس کی نفسیاتی گتھیوں اور الجھنوں

کا تجزیہ بھی باریک بینی سے کیا ہے۔ جگہ جگہ نادر اور اچھوتی تشبیہیں بھی اس افسانے کی دلکشی، دلچسپی اور حسن میں اضافہ کرتی ہیں۔ بلاشبہ یہ افسانہ اس مجموعہ کی جان ہے۔

تیسرا اہم افسانہ "مولاں روژ" ہے۔ یہ ایک اعلیٰ درجہ کا ریسٹوران ہے جس کی آرائش و زیبائش اس کے نام کی طرح فرانسیسی انداز پر کی گئی ہے۔ اس ریسٹوران میں سویرے سے لے کر آدھی رات گئے تک جو لوگ آتے ہیں، ان کی گفتگو، ان کی پسند کی غذائیں، ان ہوس کی بھری جھوٹی محبت کے کھیل، سب کا ذکر ریسٹوران کی زبانی کیا ہے۔ نئی نسل کی بے چینی اور خود فریبی "مولاں روژ" کے اس ایک جملے سے ظاہر ہوتی ہے "میرا دل بھر آیا ہے، نہ جانے کتنی باتیں سنتا رہتا ہوں دن رات ——— وہ تمام باتیں میرے کانوں میں گونج رہی ہیں۔ میرے دل میں دھڑک رہی ہیں۔ یہ سب اپنی اپنی "میں" کے کنویں میں بند ہیں اور اپنے آپ کو پکار رہے ہیں ———"

اس کے علاوہ 'ساری رات'، 'دلوں کی رات'، 'قتل برائے قتل'، اور 'سات منزلہ بھوت' بھی اس مجموعے کے دلچسپ افسانے ہیں جو زندگی کی تلخ و شیریں حقیقتوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ ان افسانوں کو پڑھ کر اس خیال کی تردید ہو جاتی ہے کہ اردو افسانے پر جمود کی کیفیت طاری ہے ——— انور عظیم بلاشبہ اپنی طرز کے منفرد افسانہ نگار ہیں۔ ان کا مشاہدہ عمیق ہے اور اندازِ بیان بے باک ہے۔ عام انداز سے ہٹ کر انھوں نے اپنا علیحدہ اسلوب اختیار کیا ہے جس میں شدید احساسات اور گہری معنویت ہے۔ ان میں افسانہ نگاروں کی اگلی نسل کی قیادت کی صلاحیتیں موجود ہیں۔

ڈاکٹر رشید موسوی

ارشاد نامہ ——— تصنیف: برہان الدین جانم

مرتبہ: محمد اکبرالدین صدیقی۔ (حیدرآباد) مارچ ۱۹۷۲ء

جو لوگ کلاسیکی کتابوں کی ترتیب و تدوین کے اہم کام میں لگے ہوئے ہیں، ان میں عثمانیہ یونیورسٹی کے محمد اکبرالدین صدیقی صاحب کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ موصوف خاموشی اور لگن سے کام کرنے کے لئے امتیاز رکھتے ہیں۔

حال ہی میں موصوف کی تین کتابیں سامنے آئی ہیں۔ کلیات ممنون (قصائد)، ارشاد نامہ، اور انتخاب محمد قلی قطب شاہ۔ ارشاد نامہ برہان الدین جانم بیجاپوری کی تصنیف ہے۔ برہان الدین جانم میراں جی شمس العشاق کے فرزند تھے۔ جن کا پورا خاندان اپنے صوفیانہ کمالات اور علم و ادب کی خدمت کے لئے مشہور رہا ہے۔ ارشاد نامہ کا موضوع شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت کے مسائل ہیں۔ ایسی کتابوں کی ایک اہمیت ان کے فلسفیانہ اور مذہبی مباحث کے علاوہ یہ بھی ہے کہ یہ اردو کے اولین نقوش کا مستند نمونہ پیش کرتی ہیں۔ ایسی تحقیقات سے قدیم اردو کے بہت سے گوشے روشنی میں آگئے ہیں۔ لیکن بعض گتھیاں ابھی ایسی ہیں جن کو جدید علوم کی مدد سے سلجھانا ضروری ہے۔ شمال تو شمال خود دکن میں اردو کے کئی نام رہے ہیں گجری، گوجری، دکنی۔ کیا واقعی یہ الگ الگ بولیاں تھیں؟ ان کے علاقے کیا تھے؟ ان کے صرفی و نحوی خصائص کیا تھے؟ اور نوتشکیل اردو سے ان سے کیا تعلق تھا۔ اردو کے اکثر محققین گجری کو گجرات کی اردو کی ایک شکل مانتے آئے ہیں۔ اکبرالدین صدیقی صاحب نے اس مسئلہ پر نئی روشنی ڈالی ہے ان کا کہنا ہے کہ گجری کوئی الگ سے بولی نہیں تھی بلکہ دکنی ہی کی ایک شکل تھی۔ ان کا خیال ہے کہ دکن کے اکثر قصبات میں خواہ وہ ریاست حیدرآباد کے ہوں یا میسور کے، جہاں روزانہ کی سبزی ترکاری یا دیگر ضروریات زندگی کے لئے سڑک کے کنارے عارضی بازار لگتا ہے اس کو 'گذری' کہتے ہیں۔ یہی گذری کثرت استعمال سے 'گجری' ہو گیا۔ چنانچہ آج بھی اکثر قصبات میں جہاں جہاں ایسے بازار لگتے ہیں، گجری ہی کہلاتے ہیں۔ ایسے بازاروں میں ملی جلی غیر معیاری زبان بولی جاتی ہے۔ اکبرالدین صدیقی صاحب کی رائے ہے کہ برہان الدین جانم نے اپنی زبان کو انھیں معنوں میں گجری کہا ہے۔ اس ساری دلیل کی بنیاد ایک صوتی تبدیلی پر ہے یعنی "ز ج"۔ یہ تبدیلی ہند آریائی بولیوں میں عام ہے۔ لیکن اردو کے تمام علاقے میں "ز" کو "ز" ہی بولا جاتا ہے۔ اس مسئلہ کا غور طلب پہلو یہ ہے کہ اگر تمام دوسرے الفاظ میں جہاں "ز" آتا ہے، اس کو "ز" ہی بولتے ہیں تو صرف "گذری" کا "ز" "ج" میں تبدیل کیسے ہو گیا۔ کیا تیلگو میں "ز" کی آواز ہمیشہ "ج" میں بدل جاتی ہے؟ نیز کیا کسی قدیم مصنف نے لفظ "گذری" زبان کے لئے استعمال کیا ہے یا سب نے ہمیشہ "گجری" ہی لکھا ہے۔ اگر "گجری" اصل "گذری" تھا تو کوئی نہ کوئی قدیم روایت ایسی ضرور ہوگی جہاں "گذری" یعنی "ز" کے زبان کے معنی میں استعمال کیا گیا ہو۔ بہر حال اگر "ز" کے "ج" میں تبدیل ہونے کی مزید مثالیں فراہم ہو جائیں تو صدیقی صاحب کی دلیل زیادہ قابل تسلیم ہوگی۔ ارشاد نامہ کی زبان کا دوسرے ہمعصر یا قریب العصر دکنی مصنفوں کی زبان سے مقابلہ کرنا اور ان کی مماثلت ثابت کرنا بھی مفید مطلب ہوگا۔

کلیات ممنون ——— تصنیف: برہان الدین جانم

مرتبہ: محمد اکبرالدین صدیقی (حیدرآباد)

صدیقی صاحب کی دوسری کاوش کلیات ممنون کی اشاعت ہے۔ ممنون کا شمار دبستان دہلی کے اہم شعرا میں ہوتا ہے، وہ شاہ نصیر اور عبدالرحمٰن احسان کے ہمعصر تھے اس وقت لکھنؤ کے اثر سے غزل کی شعری اقدار میں تبدیلی پیدا ہو چلی تھی۔ اس کا اثر ممنون کے کلام میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ پرگو بھی تھے اور مشکل زمینوں میں شعر کہنے کے شائق بھی۔ ان کی شاعری کا سفر معنی سے زیادہ اظہار و بیان کی طرف نظر آتا ہے جو اس دور کے کئی دوسرے اور تیسرے درجے کے شعرا کی کیفیت ہے۔ ان کی غزل کے اشعار تو پھر بھی توجہ سے پڑھے جائیں گے۔ لیکن قصائد کی اہمیت محض تاریخی ہے صدیقی صاحب نے اس کی وضاحت نہیں کی کہ انھوں نے قصائد کو اشاعتی ترجیح کیوں دی۔ مقدمہ میں ممنون کی زندگی کے مستند حالات جمع کر دیئے گئے ہیں۔ امید ہے کہ اگلی جلد میں ممنون کی غزل اور اس دور کی غزل میں ان کے مقام سے مکمل کر بحث کی جائے گی۔ کلاسیکی سرمایہ کی حفاظت اور اس کی اشاعت بے حد مستحسن اقدام ہے اور اس کے لئے صدیقی صاحب کی محنت لائق داد ہے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

جولائی اور اگست میں ہونے والے امتحانی مقابلے

اسپیشل انٹری کیڈٹ کی بھرتی کیلئے انڈین نیوی کا امتحان

مقررہ عمر:۔ امتحان میں شرکت کے لئے صرف وہ امیدوار درخواست دے سکتے ہیں جن کی پیدائش ۲ جنوری ۱۹۵۴ء سے پہلے کی اور یکم جنوری ۱۹۵۷ء سے بعد کی نہ ہو عمر کے سلسلے میں مذکورہ بالا پابندی ہر حالت میں ضروری ہے۔

مطلوبہ تعلیمی قابلیت:۔ انٹرمیڈیٹ یا اس کے برابر کا کوئی امتحان۔ جو امیدوار انٹرمیڈیٹ یا اس کے برابر کے امتحان میں حال ہی میں شریک ہوئے ہوں یا شریک ہونے کا ارادہ رکھتے ہوں ان کی درخواستیں بھی عارضی طور پر قابل قبول ہوں گی۔

درخواستوں کے لئے مجوزہ فارم اور مکمل تفصیلات:۔ سکریٹری پبلک سروس کمیشن دھول پور ہاؤس، نئی دہلی (۱۱۰۰۱۱) سے ایک روپیہ کا منی آرڈر بھیجنے یا کمیشن کے آفس میں کاؤنٹر پر ایک روپیہ جمع کرانے پر حاصل کی جاسکتی ہیں۔ بندرگاہوں پر بحریہ کے دفاتر سے مذکورہ بالا فارم اور تفصیلات بغیر کسی قیمت کے بھی حاصل کی جاسکتی ہیں۔

آخری تاریخ:۔ درخواستوں کے مجوزہ فارم کی خانہ پُری کرنے کے بعد یہ درخواستیں ہر حالت میں ۱۲ فروری ۱۹۷۳ء تک یونین پبلک سروس کمیشن کے دفتر میں پہنچ جانا ضروری ہیں۔ وہ امیدوار جو بیرونی ممالک میں یا جزائر انڈمان اور نکوبار، لکا دیو، منی کوائے اور امین دیو میں رہتے ہوں ان کی درخواستیں ۲۶ فروری ۱۹۷۳ء تک دفتر میں پہنچ سکتی ہیں۔

انڈین فارسٹ سروس کا امتحان ۲۶ جولائی ۱۹۷۳ء

مقررہ عمر:۔ امیدواران کی عمر یکم جولائی ۱۹۷۳ء کو ۲۰ اور ۲۴ سال یا اس کے درمیان ہونا چاہیئے۔ شیڈول کاسٹ اور شیڈول قبائل سے تعلق رکھنے والے امیدواروں اور بعض دوسرے طبقوں کے لئے مقررہ عمر سے زیادہ ہونے کی صورت میں رعایت برتی جائے گی۔

تعلیمی قابلیت:۔ مندرجہ ذیل مضامین میں سے کسی ایک کے ساتھ بی۔اے کی ڈگری کا ہونا ضروری ہے۔

بوٹنی، کیمسٹری، جیولوجی، میتھمیٹکس، فزکس، اور زوولوجی یا ایگریکلچر یا انجینئرنگ میں گریجویٹ یا اس مقصد کے لئے تسلیم شدہ دوسری کوئی ڈگری کا ہونا ضروری ہے۔

درخواستوں کے لئے مجوزہ فارم اور مکمل تفصیلات:۔ سکریٹری یونین پبلک سروس کمیشن دھول پور ہاؤس۔ نئی دہلی (۱۱۰۰۱۱) سے ایک روپیہ کا منی آرڈر بھیجنے یا کمیشن کے آفس میں کاؤنٹر پر ایک روپیہ نقد جمع کرانے پر حاصل کی جاسکتی ہیں۔

آخری تاریخ:۔ درخواستوں کے مجوزہ فارم کی خانہ پُری کرنے کے بعد یہ درخواستیں ہر حالت میں ۱۹ فروری ۱۹۷۳ء تک یونین پبلک سروس کمیشن کے دفتر میں پہنچ جانا ضروری ہیں۔ وہ امیدوار جو بیرونی ممالک میں جزائر انڈمان اور نکوبار، لکا دیو، منی کوائے، اور امین دیو میں رہتے ہوں ان کی درخواستیں ۵ مارچ ۱۹۷۳ء تک دفتر میں پہنچ سکتی ہیں۔

جیولوجسٹ امتحان برائے ۱۹۷۳ء

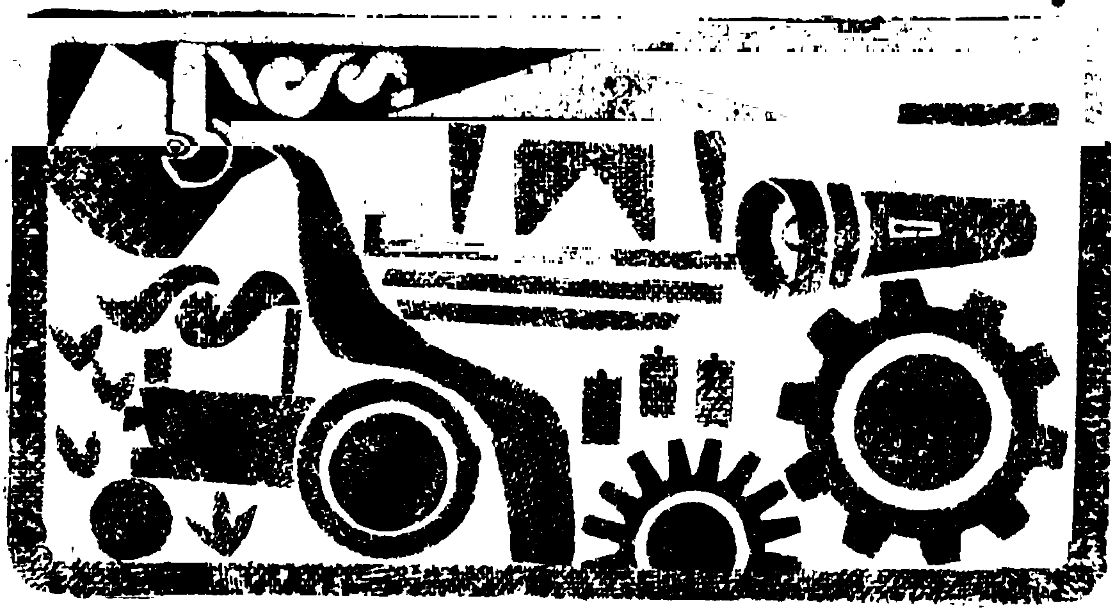
جیولوجسٹ سروے آف انڈیا میں جیولوجسٹ (جونیئر) کلاس ۱، اور اسسٹنٹ جیولوجسٹ کلاس ۱۱ کی عارضی جگہوں کو پُر کرنے کے لئے یونین پبلک سروس کمیشن کی طرف سے ۷ اگست ۱۹۷۳ء کو ایک مقابلہ کا امتحان ہو رہا ہے۔

مقررہ عمر:۔ امتحان میں شرکت کے لئے وہ امیدوار درخواست دے سکتے ہیں جن کی پیدائش ۲ جنوری ۱۹۴۳ء سے پہلے کی اور یکم جنوری ۱۹۵۲ء سے بعد کی نہ ہو، شیڈول کاسٹ اور شیڈول قبائل سے تعلق رکھنے والے امیدواروں اور بعض دوسرے درجوں، جن میں سرکاری ملازمین کے بھی کچھ درجے شامل ہیں کے لئے عمر کی مدت زیادہ نہ ہونے کی صورت میں رعایت برتی جائے گی۔

تعلیمی قابلیت:۔ جیولوجی یا اپلائیڈ جیولوجی میں ایم۔ایس۔سی کی ڈگری یا انڈین اسکول آف .... دھن باد میں اپلائیڈ جیولوجی میں شرکت کا ڈپلومہ۔

مکمل تفصیلات اور درخواستوں کے لئے مجوزہ فارم یونین پبلک سروس کمیشن دھولپور ہاؤس، شاہجہاں روڈ۔ نئی دہلی (۱۱۰۰۱۱) سے ایک روپیہ کا منی آرڈر بھیجنے یا کمیشن کے دفتر میں کاؤنٹر پر ایک روپیہ نقد جمع کرانے پر حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ امیدواروں کو چاہیئے کہ منی آرڈر کوپن پر "جیولوجسٹس ایگزامینیشن ۱۹۷۳ء" واضح طور پر لکھیں اور اپنا نام اور پورا پتہ بڑے حروف میں لکھیں۔ پوسٹل آرڈر یا چیک یا نوٹ قبول نہیں کئے جائیں گے۔ مکمل درخواستیں ۲۰ مارچ ۱۹۷۳ء تک یونین پبلک سروس کمیشن کے دفتر میں پہنچ جانا ضروری ہیں۔ ایسے امیدوار جو بیرونی ممالک میں اور جزائر انڈمان اور نکوبار، لکا دیو، منی کوائے، اور امین دیو میں رہتے ہیں ان کی درخواستیں ۳ اپریل ۱۹۷۳ء تک دفتر میں قبول کی جائیں گی۔

اپنے محدود ذرائع سے.....



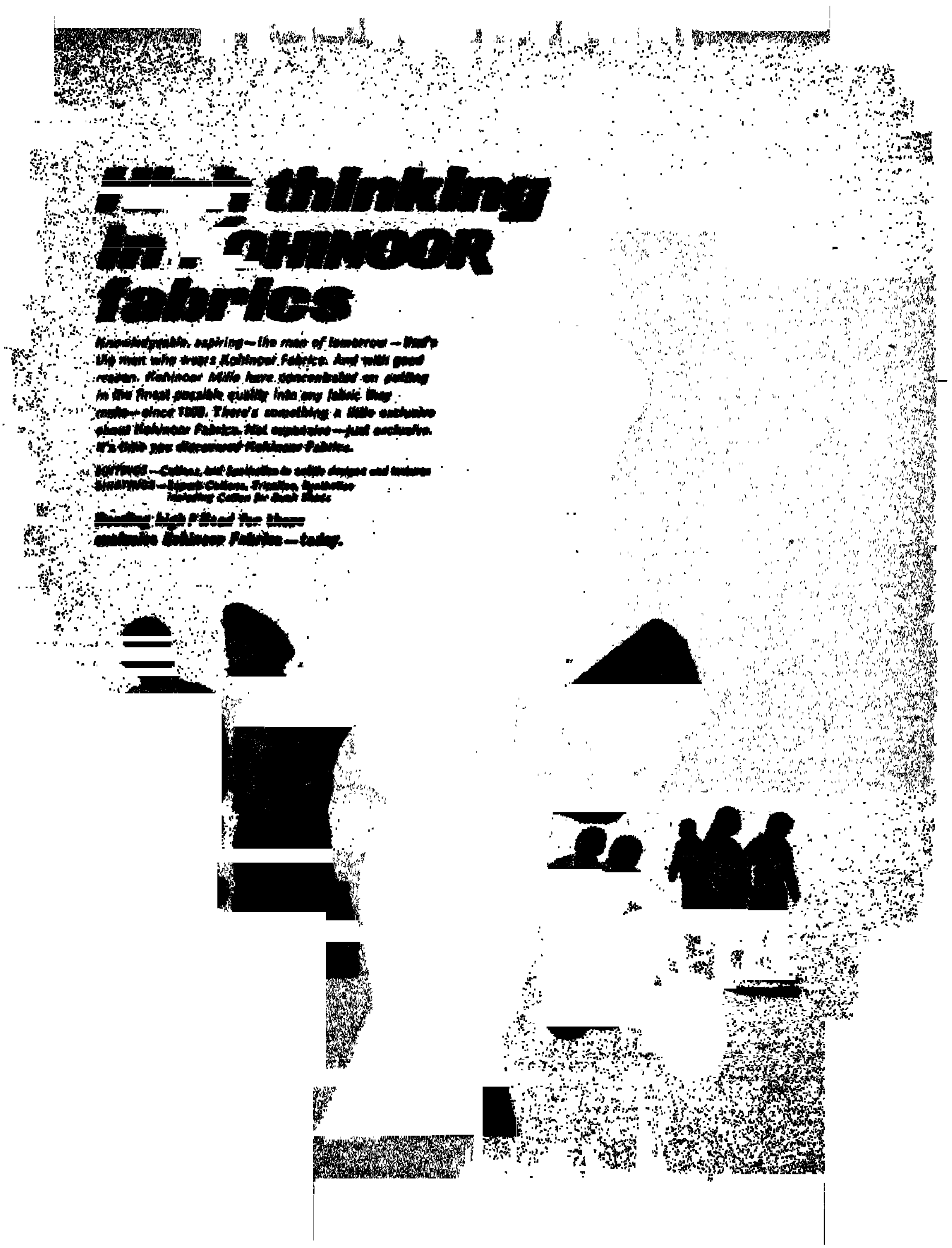
بھارت کو اپنے سبھی محاذوں پر لڑنے کے لئے ہمارا تعاون

ترقی کی راہ پر چلنے والا بھارت جیسے جیسے قدم اٹھا رہا ہے ہم بھی اپنا تعاون دے رہے ہیں. خوراک محاذ پر یونین کاربائیڈ کیڑے مکوڑے کا خاتمہ کرنے والی دوائی اور پولیتھین فلم دیتا ہے جس کے ذریعہ کسانوں کو زیادہ اور بڑھیا قسم کی فصل پیدا کرنے میں مدد ملتی ہے. گھر کے محاذ پر ہم آپکے لئے طرح طرح کی استعمال ہونے والی اشیاء جیسے بیٹری اور فلیش لائٹ سے لیکر پولیتھین سے بنے رنگین ڈبے تک مہیا کرتے ہیں. ادویات، روغن، کپڑا، لوہا فولاد اور ربڑ بنانے کیلئے خام مال اور کیمیائی اشیاء بھی مہیا کرتے ہیں. برآمد کے محاذ میں یونین کاربائیڈ پانچوں اعظموں میں اپنے لئے نئی منڈیاں تلاش کر رہا ہے اور اسکی بنی ہوئی اشیاء پچاس سے زائد ممالک میں جن میں ریاستہائے متحدہ امریکہ بھی شامل ہے بھیجی جاتی ہیں. ان کاموں میں چند ایک ہیں جنکی یونین کاربائیڈ انڈیا لمیٹڈ نے بھارت کے لوگوں کا معیار زندگی بلند کرنے کیلئے بنیاد ڈالی ہے اس طرح ہم اپنے محدود ذرائع سے بھارت کی مدد کرتے ہیں تا کہ وہ سبھی محاذوں پر اپنی لڑائی لڑ سکے۔

UNION CARBIDE

sowing the seeds of progress

UC-1656 D-CM


thinking
fabrics



انہوں نے آزادی کی جنگ جیتی

آؤ! ہم بھارت کی تعمیر و ترقی کے

انقلاب کو پایۂ تکمیل

تک پہنچائیں

25

davp 72/129

عورتوں کے لئے ایک نیا موقع

ایک نئی بچت اسکیم، جس کا افتتاح پردھان منتری شریمتی اندرا گاندھی نے یکم اپریل کو کیا تھا، آپ کو ایک عارضی جز وقتی کام مہیا کرتی ہے۔ "مہلا پردھان کشیتریہ بچت یوجنا" نامی اس اسکیم کے ذریعہ آپ

- اپنے کنبے کی آمدنی بڑھا سکتی ہیں۔
- اپنے فالتو وقت کا سود مند استعمال کر سکتی ہیں۔
- سماجی میل جول کا دائرہ وسیع کر سکتی ہیں۔
- قومی خدمت انجام دے سکتی ہیں۔



مہلا بچت پردھان کی حیثیت سے آپ کا کام ہوگا:

اپنے علاقے کی گھریلو عورتوں سے ملنا
انھیں باقاعدہ بچت کرنے پر آمادہ کرنا
ہر مہینے ان کی بچت کی رقوم اکٹھی کرنا
اور انھیں مقررہ ڈاک خانہ میں جمع کرا دینا۔

اس طرح آپ جتنی رقم اکٹھی کریں گی اس پر آپ کو 2 فیصدی کمیشن ملے گا۔

ملک بھر کے شہروں اور بڑے بڑے قصبوں میں مہلا بچت پردھان کی ضرورت ہے۔

تفصیلات کے لئے حسب ذیل پتہ پر لکھیئے:

نیشنل سیونگز کمشنر
پوسٹ بکس 96
ناگپور



نوازش نامے

مسلم پرسنل لا میں تبدیلی ضروری ہے

کبھی کبھی مجھ میں چھپا ہوا روایتی مذہب، فکر و نظر کے سامنے نئے نئے میدان دیکھ کر ایک تھکن سی محسوس کرتا ہے۔ اور کبھی کبھی روایتوں کے خرافات سے نکل بھاگتے ہوئے اپنی کارگاہِ عمل کو دیکھ کر ٹھٹک جاتا ہوں جہاں رہ کر مجھے کام کرنا ہے۔

علیگڑھ بل کے متعلق کبھی تو ہماری مذہبی، سیاسی، نیم مذہبی و نیم سیاسی جماعتوں کی کوششوں کو دیکھتا ہوں تو خود مجھے افسوس ہوتا ہے کہ ان پر انگلی اٹھانے سے پہلے ہمارا یہ کام تھا کہ عوام میں اس کی خوب پبلسٹی کی جاتی۔ ہم نے ایسا نہیں کیا۔ ظاہر ہے مسلم عوام یہ سمجھ بیٹھے کہ حکومت دیدہ و دانستہ مسلمانوں سے اس کی نشانیاں چھین رہی ہے۔ آپ کی کوشش دیکھنے سے پہلے خود میرا دماغ اس مسئلے سے متعلق صاف نہیں تھا۔ لیکن آپ ہی کہئے ایک چنا کیا بھاڑ پھوڑ سکتا ہے۔

بہت پہلے، میں نے کہیں پڑھا تھا کہ پروفیسر محمد مجیب نے یہ ثابت کیا ہے کہ مسلم پرسنل لا بڑی حد تک مسلم نہیں ہے یعنی بڑی حد تک قرآن و حدیث پر مبنی نہیں ہے۔ مگر میری بدقسمتی کہ یہ مضمون دیکھنے کا اتفاق بھی نہیں ہوا۔ اس کی اشاعت اگر ایک محدود حلقہ میں ہو تو وہ کس کام کا۔ جب کہ مسئلہ ہندوستان گیر ہو؟

خود میرے ذہن میں دو باتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں قطعیت سے میں خود محروم ہوں۔ پہلی بات تو یہ کہ قرآن نے ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت "بشرط انصاف" دی ہے۔ مسلم پرسنل لا میں شاید یہ شرط ملحوظ نہیں۔ دوسری بات یہ کہ دادا کی زندگی ہی میں باپ کے انتقال پر پوتے اور پوتیوں کو وراثت سے محروم کر دینا قرینِ انصاف نہیں ہے۔ مولانا مودودی نے اس ضمن میں کہا ہے کہ قرآن نے جب "وصیت" کا موقع دیا ہے تو دادا کو چاہیئے کہ اپنے یتیم پوتے اور پوتیوں کے متعلق وصیت فرما دے۔ مگر جب یہ حق، وراثت نہیں صرف بہ وصیت دیا گیا ہے۔ دادا اگر کسی وصیت کے بغیر مر جائیں تو کیا پوتے اور پوتیاں محروم نہیں ہوں گے؟ اگر اس "وصیت" کو، جو منشاء قرآن ہے، وراثت میں لے لی جائے تو کیا قرآن کا مقصد پورا نہیں ہوتا؟ کیا یہ بھی مداخلت فی الدین ہے؟

میری گزارش ہے کہ اس سلسلے میں علمائے اسلام کے مضامین "سیکولر ڈیموکریسی" میں سلسلہ وار شائع ہوں۔ بحث و مباحثہ ضرور ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ اکثر مذہبی بحثیں بے کار ثابت ہوتی ہیں۔ مگر لوگ حقیقت سے واقف تو ہو جائیں گے۔ مختلف نظریات سامنے آئیں گے۔ تو کم از کم مجھ جیسے تشنگانِ حق تو ضرور مستفید ہوں گے۔

عبدالوہاب تسنیم لیکچرر وی۔ آر کالج۔ نیلور

مسلم پرسنل لا اور حکومت پرست

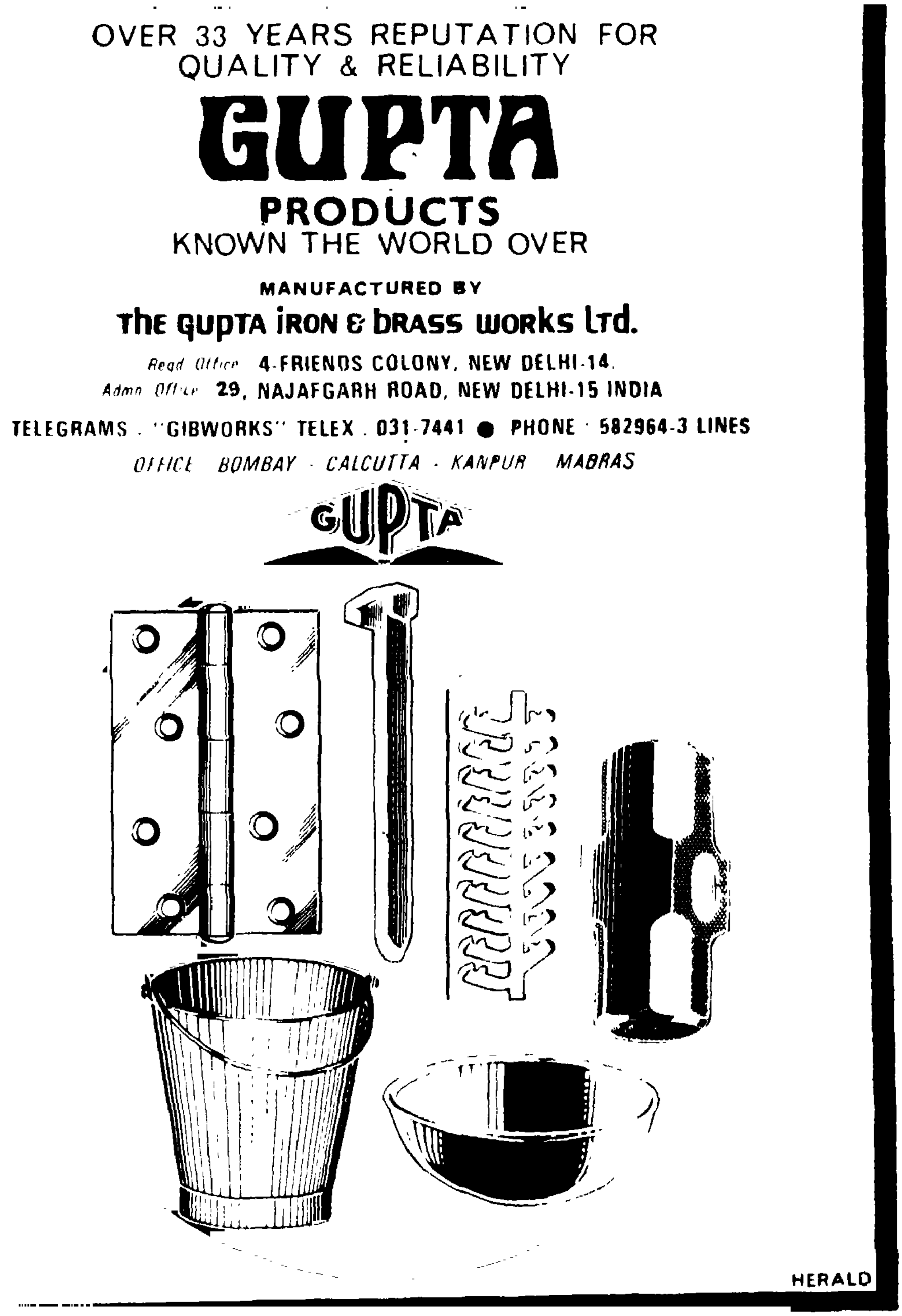
محترمی! "سیکولر ڈیموکریسی" کے پچھلے شمارے میں مسلم پرسنل لا کے کنونشن منعقدہ بمبئی پر جناب گوئل صاحب کا مضمون "مسلم پرسنل لا پر ہنگامہ آرائی" پڑھا۔ مضمون بہت اچھا ہے اور اس میں موجودہ صورت حال اور زیر بحث مسئلے کا بڑی خوبصورتی سے جائزہ لیا گیا ہے اور جذباتی اور رجعت پرست اور تنگ نظر مسلمانوں کے عقل و شعور کو جس طرح بیدار کرنے کی کوشش کی گئی، وہ قابل تعریف ہے۔ مگر حمید دلوائی اور پروفیسر اے۔ بی۔ شاہ کا اس میں ذکر بے موقع اور نامناسب ہے۔ حمید دلوائی اور اے۔ بی۔ شاہ کے خیالات اور طریق کار سے گوئل صاحب کو یا "سیکولر ڈیموکریسی" کو اختلاف ہو سکتا ہے مگر ان کے بارے میں اظہار رائے کرتے وقت اس کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ جو مسلمان حمید دلوائی اور اے۔ بی۔ شاہ کے مخالف ہیں وہ "سیکولر ڈیموکریسی" کے بھی مخالف ہیں کیونکہ یہ رجعت پرست اور قدامت پرست مسلمان ہر رسم و رواج کو مذہب کا لازمی جزو سمجھتے ہیں اور جو شخص بھی چاہے وہ حمید دلوائی ہوں یا کوئی اور، سماجی اصلاح کی کوشش کرتا ہے، ان کے نزدیک ایسا شخص مسلمان اور اسلام کا دشمن ہے۔ سر سید سے لے کر آج تک جتنے مسلمانوں کو کفر کے فتوے دیئے گئے ہیں ان کا قصور صرف یہی تھا کہ وہ قدامت پرستی، رجعت پرستی اور مذہبی تنگ نظری کے خلاف تھے اور وہ زمانہ کے تقاضوں کو پورا کرنا چاہتے تھے۔ جو مسلمان بقول گوئل صاحب "حمید دلوائی کی قماش کے لوگوں کو بھی حکومت کا نمائندہ قرار دیتے ہیں"، ان کا روئے سخن صرف حمید دلوائی، اے۔ بی۔ شاہ اور پروفیسر فیضی تک محدود نہیں ہوتا، وہ ہر اس شخص کو جو ان سے سیاسی مسائل یا سماجی برائیوں کی اصلاح میں اختلاف کرتا ہے، حکومت کا پٹھو اور چاپلوس وغیرہ کہہ کر کسی غلط فہمی میں نہیں قصداً اور سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق اسے اس قدر بدنام کرنا چاہتے ہیں کہ ایسے اشخاص عام مسلمانوں کی نظر میں بالکل گر جائیں اور ان کی تحریریں عام مسلمانوں میں پڑھی نہ جائیں۔ گوئل صاحب کی اس تحریر سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جماعت اسلامی کے روزنامہ "دعوت" نے ایک ایسا جملہ لکھا ہے جو انتہائی غیر شائستہ اور تہذیب سے گرا ہوا ہے۔

اس شمارے کے دوسرے مضامین بھی اچھے ہیں "مسلم سیاست میں توازن کی ضرورت" میں عام مسلمانوں اور فرقہ پرست مسلم رہنماؤں کی ذہنیت اور طرزِ فکر کی صحیح عکاسی کی گئی ہے اور انھیں مناسب اور مفید مشورے دیئے گئے ہیں۔ "امن کے خلاف سازشیں" دہلی میں اردو کی حالت اور ہندی اردو کے دو ادیب پروفیسر سید احتشام حسین اور موہن راکیش کے انتقال پر دونوں مضامین بہت اچھے اور معلوماتی ہیں۔ "متحدہ قومیت کی تشکیل کا مسئلہ" کے خلاف "سیکولر ڈیموکریسی" کے پچھلے شمارے میں دو خط شائع ہوئے تھے۔ اس مرتبہ میں نے اس مضمون کی دوسری قسط کو خاص طور پر پڑھا۔ اس کے بارے میں چاہے یہ خیال صحیح نہ ہو کہ "فرقہ پرستانہ اور زہریلا مقالہ ہے" مگر اس میں شبہ نہیں کہ فاضل مضمون نگار کی سمجھ بوجھ اور نظر ابھی بلوغ کی اس سطح تک نہیں پہنچی ہے جو ایسے مضامین کے لئے ضروری ہے۔

عبداللطیف اعظمی

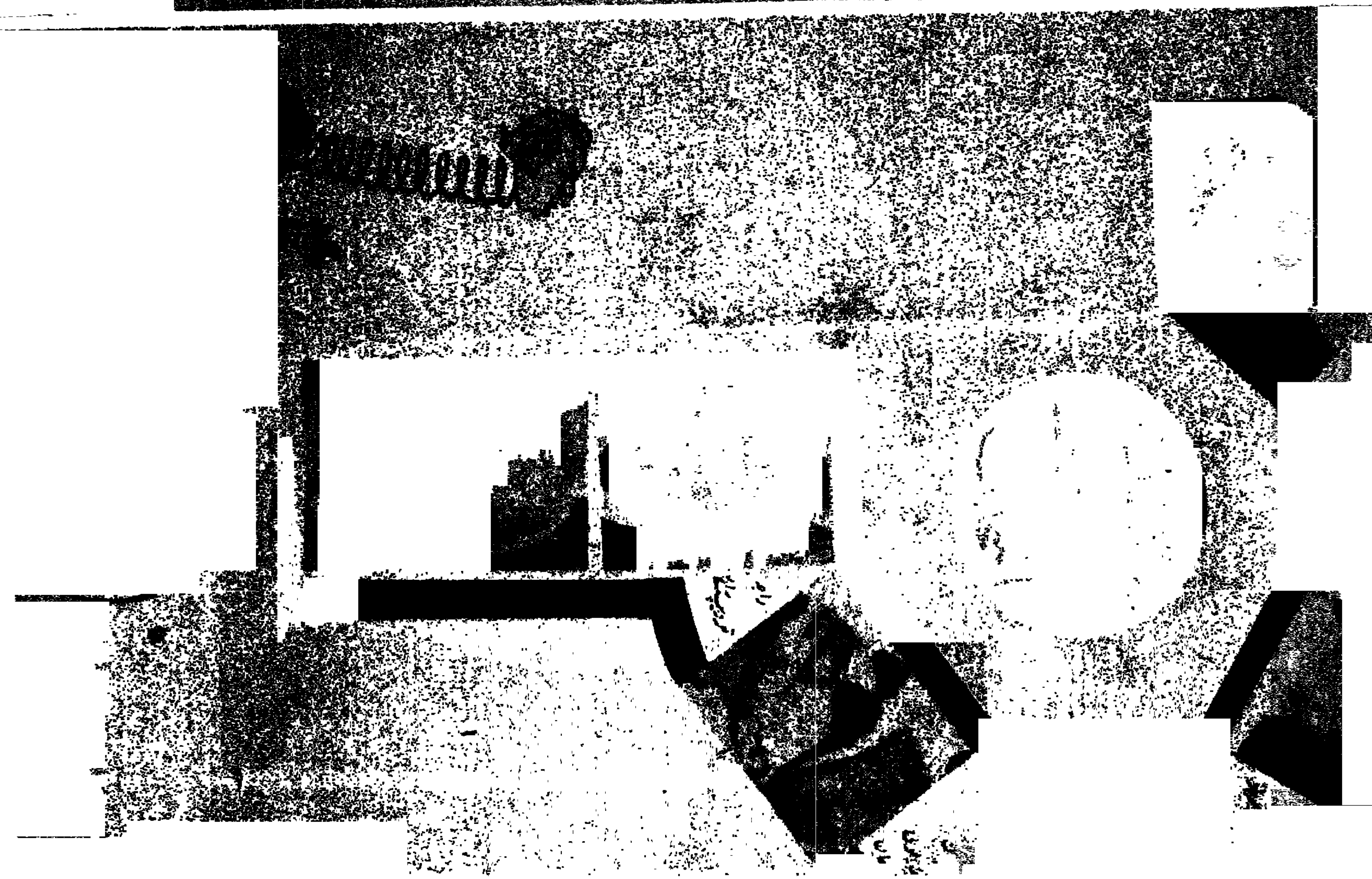


CMTH-14-203 UR



این این پانڈے نے قومی ایکتا ٹرسٹ کے لئے وشنو آفسٹ پریس سے چھپوا کر شائع کیا
رجسٹرڈ آفس:- A-19، تھیٹر کمیونیکیشن بلڈنگ، کناٹ سرکس، نئی دہلی۔ ایڈیٹر:- ڈی آر گوئل

سیکولر ڈیموکریسی



DONATE GENEROUSLY
TO
QAUMI EKTA TRUST

THE TRUST IS SET UP

- ★ TO PROMOTE NATIONAL UNITY AND COMMUNAL HARMONY.
- ★ TO FOSTER IDEAS OF COMPOSITE NATIONALISM AND COMMON CITIZENSHIP.
- ★ TO PROMOTE GOODWILL AND ERADICATE SUSPICIONS AMONG DIFFERENT COMMUNITIES.
- ★ TO PROJECT THE GREAT HUMANIST TRADITION OF INDIA.
- ★ TO BUILD A TEAM OF DEDICATED TRAINED WORKERS TO FIGHT COMMUNAL FASCISM AND OTHER DIVISIVE ANTI-DEMOCRATIC TENDENCIES.

Subhadra Joshi
Chairman
Qaumi Ekta Trust
14, Balwant Rai Mehta Lane
New Delhi-1.

بالکل نجی

آپ کا خط آپ کا بالکل نجی معاملہ ہے .... لیکن خط پر لکھا پتہ
ڈاکیے کو ضرور پڑھنا پڑتا ہے ۔ یہی تو اس کا کام ہے ....
اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا خط جلدی پہنچے تو اس پر مکمل
اور صاف پتہ لکھیے ۔

اگر مکتوب الیہ اپنا پتہ پیچھے چھوڑے بغیر نئے مقام پر چلا گیا ہے
تو آپ کے خط کو کھولے بغیر واپس کر دیا جائے گا ۔ لیکن اس کیلئے
یہ ضروری ہے کہ آپ خط کے پتے والی طرف کے بائیں نچلے کونے میں
اپنا نام و پتہ لکھ دیں ۔ ہوائی ڈاک کے ذریعے بھیجے جانے والے خطوط کی صورت میں
خط بھیجنے والے کا پتہ پشت پر اس مقصد کے لئے چھوڑی گئی جگہ پر لکھا جانا چاہیے ۔

براہ کرم پن کوڈ کام میں لائیے
اس سے ڈاک جلدی پہنچتی ہے

بہتر خدمت کے لئے ہمیں تعاون دیجیے

محکمہ ڈاک و تار



davp 72/407

دلّی کو بہتر اور خوبصورت بنانے کے لئے

آئیے

عہد کریں

۱ بجلی کی موجودہ کمی کے پیشِ نظر میں انفرادی طور پر اپنے بس بھر بجلی کے خرچ میں کفایت کروں گا۔ اور اس بات کی کارگر کوشش کروں گا کہ جن انجمنوں سے میں منسلک ہوں وہ بھی بجلی کے استعمال میں کفایت کریں گی۔

۲ میں انفرادی طور سے اور جن تنظیموں سے منسلک ہوں ان کے ذریعے اناج کی بربادی اور پارٹیوں اور سماجی تقریبات میں اشیائے خوراک کو برباد ہونے سے بچانے کی کوشش کروں گا۔

۳ میں خود اور مجھ سے منسلک اداروں اور تنظیموں کے ذریعے بلا وجہ بڑھتی ہوئی قیمتوں اور تجارت میں ذخیرہ اندوزی، مہنگائی اور بدعنوانی کو ختم کرنے کے لئے کارگر قدم اٹھاؤں گا۔

۴ میں حتی الامکان تشدّد، فرقہ واریت اور سماج کے ناپسندیدہ عناصر کے ذریعے پبلک املاک کو تباہی سے نجات دلانے کی کوشش کروں گا۔

۵ مجھ سے منسلک اداروں اور تنظیموں کے ذریعے غریبی ہٹانے، ذات کے فرق کو مٹانے اور سماجی، اقتصادی نابرابری دور کرنے کی اسکیموں کے تئیں جذبہ پیدا کرنے اور انھیں عملی جامہ پہنانے کی پوری پوری کوشش کروں گا۔

۶ میں دلّی شہر کو سماجی، اقتصادی اور خوشگوار ماحول کے پیشِ نظر اسے بہتر بنانے کی کوششوں میں اپنا بھرپور تعاون دوں گا۔

صنعت، تجارت، سوشل ورک، تعلیم اور ریسرچ اور دیگر اہم شعبوں سے متعلقہ سبھی اشخاص اور انجمنوں سے اپیل ہے کہ وہ اپنی مادرِ وطن کی راجدھانی کی عظمت و شوکت، صحت مند سماجی فلاح اور خوشگوار ماحول پیدا کرنے کے لئے مندرجہ بالا حلف اٹھائیں۔

مثالی اور نمونہ کی راجدھانی بنانے میں آپ ہمیں اپنا تعاون دیں

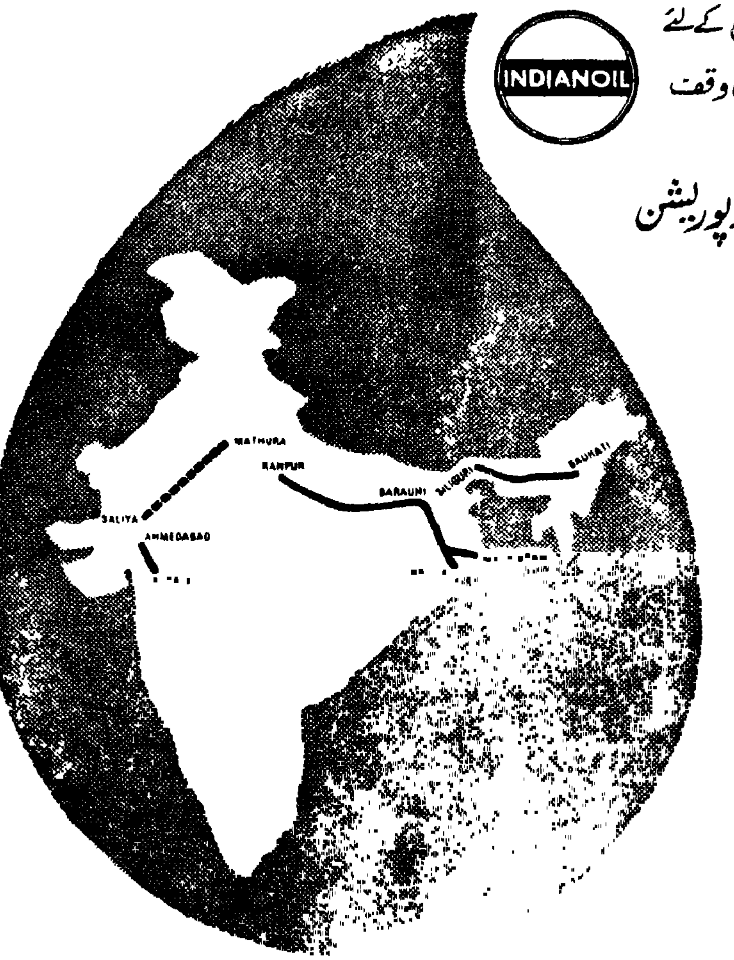
دہلی انتظامیہ دہلی

تیل بغیر کسی رکاوٹ کے پائپ لائن کے ذریعہ بہتا ہے

پائپ لائن کے ذریعہ خام اور تیار شدہ تیل ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جاتا ہے۔ اس طرح کی بار برداری بغیر کسی رکاوٹ کے اور کفالت سے ہوتی ہے۔ انڈین آئیل نے تیل صاف کرنے کے کارخانوں کو تیل استعمال ہونے والے مندرجہ ذیل مرکز سے پائپ لائن کے ذریعہ ملا دیا ہے۔

گوہاٹی۔ سلگری	:	۴۲۶ کلومیٹر
بیرونی۔ کانپور	:	۷۶۸ کلومیٹر
بیرونی۔ ہلدیا	:	۵۲۵ کلومیٹر
اور کوئلی۔ احمدآباد	:	۱۱۵ کلومیٹر

ماہر انجینئروں اور تکنیکی ماہروں نے سیلیہ (کچھ) سے متھرا تک بارہ سو کلومیٹر لمبی تیل کی پائپ لائن بچھانے کا کام شروع کر دیا ہے۔ سیلیہ میں بہت جلد تیل صاف کرنے کا سب سے بڑا کارخانہ قائم ہو رہا ہے۔



اقتصادی ترقی کے لئے
ایک قومی وقف

انڈین آئیل کارپوریشن

کیا آپ

کسی یونیورسٹی کے طالب علم

یا

تعلیم یافتہ

بیروزگار ہیں؟

ہمیں آپ ہی کی تلاش ہے!

ہمیں ایسے نوجوان اور باہمت مردوں اور عورتوں کی ضرورت ہے جو بھارت سرکار کے نیشنل سیونگز سرٹیفکیٹ اور میعادی ڈپازٹ کھاتے بیچنے کا کام کرنے کو تیار ہوں۔ آپ کا کام ان سرکاری کفالتوں کے لئے کنویسنگ کرنا ہوگا۔

ان پر سود 7 ½ % سالانہ تک دیا جاتا ہے۔ یہ ایک ہمت کا کام ہے جس پر آپ کو 1 75% کمیشن ملے گا اور نئے لوگوں سے رابطہ پیدا کرنے اور اپنی شخصیت کو اُجاگر کرنے کا موقع بھی ملے گا۔

وہ برسرروزگار افراد جو اپنی آمدنی میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں، بھی درخواست بھیج سکتے ہیں۔

اگر آپ کو اس کام سے دلچسپی ہو
تو آج ہی
نیشنل سیونگز کمشنر، پوسٹ بکس نمبر 96، ناگپور
کے پتے پر درخواست بھیجیں۔

davp 72/507

ماہنامہ

سیکولر ڈیموکریسی

مارچ ۱۹۷۳ء

شمارہ ۱۶

فہرست

شرح

مشاورت بورڈ

ڈاکٹر تارا چند
پروفیسر محمد مجیب
ڈاکٹر سروپ سنگھ
کرنل بی۔ ایچ۔ زیدی
ڈاکٹر ستیش چندر
بلراج ساہنی
عالم خوندمیری
راجندر سنگھ بیدی
اے۔ این۔ وزیالنکار
امر ناتھ سہگل
کے۔ داموودرن

* ایڈیٹرز
سبھدرا جوشی
ڈی۔ آر۔ گوئل
خلیق انجم

* جنرل منیجر
راجندر کمار

* بزنس منیجر
جی۔ ایل۔ ملہوترا

* دفتر کا پتہ
۱۹۔ اے، تھیٹر کیمونی کیشن بلڈنگ
کناٹ سرکس۔ نئی دہلی ۱

* ٹیلیفون ۴۳۳۸۳

ہمارے نمائندے

* مسز کمل سانیال
۱۔ ڈوور روڈ کلکتہ
* شری ایم۔ این۔ صدیقی
نوبت ولا پلاٹ نمبر ۵۶۔ ۵۷
جوہو ولے پارلے ہاؤسنگ سکیم
نارتھ ساؤتھ روڈ نمبر ۱
آف ارلا برج اندھیری (ویسٹ)
بمبئی ۵۸ (اے۔ ایس)
* شری روپ نرائن پانڈے
ڈی۔ ۲۸، شانتی پتھ
تلک نگر جے پور۔ ۴
* شریمتی خدیجہ عالم خوندمیری
۱۵/۱۱ ۱۱۔۱۶، سلیم نگر
حیدرآباد۔ ۳۶
* ڈاکٹر معین شاکر
ڈیپارٹمنٹ آف پولیٹکل سائنس
مرہٹواڑہ یونی ورسٹی اورنگ آباد
* شری بی۔ این۔ پانڈے
۱۴۸۔ آزاد سکوائر
ساؤتھ ملکہ الہ آباد
* سردار سریندر سنگھ سندھو
پی۔ این ۲/۳۴۔ لاڈووالی روڈ۔ جالندھر
* سردار اقبال سنگھ
سیکٹر ۱۸۔ اے
کوارٹر نمبر ۵۹۳ چنڈی گڑھ
* شری این۔ کے۔ سنگھ
کھادی گرام اُدیوگ سنگھ، مراد پور پٹنہ ۴

اگلے شمارے میں

جن سنگھ کا کانپور سیشن
ایک تجزیاتی مضمون
ڈی۔ آر۔ گوئل

علیگڈھ مسلم یونیورسٹی (ترمیمی) ایکٹ
ایک مطالعہ
خلیق انجم

علی گڑھ ایکٹ میں ترمیم ضروری

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے ترمیمی ایکٹ ۱۹۷۲ء پر ایک تنقید (سائیکلو سٹائل) کی حال ہی میں اشاعت ہوئی ہے۔ اس کے مصنف پروفیسر رشید الظفر علی گڑھ یونی ورسٹی کے اسٹاف ایسوسی ایشن کے سکریٹری ہیں۔ انھوں نے گجندر گڈکر کی یونی ورسٹی کے انتظام پر رپورٹ کی روشنی میں اس ترمیمی ایکٹ کو دیکھنے کی کوشش کی ہے اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔

"علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی (ترمیمی) ایکٹ ۱۹۷۲ء کی بہت سی دفعات کی اصل روح کو غیر جمہوری لفظ سے تعبیر کیا جانا چاہیئے ——— الیکشن کے اصول کو عام طور سے ختم کرکے نامزدگی اور مدتِ ملازمت کے مطابق باری باری تقرر کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اس ایکٹ کے مطابق وائس چانسلر کا انتخاب ایک ایسی کمیٹی کرے گی جس میں وزارت تعلیم کو کافی دخل ہوگا، پھر بھی وائس چانسلر کو غیر معمولی اقتدار دیا گیا ہے۔ یونی ورسٹی کی قانون ساز کمیٹیوں میں ڈین اور مختلف شعبوں کے صدر جن کی تعداد غیر معمولی ہے، ان کے تقرر کا حق محض وائس چانسلر کو ہے ——— اساتذہ اور یونی ورسٹی کے دوسرے ملازمین کی ایسوسی ایشن کے آئین یونیورسٹی کی ایگزیکیٹیو کونسل بنائے گی۔ بورڈ آف اسٹڈیز اور ڈپارٹمنٹ کی دوسری کمیٹیوں میں پالیسی بنانے کے معاملے میں اساتذہ کی انجمنوں کو کوئی دخل نہیں ہوگا ——— اسٹوڈینٹ یونین کا مرتبہ پہلے سے کم کر دیا گیا ہے اور اب وہ سو ممبران پر مشتمل جنرل کونسل کے ذریعہ کام کر سکے گی ——— اساتذہ کی ملازمت کی بنیاد کونٹریکٹ پر ہوگی۔ غیر اساتذہ ملازموں کو یونی ورسٹی کی کسی بھی تنظیم میں نمائندگی نہیں دی گئی ——— یونی ورسٹی کے قانون کا یہ انداز ہے جسے پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا اور جس کا پارلیمنٹ نے اور ملک نے یونی ورسٹی کے غیر معمولی جمہوری اقدام کے طور پر استقبال کیا۔"

ضرورت اس بات کی ہے کہ سب لوگ اس تنقید پر انتہائی سنجیدگی سے غور کریں، خاص طور سے وزیر اعظم اور وزیر تعلیم ——— جنھوں نے بارہا یقین دلایا ہے کہ وہ اس تعلیم گاہ کو ایک سیکولر اور جمہوری سوسائٹی کے شایانِ شان بنانا چاہتے ہیں ——— جب یہ بل پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا تھا تو اس وقت تمام سیاسی جماعتوں سے تعلق رکھنے والے لوگ (جن میں کانگریس کے لوگ بھی شامل تھے) چاہتے تھے کہ ڈرافٹ بل پر بہت احتیاط سے غور کیا جائے۔ ایسے لوگ بھی خاصی تعداد میں تھے جو چاہتے تھے کہ اس بل کو پہلے ایک مشترکہ سلیکٹ کمیٹی کے سپرد کیا جائے۔ اس بل کے بنانے والوں نے احتیاطی اقدام سے متعلق مشورے شاید اس لئے نہیں سنے کہ ان کا خیال تھا کہ مشورہ دینے والے علمی مصلحتوں کی بنا پر ایسا نہیں کہہ رہے، یا شاید ان کا عقیدہ تھا کہ جو ڈرافٹ وہ پیش کر رہے ہیں، اس پر علمی بنیادوں پر اعتراض کی گنجائش نہیں ہے۔

بدقسمتی سے جن حالات میں یہ بل پیش کیا گیا، ان میں یہ ممکن نہ تھا کہ ٹھنڈے دل سے اور احتیاط کے ساتھ اس کے جمہوری اور علمی پہلوؤں پر غور کیا جا سکتا، اس حقیقت کی بہترین مثال یہ ہے کہ کس طرح فرقہ وارانہ طاقتیں لوگوں کی توجہ اصل موضوع سے ہٹاتی ہیں اور کس طرح وہ سطحی موضوعات پر جذبات کو اُبھار کر اصل موضوع سے انحراف کرنے پر مجبور کرتی ہیں ——— علی گڑھ یونی ورسٹی میں احتجاج کرایا گیا کہ علی گڑھ بل فوراً پیش کیا جائے۔ ۱۹۶۵ء میں ہونے والے بے ہودہ واقعات کے نتیجہ کے طور پر پچھلے ایکٹ کو معطل کر دیا گیا تھا۔ احتجاج کرنے والوں نے یقیناً فرقہ وارانہ عناصر کے زیر اثر عوام کو یہ سمجھانے کی

کوشش نہیں کی کہ یونیورسٹی انتظامیہ کا وہ کون سا ڈھانچہ ہے جسے وہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے لئے مناسب سمجھتے ہیں۔ اس احتجاج سے وہ لوگ لاچار و مجبور ہوگئے۔ جو چاہتے تھے کہ اس بل پر پہلے معقول طریقہ پر بحث کی جائے اور ان لوگوں کے ہاتھ مضبوط ہوگئے جو اس بل کو جلدی میں پاس کرانا چاہتے تھے۔

اس بل پر جو ردعمل ہوا اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ بل کے نقادوں کے ذہن میں فرقہ وارانہ مصلحتوں کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ عوام کے جذبات کو یہاں تک مشتعل کیا گیا کہ وہ پولیس سے ٹکرا گئے۔ ان ناسازگار حالات سے فائدہ اٹھانے کے لئے بہت سے جانے اَن جانے عناصر سامنے آگئے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاکر عوام کی بے چینی کو بڑھانے کی کوشش کی گئی اور ظاہر ہے یہ مقصد ان لوگوں کا تھا جو ہندوستان کے سوشلزم کے راستہ میں رکاوٹ بننا چاہتے ہیں۔ علی گڑھ، فیروز آباد اور بنارس میں پولیس کے رویہ نے حالات کو اور بھی ناسازگار بنا دیا۔

علی گڑھ یونی ورسٹی سے اب خود ایک ایسی آواز بلند ہوئی ہے جو اصل مسئلہ کی نشاندہی کرتی ہے گورنمنٹ کی اندرونی اور بیرونی جمہوری رائے کا فرض ہے کہ اس موقع سے فائدہ اٹھاکر مسئلہ پر توجہ کرے اور اگر واقعی ایکٹ میں کچھ غیر جمہوری عناصر داخل ہوگئے ہیں تو انھیں نکالنے کی کوشش کرے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے یونی ورسٹی انتظامیہ کے لئے ایک بہترین ایکٹ بنایا ہے۔ انھیں اس پر نظر ثانی ضرور کرنی چاہیئے۔

جو لوگ اس ایکٹ سے متاثر ہوئے ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس میں غیر جمہوری عناصر آگئے ہیں تو ان کا فرض ہے کہ ضد نہ کریں، جمہوریت میں ہر شخص پر اور خاص طور سے صاحب اقتدار طبقہ پر یہ لازم ہے کہ وہ اپنے مخالفین کی بات کو غور سے سنیں، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی اسٹاف ایسوسی ایشن کے سکریٹری نے جو باتیں کہی ہیں وہ حقائق پر مبنی ہیں اور وہ قومی آدرشوں کی روشنی میں کہی گئی ہیں ــــ فرقہ پرست جو تباہی لاسکتے تھے، لے آئے ان کی فطرت سے اس سے بہتر کی امید بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔

سیکولر ہندوستان کو اب مزید خاموش نہیں رہنا چاہیئے۔ اگر ملک کو تباہی سے بچانا ہے تو علی گڑھ کو فرقہ واریت کے لئے استعمال کرنے والوں کی تمام کوششوں کو ناکام کرنا ہی ہوگا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ ہم سرپسندوں کی مذمت کریں بلکہ کچھ مثبت اقدام بھی لینے ہوں گے۔ اگر علی گڑھ کے موضوع پر عام بحث و مباحثہ ہوتا اور پھر یہ ترمیمی ایکٹ پاس ہوتا تو یقیناً ملک اس تلخی سے بچ جاتا جس سے وہ پچھلے سال دو چار ہوا۔ اور اس طرح ہم فرقہ پرستوں کی صاف نشاندہی کر سکتے تھے۔

بدنصیبی سے ایسے حالات پیدا ہونے دیئے گئے جن میں فرقہ پرستوں کو یہ موقع ملا کہ وہ اپنی شرارت کو جمہوری نعروں کو چھپا سکیں۔ عذر تو یہ ہے کہ وہ لوگ بھی جنھیں فرقہ پرست جماعتوں سے اور ان کے فرقہ وارانہ مطالبوں سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ مختلف سربراہوں کے وعدوں سے متاثر ہوکر ایسے دفعات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوگئے جن کی حمایت نہیں کی جاسکتی۔

جہاں تک یونی ورسٹی کے بنیادی کردار کا تعلق ہے، ۱۹۵۱ء کے ایکٹ میں جو پیش کیا گیا تھا، وہ سماج کے تمام طبقوں کے لئے قابلِ قبول تھا۔ البتہ چند ایسے عناصر کو اس سے اختلاف تھا جو سیکولر اور جمہوری سیاست کے قطعی مخالف ہیں، یونی ورسٹی کے مختلف عہدیداروں اور خاص طور سے وائس چانسلر کے رول اور اختیارات کے بارے میں شک و شبہات ہیں وہ قابلِ توجہ ہیں۔ اس کے علاوہ جس طرح سے یونی ورسٹی کا انتظام کیا گیا ہے اور خاص طور سے پچھلے چند سالوں میں جس طرح ہوا ہے اس کی روشنی میں یقیناً کچھ اور کیا جانا چاہیئے۔ اس تجربے سے جو سبق ہم نے حاصل کیا تھا، ۱۹۷۲ء کا ایکٹ بناتے ہوئے ہم نے اسے نظرانداز کر دیا۔

گورنمنٹ کو اسے اپنی عزت کا سوال نہیں بنالینا چاہیئے ــــ کتنی ہی بار گورنمنٹ کے خاص ممبروں نے عام طور پر یہ کہا ہے کہ بل کی بہتری کے لئے صرف قابل قبول مشورے ہی مانے جائیں گے اور انھیں کی روشنی میں مزید ترمیم کی جائے گی۔ پروفیسر ظفر نے جامع تنقید کی ہے۔ بہت سے لوگ اس سلسلے میں واضح رائے رکھتے ہیں۔ یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ ذمہ دار افراد و تنظیموں سے ان کے خیالات اور مشورے طلب کئے جائیں، اور اس طور پر روشن خیال رائے کے پس منظر میں پیش نظر بل کی مناسب ترمیم منظور کی جائے۔

پچھلے سال ہم نے اپیل کی تھی کہ علی گڑھ کے مسئلہ کو فرقہ وارانہ مصلحتوں سے آزاد رکھا جائے۔ اب ہم سیکولرازم اور جمہوری طاقتوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اسے فرقہ وارانہ چنگل سے نجات دلائے۔

اگر پاکستان کی پچیس سالہ تاریخ پر نظر کی جائے تو ایک حقیقت اس کے ہر مرحلے پر اُبھرتی ہے کہ اگر کوئی عنصر اس کی زندگی کا یقینی ہے تو وہ ہے غیر یقینی۔ اگر یہ کہا جائے کہ غیر یقینی کا نام ہی پاکستان ہے تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ آئے دن طرح طرح کے واقعات ڈرامائی انداز سے اُبھرتے رہے اور آج بھی اُبھر رہے ہیں۔ پاکستانی حالات کے بڑے بڑے جانکار بھی خود اعتمادی کے ساتھ یہ کہنے کا حوصلہ نہیں کرتے کہ اب کیا ہوگا۔ قیاس آرائی تو کی جاسکتی ہے مگر پاکستانی سیاست کا تغیر آمیز مزاج اتنی اجازت نہیں دیتا کہ کوئی معقول پیشین گوئی کر سکے۔ دسمبر ۱۹۷۰ء میں جب پاکستان میں پہلی بار عام انتخابات ہو رہے تھے تب کون کہہ سکتا تھا کہ پاکستان اپنے مغربی حصے ہی میں سُکڑ کر رہ جائے گا۔

پاکستان کے پہلے عام انتخابات کا ہندوستان کے جمہوری عوام نے خلوصِ دل سے خیر مقدم کیا تھا اور یہ توقع کی تھی کہ پاکستانی عوام جمہوری اقدار کی جی جان سے حفاظت کریں گے ۔۔۔ آئندہ عام انتخابات کی تاریخوں کی نشاندہی کرنا کوئی مشکل نہیں۔ لیکن اگر کوئی یہ سوال کرے کہ پاکستان میں نئے انتخابات کب ہوں گے تو جواب پاکستان کے موجودہ سیاسی رجحانات میں تلاش کرنا ہوگا۔ البتہ پاکستان کی تحریکِ استقلال کے سربراہ ائیر مارشل (ریٹائرڈ) اصغر خاں بڑے وثوق سے کہہ رہے ہیں "کوئی چاہے یا نہ چاہے لیکن اس ملک میں اس سال انتخابات ضرور ہوں گے"۔

(پشاور میں تقریر۔ ۳ر فروری ۷۳ء)

درحقیقت پاکستان میں نئے انتخابات کا مطالبہ شیخ مجیب کے نئے انتخابات کے فیصلے کے بعد زور پکڑ گیا بنگلہ دیش میں نئے آئین کے نفاذ کے بعد جب اسمبلی توڑ دی گئی، پاکستان کی اپوزیشن پارٹیاں نئے انتخابات کا مطالبہ کرنے لگیں۔ اصغر خاں تو اس سے بہت پہلے سے اس کے لئے دباؤ ڈال رہے ہیں۔

صدر بھٹو نے واضح الفاظ میں اس مطالبہ کو ۸ر دسمبر کو ایرانی صحافیوں کے ساتھ بات چیت میں ناقابلِ قبول قرار دیا۔ انھیں نئے انتخابات کرانے سے انکار نہیں ہے لیکن کرائیں گے مناسب وقت پر۔ یہ تاثر انھوں نے اخبارِ جہاں کے مدیر محمود شام کو خصوصی انٹرویو میں بھی دیا۔ "اگر انتخابات ہوئے، جب بھی ہوئے، انشاء اللہ اپنے وقت پر ہوں گے۔ اور اگر ایک جمہوری انتخاب میں، صحیح طریقے سے اگر ہمیں ہار ملی اور ایک اور جماعت کو جیت ملی اور ان کی اکثریت ہوگی، ہم اس فیصلے کا خیر مقدم کریں گے۔ اس حکومت کو نہ صرف کہیں گے کہ آپ آکر کرسی سنبھالیں۔ ان کو آرام سے بٹھا کر اپنی ٹوپی پہن کر بڑی خوشی سے اپنے گھر چلے جائیں گے۔ یہ ہے جمہوری طریقہ اور اس طریقے کو انشاء اللہ بحال رکھیں گے۔ اگر کوئی غیر جمہوری طریقہ اختیار کرنا چاہتے ہیں، کچھ لوگ اور وہ کوئی بھی ہوں، اس صورت میں ہم پوری لڑائی لڑیں گے۔ اس وقت اگر ایسی چالاکی، ایسی حرکتوں کا کوئی سوچ رہا ہے تو میں آپ کو کہنا چاہتا ہوں کہ اتنا نقصان ہوگا اس خطّے کا کہ ہمالیہ بھی شاید رونے لگے"۔

(اخبارِ جہاں۔ ۲۷ر دسمبر ۷۲ء)

صدر بھٹو کے اس انٹرویو کی صرف ایک بات پر پاکستانی اخبارات میں خاصی بحث ہوئی اور وہ تھی "ہمالیہ بھی شاید رونے لگے"۔ ان کے انٹرویو کے تمام سیاسی پہلوؤں کو چھوڑ کر محض ایک جذباتی اظہار کو موضوعِ بحث چُنا گیا۔ ایسا انھیں ملکوں میں ہوتا ہے جہاں سیاسی فلسفے کا فقدان ہو۔

آئینی مسودہ قومی اسمبلی میں پیش ہونے کے بعد نئے عام انتخابات جلد کرانے پر زور دیا جانے لگا ہے۔ جنوری کے آخر میں راولپنڈی ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن سے خطاب کرتے ہوئے جماعت اسلامی پاکستان کے امیر میاں طفیل محمد نے کہا کہ "صدر بھٹو کی حکومت کے لئے مزید برسرِ اقتدار رہنے کا جواز ختم ہو چکا ہے۔ آئین کے نفاذ کے بعد عام انتخابات



ہمارے سیاسی مبصر کے قلم سے

از سرِ نو کرائے جائیں تاکہ ملک میں جمہوری ادارے صحیح طور پر کام کر سکیں۔ حکمراں جماعت اپنی مقبولیت کھو چکی ہے اور عوام کو اس پر اعتماد نہیں رہا ہے۔ اشیائے صَرف کی قیمتوں میں غیر معمولی اضافہ، اور زندگی کے ہر شعبے میں رشوت کی گرم بازاری کے باعث موجودہ حکمرانوں کے متعلق عوام کا نقطۂ نظر بدل گیا ہے۔ گذشتہ انتخابات میں صرف ۳۸ فیصد افراد نے پیپلز پارٹی کے حق میں ووٹ دیئے تھے جب کہ ۶۲ فیصد نے پیپلز پارٹی کی حمایت نہیں کی تھی۔ میاں طفیل محمد کی زبان بندی کا انتظام یہ کیا گیا ہے کہ انھیں ایک ماہ کے لئے جیل میں بند کر دیا گیا ہے۔ لیکن ایسے علاج سے عوام کی رائے میں تبدیلی کی توقع تو نہیں کی جا سکتی۔

صدر بھٹو نے اپنی دانست کے مطابق مزدوروں اور کسانوں کی حالت سدھارنے کے لئے زمینی اصلاحات اور لیبر قوانین میں تبدیلی کے احکامات صادر فرمائے لیکن ان سب کے باوجود یہ احساس زور پکڑتا رہا ہے کہ حالات سُدھرے نہیں ہیں اور بھی اُلجھ گئے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ ان اصلاحات کے عمل درآمد میں خامیاں رہی ہوں، بہرحال اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ عوام میں بے چینی اور اضطراب کا احساس ہے۔ جماعت اسلامی کے بانی اور سابق امیر مولانا مودودی ایسے موقعہ پر خاموش رہیں، ایسا نہیں ہو سکتا؟ ۶ فروری کو لاہور میں جماعت کے کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے مولانا نئے عام انتخابات کی بحث میں شریک ہو گئے "نئے آئین کے نفاذ کے بعد نئے انتخابات کرانا ضروری ہیں۔ اگر حکمراں پارٹی منصفانہ انتخابات کے ذریعے پھر اکثریت حاصل کر لے گی تو اس کے حقِ حکمرانی کی مخالفت نہیں کی جائے گی۔ حکمراں پارٹی نے نئے آئین میں خود یہ شق رکھی ہے کہ قومی اسمبلی کے ممبروں کی تعداد ۲۰۰ اور سینیٹ کے ممبروں کی تعداد ۶۰ ہو گی تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ آئین کے نفاذ کے ۵ سال بعد تک نامکمل قومی اسمبلی اور سینیٹ کام کرتے رہیں۔"

مولانا مودودی نے بحث کے سیاسی پہلوؤں پر ہی اکتفا نہیں کیا۔ انھوں نے اس میں آئینی گولہ داغ دیا۔ درحقیقت اس آئینی خامی کا ذکر کونسل مسلم لیگ کے لیڈر سردار شوکت حیات خاں نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر ۲۲ جنوری کو اپنی اس تقریر میں کیا جو انھوں نے آئین پر بحث کے سلسلے میں نشر کی تھی۔ آئین سازی سے متعلق تعطّل کو دور کرنے کے لئے جو چھ نکاتی فارمولا انھوں نے تجویز کیا تھا اس میں "چوتھی بات یہ تھی کہ مستقل آئین منظور ہونے کے بعد فوراً غیر جانبدارانہ انتخابات کرائے جانے چاہئیں۔ دو تہائی اکثریت والی شق میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ شق پندرہ سال کے لئے انتخابات تک کے لئے رکھی گئی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ آئین بن جانے کے فوراً بعد نئے انتخابات کرائے جائیں گے۔ اگر مستقل آئین کی تیاری کے پانچ سال بعد الیکشن کرانے والی بات ہوتی تو پھر آئینی سمجھوتہ میں یہ دو تہائی اکثریت والی شق کے ساتھ تین انتخابات کے بجائے دو انتخابات کا ذکر کیا جاتا۔ اگر آئین بن جانے کے فوراً بعد مکمل عام انتخابات نہیں کرائے جا سکتے تو کم سے کم ان جگہوں کے لئے انتخابات کرانے چاہئیں جن کا آئین کی رو سے اضافہ ہو گا۔ قومی اسمبلی کی زائد ساٹھ سیٹوں کے لئے انتخابات سے مشرقی پاکستان کے مسئلے سے متعلق عوام کی طرزِ فکر کا اندازہ لگانے میں مدد ملے گی۔"

مسلم لیگ اور جماعت اسلامی کے علاوہ اپوزیشن کی دیگر کئی پارٹیوں نے نئے انتخابات کا مطالبہ کیا ہے۔ ایک مرحلے پر نیشنل عوامی پارٹی کے لیڈر خان ولی خاں نے بھی از سرِ نو انتخابات کرانے کا مطالبہ کیا تھا۔ جمعیت العلمائے پاکستان کے قائم مقام صدر اور جمعیت کی پارلیمانی پارٹی کے لیڈر مولانا شاہ احمد نورانی نے کورنگی میں ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے آئین بن جانے کے بعد ملک میں از سرِ نو انتخابات کرائے جانے کا اپنا مطالبہ دہرایا۔ "دنیا بھر میں یہ روایت ہے کہ نئے آئین کے بعد نئے انتخابات کرائے جاتے ہیں۔ آئینی سمجھوتہ کی رو سے پارلیمنٹ کے ایوان زیریں میں ۲۰۰ نشستیں ہونا قرار پایا تھا، لیکن جو آئینی مسودہ وزیر قانون نے پیش کیا ہے اس میں ۱۹۷۷ء تک صرف ۱۴۴ نشستوں کا تصور کیا گیا ہے، یہاں تک کہ حکمراں جماعت کی طرف سے سینیٹ کی ۶۰ نشستیں منظور کئے جانے کے باوجود ایوان بالا میں بھی نشستوں کی تعداد کم کر دی گئی ہے۔ آئینی سمجھوتے سے اپوزیشن نے نہیں بلکہ خود پیپلز پارٹی نے انحراف کیا ہے۔" (ڈان، کراچی۔ ۲۰ جنوری ۱۹۷۳ء)

کُل جماعتی آئینی سمجھوتہ پر دستخط کرنے والوں کی تقریروں کے سلسلے میں ۳۰ جنوری کو مولانا شاہ احمد نورانی نے بھی ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر تقریر کی۔ "قومی اسمبلی کے ممبروں کی تعداد ۱۴۴ سے بڑھا کر ۲۰۰ کرنے کی دفعہ سے یہ بالکل واضح ہے کہ از سرِ نو انتخابات کرائے جائیں گے۔ ایسا کرنا نہ صرف ایوان کی خالی نشستوں کو پورا کرنے بلکہ عوام سے آئین کی منظوری حاصل کرنے کے لئے بھی ضروری ہے۔ نئے آئین کے نفاذ کے بعد از سرِ نو انتخابات کرانا دنیا بھر کی روایت ہے۔ بھارت میں نئے آئین کی تدوین کے فوراً بعد انتخابات کرائے گئے تھے۔ اسی طرح بنگلہ دیش میں بھی مارچ میں نئے آئین کے تحت انتخابات کرائے جا رہے ہیں۔"

۵ فروری کو لاہور میں پاکستان جمہوری پارٹی کے سربراہ نوابزادہ نصر اللہ خان نے پارٹی کے کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا "یہ ایک مسلّمہ روایت ہے کہ نئے آئین کے بعد دوبارہ انتخابات کرائے جاتے ہیں تاکہ عوام آئینی امور پر رائے زنی کر سکیں۔" (نوائے وقت)

اسی دن پاکستان جمہوری پارٹی کی قومی مجلس عاملہ نے قائم مقام صدر میجر جنرل (ریٹائرڈ) سرفراز خان کی صدارت میں اس مسئلہ پر اپنی قرارداد میں کہا۔ "اگر صدر بھٹو بنگلہ دیش کو تسلیم کر کے ملکی سالمیت اور نظریۂ پاکستان کی نفی کرنے پر بضد ہیں تو انھیں یہ مسئلہ نئے انتخابات کی صورت میں رائے عامہ کے سامنے پیش کر دینا چاہیئے اس کا حل نئے غیر جانبدارانہ اور منصفانہ انتخابات کے ذریعے عوام کا فیصلہ ہی ہو سکتا ہے۔ اگر فرانس اپنی نوآبادی الجزائر کی علیحدگی کے فیصلہ کو آئینی طور پر منتخب صدر ڈیگال اور ان کی پارلیمنٹ پر چھوڑنے کی بجائے ملک میں ریفرینڈم کرانا مناسب سمجھا۔ اگر بھارت میں مسز اندرا گاندھی اپنی اقتصادی پالیسی کی توثیق کے لئے درمیانی مدت کے الیکشن کرا سکتی ہیں، اگر سوئٹزرلینڈ یورپین کامن مارکیٹ سے وسیع تر اتحاد کی پالیسیوں کے بارے میں فیصلہ حاصل کرنے

(باقی صفحہ ۳۱)

بشنو ڈے اور ان کی شاعری

ایک تعارف

ابوالفیض سحر

ادارۂ بھارتیہ گیان پیٹھ، ہندوستان کے علمی اور ادبی حلقوں کے لئے اب نہ صرف ایک معروف اور ممتاز ادارہ بن چکا ہے بلکہ بلا لحاظِ علاقہ اردو زبان، ہندوستان کے بلند پایہ شاعروں اور ادیبوں کو ان کے گراں قدر تخلیقی کارناموں پر، ملک کا سب سے بڑا اعزاز اور انعام عطا کرنے کی لائق تحسین روایت کی بدولت، اس کی آبرومندی اور توقیر میں ہر سال اضافہ ہو رہا ہے۔ اس ادارہ کی صدر شریمتی راما جین ہیں۔ ڈاکٹر کرن سنگھ، مرکزی وزیر شہری ہوا بازی، اس کے انتخابی بورڈ کے میر مجلس ہیں اور شری لکشمی چندر جین ادارہ گیان پیٹھ اور انتخابی بورڈ کے معتمد ہیں۔

"بھارتیہ گیان پیٹھ" کا یہ ادارہ ۱۸ فروری ۴۴ء میں قائم ہوا تھا۔ اور "گیان پیٹھ انعام" کی ابتدا ۱۹۶۵ء میں ہوئی تھی۔ یہ انعام، دستورِ ہند کی مسلمہ ۱۵ زبانوں کے تقابلی مطالعے پر مبنی، ممتاز ناقدین اور مشاہیرین کی آرا، اور ضروری جانچ اور تشفی کے بعد، ایک خاص مدت میں تخلیق پایا۔ کسی بھی ایک زبان کی وقیع اور قابل قدر تصنیف پر ہر سال عطا کیا جاتا ہے۔ عام طور پر، یہ انعام پچھلے پانچ سال میں شائع شدہ کسی تصنیف پر اس کے مصنف کو دیا جاتا ہے۔ ایک لاکھ روپے کی حقیر رقم، بطور انعام پیش کرنے کے ساتھ ساتھ انعام یافتہ مصنف کو متعلقہ زبان و ادب میں اس کے مقام و مرتبے کا اعتراف کرتے ہوئے ایک سند بھی عطا کی جاتی ہے۔ ساتھ ہی کانسے کا بنا ہوا "واگ دیوی" کا ایک خوبصورت مجسمہ بھی پیش کیا جاتا ہے۔ اس مجسمہ کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ راجہ بھوج نے جو اپنے وقت کا ایک جید عالم بھی تھا، اسے دھر Ujjayini کے سرسوتی مندر میں استادہ کیا تھا۔ اب تک ہندوستان کی مختلف زبانوں کے سات ممتاز شاعروں اور ادیبوں کو اسی انعام سے سرفراز کیا گیا ہے۔



اس برس ۱۰ فروری کو اس سلسلے کا آٹھواں انعام، بنگالی کے مشہور شاعر اور ادیب شری بشنو ڈے کو ان کی اہم اور نمائندہ تصنیف "Smriti Sutta Bhowishyat" پر دیا گیا ہے۔ (اس تصنیف کو ۱۹۶۵ء میں ساہتیہ اکیڈیمی کے انعام کا بھی مستحق قرار دیا گیا تھا) انعامی وثیقے میں ڈے کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ڈے کے شعور کا ارتقا ایک ایسے غیر معمولی تفکر اور احساس سے عبارت ہے جو انفرادی ہونے کے علاوہ آفاقی بھی ہے اور ساتھ ہی زندگی سے پوری طرح مربوط اور ہم آہنگ بھی۔ رومانوی جمالیات سے گریز کرتے ہوئے انھوں نے فطرت، حسن، محبت اور محنت کے جذبات اور تصورات سے، شائستگی، دیدہ تر کے ساتھ بلیغ اور دور رس ادراک و بصیرت حاصل کی ہے۔ ایک خاص قسم کی ہم مزاجی اور ہم آہنگی ان کی فکر رسا اور فن پختہ کار کا قابل قدر خاصہ ہے۔

بشنو ڈے ۱۹۰۹ء میں کلکتہ میں کالج اسکوائر کے ایک ممتاز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد اناش چندر ڈے ایک ممتاز قانون داں تھے۔ ابتدا ہی سے انہیں بزرگوں کی شفقت اور محبت کے علاوہ ایک مہذب منظم اور پُر اعتبار سے صاف ستھرا ماحول نصیب ہوا۔ جہاں کھیل کود سے لے کر علم و ادب کی تقریباً ساری سہولتیں میسر تھیں۔ نوجوان کے والد نے جو ایک باوقار اور ہمدرد شخصیت کے مالک تھے جواں سال بشنو ڈے کے ادبی مذاق کو سمجھا اور ان کے ذوق و شوق اور احساس و فکر کے ابتدائی ارتقا میں بڑی اعانت کی۔ اعلیٰ تعلیمی مدارج میں بشنو ڈے کو کئی قابل اساتذہ سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ ان میں پروفیسر ابندر نرائن گھوش خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سینٹ پال کالج سے ۳۲ء۱۹ میں انگریزی سے بی۔ اے میں امتیازی کامیابی حاصل کرنے میں انھیں گولڈ میڈل بھی عطا کیا گیا۔ ۳۴ء میں انھوں نے انگریزی زبان و ادب سے ایم۔ اے کیا۔ اور اسی برس ان کی ایک ہم جماعت پرانتی رائے چودھری سے انکی شادی ہوئی اور پھر وہ تدریسی ملازمت اور تحقیقی کاموں میں مصروف ہو گئے۔ ۱۹۳۵ء میں رپن کالج (موجودہ سریندر ناتھ کالج) میں انگریزی پڑھانے پر مامور ہوئے پھر ۱۹۴۴ء میں پریزیڈینسی کالج سے منسلک ہوئے اور اب حال ہی میں مولانا آزاد کالج کلکتہ سے انگریزی کے پروفیسر کی حیثیت سے ۱۹۶۹ء میں سبکدوش ہوئے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بشنو ڈے، ٹیگور کے بعد بنگالی کے دوسرے بڑے شاعر ہیں۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان کی شاعرانہ عظمت اور تخلیقی جواہر پاروں کی برگزیدگی میں ٹیگور کی روایات سے شعوری طور پر انحراف کے واضح نقوش بھی ملتے ہیں۔ ایک ذی حس اور باشعور فنکار ہونے کے ناطے بشنو ڈے ان تمام مسائل سے جو، ملک کے اندر اور باہر نوعِ انسانی کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے تھے۔ ہر دور میں باخبر رہے۔ ان کے ذہنی ارتقا اور فکری سفر میں ان مسائل کو حل کرنے، نجات کے راستے اور منزل کی جستجو، لگن اور تڑپ کی ایک آتش پرست پارسی کی طرح مستقل پذیرائی اور پاسداری ملتی ہے۔ ان کے خیال میں محبت، خیر اور مسرت انسانی زندگی کی بنیادی قدریں ہیں۔ اور ان کے کلام میں انھیں اقدار اور آدرشوں کی "مدحتِ لب و خسلہ" کے انداز کی تعلیم و ترغیب بھی ملتی ہے جس میں فنکارانہ حسن ہی نہیں بلکہ مفکرانہ شان اور فلسفیانہ صداقت بھی ہے۔

بشنوڈے کی تصانیف اور تراجم کے مطالعے کے بعد ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ بشنوڈے کے اندازِ فکر اور اسلوب اظہار و بیان میں ایک انقلابی ترقی پسندی اور ایک پر وقار روایت پسندی کا نہایت دلچسپ اور "تارِ حریر دورنگ" کا سا امتزاج، ان کی پہچان اور ان کی شناخت بن کر سامنے آتا ہے۔ انھیں کے الفاظ میں ملاحظہ ہو "میری ادبی تحریک کا سرچشمہ وہ تمام عوامی روایات ہیں جن کا سلسلہ Cnaryapaq سے لے کر Michael ، Ishwar Gupta اور Dinabandhu کی تصانیف تک جا ملتا ہے بنگالی ادب کے مستقبل کا دار و مدار ان کی روایات کی پاسداری سے وابستہ ہے۔ یہی وصف، بنگالی عوام کی فکر اور ان کے مزاج کی پہچان بن گیا ہے۔ ان کی جاندار اور ذی شعور حقیقت پسندی کی تشکیل بھی انھیں اقدار اور روایات سے ہوئی ہے۔

بشنوڈے نے کم عمری سے ہی لکھنا شروع کیا تھا ان کی پہلی تصنیف Urrasi O Artennis جو ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی تھی قلیل عرصے ہی میں بہت مقبول ہوئی۔ اور بنگالی ادب کے طالب علموں اور نقادوں کی خصوصی توجہ کا مرکز بنی۔ ان کی فنی اور فکری صلاحیتوں اور جولانیوں نے، ٹیگور جیسے عظیم شاعر کو بھی اپنی طرف متوجہ کیا اور ٹیگور نے اس جدید طرز کی شاعری کے تعلق سے بشنوڈے کے نام دو خطوط بھی لکھے۔ دوسرے خط میں ٹیگور لکھتے ہیں "یہ ایک تازہ اور جواں سال ذہن کی تخلیقات ہیں۔ ان میں ایک پرجوش جذبہ کچھ اس طرح موجزن ہے جیسے کسی بحرِ زخار سے موجیں اٹھ کر ساحل سے ٹکراتی ہوں ان میں چٹانوں کا سا استقلال ہے تو موجوں کا سا تلاطم بھی ہے۔"
اسی زمانے میں ڈے، دانشوروں کے Parichav گروپ کے ساتھ وابستہ ہو گئے جو جرأتِ اظہار، فکری گہرائی اور صداقت پسندی میں شکاگو کے Bloombury Group ، Poetry Group اور ایلیٹ کے Briterion Group اور Leavis کے Scrutiny group کے متوازی اور مشابہ تھا۔

اپنی دوسری تصنیف Charaboli کی اشاعت کے بعد بشنوڈے نے شعری تخلیقات کے کئی مجموعے پیش کئے، ساتھ ہی انگریزی، فرانسیسی، جرمن، اطالوی، روسی اور ہسپانوی زبانوں کے تقریباً ۶۷ نامور ادیبوں اور شاعروں کی نمائندہ تخلیقات کا ترجمہ کیا جن میں ایلیٹ، شیکسپیئر، ایٹس اور پاؤنڈ، شیلے اور باڈلیئر، پاسترناک، نرودا، ریمبیاں، اراگان اور دانستے وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے بنگالی اور انگریزی میں انشائیے اور تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔ جدید بنگالی مصوروں اور صنم تراشوں کے تعلق سے بھی انھوں بہت کچھ لکھا ہے۔ جیمنی رائے کی تصاویر کی تفہیم اور تشریح کے تعلق سے انھیں ایک مسلمہ نکتہ داں سمجھا جاتا ہے۔ اپنی ۶۳ سالہ زندگی کے خزاں دیدہ اور بہار آشنا فکری سرمایۂ حیات میں اب تک ۱۵ شعری مجموعے، بنگالی زبان سے انگریزی میں ۳ ترجمے، ۶ نثری تصانیف بزبان بنگالی اور ۸ نثری تصانیف بزبان انگریزی شائع ہو چکی ہیں۔ اس دیرینہ ریاضتِ لوح و قلم کے باوجود ان کے فکر و خیال کے بہاؤ میں نہ تو کوئی فرق آیا ہے نا ہی اس کی آب و تاب میں کچھ کمی واقع ہوئی ہے۔ ان کی فکر میں جس قدر گہرائی ہے اتنی ہی بلندی بھی ہے۔ آج بھی وہ نوعِ انسانی کی سلامتی، ترقی اور خوشحالی کے دوش بدوش انسانیت۔ وحسن کے فروغ کے محض خواب ہی نہیں دیکھتے بلکہ اپنے ساتھ اپنے قارئین کو بھی ہم رکاب و ہم سفر بنا لیتے ہیں۔ انعام یافتہ شعری تصنیف کی پہلی نظم ٹیگور کی ایک کہانی کے بنیادی خیال پر مبنی ہے۔ اس نظم میں ہمیں اپنی ذات اور اپنے آس پاس کے ماحول کے وقوف و آگہی کے شدید بحران کو سمجھنے کی نئی بصارت ملتی ہے۔ اس کی یہ نظم خوف و دہشت کرب و بے چینی اور استحصال و استبداد کے خلاف شاعر کی ان تھک جد و جہد خیر و حسن کی نہ ختم ہونے والی تلاش و جستجو کا حقیقت افروز ثبوت ہے۔

دراصل ۱۹۴۱ء میں تیسرے شعری مجموعے کی اشاعت کے بعد سے ہی بشنوڈے کی شاعری ایک خاص اور بہت واضح سمت اختیار کر لیتی ہے اور یہیں سے ان کا اندازِ سخن، ان کے اندازِ فکر و نظر کی جمہوریت اور اشتراکیت پسندی سے پوری طرح ہم آمیز اور ہم آہنگ ہو جاتا ہے اس کا ثبوت اس امر سے بھی ملتا ہے کہ ۱۹۴۲ء میں ادیبوں کی ایک مخالف فسطائیت اجتماع کا انتظام و اہتمام کرنے میں انھوں نے بہت نمایاں حصہ لیا ہے۔ پھر ان کے مزاج اور فکر کی انقلابی قوتوں نے بھی انگڑائیاں لیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں ان کے تنقیدی مضامین کے پہلے مجموعے Ruch O Pragati کو خصوصیت کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔ جس میں انھوں نے اپنے عہد کی فرسودہ روایات اور بے حقیقت معیارات و اعتقادات پر کاری ضرب لگائی ہے۔

اس عظیم شاعر کی تخلیقات اور ان کے نظریات کی تفصیلات میں گئے بغیر یہ کہنا کافی ہے کہ بشنوڈے کے نہاں خانۂ ذات میں آج کے عہد کے ایک واقعی بڑے شاعر و ادیب کی شخصیت کے علاوہ ایک گوناگوں ذوقِ نظر رکھنے والا مکمل انسان بھی چھپا ہوا ہے جو صاحبِ نظر بھی ہے اور باذوق و شائستہ بھی۔ کریم النفس بھی ہے حساس اور راست باز بھی۔ ان کا دائرۂ احباب بھی کافی وسیع ہے جس میں علم و ادب، تہذیب و تمدن کے تمام شعبوں سے تعلق رکھنے والے مشرقی و مغربی مفکرین اور فنکار شامل ہیں۔ بشنوڈے کو شعر و سخن کے علاوہ ہندوستانی اور مغربی مصوری اور موسیقی سے بھی گہرا لگاؤ ہے علم طبعیات اور جدید نفسیات سے بھی خصوصی دلچسپی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ سوشلزم اور مارکسزم بھی آپ کے مطالعے اور غور و فکر کے خاص موضوع اور میدان ہیں۔ بہر حال ٹیگور کے بعد نذرالاسلام کو ان کے اپنے ایک خاص مقام و منصب پر رکھتے ہوئے، بشنوڈے کو بنگالی کا ایک ایسا عالی مرتبت شاعر کہا جانا چاہیئے جن کی نگارشات میں مقامی اور ملکی رنگ و بو، انفرادی احساسات و تجربات کی لو اور چمک، اجتماعی وجود کی ضرورتوں اور تقاضوں کے احساس و ادراک کے ساتھ ساتھ عصری آگہی اور آفاقی اقدار بھرپور امتزاج ارتکاز کے ایسے ایسے پہلو ملتے ہیں جو اپنے ابعادوں اور زاویوں کی تمام تر رعنائیوں اور دلکشیوں کے ساتھ وقت کی آواز پر متحرک و محو رقص ہوں۔

مسلم پرسنل لا اور علما

عبداللطیف اعظمی

ہندوستان کے رائج مسلم پرسنل لا کی سماجی خرابیوں کی طرف جب پہلی مرتبہ توجہ دلائی گئی اور اس کی اصلاح کا مطالبہ کیا گیا تو علمائے اسلام نے اس کو بالکل نظرانداز کیا اور سنی اَن سنی کر دی، مگر جب بار بار لکھا گیا اور مطالبے میں کافی شدت پیدا ہو گئی تو علما نے فرمایا کہ مسلم پرسنل لا کی بنیاد قرآن و حدیث پر ہے اور اس میں کسی قسم کی ترمیم و اصلاح جائز نہیں ہے اور جب اس کے جواب میں عرض کیا گیا کہ تمام اسلامی ممالک میں مسلم پرسنل لا میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق ترمیم و اصلاح کی گئی ہے تو علما کی طرف سے یہ جواب دیا گیا کہ کسی اسلامی ملک کا کوئی فعل ہمارے لئے قابل قبول اور قابل تقلید نہیں ہے۔ علما نے جواب دینے کو تو دے دیا، مگر اس غلش سے وہ اپنا پیچھا نہیں چھڑا سکتے تھے کہ ان کا یہ جواب کسی کو مطمئن اور خاموش نہیں کر سکتا، اس لئے جمعیۃ العلما کے ترجمان روزنامہ "الجمعیۃ" نے مشورہ دیا کہ سرے سے یہ تسلیم ہی نہ کرو کہ اسلامی ملکوں نے کوئی بنیادی اور بڑی تبدیلی کی ہے، دوسرا مشورہ یہ دیا کہ اس پر زور دو کہ اسلامی ملکوں میں دوسرے مذاہب کے پرسنل لا میں وہاں کی حکومتوں نے کوئی مداخلت نہیں کی ہے، اس لئے ہندوستان میں یہاں کی حکومت کو مسلمانوں کے پرسنل لا میں مداخلت نہیں کرنی چاہیئے۔ چنانچہ ذیل کا اقتباس ملاحظہ ہو، جو ۸ر فروری کی اشاعت میں "مسلم پرسنل لا اور مسلم ممالک" کے عنوان کے تحت لکھا گیا ہے :۔

"مسلم پرسنل لا کی حمایت میں جو بزرگ تقریر کرتے ہیں، ان میں سے کوئی بزرگ یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ اگر مسلم ممالک نے اس سلسلے میں کوئی حماقت کی ہے تو ہم ذمہ دار نہیں۔ معلوم نہیں ایسے لوگوں نے مسلم ممالک کے عائلی قوانین کا کہاں تک مطالعہ کیا ہے؟ وہاں اگر پرسنل لا میں کچھ تبدیلی ہوئی ہے تو اس کا تعلق فقہی مسائل میں ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے سے ہے۔ فقہائے کرام نے ایک مسئلے کی تشریح مختلف طور سے کی ہے تو اس تشریح کو قبول کر لیا گیا ہے جو موجودہ حالات کے مناسب ہے یہ بات نہیں کہ کسی مسلمان ملک میں شریعت کو بالائے طاق رکھ کر اس کی جگہ کوئی سول کوڈ بنایا ہو۔ مسلم ممالک کا

ہم نے پورا ادارتی نوٹ اوپر نقل کر دیا ہے اور اہم اور قابل توجہ حصوں کو زیر خط کر دیا ہے۔ اس نوٹ سے مدیر روزنامہ "الجمعیۃ" مولانا محمد عثمان فارقلیط جیسے علما اور مسلم صحافت نگاروں کی پریشانی اور ذہنیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اس نوٹ کی پہلی دل چسپ اور اہم بات یہ ہے کہ مولانا فارقلیط نے خود اپنے ہم خیال علما کے مطالعے پر شبہے کا اظہار کیا ہے کہ ان لوگوں نے مسلم ممالک کے عائلی قوانین کا مطالعہ کیا ہے۔ دوسری اہم اور دل چسپ بات یہ ہے کہ مولانا نے اپنے ہم خیال اور ہندوستان کے مروجہ مسلم پرسنل لا کی اصلاح اور تبدیلی کے مخالفوں کو ڈپلومیسی کا درس دینے کی ناکام کوشش کی ہے، کہ روایتی علما میں شاید ہی کوئی ایسا عالم ملے گا جس نے مسلم ممالک کے پرسنل لا میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں ان کا گہرا اور وسیع مطالعہ کیا ہو۔ مطالعہ بھی فرمائیں تو کس طرح؟ اس موضوع پر بدقسمتی سے اب تک اردو میں کوئی بسیط اور جامع کتاب شائع نہیں

ہوئی اور انگریزی سے یہ لوگ واقف نہیں۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی جیسے علما جو انگریزی سے واقف ہیں ان کا رویہ روایتی علما سے مختلف ہے۔ ان مسائل پر عربی میں بھی مستند اور ضخیم کتابیں موجود ہیں، مگر وہ جدید عربی میں ہیں اور روایتی علما عربی کی بھی صرف وہی کتابیں آسانی سے سمجھ سکتے ہیں جو عربی مدارس کے نصاب تعلیم میں داخل ہیں اور جن پر حاشیئے در حاشیئے لکھے ہوں۔ اسلامی ممالک اس طرح نام لینا اپنے مقدمے کو مضبوط نہیں کرتا، دوسری اہم بات یہ ہے کہ جب بھی مسلم کا ذکر آئے اس گوشے کو نمایاں کیا جائے گا کہ کسی مسلمان ملک نے بھی اپنی غیر مسلم اقلیتوں کے پرسنل لا میں مداخلت نہیں کی۔ اگر پاکستان کا نام لینے میں شرم آئے تو کسی مسلمان ملک کا نام لے سکتے ہیں کہ وہاں غیر مسلموں کے نجی اور مذہبی قوانین کو زیر بحث نہیں لایا گیا، کجا کہ ان میں ترمیم کی گئی ہو یا ان کی جگہ کوئی دوسرا اور عام قانون وضع کیا گیا ہو۔ ناواقف لوگوں کو چاہیئے کہ مسلم ممالک کے نجی قوانین کا مطالعہ کریں اور پھر اصل قوانین پر زور دیں"۔

کے پرسنل لا کی تبدیلیوں کا کیا ذکر، ان علمائے کرام نے تو غور اور توجہ سے ان مضامین کو بھی نہیں پڑھا ہے۔ جو اردو میں ہندوستان کے رائج مسلم پرسنل لا میں تبدیلیوں کی حمایت میں لکھے گئے ہیں، خود مولانا فارقلیط نے انصاف کے ساتھ ان کا مطالعہ نہیں کیا ہے، ورنہ انھیں معلوم ہوتا کہ ہندستان کے مسلم پرسنل لا میں تبدیلیوں اور اصلاح کا مطالعہ قریب قریب انھیں خطوط پر کیا جا رہا ہے جن پر مسلم ممالک میں تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ میں نے بہت ہی صاف صاف لکھ دیا ہے کہ میں کوئی ایسی تبدیلی نہیں چاہتا جو قرآن حکیم کے خلاف ہو۔ مولانا کبھی زحمت فرما کر ان مطالبوں پر غور تو فرمائیں اور بتلائیں کہ فلاں مطالبہ قرآن کی فلاں آیت کے خلاف ہے۔ اسی سلسلے میں مولانا نے کامن سول کوڈ کا بھی ذکر کیا ہے، غالبًا ان کا مقصد غلط بحث پیدا کرنا ہے، ورنہ یہ ضروری نہیں ہے کہ جو مسلمان مسلم پرسنل لا میں ترمیم و تبدیلی کا حامی ہو وہ کامن سول کوڈ کا بھی ہو، اور نہ اب تک کامن سول کوڈ کی تفصیلات سامنے آئی ہیں جن کی بنا

پر مولانا یہ فتویٰ دے سکیں کہ کامن سول کوڈ اسلامی شریعت کے خلاف ہے۔ بعض دانشوروں کا خیال ہے کہ اگر کامن سول کوڈ بنایا گیا تو اس میں مسلمانوں کا فائدہ ہے کیونکہ اسلامی عائلی قوانین زیادہ ترقی پسند ہیں اور ان میں زمانے کا ساتھ دینے کی صلاحیت زیادہ ہے بشرطیکہ مولویوں کی دست بُرد سے محفوظ رہیں۔

بمبئی کے حالیہ مسلم پرسنل لا کنونشن میں اگرچہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ علما کے نزدیک مسلم پرسنل لا میں کسی قسم کی ترمیم و اصلاح کرنا مذہباً جائز نہیں ہے اور اس کا بھی دعویٰ کیا گیا ہے کہ اس معاملے میں علما میں مکمل اتحاد پایا جاتا ہے۔ مگر میرا مضمون "سیکولر ڈیموکریسی کے پچھلے شمارے (بابت ماہ فروری) میں چھپا ہے۔ اس میں میں نے دکھایا ہے کہ بہت سے علما کا خیال ہے کہ ہندوستان کے مروّجہ مسلم پرسنل لا میں اسلامی نقطۂ نظر اور ترقی پسند سماج کے نقطۂ نظر سے بہت سی خرابیاں ہیں جو بہر حال دور ہونی چاہئیں۔ انھیں روشن خیال اور روشن ضمیر علما میں سے جو مسلم پرسنل لا میں ترمیم و اصلاح کے قائل ہیں، ایک جید عالم دین مولانا محمد تقی آمینی بھی ہیں، مولانائے محترم ایک پندرہ روزہ اخبار "احتساب" کے ایڈیٹر اور متعدد کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ موصوف کی اہم کتابوں میں ایک اہم کتاب "احکام شرعیہ میں حالات و زمانے کی رعایت" بھی ہے۔ اے کاش مولانا فارقلیط اور دوسرے علما جو ہندوستان کی مروّجہ مسلم پرسنل لا میں کسی تبدیلی کو نعوذ باللہ قرآن حکیم میں تبدیلی کے مترادف سمجھتے ہیں، اس کتاب کو پڑھ لیتے۔ مولانا کے تعارف کے لئے اُن کے اخبار سے ذیل میں مختصر تین اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔ قدامت پرست علما نے اپنے اردگرد "قدغنوں" کا جو حصار بنا رکھا ہے، اس کے بارے میں مولانا آمینی لکھتے ہیں:۔

"... بہت سی قدغنیں خود بخود دور ہو سکتی ہیں، بد قسمتی سے مذہب کی شعوری سطح ابھی اتنی بلند نہیں ہوئی ہے کہ تاریخ کی بیڑیوں سے آزاد ہو کر اس کا ہم مطالعہ کریں، اس کے لئے علمی نظر کی ضرورت ہے اور مذہب کے نام پر "علم" کی شاید ابھی زیادہ گنجائش نہیں پیدا ہوئی۔"

"امت مسلمہ کی رہ نمائی کا مسئلہ نہایت مشکل بنا ہوا ہے۔ مذہب کی نمائندگی جس طرح ہو رہی ہے، توقع نہیں کہ اس کے ذریعہ کسی تعمیری انقلاب کی رو نمائی ہو سکے۔"

"... ہمارے پاس دینی تعلیم کے ادارے ہیں جن پر کروڑوں روپیہ خرچ کیا جاتا ہے، ہمارے یہاں خانقاہیں اور مسندیں ہیں جن کو لاکھوں روپیہ نذرانہ دیا جاتا ہے۔ ہمارے علما و مشائخ ہیں جو دین کے محافظ اور چوکیدار سمجھے جاتے ہیں، لیکن ان سب کے باوجود صورتحال میں تبدیلی کی کوئی شکل نظر نہیں آتی، نہ ارتداد سے روکنے کے لئے کوئی منصوبہ ہے، نہ حالات و زمانہ کی مناسبت سے تبلیغ دین کے لئے کوئی ادارہ ہے۔" ... اسی طرح یہ بھی پوشیدہ نہ ہوگی کہ دین کے نام جو دنیا داری آتی ہے، وہ اس سے زیادہ خطرناک ہے جو دنیا کے نام سے آتی ہے۔"

ان ہی عالم دین نے یعنی مولانا محمد تقی صاحب آمینی نے مسلم پرسنل لا پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"دراصل قانون کی دو قسمیں ہیں (۱) اصل اور (۲) ذیلی۔ اصلی وہ ہیں جو شارعؑ کی طرف سے مستقلاً عمل کے لئے مقرر ہوتے ہیں، ان میں تبدیلی نہیں ہوتی بلکہ حالات کے لحاظ سے ان کے موقع و محل کی تعین ہوتی ہے: 'ذیلی' وہ ہیں جو قوت نافذہ کی طرف سے "اصلی" پر ٹھیک عمل در آمد کے لئے وقتاً فوقتاً مقرر کئے جاتے ہیں اور حالات کے لحاظ سے ان میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ اگر قوت نافذہ نہ ہو تو علما کو اس قسم کے قوانین وضع کرنے کا اختیار ہے۔"

آگے چل کر مولانا لکھتے ہیں: "... اس کی دونوں وجہیں موجود ہیں اور دینی معاملات کی ذمہ دار حکومت موجود نہیں ہے۔ اس لئے علما کو ذیلی قانون کی طرف خصوصی توجہ کرنی چاہیئے، مثلاً معاشرتی فساد کی وجہ سے جہیز، تلک شادی بیاہ کی غلط رسوم، دولہا کی ناجائز فرمائشیں، مہر کی زیادتی، ذات، برادری کی تفریق وغیرہ مسلم معاشرے کے لئے لعنت ہیں، جن سے نہ معلوم کتنی بچیاں زندہ درگور بنی ہوئی ہیں۔ اسی طرح تعدد ازدواج کا رواج اگرچہ کم ہے لیکن بعض صورتوں میں دوسری بیوی کی حق تلفی سے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ معاشرتی سطح بلند نہ ہونے کی وجہ سے طلاق کا استعمال نہایت غلط طریقے سے ہو رہا ہے اور بسا اوقات تین طلاقوں کے نفاذ سے (جو بدعت ہے) پورا خاندان تباہ ہو جاتا ہے، یتیم پوتے کی کفالت چچا کے ذمے تھی، اگر وہ مفلس ہو تو حکومت ذمہ دار تھی۔ اب کوئی حکومت ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہیں اور کوئی طاقت چچا کو مجبور بھی نہیں کر سکتی۔ یہ اور اس قسم کے بہت سے مسائل ہیں جن سے مسلم معاشرہ کرب و اذیت میں مبتلا ہے۔ اگر علمائے کرام نے ان مسائل سے غفلت برتی تو مجبور ہو کر مسلمان حکومت کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے اور پھر "پرسنل لا" کی حفاظت کے لئے گلے پھاڑ پھاڑ کر تقریریں کی جائیں گی، مذہب زندگی کے لئے ہے اور زندگی مذہب کے لئے ہے اگر مذہب زندگی کے مسائل حل کرنے میں ناکام رہا تو وعظ و تقریر کی محفل گرم کرنے سے ان کی حفاظت نہ ہو سکے گی۔ کنونشن میں صرف "پرسنل لا" کے ایک پہلو سے بحث ہوئی ہے، اس کے علمی اور عملی پہلو کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ بورڈ کا دائرۂ کار اگر صرف ایک پہلو تک محدود رہتا ہے تو ہم بلا تامل کہنے کے لئے تیار ہیں کہ یہ مسئلہ جس جگہ پہلے تھا اسی جگہ اب بھی ہے اور اگر اس نے کچھ علمی و عملی قدم اٹھایا تو یہ بیشک ایک بڑا کارنامہ ہوگا جس پر ملت جسقدر بھی ناز کرے کم ہے لیکن اس قدم کے لئے جسقدر ذہنی و فکری تبدیلی کی ہے ہمارے علما سر دست اس کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ہم یہ بات محض خیال آرائی کے طور پر نہیں کہہ رہے بلکہ مجلس تحقیقات شرعیہ لکھنؤ (یہ ناچیز اس کا کنوینر تھا) کے سلسلے میں کافی تجربہ ہے۔ وہ "بزرگ" ہمارے علم میں ہیں جنھیں باتیں بنانا تو خوب آتا ہے، لیکن علمی و عملی قدم اٹھانے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔" (احتساب۔ بابت یکم فروری ۸۳ء صـ۲)

مولانا امینی نے اس اقتباس میں جن لوگوں کی طرف اشارہ کیا ہے دراصل صرف یہی علما مسلم معاشرے اور مسلم پرسنل لا کی اصلاح میں رکاوٹ ہیں اور یہ لوگ عوام کو استعمال کرنے کے لئے قرآن اور شریعت کا حوالہ دیا کرتے ہیں۔ دیکھنا ہے کہ عوام کو ان کے چنگل سے کب اور کس طرح نجات ملتی ہے؟

[redacted]

کشمیر کا شہید
میر مقبول شروانی

محترمہ کرشنا مہتہ

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان آزاد ہوگیا ـــــ ۱۸۵۷ء کے غدر کی سلگتی ہوئی چنگاری کا خاتمہ آخر کار آزادی کے روپ میں ہوگیا لیکن ہندوستان کی عظیم سرزمین کا بٹوارہ انگریزوں کی شاطرانہ چال کی سب سے بڑی فتح بن گیا اور ایک دھرتی کو دو حصوں میں بانٹ دیا گیا۔

کل تک جو ایک تھے آج الگ ہوگئے، ان کی قومیت بدل گئی۔ ملک بدل گیا۔ ان کے دلوں میں مذہب کے نام پر زہر پھیلانے والے پنڈتوں اور مولویوں کے فتووں نے رنگ دکھانا شروع کر دیا۔

۱۵ اگست کے بعد سے بٹوارہ کے ردعمل نے اپنے اثرات دکھانا شروع کر دیئے۔ لاکھوں ہندو مسلمان بے گھر ہوگئے۔ انسانیت دم توڑنے لگی اور شیطانیت کا ظالم پنجہ ہزاروں عورتوں اور بچوں کو اپنی گرفت میں لے رہا تھا۔

اچانک ۲۲ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو شیطانیت کا خونی پنجہ سرینگر (کشمیر) کے شمال مغرب کے قبائلیوں کے حملے کی شکل میں ظاہر ہوا۔ مسجدیں، مندر، گرودوارے، سب شعلوں کی لپیٹ میں آگئے کشن گنگا کا مقدس پانی بے گناہوں کے خون سے لال ہوگیا۔ چاروں طرف لاشوں کے ڈھیر ـــ گاؤں کے گاؤں ویران ہوگئے ـــــ سب کچھ تباہ ہوگیا۔ لوٹ مار کا سلسلہ، دوشیزاؤں کی عزت لوٹ کر بھی ختم نہیں ہوا۔

لوگ اپنی جانیں بچا کر کسی طرح بارہ مولا پہنچے۔ مظفرآباد سے لے کر اُوڑی تک تباہی کے سیاہ بادل چھا چکے تھے ـــــ بارہ مولا کے عوام کے دلوں پر خوف طاری ہوگیا۔

نالا پل کے پاس بریگیڈیر راجندر سنگھ ریاستی فوج کے ایک دستے کے ساتھ مورچہ سنبھالے ہوئے تھے میر مقبول شروانی نے ملک کو حملہ آوروں سے بچانے کے لئے قومی اتحاد کے جذبے کو سامنے رکھا اور وہ خود سب سے پہلے نالا پل کے مورچہ تک گیا۔ اس کے بعد اس نے رامپور کے لوگوں کو ملک کی حفاظت کے لئے اپنا فرض پورا کرنے پر آمادہ کیا۔

بارہ مولا سڑک پر سارا ٹریفک رُک گیا۔ لوگ بیل گاڑیوں اور تانگوں میں بھر بھر کر اپنے گاؤں اور شہر خالی کر رہے تھے۔ شروانی حالات کو پوری طرح سمجھ گیا۔ اس نے اپنے کچھ ساتھیوں کو ریاستی فوج کے ساتھ مورچہ پر بھیج دیا۔ لوگوں کی گرتی ہوئی قوتِ ارادی کو بحال کرنے کے لئے وہ خود ۲۴ اکتوبر کی صبح کو بارہ مولا پہنچ گیا۔ اس کے بعد وہ سرینگر پہنچا۔

بارہ مولا میں لوگوں کی پست ہوتی ہوئی قوتِ ارادی کو اس نے مضبوط کیا اور سرینگر کے لوگوں کی ہمت بندھانے میں لگا رہا۔ شروانی کا عوام سے ہر جگہ ایک ہی اصرار تھا ـــــ "اپنے ملک کی عزت کو نہ بھولیں، سب ہی لوگ (ہندو، مسلمان اور سکھ) بھائی بھائی کی طرح مل کر حملہ آوروں سے ملک کو بچائیں"۔

لوگوں پر اس کا بہت اثر ہوا۔ سرینگر نیشنل کانفرنس نے حفاظتی کارروائی شروع کر دی لیکن اچانک مہورہ پاور ہاؤس کے فیل ہو جانے اور بارہ مولا کی حالت نازک ہو جانے کی خبر سے سرینگر اور قرب و جوار کے علاقوں کو بچانے کے لئے نیشنل کانفرنس نے تیاریاں اور تیز کر دیں۔ شروانی کی ذمہ داری اور بڑھ گئی۔ بارہ مولا کی مصیبت زدہ عوام کے لئے شروانی سے بڑا ہمدرد کوئی نہ تھا ـــــ یہ وہی شروانی تھا جس نے ۱۹۴۴ء میں بارہ مولا میں مسلم لیگ قائم کرنے کی جناح صاحب کی کوششوں کو ناکام کر دیا تھا۔

تمام خطروں کا سامنا کرتے ہوئے وہ ۲۶ اکتوبر کو بارہ مولا پہنچ گیا۔ قبائلی پراسرار طریقوں سے چاروں طرف پھیل چکے تھے۔ شروانی ان خطروں کی پرواہ کئے بغیر بارہ مولا کے عوام کے درمیان پہنچ چکا تھا۔ وہاں کے عوام کی قوتِ ارادی کو اُبھارتے ہوئے اس نے فرقہ وارانہ فسادات کو روکنے کے لیے مستعدی سے کام کیا۔

حملہ آور برابر بڑھتے آرہے تھے۔ چاروں طرف فائروں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ لوگ اپنے جان و مال کی حفاظت کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کے برعکس شروانی جان و مال کی تو کیا، یہاں تک کہ گھر کی حفاظت کی پرواہ

کئے بغیر سوپور اور پاٹن میں جاکر لوگوں کے حوصلے بڑھانے میں لگ گیا۔

وہ سوپور سے واپس آکر پاٹن کی طرف آرہا تھا کہ اچانک اسے بارہ مولا کی تباہی کی خبر ملی۔ ہندوستانی فوج ابھی تک جائے وقوع پر نہیں پہنچی تھی۔ شروانی کے دوست انتظار کر رہے تھے اور شروانی کو فوجی کمک پہنچنے پر ہی بارہ مولا جانے کو کہہ رہے تھے۔ مگر شروانی طے کر چکا تھا کہ وہ بارہ مولا جائے گا — وہ نیشنل ملیشیا کے معتدد لوگوں کی بات کو سنی اَن سنی کرکے بارہ مولا کی طرف روانہ ہوگیا۔

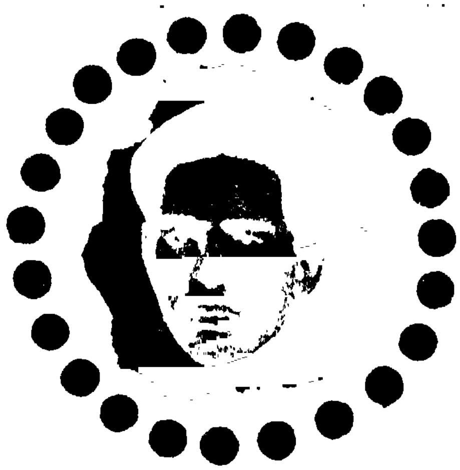
شروانی نے قبائلی بھیس اختیار کر لیا تاکہ قبائلیوں کے منصوبوں کو نیست و نابود کر سکے۔ وہ حملہ آوروں کے درمیان پہنچ گیا۔ انھیں کئی ٹکڑیوں میں منقسم کرتا گیا اور انھیں راستوں سے بھٹکاتا رہا۔ قبائلی منتشر ہونے کے بعد راستہ بھول گئے تھے اور اسی وقت ہندوستانی فوج کے ہوائی جہاز سے سرینگر پہنچنے کی اطلاع انھیں ملی تو انھیں پیر تلے زمین کھسکتی محسوس ہوئی۔ ان کے منصوبے مٹی میں مل رہے تھے۔

شروانی دُگنی ہمت سے اپنے فرض کو نبھانے میں لگ گیا۔ قبائلیوں کو ایسے ٹھکانوں کی طرف بھیجتا رہا جہاں ہندوستانی فوج انھیں خاک میں ملا دے۔ سنگھ پورا اور پٹن میں قبائلیوں کو بڑی تعداد میں اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔

کچھ قبائلی بچ کر سنبل گاؤں کی طرف نکل گئے اور انھوں نے وہاں پہنچ کر سارے گاؤں میں ظلم و تشدد شروع کر دیا۔ شروانی کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ سنبل گاؤں میں پہنچ گیا اور ساری معلومات ہندوستانی فوج کو بہم پہنچادیں۔ قبائلیوں کو ایسی زبردست شکست کا سامنا کرنا پڑا کہ ان کے ہوش گم ہوگئے۔ اتنے آدمی اب تک کہیں نہیں مارے گئے تھے۔ ان تین دنوں کے دوران اتنی شدید مار کا منہ انھیں کبھی دیکھنا نہ پڑا تھا۔

قبائلی سرداروں اور فوجی افسروں کو اپنے نئے دوست شروانی پر شک ہونے لگا۔ ایک مسلم لیگی نے شروانی کا سارا راز قبائلیوں پر کھول دیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شروانی کو پکڑ لیا گیا۔ شروانی کو انھوں نے بہت اذیت دی، مگر وہ بہادر ڈرا نہیں، اس نے بے خوف ہوکر ان قبائلیوں سے کہا — "اسلام کے نام پر ننھے بچوں اور عورتوں کو قتل کرنا 'جہاد' نہیں کہلاتا ہے عورتوں کی بے عزتی کرنا، ان پر حملہ کرنا، لوٹ مار کرنا۔ یہ سب اسلام کی تعلیم نہیں ہے — ہندو اور مسلمان ایک ہی خدا کے بندے ہیں۔ محبت اور سچائی اسلام کے دو بڑے اصول ہیں —"

درندوں پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ انکی انسانیت مرچکی تھی۔ شروانی نے جو صاف باتیں کی تھیں ان سے ان کی حیوانیت اور بھڑک اٹھی۔ انھوں نے شروانی کو 'غدار' قرار دے کر جمعہ کی نماز کے بعد دوسرے دن سولی پر چڑھانے کا فیصلہ کیا۔



میر مقبول شروانی

یہ ۱۳؍اکتوبر کا دن تھا۔ جمعہ کی نماز ہوچکی تھی۔ سارے شہر میں نافرمانی کی سزا دیکھنے کے لئے ڈھنڈورہ پٹوایا گیا۔ شروانی کو چوک کے ایک مکان کے سہارے بنائی گئی سولی پر لٹکا دیا گیا۔ دونوں ہاتھوں پر کیلیں ٹھونک دیں۔ اس کے ماتھے پر "غدار" کی تختی لگا کر اس پر کیلیں ٹھونک دی گئیں۔

شروانی نے اس غیر انسانی فعل سے اُف بھی نہ کی۔ وہ صبر سے اس ظلم کو سہتا رہا۔ ان لوگوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوچکا تھا۔ مگر وہ بے بس تھے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو نکلنا چاہ رہے تھے۔ مگر وہ رو بھی نہیں پا رہے تھے۔ چاروں طرف وحشی قبائلیوں کی بھیڑ سے گھرا شروانی، مادرِ ہند کا بہادر سپوت، جس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ چہرے پر نور تھا اور جو اپنے ملک کے لئے صلیب پر لٹک رہا تھا۔

شروانی کی آخری خواہش تھی کہ اسے جمعہ کی نماز پڑھنے دی جائے۔ حیوانیت کے درندوں نے اس کی یہ آخری خواہش بھی پوری نہیں کی۔ وہ شروانی سے ہندوستانی فوج کے راز پوچھ رہے تھے۔ مگر شروانی تھا کہ اِن سخت کاوشوں کے باوجود بھی اپنے فرض سے نہیں ہٹا اور انھیں منہ کی کھانی پڑی۔

اس نے زور سے نعرے لگائے —

"ہندو مسلم سکھ اتحاد، زندہ باد"

"نیا کشمیر زندہ باد"

"شیر کشمیر زندہ باد"

ان نعروں سے درندوں کے مظالم اور بڑھ گئے۔ انھوں نے شروانی پر گولیاں داغ کر اس کے سارے جسم کو چھلنی کر ڈالا۔ شروانی اپنے پیارے وطن کے لئے قربان ہوچکا تھا۔ درندوں نے لوگوں کو خوف زدہ کرنے کے لئے شروانی کی لاش کو چوک میں ہی رکھ دیا۔

میر مقبول شروانی کی قربانی ضائع نہیں گئی۔ وہ کشمیر کا تھا، وہ ہندوستان کا تھا۔ اپنی زندگی کے آخری لمحے تک وہ سبھی مذاہب کے لوگوں کو ایک رہنے اور ایک بن کر دشمن سے لڑنے کے لئے اُکساتا رہا۔ وہ نہ مسلمان تھا اور نہ ہندو — وہ صحیح معنوں میں مادرِ ہند کا سپوت تھا۔ اس کا نام ہمیشہ آزادی کی تاریخ میں سنہرے حروف میں ثبت رہے گا۔

کشمیر کے ہندو مسلمان آج بھی ایک ہیں — وہ کشمیری ہیں، ہندوستانی کشمیری ہیں۔ شروانی کا لافانی پیغام پورے ہندوستان کے نوجوانوں کے لئے حوصلے کا مرکز رہے گا۔ آنے والی صدیوں تک شروانی کا نام ہمیشہ تابناک ستارے کی طرح لوگوں کے دل میں چمکتا رہے گا۔

آر۔ایس۔ایس کا تعارف: ایک جائزہ

ڈی۔ آر۔ گوئل

راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کا دعویٰ ہے کہ وہ ایک کلچرل تنظیم ہے۔ اس دعوے کے برعکس جو کچھ کہا جاتا ہے

سیکولر ڈیموکریسی

اسے یہ لوگ بعض ایسے افراد اور گروہوں کی غلط بیانیوں کا نام دیتے ہیں جو تنظیم کے ساتھ دشمنی رکھتے ہیں۔ اس تنظیم کے سب سے بڑے رہنما شری گولوالکر کو گورو جی کے نام سے خطاب کیا جاتا ہے۔ ان کے سفید بال، لمبی داڑھی اور ان کے لباس سے لگتا ہے گویا وہ ایک سنیاسی ہیں۔ ان کی بات چیت اور تقریریں جن میں کچھ ناقابل فہم مذہبی اصطلاحوں کی ٹھونس ٹھانس ضرور ہوتی ہے اس دعوے کی تائید کرتی ہیں۔ اس تنظیم کے تحت روزمرہ کی شاکھائیں اور جسمانی ورزشیں کچھ ایسا تصور پیدا کرتی ہیں کہ یہ تمام ہندو لڑکوں کی اسکاوٹ تحریک ہے۔

یہ تنظیم ۱۹۲۵ء میں وجود میں آئی اور اس کے بعد ایک مدت تک اس کی تشہیر کو بڑی احتیاط کے ساتھ روکا گیا۔ تاکہ باہر کے لوگ اس تنظیم کے اغراض و مقاصد کے بارے میں اس کے علاوہ اور کچھ نہ جان سکیں جو اس کے نمائندے کہتے رہے ہیں۔ آر۔ایس۔ایس دراصل اس وقت پوری طرح روشنی میں آئی جب حکومت کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول ہوئی کہ تقسیم کے موقعہ پر فسادات اور اس کے بعد مہاتما گاندھی کے قتل میں آر۔ایس۔ایس کا ہاتھ تھا۔ اس وقت حکومت کو پتہ چلا کہ دراصل یہ تنظیم اتنی معصوم اور بے ضرر نہ تھی۔ چنانچہ ۱۹۴۸ء میں اس تنظیم پر قانونی پابندی لگا دی گئی۔ اور یہ پابندی ۱۹۴۹ء میں اس وقت اٹھائی گئی جب کہ اس کے سردار نے ایک تحریری آئین نامہ کے ذریعہ واضح طور

آر۔ایس۔ایس دراصل اس وقت پوری طرح روشنی میں آئی جب حکومت کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول ہوئی کہ تقسیم کے موقعہ پر فسادات اور اس کے بعد مہاتما گاندھی کے قتل میں آر۔ایس۔ایس کا ہاتھ تھا۔ اس وقت حکومت کو پتہ چلا کہ دراصل یہ تنظیم اتنی معصوم اور بے ضرر نہ تھی۔

پر یہ یقین دلایا کہ آر۔ایس۔ایس کی کارروائیاں محض سماجی اور ثقافتی معاملات تک محدود رہیں گی۔ آر۔ایس۔ایس کے آئین کی دفعہ ۳ کے مطابق اس جماعت کے مقاصد یہ ہیں کہ ہندو سماج کے اندر مختلف طبقوں کو متحد کیا جائے اور ہندو دھرم اور سانسکرتی کی بنیاد پر اس میں نئی روح پیدا کی جائے تاکہ بھارت ورش کی مکمل ترقی ممکن ہو سکے۔

آر۔ایس۔ایس نے ہمیشہ اس بات سے انکار کیا ہے کہ وہ ایک سیاسی یا فرقہ وارانہ تنظیم ہے۔ پہلی بار یہ انکار ۱۰ جنوری ۱۹۴۳ء کو سامنے آیا جب کہ اس تنظیم کے بانی کے ناگپور آر۔ایس۔ایس کی جانب سے منعقد ہونے والی "ماکر سانکرانتی" کی تقریبات میں تقریر کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا۔ لیکن اہم بات یہ ہے کہ اسی جگہ اور اسی وقت شری ایم۔ وی۔ جوشی نے جو جلسہ کی صدارت کر رہے تھے۔ اس دعوے کی تردید کر دی۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ یہ ایک فرقہ وارانہ جماعت ہے۔ لیکن اس کو اس بنیاد پر جائز قرار دیا کہ ہندوؤں کو اس لائق ہونا چاہیئے کہ وہ مصیبت کے وقت اپنا بچاؤ کر سکیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ آر۔ایس۔ایس عدم تشدد پر یقین نہیں رکھتی اور ان کے اس بیان کی کوئی تردید نہیں کی گئی۔ اس موقع پر ڈاکٹر بی۔ایس۔ مونجے نے بھی تقریر کی اور انھوں نے ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہوئے "پہلے حملہ کرو" کی پالیسی کی حمایت کی۔ آر۔ایس۔ایس کے اس کردار کی مزید تصدیق اس وقت ہوئی جب آر۔ایس۔ایس نے ۱۱ دسمبر ۱۹۳۷ء کو ہندو مہاسبھا کے صدر وی۔ ڈی۔ ساورکر کے اعزاز میں ایک استقبالیہ دیا۔ ساورکر نے آر۔ایس۔ایس کی خدمات کی تعریف کرتے ہوئے اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ ہندوؤں کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے درمیان چھپے ہوئے چوروں پر نظر رکھیں۔ ان چوروں سے مراد ان کی مسلمانوں سے تھی۔ انھوں نے کہا کہ اس کے بغیر ہندو بیرونی ڈاکوؤں یعنی برطانیہ کو اپنے ملک سے نکالنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ دو سال بعد ساورکر کے بھائی نرائن نے آر۔ایس۔ایس کی

تعریف اس طرح کی کہ یہ جماعت ہندو مذہب کے دشمنوں کے خلاف جنگ میں ہندو مہاسبھا اور آریہ سماج کے ایک اتحادی کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہندو مذہب کے دشمنوں سے ان کی مراد حکومت برطانیہ، مسلمان اور کانگریس سے تھی۔

ان بیانات اور آر۔ایس۔ایس کے مختلف رہ نماؤں کی دوسری تقریروں سے یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ یہ ایک فوجی قسم کی ہندو تنظیم تھی جس کا

> اپنی نسل اور اپنی تہذیب کی پاکیزگی کو برقرار رکھنے کے لئے جرمنی نے اپنے ملک کو سامی نسل یعنی یہودیوں سے مکمل طور پر پاک کرکے دنیا کو ہلا دیا۔ نسلی افتخار کا یہ سب سے زبردست مظاہرہ تھا۔

مقصد ہندو سماج کو متحد کرنا، اسے بقول ان کے اپنے دشمنوں پر اول حملہ کرنے کے قابل بنانا اور ان کے اندر چھپے ہوئے "چوروں" کے خلاف چوکنا رکھنا تھا۔ اس کے باوجود اس تنظیم کے رہ نما ہیڈگیوار سے لے کر بعد تک سب کے سب اس الزام سے منکر ہوتے رہے ہیں کہ یہ ایک سیاسی فرقہ وارانہ جماعت ہے۔ آخر کیوں؟ اس کی پہلی اور سب سے بڑی وجہ حکومت کا خوف ہے۔ باوجود اس کے کہ آر۔ایس۔ایس ایک فوجی قسم کی تنظیم ہے اور عدم تشدد کے اصول کی مخالف بھی ہے۔ اس نے آزادی سے پہلے یا آزادی کے بعد ہمیشہ حکومت سے براہ راست ٹکر لینے سے گریز کیا ہے۔ ہیڈگیوار کا بیان ۱۹۳۳ء میں آیا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ مرکزی صوبہ کی حکومت نے ایک حکم جاری کیا تھا جس کے ذریعہ حکومت کے ملازمین کا آر۔ایس۔ایس کی کارروائیوں میں حصہ لینا ممنوع قرار دیا گیا تھا۔

آزادی کے بعد جب آزاد ہندوستان کی حکومت نے ایک سیکولر نظام حکومت کو اپنایا اور اس تنظیم کی تمام کارروائیوں پر پابندی عاید کر دی اور آر۔ایس۔ایس کی اجتماعی تحریک بھی حکومت کے نظریات کو بدلنے میں ناکام رہی تو ۱۹۴۹ء میں ہیڈگیوار کے جانشین گولوالکر نے ایک تحریری آئین نامے کے ذریعہ مذکورہ بالا یقین دہانی کو دہرایا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ آر۔ایس۔ایس کی قیادت اس بات کو پوری طرح سمجھتی رہی ہے کہ ملک کی ہندو آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ خواہ اپنی روایتی رواداری کو ملحوظ رکھتے ہوئے یا اپنی کثرت پر بھروسہ کرتے ہوئے، مذہبی تعصبات اور عدم رواداری کو نفرت کی نظر سے دیکھتا ہے۔

آر۔ایس۔ایس کو چونکہ یہ احساس ہے کہ مذہبی تعصب کی بنیاد پر اس کے وحشیانہ عزائم کو کوئی خاص مقبولیت حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اس نے اپنے پیروکاروں کو مطمئن کرنے کے لئے شاید ایک نئے تصور کو جنم دیا ہے جس کو وہ کلچرل نیشنلزم کہتا ہے۔

۱۹۳۹ء جب تک گولوالکر نے جو اس وقت آر۔ایس۔ایس کے جنرل سکریٹری تھے اپنا تھیسس We or our Nationhood Defined چھپوایا تو اس جماعت کی کوئی واضح آئیڈیولوجی نہ تھی۔ اس چھوٹی سی کتاب میں انھوں نے اس بات پر زور دیا تھا کہ نیشنلزم کا تصور جس کی تبلیغ آر۔ایس۔ایس کرتا ہے۔ صرف وہی ایک سائنٹفک نظریہ ہے۔ کانگریسی نیشنلزم کو انھوں نے 'احمقوں' یا 'مکاروں' کے اظہار سے تعبیر کیا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی کتاب Bunch of Thought میں ایک نئے ڈھنگ سے اس کی وضاحت کی۔ انھوں نے کانگریسی نیشنلزم کو ٹریٹوریل نیشنلزم اور اپنے نیشنلزم کو کلچرل نیشنلزم کا نام دیا۔

قبل اس کے کہ ہم گولوالکر کے نیشنلزم کے تصور کا تجزیہ کریں مناسب ہوگا کہ کلچر اور سیاسیات کے درمیان تعلق کے بارے میں ان کے نظریات کو سمجھیں۔ گولوالکر نے ۱۰ر نومبر ۱۹۴۹ء کو کرناوتی (احمدآباد) میں سویم سیوکوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا "ہم بھول گئے ہیں کہ سیاست ہماری مکمل زندگی کا صرف ایک جزو ہے۔ زندگی سیاست سے بالاتر ہے۔ زندگی کا سب سے زیادہ اہم اور حیاتی جزو اصل میں سیاست نہیں ہے بلکہ تہذیب ہے۔"

انھوں نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا "بھارتیہ تہذیب کلچر کو ایک چھوٹا سا شعبہ تصور کرتی ہے جو انسان کی مادی ضروریات کو پورا کرتا ہے۔ اس لحاظ سے سیاست کلچر کا ایک حصہ ہے۔ جس کے اندر اقتصادی مذہبی، اور سماجی امور شامل ہیں۔"

اس سے پہلے یکم ستمبر ۱۹۴۹ء کو ایک تقریر میں انھوں نے اس کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا تھا "جب تک ہمارے سماجی اور سیاسی اداروں کی بنیاد بھارتیہ تصور پر نہ ہوگی ہم لوگ ترقی نہیں کر سکتے۔ ہمارا مقصد دنیا میں امن قائم کرنا ہے اور یہ مقصد صرف اسی وقت پورا ہو سکتا ہے جب ہم کروڑوں اعلیٰ کردار کے افراد کو منظم کریں۔ ان کے دلوں میں اپنی تہذیب کا تصور پیدا کریں اور انھیں آمادہ کریں کہ وہ اپنے مقصد کو پا سکیں۔"

آپ کا مقصد کچھ بھی ہو۔ ہندوستان کی ترقی یا دنیا کا امن —— یہ صرف ایک تنظیم اور ایسے سیاسی نظام کے ذریعہ حاصل ہو سکتا ہے جس کی بنیاد بھارتیہ یا ہندو نظریات پر ہو۔

چنانچہ سیاسی سرگرمیاں اور مقاصد ان کے خیال میں کلچرل سرگرمیوں اور مقاصد کا حصہ ہیں۔ لیکن آر۔ایس۔ایس کے رہ نماؤں کی سرگرمیوں، تحریروں، اور تقریروں میں نیشنلزم کے موضوع پر لمبے چوڑے اعلانات کے علاوہ اور کوئی اہم بات نہیں ملتی جب کہ خود نیشنلزم ایک ایسا موضوع ہے جس کا بنیادی طور پر سیاست سے تعلق ہے۔ اقتصادی اور سماجی تنظیم کے

سوال پر ان کے پاس کچھ کہنے کو نہیں ہے سوائے اس کے کہ جو کچھ قدیم ہندو فرمانرواؤں کے زمانے میں مروج تھا وہی موجودہ ہندوستانی ماحول کے لئے سب سے زیادہ مناسب ہے، اور حقیقتاً کبھی کبھی اس قسم کے اشارے بھی دیئے گئے ہیں کہ اس زمانے میں جو کچھ تھا وہ پرمیشور کی مرضی سے تھا۔ آر۔ ایس۔ ایس کے رہنما اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ ہندوؤں کا شیرازہ بکھرنے اور ان کے زوال میں کسی طرح بھی ذات پات کا امتیاز، جہالت یا عورتوں کے سماج میں مقام وغیرہ کو دخل تھا۔ ان کے خیال میں اس قسم کے نظریات ہندوستان کے دشمنوں نے پھیلائے ہیں چونکہ وہ 'اصل' موضوع سے ہماری توجہ ہٹانا چاہتے ہیں۔ اصل مسئلہ قومی شعور اور ہندو قومیت پر فخر میں کمی واقع ہو جانے کا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی بدھ اور جین فلاسفی کے زیر اثر آنے کی وجہ سے اس جذبہ کے ضائع ہو جانے کا مسئلہ ہے جسے یار الرام واد یعنی جنگجویانہ جذبہ کہا جاتا ہے۔ اس لئے اس میں آر۔ ایس ایس کا اصل مقصد "قومی شعور" اور "یار الرام واد" کو فروغ دینا ہے اور یہ مقصد ذہنی اور جسمانی تربیت سے حاصل ہوتا ہے۔

گولوالکر کا کہنا ہے کہ قوم کا ایک اہم ترین عنصر نسل ہے جس کی وہ اس طرح تعریف کرتے ہیں " ایک موروثی یا نسلی سماج کے رسم و رواج، زبان اور کسی قابلِ فخر واقعہ یا تباہی اور حادثے کی یادیں مشترک ہوتی ہیں۔ مختصراً یہ کہ یہ ایک سماج ہوتا ہے جس کا شجرۂ نسب ایک ہی کلچر کے تحت مشترک ہوتا ہے"۔

وہ آگے چل کر کہتے ہیں " اگر اس سماج میں کچھ خارجی نسل کے لوگ بھی ہوں تو انھیں بھی اس میں مدغم ہو جانا پڑتا ہے"۔

کلچر اور نسل کے درمیان اس وابستگی کی بنا پر کلچرل نیشنلزم بلاشبہ نسلی نیشنلزم کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس سلسلے میں تاکہ کوئی شبہ باقی نہ رہے وہ ہٹلر جرمنی کی مثال کو ہندوستان کے لئے قابل تقلید سمجھتے ہیں۔ اپنی کتاب میں وہ صفحہ ۴۳ پر کہتے ہیں :-

" اپنی نسل اور اپنی تہذیب کی پاکیزگی کو برقرار رکھنے کے لئے جرمنی نے اپنے ملک کو سامی نسل یعنی یہودیوں سے مکمل طور پر پاک کرکے دنیا کو ہلا دیا۔ نسلی افتخار کا یہ سب سے زبردست مظاہرہ تھا۔ جرمنی نے ایک یہ بھی سبق دیا ہے کہ نسلوں اور تہذیبوں کے لئے جب کہ اختلافات کی جڑیں گہری ہوں ایک دوسرے میں جذب ہونا کس قدر ناممکن ہے اور یہ ہندوستان میں ہمارے لئے ایک اچھا سبق ہے جس سے ہمیں فائدہ اٹھانا چاہیئے"۔

ساورکر نے آر۔ ایس۔ ایس کی خدمات کی تعریف کرتے ہوئے اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ ہندوؤں کا فرض ہے کہ وہ اپنے درمیان چھپے ہوئے چوروں پر نظر رکھیں ان چوروں سے مراد ان کی مسلمانوں سے تھی۔

اگر فرقہ پرستی کا مطلب سیاسی نظریات کو مذہبی رنگ دینا ہے تو گولوالکر کو اپنے جرم کا اعتراف کرنا پڑے گا۔ وہ مذہب کو کلچر کے ساتھ بالکل اسی طرح پہچانتے ہیں جس طرح کلچر کو نسل کے ساتھ۔ خود ان کے الفاظ میں " جہاں مذہب لوگوں کی زندگی ہے، جہاں افراد اور مجموعی طور پر پورے سماج کا ہر ایک قدم مذہب کے تابع ہے جہاں ہر عمل کے لئے صرف مذہب محرک کی حیثیت رکھتا ہے خواہ یہ عمل دنیوی یا معنوی وہاں ان دونوں عناصر میں علیحدہ علیحدہ تمیز کرنا مشکل ہے۔ یہاں پر گولوالکر کے بیان کو بعینہٖ نقل کرنا زیادہ مناسب ہوگا تاکہ یہ اجمال باقی نہ رہے کہ ان کے بیان کو توڑ موڑ کر پیش کیا گیا ہے یا اس سے غلط مطلب لیا گیا ہے۔ گولوالکر نے صاف الفاظ میں کہا ہے :-

" ہندوستان ہندوؤں کا ملک ہے۔ ان کا وطن ہے۔ ان کا موروثی علاقہ ہے۔ ایک جغرافیائی حقیقت ہے جس کی سرحدیں شمال کی جانب سے قدرتی طور پر عظیم ہمالیہ نے متعین کی ہیں اور بقیہ تین طرف اس کے لامحدود سمندر ہے۔ یہ ایک مثالی ملک ہے اور ہر لحاظ سے ایک ایسا ملک کہلائے جانے کا مستحق ہے جو لفظ قوم کی تمام شرائط کو پوری کرتا ہے۔ تاریخی دور سے بھی پہلے جو لوگ یہاں رہتے چلے آئے ہیں وہ ایک قدیم نسل سے تعلق رکھتے ہیں —— ہندو نسل۔ یہ لوگ مشترکہ رسم و رواج، تاریخی، سیاسی سماجی، مذہبی اور دوسرے مشترک تجربات کے ذریعہ آپس میں ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہیں۔ ان کی تہذیب ایک ہے۔ مادری زبان ایک ہے۔ رسم و رواج ایک ہیں اور ان کے عزائم ایک ہیں۔ یہ عظیم ہندو نسل اپنے عظیم الشان ہندو مذہب کی دعویدار ہے جو تمام دنیا میں تنہا ایک ایسا مذہب ہے جو اس طرح تعریف کئے جانے کے لائق ہے۔ زندگی کے تمام شعبوں میں انفرادی، اجتماعی اور سیاسی حیثیت سے اسی مذہب سے روشنی حاصل کرکے اس قوم نے ایک تہذیب کو ابھارا جو پچھلے ایک ہزار سالوں میں مسلمانوں اور یورپ والوں کی پست اور حقیر تہذیب کے ساتھ ایک مضر تعلق رکھنے کے باوجود آج بھی تمام دنیا میں عظیم ترین ہے"۔

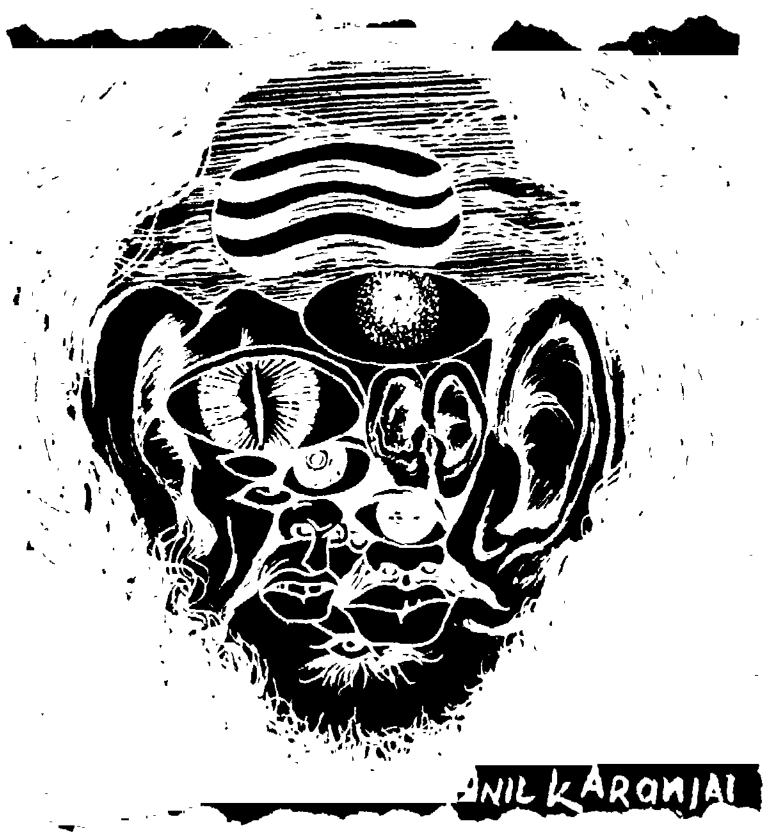
گولوالکر کے ہندوستان میں غیر ہندوؤں کو دو باتوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ضروری ہے یا تو وہ ہندو تہذیب کو قبول کریں اور مذہب، نسل اور زبان کے اعتبار سے مکمل طور پر "قوم" کے اندر جذب ہو جائیں ورنہ انھیں "خارجی تصور کیا جائے گا۔ وہ ملک میں ٹھہر سکتے ہیں لیکن مکمل طور پر ہندو قوم کا غلام بن کر۔ کسی چیز پر ان کا کوئی حق نہیں۔ حتیٰ کہ شہری حقوق سے بھی ان کا کوئی واسطہ نہیں ہوگا۔

گولوالکر کے یہ نظریات آر۔ ایس۔ ایس کے ممبروں کے سامنے صرف ایک ہی مقصد رکھتے ہیں —— ہندو راشٹر کا استحکام (یہ نظریہ جماعت اسلامی کے اقامت دین کے تصور سے بے حد قریب ہے) اور دشمن (مسلمانوں) کا تصور تاکہ ان کے جنگجویانہ خدمات کو زندہ رکھا جا سکے۔

[redacted]

وحشت اور فرشتے

محترمہ سبھدرا جوشی



پولیس سپرنٹنڈنٹ کے دفتر میں، میں کام سے بیٹھی تھی۔ ایک داروغہ جی نے آکر انھیں سلام کیا اور کہا ___ "بیان ہوگئے ہیں۔ وہ کہتی ہیں، ہمیں واپس وہیں پہنچا دو مجسٹریٹ نے حکم دے دیا ہے، میں واپس پہنچانے جا رہا ہوں۔"

"واپس کیوں جانا چاہتی ہیں ___؟" سپرنٹنڈنٹ نے پوچھا۔

"اچھی طرح رکھتے ہیں، کھانا پینا اچھا ملتا ہے انھیں اب کیا چاہیئے ___؟" داروغہ جی نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔

دہلی میں فرقہ وارانہ فساد زوروں پر تھے اس لئے ہر بات میں بولنے، دخل دینے کی عادت اور ضرورت تھی۔ میں نے پوچھا "کیا قصہ ہے، کون واپس جا رہی ہے ___؟"

داروغہ جی بولے "گوجروں کے پاس سے دو مسلمان عورتوں کو نکال کر لایا تھا۔ کسی دشمن نے رپورٹ کر دی تھی۔ دونوں کے بیان کروائے۔ وہ کہتی ہیں ہمیں اپنے ہاتھ سے گولی مار دو، نہیں تو جہاں سے لائے ہو وہیں پہنچا دو۔ ایک بے چاری کے ماں نو بچہ ... ہونا ہے ___"

مجھے حیرت ہوئی، جنھوں نے رشتہ داروں کو مارا ہوگا، گھر جلا دیئے ہوں گے ___ عزت لوٹ لی، کیا سچ مچ وہ وہیں جانا چاہتی ہوں گی۔ میں نے فوراً رُعب جماتے ہوئے کہا "عورت بے چاری مردوں کے سامنے کیا بولتی، ان کا بیان عورتوں کے سامنے کرواؤ۔"

سپرنٹنڈنٹ صاحب نے فوراً کہا "یہ ٹھیک کہتی ہیں ان کا بیان اِن کے سامنے کرواؤ۔"

اِس فوراً حکم ہو جانے سے مجھے تھوڑی گھبراہٹ ہوئی۔ تب میں نے کہا "یہاں نہیں، انھیں قدوائی صاحب کے گھر لے چلیے، ان کی بھاوج ہمارے ساتھ کام کرتی ہیں ___ بیگم انیس قدوائی ___ وہ بات چیت کریں گی تب یہ اطمینان سے بیان دے سکیں گی۔"

یہ رائے بھی مان لی گئی اور داروغہ جی کو حکم ہوگیا کہ وہ ان عورتوں والے ٹرک کو میرے ساتھ لے جائیں۔

آگے آگے میں اپنی جیپ میں، پیچھے پیچھے پولیس کا ٹرک، قدوائی صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ راستہ بھر وہ داروغہ جی مجھے اور میری جیسی تمام سماجی کام کرنے والیوں کو، جو ان کی رائے میں سینکڑوں گھومتی رہتی ہیں۔ گالی گلوچ دیتے رہے۔ (یہ بعد میں مجھے ان عورتوں نے بتایا)

قدوائی صاحب کے گھر ان دو عورتوں کو گھر کی سب عورتوں نے گھیر لیا۔ ان کا بار بار یہی کہنا تھا 'ہمیں واپس پہنچا دو جہاں سے لائے ہو وہیں بھیج دو۔' نہ وہ اپنے نام بتانے کو تیار تھیں، نہ اپنا گاؤں بتانے کو تیار ___ "ہم خودکشی کر لیں گے۔" آخر میں انھوں نے کہا۔ "دوہاں مذہب کی دہائی نے کام دیا، نہ ظالموں کے ظلم کی یاد دلانے نے کوئی نتیجہ نکالا۔" ہمارے سب مارے گئے، گھر اُجڑ گیا، گاؤں میں کوئی رہا نہیں ___" یہی ان کی استدعا تھی۔

میں نے باہر جاکر داروغہ جی سے پوچھا "یہ کون

سے گاؤں کی ہیں؟"

انھوں نے گاؤں کا نام بتا دیا۔ اس گاؤں کے لوگ دہلی کے ایک محلے میں ہی پناہ لئے ہوئے تھے میں نے آخران عورتوں سے کہا "اس گاؤں کے لوگ بچ گئے مارے نہیں گئے۔ ان کے پاس چلئے"۔

انھوں نے کہا "مارے نہیں گئے پر ہماری عزت تو نہیں بچائی، جنھوں نے ہماری عزت نہیں بچائی وہ ہمارے لئے مرگئے"۔

انھوں نے مزید کہا "ایک جگہ ہماری شادی ہوئی دوسری جگہ عزت گئی، اب آپ ہماری کسی اور جگہ شادی کریں گے ——" وہ زور زور سے رونے لگیں۔

آخر میں، میں نے کہا "ایک بار وہاں تک ہمارے ساتھ چلو —— صرف ایک بار —— وہاں مل لو —— یہ ہمارا وعدہ ہے۔ اس کے بعد جہاں آپ کہیں گی، وہاں پہنچانا میری ذمہ داری ہے —— قسم لے لو!"

وہ مان گئیں اور میری جیپ میں بیٹھ گئیں۔

پولیس والے وہیں چھوڑ دیئے گئے۔

جیپ پرانے دریا گنج کے ایک چوراہے پر پہنچ کر دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔ شام کا اندھیرا شروع ہو گیا تھا —— "بھائی بھائی!" میری پیچھے کی سیٹ پر سے دونوں میں ایک عورت کود گئی اور بھائی بھائی چلاتے ہوئے چوراہے پر کھڑے ایک لڑکے کے گلے سے جا لگی۔

جیپ رک گئی۔ چلتی پھرتی گاڑیاں رک گئیں۔ بھیڑ رک گئی۔ یہ بھائی بہن کا ملن —— دونوں لپٹ کر رو رہے تھے۔ ہچکیاں نہیں تھم رہی تھیں —— آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

بھائی بہن روتے ہنستے، کودتے، پھاندتے جیپ کے آگے آگے چلے اور ہمیں وہاں لے گئے جہاں گاؤں کے سب لوگ ٹھہرے تھے۔

دوسری عورت جو میرے پیچھے بیٹھی تھی، تھر تھر کانپ رہی تھی۔ میرے کندھے پکڑے ہوئے ہچکیاں لے رہی تھی۔ دھیرے سے بولی "وہ گاؤں کی لڑکی ہے میں تو بہو ہوں"۔

جیپ رکی، چاروں طرف سے گھیر لی گئی۔ بہو بیٹھی رہی۔ باری باری سب آکر دیکھ رہے تھے۔ گاؤں کی بہو تھی۔ بےچاری کو کون دیکھ پایا تھا۔ آخر ایک عورت پہنچی اس نے اس کو کھینچ کر چھاتی سے لگا لیا —— "یہ تو میری بہو ہے"۔ پھر وہی ملن، وہی آنسو، وہی ہچکیاں سارا گاؤں رونے لگا۔

میں نے بڑی مشکل سے پوچھا "ان کا شوہر کہاں ہے؟"

اِدھر اُدھر لوگ دوڑ پڑے۔ خطوں کا پلندہ نکال لائے۔ لکھا تھا —— "میری بیوی کو ڈھونڈ دو، کہیں بھی ہو، کیسی بھی ہو —— نہیں تو میں جان دیدوں گا"۔



(گفتگو کے ذریعے مسائل کو طے کئے جانے کے رجحان سے متاثر ہو کر)

مُڑ کے مت دیکھو وہاں کچھ نہیں سناٹا ہے
برہنہ جسم روایات کے ویرانے ہیں
درد کے دشت ہیں، زخموں کے سیہ خانے ہیں
چار سو اُتری ہوئی فصل ہے انسانوں کی
خون میں ڈوبے ہوئے زخموں کے پیراہن ہیں
سارے ماحول سے بارود کی بو آتی ہے
رات کا گہرا اندھیرا ہے جہاں رہ رہ کر
اژدہے سایوں کے سر اپنا اٹھا لیتے ہیں

مُڑ کے مت دیکھو، اندھیروں کے لپکتے سائے
کہیں آنکھیں کی جسارت سے نہ ٹکرا جائیں
دیو —— تخریب و تباہی کے دھندلکوں سے کہیں
ذہن و ادراک کی راہوں میں نہ پھر آ جائیں
اس ملاقات کو ہم لوگ غنیمت جانیں
وقت کے رِستے ہوئے زخم پہ مرہم رکھ دیں
اپنے ہی ہاتھوں سے اب چاکِ گریباں سی لیں
دل کے جاگے ہوئے جذبوں سے اُجالا کر کے
اک نئی صبح کی تعبیر کا آغاز کریں
مسئلے جن کو کوئی جنگ بھی حل کر نہ سکی
گفتگو کر کے ہمیشہ کے لئے حل کر لیں
سلسلہ رسمِ ملاقات کا چلتا ہی رہے

یوں ہی اب سلسلۂ رسمِ ملاقات چلے
گفتگو بند نہ ہو —— بات چلے، بات چلے

قتل



کمال احمد صدیقی

ملک تقسیم ہوا
ورمیں قتل ہوا
کبھی لاہور کے چوراہوں پر
کبھی دتی کے گلی کوچوں میں
کبھی ڈھاکہ، کبھی کلکتہ میں
نواکھالی میں، کبھی پٹنہ میں
کبھی پنڈی، کبھی جالندھر میں
کبھی جموں، کبھی امرتسر میں
کبھی مسجد میں، کبھی مندر میں
گوردوارے میں کبھی
کبھی ریلوں، کبھی اسکولوں میں
کبھی گھر پہ تو کبھی دفتر میں!

ملک تقسیم ہوا
ملک آزاد ہوا
اورجب نام مرا گاندھی رہا
میں نے خود اپنے کئی روپ بچانا چاہے
اورمیں قتل ہوا!
آج پچیس برس ہوتے ہیں
روز میں قتل ہوا کرتا ہوں!!
لوگوں کی سالگرہ
سال میں ایک ہی بار آتی ہے
لوگوں کا یومِ وفات
سال میں ایک ہی بار آتا ہے
——اور میں؟
روز ہی قتل ہوا کرتا ہوں!
روز آتا ہے مرا یومِ وفات
اس لئے کوئی توجہ نہیں دیتا اس پر!

اب تو ہر شہر مرا مقتل ہے
اک جبلپور نہیں
ایک میرٹھ ہی نہیں
ایک رانچی ہی نہیں
اک بنارس ہی نہیں
بمبئی ہی نہیں
ایک اندور نہیں!
سیکڑوں شہر ہیں، ہر شہر میں قاتل ہیں ہزار
اب تو ہر شہر مرا مقتل ہے!

احمد آباد بھی اک شہر ہوا کرتا تھا
جو مرے نام کا شیدائی تھا
اورجب نام مرا گاندھی تھا
احمد آباد کے رہنے والے
میری پاپوش کی دھول
اس طرح چہروں پہ ملتے تھے کہ یہ چندن ہو
اور اس دھول سے کرتے تھے تلک!
احمد آباد کے، گجرات کے لوگ
اس سعادت پہ بہت نازاں تھے
آشرم میں نے بنایا تھا وہاں
آشرم میرا وہ مندر تھا، جہاں
صرف انساں کی عبادت تھی روا!

احمد آباد کے لوگوں کا دل
اس عبادت سے بہت تنگ آیا
آشرم ہی میں مجھے قتل کیا
اور اس طرح بڑی دھوم کے ساتھ
جشنِ صدسالہ منایا میرا

اب تو ہر شہر مرا مقتل ہے
روز میں قتل کیا جاتا ہوں
شہر میں، قریہ میں، ویرانے میں
کبھی ثابت نہ ہوا جرم کسی قاتل پر
کوئی قاتل نہ ہوا لائق تعزیر کبھی!
اب یہ کہتے ہیں کہ میں مجرم ہوں
قتل ہونے کی مجھے عادت ہے
قتل ہونا ہی مقدر ہے مرا!
روز میں قتل کیا جاتا ہوں
روز میں قتل کیا جاؤں گا!!

مارچ ۵، ۳، ۱۹۷ء

اس کا پورا نام غلام نبی فاروقی تھا۔ لیکن نام سے کیا
ہوتا ہے۔ وہ نبی اور مذہب کے بارے میں بس اتنا ہی جانتا
تھا جتنا بائبل یا وید اور رام کے بارے میں۔
بھلا کون پڑھنے جائے ان موٹی موٹی کتابوں کو۔
سب میں وہی کچھ لکھا ہے۔
"جھوٹ مت بولو۔ چوری کرنا جرم ہے کسی کو
مت ستاؤ"

تک جاکر وہاں کی مٹیوں میں جم جاتے ہیں۔
سب سے زیادہ گندگی تو ہم چھاتر ہی لے جاتے
ہیں ــــ یہ جے۔
میں گاؤں واپس جاؤں گا تو صفائی لیکر جاؤں
گا ــــ ضرور۔ یقیناً۔ اور پھر کبھی پلٹ کر شہر نہ آؤں گا۔
یہاں کسی کا کسی دوسرے پر کوئی حق نہیں ہے۔ نہ ہی جینے
کا ادھیکار۔

ہی ایسی ہوتی ہے۔ اور تب ہی ہم مذہب، تہذیب اور
زبان اور نہ جانے کیا کیا سوچنے لگتے ہیں۔ صرف لڑنے
کے بہانہ کے لئے۔
کبھی مجھ سے کسی ہندو سے لڑائی کیوں نہیں ہوتی۔
اس بات پر کہ وہ ہندو ہے اور میں مسلمان۔ ارے ہو گئے۔
لیکن ہم برائیاں کبھی کبھی اپنے پر لاد بھی تو لیتے ہیں
اس چھپے ہوئے گناہ گار کو ہمیشہ بہانہ کی تلاش ہوتی۔

انتقام



قمر احسن

ارے ہمیں دھرم ورم سے کیا لینا دینا۔ یہ سب تو
ملاؤں، پنڈتوں یا سیاست والوں کا کام ہے۔ میں تو اتنا
جانتا ہوں کہ کھاؤ۔ پیو اور مست رہو۔
غلام نبی فاروقی کے یہ اصول اس وقت اور نکھر
ہوسٹل میں رہنا شروع کیا اور

گی ہے۔ دراصل سارے
ہ جو اڑتے اڑتے دیہا توں

ارے بابا ــــ کون دیسی ہے اور کون بدیسی؟
کون جانے۔ اگر ہم بدیسی ہیں تو ہندو بھی تو بدیسی ہیں۔
نہ جانے آریوں کا کبھی کوئی دیش رہا بھی ہے کہ نہیں۔ پھر ہم
اپنی صفائی کیوں دیتے پھریں کہ ہما انشے اور دیپک ــــ!!
تمہارے ساتھ ہی یہ ہمارا بھی دیش ہے۔ ارے ہے بابا ــــ
ہے!! کیوں آپس میں لڑ مر رہے ہو۔
دراصل شہروں میں ہم سب کے اندر کا چھپا ہوا
گناہ گار سر نکال کر باہر جھانکنے لگتا ہے۔ شہر کی آب و ہوا

پھر وہ سوچنے لگتا۔ بھلا میں اکیلے سے کس طرح
لڑوں گا۔ یا اس کے گھر کو کیسے لوٹ کر جلا سکتا ہوں، یا
اکیلے ہی۔ جو میرے بعد سارے گھر کو سنبھالے ہے صرف
اس لئے کہ وہ غلام نبی ایک مسلمان کا گھر ہے۔ کیسے برباد کر
سکتا ہے؟ کتنی چھوٹی چھوٹی یادوں کو ہم بھلا اور مٹا سکتے
ہیں۔ گھر، گاؤں، کھیت، باغ، تالاب، کھیل، شرارت۔ ان
سب سے ہم کتنا بندھ گئے ہیں۔ ان سب سے رشتہ کون توڑ سکے گا؟
غلام نبی فاروقی۔ یہی سب کچھ سوچتا رہتا۔ اور

سیکور

اپنے آپ ہی مسکراتا اور بڑبڑاتا۔ دراصل شہر اسے راس نہیں آرہا تھا یا ابھی تک وہ اپنے کو گاؤں سے چھڑا کر شہر میں ایڈجسٹ نہیں کرسکا تھا۔

جب لڑکے اور لڑکیوں کے ساتھ لکچرار اور پروفیسر بھی اسے دیکھ کر مسکرانے لگے اور اسے فلسفی سمجھنے لگے تو اسے ہنسی آئی۔

یہ سب میری آنکھوں سے دیکھیں اور میرے دماغ سے سوچیں تو بربادی کیوں آئے۔ لڑائی ہی کیوں ہو مان لو میں نہیں لڑنا چاہتا تو دوسرا زبردستی کس طرح مجھ سے لڑ سکتا ہے۔

یہ کیا جانیں کہ اگر میں اکھشے سے لڑنا بھی چاہوں تو نہیں لڑ سکتا۔ ابا اگر ایک دن بھی پنڈت جی سے بات نہ کرنا چاہیں تو نہیں برداشت کرسکتے۔

یہاں تو جب ٹوٹی پھوٹی ہندی میں اکھشے کا خط آتا ہے تو سارے جہان کی دولت مل جاتی ہے۔ اتنا سُکھ تو ابا کے خط سے بھی کبھی نہیں ملتا۔ یا جب پنڈت جی مجھ سے فرمائش کرتے ہیں تو مجھے کتنی خوشی ہوتی ہے۔ یہ لوگ کیا جان سکتے ہیں۔

فلسفی تو دراصل غالب، نرالا اور مہادیوی ورما ہیں۔ جو ان سب کو چھوڑ کر اور نہ جانے کیا کچھ دیکھا کرتے ہیں۔ سمجھ سے باہر کی باتیں۔

یہاں تو اپنا گھر۔ اکھشے کا گھر، مسجد، تالاب پر بنا ہوا شیوالہ، آم کے درخت، گاؤں کی گلیاں اور ہولی و محرم دیکھنے سے فرصت نہیں مل پاتی۔ جی چاہتا ہے کہ تمام دن بیٹھے سوچا کرو۔ اور مسکرایا کرو۔ کہ جب گلا سے ہولی کھیلتا ہے۔ اکھشے کے گھر والے محرم میں امام حسین کی مجلس کرتے ہیں اور تازیہ (تعزیہ) اپنے سر پر اٹھا کر لے جاتے ہیں تو کتنا اچھا لگتا ہے۔

اس بار بھی ابا نے لکھا ہے کہ اکھشے کی وجہ سے تمہاری بہت کم ضرورت محسوس ہوتی ہے یا ایسا لگتا ہے کہ تم گئے ہی نہیں ہو۔ اکھشے تو تمہیں دن رات یاد کیا کرتا ہے۔ اس بار وہی کر بانو کو اس کی سسرال سے بھی لایا۔ وہاں سنا کر لڑ بھی آیا ہے کہ میں بھائی موجود ہوں تو کیوں نہیں بدا (وداع) کرتے؟ پتہ نہیں کہاں سے تحفے تحائف بھی لے گیا تھا۔ شاید پنڈتائن کی بھی سازش رہی ہو۔ پنڈت جی بھی تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔

اور غلام نبی پھر سوچنے لگتا۔ کوئی بتنا ئے۔ ایسے اکھشے سے بھی کوئی لڑ سکتا ہے اور اگر لڑے بھی تو کہاں تک؟ خود ہی خاموش نہ ہو جائے گا۔

غلام نبی یہی سوچتا سوچتا کیمپ کے ساتھ ماؤنٹ آبو بھی چلا گیا۔ دو ماہ کی ٹریننگ۔ باپ رے باپ۔

اس نے اپنے گھر کے ساتھ ہی اکھشے اور پنڈت جی کو بھی اپنا نیا پتہ لکھ کر بھیجدیا۔ اور دو ماہ تک بے چینی سے انتظار کے بعد بھی جواب نہ آیا تو فکرمند ہونا لازمی تھا۔ پھر اچانک ہی یونی ورسٹی کے ایک ساتھی نے جو خط بھیجا اس سے غلام نبی فاروقی کے تمام نظریات ہی پلٹنے لگے۔

گاؤں اور آس پاس کے علاقوں میں فرقہ وارانہ فساد ہو گیا تھا جس میں غلام نبی کے والد بھی مارے گئے ہیں۔ غلام نبی نے پے در پے خیریت جاننے کے لئے خطوط لکھے۔ لیکن کوئی جواب نہ آیا تو کئی عدد تار روانہ کئے جب ان کا بھی جواب نہ آیا تو غلام نبی فاروقی نے گھر اپنی آمد سے اطلاع بھیجی اور یونی ورسٹی کے لئے روانہ ہو گیا۔

ہوسٹل آنے کے بعد غلام نبی کو کچھ تفصیل معلوم ہوئی کہ سارا کیا دھرا گاؤں کے ہندوؤں کا تھا۔ انھوں نے ہی آس پاس کے گاؤں سے غنڈوں کو جمع کر کے تمام مسلم گھرانوں کو لوٹ کر آگ لگا دی۔ بہت سے بوڑھے بچے مارے گئے یا مکانوں میں جل گئے اور نہ جانے کتنی عورتوں کی بے عزتی ہوئی۔ انھیں مرنے والوں میں غلام نبی فاروقی کا باپ بھی تھا۔ اور غنڈوں میں جو نام بتائے گئے ان میں پہلا نام اکھشے اور پنڈت جی کا تھا۔

غلام نبی کو جتنی تکلیف باپ کے مرنے کی تھی اتنی ہی اس بات سے ہوئی کہ اکھشے اور پنڈت جی بھی دھوکہ دے گئے۔

ارے پنڈت کا کا تم تو ابا کے ساتھ مل کر حقہ پیتے تھے اور شاید بچپن کے دوست تھے۔ تم سے کس طرح مارا گیا ہوگا۔

اور اکھشے میں تو تمہاری دوستی کی قسم کھاتا تھا۔ کب تمہیں ابا سے یا اس گھر سے تکلیف ہوئی تھی جو تم نے یہ بدلہ لیا۔

پھر غلام نبی کا دماغ کھولنے لگا ـــــ بدلہ ـــــ بدلہ ـــــ جب تک بدلہ نہ لوں گا چین سے نہ بیٹھوں گا۔ غلام نبی جب بھی چونکتا تو یہی بڑبڑاتا۔

اب یہاں ہم لوگ عزت کی زندگی اس وقت گزار سکتے ہیں جب ہم بھی تشدد پر اُتر آئیں۔ ہم سب احساسِ کمتری کا شکار ہیں۔

غلام نبی گاؤں جانے کے لئے ٹرین پر بیٹھا تو اس کا دل لرز رہا تھا۔ میں نے اپنے آنے کی اطلاع دے کر اچھا نہ کیا۔ نہ جانے اب گاؤں والے مجھ سے کیا سلوک کریں۔ کیا پتہ اب اکھشے اور پنڈت جی میری تاک میں ہوں۔ اور مار کر چپ چاپ کہیں دفن کر دیں۔ یا جلا دیں۔ وہاں فریاد کرنے والا ہوگا ہی کون؟ جاؤں یا راستہ سے ہی واپس چلا جاؤں۔ لیکن جانا تو ضروری ہے۔ پتہ نہیں ماں اور بانو کہاں ہیں؟ ان کا تو کچھ پتہ معلوم ہونا چاہیے۔ نہ جانے کہاں بے سہارا بھٹک رہی ہوں گی۔ آگے سوچتے سوچتے پھر اس کا خون کھولنے لگتا۔ اور تصور ہی میں وہ تمام گاؤں والوں کو قتل کرتا رہتا۔ سارے مکانات جلاتا رہتا۔ اور ذہن پر ایک ہی لفظ ہتھوڑے کی طرح دھمکتا رہتا ـــــ بدلہ ـــــ بدلہ ـــــ

غلام نبی اسٹیشن پر اترا تو چاروں طرف لو کے تھپیڑوں کے ساتھ گرد اڑتی پھر رہی تھی۔ اسے اچانک اپنا اسٹیشن بھی پہچاننے میں دقت ہوئی۔ چندھیائی آنکھوں سے جس طرف دیکھتا P.A.C. اور پولیس والوں کی وردیاں ہی دکھائی دیتیں۔ اسے لگا جیسے ساری وردیاں اور تمام لوگ اسے گھور رہے ہوں۔ یہی ہے۔ یہی قاتل ہے یہ بدلہ لینے آیا ہے۔ مسلمان ہے۔ اس کو مارو۔ غلام نبی کا دل حلق میں آکر دھڑکنے لگا۔

اور اچانک ہی جب اس کے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھ دیا تو وہ گھگھیا کر پلٹ پڑا۔

ایں ـــــ؟؟

پیچھے اکھشے کھڑا تھا۔ غلام نبی کو لگا جیسے بڑا بھیانک ہو گیا ہو۔ پھیلا ہوا دہانہ۔ سرخ زبان خون ٹپکتا ہوا اور بڑے بڑے دانتوں میں پھنسی ہوئی ہڈیاں اور دونوں ہاتھ خون میں لتھڑے ہوئے۔ غلام نبی خوف سے پیچھے ہٹ کر اکھشے کو گھورنے لگا اور خوف زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔

ضرور یہ اکھشے اپنے ساتھ غنڈوں کو لیکر آیا ہوگا تاکہ مجھے خاموشی سے ختم کر سکے۔ لیکن جب آس پاس کوئی نہ دکھائی دیا۔ تو سوچنے لگا۔ اچھا! ابھی سب موقع کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ یہاں پولیس کھڑی ہے نا۔ کہیں اکیلا پاکر ماریں گے۔ اس نے آہستہ سے اپنے نیفے میں گڑے ہوئے چاقو کو چھوا۔ اور اکھشے کی طرف دیکھا۔

اکھشے کی آنکھیں بالکل سرخ ہو چکی تھیں اور آنسو متواتر لڑھک لڑھک کر گردن اور زمین پر گر رہے تھے۔ وہ ایک ٹک غلام نبی کو گھور رہا تھا۔ پھر وہ غلام نبی کے پیروں کی طرف لپکا اور لپٹ کر چیخ چیخ کر رونے لگا۔

گلامے —— ابا ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔

بالکل مجبور ہو گیا تھا میرے بھائی۔ وہ مجھے باندھ کر منہ میں کپڑا ٹھونس کر بنواری میں پھینک آئے تھے۔ ہاں گلامے یقین کرو۔ بابا بھی بری طرح جل گئے ہیں۔ ان کے بچنے کی آشا نہیں ہے۔ پھر اکھشے کی ہچکیوں میں بقیہ الفاظ دبتے چلے گئے۔

غلام نبی چپ چاپ خالی خالی نظروں سے لو کے دائرے اور اڑتی ہوئی ریت کو گھور رہا تھا۔

تھک گیا تو ہچکی لیتے اور آنکھوں کو رگڑتے ہوئے غلام نبی کا سامان اٹھا کر چل پڑا۔

آؤ! گلامے لٹا ہوا گاؤں بھی دیکھ لو۔

غلام نبی کا دماغ ابھی تک سنسنا رہا تھا۔

ہونہہ! ایکٹنگ کرتا ہے۔ اتنا بے وقوف سمجھا ہے۔ بھلا ہندو اسے ہی کیوں باندھ دیتے جب کہ یہی سب کا سردار رہا ہوگا۔ مکاری کرتا ہے۔ بدمعاش، کمینہ، قاتل۔

غلام نبی کو سارے گاؤں میں پھیلے ہوئے پولیس والے اور جلا ہوا ملبہ دکھائی دیا۔ تو اسے اپنا ہی گاؤں پہچاننے میں دقت ہونے لگی۔ کہیں میں کسی اور گاؤں میں تو نہیں آ گیا ہوں۔

جلے ہوئے کھیت، مکانات۔ یہاں کریم کا گھر رہا ہوگا۔ یہ بجے کی دوکان تھی۔ یہاں امام باڑہ ہونا چاہیئے۔ مسجد کا صرف ایک گنبد ہی رہ گیا ہے۔ لیکن یہ وکرم اور پنڈت جی کا گھر کیسے جلا؟! اچھا۔ لوگوں کو دکھانے کے لیئے خود ہی آگ لگا دی ہوگی۔ ہونہہ۔

اکھشے نے جب غلام نبی کو اس کے گھر کے ملبہ پر لاکر کھڑا کیا تو غلام نبی حیران ہو کر دیکھتا رہ گیا۔ سب کچھ اتنا اجنبی۔ پھر اس کی آنکھوں سے خون بہنے لگا۔ یہ جلا ہوا نیم کا درخت، دروازہ، مکان کی جلی ہوئی نشانیاں —— غلام نبی کا حلق اور زبان خشک ہو گئے۔ اس نے گھوم کر دیکھا۔ چاروں طرف کھڑے پولیس والے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہے تھے اور آس پاس کے مکانوں سے عورتیں اور بچے جھانک رہے تھے۔ اس کے پاس بھی بہت سے لوگ کھڑے تھے۔ لیکن سب کی صورتیں دھندلا گئی تھیں۔ غلام نبی ملبہ کے اوپر سر جھکائے آنسو پیتا رہا اور ہونٹ کاٹتا رہا —— بدلہ —— بدلہ —— سب سے بدلہ۔ سب قاتل ہیں۔ وحشی، مکار۔

وہیں اکھشے ایک لوٹے میں جلدی سے گڑ کا شربت بنوا کر لایا۔ تو غلام نبی کو لگا کہ اس میں زہر ملا ہوا ہے۔ وہ جھجک کر پیچھے ہٹ گیا۔

کیا ہوا؟ اکھشے نے پوچھا۔

غلام نبی دھیرے سے بڑبڑایا —— زہر ——!

اکھشے رو پڑا۔ میں تمہیں زہر دوں گا —— میں —— اے گلامے؟ پاگل ہوا ہے۔ دیکھ میرے مکان کی کیا حالت ہے۔ جاؤ اسپتال جاکر جلے ہوئے بابا کو دیکھو۔ جن کے بچنے کی کوئی امید نہیں ہے جو تمہاری ماں، بہن، ابا اور مکان بچانے کے لئے جلتے ہوئے گھر میں گھس پڑے تھے۔

غلام نبی نے سوچا۔ ہونہہ! بچانے کے لئے۔ ارے آگ لگانے گیا ہوگا۔ بھاگ نہ سکا ہوگا؟ اب بہانے بناتے ہیں —— مکار —— ذلیل۔ بہرحال ابھی غصہ ظاہر نہ کرنا چاہیئے۔ مجھے بھی مکاری سے کام لینا ہوگا۔ وہ جلے ہوئے مکان میں گھس پڑا۔ اور کرید کرید کر چیزیں ڈھونڈھنے لگا۔ چولھا، پتیلیاں، چاول، گیہوں، لحاف، کپڑے، جانماز، یہ بیٹھکا تھا، جہاں دادا کی تصویر لگی رہتی تھی۔ یہاں ابا سوتے تھے۔ وہ راکھ پر گر کر پھر سسکنے لگا۔ اسے بس اتنا ہوش تھا کہ اس کے اردگرد گاؤں والے خاموش کھڑے ہیں اور اکھشے بار بار اسے اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے لیکن وہ شام تک وہیں راکھ کے ڈھیر پر پڑا رہا۔ پاس ہی اکھشے بھی راکھ کرید رہا تھا۔

غلام نبی نے اسے غور سے دیکھا اور پھر بڑبڑانے لگا۔ پورے گاؤں سے بدلہ لوں گا۔ کنوئیں میں زہر ڈال دوں گا سب مر جائیں۔

ماں اور بانو کہاں ہیں۔ اس نے ہمت کر کے بہت ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ کہ کہیں اکھشے کوئی بری خبر نہ سنا دے۔

میرے یہاں۔ چلو کب سے تمہارا انتظار ہو رہا ہے۔

اسے لگا کہ وہ چل رہا ہے۔ اکھشے کے جلے ہوئے گھر میں کھڑا ہے۔ ماں اور بانو اس سے لپٹ کر رو رہی ہیں۔ ابا کو یاد کر رہی ہیں۔ پھر ماتا جی آئی ہیں اور اس سے لپٹ کر رو رہی ہیں۔ ماں کہہ رہی ہیں بیٹا! اگر پنڈت جی اور اکھشے نہ ہوتے تو نہ جانے کیا ہوتا۔ اور وہ سوچ رہا تھا۔ ہونہہ! اکھشے اور پنڈت جی۔ سمجھوں گا۔ سب سے سمجھوں گا۔ ماں اور نہ جانے کیا کہہ رہی تھیں۔ اس کے ذہن میں کچھ ہی جملے چکرا رہے تھے۔

پنڈت جی اور ابا باتیں کر رہے تھے۔ بلوائی اندر گھس آئے۔ آگ لگا دی۔ ابا انھیں روکنے لگے۔ پنڈت جی جلدی سے اماں اور بانو کو لے کر بھاگے۔ پھر ابا کی چیخ سنائی دی۔ پنڈت جی جلتے ہوئے گھر میں گھس پڑے۔ پھر ابا کو باہر لاتے ہوئے پنڈت جی بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ پھر بلوائیوں نے پنڈت جی کے یہاں بھی آگ لگا دی وغیرہ وغیرہ۔

اور غلام نبی کا ذہن دہرا رہا تھا —— بدلہ —— بدلہ۔ سب سے بدلہ۔ رات کو جب وہ اکھشے کے ساتھ لیٹا تو بھی کوئی کہہ رہا تھا۔ غلام نبی۔ ابا کا بدلہ لو۔ کوئی

لگ رہا تھا۔ جلے ہوئے پنڈت جی، ننھے، رحمان، دیپک راجیش، اور نہ جانے کون کون۔ پٹیوں میں لپٹے ہوئے پنڈت جی کی کمزور آواز۔ کہہ رہی تھی۔ گلامے! میرا بھائی مجھے اپنے ساتھ نہیں لے گیا۔ خود اکیلے چلا گیا اتنی سب ذمہ داری سونپ کر۔ اور غلام نبی سوچ رہا تھا — بدلہ — ابّا کا بدلہ۔ مکان کا بدلہ۔ خون کا بدلہ۔ مکان — خون۔

رات کو سوتے ہوئے بھی اس کا دماغ کھولتا رہا۔ اکھشے کو مار ڈالوں پھر اس کے گھر میں آگ لگا دوں اور اکھشے کے گھر والوں کو اسی میں جھونک کر صبح اماں اور بانو کو لے کر کہیں بھاگ جاؤں اور اسپتال میں جا کر پنڈت جی کو بھی مار ڈالوں۔ لیکن ....

اس نے آہستہ سے اکھشے کی طرف دیکھا تو اس نے کہا گلامے! رو لے نہیں تو گھٹ جائے گا۔

غلام نبی کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ ناچ گئی۔ رو لے۔ تاکہ غصہ ٹھنڈا ہو جائے۔ چالاک! میں بدلے کے بغیر اب روؤں گا بھی نہیں۔ خون کا بدلہ خون لیکن .....

اس نے کچھ دیر پھر اکھشے کی طرف دیکھا۔ کتنا معصوم لگ رہا ہے۔ پھر اسے یاد آنے لگا گری اور لو میں آم کے باغات میں اکھشے تالاب، کھیت اور جنگل میں — ایک ہی تھالی میں دال چاول کھاتے ہوئے اکھشے ابّا اور پنڈت جی۔ اماں اور ماتا جی۔ پدما اور بانو۔ اکھشے اور غلام نبی۔ گلامے اور اکھشے۔

نہ جانے کیسے یہ سب کچھ ہوا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ واقعی باہر گاؤں والوں نے اچانک حملہ کر دیا ہو۔ بے چارے پنڈت جی کتنا زخمی ہیں۔ شاید ہی بچ سکیں لیکن کسی کو ان کی پرواہ نہیں ہے۔ سب بانو اور اماں کی خاطر داری میں لگے ہیں۔ بے چارے پنڈت جی۔ اس کے دماغ کے ایک کونے میں پھر خیال اُبھرا بدلہ — بدلہ — لیکن کس سے بدلہ — اگر ان لوگوں نے خود ہی حملہ کیا ہوتا تو خود ہی زخمی کیسے ہوتے۔ ان کا مکان کیسے جلا ہوتا۔ بانو اور اماں کو اپنے گھر میں کیوں رکھتے؟ نہ جانے ان کا مکان کس نے جلایا؟ ننھے نے؟ رحمان نے؟ یا ......

بے چارہ اکھشے اپنا سارا دکھ بھولا ہوا ہے اس وقت کتنا تھک کر سویا ہے۔ لیکن مجھے ابّا کے خون کا بدلہ لینا ہی ہوگا۔ ہونہہ کیسا مزے میں سو رہا ہے۔ ابّا کی روح تڑپ رہی ہوگی۔ اس نے آہستہ سے اپنے نیفے میں گھڑے ہوئے چاقو کو چھوا۔

غلام نبی کی آنکھیں نیند اور جلن سے اب کڑوی ہو رہی تھیں۔ اس نے سر جھٹک دیا۔ لیکن دماغ نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتا رہا۔ پنڈت جی ابّا۔ گلامے اور اکھشے اماں اور ماتا جی۔ پدما اور بانو......

صبح کی نماز کے لئے جب لوگ جلتی ہوئی مسجد کے قریب پہنچے تو ٹھٹھک کر کھڑے ہو گئے۔ مسجد کے عین دروازے پر ایک ہندو نوجوان دھوتی پہنے۔ ماتھے پر تلک اور چاول لگائے۔ ایک ہاتھ سے جنیو پکڑے ہوئے خون میں تڑپ رہا تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ایک لمبا سے چاقو پھنسا ہوا تھا۔

اکھشے نے جب صبح تڑکے ہی آنکھ کھولی تو غلام نبی فاروقی کو اپنے بستر سے غائب دیکھ کر وہ چیخ اٹھا — گلامے —! اس کا کوٹ اور جوتہ پاس ہی پڑے ہوئے تھے۔

بیان برائے ملکیت ماہنامہ "سیکولر ڈیموکریسی" (اردو) نئی دہلی اور دیگر تفصیلات

فارم ۴

۱۔ مقام اشاعت .... نئی دہلی

۲۔ وقفۂ اشاعت .... ماہانہ

۳۔ پرنٹر کا نام .... این۔ این پانڈے

شہریت .... ہندوستانی

پتہ .... سی ۴/۱۳۷۔ صفدر جنگ، ڈویلپمنٹ ایریا۔ نئی دہلی

۴۔ ایڈیٹر کا نام .... ڈی۔ آر۔ گوئل

شہریت .... ہندوستانی

پتہ .... ایچ ۴۷۲، نیو راجندر نگر۔ نئی دہلی

۵۔ ملکیت .... قومی ایکتا ٹرسٹ

۱۵۔ بلونت رائے مہتہ لین۔ نئی دہلی

میں این۔ این۔ پانڈے تصدیق کرتا ہوں کہ اوپر دی گئی تفصیلات میرے علم اور عقیدے کے مطابق درست ہیں۔

این۔ این۔ پانڈے

تاریخ ۲۸ فروری ۱۹۷۳ء



نورجہاں حسین

مسلمان اور مذہب

دنیا میں جتنے مذاہب آئے ان کا مقصد یہ تھا کہ خدا کی زمین پر کشت وخون نہ ہو۔ انتشار، بدامنی، بداخلاقی اور دیگر سماجی برائیوں کا خاتمہ ہو اور اللہ کی مخلوق امن و چین کی زندگی گزارے۔ اسلام سب سے آخری مذہب تھا اس لئے یہ ایسا ضابطۂ حیات لے کر آیا جو اپنے پیش رَو مذاہب کے مقابلے میں زیادہ جمہوری اور مکمل تھا، لیکن جیسا کہ تمام مذاہب کے ساتھ ہوا تھا اسلام کے ساتھ بھی ہوا کہ اس کی اعلیٰ تعلیمات، جمہوری روح اور انسانیت، اور بھائی چارے کی اقدار تو بھلا دی گئی ہیں اور مذہب نام رہ گیا۔ محض بے روح عبادت کا، جو سوز و گداز سے یکسر خالی تھی۔

مذہب کے ہمیشہ دو پہلو رہے ہیں ایک تو اصل مذہب یعنی اس کی روح یا تعلیمات کا نچوڑ اور دوسرا ظاہری طریقہ، عبادت۔ جو خواص ہوتے ہیں وہ ہمیشہ اصل کو اپناتے ہیں جیسے صوفیائے کرام، اور عوام کے لئے عبادت کا مخصوص طریقہ کار ہی قابلِ اتباع رہتا ہے۔ طریقت اور شریعت کی منزل ایک سہی مگر راستے جُدا ہے ہیں اور اہلِ باطن ہمیشہ اہلِ ظاہر کی نظروں میں ملعون رہے ہیں۔ (منصور، سرمد وغیرہ)

اس تمہید کا مقصد یہ ہے کہ آج امتِ مسلمہ کی کثیر تعداد مذہب کے نام پر محض ظاہری اور مخصوص طریقہ عبادت کی ادائیگی کو ہی مذہب سمجھتی ہے اور نماز، روزہ اور دیگر احکامِ شریعت کی پیروی سے جو مخصوص کردار اور مزاج پیدا ہونا چاہیئے وہ شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ اصل ایمان اور مذہب یہ ہے کہ جب دیکھ لیا کہ یہ مسلمان ہے جھوٹ نہیں بولے گا، کم نہیں تولے گا، رشوت نہیں لے گا، بد دیانتی نہیں کرے گا۔ لہٰذا ایسی عبادت کس کام کی کی جو اپنے اصل مقصد میں ناکام رہے؟ پھر دوسری بات یہ ہے کہ کسی مذہب کے بارے میں جو عام تصور پیدا ہوتا ہے وہ اس کے پیروؤں کے کردار اور عمل کی روشنی میں پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً کسی محلے میں اگر کوئی مسلمان رہتا ہے تو اس علاقے کے تمام غیر مسلم اسلام کے بارے میں جو رائے قائم کریں گے وہ اِس مسلمان کے کردار اور عمل کی روشنی میں کریں گے۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ اِس مذہب کی تعلیمات جاننے کے لئے اس مذہب کی کتابیں پڑھی جائیں۔

مسلمانوں کا کردار اور طریقہ کار تقریباً ویسا ہی ہے جیسا کہ اس علاقے یا خطے کی اکثریت کا ہے لہٰذا ان کا خیرالامت ہونے کا دعویٰ یا اپنے مذہب کی افضلیت کا ادعا محض کھوکھلا ہے کیونکہ اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کے باوصف ان کا کردار بھی اسی حد تک کھوٹا ہے جس حد تک دوسروں کا ہے۔ اس سلسلے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ پیروؤں کی خامی یا خرابی کی وجہ سے نفسِ مذہب یا اس کی تعلیمات پر کیا اثر پڑتا ہے۔ یہ صحیح ہے مگر کسی بھی دین یا جماعت کی تعلیمات اور اس کے ماننے والوں کو الگ نہیں کیا جاسکتا۔ آج کانگریسیوں کی اکثریت، کانگریس کے اصولوں سے منحرف ہے۔ آج ہم جو کانگریس کے بارے میں حکم لگاتے ہیں وہ عام کانگریسیوں کے کردار کو دیکھ کر لگاتے ہیں، کانگریس کا دستور یا مینو فیسٹو نہیں پڑھتے کہ اس میں کتنی عمدہ باتیں کہی گئی ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہر مذہب میں کچھ باتیں بنیادی ہوتی ہیں اور کچھ ضمنی۔ مسلمانوں نے اس بارے میں بہت کچھ غور کیا ہے۔ خدا کی وحدانیت، نبی کی رسالت یومِ آخرت، قرآن کی عظمت، بنیادی باتیں ہیں۔ نماز روزے کے احکام بھی قطعی ہیں مگر اس کے علاوہ ہزاروں باتیں ایسی ہیں کہ اگر ان میں حالات اور زمانے کے مطابق تبدیلی پیدا کر لی جائے تو اسلام کو کوئی گزند نہیں پہنچ سکتی۔ مثلاً کلچر کے مسئلے کو لیجئے۔ کلچر کبھی کسی مذہب کا نہیں ہوتا۔ ملک یا علاقے کا ہوتا ہے۔ جزیرۃ العرب، جہاں اسلام نے آنکھیں کھولیں اور پروان چڑھا، وہاں کا کلچر اور مزاج یورپ، ایشیا کے دیگر ممالک اور افریقہ کے کلچر سے بے حد مختلف ہے۔ جو لوگ حج کو جاتے ہیں یا بہ سلسلۂ ملازمت یا کاروبار وہاں مقیم رہے ہیں وہ سعودی عرب کے کلچر کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔ ہندوستانی سفارت خانے کے اعلیٰ افسر (جو مسلمان ہیں) نے مجھے بتایا کہ ایک نوجوان عرب مجھے اپنی والدہ کی دعوت ولیمہ کا کارڈ دینے لگے تو میں بے حد بوکھلا گیا (ان کی والدہ کی تیسری شادی تھی) ایک معلّم نے اپنی تیسری بیوی کو طلاق دی تو چھوٹی سی قہوہ پارٹی ہوئی اور مطلوقہ بیوی اپنے کپڑے اور سامان، ایک سوٹ کیس میں رکھ کر سب کو ٹا ٹا کہتی ہوئی ہنسی خوشی چلی گئی۔ ہندوستانی افسر کی بیوی بے ہوش ہوتے ہوتے بچیں۔ حرم شریف میں جوتے اور چپل پہن کر داخل ہونا عام ہے۔ عرب ممالک میں جوتے پہن کر اور ننگے سر نماز پڑھنے کا عام رواج ہے۔

ایک ہفتہ وار میں ایک ہندوستانی طالب علم کا مراسلہ پڑھا جو ایران میں زیرِ تعلیم تھا۔ ایرانی دوستوں نے افطار روزہ کی دعوت دی تھی۔ افطار کے وقت جو پہلی چیز تھی وہ بیَر تھی۔ بے چارہ ہندوستانی طالب علم بہت خفا ہوا تو ایک ایرانی نے بڑی معصومیت سے کہا "ایں ہندی آب جو را شراب می گویند"

دوسری جنگِ عظیم کے موقع پر ایک ہندوستانی

فوجی کو جو مسلمان تھا قاہرہ کی ایک مسجد میں داخل ہونے سے روک دیا گیا تھا کیونکہ اس کی جتنی لمبی داڑھی تھی اتنی لمبی داڑھی مسلمان نہیں، بلکہ یہودی رکھتے تھے۔ انڈونیشیا ملائشیا اور افریقہ کے ممالک میں جو مقامی اثرات ہیں اور خود ہندوستان کے مسلمانوں میں جو ہندوستانی اثرات ہیں وہ خالص اسلامی اثرات سے کہیں زیادہ ہیں اور بدعت کو روکنے کی زبردست کوششوں کے باوجود اب بھی شادیوں میں مانگ میں سیندور اور صندل بھرا جاتا ہے اور سینکڑوں دیگر رسموں پر عمل کیا جاتا ہے۔

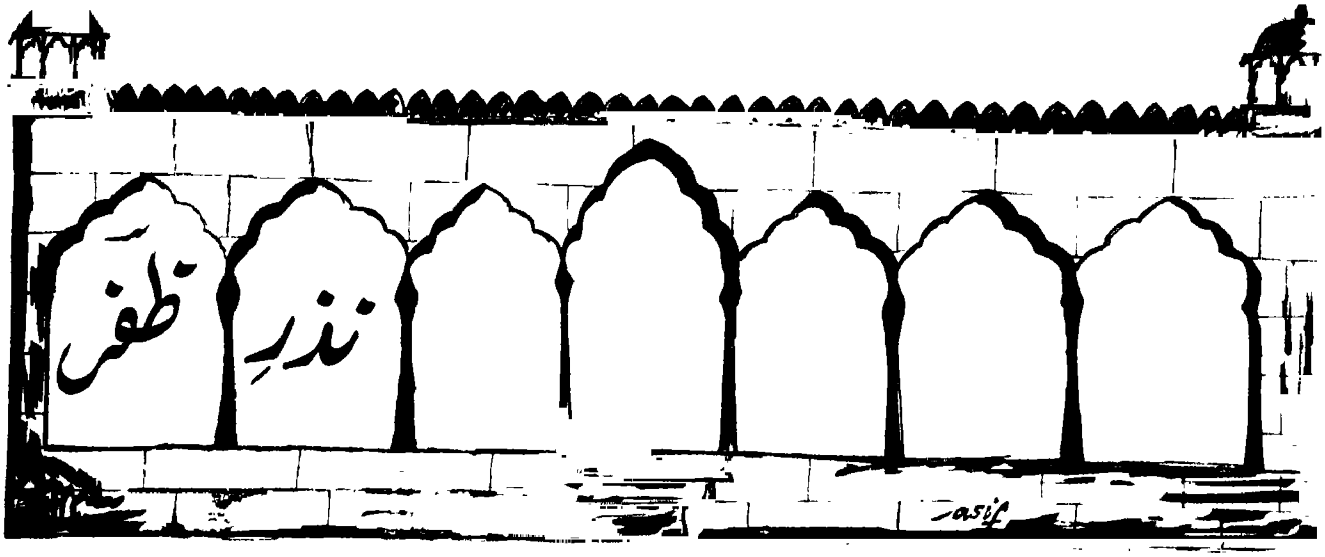
غرض یہ کہ حج کے موقعہ پر اختلاف کلچر، سیاسی خوراک اور رہن سہن کا جو مظاہرہ ہوتا ہے وہ اس کا بیّن ثبوت ہے کہ اسلامی کلچر یا ثقافت نام کی کوئی چیز نہیں ہے اور اس سلسلے میں جتنی کوششیں کی گئی ہیں وہ ناکام رہی ہیں اور ناکام رہیں گی۔ لہٰذا مقامی کلچر کو اسلام سے متصادم نہیں سمجھنا چاہیئے۔ اگر اس بات کو سمجھ لیا جائے تو مقامی حالات سے ہم آہنگ ہونے میں بڑی سہولت پیدا ہوگی۔ عام زندگی کی بہت سی باتیں ہیں جن پر حالات و زمانے کے مطابق عمل کرنے سے اسلام کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا اس سلسلے میں رویت ہلال کے مسئلے کو لیجئے۔ اگر قمری مہینوں کے بجائے شمسی مہینے یا انگریزی کیلنڈر (جنوری دسمبر) کو اپنا لیا جائے تو اس میں کیا قباحت ہے۔ سعودی عرب میں تو دستور ہے کہ حکومت کی طرف سے اعلان کر دیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں کیا کیا قباحتیں پیدا ہوتی ہیں ان سے سبھی واقف ہیں۔ اسی طرح سود کا مسئلہ ہے۔ بارہا کہا گیا ہے کہ ہندوستان میں interst اور usury دونوں کا ترجمہ سود کیا گیا ہے۔ جو گناہ ہے وہ usury ہے یعنی وہ سود جو کسی کے دکھ، تکلیف یا مجبوری کے پیش نظر لیا جائے۔ وہ interst یا منافع نہیں جو بینک یا مالی ادارے از خود دیتے ہیں۔ لکھنؤ میں علماء کی کانفرنس بھی بیٹھی، مگر نتیجہ بے سود۔ اب جو لوگ سود کو گناہ سمجھتے ہیں وہ بینک سے قرض لے کر مکان نہیں بنواتے، کاروبار نہیں کرتے۔ نتیجے کے طور پر معاشی خوش حالی سے دور رہتے ہیں۔ حیرت ہے کہ اب بھی 'برہان' میں ایسے مضامین چھپتے ہیں کہ انشورنس قمار بازی ہے۔ جو لوگ انشورنس کے بغیر مر جاتے ہیں ان کے پس ماندگان کا کیا حال ہوتا ہے۔ اس سے قطع نظر اور فقہی بھول بھلیوں سے صرف نظر کر کے دیکھا جائے تو عقل سلیم انشورنس یا interest کو ناجائز تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہے۔ جن اسلامی ممالک نے ان چیزوں کو جائز قرار دیا ہے ان پر مغربیت کا لیبل لگانا اور اپنی دین داری کا ڈھنڈورا پیٹنا، اپنے منہ میاں مٹھو والی بات ہے۔ جب کہ عربوں کا خود یہ دعویٰ ہے کہ رسول عرب میں پیدا ہوئے، قرآن عربی زبان میں نازل ہوا، تمام مقتدر صحابۂ کرام عرب میں تھے لہٰذا اسلام کی صحیح تعبیر و تشریح کا حق عربوں کو ہے نہ کہ ہندوستانیوں کو۔ اسی طرح کی بہت سی باتیں ہیں جن پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ ہمارا معاشرہ جدید تقاضوں کا ساتھ دے سکے۔

اسلام میں ثواب کا بھی جو تصوّر ہے اسے غلط سمجھنے کی وجہ سے اجتماعی طور پر مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچا ہے۔ اس تصوّر نے مسلمانوں کو بڑا خود غرض بنا دیا ہے اور ان کو عام مسلمانوں کی فلاح و بہبود سے باز رکھا ہے۔ اس میں قصور مذہب کا نہیں ہے۔ بلکہ سمجھنے سمجھانے والوں کا ہے۔ حق اللہ پر اتنا زور دیا گیا ہے کہ حق العباد جو اتنا اہم ہے اس سے توجہ بالکل ہٹ گئی ہے۔ مثال کے طور پر صاحبِ ثروت مسلمان اپنے مُردہ عزیزوں کا حج بدل کراتے ہیں۔ اگر ان سے کہا جائے کہ اس روپے سے کسی غریب کی لڑکی کی شادی کرا دیجئے، کسی بیوہ کو مشین خرید دیجئے، یا کسی نادار لڑکے کو پڑھا دیجئے تو وہ تیار نہیں ہوں گے۔ میرے ایک عزیز پانچ ہزار روپے کسی نیک کام میں خرچ کرنا چاہتے تھے۔ میں نے زور دیا کہ خاندان میں دو غریب لڑکیاں ہیں ان کی شادی کرا دو۔ مولوی سے رائے لی گئی۔ یہ فتویٰ دیا گیا کہ مسجد میں پنکھا لگا دو، صفیں منگوا دو، نل لگواؤ، یہ صدقہ جاریہ ہے، زیادہ ثواب ہوگا انھوں نے یہی کیا۔ ان دونوں لڑکیوں کی شادی ایسے گھرانے میں ہوئی ہے کہ فاقے کی نوبت ہے۔ اسی لئے مسجدوں، خانقاہوں اور مدرسوں کے لئے جائیدادیں وقف کی گئی ہیں۔ آپ کو ایسا کوئی وقف نہیں ملے گا جس کی آمدنی بیواؤں اور یتیموں کی مالی امداد کے لئے وقف کی گئی ہو۔

مسلمانوں میں سوشل ورک کا کوئی تصور ہی نہیں ملتا۔ جو بھی سوشل ورک ہے وہ ثواب کے دائرے کے اندر ہے۔ کیونکہ ثواب کے بل بوتے پر جنت مل سکتی ہے۔ اب ثواب کے بھی مدارج ہیں اور جنت کے بھی۔ یہ کوئی نہیں کرتا کہ ایک سال حج کو نہ جائے اور یہ روپیہ چند نادار مسلمانوں کو دیدے کہ پان سگریٹ کی دکان کھول لو یا مونگ پھلی بیچو، یا بوٹ پالش کرو اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالو۔ کیونکہ ان کی روزی دینا تو اللہ میاں کا کام ہے۔ ہمیں تو اپنی جنت سے غرض ہے۔ اسلام ایک سچّا مذہب ہے اسی لئے اس میں حق العباد پر غیر معمولی زور دیا گیا ہے۔ افسوس عام مسلمان اِس پر توجہ نہیں کرتے۔

مسلم پرسنل لا کا میں نے اب تک ذکر نہیں کیا۔ کیونکہ ہمارے علمائے کرام نے بمبئی میں جس زور ایمانی کا مظاہرہ کیا ہے اس کے آگے دم مارنے کی ہمت نہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ چار شادیاں اور طلاق کا غیر محدود حق دار اور خلع کا مشروط حق عرب کے حالات کے پیش نظر مناسب ہو تو ہو مگر ہندوستان میں اسلام کے عدل اور انصاف کو آوازیں دے رہا ہے۔ ہزاروں مجبور ورثا نہایت قابلِ رحم حالات میں زندگی گزار رہے ہیں اور لاکھوں عورتیں مرد کی بالادستی اور اسلام کی خاموشی پر نوحہ کناں ہیں۔ فقہی تاویلات کی ضرورت نہیں۔ اصلاً کیا ہو رہا ہے؟

ہم نے مذہب کی ایسی تاویلات کر رکھی ہیں کہ مذہب ہمارے راستے کی رکاوٹ بن گیا ہے، ہماری ترقی کی راہ میں حارج ہے۔ ہم نے بہت کم اس بات پر غور کیا ہے کہ مذہب کو وقت اور زمانے کا ساتھ دینا چاہیئے۔ اپنی تعلیمات کی نفی کر کے نہیں۔ اپنی حرکت پذیری اور اصل روح کو بروئے کار لا کر۔ ورنہ یہ دعویٰ غلط ہو جائے گا کہ اسلام ہر ملک اور ہر زمانے کے لئے ہے۔



رفعت سروش

قلعۂ سرخ کے دیوار و در بام تمام
پوچھتے ہیں کہ یہاں جشنِ حسیں کیسا ہے
اِن سے کہہ دو کہ شہیدوں کا لہو جاگ اُٹھا
اِن سے کہہ دو کہ یہاں روحِ ظفر زندہ ہے

قتل گاہوں سے اُٹھے جھوم کے سب شہزادے
کوئی حیدر، کوئی ٹیپو، کوئی لچھمی بائی
قافلے نکلے ہیں تاریخ کے اہراموں سے
دشت آباد ہیں تہذیب کے دیوانوں سے

سرنگوں پھانسی کے پھندے ہیں تو مقتل خاموش
موت شرمندہ ہے، ان سب کو فنا کر نہ سکی
ہیں امر بسمل و اشفاق، بھگت سنگھ، آزاد
پھر چراغاں ہوا، سرسبز ہوئی فصلِ مُراد

جشنِ جمہور ہے آداب شہیدوں کو کرو
آج بھی آتی ہے آواز یہ نیتا جی کی
ہے محبت جنھیں آزادی کے اس گلشن سے
بجلیاں دور رہیں امن کے اس گلشن سے

گاندھی و نہرو کا یہ دیش ہے سرگرم سفر
لغزشیں پاؤں میں اور پیاس لبوں پر ہے مگر
قافلے وقت کے بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں
کبھی دیوانے مصائب سے بھی گھبراتے ہیں

محفلِ شعر میں پھر شاہ ظفر یاد آئے
قلعۂ سُرخ کی یہ اندر سبھا زندہ باد
کیا خبر کب کوئی طوفان بجھا دے اس کو
شمع اردو کی یہ مدھم سی ضیا زندہ باد

پاکستان میں نئے انتخابات بقیہ صفحہ ۱۱

کے لئے ریفرینڈم کراسکتا ہے تو پاکستان کی سالمیت کے بارے میں یہ عدیم المثال فیصلہ کرنے کا حق اسمبلی کے ممبروں کی مختصر تعداد کو کیسے دیا جا سکتا ہے جنہیں مختلف حالات میں مختلف مقاصد کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔"

(نوائے وقت)

پاکستان جمہوری پارٹی (پی۔ ڈی۔ پی) کی مجلس عاملہ کے اجلاس سے تقریباً دو ہفتہ پہلے پارٹی کے نائب صدر نذرالرحمٰن نے لاہور میں ایک جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا "مستقل آئین نافذ ہو جانے کے بعد انتخابات کرائے جائیں اور جو نمائندے منتخب ہوں انھیں قومی خدمت کا موقعہ دیا جائے۔"

(امروز۔ ۲۴ جنوری ۱۹۷۳ء)

تحریک استقلال کے سربراہ (ریٹائرڈ) ائیر مارشل اصغر خان جو اپنی تقریروں میں مسلسل نئے انتخابات کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اس مطالبے کے حق میں کئی دلیلیں پیش کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنے مطالبے کا جواز پیش کرنے میں سب سے آگے ہیں۔ ۱۸ جنوری کو اپنی پریس کانفرنس میں انھوں نے کہا "سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کی سربراہی میں نگران حکومت قائم کی جائے اور از سر نو عام انتخابات کرائے جائیں۔ اگر مجوزہ انتخابات منصفانہ ہوئے اور کسی قسم کی دھاندلی نہ ہوئی تو پیپلز پارٹی قومی اسمبلی کی دس فیصد نشستیں بھی حاصل نہیں کر سکے گی۔ لوگوں کے خیالات کافی حد تک بدل گئے ہیں اور وہ حکمران پارٹی پر اعتماد کھو چکے ہیں اگر انتخابات نہ کرائے گئے تو حالات زیادہ خراب ہو جائیں گے اور عوام حکومت کے مظالم کے خلاف سڑکوں پر نکل آئیں گے جس کا نتیجہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ تاہم اس قسم کی صورت حال کے نتیجے میں تبدیلی ضرور ہوگی۔ مسٹر بھٹو چاہیں یا نہ چاہیں اس سال کے اندر اندر انتخابات ضرور ہوں گے۔" (امروز)

شیخوپورہ میں طلبا اور تحریک استقلال کے کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے اصغر خان نے کہا "مشرقی پاکستان میں بھی الیکشن ہو رہے ہیں اور اگر یہاں بھی ہو جائیں تو دونوں حصوں کے نومنتخب ممبر آپس میں اشتراک کر سکتے ہیں حکومت دونوں حصوں کو ملانا نہیں چاہتی۔ اگر ہمیں موقع نہ ملا تو یہ قوم کی بدقسمتی ہوگی۔ ایسی صورت میں قوم زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔" (امروز۔ ۲۷ جنوری)

پشاور کے چوک یادگار میں جلسۂ عام تقریر کرتے کرتے ہوئے اصغر خان نے یہ الزام لگایا "صدر بھٹو جنگی قیدیوں کے مسئلہ کو الیکشن سٹنٹ کے طور پر استعمال کرنا چاہتے ہیں اور ہمارے یہ قیدی اس وقت تک واپس نہیں آئیں گے جب تک نیا الیکشن نہیں ہوگا۔"

اصغر خان کی ایک اور تقریر کا ایک اقتباس عجیب بھی ہے اور ان کے انداز فکر کا ترجمان بھی ـــــ "اگر پاکستان میں انتخابات کرائے جائیں تو مسز گاندھی صدر بھٹو کو دوبارہ کامیاب کرانے کے لئے جنگی قیدیوں کو واپس بھیج دیں گی تاکہ صدر بھٹو لوگوں سے یہ کہہ سکیں کہ دیکھو میں جنگی قیدیوں کو واپس لایا ہوں۔ صدر قوم کا وکیل ہوتا ہے لیکن اب قوم کو اپنے وکیل پر بھروسہ نہیں اس لئے ہم انتخابات کے ذریعہ دوسرا صدر چن لیں گے۔"

(پشاور۔ ۳ فروری)

اور معزز شہریوں کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے اس مطالبے کا ذکر کیا "ہم انتخابات سے ڈرتے نہیں ہیں۔ ہم خود انتخابات کی پیداوار ہیں۔ حکومت انتخابات کرانے کے بارے میں فیصلہ کرے گی۔ اس فیصلہ میں اپوزیشن کو دخل دینے کا حق نہیں۔ دنیا میں کہیں بھی اقتدار سپریم کورٹ کو نہیں سونپا جاتا۔ سپریم کورٹ تو قانون چلانے کے لئے ہے۔ شکست خوردہ سیاست دانوں کو چاہیئے کہ وہ سیاسی سبق یاد رکھیں اور پانچ سال انتظار کریں۔ جب عوام کے مفادات اور قوم کا تقاضا ہوگا جب آئین تیار ہو جائے گا جب جنگی قیدی لوٹ آئیں گے، جب اسی طرح کے دوسرے اہم مسائل حل ہو جائیں گے۔ تب حکومت مناسب وقت پر انتخابات کرانے کا فیصلہ کرے گی۔"

(پاکستان ٹائمز۔ ۲۲ جنوری)

نئے انتخابات کے مطالبے کے زور شور میں نیشنل عوامی پارٹی تو چپ ہے، البتہ جمعیت العلمائے اسلام پیپلز پارٹی کی طرح اپنے اقتدار کے پانچ سال پورے کرنے کی خواہاں ہے۔ بدلے ہوئے حالات میں بلوچستان اور صوبہ سرحد کے گورنروں کی برطرفی اور بلوچستان کی منتخب حکومت کی معطلی کے بعد مولانا مفتی محمود نے احتجاجاً اپنی وزارت کا استعفےٰ پیش کر دیا ہے۔ لیکن صدر بھٹو کے ساتھ مولانا مفتی محمود کی بات چیت کے نتیجہ کے طور پر اس بات کا امکان ہے کہ جمعیت نیشنل عوامی پارٹی کا ساتھ اپنا اقتدار برقرار رکھنے کے لئے چھوڑ دے۔ پاکستان کے موجودہ حالات میں اصولوں کی آزمائش ہے۔

۲۰ جنوری کو پشاور میں اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے مولانا مفتی محمود نے جمعیت کے موقف کی اس طرح وضاحت کی تھی "آئینی سمجھوتے کے وقت نئے انتخابات کا کوئی ذکر نہ تھا اور نئے سرے سے انتخابات کرانے کی سب سے مخالفت کی تھی۔ بنگلہ دیش اور مغربی پاکستان کی صورت حال بہت مختلف ہے۔ بنگلہ دیش میں قومی اور صوبائی اسمبلی کا کام ایک ہے۔ کیونکہ وہ ایک یونٹ ہے جب کہ مغربی پاکستان میں چار صوبے ہیں اور صوبائی اسمبلیوں کا کام قومی اسمبلی سے بالکل مختلف ہے۔ دوئم لیگل فریم ورک آرڈر جس کے تحت ۱۹۷۰ء میں انتخابات ہوئے تھے، کے مطابق دستور ساز اسمبلی دستور بنانے کے بعد پانچ سال تک قومی اسمبلی کی حیثیت سے کام کرے گی۔ اسمبلی کے ممبروں کو نہ صرف آئین کی تیاری کے لئے بلکہ انھیں قانون ساز ادارے کے لئے بھی منتخب کیا گیا تھا۔"

مولانا مفتی نے تو انتخابات نہ کرانے کے لئے آئینی جواز پیش کیا مگر جمعیت کے ضلع ہزارہ سے قومی اسمبلی کے ممبر مولانا عبدالحکیم نے ملک کی اقتصادی مشکلات کا واسطہ دیا ہے۔ "ملک میں اقتصادی صورت حال کی بنا پر آئین کے بعد ہم نئے انتخابات کی مخالفت کریں گے کیونکہ نئے انتخابات سے ملک مزید اقتصادی مشکلات میں مبتلا ہو جائے گا میرے خیال میں نیپ بھی ملک میں نئے انتخابات کرانے کی حامی نہیں۔"

(پشاور۔ ۵ فروری)

اپوزیشن پارٹیوں کی طرف سے نئے انتخابات کا مطالبہ اس اندازے کے تحت کیا جا رہا ہے کہ پیپلز پارٹی کی ہر دلعزیزی میں کمی واقع ہوئی ہے۔ سندھ کے لسانی فسادات، مزدور تحریکوں اور بنگلہ دیش کے بارے میں

موقف کی وجہ سے رائے عامہ پیپلز پارٹی سے مایوس ہوئی ہے۔ ایسا حزب مخالف کے سیاسی رہنما اور ان کی جماعتوں کا خیال ہے۔ وہ تو یہاں تک سمجھتے ہیں کہ خود صدر بھٹو کی مقبولیت کا وہ عالم اب نہیں رہا کہ جو تھا۔ نئے انتخابات کا مطالبہ کرنے والوں کو یقین ہے کہ بنگلہ دیش جیسے دیگر مسائل پر بھی جذباتی طوفان کا سا ماحول پیدا کرکے اقتدار حاصل کرنے کے امکانات روشن ہوسکتے ہیں۔

اِدھر پیپلز پارٹی یہ سمجھتی ہے کہ اس نے عوام کو جمہوریت کے علاوہ انقلابی اصلاحات دیں۔ ایک مُردہ قوم میں نئی روح پھونکی، نیا اعتماد جگایا۔ آخر پیپلز پارٹی کی مقبولیت کم کیسے ہوسکتی ہے؟ صدر بھٹو پاکستان کی موجودہ سیاست کے وہ واحد رہنما ہیں کہ جن کا بدل پاکستانی عوام کو نظر نہیں آتا۔ ان کی مقبولیت دوسرے کسی بھی رہنما سے کہیں زیادہ ہے، لیکن بنگلہ دیش تسلیم کرنے کے مسئلہ پر عوام کے جذبات بھڑکانے کی اپوزیشن کی کوششوں سے وہ ڈرتے ہیں اسی لئے وہ فیصلہ کن اقدام کرنے سے جھجکتے ہیں لیکن یہ کہنا کہ ان کی مقبولیت اس حد تک کم ہوئی ہے کہ وہ انتخابات ہار جائیں گے غلط ہے۔ لیکن اپوزیشن برابر یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کررہی ہے کہ صدر بھٹو اب عوام میں مقبول نہیں رہے۔ سرحد کے وزیراعلیٰ ممتاز بھٹو نے پیپلز پارٹی کی طاقت اور عوامی مقبولیت کا دعویٰ کیا تو صوبہ کی اپوزیشن کے رہنما شاہ فریدالحق اسمبلی کے دو ممبران منیر احمد ارائیں اور مولانا محمد حسن حقانی نے ایک مشترکہ بیان میں انتخابات میں اپوزیشن کی شکست کے بارے میں ممتاز بھٹو کے دعووں کو خام خیالی پر مبنی قرار دیا۔ انھوں نے کہا "الیکشن کمیشن کو آزادانہ طور پر کام کرنے دیجئے پھر دیکھئے نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ اگر اپنی طاقت اور مقبولیت پر حکمراں جماعت کو اسقدر بھروسہ ہے تو وہ 'نئے پاکستان' میں نئے انتخابات کرانے سے گریزاں کیوں ہے؟"

(ڈان، کراچی۔ ۲ فروری)

یہ صحیح ہے کہ پیپلز پارٹی نئے انتخابات کرانے کے حق میں نہیں ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ابھی دو سال پہلے تو انتخابات ہوئے ہیں جس میں سے ایک سال یحییٰ شاہی کے آخری اندھیروں کی نذر ہوگیا۔ دوسرے اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ عوام کا رویہ اس کے تئیں بدلا ہے۔ عوام کو اب بھی صدر بھٹو کی قیادت اور پیپلز پارٹی پر بھروسہ ہے۔ یہ تو ہے کہنے کی بات، یوں ہی دل میں حکمراں پارٹی کو عوامی رویہ پر پورا بھروسہ نہیں۔ اسے خدشہ ہے کہ کسی بھی مسئلے پر اگر جذباتی نعرہ زنی زور پکڑ گئی تو عوام کا نیا فیصلہ پارٹی کے مفادات کے خلاف بھی ہوسکتا ہے کم سے کم اس کی اکثریت میں کمی ہوسکتی ہے۔ جب اتنی بھاری اکثریت کے ساتھ پانچ سال حکومت کرنے کا موقعہ اس کے سامنے ہے تو اسے کیوں چھوڑا جائے؟

اپوزیشن پارٹیوں کی طرف سے نئے انتخابات کے لئے دباؤ کا سلسلہ جاری ہے۔ ہفتہ وار 'اخبار جہاں' کے ۳۱ جنوری کے شمارے میں کراچی کی سیاسی سرگرمیوں کے بارے میں فرید احمد لکھتے ہیں "کراچی میں جمعیت العلمائے پاکستان، تحریک استقلال اور جماعت اسلامی کے کارکن اپنے سیاسی نظریات کے مطابق جلسے کرتے رہتے ہیں۔ گذشتہ ہفتے بھی کئی جلسے ہوئے۔ یہ سب جماعت اب انتخابات کرانے پر زور دے رہی ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ملک کے حالات اس طرف بھی جارہے ہیں کہ حکومت انتخابات بھی کرائے گی۔"

نئے انتخابات کی بحث محض جلسے جلوسوں تک ہی محدود نہیں رہی۔ اخبارات کے اداریوں اور خصوصی مضامین تک آپہنچی ہے۔ قومی پریس ٹرسٹ کے اخبارات حکمراں پارٹی کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کررہے ہیں۔ روزنامہ امروز کے ۲۰ جنوری کے اداریئے کا موضوع نئے انتخابات کی بحث ہے۔ "یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ مسودہ آئین پیش ہوتے ہی انتخابات کرانے کا مطالبہ ہونے لگا ہے۔ اب بعض ایسی جماعتیں بھی یہ مطالبہ پیش کرنے لگی ہیں جنھیں دستوری کمیٹی میں نمائندگی حاصل تھی اور وہ مسودہ آئین مرتب کرنے کی ذمہ داری قبول کرچکی تھیں۔ ہر شخص کے ذہن میں یہ سوال لازماً پیدا ہوگا کہ آخر اس مرحلے پر انتخابات کرانے کا مطالبہ کیوں کیا جارہا ہے؟ جواب واضح ہے۔ آئین منظور نہیں ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ انتخابات ضرور ۵ سال کے بعد ہی ہوں، مگر کوئی بھی جمہوریت پسند، مرکز اور صوبوں میں اکثریتی جماعتوں کے اس حق سے انکار نہیں کرسکتا کہ وہ پانچ سال تک اقتدار میں رہ سکتی ہیں۔ آئین کے نفاذ کے بعد یہ بحث چھیڑی جاسکتی ہے کہ انتخابات کب ہوں اور کیوں ہوں؟ اس سے پہلے یہ بحث چھیڑنے کا مقصد اس کے سوا کیا ہوسکتا ہے کہ عوام کی توجہ بٹ جائے وہ اور زیادہ ابہام کا شکار ہوجائیں اور ملک مستقل آئین سے محروم رہے۔"

مرکز کی اکثریتی جماعت کے پانچ سال تک برسرِ اقتدار رہنے کے حق کو کوئی خطرہ نہیں جب تک کہ نئے انتخابات کے بارے میں کوئی فیصلہ صدر بھٹو نہ کریں۔ مگر پاکستان کے چار میں سے دو صوبوں میں برسرِ اقتدار جماعتوں کا حق پاکستان کی سلامتی اور سالمیت کے نام پر ختم کیا جاچکا ہے۔ سازشی ماحول پاکستان کی سالمیت کو ایک بار پھر جکڑے ہوئے ہے۔

مرکزی وزرا خان عبدالقیوم خاں، اور حیات محمد خاں شیرپاؤ نے اپنی تمام تر کوششوں کو صوبہ سرحد اور بلوچستان کی حکومتوں کا تختہ اُلٹنے پر مرکوز کر رکھی تھیں۔ ان کے حمایتی بھی اس مقصد کے حصول کے لئے پیش پیش رہے ہیں۔ ۲۸ جنوری کو پاکستان مسلم لیگ کے سکریٹری اطلاعات خان غلام محمد خاں لونڈ خور نے لاہور میں ایک بیان میں کہا۔ "بلوچستان اور سرحد میں از سرِ نو انتخابات کرائے جائیں کیونکہ یہاں کی حکمران پارٹیوں کو معمولی اکثریت حاصل ہے جو انھوں نے بھارتی پیسے سے صوبائی اسمبلی کے ممبروں کو خرید کر حاصل کی ہے۔" (نوائے وقت)

کچھ ایسا ہی انداز پاکستان مسلم لیگ (قیوم گروپ) کے سینئر نائب صدر میر نبی بخش زہری کا لاہور میں یکم فروری کو ان کی پریس کانفرنس میں رہا۔ ان کے ساتھ سردار اکبر بگٹی بھی تھے جنھیں صدر بھٹو نے حال ہی میں بلوچستان کا نیا گورنر مقرر کیا ہے۔ اس پریس کانفرنس میں انھوں نے کہا "بلوچستان اور سرحد کے گورنروں کو ان کے عہدوں سے معطل کیا جائے نیشنل عوامی پارٹی پر پابندی لگائی جائے اور ولی خاں، گورنر بزنجو اور عطاؤاللہ خاں مینگل پر ملک

دشمن سرگرمیوں میں حصہ لینے کے الزام میں مقدمہ چلایا جائے اور تین ماہ کے عرصہ میں بلوچستان اور صوبہ سرحد میں نئے انتخابات کرائے جائیں"۔

اگر صدر بھٹو اور عبدالقیوم خاں صوبہ سرحد اور بلوچستان میں اپنی مرضی کی حکومتیں قائم کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے تو ان دو صوبوں میں دوبارہ انتخابات کرانے ہوں گے۔ کیونکہ ایسا کئے بغیر جمہوری نظام کی صورت ہی مسخ ہوجائے گی۔ اگر ان دو صوبوں میں نئے انتخابات کی نوبت آئے تو اپوزیشن پارٹیاں مکمل عام انتخابات کے لئے اپنی مہم تیز تر کر دیں گی۔

صدر بھٹو اور ان کی پیپلز پارٹی نئے انتخابات کو ٹالنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ اس مقصد کے لئے پیش کئے جانے والے دلائل کا عکس قومی پریس ٹرسٹ کے اخبار پاکستان ٹائمز کے پہلی فروری کے اداریئے میں ہے۔ اخبار کی رائے میں دوبارہ انتخابات کرانے سے صوبوں کے درمیان نفرت بڑھے گی "گزشتہ انتخابات کے بعد اگر اس قدر جلد دوبارہ عام انتخابات کرائے جائیں گے تو تمام جذباتی مسئلے، نفرت اور الزام تراشیاں کا زور ابھر آئے گا اور اس سے یقیناً تعمیر نو کے کاموں میں رکاوٹ پیدا ہوگی جو مالی اور نفسیاتی نقصان ہمیں گزشتہ المیہ کے دوران ہوا اسے پورا کرنے کی کوششیں رک جائیں گی۔ نئے انتخابات پر کروڑوں روپے خرچ ہوں گے۔ اس مرحلے پر جب کہ مسائل کا جال ہمیں جکڑے ہوئے ہے۔ کیا ہم ایک غیر ضروری سیاسی تجربے پر اتنی بڑی رقم خرچ کرنے کی حیثیت میں ہیں"۔

پاکستان ٹائمز کے اسی شمارے میں پولیٹیشن نے اپنی سیاسی ڈائری میں اپوزیشن جماعتوں کی دلیلوں کا جواب دینے کی کوشش کی ہے جو وہ نئے عام انتخابات کے حق میں پیش کرتے آئے ہیں۔ یہ سیاسی ڈائری بھی سرکاری نقطہ نظر کی ترجمانی کرتی ہے۔ پولیٹیشن لکھتے ہیں "نئے انتخابات کا مطالبہ کرنے میں پیش پیش زیادہ تر وہی جماعتیں ہیں جنہیں گزشتہ انتخابات میں بھاری شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ان میں سے اکثر کے قومی اسمبلی میں ایک یا دو ممبر ہی ہیں اس مطالبے سے ان کے مقاصد عیاں ہیں کہ وہ اپنی پوزیشن بہتر بنانے کے پھیر میں ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ سب سے زیادہ شور اصغر خاں مچا رہے ہیں جنہیں کہ ۷۰ء کے انتخابات میں شرمناک شکست ہوئی اور قومی اسمبلی میں ان کا ایک بھی نمائندہ نہ پہنچ سکا۔ اصغر خاں صاحب بڑے اطمینان سے یہ حقیقت فراموش کئے بیٹھے ہیں کہ جس لیگل فریم ورک آرڈر کے تحت ۱۹۷۰ء کے انتخابات ہوئے تھے اس کی رو سے آئین ساز اسمبلی آئین بن جانے کے پانچ سال بعد تک قومی اسمبلی کی حیثیت سے کام کرے گی۔ اگر موجودہ اسمبلی کا انتخاب محض آئین سازی کے لئے کیا گیا ہوتا تو انتخابات کرانے میں کوئی مضائقہ نہ تھا۔

جیسا کہ مفتی محمود صاحب وضاحت کرچکے ہیں بنگلہ دیش کے حالات کا موازنہ پاکستان کے حالات کے ساتھ نہیں کیا جاسکتا۔ اس ملک کے لئے ۷۰ء کے انتخابات کے نتائج کا جواز ختم نہیں ہوا، دوبارہ انتخابات کرانے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم ڈھاکہ کی حکومت کی آئینی حیثیت تسلیم کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ اصغر خاں جو یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ ڈھاکہ کے ساتھ بات چیت کے لئے نئی حکومت کی ضرورت ہے بے معنی اور لغو ہے۔ ڈھاکہ کے ساتھ اپنے تعلقات کی بحالی کے لئے ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں صحیح بنیاد بن سکتے ہیں۔ نئے انتخابات کرانے سے یہ بنیاد بھی ختم ہوجائے گی۔

نئے انتخابات کی بحث میں ان جماعتوں کے علاوہ کہ جن کے مفادات متاثر ہوتے ہیں چند ایسے لوگ بھی ہیں کہ جن کا اس مسئلے میں کوئی ذاتی یا جماعتی مفاد نہیں ہے۔ ایسے لوگوں میں ممتاز صحافی حبیب الرحمٰن کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ حبیب الرحمٰن صاحب راولپنڈی سے اخبار جہاں کے لئے "مرکزی دارالحکومت سے خط" لکھا کرتے ہیں۔ ۲۴ جنوری کے شمارے میں وہ لکھتے ہیں ـــ

"بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے بعد عام انتخابات کرا کے سے جناب بھٹو کو ساری قوم سے اس موقف پر دائمی مہر تصدیق ثبت کروانے میں مدد ملے گی جو انھوں نے پچھلے انتخابات کے بعد اور عہدہ صدارت سنبھالنے سے پہلے عوامی لیگ کے چھ نکات کے بارے میں اختیار فرمایا تھا۔ نئے انتخابات کے ذریعے وہ قومی سطح پر یہ سرٹیفیکیٹ بھی حاصل کر سکیں گے کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے، معاہدۂ شملہ پر دستخط کرنے اور جموں و کشمیر میں نئی کنٹرول لائن کا تعین کرنے میں وہ حق بجانب تھے۔

نئے انتخابات کی تجویز کی تائید ان تمام لوگوں کو زیادہ شد و مد کے ساتھ کرنی چاہیئے جو اپنی جگہ یہ سمجھتے ہیں کہ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت العلمائے اسلام کو اب عوام کی اکثریت کی تائید حاصل نہیں، کیونکہ نئے انتخابات کے ذریعے ہی یہ فیصلہ ہوسکتا ہے کہ نئے حالات میں کون کس کی نمائندگی کرتا ہے۔ اگر عام انتخابات کے بغیر جوڑ توڑ یا تشدد کے ذریعہ صوبہ سرحد اور بلوچستان کی موجودہ وزارتوں کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی تو مجھے اندیشہ ہے کہ اس کا نتیجہ ایک اور خانہ جنگی کے آغاز کی صورت میں رونما ہوگا"۔

جس اندیشے کا ذکر حبیب الرحمٰن صاحب نے اپنی تحریر میں کیا ہے اس کا ایک پہلو تو سامنے آچکا ہے بلوچستان کی وزارت کو ختم کیا جاچکا ہے۔ صوبہ سرحد کے لئے صدر بھٹو خود جوڑ توڑ میں مصروف ہیں۔ ان حالات میں نئے انتخابات کو زیادہ دیر نہیں ٹالا جاسکتا۔ البتہ ایک راستہ ہے۔ اگر آئین کی تکمیل اور نفاذ میں مزید تاخیر ممکن کی جاسکے تو یہ جواز پیش کیا جاسکتا ہے کہ موجودہ اسمبلی کا جب بنیادی کام ہی ختم نہیں کیا جاسکا تو نئے انتخابات کس لئے اور کس بنا پر کئے جائیں۔ نئے انتخابات کی بنیاد نیا آئین ہی ہوسکتا ہے۔ پاکستان کی سیاست کے غیر یقینی مزاج کا اثر آئین کی تکمیل پر پڑ رہا ہے۔ آئین پاکستانی عوام کے لئے سراب ہو کر رہ گیا ہے۔ کسی بھی قوم نے اپنے آئین کے لئے اس قدر صحرا نوردی نہیں کی۔ یہ سفر ختم ہوا اور نئے انتخابات کی نوبت آئی، یہ تو طے ہے۔ عین ممکن ہے کہ اصغر خاں کی پیش گوئی سچ ہو کر رہے۔ "کوئی چاہے یا نہ چاہے لیکن اس ملک میں اسی سال انتخابات ضرور ہوں گے"۔



م۔ خ۔ شاذلی

ہندی ادب میں مسلمانوں کا حصہ

م۔ خ۔ شاذلی

آج بدقسمتی سے ہمارے ملک میں لسانی بنیادوں پر تباہ کن فسادات، حکومتی اور تعلیمی سطح پر طلبا اور اہل علم حضرات میں لسانی تعصب اور مزید برآں علاقہ واریت نے جو ماحول پیدا کر دیا ہے۔ اس کے پیشِ نظر اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ جن زبانوں کے تعلق سے عوام میں محدودیت کا تصور پیدا ہو رہا ہے ان کی تاریخ کو اس انداز میں پیش کیا جائے کہ مختلف مذہبی طبقات میں یہ تصور پیدا ہو کہ ہمارے ملک کی تمام ہی زبانیں کسی ایک فرقہ یا ایک طبقہ کی پیدا کردہ نہیں ہیں۔ بلکہ ان کی تشکیل و ترقی میں تمام ہی فرقوں اور مذہبی طبقات نے برابر کا حصہ ادا کیا ہے۔ تاکہ لسانی تعصب کی جگہ ایک دوسرے کی زبانوں کے ساتھ رواداری اور محبت کا شعور بیدار ہو۔ چنانچہ جس طرح اردو کو بھارت کے تمام ہی لوگوں نے خلوص اور محبت سے اپنایا اور اس کی تشکیل و ترقی میں اپنا خون پسینہ ایک کیا۔ اسی طرح ہندی بھی ہمارے ملک کی ایک نہایت اہم زبان ہے اور اس کی ترقی و ترویج میں بھی مختلف فرقوں اور طبقوں نے حصہ لیا ہے۔

ان مختصر سطور میں ہندی زبان اور ادب کی مفصل تاریخ کو پیش کرنا ناممکن نہیں تو بے حد دشوار ضرور ہے۔ قدرے موضوع سے مختلف بھی۔ البتہ اختصار کے ساتھ اس موضوع کی بنیادی باتیں سامنے لائی جا رہی ہیں جس سے اس بات کا اندازہ ہو جائے کہ ہندی کی ابتدا، تشکیل اور ترقی ہمارے ملک میں کس انداز سے ہوئی؟ اور جس سے یہ بھی اندازہ ہو جائے گا کہ ہندی ادب کی تاریخ کے ہر مرحلے پر مسلمانوں نے اس کو بڑھاوا دینے میں برابر کا حصہ ادا کیا ہے۔ اور یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ ہندوستان کی کوئی سی زبان کسی ایک فرقہ کی ملکیت نہیں ہے۔ جو اس پر کلی طور پر اپنا قبضہ ظاہر کر سکے۔

ہندوستان میں زبانوں کی تعمیر و تشکیل کا زمانہ دراصل نویں صدی سے شروع ہوتا ہے اور علم لسانیات کے ماہرین کا خیال ہے کہ زبانوں کی تعمیر و تشکیل میں ملکوں کے سیاسی حالات اور انقلابات کا بڑا دخل ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں بھی مسلمان بادشاہوں کی آمد سے پہلے مختلف راجپوت راجاؤں کی حکومتیں تھیں۔ جو آئے دن ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتی تھیں۔ البتہ مسلمانوں کی آمد اور ان کے حملوں کے وقت یہ راجا متحد ہو جاتے تھے اور آخر کار جب مسلمان حملہ آوروں کے پیر جم گئے اور انھوں نے مستقل حکومتیں قائم کر لیں تو اکثر و بیشتر ہندو راجا مطیع ہو گئے۔ اور مسلمانوں نے بھی اپنی حکومت کے استحکام کی خاطر ہندو راجاؤں سے اپنے تعلقات مختلف انداز میں استوار کرنا شروع کر دیا۔ دراصل آپسی میل جول سے زبانوں کی تعمیر و تشکیل کا یہی زمانہ تھا۔

یہاں ایک بات ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ جس ہندی کا یہاں تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ وہ کونسی ہندی ہے۔ کیونکہ اس معاملہ میں بھی اکثر اختلاف رہا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ ہندی سے مراد وہ تمام زبانیں ہیں جو شمالی ہند میں سندھ اور پنجاب سے لے کر بنگال تک بولی جاتی تھیں۔ لیکن ماہر لسانیات جارج گریرسن کا کہنا ہے کہ ہندی دراصل راجستھانی، پچھمی ہندی، پوربی ہندی اور بہاری زبانوں کا مرکب ہے۔ یہ موقعہ ان تمام زبانوں کی تفصیلات کا نہیں ہے۔ یہ بات صاف ہے کہ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مختلف پراکرتیں استعمال ہوتی تھیں۔ جن میں سب سے عام بھاٹی زبان تھی۔ راجاؤں کے درباروں میں ان کی تعریف و توصیف کے لئے بھاٹ مقرر ہوتے تھے۔ اور وہ اس زبان میں قصیدہ خوانی کیا کرتے تھے جو منظوم ہوتی تھی۔ ان قصیدوں میں راجاؤں کی بہادری ظاہر کرنے کے لئے واقعاتِ جنگ بھی بڑی تفصیل سے بیان کئے جاتے تھے۔ چنانچہ اس حیثیت کے نمائندہ شعراء چند بردائی تھے۔ جو پرتھوی راج کے دربار سے متعلق تھے اور "پرتھوی راج راسو" ان کا زبردست ادبی کارنامہ ہے۔ اسی طرح جگ نائک، سارنگ دھر، وغیرہ بھی ممتاز شعرا شمار کئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد مذہبی دور شروع ہوتا ہے جس میں کرشن جی، اور رام چندر جی کی محبت میں شاعری کی گئی۔

مسلمانوں کی تہذیب و تمدن سے قریب ہونے پر اسلام کے اثرات بھی نمایاں طور پر پڑے۔ اور کبیر

جیسے شاعر نے نہ صرف شاعری میں نام پیدا کیا بلکہ فکری اعتبار سے ایک زبردست مذہبی فرقہ کو جنم بھی دیا۔ ان ہنگامی حالات ہی میں دراصل آپسی میل جول اور قریبی تعلقات کی بنا پر ایک زبان جنم لے رہی تھی مختلف پراکرتوں کے الفاظ اس میں شامل ہو رہے تھے۔ تاکہ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھا سکے۔ یوں مغل دور نے بھی شعرا اور ادبار کی سرپرستی میں نمایاں حصہ لیا۔ اور ہندوستان کی زبانوں کی تعمیر اور تشکیل میں مغل حکمرانوں کا ایک ناقابلِ فراموش رول ہے جو ہمیشہ تاریخ میں زندہ رہے گا۔ اگر یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ دراصل ہندی زبان کا درخشاں زمانہ مغل دور ہی ہے۔ تلسی داس، سور داس جیسے عظیم شعراء اسی دور میں ہوئے۔ سکھوں کا مشہور و معروف گرنتھ صاحب بھی اسی دور میں تکمیل پایا۔

مغلوں کے زوال کے ساتھ ہی ساتھ ہندی کا بھی زوال شروع ہوا۔ لیکن انیسویں صدی میں فورٹ ولیم کالج کے قیام اور انگریزی ادب کے اثر سے پھر سے ہندی کو عروج حاصل ہوا۔ یہ ہندی ادب کا ایک نہایت مختصر تاریخی خاکہ ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس تمام عرصہ میں ہندی زبان کو بنانے اور سنوارنے میں مسلمانوں نے کیا حصہ لیا ہے۔

یوں تو ہندی کے سب سے پہلے شاعر کی حیثیت سے نامدیو کو پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن بعض ناقدین کو اس سے اختلاف ہے۔ البتہ امیر خسرو کو کھڑی بولی (ابتدائی ہندی) کا پہلا شاعر تسلیم کرنے میں تمام ناقدین متفق ہیں۔ امیر خسرو نے عربی اور فارسی الفاظ کو شامل کرکے دراصل ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد رکھی

چونکہ امیر خسرو کا ہندی کا مشہور شاعر ہونا عام ہے۔ اس لئے اس وقت امیر خسرو کا اسی قدر تذکرہ کافی سمجھا جائے گا۔ اس موقعہ پر بہتر یہ ہے کہ ہم ادوار کے اعتبار سے جائزہ لیں تو ہمیں ایک اور بات کا بھی اندازہ ہو جائے گا کہ دراصل مسلمانوں نے نہ صرف یہ کہ زبان کی تعمیر و تشکیل میں حصہ لیا ہے بلکہ بڑی حد تک ہندوستانی روایات کو اپنایا اور ہندوؤں کی تمام تر تحریکات سے بے حد قریب رہے۔ اسلامی فلسفہ اور ہندو فلسفہ کو سامنے رکھ کر مسلمان صوفیائے کرام نے ہندو اور مسلمانوں کو اور زیادہ ایک دوسرے کے قریب کر دیا۔

ہندی ادب کو دراصل عام طور پر چار ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

ویر گاتھا کال

یہ دور ۹۹۴ء سے تقریباً ۱۳۱۹ء تک باقی رہا۔ ویر کے معنی بہادر اور گاتھا کے معنی تاریخ کے ہوتے ہیں۔ اس لئے اس دور میں بہادروں کی تاریخ بیان کرنا ہی ادب تھا۔ راجپوت راجاؤں کے درباروں میں بھاٹوں کا وجود زمانۂ قدیم سے ملتا ہے جن کا کام تھا کہ مؤثر انداز میں اپنے آقاؤں کی بہادری کے افسانے مبالغے سے سنائیں۔ اس دور کی شاعری زیادہ تر شجاعت اور بہادری کے نغموں سے لبریز ہے۔

دراصل یہی وہ زمانہ تھا کہ اپ بھرنش سے ہندی زبان وجود میں آ رہی تھی۔ پراکرتیں ایک دوسرے سے مل رہی تھیں۔ اسی دور میں دو طرح کی نظمیں عام طور پر کہی جاتی تھیں۔ پربندھ کاوئے (مثنوی) प्रबन्ध काव्य اور گیت کاوئے (نغمات موسیقی) गीत काव्य۔ اس دور کے مشہور شعراء چندر بردائی، جگنائک کیدار بھٹ وغیرہ گزرے ہیں۔ بعض شعراء نے گیت کاوئے کو بھی بڑا عروج دیا۔ اور عام طور پر شعراء اس طرف توجہ رہے لیکن بھوشن اور لال کوی اپنی روش پر مستحکم رہے۔

ہندوؤں کے ساتھ ساتھ مسلمان بھی بعض درباروں سے متعلق رہے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے بھی مقامی پراکرتوں کے الفاظ اور محاورے استعمال کرکے اسی انداز کی شاعری کی۔ جن میں مسعود، قطب علی، اکرم اور فیض نے بڑا مقام حاصل کیا۔ ہندی تذکرہ نویسوں نے ان شعراء کا بڑی اہمیت سے ذکر کیا ہے۔ لیکن انھوں نے خود ہی افسوس ظاہر کیا کہ ان شعرا کا کلام مختلف جنگوں اور سیاسی ہنگاموں کی نذر ہو گیا۔ البتہ میواڑ کے راجہ کے یہاں سولہویں صدی کی لکھی ہوئی کتاب "کہمان رائے" موجود ہے جو نویں صدی میں لکھی گئی۔ "کہمانی راسو" کی نقل بتائی جاتی ہے۔ اس طرح اجمیر کے راجہ بیسل دیو کے پاس بھی ایک تصنیف "بیسل دیو راسا" ملتی ہے۔ البتہ ہندی زبان کی تاریخ کے لحاظ سے پشپا کوی کی کتاب کو اہمیت دی جاتی ہے۔ لیکن بعض ناقدین اس کتاب کے وجود سے ہی انکار کرتے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ پشپا کوی کی کتاب میں یا جو کتاب پشپا کوی کے نام سے موسوم کی جاتی ہے اس میں ان شعراء کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔

چونکہ اس دور میں بھاٹوں کے کلام کو ضبطِ تحریر میں لانے کا رواج عام نہیں تھا۔ اس لئے بھی ان شعراء کا کلام دستیاب نہ ہو سکا۔ بھاٹوں کے علاوہ دیگر شعراء نے فلسفۂ ویدانت، اخلاقیات، مزاح اور علمِ نجوم وغیرہ پر قابلِ قدر تخلیقات پیش کی ہیں۔ جن میں مبارک علی بلگرامی کا نام خصوصیت سے لیا جا سکتا ہے۔ ان کا زمانہ ۱۵۸۳ء کا ہے جس وقت تک ہندی زبان برج بھاشا کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ چنانچہ مبارک علی بلگرامی نے برج بھاشا میں سینکڑوں چھوٹی چھوٹی نظمیں کہیں۔ جو اب تک ہندی ادب میں رائج ہیں اور ممتاز مقام رکھتی ہیں اور شمالی ہند میں اکثر و بیشتر عوام کو ازبر ہیں۔

اس دور کے دوسرے نامور مسلمان شاعر نور محمد گزرے ہیں۔ جو ہندی ادب کی تاریخ میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ان کی ایک طویل نظم "اندراوتی" ہندی ادب کا قابلِ قدر سرمایہ ہے۔ نور محمد کا زمانہ اٹھارہویں صدی کے نصف کا زمانہ ہے۔ اس وقت ہندی زبان کی ہئیت کچھ اس طرح سے تھی جو نور محمد کے کلام سے ظاہر ہے۔

سب کا ہودھن آگنیا مانا   پھلواری دِس کنیہ پیا نا
اندراوت رتھ اوپر چڑھی   دونوں بڑھی روپ کو بڑھی
چلی مان سو برہمن باری   بنیائن نائن پٹ باری
چلی سناری کنچن برنی   رجپوتی کھتری من ہرنی
لونی دھن حلوائن بھلی   اُدھر مٹھائی بانٹت چلی
چلی سہیلی سندری، اندراوتی کے سنگ
گیت بسنتی گاوتیں، پہیرے دُکل سرنگ

بھگتی کال

یہ دور ۱۳۱۹ء سے ۱۶۴۴ء تک شمار کیا جا سکتا

ہے۔ خانہ جنگیاں اور بیرونی حملہ آوروں سے بھی جنگیں اب بند ہو چکی تھی۔ سلطان علاؤالدین کے فتوحات کے بعد ایک عجیب بے چینی کا دور ہے۔ جنگ وجدال بند ہو جانے سے شجاعت و بہادری کے نغمے بھی خاموش ہو گئے۔ علاوہ ازیں مسلمان حکومتوں کے استحکام نے ہندو راجاؤں کو بجائے مقابلے کے اپنے مذہب اور کلچر کے تحفظ کی طرف متوجہ کر دیا بہرحال قلبی سکون کی خاطر اس دور کے شعراء نے تصوف کے نغمے سنا کر ان بے چین دلوں کو تسکین دی۔ اور اس طرح بھگتی کے یہ گیت تقریباً سوا تین سو برس تک ہمارے ملک میں گونجتے رہے۔

یہ دور ہمارے ملک میں مذہبی تحریکات کا دور ہے۔ مختلف مذہبی فرقے اسی دور کی پیداوار ہیں۔ اس دور کے شعراء کو البتہ دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اول وہ جو خدا کے مادّی وجود کے قائل نہ تھے نرگنتر کہلائے اور وہ جو خدا کی مادّی شکل میں پرستش کرتے تھے سگنتر کہلائے۔ البتہ نرگنتر شعرا کا عروج تھا۔ اس میں بھی بعض گیان آشری (عشق حقیقی) اور بعض پریم آشری (عشق مجازی) رہے۔ پریم آشریوں نے عشق و محبت کا پیغام اپنی شاعری کے ذریعہ دے کر عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی کی طرف متوجہ کیا۔

اسی دور میں رامانند جیسے عظیم مذہبی رہنما گزرے۔ رامانند جی نے اپنی تحریک کو عام کرنے کے لئے سنسکرت کے بجائے ہندی کو استعمال کیا۔ دراصل ہندی زبان کی ترقی و ترویج میں رامانند جی کی تحریک کو بڑا دخل ہے۔

اسی دور میں دو زبردست تحریکیں اٹھیں۔ رامائی مسلک اور کرشنائی مسلک۔ رامائی مسلک کے نمائندہ رہنما رامانند جی ہیں جن کے شاگرد کبیر تھے۔ لیکن بعد میں کبیر نے خود اپنے نظریات کے لئے ایک علیحدہ تحریک شروع کر دی۔ کبیر کی تعلیمات پر اسلام کا نمایاں اثر ملتا ہے۔ جو بت پرستی کے سخت خلاف رہے۔ رامانند جی کی تحریک ہی کے زیر اثر گرو ارجن کے سکھوں کا آدی گرنتھ لکھا۔ اور جو اس زمانہ کے ادب کا بہترین نمونہ ہے۔

اس دور میں ہندی شاعری میں تصوف کا عروج تھا جس کے لئے مسلمان صوفی شعراء کی خدمات بے حد قابلِ قدر ہیں۔ اس لئے بھی کہ تصوف کے معاملہ میں مسلمان شعراء جو عربی اور فارسی سے اچھی طرح واقف تھے، ہندو شعراء سے ہمیشہ پیش پیش رہے۔ ان کی شاعری میں نغمگی، عشق و محبت، اخلاص اور اثر پذیری بدرجہ اتم موجود تھی۔ پریم آشری کے مشہور شعراء قطبن، منجھن، ملک محمد جائسی، عثمان، قاسم، نور محمد اور فاضل شاہ، ہندی ادب میں اونچا مقام رکھتے ہیں۔

رامائی تحریک کے دوش بدوش کرشنائی تحریک بھی چلتی رہی۔ جس کے بانی ولبھ آچاریہ تھے۔ جن کے آٹھ شاگردوں نے اشٹ چھاپ کے نام سے ہندی ادب میں بڑا اضافہ کیا۔ کرشن اور ان کی گوپیوں کے حالات پر نہایت عارفانہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس تحریک کے تحت میرا بائی، برندابن داس جیسے مشہور فنکاروں کے ساتھ ہی البیلی علی کا نام بھی نہیں بھلایا جا سکتا ہے۔ ہندی تذکرہ نویسوں نے البیلی علی کا ذکر بڑی اہمیت کے ساتھ کیا ہے۔ البیلی علی نے برج بھاشا میں کرشن اور ان کی گوپیوں کی مدح سرائی میں بڑے سرمستانہ نغمے گائے ہیں۔ اسی تحریک کے تحت ہندی شاعری میں تاج نے بھی ایک ممتاز مقام حاصل کیا۔ یہ مسلمان خاتون تھیں کرشن کی پرستار تھیں۔ اور کرشن جی کی تعریف میں نہایت عمدہ اشعار کہے ہیں۔ اس کی تفصیلات میں جانے کا یہ موقعہ نہیں ہے کہ تاج کرشن جی سے کیوں متاثر تھیں۔ البتہ یہاں یہ بات نہیں بھلائی جا سکتی ہے کہ تاج نے ہندی شاعری میں فارسی اور عربی کے الفاظ کی آمیزش کر کے ہندی کو اس قدر نکھارا اور سنوار دیا کہ وہ برج بھاشا کے کھردرے پن سے آزاد ہو گئی۔ تاج کہتی ہیں ؎

سنو دل جانی میرے دل کی کہانی تم
دست ہی لکھانی بدنامی بھی سہونگی میں
دیو پوجا ٹھانی میں نماج ہی بھلانی
تجے کلمہ قرآنی سارے گنن گئی بھی میں
سانولا سلونا سرتاج سر کلّے دیئے
ترے مینہہ داگ میں نداگھ ہوئے دھونگی میں
نند کے کمار کربان تیری صورت پر
ہوں تو مغلانی ہندوانی ہوئے رہونگی میں

یہاں سے ہندی زبان صاف، شیریں، اور دلکش ہوتی چلی گئی۔ رس خان بھی اس تحریک سے متاثر تھے۔ چنانچہ ان کے کلام میں برج بھاشا اپنے اصل روپ میں دکھائی دیتی ہے ؎

مانش ہیں تو وہی رس خان بسیں
برج گوکل گاؤں کے دوران
جو پشو ہیں تو کہہ بس میرے چریں
نت نند کی دھنیں منجھارن
ہیں تو وہی گری کو جو دھریں
کر چھتر پرندر کا رن
جو کھگ ہیں تو بسیرو کریں
ملی کلندی کل کدمب کی ڈارن

رامائی تحریک اور کرشنائی تحریک کے علاوہ اس دور میں سینکڑوں مذہبی تحریکات اٹھیں۔ مثلاً کبیر پنتھی، سِکھ پنتھی، دادو پنتھ وغیرہ۔ اور ہر تحریک میں اعلیٰ پایہ کے شعراء رہے ہیں۔ دراصل ان تحریکات کی وجہ سے ہندی زبان اور شاعری کی ترقی اور ترویج میں جو مدد حاصل رہی وہ ہندی کو کسی دور میں نہ مل سکی خصوصاً اس دور میں ہندی زبان، عربی، فارسی، سنسکرت اور بعض پراکرتوں سے بھی متاثر ہوتی رہی۔ لیکن چونکہ یہ تمام تحریکات عوام تک پہنچنا چاہتی تھیں۔ اس لئے انھیں ہندی زبان کو بے حد سادہ اور اس علاقہ کی پراکرت سے قریب رکھنا پڑا۔ دراصل یہ دور ہندی کی تاریخ میں بے حد اہمیت کا حامل ہے۔

مذہبی تحریکات اور گروہوں کے ہنگاموں میں مسلمان صوفی شعراء کا ایک قابل قدر حصہ بھی ہندی زبان میں تصوف، عشق حقیقی، اخلاقیات اور انسان دوستی کا پیغام دیتا رہا۔ مسلمان صوفی شعراء میں ۱۶۶۸ء تا ۱۷۲۳ء میں باری صاحب دہلی کے ایک مشہور بزرگ گزرے ہیں۔ ہندی میں بے شمار نظمیں کہیں، جو عشق حقیقی اور تصوف کے نغمات سے پُر ہیں۔ کیشو صاحب اور ملا صاحب، باری صاحب ہی کے شاگرد رہے ہیں۔ اسی طرح ملا صاحب کے شاگرد ہلال صاحب اور بھیکا صاحب نے ہندی شاعری میں قابلِ قدر

اضافہ کیا ہے۔ انہی کے ساتھ اٹھارہویں صدی کے اوّل نصف میں دریا صاحب بہاری، اور دریا صاحب مارواڑی دو مسلمان ہندی مصنفین گزرے ہیں جن کی یادگاریں ہندی ادب میں باقی ہیں۔

اس دور کے سب سے مشہور اور ممتاز مسلمان ہندی شاعر ملک محمد جائسی گزرے ہیں۔ جائس کے رہنے والے تھے۔ امیٹھی میں انتقال ہوا اور وہیں ان کا مزار ہے۔ ان کی شاہکار نظم "پدماوت" ہندی ادب کی لافانی یادگار ہے۔ اس نظم میں رانی پدمنی اور علاؤالدین کے چتوڑ پر حملے، رتن سین اور دیو پالی کی جنگ اور پدمنی کا رتن سین کی چتا پر ستی ہو جانے کے تمام واقعات بڑی تفصیل سے اور دلگداز انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ کمال یہ ہے کہ اس تمام تاریخی حادثے کے آخر میں ملک محمد جائسی نے اس قصّہ کو صوفیانہ رنگ دیتے ہوئے چتوڑ کو جسم اور رتن سین کو روح، پدمنی کو عقل اور علاؤالدین کو وسوسہ قرار دے کر ایک عجیب کیفیت پیدا کر دی ہے۔ زبان اسی دور کی ہے کہیں کہیں فارسی الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔ یہ پہلی نظم ہے جو فارسی رسم الخط میں بھی لکھی گئی۔

سرور رھیا گھٹت نت جائی　　ٹک ٹک ہوئی کے بہرائی
بہرت ہیا کرہو پیو ٹیکا　　ریٹھی دو گرا میرو ھو ایکا
کنول جو بگسا مانسر　　بن جل گئے سکھائی
ابہوں بیل پھری پلہیئے　　جو پیو سینچے آئی

(پدماوت)

مفہوم یہ ہے کہ ناگ متی ہجر کے عالم میں بیان کرتی ہے کہ میرے دل کا تالاب روز بروز گھٹتا جاتا ہے اور تالاب کی سطح چپے چپے ہو کر ٹوٹتی ہے۔ اے میرے محبوب! میری اس حالت پر رحم کر اور جس طرح سے پہلی بارش تالاب کی سطح کو درست کر دیتی ہے۔ تو بھی اپنے جمال سے میرے دل کو درست کر دے۔ اس تالاب میں تیری محبت کا جو کنول پھولا تھا وہ پانی نہ ہونے کی وجہ سے خشک ہو گیا۔ اے محبوب! ابھی یہ ممکن ہے کہ یہ بیل اگر تو اسے اپنی محبت کے پانی سے سینچے تو ہری ہو جائے۔

دراصل ملک محمد جائسی کو زبان پر بے پناہ قدرت حاصل ہونے کے علاوہ ہندو مذہب، رسومات اور مذہبی عقائد سے بھی گہری واقفیت تھی۔ اسی عہد کے دوسرے مشہور مسلمان ہندی شاعر عثمان گزرے ہیں۔ عثمان کی مشہور و معروف تصنیف "چتراولی" ہندی ادب میں اونچا مقام رکھتی ہے۔

عثمان نے اس طرح کی زبان استعمال کی ہے ؎

چاند نہ سرور پاوٹی روپ نہ پوجے بھان
اب سنو تن من کان دیئے نکھ سکھ کروں بکھان
برتھم ہی کہوں کیسے کی سوبھا، پنگ جنوں ملے گری اوبھا
برگھ بمل بیٹھ پر پرے، لہرہیں وشدھر وش بھرے

چاند اور سورج ان کی خوبصورتی کا مقابلہ نہیں کر سکتے میں اب اس کا سراپا بیان کرتا ہوں۔ اسے بغور سنو:۔ اس کے بال لمبے اور صاف، پیٹھ پر زہریلے سانپ کی طرح لہریں لے رہے ہیں۔

اس دور میں مذہب اور تصوف کے علاوہ نرتم داس اور گنگ کوی نے دیگر موضوعات پر بھی نظمیں لکھی ہیں۔ اس دور تک دراصل ہندی زبان بے حد نکھر چکی تھی۔ برج بھاشا کی جگہ اب وہ کھڑی بولی کے نام سے یاد کی جانے لگی۔ اور تمام بھارت میں عام ہو چکی تھی۔

ریتی کال

یہ دور ۱۶۴۳ء سے ۱۸۴۳ء تک شمار کیا جا سکتا ہے۔ اکبر کا دور بڑا پُرامن دور کہلاتا ہے۔ بڑی حد تک مذہبی عصبیت اور گروہ بندی کا تصور بھی دور ہو چکا تھا۔ اتحاد و اتفاق کا زمانہ تھا۔ عوام خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ بادشاہوں کے درباروں کی رنگ رلیاں بھی عوام پر اثر کئے بغیر نہیں رہ سکیں۔ سابقہ دور میں کرشن اور رادھا کی پاک محبت کے جن نغموں نے خلوص اور محبت کے جذبات پیدا کئے تھے۔ وہی تصورات اس وقت شاہدانِ بازاری کے لئے وقف ہو گئے۔ بعض صوفی قسم کے شعرا بھی اس دور میں عام اور سستے مذاق کے شکار ہو گئے۔

البتہ حسن و عشق کے اس عام تصور سے قطع نظر اس دور میں علم عروض، تشبیہات، زبان کی صرف و نحو کی طرف زیادہ توجہ دی گئی جو ہندی زبان کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

اس دور کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اب ہندی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی مختلف مراحل طے کرتے ہوئے میدان میں آ چکی تھی۔ کھڑی بولی نے فارسی رسم الخط اختیار کر کے صاف ستھری اردو کی شکل اختیار کر لی تھی۔ چنانچہ اسی زمانہ میں ہندی بھی اردو اور فارسی سے بے حد متاثر تھی۔

اس دور میں خود اکبر کا دربار ایک بڑا ادبی گہوارہ تھا۔ اکبر خود بھی ہندی میں شاعری اکبر رائے کے نام سے کرتا رہا۔ ہندی شعراء اور ادیبوں کی بڑی سرپرستی کی۔ دراصل ہندی ادب کی ترقی اور ترویج میں اکبر نے زبردست خدمات انجام دی ہیں۔ راجہ بیربل، مان سنگھ کے علاوہ اکبر کے دربار میں ابوالفیض فیضی ہندی کا اچھا شاعر گزرا ہے۔ فارسی کے علاوہ ہندی میں فیضی کے دوہے بے حد مشہور ہیں۔

اس دور کے مسلمان ہندی شعراء میں عبدالرحیم خان خاناں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ یہ بیرم خاں کے بیٹے تھے۔ عربی، فارسی، سنسکرت اور ہندی سے بخوبی واقف تھے۔ رحیم کا کلام خصوصاً اخلاقیات بڑی اہمیت کا حامل ہے دیگر کتابوں کے علاوہ رحیم کی "رحیم ست سئی" ہندی ادب کی یادگار تصنیف ہے۔

چھار اچھارت سیس پر کہو رحیم کہہ کاج
جیہہ رج منی پتنی تری تیہہ کھوجت گجراج

رحمن رج من کی وتھا من ہی راکھو گوئے
سن اٹھلیں ہیں لوگ سب بانٹ نہ لیں کوئے

(اے رحیم دل کی بات دل ہی میں رکھو۔ دوسرے اسے سن کر اٹھلائیں گے اور تمہارے درد کی دوا نہ کریں گے)

اس دور میں ہندی شاعری میں عروض اور صنائع بدائع پر کافی زور دیا گیا۔ فن عروض پر کئی کتابیں لکھی گئیں اسی طرح صرف و نحو کی طرف بھی خاص توجہ دی گئی۔ فن عروض کے متعلق "رام النکرت منجری" مشہور کتاب مانی جاتی ہے جس کا مصنف کیشو داس ہے۔ اسی طرح ترپاٹھی نے فن عروض پر "راس چندر کا" لکھی۔

شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے زمانے تک ہندی
ہ کافی ترقی کرتا رہا۔ علم عروض کے علاوہ ہندی شاعری
مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی گئی۔ مختلف اصناف
ن بھی متعین ہوئیں۔ البتہ اورنگ زیب کے وقت سے
مغلیہ حکومت میں زوال کے آثار پیدا ہو چکے تھے۔ اور
اصل اسی زمانے سے ہندی کی ترقی بھی رکنے لگی۔ اور غیر
وس طریقہ سے ہندی ادب کا انحطاط شروع ہوا۔ گو اورنگزیب
ندی تعلیم کو پسند نہ کرتا تھا۔ تب بھی اس کے دربار میں ہندی
عرا موجود رہے اور اس نے ان کی سرپرستی کی۔

اس دور کے مسلمان شعرا میں عالم بڑی شہرت
رکھتے ہیں۔ گو انھوں نے کوئی مستقل تصنیف نہیں چھوڑی۔
لبتہ ان کی بیوی ایک انگریز کی لڑکی تھی جس کے عشق میں
عالم نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ وہ خود بھی ہندی کی اچھی
شاعرہ تھی۔ عالم نے ایک دن ایک مصرع کہا تو ان کی بیوی
نے دوسرا مصرع کہہ کر دراصل ان دونوں کے عشق کی
داستان مکمل کر دی۔ ؎

کنک چھری سی کامنی، کاہے کو کٹی چھین
کٹ کو کنچن کاٹ کر کچن مدھ دھر دین

اس دور کا دوسرا مسلمان شاعر رسلین گزرا ہے
جو بلگرام ضلع ہردوئی کا رہنے والا تھا۔ بے شمار نظمیں
ہندی میں کہیں۔ اس کا اصل نام سید غلام نبی تھا۔ رسلین
کی مشہور تصنیف "انگ درپن" ہندی ادب میں یادگار ہے۔

گدھ کال

ہندی ادب کے اس دور کا عرصہ، ۱۸۵۷ء کے
بعد سے اب تک کا قرار دیا جا سکتا ہے۔ دراصل، ۱۸۵۷ء کا
سال ہندوستان کی سیاسی، معاشی، معاشرتی اور یہاں تک
کہ لسانی اور ادبی زندگیوں میں زبردست انقلاب کا
باعث رہا ہے۔ غدر سے پہلے ہندی کے تینوں ادوار میں
شاعری پر زیادہ زور دیا گیا۔ البتہ تیسرے دور میں فن
عروض، صرف و نحو اور دیگر موضوعات پر نثر میں کتابیں
لکھی جانے لگی تھیں۔ لیکن وہ اس قدر کم ہیں کہ وہ اپنا زمانہ
یادور نہ بنا سکیں۔ البتہ غدر کے بعد ہندی نثر کو ترقی ہوئی
ہندی نثر کی پہلی کتاب اکبر کے زمانے میں گنگ بھاٹ نے
"چند چھند برنن کی مہما" کے نام سے لکھی جس کی زبان کچھ
اس طرح سے تھی۔

"سری دلی پت جی، اکبر ساہا
جی عام کاش میں تخت اوپر براجمان ہوا
ہیہ اور عام کاش بھرنے لگا ہے جیس میں
تمام امرا آئے آئے۔ کنٹر نش بجائے بجائے
جہار کرکے اپنی اپنی بیٹھک پر بیٹھ جایا کیے۔"

دراصل کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کے قیام نے
ہندی ادب خصوصاً نثر کی ترقی میں ایک اہم رول ادا کیا
ہے۔ بلکہ یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ دراصل ہندی نثر
کی ابتدا، فورٹ ولیم کالج ہی سے ہوئی۔ لیکن بعض مؤرخین
نے اس کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ دراصل اس سے پہلے ہی
انشاء اللہ خاں انشا نے "رانی کیتکی کی کہانی" ہندی
میں لکھ کر ہندی نثر میں زبردست اضافہ کیا۔ اس کتاب
کی زبان ہی نے دراصل ہندی نثر کے لئے راہیں ہموار کیں
انشا نے اس طرح کی ہندی استعمال کی ہے۔

"سر جھکا کر ناک رگڑتا ہوں۔
اس اپنے بنانے والے کے سامنے جس نے
ہم سب کو بنایا۔ اور بات کی بات میں وہ
کر دکھایا کہ جس کا بھید کسی نے نہ پایا۔"

انشا نے اس کتاب کے اوپر ہی یہ شعر لکھ
دیا ہے ؎

یہ وہ کہانی ہے کہ جس میں ہندی چھٹ
ورنہ کسی بولی کا میل ہے نہ پٹ

اس کے بعد سے ہندی اور اردو متوازی خطوط
پر ترقی کرتی آ رہی ہیں۔ بعض مرحلوں پر اردو ہندی میں
تصادم بھی ہوا۔ البتہ راجہ شیو پرشاد نے جو محکمۂ تعلیمات
سے متعلق تھے مدراس میں ہندی کو عام کیا۔ درسی کتب
زیادہ سے زیادہ رائج کروائیں۔ شیو پرشاد جی نے
زیادہ تر آسان ہندی پر زور دیا ہے۔

انگریزی ادب کے تراجم وغیرہ نے بھی ہندی
ادب کو ترقی دی۔ جنگ آزادی کی تحریک بھی ہندی کے
لئے بے حد مفید ثابت ہوئی اور اس دور میں تو تقریباً
ہندی ادب کی ہر صنف میں اردو مصنفین اور شعرا نے اسی
طرح خلوص و محبت سے کام کیا جس طرح وہ اردو کے لئے
کرتے رہے ہیں۔ ہر مسلمان اردو مصنف اور شاعر کو ہندی
سے اتنا ہی لگاؤ ہے جتنا وہ اردو سے رکھتا ہے۔

غرض ہندی ادب کے اس جائزے سے یہ
اندازہ بخوبی ہوتا ہے کہ ہندی ادب کی تعمیر و ترقی، ترویج
و تشکیل میں مسلمانوں نے نمایاں حصہ ادا کیا ہے۔ سوانح عمریوں
میں آنحضور صلعم، اکبر، شیخ سعدی وغیرہ کی سوانح عمریاں بہت
انداز میں ہندی میں لکھی گئیں۔ آج بعض کمزور گوشوں سے
ہندی اور اردو کے اختلافات کی آوازیں آتی ہیں۔ اردو
مسلمانوں کی زبان، ہندی ہندوؤں کی زبان ہے۔ یہ نہ
صرف غیر واقعی ہے بلکہ بے حد نقصان دہ بھی۔ خصوصاً اردو
نے چونکہ ہندی سے زیادہ مختلف زبانوں کو اپنایا ہے اور
لامحدود انداز میں پھیلتی چلی گئی۔ اور آج نہ صرف ہندوستان
بلکہ بین الاقوامی ماحول میں مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ ایسی
وسیع النظر زبان کے بولنے والوں کو بھی بے حد وسیع النظر
ہونا چاہیئے۔ ہندی زبان ہمارے بھارت کا بڑا قیمتی سرمایہ
ہے۔ اس کی ترویج و ترقی میں اردو داں طبقہ بھی برابر کا
شریک ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ ہمیں جس طرح اپنے وطن کا ہر
ذرہ دیوتا نظر آتا ہے اسی طرح ہمیں بھارت کی تمام ہی
زبانوں سے محبت کرنا چاہیئے بلکہ اس جذبے کو عام کرنے
کی ضرورت ہے تاکہ لسانی تعصب کی خوفناک آگ کے
شعلوں سے نازک زبانیں محفوظ رہ سکیں۔ اور اس اہم کام
کی ذمہ داری میں سمجھتا ہوں کہ اردو داں طبقہ پر جتنی عائد
ہوتی ہے اتنی دوسرے لسانی طبقات پر نہیں ہوتی
ہے۔ کیونکہ اردو بین الریاستی زبان ہے۔ اردو داں ہر ریاست
میں جا کر اردو کے ذریعہ ان خیرسگالی جذبات کا پرچار کر
سکتا ہے۔ اس طرح ہم لسانی رواداری اور قومی یکجہتی
کا ماحول پیدا کر سکیں گے جس کے بغیر بدقسمتی سے ہمارے
دیش کی ہر ترقی رکی ہوئی سی محسوس ہوتی ہے۔

غالب

سیکولرازم کے علمبردار

نورجہاں

ہمارے ناقدین کلامِ غالب کی مختلف خصوصیات پر روشنی ڈال کر عہدِ جدید میں ان کی معنویت ثابت کرتے رہے ہیں۔ جو ظاہر ہے کہ ادب کے نقطۂ نظر سے بہت اہم کام ہے لیکن میری نظر میں کلامِ غالب کی وہ خصوصیت جس کی ہمارے زمانے میں غیر معمولی اہمیت ہے ان کی وسیع المشربی، مذہبی رواداری یا دوسرے لفظوں میں ان کا سیکولر مزاج ہے۔ اگر اس نقطۂ نظر سے کلام غالب کا مطالعہ کیا جائے تو وہ سیکولرازم کے ایک عظیم علمبردار ثابت ہوتے ہیں۔ میں لفظِ سیکولرازم کو اس کے سیاسی مفہوم میں استعمال نہیں کر رہی۔ بلکہ میری مراد اس لفظ کے جدید ترین مفہوم سے ہے یعنی ایک ایسا شخص جو اپنے مذہب کی پابندی کرے اور دوسرے مذاہب کا دل سے احترام کرے۔

اس معاملے میں اردو شاعری کا مزاج ابتدا ہی سے سیکولر رہا ہے۔ تصوف کے غیر معمولی اثر کی وجہ سے دوسرے مذاہب کے احترام کی روایت نے جنم لیا تھا۔ اور یہ روایت آج تک جاری ہے۔ میر کا یہ کہنا ؎

یہ توہم کا کارخانہ ہے

یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

میر کے دین و مذہب کو پوچھتے کیا ہو ان نے تو

قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

یا میر درد جیسے صوفی شاعر کا یہ خیال ؎

مدرسہ یا دیر تھا، کعبہ یا بت خانہ تھا

ہم سبھی مہمان تھے واں، اک تو ہی صاحب خانہ تھا

اردو شاعری کے سیکولر مزاج کا غماز تھی۔ غالب نے اس سیکولرازم کو صرف روایت یا عقیدے کے طور پر ہی قبول نہیں کیا بلکہ وہ زندگی بھر اس پر عمل پیرا بھی رہے۔

وسیع المشربی اور مذہبی رواداری غالب کا مسلک تھا۔ ان کے عمل، شاعری اور خطوط اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ مذہب کے محض ظاہری رسوم ہی میں گرفتار نہیں رہے۔ انھوں نے ارضی عبادت گاہوں سے بہت بلند اپنے لئے ایک ایسی عبادت گاہ بنائی تھی کہ جہاں سے کعبہ و دیر، کلیسا اور کنشت سب یکساں نظر آتے ہیں۔ خود کہتے ہیں۔ ؎

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود

قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

غالب اہل دل بھی تھے اور اہلِ نظر بھی ان کے مذہب عقیدے رسم و رواج اور ذات پات کی بنیاد پر انسان اور انسان میں کوئی تفریق نہیں تھی۔ وہ تمام نوعِ انساں کو ایک وحدت تسلیم کرتے تھے۔ انہیں وہی عبادت پسند تھی۔ جو کفر و دین سے آزاد ہو اور بنیاد وفاداری پر ہو۔ ایسی ہی عبادت کو وہ عشق کامل سمجھتے تھے۔ ؎

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے

مرے بت خانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

عقیدے کے اعتبار سے غالب وحدت الوجود کے قائل تھے۔ وہ خدا کو کائنات سے کوئی علیحدہ چیز نہیں سمجھتے تھے۔ دنیا کیسے وجود میں آئی؟ غالب اس سوال کا جواب دیتے ہیں۔ ؎

دھر جز جلوۂ یکتائیٔ معشوق نہیں

ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود میں

غالب سوچتے ہیں کہ جب خدا مطلق اور تمام انسانی اس کا جزو ہیں۔ یعنی شہود و شاہد و مشہود سب ایک ہیں تو پھر مشاہدہ کیوں اور کس لئے۔ زندگی اپنے مخزن سے بچھڑ جانے کا نام ہے۔ اس لئے اس کا فنا ہونا اپنے مطلق سے ملنا ہے۔

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا

ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

اگر یہ ثابت ہو گیا کہ خدا کل ہے اور ہر انسان اس کا جزو۔ تو پھر انسان اور انسان میں تفریق کیسی؟ دیر و حرم میں فرق کیسا؟ کیا ناقوس اور اذان کا ایک ہی مقصد نہیں ہے؟ کیا دنیا کے تمام مذاہب خالق حقیقی تک پہنچنے کے مختلف راستے نہیں ہیں؟

غالب کا عقیدہ تھا کہ تمام فساد ظاہری رسوم سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر انھیں ختم کر دیا جائے تو شیخ و برہمن کا جھگڑا بھی ختم ہو جائے گا۔ اور لوگ اصل ایمان کو پالیں گے اس مفہوم کا غالب کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔ ؎

ہم موحد ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم

ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

اسی خیال کو غالب ایک خط میں اس طرح لکھتے ہیں۔

"ہندہ پرور میں بنی آدم کو مسلمان یا ہندو یا نصرانی عزیز رکھتا ہوں اور اپنا سگا بھائی گنتا ہوں"۔

لِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہیں
حیران ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

غالب کے سیکولر ذہن کی شہادت ان کے شاگردوں کی طویل فہرست ہے جس میں ہر مذہب و ملت کے لوگ شامل ہیں۔ وہ اگر میر مہدی مجروح کو میاں لڑکے ــــ صاحبزادے ــــ سید صاحب اور جانِ غالب ــــ جیسے القاب سے نوازتے ہیں۔ تو مرزا ہرگوپال تفتہ سے بھی اسی شفقت اور عنایت سے پیش آتے ہیں۔ اور انھیں مہاراج ــــ شفیق بالتحقیق ــــ بندہ پرور ــــ برِ نظر و لختِ جگر وغیرہ جیسے القاب لکھتے ہیں۔ غالب کے شاگردوں کی فہرست میں ہندو، مسلمان اور نصرانی سب ہی لوگ نظر آتے ہیں۔ "تلامذۂ غالب" میں مالک رام صاحب نے غالب کے رئیس ہندو شاعروں کا ذکر کیا ہے۔ انھیں میں یہ مرزا ہرگوپال تفتہ بھی ہیں۔ انھیں "مرزا" کا خطاب بھی غالب کا ہی دیا ہوا ہے۔ خطوطِ غالب کے مجموعے میں ۱۲۳ خط صرف مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام ہیں۔

غالب ایک خط میں انھیں لکھتے ہیں :۔

"خدا گواہ ہے کہ میں تم کو اپنے فرزند کی جگہ سمجھتا ہوں۔ پس تمہارے نتائج طبع میرے معنوی پوتے ہوئے جب اس عالم کے پوتے مجھے کھانا نہیں کھانے دیتے۔ ننگے ننگے پاؤں میرے پلنگ پر رکھتے ہیں۔ کہیں پانی لنڈھاتے ہیں۔ کہیں خاک اڑاتے ہیں، میں تنگ نہیں آتا تو ان معنوی پوتوں سے کہ ان میں یہ باتیں نہیں، میں کیوں گھبراؤں گا آپ ان کو جلد بہ سبیلِ ڈاک میرے پاس بھیج دیجئے۔"

ایک اور خط میں تفتہ کو لکھتے ہیں :۔

"وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے۔ اور طرح طرح سے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت درپیش آئے۔ شعر کہے، دیوان جمع کئے۔ اسی زمانے میں ایک بزرگ تھے وہ ہمارے تمہارے دوست دلی تھے۔ منشی نبی بخش اور حقیر تخلص تھا۔ ناگاہ وہ زمانہ رہا، نہ وہ معاملات، نہ وہ اختلاط نہ وہ انبساط، اور چند مدت سے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہ مثل پہلے جنم کی ہے۔ لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں میں نہیں پایا جاتا۔"

اس خط میں غالب کس حسرت اور یاس کے ساتھ وہ دن یاد کرتے ہیں جب مرزا ہرگوپال تفتہ ان کے ساتھ تھے۔ اس کے علاوہ آواگون کے فلسفے کا کس خوبصورت انداز سے استعمال کرتے ہیں۔ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ غالب آواگون کے قائل تھے۔ لیکن یہ ان کی وسیع المشربی اور وسیع القلبی ہے۔ وہ نہ صرف نثر میں بلکہ شاعری میں بھی ہندو عقائد اور رسم و رواج سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مثلاً

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

ظاہر ہے کہ یہ شعر مُردے کو جلانے سے متعلق ہے۔

غالب ایک اور شاگرد منشی پیارے لال آشوب کو لکھتے ہیں :۔

"خالق نے جو خوبیاں تم میں کوٹ کوٹ کر بھر دی ہیں۔ اگر میرا صلبی فرزند ایسا ہوتا تو میں اس کو اپنا فخرِ خاندان سمجھتا اور اب تم جس قوم اور جس خاندان میں ہو اس قوم اور اس خاندان کے ذریعۂ افتخار ہو۔ خدا تم کو سلامت رکھے اور عمر و دولت و اقبال و جاہ و جلال عطا کرے۔"

۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں مسلمانوں کا مقتدر طبقہ دہلی سے فرار ہو چکا تھا۔ اگر غالب کے ہندو دوست اور شاگرد نہ ہوتے تو نہ جانے ان کا کیا حشر ہوتا۔ مہاراجہ پٹیالہ کے سپاہیوں کی وجہ سے ان کی جان بچی۔ کافی دن تک غالب ان کی محافظت میں رہے۔ اور ان کے دہلی کے ہندو دوست اور شاگرد ان کے کھانے پینے کا انتظام کرتے رہے۔ حالات ذرا بہتر ہوئے تو مرزا ہرگوپال تفتہ نے پھر مالی مدد بھیجنی شروع کی۔ غالب نے ان واقعات کی پوری تفصیل اپنے روزنامچے "دستنبو" میں لکھی ہے۔ یہ غالب کے سیکولر مزاج ہی کا صلہ تھا جو ہندو دوستوں نے ایسے خطرناک موقع پر جی جان سے ان کی خدمت کی۔

غالب کا سیکولر مزاج بنانے میں ان کی انسان دوستی کو بہت بڑا دخل تھا۔ چھری کسی کی بھی گردن پر چلے غالب تڑپ اٹھتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی قتل و غارتگری کے بارے میں ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں۔

"انگریز قوم میں سے جو ان روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے ان میں سے کوئی میرا امید گاہ تھا اور کوئی میرا شفیق تھا ــــ کوئی میرا دوست اور میرا یار اور کوئی میرا شاگرد ــــ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ شاگرد، کچھ معشوق، سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے ــــ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے۔ جو اپنے عزیزوں کا ماتم دار ہو اس کو زیست کیوں کر نہ دشوار ہو۔ ہائے اتنے یار مرے کہ اب جو میں مروں گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا ــــ"

ایک اور خط میں غالب لکھتے ہیں :۔

"...... نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا مہربان بن جاؤں۔ اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ سہی جس شہر میں رہوں اس شہر میں تو کوئی بھوکا ننگا نظر نہ آئے۔"

یہ بات وہی کہہ سکتا ہے کہ جس کا دل انسان دوستی ہی سے بھرا ہوا ہو۔ اور یہ انسان دوستی کا وہ جذبہ ہے جو کسی بھی بنیاد پر انسان اور انسان میں فرق نہیں کرسکتا۔ ؎

ہم موحد ہے ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

کتابوں کی باتیں

انتخاب محمد قلی قطب شاہ۔ تصنیف برہان الدین

مرتبہ:۔ محمد اکبر الدین صدیقی۔ (مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی) ۱۹۷۲ء

محمد قلی کی عشقیہ شاعری کو دنیا کی بہترین عشقیہ شاعری کے ساتھ جگہ دی جاسکتی ہے۔ ان کے ہاں جسم و جمال کی جو سرشاری اور محبت کی جو بھرپور کیفیت ملتی ہے اپنا جواب نہیں رکھتی۔ ان کی غزلوں میں فارسی سے براہ راست استفادے کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ لیکن نسوانی حسن و جمال کی بے پناہ حسیاتی کیفیت کی کوئی روایت فارسی میں نہیں تھی۔ اس کا سیدھا تعلق ہندوستان کی مٹی سے یا سنسکرت کاویہ سے ہوسکتا ہے۔ یا پھر ریتی کال کی ہندی شاعری سے۔ لیکن محمد قلی محض نائیکا بھید یا نک شک ورنن کا شاعر نہیں۔ جو چیز اس کی شاعری کو عام بیانیہ سطح سے اوپر اٹھا لیتی ہے وہ حواس کی ایسی سرشاری ہے۔ جو جسم سے متعلق ہوتے ہوئے بھی جسم کا ماورا ہے۔ اس میں ایک ایسی بے کرانی اور وسعت ہے کہ ساری کائنات لمس کے سمندر میں ایک ذرۂ حقیر کی طرح ڈوبتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دکن کی سرزمین اور فضا کے سارے شوخ رنگوں کو محمد قلی قطب شاہ کے وجدان نے کچھ اس طرح جذب کرلیا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لئے جاوداں ہوگئے۔ یہ خوبی محض بیانیہ شاعری کے بس کی بات نہیں۔ اگر صرف لفظی معنی مراد لئے جائیں، تو زبان کی قدامت کی وجہ سے محمد قلی اپنی بازیافت کے باوجود دلوں پر راج نہ کرسکتے۔ ان کی مقبولیت کی بڑی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ وہ لفظی معنی سے کہیں زیادہ معنوی فضا کا شاعر ہیں۔ صدیقی صاحب نے بڑی محنت سے انتخاب کیا ہے اور محمد قلی کی شاعری کے تمام پہلوؤں کی نمائندگی کی ہے۔ ایسے شاعر کا انتخاب شائع کرنا مستحسن اقدام ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ محمد قلی کی قدر شناسی میں مزید مدد دے گا اور وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرے گا۔

گوپی چند نارنگ

پہلے آسمان کا زوال ــــــ کمار پاشی

ناشر:۔ شالیمار پبلی کیشنز ۲۸۷/8 نیا ملک پیٹھ، حیدرآباد ۳۶

صفحات ۹۶ ــــ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ــــ قیمت ۴ روپے

کمار پاشی اردو کے ایک جانے پہچانے شاعر ہیں جدید نظم گو شعراء میں موصوف کی ایک انفرادیت ہے۔ ابھی کچھ ہی مدت پہلے جسمانی تقاضوں اور ضرورتوں کو انھوں نے اپنی ایک طویل نظم 'ولاس یاترا' میں بڑی چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ علامتوں میں بہت کچھ کہہ جانا ایک فن ہے اور کمار پاشی اس فن میں کافی مہارت رکھتے ہیں 'پہلے آسمان کا زوال' کمار پاشی کی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں بارہ کہانیاں شامل ہیں۔ کتاب میں کمار پاشی کے کے لئے کہا گیا ہے۔

"کمار پاشی ایک منفرد شاعر ہی نہیں، صاحب طرز کہانی کار بھی ہیں۔ ان کی کہانیاں پراسرار فضا اور علامتی تخیل، بھرپور تخلیقی قوتوں اور الفاظ پر فنکارانہ دسترس کی وجہ سے بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ وہ اپنی کہانیوں کی فضا آفرینی جس انداز سے کرتے ہیں وہ انھیں کا اسلوب ہے۔ جس نے بھی ان کی دو چار کہانیاں پڑھ لی ہیں وہ ان کی کسی کہانی کو دیکھتے ہی کہہ اٹھے گا کہ یہ انداز کمار پاشی کا معلوم ہوتا ہے۔"

یقیناً کمار پاشی کا کہانی کہنے کا اپنا ایک انداز ہے اور اس کے لئے وہ آسانی سے پہچانے جاسکتے ہیں میں نے کمار پاشی کی یہ بارہ کہانیاں ایک ہی نشست میں پڑھی ہیں اور ان کی کہانی کار کی صفت کو بھی محسوس کیا ہے اور اس نتیجے پر بھی پہنچا ہوں کہ پاشی صاحب میں کہانی کی تخلیقی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے جو جدیدیت کی رو میں بہہ کر اور علامتوں کے چکر میں پڑ کر فوت ہوگئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ براہ راست بات میں جو تاثر ہوتا ہے وہ رمزیت اور علامت کے بیان سے عام فہم نہیں رہتا جب کہ کہانی تو کم از کم سب ہی قسم کے قارئین کے ہونی چاہیئے۔ اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ جدیدیت نے جنسی تصور و بیان کو وسعت دینے کے ساتھ ساتھ ادب کو محدود کر کے مختصر کردیا جائے تو شاید مبالغہ نہ ہوگا ہمارے مشینی دور میں لکھی جانے والی جبران اسٹائل کہانیاں خلیل جبران نہیں بنا سکتیں۔

"پہلے آسمان کا زوال" کا 'سرنامہ' بھی رمزی تحریر میں ہے۔ مصنف نے اس 'سرنامہ' میں بہت کچھ بتایا ہے نہ صرف اپنے بارے میں بلکہ اس میں رواں دواں تہذیب اور انسانی ارتقا کی کہانی بھی ہے۔

کمار پاشی کا یہ پراسرار اسلوب ہی پوری کہانی کی جان ہے۔ زرد گھاس کا میدان، دوسرا آدمی، ٹوٹی ہوئی رات، اور پہلے آسمان کا زوال۔ اس مجموعے کی زیادہ رمزی کہانیاں ہیں۔ جن میں علامتوں کے سہارے بہت کچھ کہنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جدید کہانی کے مداحوں کے واسطے یہ مجموعہ ایک بہت ہی خوبصورت پیش کش ہے۔ مگر ایک عام قاری کو ان کہانیوں کو سمجھنے کے لئے بہت زیادہ اپنے دماغ پر زور ڈالنا پڑے گا۔ اپنی خصوصیت کے نقطۂ نظر سے بحیثیت مجموعی یہ مجموعہ کمار پاشی کے اس تعارف کی پوری پوری نمائندگی ہے جو کتاب میں ان کی تصویر کے ساتھ شامل ہے۔

صاف ستھری کتابت طباعت کے ساتھ پہلے آسمان کا زوال اچھے سفید کاغذ پر شائع کیا گیا ہے۔ لیکن پروف ریڈنگ کی طرف مزید توجہ درکار تھی۔ سرورق جاذب نظر اور جدید رجحان کا عکاس ہے مگر صرف ۹۶ صفحات کی اس کتاب کی قیمت چار روپے بہت ہی زیادہ ہے۔ کتاب کی قیمت رکھتے وقت اگر لائبریریز کے ساتھ عام قاری کی قوت خرید کا بھی خیال رکھا جائے تو کیا ہی اچھا ہو! میرے خیال میں اس کتاب کی قیمت تین روپئے سے زیادہ نہیں ہونی چاہیئے تھی۔

انور کمال حسینی

روپ نرائن پانڈے کی موت

قوم کا ایک عظیم نقصان ہے

پچھلے مہینے موت کے ظالم ہاتھوں نے راجستھان اسٹیٹ سامپردائکتا وِرودھی کمیٹی کے جنرل سکریٹری شری روپ نرائن پانڈے کو ہمیشہ کے لئے ہم سے چھین لیا۔ مرحوم ایک میٹنگ میں شرکت کر رہے تھے کہ اچانک یہ حادثہ رونما ہوا۔

پانڈے جی نوجوان تھے۔ ان کے کچھ عقائد تھے جنھیں عملی شکل دینے کے لئے وہ تن، من، دھن کی بازی لگائے ہوئے تھے۔ انھوں نے بہت ہی ناسازگار حالات میں راجستھان میں فرقہ واریت کے خلاف تحریک کو منظم کرنے کی ذمہ داری لی تھی۔ ان کی محنت اور لگن کا نتیجہ ہے کہ آج اس تحریک کو تسلیم کرنے والے اور اس سے ہمدردی رکھنے والے اِس صوبے میں ہر جگہ موجود ہیں۔ انھوں نے بڑی محنت سے لوگوں کو سمجھایا کہ فرقہ وارانہ عناصر کس طرح کام کرتے ہیں اور اقلیتی فرقے کن مشکلات میں ہیں اور ان کے ساتھ کس طرح کا امتیاز برتا جاتا ہے۔

موت سے لڑا نہیں جا سکتا۔ جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا؛

روپ نرائن پانڈے کو پُر خلوص اور بہترین خراج عقیدت صرف اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے کہ ہم لوگ راجستھان میں اس تحریک کو مضبوط بنانے کے لئے اپنی تمام تر کوششیں صرف کریں۔

(ادارہ)

نوازش نامے

مسلم پرسنل لا اور حق پسندی

فروری کے "سیکولر ڈیموکریسی" میں مسلم پرسنل لا (اور بالخصوص بمبئی میں منعقدہ کنونشن) سے متعلق دو مضمون اور دو مراسلے شائع ہوئے ہیں۔ ان میں ڈاکٹر عالم خوندمیری کا مقالہ نہایت فاضلانہ اور متوازن ہے۔ اس مقالے میں ڈاکٹر صاحب نے تقریباً میرے خیالات کی ترجمانی فرمائی ہے۔ تعدد ازدواج سے متعلق اتنا اور عرض کردوں کہ ظہور اسلام کے وقت عرب میں بیویوں کی تعداد پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ اس لئے جب اسلام نے ان کی زیادہ سے زیادہ تعداد چار مقرر کی تو یہ دراصل تعداد کو محدود کرنے کا رجحان تھا، نہ کہ اسے غیر محدود چھوڑنے کا۔ اسی طرح یہ بھی درست ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے موجودہ پرسنل لا میں (جو زیادہ تر برطانوی دور کی مجالس قانون ساز کا وضع کیا ہوا ہے) کئی باتیں ایسی ہیں جو شریعت اسلامی کے مطابق نہیں ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ حصول آزادی کے بعد جو عوام داری قانون بعض ریاستوں میں تشکیل دیا گیا ہے اس کے مطابق خود کاشت زمین میں بیٹی کا حق نہیں رکھا گیا ہے۔ پھر کیا ان "غیر شرعی" قوانین کے خلاف کسی گوشے سے کوئی آواز بلند ہوئی ہے؟

میں یہ مانتا ہوں کہ اس طرح کے مسائل میں اختلاف رائے کی گنجائش ہمیشہ رہتی ہے اور زیر نظر مسئلے کے بھی بعض پہلو ایسے ہیں جن میں دو رائیں ہو سکتی ہیں مثلاً یہ کہ اس طرح کے قوانین کس حد تک مذہب کے دائرے میں آتے ہیں اور کس حد تک مشترک سماج کے دائرے میں اور اس لئے ان میں تبدیلی کا حق کسے اور کس حد تک ہے (اس میں شبہ نہیں ہے کہ تبدیلی کا نفاذ تو اسی وقت ہوگا جب اسے پارلیمنٹ کی تائید SANCTION حاصل ہوگی لیکن میرے نزدیک بحث طلب مسئلہ یہ ہو سکتا ہے کہ ــــ پارلیمنٹ کو یہ SANCTION کس مرحلے پر دینی چاہیئے) لیکن جو امر ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ہم اپنے دماغ کھلے رکھیں اور افہام و تفہیم کا دروازہ بند نہ کریں، نہ ہر اس شخص کی نیت پر شک کرنے کے لئے اُدھار کھائے بیٹھے رہیں جو ہمارا ہم خیال نہ ہو۔ حصول آزادی سے پہلے مسلم لیگ کے پیرووں نے اپنے مخالفین کا منہ بند کرنے کی سب سے آسان ترکیب یہ سوچی تھی کہ ان پر جھٹ ہندو پرستی کا الزام لگا دیا جائے۔ اس الزام سے نہ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی بچے تھے اور نہ صوبہ سرحد کے سرخ پوش یا پنجاب کے احراری۔ افسوس ہے کہ حصول آزادی کے بعد بعض ایسے حضرات بھی یہی حربہ اپنے مخالفوں کے خلاف استعمال کرنے لگے جو چند سال قبل خود اس کی زد میں رہ چکے تھے اور اس میں "حکومت پرستی" کا الزام اور شامل کر لیا۔ جب تک ہمارے سوچنے کا انداز یہ رہے گا اہم مسائل کے بارے میں کسی معنی خیز نتیجے تک پہنچنا ممکن نہیں ہوگا۔

ضمنی طور پر عبداللطیف اعظمی صاحب کے مراسلے کے ایک جزء سے تھوڑا سا اختلاف کرنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے گوئل صاحب کے جنوری کے شمارے میں شائع شدہ مضمون کے اُن خیالات پر اعتراض کیا ہے جو جناب حمید دلوائی اور پروفیسر اے۔ بی۔ شاہ سے متعلق ہیں۔ میں اس معاملے میں گوئل صاحب کا ہم خیال ہوں۔ ہمیں اس کی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے کہ بعض ایسے مسلمان ہیں جو حمید دلوائی صاحب اور اے۔ بی۔ شاہ صاحب کے مخالف ہونے کے ساتھ ساتھ "سیکولر ڈیموکریسی" کے بھی مخالف ہیں۔ ہمیں اس سے صرف نظر کر کے حق کو حق اور ناحق کو ناحق ہی کہنا چاہیئے۔ مجھے حمید دلوائی صاحب اور اے۔ بی۔ شاہ صاحب سے دو شکایتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان کا سیکولرازم یک طرفہ ہے یعنی اس کی زد ہمیشہ مسلم فرقہ پرستوں پر پڑتی ہے۔ ہندو فرقہ پرستوں پر کبھی نہیں پڑتی ہے۔ ہمارے یہاں بدقسمتی سے ایسے لوگ بھی ہیں جن کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ میں ان دونوں قسم کے "سیکولرسٹوں" کو خود اس مقصد کے لئے مضر سمجھتا ہوں جس کی خدمت کا وہ دعویٰ کرتے ہیں۔

میری دوسری شکایت یہ ہے کہ حمید دلوائی صاحب اور ان سے زیادہ اے۔ بی۔ شاہ صاحب سیکولرازم کی لڑائی کو اقتصادی استحصال کے خلاف جنگ کا حصہ بنانے کے لئے آمادہ نہیں ہیں جب کہ میری رائے میں ہم فرقہ پرستی کا قلع قمع اس وقت تک کر ہی نہیں سکتے ہیں جب تک سرمایہ داری اور اقتصادی استحصال کا خاتمہ نہ کر دیں۔

نیازمند ریاض الرحمٰن شروانی

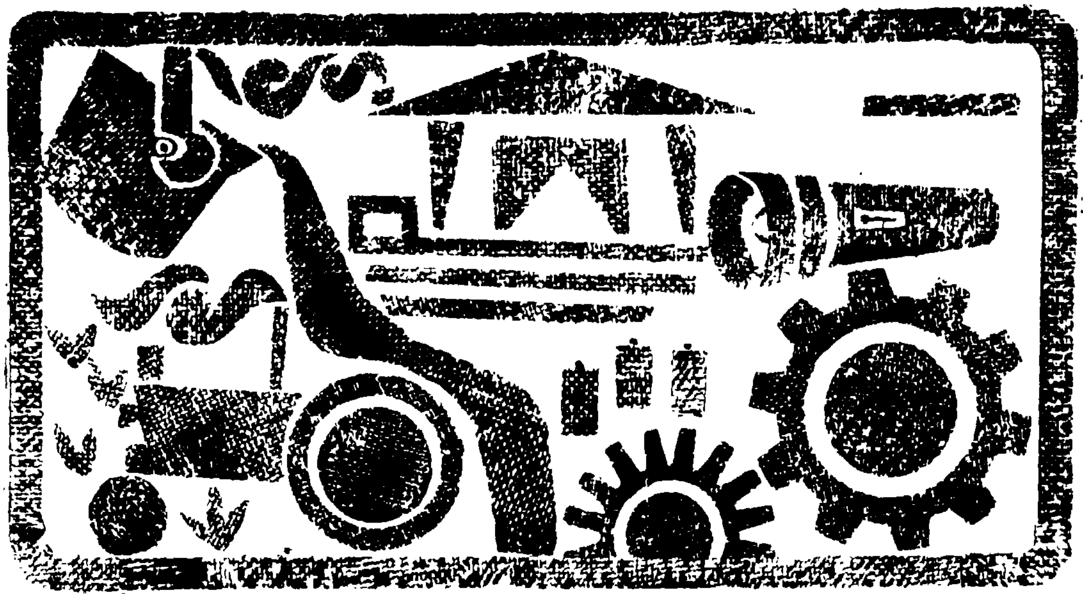
سبھدرا جی کی کہانیاں

یوں تو آپ کے رسالے میں مختلف عنوانات پر بہت مفید اور کارآمد مضامین شائع ہوتے ہیں لیکن مجھے سب سے زیادہ سبھدرا جوشی کی کہانیاں "وحشت اور فرشتے" پسند آتی ہیں۔ میری نظر میں ان کہانیوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ سیاست داں کی یادداشت ہیں۔ ان میں زبان کی وہ خوبی نہیں جو ہمارے ادیبوں کے ہاں ملتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ یہ دل کو چھوتی ہیں۔ پہلے آپ ہر مہینے تین کہانیاں شائع کرتے تھے۔ اب آپ نے دو کر دی ہیں۔ میری درخواست ہے کہ تین کی جگہ چار چھاپیئے۔ ان کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ بہار، مدھیہ پردیش اور یو۔ پی کے اکثر اخبارات انھیں نقل کرتے ہیں۔

نیازمند

آصف علی۔ پٹنہ

اپنے محدود ذرائع سے.....



بھارت کو اپنے سبھی محاذوں پر لڑنے کے لئے ہمارا تعاون

ترقی کی راہ پر چلنے والا بھارت جیسے جیسے قدم اٹھا رہا ہے ہم بھی اپنا تعاون دے رہے ہیں. خوراک محاذ پر یونین کاربائیڈ کیڑے مکوڑے کا خاتمہ کرنے والی دوائی اور پولیتھین فلم دیتا ہے جس کے ذریعہ کسانوں کو زیادہ اور بڑھیا قسم کی فصل پیدا کرنے میں مدد ملتی ہے. گھر کے محاذ پر ہم آپکے لئے طرح طرح کی استعمال ہونے والی اشیاء جیسے بیٹری اور فلیش لائٹ سے لیکر پولیتھین سے بنے رنگین ڈبے تک مہیا کرتے ہیں. ادویات، روغن، کپڑا، لوہا فولاد اور ربڑ بنانے کیلئے خام مال اور کیمیائی اشیاء بھی مہیا کرتے ہیں. برآمد کے محاذ میں یونین کاربائیڈ پانچوں براعظموں میں اپنے لئے نئی منڈیاں تلاش کر رہا ہے اور اسکی بنی ہوئی اشیاء پچاس سے زائد ممالک میں جن میں ریاستہائے متحدہ امریکہ بھی شامل ہے بھیجی جاتی ہیں. ان کاموں میں چند ایک ہیں جنکی یونین کاربائیڈ انڈیا لمیٹڈ نے بھارت کے لوگوں کا معیار زندگی بلند کرنے کیلئے بنیاد ڈالی ہے اس طرح ہم اپنے محدود ذرائع سے بھارت کی مدد کرتے ہیں تا کہ وہ سبھی محاذوں پر اپنی لڑائی لڑ سکے.

UNION CARBIDE

sowing the seeds of progress

سیکولر ڈیموکریسی

امتحانی مقابلے

پبلک سروس کمیشن۔ یو، پی

ایڈورٹزمنٹ نمبر ۷۳-۸/٤-A

فوڈ سول سپلائی ڈپارٹمنٹ اتر پردیش کے تحت (۱) وزن اور ماپ انسپکٹروں کی ۵ جگہوں،

(۲) مارکیٹنگ انسپکٹروں کی ۱۰۰ جگہوں۔ اور

(۳) سپلائی انسپکٹروں کی ۱۰۰ جگہوں کو پُر کرنے کے لئے جون ۱۹۷۳ء میں الہ آباد میں ایک مقابلہ کا امتحان ہوگا۔ اگر ضروری سمجھا گیا اور جگہ کا انتظام ہوسکا تو یہ امتحان یو۔پی میں دوسرے مقامات پر بھی ہوسکتا ہے۔ جگہیں عارضی ہیں اور ان جگہوں پر تقرری کو بغیر کسی نوٹس کے کسی بھی وقت منسوخ کیا جاسکتا ہے۔ ۱۸ فیصدی جگہیں یو۔پی کے شیڈول کاسٹ سے متعلق مناسب امیدواروں کے لئے، ۲ فیصدی جگہیں یو۔پی کے شیڈول ٹرائبس سے متعلق امیدواروں کے لئے اس کے علاوہ ۱۰ فیصدی جگہیں سابق معذور فوجیوں کے لئے اور ۱۰ فیصدی جگہیں ایسے امیدواروں کے محفوظ ہیں جن کی کفالت کی ذمہ داری جنگ آزادی میں شریک ہونے والے افراد پر ہو۔ اگر محفوظ جگہوں پر تقرری کے لئے مطلوبہ تعداد میں مناسب امیدوار نہ مل سکے تو بقیہ جگہوں کو عام امیدواروں سے پُر کیا جائے گا۔

شہریت:۔

امیدواروں کو ہندوستانی شہری ہونا چاہیئے یا وہ سکم یا تبت کے باشندے ہوں جو یکم فروری ۱۹۶۲ء سے پہلے ہندوستان آگئے ہوں یا وہ ہندوستانی ہوں جو پاکستان، برمہ، سری لنکا، اور مشرقی افریقہ کے کینیا، یوگنڈا اور تنزانیہ سے ہندوستان میں مستقل سکونت کے ارادے سے ہجرت کرکے ہندوستان آئے ہوں۔

علمی قابلیت:۔ یونی ورسٹی ڈگری یا اس کے برابر کی کوئی دوسری ڈگری کا ہونا ضروری ہے۔

عمر:۔ یکم جنوری ۱۹۷۴ء کو اس امتحان میں شریک ہونے والے امیدواروں کی عمر ۲۱ سال سے کم اور ۲۷ سال سے زیادہ نہ ہونی چاہیئے۔ یو۔پی کے شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائبس کے امیدواروں اور ایسے امیدواروں کے لئے جن کی کفالت کی ذمہ داری جنگ آزادی میں شریک افراد پر ہو۔ عمر کی مدت زیادہ ہونے کی صورت میں ۵ سال تک کی رعایت دی جاسکتی ہے۔ عمر زیادہ ہونے کی صورت میں ۵ سال کی رعایت ایسے امیدواروں کو بھی دی جائے گی جو یکم جنوری ۱۹۶۳ء کو یا اس کے بعد برمہ سے اور یکم نومبر ۱۹۶۴ء یا اس کے بعد سری لنکا سے ہجرت کرکے ہندوستان آئے ہوں بشرطیکہ یہ امیدوار اعلی تعلیم یافتہ اور مذکورہ جگہوں کے لئے مناسب ہوں۔ عمر زیادہ ہونے کی صورت میں رعایت ایسے امیدواروں کو بھی دی جائے گی جو ڈیفنس سروسز سے ریٹایرڈ یا کسی اسکیم کے تحت علیحدہ کئے گئے ہوں بشرطیکہ یکم جنوری ۱۹۷۴ء کو ان کی، موجودہ عمر میں سے ان کی فوجی خدمات کی پوری مدت کو گھٹانے کے بعد ان کی عمر مطلوبہ عمر سے ۳ سال سے زیادہ نہ ہو۔

تنخواہ:۔

نمبر (۱) اور (۲) جگہوں کے لئے ۱۲۰-۲۵۰ اور

نمبر (۳) کی جگہوں کے لئے ۱۲۰-۲۲۰۔

درخواست اور امتحان کی فیس ایک سروس کے لئے ۴۰ روپے، دو سروسوں کے لئے ۴۹ روپے اور تین سروسوں کے لئے ۵۵ روپے۔ یو۔پی کے شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائبس کے لئے بالترتیب ۱۸ روپے ۲۱ روپے اور ۲۳ روپے۔

یہ فیس صرف ٹریزری چالان کے ذریعہ جمع کرائے جائے۔ درخواستوں کے فارموں کے پہنچنے کی آخری تاریخ ۱۷ اپریل ۱۹۷۳ء۔ تمام جگہوں کے لئے صرف ایک درخواستی فارم کافی ہے۔ درخواستوں کے لئے مجوزہ ملازم مع دیگر معلومات کے دو روپے کا منی آرڈر بھیجنے یا کمیشن کے پوچھ تاچھ کے دفتر میں نقد جمع کرانے پر سچیو پریکشا وبھاگ نمبر ۷۳-۸/٤-A پبلک سروس کمیشن۔ یو، پی الہ آباد سے حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ اگر امیدوار سرکاری ملازم ہے تو منی آرڈر کوپن پر اس کی وضاحت کرنا ضروری ہے۔ ڈپارٹمنٹ، نمبر، جگہ کا نام اور بڑے حروف میں اپنا پورا نام اور پتہ منی آرڈر کوپن پر وضاحت سے لکھنا ضروری ہے۔ منی آرڈر تاخیر سے بھیجنے یا نامکمل تفصیلات بھیجنے کی وجہ سے پیدا ہونے والی صورت حال کی ذمہ داری خود امیدوار پر ہوگی۔

آل انڈیا ریڈیو، نئی دہلی

ایک ٹرانس لیٹر۔ اناؤنسر (اسٹاف آرٹسٹ) پشتو سروس کے لئے درکار ہے۔

تعلیمی قابلیت:۔ ان کے لئے جن کی مادری زبان پشتو نہیں ہے۔

۱۔ آنرز ڈگری یا فرسٹ کلاس یا سیکنڈ کلاس ڈگری۔ یا اس کے برابر کی کوئی دوسری ڈگری۔

۲۔ اگر ڈگری پشتو زبان میں نہیں ہے تو ۳ سالہ ڈگری

یا ڈپلومہ (ایڈوانس کورس پشتو) کسی بھی منظور شدہ یونیورسٹی یا ادارے سے ہونا چاہیئے۔

۳۔ انگریزی سے پشتو اور پشتو سے انگریزی میں ترجمہ کرنے کی صلاحیت ہونا چاہیئے۔

۴۔ آواز براڈکاسٹنگ کے اعتبار سے مناسب ہونی چاہیئے۔

۵۔ ہندوستانی اور عالمی امور میں دلچسپی ہونی چاہیئے۔

۶۔ پشتو بولے جانے والے علاقوں کی تاریخ اور تہذیب سے واقفیت ہونی چاہیئے۔

۷۔ جرنلسٹک یا براڈکاسٹنگ کا تجربہ ہونا چاہیئے۔

ان کے لئے جن کی مادری زبان پشتو ہے

۱۔ اسکول فائنل یا اس کے برابر کا کوئی سرٹیفکیٹ جو کہ یونیورسٹی میں داخلے کے لئے ضروری ہوتا ہے۔

۲۔ انگریزی سے پشتو میں اور پشتو سے انگریزی میں ترجمہ کرنے کی صلاحیت ہونی چاہیئے۔

۳۔ آواز براڈکاسٹنگ کے لئے موزوں ہونا چاہیئے۔

۴۔ عالمی امور میں دلچسپی۔

۵۔ پشتو بولے جانے والے علاقوں کی تاریخ اور تہذیب سے واقفیت ہونا چاہیئے۔

۶۔ جرنلسٹک اور براڈکاسٹنگ کا تجربہ ہونا چاہیئے۔

مطلوبہ عمر:۔

یکم جنوری ۱۹۷۳ء تک ۵۰ برس سے کم عمر ہونی چاہیئے۔

مطلوبہ علمی قابلیت کے مطابق امیدوار نہ ملنے کی صورت میں ایسے امیدواروں کے لئے جو دیگر اعتبار سے مناسب ہوں عمر اور علمی قابلیت کے معاملے میں رعایت برتی جا سکتی ہے۔

فیس اسکیل:۔

۴۰۰، ۴۰۰، ۴۵۰۔۳۰۔۶۰۰۔۳۵۔۷۶۰

اے۔ بی۔ ۳۵۔ ۹۵۰۔ اس کے علاوہ وہ تمام الاؤنسز جو وقتاً فوقتاً اسٹاف آرٹسٹوں کو دیئے جاتے ہیں۔ میڈیکل اور ڈنٹ فنڈ کی سہولتیں بھی دی جائیں گی۔ غیر ملکی امیدواروں کے لئے فارن الاؤنس بھی دیا جائے گا۔ غیر معمولی قابلیت اور تجربہ کار امیدواروں کے لئے فیس میں اضافہ پر بھی غور کیا جا سکتا ہے۔

امیدواروں کو ترجمہ اور آواز کا ٹسٹ دینا ہوگا۔ ترجمہ اور آواز کا ٹسٹ میں کامیاب ہونے والے امیدواروں کو انٹرویو بھی دینا ہوگا۔ امتحان میں شامل ہونے کے لئے کسی بھی قسم کا خرچہ، بھتہ نہیں دیا جائے گا۔

کامیاب ہونے والے امیدواروں کو شروع میں ایک سال کی مدت کے کانٹریکٹ پر جیسے ہی اور جہاں پر بھی جگہ نکلے گی رکھ لیا جائے گا۔ اس مدت میں امیدوار کا کام اور رویہ اگر تسلی بخش پایا گیا تو اوپر دیئے گئے اسکیل میں ۵ سالہ کانٹریکٹ پر اسٹاف آرٹسٹ بنا لیا جائے گا بشرطیکہ ہندوستانی شہری ہو۔ غیر ملکی امیدواروں کو ۵ سالہ کانٹریکٹ پر (جو کہ قابل توسیع ہوگا) اسٹاف آرٹسٹ بنا لیا جائے گا۔ سرکاری ملازمین اپنی درخواستیں اپنے دفتر کی معرفت بھیجیں۔

درخواست ایک سادہ کاغذ پر مندرجہ ذیل تفصیل کے ساتھ بھیجیں۔

(۱) نام (۲) تاریخ پیدائش (۳) موجودہ ڈاک کا پتہ (۴) شہریت (۵) تعلیمی قابلیت (امتحانات جو کہ پاس کئے ہیں، مکمل تفصیل)

(۶) زبانیں (لکھنا، پڑھنا اور بولنا)

(۷) جرنلسٹک، ترجمہ یا براڈکاسٹنگ کا تجربہ۔

(۸) غیر ممالک (جن کا کہ کبھی دورہ کیا ہو۔

ان مندرجہ بالا دستاویزات کی تصدیق کے لئے اٹسٹڈ کاپیاں ہونا ضروری ہیں۔ اپنی درخواستیں اس پتہ پر روانہ کریں۔

ڈائرکٹر، ایکسٹرنل سروسز ڈویژن

آل انڈیا ریڈیو۔ نئی دہلی

آخری تاریخ:۔ ۱۵ر مارچ ۱۹۷۳ء

امیدواروں کو ٹسٹ اور انٹرویو کے لئے بلاتے وقت اعلیٰ قابلیت رکھنے والے اور تجربہ کار امیدواروں کو ترجیح دی جائے گی۔

نئی دہلی میونسپل کمیٹی

ٹاون ہال، نئی دہلی

ایک ٹیکنیکل اسسٹنٹ (پی۔ آر) کے لئے درخواستیں مطلوب ہیں۔

فیس اسکیل:۔ ۲۱۰، ۴۲۵ اس کے علاوہ رائج الاؤنسز

درخواستی فارم ہر روز صبح ۱۰ بجے سے ایک بجے دن تک ٹاون ہال، نئی دہلی سے چھپا ہوا فارم ایک روپیہ قیمت دے کر حاصل کیا جا سکتا ہے (دبچھڑے ہوئے لوگوں کے لئے ۲۵ پیسے صرف)۔ منی آرڈر سے فارم منگانے کی قیمت ایک روپیہ ۲۵ پیسے ہے۔ (شیڈول کاسٹ کے لئے ۵۰ پیسے صرف)۔ اگر ڈاک سے فارم منگانا ہو تو سکریٹری، این۔ ڈی۔ ایم سی کے نام منی آرڈر کی رقم بھیجی جائے۔

تعلیمی قابلیت:۔

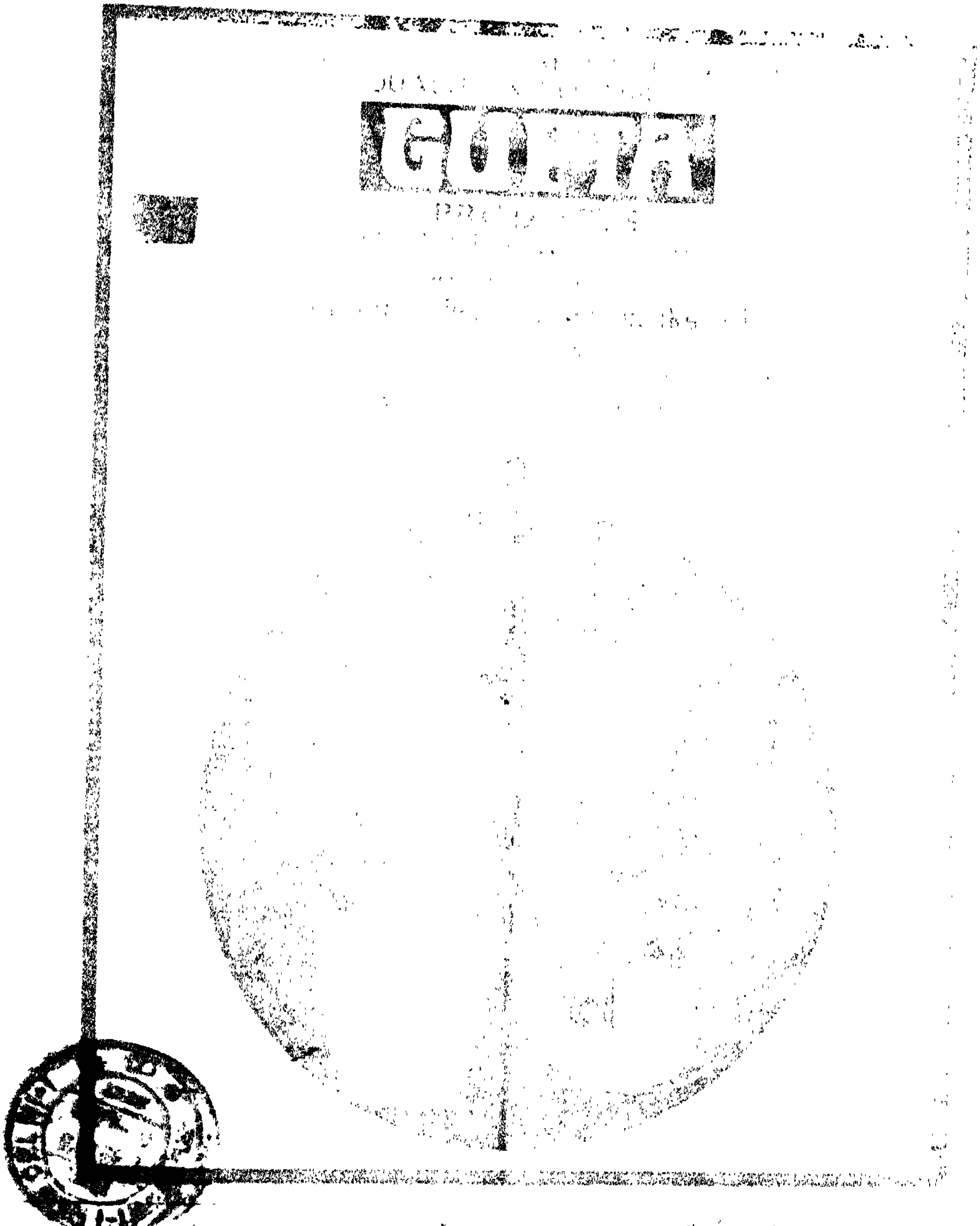
گریجویٹ، ہندی اور اختیاری مضمون کی حیثیت سے ضروری ہے۔ جرنلزم کا ڈپلومہ جو کہ پبلک سروس کمیشن سے تسلیم شدہ ہو۔ ساتھ میں دو سال کا جرنلسٹک یا پبلسٹی کا تجربہ، کسی بھی اخبار/خبر رساں ایجنسی ایڈورٹائزنگ ایجنسی کا ہونا چاہیئے۔ ان لوگوں کو ترجیح دی جائے گی جنھیں فوٹوگرافی سے دلچسپی ہے اور اردو بھی جانتے ہیں۔

۳۱ر جنوری ۱۹۷۳ء کو:۔

مطلوبہ عمر: (۱) ۱۸ سے ۳۰ سال تک کی عمر عام امیدواروں کے لئے۔

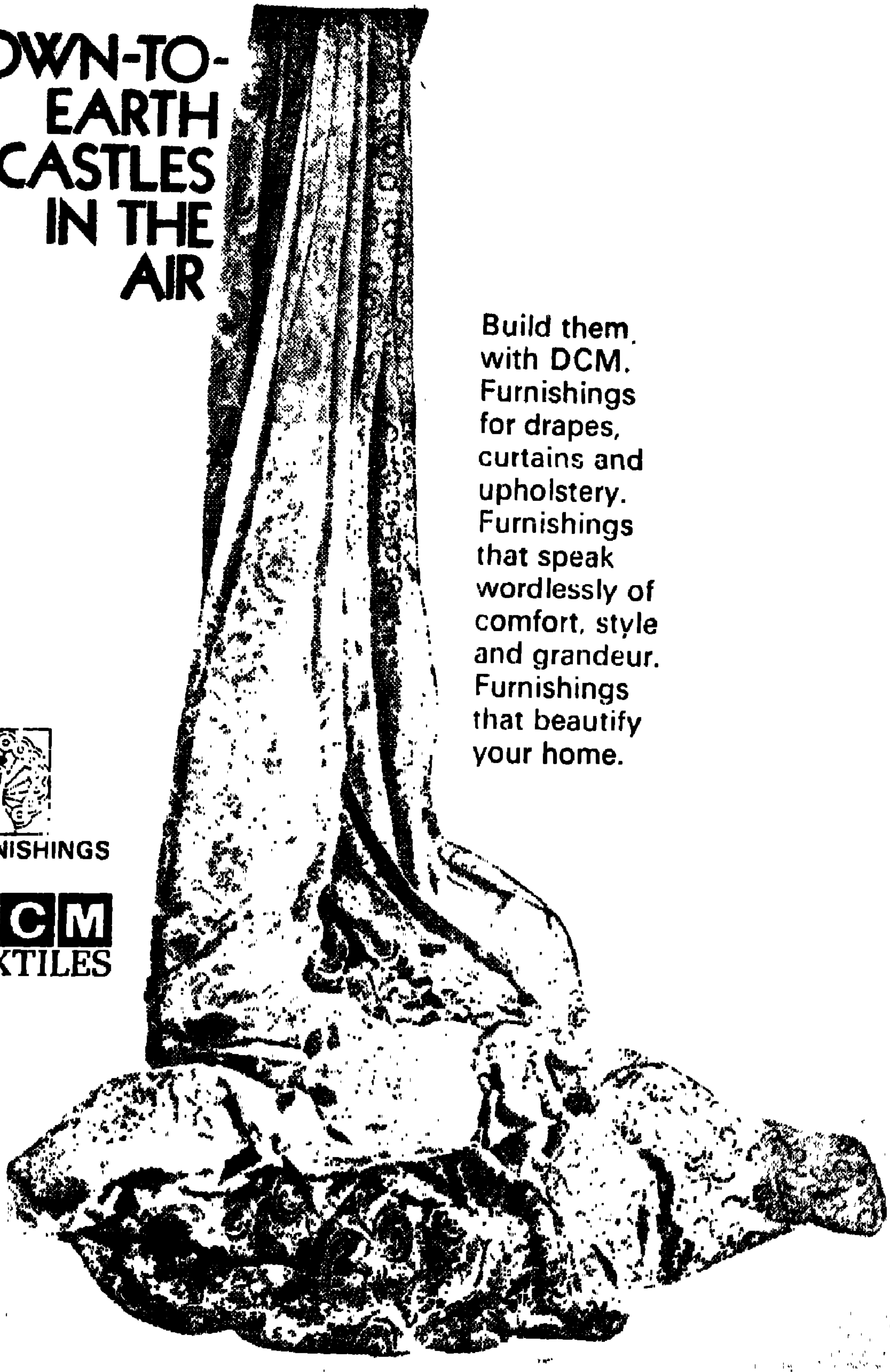
(۲) ۱۸ سے ۳۵ سال تک کی عمر (SC/ST امیدواروں کے لئے)

درخواستیں تمام ضروری کاغذات کے ساتھ مع تصدیق شدہ نقلوں کے سکریٹری، این۔ ڈی۔ ایم۔ سی نئی دہلی کے پتہ پر ۱۵ر مارچ ۱۹۷۳ء تک پہنچ جانی چاہئیں۔ درخواست کے ساتھ یک عدد تازہ پاسپورٹ سائز فوٹو بھی آنا چاہیئے۔



ڈی آرگوئل

لبرل ڈیموکریسی



اناج کی قیمتوں کو کم کرنے میں آپ مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔
کم اناج استعمال کر کے بھی آپ اپنے کھانے سے نہ صرف اسی مقدار میں،
بلکہ اس سے زیادہ مقدار میں بھی صحت کے لئے ضروری
عناصر حاصل کر سکتے ہیں۔
یہ بات بالکل آسان ہے۔ گیہوں اور چاول کم کھائیے اور آلو، شکرقندی
اور مکی، جو، باجرہ، جوار اور راگی ایسے دوسرے اناجوں کا
زیادہ استعمال کیجئے۔

کم اناج استعمال کر کے متوازن خوراک کھائیں

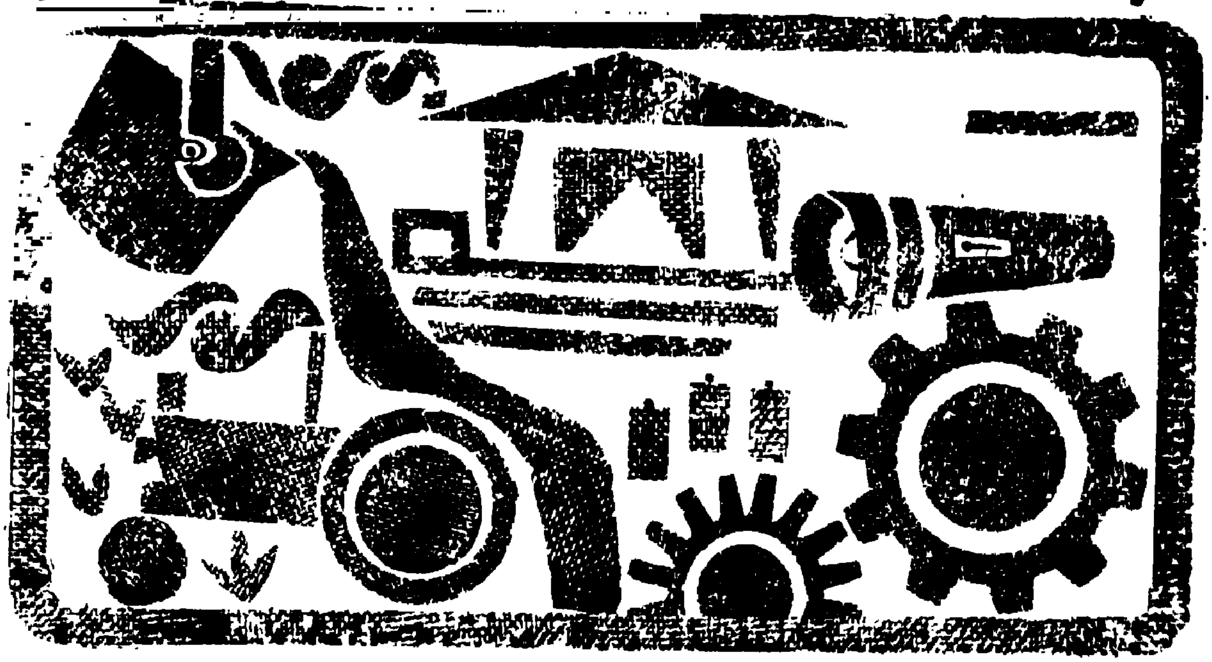


ہرے پتوں والی سبزیوں اور موسم کے مطابق پھلوں کا استعمال
کر کے آپ اپنی خوراک کو زیادہ متوازن و مقوی بنا سکتے ہیں۔
معاشی نقطہ نظر سے یہ بات ملک کے لئے بھی
زیادہ فائدہ مند ہوگی۔
اپنی روزمرہ کی خوراک میں ان کا استعمال کیجئے۔

**ہفتے میں کم از کم ایک بار ایسا کھانا کھائیے
جس میں اناج شامل نہ ہو۔**

davp 72/744

اپنے محدود ذرائع سے.....



بھارت کو اپنے سبھی محاذوں پر لڑنے کے لئے ہمارا تعاون

ترقی کی راہ پر چلنے والا بھارت جیسے جیسے قدم اٹھا رہا ہے ہم بھی اپنا تعاون دے رہے ہیں۔ خوراک محاذ پر یونین کاربائیڈ کیڑے مکوڑے کا خاتمہ کرنے والی دوائی اور پولیتھین فلم دیتا ہے جس کے ذریعہ کسانوں کو زیادہ اور بڑھیا قسم کی فصل پیدا کرنے میں مدد ملتی ہے۔ گھر کے محاذ پر ہم آپ کے لئے طرح طرح کی استعمال ہونے والی اشیاء جیسے بیٹری اور فلیش لائٹ سے لیکر پولیتھین سے بنے رنگین ڈبے تک مہیا کرتے ہیں۔ ادویات، روغن، کپڑا، لوہا فولاد اور ربڑ بنانے کیلئے خام مال اور کیمیائی اشیاء بھی مہیا کرتے ہیں۔ برآمد کے محاذ میں یونین کاربائیڈ پانچوں براعظموں میں اپنے لئے نئی منڈیاں تلاش کر رہا ہے اور اسکی بنی ہوئی اشیاء پچاس سے زائد ممالک میں جن میں ریاستہائے متحدہ امریکہ بھی شامل ہے بھیجی جاتی ہیں۔ ان کاموں میں چند ایک ہیں جنکی یونین کاربائیڈ انڈیا لمیٹڈ نے بھارت کے لوگوں کا معیارِ زندگی بلند کرنے کیلئے بنیاد ڈالی ہے اس طرح ہم اپنے محدود ذرائع سے بھارت کی مدد کرتے ہیں تاکہ وہ سبھی محاذوں پر اپنی لڑائی لڑ سکے۔

UNION CARBIDE

sowing the seeds of progress

UC-1656 D-CM

یونین پبلک سروس کمیشن

نوٹس

آئی۔اے۔ایس وغیرہ امتحانی مقابلے ۱۹۷۳ء

یونین پبلک سروس کمیشن کے تحت ۹ر ستمبر ۱۹۷۳ء کو مختلف سروسز کیلئے ایک امتحانی مقابلہ ہوگا یہ سروسز تین درجات میں تقسیم کی گئی ہیں۔

درجہ ۱

۱۔ انڈین ایڈمنسٹریٹیو سروس (آئی۔اے۔ایس) اور

۲۔ انڈین فارن سروس

درجہ ۲

۱۔ انڈین پولیس سروس اور

۲۔ دہلی، انڈومان و نیکوبار جزیروں کی پولیس سروس۔ کلاس II

درجہ ۳

(۱) کلاس I سروسز

۱۔ سینٹرل انفارمیشن سروس (گریڈ II) کلاس I

۲۔ انڈین آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سروس

۳۔ انڈین کسٹم اینڈ سینٹرل ایکسائز سروس

۴۔ انڈین ڈیفنس اکاؤنٹ سروس

۵۔ انڈین انکم ٹیکس سروس (کلاس I)

۶۔ انڈین آرڈی نینس فیکٹریز سروس (کلاس I) (اسسٹنٹ منیجر۔ نان ٹیکنیکل)

۷۔ انڈین پوسٹل سروس

۸۔ انڈین ریلوے اکاؤنٹ سروس

۹۔ انڈین ریلوے ٹریفک سروس اور

۱۰۔ ملٹری لینڈز و کنٹونمنٹ سروس (کلاس I)

(ب) کلاس II سروسز

۱۔ سینٹرل سکریٹریٹ سروس، سیکشن آفیسر گریڈ (کلاس II)

۲۔ انڈین فارن سروس۔ برانچ 'بی' گریڈ II و III آف جنرل کیڈر (سیکشن آفیسرز گریڈ)

۳۔ آرمڈ فورسز ہیڈ کوارٹرس سول سروسز، اسسٹنٹ سولین اسٹاف آفیسرز گریڈ کلاس II

۴۔ کسٹم اپریزرز سروس کلاس II

۵۔ دہلی اور انڈومان و نیکوبار جزیروں کی سول سروس۔ کلاس II

۶۔ گوا، دمن اور دیو۔ سول سروس کلاس II

۷۔ پانڈیچری سول سروس۔ کلاس II اور

۸۔ ملٹری لینڈز اینڈ کنٹونمنٹ سروس، کلاس II

یہ امتحان یونین پبلک سروس کمیشن کے تحت احمد آباد، الٰہ آباد، بنگلور، بھوپال، بمبئی، کلکتہ، کٹک، دہلی حیدرآباد، جے پور، مدراس، ناگپور، پٹیالہ، پٹنہ، شیلانگ سری نگر، تری وندرم اور لندن میں ہوگا۔

علمی قابلیت: یونیورسٹی ڈگری یا اس کے برابر کی کوئی ڈگری کا ہونا ضروری ہے۔

عمر: یکم اگست ۱۹۷۳ء تک۔

درجہ ۱ میں آنے والی تمام سروسز کے لئے ۲۱ سے ۲۶ سال

درجہ ۲ میں آنے والی تمام سروسز کے لئے ۲۰ سے ۲۶ سال

درجہ ۳ میں آنے والی تمام سروسز کے لئے بھی ۲۰ سے ۲۴ سال

شیڈول کاسٹ، شیڈول ٹرائبس اور دیگر کے لئے جن میں ریلیزڈ ایمرجنسی کمشنڈ و شارٹ سروس کمشنڈ آفیسرز بھی شامل کئے گئے ہیں کے لئے زیادہ عمر میں رعایت کی گئی ہے۔

چانسیز: شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائبس اور مختلف درجات میں آنے والے امیدواروں کے علاوہ عام امیدواروں کے لئے اس امتحانی مقابلہ میں تمام سروسز کے لئے تین بار بیٹھنے کی اجازت ہے (جب کہ پہلے صرف دو بار بیٹھنے کی اجازت تھی) لیکن ریلیزڈ ایمرجنسی کمیشنڈ /شارٹ سروس کمیشنڈ آفیسرز جو کہ عمر میں رعایت مل جانے پر اس امتحان میں شریک ہوتے ہیں ان کے لئے صرف ایک بار اس مقابلہ میں بیٹھنے کی اجازت دی گئی ہے۔

درخواستی فارم یونین پبلک سروس کمیشن، دھولپور ہاؤس نئی دہلی سے ایک روپیہ بذریعہ منی آرڈر یا دفتر میں کاؤنٹر پر نقد جمع کرانے کی صورت میں حاصل کیا جا سکتا ہے امیدوار واضح طور پر منی آرڈر کے کوپن پر انڈین ایڈمنسٹریٹیو سروس وغیرہ امتحانی مقابلہ ۱۹۷۳ء ضرور لکھیں اس کے علاوہ اپنا پورا نام و پتہ جلی حروفوں میں لکھیں۔

آخری تاریخ: پوری طرح مکمل فارم ۷ر مئی ۱۹۷۳ء تک یونین پبلک سروس کمیشن کے دفتر تک پہنچ جانے چاہئیں۔ (جو امیدوار ہندوستان سے باہر یا انڈومان نکوبار، لکادیپ اور دوسرے جزیروں میں مقیم ہیں ان کے فارم کے پہنچنے کی آخری تاریخ ۲۱ر مئی ۱۹۷۳ء ہے)

پبلک سروس کمیشن یو۔پی

ایڈورٹیزمنٹ نمبر ۳۔ ۷۳/A-1

ایکسائز انسپکٹروں کی ۱۰۹ جگہوں کو یو۔پی سب آرڈی نیٹ ایکسائز سروس کے تحت عارضی طور پر پُر کرنے کے لئے جون ۱۹۷۳ء میں الٰہ آباد میں ایک مقابلے کا امتحان ہوگا ان عارضی جگہوں کے مستقل ہوجانے کا امکان

۴. اگر ضروری سمجھا گیا اور معقول جگہوں کا انتظام ہو سکا تو یہ امتحان یو. پی میں دوسرے مقامات پر بھی ہو سکتا ہے۔ ان جگہوں میں سے ۱۸ فیصد جگہیں یو. پی کے شیڈول کاسٹ سے متعلق مناسب امیدواروں کے لئے، ۲ فیصد جگہیں یو. پی کے شیڈول کاسٹ ٹرائبس سے متعلق امیدواروں کے لئے ہیں۔ اس کے علاوہ ۱ فیصد جگہیں سابق اور معذور فوجیوں کے لئے اور ۱ فیصد جگہیں ایسے امیدواروں کے لئے محفوظ کی گئی ہیں جن کی کفالت کی ذمہ داری جنگِ آزادی میں شریک ہونے والے افراد پر ہو۔ اگر محفوظ جگہوں کی تقرری کے لئے مطلوبہ تعداد میں مناسب امیدوار نہ مل سکے تو بقیہ جگہوں کو عام امیدواروں سے پُر کیا جائے گا۔

شہریت : امیدواروں کو ہندوستانی شہری ہونا چاہیئے یا وہ سکم یا تبت کے باشندے ہوں جو یکم فروری ۱۹۶۲ء سے پہلے ہندوستان آ گئے ہوں یا وہ ہندوستانی ہوں جو کہ پاکستان، برما، سری لنکا اور مشرقی افریقہ کے کینیا، اوگنڈا اور تنزانیہ سے ہندوستان میں مستقل طور پر سکونت کے ارادے سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے ہوں۔

علمی قابلیت : امیدواروں کے لئے یونیورسٹی ڈگری کا ہونا یا اس کے برابر کی کوئی دوسری ڈگری کا ہونا لازمی ہے۔ سینہ کسی بھی حالت میں بغیر پھلائے ہوئے ۳۲ انچ اور پھلائے جانے پر ۳۴ انچ سے کم نہیں ہونا چاہیئے۔ قد کسی بھی طرح ۵ فٹ ۶ انچ سے کم نہ ہونا چاہیئے (کماؤں اور اترکھنڈ ڈویژن کے بسنے والوں کے لئے ۵ فٹ اور ۴ انچ سے کم نہیں ہونا چاہیئے)

عمر : یکم جنوری ۱۹۷۳ء کو اس امتحان میں شریک ہونے والے امیدواروں کی عمر ۲۱ سال سے کم اور ۲۷ سال سے زیادہ نہ ہونی چاہیئے۔ یعنی ان کی تاریخ پیدائش ۲ جنوری ۱۹۴۶ء سے پہلے اور یکم جنوری ۱۹۵۲ء کے بعد کی نہ ہو۔ یو. پی کے شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائبس کے امیدواروں اور ایسے امیدواروں کے لئے جن کی کفالت کی ذمہ داری جنگ آزادی میں شریک

افراد پر ہو۔ عمر کی مدت زیادہ ہونے کی صورت میں ۵ سال تک کی رعایت دی جا سکتی ہے۔ عمر زیادہ ہونے کی صورت میں ۵ سال کی رعایت ایسے امیدواروں کو بھی دی جائے گی جو یکم جون ۱۹۶۳ء کو یا اس کے بعد یکم نومبر ۱۹۶۴ء کو یا اس کے بعد برما اور سری لنکا سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے ہوں۔ بشرطیکہ یہ امیدوار اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مذکورہ جگہوں کے لئے مناسب ہوں عمر زیادہ ہونے کی صورت میں رعایت ایسے امیدواروں کو بھی دی جائے گی جو ڈیفینس سروسز سے ریٹائرڈ یا کمی کی اسکیم کے تحت علیحدہ کئے گئے ہوں۔ بشرطیکہ یکم جنوری ۱۹۷۴ء کو ان کی موجودہ عمر میں سے ان کی فوجی خدمات کو پوری مدت کو گھٹانے کے بعد اُن کی عمر مطلوبہ عمر سے ۳ سال سے زیادہ نہ ہو۔ اُن تمام امیدواروں کو بھی امتحان میں شریک ہونے کی اجازت دی گئی ہے جو کہ مطلوبہ علمی قابلیت رکھتے ہیں جن کی عمر ۲۱ سال سے کم نہیں تھی اور یکم جنوری ۱۹۷۳ء تک ۲۷ سال کی عمر سے زیادہ بھی نہیں تھی اور اب مطلوبہ عمر سے زیادہ ہو گئے ہیں۔ کیونکہ ۱۹۷۲ء میں ایسا کوئی امتحان نہیں ہوا تھا اس لئے وہ اس امتحان میں بیٹھنے کے حقدار ہیں۔ امتحان میں بیٹھنے والوں کے لئے اب چانسز کی کوئی قید نہیں ہے۔

تنخواہ : ۱۶۰-۳۲۰/ روپیہ

فیس و آخری تاریخ : درخواستی فارم کی قیمت ۲ روپے اور امتحان کی فیس ۳۳ روپیہ ہے۔ (یو. پی کے شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائبس کے متعلق امیدواروں کے لئے درخواستی فارم کی قیمت ۲ روپے اور امتحان کی فیس ۱۱ روپے مقرر کی گئی ہے) یہ فیس صرف ٹریژری چالان کے ذریعہ ہی جمع کرائی جائے درخواستوں کے فارموں کے پہنچنے کی آخری تاریخ ۲۸ / اپریل ۱۹۷۳ء ہے۔ درخواستوں کے لئے مجوزہ درخواستی فارم مع دیگر معلومات کے دو روپیے کا منی آرڈر بھیجنے پر یا کمیشن کے پوچھ تاچھ کے دفتر میں نقد جمع کرانے پر سچیو، پریکشا وِبھاگ نمبر ۷۳ - E / A۱، پبلک سروس کمیشن، یو. پی الہ آباد سے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ اگر امیدوار سرکاری ملازم ہے تو منی آرڈر کوپن پر اس کی وضاحت کرنا ضروری ہے۔ ڈپارٹمنٹ نمبر، جگہ کا نام اور بڑے حروف میں اپنا پورا نام و پتہ منی آرڈر کے کوپن پر لکھنا ضروری ہے۔ منی آرڈر تاخیر سے بھیجنے یا نامکمل تفصیلات بھیجنے کی وجہ سے پیدا ہونے والی صورت حال کی ذمہ داری خود امیدوار پر ہو گی۔

ہمارے نمائندے

- مسز کمل سانیال
  ا۔ ڈوور روڈ کلکتہ
- شری ایم۔ این۔ صدیقی
  نوبت ولا پلاٹ نمبر ۵۰۔۵۶
  جوہو ولے پارلے ہاؤسنگ سکیم
  نارتھ ساؤتھ روڈ نمبرا
  آف اِرلا برج اندھیری (ویسٹ)
  بمبئی ۵۸ (اے۔ایس)
- شریمتی خدیجہ عالم خوندمیری
  ۱۵/۱ ۱۱-۱۹، سلیم نگر
  حیدرآباد ۳۶
- ڈاکٹر معین شاکر
  ڈیپارٹمنٹ آف پولیٹکل سائنس
  مرہٹواڑہ یونیورسٹی اورنگ آباد
- شری بی۔ این۔ پانڈے
  ۱۴۸۔ آزاد سکوائر
  ساؤتھ ملکہ الہ آباد
- سردار سربندر سنگھ سندھو
  پی این ۲۳/۷۲ لاڈووالی روڈ۔ جالندھر
- سردار اقبال سنگھ
  سیکٹر ۱۸۔ اے
  کوارٹر نمبر ۳۰۷۴ چنڈی گڑھ
- شری ایس۔ کے۔ سنگھ
  کھادی گرام اُدیوگ سنگھ، مرادپور پٹنہ ۴

مشاورت بورڈ

- ایڈیٹرز
  سبھدرا جوشی
  ڈی۔ آر۔ گوئیل
  خلیق انجم
- جنرل منیجر
  راجندر کمار
- بزنس منیجر
  جی۔ ایل۔ ملہوترا
- دفتر کا پتہ
  ۹۔اے، تھیٹر کمیونی کیشن بلڈنگ
  کناٹ سرکس۔ نئی دہلی
- ٹیلیفون نمبر ۴۳۳۸۳

سرورق ۔ قومی اتحاد
عمل ۔ اجیت

ماہنامہ
سیکولر ڈیموکریسی

اپریل ۱۹۷۳ء
شمارہ ۱۷

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کنونشن

۲۰ اور ۲۱ مارچ کو دھلی میں آل انڈیا علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کنونیشن منعقد ھوا۔ یہ کنونیشن ملک کی تمام مسلم فرقہ پرست جماعتوں نے مل کر کیا تھا اور انھیں رجعت پرست پارٹیوں اور طبقوں کی مکمل حمایت حاصل تھی۔ اس کے متعلق ھمارے نامہ نگار نے جو رپورٹ بھیجی ھے وہ بجائے اداریہ درج ذیل ھے۔ اس سے کیا نتائج اخذ کئے جائیں ھم قارئین پر چھوڑتے ھیں :۔

۱۔ "کنونیشن کی تیاری کے لئے جماعت اسلامی، مسلم لیگ، مسلم مجلس اور علیگڑھ مسلم یونیورسٹی ایکشن کمیٹی کے ممبران پر مشتمل وفود نے ملک کے مختلف حصوں کے دورے کئے۔ کوشش یہ تھی کہ ہر صوبے سے کم از کم سو ڈیلی گیٹ تیار کئے جائیں جن کے اخراجات بھی کنونیشن کے داعیان برداشت کریں۔ دو ہزار سے زاید لوگوں کو دعوت دی گئی۔ تیاری کمیٹی پر امید تھی کہ وہ تمام حضرات ضرور شرکت کریں گے اور دہلی کا اجتماع ویسا ہی پُرشکوہ ہوگا جیسا بمبئی کی پرسنل لا کنونیشن کا تھا لیکن ایسا ہوا نہیں۔ شامل ہونے والے ڈیلی گیٹوں کی تعداد تین سو سے زائد نہ تھی"۔

۲۔ "اپنے خطبۂ صدارت میں جسٹس بشیر احمد سعید نے فرمایا "اس وقت پورے ملک میں ۹۵ یونیورسٹیاں ہیں ان میں صرف ایک علیگڑھ مسلم یونیورسٹی ہے جس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے حصولِ تعلیم کی سہولت مہیا کرتی ہے اور ان کی علمی ضرورت کے لئے پناہ گاہ کہی جاتی ہے لیکن یہ ایک یونیورسٹی بھی اکثریتی فرقہ اور حکمراں جماعت کی نگاہ میں کانٹے کی طرح کھٹکتی رہی۔ چنانچہ آزادی کے بعد ہی اس یونیورسٹی کو اس کے جمہوری ڈھانچے اور اس کے مسلم اقلیتی کردار سے محروم کر دینے اور ہندوستانی طرز کے ایک کلیت پسندانہ سوشلزم کا مرکز بنا دینے کی کوششیں شروع ہوگئیں"۔

یونیورسٹیوں کی تعداد تو گن دی گئی لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات کی طرف توجہ نہ جسٹس سعید نے کی اور نہ ہی ان کے لب و لہجہ میں بولتے ہوئے دیگر مندوبین میں سے کسی نے ایسا کرنے کی زحمت گوارا کی۔ ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے والے مسلم طلبا کی تعداد لگ بھگ ڈھائی لاکھ ہے۔ ان میں سے صرف پانچ ہزار علیگڑھ میں ہیں۔

۳۔ "گذشتہ ۲۵ برسوں میں جو عناصر مسلم یونیورسٹی کے بدترین دشمن رہے ہیں اور جو یونیورسٹی اس کے اساتذہ اور طلبہ پر پاکستانی ہونے اور ملک دشمن ہونے کے الزام لگاتے رہے ان کی اس کنونیشن میں عزت افزائی ہوئی۔ چودھری چرن سنگھ کی پارٹی، مرارجی ڈیسائی اور سی۔ بی گپتا کی پارٹی، پیلو مودی کی پارٹی ۱۹۷۲ء کے آخر تک اس صف میں پیش پیش تھے جن کی نگاہوں میں یہ یونیورسٹی کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی۔

اس کنونیشن میں یہ سبھی لوگ یونیورسٹی کے خیر خواہ بن کر آئے۔ ان پارٹیوں کے جن نمائندوں نے تقریریں کیں ان کا مطمح نظر صرف یہ تھا کہ مسلمان کانگریس کو ووٹ کیوں دیتے ہیں۔ اگر وہ گذشتہ انتخابات میں کانگریس کی مخالفت کرتے تو آج مسلمانوں کو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔

۴۔ "مسلم مجلس کے قائد ڈاکٹر فریدی اور ان کے ساتھی مسلمانوں کی کانگریس بیزاری پر زور دے رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کانگریس مخالف پارٹیوں کے نمائندوں کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ وہ کسی صورت بھی کانگریس کا ساتھ نہیں دے سکتے ڈاکٹر فریدی کی یہ کوشش اس حد تک پہنچی کہ انھوں نے جن سنگھ کو فسادات کے بارے میں بھی معصومیت کا سرٹیفکیٹ دے دیا۔ جب ڈاکٹر صاحب نے اعلان کیا گذشتہ برس جتنے فسادات ہوئے ہیں ان کا مشاہدہ و مطالعہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ان میں جن سنگھ اور آر۔ ایس۔ ایس کا ہاتھ نہیں تو کنونیشن کے حاضرین کی خاصی تعداد کے چہروں پر ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ یہی فریدی صاحب کچھ عرصہ پہلے تک ان پارٹیوں کو خصوصی طور پر مسلم دشمن قرار دیا کرتے تھے اور کچھ برس پہلے اتر پردیش مسلم مجلس کی کانفرنس کی صدارت کرتے وقت انھوں نے اعلان کیا تھا کہ اگر آر۔ ایس۔ ایس پر پابندی عائد کر دی جائے تو مسلمانوں کے جان و مال کی حفاظت کا مسئلہ حل ہو جائے گا اور مسلم مجلس جیسی علیحدہ مسلم تنظیم کی بھی ضرورت نہ رہیگی"۔

۵۔ "مسلم یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ ۱۹۷۲ء کے بارے میں سبھی نے کہا کہ اس سے یونیورسٹی کے مخصوص کردار پر چوٹ پڑی ہے لیکن کسی نے دلیل دے کر سمجھایا نہیں کہ چوٹ کیونکر پڑی اور مدافعت کیسے ہو سکتی ہے۔ یونیورسٹی کے نظام میں شمولیت لانے کے لئے ایکٹ میں کیسے سدھار ہونے چاہئیں۔ مقررین اپنی تان اس بات پر توڑتے تھے کہ کانگریس کا بائیکاٹ کیا جائے۔ کانگریس کو ووٹ نہ دیا جائے اور آنے والے انتخابات میں کانگریس کو ہرایا جائے۔ کل ملا کر تاثر یہ پیدا ہوتا تھا کہ یہ کوئی کانگریس مخالف سیاسی اجتماع ہے یونیورسٹی کا نام تو محض ایک بہانہ ہے"۔

۶۔ "کنونیشن کے اندر مسلم لیگ اور مسلم مجلس کے آپسی اختلافات بھی منظر عام پر آئے۔ دونوں ہی جماعتیں مسلمانوں کی واحد نمائندہ کہلانے کے لئے کوشاں ہیں چند سال پہلے ایک سمجھوتہ ہوا جس کی رو سے ان کے رہنماؤں نے آپس میں اثر کے علاقوں کا بٹوارہ کر لیا تھا۔ اس لحاظ سے اتر پردیش میں مسلم مجلس ہی سیاسی میدان میں رہتی مسلم لیگ نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی سرگرمیاں جنوبی ہند تک محدود رکھے گی۔ غالباً اسی قسم کی یقین دہانی لیگ کے رہنماؤں نے کانگریس اور کمیونسٹ پارٹی کو دی تھی جب کیرالا میں مخلوط وزارت بنانے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ لیگ اپنے وعدے پر قائم نہیں رہی لہٰذا ڈاکٹر فریدی کے ساتھی مسلم لیگ کو نیچا دکھانا چاہتے تھے۔ سمجھوتہ کرانے میں جماعت اسلامی کا نمایاں ہاتھ تھا کیونکہ جماعت اس بات کے لئے کوشاں ہے کہ مسلمانوں کا متحدہ مورچہ ہونا چاہیے اور مسلم جماعتوں کو آپس کی تکرار بند کرنا چاہیے۔ اس لئے

شروع سے ہی جماعت کے لوگوں نے مسلم لیگ کے مقابلے میں مسلم مجلس کو زیادہ اُبھارا۔ جماعت کے ذمہ دار اصحاب اس بات کے بھی شاکی رہے کہ محنت تو وہ کرتے ہیں روپیہ پیسہ وہ لاتے ہیں اور چودھراہٹ مسلم لیگ والے سنبھال لیتے ہیں۔ بی۔ کے۔ ڈی، سوتنتر پارٹی اور سنڈیکیٹ کے رہنماؤں کو نمایاں حیثیت دینے کے پیچھے ایک یہ جذبہ بھی کار فرما تھا کہ مسلم لیگ اور کانگریس کی دوستی کے سوال کو اُبھارا جائے۔"

۷۔ "یو۔ پی مسلم لیگ کے جنرل سکریٹری بصیر احمد خاں جب اسٹیج پر تشریف لائے تو مجلس کے حمایتیوں نے شور و غل شروع کر دیا۔ وہ ہنگامہ بپا ہوا کہ بصیر صاحب کو تقریر کرنا مشکل ہو گئی۔ مچھلی بازار کا سا سماں بندھ گیا۔ آوازے کسے جانے لگے۔ کچھ فقرے تو ایسے تھے جو شائستگی کی حد سے بھی گزر گئے تھے۔ صدر صاحب لاکھ کوششوں کے باوجود حالات کو معمول پر نہ لاسکے تو مجبور ہو کر کہنے لگے "کیا میں گدھا ہوں۔ اگر آپ میری بات نہیں مانتے تو پھر مجھے یہاں بلانے کی کیا ضرورت تھی؟"

۸۔ "کچھ مندوبین نے مانگ کی کہ مسلم لیگ کیرلا میں مخلوط وزارت سے علیحدہ ہو جائے اس مفہوم کا ایک ریزولیوشن بھی پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔ اگر یہ ریزولیوشن آجاتا تو کنونشن اُکھڑ جاتا لہٰذا اجازت نہیں دی گئی جس پر چند لوگ جو غالباً علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے متعلق تھے واک آؤٹ کر گئے۔"

۹۔ "کنونشن کی تنظیم کا تمام کام پس پردہ جماعت اسلامی انجام دے رہی تھی۔ مسلم لیگ والوں کی دلچسپی اسٹیج سنبھالنے تک محدود تھی۔ آخر میں جب سٹیرنگ کمیٹی بنانے کا سوال آیا تو لیگ اور مجلس کو برابر نمائندگی دینے کی بجائے ایک تیسرا فریق جوڑ دیا گیا یعنی مجلس اتحاد المسلمین حیدرآباد کے سلطان صلاح الدین اویسی کو تیسرا ممبر بنایا گیا۔ صلاح الدین صاحب کو بھی مسلم لیگ سے وہی شکایت ہے جو مسلم مجلس اور جماعت اسلامی کو ہے کیونکہ آندھرا پردیش کا علاقہ سمجھوتے کے مطابق ان کے لئے خالی چھوڑنے کے باوجود مسلم لیگ نے حیدرآباد میں پاؤں پسارنے کی کوشش کی۔"

۱۰۔ "باوجود مخالف پارٹیوں کو جمع کرنے اور ان کے لیڈروں کی اسٹیج پر نمائش کرنے کے کنونشن کے منتظمین آپسی گفتگو میں یہی کہتے سنے گئے کہ بھئی آخر مسلمانوں نے جو لینا ہے وہ ملے گا تو اندرا گاندھی سے ہی لیکن اپنی سیاسی بقا کے لئے علیگڑھ تحریک کو چلاتے رہنا ضروری ہے۔ وہ اس بات کے لئے بے حد خواہش مند نظر آرہے تھے کہ کسی صورت کانگریس کے ساتھ سمجھوتے کی کوئی صورت نکل آئے اور مسلمانوں سے یہ کہہ سکیں کہ ہم نے تمہیں یہ لے دیا۔ ڈاکٹر فریدی کے نہایت قریبی کانگریسی دوست بابو ترلوکی سنگھ کی کنونشن میں موجودگی اس بات کی دلیل تھی کہ لفظی طور پر چاہے کچھ بھی کہیں فریدی صاحب سارے پل توڑ کر نہیں آئے۔"

اس سلسلے میں ندائے ملت لکھنؤ میں شائع شدہ رپورٹ کے مندرجہ ذیل اقتباسات بھی قابل غور ہیں۔

"ڈاکٹر صاحب نے جب کنونشن میں کانگریس دشمن جذبات کا اظہار کیا تو یہ اظہارِ حقیقت ان لوگوں کو ناگوار گزرا جو آج کل کانگریس کے حلیف اور سیاسی میدان میں ملت کے مفاد کو خطرہ میں ڈالنے پر آسانی سے تیار ہو جاتے ہیں۔ کانگریس کے لئے نرم گوشہ رکھنے والوں نے شدت سے فریدی صاحب کی مخالفت کی لیکن مجمع میں سے کچھ "مجاہدین" کو چھوڑ کر سبھی فریدی صاحب کے ہم خیال اور کانگریس کو اس کی وعدہ شکنی کی سزا دینے کے لئے مصر تھے اور سخت سے سخت اقدام کے حامی تھے۔ بحث و مباحثہ میں بڑی تلخی پیدا ہو گئی۔ نوجوان عناصر کسی طرح کانگریس کی حمایت میں ایک لفظ سننے کے لئے تیار نہ تھے۔ وہ فریدی صاحب پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ کانگریس حامیوں سے سختی سے نپٹا جائے مگر فریدی صاحب نے ملت کے وسیع مفاد کے سامنے اپنی پارٹی کے مفاد اور نازک جذبات و احساسات کو پس پشت ڈال کر اس کنونشن کو ایک بڑے المیہ سے بچا لیا اور ایسی تجویز پاس کرانے میں کامیاب ہو گئے جو ٹھنڈی ہونے کے باوجود بھی کانگریس کے ایوان میں زلزلہ پیدا کر رہی ہے۔

اس کنونشن میں یہ بات خاص طور سے نوٹ کی گئی۔ دعوت ناموں کے باوجود کانگریسی مسلم ممبرانِ پارلیمنٹ شریک نہیں تھے۔ ایک سابق وزیر سے جب عدم شرکت کی وجہ پوچھی گئی تو انھوں نے دعوت نامے نہ ملنے کا عذر بیان کیا۔

بعض مقرروں نے ایک پارٹی پر یہ الزام بھی لگایا کہ ہم جماعتوں کو بت بنائیں ان کے مجاور بن جائیں اور انھیں ملت پر مقدم رکھیں۔"

مولانا علی میاں کی اس دردمندانہ اپیل کو سامعین نے بڑی اہمیت دی سامعین اس اپیل سے اس درجہ متاثر تھے کہ وہ ان مقررین کی تقریروں میں اپنی ناپسندیدگی فوراً ظاہر کر دیتے تھے، جو مولانا کی تقریر اور ان کے دیئے ہوئے رہنما اصول کو نظرانداز کر دیتے تھے۔ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ بہت سے مقررین اپنی تقریر کی ابتدا تو مولانا کی تقریر کی تائید سے کرتے، مگر پھیر پھیر کر اپنی پارٹی اور اپنے نظریات کو مسلط کرنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتے، بعض تقریریں سن کر ایسا گمان ہوتا جیسے انعامی مقابلہ کی تقریریں ہوں۔ ایک دل جلے کو تو یہ کہتے سنا گیا کہ فلاں فلاں مقررین کو بہترین تقریر پر خصوصی انعام دینا چاہیئے۔ ایک بزرگ نے جلسہ میں کی گئی انتہائی جذباتی اور اشتعال انگیز تقریروں کو سن کر فرمایا کہ مسلمانوں کے پاس الفاظ کا غیر محدود ذخیرہ ہے جس کو وہ بے دریغ استعمال کر رہے ہیں مجھے نہیں معلوم کہ وہ کونسا وقت تھا جب مسلمانوں نے تقریر کر کے کوئی بڑی فتح حاصل کی تھی کہ آج تک ہم مسلمان اسی نقشِ قدم پہ چلے جا رہے ہیں، جبکہ ہمارے برادرانِ وطن نے اچھے مقرروں کی ٹیم پیدا کرنے کے بجائے ٹھوس اور سنجیدہ کام کیا اور آج وہ سر بلند ہیں۔ ایک مقرر سے جو ہمیشہ اپنی جذباتی تقریروں میں سروں کا قطب مینار کھڑا کرتے ہیں، مولانا علی میاں نے فرمایا کہ خدا نے آپ کو تقریر کی جو صلاحیت دی ہے اس کو تعمیری کاموں میں صرف کیجئے اور مسلمانوں کا ذہن تعمیر کی طرف موڑیئے لیکن کون سنتا ہے فغاں درویش۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۷۲

پروفیسر محمود حسین

علی گڑھ یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ ۱۹۷۲ء نے بعض مسلم حلقوں میں زبردست ہیجان پیدا کر دیا ہے۔ خود یونیورسٹی میں اور اتر پردیش کے بعض مقامات پر اس سلسلے میں حادثے ہوئے جن کا نتیجہ پولیس سے ٹکراؤ اور جان و مال کے نقصان کی صورت میں نکلا۔ اس مسلسل ایجی ٹیشن کا نقطۂ عروج آل انڈیا علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کنوینشن کا ۱۰، اور ۱۱ مارچ کا دہلی اجلاس تھا۔ جیسی کہ توقع تھی، مخالف پارٹیوں مثلاً سوتنتر پارٹی، ایس۔ ایس پی اور تنظیمی کانگریس نے اس موقع کو حکمراں پارٹی کے خلاف اپنے حق میں مسلمانوں کی حمایت حاصل کرنے کے لئے استعمال کیا۔ کنونشن کی ایکشن کمیٹی نے مسلمانوں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ اتر پردیش اور اڑیسہ کے آئندہ انتخابات میں کانگریسی امیدوار کے خلاف ووٹ دیں۔ کنونشن کا اجلاس یہ قرارداد منظور کرکے ختم ہوگیا کہ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی بحالی کے لئے فوری اقدامات کئے جائیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ علیگڈھ مسلم یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ ۱۹۷۲ء کا جائزہ مسلمانوں کے اس مطالبہ کی روشنی میں کیا جائے جو وہ یونیورسٹی کا اقلیتی کردار بحال کرنے کے لئے کر رہے ہیں۔ یہ ایکٹ قانون سازی کا کوئی بہت اچھا نمونہ نہیں ہے، نہ ہئیت کے لحاظ سے نہ مواد کے لحاظ سے۔ اس کی ہر دفعہ کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کو بہت رواروی میں ترتیب دیا گیا ہے۔ یہ اپنے سے پہلے کے کئی ایکٹوں کا ایک معجون مرکب ہے۔ یعنی ۱۹۲۰ء، ۱۹۳۵، ۱۹۵۱ء، اور ۱۹۶۵ء وغیرہ کے ایکٹوں کا، حالانکہ اس نئے ایکٹ کا مقصد ان تمام گذشتہ ایکٹوں کو منسوخ کرکے ان کی جگہ لینا تھا۔ اس کو پڑھ کر شیکسپیئر کے ڈرامے میکبتھ (Macbeth) کی چڑیلوں کی دیگچی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ شیکسپیئر کی خلاقانہ جینیس (Genius) نے دیگچی کے متضاد اجزا کو ایک لڑی میں پرو کر آرٹ کے حسین شاہکار کو جنم دیا جب کہ نئی دہلی کے مسودہ نگاران اجزا کو یکجا نہ کرسکے

اس لئے اس ایکٹ میں ان کو الگ الگ پہچانا جاسکتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی سکریٹری نے اپنے کچھ کلرکوں کی مدد سے راتوں رات سکریٹریٹ میں بیٹھ کر یہ مسودہ تیار کیا جو ان کے خیال میں پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کی نظر میں بغیر کسی گرفت کے اپنی قانونی حیثیت منوا سکتا تھا۔ اور پھر یہ مسودہ صبح کے ناشتہ کے وقت تک آنریبل منسٹر تک پہنچ گیا۔ قبلہ منسٹر صاحب شاید ان لوگوں سے بھی زیادہ رواروی میں تھے اس لئے انھوں نے غور سے دیکھے بغیر لوک سبھا میں پیش کر دیا جہاں وزیر اعظم کی پارٹی کی زبردست اکثریت کے بل بوتے پر (جو انھوں نے گذشتہ الیکشن میں حاصل کی تھی) یہ آناً فاناً میں پاس ہوگیا اور اس طرح یہ دستاویز علیگڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ (۱۹۷۲ء) بن گئی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یونیورسٹی کی کارکردگی پر اس ایکٹ کے کیا اثرات ہوسکتے ہیں اور یہ کہ یونیورسٹی کے اقلیتی کردار سے اس کا کیا جوڑ ہے۔

سب سے پہلے ہم کو یہ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے کہ اس ایکٹ کے ناقدین کی "اقلیتی کردار" جس کی بحالی کے لئے وہ اتنے بے چین ہیں اس سے کیا مراد ہے؟ اگر ان کا مطلب یہ ہے کہ یونیورسٹی میں صرف مسلمان نوجوانوں کو تعلیم دی جائے اور یہاں صرف مسلمان اساتذہ ہی ہوں تو ان کو یہ بات یاد دلانے کی ضرورت ہے کہ ۔۔۔ ۱۸۷۵ء میں جب سرسید نے ایم۔ اے او کالج کی بنیاد ڈالی تھی اس وقت بھی ایسا نہ تھا اور یہ کہ اس قسم کا مطالبہ نہ صرف یہ کہ یونیورسٹی کے تاریخی کردار سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا بلکہ اس کے اصل جوہر اور روح کو بھی مجروح کرتا ہے۔ گذشتہ صدی کی آٹھویں دہائی کے دوران' ہنٹر کمیشن نے یہ اشارہ کیا تھا "اس خالص مسلم ادارے کے مسلمان بانیوں نے اپنے دروازے تمام قوموں اور عقیدوں کے لئے کھلے رکھے ہیں، صرف ہندوؤں نے ہی نہیں، عیسائیوں اور پارسیوں نے بھی اس کے احاطہ میں وسیع المشرب تعلیم حاصل کی ہے یہ ذہنی کشادگی اور وسیع المشربی اس ادارے کے

قوانین اور تعلیم ہی تک محدود نہیں بلکہ اس ادارہ کی ساری زندگی میں جاری و ساری ہے"

بالکل ابتدا سے یہ ادارہ جذباتی ہم آہنگی کا ایک مثالی نمونہ رہا ہے۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کے دوش بدوش اور مساوی بانہ ہر اس ادارے کی فیوض و برکات سے حصہ پایا اور دونوں ایک دوسرے کے جذبات میں شریک رہے۔ حالی نے کیا خوب کہا ہے:

نہیں دیکھا ہو جس نے پیار ہندو اور مسلماں میں
وہ آکر مسلم اور ہندو کو اک جان و دو تن دیکھے

یہ بات صرف طالب علموں پر ہی صادق نہیں آتی ہے بلکہ استادوں پر بھی آتی ہے۔ یہاں کے چند بہترین استاد ہندو اور دوسرے غیر مسلم تھے۔ مشہور زمانہ ماہر ریاضیات چکرورتی، انگریزی کے معروف نقاد اور عالم پروفیسر ریلے، مشہور و معروف عالم اور ڈیولپمنٹ کے ایم بانیکر اور ڈی کوسامبے، مشہور عالم ماہر ریاضیات آندرے ویل اور اپنے زمانے کے سب سے بڑے سماجی علوم کے ماہر ڈی۔ پی۔ مکرجی اس ادارہ میں درس دے چکے ہیں۔

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اپنی ہئیت ترکیبی کے اعتبار سے یہ یونیورسٹی کبھی بھی خالص مسلمان ادارہ نہیں رہی ہے۔ نہ تو طالب علموں کے لحاظ سے اور نہ استادوں کے لحاظ سے۔ اس کا کردار ہمیشہ قومی رہا ہے۔ خود سر سید نے اس ادارے کے سیکولر اور قومی کردار پر بار بار زور دیا۔ ایم۔ اے۔ او کالج مسلم نوجوانوں کو تعلیم دینے کی درس گاہ ہی نہیں تھا، یہ دراصل مسلم ذہن کو فرسودہ عقیدوں اور طرز زندگی سے آزاد کرانے کی ایک تحریک بھی تھا۔ انیسویں صدی کے آخر میں سارے ہندوستان میں جو فکر و خیال کا طوفان جاری تھا اس میں

سر سید نے زندگی کی نئی قدروں کا پرچم بلند رکھا۔ انھوں نے کٹھ ملائیت کے مقابلہ میں وسیع المشربی، رجعت پرستانہ، احیا پسندی کے مقابلہ میں ترقی پسندانہ ارتقا، توہم پرستی کے مقابلے میں سائنس اور مذہبی جنون کے مقابلے میں رواداری کی حمایت کی اور ان کا غلغلہ بلند کیا۔ علیگڑھ کو انھوں نے جاں بلب جاگیردارانہ نظام کے اثرات کے خلاف جنگ کرنے کا موثر حربہ بنا دیا۔ اپنے اس جہاد میں ان کو بڑے بڑے زمین داروں اور ان کے حاشیہ برداروں کی سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ ملاؤں اور مفتیوں نے بھی سر سید کی زبردست مخالفت کی۔ ان کے زبردست صبر و استقلال اور ناقابل تسخیر عزم و ہمت کی وجہ سے ان کو اس جنگ میں جیت نصیب ہوئی لیکن وہ لڑائی جو سر سید نے لڑی اور جیتی ان کے ساتھ ختم نہیں ہوئی۔ آج بھی وہ لڑائی جاری ہے۔ علی گڑھ کے صحت مند اور ترقی پسندانہ کردار کو آج پھر جاگیرداری کی رجعت پسندانہ قوتوں کا سامنا ہے۔

علی گڑھ کے اقلیتی کردار کی بحالی کا مطالبہ —

ایک ایسے کردار کی بحالی، جو کبھی بھی علی گڑھ کا کردار نہیں رہا ہے ——— دراصل مطالبہ ہے مسلمان زمین داروں کا یونیورسٹی پر قبضہ کرنے کا۔ دراصل یہی وہ مطالبہ ہے جس کو ۱۹۷۲ء کا ایکٹ پورا نہیں کرتا۔ پھر یہ کہ اس ایکٹ نے ان اجارہ داروں کے اختیارات کو بہت کم کر دیا ہے اس لئے اس ایکٹ کے خلاف یہ سارا شور و غوغا ہے۔ دراصل یہ واویلا ہے ایک انحطاط پذیر اور دم توڑتے ہوئے طبقہ کا جو کہ عام مسلمانوں کا۔ جن نوجوانوں نے کنونشن میں اس قدر ہنگامہ کیا اور جو یونیورسٹی کیمپس اور اس کے باہر مظاہروں اور ایجی ٹیشنوں میں مصروف ہیں اپنی سادہ لوحی سے ان غیر محتاط مفاد پرستوں کا آلۂ کار بن رہے ہیں۔ اس مطالبہ کو تسلیم کر لینا نہ صرف بزدلانہ طور پر ہتھیار ڈال دینے کے مترادف ہوگا بلکہ اس سے اس ادارے کے بانی کے سچے جذبے کی بھی نفی ہوگی۔

اپریل ۱۹۰۶ء میں سر سید کی برسی کے موقع پر ایم۔ اے۔ او کالج کے طالب علموں سے خطاب کرتے ہوئے نواب محسن الملک نے کہا تھا:

"میرے عزیز دوستو! آپ کو سر سید
کا سچا پیرو کبھی نہ سمجھا جائے گا اگر
آپ نے اس زہریلے مادے کو اپنے
جسموں میں داخل ہونے دیا اور ہندوؤں
اور مسلمانوں میں امتیاز کرنے لگے۔ آپ
کو کالج کا معزز طالب علم سر سید کا
سچا جانشین اور ہمارا محبوب سپوت
اسی وقت سمجھا جائے گا جب آپ
برادران وطن کے ناگوار کاموں کو
نظر انداز کر کے ان کی اچھی باتوں کی
طرف پورے خلوص سے توجہ دیں گے"

بد قسمتی سے طالب علموں سے کبھی کبھی اس وقت غلطی سرزد ہوئی جب انھوں نے اس مشورے پر عمل نہیں کیا ہے۔ اس قسم کی غلطی کی ایک حالیہ مثال کیمپس پر اور پھر کنونشن میں رونما ہوئی۔ طالب علموں کے ایک طبقہ نے ڈاکٹر رئیس احمد کی فیکلٹی آف سائنس کے ڈین کی حیثیت سے برطرفی کے ایجی ٹیشن کے دوران تشدد کا مظاہرہ کیا محض اس وجہ سے کہ ڈاکٹر موصوف نے ایک ایسے نقطۂ نظر کے اظہار کی جرأت کی تھی جو ان طالب علموں کے نقطۂ نظر سے مختلف تھا۔ اس سے بھی زیادہ قابل ملامت وائس چانسلر کی یہ یقین دہانی تھی کہ ڈاکٹر رئیس احمد کو ڈین

کے عہدے سے برطرف کر دیا جائے گا۔ اظہار خیال کی آزادی کے خلاف ناروا داری کی یہ ایک بھدی مثال ہے اور ان تمام باتوں کی نفی کرتی ہے جن کے سرسید علمبردار تھے۔ سرسید کے طرز فکر کا بنیادی اصول سائنٹی فِک ذہنیت کو فروغ دینا تھا۔ وہ تمام معاملات میں معقولیت کی بالادستی کے قائل تھے خواہ وہ معاملات دنیاوی ہوں یا دینی، وہ ضمیر کی آزادی اور اظہار خیال کی آزادی پر یقین رکھتے تھے۔ مسلمانوں کے ذہنوں کو اس زبردست انقلاب کے لئے تیار کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس کام میں ان کو ہر سمت سے مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ ان پر کیچڑ اُچھالی گئی، دشنام طرازی کی گئی۔ کفر کے فتوے صادر کئے گئے سرسید نے بے مثال جرأت اور عزم سے یہ سب کچھ برداشت کیا اور آخر کار ہندوستان میں ذہنی بیداری کا عہد لانے میں کامیاب ہوئے۔

وقت گزرتا رہا اور ایم۔اے۔او کالج ترقی کرتا رہا اور بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کی ضرورت کو کبھی نظر انداز نہ کیا۔ تاریکی کی وہی قوتیں جن کے خلاف سرسید جی توڑ کر لڑتے رہے۔ اور جن پر بالآخر انھوں نے فتح پائی۔ آج پھر علی گڑھ کے خلاف پھر روح سے لڑنے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی ہیں۔ اقلیتی کردار کی بحالی کی مانگ کے پردے میں رجعت پرست جاگیرداری علیگڑھ کو پھر سے اپنے پنجوں میں لینے کے لئے بری طرح ہاتھ پیر مار رہی ہے۔ علیگڑھ کے تمام سچے دوستوں اور بہی خواہوں کو اس مانگ کی پوری قوت سے مزاحمت کرنا چاہیئے اور اس کے اُن سچے آدرشوں کو متوالنے کے لئے جدوجہد کرنا چاہیئے جو سرسید نے اس کے واسطے متعین کئے تھے۔ جب ایم۔اے۔او کالج کا سنگِ بنیاد رکھا جا رہا تھا تو سرسید نے اس کے مستقبل کی تصویر ان الفاظ میں پیش کی تھی۔

"یہ کالج ترقی کر کے ایک دن یونیورسٹی بن جائے گا۔ اس کے فارغ التحصیل ملک کے کونے کونے میں جا کر وسیع القلب رواداری، آزاد تحقیق اور پاکیزہ اخلاق کی تبلیغ کریں گے۔"

یہ تھا وہ کردار جو اس یونیورسٹی کے بانی نے اس کے لئے مقرر کیا تھا اور اس کے کردار کو ہر قیمت پر باقی رکھا جانا چاہیئے، چاہے الیکشن میں تھوڑے سے ووٹ ہی کیوں نہ کھونا پڑیں۔

یہی وہ آدرش ہے جس کو قائم رکھنے کے لئے یہ ادارہ بڑے سے بڑے جوکھم میں بھی کوشش کرتا رہا اور "اقلیتی کردار" کا نعرہ لگانے والے جس کو مٹانے کے درپے ہیں کیونکہ یہ ان کے لئے راس نہیں وہ جانتے ہیں کہ آزاد تحقیق اور سائنٹی فِک طرز فکر ان کے لئے موت کا پیغام ہے۔ برٹرینڈ رسل (Bertrand Russel) نے کیا خوب کہا ہے۔

"لوگ دنیا کی کسی چیز سے، موت سے بھی،
اتنا نہیں ڈرتے جتنا کہ خیال سے۔ خیال
تخریب کار بھی ہوتا ہے اور انقلاب آفریں
بھی۔ تباہ کن بھی اور ہیبت ناک بھی، مراعات
مروجہ رواجوں اور آرام دہ عادتوں کے
ساتھ کوئی اور رعایت نہیں کرتا۔ خیال مزاجی
اور بے لگام ہوتا ہے...... خیال عظیم، برق
رفتار اور آزاد ہوتا ہے، یہی دنیا کی روشنی
اور انسان کی سب سے بڑی عظمت ہے۔"

۱۹۷۲ء کا یونیورسٹی ایکٹ میں یونیورسٹی کے کردار کو تو باقی رکھا گیا ہے لیکن اس جمہوری ڈھانچے کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے۔ یونیورسٹی کی دو خاص بااختیار مجلسیں، یعنی اکیڈمک اور اکزیکیوٹیو کا ونسلیں اس ایکٹ کی رو سے 'بھرتی کی منڈلیاں' ہوں گی جن میں وائس چانسلر کے نامزد کئے ہوئے ممبران کی بھرمار ہوگی۔ وائس چانسلر جو خود وزیر تعلیم کا نامزد کیا ہوا ہوگا۔ اسی وجہ سے بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اس ایکٹ کے تحت، یونیورسٹی وزارت تعلیم کا ایک ضمیمہ بن جائے گی۔ صحیح راستہ یہ ہوگا کہ ۱۹۵۱ء کے ایکٹ کی ان دفعہ کو بحال کیا جائے جن کی رو سے فیکلٹیوں کے ڈین اور شعبوں کے صدر اپنی مدت ملازمت (Seniority) کے لحاظ سے باری باری مقرر کئے جاتے تھے۔ عزت مآب وزیر کو جو خود بھی یونیورسٹی میں صدر شعبہ اور ڈین رہ چکے ہیں اس تبدیلی کی حکمت کو سمجھنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ اسٹوڈنٹس کا ونسل کی تشکیل انتخابات کے ذریعہ ہونا چاہیئے تاکہ یہ حقیقی معنوں میں ان کی نمایندگی کر سکے۔ ورنہ موجودہ ایکٹ کے تحت یہ محض ایک ڈھونگ ہے جس میں صرف وائس چانسلر کے نمایندے ہوں گے۔ اسٹوڈنٹس یونین کی اکزیکیٹو کمیٹی اسٹوڈنٹس کا ونسل کا زیادہ بہتر طریقہ پر رول ادا کر سکتی ہے۔

اقلیتی کردار کی بحالی کے مطالبہ کو تو سرسری طور پر محض اس بنیاد پر مسترد کیا جا سکتا ہے کہ ۱۸۷۵ء میں اس کے قیام سے لے کر اب تک اس کا جو اصلی کردار رہا ہے یہ مطالبہ اس کی نفی کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس بات کو بھی سمجھنا چاہیئے کہ ایکٹ کے خلاف مسلمانوں نے جس شدید ردعمل کا مظاہرہ کیا ہے اس کے اصلی اسباب بہت گہرے ہیں۔ مسلم اقلیت کو حکمراں سے حق بجانب شکایات ہیں جن کا اظہار اس ایکٹ کے خلاف انتہائی شدید ردعمل کی صورت میں ہوا ہے۔ مسلمانوں کے خلاف امتیاز برتا جاتا رہا ہے، ملازمتوں کے معاملے میں امتیاز برتا جا رہا ہے۔ زبان کے معاملے میں —— اردو کو اپنے وطن یو۔پی اور بہار میں تیوری چڑھائی جا رہی ہے —— اور اس سب سے بڑھ کر، جیسا کہ اتر پردیش کے بعض علاقوں میں ہونے والے حالیہ فسادات سے ظاہر ہوتا ہے۔ مسلمانوں پر آر۔ایس۔ایس اور جن سنگھ کے عناصر کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے پولیس نے جو مظالم توڑے ہیں ان کی وجہ سے اس ملک میں مسلمان اپنی جان اور مال کو محفوظ نہیں پاتے۔ شیخ عبداللہ نے کنوینشن میں یہ بات زور دے کر کہی تھی۔ ۱۹۷۲ء کے یونیورسٹی ایکٹ کے خلاف یہ تشدید ردعمل درحقیقت اظہار ہے مسلمانوں کی بے اطمینانی کا اپنی عام حالت پر، جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ ان کی جان اور مال ان لوگوں کے ہاتھوں میں بھی محفوظ نہیں جو امن اور قانون کے محافظ ہیں۔ اصل میں تدارک اسی بڑی صورت حال کا ہونا چاہیئے نہ کہ یونیورسٹی ایکٹ کی اصلاح۔

قصہ ایک پریس کانفرنس کا   بات مسلم لیگ کے انحراف کی

ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

روزنامہ الجمعیۃ دہلی کے خاص نامہ نگار کے قلم سے

[illegible] کے مسلمانوں کے خود ساختہ قائدین کیا کھیل کھیل رہے ہیں۔"

آل انڈیا علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کنونیشن کے اختتام کے بعد ۱۱ مارچ کو کنونیشن کی جائے انعقاد پر ایک پریس کانفرنس بھی ہوئی تھی جس کے ذریعہ کنونیشن کے فیصلوں پر روشنی ڈالنا مقصود تھا۔ الجمعیۃ میں پریس کانفرنس کی تفصیلات تین الگ الگ خبروں میں پیش کی گئی تھی ایک خبر ان میں سے مسلم لیگ کے آئندہ رویہ کے بارے میں تھی کہ وہ کنونیشن کے 'بائیکاٹ ریزولیوشن' کی روشنی میں کیرالا کی وزارت سے الگ نہ ہوگی۔ اس خبر پر تبصرہ کرتے ہوئے مسلم لیگ کے جنرل سکریٹری جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ نے حسب ذیل بیان بغرض اشاعت فرمایا ہے۔

"الحمد للہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کنونیشن نہایت کامیاب رہا اور یہ ملت اسلامیہ کے جذبات و احساسات کا ترجمان ہی نہیں بلکہ ان کے اتحاد عمل کا قابل تحسین مظاہرہ ہے۔ جو بھی فیصلے کنونیشن میں کئے گئے پورے اتفاق رائے سے کئے گئے۔ اخبار الجمعیۃ کے نامہ نگار کی یہ خبر کہ مسلم لیگ کنونیشن کے فیصلوں سے انحراف کرے گی گمراہ کن اور بے بنیاد ہے کہ مسلم لیگ کے ذمہ داروں نے اس قسم کا اعلان کیا غلط ہے کنونیشن کے ریزولیوشن سے جس کی تائید میں نے خود کی ہے یہ بات واضح ہے کہ عدم تعاون کانگریسی وزارتوں سے کیا جائے گا نہ کہ مخلوط وزارتوں سے۔ ریزولیوشن کو عملی جامہ پہنانے کی جو سہ رکنی کمیٹی بنی ہے اس میں بھی مسلم لیگ شامل ہے۔ یہ جدوجہد مسلم لیگ اس وقت تک جاری رکھے گی کہ جب تک کہ موجودہ ایکٹ جس کو ملت نے رد کر دیا ہے واپس نہ لیا جائے اور اس کی جگہ ایک نئے تسلی بخش ایکٹ کے ذریعہ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی اور جمہوری کردار کو برقرار نہ کر دیا جائے۔"

اس بیان پر تبصرہ سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ الجمعیۃ کی وہ اصل خبر بھی آپ کے سامنے رکھ دوں تاکہ آپ مسلم لیگ کے ذمہ دار رہنما کی تردید کی حقیقت کو سمجھ سکیں اور یہ انصاف کر سکیں کہ "الجمعیۃ کی خبر گمراہ کن اور غلط ہے" یا مسلم لیگ کا رویہ گمراہ کن اور غلط ہے؟

خبر کا متن درج ذیل ہے:-

"نئی دہلی۔ ۱۱ مارچ۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کنونیشن نے مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی ہر قسم کی کارروائیوں سے قطع تعلق کرنے کا جو ریزولیوشن پاس کیا ہے مسلم لیگ اس کی پابندی نہیں کرے گی اور وہ بدستور کیرالا میں کانگریس کے ساتھ کولیشن میں شامل رہے گی۔ کنونیشن کے اختتام پر جو پریس کانفرنس ہوئی تھی اس میں مسلم لیگی لیڈروں مسٹر ابراہیم سلیمان سیٹھ ایم۔ پی اور جنرل سکریٹری مسلم لیگ نیز محمد کویا صاحب سابق وزیر تعلیم کیرالا پر اس سلسلے میں سوالات کی بوچھار رہی اور ان سے اس کا کوئی صحیح اور معقول جواب بن نہیں پڑا اور انھوں نے غیر مبہم الفاظ میں یہ واضح کیا کہ وہ کیرالا میں کولیشن برقرار رکھیں گے اور مشکلات پیدا نہ کریں گے۔"

یہ بات نوٹ فرما لیجئے کہ نامہ نگار الجمعیۃ نے اپنی خبر میں بالکل وہی بات اپنے الفاظ میں کہی ہے جو ابراہیم سلیمان سیٹھ صاحب نے فرمائی ہے — یعنی مسلم لیگ

پرالا کی وزارت سے الگ نہیں ہوگی۔"

مزید تبصرے سے قبل پریس کانفرنس کی پوری روداد پیش کرنا بھی ضروری ہوگیا ہے تاکہ قارئین الجمعیۃ "گمراہ کن" تردید کی حقیقت کو اس کے پورے پس منظر میں سمجھ سکیں۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ پریس کانفرنس کی جو باتیں منظرِ اخبار پر لانے کی نہیں تھیں انھیں بھی پیش کیا جائے مسلم لیگ کے جنرل سکریٹری صاحب نے تردیدی بیان جاری کرکے مجھے مجبور کیا ہے کہ اب پوری رپورٹ پیش کروں اور وہ بات جسے ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی نے OFF THE RECORD (یعنی ریکارڈ پر نہ لانے اور اخبار میں رپورٹ نہ کرنے کے لئے) کہہ دیا تھا اسے صحافتی روایات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے قلم بند کروں۔

قارئین کی تشریح کے لئے یہ بتانا ضروری ہے کہ اخباری نامہ نگاروں سے گفتگو کے دوران یا پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے نامہ نگاروں کو اعتماد میں لے کر پریس کانفرنس کرنے والا جس بات کو "آف دی ریکارڈ" کہے، رپورٹنگ میں شامل نہیں کیا جاتا۔ مسلم لیگ کے رویہ کے سلسلے میں بھی کچھ "آف دی ریکارڈ" جملے تھے جواب ریکارڈ پر لائے جارہے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے پریس کانفرنس کی روداد میں صرف وہ حصے پیش کروں گا جو اس سے قبل الجمعیۃ میں نہیں آئے ہیں۔

پریس کانفرنس کی ابتدا جناب شفیق الرحمٰن صاحب کے اس بیان سے ہوئی جو اخبار نویسوں میں پہلے ہی تقسیم کر دیا گیا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے وہ ریزولیوشن اخبار نویسوں کو نوٹ کرایا جس میں مظاہرے اور دوسرے اقدامات کے لئے سب کمیٹی کا ذکر ہے۔

اس کے بعد پہلا سوال میرا تھا کہ کن کن پارٹیوں نے کنونشن کے فیصلوں کی حمایت کرنے کا یقین دلایا ہے۔ شفیق صاحب نے فرمایا "ایس۔ ایس پی، (ڈاکٹر فریدی درمیان میں بولے دونوں گروپ) کانگریس آرگنائزیشن (جو عرف عام میں سنڈیکیٹ کانگریس کہلاتی ہے) بی کے ڈی، ری پبلکن پارٹی اور سوتنتر پارٹی۔"

میں نے سوال کیا "اور جن سنگھ سے بھی کوئی بات ہوئی ہے؟"

شفیق صاحب نے جواب دیا "اس نے کوئی ایشورنس (یقین دہانی) تو نہیں کی۔ اس سے بات چیت چل رہی ہے۔"

میں نے پوچھا "ان پارٹیوں نے کوئی ریزولیوشن پاس کرکے حمایت کا اعلان کیا ہے یا انفرادی طور پر یقین دلایا ہے؟"

شفیق صاحب کی بجائے ڈاکٹر فریدی نے جواب دیا "کسی پارٹی نے ریزولیوشن تو کوئی نہیں کیا البتہ ان کے لیڈر آئے تھے وہ ہمارے اجلاسوں میں شریک ہوئے ہیں اور انھوں نے حمایت کا وعدہ کیا ہے۔"

میں نے سوال کیا "سنڈیکیٹ کانگریس کے لیڈروں میں مرارجی ڈیسائی صاحب کا کیا خیال ہے" (کیونکہ میں جانتا تھا کہ وہ بل کی حمایت کرچکے ہیں)

اس کا جواب بھی فریدی صاحب ہی نے دیا کہ "ان سے ابھی کوئی بات نہیں ہوئی ہے۔"

میں نے پوچھا "پھر سنڈیکیٹ کانگریس کے کس لیڈر سے بات چیت ہوئی ہے؟"

فریدی صاحب نے جواب دیا "بنارسی داس صاحب سے۔"

اس پر میں نے کہا "وہ تو اس ساری چیز کے پیچھے "ماسٹر مائنڈ" (شہ دماغ) ہیں؟"

فریدی صاحب بولے "آپ ایسا ہی سمجھ لیجئے۔"

میں نے پھر سوال کیا "آپ کو یاد ہوگا کہ ۱۹۶۷ء کے الیکشن سے پہلے مسلم مجلس نے ایک انتخابی منشور شائع کیا تھا......

(ڈاکٹر فریدی نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا کہ "مسلم مجلس نے نہیں مسلم مجلس مشاورت نے")

میں نے کہا "جی ہاں۔ مجلس مشاورت نے انتخابی منشور شائع کیا تھا اور اس میں بھی مسلم یونیورسٹی کا مسئلہ شامل تھا بہت سی پارٹیوں کے امیدواروں نے الیکشن میں مسلم ووٹ حاصل کرنے کے لئے اس منشور پر دستخط کرکے حمایت کا یقین دلایا تھا لیکن اس کا جو حشر ہوا آپ کو معلوم ہے؟"

ڈاکٹر فریدی بات کاٹ کر بولے "لیکن اس کا تعلق سینٹر سے ہے۔"

میں نے بھی بیچ ہی میں بات پکڑتے ہوئے کہا "لیکن

اس میں اردو کو اس کا قانونی درجہ دلانے کی بات بھی تھی اور وہ صوبائی حکومت سے تعلق رکھتی تھی اور اتفاق سے آپ کے صوبہ یو۔پی میں ایک ایسی حکومت بن بھی گئی تھی جس میں وہ سب پارٹیاں شامل تھیں جن کے ارکان نے مجلس مشاورت کے مینی فیسٹو پر دستخط کئے تھے کیا وہ لوگ اردو کو اس کا حق

درہم دلاسکے؟

انھوں نے بغیر کسی شرم و حیا کے جواب دیا

"نہیں"

"تو پھر اب ان کی حمایت پر آپ کیسے بھروسہ کر رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

اس کا جواب فریدی صاحب سے بن نہیں پڑا اور انھوں نے صرف یہ کہا "اب یہ لوگ ہماری حمایت کا اعلان کر رہے ہیں تو ہم کیا انھیں انکار کر دیں"

میں نے پھر انھیں توجہ دلائی کہ جس سنڈیکیٹ کانگریس

اس دوران کسی نامہ نگار نے [illegible]
[illegible]
[illegible] الگ ہو جائے گی؟"
انھوں نے جواب دیا "نہیں"
یہاں فریدی صاحب نے لقمہ دیا [illegible]
[illegible] کانگریس وزارت نہیں ہے
[illegible] کمیونسٹ ہے"

کے بنارسی داس صاحب آج آپ کی مدد کر رہے ہیں کیا کل ان کی حکومت نے جس میں وہ بھی شامل تھے اور بھیا کرپلانی چیف منسٹر تھیں ۱۹۶۵ء کے واقعہ کے سلسلہ میں گرفتار طلبا کو رہا تک کرنے سے انکار نہیں کر دیا تھا؟"

اس کا کسی نے کوئی جواب نہیں دیا اور فریدی صاحب جن کے میں بالکل سامنے بیٹھا تھا اور جن سے میں مخاطب بھی تھا دوسری طرف متوجہ ہو گئے۔

اس دوران کسی نامہ نگار نے ابراہیم سلیمان سیٹھ سے سوال کیا کہ "کیا کنونشن کے فیصلہ کے بعد مسلم لیگ کیرالا کی حکومت سے الگ ہو جائے گی؟"

انھوں نے جواب دیا "نہیں"

یہاں فریدی صاحب نے لقمہ دیا "ارے بھائی کیونکہ وہاں کانگریس وزارت نہیں ہے بلکہ کمیونسٹ وزارت ہے چیف منسٹر کمیونسٹ ہے" اور اس کے ساتھ نامہ نگاروں کی طرف رخ کرتے ہوئے بولے "میں آپ کو دے رہا ہوں یہ آف دی ریکارڈ ہے"

اس پر میں نے کہا "یہ تو آپ نے 'لوپ ہول' تلاش کر لیا ہے اور اقتدار سے چمٹے رہنے کے لئے ایک عذر ہے"

فریدی صاحب نے برجستہ کہا "ساری دنیا ہی 'لوپ ہول' پر قائم ہے"

اس کے دوران کسی نامہ نگار نے کیرالا کے مسلم لیگی لیڈر اور سابق وزیر تعلیم مسٹر محمد کویا سے (جو اب ایم۔پی ہو کر آگئے ہیں) کوئی سوال پوچھا جس کے جواب میں کویا صاحب نے کچھ ہچکچاہٹ کے بعد کہا "آپ یہ توقع دیکھیں کہ مسلم لیگ وہاں کوئی DILEMMA (مشکلات) پیدا کرے گی" حقیقت یہ ہے کہ مسلم لیگی لیڈران سوالات کو فیس نہیں کر سکے اور ان سے جواب نہیں بن پڑ رہا تھا۔

یہاں میں نے فریدی صاحب سے پھر ایک سوال کیا کہ "کیا آپ نے ایک خالص تعلیمی مسئلہ کو سیاسی اکھاڑے میں پولیٹیکل پارٹیوں کے ایکسپلائیٹیشن کے لئے نہیں پھینک دیا ہے؟"

فریدی صاحب نے جواب دیا "کونسا مسئلہ پولیٹیکل نہیں ہے" اس پر میں نے کہا "میں محسوس کرتا ہوں کہ دراصل یہ ۱۹۷۴ء میں ہونے والے یوپی کے انتخابات کی تیاری ہے۔

ڈاکٹر فریدی نے کسی جھجک کے بغیر جواب دیا۔

"آپ صحیح سمجھتے ہیں اور ہم کانگریس کو ایک سبق دینا چاہتے ہیں"

اب اس تفصیل کے بعد میں صرف ایک جملہ میں یہ

[illegible] سوال کیا کہ "کیا آپ نے ایک خالص تعلیمی مسئلہ کو سیاسی
اکھاڑے میں پولیٹیکل پارٹیوں کے [illegible] کے لئے نہیں پھینک دیا ہے؟"
فریدی صاحب نے جواب دیا کہ "کونسا مسئلہ پولیٹیکل نہیں ہے؟" اس پر میں نے کہا "میں
محسوس کرتا ہوں" دراصل [illegible] میں ہونے والے یو۔پی کے انتخابات کی تیاری ہے
فریدی صاحب نے [illegible] جواب دیا "آپ صحیح سمجھتے ہیں اور ہم کانگریس کو ایک
سبق دینا چاہتے ہیں"

واضح کرنا چاہتا ہوں کہ میری خبر اور ابراہیم سلیمان سیٹھ صاحب کے بیان میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں ہے میں نے وہی لکھا ہے جس کے لئے سیٹھ صاحب نے ایک سیاسی حیلہ تلاش کر لیا ہے کہ کیرالا کی حکومت کانگریس حکومت نہیں

[illegible] میں بات پڑھتے ہوئے
[illegible] کا تعلق [illegible]
[illegible] حکومت
[illegible] اتفاق سے آپ کے [illegible]
[illegible] حکومت [illegible]
[illegible] شامل تھیں جن کے ارکان نے
[illegible] کئے تھے
[illegible] درجہ دلا سکے؟"
[illegible] بغیر کسی شرم و حیا کے جواب
دیا "نہیں"

ہے اس لئے اس سے علیحدگی کا سوال پیدا نہیں ہوتا اسی حیلہ کو میں نے اپنی خبر کی سرخیوں میں یوں واضح کر دیا تھا کہ مسلم لیگ کنونشن کے فیصلوں سے انحراف کرے گی اس لئے کہ ایمانداری سے فیصلہ کا تقاضہ یہ ہے کہ مسلم لیگ وزارت سے باہر آئے اگر وہ ایسا نہیں کرتی تو میں نے گمراہ نہیں کیا مسلم لیگی لیڈر مسلم عوام کو گمراہ کر رہے ہیں۔ اور مسلم لیگ کا اقتدار سے چمٹے رہنا کوئی نئی بات نہیں، کیرالا میں وہ ۲۵ برس سے یہ کھیل کھیل کر مسلمانوں کو بے وقوف بنا رہی ہے وہ کانگریس کے ساتھ بھی وزارت میں رہی۔ پی۔ایس۔پی کی وزارت میں بھی شامل رہی۔ مارکسی کمیونسٹوں کی وزارت میں بھی شامل رہی اور آج سی۔پی۔آئی کانگریس کولیشن میں بھی شامل ہے اور اس طرح وہ کانگریس کے ساتھ تعاون کر کے حکومت برقرار رکھے ہوئے ہے ــــــ یہ سیاست دانوں کی بازی گری ہے اور اس طرح۔

ہوتا ہے شب و روز تماشہ میرے آگے

بنگلہ دیش کے عوام کے لئے ۷ مارچ انتخابات کا دن تھا

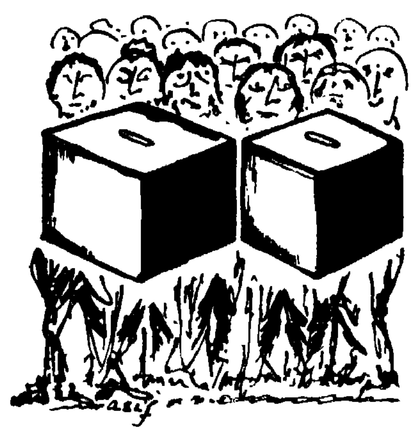
لیکن صدر بھٹو کے لئے یہ دن تھا ریفرینڈم کا۔ چند ہفتے پہلے جب صدر بھٹو سے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے مسئلہ پر ملک میں ریفرنڈم کرانے کا مطالبہ کیا گیا تو انھوں نے کہا تھا کہ ریفرینڈم موجودہ پاکستان میں نہیں بلکہ سابقہ مشرقی حصہ میں ہونا چاہئے اور اسی لئے وہاں انتخابات کرائے جا رہے ہیں۔ انتخابات کے نتائج کی صورت میں شیخ مجیب الرحمٰن کی جماعت عوامی لیگ کو شاندار اکثریت حاصل ہوئی ہے۔ تین سو نشستوں میں سے ۲۹۱ نشستیں حاصل کر کے عوامی لیگ نے ثابت کر دیا ہے کہ دو برس پہلے جو اکثریت اسے حاصل ہوئی تھی وہ محض اتفاقیہ نہیں تھی۔ بنگلہ دیش کے عوام آزادی کے پہلے برس کے اختتام پر شیخ مجیب الرحمٰن اور عوامی لیگ کے اتنے ہی حامی ہیں جتنے کہ دو برس پہلے تھے۔ ۷ مارچ بنگلہ دیش کی تاریخ کا اہم دن ہے۔ اسی دن دو برس پہلے ڈھاکہ میں شیخ مجیب کے بیباک لہجے نے عوام کے دلوں میں شمع آزادی روشن کی تھی۔ اور اسی دن اس برس آزاد بنگلہ دیش کے پہلے عام انتخابات ہوئے۔ دو برس پہلے اسی دن نے برصغیر کی فضاؤں کو آزادی کی للکار سونپی تھی اور اب اسی دن نے آزادی کی بنیادوں کو مستحکم کیا ہے۔

صدر بھٹو ان انتخابات کو ریفرینڈم سمجھیں یا کچھ اور حقیقت یہ ہے کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے فیصلہ کو التوا میں رکھنے کے لئے انھوں نے ان ہی انتخابات کا سہارا لیا تھا۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ اس وقت ان کے دل میں کیا تھا، صدر بھٹو کے دل کی بات جان لینا یوں بھی خاصا مشکل ہے۔ ایک تاثر یہ ہے کہ انھیں آزادی کے پہلے ہی برس میں شیخ مجیب کی مقبولیت کا جادو ختم ہونے کی امید تھی۔ لیکن ایک اور تاثر یہ بھی ہے کہ صدر بھٹو پاکستانی عوام پر واضح کرنا چاہتے تھے کہ اپوزیشن خصوصاً اسلام پسند جماعتوں کی طرف سے جو یہ ہوا باندھی جا رہی تھی کہ شیخ مجیب کا اقتدار محض ڈھاکہ تک محدود ہے خام خیالی کے سوا کچھ نہیں۔ دونوں ہی صورتوں میں یہ خام خیالی چاہے صدر بھٹو کی ہو یا اسلام پسند جماعتوں کی بنگلہ دیش کے حالیہ انتخابات کے نتائج کی روشنی میں دور ہو جانی چاہئے۔

سیکولر ڈیموکریسی



ابو سعید چودھری



ریفرنڈم بھی ہو چکا

ہمارے سیاسی مبصر کے قلم سے

پاکستانی عوام کے ذہنوں کو پراگندہ کرنے کے لئے لاکھ کہا جائے کہ پاکستان کی موجودہ صورتِ حال پاکستانی سیاست کا پھل نہیں، لیکن اس حقیقت کو کون جھٹلا سکتا ہے کہ بنگلہ دیش کے عوام نے پاکستان کی زندگی کے ۲۵ برس پورے ہونے سے پہلے ہی نظریۂ پاکستان کو نہ صرف رد کیا بلکہ نفرت اور استحصال سے آزادی کے فیصلہ کی تصدیق و توثیق بھی کر دی ہے۔ پاکستانی عوام کو صحت مند نقطۂ نظر سے ہمیشہ دور رکھا گیا ہے بنگلہ دیش کی جنگ آزادی کے حقائق یحییٰ خاں نے چھپا کر رکھے وہ تو فوجی آمر تھا۔ صدر بھٹو عوام کے نمائندہ ہیں ان کی حکومت کی جمہوری حیثیت سے کسی کو انکار نہیں، لیکن اس کے جمہوری کردار کا ثبوت کم ہی ملتا ہے کیونکہ اس نے بھی بنگلہ دیش کے بارے میں منفی خبروں کو ہوا دی۔ بنگلہ دیش کے بارے میں جذباتیت کا دور ختم کرنے کی بجائے ایسا تاثر دیا گیا کہ وہاں عوام ماضی کو لوٹانے کے لئے کوشاں ہیں۔ انتخابات سے چند دن پہلے تک پاکستانی عوام کو جو خبریں ملتی رہیں ان کی ایک جھلک مندرجہ ذیل اقتباسات میں ملتی ہے۔

”مشرقی پاکستان کے وہ لوگ جنھوں نے اپنی قوم کو بنگالیت کے راستے پر ڈالا تھا۔ انھوں نے ۷ کروڑ مسلمانوں کو تباہی سے دوچار کر دیا ہے اب وہ اس کی سزا بھگت رہے ہیں۔ صرف ایسٹ پاکستان ریلوے میں ۷ ہزار ہندو بھارت سے لا کر مسلط کر دیئے گئے ہیں اور ۷ ہزار مسلمان ملازمین کو نکال باہر کیا گیا ہے۔ اسی طرح نیم فوجی تنظیموں میں ۸۰ فیصد ہندو رکھے گئے ہیں اور ۲۰ فیصد مسلمان۔ بھارت نے وہاں کے مسلمانوں کو رفتہ رفتہ اس طرح کس دیا ہے کہ عظیم اکثریت میں ہونے کے باوجود وہ آواز تک بلند نہیں کر سکتے۔“

(بانی جماعت اسلامی۔ مولانا مودودی۔ نوائے وقت ۸ فروری)

”بنگلہ دیش میں عوامی لیگ کے دو اور حامیوں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ فوج کی نگرانی میں انتخابات کرانے کے لئے انتظامات کر لئے گئے۔“ (نوائے وقت ۲ مارچ)

”اس میں کوئی شک نہیں کہ مشرقی و مغربی پاکستان کے مابین صدیوں پرانے رشتے ہیں۔ دونوں حصوں کے لوگ مشترکہ جہاد میں شریک رہے ہیں۔ اسلامی اخوت کے اس صدیوں پرانے رشتہ کو پھر جوڑا جا سکتا ہے جیسا کہ صدر بھٹو نے کہا ہے۔

ہماری تو یہی تمنا ہے کہ بھائی بھائی پھر شیر و شکر ہو جائیں۔ مشرقی پاکستان کے عام مسلمانوں کا بھی یہی تاثر اور یہی خواہش ہو گی لیکن سوال یہ ہے کہ جن طاقتوں نے مشرقی پاکستان کو ہم سے جبراً الگ کیا ہے اور اسے اپنی منڈی بنا کر اسے دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہی ہیں کیا وہ مشرقی پاکستان کے عوام کو یہ اجازت دیں گی کہ وہ یہ ٹوٹا ہوا رشتہ از سر نو جوڑ لیں؟"

(اداریہ۔ نوائے وقت۔ ۹ر مارچ)

نوائے وقت اسلام پسند جماعتوں کا حامی ہے ہو سکتا ہے اسی تاثر کی بنا پر ان اقتباسات کو قابل توجہ نہ سمجھا جائے۔ مگر امروز تو ٹرسٹ کا اخبار ہے اور سرکاری کنٹرول میں ہے اس کا رخ اور رجحان بھی تنگ نظری کی طرف ہے۔

"بنگلہ دیش میں انتخابات کے دوران ہنگاموں کا خطرہ' اہم مقامات پر فوج متعین کر دی گئی"۔

(اہم شہ سرخی۔ امروز۔ ۶ر مارچ)

"بنگلہ دیش میں انتخابی مہم کے دوران ۵۵ سیاسی کارکن ہلاک' دو سو سے زائد زخمی نیشنل سوشلسٹ پارٹی کے دو سو ارکان لاپتہ ہیں"۔ (امروز۔ ۷ر مارچ)

"بنگلہ دیش میں مجیب کے حامیوں اور مخالفوں میں خون ریز تصادم۔ متعدد افراد زخمی"۔

(اہم ترین شہ سرخی۔ امروز ۸ر مارچ)

بات محض اخبارات تک ہی محدود نہیں۔ حکومت پاکستان عوامی ذہن کو اس مسئلہ پر دھندلانے میں اخبارات سے پیچھے نہیں ہے۔ "نوائے وقت کے ۹ر مارچ کے اداریئے کا محرک ہے صدر بھٹو کا وہ انٹرویو جو انھوں نے جاپانی ٹیلیویژن کو دیا اور جو بنگلہ دیش کے انتخابات سے محض دو دن پہلے پاکستانی اخبارات میں شائع ہوا۔ صدر بھٹو نے کہا تھا کہ "اگر صدیوں کے بعد دونوں حصوں کے عوام کے درمیان اب رابطہ ٹوٹ گیا ہے تو اسے مشرقی پاکستان کی خواہش کے مطابق دوبارہ بحال کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم دوبارہ متحد ہونا چاہتے ہیں لیکن اگر مشرقی پاکستان کے عوام ایسا نہیں چاہتے تو پھر ہم ان کے ساتھ کم از کم بہتر تعلقات قائم کر سکتے ہیں۔ ہم مشرقی پاکستان کے عوام کی کامیابی کے خواہاں ہیں ہم چاہتے ہیں کہ وہ اپنی مشکلات پر قابو پا لیں۔ کیونکہ ایسے



شیخ مجیب الرحمٰن

تاریخی رابطے جو مذہب، ثقافت اور کئی دوسری مشترکہ اقدار پر مبنی ہوں، اتنی جلد ختم نہیں ہو سکتے"۔

صدر بھٹو کے مقابلے میں کہیں زیادہ سلجھا ہوا لہجہ ممتاز پاکستانی صحافی جناب حبیب الرحمٰن کا ہے۔ وہ ۴ر مارچ کے 'اخبار جہاں' میں "مرکزی دارالحکومت سے ایک خط" میں لکھتے ہیں "اگلے ہفتے جب بنگلہ دیش میں نئے آئین کے تحت عام انتخابات مکمل ہو جائیں گے اور اس دیش کے عوام اپنی آزادی کے فیصلے پر ایک جمہوری عمل کے ذریعے مہر تصدیق ثبت کر چکے ہوں گے تو صدر بھٹو کے لئے قومی اسمبلی سے مطلوبہ فیصلہ حاصل کرنا اور آسان ہو جائے گا اور اس فیصلے کے بعد ہی شملہ معاہدہ کی باقی دفعات پر عمل درآمد کے لئے بھارت سے مذاکرات کا دور شروع ہو گا کہ ان متوقع اقدامات کی مخالفت میں اندرون ملک جس جماعت کی طرف سے زیادہ خطرہ ہو سکتا تھا اس سے نپٹنے کا جو اہتمام ہوا ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ باقی کسی قابل ذکر پارٹی خاص کر نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت العلمائے اسلام سے اس معاملے میں کوئی خدشہ اس لئے نہیں کہ یہ دونوں جماعتیں بہرحال پہلے ہی دن سے یہ مطالبہ کرتی آ رہی ہیں کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا جائے اور پڑوسی ملکوں کے ساتھ تمام جھگڑے نپٹا کر امن و آشتی کے ایک نئے دور کا آغاز کیا جائے۔ ان جماعتوں کے لئے اگرچہ وہ اس وقت صدر بھٹو سے دیگر وجوہ کی بنا پر ناراض ہیں، بنگلہ دیش اور بھارت کے ساتھ تعلقات کے معاملے میں اپنا دیرینہ موقف تبدیل کر لینا ممکن نہ ہو گا۔ اس لئے ان جماعتوں کے سیاسی عقائد و نظریات کی تاریخ کافی طویل ہے"۔

بنگلہ دیش کے انتخابات کے نتائج کا اعلان ہونے کے بعد خبروں کا رخ قدرے بدلا منفی خبریں شائع کئے جانا ممکن نہ تھا۔

پھر بھی نوائے وقت کا ۱۱ر مارچ کا اداریہ اپنی پرانی روش اختیار کئے ہوئے ہے۔ انتخابات کے نتائج کا اعلان ہونے کے باوجود نوائے وقت بنگلہ دیش کو نام نہاد بنگلہ دیش کہتا ہے۔ "نام نہاد بنگلہ دیش میں عام انتخابات کے جو نتائج منظر عام پر آئے ہیں انھیں غیر متوقع قرار نہیں دیا جا سکتا۔ انتخابات سے قبل اور ان کے دوران عوامی لیگ نے جو ہتھکنڈے استعمال کئے ان کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا؟ مخالف امیدواروں کو بد ترین قسم کی غنڈہ گردی کا نشانہ بنایا گیا۔ بیشتر مقامات پر بیلٹ بکس اٹھائے گئے اور بعض انتخابی حلقوں میں مخالف امیدواروں کو اغوا تک کر لیا گیا۔ نظریہ پاکستان اور اسلام پر یقین رکھنے والوں پر پہلے ہی انتخابات میں حصہ نہ لینے کی پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ ان حالات میں ۲۵ سے ۳۰ فیصد ووٹروں نے اپنا ووٹ استعمال کیا۔ اگرچہ سرکاری طور پر یہ تناسب ۵۰ فیصد بتایا گیا ہے۔ عوامی لیگ کو جو "عظیم کامیابی" حاصل ہوئی ہے اس میں ہندوؤں کے ۲۰ فیصد اور عوامی لیگ کے حامی قوم پرست اور لادینیت کے طرفدار مسلمانوں کے زیادہ سے زیادہ ۵ سے ۱۰ فیصد تک ووٹ شامل ہیں"۔

نوائے وقت کے اداریہ کا غیر منطقی اور غیر صحتمندانہ انداز ہی ان مشکلات کا سبب ہے کہ جو برصغیر کی موجودہ صورت حال کو الجھائے ہوئے ہے۔ وہ ملک کہ جسے دنیا کے تقریباً ایک سو ملک تسلیم کر چکے ہیں وہ نوائے وقت کی نظر میں نام نہاد ہے۔ جن انتخابات کے نتائج کی صحت پر نہ صرف بنگلہ دیش کے عوام کو بھروسہ ہے بلکہ جن کا خیر مقدم دنیا بھر میں کیا گیا ہے انھیں تنگ نظری، تعصب اور مذہبی جنونیت کی عینک سے دیکھنے کی ایسی کوششیں ہی پاکستانی عوام کو صحیح نقطہ نظر اپنانے سے روکے ہوئے ہیں۔ شیخ مجیب

سیکولر ڈیموکریسی

اور عوامی لیگ کی اسقدر شاندار کامیابی کے پیچھے نوائے وقت کو محض اقلیت ہی نظر آتی ہے۔ ساڑھے سات کروڑ عوام کی نمائندہ تحریک جس نے بنگلہ دیش کو ایک نوآبادی سے آزاد ملک و قوم کا روپ دیا۔

پاکستان ٹائمز نے ۱۰ مارچ کے اداریے میں حقیقت پسندی کو اپنایا گیا ہے" پیشگوئیوں کے عین مطابق شیخ مجیب کی عوامی لیگ نے بنگلہ دیش کے انتخابات میں زبردست کامیابی حاصل کی ہے۔ یہ کامیابی اتنی ہی بھرپور ہے جتنی کہ دسمبر ۱۹۷۰ء میں حاصل ہوئی تھی۔ اپوزیشن کی طرف سے انتخابات میں بددیانتی کے الزامات لگائے جارہے ہیں لیکن یہ روبہ ترقی پذیر ممالک میں اکثر دیکھنے میں آیا ہے جس کی آڑ میں شکست خوردہ عناصر جھینپ مٹانے کے لئے ایسے الزامات کا سہارا لیتے ہیں۔ جن ذرائع کا عوامی لیگ نے استعمال کیا وہ تمام ذرائع اگر اپوزیشن کو بھی میسر ہوتے تو نتائج کی صورت موجودہ صورت سے شاید ہی مختلف ہوتی"۔

ڈان میں جناب ایس۔ آر غوری کا طنز و مزاح سے بھرپور خصوصی مضمون بھی شائع ہوا ہے جس میں لکھتے ہیں" ہماری تمام تر کاوشوں اور خام خیالیوں کے باوجود شیخ مجیب الرحمٰن انتخابات کی دوڑ میں تقریباً تمام پارلیمانی نشستیں لے لوٹے ہیں۔ اس بھرپور اور شاندار کامیابی کے لئے شیخ مجیب کو کوئی خاص کوشش کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ شاید بنگلہ دیش میں آج کل ہمارے اخبارات نہیں پہنچ رہے ہیں۔ لیکن بنگلہ دیش کے انتخابات سے میرے اس اعتقاد کو تقویت ملی ہے کہ جب ہمارا آئین منظور ہو جائے گا تو نئے پاکستان میں بھی نئے انتخابات ضرور ہوں گے۔ آیئے ہم بھی یہ منزل طے کریں"۔

ایس۔ آر۔ غوری اپنے مخصوص ہلکے پھلکے انداز میں پیپلز پارٹی کی بھرپور اور شاندار جیت کی امید کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن صدر بھٹو کے نشریات اور اطلاعات کے وزیر مولانا کوثر نیازی ناصر باغ لاہور کے جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے نئے انتخابات کے مطالبات کو بے معنی قرار دیتے ہیں۔ ان کی رائے میں بنگلہ دیش میں نئے انتخابات ناگزیر تھے" بنگلہ دیش نے وفاقی نظام کو چھوڑ کر وحدانی نظام اور اسلام کو چھوڑ کر سیکولر نظریہ اپنا لیا ہے اس لئے وہاں انتخابات ناگزیر تھے۔ پاکستان میں ایسی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی پھر یہاں انتخابات کی عیاشی دوبارہ کیوں کی جائے اور غریب ملک کا خزانہ کیوں ضائع کیا جائے"۔

مولانا کوثر نیازی انتخابات کو عیاشی قرار دینے کا جواز یہ پیش کرتے ہیں کہ" حقیقت یہ ہے کہ پاکستان جغرافیائی لحاظ سے گو سکڑ گیا ہے لیکن تاریخی اعتبار سے اس کی عظمت میں اضافہ ہوا ہے۔ ہمارا جغرافیہ بدلا ہے، تاریخ نہیں بدلی"۔

اب بنگلہ دیش کے انتخابات کے نتائج سے پاکستان میں یہ سوال ابھرا ہے کہ کیا ہم بنگلہ دیش کی جداگانہ حیثیت کو تسلیم کرنے میں بدستور لیت و لعل کرتے رہیں گے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو کیا ہم نے اس کے مضرات پر سنجیدگی سے غور کیا ہے؟ اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ ہمیں بنگلہ دیش سے کئی معاملات طے کرنے ہیں ان میں پاکستانی جنگی قیدیوں کی رہائی اثاثوں کی تقسیم، قرضوں کی ادائیگی سے متعلق ذمہ داریوں کا یقین اور برصغیر میں حالات کو معمول پر لانے کے مسئلے بنیادی اور خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ ہم نے جنگی قیدیوں کی رہائی کے لئے عالمی رائے عامہ کو ہموار کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ لیکن یہ بھی تو حقیقت ہے کہ اس کے واضح فیصلوں کے باوجود کشمیر اور مشرقی وسطیٰ کے علاوہ کئی دوسرے بین الاقوامی تنازعے طویل عرصے سے حل طلب چلے آرہے ہیں۔ زود یا بدیر ہمیں یہ طے کرنا ہوگا کہ بنگلہ دیش سے معاملہ فہمی کا کون سا انداز یا طریقہ موثر ہوسکتا ہے"۔ (امروز ۱۱ مارچ۔ اداریہ)

امروز پاکستانی عوام کو عمل کی دعوت دیتا ہے لیکن نوائے وقت صورت حال کو مسخ کرکے پیش کرتا ہے اور التوا کا مزید سہارا لینے کا مشورہ دیتا ہے۔ قارئین جانتے ہیں کہ یہ انداز فکر مولانا مودودی اور دیگر اسلام پسندوں کا ہے۔ نوائے وقت لکھتا ہے۔

" نام نہاد بنگلہ دیش کے عام انتخابات میں اصل کامیابی بھارت کو حاصل ہوئی ہے اور حقیقی انتخابات اور ان انتخابات میں اتنا ہی فرق ہے جتنا اصل اور نقل میں ہوتا ہے۔ بہرکیف پاکستان کو فی الحال بہتری کی کوئی توقع نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ شیخ مجیب کا کہنا تو یہ ہے کہ پاکستان سے اس کی جنگ ختم ہوچکی ہے لیکن دشمنی ابھی ختم نہیں ہوئی وہ غالباً پاکستان سے دشمنی کا کوئی ساز منصوبہ بنائے ہوئے ہیں۔ یہ انتخابات جن حالات میں ہوئے اور وہاں کے مسلمانوں نے جس عدم دلچسپی کا مظاہرہ کیا اس کی روشنی میں ہمارے لئے مایوسی کی بھی کوئی وجہ نہیں۔ ہمیں اپنی تمام تر توجہ باقی ماندہ پاکستان کو خوشحال، مستحکم اور مضبوط بنانے کی طرف مبذول کردینی چاہیئے۔ اگر ہم نے ملک کے اساسی نظریہ کے تحت پاکستان کی عمارت کو تعمیر کرلیا تو ہماری ترقی، خوشحالی اور سر بلندی یقینی ہے۔ اس طرح بھارتی طلسم بھی پاش پاش ہوکر رہ جائے گا"۔

نوائے وقت اس نظریۂ پاکستان کے تحفظ پر مصر ہے کہ جسے ۲۵ برس کے اندر اندر پاکستان کی اکثریت نے رد کردیا۔ یہ روزنامہ اور اس کی سرپرستی اسلام پسند جماعتیں اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے جھجکتی ہیں کہ جس بنیاد پر پاکستان قائم ہوا تھا اس بنیاد کو وقت نے غلط ثابت کردیا ہے۔ ان کے لئے یہ سمجھنا بھی مشکل ہے کہ نئے حقائق کی روشنی میں باقی ماندہ پاکستان کو نئی بنیاد تلاش کرنا ہوگی۔

نوائے وقت کی تنگ نظری سے پاکستان کے دیگر اہم اخبارات محفوظ ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ جو عناصر برصغیر میں تصادم کے حامی ہیں پاکستان میں اب وہ اقلیت میں ہیں۔ اس کے علاوہ یہ تاثر بھی عام ہے کہ پاکستانی عوام کشیدگی اور تناؤ کی زد سے نکلنا چاہتے ہیں۔ کراچی کے ممتاز اردو ہفت روزہ "اخبار جہاں" کے مدیر جناب محمود شام جو پچھلے دنوں نئی دہلی تشریف لائے تھے پاکستانی عوام کی اس خواہش کا ذکر بار بار کرتے ہیں کہ اب برصغیر میں امن اور اشتراک کا دور شروع ہونا چاہیئے محمود شام تو ڈھاکہ جانے کا بھی ارادہ رکھتے تھے۔

پاکستانی صحافت کا انداز فکر گویا تو اپوزیشن نے

ایک دلچسپ پیش کش کی۔ پاکستان مسلم لیگ کے رہنما سردار شوکت حیات خاں نے ۱۰ مارچ کو راولپنڈی میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ وہ پاکستان کے دونوں حصوں کو متحد کرنے کے لئے بنگلہ دیش جانے کو تیار ہیں۔ لیکن اس کے لئے حکومت کو اس بات کی وضاحت کرنی چاہیئے کہ آیا وہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنا چاہتی ہے یا دونوں کو دوبارہ متحد کرنا چاہتی ہے " صدر بھٹو خود شیخ مجیب سے رابطہ قائم کریں۔ اگر وہ نہیں کرسکتے تو میں ڈھاکہ جانے کو تیار ہوں مگر مجھے بتایا جائے کہ میں مذاکرات میں کہاں تک جاؤں اور کس اتھارٹی سے بات کروں۔ انتخابات سے بنگلہ دیش کی صورت حال بدل گئی ہے"۔

سردار شوکت حیات خاں پاکستانی سیاست کی اہم شخصیت ہیں لیکن ان کی پیش کش سے ان کے سیاسی نقطہ نظر کی پختگی کا پتہ نہیں ملتا۔ پنجاب کے وزیر جیل جات ملک حاکمین خاں نے اگلے ہی دن ایک بیان کے ذریعہ سردار شوکت حیات خاں کے اس دعوے کو مضحکہ خیز قرار دیا کہ وہ شیخ مجیب کو دوبارہ پاکستان متحد کرنے پر آمادہ کر سکتے ہیں۔ بنگلہ دیش کے نئے انتخابات کے بعد جو اقدام پاکستان کی طرف سے ہونا چاہیئے تو اس کی کوئی صورت نہیں نظر آئی البتہ بے تکے پہلوؤں پر بحث میں وقت ضائع کیا جا رہا ہے۔ کہیں تو شیخ مجیب پر بے پناہ بھروسہ کیا جا رہا ہے اور کہیں انھیں راہ کا روڑا قرار دیا جا رہا ہے۔ راولپنڈی کے اخبار دی نیو ٹائمز کا اداریہ ملاحظہ فرمائیے۔

" ہمیں ڈر ہے کہ جب تک شیخ مجیب بنگلہ دیش میں برسر اقتدار ہیں بنگلہ دیش کے ساتھ ہمارے تعلقات کے معمول پر آنے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ اب تو یہ خبریں موصول ہو رہی ہیں کہ بنگلہ دیش کے عوام شیخ مجیب کے خلاف بغاوت کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ کوئی بھی قوم محض نعروں پر زندہ نہیں رہ سکتی۔ مکتی باہنی کے سابق لیڈر میجر جلیل اور عبدالرب شیخ مجیب کے خلاف آواز اٹھانے میں پیش پیش ہیں۔ مولانا بھاشانی اور ان کی طرز فکر [illegible] کی مدد کر رہے ہیں"۔ [illegible]

بنگلہ دیش کے انتخابات میں ان جماعتوں کا کیا حشر ہوا کہ جن کے ساتھ پاکستانی عوام کی ہمدردیاں استوار کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ شیخ مجیب کی بے پناہ مقبولیت کے سامنے ان لوگوں کے اثر و رسوخ کا دور دور تک پتہ نہیں ملتا۔ انتخابات کے نتائج اس قدر واضح ہونے کے باوجود جذباتیت کا کھیل ہے کہ ختم ہونے میں نہیں آتا۔ انتخابات سے چند دن پہلے شیخ مجیب نے بنگلہ دیش میں مقیم پاکستانیوں کے بارے میں جو بیان دیا تھا اس سے پاکستان میں خاصی بے چینی پھیلی ہے۔ اس کا عکس ڈان کے یکم مارچ کے اداریئے میں جھلکتا ہے " اگر غیر مطلوبہ شہریوں کے تبادلہ سے متعلق شیخ مجیب کی دلیل محض الیکشن سٹنٹ نہیں ہے تو ان پر واجب تھا کہ وہ مخلصانہ تجاویز پیش کرتے۔ یہ مسئلہ انتہائی اہم ہے اور دونوں جانب کی آبادی کے کافی بڑے حصے پر اس کا اثر پڑتا ہے"۔

بنگلہ دیش کے انتخابات کے نتائج کے بعد بھی حکومت پاکستان خاموش اور بے عمل ہے۔ نتائج معلوم ہونے کے فوراً بعد ریڈیو پاکستان سے سید نجی اللہ کا جو تبصرہ نشر ہوا تھا اس سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے فیصلے میں اب زیادہ دیر نہیں۔ اس تبصرہ میں کہا گیا تھا کہ حالیہ انتخابات بنگلہ دیش کے علیحدہ وجود پر ریفرنڈم کی حیثیت رکھتے ہیں اور بنگلہ دیش کے عوام کا فیصلہ برصغیر میں مفاہمت کی راہیں ہموار کرنے کے حق میں ہے۔ یہ تبصرہ نشر ہوا لیکن اس کی پیروی میں کوئی اقدام نہ کیا گیا۔ صدر بھٹو نے انتخابات سے ہفتہ بھر پہلے کوئٹہ میں گورنر اکبر بگٹی کی طرف سے دی گئی گارڈن پارٹی میں کہا تھا " ۷ مارچ کے بعد ہم دیکھیں گے کہ کیا اقدام کئے جائیں۔ جب مناسب وقت آئے گا ہم بنگلہ دیش کو منظور یا نامنظور کرنے کا معاملہ قومی اسمبلی میں پیش کریں گے"۔

۷ مارچ کا دن بنگلہ دیش کے عوام کا فیصلہ دنیا کے سامنے رکھ کر چلا گیا لیکن صدر بھٹو اب بھی مناسب وقت کے انتظار میں ہیں۔ ظاہر ہے کہ مناسب وقت کے تعین کا فیصلہ تو وہ خود ہی کریں گے۔ البتہ ایک فیصلے کی امید بندھی ہے اور وہ فیصلہ آئینی بل کے آرٹیکل [illegible] ہے۔ یہ آرٹیکل پاکستان کی علاقائی حدود سے متعلق ہے۔ اور جس میں مشرقی پاکستان کا کوئی ذکر نہیں۔ ۹ مارچ کو پاکستان کی قومی اسمبلی میں اس آرٹیکل پر غور ملتوی کرنے کے سوال پر اکثریت رائے سے فیصلہ ہو گیا۔ آرٹیکل میں سرحد، پنجاب، سندھ، بلوچستان چاروں صوبے اسلام آباد اور مرکز کے زیر انتظام قبائلی علاقہ شامل ہوگا۔ مشرقی پاکستان کے بارے میں اس میں صرف اتنا ذکر ہے کہ اس آئین میں ایسی صورت میں ترمیم کی جا سکتی ہے جب مشرقی پاکستان سے بیرونی جارحیت ختم ہو گی تو اس وقت وہاں کے عوام کی آزادانہ رائے معلوم کر کے نمائندگی دی جائے گی۔ اس آرٹیکل پر غور ملتوی کرنے کے فیصلے سے اشارہ ملتا ہے کہ حکومت پاکستان محتاط ضرور ہے۔ مگر بنیادی سوال یہ ہے کہ التوا کی راہ پر چل کر تو مسائل حل نہیں ہوں گے۔ وقت گزرتا جا رہا ہے اور لمحہ لمحہ قیمتی ہے۔ شملہ سمجھوتہ کے بعد جو مفاہمت کا ماحول پیدا ہوا تھا وہ التوا کی دھند میں ڈوبتا جا رہا ہے بنگلہ دیش کے انتخابات کے نتائج سے صدر بھٹو کو حقیقت پسندانہ اقدام کے لئے جو موقع ملا تھا وہ بھی ہاتھ سے نکل گیا صدر بھٹو اپنی موجودہ روش کو سودے بازی کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ وہ نہ صرف تمام جنگی قیدیوں کی واپسی حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں بلکہ اثاثوں کی تقسیم جیسے مسائل کا بھی اپنی مرضی کے مطابق حل تلاش کرنے کے خواہاں ہیں۔

برصغیر کی سیاسی صورت حال اس قدر سیدھی بھی نہیں کہ صدر بھٹو کی ہی مرضی کے مطابق سب معاملات طے ہو جائیں۔ صدر بھٹو کی سیاسی سوجھ بوجھ کہیں اس قدر دیر نہ کر دے کہ معاملات مزید پیچیدگی اختیار کر جائیں دیر ہو رہی ہے اور وقت تیزی سے گزرتا جا رہا ہے شملہ سمجھوتہ جیسے مواقع بار بار نہیں آتے۔ ان کی قدر نہ کرنا دانش مندی سے بعید ہے۔ پاکستانی عوام اور خصوصاً حکومت پاکستان کو جلد یا بدیر یہ بات سمجھنا ہوگی کہ بنگلہ دیش جیسی حقیقتیں کسی کے چاہنے یا نہ چاہنے سے نہیں ہوا کرتیں۔ مگر سب سے اہم بات یہ ہے کہ دیر ہی سے سمجھے تو کیا سمجھے ؟

[redacted]

"ہندو مذہب کی کوئی واضح اور متعین تعریف ممکن نہیں کیونکہ اس مذہب میں ایسے عقائد اور رواج ناپید ہیں جو سبھی ہندوؤں میں مشترک ہیں۔ ہندوؤں کے بنیادی خیال کے لئے ہر عقیدے کو ایک نہ ایک گروہ نے مسترد کیا ہے۔ چنانچہ جنوبی ہند کے لنگایت (شیو مت) ہندو مذہب کے بہت سے بنیادی عقائد کو نہیں مانتے جن میں ویدوں کے الہامی ہونے کا تصور بھی شامل ہے تاہم ہندوؤں میں عقائد، تصورات، ارادوں اور دیوی دیوتاؤں کے مشترک نہ ہونے کے باوجود کرم اور دھرم، ذات پات اور شیوا اور وشنو کی پوجا بڑے پیمانے پر عام ہے۔ لہٰذا ہندو مذہب کی کوئی واضح تعریف نہ ہوتے ہوئے عام ہندو کی شناخت مشکل نہیں۔"[1]

ہندو مذہب اور فلسفے کے جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ ہندو مذہب میں مذہب ذاتی اور انفرادی چیز ہے اجتماعی نہیں، جس طرح مسلمانوں اور عیسائیوں میں یکجا جمع ہو کر عبادت کرنے کا تصور ہے ہندوؤں میں نہیں ہے۔ اسی طرح ہندو مذہب تبلیغی مذہب بھی نہیں ہے۔ کیونکہ ہندو مذہب میں بنیادی چیز ذات پات ہے عقیدہ نہیں۔ اگر کوئی غیر ہندو، ہندو بن جاتا ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس ذات یا برادری میں داخل کیا جائے گا۔ کیونکہ ذات میں درجہ، مرتبہ متعین ہوئے بغیر اس کا سماجی مرتبہ متعین نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر اگر کوئی مسلمان سید ہندو بن جاتا ہے تو کیا اسے برہمن اپنی ذات میں شامل کر لیں گے، نہیں۔ لہٰذا ہندو مذہب اختیار کرنے والے کو ذات پات کے نظام میں نیچی جگہ ہی ملے گی، گو کہ نومسلم کی حیثیت بھی کچھ بہتر نہیں ہوتی۔ تاہم نومسلم نظری اعتبار سے اعلیٰ سے اعلیٰ مسلمان کے برابر ہے۔ عملاً خواہ ایسا نہ ہوتا ہو۔ مگر ہندو مذہب میں ایسا ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا غیر ہندوؤں کو ہندو بنانے کی کوئی منظم کوشش آریہ سماج کی شدھی تحریک سے پہلے نظر نہیں آتی۔ پھر یہ تحریک ایک خاص زمانے میں چلی

---

[1] ایم. ایل. سری نواس — ہندو مذہب سیکولر ڈیموکریسی

اسلام ایک مکمل نظام حیات لے کر آیا اور مذہب کی تبلیغ و اشاعت اس کا اہم حصہ رہی ہے لیکن دین کے معاملے میں جبر و اکراہ کی صریحی ممانعت کی گئی ہے۔ اس بحث کے اعادے کی ضرورت نہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا یا اپنی اعلیٰ تعلیمات اور پیروؤں کے کردار کی وجہ سے ایسا ضرور ہوا ہے کہ بعض صورتوں میں جبر سے کام لیا گیا مگر اس سے فائدے کی بجائے نقصان ہی پہنچا۔ اور یہ چیز بھی دین کی منشا کے مطابق نہیں تھی بلکہ ہوس ملک گیری یا سیاسی مصالح کی پیدا کردہ تھی۔

ہندو مذہب اسلام اور سیکولرازم

شہباز حسین

اور اس کے بعد اس کا زور کم ہو گیا۔ کیونکہ ہندوؤں کے لئے یہ مسئلہ بڑا پیچیدہ تھا کہ جو لوگ نیا مذہب اختیار کریں گے انھیں اپنے سماج اور ذات پات کے نظام سے کس طرح ہم آہنگ کیا جائے گا۔ مذہب کی ظاہری شکل سے قطع نظر ہندو مذہب کی اصل اساس ہے اس میں رسوم، عبادت کے طریقے اور دیوی دیوتا ظاہری مظاہر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

یہ مظاہر ضروری تو ہیں مگر وسیلہ اور ذریعہ ہیں منزل نہیں۔ ان کے ذریعہ اس ذات تک پہنچا جا سکتا ہے جو مختارِ کل اور غیر محدود ہے۔ ویدانت کے فلسفے کا ایک خلاصہ یہ ہے "اصل اور حقیقی وجود ایک ہے عام لوگ اسے مختلف ناموں سے پکارتے ہیں"۔ یا "منزل ایک ہے مگر پہنچنے کے راستے الگ الگ ہیں۔ شاعر اور پجاری اس حقیقت مستور کو جو ایک ہے اپنے الفاظ سے انیک بنا دیتے ہیں"۔ یہی تصور اور رویہ مذہبی رواداری اور مذہبی عدم تشدد کا بنیادی پتھر رہا ہے۔

قدیم ہندوستان میں ہمیں عملی طور پر بھی مذہب اور ریاست کی علیحدگی کی واضح مثال ملتی ہے برہمنوں کا طبقہ سب سے بلند اور برتر طبقہ تھا اور یہی مذہبی امور کی انجام دہی کا ذمہ دار تھا۔ حکومت اور جنگ چھتریوں کے لئے مخصوص تھی۔ عام طور سے راجہ چھتری ہوتے تھے اور وہی جدال اور قتال بھی کرتے تھے۔ اس طرح شروع سے ہی دو دھارے نظر آتے ہیں۔ ایک طبقہ مذہبی کاموں کے لئے مخصوص تھا اور دوسرا حکومت کے لئے۔ راجہ برہمنوں کی بڑی عزت کرتے تھے مگر اس فضیلت کے باوجود انھیں حکومت کے کاموں میں کوئی براہ راست دخل حاصل نہ تھا۔ صحیح معنوں میں جو عالم ہوتے تھے وہ دنیاوی ہنگاموں سے دور کسی ویرانے میں گیان دھیان میں مصروف ہوتے تھے یا طلبا کو درس دیا کرتے تھے۔

ہندو فلسفے یا مذہب کی بنیادی تعلیم یہ تھی انسان موکش (نجات) حاصل کرلے اور اس آواگون کے چکر سے نکل جائے۔ جو کہ دوبارہ جنم اپنے کرموں کے

مطابق ہوتا ہے اس لئے مذہب بڑی حد تک ذاتی چیز بن کر رہ گیا تھا۔ راجہ کے دربار میں برہمن ہوتے تھے۔ اور انھیں بڑی ممتاز جگہ حاصل تھی۔ مگر ان کا خاص کام یہ تھا کہ منتروں اور یگیوں کے ذریعہ راجہ کی کامرانی، صحت اور ملک کی خوش حالی کی دعا مانگیں۔ بعض معاملوں میں راجہ کے گرو ہونے کی حیثیت سے ان کا راجہ پر بڑا اثر ہوتا تھا اور راجہ دھرم رکھشک بھی ہوتا تھا مگر ہندو مذہب کی مخصوص تعلیمات کی وجہ سے قدیم ہندوستان میں ہمیں مذہب کے نام پر وہ قتل و غارت گری نظر نہیں آتی جو دور متوسط میں یورپ میں نظر آتی ہے۔

بعد میں مذہب اور ریاست کی علیحدگی اور زیادہ واضح ہوگئی۔ کوٹلیہ کے ارتھ شاستر اور اس کے بعد دوسرے لکھنے والوں کے یہاں ہمیں حکومت کے مسائل سے متعلق ایک بالکل نیا تصور ملتا ہے جو سیاست کو مذہب سے الگ کرنے اور سیاست کو ایک جداگانہ اور آزاد علم کی حیثیت دینے کا سہرا ارتھ شاستر کے اولین مفکروں کے سر ہے۔ کوٹلیہ اور اس کے بعد کے مفکرین نے راج نیتی کو بالکل الگ شعبہ قرار دیا اور اس سے دھرم کا کوئی تعلق باقی نہیں رکھا۔ ڈاکٹر پانیکر کے مطابق ریاست کی ایک خالص سیکولر تھیوری وجود میں آئی جس کا واحد مقصد حصول اقتدار تھا۔"

قدیم ہندوستان میں کسی حکمران نے عوام پر کسی خاص عقیدے کو مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بدھ اور جین مذاہب کا فروغ اس کی روشن مثالیں ہیں خود ہندو مت کے اندر مختلف فرقے تھے اور بعض فرقے تو خدا کے وجود کے منکر تھے۔ پھر یہود اور آتش پرست اور نصاریٰ اور مسلمان ایک سیاسی طاقت بننے سے کہیں پہلے ہندوستان آچکے تھے اور انھیں اپنے معبد تعمیر کرنے اور اپنے مذہب کی تبلیغ اور اشاعت کی اجازت حاصل تھی۔ میکس ویبر کے الفاظ میں "بلاشبہ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان میں مذہبی اور سیاسی

قدیم ہندوستان میں کسی حکمران نے عوام پر کسی خاص عقیدے کو مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بدھ اور جین مذاہب کا فروغ اس کی روشن مثالیں ہیں۔ خود ہندو مت کے اندر مختلف فرقے تھے اور بعض فرقے تو خدا کے وجود کے منکر تھے۔

مفکروں کو مکمل یا تقریباً لا محدود آزادی حاصل تھی جس کی حالیہ زمانے کو چھوڑ کر مغرب میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔"

اسلام ایک مکمل نظام حیات لے کر آیا اور مذہب کی تبلیغ و اشاعت اس کا اہم حصہ رہا ہے لیکن دین کے معاملے میں جبر و اکراہ کی صریحاً ممانعت کی گئی ہے۔ اس بحث کے اعادے کی ضرورت نہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا یا اپنی اعلیٰ تعلیمات اور پیروؤں کے کردار کی وجہ سے۔ ایسا ضرور ہوا ہے کہ بعض صورتوں میں جبر سے کام لیا گیا مگر اس سے فائدے کی بجائے نقصان ہی پہنچا۔ اور یہ چیز بھی دین کی منشا کے مطابق نہیں تھی بلکہ ہوس ملک گیری یا سیاسی مصالح کا پیدا کردہ تھی۔

ہندوستان میں مسلمانوں کا دور حکومت مجموعی لحاظ سے مذہبی رواداری کا دور تھا۔

ہندوؤں کی مذہبی احیاء کی تحریکیں مسلمانوں کے دور حکومت میں پروان چڑھیں اور بڑے بڑے مفکروں اور مصلحوں نے جنم لیا۔ زبان اور ادب نے بھی غیر معمولی ترقی کی۔ مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کی سب سے روشن مثال اکبر ہے جس کے دربار میں ہر مذہب کے عالم جمع تھے جن سے وہ ہر مذہب کی اچھی اچھی باتیں سنتا تھا۔ ڈاکٹر عابد حسین نے لکھا ہے۔

"جس نئی ہندوستانی قوم کی اکبر نے تشکیل کی۔ اس کی بنیاد مذہب نہیں بلکہ ایک ہی ریاست کی مشترک شہریت تھی۔" پروفیسر ہمایوں کبیر کے مطابق "اکبر کی پالیسی ایک سیکولر ریاست کی تشکیل کی غالباً پہلی شعوری کوشش تھی۔"

اس ضمن میں صرف اکبر ہی ایک واحد مثال نہیں ہے۔ ہندوستان اور مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کے واقعات سے تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ ابدالی کے خلاف لڑنے والوں میں مسلمان بھی تھے اور بہادر شاہ ظفر کے پرچم تلے غیر مسلم بھی تھے۔

انگریزی دور حکومت میں بھی ہندو اور مسلمان باہم شیر و شکر ہو کر رہے۔ شدھی سنگھٹن، مناظرہ بازی اور تقسیم ملک کا مطالبہ بہت بعد کی پیداوار ہے جس نے فضا کو مسموم کیا اور ملک تقسیم کے ہولناک نتائج سے دوچار ہوا۔ جس سیاست اور جن حالات کے تحت ملک کی تقسیم عمل میں آئی تھی۔ اس کی وجہ ہندوستان میں مسلمانوں کا باقی رہ جانا نہ صرف گاندھی اور نہرو کا معجزہ ہے بلکہ پوری ہندو قوم کی رواداری کی ایک روشن مثال ہے۔ مقصد یہ بتانا ہے کہ نفرت، تعصب، فرقہ پرستی اور تنگ نظری کے باوجود ملک کی بہت بڑی اکثریت نے سمجھ داری سے کام لیا اور ہیجان اور جذبات کے فرو ہو جانے کے بعد ایسے طریقے اور پالیسیاں اختیار کی گئیں جو صحیح سمت میں تھیں۔ یہ سب اس وجہ سے ممکن ہو سکا کہ سیکولرازم کے بنیادی تصورات ہندو مذہب میں پنہاں ہیں۔ سیکولرازم سے سب سے زیادہ فائدہ مسلمانوں کو پہنچا اور پہنچے گا۔ کوئی بھی اقلیت اس وقت تک پنپ نہیں سکتی جب تک کہ اس میں اپنی سلامتی کا احساس پیدا نہ ہو۔

مسلمانوں کے ایک طبقے میں یہ غلط خیال رائج ہو گیا ہے کہ سیکولرازم مذہب کی نفی کرتا ہے سیکولرازم کے اصطلاحی معنی چاہے جو بھی ہوں مگر ہندوستان میں اس سے مراد محض مذہبی رواداری ہے۔ دوسرے الفاظ میں مذہب ایک ذاتی اور نجی معاملہ ہے اور حکومت یا ملک کی دوسری آبادی کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیئے۔ اسی طرح سیکولرازم اسلام سے متصادم نہیں اسلام کی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔ انسانیت، رواداری بھائی چارہ، مساوات اور خدمت خلق اسلام کی بنیادی تعلیمات میں سے ہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کو سیکولرازم کا علم بردار ہونا چاہیئے، اس سے منحرف نہیں۔

[redacted]

؎ ڈاکٹر یو۔ این۔ گھوشال۔
سیکولر ڈیموکریسی

انسانیت ابھی زندہ ہے

صالحہ عابد حسین

۱۹۴۷ء کا وہ پُرآشوب دور کیسے بھلایا جاسکتا ہے جب آزادی کی صبح ہمارے پیارے دیش میں طلوع ہوئی اور دوسو برس کی غلامی کی زنجیریں ٹوٹنے پر دیش والوں نے جی کھول کر جشنِ مسرت منایا ـــــ اور پھر اسی صبحِ آزادی کو پرانے حاکموں کی سیاست، فرقہ وارانہ ذہنیت اور غلامی کے اثرات نے ننگِ شام بنا دیا ـــــ

ہم سب بہن بھائی نیشلسٹ تھے۔ پاکستان بننے کے مخالف تھے۔ لیکن ہمارے خاندان میں اور پانی پت والوں میں بہت سے لوگ پاکستان کے حامی اور مسلم لیگی خیالات کے تھے جو سیاست سے ناواقفیت اور سیاسی چالوں سے بے خبر ہونے کی وجہ سے اس دھوکے میں آگئے تھے کہ پانی پت یا تو پاکستان میں آجائے گا یا (خدا اس بھولے پن کا بھلا کرے) جو مٹی مشرقی اور مغربی پاکستان کو ملائے گی (اور وہ پاکستان کی ہوگی) اس میں تو ضرور ہی آئے گا۔ اور وہ اپنے وطن میں رہیں گے پاکستانی بن کر ـــــ مگر جب ۱۹۴۷ء کے فسادات کی قیامتیں برپا ہوئیں تو شیشے کے گھر میں رہنے والوں کے خواب چکنا چور ہوگئے۔ پانی پت لُٹ گیا، چھٹ گیا، وہاں کے لگ بھگ تیس ہزار مسلمان ماسی روتے دھوتے پاکستان سدھارے اور ہم جیسے گنتی کے چند لوگ اپنے ہی وطن میں بے وطن ہوکر رہ گئے!

ہم بہن بھائیوں سے ایک طرف ہمارے عزیز و ہم وطن ناراض تھے کہ ہم پاکستان کے مخالف ہیں۔ اس لئے مسلمانوں کے دشمن اور قوم کے غدار ہیں دوسری طرف رحم کھاتے اور اصرار کرتے تھے کہ تم لوگ پاکستان آجاؤ تو سب کچھ تمہیں مل جائے گا۔ سب سے زیادہ اصرار خواجہ اظہر عباس سے تھا۔ اس لئے سید بن صاحب، عابد صاحب احمد عباس سے تو وہ لوگ مایوس تھے مگر اظہر عباس کو یہ سمجھتے تھے کہ وہ اپنے بھائیوں بہنوں کی محبت میں ہندوستان رہ گئے ہیں۔ اس لئے کہ اظہر عباس جن کو اپنے وطن سے بے پناہ محبت تھی اور ہر اہلِ وطن کے لئے دل میں جگہ تھی خاموشی اور شرمیلی طبیعت کے انسان تھے جو اپنی وطن دوستی اور قوم پروری کا ڈھنڈورہ نہیں پیٹتے تھے۔ وہ ادبی آدمی نہ تھے، سیاست سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا کہ ان کی تقریریں یا تحریریں، ان کے خیالات کا پرچار کرتیں مگر ان کے قریبی دوست اور عزیز جانتے تھے کہ وہ سچے قوم پرور اور محبِ وطن انسان ہیں جنھوں نے ہر دکھ، ہر نقصان، ہر پریشانی، ہر ناانصافی جھیلی مگر ان کے دل میں کبھی میل نہیں آیا۔ ایسے عالی ظرف انسان میں نے بہت کم دیکھے جنھوں نے ۱۹۴۷ء میں گھر بار بیٹھے، وطن، جائیداد، سب کچھ کھو دیا۔ پھر بھی ان کے دل میں فسادیوں تک کے خلاف تلخی پیدا نہ ہوئی بلکہ اُلٹی ان کی طرف سے صفائی پیش کرتے اور جن لوگوں نے اسی زمانے میں انسان دوستی اور شرافت دکھائی، ان کے گُن گاتے رہے۔ پاکستانی دوستوں اور عزیزوں کی سمجھ میں کسی طرح یہ بات، یہ حب الوطنی نہ آتی تھی اور آخر تک ان کا اصرار اظہر عباس سے رہا کہ وہ پاکستان آکر بس جائیں۔

۱۹۴۷ء میں اظہر عباس سپلائی ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتے تھے اور نئی دہلی کی اسی بستی میں رہتے تھے جو سرکاری ملازمین کے لئے حال ہی میں ہارڈنگ برج کے قریب بسائی گئی تھی۔ کوئی بیس کوارٹر تھے جن میں سے مسلمان صرف ہی تھے اور سب پڑوسیوں سے جن میں ہندو بھی تھے اور سکھ بھی، ان کی صاحب سلامت تھی زیادہ میل جول نہ تھا۔ ۱۵ راگست سے پہلے اسی بستی کے آس پاس بھی آر۔ ایس۔ ایس کا زور تھا اور اس کے جواب میں کچھ جوشیلے مسلمان نوجوانوں نے ایک مسجد میں جلسے وغیرہ کرنے شروع کئے تھے۔ ان کے پاس کئی بار پیام پہنچے کہ وہ جلسے میں آئیں۔ مگر اظہر عباس نے صاف انکار کر دیا کہ مجھے سیاست سے کوئی واسطہ نہیں۔ اور حقیقت ہے کہ عملی حصہ انھوں نے کبھی نہیں لیا۔ ہاں جشنِ آزادی سب دہلی والوں کے ساتھ ضرور جوش و خروش سے منایا اور پھر اپنے کام میں لگ گئے۔

پنجاب میں خون کی ہولی کھیلی جارہی تھی، دہلی کی فضا خراب سے خراب تر ہورہی تھی۔ مگر انھیں ان میں سے کسی بات کا یقین نہ تھا۔ اخبار والوں کا مبالغہ اور لوگوں کی بدگمانی سمجھتے رہے۔ دراصل وہ کسی طرح یہ یقین کرہی نہیں سکتے تھے کہ انسان اتنا ظالم، ایسا وحشی ہوسکتا ہے مگر جب ستمبر کے شروع میں ان کی تین بھانجیاں اور ایک داماد قرول باغ میں اپنا گھر بار لٹا کر اور کسی طرح اپنی جان و آبرو بچا کر ان کے پاس پہنچے تو حالات کے بگڑنے کا انھیں اندازہ ہوا۔ مگر اب بھی یہ یقین تھا کہ نئی دہلی فساد سے محفوظ رہے گی!

پھر ایک دن وہ صبح تیار ہوکر دفتر جانے والے تھے کہ پرانی دہلی سے ان کے ایک عزیز دوست نند گوپال کا فون آیا کہ "آج نئی دہلی میں بہت خطرہ ہے تم دفتر نہ جانا۔"

پہلے تو یہ ان سے بحث ہی کرتے رہے کہ ایسا ممکن ہی نہیں اور تم خواہ مخواہ وہم کرتے ہو لیکن جب انھوں نے ڈانٹا "خبردار جو تم گھر سے نکلے!"

انھوں نے ہنس کر وعدہ کر لیا اور پھر کپڑے بدل، کتاب ہاتھ میں لے بستر پر لیٹ گئے۔ اس بات سے بےخبر کہ ان کا گھر اس لسٹ میں شامل ہے

جن گھروں کو آج لوٹا جانا تھا اور اس پر نشان بھی بنا دیا گیا ہے۔

پڑوس کے بوڑھے سردار جی نے دروازہ کھٹکھٹایا "عباسی صاحب" (وہ ان کو ہمیشہ عباس کی جگہ عباسی کہتے تھے)

انھوں نے دروازہ کھول کر اندر بلا لیا سردار جی، ان کا لڑکا اور پورا خاندان سامنے کے کوارٹرز میں رہتا تھا اور اظہر عباس سے ان کی بس صاحب سلامت آتے جاتے ہو جاتی تھی۔ سردار جی بہت پریشان نظر آ رہے تھے "عباسی صاحب تسی بہت خطرے میں ہے۔"

"کیوں سردار جی؟ کیا خطرہ ہے؟" انھوں نے پوچھا۔

سردار جی نے بتایا کہ آس پاس کے محلوں میں مسلمانوں کے گھروں پر دھاوا ہو رہا ہے اور آپ کا گھر بھی اسی لسٹ میں شامل ہے جسے لوٹا جانا ہے کوئی دم میں فسادی یہاں آ سکتے ہیں۔

اظہر عباس نے پھر احتجاج کیا "بھلا سردار جی نئی دہلی بھی لوٹی جانے لگی تو حکومت کا شیرازہ نہ بکھر جائے گا۔"

سردار جی بہت حیران ہوئے "عباسی صاحب آپ کیسے بھولے آدمی ہیں ــــ اور آپ کے گھر میں جوان لڑکیاں بھی ہیں ــــ اپنی حفاظت کا کچھ انتظام کیجئے۔"

اظہر صاحب اب گھبرائے مگر کریں کیا؟ کہاں جائیں؟ سردار جی نے ان کو پریشان دیکھا تو بڑی دردمندی سے کہا کہ "پچھلے دروازے سے لڑکیاں میرے گھر چلی آئیں اور آپ بھی اسی طرف سے آ جائیے آپ کا داماد ظاہر ہو سکتا ہے اس لئے کہ یہاں اسے کوئی جانتا نہیں۔"

چنانچہ تینوں لڑکیاں سردار جی کے گھر چلی گئیں اور سردار جی نے بڑے پیار سے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ فسادیوں کو برا بھلا کہا، ان کے بندیاں لگائیں اور اپنی بہو بیٹیوں کے ساتھ بٹھا دیا۔ سردار جی اظہر عباس کو اپنے کمرے میں لے گئے اور دلاسا دینے لگے۔

تھوڑی دیر میں فسادیوں کا غول نعرے لگاتا ہوا ان کے گھر پر حملہ آور ہو چکا تھا اندر کمرے سے لڑکیاں، باہر گھومتے ہوئے قیصر زیدی، اور اندر مردانے کمرے کی چق کے پیچھے سے اظہر عباس گھر پر حملہ ہوتے دیکھ رہے تھے۔ فسادی بگڑ رہے تھے، محلے والوں سے جھگڑ رہے تھے کہ اس گھر میں جو شخص رہتا تھا وہ کہاں ہے؟ تم لوگوں نے اسے چھپایا تو نہیں؟ مگر محلے میں صرف سردار جی کا گھرانا یہ جانتا تھا کہ وہ کہاں ہے اور ان کے گھر کے بچے اور نوکر مصلحتاً فسادیوں کے ساتھ گھر لوٹنے میں شریک ہو گئے تھے۔ اور دو ایک نو عمر لڑکیوں نے کچھ ساڑھیاں اور تولئے، چادریں وغیرہ لوٹ کر ہماری لڑکیوں کو لا کر دیں کہ دیکھو یہ ہم نے بچا لی ہیں۔ اور بعد میں ہمارا فرنیچر جو کافی ٹوٹ پھوٹ گیا تھا سردار جی نے اپنے گھر میں رکھ لیا تھا اور وہاں ــــ سے نند گوپال اسے لے آئے تھے جو مدت بعد اظہر عباس کو واپس کر دیا گیا۔

اظہر عباس خاموشی سے کھڑے اپنے گھر کو دیکھ رہے تھے جسے انھوں نے بڑے چاؤ، بڑی محنت سے سنوارا تھا، سجایا تھا اور یہ تنکا تنکا کر کے جوڑا آشیانہ آنکھوں کے سامنے لٹ رہا تھا ــــ کہ پیچھے سے سردار جی نے آکر آہستہ سے کہا "عباسی صاحب ذرا اندر چلو۔"

وہ ان کے ساتھ اندر کے کمرے میں گئے تو دیکھا کہ سردار جی کا جوان لڑکا ننگی کرپان لئے کھڑا ہے۔ اظہر عباس نے سمجھ لیا کہ ان کا وقت آ گیا۔ انھوں نے دل ہی دل میں کلمہ شہادت پڑھا اور مرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ آنکھیں خود بخود ذرا دیر کے لئے بند ہو گئیں۔ ایک لمحہ بعد آنکھیں کھولیں سردار جی کرپان ان کے ہاتھ میں تھما کر کہہ رہے تھے۔

"عباسی صاحب باہر فسادی ہڑ کر رہے ہیں شاید انھیں پتہ چل جائے کہ آپ لوگ یہاں چھپے ہیں۔ لعل میں اور میرا بیٹا آپ کو بچانے کے لئے اپنی جان دے دیں گے ــــ مگر ــــ مگر مرد کے ہاتھ میں ہتھیار رہنا ہی چاہئے۔ اسی کرپان سے آپ اپنی حفاظت کر سکتے ہیں۔"

اظہر عباس کا سر احسان کے بار سے جھک گیا اور آنکھیں بھر آئیں۔ "سردار جی آپ کی محبت اور شرافت کا شکریہ ادا کرنا میرے بس کی بات نہیں ــــ مگر یہ تلوار ــــ یہ میرے لئے بے کار ہے۔ میں تو ایک چڑیا بھی نہیں مار سکتا ــــ کسی انسان پر میرا ہاتھ کیسے اٹھ سکتا ہے بھلا۔"

سردار جی اور ان کا لڑکا حیران ہو کر اس مرد شریف کو دیکھ رہے تھے جو جوان تھا، تندرست تھا، وجیہہ تھا ــــ اور پھر بھی عورت سے زیادہ نازک اور دردمند دل کا مالک تھا۔ "عباسی صاحب آپ جیسا شریف آدمی ہم نے نہیں دیکھا۔"

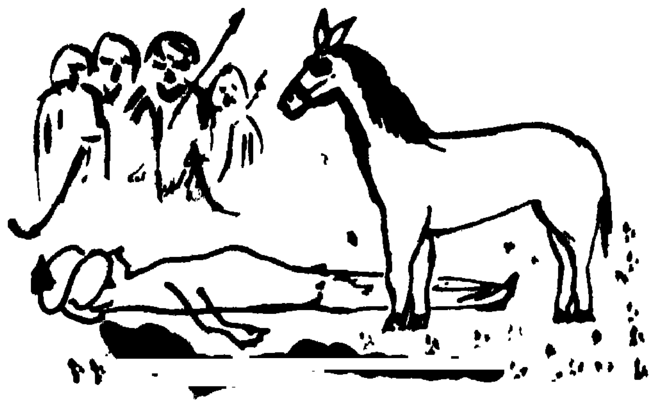
فسادی گھر لوٹ کر جو چیزیں نہ لے جا سکے انھیں توڑ پھوڑ کر چلے گئے۔ سردار جی اور قیصر زیدی کی کوشش سے شام گئے مولانا آزاد کے ہاں کسی طرح فون کیا جا سکا۔ مولانا ان دونوں بھائیوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ فوراً ہی ایک ٹرک فوجی سپاہیوں کی حفاظت میں ان لوگوں کو نکالنے کے لئے بھیجا گیا۔ سردار جی اور ان کے گھر بھر کا شکریہ ادا کر کے جب یہ لوگ مولانا آزاد کے گھر کو روانہ ہوئے تو کتنی ہی ...... لاشیں سڑکوں پر انسان کی بہیمیت کی داستان سنا رہی تھیں، مگر ان کے دلوں میں سردار جی اور سردار[illegible] اور ان کی بہوؤں بیٹیوں کی ہمدردی اور انسان دوستی نے گرمی پیدا کر دی تھی۔

اس واقعہ کو ۲۵ سال سے زیادہ گزر چکے ہیں۔ ان سردار جی کا نام بھی ہم میں سے کسی کو یاد نہیں۔ ان کے خاندان کے افراد سے بھی پھر کبھی ملاقات نہیں ہوئی کہ اس حادثہ کے بعد اظہر عباس بمبئی چلے آئے تھے اور واپس دہلی آئے تو سردار جی کا خاندان کہیں اور جا چکا تھا۔ خود اظہر عباس خدا کو پیارے ہو چکے۔ مگر اس واقعہ کی یاد آج بھی ہمارے دلوں میں تازہ ہے۔ یہ اس فرشتہ صفت سردار جی اور ان کے خاندان ہی کے لئے محبت اور احسان مندی کا جذبہ نہیں بلکہ اس پوری قوم کی عزت اور محبت موجود ہے جس میں ایسے افراد کم نہیں جن کا کردار انسانیت پر عقیدہ قائم رکھنے میں مدد دے، ہمدردوں کے لئے اپنی جان خطرے میں ڈال دیں اور اس شعر کی تفسیر بن جائیں ؎

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

وحشت اور فرشتہ

[illegible]



انسان سے بڑھ کر

ایک پتھر، دو پتھر، تین پتھر ــــــ گھوڑا دھیرے سے کھسک کر سڑک کے کنارے ہوگیا ــــ مارنے والا گروہ آگے بڑھ گیا، گھوڑا لوٹ کر پھر سڑک کے درمیان کھڑا ہوگیا۔ وہ سر جھکائے کھڑا رہا۔ گروہ پھر پلٹا، گھوڑا کھڑا تھا، پھر پتھر پڑنے لگے گھوڑا دوسری طرف کھسک گیا، گروہ گیا تو گھوڑا پھر اپنی پہلی جگہ پر آگیا۔

تانگے والے کے بیوی بچے فساد میں مارے گئے۔ جھونپڑیاں جلادی گئیں۔ اپنے آخری بچے ہوئے ساتھی گھوڑے کو لے کر بھاگ رہا تھا کہ پوسارو ڈی پر گھیر لیا گیا اور مار ڈالا گیا۔

اس کی لاش سڑک کے بیچوں بیچ پڑی تھی اور وہاں اس کا آخری ساتھی، حیران، پریشان، آنسو بہاتا، بھوکا پیاسا، پاس کھڑا تھا۔ صبح گزر گئی، کڑکتی دھوپ اس کے سر سے گزر گئی، رات گزر گئی، مگر وہ وہیں کھڑا تھا۔ جھنڈ کے جھنڈ لاٹھیاں، بلّم اور ہاکیاں لے کر گھوم رہے تھے۔ گھوڑا سب کا کھلا چیلنج قبول کئے کھڑا تھا ــــ دنیا ایک طرف ــــ میں ایک طرف!!

مارنے والوں کی روح ان کی گھناؤنی کارروائی پر جتنا دھتکارتی ان کا غصہ اتنا ہی بڑھتا جاتا۔

دن نکل آیا، پھر وہی سب شروع ہوا گھوڑے کو بھگانے کی کوشش کی، اسے مارنا ــــ اس کا ذرا سا کھسک جانا ــــ پھر مالک کی لاش کے پاس آجانا۔ جگہ جگہ پتھروں کی چوٹ لگ گئی تھی، جس خوبصورت جسم پر مالک پیار سے کھریرا کرتا تھا وہاں جگہ جگہ خون نکلنے لگا تھا، لیکن گھوڑے کا جھکا ہوا سر! اس کی نیچی نظریں صرف مالک کی لاش کو دیکھ رہی تھیں، جو خون سے لت پت پڑی تھی ــــ وہ زخمی گھوڑا کبھی کبھی دُم ہلاتا شاید مالک کی لاش سے مکھیاں اڑانے کی کوشش کر رہا تھا یا کڑکتی دھوپ میں ہوا دے کر ٹھنڈک پہنچانے کی فکر میں تھا۔

پھر بھیڑ جمع ہوئی۔ لاش پر اور گھوڑے پر گالیوں کی بوچھار ہونے لگی۔ پتھر پڑنے لگے ــــ گھوڑے کو ضد ہوگئی اس نے ہلنے سے بھی انکار کر دیا گھوڑے کے خون بہنے لگا، لاش پتھروں سے ڈھک گئی ــــ گھوڑا اسی طرح کھڑا تھا۔ اس کے قدم ڈگمگانے لگے، مگر اس وقت بھی مالک کی حفاظت کر رہا تھا، گرنا نہیں چاہتا تھا۔ لوگوں کی روح دھتکار رہی تھی۔ ان کا غصہ تیز ہوگیا۔ اپنے پاپ کا ہر نشان مٹانے کی کوشش میں تھے۔ مالک کے لئے گھوڑے کی وفاداری آگ میں گھی کا کام کر رہی تھی۔ لاٹھیاں اٹھ گئیں، بلّم اٹھ گئے، گھوڑے پر چھُروں کی بارش ہونے لگی۔ گھوڑا گر گیا، دھیما سا پکارا، چپکے سے مالک کے پاس گر کر معصوم نے دم توڑ دیا۔

لیڈی وِدھ دا لیمپ

"جب ہم لوگ آپ کو چھوڑنے آتے ہیں تو سامنے کے محلے سے لوگ بھاگتے کیوں ہیں! کیا ہم پر ناراض ہوتے ہیں؟" ہم لوگوں نے حکیم صاحب سے پوچھا۔

حکیم عبدالجلیل نے کہا "ناراض نہیں ہوتے، چلا کر کہتے ہیں 'راشن نہیں ہے'۔"

"راشن کیوں نہیں ہے؟" ہم لوگوں نے تعجب سے پوچھا۔

تا بھی یہ ہنس کر حکیم صاحب نے کہا "روشنی کہاں سے آئے گی۔"

"کیا یہ بیٹے جاسکتے ہیں؟" میں نے کہا "کبھی آپ کے محلے میں اندھیرا ہوں؟"

حکیم صاحب نے قیادت کی۔ ہم لوگ محلہ میں گئے۔
بچپن میں تصویریں دیکھی تھیں جن میں لوگ دوزخ دکھاتے تھے۔ کوئی آری سے کاٹا جاتا تھا، کوئی آگ پر جلایا جاتا تھا، کوئی کڑھائی میں تلا جاتا تھا، اس جہنم میں الگ الگ گناہوں کی الگ الگ سزا دکھائی جاتی تھی۔ بڑی مشکل سے دماغ سے وہ خطرناک منظر مٹائے تھے۔ اس محلہ میں آکر وہ خطرناک منظر پھر ابھر گئے۔ وہ محلہ ضرور دوزخ ہوگا۔ لیکن وہ لوگ یہاں کس گناہ کی سزا میں آئے یا کس کے گناہ کی سزا میں آئے۔

کوڑے کے انبار لگے تھے۔ نالیاں رک گئی تھیں لوگ ادھر ادھر چارپائیوں پر بیٹھے تھے کوئی دروازوں



میں کھڑا تھا، جگہ جگہ جانور بندھے تھے۔ بیل، گھوڑے کہیں کہیں گائے۔ باندھنے کی ضرورت ہی کیا رہی ہے

بھوک سے بیدم ہو رہے تھے، پیٹ لٹک گئے تھے گردنیں جھک گئی تھیں، آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ان سب کی دنیا ختم ہو گئی تھی۔ کچھ زندگی ایک گھر میں تھے۔ باہر علاج کے لئے نہیں جا پاتے تھے۔ کوئی کے ہاتھ پاؤں پر پٹیاں باندھ دی گئی تھیں۔ باہر کیا ہو رہا ہے یہاں کوئی جانتا نہیں تھا سنا تھا ان لوگوں نے سبزی منڈی اور پہاڑ گنج میں کوئی مسلمان بچا نہیں۔ پہاڑ گنج کی تاریخ میں کبھی کسی ایک کی

میٹنگ نہیں ہوئی تھی کبھی کسی سرپھرے نے کوشش کی تو وہاں کے بدمعاش اور عوام ان کو مارتے مارتے باہر تک کھدیڑ آئے۔

محلہ کے لوگ باہر جا نہیں سکتے تھے۔ ڈر کے مارے باہر سے کوئی اندر آتا نہیں تھا۔ محلہ کی دیوار میں نفرت کیا مسی بجلی کی کرنٹ آگئی تھی۔

میں گھومتی رہی۔ محلہ خاموش تھا میں بھی خاموش تھی۔ میں نے کہا "اب میں جاتی ہوں"۔

میرے ایک ساتھی نے کہا "مجھے یہیں چھوڑ دیجئے۔ میں یہ سب دیکھ کر یہاں سے جا نہیں پاؤں گا شاید ان کے کسی کام آسکوں"۔

ہم لوگ دوڑتے ہوئے دفتر گئے، راشن نہیں ملتا تھا۔ یہ لوگ جا نہیں سکتے۔ دکان تک یہ جا نہیں سکتے تھے جنھوں نے ہمارے لاکھوں بھائی بہنوں کو مار دیا تھا۔ کیا سرکار کھانا لے کر ان کے گھر دینے جائے گی۔ کانگریس تو جائے گی، کیونکہ کانگریس کے یہ داماد لگتے ہیں "طعنے ملتے تھے، چاروں طرف سے انگلیاں اٹھنے لگیں" یہ مسلمانوں کے لئے آٹا لے جاتی ہے"۔ لوگ راستے میں آوازیں کستے۔ ہم آٹا مانگنے کے لئے دفتروں کی خاک چھانتے۔ لڑ بھڑ کر کچھ لاتے تھے۔

ٹاؤن ہال میں اندرا جی سے ملاقات ہو گئی۔ ایک دوسرے کا نام پوچھا۔ پروگرام بن گیا۔

ہم لوگ پھر اسی محلے میں پہنچ گئے۔ جواہر لال نہرو کی لڑکی آئی ہے، خبر بجلی کی طرح پھیل گئی۔ بھیڑ جمع ہو گئی۔ روتے بلکتے لوگ فریاد کرنے لگے۔ مائیں بچے اٹھا اٹھا کر جواہر لال کی لڑکی کے پیروں میں ڈالنے لگیں۔ ان کی کون حفاظت کرے گا؟ کوئی مہربان دوڑا دو پیالے چائے بنا لایا۔ اچھا ذائقہ کرنے کو نمک بھی ڈال لایا۔ دوسرا دوڑ کر ایک پلیٹ لے آیا۔ کسی ڈبے میں سے برفی نکالی گئی — نہ معلوم کس خوشی کے موقع پر یہ برفی آئی ہوگی۔ اب میلی ہو چکی تھی۔ پر وزیر اعظم کی لڑکی کی خاطر تو کرنی ہی تھی کسی کے نصیب کہ گھر میں پاؤں رکھے تھے۔ کالی سی برفی ہم لوگوں نے کھائی اور ساتھ ہی لانے لگیں چائے کی پی۔ پھر تو یہ تو آنا روز کے پروگرام کا ایک حصہ بن گئی۔

اندرا جی نے فون کئے، دوڑ دھوپ کی، راشن کا انتظام ہو گیا۔ اسی محلے میں ہمارا دفتر کھل گیا۔ شانتی دل کے لوگ راشن بانٹنے لگے۔

صفائی کرمچاریوں کو جمع کیا۔ محلوں میں مسلمانوں نے کس طرح کتنے ہندو مار ڈالے تھے ایسی کہانیوں سے بے چارے ڈر کے بھاگ گئے تھے۔ وہاں کون صفائی کرنے جا سکتا تھا۔ اور پھر ضرورت بھی کیا تھی۔ جلد ہی یہ لوگ ختم کر دیئے جائیں گے یا حکومت پاکستان بھجوا دے گی۔ پہاڑ گنج اور سبزی منڈی کے بعد اسی علاقے کا نمبر ہے۔

پر اب بات اور تھی۔ وزیر اعظم کی لڑکی کے ساتھ کیا خطرہ ہو سکتا تھا۔ اب تو کوئی بھی جا سکتا تھا۔ جب وزیر اعظم کی لڑکی بنا پولیس، بنا فوج، بنا ہتھیار وہاں جا سکتی ہے تو دوسرے بھی جا سکتے ہیں۔ کچھ ہوگا تو اپنے آپ سنبھالیں گی۔ محلوں کی صفائی ہو گئی، زخمی اسپتال میں پہنچ گئے، خطرے بچھڑتے نظر آنے لگے۔

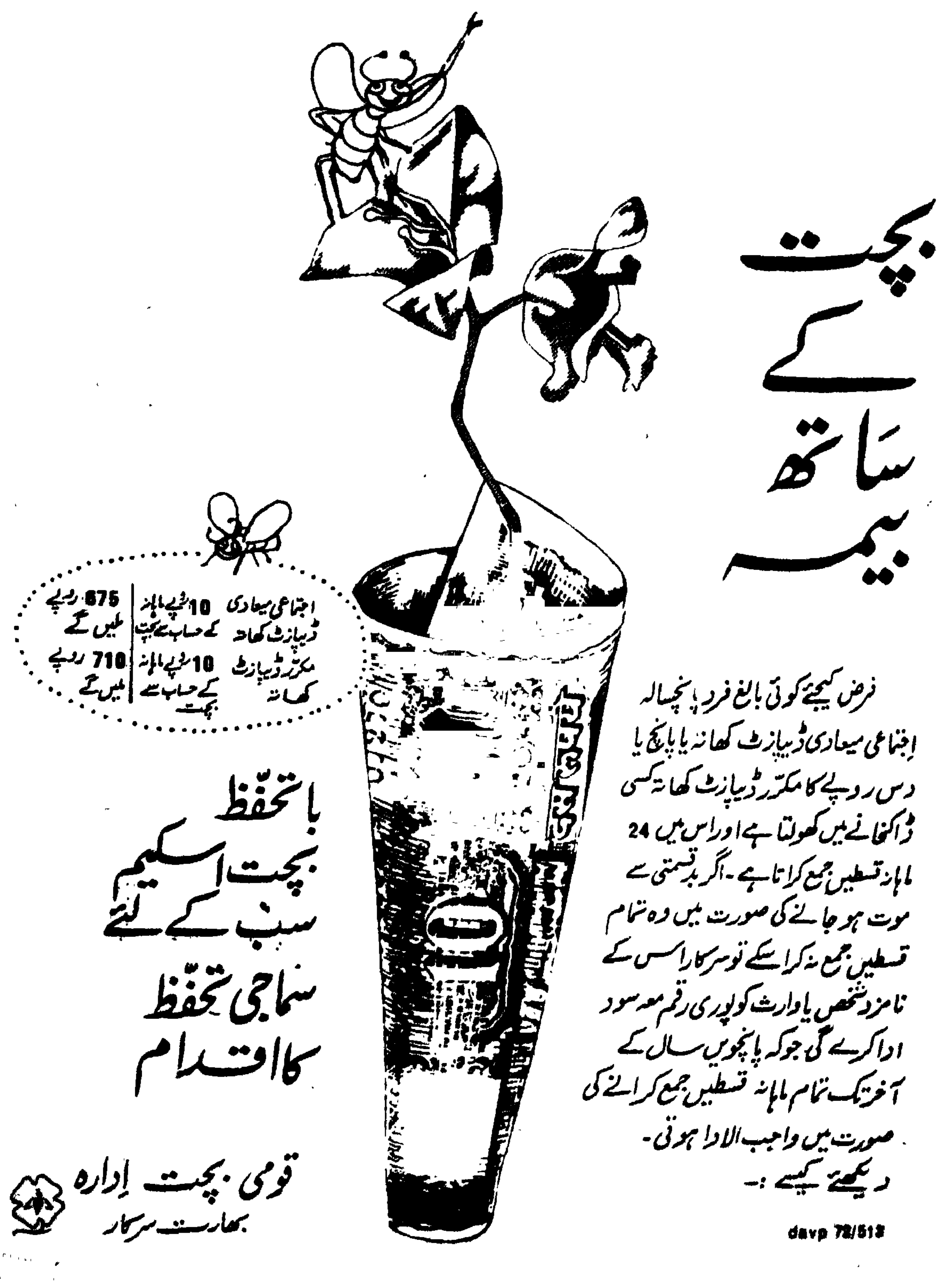
"کیا ہم بچیں گے؟" ایک بوڑھے مسلمان نے ایک گروہ کی نمائندگی کرتے ہوئے پوچھا۔

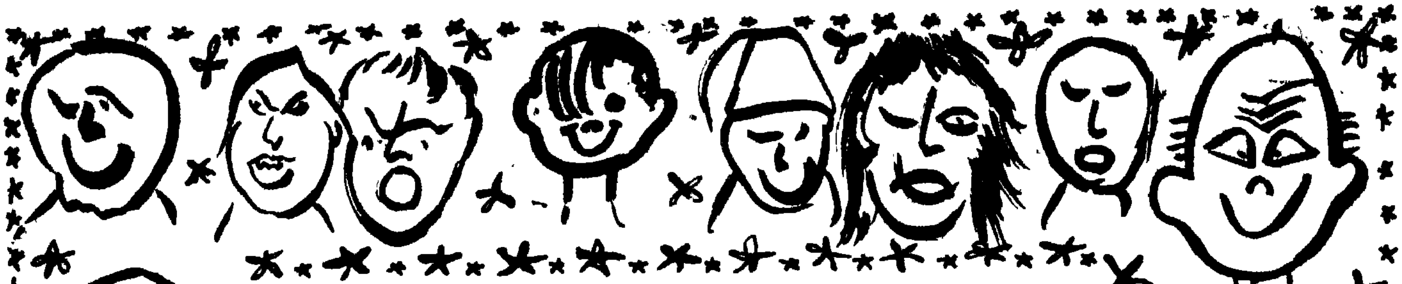
کیا جواب دیا جائے۔ اس کا جواب تو ہمارے پاس بھی نہیں تھا۔ سو میں نے بات کو ٹالنے کے لئے پرانا آزمودہ نسخہ استعمال کیا۔ میں نے کہا

"گاندھی جی کہتے ہیں بچانا تو صرف بھگوان کے ہاتھ میں ہے"۔ گاندھی جی کا تو صرف یقین تھا ہی سو میں نے بھگوان کا نام ان کے ساتھ دبی زبان میں جوڑ کر گاندھی جی کی بات دہرا دی۔

اس گروہ پر سناٹا چھا گیا۔ اس بات کا ایسا اثر ہوا جیسے بھگوان نے خود یقین دلا دیا ہو۔
اس کے بعد تو اس سوال کا یہی جواب موزوں تھا۔

ان محلوں میں دکھ اور خوف کے اندھیرے میں اندرا گاندھی روشنی کی کرن کی طرح پہنچیں۔ مگر اس بات سے لوگوں کو زیادہ ہوش ہوتا تو اندرا گاندھی "لیڈی ود دا لیمپ" کہلانے لگتیں جو نام بیماروں اور زخمیوں نے فلورینس نائٹنگیل کو دیا تھا۔


بچت کے ساتھ بیمہ
اجتماعی میعادی ڈپازٹ کھاتہ
10 روپے ماہانہ کے حساب سے بچت
675 روپے ملیں گے
مکرّر ڈپازٹ کھاتہ
10 روپے ماہانہ کے حساب سے بچت
710 روپے ملیں گے
فرض کیجئے کوئی بالغ فرد پنچسالہ
اجتماعی میعادی ڈپازٹ کھاتہ یا پانچ یا
دس روپے کا مکرّر ڈپازٹ کھاتہ کسی
ڈاکخانے میں کھولتا ہے اور اس میں 24
ماہانہ قسطیں جمع کراتا ہے۔ اگر بدقسمتی سے
موت ہو جانے کی صورت میں وہ تمام
قسطیں جمع نہ کرا سکے تو سرکار اس کے
نامزد شخص یا وارث کو پوری رقم معہ سود
ادا کرے گی جو کہ پانچویں سال کے
آخر تک تمام ماہانہ قسطیں جمع کرانے کی
صورت میں واجب الادا ہوتی۔
دیکھئے کیسے :-
باتحفّظ
بچت اسکیم
سب کے لئے
سماجی تحفّظ
کا اقدام
قومی بچت اِدارہ
بھارت سرکار
davp 72/513



دلی میں آل انڈیا مزاحیہ مشاعرہ





مجتبیٰ حسین

آرٹسٹ شادان

یہ جو خلیق انجم ہیں نا۔ کبھی نچلے نہیں بیٹھتے۔ کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے ہیں ہمیشہ کوئی نہ کوئی سودا ان کے ذہن میں یا سودے میں ان کا ذہن سمایا رہتا ہے۔ ایک دن نہ جانے کیا بات تھی کہ وہ خلاف توقع بے کار بیٹھے تھے۔ مجھے خلیق انجم کی یہ بے کاری اچھی نہ لگی۔ بڑا ترس آیا ان کی بے کاری پر۔ لہٰذا میں نے فوراً ایک تجویز پیش کردی۔

"خلیق صاحب! دہلی میں اگر ایک مزاحیہ مشاعرہ منعقد ہو تو کیسا رہے گا؟"

خلیق انجم اچانک مصروف ہوگئے۔ انھوں نے جھٹ سے کہا "بڑی اچھی تجویز ہے۔ مگر شاعر کہاں سے آئیں گے؟"

میں نے کہا "جہاں تک زندہ دلانِ حیدرآباد کے شاعروں کا تعلق ہے انھیں لانے کی ذمہ داری میری۔ بقیہ شاعر آپ پیدا کرلیجئے"

اور خلیق انجم وہاں سے جانے لگے تو ان کے جانے کے تیور کچھ ایسے تھے جیسے شاعروں کو پیدا کرنے جارہے ہوں۔ دو تین دن بعد ملے تو بولے "لیجئے صاحب! مزاحیہ مشاعرہ تیار ہوگیا ہے۔ مسز سبھدرا جوشی اور سیکولر ڈیموکریسی کے ایڈیٹر مسٹر ڈی۔ آر گوئیل ہولی کے موقع پر قومی ایکتا ٹرسٹ کی جانب سے مزاحیہ مشاعرہ منعقد کرنے کے لئے تیار ہوگئے ہیں۔ ۱۸ مارچ کی تاریخ طے ہوچکی ہے۔ اب آپ زندہ دلانِ حیدرآباد کے شاعروں کو بلوانے کا انتظام کیجئے"

میں نے پوچھا "اور وہ جو آپ بقیہ شاعروں کو پیدا کرنے والے تھے ان کا کیا ہوا؟"

خلیق انجم بولے "اب نئے شاعر پیدا کرنے کا بالکل وقت نہیں ہے۔ جو شاعر پہلے ہی پیدا ہوچکے ہیں ان سے ہی کام چلایا جائے گا"

میں نے پوچھا "کیا مطلب؟"

بولے " جو شاعر اب تک سنجیدہ شاعری کرتے آئے ہیں ان سے خواہش کی جائے گی کہ وہ مزاحیہ کلام کہیں۔"

میں نے کہا " یہ تو بڑا اچھا مذاق ہے۔

پھر خلیق انجم نے سنجیدہ شاعروں کو نہ جانے کیا کیا دھمکیاں دیں، کس کس طرح بہلایا پھسلایا کہ ۱۸ر مارچ کو جب لال قلعہ کے سامنے پریڈ گراؤنڈ پر دہلی کے پہلے کل ہند مزاحیہ مشاعرہ کا آغاز ہوا تو اکثر سنجیدہ شعرا ایک دوسرے کو دیکھ کر حیران رہ گئے کیونکہ اس حمام میں تو سبھی ننگے تھے (سوائے خلیق انجم کے) پریڈ گراؤنڈ کے وسیع احاطہ میں شامیانے نصب کئے گئے تھے۔ سامنے انسانی سروں کا ایک سیلاب تھا۔ آٹھ ہزار سے زائد سامعین کل ہند مزاحیہ مشاعرے سے لطف اندوز ہونے کے لئے جمع تھے۔ سارے پریڈ گراونڈ کو اس خوش اسلوبی سے سجایا گیا تھا جیسے وہاں کوئی سنجیدہ مشاعرہ ہونے جارہا ہو۔ ڈائس پر صدر کانگریس شری شنکر دیال شرما ضیا رالرحمٰن انصاری، مرکزی نائب وزیر صنعت۔ مسز سبھدرا جوشی۔ ڈی۔ آر گوئل۔ مہتاب چند جین، شری چندر بھان کھنڈیلوال، شری مول چند، شری ڈی. ڈی چودھری اور مرزا عثمان کے علاوہ سنجیدہ شاعروں میں بسمل سعیدی، کمال احمد صدیقی، بہار برنی، رفعت سروش، کرشن موہن، مخمور سعیدی، سلام مچھلی شہری (جنھیں مسز سبھدرا جوشی بار بار "پدم شری مچھلی " کہہ کر پکار رہی تھیں) شہاب جعفری، اسلم پرویز، اظہار اثر، عزیز وارثی، فصیح اکمل قادری، نظر برنی، سلمان رضوی، شاہد ماہلی، شہزاد اختر، نجم مظفر نگری وغیرہ۔

اور مزاحیہ شاعروں میں ہلال رامپوری، ثمر ملتانی، کہاب علیگ کے علاوہ زندہ دلانِ حیدرآباد کے مشہور شعرا سلیمان خطیب، برق آشیانوی، اسماعیل ظریف، گڑبڑ حیدرآبادی، مصطفیٰ علی بیگ اور بوگس حیدرآبادی موجود تھے۔

سب سے پہلے مسز سبھدرا جوشی نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ " ہولی کے موقع پر مزاحیہ مشاعرے کا انعقاد ایک فال نیک ہے۔ ہولی مسرتوں، رنگینیوں اور قہقہوں کا گہوارہ ہے۔ اسے ہم سب کو مل جل کر بڑے اہتمام سے منانا چاہیئے اور اس کے منانے کا ایک ڈھنگ بھی ہونا چاہیئے کیونکہ بعض اوقات ہولی کے موقع پر لوگ گڑ بڑ کر بیٹھتے ہیں اور ایسا مذاق کر گزرتے ہیں جس سے سماج میں کشیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی لئے جب بھی ہولی آتی ہے تو قومی ایکتا ٹرسٹ والے امن وامان کی بحالی کے لئے حکومت پر زور دینے لگتے ہیں کہ " پولیس کا انتظام کرو" لیکن اس بار ہم نے ایسا نہیں کیا۔"

ڈی۔ آر۔ گوئل نے جو بازو ہی میں بیٹھے تھے فوراً لقمہ دیا " اس بار ہم نے پولیس کا انتظام کروانے کی بجائے یہ کہا کہ " مزاحیہ مشاعرہ کا انتظام کرو۔"

مسز سبھدرا جوشی نے سارے سامعین کو ہولی کی مبارکباد دی۔ اس کے بعد مشہور شاعر سلام مچھلی شہری کا قومی ایکتا ٹرسٹ کی جانب سے خیر مقدم کیا گیا اور ان کے " پدم شری " بننے پر انھیں مبارکباد دی گئی۔

مسز سبھدرا جوشی کے بعد صدر کانگریس ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے بڑی شگفتہ اور رواں دواں اردو میں تقریر کی اور مشاعرے کا افتتاح کیا۔ انھوں نے کہا کہ " اردو ہمارے ملک کی ایک پیاری زبان ہے، اسے بنانے اور سنوارنے میں بلا لحاظ مذہب و ملّت سب نے حصّہ لیا ہے۔ اس کی حفاظت کرنا ہم سب کا فرض ہے۔"

ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے اپنی بصیرت افروز تقریر میں نوجوان نسل کو مشورہ دیا کہ وہ رجعت پسند اور تخریبی عناصر سے چوکس اور ہوشیار رہیں۔ ڈاکٹر شنکر دیال شرما کے بعد صدر مشاعرہ جناب ضیا رالرحمٰن انصاری، مرکزی نائب وزیر صنعت نے مختصر سی تقریر کی اور جدوجہد آزادی میں اردو کے رول کو واضح کیا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اچھی اور موثر مزاحیہ و طنزیہ شاعری کے ذریعہ معاشرہ کی اصلاح کی جا سکتی ہے اور غلط سمت میں اُٹھنے والے قدموں کو روکا جا سکتا ہے۔

مشاعرے کی رسمی کارروائی کے بعد اب فضا مزاحیہ شاعری کے لئے سازگار ہو گئی تھی۔ لوگ ہنسنے کے لئے بے چین تھے۔ یوں بھی دہلی میں ہنسنا بڑا مشکل کام ہے یہاں کے رہنے والوں کے قہقہے بڑی بڑی عالیشان عمارتوں، سماج کی اونچ نیچ، دفتروں کی فائلوں، بھیڑ کے قدموں، ایک بڑے شہر کے مشینی شور و غل کے دبیز پردوں اور سماجی رشتوں کے گنجلک تانے بانے میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ ان کے قہقہوں کو اس گنجلک نظام سے باہر نکالنا بلّی کو تھیلے سے باہر نکالنے کے مترادف تھا۔ خلیق انجم پریشان تھے۔ کہ اگر مزاحیہ شاعروں نے کلام سنایا اور سامعین نے ہنسنے سے انکار کر دیا تو کیا ہوگا۔

میں نے کہا " آپ فکر نہ کریں۔ ہمارے سامعین کی حسِ مزاح ابھی اتنی بلند نہیں ہوئی ہے کہ وہ مزاحیہ کلام پر ہنسنے سے گریز کریں۔"

خلیق انجم مشاعرے کی کارروائی چلانے کے لئے آگے بڑھے۔ انھوں نے کہا کہ سنجیدہ مشاعروں میں تو آپ لوگ آئے دن ہنستے ہی رہتے ہیں لیکن کبھی کبھار مزاحیہ مشاعرہ میں بھی ہنس لینے میں کیا قباحت ہے۔ سب سے پہلے انھوں نے دہلی یونیورسٹی کے ایک نوجوان سنجیدہ شاعر شہزاد اختر سے خواہش کی کہ وہ اپنا کلام سنائیں وہ اپنی دلچسپ نظم کے ذریعہ مشاعرہ میں ایک ہلچل سی پیدا کر کے چلے گئے۔ پھر نظر برنی نے اپنی مزاحیہ غزل کے ذریعہ مشاعرہ کا رنگ خوب جمایا۔

اب زندہ دلان حیدرآباد کے شاعر بوگس حیدرآبادی سے خواہش کی گئی کہ وہ اپنا کلام سنائیں۔ بوگس نے آتے ہی ایک " چوپایہ " سنایا۔ " چوپایہ " سے ان کی مراد قطعہ تھی۔ اس کے بعد انھوں نے اعلان کیا کہ وہ اپنی ایک آدھی غزل سنائیں گے آدھی غزل کا مطلب یہ تھا کہ ان کی غزل کا مصرعِ اولیٰ تو ان کا ہوگا اور مصرعۂ ثانی غالب کا ہوگا۔ ملکیت کے فرق کو ملحوظ رکھنے کی خاطر وہ ایک مصرع تحت اللفظ پڑھتے تھے اور دوسرا ترنم سے۔ بوگس حیدرآبادی نے اچانک ساری فضا کو بدل دیا اور

قہقہوں سے سارا پریڈ گراؤنڈ گونجنے لگا۔ بوگس کو سامعین نے یونہی جانے نہیں دیا بلکہ انھیں ایک اور "آدمی" غزل سنانی پڑی۔ ان کی غزل کے چند شعر ملاحظہ کیجئے۔

حسن والوں کو گھورتا کیا ہے   دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
ایک زردار چور کا ہے سوال   اور درویش کی صدا کیا ہے
کھا کے چورن وہ خود سمجھ لیں گے   ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

کمال احمد صدیقی ایک سنجیدہ شاعر اور نقاد کی حیثیت سے بڑی شہرت رکھتے ہیں مگر اس دن اُن کا ایک نیا روپ بھی سامنے آیا۔ انھوں نے خالص کلاسیکی انداز میں ایک مزاحیہ غزل سنائی اور سامعین سے خوب داد حاصل کی۔ چند شعر یہ ہیں۔

ہر چیز یہاں بناوٹی ہے
اصلی یہاں کوئی شے نہیں ہے
کھانے پہ سماج واد کی بات
گھر کے لئے یہ وشئے نہیں ہے
ایوان میں کچھ پرائے بھی ہیں
سچ بولنے کا سمے نہیں ہے

اس مشاعرے کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں سماج کے سارے ہی کرداروں کا جی کھول کر مذاق اڑایا گیا۔ سیاستداں، شاعر، چور بازاریئے، وزیر، زن مرید شوہر، فنکار، حکومت کے اعلیٰ عہدے دار، اور آج کے نوجوان۔ غرض مزاحیہ شاعروں کے مذاق کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ اس کی لپیٹ میں وہ سارے سامعین بھی آگئے جو اس وقت مشاعرے میں موجود تھے۔ یوں بھی مزاح کا معاملہ ایک خوشگوار معاہدے کی پیداوار ہوتا ہے جس میں مذاق کرنے والے اور مذاق کا نشانہ بننے والے میں ایک خوشگوار تعاون کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ جب سیاستدانوں کا مذاق اڑایا گیا تو اس کا سب سے زیادہ لطف ڈاکٹر شنکر دیال شرما، شریمتی سبھدرا جوشی اور مسٹر ضیاء الرحمٰن انصاری نے اٹھایا۔ جب عہدے داروں اور تاجروں کا مذاق اڑایا گیا تو سامنے والی دو چین قطاروں میں قہقہوں کا سیلاب آگیا۔ جب نئی نسل کا مذاق اڑایا گیا تو پچھلی صفوں میں داد کا بے پناہ شور بلند ہوا۔ اور جب زن مرید شوہروں کا مذاق اڑایا گیا تو سارے پنڈال میں قہقہوں کا شور بلند ہوا۔ یوں لگتا تھا جیسے سامعین بھی مزاح نگاروں کے مذاق میں شامل ہو گئے ہیں۔

فصیح اکمل قادری نے ایک دلچسپ نظم سنا کر سامعین کو محظوظ کیا پھر اسلم پرویز اور شاہد ماہلی نے مشاعرے میں گرمی پیدا کی۔ اس کے بعد اردو کے ممتاز اور جانے پہچانے شاعر رفعت سروش مائک پر آئے۔ وہ اس انداز سے مائک پر آئے جیسے کوئی سنجیدہ غزل سنانے چلے ہوں۔ مگر آتے ہی انھوں نے ایک مزاحیہ شعر سنا کر محفل کو لوٹ پوٹ کر دیا۔ شعر تھا ـ

رات کہتے ہیں تری زلف گرہ گیر کو لوگ
تو اگر سر کو منڈا لے تو اُجالا ہو جائے

پھر انھوں نے ایک مزاحیہ غزل چھیڑی اور مشاعرہ کو لوٹ کر اپنے ساتھ لے گئے اور پولیس والے صرف منہ دیکھتے رہ گئے۔ غزل کے چند شعر سنیئے۔

بیگم کی نازک ٹھوڑی پر مصنوعی اک تل کالا ہے
ہم نے بھی صورت دیکھتے ہی کیا نازک شعر نکالا ہے
پہلے بھی قیامت ڈھاتی تھیں سُرمگیں قسم مستی کی قسم
جب سے تم دلی آئی ہو نخروں میں گرم مسالا ہے

اب زندہ دلانِ حیدرآباد کے ایک اور شاعر مصطفیٰ علی بیگ مائک پر آئے۔ مصطفیٰ علی بیگ کو ہندوستان میں انگریزوں کی چھوڑی ہوئی "آخری نشانی" کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ وہ اینگلو اردو شاعری کرتے ہیں۔ مصطفیٰ جتنے اچھے شاعر ہیں اتنے ہی اچھے کامیڈین بھی ہیں۔ انھوں نے ایک اینگلو اردو غزل سنائی۔

God کی جس کو aid ہو جائے
دور Shade کا ill luck ہو جائے
جس کو سسرال Well to do مل جائے
Honorary بھی paid ہو جائے

مصطفیٰ علی بیگ نے خوب رنگ جمایا اور اپنے ساتھ بہت سے قہقہے سمیٹ کر لے گئے۔

گرگٹ بڑ حیدرآبادی نے اپنے قطعات اور غزلوں کے ذریعہ مشاعرے میں خوب گڑبڑ مچائی اور دھواں دھار داد وصول کر کے چلے گئے۔ ایک قطعہ سنیئے۔

اِدھر ہم نوکری چھوڑے ہوئے بیزار بیٹھے ہیں
اُدھر سسرے خلع کے واسطے تیار بیٹھے ہیں
نہ چھیڑا ہے ہم نشیں ایسے میں نغمے پیار و الفت کے
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں، ہم بیزار بیٹھے ہیں

کرشن موہن کی سنجیدہ شاعری سے کون واقف نہیں ہے۔ وہ بڑی متانت کے ساتھ آئے اور آتے ہی ایک دھماکہ خیز شعر سنا کر محفل کو درہم برہم کر دیا۔ شعر تھا۔

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
محلہ میں دو لڑکیاں اور بھی ہیں

کسی نے پکار کر کہا "اجی قبلہ! ہم بھی تو آپ کے محلہ میں رہتے ہیں۔ کچھ ہمارا بھی خیال کیجئے گا یا نہیں"

بازو میں بیٹھے ہوئے صاحب نے پکارنے والے کو مشورہ دیا "آپ پریشان نہ ہوں۔ محلہ میں دو لڑکیاں ہیں۔ ایک کا امتحان آپ لیجئے دوسری کا امتحان کرشن موہن لے لیں گے۔"

اس شعر کے بعد کرشن موہن نے غزل سنائی۔ اگرچہ غزل سنجیدہ تھی مگر سامعین اس وقت تک ہنسنے کے عادی ہو گئے تھے اس لئے سنجیدہ غزل پر بھی ہنستے رہے۔

اب شہاب جعفری جھومتے جھامتے مائک پر آئے۔ شہاب جعفری نے بہت ہی لطیف مزاح رکھنے والی غزل سنائی۔ اس غزل کی خوبی یہ تھی کہ یہ کلاسیکی رنگ میں کہی گئی تھی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

قاتل کا پڑا ہے جو میرے خون پہ کرتہ　　بھیگی ہوئی ململ کا ہے یہ ٹون پہ کرتہ
سرگوشی میں پوچھا کہ کہو پہنے ہو کرتی　　اس شوخ نے شرما کے کہا فون پہ کرتہ
ہپی نے پہن رکھی ہے اک جینس پہ انگیا　　ہپن نے چڑھا رکھا ہے پتلون پہ کرتہ

سلام مچھلی شہری اپنی روایتی بے نیازی کے ساتھ آئے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ جھومتے جھامتے نہیں آئے، کیونکہ انھوں نے اب "جھومنا جھامنا" چھوڑ دیا ہے۔ بڑے خلوص اور پیار کے ساتھ انھوں نے مزاح نگاروں کے نام ایک نظم سنائی اور سامعین سے داد حاصل کی۔ چند شعر ملاحظہ کیجئے۔

بے شک بہت حسین ہے بہاروں کی جستجو
دشت جہاں میں زعفراں زاروں کی جستجو
لیکن میں جانتا ہوں بہت مضمحل ہیں آپ
اس کوشش نشاط سے بے حد خجل ہیں آپ

سلام مچھلی شہری کے بعد امیر آغا قزلباش نے اپنا رنگ جمایا۔

برق آشیانوی زندہ دلان حیدرآباد کے بڑے متین اور بردبار شاعر ہیں صورت دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا کہ شعر بھی کہتے ہوں گے۔ ایسی مسکین صورت پائی ہے کہ بالکل اللہ میاں کی گائے لگتے ہیں مگر جب کلام سناتے ہیں تو ایسے شگوفے کھلاتے ہیں کہ ساری محفل زعفران زار بن جاتی ہے۔ قد چونکہ چھوٹا سا ہے اسی لئے اس کی تلافی کے لئے طویل نظمیں کہتے ہیں۔ انھوں نے "عاشقوں کی کانفرنس" کے عنوان سے ایک نظم سنائی اور بے پناہ داد حاصل کی۔ عاشقوں کی اس کانفرنس کا حال آپ بھی پڑھیے۔

عاشقوں کی کانفرنس

ملک میں ہونے لگیں جب کانفرنسیں پے بہ پے　　تو کیا اک روز سب عشاق نے مل کر یہ طے
کانفرنس عشاق کی بھی ایک ہونا چاہیئے　　اپنا رونا ایک دن ہم کو بھی رونا چاہیئے
اک بیاباں کا کیا سب عاشقوں نے انتخاب　　شہ نشیں اک بن گیا کانٹوں کا مسند لاجواب
ملک کا اک عاشقِ خستہ نفس بلوایا گیا　　صدر کے مسند پہ لاکر اس کو چپکایا گیا
ہار اس کے واسطے گل ہائے خوردہ کا بنا　　اور سنگِ آستانِ یار کا تکیہ بنا
قبلہ جی آوارگی، تعلیم میں جاہل تھا وہ　　لیکن اپنے وقت کا اک عاشقِ کامل تھا وہ
اور اک عاشق بنا اس کانفرنس کا معتمد　　خانۂ ویراں میں اک وشکل وصورت میں جھنڈ
عاشقانِ چند رکنِ انتظامی بن گئے　　سینکڑوں عشاق رکن عام کی صف میں رہے
صورتوں پر سب کی وحشت، جسم پر گرد و غبار　　بال سر کے خاک آلودہ، کپڑے تار تار
دل میں دھڑکن، چشم پُرنم، لب پہ آہیں سرد سرد　　جس کو دیکھو وہ نظر آتا تھا اک تصویرِ درد
معتمد نے جب پڑھا اک خطبۂ استقبالیہ　　کھینچ ڈالا عاشقوں کا ایک نقشہ حالیہ
یوں نظر آیا کہ شعرا کا نگیٹو ہیں یہ سب　　شاعروں کے دور کے گویا ریلیٹو ہیں یہ سب
ریزولیوشن پاس سب عشاق نے مل کر کیا　　اولیں منزل کو گویا کانفرنس کی سر کیا
سب سے پہلے قیس اور فرہاد کا ماتم ہوا　　ہیر رانجھا اور ششی پنوں کا رنج و غم ہوا
ہو کے استادہ منائی دو منٹ کی خامشی　　اک اداسی دیر تک محفل پہ طاری سی رہی
پھر بتایا۔ ہیں بہت مشکل مراحل سامنے　　عاشقوں کے رکھے پیچیدہ مسائل سامنے
کیا بیاں کیجئے زباں سے عاشقوں کا حال زار　　عاشقانِ باوفا ہیں ملک کے بے روزگار
کچھ توجہ عاشقوں کے حال پہ فرمایئے　　جو تیرے منصوبہ میں ان کے بھی مسائل لایئے
ہم جمیع عشاق کی یہ مشترک اک مانگ ہے　　غور کر کے دیکھئے یہ رائٹ ہے یا رانگ ہے
دفعہ ۵۰۰ سی کو فوراً کالعدم کر دیجئے　　کتنی ہے توہین اس میں عاشقوں کی دیکھئے
راہ میں محبوب کو ہے چھیڑ لینا کیا بُرا؟　　چھیڑ گویا نام ہے اک حسرتِ ناکام کا
چھیڑ غالب نے کیا ہے حسرتِ شام وصال　　وصل گر ہوتا نہیں تو لیجئے حسرت نکال
کالجوں میں عام ہو طلبا میں رسم عاشقی　　حیثیت اس کی رہے کمپلسری سبجکٹ کی
طالبانِ علم درسِ عاشقی میں طاق ہوں　　ملک میں سارے فقط عشاق ہی عشاق ہوں
عزت و عظمت میں ان کو دیجئے جائز مقام　　نام پر عشاق کے رکھوا دیجئے سڑکوں کے نام
جیسے شیریں پارک، مجنوں روڈ، لیلیٰ اسٹریٹ　　ہیر رانجھا مارگ، رومیو کراس، جولیٹ مارکیٹ
ملک چاہے بھوک اور غربت کے دوراہے پہ ہو　　اک اسٹیچو ہر اک عاشق کا چوراہے پہ ہو
ان کا مستقبل درخشاں اور تابندہ بھی ہو　　پارلیمنٹ میں عاشقوں کا اک نمائندہ بھی ہو
سب سے اونچا عاشقوں کا ایک پلیٹ فارم بھی ہو　　مرکزی اک انجمن عشاق کی قائم بھی ہو
زخمِ دل کے واسطے مرہم بھی ہونا چاہیئے　　عاشقوں کا اپنا اک پرچم بھی ہونا چاہیئے

آؤ اک نعرہ لگائیں عاشقانِ نامراد
"اے محبت زندہ باد، اے عاشقی پائندہ باد"

پھر بہار برنی بڑی سج دھج کے ساتھ مائک پر آئے اور بہار بن کر سارے مشاعرے پر چھا گئے۔ سامعین کو انھوں نے خوب محظوظ کیا۔ ایک قطعہ ملاحظہ کیجئے۔

میں نے دیکھا ہے مورکھوں کا جلوس
ایک سے ایک چڑھ کے احمق تھا
ایک سے تو یہ ہوا محسوس
جیسے میں سب سے بڑھ کے احمق تھا

پھر نجم منظر نگری آئے اور ان کے بعد نوجوان شاعر سلمان رضوی نے ساحر لدھیانوی کی مشہور نظم "تاج محل" کی پیروڈی "داغ محل" کے عنوان سے سنائی۔

سلیمان خطیب دکنی زبان کے منفرد و ممتاز شاعر ہیں۔ ان کے کلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ لوگوں کو ہنساتے ہنساتے اچانک رُلانے لگتے ہیں۔ بڑے ناقابل بھروسہ شاعر ہیں۔ آپ کو بہت ہوشیار رہنا پڑتا ہے۔ اور ایک ایک مصرعہ کی جانچ پڑتال کرنی پڑتی ہے کہ اس پر ہنسنا ہے یا رونا ہے۔ مزاح اور طنز کا ایسا حسین امتزاج شاید ہی کسی اور شاعر کے یہاں موجود ہو۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ دہلی والوں نے دکنی زبان کے ایک شاعر کو سنا۔ اندیشہ تھا کہ کہیں دہلی والے ان کی دکنی زبان کو سمجھ نہ پائیں۔ مگر سامعین نے انھیں خوب سمجھا اور خطیب صاحب نے بھی سامعین کو خوب سمجھ لیا۔ بڑے اعتماد کے ساتھ سلیمان خطیب نے پے بہ پے نظمیں سنائیں اور لوگ انھیں مائک سے جانے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ سلیمان خطیب کی نظم "جدید مصورؔ" کے چند شعر سنیئے۔

لمبے لمبے قلم ہیں گالوں پر   داڑھی آدھی پلیٹ حاضر ہے
ہاف داڑھی سے ٹھڈی ظاہر ہے   گویا چھلکے سے گٹھلی باہر ہے

اس کے بعد زندہ دلانِ حیدرآباد کے بزرگ شاعر اسماعیل ظریف نے جی کھول کر قطعات سنائے اور سامعین سے خوب داد حاصل کی۔

اب دہلی کے بزرگ شاعر ثمر ملتانی سامعین کے سامنے آئے۔ سر پہ طرّہ باندھے اور پٹھانوں کا سا لباس پہنے وہ مائک پر یوں آئے جیسے وہ سامعین سے داد وصول کرنے نہیں آرہے ہوں بلکہ سود وصول کرنے آرہے ہوں۔ ثمر ملتانی کی مزاح سے بھرپور غزلوں نے مشاعرہ کو چار چاند لگا دیئے۔ سامعین انھیں چھوڑنا نہیں چاہتے تھے اور وہ ضعف کے مارے ہانپ رہے تھے۔ معاملہ وہی تھا کہ میں کمبل کو چھوڑنا چاہتا ہوں مگر کمبل مجھے نہیں چھوڑتا۔ بے شمار غزلوں کے بعد ثمر ملتانی بہت سارا "سود" وصول کرکے اپنے ساتھ لے گئے۔ چند شعر سنیئے۔

ڈاکٹر کہتے رہے یہ درد تو ہے لاعلاج   ایک ہی سینڈل پڑا بیمار اچھا ہوگیا
بس میں بیٹھوں کہتے ہیں بابا مجھے وہ شوخ چشم   دل میرا تو ہے جواں میں کب سے بوڑھا ہوگیا
کم سنی جب تک تھی وہ ایسے تھا جیسے پھلجھڑی   جب شباب آنے لگا وہ اک پٹاخا ہوگیا

پھر مخمور سعیدی نے ایک پھڑکدار مزاحیہ غزل سنائی۔ چند شعر ہیں

پیار رہ جائے یہاں تک کہ وہاں تک پہنچے   یہ کوئی شرط نہیں ہے کہ کہاں تک پہنچے
پھر اندھیرے کہ جہاں گیر نظر آنے لگے   عصر موجود کی ہر نور جہاں تک پہنچے

بزرگ اور کہنہ مشق شاعر بسمل سعیدی نے اپنے استادانہ رنگ میں مزاحیہ غزل سنائی اور سامعین سے خوب داد حاصل کی۔ پھر عزیز وارثی نے اپنا رنگ جمایا۔

کباب علیگ کے نام کے ساتھ ہی لوگ ہنسنے لگے۔ کباب علیگ اردو کے مزاحیہ شاعروں میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ ان کا مزاح نہایت نکھرا ستھرا ہوتا ہے۔ سامعین کے اصرار پر انھوں نے کئی قطعات دو غزلیں سنائیں اور سامعین ہنستے ہنستے بے حال ہوگئے۔

اب ہلال رامپوری کی باری تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ مشاعرہ کھلے میدان میں ہو رہا تھا۔ اگر خدانخواستہ یہ کسی ہال میں منعقد ہوتا تو ہلال رامپوری کے کلام کے باعث ہال کی چھت کا اڑ جانا یقینی تھا۔ ہلال رامپوری کلام سنائیں اور آپ اپنی ہنسی کو ضبط کر سکیں یہ ایک ناممکن بات ہے۔ بات میں بات پیدا کرنا کوئی ہلال رام پوری سے سیکھے۔ مزاح کی وہ فراوانی اور زبان کی وہ روانی ہوتی ہے کہ محفل ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتی ہے۔ ہلال صاحب نے اس رات نہ جانے کتنے قطعات اور کتنی غزلیں سنائیں۔ بس وہ تھے اور سامعین۔ ہنسی کے فوارے سے پھوٹ نکلے۔ پریڈ گراؤنڈ قہقہوں کی گونج میں ڈوب گیا۔ یہ مشاعرے کی معراج تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ہنسی ہلال رامپوری پر ختم ہونے والی ہے۔

ہلال صاحب کے بعد سامعین کی جانب سے یہ مطالبہ ہونے لگا کہ مشہور کامیڈین عزیز دھامپوری "آل انڈیا مشاعرہ" کا آیٹم پیش کریں۔ عزیز دھامپوری نے بڑی مہارت کے ساتھ کئی شاعروں کی کامیاب نقلیں اتاریں۔ اور جب آخر میں وہ "آل انڈیا مشاعرہ" کے صدر چودھری ہوری سنگھ کی تقریر کی نقل کرنے لگے تو قہقہوں کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔

اس کے بعد زندہ دلانِ حیدرآباد کے مشہور کامیڈین مصطفٰے علی بیگ سے خواہش کی گئی کہ وہ اپنا کوئی آیٹم پیش کریں۔ مصطفٰے علی بیگ نے "غالب ھندی تقاریب" کا مزاحیہ پہلو سامعین کے سامنے پیش کیا اور روس، امریکہ، فرانس اور خود ہندوستان میں غالبؔ کی جو دُرگت بنی ہے اسے بڑی مہارت سے پیش کیا۔ مصطفٰے علی بیگ نے ایک ثانیہ کے لئے بھی سامعین کو چین لینے نہیں دیا۔ ہنسی اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ چکی تھی۔ رات کے تین بج رہے تھے اور پریڈ گراؤنڈ قہقہوں سے دہل رہا تھا۔ ایسے قہقہے پریڈ گراؤنڈ نے شاید ہی کبھی سنے ہوں۔ اس انتہا کو پہنچنے کے بعد اب مشاعرے میں مزاح کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ اگرچہ سامعین مصطفٰے علی بیگ سے مزید آیٹمیں سننا چاہتے تھے مگر اس سے زیادہ ہنسی "امن عامہ" کے لئے مناسب نہیں تھی۔ لہٰذا خلیق انجم نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ شکریہ ادا کر دیا اور دہلی کی یہ باغ و بہار محفل اختتام کو پہنچی۔

اظہارِ معذرت :۔ خلیق صاحب نے مشاعرہ کے بعد مجھ سے یہ خواہش کی کہ میں اس مشاعرہ کا "آنکھوں دیکھا حال" لکھوں یہی وجہ ہے کہ اس میں بہت سے شاعروں کے کلام کے نمونے نہیں دیئے جا سکے۔ جو کلام یاد تھا یا جو کلام حاصل ہو سکا وہی اس رپورٹ میں شامل ہے۔

[redacted]

بھٹکتی نسلیں

(انجم عثمانی صاحب دیوبند کے فاضل ہیں اس مقالے میں جو کچھ انھوں نے لکھا ہے اس کی بنیاد ذاتی تجربے اور مشاہدے پر ہے) (ادارہ)



درسِ نظامی کے فارغین کا مسئلہ

انجم عثمانی

بے روزگاری یوں تو پورے ملک پر مسلط ہے لیکن عربی مدارس کے فارغین کے لئے یہ ایک ایسا ناقابل حل مسئلہ بن گیا ہے کہ جس کا کوئی مثبت حل تلاش کرنے میں ذہن ناکارہ اور جستجو ناکام ہوچکی ہے۔ اگرچہ عام طور پر مختلف علوم کے لوگ ملازمتوں کے قحط سے متاثر ہیں۔ لیکن درس نظامی کے فارغین کے علاوہ دوسرے علوم کے فارغین اگر حاصل کردہ علم کے میدان میں جگہ نہیں پاتے ہیں تو اپنی اقتصادی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے دیگر تراکیب و ذرائع استعمال کرلیتے ہیں۔ خاص طور پر صنعتی دور کے ارتقا نے ان افراد کے لئے ذریعۂ معاش کا مسئلہ کسی حد تک حل کردیا ہے کہ جو صنعت و حرفت سے کسی بھی علم کے ذریعہ ادنیٰ طور پر بھی وابستہ ہیں۔ اس سلسلے میں چھوٹے پیمانے پر صنعتی کام (اسمال انڈسٹریز) کے پھیلاؤ اور چھوٹے پیمانے پر تجارت کے فروغ نے ان لوگوں کو کافی راہ دکھائی ہے، مثلاً اگر کوئی شخص گریجویشن کرنے کے بعد بھی ملازمت نہیں پاتا تو وہ مذکورہ ذرائع کے استعمال سے کسی حد تک اپنی اقتصادی حالت سنبھالے رکھتا ہے لیکن درس نظامی کے فارغین کے لئے ان آسانیوں کا استعمال ایک شجر ممنوعہ کی حیثیت اختیار کئے ہوئے ہے۔ نتیجہ یہ کہ وہ دیگر علوم کے فارغین کی طرح اپنی اقتصادیات کے حل کے لئے مذکورہ ذرائع کو استعمال نہیں کرپاتا۔ دنیاوی ضروریات کے لئے خالص دنیاوی انداز کے ذرائع (غیر تدریسی وغیر تبلیغی ذرائع) کے استعمال کو لوگ اس کے لئے برداشت نہیں کرپاتے عوام کے ذہن میں ایک مولوی کی کیا تصویر ہے؟ اور کیوں؟

عوام کے ذہنوں میں مولوی کا تصور یہ ہے کہ وہ کسی مدرسہ میں ڈیکس کے پیچھے بیٹھا پڑھا رہا ہے، کسی جلسے میں وعظ کررہا ہے یا کسی مسجد میں امام ہے وغیرہ وغیرہ' اور بس۔ اس سے آگے وہ مولوی کی ضروریات' اس کے مسائل اور اس کی صلاحیات کو نہ سمجھنا چاہتے ہیں اور نہ اس کی ضرورت سمجھتے ہیں۔ مولوی بھی ایک انسان ہوتا ہے اس کے سینے میں بھی دل اور دل میں اوروں جیسے ارمان انگڑائیاں لے سکتے ہیں' اسے بھی اوروں کی طرح بھوک ستاتی اور روشنی چکاچوند کرسکتی ہے، اس کے بھی اس ایک خاص تصور سے ہٹ کر کچھ مسائل ہوتے ہیں، اس میں بھی درس و تدریس کے علاوہ دیگر کاموں کو بہتر طور پر انجام دینے کی صلاحیت ہوسکتی ہے۔ اس قسم کی باتوں کو ایک مولوی کے لئے عوام سوچنے کو تیار نہیں۔ اس تصور اور ذہنیت کی دیگر وجوہات میں سے ایک بڑی وجہ خود ماضی کا مولوی بھی ہے۔ ماضی میں مولویوں نے عوام کے ذہن میں مولوی کو قدرے مافوق الفطرت اور سماجی ڈھانچے سے ذرا ہٹ کر دکھایا اس نے اپنے ہر شاگرد کے سر پر یہ کہہ کر دستارِ فضیلت باندھی کہ تم بھی اوروں کو اسی ڈھانچہ اور طرز پر تعلیم دیتے رہنا۔ انھوں نے اپنی تحریر و تقریر میں ہر اس بات پر زور دیا کہ جس سے عوام اپنی نئی نسل کو اس ارادہ کے ساتھ مدارس میں بھیجدیں کہ وہ بھی بڑے ہوکر "مولوی صاحب" جیسا بن سکے گا۔

اس عظیم دشواری اور پیچیدگی کی دو بڑی وجہیں ہیں ایک عوام کی درس نظامی کے فارغین سے غلط اور بے محل توقعات کی وابستگی۔ دوم، درس نظامی کے فارغین کی عدم توجہی۔

پہلی وجہ کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ہمیں درس نظامی کے فارغین کے لئے عوام کے رجحانات کا جائزہ لینا ہوگا اور اس امر کی تشریح ضروری ہوگی کہ عوام درس نظامی کے فارغین سے کس قسم کی توقعات رکھتے ہیں

اس تمام بحث سے ماضی کے مولوی کی نیت پر شبہ مقصود نہیں اس لئے کہ تجربے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ زمینداری کے خاتمے سے قبل اور معاشرتی و اقتصادی ڈھانچے کے تبدیل ہونے سے پہلے ایک باپ کا اپنی اولاد کو مدارس میں بھیجنے کا مقصد جزوی طور پر بھی اقتصادی نہیں ہوتا تھا اس لئے کہ اس کے سامنے آج جیسی اقتصادی مشکلات ہی نہیں تھیں اسے اس بات کی بالکل فکر نہ تھی کہ میری اولاد زندگی کے بہت سے برس ایک شئے کو حاصل کرنے میں صرف کرنے کے بعد اس کے نتیجے میں کچھ دنیاوی مال و دولت بھی حاصل کرنے کے قابل ہوسکے گی یا نہیں؟ اس لئے کہ اس کے پاس اتنا کچھ مال ہوتا تھا کہ وہ اپنی زیر تعلیم نسل کے اخراجات اس رجحان سے ہٹ کر بھی برداشت کرسکے یہ صورت حال ظاہر ہے کہ اب نہیں ہے۔ اسی فارغ البالی کی صورت حال کے پیش نظر یہ ہوتا رہا کہ ایک شخص درس نظامی سے فراغت پاکر آتا اور دوسروں کو اسی انداز پر تعلیم دیتا۔ یہ صورت حال اس وقت تک نقصان دہ نہیں رہی جب تک وقت ان کا ساتھ دیتا رہا معاشی و اقتصادی فریم جوں کا توں رہا لیکن جیسے ہی رفتار زمانہ نے دنیاوی ضروریات کے حصول اور صرف کی راہیں

بدلیں یہ صورت حال نقصان دہ ہوتی گئی۔ زمانہ اپنی قدریں اور اقتدار کے معنی بدلتا رہا اور یہ لوگ اپنے اس طرز عمل کے محدود دائرے میں رہ کر سوچتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مولوی اور مولویت ایک پچھڑی ہوئی شئے اور درس نظامی کا فارغ ایک محدود چیز بنتا گیا۔ اور اب تک یہ صورت حال تقریباً جوں کی توں ہے۔

ایسا کیوں ہے؟ اس دائرے کے ذمہ دار افراد نے زمانہ کی رفتار پہچان کر اپنے اندر جن تبدیلیوں کی جائز طور پر گنجائش تھی، کیوں نہیں کیں؟ اگر اس کو گہری اور منصفانہ نظر سے دیکھا جائے تو اس میں موجودہ افراد کا خلوص کم اور اغراض زیادہ وابستہ نظر آئیں گی۔ اس لئے کہ موجودہ مولویت کے ٹھیکیدار یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کے پاس وہ صلاحیت نہیں ہے کہ جس سے موجودہ نسل کو مسائل کا حل سمجھایا جاسکے اور مدرسی سے کیونکہ زمانہ کی رفتار نے اقتصادیات کو وابستہ کر دیا ہے اس لئے یہ لوگ اپنی آنکھوں کو بند رکھنا چاہتے ہیں اور نئی نسل کو بھی آنکھوں پر پٹی باندھ کر وقت کے اندھیروں میں دھکیل رہے ہیں۔ موجودہ صاحب اقتدار روایتی مولوی جانتے ہیں کہ موجودہ ڈھانچے میں حالات کے تقاضوں کے مطابق تبدیلیاں لائی جائیں تو اس میں ان جامد افراد کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہوگی جس سے ان کی روٹیوں پر فرق پڑے گا۔ اور اس کے لئے یہ تیار نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر موجودہ ڈھانچے میں وہ صالح اور ترقی پسند تبدیلیاں لائی جائیں کہ جن میں دنیاوی علوم کو بھی حسبِ ضرورت دخل ہو تو یہ لوگ ناکارہ ثابت ہوں گے کہ جو اپنے ڈھونگ سے عوام کو اپنے پھندوں میں پھانسے ہوئے ہیں۔ اس صحت مند کام کے لئے دوسرے ہی پرخلوص اور باخبر لوگ درکار ہوں گے۔ ان بےچاروں کے پاس کوئی اور میدان بھی نہیں کہ جس میں یہ کھا کما لیں۔ لہٰذا یہ لوگ اس کے لئے تیار نہیں کہ موجودہ روایتی نظام میں کوئی ادنیٰ سی بھی تبدیلی لائی جائے چاہے وہ جائز ہی کیوں نہ ہو۔ بھلے ہی اس خودغرضی کے نتیجہ میں نئی نسل زندہ درگور ہوتی رہے۔

یہ تو ہے ان صاحب اقتدار روایتی مولویوں کا رویہ، اس کے علاوہ درس نظامی کے فارغین کی معاشی مشکلات کے اضافہ میں ان افراد کو بھی دخل ہے کہ جو مستقبل کو اپنی کوتاہ نظری کے باعث انہی حدود میں محدود سمجھتے ہیں کہ جن کو روایتی مولویوں نے اپنی اغراض کے پیش نظر قائم کر رکھا ہے۔ دوران تعلیم وہ اس جانب توجہ ہی نہیں دیتے کہ اب یہ حدود کس قدر نقصان دہ ثابت ہو رہی ہیں اور اس طرح کوئیں کے مینڈک بنے رہنے سے ہمارا اور ہمارے چھوٹوں کا مستقبل کس قدر تاریک اور اذیت ناک ہو سکتا ہے۔ یہاں سے نکل کر مسجدوں اور مدرسوں کے علاوہ وہ کون سی جگہ ہے جہاں ہماری کھپت ہو سکتی ہے اور جس راہ کو اپنا کر ہم جائز طریقے سے اپنی معاشی ضروریات کی کفالت کر سکتے ہیں، اس کوتاہ ذہنی اور عدم توجہی کے بہت سے اسباب میں سے تین بنیادی سبب یہ بھی ہیں۔

۱۔ عربی مدارس میں اکثر ایسے افراد داخل ہونے لگے ہیں کہ جو ذہنی اعتبار سے کمزور ہوتے ہیں اور عام طور پر ایسے ماحول اور ایسے علاقوں سے آتے ہیں کہ جو کئی لحاظ سے پس ماندہ ہوتے ہیں۔

۲۔ ماں باپ اپنی اولاد میں سے اس فرد کو ان مدارس میں بھیجنے لگے ہیں کہ جو جسمانی اور ذہنی اعتبار سے دوسری اولاد کے مقابلہ میں کمزور ہوتے ہیں۔

۳۔ مدارس میں آنے کے بعد انھیں زمانے کی رفتار اور حالات کے تقاضوں کو پہچاننے کے مواقع میسر نہیں آتے اور ایسے انداز پر تعلیم نہیں ہوتی کہ وہ مروجہ درس وتدریس کے علاوہ زندگی کے کسی اور شعبہ میں بھی بغیر کسی اور ذریعہ کی مدد کے نمایاں رول ادا کر سکیں، جس کی وجہ سے وہ مدارس سے باہر نکلتے ہی اپنے اندر احساس کمتری پاتے ہیں اور دوسروں کے مقابلے میں زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ انھیں مولویت کی معراج بس یہی سمجھائی جاتی ہے کہ تم کسی مدرسے میں بڑے مدرس ہو جاؤ اور بس۔ یہ نہیں کہ تم یہاں سے نکل کر تجارت کی کوشش کرنا، اچھے میکنک یا اچھے کسان بننے کی سعی کرنا وغیرہ۔ حالانکہ اسلامی نظام تعلیم میں ان سب شعبوں کے لئے نہ صرف یہ کہ اوروں سے زیادہ گنجائش ہے بلکہ بہت کچھ روشنی ملتی۔

سبب نمبر ایک (۱) کی بنیاد یہ ہے کہ اب اقتصادیات کی صورت انفرادی ہے یعنی اب ہر فرد کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو، اپنے مسائل سے خود نمٹ سکتا ہو، اپنی کفالت خود کر سکتا ہو، اور ہمارے درس نظامی کا انداز ابھی تک اسی طرح کا ہے کہ جس میں اقتصادیات کے سدھار کے لئے بہت کم گنجائش ہے اس لئے کہ اس میں تو شک نہیں کہ درس نظامی مذہب کی تمام عبادتی جذبات سے سیر حاصل بحث کرتا ہے جس سے مذہبی مسائل کھل کر سامنے آجاتے ہیں اور دینی زندگی میں مکمل عالم ہو جاتا ہے لیکن دنیاوی ضروریات (بالخصوص موجودہ دور میں پیدا شدہ ضروریات) پر ان کی عملی تطبیق نہیں کی جاتی، ایسا نہیں کہ مروجہ کورس میں انسانی ضروریات کا شعور ہی حاصل نہ ہوتا ہو اور طالب علم کو دنیاوی ضروریات سے بالکل ہی آگاہی حاصل نہ ہوتی ہو، بلکہ وجہ یہ کہ درس نظامی میں دنیاوی معاملات کے لئے نظریات تو بہت ہیں لیکن ضروریات اور مسائل زندگی پر ان کی عملی تطبیق مفقود ہے یعنی درس نظامی یہ تو سکھا دیتا ہے کہ تجارت، صنعت اور زراعت وغیرہ کے اسلامی قوانین یہ ہیں لیکن نہ تو ان کو عملی طور پر کرایا جاتا ہے اور نہ درس وتدریس میں ہی ان باتوں پر زور دیا جاتا ہے۔

باعتبار مسائل ونظریات درس نظامی میں بہت کچھ پڑھا دیا جاتا ہے لیکن دنیوی مصروفیات میں ان کا استعمال عملی طور پر مشق نہیں کرایا جاتا۔ نتیجہ یہ کہ جب مدرسوں کی چہار دیواری سے نکل کر عملی زندگی میں قدم رکھتے ہیں تو کچھ سجھائی نہیں دیتا کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں؟ سوائے اس کے کہ کسی مدرسے میں مدرس ہو جائیں یا مسجد میں امام ومؤذن۔

اس جمود سے جہاں یہ خرابی پیدا ہوئی کہ عوام نے زیادہ کارآمد ذہن مدرسوں سے ہٹا کر دوسری جگہ لگا دیئے وہاں یہ فتنہ بھی زور پکڑ تا گیا کہ گزارہ کرنے کے لئے ایسے ذرائع پیدا کئے جائیں کہ جو مولویت کے رواجی دائرے میں رہ کر اپنائے جاسکیں، نتیجہ میں تعویذ گنڈوں، جادو ٹونوں، جھاڑ پھونک کو فروغ ہوا اور درس نظامی کے

فارغین نے کسی اور میدان میں جگہ نہ پاکر اس میدان میں گل کھلانے شروع کر دیئے۔ آہستہ آہستہ لوگوں کے دل سے یہ بات ہی صاف ہو گئی کہ تعویذ گنڈوں کے جال میں پھانس کر عوام سے روپیہ بٹورنا جائز ہے کہ ناجائز؟ اس طرح مذہبی تعلیم کا تمام تر ہی مقصد فوت ہو گیا کہ جس کے لئے عمر عزیز کے بہت سے سال لگائے گئے تھے کہ وہ جائز اور ناجائز میں فرق کر سکے اور زندگی کے ہر شعبہ میں جائز کو اپنا کر ناجائز سے گریز کرے اور اب تو حالت یہاں تک پہنچی ہے کہ اچھا...... اور...... کامیاب مولوی وہی کہلاتا ہے کہ جس کے زیادہ سے زیادہ چیلے ہوں اور جس کے یہاں تعویذ لینے والوں، ہاتھ چومنے والوں کی لمبی سے لمبی لائن لگتی ہو، جو عوام کو دھوکے دے کر چھے دار تقریریں کر کے زیادہ سے زیادہ دولت لوٹ سکے۔ حاصل یہ کہ مولویت ایک علم سے زیادہ پیشہ بن گئی ہے اور اس میں وہ تمام پیشہ ورانہ خرابیاں داخل ہو گئی ہیں جو کسی غیر شرعی پیشہ میں ہو سکتی ہیں، پیری مریدی کے لئے حلقے بنے ہوئے ہیں، بالکل ان بدقماش لوگوں کی طرح جن کے بدمعاشی کے لئے اڈے بنے ہوتے ہیں اور جو اپنے علاقے میں کسی اور کا گزر بھی پسند نہیں کرتے۔ مدارس کی آپس کی رقابتیں اور مدرسوں کی آپسی چپقلش بھی بالکل پیشہ ورانہ رقابتوں کی طرح ہے۔ عہدوں کے لئے بھاگ دوڑ اور کنبہ پروری بھی بالکل سیاسی گرگوں جیسی ہے۔ غرض کہ ہر وہ غیر اسلامی، غیر اخلاقی بالکل غیر انسانی رویہ مولویت کو پیشہ بنا کر اپنا لیا گیا ہے کہ جس سے نہ صرف مقصد تعلیم ہی فوت ہو گیا ہے بلکہ اس گھناونی زندگی کو اپنا کر مولویت جیسے مقدس نام اور دین جیسے پاک تعلیم کے حصول پر بدنما داغ بن گئے ہیں۔

سبب نمبر دو (۲) کی بنیادی وجہ بھی یہی ہے کہ جب عوام درس نظامی کے فارغین کو ایسی بدحالی میں مبتلا دیکھتے ہیں تو زیادہ سے زیادہ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کے اچھے ذہن اس میں برباد نہ کئے جائیں مثلاً اگر کسی کے تین بچے ہیں تو وہ یہ دیکھتا ہے کہ ان میں سب سے زیادہ ذہین کونسا ہے اس کو وہ کسی اسکول میں داخل کر دیتا ہے پھر دوسرے کو جو اس سے کچھ کم درجہ کا ہے کسی صنعت میں ڈال دیتا ہے اور تیسرا جو سب سے کند ذہن ہے اسے مدرسے میں بھیجدے گا کہ وہاں مفت کی روٹی تو ملتی ہے کم از کم پندرہ سال تک تو اسکی کفالت سے چھٹی ملی۔

سبب نمبر تین (۳) درس نظامی کی اقتصادی تباہی کا سب سے بڑا سبب ہے اس لئے کہ فراغت کے بعد یکطرفی تعلیم کی وجہ سے ان کے پاس کوئی میدان نہیں ہوتا۔ ان مدارس میں نہ صنعت کے شعبے ہیں اور نہ زراعت و تجارت کے۔ وہاں سے نکلا ہوا شخص نہ میکینک ہے نہ تاجر نتیجہ پھر وہی مولویت کا روایتی میدان اور اقتصادی الجھنیں۔

اب تک کی تمام بحث کے بعد کوئی معترض یہ کہہ سکتا ہے کہ عربی مدارس کے قیام کا مقصد دنیاوی ہے ہی کب کہ اس قسم کی مشکلات و مسائل پر بحث کر کے ان کے حل تلاش کرنے کی کوشش کی جائے۔ اگر روپیہ ہی کمانا ہے تو یہ مدارس ہی کیوں؟ کوئی اور راہ اپنائیے۔

یہ اعتراض صریحاً غلط ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ دینی مدارس کے قیام کا مقصد خالص دنیا کمانا تو واقعی نہیں ہے اس کے لئے اور بہت سے راستے ہیں لیکن کیا مدارس کے قیام کا مقصد یہی ہے کہ جس قسم کے افراد فارغ ہو رہے ہیں ہوتے رہیں؟ کیا اسلام صرف مکاتب و مساجد تک محدود ہے؟ کیا اسلامی نظام تعلیم صرف دینی مسائل کا حل اپنے اندر رکھتا ہے؟ کیا مدارس کی حیثیت ایسے کارخانے کی نہیں ہونی چاہیئے کہ جس میں سے نکلنے والی نئے دینی و دنیاوی اعتبار سے مثالی ہو؟ کیا مقاصد قیام میں یہ نیت کارفرما نہیں کہ یہاں سے قوم کے معمار نکلیں اور قوم میں اسلامی اسپرٹ اور جذبہ پیدا کریں؟ کیا قوم کے نوجوان طبقے کو مدارس میں جمع کرنے کا مقصد یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ پوری قوم کے مسائل کو سمجھیں اور انھیں دینی تعلیم کی روشنی میں حل کریں عام اس سے کہ وہ مسائل دینی ہوں یا دنیاوی۔ کیا دینی مدارس کے چلائے رہنے میں یہ نیت کارفرما نہیں کہ یہاں سے فارغ شدہ وقت کے نئے مسائل کا حل قرآن و حدیث کی روشنی میں نہ صرف یہ کہ دنیا کے سامنے پیش کریں بلکہ ان پر خود بھی عمل پیرا ہوں؟

ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے بلکہ مذکورہ بالا تمام جذبات اور اسی قسم کے دیگر بنیادی مقاصد مدارس کے قیام میں پیش نظر رہے ہیں مگر ان مقاصد کو مدارس کے قیام میں پیش نظر نہیں رکھا جاتا اور صرف معترض کی محدود نگاہ کا کیا گیا، اعتراض مان لیا جاتا ہے تو پھر ان مدارس سے فائدہ ہی کیا ہے؟ اگر صرف ضروری دینی تعلیم دینا مقصد ہے (جتنی کہ فرض ہے) تو اس کے لئے اتنے بڑے بڑے مدارس کے قیام کی ضرورت ہے؟ یہ کام تو گھر بیٹھے کچھ کتابیں پڑھ کر بھی کیا جا سکتا ہے، اس کے لئے قوم کے کروڑوں روپے صرف کرنے، اور دنیا کے گوشے گوشے سے ہزارہا افراد کو اپنا گھر بار چھوڑنے، زندگی کا ایک قابل لحاظ حصہ اس کے حصول میں صرف کرنے سے کیا فائدہ ہے؟

معلوم ہوا کہ مذکورہ تمام جذبات مدارس کے قیام کا اصل اور بنیادی مقصد ہے اس لئے کہ مذہب اسلام کا مقصد صرف دینی زندگی کا سدھار ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ دنیاوی زندگی کے تمام مسائل کا حل بھی ہے، اسلام صرف عبادت کا نام نہیں بلکہ ایک مکمل اور ہر دور میں مکمل دستور حیات ہے۔ ان مدارس کے قیام کا اصل مقصد تھا بھی یہی کہ نوجوان کتابی علم کے ساتھ زندگی کا ایک معتدبہ حصہ ایک ایسے خالص اسلامی ماحول میں گزاریں کہ جو اُن کو دینی اور دنیاوی دونوں اعتبارات سے مکمل انسان بنا دے تاکہ جب وہ وہاں سے نکلیں تو انسانی زندگی کے لئے رحمت ثابت ہوں زحمت نہیں، عوام ان کو دیکھ کر دین کی جانب مائل ہوں نہ کہ بیزار، ان کی تمام زندگی کا ہر ہر لمحہ قرآن و حدیث کی بتائی ہوئی راہ کے مطابق ہو نہ کہ اسکے مخالف۔

اب ان تمام اور اس قسم کی دیگر بنیادی مقاصد کے پیش نظر جائزہ لیجئے کہ مدارس جن پر قوم کا لاکھوں روپیہ اور نوجوانوں کی زندگی کا ایک معتدبہ حصہ صرف کیا جا رہا ہے مذکورہ مقاصد کو موجودہ طرز کی روشنی میں کس حد تک پورا کر رہے ہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟ آیا موجودہ نظام بالکل ہی ناکارہ ہے یا اس میں تبدیلیوں کی ضرورت ہے؟

[redacted]

تاریخ ہند اور فرقہ پرستی



اصغر علی انجینیر   ترجمہ: شہاب افسر

ہم عصر مورخوں کی لکھی ہوئی تاریخوں کے بغور مطالعہ کے بعد ہم بہ آسانی اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ڈاکٹر رومیلا تھاپر، ہربنس مکھیا، ڈاکٹر عرفان حبیب اور ان جیسے چند مورخوں کو چھوڑ کر بیشتر جدید مورخوں نے تاریخ ہند کو نہایت تنگ نظری اور اکثر فرقہ واریت کے جذبے کے تحت لکھا ہے۔

بدقسمتی سے آج کل ہمارے مدرسوں کے نصاب میں ان گھٹیا قسم کے مورخوں کی کتابیں پڑھائی جا رہی ہیں جنہوں نے بڑی ڈھٹائی سے تاریخ ہند کے چند مخصوص واقعات کے خاکوں کا انتخاب کیا۔ اور ان میں جی کھول کر فرقہ واریت کا رنگ بھرا۔ فرقہ واریت کا یہ زہر اگر کتابوں کے ذریعہ مسلسل طلبا کے معصوم ذہنوں کو مسموم کرتا رہے تو وہ دن دور نہیں کہ ہماری آئندہ نسلیں ہمارے تاریخی وتمدنی ورثہ کے صحت مندانہ تصور سے محروم ہو جائیں اور اس کی جگہ قومی تاریخ کا نہایت ہی مسخ شدہ بھیانک تصور ان کے دلوں میں جاگزیں ہو جائے۔ جس کے نتیجے کے طور پر ہندوستان کے مختلف تہذیبی گروہوں میں فرقہ وارانہ منافرت اور باہمی تصادم کا لامتناہی سلسلہ قائم ہو جائے۔

کسی تاریخی واقعہ کا صحیح ادراک اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ اسے رائج الوقت افکار و نظریات اور اس دور کے سماجی و سیاسی حالات کے ڈھانچہ میں رکھ کر نہ پرکھا جائے۔ فرقہ وارانہ بنیادوں پر ہندوستانی تاریخ کی تدوین کی ابتدا ایک انگریز فلسفی اور مورخ جیمس مل (James Mill) نے کی تھی۔ اس مورخ نے ہندوستان کی تاریخ کو تین ادوار یعنی ہندو دورِ حکومت، مسلم دورِ حکومت اور برٹش دورِ حکومت میں تقسیم کر کے پہلی بار ہندوستانی تاریخ کی فرقہ وارانہ توجیہہ کے کام کی ابتدا کی۔

ڈاکٹر رومیلا تھاپر کا ہندوستانی تاریخ کے مختلف ادوار کی من مانی تقسیم پر اعتراض حق بجانب ہے۔ ان کے بموجب "یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ ۱۲۰۰ قم تا ۱۲۰۰ء کے درمیانی وقفہ کو ہندو دور کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس دور میں برصغیر کے سلاطین ہندو مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ حالانکہ محض سلاطین کی خاندانی تاریخ کی بنیاد پر بھی اس دور کو صحیح طور پر ہندو دور نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ اس میں بے شمار دیگر سلاطین بھی تھے جنہیں کسی طرح بھی ہندو نہیں کہا جا سکتا۔ مثلاً موریا خاندان کے سلاطین، ہند یونانی (Indo-Greek)، شاکا خاندان اور کشن (Kushans) سلاطین جن میں سے بیشتر بادشاہ بدھ مت کے پیرو تھے۔ گو یا لوگ ہندو مذہب کے خلاف نہیں تھے لیکن انہوں نے ہمیشہ خود کو ہندو کی بجائے بدھ مت کے پرستار کہلوانا پسند کیا۔"

اسی طرح تاریخ ہند کے دوسرے دور کو مسلم دورِ حکومت کہنا بھی مناسب نہیں کیونکہ اس دور کے مسلم سلاطین کے درمیان ہم مذہبی کے مشترکہ رشتہ کے باوجود قبیلہ وارانہ بنیادوں پر جنگ و جدال کا سلسلہ جاری رہا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وسط ایشیا کے بیشتر خانہ بدوش قبیلوں نے اسلام قبول کر لیا تھا لیکن محض تبدیلیٔ مذہب نہ تو ان کے درمیان قبیلہ وارانہ رقابتوں ہی کا خاتمہ کر سکا اور نہ اس کے باعث ان کی سوسائٹی کے سماجی اور معاشی ڈھانچے میں کوئی نمایاں تبدیلی ہوئی۔ وسط ایشیا کے یہ وحشی قبائل مذہب اسلام اور اس کی ان اعلیٰ روحانی قدروں کے ادراک سے قاصر تھے جن قدروں کو مکہ معظمہ کے اعلیٰ تہذیب یافتہ تاجر پیشہ افراد نے ان تک پہنچایا تھا۔ اسلام قبول کرنے کا اگر کچھ اثر ان قبائل پر پڑ سکا تو وہ صرف اس قدر تھا کہ نئی اسلامی برادری کے تصور کے زیر اثر مختلف قبائل علاقائی بنیادوں پر اپنی فیڈریشن (Federation) بنا سکیں۔ ان میں سب سے طاقتور فیڈریشن منگول اور ترک قبیلوں کی تھی۔ ان قبائل کا سب سے بڑا معاشی ذریعہ چوری، ڈکیتی اور غارت گری تھا۔ ان کی غارت گری اور قتلِ عام کا سب سے پہلا نشانہ وہ شہر بنا جو اسلامی علوم و ثقافت کا گہوارہ تھا۔ اس سلسلے میں پروفیسر محمد حبیب لکھتے ہیں:۔

"ماوراالنہر، فارس اور عراق جیسے ممالک کی فتح کے بعد وہاں منگول حکمراں طبقہ کی بنیاد پڑی۔ گو اس طبقہ نے رسماً اسلام قبول کر لیا تھا لیکن یہ طبقہ اپنی قدیم منگول روایات کا پابند رہا۔ جن کے تحت نہ صرف یہ کہ قتلِ عام کی اجازت دی گئی تھی بلکہ خون ریزی کو اعلیٰ اور ارفع فعل بھی تصور کیا جاتا تھا۔"

ان منگول قبائل نے مغربی ایشیا کی مکمل لوٹ کھسوٹ کے بعد ہندوستان کا رخ اختیار کیا۔ وہ یہاں پر اسلام کی اشاعت کی غرض سے نہیں آئے تھے جسے انہوں نے حال ہی میں قبول کیا تھا۔ بلکہ ان کا مقصد یہاں بھی قتل و خون ریزی کے ذریعہ ہندوستان کی افسانوی دولت کی لوٹ کھسوٹ تھا۔ گو انہوں نے اپنی جنگوں کو جہاد کا نام دے رکھا تھا لیکن اس اصطلاح کے پس پشت بجز لوٹ کھسوٹ اور خون آشامیوں کے اور کچھ نہ تھا۔

اس تجزیہ کی روشنی میں قتل و غارت گری اور

معاشی استحصال کے اس دور کو جس کی ابتدا ہندوستان پر ترک منگولیائی نسل کے قبائل کے حملوں سے ہوئی کسی قیمت پر اسلامی دور حکومت نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی بجائے اس دور کو حکمراں خاندانوں کے نام سے منسوب کیا جا سکتا ہے یہ بات اس لئے بھی موزوں معلوم ہوتی ہے کہ بیرونی حملہ آوروں کے مختلف خاندانوں کے درمیان بھی اسی قسم کی شدید جنگیں ہوئیں جیسی کہ مقامی ہندوستانی حکمرانوں کے ساتھ۔ بعض اوقات ترک حکمران خاندانوں نے اپنے ہی ہم مذہب منگولوں کے حملے روکنے کے لئے ہندو راجاؤں سے مدد حاصل کی۔ لحاظ ان تمام جنگوں کو ہوس ملک گیری کی جنگیں کہنا چاہیئے جن میں مختلف قبیلوں نے بلا لحاظ مذہب و ملت ایک دوسرے سے تعاون کیا اور اپنے ہم مذہبوں سے نبرد آزما ہوئے۔

مورخین نے علاؤالدین خلجی کے تاریخی کردار کو کافی مسخ کیا ہے کیونکہ اس نے چند طاقتور ہندو زمینداروں کو جو اس کے خلاف سازش میں مصروف تھے سزائیں دی تھیں۔ لیکن یہ مورخ اس سے کہیں زیادہ سخت ان سزاؤں کو یکسر نظر انداز کر جاتے ہیں جو علاؤالدین خلجی نے ان مسلمانوں کو دی تھیں جنھوں نے اس کے اقتدار اعلیٰ کو چیلنج کرنے کی جسارت کی تھی۔ اس بارے میں آر۔ سی۔ مجومدار کہتے ہیں۔

"وہ 'نو مسلم' جو دہلی کے اطراف و کناف میں بسے ہوئے تھے غیر مطمئن اور بے چین تھے۔ ان لوگوں نے اس وقت علم بغاوت بلند کر دیا جب علاؤالدین خلجی کی فوجیں گجرات کی فتح کے بعد واپس لوٹ رہی تھیں۔ بادشاہ نے تمام نو مسلموں کو ملازمت سے برخاست کر دیا جس کے باعث ان کی بے چینی میں مزید اضافہ ہوا اور سخت مایوسی کے عالم میں انھوں نے بادشاہ کو قتل کر ڈالنے کی سازش مکمل کر لی۔ لیکن اس سازش کا انکشاف ہو گیا اور شہنشاہ نے ان کے قتل کا فرمان جاری کر دیا اس طرح صرف ایک دن میں کوئی بیس تا تیس ہزار نو مسلم بے رحمی سے قتل کئے گئے۔"

اسی طرح غداری کے شبہہ پر علاؤالدین خلجی نے ایک مسلم صوفی بزرگ سدی مولا کو بھی قتل کروایا۔

جدید مورخین کی فرقہ وارانہ تاریخ نویسی کی مثال محمود غزنوی کے سوم ناتھ کے مندر پر حملہ کا تذکرہ ہے جس کو انھوں نے کافی تفصیل کے ساتھ کتابوں میں درج کیا ہے۔ غزنوی کے اس مکروہ فعل کو تو مورخین نے بڑی شدت کے ساتھ تاریخ کے صفحات پر ابھارا ہے لیکن انھوں نے کشمیر کے راجہ ہرش (۱۰۸۹-۱۱۰۱) کے ان افعال کا بھولے سے بھی کہیں تذکرہ نہیں کیا ہے جو اپنی شدت اور گھناؤنے پن میں غزنوی کے افعال سے کہیں زیادہ ہے۔ ڈاکٹر کوسامبی (Dr. Kosambi) لکھتے ہیں:-

"کشمیر کے راجہ ہرش نے اپنی سلطنت کے طول و عرض میں پائے جانے والی دیوی دیوتاؤں کی دھات کی بنی ہوئی مورتیوں میں سے چار کو چھوڑ کر بقیہ تمام کو پگھلوا دیا۔ اس مقصد کے لئے ہرش نے ایک مخصوص قلمدان وزارت قائم کی۔ متعلقہ وزیر کو 'دیوتاؤں کا غارت گر' (Devotpatana Nayaka) کہا جاتا تھا حاصل کردہ مورتیوں کی سر عام بے حرمتی کروائی جاتی۔ جزامی سر عام ان پر پیشاب کرتے، بول و براز ڈالتے اور پھر انھیں گھسیٹتے ہوئے دھات پگھلانے والی بھٹی تک لے جاتے تھے۔ ان سب گھناؤنی باتوں کے لئے کبھی کوئی معمولی سا مذہبی جواز تک پیش نہیں کیا جاتا۔ ان بے ہودہ افعال پر دینیاتی مباحث کے خواہ کتنے ہی دبیز پردے ڈالے جائیں۔ یہ بات صاف ظاہر ہے کہ ان افعال کا محرک معاشیات ہی کا مسئلہ تھا۔ یہ لوٹ کھسوٹ کی ایک واضح مثال تھی۔ اسی طرح پرمار خاندان کے راجہ سبھا تاورن (۱۱۹۳-۱۲۱۰) نے بھی گجرات پر حملے کے دوران دابھوئی (Dabohi) اور کھمبے (Cambau) کے جین مندروں کو خوب خوب لوٹا اور بے حرمت کیا۔

تاریخ کی فرقہ وارانہ توجیہہ کرتے وقت مورخ واقعات کو مذہبی تنگ نظری کا چشمہ لگا کر دیکھتا ہے اور حقیقی تاریخی و سیاسی عوامل کو یکسر نظر انداز کر دیتا ہے ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کے طرز حکومت کو مورخین نے غلط طور پر ان کے اسلامی عقائد سے ہم آہنگ ثابت کرنے کی کوشش کی۔ ہندوستان کے کسی مسلم حکمراں کی خواہشات کے قطع نظر یہ بات کسی صورت میں ممکن ہی نہ تھی کہ ہندوستان جیسا وسیع و عریض ملک اپنے مختلف الانواع سماجی اور معاشی ڈھانچوں سمیت اسلامی طرز زندگی کو اپنا لے۔ ترکی النسل سلاطین اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے اسی لئے انھوں نے کبھی مال گذاری اور حصول دولت کے اسلامی تصورات کو رائج نہیں کیا حالانکہ اس پر اس ضمن میں درباری علماء نے بہت زور ڈالا۔

دراصل مسلم حکمرانوں نے نچلی سطح پر نظم حکومت کو بالکلیہ ہندو سرداروں اور چودھریوں کے سپرد کر دیا تھا جو رعایا سے لگان وصول کر کے شاہی خزانہ تک پہنچایا کرتے تھے۔ اس کام میں اس وقت تک انھیں مکمل آزادی حاصل رہتی جب تک کہ وہ محصولات کی وصولیابی کا کام اطمینان بخش طریقہ پر انجام دیتے رہتے اور رقم خزانہ عامرہ میں پہنچتی رہتی۔ خود مکتفی دیہاتی علاقے جن میں رعایا کا بیشتر حصہ آباد ہوتا مرکز میں چلنے والی سیاسی ریشہ دوانیوں اور اقتدار کی دھوپ چھاؤں کے اثرات سے بے نیاز رہتے۔

اسلامی نظم حکومت کے چلانے میں برہمنوں نے جو رول ادا کیا ہے اس کے بارے میں پروفیسر ٹائینبی (Toyanbee) یوں لکھتے ہیں:-

"ہندوستان میں سیاسی اقتدار خواہ کسی قوم کے پاس رہا ہو وزارتی قلمدان بہر حال برہمنوں کے پاس رہے ہیں۔۔۔۔۔۔ مغلوں سے پہلے کے مسلم حکمرانوں نے اور خود مغلوں نے ہندو راجاؤں کے طرز حکومت کو برقرار رکھا۔ جس کے باعث ان کے برہمن وزراء کو اور ان برہمنوں کو جو دیگر اعلیٰ و ادنیٰ عہدوں پر فائز تھے اس ملک میں مسلمانوں کی حکومت کی جڑیں مضبوط کرنے میں اور ہندوؤں کے لئے اسے قابل قبول بنوانے میں کافی سہولت مہیا ہوئی۔"

جہاں تک اسلام کے سماجی اور قانونی پہلوؤں کا تعلق ہے ان کا اطلاق کم و بیش مسلم رعایا پر

ہی کیا گیا۔ شریعت اسلامی کا نفاذ مسلمانوں کے علاوہ کسی اور گروہ پر نہیں کیا گیا۔ قانون شریعت کبھی بھی اسٹیٹ پالیسی کا جز و لاینفک نہ بن سکا۔ ممکن ہے چیدہ چیدہ شکلوں میں اس کلیہ سے انحراف کیا گیا ہو۔ تاہم یہی کلیہ ہمیشہ اصول حکمرانی کی اساس رہا ہے۔

ہماری تاریخوں میں اورنگ زیب کو ہندؤں کا دشمن بتایا گیا ہے لیکن اس بات کو حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ اپنی نجی مذہبی زندگی میں وہ یقیناً تقلید پسندی اور کٹر پن کا شکار تھا لیکن سیاسی معاملات میں وہ یقیناً قطعی غیر متعصب حکمران تھا۔ سیاسی انتظامی معاملات میں اورنگ زیب کے غیر متعصبانہ طرز عمل کا اندازہ اس تجویز سے لگایا جا سکتا ہے جو اس نے امین خان نامی ایک سردار کی درخواست پر کی تھی جس میں امین خان نے سُنّی العقیدہ ہونے کے باعث کسی بڑے عہدے پر مامور کئے جانے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اس کی درخواست پر بقول ڈاکٹر ستیش چندرا اورنگ زیب نے لکھا تھا۔

"دنیوی امور کا مذہب سے کیا تعلق ہے؟ اور انتظامی امور کو مذہبی عقائد میں الجھنے کی کیا ضرورت ہے؟ تمہارے لئے تمہارا دین کافی ہے اور میرے لئے میرا۔

اگر تمہارا تجویز کردہ اصول تسلیم کر لیا جائے تو تمام ہندو راجاؤں اور ان کی رعایا کا صفایا کر ڈالنا لازمی ہو جائے گا:"

اورنگ زیب کے یہ الفاظ ہمارے موجودہ سیکولرازم کے فلسفہ کے بنیادی اصولوں کے عین مطابق ہیں۔

اورنگ زیب نے اس امر میں بہت زیادہ احتیاط ملحوظ رکھی تھی کہ اس کے کسی فعل سے ہندو بحیثیت قوم برگشتہ نہ ہونے پائیں۔ تاکہ اکبر اور اورنگ زیب کی اختیار کردہ پالیسیوں میں کافی فرق موجود ہے۔ پرسیول اسپیر (Pearcivel Spear) کے کہنے کے مطابق "اورنگ زیب اکبر کے مقابلہ میں اس لئے مختلف تھا کہ اس نے ہندوؤں کو اکبر کی طرح مساوات کا درجہ دینے کی بجائے ان کے ساتھ دانستہ رواداری برتنے پر ہی اکتفا کیا۔ ہندوؤں کے ساتھ اس کی مبینہ غیر رواداری کے من گھڑت افسانوں کی بنیاد بنارس کے ایک سابقہ مندر کی بنیادوں پر مسجد کی تعمیر جیسے چند واقعات پر رکھی گئی ہے۔ بہادر مرہٹہ ہیرو شیواجی اور اورنگ زیب کی لڑائی کو بھی فرقہ وارانہ رنگ دیا گیا ہے۔ شیواجی گوریلا فن حرب کا ماہر تھا۔ اس نے اپنی چھوٹی سی لیکن منظم فوج کے بل بوتے پر سلطنت مغلیہ کی عظیم قوت کو للکارا تھا اطراف واکناف کے تمام مرہٹے کسان شیواجی کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے تھے اور انھوں نے شیواجی کو اپنی امنگوں اور آرزوؤں کا مرکز بنا لیا تھا۔ شیواجی اور اورنگ زیب کی لڑائی دراصل حصول اقتدار کی جنگ تھی۔ لیکن افسوس کہ ہمارے مورخ اسے فرقہ واریت کا رنگ دیتے ہیں۔ اورنگ زیب نے شیواجی کی تالیف قلب کی بہتری کوشش کی لیکن وہ شیواجی کی بلند بانگ آرزوؤں کی تکمیل نہ کر سکا۔ اس بارے میں ڈاکٹر ستیش چندر یوں رقمطراز ہیں:۔

"مغلوں اور شیواجی کے درمیان نزاعی مسئلہ منصب اور علاقہ کا تھا جو شیواجی کو عطا کیا جانا تھا۔ بعد ازاں چوتھ (Chauth) اور سردیشمکھی بھی نزاعی مسائل بن گئے۔ لیکن مغل یہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ ان کی جنوبی سرحدوں سے ملحق اتنی طاقتور مرہٹہ سلطنت قائم ہو جائے کہ انھیں کوئی خطرہ لاحق ہو......"

اس میں کوئی شک نہیں کہ شیواجی مرہٹوں کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کو ملا کر ایک بڑی طاقت کا روپ دینے میں کامیاب ہو گیا لیکن وہ انھیں جاگیردارانہ استحصال سے چھٹکارا نہ دلا سکا کیونکہ وہ خود بہت بڑا منصب دار بننا چاہتا تھا.......

ہماری تاریخیں حکمرانوں کی اچھائیوں، برائیوں اور فوج کشیوں کے تذکروں سے بھری پڑی ہیں حکمران جماعتیں ہی تاریخ پر ہمیشہ چھائی رہیں لیکن عام لوگوں کے حالات، ان کی سماجی اور سیاسی زندگی، ان عادات واطوار اور وہ تمام مشہور تحریکیں جو ان کے درمیان پھیلیں یکسر نظر انداز کر دی گئیں۔ ہم تاریخوں میں حکمرانوں کے سماجی اور سیاسی جھگڑوں کا حال کچھ اس طرح بیان کرتے رہے گویا کہ وہ جھگڑے ہمارے اپنے ہوں۔ ہم نے اس بات کو یکسر فراموش کر دیا کہ حکمران خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان اپنی مثال آپ تھے۔ انھیں اپنی رعایا سے کوئی سروکار نہ تھا خواہ وہ رعایا ان کی اپنی ہم مذہب ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ ترک بادشاہوں کا درباری مورخ ضیا برنی محنت کش مسلم عوام کو کتے اور سور کہہ کر مخاطب کرتا ہے اور انھیں اعلیٰ تعلیم کا اہل نہیں گردانتا۔

محنت کش عوام جن میں ہندو اور مسلمان سب ہی شامل تھے ان تھک محنت کرتے رہے اور اپنے فرماں رواؤں کے لئے سامان عیش ونشاط مہیا کرتے رہے۔ چنانچہ کے۔ کے۔ دتہ اور مجومدار لکھتے ہیں:۔

"ہندو اور مسلم فرقوں نے ایک دوسرے کے خیالات اور رواجوں کو اپنایا۔ زندگی کے طوفانی دھاروں کے نیچے ہمیشہ باہمی یگانگت اور رواداری کے جذبات موجزن رہے۔ دراصل ہندو اور مسلمان دونوں ہی ایک دوسرے کے کلچر کے شروع ہی سے مداح رہے ہیں چنانچہ اسلامی تصوف کے دیگر ماخذوں میں ایک ماخذ ہندوستانی بھی رہا ہے۔ ہندوؤں نے مسلم صوفیہ کرام اور بزرگان دین کی عزت وتکریم کر کے اور مسلمانوں نے ہندو بزرگوں کی عزت وتکریم کر کے باہمی رواداری کا مظاہرہ کیا۔ جس کے نتیجے کے طور پر دونوں فرقے ستیہ پیر (سچے پیر) سے عقیدت مندی کا اظہار کرنے لگے کئی مسلم شہزادوں اور صوفیہ کرام (جن میں زین العابدین کشمیری، داراشکوہ اور مرزا مظہر جانِ جاناں شامل ہیں) نے باضابطگی سے ہندو فلسفہ کا مطالعہ بڑے ذوق وشوق سے کیا۔ داراشکوہ نے ہندوؤں کی کئی مقدس کتابوں کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا۔ مزید براں دونوں تہذیبوں کے باہمی اشتراک کے باعث موسیقی، مصوری اور فن تعمیر میں کئی نئی شکلیں ابھریں۔

ہندو مسلم اتحاد فکر وفن کا یہی وہ بیش بہا تہذیبی ورثہ ہے جس پر ہر ہندوستانی کو فخر ہونا چاہئے ہماری آئندہ نسلوں کے لئے لکھی جانے والی تاریخوں میں ان پہلوؤں پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔

[redacted]

اشفاق اللہ خاں

حسرت وارثی

رفعت سروش

اشفاق کی زندگی کا سفر انسی بیسویں صدی کے بیتاب اور بے قرار لمحوں کے سفر کے ساتھ شروع ہوا اور وہ اپنے دامن میں اپنے دور کے تمام اضطراب، تمام بے چینی، تمام جوش و خروش، تمام اولوالعزمی اور جذبات ایثار و بغاوت کو سمیٹے ہوئے شریر بچپن سے الھڑ لڑکپن اور لڑکپن سے پر شور جوانی کی منزلوں میں داخل ہوتا ہوا اور لرزہ خیز طوفانوں کو للکارتا ہوا، قید و بند کی صعوبتوں پر زہر خند کرتا ہوا اور اپنے اقدامات پر فخر کرتا ہوا دار و رسن کی منزل تک پہنچا اور امر شہید ہو گیا ؎

زندگی بعد فنا تجھ کو ملے گی حسرتؔ
تیرا جینا ترے مرنے کی بدولت ہوگا

شاہ جہاں پور میں اس کے سادہ مزار پر یہ کتبہ مرقوم ہے۔

شہید وطن اشفاق اللہ خاں

آثار اشفاق کی تلاش مجھے کشاں کشاں اس سرزمین پر لے گئی جہاں یہ شعلۂ پیکر وجود میں آیا تھا، جہاں اس نے فروغ پایا تھا اور جہاں وہ سپرد خاک ہے۔ شاہ جہاں پور کے ریلوے اسٹیشن سے نکلتے ہی شہید وطن اشفاق اللہ خاں روڈ ہے۔ جس کی چہل پہل اور ہر وقت کی بیداری اشفاق کی بے تکان زندگی کو ہر لمحہ یاد دلاتی ہے اس روڈ کے ایک سرے پر اشفاق نگر پولیس چوکی ہے جو اشفاق کی طرح اس شہر اور علاقے کی نگراں ہے۔ اور پھر ہے محلہ اشفاق نگر (یہ اس کا نیا نام ہے) اس محلہ کے ایک معزز پٹھان گھرانے میں اشفاق نے آنکھ کھولی۔ اس خاندان کا تعلق قدن خیل قبیلے سے ہے۔

میں نے وہ حویلی دیکھی جہاں اشفاق پلے بڑھے، جوان ہوئے اور جہاں ان کی انقلابی سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ یہ ایک بڑی حویلی ہے جس کے ایک حصہ میں اشفاق رہتے تھے۔ باہر کی بیٹھک بدستور ہے اور اس بیٹھک کے ایک کونے میں وہ کوٹھری ہے جہاں اشفاق میٹنگیں کیا کرتے تھے۔ اس وقت اس کوٹھری میں کچھ پرانے قالین، کچھ ٹوٹی پھوٹی کرسیاں اور کچھ ادھر ادھر کا بے کار سامان پڑا ہے اور وہاں سوائے ان رازوں کے اور کچھ نہیں جو



اشفاق کے سینے میں آرزو بن کر دفن ہوگئے ——— اور وہ گھر وہ دالان، وہ چوڑی سیڑھیوں والا کوٹھا جہاں سے اشفاق فرار ہوئے تھے۔ آج بھی اشفاق کے قدموں کی کمک محسوس کرتا ہوگا۔

اس گھر کا ہی نہیں، اس محلہ کا بچہ بچہ اشفاق کو یاد کرتا ہے اور ابھی کچھ بزرگ باقی ہیں جو اشفاق کے ہم جلیس رہ چکے ہیں۔ اس گھر میں سب سے وقیع ذات اشفاق کی بھابی صاحبہ بیگم ریاست اللہ خاں کی ہے جن کے دل میں اپنے دیور اشفاق کی یادوں کے خزانے محفوظ ہیں وہ کس قدر ہنس مکھ، کتنے کھلنڈرے، کتنے ہشاش بشاش کتنے بہادر اور کس قدر نڈر انسان تھے اس کا اندازہ ان سے گفتگو کر کے ہو جاتا ہے۔ اس وقت ان کے خاندان میں اور بہت سے افراد ہیں، مگر ان کے سگے بھتیجے اشتیاق اللہ خاں کے پاس وہ انمول چیزیں محفوظ ہیں جن سے اشفاق کی زندگی اور ان کے فکر و فن پر روشنی پڑتی ہے۔ اشفاق کی قلمی ڈائری اور ان کی غزلوں کے مسودے ازراہ نوازش اشتیاق اللہ نے مجھے بھی دکھائے۔

اشفاق اللہ خاں کا مزاج لڑکپن سے باغیانہ تھا ——— خود لکھتے ہیں:-

"جنگ کے حالات پڑھنے سے مجھے بہت دل چسپی تھی۔ یہ دل چسپی جب عملی شکل اختیار کر لیتی تو مولوی صاحب مجھے کان پکڑ کر اٹھایا بٹھایا کرتے تھے۔ تھی تو سزا مگر کسرت کا کام دیتی تھی اور یہی وجہ ہے کہ میں خاندانی بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہونے کے باوجود سب کو زمین جھنکا دیتا تھی۔ محلہ میں بھی جنگ آزمائی ہوتی رہتی تھی، کیونکہ میں ایک جنگ جو لڑکا تھا غرض مار پیٹ کا بازار ہر وقت گرم رہتا تھا۔"

شاہ جہاں پور ان دنوں رام پرساد بسمل کی وجہ سے انقلابیوں کا مرکز تھا۔ جب اشفاق اللہ خاں مشن اسکول کے ساتویں درجہ میں پڑھتے تھے ان دنوں مین پوری سازش کیس کے سلسلے میں اس اسکول کا ایک لڑکا راجہ رام بھارتی گرفتار ہوا۔ اس سے اشفاق جیسے ذہین، بہادر، آزاد مزاج اور ہم عمروں میں ممتاز رہنے والے لڑکے کے

دل میں بھی کچھ کرنے کی خواہش پیدا ہونا قدرتی بات تھی۔ اور آٹھویں کلاس میں اشفاق نے جب سر والٹر اسکاٹ کی نظم "لو آف کنٹری" پڑھی۔ تو حب الوطنی کا شعلہ اس کے دل میں بھی دہک اٹھا۔

خلافت تحریک نے بھی اشفاق کے دل و دماغ پر اثر ڈالا ــــــ اور جب کرانتی کاری دل کے نیتا پنڈت رام پرساد بسمل سے ان کی ملاقات ہوئی۔ تو گویا اشفاق کے بے تاب ارادوں کو ایک سمت مل گئی۔ اور بہت جلد اشفاق نے بسمل کا اعتماد حاصل کر لیا اور وہ دونوں ایک جان دو قالب بن گئے۔ چنانچہ بسمل نے اپنی اور اشفاق کی دوستی پر جگہ جگہ فخر کیا ہے اور اس دوستی کو ہندو مسلم اتحاد کے لئے ایک قابل تقلید مثال سے تعبیر کیا ہے۔ ان دونوں کی دوستی کا یہ عالم تھا کہ اشفاق بسمل کو رام کہا کرتے تھے اور بسمل اشفاق کو کرشن کہہ کر پکارتے تھے۔

کرانتی دل کی انقلابی مہموں میں اشفاق بہت نمایاں کام انجام دیتے تھے اور کاکوری کیس میں ریلوے کے خزانے کا صندوق اشفاق نے ہی اپنے قوی ہاتھوں سے توڑا تھا۔

کاکوری کیس نے انگریزی حکومت کو چوکنا کر دیا اور ۲۶ دسمبر ۱۹۲۵ء کو جب گروہ کے افراد کے گھروں پر پولیس نے چھاپے مارے تو اشفاق فرار ہو گئے ــــ اور گھومتے گھامتے بنارس پہنچے۔ وہاں سے بہار ڈالٹن گنج میں ایک ایگزیکٹو افسر کے دفتر میں ملازمت کرنے گئے۔ اور اپنا تعارف متھرا کے ایک کائستھ کے روپ میں کرایا۔ ڈالٹن گنج میں انہوں نے آٹھ ماہ ملازمت کی۔ پھر اس مصنوعی زندگی سے تنگ آ کر نکل کھڑے ہوئے۔ اور دہلی آئے کہ کسی صورت سے باہر جانے کا پاسپورٹ مل جائے ــــ مگر شامت اعمال کہ دہلی میں انھیں ان کے بچپن کا ایک دوست مل گیا جو شاہ جہان پور کا ہی پٹھان تھا۔ اس دوست نے حق دوستی خوب ادا کیا۔ یعنی دو ہزار روپے انعام کے لالچ میں اشفاق کو گرفتار کرا دیا۔ غرض اس طرح ستمبر ۱۹۲۶ء میں اشفاق کو سنٹرل جیل لکھنؤ بھیج دیا گیا۔

چونکہ کاکوری کیس کے دوسرے گرفتار شدگان کا مقدمہ بہت آگے بڑھ چکا تھا اس لئے اشفاق اور ان کے ایک اور ساتھی شچیندر ناتھ بخشی پر (جو کچھ دن بعد گرفتار ہوئے تھے) الگ مقدمہ چلا ــــ فیصلہ تو سب کا ایک ساتھ ہی ہوا اور اشفاق اللہ خاں کو اسی روز پھانسی دی گئی جس دن اور جس وقت بسمل اور دوسرے ساتھیوں کو پھانسی دی گئی تھی۔ بسمل کو گورکھپور میں اور اشفاق کو فیض آباد میں ــــ

تنگ آکر ہم بھی ان کے ظلم کی بیداد سے
چل دیئے سوئے عدم زندانِ فیض آباد سے

اشفاق لفظی طور پر نہیں، عملی طور پر ہندو مسلم اتحاد کے حامی اور مجاہد تھے۔ یہ اشفاق ہی کا کارنامہ ہے کہ پنڈت رام پرساد بسمل جیسے کٹر آریہ سماجی کو جو مسلمانوں کی شدھی کرایا کرتے تھے .... اپنے عمل سے اور خلوص سے اسقدر بدل دیا تھا بسمل کے دل سے ہندو مسلمان کی تفریق جاتی رہی تھی۔ اور یہ دونوں ایک تھالی میں کھاتے تھے ــــ اس امر کا اعتراف خود بسمل نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں کیا ہے۔ اور اہم بات یہ ہے کہ یہ ایکتا اور اتحاد اس کے باوجود تھا کہ دونوں دوست اپنے اپنے مذہب پر سختی سے قائم تھے۔ گویا اپنے اپنے طریقوں سے عبادت کرتے تھے۔ یہ اشفاق کا عظیم کارنامہ تھا۔ اور انہوں نے پھانسی سے تین روز پہلے فیض آباد جیل سے ۱۶ر دسمبر ۱۹۲۷ء کو برادران وطن کے نام اپنا پیغام لکھ کر بھیجا تھا اس میں ان کے خیالات نہایت واضح ہیں اور اسقدر روشن کہ آج بھی مشعل راہ بن سکتے ہیں۔

"گورنمنٹ کے خفیہ ایجنٹ مذہبی بنیادوں پر پروپیگنڈہ کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کا مقصد مذہب کی حفاظت یا ترقی نہیں ہے بلکہ چلتی گاڑی میں روڑا اٹکانا ہے ــــ بھائیو! تمہاری خانہ جنگی، تمہاری آپس کی پھوٹ تم دونوں میں سے کسی کے لئے بھی سودمند ثابت نہ ہوگی"

مذہبی جنونیوں کو اشفاق نے خوب للکارا ہے۔

"تبلیغ اور شدھی والو! ذرا آنکھیں کھولو۔ کہاں تھے اور کہاں پہنچ گئے۔ آج کون ایسا ہندو یا مسلمان ہے جو مذہبی آزادی اتنی رکھتا ہے جتنا اسے حق ہے۔ کیا غلام قوم کا کوئی مذہب ہوا ہے؟ تم اپنے مذہب کا کیا سدھار کر سکتے ہو۔ آپس میں مل جل کر رہو اور متحد ہو جاؤ"

اشفاق نے لکھا ہے کہ وہ اپنے فراری کے زمانے میں بھیس بدل بدل کر کسانوں اور غریب مزدوروں میں رہے اور ملک کے اس طبقہ کا حال انہوں نے خود دیکھا اور اسی لئے غریبوں کے لئے کچھ کرنے اور صحیح سماج واد قائم کرنے کی تڑپ اپنے دل میں لے کر انہوں نے جان دی۔ کیا سماج واد کی اس سے بہتر کوئی اور تصویر ہو سکتی ہے

"میں ہندوستان کی ایسی آزادی کا خواہش مند تھا جس میں غریب خوشی اور آرام سے رہتے اور سب برابر ہوتے۔ خدا میرے بعد وہ دن جلد لائے جب کہ چھتر منزل لکھنؤ میں عبداللہ مستری ورکشاپ اور دھنیا چمار اور کسان بھی مسٹر خلیق الزماں جگت نرائن اور نواب محمود آباد کے برابر کرسی پر بیٹھے نظر آئیں"

آج روح اشفاق کو ایک گونہ تسکین ضرور ہوگی کہ جس سورج کے طلوع ہونے کے لئے اشفاق نے ان الفاظ میں دعا کی تھی وہ کب کا طلوع ہو چکا ہے۔

"اے خداوند قدوس کیا کوئی ایسا سویرا نہیں آئے گا کہ جس کی صبح کو آفتاب آزاد ہندوستان میں چمکے گا"

اور جس قسم کی آزادی کے وہ خواہش مند تھے آج ہندوستان سوشلزم کے اسی نصب العین کی طرف بڑھ رہا ہے اور ہزار دقتوں کے باوجود ان خوابوں کی تعبیریں ابھی دھندلی ہی سہی، مگر نظر تو آنے لگی ہیں۔ جو آزادی کے شہیدوں نے پھانسی کے جھولوں کو چومتے وقت دیکھے تھے۔

شین مظفر نگری

اس شہر اور اس مکان میں آئے ہوئے مجھے تقریباً ایک سال گزر چکا ہے۔ میں یہاں تنہا آیا تھا اور آج بھی تنہا ہوں۔ اپنے شہر کی تو اب صرف یاد باقی رہ گئی ہے۔ میں اس کو بھلا دینا چاہتا ہوں۔ اب شاید اپنے آبائی شہر کی یاد بھلانے میں کامیاب ہو جاؤں گا کیونکہ کل ایک بات اور زندگی میں ایسی گزر گئی ہے جس کے بعد کچھ اور یاد رکھنے کی ضرورت نہیں ۔۔۔۔ ایک غم اور ایک خوشی کی ملی جلی یاد۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میں یہاں تنہا آیا تھا اور آج پھر تنہا ہوں۔ مگر میں یہاں تنہا کیوں آیا تھا؟ میرے تو سب قریبی عزیز تھے مگر صرف چند گھنٹوں میں ایک ایسا انقلاب آیا کہ میں تنہا رہ گیا۔ صبح کو ماں کی پیار بھری ڈانٹ سن کر یہ وعدہ کرکے دفتر گیا کہ اب شام کو جلد گھر آیا کروں گا۔ دفتر شہر سے باہر ہونے کی وجہ سے کچھ دیر ہو ہی جاتی تھی۔ یوں بھی کنوارے بالے آدمی کی کچھ دلچسپیاں گھر سے باہر بھی ہوا کرتی ہیں۔

دوپہر کو دفتر میں اچانک اس خبر سے کھلبلی مچ گئی کہ شہر میں فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑا ہے۔ لوگ دفتر چھوڑ کر اپنے اپنے گھروں کی خبر لینے کو دوڑے۔ راستے میں ایک دو جگہ پولیس والوں نے روکا بھی۔ کچھ لوگ پولیس کی حفاظت میں جانے کے انتظار میں رک گئے۔ مگر کچھ لوگ منع کرنے کے باوجود نہ مانے۔ رک جانے والوں میں ایک میں بھی تھا۔

شام سے ذرا پہلے پولیس کی محافظت میں شہر پہنچا تو عجیب بھیانک سماں تھا۔ چند گھنٹوں میں چھوٹا سا شہر ویران اور سنسان نظر آنے لگا تھا۔ کرفیو کے باعث زندگی کی چہل پہل رک سی گئی تھی۔ شہر پر قبرستان کا سا سناٹا طاری تھا۔ چوراہوں اور موڑوں پر پولیس اور فوج کے پہرے دار چوکنا نظر آرہے تھے۔ ادھر اُدھر دھوئیں کے مرغولے اور شعلے اُٹھ رہے تھے۔ میں اپنے مکان پر پہنچا تو وہاں ملبے کا ڈھیر تھا جس میں سے گھٹ گھٹ کر دھواں نکل رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ میرے گھر والے پڑوس کے محفوظ مکانوں میں پناہ لئے چھپے ہوں گے۔ مگر سامنے کے ایک محفوظ مکان کی کھڑکی سے شانتی چاچی نے دہاڑیں مار مار کر روتے ہوئے پکارا "بیٹا! کوئی زندہ نہیں بچا سب اسی میں جل گئے، دب گئے۔ تمہارے چاچا نے بہت چاہا، مگر ظالموں نے کسی ایک کو بھی باہر نکلنے نہ دیا۔ تمہارے چاچا بھی ان کے ہاتھوں زخمی ہو کر ابھی گھر ہی میں پڑے ہیں۔ آؤ بیٹا یہاں ہمارے ہی پاس آجاؤ۔"

مجھے اچانک یوں لگا جیسے سر سے پاؤں تک ۔۔۔۔ میں سُن ہو گیا۔ اسی عالم میں میری نگاہ ایک بار پھر شانتی چاچی کی طرف اٹھ گئی۔ وہ جھٹ ہاتھ جوڑ کر پوری طاقت سے پکار اٹھی "میری بات مانو بیٹا۔ جان خطرے میں نہ ڈالو۔ ہمارے پاس آجاؤ۔"

میں نے دیکھا کہ چاچی کی بہو اور بیٹی بھی کھڑکی میں اس کے پیچھے آکھڑی ہوئی تھیں۔ زبان تو خاموش تھی مگر آنکھیں ان کی بھی مجھے اپنی طرف پکار رہی تھیں۔ اگر ان کا بس چلتا تو وہ دوڑ کر باہر آتیں اور مجھے کھینچ کر لے جاتیں۔ پہرے دار کانسٹبل بھی میرا منہ تکنے لگا تھا۔ مجھے جب تک اپنا شہر یاد رہے گا تب تک اس کانسٹبل کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسو بھی یاد رہیں گے۔ مگر اس نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ شاید میری طرح اس کے وجود پر بھی سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ میری حس اور قوتِ فیصلہ جواب دے چکی تھی۔

اتنے میں کچھ کانسٹبلوں کے ساتھ فائر بریگیڈ کا عملہ پہنچ گیا۔ آگ تو بجھ چکی تھی، صرف دھواں اٹھ رہا تھا پھر بھی انھوں نے پانی چھڑک کر دھوئیں کو بند کیا۔ پہرے دار کانسٹبل کے کہنے پر فائر بریگیڈ کے آدمیوں نے ملبہ کریدنا شروع کر دیا۔ دو گھنٹے کی جدوجہد کے بعد وہاں جھلسی اور کچلی ہوئی چھ لاشیں ایک قطار میں لیٹی ہوئی تھیں ۔۔۔۔ میرا بیمار باپ جو پولیس کا ایک ریٹائرڈ افسر تھا۔ میری ڈانٹنے والی ماں جس سے میں شام کو جلد گھر لوٹنے کا وعدہ کرکے دفتر گیا تھا۔ میری جوان بہن جس کی آئندہ ہفتے شادی ہونے والی تھی۔ میری سب سے چھوٹی ساتویں میں پڑھنے والی بہن جس کو غالب کی پندرہ غزلیں فلمی دھنوں میں یاد تھیں اور جس کا سب سے عزیز سرمایہ اندرا گاندھی کی ایک سو ایک تصویروں والا البم تھا۔ میری بیوہ بھابی جس نے میرے بھائی کی محبت میں دوسری شادی نہیں کی۔ میری گڑیا سی بھتیجی جو میری بھابی کی زندگی کا واحد سہارا تھی ۔۔۔۔ اور ایک میں خود ان سب کا پیارا تھا۔ لیکن میں تو کھڑا تھا اور سانس لے رہا تھا۔

اپنے کام سے فارغ ہو کر فائر بریگیڈ والوں نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ کیونکہ انھیں ابھی ایسے کتنے ہی ملبے کریدنے کی عجلت تھی۔ تب میرے منہ سے نکلا۔

"شکریہ۔ بس اور نہیں۔ اتنے ہی ستھے"۔

پھر وہ چلے گئے اور میں کھڑا لاشوں کے بگڑے ہوئے چہروں پر نیم تاریکی میں نظر گاڑنے کی کوشش کرتا رہا۔ اور سوچتا رہا آج صبح تک یہ میرا باپ تھا، یہ میری ماں تھی، یہ میری بہنیں تھیں، یہ میری بھابی تھی، یہ میری من موہنی بھتیجی تھی۔ مگر شام کو یہ میرے کوئی نہیں، میں ان کا کوئی نہیں۔ یہ لاشیں ہیں اور میں ان لاشوں کا وارث ہوں۔ ایک بار پھر میری آنکھیں شانتی چاچی کی کھڑکی کی طرف اُٹھ گئیں۔ وہ وہیں کھڑی تھیں۔ مگر اس کی زبان جواب دے چکی تھی۔ مجھے پکارنے کی ہمت اس کو اب نہ ہو سکی۔ ادھر ادھر اور بھی کئی مکانوں کی کھڑکیوں سے پھٹی پھٹی آنکھیں مجھے اور میری لاشوں کے اثاثے کو جھانک رہی تھیں۔

میں کھڑا کھڑا تھک گیا تھا۔ لاشوں کے چند گز کے فاصلے پر بیٹھ گیا۔ رات کی تاریکی تیزی سے گہری ہوتی جا رہی تھی کچھ دیر اور گزری تو میں نے مکانوں کی کھڑکیوں سے آنے والی دھندلی روشنی میں دیکھا کہ ایک کتا ملبوں کو پھلانگتا ہوا آیا اور ایک لاش ــــــ میری چھوٹی بہن کی لاش کو سونگھنے لگا۔ میرے بدن میں جھرجھری آ گئی میں نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ اٹھ کر کتے کو بھگا دیا اور لاشوں سے کچھ اور قریب ہو کر بیٹھ گیا۔ میرا دل بھی نڈھال ہو گیا تھا اور جسم بھی نڈھال تھا۔ رات بھیگنے لگی تو کچھ خنکی کا احساس ہوا۔ پہرے دار کانسٹبل دور ہی سے کھڑا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔ کبھی کبھی ادھر ادھر سے کسی کتے کے بھونکنے یا رونے کی آواز آ جاتی تھی۔ شاید وہ خدا سے کہتا ہو گا کہ اگلے جنم میں بھی وہ اس کو کتا ہی بنا کر پیدا کرے ــــــ کم از کم انسان بنا کر ہرگز پیدا کرے۔ رہ رہ کر کسی کھڑکی سے بھی کوئی ایک آدھ اچٹتی سی نگاہ ڈال کر ہٹ جاتا تھا۔ میں اس وقت زندہ نہیں تھا بلکہ سانس لیتی ہوئی ساتویں لاش تھا۔

ذرا دیر گزری تو ایک گشتی پولیس وین میرے پاس آ کر رکی۔ پہرے دار کانسٹبل لپک کر قریب آ گیا اور میری موجودگی پر اعتراض کرنے والے پولیس افسر کو بتایا کہ میں ان لاشوں کا وارث ہوں۔ پولیس افسر نے مجھے وہاں سے چلے جانے کو کہا۔ لیکن جب میں نے کہا "اب میں کہاں جاؤں؟"

تو پولیس افسر یہ کہتا ہوا چلا گیا کہ وہ جلد ہی ان لاشوں کے اٹھوانے کا بندوبست کر دے گا۔

جب پولیس وین چلی گئی تو رات کے سناٹے میں شانتی چاچی نے پھر کھڑکی سے مجھے پکارا۔ اور جب میں نے سنی ان سنی کر دی تو ذرا دیر بعد وہ کرفیو کی پرواہ کئے بغیر ایک تھال میں کچھ کھانا اور لُٹیا میں پانی لئے میرے پاس آ گئی۔ اس نے ہزار ہا کہا، لیکن مجھ سے کھایا نہ گیا۔ پھر بھی اس کی ضد پر دو چار گھونٹ پانی پی لیا۔ شانتی چاچی نے جاتے ہوئے کچھ روپے میری جیب میں ڈال دیئے اور اپنی چادر میرے بدن پر رکھ دی۔

آخر شانتی چاچی کو مجھ پر اتنی ممتا کیوں تھی؟ میں تو مسلمان تھا۔ اور میرے سامنے جن کی چھ لاشیں ایک قطار میں پڑی تھیں ان کا قصور بھی یہی تھا کہ وہ مسلمان تھے۔ مگر شانتی چاچی صرف نام کی ہندو نہیں تھی اس کی آتما بھی ہندو تھی۔ اس لئے ممتا اس کا دھرم بن چکا تھا محبت کا رشتہ مذہب کے رشتے سے زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ جس وقت شانتی چاچی تھال لئے میرے سامنے آئی تو دھندلی روشنی میں بھی میں نے اس کی ڈبڈبائی ہوئی چمکیلی آنکھوں میں ندامت دیکھی تھی ــــــ شاید اس بات کی کہ ان چھ بے گناہوں کا قتل ہندو دھرم کے نام پر کیا گیا تھا جو جیو ہتھیا کا سخت مخالف ہے۔

پھر رات بیت گئی۔ پَو پھٹنے تک بھی کوئی لاشیں اٹھانے کو نہ آیا۔ میں اتنی لاشوں کو کہاں اور کس طرح ٹھکانے لگاتا؟ ان لاشوں کی مزید رکھوالی کرنے اور دن کی روشنی میں ان کو دیکھنے کے تصور ہی سے میرا دل بیٹھنے لگا۔ میں نے شانتی چاچی کی دی ہوئی چادر کو پھیلا کر اپنی ماں، اپنی بہن اور اپنی بھابی کی لاشوں کو آدھا آدھا چھپا دیا اور رات کے اندھیرے کی امانت دن کے اجالے کو سونپ کو سیدھا اسٹیشن کی سمت چل پڑا۔

اسٹیشن پر پہنچا جیب میں شانتی چاچی کے دیئے ہوئے سو سو کے پانچ نوٹ تھے۔ وہ نیک عورت آج بھی میرے دل کے اس خانے میں ہے جہاں ماں کا بسیرا ہے۔ معلوم نہیں وہ ممتا کی دیوی اور ہندو دھرم کی لاج زندہ ہے یا مر گئی۔ مگر کبھی کبھی میرے تصور میں وہ اس طرح آتی ہے جیسے آنکھوں میں لئے آنسو اور ہاتھ جوڑے گڑگڑا کر مجھ سے یوں معافی مانگ رہی ہو "میرے بیٹے، وہ ہندو نہیں تھے جنھوں نے تمہارے پورے خاندان کو قتل کر دیا۔ ان کا کوئی دھرم نہیں تھا۔ ہندو تو میں ہوں"۔

اور اس طرح اپنے ساتھ ایک کہانی لئے ہوئے میں اس دور دراز نئے شہر میں پہنچا۔ جہاں زندگی کی کہانی کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ یہاں اسٹیشن پر اترتے ہی میرا ایک کلاس فیلو مل گیا ــــــ چندر پرکاش۔ وہ یہاں ٹکٹ کلکٹر ہو کر آ گیا تھا۔ میں نے اس سے اپنی سرگزشت چھپانی چاہی۔ کیونکہ شانتی چاچی کا نادم اور غمگین چہرہ میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ میں ایک اور اچھی آتما کو اپنی دردناک کہانی سنا کر دکھی کرنا نہیں چاہتا تھا مگر میرے شہر کی خبریں تو اسے مل ہی چکی تھیں۔ میرا چہرہ اور حلیہ دیکھ کر ہی میری بربادیوں کی داستان اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اس کے بہت ضد کرنے اور بہت کریدنے پر میں نے اپنی روداد اس کو سنا دی۔ مجھے جو ڈر تھا ٹھیک نکلا۔ وہ عجیب شرمسار نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ جیسے وہی مجرم اور ذمہ دار تھا۔ مجھے اس کے چہرے میں بھی شانتی چاچی کے چہرے کی جھلک نظر آئی۔ اس نے مجھے کہیں اور جانے نہ دیا۔

ایک ماہ تک چندر پرکاش نے مجھے اپنا مہمان رکھا۔ اب میں کھانے پینے اور گھومنے پھرنے لگا تھا۔ مگر باؤلوں کی طرح۔ ایک دن پرکاش نے مجھ سے کہا "یار جب تم اپنے شہر میں لوٹنا نہیں چاہتے اور اپنی جائیداد کا خیال بھی دل سے نکال چکے ہو، بلکہ وہاں کی ملازمت تک سے باز آ گئے ہو تو ایسے کب تک جیو گے۔ جینے کے لئے تو کچھ نہ کچھ کرنا ہی چاہیئے۔ معروف رہو گے تو غم بھی

طے ہو جائے گا اور آئندہ زندگی کا کوئی راستہ بھی بن جا سکے۔ میرے رشتہ داروں کا ٹرانسپورٹ کا بڑا بزنس ہے۔ اس میں تمہارے لئے ملازمت طے کر لی ہے۔"

پرکاش کی بات میرے دل کو لگ گئی اور میں نے اس کی رائے مان لی۔ وہ شاید ابھی کچھ دنوں اور کوئی ایسی بات نہ کہتا۔ لیکن اس کا ٹرانسفر آرڈر آ گیا تھا۔ اس لئے جانے سے پہلے وہ میرا بندوبست کر دینا چاہتا تھا۔ رہنے کی جگہ تو مل ہی گئی تھی۔ پرکاش کو کوارٹر الاٹ نہیں ہوا تھا اس لئے وہ ایک پرائیویٹ مکان ہی میں رہ رہا تھا۔ اندر کے حصے میں وہ فیملی کے ساتھ رہتا تھا۔ اور باہر الگ ایک کوٹھری تھی جو مجھے مل گئی تھی۔ چندر پرکاش نے ایک رشتہ دار فیملی کو اس شرط پر اپنا چھوڑا ہوا مکان حوالے کرنا منظور کیا تھا کہ میں بہر حال اس کوٹھری میں رہوں گا۔

چندر پرکاش کو یہاں سے گئے کچھ کم ایک سال گزر چکا ہے میں اسی ملازمت اور اسی کوٹھری میں ہوں۔ تنہا ہوں۔ چندر پرکاش نے جانے سے پہلے مجھ سے پوچھا تھا "تم کیا اس طرح ہمیشہ ہندوؤں میں رہ سکو گے؟"

میں نے کہا تھا "ضرور رہوں گا۔ جب ملک اور شہر میں ہندوؤں کے ساتھ رہ سکتا ہوں تو محلے میں کیوں نہیں رہ سکتا؟ جب میں ان کے ساتھ پیدا ہوا ہوں تو ان کے ساتھ جینا مرنا تو ہے ہی۔ مجھے تو ہر ہندوستانی سے اپنے خون کی بو آتی ہے۔ کبھی تو کوئی ہندو پوچھے گا کہ میں تنہا کیوں ہوں؟"

میری ان باتوں سے پرکاش کا دل بھر آیا تھا اور آنکھیں بھی بھر آئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے تھرتھراتے ہوئے قطرے لاکھوں قاتلوں کے دامن کو دھو ڈالنے کے لئے کافی ہو سکتے تھے۔ اس کے چلے جانے کے بعد اس کی جو رشتہ دار فیملی اس مکان میں رہنے لگی وہ بھی بہت مہذب اور شریف ہے۔ ایک تعلیم یافتہ بیوہ ماں، ایک برسرِ ملازمت بیٹا، ایک بہو اور ان کی چھ سات سال کی ایک بچی بندو، جو مجھے اپنی بھتیجی کی یاد دلایا کرتی ہے عجیب اتفاق ہے کہ یہاں بھی مجھے شانتی چاچی مل گئی۔ ان کا نام بھی شانتی دیوی ہے۔ وہ واقعی شانتی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں بھی وہی شانتی چاچی والی نیکی اور نرمی کی چمک ہے۔

یہ سب مجھ سے بہت مانوس ہیں۔ بندو کچھ زیادہ مانوس ہے۔ وہ کبھی کبھی میرے ساتھ گھومنے بھی چلی جاتی ہے۔ ان لوگوں کو میری کہانی معلوم ہے اور یہ لوگ مجھے بڑا دکھی اور گھائل آدمی سمجھ کر برتاؤ کرتے ہیں۔ مجھے یاد آتا ہے کہ جب یہ لوگ نئے نئے آئے تو میں بہت محتاط رہتا تھا کہ کوئی ایسی بات نہ ہو جس سے میرا یہاں رہنا انھیں ناگوار ہو۔ ان دنوں اور بھی کئی فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔ جب کبھی کسی نئے فساد کی خبر آئی تو یہ لوگ کئی کئی دنوں تک مجھے عجیب پراسرار نظروں سے دیکھتے رہے۔ وہ لوگ شاید محسوس کرتے تھے کہ میں ڈرا سہما ہوا ہوں۔

انہی دنوں دیوالی کی رات بھی آئی۔ شہر کے در و دیوار جگمگا اٹھے تھے۔ تب تک میں اس فیملی سے مانوس نہیں ہوا تھا۔ شام ہوتے ہی بندو میری کوٹھری میں آئی اور دونوں کھڑکیوں میں ایک ایک دیا جلا کر چپ چاپ چلی گئی۔ البتہ جاتے ہوئے ایک بار میری طرف دیکھ کر وہ مسکرائی بھی تھی ـــــ اس ایک مسکراہٹ کے پیغام پر دنیا کے سارے مذاہب کو قربان کیا جا سکتا ہے۔ اگر یہ مسکراہٹ روئے زمین سے ایک دم ناپید ہو جائے تو زندگی کی ہر سانس میں جہنم کے شعلوں کی لپک پیدا ہو جائے۔ اپنا شہر چھوڑنے کے بعد مجھے یہ پہلی مسکراہٹ ملی جس سے میرے مُردہ دل میں زندگی کی ایک لہر سی اٹھی۔ میں بہت دیر تک اس پھول کی بچی ـــــ بندو کے بارے میں سوچتا رہا۔ میری بھتیجی بھی ایسی ہی تھی۔ آج ایک سال بعد وہ کم از کم چار انگل ضرور بڑھ چکی ہوتی۔ اور اب وہ اسکول بھی جا رہی ہوتی۔

بندو کے جانے کے تھوڑی دیر بعد اس کی دادی شانتی دیوی میری چوکھٹ کے اندر آ کھڑی ہوئیں۔ ایک ہاتھ میں پیتل کا چمکتا ہوا تھال دوسرے میں پانی کا لوٹا۔ میں بستر سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس سرخ و سپید خاتون کے پروقار چہرے پر نہ جانے کس احساس سے ایک کپکپی سی تھی اور آنکھوں سے جیسے رحمت و شفقت چھلکی پڑتی تھی۔

میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بھرائی ہوئی آواز میں وہ بولیں "بیٹا، میں تمہارے لئے کھانا لائی ہوں میں بھی تمہاری ماں ہوں۔"

جب میں نے اپنے گھر کی چھ لاشیں دیکھی تھیں تب میری آنکھوں میں آنسو نہیں آئے تھے۔ جب شانتی چاچی نے میری جیب میں روپے رکھ کر اپنے جسم کی چادر میرے بدن پر ڈال دی تھی تب بھی میں نہیں رویا تھا۔ جب اسٹیشن پر میں نے چندر پرکاش کو اپنی بپتا سنائی تھی تب بھی میری آنکھیں خشک ہی رہی تھیں۔ مگر آج ـــــ شانتی دیوی کے صرف ایک بول پر میری آنکھوں سے آنسوؤں کے دھارے پھوٹ نکلے تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے سچ مچ میری ماں قبر سے اٹھ کر آ کھڑی ہوئی ہو (کون جانے اس کی کوئی قبر بھی بنی ہو گی یا نہیں۔)

شانتی دیوی نے میز پر کھانا رکھ دیا اور میرا منہ تکنے لگیں۔ ان کی آنکھوں میں میری آنکھوں سے زیادہ آنسو تھے۔ شاید ان کو الفاظ نہ مل سکے۔ اس لئے وہ کچھ بولیں نہیں۔ وہ میرے پاس رک بھی نہ سکیں میری دونوں آنکھوں کو آنچل سے پونچھ کر چلی گئیں۔ لیکن میں تو روتا ہی رہا۔ سال بھر کا رونا آج ہی رو رہا تھا۔ تب بندو کے پاپا ستیش آئے۔ ان کے آتے ہی میرا رونا کم ہو گیا۔ انھوں نے میرے پہلو میں بیٹھتے ہوئے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑے دانش ورانہ لہجے میں کہا ـــــ

"My friend tak it philosophically

آپ تو تعلیم یافتہ آدمی ہیں۔ دنیا میں کیا نہیں ہوتا۔ ہیروشیما ہوتا ہے۔ ویت نام ہوتا ہے۔ بنگلہ دیش ہوتا ہے ـــــ اور بھی کیا کیا ہوتا ہے۔ کہیں کسی لئے تو کہیں کسی لئے۔ یہ سب کچھ ہمیشہ سے ہوتا رہا ہے اور جب تک دنیا ہے کسی نہ کسی شکل میں ہوتا ہی رہے گا۔ دنیا میں

دو ہی مذہب ہیں، اچھائی اور برائی۔ یہ دونوں مذہب انسان اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوا ہے۔ اچھوں کا ایک مذہب، بُروں کا دوسرا مذہب۔ چاہے ان دونوں کو لوگ کتنے ہی خانوں میں بانٹ لیں۔ اچھائی کی پہچان کے لئے بُرائی کا رہنا ضروری ہے۔ اس لئے اچھائی کا مذہب اور برائی کا مذہب دونوں ساتھ ساتھ زندہ رہیں گے۔"

ستیش کی باتوں سے میرے آنسو خشک ہو گئے۔

اس دن سے اس فیملی کے ساتھ میرے تعلقات دوستانہ اور پھر گہرے ہو گئے۔ میں بھی اس فیملی کا فرد بن گیا۔ البتہ کبھی کبھی بازار میں دکانوں پر نظر پڑتی تو اکیلے پن کا احساس ہوتا —— کپڑوں، چیزوں اور کھلونوں کو دیکھ کر۔ آخر میں یہ چیزیں کس لئے خریدتا؟ انھیں دیکھ کر ایک تصور سا اُبھرتا —— یہ ساڑی زینت کے لئے، یہ چھینٹ چھوٹی بہن کلثوم کے لئے، یہ فراک اور گڑیا ننھی صنوبر کے لئے، یہ نیلی کناری کی ساری ساڑی بھابی کے لئے، اور یہ ابا کے لئے اور یہ اماں کے لئے۔ لیکن جب گھر پر بندو، شانتی چاچی بھابی اور ستیش کی مسکراہٹیں میرا خیر مقدم کرتیں تو اکیلے پن کا احساس جاتا رہتا۔

بندو بڑی دیر تک میری کوٹھری میں مجھ سے باتیں کرتی رہتی۔ کبھی کبھی اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا کہ گھر میں میری عدم موجودگی میں بھی میرے متعلق باتیں ہوا کرتی تھیں —— جیسے ایک دن اس نے کہا "چاچا، تم نماز اور قرآن کہاں پڑھتے ہو۔ یہاں تو ہم دیکھتے نہیں۔" یہ بات بندو کی نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر ایک دن اس نے مشورہ دیا "چاچا، تم شادی کیوں نہیں کر لیتے؟ اکیلے کب تک رہو گے؟" یہ بات بھی بندو کی نہیں ہو سکتی تھی۔ بندو کے یاد دلانے پر مجھے اپنی شادی کا پہلی بار خیال آیا۔ مگر میں شادی کیسے کر لیتا؟ میری شادی کی شرط تو پوری ہوئی نہیں۔ شرط یہ ٹھہری تھی کہ جب زینت کی شادی ہو چکے گی تب میری شادی کی بات چلے گی۔ زینت کی شادی تو ہوئی نہیں۔ پھر میں کیسے شادی کر لیتا؟ پھر یہ ڈر بھی تو سمایا ہوا تھا کہ جس سے شادی کرتا کہیں اس کی بھی خون آلود جھلسی ہوئی لاش نہ دیکھنی پڑ جائے۔ اب لاشیں دیکھنے کی تاب میرے اندر باقی نہ تھی۔

اس طرح میری زندگی کا ایک سال اور گزر چکا ہے۔

اور آج میں پھر اکیلا ہوں۔ کل شانتی دیوی نے اچانک کہا تھا "بیٹا، ہم لوگ الہ آباد جا رہے ہیں ستیش نے نوکری چھوڑ دی ہے۔ اپنے ہی شہر میں بزنس کرے گا۔ جلد ہی ہم تمہیں بھی وہاں بلا لیں گے۔ تمہاری شادی بھی وہاں ٹھیک کروں گی۔ وہاں کئی مسلم گھرانوں سے ہمارے بڑے اچھے تعلقات ہیں۔"

میں ان کا منہ دیکھتا رہ گیا۔

آج وہ لوگ چلے گئے اور اب میں پھر اکیلا ہوں۔

جب دستک ہو

کمار پاشی

جب دروازے پر دستک ہو تو مت کہنا میں اندر ہوں
آنے والے کی مت سوچو
اس نے بھی کب تم سے ملنے کی ٹھانی ہے
اس کو تو خاک اڑانی ہے

وہ کہتا ہے
اِس کونے سے اُس کونے تک
اک رات مسلسل رات ہے —— اپنے ہونے تک

وہ کہتا ہے
جو میں نے اب تک جانا ہے
اک اک کو آج سنا دوں گا
میں سب کی نیند اڑا دوں گا

وہ کہتا ہے

- - - - - - - - - - - -

بے کار میں یوں دُکھ سہتا ہے
اوروں کو بھی تڑپاتا ہے
ہر ہنستے گاتے گھر میں آگ لگاتا ہے

تم اس پگلے کی مت سوچو
جب دروازے پر دستک ہو خاموش رہو

ہندوستانی مسلمانوں کے دو دشمن

مسلم لیڈر اور مسلم پریس

ایس منیر نیازی

اگرچہ یہ بات چونکا دینے والی ضرور ہے لیکن مبالغہ سے قطعی پاک ہے کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے دشمنوں کی جب بھی کوئی فہرست تیار کی جائے گی تو سب سے اوپر مسلم لیڈر اور مسلم پریس ہی کے نام آئیں گے۔ ہندوستانی مسلمانوں کو جتنا نقصان ان دونوں گروہوں سے پہنچا ہے اتنا کسی اور سے نہیں۔ مسلمانوں کی قومی سرگرمیوں سے عدم دلچسپی گوشہ نشینی، مایوسی اور احساسِ کمتری کا تجزیہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سارا بگاڑ انھیں دونوں کی ایک بڑی اکثریت کا پیدا کردہ ہے۔

ملک کی تقسیم کے بعد جو حالات پیدا ہوئے ان کے لئے ہندوستانی مسلمان ذہنی طور پر تیار نہیں تھے۔ پاکستان کی حمایت میں نعرہ لگاتے وقت ان کی اکثریت کے ذہن میں جو نقشہ تھا وہ تقسیم کے بعد کے نقشے سے قطعی مختلف تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کم از کم اتر پردیش اور بہار جیسی ریاستوں کے مسلمانوں نے پاکستان کی حمایت نہیں کی ہوتی۔ اس وقت کے مسلم لیڈروں نے یا تو انھیں جان بوجھ کر بتایا نہیں تھا کہ ان کے خوابوں کا پاکستان کیسا ہوگا یا جذبات کی رو میں بہہ کر انھوں نے خود ہی کسی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ وجہ خواہ کچھ بھی رہی ہو ان کی آنکھ اس وقت کھلی جب پاکستان بن چکا تھا اور ان کے لیڈر کراچی پہنچ چکے تھے۔ جن لوگوں کے ساتھ نہ رہنے کے لئے انھوں نے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا اب انھیں کے ساتھ رہتے ہوئے وہ خوف پشیمانی اور اندیشوں میں مبتلا رہنے لگے اور اپنے آپ کو پوری قوم سے الگ تھلگ اور کٹا کٹا محسوس کرنے لگے۔

مسلم لیڈروں کا رول

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ملکی حالات رفتہ رفتہ بہتر ہوتے گئے۔ ان حالات میں وقت کا تقاضہ تو یہ تھا کہ مسلمان ملک کی ترقی پسند جماعتوں کے ساتھ مل کر قومی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے اور اپنے تعاون سے جمہوری اور سیکولر طاقتوں کو تقویت پہنچاتے۔ لیکن ہوا اس کے برعکس۔ مسلم لیڈروں نے جن کی سیاسی میدان میں ساکھ ختم ہو چکی تھی، اس ڈر سے کہ یہ بچا کھچا مالِ غنیمت بھی دوسروں کے ہاتھ نہ لگ جائے مسلمانوں کو اکثریت کا خوف دلا دلا کر اتنا بدحواس کر دیا کہ انھوں نے انھیں ہی اپنا محافظ اور نگراں سب کچھ سمجھ لیا۔ ان حالات میں مسلم لیڈروں کا فرض تھا کہ وہ مایوس مسلمانوں میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کرتے اور ماضی کی سیاسی غلطیوں کی اصلاح کر کے انھیں نئے حالات سے ہم آہنگ ہونے کے لئے تیار کرتے۔ لیکن اس کے برعکس انھوں نے ہندو فرقہ پرستی کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں سے شہ پا کر ایک بار پھر مسلم مسائل کے نام پر مسلمانوں کی ایک علیحدہ سیاسی تنظیم قائم کرنے کے لئے جدوجہد شروع کر دی۔

گزشتہ ۲۵ سال کے دوران ملت میں کتنی ہی بار مختلف [illegible]

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد کے ہندوستان میں مسلم فرقہ پرستی اگرچہ ختم تو نہیں ہوئی تھی لیکن اس کی کمر اور ٹوٹ گئی تھی۔ ہندو فرقہ پرستی پر بھی آخری ضرب لگانے کا یہی موقع تھا۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ شاید سوچا گیا تھا کہ مسلم فرقہ پرستی کی عدم موجودگی اور سیکولر اسٹیٹ کے نئے ماحول میں ہندو فرقہ پرستی اپنے آپ ختم ہو جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ حکومت ترقی پسند سیاسی جماعتوں اور دانش وروں کے تغافل سے ہندو فرقہ پرستی کی سرگرمیاں اتنی بڑھیں کہ ایک کونے میں دبکی بیٹھی مسلم فرقہ پرستی بھی شہ پا کر مسلم لیگ اور مسلم مجلس کے جھنڈوں کے ساتھ میدان میں آ کودی۔

یہ نام نہاد فرقہ پرست مسلم رہنما سوچنے لگے کہ سیکولر اور ترقی پسند جماعتوں میں رہ کر نہ وہ پبلک چھپکتے کل ہند سطح کے لیڈر بن سکتے ہیں (جیسے ڈاکٹر فریدی) اور نہ دوسری جماعتوں سے ساز باز کر کے وہ آسانی سے وزارت کی کرسی ہتھیا سکتے ہیں جیسا کہ ۱۹۶۷ء کے عام الیکشن کے بعد کئی ریاستوں کی مخلوط حکومتوں میں ہوا۔ ان مسلم لیڈروں کے قول و عمل میں کتنا تضاد ہے اس کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک طرف تو یہ جن سنگھ آر۔ ایس۔ ایس اور ہندو مہاسبھا کے فرقہ وارانہ روپ کی مذمت کرتے ہیں اور دوسری طرف مسلمانوں کی ایک علیحدہ سیاسی تنظیم کی وکالت کرتے ہوئے یہ بھی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے مسائل حل کرنے کے لئے ان کی اپنی ایک علیحدہ تنظیم ضروری ہے۔

مسلم لیڈروں نے اب تک اپنی پوری قوت مسلمانوں کو صرف یہ سمجھانے پر صرف کی ہے کہ ان کے مسائل فقط چار ہیں یعنی:-

۱۔ فرقہ وارانہ فسادات۔
۲۔ اردو۔
۳۔ مسلم یونیورسٹی۔
۴۔ مسلم پرسنل لا۔

مسلم قیادت کی ساری بھاگ دوڑ [illegible]

سیکولر ڈیموکریسی

مسائل تک محدود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک بڑی اکثریت کو ان چند مسائل کے علاوہ ملک کے کسی دوسرے مسئلے سے کوئی خاص دل چسپی نہیں ہے۔ حالانکہ عام ہندوستانی شہریوں کی طرح وہ بھی اپنی روزمرہ کی زندگی میں گرانی، بے کاری، رہائش گاہ کی کمی، قحط اور سیلاب کی تباہ کاریوں سے متاثر ہوتے ہیں لیکن ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرنا تو درکنار مسلم لیڈر اور مسلم عوام کی اکثریت ان کے خلاف احتجاج بھی نہیں کرتی۔ گزشتہ ۲۵ سال کے دوران ملک میں کتنی ہی بار مختلف مسائل کو لے کر عوامی سطح پر تحریکیں چلائی گئیں جن سے پورا ملک متاثر ہوا لیکن اگر کوئی متاثر نہیں ہوا، تو وہ مسلمان تھے۔ ایک طرف تو قومی مسائل سے اسقدر بے تعلقی ہے اور دوسری طرف اس کے برعکس اگر کسی نے مذکورہ بالا چار مسائل میں سے کسی کے بھی بارے میں ان کے اپنے موقف کے خلاف کوئی بات کہہ دی تو جنگل کی آگ کی طرح ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک احتجاج کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ مسلم لیڈروں کے درمیان جذباتی بلکہ بہت حد تک اشتعال انگیز بیانات جاری کرنے کا جیسے مقابلہ شروع ہو جاتا ہے جس کے نتائج اکثر و بیشتر افسوسناک ہوتے ہیں۔

مذکورہ بالا مسائل کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اعتراض صرف اس طریقہ کار پر کیا جاسکتا ہے جسے مسلم لیڈران مسائل کو حل کرنے کے لئے اپناتے ہیں جمہوری نظام میں مسائل کو حل کرنے کا اپنا ایک الگ طریقہ کار ہوتا ہے اس نظام میں مسائل کو ایسا روپ دینا پڑتا ہے کہ وہ چند افراد کے مسائل نہ بن کر عوامی مسائل بن جائیں اور اس کے ساتھ ہی ساتھ رائے عامہ کو اس طرح بیدار کرنا پڑتا ہے کہ ایک بڑی اکثریت کی حمایت و تائید حاصل ہو جائے لیکن مسلم لیڈروں نے جب بھی کوئی مسئلہ اٹھایا تو اس کو صرف مسلمانوں کی ذات ہی تک محدود رکھنے کی کوشش کی۔ حد تو یہ ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات اور اردو کے ساتھ ناانصافی جیسے مسائل کو بھی ان لوگوں نے خالص مسلم مسئلہ بنا کر پیش کیا اور اس سلسلے میں ہندو رائے عامہ کو اپنے ساتھ لینے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی۔ غالباً اس کی وجہ ان کا یہ خدشہ ہے کہ اگر انھوں نے اپنا دائرہ کار وسیع کیا تو مسلم قیادت کی باگ ڈور ان کے ہاتھ سے نکل کر دوسروں کے ہاتھ میں چلی جائے گی۔ امریکہ میں گوروں اور کالوں کا فساد ہندوستان میں ہندو مسلم فساد سے کم بھیانک نہیں ہے لیکن جب وہاں کالوں نے اسے ایک انسانی مسئلہ بنا کر پیش کیا تو

مسلم لیڈروں کی طرح مسلم اخبارات کے لئے بھی فرقہ وارانہ فسادات، مسلم یونیورسٹی، اردو اور مسلم پرسنل لا دل چسپ ترین موضوع ہیں۔

گوروں کی ایک بڑی تعداد کالے مظلوموں کی حفاظت کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ کیا ہندوستان میں مسلم لیڈروں نے کبھی ایسی کوشش کی؟ سرودے لیڈر جے پرکاش نرائن جب تک فسادات کے سلسلے میں ہندو فرقہ پرستوں کی مذمت کرتے رہے مسلمانوں کے محبوب لیڈر بنے رہے اور جب انھوں نے مسلم فرقہ پرستی پر انگلی اٹھائی تو آناً فاناً ان کا شمار جن سنگھی ذہنیت کے لیڈروں میں کیا جانے لگا۔

مسلم پریس [illegible]

مسلم عوام میں بگاڑ کی سب سے بڑی ذمہ داری بیشتر مسلم پریس (یہاں مراد اردو اخبارات سے ہے) پر عائد ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر یہ رجعت پسند نام نہاد مسلم لیڈروں کے ساتھ تعاون نہ کریں تو ان کی کوئی تحریک آگے نہ بڑھنے پائے لیکن یہ بھی اپنا کاروبار چمکانے کے لئے ایسے لیڈروں کے محتاج ہیں۔ اپنے قارئین کا حلقہ وسیع کرنے کے لئے ان کے پاس سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ وہ ان لیڈروں کے بیانات اور تقریروں کو خوب اچھالیں۔ مسلم لیڈروں کی طرح مسلم اخبارات کے لئے بھی فرقہ وارانہ فسادات، مسلم یونیورسٹی، اردو اور مسلم پرسنل لا دل چسپ ترین موضوع ہیں۔ چند اخباروں کو چھوڑ کر ملک کی کسی بھی ریاست سے شائع ہونے والے کسی بھی اردو اخبار کے ایک سال کا فائل اٹھا کر دیکھ لیجئے اس کے ۹۰ فیصد اداریے اور مضامین براہ راست یا بالواسطہ انھیں موضوعات پر ہوں گے۔ یہ اخبارات ہر وقت اس تاک میں لگے رہتے ہیں کہ اس سلسلے میں کون لیڈر کب کہاں بیان دیتا ہے۔ جب بھی اس سلسلے میں کوئی انتہائی جذباتی اور اشتعال انگیز بیان ان کے ہاتھ آلگتا ہے، خواہ وہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو، تو وہ اسے سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ اگر کسی روز ملک میں پانچ سالہ ترقیاتی پلان کے پروگراموں کا اعلان کیا جائے اور اسی روز کسی چھوٹے قصبہ میں فرقہ وارانہ فساد بھی ہو جائے تو بیشتر اردو اخبارات پلان کی خبر سے زیادہ اہمیت فساد کی خبر کو دیں گے اور اسے زیادہ نمایاں طور پر شائع کرنا پسند کریں گے۔ مسلمانوں کے خلاف جن سنگھ آر۔ ایس۔ ایس اور ہندو مہاسبھا کے لیڈروں کے بیانات ان کے لئے نعمت سے کم نہیں ہوتے۔ ان اخبارات میں جن سنگھ کی سرگرمیوں کی تفصیل "پانچ جنیہ" اور "آرگنائزر" سے کسی بھی طرح کم نہیں ہوتی۔ ایسے ہی ایک اخبار کے ایڈیٹر سے جب میں نے اس کی وجہ پوچھی تو انھوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ——— "دشمن کی سرگرمیوں سے اپنے قارئین کو باخبر کرنا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں"۔ ہوسکتا ہے کہ ان کی نیت واقعی یہی ہو۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اس طرح سے اگر شعوری طور پر نہیں تو غیر شعوری طور پر ہی سہی جن سنگھ کو تقویت پہنچاتے ہیں۔

ان حالات کا نتیجہ یہ ہے کہ اردو اخبارات کے عام قارئین کو جتنی معلومات فرقہ وارانہ فسادات اور فرقہ پرست لیڈروں کی سرگرمیوں کے بارے میں ہوتی ہے اتنی کسی اور کے متعلق نہیں ہوتیں۔ وہ آسانی کے ساتھ یہ تو بتا سکتے ہیں کہ کس سال کہاں فرقہ وارانہ فساد ہوا لیکن اس دوران فرقہ وارانہ اتحاد کے لئے کیا کیا گیا، ملک کے صنعتی، زراعتی، سماجی اور تعلیمی میدانوں میں کیا انقلابات آئے، کہاں کوئی نیا کارخانہ یا بندھ تعمیر ہوا اور کہاں کوئی نئی یونیورسٹی قائم کی گئی۔ اس کے متعلق ان کی معلومات عموماً صفر ہوتی ہے۔ یہ بائیں بازو کے ترقی پسند لیڈروں کے مقابلہ میں جن سنگھ اور آر۔ ایس۔ ایس کے لیڈروں سے زیادہ متعارف ہوتے ہیں۔ دراصل قصور قارئین کا نہیں بلکہ ان بیشتر مسلم اخبارات

اور صحافیوں کا ہے جو ان چند موضوعات کے علاوہ اپنے قارئین کو اندھیرے میں رکھنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے پہلے ہی سے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ قارئین کو فلاں فلاں خبروں کے علاوہ بقیہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔

مسلم اخبارات اور صحافیوں کو شکایت ہے کہ مسلمانوں کے اندر عدم تحفظ کا عام احساس ہے۔ ۲۵ سال کی آزادی کے باوجود وہ اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھتے۔ بات اپنی جگہ پر درست بھی ہے۔ لیکن میں کہنا چاہوں گا کہ عدم تحفظ کا یہ احساس ہندو فرقہ پرست جماعتوں سے زیادہ خود مسلم لیڈروں اور مسلم صحافیوں کا پیدا کیا ہوا ہے۔ انھوں نے فساد کی خبروں اور ہندو فرقہ پرستوں کے اشتعال انگیز بیانات کو اچھالنے کی کوشش تو ضرور کی ہے لیکن کیا انھوں نے مسلمانوں کو ہندوؤں کے قریب لانے یا ملک کی تقسیم کے نتیجے میں عام مسلمانوں کے بارے میں ہندو حلقوں میں پھیلی ہوئی بدگمانی، غلط فہمی اور شبہات کو دور کرنے کی بھی کبھی کوشش کی ہے؟ کیا انھوں نے جس شدت کے ساتھ ہندو فرقہ پرستوں کی مذمت کی ہے اسی شدت کے ساتھ مسلمان فرقہ پرستوں کو بھی گرفت میں لیا ہے؟ کیا انھوں نے ایک ذمہ دار شہری ہونے کے ناطے ہندو مسلم اتحاد کے لیے کسی مشترکہ بنیاد کی تلاش کو اپنا فرض سمجھا ہے؟ کتنے مسلم صحافی ہیں جنھوں نے مسلمانوں کی صرف مظلومیت کا رونا نہ رو کر ان کی خامیوں، کمزوریوں اور غلطیوں کی طرف ان کی توجہ مبذول کرائی ہے؟

فوری ضرورت

مسلم لیڈروں اور مسلم پریس کی غلط تربیت نے مسلم عوام کی ایک بڑی اکثریت کو انتہائی نازک مزاج، ضدی اور شکّی بنا دیا ہے۔ ان کی نازک مزاجی کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنے اوپر کوئی بھی تنقید، خواہ وہ کتنی ہی صحت مند کیوں نہ ہو، سننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ پریس عوام کو گائڈ کرتا ہے لیکن ہندوستان میں اب مسلم عوام ہی مسلم پریس کو گائڈ کرنے لگے ہیں۔ کوئی بھی مسلم اخبار کسی بھی موضوع پر لکھنے سے پہلے اب یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اس سلسلے میں مسلم عوام کی اکثریت کا اندازِ فکر کیا ہے؟ یہی حال مسلم لیڈروں کا بھی ہے۔ ان دونوں نے اکثریت کا خوف دلا دلا کر ڈر، شک اور بے اعتمادی کا ایک ایسا ماحول تیار کر دیا ہے کہ آج مسلمانوں کے سامنے جب بھی کوئی نئی تجویز پیش کی جاتی ہے تو خواہ وہ ان کے لئے کتنا ہی سودمند کیوں نہ ہو، اس میں اپنے فائدے کا نہیں بلکہ نقصان کا پہلو تلاش کرنے کی کوشش پہلے کرتے ہیں۔ بلاشبہ یہ ایک نفسیاتی بیماری ہے جس کے ذمہ دار مسلم لیڈر اور مسلم پریس ہیں۔ کسی قوم کی سات آٹھ کروڑ آبادی کا اس طرح کی کسی بیماری میں مبتلا ہو جانا ایک قومی سانحہ ہے۔ اس سے پہلے کہ آبادی کا اتنا بڑا حصہ مفلوج اور اپاہج بن جائے ملک کی ترقی پسند جماعتوں اور دانشوروں کا فرض ہے کہ وہ اسے اس کے دوست نما دشمنوں کے شکنجے سے نکال کر جمہوری و سیکولر نظام میں جینے کا انداز سکھائیں۔

DONATE GENEROUSLY
TO
QAUMI EKTA TRUST

THE TRUST IS SET UP

- ★ TO PROMOTE NATIONAL UNITY AND COMMUNAL HARMONY;
- ★ TO FOSTER IDEAS OF COMPOSITE NATIONALISM AND COMMON CITIZENSHIP;
- ★ TO PROMOTE GOODWILL AND ERADICATE SUSPICIONS AMONG DIFFERENT COMMUNITIES;
- ★ TO PROJECT THE GREAT HUMANIST TRADITION OF INDIA;
- ★ TO BUILD A TEAM OF DEDICATED, TRAINED WORKERS TO FIGHT COMMUNAL FASCISM AND OTHER DIVISIVE, ANTI-DEMOCRATIC TENDENCIES.

Subhadra Joshi
Chairman
Qaumi Ekta Trust
15, Balwant Rai Mehta Lane
New Delhi-1.

Regd. No. R.N. 16241/68 Regd. No. D-1820

این این پانڈے نے قومی ایکتا ٹرسٹ کے لئے وشنو آفسٹ پریس سے چھپوا کر شائع کیا
رجسٹرڈ آفس:۔ A-۱۹، تھیٹر کمیونی کیشن بلڈنگ۔ کناٹ سرکس۔ نئی دھلی۔ ایڈیٹر:۔ ڈی آر گوئل

ڈیموکریسی

مئی ۱۹۷۳ء شمارہ ۱۸ قیمت ایک روپیہ



STANDARD DRUM & BARREL MFG. COMPANY

CORRIDOR ROAD, GAVANPADA VILLAGE,
CHEMBUR, BOMBAY-74

★

Delhi Address :
143, TAGORE PARK, DELHI-9

TELE. : 225913

دہلی ٹیلی فون

ضرورت ہے ۱۸ اسٹینوگرافرز کی۔ جس میں چھ آسامیاں شیڈول کاسٹ، دو آسامیاں شیڈول ٹرائبس اور ایک آسامی سابق فوجی کے لئے محفوظ رکھی گئی ہیں۔

باقی ۹ آسامیاں ڈیپارٹمنٹل امیدواروں کے لئے محفوظ ہیں۔ لیکن ایسے امیدواروں کے نہ ملنے پر یہ آسامیاں باہر کے امیدواروں سے پُر کی جائیں گی۔

انگلش میں ڈکٹیشن لینے کی صلاحیت ہو نا چاہیئے اور صحیح و صاف ستھرا ٹائپ جاننا ضروری ہے

شہریت :- ہندوستانی ہونا چاہیئے۔

عمر :- یکم جولائی ۱۹۷۳ء کو ۱۸ سے ۲۴ سال تک عمر ہونی چاہیئے۔ شیڈول کاسٹ/شیڈول ٹرائبس اور بے کار گولڈ اسمتھز/کمی میں آئے ہوئے سرکاری ملازمین اور سابقہ فوجی/یونین ٹیری ٹری۔ پانڈی چری کے رہنے والے شہری، ایسٹ پاکستان سے آئے ہوئے وہ لوگ جو ۱-۱-۶۴ تک ہندوستان میں آچکے ہیں/سیلون سے آئے ہوئے لوگ/افریقی ملکوں جیسے کینیا، اوگنڈا، تنزانیہ سے آئے ہوئے لوگ، کی زیادہ عمر میں رعایت کی گئی ہے۔

کم سے کم علمی قابلیت :- میٹرک پاس یا اس کے برابر کوئی اور امتحان۔

تنخواہ :- ۱۳۰-۵-۱۶۰-۸-۲۰۰

ای۔بی۔۸-۲۵۶-ای۔بی۔۸-۲۸۰-۱۰-۳۰۰

اس کے علاوہ تمام الاؤنسز

سلیکشن :- جولائی ۱۹۷۳ء میں ایک امتحانی مقابلہ منعقد کیا جائے گا جس میں

(۱) ڈکٹیشن ٹیسٹ، ۱۰۰ الفاظ ایک منٹ میں

اور (۲) رائٹنگ ٹائپ ٹیسٹ، ۴۰ الفاظ ایک منٹ میں کی رفتار سے ہوگا۔

فیس داخلہ امتحان :- (۴ روپے) (شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائبس کے لئے ایک روپیہ)

درخواستی فارم :- درخواستی فارم ایک روپیہ کا کراس پوسٹل آرڈر (۲۵ پیسہ شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائبس کے لئے) ایڈمنسٹریٹو آفیسر (کیش) دہلی ٹیلی فون۔ خورشید لال بھون۔ نئی دہلی، کے نام بھیج کر صبح دس بجے سے بارہ بجے دوپہر تک تمام کاروباری دنوں میں ۱۵ مئی تک حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

آخری تاریخ :- ۱۵ مئی ۱۹۷۳ء۔ تمام درخواستیں امیدوار کے قریبی ایمپلائمنٹ ایکسچینج کی معرفت آنی چاہئیں۔ جو امیدوار ملازمت میں ہیں وہ اپنے دفتر کی معرفت ہی درخواستیں بھیجیں۔

پتہ

جنرل منیجر، ٹیلیفون۔ خورشید لال بھون۔ نئی دہلی

پبلک سروس کمیشن۔ اتر پردیش

ایڈورٹیزمنٹ نمبر :- A-۲/E-۷۳

سروے اینڈ لینڈ ٹریننگ اسکول ہردوئی میں ۳۳ امیدواروں کے لئے سپروائزر قانونگو کی ٹریننگ کے واسطے ایک امتحانی مقابلہ جولائی ۱۹۷۳ء میں الہ آباد میں منعقد ہوگا۔

۱۸ فیصدی آسامیاں اتر پردیش کے شیڈول کاسٹ سے متعلق مناسب امیدواروں کے لئے محفوظ ہیں اس کے علاوہ ۱۰ فیصدی جگہیں سابق اور معذور فوجیوں کے لئے اور مزید ۱۰ فیصدی جگہیں ایسے امیدواروں کے لئے محفوظ کی گئی ہیں۔ جن کی کفالت کی ذمہ داری جنگ آزادی میں شریک ہونے والے افراد پر ہو۔ اگر محفوظ جگہوں کی تقرری کے لئے مطلوبہ تعداد میں مناسب امیدوار نہ مل سکے تو بقیہ جگہوں کو عام امیدواروں سے پر کیا جائے گا۔ جگہیں گھٹ بڑھ سکتی ہیں۔

شہریت :- امیدواروں کو ہندوستانی شہری ہونا چاہیئے یا وہ سکم یا تبت کے باشندے ہوں۔ جو یکم فروری ۱۹۶۲ء سے پہلے ہندوستان آگئے ہوں، یا وہ ہندوستانی ہوں جو کہ پاکستان، برما، سری لنکا اور مشرقی افریقہ کے کینیا، اوگنڈا اور تنزانیہ سے ہندوستان میں مستقل طور پر سکونت کے ارادے سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے ہوں۔

علمی قابلیت :- امیدواروں کو اتر پردیش بورڈ سے ہائی اسکول ہونا چاہیئے یا اس کے برابر کا کوئی دوسرا امتحان میتھ میٹکس یا ایلیمنٹری میتھ میٹکس (صرف ارتھ میٹک نہیں)۔ اختیاری مضمون کی حیثیت سے پاس کئے ہوں۔

وہ امیدوار جو اسی سال ہائی اسکول کے امتحان میں بیٹھے ہیں، مقابلہ میں بیٹھ سکتے ہیں بشرطیکہ ایسے امیدوار جو مناسب پائے گئے۔ ۳۰ جون ۱۹۷۳ء تک یا اس سے پہلے رزلٹ آنے پر ثبوت دے سکیں کہ وہ میتھ میٹکس یا ایلیمنٹری میتھ میٹکس مضمون کے ساتھ پاس ہوئے ہیں۔

عمر :- یکم جولائی ۱۹۷۳ء کو اس امتحان میں شریک ہونے والے امیدواروں کی عمر ۱۸ سال سے

کم اور ۲۷ سال سے زیادہ نہ ہونی چاہیئے۔ یعنی ان کی تاریخ پیدائش ۲ جولائی ۱۹۴۶ء سے پہلے اور یکم جولائی ۱۹۵۵ء کے بعد کی نہ ہو۔ یو۔ پی کے شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائیبس کے امیدواروں اور ایسے امیدواروں کے لئے جن کی کفالت کی ذمہ داری جنگ آزادی میں شریک افراد پر ہو، عمر کی مدت زیادہ ہونے کی صورت میں ۵ سال تک کی رعایت دی جا سکتی ہے۔ عمر زیادہ ہونے کی صورت میں ۵ سال کی رعایت ایسے امیدواروں کو بھی دی جائے گی جو یکم جون ۱۹۶۳ء کو یا اس کے بعد برما سے اور یکم نومبر ۱۹۶۴ء کو یا اس کے بعد سری لنکا سے ہجرت کر کے ہندوستان آ گئے ہوں۔ عمر زیادہ ہونے کی صورت میں رعایت ان امیدواروں کو بھی دی جائے گی جو ڈیفنس سروس سے ڈیٹائرڈ یا کسی کی اسکیم کے تحت علیحدہ کئے گئے ہوں بشرطیکہ یکم جولائی ۱۹۷۳ء کو ان کی موجودہ عمر میں سے ان کی فوجی خدمات کو پوری مدت کو گھٹانے کے بعد ان کی عمر مطلوبہ عمر سے زیادہ نہ ہو۔

فیس :- درخواستی فارم کی قیمت سات روپے ہے اور امتحان کی فیس ۱۲ روپے ہے (یو۔ پی کے شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائیبس کے متعلق امیدواروں کے لئے فیس صرف ۳ روپے ہے) یہ فیس ٹریژری چالان کے ذریعہ ہی جمع کرائی جائے۔

درخواستوں کے پہنچنے کی آخری تاریخ ۲۶ مئی ۱۹۷۳ء ہے۔ درخواستوں کے لئے مجوزہ درخواستی فارم معہ دیگر معلومات کے دو روپے کے منی آرڈر بھیجنے پر یا کمیشن کے پوچھ تاچھ کے دفتر میں نقد جمع کرانے کی صورت میں "بھیجو" پریکشا وبھاگ نمبر ۲۳۔ E/۲۔ A، پبلک سروس کمیشن، یو۔ پی، الہ آباد سے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ اگر امیدوار سرکاری ملازم ہے تو منی آرڈر کوپن پر اس کی وضاحت کرنا ضروری ہے۔ ڈپارٹمنٹ نمبر، جگہ کا نام اور بڑے حروف میں اپنا پورا نام و پتہ منی آرڈر کوپن پر لکھنا ضروری ہے۔ منی آرڈر تاخیر سے بھیجنے یا نامکمل تفصیلات بھیجنے کی وجہ سے پیدا ہونے والی صورت حال کی ذمہ داری خود امیدوار پر ہوگی۔

الہ آباد۔ ۱۰ اپریل ۱۹۷۳ء

رُورل انجینئرنگ سروس

ڈرافٹس مین کی ۲۵ عارضی جگہوں کے لئے درخواستیں مطلوب ہیں۔

تنخواہ :- ۱۷۰ - ۸ - ۲۰۰ - ای۔ بی - ۱۰ - ۲۸۰ اور اس کے علاوہ تمام وہ الاؤنسز جو اسٹیٹ گورنمنٹ میں رائج ہیں۔

تعلیمی قابلیت :- ہائی اسکول پاس ہونا چاہیئے۔ اس کے علاوہ کسی بھی منظور شدہ ادارے سے ڈرافٹس مین شپ کا ۳ سالہ ڈپلومہ یا سول انجینئرنگ ڈپلومہ بشرطیکہ ۶۰ فیصدی مارکس ڈرائنگ میں ہوں۔

عمر :- پہلی جنوری ۱۹۷۳ء تک ۲۷ سال سے زیادہ نہ ہو۔ شیڈول کاسٹ امیدواروں کے لئے عمر میں ۵ سال کی رعایت کی گئی ہے۔ درخواست میں معہ پورے نام (جلی حروف میں) تاریخ پیدائش، تعلیمی قابلیت، ڈرافٹس مین شپ کے امتحان میں حاصل کئے ہوئے مارکس کی پرسنٹیج، ساتھ میں تمام سرٹیفکٹس کی اٹیسٹ ہوئی کاپیاں، چیف انجینئر کے نام روانہ کریں۔

پتہ :- چیف انجینئر
رورل انجینئرنگ ڈپارٹمنٹ۔ سکریٹریٹ۔ یو۔ پی لکھنؤ
آخری تاریخ :- ۲۰ مئی ۱۹۷۳ء

اس تاریخ کے بعد پہنچنے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا۔ شیڈول کاسٹ امیدواروں کو چاہیئے کہ اپنے ضلع مجسٹریٹ کے دفتر سے اپنے شیڈول کاسٹ ہونے کے سلسلے میں ایک سرٹیفکٹ پیش کریں۔ امیدواروں کو چاہیئے کہ اپنے نام قریبی ایمپلائمنٹ ایکس چینج میں رجسٹر کرائیں اور اپنا رجسٹریشن نمبر معہ رجسٹریشن کی تاریخ درخواست میں لکھیں۔ ایسے امیدوار جو کہ سرکاری ملازمت میں ہیں وہ اپنی تمام درخواستیں اپنے دفتر کے ذریعہ ہی سے بھیجیں۔ درخواست کے ساتھ اپنے ڈپارٹمنٹ کے ہیڈ سے حاصل کیا ہوا نو اب جکشن سرٹیفکٹ بھی ہونا چاہیئے۔

ہمدرد دوا خانہ (وقف) دہلی میں روح افزا سیزن کے لئے ۱۲۰/- روپے ماہانہ بالمقطع مشاہرہ پر کارکنان کی ضرورت ہے۔
امیدواران کو صحت مند، معمولی پڑھا لکھا اور اٹھارہ سال سے زائد عمر کا ہونا چاہیئے۔
خواہش مند امیدوار حسب ذیل پتہ پر فوراً درخواست دیں۔
پتہ :- ڈویژنل منیجر ایڈمنسٹریشن
ہمدرد دواخانہ۔ لال کنواں۔ دہلی

فضل الرحمٰن اسلامیہ انٹر کالج بریلی

مندرجہ ذیل اسامیوں کے لئے اساتذہ کی ضرورت ہے :-

۱۔ اسسٹنٹ ٹیچر سی۔ ٹی گریڈ میں۔ جونیئر ہائی اسکول درجات کو سائنس اور ریاضی پڑھانے کے لئے۔

۲۔ ٹائپ انسٹرکٹر سی۔ ٹی گریڈ میں۔ انٹر کامرس۔ (اسٹینو ٹائپنگ کے ساتھ) درخواست معہ ایک نقل مجوزہ فارم پر جو کالج دفتر سے ایک روپیہ نقد یا منی آرڈر سے بھیج کر حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ معہ نقول جملہ اسناد ۲۶ مئی ۱۹۷۳ء تک پرنسپل کالج ہذا کے نام پہنچ جانی چاہئیں۔

اسلامیہ گرلس انٹرمیڈیٹ کالج بریلی

مندرجہ ذیل اسٹاف کی ضرورت ہے۔

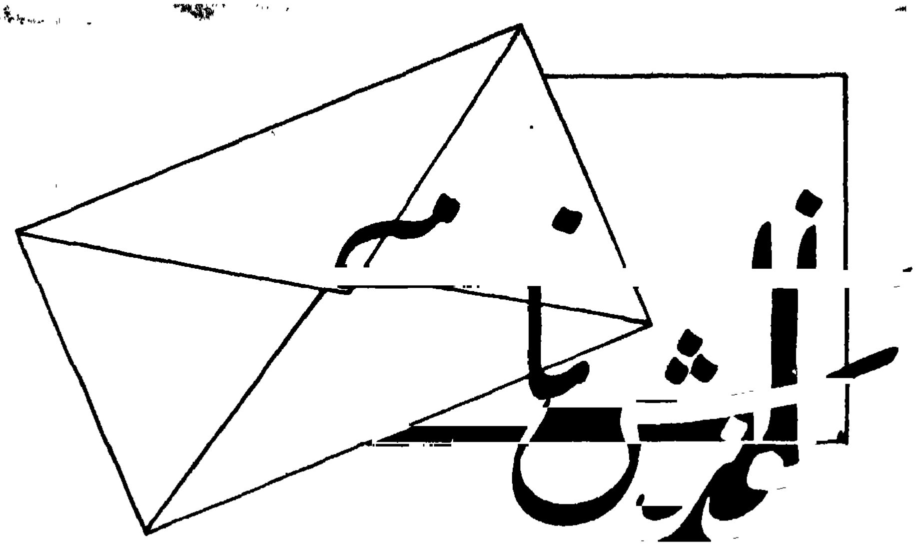
۱۔ ۲ سی۔ ٹی۔ میتھ میٹکس اور ہندی کے مضامین کے ساتھ۔

۲۔ ایک کوالیفائڈ پی۔ ٹی انسٹرکٹر۔

۳۔ ایک کوالیفائڈ لائبریرین، اردو کی معلومات زائد صلاحیت سمجھی جائے گی۔

تنخواہ و دیگر شرائط ایجوکیشن ڈپارٹمنٹل رولز کے مطابق۔ درخواستیں معہ مصدقہ نقول اسناد کے پرنسپل کے نام ۱۵ مئی ۱۹۷۳ء تک پہنچ جانی چاہئیں۔

[redacted]



نصابی کتابیں اور فرقہ واریت

اخبارات میں شائع ہونے والی ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق مرکزی وزارت تعلیم ان تعلیمی اداروں کی امداد بند کرنے کے سوال پر غور کر رہی ہے جو فرقہ پرست جماعتوں کے زیر انتظام ہیں اور یہ منصوبہ تعلیمی برادری سے تنگ نظاور فرقہ وارانہ جذبات کو ختم کرنے کے لئے تجویز کیا گیا ہے۔ مرکز نے ایک اور پروگرام اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے جس کے تحت تمام ابتدائی درجوں کے لئے رائج تمام کتب خصوصی طور پر زبان، تاریخ، سوکس اور سوشل اسٹڈیز کی کتابوں کا تنقیدی جائزہ لیا جائے گا۔ مرکز کے اسی پروگرام میں قومی یک جہتی کے پیشِ نظر ان کتابوں سے قابلِ اعتراض اور فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے والے اسباق کا اخراج بھی شامل ہے۔

۱۹۶۶ء میں مرکزی وزارتِ تعلیم نے علاقائی اتحاد اور فرقہ وارانہ یک جہتی کے جذبات کو فروغ دینے کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اسکول کی نصابی کتابوں کا جائزہ لینے کے لئے خواجہ غلام السیدین مرحوم کی سربراہی میں ایک کمیٹی قائم کی تھی۔ اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ بعض ہندی ریاستوں میں چلنے والی تاریخ، سوشل اسٹڈیز اور زبان کی نصابی کتابوں میں بعض فرقہ کے طلبہ کے نقطۂ نظر سے قابلِ اعتراض مواد پایا تھا یا تعلیمی بنیاد پر وہ اسباق نامناسب تھے۔ کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں منجملہ اور باتوں کے یہ بھی کہا تھا کہ ہندی بولنے والی ریاستیں کوٹھاری تعلیمی کمیشن کی سفارشات کے مطابق سہ لسانی فارمولے کو عملی جامہ نہیں پہنا رہی ہیں جس میں سنسکرت کو فارمولے سے علیحدہ کرنے کی سفارش کی گئی تھی۔

۱۹۷۰ء میں فرقہ واریت مخالف کمیٹی نے ایک مختصر تحقیقاتی مقالہ کتابی شکل میں شری بھی سہدراجوشی کے پیش لفظ کے ساتھ شائع کیا جو مسٹر راشد نعمانی نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ تعلیمات کے لئے تصنیف کیا تھا۔ اس تحقیقی مطالعہ میں نصابی کتابوں کی کمزوریوں کی جانب نشاندہی کی گئی تھی۔ مسٹر نعمانی کے منصفانہ اور واقعیت پسندانہ تجزیہ سے اس بات کا انکشاف ہوا کہ "ان تینوں کتابوں سے ایک مخصوص فرقہ کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچ سکتی ہے یہ تجزیہ انتہا پسندانہ ہو سکتا ہے فرقہ وارانہ خیالات تنگ نظری کا نقطۂ نظر پیدا ہو سکتا ہے۔"

اکتوبر ۱۹۷۱ء میں قومی کونسل برائے تعلیمی تحقیق و تربیت نے نصابی کتابوں کا دوبارہ کل ہند جائزہ لیا اور ان میں ۳۵ فیصدی مواد قومی یک جہتی کے خلاف پایا اور مشورہ دیا کہ اس قسم کی کتابوں کو مکمل یا جزوی طور پر واپس لے لیا جائے۔

ان تمام چونکا دینے والے جائزوں کے باوجود حکومت نے اس سلسلہ میں کوئی حوصلہ افزا قدم نہیں اٹھایا۔ آج بھی فرقہ وارانہ نصابی کتابیں رائج ہیں اور یہاں تک کہ سرکاری امداد یافتہ تعلیمی ادارے فرقہ وارانہ خطوط پر چلائے جاتے ہیں۔ خصوصی طور پر پرنسپلوں اور اساتذہ کا انتخاب اسی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ سنسکرت ابھی تک سہ لسانی فارمولے کا جزو لاینفک ہے اور اردو کو جو مشترکہ قومی تہذیب اور سیکولرازم کی علامت ہے۔ ہندی بولنے والی ریاستوں میں زیادہ تر اسکولوں سے عملاً خارج کیا جا چکا ہے۔

جب تک حکومت مندرجہ بالا رپورٹوں اور تحقیقاتی مقالوں کی سفارشات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ولولہ انگیز اقدامات نہیں کرے گی، بہتری کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی ہے۔ خصوصی طور پر ان حالات میں جب تعلیم بدقسمتی سے مرکزی حکومت کی فہرست میں نہیں آتی ہے۔

عبدالسلام صدیقی۔ لکھنؤ

دینی مکتبوں کے فارغین کا مسئلہ

I

ابتداء ہی سے 'سیکولر ڈیموکریسی' زیر مطالعہ رہا ہے۔ جہاں تک نظریات کا سوال ہے (بعض باتوں کے علاوہ) میں ان نظریات کا اپنے آپ کو پابند سمجھتا ہوں، جن کی تبلیغ آپ اس جریدے کے ذریعہ کرتے ہیں۔

ماہ اپریل کے جریدے میں "بھٹکتی نسلیں" ایک مقالہ پڑھا، جسے پڑھ کر فاضل مقالہ نگار کے ذہنی دیوالیہ پن کا بری طرح احساس ہوا۔

ہندوستان میں آزادی سے قبل جتنی بھی ملکی اور قومی پیمانے پر تحریکیں چلائی گئیں، ان میں علماء کا نمایاں کردار رہا ہے۔ اور یہ تمام علماء عربی مدارس سے درسِ نظامی کے فارغین تھے۔ اگر آزادیٔ ہند کی تاریخ تعصب اور تنگ نظری سے بالاتر ہو کر مرتب کی جائے تو ان علماء کا نام سرِفہرست نظر آئے گا۔

فاضل مقالہ نگار اپنے دلائل پیش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:۔

" عربی مدارس میں اکثر ایسے افراد داخل ہوتے ہیں جو ذہنی اعتبار سے کمزور ہوتے ہیں اور عام طور سے ایسے ماحول اور ایسے علاقوں سے آتے ہیں جو کئی لحاظ سے پس ماندہ ہوتے ہیں۔"

ذرا اس دلیل پر غور فرمائیے اور یہ چھوٹی سی فہرست ملاحظہ فرمائیے۔

مولانا محمود الحسن (اسیر مالٹا) مولانا حسین احمد مدنی، مولانا حسرت موہانی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا اشرف علی تھانوی وغیرہ۔ ان علماء کا نام ہی اس دلیل کو باطل کرنے کے لئے کافی ہے۔ وہ نہ تو کُند ذہن تھے نہ ہی کسی پس ماندہ ماحول یا علاقہ کے باشندے تھے۔

اگر فاضل مقالہ نگار ذہنی طور سے بالغ ہوتے تو شاید انھیں اس بات کا احساس ہوتا کہ اسلام اور اسلامی تعلیمات انسان کو مادیت کی طرف جانے سے روکتی ہیں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے انسان کو دنیا میں صرف اس بات کی اجازت ہے کہ وہ مادیت کی طرف اتنی توجہ دے جس سے اسے سامانِ زیست فراہم ہو سکے۔ ایک مسلمان کی زندگی خیمہ زن سے زیادہ نہیں ہونی چاہیئے۔

آج ہم علماء اور دینی مدارس کو تنقید کا نشانہ بنا کر آنے والی نسلوں کے حوصلے پست کر رہے ہیں۔ اگر ہم انھیں اپنے سے برتر نہیں سمجھ سکتے تو ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ ہم اس قسم کی لایعنی باتوں کی تبلیغ کرکے اِن علماء کی توہین کریں جو اس کام کے لئے اپنی زندگی وقف کر چکے ہیں اور خدا کے راستہ پر آنے والوں کی حوصلہ شکنی کریں۔

درسِ نظامی کے فارغین کے مستقبل کا مسئلہ اتنا اہم نہیں ہے جتنا کہ علوم دنیاوی کے طلبا کے مستقبل کا مسئلہ ہے۔ بی۔ اے اور ایم۔ اے کرنے کے بعد بھی تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بیروزگاری کا مسئلہ ایک سیلاب بن کر ہماری معاشی اور سماجی زندگی کو بری طرح متاثر کر رہا ہے برخلاف اس کے درس نظامی کے فارغین نہ تو سماج پر اثر انداز ہوتے ہیں اور نہ ہی معاشی زندگی پر عقاب بن کر مسلط ہوتے ہیں۔ ع

رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی سے معاف

(حافظ مولوی) انیس الرحمٰن بی۔ اے آنرز

II

دین اور دنیا کا توازن

مکرمی! "بھٹکتی نسلیں" میں جن مسائل کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ ان پر انتہائی سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ دو چار یا دس پانچ کا نہیں بلکہ ہزاروں نوجوانوں کا مسئلہ ہے۔ میں سو فی صدی اس حق میں ہوں کہ بچوں کو دینی تعلیم دی جائے لیکن انھیں ایسی تعلیم بھی دینی ضروری ہے جس سے وہ ایک اچھے شہری بن سکیں۔ اسلام کی اصل دین یہ ہے کہ اس نے دین اور دنیا میں توازن قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ دنیا کے علم وفن کی تاریخ میں مسلمانوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اگر مسلمان نہ ہوتے تو آج یورپ وہاں نہ ہوتا جہاں ہے۔ اور انسانی علم کی تاریخ بہت مختصر ہوتی ہے۔ میدانِ جنگ ہو یا میدان علم مسلمان نے ہر جگہ اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ اور اس سب کی وجہ دین و دنیا کا وہ توازن ہے جسے اسلام نے پیش کیا تھا صرف اللہ اللہ کرتے رہنے سے قوموں کی تقدیریں نہیں بدلا کرتیں۔

عثمانی صاحب نے اپنا موضوع روزگار کے امکانات تک محدود رکھا ہے مسئلہ صرف اتنا نہیں ہے مسئلہ یہ بھی ہے کہ دینی مدرسوں اور مکتبوں سے کتنے لوگ نکلتے ہیں جو انسانی علم میں اضافہ کرتے ہیں مسلمانوں کی تاریخ بو علی سینا، امام غزالی، ابن بطوطہ اور ایسے ہی دوسرے عالموں کی وجہ سے روشن ہے ان دینداروں کی وجہ سے نہیں جنھوں نے "اللہ ہو" میں اپنی زندگی گزار دی۔ بلکہ ان لوگوں کی وجہ سے جنھوں نے اسلام کی ہر چیز کو جان سے زیادہ عزیز رکھا اور ساتھ ساتھ دنیاوی معاملات میں بھی اسلام کا پرچم لہرایا۔

عبدالغفور۔ مرادآباد

III

میری بربادی کا ذمہ دار کون؟

جو بات میں مدتوں سے محسوس کرتا رہا ہوں لیکن ڈر کے مارے منہ سے نہ نکال سکا وہ بات انتہائی مدلل طریقے سے انجم عثمانی صاحب نے کہی ہے۔ میں بھی دیوبند کا فاضل ہوں۔ میں نے بھی چودہ سال وہاں گزارے ہیں۔ اس وقت میری عمر چوالیس سال ہے اور میں ایک کپڑے والے کی دوکان پر منشی ہوں اور مجھے صرف ایک سو اسّی روپے ماہوار تنخواہ ملتی ہے۔ مجھ سے بہت کم ذہانت کے بچے جنھیں جدید تعلیم دلائی گئی تھی مجھ سے کہیں زیادہ آسودگی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ میری زندگی خراب کرنے کی تمام تر ذمہ داری میرے والد مرحوم پر ہے جن کی تمنا تھی کہ میں کسی مسجد کا مولوی بن کر محلے والوں کی روٹی پر زندگی گزاروں۔ لیکن یہ مکتب بھی میری بربادی کے کچھ کم ذمہ دار نہیں۔ میرے کئی دوست جنھوں نے میرے ساتھ دیوبند میں تعلیم پائی تھی، سونا رول رہے ہیں لیکن ایسا شخص جو ایمانداری سے زندگی گزارنا چاہتا ہے تعویذ گنڈوں کے ذریعہ عوام کو بے وقوف نہیں بنانا چاہتا۔ بیوی بچوں کا پیٹ بھی پالنے کے قابل نہیں۔

جلیس احمد۔ لکھنؤ

IV

"بھٹکتی نسلیں" پر میں انجم عثمانی کو دلی مبارکباد دیتا ہوں۔ مگر اس سلسلے میں میری گزارش یہ ہے کہ ان مکاتیب کی افادیت سے قطعاً انکار کرنا ہرگز مناسب نہیں۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ مکاتیب کے ذمہ داران پر یہ فرض ہے کہ وہ نئے حالات کے مطابق اپنے کورس اس طرح تیار کریں کہ اگر طالب علم چاہے تو ایک عالم کی طرح زندگی گزارے اور چاہے تو ایک دنیاوی انسان یہ تعلیم دونوں میدانوں میں اس کے کام آنی چاہیئے۔

مقالہ چھپے ہوئے ایک مہینہ ہو چکا ہے۔ حیرت ہے کہ مسلم مجلس، مسلم لیگ اور دوسری مسلم فرقہ پرست جماعتوں نے اب تک یہ انکشاف نہیں کیا کہ یہ شوشہ بھی حکومت نے اٹھایا ہے تاکہ مسلمانوں کے مذہب اور تہذیب کو ختم کیا جا سکے۔

اصغر علی بمبئی

[redacted]

ہمارے نمائندے

- مسز کمل سانیال
  ا۔ ڈوور روڈ کلکتہ
- شری ایم۔ این۔ صدیقی
  نوبت ولا پلاٹ نمبر ۵۶-۵۷
  جوہو ولے پارلے ہاؤسنگ سکیم
  نارتھ ساؤتھ روڈ نمبرا
  آف ارلا برج اندھیری (ویسٹ)
  بمبئی ۵۸ (اے۔ایس)
- شریمتی خدیجہ عالم خوندمیری
  ۱۱/۱۵ ۱۱-۱۶، سلیم نگر
  حیدرآباد ۳۶
- ڈاکٹر معین شاکر
  ڈپارٹمنٹ آف پولٹیکل سائنس
  مرہٹواڑہ یونیورسٹی
  اورنگ آباد
- شری بی۔ این۔ پانڈے
  ۱۴۸۔ آزاد سکوائر
  ساؤتھ ملکہ
  الہ آباد
- سردار سریندر سنگھ سندھو
  پی۔ این ۳۴/۲ لارڈو والی روڈ
  جالندھر
- سردار اقبال سنگھ
  سیکٹر ۱۸۔ اے
  کوارٹر نمبر ۵۹ چنڈی گڑھ
- شری این۔ کے۔ سنگھ
  کھادی گرام اُدیوگ سنگھ۔ مرادپور
  پٹنہ

مشاورت بورڈ

- ایڈیٹرز
  سبھدرا جوشی
  ڈی۔ آر۔ گوئل
  خلیق انجم
- جنرل منیجر
  راجندر کمار
- بزنس منیجر
  جی۔ ایل۔ ملہوترا
- دفتر کا پتہ
  ۴-۱۹، تھیٹر کمیونی کیشن بلڈنگ
  کناٹ سرکس
  نئی دہلی ۱
- ٹیلی فون نمبر ۴۳۳۸۳

ماہنامہ

سیکولر ڈیموکریسی

مئی ۱۹۷۳ء
شمارہ ۱۸

شرح

ڈاکٹر فریدی اور فسادات

سیاست میں لوگ پلٹتے دیکھے گئے ہیں۔ گذشتہ پانچ چھ برس کے دوران ہندوستان میں آیارام گیارام جیسی مضحکہ خیز منس بھی دیکھنے میں آئی ہے۔ عوام ان کو جس نظر سے دیکھتے ہیں اس کی تشریح کی چنداں ضرورت نہیں، لیکن وہ لوگ عام طور پر کم دائرے میں اثر کرتے تھے اور ان کا اثر ختم ہو جاتا تھا۔ گذشتہ دو برس کے عرصے میں فریدی صاحب نے جو تبدیلی اپنے خیالات میں ظاہر کی ہے اس کی نوعیت آیارام گیارام سے زیادہ گمبھیر اور نتیجہ خیز ہے۔ انھوں نے اپنی ذات کو نہیں تمام مسلمانوں کے مفادات کو داؤں پر لگایا ہے۔ اس کا سب سے نمایاں اظہار انھوں نے تب کیا جب انھوں نے کہا کہ پچھلے چند مہینوں میں جو فسادات ہوئے ہیں ان میں جن سنگھ یا آر۔ ایس۔ ایس کا کوئی قصور نہیں۔

ان کے اس بیان کو پڑھ کر ہم کو کافی حیرانی ہوئی اگرچہ کچھ لوگ جو ڈاکٹر صاحب کو ہم سے بہتر جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں حیران نہیں ہیں۔ بہرحال ہم ان کے تین برس پہلے کے بیان کو قابلِ اعادہ سمجھتے ہیں۔

مسلمانوں کی "خالص سیاسی تنظیم" یعنی مسلم مجلس کی افتتاحی کانفرنس منعقدہ کانپور میں خطبۂ صدارت پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر فریدی نے مجلس کی تنظیم و تشکیل کی وجہ یوں بیان فرمائی تھی:۔

> "میں اسے صاف کر دینا چاہتا ہوں کہ مسلم مجلس مسلمانوں کو ختم کروانے کے بھرپور منصوبے کے خلاف ان کے دفاع اور تحفظ کے لئے قائم کی گئی ہے۔ بیس سال صبر کرتے رہنے کے بعد ہم نے محسوس کیا ہے کہ ہمیں خود اپنے پیروں پر کھڑا ہو جانا چاہیے۔ کوئی دوسرا گروہ یا سیاسی پارٹی اپنی مقبولیت کو خطرے میں ڈال کر ہمارے مسائل حل کرنے یا ہماری حفاظت کرنے نہیں آئے گی۔ اگر جن سنگھ یا آر ایس ایس جیسی جارحانہ تنظیمیں ختم کر دی جائیں اور صحیح جمہوریت بحال ہو جائے تو مسلمانوں کی علیحدہ پارٹی بنانے کی ضرورت نہیں رہے گی۔" (عزائم، لکھنؤ۔ ۱۳ مارچ ۱۹۷۰ء)

یہ اقتباس خطبۂ صدارت میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ تقریر کے باقی حصے میں مسلمانوں کی زبوں حالی، مختلف سیاسی پارٹیوں کے سیکولرازم کے آدرشوں سے انحراف اور جن سنگھ وغیرہ کی جارحیت کا تجزیہ پیش کیا گیا تھا۔ اس سے سیدھے سیدھے کچھ باتیں سامنے آتی ہیں۔ اول تو مسلمانوں کو ختم کروانے کے بھرپور منصوبے" کے لئے سب سے بڑا ہتھیار "جن سنگھ اور آر ایس ایس جیسی جارحانہ تنظیمیں" ہیں یعنی فرقہ وارانہ فسادات کے پیچھے اگر کوئی نظریہ یا تنظیم ہے تو انھیں پارٹیوں کا ہے۔ دوسری پارٹیاں اسی حد تک ذمہ دار ہیں جس حد تک ان پارٹیوں کی ذہنیت ان کے ممبران میں سرایت کر چکی ہے۔

اس اعلان کے تین برس بعد اگر ڈاکٹر فریدی اپنا نظریہ بدلتے ہیں تو ظاہر ہے وجوہات پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔ ڈاکٹر فریدی صاحب فرماتے ہیں کہ وہ اپنے مشاہدے کی بنیاد پر اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ ہم زیادہ دور کی بات نہیں کرتے لکھنؤ سے سو میل دور گونڈہ میں جو کچھ ہوا اس کی جانب ان کی توجہ کھینچنا چاہیں گے ہمیں یقین ہے کہ انھوں نے گونڈہ اور نواحی علاقوں میں جو واقعات ہوئے ان کا مشاہدہ اور مطالعہ غور سے کیا ہوگا۔ انھوں نے جگہ جگہ وہ پرچے اور اشتہارات بھی دیکھے ہوں گے جن میں زہریلے الفاظ میں مسلمانوں کے خلاف منافرت ابھاری گئی تھی۔ ان پرچوں اور اشتہارات کے نیچے انھوں نے ان تنظیموں کے نام بھی دیکھے ہوں گے جن کی طرف سے وہ جاری کئے گئے تھے۔ ان کے اندر راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ، وشو ہندو پریشد، ودیارتھی پریشد وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں لیکن کیا ہم یقین کریں کہ ڈاکٹر فریدی جیسا باخبر سیاست داں ان تنظیموں کے تعلقات سے ناواقف ہوگا؟ کیا ان کو معلوم نہیں کہ یہ تمام ایک ہی درخت کے پھل ہیں؟

ہمیں یہ کہنے میں کوئی گریز نہیں کہ کچھ کانگریس والوں کے ایمان بھی متزلزل ہوئے لیکن وہ ماحول کس نے بنایا تھا جس میں کانگریس کے چند افراد بہہ نکلے؟ اور کیا ان کانگریسیوں کا کردار اسی نوعیت کا نہیں جس کا ذکر خود ڈاکٹر فریدی نے اپنے خطبۂ صدارت میں کیا تھا؟ ڈاکٹر فریدی کو شاید اس بات کا بھی علم ہوا ہوگا کہ شریمتی سبھدرا جوشی کے گونڈہ جانے کے بعد جو ماحول میں تبدیلی آئی تو بھٹکے ہوئے کانگریسی تیزی سے اس راستے کی طرف لوٹے جسے چھوڑ کر وہ فرقہ واریت کی تباہ کن ڈگر پر چل دئیے تھے۔

ان تمام واقعات کو دیکھتے ہوئے جس نتیجے پر ڈاکٹر فریدی پہنچے ہیں اور جو نتیجہ وہ مسلمانوں کے گلے سے اُتارنا چاہتے ہیں اس کے بارے میں شک گزرتا ہے کہ اس کا محرک جذبہ واقعات کی صحت و سچائی سے محبت کے علاوہ کچھ اور ہے۔ ڈاکٹر فریدی فخریہ طور پر خود کو سو فیصدی سیاسی آدمی کہتے ہیں شاید اس سو فی صدی سیاسی کردار کے معنی یہ ہیں کہ اصول کی سیاست سے

یا وہ ان کو سودے کی سیاست مرغوب ہے۔

اصول کی سیاست کا تقاضہ یہ تھا کہ تین ہی برس پہلے انھوں نے جو بات کہی تھی اس کو منوانے کے لئے پورا زور لگاتے۔ مسلمانوں کے تحفظ کے لئے وہ جس قسم کے سیاسی نظریات اور سیاسی تنظیموں کو مہلک سمجھتے تھے ان پر پابندی لگانے کے مطالبے کی شدت سے حمایت کرتے لیکن ان تین برسوں میں انھوں نے اس سلسلے میں اُنگلی تک نہیں ہلائی۔ جو تنظیمیں اور تحریکیں مستعدی سے ان عناصر کا قلع قمع کرنے میں مصروف ہیں اور جو ہر پارٹی سے فرقہ وارانہ ذہنیت کو نکال پھینکنے کے لئے کوشاں ہیں ان کے ساتھ انھوں نے تعاون تو دور کی بات رہی ان سے دشمنی شعار کر لی۔ ورنہ شریمتی سبھدرا جوشی کی قیادت میں چلنے والی سامپردائکتا ورودھی کیٹی کی سرگرمیوں پر اعتراض کے کیا معنی؟ کیا ڈاکٹر صاحب کو اس بات کا قلق ہے کہ انھوں نے اتر پردیش کی فضا میں گھلتے ہوئے فرقہ پرستی کے زہر کا مداوا شروع کر دیا اور غالباً سودے بازی کے امکانات کم کر دیئے؟

اصول کی سیاست کا تقاضہ تو یہ تھا کہ ۱۹۷۰ء کے بعد فرقہ وارانہ ماحول میں جو تبدیلی آئی اس کا اعتراف اور خیر مقدم کرتے اور ایمان داری سے ان لوگوں کو مبارکباد پیش کرتے جنھوں نے احمد آباد، جلگاؤں اور بھونڈی کے بعد کے مسموم ماحول میں اپنی "مقبولیت" کی پرواہ نہ کرتے ہوئے فرقہ وارانہ سیاست پر بھرپور سیاسی وار کیا۔ یہ شریمتی اندرا گاندھی کا قصور نہیں کہ ملک کی بھاری اکثریت نے ان کے اس اقدام کو اچھا سمجھا اور ان کا ساتھ دیا اور جن سنگھ کو شکست دی۔ صرف مسلمانوں نے ہی نہیں ہندوؤں میں بھی بڑی اکثریت نے جن سنگھ کو اس کی جگہ دکھانے میں پیش قدمی کی۔ اس سے تو یہ نتیجہ نکالنا چاہیئے تھا کہ ملک کی آبادی کا بیشتر حصہ فرقہ واریت کے خلاف ہے اور اس سلسلے میں شریمتی اندرا گاندھی کی قیادت کا مداح ہے۔ اس کا دوسرا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ملک میں فرقہ واریت کو ختم کرنے کے لئے (اور اسی میں مسلمانوں کا تحفظ اور بہبودی مضمر ہے) شریمتی اندرا گاندھی کے ہاتھ مضبوط کئے جائیں۔ لیکن فریدی صاحب نے منطقی نتائج سے گریز کیا اور شریمتی اندرا گاندھی کی کانگریس کے ساتھ سیٹوں کا سودا شروع کر دیا اور اس طرح اصول پرستی میں موقع پرستی کی آمیزش کے لئے ذمہ دار ہے۔

اصول کی سیاست کا یہ بھی تقاضہ تھا اور ہے کہ حالیہ فسادات پر تجزیاتی نظر دوڑائی جائے اور غور کیا جائے کہ کس پارٹی کا سیاسی مفاد فرقہ وارانہ فضا کو مکدر کرنے کے ساتھ وابستہ ہے۔ ڈاکٹر فریدی اگر اس طرح سوچتے تو جن سنگھ کو معصوم قرار نہ دیتے۔ اس اٹل بہاری باجپئی اور جن سنگھ کے ساتھ دوستی کی باتیں نہ کرتے جو تین برس پہلے اپنی مسلم دشمنی کا اس طرح مظاہرہ کرتے تھے کہ وزیر اعظم کو پارلیمنٹ کے اندر انھیں ٹوکنا پڑا جو بھارتیہ کرن کی باتیں کرتے تھے۔ اور جن کی ذہنیت آج بھی اس بیان سے ظاہر ہوتی ہے جو انھوں نے پارلیمنٹ میں آنند مارگ کے گورو کے سلسلے میں دیا ہے اور جس میں انھوں نے کہا کہ اگر کوئی ملّا یا پادری جیل میں ہوتا تو اس کے ساتھ وہ سلوک نہ ہوتا جو آنند مورتی کے ساتھ ہو رہا ہے۔ آنند مورتی کے بارے میں جس جھوٹ اور مبالغہ آرائی سے وہ کام لے رہے ہیں یہاں اس پر بحث نہیں لیکن اس کے بعد اقلیتوں کی جانب ان کی ذہنیت پہچاننے میں مشکل نہیں ہونی چاہیئے۔

اس پر بھی اگر ڈاکٹر فریدی کانگریس دشمنی میں اس حد تک پہنچ جاتے ہیں کہ جن سنگھ کو فسادات کی ذمہ داری سے بَری کرتے ہیں تو ہم ان سے پوچھنا چاہیں گے کہ اگر جن سنگھ فسادات کا سلسلہ مزید تیز کر دے جیسا کہ وہ انتخابات سے پہلے کیا کرتی ہے تو کیا ڈاکٹر فریدی خود اس الزام سے بچ سکیں گے؟ سیاست کی شطرنج کے کھلاڑی کے طور پر بھی اگر وہ نام پانا چاہیں تو انھیں کم سے کم کروڑوں ہندوستانیوں کی زندگی اور موت کے سوال کو اس شطرنج کا ایک مُہرہ نہیں بنانا چاہیئے۔

قارئین سے گزارش



مسافر رک گیا ہے چلتے چلتے

نعمت سروش

مرا ساہنی کی موت سے ہندوستان نے ایک ناگہانی صدمہ و ناقابل تلافی نقصان ہے بلراج ساہنی کی زندگی فلمی دنیا کے لئے ہی نہیں تھی اس تحریک کے بانیوں میں سے تھے فرقہ واریت کے خلاف بہادران کی انسان دوستی کا ایک نشہ تھا۔ بھیونڈی میں فسادات کی آگ کے خلاف جس خاموشی کے ساتھ انھوں نے کام کیا وہ فرقہ واریت کے خلاف لڑنے والوں کے لئے ... ہے ان کو خراج عقیدت اس کے سوائے اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ جو کام وہ ادھورا چھوڑ گئے اسکی تکمیل کیلئے ہم خود کو وقف کر دیں۔ (ادارہ)

اور اس دن جب صبح ہی صبح اخبار میں یہ خبر پڑھی کہ بلراج ساہنی شوٹنگ کے لئے جانے کو تیار تھے کہ اچانک انھوں نے دل کے درد کی تکلیف محسوس کی، اور بجائے فلم اسٹوڈیو کے اسپتال کا رخ کیا۔ مگر دل سنبھالے نہ سنبھلا اور چند گھنٹوں کی جدوجہد کے بعد بلراج نے "آرام" کرنے کی ٹھان لی ــــــ تو یہ خبر پڑھ کر بیساختہ میرے منہ سے نکلا ــــــ "مسافر رک گیا ہے چلتے چلتے"

بلراج ساہنی نے عمر کی ساٹھ منزلیں طے کیں اور ہر منزل پر اپنے قدموں کے نہ مٹنے والے نشان چھوڑے ایسے نشان جو آئندہ نسلوں کے لئے چراغِ راہ ثابت ہوں گے۔ بلراج کے نقوشِ قدم سے روشنی حاصل کرنے والوں میں سے ایک میں بھی ہوں اور آج جب اپنے تاثرات قلمبند کرنے بیٹھا ہوں تو خیالوں اور یادوں کا ہجوم ذہن میں موجود ہے۔

سب سے پہلے مجھے بلراج کی جس چیز نے چونکایا وہ تھا ان کا ایک ریڈیو ڈرامہ ــــــ ممتاز مفتی کی مشہور کہانی ــــــ "آندھی" جس نے ۱۹۴۰ء کے آس پاس اردو افسانہ کو نئے امکانات کا پتہ دیا تھا اس کہانی کا ریڈیائی ڈرامائی روپ بلراج ساہنی نے تخلیق کیا۔ اور جب میں نے ۱۹۴۵ء کے اواخر میں بمبئی ریڈیو میں ملازمت اختیار کی تو یہ ڈرامہ ان ڈراموں میں سے ایک ہے جنھوں نے مجھے بیحد متاثر کیا۔ اور جس سے میں نے ریڈیائی ڈرامے کی تکنیک سیکھنے میں مدد حاصل کی۔

یہ اس پرخلوص دور کا ذکر ہے جب بمبئی میں ہم ترقی پسند ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں کا گروپ مثل ایک بڑے کنبے کے تھا اور ہم لوگ ذاتی اغراض اور مصلحتوں سے بے نیاز اپنے اپنے طریقہ اور بساط کے مطابق ترقی پسندی کے تقاضوں کو پورا کرنے میں منہمک رہتے تھے۔ شہرت اور روپیہ حاصل کرنے کے لئے باہمی مقابلہ بازی کا دور شروع نہیں ہوا تھا اس لئے خلوص کی کمی نہ تھی۔

عوام سے براہ راست رابطے کی مشاعروں کے علاوہ دوسری شکل تھی عوامی تھیٹر ــــــ اور ترقی پسند مقاصد کے تحت "کلچرل اسکوارڈ" قائم تھا جس کی سربراہی بلراج ساہنی کرتے تھے۔ خواجہ احمد عباس ان دنوں اس کے لئے بڑی شدومد سے ڈرامے لکھ رہے تھے اور پریم دھون اپنے رقص اور عمر شیخ اپنے گانوں سے اس کے پروگراموں میں تازہ روح پھونکتے تھے ــــ بلراج ساہنی تب بھی تھیوسوفیکل کالونی جوہو میں رہتے تھے۔ بی بی سی سے نئے نئے آئے تھے اور ان کی جاذب پرخلوص اور تیکھی شخصیت نے ان کو بے حد مقبول بنا دیا تھا

پھر کلچرل اسکوارڈ کی جگہ "اپٹا" (انڈین تھیٹر) نے لی اور بلراج ساہنی کی کوششوں کی بدولت 'اپٹا' کو ہندوستان گیر مقبولیت حاصل ہو گئی۔ 'اپٹا' ان کی شخصیت کا آئینہ تھا اور وہ اس ادارے میں ہندوستان کے تہذیبی محاذ پر کام کرنے کے لئے نوجوانوں کی ایک نئی نسل تیار کر رہے تھے۔ وہ جب کوئی نیا کھیل تیار کرتے تو زیادہ زور اس بات پر دیتے تھے کہ نئے فن کار اس میں حصہ لیں۔ انھیں اس کی پرواہ نہیں تھی کہ لوگ تجربہ کار ہیں یا نہیں ــــ کبھی پہلے تھیٹر میں کام کیا ہے یا نہیں۔ صرف یہ شرط ہوتی تھی کہ دل سے تھیٹر میں کام کرنے کے شوقین ہوں اور اپنا وقت خوشی سے دے سکیں۔

وہ وقت ترقی پسندوں کے لئے بڑا کڑا اور آزمائشی وقت تھا، اور حق گوئی کی سزا اگر پھانسی نہیں تو جیل ضرور تھی۔

بلراج ساہنی کو بھی جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ ور جیل سے رہائی کے بعد وقت اور حالات کے تقاضے کے مطابق بلراج کی زندگی میں ایک نیا موڑ آیا۔ مگر یہ نیا موڑ انھیں زندگی کی نئی بلندیوں اور آدرش کی نئی رفعتوں کی طرف لے گیا اور ہندوستان کی فلمی صنعت کو بلراج ساہنی کے روپ میں ایک ایسا شخص مل گیا جو اپنی نیچرل اداکاری سے عوام کے جذبات کی صحیح

شدہ نہیں، بلکہ حقیقی نمائندگی کر سکتا تھا، اور بلراج نے "ہم لوگ" اور "دو بیگھہ زمین" جیسی فلموں میں کام کر کے شروع میں ہی اپنی فن کاری کے وہ اعلیٰ جوہر دکھائے کہ آج تک کوئی اور اس کی نقل نہیں کر سکا۔

ہمارے ملک میں آدمی کو "شہرت" کے آئینے میں دیکھا جاتا ہے، جس بلراج ساہنی کی شہرت و مقبولیت "اپٹا" میں چوبیس گھنٹے عرق ریزی کرنے کے بعد بھی محدود تھی اور جسے جوہو پر ایک چھوٹے سے ساحلی جھونپڑے میں زندگی گزارنی پڑتی تھی ——— وہی بلراج ساہنی جب فلموں میں آیا تو شہرت نے اس کے قدم چومے اور کروڑوں فلم بین عوام کے دلوں میں گھر کر گیا۔ فلموں میں بلراج نے ایک ہی ٹائپ کے رول نہیں کئے۔ بلکہ مختلف حیثیتوں سے جلوہ گر ہوتا رہا اور ہر جگہ اس کی اپنی ایک شان تھی پھر بھی فلم انڈسٹری چونکہ لکیر کی فقیر ہے۔ اس لئے ایک ہیرو آخر وقت تک ہیرو ہی رہتا ہے۔

ویلن آخر وقت تک ویلن، اور کیریکٹر کو آخر وقت تک کوئی اور موقعہ نہیں ملتا ——— بلراج ساہنی اگرچہ اس دائرہ کو توڑ کر جگہ جگہ نظر آئے مگر پھر بھی فلم بین حضرات اس کی فنکارانہ شخصیت کے بہت سے جوہر نہیں دیکھ سکے۔ مثلاً ان کی مزاحیہ اداکاری۔

بلراج ساہنی کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے فلمی ماحول میں اپنے آپ کو ضم نہیں کیا بلکہ اپنے کردار و عمل سے اس ماحول کو متاثر کیا اور اس بنیادی مقصد اور آدرش کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا جس کے لئے انھوں نے اپٹا اولین قدم اٹھایا تھا اور گورنمنٹ کالج لاہور سے گریجویشن کر کے اور خاندانی روایات کے مطابق بزنس کرنے کے بجائے وہ "شانتی نکیتن" چلے گئے تھے۔ بلراج عالمی امن کے حامی تھے۔ سوشلسٹ طرزِ حیات کے مبلغ تھے اور ان کی سرگرمی میں سوشلسٹ ملکوں کو بہت سے ثقافتی وفود گئے

اور اس طرح بین الاقوامی سطح پر ہندوستان کے تہذیبی رشتے استوار کرنے میں بلراج کا بھی حصہ ہے اور قابلِ قدر حصہ ہے۔

وہ اپنی کامیاب فلمی زندگی کی مصروفیتوں کے باوجود سماجی، سیاسی، ادبی اور ثقافتی کاموں کے لئے وقت نکال ہی لیتے تھے۔ الیکشن کے موقعوں پر ان کی شعلہ بار تقریروں نے عوام کے دلوں کو مسخر کیا۔ ہندی اور پنجابی ادب میں انھوں نے اپنا نمایاں مقام پیدا کیا۔ شروع میں وہ ہندی میں لکھتے تھے مگر بعد میں پنجابی میں۔ اور گورمکھی

ڈراپ سین

بلراج ساہنی کی موت پر

اِک معلّم
اِک ادیب
ایک فن کار
اِک اداکار
ایک انسان
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

رسم الخط میں لکھنے لگے تھے۔ اور پنجابی ادب کی انھوں نے خاص طور پر خدمت کی۔ اور جب بھی ادبی تحریک کو ان کی ضرورت پڑی، وہ اسٹوڈیو کی تیز روشنیوں سے نکل کے ادبی محفل کی رونق بننے کے لئے تیار رہے۔

فلمی زندگی گزارنے کے باوجود تھیٹر سے ان کی دلچسپی بدستور قائم رہی۔ غالباً اس لئے کہ فلم میں ایک اداکار کو مکمل کام کرنے کا موقعہ نہیں ملتا۔ اور فی الواقعی یہ تکنیک ایسی ہے کہ ایک فقرہ اور ایک جملہ ادا کرنے کے لئے آپ گھنٹوں روشنیوں اور کیمروں کی زد میں کھڑے ہیں جب کہ اسٹیج پر اداکار کو اپنی شخصیت

اُجاگر کرنے کا پورا موقع ملتا ہے اور وہ بھرپور طریقے سے سامنے آتا ہے نہ کہ یہ کہ قسط وار اپنا رول ادا کرتا ہے تھیٹر سے بلراج کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ اپٹا چھوٹنے کے بعد اور فلموں میں مصروف ہو جانے کے بعد بھی انھوں نے بمبئی کی دور دراز ساحلی بستی "جوہو" میں "جوہو آرٹ تھیٹر" قائم کیا۔ اور اپنی عادت کے مطابق بالکل نئے اور نوجوان فنکاروں کو اس تھیٹر میں کام کرنے کی دعوت دی اور اپنے عمل سے ترغیب دلائی کہ یہ نوجوان "جوہو آرٹ تھیٹر" کو پیسہ کمانے کا ذریعہ نہ سمجھیں بلکہ اپنی ذہنی آسودگی اور افتادِ طبع کی تسکین کا ذریعہ سمجھیں ——— اب سے بیس یا پچیس سال پہلے بلراج ساہنی کا لگایا یہ پودا آج ایک تناور درخت بن چکا ہے اور "جوہو" تھیٹر کا مرکز ہے۔

فلم کو بلراج ساہنی جیسے ایکٹر بہت کم ملیں گے۔ ملک کو بلراج ساہنی جیسے ادب و ثقافت کے مشکل سے میسر آئیں گے۔ عوام کو ایسے نڈر کلاکار ملتے دشوار ہیں جو زمانے کے آگے نہ جھکتے تھے زمانہ جن کے آگے سرنگوں ہوا۔ بلراج کو اعزازات اور خطابات وغیرہ نہیں ملے مگر ان کی شخصیت اور قربانیاں ان چیزوں سے بہت بلند تھیں۔ ان کے خیالات نہایت واضح، زندگی کا رویہ نہایت حقیقت پسندانہ اور عمل نہایت صالح تھا۔ وہ لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے۔ ملنگوں میں ہم لوگ جب بحث و مباحثہ کرتے تھے تو وہ اس رجحان کو اور بڑھاوا دیتے تھے۔

گزشتہ دنوں نہرو یونیورسٹی میں ان کا کونووکیشن ایڈریس، ایک عرصہ موضوعِ گفتگو بنا رہا جس میں انھوں نے بے کم و کاست اپنے ترقی پسند خیالات کا اظہار کیا تھا۔

وہ آخر وقت تک کام کرتے رہے ——— بے تکان کام کرتے رہے ——— ہر محاذ پہ کام کرتے رہے ——— اور اب جب کہ ان کے قلب کی حرکت نے ان کے ارادوں کا ساتھ چھوڑ دیا ——— محسوس ہوتا ہے کہ
مسافر رک گیا ہے چلتے چلتے

اقبال اور تصورِ پاکستان

بیگم شاہدہ کمال
سرینگر (کشمیر)

محمد علی جناح مرحوم نے شیخ محمد اقبال کو پاکستان کے تصور کا موجد قرار دیا۔ جناح مرحوم کی بات کو پاکستان کے ہر حکمران نے دہرایا، اور اس بات کی اتنی رٹ لگائی گئی کہ پاکستان ہی میں نہیں، ہندوستان میں بھی بہت سے سادہ لوگ ہیں جو اس کو درست سمجھتے ہیں۔ ان میں بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جنھوں نے اقبال کی زندگی، ان کے مضامین، اور ان کے خطوط کا مطالعہ نہیں کیا۔ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جنھوں نے اقبال کی قومی اور وطنی نظمیں پڑھی اور سنی ہیں، ہندو رہنمایانِ دین کے بارے میں اقبال کی عقیدت سے بھری ہوئی نظمیں بھی پڑھی ہیں۔ لیکن پھر بھی اقبال کو فرقہ پرست اور تصورِ پاکستان کا مصنف سمجھتے ہیں۔

چونکہ ہندوستان میں اقبال کی ولادت کا جشن صد سالہ بڑی دھوم دھام سے منایا جا رہا ہے اس لئے آئیے ذرا اس بات پر بھی ایک نظر ڈالیں کہ اقبال نے پاکستان کا واقعی کوئی خاکہ بنایا تھا۔

۱۹۳۰ء سے پہلے دو مسلم لیگیں تھیں۔ دونوں لیگیں مدغم ہوئیں اور دسمبر ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کا جو اجلاس الٰہ آباد میں ہوا، اس کی صدارت اقبال نے کی۔ اور جو خطبۂ صدارت انھوں نے پڑھا اس کو تصورِ پاکستان کی بنیاد سمجھا جاتا ہے۔ اس میں انھوں نے کہا تھا:

"میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ، اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے، خواہ یہ ریاست سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری حاصل کرے، یا باہر رہ کر۔ مجھے تو نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمالی مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو آخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنی پڑے گی۔"

اقبال کیا چاہتے تھے؟ پنجاب کی خوشحالی اور اس کے لئے وہ پنجاب سے برطانوی ہند کے ان صوبوں کا الحاق چاہتے تھے جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔

اقبال نے ہندوستان سے الگ مسلمانوں کے کسی وطن کا خواب نہیں دیکھا تھا

وہ چونکہ شمال مغربی ہندوستان میں رہتے تھے، اس لئے وہ صرف اسی کے بارے میں سوچتے تھے۔ مسلمانوں کی واقعی اکثریت تو بنگال میں تھی۔ دوسری بات یہ ہے کہ کشمیر کی ریاست پنجاب سے ملحق ہونے کے باوجود، اور اقبال کے اپنے کشمیری ہونے پر فخر کرنے کے باوجود اس ریاست کے نقشے میں کہیں نہیں ہے۔ میں ایک سوال کروں گی۔ کیا یہی پاکستان کا تصور ہے اور جواب اس کا واضح ہے۔

یہ پاکستان نہ اپنی تشکیل کے اعتبار سے اور نہ اپنے نظام کے اعتبار سے اس ریاست کے تصور کے قریب تھا جو اقبال کے ذہن میں تھا۔ ایک تو اقبال نے اس بات پر بھی سمجھوتہ کر لیا تھا کہ صوبوں کا یہ الحاق سلطنت برطانیہ کے اندر ہوگا۔ اور سلطنت برطانیہ سے ان کی مراد تاجِ برطانیہ نہیں، بلکہ برطانوی ہند سے تھی۔ منظم اسلامی ریاست سے ان کی کیا مراد تھی؟ یہ ان کی اس کھلی چٹھی سے ظاہر ہے جو انھوں نے ۳۰ جولائی ۱۹۳۱ء کے سول اینڈ ملٹری گزٹ میں سر فرانسس ینگ ہسبنڈ کے نام لکھی تھی۔ اس میں انھوں نے لکھا تھا:

"اگر بولشوزم میں خدا کی ہستی کا اقرار شامل کر دیا جائے تو بولشوزم اسلام کے بہت قریب آ جاتا ہے۔ اس لئے مجھے تعجب نہ ہوگا اگر کسی زمانے میں اسلام روس پر چھا جائے یا روس اسلام پر۔ اس بات کا دارومدار اس پر ہوگا کہ نئے آئین میں ہندوستان کے مسلمانوں کی حیثیت کیا ہوگی؟"

یہاں بھی اقبال "ہندوستان کے مسلمانوں کی حیثیت" کی بات کرتے ہیں۔ انھوں نے ہندوستان سے الگ، مسلمانوں کے لئے کسی وطن کا خواب نہیں دیکھا تھا۔ یہاں میں ایک بات واضح کر دوں۔ اقبال نے جگہ جگہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو قومیں کہا ہے۔ ان کے زمانے میں تعلیمی اداروں، دفتروں اور عدالتوں کے کاغذات اور فارموں میں قوم کے خانے میں شیخ، سید، پٹھان، برہمن، کھتری، ویش، اہیر، جُلاہا، کُرمی وغیرہ لکھا جاتا تھا۔ پھر اقبال ہندوستان کے مسلمانوں ہی کو نہیں ساری دنیا کے مسلمانوں کو ایک قوم، اور ساری دنیا کے عیسائیوں کو ایک قوم سمجھتے تھے۔ اس لئے دو قومی نظریے یا پاکستان کے تصور کے سلسلے میں، ان کا نام لینا یا تو لاعلمی کے سبب سے ہو سکتا ہے، یا پھر فتنہ کے لئے۔ اور دونوں باتیں اچھی نہیں ہیں۔ اقبال کے پرستار ایسا کریں تو یہ اقبال کی شان میں گستاخی ہے۔ اور اقبال کے معترض ایسا کریں تو وہ اپنی لاعلمی کا بہت بھونڈا اشتہار دیں گے۔

یہ حالات کی ستم ظریفی ہے کہ کچھ لوگوں نے سنجیدگی کے ساتھ اور کچھ نے بغض اور نفرت کے جذبے کے

تحت اقبال کو نظریۂ پاکستان کا حامی قرار دیا۔ اور شاعر کی حیثیت سے بھی اس کو پاکستان کے حوالے کر دیا۔ حالات کی دوسری ستم ظریفی یہ ہے کہ اقبال نے برطانوی ہند کے صوبوں کو پنجاب سے ملا کر "اٹانوی" کا خواب دیکھا تھا آج پاکستان سمٹ کر اتنا ہی ہو گیا ہے۔ اور آئندہ حصے بخرے نہ ہوں گے، اس کے بارے میں یقین سے کون کہہ سکتا ہے؟

تقسیم سے پہلے اگر مسلمان کسی ایک علاقے میں، دوسرے علاقوں کے مسلمانوں کی الگ الگ تعداد سے زیادہ تھے تو وہ تھا بنگال کا علاقہ۔ اور بنگال پر شیرِ بنگال مولوی فضل الحق کا اثر تھا، اور وہ فرقہ وارانہ سیاست میں یقین نہیں رکھتے تھے۔ اس لئے اقبال نے کبھی پاکستان کا خواب نہیں دیکھا۔

۱۹۴۴ء تک کی جدوجہد آزادی پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ مسلم لیگ بحیثیت ایک سیاسی جماعت کے برائے نام پارٹی تھی۔ محمد علی جناح ۱۹۳۴ء میں انگلستان سے ہندوستان واپس آئے تو انھوں نے مسلم لیگ کو ایک بے جان جسم پایا۔ انھوں نے سارے ملک کا دورہ کیا، اور ہر جگہ خطاب یافتہ "مسلم اکابرین" سے جن میں انگریزوں کے حاشیہ نشین شامل تھے، رابطہ قائم کیا۔ اس سلسلے میں صوبوں کے برطانوی حکمرانوں نے دل کھول کر ان کی مدد کی۔ اس کے باوجود مسلم لیگ ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے نہ اُبھر سکی۔ کیونکہ اس کے پاس کوئی اقتصادی پروگرام نہ تھا۔ وہ برطانوی تسلط سے ہندوستان کی آزادی کی خواہاں بھی نہیں تھی، بلکہ تاجِ برطانیہ کے سائے میں "مسلمانوں" کے حقوق کو جنت کے خواب دکھا رہی تھی۔ یہ سبز باغ تھے، اور مسلم عوام ان کی حقیقت سے واقف تھے۔ وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ مسلم لیگ کی پشت پر نہ صرف رجواڑے اور مسلم سرمایہ دار ہیں بلکہ غیر ملکی حکمران بھی اس پارٹی کو شہ دے رہے ہیں۔ آخر تمام مسلمانوں کا کوئی مشترکہ مفاد نہیں تھا، اور نہ ہو سکتا تھا۔ سماج طبقوں میں بٹا ہوا ہو تو مختلف طبقوں کے مفادات مختلف ہوتے ہیں۔ کانگریس اس طبقاتی جدوجہد میں کسانوں، مزدوروں، اچھوتوں۔ غرض یہ کہ کمزور طبقوں کے ساتھ تھی۔ یہ دوسری بات تھی کہ ہندوستان کا سرمایہ دار بھی آزادی کی جدوجہد میں شریک تھا۔ ایک طرف وہ برطانوی حکمرانوں کو ڈالیاں لگاتا تھا، لیکن دل سے یہ چاہتا تھا کہ انگریز ملک سے جائے تو اسے استحصال کے لئے نہ صرف سستی محنت ملے بلکہ اتنی بڑی منڈی بھی ملے جس میں بدیشوں کا سامان آ کر بکتا ہے، اور بدیشی خام مال سستے داموں میں خرید کرلے جاتے ہیں۔ اسی طرح سرمایہ داروں کے کچھ گھرانے بھی کانگریس کے ساتھ تھے، اور کانگریس کی مدد کرتے تھے۔ اس کے باوجود کانگریس کے سامنے ایک واضح

> دو قومی نظریہ یا پاکستان کے تصور کے سلسلے میں اقبال کا نام لینا یا تو لاعلمی کے سبب ہو سکتا ہے یا پھر فتنے کے لئے۔ اور دونوں باتیں ایسی ہیں جس میں اقبال کے پرستار یا اسیر ہیں تو یہ اقبال کی شان میں گستاخی ہے اور اقبال کے معترض ایسا کریں تو وہ اپنی لاعلمی کا بہت بھونڈا اظہار دیں گے

اقتصادی پروگرام تھا۔ ایک طرف گاندھی جی کا فلسفہ یہ تھا کہ سرمایہ دار خود کو سرمایہ کا کسٹوڈین سمجھے اور سرمایہ کو غریبوں کی بھلائی کے لئے استعمال کرے تو دوسری طرف جواہر لال نہرو ایسے سوشلسٹ کانگریس کی قیادت میں ہراول دستے میں تھے جو مکمل آزادی اور سوشلزم سے کم کسی بات پر سمجھوتے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر ملکی حکمرانوں کی امداد، اور ان کے اشاروں کے پابند اخباروں کے بانس پر چڑھنے کے باوجود مسلم لیگ کے قد میں اضافہ نہ ہو سکا۔

۱۹۳۷ء میں انتخابات ہوئے تو چھ صوبوں میں کانگریس نے وزارتیں بنائیں۔ بنگال، پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ۔ تینوں مسلم اکثریت کے علاقے تھے لیکن ان تینوں صوبوں میں مسلم لیگ کی حالت نہ صرف تشویشناک، بلکہ عبرت ناک تھی۔ بنگال میں شیرِ بنگال مولوی فضل الحق کا بول بالا تھا اور ان کی "پرجا پارٹی" غیر فرقہ وارانہ پارٹی تھی۔ صوبۂ سرحد میں خان عبدالقیوم خان کا اثر تھا اور پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کا زور تھا۔ یہ تھی برطانوی ہند کی حالت۔ ریاستوں میں جموں و کشمیر کی ریاست کا حکمران غیر مسلم تھا لیکن اکثریت مسلمانوں کی تھی یہاں عوامی تحریک "مسلم کانفرنس" کے تحت اُبھری لیکن اس تحریک کا مقصد چونکہ عوام کو ان کے جمہوری حقوق دلانا تھا اس لئے تحریک کے بانیوں نے جن میں شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ اور خواجہ غلام محمد صادق شامل تھے، یہ فیصلہ کیا کہ جمہوری حقوق کے لئے یہ جنگ صرف مسلمانوں کی جنگ نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ صادق صاحب کی صدارت میں ایک جلسہ ہوا اور مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کر دیا گیا۔ جو ریاست میں انڈین نیشنل کانگریس کا بازو تھی۔ چنانچہ جب بھی ریاست کی تحریک پر کوئی مشکل وقت آیا تو مسلم لیگ کی قیادت اس کے کام نہیں آئی۔ مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو نے نہ صرف اعلانیہ مدد کی بلکہ جواہر لال نہرو تو ۱۹۴۶ء میں شیخ محمد عبداللہ کی پیروی کرنے کے لئے کشمیر بھی گئے اور کوہالہ کے پُل پر انھیں حراست میں بھی لیا گیا۔ شیخ محمد عبداللہ جب مہاراجہ کی قید تھے تو ان کی رہائی کے لئے کانگریس کے نامزد صدر جواہر لال نہرو گئے کہ مقدمے کی پیروی کریں۔ محمد علی جناح مسلم لیگ کے صدر ہی نہیں ایک پریکٹسنگ بیرسٹر تھے۔ جن کا نام اس پیشے میں چمکا ہوا تھا، لیکن وہ اہل کشمیر کی جمہوری تحریک کے قائد کی وکالت کے لئے نہیں گئے، کیونکہ ان کے تعلقات براہِ راست غیر ملکی حکمرانوں اور دیسی حکمرانوں سے تھے۔ اور اس معاملے میں "دو قومی نظریہ" کے قائل نہ تھے۔ (یہاں اس بات کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ اس صدی کی چوتھی دہائی میں جب محمد علی جناح کشمیر آئے تھے تو ان کا استقبال صرف اس وجہ سے شاندار ہوا کہ شیخ صاحب نے استقبال منظم کیا تھا۔ جناح صاحب، شیخ صاحب کو فرقہ وارانہ سیاست میں نہ لا سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اہل کشمیر نے شیخ محمد عبداللہ کو شیرِ کشمیر کے ساتھ ساتھ قائدِ اعظم بھی کہنا شروع کر دیا)

اس میں شک نہیں کہ اقبال مسلم لیگ کے ممبر تھے لیکن جس مسلم لیگ کے ممبر اقبال تھے اور جس مسلم لیگ کے

سربراہ محمد علی جناح تھے ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اقبال انسانیت دوست تھے، سیاستداں نہیں جب کہ جناح صاحب "سیاستداں" تھے، "سیاستداں" کے بہت محدود معنوں میں۔ اقبال بین اسلامی تصورات میں گھرے ہوئے تھے اور اس مسلم لیگ کی تنظیم کو، جو وجود اور عدم کے مابین کسی نامعلوم نکتہ پر تھی۔ اپنے خیالات کے اظہار کے لئے ایک پلیٹ فارم کے طور پہ استعمال کرنا چاہتے تھے۔ اور جناح صاحب اقبال کی شاعری کی حیثیت سے شہرت کو اپنی تنظیم کو چمکانے کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے ورنہ جناح صاحب کو ہمیشہ اقبال کے خیالات سے اختلاف رہا

دوسری گول میز کانفرنس ۱۹۳۱ء کے آخر میں لندن میں ہوئی تھی۔ اقبال بھی اس میں شرکت کرنے کے لئے گئے تھے۔ جب پہلی دسمبر کو یہ کانفرنس ختم ہوئی تو اقبال فلسطین گئے اور یہاں ہندوستان کے ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے مؤتمر عالم اسلامی میں شرکت کی۔ مؤتمر کی ایک سب کمیٹی کے سامنے یہ تجویز تھی کہ یروشلم میں ایک اسلامی یونیورسٹی قائم کی جائے جو قدیم جامعہ ازہر کے نمونے پر ہو اقبال نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی۔ اور کہا کہ یونیورسٹی قدیم طرز کے بجائے جدید وضع کی ہو اور اس میں جدید علوم کی تعلیم دی جائے۔ اس رویئے سے اقبال کے ذہن کو سمجھا جاسکتا ہے۔ مؤتمر عالم اسلامی میں شرکت کرنے کے بعد جب اقبال وطن واپس آئے تو لاہور اسٹیشن پہ ان کا شایانِ شان خیر مقدم ہوا۔ یہ استقبال مسلم لیگ نے نہیں، جمعیت اسلام کے کارکنوں نے منظم کیا تھا۔

دسمبر ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے الٰہ آباد کے اجلاس کے خطبۂ صدارت میں اقبال کے جن جملوں کو مسخ کر کے "قراردادِ پاکستان" بتایا جاتا ہے، ان کے بارے میں عرض کیا جاچکا ہے۔ اس خطبے میں اقبال نے "کل ہند فیڈریشن" کے قیام کے خلاف بھی اظہارِ خیال کیا تھا۔ لیکن یہ اختلاف قطعی نوعیت کا نہیں تھا۔ اقبال نے اس بات پر زور دیا تھا کہ پہلے صوبوں کو اختیارات دیئے جائیں (کیونکہ سارے اختیارات گورنر کے پاس تھے) پہلے "صوبائی خود اختیاری حکومت قائم کی جائے جب ان حکومتوں کا تجربہ کامیاب ہو جائے تو مرکز میں وفاق قائم کیا جائے، اور اولین مرحلے پر یہ وفاق بھی صرف برطانوی ہند کے صوبوں کا ہو۔ ریاستیں اس میں شریک نہ کی جائیں"۔ یہ بات کسی تبصرے کے بغیر واضح ہے کہ تمام برطانوی ہند کے صوبوں کا وفاق، صوبوں کو خود اختیاری (اٹانومی) ملنے کے بعد، اقبال کا مقصود تھا۔ اور اس کو کسی طرح "تصورِ پاکستان" نہیں کہا جاسکتا۔ یہاں یہ عرض

مؤتمر کی ایک سب کمیٹی کے سامنے یہ تجویز تھی کہ یروشلم میں ایک اسلامی یونیورسٹی قائم کی جائے جو قدیم جامعہ ازہر کے نمونے پر ہو۔ اقبال نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی۔ اور کہا کہ یونیورسٹی قدیم طرز کے بجائے جدید وضع کی ہو اور اس میں جدید علوم کی تعلیم دی جائے۔

کر دینا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ علامہ اقبال کے اس خطبۂ صدارت سے "پاکستان" کا تخیل یا نام جناح صاحب یا مسلم لیگ کے کسی ادارہ نمائے اخذ نہیں کیا بلکہ انگلستان میں کیمبرج کے چودھری رحمت علی نے اپنے ایک پمفلٹ میں اس کو "پاکستان" کا تصور قرار دیا۔ انڈین نیشنل کانگریس کے وزن پر پاکستان نیشنل کانگریس کی بنیاد ڈالی۔

وسط نومبر ۱۹۳۲ء میں تیسری گول میز کانفرنس لندن میں ہوئی۔ اقبال بھی اس بھی شرکت کے لئے گئے۔ لیکن انھوں نے اس میں کوئی بہت نمایاں حصہ نہیں لیا۔ ۱۹۳۲ء تک اقبال کے خیالات میں کچھ تبدیلی آگئی تھی۔ ڈاکٹر امبیدکر کی کتاب "پاکستان" میں ص ۳۲۹ پر اقبال کے اس زمانہ کے خیالات کے بارے میں درج ہے۔

> "ہندوستان میں سرے سے کوئی مرکزی حکومت (خواہ وہ وفاقی ہی کیوں نہ ہو) قائم نہ کی جائے بلکہ ہر صوبہ کو آزاد ڈومینین بنا دیا جائے جس کا تعلق ہندوستان کی کسی مرکزی حکومت کی بجائے براہ راست لندن میں وزیرِ ہند سے ہو"۔

اقبال کی شاعری کی طرح، اقبال کے "سیاسی خیالات میں بھی تضادات ہیں۔ ایک طرف انھوں نے شمال مغربی برطانوی ہندوستان کے ان صوبوں کو آپس میں ضم کر دینے کی خواہش کی تھی جن میں مسلمان اکثریت تھے۔ پھر وہ یہ سوچنے لگے سرے سے کوئی مرکزی حکومت نہ ہو۔ اور ہر صوبہ براہ راست لندن میں وزیرِ ہند کے ماتحت ہو۔ آج اقبال اس سوال کا جواب دینے کے لئے موجود نہیں ہیں، اس لئے یہ سوال آج ہم صرف خود سے کر سکتے ہیں۔ سوال یہ ہے: اقبال ہر صوبے کو خود مختار ڈومینین کیوں دیکھنا چاہتے تھے؟ — اس کا صرف ایک جواب ہے۔ اگر مسلم اکثریت کے برطانوی صوبوں کا ایک الحاق بن جاتا تو اس میں پنجابی اقلیت میں ہوتے۔ برہمن زادہ کشمیر کو بنیادی طور پر پنجابیوں کا مفاد عزیز تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ مسلم اکثریت کا سب سے بڑا صوبہ بنگال شمال مغربی ہندوستان کے مسلم اکثریت کے صوبوں سے اتنی دور تھا کہ "مسلم صوبوں" کا وفاق بالکل ہوائی بات تھی،

شمال مغربی صوبوں کے الحاق کے بارے میں جو بات انھوں نے ۱۹۳۱ء کے لیگ کے خطبۂ صدارت میں کہی تھی بعد میں وہ بھی ان کو ہوائی بات معلوم ہوئی چنانچہ اسی لئے انھوں نے اپنے اس خیال میں بھی ترمیم کی لیکن بعد میں پھر اس کی طرف لوٹ آئے۔ شمال مغربی صوبوں کا الحاق پاکستان کے وجود میں آنے کے دس برس بعد اس وقت ہوا جب مغربی پاکستان کو ایک یونٹ بنایا

۵ "ذکرِ اقبال" مصنف عبدالمجید سالک (۱۹۵۵ء) مطبوعہ لاہور (پاکستان) ص ۱۵۰

گیا۔ یہ ایک یونٹ اس لئے بنایا گیا تھا کہ پہلی بار اس وقت کے مشرقی پاکستان میں جب انتخابات ہوئے تو نہ صرف وزیرِ اعلیٰ نور الامین نے ایک طالب علم سے شکست کھائی بلکہ صوبے میں مسلم لیگ حرفِ غلط کی طرح مٹ گئی اور فضل الحق برسرِ اقتدار آئے۔ ان کی حکومت نے مغربی پاکستان سے علیحدگی اور آزادی کا مطالبہ کیا۔ پاکستان کے حکمرانوں نے نوشتۂ دیوار پڑھا لیکن حقیقت کو تسلیم کرنے کے بجائے انھوں نے میجر جنرل اسکندر مرزا کو ڈھاکہ کا گورنر مقرر کر دیا۔ اور مرکزی اسمبلی میں صوبوں کے نمائندے آبادی کے حساب سے رکھنے کے بجائے چال یہ چلی کہ مغربی حصے کے تمام صوبوں کو ایک یونٹ بنا دیا۔ اب بھی مشرقی پاکستان کی آبادی اس مغربی یونٹ سے زیادہ تھی لیکن مرکزی اسمبلی میں مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کو "مساوی" نمائندگی دی گئی۔ شمال مغربی صوبوں کا الحاق فیلڈ مارشل ایوب خاں تک قائم رہا۔ لیکن وہ بھی اسے دوبارہ صوبوں میں بٹنے سے نہ روک سکے اور خود ان کے اقتدار کا ستارہ غروب ہو گیا۔

جناح صاحب کے نام اقبال نے جو خط لکھے ان

اقبال کو اس بات کا شدید [illegible] تھا
[illegible] مسلم لیگ اعلیٰ طبقوں [illegible] برطانوی [illegible]
کے ہاتھوں میں کھلونا بنی ہوئی ہے۔ اس [illegible]
[illegible] مفادات [illegible]

سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ برطانوی ہند کے شمال مغربی صوبوں کے الحاق کے بارے میں بڑے بے چین تھے لیکن مشکل یہ تھی کہ ان صوبوں میں مسلم لیگ کا کوئی اثر نہیں تھا۔ سیاست کی شطرنج بھی عجیب ہوتی ہے۔ مسلم لیگ کو انگریزوں اور جاگیرداروں کا مفاد عزیز تھا۔ پنجاب میں مسلمان، ہندو اور سکھ جاگیرداروں کی جماعت یونینسٹ پارٹی تھی۔ اقبال پنجاب مسلم لیگ کے صدر تھے لیکن جب جناح صاحب نے پنجاب میں مسلم لیگ صوبائی پارلیمنٹری پارٹی بنانے کا فیصلہ کیا۔ تو اس کی قیادت کے لئے میاں فضل حسین کو دعوت دی۔ میاں فضل حسین نے یہ دعوت ٹھکرا دی تو جناح صاحب نے کسی اور کے تیار نہ ہونے کی بنا پر اقبال کو یہ کام سپرد کیا۔ یہ ۱۹۳۶ء کی بات ہے۔ پنجاب مسلم اکثریت کا صوبہ تھا۔ اور اس میں مسلم لیگ کا کیا اثر تھا، اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ۱۹۳۶ء کے انتخابات میں مسلم لیگ نے صرف ۶۰ نشستوں کے لئے اپنے امیدوار کھڑے کئے۔ صرف دو امیدوار کامیاب ہوئے، راجہ غضنفر علی خاں اور ملک برکت علی۔ راجہ غضنفر علی خاں نے مسلم لیگ کی مضحکہ خیز پوزیشن کو دیکھتے ہوئے دوسرے دن ہی مسلم لیگ چھوڑ کر یونینسٹ پارٹی میں شمولیت کر لی۔ اور پارلیمنٹری سکریٹری بن گئے۔

اقبال کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ مسلم لیگ اعلیٰ طبقوں اور برطانوی حکمرانوں کے ہاتھوں میں کھلونا بنی ہوئی ہے۔ اس لئے عوام کے مفادات کے لئے کام نہیں کر سکتی۔ اور اسی لئے مسلم عوام بھی اس سے بے تعلق ہیں۔ چنانچہ ۲۸ر مئی ۱۹۳۷ء کو انھوں نے جناح صاحب کو لکھا:[1]

"لیگ کو بالآخر یہ فیصلہ کرنا ہی پڑے گا کہ آیا وہ صرف ہندوستانی مسلمانوں کے اونچے طبقے کی نمائندہ جماعت بن کر رہے گی یا ایسے عام مسلمانوں کی جماعت بنے گی جنھوں نے ابھی تک معقول وجہ کی بنا پر اس میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ ذاتی طور پر میں یقین رکھتا ہوں کہ وہ سیاسی تنظیم جو عام مسلمانوں کی بہتری کے لئے کوشاں نہ ہو، عوام کو اپنی طرف نہیں کھینچ سکتی۔"

اقبال اپنی تمام کوششوں کے باوجود محمد علی جناح کو اس بات کی طرف مائل نہ کر سکے کہ بالا بالا برطانوی حکمرانوں اور جاگیرداروں سے سمجھوتہ کرنے کے بجائے براہِ راست مسلم عوام سے رابطہ پیدا کیا جائے۔ مسٹر جناح سیاست داں تھے اور اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ عوام کی سطح پر ہر فرقے کے ایک جیسے مسئلے ہیں اس لئے دو قوموں یا ایک سے زیادہ قوموں کا نظریہ نہیں چل سکے گا۔ چنانچہ انھوں نے اقبال کے مشوروں کو قابلِ عمل نہ سمجھا۔ ہاں لکھنؤ کے لیگ کے اجلاس میں سر سکندر اور مسٹر جناح کے درمیان ایک معاہدہ ہو گیا۔ اس کی دفعات سیاست میں مزاح کا اچھا نمونہ ہیں۔

سر سکندر اپنی پارٹی کے مسلم ممبروں کو مشورہ دیں گے کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں۔ لیکن اس سے یونینسٹ پارٹی کی حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

سر سکندر اور مسٹر جناح کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا۔ اس سے اقبال کو بہت صدمہ ہوا ۔۔۔ اور انھوں نے اس مضحکہ خیز سمجھوتے کی لغویت واضح کرنے کے لئے سر سکندر پہ زور ڈالا کہ ان کی پارٹی کے تمام مسلم ممبر لیگ کے فارموں پر دستخط کر کے لیگ کی ڈسپلن کے پابند ہو جائیں۔ سر سکندر نے پہلو تہی کی، اور کہا کہ وہ اپنی پارٹی کے مسلم ممبروں کو صرف مشورہ دے سکتے ہیں، ان سے دستخط نہیں کرا سکتے۔ یہ جھگڑا بڑھتا گیا۔ انتقال سے ۱۷ دن پہلے یعنی ۴ر اپریل ۱۹۳۸ء کو اقبال نے ایک بیان تیار کیا جس میں سر سکندر اور مسٹر جناح کے درمیان ہونے والے سمجھوتے کو کالعدم قرار دیا گیا تھا یہ بیان مسٹر جناح کو بھی گیا تو انھوں نے اقبال کو تار دیا کہ بیان جاری نہ کیا جائے۔ اور ۸ر اپریل یعنی انتقال سے صرف ۱۳ روز پہلے آل انڈیا مسلم لیگ نے پنجاب مسلم لیگ کو اطلاع دی کہ اس کا الحاق آل انڈیا مسلم لیگ سے نہیں ہو سکتا۔

علامہ اقبال کی جماعت کو آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنی صوبائی شاخ نہیں سمجھا۔ لیکن ان کی وفات کے بعد انھیں پاکستان کا خالق قرار دے دیا۔ اور آج بھی کچھ لوگ اپنے مقاصد کے لئے ان کے نام کا اس حیثیت سے استعمال کرتے ہیں۔ اقبال کی ولادت کے جشن صد سالہ پر اس بارے میں سنجیدگی سے کام کرنے اور غلط فہمی دور کرنے کی ضرورت ہے۔

[1] ذکرِ اقبال۔ مصنف عبدالمجید سالک صفحہ ۲۰

ڈاکٹر احسان اللہ خان

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو توانائی عطا کی ہے اسے مصرف کے لحاظ سے دو زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک پیداواری اور دوسرا تفریحی۔ لیکن پیداواری اور تفریحی کاموں میں تصرف وقت کا تناسب دال اور نمک کے مماثل ہے۔ جب یہ تناسب ایک فرد بدلتا ہے تو وہ فرد زوال پذیر ہوجاتا ہے۔ یہی حال قوموں کا بھی ہوتا ہے۔ پیداواری اور تفریحی طریقوں میں ہمیشہ فرق واضح ہوتا رہا ہے۔ جب ایک طریقۂ پیداوار کسی علاقے کی آبادی کو متمول اور خوشحال نہیں رکھ سکتا ہے تو اس علاقے کے لوگوں کو تفریح کے لئے بہت کم وقت مل پاتا ہے۔ اگر اس علاقے کے لوگ بڑھتی ہوئی آبادی کو کسی نئے ترقی یافتہ طریقۂ پیداوار کو اختیار کرکے متمول نہیں رکھ سکتے تو یہ آبادی ضروریات زندگی کے معیار میں کمی کرکے اپنے وجود کو کچھ دنوں کے لئے برقرار رکھ سکتی ہے۔ اگر وہ سابقہ معیار زندگی اختیار کئے رہنے پر مصر رہتی ہے تو جلد فنا ہوجاتی ہے۔

لیکن چونکہ انسان فطری طور سے جدت پسند واقع ہوا ہے اس لئے وہ نت نئے پیداواری طریقے ایجاد کرتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک انسان اس سرزمین پر بہتر سے بہتر معیار زندگی اختیار کرنے کے باوجود زندہ ہے اور اس کا دائرۂ کار وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔ مثال کے طور پر آج سے پچاس سال پہلے سلطنت برطانیہ میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا لیکن اس کے باوجود اس کی آبادی کا ایک بڑا حصہ غربت اور بے روزگاری کا شکار تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پوری قوم پیداواری اور تفریحی زمروں کا صحیح تناسب کھوچکی تھی۔ لیکن آج جب کہ برطانوی سیاسی اقتدار عملاً اپنی قومی حدود میں سمٹ کر رہ گیا ہے سو وہاں نہ صرف یہ کہ جہالت، بھوک اور بے روزگاری کا خاتمہ ہوچکا ہے بلکہ وہاں کے عام لوگوں کا معیار زندگی پہلے کے مقابلے میں کافی بہتر ہے۔ اب یہ ملک اس پوزیشن میں ہے کہ ہزاروں، لاکھوں غیر ملکیوں کو اپنی معیشت میں کھپا سکے۔ جرمنی اور جاپان کے کارنامے کو اس معاملے میں برطانیہ سے بھی زیادہ نمایاں ہیں۔ ان سب ملکوں کی کامیابی کا راز اس حقیقت میں مضمر ہے کہ انھوں نے پیداوار کے نئے طریقے ایجاد و اختیار کئے ہیں جنھیں عام طور سے جدید ٹکنالوجی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس کے برعکس پرتگال بہت سی نوآبادیوں پر حکمراں ہونے کے باوجود ایک پس ماندہ ملک بن کر رہ گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں کے لوگ اپنے آپ کو عصر جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ اور پیداواری و تفریحی اوقات کا تناسب برقرار نہیں رکھ سکے ہیں۔ یہ محض اتفاق کی بات نہیں ہے کہ پرتگیزی لوگ یورپ کی غریب ترین قوم ہیں حالانکہ ان کے قدرتی وسائل ڈنمارک و ہالینڈ وغیرہ کے مقابلے میں اچھے خاصے ہیں۔

مذکورہ بالا مثالوں سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ اگر کوئی آبادی یا قوم ضرورت کے ساتھ ساتھ طریقۂ پیداوار میں تبدیلی کرتی رہتی ہے اور پیداواری و تفریحی اوقات کا تناسب برقرار رکھتی ہے تو وہ اپنی حاکمانہ حیثیت کو برقرار رکھتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ پہلے حاکمانہ حیثیت کا اظہار سیاسی اقتدار کی شکل میں ہوتا تھا اور اب اس نے معاشی اقتدار کی شکل اختیار کرلی امریکہ، جرمنی اور جاپان وغیرہ کے اقتصادی اقتدار کی عالمگیر نوعیت سے کون انکار کرسکتا ہے؟

تقریباً یہی بات پوری انسانیت کے لئے بحیثیت مجموعی کہی جاسکتی ہے۔ اگر انسان ضرورت کے مطابق طریقۂ پیداوار میں تبدیلی کرتا رہا اور اس نے پیداواری و تفریحی اوقات کا تناسب برقرار رکھا تو اس سرزمین پر اس کی حاکمانہ حیثیت یا خلیفۃ الارض کی حیثیت برقرار رہے گی۔

لیکن اس کے برعکس جو لوگ اپنے آباو اجداد کے طریقہ پیداوار پر فخر کرتے ہیں اور محض اس کے احیا کے لئے کوشش کرتے رہتے ہیں تو ان کا معیار زندگی پست سے پست تر ہوتا چلا جاتا ہے اور بالآخر وہ عملاً نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔ خواہ وہ پورا وقت پیداواری کاموں میں ہی کیوں نہ صرف کرتے رہے ہوں۔ لہٰذا جو بھی قوم زندہ و خوشحال رہنا چاہتی ہے اسے بدلے ہوئے حالات میں زیادہ ترقی یافتہ پیداواری طریقے اختیار کرنے چاہئیں۔ ہر طریقہ پیداوار کے ساتھ ایک نیا تفریحی ڈھنگ بھی ایجاد ہوتا ہے جو نئی تہذیب کا ایک جزو ہوتا ہے۔ مگر جب کوئی زوال یافتہ یا رو بہ زوال قوم نئی ترقی یافتہ تہذیب کی طرف راغب ہوتی ہے تو عام طور سے اس کا رجحان پیداواری طریقوں کے بجائے تفریحی طریقوں کی طرف ہوتا ہے۔ اس کی وجہ زوال یافتہ قوم کا طرز تعلیم ہوتا ہے۔ جو پوری قوم کو قناعت و سہل روی کی طرف مائل کرتا ہے اور انھیں سختی و جفاکشی کے راستے سے دور رکھتا ہے۔ یہ دنیا کے مقابلے میں عقبیٰ کی بہتری کا غلط تصور پیش کر کے انھیں مقابلہ سے کترانے کے ڈھنگ سکھاتا ہے۔ قصہ مختصر کسی زوال پذیر قوم کی تعلیم گاہیں، قتل گاہوں یا صلاحیتوں کے قبرستان کے مترادف ہوتی ہیں۔

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی حکومت جب عرب کے نواح میں پھیلی تو ان کو جہاں روما کی مضبوط و منظم فوج کا سامنا کرنا پڑا وہیں ان کو یونان کے اس فلسفہ کا سامنا کرنا پڑا جس میں اُلجھ کر یونانی قوم عملی ہونے کے بجائے علمی ہو کر رہ گئی تھی۔ مگر مسلمانوں نے اس کو محض علمی حیثیت سے حاصل کیا اور اس کو اسلامی رنگ میں رنگ دیا۔ یہ محض جفاکشی اور عملی دنیا سے مطابقت کرنے کی صلاحیت کا نتیجہ تھا

[illegible]

لیکن بدقسمتی سے اس زمانے کا علم کلام آج بھی اسی طرح پڑھایا جاتا ہے اور اسی کو معراج تصور کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس زمانہ میں فلسفہ کے میدان میں اس علم کلام کا کوئی خاص مقام نہیں ہے۔ حدیث کی تحقیق میں ہمارے محدثین نے جو جفاکشی کی اس کا عشر عشیر بھی آج کے علما میں ناپید ہے۔ فقہا نے آج سے ایک ہزار سال جو فقہ مرتب کی آج کل کے علما اس کا محض اعادہ کرا دینا کمال سمجھتے ہیں۔ دور مروج کے مسلم متکلمین نے اپنے فکری ورثہ کے تجزیئے، معاصر افکار کے جائزے اور دونوں کے امتزاج سے نئی اسلامی فکر کی تشکیل کے جو کام کئے تھے ہمارے علما آج اس کا شعور بھی نہیں رکھتے۔ یہاں تک کہ اپنے فکری ورثہ کے تجزیئے میں ان کا کام اس تحقیقی کام سے بھی بہت پیچھے ہے جو آج مغربی علما (مستشرقین) کر رہے ہیں۔

تاریخ کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی بھی نئے زمانے میں قدامت پسندوں نے کوئی اہم کام انجام نہیں دیا بلکہ اس کے برعکس مجددین نے ہی ہمیشہ اہم کام انجام دیئے۔ مثال کے طور پر خود ہندوستان کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انگریزوں کی آمد کے ساتھ ساتھ ایک جدید دور کا آغاز ہوا۔ اس وقت مسلمانوں کی اصلاح و بہتری کے لئے دو تحریکیں ساتھ ساتھ اُبھریں۔ ایک علی گڑھ اور دوسری دیوبند کے نام سے مشہور رہے۔ اول الذکر کا مقصد تجدید پیدا کرنا تھا اور موخر الذکر کا مقصد اسلاف کی تقلید پر زور دینا تھا۔

زمانہ سے ہم آہنگ نہ ہونے کی وجہ سے تقلیدی تحریک بڑی حد تک متمول گھرانوں میں پھل پھول نہ سکی۔ بلکہ محض غریب و نادار خاندانوں کو اپنے حلقہ اثر میں لے سکی۔ اجتہادی تحریک اگرچہ بلند پایہ مجتہد پیدا نہ کر سکی۔ پھر بھی اس نے ہندوستانی مسلمانوں پر کافی معاشی، معاشرتی اور سیاسی اثرات ڈالے دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے تقلید کی زنجیر توڑ کر اجتہاد کے لئے زمین ہموار کی اور ہندوستانی مسلمانوں میں مقابلہ سے کترانے کے بجائے مقابلہ کے لئے للکارنے کی ہمت پیدا کی جو ہمیشہ زندہ قوموں کا شعار رہا ہے۔ مگر اب علیگڑھ اجتہادی تحریک کا گہوارہ ہونے کے بجائے تقلیدی تحریک کا مرکز ہوتا جا رہا ہے۔ تبلیغی جماعت کے روزافزوں اثرات کی اس کے علاوہ اور کیا توجیہہ کی جا سکتی ہے۔ مختصر یہ کہ ہندوستانی مسلمانوں میں اب کوئی اجتہادی تحریک باقی نہیں ہے۔ اگر ہندوستانی مسلمانوں میں کوئی موثر اجتہادی تحریک نہ اُبھری تو یہ پورا فرقہ یا تو اپنی موت آپ مر جائے گا یا اگر باقی رہا تو اس کا مقام پست ترین زمروں میں ہوگا۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں میں سے جو لوگ دینی اور دنیاوی امور پر یکساں گہری نظر رکھتے ہیں وہ آگے آئیں اور اجتہاد کے بند دروازے کو پھر سے کھولیں۔ لیکن یہ کام جتنا اہم ہے اسی قدر نازک و پیچیدہ بھی ہے۔ نئی اجتہادی تحریک کا آغاز ایک ایسے ادارے کی شکل میں کیا جا سکتا ہے جہاں پر یونیورسٹی سے لے کر پی۔ ایچ۔ ڈی کی سطح تک ہر مضمون کی تعلیم کا انتظام ہو۔ جہاں پر بلند پایہ اساتذہ کا تقرر اور معیاری طلبا کا داخلہ ہو۔ جہاں پر مقابلہ سے کترانے کے بجائے مقابلہ کے لئے للکارنے کی ہمت اور صلاحیت پیدا کی جائے۔ انیسویں صدی کے آخری دور میں اس خلا کو پر کرنے کے لئے ابتدا ایک کالج سے کی گئی تھی لیکن بیسویں صدی کے آخری حصے میں اس کی ابتدا ایک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے کی جانی چاہیئے اور بتدریج پھر یونیورسٹی کی طرف جانا چاہیئے یعنی زمانہ کا لحاظ رکھتے ہوئے ابتدا ہی مخالف سمت سے کرنی پڑے گی۔

کیا امت مسلمہ اس بارگراں کو اٹھانے کے لئے تیار ہے جو اس کی زندگی و ترقی کے لئے انتہائی ضروری ہے؟

ہندوستانی قومیت کی تشکیل کا مسئلہ

سہیل عظیم آبادی

"سیکولر ڈیموکریسی" کی کسی پچھلی اشاعت میں ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی کا مضمون اسی عنوان سے شائع ہوا تھا۔ مجھے اس مضمون کے بارے میں کچھ کہنا نہیں ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ یہ مسئلہ بے حد اہم ہے۔ اور اب بھی اہل فکر طبقہ کی توجہ کا محتاج ہے۔ ہم ہندوستانی قومیت پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ یہ عقیدہ اٹوٹ بھی ہے لیکن اس کی عملی شکل اب بھی واضح نہیں ہو سکی ہے۔ اب بھی اس سلسلے میں لوگوں کے ذہنوں میں الجھنیں ہیں۔ مختلف اصحاب اسے مختلف عینکوں سے دیکھتے ہیں۔

ہندوستانی قومیت کا یہ بڑا المیہ ہے کہ وہ اپنی تشکیل سے پہلے ہی احیا پرستی کا شکار ہو گئی۔ اور بار بار اسے احیا پرستی کا دورہ پڑتا رہا، اور آج بھی یہ روگ اس کی جان کو لگا ہوا ہے۔

انگریزوں کے اقتدار سے پہلے ہندوستان میں قومیت کا کوئی تصور نہیں تھا۔ ملک کے اندر چھوٹے بڑے حکمراں تھے۔ رعایا کی قیادت ان کے ہاتھ میں تھی۔ ان کے ساتھ وفاداری رعایا پر فرض تھی۔ عوام کی کوئی طاقت تھی اور نہ آواز۔ حکمرانوں میں خاندانی برتریت کا جذبہ موجود تھا وہ اپنی حکومت کو بڑھانا اور خاندان کی حکومت کو باقی رکھنا چاہتے تھے۔ یہ جذبہ قومیت کا نہیں، بلکہ خاندانی مفاد اور امتیاز کا جذبہ تھا۔ اور جو لوگ دربار سے دور تھے ان کو اس سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔

اورنگ زیب کی موت کے بعد سلطنت مغلیہ زوال کا شکار ہو گئی۔ مغل شہزادوں میں کوئی ایسا نہیں تھا جو اس گرتی دیوار کو سنبھال سکے۔ ملک کے اندر کوئی مرکزی طاقت باقی نہیں رہ گئی۔ دکن میں آصف شاہی خاندان کی حکومت قائم ہو گئی تھی۔ بنگال میں خود مختار حکومت بن چکی تھی۔ پنجاب میں سکھ، پونا سے وسطی ہند تک مرہٹوں کا بول بالا تھا۔ اودھ میں نواب کی حکومت تھی۔ سارا ملک مختلف حکمرانوں کے زیر اختیار اور بٹا ہوا تھا۔ اور سارے حکمراں اپنی طاقت بڑھانے کے لئے برسرپیکار تھے یا سازشوں میں مصروف۔

دوسری طرف، یورپ سے تجارت کے لئے آئے ہوئے تاجران حالات سے فائدہ اٹھا کر اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتے تھے۔ انگریز سب سے آگے آگے تھے۔ ان حالات نے اہل فکر طبقہ کو سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ اہل فکر طبقہ علما کا تھا جن کو مغل دور حکومت میں اقتدار حاصل تھا۔ اس وقت کے علما میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی بھی تھے۔ انھوں نے حالات کو صحیح طور پر سمجھا اور ملک کو ایک نئے خطرے سے بچانے کے لئے ایک تحریک چلائی۔ جو ولی اللہی تحریک کے نام سے مشہور ہوئی۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے اسے عوامی تحریک بنانے کی کوشش کی۔ لیکن چونکہ دولت اقتدار اور ہر چیز امرا کے قبضے میں تھی) اور عوام کے حصے میں محرومی کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ اس لئے یہ تحریک امرا اور متوسط طبقہ تک محدود رہ گئی۔ عوامی شکل اختیار نہیں کر سکی۔ اور دوسری بات جو زیادہ خراب ہوئی وہ یہ کہ مسلمانوں کے حلقے سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ یقینی طور پر یہ تحریک مسلمانوں کے لئے فرقہ وارانہ تصور کے تحت نہیں چلائی گئی تھی لیکن چونکہ اس کے بانی ایک مسلمان عالم تھے اور مذہبی انداز میں یہ چلائی گئی تھی اس لئے غیر مسلموں کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکی۔ حالانکہ بنیادی طور پر یہ تحریک انگریزوں کے خلاف تھی۔ لیکن اس میں احیائے اسلام کا جذبہ ضرور موجود تھا۔ اس لئے یہ تحریک مسلم تحریک بن کر رہ گئی۔ ڈاکٹر اشرف نے اپنے مضمون "احیائے اسلام کے حامی اور ۱۸۵۷ء کا انقلاب" میں لکھا ہے:

> "مسلم حکومت کی دوبارہ تعمیر کی خاطر ایک نئی نظریاتی بنیاد ڈالنے کے لئے انھوں نے (شاہ ولی اللہ) حضرت محمدؐ کی احادیث کی روشنی میں قرآن مجید کی حقیقی تعلیمات پر زور دیا۔ انھوں نے ایک طرف خلافت اور امامت کے عقائد کے بیچ (یعنی شیعہ اور سنّی فرقوں) اور دوسری طرف شریعت اور طریقت یعنی قدامت پسندی اور تصوّف کے درمیان بڑھی ہوئی خلیج کو پاٹنے کی کوشش کی۔ شاہ ولی اللہ بلاشبہ انیسویں صدی کے احیائے اسلام کے ممتاز معرکوں میں ہیں۔ انھوں نے برطانوی حکومت کے خلاف پے در پے سازشوں کی تنظیم اور قیادت کی۔"

یہی ولی اللہی تحریک بعد میں وہابی تحریک کے نام سے مشہور ہوئی۔ بدنصیبی سے یہ تحریک آگے چل کر سکھوں کے خلاف ہو گئی۔ سکھوں کے خلاف اس کا رُخ موڑ دینے میں انگریزوں کی چالاکی کو بڑا دخل تھا۔ اس طرح یہ تحریک جو ملک کی حفاظت کے لئے کھڑی ہوئی تھی صرف احیا پرستی کی وجہ سے مسلم تحریک بن کر رہ گئی۔

کچھ ایسا ہی حال غیر مسلموں کا تھا۔ ہندوؤں کے ایک بڑے حلقے میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ انگریز ان کے

مذہب کو برباد کر دینا اور سب کو عیسائی بنا ڈالنا چاہتے ہیں۔ اس خیال کو تقویت عیسائی مشنریوں کی جارحیت کی وجہ سے بھی ملی۔ عیسائی مبلغ جہاں جی چاہتا تھا مسیحیت کی تبلیغ کے لئے چلے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ مندروں اور مسجدوں کے سامنے بھی۔ اور پولیس ان کی مدد کرتی تھی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہندوستانیوں کو سیاسی اور سماجی لوٹ کھسوٹ کا احساس نہ تھا، تھا ضرور، لیکن مذہب پرستی کا جذبہ غالب ضرور تھا۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت سیاسی بیداری کا نتیجہ ضرور تھی لیکن اس کے اکثر رہنما بھی مولوی اور پنڈت تھے۔ اور انھوں نے مذہب کا نام کھل کر استعمال کیا تھا ظاہر ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا مقصد ایک ہونے کے باوجود رجحان دو ہوگئے۔ اور قومیت کے جذبے پر مذہبی جذبہ غالب رہا۔ اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستان کی پچھلی تاریخ کے اثرات بھی تھے۔ خاص کر اورنگ زیب کے ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ سلوک کا اثر تھا اور ہندوؤں کے ایک مختصر سے حلقے میں ہی سہی، لیکن مسلمانوں کے خلاف ذہن پیدا ہو چکا تھا۔ بغاوت کی ناکامی کے بعد انگریزوں نے اس سے خوب فائدہ اٹھایا۔ سیاسی جوڑ توڑ اور سازشوں میں انگریز ہندوستانیوں سے بہت آگے تھے اور سیاسی کام کرنا جانتے تھے۔ اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ۱۸۵۷ء میں جہاں ملک کا ایک حصہ انگریزوں کا مخالف تھا تو کچھ حصہ ان کا حلیف بھی بن گیا تھا۔ انگریزوں نے بغاوت کی ساری ذمہ داری مسلمانوں پر ڈال دی۔ اور ان کو کچلنا شروع کیا ہندوؤں نے اس میں عافیت دیکھی کہ الزام ان کے سر نہیں آرہا ہے تو خواہ مخواہ حصہ دار بن کر مصیبت میں کیوں مبتلا ہوں۔ اس صورت حال سے گھبرا کر سرسید نے اپنا مشہور رسالہ 'اسباب بغاوت ہند' لکھا۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب تھا کہ اصل ملزم مسلمان نہیں، بلکہ ہندو تھے۔ شکست خوردہ ذہنیتیں اپنی حفاظت کے ایسے ہی طریقے سوچتی ہیں۔

بغاوت کے دوران ہی انگریزوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اگر ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں میل ہوگیا تو پھر وہ ہندوستان میں ایک دن بھی نہیں رہ سکتے۔ اور انھوں نے بڑی چالاکی سے دونوں فرقوں کے درمیان خلیج کو بڑھانا شروع کر دیا۔ جب ان کی حکومت قائم ہوگئی تو بہت سے حاشیہ بردار اور جاہ طلب افراد ان کے ساتھ ہوگئے۔ اور ۱۸۸۵ء میں جب کانگریس قائم ہوئی تو اس وقت قومیت کے دو دھارے موجود تھے۔ اور ایسے لوگ یقیناً بہت کم تھے جو قومیت کو مذہب سے الگ کر کے سمجھنے کی کوشش کرتے۔ سرسید نے جس طرح مسلمانوں کو کانگریس سے الگ رہنے کی تلقین کی وہ ایک دھارے کو ظاہر کرتا ہے۔ اور شہرۂ آفاق بنگالی ناول نویس شرت چند چٹرجی نے اپنے ناولوں میں جس انداز سے قومیت کی تبلیغ کی ہے دوسرے دھارے کا مظہر ہے۔

یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا بلکہ بڑھتا ہی رہا۔ یہاں تک کہ سرآغا خان نواب سلیم اللہ اور نواب محسن الملک نے مسلمانوں کو کانگریس سے دور رکھنے کے لئے ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی۔ اگر مسلم لیگ کا مقصد صرف کانگریس سے مسلمانوں کو دور رکھنا ہوتا تو بھی غنیمت تھا۔ مسلم لیگ کانگریس کی حریف کی شکل میں کھڑی ہوئی اور ہندو مسلم مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ غور کرنے کی بات ہے کہ اسی زمانے میں ہندو مہاسبھا نے بھی جنم لیا۔ یہ عجیب بات تھی۔ مسلمان اقلیت میں تھے اور اکثریت کا اقلیت سے خوف کھانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

یہ سمجھنا بڑی غلطی ہوگی کہ ہماری قومی تحریک کے اندر رجعت پسند اور احیا پرست نہیں تھے۔ تھے اور یہی وجہ اس کی کمزوری کی تھی۔ بہت کم لوگ تھے جو قومیت کو مذہب سے الگ کر کے سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔

پچھلی ساری باتوں کو بھول کر آج کے حالات پر نظر ڈالی جائے۔ تو بھی کوئی خوشگوار تصویر نہیں ابھرتی۔ بنیادی طور پر ہم ہندوستانی قومیت میں عقیدہ ضرور رکھتے ہیں۔ لیکن عملی طور پر مذہبوں، علاقوں، زبانوں اور تہذیبوں کے خانوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ بات اتنی سی رہتی تو شاید اتنی بڑی نہ ہوتی۔ لیکن اس سے بھی آگے بڑھ کر ذاتوں اور نسلوں تک پہنچ چکی ہے۔ یہ مسئلہ کسی ایک ریاست یا علاقے کا نہیں ہے۔ سارے ہندوستان میں یہ بیماری پھیلی ہوئی ہے۔ لسانی ریاستوں کی تنظیم نے اس شعور کے بڑھنے میں مدد دی ہے۔ اور اب چھوٹی چھوٹی اکائیاں بھی اپنے وجود کو تسلیم کرانے پر آمادہ نظر آتی ہیں۔ پنجاب کی تقسیم در تقسیم، اس کے بعد تلنگانہ کی علیحدگی کا مطالبہ، بھوجپور ریاست کی تشکیل کی آواز، جھارکھنڈ کا مطالبہ، میتھلا تہذیب پر زور، ڈوگری پر اصرار۔ ان ساری باتوں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ہندوستان کے اندر اب بھی ہندوستانی قومیت کا تصور دوسرے درجے کی چیز ہے یا اس کی حیثیت محض ذیلی مضمون کی ہے۔

یہ صورت حال کسی بڑی قوم کے لئے اچھی نہیں کہی جا سکتی۔ ان حالات کی موجودگی میں سارے قوم کے بکھر جانے کا خطرہ ہر وقت موجود رہتا ہے۔ بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ ہندوستانی سیاسی کارکنوں نے ان رجحانات کے خلاف جنگ نہیں کی۔ بلکہ اپنے وقتی فائدے کے لئے ہمیشہ غلط رجحانات کو ہوا دینے کی کوشش کی ہے۔

اس سلسلے میں سب سے کمزور اور مضحکہ خیز رویہ حکومت کا ہے جو جمہوریت کے نام پر غلط چیزوں کو بھی پنپنے کا موقع دیتی ہے۔ یہ موٹی سی بات ہے کہ قانون کے خلاف کوئی فعل بھی جرم ہے اور اس کو سزا ملنی چاہیئے۔ اگر کوئی شخص بھوک سے مجبور ہو کر کسی کے گھر میں چوری کرلے تو مجرم قرار دیا جاتا ہے۔ اسے سزا دی جاتی ہے لیکن ہمارے ملک کا دستور سیکولر اور جمہوری ہے مگر سیکولرازم اور جمہوریت کے خلاف بولنے والوں کو کھلی آزادی ہے۔ ایسی جماعتوں کو بھی آزادی ہے جو سرے سے ہمارے موجودہ دستور پر یقین نہیں رکھتے۔ دوسرے لفظوں میں آر۔ ایس۔ ایس اور جن سنگھ، جماعت اسلامی جیسی وطن دشمن جماعتوں کو کھلی آزادی ہے۔ اگر یہ جماعتیں باقی رہیں تو ہندوستانی قومیت کا خواب شاید ہی کبھی شرمندۂ تعبیر ہو۔

یہ مسئلہ اہم ہے اور اس پر ٹھنڈے دل سے سوچنے کی ضرورت ہے۔

کتنا سہل کتنا کٹھن

برصغیر کے حالات کو نیا موڑ دینے کے لئے دو الگ مرحلوں پر جو کاوشیں ہو رہی تھیں ان کے لئے ایک کا مرکز تھا اسلام آباد اور دوسرے کے لئے پہلے ڈھاکہ اور پھر نئی دہلی۔ اسلام آباد میں پاکستان کے مستقل آئین کی تکمیل کے لئے سرگرمیاں آخری منزل تک آپہنچی تھیں۔ ڈھاکہ اور نئی دہلی میں برصغیر کے حالات کو معمول پر لانے کی راہ میں حائل جمود اور تعطل کو ختم کرنے کی مہم تھی۔ اپریل کے دوسرے ہفتہ کے وسط تک پاکستان کے آئینی ڈرامہ کا ڈراپ سین ہوا اور ہفتہ بھر بعد ہند اور بنگلہ دیش کے ۱۹۷۱ء کی جنگ سے پیدا شدہ انسانی مسائل کے حل کی مشترکہ تجویز پیش کر دی جس کے مطابق ۱۹۵ کے سوا تمام پاکستانی جنگی قیدیوں، پاکستان میں گھرے بنگالیوں اور بنگلہ دیش میں مقیم ان پاکستانی شہریوں کے ایک ساتھ باہمی تبادلے کی پیش کش کی گئی ہے جنھوں نے اپنے وطن پاکستان جانے کے ارادے کا تحریری طور پر اظہار کیا ہے۔ اس اجتماعی تجویز پر عمل درآمد سے چھ لاکھ سے زائد انسان اس پرخلوص پیشکش کے فیصلہ تک چند دنوں میں پہنچ گئے۔ لیکن پاکستان کے مستقل آئین کا سفر خاصا طویل ہوگا جبکہ بنگلہ دیش نے اپنی آزادی کے پہلے برس میں جس صدق دلی اور خاموشی سے اپنا آئین وضع اور نافذ کیا اس پر بہتوں کو اچنبھا ہوا۔ پاکستانی رہنما اس بات کا اعتراف کریں خواہ نہ کریں، انھیں قطعاً امید نہ تھی کہ جو مرحلہ ان کی ۲۵ سالہ قوم سے طے ہونے میں نہیں آرہا تھا اسے بنگلہ دیش کی نوزائیدہ قوم طے نہیں کر پائے گی۔ بنگلہ دیش نہ صرف اپنے نئے آئین کی چھاؤں میں سرگرم عمل ہو گیا بلکہ اس کے تحت پہلے عام انتخابات کے بعد نئی حکومت کی رہنمائی میں تعمیر نو کی راہوں پر گامزن ہے۔

پاکستانی آئینی ڈرامہ ختم ہوا لیکن انجام تک پہنچتے پہنچتے ان خونی لمحوں سے ہمکنار ہوا کہ جن کی دہشت آج بھی راولپنڈی کی نگاہوں میں نظر آتی ہے۔ مستقل آئین کی غیر موجودگی نے تو کئی پاکستانیوں کی جان لی، نیا آئین بھی لہو کا نذرانہ لئے بغیر مکمل نہ ہوا۔

۲۳ مارچ ہر سال یوم پاکستان کے طور پر منایا جاتا ہے۔ آغاز تو اس برس بھی تقریبات کی صورت ہی ہوا لیکن شام تک پہنچتے پہنچتے یوم پاکستان کی پیشانی پر پاکستانی لہو کے چھینٹے تھے۔

"یوم پاکستان جس کی صبح کا ۳۱ توپوں کی سلامی سے خیر مقدم کیا گیا، راولپنڈی سے رخصت ہوا تو اس کے دامن میں لہو کے داغ، بارود کا بدبودار دھواں اور دس لاشیں تھیں، زخمیوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔۔۔ قابل غور بات یہ ہے کہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ نیشنل عوامی پارٹی یہ خونی ڈرامہ کھیلنا چاہتی تھی تو اسے یہ کھیل راولپنڈی میں کھیلنے کی کیا ضرورت پڑ گئی؟ اس سلسلے میں گورنر کھر کی تقریر سے حقائق سامنے آتے ہیں انھوں نے کہا کہ یہ خونی کھیل نیپ کی سازش کا حصہ تھا لیکن اسے حکومت کی کوششوں اور عوام کے تعاون نے ناکام کر دیا۔ اگر حکومت اتنی ہی باخبر تھی تو وہ پہلے کیوں حرکت میں نہیں آئی؟"

(حریت۔ ۲۷ مارچ)

"جمعہ کے روز راولپنڈی کے لیاقت پارک میں آٹھ جماعتی متحدہ جمہوری محاذ کے جلسہ میں جو کچھ ہوا وہ انتہائی تکلیف دہ اور افسوسناک ہے۔ یہ بات بعید از فہم ہے کہ اپوزیشن کو اشتعال انگیزی اور جھگڑے میں الجھنے کی کیا ضرورت تھی۔ عام دستور یہ ہے کہ کسی بھی جلسہ کے منتظمین اس کی کامیابی کے لئے پرامن ماحول کا اہتمام کرتے ہیں۔ اس افسوسناک واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ قوم کی سیاسی زندگی ایسے لمحے میں جب اسے امن و سکون کے ماحول کی شدید ضرورت ہے کس قدر تفرقات اور کشیدگی کا شکار ہے؟"

(ڈان، کراچی۔ ۲۵ مارچ)

"ایسے لمحہ میں بندوقیں باآواز ہوئی ہیں کہ جب اس کی قطعاً توقع نہ تھی اور نہ ہی ملک اسے برداشت کرنے کے اہل تھا۔ بہر حال، ایسا لگتا ہے کہ یہ ملک خودکشی کے اقدامات کے لئے بدنام ہو چلا ہے۔" (خیبر میل، پشاور۔ ۲۷ مارچ)

"یہ اتنا قابل مذمت ہے کہ ملک میں سیاسی جلسے جلوسوں کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ قائد اعظم کی وہ سرزمین کہ جسے برصغیر کے مسلمانوں کے دارالامان کے طور پر حاصل کی گئی وہی مسلمانوں کے خون سے داغدار ہوئی۔ ایک طرف ہم بلند آدرشوں کو اپنی منزل بنائے ہوئے ہیں دوسری طرف یہ اجتماعی جنون ہمیں شرمسار کئے ہوئے ہے کیا ہم اپنی قوم کے رہنماؤں سے یہ سوال کر سکتے ہیں کہ پنڈی کے خونی ڈرامہ کے لئے کون ذمہ دار ہے؟"

(جنگ، کراچی۔ ۲۵ مارچ)

اپوزیشن کے آٹھ جماعتوں کے متحدہ جمہوری محاذ نے راولپنڈی میں لیاقت پارک میں یوم پاکستان کی سہ پہر ایک جلسہ عام کا اہتمام کیا تھا۔ یہ متحدہ محاذ سرحد اور بلوچستان میں نیپ اور جمعیت العلمائے اسلام کی مخلوط حکومتوں کی برطرفی اور استعفے کے بعد وجود میں آیا تھا لیکن سرحد اور بلوچستان کی حکومتوں پر مرکز کی طرف سے جو وار کیا

گیا اس کے پیچھے بھٹو حکومت کا یہ احساس کارفرما تھا کہ حکومتوں کے رہتے آئینی مراحل طے ہونا ممکن نہ ہو سکے گا متحدہ محاذ کے اس جلسہ کو گولیوں کے زور شور میں ختم کر دیا گیا۔ لیاقت پارک میں لاشیں بچھی تھیں، زخمی کراہ رہے تھے۔ جن بسوں میں صوبۂ سرحد سے نیپ کے حامی آئے تھے ان میں سے بیشتر نذرِ آتش کر دی گئیں۔ سیاسی عناد کے علاوہ وہ اختلافات اسی خون خرابے کے سبب بنے کہ جن کی وجہ سے مستقل آئین کی تشکیل میں الجھن آ پڑی تھی۔

درحقیقت مستقل آئین کے لئے پاکستان کی برسوں کی جستجو کا سفر گزشتہ برس ۲۰ اکتوبر کو ایک اہم سنگِ میل تک آ پہنچا۔ آئینی سمجھوتہ صدر بھٹو کی سیاسی پختگی کا نتیجہ تھا لیکن وقتی اتفاقِ رائے کے پس پردہ اختلاف کی گنجائشیں ان کی نظر سے بچ نکلیں اور نئے سال کے آغاز سے پہلے ہی اختلافی پہلو نکلنے لگے۔ اس کا پہلا اشارہ صدر بھٹو کی اس تقریر میں ملتا ہے کہ جو انھوں نے تین جنوری کو نشتر پارک کراچی میں کی تھی۔ اس تقریر میں انھوں نے خان عبدالغفار خاں اور خان عبدالولی خاں پر نکتہ چینی کی تھی اور بلوچستان کے موجودہ گورنر اکبر بگٹی کے لئے تعریفی کلمات کہے تھے۔ بھٹو حکومت تب سے اس ٹوہ میں لگ گئی کہ کب موقع ملے اور بلوچستان اور صوبۂ سرحد کی مخلوط حکومتوں کو صفِ اقتدار سے نکال باہر کیا جائے۔ عراقی سفارت خانہ سے اسلحہ کی برآمدگی کے لمحے نے وہ موقع بھی فراہم کر دیا۔ حزبِ اختلاف میں سے بھٹو حکومت کو نیپ اور جماعت اسلامی کی طرف سے ہی خدشہ رہا۔ اتفاق کی بات یہ کہ ان دونوں جماعتوں کے نقطۂ نظر جداگانہ نوعیت کے ہیں، ورنہ جانے کب کا یہ خدشہ حقیقی خطرے کا روپ لے لیتا۔ فروری کے وسط سے واقعات کی رفتار تیز ہو گئی اور یومِ پاکستان کے اندوہناک سانحے کے بعد تو تیز تر ہو گئی۔ بات چیت کے دور بڑھے۔ سیاسی صف آرائی تصادم کی طرف بڑھنے لگی۔

آئین سازی کے بائیکاٹ کا صدر بھٹو پر کچھ اثر نہ ہوا ہو ایسا بھی نہیں۔ انھیں علم تھا کہ صرف بلوچستان کے نمائندے ہی آئین کی تکمیل کی راہ روک سکتے ہیں۔ خود صدر بھٹو نے اپنے ایک شائع شدہ انٹرویو میں اس امر کا اعتراف کیا تھا کہ آئین سازی کے معاملے میں بلوچستان کو حقِ تنسیخ یعنی ویٹو حاصل ہے۔ بلوچستان کے قومی اسمبلی میں پانچ نمائندوں میں سے ایک جمعیت کا اور باقی چار نیشنل عوامی پارٹی کے ہیں۔ اسی احساس کے تحت صدر بھٹو اپنے مخصوص انداز میں کبھی نرم کبھی سخت رویہ اختیار کرتے رہے ہیں تاکہ ویٹو کی نوبت ہی نہ آئے۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ متحدہ اپوزیشن کی طرف سے آئین کی منظوری کے آخری مرحلے میں مستقل بائیکاٹ کی صورت میں اکثریتی پارٹی کے آئین کی وقعت جمہوری دنیا کی نگاہوں میں کیا رہ جائے گی۔

اس احساس کے علاوہ باشعور مبصروں نے بھی کچھ ایسے ہی مشورے دیئے۔ کراچی کے ہفتہ وار 'اخبارِ جہاں' کے کالم نویس حبیب الرحمٰن نے یہ مشورہ دیا "ہم پچھلے چند ہفتوں میں ایسے بہت سارے تماشے کر چکے ہیں جو ان ممالک میں بھی ہماری مزید رسوائی کا باعث بنے ہیں جن کے سامنے ہم اپنی بنیادی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے دستِ سوال پھیلانے پر مجبور ہیں اور اب اگر ساری اپوزیشن پارٹیوں کی طرف قومی اسمبلی کے بائیکاٹ اور اس کے بعد ایک ملک گیر احتجاجی تحریک کے آغاز کے تماشے کی نوبت بھی لائی گئی تو داخلی نتائج سے قطع نظر یہ بعید از قیاس نہیں کہ وہ بیرونی طاقتیں بھی ہم سے پوری طرح منہ موڑ لینے کا فیصلہ کر لیں جن سے ہمارے موجودہ حکمران بڑی امیدیں لگائے بیٹھے ہیں۔" (۲۸ مارچ)

۲۹ مارچ کی شام صدر بھٹو نے ریڈیو اور ٹیلیویژن پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے جہاں صورت حال کی سنگینی کا ذکر کیا، وہاں اپوزیشن لیڈروں کی مذمت کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ یہ طویل نشریہ دو گھنٹے تک چلا۔ صدر بھٹو کے مخصوص انداز میں فکرمندی کا پہلو نمایاں تھا۔ اپوزیشن لیڈر خصوصاً نیپ کے لیڈر غدار قرار دیئے گئے۔ صدر بھٹو کے نشریہ سے دو روز قبل وزیر قانون عبدالحفیظ پیرزادہ نے قومی اسمبلی کے اجلاس میں کہا "اپوزیشن نے آئین سازی کا بائیکاٹ جاری رکھا تو حکومتی پارٹی کے پاس اور بھی کئی طریقے ہیں جن کے ذریعے آئین پر عوام سے اتفاق رائے حاصل کیا جا سکتا ہے..... ہم اپوزیشن کے ارکان کو غدار کہنے پر حق بجانب ہوں گے۔"

حکومت کی طرف سے اپوزیشن پر جو بھی اعتراضات یا الزامات عائد کئے گئے ہیں ان کا زیادہ تر نشانہ نیپ کے سربراہ خان عبدالولی خان بنے۔ ۹ اپریل کی شام کو راولپنڈی میں چودھری ظہور الٰہی کی رہائش گاہ پر اخباری نمائندوں سے غیر رسمی بات چیت کے دوران ولی خان نے جوابی وار کیا "پاکستان اور صدر بھٹو ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ صدر بھٹو سیاسی طور پر ناکام ہو چکے ہیں ان کی پارٹی بھی ناکام رہی ہے اگر وہ حکومت پر قائم رہنا چاہتی ہے تو اسے اپنی قیادت تبدیل کرنا ہوگی۔ مسٹر بھٹو کی تقاریر میں تضاد ہوتا ہے اور وہ بحران پر بحران پیدا کر رہے ہیں ان کی یہ سوچ ہے کہ ان کی ذات اور پارٹی اس ملک سے زیادہ اہم ہے۔"

اگلے ہی روز جواباً مرکزی وزیر مواصلات غلام مصطفیٰ جتوئی نے اپنے بیان میں کہا "ولی خاں الفاظ کے ہیر پھیر سے پاکستان کے عوام کو گمراہ نہیں کر سکتے۔ پاکستانی عوام ہمیشہ درست فیصلہ کرتے ہیں۔ پاکستان صرف بھٹو کے ساتھ زندہ رہ سکتا ہے اور ان کے بغیر ختم ہو جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ولی خاں اور ان جیسے لیڈر ملک کی سالمیت اور بقا کے لئے خطرہ ہیں۔"

صدر بھٹو کی شخصیت میں عظمت کے پہلو تلاش کرنے کی کوششیں اسی انداز سے جاری ہیں کہ جس انداز سے فیلڈ مارشل ایوب کے قصیدے پڑھے جاتے تھے۔ ادھر آئین سازی سے متعلق محاذ آرائی چل رہی تھی اور اُدھر پاکستان سینٹر لاہور میں مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات مولانا کوثر نیازی یونس ادیب کی کتاب 'قائدِ عوام' کے افتتاح کی تقریب میں صدارتی تقریر کر رہے تھے "آج سیاست میں صدر بھٹو کے سوا کسی دوسرے فرد کو ملک گیر اہمیت اور مقبولیت حاصل نہیں ہے۔ بھٹو کے سوا تمام شخصیتیں صوبائی اور علاقائی ہیں۔ بھٹو کو چاروں صوبوں کے غریب عوام کا اعتماد حاصل ہے۔ بعض دانشور ان کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے شرماتے ہیں۔ عوام سے ایسے لوگوں کا رشتہ برقرار نہیں رہ سکتا۔"

آئین سازی سے متعلق صف آرائی سیاسی محاذ آرائی ہی کا حصہ تھی۔ پیپلز پارٹی کی طرف سے پروپیگنڈہ قدرتی تھا۔ اس میں وہ آوازیں بھی شامل ہو گئیں کہ جنھیں صدر بھٹو نے اقتدار سے نوازا تھا۔ بلوچستان کے گورنر نواب محمد اکبر بگٹی نے نوشکی میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہا "اگر صدر بھٹو کو ہٹا دیا گیا تو خان عبدالولی خاں سردار شوکت حیات خاں اور مولانا نورانی کو یقیناً صدر نہیں بننے دیا جائے گا بلکہ فوج مداخلت کرے گی جس کے نتائج تباہ کن ہوں گے۔ مٹھی بھر افراد پر مشتمل اس گروہ (متحدہ جمہوری محاذ) کو قوم کی قسمت سے کھیلنے نہیں دیا جا سکتا۔"

(امروز، لاہور۔ ۱۴ر اپریل)

چند ایسے لوگ بھی جو فی الحال اقتدار سے محروم ہیں محاذ آرائی میں صدر بھٹو کی حمایت میں آگے بڑھے۔ مغربی پاکستان کے سابق وزیر اعلیٰ نواب مظفر علی قزلباش نے ایک انٹرویو میں کہا "ملک کا آئین تیار ہو رہا ہے، اس سلسلے میں برسر اقتدار پارٹی اپنی ذمہ داری اور اپنے فرائض کو پورا کرنے کے لئے بھرپور کوشش کر رہی ہے اور وہ اپنے وعدے کے مطابق ملک کو مقررہ تاریخ پر آئین دے گی۔ اس مرحلے پر حزب مخالف اور عوام کو چاہیئے کہ وہ آئین جیسے مسئلے پر معقولیت کا ثبوت دیں اور حکومت سے بھرپور تعاون کریں۔" (امروز ملتان۔ ۵ر اپریل)

متحدہ جمہوری محاذ مستقل آئین میں آٹھ جماعتوں کے مجموعی خیالات سموئے پر زور دیتا رہا، اس کی طرف سے آئین سازی کا بائیکاٹ شروع ہوا تو اس کے ختم کئے جانے کے امکانات نظر نہ آ رہے تھے۔ صدر بھٹو کی طرف سے پیش کش ہوتی رہی، حکومت کی طرف سے دباؤ کا سلسلہ بھی رہا۔ اس کی ایک شکل اخبارات، ریڈیو اور ٹی وی پر پروپیگنڈہ تھا کہ جسے خوب خوب استعمال کیا گیا۔ ۴ر اپریل کی رات صدر بھٹو نے مصالحتی فارمولے کا اعلان کیا۔ اس کی وکالت مولانا کوثر نیازی نے ریڈیو اور ٹی وی پر ایک پریس کانفرنس میں تنبیہ کے لہجہ میں کی "اپوزیشن نے اگر حکمراں پارٹی کے خلاف کسی قسم کی تحریک شروع کی تو عوام اسے سختی سے کچل دیں گے۔ اپوزیشن نے جو کچھ مانگا تھا صدر بھٹو نے بہت حد تک وہ انھیں دے دیا ہے اب سارا معاملہ عوامی عدالت میں ہے۔ عوام بہتر جج ہیں۔ آئین کی ایک سو دس دفعات تک ساتھ دینے والوں کو صدر بھٹو نے منانے کی بہت کوشش کی۔ اب عوام کو اس بات کا فیصلہ کرنا ہے کہ آئین سازی میں کون رکاوٹ بن رہا ہے۔ اگر پھر بھی اپوزیشن اسمبلی میں آنے کے لئے تیار نہ ہوئی تو ہم اس کی پرواہ نہیں کریں گے۔"

پاکستانی سیاست کا ایک اور خاص پہلو یہ بھی ہے کہ جس مسئلہ کو سنگین قرار دیا جاتا ہے اسی کو معمولی نوعیت پر بھی زور دیا جاتا ہے۔ آئین سازی میں تعطل سنگین معاملہ ہے اسی لئے اسے حل کرنے کے لئے مسلسل کوششیں ہوئیں مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا کہ حزب اختلاف کے بیشتر خیالات کو آئین میں شامل کر لیا گیا ہے اس لئے اختلاف کی کوئی وجہ بھی نہیں۔ اس سلسلے میں نوائے وقت کے اداریئے کا یہ اقتباس دلچسپ ہے "ہمارے لئے یہ امر ناقابل فہم ہے کہ جب حزب اقتدار اور حزب مخالف دونوں ملک و ملت کو ایک وفاقی، جمہوری اور اسلامی آئین دینے کے علمبردار ہیں۔ جب خود صدر مملکت اپنی تقریر میں یہ کہہ چکے ہیں کہ آئین کے بارے میں بحران موجود نہیں اور اختلاف کی کوئی ٹھوس وجہ نہیں تو پھر یہ تعطل کیوں؟" لیکن اسی اداریئے میں آگے چل کر بات یہ رخ اختیار کر لیتی ہے "جو لوگ ماضی کے تجربات سے سبق حاصل نہیں کرتے اور مسلمہ راستوں سے انحراف کرتے ہیں وہ ہمیشہ خسارے میں رہتے ہیں۔ حکومت اور اپوزیشن دونوں کو چاہیئے کہ وہ ایک دوسرے کو غدار، ملک دشمن، مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور پاکستان کی تباہی و بربادی کا ذمہ دار کہنے کی بجائے ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کریں۔ اس وقت پاکستان طرح طرح کے بحرانوں اور ملکی و بین الاقوامی سازشوں سے دوچار ہے۔"

(۳ر اپریل)

آئین سازی سے متعلق رسہ کشی اگر سنگین صورت اختیار نہ کرتی تو صدر بھٹو کو اپنا ایران کا دورہ کیوں ملتوی کرنا پڑتا۔ صدر بھٹو کو ایک طویل یادداشت کے ذریعہ اپوزیشن کو آئین سازی میں شریک کرنے کی غرض سے مزید مراعات کی پیش کش کی۔ یہ مراعات پارلیمنٹ کو توڑنے اور مرکز اور صوبوں کے تعلقات کے بارے میں تھیں۔

نوائے وقت نے اپنے اداریہ میں اس پر یوں رائے زنی کی ہے "صدر نے بظاہر کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر عمل کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اپوزیشن کی کسی ترمیم یا تجویز کو پذیرائی نصیب نہیں ہوئی...... بنیادی چیز یہ ہے کہ ملک کا آئین جمہوری، وفاقی اور آبادی کے تمام طبقوں کے لئے قابل قبول ہو۔ ملک کا آئین ایک مقدس دستاویز ضرور ہوتا ہے لیکن یہ کوئی صحیفہ آسمانی نہیں ہوتا اور آئینی دستاویزوں میں ترمیم و اضافہ کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔"

(۶ر اپریل)

نوائے وقت کے مقابلے میں امروز سرکاری ترجمان ہے اس کا لہجہ مختلف ہے۔ "مخالف جماعتوں کے کچھ نمائندوں کی غیر حاضری کے باوجود آئین بروقت مکمل ہونا چاہیئے۔ ایک مختصر سی اقلیت کی خوشنودی کی خاطر یا اس کی سیاسی مصلحتوں کے احترام میں آئین کی منظوری اور نفاذ کو التوا میں ڈالنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ مصالحت کی خاطر خود صدر بھٹو نے پچھلے چھ ماہ میں متعدد اقدامات کئے اور ان کی روشنی میں سمجھوتے بھی ہوئے۔ مگر بالآخر حزب اختلاف کے ان عناصر نے یہ سمجھوتے منسوخ کر دیئے جو تعاون پر آویزش کو ترجیح دیتے ہیں۔" (اداریہ۔ ۸ر اپریل)

کچھ اسی قسم کا لہجہ پاکستان ٹائمز کا ہے کہ جس کے اداریہ اور ایچ کے۔ برکی کے خصوصی مضمون میں اپوزیشن ہی کو مورد الزام ٹھہرایا گیا ہے۔ ۹ر اپریل کے اداریئے کی آخری چند سطور یوں ہیں "اکثریتی جماعت کو چاہیئے کہ وہ نہ صرف جس قدر جلد ممکن ہو سکے آئین مکمل کر کے ملک میں نافذ کرے بلکہ ایسے اقدامات بھی کرے جن سے اپوزیشن کی اُدھار لی ہوئی دلیلوں اور عظمتوں کی قلعی کھل سکے۔ ان عناصر کے دلوں اور ذہنوں کی گندگی عوام کی عدالت میں بے نقاب ہونی چاہیئے۔"

کسی بھی ایسی قوم کے لئے آئین سازی کا مرحلہ دشوار نہیں ہونا چاہیئے جسے اپنی منزل کی آگہی ہو اور جس نے اپنے قومی آدرشوں کو قومی زندگی میں ڈھالنے کی کوشش کی ہو۔ ہند نے جمہوریت، سوشلزم اور سیکولرازم کو اپنا قومی آدرش تصور کیا، ہند کا آئین آزادی کے

تیسرے برس نافذ بھی ہوگیا۔ بنگلہ دیش نے ان تینوں آدرشوں کے علاوہ قوم پرستی کو بھی اپنا آدرش مانا اور آزادی کے دوسرے برس کا آغاز نئے آئین کے نفاذ سے کیا۔ پاکستان کی مشکل اس کی غلط بنیاد کی وجہ سے ہے محض مذہب کو اپنی بنیاد مان کر وہ آگے بڑھا۔ ۲۵ برس ختم ہوتے ہوتے اس کی آبادی کی اکثریت اس سے الگ ہو کر سیکولرازم کی راہ پر چل نکلی۔ پاکستان کو اپنا مستقل آئین وضع کرنے میں دشواریاں اس لئے پیش آئیں کہ اس نے اپنے آدرشوں کا، اپنی منزلوں کا صحیح تعین نہیں کیا۔ ایک ممتاز پاکستانی صحافی کا یہ کہنا ہے کہ ڈاکٹر اقبال اور مسٹر جناح کے جس فلسفہ کے زور پر پاکستان وجود میں آیا آج بھی اس سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ اس کی سوچ اسی مقام پر اٹکی ہوئی ہے اور یہی ہے پاکستان کی مشکلات کی جڑ۔ پاکستان کی اکثریتی پارٹی اور اپوزیشن کی جماعتیں اسلام کا نام تو لیتی رہیں لیکن آئین میں اسلام کے لئے کیا جگہ ہو، یہ بات سودے بازی سے ہی طے ہوگی۔ جمہوریت کے معاملے میں پہلے ہی بحث چلتی رہی کہ وفاقی نظام صدارتی ہو یا پارلیمانی۔ جب اس کا فیصلہ ہوا تو آئینی سمجھوتہ میں وزیر اعظم کو اسقدر اختیارات دیدیئے گئے کہ اس پر ڈکٹیٹر ہونے کا شبہ ہونے لگا۔ سوشلزم کے مسئلہ پر جو لے دے ہوئی اس کا یہ رنگ بھی دیکھنے کو ملا کہ پیپلز پارٹی کے رہنما اور کارکن جس اسلامی سوشلزم کی اُٹھتے بیٹھتے قسمیں کھاتے تھے، نئے آئین سے اسے نکال باہر کیا گیا۔ قومی اسمبلی میں بیگم نسیم جہاں نے اپنی زبانی ترمیم کے ذریعے ۱۳ اپریل کو یہ مسئلہ اٹھایا تھا " پیپلز پارٹی کے قیام کے وقت ہم نے بھی دوسرے ممالک کی طرح اسلام کو اپنا دین، جمہوریت کو سیاست اور سوشلزم کو معیشت بنایا تھا۔ اب پارٹی کے منشور کو تمہید یہ میں شامل کرنا چاہیئے۔ اس میں سوشلزم کا کہیں ذکر نہیں، اس لئے ضروری ہے کہ غیر طبقاتی سوشلسٹ معاشرے کے قیام کے لئے تمہید میں ترمیم جائے۔ مبہم الفاظ کے بجائے غیر طبقاتی اور سوشلسٹ کے الفاظ شامل کئے جائیں۔"

مستقل آئین کی آخری منزل تک پہنچ پہنچتے پیپلز پارٹی اپنے منشور سے دور ہوتی گئی۔ ادھر اپوزیشن کی دشواری یہ تھی کہ متحدہ جمہوری محاذ میں شامل سیاسی جماعتوں کی طرز فکر جُداگانہ تھی۔ اس کا احساس ان جماعتوں کو بھی رہا ہے، ورنہ آئین سازی سے متعلق جو سیاسی سودے بازی ہوئی ہے ممکن نہ ہوتی۔ حکمران پارٹی کی طرف سے متحدہ محاذ کو 'بھان متی کا کنبہ' کہا گیا۔ یہ دلیل وزیر اعلےٰ معراج خالد جیسے نرم گو سیاستداں نے بھی بلا جھجک استعمال کی۔ ۷ اپریل کو لاہور کے ہوائی اڈے پر انھوں نے اخباری نمایندوں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا "حیرت یہ ہے کہ اسلام کی دعویدار اور سیکولرازم کی حامی جماعتیں کیسے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوگئی ہیں۔" اس معصوم انداز تمسخر کے ساتھ انھوں نے اپوزیشن پر ایک اور وار کیا "بیرونی ممالک جو پاکستان میں آئینی بحران کے خاتمے کے منتظر ہیں ان میں آئین کی منظوری سے پاکستان کا وقار بڑھے گا۔ نیا آئین ملک میں جمہوری اور آئینی بنیاد ثابت ہوگا اور اس سے جنگی قیدیوں کی واپسی میں بھی مدد ملے گی۔ وہ لوگ جو جنگی قیدیوں کی جلد از جلد رہائی کے لئے بے چین ہیں، ملک کو درپیش سب سے بڑے مسئلے یعنی آئین کی تیاری کی راہ میں رکاوٹیں ڈال رہے ہیں۔"

آئین سازی کے آخری مرحلے پر سیاسی سرگرمیاں ڈرامائی انداز اختیار کر گئیں۔ پاکستان مسلم لیگ کے پانچ ممبروں کو حکومت کی حمایت کے لئے رضامند کیا گیا۔ لیگ کے صدر مسٹر حسن۔ اے۔ شیخ نے جماعتی ضبط و نظم کی خلاف ورزی پر غلام حسین ڈھانڈلا، نوابزادہ محمد ذاکر قریشی، ملک کرم بخش اعوان، پیر صفی الدین اور رجال محمد گوریجہ کو پارٹی سے خارج کر دیا۔ ۸ اپریل کو رات بلوچستان سے جمعیت العلمائے اسلام کے قومی اسمبلی کے رکن مولانا عبدالحق کو بڑے ڈرامائی انداز میں گورنمنٹ ہوسٹل سے پریذیڈنسی لے جایا گیا جہاں ان کی صدر بھٹو سے بات چیت ہوئی۔ مولانا رات بھر پریذیڈنسی میں رہے۔ ادھر اچانک عبدالحفیظ پیرزادہ اور متحدہ محاذ کے سکریٹری جنرل پروفیسر غفور احمد کے درمیان بات چیت بھی آخری مرحلہ پر ہوئی سرگرمیوں کا انجام اس لحاظ سے قطعاً مختلف تھا کہ جو محاذ کے صدر پیر سید علی مردان شاہ پگاڑو شریف کے جوابی بیان کا تھا۔ بہرحال کفر ٹوٹا خدا خدا کرکے۔ ۱۲ اپریل کو صدر بھٹو نے نئے آئین کی توثیق کر دی۔ یہ رسم ہفت روزہ جشن کا حصہ بنی۔ صدر بھٹو جشن کی تقریبات میں شرکت کے لئے چاروں صوبوں میں گئے۔ خاصا ہنگامہ رہا۔ پاکستان براڈ کاسٹنگ کارپوریشن کو ۱۰ سے ۱۶ اپریل تک "آئین نشانِ منزل" کے سلسلہ وار پروگرام نشر کرنے کا حکم ہوا۔

پاکستان کا مستقل آئین بالآخر مکمل ہوا۔ کسی بھی آئین کی پرکھ اس کے نفاذ کے بعد ہی ہو سکتی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ نیا آئین کس حد تک اسلام، جمہوریت اور سوشلزم کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ حکمران پارٹی اور اپوزیشن کے متحدہ جمہوری محاذ کے درمیان آئین سازی کے آخری مرحلہ میں جو سیاسی سودے بازی ڈرامائی سرگرمیوں کی صورت میں ہوئی ہے اس سے آدرش پگھلے پگھلے سے ہیں۔ بہرحال اس کی فکر تو پاکستانی عوام کو کرنی ہے کہ جنھیں اس نئے آئین کی چھاؤں میں اپنی امنگوں اور آرزوؤں کو حقیقت میں ڈھالنے کے لئے سرگرم عمل ہونا ہے۔ نیا آئین اچھا ہے یا ناقص، یہ فیصلہ تو پاکستانی عوام ہی کو اپنے تجربے کی بنا پر کرنا ہے۔ جہاں تک برصغیر کے حقائق کا تعلق ہے ان کا احترام پاکستان کے نئے آئین میں نہیں کیا گیا کیونکہ پاکستان کی جغرافیائی حدود کا ذکر کرتے ہوئے بنگلہ دیش کے علاقہ کو پاکستان کا حصہ ظاہر کیا گیا ہے اور اس کے دوبارہ پاکستان میں آملنے کی امید کی گئی ہے۔ پاکستان کا نیا آئین اس خام خیالی کا شکار نہ ہوتا تو اچھا تھا۔ خام خیالیوں سے پہلے ہی پاکستان کو کافی نقصان پہنچ چکا ہے۔

نئے آئین کی تکمیل کا سفر خاصی کٹھنائی سے ختم ہوا۔ برصغیر کے انسانی مسائل کا حل ہند اور بنگلہ دیش کی مشترکہ اجتماعی پیش کش کے ذریعے حل کرنے کے بعد صدر بھٹو کو بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا اقدام بھی کرنا ہوگا۔ برصغیر کے سیاسی مسائل حل کرنے کی یہی سہل راہ ہے اسے مزید کٹھن بنانے کی ضرورت نہیں۔ پہلے ہی خاصی تاخیر ایسے رویہ سے ہو چکی ہے۔

سروپا گاؤں کی کہانی



محترمہ سعیدہ راجوشی



چھوٹا سا گاؤں! ایک لمبی سی ہال جیسی عمارت، جس میں کچھ مسلمان خاندان رہتے تھے ـــــ روئی دُھن کر گزارہ کرتے تھے۔ شہر میں فساد ہوگیا، آگ گاؤں تک پہنچی شکار کی تلاش ہونے لگی۔ کئی گاؤں میں گھرا وہ ایک گاؤں جس میں چند مسلمان خاندان آباد تھے، دروازے بند کرکے بیٹھ گئے۔ ایک باہر کھڑے ہوکر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ کیا اس وسیع ملک میں اور اس بڑی دنیا میں کوئی حفاظت نہ کرے گا ـــــ؟!

دور کھیت کے پار ایک جھنڈ چلا آرہا تھا۔ ہاتھوں میں کئی چیزیں تھیں ـــــ لاٹھیاں، بلم نظر آرہے تھے ـــــ پر آگے آگے کون ہے ـــــ؟ بھیا صاحب! پھر کیا فکر کی بات ہے اپنے پرانے جانے پہچانے ہمسایہ، بڑے چودھری کے بڑے بیٹے۔

’بھیا‘ یہ کیسے چلے آرہے ہیں؟ باہر کھڑے آدمی نے پکارا۔ بھیا صاحب نے بندوق اٹھائی ـــــ نشانہ باندھا۔ غریب کے جواب میں بھیا صاحب کی گولی اس کا سینہ پار کرگئی۔

بھیا صاحب کی رہنمائی میں وہ مجمع گھر کے پاس پہنچ گیا۔ ایک چھوٹا بچہ باہر کھیل رہا تھا۔ بھیڑ میں سے ترشول لئے ہوئے شخص نے اسے اوپر اچھالا اور ترشول سے چھید کر اوپر اٹھا لیا۔ گلے اور ہاتھوں میں پہنے ہوئے کالے موتی خون کے ساتھ ہر طرف دھول میں جا گرے ـــــ گھر کے لوگ چلانے لگے، اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ بھیا صاحب نے دہاڑ کر کہا ـــــ ”سب اِدھر آجاؤ ـــــ جو کچھ تمہارے پاس ہے اِدھر پھینکتے جاؤ ـــــ جلدی کرو ـــــ بچنا چاہتے ہو تو اِدھر آجاؤ ـــــ“ گھر کے ایک کونے کو آگ لگا دی گئی۔ گھر میں گھرے ہوئے لوگ ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے بھیا صاحب کے قریب جمع ہوگئے۔ ترشول پر بچہ لٹک رہا تھا۔ قریب ہی بندوق تھامے بھیا صاحب کھڑے تھے ـــــ پیسے، نوٹ، چاندی کے چھلے، چوڑیاں، بچھوؤں کا بھیا صاحب کے سامنے ڈھیر لگنے لگا۔

گھر میں آگ ہی آگ پھیل گئی ـــــ جو اپنا سب ڈالتا جاتا، بھیا صاحب کے ساتھی اس کے سر پر ایک لاٹھی جماتے اور اس کے گرتے ہی اسے اُچھال کر جلتے مکان میں ڈال دیتے۔ مرد، عورتیں، بچے، تانبا چاندی بھیا صاحب کے سامنے پھینک پھینک کر آگ کے حوالے ہوگئے۔

ایک دس برس کا معصوم بچہ، خالی ہاتھ آکر کھڑا ہوگیا۔ پیچھے ایک خوبصورت جوان لڑکی ـــــ بھیا صاحب نے لڑکی کو کھینچ کر اپنی طرف کر لیا۔ ان کا دھیان اس لڑکی کی طرف ہوتے ہی بھیڑ میں سے ایک آدمی نے چلا کر بچے کو مخاطب کیا ”بھاگ یہاں سے“۔

وہ بھاگا ـــــ وہ بچہ ـــــ ماں باپ مارے گئے۔ پڑوسی، رشتہ دار، سب آگ کی نذر ہوگئے۔ بہن بھیا صاحب کے قبضے میں تھی ـــــ وہ بچہ بھاگتا چلا گیا۔ دور، گاؤں سے دور ـــــ کھڑے ہوکر ایک بار اس نے مڑ کر دیکھا ـــــ آخری بار۔ بہن کی صرف ساڑی نظر آئی ـــــ پھر بھاگا۔

اسے پڑوس کے گاؤں کی یاد آئی۔ تاؤ اکثر آتے تھے۔ یہ بھی ان کے گھر سینکڑوں دفعہ گیا تھا۔ گھبراہٹ میں یاد ہی نہ رہا ـــــ گاؤں کی طرف گھوم گیا ـــــ دوڑا ـــــ تیز دوڑا ـــــ ’تاؤ کو فوراً خبر کروں۔ تاؤ تو بھیا صاحب کو بھی جانتے ہیں ـــــ بہن کو تو بچا ہی لیں گے‘۔ وہ گاؤں میں پہنچا۔ بچے کھیل رہے تھے ـــــ

دوڑ کر پاس گیا ــــ آواز دی "کالو دھنیا!" بچوں نے اسے دیکھا۔ کھیلنا چھوڑ دیا اور بھاگ گئے۔ "کیا ہو گیا آج ان سب کو؟" وہ آگے بڑھا۔ تاؤ چارپائی پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے وہ دوڑ کر تاؤ سے لپٹ گیا ــــ "ماں کو مار دیا ــــ باپو کو مار دیا ــــ سب مار دیئے ــــ سب جلا دیئے۔" وہ ہچکیاں لے رہا تھا۔ تاؤ جھٹکے سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ بچہ دور جا گرا۔ کڑک کر بولے "تو یہاں کیوں آیا؟ مروائے گا ہم کو نکل یہاں سے ــــ" آج تاؤ ہندو تھے بچہ مسلمان۔ کیا دوستی، کیا رشتہ، کیا پڑوس، کیا بچہ اور کیا رحم۔ کیا آسرا اور کیا حفاظت ــــ!!!

سناتے سناتے سبق کی طرح یہ کہانی اس کو ازبر ہو گئی تھی ایک سانس میں اس نے مجھے بھی سنا دی ــــ نہ آنکھ جھپکی نہ رویا ــــ نہ اس نے دیکھا کب میرے آنسو بہنے شروع ہوئے۔ میں سوچ رہی تھی ــــ یہ آٹھ دس برس کا بچہ کیسے جیئے گا؟

بچہ چل دیا۔ اس کے آنسو خشک ہو گئے ــــ وہ گھنٹہ بھر میں جوان ہو کر بوڑھا بھی ہو گیا ــــ اس نے دنیا دیکھ لی۔

وہ جنگل کو چل دیا ــــ رات ہو چکی تھی ــــ بے سہارا، بے آسرا، ناامید ــــ کہاں جائے۔ ایک پیڑ پر چڑھ گیا۔ ڈال کا سہارا لے کر پرندوں میں سو گیا ــــ پو پھٹتے ہی اترا اور شہر کی طرف پانچ میل کے سفر پر روانہ ہو گیا۔

سناتے سناتے، سبق کی طرح یہ کہانی اس کو ازبر ہو گئی تھی ایک سانس میں اس نے مجھے بھی سنا دی ــــ نہ آنکھ جھپکی نہ رویا ــــ نہ اس نے دیکھا، کب میرے آنسو بہنے شروع ہوئے میں سوچ رہی تھی ــــ یہ آٹھ دس برس کا بچہ کیسے جیئے گا؟ یہ کیسے ان باتوں کو بھولے گا ــــ؟ یہ اپنی یادداشت سے اس نظارے کو کیسے مٹائے گا ــــ؟

اس نے انتہائی اشتیاق سے پوچھا ــــ "آپ وہاں چلیں گی؟ میں آپ کو دکھاؤں گا۔" پھر آہستہ سے بولا "شاید میری بہن وہاں ہو ــــ وہ وہیں کھڑی تھی جب میں بھاگا تھا ــــ میں ڈر کر بھاگ آیا۔" اس نے ندامت آمیز لہجے میں کہا۔

ہم لوگ اس بچے کے ساتھ گاؤں پہنچے ــــ فوج کے جوان گاؤں میں تعینات تھے۔ اب کیا رکھا تھا بچانے کے لئے۔

بڑے بڑے جوڑے ہال کی دیواریں آدھی آدھی کھڑی تھیں ــــ چھت جل چکی تھی۔ اینٹوں پتھروں کے ڈھیر اندر پڑے تھے۔ ایک جگہ، شاید وہ دروازہ رہا ہو گا۔ وہاں ایک ترشوں پڑا تھا۔ کالے اور ہرے موتی آس پاس بکھرے تھے۔

دیواروں پر مکیں کے خون کے چھینٹے تھے طاق میں مرغی بیٹھی تھی ــــ ہمارے پہنچتے ہی اتر کر بھاگ گئی۔ طاق میں انڈوں کا ڈھیر لگا تھا۔ میں نے فوجیوں سے پوچھا "یہ انڈے آپ لوگ استعمال میں کیوں نہیں لاتے ــــ کیا آپ لوگ کھاتے نہیں ہیں؟"

فوجی نوجوان نے کہا "کیا ہم یہ کھا سکتے ہیں ہم ان انڈوں کو دیکھ دیکھ کر روتے ہیں۔ یہ مرغی عادت کے مطابق یہیں آتی ہے ــــ انڈہ دیتی ہے، اسے کیا معلوم اس کے مالکوں پر کیا بیتی ہے ــــ؟"

پھر انہوں نے کہا "یہاں اب بچانے کو رکھا ہی کیا ہے ــــ ہمیں تو جب تک حکم ہو گا ہم یہاں رہیں گے ــــ لیکن آپ لوگ آتے ہیں تو ان بدنصیبوں کے رشتہ داروں کو تلاش کیجئے اور ان سے کہیئے کہ سرکار کو درخواست دے کر اپنے ڈھوروں کو لے جائیں ــــ" بھرائی آواز میں اس نے مزید کہا ــــ "ہم ڈھکیل ڈھکیل کر ڈھوروں کو چرنے بھیجتے ہیں گائے، بیل، بچھڑوں کو ــــ لیکن وہ شام کو یہیں 'اپنے گھر' جمع ہو جاتے ہیں۔ ہم سے دیکھا نہیں جاتا۔ بائی جی! یہ جانور رات کو بھی رہ رہ کر اپنے مالکوں کی یاد میں روتے ہیں ــــ گاؤں والے کہتے ہیں کہ ان کی آواز ان مالکوں جیسی ہے جو یہاں مارے گئے اور کہتے ہیں یہ آواز گاؤں میں اور جنگل میں گونجتی رہتی ہے ــــ عورتیں اور بچے ڈرتے ہیں ــــ"

باقی جوان آنسو پونچھ رہے تھے۔

لڑکا غائب تھا ــــ ایک آدمی کو ہاتھ پکڑ کر لا رہا تھا ــــ "چچا نے یہ سب دیکھا تھا ــــ بچا بتاؤ انھیں ــــ" وہ صاحب خاموش کھڑے تھے بچہ سے کیا کہتے۔ میں نے پوچھا "کیا اس کی بہن بچ گئی ہے؟"

اس نے کہا "میں نے اس دیوار کے پیچھے سے یہ سب دیکھا تھا ــــ لڑکی کو میں نے اس دیوار پر کھڑا دیکھا تھا ــــ اس کے بعد مجھے معلوم نہیں۔"

"وہ ضرور چھپ گئی ہو گی جنگل میں میری طرح ــــ" اس معصوم نے کہا۔

ہم لوگ چلے۔ ایک ایک جھاڑی میں تلاش کرنے لگے ــــ صرف بچے کی تسلی کے لئے ــــ دور ایک جھاڑی میں ایک ساڑی تھی۔ پیسے رکھنے کا ایک ٹوٹا ڈبہ تھا۔ یہ اس بچی کا آخری نشان تھا۔

سالار ہندی لکھتا ہے

"ہماری بے عزتی کی گئی ــــ مسلمان لڑکیوں کی عزت لوٹ لی گئی، کسی کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی ــــ" ایک نوجوان لڑکی نے غصے میں کہا۔

"ہمارے گھر لٹ گئے، جلا دیئے گئے سارے محلہ کو فقیر کر دیا ــــ آج لوگوں کے گھر دانے دانے کو محتاج ہو گئے ہیں ــــ" دوسری لڑکی نے کہا۔

ان دونوں لڑکیوں کے پیچھے ایک ادھیڑ عمر کا آدمی دیوار کے سہارے خاموش کھڑا تھا۔

ایک بہت بڑے احاطہ میں سینکڑوں لوگ



پڑے ہیں۔ پھٹے ہوئے کپڑے، ادھ جلا سامان ــــ صابن اور ٹوٹے برتنوں کو جمع کئے ہوئے ایک ایک خاندان کو تسلی دینے کی کوشش کرتے ہم اس کوٹھری کے سامنے پہنچے تھے۔

میں نے عقب میں کھڑے ہوئے شخص سے کہا "بچوں کی پریشانی صحیح ہے ــــ مگر کیا کر سکتے ہیں، مجرموں کے خلاف کارروائی ضرور ہوگی ــــ آپ کی مدد کرنے کی کوشش کر رہے ہیں"۔

اس شخص نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا "یہ آخری کہانی ہوگی جو شاید میں لکھ پاؤں گا"۔

یہ عجیب سا جواب پاکر میں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ ایک ساتھی نے آہستہ سے کہا "یہ ظہور بخش صاحب ہیں ــــ اور یہ ان کی لڑکیاں ہیں کالج میں پڑھتی ہیں"۔

آج میری باری تھی ــــ میں نے سہارے کے لئے دروازہ تھام لیا۔ 'ظہور بخش' ــــ ہندی کے مشہور کہانی کار ــــ ظہور بخش۔ جن کی تخلیقات بچپن سے پڑھتے آئے تھے۔ جن کو دیکھنے کی تمنا برسوں سے دل میں تھی۔ جن کی ہیرو کی طرح ہم لوگ دل میں پرستش کرنے لگے تھے ــــ آج ظہور بخش کا دیدار ہو گیا۔ یہ ظہور بخش ــــ! یہ پھٹا کرتہ، یہ میلی لنگی، بکھرے بال ــــ خلا میں کچھ نہ دیکھتی ہوئی آنکھیں ــــ اور یہ ظہور بخش کی لڑکیاں ــــ! اس عمر کی، جس عمر میں ظہور بخش کی کہانیاں دل پہ نقش ہو جاتی تھیں!

میں لوٹ آئی۔ ظہور بخش کے گھر آئی۔ گھر جل چکا تھا ــــ اندر گئی ــــ اندر کبھی کچھ رہا ہوگا۔ اب تو سب باہر ہی باہر تھا۔ ایک کمرہ تھا جلا ہوا۔ نیچے سے چھت تک کتابیں جلی ہوئی تہہ کی تہہ رکھی تھیں۔ ظہور بخش میرے پیچھے کھڑے تھے۔ بولے "اس میں گیتا تھی ــــ تلک کی، گاندھی کی، اس میں تلسی کی رامائن تھی، بالمیکی کی رامائن تھی ــــ مہابھارت بھی تھی ــــ 'ہنومان چالیسہ' بھی تھا، اس میں کئی پران تھے ــــ ان کو پڑھ پڑھ کر ہی تو میں لکھ پاتا تھا، یہ میری عمر بھر کی پونجی تھی ــــ عمر بھر کی کمائی تھی ــــ آدھی میرے ہاتھ سے لکھی تھی، باقی پڑھ پڑھ کر میں نے اپنی آنکھیں دھندلی کر لی تھیں ــــ"

ظہور بخش وہاں جاکر کھڑے ہو گئے جہاں شاید کبھی برآمدہ رہا ہوگا، بولے "میں یہاں آگیا، میں چیخا، میں رویا، میں نے پکارا ــــ میں نے بھیڑ کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے ــــ میں نے گھٹنے ٹیک دیئے ــــ میں نے کہا مجھے مار لو، میری کتابیں چھوڑ دو ــــ پھر مجھے مرنے نہیں دیا ــــ پولیس مجھے گھسیٹ کر لے آئی ــــ مجھے بچا لیا، میری کتابیں جلا دی گئیں ــــ" پھر آہستہ سے بولے "کئی تو ابھی شائع بھی نہیں ہوئی تھیں ــــ"

جبل پور میں فسادات ہوئے، یہ فسادات ساگر میں پہنچ گئے۔ ظہور بخش کا گھر گھیر لیا گیا ــــ ظہور بخش روئے، گڑگڑائے۔ جن سنگھی چلائے "سالا ہندی لکھتا ہے!"

گھر خاک کر دیا گیا ــــ ظہور بخش اور ان کے خاندان کو پولیس نے کھینچ کر جلتی کتابوں سے الگ کیا اور بچا لیا اور اب وہ بھکاری ہو کر کیمپ میں پڑے تھے۔

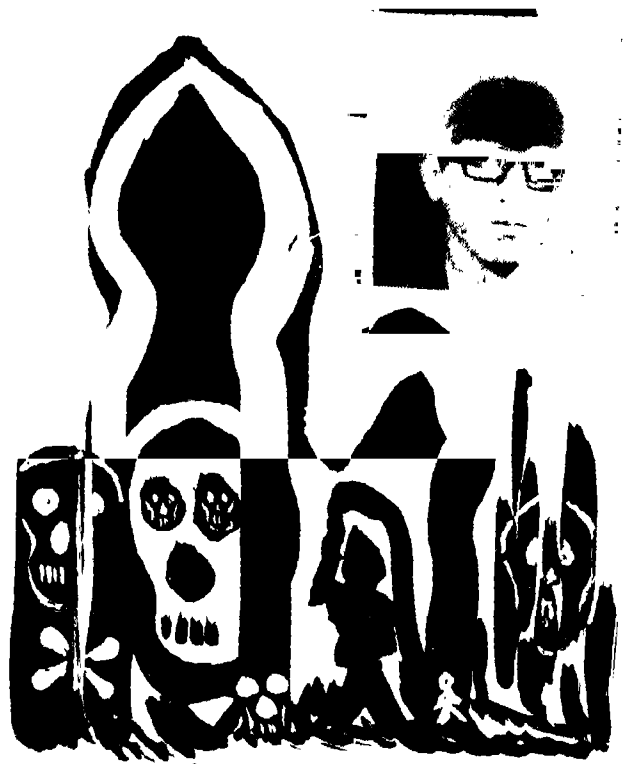
میں لڑکیوں کو گھر لے گئی ــــ کپڑے دیئے اور وہ مدد دی جو فسادات کے مارے لوگوں کو دی جاتی ہے، لڑکیوں نے کہا "ہم کالج میں پڑھتے تھے ــــ اب کیا ہوگا؟"

میں نے سمجھا کتابیں جل جانے کا مسئلہ ہے۔ میں نے کہا "اس کی فکر نہ کرو، کتابوں اور فیس کا انتظام ہو جائے گا"۔

انھوں نے آنسو پیتے ہوئے کہا "فیس اور کتابوں کی بات نہیں"۔ انھوں نے پھر کہا "جب ہمارا گھر گھرا ہوا تھا ــــ ہماری آنکھیں چاروں طرف مدد تلاش کر رہی تھیں ــــ ہمارے کلاس کے ساتھی ہمارے کالج کے ساتھی بھیڑ میں تھے ــــ ہمارے بھائی نے خوش ہو کر بڑی امید سے ــــ بھروسے سے، انھیں نام لے لے کر پکارا ــــ مدد مانگی ــــ لیکن بہن جی وہ ہمارے نام لے لے کر ہماری بے عزتی کر رہے تھے ــــ شرمناک باتیں کرنے لگے ــــ باہر کھینچ کر لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اب ہم اس کلاس میں، اس کالج میں کس منہ سے جائیں گے ــــ اس دنیا سے ہمارا یقین اٹھ گیا ــــ"

چند سال بعد بھوپال میں، میں فرقہ واریت کے خلاف ایک میٹنگ کر کے جانے لگی۔ ایک بوڑھے نے جیپ روک لی اور کچھ کہنے لگا ــــ لوگوں نے اسے پیچھے ہٹا دیا۔ اشارے سے کہا "پاگل ہے"۔

جیپ چلی تو ڈرائیور نے کہا "یہ ظہور بخش تھا ــــ"



رات کا مکان

وحید اختر

ایک آسیب صدیوں سے منڈلا رہا ہے یہاں
یہ مکاں
مردہ روحوں سے آباد ہے
سر بسجدہ عقیدت یہاں سر اٹھاتی نہیں
مردہ روحوں سے آنکھیں ملاتی نہیں
اور پرچھائیاں رات بھر چیختی روتی چلاتی لڑتی جھگڑتی پھرا کرتی ہیں ہر طرف

ایک پرچھائیں کے ہاتھ میں بان ہے اور تلوار ہے
اس کی گردن میں لپٹے ہوئے پیچ در پیچ ناگ اپنی آنکھوں کے ہیروں کا تاج
اس کے سر پر اٹھائے ہوئے خندہ زن
اس کی خونی زباں منہ سے لٹکی ہوئی
اس کے ہاتھوں میں جکڑے ہوئے ان گنت سر بدن سے جدا
اس کے قدموں میں لاشوں کے انبار ہیں
اور بے جان بے گوشت ڈھانچے عقیدت سے ہیں سرنگوں

ایک پرچھائیں پہنے ہوئے تیاگ کا گیروا پیرہن
اپنے ہاتھوں میں کاسہ لئے
مُردہ ڈھانچوں کا پس خوردہ چنتی ہوئی گھومتی ہے یہاں

اور پھر ہر طرف سے جھپٹتی ہیں پرچھائیاں مُردہ ڈھانچوں کا خوں چوسنے کے لئے
روز ہوتا ہے شب خوں یہاں
یہ مکاں
مُردہ روحوں سے آباد ہے

ایک پرچھائیں مصلوب ہے
اس کے ہاتھوں میں پیروں میں میخیں گڑی
روز اترتی ہے امید و حسرت کے زینے سے یاں
یہ مکاں آسماں کی طرف اُس کی پرواز میں آج حائل نہ ہو
روز کتنی ہی پرچھائیاں اُس کے کاندھے پہ اپنی صلیبوں سے کرتی ہیں وار
ہر صلیب اُس کو اپنی نجات اپنا سرمایہ سمجھے ہوئے
چاہتی ہے اسی کا وہ زیور بنے

ایک پرچھائیں محراب کی تیغ ابرو نما میں جھکاتی ہے سر
اس کے سر پر چمکتا ہے یرقاں زدہ ریگ زاروں کے طوفان میں خون روتا ہلال
اور چاروں طرف سے جھپٹتے ہیں مینار و گنبد اسے پیسنے کے لئے
روز ہی جنگ ہوتی ہے پرچھائیوں میں یہاں
روز ہی قتل ہوتی ہیں پرچھائیاں
یہ مکاں
مُردہ روحوں سے آباد ہے
اور یہاں رات ہے
جھاڑ، فانوس، شمعیں، دیئے سب اُگلتے ہیں اپنی لوؤں سے اندھیرا یہاں
ایک امر رات ہے، اِک اٹل رات ہے
صبح آتی ہے، لیکن یہاں، اس مکاں میں نہیں
دھوپ، تازہ ہوا، روشنی اس مکاں کا مقدر نہیں
یہ مکاں رات کی اک کمیں گاہ ہے

آسماں پر خدا ہے اکیلا
اور تنہا زمیں پر ہے انساں
ہر طرف راج کرتی ہیں پرچھائیاں

دینی مدرسے اور اردو

انجم عثمانی

"اردو ختم کی جا رہی ہے۔ اردو کا مستقبل خطرے میں ہے۔ ہم ہر قیمت پر اردو کی ترقی اور اس کی بقا چاہتے ہیں"۔ اس قسم کے نعرے ہر وقت اور ہر جگہ سنے جاتے ہیں۔ نعرے لگانے والوں میں سر فہرست وہ لوگ بھی دکھائی دیتے ہیں جو مختلف طریقوں سے دینی مدرسوں سے وابستہ ہیں۔ اور ان مدرسوں کے ذمہ دار افراد سمجھے جاتے ہیں۔ اس طرح یہ لوگ بھی اپنے آپ کو اردو کی بھلائی چاہنے والوں میں شمار کرانے ہیں۔ اردو کی ارتقا اور بقا کے نعرے لگانے والوں میں تین طرح کے افراد ملتے ہیں۔

۱۔ وہ لوگ جنھوں نے حقیقتاً قول و عمل دونوں طریقوں سے اردو کی خدمت کی ہے اور کر رہے ہیں (اس طبقہ میں ہر مذہب اور ہر قوم کے افراد شامل ہیں)

۲۔ وہ جو صرف نعروں کو سن کر نعرے لگاتے ہیں (یہ معذوروں کا طبقہ ہے)

۳۔ وہ جو اردو کے نیم جاں جسم پر اپنی سیاست کے ارمانوں کا اسٹیج سجائے اردو اردو چلاتے ہیں۔ لیکن عملی طور پر نہ وہ اردو کی کوئی ٹھوس خدمت انجام دے رہے ہیں اور نہ اردو کے لئے دی گئی سہولتوں سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔

اس تیسری قسم میں مدرسوں کے ذمہ دار افراد کا شمار بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ یہی لوگ جن کا حلق اردو اردو چلاتے (مصلحتاً) سوکھا جاتا ہے اور جو اردو کے نام پر شہرت اور دولت دونوں کمانے ہیں عملی طور پر اردو کے لئے کچھ نہیں کرتے۔ ہمارے دینی مدرسوں میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام نہیں ہے (اور بعض مدرسوں میں ہے بھی تو صرف اتنا کہ بالکل ابتدائی کلاسوں میں دینی تعلیم کا رسالہ وغیرہ پڑھا دیا جائے اور بس۔ اور بعض مدرسوں میں سرے سے یہ بھی غائب) وہاں نہ اردو لسانیات داخل نصاب ہے نہ اردو تاریخ و ادب، نہ وہاں اردو شاعری قابل ذکر ہے اور نہ اردو شاعر جب کہ ان مدرسوں کے ذریعہ اردو جاننے والوں کا ایک بہت بڑا طبقہ تیار کیا جا سکتا تھا اور تیار کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ پورے ملک کے تقریباً ہر صوبے اور ہر ضلع میں دینی مدرسے قائم ہیں جن میں ملک کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے طلباء کی ایک کثیر تعداد بیک وقت جمع رہتی ہے۔ انجمن ندائے اسلام کلکتہ نے ۱۹۷۱ء میں ہندوستان کے دینی مدرسوں کی ایک فہرست شائع کی تھی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پورے ملک میں قابل ذکر دینی مدرسوں کی تعداد ۹۶۴ ہے۔ واضح رہے کہ یہ محدود جائزہ ہے اس لئے کہ اس تعداد میں صرف وہ مدرسے شامل ہیں جو دیوبندی مکتب خیال سے وابستہ ہیں۔ اگر دیگر مکتب خیال کے مدرسوں کو بھی شامل کیا جائے تو یقیناً یہ تعداد ہزاروں تک پہنچے گی) ۹۶۴ کی اس تعداد میں صرف یو۔ پی اور بہار میں بالترتیب ۱۹۶ اور ۳۲۵ قابل ذکر مدرسے ہیں۔ اگر دوسرے علاقوں کو چھوڑ کر صرف یو۔پی اور بہار کے مدرسوں میں بھی اردو تعلیم کا کوئی معقول انتظام کیا جاتا تو بلاشبہ اب تک اردو جاننے والا ایک بڑا طبقہ عالم وجود میں آ سکتا تھا۔ جس سے ظاہر ہے کہ اردو کی ترقی ہوتی اور اس کثیر تعداد سے اردو کو فائدہ پہنچتا اور شاید اردو کے بہت سے مسائل اس تعداد کے ذریعہ حل کئے جا سکتے یا پیدا ہی نہ ہوتے۔

ان مدرسوں کے نصاب سے اردو غائب

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان مدرسوں میں اردو تعلیم کا کوئی معقول انتظام کیوں نہیں کیا گیا اور کیوں نہیں کیا جا رہا ہے؟ "کیوں نہیں کیا گیا" کے سلسلہ میں شاید یہ کہا جا سکے کہ اس سے قبل اردو کو یہ مسائل در پیش ہی کب تھے؟ جو آج ہیں کہ اردو کے فروغ اور بقا کا نصاب میں لحاظ رکھا جاتا۔ اگرچہ یہ جواب بھی مکمل جواب نہیں ہے تاہم اگر اس کو تسلیم کر لیا جائے تب بھی "کیوں نہیں کیا جا رہا ہے؟" کے سلسلہ میں بظاہر ان افراد کے پاس کوئی قابل اطمینان جواب نہیں۔ اس لئے کہ مدرسوں میں اردو تعلیم کا کوئی معقول اور معیاری انتظام نہ ہونے کے سلسلہ میں چند مشکلات کا ذکر کیا جا سکتا ہے مثلاً روپیہ یا افراد کی کمی، کتابوں کا موجود نہ ہونا اور اردو کا دینیات کے دائرہ سے باہر ہونا۔ لیکن فی الحال اس قسم کی کوئی دشواری سامنے نہیں آتی اس لئے کہ جہاں تک روپیہ اور افراد کا سوال ہے ان دونوں کی مدرسوں کے پاس کمی نہیں (کم از کم ان بڑے مدرسوں کے پاس تو بالکل ہی نہیں جنھیں مرکزی حیثیت حاصل ہے جیسے دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء لکھنؤ وغیرہ) مثلاً دارالعلوم دیوبند کا سالانہ بجٹ تقریباً ۱۲ لاکھ روپیہ ہے اور طلبا کی تعداد بھی ڈیڑھ ہزار کے قریب رہتی ہے۔ یہ دونوں چیزیں ہمیشہ اسے حاصل رہتی ہیں۔ پھر اردو کی تعلیم کے لئے ان مدرسوں کو نہ الگ سے بجٹ کی ضرورت ہے اور نہ ہی الگ سے طلبا کی۔ بلکہ صرف انتظام کا مسئلہ ہے۔

دوسری دشواری یعنی نصاب کی دشواری بھی نہیں ہے اس لئے کہ اردو میں مذہبی لٹریچر کی کمی نہیں ہے شاید ہی کوئی مذہبی موضوع ہو جس کی کتاب اردو زبان میں موجود نہ ہو۔ حدیث و فقہ سے لے کر ادب و منطق تک تمام مذہبی کتابیں، شرحیں، ترجمے اور تصانیف کی شکل میں موجود ہیں۔ اس لئے ایسی کوئی دشواری نہیں کہ ان مدرسوں کے نصاب میں اردو کو مناسب مقام نہ دیا جائے۔

تیسری دشواری بھی سامنے نہیں آتی کہ اردو مدرسوں کے دائرہ کار سے خارج ہو اس لئے کہ زبان کبھی کسی تعلیم کے دائرہ کار سے باہر نہیں ہو سکتی کیونکہ زبان کے ذریعہ ہی مسائل کو سمجھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ زبان صرف الفاظ و ہیئت (Words and Shape) کا نام نہیں۔ بلکہ تہذیب کی زبان سے وابستگی کا بھی نام ہے۔ اردو زبان سے بھی ایک خاص تہذیب وابستہ ہے۔ اگر زبان کا ارتقاء نہیں ہوتا اور اسے سکھا ... کا معقول انتظام نہیں کیا جاتا تو زبان سے وابستہ تہذیب بھی کسی بُرے حشر سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔ جب یہ بات طے ہے کہ زبان سے تہذیب کا اٹوٹ رشتہ ہے تو ظاہر ہے کہ تہذیب کی بقا کے اہتمام کا فرض بھی سب سے زیادہ انہیں افراد پر عائد ہوتا ہے۔ جو اپنے لئے تہذیب کے محافظ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں

> سب سے بہتر اردو جاننے والا طبقہ مدرسوں سے پیدا کیا جا سکتا ہے

یہ بات طے شدہ ہے کہ اردو دوسری زبانوں کے مقابلے میں فارسی اور عربی سے زیادہ قریب ہے۔ اور کیونکہ ان مدرسوں میں عربی اور فارسی کی تعلیم ہوتی ہے اس لئے تھوڑی توجہ اور انتظام سے ہی ایک ایسا ماحول پیدا کیا جا سکتا ہے کہ طلبا عربی اور فارسی جاننے کے ساتھ ساتھ اردو کے بہترین ادیب اور زبان داں بن جائیں۔ عجیب بات ہے کہ ان مدرسوں میں عربی ادب و شاعری کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں (دیوان حماسہ اور دیوان متنبی وغیرہ) فارسی ادب و شاعری کی کتابیں نصاب میں شامل ہیں (انوار سہیلی، سکندرنامہ، گلستاں، بوستاں وغیرہ) اگر داخل نصاب نہیں تو اردو ادب کی کتابیں جب کہ اردو ادب کے ذریعہ ہی وہ تمام فائدے حاصل کئے جا سکتے ہیں جو مذکورہ دونوں زبانوں کے ادب کے ذریعہ حاصل کئے جا رہے ہیں۔ اس طرح ان مدرسوں سے ان لوگوں کے مقابلے میں جو عربی اور فارسی کے طالب علم نہیں ہیں کہیں زیادہ بہتر اردو جاننے والا طبقہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔

> مدرسوں کے ذریعہ اردو سارے ملک میں پڑھائی جا سکتی ہے

اگر مدرسوں کا آپ جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ ان مدرسوں میں ملک کے تمام صوبوں اور زبانوں کے لوگ جمع ہیں۔ اگر مدرسوں میں اردو کی تعلیم کا معقول انتظام کر دیا جائے تو یقیناً ملک کے کونے کونے سے آئے ہوئے بہت سے افراد اردو داں بن جائیں گے اور پھر جب یہ لوگ اپنے اپنے علاقوں میں لوٹیں گے تو دوسروں کو اردو کی جانب متوجہ کریں گے اس طرح ملک کے ہر صوبے میں اردو جاننے والوں کا ایک اچھا خاصہ حلقہ اور ذوق پیدا ہو جائے گا اور جب اردو جاننے والوں کی تعداد بڑھے گی تو اردو کتابوں کی اشاعت، اردو اخبار و رسائل کی توسیع وغیرہ کو بھی تقویت ملے گی۔ اور اردو کے بہت سے مسائل حل ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ ملک کے گوشہ گوشہ سے آئے ہوئے افراد کو اردو سکھانے میں جہاں لسانی اور تہذیبی مفاد وابستہ ہے وہاں اقتصادی فائدہ بھی ہو سکتا ہے اس لئے کہ اردو کے سلسلہ میں اتنی مراعات دی جا رہی ہیں کہ اردو داں طبقہ اقتصادی بدحالی سے نجات پالے لیکن اس کو کیا کیجئے کہ ان مدرسوں میں نہ صرف یہ کہ اردو سکھانے کا کوئی معقول انتظام نہیں بلکہ ان میں رہتے ہوئے ان کے احاطے سے باہر بھی اردو سیکھنے کے لئے باقاعدہ جدوجہد نہیں کی جا سکتی اور اردو کے کسی دوسرے ادارے (جامعہ اردو وغیرہ) سے بھی فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا اس لئے کہ مدرسوں کا قانون یہ ہے کہ دوران تعلیم کوئی دوسرا امتحان نہیں دیا جا سکتا۔ چنانچہ یہاں کے طلبا اردو کے سلسلہ میں دی گئی رعایتوں سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ ظاہر ہے کہ اس میں رعایتیں دینے والوں کا قصور نہیں بلکہ اس طبقہ کا دوش ہے۔ جو خود ساختہ زنجیروں میں اپنے آپ کو جکڑے ہوئے ہے۔

بنیادی ضرورت

یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ مدرسوں میں اردو شامل نصاب نہ ہونے کی بنا پر ایک بڑا حلقہ اردو کی تعلیم سے محروم رہا ہے اس وقت جب کہ اردو تعلیم کو نئے نئے مسائل درپیش ہیں، ضروری ہے کہ مدرسوں کو بھی اردو زبان اور اس سے وابستہ تہذیب سے الگ نہ رکھا جائے اور مدرسوں میں اردو کی معیاری تعلیم کا ایسا نظام قائم کیا جائے جس سے زبان کے نکھرنے مسکرانے پھلنے پھولنے اور ترقی کرنے کے امکانات بڑھیں اور اس کے ذریعہ اردو کے سلسلے میں دی گئی مراعات سے مدرسوں کے طلبا بھی فائدہ حاصل کر سکیں۔ اور اردو سے محروم یہ حلقہ بھی محرم اردو بن سکے۔ یہ فرض انہی لوگوں کا ہے جو ان مدرسوں سے وابستہ ہیں اور جن کے ہاتھوں میں ان مدرسوں کی باگ ڈور ہے۔ اس تعلق سے جہاں یہ ضروری ہے کہ مدرسے اپنے طور پر اردو کی تعلیم کا معقول انتظام کریں وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ اردو کے لئے دی گئی رعایتوں سے مکمل فائدہ اٹھایا جائے۔ اور اُلٹے سیدھے پروپیگنڈے سے متاثر نہ ہوکر حکومت کی جانب سے اردو کے لئے متعین کی ہوئی کمیٹیوں (گجرال کمیٹی وغیرہ) سے پورا تعاون حاصل کیا جائے کیونکہ حکومت نے یہ کمیٹیاں اردو کو درپیش مسائل کو حل کرنے کے لئے ہی قائم کی ہیں۔ اس لئے مدرسوں سے وابستہ افراد (خاص طور پر وہ افراد جو اردو کے نعرے لگاتے ہیں) اس مسئلہ کی جانب مخلصانہ توجہ دیں اور ایسے اقدامات کریں کہ مدرسوں کے ذریعہ اردو کے کاز کو نفع پہنچے اور اس کی ترقی ہو۔ اس حقیقت کو سامنے رکھیں کہ ترقی صرف نعرے لگانے اور مطالبے کرنے سے نہیں بلکہ بنیادی اور ٹھوس عمل سے ہوتی ہے لہٰذا اردو زبان اور اس سے وابستہ تہذیب و بقا کے لئے ضروری ہے کہ مدرسوں کے ذریعہ موجودہ نسل کو اردو کی معیاری تعلیم دی جائے تاکہ اردو کا یہ قیمتی سرمایہ نعروں اور احتجاج میں صرف ہونے کے بجائے تعمیری، اصلاحی اور قومی کاموں میں لگے جس سے دیرپا نتائج برآمد ہوں بھلے ہی ان کی رفتار ابتداء میں دھیمی ہی کیوں نہ ہو لیکن مثبت اور مستقل ہو۔ اس کام کو یہ دینی مدرسے (اگر نیک نیتی سے کام لیں) جس خوش اسلوبی سے انجام دے سکتے ہیں اتنا شاید کوئی دوسرا ادارہ نہیں دے سکتا۔

احساسِ کمتری کا شکار؟

کرمی اللہ احسانی

آپ کے بیٹے وزارت میں کیوں نہ لئے گئے؟
آپ کے بیٹے کلکٹر کیوں نہ بنے؟
آپ کو تحصیلداری کیوں نہ ملی؟
ایک بھی داروغہ نہ بنا؟

حد تو یہ ہے کہ آپ کے کئی بیٹے جوان سال ہیں اور کسی کو بھی سرکاری ملازمت میں نہیں لیا گیا۔ واقعی افسوسناک بات ہے اور قابل غور بھی۔ کیا آپ اس ملک کے باشندے نہیں ہیں؟ کیا آپ کا سرکاری ملازمتوں میں حصہ نہیں ہے؟ آپ کے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا جاتا ہے؟ یہ کیسا امتیاز ہے؟ آپ کو کیوں نظرانداز کیا جا رہا ہے؟ اس کی کوئی خاص وجہ ــــ؟ وجہ صرف یہی ہے کہ آپ مسلمان ہیں یا آپ کا نام عبداللہ ہے آپ کو صرف مسلمان ہونے کی بنا پر ان مراعات سے محروم کیا جا رہا ہے اور اسی قسم کے بے شمار سوالات آپ کے وہمی دل اور متعصب دماغ میں پرورش پا رہے ہیں اور پھر آپ حکومت کو خوب خوب کوستے اور خوب خوب گالیاں دیتے ہیں اس پر درجنوں جانب داری کے الزامات عائد کرتے ہیں اور یہیں سے آپ متعصب بن جاتے ہیں اب آپ کی امیدیں کسی دوسرے ملک سے وابستہ ہو کر رہ جاتی ہیں یہیں سے آپ دوسروں کی طرف دیکھنا شروع کر دیتے ہیں اور اس پر بھروسہ کر لیتے ہیں۔

آپ کے بچوں کی تعلیم کیا ہے؟ کتنے بچوں کو تعلیم دلائی ہے کتنے بچے گریجویٹ ہیں؟ بولئے جواب دیجئے ــــ ایک بھی تعلیم یافتہ نہیں سب صفر ہیں اور انگوٹھا ٹیک۔ ایک بھی گریجویٹ نہیں۔ تو کیا کوئی اَن پڑھ وزیر بن سکتا ہے؟ بے پڑھا کلکٹر بنتے سنا ہے؟ کہیں جاہل بھی تحصیلدار دیکھا ہے؟ بدھو بھی داروغہ جی کی کرسی پر براجمان ہو سکتا ہے؟

آخر آپ کس حیثیت سے اپنے بچوں کو ایسے بڑے عہدوں پر متمکن دیکھنا چاہتے ہیں؟ پدرم سلطان بود کا زمانہ ہوا ہو گیا جب ان کی تعلیم ہی نہیں ہے تو پھر آپ کا یہ رونا قطعاً بے سود۔ آپ کی یہ شکایت محض بکواس۔ ذرا سوچئے تو سہی کیا ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم اَن پڑھ تھے؟ جاہل تھے؟ ان کے پاس کوئی تعلیمی ڈگری نہیں تھی؟ آخر وہ کیوں ہندوستان کے سب سے بڑے آدمی بنے؟ کیا وہ مسلمان نہیں تھے؟ وہ بھی مسلمان تھے لیکن ان کے پاس تعلیم تھی اس لئے وہ ہندوستان کے صدر بنے۔ یہاں وہ تعصب کہاں گیا؟ کیوں ان کو صدر بنا دیا گیا؟ اگر آپ کے بچوں کے پاس تعلیم ہے تو یقین فرمائیے کہ آپ کے بچے آج آزاد بھارت میں سب کچھ بن سکتے ہیں لیکن آپ کی کم ہمتی یا احساس کمتری آپ کو کچھ کرنے بھی دے۔ آپ آئے دن حکومت کا رونا روتے ہیں کہ وہ آپ کے نونہالوں کو ترقی کے مواقع نہیں دیتی ان کو بڑھنے نہیں دیتی۔ یہ آپ کا الزام سراسر لغو اور بے ہودہ ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم سے لے کر علی یاور جنگ، یونس سلیم، ہدایت اللہ خان، جنرل شاہ نواز، محمد شفیع قریشی، فخرالدین علی احمد، محسن، میر مشتاق احمد وغیرہم تک کو کس نے ترقی کرنے سے روکا؟ کیا یہ حضرات مسلمان نہیں ہیں؟ کیا حکومت ان پر بھروسہ نہیں کرتی ہے؟ ان کو حکومت نے نظرانداز کیوں نہیں کیا؟ ان کو کیوں حکومت نے اپنے خاص معتمد بنائے؟ اس لئے کہ ان میں وہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں جن سے کہ ہر انسان ترقی کر سکتا ہے قابل اعتماد بنتا ہے، یہ بھی تو مسلمان ہی ہیں۔ یہ کیوں رونا نہیں روتے، یہ کیوں آئے دن حکومت کی شکایت نہیں کرتے؟ آپ ہی کیوں اتنے حساس بنے ہوئے ہیں؟ کمی آپ ہی میں ہے۔ آپ نے اپنے بچوں کو تعلیم ہی نہ دلائی، زمانے کے ساتھ ہی نہ چل سکے، ہواؤں کے رخ کو نہ پہچان سکے۔ اس لئے آپ میدانِ عمل میں پٹ کر رہ گئے۔ بہت پیچھے جا پڑے۔ اب بھی اگر آپ نے اپنے بچوں کو تعلیم نہ دلائی تو یاد رکھئے کہ آپ کے بچوں کو کوئی چپراسی تک کی نوکری نہیں دے سکے گا اس لئے کہ آج چپراسی بھی گریجویٹ ملتے ہیں۔ بی۔اے، ایم۔اے کی ڈگریاں لئے پھرتے ہیں اور آپ کے بچے ٹھہرے جاہل مطلق۔ آپ نے کبھی ٹھنڈے دل سے اس پہلو پر غور کیا کہ آج ہندوستان میں مسلمان ایسے ذمہ داری کے عہدوں پر کیوں لگے ہوئے ہیں۔ آپ کے بچوں یا ان ذمہ دار مسلمانوں میں جو کہ بڑی جگہوں اور اونچی پوسٹوں پر نظر آتے ہیں۔ کیا کمی ہے؟ ہم دعوے کے ساتھ کہتے ہیں کہ اگر آپ کے بچے تعلیم یافتہ ہیں تو یاد رکھئے وہ ذاکر حسین سے لے کر میر مشتاق احمد اور اکبر علی خاں تک سب کچھ بن سکتے ہیں۔ حکومت ان پر اعتماد کرتی ہے۔ یہ آپ کی غلط فہمی ہے کہ حکومت مسلمان کو سرکاری نوکری نہیں دیتی اور نہ ان پر بھروسہ کرتی ہے۔ آپ اپنے بچوں کو پڑھائیے پھر دیکھئے آپ کہاں ہوں گے اور آپ کے بچے کس جگہ ہوں گے۔ آج بغیر تعلیم کے کچھ نہیں ہے۔ اگر تعلیم ہے تو آپ کے بچے صدرِ جمہوریہ بن سکتے ہیں وزارت بھی پا سکتے ہیں کلکٹری کے عہدے پر بھی جا سکتے ہیں اور داروغہ جی بن کر حکومت چلا سکتے ہیں۔ ذرا ان کو تعلیم تو دلائیے۔ تعلیم

آپ دلا نہیں رہے اور چلے ہیں حکومت سے گِلے شکوے کرنے۔ اس احساس کمتری کا کیا علاج؟ آپ کی اس تنگ نظری کو کیا کہا جائے۔ کیا آپ کے اس نظریے کا آج مذاق نہیں اُڑے گا؟ آپ کے ایسے بے ہودہ خیالات پر ماتم نہیں کیا جائے گا۔ آیئے چپکے سے سن کر کوئی عملی قدم بھی اٹھائیے۔ ۔

ایک مفلس کہ بے پڑھا لکھا بڑھ کے گا ہے وزیر ہوتا ہے
اور اَن پڑھ امیر زادہ ایک گھٹ کے اک دن فقیر ہوتا ہے

آپ نے کبھی کسی عیسائی کو یہ کہتے سنا کہ میرے بچوں کو سرکاری نوکری نہیں ملتی ہے یا ان کو حکومت عیسائی ہونے کی بنا پر نظرانداز کر رہی یا کسی بھی کلیدی اور ذمہ داری کی پوسٹ پر جگہ نہیں دے رہی ہے وہ ایسی شکایت کبھی نہیں کرتے۔ وہ ایسا رونا بھول کر بھی نہیں روتے۔ اس لئے کہ ان کے بچے پہلے پڑھتے ہیں پھر نوکری یا کوئی کاروبار کرتے ہیں سائنسداں یا انجینئر ہو کر اپنے ملک کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔ وہ کبھی نہیں سوچتے کہ بھارت ہمارا ملک نہیں ہے اسے کیوں فائدہ پہنچایا جائے۔ ان کے پاس تعلیم ہے وہ آج بڑے بڑے عہدوں پر نظر آتے ہیں ان کے بڑے بڑے کاروبار ہیں ان کی ایک تنظیم ہے وہ چاہیں تو باہر کی طرف دیکھتے رہیں اور باہر والوں پر بھروسہ کئے رہیں اس لئے کہ وہ بھارت میں لگے بچے ہیں۔ بخلاف اس کے وہ آج بھارت میں خوش ہیں اور اپنے مستقبل سے مطمئن۔ حالانکہ وہ آپ سے تعداد میں کہیں کم ہیں ان کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ آپ ان سے کہیں زیادہ ہیں، ان کے مقابلے پر کئی گنا زیادہ ہیں لیکن تعلیم سے لے کر کاروبار کے میدان تک ان سے صدیوں پیچھے ہیں۔ آپ پر جمود طاری ہے، آپ بے حسی کا شکار ہیں، آپ کے دماغ پر آپ کے وہ بھائی جو کہ سرحد پار ہیں چھائے ہوئے اور سوار ہیں۔ حالانکہ وہ آپ کو مسلمان تک نہیں سمجھتے، آپ کو ذلیل و خوار سمجھتے ہیں اگر آپ سوچیں اور سنجیدگی سے غور کریں تو حق بات یہ ہے کہ انھوں نے آپ کے لئے کچھ بھی نہیں کیا اور نہ کچھ کر سکتے ہیں۔ یہ احساس کمتری، یہ بے حسی انہی کی تو دین ہے۔ یہ سوچنے کا انداز بدلنا ہوگا ادھر دیکھنے کے نظریے پر نظر ثانی کرنا ہوگی۔ آپ کیوں باہر کی طرف نظریں جمائے بیٹھے ہیں۔ عیسائی کیوں اپنے عیسائی ممالک کی طرف نہیں دیکھتے۔ اس فرق کو محسوس کیجئے اور اس کمی کو دور فرمایئے۔

کبھی آپ نے سوچا ہے کہ بھارت میں سکھ کتنے ہیں ــــــ؟ اور وہ اقلیت میں ہوتے ہوئے آج کہاں ہیں۔ آپ ایسا کبھی نہیں سوچیں گے۔ آج سکھوں کے پاس کیا کچھ نہیں ہے۔ آخر آپ ان سے کہیں زیادہ ہیں۔

ہاں تو دیکھئے سکھوں سے تعداد میں آپ کہیں زیادہ ہیں لیکن اگر آپ کا ان سے مقابلہ کیا جائے تو آپ ان سے بھی کہیں پس ماندہ ہیں ان سے برسہا برس پیچھے ہیں، وہ زندگی کے ہر میدان میں آپ سے بہت آگے ہیں۔ آخر وہ کم تعداد میں ہوتے ہوئے اس قدر کیوں آگے ہیں۔ اگر وہ بھی چاہیں تو حکومت کا رونا روتے رہیں اور وہ بھی احساس کمتری کا شکار ہو کر بیٹھ رہیں حکومت کے ساتھ کسی قسم کا تعاون نہ کریں۔ وہ بھی آئے دن حکومت کی شکایت کرتے رہیں لیکن انھیں اتنی فرصت ہی کہاں ہے اگر وہ اس طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں تو یقین فرمایئے کہ وہ آپ کی جگہ ہوں گے وہ آپ کی طرح برسہا برس میدان عمل میں پیچھے جا پڑیں گے۔ پس ماندہ ہو کر رہ جائیں گے کسی شعبہ میں ترقی نہ کر سکیں گے، آگے نہ بڑھ سکیں گے۔ حیرت ہے کہ آپ نے سکھوں کی عملی زندگی سے کچھ بھی نہ سیکھا۔ حالانکہ دنیا کے سامنے آپ نے عمل پیش کیا تھا، آج آپ اسے بھلا بیٹھے۔ وہ آپ سے کم سہی لیکن آپ سے بہت زیادہ بڑھے ہوئے ہیں۔ آج وہ لوگ ترقی یافتہ ہیں، ان کی ایک آواز ہے جس میں ایک طاقت ہے، قوت ہے، ایک وزن ہے اور آپ کے پاس آج کچھ بھی نہیں۔ اس لئے کہ آپ نے تو اپنے گھر، اپنے ملک، اپنے وطن کو اپنا سمجھا ہی نہیں ہے جب آپ کی بزدلی۔ بے حسی۔ احساس کمتری کا یہ عالم ہو تو ظاہر ہے کہ آپ قعرِ ذلت میں جا گریں گے یا چاند پر کمندیں ڈالیں گے۔

آیئے! آج عہد کیجئے اور صرف تعلیم ہی پر زور دیجئے، تمام طاقت صرف کیجئے۔ اپنے بچوں کو پڑھایئے اور کچھ نہ کیجئے پھر آپ کو کسی سے کوئی شکایت نہ رہے گی۔ آپ شکوہ سرا نہ رہیں گے۔ آپ ایک بار پھر اپنے ملک کو اپنا عزیز ملک سمجھئے۔ اگر چند متعصب آپ کی راہ میں حائل ہوتے ہیں تو ہونے دیجئے۔ کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ کتے بھونکتے رہتے ہیں اور گاڑی گزر جاتی ہے۔ یہ طے کر لیجئے کہ کتوں کا کام بھونکنا ہے اور گاڑی کا کام چلنا۔ اگر اس نظریہ پر عمل کیا تو یقین جانئے کہ آپ بھارت میں بہت کچھ ترقی کریں گے۔ بہت کچھ شہرت پائیں گے۔ مجھے یہ کہنے اور تسلیم کرنے میں ذرا باک نہیں ہے کہ آپ یہاں کے فرقہ پرست، تنگ نظر اور متعصب لوگوں کی وجہ سے بھی پریشان ہیں آپ کے دماغ پر ان کا خوف بری طرح سے مسلط ہے آپ ان کی وجہ سے کچھ نہیں کر پا رہے ہیں لیکن ایک بات یاد رکھئے کہ اگر آپ حقیقت میں وطن پرست ہیں اور وطن پر آپ کا ایمان ہے تو دنیا کے تمام سر پھرے، تمام متعصب، تمام فتنہ پرور آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ آپ ان سے نہ گھبرایئے۔ آپ جم کر اور ڈٹ کر کام کیجئے حکومت آپ کے ساتھ ہے۔ آپ حکومت کے ساتھ تعاون تو فرمایئے پھر دیکھئے آپ کہاں ہوں گے۔ کیا آپ کا فرض نہیں ہے کہ جنگجو، جھگڑالو لوگوں کو بے نقاب کر کے حکومت کے حوالے کریں۔

ایک بات اور سن لیجئے کہ جو بھی ملک بھی جھگڑے یا قتل و غارت گری، بدامنی کا بازار گرم کرا رہے ہیں وہ سب غیر ملکی اشاروں پر چل رہے اور انھیں کے ہاتھوں پرناچ رہے ہیں۔ ان کا کام ہی ملک میں بدامنی

(باقی صفحہ ۴۳ پر)



انہوں نے آزادی کی جنگ جیتی

آؤ! ہم بھارت کی تعمیر و ترقی کے

انقلاب کو پایۂ تکمیل

تک پہنچائیں

25

davp 72/120



بچت کے ساتھ بیمہ
اجتماعی میعادی ڈیپازٹ کھاتہ | 10 روپے ماہانہ کے حساب سے بچت | 675 روپے ملیں گے
مکرر ڈیپازٹ کھاتہ | 10 روپے ماہانہ کے حساب سے بچت | 710 روپے ملیں گے
باتحفّظ
بچت اسکیم
سب کے لئے
سماجی تحفّظ
کا اقدام
فرض کیجیے کوئی بالغ فرد پانچسالہ اجتماعی میعادی ڈیپازٹ کھاتہ یا پانچ یا دس روپے کا مکرر ڈیپازٹ کھاتہ کسی ڈاکخانے میں کھولتا ہے اور اس میں 24 ماہانہ قسطیں جمع کراتا ہے۔ اگر بدقسمتی سے موت ہو جانے کی صورت میں وہ تمام قسطیں جمع نہ کرا سکے تو سرکار اس کے نامزد شخص یا وارث کو پوری رقم معہ سود ادا کرے گی جو کہ پانچویں سال کے آخر تک تمام ماہانہ قسطیں جمع کرانے کی صورت میں واجب الادا ہوتی۔
دیکھیے کیسے :-
قومی بچت اِدارہ
بھارت سرکار
davp 72/513

خدا کیلئے چپ ہو جائیے

جمیل مہدی

ایک بہت خطرناک واقعہ یونیورسٹی بند ہونے کی صورت میں رونما ہوگیا ہے، اس واقعہ سے مشتعل ہوکر اندھا دھندا اقدام کے بجائے بڑی احتیاط اور ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ان محرکات سے واقف ہونے کی ضرورت ہے جو یونیورسٹی کو بند کرنے کا باعث ہوئے ہیں، ان محرکات کی قوت کا اندازہ لگانے کی ضرورت ہے جو یونی ورسٹی کے سلسلے میں پسِ پردہ مصروف عمل ہیں، اس انتہائی حد تک پہنچے ہوئے ردعمل اور فیصلے کی نوعیت کا پتہ لگانے کی ضرورت ہے جس نے بلااشتعال گولی چلا دینے کی سی دہشت ناک فضا پیدا کر دی ہے۔

یونیورسٹی کے مسئلے میں ایک بہت بڑی غلطی حکومت نے کی ہے۔ اس بارے میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں میں ان لوگوں میں ہوں جنھوں نے مسلم یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ سے بہت پہلے اس نقطۂ نظر کا اظہار کیا تھا کہ ہندوستان کی حکومت کو اپنے ملک میں ایک دوسری دیوار گریہ بنا دینے کے خطرناک اقدام سے پرہیز کرنا چاہیئے پھر ترمیمی ایکٹ کے بعد جب کہ تمام احمق لوگ اس بل کے جواز اور حمایت میں دلائل اور لفاظی کا پورا زور صرف کر رہے تھے میں نے لکھا ــــــ کہ اس طرح کا رویہ زخموں پر نمک پاشی کے سوا دوسرے کسی مقصد کو پورا نہیں کرے گا۔ ایک درست اور ضروری اقدام کو ٹھیک وقت پر کرنے کے بجائے بہت غلط کام غلط وقت پر کر دیا گیا ہے اسے درست اور ٹھیک اقدام ثابت کرنے کی کوشش سے دلدل میں دھنستے چلے جانے کے سوا کوئی دوسرا نتیجہ برآمد نہیں ہوسکتا

وہ بہت خطرناک وقت اور بہت غلط فیصلہ تھا جو مسلم یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ کی صورت میں سامنے آیا، لیکن اس سے بھی زیادہ خوف ناک اور غلط وہ اقدام تھا جو ان مسلم رہنماؤں کی طرف سے عمل میں لایا گیا ــــــ

مسلم یونیورسٹی کے مسئلہ کو سیاست کی بازی میں ایک جوکر کی حیثیت سے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا گیا، اور غور و فکر کے ضروری فرض کو بالکل فراموش کرکے، اس مسئلہ کو جس سے ہندوستان کے پانچ کروڑ انسانوں کے مستقبل اور آبرو کا سوال وابستہ تھا، بہت نیچی سطح پر اتر کر الیکشن جیسے وقتی مسئلہ کے ساتھ جوڑ دیا گیا۔ ایک حقیر اور وقتی فائدے کے لئے ملت کی متاعِ عزیز جیسی عظیم چیز داؤ پر لگانے والوں کو سوچنا چاہیئے تھا کہ یونیورسٹی باربار نہیں بنا کرتی۔ الیکشن ہر پانچویں بلکہ دوسرے تیسرے سال آتا رہتا ہے۔

جذباتی سیاست اور انتخابی حکمت عملی ایک ساتھ جمع ہو جائیں تو ایک ایسی خوفناک تلوار کی صورت بن جاتی ہے جو دوسروں کی گردن کاٹنے میں ناکام رہ جائے تو اپنی گردن صاف اڑ جاتی ہے۔ اب سے چھ سال پہلے ۱۹۶۷ء میں یہ ہولناک تجربہ ہوچکا ہے معلوم نہیں اس وقت کیا کسر رہ گئی تھی جسے اب پورا کرنے کا امکان اور ارمان اس طرح کی خوفناک حالت کو پیدا کرنے اور اس طرح کے خطرات مول لینے کی ہمت کرنے کا سبب بنا، وہ کون سے نئے حالات پیدا ہوئے جنھوں نے یقین دلایا کہ آگ سے برف اور بدی کے پیٹ سے نیکی پیدا ہوگی۔ اسی سیاست کے بازار میں قوموں کی قسمتیں خریدنے کے لئے مسلمانوں نے کبھی بڑی سے بڑی قیمتیں لگائی تھیں۔ کیا یہ حالت شرمناک اور عبرت ناک نہیں کہ وہ اپنی قسمت کو سستے داموں کبھی اس کے ہاتھ اور کبھی اُس کے ہاتھ بیچ دینے کا کاروبار پچھلے دس سال سے کر رہے ہیں اور اسے ایک باعزت کام سمجھتے ہیں۔

آگ کے ساتھ کھیلنے کا انجام جُھلس جانے کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا۔ ایک بار غلط راستہ پر قدم گیا تو ہر قدم منزل سے دور ہی کرتا ہے، قریب نہیں لاسکتا۔ مسلم یونیورسٹی کو سیاست کے بازار میں نیلام پر رکھ دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ یونیورسٹی کے اندر کی فضا جو پرسکون تھی اور اندر ہی کے دوگروپوں کے درمیان کشمکش تک محدود تھی، نئے نئے لوگوں کی ریشہ دوانیوں سے اور زیادہ شدت اختیار کر گئی۔ اب تک تو یہ حالت تھی کہ معاملہ صرف مسلمانوں اور حکومت کے درمیان اختلاف اور رسہ کشی تک محدود تھا جس میں حکومت نے غلط فریق کی حمایت کا غلط فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ فیصلہ بدلا جاسکتا تھا اس کے آثار بھی پیدا ہوگئے تھے اور اس طرح کی آوازیں سڑکوں تک سنائی دینے لگی تھیں کہ یہ فیصلہ بدلا جا رہا ہے لیکن مسلم یونیورسٹی ایکٹ کو الیکشن کے ایک حربہ کے طور پر استعمال کرنے کی مضر حکمت عملی نے اپوزیشن کے لیڈروں کو اس کا موقع فراہم کر دیا کہ وہ اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ یونیورسٹی کے اندر گھس پڑیں انھوں نے یونیورسٹی کیمپس کو نہ صرف حکومت اور برسرِ اقتدار پارٹی کے خلاف ایک قلعو بند مورچے کی حیثیت سے استعمال کرنے کی تیاریاں کھلے بندوں کرنا شروع کیں بلکہ خود یونیورسٹی کے حامی اور تدبر سے عاری ایک طبقہ نے،

ان لیڈروں نے ان کے مقاصد کی ہمنوائی اس زور و شور کے ساتھ شروع کی کہ اس ریاست میں جو عام انتخابات کے دروازے پر کھڑی ہے، ایک ایسی فضا بن گئی جو برسراقتدار جماعت کے لئے ہرگز قابل برداشت نہیں ہو سکتی تھی۔

دہلی کے مسلم یونیورسٹی کنونشن نے ناعاقبت اندیشی کے ساتھ کانگریس کو ووٹ نہ دینے کی تجویز پاس کرکے کمر پکڑوا دینے جیسی ایک خوفناک غلطی کی — اور حکومت کو اور برسراقتدار جماعت کو وار کرنے کا پورا موقع فراہم کر دیا —— جب ایک فریق یہ فیصلہ کرے کہ وہ کانگریس کو ووٹ نہیں دے گا اور کانگریس کی مخالفت میں یونیورسٹی کو استعمال کرے گا تو حکومت کی تمام طاقتوں سے مسلح کانگریس کے خلاف کون سی منطقی اور اخلاقی دلیل لائی جا سکے گی، اگر وہ یہ فیصلہ کرلے کہ وہ اپنے اقتدار کو لاحق اس خطرے کا پوری طاقت کے ساتھ مقابلہ کرے گی اور اپنے خلاف یونیورسٹی کو ہرگز استعمال نہ ہونے دے گی؟ خود مسلم یونیورسٹی کے نادان دوستوں کے ہاتھوں یونیورسٹی کا مسئلہ الیکشن کا ایک حقیر مسئلہ بنا دیا گیا انتقام جیسا کہ ردعمل ظاہر کرکے جوابی انتقام کی پوری گنجائش اور جواز پیدا کرنے اور الیکشن کی کش مکش کے درمیان یونیورسٹی کی تباہی کا سامان خود مہیا کرنے کا کارنامہ ان لوگوں نے انجام دیا جو اپنے آپ کو یونیورسٹی کا خدمت گزار اور جاں نثار کہتے تھے۔ تاریخ کو خدمت گزاری اور جاں نثاری کا یہ شاندار ریکارڈ محفوظ کر لینا چاہیئے۔

لیکن ان ساری غلطیوں، ناعاقبت اندیشیوں اور اشتعال انگیز کارروائیوں کے باوجود کیا حکومت کو یہ زیب دیتا ہے کہ وہ ایک کمزور فرقہ کے خلاف اپنی قہرمان طاقتوں اور اسلحوں کے ساتھ صف آرا ہو جائے اور نادانیوں کے ساتھ آخری حد تک جانا گوارا کرلے۔ اس ایجی ٹیشن اور بنی بنائی فضا کو خراب کر دینے کا موجب بنے جو حکومت کے اشاروں، وزیروں اور لیڈروں کے بیانات کے ذریعہ امیدوں اور تشفی کی توقعات سے لبریز ہو چکی تھی؟ کیا مسلم یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ میں ترمیم پر آمادگی اور اس خوفناک حملے میں کوئی مناسبت اور مطابقت ہے جس نے آن کی آن میں پورے ملک کے کروڑوں لوگوں کو زخمی اور بدحواس کرکے رکھ دیا ہے؟

اب صورت یہ بنے گی کہ یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ کی واپسی کا مطالبہ پیچھے پڑ جائے گا۔ اس کی ایک متحدہ آواز کی طاقت گھٹ گی، فکر اور تشویش کی حالت میں ساری توجہ اور دھیان یونیورسٹی کو دوبارہ کھلوانے کی جدوجہد اور مطالبے تک محدود ہو جائے گا۔ یہ ایک قدم، بڑھنے کے بجائے ایک قدم پیچھے ہٹنے جیسی ایک پوزیشن ہوگی۔ یہ پوزیشن یونیورسٹی کے لئے مفید ہوگی نہ مسلمانوں کے لئے، نہ ملّی وقار اور آبرو کے لئے۔

ہمیں تسلیم کرنا چاہیئے کہ ہم جس ماحول سے دوچار ہیں اس میں ٹکراو اور دھمکی کی سیاست چلانے کی بالکل گنجائش نہیں ہے۔ ۱۹۶۵ء میں جو ہوا تھا اس کی اندوہناک یاد اور قیمتی تجربہ کو فراموش کر دینا اچھی بات نہیں تھی۔ زخم اگر مندمل بھی ہو جائیں تو ان کے نشانات ضرور نظروں کے سامنے رہنے چاہئیں۔ پھر ابھی ۱۹۶۷ء میں کیا ہوا، بدنظمی کو نظم وضبط اور بھیڑ جیسی ایک حالت کو منظم تحریک فرض کرکے جو اقدامات کئے گئے، ان کی بدولت فتحمندی کا خوبصورت چہرہ تو دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ بنارس اور فیروز آباد اور دوسری جگہوں پر ایسی دلدوز اور بھیانک صورت حال سے دوچار ہونا پڑا کہ لینے کے دینے پڑ گئے۔ کال مٹھی بھر احمق لوگوں کی تھی، ناکامی کی بے عزتی اور نقصان کا صدمہ پوری قوم کو برداشت کرنا پڑا۔ چار چھ مہینے میں کہیں جاکر اس صدمہ سے سنبھل پائے تھے کہ مسلم یونیورسٹی کنونشن برپا ہوا۔ باہمی اختلاف اور اندرونی رسہ کشی کی تو یہ حالت کہ یونیورسٹی کے بارے میں تو یہ طے نہ ہو سکا کہ آئندہ کیا کرنا ہے۔ اس بات کی بہت جلدی پڑ گئی کہ ایک سال پہلے ہی مسلمانوں کو یہ مشورہ دے دو کہ الیکشن میں کانگریس کو ووٹ نہیں دینا ہے۔

اب اگر عجلت، جلد بازی، جذباتی اشتعال اور کم اندیشی کے ساتھ کوئی ایسا اقدام دوبارہ عمل میں آگیا جو صورت حال کو سنبھالنے کے بجائے حسب معمول اور زیادہ خراب کر دینے کا باعث ہو تو نہ معلوم کتنی مدت کے لئے بات ہاتھ سے نکل جائے گی۔ اس لئے سب سے ضروری بات یہ ہے کہ اس مرحلے پر خاموش رہ کر کچھ وقت غور و فکر میں صرف کیا جائے۔ ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ جائزہ لیا جائے کہ یونیورسٹی کے تحفظ اور اس کے سر پر گھرے ہوئے طوفان کے مقابلے کے لئے کیا کیا جا سکتا ہے۔ ایک ایسے مسئلے کے بارے میں جس کے ساتھ غلط یا صحیح مسلمانوں کا اجتماعی وقار اور ملّی آبرو کا سوال وابستہ ہو گیا ہو، تدبر اور فراست کے سارے تقاضوں کو پس پشت ڈال کر ایجی ٹیٹروں کا سا طرز عمل اختیار کرنا اسلامی تقاضوں اور روایات کے بھی خلاف ہے اور مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کے۔

رہا نیت کا معاملہ اور خدمت کا سوال تو اس کے لئے انگریزی میں کہا گیا ہے کہ

"THE WAY TO HELL IS PAYED WITH GOOD INTENTIONS."

یعنی جہنم کا راستہ بھی نیک ارادوں اور نیک نیتی کے ساتھ ہی طے کیا جاتا ہے کسی اور پر یہ مثل صادق آئے یا نہ آئے ہم بدنصیب مسلمانوں کی ۲۵ سالہ سرگرمیوں کے ایک ایک دن پر اسے منطبق کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ اس سلسلے میں نیک نیتی اور بدنیتی، اخلاص اور غیر اخلاص کا سوال نہ اٹھایا جائے۔ اگر میں اپنے آپ کو ان قابل احترام لوگوں سے بڑا سمجھتا تو یہ وقت تھا کہ ان سے بڑی ناگواری کے ساتھ کہا جا سکتا تھا کہ "آپ بہت بول چکے، بہت نقصان پہنچا چکے۔ اب بیٹھ جائیے"۔

لیکن مجھے اعتراف ہے کہ منصب اور مقام کے اعتبار سے میرا ان لوگوں سے کوئی مقابلہ نہیں، ان میں بعض بعض تو اتنے مقدس اور برگزیدہ لوگ ہیں کہ ان کے پیروں کی خاک کی برابری بھی مجھ سے نہیں ہو سکتی، اس لئے میں صرف درخواست کر سکتا ہوں، اپیل کر سکتا ہوں کہ خدا کے لئے اس وقت خاموش ہو جائیے۔ یہ وقت بولنے کا نہیں، سوچنے کا ہے۔ خود بھی سوچئے ان لوگوں کو بھی سوچنے دیجئے جو اگر چہ آپ کی صفوں میں نہیں لیکن یونیورسٹی کے معاملے میں آپ سے کہیں زیادہ بے تاب اور فکر مند ہیں۔

دہلی ڈویلپمنٹ اتھارٹی

انتباہ

۱۔ عوام الناس کو ایک بار پھر متنبہ کیا جاتا ہے کہ دہلی لینڈ (انتقالات پر پابندی) ایکٹ مجریہ ۱۹۷۲ء کے نفاذ میں آنے کے بعد سے ایکوائر کی گئی اور ایکویزیشن کے نوٹس نوٹیفکیشن کے تحت آنے والی اراضی کی خرید و فروخت خلاف قانون ہے۔

۲۔ دہلی ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے نوٹس میں یہ بات آرہی ہے کہ بعض بے اصولے کالونائزر دہلی کی شہری حدود کے باہر ان نوٹیفائیڈ زرعی اراضی فروخت کر رہے ہیں اور پبلسٹی کرکے زرعی اراضی کے رہائشی مقاصد کے لئے خرید کی غرض سے لوگوں کو دعوت دے رہے ہیں۔ بعض ایک یہ دعویٰ کرکے عوام کو گمراہ کر رہے ہیں کہ انھوں نے NO OBJECTION CERTIFICATE حاصل کر لئے ہیں۔ جنتا کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ دہلی کی شہری حدود کے باہر بھی کسی زمین کی خرید و فروخت دہلی لینڈ ریفارمز ایکٹ ۱۹۵۴ء۔ دہلی میونسپل کارپوریشن ایکٹ، ۱۹۵۷ء۔ دہلی ڈویلپمنٹ ایکٹ، ۱۹۵۷ء اور ماسٹر پلان دہلی کی دفعات کے منافی ہے۔ دہلی ایڈمنسٹریشن یا دہلی ڈویلپمنٹ اتھارٹی کی طرف سے رہائشی مقاصد کے لئے یا ایسی اراضیات کی خرید و فروخت کے لئے کوئی NO OBJECTION CERTIFICATE نہیں دیا جاتا ہے۔

۳۔ کسی بھی زرعی اراضی کے رہائشی مقاصد کے لئے استعمال کی اجازت نہیں۔ ذیل میں ان چند بستیوں کے نام مثال کے طور پر دیئے جاتے ہیں جن میں کالونائزر نامنظور شدہ کالونیاں قائم کر رہے ہیں اور عوام کو گمراہ کر رہے ہیں۔

۱۔ اندر پارک	۴۔ وششٹ پارک	۷۔ بندراپور ایکسٹینشن
۲۔ سیتاپوری	۵۔ جیون پارک	۸۔ راجندر پارک
۳۔ پون پوری	۶۔ جنک پوری	۹۔ مونیکا نگر

۱۰۔ سیوا پارک وغیرہ (یہ فہرست جامع نہیں ہے)

کوئی لے آؤٹ پلان منظور نہیں کئے گئے ہیں۔ ان علاقوں اور دوسرے علاقوں میں پلاٹوں کی خرید و فروخت یکسر غیر قانونی ہے۔

۴۔ زرعی اراضیات کے خلاف قانونی سودوں کی وجہ سے کئی کالونائزروں/مالکوں/خریداروں پر مقدمات دائر ہو چکے ہیں خواہش مند خریداروں کو ایک بار پھر اس قسم کے سودے نہ کرنے کے لئے خبردار کیا جاتا ہے۔ زرعی سبز زمین پر کسی تعمیر کا نتیجہ نہ صرف اس کے گرائے جانے کا موجب بنے گا بلکہ سبز اراضیات کو رہائشی، صنعتی یا تجارتی مقاصد کے لئے استعمال کرنے کے پیش نظر مختلف قوانین کے تحت مقدمات میں بھی دائر کئے جائیں گے۔

۵۔ اراضیات وغیرہ کی نوعیت کے بارے میں کوئی بھی پوچھ تاچھ ڈی۔ ڈی۔ اے کے سنٹرل ریکارڈ سیل کمرہ نمبر ۱۲۴ بلاک "بی" وکاس بھون سے کی جاسکتی ہے۔

(بی سہائے)

ڈائریکٹر لینڈز مینجمنٹ

(جاری کردہ منیجر پبلک ریلیشنز اشتہار نمبر ۸ ایم/۴۳/۴۰)

جو پہنے کوہ نور

وہ ذہین باشعور

ذہین اور حوصلہ مند جس کے ہاتھ میں مستقبل ہوگا۔ یہ وہ شخص ہے جو کوہ نور کے کپڑے پہنتا ہے اور اس کی معقول وجہ بھی ہے۔ ۱۹۰۶ء سے کوہ نور ملز کی ہر ممکن کوشش رہی ہے کہ جو کپڑا بھی بنائے وہ اعلیٰ ترین درجے کا ہو۔ کوہ نور کپڑے دوسرے کپڑوں سے ذرا مختلف ہوتے ہیں۔ مہنگے نہیں۔ لیکن مختلف ضرور

آپ بھی کوہ نور کے کپڑے پہنیں

سوٹنگ :۔ سوتی اور سنتھیٹک۔ ہر نفیس ڈیزائن کے لئے مناسب۔

شرٹنگ :۔ اعلیٰ ترین سوتی کپڑے ٹرائی کوبین۔ سنتھیٹک بش شرٹ کے لئے سوتی کپڑا۔

رفتار میں سب سے آگے۔ آپ بھی کوہ نور کے کپڑے پہن کر شامل ہو جائیے۔



فرقہ واریت کے ڈونئے شکار

ناگور اور ہزاری باغ

ناگور کا فساد (وی. بھوجوانی)

۲۱ مارچ ۱۹۷۳ء کو ناگور کے اک مقامی کالج کے ایک فرسٹ ایر کے طالب علم شری ریش کا قتل ہوا۔ جس کے نتیجہ میں شہر میں زبردست فرقہ وارانہ کشیدگی پھیل رہی تھی۔ میں ۲۶ مارچ کی صبح کو صورت حال کا مطالعہ کرنے کی غرض سے ناگور پہنچ گیا۔ شری ریش آر. ایس. ایس کا ایک تربیت یافتہ ورکر تھا۔ چند ماہ پہلے اس نے اقلیتی فرقہ سے متعلق ایک شخص یوسف کے پٹرول پمپ کو آگ لگانے میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ یہ فسادات دونوں فرقوں کے درمیان ایک قبرستان کی زمین کے سلسلے میں رونما ہوئے تھے۔ ناگور میں اقلیتی فرقہ کے لوگ اپنے قبرستان کے چاروں طرف باڑھ لگانا چاہتے تھے۔ ان میں کچھ ایسے غیر معمولی جوشیلے لوگ بھی تھے جنھوں نے باڑھ لگاتے وقت زمین کا کچھ حصہ جو شمشان بھومی سے متعلق تھا قبرستان میں شامل کر لیا۔ چنانچہ جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ بدقسمتی کی بات یہ کہ کانگریس کی مقامی قیادت دونوں فرقوں کے درمیان اس معاملے کو طے کرنے اور قبرستان اور شمشان بھومی کی صحیح حدود قائم کرنے میں ناکام رہی۔ چنانچہ دونوں فرقوں کے درمیان شرپسند عناصر نے اس جھگڑے کو فسادات کی شکل دے دی۔ اکثریتی فرقہ سے متعلق شرپسند غنڈوں نے یوسف کے پٹرول پمپ کو آگ لگا دی اور اس طرح یوسف کے بیٹے سے انتقام لیا۔ جس نے خود بھی فسادات میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ حالانکہ وہاں پر تجارت پیشہ حلقہ میں یوسف کو کافی شہرت اور مقام حاصل ہے۔ اس کے بعد سے یوسف کے بیٹے اور ریش کے درمیان مستقل دشمنی قائم ہو گئی اور جس کا انجام ۲۱ مارچ کو ریش کے قتل کی صورت میں سامنے آیا۔ یوسف کا بیٹا (جو قتل کی سازش میں شریک تھا) اور ریش عام طور پر ایک نائی کی دوکان میں گھنٹوں بیٹھا کرتے تھے ان کے درمیان ہنسی مذاق بھی ہوتا تھا اور اکثر لڑائی بھی۔ اور یہ صورت قبرستان کے جھگڑے سے پہلے تک جاری تھی۔ قتل کے روز اور اس سے پہلے کئی بار ریش اور یوسف کے بیٹے کے گروہوں کے درمیان زبردست لڑائی ہوتی رہی تھی۔ قتل کے روز یہ ہوا کہ شام کے وقت دونوں اسی نائی کی دوکان پر بیٹھے تھے۔ کسی بات پر جھگڑا ہوا اور دونوں ہاتھا پائی پر اتر آئے۔ اور اس کے بعد دونوں نے ایک دوسرے کو ختم کرنے کی دھمکی دی اور چلے گئے۔ یوسف کا بیٹا اسی وقت بھاگا ہوا اپنے ماموں کے پاس گیا۔ جو فوراً ہی ایک چھرا لے کر اس کے ساتھ نکل کھڑا ہوا۔ نائی کی دوکان سے تھوڑے فاصلے پر ایک محلہ ہے۔ جو سراوگیان کا محلہ کہلاتا ہے ریش وہاں پہنچا ہی تھا کہ دونوں نے اسے جا لیا۔ لڑائی ہوئی اور لڑائی کے دوران ریش کے سینہ میں چھرا بھونک دیا گیا۔ اس صورت حال کے پیش نظر ظاہر ہے اس قتل کی وجہ ذاتی دشمنی اور اشتعال تھی۔ ناگور میں جس شخص سے بھی میری ملاقات ہوئی اس کی معلومات تقریباً یہی تھیں اور ان دونوں کے درمیان پرانی دشمنی کا جن لوگوں کا علم تھا انھیں اس واقعہ پر زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔

جب یہ دونوں لڑکے (یوسف کا بیٹا اور اس کا ماموں لیاقت) ریش کو قتل کرنے کے بعد گھر پہنچے تو شری یوسف کی بیوی یعنی لیاقت کی بہن اور دوسرے لڑکے کی ماں کا فوری ردعمل کیا تھا اس پر بھی یہاں روشنی ڈالنا مناسب ہوگا۔

شری یوسف کی بیوی نے جب ان دونوں لڑکوں کے کپڑوں پر خون کے دھبے دیکھے تو اس نے ان پر بے تحاشہ چیخنا شروع کر دیا۔ اس نے اس کی بھی قطعی پروا نہ کی کہ پڑوس میں ہندو رہتے ہیں اور انھیں اگر اس واقعہ کا علم ہو گیا تو کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس نے چیخ چیخ کر پوچھا "بتاؤ تمہارے کپڑوں پر یہ خون کے دھبے کیسے ہیں؟" دونوں لڑکوں نے کچھ بتانے سے گریز کیا تو اس نے انھیں دھکے دے کر گھر سے نکال دیا وہ چیخ رہی تھی ظالم

زادوں میرے گھر سے نکل جاؤ۔"

اورجب پولیس گھر پر پہنچی تو اس نے پولیس کو صاف صاف بتا دیا۔ پولیس نے دونوں کو گرفتار کر لیا۔ اس کے بعد سے اس خاتون نے دونوں لڑکوں کی شکل دیکھنا گوارا نہ کی۔ اور جب ایک بار پولیس دونوں کو گھر لائی اور اس خاتون کو علم ہوا کہ رمیش، جسے وہ اچھی طرح جانتی تھی ان کی گھناؤنی حرکت کا شکار ہوا ہے تو اس نے پولیس کی موجودگی میں چیخ چیخ کر کہا "حرام زادوں اس کے بڈھے باپ پر بھی تمہیں رحم نہیں آیا"۔ اس طرح اس یقین کو اور تقویت ملتی ہے کہ جرم ان لڑکوں کا قطعی طور پر ذاتی عمل تھا۔

لیکن فرقہ پرستوں کے لئے یہ واقعہ فسادات بھڑکانے کا ایک سنہری موقع تھا۔ انھوں نے رمیش کو "شہید" بنا دیا۔ گویا رمیش پورے ہندو فرقے کا نمائندہ تھا اور مجرمین پورے مسلمان فرقے کے۔ انھوں نے جلوس نکالنے کے لئے لاش کا مطالبہ کیا۔ پولیس نے انھیں جلوس نکالنے کی اجازت دے کر زبردست غلطی کی۔ جلوس میں اشتعال آمیز نعرے لگائے گئے مثلاً "خون کا بدلہ خون" وغیرہ وغیرہ۔ جلوس میں شریک شرپسند عناصر جو عام طور پر جلوس کے پیچھے ہوتے ہیں انھوں نے جلوس سے علیحدہ ہو کر تشدد کی کارروائیاں شروع کر دیں۔ ان کارروائیوں میں سب سے بڑا واقعہ اقلیتی فرقے سے متعلق ایک دواؤں کے اسٹور (سید ڈرگ اسٹور) کو آگ لگائے جانے کا تھا نقصان کا اندازہ تقریباً ۵۰ ہزار روپے تک کا لگایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ چھوٹی چھوٹی دوکانیں اور گاڑیاں وغیرہ جلائی گئیں۔ اس قسم کے چھوٹے چھوٹے واقعات کی تعداد چھ ہے۔ ان بے چاروں کے نقصان کا اندازہ بھی ۵۰ اور ۶۰ ہزار روپے کے درمیان ہے۔ البتہ لوٹ مار نہیں کی گئی صرف املاک کو آگ لگانے پر اکتفا کیا گیا۔ قتل وغیرہ کے واقعات بھی نہیں ہوئے۔ اور نہ یہ کشیدگی قرب و جوار کے دیہاتی علاقوں کی طرف بڑھی۔ یہ کہنا ضروری ہوگا کہ اگر پولیس موثر طور پر صورت حال سے نہ نمٹتی تو فسادات کی آگ شدت سے بھڑک سکتی تھی۔

لیکن افسوسناک بات یہ ہے کہ کانگریس کے مقامی رہنماؤں نے اس موقع پر ہندوؤں کی ہمدردی کھوئے جانے کے خوف سے فرقہ پرستوں کا صحیح ڈھنگ سے مقابلہ نہیں کیا۔ ان پر یہ خوف طاری رہا کہ کہیں لیڈرشپ جن سنگھ کے ہاتھوں میں نہ چلی جائے۔ جن سنگھ کے ورکروں کے ساتھ ساتھ ان میں سے بھی کچھ لوگوں نے بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ لیکن بہر حال میں ان کا شکر گذار ہوں کہ انھوں نے میرے اس مشورے کو قبول کیا کہ وہ اپنی بھوک ہڑتال گاندھی جی کے انداز پر جاری رکھیں جس کا مطلب لوگوں کے دلوں کو بدل ڈالنا ہو۔ اور یہ طریقہ مفید ثابت ہوا۔ یہ ہڑتال گیارہ بجے کی گئی اور شام تک اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ میونسپل ہال میں جمع ہونا شروع ہو گئے۔ انھوں نے یقین دلایا کہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی بہر صورت قائم رکھی جائے گی۔ بھوک ہڑتال ختم ہو گئی۔ ہڑتال ختم ہونے کی خبر سن کر دوکانیں کھلنا شروع ہو گئیں اور سڑکوں پہ دونوں فرقوں کے لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ پھر سے جاری ہو گیا۔

کشیدگی پھیلانے میں افواہیں کس طرح کام کرتی ہیں اس کا اندازہ اِس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۲۵ر تاریخ کو جب کہ ہڑتال ختم ہونے والی تھی شری لودھا ایک جن سنگھی ایم۔ ایل اے جو آر۔ ایس۔ ایس کے کچھ ورکروں کے ساتھ وہاں پہنچے تھے انھوں نے یہ افواہ پھیلا دی کہ پولیس قاتلوں سے مل گئی ہے اور پولیس نے انھیں گرفتار نہیں کیا ہے۔ جب کہ ان کی گرفتاری اسی رات عمل میں آ چکی تھی۔ اس افواہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہڑتال ختم نہ ہو سکی اور کشیدگی میں اور اضافہ ہو گیا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ کسی نے ان بے بنیاد افواہوں کی تردید کرنے کی کوشش نہیں کی۔

میں مندرجہ بالا واقعات کی روشنی میں تجویز کرتا ہوں کہ

شمشان اور قبرستان دونوں کی حدود واضح طور پر مقرر کی جائیں اور ان کے گرد پکی دیواریں کھڑی کی جائیں تاکہ ہمیشہ کے لئے یہ جھگڑا ختم ہو سکے۔

۲۔ ملزموں کو مناسب سزا مل سکے اس کے لئے پر اثر سرکاری وکلا کا انتظام ہونا چاہیئے۔

۳۔ یہ تحقیق کی جائے کہ جلوس کی اجازت کن حالات میں اور کیوں دی گئی اور غلط افسران کے خلاف سخت کارروائی کی جائے، ساتھ ہی ایسے افسران کی حوصلہ افزائی کی جائے جنھوں نے حالات کو مزید خراب ہونے سے بچانے کے لئے فوری طور پر موثر اقدامات کئے۔

۴۔ ضلع کی سطح پر کانگریس کی سیاسی شاخ کو تیار کیا جائے کہ حالات کا جرأت اور حوصلہ کے ساتھ مقابلہ کرے اور فرقہ پرست عناصر کی سازشوں کا پردہ فاش کرے۔

۵۔ ڈی۔ سی۔ سی۔ ایس سامپردائکتا وِرودھی مقامی کمیٹیوں کے ساتھ مل کر قومی یکجہتی کے لئے کام کرے اور اقلیتی فرقوں کی جائز شکایات کو دور کرانے میں مدد دے۔

۶۔ جو لوگ فساد کا شکار ہوئے ہیں ان کو مناسب معاوضہ دیا جائے۔

ہزاری باغ کے فسادات (این۔ کے۔ سنگھ

ہزاری باغ کے فساد زدہ شہر اور نواحی علاقوں میں جہاں گزشتہ ۲ار اپریل سے ۶ار اپریل تک بڑے پیمانے پر تشدد، آتش زنی اور قتل و غارت گری کا بازار گرم رہا۔ حالات اب رفتہ رفتہ معمول پر آ رہے ہیں۔ شہر اور مضافات میں ۲ار اپریل کو جو کرفیو لگا دیا گیا تھا اسے ۱۹ر اپریل کو اٹھا لیا گیا ہے لیکن دفعہ ۱۴۴ ابھی بدستور نافذ رہے گی۔

پولیس فورس، جس میں بارڈر سیکورٹی فورس کے دستے شامل ہیں اور جس کو قریب کے اضلاع سے بلایا گیا تھا، متاثرہ علاقہ میں خیمہ زن ہے اور اس کا گشت برابر جاری ہے۔ حکام کسی بھی ناخوشگوار

واقعہ کو روکنے کے لئے پوری طرح چوکس ہیں تقریباً تین سو افراد کو گرفتار کیا جا چکا ہے اور قانون کی مختلف دفعات کے تحت ۱۸ مقدمات درج کئے جا چکے ہیں۔ مرکزی حکومت نے وزارت داخلہ کے ایک سینیر افسر کو پورے حالات کا موقع پر جائزہ لینے کے لئے ہزاری باغ بھیجدیا ہے۔

یہ فساد جس کے نتیجے میں سرکاری ذرائع کے مطابق ۱۳ موتیں ہوئیں...... اگرچہ افسران کو خود پوری طرح یقین نہیں ہے کہ "آیا تمام لاشیں دستیاب ہو گئی ہیں"...... اور ۳۶ افراد (جن میں بیشتر مسلمان ہیں) زخمی ہوئے، ۱۲ اپریل کو ہزاری باغ سے تین کلومیٹر دور پلوار گاؤں میں رام نومی کے ایک جلوس پر مبینہ حملہ کا نتیجہ تھا۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ چھوٹا ناگپور کے علاقے کے رام نومی کے جلوس ملک کے دوسرے علاقوں کے رام نومی جلوسوں کے مقابلے میں کچھ مختلف ہوتے ہیں۔ رانچی کے ۱۹۶۷ء کے فسادات کے بعد سے یہ جلوس، مختلف اکھاڑوں کے ذریعہ جن میں سے اکثر پر اب آر۔ ایس۔ ایس کا تسلط ہے، طاقت کا رعب جمانے کا ایک ذریعہ بن گئے ہیں اور ہر نئے سال، یہ جلوس پچھلے سال کے مقابلے میں زیادہ بڑے پیمانے پر نکالے جاتے ہیں۔ اس جلوس میں یہ بات بھی عام ہے کہ خاتون تماشائیوں کو چھوڑ کر جلوس میں شریک ہونے والے سبھی لوگ مہلک ہتھیاروں سے لیس ہوتے ہیں۔ عام طور پر یہ بھی ہوتا ہے کہ جلوس والے مجنونانہ نعرے لگا کر اس مذہبی تہوار کو فرقہ وارانہ رنگ دیدیتے ہیں۔

نتیجہ یہ ہے کہ چھوٹا ناگپور کے ایسے شہروں اور دیہاتوں میں سے اکثر میں، جہاں مسلمانوں کی اچھی خاصی آبادی ہے، رام نومی سے پہلے ہی فضا میں ایک تناؤ اور کشیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اکثر بہت منظم طور پر جلوس پر مسلمانوں کے حملے کے خطرے کی افواہیں بھی پھیلائی جاتی ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں رام نومی کے موقع پر ایسا ہی ایک فساد چائی باسا ضلع میں ہو چکا ہے۔

چائی باسا کی طرح ہزاری باغ میں بھی رام نومی سے پہلے زبردست کشیدگی موجود تھی اور اس کشیدگی کی وجہ بھی ویسی ہی تھی جیسی کہ چائی باسا میں، یعنی جلوس کا راستہ۔ یہاں ایک متنازعہ قطعہ زمین ہے جس پر دونوں فرقے ملکیت کے دعویدار ہیں۔ اکثریت کا دعویٰ ہے کہ یہ عام افتادہ زمین کا ایک ٹکڑا ہے جب کہ اقلیت کے لوگ اسے اپنے قبرستان کا ایک حصہ بتاتے ہیں...... سرکاری ذرائع کا کہنا ہے کہ تصادم درحقیقت اس لئے ہوا کہ اقلیتی فرقے کو یہ ڈر تھا کہ متنازعہ اراضی کے متعلق جلوس والے دعویٰ دائر کر دیں گے۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اس افسر نے جلوس کو اس راستہ سے گزرنے ہی کیوں دیا جب کہ نقضِ امن کا اندیشہ موجود تھا۔ حالات کا تقاضا تو یہ تھا کہ کشیدگی کی موجودگی کی وجہ سے اس جلوس کو بالکل ہی موقوف کر دیا جاتا۔

جیسا کہ فسادات کا عام ڈھنگ رہا ہے۔ کشیدگی کی موجودگی سے فرقہ وارانہ عناصر کو اپنی سرگرمیاں تیز کرنے کا بہانہ مل گیا۔ بڑے پیمانے پر افواہیں پھیلائی گئیں، یہاں تک کہ پلوار میں اور آس پاس ہر شخص کو یہ یقین ہو گیا کہ کوئی آفت آ کر رہے گی۔

جلوس جب متنازعہ اراضی پر سے گزرنے لگا تو مبینہ طور پر اس پر پتھراؤ کیا گیا اور "حملہ" کیا گیا۔ قدرتی طور پر اس سے عام قیاس یہی کیا جا سکتا تھا کہ یہ اقلیتی فرقہ کی حرکت ہے۔ جب کہ غور طلب بات یہ ہے کہ اکثر اس قسم کے واقعات (گزشتہ موقعوں پر بھی) شرپسندوں کی کارستانی ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر چائی باسا کے فساد کے سلسلہ میں یہ کہا گیا تھا کہ جلوس پر "بموں سے حملہ کیا گیا تھا" لیکن حقیقت میں یہ بم وہ پٹاخے تھے جن کو خود جلوس والے کثرت سے چھوڑتے ہیں۔

اس حملے کے بعد آناً فاناً یہ آگ ہزاری باغ اور اس کے نواحی علاقوں تک پھیل گئی۔ آتش زنی لوٹ مار اور چھرے بازی کا بازار گرم ہو گیا۔ جو لوگ نشانہ بنے ان میں سے اکثر اقلیتی فرقے کے تھے۔

یہ حقیقت ہے کہ حملہ کا پہلا واقعہ ۱۲ اپریل کو ہوا لیکن فساد کو آئندہ چار دن تک بڑھنے دیا گیا جب کہ اعلیٰ پولیس افسر پولیس کی ایک بڑی مسلح جمعیت کے ساتھ موقع پر موجود تھے اس بات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کچھ افسران ان لوگوں سے ساز باز کئے ہوئے تھے جنھوں نے فرقہ وارانہ عناصر کو اکسایا۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ چھرے بازی کے زیادہ تر واقعات کرفیو کے اوقات میں ہوئے ـــــ خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ بی۔ ایس۔ ایف اور بہار ملٹری پولیس دونوں کو "دیکھتے ہی گولی مار دو" کا حکم تھا۔ جبل پور کے فسادات کے بعد امن اور قانون کے محافظوں کی فرقہ وارانہ ہنگاموں میں بڑھتی ہوئی شرکت اور شمولیت کے پیش نظر یہ کوئی حیرت کی بات نہیں رہ گئی ہے۔

جن تین سو افراد کو گرفتار کیا گیا ہے ان میں ایک جھارکھنڈ پارٹی کی ضلع یونٹ کا خزانچی اور ایک جن سنگھ کا لیڈر ہے۔

ہزاری باغ کے واقعات کے سلسلے میں شری رام پرشاد سہائے سابق ایم۔ ایل۔ اے نے یہ الزام لگایا ہے کہ انتظامیہ اس لئے اس کشت و خون کو نہ روک سکی کیونکہ وہ سماج کے اس بااثر طبقہ سے ڈرتی تھی جو اس فساد کا ذمہ دار تھا۔ امن کمیٹی کے ممبروں نے ایک بڑے بیوپاری پر کھلم کھلا الزام لگایا ہے کہ وہ اندرا پوری سینما ہاؤس کے پاس اپنی نگرانی میں دکانوں کو لٹوا رہا تھا اور آگ لگوا رہا تھا۔

امن اور ترقی کی حامی قوتوں کو چاہیئے کہ وہ اس علاقے کو جو فرقہ وارانہ عناصر کے لئے ایک زرخیز زمین بنتا جا رہا ہے۔ اس قسم کے مزید واقعات سے محفوظ رکھنے کے لئے پوری قوت سے جدوجہد کریں۔

[redacted]

یہ احساس کمتری کب تک؟ بقیہ صفحہ ۳۲

کو فروغ اور جھگڑوں کو ہوا دینا ہے۔ آپ ان سے ذرا نہ گھبرایئے ان سے ہرگز نہ ڈریئے۔ اگر ان کا ہوا آپ کے دماغ پر مسلط رہا تو آپ کہیں کے بھی نہ رہیں گے۔ کاروبار صنعت و حرفت کی دوڑ میں صدیوں پیچھے رہ جائیں گے۔ تعلیمی میدان میں آپ قطعی پچھڑ کر رہ جائیں گے ان کا جو کام ہے وہ ان کو برابر اور مستقل کر دیجئے اور آپ اپنے کام میں جٹ جائیں اور اعلان کر دیجئے کہ

آشیاں بناؤں گا میں بھی ہر ایک شاخ پر
کیا میری ضد میں باغباں سارا چمن جلائے گا

آپ مدافعت کے لئے حکومت سے مدد لیجئے وہ آپ کے ساتھ ہے لیکن پتھر کا جواب پتھر سے نہ دیجئے گالی کا جواب ہرگز گالی نہیں ہے اس لئے کہ

ظلم کا بدلہ پیار سے دے
کنکر لے کر ہیرے تول

اچھی بات ہے۔ اس طرح کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا ہے کیا آپ کے وہ دور ترقی یاد نہیں ہے جب آقائے نامدار محمد مصطفیٰ صلعم پر پتھراؤ ہوا کرتا تھا، گالیاں دی جاتی

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

تھیں، ہر طرح سے پریشان کیا جاتا تھا لیکن قربان جایئے اس ذات عظیم پر کہ آپ نہ پتھر کا جواب پتھر سے دیتے تھے، نہ گالی کا جواب گالی سے، بلکہ نہایت صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا جاتا تھا اور ایسے لوگوں کو دعائے خیر سے یاد فرماتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ متعصب، وہ دشمن، وہ فرقہ پرست خود ہی جب سادھ کر بیٹھ رہے

آج بھی ایسا ہی کیجئے ذرا اس مصطفائی نکتہ پر عمل تو کر دیکھئے پھر دیکھئے آپ کی زندگی کیا ہو گی، آپ کہاں ہوں گے؟ ذرا پتھر، اینٹ، آگ، گالی سے ہٹ کر بات کیجئے کون ایسا فرقہ پرست ہو گا جو آپ سے ہاتھ نہیں ملائے گا۔ آپ کی دوستی پر فخر نہیں کرے گا لیکن آپ ایسا کر نہیں سکتے اور اسی طرح احساس کمتری کا شکار رہیں گے، یونہی حکومت اور فرقہ پرستوں کی شکایت کرتے رہیں گے۔ آخر آج کے دور میں ایسی باتوں سے کیا حاصل ہوتا ہے کچھ بھی نہیں۔

آیئے! اپنے وطن عزیز کے لئے کچھ کیجئے! اپنے مستقبل کو تابناک بنایئے اور شکوہ و شکایت پر تھوکئے یہ زندگی نہیں ہے یہ آپ کی موت ہے آپ کے لئے زہر ہے، آپ کے بچوں کے لئے قعر مذلت سے کم نہیں۔ آپ اس طرح کبھی نہیں اُبھریں گے زندگی بھر سسکتے رہیں گے۔

جمود زیست مٹانا بڑا ضروری ہے

[redacted]

سامپردائکتا وِرودھی کمیٹی کی سرگرمیاں

فرقہ واریت کے خلاف ممبرانِ پارلیمنٹ کی کمیٹی کی وزیراعظم کے نام یادداشت جو ۱۹ اپریل ۱۹۷۳ء کو پیش کی گئی

سیکولرازم ہندوستانی آئین کے بنیادی اصولوں میں سے ایک ہے، اس لحاظ سے کہ آئین نے مذہب، ذات عقیدہ اور جنس سے قطع نظر ۔۔۔۔۔ سب کو مساوی حقوق دیئے جانے پر زور دیا ہے۔ آئین میں اقلیتوں کے اپنے مذہب کے ادعا، اپنی تہذیبی انفرادیت کی بقا اور فروغ اور ملک کی سیاسی اور سماجی زندگی میں بھرپور حصہ لینے کے سلسلے میں تحفظات کا خاص طور پر ذکر موجود ہے۔ لیکن یہ بات اپنی جگہ پر مسلّم ہے کہ اقلیتوں، خاص طور پر مسلمانوں کو قومی زندگی میں اُتنا حصہ نہیں ملا ہے جس کی وہ مستحق ہیں۔ اس کی مختلف توجیہیں کی جا سکتی ہیں لیکن حکومت اور سماج، اُن رکاوٹوں کو دور کرنے کی اپنی ذمہ داری سے بچ نہیں سکتے جو اقلیتوں کو قومی زندگی میں شریک ہونے میں آڑے آتی ہیں۔ ظلم اور ناانصافی کا شکار ہونے کا مستقل احساس اقلیتوں میں الگ تھلگ ہونے کا غیر صحت مند جذبہ پیدا کر دیتا ہے اور علیحدگی پسندی، فرقہ واریت اور گٹ بندی کے غیر ذمہ دارانہ رجحانات کو جنم دیتا ہے۔ ایک صحت مند، متحد اور ترقی پسند قومی زندگی کے مفاد میں یہ ضروری ہے کہ اقلیتوں میں اعتماد کا احساس پیدا کیا جائے اور ان کو قومی زندگی میں آزادانہ طور پر حصہ لینے کا موقع دیا جائے۔

مندرجہ بالا مقاصد کے حصول کے لئے کمیٹی درج ذیل اقدامات کی سفارش کرتی ہے۔

۱۔ مرکز میں وزیراعظم کے ماتحت اور ہر ریاست میں وہاں کے وزیراعلیٰ کے ماتحت ایسے محکمے ہوں جو اقلیتوں کے مفادات کی دیکھ بھال کریں۔ ان محکموں کا کام یہ ہوگا کہ ۔۔ (۱) فرقہ وارانہ پروپیگنڈے اور فرقہ وارانہ تشدد کے متعلق قومی یکجہتی کونسل کی سفارشات پر پوری طرح عملدرآمد ہو۔

(ب) سرکاری ملازمتوں میں بھرتی اور تجارت وصنعت کے لئے سہولتیں مہیا کئے جانے میں اقلیتوں کے خلاف کسی قسم کا امتیاز نہ برتا جائے۔

(ج) اقلیتوں کی اپنی تعلیمی، سماجی اور اقتصادی پس ماندگی پر قابو پانے کے لئے مناسب طور پر ہمت افزائی کی جائے تاکہ وہ برابری اور بھائی چارے کی حقیقی بنیادوں پر قومی زندگی میں حصہ لے سکیں۔

۲۔ یہ بات سبھی مانتے ہیں کہ قومی زندگی میں اردو کو اس کا جائز مقام ملنا چاہیئے۔ یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ اردو بولنے والے شہریوں کو اس بات کا اطمینان دلایا جائے کہ سرکاری ملازمتوں کے معاملے میں، تجارت وصنعت اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں ان کو مساویانہ مواقع حاصل ہوں گے اور ہر کہ انتظامیہ سے کاربراری میں انہیں کوئی دقت نہ ہوگی۔ اس سلسلے میں کمیٹی مندرجہ ذیل اقدامات کی سفارش کرتی ہے۔

(ا) اردو کے ذریعہ تعلیم حاصل کرنے والوں کو سرکاری ملازمتوں کے وہی مواقع حاصل ہونا چاہئیں جو آئین کے شیڈول نمبر ۸ میں درج دوسری زبانوں میں تعلیم حاصل کرنے والوں کو میسر ہیں۔

(ب) اردو میڈیم اسکولوں میں متعلقہ صوبے کی غالب زبان کی تعلیم کا مناسب انتظام ہونا چاہیئے۔

(ج) ایسی ریاستوں اور علاقوں میں، جہاں اردو بولنے والوں کی خاصی بڑی تعداد موجود ہے، وہاں کے سرکاری ملازمین کے لئے اردو کا کوئی استعدادی امتحان (Qualifying Test) پاس کرنا ضروری قرار دیا جائے اور وہاں کے تمام اسکولوں میں اردو کی تعلیم کے انتظامات کئے جائیں۔

(د) ایسے علاقوں اور ریاستوں میں جہاں پچھلے پچاس سال کے دوران کسی وقت بھی اردو سرکاری نظم ونسق کی زبان رہ چکی ہے تمام سرکاری اعلانات، اطلاعات، حکم نامے اور عدالتی فیصلے اردو میں بھی فراہم کئے جائیں۔

۳۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ کے سلسلے میں فرقہ وارانہ بنیاد پر ترمیم کو خارج از امکان قرار دیتے ہوئے اس میں ایسی ترمیم کی جائے جس سے یونیورسٹی کی خود مختاری بحال ہو اور یہ ترمیمات جمہوریت کی نمائندگی اور علمی زندگی کی ہمہ گیر ترقی کے اصولوں سے بھی ہم آہنگ ہوں۔

۴۔ اس بات کا اچھی طرح اطمینان کرنا چاہیئے کہ مسلم پرسنل لا کے بارے میں حکومت کی پالیسی کی، جس کی وضاحت وزیراعظم نے کر دی ہے حکومت کی ہر سطح پر پورا پورا احترام اور پابندی کی جائے گی۔

۵۔ حکومت کو اپنے ملازمین میں سیکولرازم کی قدروں کے ساتھ وابستگی پیدا کرنے کے لئے مثبت اقدام کرنا چاہیئے تاکہ ان کا رویہ

اور سلوک اقلیتوں کے خلاف ہر قسم کے تعصب سے پاک ہو جائے اور قومی بھائی چارے کے ماحول کو برباد نہ کر سکے۔

وزیراعظم کو

اتر پردیش سامپردائکتا ورودھی کمیٹی کی مجلسِ عاملہ کی یادداشت

محترمہ وزیراعظم صاحبہ!

آپ کو معلوم ہے کہ اتر پردیش اسمبلی کے انتخابات کے قریب آتے ہی فرقہ وارانہ منافرت، طبقاتی امتیاز اور پھوٹ کو ہوا دینے والے، عناصر کی سرگرمیاں بڑھنے لگی ہیں۔ اتر پردیش سامپردائکتا ورودھی کمیٹی کی مجلس عاملہ، فرقہ وارانہ خونریزی اور طبقاتی فسادات کے بڑھتے ہوئے واقعات پر اور رجعت پرست علیحدگی پسندوں کے از سر نو احیا پر اپنی گہری تشویش کا اظہار کرتی ہے۔ جارحانہ رجحان رکھنے والی فرقہ وارانہ تنظیمیں جیسے آر۔ ایس۔ ایس اور جماعت اسلامی اور فرقہ وارانہ سیاسی پارٹیاں جیسے جن سنگھ، مسلم لیگ اور مسلم مجلس ریاست کے امن و امان کو برباد کرنے کے لئے نکل پڑی ہیں۔ سماجی، اقتصادی اور تہذیبی مسائل کا غور سے تجزیہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہریجنوں کے خلاف امتیاز اب بھی موجود ہے اور ذات پات کے بندھنوں سے گہرا لگاؤ اب بھی قائم ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے حالیہ ترمیمی ایکٹ کو بھی بہانہ بنا کر تنظیمی کانگریس اور بھارتیہ کرانتی دَل کے بعض ناعاقبت اندیش سیاست داں فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

یہ بات بھی محسوس کی گئی کہ تمام سیکولر، جمہوری اور ترقی پسند قوتوں کو متحد ہو کر بڑھتی ہوئی فرقہ واریت اور چھوت چھات کا، خواہ وہ مسلمانوں میں ہو یا ہندوؤں میں، موثر طور پر مقابلہ کرنا چاہیئے۔ کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ ان سرگرمیوں کا منظم طور پر مقابلہ کیا جائے۔ چنانچہ مندرجہ ذیل معروضات آپ کی توجہ اور التفات کے لئے پیش خدمت ہیں۔

۱۔ آر۔ ایس۔ ایس اور جماعت اسلامی جیسی فرقہ وارانہ تنظیموں پر پابندی لگائی جائے اور اس سلسلے میں قانون بنایا جائے جس پر عمل درآمد ضروری ہو اور جس کی خلاف ورزی سخت سزا کی مستوجب ہو۔

۲۔ تمام مرکزی یونیورسٹیوں کے انتظام کے لئے یکساں اور جامع بل پارلیمنٹ میں پیش کیا جائے اور یہ بل، جہاں تک ممکن ہو تمام متنازعہ امور پر غور کرنے کے بعد زیادہ جمہوری طرز پر ترتیب دیا جائے۔

۳۔ چھوت چھات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی سماجی نااہلیت Disability کا انسداد کیا جائے۔ اس ضمن میں خصوصی قانون کو جیسے ۱۹۵۵ء کا چھوت چھات ایکٹ، مؤثر طور پر نافذ کیا جائے اور ہریجنوں کے لئے زیادہ تعلیمی سہولتیں فراہم کرنے اور سرکاری اور غیر سرکاری ملازمتوں میں ان کے لئے زیادہ نشستیں مخصوص کرنے کے لئے موثر اقدامات کئے جائیں۔

۴۔ ۱۹۴۸ء کے گورنمنٹ آرڈر کو اس کی مذہبی اساس کے باعث غلط اور غیر قانونی قرار دے کر اس کو فوری طور پر واپس لیا جائے۔

۵۔ کانگریس کے ۱۹۷۱ء کے انتخابی منشور میں کئے گئے وعدوں کے مطابق اردو کی تعلیم کے انتظام کے لئے اقدامات کئے جائیں۔

۶۔ ایسے سرکاری افسران اور پولیس کے عملے کے خلاف سخت کارروائی کی جائے جو خطرناک فرقہ وارانہ حالات میں اپنے فرائض میں کوتاہی کرتے ہوئے یا فرقہ وارانہ کشیدگی کو ہوا دیتے ہوئے پائے جائیں۔ پولیس کے عملے، خاص طور پر پی۔ اے۔ سی کی ذہنی تربیت اور فرقہ وارانہ میل ملاپ، قومی یک جہتی اور مشترک تہذیبی ورثہ کا پس منظر اور اہمیت کو ان کے ذہن نشین کرنے کے لئے خاص قدم اٹھائے جائیں۔

۷۔ قومی یک جہتی کو بڑھاوا دینے کی خاطر تاریخ اور زبان کی نصابی کتابوں پر نظر ثانی کی جائے اور ایسے تعلیمی اداروں اور بچوں کی اکاڈمیوں کی سرکاری مالی امداد روک دی جائے جو تنگ نظر فرقہ وارانہ سرگرمیوں میں ملوث پائے جائیں۔

۸۔ قومی یک جہتی کاؤنسل کی سرگرمیوں کی از سر نو تنظیم کی جائے اور اس کی کارکردگی کو زیادہ موثر بنایا جائے۔

۹۔ کمیٹی نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ ایسے تمام لوگوں کو جو عدم فرقہ واریت اور عدم علیحدگی (Anti - Communalism and anti-separatism) پر یقین رکھتے ہوں سامپردائکتا ورودھی کمیٹی میں شامل ہونے کی دعوت دی جائے۔

آپ کو یہ اطلاع دیتے ہوئے ہمیں بڑی مسرت ہے کہ اتر پردیش ودھان سبھا اور ودھان پریشد کے تمام ترقی پسند پارٹیوں سے تعلق رکھنے والے ممبروں نے اپنے اپنے حلقوں میں فرقہ واریت اور چھوت چھات سے لڑنے کے لئے سامپردائکتا ورودھی کمیٹی کا ایک یونٹ بنا لیا ہے۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آج کی شام آپ ہمارے شہر میں موجود ہیں۔ اس حسن اتفاق سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، علیحدگی پسندی، چھوت چھات اور فرقہ واریت کے خلاف اپنی اس جدوجہد میں کمیٹی آپ سے رہنمائی اور تعاون کی طالب ہے۔

ہم ہیں آپ کے مخلص

لکھنؤ — صدر اور ممبران مجلس عاملہ
اتر پردیش سامپردائکتا ورودھی کمیٹی

الہ آباد ڈویژن کی سامپردائکتا ورودھی کمیٹی کا دو روزہ کنونشن

الہ آباد ڈویژن کی سامپردائکتا ورودھی کمیٹی کا دو روزہ کنونشن ۱۲، ۱۳ اپریل ۱۹۷۲ء کو کانپ[illegible] میں ہوا جس کا افتتاح راجستھان کے چیف منسٹر جناب برکت اللہ خاں نے کیا۔

۱۲/اپریل کے کنونشن کو خطاب کرتے ہوئے برکت صاحب نے اس بات پر زور دیا کہ سماج دشمن عناصر کی تمام کارکردگی پر کڑی نظر رکھی جائے جو ایسے مواقع کے متلاشی رہتے ہیں جن سے اتحاد اور وطن کے قومی اتفاق کو برہم کرکے فائدہ اٹھا سکیں

ان کا خیال تھا کہ موجودہ حالات کا اصل حل عام آدمی کی معاشی حالت کو سدھارنا ہے سرمایہ دارانہ اور احیائے مذہب کے حامی، آسانی سے غریبوں کے جذبات سے کھیل کر انھیں گمراہ کرسکتے ہیں سرمایہ دار غریب سے ناجائز فائدہ اٹھانے میں دلچسپی رکھتا ہے، خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان ـــــ لیکن جب غریب معاشی بہتری کے لئے مشتعل ہوتا ہے تو اپنا مطلب نکالنے والے سرمایہ دار فرقہ وارانہ نعرے دے ان مظلوموں کی توجہ اور طاقت کو دوسری طرف موڑ دیتے ہیں برکت اللہ خاں صاحب نے اس بات پر بھی زور دیا کہ اسکول اور کالج کی کتابوں پر نظر ثانی کی جائے اس لئے کہ موجودہ کتابوں سے فرقہ پرستوں کا مقصد پورا ہوتا ہے۔

اتر پردیش سامپردائکتا وردھی کمیٹی کی صدر شریمتی راجندر کماری باجپئی نے اس بات پر زور دیا کہ اقلیتوں میں محفوظ ہونے کا احساس پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے تمام سیکولر طاقتوں سے اپیل کی کہ وہ ایک ایسا طریقہ اپنائیں جس سے سب متحد ہو کر فرقہ وارانہ اور رجعت پسند عناصر دونوں کو ایک زبردست شکست دے سکیں۔ انھوں نے ہندوستان میں اردو کے سوال پر سنجیدگی سے متوجہ ہونے کی بھی مانگ کی۔ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ میں مزید ترمیم کی ضرورت پر اظہار خیال کیا تاکہ ادارے میں زیادہ جمہوری احساس پیدا ہو سکے۔

انھوں نے اکثریت کے کچھ ایسے لوگوں کی سخت مذمت کی جو کسی بھی اقلیت کی مادر وطن کے لئے وفاداری پر شک کرتے ہیں۔

کل ہند سامپردائکتا وردھی کمیٹی کی صدر شریمتی سبھدرا جوشی نے اپیل کی کہ سیکولر سیاسی جماعت کو کسی بھی فرقہ وارانہ پارٹی سے اتحاد نہیں کرنا چاہیئے انھوں نے کیرالا میں کانگریس اور مسلم لیگ کے اتحاد کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ سوسائٹی کا ایک بہت چھوٹا، لیکن نہایت منظم حصہ، فرقہ وارانہ ماحول کا ذمہ دار ہے اور صرف ایک منظم سیکولر فرنٹ ہی اس خطرے کا مقابلہ کرسکتا ہے۔

۱۳/اپریل کے سیمنار میں جناب شنکر دکشت یونین ہوم منسٹر نے مشورہ دیا کہ کانگریس کے ایسے تمام ممبروں کو جو سیکولرازم پر کسی طرح کا یقین نہیں رکھتے۔ اس تنظیم سے مستعفی ہو جانا چاہیئے۔

جناب ڈی۔ آر۔ گوئل نے جو کہ کل ہند سامپردائکتا وردھی کمیٹی کے جنرل سکریٹری ہیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فوراً کھولے جانے کی مانگ کی اور کہا کہ چند طلبا کی غلطیوں کی سزا تمام طلبا کو نہیں دینی چاہیئے۔

ایک عام میٹنگ میں جو کہ قدوائی نگر میں ہوئی، شری دکشت نے پولیس افسران اور شہری انتظامیہ کے عملے کو متنبہ کیا کہ اگر وہ کسی فرقہ وارانہ جھگڑے میں حصہ لیتے ہوئے دیکھے گئے تو ان کو نوکری سے برطرف کر دیا جائے گا اور ان کے ساتھ سخت برتاؤ کیا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ مذہب نہیں بلکہ غریبی ہمارے ملک کا اصل مسئلہ ہے۔ مذہب اتحاد سکھاتا ہے نا کہ طاقت کی تقسیم ـــــ فرقہ وارانہ ذہنیت کے حامل اپنے مطلب کے لئے مذہب کا غلط استعمال کرتے ہیں۔ قومی یکسانیت ہندوستان کی ترقی کی بنیادی شرط ہے۔ شری دکشت نے صلاح دی کہ سامپردائکتا وردھی کمیٹی کی شاخیں ملک کے کونے کونے میں پھیل جانی چاہئیں ـــــ قدوائی نگر کی یہ عوامی میٹنگ نہایت کامیاب رہی۔ اس میٹنگ میں پندرہ ہزار افراد شامل تھے۔

اس کنونشن نے مندرجہ ذیل قرار دادیں منظور کیں۔

۱۔ سامپردائکتا وردھی کمیٹی کنونشن جو کہ الہ آباد اور کانپور میں ہوا، نہایت افسوس کا اظہار کرتا ہے کہ علی گڑھ اور بنارس یونی ورسٹیاں غیر معینہ مدت کے لئے بند کی گئی ہیں۔ یہ بات نہ صرف طلبا اور ان کے سرپرستوں کو صدمہ پہنچائے گی بلکہ ملک کا بھی نقصان ہوگا اور وہ ان نوجوانوں کے تعاون سے جو قومی قدرشناسی کی صلاحیت رکھتے ہیں، محروم ہو جائے گا۔

کنونشن اس نتیجہ پر پہنچا کہ کچھ سیاسی پارٹیاں سیاسی فرقہ واراریت کے گرداب (Whirlpool) میں پھنسی ان یونیورسٹیوں پر اپنا جال پھینک رہی ہیں یہ کام سیاسی ناآسودگی کے ردعمل کے طور پر ہو رہا ہے اور رجعت پسندی کے سیاسی نمونے کا یہ ایک آلہ ہے۔ نتیجہ کے طور پر طلبا اور استادوں کے درمیان ایک خلیج بنی ہوئی ہے جو کہ یونیورسٹی کی تعلیم میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔

کنونشن نے نیچروں سے اپیل کی کہ طلبا خاص طور سے سیاسی پارٹیوں کی دلچسپیوں کا رخ پھیر کر ایک اعتماد اور خیر خواہی کی فضا پیدا کریں تاکہ یونیورسٹیاں جلد سے جلد کھل سکیں اور تمام ذہنی تکلیف اور نقصان جو یونیورسٹیوں کے بند ہونے سے ہوا ہے اس کی تلافی ہو سکے۔

۲۔ سامپردائکتا وردھی کمیٹی کا بنیادی طور پر یہ خیال رہا ہے کہ فرقہ وارانہ کمیٹیوں کا عوام سے بائیکاٹ کر دیا جائے تاکہ ملک کی فضا سازگار ہو سکے الہ آباد کے اس غیر فرقہ وارانہ کنونشن نے تاسف کے ساتھ نکالا ہے کہ کچھ فرقہ وارانہ کمیٹیاں اس اصول کی خلاف ورزی کر رہی ہیں ـــــ انڈین نیشنل کانگریس اور ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی متفقہ طور پر مسلم لیگ کے ساتھ ہو گئی اور یہ طے کیا کہ ملک میں مسلم لیڈر شپ کی الگ کوئی بات کرنے کو تیار نہیں ہیں اور وہ فرقہ وارانہ سیاست میں الجھنا نہیں چاہتے۔ تجربہ شاہد ہے کہ وہ تمام وعدے جھوٹے ثابت ہوئے اور مسلم لیگ برابر فرقہ وارانہ علیحدگی کے لئے کام کر رہی

ہے۔ اس تجربے نے ثابت کیا ہے کہ کوئی پارٹی جو فرقہ واریت پر قائم ہوتی ہے وقتی طور پر ترقی پسند سیاست پر عمل کر سکتی ہے۔

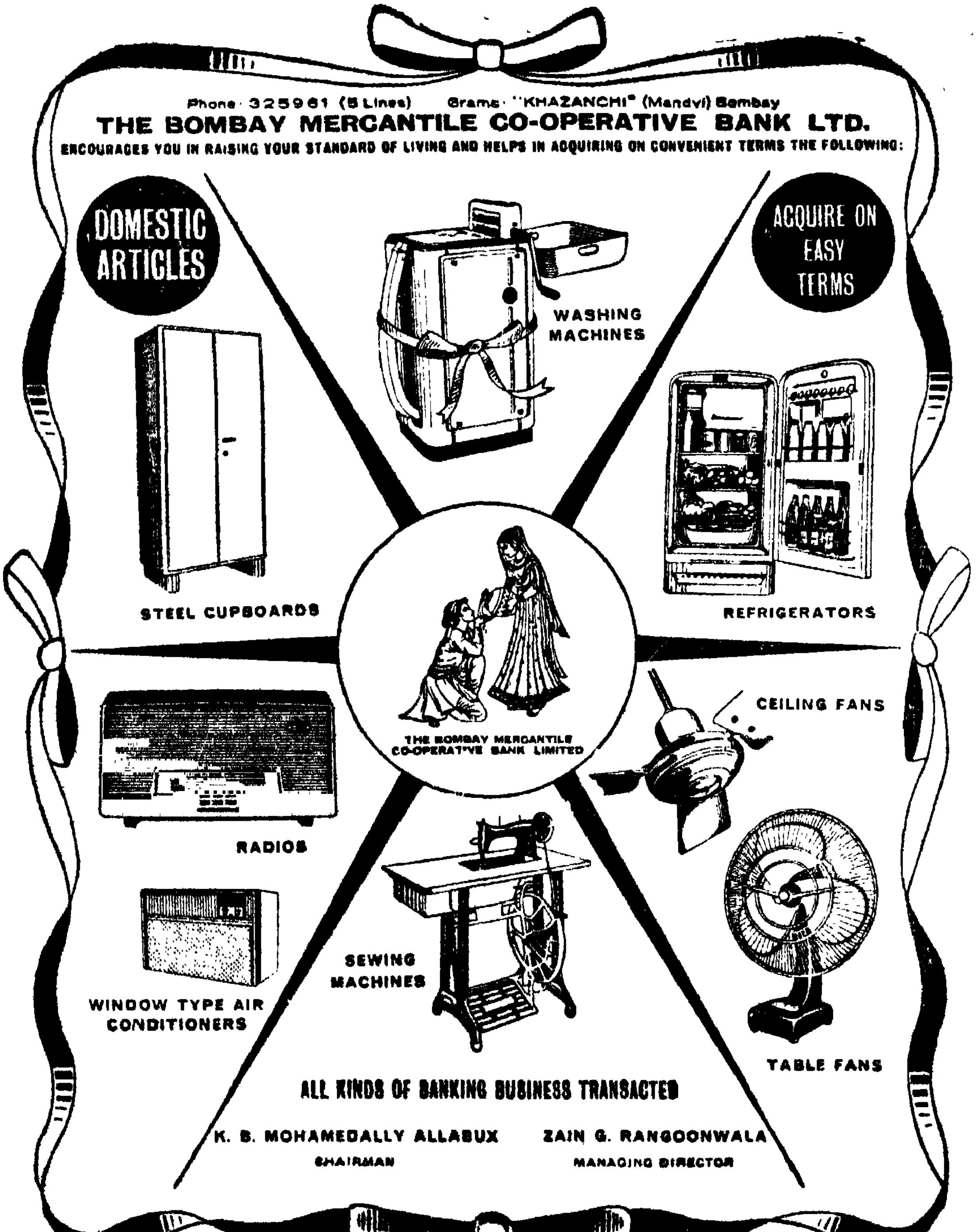
اس کنوینشن نے غیر فرقہ وارانہ عناصر کو متنبہ کیا کہ وہ ان کی سیاسی پارٹیاں فرقہ وارانہ پارٹی سے کسی طرح کی ہم آہنگی، اتحاد اور اتفاق نہیں رکھیں۔

۳۔ فاشسٹ اور فرقہ پرستی کے خطرے نے ملک کو ہوشیار کر دیا ہے اور قوم نے ملک میں فرقہ وارانہ اور نیم فوجی تنظیموں پر پابندی لگانے کی مانگ کی ہے۔ اس خاص مانگ کے تحت اور حال ہی میں ہندوستان کے قانون میں جو ترمیم کی گئی ہے اس کے بعد امید کی جاتی ہے کہ آر۔ ایس۔ ایس اور جماعت اسلامی جیسی تنظیموں پر پابندی لگا دی جائے گی۔ آندھرا پردیش کے حادثات اور علی گڑھ اور بنارس یونیورسٹیوں کے گذشتہ سال کے حالات نے دوبارہ اس حقیقت پر روشنی ڈالی ہے کہ یہ دونوں تنظیمیں ملک میں فرقہ وارانہ فسادات اور تشدد برپا کرنے کا سبب رہی ہیں۔

سامپردائکتا ورودھی کمیٹی کے اس کنوینشن نے گورنمنٹ سے اپیل کی کہ بغیر کسی تاخیر کے ان پارٹیوں پر پابندی عائد کر دی جائے تاکہ ملک میں صحت مند فضا پیدا ہو سکے اور معاشی پلان کو آگے بڑھاتے ہوئے عوام کی ترقی اور حفاظت کو برقرار رکھا جا سکے۔

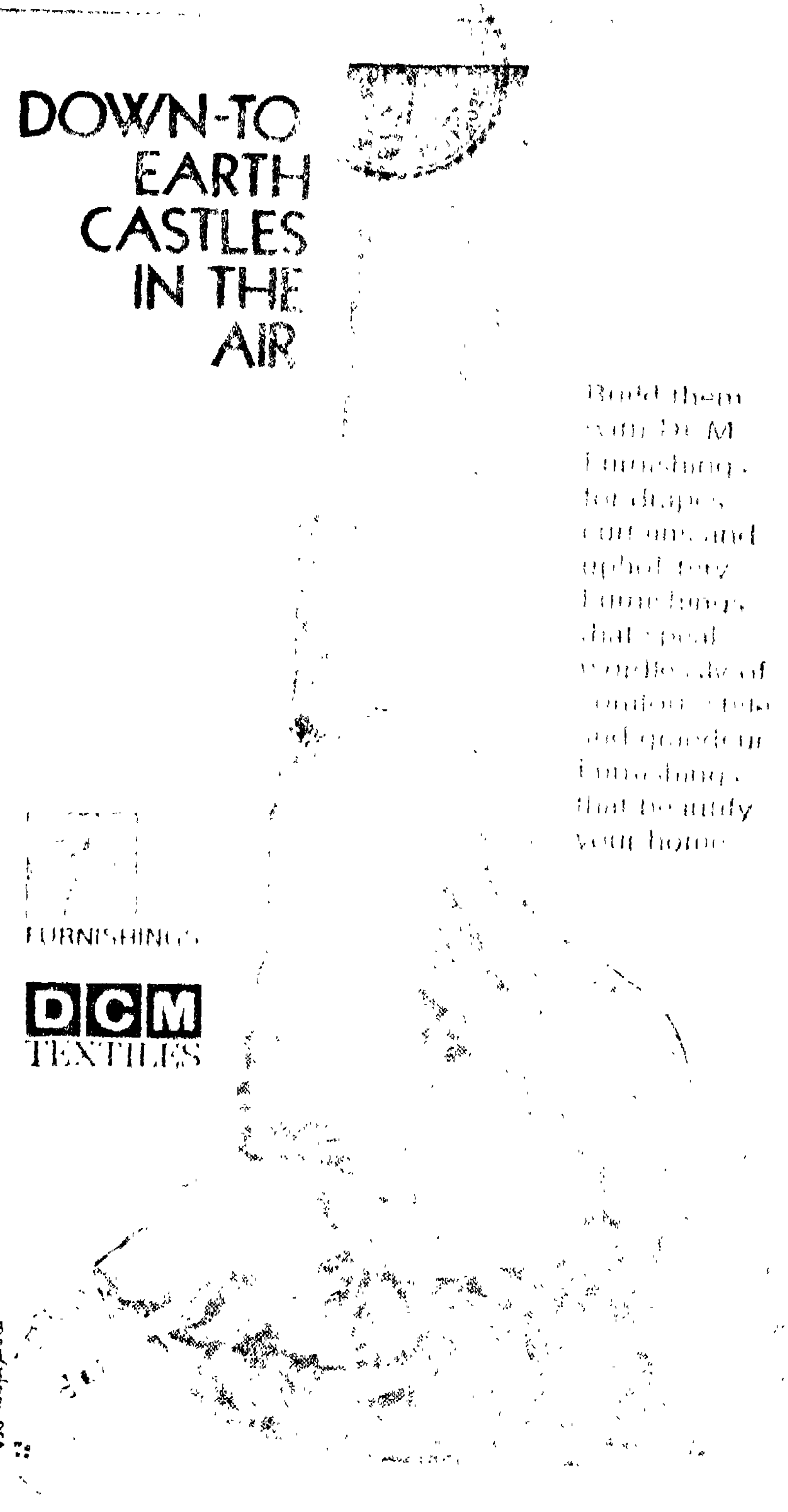
۴۔ ہندوستان کے آئین نے گورنمنٹ اور عوام پر یہ ذمہ داری عائد کی ہے کہ ملک میں سیکولر اور جمہوری نظام قائم کیا جائے ــــــ چند لوگوں کے علاوہ پوری قوم یقین رکھتی ہے کہ ملک میں غیر فرقہ وارانہ سیکولر جمہوریت، ترقی، عزت اور آزادی کی ضامن ہے۔ اس حقیقت سے قطع نظر، افسوس کا مقام ہے کہ انتظامیہ کے کچھ عناصر نہ صرف یہ کہ ان بنیادی اصولوں پر یقین رکھتے ہیں بلکہ ان کی مخالفت بھی کرتے ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات کے کچھ واقعات اس ٹریجڈی کو واضح کرتے ہیں سامپردائکتا ورودھی کمیٹی کا غیر فرقہ وارانہ کنوینشن نے جو کانپور میں ہوا، گورنمنٹ سے پرزور مانگ کی کہ افسران کے رویئے اور اخلاق کی جانچ کی جائے اور کوئی بھی سرکاری ملازم فرقہ وارانہ خیالات کا پرچار کرتے ہوئے پایا جائے تو اسے فوراً نوکری سے برطرف کر دیا جائے۔ گورنمنٹ کی نوکری کے لئے غیر فرقہ واریت پر یقین کو ضروری شرط بنا دینا چاہیئے اور اگر کوئی افسر اعلیٰ فرقہ واریت کا حامی ثابت ہو تو اس کے ساتھ آئین کی خلاف ورزی کرنے کا برتاؤ کرنا ہے۔ اگر کہیں فساد ہو تو اس علاقے کے ذمہ داران افسروں کے بارے میں سمجھنا چاہیئے کہ انھوں نے اپنے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی سے کام لیا ہے۔ ان کی سروس بک میں اس حقیقت کو درج کر دینا چاہیئے۔

کنوینشن یہ بھی مطالبہ کرتا ہے کہ نیشنل انٹیگریشن کاؤنسل کی سرکاری افسران کے بارے میں سفارشات پر پوری طرح عمل کیا جائے۔


Phone 325961 (5 Lines) Grams "KHAZANCHI" (Mandvi) Bombay
THE BOMBAY MERCANTILE CO-OPERATIVE BANK LTD.
ENCOURAGES YOU IN RAISING YOUR STANDARD OF LIVING AND HELPS IN ACQUIRING ON CONVENIENT TERMS THE FOLLOWING:
DOMESTIC ARTICLES
ACQUIRE ON EASY TERMS
WASHING MACHINES
STEEL CUPBOARDS
REFRIGERATORS
THE BOMBAY MERCANTILE CO-OPERATIVE BANK LIMITED
CEILING FANS
RADIOS
SEWING MACHINES
WINDOW TYPE AIR CONDITIONERS
TABLE FANS
ALL KINDS OF BANKING BUSINESS TRANSACTED
K. B. MOHAMEDALLY ALLABUX
CHAIRMAN
ZAIN G. RANGOONWALA
MANAGING DIRECTOR

Regd. No. R.N. 16241/68

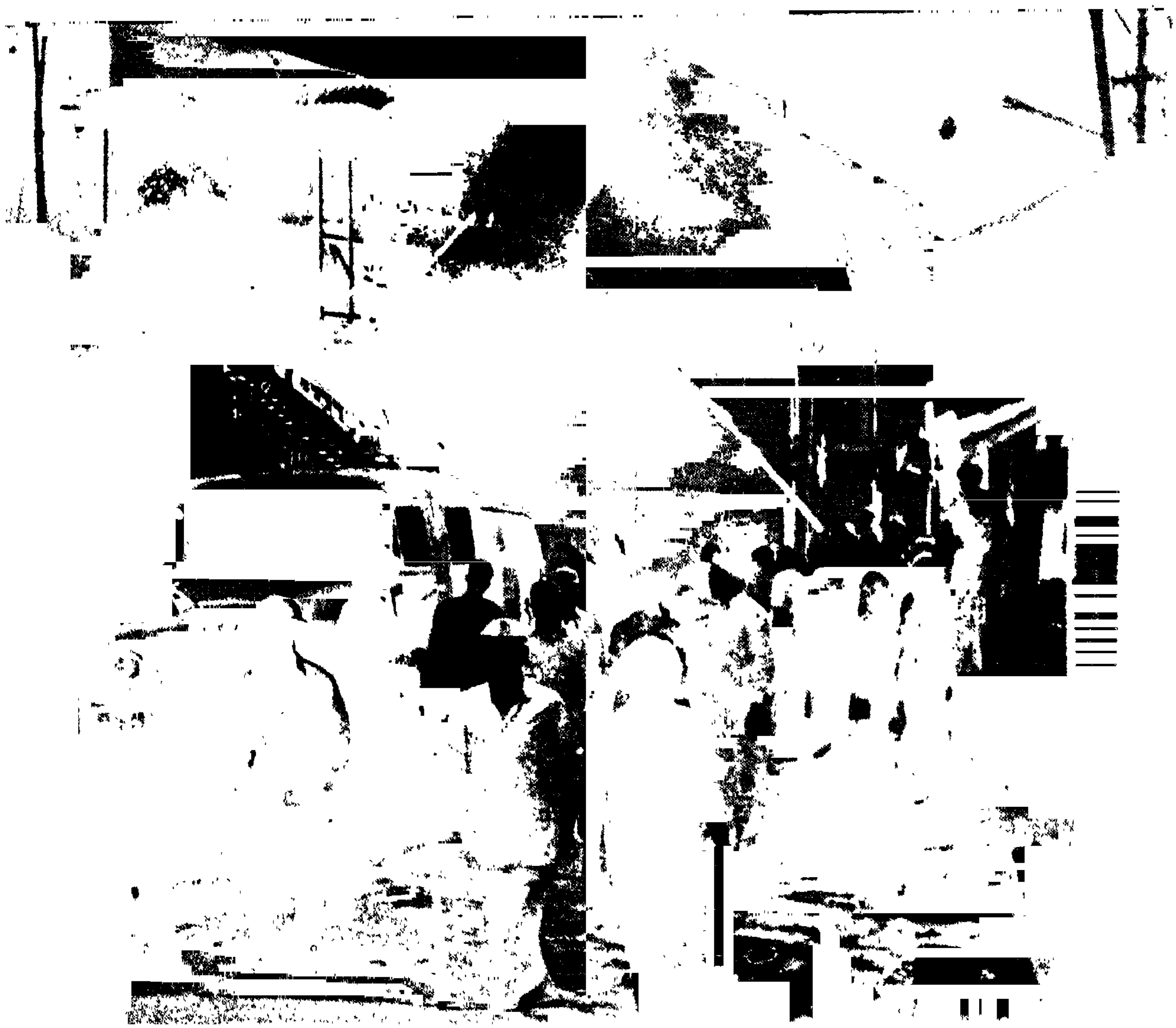
Regd. No. D-1820



این این پانڈے نے قومی ایکتا ٹرسٹ کے لئے وشنو آفسٹ پریس سے چھپواکر شائع کیا

رجسٹرڈ آفس:- ۸-۱۱۹ ڈھیٹر کمیونی کیشن بلڈنگ کناٹ سرکس نئی دھلی ایڈیٹر:- ڈی آر گوئل

سپانسرڈ ڈیموکریسی



DONATE GENEROUSLY

TO

QAUMI EKTA TRUST

THE TRUST IS SET UP

- ★ TO PROMOTE NATIONAL UNITY AND COMMUNAL HARMONY;
- ★ TO FOSTER IDEAS OF COMPOSITE NATIONALISM AND COMMON CITIZENSHIP;
- ★ TO PROMOTE GOODWILL AND ERADICATE SUSPICIONS AMONG DIFFERENT COMMUNITIES;
- ★ TO PROJECT THE GREAT HUMANIST TRADITION OF INDIA;
- ★ TO BUILD A TEAM OF DEDICATED, TRAINED WORKERS TO FIGHT COMMUNAL FASCISM AND OTHER DIVISIVE, ANTI-DEMOCRATIC TENDENCIES.

Subhadra Joshi
Chairman
Qaumi Ekta Trust
15, Balwant Rai Mehta Lane
New Delhi-1

نوازش نامے

ڈاکٹر فریدی اور فسادات

محترمی! پچھلے مہینے کا اداریہ پڑھ کر حیرت ہوئی۔ ڈاکٹر فریدی جنھوں نے بقول خود مسلم مجلس کی بنیاد جن سنگھ اور آر ایس ایس سے مقابلہ کرنے کے لئے رکھی تھی۔ آج خود صرف معمولی سے ذاتی مفاد کے لئے جن سنگھ کی گود میں جا بیٹھے۔ کیا قوم فروشی کی اس سے بدتر کوئی مثال ہوسکتی ہے؟

ان مسلم فرقہ پرست رہنماؤں نے اپنی لیڈری چمکانے اور معمولی سے مالی مفاد کی خاطر اردو، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ اور مسلم پرسنل لا، غرض مسلمانوں کے تمام سرمائے کو داؤ پر لگا دیا ہے۔ ان فرقہ پرستوں کی ہر ممکن کوشش یہ ہے کہ کسی طرح سے ان تینوں میں سے کوئی مسئلہ حل نہ ہو۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اگر یہ مسائل حل ہوگئے تو ان کی روزی خطرے میں پڑ جائے گی۔

کل تک ڈاکٹر فریدی جن سنگھ اور آر ایس ایس کو فسادات کا ذمہ دار قرار دیتے تھے۔ لیکن آج کانگریس دشمنی میں وہ ان دونوں کو معصوم ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ صرف اس لئے کہ یو۔پی میں الیکشن قریب ہیں اور اس وقت وہ کانگریس پر دباؤ ڈال کر کچھ مالی فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ شرم۔ شرم۔ شرم۔

مجیب الرحمٰن۔ کلکتہ

"بھٹکتی نسلیں": مزید خطوط

۱

ماہ مئی کے سیکولر ڈیموکریسی میں انجم عثمانی کے مضمون "بھٹکتی نسلیں" پر مولوی حافظ انیس الرحمان صاحب کا خط نظر سے گزرا۔ انھوں نے انجم صاحب کے پرمغز، مدلل مقالے کو سراہنے کے بجائے صاحبِ مضمون کو "ذہنی دیوالیہ پن" کا حامل ٹھہرایا تو یہ ان کا قصور نہیں بلکہ اس ذہنیت کا قصور ہے جواب سے نہیں بلکہ صدیوں سے دلوں میں جڑ پکڑے ہوئے ہے کہ آباؤ اجداد کا ہر عمل لائقِ تقلید ہے، خواہ اس کوری اور اندھی تقلید کے نتیجہ میں تباہیوں اور ہلاکتوں سے ہمکنار ہونا پڑے۔

پچھلی امتوں کی تاریخ پر نظر ڈالئے، تو راہِ حق کی طرف دعوت پر ان کا جواب یہی ہوتا تھا کہ "ہمارے باپ اور دادا یہی کرتے آئے ہیں"۔

صاحبِ مضمون نے جس دلسوزی اور ہمدردی کے ساتھ مفید مشورے دیئے ہیں وہ قابل غور ہیں۔ صرف تھوڑی سی صحیح تنقید پر چراغ پا ہونا کہاں کی دانشمندی ہے؟

اکابر علماء کی تحریک آزادی میں جدوجہد ناقابل فراموش، لائق تقلید اور آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ مگر یہ واضح رہے کہ ہمیشہ ایسے علماء کی تعداد بہت کم رہی ہے۔

یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اس دور میں مدارس سے نکلنے والے فارغین کی کھیپ اتنی قناعت پسند اور صابر نہیں ہوتی اور نہ حالات اس کی اجازت دیتے ہیں کہ صرف مدارس کی معمولی تنخواہوں پر اکتفا کرتے ہوئے نامناسب طریقوں سے حصولِ زر سے اجتناب کرے۔ ظاہر ہے کہ جب عہدِ حاضر میں یہ چیز کمیاب ہے تو مدارس میں ایسی تعلیم اور ایسی تربیت کا انتظام ضرور ہوگا کہ فارغینِ مدارس ہر ایسے عمل سے گریز کرسکیں جو لائق مذمت ہو۔

یہ صحیح ہے کہ دینی تعلیم کا مقصد صرف دنیا کمانا نہیں ہے۔ لیکن دنیاوی ضروریات کی تکمیل کے لئے اتنی یافت تو ضروری ہے کہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے یا غلط اور نامناسب طریقوں سے پیسہ کمانے کی نوبت نہ آئے۔ کیا کسی دست کاری کی اسلام نے ممانعت کی ہے؟ کیا کسی جائز پیشہ کا اختیار کرنا علم کی دولت کو چھین لینے کے مترادف ہے۔ آنحضور صلعم اور صحابہ کرام کے حالات کیا لائق تقلید نہیں؟ کیا صحابہ کرام رض دولت دین کا دامن مضبوطی سے تھامے ہوئے دنیاوی ضروریات کے لئے مختلف پیشوں اور صنعتوں کے ذریعہ روٹی نہیں کماتے تھے؟

اسلام دین اور دنیا کے متوازن سنگم کا نام ہے افراط و تفریط کی اس میں کوئی گنجائش نہیں۔

سہیل عزیز۔ دیوبند

۲

مولانا انیس الرحمٰن بی۔ اے آنرز کا "دینی مکتبوں کے فارغین" کے عنوان کے تحت شائع شدہ خط پڑھ کر مناسب معلوم ہوا کہ میں بھی اس سلسلے میں کچھ تحریر کروں۔ انجم عثمانی کا مقالہ "بھٹکتی نسلیں" دراصل ایک دعوت فکر ہے اور اس پر تنقید بھی کی جاسکتی ہے لیکن تنقید کا مقصد شاید یہ تو ہرگز نہیں کہ اصل موضوع کو بالائے ط[illegible]کھ کر ہم کچھ ماضی کی شخصیتوں اور ان کے کارناموں کا تذکرہ کرکے اپنی کمزوریوں کو چھپانے لگیں۔ مقالہ نگار اس مسئلے سے تو بحث نہیں

رہا ہے کہ ماضی میں علمائے کرام نے آزادی کے لئے کیا کوششیں کیں اور کون کون سے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ وہ تو صرف یہ دریافت کر رہا ہے کہ موجودہ مولوی نسل کے مسائل کو حل کرنے کے سلسلے میں علمائے کیا رول ادا کیا ہے۔

مولانا حسین احمد یا شبیر احمد عثمانی کے درس نظامی کی تعریف میں رطب اللسان ہونے سے پہلے غور کرنا ہوگا کہ اونچی اونچی بنیادوں کے سائے میں پرورش پانے والے مولوی بھی تو اسی درس نظامی کے فارغ ہیں۔ آپ ان کی ان کملائی ہوئی پژمردہ تصویروں کو کون سے فریم میں فٹ کریں گے۔ جو سو ڈیڑھ سو روپے کے عوض اپنے ایجاب و قبول کے نتائج کی پرورش کرتے ہیں۔ اوران کے ذہن اس مادیت پرستی کے دور میں مادیت کے علاوہ ہر نئی فکر سے آزاد ہیں۔ انگلیوں پہ گنے جانے والے اشرف علی اور حفظ الرحمٰن کو چھوڑ کر آپ ان سینکڑوں علمائے کرام و فضلاء عظام کو زندگی کے کون سے چوراہے پر کھڑا کریں گے جو منی آرڈر فارم خریدنے کے بعد ایسے آدمی کی تلاش میں رہتے ہیں جو اس کی خانہ پری کر دے۔ اسلام کی تعلیم شاید یہی ہو کہ وہ سامان زیست سے زیادہ فراہم کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ لیکن میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ سوا اور سوا سو روپے میں سامان زیست بھی فراہم ہو جاتا ہے یا نہیں؟۔ رہ جاتا ہے علما کو تنقید کا نشانہ بنانے کا سوال، تو میں اتنا اور عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ تنقید تو پوری زندگی ہے۔ انسانیت کا سارا کا سارا ارتقا اسی تنقید کا مرہون منت ہے۔ لہٰذا آپ اس بے چاری سے اتنا گھبراتے کیوں ہیں۔ "بھٹکتی نسلیں" کا مقالہ نگار تو آپ سے صرف یہ کہہ رہا ہے کہ آپ اپنے اندر وقت کا عرفان پیدا کیجئے۔ زمانہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا سیکھئے۔ اس ذرا سی بات کو آپ نسلوں کی حوصلہ شکنی کیوں سمجھ بیٹھے۔ ان نسلوں کی حوصلہ شکنی، غالباً اس قسم کے مقالوں سے نہیں ہوتی بلکہ اس وقت ہوتی ہے جب ان کو ایک مخصوص دائرے سے نکلنے کے بعد ساری کائنات اجنبی نظر آتی ہے۔

اور درس نظامی کے فارغین نہ تو سماج پر اثر انداز ہوتے ہیں اور نہ معاشی زندگی پر عتاب بن کر مسلط ہوتے ہیں۔ میں سمجھ نہیں سکا کہ یہ ان فارغین کی تعریف ہے یا تنقیص۔

اگر سماجی زندگی میں آپ کا کردار یہی ہے تو آپ کے مسند نشین مولوی ہونے یا جھگی نشین، سبزی فروش ہونے کے درمیان کتنا فاصلہ رہ جاتا ہے۔

راشد علی۔ فاضل دارالعلوم دیوبند

۳

مئی کے شمارے میں انجم عثمانی صاحب کے مضمون "بھٹکتی نسلیں" سے متعلق انیس صاحب کا مراسلہ نظر سے گزرا۔

مراسلہ نگار نے عثمانی صاحب کی دلیل .....

"ایسے افراد داخل ہونے لگے ہیں جو ذہنی اعتبار سے کمزور ہوتے ہیں ...." کو نقل کرکے چند علما کے نام دیئے ہیں۔ اور لکھا ہے کہ "مضمون نگار کی دلیل کو پڑھیے اور یہ چھوٹی سی فہرست ملاحظہ فرمایئے"۔ پہلی بات تو یہ کہ عثمانی صاحب کی دلیل کو مراسلہ نگار نے غلط نقل کیا ہے۔ انھوں نے "داخل ہونے لگے ہیں" لکھا تھا اور مراسلہ نگار نے "داخل ہوتے ہیں" نقل کیا ہے "ہونے لگے ہیں" اور "ہوتے ہیں" کے معنوی فرق پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ مراسلہ نگار کس غلط بحث کے مرتکب ہوئے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ مدارس کی تیس چالیس سال کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو مراسلہ نگار چند نام کے سوا کوئی ایسی فہرست نہیں پیش کرسکتے کہ جو مراسلہ نگار کی دی ہوئی فہرست کے ہم پلّہ تو درکنار ان سے اُنیس ہی ہوں جب کہ مدارس سے ہر سال ہزاروں کی تعداد فارغ ہوتی ہے، اس تناسب کی روشنی میں اس کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ مدارس میں اچھے ذہن نہیں پہنچ رہے ہیں؟

دراصل مراسلہ نگار خود تضاد کا شکار ہیں، ایک طرف ایسے افراد کی فہرست گنوا رہے ہیں کہ سماج کے ایک بڑے طبقہ پر اثر انداز ہوئے (جس اثر کو قبول کرنے میں خود مراسلہ نگار بھی ہیں) اور دوسری طرف فرماتے ہیں کہ درس نظامی کے فارغین سماج پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ ہوتے ہیں، نہیں ہوتے۔ یعنی چہ؟ میرے خیال میں آئینہ پر تاؤ کھانا ذہنی دیوالیہ پن کی علامت ہے۔

شاداب احمد۔ نئی دہلی

پندرہ روزہ کیجئے

کاش! آپ اس رسالے کو واقعی پندرہ روزہ ہی نہیں بلکہ ہفتہ وار کرا دیں۔ اس لئے کہ مجھ جیسے بسرے [illegible] رہنے اور طالب علم کا مہر [illegible] آتے کئی کئی [illegible] انتظار میں [illegible] ابھی بھی پندرہ روزہ [illegible] لیکن بہت [illegible]

[illegible] الاحسانی ضلع مظفر نگر

آپ کا پرچہ نہایت خوبصورت اور پابندی سے شائع ہوتا ہے آپ کے پاس روشن خیال اور ترقی پسند [illegible] قابل رشک گروہ ہے۔ پرچے کی پالیسی اور [illegible] کا معیار [illegible] بڑھتا جا رہا ہے۔ [illegible] میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو رہا ہے جس کا ذہن اور دل صاف ہے اور ساتھ ہی بہت بیباک بھی ہے۔ یہ تمام باتیں آپ کے پرچے میں موجود ہیں [illegible] مولوی [illegible] [illegible] [illegible] شائع ہونا چاہئے۔ [illegible] اس پروگرام کے لئے تجویز کیجئے گا۔

عبدالعزیز [illegible]

[illegible]

(باقی صفحہ ۴۲ پر)

فوج میں شارٹ سروس کمیشن (ٹیکنیکل)

کروپس آف انجینئرز، سگنلس، الیکٹریکل اینڈ مکینکل انجینئرز اینڈ رجمنٹ آف آرٹیلری میں برائے شارٹ سروس کمیشن (ٹیکنیکل) پانچ سال کی مدت کے لئے ہندوستانی شہریوں (مرد) سے درخواستیں مطلوب ہیں۔ یہ کورس نومبر ۷۳ء سے آفیسرز ٹریننگ اسکول مدراس میں شروع ہو رہا ہے۔

عمر کی میعاد:۔ امیدوار ۲ر نومبر ۴۶ء ۱۹ سے قبل اور یکم نومبر ۵۲ء ۱۹ سے بعد کے پیدا ہوئے نہیں ہونے چاہیئے۔

کم سے کم قابلیت:۔ (اے) ڈگری) ڈپلومہ (ڈگری کے مساوی) الیکٹریکل مکینکل، سول، آرکیٹیکچر، آٹوموبائل، ٹیلی کمیونیکیشن، میٹالرجیکل انجینئرنگ میں منسٹری آف ایجوکیشن سے برائے سینٹرل گورنمنٹ کے تحت اونچی جگہوں کی بھرتی کے واسطے منظور شدہ۔

یا

(بی) کوئی دوسری ڈگری/ ڈپلومہ (ڈگری کے مساوی) سول، الیکٹریکل مکینکل آرکیٹیکچر، آٹوموبائل، ٹیلی کمیونیکیشن یا میٹالرجیکل انجینئرنگ میں ایکزامیشن آف پاسنگ سیکشن اے، اینڈ بی، ان کے ایسوسیئٹ ممبرشپ کے امتحان کے لئے کسی انسٹی ٹیوٹ آف انجینئرز (انڈیا) سے منظور شدہ۔

یا

(سی) ایم۔اے/ایم۔ایس۔سی (فزکس)، وائرلیس/ الیکٹرونکس/ ریڈیو کمیونیکیشن میں بطور خاص مضمون کسی ہندوستانی یا غیر ملکی یونیورسٹی سے۔

یا

(ڈی) الیکٹرونکس میں ڈپلومہ (ڈی ایم آئی ٹی) مدراس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی، مدراس کا۔

(ای) وہ امیدوار جو پیرا (اے) اور (بی) میں دیئے گئے فائنل امتحان میں بیٹھ چکے ہیں اور ۳۰ر ستمبر ۷۳ء ۱۹ سے پہلے پاس ہونے کی توقع رکھتے ہیں وہ بھی اس کے لئے مستحق ہیں۔ مگر ان کو اس کے لئے اپنے کالج/ انسٹی ٹیوٹ سے سرٹیفیکیٹ لے کر جمع کرنا ہوگا۔

وہ امیدوار جو اسٹیٹ بورڈ آف ٹیکنیکل ایجوکیشن سے حاصل کیا ہوا ڈپلومہ رکھتے ہیں یا کوئی دوسرا ڈپلومہ جو ڈگری کے مساوی نہیں ہے اور وہ اس انسٹی ٹیوٹ آف انجینئرز (انڈیا) سے منظور شدہ نہیں ہے ایکزامیشن آف پاسنگ سیکشن اے اینڈ بی، ان کے ایسوسی ایٹ ممبرشپ کا امتحان جو بذریعے منسٹری آف ایجوکیشن برائے بھرتی، اونچی جگہ کے لئے سینٹرل گورنمنٹ کے تحت کے لئے مستحق قرار نہیں دیئے جائیں گے۔

کس طرح درخواست گزاریں:۔ درخواست کے فارم اور پوری تفصیلات آرمی ہیڈ کوارٹرز ایڈجوائنٹ جنرل برانچ، آر ٹی جی۔۶ (ایس بی) (ڈی (ا) ویسٹ بلاک III، ونگ نمبر ا، آر۔ کے پورم نئی دہلی۔ ۲۲ سے مندرجہ ذیل معلومات بہم پہنچا کر حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

(اے) عمر اور تاریخ پیدائش جیسا کہ میٹریکلیشن یا مساوی امتحان کی سند میں درج ہے۔

(بی) انجینئرنگ کی برانچ جس میں ڈگری/ ڈپلومہ (ڈگری کے مساوی) حاصل کیا ہے۔

(سی) انسٹی ٹیوٹ/ یونیورسٹی کا نام جس سے ڈگری/ ڈپلومہ حاصل کیا گیا ہو۔

فارم کی درخواست کے ساتھ ۱۲×۲۵ سینٹی میٹر سائز کا بغیر ٹکٹ لگا ہوا لفافہ ضرور آنا چاہیئے۔

	آخری تاریخ
ہندوستان میں رہنے والے امیدواروں کے لئے	۳۰ر جولائی ۷۳ء ۱۹
گورنمنٹ سروس میں لگے امیدواروں کے لئے	۱۵ر جولائی ۷۳ء ۱۹
ہندوستان سے باہر رہنے والے امیدواروں کے لئے	۳۱ر جولائی ۷۳ء ۱۹

ریجنل کالج آف ایجوکیشن

شیاملا ہلز۔ بھوپال ۱۳

داخلہ نوٹس برائے سیشن ۷۴-۱۹۷۳ء

ا۔ مجوزہ فارموں پر مندرجہ کورسوں میں داخلے کے لئے درخواستیں مطلوب ہیں۔ درخواست کے فارم اور کالج پراسپکٹس حاصل کرنے کے لئے مبلغ ایک روپیہ کا کراسڈ پوسٹل آرڈر بنام ایڈمنسٹریٹو آفیسر ریجنل کالج آف ایجوکیشن بھوپال ۱۳

روانہ کیا جانا چاہیئے۔ درخواست کے فارم جو ہر طرح سے پُر کئے گئے ہوں، کے ساتھ مبلغ ۵۰/۷ روپیہ کا انڈین پوسٹل آرڈر بنام ایڈمنسٹریٹو آفیسر ریجنل کالج آف ایجوکیشن۔ بھوپال کے نام بتاریخ ۲۲ر جون ۱۹۷۳ء تک روانہ فرمائیں۔ گوا اور گجرات کے امیدواروں کے لئے درخواست کے فارم موصول ہونے کی آخری تاریخ ۳۱ر مئی ۱۹۷۳ء ہے۔

۲۔ امیدوار جو اسٹیٹ آف گجرات، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر اینڈ یونین ٹیریٹری آف گوا دمن اینڈ دیو سے متعلق ہیں درخواست گزارنے کے مستحق ہیں۔ اترپردیش، راجستھان، دہلی، ہریانہ، پنجاب، ہماچل پردیش اور جموں اینڈ کشمیر کے امیدوار بھی، انگریزی میں چار سالہ کورس کے لئے درخواست گزارنے کے مستحق ہیں۔ اگر مزید جگہیں دستیاب ہوسکیں تو دوسری ریاستوں کے امیدواروں کے لئے بھی غور کیا جائے گا۔

۳۔ پڑھنے کے لئے کورس اور مطلوبہ قابلیت :-

(۱) چار سالہ کورس سائنس میں بی ایس سی (آنرز) بی ایڈ ڈگری کے واسطے امیدواروں کے لئے ہائر سیکنڈری / پی۔ یو۔ سی / انٹرمیڈیٹ امتحان فزکس کیمسٹری، میتھمیٹکس یا بایولوجی بطور اختیاری مضمون، کم از کم ٹوٹل ۴۵ فیصدی نمبروں سے پاس کیا ہونا ضروری ہے۔

اس کورس کے خاص فیچر اس طرح ہیں :-

(اے) ووکیشنل اور ایجوکیشنل مضامین کے ساتھ سائنس کے مضمون میں تعلیم۔

(بی) چار سالہ کورس پورا کرنے پر بی ایس سی (آنرز) بی ایڈ کی ڈگری پیش کی جائے گی۔ سائنس کے کسی ایک مضمون (فزکس، کیمسٹری، میتھمیٹکس / زولوجی / بوٹنی میں آنرز لیول پر بہم پہنچانا۔

۲۔ چار سالہ کورس برائے انگلش ایجوکیشن بی۔ اے (آنرز) بی ایڈ ڈگری :-

امیدوار ہائر سیکنڈری امتحان / پی۔ یو۔ سی / انٹرمیڈیٹ امتحان سیکنڈ ڈویژن میں جس میں انگریزی کے مضمون میں ۴۵ فیصدی نمبر ہوں، ضرور پاس ہونے چاہئیں ایسے امیدوار جنھوں نے کل نمبروں میں صرف ۴۰ فیصدی نمبر حاصل کئے ہوں مگر انگریزی کے مضمون میں ۶۰ فیصدی نمبر حاصل کئے ہوں بھی درخواست گزار سکتے ہیں۔

ان کو انگریزی کے علاوہ ہندی / گجراتی / مراٹھی / اردو کو بطور اختیاری مضمون لینا ہوگا۔

اس کورس کے خاص فیچر اس طرح ہیں :-

(اے) چار سالہ کورس کو کامیابی کے ساتھ مکمل کرنے پر بی۔ اے (آنرز) بی ایڈ ڈگری کے مستحق۔

(بی) ووکیشنل اینڈ ایجوکیشنل مضامین بشمول انگریزی مضمون میں تعلیم امیدوار کے لئے روزگار کے مواقع بڑھانے کے لئے۔

(سی) انگریزی زبان بولنے پر خاص توجہ اور ساتھ میں موڈرن انگلش لٹریچر کی تعلیم۔

۳۔ ایک سالہ بی ایڈ کورس سائنس / کامرس / زبانیں مضامین میں :-

اس کورس میں داخلہ لینے والے امیدواروں کے پاس بی ایس سی / بی۔ کام کی ڈگری ضرور ہونی چاہیئے۔ بی ایڈ (زبان کے معاملہ میں امیدوار کو بی میں کم از کم ۴۵ فیصدی نمبر ضرور حاصل کئے ہونے چاہئیں اور کم از کم ایک لٹریچر کورس میں ہو (انگریزی / ہندی / مراٹھی / گجراتی / اردو) ان امیدواروں کے لئے نمبر کے فیصد میں نرمی برتی جائے گی جو انگریزی لٹریچر کے ساتھ بطور اختیاری مضمون ایک ریجنل لٹریچر بھی آخر کریں گے۔

۴۔ ایم۔ ایڈ :- اس کورس میں داخلہ لینے والے امیدواروں کے لئے ضروری ہے کہ انھوں نے گریجویشن میں سیکنڈ ڈویژن۔ ۵۰ فیصدی نمبر کے ساتھ حاصل کی ہو اور سیکنڈ کلاس پوسٹ گریجویشن میں حاصل کی ہو، ایسے امیدواروں کے لئے ضروری ہے کہ بی۔ ایڈ میں ڈبل سیکنڈ ڈویژن حاصل کی ہو۔ امیدوار کو کم از کم ۲ سال پڑھانے کا تجربہ ہونا چاہیئے مخصوص طور پر تعلیم یافتہ امیدوار کے لئے اس شرط میں نرمی برتی جا سکتی ہے۔

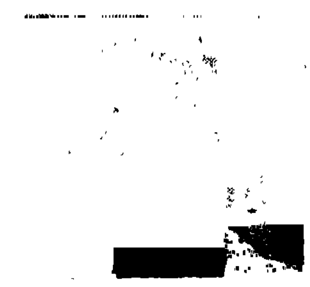
۵۔ ایسے امیدوار جو اس سال استعداد کے امتحان میں بیٹھ رہے ہیں اس کے مستحق ہیں لیکن جیسے ہی ان کا نتیجہ ظاہر ہو فوراً ہی ان کو اطلاع دینی ہوگی۔ مگر یہ اطلاع ۳۰ر جون ۱۹۷۳ء کے بعد موصول کی جائے گی۔

۶۔ اسکالرشپ :- این سی۔ ای۔ آر۔ ٹی کی شرائط اور ضابطے کے مطابق داخل ہونے والے طالب علموں میں سے ۵۰ فیصدی کو اسٹیٹ کوٹہ کی بنیاد پر اسکالرشپ دیا جائے گا۔ اسکالرشپ پانے والے امیدواروں کو کالج ہوسٹل میں رہنا ہوگا۔ شیڈولڈ کاسٹ اور شیڈولڈ ٹرائبس کے سب ہی طالب علموں کو جو اس کالج میں داخلہ لیں گے اسکالرشپ دیا جائے گا۔ اسکالرشپ ۷۵ روپے ماہوار ہوگا۔ ایم۔ ڈی کے طالب علموں کو مبلغ ۲۰۰ روپے ماہوار اسکالرشپ میرٹ کی بنیاد پر دی گئی شرائط پوری کرنے پر دیا جائے گا۔ یہ اسکالرشپ ۴ سالہ کورس میں ہر سال یونیورسٹی کے امتحان میں صلاحیت پر سالانہ دیا جائے گا۔

۷۔ مستحق امیدواروں کو انٹرویو کے لئے طلب کیا جائے گا۔ انٹرویو میں طلب کئے جانے والے امیدواروں کو اپنے خرچ پر مندرجہ ذیل سینٹروں پر انٹرویو کے لئے آنا ہوگا۔

ریاستیں	جگہ	ریاستیں	جگہ
گجرات	احمد آباد	مہاراشٹر	ناگپور
ناردن ریجن	دہلی	مدھیہ پردیش	بھوپال

امیدواروں کو انٹرویو کی تاریخوں سے بروقت آگاہ کر دیا جائے گا۔



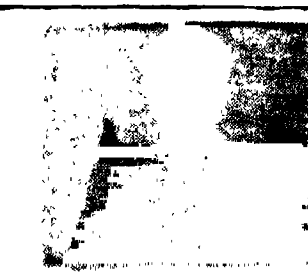
عتیق صدیقی

ایک پاکستانی صحافی کی بھارت یاترا



ڈاکٹر شکیل الرحمٰن

برگد کا پیڑ



ریاض الرحمٰن شروانی

مسلم سیاست کا ایک خطرناک رجحان

مشاورت بورڈ

دفتر کا پتہ

۸-۱۹۰ تعمیر کمیونی کیشن بلڈنگ

کناٹ سرکس

نئی دہلی ۱

ٹیلی فون نمبر ۴۳۳۸۳

ماہنامہ

سیکولر ڈیموکریسی

جون ۱۹۷۳ء

شمارہ ۱۹

شرح

سالانہ ... دس روپے

ششماہی ... پانچ روپے

قیمت فی پرچہ ... روپیہ

ش۔ ن۔ ی

پونا سے لکھنؤ تک

اگرچہ پونا میں فرقہ وارانہ فسادات اور اتر پردیش پی۔ اے۔ سی کی بغاوت کے درمیان بالواسطہ کسی قسم تعلق ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن واقعات کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ دونوں میں بہت حد تک ایک مشابہت ہے جن حالات اور منظم طریقے سے یہ دونوں واقعات رونما ہوئے ہیں ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی منصوبہ بند سازش کا نتیجہ ہیں۔ یہ فرقہ پرست جماعتیں بمبئی میں کارپوریشن کے انتخابات کے زمانہ ہی سے پونا کے فسادات کے لئے زمین تیار کر رہی تھیں۔

اتنے بڑے پیمانے پر فساد کی آگ بڑھکنے سے بیشتر بمبئی میں ہونے والی معمولی وارداتیں مستقبل قریب میں آنے والے اس طوفان کی طرف اشارہ کرچکی تھیں۔ اسی طرح اتر پردیش میں پی۔ اے۔ سی کے جوانوں کی طرف سے اپنے افسروں کے احکام کی خلاف ورزی چھوٹے چھوٹے سوالوں پر ان کی طرف سے کئے جانے والے مظاہرے اور مخالف پارٹیوں کے رہنماؤں کے ساتھ ان کی ملاقاتیں اس بات کی مظہر تھیں کہ پی۔ اے۔ سی کے جوانوں میں تشویش واضطراب کی ایک لہر دوڑ رہی ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ افسران کو ان تمام باتوں کا علم نہ ہو لیکن یہ تعجب خیز امر ہے کہ ان تمام واقعات کو نظر انداز کر دیا گیا۔ اتر پردیش کے وزیراعلیٰ شری کملا پتی ترپاٹھی نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ پی۔ اے۔ سی کے جوانوں میں پھیلی بدنظمی کے متعلق اطلاعات انھیں پہلے موصول ہوچکی تھیں لیکن انھوں نے اس امر کا انکشاف نہیں کیا کہ آخر وہ کونسی مجبوری تھی جس کے زیر اثر حکام نے بروقت مناسب کارروائی کرنے سے گریز کیا۔

اسی طرح پونا میں بھی فسادی عناصر کی کارگزاریاں حکومت کو متنبہ کرچکی تھیں لیکن وہاں بھی چشم پوشی اور لاپرواہی برتی گئی۔

بنارس اور فیروزآباد کے فرقہ وارانہ فسادات میں بھی ان ہتھیار بند جوانوں کا رول باعث شرم ثابت ہوچکا ہے۔ اقلیتوں اور پس ماندہ طبقوں کی حفاظت کے لئے تعینات پی۔ اے۔ سی نے نہ صرف فسادیوں کی مجرمانہ حرکتوں سے چشم پوشی کی، بلکہ اس کے خلاف یہ بھی الزام عاید کیا گیا کہ اس نے غنڈوں کی بالواسطہ امداد کی اور لوٹ کھسوٹ میں اپنے بھی ہاتھ رنگے۔

حیرت کا باعث تو یہ ہے کہ ان باتوں کے باوجود ذمہ دار افسران وسیاسی رہنما نرمی اور چشم پوشی سے کام لیتے رہے۔ یہ جاننے کی بھی کوشش نہیں کی کہ ان ہنگاموں میں پی۔ اے۔ سی کے ملوث ہونے کی وجہ کہیں یہ تو نہیں کہ اس محکمہ کے پس پشت فرقہ پرست عناصر اپنا کام کر رہے ہوں۔

لکھنؤ یونی ورسٹی میں جن سنگھ کی ودیارتھی پریشد ایس۔ ایس۔ پی کی یوجن سبھا اور ہندو مہاسبھا کے پیروکاروں کے ساتھ مل کر پی۔ اے۔ سی کے جوانوں نے جس بدامنی اور ہنگامہ آرائی کا ثبوت دیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس محکمہ میں عرصہ دراز سے فرقہ وارانہ عناصر سرایت کر رہے ہیں۔ ان باتوں کے باوجود حکام کی طرف سے نرمی اور خاموشی کا رویہ ہمارے لئے ناقابل فہم ہے۔ اگر حکام نے حالات کا جائزہ لینے کی تکلیف گوارا کی ہوتی تو پونا اور لکھنؤ کے ان حادثات کو روکا جاسکتا تھا۔

سب سے افسوسناک بات تو یہ ہے کہ ان حالات میں ملک کے محکمۂ سراغرسانی نے اپنے نااہل ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس محکمہ میں اصلاح وتبدیلی کی اشد ضرورت ہے۔ حکومت کو اس بات پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے کہ وہ کیا اسباب ہیں جن کی وجہ سے پی۔ اے۔ سی میں وسیع پیمانے پر پھیلی بدامنی کے متعلق اس محکمہ کو کوئی علم نہ ہوسکا یا کن وجوہات پر اس محکمہ نے حکومت تک اس کی رپورٹ نہ پہنچائی۔ اسی طرح پونا میں مسلم لیگ، شیوسینا اور جن سنگھ کی طرف سے پھیلے ہوئے زہر کے متعلق یہ محکمہ کیسے لاعلم رہا اور اگر اسے علم تھا تو حکام کو مطلع کیوں نہیں کیا گیا؟ آخر وہ کونسی قوتیں ہیں جو پوشیدہ طور پر اس محکمہ میں سرگرم عمل ہیں؟ حکومت کو فوراً اس معاملہ پر غور کرنا چاہیئے اور پولیس و سراغرسانی کے محکموں میں صحت مند تبدیلیاں لانے کے لئے مناسب اقدامات کرنے چاہئیں۔

پونا کے ان فسادات کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ فرقہ پرست طاقتوں کے گٹھ جوڑ سے ملک میں بڑے سے بڑا حادثہ رونما ہوسکتا ہے شیوسینا، مسلم لیگ اور جن سنگھ نے بمبئی اور پونا میں اپنی جڑیں مضبوط کرنے کے لئے جو نفرت انگیز کھیل کھیلا ہے وہ ایک سیکولر اور ترقی پسند شہری کے لئے باعث تشویش ہے۔ ان جماعتوں کے موقعہ پرست رویہ کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ جس وقت بمبئی کارپوریشن کی عمارت میں مسلم لیگ، شیوسینا کے نمائندے کو میئر منتخب کرانے کے لئے اس کے ساتھ تعاون کا ثبوت دے رہی تھی اس وقت بمبئی کی سڑکوں پر شیوسینا کے جوان مسلمانوں کو اپنے تشدد کا نشانہ بنا رہے تھے۔

فرقہ پرست عناصر کا یہ گٹھ جوڑ اتر پردیش میں بھی شروع ہوچکا ہے۔ مارچ ۱۹۷۴ء میں ہونے والے انتخابات کے پس منظر میں اگر یہاں بھی پونا اور بمبئی کے حادثات دہرائے جائیں تو کوئی تعجب نہیں۔

ہمارے نامہ نگار کے قلم سے

پونا میں کس کا لہو، کس کا خنجر؟

اس فساد کا سب سے زیادہ تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ اس میں بارہ اور تیس سال کی عمر کے درمیان کے لڑکوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ وہ کرفیو کے دوران بھی ہر علاقے میں غنڈہ گردی مچاتے دیکھے گئے اور پولیس سے انھوں نے جا بجا جم کر ٹکر لی۔ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان کو پہلے سے ان کی تربیت دی گئی اور پیشہ ور سماج دشمن اور غنڈے ان کی قیادت کر رہے تھے۔

۱۶ مئی سے ۲۰ مئی تک، پورے چار دن، پونا میں آتشزنی، قتل اور غارت گری کا بازار گرم رہا۔ اور سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اگرچہ اس موج خون کی آمد کی خبر پچھلے ایک مہینہ سے گرم تھی۔ لیکن جب یہ طوفان آیا تو امن وقانون کے محافظ سو رہے تھے۔ اس فساد کی سنگینی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ پونا کے پولیس کمشنر کو فوج کو چوکنا کرنا پڑا اور مرکزی وزیر داخلہ اور مہاراشٹر کے وزیر اعلیٰ کو دوسرے دن بھاگا بھاگا پونا جانا پڑا۔

مارچ ۱۹۷۴ء سے جب بمبئی میں 'وندے ماترم' کا شاخسانہ کھڑا ہوا تو اسی وقت فرقہ وارانہ جماعتوں نے پونا میں نفرت اور تنا تنی کی فضا بنانا شروع کر دیا تھا۔ جیسا کہ ایک مشہور روزنامے کے نامہ نگار نے کہا ہے "وہ اس معاملہ میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی تیاری کر رہے تھے۔ شیوسینا اور مسلم لیگ نے اس نزاع کو بمبئی میں خوب ہوا دی اور اپنے اپنے فرقوں کے جذباتی ابال کا فائدہ اٹھا کر دونوں جماعتوں نے کارپوریشن کے الیکشن میں خاصی تعداد میں نشستیں حاصل کر لیں۔ اس کے بعد یہ دونوں پارٹیاں مسلم لیگ اور شیوسینا، جو ایک دوسرے کی ضد ہیں، انتہائی مکروہ قسم کی ابن الوقتی سے کام لیتے ہوئے، میئر کے انتخاب میں کانگریس کے امیدوار ہرانے کے لئے ایک ہوگئیں اور مسلم لیگ کی مدد سے شیوسینا کا امیدوار میئر منتخب ہوگیا۔ اس صورت حال کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اس وقت جب شیوسینا اور مسلم لیگ کارپوریشن کے اندر ایک دوسرے کے اتحادی بنے ہوئے تھے۔ کارپوریشن کے باہر شیوسینک مسلمانوں کے خلاف اشتعال انگیزی کر رہے اور ان کو مار پیٹ رہے تھے۔

اب شیوسینا نے پونا میں فتح کا جشن منانے کا فیصلہ کیا۔ شیوسینا کے قائد بال ٹھاکرے نے ایک عام جلسے میں مسلمانوں کے خلاف خوب خوب زہر اگلا اور اعلان کیا کہ ہندوؤں کا یہ ایک مقدس حق ہے کہ وہ مسجدوں کے سامنے باجہ بجائیں۔ انھوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ شیوسینک اپنے اس حق کو استعمال کرنے کے لئے ایک جلوس نکالیں گے۔ یہ جلوس ۲۴ اپریل کو مقامی شیوسینکوں نے نکالا جس کے آگے آگے باجے والوں کے کئی بینڈ باجا بجاتے ہوئے چل رہے تھے۔ یہ جلوس باجا بجاتا ہوا پونا کی سڑکوں پر چلتا رہا۔ راہ میں آنے والی مسجدوں کا خیال کئے بغیر۔ بمبئی اور پونا میں جو واقعات پیش آئے ان کا مطالعہ کرنے سے ہم فرقہ وارانہ جماعتوں کے ہتھکنڈوں کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں اور یہی کچھ ملک کے اور حصوں میں ہونے والے اس قسم کے واقعات پر بھی صادق آتا ہے۔ کارپوریشن کے انتخابات سے ذرا پہلے ایک مردہ مسئلہ کو جس میں اشتعال انگیزی کے بھرپور واقعات موجود ہیں، ایک فرقہ کے مفاد پرست (اس معاملہ میں مسلم لیگ) کرید کرید کر بھڑکا دیتے ہیں اور دوسرے فرقہ کے رجعت پسندوں کو (شیوسینا اور جن سنگھ) کو ایک بہانہ ہاتھ آجاتا ہے۔ گرما گرم بحث چھڑتی ہے اور تنا تنی اور کشیدگی اس ڈھنگ سے پیدا کی جاتی ہے کہ سب ہی اس میں پھنس جائیں اور پھر فساد شروع ہو جاتا ہے جو مزید تلخیاں پیدا کرتا ہے اور اس طرح ترقی کی مخالف قوتوں کو اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل ہو جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح مسلم لیگ، شیوسینا اور جن سنگھ کو خاصی تعداد میں اپنے امیدوار بمبئی میونسپل کارپوریشن میں پہنچانے میں کامیابی حاصل کر لی۔ لیکن بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ یہ فرقہ وارانہ حریف اب ترقی کی قوتوں کو شکست دینے کے لئے متحد بھی ہو جاتے ہیں۔ بمبئی میں شیوسینا اور مسلم لیگ اپنی پسند کا میئر منتخب کرانے کے لئے ایک ہوگئے تھے اس طرح بے حیا فرقہ پرستی اپنا جال بُن رہی ہے اور اس کو ہر ہر صوبہ اور ہر ہر شہر میں پھیلا دینا چاہتی ہے۔ جس طرح ڈکٹیٹر شپ کو زندہ رہنے کے لئے خلفشار اور مستقل کش مکش کی ضرورت ہے اسی طرح فرقہ واریت کو زندہ رہنے کے لئے مستقل کشیدگی اور فسادات کی ضرورت ہے۔ بال ٹھاکرے نے بمبئی میں اپنی کامیابی کے بعد اپنی توجہ کا مرکز پونا کو بنایا۔ اقلیت کے

فرقہ وارانہ عناصر کے لئے بھی یہ بات اُتنی ہی موزوں تھی۔

۲۲ راپریل کے فتح کے جلوس میں شامل ہونے والوں نے کہا جاتا ہے کہ راستہ میں پڑنے والی ایک مسجد پر گلال پھینکا۔ اسی دن اشتعال انگیزی کی ایک دوسری کوشش کی گئی جب کہ میلاد النبی کے سلسلے میں نکالے جانے والے ایک مسلم جلوس پر تیزاب کے بلب پھینکے گئے جس سے دو عورتیں بری طرح جھلس گئیں۔ وسط اپریل میں 'نوبدھوں' کی ایک بارات جب ایک مسجد کے سامنے سے گزری تو وہ گومگو میں پڑ گئے کہ باجا بجائیں یا خاموشی سے گزر جائیں۔ اتنے میں باراتیوں میں سے ایک لڑکا ایک کار کی بونٹ پر چڑھ کر مسلمانوں کے خلاف اشتعال انگیزی کرنے لگا اور باجے والوں سے کہا کہ وہ باجا بجائیں کیونکہ ان کو اس کی اجرت دی جا چکی ہے۔ اور انھیں چند لمحوں میں بارات پر پتھر اور سوڈے کی بوتلیں پھینکی گئیں۔ جو کہا جاتا ہے کہ مسجد کے اندر سے پھینکی گئی تھیں۔

بعد میں ۴ رمئی کو شیواجی جینتی جلوس نکالا گیا جس کے آگے آگے ایک نوجوان شیواجی کے رول میں چل رہا تھا۔ دو دن بعد یہ افواہ اڑا دی گئی کہ اس نوجوان پر مسلمانوں نے ایک تلوار سے حملہ کر دیا۔ جس سے اس کا انگوٹھا کٹ گیا حالانکہ اس واقعہ کی تصدیق نہیں ہو سکی ہے۔ فساد شروع ہونے سے چند دن پہلے ایک سینما کے قریب دو فرقوں کے کچھ لوگوں کے درمیان کسی بات پر جھڑپ بھی ہوئی۔

اوپر کہا گیا ہے کہ یہ واقعہ اپنے اندر اتنا ڈائنامائیٹ رکھتا تھا کہ بڑھ کر زوردار فساد بن سکتا تھا لیکن پونا کے عوام نہیں چاہتے تھے اور اس طرح فرقہ وارانہ عناصر کو ان انفرادی واقعات کے نتیجہ میں ایک مسلسل ردعمل شروع کرنے میں ناکامی ہوئی۔ لیکن اس سے انتظامیہ اپنے آپ کو ابھی عدم چوکسی اور عدم دوربینی کے الزام سے نہیں بچا سکتی۔ شرپسند، اپنی شروع کی ناکامیوں کے بعد، کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھے جب وہ سارے شہر کو بلووں کی آگ میں جھونک سکیں اور پونا بندھ (مہاراشٹر بندھ کا ایک حصہ) نے یہ موقع فراہم کر دیا۔ سوال یہ ہے کہ جب فساد ہونے کی افواہیں پہلے ہی سے گشت کر رہی تھیں تو پولیس فساد کے وقت کیوں غافل پائی گئی۔

۱۷ رمئی کا دن، جو بندھ کے لئے مقرر تھا پرامن طور پر طلوع ہوا۔ بندھ کا اعلان بائیں بازو کی پارٹیوں کی طرف سے غلے کی کمی، مہنگائی وغیرہ کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے کیا گیا تھا۔ اس دن بیشتر دوکانیں، تجارتی ادارے اور کارخانے بند رہے بند کا انتظام کرنے والی پارٹیوں نے پانچ مورچے شہر کے مختلف حصوں میں نکالے اور راستہ میں زیادہ سے زیادہ لوگوں سے ان مورچوں میں شامل ہونے کے لئے اپیل ہوتی رہی۔ بعد میں یہ سب مورچے ملکر ایک بڑا جلوس بن گیا۔ اس میں کارخانوں کے مزدور، ٹرانسپورٹ ورکرز اور دوسرے لوگ شامل تھے۔

حزب اختلاف کے سرکردہ لیڈر جلوس کی سربراہی کر رہے تھے۔ جلوس برابر پُرامن اور باقاعدہ رہا۔ اس جلوس کے خاتمے پر ایک عام جلسہ ہوا شہر کی ساری پولیس بندھ کے سلسلے میں احتیاطی تدابیر میں لگا دی گئی تھی اور مورچوں کے ساتھ بھی پولیس کے خاصے بڑے دستے موجود تھے۔ جلوس دوپہر سے پہلے ہی کلکٹر کے دفتر پہنچ گیا تھا اور کلکٹر کے دفتر کے باہر ہی جلوس کے قائدین نے تقریریں شروع کر دیں۔ فرقہ وارانہ عناصر کے لئے وار کرنے کا یہ بہترین موقع تھا۔ چنانچہ ساڑھے گیارہ بجے انھوں نے بھرپور وار کیا۔

انھوں نے نہایت ہوشیاری سے اپنی اس کارستانی کو شروع کرنے کے لئے نانا پیٹھ کا انتخاب کیا، جو کلکٹری سے کافی دور ہے۔ چاند تارا مسجد پر حملہ کیا گیا اور مسلمانوں کی دو کانوں کو آگ لگائی گئی۔ چند ہی منٹ میں سہرے ہی علاقے پوری طرح آتش زنی اور لوٹ مار کی لپیٹ میں آگئے۔ تیزاب سے بھرے ہوئے بلب، پتھر، اینٹیں اور سوڈا واٹر کی بوتلیں اس طرح مشرقی اور وسطی پونا کی گھنی آبادی والے محلوں میں برسائے جا رہے تھے جیسے بم برس رہے ہوں۔ نانا پیٹھ پر دیئے جانے والے سگنل کے اتباع میں کئی مقامات پر لوٹ مار، آتش زنی اور چھرے بازی شروع ہو گئی۔ بلوے کی خبر جلسۂ عام تک پہنچی اور جلسہ فوراً ختم ہو گیا۔

حزب مخالف کے لیڈر متاثرہ علاقوں کی طرف دوڑ پڑے اور انھوں نے لوگوں کو دیوانگی کی ان حرکتوں سے روکنے کی پوری کوشش کی مسٹر ایس ایم جوشی، سوشلسٹ پارٹی لیڈر مسٹر مدھو لمایا، پونا کے میئر اور کارپوریشن کے سوشلسٹ ممبر مسٹر رام واڈکے کے نام متاثرہ علاقے میں جانے والوں میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ پونا سٹی کانگریس کے صدر مسٹر تھوراٹ اور ایک کانگریسی ایم۔ ایل اے مسز لیلا بھائی مرچنٹ نے بھی متاثرہ علاقہ کا دورہ کیا۔ اور مسز لیلا بھائی نے جس جرأت کا مظاہرہ کیا اس سے لوگ بہت متاثر ہوئے۔ لیکن ان دوروں کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ بلوے سارے شہر میں پھیل گئے اور چار دن تک سماج دشمن عناصر شہر کو برباد کرتے رہے۔

پہلے ۲۴ گھنٹہ تک سارا پولیس کا نظام ایک عجیب الجھن اور انتشار میں مبتلا رہا۔ وہ ہر ٹیلی فون کال پر ادھر ادھر دوڑتے، بلوائیوں کے پیچھے بھاگے لاٹھی چارج بھی کیا لیکن اس سے بھی کچھ نہ ہوا۔ پولیس کمشنر مسٹر کدم باندے نے فساد شروع ہونے کے چار گھنٹے کے اندر چوبیس گھنٹے کے کرفیو کا اعلان کر دیا۔ کرفیو تین دن جاری رہا۔ لیکن کرفیو کے دوران بھی غنڈوں اور پولیس میں جا بجا جھڑپیں ہوئیں اور وہ مسلسل اپنی کارروائیوں میں مصروف رہے۔

چند مثالوں سے یہ واضح ہو جائے گا کہ یہ

(باقی صفحہ ۳۹)

اردو ہے میرا نام

رفعت سروش

کیا حال میرا پوچھو ہو، اردو ہے میرا نام
ہندوستاں میں رہتی ہوں، ہندوستاں سے دور

کیا اس تعارف کے بعد بھی مجھے اپنے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت ہے؟! اگر ہاں، تو مجھے اپنے دل کے زخم کرید کرید کر دکھانے میں اس لئے لذت محسوس ہوتی کہ چارہ گر میرے ارد گرد نمکداں لئے ہوئے ہی سہی، موجود تو ہیں اور میرے حال زار کو — ع زمانہ بڑے شوق سے سن رہا ہے۔ اس لئے میں داستان کہتے کہتے نڈھال ہو جاؤں تو اور بات ہے، محو خواب نہ ہوں گی — اور یہ محوِ خواب ہونے کا وقت بھی نہیں کیونکہ تکلف برطرف —— "اٹھالے ہاتھ جو بڑھ کر یہاں مینا اسی کا ہے"۔ پھر میں جس کا وظیفہ "انقلاب۔ زندہ باد" رہا ہے، انقلاب کے زندہ باد ہو جانے کے بعد کس لئے ہمہ تن گوش رہوں، اور داستان کہنے کے لئے اس سے بہتر وقت اور کونسا ہوگا جب میرے وظیفۂ انقلاب کا جادو ہندوستانی عوام کے سروں پر چڑھ کر بول رہا ہے، اور میں نے اپنے آرام و آسائش کے لئے نہیں، بلکہ ملک کی خوش حالی کے لئے جو خواب دیکھے اور بنے تھے ان کی تعبیریں مجسم ہونے کو ہیں۔

دراصل میری مشکلوں کا آغاز ہی نعرۂ "انقلاب زندہ باد" سے ہوا ہے، اور انقلاب دشمنوں نے میری توانائی اور قوت اور جوش و خروش کو اس وقت بھانپ لیا تھا جب میں انقلاب کا نعرہ لگا رہی تھی اور سرفروشی کی تمنا دل میں لے کر بازوئے قاتل کا زور آزمانے کا اعلان کر رہی تھی۔

انقلاب دشمن عناصر نے —— چاہے وہ انگریز سامراج ہو یا ملک کے فرقہ پرست مجھے اپنے اپنے انداز سے کچلنا شروع کیا اور گویا اس طرح "مری تعمیر میں ہی میری خرابی کی اک صورت مضمر رہی" —— اس لئے جس قدر رشد و مد سے میں نے انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگایا، اسی قدر شدت کے ساتھ میرا گلا گھونٹنے کے منصوبے بنائے جانے لگے۔ مگر میں ان سب ریشہ دوانیوں سے بے پرواہ اپنی دھن میں لگی رہی، اپنے کام میں مصروف رہی، اور آخر انقلاب آیا —— انگریز سامراج کے لئے انقلاب آیا کہ اسے اپنا رخت سفر باندھ کر واپس جانا پڑا۔ عوام کے لئے انقلاب آیا کہ انھوں نے آزادی کے گیت گانے شروع کئے۔ مگر میرے لئے بھی انقلاب آیا کہ جب سامراج اور فرقہ پرستوں کے گٹھ جوڑ نے ہندوستان کے قلب نازک کو اپنی سیاست کے تیر سے دو نیم کر دیا تو اسی تیر سے میرے بھی ٹکڑے کر دیئے گئے —— اور اس طرح "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ دینے والی زبان سے انتقام لے لیا گیا۔

اور جب میں مجروح ہو گئی تو میرے زخموں پر پھاہے رکھے گئے مگر ایسے جن پر نمک بھی چھڑکا ہوا تھا کہ یہ بدیسی زبان ہے، کہ یہ فرقہ پرست زبان ہے، کہ یہ ایک خاص مذہب اور خاص فرقہ کی زبان ہے۔ اور انقلاب دشمن عناصر نے۔ جو میرے ازلی دشمن تھے۔ اور انقلاب آزادی کے بعد بھی پوری آن بان سے اس ملک میں موجود تھے۔ ان الزامات اور تہمتوں کو میرے سر اسقدر مڑھا کہ مجھے اپنے آپ سے شرم آنے لگی اور میں سوچنے لگی ع

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

لیکن جب بات چل پڑتی ہے تو ہونٹوں سے نکل کر کوٹھوں پر پہنچتی ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا جگہ جگہ مجھے قتل کیا جانے لگا۔ میرے ازلی دشمنوں کو اس من مانی کرنے کا موقع مل گیا جب تقسیم ملک کے وقت پاک والے میرے چمن سے میری قلم لے کر اپنے فرقہ پرستی باغ میں لگا کر چلائے کہ یہ تو ہمارا پودا ہے۔ ہماری ز ہے۔ ہماری سرکار کی زبان ہے۔ اب چاہے میری قلم و پھلے یا نہ پھلے، چاہے مجھے سرکاری گلدانوں میں ہی س گیا ہو اور وہاں کی مٹی کی کوکھ میں پروان مجھے چڑ کا موقع نہ دیا گیا ہو۔ وہاں کی عام بول چال میں میرا نہ چلتا ہو۔ اور مجھے وہاں بدیسی ہی پکارا جاتا ہو، میرے نام لیواؤں کو غدارِ وطن تک کہا جاتا رہا ہو۔ اس کنٹریبونٹ کا میرے دشمنوں نے ہندوستان میں

انقلاب دشمن عناصر نے — [redacted]
وہ انگریز سامراج ہو یا ملک [redacted]
پرست مجھے اپنے اپنے انداز سے [redacted]
شروع کیا اور گویا اس طرح " [redacted]
میں ہی میری خرابی کی اک [redacted]
رہی" — اس لئے جس قدر رشد و مد
انقلاب زندہ باد کا میں نے نعرہ لگایا۔ ا
قدر شدت کے ساتھ میرا گلا گھو
کے منصوبے بنائے جانے لگے۔

فائدہ اٹھایا اور صدیوں سے جس مٹی میں میری جڑ پھیلی ہوئی تھیں، جس کے رنگارنگ موسموں، تیوہار میلوں ٹھیلوں اور عوام خواص کا روپ رنگ بغیر تفر مذہب و ملت میری کونپل کونپل میں سمایا ہوا تھا اور ہے —— اس مٹی کی آغوش سے، اس مادرِ وطن سے مجھے اس طرح الگ کیا جانے لگا جیسے روح کو جسم سے الگ کیا جائے اور مجھے بدیسی کہہ کر میرے لئے جذبۂ

وبیگانگی کو عام کیا جانے لگا۔ شاید مجھے کوئی خبیث روح یا چڑیل سمجھا جانے لگا۔ اور خاص طور پر بچوں کو مجھ سے اسقدر دور رکھا جانے لگا کہ میں اپنی شیرینی اور لطافت ان پیارے بچوں ــــــ اور نئی نسلوں کو دینے کے لئے ترس گئی۔ یہاں تک نوبت پہنچی کہ جن گھروں میں میری لطافتوں کی گنگا بہتی تھی، ان گھروں میں بھی مجھے بچوں نے منہ لگانا چھوڑ دیا۔ اور مجھے محسوس ہونے لگا کہ وہ دن دور نہیں جب میں بوڑھی نانی کی طرح ماضی کی کہانی سنایا کروں گی۔ اور پھر کوئی میری کہانی سننے والا بھی نہ ہوگا کیونکہ کسی کو عملی زندگی میں، چاہے وہ گھر ہو یا دفتر، میری ضرورت ہی نہ رہے گی ــــ اور مجھے احساس ہوا، شدید احساس کہ ؏

"ہندوستاں میں رہتی ہوں ہندوستاں سے دور"

"انقلاب زندہ باد" کا خواب پورا ہونے کے بعد۔ صرف چوتھائی صدی میں میری جو درگت بنی اس کا تصور اگر "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ بلند کرنے والوں نے کیا ہوتا تو شاید وہ بھی مجھ سے گریز کر لیتے مگر اس وقت مجھ سے گریز ممکن نہیں تھا۔ کیونکہ اس سامراج زدہ سماج میں جب ایک طرف "ہندو پانی" اور "مسلم پانی" کی تختیاں لگی رہتی تھیں۔ میں ہی تھی جسے ہندو مسلمان، دونوں کا مشترکہ ورثہ کہا جا سکتا تھا۔ مجھ میں اگر میر و مرزا کی لطافت تھی تو رتن ناتھ سرشار اور پریم چند کی جادو بیانی بھی تھی۔ اقبال کی شان تھی تو چکبست کی آن بھی۔ جوش کا خروش تھا تو فراق کا طمطراق بھی ــــ غرض مشترکہ تہذیب کا متوازن اظہار میری ہی ذات کے ذریعہ تھا۔ اور اسی لئے میں سامراج اور سامراجی قوتوں اور ٹوڈی بچوں کے خلاف انقلاب پسندوں اور نئے ہندوستان کے معماروں کو متحد کرنے اور ان کو ایک مرکز پر لانے میں منہمک رہی اور آخر کامیاب رہی ــــ مگر اس ملک میں کامیابی حاصل کرنے کی جزا نہیں ملتی، سزا ملتی ہے۔ جس ملک میں آزادی حاصل کرنے والے گاندھی کو فرقہ پرستی کی گولیوں کا نشانہ بنا دیا گیا ہو، بھلا اس ملک میں آزادی کے لئے تیغ کی مانند چلنے والی زبان کو کیوں نہ گُند کیا جاتا۔ اور اس سے کم اور کیا سزا ملتی جو مجھے ملی۔ مجھے مردہ قرار دے دیا گیا۔ مجھے عضوِ معطل سمجھ کر قوم کے جسم سے کاٹ کر پھینکنے کے مشورے ہونے لگے یہاں تک کہ میرے ہی بہت سے نام لیوا مصلحت اور موقع پرستی کے شکار ہو کر میرے لباس ظاہری کو بھی مجھ سے چھین کر میری موت پر مہر ثبت کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ یعنی میرا رسم الخط بھی مجھ سے جدا کرنے لگے۔ ؏

"محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی"

لیکن ؏

"قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے"

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ہندوستان دشمن، اور انقلاب دشمن عناصر اپنا عروج دکھا کر بالآخر اپنے ہی بل گر رہے ہیں اور فرقہ پرستی اور علیحدگی پسندی کا جذبہ اپنی ہی موت مر رہا ہے۔ گاندھی جی اور ان کے اصول پھر زندہ ہو رہے ہیں اور اس نئے انقلاب کے موڑ پر یہ بھی کچھ کم نہیں ہے کہ کچھ چارہ گر پھر میرے زخموں کے تماشائی ہیں۔ اور میں سوچ رہی ہوں ؎

نظر لگے نہ کہیں ان کے دست و بازو کو
یہ لوگ میرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں"

کیونکہ یہ تو وہ بھی عزیز ہیں جنھوں نے میری تجہیز و تکفین کا انتظام کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی در اصل وہ میرے جادو اور سحر بیانی کے اس قدر قائل تھے کہ اس سے خائف ہو گئے تھے۔

مگر میں انقلاب کی پیامی تھی، ہوں اور رہوں گی۔ اسی لئے نئے انقلاب کے اس نازک موڑ پر جدید انقلاب کے حامیوں نے پھر مجھے آواز دی ہے اور صحیح وقت پر آواز دی ہے۔ کیونکہ میں وہی ہوں جس نے مشترک تہذیب کے خد و خال ابھارے تھے اور انھیں اپنے صنم خانے میں سنبھال کر رکھا ہے اور اب وقت آنے پر بخل نہیں کروں گی۔ اور جو کچھ میرے دامن میں ہے اسے نہ میں نے کسی ایک تہذیب، کسی ایک فرقے یا کسی ایک علاقے کی ملکیت سمجھا ہے نہ یہ میرے مزاج اور خمیر میں ہے۔ اور غالباً اسی لئے وقت کے بعض شناسوں کی نظر پھر مجھ پر پڑی ہے۔ اور قوم کے چارہ گروں کو پھر میرے زخموں کی فکر ہے۔ زہے نصیب! ــــ مجھے ان زخموں پر بھی فخر ہے کہ جو انھوں نے دیئے ہیں۔ اور میں یہ زخم کھا کر اور زیادہ حساس ہو گئی ہوں، اور اپنے اس زخمی احساس کو نہ صرف ایک فرقے، نہ صرف ایک مذہب، نہ صرف ایک علاقے، بلکہ پورے ملک کو بانٹنا چاہتی ہوں۔ ایکتا اور ہم آہنگی کا جتنا شدید احساس مجھے آج ہے اتنا اس سے پہلے شاید کبھی نہیں تھا۔ اور میں بچہ بچہ کی ہم زبان ہو کر یہ پیغام دینا چاہتی ہوں کہ وہ فرقہ پرست میرے دشمن ہیں جو مجھے محض اپنی زبان سمجھتے ہیں۔ مجھ سے پیار کا ایک ــــ اور صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ میرے وجود کو اس سرزمین کا ایک لازمی جزو سمجھو اور مجھے علیحدگی پسندی کے لئے نہیں، بلکہ ہم آہنگی کے لئے استعمال کرو۔ میں جن گھروں میں پلی، جن گلیوں میں کھیلی، جن شہروں میں بسی، میری مہک صرف وہیں تک محدود رہے، یہ مجھے قبول نہیں۔ میں بیکراں خوشبوؤں کی مانند ہر طرف پھیل جانا چاہتی ہوں۔ میرے پاؤں میں زنجیریں نہ ڈالو، مجھے اپنی محبت عام کرنے دو۔ مجھے ہندوستان کے جدید انقلاب کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے دو۔ یہی میرے زخموں کا مداوا ہے۔ مجھے اس احساس سے نجات دلاؤ کہ

ہندوستاں میں رہتی ہوں ہندوستاں سے دور

[redacted]

ایک پاکستانی صحافی کی بھارت یاترا

عتیق صدیقی

یہ تاثر پاکستان کے مقبول ترین اخبار جنگ کے ہفتہ وار ایڈیشن اخبار جہاں کے جواں سال معاون مدیر محمود شام کا ہے، جو ڈھائی مہینے قبل ہندوستان آئے تھے اور اپنے سترہ روزہ قیام کے دوران ملک کے اکثر حصوں کا دورہ بھی کیا تھا۔ انھوں نے اپنے اس دورے کے تاثرات پہلے روزنامہ جنگ میں بالاقساط ۱۴ مارچ سے ۲۰ مارچ تک شائع کئے۔ اس کے ساتھ ہی اخبار جہاں میں بھی اس کا سلسلہ شروع کیا، جو ہنوز جاری ہے۔ اس وقت ہمارے پیش نظر جنگ میں شائع شدہ مضامین ہیں۔

برصغیر کی تاریخ میں شملہ کانفرنس سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ نفرت، تعصب اور بے اعتمادی کی اس آہنی دیوار کو، جو چوتھائی صدی سے ہندوستان و پاکستان کے درمیان دیوار چین بنی کھڑی تھی یہ کانفرنس اگر یکسر منہدم نہیں کر سکی تو اس کی بنیادیں بے طرح متزلزل کر دیں۔ ہندوستان کے تو نصف درجن صحافی شملہ کانفرنس سے پہلے پاکستان کا دورہ کر چکے تھے، لیکن ہندوستان میں پاکستانی صحافیوں کی آمد کا سلسلہ اس کانفرنس کے بعد ہی شروع ہوا۔ سب سے پہلے ڈان کے ایڈیٹر مظہر علی خاں اور اس کے کالم نگار سید نجی اللہ آئے۔ اس کے بعد مارننگ نیوز (کراچی) کے ایڈیٹر سلطان احمد آئے۔ ان تینوں کے بعد محمود شام کا نمبر آیا، جو اپنے پیش رو صحافیوں سے اس اعتبار سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں کہ ان کا تعلق پاکستان کے دو مقبول ترین اخبارات سے ہے۔

محمود شام نے اور ان کے پیش رو اخبار نویسوں نے بھی، ہندوستان سے لوٹنے کے بعد اپنے پاکستانی قارئین کے سامنے ہندوستان کی جو تصویر پیش کی، اسے پاکستانی قارئین نے تو آنکھیں مل مل کر دیکھا اور پڑھا ہوگا۔ محمود شام کی زبانی یہ سن کر انھیں یقیناً ہم سے زیادہ حیرت ہوئی ہوگی:

"میں کسی ٹیکسی، رکشے میں سفر کرتا، کسی دوکان پر جاتا، یا کسی ہوٹل وغیرہ میں، جس ہندوستانی کو بھی معلوم ہوتا کہ میں پاکستانی ہوں، تو وہ بے ساختہ پیار اور تپاک سے ملتا، محبت کا اظہار کرتا... ادیبوں، شاعروں اور عام صحافیوں میں بھی یہی خلوص اور محبت نظر آئی.... مجموعی طور پر یہ ادیب و شاعر پاکستان سے اچھے تعلقات کے خواہش مند ہیں.. . وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ پاکستان میں اگر سیاسی حکومت ہوتی، جمہوریت ہوتی، تو نہ پاکستان کے عوام کے ساتھ زیادتی ہوتی اور نہ بھارت کو موقع ملتا کہ وہ بنگالیوں کی مدد کے لئے میدان میں کود دے۔ اس لئے وہ کہتے ہیں کہ اب چونکہ پاکستان میں منتخب سیاسی حکومت قائم ہو چکی ہے اور اسی کی وجہ سے معاہدہ شملہ ممکن ہوا، تو ہم سمجھتے ہیں کہ اب ہندوستان کے لوگوں، ادیبوں، شاعروں اور اخبار نویسوں کو پاکستان کو سمجھنے اور قریب لانے کے لئے نمایاں کردار ادا کرنا ہے۔ اس کے لئے ان کا کہنا ہے کہ پاکستان و ہندوستان کے درمیان اخبارات، رسائل اور کتابوں کی آزادانہ ترسیل انتہائی ضروری ہے۔ کیونکہ اس وقت اتنی بڑی آہنی دیوار راستے میں حائل ہے کہ براہ راست ہمیں ایک دوسرے کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہونے پاتا.... ادیبوں، شاعروں، اور صحافیوں کا غالب خیال یہ ہے کہ براہ راست کچھ معلومات نہ ہونے کی وجہ سے غلط فہمیاں بہت بڑھ رہی ہیں، اس لئے یہ قدم انتہائی ضروری ہے.. . ہم اب اس نفرت اور مخالفت کے ورثے کو نسل در نسل منتقل کرنا نہیں چاہتے۔"

اسی سلسلے میں انھوں نے اپنے پاکستانی قارئین کو بتایا کہ:

"ایک اور بزرگ اور نامور صحافی جمنا داس اختر نے ایک اور زیادہ عملی تجویز پیش کی کہ کچھ ایسا انتظام ہونا چاہیئے کہ پاکستان کے اخبار نویس بھارت کے اخبارات اور رسائل میں لکھیں اور بھارت کے اخبار نویس پاکستان کے اخبارات و رسائل میں لکھیں شروع شروع میں یقیناً یہ تحریریں ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہوں گی، اور یہ اخبار نویس بھی اپنے پہلے سے قائم تعصبات

اور نظریات کے تحت لکھیں گے، لیکن آہستہ آہستہ وہ اپنی تحریروں میں اصلاح کریں گے اور وہ یک طرفہ نہیں رہیں گی اس سے جہاں قارئین کو ایک دوسرے ملک کے بارے میں معلومات ہوں گی، وہاں اخبار نویس بھی ایک دوسرے کو زیادہ جاننے لگیں گے اور ان کا اندازِ فکر و اسلوبِ تحریر متعصبانہ نہیں رہے گا۔ . . . میں نے ان کی اس تجویز بھارت کے دوسرے صحافیوں، ادیبوں، شاعروں میں اور سرکاری حلقوں میں ذکر کیا تو انھیں بھی یہ تجویز خاصی وزنی معلوم ہوئی۔ اب دیکھنا یہ ہے پاکستان میں اس تجویز کا کیا ردعمل ہوتا ہے۔"

پاکستان بھی ایسا ہی ہے جی؟

ہندوستان کی نئی نسل کے بہت کم لوگوں نے پاکستان کو دیکھا ہے اور پاکستان کے متعلق ان کی معلومات نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس میں خود ان کی کوتاہیوں کو دخل نہیں ہے، بلکہ اس کی ذمہ داری ان نامساعد سیاسی حالات پر ہے جس نے دونوں ملکوں کو "باوجود قرب اتنا دور" کر دیا ہے۔ یہ اسی کا کرشمہ تھا کہ محمود شام دہلی میں پہلے ہی روز جس ٹیکسی میں بیٹھ کر اشوکا ہوٹل سے پرانی دہلی کے کوچۂ بلیماران کی طرف گئے۔ اس ٹیکسی کے ڈرائیور نے ان سے پوچھا کہ "پاکستان بھی ایسا ہی ہے جی؟ یا وہاں پہاڑ ہی پہاڑ ہیں؟" اسی سوال کے سلسلے میں انھوں نے لکھا ہے:

"ایسے سوال ہندوستان کی نئی نسل کی طرف سے بہت کئے گئے یہ وہ نسل ہے جو تقسیم کے بعد بھارت میں پلی اور بڑھی ہے جس نے نفرت کی فضا میں جنم لیا۔ . . . پاکستان کے بارے میں تجسس بے پناہ پایا جاتا ہے . . . پاکستان کے بارے میں جو کتاب بھی شائع ہوتی ہے، وہ ہزاروں کی تعداد میں چند ہی روز میں بک جاتی ہے۔ اس تجسس کی وجہ سے ہندوستان کی نئی نسل میں یہ خواہش بھی پائی کہ پاکستان سے تعلقات جلد از جلد بہتر ہوں تاکہ وہ پاکستان دیکھ سکیں۔"

اسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

"یہ تو عوامی حلقوں کی بات تھی، سرکاری حلقوں میں بھی یہی خواہش تھی، لیکن جو بنیادی مسائل اٹکے ہوئے ہیں، اس کے سبب وہ کھل کر بات نہیں کر سکتے ہیں۔ لیکن بھارت کے سرکاری حلقے اب سفارتی تعلقات اور مواصلات کی بحالی کے لئے بے تاب ہیں۔"

ڈان کے کالم نگار سید نجم اللہ جب ہندوستان آئے تھے تو انھوں نے ماہرِ معاشیات ہونے کی حیثیت سے، دونوں ملکوں کے مابین اقتصادی اشتراک پر خصوصیت سے زور دیا تھا۔ انھیں برصغیر کے دونوں ملکوں سے شکایت تھی کہ شملہ کانفرنس کے بعد جو خوشگوار فضا پیدا ہوئی ہے اس سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے تجارتی تعلقات استوار کرنے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی ہے اور اب تک کانفرنسوں کے جو ایجنڈے بنے، ان میں اس اہم ترین موضوع کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ محمود شام نے اس سلسلے میں اپنے قارئین کو بتلایا ہے کہ:

"اس کا احساس بھارت کے سرکاری حلقوں کو بھی تھا کہ بڑے مسائل حل ہو جائیں تو اس کے بعد بھارت اور پاکستان کے درمیان تجارت کی بے پناہ گنجائش اور امکانات ہیں ان امکانات کا ذکر عام تجارتی حلقوں نے بھی کیا اور متعلقہ سرکاری حلقوں نے بھی۔ اس سلسلے میں غیر ملکی تجارت کی وزارت کے سکریٹری مسٹر محمد یونس سے بھی تفصیلی گفتگو ہوئی۔ وہ صوبہ سرحد کے رہنے والے ہیں، پرانے کانگریسی تقسیم کے بعد وہیں آباد ہو گئے تھے۔ وہ اس بارے میں بہت گرمجوش تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ برصغیر کے رہنے والے آپس میں چونکہ تجارت اور مشترکہ منصوبوں کا جائزہ نہیں لیتے، اس لئے دوسرے ممالک ان کے خام مال اور ان کی مصنوعات سے فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں۔ یہ ممالک آپس میں تجارت کریں اور مل جل کر بعض صنعتیں لگانے کی طرف توجہ دیں، تو جہاں ان کو بے پناہ زرمبادلہ کی بچت ہوگی، وہاں غیر ضروری اخراجات اور تاخیر بھی نہیں ہوگی۔ ان کے خیال کے مطابق بھارت، پاکستان، بنگلہ دیش برما، نیپال اور سیلون مشترکہ طور پر تجارت اور صنعت کی منصوبہ بندی کریں۔ . . .

میرے ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ اگر آپ یہ سمجھیں کہ ہندوستان بڑا ملک ہونے کی وجہ سے تجارت پر غلبہ پائے گا، تو اقتصادی اصولوں کی بنا پر یہ غلط ہے۔ کیونکہ زیادہ آبادی ہونے کی وجہ سے ہم تو ضرورت مند ہیں، زیادہ چیزیں ہم درآمد کریں۔ . . . ہم سیلون سے دو کروڑ روپے کا سامان خرید رہے ہیں، جب کہ وہ ہم سے صرف پندرہ لاکھ کا خرید رہا ہے . . . . ہم عراق سے پہلے صرف کھجوریں منگواتے تھے۔ اب ہم نے پچپن کروڑ روپے کی تجارت کا معاہدہ کیا ہے۔ اس سال کے آخر تک یہ رقم سوا کروڑ روپے ہو جائے گی۔ ہم اس کے بدلے میں عراق کو ایک اسٹیل پلانٹ

لگاکر دے رہے ہیں۔ ان کو خام لوہا بھی ہم مہیا کریں گے۔"

محمود شام کے اس سوال کے جواب میں کہ "پاکستان و ہندوستان کے درمیان کس شعبے میں آپ کو تجارت کے امکانات نظر آتے ہیں؟" محمد یونس نے کہا:

"پاکستان و ہندوستان میں ایک آدھ شعبے میں نہیں، بے شمار شعبوں میں تجارت کے امکانات ہیں... آپکے ہاں سوئی گیس نکلی ہے، جو آپ کی ضرورت سے کہیں زیادہ ہے بھارت کو آپ جتنی چاہیں مہیا کر سکتے ہیں، پائپ ہی تو بچھانا ہیں۔ پھر آپ سے لڑتے ہوئے بھی ہم ڈریں گے کیونکہ آپ نے پائپ کاٹ دیئے تو ہمارے گھروں میں چولھے ٹھنڈے ہو جائیں گے۔ یہ تو ایک مثال ہے۔ آپ کی بے شمار مصنوعات ہیں، جن کی ہمارے ہاں یقیناً بہت کھپت ہے۔ اسی طرح ہماری کئی مصنوعات آپ کے ہاں کھپ سکتی ہیں ہمارے ہاں موٹر کاریں، بسیں اور ٹرک تیار ہو رہے ہیں، جو آپ دنیا بھر سے منگواتے ہیں۔ بھارت سے لینے میں آپ کو یقیناً فائدہ رہے گا اور فریٹ (نقل و حمل) کا خرچ بھی نہیں ہوگا۔"

"فارن سکریٹری صاحب نے بھی سوئی گیس کے لئے بھارت کی ضرورت کا ذکر کیا۔ ان کا بھی یہی کہنا تھا کہ آپ کو صرف پائپ بچھانے پڑیں گے اور بے حساب زرمبادلہ کما لیں گے۔ ہمیں تو جتنی بھی سوئی گیس مہیا کریں کم ہے۔

فارن سکریٹری مسٹر کیول سنگھ نے یہ بھی کہا کہ اس سے آپ کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔ ہم حقیقی طور پر ایسا چاہتے ہیں ہم تو چاہتے ہیں کہ جلد ہی موقع پیدا ہو کر مواصلات کی بحالی فضائی حدود کے استعمال اور دانشوروں، ادیبوں اور تاجروں کے وفود کے تبادلے پر بات چیت ہو۔"

یہ باتیں محمود شام کے دل کو بھی لگیں۔ خود ان کا بیان ہے کہ:

"میں نے محمد یونس صاحب سے کہا کہ آپ کی تجاویز تو بہت اچھی اور مخلصانہ ہیں۔ مگر بات ہمیشہ متنازعہ مسائل پر جا اٹکتی ہے۔ اب پہلی بار ایسا موقع آیا ہے کہ دونوں ملکوں میں منتخب عوامی لوگوں کی حکومت ہے۔ عوام ان کے ساتھ ہیں۔ یہ اگر چاہیں تو اپنے اقتدار کے دوران پاکستان اور بھارت کے درمیان موجودہ تنازعات کو طے کر کے بنیادی رکاوٹیں دور کر سکتے ہیں یقیناً برصغیر کے عوام کو بھی پرامن زندگی بسر کرنے کا موقع ملنا چاہیئے۔ میں آپ کی تجاویز پاکستان کے عوام تک ضرور پہنچاؤں گا۔ پاکستان کے عوام یقیناً ان تجاویز کو پسند کریں گے۔"

محمود شام نے جس دیانت داری اور خلوص کے ساتھ ہندوستانی ادیبوں، شاعروں صحافیوں اور سرکاری و غیر سرکاری سیاسی حلقوں کے جذبات و احساسات پاکستانی قارئین تک پہنچائے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ان جذبات و احساسات کو کسی وقتی مصلحت پر مبنی نہیں، بلکہ دلوں کی گہرائی سے نکلی ہوئی آواز سمجھتے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ ان کا اندازِ بیان پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ:

گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ محمود شام نے ہندوستانی جذبات و خیالات کی صداقت کو اور ہندوستانی سرکاری و غیر سرکاری حلقوں کی تجاویز کو صرف خلوص پر مبنی، یا ان کی اصابت کو بے چون و چرا تسلیم کر لیا ہے۔ یہ بھی نہیں ہے کہ انھیں ہندوستان میں خرابیاں اور خامیاں نظر نہ آئی ہوں۔ ان پہلوؤں کی طرف بھی انھوں نے جگہ جگہ اشارے کئے ہیں۔

یہ بے چارے کہاں جائیں؟

ہمارے سیاسی مبصر کے قلم سے

جن لوگوں نے پاکستان کے قیام کے لئے بڑی امنگوں اور چاؤ کے ساتھ کوششیں کی تھیں قیام پاکستان کے بعد وہ جس بیچارگی اور کس مپرسی کا شکار ہوئے تاریخ انسانی اس کی شاید ہی کوئی دوسری مثال پیش کرسکے۔ نعروں کے پھیر میں آکے اِن لوگوں نے کیا کیا خواب نہ دیکھے، وائے تقدیر کہ حقیقت ان خوابوں کا مقدر نہ تھی۔ اِنھیں بہلاوا دیا کہ پاکستان برصغیر کے تمام مسلمانوں کے لئے دارالامان ہوگا، اس میں اسلامی طرزِ زندگی اور اسلامی ماحول کو فروغ ہوگا۔ نہ تو پاکستان برصغیر کے تمام مسلمانوں کے لئے دارالامان ہوا اور نہ ہی اس میں اسلامی ماحول اور طرز زندگی کا فروغ ہوا۔ البتہ اسلام کے نام پر مسلمان کے ہاتھوں مسلمان کا استحصال ہوا اور وہ بھی ایسا کہ انسانی تاریخ کے بدترین دور اس سے شرما جائیں۔

یہ بے چارے کون ہیں

جن کی عبرت ناک زندگی نے مملکت خداداد کا اصلی روپ بے نقاب کر دیا ہے۔ ان بدنصیبوں کو عرفِ عام میں "بہاری" کہتے ہیں۔ خود پاکستان میں انھیں پاکستانی کی بجائے "بہاری" کہا جاتا ہے، حالانکہ ان میں سے بہت سے کسی صورت بھی بہار سے وابستہ رہے نہیں ۳ مئی کو راولپنڈی میں مشرقی پاکستان اسٹوڈنٹس کمیٹی کے ڈپٹی چیئرمین احتشام الدین ارشد نے پریس کانفرنس کو اس بارے میں بتایا "یہ کہنا درست نہیں ہے کہ یہ غیر بنگالی سب بہاری ہیں، ان میں پنجابی، پٹھان، بلوچ اور سندھی ہیں اور ان سب نے پاکستان کے لئے ہی قربانیاں

ان میں پنجابی، پٹھان، بلوچ اور سندھی ہیں اور ان سب نے پاکستان کے لئے ہی قربانیاں دی ہیں۔

دی ہیں۔ یہ لوگ پاکستان منتقل ہونا چاہتے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ان کو کسی خاص صوبے میں بسایا جائے۔ وہ ریگستان کو بھی آباد کرلیں گے مگر ان کو یہاں لانا اشد ضروری ہے"۔

اسی قسم کا تذکرہ کراچی کے ممتاز ہفت روزہ اخبار جہاں کے ۲ مئی کے شمارے میں ہے "مشترکہ اعلان میں شامل دوسری شرط بنگلہ دیش میں پھنسے ہوئے ان دو لاکھ غیر بنگالیوں کی پاکستان کو منتقلی سے تعلق رکھتی ہے جو خود کو اب بھی پاکستانی شہری کہتے ہیں، ان میں غالباً بھاری اکثریت ان لوگوں کی ہے جنھیں عرف عام میں 'بہاری' کہا جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو قیام پاکستان کے وقت مغربی پاکستان کی بجائے مشرقی پاکستان چلے گئے تھے اور پاکستانی بن کر گئے تھے اور اسی عقیدے سے گئے تھے کہ مشرقی پاکستان ہمیشہ پاکستان کا حصہ رہے گا۔ ان کا یہی عقیدہ تھا جس کی بنیاد پر وہ آخر دم تک پاکستان کی سالمیت کو بچانے کے لئے دیوانہ وار لڑتے رہے۔ اب ان کی یہ بدنصیبی کہ ہماری فوج کے ساتھ وہ بھی مات کھا گئے۔ اگر آج ان بدنصیبوں کو ہم پاکستان میں قبول کرنے پر رضامند نہ ہوئے تو اس کے بعد ہمیں پھر کبھی یہ کہنے کا اصولاً حق حاصل نہ ہوگا کہ وہ نظریہ جس کی بنیاد پر پاکستان بنایا گیا تھا وہ اپنی جگہ پر قائم ہے"۔ (مرکزی دارالحکومت سے ایک خط ـــــ حبیب الرحمٰن) اسی تحریر میں دارالامان کی حقیقت بھی عیاں ہوجاتی ہے "پاکستان سارے برصغیر کے مسلمانوں کے ووٹوں سے بنا تھا اور یہ ووٹ اس وعدے پر حاصل کئے گئے تھے کہ پاکستان برصغیر کے مسلمانوں کی پناہ گاہ ہوگا۔ وہ تو خیریت گزری کہ کروڑوں مسلمانوں نے بھارت ہی میں رہ کر نامساعد حالات کا ثابت قدمی سے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا اور آج وہاں انکی تعداد سات کروڑ کے لگ بھگ ہے"۔

ہند بنگلہ دیش پیش کش اور پاکستان

یوں تو جب سے بنگلہ دیش وجود میں آیا ہے تبھی سے ان بدنصیب پاکستانیوں کے کہ جنھیں پاکستانی "بہاری" کہتے ہیں مستقبل کے بارے میں تشویش اور فکر مندی کا اظہار ان سے متعلق لوگ کرتے رہے ہیں لیکن جس خلوص اور صدق دلی سے ہند اور بنگلہ دیش کی حکومتوں نے گزشتہ جنگ سے پیدا ہونے والے انسانی مسائل کو سیاسی حالات سے الگ رکھ کر حل کرنے کی مشترکہ تجویز پیش کی، اس کے بعد سے تو ان بدنصیب پاکستانیوں کے بارے میں بیشتر پاکستانی اخبارات اور ریڈیو آئے دن پاکستانی ضد دُہرا رہے ہیں۔ ۱۷ اپریل کے مشترکہ اعلانیہ میں ہند اور بنگلہ دیش نے پیش کش کی کہ بانوے ہزار پاکستانی جنگی قیدیوں، پاکستان میں محصور بنگالیوں اور بنگلہ دیش میں موجود ان غیر بنگالیوں کا فوری، غیر مشروط طور پر، باہمی تبادلہ کیا جائے کہ جنھوں نے پاکستان کے تئیں وفاداری اور وہاں جانے کے ارادہ کا تحریری طور پر اظہار کیا ہے۔ اس پر خلوص پیش کش کا جواب پاکستان کی طرف سے بات چیت کے مطالبہ کی صورت میں کیا گیا ہے اور ادھر عالمی کورٹ میں جنگی قیدیوں کا مسئلہ پیش کر دیا گیا ہے۔ ان اقدامات سے صاف ظاہر ہے کہ پاکستان کو نہ تو جنگی قیدیوں کی فوری رہائی میں دلچسپی ہے اور نہ ہی بنگلہ دیش میں موجود اپنے شہریوں کی فکر ہے۔

پاکستانی

برصغیر کے موجودہ جمود و تعطل کو توڑنے کے لئے ہند اور بنگلہ دیش نے جو پیش قدمی کی ہے اس کا مثبت جواب دینے میں پاکستان کو نہ صرف تامل ہے بلکہ وہ مسلسل بے معنی اعتراضات کا سہارا لے رہا ہے۔ اس کی ایک مثال پاکستان کے دفاع اور امور خارجہ کے

• وزیر مملکت عزیز احمد کا وہ ٹیلی ویژن انٹرویو ہے جو ۲۴ اپریل کی رات کو نشر ہوا "بنگلہ دیش کا یہ دعویٰ کہ اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ تمام بہاریوں یا غیر بنگالیوں کو نکال باہر کرے گا ایسی سیاسی اقلیت کے متعلق عجیب و غریب رویّہ ہے کہ حکمراں جماعت کے سیاسی فلسفے سے متفق نہیں ہے۔ آپ کسی کو محض اس لئے ملک سے نہیں نکال سکتے کہ وہ آپ کا ہم خیال نہیں ہے۔" (امروز۔ ۲۵ اپریل)

عزیز احمد کس سنجیدگی اور معصومیت کے ساتھ ایک بے معنی دلیل کے ذریعے پاکستانیوں کو بنگلہ دیش میں رکھنے کا مشورہ دے گئے۔ معاملہ صرف سیاسی اختلاف کا نہیں، بلکہ غیر ملکی ہونے کا ہے۔ ان غیر بنگالیوں نے بنگلہ دیش کی بجائے پاکستان کے ساتھ وفاداری کا اظہار کیا ہے، لہٰذا یہ پاکستان کی ذمہ داری ہے کہ اپنے شہریوں کو واپس لے۔ عزیز احمد ان بدنصیبوں کو پاکستان کی سرحدوں سے دور رکھنے کے لئے سیاسی اقلیت کے لیبل سے نواز رہے ہیں۔

نوائے وقت کے کالم نگار مرغوب صدیقی اپنے سلسلہ وار خصوصی مضامین میں اس سے بھی زیادہ دلچسپ پوزیشن اختیار کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "پاکستان کے ساتھ وفاداری اور وہاں جانے کی خواہش کے اظہار کے باوجود ان غیر بنگالیوں کو پاکستان بھیجنا نسل پرستی ہوگی"۔ بہاریوں نے اگر یہ اعلان ایمانداری کے ساتھ کیا تو اس کے لئے ان کو موردِ الزام کس طرح ٹھہرایا جا سکتا ہے؟ رہی ان کے پاکستان آنے کی خواہش تو انھوں نے یہ خواہش پاکستان بننے کے ۲۵ سال تک کیوں نہ کی تھی؟ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ تقسیم ہند کے وقت مشرقی پاکستان کی بجائے مغربی پاکستان میں کیوں نہ آ بسے تھے؟ ...... اس کا یہ علاج ہرگز نہیں ہے کہ ان بہاریوں کو مغربی پاکستان میں آباد کیا جائے، بلکہ اس کا علاج یہ ہے کہ چار لاکھ مغربی پاکستان میں مقیم بنگالیوں (جن میں اٹھائیس ہزار فوجی بھی شامل ہیں) میں سے ایک فرد کو بھی اس وقت تک بنگلہ دیش نہ جانے دیا جائے جب تک بنگلہ دیش میں غیر بنگالیوں کے متعلق بالکل تسلی بخش انتظام نہیں ہو جاتا۔" مئی کے پہلے ہفتہ میں حکومت پاکستان نے اسلام آباد کے چھ ہزار بنگالیوں کو کیمپوں میں منتقل کر کے غالباً مرغوب صدیقی کے مشورے پر عمل کیا ہے۔

پاکستانی موقف کی ایک اور وضاحت پروفیسر محمد عثمان نے امروز (چھ مئی) کے کالم "فکر و تاثر" میں پیش کی ہے "اگر برصغیر میں ہم سب لوگ امن اور چین سے رہنا چاہتے ہیں تو پھر آبادی کے اس تبادلے کی کیا ضرورت ہے؟ اول تو یہ بات باور نہیں کی جا سکتی کہ اتنی تعداد میں بہاری اس خطے کو اپنا وطن قرار دینے کے لئے تیار نہیں، جہاں وہ ۲۵ برس سے رہ رہے ہیں اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ لوگ غیر بنگالی ہیں اور بنگلہ کے علاوہ کوئی اور زبان بولتے ہیں تو کیا دنیا کے کسی ملک میں اُس ملک کے باشندوں کے علاوہ کوئی اور گروہ نہیں بستا؟ بہاری ایک اقلیت کے طور پر بنگلہ دیش میں کیوں نہیں رہ سکتے؟ اور انھیں پاکستان کی مرضی اور اجازت کے بغیر پاکستان بھیجنے پر اصرار کے کیا معنی ہیں؟"

یہ اقلیت نہیں

بنگلہ دیش میں مقیم پاکستانیوں کو بنگلہ دیش کی ذمہ داری بنائے رکھنے کی فکر میں پاکستانی مبصرین یہ بنیادی حقیقت بھی بھول جاتے ہیں کہ کسی بھی ملک کی اقلیت اسی کے تئیں وفادار ہوتی ہے۔ یہ بدنصیب پاکستانی تو پاکستان کے ساتھ اپنی وفاداری کا اعلان کر رہے ہیں اور اُدھر پاکستان ہے کہ ان سے دامن بچانے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہے۔ بنگلہ دیش میں مقیم غیر بنگالیوں

> بنگلہ دیش میں مقیم غیر بنگالیوں میں سے صرف ایک تہائی یعنی ڈھائی لاکھ نے اپنے پاکستانی ہونے کا اعلان کیا ہے۔

میں سے صرف ایک تہائی یعنی ڈھائی لاکھ نے اپنے پاکستانی ہونے کا اعلان کیا ہے۔ بقیہ دو تہائی بنگلہ دیش ہی میں رہیں گے۔ نہ وہ پاکستان جانا چاہتے ہیں اور نہ ہی بنگلہ دیش انھیں بھیجنا چاہے گا۔

فیصلہ کون کرے؟

پاکستانی ذہن غیر صحت مند فکر کا شکار ہے۔ کسی بھی مسئلہ کو دیکھنے کا اس کا انداز عجیب ہے۔ بنگلہ دیش میں مقیم غیر بنگالیوں سے متعلق اپنے موقف کو صحیح ثابت کرنے کے لئے وہاں بے بنیاد خبریں شائع کی جا رہی ہیں مثلاً ۴ مئی کے امروز میں ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان کے حوالے سے ایک خبر شائع ہوئی ہے کہ بنگلہ دیش میں ہندوؤں کی آبادی کا جو تناسب ۱۹۷۱ء میں چار کے مقابلے میں ایک تھا اب تین کے مقابلے دو ہو گیا ہے۔ اس خبر کے مطابق غیر بنگالی مسلمانوں کی جائیدادیں ہندوؤں کے حوالے کی جا رہی ہیں۔ اس خبر کی صحت کے بارے میں برصغیر کے حالات سے آشنا کوئی بھی باہوش انسان اندازہ لگا سکتا ہے۔ سوال ہندو یا مسلمان کا نہیں بلکہ پاکستانی یا بنگلہ دیشی کا ہے۔

ہند بنگلہ دیش اعلانیہ میں جس سہ طرفہ تبادلے کی پیش کش کی گئی ہے اس کے بارے میں پاکستانی اعتراضات میں یہ کہا گیا ہے کہ بنگلہ دیش سرکار کو یہ اختیار کس نے دیا کہ وہ غیر بنگالیوں کے پاکستانی شہری ہونے کا فیصلہ کرے یا یہ فیصلہ کرے کہ کون پاکستان جائے گا کون نہیں؟ یہ اعتراض اسلام آباد کے ردعمل میں کیا گیا۔ اس کا سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ فیصلہ بنگلہ دیش سرکار نے نہیں

کیا بلکہ ان غیر بنگالیوں نے کیا ہے کہ جو خود کو پاکستان کے وفادار کہتے ہیں اور وہاں جانا چاہتے ہیں۔ اب اگر یہ پوچھا جائے کہ یہ حق انھیں کس نے دیا تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ اسی حق خود ارادیت نے جس کے تحت ۲۶ برس پہلے پاکستان کا قیام عمل میں آیا تھا۔

پاکستانی اعتراض کی رہی سہی گنجائش شیخ مجیب الرحمٰن کے ذاتی نمایندے مستفیض الرحمٰن صدیقی نے بی۔ بی۔ سی کے لئے اپنے انٹرویو کے ذریعے ختم کردی۔ انھوں نے کہا " پاکستان کے حامیوں اور غیر بنگالیوں کو بنگلہ دیش چھوڑنے پر مجبور نہیں کیا جارہا۔ ہم کسی بھی بین الاقوامی ادارے کو قبول کرسکتے ہیں جو اس بات کا جائزہ لے کہ کون پاکستان جانا چاہتا ہے، کون نہیں؟" اس پیش کش کے بعد پاکستانی اعتراض کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ پاکستان کے وفادار غیر بنگالیوں کی رضا و رغبت کی پرکھ اب مشکل نہیں رہی، بشرطیکہ پاکستان اس پرکھ کے بعد اپنے شہریوں کو قبول کرنے کا وعدہ کرے۔

یہ بنگالی کبھی پاکستانی شہری تھے

بنگلہ دیش میں مقیم غیر بنگالیوں کے بارے میں تو حکومت پاکستان انسانی اقدار کی دُہائی دیتی رہتی ہے، لیکن وہ خود جو سلوک وہاں محصور بنگالیوں کے ساتھ روا رکھ رہی ہے وہ کن اصولوں، کن اقدار کی بنا پر جائز ہے؟ جن خواتین کو ایک وفد کی صورت میں پچھلے دنوں دنیا بھر کے دورے پر بھیجا گیا تاکہ پاکستانی جنگی قیدیوں کی رہائی کے لئے انسانی ہمدردی جگائی جائے جب ان میں سے کوئی غیر انسانی موقف اختیار کرے تو پاکستانی پروپیگنڈے کی حقیقت سمجھنے میں کچھ دشواری نہ ہونی چاہیئے۔ ۳ مئی کو جنگی قیدیوں کے لئے قومی کونسل کی صدر بیگم فضل حق نے راولپنڈی میں ایک پریس کانفرنس میں کہا " اگر بھارت نے مقدمات چلانے کے لئے پاکستانی جنگی قیدیوں کو بنگلہ دیش کے حوالے کیا تو پاکستان میں بنگالیوں پر غداری اور تخریب کاری کے الزامات میں مقدمے چلائے جائیں گے۔" دو روز بعد آدھی رات کے وقت ۶ ہزار بنگالیوں کو اسلام آباد میں گھروں سے نکال کر ٹرکوں اور بسوں میں بھر کر صوبہ سرحد اور پنجاب میں مختلف جگہوں پر کیمپوں میں بند کردیا گیا۔ حکومت پاکستان کا کہنا ہے کہ انھیں بنگلہ دیش بھیجنے کے لئے کیمپوں میں لے جایا گیا ہے۔ روزنامہ ڈان کے ۸ مئی کے شمارے کے آخری صفحہ پر صدر بھٹو کے نام ایک اپیل اشتہار کی صورت میں شائع کی گئی ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ جن بنگالی افسروں کو کیمپوں سے لے جایا گیا ہے ان کے بیوی بچوں کو ان کے ساتھ ہی منتقل نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے یہ عورتیں اور بچے خود کو بے سہارا اور غیر محفوظ محسوس کرتے ہیں اس لئے ان کی کیمپوں میں منتقلی تک ان کا گزارہ الاؤنس جاری رکھا جائے۔ پاکستانی پروپیگنڈے کا جواب اس اپیل میں ہے۔

بنگالی موقف

پاکستانی موقف کا یہ رُخ ناقابل فہم ہے۔ وہاں مقیم بنگالیوں کو مصائب کا شکار بنایا جارہا ہے اور پاکستانیوں کو قبول کرنے میں تامل سے کام لیا جارہا ہے پاکستانی شہریوں کے تئیں پاکستان کے منفی رویہ کا رد عمل بنگلہ دیش میں ان بدنصیب لوگوں کے حق میں نہیں ہوسکتا " اگر پاکستان ان کے بارے میں کوئی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کرتا ہے تو بنگلہ دیش ان کی غیر موافق موجودگی کو کیسے برداشت کرسکتا ہے؟" (دی پیپل۔ ڈھاکہ، ۳۰ اپریل) " اگر بنگلہ دیش پاکستان کی تقلید کرنا چاہتا تو بنگلہ دیش میں رہ گئے ان پاکستانیوں پر مقدمات چلا سکتا تھا جنھوں نے جنگی جرائم میں معاونت کی ہے"۔ (دی پیپل۔ ڈھاکہ، ۹ مئی)

حیرت کی بات یہ ہے کہ ہمارے پالیسی ساز یہ تک بھلا بیٹھے ہیں کہ بنگلہ دیش میں پھنسے ہوئے پاکستانیوں کو واپس لینے سے انکار کرتے رہنے کی وجہ سے دنیا ہمارے بارے میں کیا سوچے گی؟

ہند میں بنگلہ دیش کے ہائی کمشنر ڈاکٹر اے۔ آر۔ ملک نے لیلی ویٹرن انٹرویو میں حکومت بنگلہ دیش کے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ " پاکستان کی طرف سے ان لوگوں کو نسلی اور سیاسی اقلیت قرار دیا جانا اور بنگلہ دیش کے ظلم و ستم کا شکار کیا جانا نہایت غلط اور بے بنیاد ہے۔ ہم کسی کو اپنے ملک سے نکال نہیں رہے۔ البتہ اتنا ضرور چاہتے ہیں کہ دنیا سمجھ لے کہ جو لوگ ہماری قومیت اور خود مختاری قبول نہیں کرتے انھیں ہم کیسے رکھ سکتے ہیں۔ یہ لوگ وہاں تخریبی کارروائیوں کا مرکز بن سکتے ہیں۔"

بے چاروں کے حق میں

پاکستان میں سبھی آوازیں ان بے چاروں کے خلاف ہوں، ایسا بھی نہیں۔ کراچی کے روزنامہ 'حریت' کا ۲۸ اپریل کا اداریہ ان کے لئے یقیناً امید افزا ہے۔ " اصول پرستی کبھی آسان نہیں ہوتی۔ اصول پرستی یہ نہیں ہوتی کہ جب فائدہ نظر آئے یا نقصان کا احتمال نہ ہو تو اصولوں پر عمل کرلیا جائے۔ اگر ہم اپنے اعلیٰ اصولوں پر عمل کرتے ہوئے ان پاکستانیوں کو واپس لے آئیں تو اس سے ہمارے لئے وقتی طور پر کچھ مشکلات ضرور پیدا ہوجائیں گی، لیکن ہم اپنے اس دعوے کو ثابت کرسکیں گے کہ ہم ایک اصول پرست قوم ہیں۔"

حکومت پاکستان اپنے وزیر مملکت راجہ تری دیو رائے کے اس اعلان کو کہ بنگلہ دیش سرکار کو انھیں شہری حقوق سے محروم کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں کیونکہ وہ پاکستانی شہری ہیں، معتبر سمجھتی ہے لیکن بنگلہ دیش کے غیر بنگالیوں کے اعلان وفاداری کو نظر انداز کررہی ہے۔ ان کے پاکستانی شہری ہونے پر شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے حبیب الرحمٰن اخبارِ جہاں میں لکھتے ہیں " وہ نہ صرف سوا سال پہلے تک پاکستانی تھے بلکہ آج بھی پاکستانی ہونے کے دعویدار ہیں بنگلہ دیش کے غیر بنگالی پاکستانیوں کے مسئلہ کا فیصلہ کرتے وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم کوئی ایسی روایت

(باقی صفحہ ۲۳)

مسلم فرقہ پرست جماعتیں اور مسلمان

شعیب اعظمی

ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ عجیب وغریب ہے۔ ہر زمانے میں حقائق کی طرف سے منہ موڑ کے ایک غیر متعین اور لاحاصل مقصد کے لئے کوشاں رہے ہیں جس کے حصول میں خود ان کا اپنا کوئی فائدہ نہیں ہوتا ہے اور دوسروں کے لئے مرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ خود دیکھتے ہیں کہ ہماری معاشی حالت بہتر نہیں ہے مگر دوسروں کی مدد اللہ واسطے کرتے رہتے ہیں۔ اپنی بیکسی اور پریشانی کا ذمہ دار حکومتِ وقت، زمانہ اور مقدر کو قرار دیتے ہیں۔ مسلم حکمرانوں کا اس لئے ساتھ دیا کہ وہ اسلام کے نام لیوا تھے چاہے من مانی کرتے رہے ہوں۔ شروع میں انگریزوں سے برسرپیکار اس لئے رہے کہ انھوں نے مسلم حکمرانوں سے زمام حکومت چھین لی تھی۔ انگریزی زبان، لباس اور تمدن سے نفرت کی حد کر دی اور سرسید نے جب اس پس ماندگی کی طرف توجہ دلائی تو انھیں کافر، ملحد، بے دین اور کرستان کے القاب سے نوازا۔ جب پانی سر سے اونچا ہوا تو آنکھ کھلی اور گھبراہٹ میں نہ صرف انگریز کے دامن میں پناہ لی بلکہ اس طرح شیر وشکر ہو گئے گویا انگریز کبھی غاصب نہ تھے، انگریز غیر ملکی نہ تھے اور نجس نہ تھے۔ اگر دنیا میں کوئی محسن تھا تو وہ انگریز قوم تھی چنانچہ اس جذبے کی بنا پر آزادیٔ وطن کی تحریک میں ملک کے دوسرے لوگوں کے ساتھ نہ صرف تعاون سے انکار کیا بلکہ ان کا ساتھ دینے والے تمام مسلمانوں پر گندگی اچھالتے رہے، داڑھیاں نوچتے رہے، گالیاں دیتے رہے، دائرۂ اسلام سے خارج کرتے رہے اور طرح طرح کے طعن وتشنیع سے زخمی کرکے قہقہے لگاتے رہے۔ آزادی کے طلبگاروں کا ساتھ دینے کے بجائے انگریز کا ساتھ دیتے رہے۔ برادرانِ وطن سے سمجھوتہ کرنے کے بجائے انگریز کو اپنا محافظ جانتے رہے اور اس سے یہ کہتے رہے کہ یہ دیوانے ہیں، ان کی نہ سنو۔ لاٹھی، ڈنڈے اور جیل بھرنے سے تمہاری چار دانگ عالم میں مشہور حکومت کا یہ بال بیکا نہیں کر سکتے اور یہ گنتی کے سر پھرے مسلمان اگر ان کے ساتھ ہیں تو بہکے ہوئے لوگ ہیں، یہ بے اثر ہیں، یہ نہ تو مسلمان ہیں اور نہ مسلمانوں کے نمائندے ہیں، اصل نمائندے ہم ہیں۔ ہم جو چاہتے ہیں وہ ہوگا۔

مگر آزادی کے متوالوں نے اپنا سفر جاری رکھا ملکی اور غیر ملکی حالات نے انگریز بہادر کو بوریا بستر باندھنے پر مجبور کر دیا۔

آزاد جمہوریت میں یہ طے کیا کہ ہم الیکشن میں حصہ نہیں لیں گے، بائیکاٹ کرتے رہے مگر رہے سہے علما نے پھر کروٹ لی اور یہ طے ہوگیا کہ الیکشن کی اجازت مذہب نے دی ہے۔ دارالحرب میں مذہب کی نئی تشریح انھیں علماء کی رہینِ منت تھی اور پھر کوئی صحیح راستہ قائم کرنے کے بجائے سودے بازی کی سوچی گئی اور سامان تجارت، زبان، ملازمت اور تحفظ کو دونوں کے سکّہ بر بڑھا جانے لگا۔ کبھی ادھر کبھی ادھر، مسلم مجلس مشاورت، مسلم مجلس کے نام سے اچھوتوں کی صف میں کھڑے ہوگئے اور چند سیٹیں حاصل کیں۔ مگر کچھ پانے کے بجائے رہی سہی حیثیت بھی کھو بیٹھے اور پھر وہاں سے توبہ کرکے حکمراں پارٹی سے ساز باز کی اور کوئی مناسب راہ نہ پاکر اس کا ساتھ دینے پر آمادہ ہوگئے اور اب جب ادھر سے بھی مطلب برآری نہ ہوئی تو اسی سیاسی پارٹی کی حکمراں لیڈر کو فلاں فلاں سن لو، جان لو، خبردار ہو جاؤ، ہم یہ کر دیں گے ہم وہ کر دیں گے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس بار مسلم لیگ کھل کر میدان میں ہے اور صدارت اسی کے ہاتھ میں ہے۔

کتنا بھولا ہے ہندوستانی مسلمان کہ ان تمام تلخیوں کو اتنی جلد بھلا بیٹھا ہے یہ وہی مسلم لیگ ہے جس نے تقسیم کے بہانے مسلمانوں کی وحدت کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا۔ زبان ختم کر دی یہاں تک کہ کراچی میں بھی اب اردو کا دامن تنگ ہے۔ بے چارے ہندوستانی مہاجر کراچی اور ڈھاکہ لٹے پٹے گئے تھے بیس برس میں جب کچھ سنبھلے تو ان کے ساتھ انھیں اسلامی بھائیوں نے جو ستم توڑے وہ تاریخ کا المیہ ہیں۔ آج وہ سب بہاری ہیں جنھیں بنگلہ دیش اور خود مملکت خداداد لینے کو تیار نہیں ہے اور بعض کیا بیشتر ہندوستانی مسلمان ہندوستان پر الزام لگاتے ہیں کہ کیوں نہیں ان مہاجروں کو ہندوستانی شہریت دے دی جاتی ہے

اس جماعت کے کارنامے کسی سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔ آج اس کے تمام مطالبات وہی ہیں جن کی قیادت میں وہ مسلمانوں کی مٹی پلید کرا چکی ہے اور حیرت تو اس پر ہے کہ دیگر علما نے بھی قیادت کی کرسی اسی جماعت کے سپرد کر دی ہے اور آج کوئی بھی ان سے یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ کبھی آپ کی رہنمائی نے تو ہمیں کہاں کہاں پہنچا دیا۔ اپنی صفائی کے لئے مسلم لیگ کہتی ہے کہ ہم انڈین مسلم لیگ ہیں اور ہماری پرانی مسلم لیگ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ وضاحت بالکل ویسی ہے جو جماعتِ اسلامی ہند دیا کرتی ہے کہ ہم الگ ہمارے مقاصد الگ

ہیں حالانکہ یہ بات بدیہی ہے کہ جماعت کے مقاصد اور اور طریقۂ فکر میں کوئی فرق نہیں ہے اور پھر جماعت اسلامی ایک خالص مذہبی جماعت ہوتے ہوئے بھی مکمل طور پر سیاسی میدان میں کود پڑی ہے۔

مسلمانوں کی یہ جماعتیں پوری قوم کو کس طرف لے جا رہی ہیں۔ ایک طرف تو مسلمانوں کی معاشرتی پستی کا رونا ہے اور ان کا علاج خالص مذہبی مطالبوں کے ذریعہ سوچا جا رہا ہے۔ ایک طرف تو آپ مسلمانوں کو تمام جدید تقاضوں سے الگ رکھنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف ملک کے تمام مسائل اور ان کے اچھے نتائج سے فائدہ اٹھاتے دیکھنا چاہتے ہیں۔ ایک طرف یہ جماعتیں مسلمانوں کو رجعت پرستی کی طرف کھینچتی ہیں اور دوسری طرف سائنس اور سماجی علوم کے تمام وسائل سے بہرہ مند بھی ہونا چاہتی ہیں مسلم پرسنل لا کے خلاف اور مسلم یونیورسٹی ایکٹ کے خلاف بالترتیب بمبئی اور دہلی کے کنونشنوں میں جو کچھ ہوا ہے وہ ان تمام مقاصد کی غمازی کرتا ہے جو مسلم لیگ اور جماعت اسلامی چاہتی ہیں اور اس سلسلے میں انھوں نے ملک کی تمام رجعت پسند پارٹیوں کو اپنے پلیٹ فارم پر بلا کر اپنے مطالبوں کی حمایت کی سند ان سے مانگی ہے اور مخالفت میں یہاں تک آگے بڑھ گئی ہیں کہ جن سنگھ کو اپنا ہمدرد سمجھنے لگی ہیں۔

مسلمانوں کو بہت سی شکایتیں ہیں اور جائز ہیں اس سے کوئی صحیح الدماغ اور لیڈر انکار نہیں کر سکتا مگر ان کا علاج ملک کی قدامت پرست طاقتیں کبھی نہیں کر سکتی ہیں اور نہ ہی وہ طریقۂ کار جو وقت کی مسلم سیاست انجام دے رہی ہے۔ یہ دھمکی دینا کہ علیگڑھ کا کام مسلم اوقاف کی تین کروڑ کی سالانہ آمدنی سے انجام دیں گے اور خود مسلم یونیورسٹی چلائیں گے ایک خیال خام ہے جو قوم اپنے دہلی کے اوقاف کی آمدنی سے اینگلو عربک اور فتحپوری یا بارہ کا ایک ہائی اسکول سرکار کی بغیر اعانت کے نہ چلا سکتی ہو وہ مسلم یونیورسٹی کا خرچ چلائے گی؟ اسی طرح یو۔پی کے فساد کی ذمہ داری سے جن سنگھ کو بری کر دینے کا سرٹیفکٹ عطا کر دینا دانش مندی ہے، یہ جن سنگھ ہے اس کا ترجمان آرگنائزر ہے، اس کے رہنما ہیں جو بیک وقت عوام اور حکومت کے افسران پولیس کے جوانوں کو فسطائیت کا سبق پڑھا رہے ہیں اور آپ بھی اس جرم میں شریک ہیں جس طرح ہندو نسل کو جن سنگھ قدامت کی طرف کھینچ رہی ہے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک خلیج حائل کر رہی ہے اسی طرح آپ کی جماعتیں اس خلیج کو اور زیادہ وسیع کر رہی ہیں۔ روزانہ کی نت نئی مانگوں اور یہاں تک کہ جائز مانگوں کے خلاف ہندو ذہن میں جن سنگھ زہر بھرتی ہے اور اس زہر کو مؤثر آپ بناتے ہیں مخلوط الیکشن کا مطالبہ ختم کرکے الگ محفوظ نشستوں کا مطالبہ ہوتا ہے۔ ملازمتوں میں ہریجنوں کی طرح آبادی کے تناسب سے تعین چاہتے ہیں اور اس کے ردعمل پر چراغ پا ہو کر ترقی پسند اداروں اور جماعتوں پر برستے ہیں۔

ہندوستان میں ترقی پسند جماعتیں ہیں۔ اگرچہ ان کا اثر کم ہے مگر وہ اپنے نقطۂ نظر کو سیکولرازم کے استحکام کے لئے صرف کرنے میں تن من دھن سے لگے ہوئے ہیں۔ وہ غریبی، جہالت، بیماری کی لعنت ختم کرکے ملک کو ایک جمہوری مزاج بخشنے میں سرگرم ہیں جس میں ہندو، مسلم یا کسی فرقہ کی امتیازی حیثیت کا سوال نہیں بلکہ عام خوشحالی اصل مقصد ہے۔ یہ جماعتیں ادھر کیوں نہیں آتی ہیں سودے بازی اور نعرہ بازی کے بجائے ایک عام مقصد کے لئے جدوجہد کرنے میں کیا تکلف ہے۔ مذہب اس راہ میں حائل نہیں ہے ہاں مذہب کو لا کھڑا کیا جاتا ہے اور سیکولرازم کا مذاق اڑایا جاتا ہے صرف اس لئے کہ مذہب کا نعرہ ایک آلۂ کار ہے جس طرح جن سنگھ روز یہ نعرہ لگاتی ہے کہ موجودہ حکومت میں ہندو دھرم اور سنسکرتی خطرہ میں ہے اسی طرح مسلم جماعتیں اس حکومت سے نالاں ہیں کہ زبان، کلچر اور تہذیب سب مٹ رہے ہیں۔ حکومت کی پوزیشن تو اب اس شعر کی مانند ہو گئی ہے ؎

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں

حکومت کی خامیاں، ترقی پسند جماعتوں کی مجبوریاں اور معائب اپنی جگہ مسلّم ہیں مگر اس میں مدد کرنے کے بجائے جن سنگھ کی طرح مسلم قیادت نہ صرف روڑے اٹکا رہی ہے اور اسے بدنام کرنے میں جن سنگھ سے دس ہاتھ آگے ہے مسلم صحافت مسلم قیادت پچھاڑ کر اس کوشش میں نمایاں کردار ادا کر رہی ہے خصوصاً لکھنؤ کے ہفتہ وار بریچ کے مدیر محترم کے نزدیک ہندوستان دنیا کی نگاہوں میں بدنامی بھوک اور جہالت کے دہانے پر کھڑا ہے۔ آپ تمام معاملات میں حکومت کو وہی مشورے دیتے ہیں جو ملکی مفاد سے ٹکراتے ہیں۔ کیڑے نکالنا آپ کا محبوب مشغلہ ہے اسی طرح دہلی کے روزنامہ "دعوت" میں تقریباً وہ خبریں، تراشے، اداریے زیادہ ہوتے ہیں جو حکومت کے نہ صرف خلاف بلکہ بے جا اور مخالفانہ تنقیص کے مظہر ہوتے ہیں۔ "الجمعیۃ" تک کا یہ حال ہے کہ مسلم پرسنل لا کی مخالفت میں اپنے حمایتیوں میں ایک بار گروگولوالکر کا نام اور تقریر کو بھی شامل کر لیا۔ یہ وہ قیادت ہے جو بیماری، جہالت، غریبی اور مساوات کا علاج مذہب کے غلط نام سے کرنا چاہتی ہے اور ٹھیک اسی راہ پر نئی نسل کو لے جا رہی ہے جس پر چل کر مسلمانوں کی پچھلی نسلیں تباہ و برباد ہوئی تھیں۔

نئی نسل کو اس خواب گراں اور مدہوشی سے بیدار ہونا چاہیئے وہ ہو کر رہے گی اور اس قیادت کے فرسودہ اور کھوکھلے نعروں کی گرفت سے آزاد ہو کر حقائق کو سمجھنے کی کوشش کرے گی اور اقبال کے اس شعری نکتہ کو سمجھ کر اپنی راہ متعین کرے گی جس میں "در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق" کا راز پنہاں ہے ؎

آئین نو سے ڈرنا طرز کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

مسلم سیاست کا
ایک خطرناک رجحان

ریاض الرحمٰن شروانی

پارلیمانی جمہوریت میں بلاشبہ انتخابات کو بہت اہمیت حاصل ہوتی ہے اور اس میں بھی کلام نہیں ہے کہ سیاسی جماعتوں کا مقصد انتخابات میں کامیابی حاصل کرکے اقتدار تک پہنچنا ہوتا ہے۔ تاہم سیاسی جماعتیں بعض اصول ونظریات کی بنیاد پر انتخابات میں حصہ لیتی ہیں اور جو رائے دہندگان جس جماعت کے اصول ونظریات کو صحیح سمجھتے ہیں اس کے حق میں رائے دیتے ہیں۔ اس طرح جس اصول ونظریات کی حامل جماعتوں کو اکثریت کی تائید حاصل ہو جاتی ہے وہ ایک متعینہ مدت کے لئے اقتدار کی کرسی پر متمکن ہو جاتی ہیں لیکن جب حصول اقتدار کو اتنی اہمیت دے دی جائے کہ اصول ونظریات ہی پس پشت جا پڑیں تو نہ صرف ان جماعتوں پر سے عوام کا اعتماد اٹھنے لگتا ہے بلکہ خود جمہوریت کا مستقبل خطرے میں پڑ جاتا ہے۔

افسوس ہے کہ اس وقت ہمارے ملک میں کچھ ایسا ہی نقشہ بنتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ ۱۹۷۴ء کے آغاز میں یو۔پی اور بعض دوسری ریاستوں میں انتخابات متوقع ہیں۔ ان انتخابات کے پیش نظر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حزب اختلاف کی اکثر جماعتوں نے اصول ونظریات کو خیرباد کہہ کر صرف انتخابات میں کامیابی کو اپنا مطمح نظر بنا لیا ہے اور ایسا کرتے ہوئے انھیں اس کی ذرا پرواہ نہیں ہے کہ اس کا اثر جنتا کے ذہنوں پر کیا پڑے گا۔ زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ وہ جو الزامات برسرِ اقتدار جماعت پر لگاتی ہیں ان ہی سب حرکتوں کا ارتکاب خود بھی کرتی ہیں۔ ایسی صورت میں ان کی بات میں کیا وزن باقی رہ سکتا ہے اور عوام ان کے بارے ۔۔۔۔ میں کوئی اچھی رائے کیسے قائم کر سکتے ہیں؟

اس کی سب سے روشن (یا تاریک) مثال مسلمانوں کے بارے میں ان جماعتوں کا طرز عمل ہے اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ بدقسمتی سے ہندوستان میں مسلمانوں کے بعض ایسے مسائل ہیں جس کی طرف ارباب اقتدار نے اس انداز سے اب تک توجہ نہیں کی ہے جس انداز سے کرنی چاہیئے تھی اور اس لئے یہ مسائل ابھی تک پوری طرح حل نہیں ہو سکے ہیں ان مسائل میں اولیت فرقہ وارانہ فسادات کو دیتا ہوں کیونکہ فرقہ وارانہ فساد سے جانی اور مالی نقصان تو ہوتا ہی ہے لیکن میرے نزدیک سب سے بڑا نقصان نفسیاتی ہوتا ہے۔ جو لوگ ان فسادات کا نشانہ بنتے ہیں طویل مدت کے لئے ان کا اعتماد اپنے مستقبل پر سے اٹھ جاتا ہے اور تخریب پسند جماعتوں اور افراد کے لئے انھیں ورغلا کر راہ راست سے ہٹانا آسان ہو جاتا ہے۔ دوسرے سب سے اہم مسئلہ مسلمانوں کی اقتصادی پس ماندگی اور تباہ حالی کا ہے۔ بھوکا صرف ایک زبان سمجھتا ہے اور وہ پیٹ کی زبان ہے۔ اُسے اخلاقی درس دینا یا اعلیٰ سیاسی اور قومی اصول ونظریات سمجھانا قطعاً لاحاصل ہے۔ تیسرے درجے پر مسلمانوں کے ثقافتی اور تعلیمی حقوق کے تحفظ کا مسئلہ ہے اور ان حقوق میں سب سے زیادہ اہمیت اردو کے مسئلے کو حاصل ہے۔

یہ کہنا تو صحیح نہیں ہوگا کہ ان مسائل کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں دی گئی ہے اور ان کے حل کی طرف بالکل ہی پیش قدمی نہیں ہوئی ہے لیکن، جیسا کہ عرض کیا گیا، یہ کہنا ضرور صحیح ہوگا کہ یہ مسائل جس توجہ کے مستحق ہیں وہ توجہ انھیں اب تک حاصل نہیں ہوئی ہے۔ انھیں حل کرنے کے لئے کانفرنسیں منعقد کی گئیں تجاویز منظور ہوئیں، احکامات جاری کئے گئے لیکن نتائج کچھ زیادہ ہمت افزا صورت میں سامنے نہیں آئے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ان مسائل کے حل کے لئے جو دلچسپی اعلیٰ سطح پر پائی جاتی ہے وہ نچلی سطحوں پر نہیں پائی جاتی ہے اور ہمارا اقتدارِ اعلیٰ اپنے ماتحتوں میں یہ دلچسپی پیدا کرنے سے قاصر رہا ہے۔ لیکن اس بارے میں صرف کسی ایک جماعت کو مورد الزام قرار دینا ممکن نہیں ہے۔ مرکزی سطح پر نہ سہی ریاستی سطح پر تو مختلف جماعتوں کا تجزیہ ہو ہی چکا ہے اور سب ہی جماعتیں اس معاملے میں یکساں طور پر ناکام ثابت

دوسرا سب سے اہم مسئلہ مسلمانوں کی اقتصادی پس ماندگی اور تباہ حالی کا ہے۔ بھوکا صرف ایک زبان سمجھتا ہے اور وہ پیٹ کی زبان ہے۔ ا۔۔۔ اخلاقی درس دینا یا اعلیٰ سیاسی او۔ قومی اصول ونظریات سمجھا۔ لاحاصل ہے۔

ہوئی ہیں۔

اس ضمن میں ۱۹۷۱ء میں ہونے والے علی گڑھ کے فرقہ وارانہ فساد کا ذکر بے جا نہیں ہے یہ فساد عام فسادات کی طرح بالکل یک طرفہ نہیں بلکہ اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کا ن[illegible] ہوا تھا (اگرچہ زیادہ نقصان مسلمانوں ہی کا ہو[illegible] اُس وقت یو۔پی میں متحدہ محاذ کی حکومت تھی کے وزیر اعلیٰ تنظیمی کانگریس کے شری ٹی۔ این[illegible] تھے۔ فساد کے فوراً بعد شری ٹی۔ این سنگھ اور رش[illegible] سی۔ بی گپتا علی گڑھ تشریف لائے اور شہر کے

معروف سرمایہ دار کے یہاں قیام کیا۔ اس موقع پر گپتا جی نے ایک بیان دیا جس میں کہا کہ ۱۹۴۷ء کے بعد میں نے اتنا ہولناک فساد ہندوستان میں کسی دوسری جگہ نہیں دیکھا (اگر گپتا جی نے جبل پور اور احمد آباد وغیرہ کے فسادات کی ہولناکی کا نظارہ نہیں فرمایا تو اس میں قصور کس کا ہے ؟) بہر حال گپتا جی اور شری ٹی۔ این سنگھ کی علیگڑھ سے واپسی کے بعد مسلمانوں کی جو دارو گیر ہوئی اور انھیں جن مصائب کا مقابلہ کرنا پڑا اس کی یاد ابھی تک ان کے ذہنوں سے محو نہیں ہوئی ہے۔

ان بنیادی مسائل کے علاوہ بعض اور مسائل بھی وقتاً فوقتاً ابھرتے رہتے ہیں۔ آج کل جو مسئلہ مسلمانوں کی بھاری اکثریت کے لئے پریشانی اور اضطراب کا باعث بنا ہوا ہے وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی مسئلہ ہے اس مسئلے کی تفصیلات میں جائے بغیر یہ عرض کرنا ناگزیر ہے کہ اسے بگاڑنے میں جہاں حکومت کی بے تدبیری کو دخل ہے وہاں خود مسلمانوں کے ان عناصر کو بھی کچھ کم دخل نہیں ہے جو اس سے سیاسی فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ مسلمانوں کے ان عناصر کے ساتھ اس وقت حزب اختلاف کی بیشتر جماعتوں نے کاندھا ملا رکھا ہے اگر ان جماعتوں کا یہ اقدام خلوص پر مبنی ہوتا تو شکایت کا کوئی موقع نہیں تھا لیکن اس بارے میں بعض گزشتہ تجربات اور بعض حالیہ واقعات واضح طور پر اس کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ان کا مقصد صرف مسلمانوں کے ووٹ حاصل کرنا ہے، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے دورِ وائس چانسلری میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں میڈیکل کالج صرف اس وجہ سے قائم نہیں ہوسکا تھا کہ شری سی۔ بی۔ گپتا (جو اس وقت یو۔ پی کے وزیر صحت تھے) اسپتال کی تعمیر کے سلسلے میں بعض ایسی شرائط منوانا چاہتے تھے جو ذاکر صاحب اور یونیورسٹی کے دوسرے اربابِ حل و عقد کے لئے قابل قبول نہیں تھیں۔ یہ کھلا ہوا راز ہے کہ اس معاملے میں پنڈت جواہر لال نہرو اور مرکزی سرکار کا رویہ یونیورسٹی کے حق میں نہایت ہمدردانہ تھا اور کہا جاتا ہے کہ پنڈت جی نے گپتا جی کو اس بات میں اپنی رائے سے آگاہ بھی کر دیا تھا، تاہم گپتا جی اپنی ضد پر قائم رہے تاآں کہ ذاکر صاحب علی گڑھ سے تشریف لے گئے اور پھر ان کے جانشین کرنل بشیر حسین زیدی نے کسی نہ کسی طرح یہ مسئلہ حل کیا۔

ابھی حال میں بھارتیہ کرانتی دل کے لیڈر چودھری چرن سنگھ علی گڑھ تشریف لائے تھے۔ انھوں نے کئی جلسوں میں تقریریں کیں۔ ایک جلسے میں شرکت کا مجھے بھی موقع ملا۔ ایک مقامی کالج کے طالب علم نے ان سے سوال کیا کہ چند روز قبل دہلی میں مسلم یونیورسٹی سے متعلق جو کنونشن منعقد ہوا تھا اور جس میں یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو بحال کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا اس میں بی۔ کے۔ ڈی کے جنرل سکریٹری بھی شریک تھے کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ بی۔ کے۔ ڈی اس مطالبے سے متفق ہے ؟ چودھری صاحب نے جواب دیا کہ ہم صرف یونیورسٹی کی اندرونی خود مختاری بحال کرنے کے حق میں ہیں، اقلیتی کردار سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ رہا کنونشن میں جنرل سکریٹری کی شرکت کا سوال تو وہ اپنی ذاتی حیثیت میں شریک ہوئے تھے۔ بی۔ کے۔ ڈی کے نمایندہ کی حیثیت سے شریک نہیں ہوئے تھے۔ اسی موقع پر انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ جب ہم نے یو۔ پی میں جن سنگھ کے ساتھ مل کر وزارت بنائی تھی تو ہم پر اعتراض کیا گیا تھا لیکن اب خود کانگریس کیرل میں مسلم لیگ کے ساتھ وزارت میں شریک ہے تو کوئی اعتراض نہیں کرتا ہے حالانکہ جن سنگھ فرقہ پرست جماعت نہیں ہے کیونکہ اس کے دروازے ہر ایک کے لئے کھلے ہوئے ہیں جب کہ مسلم لیگ کی فرقہ پرستی —— اس کے نام ہی سے ظاہر ہے (حیرت ہے کہ آج چودھری صاحب کی جماعت یو۔ پی میں مسلم مجلس کے ساتھ گٹھ جوڑ کئے ہوئے ہے حالانکہ ان کے نام میں بھی لفظ "مسلم" موجود ہے)۔ اس کے علاوہ معتبر ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ چودھری صاحب نے ایک دوسرے جلسے میں یہ بھی فرمایا کہ جب تک ہندوؤں کی اکثریت اردو کو یو۔ پی کی دوسری سرکاری زبان ماننے کے لئے تیار نہ ہو اس وقت ان کی جماعت اس مطالبے کی حمایت کرنے سے معذور ہے۔ (یہاں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ چودھری صاحب نے یو۔ پی یا ہندوستان کے عوام کی اکثریت نہیں کہا بلکہ "ہندوؤں کی اکثریت" کہا)۔ میں نے چودھری چرن سنگھ کی تقریروں کے اتنے طویل حوالے اس لئے دیئے ہیں کہ ان سے حزب اختلاف کی بعض جماعتوں کی نیت اور حکمت عملی کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر عبد الجلیل فریدی کے بارے میں "سیکولر ڈیموکریسی" نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ "گزشتہ دو برس کے عرصے میں فریدی صاحب نے جو تبدیلی اپنے خیالات میں ظاہر کی ہے اس کی نوعیت آیا رام گیا رام سے زیادہ گمبھیر اور نتیجہ خیز ہے۔ انھوں نے اپنی ذات کو نہیں، تمام مسلمانوں کے مفادات کو داؤں پر لگایا ہے"۔ میں صرف اس میں یہ تبدیلی کرنا چاہتا ہوں کہ فریدی صاحب کے خیالات کی یہ کایا پلٹ دو برس نہیں بلکہ گزشتہ بیس برس کی مدت پر حاوی ہے۔ انھوں نے سماج واد سے فرقہ واریت تک کا یہ سفر ۱۹۵۲ء میں شروع کیا تھا۔ اور نہیں کہا جا سکتا کہ کب اور کہاں پہنچ کر ختم ہوگا۔ اگر ماضی بعید کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو ماضی قریب میں اس داستان کا آغاز ۱۹۶۷ء سے

ڈاکٹر فریدی مسلمانوں کا نیلام کانگریس کے ہاتھوں کرتے ہیں تو کبھی حزب اختلاف کے ہاتھوں۔ اب یہ مسلمانوں کی عقل و فہم پر منحصر ہے کہ وہ ڈاکٹر فریدی اور ان کے ہم خیال حضرات کے ہاتھوں کا کھلونا بننے پر آمادہ ہوتے ہیں یا نہیں۔

ہوتا ہے۔ ۱۹۶۲ء کے انتخابات میں انھوں نے کانگریس کے خلاف حزب اختلاف کی جماعت کے ساتھ گٹھ جوڑ کیا تھا لیکن جب یو۔پی اور بہار وغیرہ میں متحدہ محاذ کی حکومتوں سے انھیں مایوسی ہوئی تو ۱۹۶۹ء اور ۱۹۷۱ء کے انتخابات میں انھوں نے کانگریس سے خفیہ معاہدہ کیا اور جب کانگریس بھی ان کی توقعات پر پوری نہیں اتری تو گزشتہ سال سے انھوں نے ایک دفعہ پھر ان ہی جماعتوں کو آزمانے کا بیڑا اٹھایا ہے جنھیں پہلے بھی آزما کر مایوس ہو چکے ہیں۔ اس مرتبہ کانگریس کی مخالفت کے جوش میں وہ اتنے آگے بڑھ گئے ہیں کہ جن سنگھ تک کو نیک چلنی کا سرٹیفکیٹ مرحمت فرما دیا ہے۔ فریدی صاحب اور ان کی جماعت کا یہ طرز عمل جس سیاسی دیوالیہ پن کی نشاندہی کرتا ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔

حصول آزادی سے پہلے ایک موقع پر مولانا ابوالکلام آزاد نے فرمایا تھا کہ جس طرح ڈاکٹر امبیڈکر نے ہریجنوں کو بازار کی جنس بنا دیا ہے، جو زیادہ قیمت لگائے انھیں خرید لے۔ میں نہیں چاہتا کہ مسلمان بھی اسی طرح بازار کی جنس بن جائیں (خیالات مولانا آزاد کے ہیں، الفاظ میرے ہیں) آج بالکل یہی معاملہ ڈاکٹر فریدی مسلمانوں کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں کبھی ان کا نیلام کانگریس کے ہاتھوں کرتے ہیں اور کبھی حزب اختلاف کے ہاتھوں۔ اب یہ مسلمانوں کی عقل و فہم پر منحصر ہے کہ وہ ڈاکٹر فریدی اور ان کے ہم خیال حضرات کے ہاتھ کا کھلونا بننے پر آمادہ ہوتے ہیں یا نہیں۔ ہمیں توقع بھی رکھنی چاہیئے اور اس کی کوشش بھی کرنی چاہیئے کہ مسلمان اپنے مستقبل کا فیصلہ خود اپنی عقل کی روشنی میں کریں گے، نہ کہ کسی دوسرے کی عقل کی روشنی میں۔

ذاتی طور پر مجھے ڈاکٹر فریدی اور ان کی جماعت سے اتنی شکایت نہیں ہے جتنی ان جماعتوں سے ہے جو سیکولرازم ——— اور جمہوریت پسندی کی دعوے دار ہیں۔ یہ جماعتیں بجائے اپنے اصولوں اور آدرشوں پر اعتماد کرنے کے الیکشن جیتنے کے لئے ایسے کمزور سہارے تلاش کرتی ہیں جو اول تو انھیں منزل مقصود تک پہنچا ہی نہیں سکتے ہیں اور اگر وقتی طور پر پہنچا بھی دیں تو اس سے خود ان کے اصولوں آدرشوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچتا ہے۔ اس وقت ۱۹۷۴ء کے انتخابات کے پیش نظر مسلمانوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے جو دوڑ لگ رہی ہے کاش اس کی بنیاد خلوص اور نیک نیتی پر ہوتی اور اس کے پیچھے واقعی ان کے جائز مسائل کو حل کرنے کا جذبہ کارفرما ہوتا! لیکن افسوس ہے کہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ یہ ایک خطرناک رجحان ہے جس سے ہمیں نہ صرف خود باخبر رہنا چاہیئے بلکہ ان لوگوں کو بھی آگاہ کرنے کی بھرپور کوشش کرنی ——— چاہیئے جنھیں پھانسنے کے لئے یہ جال بچھایا گیا ہے۔

یہ بے چارے کہاں جائیں؟ بقیہ ص۱۸

قائم نہ کریں جو مستقبل میں ایک خطرناک نظیر بن جائے پھر دو لاکھ افراد کی منتقلی اور آبادکاری کا مسئلہ اتنا کٹھن بھی نہیں جتنا کہ اسے بنایا اور بتایا جا رہا ہے۔ بلوچستان جو رقبے کے اعتبار سے باقی ماندہ پاکستان کے دیگر تینوں صوبوں سے بڑا ہے وہاں کی آبادی صرف بارہ لاکھ ہے اور وہی ایک صوبہ اپنی آغوش میں دو کیا بیس لاکھ انسانوں کو بھی پناہ دے سکتا ہے۔"

[illegible]

ہند بنگلہ دیش مشترکہ اعلامیہ میں ایک اجتماعی پیش کش کی گئی ہے جس کا ایک حصہ بنگلہ دیش سے پاکستانیوں کی واپسی سے متعلق ہے۔ حکومت پاکستان سہ طرفہ تبادلے کی اس تجویز کو زبردستی مشروط قرار دے رہی ہے۔ "بیریئر" کراچی کے اداریے میں اس دلیل کا بھی جواب ہے "کہ کوئی شرط ہے ہی نہیں۔ یہ شرط محض اس وجہ سے بنی ہوئی ہے کہ ہم اپنی ایک جائز ذمہ داری سے دامن بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ ہمارے جنگی قیدیوں کی واپسی میں اس لئے تاخیر ہو رہی ہے کہ ہم پاکستانی شہریوں کو واپس لینے پر آمادہ نہیں ہیں، حیرت کی بات یہ ہے کہ ہمارے پالیسی ساز یہ تک بھلا بیٹھے ہیں کہ بنگلہ دیش میں پھنسے ہوئے پاکستانیوں کو واپس لینے سے انکار کرتے رہنے کی وجہ سے دنیا ہمارے بارے میں کیا سوچے گی۔ پاکستان کو ایک ایسے مجبور ملک کا اعزاز دیا جا رہا ہے جو اپنے شہریوں کو واپسی کے لئے جدوجہد کرنے کی بجائے انھیں اپنی سرحدوں سے دور رکھنے کی سرتوڑ کوشش کر رہا ہے۔" (۲۸ اپریل)

بنگلہ دیش کے غیر بنگالی پاکستانیوں کو پاکستان سے دور رکھنے کے دو مقاصد ہیں۔ سندھی سندھ میں غیر غیر سندھیوں کی آبادکاری کے خلاف ہیں، ایسی ہی مشکل دوسرے کسی صوبے میں بھی پیش آسکتی ہے۔ دوسرے اگر یہ لوگ بنگلہ دیش میں رہ سکیں تو انھیں پاکستان کے حق میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ صدر بھٹو کے دل و ذہن میں ان لوگوں کو قبول نہ کرنے کا کوئی اور مقصد بھی ہو تو اس کا ابھی کوئی اشارہ نہیں ملا۔ سوائے اس کے کہ ان کی آبادکاری کے لئے پاکستان کے مالی وسائل پر بھی خاصا بوجھ پڑے گا۔ بہرحال مقصد خواہ کچھ بھی ہو ڈھائی لاکھ پاکستانی حکومت پاکستان کے ہاتھوں تذبذب اور بے یقینی کا شکار ہیں۔ حالات کی کیسی ستم ظریفی ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں کے دارالامان میں خود اس کے اپنے ڈھائی لاکھ شہریوں کے لئے جگہ نہیں ہے۔ یہ لوگ مسلمان بھی تھے اور پاکستانی بھی۔ پھر بھی پاکستان کے دروازے ان بدنصیبوں پر بند ہیں۔ اور شاہ ظفر کا یہ مصرعہ ان کے حال کا ترجمان ہے۔

دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں



مختصر افسانہ

برگد کا پیڑ

شکیل الرحمٰن

میں اس وقت فوج میں بھرتی ہوا تھا جب دیس کی کئی سیماؤں پر دشمنوں نے اپنے دانت گڑا رکھے تھے۔ تب سے اب میں اپنے گاؤں کوٹلہ واپس آیا ہوں۔

جب میں ریلوے اسٹیشن پر اترا تو یاد آیا کہ ابھی مجھے گھوڑے پر ۲۰، ۲۵ کلومیٹر اونچے نیچے راستوں سے جانا ہوگا تب کہیں جاکے میرے گاؤں کی سرحد شروع ہوگی میں ریلوے اسٹیشن سے باہر آیا تو کوٹلہ جانے کے لئے کئی گھوڑے والے سامنے آگئے۔

"صاحب، میرا گھوڑا بہت اچھا ہے" ایک طرف سے آواز آئی۔

"کوٹلہ بس میرے گھوڑے پر جاؤ صاب۔" دوسری آواز آئی۔

"ساتھی، اونچائی نیچائی کے راستے میں میرے گھوڑے پر آؤ۔ دیکھنا کتنے آرام سے کوٹلہ پہنچا دے گا" میرے پاس کھڑے ایک نوجوان گھوڑے والے نے کہا۔

میں نے اس سے کہا کہ "کہاں ہے تمہارا گھوڑا یہ سامان اس پر باندھ دو۔" نوجوان گھوڑے والے کے سوچتے ہوئے معصوم چہرے سے میں اسی لمحہ متاثر ہو گیا تھا۔

کچھ دیر بعد چائے پی کر میں گھوڑے پر تھا اور گھوڑے والا آگے آگے گھوڑے کو تھامے چل رہا تھا۔ کچھ دور چل کر میں اُتر جاتا اور گھوڑے والے کے ساتھ چلنے لگتا۔ جب کچھ تھک جاتا تو پھر گھوڑے پر بیٹھ جاتا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بھارت۔" اس نے جواب دیا۔

"اس سے سندر نام اور کیا ہو سکتا ہے؟" میں نے کہا اور وہ میری طرف اس طرح دیکھنے لگا جیسے میں نے کوئی عجیب بات کہہ دی ہو۔

شام ہو رہی تھی، سورج غروب ہو رہا تھا۔ آسمان پر ہلکے سفید بادل کے ٹکڑے اِدھر اُدھر چپک گئے تھے جیسے وہ سورج کی کرنوں کو تک رہے ہوں ڈوبتے سورج کی نارنجی روشنی سے نیلے آسمان پر ایک سے زیادہ رنگ اُبھر رہے تھے۔

ہم نیچے اونچے راستے طے کرتے ہوئے ایک ڈھلوان سے اترے تو سامنے وہ ندی نظر آئی جو جانی پہچانی تھی۔ خاموش بہتی ہوئی، چھوٹی سی سندر ندی۔ میں اسے دیکھتے ہی پہچان گیا۔ بچپن سے میرا اس کا ایک رشتہ، ایک سمبندھ تھا۔ ندی کے نزدیک ہی برگد کا وہ پرانا پیڑ تھا جہاں میں اکثر گاؤں سے شہر جاتے ہوئے اور شہر سے گاؤں آتے ہوئے بیٹھ جاتا تھا۔ اس کی ٹھنڈی چھاؤں، اس کے پتّوں کی ہواؤں اور اس کی مضبوط ڈالیوں کو میں بھولا نہیں تھا۔ لوگ اکثر کہتے تھے کہ اس پیڑ کے نیچے لیٹنے والا مر جاتا ہے اس لئے کہ اس پر بھوت رہتے ہیں۔ میں نے کبھی بھوت دیکھا اور نہ کبھی اس پیڑ کے نیچے لیٹ کر مجھے ڈر لگا۔ اس پیڑ پر چاقو سے کئی نام کھدے ہوئے تھے اور کچھ ایسے نشان پڑے ہوئے تھے کہ اکثر مجھے لیٹ کر انھیں دیکھتے ہوئے اچھا لگتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان لکیروں سے میرے سامنے پھر جانی پہچانی صورتیں بنتی تھیں، مکھیا جی کی صورت، بڑے زمیندار صاحب کی صورت، دکھیا چوکیدار کی صورت۔

میں ندی کے نزدیک گھوڑے سے اتر گیا۔ ندی میں ہاتھ منہ دھویا۔ اب مجھے اپنے گاؤں کی مٹی کی خوشبو ملنے لگی تھی۔ بھارت نے گھوڑے کو کچھ کھلایا اور ندی کا پانی پلایا۔ اب میرا گاؤں زیادہ دور نہ تھے۔ پھر بھی جی چاہا تھوڑی دیر اس گھنے پیڑ کے نیچے لیٹ کر آرام کر لوں۔ میں برگد کے اس پرانے پیڑ کے نیچے لیٹ گیا۔ گھر کے لوگوں کو یاد کرنے لگا۔ درخت پر بنے نشان اور اُلٹی سیدھی لکیروں سے کبھی چاچی کی صورت اُبھرتی، کبھی ماں کی، کبھی رما کی۔ میری بہن رما اب تو بہت بڑی ہو گئی ہو گی۔ اس کا بیاہ بھی تو کرنا ہے۔ میں نے لیٹے لیٹے پیڑ کی ڈالیوں کو دیکھا، بڑی بڑی ڈالیاں، پرانی ڈالیاں پتے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں دے رہے تھے۔

"ساتھی، اس پیڑ کے نیچے نہ لیٹو۔" بھارت نے دور سے کہا۔

"کیوں؟" میں نے درخت کی گھنی ڈالیوں کو دیکھتے ہوئے لیٹے لیٹے پوچھا۔

"کہتے ہیں اس درخت پر بھوت رہتے ہیں۔" بھارت نے اپنے گھوڑے کو سہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ تو اپنا دیش ہے بھارت۔ اتنا گھنا، اتنا گمبھیر، اتنا سندر، سوچتا ہوا، ماضی کی کہانیاں سناتا ہوا، سایہ دار ـــــ اس کی چھاؤں میں لیٹ کر تو مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں اپنے دیش کی گود میں لیٹا ہوا ہوں، تمام ڈالیاں میری حفاظت کر رہی ہیں۔ اس پیڑ کے سب بھوت بھاگ چکے ہیں بھارت۔ یہاں تو صرف ہم تم ہیں۔" میں نے لیٹے لیٹے کہا۔

بھارت پھر کچھ نہ بولا۔

واقعی مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے سارا دیس ایک پیڑ بن گیا ہے اور میں اس کے سائے میں آرام سے لیٹا ہوا ہوں۔ برگد کا یہ پیڑ بھارت ہی تو ہے اپنا دیس، سایہ، ہوا، خوشی، کیا نہیں ہے یہاں؟

اتنی ڈالیاں، اتنے پتے، سب کا رشتہ اسی ایک جڑ اور اسی ایک دھرتی سے تو ہے۔ جب طوفان آتا ہے تو سب مل کر اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اسی طرح ——— جس طرح ہم سپاہی سرحدوں پر، ہر دھرم کے لوگ، ساتھی بن کر دشمنوں کو جواب دیتے ہیں۔ میں اسی قسم کی باتیں سوچ رہا تھا۔ برگد کی ہوا مجھے آج زیادہ اچھی لگ رہی تھی۔

اسی وقت ایک عورت کے چیخنے اور رونے کی آواز آئی ——— پھر وہ ہنسنے لگی، قہقہے کی آواز ——— اور یہ آواز پھر گم ہو گئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے اس پیڑ کے اوپر سے ایسی آوازیں آ رہی ہیں۔ میں چونک کر اٹھ گیا۔

"وہ آ گئی ——— وہ آ گئی۔" بھارت نے کہا۔

"کون آ گئی بھارت؟" میں نے پوچھا۔

پھر وہی آواز آئی ——— رونے کی آواز ہنسنے کی آواز ——— سناٹے میں یہ آواز گونج رہی تھی۔

"کون ہے یہ عورت؟" میں نے اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ قریب آ رہی تھی۔ الجھے ہوئے سفید بڑے بڑے بال، سفید شلوار قمیض، چہرے پر جھریاں، پچپن ساٹھ کی عمر ——— وہ کبھی آہستہ چل رہی تھی اور کبھی تیز بھی رو رہی تھی اور کبھی قہقہے لگا رہی تھی۔

"کوئی دیوانی ہے۔" میں نے سوچا۔

"کون ہے یہ عورت بھارت؟" میں نے بھارت سے پوچھا۔ درخت کے پاس سے اٹھ کر میں بھارت کے نزدیک آ گیا۔

"جسونت کنور ہے ساتھی۔" بھارت کے جواب میں عجیب سی کسک تھی، درد تھا۔

"کون جسونت کنور؟" میں نے پوچھا۔

"وہی جو سمجھتی ہے کہ اس برگد کے نیچے اسے … بار پھر دلاور مل جائے گا، اسے تیس سال پہلے … درخت کے نیچے دلاور ملا جو تھا۔" بھارت نے کہا۔

"کون دلاور؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے زیادہ تو معلوم نہیں ساتھی۔ کچھ کچھ جانتا ہوں۔" بھارت نے جواب دیا۔

"میں کچھ تو سنوں۔" میں نے کہا۔

"کوٹلہ پہنچنے میں دیر ہو جائے گی ساتھی مجھے پھر واپس ریلوے اسٹیشن بھی آنا ہے۔ گھوڑے پر بیٹھ جاؤ چلتے چلتے راستے میں جو جانتا ہوں بتا دوں گا۔"

میں نے بھارت کا مشورہ مان لیا اور گھوڑے پر بیٹھ گیا۔ جسونت کنور کی آواز اب بھی سنائی دے رہی تھی۔ وہ برگد کے پرانے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر کچھ کہہ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اس پیڑ سے باتیں کر رہی ہو۔ کبھی ادھر ادھر کچھ ڈھونڈھ رہی تھی جیسے کوئی نہایت ہی قیمتی چیز گم ہو گئی ہو۔

میں گھوڑے پر کچھ آگے بڑھ چکا تھا بھارت گھوڑے کی رسی تھامے چل رہا تھا۔ شام کے اندھیرے پھیل رہے تھے، سورج ڈوب چکا تھا۔ برگد کے پرانے پیڑ پر جانے کتنے پرندے بیٹھ رہے تھے، اڑ رہے تھے، شور کر رہے تھے، آسمان کے سفید سفید بادل اپنا رنگ بدل چکے تھے۔

"بہت دنوں کی بات ہے لوگ کہتے ہیں کہ برگد کے اس پیڑ کے نیچے جسونت کنور کو ایک ننھا سا خوبصورت بچہ ملا تھا۔" بھارت نے کہانی شروع کی اور میں سننے لگا۔ دور سے کبھی کبھی جسونت کنور کے چیخنے رونے اور قہقہے لگانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

"غالباً تیس سال پہلے اس ندی کے کنارے میلہ لگا تھا۔ پرتاپ سنگھ اور جسونت کنور دونوں میاں بیوی اس میلے میں آئے تھے۔ جب واپس جانے لگے تو اس برگد کے نیچے ایک خوبصورت سا بچہ انھیں ملا۔ پتہ نہ چل سکا کہ وہ کس کا بچہ ہے؟ اس لئے پرتاپ سنگھ اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ جسونت کنور کو وہ بچہ بہت پسند تھا، اس نے اس کی پرورش کی، وہ بڑا ہو گیا۔"

اب ہم پہاڑی سے نیچے اتر رہے تھے۔ کوٹلہ گاؤں کے مکانوں کی ہلکی ہلکی روشنیاں دور سے نظر آ رہی تھیں۔

"اس لڑکے کا نام دلاور تھا سب اسے دلاور سنگھ کہتے تھے۔ وہ بڑا ہو گیا تو اس نے کچھ لکھ پڑھ لیا اور پھر فوج میں بھرتی ہو گیا۔ تین سال پہلے جب ہماری سیماؤں پر تم لوگ بہادری سے لڑ رہے تھے تو دلاور سنگھ بھی تمہارے ساتھ تھا۔"

"پھر کیا ہوا؟" میں اس کہانی میں کھو سا گیا۔

"دلاور سنگھ بہادری سے لڑتا ہوا شہید ہو گیا۔ جب اس کی لاش آئی تو روتے روتے جسونت کنور کا برا حال ہو گیا۔ وہ اپنے دونوں بچوں کو بھی بھول گئی جب کریا کرم کا وقت آیا تو جسونت کنور نے سب سے کہا کہ دلاور سنگھ کو دفن کیا جائے گا۔ میرے مکان کے اندر اس کی قبر بنے گی۔ یہ سن کر سب گھبرا گئے۔ اس نے بتایا کہ دلاور سنگھ دراصل دلاور خاں تھا، ایک پٹھان باپ کا بیٹا، جس کی پرورش بہادر سنگھ گھرانے میں ہوئی تھی۔ ساتھی، ایسی ماتا کسی نے دیکھی اور نہ سنی۔ جب سے دلاور دفن ہوا ہے جسونت کنور پاگل ہو گئی ہے۔ وہ اسی طرح روتی رہتی ہے، ہنستی ہے، روتی ہے ——— برگد کے اس پیڑ کے نیچے آکر اپنے بیٹے کو تلاش کرتی ہے۔"

بھارت کی کہانی ختم ہو گئی تھی۔

اب ہم کوٹلہ پہنچ چکے تھے۔ سامنے میرا مکان تھا میں گھوڑے سے اتر گیا۔ بھارت کو کرایہ ادا کر کے سامان اتارنے لگا۔

بھارت نے پوچھا "ساتھی، تم اتنے چپ کیوں ہو؟ کیا سوچ رہے ہو؟ اتنے دنوں کے بعد گھر آئے ہو بہت خوش ہونا چاہیئے۔"

"میری خوشی دہری ہو گئی ہے بھارت! اتنا خوش ہوں کہ چپ ہو گیا ہوں۔ جسونت کنور جیسی ماں اور دلاور جیسے بیٹے ہر گھر، ہر محلے، ہر شہر اور ہر گاؤں میں ہیں، انھیں دیکھنے کے لئے آنکھیں چاہئیں۔ برگد کے اس پیڑ کے نیچے جو چھاؤں ہے بھارت وہ ماتا کی ٹھنڈی چھاؤں ہے، صرف ماتا کی ٹھنڈی چھاؤں۔"

میں اپنا سامان لے کر اپنے گھر کی طرف بڑھ گیا مجھے اپنا گھر برگد کا وہی پرانا پیڑ نظر آ رہا تھا جہاں جسونت کنور کی ماتا کچھ ڈھونڈھ رہی تھی۔

غزل

سلمیٰ [illegible]

منزلِ زرّیں میں اپنا کارواں آیا تو ہے
شان سے پھر پرچم سہ رنگ لہرایا تو ہے
ساری تنقیدیں سر آنکھوں پر مگر یہ سوچئے
فیضِ دورِ نو سے ہم نے کچھ نہ کچھ پایا تو ہے
مدّتوں سے جو دلِ جمہور میں پلتا رہا
ہم نے وہ نغمہ ربابِ شوق پر گایا تو ہے
وہ جو ہے جانِ تخیل، وہ جو ہوگا ہم کلام
آئینے میں اس نگارِ شوق کا سایا تو ہے
اب نئے سورج کی کرنیں اس طرف آئیں نہ آئیں
ہم نے خوشبوؤں سے اپنے گھر کو مہکایا تو ہے
جس طرف لہروں کے نغمے، جس طرف ساحل کا نور
اک حسیں ملاح کشتی اس طرف لایا تو ہے
میکدے کی یہ فضا بھی کم نہیں ہے اے سلام
اپنا پیالہ ہم نے جامِ جم میں ٹکرایا تو ہے!!

قومی یکجہتی

سیّدہ فرحت

ذہن انساں کے مقفل یہ دریچے کھولو
حبس بے حد ہے ذرا تازہ ہوا آنے دو

روشنی کیوں نہیں ہوتی یہ اندھیرا کیوں ہے
ظلمتِ شب کا یہ ہم رنگ سویرا کیوں ہے

کیوں دماغوں پہ ہیں نفرت کے دھندلکے چھائے
چاک ہو جائیں جو پردے تو اُجالا آئے

غیریت نے جو اٹھا رکھی ہے اونچی دیوار
روشنی سے کبھی ہونے نہیں دے گی دوچار

لے کے تیشہ اُٹھو اک آن میں ڈھا دو اس کو
روشنی روکے ہوئے ہے یہ گرا دو اس کو

بات اب شیخ و برہمن کی نہ چلنے دینا
فرقہ سازوں کو نہ اب زہر اُگلنے دینا

ذہن میں نقش دوئی کوئی نہ باقی چھوڑو
دل کے ٹوٹے ہوئے رشتوں کو دوبارہ جوڑو

پھوٹ جو تحفۂ اغیار ہے کیوں پاس رہے
کیوں نہ اب قوم کو یکجہتی کا احساس رہے

روحِ وحدت کو ہے کثرت میں نمایاں کرنا
جذبۂ حُبِّ وطن دل میں فراواں کرنا

بیٹھ کر شیش محل میں د حفاظت ہوگی
کوئی طوفان اٹھے گا تو قیامت ہوگی

خلوتِ خاص سے اب بر سرِ عام آجاؤ
مل کے کرنا ہے ہمیں آج تو کام آجاؤ

قطرہ دریا سے الگ ہو کے فنا ہوتا ہے
پھول کا شاخ ہی پر نشو و نما ہوتا ہے

متحد ہو کے اگر ہوگی نہ تعمیرِ وطن
آج بدلی ہے نہ کل بدلے گی تقدیرِ وطن

السیکولر ڈیموکریسی



وقفہ

شاہد ماہلی

سرد راتوں کی گرمی
جھلسے دنوں کی ہوا لے گئی
ریگ زاروں پہ
بارود کی بو سے جھلسے ہوئے خشک پتے بکھرنے لگے
جلتے آگ اگلتے گرجتے ہوئے
زہر آلود لہجے
اچانک بدلنے لگے
پیلی آنکھوں سے تاریک چشمے اترنے لگے
سارے اخبار کی سرخیاں گھٹ گئیں

سہمی سہمی زمیں
اپنی آغوش میں
ٹوٹے پھوٹے گھروندے چھپائے ہوئے
ہانپتی کانپتی
کھیل کے اک نئے دور کی منتظر
اپنے بیٹوں کی گنتی میں مصروف ہے

بنامِ شعرائے کرام

نصر قریشی

پائل کی جھنکار کے نغمے کب تک یارو گاؤ گے!
کب تک وصل کی رات کے قصے، ہجر کا درد سناؤ گے
زلف و قد و رخسار کے چرچے کب تک ہونگے ہونٹوں پر
کب تک دل کی باتیں کرکے اپنا وقت گنواؤ گے
مرگِ پروانہ پہ ہر شب ماتم کرنے والو سنو!
فصلِ ادب پہ شبخون مارکے آہیں بھرنے والو سنو!

عہدِ حاضر تم سے حقیقت کی تصویریں مانگے ہے
خونِ دل میں ڈوبی ہوئی زندہ تحریریں مانگے ہے
اپنی پوری نسل کا بچپن، پیری، جوانی، دن اور رات
یہ ادھورے سپنوں کی دل کش تعبیریں مانگے ہے
تم ہو اپنے عہد کا درپن، تم ہو ساز، تمہیں آواز
ذہن کے شیش محل سے نکلو، بن جاؤ پھر وقت کا ساز

وقت رُکا ہے اور نہ رُکے گا، وقت ہے حاکم سب محکوم
وقت ہے طوفاں، شعلہ بداماں، وقت ہے یارو بادِ سموم
خیمہ زن ہیں وقت کی رہ میں رہ زن رہبر کی صورت
وقت کے اندھیاروں میں دیکھو کون ہے ظالم اور مظلوم
لوح و قلم کی لاج بچاؤ، فکر کی مشعل تیز کرو
اپنے لہو کی آمیزش سے طرزِ بیاں میں رنگ بھرو

تم جیسے فن کار زمانے کی تصویر بدلتے ہیں
تم جیسے البیلے شاعر آگ کے شعلے اُگلتے ہیں
تم جیسے تقدیرِ زمانہ انگاروں پہ چلتے ہیں
وقت کے دھارے موڑنے والے راگ تمہیں میں پلتے ہیں
ہر دل ہے اک پیار کا مندر، اس مندر کا مان رہے
جس گھر میں بھگوان براجیں، اس میں کیوں شیطان رہے

عہد کرو، تم نفرت کی دیوار گرا کر دم لوگے
عہد کرو، تاریخ کا خونیں باب مٹا کر دم لوگے
عہد کرو، تم پیار کی شبنم بن کر دل پر چھاؤ گے
عہد کرو، تم امن کے پرچم کو لہرا کر دم لوگے
پیار کی شبنم سے یارو بن جاتے ہیں انگارے پھول
پیار ہے مذہب، پیار صحیفہ، پیار خدا ہے پیار رسول

یاد رکھو، تم جیسے کتنے آئے، آکر خاک ہوئے
نغمہ برائے ذہنی تعیش کتنے گا کر خاک ہوئے
اقبال و ٹیگور کے جیسے وقت کے نغمہ ساز بنو
وہ بھی تھے جو دہر پہ اپنا نقش جما کر خاک ہوئے
دیدۂ ذہن کے نرگس کی بے نوری کو دور کرو
دل سے دل تک راہ بنا کر ہر دوری کو دور کرو

فلمی دنیا پر شیوسینا کا منحوس سایہ

تاریخ شاہد ہے کہ فنونِ لطیفہ پر جغرافیائی حد بندیوں نسل پرستی اور علاقائی تعصب کی مہریں کبھی ثبت نہیں ہوئیں۔ تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ ادیبوں، شاعروں، مصوروں، سنگ تراشوں، موسیقاروں، کلاکاروں، اور دوسرے فن کاروں کے گرد مذہبی یا فرقہ پرستی کی دیواریں



بائیں سے دائیں۔ نوین نشچل، ہیم چند، آشا بھونسلے، راجیش کھنہ، بال ٹھاکرے

کھڑی نہیں کی گئیں۔

کوئی بھی قوم، کوئی بھی ملک اپنے فن کاروں اور ان کے شہ پاروں پر ناز تو کر سکتا ہے لیکن انھیں صرف اپنے مذہبی نظریے کے حصار یا ملک کی سرحدوں میں مقید نہیں کر سکتا۔

شیکسپیئر، گوئٹے، برنارڈ شا اور ٹالسٹائی کا فن صرف یورپ تک محدود نہ رہا۔ شیخ سعدی، جامی اور فردوسی کے شاہکاروں نے صرف اہلِ ایران سے داد نہ لی۔ اُم کلثوم کی آواز پر اہلِ مصر کوئی پابندی نہ لگا سکے۔ پکاسو کی تخلیقات پر تمام دنیا کے اہلِ فن نے خراجِ تحسین پیش کیا۔

ہمارے ملک میں سورداس، تلسی داس، میرا بائی، غالب، میر، کبیر، امیر خسرو، ملک محمد جائسی، عبدالرحیم خانخاناں، شیخ فرید، وارث شاہ اور بلھے شاہ کی تخلیقات پر کبھی کسی مخصوص فرقے یا نسل نے اپنا مذہبی لیبل نہیں لگایا۔ بلکہ ان شخصیتوں نے پورے ملک، پوری قوم، بلکہ عالمِ انسانیت کو اپنے فن سے متاثر کیا۔ ان کی تخلیقات کسی ایک مذہب یا کسی مخصوص قوم کی جاگیر نہیں بلکہ یہ سرمایہ قوم کا سرمایہ ہے۔ انسانیت کا سرمایہ ہے۔ لیکن یہ ہماری بدقسمتی نہیں تو اور کیا ہے کہ ہمارے ملک میں فرقہ پرستوں کا ایک ایسا ٹولہ بھی موجود ہے جو فن کار کو مذہب کی نگاہ سے دیکھتا ہے اسی فرقے کی نظر میں ڈاکٹر اقبال صرف مسلمانوں کا شاعر ہے، میرا بائی کا تصوف بھرا کلام ہندوؤں کی مقدس امانت ہے، وارث شاہ کی تخلیقات پر صرف پنجابیوں کا حق ہے۔

کرشن چندر "اردو ادیب" ہے گورودت صرف ہندی لیکھک ہے۔ ساحر لدھیانوی اردو شاعر اور بھرت ویاس ہندی کوی ہے لیکن کوئی بھی ادب رسم الخط کا اسیر نہیں ہو سکتا۔

بحث یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ مزید افسوس اس وقت ہوتا ہے جب فرقہ پرستی کے منحوس سائے فن کاروں کی اس بستی پر پڑتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جہاں مذہب، قوم اور علاقائی سیاست کا کبھی دخل نہیں رہا۔ ہماری فلمی دنیا ایک سیکولر دنیا ہے یہاں کے لوگ مذہبی، نسلی یا کسی مخصوص فرقے کی نمائندگی نہیں کرتے۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، یہودی، پارسی اور دیگر قوموں کے افرادِ فن کی خدمت کرتے ہیں۔ مختلف مذاہب کے پیروکار، مختلف علاقوں کے رہنے والوں میں یہاں کوئی امتیاز نہیں۔ مہاراشٹریوں، گجراتیوں، پنجابیوں، شمالی ہندوستان کے رہنے والوں اور جنوبی ہندوستان کے رہنے والوں کی مشترکہ کاوشوں کے نتیجے میں ہماری فلم انڈسٹری پھل پھول رہی ہے۔

لیکن گزشتہ چند سالوں سے نسل پرستی کی نمائندگی کرنے والی فاشسٹ جماعت شیوسینا نے فلمی دنیا کے سیکولرازم پر اپنے منحوس پنجے گاڑنے شروع کر دیے ہیں۔ شیوسینا نے سب سے پہلے ہندی اور مراٹھی فلموں کا جھگڑا شروع کیا تھا جس کے نتیجے میں جنوبی ہندوستان میں ہندی فلموں کا بائیکاٹ کیا گیا۔ بمبئی کے سینما مالکان کو مراٹھی فلمیں دکھانے پر زبردستی مجبور کیا گیا تھا۔ غنڈہ گردی اور توڑ پھوڑ کی کارروائیاں کی گئی تھیں۔

فلمی دنیا کے چند ابن الوقت لوگوں نے شیوسینا کی فرقہ پرستی کے زہر کو تریاق سمجھتے ہوئے اس کی خدمات سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ فلم ساز رام دیال نے اپنی ایک زیرِ تکمیل فلم "حسینوں کا دیوتا" کے ہیرو سنجے (جو مسلمان ہے) کے خلاف شیوسینا کی "چترپٹ شاکھا" کی خدمات حاصل کیں۔ چترپٹ شاکھا نے مصروف ترین ہیرو سنجے کو رام دیال کی فلم جلد از جلد مکمل کرنے کی دھمکی دی۔ سنجے نے دوسری فلموں کو چھوڑ کر رام دیال کی فلم مکمل کرائی۔ بڑھتے ہوئے سینماؤں کے کرایوں کے خلاف بمبئی فلم انڈسٹری نے احتجاج کیا تو "فلم سینا" بنائی گئی۔ دلیپ کمار نے جو ان دنوں مدراس میں ایک فلم کی تکمیل میں مصروف تھا "فلم سینا" کے قیام کو فضول بتایا۔ شیوسینا کے فاضل رہنماؤں نے "فلم سینا" کو شیوسینا سمجھا اور یہی شوشہ اٹھا کر دلیپ کمار (جو نجی زندگی میں یوسف خاں ہے) کے خلاف شیوسینا نے جنگ چھیڑ دی۔ بمبئی کے اپسرا سینما میں دلیپ کمار کی فلم مغلِ اعظم کی نمائش کے دوران شیوسینا کے غنڈوں نے

سینما کو زبردست نقصان پہنچایا۔ سینما ہاؤس کی نشستیں پھاڑ دی گئیں، سینما گھر پر لگائے گئے فلم بینرس کو جلایا گیا۔ دلیپ کمار مدراس سے بمبئی پہنچا تو اس نازک صورت حال کا احساس ہوا۔ اس نے اس افواہ کی تردید کی۔

دلیپ کمار نے اپنے بنگلے کی توسیع کے لئے حکومت مہاراشٹر سے ایک قطعہ اراضی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لینے کی درخواست دی۔ حکومت مہاراشٹر نے اس درخواست کو منظور کرتے ہوئے کارپوریشن کو زمین دینے کے احکامات جاری کئے۔ لیکن یہ بات شیوسینا سے ہضم نہ ہو سکی۔ اس نے اسمبلی اور کارپوریشن میں وہ واویلا مچایا کہ کارپوریشن نے دلیپ کمار کو وہ زمین دینے سے انکار کر دیا۔ حکومت پر الزام لگایا گیا کہ وہ دلیپ کمار پر یہ نوازش اس لئے کر رہی ہے کہ دلیپ کمار نے انتخابات میں کانگریس کی حمایت کی تھی۔ مہاراشٹر کے وزیر صحت ڈاکٹر رفیق زکریا نے ان بے بنیاد الزامات کی سختی سے تردید کی۔

غرض یہ کہ ایسی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں جس کی روشنی میں یہ دیکھنا زیادہ آسان ہو جائے گا کہ شیوسینا کی چترپٹ شاکھا فلم انڈسٹری کی کوئی ٹھوس خدمت کرنے کی بجائے اسے صرف "مسلمانوں" کے خلاف ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہی ہے۔ بات فرقہ پرستی ہی تک محدود نہ رہی بلکہ شیوسینا نے فلمی دنیا کے بعض ایسے معاملات میں اپنی ٹانگ اڑا کر یہ ثبوت بھی فراہم کر دیا کہ فاشسٹ، غنڈوں کا گروہ پردۂ فلم پر صرف اپنے نظریئے کا پرچار کرانا چاہتا ہے مثلاً جیمنی کی فلم "سماج کو بدل ڈالو" (جس کی ہیروئن شاردا کو اسی فلم کے ملیالم حصے میں بہترین کردار نگاری پر حکومت ہند نے اروشی ایوارڈ سے نوازا تھا) کے خلاف بھی شیوسینا نے ہنگامے کئے تھے۔ فلم میں لال جھنڈا اور نعروں پر اعتراضات اٹھائے گئے تھے سنسر بورڈ کے سارٹیفکیٹ شدہ فلم پر اعتراضات کیا معنی رکھتے تھے لیکن غنڈہ گردی کا کیا علاج۔ پروڈیوسر نے شیوسینا کی غنڈہ گردی کے آگے سر خم کر دیا اور فلم میں سے ایسے تمام مناظر نکال دیئے گئے جن میں غریب اور سماج کے پچھڑے ہوئے لوگ جلوس میں ترقی پسند نعرے بلند کر رہے تھے۔

ایسا ہی واقعہ راجکپور کی فلم "میرا نام جوکر" کی نمائش کے دوران پیش آیا۔ شیوسینا نے ماسکو کے ریڈ اسکوائر میں فلمائے گئے ان مناظر پر اعتراضات اٹھائے جن میں لاکھوں عوام لال جھنڈے لئے مارچ کر رہے تھے۔ بمبئی کے سینما گھروں پر مظاہرے کئے گئے شہر میں لگائے گئے فلم بینرس کو نقصان پہنچایا گیا۔ راج کپور نے شیوسینا کے گرو بال ٹھاکرے سے ملاقات کی۔ لیکن بات اس وقت تک نہیں بنی جب تک فلم میں سے وہ تمام مناظر نکال نہیں دیئے گئے۔

فلم انڈسٹری کی بدبختی یہ رہی کہ یہاں بھی ایسے لوگ موجود رہے جن کا دست تعاون شیوسینا کے لئے ہمیشہ بڑھا رہا۔ اس ٹولے نے غنڈہ گردی کی مخالفت کرنا تو کجا ان کی ہمت افزائی کی۔ آئی۔ ایس۔ جوہر، وجینتی مالا اور ان کے شوہر ڈاکٹر بالی کا آشیرواد ہمیشہ شیوسینا کے ساتھ رہا۔ وجینتی مالا اپنے شوہر کے ساتھ شیوسینا کے جلسوں میں شریک ہوتی رہی۔ آئی ایس جوہر پارلیمانی انتخابات کے موقعہ پر شیوسینا کی سرپرستی میں الیکشن لڑنے کے لئے میدان میں آئے۔ لیکن بعد میں سرمایہ دار نول ٹاٹا کے حق میں دست بردار ہو گئے۔

موسیقار شنکر کا نام شیوسینا کے مالی معاونین میں سر فہرست لکھا جاتا ہے۔ شنکر پدم شری ہیں لیکن اس ذات شریف نے شیوسینا کی چترپٹ شاکھا کی بیسویں سالگرہ پر شنکر جے کشن نائٹ کا اہتمام کیا اور نسل پرستوں اور مذہبی جنونیوں کے اس گروہ کی مالی معاونت کے لئے پہلی بار عملی قدم اٹھایا۔ مزے کی بات یہ کہ اس شو کا اہتمام اس موسیقار نے کیا جس کا کیریر راج کپور نے بنایا اور راج کپور کی ترقی پسند پالیسیوں سے ملک کا بچہ بچہ واقف ہے اور شیوسینا نے 'میرا نام جوکر' کے جن مناظر کو فلم سے نکلوایا ان کی پس منظر موسیقی بھی اسی موسیقار نے ترتیب دی تھی۔

شیوسینا کی چترپٹ شاکھا نے فلمی دنیا کی بہتری اور ترقی کے لئے کوئی اقدام کئے ہوں یا نہیں لیکن اس نے اس سال فلم انڈسٹری کی ایک "بیش بہا خدمت" ضرور انجام دی ہے۔ چترپٹ شاکھا نے ۱۹۷۲ء کے لئے جن فلمی ستاروں کو ایوارڈز دیئے ہیں ان میں یہ لوگ شامل ہیں۔ ہیما مالنی، منوج کمار، سنجیو کمار، راجکمار دھرمیندر، جتندر، نوین نسچل، موسیقار شنکر، آشا بھوسلے، اور کشور کمار۔

یہ تقریب پچھلے دنوں بمبئی کے شیواجی پارک میں منعقد ہوئی۔ تقریب کے مہمان خصوصی کے فرائض راجیش کھنہ نے ادا کئے۔ فلمی لوگوں کے علاوہ راجیش کھنہ نے اس تقریب میں بمبئی میونسپل کارپوریشن کے حالیہ چناؤ میں جیتنے والے کونسلروں کو یادگاری تمغے بھی دیئے۔

ایوارڈز یافتہ افراد کی فہرست پر نظر ڈالئے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ ایوارڈز فن کاروں کو فن پر نہیں دیئے گئے بلکہ ان کی تقسیم میں صرف ایک طبقے کو خوش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تقریباً ایک لاکھ افراد کی موجودگی میں دیئے گئے یہ نام نہاد ایوارڈز فن یا فنکاروں کو تو کوئی خاص اعزاز نہیں بخشیں گے لیکن اگر یہ سلسلہ برقرار رہا تو فلمی دنیا میں تنگ نظری، فرقہ پرستی اور مذہبی جنون کو ضرور تقویت ملے گی جو کسی بھی طور فلمی دنیا جیسے سیکولر ادارے کے لئے سودمند ثابت نہ ہوگی۔

اس کا مثبت جواب یہ ہو سکتا ہے کہ ترقی پسند سیاسی جماعتیں سامنے آئیں اور فلمی دنیا کے فنکاروں کو ایوارڈز دینے کا سلسلہ شروع کریں اور صرف انہیں فن کاروں کو ایوارڈز دیئے جائیں جو ترقی پسند قوتوں اور سیکولرازم کی حمایت کرتے ہوں۔ ان ایوارڈز میں ان فلموں کو سر فہرست رکھا جائے جن میں ہم آہنگی، قومی رواداری اور اونچ نیچ کے خلاف زور دیا گیا ہو۔ اگر یہ سلسلہ شروع ہو جائے تو شیوسینا اور اس کی پروردہ چترپٹ شاکھا اپنی موت آپ مر جائے گی اور فن کا دامن نسل اور صوبہ پرستی کے زہر سے بچ جائے گا۔

انسانیت کا علمبردار

قبائلی سردار آغا جان خان

محترمہ کرشنا مہتہ



کشمیر کے شمال مغرب میں مظفرآباد ہے جو قبائلی حملے سے پیشتر ریاست کشمیر کا ایک ضلع تھا۔ جولائی ۱۹۴۷ء کی بات ہے کشمیر ریاست کی طرف سے شری دُنی چند مہتہ کو مظفرآباد کا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ (وزیر وزارت) بنا کر بھیجا گیا۔ اس سے قبل وہ سری نگر میں اسسٹنٹ گورنر تھے۔

۲۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء کے بعد سے قبائلی حملے میں اضافہ ہونے لگا۔ ۲۲ اکتوبر سے یہ علاقہ کھلا مورچہ بن گیا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس اور ڈاکٹر کی کوٹھی گولہ باری سے جل گئی۔ شریمتی مہتہ اس خطرناک مورچہ پر رہی تھیں کسی طرح وہ اپنے بچوں سمیت کوٹھی سے باہر نکلیں۔ حملہ آوروں نے اسپتال کو بھی نشانہ بنایا۔

شریمتی کرشنا مہتہ کے باہر جانے کے کچھ دیر بعد ہی ساتھ قبائلیوں نے کوٹھی کو لوٹا اور جلا دیا۔ شری مہتہ بڑی بہادری سے لڑتے ہوئے جاں بحق ہوئے۔ شریمتی مہتہ کو مختلف مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان مصیبتوں کے باوجود وہ ہمت نہیں ہاریں —— وہ اپنے بچوں سمیت ہمیشہ مصیبت کا سامنا کرنے کے لئے تیار رہتی تھیں۔ مشکل حالات میں بھی کبھی نہ ہارنے والی شریمتی مہتہ کے سامنے قبائلی لٹیرے تک اپنی حیوانیت بھول گئے۔ بہت سے مسلمانوں نے ان کی حفاظت کی۔ آخرکار انھوں نے مع بچوں کے ایک مولوی صاحب کے گھر میں پناہ لی۔

شریمتی مہتہ کو مولوی صاحب کے گھر میں رہتے ہوئے کئی دن ہو گئے تھے۔ رحم داد خاں نامی ایک پاکستانی سپاہی شریمتی مہتہ کی بہت مدد کر رہا تھا۔ ایک دن رحم داد خاں ایک ڈاکٹر کے ساتھ مولوی صاحب کے گھر پہنچا، اس کے ساتھ ایک تیسرا آدمی بھی تھا۔ دوران گفتگو تیسرا آدمی خاموش رہا۔

وہ آدمی دوسرے دن اکیلا ہی شریمتی مہتہ سے ملنے پہنچا۔ اس کی عمر تقریباً پچاس سال تھی۔ اس نے معمولی کپڑے پہن رکھے تھے۔ وہ "خان" کے نام سے مشہور تھا۔ وہ اپنے بارے میں بتانے لگا کہ وہ ڈاکٹر کا ساتھی ہے اور انھیں کی کوٹھی میں ٹھہرا ہوا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ایک کمرے میں ہڈیوں کا کچھ چورا ٹین کے تختے کے نیچے ہے اور وہ جنت مکانی مہتہ صاحب کا ہے، کیا آپ اسے ندی میں ڈالنا چاہتی ہیں؟

اور پھر خان نے نوکر کی مدد سے اس ہڈیوں کے چورے کو کرشنا ندی میں ڈالنے کی بات کی —— وہ مہتہ صاحب کی تعریف بھی کر رہا تھا۔ خان نے مولوی صاحب سے معلومات کیں اور پھر کہا —— "سنو مولوی صاحب! یہ میری بہن ہے اس کی ہر طرح حفاظت کرنا۔ اگر اسے تکلیف پہنچی تو ہماری بیریاں ——

'خان' نے ہی رامائن پڑھنے کے بارے میں پوچھا اور مولوی صاحب کے یہ کہنے پر کہ "میں اردو گیتا پڑھنے کے لئے دے دوں گا" خان نے کہا تھا "ہاں ضرور دیدینا"۔

دوسرے دن 'خان' خود شریمتی مہتہ کے نوکر اوم کو ساتھ لے گیا تھا اور اس نے مرحوم مہتہ صاحب کی 'ہڈیاں' کرشنا گنگا کی بیچ دھار میں ڈلوا دیں تھیں۔

'خان' گھنٹوں بات چیت کرتا۔ کئی لوگوں نے اس کے پاکستانی ہونے پر شبہہ کیا، اس کی باتوں اور انداز سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کوئی بڑا آدمی ہے۔ اس پر شک بھی ہوتا تھا —— مگر شہر میں اس کی بڑی دھاک تھی۔

ایک بار کشمیر کا گورنر سردار ابراہیم وہاں (مظفرآباد) گیا تھا وہ شریمتی مہتہ سے ملا۔ خان ساتھ تھا جب ابراہیم نے ان کی مشکلات کے بارے میں دریافت کیا تو خان نے کہا —— "ان کے پاس ہے ہی کیا —! بچوں کو دیکھئے، پھٹے کپڑے پہنے ہیں۔ کھانے کے لئے آٹے کے سوا کچھ نہیں۔ کپڑے دھونے کو صابن نہیں —— پھر بھی یہ آپ سے کچھ نہیں مانگیں گی ——"

مولوی صاحب کے ہاں رہتے ہوئے شریمتی مہتہ کو دو مہینے ہو گئے تھے —— وہ لوگ اگرچہ تنگ آ گئے تھے، مگر خان اور دوسرے افسروں کے ڈر کے سبب کچھ نہ کہتے تھے۔

شریمتی مہتہ ہر غیر متعارف کے سامنے آ جاتی تھیں۔ اس سلسلے میں خان نے کہا —— "بہن! میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم اب کسی غیر کے سامنے نہ آنا —— وعدہ کرو، نہیں آؤ گی ——"

شریمتی مہتہ مولوی صاحب کا مکان چھوڑنا چاہتی تھیں، انھوں نے خان سے بھی کہا۔ تب خان نے کہا تھا "مکان بدلو تو مجھے بھی ساتھ لے لینا"۔ مگر شریمتی مہتہ نے مکان بدل لیا اور خان کو کچھ نہیں بتایا۔ وہ چمن لال نامی ایک شخص کے مکان میں چلی گئی تھیں۔

شریمتی مہتہ کو وہاں گئے دو دن ہوئے تھے کہ خان اسی مکان میں پہنچ گیا۔ خان نے کہا —— "میں

نے مہیں بہن سمجھا تھا، لیکن مہیں مجھ پر بھی شک ہے جب ہی تو تم یہاں چوری چوری چلی آئیں ——— اتنی غیریت! پھر بھی میں تمہیں بہن کہہ چکا ہوں، اس لئے عزت کرتا ہوں ——— جب تک میں یہاں ہوں جان دے کر بھی تمہیں بچاؤں گا ———"

شریمتی مہتہ نے اپنی غلطی مان لی۔ اس کے بعد چاقو کی نوک سے اپنی انگلی سے خون نکال کر خان کے ماتھے پر تلک لگایا، پھر سوت لے کر اس کی کلائی پر راکھی باندھی ——— تب خان نے شریمتی مہتہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ———" سنو بہن! میرے قبیلے میں دو سو آدمی ہیں۔ کوئی تمہیں بہن کہے گا کوئی پھوپی اور کوئی خالہ ——— جہاں تک ہو سکے گا تمہیں بچائیں گے تمہاری حفاظت، ہماری ذمہ داری ہے۔ تمہیں اپنا بوجھ ہم پر ڈال دینا چاہیئے۔ کیا تم بتا سکتی ہو کہ تمہارا مال کس نے لوٹا ہے؟ میں وہ سب لا دوں گا۔"

پھر اس نے شریمتی مہتہ کی بات مان لی اور چمن لال سے کہا "تم نے میری بہن کو یہاں پناہ دی ہے تمہارے لڑکوں نے جیل میں اس کی جان بچائی ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔"

خان برابر ان کی مدد کرتا رہا۔ ایک دن شریمتی مہتہ بہت اداس بیٹھی تھیں۔ خان نے پوچھا "کیا تمہیں اپنے مالک کی یاد آتی ہے، بڑی سرکار ———؟" تب انھوں نے جواب دیا تھا "میرے پاس کوئی نشانی نہیں ہے۔" خان دھوبی کے ہاں سے ان کے مرحوم شوہر کی ایک پرانی قمیص لے آیا تھا۔

ایک دن خان شریمتی مہتہ کے کان کا زیور لے آیا اور اس نے چمن کی ماں سے کہا "تم میری بہن کو سمجھاؤ کہ وہ اسے واپس لے لے۔ میں نے اسے بہن کہا ہے میں اس کی چیز دوسرے کے پاس نہیں دیکھ سکتا۔" شریمتی مہتہ کے سمجھانے پر وہ مان گیا اور اس نے وہ زیور واپس کر دیا۔

ایک دن باتوں کے دوران خان نے کہا "بہن! تمہیں اور تمہارے بچوں کو بلکتا دیکھ کر میرا جی چاہتا مارا ہے، اسے میں ماروں تاکہ اس کی بیوی اور بچے اسی طرح تڑپیں جیسے تم اور تمہارے بچے تڑپ رہے ہیں۔"

وہ برابر ان کا خیال رکھتا تھا ان کے خیالات کی عزت کرتا تھا۔

خان اکثر ان کے پاس آتا تھا۔ ایک دن وہ بیٹھا ہوا تھا تو ایک پولیس افسر وہاں آیا۔ خان کو دیکھتے ہی اس کا رنگ بدل گیا۔ خان چلا گیا تو وہ پھر واپس آیا بولا "کیا آپ جانتی ہیں کہ یہ کون ہے اور کتنا خطرناک ہے؟ آپ کو ہر ایک کے سامنے نہیں آنا چاہیئے اور ہر کسی پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے۔ کچھ دن پہلے آپ کی کوٹھی میں جو ہندوؤں کو مارا گیا تھا وہ سب اسی کی کارستانی تھی۔"

واقعی وہ خان کو دیکھ کر ڈر گیا تھا۔

خان نے بہت سے موقعوں پر شریمتی مہتہ کی حفاظت کی۔ وہ جب تک وہاں رہا، برابر ان کا خیال کرتا رہا۔ وہاں آتا تھا اور ان سے باتیں کرتا تھا۔

آخر خان ایک دن آیا اور کہنے لگا "بہن! اب میں جا رہا ہوں، ہماری ساری پارٹی جا رہی ہے مجھے کوئی نشانی دو اسے میں اپنے بچوں کو دکھاؤں گا۔"

خان نے اس سے وہ قمیص مانگا جو مرحوم مہتہ کو پسند تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی شریمتی مہتہ نے وہ قمیص خان کو دے دیا۔ اس نے اپنی بہن (شریمتی مہتہ) کا ایک فوٹو بھی لیا۔ خان ان سے کابل چلنے اور وہاں سے ہندوستان پہنچانے کی بات کرتا رہا۔ مگر وہ تیار نہ ہوئیں۔

تب خان نے کہا "میں اپنے ہاتھ سے کچھ لکھ لاؤں گا اور باہر دروازے پر چپکا دوں گا اسے دیکھ کر کسی کی اندر آنے کی ہمت نہ ہوگی۔"

خان کے جانے کے بعد سب اس کی باتوں پر ہنسنے لگے۔ اصل میں وہ کون ہے یہ کسی کو بھی پتہ نہ تھا دوسرے دن وہ ایک کاغذ لایا جس پر لال روشنائی سے لکھا تھا:۔

"کوئی ہندو یا مسلمان بغیر اجازت
اس مکان کے اندر داخل نہ ہو
اگر بغیر اجازت داخل ہوا تو سارا
قبائلی علاقہ اس کا دشمن ہو جائے گا۔"
"آغا خان، لیڈر قبائلی علاقہ"

تب خان نے کاغذ دکھا کر کہا "دیکھو لال روشنائی سے لکھا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ پٹھان کے خون سے لکھا گیا ہے۔ میرے بعد یہ تمہاری حفاظت کرے گا۔"

یہ کہہ کر خان باہر چلا گیا، اور اس نے کاغذ کو دروازے پر اونچی جگہ پر چپکا دیا۔ اس کاغذ پر خان کا نام اور پتہ دیکھ کر شریمتی مہتہ کو معلوم ہوا کہ خان کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔

خان چلا گیا۔ ایک ماہ بعد اس کا خط ملا، جو پولیس نے کھول کر بھیجا تھا۔

کرشنا بہن، آداب عرض!
میں گھر پہنچ گیا ہوں، لیکن میرا
دھیان تم اور تمہارے بچوں میں لگا ہوا
ہے۔ میں تمہارے لئے خدا سے دعا کرتا
ہوں کہ وہ ہر طرح سے تمہاری مدد کرے۔
تمہارا بھائی
آغا جان خان
بنو، کوہاٹ

سچ مچ اس کاغذ نے بہت سوں کی حفاظت کی کوئی عام آدمی وہاں گھسنے کی ہمت نہ کرتا تھا۔

خان انسان کے روپ میں فرشتہ تھا۔ اس نے نہ تو بیجا ظلم کئے اور نہ حیوانیت پر اترا۔ اس نے حیوانیت پسند لوگوں سے شریمتی مہتہ اور ان کے خاندان کو ہی نہیں بلکہ بہت سے خاندانوں کی حفاظت کی۔ آغا جان خان اس قوم سے تھا جو اپنے قول کو نبھانے سے کبھی پیچھے نہیں ہٹتے۔ جب انسانیت اندھی ہو کر حیوانیت پر اتر آئی تھی اس وقت خان جیسے لوگوں نے انسانیت کو زندہ رکھ کر ایک نئی مثال قائم کی ——— قومی یکجہتی کا وہ حامی اپنے بہادرانہ کارناموں کے لئے ہمیشہ یاد رہے گا۔

پی۔اے۔سی

کس کا ہتھیار؟

ہمارے خاص نامہ نگار کے قلم سے

اترپردیش میں پی۔اے۔سی کے عملہ کی حالیہ بغاوت سے ساری قوم کو زبردست دھکا لگا ہے۔ خوش قسمتی سے یہ ہنگامہ آرائی چند ہی مقامات تک محدود رہی صوبائی اور مرکزی حکومت کی فوری اور موثر مداخلت کے باعث بڑے پیمانے پر خون خرابہ کے بغیر بغاوت کو پسپا کر دیا گیا۔

اب جیسا کہ حالات معمول پر آچکے ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ اس قسم کے افسوسناک واقعات کی تکرار کو روکنے کے لئے مناسب اقدام کئے جائیں۔

پی اے سی کے دستے گذشتہ ماہ کے شروع میں لکھنؤ یونی ورسٹی میں اس لئے تعینات کئے گئے تھے کیونکہ یونی ورسٹی کے منتظمین کو ڈر تھا کہ طالب علموں کے لبادے میں چند شرپسند امتحانات کو درہم برہم کرنے کے درپے ہیں اور امتحان دینے والوں اور امتحانات کی نگرانی کرنے والوں کی ان شرپسندوں سے حفاظت کرنا ان کے لئے ممکن نہیں۔

حکومت کو مارچ ۱۹۷۳ء میں ہی پی اے سی کے عملہ میں پھیلی ہوئی بے اطمینانی کا علم ہوگیا تھا جب کہ ان کی ایک نئی یونین پولیس کرمچاری پریشد کے نام سے رجسٹر کرائی گئی تھی۔ یہ بے اطمینانی اس وقت اور بھی زیادہ کھل کر سامنے آگئی جب پولیس والوں نے افسران کے خلاف اپنی شکایات کا کتابچہ بڑے پیمانے پر تقسیم کرایا۔ ایسے حالات میں جب کہ حکومت یو پی کو پی اے سی کی ان کم مدولیوں اور ڈسپلن کی خلاف ورزیوں کا اچھی طرح علم تھا۔ ان کو لکھنؤ یونیورسٹی میں تعینات کرنا ایک انتظامی غلطی تھی۔

یونیورسٹی میں پی اے سی کا واسطہ شرپسند نوجوانوں کے ان گروپوں سے پڑا جن کی قیادت سماج وادی یوجن سبھا (ایس۔ ایس۔ پی کے راج نرائن گروپ کی نوجوانوں کی تنظیم) اور ودیارتھی پریشد (جن سنگھ کی نوجوانوں کی تنظیم) کے ہاتھوں میں تھی۔ اس کے علاوہ ہندو مہاسبھا کے دوسو کے قریب شورہ پشتوں سے جن کی قیادت مہاسبھا کا ایک سرکردہ گورکھپوری لیڈر کر رہا تھا، بھی پی اے سی والوں کو قرب حاصل ہوا۔ پی اے سی کا زیادہ تر عملہ ریاست کے مشرقی اضلاع کے باشندوں پر مشتمل ہے اس لئے گورکھپور کے ان شورہ پشتوں نے آناً فاناً پی اے سی والوں کو اپنے شیشہ میں اتار لیا۔

حالات اس وقت بھڑک اٹھے جب ۲۰ مئی کی شام کو پریشد کے سیکریٹری رام اشیش رائے نے یونی ورسٹی میں آکر پی اے سی کے عملہ کا ایک جلسہ کیا اور انھیں یہ من گھڑت کہانی سنائی کہ اس کو کس طرح ایک مسلمان افسر نے اغوا کرکے ناجائز طور پر قید کیا اور طرح طرح کی اذیتیں پہنچائیں۔

اس کہانی کو سنتے ہی پی اے سی والوں نے سڑک کے اس پار پولیس لائن پر یلغار کر دی اور اس پولیس افسر کے گھر کا محاصرہ کرکے اس پر گالیوں اور پتھروں کی بوچھار شروع کر دی۔ افسر تو اس وقت گھر پر نہیں تھا لیکن اس کے خاندان کے افراد پر تھوڑی دیر کے لئے ضرور قیامت ٹوٹ پڑی۔

لائن میں موجود دوسرے پولیس والے خاموش تماشائی بنے یہ سب کچھ دیکھتے رہے۔ وہ تو کیھئے چند افسر اسٹین گنوں stan guns سے لیس موقع



لکھنؤ یونی ورسٹی کا ایک منظر

پر پہنچ گئے اور حالات کو مزید بگڑنے سے بچا لیا۔

اس کے بعد لکھنؤ یونی ورسٹی میں پی اے سی والے کھل کھیلے۔ انھوں نے طالب علموں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ 'طالب علم' اپنے استادوں کی گالیوں اور پتھروں سے تواضع کرنے لگے اور ادھر پی اے سی والوں نے اپنے افسروں کی خوب خوب درگت بنائی پی۔ اے سی کے چند افسروں نے جب مداخلت کرنی چاہی تو ان کی خوب گت بنائی گئی۔

جب یہ سب کچھ ہونے لگا تو انتظامیہ کے چوٹی کے افسروں کی آنکھیں کھلیں کہ یہ تو "بغاوت" ہے چنانچہ انھوں نے مدد کے لئے فوج کو بلانے اور پی۔ اے سی کو واپس کرنے کا فیصلہ کیا۔

۲۱ مئی کی صبح ۶ بجے تک پی اے سی یونیورسٹی کیمپس سے نکل گئی لیکن جاتے جاتے وزیر اعلیٰ کے بیان کے مطابق، غنڈوں کو پٹرول کے ٹین دیتی گئی تاکہ وہ یونی ورسٹی کو جلا کر راکھ کر دیں۔ فوجی دستے جن کو یونی ورسٹی میں تعیناتی کا حکم ملا تھا، ان کو دو گھنٹے بعد یونیورسٹی پہنچنا تھا۔ چنانچہ پی اے سی کی واپسی اور فوج کی آمد کے درمیانی وقفہ میں آتش زنوں نے یونیورسٹی کو خاکستر کر دیا۔

اس مرحلہ پر ایک اور حیرت ناک بات یہ ہوئی کہ یونی ورسٹی میں تعینات پی اے سی کے یونٹ کی بغاوت کے چند گھنٹے کے اندر ساری ریاست کے پی اے سی والوں کو لکھنؤ کے واقعات کا علم گیا۔ یہ کیسے ہوا؟ اس کا پتہ لگایا جانا ابھی باقی ہے۔ ۲۱ مئی کی صبح ہونے تک پی اے سی کی بٹالینوں نے کئی مقامات پر اسلحہ خانوں پر قبضہ کر لیا اور فوج (جو ان کو غیر مسلح کرنے والی تھی) سے مقابلہ کرنے کے لئے پوزیشن سنبھال لی۔ 'ڈسپلن کی خلاف ورزیوں کی ان حرکات' کو ختم ہونے میں چار دن لگ گئے اور ۳۴ قیمتی جانیں ضائع ہوئیں۔

ان ہنگاموں کا سب سے زیادہ قابل توجہ پہلو یہ ہے کہ غیر تسلیم شدہ تنظیم 'پولیس کرمچاری

پریشد' کے تقریباً سارے کے سارے عہدے دار انٹیلی جنس ڈپارٹمنٹ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے صدر رام کیلاش بعدکیا، سکریٹری رام آشیش رائے اور خزانچی رام اوتار ورما، سب ہی انٹیلی جنس کے شعبہ کے ہیں۔

یہ مخصوص صورت حال اور اس کے ساتھ پی اے سی کی معاشی شکایتیں، افسران کا پی اے سی کے سپاہیوں کے ساتھ اہانت آمیز سلوک نے وہ ہنگامہ کھڑا کیا جو 'پولیس کی بغاوت' کے نام سے مشہور ہوا۔ پریشد کے اکثر لیڈر جو ایس وی ڈی (سمیکت ودھایک دل) کے وزیروں کے بندوقچی رہ چکے ہیں۔ جن سنگھ، ایس ایس پی، تنظیمی کانگریس اور بی کے ڈی سے تعلق رکھتے ہیں۔ انٹیلی جنس شعبہ کے دو سو آدمی، جن میں انسپکٹر اور کانسٹبل سبھی شامل



کملاپتی ترپاٹھی

ہیں۔ اب تک سابق وزیروں اور ایم ایل ایز کے (جو اب اپوزیشن میں ہیں) کے بندوقچی بنے ہوئے ہیں۔ یو پی پولیس کی ملازمت آر۔ ایس ایس کے لڑکوں کے لئے ایک خاص کشش رکھتی تھی۔ چنانچہ حکومت کی طرف سے آر ایس ایس پر سے پابندی اٹھتے ہی اور اسے کلچرل تنظیم کا خلعت عطا ہوتے ہی

آر ایس ایس کے تربیت یافتہ ان لڑکوں نے پولیس کی نوکری کے لئے قطار لگانی شروع کر دی تھی۔

یہ بات بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ ایس وی ڈی وزارت کے دوران پی اے سی میں بھرتی مختلف پارٹیوں کے ورکروں کی سفارش کی بنیاد پر ہوتی تھی

گزشتہ جون میں فیروز آباد اور بنارس میں فرقہ وارانہ فسادات کے دوران پی اے سی کے عملہ نے جو رویہ اختیار کیا تھا اس کے خلاف کانگریس اور بعض اپوزیشن کے ممبران پارلیمنٹ نے سخت احتجاج کیا تھا۔ کانگریس ایم۔ پی محترمہ سبھدرا جوشی اور مولانا اسعد مدنی نے پی اے سی اور پولیس اور آر۔ ایس ایس کے ملّڑ بازی کے رویئے کی سخت نکتہ چینی کی تھی۔ اتر پردیش کانگریس کمیٹی کی اس وقت کی صدر مسز راجندر کماری باجپیئی نے فیروز آباد کے ہنگاموں کے دوران پولیس اور پی اے سی کے غلط رویئے کے خلاف تحقیقات کی بھی مانگ کی تھی لیکن حکومت نے نہ صرف تحقیقات کرانے سے انکار کر دیا بلکہ پولیس کی زیادتیوں کو جائز قرار دینے کی بھی کوشش کی۔

مسز باجپیئی نے اپنے ایک حالیہ بیان میں کہا ہے کہ انھیں یقین ہے کہ اگر حکومت یو۔ پی اسی وقت ان کے مشورے کو مان لیتی تو اس فتنہ کا اسی وقت سدباب ہو جاتا۔

پولیس اور پی اے سی کی قیادت سابقہ آر ایس ایس والوں اور ان لوگوں کے ہاتھ میں تھی تھی جن کا آر ایس ایس اور ایس ایس پی سے بہت قریبی تعلق تھا۔ اسی کے ساتھ ایسے متعصب اور رجعت پسند عناد جیسے گرو دیو بھی پی اے سی والوں کے ساتھ ہر وقت اٹھتے بیٹھتے دیکھے گئے تھے۔ خود حکومت کی اطلاع کے مطابق اکثر مقامات پر آنند مارگ سے بھی پولیس کے قریبی روابط کا پتہ چلا تھا۔

حالت یہ تھی کہ آر۔ ایس ایس کا پروردہ بھی پولیس والوں کی مانگوں اور پریشد کے ایجی ٹیشن کی خوب خوب تشہیر کر رہا تھا لیکن حکومت فوری طور پر

رکت میں آنے کی بجائے تماشہ دیکھ رہی تھی اور سارے معاملہ کو پولیس افسران پر چھوڑ رکھا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ پولیس والوں کو شکایات افسران سے تھیں حکومت سے نہیں تھیں۔ پھر بھی صورت حال سے سیاسی سطح پر نمٹنے کی ضرورت تھی۔ حکومت کی اسی ڈھل مُل یقینی کی وجہ سے انٹیلی جنس کا نظام اس کے ہاتھوں سے نکل گیا اور بجائے اس کے کہ انٹیلی جنس والے پولیس اور پی اے سی کے حالات سے حکومت کو باخبر رکھتے۔ انھوں نے اس کا بالکل اُلٹا کیا۔ وہ حکومت کو تو تاریکی میں رکھتے رہے اور پریشد کے رہ نماؤں کو ہر ہر بات کی اطلاع دیتے رہے۔

پی۔اے سی والوں کی چند شکایات جائز بھی ہیں۔ پی اے سی کے جوانوں کو افسران کا اپنے ذاتی گھریلو نوکروں کی طرح استعمال کرنا اور ان سے خانگی خدمت لینا اس ہیجان کا باعث بنا ہے۔ ضرورت تھی کہ ان کی شرائط ملازمت کو بہتر بنایا جاتا لیکن اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ جیسا کہ حالیہ واقعات سے ثابت ہوتا ہے افسروں اور جوانوں کے درمیان مطلق اجنبیت پیدا ہو گئی تھی۔ حکومت کو چاہیئے کہ وہ اس بات پر ٹھنڈے دل سے غور کرے اور پی اے سی کے موجودہ جاگیردارانہ نہج کو بدلے۔

بی کے ڈی کے صدر نے، دیر ہی سے سہی، اپنے بیان میں کہا ہے کہ وہ پولیس والوں کے یونین بنانے کے حق میں نہیں ہیں۔ ایس ایس پی (راج نرائن گروپ) جن سنگھ کی نوجوان تنظیم، ودیارتھی پریشد اور تعجب یہ ہے کہ سی پی آئی (ایم) نے کھلم کھلا اور درپردہ

بجائے اس کے کہ انٹیلی جنس والے پولیس اور پی اے سی کے حالات سے حکومت کو باخبر رکھتے انھوں اس کا بالکل الٹا کیا۔ وہ حکومت کو تو تاریکی میں رکھتے رہے اور پریشد کے رہ نماؤں کو ہر ہر بات کی اطلاع دیتے رہے۔

دونوں طرح پی اے سی کو شہ دی۔

سی پی آئی (ایم) نے تو بے لگام پی اے سی والوں کی حمایت میں جلوس بھی نکالا۔ ۲۴ مئی کے ہندوستان ٹائمز کی ایک اطلاع کے مطابق پی اے سی کے لیڈروں نے دہلی میں ایک سابق جن سنگھی ایم پی سے تین گھنٹے تک خفیہ بات چیت کی اور اس کے فوراً بعد پورا پی اے سی گروپ روپوش ہو گیا۔

یو پی گورنمنٹ نے پولیس کرمچاری پریشد کو غیر قانونی قرار دے کر صحیح اقدام کیا ہے۔ ۱۹۶۶ء کے پولیس فورسس ایکٹ کے مطابق حکومت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ پولیس کو ٹریڈ یونین قسم کی تنظیم بنانے سے روک سکتی ہے۔ حکومت اپنے اس اختیار کو پہلے ہی استعمال کر سکتی تھی۔

بہر حال اب فوری ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومت پی اے سی سے رجعت پسند اور متعصب عناصر کا صفایا کرے اور نئے بھرتی ہونے والوں کی اچھی طرح جانچ کر کے ان کو رکھے۔ پی اے سی کا جاگیردارانہ ڈھانچہ تبدیل کرے تاکہ افسروں اور جوانوں میں مناسب اور بہتر تعلق پیدا ہو سکے۔

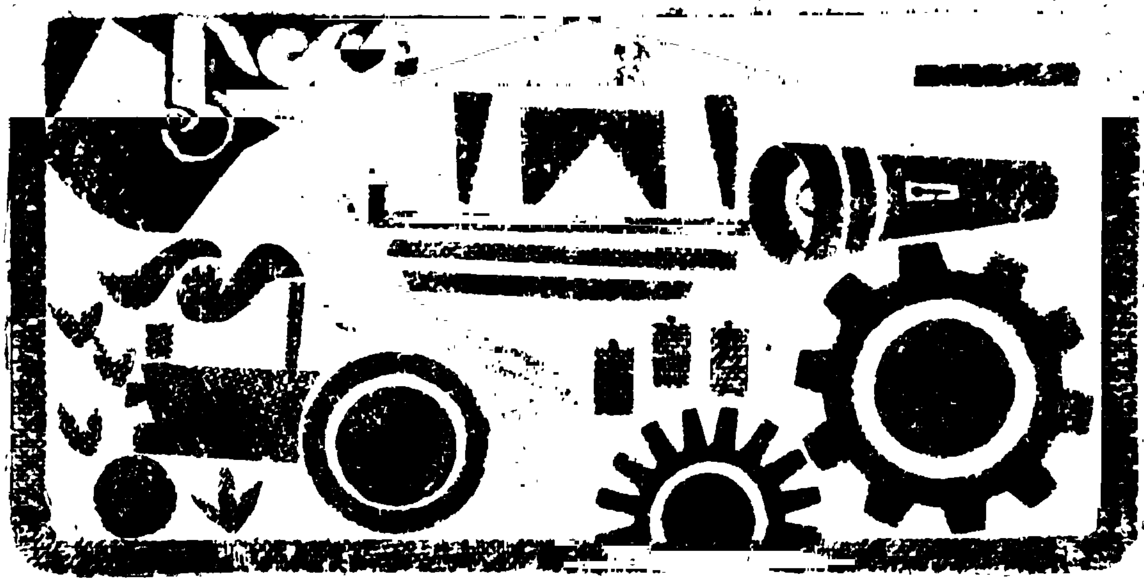
ڈیموکریسی ایسی اسٹیٹ نہیں جس میں عوام بھیڑوں کی مانند عمل کریں۔ ڈیموکریسی میں عقیدے اور عمل کی آزادی کی پوری طاقت سے حفاظت کی جاتی ہے۔

مہاتما گاندھی

ینگ انڈیا۔ مارچ ۱۹۲۲ء

ٹاٹا کیمیکلز کی جانب سے شائع کردہ

اپنے محدود ذرائع سے.....



بھارت کو اپنے سبھی محاذوں پر لڑنے کے لئے ہمارا تعاون

ترقی کی راہ پر چلنے والا بھارت جیسے جیسے قدم اٹھا رہا ہے ہم بھی اپنا تعاون دے رہے ہیں۔ خوراک محاذ پر یونین کاربائیڈ کیڑے مکوڑے کا خاتمہ کرنے والی دوائی اور پولیتھین فلم دیتا ہے جس کے ذریعہ کسانوں کو زیادہ اور بڑھیا قسم کی فصل پیدا کرنے میں مدد ملتی ہے۔ گھر کے محاذ پر ہم آپ کے لئے طرح طرح کی استعمال ہونے والی اشیاء جیسے بیٹری اور فلیش لائٹ سے لیکر پولیتھین سے بنے رنگین ڈبے تک مہیا کرتے ہیں۔ ادویات، روغن، کپڑا، لوہا فولاد اور ربڑ بنانے کیلئے خام مال اور کیمیائی اشیاء بھی مہیا کرتے ہیں۔ برآمد کے محاذ میں یونین کاربائیڈ پانچوں براعظموں میں اپنے لئے نئی منڈیاں تلاش کر رہا ہے اور اسکی بنی ہوئی اشیاء پچاس سے زائد ممالک میں جن میں ریاستہائے متحدہ امریکہ بھی شامل ہے بھیجی جاتی ہیں۔ ان کاموں میں چند ایک ہیں جنکی یونین کاربائیڈ انڈیا لمیٹڈ نے بھارت کے لوگوں کا معیار زندگی بلند کرنے کیلئے بنیاد ڈالی ہے۔ اس طرح ہم اپنے محدود ذرائع سے بھارت کی مدد کرتے ہیں تاکہ وہ سبھی محاذوں پر اپنی لڑائی لڑ سکے۔

UNION CARBIDE

sowing the seeds of progress

کتابوں کی باتیں

خلیق انجم

لسانی مطالعے ______ ڈاکٹر گیان چند جین

نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا۔ نئی دہلی

قیمت:۔ ۱۲ روپے، ۵۰ پیسے

علم لسانیات کی عمر لگ بھگ ایک صدی ہے۔ اردو میں تو یہ مدت اور بھی مختصر ہے۔ اردو کے لسانی پہلوؤں پر پہلی کتاب ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی (Hindustani Phonetics) ہے جو ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ زور صاحب کے بعد کافی عرصہ اس موضوع کی طرف خاص توجہ نہیں دی گئی۔ پھر آزادی کے بعد ڈاکٹر مسعود حسین نے اردو کی تاریخی اور تجرباتی لسانیات پر دو کتابیں شائع کیں۔ جو اردو لسانیات میں اہم ترین اضافہ تھیں۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے بعد پاکستان میں ڈاکٹر شوکت سبزواری اور ڈاکٹر سہیل بخاری اور ہندوستان میں ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے اردو لسانیات میں اہم اضافے کئے۔

حال ہی میں ترقی اردو بورڈ نے ڈاکٹر گیان چند کی لسانی مطالعے شائع کی ہے۔ پانچ حصوں میں تقسیم یہ کتاب بنیادی طور پر تجزیاتی لسانیات سے متعلق ہے۔ پہلے حصے میں انتہائی عالمانہ طور پر لسانیات کے مطالعے کی افادیت، زبان اور علم زبان، زبان کا آغاز، اور زبان اور بولی جیسے موضوعات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ کتاب کا دوسرا حصہ صوتیات سے متعلق مضامین پر مشتمل ہے۔ جو میرے خیال سے اہم ترین حصہ ہے۔ اس میں ڈاکٹر گیان چند نے ان پہلوؤں پر بھی لکھا ہے جن پر پہلے لکھا جا چکا تھا۔ مثلاً اردو مصوتے، اردو کا صوتی تجزیہ اور اردو کے جڑواں مصوتے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے اردو صوتیات کے ان پہلوؤں پر بھی لکھا ہے جو اب تک محتاج قلم تھے۔ مثلاً اردو کی غنائی اصوات، اور اردو عروض اور لفظ کا بل۔ ان تمام مضامین میں جس دیدہ ریزی اور تلاش و تحقیق سے کام لیا گیا وہ لائق صد تحسین ہے عام خیال یہ تھا کہ اردو اور ہندی میں تمام مصمتے اور مصوتے مشترک ہیں۔

ڈاکٹر گیان چند جین نے چار ایسے خفیف مصوتے ڈھونڈھ نکالے ہیں۔ جو اردو میں ہیں لیکن ہندی میں نہیں۔ اسی حصے میں شامل ان کا مضمون "اردو عروض اور لفظ کا بل" پڑھ کر ہی ہم کو یہ پتہ چلتا ہے کہ انھیں فن لسانیات کے ساتھ ساتھ اردو کے فن عروض پر بھی کتنا عبور حاصل ہے۔ اردو میں اپنے موضوع پر پہلا مضمون ہوتے ہوئے بھی یہ انتہائی جامع اور مکمل ہے۔

کتاب کا تیسرا حصہ فن تحریر سے متعلق مضامین پر مشتمل ہے "اردو الفاظ کا رومن املا" میں بین الاقوامی صوتیاتی رسم الخط میں لکھنے کے طریقوں سے بحث کی ہے اسی حصے کا ایک اور مضمون ہے "اردو رسم الخط کی اصلاح" اس میں اردو رسم الخط کی بعض خامیوں کی نشان دہی کر کے کچھ اصلاحیں تجویز کی گئی ہیں۔ جو لوگ اردو سے واقعی محبت کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اردو سیکھیں۔ ان کا فرض ہے کہ ڈاکٹر گیان چند جین کی پیش کی ہوئی تجویزوں پر انتہائی سنجیدگی سے غور کریں۔

چوتھے اور پانچویں حصے میں اردو زبان سے متعلق مضامین ہیں۔ لیکن اردو لسانیات پر نہیں۔ میرے خیال میں یہ مضامین الگ شائع کئے جاتے تو اچھا تھا۔ کتاب کے آخر میں وہ تمام انگریزی اصطلاحیں اور ان کے اردو ترجمے دیئے گئے ہیں جو مصنف نے اس کتاب میں استعمال کئے ہیں۔

لسانی مطالعے اردو لسانیات میں ایک اہم ترین اضافہ ہے۔ اردو صوتیات سے متعلق اس کے مضامین کا انگریزی ترجمہ ہونا ضروری ہے تاکہ ہندوستان سے باہر اردو اور ہندی صوتیات پر کام کرنے والے ان سے استفادہ حاصل کر سکیں۔

اتنی صاف ستھری خوبصورت کتاب چھاپنے پر ترقی اردو بورڈ قابل مبارکباد ہے۔

خلیق انجم

قصہ مختصر ______ مجتبیٰ حسین

نیشنل بک ڈپو۔ مچھلی کمان۔ حیدرآباد

قیمت ______ ۵ روپے

یوں تو اردو میں مزاح نگاری کی روایت بہت قدیم ہے۔ لیکن سنجیدہ اور بامقصد مزاح نگاری پطرس بخاری اور رشید احمد صدیقی کی سنجیدہ، بامقصد اور پھکڑپن سے پاک مزاح نگاری کی روایات کو آگے بڑھاتے ہوئے اردو مزاح میں جو چند ممتاز نام ابھرے ہیں مجتبیٰ حسین کا نام بھی انھیں میں شامل ہے۔ ہمارے

ماج میں بلکہ پوری دنیا کے سماج میں بعض موضوعات چٹکلے، فلسفے کے لئے مخصوص ہیں۔ ان میں میاں بیوی کے تعلقات اور پرانی سائیکل یا موٹر وغیرہ جیسے موضوعات قابلِ ذکر ہیں۔

ایک اچھے اور اوریجنل مزاح نگار کے بننے کی پہلی شرط یہ ہے کہ ان فرسودہ اور پامال موضوعات سے گریز کرے۔ سچے مزاح نگار کو موضوع کی تلاش نہیں ہوتی، بلکہ قدم قدم پر موضوعات خود اس کی تلاش میں رہتے ہیں۔ بشرطیکہ مزاح نگار چشمِ بینا رکھتا ہو۔ مثلاً اگر آپ ریل کے تھرڈ کلاس کے مسافر ہیں تو سفر کے دوران آپ پر کیا گزرتی ہے۔ کس طرح آپ ڈبے میں کس کے کندھوں پر سوار ہوتے ہیں اور کچھ لوگ آپ کے کندھوں اور سر پر۔ آپ اگر اپنی یہ تصویر دیکھنا چاہتے ہیں تو مجتبیٰ حسین کا مزاحیہ مضمون "ریلوے منتری مسافر بن گئے" ملاحظہ فرمائیے۔ تھرڈ کلاس کی ڈبے کی کھڑکیاں بظاہر بہت چھوٹی ہوتی ہیں لیکن یہ حقیقت میں کتنی کشادہ ہوتی ہیں اس کا احساس مجتبیٰ حسین صاحب اِن الفاظ میں دلاتے ہیں۔ ریل کی کھڑکی بہت کشادہ ہوتی ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ ضرورت پڑنے پر میں ساری ریل گاڑی کو انجن سمیت اس ڈبے کی کھڑکی میں سے گزار سکتا ہوں۔ یہ سب تصوف کا مسئلہ ہے۔ قطرہ سمندر میں جا ملتا ہے اور کبھی سمندر خود ایک قطرہ میں جا کر مل جاتا ہے۔" اس دور میں ہوتے حاتم طائی" مرزا کی یاد" میں اور ہوٹل شبانہ میں مجتبیٰ حسین نے بالکل اچھوتے موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔" اس دور میں ہوتے حاتم طائی میں" فقیری کے فن کے رموز اور فقیروں کی قسمیں بیان کی گئی ہیں، فقیروں کی قسمیں ملاحظہ ہوں، جلالی فقیر، کمالی فقیر، جمالی فقیر، خالی فقیر اور گالی فقیر۔ ان تمام فقیروں کی صفات پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔

مجتبیٰ حسین صرف لطیفوں اور دل چسپ مضمون کا سہارا لے کر مزاح نگاری نہیں کرتے۔ ان کا فن یہ ہے کہ وہ حالات اور واقعات میں پوشیدہ تضاد کو اپنے دل چسپ اندازِ بیان اور شوخ لب و لہجے سے اس طرح ابھارتے ہیں کہ پڑھنے والے اچانک ہنس پڑتے ہیں۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد اس کی ہنسی ایک سنجیدہ فکر میں بدل جاتی ہے۔ اب تک جو کچھ مجتبیٰ حسین نے لکھا ہے اسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مستقبل کے نمایاں اور ممتاز ترین مزاح نگاروں میں شامل ہوں گے۔

خلیق انجم

بے جڑ کے پودے ——— سہیل عظیم آبادی

نصرت پبلیشر، وکٹوریہ اسٹریٹ

لکھنؤ ۳

قیمت:- ——— ۳ روپے ۵۰ پیسے

ناولٹ کے ہیرو اور ہیروئن ارنسٹ اور نورا ہیں۔ ان دونوں کو مرد اور عورت کے ان جنسی تعلقات نے جنم دیا تھا جنھیں سماج کی (Sanction) حاصل نہیں تھی۔ یہ دونوں پودے ہیں، لیکن بے جڑ کے۔ اگرچہ سہیل صاحب نے ان دونوں کے درد اور ذہنی کرب کو بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ لیکن ان کے کرداروں میں جان نہیں پیدا ہو سکی۔ ارنسٹ بغاوت کر کے مشن سے نکل آتا ہے۔ یہاں اس کردار میں جان پڑتی ہے لیکن مسٹر سنہا اسے اپنے گھر میں پناہ دے کر پھر بے جان کر دیتے ہیں۔

ناولٹ کے دو کردار بہت جاندار ہیں مس گرین اور مسٹر سنہا۔ مس گرین کے کردار کا فطری ارتقا ہوتا ہے اور وہ آپ کے ذہن پر ایک پائیدار نقش چھوڑ جاتا ہے لیکن مسٹر سنہا کا معاملہ مختلف ہے۔ ابتدا میں وہ ایک نیک دل، خدا ترس اور غریب پرور انسان کی حیثیت سے متعارف کرائے جاتے ہیں اور پڑھنے والوں کے ذہن میں وہ ایک آئیڈیل کردار کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ یہ تسلیم نہیں کرتے کہ معصوم بچوں کو حلال اور حرام کے خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اسی لئے وہ مشن کی ہر طرح مدد کرتے ہیں جب ارنسٹ بغاوت کر کے مشن سے نکلتا ہے تو مسٹر سنہا اسے اپنے ہاں پناہ دیتے ہیں۔ جب انھیں نورا کی حالت معلوم ہوتی ہے تو اسے بھی اپنے پاس بلا لیتے ہیں۔ ان کے قول اور عمل کی وجہ سے ہمیں ان سے دلی عقیدت ہو جاتی ہے۔ لیکن اچانک ہماری یہ عقیدت نفرت اور غصہ سے بدل جاتی ہے کیونکہ خود مسٹر سنہا بتاتے ہیں کہ ارنسٹ اور نورا دونوں ان کے بچے ہیں۔ سماج کے ڈر سے انھوں نے ان بچوں کو مشن میں پھنکوا دیا تھا۔ مشن سے ان کی غیر معمولی دل چسپی کا راز بھی یہی بچے ہیں۔ مسٹر سنہا کے ساتھ ہمیں سہیل صاحب پر بھی غصہ آتا ہے۔ اس قابلِ تقلید کردار کا گلا اس طرح نہیں گھونٹنا چاہیئے تھا لیکن کچھ دیر بعد لگتا ہے کہ جیسے سہیل ہم سے کہہ رہے ہوں " مجھ پر کیوں غصے ہوتے ہو، سنہا تو تمہارے سماج کا ایک زندہ کردار تھا۔" بہت عرصہ بعد سہیل عظیم آبادی کا ایک ناولٹ بے جڑ کے پودے شائع ہوا ہے۔

سہیل عظیم آبادی کا شمار اردو کے ان ترقی پسند افسانہ نگاروں میں ہے جنھوں نے اپنے فن کا چراغ پریم چند سے جلایا تھا۔ پریم چند کی طرح سہیل بھی فن کو عبادت سمجھتے ہیں۔ اسی لئے انسان دوستی کا جذبہ پورے ناولٹ پر چھایا ہوا ہے۔ سہیل کو زندگی کا سچا شعور ہے۔ وہ مسکراہٹوں کی تہہ میں چھپے ہوئے انسانی درد کو اپنی گرفت میں اس طرح لے لیتے ہیں کہ پڑھنے والا ہنستے ہنستے اچانک سنجیدہ ہو جاتا ہے۔

"بے جڑ کے پودے" کا پس منظر ایک عیسائی مشن ہے جسے مس گرین نے قائم کیا ہے۔ وہ جوانی میں یہاں آئی تھی اور اب زندگی کی آخری منزل میں ہے۔ سہیل نے اپنی کہانی کا تانا بانا کچھ اس طرح بُنا ہے کہ عیسائی مشن کی پوری زندگی ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ کس طرح بعض لوگ اپنی ساری زندگی خدمتِ خلق پر قربان کر کے دوسروں کے درد کو اپنا درد بنا لیتے ہیں اور کس طرح بعض لوگ خود غرضی اور سازشوں سے یہاں کی پاک اور پوتر فضا کو بھی مسموم کر دیتے ہیں یہ سب تفصیلات ہمیں کرداروں کے ذریعہ مل جاتی ہیں۔ "میں نے تو صرف اس کی نقاب ہٹائی ہے۔"

پونا میں کس کا لہو کس کا خنجر؟ بقیہ صفحہ ۱۰

بقیہ صفحہ ۱۰

سارا معاملہ کتنا منظم اور منصوبہ بند تھا۔ جب شہر کے سرکردہ لیڈر چاند تارا مسجد کے پاس جمع مجمع کے پاس پہنچے اور انھوں نے مجمع کو سمجھانا چاہا تو کسی نے ان کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ فائر بریگیڈ آگ بجھانے آیا تو بلوائیوں نے اسے گھیر لیا اور آگے جانے سے روک دیا مسٹر مدھولمایا نے جب یہ دھمکی دی کہ اگر آگ بجھانے والوں کو آگے جانے نہ دیا گیا تو وہ اپنے آپ کو ختم کرلیں گے۔ لیکن اتنے بڑے لیڈر کی اتنی بڑی دھمکی پر کسی نے کان نہ دھرا اور فائر بریگیڈ کا راستہ روکے رکھا۔

پونا کے مراٹھی ہفتہ وار "تیگا سوی" میں آنکھوں دیکھے حال میں بھوانی پیٹھ، کسبا، گنیش راستہ اور دوسرے مقامات پر عبادت گاہوں کے جلائے جانے کا ذکر ہے۔ مسلمانوں کی دو کانیں بلوائیوں کا خاص نشانہ تھیں۔ نانا پیٹھ، اسلام پورہ اور بھیم پورہ میں مسلمانوں نے مزاحمت کی تو وہاں جم کر لڑائی ہوئی اور دونوں فرقوں کے کافی اشخاص زخمی ہوئے تین دن میں پولیس کو پوبیس بار گولی چلانی پڑی

اس فساد کا سب سے زیادہ تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ اس میں بارہ اور بیس سال کی عمر کے درمیان کے لڑکوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ وہ کرفیو کے دوران بھی ہر علاقے میں غنڈہ گردی چلاتے دیکھے گئے اور پولیس سے بھی انھوں نے جابجا جم کر ٹکر لی۔ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ان کو پہلے سے اس کی تربیت دی گئی تھی اور پیشہ ور سماج دشمن اور غنڈے ان کی قیادت کر رہے تھے۔

پونا کے واقعات ایک نیا انتباہ ہیں حکام کے لئے۔ اگر انھوں نے بھیمڑی اور جلگاؤں کے واقعات سے سبق لیا ہوتا تو پونا کا فساد نہ ہوتا۔

چیئرمین قومی ایکتا ٹرسٹ اور سیکولر ڈیموکریسی کی مدیر محترمہ سبدرا جوشی اپنے سر کی چوٹ کے علاج کے لئے پولینڈ تشریف لے گئی ہیں۔ اطلاع ملی ہے کہ انھیں پھیپھڑوں کی کچھ تکلیف ہوگئی ہے۔ جس کے لئے وہ زیر علاج ہیں۔ تشویش کی کوئی بات نہیں۔ امید ہے کہ وہ جون کے آخر تک تشریف لے آئیں گی۔

انور مسعود

خونِ قلم دیا، یادداشت

(ان بدبختوں کے نام، جنھوں نے ہندی افسانہ نگار جناب ظہور بخش کی لائبریری کو جلا دیا اور اسے "متعصب" قرار دے کر طرح طرح کی اذیتیں دیں)

زبان و ادب ملکیت تو نہیں
پروازِ تخلیق قید بھی تو نہیں
ایسے میں وہ
در و دیوار کیوں کر ہلاتیں
مکینوں کو ستائیں
وہ کہ جو
بھٹکے ہوئے ذہن ہیں
خونِ آدم ہے کہ بہاتے ہی چلے جاتے ہیں
مورخ
جو کہ آج کی داستان
اسی بہتے ہوئے خونِ آدم میں قلم ڈبو کر لکھیں گے

زبان و ادب ملکیت تو نہیں
پروازِ تخلیق
عصمت دری کی، وہ سب ٹھیک ہے
مگر اپنے بھٹکے ہوئے ذہنوں سے سوچا ہوتا
کہ
پوتر تا اپنے مشرق کا ورثہ ہے
کلنک لگنے سے پہلے
کچھ تو سوچا ہوتا

زبان و ادب ملکیت تو نہیں
پروازِ تخلیق
اے صاحبِ قلموں سنبھلو وقت گیا نہیں
ابھی کچھ بگڑا نہیں
اتنا زورِ تحریر پیدا کرلو
اتنا سب کچھ لکھ لو
کہ یہ معاون
لاٹھیاں، بم، بندوق، نیزے، ترشول
ان کی اوٹ میں سما جائیں
چھپ جائیں
یا
آؤ پھر ایک کام کریں
روایات کو دہرائیں
کسی کو
یادداشت پیش کریں

امتحانی مقابلہ۔ بقیہ ص۶

داخلہ کے سلسلے میں کسی قسم کی پیشگی انکوائری پر غور نہیں کیا جائے گا۔

پرنسپل

یونین پبلک سروس کمیشن

نیشنل ڈیفنس اکیڈمی

بری، بحری اور ہوائی افواج کے لئے، نیشنل ڈیفنس اکیڈمی کے ۵۱ ویں کورس میں داخلے کے لئے نیشنل ڈیفنس اکیڈمی کی طرف سے ۲۰ دسمبر ۱۹۷۳ء کو ایک امتحانی مقابلہ منعقد کیا جا رہا ہے۔ یہ کورس ۱۹۷۴ء سے شروع کیا جائے گا۔

عمر:۔

امیدواروں کی تاریخ پیدائش ۲ جنوری ۱۹۵۶ء سے پہلے اور یکم جولائی ۱۹۵۸ء کے بعد کی نہیں ہونا چاہیئے۔ کسی بھی حالت میں عمر میں رعایت نہیں کی جائے گی۔

علمی قابلیت:۔

ہائر سیکنڈری کا امتحان پاس ہو یا اس کے برابر کا کوئی امتحان پاس ہونا چاہیئے۔ جو امیدوار ہائر سیکنڈری کے امتحان یا اس کے برابر کے کسی امتحان میں شریک ہو چکے ہیں، یا شریک ہونا چاہتے ہیں، وہ بھی درخواستیں بھیج سکتے ہیں۔

پوری معلومات اور درخواستی فارم سیکریٹری یونین پبلک سروس کمیشن دھولپور ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۱ سے، ایک روپیہ منی آرڈر کے ذریعہ یا دفتر کے کاؤنٹر پر جمع کر کے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ امیدواروں کو چاہیئے کہ وہ منی آرڈر کے کوپن پر صاف صاف جلی حروف میں، نیشنل ڈیفنس اکیڈمی ایگزامینیشن دسمبر ۷۳ء ضرور لکھ دیں۔ اس کے علاوہ اپنا پورا نام و پورا پتہ جلی حروف میں لکھیں۔ پوسٹل آرڈر یا چیک وغیرہ منظور نہیں کئے جائیں گے۔ پوری تفصیلات معہ درخواستی فارم کے قریب کے بھرتی دفتر، ملٹری ایریا، سب ایریا ہیڈ کوارٹرز یا نیشنل کیڈٹ کور یونٹس سے بغیر کسی فیس کے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

پوری طرح مکمل فارموں کے یونین پبلک سروس کمیشن کے دفتر میں بھیجنے کی آخری تاریخ ۱۶ جولائی ۱۹۷۳ء ہے۔ ایسے امیدوار جو ہندوستان سے باہر سکونت پذیر ہیں یا انڈومان، نیکوبار، لکادیپ، منی کوئے اور امین دیپ وغیرہ وغیرہ جزیروں کے رہنے والے ہیں۔ ان کے لئے فارموں کے دفتر بھیجنے کی آخری تاریخ ۳۰ جولائی ۱۹۷۳ء ہے۔

ڈائرکٹریٹ آف ایڈورٹائزنگ اینڈ ویژول پبلسٹی

آٹھ جگہیں، ایگزیبیشن اسسٹنٹ کے لئے خالی ہیں۔

شیڈول کاسٹ کے لئے دو جگہیں اور شیڈول ٹرائبس کے لئے ایک جگہ مخصوص ہے۔

تنخواہ:۔

۲۱۰ - ۴۲۵۔ ساتھ میں تمام الاؤنسز۔

شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائبس اور دوسرے امیدواروں کی زیادتی، عمر میں رول کے مطابق رعایت کی گنجائش ہے۔

علمی قابلیت:۔

ضروری: (۱) انٹرمیڈیٹ یا سینئر کیمبرج یا ہائر سیکنڈری یا اس کے برابر کا کوئی امتحان یا کسی منظور شدہ انسٹی ٹیوشن سے آرٹ میں ڈپلومہ ہونا ضروری ہے۔

(۱) تقریباً دو سال کا پبلسٹی کا تجربہ یا سیلزمین شپ کا تجربہ کسی تجارتی ادارہ میں ہونا ضروری ہے۔

ایک سے زیادہ ہندوستانی زبانیں جاننے والے کو ترجیح دی جائے گی۔ یہ آسامیاں ہندوستان کے مختلف علاقوں میں ہیں۔ امیدواروں کو سفر پر بھیجا جا سکتا ہے۔

درخواستیں معہ نام و پتہ، باپ کا نام، عمر، تعلیمی قابلیت، ذات وغیرہ سے پُر ساتھ میں تمام سرٹیفکیٹ اور سندوں کی اٹسٹڈ کاپیاں نتھی کرنے پر ۱۲ جون ۷۳ء تک ڈپٹی ڈائرکٹر (ایڈمنسٹریشن) ڈی۔ اے۔ وی۔ پی۔ پی۔ ٹی۔ آئی بلڈنگ تھرڈ فلور۔ پارلیمنٹ اسٹریٹ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۱ پہنچ جانی چاہئیں۔

جو امیدوار ملازم ہیں انھیں چاہیئے کہ وہ اپنی درخواستیں اپنے دفتر کی معرفت ہی بھجوائیں۔

دینی مکتبوں کے فارغین کا مسئلہ

آج اگر اردو کے شیدائیوں اور خاموش خادموں کا جائزہ لیا جائے تو سب سے پہلے ہمیں دینی مدارس کا نام نظر آئے گا۔ یہ ایک ایسی عیاں حقیقت ہے جس میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ مگر تعجب ہوتا ہے کہ سیکولر ڈیموکریسی کے مئی کے شمارے میں انجم عثمانی نے نہ صرف یہ کہ اردو کے سلسلے میں دینی مدرسوں کی پیہم اور بے لوث خدمات سے انکار کیا ہے، بلکہ ان پر اردو سے غفلت، بے اعتنائی اور سستی شہرت کا ذریعہ بنانے کے الزامات عائد کرتے ہوئے طعن و تشنیع کے تیر و نشتر بھی چلائے ہیں۔

مضمون مذکور پڑھنے کے بعد یہ اندازہ نہیں

مضمون نگار نے لکھا ہے کہ دینی مدارس سے وابستہ افراد" اردو کے نیم جان جسم پر اپنی سیاست کے ارمانوں کا اسٹیج سجائے اردو اردو چلاتے ہیں اور نعرہ لگانے والوں میں سرِفہرست دکھائی دیتے ہیں"۔

یہ صرف الزام ہی الزام ہے جو حقیقت سے کوسوں دور ہے۔ بے چارے دینی مدارس سے وابستہ حضرات کو اپنی داخلی سیاست سے فرصت ہی کب ہے کہ وہ اس سے باہر نکل کر اردو کے "نیم جان جسم" کو منتخب کریں۔ جہاں تک نعرہ لگانے کا سوال ہے اس میں وہ سرِفہرست کیا پچھلی صفوں میں بھی نظر نہیں آتے ہندوستان میں چھوٹے بڑے دینی مدارس میں پڑھنے والے طلبا بیس پچیس کی تعداد سے لے کر ہزار بارہ سو تک ملتے ہیں۔ مگر شاید کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں پیش کی جا سکتی کہ کسی دینی مدرسہ کے طلبا نے اردو کے لئے ہڑتالیں کی ہوں، سڑکوں پر نعرے لگائے ہوں، سائن بورڈ توڑے ہوں

پورے ہندوستان سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف یو پی کے ہر دیہات میں جہاں مسلم معقول تعداد میں ہیں ایک دینی مدرسہ ضرور ملے گا، اور شہروں میں تقریباً ہر محلے میں۔ اس طرح دینی مدرسوں کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہو جاتی ہے۔ ان مدارس میں درجہ سوم سے لے کر کم از کم پانچویں کلاس تک پڑھائی ہوتی ہے۔ ان مدرسوں میں ابتدا اردو سے ہوتی ہے۔ درجہ سوم تک پہنچتے پہنچتے طلبا میں اس قدر اردو سے واقفیت ہو جاتی ہے کہ ان کا شمار "اردو جاننے والے" افراد میں ہو سکے۔ طلبا ان مدارس سے نکلنے کے بعد یا تو بڑے دینی مدارس میں چلے جاتے ہیں یا سرکاری اسکولوں میں۔ اگر دینی مدارس میں گئے تو انھیں مزید اردو تعلیم اور اردو ماحول ملتا ہے۔ لیکن اگر اسکولوں کا رخ کرتے ہیں تو ان کی اردو کے لئے اللہ ہی خیر کرے۔

یہ چھوٹے مدارس یا مکاتب کا حال ہے۔ رہے بڑے دینی مدارس تو ان میں اکثر نے تعلیمی سلسلے کو دو تین مراحل میں تقسیم کر رکھا ہے۔ عام طور سے پہلا مرحلہ مکتب پنجم یا ہفتم تک چلتا ہے جس میں اردو، ہندی، جغرافیہ حساب وغیرہ پڑھائے جاتے ہیں۔ مکاتب کے آخری درجات میں اردو ادب منظوم و منثور کے انتخابات یا مسدس حالی جیسی کتابیں داخل نصاب ہوتی ہیں۔

اس کے بعد دوسرا مرحلہ عربی درجات کا شروع ہوتا ہے جس میں عربی زبان اور دینی علوم کے ساتھ ساتھ انگریزی بھی پڑھائی جاتی ہے۔ چونکہ دینی مدارس کی غرض کچھ اور ہوتی ہے اس لئے ان میں اگرچہ اردو باقاعدہ نصاب میں داخل نہیں ہوتی تاہم اردو ہی اوڑھنا بچھونا رہتی ہے، اردو ذریعۂ تعلیم ہوتی ہے اور عام طور سے اردو اخبارات و رسائل نظروں سے گزرتے ہیں۔ اس کے بعد بھی یہ کہنا کہ

"مدرسوں میں اردو شامل نصاب نہ ہونے کی بنا پر ایک بڑا حلقہ اردو کی تعلیم سے محروم رہا ہے"۔

سراسر کذب بیانی نہیں تو اور کیا ہے۔

مزید براں میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ رہا ہوں کہ عربی مدارس سے فارغ اور اچھے اور اچھے طلبا سرکاری کالجوں اور یونیورسٹیوں کے ایم۔ اے اردو کے ذہین اور اچھے طلبا سے زباندانی یا شعر فہمی میں کسی طرح پیچھے نہیں رہتے۔ سرکاری اسکولوں کی جانب سے آنے والے بی۔ اے کے صرف پانچ فیصدی طلبا بالکل صحیح املا لکھ سکتے ہیں، جب کہ دینی مدرسوں کے فارغین میں شاید مشکل سے پانچ فیصدی کی املا کہیں کہیں غلط ہو جاتی ہو۔

فاضل مضمون نویس نے یہ بھی انکشاف فرمایا ہے کہ "ان مدرسوں کے ذریعہ اردو جاننے والوں کا ایک بہت بڑا طبقہ تیار کیا جا سکتا تھا اور تیار کیا جا سکتا ہے"۔

گویا ایسا ہوا نہیں ہے اور نہ ہو رہا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مدرسوں کے روزِ تاسیس سے لے کر اب تک یہ مقصد دانستہ یا دانستہ طور سے حاصل ہوتا رہا ہے اور ہو رہا ہے۔ یہاں اگر "اردو جاننے" سے مراد صرف اردو لکھنا، بولنا اور پڑھنا ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ معدودے چند کے علاوہ (جو غیر ملکی کرتے ہیں) دینی مدارس میں زیر تعلیم صد فیصد طلبا اردو جاننے والے پیدا ہوتے ہیں۔ اور اگر "اردو جاننے والوں" سے مراد ادیب و انشاپرداز حضرات ہیں (جن کی الفاظ اجازت نہیں دیتے) تو سب سے پہلے یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیئے کہ یہ ملکہ خداداد ہوتا ہے۔ اردو کے ایسے ادبا کی ایک فہرست دی جا سکتی ہے جن کی تعلیم کسی مستند مدرسہ کی نہیں یا جن کی تعلیم کا اسٹینڈرڈ ہائی اسکول کے برابر بھی نہیں مگر ان کی انشاپردازی کا ایک دنیا لوہا مانتی ہے۔ اس بات سے قطع نظر اس میدان میں بھی دینی مدرسوں کی خدمات کو آسانی سے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ آنکھ بند کر کے اردو کے دس پندرہ ادیبوں اور شاعروں کو لے لیجئے اور پھر ان کے ابتدائی حالات کی چھان بین کیجئے تو معلوم ہوگا کہ آدھے سے زیادہ حضرات کی اردو کسی مدرسہ ہی کی رہین منت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مدارس اردو زبان و ادب کو پھیلانے میں اساسی و کلیدی رول ادا کر رہے ہیں اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو شاید فاضل مضمون نگار بھی کسی ایسے ہی مدرسہ کے فیض یافتہ ہوں گے، گو کہ اپنے مضمون میں انھوں نے دینی مدرسوں کی بنیادی باتوں سے جس لاعلمی کا ثبوت دیا ہے اس سے کسی کو

اس بات کا علم یقین ہوگا۔

مضمون نگار نے مدرسوں میں اردو کی تعلیم کا معقول انتظام نہ ہونے کے خود ساختہ تین اسباب گنائے ہیں۔ حالانکہ اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ تمام دینی مدرسوں میں ابتدا ہی سے معقول پیمانے پر اردو تعلیم کا انتظام ہے۔ اس کے بعد ضمنی حیثیت سے اردو کی تعلیمی استعداد میں اضافہ ہوتا رہتا ہے کیوں کہ تمام مدرسوں کا ذریعۂ تعلیم Medium of Instruction اردو ہے، اور ہمیشہ اردو ہی سے سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ اس لئے اس کو ان کے "دائرۂ کار" کے اندر پایا ہوا سمجھنے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔

فاضل مضمون نویس نے یہ مشورہ بھی دیا ہے

"حدیث و فقہ سے لے کر ادب و منطق کی تمام مذہبی کتابیں، شرحیں، ترجمے، اور تصانیف کی شکل میں موجود ہیں اس لئے ایسی کوئی دشواری نہیں کہ ان مدرسوں کے نصاب میں اردو کو مناسب مقام نہ دیا جائے۔"

گویا یہ سب کتابیں اردو میں پڑھانی شروع کر دیں۔ حالانکہ یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ جو بات کسی اصل زبان میں ہوتی ہے وہ ترجمے میں نہیں ہوتی۔ پھر ترجموں میں غلطیوں اور مفہوم کے بدلنے کا بھی احتمال ہوتا ہے۔ جو روح اصل میں ہوتی ہے وہ نقل میں کہاں۔ مزید یہ کہ حاشیے اور ترجمے صلاحیت کُش ہوتے ہیں اور تقلیدی ذہن پیدا کرتے ہیں۔ اگر حاشیے اور ترجمے پڑھانے کا سوال ہوتا تو شاید اتنے بڑے بڑے ادارے قائم کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ اسی لئے عربی مدرسوں نے کبھی یہ غلطی نہیں کی۔ ان کا مقصد ہے دین کو اس کے اصل سرچشمے اور اصلی زبان سے سمجھنے والے افراد کی نشو و نما، عربی، فارسی یا اردو کے ادبا و شعرا اور نکتہ سنجوں کا پیدا کرنا ان کا براہ راست کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ دیوان حماسہ متنبی، انوار سہیلی، سکندر نامہ جیسی کتابیں صرف اس لئے درس میں شامل رہتی ہیں کہ ان سے عربی و فارسی، زبان و ادب کی باریکیوں کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو۔ کیونکہ اسلام کا ابتدائی و قدیم سرمایہ انہیں زبانوں میں ہے۔ گیسوئے اردو کے پیچ و خم کو سمجھنے کے لئے ان دو زبانوں سے واقفیت بہت ضروری ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اردو میں غالب تر تشبیہات و استعارے، تلمیحات و محاورے اور مضامین عربی و فارسی سے ماخوذ ہیں۔ ان زبانوں کی ادبیات پڑھنے کے بعد اردو ادب و شاعری کو کلاسوں میں پڑھانے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ ایک ذرا سے التفات اور مختصر سے ذاتی مطالعہ کے بعد اعلیٰ اردو داں بن سکتے ہیں۔

مضمون نگار نے اردو دانی سے "اقتصادی حالات" کے سدھرنے کا ذکر کیا ہے اور جگہ جگہ "سرکاری مراعات" سے فائدہ اٹھانے پر اُکسایا ہے۔ مگر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اردو دانی سے کیا اقتصادی حالت سدھرے گی۔ اگر یہی بات ہوتی تو سرکاری اسکولوں میں اس کا رونا نہیں رہتا کہ اردو پڑھنے والے طلبا نہیں ملتے۔ آج کل اسکولوں میں کم سے کم طلبا اردو مضمون لیتے ہیں۔ کیونکہ ان کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اقتصادی حیثیت سے آگے بڑھنا ہے۔ ان کے سرپرست اگر استطاعت رہی (جو بہت کم ہوتی ہے) تو کسی کانونٹ اسکول میں بھیجیں گے یا پھر خالص ہندی، اردو کو جلدی ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اردو کے بعد ان کا کوئی معاشی مستقبل نہیں ہے۔ اس کے برخلاف دینی مدرسوں میں سبھی اردو پڑھتے ہیں کیونکہ ان کے سامنے معاشی حالت کو سدھارنا مقصد نہیں ہوتا۔ وہ سب اردو پڑھتے ہیں مگر اردو کی وجہ سے ان کا کوئی اقتصادی فائدہ نہیں ہوتا۔ اس کے بعد ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کون سی مراعات ہیں جن کا ذکر کرنا چاہتا ہے، اور مدارس کے طلبا اپنی دینی تعلیم کو برقرار رکھتے ہوئے جن سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ ایک اردو اساتذہ کی ٹریننگ کا انتظام ہو نہیں سکا۔ کاغذی مراعات سے کیا ہوتا ہے۔ آئے دن اردو میڈیم اسکولوں اور مختلف کالجوں سے اردو کے اخراج کی خبریں آتی ہیں مگر حکومت سے "مراعات پانے والے" اس کی طرف نہیں دیکھتے۔

مضمون نگار کا یہ فرمانا کہ "ان مدرسوں میں کسی دوسرے ادارے (جامعہ اردو وغیرہا) سے بھی فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ اس لئے کہ مدرسوں کا قانون یہ ہے کہ دوران تعلیم کوئی دوسرا امتحان نہیں دیا جا سکتا" بالکل بجا نہیں ہے کیونکہ اس میں بھی بہت زیادہ استغنا ہے۔ بہت سے ایسے دینی مدارس ہیں جو دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عربی و فارسی بورڈ الہ آباد یا جامعہ اردو علی گڑھ سے باقاعدہ امتحان دلایا کرتے ہیں وہ تو "اردو کو مراعات" دینے والے اصحاب ہیں جو آئے دن طرح طرح کی قیود و شرائط بڑھا کر مدارس کے طلبا کی دراندازیوں کو محدود کرتے جاتے ہیں۔ اگر ندوۃ العلما لکھنؤ، مدرستہ الاصلاح سرائے میر یا اسی طرح کے بڑے مدارس کے فارغین کو کسی ٹیسٹ کے بعد کم از کم بی۔ اے میں داخلہ دیا جائے تو وہ اپنے ہم جماعتوں سے یقیناً آگے رہیں گے۔

اگر کچھ مدارس خارجی امتحانات پر پابندیاں عائد کرتے ہیں تو ان کے پاس یہ عذر ہے کہ پڑھنے والے مسلم طلبا کا پانچ فیصد سے بھی کم حصہ اپنے آپ کو دینی تعلیم کے لئے وقف کرتا ہے۔ اگر یہ بھی دوسرے امتحانات کے چکر میں پڑ جاتے ہیں تو ان کا اصل مقصد پس پشت جا پڑتا ہے۔ وہ خود اردو کی اتنی تعلیم دے دیتے ہیں کہ صرف اردو پڑھنے کی غرض سے خارجی امتحان کی ضرورت نہیں رہتی۔

مختصر یہ کہ دینی مدارس اردو کے مخلص خادم خاموش اور بے نفس محافظ اور ناقابل تسخیر قلعے ہیں۔ اردو کی عملاً ترویج و اشاعت کی خدمت جتنی کچھ یہ انجام دے رہے ہیں، کہیں نہیں پائی جاتی۔ مضمون نگار صاحب کے بارے میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد

عبدالعظیم اصلاحی، اعظم گڑھ

اگلا بچہ ہونے سے پہلے

ذرا سوچیے

کیا آپ اس بچے
کی صحیح دیکھ بھال
نہیں کرنا چاہیں گے ؟



اس کے روشن مستقبل کیلئے اعلیٰ تعلیم کی شروعات اور باقی سبھی ضرورتوں کو پورا کرنے کا انتظام ... لیکن اگر بچہ جلد ہو گیا تو یہ سب کچھ کرنا آپ کے لئے مشکل ہوگا۔ آپ اس پریشانی سے ضرور بچنا چاہیں گے۔

نِرودھ کی وجہ سے اب آپ اگلے بچے کی پیدائش کو تب تک ٹال سکتے ہیں، جب تک آپ اسکی پوری دیکھ ریکھ کرنے لائق نہیں ہو جاتے۔

نِرودھ مردوں کیلئے ہے۔ ربڑ سے بنا حمل روکنے کا یہ آسان ذریعہ برسوں سے ساری دنیا میں مقبول ہے۔ آپ بھی نِرودھ استعمال کیجئے۔

نِرودھ ہر جگہ ملتا ہے۔ سرکاری رعایتی دام، 15 پیسے میں 3



جب تک نہ چاہیں تب تک نہ پائیں سنتان

▼ نِرودھ

لاکھوں میں مقبول، بے ضرر اور آسان

کریانہ فروشوں، دوا فروشوں، پنساریوں، پان و سگریٹ کی دکانوں وغیرہ کے یہاں بکتا ہے۔

davp 72/658



انہوں نے آزادی کی جنگ جیتی

آؤ! ہم بھارت کی تعمیر و ترقی کے

انقلاب کو پایۂ تکمیل
تک پہنچائیں

25

davp 72/129

کیا آپ

کسی یونیورسٹی کے طالب علم

یا

تعلیمیافتہ

بیروزگار ہیں؟

ہمیں آپ ہی کی تلاش ہے!

ہمیں ایسے نوجوان اور باہمت مردوں اور عورتوں کی ضرورت ہے جو بھارت سرکار کے نیشنل سیونگز سرٹیفکیٹ اور میعادی ڈپازٹ کھاتے بیچنے کا کام کرنے کو تیار ہوں۔ آپ کا کام ان سرکاری کفالتوں کے لئے کنویسنگ کرنا ہوگا۔
ان پر سود 7½% سالانہ تک دیا جاتا ہے۔ یہ ایک ہمت کا کام ہے جس پر آپ کو 1 75% کمیشن ملے گا اور نئے لوگوں سے رابطہ پیدا کرنے اور اپنی شخصیت کو اُجاگر کرنے کا موقع بھی ملے گا۔
وہ برسرِ روزگار افراد جو اپنی آمدنی میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں، بھی درخواست بھیج سکتے ہیں۔

اگر آپ کو اس کام سے دلچسپی ہو
تو آج ہی
نیشنل سیونگز کمشنر، پوسٹ بکس نمبر 96، ناگپور
کے پتے پر درخواست بھیجیں۔

davp 72/507

Regd. No. R.N. 16241/68 Regd. No. D-1820

این این پانڈے نے قومی ایکتا ٹرسٹ کے لئے وشنو آفسٹ پریس سے چھپوا کر شائع کیا

رجسٹرڈ آفس:۔ A-19، تھیٹر کمیونی کیشن بلڈنگ، کناٹ سرکس، نئی دھلی۔ ایڈیٹر:۔ ڈی آر گوئل



سیکولرڈیموکریسی
شمارہ ۲۰ قیمت ایک روپیہ
اس ملک کا ہر فرد آزاد ہے
تبدیلی نہیں چاہتی
نمبر
RAIS

انکم ٹیکس دہندگان!

محکمہ انکم ٹیکس کی طرف سے

مستقل کھاتہ نمبر

ہر ٹیکس دہندگان کو الاٹ کیا گیا ہے تاکہ ادائیگیوں کے چالانوں، گوشواروں اور دوسری خط و کتابت کا صحیح ڈھنگ سے ریکارڈ رکھا جا سکے اور انھیں فائل کیا جا سکے۔

اگر غلطی سے آپ کو دو مستقل کھاتہ نمبر الاٹ ہو گئے ہیں، یا کوئی بھی نمبر الاٹ نہیں کیا گیا، تو از راہ کرم اپنے انکم ٹیکس افسر / کمشنر انکم ٹیکس سے کہیں کہ وہ آپ کے دوسرے نمبر کو منسوخ کر دیں یا کوئی نمبر الاٹ کریں۔

از راہ کرم اپنے گوشواروں، چالانوں وغیرہ پر اپنے مستقل کھاتہ نمبر کا صحیح طور پر حوالہ دینا نہ بھولیں۔ اس سے جہاں آپ محکمے کی مدد کریں گے، وہاں محکمہ بھی آپ کی بہتر خدمت انجام دے سکے گا۔

جاری کردہ:
ڈائریکٹوریٹ آف انسپکشن
(ریسرچ، اسٹیٹسٹکس اینڈ پبلیکیشن)
نئی دہلی

davp 78/147



انہوں نے آزادی کی جنگ جیتی

آؤ! ہم بھارت کی تعمیر و ترقی کے

انقلاب کو پایۂ تکمیل
تک پہنچائیں

25

dave 72/129

یونین پبلک سروس کمیشن

ایڈورٹزمنٹ ۲۶، انڈین ایکونامک سروس/انڈین اسٹیٹس ٹیکل

سروس ایگزامی نیشن ۱۹۷۴ء

یونین پبلک سروس کمیشن کی جانب سے گریڈ III سروسز۔ (۱) انڈین ایکونامک سروس (۲) انڈین اسٹیٹس ٹیکل سروس، کی بھرتی کے لئے ایک امتحانی مقابلہ منعقد کیا جائے گا جو کہ ۱۸ جنوری ۱۹۷۴ء کو ہوگا۔

__عمر:__۔ امیدواروں کی تاریخ پیدائش ۲ جنوری ۱۹۴۸ء سے پہلے اور یکم جنوری ۱۹۵۳ء کے بعد کی نہیں ہونا چاہیئے۔ شیڈول کاسٹ/شیڈول ٹرائبس اور دیگر امیدواروں کی زیادہ تی عمر میں رول کے مطابق رعایت کی گنجائش ہے۔

__علمی قابلیت:__۔

انڈین ایکونامک سروس:

یونیورسٹی ڈگری ایکونامکس یا اسٹےٹیسٹک کے مضمون کے ساتھ۔

انڈین اسٹےٹیسکل سروس:

یونیورسٹی ڈگری اسٹےٹیسٹک یا میتھ میٹکس یا ایکونامکس کے مضمون کے ساتھ یا کوئی اور تعلیمی قابلیت جو کہ رول کے مطابق ہو۔

پوری معلومات اور درخواستی فارم سکریٹری یونین پبلک سروس کمیشن دھولپور ہاؤس۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۱ سے ایک روپیہ منی آرڈر کے ذریعہ یا دفتر کے کاؤنٹر پر جمع کرا کے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ امیدواروں کو چاہیئے کہ وہ منی آرڈر کے کوپن پر صاف صاف جلی حروف میں "انڈین ایکونامک سروس / انڈین اسٹیٹس ٹیکل سروس ایگزامی نیشن ۱۹۷۴ء" ضرور لکھ دیں۔ اس کے علاوہ اپنا پورا نام و پورا پتہ جلی حروف میں لکھیں۔ پوسٹل آرڈر یا چیک وغیرہ منظور نہیں کئے جائیں گے۔

پوری طرح مکمل فارموں کے یونین پبلک سروس کمیشن کے دفتر میں پہنچنے کی آخری تاریخ ۲۷ اگست ۱۹۷۳ء ہے۔ ایسے امیدوار جو ہندوستان سے باہر سکونت پذیر ہیں یا انڈومان نکوبار، لکادیپ، منی کوئے اور امین دیپ وغیرہ وغیرہ جزیروں کے رہنے والے ہیں ان کے لئے فارموں کے دفتر پہنچنے کی آخری تاریخ ۱۰ ستمبر ۱۹۷۳ء ہے۔

رورل انجینئرنگ سروس، یو۔پی، لکھنؤ

سول اوورسیئرز کی ۴۰۰ (چار سو) عارضی جگہوں کے لئے درخواستیں مطلوب ہیں۔

__تنخواہ اسکیل:__

۱۶۵ ۔ ۶ ۔ ۲۱۰ ۔ ای ۔ بی ۔ ۱۰ ۔ ۲۶۰ ۔ ای ۔ بی ۔ ۱۰ ۔ ۳۰۰ ۔

۱۸ فیصدی جگہیں شیڈول کاسٹ امیدواروں کے حق میں محفوظ کی گئی ہیں۔

__علمی قابلیت__

کسی بھی منظور شدہ ادارے کے پاس سول انجینئرنگ میں ڈپلومہ ہونا ضروری ہے۔

__عمر:__

یکم جولائی ۱۹۷۳ء تک امیدوار کی عمر ۲۲ سال سے زیادہ نہیں ہونی چاہیئے شیڈول کاسٹ امیدواروں کے لئے زیادہ تی عمر میں ۵ سال کی چھوٹ دی گئی ہے۔

درخواستیں سادہ کاغذ پر مع تمام تر تفصیلات کے جس میں اپنا نام و پورا پتہ جلی حروف میں، ہائی اسکول سرٹیفکٹ کی نقل، ڈپلومہ ایگزامی نیشن کے آخری سال کے مارکس شیٹ اور شیڈول کاسٹ ہونے کی صورت میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی جانب سے ایک سرٹیفکٹ ہونا ضروری ہے۔ مکمل درخواستیں چیف انجینئر کے نام رورل انجینئرنگ سروس۔ یو۔پی۔ لکھنؤ کے پتے پر بھیجیں۔

۳۱ جولائی ۱۹۷۳ء درخواستوں کے پہنچنے کی آخری تاریخ ہے۔ مقررہ تاریخ کے بعد موصول ہونے والی درخواستیں غور طلب نہیں ہوں گی۔

جو امیدوار سرکاری ملازمت میں ہیں انہیں چاہیئے کہ وہ اپنی درخواستیں اپنے دفتر ہی کی معرفت، نو آبجکشن سرٹیفکٹ کے ساتھ بھجوائیں۔

چیف انجینئر
رورل انجینئرنگ سروس
یو۔پی۔ لکھنؤ

امتحانی مقابلہ سروس

[illegible] آپ نے بھی [illegible] امتحان میں شریک ہونے کے اہل ہیں [illegible] روزگاری کی [illegible] بھی ہو سکتی ہے۔

آپ کسی بھی امتحانی مقابلے کے بارے میں [illegible] معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں لکھئے۔ ہم بغیر کسی معاوضے کے آپ کی خدمت کریں گے

اس پتے پر ہمیں لکھئے [illegible] انچارج امتحانی مقابلہ سروس سیکولر ڈیموکریسی ۱۹-۵، تھیٹر کمیونیکیشن بلڈنگ۔ کناٹ سرکس، نئی دہلی

ڈائرکٹریٹ آف ایجوکیشن ۔ دہلی

(اسکالرشپ برانچ)

نیشنل لون اسکالرشپ اسکیم

حکومت ہند، وزارت تعلیم و سماجی بھلائی، نئی دہلی نے فیصلہ کیا ہے کہ ۷۴-۱۹۷۳ء کے درمیان تعلیمی قرضوں کی اسکیم جاری کی جائے۔ اس اسکیم کا مقصد لائق، ہونہار لیکن ضرورت مند طلبا کی مالی مدد کرنا ہے تاکہ وہ اونچی تعلیم حاصل کر سکیں۔ یہ قرضہ ماہوار اقساط میں دیا جاتا ہے اور واپسی ادائیگی قرضدار کے برسر روزگار ہو جانے پر، اس کے ایک سال بعد یا تعلیمی کورسوں کو مکمل کرنے کے تین سال بعد سے شروع ہوگی۔ بہرحال جو بھی مدت پہلے پڑے گی اس سے واپسی ادائیگی شروع کرنا ہوگی۔ اگر قرضہ کی رقم کی واپسی ادائیگی مقررہ میعاد کے اندر اندر اور باقاعدگی سے کی جائے گی تو اس صورت میں کوئی سود بھی نہیں لیا جائے گا جو امیدوار اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد پڑھانے کا پیشہ اختیار کریں گے انھیں قواعد کی دفعات کے تحت قرضہ کی واپسی ادائیگی سے مستثنیٰ قرار دیا جائے گا۔

اسکیم ہذا کے تحت مندرجہ ذیل زمروں کے طالب علم قرضہ کے حصول کے لئے درخواستیں متعلقہ دفتر میں بھیجنے کے اہل ہیں۔

اہلیت :

۱۔ لون اسکالرشپ اسکیم صرف ہندوستانی شہریوں کے لئے جاری کی گئی ہے۔

۲۔ صرف وہی طلبا جن کے والدین / سرپرست کی کل آمدنی بشمول ان کی اپنی آمدنی چھ ہزار روپیہ (۶۰۰۰ روپے) سے زائد نہیں ہے وہ اہل ہوں گے۔ (ملازم پیشہ کی صورت میں آمدنی سے مراد صرف بنیادی تنخواہ ہے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی اور آمدنی کسی اور ذرائع سے ہے اور اس میں کوئی بھتہ مثلاً مہنگائی بھتہ وغیرہ شامل نہیں ہیں دیگر لوگوں کی صورت میں ان کی آمدنی وامد ہونی چاہیے جس پر برائے (انکم ٹیکس مقاصد تشخیص کی جائے) پوسٹ گریجویٹ اسٹوڈینز کے لئے آمدنی کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ وہ درخواست دہندگان جنھوں نے آخری فائنل بورڈ / یونیورسٹی امتحان (اسکول لیونگ سرٹیفکٹ / پی۔ یو۔ سی / پری پروفیشنل / انٹر / ایم۔ بی۔ بی۔ ایس پارٹ I یا پارٹ II / بی۔ اے / بی۔ ایس سی / بی۔ کام / بی۔ اے / ایم۔ اے یا ایم۔ ایس۔ سی یا دیگران کے مساوی امتحانات ٹکنیکل یا پروفیشنل اسٹوڈینز) کسی ایگزامننگ باڈی سے جو یونین ٹیریٹری آف دہلی میں واقع ہے کم از کم ۵۰ فیصدی نمبر مجموعی طور پر لے کر پاس ہوئے ہیں وہ بھی قابل غور ہوں گے۔

(۳) فل ٹائم ملازم امیدوار ہرگز ان تعلیمی قرضوں کے اہل نہیں ہیں۔

(۴) جو امیدوار اپنی تعلیم ایوننگ کالج میں جو ملازم لوگوں کے لئے ہے، میں اپنی تعلیم جاری رکھنا چاہتے ہیں یا اپنی تعلیم کارسپانڈینس کے ذریعہ حاصل کر رہے ہیں وہ بھی اہل نہیں ہیں۔

ویلیو

تعلیمی قرضوں کی زیادہ سے زیادہ ویلیو درج ذیل ہے۔

۱۔ انڈر گریجویٹ اور ڈپلوما کورسز (ماسوائے انڈر گریجویٹ کورسز جو انجینئرنگ، ٹیکنالوجی اور میڈیسن میں ہوں گے) ۷۲۰ روپے سالانہ

۲۔ انڈر گریجویٹ کورسز انجینئرنگ، ٹیکنالوجی اور میڈیسن میں ۹۰۰ روپے سالانہ۔

۳۔ ایم۔ اے / ایم۔ ایس۔ سی / ایم۔ کام اور دیگر اس کے مساوی امتحانات ۹۰۰ روپے سالانہ۔

۴۔ پوسٹ گریجویٹ کورسز انجینئرنگ اور ٹیکنالوجی میں ۱۱۵۰ روپے سالانہ۔

۵۔ پی۔ ایچ۔ ڈی / ڈی۔ سائنس ان مضامین میں جو ماسوائے انجینئرنگ ٹیکنالوجی اور میڈیسن ہوں گے ۱۵۰۰ روپے سالانہ۔

۶۔ پی۔ ایچ۔ ڈی / ڈی۔ سائنس / انجینئرنگ ٹیکنالوجی اور میڈیسن اور ایم۔ ڈی / ایم۔ ایس۔ میڈیسن میں ۱۷۵۰ روپے سالانہ۔

ان تعلیمی قرضوں کے لئے انتخاب کڑے ضابطے کے تحت قابلیت کی بنا پر ان اہل امیدواروں میں سے کیا جائے گا جو تعلیم کے ہر مرحلہ پر ایوارڈ کے لئے درخواست کریں گے۔ قابلیت کا تعین امیدوار کے کوالیفائنگ امتحان کی کامیابی پر منحصر ہوگا۔ مختلف امتحانات کے لئے کوٹا حکومت ہند مقرر کرے گی۔

درخواست فارم اسکالرشپ برانچ کمرہ نمبر ۳۳، بلاک نمبر ۱۰، ڈائرکٹریٹ آف ایجوکیشن، اولڈ سیکریٹریٹ دہلی سے مل سکیں گے۔ درخواستیں جو قواعد اور ضابطوں کے مطابق ہر پہلو سے پُر کی گئی ہوں گی۔ ڈائرکٹریٹ کے پاس مورخہ ۳۱ اگست ۱۹۷۳ء تک یا اس سے قبل لازماً پہنچ جانی چاہئیں۔

نامکمل درخواستیں، مقررہ تاریخ کے بعد موصول ہونے والی درخواستیں زیر غور نہیں لائی جائیں گی۔

دستخط

ڈپٹی ڈائرکٹر آف ایجوکیشن۔ دہلی



مشاورت بورڈ

ماہنامہ

سیکولر ڈیموکریسی

اردو نمبر، جولائی ۱۹۷۳ء
شمارہ ۲۰

شرح

ایڈیٹرز
سبھدرا جوشی
ڈی۔ آر۔ گوئل
خلیق انجم

جنرل منیجر
راجندر کمار

بزنس منیجر
جی۔ ایل۔ ملہوترا

دفتر کا پتہ
۸-۱۹، تعمیر کمیونی کیشن بلڈنگ
کناٹ سرکس
نئی دہلی ۱
ٹیلی فون نمبر ۴۳۳۸۳

ہماری گذارش

اس شمارے کو ہم نے خصوصی طور پر اردو کے معاملے پر بحث کے لئے وقف کیا ہے۔ مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر علمی اور علمی بحث قارئین آئندہ صفحوں میں پائیں گے۔ آج اردو کے مسئلے کی نوعیت کیا ہے؟ اس حقیقت کو تسلیم کیا جانا چاہیئے کہ یہ مسئلہ علمی نہیں سیاسی بھی ہے اور سیاست کے میدان میں پہنچنے کے بعد یہ فرقہ پرستی کی بھول بھلیوں میں بھی اُلجھ گیا ہے۔ اس بات پر جز بز ہونے کی ضرورت ہے نہ اس سے فرار کی گنجائش۔ جمہوری نظام اور جمہوری طرز زندگی میں خاص طور سے ایسی جمہوریت میں جس کو عوام نے اپنی زندگی کو بہتر بنانے کا ذریعہ بنایا ہو زندگی کے بہت کم پہلو ہیں جو سیاست سے کلیتاً دور ہوں۔ اگر اردو زبان کی ترقی میں نظام تعلیم میں اس کی ترویج۔ دفاتر میں اس کا استعمال اور اردو زبان و ادب کے لئے سرکاری اداروں کی سرپرستی لازمی جزو ہیں تو یہ مسئلہ ملکی سیاست کا ایک حصہ بنے گا اور ہے اور ہمہ گیر قومی سیاست کے متعلق فیصلے کرتے وقت ہر ذی ہوش کو اس زبان کے حال و مستقبل کے بارے میں غور کرنا پڑے گا۔

ہندوستان کے اندر ایسے لوگوں کی تعداد معمولی نہیں جو صرف اردو ہی لکھنا پڑھنا جانتے ہیں یا جو اردو کے ذریعے معاملات کو بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ یہ لوگ ہزاروں لاکھوں نہیں کروڑوں ہیں۔ اگر ملک کی سماجی، معاشی، اقتصادی، سیاسی اور تعلیمی زندگی میں اردو کی مناسب جگہ نہ ہوگی تو ان کروڑوں لوگوں کا رابطہ زندگی کے ان شعبوں سے ٹوٹ جائے گا۔ اتنی بڑی تعداد کی شرکت کے بغیر جمہوریت ایک مذاق بن کر رہ جائے گی۔ جس جمہوریت کی بنیاد یہ ہو کہ اس میں ہر بالغ برابر کا حصہ دار ہے اس کے اندر اگر پانچ یا دس فیصدی لوگ ایسے ہوں جنھیں زبان کی دقت کی وجہ سے اس کے طور طریقوں کو نہ سمجھ پائیں تو وہ جمہوریت لنگڑی ہوگی۔ نامکمل ہوگی جمہوریت کہلانے کی حقدار نہیں ہوگی۔ اس کے علاوہ وہ کون سی سیاسی دانش مندی ہے کہ ملک کے اتنے بڑے حصے کی صلاحیتوں سے ملک کو محروم رکھا جائے؟

رہا سوال اس کے فرقہ پرستی میں الجھ جانے کا وہ تبھی تک ہوتا ہے جب تک غیر فرقہ وارانہ لیڈر خود اردو کے متعلق فیصلہ اس بات کو بالائے طاق رکھ کر نہیں کرتے کہ مسلم لیگ والے اس کی موافقت اس لئے کرتے ہیں کہ اسے مسلمانوں کی زبان کہتے ہیں اور جن سنگھ والے اس کی مخالفت اس وجہ سے کرتے ہیں کہ ان کو مسلمانوں کی کوئی چیز پسند نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آبادی کے تناسب سے مسلمان ہندوؤں کے مقابلے میں اردو سے زیادہ لگاؤ رکھتے ہیں مگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اردو داں دانش ور طبقے میں ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں سے زیادہ تو ہو سکتی ہے کم نہیں۔ لیکن مسلمانوں کے اردو کے ساتھ تاریخی یا تہذیبی لگاؤ کی وجہ سے اسے متنازعہ زبان بننے دینا سیکولرازم کے منافی ہے۔

اس کا مناسب مقام کیا ہے؟ اس سوال پر بھی بہت بحث ہوتی آئی ہے اور ہو رہی ہے۔ اس میں بہت سی لاحاصل ہوتی ہے بہت سی بات مفاد پرست بڑھا دیتے ہیں۔ ورنہ سیدھی سادی بات ہے کہ اس کا وہی مقام ہونا چاہیئے جو کسی بھی اس زبان کا ہے جس کو آئین کے آٹھویں شیڈول میں جگہ دی گئی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم یوں کہیں گے کہ اردو جاننے والوں کو نوکری یا دوسری سرکاری مراعات حاصل کرنے میں دیگر زبانوں کے ذریعے خط و کتابت کرنے والوں کے مقابلے میں کمتر نہیں سمجھا جانا چاہیئے۔ دفتروں میں درخواست اردو میں جائے تو اس کا جواب اردو میں ہی اتنی ہی جلدی یا درستی سے ملنا چاہیئے جتنا کسی اور زبان میں درخواست دینے پر ملتا ہے۔ اسکولوں میں بلا لحاظ تعداد طلبا اردو کی پڑھائی کا عام رواج ہونا چاہیئے۔ اس ضمن میں ہم مخالف فرقہ واریت کمیٹی کی طرف سے دی گئی تجاویز کی طرف حکومت کی توجہ دلائیں گے۔

مسلمانوں کے لئے نیا درد سر

آزادی کے بعد ۲۵ برس بعد کہ مسلمان تقسیم ملک کی چوٹ سے کچھ اُبھرنے لگے تھے۔ گذشتہ چار برس میں قوم پرست ملکی قیادت۔ خاص طور پر وزیراعظم اندرا گاندھی نے فرقہ واریت پر جو بھرپور یلغار کی تھی اس کے نتیجے کے طور پر مسلمانوں میں یہ ہمت اور حوصلہ پیدا ہونے لگا تھا کہ وہ فسادات کے خطروں کے علاوہ بھی کچھ باتوں پر غور کریں۔ یہ صحیح ہے کہ فوری طور پر وہ پرسنل لا، علی گڑھ وغیرہ کے فروعی مسائل میں اُلجھا دیئے گئے لیکن دماغ ان باتوں سے ہٹ کر ملک اور قوم کے دیگر مسائل کی طرف لازمی طور پر سوچتا ہے۔ اس بات کے آثار نمایاں ہونے لگے ہیں کہ مسلم دانش ور ملکی قیادت کی اگلی صفوں پر اپنا مقام حاصل کریں۔ لیکن عین اسی وقت کیرالا مسلم لیگ کے لیڈروں کو پرانا فتنہ پھر سے جگانے کی سوجھی ہے۔ ابراہیم سلیمان سیٹھ صاحب اور ان کے رفقا ملک کی تقسیم کے بعد بار بار دہراتے رہے کہ مسلم لیگ کا جناح صاحب کی مسلم لیگ سے کوئی تعلق نہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ وہ علیحدگی پسند سیاست کے خلاف ہیں۔ ان کی ایسی ہی باتوں میں آکر شریمتی اندرا گاندھی نے بھی کہہ دیا تھا کہ کیرالا مسلم لیگ کی نوعیت مختلف ہے۔ آج انھوں نے اپنی تان بدل دی ہے اور وہی زبان بولنے لگے ہیں جو تقسیم سے پہلے مسٹر جناح بولا کرتے تھے آج وہ اعلان کر رہے ہیں کہ وہی ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے واحد نمائندہ ہیں۔ ان کے ساتھی عمر تنگل صاحب نے اعلان کر دیا ہے کہ ان کی مسلم لیگ جناح صاحب کی مسلم لیگ کی وارث ہے۔

جناح صاحب نے اس ملک کے مسلمانوں کو جس عذاب میں ڈالا تھا اس کو مسلمان کبھی بھولا نہیں وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ آزمودہ را آزمودن جہل است۔

[redacted]

فرقہ پرستوں کی ناکام سازش

دہلی کے فسادات پر تجزیاتی رپورتاژ

ہمارے نامہ نگار خصوصی کے قلم سے

ہندوستان کی راجدھانی فرقہ وارانہ آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں آنے سے بال بال بچ گئی۔ فرقہ پرست عناصر نے باڑہ ہندو راؤ میں فرقہ واریت کے شعلوں کو ہوا دینے کی ہر ممکن کوشش کی۔ لیکن عوام کی بیداری اور دانش مندی، سیکولر عناصر کی عملی سرگرمی اور پولیس کے ذمہ داران کے بروقت اقدام نے حالات بگڑنے نہیں دیئے۔ ورنہ یہاں بھی پونا کی داستان دہرائی جا سکتی تھی۔ ناموافق حالات جنھے ایک خوفناک سانحہ کی شکل دے سکتے تھے وہ ایک چھوٹا سا واقعہ بن کر رہ گیا۔ جس کی وجہ سے فرقہ پرستی کے تاجروں کو مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا۔

باڑہ ہندو راؤ پر کافی عرصہ سے فرقہ پرستوں کی نظر رہی ہے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے بھی ہر سال گاؤکشی اور مسجد کے سامنے باجا بجانے کے پرانے بہانے استعمال کئے جاتے رہے تاکہ دونوں فرقوں کے غنڈوں کا اپنی طاقت کی آزمائش کا موقعہ مل سکے۔

اہم بات یہ ہے کہ اسی علاقے نے فرقہ پرستی کے کٹر مخالف رہنماؤں کو بھی جنم دیا۔ تقسیم ہند کے اس دور میں جب یہ علاقہ دیوانگی کے شعلوں میں سلگ رہا تھا۔ محترمہ سبھدرا جوشی یہیں مقیم تھیں۔ یہاں کے رہنے والوں کو اب بھی یاد ہے کہ جب اس علاقہ میں پہلا فرقہ وارانہ تصادم ہوا تو کس طرح وہ ڈاکٹر کی ہدایت کے خلاف بستر علالت سے اٹھ کر موقعۂ واردات پر پہنچ گئی تھیں۔ انھوں نے مس مریدولا سارا بھائی کے ساتھ مل کر شانتی سینا قائم کی۔ جس نے تقسیم سے پیدا ہونے والے مصائب کو دور کرنے میں شاندار کارنامہ انجام دیا۔ وزیراعظم محترمہ اندرا گاندھی بھی اس عظیم جدوجہد میں پیش پیش تھیں۔ وہ اس علاقے کی ہر گلی اور کوچہ میں گئیں۔ اور لوگوں کو نہ صرف کھانا اور کپڑے پہنچائے بلکہ حالات سے مقابلہ کرنے کے لئے ان میں اخلاقی جرأت پیدا کی جس کی اس وقت شدید ضرورت تھی۔ ناامیدی اور مایوسی کے چھائے ہوئے گہرے بادلوں میں وہ مستقبل کی گزرگاہوں کو روشن کرنے والی امید کی ایک کرن

فرقہ وارانہ عناصر کا [illegible] قوموں کی [illegible] جن کی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] سیاست کی [illegible] شروع ہوتی ہیں تو پورے ملک [illegible] [illegible] تقسیم کرنے [illegible]

بن کر آئیں تاکہ لوگوں میں یہ ہمت پیدا ہو سکے کہ اپنے گھر کو اپنا گھر کہہ سکیں اور بیگانگی کے اس احساس سے نجات پا سکیں جو مسلم لیگ کی سیاست نے ان میں پیدا کیا تھا۔

اس عظیم عورت کی دلیری نے اس علاقہ میں ایک ایسی مثال قائم کی تھی جس کے زیر اثر وہاں کے رہنے والوں نے ایسے ہمت آفریں کام کئے جن کو غیر معروف انسانوں کے عظیم کارناموں کے نام سے یاد کیا جا سکتا ہے اس فہرست میں قیصر زیدی کا نام ہے جنھوں نے ننھے بچوں کو منظم کیا تاکہ وہ فرقہ وارانہ دیوانگی کے خلاف احتجاج کریں دادا الطاف الرحمٰن کا نام ہے جنھوں نے چیخوف کی کہانی کی ننھی چڑیا کی طرح ہمت و استقلال کا ثبوت دیا تاکہ آزاد ہندوستان کے وزائدہ سیکولرازم کی حفاظت کی جا سکے۔

دادا الطاف ان جیوٹ انسانوں میں سے ہیں جنھوں نے اس علاقہ میں فرقہ واریت کو سر اٹھانے کا موقع نہیں دیا ہے۔ وہ ایک طرف مظلوم و خوفزدہ مسلمانوں کے لئے باعث تسکین تھے تو دوسری طرف پاکستان سے آئے ہوئے مہاجرین کے بھی معاون و مددگار تھے۔ دادا اس علاقہ میں ان تحریکات کی نمائندگی کرتے ہیں جنھوں نے وہاں زندگی کے دھارے کو نیا رخ عطا کیا ہے۔ اگر فرقہ پرستی کی بھیانک طاقتوں نے اپنے حملوں کو جاری رکھا ہے تو دادا اور ان کے دوست بھی مقابلے میں ہمالہ تا تل ڈٹے رہے ہیں۔ اس مرتبہ بھی کامیابی دادا اور ان کے دوستوں کو ہی حاصل ہوئی ہے۔

۱۲ جون کی رات کو آنے والے طوفان کی پیش آگاہی علامات بہت پہلے ظاہر ہو چکی تھیں۔ انتخابات میں شکست کا احساس فرقہ پرست عناصر کو بے چین کئے ہوئے تھا۔ جن سنگھ اور اس کا تکمیلی جز مسلم لیگ موقع کی تلاش میں تھے۔ متعدد بار وہ اس بات کی کوشش کرتے رہے تھے کہ کسی بھی معمولی حادثہ کو فرقہ وارانہ فساد کی شکل دے دی جائے۔

بمبئی میں بندے ماترم کے سوال کو لے کر وہ

ہندو مسلمانوں کے فرقہ وارانہ جذبات کو مشتعل کرنے میں کامیابی حاصل کر چکے تھے۔ اس کے بعد وہ لگا تار ایسے موقعوں کی تلاش کرتے رہے ہیں جن کی مدد سے وہ ملک کے سب سے بڑے صوبے یو پی میں ہونے والے انتخابات کی لڑائی میں اپنے لئے زمین ہموار کر سکیں۔ یہ بات بھولنی نہیں چاہیئے کہ یو پی کو ملک کی سیاست کی کنجی تصور کیا جاتا ہے۔ اس سرزمین پر ایسی تحریکیں شروع ہوتی ہیں جو پورے ملک کے نقشے پر نئی تبدیلیوں کا باعث بن جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یو پی کے انتخابات سے پیشتر آبادی کو فرقہ وارانہ سطح پر تقسیم کرنے کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ اس خاطرانہ بساط کے لئے ابھو ملی میں فرقہ وارانہ فساد بہترین مہرہ ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اندرا گاندھی کی شخصیت مجروح ہو جائے گی۔ یہ خواہش بعید از فہم نہیں ہے کیونکہ پچھلے چند سالوں میں اندرا گاندھی ہی تمام رجعت پسند طاقتوں کے خلاف ایک مضبوط چٹان بنکر ڈٹی ہوئی ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ ماہر قوانین کے معیار کے مطابق کسی آئین کے محدود چوکھٹے میں کسی کسائی کوئی شہادت سامنے نہ پیش کی جا سکے لیکن واقعات کا تذکرہ و تجزیہ اس کے باوجود ضروری ہے۔ فروری کے مہینے میں علاقہ کی ایک گلی میں معمولی سا جھگڑا اس وقت ہوا تھا جب کہ نوجوان لڑکوں کے ایک گروہ نے ایک جن سنگھی رہنما کی قیادت میں باڑہ ہندو راؤ کے کچھ لڑکوں پر حملے کی کوشش کی تھی۔ جن سنگھی رہنما نے اس عمل کے جواز میں یہ بات پیش کی تھی کہ اس محلہ کے ایک لڑکے نے ایک روز پیشتر ایک ہندو لڑکی کے ساتھ چھیڑ خانی کی تھی۔ ملک کی روایت کے مطابق جس معاملہ کو علاقہ کے بزرگوں کی مدد سے حل کرنا چاہیئے تھا یا جسے پولیس کے سپرد کرنا چاہیئے تھا اس کو غنڈوں کی مدد سے نپٹانے کی کوشش کی گئی۔ اس وقت دادا کی مداخلت کی وجہ سے معاملہ رفع دفع ہو گیا اور جھگڑے کی صورت اختیار نہ کر سکا۔ اس سلسلے میں یہ امر قابل غور ہے کہ علاقہ کی پولیس نے ۲۳ جون کو اس پرانے گڑے مردے کو پھر اکھاڑنے کی کوشش کی ہے جب کہ باہمی مفاہمت کی تحریری دستاویز ایس۔ ڈی۔ ایم کے سامنے مارچ میں درج کی جا چکی ہے۔

اس عرصہ میں چند چھوٹے موٹے واقعات کے علاوہ مئی کے مہینہ میں ایک اور ایسا واقعہ پیش آیا جب کہ جن سنگھی عناصر نے فرقہ وارانہ شعلوں کو بھڑکانے کی کوشش کی۔ اسی علاقہ کی ایک اور گلی احاطہ چوکیدارا میں ایک جھگڑا ہوا۔ واقعات یہ ہیں کہ ایک دودھ والے کی سائیکل سے ایک بچہ کو چوٹ آگئی۔ بچہ کے والدین نے اس دودھ والے کو برا بھلا کہا۔ اس بنا پر دودھ والے کو غصہ آیا اور اس نے اپنے ساتھیوں کے گروہ کو بلا لیا۔ دونوں گروہوں میں جھگڑا ہو گیا۔ اور پولیس آکر دونوں گروہ کے آدمیوں کو تھانے لے گئی۔ جن سنگھ کا ایک اہم نیتا آر۔ ایس ایس کے کافی لڑکوں کی تعداد کے ہمراہ تھانے پہنچا اور پولیس حکام کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ صرف مسلمانوں کو گرفتار کرنا چاہیئے اور ان کے خلاف ہی کارروائی ہونی چاہیئے کیونکہ مسلم محلہ میں ایک ہندو کو زدوکوب کیا گیا ہے جب یہ احمقانہ داؤ کام نہ آسکا تو جن سنگھ کا ایک کارکن یہ غل مچانے لگا کہ ہندوؤں کی عزت محفوظ نہیں ہے وہ سرپھرا اسی وقت خاموش ہوا جب اسے یہ تنبیہہ کر دی گئی کہ اس طرح کے بیجا شور و غل کا کیا نتیجہ ہو سکتا ہے۔

اس طرح فتنوں کا یہ لاوہ وہاں پکتا رہا۔ ۱۲ جون کی رات کو غنڈوں کے پرانے دشمن دو گروہوں میں باڑہ ہندو راؤ سڑک پر یکی گلی اور باغیچی اچھے جی کے دوراہے پر جم کر لڑائی ہوئی۔ جس وقت یہ واقعہ رونما ہوا اور محلہ کے لوگ پولیس کی آمد کا انتظار کر رہے تھے کچھ اشخاص گلی جمعدار اور بیری والا باغ وغیرہ کے آس پاس کے ہندو علاقوں میں پہنچ گئے اور یہ افواہ پھیلانی شروع کر دی کہ باڑہ ہندو راؤ کے مسلمانوں نے ہندو مکانوں پر حملہ کر دیا ہے۔ گو کہ اب تک کوئی ان اشخاص کی شناخت نہیں کر سکا ہے لیکن وہ لوگ آر ایس ایس کے کارکن ہی ہو سکتے ہیں کیونکہ ۱۲ جون سے پیشتر ہی کچھ دنوں سے آر۔ ایس ایس کے حلقوں میں اس قسم کے حادثہ کی پیش گوئی کی جا رہی تھی۔ اس سے قبل کہ پولیس اس مقام پر پہنچتی بہادر گڑھ روڈ پر ایک بہت بڑا مجمع اکٹھا ہو چکا تھا۔ اینٹ پتھر، سوڈا واٹر کی بوتلیں اور چیتھڑوں سے بنی جلتی ہوئی گیندوں کا بڑے پیمانے پر استعمال کیا گیا۔ سڑک کی طرف جو مجمع اکٹھا تھا ان میں کافی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو کہ شرارت پر تلے ہوئے تھے۔ ان میں سے چند افراد سڑک کے ایک طرف کچھ مکانوں کی چھتوں پر چڑھ گئے اور انھوں نے بیگم منزل کی طرف پتھروں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ بیگم منزل باغیچی اچھے جی میں ایک ایسی عمارت ہے جو ہندوؤں سے گھری ہوئی ہے۔ حالات پر اس وقت قابو پایا جا سکا جب کہ مسلح پولیس کا ایک بڑا دستہ اس جگہ پہنچا اور اس نے گولیاں چلائیں۔ اگرچہ پولیس کی گولیوں کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور اس کی وجہ سے علاقے کی پولیس کی لاپروائی پر کچھ پردہ پڑ سکا۔

اس سارے معاملے کا ایک عجیب پہلو یہ ہے کہ تمام گولیوں کا نشانہ بیگم منزل ہی بنی اور شرارت پسندوں کا شکار بھی یہی عمارت ہوئی تھی۔ شواہد موجود ہیں کہ پولیس کو کسی نے غلط فہمی میں مبتلا کیا کہ بیگم منزل مسلمان غنڈوں کا ایک اڈہ ہے جہاں کہ سڑک کے پار ہندو مکانوں پر حملے کی تیاری مکمل ہے اور اس کے لئے ہتھیار جمع ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو غنڈوں کی طرح پولیس کا شکار بھی یہ عمارت کیوں بنتی؟ اس شبہ کو تقویت اس بیان سے بھی ملتی ہے جو کہ بھارتیہ جن سنگھ کے نائب صدر کنور لال گپتا نے دیا ہے اور جس کی رپورٹ مدر لینڈ اخبار میں شائع ہوئی ہے اس عمارت کے بارے میں یہ افواہ بہت گرم رہی ہے کہ یہاں غنڈے سرگرم عمل رہے ہیں اور یہیں سے بندوق کی گولی بھی چلائی گئی ہے۔ علاقہ کا نقشہ دیکھنے سے یہ بات بعید از یقین ہے کہ باڑے کی سڑک پر

بیگم منزل غنڈوں کا اڈہ ہو سکتی ہے۔ جس بندوق کی گولی کے متعلق افواہ گرم ہے اس کی کوئی شہادت اب تک دستیاب نہیں ہو سکی۔

باہمی اچھے جی پر حملہ کو کامیاب بنانے کے لئے بیگم منزل پر قبضہ ایک اچھی حکمتِ عملی ہو سکتی ہے باڑہ کی طرف سے ہندو فرقہ پرستوں کے لئے باہمی میں داخل ہونا بہت خطرناک ہے۔ کیونکہ اس طرح وہ چاروں طرف سے مسلمانوں میں گھر جائے۔ اس کے برعکس اگر بیگم منزل پر قبضہ ہو جائے تو ان کو حملہ کرنے کے لئے ایک بلند مقام ہاتھ آ جاتا ہے کسی کے دماغ میں یہ پلان ضرور رہا ہوگا۔ یہ نتیجہ اخذ کرنے کی کچھ وجوہات ہیں (۱) جس وقت غنڈوں میں تصادم شروع ہوا اسی وقت فرقہ وارانہ عناصر یہ شور مچا رہے تھے کہ بیگم منزل میں مسلمانوں غنڈوں کا گڑھ ہے۔ (۲) ہیٹر کے ایک ایک گروہ نے سیڑھی کی مدد سے اس عمارت پر چڑھنے کی کوشش کی (یہ سیڑھی شاید بہادر گڑھ روڈ پر بجلی کمپنی کی ملکیت تھی) اور کھڑکی کے ایک پردے کو آگ لگانے کی کوشش کی جس کو کہ اندر رہنے والوں نے پردہ پھینک کر بچایا۔

۳۔ ایک اور گروہ دوسری عمارت پر (اس کے ہندو مالک کی مرضی کے خلاف) چھت پر چڑھ گیا اور اس نے وہاں سے قریب کے مسلمانوں کے مکانوں کو آگ لگانے کی کوشش کی۔

اس تصادم کے دوسرے روز حکام کی یہ مرضی تھی کہ اس سارے معاملے کو ختم کیا جائے اور حادثہ کی نوعیت غنڈوں کے دو گروہوں کے تنازعے سے زیادہ نہ سمجھی جائے۔ درحقیقت بات بھی یہی تھی۔ وہ اس واقعہ کو فرقہ وارانہ رنگ نہیں دینا چاہتے تھے کیونکہ اس سے سارے شہر میں ہیجان پھیلنے کا خطرہ تھا۔ اس بات کو مدِنظر رکھتے ہوئے ایک میٹنگ طلب کی گئی تاکہ سیاسی جماعتوں اور گروہوں کے ساتھ مل کر ایک فیصلہ ہو جائے جس کے تحت اس قسم کی کارروائی نہ کی جائے اور ایسے ہر کام سے پرہیز کیا جائے جس کی وجہ سے تناؤ میں اضافہ ہو۔ جن سنگھ کے سوائے ان کی اس تجویز کو تمام جماعتوں نے قبول کر لیا۔ جس وقت جن سنگھ کو یہ احساس ہو کہ وہ اکیلا رہ گیا ہے تو اس نے بھی اس تجویز کو قبول کر لیا اور شہر میں فرقہ وارانہ امن قائم رکھنے کے لئے ایک مشترکہ اپیل پر دستخط کر دیئے۔ واقعات جو رخ اختیار کر رہے تھے جن سنگھ کو اس پر کوئی خوشی نہ ہونا قدرتی امر تھا۔ ان کی جماعت کو سیاسی فائدہ اسی صورت میں ہو سکتا تھا جب کہ فرقہ وارانہ کشمکش اور تناؤ میں اضافہ ہوتا۔ اسی وجہ سے تمام جماعتوں کی مشترکہ تجویز سے منحرف ہو کر اس نے اپنا راستہ الگ اپنانا شروع کر دیا۔ دوسرے روز صبح انھوں نے شہر کی دیواروں پر ایک اشتہار چسپاں کرایا جس میں "آزادی کے ۲۵ سال بعد راجدھانی میں دوسرا پاکستان قائم کرنے کی گہری سازش" جیسے الفاظ استعمال کر کے اشتعال دلانے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس اشتہار میں پاکستانی ایجنٹوں اور مسلم لیگ کو اس سازش کے لئے ذمہ دار گردانا گیا تھا جس پارٹی کا اعلانیہ مقصد مسلمانوں کو ہندو بنانا ہو وہ اس اشتہار سے کیا یہ بتانا چاہتی ہے؟ یہ بعید از قیاس نہیں ہے یہی بات دہلی جن سنگھ کے نائب صدر کنور لال گپتا نے پریس کو دیئے گئے ایک بیان میں دہرائی۔ اور جن سنگھ کے روزنامہ مدر لینڈ نے واقعات کی رپورٹ بھی اسی پیرائے میں کی۔ یہاں یہ بات اہم ہے کہ یہ اشتہار صرف ہندی زبان میں شائع کیا گیا۔ جہاں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی آبادی مخلوط ہے کیونکہ ایسے ہی علاقوں میں اس قسم کے شبہات جڑ پکڑ سکتے ہیں اور فرقہ وارانہ کشمکش کی شکل میں تحت الشعور سے ابھر کر شعور میں آ سکتے ہیں۔ جوابی کارروائی مسلم لیگ کی طرف سے بھی کی گئی جس نے مسلم علاقوں میں نوٹس چسپاں کئے کہ باڑہ ہندو راؤ کے فساد زدگان کو امداد بہم پہنچائی جائے۔

اپنی سیاسی سوجھ بوجھ کے دائرے میں جن سنگھ نے اپنی تنظیم میں حرکت پیدا کی۔ شہر میں پھیلے ہوئے شاخوں کے جال کی مدد سے آر ایس ایس نے دل ہلانے والی کہانیاں پھیلانی شروع کر دیں۔ جن میں مسلمانوں کی سازشیں، مسلمانوں کے حملے اور ہندوؤں پر مظالم کا ذکر کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہا گیا کہ یہ سب اندرا گاندھی کی مسلم نواز پالیسی کا نتیجہ ہے جو کہ کمیونسٹوں کے زیرِ اثر اختیار کی گئی ہے۔ ۱۳ جون کی صبح کو اس قسم کی کہانیاں شہر کے مختلف حصوں میں لوگوں کو ہر جگہ سنائی دیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود شہر میں امن و امان قائم رہنے کی وجہ یہ تھی کہ عوام نے اپنے ہوش و حواس سے کام لیا اور جن سنگھ و آر ایس ایس کو وہ ناقابلِ اعتماد جماعت سمجھتے ہیں۔ ساتھ ہی سیکولر جماعتوں اور حکام نے بھی بڑی سرگرمی کے ساتھ ان تمام افواہوں کو بے بنیاد ثابت کر دیا۔ باڑہ ہندو راؤ کے مسلمانوں کا یہ فعل قابلِ تحسین ہے کہ انھوں نے لیڈروں سے مسلم لیگ اور جماعت اسلامی کی طرف بھیجی گئی رقم کی تمام امداد کو واپس کر دیا۔ دراصل علاقہ کے مسلمانوں اور ہندوؤں کو ایک دوسرے کے خلاف کوئی شکایت نہ تھی۔ انھیں شکایت صرف علاقہ کی پولیس کے خلاف تھی جس نے کانڈ عناصر

[illegible] کارخانے کو کچے مال کا ذخیرہ جن سنگھ کے [illegible] ممبر لیڈر کی رپورٹوں سے نہیں ہوتا [illegible] جن سنگھ کی کوشش یہی رہی کہ ادھر ادھر سے [illegible] باڑہ ہندو راؤ کے تیس دم کے ساتھ منسلک کر دیا جائے۔ صدر بازار کے سودیشی مارکیٹ میں [illegible] واقعہ کو ایسے غنڈہ عناصر کے ساتھ جوڑا گیا جو کہ پولیس کو تکیہ دے کر باڑہ ہندو راؤ سے [illegible] آگ لگانے کے لئے چلے آئے تھے۔ اس مارکیٹ کے چار دروازے ہیں جن میں سے تین رات کو [illegible] سے بند رہتے ہیں چوتھے دروازے پر چوکیدار حفاظت کے لئے تعینات ہے۔ کوئی بھی گروہ یا کوئی بھی فرد جو رات کو مارکیٹ میں داخل ہو گا چوکیدار کی نگاہ سے نہیں بچ سکتا۔ تمام چوکیدار اور دکاندار اس بات پر متفق ہیں کہ آگ اتفاقیہ لگی اور بتایا جاتا ہے کہ تاروں کی خرابی اس کے لئے ذمہ دار ہے۔

کو دبانے کے لئے بروقت اور مناسب کاروائی نہیں کی۔

آر۔ایس ایس کی افواہوں کے کارخانے کو بچے مال کا ذخیرہ جن سنگھ کے رہ نماؤں اور اخبار مدر لینڈ کی رپورٹوں سے مہیا ہوتا رہا جن سنگھ کی کوشش یہی رہی کہ ادھر ادھر کے حادثات کو باڑہ ہندو راؤ کے تصادم کے ساتھ منسلک کر دیا جائے۔ صدر بازار کی سودیشی مارکیٹ میں آتش زنی کے واقعہ کو ایسے غنڈہ عناصر کے ساتھ جوڑا گیا جو کہ پولیس کو چکمہ دے کر باڑہ ہندو راؤ سے وہاں تک آگ لگانے کے لئے چلے آئے تھے۔ اس مارکیٹ کے چار دروازے ہیں جن میں سے تین رات کو اندر سے بند رہتے ہیں چوتھے دروازے پر چوکیدار حفاظت کے لئے تعینات ہے۔ کوئی بھی گروہ یا کوئی بھی فرد جو کہ آدھی رات کو مارکیٹ میں داخل ہوگا چوکیدار کی نگاہ سے نہیں بچ سکتا۔ تمام چوکیدار اور تمام دکاندار اس بات پر متفق ہیں کہ آگ اتفاقیہ لگی اور شائد بجلی کے تاروں کی خرابی اس کے لئے ذمہ دار ہے۔ اس علاقہ میں اس قسم کی آگ پہلے بھی لگتی رہی ہے۔ ایک دوسرے علاقہ حوض قاضی میں بھی آگ لگنے کے ایسے ہی واقعہ پر سازش کی افواہ پھیلا دی گئی۔ لیکن لوگوں کی بھیڑ نے وہاں اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ لیا کہ آگ بجلی کے تاروں کی خرابی کی وجہ سے شروع ہوئی۔ ڈپٹی کمشنر نے فوراً ایک بیان جاری کرکے صحیح واقعات عوام کے سامنے رکھ دیئے۔

دو اور واقعات جن سنگھی عناصر کے ارادوں کو منظر عام پر لاتے ہیں۔ علاقہ رام نگر میں ایک گائے مردہ حالت میں پڑی پائی گئی اور انھوں نے اس واقعہ کو توڑ موڑ کر قصداً گاؤکشی کی شکل دینے کی کوشش کی۔ ایک پہلوان جس کا نام چاند تھا پنجابی باغ میں بیحد شراب پینے کی وجہ سے فوت ہوگیا اور سنگھیوں نے اس معاملہ کو لے کر جو کہانی گھڑی وہ یہ تھی کہ مسلم غنڈوں کے ہاتھوں وہ باڑے کے علاقہ میں قتل کیا گیا۔

ان تمام مکروہ کوششوں کا نتیجہ اگرچہ کچھ بھی نہیں نکلا لیکن انھوں نے فرقہ پرستوں کے ناپاک ارادوں کو عیاں کر دیا جن کی وجہ سے حکام اور عوام اب چوکنے رہ سکتے ہیں۔ سیاسی جماعتوں اور اخباروں نے کھلے الفاظ میں جن سنگھ کی مذمت کی اور مزید شرارتیں روکنے کے لئے جن سنگھ کے رہ نماؤں کو گرفتار کرنے کی مانگ کی۔ حکومت نے احتیاط سے کام لیتے ہوئے جنرل ست نرائن بنسل کو ہی گرفتار کیا اور ایک اشتعال انگیز پوسٹر شائع کرنے کا الزام عائد کر دیا۔ صرف اس ایک ہی گرفتاری نے جن سنگھ کے رہ نماؤں کے دلوں میں خوفِ خدا پیدا کر دیا۔ سماج دشمن شرپسند بنیادی طور پر ڈرپوک ہوتے ہیں۔

اس کے بعد جن سنگھ کے رہ نماؤں نے دوسرا داؤ پھینکا اور وہ تھا عوام کی ہمدردی کو پھر حاصل کرنا۔ انھوں نے معصومیت کا چوغہ پہن کر عدالتی جانچ کی مانگ شروع کر دی۔ ساتھ ہی فسادزدگان کے لئے امداد اور اپنے جنرل سکریٹری کی رہائی بھی طلب کرنے لگے۔ عدالتی جانچ جہاں تک جن سنگھ کا تعلق ہے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہر فساد کے بعد وہ یہی مانگ کرتے رہے ہیں کیونکہ انھیں یقین کامل ہے کہ شہادت کے تحت قانون کی گرفت میں وہ نہیں آسکیں گے۔ اس بھروسے کی وجہ یہ ہے کہ انھیں اس بات کا علم ہے کہ ان کی سازشوں کا کوئی تحریری ثبوت مہیا نہیں کیا جا سکتا اور اگر کوئی فرد گرفت میں آبھی جائے تو پارٹی ایسے آدمی سے لاتعلقی کا اعلان بلاخوف کر سکتی ہے۔ آر۔ایس ایس کے ساتھ گوڈسے کے تعلق سے انکار آج بھی بڑی شدت کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

بلکہ جن سنگھ کی نام نہاد ستیہ گرہ بھی کوئی معصومانہ فعل نہیں تھا معتبر اطلاعات کے مطابق دہلی جن سنگھ کے مسلم ممبر اس اقدام کے خلاف تھے کیونکہ انھیں ڈر تھا کہ وہ اپنے فرقے سے اور دور ہو جائیں گے۔ ساتھیوں نے ان کی آواز کو دبا دیا۔ افسوس ہے کہ جن سنگھ کے اس کھلم کھلا فرقہ پرستانہ عمل اور مسلم مخالف رویئے کے باوجود مسلم ممبران جن سنگھ سے چپکے رہے۔ پہلے دن ستیہ گرہ چاندنی چوک میں کی گئی۔ اور پھر اس طرح کی گئی کہ فرقہ وارانہ امن مستقل خطرے میں رہا۔ ہمیں فرقہ پرستی کی مخالف طاقتوں کا شکرگزار ہونا چاہیئے جن کے مصمم ارادوں کی وجہ سے فرقہ پرست ناکام رہے جن سنگھ کی ان حرکتوں کا فرقہ وارانہ ہم آہنگی پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ اور جن سنگھی کے جنگ باز کھسیا کر پولیس پر پتھر اور آتشیں گولے پھینکنے لگے جس نے انھیں ایک اور مشکل میں پھنسا دیا۔ کیونکہ ان کی حرکتوں سے چاندنی چوک کے کاروبار پر بُرا اثر پڑا۔ وہاں کے کاروباری جو عام حالات میں جن سنگھ کے ہمدرد ہوتے ان سے ناراض ہو گئے۔

اس وقت تک جن سنگھ کے مرکزی رہ نما دور بیٹھے حالات کا جائزہ لیتے رہے تھے لیکن جب انھوں نے اپنے نوجوان ساتھیوں کو مصیبت میں گھرا دیکھا تو انھیں بچانے کے لئے وہ دہلی آپہنچے۔ انھوں نے وزارت داخلہ اور دہلی ایڈمنسٹریشن کو یقین دیا کہ انھیں اپنے نوجوان ساتھیوں کا یہ رویہ پسند نہیں۔ نیز یہ کہ اگر عزت بچانے میں کچھ مدد کی جائے تو احتجاج ختم کیا جا سکتا ہے۔ اوپر کی سطح پر کسی بھی قسم کی یقین دہانی کے لئے کوئی تیار نہیں تھا اور جن سنگھ کو مجبوراً بغیر کسی شرط کے احتجاج ختم کرنا پڑا۔

عدالتی جانچ کا مطالبہ تسلیم نہیں کیا گیا، جن سنگھ کو سرکاری تحقیقات پر قانع ہونا پڑا۔ اور یہ مطالبہ دوسرے لوگوں نے بھی کیا تھا سودیشی مارکیٹ کی آگ کا باڑہ ہندو راؤ کے تصادم سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ گرفتار شدہ لیڈروں میں سے کسی کو رہا نہیں کیا گیا۔ البتہ ایک واقعہ سے ان کی تھوڑی بہت عزت باقی رہ گئی۔ ہوا یہ کہ جب پولیس نے مزید ریمانڈ حاصل کرنے کے لئے جن سنگھ سکریٹری کو مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا تو مجسٹریٹ نے پولیس کی درخواست ماننے سے انکار کر دیا۔ اور اس ضمن میں کچھ غیر ضروری باتیں بھی کہیں۔ اس نے کہا کہ میرے خیال سے اشتہار میں قابلِ اعتراض زبان کا استعمال نہیں کیا گیا۔ اس معاملے میں مجسٹریٹ کے بیان کو آخری الفاظ نہیں سمجھا جانا چاہیئے اور پوری مستعدی سے اس معاملے

کی پیروی کی جانی چاہیئے۔

فرقہ پرستی کی مخالف طاقتوں کی متحد اور منظم جدوجہد نے فرقہ پرستوں کی سازش کو ناکام بنا دیا۔ وہ دن رات چوکنا رہے۔ اور انھیں کی وجہ سے ایڈمنسٹریشن بھی برابر حرکت میں رہا۔ بارڈرے کے تصادم کے بعد ایڈمنسٹریشن کا رول بحیثیت مجموعی اچھا رہا۔ اگرچہ بہت سے پہلو ایسے بھی ہیں جن کی اوپر کی سطح پر بڑی احتیاط سے جانچ پڑتال ہونا ضروری ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ وہاں کے رہنے والے شکایت کرتے ہیں کہ پولیس نے غنڈوں کے ساتھ اس طرح نہیں نپٹا جس طرح نپٹنا چاہیئے تھا۔ ہندو اور مسلم دونوں نے ان کے خلاف بہت سی شکایتیں کیں۔ لیکن اس سلسلے میں کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔ مثال کے طور پر جو غنڈے ۱۲ جون کو لڑے تھے انھیں علاقہ کے ذمہ دار لوگوں کی شکایت پر بہت پہلے گرفتار کیا جا سکتا تھا۔

دوسرے مقامی ذمہ داران جن سنگھ کے رہنماؤں کا ذرا زیادہ ہی لحاظ کر رہے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ بعض لوگوں سے ان کے تعلقات بہت گہرے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے علاقے کے تمام غیر جن سنگھی عناصر کو پولیس سے الگ کر دیا۔ یہ یقینی امر ہے کہ اس پارٹی کی مدد سے امن قائم نہیں کیا جا سکتا جو امن کو خطرے میں ڈال کر فائدہ حاصل کرنا چاہتی ہے۔

یہ دور از قیاس نہیں کہ ابتدائی منزلوں پر پولیس کو جو دقتیں پیش آئیں اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے جن سنگھی لیڈروں کی باتوں پر بھروسہ کیا۔

تیسری شکایت یہ تھی کہ ان ذمہ دار لوگوں کو ڈرانے دھمکانے کی کوشش کی گئی جو علاقے میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو قائم کرنے کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے ہیں۔

[redacted]

ادیب فرقہ پرستوں کی زد میں

ادارہ

جبل پور کارپوریشن کے انتخابات میں، نگر کانگریس کمیٹی، علاقائی رہنماؤں کے ذریعہ جبل پور کی طرف سے لاپرواہی اور ممبران اسمبلی کی گروہ بندی کی وجہ سے جن سنگھ برسر اقتدار آ گیا۔ مہاکوشل علاقہ میں کانگریس کے گڑھ جبل پور میں آزادی کے ۲۵ سال بعد جن سنگھ کو اقتدار حاصل ہوا۔ کارپوریشن میں اقتدار حاصل کرنے کے بعد جن سنگھ اور راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ کے سوئم سیوکوں کا حوصلہ اتنا زیادہ بڑھ گیا کہ ۱۲ جون کو دوپہر میں آر۔ ایس۔ ایس کے دو سوئم سیوکوں نے رائٹ ٹاؤن علاقہ میں ہندی کے بہت مشہور مزاح نگار شری ہری شنکر پرسائی کے گھر میں گھس کے ان پر بیتوں سے حملے کئے۔ جب دو والنٹیر شری پرسائی کے گھر پہنچے تو اس وقت وہ لکھنے میں مصروف تھے۔ والنٹیروں نے ان سے پوچھا کہ "آپ ہی پرسائی ہیں؟" اور بیت چلانا شروع کر دیا جس سے ان کے سر، آنکھ کے پاس، ہاتھ اور پیروں میں چوٹیں آئیں۔ شری پرسائی جب تک سنبھل پائے حملہ آور بھاگ گئے اور تنبیہ کر گئے کہ "آپ ہمارے سنگھ اور جماعت کے بارے میں غلط باتیں لکھتے ہیں اگر لکھنا بند نہیں کیا تو سمجھ لیا جائے گا"

شری ہری شنکر پرسائی علاقہ کے تین اہم روزنامے " نئی دنیا' اندور۔ دیشن بندھو رائے پور اور نوین دنیا' جبل پور میں، سنو بھائی سادھو کے عنوان سے کالم لکھتے ہیں۔ اور 'جن یگ' میں شائع ہونے والے مضمون "ماجرا کیا ہے" کی اشاعت دیشن بندھو جبل پور میں بھی باقاعدہ کی جاتی ہے۔

راشٹریہ سیوم سیوک سنگھ کے گورو گولوالکر کے بعد شری پرسائی نے جو مضمون لکھا تھا اس میں اگرچہ مرحوم کے متعلق کچھ نہیں کہا گیا تھا، لیکن سنگھ کی سیاست، طنز کا شکار بنی تھی جسے سنگھ کے غنڈے پورے طور پر سمجھ ہی نہیں سکے تھے۔ اس واقعے کے بعد جبل پور کے روزنامہ "جبل پور سماچار" شام کے ایڈیشن میں شری پرسائی نے ایک لمبا بیان شائع کرایا جس میں انھوں نے بتایا تھا کہ ہر دوار میں ادیبوں اور فن کاروں پر فاشسٹوں کے کاری حملے ہوئے ہیں۔ جن سنگھ اور آر۔ ایس۔ ایس نے ان حملوں کا آغاز کر دیا ہے اور ان کا پہلا شکار میں بنا ہوں۔

اس بیان کے شائع ہونے کے بعد فوراً جبلپور میں ہلچل کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ٹریڈ یونین کونسل، طلبا کونسل، کمیونسٹ پارٹی، جبلپور ساہتیہ سنگھ، شری جیون چتر کار سنگھ اور سیکڑوں صحافیوں نے



ہری شنکر پرسائی

اپنے غصہ کا اظہار کیا۔ کانگریس کے نوجوان ممبر اسمبلی شری موتی لال سونکر نے جن سنگھ کو متنبہ کیا کہ ہم اس قسم کے چیلنج کا سامنا کرنے کے لئے پوری طرح تیار ہیں۔ شہر میں چند مقامات پر جن سنگھ کے دفاتر کو گھیر بھی لیا گیا۔

شری پرسائی کے بیان اور اس کے ردعمل سے گھبرا کر، پانچ لاکھ روپے کی لاگت سے بنے جن سنگھ کے ہیڈ کوارٹر "کیشو کٹی" سے ایک بیان جاری کیا گیا جس میں اس واقعے کی مذمت کی گئی تھی اور افسوس کا اظہار کیا گیا تھا۔ حالات مکمل طور پر پُر سکون نہیں ہیں اور نوجوانوں کا طبقہ فسطائی مخالف مورچہ بنا کر آر۔ ایس۔ ایس اور جن سنگھ کی کارروائیوں کا جواب دینے کے لئے منظم ہو رہا ہے۔

[redacted]



اردو کی ہندوستانی بنیاد

گوپی چند نارنگ

اردو کا تعلق ہندوستان اور ہندوستان کی زبانوں سے بہت گہرا تعلق ہے یہ زبان یہیں پیدا ہوئی اور یہیں پلی بڑھی۔ آریاؤں کی قدیم زبان سنسکرت یا "انڈک" چار پشتوں سے اس کی جدا مجد قرار پاتی ہے یوں تو ہندوستان میں زبانوں کے کئی خاندان ہیں۔ لیکن ان میں سے دو خاندان خاص ہیں۔ ایک دراوڑی دوسرا ہند آریائی۔ ہند آریائی خاندان کی زبانیں پورے شمالی ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہیں جنوب میں گجرات اور مہاراشٹر تک انھیں کا جال ہے۔ مسیح کی پیدائش سے تقریباً ہزار سال پہلے جب آریا ہندوستان میں وارد ہوئے تو جو عوامی بولیاں وہ بولتے تھے، ان کے مجموعے کو "انڈک" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ چاروں وید انھیں عوامی بولیوں میں لکھے گئے تھے۔ بعد میں پانتی اور پاتنجلی کے زمانے تک انھیں بولیوں کے منزہ اور شستہ روپ کو "سنسکرت" کے نام سے پکارا جانے لگا۔ بودھوں اور جینیوں کے دور میں یہی بولیاں اپنے ارتقا کی دوسری منزل میں داخل ہو گئیں اور "پراکرتیں" یعنی فطری بولیاں کہلائیں اور آگے چل کر پانچویں صدی عیسوی کے لگ بھگ انھیں کی بگڑی ہوئی شکلیں جو "اپ بھرنش" کہلاتی تھیں، استعمال میں آنے لگیں۔ "یہ ہند آریائی" کے ارتقا کی تیسری منزل تھی۔" اپ بھرنشوں" میں سب سے زیادہ اثر والی مرکزی اپ بھرنش "شورسینی" کہلاتی تھیں۔ یہ اپ بھرنش پنجاب کے مشرقی حصے سے لے کر اودھ کے مغربی حصوں تک رائج تھی اور اس کی کئی بولیاں تھیں۔ دسویں صدی عیسوی کے لگ بھگ یہ اور دوسری ہند آریائی بولیاں اپنے ارتقا کی چوتھی منزل میں داخل ہوئیں جسے جدید ہند آریائی زبانوں کا دور کہا جاتا ہے۔ یہی زمانہ مسلمانوں کے ہندوستان آنے کا بھی ہے، جب سیاسی نقشے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے تہذیبی اور لسانی نقشے میں بھی تیزی سے تبدیلیاں ہونے لگیں۔ ہندی، اردو اور پنجابی اسی شورسینی اپ بھرنش کی جانشین ہیں۔ گریرسن کی تقسیم کے مطابق ہندی کی دو شاخیں ہیں "مشرقی ہندی" اور "مغربی ہندی" مشرقی ہندی" میں اودھی، بھوج پوری چھتیس گڑھی مگھی، میتھلی وغیرہ بولیاں شامل ہیں۔ اور "مغربی ہندی" میں کھڑی، برج، ہریانی وغیرہ۔ جدید معیاری اردو اور جدید معیاری ہندی دونوں کا تعلق اسی "مغربی ہندی" سے ہے۔ اس لحاظ سے اردو اور ہندی کا رشتہ سگی بہنوں کا ہے اور ان دونوں کی بنیاد ایک ہے۔

اردو کے ابتدائی ارتقا کی کہانی ہندی کے ارتقا کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ یہ داستان خاصی دل چسپ ہے کہ ان دونوں کا ارتقا مغربی ہندی کی بولیوں کے ساتھ مل کر کیسے ہوا؟ اردو کی ساخت، ڈول اور کینڈے کا تعین دسویں گیارہویں صدی سے سولہویں، سترہویں صدی تک ہوتا رہا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اشتراک، اور نئی تاریخی اور تہذیبی ضرورتوں کے تحت جو زبان پیدا ہو رہی تھی وہ کئی ناموں سے پکاری جاتی تھی، کبھی ہندی اور کبھی دکنی۔ بازاروں میں جہاں لین دین ہوتا تھا اور جہاں تجارت کی مجبوریوں سے ایک ملی جلی زبان بولنی پڑتی تھی، وہاں تو اس نوزائیدہ زبان کا استعمال ہوتا ہی تھا۔ اس کے علاوہ یہ سنتوں اور صوفیوں کی زبان بھی بن گئی تھی۔ عوام کے دلوں تک پہنچنے کے لئے نہ تو سنسکرت کا استعمال کیا جا سکتا تھا، نہ فارسی کا، بلکہ کسی ایسی زبان کی ضرورت تھی جو عام فہم ہو اور جو سب کی سمجھ میں آ سکے، اور یہ زبان یہی گری پڑی، ملی جلی "ریختہ" زبان ہو سکتی تھی۔ ہندی والے اس کی ابتدا برج کے آغاز سے کرتے ہیں اور اردو والے پنجابی اور کھڑی سے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عہدِ وسطیٰ میں جس طرح ہندو تہذیبی روایتوں کا لسانی وسیلۂ اظہار برج تھی، اسی طرح ہندو اور مسلمانوں کے پہلے ہمہ گیر تہذیبی اور سماجی سابقے کی سرزمین پنجاب تھی۔ برج تو شورسینی کی سچی جانشین تھی ہی اور اس کا ارتقا تو ہونا ہی تھا لیکن عین ممکن ہے کہ وہ بولی جو آگے چل کر کھڑی کہلائی، بڑی حد تک ہندوؤں اور مسلمانوں کے لسانی اور تہذیبی اشتراک سے اپنی نشو و نما میں براہ راست طور پر متاثر ہوئی۔ وہ یوں کہ پرانی "ہندوی"، بولی کے نمونوں کا ذکر بارہویں اور تیرہویں صدی سے ملنے لگتا ہے۔ قیاس چاہتا ہے کہ یہ نوزائیدہ زبان ایک طرف تو پرانی پنجابی سے مختلف ہو گی دوسری طرف برج سے۔ افسوس کہ مسعود سعد سلمان کا، جو محمود غزنوی کے زمانے میں لاہور کے شاعر تھے "ہندوی" کلام دستیاب نہیں ہوتا۔ اگرچہ محمد عوفی نے اپنے تذکرے لباب اللباب میں تصدیق کی ہے کہ مسعود نے "ہندوی" میں شعر کہے تھے۔ اگر اس زبان کی ابتدا گیارہویں اور بارہویں صدی میں غزنویوں

نے زمانے میں ہم تسلیم نہ بھی کریں تو بھی اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ امیر خسرو کے زمانے تک یہ زبان ایک خاص حد تک ترقی کر چکی تھی۔ امیر خسرو نے اپنے تیسرے فارسی دیوان غرۃ الکمال میں ہندوی میں شعر کہنے کا فخریہ اعتراف کیا ہے۔ لطف کی بات ہے کہ امیر خسرو کو اردو اور ہندی والے دونوں اپنا پہلا شاعر تسلیم کرتے ہیں۔ امیر خسرو کا انتقال ۱۳۲۴ء میں ہوا۔ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ اس سے تقریباً ایک صدی پہلے خلجیوں کی فوجوں نے دکن پر حملہ کیا تھا، اور تقریباً ۸۷ برس پہلے جب محمد تغلق نے پایہ تخت دیوگیر، دولت آباد منتقل کیا تو بھی زبان وہاں جاکر گجری اور دکنی کے نام سے موسوم ہوئی اور نہایت تیزی سے ادبی زبان کا درجہ حاصل کر گئی۔ اس وقت شمالی ہندوستان میں فارسی کا اثر تھا، اس لئے شمال کے مقابلے پر دکن میں اس پر توجہ زیادہ تھی، مگر شمال میں بھی عوامی تحریکوں، صوفیوں اور سنتوں نے اس کی مقبولیت کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔ اگرچہ کرشن بھگتی تحریک اور اکبر کے آگرہ کو راجدھانی بنانے سے برج کا ستارہ پھر سے چمک اٹھا، لیکن شاہ جہاں نے جب دہلی کو دوبارہ بسایا تو کھڑی اس وقت تک اپنے آپ کو پہچان چکی تھی اور دہلی کی سیاسی اور تہذیبی مرکزیت کی وجہ سے اسی کا اثر نئی ریختہ زبان پر غالب آنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے اردو؛ اردوئے معلّی کے منصب پر فائز ہو گئی۔ اور اورنگ زیب کے بعد سے تو اس میں جیسے شعر و شاعری کا بند کھل گیا، اور زبردست ادبی سرگرمی شروع ہو گئی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندی ادب ابھی برج، اودھی اور راجستھانی بولیوں کا رہین منت تھا۔ یہ سب بولیاں بھی ہندی کہلاتی تھیں، اور اردو کو بھی ہندی کہنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کی جاتی تھی دراصل اس وقت تک اردو اور ہندی دو زبانیں تھیں ہی نہیں، ورنہ فضل علی فضلی اپنی کربل کتھا کی زبان کو "نثر ہندی" کیوں کہتے یا محمد حسین خاں عطا تحسین "نوطرز مرصع" کے سبب تالیف میں "عبارت رنگین زبان ہندی" لکھنے پر فخر کیوں کرتے یا مصحفی اپنے تذکرے کو "ہندی گویان" سے منسوب کیوں کرتے یا غالب اپنی اردو نثر کے لئے لفظ "ہندی" استعمال کیوں کرتے۔ ہندی اور اردو کی پہلی باقاعدہ ادبی تقسیم فورٹ ولیم کالج سے پیدا ہوئی، جہاں چند ہندی منشیوں کو خاص اس خدمت پر مامور کیا گیا کہ اردو عبارت کو دیوناگری میں لکھتے ہوئے فارسی، عربی لفظوں کی جگہ ہندی مترادفات لکھتے چلے جائیں۔ اس کے بعد کے برطانوی تسلط، سامراجی حکمت عملی، سیاسی دباؤ اور باہمی شک و شبہ نے ایک پیڑ کی دو شاخوں کو الگ الگ کر کے رکھ دیا، اور ایک بڑے تنے سے دو درخت الگ الگ بنا دیئے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہندی اور اردو کے الگ الگ ادبی زبان بن جانے سے ان دونوں کا لسانی رشتہ ختم ہو گیا۔ دونوں کی ادبی روایتیں، ادبی معیار، ادبی موضوعات اور ادبی تاریخ کتنی ہی الگ الگ کیوں نہ سہی، دونوں کا لسانی ڈھانچہ اس کے بعد بھی ایک رہا۔ اول تو دونوں کی تقریباً چالیس آوازوں میں صرف پانچ کو چھوڑ کر باقی سب کی سب ایک ہیں۔ ہند آریائی زبانوں کی سب سے بڑی پہچان ہکار آوازوں بھ، پھ، تھ، دھ، ..... کا سیٹ ہے جو اردو میں پورا کا پورا موجود ہے۔ اس کے علاوہ معکوسی آوازیں ٹ، ڈ، ڑ اور ٹھ، ڈھ، ڑھ، بھی اردو میں جوں کی توں موجود ہیں۔ یہ آوازیں نہ عربی میں ہیں نہ فارسی میں۔ صرف و نحو کا معاملہ یہ ہے کہ کچھ اسم اور صفت تو اردو نے عربی، فارسی سے لئے لیکن اردو فعل کا سرمایہ سارا کا سارا دیسی ہے۔ اٹھنا بیٹھنا، کھانا، پینا، سونا، سینکڑوں ہزاروں فعل جو زبان کی ریڑھ کی ہڈی ہیں کلیتہً ہند آریائی ہیں۔ یہی معاملہ مرکب افعال مثلاً گر پڑنا، مار ڈالنا، ٹوٹ جانا سن لینا وغیرہ کا ہے۔ یہ جیسے ہندی میں ہیں ویسے اردو میں۔ یہی حال فعل سے بننے والے محاوروں کا ہے مثلاً آنکھیں بچھانا، آنکھیں بھر آنا، آنکھیں ٹھنڈی ہونا آنکھیں روشن ہونا وغیرہ یا پھر محاورے ہیں جو دونوں زبانوں کے مختلف سرمائے کا بیش قیمت حصہ ہے۔ مثلاً جیسا دیس ویسا بھیس، گھر کی مرغی دال برابر، ڈوبتے کو تنکے کا سہارا، بچہ بغل میں ڈھونڈورا شہر میں، مفت کی شراب قاضی کو بھی حلال، گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔ اور تو اور ہندی اور اردو کی بنیادی لفظیات ایک ہے یعنی مصدر ایک ہیں۔ امدادی افعال ایک ہیں۔ حروف جار میں نے، پر، تک، کا، کے، کی، کو، سب ایک ہیں، اسی طرح ضمیریں ایک ہیں۔ سوالیہ مادے ایک ہیں۔ بنیادی اور توصیفی اعداد ایک ہیں۔ گنتی ایک ہے جسم کے اعضا کے نام ایک ہیں اور تو اور رشتہ داریاں ایک ہیں اور گالیاں بھی ایک ہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ اردو ہندوستان کی انتہائی ترقی یافتہ زبانوں میں سے ایک ہے۔ اگر ایک طرف اس کا دامن سامی اور ایرانی زبانوں سے بندھا ہوا ہے تو دوسری طرف اس کی بنیاد ہند آریائی ہے۔ اس کا رسم الخط ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ مشرقِ وسطیٰ کے بیسیوں ملکوں میں تھوڑے تھوڑے اختلاف کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ اردو کے تقریباً ساٹھ ہزار الفاظ میں سے تقریباً دو تہائی الفاظ یعنی چالیس ہزار الفاظ سنسکرت اور پراکرتوں کے ماخذ سے آئے ہیں جس زبان کی جڑیں اپنے ملک کے لسانی ذخیرے اور اس کی تہذیبی سرزمین میں اتنی گہری ہوں، جس کا دامن اتنا وسیع ہو، جس کے لہجے میں ایک ایسی چستی اور کھنک ہو، جس کے انداز میں ایک خاص شستگی اور شائستگی ہو، جس کی قومی خدمات ایسی وقیع ہوں، اور جس کا ادبی سرمایہ بشمول میر، غالب، انیس، اقبال فراق اور فیض کے اتنا شاندار ہو، وہ زبان کبھی مٹ نہیں سکتی۔ اس زبان کا ہندوستان پر ایسا حق ہے جو کبھی ٹھکرایا نہیں جا سکتا اور ہندوستان کا بھی اس پر ایسا حق ہے جو اسے ضرور وصول کرنا چاہیئے۔

کیا اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے؟

اردو ہندوؤں مسلمانوں سکھوں اور عیسائیوں
کی مشترکہ میراث ہے۔ زبان کا اس
کا ہندوستانی روپ جو بہت آسانی
سے انگریزی کی جگہ لے سکتا تھا۔
یوں بھی ایک سیکولر ملک اور قوم کی
زبان بھی اعتبار سے سیکولر ہی ہونی
چاہیئے۔ اور اس کا بہترین حل مہاتما
گاندھی اور پنڈت نہرو جیسے عالی
مرتبت قومی رہنماؤں کے خیال
میں ہندوستانی ہی تھا۔



ابوالفیض سحر

اگرچہ یہ ایک تاریخی حقیقت رہی ہے کہ قدیم زمانے میں زبان اور مذہب کے بیچ ایک گہرا تعلق رہا ہے یا رکھا گیا ہے۔ شاید اسی وجہ سے ہمارے ابتدائی سماجوں کے لسانیاتی دائرۂ فکر میں بھی، ایسے ہی احساسات و جذبات، اعتقادات اور نظریات کارفرما رہے اور زبانوں کے تعلق سے اس طرح کے عقائد کہ فلاں زبان "دیو بانی" ہے اور فلاں زبان "الہامی کلام" ہے، عام ہوگئے۔ مگر جوں جوں علوم و فنون اور انسانی لیکن اس کے باوجود غلط پروپیگنڈہ گمراہ کن لٹریچر کی نشر و اشاعت کو اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود یہ حقیقت پھر ایک بار روز روشن کی طرح واضح ہو چکی ہے کہ اردو نہ تو کوئی بیرونی زبان ہے اور نہ ہی یہ صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔

اردو اور مسلمانوں کے تعلق سے مزید تفصیلات میں گئے بغیر یہ بحث ادھوری رہ جائے گی۔ دراصل ہوتا یوں ہے کہ بولیاں اور زبانیں بہت پہلے بنتی ہیں اور ان کے نام بعد میں رکھے جاتے ہیں۔ اور یہ نام لسانی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ بدلتے بھی رہتے ہیں جیسے تہذیب و تمدن کا ارتقا ہوتا گیا۔ ان میں حقیقت پسندی پیدا ہوتی گئی اور جوں جوں انسانی فکر و شعور بیدار ہو کر فہم و ادراک کی اعلیٰ منزلوں سے روشناس ہوتا گیا، یہ روایت بھی قدیم توہمات کی طرح باطل قرار پائی گئی کہ زبان اور مذہب کا کوئی بنیادی یا خمیر منفک تعلق ہوتا ہے۔ دنیا کے اور خطوں کے علاوہ آج ہمارے ملک میں بھی، جمہوری سیکولر اور ترقی پسند قوتوں نے اس جادو کو بڑی حد تک بے اثر بنا دیا ہے۔

مگر پھر بھی یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ ملک کی آبادی کا ایک مخصوص طبقہ ایک خاص گروہ نے اردو کے سلسلے میں یہ زہر پھیلا رکھا ہے کہ اردو بیرونی زبان ہے یا یہ صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ اس میں دو طرح کے لوگ ہیں۔ کچھ تو دانشور اور کم تعلیم یافتہ

ان کے نام بعد میں رکھے جاتے ہیں۔ اور یہ نام لسانی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ بدلتے بھی رہتے ہیں جیسے
آج ہندی کہا جاتا ہے دراصل وہی اردو تھی اور اسی اردو رسم خط کے ساتھ حضرت امیر خسرو کے زمانے میں بھی اور جنوب میں دکنی ہند میں بھی اردو کو ہندی یا ہندوی کہا جاتا تھا۔ اس زمانے میں نہ آج کی ہندی کا وجود تھا اور نہ آج کے دیوناگری رسم خط کا اتنا رواج تھا۔ پھر شمال میں معیاری اردو کے دور تک بھی اردو کو ہندی کے نام سے یاد کرنے کی روایت ملتی ہے جیسے

کربل کتھا (فضلی) "اب تک ترجمہ فارسی بہ عبارتِ ہندی نثر نہیں ہوا۔"

نوطرزِ مرصع (محمد حسین خاں عطا تحسین) "لیکن مضمون اس داستانِ بہارستان کے تئیں بھی بیچ عبارتِ رنگین زبان ہندی کے لکھا جائے۔"

نصیحت المسلمین (۱۲۴۸ھ۔ مولوی محرم علی)

"ہر آیت کا ترجمہ ہندی زبان میں صاف صاف بیان کرے تاکہ ہر ایک کو فائدہ عام ہو۔"

آتش سے منسوب یہ شعر بھی یہاں پیش کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا ؎

مطلب کو میرے یار نہ سمجھے تو کیا عجب
سب جانتے ہیں ترک کی ہندی زبان نہیں

اس طرح مختلف ادوار میں مختلف مقامات پر اردو ہی کو مختلف نام ملتے رہے جیسے ہندی، ہندوی، دکنی، گجری، شاہ جہاں آبادی، اردوئے معلّیٰ، ہندوستانی وغیرہ لفظ "اردو" سے اگر ترکی الاصل ہونے کی نشان دہی ہوتی ہے تو لفظ "ہندی" بھی تو فارسی ماخذ کا پتہ دیتا ہے۔ یار رہے لفظ اردو یا ہندی سے کسی خاص مذہب کی بو نہیں آتی۔

یوں تو مذہبی اساس پر زبانوں کی تقسیم نہ صرف اصول لسانیات کے خلاف ہے بلکہ خلاف واقعہ بھی۔ پھر بھی اگر مسلمانوں کی کوئی مذہبی زبان کہلائی جاسکتی ہے تو وہ عربی ہو سکتی ہے اردو نہیں۔ اب تو اسلامی مذہبی رسومات اور فرائض کی ادائیگی بھی غیر عربی بلکہ زیادہ

وضاحت سے مقامی زبانوں میں ہو رہی ہے۔ اسی طرح دنیا کے کسی بھی خطے کے مسلمانوں کی زبانوں کا مطالعہ کیجئے یہ کسی بھی طرح صرف عربی ہی نہیں۔ روسی مسلمانوں کی زبان روسی علاقوں کی مقامی زبانیں ہیں۔ افریقہ میں افریقی زبانیں۔ انڈونیشیا اور ملیشیا میں ملائے ہے تو بنگلہ دیش میں بنگالی ہے۔ خود ہندوستان کو لیجئے۔ یہاں کی مختلف ریاستوں میں آباد مسلمانوں کی زبانیں مختلف ہیں۔ کشمیری مسلمانوں کی زبان کشمیری ہے، پنجابی مسلمانوں کی زبان پنجابی، بنگالی مسلمانوں کی زبان بنگالی، مدراسی مسلمانوں کی زبان ٹمل، ملیالی مسلمانوں کی زبان ملیالم۔ اس کے برخلاف "ملاپ پرتاپ" جیسے اخبار پڑھنے والے تقریباً سب کے سب ہندو ہیں۔ اس کے علاوہ اردو ہندوں شاعروں ادیبوں، فسانہ نگاروں کی ایک بہت بڑی فہرست ہے جس سے سبھی واقف ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض مخصوص سیاسی حالات کی وجہ سے آج اردو کو بحیثیت مادری زبان بولنے اور مردم شماری میں اندراج کروانے والی آبادی کا بیشتر حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ایسا کیوں ہوا؟ یہ وقت کی ستم ظریفی ہے یا تاریخ کا فیصلہ اس بارے میں فیصلہ کرنے سے قبل بعض بنیادی حقائق تسلیم کر لیا جائے اور بعض فرقہ وارانہ اندازِ فکر رکھنے والوں کی پیدا کردہ غلط فہمیوں کا ازالہ کر لیا جائے اور سیاسی مصلحتوں کے پردوں کو چاک کر دیا جائے تو آج بھی یہ سب کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اردو اپنی ابتدا سے آج تک بھی، ہندو مسلمانوں، سکھوں اور عیسائیوں کی مشترکہ میراث ہے۔ خاص کر اس کا ہندوستانی روپ جو بہت آسانی سے انگریزی کی جگہ لے سکتا تھا یوں بھی ایک سیکولر ملک اور قوم کی زبان ہر اعتبار سے سیکولر ہی ہونی چاہیئے۔ اور اس کا بہتر حل مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو جیسے عالی مرتبت قومی رہ نماؤں کے خیال میں ہندوستانی ہی تھا۔

اردو کو اس کسوٹی پر بار بار پرکھا جا چکا ہے اور ہر بار یہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ دمک اٹھتی ہے۔ یہ نہ صرف ایک خالص ہندوستانی زبان ہے بلکہ اس میں ہمہ گیر انداز میں ملکیت بھی ہے آفاقیت بھی۔ جہاں تک قواعد اور صرف و نحو کا تعلق ہے۔ اسم فعل، صفت، جمع و تانیث کے بنیادی قاعدے بنیادی ضمائر حروف جار اور اعداد کے اعتبار سے بھی اس میں اور ہندی میں کوئی فرق نہیں کیونکہ یہ ایک ہی زبان کی دو شیلیاں ہیں۔ لغت کے اعتبار سے بھی اس میں تقریباً ساٹھ فیصد سے زائد الفاظ سنسکرت کے ہیں اور باقی الفاظ میں عربی، فارسی، ترکی، انگریزی فرانسیسی، پرتگالی، ہسپانوی وغیرہ ہیں۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی بے جا نہ ہوگا کہ خود سنسکرت میں بیشتر الفاظ قدیم فارسی ہی کے ہیں۔ جدید فارسی اور جدید ہندی میں بھی ان نقوش کو ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ ٹمل زبان میں تقریباً ۸۰ فیصد الفاظ سنسکرت کے ہیں مگر پھر بھی وہ دراوڑی زبان ہے۔ موجودہ ہندی اور دیوناگری کا ارتقا تو بہت بعد کی لسانی تبدیلیاں اور ترقیاں ہیں ابتدائی اردو رسم خط اور زبان کا سراغ پراکرت اور فروشتی رسم تحریر کے عہد سے ملتا ہے جو قدیم یونانیوں اور اہل ایران کے، جو غیر مسلم تھے، ہندوستان کے ساتھ سیاسی اور تجارتی، سرکاری اور عوامی تعلقات اور تہذیبی لین دین کا نتیجہ تھا۔ کشک اور پھر اشوک اعظم کے بعد تک ہندوستان میں مروج تھا۔ یہ زبان اور یہی رسم تحریر بعد کو اپنے دوسرے دور میں مکمل زبان اور مکمل رسم تحریر کی صورت میں آج تک ہند لسانی یا ہند ایرانی زبان اور تہذیب بن کر ہماری قومی تاریخ کی متاع عزیز بن چکا ہے

اس کے برخلاف اگر ایماندارانہ اور غیر جانبدارانہ لسانی تحقیق اور تجزیہ کیا جائے تو خود سنسکرت زبان اور اس کا برہمی رسم تحریر دونوں آریاؤں کے ساتھ باہر سے ہندوستان آئے ہیں۔ پھر یہ ہندوستان کے مذہب و ثقافت، تہذیب و تمدن اور علم و ادب میں اس درجہ فروغ پائی کہ اس کے ادب عالیہ کے بغیر ہندوستانی علوم و فنون اور لسانیات و ادبیات کی تاریخ مکمل نہیں ہوتی۔ اس ادب عالیہ کا ہم نہ صرف احترام کرتے ہیں بلکہ اس پر فخر بھی کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ، اردو والوں نے آزادی سے پہلے بھی اور آزادی کے بعد بھی نہ تو سنسکرت کی مخالفت کی نہ ہندی کی، بلکہ مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو کی مجوزہ ہندوستانی فارمولا کی بھی مخالفت نہیں کی۔ البتہ جس طبقے نے اس وقت اس کی مخالفت کی وہ آج بھی اس کو برداشت نہیں کرتے۔ اسی طرح کے رجعت پسندانہ عمل ورد عمل کے نتیجے کے طور پر ہمارے ملک کی تاریخ میں وہ بھیانک اور بدبخت ترین واقعہ رونما ہوا جس کی وجہ سے نہ صرف ملک کا علاقہ بٹ گیا بلکہ آبادی دل و دماغ بھی تقسیم ہو گئے، سوچنے سمجھنے، دلیل و استدلال کے انداز اور بنیاد بھی بدل گئی۔

جب تقسیم کا ذکر آ ہی گیا ہے تو پھر آیئے ڈاکٹر رفیق ذکریا کی ادبی ٹرسٹ حیدرآباد کے کل ہند مشاعرے کی صدارتی تقریر (شائع شدہ سیاست اداریہ مورخہ ۲۶ مئی ۱۹۷۳ء) کے اس اقتباس اور اس میں پوشیدہ حقائق کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

"اردو کی ترقی اور وسعت سے نیشنل لنگویج کو ترقی اور وسعت ملتی ہے۔ اردو ادب کا مزاج سیکولر رہا ہے اور اردو کی بقا کے لئے ہر تحریک کو سیکولر ہی رہنا پڑے گا۔ ہندوستان میں سیکولرازم، جمہوریت اور سوشلزم کی ترقی اور ان طاقتوں سے ہی اردو کا مستقبل وابستہ ہے۔ ہندوستان کی تقسیم کے مطالبوں میں جہاں اور کئی غیر منطقی کج بحثیاں تھیں وہیں یہ نعرہ بھی تھا کہ اردو کو ایک محفوظ وطن چاہیئے کوئی بھی ایکشن اپنے ری ایکشن کے بغیر نہیں گزرتا۔ کچھ تو سیاسی حالات نے پلٹا کھایا اور کچھ اس نعرہ کا ری ایکشن یا رد عمل ہوا۔ ری ایکشنری طاقتوں کو منہ مانگی مراد ملی۔ انہوں نے پہلا وار اسی نوخیز پر کیا اردو زبان کے لسانی تعلیمی اور ادبی حقوق خود اس کے وطن میں دیدہ دلیری سے پامال کئے جانے لگے یہاں اس کی ہر مانگ میں کم نظروں کو فرقہ پرستی نظر آنے لگی اس آگ کو یہاں تک ہوا دی گئی کہ ملک کے

اہم شمالی علاقے میں اردو کو کچھ سرکاری حیثیت دیئے جانے کے خلاف ایک طوفان برپا ہو گیا جو ہولناک کی اور زبانوں کے مقابلے میں ۲۵ سال پیچھے رہ گئی۔"

ان تمام تاریخی اور لسانی حقائق کے گہرے شعور و ادراک کے ساتھ ڈاکٹر گیان چند اردو اور ہندی کو مذہبی بنیادوں پر تقسیم نہ کرنے کا مشورہ دیتے ہیں اردو کے ہندو اور مسلمانوں کی مشترک زبان ہونے اور مردم شماری میں ہونے والی دھاندلیوں کی طرف بھی اشارہ کرتے ہوئے اپنی روایتی دیانتداری اور حق گوئی کے ساتھ "علم و دانش" فروری، مارچ ۳،۱۹۹۰ء صفحہ ۱۸ پر تحریر فرماتے ہیں۔

"مذہب کی بنا پر زبان کی یہ مصنوعی تقسیم کیا بددیانتی نہیں؟ پنجاب اور چنڈی گڑھ کے ہندو پنجابی بولتے ہیں لیکن سیاسی وجوہ سے اپنی زبان کو ہندی کہتے ہیں۔ اسے سراہا نہیں جا سکتا۔ اسی طرح مذاہب کی بنیاد پر ایک زبان بولنے والوں کو دو میں بانٹ دینا سیاست اور فرقہ واریت کا کرشمہ ہوتا ہے۔ فرار واقعی صورت حال نہیں۔ ہندوستان کے آئین میں اردو اور ہندی کو دو زبانوں کی حیثیت سے درج کرنا سیاسی مصلحت ہے لسانی حقیقت نہیں۔ مردم شماری میں اردو اور ہندی بولنے والوں کی تعداد کی تقسیم محض فرضی اور خیالی ہے یہ سب اردو بولنے والے بھی کہلا سکتے ہیں ہندی بولنے والے بھی۔"

جس طرح زبان کو مذہب کی اساس پر جانچا نہیں جا سکتا اسی طرح تہذیب کی بنیاد پر بھی اس کی اس طرح کی شناخت کرنا مشکل ہے لیکن پھر بھی کسی زبان میں ملکی، علاقائی یا مقامی رنگ دیکھنے کے لئے اس زبان کے ادب میں متعلقہ ملک و قوم کی تہذیبی ثقافتی اور سماجی جھلکیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ اگر اسے ایک کے اصول یا کلیہ کی صورت دی جائے اور اس پر بھی اردو زبان کو پرکھا جائے تو ہندوستان جو صدیوں سے ایک روادار ملک رہا ہے اور خود مختلف مذاہب مختلف تہذیبوں کا گہوارہ رہا ہے، اپنے پورے رنگ و روپ کے ساتھ اردو زبان کی ہر صنف میں جیتا جاگتا، ہنستا گاتا نظر آتا ہے۔ یہاں ڈاکٹر گیان چند صاحب کے خیال سے جزوی طور پر اختلاف کرتے ہوئے نفس مضمون کو مثبت رنگ میں پیش کرنا چاہوں گا۔ وہ لکھتے ہیں۔

"اردو خط میں جماعت اسلامی کی کتابیں بھی ہیں، سناتن دھرم اور آریہ سماج کی بھی۔ انیس کے مرثیے بھی ہیں اور آریہ سنگیت رامائن اور آریہ سنگیت مہا بھارت بھی۔" اور اسی لئے اردو زبان کی نوعیت کو بھی کلچرل پس منظر میں طے نہیں کر سکتے۔ حالانکہ اس سے صرف یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اردو زبان اور ادب کسی ایک خاص فرقے یا الفاظ دیگر مسلمانوں کے ہی کلچر کی آئینہ دار نہیں بلکہ ہندوستان کے سبھی فرقوں، ذاتوں اور طبقوں کی تہذیبی ورثے اور سماجی روایات کی علمبردار ہے۔ بلا خوف تردید آج بھی یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اردو زبان میں جس قدر مشترکہ تہذیبی روایات ملتی ہیں اس کی مثال ہندوستان کی شاید ہی کسی زبان میں ملتی ہوں۔ ابراہیم عادل شاہ کی کتاب "نورس" (دکنی) سے لیکر کمار پاشی کی "و اس یاترا" تک اور شاعری میں ہندو دیومالائی عناصر بھرپور انداز میں ملتے ہیں یہی حال اس کی دیگر اصناف ادب کا بھی ہے بالخصوص افسانوی ادب کا۔ "ہماری زبان" مورخہ ۱۴ مئی ۳، ۹ء کے صفحہ ۱۴ پر ڈاکٹر مسعود حسین خان کے بھی الفاظ ملاحظہ ہوں۔

"ثقافتی و معاشرتی نقطۂ نظر سے ہر عہد میں اردو مسلم اکثریت کے باوجود ایک سیکولر زبان رہی ہے اس میں مسلمانوں کا مذہبی ادب بھی کثرت سے ملتا ہے اور آریہ سماج کا بھی۔ کبھی کبھی کسی مذہبی مناظرہ بازی کے باوجود غزل جو اس کی شاعری کی جان ہے شروع سے آخر تک سیکولر اور عام انسانی جذبات سے مملو رہی ہے اس کا افسانوی ادب تمام تر غیر فرقہ وارانہ رہا ہے اس کے پہلے نظم گوؤں میں محمد علی قطب شاہ اور نظیر اکبرآبادی کے یہاں سبکے لب و دنداں کے بقدر چاشنی ملتی ہے۔ فرقہ وارانہ فساد برپا کر ختم ہوا۔ اردو غریب جہاں تھی وہیں رہ گئی۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اردو ہندوستان آزاد روی اس کا مسلک رہا ہے۔"

حال ہی میں خود میں نے "نیا دور" (لکھنؤ) کے صفحات پر اس موضوع پر ایک مبسوط مقالہ پیش کیا ہے۔ ویریندر پرشاد سکسینہ نے بھی "اردو ادب" علیگڑھ شمارہ ۱/۴، ۸۷ء میں اس تعلق سے مدلل بحث کی ہے ڈاکٹر انصار اللہ نے "اردو کے حروف تہجی" میں ایک مقام پر اس عقیدے کا اظہار کیا ہے کہ خود "رام چرتر مانس" سب سے پہلے اردو خط میں لکھی گئی۔

ہمارے بعض دانش ور کمال دانش مندی سے اردو ہندی قضیہ کا الزام انگریزوں کے سر منڈھ دیتے ہیں اور اپنی ذمہ داریوں کی طرف سے آنکھیں موند لیتے ہیں زیادہ سے زیادہ اس نزع کا سراغ فورٹ ولیم کالج کے قیام اور اس کے تصانیف میں ڈھونڈتے ہیں۔ حالانکہ دیانت داری کی بات یہ ہے کہ جان گلکرسٹ کا مطمح نظر یہ نہیں تھا اس کے برخلاف وہ دیوناگری لکھاوٹ کو بھی مقبول بنانا چاہتا تھا جو اس زمانے میں اردو خط کی بہ نسبت زیادہ مروج نہ تھا اور نہ ہی موجودہ ہندی اس زمانے میں تھی۔ یہاں میں پھر ڈاکٹر گیان چند کے دو جملے دوہرا کر اپنی بات مکمل کروں گا کہ "انشاء کی رانی کیتکی کی کہانی، فورٹ ولیم میں ترجمہ شدہ سنگھاسن بتیسی اور بیتال پچیسی یہ تینوں کتابیں اردو ادب کا بھی سرمایہ ہیں، ہندی ادب کا بھی۔" اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اس منافرت کے بیج انگریزوں نے بوئے ہیں تو پھر ہم اپنے بیدار قومی یکجہتی کے شعور کے باوجود ان کے وارث کیوں بن رہے ہیں۔ ان کی فصلیں کیوں کاٹ رہے ہیں؟ اس برائی کو پوری قوت کے ساتھ ختم کیوں نہیں کیا جاتا؟ اس فساد کی جڑ کی بیخ کنی کیوں نہیں کی جاتی مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو کے سبھی اصولوں کو آدرش کی حیثیت دی جاتی ہے مگر اردو زبان کے تعلق سے ان کی حکمت عملی پر کیوں کاربند نہیں ہوتے؟

اب وقت آ چکا ہے کہ ہمارے جمہوری سماج اور ہمارے سیکولرازم اور سوشلزم کو ان سوالوں کا جواب دینا ہی ہوگا۔

اردو کو قانونی تحفّظ دیا جائے

جمیل مہدی

اتنے شدید مخالف ماحول اور ناسازگار فضا میں بھی یہ زبان زندہ اور موجود رہی تو اس کا پہلا سبب یہی ہے کہ یہ زبان نہ صرف یہیں کے ماحول اور موسم کی پیداوار تھی بلکہ اسی آب و ہوا میں اس کی زندگی و نشوونما کے سارے ضروری سامان موجود تھے۔

اردو کے بارے میں اس بات کو دہرانا غیرضروری ہے کہ یہ ایک زندہ، خوبصورت اور مشترکہ زبان ہے جس کے اندر ہندوستان کے دانشوروں، فن کاروں، مذہبی مبلغوں، دھرم کے پرچارکوں اور سیاست دانوں کا صدیوں کا اکھٹا کیا ہوا سرمایہ محفوظ ہے اور یہ بھی کہ یہ زبان اسی ملی جلی تہذیب اور مشترکہ تمدن کی دین ہے جو ۲۵ برسوں سے ہمارے قومی رہنماؤں کا آدرش بنا ہوا ہے، اور یہ بھی کہ یہ خالص ہندوستان کی زبان ہے اور وزیراعظم اندرا گاندھی کے بقول "کسی دوسرے ملک کی زبان ہو نہیں سکتی"۔

جس طرح ایک خاص آب و ہوا اور موسم کا متقاضی کوئی پودا، مختلف آب و ہوا اور مخالف ماحول میں زندہ نہیں رہ سکتا، اسی طرح زبانیں بھی مصنوعی آب و ہوا میں زندہ نہیں رہ سکتیں، پاکستان کے ارباب دانش نے جہاں اور بہت سی غیردانش مندانہ باتیں کی ہیں۔ یہ غلطی بھی ان سے سرزد ہوئی کہ انھوں نے اردو کو پاکستان کی سرکاری زبان قرار دے دیا۔ تقسیم ہند کے شدید ہیجانی دور اور جذباتی فضا میں اس وقت تو کوئی نہیں بولا اور پاکستان میں اردو کی سرکاری حیثیت کو دینی ضروریات کے ایک حصہ کے طور پر ظاہر کیا گیا لیکن اس کی بدولت اردو کو تاریخ کی جن خوفناک اور اذیت دہ آزمائشوں میں مبتلا ہونا پڑا، وہ تقریباً سبھی کے لئے معلوم اور معروف ہیں

جیسا کہ اس دنیا کا قاعدہ ہے غیرقدرتی عمل کے نتائج بھی مایوس کن اور غیرقدرتی ہی نکلتے ہیں، اردو زبان کے بارے میں بھی اسی اصول کی صداقت ظاہر ہوکر رہی، پاکستان میں جہاں واہ واہ کے شور اور تحسین کے نعروں کے درمیان اسے سرکاری زبان کی باعزت مسند پر بٹھایا گیا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کے خلاف ناگواری اور مخالفت کے جذبات اُبھرنے لگے اور بالآخر نفرت اس درجہ تک ترقی کر گئی کہ آج پاکستان میں اس زبان کا وجود خطرے میں پڑ گیا ہے اور اردو بولنے والوں کے خلاف ہنگامہ آرائیوں اور فسادات کی نوبت پہنچ گئی ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ اردو کا قلم ایک ایسی زمین میں لگایا گیا تھا جہاں اس کی نشوونما کے آثار و امکان مفقود تھے۔

اس کے برخلاف ہندوستان میں، بظاہر لسانی جھگڑوں لیکن درحقیقت سیاسی ردعمل کے باعث ۲۵ برس تک اس زبان کی مخالفت اتنے خوفناک طریقہ پہ کی گئی کہ اس کا وجود اور مستقبل دونوں کے متعلق مایوسی پیدا ہوگئی اور عام طور پر یہ خیال کیا جانے لگا کہ کوئی دن جاتا ہے کہ اردو کم از کم ہندوستان میں فسانۂ ماضی اور گئے وقتوں کی سرگزشت کے طور پر تو شاید یاد رکھی جائے ایک زندہ اور چلتی زبان کی حیثیت سے ہرگز باقی نہ رہ سکے گی۔ اتنے شدید مخالف ماحول اور ناسازگار فضا میں بھی یہ زبان زندہ اور موجود رہی تو اس کا پہلا سبب یہی ہے کہ یہ زبان نہ صرف یہیں کے ماحول اور موسم کی پیداوار تھی بلکہ اسی آب و ہوا میں اس کی زندگی اور نشوونما کے سارے ضروری سامان موجود تھے اب موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے تو ۲۵ برس تک اردو کی حالت ایک ایسے درخت کی تصویر پیش کرتی ہے جو خزاں کے موسم میں اتنا ویران اور پھول پتوں سے اتنا محروم ہو جاتا ہے کہ بادیٔ النظر میں اس کے دوبارہ پھلنے پھولنے کا امکان ہی دکھائی نہیں دیتا اور دور سے دیکھنے والا یہی سمجھتا ہے کہ یہ خشک درخت اب جلانے کے سوا کسی کام میں نہیں آسکتا، لیکن جوں ہی خزاں کا موسم ختم ہوتا ہے تو دیکھتے ہی دیکھتے یہ سوکھا ہوا درخت سرسبز پتوں، جھومتی ہوئی شاخوں، خوشگفتہ پھولوں اور رسیلے پھلوں سے لدا ہوا نظر آنے لگتا ہے اور اس وقت اس کا دیکھنے والا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ کسی وقت یہ درخت زندگی کی علامتوں سے محروم اور خشک لکڑیوں کے ایک انبار کی شکل میں ایستادہ تھا۔

اردو کا مسئلہ اس وقت جن نازک مراحل سے گزر رہا ہے، ان کے پیش نظر اس طرح رجائیت سے بھرپور خیالات شاید قبل از وقت معلوم ہوں لیکن مجھ جیسے لوگ جو اس ملک کی جمہوریت اور اعلیٰ انسانی قدروں پر اٹوٹ اعتقاد رکھتے ہیں اس بارے میں مایوس ہونے پر ایک منٹ کے لئے بھی تیار نہیں ہو سکتے، اگر اس ملک میں جمہوری نظام باقی رہتا ہے، مضبوط اور مستحکم بنتا ہے تو یقیناً اس کے تقاضے بھی پورے ہوں گے اور اس کی وہ برکتیں بھی بہت دنوں تک محدود نہیں رکھی جا سکیں گی جن کی بدولت یہ نظام اس دنیا کا سب سے بہتر اور مقبول نظام قرار دیا جا چکا ہے۔

ایک بڑی اور فیصلہ کن لڑائی میں کامیابی کے بعد سیکولر اور سوشلسٹ قوتوں کے راج کی جو نئی صورت سامنے آئی ہے اس نے اردو زبان کے ساتھ ۲۵ برس تک روا رکھی جانے والی بے انصافیوں کے خاتمہ کی امید بھی پیدا کر دی ہے، معاشی اور سماجی میدانوں میں جہاں قومی قیادت نے جرأت مندانہ فیصلے کئے ہیں اور کامیابیاں حاصل کی ہیں وہیں اس کا امکان بھی بڑھا ہے کہ لسانی محاذ پر بھی اسی طرح کی جرأت اور حقیقت پسندی کی مثالیں دیکھنے کو ملے گی، اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو کی نشاۃ الثانیہ کا مسئلہ بیحد مشکل اور دقت طلب ہے، جتنا نقصان ہو چکا ہے، جتنی خرابیاں اور الجھنیں پیدا ہو چکی ہیں۔ اردو سے مکمل طور پر نابلد ایک پوری نسل ماضی سے کٹ کر مختلف میدانوں میں جس طرح پھیل چکی ہے، دفتروں سے، سرکاری اور عدالتی ایوانوں سے، اسکولوں اور کالجوں سے اس زبان کو جس طرح بے دخل اور سماجی، سیاسی اور تجارتی شعبوں میں اسے جس طرح متروک کر دیا گیا ہے وہ نہ صرف جمہوری نظام کے لئے ایک بدنما بات ہے بلکہ ایک ایسی خطرناک صورت پیدا ہو گئی ہے جسے جاری رہنے کی اجازت دی گئی تو قومی اور اجتماعی مفادات تک کو کئی طرح کے خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔

مخالفتوں، معاندانہ کوششوں اور سرکاری سرپرستی سے محرومی کے باوجود اردو زبان ایک ایسی زبان ہے جسے اب بھی کروڑوں لوگ بولتے اور اپنا مافی الضمیر ظاہر کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں، اس گئی گزری حالت میں بھی اگر سروے کیا جائے تو آج بھی انگریزی اور ہندی کے بعد اردو ہی خط و کتابت کا تیسرا بڑا ذریعہ ہے۔ ایک ایسی ناواقفیت جو ملک کے کروڑوں لوگوں کے درمیان آج بھی رابطہ کا کام دے رہی ہو کتنے دور رس اور خطرناک نتائج پیدا کر سکتی ہے اس کا اندازہ ان لوگوں کو ہونا چاہیئے جن پر قومی سالمیت کے تحفظ کی ذمہ داری ہے۔

کیا ایسی صورت حال کسی ملک اور قوم کے لئے اطمینان بخش اور مناسب قرار دی جا سکتی ہے کہ اس کے چھوٹے بڑے افسر اور عہدیدار ایک ایسی زبان سے بالکل ناواقف اور اس کے ذریعہ ہونے والی مراسلت کا مفہوم تک سمجھنے کے ناقابل ہوں جو کروڑوں لوگوں کے خیالات کی ترجمانی اور اظہار مطالب کا ذریعہ بنی ہوئی ہو! اقلیتوں اور اکثریت کے درمیان روز بروز بڑھنے والی خلیج کا ایک بہت بڑا سبب یہ بھی ہے کہ اس کے زیادہ تر افراد کی زبان کی ناواقفیت کے باعث ان کی شکایتوں اور ضرورتوں سے بے خبر رہتے ہیں اور معاملات کی اصل شکل و صورت اور نوعیت سے لاعلمی کی بدولت ان سے غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔

اس وقت سے پہلے کہ مسئلہ کو سنبھالنے کی کوئی صورت ہی باقی نہ رہ جائے اس نقصان کی تلافی کر لینی چاہیئے جو پہنچ چکا ہے، اور اس نقصان سے بچنا چاہیئے جو پہنچنے والا ہے۔ زبانوں کی موت و زیست کا دارومدار سیاسی فیصلوں پر ہرگز نہیں ہوتا، طاقت اور حکومت کے اختیارات اس سلسلے میں ہمیشہ بے بسی اور ناکامی سے دوچار ہوتے ہیں، قیصر ولیم نے ایک بار اپنی تقریر میں ایک جرمن لفظ کو مذکر کے بجائے مونث استعمال کیا تو ایک آدمی نے اسے ٹوکا۔

"یور مجسٹی! یہ لفظ مذکر ہے، تانیث کے صیغے میں استعمال نہیں ہوتا۔ کون کہتا ہے؟ قیصر نے خشمگیں تیوروں سے مخاطب کی طرف دیکھا گویا کہتا ہے، اس شخص نے ادب کے ساتھ عرض کیا کون بڑھئی کا بیٹا؟ قیصر نے حقارت کے ساتھ کہا وہ بڑھئی کا بیٹا ایک لفظ کو مذکر بنا سکتا ہے، میں شہنشاہ ہو کر اس کی جنس نہیں بدل سکتا نہیں! میں اسے مؤنث ہی استعمال کروں گا۔ قیصر نے یہ کہہ کر تقریر کا سلسلہ شروع کر دیا سب لوگ ادب سے خاموش ہو گئے"

لسانیات و ادب کے ناقدین نے اس واقعہ کو مثال میں پیش کرتے ہوئے فخر کے ساتھ لکھا ہے کہ وہ لفظ آج بھی مذکر ہی بولا جاتا ہے، ایک شہنشاہ ملک فتح کر سکتا ہے ایک لفظ کی جنس نہیں بدل سکتا۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ زبانیں اپنے چلن کے لئے عوام کی محتاج ہوتی ہیں حکومت اور طاقت کے فیصلوں کی پابند نہیں ہوتیں، بڑی مسرت اور اطمینان کی بات ہے کہ آج اردو کے حق میں جو فضا پائی جا رہی ہے اس میں حقیقت کے اعتراف اور ناانصافیوں کے احساس کے ساتھ ساتھ تلافی کی خواہش بھی خوشگواری پیدا کر رہی ہے۔ وزیر اعظم کی ذاتی دلچسپی نے اس معاملے کو فیصلہ کن مرحلے تک پہنچا دیا ہے اور اب اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ مدت سے لٹکتے ہوئے اس معاملے کو جلد از جلد طے کر دیا جائے اور تمام ان قانونی رکاوٹوں کو ختم کر دیا جائے جو اس مظلوم اور بدنصیب زبان کے راستے میں حارج ہیں۔

اس سلسلے میں سب سے زیادہ توجہ طلب مسئلہ اردو کو قانونی تحفظات مہیا کرنے کا ہے۔ وعدے اور یقین دہانیاں کبھی بھی قانون کا بدل نہیں بن سکتیں اور کوئی زبان اس وقت تک ترقی اور نشو و نما کے لئے سازگار حالات حاصل نہیں کر سکتی جب تک اس کے ساتھ اقتصادی فوائد وابستہ نہ ہوں، جب تک مال اور فوجداری کے محکموں، سرکاری خط و کتابت کے زمروں، پولیس اور انتظامیہ کے شعبوں، اسکولوں اور کالجوں کی عمارتوں میں اردو کی تعلیم لازمی اور سرکاری نوکریوں اور ذمہ دار عہدوں کے لئے اردو کا جاننا ضروری قرار نہیں دیا جائے گا، اس وقت تک وزیر اعظم کا یہ وعدہ پورا نہیں ہو سکتا کہ اردو کو اس کا جائز مقام دیا جائے گا۔ جائز مقام اس کے علاوہ دوسرا نہیں ہو سکتا کہ اس کی وہ پرانی پوزیشن بحال کر دی جائے جس سے اس زبان کو بے وجہ معزول کر دیا گیا تھا، انگریزوں کے دور میں یہ زبان انگریزی کی برتری قبول کرنے پر آمادہ ہو سکتی تھی تو قومی حکومت کے دور میں ہندی کی برتری کیوں نہ قبول کرے گی، اس لئے اس بروقت فیصلے میں کسی جھجک سے کام نہ لینا چاہیئے کہ اسے شمالی ہندوستان کے ان خطوں کی دوسری سرکاری زبان تسلیم کر لیا جائے جن میں اس کا چلن ایک صدی سے موجود تھا۔

پروفیسر مسعود حسین خاں

اردو: دوسری سرکاری زبان



اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ شری کملاپتی ترپاٹھی نے ایک وفد سے اردو کے بارے میں اپنی بہترین خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ اردو بہر صورت اتر پردیش کی دوسری سرکاری زبان نہیں بنائی جاسکتی اس لئے کہ یہ ریاست کے مفاد سے بعید ہوگا!

چودھری چرن سنگھ، سابق وزیر اعلیٰ اتر پردیش نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبا کے ایک استقبالیہ میں ان کی عرضداشت کا جواب دیتے ہوئے زیادہ واضح الفاظ میں کہا تھا کہ میں اردو کو ریاست کی دوسری زبان بنانے کی تائید میں نہیں ہوں، اس لئے کہ اس کے لئے ریاست کے ہندوؤں کی اکثریت تیار نہیں ہے!

اردو کی بدنصیبی یہی ہے کہ اتر پردیش ہو یا بہار، آندھرا پردیش ہو یا مہاراشٹر، اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کے لئے نہ تو وہاں کی قیادت تیار ہے اور نہ عوام۔ ان کے دلوں میں یہ بات جاگزیں ہے کہ ایسا کرنا ایک نئے فتنے کو جگانا ہے پچھلے پچیس سال کے پروپیگنڈے کے ذریعے سیاسی قیادت نے عوام کو باور کرا دیا ہے کہ اگر اردو کو اس کا حق مل گیا تو ملک کی سالمیت خطرے میں پڑ جائے گی۔ ان کے خیال میں اردو تفرقے اور فرقہ پرستی کی زبان ہے۔

لسانی اکثریت نے اپنی فرقہ پرستی کو چھپانے کے لئے یہ منطق بھی تراشی کہ لسانی بنیادوں پر ریاستوں کی تنظیم ہو جانے کے بعد دو لسانی ریاست کا مسئلہ ہی نہیں پیدا ہوتا۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ اس تنظیم کے بعد بھی عرصے تک بمبئی، مدھیہ پردیش، اور پنجاب کی ریاستیں دو لسانی رہی ہیں۔ آج پنجابی ریاست بن جانے کے بعد بھی ہندی کو ایک باعزت مقام دلانے کے لئے جدوجہد جاری ہے!

جس طرح علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سلسلے میں تاریخی کردار، مخصوص کردار، اقلیتی کردار اور اس طرح کی بہت سی اصطلاحیں نکل پڑی ہیں اور ان سب کی موقع و محل کے لحاظ سے اپنی اپنی تعریف و تفہیم ہے اردو کے بارے میں بھی الفاظ کا یہ ستم (اور طلسم بھی!) علاقائی کیا گیا ہے۔ دفعہ ۲۹ میں مادری زبان کے بنیادی حق کو تسلیم کیا گیا ہے۔ دفعہ ۳۴۵ میں ریاستوں کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ "ایک یا ایک سے زیادہ زبانوں" کو اختیار کر سکتی ہیں۔ چنانچہ ریاستوں کی نئی تنظیم کے بعد بمبئی، مدھیہ پردیش اور پنجاب نے دو دو زبانیں (گجراتی اور مراٹھی، مراٹھی اور ہندی، پنجابی اور ہندی) کو تسلیم کیا تھا۔ دفعہ ۳۴۷ میں لسانی آمریت کے تدارک کا بھرپور بندوبست کر دیا ہے اور لسانی اقلیتوں کے ہاتھوں میں ایک موثر حربہ دے دیا ہے۔ چنانچہ اردو والوں نے اتر پردیش اور بہار میں دستخطی مہم کے ذریعے اس حربے کو استعمال بھی کرنا چاہا لیکن صدر جمہوریہ کی تائید نہ مل سکی۔ اردو والوں کی اس شکایت کا کوئی تشفی بخش جواب نہ تو کانگریس پارٹی کے پاس ہے اور نہ مرکزی سرکار کے پاس۔ شکایت اور زیادہ سنگین ہو جاتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مرکز اور ریاستوں میں اس وقت ایک ہی سیاسی پارٹی کی تشکیل کردہ حکومتیں تھیں۔ دراصل ریاستی حکومت نے مرکزی سرکار سے اور ریاستی شاخ نے کانگریس کی ہائی کمان سے اس مسئلے پر بغاوت کی تھی۔ آج بھی وہی صورت حال ہے کشش کاف کرم کے باوجود کام کی کوئی بات

سند نہیں ہوتی۔ ع

دروغ راست نمائے کہ داشتی، داری!

اردو کے سلسلے میں "علاقائی زبان" کی اصطلاح نہایت بدنمانہ رہی ہے۔ دستور میں یہ اصطلاح حصہ ۴ "سرکاری زبان" کے باب ۲ کے عنوان کے طور پر دفعہ ۳۴۵ سے قبل استعمال ہوئی ہے۔ اس کے دستور میں نہ تو کہیں تعریف کی گئی ہے اور نہ یہ کسی دفعہ کا حصہ ہے کہ قانونی حیثیت رکھتی ہو۔

اس لئے کسی ریاست کی دوسری زبان سے متعلق ساری بحث "سرکاری زبان" کے تحت ہونی چاہیئے کہ یہ دستور کے حصہ ۴ کا محیط عنوان ہے۔ دفعہ ۳۴۵ کے ذیلی عنوان "کسی ریاست کی سرکاری زبان یا زبانیں" سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے "زبانیں" ہی سے "دوسری یا ثانوی" سرکاری زبان کا مفہوم پیدا ہوتا ہے اس لئے کہ زبان، ریاستی زبان، دوسری سرکاری زبان کی تراکیب میں دیکھا جاسکتا ہے۔ یہاں بھی سیدھا سادہ مفہوم الفاظ کا شکار ہو کر رہ گیا ہے۔

ان اصطلاحوں کے گورکھ دھندے سے نکلنے کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مقدمہ کا آغاز اردو کے دستوری حق اور جواز کے تجزیاتی مطالعہ سے کیا جائے۔

دستور ہند کی رو سے اردو کے سلسلے میں حسب ذیل دفعات لائق توجہ ہیں۔

"(۱) ہندوستان کی سرزمین یا اس کے کسی حصے کے شہریوں کے کسی گروہ کو جس کی اپنی الگ زبان، رسم خط یا کلچر ہو، اسے برقرار رکھنے کا حق ہوگا۔"

"کسی ریاست کی قانون ساز جماعت کو اختیار ہے کہ قانون کے ذریعے ان زبانوں میں سے جو ریاست میں بولی جاتی ہوں ایک یا ایک سے زیادہ زبانوں کو یا ہندی کو اس ریاست کے سب یا بعض سرکاری مقصدوں کے لئے اختیار کر لے۔"

عنوان کے تحت اردو کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

دستور ہند کی مذکورہ بالا دفعات کو ترتیب وار رکھ کر اگر اردو کا مقدمہ مرتب کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اقلیتی زبانوں کے تحفظ کا اس میں پورا پورا بندوبست ہے "اگر اس بارے میں کوئی مطالبہ کیا جائے اور راشٹرپتی کو اس کا اطمینان بھی ہو جائے کہ ریاست کی آبادی کے ایک قابل لحاظ حصے کی خواہش ہے کہ وہ ریاست اس زبان کو جسے وہ حصہ بولتا ہے تسلیم کرے تو راشٹرپتی کو اس کا اختیار ہوگا کہ وہ ہدایت کریں کہ وہ زبان پوری ریاست میں یا اس کے کسی حصے میں ان مقصدوں کے لئے استعمال کی جائے جن کی وہ صراحت کریں۔"

ان دفعات کے علاوہ اردو کے نقطۂ نظر سے دستور کا شیڈول نمبر۸ بھی اہم ہے جو دفعات ۳۴۴ اور ۳۵۱ کے حوالے سے دیا گیا ہے اور جس میں "زبانیں" کے

جب کسی ریاست میں ایک سے زائد سرکاری زبانیں ہوں گی تو ان میں یقیناً فوقیت بڑی زبان کو حاصل ہوگی اور دوسری یا ثانوی زبان کو "پوری ریاست میں یا اس کے کسی حصے میں مخاص مقصدوں کے استعمال کئے جانے کی صراحت" ہوگی۔

چنانچہ صدر جمہوریہ چاہیں تو اردو کو بعض ریاستوں میں دوسری سرکاری زبان بنانے کا اعلان کرسکتے ہیں یا بغیر اس اعلان کے بھی بعض مقصدوں کے لئے اس کے استعمال کی صراحت اس طرح کرسکتے ہیں کہ اردو کو آئینی تحفظ مل سکتا ہے۔

اس آئینی تحفظ کے بغیر اردو کا ہندوستان میں کوئی مستقبل نہیں۔

اردو یونیورسٹی کی تجویز

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی

اردو یونیورسٹی کی تجویز سب سے پہلے میں نے قبلۂ دیدہ و دل ڈاکٹر ذاکر حسین، اس کے بعد ڈاکٹر سید عابد حسین اور پروفیسر خواجہ غلام السیدین کے حضور میں پیش کی تینوں نے مختلف جگہ اور مختلف لفظوں میں ایک ہی بات کہی۔ "یہ کام مشکل ضرور ہے لیکن کرنے کا ہے۔ اس سے بڑا شرف اور اس سے بڑی سعادت اور کوئی نہیں ہو سکتی۔" یہ تینوں دیدہ ور ماہر تعلیم ہیں اور انھوں نے اپنے اعجاز عمل سے مستقبل کی گزرگاہوں کو روشن کر دیا ہے۔ اس تجویز کو ان ناموں سے اسی لئے منسوب کر رہا ہوں کہ اس میں خیر و برکت ہو اور میری کوتاہیوں سے زیادہ کام کی اہمیت پر نظر رکھی جائے۔

اردو یونیورسٹی کی تجویز کا خلاصہ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے کہ جن حضرات کی مادری زبان اردو ہے اور جو اس کے ذریعہ تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کو ابتدائی سے لے کر اعلیٰ سطح تک اس کی پوری سہولت اور آسانی فراہم ہونا چاہیئے۔

یہ حق مجھے دنیا کے تمام ماہرین تعلیم نے دیا ہے اور میں کسی حال اس سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں۔ یہی روح ہمارے آئین و دستور میں کارفرما ہے یہی وہ اصول ہے جس پر گاندھی جی ساری زندگی عمل پیرا رہے۔ انھوں نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ "انگریزی کے ذریعہ تعلیم کو فی الفور بدل دینا چاہیئے اور ہر قیمت پر علاقائی اور قومی زبانوں کو ان کا صحیح مقام ملنا چاہیئے میں مجرمانہ تضییع اوقات کے مقابلے میں اعلیٰ سطح پر اس تعلیمی نراج کو ترجیح دوں گا جو عارضی طور پر انگریزی کے بدلنے سے پیدا ہوگا۔"

تعلیم کس زبان میں دی جانا چاہیئے۔ اس کا فیصلہ سیاست داں نہیں کریں گے بقول مہاتما گاندھی "اس کا فیصلہ تو ہر آزاد اور مہذب ملک میں پہلے ہو چکا ہے۔"

بعض حضرات کا خیال ہے کہ پہلے اردو کو ثانوی سرکاری زبان کا درجہ ملنا چاہیئے، اس کے بعد اردو یونیورسٹی کی گفتگو کرنا چاہیئے۔ دوسرے لفظوں میں جب تک یوپی بہار، اور دہلی "مشرف بہ اردو" نہ ہو جائیں گے یہ حضرات اعلیٰ سطح پر اردو کے ذریعہ تعلیم کا کوئی بندوبست کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ یہ عجیب و غریب منطق ہے! اچھا حکیم تو وہ ہے جو نسخہ میں معدہ اور جگر سب ہی کی رعایت ملحوظ رکھتا ہے۔ دراصل ان حضرات کے تحت الشعور میں یہ عقیدہ بھی کارفرما ہے کہ انگریزی ہمیشہ اسی طرح قائم رہے گی اور اس کی جگہ ہماری قومی زبانیں لے ہی نہیں سکتیں۔

علاقائی یا قومی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے اس کی تائید آل انڈیا کانگریس، ہندوستانی پارلیمنٹ، یکجہتی کاؤنسل، وزارت تعلیم، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن، ایجوکیشن کمیشن رپورٹ اور پبلک سروس کمیشن، غرض ہر ہر سطح پر ہو چکی ہے۔

میری گزارش صرف یہ ہے کہ اگر واقعی چودہ قومی زبانوں کو عملاً انگریزی کی جگہ لینی ہے تو اردو والوں کو اس کی ابھی سے پوری تیاری کرنا چاہیئے۔

مجھے اس کا کامل یقین ہے کہ اردو یونیورسٹی کا مطالبہ منظور ہو کر رہے گا اس لئے کہ یہ تعلیم کے صحیح

اصولوں پر مبنی ہے اور اس سے ملک کی تعلیمی تقدیر وابستہ ہے۔ یہی طریقِ تعلیم ایسا ہے جو فطرت کے عین مطابق اور نئے ہندوستان کے حالات سے ہم آہنگ ہے۔

اردو دنیا کی اہم زبانوں میں سے ہے اور اس کے بولنے والوں کی تعداد شمالی چینی اور انگریزی کو چھوڑ کر دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی کانگریس نے اس کو اپنے نیشنل ڈیفنس ایکٹ میں ان چند زبانوں میں شامل کیا ہے جو غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں[عہ]۔ عددی اعتبار سے روسی، ہسپانوی، جرمن اور جاپانی زبانوں کا نام اردو کے بعد آتا ہے۔ اردو بولنے والوں کی آبادیاں فیجی، قدیم برٹش گیانا، ٹرینی ڈاڈ، جنوبی اور مشرقی افریقہ، انگلستان، عدن، افغانستان پاکستان، ماریشس، برما، ملیشیا، سنگاپور اور انڈونیشیا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ یونسکو کوریر کی اطلاع کے مطابق دنیا میں اردو کے بولنے والوں کی تعداد ایک سو ساٹھ ملین کے قریب ہے[عہ]۔ اردو کے پروگرام دنیا کے تقریباً تمام بڑے بڑے مرکزی شہروں سے نشر کئے جاتے ہیں۔ اردو کے اخبار یا رسالے برصغیر ہند کے علاوہ انگلستان، سنگاپور اور افریقہ سے بھی شائع ہوتے ہیں۔ اور اردو کی تعلیم اور تحقیق کی سہولتیں ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ امریکہ، انگلستان اور روس کی بعض اہم یونیورسٹیوں میں بھی موجود ہیں۔

کسی ملک کی ترقی کا انحصار تعلیم پر ہے اور ماہرین اس پر متفق ہیں کہ طالب علم کی زبان اور تعلیم کی زبان میں فرق نہیں ہونا چاہیے اور وہ تعلیم یکسر بے وقعت اور بے معنی ہے جو مادری زبان میں نہ دی جائے یا جو اپنی تمدنی بنیادوں سے ناآشنا ہو۔ تعلیم کا مقصد چند کتابوں کو حفظ کر لینا نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد شخصیت کی تعمیر اور جذبات کی تہذیب ہے۔ اس کا مقصد فرد اور جماعت کے درمیان بھی ہم آہنگی پیدا کرنا ہے اور خوابیدہ صلاحیتوں کو اس طرح ابھارنا اور سنوارنا ہے کہ طالب علم اپنے سماج کی ذمہ داریوں کو خندہ پیشانی سے اٹھا سکے۔

ذہنی زندگی کی تربیت کے لئے جو اصل معنوں میں انسانی زندگی ہے، مادری زبان میں تعلیم سب سے زیادہ اہم ہے۔ جاپان نے اپنی علمی اور تہذیبی دولت کو عام کرنے کے لئے یہ ضروری سمجھا کہ مغربی علوم کو سیکھنے کے لئے مادری زبان کو ذریعۂ تعلیم بنائے۔ یہی اس کی ترقی اور خوشحالی کا راز ہے اور اسی کی وجہ سے آج تخلیقی فکر اور صنعت و حرفت کے میدان میں وہ بہت سے ملکوں سے آگے ہے۔

ہندوستان میں جو ترقی کی رفتار اتنی سست ہے اور اس کی ایک بڑی آبادی جو اس درجہ مردہ و بے ذوق ہے، اس کا سبب بھی یہ ہے کہ ہم نے تعلیم کی میزان میں مادری زبان کو وہ اہمیت نہیں دی جس کی وہ درحقیقت مستحق ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا انگریزی میں تعلیم جاری کرنے سے ایک مقصد یہ تھا کہ ان کو سستے محرر مل جائیں اور ہندوستانی، انگریزی پڑھ کر انگریزی مصنوعات کے دلدادہ ہو جائیں۔

جہاں تک ابتدائی تعلیم کا تعلق ہے ہندوستان کے آئین و دستور نے ہمیں یہ حق دیا ہے کہ ہم اسے اپنی مادری زبان (اردو) میں حاصل کریں۔ جب تک یہ دستور زیر عمل ہے یہ حق دنیا کی کوئی طاقت ہم سے نہیں چھین سکتی۔ اسکول کے بعد ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی منزل آتی ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ اسکول میں تعلیم مادری زبان میں ہو اور ثانوی اور اعلیٰ سطح پر یہ رشتہ کٹ جائے۔ اور پھر ایک نئی زبان میں تعلیم حاصل کی جائے۔ اسی لئے ایجوکیشن کمیشن نے اپنی رپورٹ (۶۶-۱۹۶۴ء) میں لکھا ہے کہ چونکہ ہم نے اسکول کی سطح پر علاقائی زبان کو ذریعۂ تعلیم مانا ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس کا زیادہ سے زیادہ استعمال تعلیم کی اعلیٰ سطح پر بھی ہو۔ (ص ۱۳) جذباتی ہم آہنگی کی جو کمیٹی قائم ہوئی تھی۔ اس نے بھی یہی کہا تھا کہ علاقائی (یا مادری) زبان کا استعمال ابتدائی سے اعلیٰ سطح تک قومی یکجہتی کے لئے لازمی ہے جون ۱۹۶۲ء میں اس کی تائید قومی یکجہتی کا ونسل نے کی اور کہا بغیر علاقائی زبانوں کی مدد کے ہماری یونیورسٹیوں کے دانش ور عوام سے کوئی رشتہ اور تعلق قائم نہیں کر سکتے، جو جمہوری اشتراکیت کی بنیادوں کو استوار کرنے کے لئے از بس ضروری ہے۔

"ایجوکیشن کمیشن نے یہ بات اپنی رپورٹ میں صراحت سے لکھی ہے کہ ہندی یا انگریزی کو آڑ بنا کر علاقائی زبانوں کی حق تلفی نہیں کرنا چاہیئے۔ ہندی، غیر ہندی علاقوں کی مادری زبان نہیں بن سکتی۔ اور انگریزی، پورے ملک کی ضرورت کے پیش نظر ابدالآباد تک قائم نہیں رہ سکتی۔ اس نے یہ بھی واضح طور پر لکھا ہے کہ اردو ہر چند کہ عرف عام میں علاقائی زبان نہیں ہے لیکن اس کی ہندوستان گیر اہمیت ہے اور ہر تعلیمی سطح پر اس کی ہمت افزائی کرنا چاہیئے (ص ۱۵) آگے چل کر اس رپورٹ نے اس پر زور دیا ہے کہ اقلیتوں کی دلداری اور ان کے مفاد کے تحفظ کے لئے بھی ضروری ہے کہ اردو میڈیم کے کالج اور دوسرے ادارے ہوں، اور ان کے قیام کی نہ صرف اجازت ہو بلکہ ان کی ہمت بڑھائی جائے (ص ۲۹۲) اسی طرح کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اپنے اجلاس منعقدہ نئی دہلی ۵ اگست ۱۹۴۹ء کی تجویز میں یونیورسٹی کی سطح پر اردو کو صوبائی یا علاقائی زبان کی حیثیت سے تعلیم کا ذریعہ مانا ہے۔ ۱۷ مئی ۱۹۵۳ء کی تجویز میں پھر اس پر اصرار کیا ہے کہ آئین کے آٹھویں شیڈول کی خاص زبانوں میں اردو بھی شامل ہے اور اس کو قومی زندگی میں "مناسب جگہ ملنا چاہیئے۔ ۱۵ مئی ۱۹۵۸ء کی تجویز میں خاص طور پر یہ وضاحت کی ہے کہ اردو ہماری قومی زبان ہے اور صوبائی اور مرکزی حکومتوں کو ہدایت ہے کہ وہ علاقائی زبان کی حیثیت سے اردو کی تعلیم اور اس کے استعمال کی تمام ضروری سہولتیں بہم پہنچائیں۔ ۱۳ فروری ۱۹۷۵ء کی تجویز میں لکھا ہے کہ آل انڈیا سروس کے

عہ عنوان ۶ سیکشن ۱۰۷ ب

عہ یونسکو کوریر مورخہ ۱۹۵۴ء نمبر ایک ص ۳۲

جملہ امتحانات علاقائی زبانوں میں بھی ہوں اور امیدواروں کو یہ اختیار ہو کہ وہ جس علاقائی یا قومی زبان کو چاہیں اختیار کریں۔

اب اردو والوں کو یہ طے کرنا ہے کہ وہ چودہ قومی زبانوں میں سے کس زبان کو ذریعۂ تعلیم بنائیں گے اردو کو؟ یا آسامی، بنگالی، گجراتی، ہندی یا کنٹر کو۔ انتخاب اردو یا انگریزی میں کرنا نہیں ہے بلکہ اردو یا آٹھوں شیڈول کی جدید ہندوستانی زبانوں میں سے کسی ایک زبان کو انتخاب کرنا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اردو والوں کا فیصلہ اردو کے حق میں ہوگا جو ان کی مادری زبان ہے اور جو ہندوستان کی تین ریاستی، قومی زبان ہے اسی کے ذریعے ہم اپنے تمدنی نصب العین کو پاسکیں گے اور علم کی تخلیقی توانائیوں کو وسیع تر علاقے میں پھیلا سکیں گے۔ یہ جمہور کا دور ہے اور ہمیں پورے سماج کو ساتھ لے کر چلنا ہے ان کی رہنمائی اس تعلیم سے نہیں ہوسکتی، جو صرف چند خواص کے لئے محدود ہو۔

ان مقاصد کو حاصل کرنے کی واحد صورت یہ ہے کہ ہم ایک اردو یونیورسٹی قائم کریں اور اس کو نئے ہندوستان اور نئی سائنسی تہذیب کا مرکز بنادیں۔ یہ ہماری مشترکہ زندگی کی آئینہ دار، اردو کے اتحاد پسندانہ کردار کی مظہر، اور علوم جدیدہ کی اعلیٰ دانش گاہ ہو۔ اس کا مقصد ایک ایسے متحرک ہندوستانی معاشرے کی تخلیق کرنا ہو جس میں جوش کردار کے ساتھ ساتھ فکر تازہ اور جرأت اندیشہ ہو، اور جس کی بدولت نئے صبح و شام پیدا کرسکیں اور اس قدیم ملک میں علم و ہنر کی بہترین روایات زندہ ہو جائیں۔

اس وقت ملک کے سامنے سب سے اہم کام نئے ہندوستان اور نئی ہندوستانیت کی تعمیر ہے۔ اس کام میں اردو کا حصہ بہت نمایاں ہوگا۔ اس لئے کہ اردو ہند آریائی زبان ہے اور نا مذہبی اور عوامی فضا میں پلی اور بڑھی ہے۔ نئے ہندوستان کا قافلہ بھی نامذہبی اور جمہوری راستے پر چل رہا ہے۔ دونوں میں کوئی تضاد نہیں، ربط ہے۔ اردو کو ہندوستانی زبانوں میں جو اہمیت حاصل ہے وہ بھی اتفاقی نہیں بلکہ ہزاروں سال کی تمدنی ضروریات اور تحریکات کا لازمی نتیجہ ہے۔ اردو دراصل شورسینی اپ بھرنش کا ورثہ ہے جو بارہویں صدی کے قریب کھڑی بولی کو ملا ہے۔ وہ عوامل جنھوں نے اردو کو پروان چڑھایا وہ ہندوستان کی زمین اور آب و ہوا میں اب بھی موجود ہیں۔ ان سے اگر ہم کام لیں تو اردو نئے ہندوستان اور نئی ہندوستانیت کی تعمیر میں بہت بڑی مدد دے سکتی ہے۔

اردو یونیورسٹی کسی ایک مذہبی طبقہ سے وابستہ نہیں ہوگی۔ اردو کا کردار سیکولر رہا ہے اور اس کے بنانے اور سنوارنے میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب برابر کے شریک رہے ہیں۔ یہی خصوصیت اردو یونیورسٹی کی بھی ہوگی۔ اس کے دروازے بلا امتیاز مذہب و ملت ان تمام لوگوں کے لئے کھلے ہوں گے جو اپنی مادری زبان، یعنی اردو میں، جدید تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

اگر ہم قدیم دلی کالج، شمس الامرا امیر کبیر ثانی، سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی۔ ٹامسن سول انجینئرنگ کالج رڑکی۔ میڈیکل کالج آگرہ، اور عثمانیہ یونیورسٹی کی کوششوں کو سامنے رکھیں تو معلوم ہوگا کہ اردو میں علمی مضامین کی بہتات رہی ہے اور وہ سائنسی لٹریچر سے تہی دامن نہیں ہے۔ تاہم اردو کو نئے علوم سے معمور کرنے کے لئے اشد ضروری ہے کہ اچھے استاد اردو میں کتابیں لکھیں اور اس تخلیقی کام میں دل و نگاہ و نفس سب کچھ لگادیں۔ حکومت ہند نے "ترقی اردو بورڈ" کو ایک کروڑ روپیہ دیا ہے اور اس کو یہ کام سونپا ہے کہ وہ اردو میں کالج اور یونیورسٹی کی سطح کی معیاری کتابیں تیار کرائے۔ بعض نئی ہوں، بعض ترجمہ۔ حکومت کے سامنے یہ تجویز بھی ہے کہ ان اعلیٰ درجے کی درسی کتابوں کی تیاری پر بعض مغربی ملکوں کی طرح ان استادوں کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دی جائے اور ترجمے سے زیادہ نئی کتابیں لکھوانے کا اہتمام کیا جائے۔ درسی کتابوں کے ساتھ ایک مسئلہ وضع اصطلاحات کا ہے لیکن اس معاملے میں "ترقی اردو بورڈ" نے پچھلی تاریخ، موجودہ چلن اور زبان کے مزاج کا خیال رکھا ہے۔ اور انگریزی اصطلاحوں کے لینے سے بھی گریز نہیں کیا۔

اردو یونیورسٹی کے طلبا صرف اردو ہی سے واقف نہیں ہوں گے بلکہ وہ انگریزی اور ہندی بھی اچھی طرح جانتے ہوں گے۔ ان کی مہارت ان زبانوں میں زیادہ ہوگی اس لئے کہ وہ اپنی زبان کو اچھی طرح جانتے ہوں گے۔ اور ایک زبان کو اچھی طرح جاننے کے بعد ہی دوسری زبان اچھی طرح سیکھی جاسکتی ہے۔ ہالینڈ چھوٹا سا ملک ہے لیکن وہاں ہر بچہ بڑا چار زبانیں جانتا ہے۔ ہندوستان میں بھی یہ ضروری ہے کہ ہم کم سے کم تین زبانوں سے واقف ہوں۔ مادری زبان سے ہماری صاحب سلامت دور کی نہ ہو۔ بلکہ وہ ہمارے دل اور دماغ کے ریشے ریشے میں زندہ ہو اور ہماری شخصیت کا ایک ضروری حصہ ہو۔ دوسرے ہم سرکاری زبان سے اچھی طرح واقف ہوں۔ جہاں تک ہندی کا تعلق ہے اردو، ہندی سے ہندوستان کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ قریب ہے اور اگر ہمیں جمہوریت اور یونیورسل سفریج کے تجربوں کو کامیاب بنانا ہے تو ان دونوں زبانوں کو اور زیادہ قریب لانا ہوگا۔ دستور کی دفعہ ۳۵۱ میں لکھا ہے کہ ہندی زبان کا ایک وسیع تصور سامنے رکھا جائے اور اور اس کو اس طرح ترقی دی جائے کہ وہ ہندوستان کی مختلف تہذیبوں کے اظہار خیال کا ذریعہ بن جائے یہ بھی اردو کے لئے ایک بڑا موقع ہے وہ اپنی ملنساری اور عوام دوستی سے نہ صرف یہ کہ ہندی پر بڑا اثر ڈال سکتی ہے بلکہ اس کا رخ بھی متعین کرسکتی ہے تیسرے ہم ایک یوروپی زبان پر قدرت رکھتے ہوں جس کی بدولت نئی دنیا کے قدم بہ قدم چل سکیں۔ اس زمرے میں یہ حالت موجودہ انگریزی ہی آسکتی ہے۔

اردو والوں کو اب تک یقین نہیں ہے کہ انگریزی کی جگہ چودہ قومی زبانوں کو دی گئی ہے اور

سیکولر ڈیموکریسی

اب ان کے لئے ہر سطح پر مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنا ممکن ہے اور اسی لئے پبلک سروس کمیشن نے سرکاری ملازمتوں کے لئے اردو میں امتحانات کا انتظام کیا ہے اور اسی لئے اردو کو، یونیورسٹی کی سطح پر ایک کروڑ روپیہ درسی کتابیں تیار کرنے کے لئے دیا گیا ہے۔

ہم مادری زبان میں تعلیم حاصل کرتے ہوئے اس لئے ڈرتے ہیں کہ اس سے ہمیں ملازمت نہیں ملے گی۔ یہ رونا صرف اردو کا نہیں بلکہ پوری قومی زندگی کا رونا ہے۔ اس کے پیچھے جو ذہنیت کارفرما ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے سامنے زندگی اور تعلیم کے وہ اعلیٰ مقاصد نہیں۔ جو اسے بامعنی اور بامقصد بنا دیتے ہیں۔ ہم مادری زبان کی تعلیمی اہمیت سے بے خبر ہیں اور کل تہذیبی زندگی میں اس کا جو مقام ہے اس کے شناسا نہیں۔ روٹی کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں بارہویں صدی عیسوی سے جب سے یونیورسٹیوں کا تصور وجود میں آیا ہے روزگار کی اہمیت پیش نظر رہی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ذاتی صلاحیت اور تہذیبی مطالبے بھی نہایت درجہ اہم ہیں۔ بے روزگاری کا مسئلہ اتنا آسان نہیں۔ یہ کسی زبان کے پڑھنے یا نہ پڑھنے سے طے نہیں ہو سکتا۔ یہ اس سے کہیں بڑا مسئلہ ہے۔ یہ سارے ملک کی معاشی تنظیم کا معاملہ ہے۔ پیداوار کی اور دولت کی مناسب تنظیم اور بہتر تقسیم کا مسئلہ ہے۔

اردو یونیورسٹی اگر قائم ہو گئی تو اس کے ذریعے اردو کے ریاستی اور علاقائی مفادات کو بھی تقویت پہنچے گی اور کئی ریاستوں میں اس کو جائز مقام مل سکے گا۔ یہ گویا اس ضمن میں پہلا ضروری قدم ہے۔ یہ بھی ناممکن ہے کہ ہماری فلاحی اور جمہوری حکومت ۲۹ ملین آبادی کو یکسر نظرانداز کر دے یا ان کے روزگار کا خیال نہ رکھے۔

میری یہ بھی خواہش ہے کہ اردو یونیورسٹی جہاں تک تعلیمی معاملات کا تعلق ہے اسی طرح آزاد ہو جیسے دہلی، بنارس، کیمبرج اور ہارورڈ کی یونیورسٹیاں ہیں۔ قومی حکومت سے مدد لینے میں مضائقہ نہیں بلکہ اس کو ان ذمہ داریوں کی طرف متوجہ کرنا چاہیئے لیکن اگر اردو والوں کو ایک صحت مند سماج کی حیثیت سے زندہ رہنا ہے جس کے ذہن اور دماغ پر تالے لگے ہوئے نہ ہوں بلکہ جو ترقی کی دوڑ میں برابر کے شریک ہوں تو ان کی یونیورسٹی کو آزادیِ خیال، تہذیبِ ذوق اور تخلیقی فکر کا سب سے بڑا مرکز ہونا چاہیئے۔

اگر ہم نے سچا ارادہ کر لیا ہے اور اس مثبت مقصد کے لئے اپنی ساری ناتواں توانائیوں کو جمع کر لیا تو مشکلات راستے سے ہٹ جائیں گی اور اردو یونیورسٹی ایک روشن حقیقت بن کر سامنے آجائے گی۔

اردو یونیورسٹی کیسے اور کہاں قائم ہو؟

عبداللطیف اعظمی

کئی سال سے اردو دوستوں کی طرف سے اردو یونیورسٹی کے قیام کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ اس مطالبے کے جواز اور صحت سے اردو کا کوئی ہمدرد اور بہی خواہ انکار نہیں کر سکتا۔ اردو ہندوستان ہی میں پیدا ہوئی، بڑھی، جوان ہوئی۔ اس کے پرستاروں اور چاہنے والوں میں ہر مذہب اور علاقے کے لوگ شامل ہیں، ملک کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں اس کے بولنے والے اور سمجھنے والے موجود نہ ہوں۔ اسی لئے اردو والوں کا یہ مطالبہ کہ ان کے ادب کی ترقی و فروغ اور ان کے نوجوانوں کی تعلیم کے لئے ایک یونیورسٹی ہونی چاہیئے، ہر لحاظ سے نہ صرف یہ کہ مناسب اور جائز ہے بلکہ اس کو منظور کرنا ایک جمہوری اور انصاف پسند حکومت کے لئے ضروری ہے۔ مگر یہ مجوزہ اردو یونیورسٹی کیسے ہو اور کہاں ہو؟ اس پر اچھی طرح غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سے بھی پہلے اس کے مسائل پر اور اس کے قیام کی راہ میں جو مشکلات ہیں، اس پر، جذبات سے الگ ہو کر اور دل و دماغ کو تمام تعصبات اور جانب داری سے پاک کر کے، غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔

اردو کا کوئی ہمدرد اور دوست ان مشکلات اور دقتوں سے انکار نہیں کر سکتا جو مجوزہ یونیورسٹی کے قیام کی راہ میں پیش آئیں گی۔ میرے نزدیک جو مشکلات اور دقتیں پیش آسکتی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ سب سے پہلا اور اہم ترین مسئلہ یونیورسٹی کا قیام ہے اس زمانے میں کسی یونیورسٹی کا قیام آسان نہیں ہے ایک اچھی یونیورسٹی کے لئے کروڑوں روپے کی ضرورت ہے اس میں شبہ نہیں کہ آج کل اردو کے بارے میں کم از کم مرکزی حکومت کا رویہ بہت اچھا ہے۔ بہت سی ریاستوں میں ہمدردانہ جذبہ پیدا ہو گیا ہے اور بہت کچھ کیا جا رہا ہے اور بہت کچھ ہوتا ہے۔ مگر اس کے باوجود مجھے یقین نہیں کہ مرکزی حکومت یا کوئی ریاستی حکومت اردو کی کوئی بالکل ہی نئی یونیورسٹی قائم کر دے گی۔ البتہ اگر اردو والے اس قابل ہوتے کہ وہ اس سلسلے میں مالی تعاون کر سکتے تو صورت حال مختلف ہوتی

اردو یونیورسٹی پاکستان میں!

نامناسب نہیں ہوگا اگر میں یہاں پاکستان کا ذکر کر دوں، جہاں بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم

جیسی بااثر شخصیت کی کوششوں کے باوجود اردو یونیورسٹی قائم نہ ہوسکی بڑی مشکلوں سے ایک اردو کالج قائم ہوا تھا جس کے لئے بابائے اردو کو بڑے پاپڑ بیلنے پڑے۔ پھر بھی ان کی زندگی میں اس کی حالت بہت ہی خراب اور ناقابل اطمینان بخش تھی، اب خدا جانے اس کی کیا حالت ہے۔

۲۔ لیکن اگر بہ فرض محال سیاست کے دباؤ میں آکر حکومت نے اردو یونیورسٹی قائم بھی کر دی تو پھر اس کے لئے طالب علم کہاں سے آئیں گے؟ اگر اردو کی مجوزہ یونیورسٹی بہت مختصر ہوئی تب بھی کئی درجن ایسے اسکولوں کی ضرورت ہوگی جن کا ذریعۂ تعلیم اردو ہو۔ فی الحال شمالی ہند میں، ایسے اسکول نہیں ہیں۔ کئی مرتبہ کوشش کی گئی کہ یو پی میں جو اسکول مسلمانوں کے انتظام و انصرام میں ہیں ان کا ذریعۂ تعلیم اردو کر دیا جائے، مگر اندیشہ ہائے دور دراز کے پیش نظر یہ کوششیں کامیاب نہیں ہوسکیں اور آئندہ کے لئے بھی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ کامیاب ہوسکیں گی۔ بمبئی میں اردو ذریعۂ تعلیم کے متعدد اسکول ہیں اور غالباً آندھرا پردیش میں بھی ہیں۔ مگر اس کی توقع رکھنا کہ شمالی ہند میں اردو کی جو یونیورسٹی قائم ہوگی اس میں مہاراشٹر اور آندھیر پردیش کے طالب علم برآمد کرکے اس کی ضرورت پوری کر دی جائے گی، خام خیالی سے کم نہیں۔ حکومت یو پی نے ابھی حال میں اردو کے ٹیچروں کے سلسلے میں جو فیصلہ کیا ہے اور اگلے سال کے تعلیمی سال سے جس پر عمل ہوگا، اس سے ظاہر ہے کہ اتنے طالب علم نہیں مل سکتے جو ایک یونیورسٹی کی ضرورت کو پورا کر سکیں۔ جامعہ ملیہ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ پورے ملک میں، اس وقت صرف یہی ایک یونیورسٹی ہے جس کا ذریعۂ تعلیم اردو ہے، مگر آزادی کے بعد سے ایسے طالب علموں کی تعداد برابر کم ہو رہی ہے جو اردو سے بخوبی واقف ہوں اور یونیورسٹی کی سطح پر وہ اردو میں تعلیم حاصل کر سکیں۔

۳۔ اسی طرح اردو کے ذریعہ پڑھانے والے استادوں کا مسئلہ ہے۔ ظاہر ہے مجوزہ اردو یونیورسٹی میں وہ تمام مضامین پڑھائے جائیں گے جو آج کل ایک مکمل اور معیاری یونیورسٹی میں پڑھائے جاتے ہیں اور جن کے بغیر کوئی شخص تعلیم یافتہ کہلانے کا مستحق نہیں۔ اس وقت اس کے لئے جو بھی استاد ملیں گے انھوں نے یا تو انگریزی کے ذریعۂ تعلیم حاصل کی ہوگی یا ہندی کے ذریعہ، اور تعلیم کا ان کا جو بھی تجربہ ہوگا وہ انھیں دونوں زبانوں میں سے کسی ایک میں تعلیم دینے کا ہوگا، ایسی صورت میں یک بہ یک وہ اردو میں کیسے پڑھانے لگیں گے؟

۴۔ ایسا ہی ایک اہم مسئلہ اردو میں کتابوں کا ہے۔ کہا جا سکتا ہے بلکہ کہا جاتا ہے کہ ترقی اردو بورڈ کی نگرانی میں جو ترجمے کئے جا رہے ہیں ان سے یہ ضرورت پوری ہو جائے گی۔ ترقی اردو بورڈ کی رفتار ترقی سے میں بخوبی واقف ہوں، اس لئے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ابھی کئی سال لگیں گے جب تمام ضروری مضامین میں کتابیں چھپ کر مل سکیں گی، لیکن ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ جب یہ کتابیں چھپ کر بازار میں آئیں گی، تو ان میں سے وہ تمام کتابیں جن میں تازہ ترین اعداد و شمار دیئے ہوں گے اور جدید ترین نظریوں سے بحث کی گئی ہوگی، پرانی (آوٹ آف ڈیٹ) ہو چکی ہوں گی۔ مجھے معلوم ہے، ایک صاحب نے معاشیات کی ایک کتاب کا ترجمہ کیا۔ انھوں نے تازہ ترین اڈیشن سے ترجمہ کیا تھا، مگر جب مکمل کرکے ترقی اردو بورڈ کے حوالے کر دیا تو اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن بازار میں آگیا۔ ظاہر ہے اس میں پچھلے ایڈیشن کے مقابلے میں، جس سے ترجمہ کیا گیا تھا۔ تازہ ترین اعداد و شمار ہوں گے اور ملک کے مسائل میں بھی کچھ نہ کچھ تبدیلیاں آئی ہوں گی۔ اس خرابی کا علاج صرف اسی صورت میں ممکن ہے۔ جب خود مجوزہ یونیورسٹی کے پاس اتنا فنڈ ہو اور اس کے وسائل اتنے وسیع ہوں کہ وہ خود ضروری کتابیں چھپوا سکے یا پھر جامعہ ملیہ کی طرح کتابوں پر کم سے کم انحصار کیا جائے اور لیکچر کا طریقہ رائج کیا جائے۔

میں نے اس زمانے میں جامعہ ملیہ میں اردو کے ذریعہ تعلیم حاصل کی ہے، جب جامعہ عثمانیہ اور دارالترجمہ دونوں زندہ تھے، مگر اس وقت بھی انگریزی کی کتابوں سے بے نیاز نہیں ہوسکتے تھے۔ مگر اس وقت کتابیں نہیں مضامین پڑھائے جاتے تھے، استاد تازہ ترین کتابوں سے نوٹ تیار کرکے اردو میں لیکچر دیتے تھے، اس طرح اردو کی کتابوں کی کمی کا مسئلہ تعلیم کی راہ میں حائل نہیں تھا۔

مشکلات کا حل

اوپر میں نے جن مشکلات اور دقتوں کا ذکر کیا ہے، ان کا حل میرے نزدیک صرف یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ اردو کی کوئی نئی یونیورسٹی قائم کی جائے، موجودہ یونیورسٹیوں میں کسی کو جو اس کے لئے تیار ہو، اردو یونیورسٹی میں تبدیل کر دیا جائے۔ ظاہر ہے اردو والوں کا بنیادی مطالبہ یہ نہیں ہے اور نہ وہ اس پر اصرار کریں گے کہ ہر حالت میں کوئی نئی یونیورسٹی قائم کی جائے۔ وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ اردو میں یونیورسٹی کی سطح پر تعلیم کا انتظام ہونا چاہیئے۔ یہ انتظام کوئی نئی یونیورسٹی قائم کرکے بھی کیا جا سکتا ہے اور موجودہ یونیورسٹیوں میں سے کسی کا ذریعۂ تعلیم اردو قرار دے کر بھی کیا جا سکتا ہے۔

موجودہ یونیورسٹیوں میں سے، میرے خیال میں صرف دو یونیورسٹیاں ایسی ہیں جن سے یہ ضرورت بدرجہ اتم پوری کی جا سکتی ہے، ایک مسلم یونیورسٹی علیگڑھ اور دوسری جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی۔ مسلم یونیورسٹی کا ذریعۂ تعلیم، دفتری زبان اور طلبا کی یونین کی زبان اب بھی انگریزی ہے۔ میں نے وہاں کے اساتذہ اور طلبا سے بارہا بات کی ہے، وہ اپنی یونیورسٹی کا موجودہ ذریعۂ تعلیم بدلنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اساتذہ کا کہنا ہے خاص طور پر انجینئرنگ، سائنس اور میڈیکل کالج کے اساتذہ کا کہ ان فنون کی اردو میں تعلیم ممکن نہیں ہے انجینئرنگ کے جن پرنسپل صاحب سے میری بات ہوئی تھی ان کا تعلق حیدرآباد سے ہے، انھوں نے فرمایا کہ اردو میں انجینئرنگ وغیرہ کی تعلیم کا جامعہ عثمانیہ میں تجربہ بالکل ناکام رہا۔ طلبا کا کہنا ہے کہ ہمارے ساتھ اس وقت بھی ملازمتوں اور مقابلے کے امتحانوں میں امتیاز

برتا جاتا ہے اور اگر یونیورسٹی کا ذریعۂ تعلیم اردو ہو جائے گا تو ملازمت اور مقابلے کے امتحانوں کے دروازے ان کے لئے بالکل ہی بند ہو جائیں گے۔

پروفیسر آلِ احمد سرور صاحب کی کوششوں سے چند سال سے مسلم یونیورسٹی میں اردو اور ہندی میں امتحان کے پرچوں کے جواب لکھنے کی اجازت مل گئی ہے۔ یعنی ذریعۂ تعلیم تو انگریزی ہے مگر امتحان میں جواب لکھنے کے لئے ایک رعایت ملی ہے، مجھے یہ معلوم کرنے کا اب تک موقع نہیں ملا کہ اس کا کیا نتیجہ نکلا اور اس رعایت سے کتنے فیصدی طالب علموں نے فائدہ اٹھایا۔

مسلم یونیورسٹی کے برعکس جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شروع ہی سے ذریعۂ تعلیم اردو ہے۔ اردو میں تعلیم دینے کا اسے ۵۳ سال کا وسیع اور طویل تجربہ ہے۔ اس کے ماحول میں اردو اچھی طرح رچ بس گئی ہے۔ ایسے استاد اور طالب علم بھی جو اردو سے ناآشنائے محض ہوتے ہیں، کچھ عرصہ میں یہاں کے ماحول سے متاثر ہو کر اردو سے مانوس ہو جاتے ہیں، اس کا تاریخی کردار ایثار، خدمت اور قوم پروری رہا ہے۔ اس کے امیر جامعہ (چانسلر) اور شیخ الجامعہ (وائس چانسلر) مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور عبدالمجید خواجہ جیسے راسخ العقیدہ نیشنلسٹ رہے ہیں اور استادوں اور خدمت گزاروں میں ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین پروفیسر محمد مجیب اور شفیق الرحمٰن جیسے مخلص شامل رہے ہیں، جنھوں نے ایک طرف مسلمانوں کی خدمت کی اور ساتھ ہی ملک و قوم اور اردو کی بھی۔ اگر اردو کی خدمت اور تعلیم کا مزید کام اس ادارے کے سپرد کیا گیا، جس پر کبھی فرقہ پرستی کا شبہ نہیں کیا گیا ہے تو وہ زیادہ بہتر طور پر اس کام کو کر سکے گا۔

میں نے اپنے اس مضمون میں اس بات پر زور دیا ہے کہ جامعہ کی دفتری زبان بھی اردو ہے، ایسا اس لئے کیا ہے کہ میرے نزدیک اس کی اہمیت ذریعۂ تعلیم سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اگر اردو کی کوئی نئی یونی ورسٹی قائم ہوگی تو اسے ایسے دفتر کے قیام میں بڑی مشکلات پیدا ہوں گی جس کی جملہ خط و کتابت اور جملہ کارروائیاں اردو میں ہوں۔ جامعہ ملیہ میں دفتر مسجل (رجسٹرار آفس) دفتر شیخ الجامعہ (وائس چانسلر آفس)، دفتر محاسبی (اکاؤنٹ آفس) اور دوسرے تمام دفاتر ۵۳ سال سے اردو میں کام کرتے ہیں۔ اس قیمتی تجربے سے اردو کی مجوزہ یونیورسٹی کو بیش از بیش فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اگر جامعہ ملیہ اسلامیہ کو اردو کی چارٹرڈ یونی ورسٹی بنا دیا جائے۔ جامعہ کے ارباب حل و عقد اس بارگراں کو اٹھانے کے لئے بھی تیار ہیں۔

اردو رسم الخط

پروفیسر گیان چند جین

سب سے پہلے یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اردو رسم الخط عربی یا فارسی رسم الخط نہیں یہ اردو ہے۔ عربی و فارسی سے بہت بڑی مماثلت و اشتراک کے باوجود یہ دونوں سے کسی قدر مختلف ہے۔ عربی میں آٹھ حروف ث، ح، ذ، ص، ض، ط، ظ، ع کی مخصوص آوازیں ہیں جو اردو خط میں نہیں ہیں۔ نیز اردو کے بہت سے حروف مثلاً پ، چ، ژ، گ، ٹ، ڈ، ڑ، نیز کئی ہائیہ حروف (بھ، پھ، وغیرہ) عربی میں موجود نہیں۔ فارسی خط اردو سے نزدیک تر ہے لیکن اردو خط ہو بہو فارسی نہیں کیونکہ اردو میں ٹ، ڈ، ڑ اور ہائیہ حروف زیادہ ہیں۔ اس کے باوجود اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو خط فارسی خط کا ترقی یافتہ روپ ہے اور فارسی خط عربی خط کی ارتقا یافتہ شکل۔ تھوڑے سے فرق کے ساتھ یہ خط ہندوستان کی دو اور زبانوں کشمیری اور سندھی کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے نیز پاکستان کی جملہ زبانیں اسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں۔

ہندوستان میں اردو، سندھی اور کشمیری کے علاوہ تمام زبانیں قدیم براہمی خط سے ماخوذ خطوں میں لکھی جاتی ہیں۔ شمالی ہند کی زبانوں کا خط براہمی سے ارتقا یافتہ دیوناگری خط سے بہت نزدیک ہے جنوب کی چار زبانوں کے خط بھی قدیم براہمی کی دکنی شاخ سے ماخوذ ہیں لیکن اب وہ اہل شمال کے لئے اتنے اجنبی ہو گئے ہیں جتنے یونانی یا چینی خط۔ کشمیری زبان پوری طرح ہند آریائی نہیں اس لئے اس کے اردو نما خط پر کسی کو اعتراض نہیں لیکن اردو چونکہ ہندی کی سگی بہن ہے اس لئے بعض کم بین نگاہوں کو اس کی علیحدہ ہی ایک آنکھ نہیں بھاتی۔

بیسویں صدی میں مختلف اوقات میں مختلف زعما نے ہندوستان کی تمام زبانوں کو ایک

رسم الخط میں لکھنے کی وکالت کی۔ یہ مشترک خط دیونا گری تھا۔ آج کل اس موقف کے سب سے بڑے وکیل آچاریہ ونوبا بھاوے ہیں۔ مشترک رسم الخط کا مطالبہ نہ عام ہے نہ پُرزور۔ کبھی کبھار کسی گوشے سے کوئی نحیف سی آواز سنائی دے جاتی ہے اس لئے اس سے ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں مشترک خط کے حامیوں کی نیت پر بھی شک کرنا ضروری نہیں سمجھتا لیکن ان کے نقطۂ نظر سے نادرست ہونے میں مجھے کوئی شبہ نہیں۔

دنیا میں مستثنیات کو چھوڑ کر نیشن یا قوم عموماً ایک زبان کے بولنے والوں پر مشتمل ہوتی ہے لیکن ہندوستان میں زبان، کلچر اور مذہب کے وہ وہ اختلافات ہیں کہ شک گزرنے لگتا ہے کہ یہ ملک ایک قوم ہے بھی کہ نہیں، کہیں یہ مختلف اقوام کا مجموعہ تو نہیں، جسے ایک مرکزی ریاست نے ایک قوم کا روپ دے رکھا ہے۔

ان اختلافات سے گھبرا کر بعض حضرات یہ سوچنے لگتے ہیں کہ ملک میں کلچر کے اختلافات کو جس حد تک دور کر دیا جائے اسی حد تک قوم میں یک جہتی استوار ہو جائے گی۔ ان کے نزدیک اتحاد کے لئے وحدت ضروری ہے یہ ان کے فکر کی غلطی ہے۔ کثرت میں بھی وحدت ممکن ہے۔ ملک کے مخصوص حالات میں رنگارنگی کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔ جس طرح کوئی ملک دوسرے کے تابع ہونا پسند نہیں کرتا اسی طرح کوئی مذہب، کوئی زبان دوسرے مذہب یا زبان میں ضم ہونے کو تیار نہیں۔ غالبؔ نے صحیح کہا ہے۔ ع

ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے

ملک کا دستور بنانے والے بزرگ اس حقیقت کا عرفان رکھتے تھے اسی لئے انھوں نے دستور میں ہر زبان، رسم الخط اور کلچر کی بقا کی ضمانت دی۔ بنیادی حقوق کے سلسلے میں لکھا ہے:

Section 29(1) Any of the citizens residing in the territory of India or any part thereof having a distinct language, script or culture of its own shall have the right to conserve the same.



پروفیسر گیان چند جین

جب تک دستور کی یہ دفعہ موجود ہے اردو رسم الخط کو کسی طرح سے بھی کھونے کا مقام نہیں۔ ۱۹۵۸ء کے قریب سرکاری زبان کمیشن رپورٹ میں ایک ممبر جسٹس تیجا سنگھ نے یہ خدشہ ظاہر کیا تھا کہ مشترک رسم الخط کی مانگ ہندی سے ملتی جلتی زبانوں اردو اور پنجابی کی انفرادیت کو ختم کرنے کی کوشش کے سوا کچھ نہیں۔ یہ خدشہ اقلیتوں کی غیر محفوظیت کی حس کا زائیدہ تھا۔ اس کے ازالے کے لئے پنڈت نہرو نے ۴ اکتوبر ۱۹۶۱ء کو مدراس میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں یقین دلایا کہ کسی زبان کے رسم الخط کو ہٹا کر اس پر دیوناگری نہیں تھوپی جائے گی۔

اردو کا خط بدلنے کی آواز اب تقریباً موہوم ہو گئی ہے۔ اہل اردو غیروں کے مطالبے سے اتنے ترساں نہیں جتنا اپنوں کے مشوروں سے۔ اردو کے ترقی پسند مصنفین نے ۱۹۴۸ء میں اردو کے لئے دیوناگری خط اختیار کرنے کی آمادگی ظاہر کی۔ سردار جعفری ہندی کے ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں تحریری پیش کش لے کر گئے کہ اردو والے اردو کے لئے دیوناگری لپی اور ہندی نام قبول کرنے کو تیار ہیں بشرطیکہ ہندی والے پورے اردو ادب کو ہندی ادب میں شامل کر لیں۔ ہندی ساہتیہ سمیلن کے دو سابق صدروں امرناتھ جھا اور راہل سانکرتاین نے اس پیش کش کو مسترد کر دیا۔ دو تین سال پہلے بمبئی میں جو اردو کانفرنس ہوئی تھی کہا جاتا ہے کہ اس میں بھی کرشن چندر اور سردار جعفری نے اردو کے لئے دیوناگری خط کی بات کہی تھی۔ اس پر اردو رسالوں میں بڑی لے دے ہوئی جس پر کرشن چندر اور سردار جعفری دونوں نے بیانات دیئے کہ وہ اردو کا رسم الخط بدلنے کا مطالبہ نہیں کرتے۔

راقم الحروف فروغ اردو کی گجرال کمیٹی کا رکن ہے۔ شاید یہ لکھ کر میں کوئی راز افشا نہیں کر رہا کہ کمیٹی کے سامنے کسی بھی موقع پر اردو کا رسم الخط بدلنے کی تجویز نہیں آئی۔ کمیٹی کے سامنے شہادت دینے والوں نیز کمیٹی کے ارکان میں سے کسی نے یہ بات اٹھائی ہی نہیں تو فی الوقت یہ پوزیشن ہے کہ کسی حلقے سے اردو کا رسم الخط بدلنے کا مطالبہ نہیں کیا جا رہا۔

اردو کا رسم الخط بدلنے کی ضرورت نہیں یہ سب مانتے ہیں۔ آخر ہم اپنے ادبی ورثہ سے منقطع ہونے کو تیار نہیں۔ اس رسم الخط میں اصلاح کی ضرورت ہے، یہ بھی سب مانیں گے۔ اس خط کی خامیوں کو دو گروہوں میں سمیٹا جا سکتا ہے۔

۱۔ یہ تلفظ کو صحیح طور پر ادا نہیں کرتا جس کی وجہ سے اس خط میں انھیں الفاظ کو صحیح پڑھا جا سکتا ہے جن کے تلفظ سے قاری پہلے سے واقف ہے مثلاً کتنے ہی زیر زبر لگائیے ناواقف شخص 'راہل سانکرتاین' کا نام صحیح نہیں پڑھ سکتا۔ گویا یہ خط محض اہل زبان کے ڈھب کا ہے۔

۲۔ یہ خط ٹائپ اور چھاپے کی ضرورتوں کا حریف نہیں۔

دونوں اعتبار سے ہمارے خط کی خامیاں بے نہایت ہیں۔ جس طرح موجودہ نظام تعلیم' بالخصوص طریق امتحان' کی خامیوں کا ہر شخص راز داں اور نقیب ہے لیکن کوئی بہتر اور قابل عمل نظام تجویز نہیں کر سکتا اسی طرح اردو خط کے اسقام کی دنیا لا متناہی ہے لیکن

ان اِستقام کو دور کرنے والا مصلح کوئی نہیں۔ ایسی تجاویز کو پیش کرنے سے کیا فائدہ جو شرمندۂ عمل نہ ہو سکیں۔ انگریزی کے رومن خط میں سب سے زیادہ سائنٹفک بننے کی صلاحیت ہے لیکن انگریزی میں جس طرح اس کی مٹی پلید ہوئی ہے اس کے باعث یہ سب سے زیادہ غیر سائنٹفک خط ہو کر رہ گیا ہے۔ اس میں کسی بھی حرف علت کے نشان سے کوئی بھی آواز برآمد کر لی جاتی ہے رومن خط کے نقائص کو جانتے ہوئے بھی کوئی انھیں دور نہیں کر پاتا کیونکہ کون سی طاقت پوری انگریزی داں (قدامت پرست) دنیا سے اپنے احکام کو منوالے یہی دقت اردو دنیا کے ساتھ ہے جو کچھ اور بھی قدامت پرست واقع ہوئی ہے۔

قدیم مصری خط اور سامی خط میں حروف علت (مصوتوں) کے لئے نشانات نہیں تھے۔ بعد میں چند نشانات وضع کئے گئے لیکن ناکافی طور پر۔ یہی اردو خط کی سب سے بڑی کمزوری ہے لیکن اب اس کا تدارک ممکن نہیں۔ حروف علت کا ناقص نظام اس خط کا ایسا جزو لاینفک ہے کہ خط کو بدلے بغیر اس کی اصلاح ممکن نہیں اور وہ دوا کیا جس سے مرض رہے نہ مریض۔

اگر کوئی شخص کوئی دوسری لپی پہلے سے جانتا ہے اور اس کے بعد اردو لپی سیکھتا ہے تو وہ جن مسائل سے دوچار ہوتا ہے وہی اردو خط کی کمزوری ہے۔ مثلاً میرے ایک بچے نے انگریزی اور ہندی کے بعد اردو سیکھی تو مجھ سے کہا کہ 'خدا' میں یہ دال کہاں ہے یہ تو 'رے' ہے اور 'بعد' پر اس نے یہ اعتراض کیا 'ع' کا منہ اُلٹا کیوں لکھا ہے۔

یہی اردو خط کی بوالعجبیاں ہیں۔ اردو خط نوآموز کو مخصوص عربی حروف کا وقوع جاننے کی کٹھنائی ہوتی ہے کیونکہ اردو میں ان حروف سے کوئی آواز نہیں۔ اسے کیونکر معلوم ہو کہ "جیسے موٹے لفظ کے آخر میں بڑی 'ح' نہیں 'ہ' ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ خاصہ پڑھا لکھا شخص بھی نہ سکے سمجھنے میں ٹھوکر کھا جاتا ہے۔ اچھا رسم الخط وہ ہے جس میں محض تلفظ سن کر صحیح ہجے لکھے جا سکیں اور محض تحریر سے صحیح تلفظ برآمد کیا جا سکے۔ اگر لفظوں کے ہجے فرداً فرداً یاد کرنے پڑیں تو یہ رسم الخط کے عملی پہلو کی بے اصولی کی نشانی ہے۔ اردو کے فاضل ماہر لسانیات ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے ان عربی حروف کو مردہ لاشیں قرار دیا ہے جنھیں اردو خط محض اس لئے اٹھائے ہوئے ہے کہ جعلی لسانی رشتہ عربی سے ثابت ہے۔ تاوقتیکہ اردو دنیا انھیں ترک کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتی کسی مزید اصلاح کی بات بے سود ہے۔

طباعت کے لئے موجودہ نستعلیق طرز میں یہ خرابی ہے کہ اس میں دستی کتابت کی ضرورت ہوتی ہے جو بہت دیر طلب ہے لیتھو کی چھپائی ارزاں رہتی ہے لیکن اس میں زیادہ کاپیاں نہیں نکالی جا سکتیں۔ یہ فوٹو آفسیٹ طریقے سے ممکن ہے لیکن وہ بہت گراں ہے جب تک کسی چیز کی کئی ہزار کاپیاں نہ چھاپی جائیں یہ مہنگا پڑتا ہے۔ میکانکی ضرورتوں کے پیش نظر نستعلیق کی جگہ ٹائپ کو اختیار کرنے کی تجویز پیش کی جاتی ہے آخر برّاعظم ہندوپاک کے باہر تو کہیں نستعلیق اور لیتھو کا نام نہیں سب کچھ ٹائپ میں چھپتا ہے۔ ہمارے لئے نسخ ٹائپ اختیار کرنے میں دو قباحتیں ہیں۔

۱۔ یہ لیتھو کے مقابلے میں کافی گراں ہے۔

۲۔ یہ آنکھوں میں چبھتا ہے۔

لسان العصر نے کہا تھا ؎

پانی پینا پڑا ہے پائپ کا، حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا

اس میں اردو خط کا جمالی پہلو بالکل مضروب ہو جاتا ہے۔ پاکستان سے عبداللہ حسین کا ناول اداس نسلیں اور ہندوستان سے نسخہ عرشی ٹائپ میں چھپے تخلیقی ادب کو اس کانٹے دار آہنی جامے میں دیکھ کر آنکھیں کھٹکنے لگیں۔ ہاں کسی علمی یا سائنسی موضوع کی کتاب ہو اور وہ ٹائپ کی جگہ نستعلیق میں چھپی ہو تو بڑھی گھوڑی لال لگام کی مصداق معلوم ہوتی ہے۔ ٹائپ کی دیدہ کاوی کی ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ جموں یونیورسٹی کے ایم۔ اے کے نصاب میں افضل کی مثنوی بکٹ کہانی ہے جو ٹائپ میں چھپی ہوئی ہے۔ آج کل کے ایم۔ اے کے طلبہ کو بھی ٹائپ میں پڑھنے کی عادت نہیں ہوتی۔ جموں میں ایک کشمیری طالب علم اس کتاب کو امتحان کے لئے تیار ہی نہ کر سکا کیونکہ وہ ٹائپ پڑھنے سے معذور تھا۔ دوسرے طالب علم نے کسی دوسرے سے پڑھوا کر سن لی اگر ایم۔ اے کے طلبہ کا یہ حال ہے تو جناب زید، عمر، اور بکر اخبار، ناول اور شعر کیوں ٹائپ میں پڑھنے لگے حسن اتفاق یا سوئے اتفاق سے ہندوستان میں اردو قارئین کی دنیا بہت محدود ہے۔ چند اخباروں اور دو ایک رسالوں کے سوا کسی اور تحریر کے ہزاروں کی تعداد میں چھپنے کی نوبت نہیں آتی۔ اس لئے موجودہ برا بھلا طریق طباعت کام دے رہا ہے۔ ہم اس میں ایسی اصلاحیں نہیں کر سکتے جو قارئین کو قبول ہوں۔ اکبر الٰہ آبادی نے کہا تھا ؎

اِدھر خیال نہیں مصلحانِ نیشن کا
کہ فرطِ ضعف نہیں وقت آپریشن کا

رسم الخط کے معاملے میں ترمیم کے ساتھ اسی شعر کو پڑھنا پڑتا ہے ؎

اِدھر خیال نہیں مصلحانِ رسم الخط
کہ فرطِ ضعف نہیں وقت آپریشن کا

کرسی

اردو زبان و ادب کی اعلیٰ تعلیم

(چند حقائق، چند مسائل)

قمر رئیس

آزادی سے قبل ہندوستان کی صرف چھ یونیورسٹیوں میں اردو کی تعلیم کا انتظام تھا آج یہ تعداد ۲۵ تک پہنچ چکی ہے۔ گویا اردو والے ہر مورچے سے بہادری کے ساتھ پیچھے ہٹتے ہوئے اب یونیورسٹیوں کے قلعوں میں جم کر بیٹھ گئے ہیں لیکن سوچ وہ یہی رہے ہیں کہ جن علاقوں سے وہ بے دخل ہو چکے ہیں کیا ان پر وہ پھر تسلط کر سکیں گے؟ اور یہ کہ اب تک جو رسد اور کمک انہیں کٹ کٹ کر پہنچ [illegible] سپلائی اب تک جاری رہ سکے گی۔

محض یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اردو ایک ہندوستانی زبان ہے۔ یہ دکھانے کے لئے کہ ہر علاقہ میں، ہر سطح پر، ہر روز اردو کے ساتھ صریح بے انصافیاں روا رکھی جا رہی ہیں، یہ جتانے کے لئے کہ اردو کی موت ہندوستان کی مشترکہ تہذیب، [illegible] اور سیکولر جمہوریت کے بعض بلند آدرشوں کی موت ہوگی، گزشتہ چوتھائی صدی میں مضامین، نظموں، اداریوں، خبروں، مراسلوں، مذاکروں، رپورٹوں، اعلانوں، سیاسی منشوروں، بیانات، شکایات اور عرضداشتوں کی شکل میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا حجم اتنا زیادہ ہے کہ اگر اس سارے دفتر کو جمع کرکے پارلیمنٹ کے بے شمار دروازوں میں سے ہر دروازہ پر ڈھیر کر دیا جائے تو پارلیمنٹ کا ایک رکن بھی جمہوریت کے اس مقدس اور پُرشوکت ایوان میں داخل نہ ہو سکے گا۔ دوسری طرف اگر اس دفتر کو رقم کرنے والے ہزاروں اردو دوستوں سے پوچھا جائے کہ انھوں نے اپنے کردار وعمل سے، ایثار و قربانی سے اردو کی بقا اور ترقی کے لئے کیا کیا ہے تو ان کے کارناموں کو لکھنے کے لئے شاید ایک صفحہ سے زیادہ درکار نہ ہو۔ اس لئے حکومت اور اہل سیاست ہی نہیں خود اردو دوستوں نے اردو کے ساتھ جو سلوک روا رکھا اور آج بھی وہ جس شکست خوردگی، کم حوصلگی، مایوسی اور بے عملی کا شکار ہیں یہاں اس داستان کو دہرانے کا موقع نہیں۔ کہنا صرف یہ ہے کہ اس "سب" کے باوجود اردو ابھی زندہ ہے۔

اردو کی بقا کے سلسلہ میں گزشتہ دنوں ایک بزرگ استاد نے مجھ سے کہا کہ اردو اس لئے زندہ ہے اور زندہ رہے گی کہ یہ صوفیوں، سنتوں، درویشوں اور شہیدوں کی زبان اور ان کی تعلیمات کا ذریعۂ اظہار رہی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ سنسکرت تو نہ صرف سنتوں اور رشیوں منیوں بلکہ دیوتاؤں کی زبان رہی ہے پھر اس کا حشر کیا ہوا؟ فرمایا "سنسکرت آج بھی ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں میں پڑھائی جارہی ہے اور اب تو بہت سے اسکولوں میں بھی اس کی تعلیم ہو رہی ہے۔"

اگر کسی زبان کی زندگی اور بقا کا تصور یہی ہے تو یقیناً اردو بھی ابھی کئی صدیوں تک زندہ رہے گی لیکن میں نے معاندانہ سازشوں اور بندشوں کے باوجود اردو کی زندگی کا جو تذکرہ کیا ہے وہ اس خیال سے نہیں کہ سنتوں اور درویشوں کی دعائیں اس کی بقا کی ضامن ہیں بلکہ اس لئے کہ عوام کے کام و دہن اس کی لذت سے اب تک مانوس ہیں۔ اس کے محاورے، فقرے، اصطلاحیں اظہار و اشعار سونے چاندی کے ان کھرے سکوں کی طرح رائج ہیں جن کی جگہ لینے کے لئے نقلی دھاتوں کے سکے چلائے جا رہے ہیں اور اس لئے کہ اس کے شعر و ادب میں زندگی کی توانائی اور فن کی دلکشی ہے۔ اس کے فن کار آج بھی اپنی بہترین تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کر رہے ہیں۔ تاہم یہ صورت حال ہمیشہ رہنے والی نہیں۔ اس کے چلن اور اس کی مقبولیت کا حلقہ جس تیزی سے سکڑ رہا ہے، جس سُرعت سے اس کی جڑیں خشک اور کھوکھلی ہو رہی ہیں، اگر اس کا فوری تدارک یا مداوا نہ ہو سکا تو صرف نصف صدی بعد اردو کو وہی مقام اور منصب مل جائے گا جو سنسکرت کو ہزاروں سال میں نصیب ہو سکا ہے۔

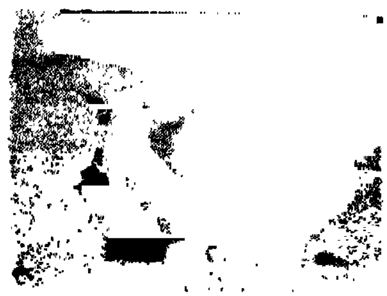
اس تلخ حقیقت کے احساس اور اردو کے مستقبل کے خوف نے ہر اردو دوست کو کسی نہ کسی حد تک اعصاب زدہ سا کر رکھا ہے تاہم اس میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ گزشتہ ۲۰ سال میں اعلیٰ تعلیم اور تحقیق کے میدان میں اردو کو فروغ حاصل ہوا ہے۔ اور اس سطح پر حکومت نے بھی فراخدلی سے اردو کی سرپرستی کی ہے۔ آزادی سے قبل ہندوستان کی صرف چھ یونیورسٹیوں میں اردو کی تعلیم کا انتظام تھا آج یہ تعداد ۲۵ تک پہنچ چکی ہے۔ گویا اردو والے ہر مورچے سے بہادری کے ساتھ پیچھے ہٹتے ہوئے اب یونیورسٹیوں کے قلعوں میں جم کر بیٹھ گئے ہیں۔ لیکن سوچ وہ یہی رہے ہیں کہ جن علاقوں سے وہ بے دخل ہو چکے ہیں کیا ان پر وہ پھر تسلط کر سکیں گے؟ اور یہ کہ اب تک جو رسد اور کمک انھیں کٹ کٹ کے پہنچ رہی

ان ہارسے ہوئے علاقوں سے مل رہی ہے اس کی سپلائی کب تک جاری رہ سکے گی۔

بات استعارہ میں اُلجھ گئی کہنے کا مدعا یہ تھا کہ آزادی کے بعد ملک کے اعلیٰ نظام تعلیم میں جو ہمہ گیر توسیع و ترقی ہوئی ہے اس میں اردو کا حصہ بھی خاصا وسیع ہے۔ آج ملک کی کم و بیش ۴۴ یونیورسٹیوں میں بی۔ اے کی تعلیم کا اور چوبیس یونیورسٹیوں میں پوسٹ گریجویٹ تعلیم اور تحقیق کا انتظام ہے۔ ان یونیورسٹیوں سے اردو کے جو استاد وابستہ ہیں ان کی تعداد ساڑھے چار سو سے زائد ہے۔

اگر ان یونیورسٹیوں کے اردو نصاب تعلیم پر نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوگا کہ دوسری جدید زبانوں کی طرح اردو کی اعلیٰ تعلیم کا مقصد بھی طلبا کو معیاری زبان و ادب، ادبی تاریخ، رجحانات، اسالیب، مکاتیب اور اصناف سے متعارف کرانا اور امکانی حد تک زبان و ادب کی مہارت پیدا کرنا ہے۔ لیکن اگر حقیقت پسندی کی عینک سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یونیورسٹیوں کا عام معیارِ تعلیم جس تیزی سے گر رہا ہے اردو کی تعلیم کا زوال زیادہ تیز رفتار اور دور رس ہے۔ اکثر یونیورسٹیوں کے ضابطہ کے مطابق طلبا کے لئے بی۔ اے میں اردو ایک اختیاری مضمون کے طور پر لینے کے لئے ضروری نہیں کہ ثانوی درجہ تعلیم میں بھی اردو ایک مضمون رہا ہو۔ اس لئے ایسے بیشمار طلبا جو اردو سے جذباتی تعلق یا اسے ایک آسان مضمون سمجھ کر بی۔ اے میں اختیار کرتے ہیں اردو کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہوتے۔ انھیں استاد معیار زبان و ادب کے درس دینے کے بجائے پہلے الف، ب سکھاتا ہے پھر ہجے کی درستی اور املا کی مشق کراتا ہے اور آخر میں اگر کچھ وقت ملا تو درسی کتب کے ایک دو آسان سبق پڑھا دیتا ہے۔ انجمن اساتذہ اردو کی پچھلی کانفرنسوں کے دوران مختلف علاقوں کے کئی استادوں نے مجھ سے اس واقعہ کا اظہار کیا اور اس میں کسی مبالغہ کو دخل نہیں۔ سوال یہ ہے کہ زبان و ادب کی اعلیٰ تعلیم کا جو نصب العین ہے کیا یہ طلبا اسے پورا کر سکتے ہیں؟ دلچسپ بات یہ ہے کہ اردو

ان میں سے اکثر کی مادری زبان ہوتی ہے دوسری زبانوں کے طلبا اگر بی۔ اے آنرز یا ایم۔ اے میں زبان و ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو اسکول میں وہ نہ صرف یہ کہ اپنی زبان



قمر رئیس

بلکہ دوسرے مضامین بھی مادری زبان کے وسیلے سے پڑھ کر آتے ہیں۔ وہ اپنی زبان کے رسم الخط، مزاج، قواعد، اور بنیادی اسالیب سے روشناس ہوتے ہیں۔ ان کا ذخیرہ الفاظ وسیع ہوتا ہے جب کہ اردو کے اکثر طلبا اس سہولت سے محروم رہتے ہیں۔ یو۔ پی جو اردو والوں کی سب سے بڑی ریاست ہے اور جہاں ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق اردو بولنے والوں کی تعداد ۹۳ لاکھ ہے وہاں لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی رپورٹ کے مطابق صرف علیگڑھ کے اسکول کو چھوڑ کر ایک بھی اردو میڈیم اسکول نہیں۔ اور ایسے اسکول بھی جہاں اردو ایک مضمون کے طور پر پڑھائی جاتی ہے۔ اردو آبادی کی نسبت سے نہ ہونے کے برابر ہے۔ گویا گزشتہ چوتھائی صدی میں یو۔ پی میں لاکھوں بچے جن کی مادری زبان اردو تھی اسکول میں اس کی تعلیم سے محروم رکھے گئے۔ کم و بیش یہی صورت حال شمالی ہند کی دوسری ریاستوں میں بھی ہے۔ صرف غیر ہندی ریاستوں آندھرا، کشمیر اور ایک حد تک مہاراشٹر کی صورت حال اس سے مختلف ہے۔ آندھرا میں ۲۶۴ ہائی اسکول۔ ۴۰ انٹر کالج اور تین ڈگری کالج ایسے ہیں جہاں ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ غیر ہندی علاقوں میں تدریس و تعلیم کی سطح پر اردو کا جو کاروبار ہے وہ حکومت کے بجائے اردو دوستوں کے عزم و ہمت، پرائیویٹ تعلیمی اداروں اور ٹرسٹوں

یا انجمنوں کا کارنامہ ہے۔ مہاراشٹر جہاں اردو دوستوں کی کوشش سے سیکڑوں اردو میڈیم اسکول اور کالج کام کر رہے ہیں وہاں کی کسی یونیورسٹی میں حکومت نے اب تک اردو کا باقاعدہ شعبہ قائم نہیں کیا۔ بمبئی یونیورسٹی اور مرٹھواڑہ یونیورسٹی جہاں پوسٹ گریجویٹ سطح پر اردو کی تعلیم اور تحقیق کا انتظام ہے وہاں نہ تو اساتذہ کا تقرر ہو رہا ہے اور نہ ہی اعلیٰ تعلیم اور ریسرچ کے لئے اچھے کتب خانے کی جو بنیادی سہولت طلبا کو حاصل ہونی چاہیئے وہ ان یونیورسٹیوں میں انھیں میسر ہے۔ دراصل ایک معقول کتب خانے کے بغیر کسی بھی مضمون کی اعلیٰ تعلیم کا مقصد و منتہا پورا نہیں ہو سکتا۔ آنرز اور ایم۔ اے کی تعلیم کلاس روم سے کہیں زیادہ کتب خانوں میں ہوتی ہے۔ یو۔ پی اور بہار کی بہت سی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں جہاں گزشتہ دس پندرہ سال میں اردو کی پوسٹ گریجویٹ تعلیم کا آغاز ہوا ہے وہاں کے کتب خانے بے حد ناقص ہیں۔ ایک مشکل یہ ہے کہ کسی مضمون کی کتابوں کی خریداری کے لئے جو گرانٹ دی جاتی ہے بعض یونیورسٹیوں اور کالجوں میں اس کا تعین کرتے ہوئے طلبا کی تعداد کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ اردو کے طلبا کی تعداد سب سے کم ہوتی ہے۔ اس لئے طلبا کی تعداد کو نہیں بلکہ اعلیٰ تعلیم کے مقاصد کو سامنے رکھ کر اگر کتب خانوں کے اردو شعبوں کی تعمیر کرنا ہے تو اس کے لئے خصوصی رقم مہیا کرنی ہوگی۔

اس میں شک نہیں کہ دانش گاہوں اور کالجوں میں اردو تعلیم کی توسیع و ترقی کے لئے حکومت کسی امکانی امداد سے دریغ نہیں کرتی لیکن یہ سوال بنیادی اہمیت رکھتا ہے کہ پرائمری اور ثانوی سطح پر اگر اردو کی تعلیم اسی طرح محدود بلکہ مسدود رہی تو دانشگاہوں میں اردو کی اعلیٰ تعلیم کے لئے طلبا کب تک آتے رہیں گے۔ دہلی کے جن کالجوں میں اردو آج ایک اختیاری مضمون کے طور پر پڑھائی جاتی ہے وہاں ایک کے علاوہ کسی بھی کالج میں طلبا کی تعداد ۴، ۵ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ بلکہ بیشتر کالجوں میں یہ تعداد ایک اور تین کے درمیان رہتی ہے۔ اور ہر سال ان کالجوں کے پرنسپلوں کو

اپنی ملازمت برقرار رکھنے کے لئے طلبا کو داخلے کے لئے ڈھونڈھنا پڑتا ہے۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ داخلے کے امیدوار طلبا کے پاس کئی کالجوں کے اساتذہ اپنے اپنے کالج میں داخلے کی اپیل لیکر پہنچتے ہیں اور جو استاد زیادہ سے زیادہ سہولتیں دینے کا وعدہ کرتا ہے طالب علم اسی کے کالج میں داخلہ لیتا ہے۔ یہ صورت حال دہلی کی ہے جو صدیوں سے اردو زبان وادب کا گہوارہ رہی ہے۔ اس سے دوسری ریاستوں کے کالجوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اور مسئلہ بھی دانشگاہوں کے اساتذہ کے لئے تشویش کا باعث ہوا ہے جو طلبا ثانوی درجوں میں اردو کی تعلیم حاصل کرکے آتے ہیں ان کی آگہی اور زبان دانی کا معیار بہت غیر تشفی بخش ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسکولوں میں اردو کی تدریس کا معیار تیزی سے روبہ زوال ہے۔ دوسرے یہ کہ ثانوی تعلیم کے بورڈ اردو کا جو نصاب مرتب کرتے ہیں وہ اکثر روایتی ہوتا ہے اور اس میں تعلیم کے جدید اور تدریسی طریقہ کار یا تقاضوں کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ اس کے علاوہ اسکول کے نصاب اور ڈگری کو اس کے اردو نصاب میں کوئی مطابقت یا مناسبت نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر ثانوی درجوں میں اکثر طالب علم میر و غالب کا جو کلام پڑھ کر آتے ہیں وہی انھیں بی۔اے میں بھی پڑھایا جاتا ہے اس کی وجہ سے ان میں کورس کے مطالعہ کا شوق اور دلچسپی پیدا نہیں ہوتی۔ ضرورت اس کی ہے کہ ثانوی تعلیم کے اردو نصاب میں اس علاقہ کی یونیورسٹیوں یا کالجوں کے اساتذہ کا مشورہ بھی شامل رہے تاکہ دونوں سطح کے نصابات اور طریقہ تعلیم میں تال میل پیدا ہوسکے۔

اردو آشوب کے اس دور میں اردو کتابوں کی طباعت، اشاعت اور تقسیم بھی بحرانی حالات سے گزر رہی ہے۔ اس کے نتیجہ میں دانشگاہوں کے طلبا اور اساتذہ کے لئے درسی کتب کی فراہمی بھی ایک مستقل مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ نصاب کی ترتیب کے وقت ہم تعلیم و تدریس کے تقاضوں اور ضرورتوں کے بجائے اس بات کو پیش نظر رکھتے ہیں کہ کونسی کتابیں بازار میں دستیاب ہیں پھر چند مہینوں بعد معلوم ہوتا ہے کہ جو کتابیں نصاب کی ترتیب کے وقت دستیاب تھیں اب غائب ہوگئی ہیں۔ یہ مسئلہ ہندوستان کی ان دس ریاستوں سے تعلق رکھتا ہے جہاں اردو کی اعلیٰ تعلیم کا بندوبست ہے۔ اسکی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند کی گذشتہ کانفرنس میں تمام مندوبین نے متفقہ طور پر ایک تجویز پاس کی جس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

"اساتذہ اردو کا یہ جلسہ اردو میں نصاب کی کتابوں کی کم یابی کو تشویش کی نظر سے دیکھتا ہے اور ترقی اردو بورڈ نے اس مقصد کے لئے جو کمیٹی مقرر کی ہے اس سے اپیل کرتا ہے کہ وہ انجمن اساتذہ اردو کے مشورے اور تعاون سے مختلف علاقوں میں اردو نصاب میں شامل کتابوں کی اشاعت کو ترجیحی اہمیت دے۔"

اندیشہ یہ ہے کہ اس اہم قرارداد کا بھی وہی انجام ہوگا جو انجمن اساتذہ اردو کی لکھنؤ کانفرنس میں ترقی اردو بورڈ کے بارے میں پاس کی جانے والی تجویز کا ہوا تھا۔ یعنی یہ کہ بورڈ کے ذمہ داروں نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ ترقی اردو بورڈ کا ایک اہم مقصد اردو زبان وادب کی اعلیٰ تعلیم اور اعلیٰ سطح پر اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے لئے درسی کتب کی تدوین واشاعت ہے لیکن ہر سال لاکھوں روپیہ صرف کرنے کے باوجود ترقی اردو بورڈ نے سچ مچ اردو کی ترقی کے لئے کوئی کام کیا ہے؟ اس کا کوئی ثبوت اب تک اردو والوں کو نہیں مل سکا ہے۔

اردو کی اعلیٰ تعلیم کا ایک بڑا مقصد تحقیقی کام کو فروغ دینا اور زبان وادب کے بارے میں علم و آگہی کی حدوں کو وسیع تر کرنا ہے۔ اس کی توقع اساتذہ اور ریسرچ اسکالرز دونوں سے کی جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ گذشتہ چوتھائی صدی میں ہندوستان کی دانشگاہوں کے اردو شعبوں میں قابل قدر تحقیقی کام ہوا ہے۔ اردو زبان اور شعر وادب کی تاریخ کے بارے میں بہت سے نئے اور نتیجہ خیز حقائق سامنے آئے ہیں۔ صرف ہماری دانشگاہوں میں آزادی کے بعد تحقیقی مقالے لکھ کر تیس امیدواروں نے ڈاکٹریٹ کی سندیں حاصل کیں۔ اگر تمام یونیورسٹیوں کے پی۔ایچ۔ڈی اور ڈی۔لٹ کے تحقیقی مقالوں کی فہرست مرتب کی جائے تو یہ تعداد ایک سو بیس سے تجاوز کر جائے گی۔ اس کے باوجود یہ احساس ہوتا ہے کہ اردو میں تحقیقی کام جتنا اور جس معیار کا ہونا چاہیئے تھا نہیں ہوسکا ہے۔ اس کے بہت سے اسباب ہیں۔ قدیم کلاسیکی ادب کی تحقیق کے لئے فارسی کی استعداد ضروری ہے جس سے اس زمانے کے بیشتر طلبا نابلد ہیں۔ متعدد یونیورسٹیوں میں اساتذہ یا اسکالر جو تحقیق کی صلاحیت نہیں رکھتے بعض اہم موضوعات کو اپنے نام سے رجسٹر کرا لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ نہ خود کام کرتے ہیں اور نہ ہی ان نہایت اہم موضوعات پر دوسرے با استعداد طلبا کو کام کرنے کا موقع ملتا ہے ملک کے مختلف علاقوں کے کتب خانوں میں اردو کے نادر مخطوطات اور کمیاب کتابوں کا جو ذخیرہ ہے ایک عام اسکالر ان تمام جگہوں کا سفر کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ ایسے نااہل طلبا کی تعداد بھی بہت ہے جو کئی سال تک یو۔جی۔سی کا فیلوشپ یا یونیورسٹی کا وظیفہ حاصل کرنے کے بعد بھی اپنا تحقیقی مقالہ مکمل نہیں کرسکے۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ اردو کے بعض پروفیسر یا سینیئر استاد جو تحقیقی کاموں کی نگرانی کرتے ہیں اکثر اپنا قیمتی وقت دوسرے مفید کاموں میں صرف کرنا پسند کرتے ہیں۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ پی۔ایچ۔ڈی میں داخلہ لینے والے پانچ طلبا میں سے صرف ایک ہی اپنا کام مکمل کر پاتا ہے ممکن ہے یہ صورت حال بعض دوسرے مضامین میں بھی ہو لیکن اردو میں تحقیقی کام سے اس بے دلی کا ایک بڑا سبب مستقبل کا اندیشہ ہے۔ آج بھی اردو میں ڈاکٹریٹ والے بہت سے طلبا بے روزگار ہیں۔ ایک نوجوان جس نے دہلی یونیورسٹی سے اردو میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی کئی سال تک ملازمت کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ بالآخر مایوس ہوکر کھیتی باڑی کرنے لگا۔

دراصل اردو کے طلبا یہ دیکھ رہے ہیں کہ اس زبان کا اب ملک کے معاشی، سماجی اور انتظامی نظام سے کوئی زندہ تعلق نہیں رہا ہے۔ اردو ادبیات میں ایم۔اے

یا ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد وہ کسی کالج یا یونیورسٹی میں اردو کے استاد ہی ہوسکتے ہیں اور اس کے لئے اب مقابلہ سخت اور امکانات محدود تر ہونے جارہے ہیں۔ یہ المناک حقیقت بھی ناقابل تردید ہے کہ آج ملک میں اردو کی جو حالت ہوگئی ہے اس کی بنا پر اردو کا استاد کسی کو یہ بتاتے ہوئے بھی ہچکچاتا ہے کہ وہ اردو کا استاد ہے۔ اردو کی کس مپرسی پر جس طرح لوگ ترس کھاتے ہیں عزت نفس رکھنے والے ایک استاد یا دانشور کے لئے وہ ناقابلِ برداشت ہے۔ اردو کے بہت سے باصلاحیت اور غیور استاد اس رویئے سے بیزار ہو کر کسی دوسرے شعبہ میں باوقار ملازمت کے لئے جد و جہد کرتے رہتے ہیں عام طور پر ذہین اور باشعور طلبا اردو میں اعلیٰ تعلیم کا خیال بھی دل میں نہیں لاتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ دوسرے اور تیسرے درجے کے طلبا کو ہی غنیمت سمجھا جاتا ہے۔ اگر یہ صورت حال جاری رہی تو اردو کی اعلیٰ تعلیم صرف ادنیٰ درجے کے ماہرین پیدا کرسکے گی۔

صورت حال بے شک تشویشناک ہے لیکن اگر ہم گذشتہ دو تین سال میں اردو کے بارے ابنائے وطن کے بدلتے ہوئے رویوں اور حالات پر نظر ڈالیں تو مایوسی کے اندھیرے میں روشنی کی کچھ کرنیں ضرور نظر آئیں گی۔ دراصل آزادی کے بعد ابتدائی بیس برسوں میں ملک میں بعض سیاسی جماعتوں اور رجعت پسند طاقتوں نے ہندوستان کی قومی تہذیب کا جو احیا پرستانہ تصور پیش کیا، لسانی معاملات میں جس طرح کی جارحیت اور فسطائی رویہ پر اصرار کیا اس میں اردو کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ ان گمراہ کن اور اردو دشمن خیالات اور عقائد کے نشر و اشاعت میں بعض ریاستی حکومتوں نے بھی تعاون کیا۔ سرمایہ داروں کے زرخرید پریس نے اسے ہمیشہ ہوا دی۔ اس کے نتیجہ میں اردو کے خلاف تعصبات اور غلط فہمیوں کا انبار جمع ہوتا رہا۔ اب اس مہلک پروپیگنڈے کے اثرات کچھ تحلیل ہو رہے ہیں۔ سیاسی پارٹیوں اور حکومتوں کا رویہ بھی بدل رہا ہے۔ اردو مر سکتی ہے 'ہندیائی' نہیں جاسکتی۔ اس کا اپنا مزاج، اپنا بانکپن اپنا رسم خط اور اپنے تہذیبی رشتے ہیں۔ اس لئے حکومت کو ترقی اردو بورڈ یا اردو اکیڈمیوں کے قیام کے ساتھ ساتھ اردو کی بحالی کے لئے اس گمراہ کن پروپیگنڈے کا ازالہ بھی کرنا ہوگا۔ جس نے اردو کو اس ملک میں اپنی زمین اور اپنے وقار سے محروم کردیا۔ محترمہ سبھدرا جوشی اور ان کی کمیٹی نے فرقہ واریت کے راکھشس سے جنگ کرکے ہندوستان کے سیکولر دستور اور جمہوریت کو ٹھوس ستونوں پر مستحکم کرنے کا جو بیڑا اٹھایا ہے اس میں بھی اس کو نمایاں اہمیت حاصل ہونا چاہیئے۔

یہ سچ ہے کہ اردو یونیورسٹی اردو والوں

> ثانوی درجوں میں اکثر طالب علم میر و غالب کا جو کلام پڑھ کر آتے ہیں وہی انہیں بی۔ اے میں بھی پڑھایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے ان میں کورس کے مطالعہ کا شوق اور دلچسپی پیدا نہیں ہوتی۔

کی فوری ضرورت نہیں۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اردو یونیورسٹی کے بغیر اردو ملک میں کبھی اپنے وقار اور اپنے جائز حقوق کی بحالی میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔ اور اس کے بغیر ملک میں اردو کی اعلیٰ تعلیم کا مستقبل بھی روشن نہیں کہا جاسکتا۔ ڈاکٹر رفیق زکریا نے حال ہی میں اساتذہ اردو کی اورنگ آباد کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے صحیح کہا تھا کہ "جب تک اردو یونیورسٹی موجود نہ ہو اردو کالج نہیں پنپ سکتے۔ بڑے پیمانے پر اردو ذریعہ تعلیم نہیں بن سکتی"۔ یعنی اگر اردو یونیورسٹی نہیں ہے تو پھر اردو میڈیم اسکول اور کالج بھی اپنی حقیقی افادیت سے محروم ہوجائیں گے۔ اگر ثانوی سطح تک اردو والوں کو اردو میڈیم سے تمام مضامین پڑھنے کی سہولت دی گئی، جو بہر حال دی جانی چاہیئے تو کیا یونیورسٹی میں انھیں مجبور کیا جائے گا کہ وہ ہندی، تلیگو یا کسی دوسری غیر مادری زبان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔ ظاہر ہے یہ ممکن نہیں لیکن اردو یونیورسٹیوں کا قیام بعد کا مرحلہ ہے۔ فی الحال تو پرائمری اور ثانوی سطح پر اردو کی تعلیم اور اردو کے وسیلے سے تعلیم بنیادی مسئلہ ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ عدلیہ، انتظامیہ، ریڈیو، ٹی وی ڈاک خانہ اور دوسرے شعبوں میں اردو کے حقوق کی فوری بحالی کا مسئلہ ہے۔

انجمن اساتذہ اردو کی پچھلی کانفرنس میں بعض مندوبین نے اس پر زور دیا کہ اردو کی اعلیٰ تعلیم میں پیشہ ورانہ مضامین کو خاص اہمیت دی جائے تاکہ اردو کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے نوجوان صرف معلمی ہی نہیں دوسرے شعبوں مثلاً ریڈیو، ٹی۔ وی صحافت اور خطاطی وغیرہ کے کاموں میں بھی کھپ سکیں۔ سوال یہ ہے کہ اردو کے بارے میں جب تک موجودہ رویوں اور حالات میں بنیادی تغیر نہ ہو، جب تک مختلف علاقوں کے ریڈیو اور ٹی۔ وی کے اردو پروگراموں اور اردو اخبار نویسی کے کاموں میں بڑے پیمانے پر توسیع و ترقی نہ ہو، اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے کتنے نوجوانوں کو ان شعبوں میں روزگار مل سکے گا۔ خطاطی کے لئے اردو زبان و ادب کی اعلیٰ تعلیم کی ضرورت نہیں۔ ہاں اگر ثانوی اسکولوں میں اردو کی تعلیم عام ہو، اردو گھرانوں کے بچوں کو اردو میں تعلیم حاصل کرنے کا حق مل جائے تو دانش گاہوں میں اردو کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے نوجوان بڑی تعداد میں کھپ سکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ملک کے معاشی اور سماجی نظام میں اردو کی ضرورت اور افادیت سے ہی اردو کی تعلیم اور ترقی کا مسئلہ وابستہ ہے۔ اردو کی تعلیم کے لئے مادی محرکات اور ترغیبات کی ضرورت ہے۔ اور اس سے زیادہ ضرورت ہے رواداری کے ایسے ماحول کی جس میں کروڑوں ہندوستانی اردو کو اپنی مادری زبان مانتے ہوئے کہتے ہوئے نہ جھجکیں، نہ ڈریں۔ اردو کی اعلیٰ تعلیم کو بھی اپنے منصب اور نصب العین کی تکمیل کے لئے ایسے ہی سازگار ماحول کا انتظار ہے۔

رسم الخط کا تنازعہ

ایک تہذیبی نقصان

معین اعجاز

ہندی اور اردو کا جھگڑا کب سے شروع ہوا، کیونکر شروع ہوا، اس کے پیچھے کیا کیا مقاصد کار فرما تھے، انگریزی نے اس جھگڑے کو کہاں تک ہوا دی۔ للولال جی اور فورٹ ولیم کالج کا اس سلسلے میں کیا رول رہا ہے؟ میرے خیال سے ان باتوں میں الجھ کر وقت اور energy برباد کرنا بے سود ہے۔ ماضی میں جو کچھ ہو چکا اسے قصہ پارینہ سمجھ کر بھلا دینا زیادہ بہتر ہے۔ اب جب کہ اردو اور ہندی دستوری طور پر بھی اپنے اپنے رسم الخط کے ساتھ دو علیحدہ زبانیں تسلیم کی جا چکی ہیں تو پھر ان جھگڑوں کا مکمل طور پر خاتمہ ہونا چاہیئے۔ ہندوستان کوئی چھوٹا موٹا ملک نہیں ہے یہ نیم برّاعظم ہے اور یہاں مختلف زبانیں اور کلچر کا پایا جانا یقینی اور لازمی امر ہے۔ دستور ہند میں پندرہ قومی زبانوں کا ذکر ہے اس لئے ان سب کو یکساں طور پر ترقی کے مواقع فراہم ہونے چاہئیں اور سرکاری طور پر ان سب کا استعمال بھی ہونا چاہیئے۔ کسی بھی لسانی گروہ کو اس کا رسم الخط ترک کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ زبانوں کی تقسیم مذہب، ذات یا فرقوں کی بنیاد پر نہیں ہوتی بلکہ علاقوں کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ بنگال کے ہندو اور مسلمان دونوں کی زبان بنگلہ ہے ٹیگور اور نذرالاسلام کا ادب دونوں کا ادبی اور تہذیبی سرمایہ ہے۔ کیرالا کے رہنے والے ہندو، مسلمان اور عیسائی سب کی زبان ملیالم ہے۔ اسی طرح اتر پردیش، بہار، دہلی، مدھیہ پردیش اور ہریانہ وغیرہ صوبوں میں رہنے والے ہر فرقے کی زبان ہندوستانی (اردو یا ہندی) ہے۔ بلکہ مشرقی یو پی اور بہار میں صرف شہروں میں ہندی اور اردو بولی جاتی ہے۔ دیہات کے لوگ عموماً مقامی بولیاں (مثلاً پوربی، بھوجپوری، میتھلی اور مگھی وغیرہ) بولتے ہیں البتہ علمی اور ادبی زبان اردو یا ہندی ہے۔ "ہندوستانی" زبان کے صوبوں کے لئے مہاتما گاندھی کا فارمولا مناسب اور دونوں کے لئے قابل قبول تھا اور اسی بنیاد پر پٹنہ میں ۱۹۳۸ء میں مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر راجندر پرشاد کے درمیان ایک معاہدہ ہوا تھا جس کی رو سے آزادی کے بعد ہندوستان کی سرکاری زبان "ہندوستانی" ہوتی جسے دونوں رسم الخط میں لکھا جاتا لیکن افسوس کی بات ہے کہ آزادی کے بعد اس معاہدے کی spirit کو بالکل بھلا دیا گیا۔ خیر گزری ہوئی تلخ باتوں کو یاد کرنا یا شکوے شکایات کرنا بیکار سی بات ہے۔ اگر ہم ہندی اور اردو دونوں کو اپنی قومی زبان تصور کرتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ دونوں کو اپنائیں اور دونوں کی ترقی کی تدابیر کریں، دونوں کے بولنے والوں کے علاقے قریب قریب ایک ہی ہیں۔ اس لئے صرف رسم الخط کے مسئلے پر اسقدر تناؤ Tension کچھ اچھی اور خوش آئند بات نہیں ہے۔

سب سے پہلے تو دونوں کو چاہیئے کہ اپنی اپنی زبان کو زیادہ سے زیادہ آسان بنائیں، اور ایک دوسرے کے قریب آنے کی کوشش کریں۔ یہ سوچنا بالکل غلط ہے کہ اردو صرف مسلمانوں کی اور ہندی صرف ہندوؤں کی زبان ہے۔ یہ تو سیاسی شعبدہ بازوں نے اپنے اپنے مفادات اور مقاصد کی حصولیابی کے لئے ایک دوسرے کو دور کرنے کی کوشش کی تھی اور جس کی قیمت بھی برصغیر کے کروڑوں باشندوں کو چکانا پڑی ہے۔ جہاں تک بول چال کا تعلق ہے دونوں کی زبان ایک ہی ہے تحریری اور ادبی طور پر ضرور فرق ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنے تو نہیں کہ دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی یا غیر ہیں۔ اگر ہندی صرف ہندوؤں کی زبان ہوتی تو اس میں امیر خسرو، ملک محمد جائسی، رس کھان اور عبدالرحیم خانخاناں جیسے شعراء ناپید ہوتے اسی طرح اردو میں کسی پریم چند، چکبست یا نسیم کا وجود نہ ہوتا۔ دراصل ان سب کے افکار دونوں کے لئے مشترکہ تہذیبی سرمایہ ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ کبیر، تلسی، جائسی اور سور داس کی چیزوں کو اردو رسم الخط میں اور میر، غالب اور اقبال کی چیزوں کو دیوناگری لپی میں بڑے پیمانے پر شائع کیا جائے اور اس طرح دونوں کو قریب لایا جائے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک کو رسم الخط بدلنے پر مجبور کیا جائے۔ ایک زبان کی چیز کو دوسری زبان میں شائع کرنا ایک الگ بات ہے لیکن رسم الخط کی تبدیلی قطعی طور پر ایک مختلف چیز ہے۔ ایک بات بالکل سمجھ میں نہیں آتی کہ آخر اردو والوں سے رسم الخط تبدیل کرنے کے لئے کیوں کہا جاتا ہے؟ اگر اردو اور ہندی کے لئے دو مختلف رسم الخط استعمال ہوں تو اس میں برائی کیا ہے؟ آخر ہندوستان کی جتنی قومی زبانیں ہیں سب کا تو اپنا اپنا علیحدہ رسم الخط ہے پھر ان سب سے کیوں نہیں رسم الخط بدلنے کی بات کی جاتی؟ پھر ہندوستان کے بعض دوسرے صوبوں میں ایک سے زیادہ زبانیں جب سرکاری طور پر تسلیم کی گئی ہیں تو پھر ہندی والے صوبوں میں دو زبانیں کیوں نہیں رائج ہو سکتیں؟

اگر اردو اور ہندی والوں کا انتہا پسند طبقہ اپنے رویئے میں ذرا سی لچک پیدا کرے تو مسئلہ بڑی آسانی سے حل ہو سکتا ہے۔ دونوں طبقوں کا فرض ہے کہ وہ اردو اور ہندی دونوں کو اپنی ہی

زبان تصور کریں اور دونوں ادبی سرمائے کو قدر کی نگاہوں سے دیکھیں، سیاسی بازی گروں کے چکر میں پڑنے سے ہمیشہ نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔

وقت نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ زبان اور ادب کے سلسلے میں جذباتی نعرے بالکل عارضی اور کھوکھلے ثابت ہوئے ہیں۔ ملک کی تقسیم کے بعد پاکستان میں "اسلامی ادب" کی بڑی دھوم تھی اور "سحرانگیز" نعرے کو کسی حد تک سرکاری سرپرستی بھی حاصل رہی۔ لیکن کیا پریم چند، چکبست اور کرشن چندر کو "غیر اسلامی" اہل قلم کہہ کر انھیں ٹھکرا دیا گیا؟ اسی طرح ہندوستان میں بھی جو لوگ ادب کی "شدھی" کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے بھی جائسی، امیر خسرو اور عبدالرحیم خانخاناں کو نظرانداز کرنا ناممکن ہوگا کیونکہ یہ چیز نہ صرف عجیب و غریب ہے بلکہ خلاف فطرت بھی ہے۔

اب ہر دو زبان کے دانش وروں اور اہل قلم کا فرض ہے کہ وہ اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ دونوں زبان کے بولنے والوں کے درمیان پائی جانے والی غلط فہمیوں کو دور کریں اور ایسی فضا تیار کرنے کی کوشش کریں کہ دونوں کے دل میں ایک دوسرے کے لئے محبت اور احترام پیدا ہو۔ مختلف شہروں اور قصبوں میں جو سماجی تنظیمیں قومی ایکتا کے لئے کچھ کر رہی ہیں ان کی ہمت افزائی سنجیدہ لوگوں کی طرف سے ہونی چاہیئے۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں تقریر و تحریر کی آزادی کچھ اس انداز سے دی گئی ہے کہ جب جس کا جی چاہتا ہے وہ مختلف فرقوں کے درمیان منافرت پیدا کر دیتا ہے۔ ایسے ماحول میں سرکار کی طرف سے قومی ایکتا کا راگ الاپا جانا سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔ فرقہ وارانہ بنیادوں پر کی جانے والی سیاست پر سب سے پہلے پابندی لگانی چاہیئے اور جو افراد یا "لیڈران" منافرت پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں انھیں سخت سزا دی جانی چاہیئے۔ اس کے بغیر قومی ایکتا کا خواب پورا نہیں ہو سکتا۔

بہرحال اردو اور ہندی بولنے والوں کو ایک دوسرے کے قریب آنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ نوجوانوں کی تنظیموں کو چاہیئے کہ وہ قومی ایکتا پر جم کر کام کریں، اور مختلف لسانی اور مذہبی گروہ کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کی کوشش کریں۔

ہمیں چاہیئے کہ دونوں زبانوں کو شوق سے سیکھیں اور دونوں کی ترقی کے لئے فضا ہموار کریں لیکن ایسا کرنے وقت اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیئے کہ درمیان میں رسم الخط کا کوئی ذکر نہ آئے، کیونکہ ایسا کرنے سے شکوک و شبہات جنم لیں گے۔ یوں بھی آج کے دور میں کسی بھی زبان کے رسم الخط کی تبدیلی کی بات کرنا حد درجہ نادانی ہے۔ رسم الخط کے جھگڑے میں پڑ کر ہم نے تہذیبی طور پر بہت نقصان اٹھایا ہے اب مزید نقصان نہیں اٹھانا چاہیئے۔



اردو کا موقف: اعداد و شمار کی روشنی میں

نور جہاں

اردو بولنے والوں کے صحیح اعداد و شمار ہمیں ۱۹۶۱ء کی مردم شماری سے فراہم ہوتے ہیں، اس سے پیشتر یعنی ۱۹۴۱ء اور ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کا طریقۂ کار کچھ ایسا رکھا گیا تھا جس سے اردو بولنے والوں کی صحیح تعداد کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری تک اردو کو ہندی، پنجابی اور پہاڑی بولیوں کے ساتھ منسلک کر دیا گیا تھا جس کا مطلب یہ ہوا کہ پنجابی، ہندی اور اردو بولنے والوں کو اکٹھا کر دیا جاتا تھا اور انھیں مردم شماری کے مقاصد کے تحت "ہندوستانی" بولنے والوں کے زمرے میں شامل کیا جاتا تھا۔ اس طریقۂ کار کی وجہ سے نہ صرف اردو، بلکہ پنجابی کے اعداد و شمار کا پتہ بھی نہیں چل سکتا۔ ۱۹۵۱ء میں پہلی بار ان ساری زبانوں کو علیٰحدہ علیٰحدہ حیثیت دی گئی تاہم اس میں "ہندوستانی" کو بھی شامل رکھا گیا، حالانکہ دستور ہند کی آٹھویں جدول میں موجود زبانوں میں کہیں کوئی ذکر نہیں۔ لیکن ۱۹۵۱ء کی مردم شماری میں بھی 'ہندوستانی' کی شمولیت کے باعث اردو بولنے والوں' اور ہندی بولنے والوں میں غلط فہمی پیدا ہو گئی، چنانچہ اکثر اردو بولنے والوں نے اپنی مادری زبان "ہندوستانی" لکھوا دی، جب کہ اس وقت اردو کے اعداد و شمار ایک علیٰحدہ زبان کے طور پر جمع کئے جا رہے تھے۔ ہندی بولنے والوں نے تو اپنی زبان "ہندی" ہی درج کرائی لیکن اردو بولنے والوں نے غلط فہمی کی بنا اپنی مادری زبان "ہندوستانی" لکھوا دی۔

۱۹۶۱ء میں ہندوستانی کو مردم شماری کے خانے سے خارج کر دیا گیا چنانچہ ۱۹۵۱ء اور ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار کا تقابلی جائزہ لیتے

یہ پتہ چلتا ہے کہ اچانک اردو بولنے والوں کی تعداد میں بین اضافہ ہوگیا ہے یہ ایک عجیب بات ہے کہ ایسے وقت میں جب کہ ملک تقسیم ہوا تھا اور ایک کثیر آبادی کا تبادلہ عمل میں آیا تھا، ہمیں یہ معلوم کرنے میں خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ ملک کی تقسیم سے پہلے اور اس کے فوراً بعد ملک میں اردو بولنے والوں کی تعداد کیا تھی۔

۱۹۶۱ء کی مردم شماری سے قبل عام طور پر یہ شکایتیں بھی سننے میں آتی تھیں کہ مردم شماری کے کارکن جان بوجھ کر اردو مادری زبان کا اندراج نہیں کرتے۔ انھیں بے اعتدالیوں کی وجہ سے ۱۹۴۱ء اور ۱۹۵۱ء کے بحرانی دور کے عرصہ میں اردو کی صحیح صورت حال کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ تاہم ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کو مستند مانا جاسکتا ہے، اگرچہ اس میں بھی کئی دفتری خامیاں موجود ہیں مگر پھر بھی اردو کے موقف کی ایک شکل ضرور واضح ہو جاتی ہے ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق سارے ملک میں اردو بولنے والوں کی تعداد ۲۳۳۲۲۵۱۸ تھی اور جو ملک کی کل آبادی کی ۲ر۵ فیصد پر مشتمل تھی (اس فی صد میں جموں کشمیر، پنجاب، دہلی اور ہماچل پردیش کے اردو بولنے والوں کی تعداد شامل نہیں تھی)

۱۹۵۱ء اور ۱۹۶۱ء کی مردم شماری میں اردو بولنے والوں کی تعداد کا تقابلی جائزہ ظاہر کرتا ہے کہ ملک کی ہر ریاست میں اردو بولنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے، چنانچہ آندھرا پردیش میں اردو بولنے والے ۱۹۵۱ء میں ۱ر۵ فیصد پر مشتمل تھے وہ ۱۹۶۱ء میں ۱ر۷ فیصد ہوگئے اسی طرح ۸ر۶ سے ۹ر۸ اتر پردیش میں، ۸ر۶ سے ۷ر۱۰ میسور میں، ۵ر۴ فیصد سے ۸ر۶ فی صد مدھیہ پردیش میں، ۴ر۱ فیصد سے ۳ر۲ فیصد ہوگئے ۱۹۵۱ء سے ۱۹۶۱ء کے دہے میں سوائے آسام اور اڑیسہ کے، ہر ریاست میں اردو بولنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔

ذیل میں ۱۹۶۱ء اور ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے اعتبار سے اردو بولنے والوں کے اعداد و شمار دیئے جارہے ہیں۔

نمبر شمار	نام ریاست	۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق		۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق	
		ریاست کی کل آبادی	اردو بولنے والوں کی تعداد	ریاست کی کل آبادی	اردو بولنے والوں کی تعداد
۱	آندھرا پردیش	۳۵۹۸۳۴۴۷	۲۵۵۳۷۵۳	۴۳۵۰۲۰۰۰	۳۲۹۹۸۵۴
۲	آسام	۱۱۸۷۲۷۷۲	۱۱۲۶۳	[illegible]۵۸۰۰۰	۹۳۲۵
۳	بہار	۴۶۴۵۵۶۱۰	۴۱۴۹۲۴۵	۵۶۳۵۳۰۰۰	۴۹۹۳۲۸۴
۴	گجرات	۲۰۶۳۳۳۵۲	۵۱۴۵۳۸	۲۶۶۹۷۰۰۰	۵۸۵۰۰۸
۵	جموں کشمیر	۳۵۶۰۹۷۶	۱۲۴۴۵	۴۶۱۷۰۰۰	۱۲۷۴
۶	کیرالا	۱۶۹۰۳۷۱۵	۹۱۶۰	۲۱۳۴۷۰۰۰	۱۱۳۷۴
۷	مدھیہ پردیش	۳۲۳۷۲۴۰۸	۷۴۰۰۹۸	۴۱۶۵۴۰۰۰	۹۸۸۲۷۵
۸	مہاراشٹر	۳۹۵۵۴۷۱۸	۲۷۲۵۶۸۹	۵۰۴۱۲۰۰۰	۳۶۶۱۸۹۸
۹	میسور	۲۳۵۸۶۷۷۲	۲۰۳۴۴۸۱	۲۹۲۹۹۰۰۰	۲۹۳۶۹۸۸
۱۰	اڑیسہ	۱۷۵۴۸۸۴۶	۲۱۲۸۹۱	۲۱۹۴۵۰۰۰	۲۸۶۵۴۱
۱۱	پنجاب	۲۰۳۰۶۸۱۲	۲۵۵۶۶۰	۱۳۵۵۱۰۰۰	۲۹۰۰۳
۱۲	راجستھان	۲۰۱۵۵۶۰۲	۵۰۹۶۷۳	۲۵۷۶۶۰۰۰	۶۵۰۹۴۷
۱۳	تامل ناڈو	۳۳۶۸۶۹۵۲	۶۱۵۵۰۳	۴۱۱۹۹۰۰۰	۷۵۹۶۰۷
۱۴	اتر پردیش	۷۳۷۴۶۴۰۱	۷۸۹۱۷۱۰	۸۸۳۴۱۰۰۰	۹۲۷۳۰۸۹
۱۵	مغربی بنگال	۳۴۹۸۶۲۷۹	۸۳۲۸۴۷	۴۴۳۱۲۰۰۰	۹۵۰۳۶۲

مرکزی زیر انتظامیہ علاقے

۱	انڈومان نکوبار	۶۳۵۴۸	۱۸۹۷	۱۱۵۰۰۰	۲۴۸۸
۲	دہلی	۲۸۵۸۶۱۲	۱۵۳۲۴۷	۴۰۶۶۰۰۰	۲۳۱۱۲۷
۳	دادر نگر حویلی	۵۷۹۶۳	۱۴۰	۷۴۰۰۰	۱۳۴
۴	گوا دمن دیو	۶۲۶۶۶۷	۹۵۲۱	۸۵۸۰۰۰	۱۹۲۰۵
۵	لکادیپ، منی کوائے ایمن دیوی جزائر	۲۴۱۰۸	۱	۳۲۰۰۰	۳۲
۶	پانڈیچری	۳۶۹۰۷۰	۲۵۹۴	۴۷۲۰۰۰	۳۳۶۲
۷	منی پور	۷۸۰۰۳۷	۳۶		
۸	ناگالینڈ	۳۰۹۲۰۰	۵۶		
۹	تری پورہ	۱۱۴۲۰۰۵	۲۱		
۱۰	ہماچل پردیش	۱۳۳۱۱۴۴	۶۲۷۱		
۱۱	نیفا	۳۳۶۵۵۸	۲۰۹		
۱۲	سکم	۱۶۲۱۸۹			

مرکزی زیر انتظامیہ علاقے، جنھیں بعد الگ ریاستوں کا درجہ گیا میں ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے اعتبار سے اردو بولنے والوں کی تعداد۔

نمبر شمار	نام ریاست	کل آبادی	اردو بولنے والوں کی تعداد
۱	ہریانہ	۱۰۰۳۷۰۰۰	۱۹۵۸۳۶
۲	ہماچل	۳۴۶۰۰۰۰	۱۰۱۲۱
۳	منی پور	۱۰۷۳۰۰۰	۳۱۱

۴	میگھالیہ	۱۰۱۲۰۰۰	۱۴۱۰
۵	ناگالینڈ	۵۱۶۰۰۰	۲۵۲
۶	تری پورہ	۱۵۵۶۰۰۰	۶۷

۱۹۷۱ء کے اعداد و شمار کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو ہندوستان کی چھٹی بڑی زبان ہے۔ ہندی، تلیگو، بنگالی، مرہٹی اور تامل کے بعد اردو بولنے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ بہت سی زبانیں ایسی بھی ہیں جن کے بولنے والوں کی تعداد اردو بولنے والوں کی تعداد سے بہت کم ہے جیسے گجراتی، کنٹر، ملیالم، اڑیا، پنجابی، سندھی، آسامی اور کشمیری وغیرہ۔

اردو بولنے والوں کی اس کثیر تعداد کے باوجود، اردو بولنے والوں کی بدقسمتی صرف اتنی ہے کہ وہ سارے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں، ان کی قطعی اکثریت کسی ایک جگہ نہیں ہے۔ اس لئے اردو بولنے والوں کو آج تک کوئی ایسا علاقہ نہیں ملا جہاں محض اردو بولنے والوں کی تعداد زیادہ ہو۔ دل چسپ بات تو یہ ہے کہ کشمیر کو اردو کا علاقہ قرار دیا گیا ہے اور اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا ہے لیکن ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق کشمیر میں اردو بولنے والوں کی تعداد ۱۲۷۴۰ ہے۔ وہاں عام طور پر کشمیری بولی جاتی ہے، اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ اردو کی ترقی کے امکانات کم از کم کشمیر کی حد تک بہت کم ہیں۔

قطع نظر ان لوگوں کے جن کی مادری زبان اردو ہے، ملک میں ایسے افراد بھی موجود ہیں جو نہ صرف اردو سمجھتے ہیں بلکہ لکھتے اور پڑھتے بھی ہیں۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری میں ایسے افراد کے بارے میں بھی معلومات فراہم کی گئی تھیں جو مادری زبان کے علاوہ کسی اور زبان کو ذیلی زبان کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ ان اعداد و شمار کے مطابق ایسے افراد کثیر تعداد میں موجود ہیں جو اردو کو ذیلی زبان کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ذیل میں چند ریاستوں میں ایسے افراد کے اعداد و شمار دیئے جارہے ہیں جنھوں نے اردو کو ذیلی زبان کے طور پر قبول کیا ہے۔

۱۔ آندھرا پردیش (۳۳۲۷۱۸)

۲۔ بہار (۷۰۵۰۸)

۳۔ گجرات (۵۹۵۴۲)

۴۔ جموں کشمیر (۲۴۴۲۳۳)

۵۔ مہاراشٹر (۸۹۷۶۳)

۶۔ پنجاب (۴۱۲۱۵۳)

۷ اتر پردیش (۳۸۲۴۳۷)

۸۔ مغربی بنگال (۷۶۸۵۲)

۹۔ دہلی (۲۲۹۱۰۵)

ذیلی زبان کے طور پر اردو کو استعمال کرنے والوں کی تعداد کو مادری زبان (اردو) والوں کی تعداد میں شامل کیا جائے تو اردو کا کیس اور بھی مستحکم ہوسکتا ہے۔ بعض علاقے ایسے بھی ہیں جہاں اردو مادری زبان بولنے والوں کی تعداد اور ذیلی زبان بولنے والوں کی تعداد کم و بیش برابر ہی ہے۔ مثال کے طور پر دہلی میں (اردو) مادری زبان کے افراد کی تعداد ۲۳۱۱۲۷ ہے جب کہ اسے ذیلی زبان کے طور پر استعمال کرنے والوں کی تعداد ۲۲۹۱۰۵ ہے کشمیر میں اردو کو مادری زبان کے طور پر بولنے والوں کی تعداد ناقابل لحاظ (۱۲۷۴۰) ہے جب کہ اسے ذیلی زبان کے طور پر بولنے والوں کی تعداد ۲۴۴۲۳۳ ہے۔

اردو کے سلسلے میں اکثر یہ دعویٰ بھی کیا جاتا ہے کہ اردو محض شہروں میں بولی جانے والی زبان ہے۔ لیکن اگر ۱۹۶۱ء کے اعداد و شمار کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اردو شہروں سے کہیں زیادہ دیہی علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ چنانچہ دیہی علاقوں میں اردو بولنے والوں کی تعداد ۱۳۹۱۶۷۰۶ اور شہری علاقوں میں ۹۴۰۶۱۲ تھی۔ تناسب کے اعتبار سے گویا اردو بولنے والوں کی ۶۰ فیصد آبادی دیہی علاقوں میں اور ۴۰ فیصد آبادی شہری علاقوں میں موجود تھی۔

اس لئے ضروری ہے کہ اردو کے مستقبل کا فیصلہ کرتے وقت نہ صرف ہندوستان کے شہروں میں اردو بولنے والوں کی کل تعداد کو پیش نظر رکھا جائے بلکہ یہ بھی خیال رکھا جائے کہ اردو بولنے والوں کی اکثریت دیہی علاقوں میں ہے۔

۴۰-۱۰ کا فارمولا

اعجاز حسن



۱۔ ۴۰:۱۰ فارمولہ کا پس منظر

اگست ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی آزادی کے بعد زبانوں کے مسئلہ نے اچانک ایک پیچیدہ صورت حال اختیار کی اور تعلیمی نظام میں زبردست تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ہندوستان کی آزادی تک انگریزی ملک کی سرکاری زبان تھی اور سیکنڈری مدارس میں یہی ذریعہ تعلیم بھی تھی۔ آزادی کے بعد ہندی کو ملک کی سرکاری زبان بنانے کا اعلان کیا گیا۔ اور اس کے بعد لسانی بنیادوں پر ریاستوں کی تنظیم جدید کا مطالبہ زور پکڑنے لگا۔ ان تبدیلیوں نے اقلیتی زبانوں کے لئے بڑی سنگین صورتحال پیدا کر دی اور اقلیتی زبانوں سے تعلق رکھنے والے افراد کو یہ اندیشہ پیدا ہو گیا کہ ان کے بچے اب اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل نہ کر سکیں گے۔

اس صورت حال پر سب سے پہلے صوبائی وزرائے تعلیم کی اس کانفرنس میں غور کیا گیا جو اگست ۱۹۴۹ء میں منعقد ہوئی تھی اور اس کانفرنس نے مادری زبان میں تعلیم کی سہولتوں کی فراہمی کے لئے ۱۰-۴۰ کا فارمولہ پیش کیا۔ کانفرنس نے اس ضمن میں جو قرارداد منظور کی تھی اس کا متن حسب ذیل ہے۔

"جونیر بیسک سطح پر ذریعہ تعلیم اور ذریعہ امتحان بچہ کی مادری زبان میں ہونا چاہیئے اور جہاں کسی بچہ کی مادری زبان ریاست کی علاقائی زبان سے مختلف ہو وہاں بچہ کی مادری زبان میں تعلیم کا انتظام کرنے کی غرض سے کم از کم ایک ٹیچر کا تقرر کیا جائے بشرطیکہ پورے اسکول میں اس زبان میں تعلیم حاصل کرنے کے خواہش مند طلبا کی تعداد ۴۰ اور ایک جماعت میں دس طلبا سے کم نہ ہو۔

• طلبا کی مادری زبان کا اعلان طلبا کے والدین یا سرپرستوں کی جانب سے کیا جائے۔"

"سیکنڈری سطح پر اگر ایسے طلبا کی تعداد قابل لحاظ ہو جن کی مادری زبان علاقائی زبان سے مختلف ہو اور ان کی تعداد اتنی ہو کہ جس کی بنیاد پر اس علاقہ میں ایک علٰحدہ اسکول قائم کیا جا سکے تو ایسی صورت میں اس اسکول میں ذریعہ تعلیم ان طلبا کی مادری زبان ہونا چاہیئے۔ اگر ایسے اسکول خانگی اداروں اور ایجنسیوں کی جانب سے قائم کئے جائیں تو انھیں حکومت کے قواعد کے مطابق تسلیم کیا جانا چاہیئے اور انھیں گرانٹس دیجانی چاہئیں۔ حکومت اسی قسم کی سہولتیں ان سارے سرکاری میونسپل بورڈ، ڈسٹرکٹ بورڈ مدارس میں بھی فراہم کرے گی جن طلبا کی ایک تہائی تعداد اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کی خواہش کا اظہار کرے گی تاہم ایسے اسکولوں میں سیکنڈری سطح پر علاقائی زبان ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جائے گی۔"

صوبائی وزرائے تعلیم کی اس قرارداد کے باوجود لسانی اقلیتوں کے اندیشے کم نہیں ہوئے کیونکہ اس قرارداد پر کبھی بھی عمل نہیں کیا گیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۵۶ء میں ریاستوں کی تنظیم جدید عمل میں لائی گئی۔ ریاستی تنظیم جدید کمیشن نے بھی اپنی رپورٹ کے چوتھے باب میں لسانی اقلیتوں کے مسائل پر غور کیا تھا لیکن صرف قراردادوں کے ذریعہ لسانی اقلیتوں کی بے اطمینانی کو ختم نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اس مقصد کے لئے دستوری تحفظ کی گنجائش فراہم کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ دستور کی ساتویں ترمیمی ایکٹ بابت ۱۹۵۶ء کے ذریعہ دستور ہند میں دفعات ۳۵۰ (الف) اور ۳۵۰ (ب) کا اضافہ کیا گیا۔ دفعہ ۳۵۰ (الف) کے تحت یہ اعلان کیا گیا کہ "ہر ریاست اور لوکل اتھارٹی کی یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ وہ اپنی ریاست کے اندر تعلیم کی پرائمری سطح تک لسانی اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے بچوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم دینے کا بندوبست کرے۔ صدر جمہوریہ کو یہ حق حاصل ہو گا کہ وہ ان سہولتوں کی فراہمی کے لئے اگر وہ ضروری اور مناسب سمجھیں تو کسی بھی ریاست کو ہدایات جاری کریں۔"

اس ترمیمی ایکٹ کے تحت ملک میں پہلی بار لسانی اقلیتوں کے خصوصی عہدیدار کا تقرر عمل میں لایا گیا دستور میں یہ ترمیم صوبائی وزرائے تعلیم کی اگست ۱۹۴۹ء میں منعقدہ کانفرنس کی قرارداد کی بنیاد پر ہی کی گئی تھی دستور میں ترمیم کے بعد مرکزی حکومت نے بھی زبانوں کے مسئلہ پر ستمبر ۱۹۵۶ء میں ایک میمورنڈم جاری کیا جس میں لسانی اقلیتوں کے سلسلے میں مرکزی حکومت کی پالیسی کی وضاحت کی گئی۔

اس میمورنڈم میں بھی اس بات کو تسلیم کیا گیا کہ پرائمری سطح تک لسانی اقلیتوں کے طلبا کو ان کی مادری زبان میں تعلیم کے مواقع ملنے چاہئیں۔ جہاں تک سیکنڈری ایجوکیشن کا تعلق ہے ریاستی تنظیم جدید کمیشن نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ سیکنڈری ایجوکیشن کا جائزہ پرائمری تعلیم سے ہٹ کر لیا جانا چاہیئے۔ اسی لئے کمیشن نے سیکنڈری ایجوکیشن کی سطح پر مادری زبان میں ذریعہ تعلیم کی سہولتوں کی فراہمی کے لئے دستور ہند میں ترمیم کرنے کی کوئی سفارش پیش نہیں کی تھی۔ تاہم تعلیم کے مرکزی مشاورتی بورڈ نے یہ فیصلہ کیا کہ سیکنڈری سطح پر سہ لسانی فارمولہ کے تحت اقلیتی طلبا کی مادری زبانوں کو ہم مقام دیا جائے۔

اقلیتی زبانوں میں تعلیم کے لئے اگرچہ یہ ساری

گنجائشیں فراہم کی گئیں لیکن اس کے باوجود اسے عملی شکل دینے اور اقلیتی زبانوں میں تعلیم کے حق کے تحفظ کے لئے دفتری طریقہ کار کی کوئی وضاحت نہیں کی گئی۔

اس ضمن میں ایک باضابطہ طریقہ کار کو اپنانے کی پہلی کوشش جنوبی علاقائی کونسل کی وزارتی کمیٹی کے اجلاس میں کی گئی جو ۱۶ اور ۱۷ مئی ۱۹۵۹ء کو اوٹکمنڈ میں منعقد ہوا تھا۔ اس اجلاس میں پرائمری اور ابتدائی اسکولوں کی سطح پر لسانی اقلیتوں کے طلبا کو مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کی سہولتوں کو فراہم کرنے کی غرض سے دفتری طریقہ کار کا جائزہ لیا گیا۔ جنوبی علاقائی کونسل نے متفقہ طور پر یہ طے کیا کہ جس اسکول میں کسی اقلیتی زبان کے بولنے والے طلبا کی تعداد ۴۰ ہو یا کسی جماعت میں دس بچے ہوں تو ان کے لئے تعلیمی سہولتیں فراہم کی جائیں اور جوں جوں اقلیتی زبان میں تعلیم حاصل کرنے کے خواہش مند طلبا کی تعداد بڑھتی جائے تعلیمی سہولتوں میں بھی اسی تناسب سے اضافہ کیا جائے۔

مندرجہ بالا تحفظ کو روبہ عمل لانے کے لئے یہ طے کیا گیا کہ تمام پرائمری اسکولوں میں لسانی اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے طلبا کے سرپرستوں کی جانب سے اسکول میں داخلہ کے لئے پیشگی درخواستیں قبول کی جائیں جن میں یہ صراحت کی جائے کہ ان کے بچے کس زبان میں تعلیم حاصل کرنے کے خواہش مند ہیں۔ یہ پیشگی درخواستیں تعلیمی سال کے آغاز سے پندرہ روز پہلے تک ختم ہونے والے تین ماہ کے عرصہ میں قبول کی جائیں تاکہ عہدیداروں کو پہلے سے یہ اندازہ ہو جائے کہ کسی جماعت میں کتنے طلبا کون سی زبان میں تعلیم حاصل کرنے کے خواہش مند ہیں۔ پھر یہ درخواستیں ایک رجسٹر میں درج کی جائیں۔ عہدیداروں کو یہ ہدایت دی گئی کہ وہ کسی بھی درخواست کو مسترد نہ کریں بلکہ ساری درخواستوں کو جمع کریں اور جب درخواستیں جمع ہو جائیں تو یہ پتہ چلائیں کہ آیا کسی اقلیتی زبان میں تعلیم حاصل کرنے کے خواہش مند طلبا کی تعداد سارے اسکول میں ۴۰ اور کسی جماعت میں دس ہو گئی ہے یا نہیں؟ اگر یہ درخواستیں اس شرط کی تکمیل کرتی ہوں تو پھر اسکول میں اس لسانی اقلیت کے طلبا کو ان کی مادری زبان میں تعلیم دینے کا بندوبست کیا جائے۔

جہاں تک سیکنڈری سطح پر مادری زبان میں تعلیم دینے کا سوال ہے جنوبی علاقائی کونسل کی چاروں ریاستوں آندھرا پردیش، مدراس، میسور اور کیرالا نے یہ طے کیا کہ ہائر سیکنڈری کورس کے آٹھویں سے گیارہویں درجہ تک کسی اقلیتی زبان میں تعلیم حاصل کرنے کے خواہش مند طلبا کی تعداد اگر ۶۰ ہے یا ہر درجہ میں ایسے طلبا کی تعداد ۱۵ ہو تو ایسی صورت میں ان کی مادری زبان میں تعلیم کا بندوبست ہونا چاہیئے۔

جنوبی علاقائی کونسل نے لسانی اقلیتوں کو دیئے گئے تحفظات کو روبہ عمل لانے کے لئے پہلی مرتبہ دفتری طریقہ کار کی وضاحت کی۔ بعد میں اگست ۱۹۶۱ء میں ریاستی چیف منسٹروں اور مرکزی وزرا کا ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں لسانی اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے سلسلہ میں جنوبی علاقائی کونسل کے فیصلوں کو اصولی طور پر قبول کر لیا گیا اور ساری ریاستوں سے یہ خواہش کی گئی کہ وہ بھی اس طریقہ کار پر عمل کریں۔

۱۰-۴۰ فارمولے کی دشواریاں

مندرجہ بالا سطور میں اس تاریخی پس منظر کا جائزہ لیا گیا جس کی روشنی میں ۱۰-۴۰ کا فارمولا تیار کیا گیا۔ مگر جب آپ اس فارمولے کو عملی شکل میں اور بالخصوص اردو تعلیم کے پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ۱۰-۴۰ کا فارمولہ ایک ناکام ترین فارمولا ثابت ہو چکا ہے۔ اس کا اندازہ لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی مختلف رپورٹوں کے مطالعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ لسانی اقلیتوں کے کمشنر نے اپنی چوتھی رپورٹ بابت ۱۹۶۲ء میں لکھا ہے کہ ساری ریاستوں نے اس فارمولے کو قبول کر لیا ہے مگر کمشنر نے اپنی پانچویں رپورٹ بابت ۱۹۶۳ء میں لکھا ہے کہ حکومت اتر پردیش نے اس سلسلے میں ابھی تک کوئی سرکاری احکام جاری نہیں کئے ہیں۔

اردو کے سلسلے میں ۱۰-۴۰ فارمولے کی ناکامی کا اندازہ اتر پردیش میں اردو تعلیم کی زبوں حالی سے لگایا جا سکتا ہے۔ حکومت اتر پردیش نے اس فارمولے کو اصولی طور پر قبول کر لینے کے باوجود اسے کوئی عملی شکل نہیں دی۔ ۱۹۶۱ء میں لسانی اقلیتوں کے کمشنر نے اتر پردیش کے چیف منسٹر سے یہ شکایت کی تھی کہ اسکولوں میں اردو مادری زبان کے ذریعہ تعلیم حاصل کرنے کے خواہشمند طلبا کے "پیشگی رجسٹریشن" کا طریقہ کار اطمینان بخش نہیں ہے لہٰذا اس میں تبدیلی کی جائے۔ کمشنر نے یہ تجویز پیش کی کہ "پیشگی رجسٹریشن" کی بجائے داخلہ کے فارمس میں ایک خانہ کا اضافہ کیا جائے جس میں طلبا کے سرپرست اپنے بچوں کی مادری زبان کا اندراج کریں تاکہ اس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ کس جماعت میں اردو مادری زبان رکھنے والے طلبا کی تعداد کتنی ہے اور اسی مناسبت سے اسکولوں میں اردو جماعتیں کھولی جائیں۔ چیف منسٹر نے کمشنر کی اس تجویز کو تو قبول کر لیا لیکن جب اس کو روبہ عمل لانے کا سوال اٹھایا تو حکومت اتر پردیش نے ایسا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

اتر پردیش میں اردو زبان میں تعلیم حاصل کرنے کے دستوری تحفظ کی جس طرح خلاف ورزی کی گئی اس کی مثال ہندوستان کی کسی اور ریاست میں نہیں ملتی حالانکہ اتر پردیش میں اردو بولنے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے اور یہیں اردو ذریعہ تعلیم کے خصوصی انتظامات کی ضرورت بھی ہے۔ لسانی اقلیتوں کے کمشنر نے اپنی پانچویں رپورٹ میں لکھا تھا کہ بہار میں اردو زبان سے تعلیم حاصل کرنے والے طلبا اور اردو مدارس کی تعداد اتر پردیش کے اردو مدارس اور اردو طلبا کے مقابلے میں دوگنا زیادہ ہے۔ یہاں تک کہ مہاراشٹر کے مقابلے میں بھی اتر پردیش میں اردو مدارس کی تعداد کم تھی۔ اصل میں اتر پردیش کی حکومت نے کبھی بھی ۱۰-۴۰ کے فارمولے کو اہمیت نہیں دی۔ بلکہ اس نے اردو تعلیم کی سہولتوں کو ختم کرنا شروع کر دیا۔ اس کی مثال اس طرح دی جا سکتی ہے کہ ۷۱-۱۹۷۰ء میں ضلع گورکھپور میں ۳۴۵ اردو پرائمری مدارس تھے مگر دوسرے ہی سال اس ضلع میں ایک بھی

اردو اسکول باقی نہیں رہا۔ ایسی بے شمار مثالیں دی جاسکتی ہیں جہاں حکومت اتر پردیش نے جان بوجھ کر اردو میں تعلیم کی سہولتوں کو ختم کیا۔

اس فارمولے کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ بچوں کی تعداد کا تعین کرنے کا اختیار مدارس پر چھوڑ دیا گیا۔ فارمولے کے تحت یہ ضروری ہے کہ ہر اسکول میں اقلیتی زبانوں میں تعلیم حاصل کرنے کے خواہشمند طلبا کے لئے "پیشگی رجسٹریشن" کروایا جائے۔ مگر لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی ساری ہی رپورٹوں سے پتہ چلتا ہے کہ ہر ریاست میں "پیشگی رجسٹر" رکھنے کے معاملہ میں لاپرواہی برتی جاتی ہے۔ اسکول کے عہدیدار طلبا کے سرپرستوں سے کہہ دیتے ہیں کہ اسکول میں اردو تعلیم کا انتظام نہیں ہے۔ لہٰذا وہ خاموش ہو جاتے ہیں اور مادری زبان کو چھوڑ کر کسی اور زبان یا علاقائی زبان میں اپنے بچوں کو تعلیم دلوانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ اس فارمولے کی مناسب تشہیر بھی نہیں کی گئی جس کی وجہ سے لسانی اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے افراد کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ دستور ہند میں مادری زبان میں تعلیم دلانے کے حق کا تحفظ کیا گیا ہے۔ ایک بار لسانی اقلیتوں کے کمشنر نے حکومت اتر پردیش سے خواہش کی تھی کہ وہ اس فارمولے کی مناسب تشہیر کرے مگر حکومت اتر پردیش نے کوئی انتظام نہیں کیا۔

لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی جانب سے تقریباً ۱۹۶۰ء سے ریاستی حکومتوں کو متواتر ہدایات دی جا رہی ہیں کہ وہ اسکولوں میں "پیشگی رجسٹر" رکھنے کی پابندی کریں اور ۱-۴۰ کے فارمولے کی سختی سے پابندی کریں۔ اردو کے سلسلے میں ان ہدایات پر کس حد تک عمل ہوا ہے اس کا اندازہ کمشنر کی رپورٹ بابت ۱۹۷۰ء کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلے گا کہ کئی برس گزر جانے کے باوجود ۱-۴۰ کا فارمولہ ایک ناکام فارمولہ ثابت ہوا ہے۔ ہم یہاں بعض ریاستوں میں اردو تعلیم کے سلسلے میں ۱-۴۰ کے فارمولے کا جو موقف رہا ہے اس کا اجمالی ذکر کمشنر کے ۱۹۷۰ء کی رپورٹ سے پیش کرتے ہیں۔

آندھرا پردیش میں لسانی اقلیتوں کے کمشنر نے دو اضلاع نظام آباد اور میدک کا دورہ کیا تھا۔ اس دورے میں پتہ چلا کہ پرائمری مدارس میں "پیشگی رجسٹر" نہیں رکھے جا رہے ہیں۔

میسور کے دورے میں کمشنر کو پتہ چلا کہ ریاست کے کئی اضلاع کے اسکولس میں ابھی تک "پیشگی رجسٹر" رکھنے کا اصول رائج نہیں کیا گیا۔

پنجاب اور ہریانہ کی ریاستوں نے کمشنر کو مطلع کیا ہے کہ اب یہ دونوں ریاستیں "یک لسانی ریاستیں" بن گئی ہیں لہٰذا اب یہاں کسی اور زبان میں تعلیم کا انتظام کرنا دشوار ہے۔ اب یہ ریاستیں تعلیم کے سلسلے میں قومی پالیسی کو قبول کرنے سے ہی انکار کر رہی ہیں۔

اتر پردیش کے ۵۴ اضلاع میں سے صرف ۳۴ اضلاع سے "پیشگی رجسٹریشن" کے بارے میں اعداد و شمار فراہم کئے گئے اور بقیہ اضلاع کی جانب سے کوئی اعداد و شمار فراہم نہیں کئے گئے۔ یوں بھی اتر پردیش میں اردو اسکولوں اور طلبا کی تعداد مسلسل کم ہوتی جا رہی ہے۔

ان سارے حقائق کی روشنی میں ۱-۴۰ کا فارمولا ایک غیر مؤثر فارمولہ نظر آتا ہے۔ پھر اس فارمولے کا جو طریقہ کار ہے وہ بڑا پیچیدہ ہے۔ طلبا کے سرپرستوں سے یہ توقع رکھنا بے کار ہے کہ وہ تین مہینے پہلے اپنے بچوں کے نام اسکولوں میں درج کروائیں گے۔ اسکولوں کے عہدیدار اگر چاہیں تو مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کے خواہشمند طلبا کی تعداد کو کم کر سکتے ہیں۔ اکثر ایسی شکایات سننے میں آتی ہیں کہ اکثر سرپرستوں کو یہ کہہ کر ٹال دیا جاتا ہے کہ مدرسہ میں اردو کی تعلیم کا انتظام نہیں ہے۔ ایک دشواری اور بھی ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک جماعت میں دس لڑکے شریک ہوتے ہیں اور جب سالانہ امتحان ہوتا ہے تو ان میں سے دو لڑکے فیل ہو جاتے ہیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگلی جماعت میں صرف آٹھ طلبا باقی رہ جائیں گے۔ ایسی صورت میں اسکول کا انتظامیہ یہ استدلال پیش کر سکتا ہے کہ چونکہ اگلی جماعت میں طلبا کی تعداد دس سے زائد نہیں ہے اس لئے نئی جماعت کھولنے کا انتظام نہیں کیا جا سکتا۔ لازماً ان بچوں کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اس فارمولے کو سرے سے برخاست کر دیا جائے اور اس کے بجائے ہر اسکول میں متعلقہ علاقہ کی آبادی کی بنیاد پر اردو تعلیم کا لازمی طور پر انتظام کیا جائے۔ جب تعلیم کا انتظام ہوگا تو طلبا خود بخود اردو ذریعہ تعلیم سے استفادہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ کسی انتظام کے بغیر یہ شرط عائد کرنا کہ طلبا کی مطلوبہ تعداد فراہم کی جائے، ایک زیادتی ہے۔ اسکولوں میں تعلیم کا انتظام کر دیا جائے تو طلبا خود بخود داخلہ لیں گے۔

اس کی مثال خود اتر پردیش کے ان اضلاع سے دی جا سکتی ہے جہاں اردو تعلیم کے انتظام کو بہتر بنایا گیا۔ چنانچہ ضلع مرادآباد میں ۶۳-۱۹۶۲ء میں اردو تعلیم کا جب بہتر انتظام کیا گیا اور نئے اردو پرائمری اسکول کھولے گئے تو اردو طلبا کی تعداد اچانک ۱۸۶۱۰ ہو گئی۔ جب کہ ایک سال پہلے ۶۲-۱۹۶۱ء میں ان طلبا کی تعداد صرف ۲۴۳۰ تھی۔ اسی طرح ضلع بارہ بنکی میں جب اردو اسکولوں کی تعداد میں اضافہ کیا گیا تو اردو طلبا کی تعداد جو ایک سال پہلے ۲۱۵۶ تھی وہ بڑھ کر ۶۳-۱۹۶۲ء میں ۴۵۸۵ ہو گئی۔ اس کے برخلاف جن اضلاع میں اردو تعلیم کی سہولتیں کم کر دی گئیں وہاں طلبا کی تعداد خود بخود کم ہو گئی۔

ان حالات میں یہ ضروری ہے کہ اس رفتہ رفتہ فارمولے میں کو یکسر ختم کر دیا جائے۔ اسکولوں میں اردو تعلیم کا انتظام کیا جائے اور اس کے لئے پہلے سے کوئی شرط عائد نہ کی جائے۔ اب یہ فارمولہ اردو تعلیم ہی کیا بلکہ دیگر اقلیتی زبانوں کی تعلیم کے لئے بھی ایک رکاوٹ بنتا جا رہا ہے۔ ماہرین تعلیم کو چاہیئے کہ وہ اس فارمولے کا از سر نو جائزہ لیں۔ جو فارمولہ گذشتہ ۲۳ برسوں میں کامیاب نہ ہو سکا اسے باقی رکھنا کوئی دانشمندی نہیں ہے۔

اردو کی نصابی کتابوں کا مسئلہ

مسراج بیگم

ہمارے آئین کے مطابق تعلیم ریاستی شعبہ ہے۔ اس لئے تمام تعلیمی ضروریات کی تکمیل کی ذمہ داری ریاستی حکومت پر عائد ہوتی ہے۔ لیکن اردو کی ریاستوں میں اردو تعلیم کا انتظام ہی نہیں ہے یا ہے بھی تو نہ ہونے کے برابر۔ اس لئے درسی کتب کی تیاری اور اس کی اشاعت سے قصداً پہلوتہی کی گئی ہے۔ اس طرح کا رویہ رکھنے والی ریاستوں میں کچھ لسانی عصبیت کی بنا پر ایسا کیا گیا ہے۔ اور کچھ خود اردو والوں کی نااہلیت کی وجہ سے اردو ذریعہ تعلیم اس بدبختی کا شکار ہوا ہے۔

پچھلے ۲۵ برسوں میں اردو ذریعہ تعلیم کو نہ صرف نظر انداز کیا جاتا رہا ہے بلکہ قصداً اسے ختم کرنے کی ہر ممکن کوششیں ہوتی رہی ہیں جس کا بھیانک نتیجہ یہ نکلا کہ آج خود اردو والوں کی ایک پوری نسل اردو سے نابلد ہے۔ - اردو ذریعہ تعلیم اور درسی کتابوں کے مسائل بھی بجائے سلجھنے کے اُلجھتے ہی گئے۔ اس طرح اردو والے اپنے آئینی اور بنیادی حقوق سے بھی محروم ہوتے رہے۔ اردو پڑھنے والے ہوں تو مدارس نہیں، مدارس ہوں تو اساتذہ نہیں

شکر ہے کہ اب اردو کے تعلق سے عصبیت میں کمی ہو رہی ہے۔ اردو کو اس کے حقوق دیئے جانے پر ارباب اقتدار بھی مثبت انداز میں غور کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ ایسے میں اردو والوں کو ہر شعبۂ زندگی میں اردو کے استعمال پر اصرار بھی کرتے رہنا چاہیئے۔ اردو پڑھنا اور پڑھانا چاہیئے۔ صرف شعر و شاعری یا افسانوں اور ناولوں کی تخلیق و اشاعت پر ہی اکتفا نہیں کرنا چاہیئے بلکہ علمی اور درسی کتابوں کی تصنیف و اشاعت اور ان کی خرید و فروخت کے بھی جتن کرنے چاہئیں۔

اب ہمارے سامنے تین طرح کی ریاستیں آتی ہیں:

۱۔ ایسے علاقے جو مرکز کے زیر انتظام ہوں۔

۲۔ ایسی ریاستیں جنھیں اردو کی بھی ریاستیں کہا جا سکتا ہے۔

۳۔ ایسی ریاستیں جو بنیادی طور پر غیر اردو ریاستیں ہیں مگر ان میں اردو پڑھنے لکھنے کا انتظام ہے۔

پہلی قسم کے علاقوں میں سوائے دہلی کے کہیں اور اردو تعلیم کا انتظام نہیں۔ یہاں دہلی انتظامیہ کی کتابیں اردو میں بھی شائع کی جا سکتی ہیں یا کسی اور ناشر کی مدد سے بھی یہ کام انجام دیا جا سکتا ہے۔ بہ حالت موجودہ اس کا بیڑا ترقی اردو نے اٹھایا ہے اور مڈل اسکولوں کے لئے ابھی انتظامیہ کی ہندی کتابوں کا اردو ترجمہ کروا کے شائع کیا جا رہا ہے۔ جو بذات خود ایک بڑا کام ہے اسے آئندہ بھی جاری رکھا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یو۔پی۔ ایس۔ سی اور پولیس و فوج وغیرہ جیسے محکموں میں بھی اردو تعلیم کا بندوبست کیا جائے ان کے نصاب کی کتابوں کی تیاری کے سلسلے میں ترقی اردو بورڈ کی خدمات سے مستقل طور پر استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ مرکزی زیر انتظام یونیورسٹیوں میں اردو کی کتابوں کی تصنیف و تالیف اور ترجمے پھر ان کی اشاعت و طباعت کے تعلق سے بھی یہ ترقی اردو بورڈ کو مصروف رکھا جا سکتا ہے۔

دوسری قسم کی ریاستوں میں محکمۂ تعلیم کے زیر انتظام، ریاستی تاریخ و جغرافیہ، تہذیب و تمدن مقامی روایات کی آئینہ دار ابتدائی جماعتوں اسے ثانوی جماعتوں تک نصابی کتابوں کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ فوری ضروریات کی تکمیل کے لئے دوسری ریاستوں میں مروج درسی کتب کو شریک نصاب کیا جا سکتا ہے پھر بعد میں ان میں ترمیم و اضافوں یا نئے سرے سے نئی کتابیں لکھوائی اور چھپوائی جا سکتی ہیں۔ ہندی کی درسی کتابوں کے ترجموں سے بھی اس ضرورت کی تکمیل کی جا سکتی ہے۔ چونکہ ہندوستان ایک ہمہ گیر ملک ہے مختلف مذاہب، مختلف تہذیب و تمدن اور مختلف جغرافیائی حالات کے پیش نظر ایک ریاست کی تعلیمی ضروریات دوسری ریاست کی تعلیمی ضروریات سے قدرے مختلف ہوتی ہیں مگر مقامی ریاستی خصوصی دلچسپی لیں تو یہ مسئلہ بھی بخوبی حل کیا جا سکتا ہے۔ یا اس سلسلے میں اردو نصاب کا تعین کرنے کے لئے کسی مرکزی ادارے سے مدد لی جا سکتی ہے۔ اور فنی اور تکنیکی اصلاح و مشورے کئے جا سکتے ہیں۔

تیسری قسم کی ریاستوں میں واقعی تدریسی کتابوں کی فراہمی کا مسئلہ پیچیدہ ہے ایک اس وجہ سے کہ وہاں اردو بولنے والی آبادی بہت زیادہ نہیں ہوتی۔ مگر ان جغرافیائی حالات اور سماجی و تہذیبی زندگی اردو کی دوسری ریاستوں سے مختلف ہوتی ہے مگر ان کا ادراک و شعور طلبا کے لئے نہایت ضروری ہوتا ہے۔ اسلئے تدریسی کتابوں کی تیاری اور ان کی اشاعت میں بڑی دشواری پیدا ہوتی ہے۔ لیکن بہرحال یہ ایک آئینی اور قانونی ذمہ داری ہے ہر ریاست کو اس سے عہدہ برا ہونا چاہیئے۔ اس لئے مشاورتی مجالس بنا کر، درپیش دشواریوں کو دور کیا جا سکتا ہے۔ اور بہ وقت ضرورت ترقی اردو بورڈ یا اس قسم کے دوسرے اداروں اور خود وزارتِ تعلیم سے ہر طرح کی مدد لی جا سکتی ہے۔

پاکستانی سیاست میں تشدد

ہمارے سیاسی مبصّر کے قلم سے

یوں تو دنیا کے ہر ملک کی سیاست کے کسی نہ کسی پہلو میں تشدد کے آثار ملتے ہیں لیکن پاکستانی سیاست کا نمایاں عنصر تشدد ہی ہے۔ وہاں زیادہ تر سیاسی خیالات اور سیاسی فلسفہ کی پُر پیچ راہوں سے گزرنے کی بجائے تشدد کی کمند کا سہارا لیا جاتا ہے۔ اگر پاکستان میں عام زندگی پر بھی نظر ڈالی جائے تو وہاں بھی تشدد کے داغ جگہ جگہ دکھائی دیتے ہیں۔ اخبارات کا سرسری جائزہ بھی اغوا، قتل، عصمت دری کی سرخیوں میں الجھ الجھ جاتا ہے۔ یہ کہنا تو جائز نہ ہوگا کہ پاکستانی عوام فطرتاً تشدد پسند ہیں، عوام تو امن و امان کی گھنی چھاؤں چاہتے ہیں لیکن انھیں تشدد کا شکار اس لئے ہونا پڑتا ہے کہ وہاں نہ تو جمہوری نظام مستحکم ہے اور نہ ہی سیاسی اندازِ فکر و اظہار توانا ہے۔ اس حقیقت کی نشاندہی ممتاز پاکستانی ہفتہ وار" اخبارِ جہاں" کے ۱۳ جون کے اداریہ میں کی گئی ہے" ہم فوجی آمریت کے طویل سیاہ دور کے بعد جمہوری دور میں داخل ہوئے ہیں۔ ڈیڑھ برس سے اوپر ہو گیا ہے مگر ہم جمہوریت سے ہچکچا بھی رہے ہیں جمہوریت کا نام تو سبھی لیتے ہیں مگر جمہوری اصولوں پر مکمل عمل درآمد کی ہمت اپنے آپ میں نہیں پاتے۔ جہاں ایک طویل عرصے تک جمہوریت کی ہوا نہ چلی ہو، ایسے ملک میں وسوسے اور خدشات اتنے زیادہ چھا جاتے ہیں کہ جمہوریت کے سیدھے سادے اصول اپناتے ہوئے بھی قدم بار بار ٹھٹکتے ہیں، پاکستان میں آج کل یہی ہو رہا ہے...... ہم ایک دوسرے پر اعتماد اب تک حاصل نہیں کر سکے ہیں، اس کی وجہ سے حکومتیں برطرف کی جا رہی ہیں۔ ایک دوسرے پر الزامات عائد کئے جا رہے ہیں، جلسے خراب کئے جا رہے ہیں۔"

منظم تشدد

" اخبارِ جہاں کے اسی شمارے میں حبیب الرحمٰن نے اپنے کالم میں میاں محمود علی قصوری کی قومی اسمبلی میں کی گئی تقریر کا یہ اقتباس بھی شامل کیا ہے:" اس دور میں جس منظم طریقے اور جس شدت کے ساتھ حزبِ اختلاف سے تعلق رکھنے والے اور حکمرانوں کی حمایت نہ کرنے والے ارکان اسمبلی کو پریشان اور ہراساں کیا جا رہا ہے۔ اس کی مثال پاکستان کی تاریخ کے کسی اور دور میں نہیں ملتی یہ سب کچھ ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت ہو رہا ہے"۔

میاں صاحب کا سب سے سنگین الزام یہ ہے کہ ان سے انتقام لینے اور انھیں حکومت کی مخالفت سے باز رکھنے کی خاطر ان کے ایک جواں سال بیٹے دانیال کو جو پنجاب یونیورسٹی کے طالب علم ہیں پستول اور خنجر دکھا کر اغوا کیا گیا اور ان سے جبراً یہ تحریر لکھوائی گئی کہ وہ یونیورسٹی کے امتحان میں نقل اڑانے کے مرتکب ہوئے ہیں۔ حبسِ بے جا کے دوران جواں سال دانیال کے ساتھ مجرمانہ سلوک کیا گیا اور انھیں اسی وقت رِہا کیا گیا جب کہ یونیورسٹی کے امتحان کے ایک پرچہ کا وقت گزر چکا تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حالات کو اس نوبت تک لے جانے کے لئے کون ذمہ دار ہے؟ اگر پاکستان کے سابق وزیر قانون کے صاحب زادے سیاسی تشدد کا شکار ہو سکتے ہیں تو یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ وہاں کون کس حد تک محفوظ ہے۔ ظاہر ہے کہ حکومت ان حالات سے لاعلمی کا سہارا نہیں لے سکتی۔ پیپلز پارٹی اور حکومت کے اہم رکن ایسے بیانات دیتے رہے ہیں کہ جن سے سیاسی تشدد کے رجحانات کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ پنجاب کے گورنر غلام مصطفےٰ کھر کبھی کبھی ایسا لب و لہجہ اختیار کرتے ہیں کہ جو ان کے عہدے اور منتخب عوامی رہنما کی حیثیت سے قطعاً مناسبت نہیں رکھتا۔

پچھلے دنوں تحریکِ استقلال کے سربراہ ائیر مارشل (ریٹائرڈ) اصغر خان کے اس بیان کے خاصے چرچے رہے جس میں انھوں نے گولی کے ذریعہ حکومت بدل دینے کی دھمکی دی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اصغر خان سیاسی سوجھ بوجھ کم ہی رکھتے ہوں، اور اسی وجہ سے ایسی بات کہہ گئے۔ لیکن ایک بات واضح ہے کہ یہ لب و لہجہ انھوں نے مجبور ہو کر اختیار کیا ہے۔ جس شخص کی زندگی پر بار بار شدید اور خطرناک حملے کئے جائیں وہ تنگ آکر اس قسم کی بات نہ کرے تو کیا کرے۔ اگر صدر بھٹو کی مخالفت کے لئے اصغر خاں جمہوری لب و لہجہ نہیں اپناتے تو اس کا یہ علاج تو نہیں کہ ان کی زبان بندی کے لئے قتل کی راہیں تلاش کی جائیں۔ عوام کے جمہوری اعتقادات اور ذہنی صحت پر بھروسہ کرنا کافی ہے۔ اس سے پہلے دن دہاڑے سرِ عام خواجہ محمد رفیق کا قتل ہوا۔ لیکن یہ سیاسی تشدد ابھی تک سزا طلب ہے۔

سیاسی تشدد ۔ ایک مرض

دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت۔ ہند کے عوام اس قسم کی صورت حال کا تصور تک نہیں کر سکتے۔ انسانی

خون اور اہم سیاسی زندگی اسقدر سستی کیسے ہو سکتی ہیں ہند میں سیاسی جماعتوں کی خاصی بڑی تعداد ہے۔ ان کے سیاسی اختلافات بھی خاصے گہرے ہیں لیکن نہ تو حکمران جماعت اور نہ ہی اپوزیشن سیاسی تشدد کا سہارا لے سکتے ہیں۔ ماضی میں نکسل پارٹیوں نے تشدد کے ذریعہ بساطِ سیاست الٹنے کے خواب دیکھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عوام نے انھیں ٹھکرا دیا۔ اگر سیاسی تشدد کے مرض کا ایسا ہی علاج پاکستانی عوام نہیں کر سکے تو اس کا سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ وہاں جمہوری اقدار کے تذکرے تو ہیں۔ لیکن جمہوری روایات کا فقدان ہے۔ جمہوری نظام اس قدر کمزور ہے کہ ایک فرد کے اِدھر اُدھر ہونے سے ہی فوجی غلبے کے آثار پیدا ہونے لگتے ہیں۔

گذشتہ فروری میں جب بلوچستان اور صوبہ سرحد کی عوامی حکومتوں کو برطرف کر کے صدر بھٹو نے اکبر بگٹی اور اسلم خٹک کو گورنری پیش کیں تو نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیۃ العلمائے اسلام نے ان غیر جمہوری اقدامات کا مقابلہ کرنے کے لئے دوسری اپوزیشن پارٹیوں کے ساتھ مل کر متحدہ جمہوری محاذ کی تشکیل کی۔ پیر پگارا کی رہنمائی میں جمہوری محاذ نے عوام کو حکومت کی غیر جمہوری کارکردگیوں کی تفصیلات جلسوں کے ذریعہ دینے کا فیصلہ کیا تو حکمراں جماعت نے اپنے اثر و رسوخ کا مکمل اور موثر استعمال کر کے لیاقت باغ راولپنڈی میں محاذ کے پہلے جلسہ کو آگ اور گولی بارود کی نذر کر دیا کئی زندگیاں تلف ہوئیں۔ تب سے یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔

اس غیر جمہوری سیاسی کارکردگی کا صدر بھٹو کو علم نہ ہو ایسا ممکن نہیں ہے، خواہ وہ لاکھ معصومیت کے دعوے کریں جیسا کہ انھوں نے ۱۰ر جون کو لاہور ہوائی اڈے پر اس سوال کے جواب میں کیا کہ قومی سیاست میں تشدد کا رجحان کیوں بڑھ رہا ہے۔ صدر بھٹو کا کہنا ہے کہ اس سوال کا جواب ان لوگوں کو دینا چاہیئے جو آج کل جلسے کر رہے ہیں۔ میں نے عرصہ ہوا کسی عوامی جلسے سے خطاب نہیں کیا۔ اگر صدر بھٹو کے ان الفاظ کا جائزہ لیا جائے تو نتیجہ یہی نکلے گا کہ ان کی رائے میں عوامی جلسے کرنے سے سیاست میں تشدد کے رجحانات بڑھے ہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ اندازِ فکر اپنانے کے لئے صدر بھٹو نے کس منطق کا سہارا لیا ہے۔ جلسے کرنا تو ایک جمہوری عمل ہے جس سے تشدد کے رجحانات بڑھنے کا تب تک سوال پیدا نہیں ہوتا جب تک ان جلسوں میں تشدد کا پرچار نہ کیا جائے۔

جہاں تک متحدہ جمہوری محاذ کا تعلق ہے اس کی عوام دوستی کا عالم بھی وہی ہے جو پیپلز پارٹی کی عوام دوستی کا ہے۔ لیکن یہ بات ناقابل فہم ہے کہ ایک ایسا نظام جسے فیڈرل اور جمہوری قرار دیا جس کے لئے تازہ تازہ آئین بھی تیار ہوا ہو وہاں عام جلسے ناممکن ہو کر رہ جائیں۔ تو یہ کیسا جمہوری نظام ہے؟ پاکستان میں جلسوں میں تشدد کے بارے میں جو رویہ ہے اس پر قومی اسمبلی میں انگشت نمائی تو ہونی ہی تھی، پنجاب اسمبلی نے بھی اس کی مذمت کی۔ علامہ رحمت اللہ ارشد نے ۵ر جون کی بحث کا آغاز کرتے ہوئے کہا "اپوزیشن کے عام جلسوں کے بارے میں حکومت کی پالیسی جمہوریت کے مزاج کے منافی ہے۔ اگر حکومت نے اپوزیشن کے بارے میں اپنے موجودہ رویے کو تبدیل نہ کیا اور اسے عام جلسے منعقد کرنے کی اجازت نہ دی تو وہ دن زیادہ دور نہیں کہ پنجاب میں بھی بلوچستان جیسی صورت حال پیدا ہو جائے گی اور ملک خانہ جنگی کا شکار ہو جائے گا۔ لاہور میں متحدہ جمہوری محاذ کے جلسے کو خراب کرنے کے لئے صوبے کے مختلف مقامات سے مسلح لوگ منگوائے گئے۔ کوٹ لکھپت میں میاں طفیل محمد کی داڑھی نوچی گئی۔ اس قسم کے اقدامات نے صوبے میں سیاسی صورت حال کشیدہ ہو رہی ہے۔

اس بحث کے اگلے روز اس کا جواب مزید تشدد سے دیا گیا۔ ۶ر جون کو تیز گام ٹرین کے اس ڈبہ پر جس میں متحدہ جمہوری محاذ کے چوٹی کے لیڈر سفر کر رہے تھے۔ گوجرانوالہ اور وزیر آباد میں گولیاں چلائی گئیں اور تین دستی بم پھینکے گئے جس سے چودھری ظہور الٰہی معمولی زخمی ہوئے، لیکن نصف درجن کے قریب کارکن سخت زخمی ہوئے۔

حکومت کی طرف سے ڈپٹی کمشنر گوجرانوالہ نے کہا "وزیر آباد ریلوے اسٹیشن پر تین پٹاخے پھٹے تھے اور ہو سکتا ہے کہ یہ پٹاخے ان لیڈروں کے استقبال کے سلسلے میں چھوڑے گئے ہوں"۔

قومی اسمبلی میں اس سلسلے میں جب تحریک التوا پیش کی گئی تو چودھری ظہور الٰہی کی تقریر پر اعتراض کرتے ہوئے اسپیکر نے کہا "یہ اسمبلی ہے، کوئی جلسہ گاہ نہیں۔ آپ باہر جا سکتے ہیں اور بموں کا مقابلہ کر سکتے ہیں"۔ اس کے جواب میں چودھری ظہور الٰہی کے الفاظ پاکستان کی موجودہ سیاسی صورت حال کی سنگینی طرف اشارہ کرتے ہیں "آپ تشدد کی دعوت دے رہے ہیں اور ایسی صورت میں کوئی بھی بچ نہیں سکے گا"۔

وہ کونسا خوف ہے؟

اسی واقعہ سے متعلق روزنامہ "نوائے وقت" نے ۸ر جون کے اپنے اداریہ "کس کے لئے باعث فخر ہے"! میں لکھا ہے "سیاسیات میں نفرت اگر تشدد کی حد کو پہنچ جائے تو نہ برسرِ اقتدار طبقہ کے لئے نیک فال ہے، نہ ملک کے امن و سکون کے لئے۔ متحدہ محاذ والوں کو اگر اپنی بات کہنے کا موقع بھی نہ ملے اور ایسے حالات پیدا کر دیئے جائیں کہ ان کا سفر بھی محفوظ نہ رہے تو یہ جمہوریت کی کونسی خدمت ہو گی اور اس صورت حال پر آمریت کا اطلاق ہونے میں کیا کسر رہ جائے گا۔ کسی خوف کی وجہ سے ان کے جلسوں کو درہم برہم کرانا اور اثنائے سفر میں ان کو غیر محفوظ ہونے کا دھڑکا پیدا کرنا، نہ قانون و انصاف کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہے نہ جمہوریت کے دعوے کی کوئی دلیل ہے اور نہ ہی سیاست میں تشدد کا رواج ملک و قوم کے لئے نیک شگون ہے"۔

اس ادارتی اقتباس میں کسی خوف کی

طرف جو اشارہ کیا گیا ہے وہ معنی خیز ہے۔ آخر حکمران جماعت کو اپوزیشن سے کیا خوف ہے؟ قومی اسمبلی اور پنجاب اور سندھ کی اسمبلیوں میں پی پلز پارٹی کی اکثریت ہے۔ بلوچستان اور صوبہ سرحد سے نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت العلمائے اسلام کا اقتدار ختم کیا جا چکا ہے۔ ان حالات میں وہ کیا خوف ہے جس سے بچنے کے لئے حکمران جماعت تشدد کا استعمال کر رہی ہے؟ اگر متحدہ جمہوری محاذ نے حیدرآباد کی طرح کسی دوسری جگہ جلسہ کر بھی لیا تو کیا ہوگا؟ اس میں تقریریں ہی تو ہوں گی۔ ان تقریروں کا جواب پی پلز پارٹی جب چاہے دے سکتی ہے۔ تشدد کے استعمال کا جواز سمجھ میں نہیں آتا۔

ملتان کا جلسہ

متحدہ جمہوری محاذ کا دعویٰ ہے کہ پی پلز پارٹی اور بھٹو حکومت پشاور، کوئٹہ اور حیدرآباد میں محاذ کے عام جلسوں کے بعد پریشان ہو گئی ہیں اور دھمکی آمیز حربوں پر اتر آئی ہیں۔ فسطائی ہتھکنڈوں اور فیڈرل پولیس کو جمہوریت کی راہ روکنے کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ ممکن ہے یہ الزامات صحیح ہوں۔ ملتان میں جمہوری محاذ کے جلسہ کو ناکام کرنے کے لئے ہزاروں مسلح افراد بسوں میں بھر کر ملتان لائے گئے۔ ایسے افراد کے لباس پر پہچان کے لئے امتیازی نشانات لگائے گئے"

ایسا اور [illegible] اقتباس اس کا لب و لہجہ کا [illegible] سے کہ [illegible] انتظامیہ جو عقل سے [illegible] وہ سب کچھ کر سکتی ہے جو کچھ ملتان میں [illegible] پولیس اور سیکورٹی فورس کو بھیجا [illegible] بطور استبداد [illegible] کی طرف جانے والے تمام راستوں کی ناکہ بندی کی جائے۔ ہر آنے والے کی تلاشی لی جائے۔ اپنے مبینہ طور پر مسلح آدمیوں سے بھرے ہوئے ہوٹرک باہر سے آئیں انہیں اندر آنے کی اجازت دی جائے۔ جلسہ میں شرکت کرنے والے تمام لوگوں کو واپس جانے کا مشورہ دیا جائے۔ [illegible] جلسہ کو درہم برہم کرنے

میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ اس کو جو نام بھی دے دیجئے اگر سب کچھ روا اور درست ہے تو پھر یہ اور سب کچھ ہو سکتا ہے جمہوریت ہرگز نہیں۔" (نوائے وقت ۱۳ جون)

حکومت کی طرف سے سیاسی تشدد کی راہ ہموار کئے جانے کے علاوہ قاسم باغ ملتان میں ہونے والے جلسہ کو ناکام بنانے کے لئے محاذ کے لیڈروں کو لیکر آنے والی "خیبر میل" کو چار گھنٹے لیٹ کیا گیا۔

کیا واقعی جمہوری دور آگیا؟

یوں تو صدر بھٹو کے اقتدار سنبھالنے کے وقت ہی سے یہ کہا جا رہا ہے کہ فوجی آمریت ختم ہو گئی، عوامی اقتدار اور جمہوریت کا دور آ گیا لیکن جمہوری اقدار کو پامال کرنے کے جو حربے ایوب خاں اور یحییٰ خاں کے دور میں استعمال کئے گئے ان کا استعمال اب بھی بدستور جاری ہے۔ بلکہ صدر بھٹو اور پی پلز پارٹی نے ماضی کے حربوں کی بنا پر ان حربوں کو مزید تیکھا اور موثر بنا لیا ہے۔ گویا آمریت کے ہتھیار اور زیادہ عوام دشمن زہر لئے جمہوری عہد میں جمہوریت کو تباہ کرنے کے لئے استعمال ہو رہے ہیں۔

بھٹو حکومت قومی سیاست میں تشدد کا عنصر داخل کرنے کی مرتکب ہے۔ اس کا ذکر احمد رضا قصوری نے قومی اسمبلی میں التواء کی تحریک پیش کرتے ہوئے کیا تھا "گزشتہ دنوں کوئٹہ میں تحریک استقلال کے سربراہ اصغر خاں کے طیارے میں بم رکھنے کی اطلاع ملی تھی جس کی حکومت کی طرف سے کوئی تردید نہیں کی گئی۔ اپنے مخالفین کو ختم کرنے کا یہ ایک طریقہ ہے۔

سیاست میں تشدد یا تشدد کی سیاست کو جمہوری دنیا میں کہیں بھی برداشت نہیں کیا جاتا اور اس کی ہمیشہ حوصلہ شکنی کی جاتی ہے کیونکہ اگر سیاست میں تشدد کو روا رکھا جائے تو پھر یہ سیاست جمہوری نہیں رہتی بلکہ آمریت اور فاشزم کی سرحدوں کو چھونے لگتی ہے۔" اسلامی جمہوریہ پاکستان میں سیاسی فضا تشدد و لاقانونیت، غنڈہ گردی اور ہلڑ بازی سے پاک رہنی چاہیئے۔ ہم سیاست میں تشدد یا تشدد

کی سیاست کا خاصا نقصان برداشت کر چکے ہیں۔ اب ہمیں اس سے نجات حاصل کرنی چاہیئے کیونکہ ہر عمل کا ایک رد عمل ہوتا ہے۔ تشدد کی کوکھ سے تشدد ہی جنم لیتا ہے۔ پھر یہ مکروہ دائرہ بڑھتے بڑھتے غنڈہ گردی اور تشدد کو جائز و روا سمجھنے والوں بلکہ اس کا آغاز کرنے والوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور بالآخر کمزور ملک خانہ جنگی اور طبقاتی لڑائی کا شکار ہو جاتے ہیں۔" (نوائے وقت)

کن پستیوں تک

پاکستانی سیاست میں تشدد کی بات ادھوری رہ جائے گی اگر کراچی کے انگریزی روزنامہ "ڈان" کے اداریہ کے ایک اقتباس کی طرف اشارہ نہ ہو" اگر عوام کو یہ موقع حاصل نہ ہو کہ دونوں طرف کی بات سن سکیں اور سیاسی تبادل کی نوعیت کے بارے میں جان سکیں تو جمہوری طریق کار بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ اب جب کہ عام جلسوں کو انتہا پسندی اور نفرت کے ذریعہ روکا جا رہا ہے تو تمام محبان وطن اور جمہوریت پسندوں کو اس بات پر غور کرنا ہوگا کہ اگر اس خطرناک رجحان کی روک تھام نہ کی گئی تو ملک اور اس کا سیاسی نظام کن پستیوں تک جا گرے گا۔"

(۵ جون)

پاکستانی سیاست میں تشدد کا زور پاکستانیوں کے لئے تشویش کا باعث تو ہوگا ہی' اہل ہند کو بھی اس سے تشویش ہونا قدرتی ہے۔ پڑوس میں آگ لگتی ہے تو اس کی آنچ اور کبھی کبھی شعلوں کی لپیٹ سے بچنا مشکل ہے۔ ۲۶ برس ہو گئے مگر پاکستان تشدد کی اُبلتی دلدلوں سے نکل کر صحت مند سیاست کی پختہ سطح تک نہیں پہنچ سکا۔ درحقیقت یہ مذہبی سیاست پر انحصار کی وجہ سے ہے۔ اس انحصار سے نجات حاصل کر کے اور ٹھوس عوامی مفاد پر مبنی سیاسی اصولوں کی راہ پر چل کر ہی پاکستان تشدد کی آگ اور خون کے دائروں سے نکل سکے گا۔

بھارتی زبانوں میں بیسک ادب کا مقابلہ

ایک ہزار روپیہ جیتئے

بیسک ادب کے ۱۰ ویں کل بھارت مقابلے کے لئے بھارتی مصنف درج ذیل موضوعات میں سے کسی پر اپنے مسودات/کتابیں (بشمول ڈرامہ) داخل کر سکتے ہیں۔

موضوعات

- دیہی ترقی کے جامع پروگرام کے ذریعے روزگار کے مواقع بڑھانا۔
- دیہی علاقوں میں صحت بخش غذا نہ ملنے کا مسئلہ۔
- بلاک اور گاؤں کی سطح پر منصوبہ بندی کے ذریعے مقامی ترقیاتی پروگرام۔
- پنچایتی راج کے اداروں کی نشو ونما کو کیسے یقینی بنایا جائے (کچھ ریاستوں میں پنچایتی راج سسٹم کی کامیابی اور کچھ میں اس کی کامیابی کی مدھم رفتار کا موازنہ پیش کیا جائے۔)
- مقامی مسائل کو حل کرنے کے لئے دیہی سماج نے جن اختراعات کو اپنایا ہے ان کی کامیابی کی کہانیاں۔
- دیہی سماج میں مقامی قیادت تیار کرنا (کامیابی کی کہانیاں بیان کریں)
- سکھی دیہات کے لئے صفائی کے بہتر انتظامات۔
- زرعی پیداوار کی پراسیسنگ اور اسے منڈیوں میں پہنچانا۔ امداد باہمی کے نقطہ نظر سے۔
- قبائلی علاقوں کی ترقی میں امداد باہمی کے اداروں کا کردار۔
- سماج کے کمزور طبقوں کی خدمت کے سلسلے میں امداد باہمی کے اداروں کا کردار۔
- زرعی پیداوار بڑھانے میں امداد باہمی کے اداروں کا کردار۔
- امداد باہمی کا شعبہ اور نوجوان۔
- امداد باہمی کے اداروں (ڈیری کوآپریٹو) کے ذریعہ دودھ کی پیداوار بڑھانا (سفید انقلاب)
- اناج اور دوسری ضروری اشیاء کی سرکاری تقسیم کے سسٹم میں امداد باہمی کے اداروں کا کردار۔

زبانیں

آسامی، بنگالی، گجراتی، ہندی، کنڑ، کشمیری، ملیالم، مراٹھی، اڑیہ، پنجابی، سندھی، تامل، تیلگو اور اردو۔

سٹائل (اسلوب)

متعلقہ موضوع پر تحریر سادہ اور واضح اسلوب میں ہو جسے اجتماعی ترقی پنچایتی راج اور امداد باہمی کے پروگراموں سے متعلقہ کارکن، جن کے لئے یہ لٹریچر تیار کرنا مقصود ہے، آسانی سے سمجھ سکیں اور اس سے متاثر ہو سکیں۔

سائز

مسودہ/کتاب میں تقریباً دس ہزار الفاظ ہونے چاہئیں۔ اس میں مناسب تصاویر بھی ہونی چاہئیں۔

انعامات

ہر زبان میں منتخب بہترین کتاب پر ایک ہزار روپے کا نقد انعام دیا جائے گا۔

کاپی رائٹ

انعام پانے والی کتابوں کا کاپی رائٹ (حق اشاعت) مکمل طور پر بھارت سرکار کو منتقل ہو جائے گا اور اس کے بدلے میں مصنف کو مزید ایک ہزار روپے کی رقم دی جائے گی۔

مقابلے میں کیسے شریک ہوں

مقابلے کے لئے داخل کئے جانے والے مسودوں، کتابوں کی دو نقول، ہر تصنیف کے لئے تین روپے کے راسٹ انڈین پوسٹل آرڈر کے ساتھ جو نئی دہلی ڈاکخانہ میں اجتماعی ترقی اور امداد باہمی کے شعبہ جات کو واجب الادا ہو، درج ذیل پتہ پر بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک (اے۔ ڈی) بھیجی جائیں۔ مقابلہ کے قواعد اور ہدایات کے بارے میں تفاصیل بھی درج ذیل پتہ سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔

ڈائرکٹر (بیسک لٹریچر)
وزارت زراعت، بھارت سرکار۔
(شعبہ جات اجتماعی ترقی و امداد باہمی)
کرشی بھون، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۱

مسودے، کتابیں بھیجنے کی آخری تاریخ:
۱۶ راگست ۱۹۷۳ء

ڈی اے وی پی 73/161

DONATE GENEROUSLY

TO

QAUMI EKTA TRUST

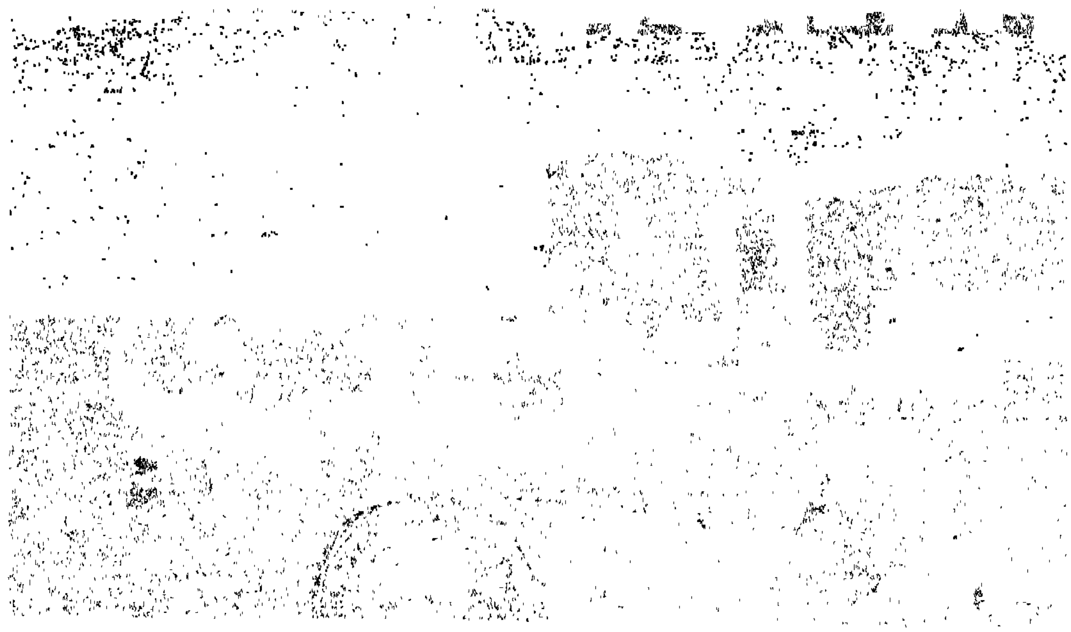
THE TRUST IS SET UP

- ★ TO PROMOTE NATIONAL UNITY AND COMMUNAL HARMONY;
- ★ TO FOSTER IDEAS OF COMPOSITE NATIONALISM AND COMMON CITIZENSHIP,
- ★ TO PROMOTE GOODWILL AND ERADICATE SUSPICIONS AMONG DIFFERENT COMMUNITIES;
- ★ TO PROJECT THE GREAT HUMANIST TRADITION OF INDIA;
- ★ TO BUILD A TEAM OF DEDICATED, TRAINED WORKERS TO FIGHT COMMUNAL FASCISM AND OTHER DIVISIVE, ANTI-DEMOCRATIC TENDENCIES.

Subhadra Joshi
Chairman
Qaumi Ekta Trust
15, Balwant Rai Mehta Lane
New Delhi-1

Regd. No. R.N. 16241/68 Regd. No. D-1820

این این پانڈے نے قومی ایکتا ٹرسٹ کے لئے وشنو آفسٹ پریس سے چھپوا کر شائع کیا
رجسٹرڈ آفس:۔ A-14، تھیٹر کمیونی کیشن بلڈنگ، کناٹ سرکس، نئی دہلی۔ ایڈیٹر:۔ ڈی آر گوئل



دو کا درجہ؟ · مسلم لیگ کا نظریہ اور کردار · جن سنگھ کی خوش

(پروفیسر) آل احمد سرور · معین شاکر اور ایس ایچ مغربی · سیاسی نامہ نگار کے قلم سے

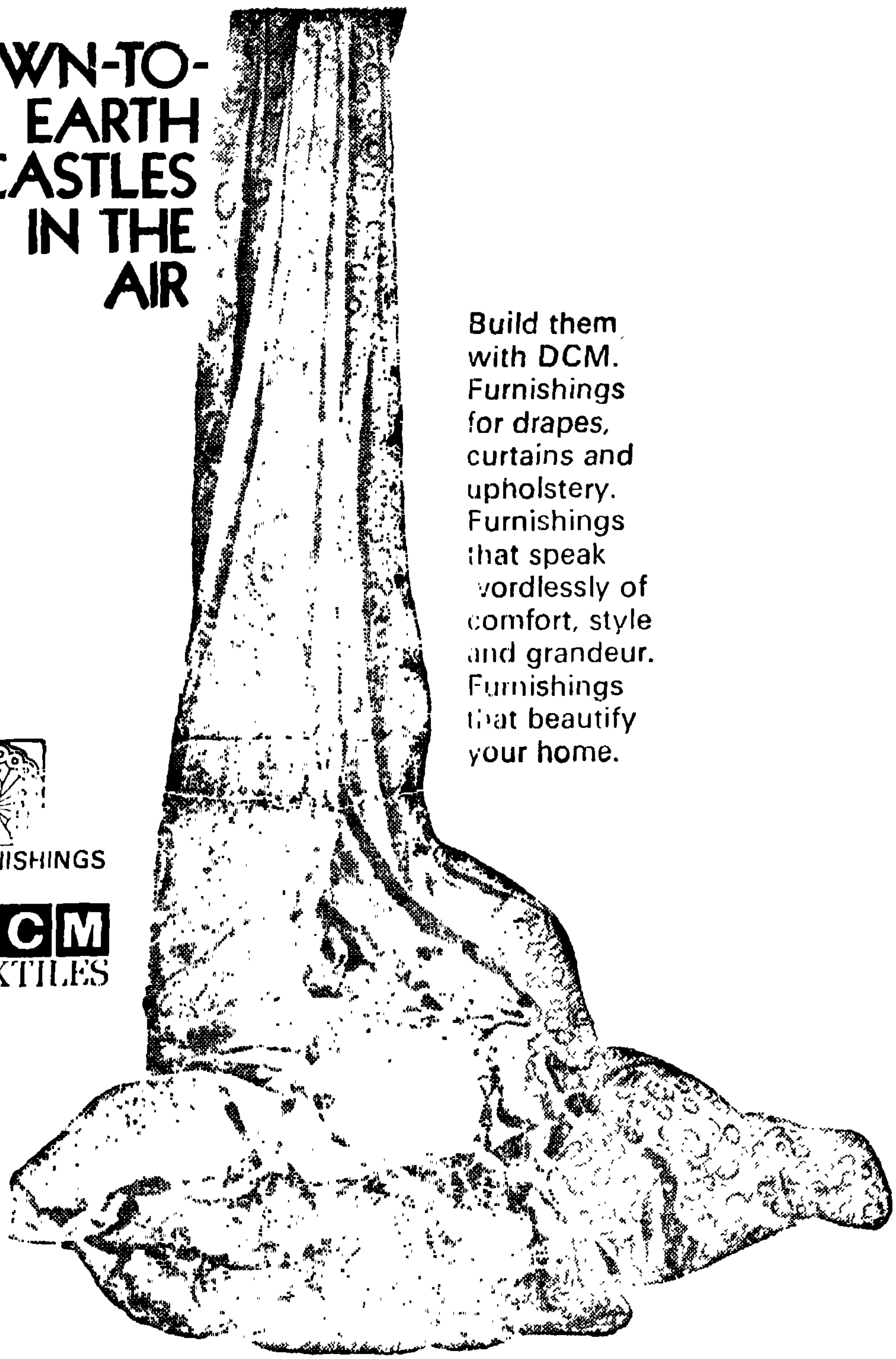
آزادی نمبر

شمارہ ۲۱

قیمت ایک روپیہ

No

DOWN-TO-EARTH CASTLES IN THE AIR



Build them with DCM. Furnishings for drapes, curtains and upholstery. Furnishings that speak wordlessly of comfort, style and grandeur. Furnishings that beautify your home.

FURNISHINGS

DCM
TEXTILES

mcm/dcm/251

بھارت ایک مُرقّع ہے
مذہبوں کا،
تہذیبوں کا،
زبانوں اور پہناووں کا،

رسموں اور رواجوں کا،
روایتوں اور جدّتوں کا،
آدرشوں اور اُمنگوں کا،
کاوشوں اور کامیابیوں کا۔



بے مثال رنگارنگی
لازوال یک جہتی

بھارت ایک گُلدستہ ہے
جس میں آراستہ
بھانت بھانت کے پھُول
آنکھوں کو بھاتے ہیں،
دِلوں کو لبُھاتے ہیں،
دماغوں کو معطّر بناتے ہیں۔

davp 73/125

دہلی شاہراہِ ترقی پر

تعلیم کے میدان میں بیداری

اس سال ہم آزاد بھارت کی ۲۵ ویں سال گرہ منارہے ہیں۔

ان ۲۵ سالوں میں بنی نوع انسانی کے ساتویں حصہ کی قسمت بنانے میں مدد ملی۔

ان ۲۵ سالوں میں بھارت کی راجدھانی ــــ دہلی ــــ کی ترقی و خوش حالی دیکھنے کو ملی

تعلیم کا شہر

شہری اور دیہی علاقوں میں ۵ لاکھ بچے ۵۳۶ ہائر سیکنڈری اسکولوں میں تعلیم پارہے ہیں۔

اس سال کے امتحانات اور سائنسی ذہانت کے مقابلوں میں ذہین طلبا کی تعداد کا فیصد بہت اونچا رہا۔ یہ گذشتہ ۲۵ سالوں کا ریکارڈ ہے۔

سائنسی تعلیم

دہلی انتظامیہ نے روزگار کے مواقع فراہم کرنے اور تکنیکی ترقی کا میدان تیار کرنے کے مقصد سے سائنسی تعلیم کو سب سے زیادہ ترجیح دی ہے۔

سائنس کی تعلیم ۱۰۴ مڈل اور ۲۵۰ پرائمری اسکولوں میں مزید شروع کی جائے گی۔

اس سال سائنسی مرکزوں میں اور ورکشاپوں میں سائنسی پروجیکٹوں اور تربیت کو صحیح طور پر جاری رکھنے کے لئے ۲۰ لاکھ روپے کی رقم خرچ کی جائے گی۔

پیشہ ورانہ رہ نمائی

کام کاج کا تجربہ حاصل کرنے کے مقصد سے متعلقہ نصاب ۹۰ سکولوں میں جاری کئے جاچکے ہیں اور پیشہ ورانہ رہ نمائی کی خدمات بھی ۱۵ مزید اسکولوں میں فراہم ہیں۔ اس پر اس سال ۳ لاکھ ۱۵ ہزار روپے خرچ کئے جائیں گے۔

اقتصادی امداد

ضرورت مند طلبا کو تعلیمی سہولیات فراہم کرنے کے لئے اس سال ۲۲ لاکھ روپے خرچ کئے جائیں گے۔ ان سہولیات میں کمزور طلبا کے لئے خصوصی تعلیم کے مطالعاتی مراکز کا قیام، کتابوں کا بینک، آمد و رفت کی سہولیات اور تعلیمی سیر و سیاحت شامل ہیں۔

۱۵ ہزار سے زائد طلبا کو وظائف دیئے جارہے ہیں اور ۴۰ ہزار اسکولی بچوں کو دوپہر کو کھانا دیا جارہا ہے۔ ذہین اور باصلاحیت بچوں کے لئے خصوصی کلاسیں بھی شروع کی گئی ہیں۔

تعلیم بالغان

اس میدان میں ۶۴ خواتین سوشل تعلیمی مراکز اور ۷۵ کسانوں کے پیشہ ورانہ خواندگی کے مراکز چل رہے ہیں۔ روزی کمانے والے افراد کو تعلیم کی سہولیات کے سلسلے میں شبینہ مدارس اور مراسلاتی نصاب کے اسکول چلائے جارہے ہیں۔

تعلیم کی توسیع و ترقی

تعلیم کی توسیع و ترقی کے لئے مزید اسکول اور کالجوں کا قیام عمل میں لایا جارہا ہے۔

سوسائٹی کے سب ہی طبقوں خاص کر کمزور طبقے کے لوگوں کے مفاد کے پیش نظر اعلیٰ تعلیم کا بندوبست ہے۔

اور ان کو اچھا شہری بنانے اور مختلف میدانوں میں کامیاب رہ نمائی کی باگ ڈور سنبھالنے کی جانب بھی قدم اٹھائے گئے ہیں۔

دہلی کے اپنے شہریوں کے لئے ایک منصوبہ ہے جس میں تعلیم، صنعتی ترقی، دیہی ترقی اور سوشل ویلفیر کے سب ہی پہلوؤں کو شامل کیا گیا ہے ان سب کو عمل میں لانے کے لئے آپ کا بیش از بیش تعاون نہایت ضروری ہے۔

دہلی کی ترقی میں اپنا تعاون دیجئے

محکمۂ اطلاعات و اشاعت۔ دہلی انتظامیہ۔ دہلی

آجرین!

ہر ماہ اپنے ملازمین کو تنخواہ دیتے وقت ازراہِ کرم اس بات کا اطمینان کرلیں کہ:

i۔ اگران کی تنخواہ ۵ ہزار روپے سالانہ (بشمول دیگر آمدنی) سے بڑھ گئی ہے تو جس جگہ سے انھیں تنخواہ ملتی ہے، وہاں ان کا صحیح ٹیکس وصول کرلیا گیا ہے۔

ii۔ اس طرح ٹیکس کی جو رقم وضع کی گئی ہے، ایک ہفتہ کے اندر اندر وہ مرکزی حکومت کے کھاتے میں جمع کروادی جائے۔

مہربانی کرکے قانون کے تقاضوں کو پورا کریں اور اپنے آپ کو جرمانہ، سزا اور قانونی چارہ جوئی سے بچائیں۔

مزید معلومات کے لئے اپنے انکم ٹیکس افسر/ محکمہ انکم ٹیکس کے افسر تعلقاتِ عامہ سے رابطہ قائم کریں۔

جاری کردہ:

ڈائرکٹریٹ آف انسپکشن

(ریسرچ، سٹیٹسٹکس اینڈ پبلی کیشن)

مئور بھون، کناٹ سرکس۔ نئی دہلی

davp 73/68

نوازش نامے

اردو نمبر

مکرمی! "سیکولر ڈیموکریسی کے" اردو نمبر" کی کامیابی پر مبارکباد قبول فرمایئے۔ اس سلسلے میں صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں کہ آپ نے اس نمبر کے بیشتر مضامین یونیورسٹی کے پروفیسروں سے لکھوائے ہیں۔ شاید آپ کا خیال ہے کہ اردو کا معاملہ صرف یونیورسٹی کے اساتذہ کا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس نمبر میں اور طبقوں کی بھی نمائندگی ہوتی۔

عبدالستّار۔ بریلی

اردو اور اہلِ اردو

مکرمی!

اردو اپنے دشمنوں اور دوستوں دونوں کے ہاتھوں ماری گئی ہے۔ ستم یہ ہے کہ دشمن غیر معمولی عقلمند اور دوست غیر معمولی نادان ہیں۔ اردو کے حق میں نعرے لگانے والے مسلم مجلس اور مسلم لیگ جیسی فرقہ پرست اور ذاتی اغراض پر سب کچھ قربان کر دینے والی سیاسی جماعتیں ہیں یا اردو کے اساتذہ ہیں۔ سیاسی رہ نماؤں اور وہ بھی فرقہ پرست رہ نماؤں سے کسی طرح کی توقع کرنا بیکار ہے۔ رونا یہ ہے کہ اساتذہ بھی اردو کے مسائل سے قطعی ناواقف ہیں۔ فرقہ پرستوں کے نعروں سے متاثر ہو کر وہ بھی ان کی آواز میں آواز ملانے لگتے ہیں اور اردو کے لئے کام کرنے کے لئے تیار کوئی نہیں۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آزادی سے پہلے مسلم لیگ نے جو اردو کی بربادی کے سامان کئے تھے اور غیر مسلم ذہن کو متاثر کیا تھا۔ اسے راہِ راست پر لانے اور انھیں حقیقت سے آشنا کرنے کا کام کس نے کیا ہے؟ آج حکومت اردو کو ہندوستان کی سرکاری زبان بنا دے تب بھی کون تسلیم کرے گا۔ یہ جمہوریت ہے۔ یہاں حکومت کی وہ اہمیت نہیں ہے جو عوام کی ہے۔ اور حکومت سے مطالبہ کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ غیر اردو عوام کی ہمدردی حاصل کی جائے۔ آپ بھی اس راز سے واقف ہوں گے کہ بیشتر خاصے پڑھے لکھے لوگ سمجھتے ہیں کہ اردو فارسی کی بیٹی ہے اور اسے مسلمان ایران سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ کتنے اردو والوں نے اس صریحاً غلط خیال کی تردید کرنے کی کوشش کی ہے؟ ہر صوبے اور ہر شہر میں سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اردو پڑھنا چاہتے ہیں۔ یونیورسٹیوں کے کتنے اساتذہ ہیں جو اپنے ڈرائنگ روموں کے عیش و آرام کو چھوڑ کر اردو کی اس طرح کی خدمت پر آمادہ ہوں۔ وہاں تو ساری دوڑ ریڈر شپ اور پروفیسر شپ کی ہے اور انھیں کوششوں کا ایک حصہ اردو کے سلسلے میں مطالبے ہیں۔ اگر آپ ایک شخص کو اردو پڑھاتے ہیں تو کم سے کم چار پانچ اردو دوست حاصل کر لیتے ہیں۔

جب تک اردو فرقہ پرست سیاست دانوں اور اساتذہ کے چنگل سے نہیں نکلے گی۔ اسے مرنے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ آپ کتنا ہی زور لگا لیجئے۔

محمد نصیر خاں۔ کلکتہ

اردو اور آریہ سماج

مکرمی! آریہ پرتی ندھی سبھا کے صدر مسٹر پرکاش ویر شاستری نے حال ہی میں میرٹھ میں کہا ہے کہ اتر پردیش میں آریہ سماج کے زیر اہتمام چلنے والے اسکولوں میں اردو ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے نہیں پڑھائی جائے گی۔ ان اسکولوں میں اردو کے بجائے سنسکرت کو لازمی مضمون بنایا جائے گا۔ اگر ریاستی حکومت نے مالی امداد بند کر دی، تو آریہ سماج عوام کے چندہ سے ان اسکولوں کو چلائے گی۔

آریہ سماج کا اردو دشمنی کا یہ رویہ ناقابل فہم ہے کیونکہ انیسویں صدی کے دوران آریہ سماج کی تحریک اردو کے ذریعہ چلائی گئی تھی۔ بیشتر کتابیں اب بھی اردو میں ہیں۔ آریہ سماجی تحریک کا خاص مرکز پنجاب رہا ہے اور یہیں سے شائع ہونے والے تقریباً سب ہی آریہ سماجی اخبارات اردو ہی میں نکلتے ہیں۔ اس وقت بھی آریہ سماج کے کثیر الاشاعت اخبار جیسے "ملاپ" اور "پرتاپ" اردو میں نکلتے ہیں۔ آریہ سماج کے سرکردہ لیڈر اور تحریک کے اہم علم بردار لالہ لاجپت رائے اردو کے آدمی تھے اور ان کا اردو اخبار "بندے ماترم" آریہ سماج کی تحریک کی تبلیغ کا مؤثر آلہ کار تصور کیا جاتا ہے۔

یہ کہنا گمراہ کن ہے کہ اردو کے بجائے سنسکرت کو آریہ سماج کے اسکولوں میں لازمی مضمون بنایا جائے گا۔ کیونکہ یو۔ پی کے بیشتر اسکولوں میں سنسکرت کو سہ لسانی فارمولے کا جزو لاینفک بنایا جا چکا ہے۔ تعلیمی اعتبار سے اردو کے بجائے سنسکرت کو شامل کرنا، یا کسی دوسری جدید ہندوستانی زبان کو سہ لسانی فارمولے کے تحت لانا، کوٹھاری کمیشن کے مجوزہ فارمولے کی کھلم کھلا خلاف ورزی ہے۔

امید ہے کہ یو۔ پی آریہ پرتی ندھی سبھا کے صدر اور خصوصی طور پر یو۔ پی کی حکومت بھی، تعلیمی اداروں میں ہندی اور انگریزی کے ساتھ اردو پڑھنے کی اجازت دیں گے۔ سنسکرت کو کوٹھاری کمیشن کی سفارش کے بموجب چوتھی اختیاری مضمون کی حیثیت سے خواہشمند اداروں میں پڑھایا جا سکتا ہے۔ اردو کو سہ لسانی فارمولے میں لازمی جگہ دینا ہمارے قومی جمہوری و سیکولر کردار

کے عین مطابق ہوگا اور اس سے اتحاد، اخوت اور رواداری کو بھی فروغ حاصل ہوگا۔

عبدالسلام صدیقی۔ لکھنؤ

اردو نمبر

اردو نمبر دیکھ کر جی خوش ہوگیا۔ آپ نے انتہائی سلیقے اور ایمانداری سے اردو کا معاملہ عوام اور حکومت کے سامنے رکھا ہے۔ حکومت کی پالیسیوں پر نکتہ چینی دو مقاصد کے لئے کی جاتی ہے ایک تو صرف اس لئے کہ حکومت پر بناوٹی غم و غصہ کا اظہار کرکے عوام کو بے وقوف بنایا جائے تاکہ الیکشن میں ان کے ووٹ حاصل کئے جائیں اور دوسرے اس لئے کہ حکومت سے بعض ایسی کوتاہیاں ہوئی ہیں جن سے کوئی ایک مذہبی یا لسانی یا علاقائی فرقہ اپنے جمہوری حقوق سے محروم رہ گیا ہے۔ آپ کے اردو نمبر سے یہی مقصد واضح ہوتا ہے ایڈیٹوریل سے لے کر آخری مضمون تک ایک توازن قائم رہا ہے اور اردو کا معاملہ کہیں بھی سیاسی نعرہ بازی کا شکار نہیں ہوا۔ میں اس کامیاب نمبر پر دلی مبارکباد دیتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آئندہ بھی آپ اقلیتی فرقوں کے مسائل پر اسی طرح خاص نمبر نکالتے رہیں گے۔

عبدالرحیم احسان۔ بمبئی

اردو یونیورسٹی

(۱)

پہلے اردو دوسری سرکاری زبان تسلیم کی جائے

مکرمی! میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کی اردو یونیورسٹی کی تجویز سے بالکل متفق ہوں۔ مگر اس سلسلے میں میری دو گزارشیں ہیں ایک تو یہ کہ یونیورسٹی اس وقت قائم کی جائے جب یو۔پی، بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان اور دہلی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان تسلیم کر لیا جائے تاکہ اس یونیورسٹی سے فارغ طالب علموں کو ملازمت مل سکے۔ دوسرے جامعہ ملیہ اسلامیہ کو اردو یونیورسٹی بنانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اس کا تو پہلے ہی ذریعۂ تعلیم اردو ہے۔ یونیورسٹی لکھنؤ یا رامپور یا مرادآباد میں قائم ہونی چاہیئے۔

عبدالغفور۔ لکھنؤ

(۲)

دو اردو یونیورسٹیوں کی ضرورت

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے صرف ایک اردو یونیورسٹی کا مطالبہ کیا ہے۔ غالباً وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اردو والے صرف شمالی ہندوستان میں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ جنوبی ہندوستان میں بھی اردو یونیورسٹی کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی شمالی ہندوستان میں۔ اس لئے ملک میں دو یونیورسٹیاں قائم ہونی چاہئیں۔

حمایت علی۔ حیدرآباد

(۳)

محترمی! مجھے حیرت ہے کہ آپ نے "اردو نمبر" اردو یونیورسٹی کے حق میں دو مضامین کس طرح چھاپ دیئے۔ آپ کو بخوبی علم ہے کہ یہ سودا آنے سیاسی مطالبہ ہے۔ جس کا تعلیم سے کوئی واسطہ نہیں۔ میرا عقیدہ ہے کہ اگر خدا نہ کرے حکومت نے یہ مطالبہ تسلیم کر لیا۔ اور ایسی کوئی یونیورسٹی وجود میں آگئی تو یہ مسلمانوں کی قبر ثابت ہوگی۔ ہمیں محض ذاتی مفاد کے لئے پورے فرقے کو بھینٹ نہیں چڑھانا چاہیئے۔

آغا محمد جان۔ سری نگر

دس اور چالیس کا فارمولہ

مکرمی! آمنہ ابوالحسن نے دس اور چالیس کے فارمولے پر بھرپور مضمون لکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کا کوئی فارمولہ لسانی اقلیتوں کے مسائل حل نہیں کرسکتا۔ اس کی وجہ صاف ہے کہ جن لوگوں کو اس طرح کے فارمولوں پر عمل کرنا ہوتا ہے ان میں سے کچھ کے ذہن فرقہ واریت سے متاثر ہوتے ہیں۔ اگر مشین کا ایک پرزہ بھی خراب ہو جائے تو پوری مشین خراب ہو جاتی ہے۔

ان مسائل کا واحد حل یہی نظر آتا ہے کہ یو۔پی، بہار، مدھیہ پردیش، دہلی، راجستھان، آندھرا اور مہاراشٹر وغیرہ کے پرائمری اسکول میں ایک اردو استاد کا تقرر کیا جائے اور اردو پڑھنے والے طالب علموں کی تعداد کی کوئی قید نہ رکھی جائے۔

اصغر علی۔ دہلی

اردو کی نصابی کتابوں کا مسئلہ

محترمی و مکرمی! اردو کی نصابی کتابوں کے مسئلے پر محترمہ سراج بیگم کے مقالے میں تشنگی کا احساس ہوا۔ انھوں نے اس سلسلے میں کوئی معقول تجویز بھی پیش نہیں کی۔

میرا خیال ہے کہ ترقی اردو بورڈ جو کام کر رہا ہے وہ بہت اہم ہے۔ کالج اور یونیورسٹی کی سطح کی کتابیں تیار کرنا ہر لحاظ سے قابلِ تحسین ہے۔ لیکن اگر ترقی اردو بورڈ پہلے ہندوستان کے تمام صوبوں کے لئے اسکول کی نصابی کتابیں تیار کرتا تو زیادہ اچھا ہوتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ دونوں کام ایک ساتھ ہی کئے جائیں۔

ہمیں پہلے اسکول کی نصابی کتابوں کی ضرورت ہے۔

عبدالجبار۔ دہلی

اردو۔ دوسری سرکاری زبان

مکرمی! اردو کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ کسی بھی ریاست کی سرکاری زبان نہیں ہے۔ آپ نے "اردو نمبر" میں اس موضوع پر پروفیسر مسعود حسین خاں کا ایک مقالہ شائع کیا ہے۔ وہ اول تو مختصر ہے اور دوسرے مدلل نہیں ہے۔ میری گزارش ہے کہ پروفیسر صاحب کو ایک مدلل مضمون لکھنے کی تکلیف دی جائے۔ اردو کا معاملہ ان سے بہتر کون پیش کرسکتا ہے۔

نیاز محمد۔ بنگلور

گجرات پبلک سروس کمیشن

گجرات کوآپریٹیو سروس کلاس ایک اور کلاس دو، گجرات لیبر سروس کلاس دو، گجرات سیلز ٹیکس سروس کلاس دو اور گجرات اسٹیٹ سروس کلاس دو میں مندرجہ ذیل آسامیوں کو پُر کرنے کے لئے ایک مشترکہ مقابلہ کا امتحان دسمبر ۱۹۷۳ء میں احمد آباد میں ہو رہا ہے۔ یہ امتحان راج کوٹ اور بڑودہ سینٹروں میں بھی ہو سکتا ہے بشرطیکہ ان سینٹروں میں سے ہر ایک میں نام درج کرانیوالے امیدواروں کی تعداد پندرہ سے زائد ہو۔

قسم اول:۔

۱۔ ڈسٹرکٹ رجسٹرار آف کوآپریٹیو سوسائٹی کلاس ایک۔ ۲ آسامیاں

قسم دوئم:۔

۲۔ گورنمنٹ لیبر آفیسر کلاس دو۔ ۱۰ آسامیاں، دو جگہیں شیڈول کاسٹ اور دو جگہیں شیڈول ٹرائبس سے متعلق امیدواروں کے لئے محفوظ ہیں۔

ایک جگہ شیڈول کاسٹ اور ۲ جگہیں شیڈول ٹرائبس کے امیدواروں کے لئے محفوظ ہیں۔

تعلیمی قابلیت:۔

آرٹ، سائنس، کامرس، ایگریکلچر، لاء یا انجینئرنگ میں کسی منظور شدہ یونیورسٹی کی ڈگری۔

عمر:۔

یکم نومبر ۱۹۷۳ء کو ۲۱ اور ۲۶ سال کے درمیان۔ شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائبس کے امیدواروں کے لئے ۳۱ سال تک۔ یکم جنوری ۱۹۶۴ء کے بعد مشرقی پاکستان سے آئے ہوئے لوگوں کے لئے عمر میں رعایت دی جائے گی۔ ECOS اور S.S.R.C.OS کو حکومت کے قانون کے مطابق عمر میں رعایت دی جائے گی۔ اس کے علاوہ اور کسی حالت میں بھی عمر کی مقررہ شرط میں کوئی رعایت نہیں دی جائے گی۔

تنخواہ:۔

۳۔ سیلز ٹیکس آفیسر کلاس دو، ۴۲ آسامیاں، ایک جگہ شیڈول کاسٹ اور دو جگہیں شیڈول ٹرائبس اور جگہیں دوسرے امیدوارن مثلاً S.S.R.C.OS/ECOS کے لئے محفوظ ہیں۔

۴۔ سیکشن افیسر کلاس دو چار آسامیاں۔

۵۔ سپرنٹنڈنٹ آف پروہیبیشن اینڈ ایکسائز کلاس دو، ۱۳ آسامیاں ایک جگہ شیڈول ٹرائب اور ایک جگہ ECOS/S.S.R.C.OS کے امیدواروں کے لئے محفوظ ہیں۔

۶۔ معاملت دار کلاس دو ۱۰ آسامیاں، ایک جگہ شیڈول کاسٹ، ایک شیڈول ٹرائب اور دو جگہیں ECOS/S.S.R.C.OS کے امیدواروں کے لئے محفوظ ہیں۔

۷۔ اسسٹنٹ رجسٹرار آف کوآپریٹیو سوسائٹیز کلاس دو، ۱۱ آسامیاں

ڈسٹرکٹ رجسٹرار آف کوآپریٹیو سوسائٹیز کلاس ایک ۹۵۰-۵۰۰ سیکشن آفیسر ۸۵۰-۴۲۵، گورنمنٹ لیبر آفیسر ۱۰۰۰-۳۵۰ اور بقیہ عہدوں کے لئے ۸۵۰-۳۵۰ اس کے علاوہ مروجہ الاؤنس وغیرہ۔

امتحان:۔

تحریری اور زبانی دونوں صورتوں پر مشتمل ہوگا۔ امتحان میں میڈیم زبان انگریزی یا گجراتی ہوگی۔ ہر دو قسم کی جگہوں میں ایک یا ایک سے زیادہ آسامیوں کے لئے صرف ایک درخواست ایک ہی فیس کے ساتھ دی جا سکتی ہے۔

فیس:۔

فیس درخواست دو روپے پچاس پیسے۔ فیس امتحان پینتالیس روپے۔ (شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائبس سے فیس امتحان پندرہ روپے)۔ یہ فیس درخواست کے ہمراہ آنا ضروری ہے۔ ECOS اور S.S.R.C.OS سے کسی قسم

ں کوئی فیس نہیں لی جائے گی۔ کمیشن یکم جنوری ۱۹۶۴ء کے بعد مشرقی پاکستان سے آئے ہوئے لوگوں کے لئے فیس کی ادائیگی کرسکتا ہے۔ درخواست کا مجوزہ فارم دو مکمل تفصیلات، اپنا پتہ لکھا ہوا ایک بڑے سائز کا لفافہ (25 x 10 cms) اور ایک روپیہ پینسٹھ پیسے کے ڈاکخانہ کے ٹکٹ اور پچاس پیسے کا ایک کراس کیا ہوا پوسٹل آرڈر، فارم بنام "سکریٹری" گجرات پبلک سروس کمیشن احمدآباد ۳۸۰۰۰۱ کے پتے پر بھیجنے پر حاصل کی جاسکتی ہیں۔ اس کے علاوہ درخواستی فارم اور تفصیلات کمیشن آفیس۔ سی بلاک، فرسٹ فلور۔ ملٹی اسٹوری بلڈنگ۔ لال دروازہ احمدآباد ۳۸۰۰۰۱ میں کاؤنٹر سے بھی پچاس پیسے فی فارم کے حساب سے تعطیل کے علاوہ تمام دنوں میں گیارہ بجے سے دو بجے تک اور پونے تین بجے سے چار بجے تک حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ منی آرڈر یا ڈاک کے ٹکٹوں سے ادائیگی قبول نہیں کی جائے گی۔ درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ ۱۴ اگست ۱۹۷۳ء ہے۔

دہلی ایڈمنسٹریشن دلّی نوٹس

دہلی ایڈمنسٹریشن سب آرڈی نیٹ سروس گریڈ دویم ایگزامینیشن

ستمبر ۱۹۷۳ء

دہلی ایڈمنسٹریشن دہلی گریڈ دو (ایگزیکیٹو) یعنی انسپکٹرز وغیرہ اور گریڈ دو (منسٹریل) یعنی اسسٹنٹ وغیرہ کی عارضی جگہوں کو پُر کرنے کے لئے جن کا اسکیل ۲۱۰-۴۲۵ + مروجہ الاؤنس وغیرہ ہے، ۲۳ ستمبر ۱۹۷۳ء اور ۲۴ ستمبر ۱۹۷۳ء کو مقررہ قوانین کے تحت جو درخواست کے فارموں کے ساتھ مل سکتے ہیں ایک مقابلہ کا امتحان منعقد کررہا ہے۔

مندرجہ بالا گریڈس میں آسامیوں کی تقریباً تعداد اس طرح ہے۔

ا۔ گریڈ دو (ایگزیکیوٹو) ۹۰ آسامیاں۔

ب۔ گریڈ دو (منسٹریل) ۱۱۶ آسامیاں۔

آسامیوں کی مندرجہ بالا تعداد میں ترمیم ہوسکتی ہے۔ شیڈول کاسٹ شیڈول ٹرائبس اور ۱۲ سروس مین کے امیدواروں کے لئے گورنمنٹ آف انڈیا کی ہدایت کے مطابق جگہوں کی تعداد محفوظ کی جائے گی۔

۲۔ ا۔ تعلیمی قابلیت۔ آرٹ، کامرس، سائنس یا ایگریکلچر میں کسی منظور شدہ یونیورسٹی کی ڈگری۔

ب۔ عمر۔ ۱۸ سے ۲۵ سال۔

۳۔ ایک امیدوار مندرجہ بالا گریڈس میں سے ایک یا دونوں کے لئے امتحان میں شرکت کی درخواست کرسکتا ہے۔ اگر امیدوار دونوں گریڈس کے امتحانوں میں شریک ہونا چاہتا ہے تب بھی اسے صرف ایک درخواست کا فارم پُر کرنا ہوگا۔

فیس بھی اسے صرف ایک بار ادا کرنا ہوگی۔ علیحدہ سے کوئی اور فیس ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

۴۔ امیدوار کو چاہیئے کہ درخواستی فارم میں گریڈ کا نام جس کے لئے وہ امیدوار ہے واضح طور پر لکھے۔ صرف وہ امیدوار امتحان میں شریک ہوسکتے ہیں جن کا نام ۲۶ جولائی ۱۹۷۳ء سے پہلے ایمپلائمنٹ ایکس چینج میں درج ہوگا۔

۵۔ امتحان میں شرکت کے لئے امیدواروں کو چاہیئے کہ اپنی درخواستیں (مجوزہ فارموں پر) دہلی یا نئی دہلی میں ایمپلائمنٹ ایکس چینج کے آفیسر انچارج کے نام بھیجیں جہاں ان کا نام ملازمت کے لئے درج ہوچکا ہے۔ یہ درخواستیں بذریعہ ڈاک بھی بھیجی جاسکتی ہیں۔

۶۔ درخواستوں کے لئے مجوزہ فارم ریکارڈز برانچ۔ بلاک ۵، ۵، شام ناتھ مارگ، دہلی ایڈمنسٹریشن سکریٹریٹ دہلی سے پچاس پیسے نقد یا منی آرڈر کے ذریعہ ادا کرنے پر حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ درخواست کا مجوزہ فارم پچاس پیسے کا ایک کراسڈ پوسٹل آرڈر انڈر سکریٹری (ایڈمنسٹریشن) دہلی ایڈمنسٹریشن دہلی کے نام بھیجنے پر بھی بذریعہ ڈاک حاصل کیا جاسکتا ہے (ڈاک کے ٹکٹ قبول نہیں کئے جائیں گے) ڈاک کے ذریعہ مجوزہ فارم حاصل کرنے کے لئے انڈر سکریٹری (ایڈمنسٹریشن) ۵۔ شام ناتھ مارگ، دہلی ۶ سے رجوع کریں۔ شیڈول کاسٹ، شیڈول ٹرائبس اور ایکس سروس مین کے امیدواروں کو اپنے سرٹیفکٹس کی مصدقہ نقلیں پیش کرنے پر درخواستی فارم مفت دیئے جائیں گے۔ درخواست بھیجنے کی آخری تاریخ ۲۲ اگست ۱۹۷۳ء ہے۔

۸۔ امتحان کی مقررہ فیس (قوانین کے مطابق) درخواست کے ہمراہ پوسٹل آرڈر کے ذریعہ ادا کی جانی چاہیئے۔

۸۔ مقررہ تاریخ کے بعد کسی درخواست پر غور نہیں کیا جائے گا۔

ہماچل پردیش، پبلک سروس کمیشن

مندرجہ ذیل آسامیوں کے لئے مروجہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔ درخواستیں ۶ ستمبر ۱۹۷۳ء تک سکریٹری پبلک سروس کمیشن شملہ ۲ کو پہنچ جانی چاہئیں۔ مزید معلومات اسی پتے سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔

۱۔ ڈسٹرکٹ کوآپریٹیو اور سپلائز آفیسرز کی دو عارضی آسامیاں گریڈ ۳۵۰-۹۰۰۔ ان میں سے ایک جگہ شیڈول کاسٹ کے امیدواروں کیلئے محفوظ ہے۔

۲۔ ٹرانسپورٹ ڈپارٹمنٹ میں ایک ریجنل منیجر کی مستقل آسامی۔ گریڈ ۳۵۰-۲۵-۵۰۰-۳۰/۸۰۰، ۴۰-۱۰۰۰۔

۳۔ ایک ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ (کریٹوگرافی) کی عارضی آسامی۔ گریڈ ۴۰۰-۲۰-۵۵۰/۴۰-۷۵۰/۵۰-۱۲۰۰

ماہنامہ

سیکولر ڈیموکریسی

(آزادی نمبر)

اگست ۱۹۷۳ء

شمارہ ۲۱

مشاورت بورڈ

ڈاکٹر تاراچند
ڈاکٹر سروپ سنگھ
ڈاکٹر ستیش چند
پروفیسر محمد مجیب
کرنل بی۔ایچ۔زیدی
عالم خوندمیری
راجندر سنگھ بیدی
اے۔این۔ودیالنکار
امرناتھ سہگل
کے۔دامودرن

٭ ایڈیٹرز

سبھدرا جوشی
ڈی۔آر۔گویل
خلیق انجم

٭ جنرل منیجر

راجندر کمار

٭ بزنس منیجر

جی۔ایل۔ملہوترا

٭ دفتر کا پتہ

۸-۱۹ تھیٹر کمیونی کیشن بلڈنگ
کناٹ سرکس۔نئی دہلی

٭ ٹیلی فون نمبر ۴۳۳۸۳

ہمارے نمائندے

٭ مسز کل سانیال
۱۔ ڈوور روڈ کلکتہ

٭ شری ایم۔این۔صدیقی
نوبت ولا پلاٹ نمبر ۵۶۔۵۷
جو ہو ولے پارلے ہاؤسنگ سکیم
نارتھ ساؤتھ روڈ نمبر ۱
آف اِرلا برج اندھیری (ویسٹ)
بمبئی ۵۸ (اے۔ایس)

٭ شریمتی خدیجہ عالم خوندمیری
۱۵/۱۱ ۱۱-۱۶، سلیم نگر
حیدرآباد ۳۶

٭ ڈاکٹر معین شاکر
ڈپارٹمنٹ آف پولیٹکل سائنس
مرہٹواڑہ یونیورسٹی
اورنگ آباد

٭ شری بی۔این۔پانڈے
۱۴۸۔ آزاد سکوائر
ساؤتھ ملکہ
الہ آباد

٭ سردار سوندر سنگھ سندھو
پی۔این ۳۴/۲ لارڈو والی روڈ
جالندھر

٭ سردار اقبال سنگھ
سیکٹر ۱۸۔اے
کوارٹر نمبر ۳۴۵۹ چنڈی گڑھ

ہماری گذارش

رہبروں کے بھیس میں رہزن

پندرہ اگست کا دن آتا ہے تو ملک کی آزادی کی جد و جہد کی یادیں لامحالہ ذہن میں آجاتی ہیں۔ جن لوگوں کو اس طویل جد و جہد میں حصہ لینے کی سعادت نصیب ہوئی ان کے لئے اپنے تجربات پر دوبارہ غور کرنے کا موقع آتا ہے۔ جو آزاد ہندوستان میں پروان چڑھے ہیں انھیں اپنے بزرگوں کے کارہائے نمایاں پر غور کرنے کی خواہش ہوتی ہے اور تاریخ سے سبق لے کر مستقبل روشن کرنے کے واسطے راہیں تلاش کرنے کی تمنائیں جاگتی ہیں۔

گذشتہ برس آزادی کی سلور جوبلی کا سال تھا۔ اس سال کے ساتھ کئی باتیں جڑ گئیں۔ آزادی کی سلور جوبلی مناتے ہوئے شہیدوں کو یاد کیا گیا جنگ آزادی کے مجاہدوں کو اعزازات دیئے گئے۔ ان میں سے جن کا کوئی خاطر خواہ ذریعہ معاش نہیں تھا ان کے لئے پنشنیں مقرر کی گئیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ قومی آدرشوں کو یاد کیا گیا اور پھر سے عہد کیا گیا کہ سوشلزم ڈیموکریسی اور سیکولرزم کے نظریات کو تقویت دی جائے گی۔ اس سال کے دوران قومی آدرشوں پر عملدرآمد میں جو کوتاہیاں اور خامیاں رہیں ان کو بھی نمایاں کرکے پیش کیا گیا تاکہ آنے والے دور میں ان کو دور کیا جاسکے۔ پچیس برسوں میں نو بہ نو ترقیوں کے باوجود زندگی کے کئی میدانوں میں خاص کمزوریاں رہیں۔ اقلیتوں اور کمزور طبقوں کے بارے میں جو آئینی تحفظات دیئے گئے ہیں ان کو عمل میں کس حد تک لایا گیا اس بات پر خاص طور سے غور کیا گیا۔ سماج کے ان طبقوں پر اس خصوصی توجہ مرکوز ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ۱۹۶۹ء سے شریمتی اندرا گاندھی کی قیادت میں ملکی سیاست میں جو نیا موڑ آیا ہے اس کے مطابق جمہوریت کی تکمیل کے لئے قوم کے کمزور اور پس ماندہ طبقوں کو برابر کے حقوق ہی نہیں ترقی کے برابر موقعے مہیا کرنا بھی ایک شرط سمجھا گیا ہے۔ بنکوں کا قومیانا، راجے رجواڑوں کے وظائف اور مراعاتِ خصوصی کو بند کرنا۔ فولاد کے کارخانوں اور کوئلے کی کانوں کو قومی ملکیت قرار دینا۔ سپریم کورٹ کے فیصلوں کو پارلیمنٹ کے تابع قرار دینا۔ اناج کی تھوک تجارت کا راشٹریہ کرن وغیرہ اسی بنیادی پالیسی کی مختلف کڑیاں ہیں ان تمام اقدامات سے ان لوگوں کو تکلیف ہوئی ہے جو اپنے عیش و آرام کی خاطر عوامی استحصال کو اپنا بنیادی حق سمجھتے تھے۔ لیکن ملک کے ۹۵ فی صدی سے زاید عوام جو محنت مزدوری سے اپنا پیٹ پالتے ہیں ان کے لئے ترقی کی نئی راہیں کھل گئیں۔ اقلیتوں کے لوگ ہوں یا ہریجن، ان کا شمار چند ایک افراد یا چند ایک خاندانوں کو چھوڑ کر ان ۹۵ فی صدی میں ہوتا ہے۔ مندرجہ بالا اقدامات نے وہ راہیں ہموار کر دیں جن سے ان تمام لوگوں کو فائدہ پہنچ سکتا تھا۔

اس سب کے علاوہ اس بات پر بھی توجہ دی جانے لگی کہ ان طبقوں کے افراد کو سرکاری اور غیر سرکاری ملازمتوں میں مناسب جگہ ملتی ہے یا نہیں۔ اسی توجہ کے نتیجے کے طور پر یہ بات سامنے آئی کہ ملازمتوں میں اقلیتوں اور پس ماندہ جاتیوں کا تناسب اس قدر کم ہے کہ گمان ہی نہیں بلکہ یقین ہوتا ہے کہ ان کے خلاف گذشتہ پچیس برسوں میں امتیازی اور غیر منصفانہ سلوک کیا گیا ہے۔ اسی احساس کا نتیجہ ہے کہ وزیر اعظم نے حکومت کے مختلف محکموں اور ریاستی حکومتوں کو تلقین کی کہ غیر منصفانہ امتیاز کو ختم کیا جائے اور روزگار کی پالیسی اس طرح مرتب کی جائے کہ پرانی بے انصافیوں کا بھی ازالہ ہو سکے۔

اردو کے ساتھ ہونے والی بے انصافی نے بھی وزیر اعظم کی ہمدردی اور توجہ کو اپنی طرف مبذول کیا۔ بے انصافی کا قلع قمع کرنے اور اردو کو مناسب ترقی کے مواقع فراہم کرنے کے لئے کیا کیا جائے۔ اس مسئلے پر غور کرنے کے لئے وزیر اطلاعات و نشریات کے زیر صدارت ایک اکسپرٹ کمیٹی قائم کی گئی ہے جس کی سفارشات عنقریب آنے والی ہیں۔ اس وقت کسی شبہے کی گنجائش نہیں کہ اردو کے سلسلے میں جلد اور اہم فیصلے کئے جائیں گے۔ اعلیٰ سطح پر اس احساس کی بھی کمی نہیں کہ سرکاری مشینری میں ایسے لوگ گھسے ہوئے ہیں جو اس نئے دور کی نئی پالیسیوں سے اختلاف رکھتے ہیں اور ان کو سابوتاژ کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں گے۔ وزیر اعظم نے بار بار سرکاری افسران کی پالیسی کو سمجھنے اور اس پر صحیح اسپرٹ میں عملدرآمد کرنے پر زور اسی لئے دیا ہے۔ لیکن جب تک افسران کا خاطر خواہ جائزہ نہ ہو جائے تب تک کاروائی کرنے کی اجازت جمہوری نظام نہیں دیتا۔ سرکاری افسران چونکہ اپنے خیالات کا اظہار پبلک طور پر نہیں کرتے اس لئے خیالات و نظریات کی بنیاد پر ان کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کی جاسکتی۔ اب تجربہ ہو گیا ہے کہ غلے کے تھوک بیوپار کو قومیانے اور یو۔پی کے اسکولوں میں اردو ٹیچروں کے تقرر کی پالیسی کو مسخ اور ناکام بنانے کے لئے بیوروکریسی کے رجعت پسند اور فرقہ پرست کل پرزوں نے کس چالاکی اور تندہی سے کام کیا ہے۔ امید کرنی چاہیئے کہ اپنی نئی پالیسیوں کی کامیابی اور ملک کی اجتماعی بہبودی کے پیشِ نظر حکومت اور قومی قیادت اس افسر شاہی کی ریشہ دوانیوں کو ختم کرنے کے لئے موثر قدم اٹھائے گی۔

اس دوران میں ایک دوسری چیز جو اُبھر کے سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ مفاداتِ خصوصی کی علمبردار طاقتوں نے نئی پالیسیوں کے خلاف سیاسی جہاد بول دیا اور ان میں رخنہ اندازی کے لئے زمین و آسمان کے قلابے ملانے شروع کر دیئے۔ اس جہاد کا پہلا اور بنیادی حصہ یہ تھا کہ وزیر اعظم کو بدنام کرنے اور ان کو کمزور اور نااہل ثابت کرنے کی کوشش کی جائے۔ تفصیلات میں جانے کے بجائے ہم قارئین کی توجہ ان پارٹیوں کے عمل اور کردار کی طرف دلانا چاہیں گے جو ۱۹۷۱ء کے پارلیمنٹری

انتخابات کے وقت رسوائے زمانہ گرانڈ الائنس یا عظیم اشتراک کا حصہ تھیں۔ ان کو اپنے ارادوں میں کس قدر کامیابی ہوئی ہے اس کا اندازہ کافی حد تک اسی بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ سب دوبارہ اس قسم کے اشتراک کا حصہ بننے میں انتہائی شرم محسوس کرتے ہیں۔ آچاریہ کرپلانی، بیجو پٹنائک، اشوک مہتہ جیسے سیاسی پیرانِ جواں سال ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پوری طاقت سے دوڑ لگا رہے ہیں لیکن مخالف پارٹیوں کو کسی ایک اشتراک میں باندھنے کی امید کہیں اب تک نظر نہیں آئی۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ انفرادی یا جماعتی مفاد یا غرور راستے میں رکاوٹ بن رہا ہے۔ کامیابی کی امید ہو تو اپوزیشن کے تمام زعما اپنے بلند بانگ دعووں اور پالش شدہ اصولوں کو بالائے طاق رکھنے میں ذرہ برابر بھی تامل نہ کریں لیکن سب کو یہ خیال ہے کہ فتح کی امید خیالِ خام سے زیادہ نہیں اور اگر اپوزیشن ہی میں رہنا ہے تو اپنی الگ دکان اور اپنا الگ سائن بورڈ بھی کیوں ہٹایا جائے۔ ہم بلا خوف تردید یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ مخالف پارٹیوں کے بہت سے رہ نما یہ بھی خواہش رکھتے ہیں کہ کسی طرح وزیر اعظم کے ساتھ سمجھوتہ ہوجائے تو ان کے لئے زیادہ موزوں رہے گا۔ حتیٰ کہ باوجود بارہا پھٹکار کھانے کے جن سنگھ اور آر۔ ایس۔ ایس بھی اسی کوشش میں سرگرداں ہیں۔

نئی پالیسیوں کی مخالف طاقتیں ملکی بھی ہیں غیر ملکی بھی۔ امریکہ شریمتی اندرا گاندھی کی طاقت اور مقبولیت سے اسی قدر خوفزدہ اور پریشان ہے جس قدر ہندوستان کے سرمایہ دار، راجے رجواڑے اور فسادی فرقہ پرست۔ ان کی مخالفت میں یہ سبھی لوگ مل کر کام کر رہے ہیں۔ ان کی دست درازیاں حکومتی مشینری کے اندر تک بھی پہنچی ہوئی ہیں۔ ان لوگوں کو اس بات کا بھی شدید احساس ہے کہ شریمتی اندرا گاندھی کی پالیسیوں نے غریب عوام کو عموماً اور اقلیتوں و پس ماندہ طبقوں کو خصوصاً ان کی حمایت میں صف بند کر دیا ہے۔ لہٰذا انھوں نے ان طبقوں میں دخل اندازی شروع کی ہے۔ مسلم لیگ اور مسلم مجلس کی نئی روش اسی سازش کی عکاسی کرتی ہے۔ اس سب کے باوجود فسادات کے بڑھتے ہوئے سیلاب کا رخ موڑنے اقلیتوں کو اقتصادی ترقی کے لئے مناسب مواقع فراہم کروانے، اردو زبان کے ساتھ انصاف کرنے کے سلسلے میں شریمتی اندرا گاندھی سے بڑھ کر شاید کسی کا بھی حصہ آزاد ہندوستان میں نہ ہوگا۔ یہ جماعتیں ان کی مخالفت میں پاگل ہوکر جن سنگھ کے گناہ بھی ان کے سر تھوپنے میں گریز نہیں کرتیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اپنے اس رویے سے یہ لوگ زوال پذیر جن سنگھ اور آر۔ ایس۔ ایس کو نئی زندگی دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ گزشتہ پچاس برس کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے ہندوستانی عوام اس بات کا عہد کریں گے کہ مفاداتِ خصوصی کے ہاتھوں غریب اور پس ماندہ عوام کی قسمت کا سودا کرنے والے ان نام نہاد رہ نماؤں کا خاطر خواہ جواب دیا جائے گا۔ یہ رہبر نہیں رہزن ہیں۔

شیشہ و تیشہ

۔۔۔۔ یہ اندازِ گفتگو ۔۔۔۔

کہاوت ہے کہ بلی کو خواب میں بھی چھیچھڑے نظر آتے ہیں۔ انڈین یونین مسلم لیگ کے "ترجمان" ہفت روزہ 'مستقیم' کو دیکھ کر ہمیں یہ کہاوت یاد آئی۔ وہ یوں کہ اس کی تحریروں میں لفظ 'روٹیاں' بڑی کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔ روٹیوں کی ضرورت ظاہر ہے کہ کس کو نہیں ہوتی۔ غالباً مدیر "مستقیم" اور ان کے مالکانِ گرامی ہواخوری سے ہی گزارہ کرتے ہیں۔

اگر "مستقیم" کے مالکان سے مراد مسلم لیگ کے قائدین سے ہی ہو تو سیاست کی حد تک یہ قبول کرنا ہی پڑے گا کہ سوائے ہواخوری کے ان کا کوئی کام نہیں۔ سیاسی ہواخوری اگر ان کا شیوہ نہ ہوتا تو مسلم لیگ اور مسٹر جناح کا نام نہ لیتے کیونکہ پاکستان بنتے ہی جناح صاحب نے فرما دیا تھا کہ 'ہندوستانی مسلمانوں کو میں نے اپنی فہرست سے نکال دیا ہے'۔ لیکن چونکہ ہوا کو کسی فہرست سے نکلنے اور گھسنے نہ دیر لگتی ہے نہ تردد ہوتا ہے اس لئے ہواخوری کرنے والے لیڈروں کو فہرست سے نکالے جانے کے بعد بھی اس میں شمولیت اختیار کرنے میں دقت یا شرم کا احساس نہیں ہوتا۔

محض ہواخوری پر قائم سیاسی مبصر ہی شریمتی سبھدرا جوشی کے بارے میں لکھ سکتا ہے کہ "کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ سبھدرا جوشی ملک کی پرانی خادمہ اور تحریکِ آزادی کے سپاہیوں میں سے ہیں ممکن ہے کہ ایسا ہو"۔ سیاسی ہواخوری کا ہی نتیجہ ہے کہ مدیر 'مستقیم' نے "سیکولر ڈیموکریسی" پر مسلم آزاری کا الزام لگایا ہے۔ ان کے خیال سے غالباً مسلمانوں کی اقتصادی زبوں حالی، فسادات میں مسلمانوں کی پریشانی، جن سنگھ اور آر۔ ایس۔ ایس جیسی مسلم دشمن جماعتوں کے خلاف لگاتار جہاد کرنا مسلم آزاری کے مترادف ہے۔ جس کسی نے "سیکولر ڈیموکریسی" کی گزشتہ پانچ برس سے زائد زندگی اور شریمتی سبھدرا جوشی کی زاید از تیس سال سیاسی زندگی کو سرسری طور پر بھی دیکھنے کی کوشش کی ہے وہ ان الزامات کو ہواخوری سے زیادہ اہمیت نہیں دے گا۔ جی چاہتا ہے کہہ دیں کہ ؎

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا ٭ اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں

لیکن کافر و مسلمان کی اصطلاحیں ہمیں پسند نہیں۔ ہمارا تو یہ بھی خیال ہے کہ مسلم لیگ کے رہ نماؤں کو بھی (کم از کم خلوت میں) مدیر مستقیم کی تحریر سے اتفاق نہیں ہوگا۔ ان کی طبع آزمائی کی محرک غالباً روٹیاں نہیں ڈبل روٹیاں ہیں۔ ورنہ یہ اندازِ گفتگو اختیار نہ کرتے۔

(شیشہ گر)

مسلم لیگ کا نظریہ اور کردار

معین شاکر اور ایس۔ ایچ مغربی

مسلم لیگ مسلمانوں کی ایک بڑی سیاسی تنظیم ہونے کی دعوے دار ہے۔ بنیادی طور پر تو یہ علاقائی پارٹی ہے۔ لیکن صحیح معنوں میں ایک کل ہند پارٹی اور ہندوستانی مسلمانوں کی واحد سیاسی تنظیم بننے کے لئے اس نے حال ہی میں ملک کے دوسرے حصوں میں ایک کامیاب پیش رفت کی ہے۔

مسلم لیگ ایک طرف تو مسلم فرقے کے احساسِ محرومیت اور دوسری طرف مسلم سیاست کی قوت اور اثر کو سمجھنے میں قومی سیاسی پارٹیوں کی ناکامیوں کی مظہر ہے مسلم لیگ ایک سیاسی جماعت سے زیادہ عارضی ماحول کی عکاسی کرنے والی ایک جماعت ہے۔ یہ پارٹی سیاسی اور اقتصادی مسائل حل کرنے کی حقیقی خواہش کی بنیاد پر نہیں بلکہ مسلم ذہن کی اپنے فرقے سے تعلق قدامت پسندانہ خصوصیات کی بنیاد پر ترقی کر رہی ہے۔

تقسیم ملک کے بعد مسلمانوں نے خود کو ایک ایسی حالت میں پایا کہ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کریں اور کہاں جائیں تقسیم سے قبل مسلم لیگ ایک علیحدہ ہوم لینڈ چاہتی تھی جو ۱۹۴۷ء میں اسے مل گیا۔ بدنصیبی سے جمہوری سیکولر نظام سیاست نے مذہبی بنیاد رکھنے والی تنظیموں پر پابندی عائد نہیں کی مسلم لیگ کے پاس کوئی معقول وجہ نہیں تھی کہ وہ اب بھی ہندوستانی سیاست میں عملی طور پر حصہ لے۔ لیکن اس نے اپنا کام جاری رکھا۔ اگر چہ اب یہ چھوٹے پیمانے پر تھا۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ تقسیم ملک کے وقت مسلم لیگ کے بیشتر رہنما اس حق میں تھے کہ آزاد ہند میں پارٹی کو ختم کر دیا جائے۔ سہروردی اور دوسرے رہنماؤں کا خیال تھا کہ مسلم لیگ کوئی مثبت رول ادا نہیں کر پائے گی۔ گاندھی جی کے قتل کے بعد نواب اسمٰعیل خاں کی رہنمائی میں آئین ساز اسمبلی کے مسلم ممبران نے اکثریت رائے سے طے کیا کہ مسلم لیگ کو ختم کر دیا جائے۔ لیکن جنوبی ہندوستان کے لیگی رہنماؤں نے مسلم لیگ کے مستقبل کے بارے میں نواب اسمٰعیل خاں کے اس خیال سے اتفاق نہیں کیا۔ مدراس کے محمد اسمٰعیل صاحب کا خیال تھا کہ ایک سیاسی تنظیم کی حیثیت سے مسلم لیگ کا زندہ رہنا مسلم فرقے کے حق میں ہوگا۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ جنوبی ہند میں حالات بالکل مختلف تھے۔ تاریخی اور سیاسی اعتبار سے شمالی اور جنوبی ہندوستان کے حالات میں اختلاف تھا۔ جنوبی ہندوستان مسلم لیگ کے وجود اور اس کی سرگرمیوں کے لئے سازگار تھا۔

تھیوڈور رائٹ (جونیئر) نے ٹھیک کہا ہے کہ اسلام شمال کے مقابلے میں جنوب میں زیادہ پُر امن طریقے سے آیا ہے۔ عرب تاجروں نے طاقت اور فتح کے زور سے نہیں بلکہ ترغیب و تحریص کے ذریعہ اسلام کی تبلیغ کی ہے۔ انھوں نے ہندو عورتوں سے شادیاں کیں اور مالابار کے موپلا، کنارا کے اَدوبیت اور لبائی، مدراس کے مارا کئیر اور روتیروں کو جنم دیا۔ دوسرے جنوبی ہندوستان کے بیشتر مسلمان اپنے ہندو پڑوسیوں کی زبانوں ملیالم، تامل اور گجراتی بولیاں استعمال کرتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ میسور کے حیدر علی اور ٹیپو سلطان اور چودھویں صدی عیسوی کے مادورائی سلطانوں کے مختصر دورِ حکومت کے علاوہ جنوبی ہندوستان پر سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کا تسلط کبھی نہیں رہا۔

چوتھے یہ کہ جنوب کے خود اپنا کام کرنے والے جہاز راں تاجر، مچھیرے اور کاشتکار شمالی ہندوستان میں اپنے ہم مذہبوں کی طرح روزگار اور بعض رعایتوں کے لئے حکومت کے محتاج نہیں ہے۔ پانچویں یہ کہ تقسیم ملک کے وقت جنوبی ہندوستان میں کوئی فساد نہیں ہوا تھا آخری بات یہ ہے کہ جنوب مغربی ساحل پر مالابار میں کچھ ایسے علاقے ہیں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔

آئین ساز اسمبلی کی کارروائی کے مطالعے سے مسلم لیگ کے رہنماؤں کے سیاسی عقائد سمجھ میں آجاتے ہیں۔ بی۔ پوکر صاحب اور کے۔ ٹی۔ احمد ابراہیم نے صوبائی اور مرکزی سطح پر مسلمانوں کے جداگانہ انتخاب کی حمایت کی۔ چودھری خلیق الزماں نے اس خیال کی شدت سے موافقت کی۔

جداگانہ انتخاب کے حق میں دلائل یہ دئیے گئے کہ اس طرح مسلمان قانون ساز اسمبلیوں میں اپنے حقیقی نمائندے بھیج سکیں گے۔ ان کے رہنما مسلم فرقے کے مطالبوں اور شکایتوں کو پیش کر سکیں گے سردار پٹیل اور بعض مسلم رہنماؤں نے اس مطالبے کی مخالفت کی۔ مسلم لیگی ممبران نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ اگر جداگانہ انتخاب کا حق نہیں دیا جاتا تو قانون ساز اسمبلی کے ہر ممبر کو اپنے فرقے کے تیس فی صدی ووٹ دینے چاہئیں مسلم لیگ کی یہ خواہش بھی تھی کہ قانون ساز اسمبلیوں میں نشستیں محفوظ ہوں۔ دراصل خوف یہ تھا کہ جداگانہ انتخاب نہ ہونے تو مسلم قانون سازوں کی طاقت قابلِ لحاظ حد تک کم ہو جائے گی۔ مسلم لیگی ممبران نے آئین ساز اسمبلی میں مشترکہ سول کوڈ کی شدت سے مخالفت کی۔ اس سلسلے میں یہ کہا گیا کہ یہ غیر جمہوری، مذہب مخالف اور اقلیت پر اکثریت کی رائے تھوپنے کے مترادف ہے۔ انھوں نے اردو کو دستورِ ہند کے آٹھویں شیڈول میں شامل کرنے کی بھی حمایت کی۔ محمد اسمٰعیل نے ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو اپنی تقریر میں کہا کہ اقلیتوں کے تعلق سے دستورِ ہند

ناقص ہے۔ کیونکہ یہ جداگانہ انتخاب کو تسلیم نہیں کرتا۔ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کے لئے نشستیں محفوظ نہیں کرتا۔ پرسنل لا کی حفاظت کی ضمانت نہیں دیتا۔ اور سرکاری اسکولوں میں بچوں کو مذہبی تعلیم کی اجازت نہیں دیتا۔

مسلم لیگ کے رہ نماؤں نے آئین ساز اسمبلی میں جو تقریریں کی تھیں ان سے وہ اصول واضح ہو گئے تھے جن کے تحت مسلم لیگ کو آزاد ہندوستان میں کام کرنا تھا اس سے نااہلیت اور جمہوری طریقوں میں عدم اعتماد کا اظہار ہوتا ہے جس کا نتیجہ فرقہ وارانہ روش اختیار کرنا ہوتا ہے۔

۱۹۴۸ء کے بعد مدراس مسلم لیگ کی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ ۱۹۵۱ء میں پارٹی کا آئین مرتب ہوا جس میں مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے سماجی، اقتصادی اور تہذیبی حقوق پر زور دیا گیا۔ مسلمانوں اور دوسرے فرقوں کے مخلصانہ اور دوستانہ تعلقات کے فروغ کی اہمیت کو بھی تسلیم کیا گیا۔ لیکن جس چیز نے مسلم لیگ کو ایک معقول اور مؤثر جماعت کی حیثیت دی وہ الیکشن کی سیاست میں اس کی دانش مندانہ شرکت تھی۔

مختلف صوبوں میں ذات پات کی تقسیم نے چھوٹے چھوٹے منظم گروہوں کو زیادہ موثر اور سود مند بنا دیا ہے۔ مختلف سیاسی جماعتوں کے رہ نما حمایت حاصل کرنے کے لئے فرقہ پرست گروہوں سے متحد ہونے میں بالکل نہیں جھجکتے۔ مثلاً ۱۹۵۲ء میں مدراس کے میونسپل انتخابات کے دوران کانگریس چاہتی تھی کہ مسلم لیگ سے انتخابی سمجھوتہ کر لے لیکن اس کے لئے مسلم لیگ کا یہ مطالبہ قابل قبول نہیں تھا کہ مسلمانوں کے لئے سیٹیں محفوظ ہونی چاہئیں۔

۱۹۵۲ء کے بعد مسلم لیگ سمجھوتہ بازی کی سیاست میں کامیابی سے حصہ لینے لگی۔ یہ سمجھوتہ کبھی ڈی۔ ایم۔ کے یا سوتنتر سے ہوا اور کبھی کانگریس کمیونسٹوں سے۔

یہاں ملک کی انتخابی سیاست میں مسلم لیگ کے رویئے کا ذکر ضروری ہے۔ ملک کی دوسری مسلم تنظیموں کی طرح مسلم لیگ پارلیمانی جمہوری انتخابات میں شرکت کرنے سے بالکل نہیں جھجکی۔ ایک طرح سے مسلم لیگ کے لئے یہ اقدام لائق تحسین ہے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ مسلم لیگ نے مستقبل کے لئے مسلم سیاست کا ایک نمونہ بنا دیا۔

مسلم لیگ کے رہ نما چیخ چیخ کر یہ کہتے رہے ہیں کہ پاکستان یا تقسیم ملک سے پہلے کی سیاست سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن ان کی رہ نمائی کا انداز اور مسلم فرقے کے مسائل کو سمجھنے کا طریقہ تقسیم ملک سے پہلے کی مسلم لیگ سے زیادہ مختلف نہیں تھا۔ اس پس منظر میں مسلم لیگ کے موجودہ رہ نماؤں کا یہ موقف حیرت انگیز نہیں ہے کہ مسلم لیگ ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے اور تقسیم ملک سے پہلے کی جناح والی مسلم لیگ کی جانشین ہے۔

کسی جمہوری نظامِ سیاست میں جہاں ہر قدم پر مقابلہ ہو، اگر اقلیتی فرقوں کی سیاسی تنظیمیں کام کریں گی۔ تو اس کا لازمی نتیجہ سمجھوتے اور اتحاد کا اصول ہوگا۔ سمجھوتے اور اتحاد اگر ابن الوقتی کی بنیاد پر نہیں تو ذاتی اغراض و مفاد کی بنیاد پر کئے جاتے ہیں اور اس طرح کی سیاست میں حصہ لینے کی مسلم لیگ کی پرانی روایت ہے۔ پچیس سال کے تجربے سے یہی واضح ہوتا ہے کہ مسلم لیگ جنوبی ہندوستان کے بعض علاقوں میں کافی سرگرم رہ کر رفتہ رفتہ تمام ملک کی سیاست میں حصہ لینے لگی ہے۔ اس نے کیرالا، تامل ناڈو، میسور، مغربی بنگال، بہار، مہاراشٹرا اور یو۔ پی کے انتخابات میں حصہ لیا۔ کیرالا میں مسلمانوں کی آبادی انیس سے بچاس فی صدی، تامل ناڈو میں ۵٫۱۱ فی صدی، میسور میں ۱۰٫۶۳ فی صدی، مغربی بنگال میں ۲۰٫۴۶ فی صدی، بہار میں ۱۲٫۴۸ فی صدی، مہاراشٹر میں ۸٫۴ فی صدی اور یو۔ پی میں ۱۵٫۴۸ فی صدی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جموں و کشمیر، جزائر لکادیپ، منی کوائے و امین دیوی جہاں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں مسلم لیگ کو قطعی مقبولیت حاصل نہیں ہے۔

جہاں سیاست میں چھوٹے چھوٹے گروہوں کا تسلط ہے جیسے تامل ناڈو اور کیرالا۔ مسلم لیگ نے اس پھوٹ اور تفرقے کا پورا پورا فائدہ اٹھا کر خود کو ایک موثر گروہ کی حیثیت سے قائم کر لیا ہے۔ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ یہ صرف انھیں صوبوں میں شور و غل کے طور طریقے استعمال کرتی ہیں جہاں مسلمانوں کی آبادی دس فی صدی سے کم ہے۔ کیرالا البتہ مستثنیات میں سے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صرف انہی علاقوں میں مسلم لیگ بے کار اور غیر اہم مسائل کا ہوا کھڑا کر کے لوگوں کو اپنے جھنڈے تلے اکٹھا کرنے کا شغل کر سکتی ہے۔ مثال کے طور پر بمبئی میں مسلم لیگ کارپوریشن کی سطح پر ایک اہم قوت کی حیثیت سے اُبھری۔ ۱۹۷۲ء کے صوبائی انتخابات میں بھی مسلم لیگ نے غیر معمولی کامیابی حاصل کی۔ ان دونوں انتخابات میں لیگ نے اپنی انتخابی مہم کو مسلم پرسنل لا، بنگلہ دیش میں مقیم بہاری مسلمانوں اور بندے ماترم کا ترانہ گانے کے مسائل پر مرکوز کیا۔ لیگ نے جو مسائل اٹھائے ان میں سے کسی کا بھی مختلف صوبوں میں مسلمانوں کے اصل مسائل سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ لیگ نے کسی بھی مرحلے پر کبھی بھی مسلمانوں کے اقتصادی مسائل کے بارے میں آواز بلند نہیں کی۔ بجائے اس کے کہ وہ مسلمانوں کی سیاسی پیش رفت کے لئے کچھ کرتی۔ وہ ہمیشہ مسلم ذہن کے رجعت پرست اور قدامت پسند رجحانات سے فائدہ اٹھاتی رہی ہے۔ بندے ماترم کے سوال سے نہ صرف بمبئی میں بلکہ صوبے کے دوسرے حصوں میں کشیدگی بڑھی جس کا بالآخر انجام پونا فسادات کی شکل میں رونما ہوا جس سے معصوم اور غریب مسلمانوں کو سب سے زیادہ نقصان اٹھانا پڑا۔

یہ بات البتہ قابل ذکر ہے کہ لیگ انتخابات میں حصہ لے کر خاصی فائدے میں رہی۔ بہت سے صوبوں میں اس نے اپنے وجود کا احساس دلایا اور حکومتوں کی تشکیل اور ان کے تسلسل میں بہت اہم

اور موثر رول ادا کیا۔

کیرالا میں اقتدار کا توازن مسلم لیگ کے ہاتھ میں ہے بمبئی کارپوریشن میں غیر کانگریسی مخلوط اقتدار قائم کرنے میں مسلم لیگ نے نمایاں رول ادا کیا لوک سبھا اور صوبائی اسمبلیوں میں بھی مسلم لیگ کی کارکردگی کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

لیگی رہنماؤں نے اپنی جماعت کی سرگرمیوں کے جواز میں جو دلائل پیش کئے ہیں۔ ان کا تجزیہ بھی اس وقت بے محل اور بے موقعہ نہ ہوگا۔ لیگ کی طرف سے دلیل یہ دی جاتی ہے کہ وہ ایک جمہوری تنظیم ہے اور وہ مسلم مسائل پر مسلم رائے عامہ کی ترجمان ہے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں میں لیگی ممبر مسلم فرقے کے حقیقی نمائندے ہیں۔

لیگ خود کو سیکولر اقتدار کی ضامن بھی کہتی ہے۔ لیگ کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ وہ ایک علیٰحدگی پسند تنظیم نہیں ہے کیوں کہ وہ مسلمانوں کو سیاسی سرگرمیوں میں شرکت کی تحریک دیتی اور مسلم فرقے کو قومی دھارے میں لانے کی کوشش کرتی ہے۔ لیگ ہندوستان کی خارجہ پالیسی پر صحت مندانہ اثر کی دعوے دار بھی ہے۔ اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ فرقہ وارانہ تنظیم نہیں ہے اس کی رائے میں شمالی ہند میں فرقہ واریت کو جن سنگھ کی وجہ سے فروغ حاصل ہوا۔ جب کہ مسلم لیگ کا وہاں وجود نہیں ہے۔ مدعا یہ ہے کہ وہ بزعم خود ایک ایسی اقلیتی تنظیم ہے جو مسلمانوں کے آئینی حقوق کو فروغ دیتی ہے۔

لیگی لیڈروں کے مندرجہ بالا دلائل جھوٹے اور کھوکھلے ہیں۔ مسلم لیگ سراسر فرقہ وارانہ روش پر چلتی ہے اور وہ مختلف علاقوں میں تخریب امن کے ذریعہ کئی فرقہ وارانہ جھگڑے پیدا کرتی رہی ہے لیگ کا پروگرام اور اس کی سرگرمیاں واضح طور پر فرقہ وارانہ انتہا پسندی کو فروغ دیتی رہی ہیں مسلم فرقے کی طبقاتی ترتیب سے قطع نظر تمام مسلمانوں کی نمائندگی کا خیال غیر جمہوری ہے اور اس سے فرقہ واریت ہی جھلکتی ہے۔ انتہا پسند ہندو فرقہ واریت کی سرگرمیوں کے پیش نظر مسلم لیگ دونوں فرقوں کے سیکولر عناصر کو کمزور بناتی ہے۔

اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مسلم لیگ اقتدار میں شرکت کی غرض سے مسلمانوں کے اہم مفادات کو قربان کرتی رہی ہے ورنہ شیوسینا جیسی مشہور مسلم دشمن اور فاشسٹ تنظیم کے ساتھ گٹھ جوڑ کا کوئی اور جواز سمجھ میں نہیں آتا۔ مسلم لیگ کو شمالی ہند میں جن سنگھ کے ساتھ سمجھوتہ کرنے میں کوئی عار نہیں ہے حالانکہ جن سنگھ مسلمانوں اور ملک کی مسلم تہذیب و ثقافت کی جانی دشمن ہے۔ یہ ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے کہ لیگ سمیت تمام مسلم تنظیمیں یہ سمجھتی ہیں کہ ہندو فرقہ پرست رہنما سیکولر رہنماؤں کے مقابلے میں ہندو فرقے کے اصل نمائندے ہیں۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ یہ تنظیمیں مسلم پرسنل لا سے متعلق اندرا گاندھی کے بیان پر اعتماد نہ کریں اور اس کی بجائے گرو گولوالکر کے سیاسی اغراض کے زیر اثر مسلم پرسنل لا، کے بارے میں دیئے گئے بیان کو غیر متناسب اہمیت دیں۔ مسلم تنظیموں کے اخبارات اور جرائد کے مواد کے تجزیہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں ہندو فرقہ وارانہ تنظیموں اور ان کے لیڈروں کی سرگرمیوں کو نمایاں جگہ دی جاتی ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مسلم تنظیموں کا ملک کی سیکولر یک جہتی میں کوئی اعتقاد نہیں اور وہ الگ تہذیبوں اور الگ سیاسی مفادات کے علم برداروں کی حیثیت سے دونوں فرقوں کے جداگانہ وجود کو برقرار رکھنا چاہتی ہیں۔

مسلم لیگ ہندوستان کی صورتِ حال کے اہم ترین حقائق سے چشم پوشی کرتی ہے۔ اس کے تمام سیاسی کردار پر شہری مسلم آبادی کے مسائل اثر انداز ہیں۔ یہ جن مسائل کو اٹھاتی ہے وہ تمام فرقے کے نہیں بلکہ اس کے نہایت ہی محدود طبقے سے متعلق ہوتے ہیں۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے مسئلہ کو لے کر اتر پردیش کے الیکشن میں شرکت کے لیگی موقف کا یہاں تجزیہ کرنا ضروری ہے۔ مسلم لیگ یہ بھول جاتی ہے کہ بیشتر مسلم آبادی دیہی علاقوں میں ہے۔

چھ کروڑ چودہ لاکھ سترہ ہزار نو سو چونتیس کی کل مسلم آبادی میں سے چار کروڑ سینتیس لاکھ بتیس ہزار نو سو ترپن دیہی علاقوں میں آباد ہے جب کہ صرف ایک کروڑ سترہ لاکھ چوراسی ہزار نو سو اکیاسی مسلمان شہروں میں آباد ہیں۔ اس کے علاوہ ملک کے ان تیس اضلاع میں سے جہاں کہ مسلم آبادی بیس فی صد سے زیادہ اور پچاس فی صد سے کم ہے۔ مسلم لیگ کا اثر و رسوخ محض تین اضلاع تک محدود ہے۔ مسلمانوں کے مسائل کا مسلم لیگی تصور کس قدر بے بنیاد ہے اس کا اندازہ ان حقائق کی روشنی میں کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے مسلم لیگ کا یہ دعوےٰ کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کی واحد سیاسی تنظیم ہے محض ہوائی ہے۔

اگر ان علاقوں میں جہاں کہ مسلم آبادی دس فی صدی سے زیادہ ہے۔ مسلم فرقہ وارانہ سیاست زندہ رہی تو اس کی شکل کل ہند جماعت کی بجائے علاقائی فرقہ وارانہ پارٹی کی ہوگی۔ جیسا کہ اتر پردیش میں مسلم مجلس، حیدرآباد میں اتحاد المسلمین یا بہار میں مسلم تنظیم۔

مسلم لیگ کے رویئے کی انتہا پسندی میں ایک اور خطرہ بھی پنہاں ہے محض الگ الگ فرقوں میں اثر و رسوخ رکھنے والی تنظیموں سے سیکولر نظام کے بنیادی اصولوں کو یقیناً خطرہ لاحق ہے۔ ایسی تنظیموں کی کارکردگی سیکولرازم کے مقاصد کے منافی ہے۔ ان کی سیاست کی کوشش یہ تو ہے کہ وہ ثقافتی اور مذہبی پہلوؤں کو اپنے آپ میں سمولے۔ پھر ان پہلوؤں کو سیاست میں اس طور سے گھسیٹتے ہیں کہ عوام کی توجہ اقتصادی اور سیاسی مسائل سے ہٹ سکے۔ یہاں کیرالا کے نصابی کتابوں کے تنازعے کی مثال دی جا سکتی ہے۔ ٹھیک اسی طریقے سے مسلم لیگ نے مسلم پرسنل لا کو سیاسی رنگ دینے کی کوشش کی۔

مسلم لیگ ہمیشہ ثقافتی مسائل اٹھانے

(باقی صفحہ ۳۳)

جن سنگھ کی خوش فہمی

سیاسی نامہ نگار کے قلم سے

جن سنگھ کے سربراہوں کو یہ پختہ یقین ہو چکا ہے کہ ملک بہت جلد افراتفری اور بدنظمی کے ایک نئے دور سے گزرنے والا ہے اور تنظیمی حیثیت سے انھیں اس بات کے لئے تیار رہنا چاہیئے کہ اس موقعہ کا پورا فائدہ اٹھایا جا سکے۔

اس جماعت کے رہنماؤں کا یہ یقین چند مفروضات پر مبنی ہے۔ اول یہ کہ کانگریس کی حکومت موجودہ معاشی بحران پر قابو نہیں پا سکتی اور روز بروز بڑھتی ہوئی قیمتوں کو روکنے میں ناکام رہے گی۔ دوم کانگریس ہائی کمانڈ مختلف صوبوں میں جماعت کی اندرونی گٹھ بندیوں کو ختم نہیں کر سکتا۔ سوئم ملک کی منڈیوں میں پھیلے ہوئے انتشار اور ابتری کی وجہ سے عوام میں بڑھتی ہوئی بےچینی کو رفع کرنا حکومت یا کانگریس کے بس کی بات نہیں ہے اور نہ ہی اب نعروں کی مدد سے اس بددلی کو دور کیا جا سکتا ہے۔ چہارم یہ کہ نظم و نسق کے لئے ذمہ دار افسران پر حکومت کا تسلط کمزور پڑ چکا ہے۔ اس کے علاوہ ان رہنماؤں کا یہ بھی یقین ہے کہ اناج کی قیمتوں پر کنٹرول کی وجہ سے جو بحران پیدا ہو گیا ہے وہ جلد ہی نہ صرف مرکز میں بلکہ صوبوں میں بھی کانگریسی حکومت کو لے ڈوبے گا۔

اس جماعت کے سربراہوں کے دماغ میں کچھ اور باتیں ایسی بھی ہیں جن کی بنیاد پر انھوں نے اپنی تنظیم کے لئے ایک نئی پالیسی مرتب کی ہے۔ ان کا ایک خیال یہ ہے کہ دوسری غیر کمیونسٹ مخالف جماعتوں کے مقابلہ میں صرف جن سنگھ ہی مکمل طور پر منظم جماعت ہے اور موجودہ معاشی بحران کا سب سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتی ہے۔ تنظیمی کانگریس اور سوتنتر پارٹی دو "ہم خیال" جماعتوں کے متعلق اس کا مجمی جائزہ یہ ہے کہ پہلی جماعت ایسے عمر رسیدہ بزرگوں پر مشتمل ہے جو کہ سکت کی قوت گنوا بیٹھے ہیں اور دوسری جماعت میں صرف چند سپہ سالار موجود ہیں جب کہ فوج لاپتہ ہے۔ جہاں تک سوشلسٹوں کا سوال ہے چاہے وہ سوشلسٹ پارٹی سے متعلق ہوں یا سنیکت سوشلسٹ پارٹی سے ان کی اہمیت صرف اتنی ہی ہے کہ وہ دائیں بازو کی قدامت پسند جماعتوں کے ساتھ مل کر ان پر بھی ترقی پسندی کی مہر ثبت کر دیتے ہیں۔ بی۔ کے۔ ڈی کے سربراہ چرن سنگھ کے وہ مداح ہیں کیونکہ معاشی مسائل پر ان کے قدامت پرست نظریات کے وہ حامی ہیں جن کے ساتھ ہی وہ ان سے خوف بھی کھاتے ہیں کیونکہ چرن سنگھ کا اپنی برادری پر زبردست اثر ہے اور یو۔پی میں یہ اثر بہت زیادہ نمایاں ہے۔

ان لوگوں کے لئے جو کہ جن سنگھ کے رہنماؤں یا پس پردہ ان پر بالادستی رکھنے والی تنظیم کے ذہن سے بخوبی واقف ہیں۔ یہ سب نئی باتیں نہیں ہیں مثال کے طور پر ۱۹۷۰ء کے شروع میں چنڈی گڑھ میں اس جماعت کی جنرل کونسل کی جو میٹنگ ہوئی تھی اس میں انھیں تصورات کے پیش نظر ۱۹۷۱ء کے عام انتخابات سے پیشتر اس بدنام زمانہ "عظیم گٹھ جوڑ" کی بنیاد کی حمایت کی گئی تھی۔ لیکن لوک سبھا کے انتخابات میں عظیم گٹھ جوڑ کی جو درگت بنی اس کے لئے جن سنگھ کو ہی ذمہ دار قرار دیا گیا جس کی وجہ سے جماعت کو بے انتہا مایوسی ہوئی تھی۔ گٹھ جوڑ کے ہر شریک نے باری باری سے جن سنگھ اور آر۔ ایس۔ ایس کے فرقہ وارانہ کردار کو اس شکست فاش کے لئے ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔ بی کے۔ ڈی کے سربراہ چرن سنگھ نے تو اس سے پیشتر ہی جن سنگھ کو اور کئی باتوں کے لئے ملزم قرار دیا تھا جب کہ سوتنتر پارٹی جن سنگھ اور ان کے درمیان ایک مشترکہ محاذ قائم کرنے کے لئے ہونے والے مذاکرات کا سلسلہ ٹوٹ گیا تھا۔ اسی پس منظر میں جماعت کے وہی رہنما جو کبھی مخلوط سرکار کی تعریف کرتے نہیں تھکتے تھے، بعد ازاں یہ اعلان کرتے دیکھے گئے کہ وہ کبھی دوبارہ مخلوط حکومت یا ایسے گٹھ جوڑ میں شرکت کی غلطی نہیں کریں گے۔ بار بار انھوں نے اپنے اس ارادے کا اعادہ کیا کہ وہ دیگر مخالف پارٹیوں کے ساتھ علاقائی سطح پر معمولی انتخابی سمجھوتوں کے علاوہ کسی قسم کا معاہدہ نہیں کریں گے۔ کم از کم پچھلے دنوں فروری میں منعقد ہونے والی آل انڈیا کانفرنس کے پونہ اجلاس میں جماعت نے اپنی اسی پالیسی کا اعلان کیا تھا۔

یہاں اس امر کا ذکر کرنا مناسب ہوگا کہ مبصرین کی توجہ ماہ مئی میں بھی کانپور سیشن میں ریاستوں کی نئی تنظیم کے مسئلے پر جن سنگھ کی قلابازی کی طرف کہیں زیادہ مبذول ہوئی اور گٹھ جوڑ کے متعلق نئی پالیسی کے اعلان پر دھیان نہیں گیا۔ کانپور میں اس بات کا احساس کیا گیا کہ جن سنگھ کی دلی خواہش یہ ہے کہ ملک بھر میں انتشار و بدنظمی کا دور شروع ہو جائے آندھرا میں صوبہ کی تقسیم کی تحریک کے متعلق جن سنگھ نے اپنے نتیجے اخذ کئے ہیں۔ اس تحریک نے جمہوری نظام حکومت، معاشیات اور کانگریس کے وقار کو مجروح کیا ہے۔ آر۔ ایس۔ ایس کے شر پسندوں نے صوبہ کی زندگی کو درہم برہم کرنے میں پس پردہ ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ جس وقت آر۔ ایس۔ ایس کا ایک پرچارک

دیے واڑہ میں آگ لگانے والے ایک مجمع پر پولیس کی گولی چلانے کی وجہ سے فوت ہوگیا۔ تو جن سنگھ کے سربراہوں نے بڑے معصومانہ انداز سے صفائی پیش کی کہ وہ تو بھیڑ میں کھڑا ایک تماشائی تھا۔ لیکن جماعت نے آندھرا کی تحریک سے ملک گیر سطح پر اپنا پروگرام مرتب کرنے کے لئے اہم نتیجے اخذ کر لئے۔ ناگ ودربھا میں علیحدہ صوبہ بنانے کے لئے جمبوونت دھوتے کی قیادت میں جو تحریک چلائی گئی اس میں جن سنگھ کی شمولیت کا بھی یہی مقصد تھا۔

ان وجوہات کی بنا پر جن سنگھ نے اپنے کانپور کے اجلاس میں صوبوں کی تشکیل کے متعلق اپنی پچھلی پالیسی کو تبدیل کرنے کے لئے زمین ہموار کرنی شروع کر دی۔ آندھرا میں جماعت کے ایک وفد کی رپورٹ کو کانپور اجلاس میں بڑے کرّوفر کے ساتھ اخباری نمائندوں کے سامنے پیش کیا۔ یہ اقدام بھی کانپور میں ان کی بدلتی ہوئی پالیسی کے پیش نظر ہی اٹھایا گیا تھا اس وفد نے اپنی رپورٹ میں یہ رائے ظاہر کی تھی کہ لسانی بنیادوں پر صوبوں کی تشکیل کا نظریہ ناکام ثابت ہو چکا ہے اور اب ہر صوبہ میں ترقی یافتہ اور پچھڑے ہوئے علاقوں کے درمیان کش مکش کا دور شروع ہو رہا ہے۔ اس پس منظر میں جماعت حالات کے مطابق دونوں میں سے کسی بھی فریق کی حمایت کا فیصلہ کر سکتی ہے تاکہ اس کو ان علاقوں میں پاؤں جمانے کا موقعہ مل سکے۔

جن سنگھ کے اس وفد نے یہ خیال پیش کیا تھا کہ ملک کو تیس یا چالیس صوبوں میں منقسم کر دیا جائے اور یو۔ پی کے تین یا چار حصے کر دیئے جائیں۔ اس رپورٹ کا ڈرافٹ سبرامنیم سوامی نے تیار کیا تھا۔ یہ صاحب جماعت میں ایک ماہر کی حیثیت سے شمار ہوتے ہیں۔ یہ امر تعجب خیز ہے کہ آر۔ ایس۔ ایس کے اعلیٰ سربراہوں نے اس خیال کی تائید کی تھی اور بعد ازاں جن سنگھ کی مجلس عاملہ نے بھی اس نظریہ کی حمایت کی۔

لیکن کانپور کا یہ اجلاس جن سنگھ کے لئے بہت کامیاب ثابت نہیں ہوا۔ اول تو یہ کہ شری بلراج مدھوک جو کہ جماعت کے رہنماؤں کے حلق میں کانٹے کی طرح اٹکے ہوئے تھے وہاں موجود تھے۔ دوم یہ کہ اجلاس میں علیحدہ بندیلکھنڈ بنانے کے حامی ایک ڈیلی گیٹ نے یہ اعلان کیا کہ اگر حکومت یہ نیا صوبہ نہیں بنائے گی تو اس علاقہ میں بھی آندھرا کی طرح خون کی ہولی کھیلی جائے گی۔ اس کے جواب میں دہرادون کے ایک صاحب نے بندیلکھنڈ کے اس ڈیلی گیٹ کی تقریر کی مذمت کی اور پارٹی کی توجہ اس خطرہ کی طرف مبذول کی جو کہ پارٹی کی نئی پالیسی کے تحت ملک کو لاحق ہو سکتا ہے۔ ایک لمحہ کے لئے تو پارٹی کے سربراہ سکتہ میں آگئے لیکن اس مشکل مرحلے سے نکلنے کا حل یہ نکالا گیا کہ ایک سمجھوتہ پسند قرارداد پاس کی گئی کہ کسی صوبہ کی مزید تقسیم کا سوال اس وقت تک نہیں اٹھایا جائے گا جب تک کہ اس مخصوص صوبہ کی تمام جن سنگھی شاخائیں اتفاق رائے سے اس بات کو منظور نہ کر لیں۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ مرحوم شری گولوالکر کو بھی اس نئے نعرے کی حمایت کا کھل کر اعلان کرنا پڑا تاکہ تمام اراکین کے دلوں میں کوئی شک شبہ کی گنجائش باقی نہ رہ جائے۔

یہاں یہ بات دلچسپ ہے کہ پارٹی کی اس نئی پالیسی کا اثر الٹا ہوا ہے۔ پارٹی کے ممبران اور عوام کے دلوں میں اس سے رہنماؤں کی عزت گھٹ گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ عرصہ کے لئے اس پالیسی پر عمل درآمد کا سوال بالائے طاق رکھ دیا گیا ہے۔ یہ امر اس جماعت کے مخصوص کردار کے عین مطابق ہے۔

ان حالات میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بمبئی میں منعقد ہونے والی جنرل کونسل کی میٹنگ (جولائی ۱۶، ۱۷ اور ۱۸) سے بہت پہلے جن سنگھ نے ملک میں بدنظمی پھیلانے کا پروگرام مرتب کر لیا تھا۔ یہ خیال غلط ہے کہ کانگریس کے اندرونی جھگڑوں اور ملک میں اقتصادی بحران کے بعد جن سنگھ کو ملک میں بدنظمی کے آثار نمودار ہونے کا خیال آیا ہو۔ یہ تو صرف وہ عوامل ہیں جن کا فائدہ اٹھا کر جن سنگھ ملک میں بدنظمی اور افراتفری کے خواب کی تکمیل دیکھنا چاہتا ہے۔ کوئی بھی سمجھدار انسان جن سنگھ کی اس نئی پالیسی کے اسباب کا اندازہ آسانی سے لگا سکتا ہے۔ اگر ہم اس کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو دیکھیں گے کہ ۱۹۶۷ء کے عام انتخابات میں جن سنگھ کئی ہندی بولنے والے صوبوں میں ایک طاقتور پارٹی کی حیثیت سے نمودار ہوا اور کانگریس کے مقابلے میں کھڑا ہونے کا دعویٰ کرنے لگا۔ لیکن ۶۹-۱۹۶۸ء کے وسط مدتی چناؤ میں انہی صوبوں میں ماسوائے بہار، اس کو کافی نشستوں کا نقصان اٹھانا پڑا۔ جو امر اس کے زوال کی نشاندہی کرتا تھا 'عظیم گٹھ جوڑ' کی اس کی پالیسی ۱۹۷۱ء کے انتخابات میں اس کو شکستِ فاش سے نہیں بچا سکی اور ۱۹۷۲ء کے صوبائی انتخابات میں چھوٹے پیمانے پر کئے گئے مقامی گٹھ جوڑ بھی اس جماعت کے کسی کام نہ آسکے۔ دریں اثنا بنگلہ دیش کی تحریک کے دنوں میں اس جماعت کو اچھا موقعہ ملا کہ اپنی پرانی اسلام دشمن پالیسی کو پاکستان کی مخالفت کے بہانے منظرِ عام پر لے آئے۔ انھیں دنوں صدر نکسن کے نقش قدم چلنے والے اصول کے مطابق یہ جماعت ابھی چین کے معاملہ میں اپنی نئی پالیسی کی وضاحت بھی نہ کر سکی تھی کہ برصغیر میں ہونے والے واقعات نے اس کو پھر مشکل میں ڈال دیا۔ ہند، روس دوستانہ معاہدے نے تو اس جماعت کے پاؤں تلے سے زمین کھسکا دی اور اسے پے در پے ان شکستوں سے سنبھلنے میں کافی وقت لگ گیا۔

اقتصادی سوالات پر بھی جماعت کا ڈھل مل رویہ ہر موقعہ پر عوام کے سامنے آتا رہا ہے۔ مثلاً بنکوں کے قومیانے، راجاؤں نوابوں کی مراعات، دیہی اور شہری جائیدادوں کی حد بندی کے سوالات پر یہی تماشہ دیکھنے کو ملا ہے۔ اس پارٹی کا طریقہ عمل یہ رہا ہے کہ چور سے کہو چوری کر اور شاہ سے کہو جاگتا رہ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ جن سنگھ کی ساکھ متوسط اور

(باقی صفحہ ۳۳)

اردو کو

بعض ریاستوں میں سرکاری زبان کا درجہ دینا کیوں ضروری ہے؟

آلِ احمد سرور

ہندوستان ایک جمہوریت ہے۔ جمہوریت کے معنی اکثریت کی حکومت کے نہیں اگرچہ اکثریت کی اہمیت مسلّم ہے۔ اس میں اقلیت کا اطمینان اور اس کے جائز مطالبات کو تسلیم کرنا تاکہ وہ خوش دلی کے ساتھ ملک کی تعمیر کے کام میں مصروف ہو سکے، ضروری ہے۔ ہندوستان ایک سیکولر جمہوریت ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ حکومت کے فیصلوں اور عام کاروبار میں مذہب کی بنیاد پر کسی فرد یا گروہ کے ساتھ تفریق نہیں ہوگی، نہ اکثریت کو اس لحاظ سے کوئی خاص سہولت ہوگی نہ اقلیت کو اس بنا پر کوئی نقصان پہنچے گا۔ ہندوستانی قومیت کسی علاقے کسی زبان، کسی طبقے کو دوسرے پر ترجیح نہیں دیتی ہر علاقے، ہر زبان، ہر طبقے کو ترقی کرنے کا حق حاصل ہے۔ حکومت کا فرض ہے کہ جو علاقہ یا زبان یا طبقہ کسی وجہ سے زندگی کی دوڑ میں حصہ نہیں لے سکا ہے تو اسے اس قابل بنائے کہ وہ دوسروں کے دوش بدوش چل سکے۔ ہندوستان کے دستور میں جو آزادی مساوات اور اخوت کا صحیفہ ہے، ہندوستان کے ہر مذہبی یا لسانی یا علاقائی جز کے لئے بقا اور ترقی کی ضمانت موجود ہے۔ پھر بھی جمہوریت کے ۲۵ سال گزر جانے پر لسانی اقلیتوں کی شکایات بدستور ہیں، انھیں اب بھی تشنگی اور محرومی کا احساس ہے۔ ان لسانی اقلیتوں میں سے اردو کی لسانی اقلیت بلاشبہ سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے کیونکہ اگرچہ کسی ریاست میں اس کی اکثریت نہیں، مگر پورے ملک میں ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق دو کروڑ چھیاسی لاکھ افراد کی یہ مادری زبان ہے۔ چونکہ ہمارے ملک میں اب تک اعداد و شمار کی صحت کے معاملے میں اتنی توجہ نہیں کی جاتی جتنی ہونی چاہیئے اس لئے یہ قیاس غلط نہیں کہ یہ تعداد تین کروڑ سے زیادہ میں ہوگی۔ پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ کئی ریاستوں میں اردو بولنے والوں کی تعداد بیس لاکھ سے زیادہ ہے۔ اتر پردیش میں ۸۶ لاکھ، بہار میں ۵۰ لاکھ، آندھرا میں ۳۳ لاکھ، مہاراشٹر میں ۳۲ لاکھ، میسور میں ۳۰ لاکھ، ہندوستان کی بعض ریاستوں مثلاً جموں و کشمیر کی پوری آبادی کی تعداد اتر پردیش کی اردو بولنے والی اقلیت کی تعداد سے کم ہے۔ ہندوستانی جمہوریت کے پرستاروں کو اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیئے کہ اتنی بڑی لسانی اقلیت کی بے اطمینانی اور بددلی، بیزاری اور برہمی ملک کے لئے کتنی نقصان دہ ہے اور اس کا اطمینان اور سکون ملک کے لئے کتنا ضروری۔

دراصل ہندوستان ایک قدیم ملک ہے اور جدید قوم۔ یہ واقعہ ہے کہ ابھی قومی احساس اور قومی شعور عام طور پر زندگی کی لے نہیں بنا ہے۔ صرف سطحی ہے۔ لوگ اب بھی ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی یا پنجابی بہاری، مہاراشٹری، بنگالی کے نقطۂ نظر سے سوچتے ہیں۔ جس کے پاس دولت ہے وہ ہر حال میں اس پر قبضہ رکھنا چاہتا ہے جو کنگال ہے اس کی حالت کچھ بہتر ہوئی ہے مگر ابھی خاصی ابتر ہے۔ سیاسی پارٹیاں انتخاب کے موقع پر ووٹ لینے کے وہ تمام حربے استعمال کرتی ہیں جن کی وہ پلیٹ فارم سے مذمت کرتی ہیں۔ ذات پات علاقائی پاسداری، زبان، مذہب، برادری کے نام پر ووٹ مانگے جاتے ہیں اور ملتے ہیں۔ بیشتر سیاسی پارٹیوں کا منشور کچھ کہتا ہے اور عمل کچھ۔ سیاست کا نام اب اقتدار کی جدوجہد ہو گیا ہے۔ اقتدار ملتا ہے تو ملک کی ترقی کے بجائے، کچھ لوگوں کا فائدہ ہوتا ہے یہ لوگ اپنا مفاد ایک پارٹی میں رہ کر اگر نہیں دیکھتے تو دوسری میں جھٹ شامل ہو جاتے ہیں۔ اخلاقی قدروں کے زوال نے قول اور عمل میں ایک خلیج پیدا کر دی ہے سیاسی پارٹیاں عوام سے انتخاب کے موقع پر ہر طرح کے وعدے کر لیتی ہیں۔ اگر اقتدار مل جائے تو ان کو پورا کرنے کے لئے دل خوش کن اعلانات بھی کرتی ہیں مگر دفتری نظام ان اعلانات کی وہ مٹی پلید کرتا ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ پھر بھی کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ واقعی ہم لوگ بڑے صبر والے ہیں۔ صدیوں کے ظلم و جبر نے ہم سے اپنے جائز حقوق کے لئے لڑنے اور قومی اور جمہوری اور آئینی طریقوں سے لڑنے کا ہنر چھین لیا ہے۔ ہم جھوٹے وعدوں، کھوکھلی تسلیوں، مبہم یقین دہانیوں سے جلد مطمئن ہو جاتے ہیں۔ تاریخ کا سبق یہ ہے کہ جو فرد یا گروہ اپنے جائز حقوق کے لئے نہیں لڑ سکتا، وہ بالآخر زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتا ہے۔ اردو دوستوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے حقوق کے لئے تمام جمہوری اور آئینی ذرائع سے اپنی لڑائی جاری رکھیں۔ جیسے جیسے

جمہوریت کا تصور دلوں میں گھر کرتا جائے گا جیسے جیسے سیکولرازم پر یقین بڑھتا جائے گا جیسے جیسے مشترک تہذیب اور اس کا سارا سرمایہ، ہندوستان اور اس کی پوری تاریخ، قومیت اور اس کے سارے مضمرات عزیز ہوتے جائیں گے۔ اردو کی ترقی کی راہیں بھی کھلتی جائیں گی اور اس شاندار اور جاندار، حسین اور شیریں، مالدار اور طرحدار زبان کو اس کے گھر میں اس کا جائز اور مناسب مقام ملے گا۔

اردو ایک جدید ہندوستانی زبان ہے اس کی ساخت میں پنجابی اور برج کا بھی حصہ رہا ہے۔ ہندوستان کی خوش قسمتی یہ ہے کہ اس کی تاریخ میں جنوبی ایشیا، وسطی ایشیا اور مغربی ایشیا تینوں کا رول رہا ہے۔ اردو ان تینوں اثرات کی حامل ہے۔ یہ ان چند ہندوستانی زبانوں میں سے ہے جن میں ایشیائی عناصر دوسروں سے زیادہ ہیں۔ یہ اس کی ایک ایسی دولت ہے جو اسے مقامی اور محدود ہونے سے بچاتی ہے اور اس کی آفاقیت اور ہمہ گیری کو نمایاں کرتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اردو بولنے والوں کی بہت بڑی تعداد آج ہندوستانی مسلمانوں پر مشتمل ہے لیکن یہ ہندوستانی مسلمان ہندوستان کی آبادی کا ایک قابل فخر حصہ ہیں اور ان کی ہندوستانیت پر جو شک کرے مجھے اس کی ہندوستانیت مشکوک نظر آئے گی۔ ہندوستانی تاریخ کے ایک موڑ پر فارسی ملک کی سرکاری زبان بنی لیکن ریاستوں میں مقامی زبانوں کا راج رہا۔ انیسویں صدی کے پہلے نصف میں فارسی کی جگہ اردو نے لی۔ آزادی تک کئی دیسی ریاستوں میں اردو سرکاری زبان رہی۔ کئی ریاستوں کی تہذیب پر اردو کا گہرا اثر ہے۔ اترپردیش میں اردو بولنے والوں کی تعداد دس بارہ فی صدی ہوگی اور مسلمانوں کی تعداد پندرہ فی صدی سے زیادہ نہیں۔ مگر اترپردیش کی تہذیب پر اردو کی گہری چھاپ ہے جس سے کوئی انکار کرے تو وہ تاریخ اور سماجی حقائق سے انکار کرے گا۔ اس طرح دہلی کی چالیس لاکھ کی آبادی میں اردو بولنے والے چند لاکھ ہوں گے، مگر دہلی ہندوستان کا دل ہی نہیں اردو کی جنم بھومی بھی ہے اور آج بھی دہلی کی زبان پر اردو اور اس کی تہذیب کے غیر فانی نقش مل جائیں گے۔ اگر کوئی امرت سر سے کلکتے تک تیسرے درجے میں سفر کرے اور لوگوں کی بات چیت سنے تو وہ جس زبان کو کسی نہ کسی روپ میں ہر جگہ سنے گا وہ اردو ہوگی۔ اردو اور ہندی ہی صرف دو ایسی زبانیں ہیں جو کل ہند زبانیں کہی جا سکتی ہیں۔ ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کے ہر موڑ پر اردو کا رول نمایاں رہا ہے۔ انقلاب زندہ باد سے لے کر آرام حرام ہے اور غریبی ہٹاؤ تک ملک کو جو بھی ولولہ انگیز نعرے دیئے گئے ہیں وہ اردو کی دین ہیں۔ یوں تو ہندوستان کی سبھی جدید زبانوں کا ادب شاندار ہے اور یہ نہیں کہنا چاہیئے کہ فلاں زبان کا ادب دوسرے ادب سے زیادہ بلندی یا گہرائی رکھتا ہے۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ اردو کے غالب اور اقبال اور پریم چند کو دنیا جانتی ہے اور اردو کے میر، نظیر، انیس سے بھی ناواقف نہیں۔ اردو میں اعلیٰ تعلیم کا تجربہ عثمانیہ یونیورسٹی میں کامیابی سے کیا جا چکا ہے اور انجمن ترقی اردو ہند اور دوسرے اداروں نے عالمی کلاسیکی کو اردو کے قالب میں بھی پیش کر دیا ہے۔ افلاطون کی ریاست، ارسطو کی بوطیقا کانٹ کی تنقید عقل محض، شیکسپیئر کے بہت سے شاہکار، گوئٹے کا فاوسٹ، روسو کا معاہدہ عمرانی فرانسیسی، جرمن، روسی، عربی، فارسی، سنسکرت کے بہت سے شاہکار جس زبان میں منتقل ہو چکے ہوں فوجداری اور دیوانی کے قوانین جس زبان میں موجود ہوں، عدالتوں اور دفاتر کے پرانے ریکارڈ اور زمین اور جائیداد کے کاغذات جس زبان میں برسوں رکھے گئے ہوں، اس کے ساتھ بے انصافی ہندوستانی قومیت اور اس کی تاریخ اور جمہوریت اور سیکولرازم کے ساتھ بے انصافی ہے جس کو دور کئے بغیر ملک میں سچی جمہوریت کو فروغ نہیں ہو سکتا۔

آخر اب تک اس زبان کے ساتھ بے انصافی کیوں ہوتی رہی ہے اور اس کی بقا اور ترقی کے راستے میں پہاڑ کیوں جوں کے توں کھڑے ہیں۔ غور کرنے سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ تقسیم اور اس کے بعد کی سیاست کی شکار ہو گئی ہے۔ مسلم لیگ نے جب تقسیم کا مطالبہ کیا تو اردو کو بھی اپنے سیاسی مقصد کے لئے استعمال کیا لیکن اس مطالبے کی وجہ سے کچھ لوگوں نے اردو کو بدیسی، غیر یا تقسیم کی ذمہ دار سمجھ لیا تو یہ ان کی بہت بڑی غلطی ہے۔ سیاست میں آئے دن ہر قسم کے پینترے استعمال ہوتے ہیں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ ہمارے ملک کی آبادی کا خاصا حصہ اس پروپیگنڈے سے متاثر ہوا اور تقسیم کے خلاف جو برہمی تھی اس کی شکار اردو بھی ہوئی۔ چنانچہ آزادی کے کچھ عرصے بعد تک اردو کو پاکستان کی زبان کہہ کر اپنے گھر میں اس کے حقوق کو پامال کیا جاتا رہا۔ انجمن ترقی اردو ہند اور دوسرے قومی ادارے اور قومی کارکن برابر اس زیادتی کے خلاف آواز بلند کرتے رہے۔ یہ لے اب کم ہوئی ہے اور جن سنگھ کے لیڈر بھی اب کم سے کم زبان سے کہنے لگے ہیں کہ اردو ہندوستانی زبان ہے اور ہم اس کی ترقی چاہتے ہیں۔ مگر غور سے دیکھا جائے تو اچھی اچھی سیکولر پارٹیوں کے عام ممبروں کے دل میں کہیں یہ خیال گھسا ہوا ہے کہ اردو کو اس کا حق دے دیا گیا اور اس کے سلسلے میں دستور میں جن تحفظات کی گنجائش ہے ان پر عمل کیا گیا تو علیحدگی پسندی کو ہوا ملے گی۔ اور تو اور ہمارے وہ سیاسی رہنما جنھوں نے ہندوستان میں جمہوریت اور سیکولرازم کی بنیادوں کو مضبوط کیا ہے اور جو نہ صرف اردو کو ہندوستان کی ایک دولت سمجھتے اور اس پر فخر کرتے ہیں بلکہ اسے اپنی زبان بھی کہتے ہیں۔ اردو کے سلسلے میں وہ صاف نظر اور فیصلہ کن عمل نہیں دکھا سکے جس کی ان سے توقع تھی۔ یہاں مجھے گاندھی جی یاد آتے ہیں جن کو ہندوستان نے بالکل بھلا دیا ہے پنڈت سندر لال نے مجھ سے بیان کیا کہ گاندھی جی سے اور ان سے اردو ہندی کے مسئلے پر بات چیت ہو رہی تھی۔ گاندھی جی نے پوچھا کہ کچھ ہندو اردو کی کیوں مخالفت کرتے ہیں؟ پنڈت سندر لال نے جواب دیا کہ عام ہندو جب ہندی

کے حق میں سوچتے ہیں تو وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے دھرم سے قریب ہوگئے۔ اسی طرح عام مسلمان اردو کی بات کو اسلام سے ملا دیتے ہیں۔ گاندھی جی نے کچھ سوچ کر کہا کہ یہ بات تو مجھ میں بھی ہے مگر سندر لال میں اسے نکال دوں گا اور مذہب کو زبان سے نہیں ملاؤں گا ہم میں سے ہر ایک کا فرض ہے کہ گاندھی جی کے اس ارشاد کو ذہن میں رکھے اور زبان کے مسئلے پر قومی اور تہذیبی نقطۂ نظر سے غور کرے۔ گاندھی جی کی ایک اور بات میں یہاں یاد دلانا چاہتا ہوں جس کی تصدیق سبھدرا جوشی اور مہابیر تیاگی دونوں کرسکتے ہیں۔ جب ۱۹۴۷ء میں دہلی میں فسادات ہو رہے تھے تو کچھ کانگریسی گاندھی جی کے پاس پہنچے اور اس بات پر بڑا دکھ ظاہر کیا کہ دہلی میں مسلمان مارے جا رہے ہیں۔ گاندھی جی نے ان سے پوچھا کہ تم میں سے کتنے مارے گئے؟ گاندھی جی کا مطلب یہ تھا کہ زبانی ہمدردی کافی نہیں، اصول کے لئے جان قربان کر دینی چاہیئے۔ افسوس ہے کہ گاندھی جی کا نام لینے والوں اور اس نام سے ہر قسم کا فائدہ اٹھانے والوں میں گاندھی جی کی سی اصول پرستی اور حق اور انصاف کے لئے بلکہ مظلوم کی حمایت کے لئے بڑی سے بڑی قربانی کرنے کا جذبہ کہیں نظر نہیں آتا۔ ہمارا ملک چاہے کتنی ترقی کر جائے لیکن جب تک اخلاقی اعتبار سے وہ بلند نہیں ہوگا جب تک اس کے رہنماؤں میں حق گوئی اور بیباکی نہیں آئے گی اس وقت تک اس کی ترقی صرف دکھاوے کی ہوگی حقیقی نہ ہوگی۔

میں ان لوگوں میں سے ہوں جو شروع سے اس خیال کے حامی ہیں کہ ملک کی تقسیم غلط ہوئی۔ اس نے کوئی مسئلہ حل نہیں کیا اور بہت سے مسئلے پیدا کر دیئے لیکن ایک بات میں صفائی سے کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے ملک کی اکثریت میں یہ خیال عام ہے کہ تقسیم مسلم لیگ نے کرائی اور چونکہ تقسیم نہیں ہونی چاہیئے تھی اس لئے مسلم لیگ تنہا تقسیم کی ذمہ دار ہے۔ حالانکہ تقسیم پر کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کا اتفاق ہوا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ کانگریس نے مجبوراً اسے تسلیم کیا کیونکہ اس کے بغیر اس وقت ملک شاید آزاد نہ ہو پاتا۔ بہرحال ملک تقسیم ہوگیا اب تقسیم پر رونا بھی غلط ہے۔ ہاں اس کی کوشش برابر کرنی چاہیئے کہ ہندوستان اور پاکستان اچھے پڑوسیوں کی طرح رہیں اور اگر ہو سکے تو بالآخر ہندوستان، بنگلہ دیش اور پاکستان کا ایک کانفیڈریشن (Confederation) بن جائے۔ مگر اس کے لئے تینوں ملکوں کی رضامندی ضروری ہوگی۔ یہ کسی پر لادی نہیں جاسکتی۔ ہندوستان کے اعصاب پر پاکستان سوار نہیں ہونا چاہیئے۔ ملک

> ہمارا تجربہ ہے کہ کتنی ہی نیک نیتی ہو، کتنی ہی ہمدردی ہو، موجودہ دفترشاہی نظام میں جب تک قانونی طور پر اردو کا تحفظ نہیں ہو جاتا، یعنی اسے سرکاری زبان تسلیم نہیں کر لیا جاتا اس وقت تک دراصل یہ سہولتیں جن کا برابر اعادہ کیا جاتا رہا ہے نہ صرف عمل کی دنیا میں مل نہیں پائیں گی بلکہ کم ہوتی جائیں گی۔

کے مفاد کی روشنی میں پاکستان سے تعلقات رکھنے چاہئیں۔ پاکستان کچھ کرے، ہندوستان کے جو اصول ہیں ان پر قائم رہنا چاہیئے۔ بقول اکبر ؎

تو وضع پہ اپنی قائم رہ، فطرت کی مگر تحقیر نہ کر
دے پائے نظر کو آزادی، خودبینی کو زنجیر نہ کر

ہندوستان کا اصول کیا ہے؟ یہاں صرف لسانی اصول کی وضاحت ضروری ہے۔ تمام زبانیں برابر ہیں۔ جو بڑی زبانیں ہیں وہ سب قومی زبانیں ہیں۔ لسانی اقلیتوں کے بچوں کی ابتدائی تعلیم ان کی مادری زبان میں دینے کے لئے پوری کوشش کرنا ہر ریاست کا فرض ہے۔ دستور کی دفعہ (الف) ۳۵۰۔ لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی ساتویں رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ اتر پردیش میں جس شرح سے ابتدائی منزل پر تعلیم پانے والوں کی تعداد بڑھی ہے اس کا عکس اقلیتی زبانوں کے بچوں کی تعداد میں نظر نہیں آتا۔ صاف الفاظ میں اس کے معنی یہ ہیں کہ ۸۶ لاکھ کی آبادی کے مشکل سے چار پانچ لاکھ بچے اردو کے ذریعہ ابتدائی تعلیم حاصل کر رہے ہیں حالانکہ یہ تعداد پندرہ بیس لاکھ کے درمیان ہونی چاہیئے تھی۔ اس صورت حال کی ذمہ داری کس پر ہے؟ ریاستی حکومت پر، مرکزی حکومت پر، سرکاری افسروں پر، برسراقتدار پارٹی پر، یا خود اردو والوں پر جو شاید تعلیم سے بہرہ ور ہونا ہی نہیں چاہتے۔

تعلیم کا اصول یہ ہے کہ بچے کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم اس کی مادری زبان میں ہونا چاہیئے۔ اس اصول کو معلم یا ماہر نفسیات اور عالم زبان سبھی تسلیم کرتے ہیں مگر اتر پردیش کی ریاست میں لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی رپورٹ کے مطابق علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے زیر نگرانی تین اسکولوں کو چھوڑ کر ایک بھی اسکول ایسا نہیں جس میں ذریعۂ تعلیم اردو ہو۔ کئی وزیر اعظم سہولتوں کا اعلان کرتے رہے، کئی وزارتیں یقین دہانیاں کرتی رہیں۔ پلیٹ فارم سے اردو کی قومی حیثیت کا بار بار اعتراف ہوتا رہا، مگر ابتدائی تعلیم اردو میں دینے کا تسلی بخش انتظام اب تک نہ ہو سکا۔ ثانوی تعلیم کی منزل پر اتر پردیش میں سہ لسانی فارمولے میں اردو کی پوزیشن مضبوط کرنے کا حال میں اعلان ہوا ہے مگر ثانوی تعلیم کی منزل پر اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے مسئلے پر آج بھی اتر پردیش میں خاموشی ہے جب کہ آندھرا، مہاراشٹر میسور، مغربی بنگال، گجرات، تامل ناڈو میں ہر قسم کی سہولت ہے اور وہاں خاصی بڑی تعداد میں اردو کے ثانوی اسکول ہیں، بلکہ آندھرا میں تو انٹر کالج بھی ہیں اور ڈگری کالج بھی۔ مگر اتر پردیش میں خصوصاً اور ہندی ریاستوں میں عموماً ہنوز روز اول ہے۔ دہلی میں تو پٹھان کی دعوت کا نقشہ ہے یعنی اسکول ہے تو کتابیں نہیں، کتابیں ہیں تو استاد نہیں، استاد ہے تو اس کے لئے ٹائم ٹیبل میں گنجائش نہیں۔ سہ لسانی فارمولے پر عمل میں ایک ستم ظریفی یہ ہے کہ مادری زبان کو اس کا جائز مقام نہیں دیا گیا۔ اتر پردیش کی حکومت آٹھویں شیڈول میں درج تمام زبانوں کی تعلیم تیسری

زبان کی حیثیت سے کاغذ پر دیتی ہے، عملاً اس کے معنی یہ ہیں کہ عام طور پر سنسکرت پڑھائی جائے اور شور و پکار کے بعد کہیں کہیں اردو کا بھی انتظام ہو جائے یعنی

خود اپنے قتل پہ راضی نہ ہوں جو دیوانے
ستم کے ساتھ کچھ افسونِ دلبری بھی رہے

جب لسانی اقلیتوں کے کمشنر کے بار بار توجہ دلانے پر، نہ ریاستی حکومتوں کے کان پر جوں رینگتی ہے نہ مرکزی حکومت اپنا فرض پہچانتی ہے۔ جب ساری یقین دہانیاں بے نتیجہ ثابت ہو چکی ہیں، جب دفتری نظام اوپر کے احکام کو ٹھاٹھ سے نظر انداز کر سکتا ہے جب ایک پارٹی کی حکومت دوسری پارٹی کی حکومت کے فیصلے کو آسانی سے بدل سکتی ہے، جب اردو دوستوں کی قومی اور آئینی جدوجہد کو علٰیحدگی پسندی قرار دیکر جن سنگھ اور اس کے ہم خیال فسادات تک کرا سکتے ہیں جب یشپال اور امرت لال ناگر جیسے روشن خیال اور ترقی پسند اردو کے حقوق کی تحریک میں وہ ذہن سونگھ لیتے ہیں جس نے پاکستان بنوایا، جب اردو دوست دیکھ رہے ہیں کہ ایک پوری نسل مرکزی حکومت کی غفلت اور ہندی ریاستوں کی حکومتوں کی دانستہ تنگ نظری اور اردو کے حقوق سے چشم پوشی کی وجہ سے اپنے آپ کو گونگا اور اپنی شخصیت اور سیرت کو یک رُخا پا رہی ہے، تو اس کے لئے سوائے اس کے کیا چارہ ہے کہ وہ دستور کی دفعہ ۳۴۷ کی دہائی دے جس کی رو سے صدر کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اگر مطمئن ہے کہ کسی ریاست کی معتد بہ یا معقول (Substantial) آبادی یہ چاہتی ہے کہ جو زبان وہ بولتی ہے اسے سرکاری طور پر تسلیم کر لیا جائے تو وہ یہ ہدایت دے سکتا ہے کہ اس زبان کو بھی پوری ریاست میں یا اس کے کسی حصے میں ان اغراض کے لئے جن کی وہ صراحت کرے گا سرکاری طور پر تسلیم کیا جائے گا۔

واضح رہے کہ اس دفعہ میں صرف دو شرطیں ہیں ایک معتد بہ آبادی کی ہے دوسرے صدر کے اطمینان کی کہ اس معتد بہ آبادی کی خواہش ہے کہ اس کی زبان کو سرکاری طور پر تسلیم کر لیا جائے۔ اترپردیش کی ۸۶ لاکھ آبادی اگر معتد بہ نہیں ہے تو معتد بہ کے معنی شاید بدل گئے ہیں اور جہاں تک ان کی خواہش کا سوال ہے، دستخطی مہم سے لے کر آج تک اس آبادی کی خواہش روز روشن کی طرح عیاں ہے۔

اس سلسلے میں یار لوگ ریاستوں کی تنظیم نو کے کمیشن کا حوالہ ضرور دیتے ہیں جس کی رو سے جب تک کسی ریاست کی تیس فی صدی آبادی کسی دوسری زبان کی بولنے والی نہ ہو، اس وقت تک اسے دو لسانی (Bilinqual) نہیں قرار دیا جا سکتا۔ دستور کی دفعہ ۳۴۵ اور دفعہ ۳۴۷ میں ایسی کوئی شرط نہیں ہے۔ پھر ہمارا مطالبہ دوسری سرکاری زبان کا نہیں، اردو کو بھی سرکاری زبان تسلیم کئے جانے کا ہے۔ دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے۔ یوں تو سب زبانیں برابر ہیں لیکن اردو بھی سرکاری زبان تسلیم کرنے کا، مثلاً یہ مطلب نہیں کہ ریاست کے ہر شہری کے لئے اس کا جاننا لازمی ہوگا۔ جتنے ہندی کے لئے استاد رکھے جائیں گے اُتنے ہی اردو کے استاد ہوں گے یا جتنی تعداد میں ہندی گزٹ چھپے گا، اتنی ہی تعداد میں اردو گزٹ چھپے گا۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ریاست میں اردو کے ذریعہ ابتدائی اور ثانوی تعلیم اردو کی لسانی اقلیت کے بچے حاصل کر سکیں گے اور اعلیٰ تعلیم میں آئینی سہولتیں ملیں گی ہر سرکاری دفتر میں اردو میں درخواست لی جا سکے گی اور اردو میں اس کا جواب دیا جا سکے گا۔ ہر سرکاری دفتر میں کم سے کم ایک سرکاری کارکن اردو ضرور جانتا ہوگا۔ ہر اعلان، قانون، قاعدہ، نوٹس اردو میں بھی چھپے گا۔ سڑکوں پر نشانات اردو میں بھی ہوں گے۔ ریاست کی قانون ساز اسمبلی میں اردو میں تقریر ہو سکے گی اور اس کا متن اردو میں ریکارڈ ہو سکے گا۔ ضلع اور تحصیل کے افسروں کے لئے چونکہ اردو جاننا بھی ضروری ہوگا اس لئے ان کو اردو کا کوئی مناسب امتحان ملازمت کے دوران پاس کرنا ہوگا۔ پھر ہر ریاست میں اردو کو بھی سرکاری زبان تسلیم کرنے کا سوال نہیں ہے جہاں تیس لاکھ سے زیادہ آبادی ہے وہاں تسلیم کرنا چاہیئے ہاں دہلی میں اس لئے کہ دہلی اردو کا گھر ہے اور نیک کام گھر سے شروع ہوتا ہے۔

ہمارے کچھ مہربان یہ کہتے ہیں کہ جو سہولتیں آپ چاہتے ہیں وہ سب مل جائیں گی، صرف اردو کو سرکاری زبان تسلیم کرانے پر اصرار نہ کیجئے۔ آخر نام میں کیا دھرا ہے، کام سے غرض ہونی چاہیئے۔ آپ کو آم کھانے سے مطلب ہے کہ پیڑ گننے سے۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ ہمیں نام اور کام، آم اور پیڑ دونوں سے مطلب ہے اور ہمارا تجربہ یہ ہے کہ کتنی ہی نیک نیتی ہو کتنی ہی ہمدردی ہو، موجودہ دفتر شاہی نظام میں جب تک قانونی طور پر اردو کا تحفظ نہیں ہو جاتا، یعنی اسے سرکاری زبان تسلیم نہیں کر لیا جاتا اس وقت تک دراصل یہ سہولتیں جن کا برابر اعادہ کیا جاتا رہا ہے نہ صرف عمل کی دنیا میں مل نہیں پائیں گی بلکہ کم ہوتی جائیں گی۔ سمپورنانند کہتے تھے کہ پچیس سال گزر جانے دو، اردو والوں کا مطالبہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔ خیر اردو والوں کا مطالبہ تو بدستور ہے، اس لئے کہ ان کے حقوق کی پامالی بدستور ہے۔ ہاں ہندوستانی جمہوریت اور سیکولرازم کی آزمائش جاری ہے اور ان سیاسی رہنماؤں کی بھی جو اردو سے ہمدردی کرتے رہتے ہیں۔ مگر اردو کی بقا اور ترقی کے لئے جو راستہ اختیار کرنا چاہیئے اسے اختیار کرتے ڈرتے ہیں۔ ایک ساس نے اپنی بہو کو بہت دبا کر رکھا تھا۔ بہو کا اپنے گھر میں کوئی اختیار نہ تھا۔ اتفاق سے ساس کو کسی شادی میں باہر جانا پڑا۔ اس نے بہو کو گھر کی چابیاں سونپتے ہوئے کہا "لو بہو گھر تمہارے حوالے مگر کوٹھری کٹھلے کو ہاتھ نہ لگانا"۔

ہندوستان بہت بڑا ملک ہے۔ اس کے چلانے والوں کے دل و دماغ بھی بڑے ہونے چاہئیں۔ بہار کو یک رنگ نہ بنانا چاہیئے۔ کثرت میں وحدت کو دیکھنا اور دکھانا ضروری ہے۔ غالب نے صحیح کہا ہے۔ ع

ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے

پروفیسر ضیا احمد بدایونی

خلیق انجم

پروفیسر ضیا احمد بدایونی اردو، عربی اور فارسی کے عالم تھے۔ ان تینوں زبانوں کے کلاسیکی سرمائے پر ان کی غیر معمولی نظر تھی۔ وہ ماہرِ لسانیات نہیں تھے۔ لیکن عربی اور فارسی زبانوں پر غیر معمولی عبور کی وجہ سے انھیں اردو کی کلاسیکی زبان پر بڑی قدرت حاصل ہوگئی تھی۔

"کربل کتھا کا لسانی مطالعہ" کے سلسلے میں مجھے ان سے استفادہ کا موقع ملا ہے۔ کئی الفاظ ایسے تھے جو اردو کی کسی بھی لغت میں نہیں تھے۔ اور فارسی اور عربی کی ڈکشنریوں میں ان کے جو معنی بتلائے گئے تھے وہ عبارتوں کے سیاق و سباق سے مختلف تھے۔ میں قبلہ مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ کسی بھی لفظ کا مفہوم بتلانے میں انھیں دماغ پر قطعی زور نہیں دینا پڑا۔ بعض لفظوں کی پوری تاریخ بھی انھوں نے بیان کی کہ کب وہ لفظ اردو میں داخل ہوا۔ اور کس طرح ان کے مفہوم اور تلفظ میں تبدیلی آئی۔ انھیں فنِ لغت نگاری سے خاص لگاؤ تھا۔ ۱۹۵۸ء میں جب وہ پروفیسر اور صدر شعبہ فارسی (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے تو انجمن ترقی اردو ہند علیگڑھ نے اردو لغت کی ایک اسکیم کی نگرانی کے لئے ان کی خدمات حاصل کرلیں۔ اس کے بعد وہ دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کے تحت کئی جلدوں میں مرتب ہونے والی اردو ہندی لغت کے انچارج ہوگئے۔ اور انھوں نے اس حیثیت سے لگ بھگ آٹھ سال کام کیا۔

اردو میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مومن کو ان کے اصل روپ میں اہلِ اردو سے متعارف کرایا۔ مومن کے مشکل اشعار کی نہ صرف شرح کی ہے بلکہ ان کے کلام کی قدر و قیمت کا صحیح تعین بھی کیا ہے۔ کسی نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ یادگارِ غالب لکھ کر حالی نے غالب پر جو احسان کیا تھا ضیا صاحب نے شرح مومن لکھ کر وہی کچھ مومن کے ساتھ کیا۔ مومن اور غالب کے مشکل اور پیچیدہ اشعار کی شرح میں انھیں خاص ملکہ حاصل تھا۔

ان کے مضامین کے مجموعہ "مباحث و مسائل" کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے خود کو صرف کلاسیکی ادب تک ہی محدود نہیں رکھا تھا بلکہ وہ ادب میں جدید تحریکوں سے نہ صرف بخوبی واقف تھے بلکہ ان کے بارے میں اچھی کھلی رائے رکھتے تھے۔

ادب کے علاوہ اسلامیات ان کا خاص موضوع تھا۔ انھوں نے موضوع پر قولِ سدید، جلوۂ حقیقت اور کیا موجودہ تصوف خالص اسلامی ہے جیسی کتابیں بھی لکھیں۔

ضیا صاحب کی وفات اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں کا ایسا نقصان ہے جس کی تلافی ممکن نہیں۔

جشنِ آزادی

یاضت علی شائق سانکھنوی

بنامِ امنِ عالم پیار کے نغمے سنائیں ہم
غمِ دوراں کو شرمندہ کریں اور مسکرائیں ہم
وطن کی آبرو جیسے بھی ممکن ہو بچائیں ہم
زمیں سے آسمانوں کی حدوں تک پھیل جائیں ہم
چلو اب کے برس یوں جشنِ آزادی منائیں ہم

بجھا دیں دستِ حکمت سے چراغِ بغض و نفرت کو
کریں پھر عام ربطِ باہمی کو، رسمِ اُلفت کو
بدل دیں تفرقہ بازوں کے اندازِ سیاست کو
کبھی اک لفظ بھی تفریق کا لب پر نہ لائیں ہم
چلو اب کے برس یوں جشنِ آزادی منائیں ہم

نہ پھلنے پھولنے دیں ملک میں سرمایہ داری کو
اٹھو اب دور کر دیں مفلسوں کی بے قراری کو
بدل دیں قہقہوں میں بےکسوں کی آہ و زاری کو
برائے آشتی اک دوسرے کا غم بٹائیں ہم
چلو اب کے برس یوں جشنِ آزادی منائیں ہم

مٹا دیں ذہن و دل سے جذبۂ فرقہ پرستی کو
فنا کر دیں زمانے کی ہر اک بے رحم ہستی کو
نہ چلنے دیں بہر صورت خرد کی پیش دستی کو
نرالی شان سے پرچم جنوں کا لہلہائیں ہم
چلو اب کے برس یوں جشنِ آزادی منائیں ہم

رفعت سروش

اور کچھ تیز کرو نغمۂ نَے
اور کچھ تیز کرو رقص کی لَے
اور کچھ اور گلابی چھلکاؤ
اور کچھ اور ستارے برساؤ
جشنِ سیمیں کسی گلنار کا ہے
جشن اک شوخ طرحدار کا ہے
جشنِ آزادئ جمہورِ وطن
جشنِ آزادئ ہر سرو سمن
آج اک شوخ کے ہاتھوں میں ہے بلّور کا جام
تشنہ رہنا ہے حرام
پیتے رہنا ہے مدام
—— تیز کرو نغمۂ نَے
اور کچھ تیز کرو ——
تیز کرو ——
رقص کی لے
نغمۂ و رقص میں تمیزِ من و تو نہ رہے
ایک ہی راگ میں نغمہ جاگے
ایک ہی تال پہ ہر پاؤں اٹھے
چھنچھناتی ہوئی بجلی چمکے
ایک ہے پردۂ ساز
ایک ہی نغمہ ہو اک ہی آواز
سب ہوں ہمراز
سبھی ہوں دمساز
—— تیز کرو نغمۂ نے ——
اور کچھ تیز کرو ——
تیز کرو ——
رقص کی لے
تیز کرو ——
تیز کرو ——

محترمی! اسلام فراواں۔ و۔ خلوصِ بیکراں

آپ کا جریدہ "سیکولر ڈیموکریسی" جو ایک خاص نصب العین کا حامل ہے، ہمیں برابر ملتا ہے۔ خدا آپ کو اصلاحِ قوم کی اس سعی میں کامیاب فرمائے آمین۔

ایک غزل ارسالِ خدمت ہے۔ اگر "سیکولر ڈیموکریسی" کے تازہ شمارے میں شریکِ اشاعت کرلیں تو ممنون ہوں گا

شکریہ

سید مظفر عالم ہاشمی
جنگی قیدی ۳۷۴۴۔ بلاک ۱۲
پی۔ ڈبلو کیمپ ۴۹ معرفت ۵۶ اے پی او

غزل

سید مظفر عالم ہاشمی

یاد کے زخم مرہم بن گئے — اپنے آنسو آج شبنم بن گئے
کل تک تھے جو دشمن اپنے — خوبیٔ قسمت سے ہم دم بن گئے

التفاتِ دوست پاکر ہم نشیں — اس کے دیوانے، ہم بن گئے
مجھ کو تحفہ دیا یہ میری زیست نے — حرف جتنے خوشی کے تھے غم بن گئے

راج کرتے دلوں پہ تو تھی کوئی بات — ایران کے وہ جو جم بن گئے
ہنس کے اس نے بات جو کی — ہم بھی مشقِ ستم بن گئے

کل جن کے سر پہ تھا تاجِ شہی — آج وہ سرنگوں اک علم بن گئے

ہاشمی کی کوئی بات پوچھو نہ تم
وہ تو تصویرِ غم بن گئے

مستقبل روشن ہے

مجیب الرحمن بزمی

ہر طرف ظلم کی آندھیاں جب چلیں
بجھ گیا جھلملا کر چراغِ سحر
دورِ جمہور میں خون بہتا رہا
آدمیت رہتی دھرم کے نام پر

ماں کی عزت پہ اب حرف آنے لگا
پردے اٹھتے ہی جلوے بھی بکنے لگے
گل فروشی تو تھی عام ہر شہر میں
نو شگفتہ شگوفے بھی بکنے لگے

ماما پیٹ کی آگ میں جل گئی
شیر خواروں کو بھی گہری نیند آگئی
سسکیوں کی صدائیں ابھرنے لگیں
سرخ رخسار پر مُردنی چھا گئی

اس سے پہلے کہ پھر فتنہ پرور اُٹھیں
بڑھ کے تم روک دو سرکشوں کے قدم
کوئی بیٹی بھی بیوہ نہ ہو دیش کی
دوستو تم کو انسانیت کی قسم

ہاتھ میں لے کے عزم و عمل کا نشاں
موت سے بڑھ کے پنجہ لڑاتے چلو
اپنے دامن میں آنسو چھپائے ہوئے
رنج میں مسکرانے کے خوگر بنو

دوستو ظلم کی اس کڑی دھوپ میں
مثلِ ابرِ رواں سوئے منزل بڑھو
شہر و بازار سے کھیت کھلیان سے
اپنے حق کی حفاظت کی خاطر اُٹھو

فکرِ دار و رسن بھول کر ساتھیو
نغمۂ حریت تم سناتے چلو
آہنی بیڑیوں کے مدھر ساز پر
گنگناتے چلو گیت گاتے چلو

یہ بجا کہ ہے ہر سو اندھیرا مگر
مشعلِ عزم لے کر بڑھو ساتھیو
ظلم کے خوگروں کو کچلتے ہوئے
نفرتوں کے سمندر کا رُخ موڑ دو

ہم اس وقت پانچویں پنجسالہ پلان کی تفاصیل مرتب کر رہے ہیں۔ مختلف شعبوں میں ملک کو خود کفیل بنانے کے لئے جو کام کرنا باقی ہے، اس پلان کا بڑا مدعا اسے پورا کرنا، ملک کے غریب ترین طبقوں کی سماجی بہبود کے پروگرام کو فروغ دینا، اور پیداوار کی جو صلاحیتیں پہلے ہی وجود میں آ چکی ہیں ان سے پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنا ہے۔ ہمارے سماجی پروگراموں میں بے زمین افراد کے لئے مکانوں کی تعمیر کے لئے جگہ مہیا کرنے، کم بارش کے علاقوں میں چھوٹے کسانوں کے لئے قرضے اور کھیتی باڑی کی ضروری اشیاء فراہم کرنے، گندی بستیوں کے علاقوں میں بہتر مکانات کا انتظام کرنے، مزید دیہات میں بجلی کی سہولتیں مہیا کرنے، پڑھے لکھے بیروزگاروں کے لئے روزگار کی اسکیمیں عمل میں لانے اور فیملی پلاننگ کی طرف زیادہ توجہ دینے کے پروگراموں کو اہمیت دی جائے گی۔

——— اندرا گاندھی

پردھان منتری

خود کفالت

کی طرف بڑھتے قدم



davp 73/347

نفرت کی تاریخ — یا — ماضی کی بیساکھیاں

ہمارے سیاسی مبصر کے قلم سے

پچھلے دنوں صدر پاکستان ذوالفقار علی بھٹو خاصے متضاد بیانات دیتے رہے ہیں۔ افہام و تفہیم کا ذکر کرتے کرتے انھوں نے تصادم کی تلخ اور بے بنیاد باتیں کہی ہیں۔ بیک وقت گرم اور سرد لہجہ اپنانے کے لئے انھیں شہرت حاصل ہے۔ لیکن اس شوق کو پورا کرنے کے لئے تاریخ کے ساتھ کھلواڑ مناسب نہیں۔ تاریخ ماضی کی امانت ہے، اس لئے اس کا تحفظ احترام کا تقاضہ کرتا ہے۔

گزشتہ ۴ جولائی کو اسلام آباد میں امریکہ کی آزادی کی ۱۹۷ ویں سالگرہ کے سلسلے میں امریکی ناظم الامور سڈنی سوبرز کی قیام گاہ پر ایک تقریب سے صدر بھٹو نے محض اس لئے خطاب کیا کہ وہ اپنے دورۂ امریکہ کے لئے مناسب ماحول پیدا کر سکیں۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ دورہ ستمبر کے وسط پر جا لگا۔ اپنی اس تقریر میں صدر بھٹو نے کہا "ہم نے اہم تبدیلیاں دیکھی ہیں۔ چین اور ویت نام سے امریکہ نے بات چیت کی۔ یورپ میں مصالحت کی فضا پیدا ہو رہی ہے۔ برصغیر میں بھی محاذ آرائی ختم کرنے کے لئے بات چیت ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں کیونکہ برصغیر میں تصادم کی تاریخ ایک ہزار برس پرانی ہے۔"

صدر بھٹو تاریخی حقائق سے اس قدر انجان تو نہ ہوں گے کہ انھیں نصف صدی ہزار برس کی لگے۔ اگر واقعی ایسا ہے تو بدقسمتی کی بات ہے اور اگر جان بوجھ کر وہ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے تاریخ کو مسخ کر رہے ہیں تو یہ اور بھی بدقسمتی کی بات ہے خصوصاً اس لئے کہ یہ کوشش چھ کروڑ پاکستانیوں اور چھپن کروڑ ہندوستانیوں کے درمیان آگ کی دیوار کھڑی کر رہی ہے۔ بات اس تقریب ہی تک رہتی تو ٹھیک تھا۔

درحقیقت اس تقریر کو صدر بھٹو نے دو دھاری تلوار کے طور پر استعمال کیا۔ ایک طرف امریکہ کی خوشامد کرنے کے لئے اسے امن پسند بنا دیا اور دوسری طرف برصغیر ہند کو ہزار سالہ میدانِ جنگ قرار دیا۔ امریکہ کی وہ جس قدر خوشامد کرنا چاہیں، انھیں مبارک۔ لیکن اس سرزمین کی فضاؤں میں جہاں مختلف مذاہب کے پیروکار اور مختلف الخیال لوگ صدیوں خلوص و محبت سے ساتھ ساتھ جئے مرے، کیوں زہر گھول رہے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس دھرتی کو ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنے لہو سے سینچا ہے۔ اس ناقابل تردید حقیقت کے باوجود صدر بھٹو نے جھوٹ کو تاریخ کا درجہ دینے کی کوشش کیوں کی؟ نفرت اور تشدد کو پاکستان کی بنیاد سمجھ کر ماضی میں بھی پاکستان کے چند عناصر اس قسم کا جھوٹ پھیلاتے رہے ہیں۔ لیکن صدر بھٹو اب ایک ذمہ دار حیثیت کے مالک ہیں اس لئے اب انھیں اس قسم کی باتیں کرنا زیب نہیں دیتا۔

واشنگٹن پوسٹ کے لیوس سائمنز کو دیئے گئے ایک انٹرویو میں زبردستی خود کو اور پاکستانی عوام کو ماضی کے حملہ آوروں سے وابستہ کرنے کی کوشش میں صدر بھٹو نے دھمکی آمیز رویہ اپنایا "بنگلہ دیش میں ہندوستان کا جنگ جیت جانا تاریخ کی بوالعجبی کے سوا کچھ نہیں۔ ہندوستان اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ پاکستان سے دوسری جنگ بھی جیت لے گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر کوئی شخص یہ بات بھولتا ہے کہ شمال کے پہاڑی علاقوں سے دہلی کے میدانوں پر دھاوے ہوتے رہے ہیں تو وہ اپنے لئے خطرات کو دعوت دے رہا ہے اور خسارے میں رہے گا۔ مغل بار بار ہندوؤں کو روندتے رہے ہیں۔" اسی انٹرویو میں صدر بھٹو نے کہا "سقوطِ ڈھاکہ ہندوستان کے زوال کی ابتدا ہے۔"

تصادم پسندی کے نشے میں صدر بھٹو یہ مضحکہ خیز باتیں کہہ گئے اور ۹ جولائی کی رات پاکستان قومی اسمبلی کے اجلاس میں وہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا اختیار حاصل کرنے کی خاطر اپنی گھنٹہ بھر لمبی تقریر میں یہاں تک کہہ گئے "میں بنگلہ دیش کو اس لئے تسلیم کرنا چاہتا ہوں کہ اسے ہندوستان کے ہندو غلبہ سے بچایا جا سکے" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اسی تقریر میں انھوں نے یہ بھی کہا "ہندوستان کو امن سے خطرہ ہے۔ ہندوستانی جانتے ہیں کہ وہ پاکستان دشمنی کے ذریعے ہی ہندوستان کو یکجا رکھ سکتے ہیں۔"

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر صدر بھٹو یہ تلخ اور نفرت آمیز رویہ نہ اپناتے تو کیا ان کی قومی اسمبلی انھیں بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے اختیار سے محروم رکھتی؟ قومی اسمبلی میں ان کی پارٹی کی زبردست اکثریت ہے۔ متحدہ جمہوری محاذ میں شامل بیشتر جماعتوں کو بھی اب یہ احساس ہو گیا ہے کہ پاکستان کے لئے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنا اب ناگزیر ہو گیا ہے۔ پاکستانی عوام بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے حق میں ہو چلے ہیں۔ ان حقائق کے پیش نظر نفرت کا یہ زہر کیوں؟

اس سوال کا جواب روزنامہ نوائے وقت کے ۱۰ جولائی کے اداریے میں سہواً آ گیا ہے "تحریک پاکستان میں عملی طور پر حصہ نہ لینے کے باوجود صدر بھٹو جذباتی طور پر خود کو اس تحریک کے ساتھ وابستہ سمجھتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ذاتی طور پر بھارت کے ساتھ کنفرنٹیشن یعنی محاذ آرائی کا نعرہ بلند کر کے اعلانِ تاشقند کے خلاف میدان جذب اختلاف میں کود پڑے تھے۔ ہزار سال جنگ کا ذکر عام کر کے اقتدار پر قابض ہوئے تھے۔" صدر بھٹو کو دو لفظ بہت عزیز ہیں "تصادم" اور "ہزار سال"۔ تصادم اس لئے کہ وہ فطری طور پر جذباتی واقع ہوئے ہیں اور جذبات میں اگر تصادم تو کیا بعض ایسی باتیں کہہ جاتے

اگ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

وقت کی قیمت

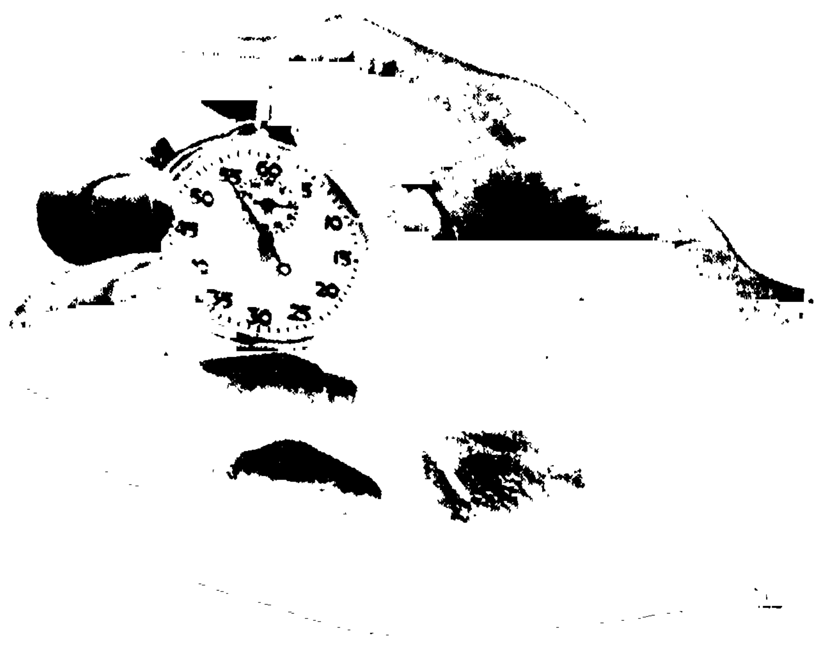
آج کے بیوپار میں

سب سے زیادہ ہے

وقت کے ساتھ ساتھ ہم نے آرڈر ملنے اور مال سپلائی کرنے کا وقفہ بہت کم کر دیا ہے۔ ایم۔ایم۔ٹی۔سی کو اس بات کا فخر ہے کہ اس نے دیش کی صنعتی ترقی میں اہم اور آسانی سے دستیاب نہ ہونے والی معدنیات جیسے تانبہ جست، سیسہ، ٹِن، نِکل، المونیم، پلیڈیم، پلاٹنیم، سٹین لیس اسٹیل وغیرہ امپورٹ کر کے اور سپلائی کر کے بہت اہم کامیابی حاصل کی ہے۔ ایم۔ایم۔ٹی۔سی کے ذریعہ اکسپورٹ میں بھی بہت ترقی ہوئی ہے۔ وزاگاپٹنم اور پرادیپ جیسی بڑی بندرگاہوں کو میکانکی بنایا گیا ہے۔ جس سے غیر ملکی گاہکوں کو معدنیات جلدی اور زیادہ تعداد میں سپلائی ہو سکا ہے۔

دی۔ایم۔ایم۔ٹی۔سی

ایکسپریس بلڈنگ، بہادر شاہ ظفر مارگ، نئی دہلی



ہیں کہ کیا کہا جائے۔ اور "ہزار سال" سے انھیں اس لئے رغبت ہے کہ اس سے چھوٹا ہندسہ انھیں کچھ جچتا نہیں۔ ویسے ۹ جولائی کی شب کو انھوں نے قومی اسمبلی سے خود کہا "معاہدہ شملہ کے بعد امید کے ساتھ ساتھ خدشات بھی موجود تھے۔ ان خدشات کی بنیاد گزشتہ ۲۵ برس کے حالات ہیں"۔

صدر بھٹو کا بس چلے تو پاکستان کی عمر بھی ہزار سال قرار دیں۔ البتہ وہ اتنا ضرور کرتے ہیں کہ وہ پاکستانی قوم کی عمر ہزار سال ثابت کرنے کے لئے اس کا رشتہ ہند میں اسلام کی آمد سے جوڑتے ہیں۔ صدر بھٹو برصغیر کی تاریخ کو اس حد تک مسخ کر رہے ہیں کہ وہ ہند میں اسلام کی تاریخ کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مسلسل تصادم سے تعبیر کرتے ہیں۔

۲۶ برس ہو گئے پاکستان قائم ہوئے۔ گو ہند کے عوام نے اسے خلوص دل سے قبول کر لیا ہے لیکن وہ اس حقیقت سے بھی بخوبی واقف ہیں کہ پاکستان کی بنیادوں میں نفرت اور تشدد کے خونی پتھر ہیں۔ ہند کے عوام نے قیام پاکستان کو قبول کرتے وقت یہ امید کی تھی کہ انگریزوں نے اپنا اقتدار برقرار رکھنے کے لئے نفرت کے جو بیج بوئے تھے وہ بے جان ہو کے رہ جائیں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا نفرت کے بیوپاریوں نے انگریزوں کی پیدا کردہ ہندو مسلم نفاق کی دال کو طول دینا شروع کر دیا۔ "ہزار سالہ تصادم" اسی کی اُپج ہے۔ صدر بھٹو اپنے دل میں یہ جانتے ہیں کہ اگر کوئی ان سے اس تصادم کی کوئی مثال گزشتہ صدی میں سے پیش کرنے کے لئے کہے تو وہ ڈھونڈتے رہ جائیں گے اور کچھ بھی ہاتھ نہ آئے گا۔ کیا وہ اس حقیقت کو جھٹلا سکیں گے کہ آخری مغل کے اقتدار کی شمع روشن رکھنے کے لئے مسلمانوں کے شانہ بشانہ ہندوؤں نے بھی اپنے خون کا نذرانہ دیا تھا؟

بیسویں صدی ہی کو لے لیں۔ برصغیر کی جنگ آزادی کی تاریخ سے تو صدر بھٹو بے بہرہ نہ ہوں گے۔ اس کے اوراق شہیدوں کی لازوال قربانیوں کے احوال سے بھرے پڑے ہیں۔ ان میں ہندو بھی تھے، مسلمان بھی۔ تصادم کے نشان بھٹو جیسے ذہنوں کی پیداوار ہیں اور یہ نشان سُلگتے بھی وہیں ہیں۔ عجب ستم ہے کہ جن لوگوں نے اور جن کے آباواجداد حصولِ آزادی کے لئے تنکا بھی نہ توڑا، آج آزادی کے بعد برصغیر کی پیشانی کو تصادم اور نفرت کی سیاہیوں سے پوتنے کے درپے ہیں جس ہندو مسلم نفاق کو صدر بھٹو اپنی اور پاکستان کی طاقت تصور کرتے ہیں، اس کی عمر ۵۰ برس سے زیادہ کسی طور نہیں ہو سکتی اور اس کا خالق ہے انگریز سامراج۔ اسی دور میں بدیسی اقتدار برقرار رکھنے کے لئے تعلیم کا ایک ایسا نظام شروع کیا جس کے ذریعے ہندوؤں اور مسلمانوں کے دوران ثقافتی تفرقات کے بیج بوئے گئے جو وقت اور ماحول سازگار ہونے کی وجہ سے پنپے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو برطانوی سامراج کے ایجنٹ ایک دوسرے کے خلاف بھڑکاتے رہے۔ لیکن جنگ آزادی کے جذبۂ اتحاد کے زور میں برطانوی سامراجیوں نے گھبرا کر نئی چال چلی۔ ہندوؤں سے کہا گیا کہ تمہیں ہزار برس سے غلام بنا کر رکھا گیا ہے اور مسلمانوں کو یہ کہہ کر اکسانے لگے کہ ہند پر حکومت کرنے کا حق تمہیں کو ہے اور یہ حق تمہیں کسی حالت میں نہیں چھوڑنا چاہیئے۔

ہو سکتا ہے کہ صدر بھٹو یہ سوچ کر خوش ہو رہے ہوں کہ انھوں نے 'ہزار سالہ' تصادم کے نرالے خیال کی کھوج کی ہے۔ کاش، کوئی انھیں بتائے کہ یہ خیال تو برطانوی سامراجی ذہن میں پیدا ہوا اور خود اس خیال کے جنم سے اس صدی کا آغاز ہوا۔ اس مانگے تانگے خیال کو اپنانے کی بجائے اس کی پرکھ کرنے کی ضرورت تھی، لیکن نفرت کا محاذ کھڑا کرنے والوں کو تو یہ خیال راس آگیا، انھیں اس کی پرکھ سے کیا مطلب؟ انھیں تو اپنے مفادات سے مطلب تھا۔

کراچی کے ممتاز ہفت روزہ "اخبار جہاں" میں اس کے مدیر جناب محمود شام اپنے ۲۱ روزہ دورۂ ہند کے بارے میں بلا اقساط لکھتے رہے ہیں۔ اس کا ردعمل قارئین کے خطوط کی شکل میں اخبار جہاں میں چھپتا رہا ہے۔ ۱۱ جولائی کے شمارے میں دو خطوط چھپے ہیں جو موضوع بحث سے متعلق ہیں۔

"آپ کے سیاسی تجزیئے اور لسانی و تہذیبی مسائل پر اظہارِ خیال سے تو یہ ثابت ہوا کہ امیر خسرو اور میر و غالب، حافظ و خیام کے مقابلے میں ہمارے زیادہ قریب ہیں۔ اگر ہندوستان ہمارا بدترین دشمن ہے تو وہی ہمارا بہترین دوست بھی بن سکتا ہے۔ دل سا دوست نہ دل سا دشمن"۔ (منظور احمد۔ لاہور)

دوسرا خط زیادہ اہم ہے "ہندوستان سے ہمارے جو سیاسی اختلافات ہیں وہ سامنے کی بات ہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم کبھی ان اختلافات کو ختم کرنے کی کوشش بھی کریں گے یا ہمیشہ ایک دوسرے کو مجروح کرنے پر ہی تُلے رہیں گے۔ کتنے دکھ کی بات ہے کہ ایک ایسے دور میں جب کہ مشرقی اور مغربی جرمنی بہتر تعلقات کے لئے مذاکرات کر رہے ہیں، چین اور جاپان نے اپنے برسوں پرانے جھگڑے بُھلا دیئے ہیں، دوسری طرف امریکہ اور روس اور چین اور امریکہ جیسے جانی دشمن صلح، امن، بین الاقوامی دوستی اور بھائی چارے کی بات کر رہے ہیں، عین اسی وقت ہم محاذ آرائی کی خواہش رکھتے ہیں اور اپنی جنگی تیاریوں کا ذکر کر کے خوش ہوتے ہیں"۔

کراچی کی زاہدہ حِنا بے سود کشیدگی کا ذکر کرتے ہوئے مزید لکھتی ہیں "ہم ۲۶ برس سے ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہیں۔ آخر اس سے ہمیں کیا فائدہ پہنچا؟ اگر انسانی جانوں کا زیاں، املاک کی تباہی اور انسانی اقدار کی پامالی ہماری کمائی ہے تو پھر یقیناً پاکستان بہت فائدے میں ہے۔ لیکن اگر معاملہ اس کے برعکس ہے تو پھر ہمیں سوچنا چاہیئے کہ ہمارا جنگی جنون آخر کار ہمیں کہاں لے جائے گا۔ لال قلعے پر سبز ہلالی پرچم لہرانے کی آرزو یا جامع مسجد میں نماز پڑھنے کے خواب ہمیں زمین کی کن گہرائیوں میں دفن کر دیں گے؟"

ہندو سامراج کا ہوّا!

صدر بھٹو کی طرف سے گمراہ کن پروپیگنڈے

اتر پردیش میں اردو کی تیز رفتار ترقی

موجودہ ریاستی حکومت کی جانب سے زبردست سہولتیں

اردو جسے دستورِ ہند میں ایک قومی زبان کا درجہ حاصل ہے، ہمارے ملک خاص طور سے ہماری ریاست اتر پردیش کی اہم اور مقبولِ عام زبان ہے۔ یہ کسی ایک فرقے یا مذہب کی زبان نہیں۔ اس کے چمن کی آبیاری میں سب برابر کے شریک اور حصے دار ہیں۔ اتر پردیش کی موجودہ ریاستی حکومت نے اس کے پھلنے پھولنے اور اس کی ترقی و توسیع کے لئے متعدد اہم اور دور رس اقدامات کئے ہیں۔

پرائمری سطح پر

- جولائی ۱۹۷۳ء سے ریاست کے تمام شہری علاقوں کے ہر پرائمری اسکول میں اردو پڑھنے کی سہولت۔
- اس مقصد کے لئے تقریباً چار ہزار اردو ٹیچروں کی تقرری کا فیصلہ۔
- اگر کسی پرائمری اسکول میں فی الحال اردو پڑھنے والے بچے نہ بھی ہوں تب بھی اُس اسکول میں کم سے کم ایک اردو ٹیچر کا انتظام ہوگا۔
- تمام تسلیم شدہ اردو میڈیم اسکولوں اور مکتبوں کو مالی امداد دینے کا بندوبست
- ٹریننگ اسکولوں میں اردو کی استعداد رکھنے والے امیدواروں کو داخلے میں سہولت۔
- اردو کے ٹرینڈ ٹیچر نہ ملنے پر ان ٹرینڈ اردو ٹیچروں کی تقرری کا فیصلہ
- کوئی ان ٹرینڈ اردو ٹیچر اوپر کے احکامات کے بغیر ملازمت سے علیحدہ نہیں کیا جائے گا۔
- ٹیچروں کو اردو پڑھنے کی جانب زیادہ سے زیادہ متوجہ کرنے کے لئے ترغیبی الاؤنس جاری رکھنے کا فیصلہ۔
- نئے اردو میڈیم اسکول قائم کرنے کی کوششوں کی یقین دہانی۔

ثانوی سطح پر

- جونیئر اور ہائر سکنڈری اسکولوں میں سہ لسانی فارمولے کے تحت اردو پڑھنے کا بندوبست۔
- ہر گورنمنٹ ہائر سکنڈری اسکول میں سہ لسانی فارمولے کے تحت اردو کی تعلیم کے لئے ایک اردو ٹیچر کی تقرری۔
- تسلیم شدہ ہائر سکنڈری اسکولوں میں بھی سہ لسانی فارمولے کے تحت اردو کی تعلیم کا بندوبست کئے جانے کے احکامات۔

ڈپٹی ڈائرکٹر (اردو)

- اردو کی تعلیم، اس کی دیکھ بھال اور ترقی کی رفتار کو تیز کرنے کے لئے ڈپٹی ڈائرکٹر (اردو) کی تقرری۔

ڈگری سطح پر

- بجنور، میرٹھ، سہارنپور، مظفر نگر، پیلی بھیت، بریلی، مرادآباد، رامپور وغیرہ کے ضلعوں میں ایک ایک ڈگری کالج کو ڈگری کلاسوں میں اردو پڑھانے کے لئے آئندہ تعلیمی سال سے مالی امداد دینے کا فیصلہ۔
- یونیورسٹیوں کے علاوہ ان سے الحاق شدہ ڈگری کالجوں میں بھی اردو کی تعلیم کی سہولت مہیا کرنے کے لئے کاروائی۔
- تمام گورنمنٹ کالجوں میں گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ کی سطح پر اردو کی تعلیم کا بندوبست۔

اردو اکاڈمی

- اردو زبان کے تحفظ اور اردو ادب کی ترقی کے لئے ملک بھر میں سب سے پہلے ریاست اتر پردیش میں اردو اکاڈمی کا قیام۔
- اکاڈمی کے قیام سے ریاست میں اردو زبان و ادب کا مستقبل روشن۔
- اردو ادیبوں، شاعروں، لائبریریوں اور مطالعہ گھروں کو اکاڈمی کی جانب سے اب تک پانچ لاکھ روپے کے انعامات و مالی امداد۔

عدالتوں اور سرکاری کاموں میں اردو کے لئے سہولت

- تمام ضلع افسران کو اردو میں لکھی ہوئی درخواستیں قبول کرنے کے تحت احکامات۔
- ان احکامات کی خلاف ورزی کرنے والے افسران کے خلاف تادیبی کاروائی کی جائے گی۔
- دیوانی ملازمتوں کے لئے اردو کا امتحان بھی پاس کرنا ضروری۔
- اہم قوانین، قواعد اور سرکاری اعلانات اور فہرست رائے دہندگان کی اردو میں بھی اشاعت۔
- ہندی کی طرح اردو اخبارات کو بھی سہولتیں۔

اردو ہماری، آپ کی، سب کی زبان ہے

اس کی خدمت کرنا اور ترقی دینا ہمارا فریضہ ہے

محکمہ اطلاعات، اتر پردیش کی جانب سے جاری کیا گیا

کے ذریعے ہند کو ہندو ملک بنا کر پیش کیا جا رہا ہے ہو سکتا ہے کہ پاکستانی عوام اس کا کچھ اثر بھی قبول کریں کیونکہ وہ بے چارے شاید نہ جانتے ہوں کہ جتنے مسلمان پورے پاکستان میں ہیں اس سے زیادہ مسلمان اس ہندوستان میں ہیں کہ جسے بھٹو حکومت ہندو ملک کہہ رہی ہے۔ اتنا حوصلہ نہ صدر بھٹو میں ہے اور نہ ان کی حکومت میں کہ وہ اس ملک کو سیکولر کہہ سکیں، کیونکہ لفظ سیکولر کو وہ اسلامی مملکت کے لئے قاتل سمجھتے ہیں۔ پاکستان کی اسلامی جمہوریہ کی بقا وہ ہندو پڑوسی میں دیکھتے ہیں لیکن سیکولر دوست اسے راس نہیں آئے گا کیونکہ سیکولر نظام میں مذہبی جنون اور نفرت کا کوئی مقام نہیں، تو پھر پاکستان میں نفرت کی آگ جلائے رکھنا کیونکر ممکن ہوگا۔

بدلہ کا جنون

صدر بھٹو کے "ہزار سالہ تصادم" کی تشہیر و تبلیغ کرنے والے ہند کو ہندو ملک کہنے پر اکتفا نہیں کرتے۔ پاکستانی عوام کی نظر میں اسے سامراجی ہوّا بنا کر ان کی توجہ اصل مسائل سے ہٹاتے ہیں۔ آئے دن ریڈیو پاکستان سے یہی نشر ہوتا ہے "ہند پورے برصغیر پر ہندو سامراج قائم کرنے اور مکروہ چالوں کے ذریعے اپنے پڑوسیوں کی آزادی ہڑپنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ ہند کے جارحانہ رویئے کی وجہ سے برصغیر کا امن مسلسل خطرے کی زد میں ہے"۔۔۔۔ "برطانیہ نے سمندر پر اپنا اثر قائم کر کے پورے برصغیر کو غلام بنا لیا تھا۔ ہند بھی برطانوی سامراج کی چال چل رہا ہے۔ لیکن وہ بھول رہا ہے کہ نو آبادیاتی دور کب کا ختم ہو گیا۔"

نہ صرف یہ کہ ہند کو غلط رنگ میں پیش کیا جا رہا ہے بلکہ تصادم کے رجحان کو تقویت دینے کے لئے گزشتہ جنگ میں ہوئی شکست کا بدلہ لینے کی ہوا بندی جا رہی ہے۔ ۱۵ر جولائی کو لاہور کے پروگرام "تلقین شاہ" میں پاکستانی عوام سے بدلہ لینے کے عہد کے ساتھ ساتھ یہ عہد بھی کرایا گیا کہ وہ کم از کم تین برس پوری لگن سے تیاری کریں تاکہ ہند سے بدلہ لے سکیں۔

شملہ کے عہد و پیمان کیا ہوئے؟

شملہ سمجھوتے کے بعد تصادم اور محاذ آرائی کی باتیں کچھ دھیمی پڑ گئی تھیں، لیکن جب خود صدر پاکستان شملہ میں کئے گئے عہد و پیمان بھلا کر ٹکراؤ کی باتیں کریں گے تو تصادم پرست وہ ماحول پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے جس میں نفرت کا بول بالا رہے خواہ ایسا کرنے میں عوام پر قیامت ٹوٹتی رہے۔ گزشتہ تصادم کے نتائج سے سبق سیکھنے کی بجائے نئے تصادم کی راہ پیدا کرنے کی حمایت کی جا رہی ہے۔ پاکستانی تصادم پرست پرایک ستم اور ڈھا رہے ہیں۔ خواہ مخواہ یہ تاثر پیدا کیا جا رہا ہے کہ ہند پاکستان پر اپنا غلبہ رکھنا چاہتا ہے۔ مسز گاندھی اور سردار سورن سنگھ نے بار بار کہا ہے کہ ہند اپنے مسائل سے نپٹنے میں اس قدر مصروف ہے کہ اسے ان بے کار مشغلوں کے لئے فرصت ہی نہیں۔ اس کے باوجود پاکستانی پروپیگنڈہ ایجنسیاں یہ واویلا کئے جا رہی ہیں کہ ہند پاکستان پر اپنی سرداری تھوپنا چاہتا ہے۔

بہت دنوں کے بعد صدر بھٹو کو "ہزار سالہ تصادم" کی یاد آئی ہے لیکن جولائی ۱۹۷۳ء میں اس یاد سے وہ جس قدر بے چین ہوئے ہیں پہلے نہ ہوئے ہوں گے۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ اس ماہ صدر بھٹو نے ہند کے خلاف جو تلخ کلامی کی ہے ریڈیو پاکستان نے اس کے بارے میں خاموشی اختیار کئے رکھی کہیں کہیں اخباروں میں مختصراً اس کا ذکر ضرور ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ "ہزار سالہ تصادم" کا ذکر پاکستانی ذہنوں کے لئے ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اتنے مہینے معقول رویہ اپنانے کے بعد یکلخت صدر بھٹو نے یہ رخ کیوں اختیار کیا ہے؟ کیا ہند کے خلاف اس تلخ کلامی کا مقصد پاکستانی فوج کو پست ہمتی کی غار سے نکال کر اس کا اعتماد حاصل کرنا ہے کیا یہ لہجہ اپنا کر وہ اپوزیشن کے روایتی ہند دشمن عناصر کی حمایت حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ اپنے ملک کی کسی بھی اندرونی مجبوری کے باعث انھیں ایسا کرنا پڑا ہو۔ بہرحال صدر بھٹو کے ہند کے خلاف یہ نفرت آمیز کلمات قابلِ صد افسوس ہیں۔ ان کی وجہ سے برصغیر کے حالات معمول پر لانے میں دشواریاں بڑھیں گی۔

اپنی "ہزار سالہ تصادم" کی تھیوری کے چکر میں صدر بھٹو نے مغل حملوں کا ذکر جس فخر سے کیا ہے اس سے لگتا ہے کہ وہ اپنا یا اپنی قوم کے عناصر کا خون کا رشتہ مغلوں کے ساتھ جڑا سمجھتے ہیں۔ پہلی بات یہ کہ یہ تصور ساقط دور کا ہے اب اسے کوئی پوچھتا نہیں۔ دوسرے صدر بھٹو اور پاکستانی عوام سرزمین ہند کے ہی پالے ہوئے ہیں۔ زبردستی خود پر بوسیدہ درآمدی لیبل چسپاں کرنا طاقت یا عظمت کی نشانی نہیں بلکہ کمزوری اور احساسِ کمتری کی نشانی ہے آج کا سیکولر ہند عہدِ وسطٰی کے بٹے بٹے برصغیر کے مقابلہ میں کہیں زیادہ طاقتور ہے۔ ہند کو خوش فہمیوں سے بچنے کا مشورہ دینے سے پہلے صدر بھٹو کو خود اس مشورے پر عمل کرنا چاہیئے۔ اگر وہ ماضی کی محبت میں عہدِ حاضر کے حقائق کو بھلا بیٹھے تو وہ اپنے لئے خطرات کو دعوت دیں گے اور خسارے میں رہیں گے۔"

عہدِ حاضر نئے چراغوں کا متقاضی

پاکستانی عوام اگر زاہدہ حنا کے ان الفاظ کی حقیقت کا احترام کر سکیں تو نئے دور کا آغاز ہو سکتا ہے "کاش پاکستان میں شریمتی سبھدرا جی اور ڈاکٹر ستیش کمار جیسے باشعور اور انسان دوست سامنے آئیں اور عوام الناس کو یہ بتائیں کہ دیواروں پر "بھارت کچل دو" اور اسی نوعیت کے دوسرے نعرے لکھنے سے نہ تو بھارت صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گا اور نہ ہی ہمارے یہاں موجود بھوک، بیروزگاری، جہالت اور افلاس جیسے مسائل حل ہو سکیں گے۔ دونوں ملکوں میں ایسے لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہو جو دوستی اور محبت کے چراغ جلائے رکھیں کہ چراغ سے چراغ جلتا ہے۔"

ان الفاظ کی اٹل سچائی اگر صدر بھٹو پر بھی عیاں ہو سکے تو انھیں "ہزار سالہ تصادم" کے جھوٹے سہاروں اور ماضی کی بیساکھیوں کی ضرورت نہ رہے گی۔

SPECIAL REGISTRATION

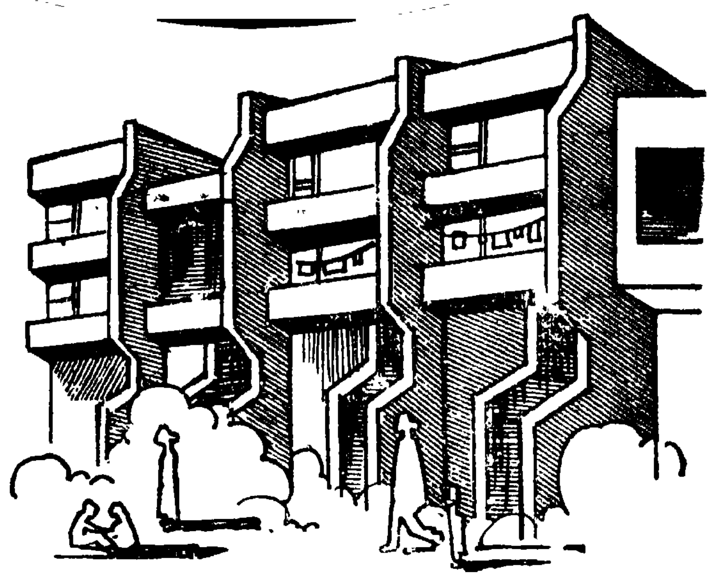
for

THE PERSONS BELONGING TO THE SCHEDULED CASTES/SCHEDULED TRIBES

for

janta, low and middle income group flats.

Registration FROM 23rd JULY, 1973



- THE DELHI DEVELOPMENT AUTHORITY is happy to announce a SPECIAL SCHEME for the individuals belonging to the SCHEDULED CASTES AND SCHEDULED TRIBES who fall in the Janta, Low and Middle Income Groups. The registration of the scheme would COMMENCE ON 23rd JULY, 1973 and will CLOSE ON THE 31st AUGUST, 1973. The main terms and conditions of allotment of houses under the scheme are as follows :—
- The persons belonging to JANTA INCOME GROUP will have to deposit Rs. 100/- as registration fee, while those belonging to the LOW INCOME GROUP will have to deposit Rs.1500/- and those belonging to the Midd'? Income Group Rs. 2500/-.
- The Middle Income Group will comprise those whose income is between Rs. 7,201/- and Rs. 18,000/-. The Low Income Group will comprise those with annual income of Rs. 7,200/- or less and the Janta category will be exclusively reserved for those whose annual income is less than Rs. 3,000/-.
- Whereas the design and cost will vary from locality to locality, the general idea about the type of accommodation that would be available in different income groups can be had by visiting the model houses in the following colonies :—

LOCALITY	INCOME GROUP
Wazirpur, Janakpuri	Middle Income Group
Lawrence Road and under construction houses at Wazirpur, Rajouri Garden Janakpuri and Kalkaji	Low Income Group
Madangir and Madipur	Janta Group

- The houses would be constructed on group housing basis in the newly developed colonies of the Delhi Development Authority. The endeavour is to build simple, inexpensive, functionally utilitarian and aesthetically satisfying houses
- This is a SPECIAL OPPORTUNITY that is being given to members of the SCHEDULED CASTES AND SCHEDULED TRIBES to secure a suitable accommodation for themselves in neat and clean environments. For detailed provisions of the scheme a brochure has been published by the Delhi Development Authority and this may be purchased from the Form Sales Counter of the Delhi Development Authority in D Block, Delhi Vikas Bhawan, Indraprastha Estate, New Delhi on payment of Re. 1/- per brochure. THE TIMINGS OF SALE OF BROCHURES WILL BE BETWEEN 10.00 A.M. and 4.00 P.M. ON ALL WORKING DAYS.

JAGMOHAN
VICE-CHAIRMAN

DELHI Development Authority

بقیہ صفحہ ۱۲: مسلم لیگ کا نظریہ اور کردار

کے لئے بیتاب نظر آتی ہے کیونکہ اس طرح مسلم عوام کو غیر مسلم رہ نماؤں سے متنفر کیا جاسکتا ہے۔

کیرالا کی مخلوط حکومت میں ایک شریک کی حیثیت سے مسلم لیگ کی شرکت سے صاف ظاہر ہے کہ اسے پارلیمانی جمہوریت کے اصولوں کو اپنانے میں نہ تو دلچسپی ہے اور نہ ایسا کوئی ارادہ ہے۔ حکومت میں لیگی نمائندے پارٹی کے سامنے تو جوابدہ ہیں لیکن قانون ساز ادارے یا کابینہ کے سامنے نہیں۔

مسلم لیگ تو غیر ذمہ دارانہ انداز عمل اپنا سکتی ہے جب کہ بڑی پارٹیاں اپنی کارکردگی میں سمجھوتے کی راہ اپنانے ہوئے جھجکتی ہیں۔ اسی لئے مسلم لیگ اور ترقی پسند جمہوری پارٹیوں کے درمیان تصادم ناگزیر ہے۔ اس کا ثبوت کیرالا کے تیرور کے میونسپل انتخابات میں ملا تھا۔ ان انتخابات میں کانگریس نے مسلم لیگ کے خلاف مارکسسٹ کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ سمجھوتہ کیا تھا۔ ان دونوں پارٹیوں نے کل ملا کر آٹھ نشستیں حاصل کیں جب کہ مسلم لیگ کو پندرہ اور جن سنگھ کو ایک نشست ملی۔ فرقہ واریت کے خلاف اصولوں پر مبنی کھلا حملہ ہی نتیجہ خیز ہوسکتا ہے۔ اس سلسلے میں بنگال میں ۱۹۷۱ء کے صوبائی اسمبلی کے انتخابات کی بھی یاد آتی ہے جن میں سیاسی میدان سے مسلم لیگ کا سرے سے صفایا ہوگیا تھا۔

اس تمام بحث سے یہ صاف ظاہر ہے کہ مسلم لیگ کی سیاست میں ابھی تک پختگی نہیں آسکی۔ صرف مسلم لیگ ہی نہیں بلکہ مسلم فرقہ وارانہ سیاست ایک عبوری دور سے گزر رہی ہے۔ کیونکہ نظریاتی اعتبار سے مسلم لیگ کمیونزم مخالف رجحانات کا شکار ہے اور سیاسی اعتبار سے یہ کانگریس کی ترقی پسند پالیسیوں سے دور ہوتی جارہی ہے جیسا کہ کیرالا میں ہو رہا ہے۔

مسلم ووٹروں کا سیاسی شعور قابل صد مبارکباد ہے کہ جس کی وجہ سے تامل ناڈو میں مسلم لیگ کا ڈی۔ ایم۔ کے کے ساتھ نکاح چند روزہ ثابت ہوا اور بنگال میں تو اس کا وجود ہی ناپید ہوگیا ہے۔ اس اعتبار سے اتر پردیش کے انتخابات انتہائی اہم ہیں۔ مسلم لیگ کا مستقبل اس کی غیر اہم مسئلوں پر مسلم حمایت حاصل کرنے کی اہلیت پر منحصر ہے۔ آزادی سے پہلے لیگ یہی کرتی رہی ہے۔ یہ فرض قوم پرست سیاسی جماعتوں پر عائد ہوتا ہے کہ وہ قومی مفادات کی خاطر اس قسم کی سیاسی بے راہ روی کا پردہ فاش کریں۔

بقیہ صفحہ ۱۸: جن سنگھ کی خوش فہمی

پچھڑے طبقوں میں بہت کمزور پڑگئی ہے۔ مئی ۱۹۷۲ء میں پارٹی کی جنرل کونسل کا اجلاس غالباً اس جماعت میں گہری پھوٹ پڑنے کا آغاز تھا۔ پارٹی کے بڑے رہ نما اپنے گناہوں کے لئے شاید پہلی بار بلراج مدھوک کو ذمہ دار گردانے کے لئے کوئی معقول وجہ تلاش نہ کرسکے۔ مئی ۱۹۷۲ء سے جولائی ۱۹۷۳ء (بھیلی اجلاس) تک اس جماعت کے سربراہ کسی عوام مقبول پالیسی کے تلاش میں کوشاں رہے۔ اس دور کی یہی اہمیت ہے۔

جن سنگھ کے اس رویئے کے لئے مبصرین کچھ خارجی عناصر کو بھی ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ ان کے خیال میں بنگلہ دیش کی تحریک کے دوران امریکہ کے اس طرز عمل اور جن سنگھ کے اس اعلان میں کہ ۳۰۔۴۰ صوبے قائم کئے جائیں کچھ نہ کچھ تعلق ضرور موجود ہے اس سلسلے میں بہاری بچاؤ تحریک کا ذکر بھی برمحل ہے۔

یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ بھیلی کے اجلاس میں پالیسی کا اعلان آر۔ایس۔ایس سرسنگھ چالک گرو گولوالکر کی وفات کے بعد کیا گیا۔ اور ان کی وفات کے موقعہ پر جن سنگھ کے چوٹی کے رہ نما اور آر۔ایس۔ایس کے سب ذمہ دار ممبران ناگپور میں جمع ہوئے تھے۔ جہاں کہ ان کے مابین مذاکرات اور گفت وشنید کا ایک لمبا سلسلہ چلا تھا۔

جن سنگھ کے نئے صدر ایل۔کے۔اڈوانی نے پارٹی کے طریق عمل کی وضاحت مندرجہ ذیل الفاظ میں کی ہے:-

"اندرا گاندھی کی حکومت میں عوام کا اعتماد ختم ہوچکا ہے اور اس طرح ایک سیاسی خلا پیدا ہوگیا ہے ہر طرف مایوسی کا ایک ماحول موجود ہے اور اس خلا کو پُر نہ کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔"

اسی موقعہ پر جن سنگھ کے ممبران سے اپیل کی گئی کہ وہ اس وقت اپنے کام کا ثبوت دیں۔ اس کے ساتھ دوسری بات یہ کہی گئی ہے کانگریس کے بعد ملک گیر سطح پر جو جماعت اس کی جگہ حاصل کرسکتی ہے وہ جن سنگھ ہی ہے کیونکہ کسی اور جماعت کی تنظیم اس قدر اچھی نہیں ہے تیسری صلاح یہ دی گئی کہ تمام مخالف پارٹیوں کا مل کر ایک ہو جانا نیک خیال ضرور ہے لیکن عمل نہیں ہے صرف خاص خاص مسائل پر دوسری جماعتوں کے ساتھ اتحاد کیا جاسکتا ہے اور اپنے اثر کو لگاتار وسعت دی جا سکتی ہے

لیکن ان سب باتوں کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ جن سنگھ نے اپنے فرقہ وارانہ رویہ میں کوئی تبدیلی کی ہے۔ وندے ماترم کے سوال پر بمبئی کارپوریشن کے انتخابات میں کامیابی پر پارٹی نے اپنے ممبران کو مبارکباد دی ہے دراصل اس جماعت کی رائے میں اندرا حکومت کو مخالفت کا شکار بنانا چاہیئے لیکن پوری کانگریس جماعت کی مخالفت ایک صحیح پالیسی نہیں ہے۔

ملک میں اناج کے تھوک بیوپار پر کنٹرول کے بعد جن سنگھ کے رہ نماؤں نے اپنا کام زیادہ جوش وخروش کے ساتھ شروع کردیا ہے کیونکہ ان کا خیال ہے کہ تجارت کرنے والا پورا طبقہ کانگریس مخالف ہوگیا ہے اور اب اس کی جڑیں ہل جائیں گی۔

گو کہ جن سنگھ کو آج بھی اس بات کا مکمل یقین نہیں ہے کہ اس کی پالیسی کامیاب ہوجائے گی لیکن اس نے فیصلہ کرلیا ہے کہ وہ اس پر عمل کرے گا۔

قومی ایکتا ٹرسٹ کی تین اہم کتابیں

اردو میں بنگلہ دیش پر یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جو اخباری یا کتابی مطالعے پر نہیں بلکہ عینی مشاہدے پر مبنی ہے۔ یہ ایک ایسے مصنف کے تاثرات ہیں، جو بنگلہ دیش کے مسائل پر گہری نظر رکھتا ہے۔

بنگلہ دیش میں بارہ دن

(عتیق صدیقی)

حال ہی میں عتیق صدیقی بنگلہ دیش گئے تھے۔ اور دو ہفتے قیام کرکے وہاں کے حالات کا انھوں نے غائر مطالعہ کیا۔ بنگلہ دیش کے وزیروں اور لیڈروں ہی سے نہیں، عام لوگوں سے بھی انھوں نے ملاقاتیں کیں اور جو کچھ دیکھا یا سنا اُسے نہایت دلکش انداز میں بے کم و کاست قلم بند کر دیا۔ مصنف کے مکالماتی انداز بیان نے اس رپورتاژ کو آج کے بنگلہ دیش کی جیتی جاگتی تصویر بنا دیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اردو کے بہترین رپورتاژوں میں اس کا شمار ہوگا۔ طباعت آفسٹ۔

متحدہ قومیت اور اسلام

مولانا حسین احمد مدنی

تحریک آزادی کے پیچھے جو ایک خیال اور جذبہ کارفرما تھا وہ یہ تھا کہ ہندوستان کے تمام باشندے بلا لحاظ مذہب و ملت ایک قوم ہیں جن کو اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کا حق ہے۔

اس تحریک اور جدوجہد کے دوران ایک جذبۂ یک جہتی و قومیت پیدا ہوا۔ انگریز کے حواریوں نے اس کے خلاف جذبات بھڑکانے کی کوشش کی۔ راشٹریہ سویم سیوک سنگھ اور ہندو مہاسبھا نے تحریک شروع کی کہ ہندوستان کی قومیت ہندو قومیت ہی ہو سکتی ہے۔ جو ہندو نہیں وہ اس ملک کا شہری یا قوم پرست نہیں ہو سکتا۔ اس کے مقابلے میں مسلمانوں میں تحریکیں شروع ہوئیں جنھوں نے کہنا شروع کیا کہ مسلمان تو کسی ایسی قومیت کا حصہ ہو ہی نہیں سکتے جس میں غیر مسلم بھی شامل ہوں۔ مسلم لیگ نے اعلان کیا کہ مسلمان علیحدہ قوم ہیں اس لئے مسلمانوں کے لئے الگ ملک بننا چاہیئے۔

مسلم لیگ کے علاوہ ایک دوسرا خیال جماعت اسلامی نے پھیلایا کہ مسلمان تو کسی بھی قومیت سے متعلق نہیں ہو سکتے۔ انھوں نے مسلمانوں کو سمجھانا شروع کیا کہ قومیت کا تصور ہی غیر اسلامی ہے اور مغرب کی پیداوار ہے۔ اسی طرح جمہوریت بھی غیر اسلامی نقطۂ نظر ہے مسلمانوں کو ان سے الگ رہنا چاہیئے

یہ خیالات ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے لئے بھی خطرناک تھے اور تمام ملک کے لئے بھی ضرر رساں۔ اس بات کو بہت سے مسلم قائدین نے سمجھا اور مسلمانوں کو صحیح صورت حال سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔ ان میں مولانا حسین احمد مدنی پیش پیش تھے۔ اس مسئلے پر انھوں نے متحدہ قومیت اور اسلام کے نام سے ایک کتابچہ لکھا ہے جو پچھلے پچیس تیس سال سے نایاب تھا۔ افادیت کے پیش نظر اسے دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔ صفحات ۷۸، طباعت آفسٹ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔

جلتا شہر کراہتی راتیں

اظہار اثر

ایک شہر .... جو تاریکیوں اور گناہوں کے آغوش میں سسک رہا تھا......!

ایک شہر، جس کے آسمان پر عسکری سیاست کی دھند چھائی ہوئی تھی۔

ایک دنیا ..... جو، آگ اور خون کے در و دیوار میں جینے والوں کی حسرتیں سمیٹے ہوئے سُلگ رہی تھی

جسموں کی عریانی اور سنسناتی ہوئی گولیوں کے درمیان ...... بھڑکنے والے ان شعلوں کی پراسرار داستان

.... جو شہر اور کراہتی راتوں کی ہزاروں داستانوں کو چھپائے ہوئے تھے

اسرار، ہیبت اور عصری سیاسی شعور سے بھرپور ایک جاسوسی ناول جسے [illegible] نے پراسرار ناولوں کے ایک نئے تجربے کی صورت میں تخلیق کیا ہے۔

صفحات ۱۲۸، طباعت آفسٹ، قیمت ڈھائی روپے

۱۵۔ بلونت رائے مہتہ لین نئی دہلی

ہندوستانی فلموں کا پیغامِ محبّت

ظہیر ناصر

پاکستان کی ۲۶ سالہ زندگی میں چاہے بانیٔ پاکستان محمد علی جناح کا دورِ حکومت رہا ہو یا یحییٰ خاں کی ڈکٹیٹر شپ کا زمانہ، پاکستان کے حکمرانوں نے چاہے ہندوستان سے ہزار سالہ جنگ کی باتیں کی ہوں یا شملہ معاہدے پر دستخط کئے ہوں۔ ہر دور میں ہندوستانی فلموں، ہندوستانی فلموں کے اداکار و اداکاراؤں اور ہندوستانی فلموں کے گیتوں نے پاکستان میں اپنی اہمیت کا لوہا ضرور منوایا ہے۔

پاکستان کے حکمرانوں نے ہندوستانی دشمنی میں چاہے کتنی نظیریں پیش کی ہوں لیکن پاکستانی عوام نے ہندوستانی فلموں کو ہمیشہ سراہا ہے۔ ہر پاکستانی چاہے وہ حکومت کا اعلیٰ رکن ہو یا ادنیٰ باشندہ، ہمیشہ ہندوستانی فلمیں دیکھنے کا خواہش مند نظر آیا ہندوستانی فلموں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا اس کی کمزوری رہی۔ یہ بات صرف شہریوں ہی تک محدود نہ رہی بلکہ پاکستان کی مسلح افواج پر بھی صادق آتی ہے جسے ہندوستان دشمنی کی تربیت دے کر غیر ملکی اسلحہ سے لیس کیا گیا ہے۔

مثال کے طور پر پچھلے دنوں ملک کے کئی روز ناموں میں ایک خبر اس سرخی کے ساتھ شائع ہوئی۔

"پاکستانی فوجیوں نے "پاکیزہ" دیکھی اور ہندوستانی فوج کا شکریہ ادا کیا"

اس خبر کے مطابق کشمیر کے کسی سرحدی مقام پر ہندوستانی فوجیوں کو کمال امروہوی کی فلم پاکیزہ دکھائی جا رہی تھی۔ رات کے اندھیرے میں جیسے ہی اسکرین پر فلم شروع ہوئی پاکستانی سرحدوں پر تعینات فوجیوں نے ہندوستانی فوج کے افسران سے فلم دیکھنے کی درخواست کی۔ درخواست کو منظور کرتے ہوئے ہندوستانی فوج کے افسران نے پردۂ فلم کا رخ پاکستانی سرحدوں پر کر دیا، اور اس طرح پاکستانی فوجیوں نے ہندوستانی فلم دیکھی اور فلم شو کے بعد ہندوستانی فوجیوں کا اتنی خوب صورت فلم دکھانے پر شکریہ ادا کیا۔" اخباری صفحات پر اس خبر نے کوئی نمایاں جگہ پائی ہو یا نہیں لیکن اس خبر کے پس منظر میں جو حقائق سامنے آئے ہیں وہ اس بات کی علامت ہیں کہ نفرت اور جنگ کی باتیں کرنے والے اور اسے عملی جامہ پہنانے والے بھی ہندوستانی فلموں کی خوبصورتی اور حسن کے شیدائی ہیں۔ اسی طرح کمال امروہی نے پچھلی جنگ کے بعد ہندوستانی فوجیوں کے لئے پاکیزہ کا ایک خصوصی پرنٹ جنرل مانک شاہ کو پیش کیا۔ مانک شاہ نے فلم کی اہمیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے (پاکیزہ کی کہانی مسلم معاشرے کی عکاسی کرتی ہے) اسے ان پاکستانی جنگی قیدیوں کے لئے دیدیا جو ہندوستان میں مقیم ہیں۔ کمال امروہی نے اس بات کا برا مانا کہ میں نے یہ پرنٹ ہندوستانی فوجیوں کے لئے دیا تھا نہ کہ پاکستانی جنگی قیدیوں کے لئے۔ لیکن مانک شاہ نے ایک خط کے ذریعہ کمال امروہی کو بتایا کہ ہمارے فوجی تو پاکیزہ بہر حال میں دیکھ لیں گے لیکن پاکستان کے جنگی قیدیوں کو یہ فلم دکھانا از حد ضروری ہے لہٰذا میں نے جو قدم اٹھایا ہے وہ سوچ سمجھ کر اٹھایا ہے۔

یہی صورت شملہ کانفرنس کے دوران نظر آئی ہندوستانی حکومت نے پاکستانی وفد کو دکھانے کے لئے پانچ ہندوستانی فلموں کا انتخاب کیا جن میں مرزا غالب، مغلِ اعظم، صاحب بی بی اور غلام، چودھویں کا چاند، اور پاکیزہ وغیرہ شامل تھیں۔ پاکستانی وفد نے خصوصی شو میں یہ فلمیں دیکھیں اور بے حد پسند کیں۔ پاکستانی وفد میں طارق عزیز بھی شامل تھے جو پاکستانی فلموں کے جانے پہچانے اداکار ہیں۔ پاکستان واپس جانے پر طارق عزیز نے کئی مضامین لکھے جن میں ہندوستانی فلموں کی تعریف کی۔ طارق عزیز نے پاکستانی فلم سازوں کو مشورہ دیا کہ وہ ہندوستانی فلموں کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے نئے راستے اپنائیں، قدامت پسندی کا جوا اُتار پھینکیں۔ طارق عزیز نے پاکستانی فلم سازوں کو ہندوستانی فلم سازوں کی تکنیک استعمال کرنے کا مشورہ دیا اور اداکاروں کو حقیقت پر مبنی اداکاری پیش کرنے کی تلقین کی تھی۔ موصوف نے مرحومہ مینا کماری کی پاکیزہ اور صاحب بی بی اور غلام میں اعلیٰ پایہ کی کردار نگاری کی بے حد تعریف کی تھی۔

طارق عزیز کے علاوہ روزنامہ "نوائے وقت کے ایک کالم نویس نے جو شملہ کانفرنس کے دوران ہندوستان آئے تھے، پاکستان جا کر ہندوستانی سفر اور قیام کے تاثرات قلمبند کئے ہیں جنھیں نوائے وقت' میں قسط وار شائع کیا گیا تھا۔ کالم نویس نے یوں تو ہندوستان کے معاشرے، ادب اور صنعت پر سیر حاصل تبصرہ کیا تھا لیکن فلموں پر تبصرہ لکھتے وقت ان کے قلم نے بے حد سچائی کا مظاہرہ کیا تھا۔ کالم نویس

نے پاکیزہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "ہمیں قیام شملہ کے دوران کئی فلمیں دکھائی گئیں جو بہترین فلمیں تھیں لیکن "پاکیزہ" کا تو جواب ہی نہ تھا۔ اتنی خوبصورت اور حسین فلم دیکھ کر ذہن کو آسودگی نصیب ہوئی۔ اگر پاکیزہ کی نمائش ہمارے ملک میں ہو تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جن سینما گھروں میں اس کی نمائش ہو ان کی دیواروں میں لوگوں کے اژدہام سے دیواروں میں شگاف پڑ جائیں۔"

پاکستانی وفد کے ارکان نے شملہ کانفرنس کے دوران نہ صرف ہندوستانی فلمیں دیکھیں بلکہ ہندوستانی فلموں کے ریکارڈز کی اس حد تک خریداری کی کہ شملہ کے دکانداروں کے پاس اسٹاک ختم ہو گیا۔ وفد کے ایک رکن نے خاص طور پر پنڈت روی شنکر کے ریکارڈز خریدے۔ اور اس خریداری کے دوران ایک دلچسپ واقعہ بھی پیش آیا ایک دکاندار نے پاکستانی خریداروں کو جب "ہرے راما ہرے کرشنا" کا مشہور زمانہ ریکارڈ "دم مارو دم مٹ جائے غم، بولو صبح و شام ہرے کرشنا ہرے رام" سنایا تو خریداروں نے اس ریکارڈ کی خریداری پر جھجک محسوس کی لیکن جیسے جیسے ریکارڈ بجتا گیا خریداروں کی دلچسپی بھی بڑھتی گئی اور آخر کار یہ ریکارڈ بھی خرید لیا گیا۔

شملہ معاہدے کے بعد کئی ہندوستانی صحافی پاکستان کے دورے پر گئے۔ پریس ایشیا انٹرنیشنل کے روحِ رواں ظفر پیامی بھی خیر سگالی کے دورے پر پاکستان گئے تھے۔ ظفر پیامی نے پاکستان کی مقتدر شخصیتوں سے ملاقاتیں کیں، مختلف شہروں کا دورہ کیا۔ اور اپنے دورے کے تاثرات قلمبند کئے۔ ماہنامہ شبستان میں اپنے دورۂ پاکستان کے تاثرات بیان کرتے ہوئے ظفر پیامی نے ہندوستانی فلموں کی مقبولیت کا خصوصی طور پر تذکرہ کیا۔ بقول ظفر پیامی "آج بھی پاکستانی ہندوستانی فلمیں دیکھنے کے بے حد آرزومند رہتے ہیں پاکستانی آج بھی دلیپ کمار، وجینتی مالا، کامنی کوشل اور اشوک کمار کے فن کے اسیر ہیں۔ پاکستانیوں کو اس وقت بڑی حیرت ہوئی جب انھیں معلوم ہوا کہ وجینتی مالا فلموں کو خیرباد کہہ چکی ہے۔" ظفر پیامی نے ہندوستانی فلمی رسائل کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ ظفر پیامی لکھتے ہیں کہ "ماہنامہ شمع پاکستان میں بے حد مقبول ہے اور اسے کابل اور عرب ریاستوں سے اسمگل کر کے لایا جاتا ہے جہاں اسے پانچ چھ روپے فی کاپی فروخت کیا جاتا ہے۔"

بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ ہندوستانی فلموں کی پاکستان میں مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ پاکستان کے بیشتر فلم ساز ہندوستانی فلموں کے چربے بنا کر خوب دولت کماتے ہیں کہانیوں، گیتوں، اور موسیقی کی ہو بہو نقل کر لی جاتی ہے اور جب ایسی فلم کی نمائش ہوتی ہے تو کامیابی سے ہمکنار ہوتی ہے ایسی فلمیں بنانے والے فلم ساز کابل جا کر ہندوستانی فلمیں دیکھتے ہیں اور اپنے ساتھ فلمی ادیب بھی لے جاتے ہیں جو فلم کی نمائش کے دوران کہانی سمجھتے رہتے ہیں یا ایسے موقعے پر ٹیپ ریکارڈ کا سہارا لیا جاتا ہے جس میں فلم کا مکمل ڈرامہ ٹیپ کر لیا جاتا ہے اور پھر پاکستان آ کر اس کا پوسٹ مارٹم کر کے اسے پاکستانی بنا دیا جاتا ہے۔

پاکستان کے ہر شہر کے چائے خانوں میں گیت سننے کا رواج ہے اور ان گیتوں میں اکثریت ہندوستانی فلموں کے گیتوں کی ہوتی ہے۔ ہر ٹیکسی میں ریکارڈ پلیئر لگا ہوا ہوتا ہے جس پر ہندوستانی گیت بجائے جاتے ہیں لوگ ایسی ٹیکسیوں میں بیٹھنا پسند نہیں کرتے جن میں ایسا انتظام نہ ہو۔ گذشتہ دنوں پاکستانی اخباروں نے اس بات پر بڑا واویلا مچایا تھا کہ ہندوستانی فلموں کی چوری چھپے نمائش کی جاتی ہے۔ اس خبر کے مطابق کچھ ہندوستانی فلمیں اسمگل کر کے پاکستان پہنچی تھیں جن کی آدھی رات کو خصوصی شو میں نمائش کی جاتی تھی اور فلم دیکھنے والوں سے کم از کم پچیس روپے لئے جاتے تھے۔

ایوب خاں کے بعد حکومت پاکستان نے ہندوستانی فلمیں درآمد کرنے کا دوبارہ فیصلہ کیا تھا (جو ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد بند ہو گئی تھیں) حکومت کے اس فیصلہ پر عوام تو خوش تھے لیکن پاکستانی فلمی صنعت بوکھلا گئی۔ لاہور سے فلمی لوگوں کا ایک قافلہ اسلام آباد پہنچا اور حکومت پاکستان کو اس فیصلے سے باز رہنے کی اپیل کی گئی۔ دراصل ہندوستانی فلمیں ہمیشہ پاکستانی صنعت فلم کے لئے خطرہ بنی رہی ہیں۔ جس زمانے میں پاکستان میں ہندوستانی فلموں کی باقاعدہ نمائش ہوتی تھی وہاں کے عوام پاکستانی فلموں پر ہندوستانی فلموں کو ترجیح دیتے تھے۔ راقم الحروف آج سے سولہ سال پہلے پاکستان گیا تھا اسے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی تھی کہ کراچی جیسے بڑے شہر میں ہندوستانی فلم "بھائی بھائی" ایک ہی سینما پر (جوبلی) مسلسل دو سال سے دکھائی جا رہی تھی اور اس وقت بھی لوگ اس فلم کو اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے آج ہی ریلیز ہوئی ہے۔ جب کہ ایک پاکستانی فلم دیکھنے کے دوران ایک عجب تجربہ ہوا کہ وہاں بکنگ خالی اور ہال کی نصف سے زائد سیٹیں خالی پڑی تھیں، جب کہ ان سینما گھروں پر پبلک ٹوٹی پڑ رہی تھی جہاں ہندوستانی فلموں کی نمائش ہو رہی تھی۔ راقم الحروف نے کراچی میں متعدد دکانوں پر دلیپ کمار کی رنگین تصویریں آویزاں دیکھیں اور جب بھی کسی کو معلوم ہوتا کہ میں ہندوستانی ہوں تو وہ نئی فلموں کے بارے میں بات کرتا۔ اس زمانے میں دلیپ کمار کی "مسافر" اور گرودت کی "پیاسا" کے گیتوں نے پاکستانیوں پر جادو کر رکھا تھا۔ راقم الحروف کو یہ دیکھ کر بھی بڑی حیرت ہوئی تھی کہ پاکستان میں "بناکا گیت مالا" کا پروگرام بڑی دلچسپی سے سنا جاتا ہے۔ اس پروگرام میں ہندوستانی فلموں کے ہفتہ کے بہترین اور مقبول گیت بجائے جاتے ہیں۔ لوگ اپنے کاموں سے فارغ ہو کر ریڈیو کے گرد بیٹھ جاتے اور ہندوستانی گیتوں سے لطف اندوز ہوتے اور آج بھی وہی حال ہے۔ شادی بیاہ یا کسی خاص تقریب کے موقعوں پر لاؤڈ اسپیکر پر گیت بجائے جاتے ہیں جن میں ہندوستانی گیتوں کی کثرت ہوتی ہے۔ پاکستانی فلمی رسائل اور اخبارات ہندوستانی فلموں اور اداکاروں پر آج بھی مضامین شائع کرتے ہیں۔ ہندوستان کی پرانی

ہے کہ مکمل ڈرامے مع تصویروں کے شائع کرنے والے باقاعدہ اخبارات کی اشاعت بھی زیادہ ہے۔ یہ بات انھیں پاکستانیوں پر صادق نہیں آتی جو پاکستان میں رہتے ہیں بلکہ وہ پاکستانی جو دنیا کے بیشتر ملکوں میں مقیم ہیں اور جہاں ہندوستانی فلموں کی باقاعدہ نمائش ہوتی ہے وہاں بھی پاکستانیوں کی ایک بڑی اکثریت ہندوستانی فلمیں شوق سے دیکھتی ہے۔ لندن میں تو پاکستانی باشندے ہندوستانی فلمیں بڑے چاؤ سے دیکھتے ہیں۔ بنگلہ دیش مہم کے زمانے میں کچھ پاکستانیوں نے اپنے اہل ملک کو ہندوستانی فلموں کے بائیکاٹ کرنے کی اپیل بھی کی تھی اور خاص طور پر ان ہندوستانی اداکاروں کی فلموں کے بائیکاٹ کی اپیل کی گئی تھی جنھوں نے عملی اور اخلاقی طور پر بنگلہ دیش کے مفاد کے لئے کام کیا تھا ان ہندوستانی اداکاروں میں دلیپ کمار، وحیدہ رحمٰن، سنیل دت اور نرگس وغیرہ شامل تھے۔ لیکن بائیکاٹ کی اس اپیل کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوسکا۔ پاکستانی اس وقت بھی ہندوستانی فلمیں دیکھتے رہے اور آج بھی دیکھ رہے ہیں۔ لندن سے شائع ہونے والا فلمی ماہنامہ "تصویر" ایک پاکستانی باشندے کی ملکیت تھا جو باقاعدگی سے ہندوستانی فلموں کا تذکرہ کرتا تھا بلکہ جریدے کا نصف حصہ ہندوستانی فلموں پر مشتمل ہوتا تھا۔ ہندوستانی فلموں نے نہ صرف مغربی پاکستان پر اپنی مقبولیت کا سکّہ جمایا بلکہ سابقہ مشرقی پاکستان (حال بنگلہ دیش) میں ایک فلمی میلے کے دوران ستیہ جیت رے کی شہرۂ آفاق فلم "پاتھیر پنچالی" کی نمائش ہوئی تھی ہزاروں کی تعداد میں لوگ سینما گھر پر ٹوٹ پڑے تھے جنھوں نے فلم دیکھی تھی وہ خوش نصیب قرار دیئے گئے تھے۔

پاکستانی صنعت فلم سازی ہندوستانی فلموں کی مقبولیت اور اس کے اداکاروں کی شہرت سے اتنی متاثر ہے کہ کئی پاکستانی اداکار ہندوستان کے بڑے اداکاروں کے ناموں سے پکارے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر اداکار ندیم کو پاکستانی دلیپ کمار اور کمال کو پاکستانی راج کپور کہا جاتا ہے اور شمیم آرا پاکستانی مینا کماری کے نام سے مشہور رہے۔

پنجاب میں ٹی۔ وی۔ اسٹیشن قائم ہونے کے بعد اہل لاہور ہر ہفتہ ایک ہندوستانی فلم دیکھ لیتے ہیں اور اپنی خوش قسمتی پر ناز کرتے ہیں۔

پاکستان کے اہل سیاست منافرت، دشمنی اور جہاد کی کتنی باتیں کیوں نہ کریں وہ پاکستانی عوام کے دلوں سے ہندوستانی فلموں کی محبت ختم نہیں کر سکتے۔ اس امر کا ثبوت اس بات سے مل سکتا ہے کہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان تین جنگیں لڑی جا چکی ہیں لیکن پاکستانی عوام آج بھی ہندوستانی فلموں کی گرویدہ ہے اور مستقبل میں بھی ہندوستانی فلمیں اپنا پیغام محبت پاکستانی عوام تک پہنچاتی رہیں گی۔

چلو آواز دیں

سلمان رضوی

چلو آواز دیں اس خون کے پر ہول جنگل سے
تھکن، بھوک اور بے کاری کے
اس ویران صحرا سے
کرپشن، چور بازاری و رشوت کے نگر
اور
گناہوں سے بھری ناپاک بستی سے
پھر ان پیغمبروں کو
جو
صداقت، امن، اخوّت اور صلح و آشتی کے زندہ سورج تھے
(چلو آواز دیں عیسیٰؑ کو گوتم کو محمدؐ کو)
چلو آواز دیں اس کربلا کے شاہزادے کو
کہ جس نے راہِ حق میں زندگی قربان کردی تھی
چلو آواز دیں اس رام کو جس کی شجاعت نے
اندھیرے کے پجاری راونوں کا خون بہایا تھا
۔چلو آواز دیں مریم کے اس پاکیزہ بیٹے کو
کہ جس نے ساری دنیا کو اخوّت کی سنہری روشنی بخشی
چلو آواز دیں فاراں کے اس تابندہ سورج کو
کہ جس کی ذات اک مہر درخشاں تھی زمانے میں
چلو آواز دیں چشتیؒ کو نانک اور کاکیؒ کو
جنھوں نے ایک رہنے کا دیا درس اہلِ عالم کو
چلو آواز دیں لنکن کو گاندھی اور لینن کو
کہ جن کی رفعت عزم و عمل نے
نسلِ آدم کو
سیہ راتوں کا سینہ چیر کر صبحِ درخشاں سے شناسائی کی ہمت دی
چلو آواز دیں دنیا کے ان سب ناخداؤں کو
کہ جن کی زندگی اک جگمگاتا چاند تھی
مہرِ درخشاں تھی زمانے میں
پھر اس کے بعد یہ دیکھیں کہ اس پر ہول جنگل اور اس ویران صحرا
اندھیروں کے تسلّط کو مٹانے کون آتا ہے
چراغِ زندگی کی لَو بڑھانے کون آتا ہے

مُردے کو دفنا دو!

راج گل

مترجم: سبینت رندھاوا

اس کو بالکل احساس نہ تھا کہ اکثر اس کی آنکھیں دروازے پر لگی رہتی تھیں اور ہر آنے والے کا جائزہ لیتی رہتی تھیں اور پھر اس کا جائزہ لینے کے بعد اس پر سے ہٹ جاتی تھیں اور یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہتا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے سے اسپتال کا عملہ، یڈکراس کے لوگ، سوشل ورکر، پبلک کے لوگ اور بڑے بڑے لوگ گزرتے رہتے۔ اس کی آنکھیں ان سب کو دیکھتیں۔ لیکن اس کی توجہ کو ان میں سے کوئی بھی اپنی طرف نہ کھینچ پاتا۔ اور اب تو یہ حالت ہو گئی تھی کہ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ہی وہ آنے والے کے قدموں کی چاپ ہی سے اس کی شخصیت معلوم کر لیتا تھا۔ ان کے جوتوں کی آواز، بات کرنے کا ڈھنگ، ان کے قدموں کی چاپ، جن میں سے کچھ تیز ہوتے اور کچھ نپے تلے اور با قاعدہ ہوتے۔ وہ یہ پتہ چلا لیتا کہ کمرے میں آنے والا کوئی ڈاکٹر ہے، سوشل ورکر ہے یا کوئی نرس۔ لیکن اس کے باوجود اسے ان سے کوئی دل چسپی نہ تھی۔

اس کی آنکھیں اس مسلسل پہرہ داری سے تھکتی نہ تھیں۔ اس کو اور کوئی کام بھی نہ تھا سوائے اس کے کہ بستر پر تکئے کا سہارا لئے پڑا رہے اور دروازے کو تکتا رہے۔ اس طرح اس کے ذہن کو ایک آس سی لگی رہتی۔ اور جنگ کی بھیانک یادیں بھی اس سے دور رہتیں جنگ جس کے دوران وہ خود زخمی ہو گیا تھا اور اس کا دوست کیپٹن کیشیپ مارا گیا تھا اور دوسرے ہزاروں لوگ موت کی نیند سو گئے تھے۔ جب کبھی اسے اس المناک حادثہ کی یاد آجاتی، اس کے سارے وجود میں ایک جلتی ہوئی تیز لہر دوڑ جاتی۔

کیشیپ جو بے چارہ ڈیوٹی پر بھی نہ تھا۔ وہ دشمن کی چوکیوں پر جو سہ پہر سے پہلے تھیں آٹھ گھنٹے کی گولہ باری کی اپنی ڈیوٹی پوری کر کے اب فرصت میں تھا، لیکن اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ نیند کے لئے اس نے بہتیرے جتن کئے، خط لکھنے لگا، کتاب اٹھا کر پڑھی، خیالی بھیڑوں کی گنتی بھی کی، لیکن اسے کسی طرح نیند نہ آئی۔ آخر اس نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنے بنکر Bunker سے نکل اپنے دوست کیپٹن چوپڑہ کے پاس چلے جائے جو توپخانے کی چوکی پر ڈیوٹی پر تھا۔ اس وقت دونوں طرف کی توپیں خاموش تھیں لیکن آگ اور خون کا یہ کھیل کسی لمحے بھی شروع ہو سکتا تھا۔

"کیشیپ، تم اس وقت یہاں کیسے؟" چوپڑہ نے پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔

"مجھے نیند نہیں آرہی ہے۔" کیشیپ نے تھکے انداز میں کہا۔

"کیسی باتیں کرتے ہو، یار؟ میں تو کمبھ کرن کی طرح سو سال تک سو سکتا ہوں۔" چوپڑہ نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

"تو پھر سو کیوں نہیں جاتے؟"

"سو جاؤں تاکہ دشمن مجھے اپنی گولیوں سے بھسم کر دے۔" چوپڑہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میرا مطلب یہ نہیں تھا پیارے! میں یہ کہہ رہا تھا کہ تم میرے بنکر پر جا کر گھنٹہ دو گھنٹہ سو رہو، میں یہاں تمہاری جگہ سنبھال لوں گا۔"

"پاگل تو نہیں ہو گئے ہو!"

"میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں، چوپڑہ! اس طرح شاید میرا بھی سونے کا موڈ بن جائے۔"

ذرا دیر دونوں میں دوستانہ ردو قدح ہوتی رہی۔ اس کے بعد چوپڑہ اس بات پر راضی ہو گیا کہ کیشیپ کو توپ خانے پر چھوڑ کر تھوڑی دیر اس کے بنکر پر جا کر سو جائے۔

ابھی چوپڑہ مشکل سے بیس قدم چلا ہوگا کہ گولہ باری پھر شروع ہو گئی۔ اپنی طرف آتی ہوئی ایک گولی کی سنسناہٹ سن کر اس نے اپنے آپ کو زمین پر گرا دیا۔ دوسری ہی لمحے اسے ایسا محسوس ہوا جیسے ہزاروں زنگ آلود کیلیں اس کے جسم میں گھس گئی ہوں اور اس کا سینہ کسی ایسے ٹین کی طرح ہو گیا تھا جو آدھا کنکریوں سے بھرا ہوا ہو۔ گولہ باری ایک گھنٹے تک جاری رہی۔ اس کے ہوش و حواس قائم رہے۔ اس کو صرف ایک ہی خیال تھا اور وہ یہ کہ کسی طرح رینگتا ہوا توپ خانے کی چوکی تک پہنچ جائے جو مشکل سے بیس قدم پر تھی۔ بیس قدم کا یہ فاصلہ اس نے انتہائی تکلیف اور کرب کے عالم میں پندرہ منٹ میں طے کیا۔ چوکی کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ چوکی اب ایک بڑا، دندانے دار، جھلسا ہوا غار نظر آرہی تھی جس میں سے نکلتے ہوئے دھوئیں سے جلتے ہوئے گوشت کی بدبو آرہی تھی۔

جہنم کے اس دہانے کے کنارے پڑے پڑے اس کو یہ خیال آتے ہی ایک شدید دھکا سا لگا کہ قاعدے میں کیشیپ کی جگہ اس کے اپنے جسم کو نشانہ بننا چاہیئے تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے جوان کیشیپ کی جان لی ہو۔ ڈاکٹروں کو اس کے دماغ کو احساس جرم کے اس بوجھ سے بچانے کے لئے بے ہوشی کی دوا دینا پڑی۔

آخر کار صدمہ کا بوجھ اس کے دل پر سے اٹھ گیا اور اس کا دماغ اس قابل ہو گیا کہ وہ روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والے بے شمار واقعات کو سمجھ سکے اور اس کا تجزیہ کر سکے اور ان کو قبول یا رد کر سکے۔ اس کے بعد اس کو دہلی کے فوجی اسپتال میں منتقل کر دیا گیا۔ اس سے اس کے افسردہ دماغ کو یک گونہ راحت ملی۔ اب اس کو اپنے آپ کو ایک ایسے اقدام کی سزا دینے سے نجات مل گئی جس میں نہ اس کے ارادہ کو دخل تھا اور

نہ علم کو اور اس کو ایک آس سی پیدا ہو گئی۔

دہلی کے فوجی اسپتال میں اڑتالیس گھنٹے گزارنے کے بعد گویا اس کا سارا وجود اس چھ فٹ اونچے اور چار فٹ چوڑے دروازے کے چوکھٹے میں سمٹ آیا تھا کیونکہ یہی دروازہ تو تھا جس سے اس کو اپنی جھلسی ہوئی روح کے مداوے کی آمد کی توقع تھی وہ اپنے پورے دھڑکتے ہوئے وجود سے اس کا منتظر تھا اس کو معلوم تھا کہ جس لمحہ وینا اس دروازے میں داخل ہو گی تو پھر وہی بات ہو گی ـــــ یعنی جنگ اور اس کا پیدا کردہ المیہ ذہن سے محو ہو جائے گا اور صرف مستقبل کا خیال۔ امید بھرے مستقبل کا خیال ہی ان کے لئے سب کچھ ہو گا۔ کاش وہ کیشیپ کے خیال کو بھی اپنے ذہن سے نکال سکتا!

اس نے سوچا، اگر میں سارا ماجرا وینا سے کہہ سناؤں تو ہو سکتا ہے مجھے اس احساس جرم سے چھٹکارا مل جائے، وہ ضرور سب کچھ سمجھ جائے گی! لیکن اگر وہ نہ سمجھ سکی تو ...... ؟ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وینا کا رد عمل کیا ہوگا۔ اس کو ایک دم سے پوری بات وینا کو نہ بتانی چاہیئے۔ ہو سکتا ہے کہ ایسا کہنے سے اس کو ناقابل برداشت صدمہ پہنچے۔ عورتیں تو ویسے بھی بہت جذباتی ہوتی ہیں۔ ممکن ہے اس طرح اسے یہ احساس ہو کر مجھے قبول کر کے اس نے چوری کا سامان قبول کیا ہے۔ اور یہ حقیقت بھی تھی کہ اس کی اپنی زندگی تو کیشیپ سے چرائی ہوئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ کبھی اس بات کا فیصلہ نہ کر سکے گا کہ وینا سے سچ بتا دے یا زندگی بھر احساس گناہ کے اس بوجھ کو اپنی پیٹھ پر دبے پھرتا رہے۔

ان ننھے خیالات کا تانا بانا کمرے کی دہلیز پر کسی کے جھجکتے ہوئے قدموں کی نرم چاپ سے ٹوٹ گیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کا اپنا سارا وجود پگھل کر نرم ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ آج اندر آتے ہوئے ہچکچا کیوں رہی تھی؟ وہ کس بات سے خوفزدہ تھی؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ کسی نے یہاں آنے سے پہلے ہی اسے سب کچھ بتا دیا ہو؟ ممکن ہے اس نے اسپتال کے رجسٹرار کی بات پر یقین نہ کیا ہو اور یہ سمجھ رہی ہو کہ مجھے بہت شدید زخم آئے ہیں یا میرے اعضا کٹ گئے ہیں یا میں پلاسٹر میں لپٹی ہوئی سانس لیتی ہوئی ایک ممی ہوں۔ یہ سوچ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے کہ اسپتال آنے کے لئے وینا کو کتنی جرأت سے کام لینا پڑا ہوگا اور یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ وینا کو اس سے اتنی محبت تھی جس کا کہ وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا۔

وینا کے دروازے میں داخل ہوتے ہی اس کے یہ وسوسے ختم ہو گئے۔ وینا کی اس وقت اسپتال میں آمد کسی فرشتہ کی آمد سے بھی زیادہ خوش آیند تھی۔ دروازے میں داخل ہو کر وہ ایک لمحہ کے لئے ٹھٹکی اور پھر اس کے پلنگ کی طرف بڑھنے لگی۔ اس کمرے میں تین فوجی اور بھی تھے۔ لیکن وہ کمرے کے بیچوں بیچ پہنچ کر رک گئی اور اور اس کے رکنے کے ساتھ ساتھ چوبڑہ کی خوشیوں کا مچلتا ہمکتا کارواں بھی ایک دم سے رک گیا۔ یہ وینا نہیں ہے۔ اس کا دل کراہا۔ یہ وینا نہیں ہے۔ یہ وینا نہیں ہے۔

لیکن وہ جو کوئی بھی تھی۔ ذرا سی دیر میں اپنے حواس مجتمع کر کے پھر اس کے بستر کی طرف بڑھنے لگی اور اس کے بستر کے بالکل قریب آ کر رک گئی۔ اتنا قریب کہ چوبڑہ کو الجھن ہونے لگی۔

"ہلو۔ تم کیسے ہو؟" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

چوبڑہ نے جواب نہیں دیا۔ وہ اسے مشکوک غصیلی نظروں سے گھورتا تھا۔ اس کے دماغ میں ہتھوڑے سے چل رہے تھے۔

"مجھے امید ہے کہ تمہارے زخم زیادہ خطرناک نہیں ہیں؟" اس نے اپنے ہاتھوں کو ملتے ہوئے کہا۔

چوبڑہ کی شجاعت عود کر آئی۔ فوجی افسروں کو مہمان خواتین کے ساتھ اس طرح کا گھٹیا سلوک کرنا زیب نہیں دیتا۔

"نہیں!" اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے جلدی سے جواب دیا "میرے زخم زیادہ گہرے نہیں ہیں۔ اور اب تو ان پر ٹانکے لگ ہی چکے ہیں۔"

یہ جواب سن کر اس کو تھوڑا سا اطمینان ہوا، لیکن اس کے چہرے پر اب بھی اندرونی کشمکش کے آثار موجود تھے۔

"تم کس محاذ پر تھے؟"

"میں مغربی محاذ پر تھا۔ فیروز پور میں۔"

"اوہ۔" وہ جیسے چیخ پڑی اور زور زور سے اپنے ہاتھ ملنے لگی۔ شاید اس کا محبوب بھی اسی محاذ پر تھا چوبڑہ نے سوچا۔ عورت نے پہلو بدلتے ہوئے کمرے کا ایک جائزہ لیا اور پھر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ درحقیقت وہ اس کے جسم کو دیکھ رہی تھی اور باوجود یہ کہ وہ چادر اوڑھے ہوئے تھا، وہ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس کے جسم کا کونسا حصہ مجروح ہوا تھا۔ چوبڑہ نے اس اس طرف کوئی توجہ نہ دی۔

"کیا میں آپ کی کچھ خدمت کر سکتی ہوں بلا تکلف بتایئے۔"

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس مایوسی کی تلافی کرنا چاہتی ہو جو اس کے آنے سے چوبڑہ کو ہوئی تھی۔

"میرا جی مولی کھانے کو چاہ رہا ہے مسالہ چھڑکی ہوئی چھلی ہوئی مولیاں۔ جو خوانچہ فروش بیچتے ہیں" اس نے بے خیالی میں یونہی کہہ دیا۔

"میں ابھی لائی۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے وارڈ سے باہر چلی گئی۔

جب وہ جا چکی تو اس کو اپنی حماقت کا احساس ہوا کہ اس نے ایک ایسی خاتون سے جس سے وہ واقف بھی نہیں تھا ایک ایسی مہمل فرمائش کر دی، بےچاری کو مولیوں کی تلاش میں کنٹونمنٹ چھاننا پڑے گا شاید اس کے پاس کار ہو اور وہ مولیاں لینے کناٹ پلیس چلی جائے۔ اس نے ایسے گدھے پن کا ثبوت کیوں دیا؟ کیا وہ اپنے زخموں کا فائدہ اٹھا کر اس عورت کی کمزوری سے نہیں کھیل رہا تھا؟

عورت کے جانے کے بعد ان خیالات نے اس کو بہت دکھی کر دیا۔ وہ اتنا دکھی ہو رہا تھا کہ وہ دروازے

کے سامنے سے آنے جانے والوں کو تاکنے کا اپنا معمول بھی بھول گیا تھا۔

وہ تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد ایک درجن مسالہ لگی مولیاں لے کر آ گئی۔ دوڑ بھاگ کی وجہ سے اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔

"یہ لیجئے، یہ رہیں آپ کی مولیاں۔" اس نے گرمجوشی سے مسکراتے ہوئے مولیاں اسے دے دیں۔ ممکن ہے وہ اس وقت یہ سوچ رہی ہو کہ شاید کسی دوسرے اسپتال میں اس کے زخمی محبوب کی بھی کوئی عورت اسی طرح خاطرداری کر رہی ہو۔ بہرحال کیا کہا جا سکتا ہے!

"میں آپ سے معافی چاہتا ہوں میری احمقانہ فرمائش سے آپ کو بڑی تکلیف ہوئی۔" اس نے احساس شرمندگی سے کہا۔

"نہیں بالکل نہیں جناب ...."

"میرا نام کیپٹن چوپڑہ ہے۔"

"مجھ کو مطلق کوئی زحمت نہیں ہوئی کیپٹن۔ خوش قسمتی سے مجھے دھولا کنواں ہی پر ایک مولی بیچنے والا مل گیا۔ بس اسکوٹر ملنے میں ذرا دیر لگی۔ آپ کو دہلی میں ٹرانسپورٹ کا حال تو معلوم ہی ہے۔"

اس نے دیکھا کہ اس عورت میں اب بھی جوانی کا الھڑپن موجود تھا جو اس وقت اور بھی نمایاں ہو جاتا جب وہ بے خیالی میں محو گفتگو ہوتی۔

"اوہ خدا! آپ کو ایک گدھے کی احمقانہ فرمائش پوری کرنے کے لئے اتنی دور جانا پڑا۔"

"آپ جانتے ہیں، یہاں آس پاس کہیں بھی مولیاں نہیں ملتیں۔" اس نے سادگی سے کہا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا "مہربانی کر کے تشریف رکھئے۔"

وہ ذرا جھینپی لیکن پھر ایک اسٹول کھینچ کر اس پر بیٹھ گئی۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ وہ اسٹول کے سرے پر بس ذرا سی ٹکی ہوئی بیٹھی ہے۔ اس نے مولی کا ایک ٹکڑا اپنے منہ میں رکھ لیا "یہ واقعی بڑی مزیدار ہیں، بس ایسی ہی میں چاہتا تھا۔"

وہ ذرا مسکرائی اور پھر کچھ جھینپ سی گئی۔

"اگر آپ اس کو دخل در معقولات نہ سمجھیں تو میں آپ سے پوچھوں کہ آپ شاید کسی کی تلاش میں یہاں آئی تھیں محترمہ......"

"میرا نام سمن ہے۔ سمن کپور۔"

"ہاں تو مس کپور، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

"جی ہاں، میں کسی کی تلاش ہی میں یہاں آئی تھی۔" اس نے گھبراتے جھجکتے ہوئے کہا۔

"شاید آپ اس موضوع پر مزید بات کرنا پسند نہ کریں۔" اس نے اس کو گویا فرار کا راستہ دکھایا۔

"نہیں، ایسا نہیں ہے۔ وہ بھی فیروز پور کے محاذ پر ہی تھے۔"

اس کا دل جیسے ایک لمحہ کے لئے رک گیا۔ اسے ڈر تھا کہ اس کی پریشانی اس کے چہرے سے نہ ظاہر ہو جائے لہٰذا اس نے زور زور سے مولی چبانا شروع کر دی اپنی گھبراہٹ کو چھپانے کے لئے۔

"آپ جانتے ہی ہیں کہ ڈاک کا نظام گڑبڑ ہے اور اخبار سے بھی کچھ پتہ نہیں چلتا ...." وہ ذرا ہچکچائی کہ لفظ 'مرنے والے' استعمال کرے یا نہ کرے۔ اور پھر بولی "میرا مطلب یہ ہے کہ اخبار والے کسی کے متعلق کوئی اطلاع نہیں دیتے اور خواہ مخواہ کو پریشانی ہو جاتی ہے اور دل میں طرح طرح کے وہم آتے ہیں۔" وہ شدت جذبات سے اپنا رومال زور زور سے مسل رہی تھی اور الفاظ اس کے منہ سے رک رک کر نکل رہے تھے۔

"ہاں ڈاک کی گڑبڑ تو ضرور ہے لیکن ہمیں بُرے بُرے خیال اپنے دماغ میں نہ لانا چاہیئے۔"

"ایسا نہیں ہے کیپٹن چوپڑہ، ہم تو متعلقہ لوگوں سے پوچھتے رہتے ہیں، شاید کسی سے کوئی صحیح اطلاع مل جائے۔ میں نے سنا ہے کہ کچھ فوجی افسروں کو فیروز پور سے دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا ہے۔" وہ پورے ایک منٹ تک خاموش رہی، شاید وہ اپنی بات جاری کرنے کی ہمت نہیں کر پا رہی تھی "ایسی خبریں پا کر ظاہر ہے طبیعت اور پریشان ہو جاتی ہے۔ اور یہ پریشانی اسی وقت ختم ہو سکتی ہے جب تک صحیح حالات نہ معلوم ہوں خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ کئی دن سے ان کا کوئی خط بھی نہیں ملا ہے۔" وہ ایکدم سے خاموش ہو گئی۔ اس نے ہمدردانہ انداز میں اپنے سر کو جنبش دی۔ اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ رجسٹرار کی اطلاع پر یقین نہ کرتے ہوئے اس نے وارڈ کے اندر آنے پر اصرار کیا تھا۔ اب وہ خاموش بیٹھی اپنے گانٹھ بنے ہوئے رومال کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔

"ہاں آپ نے ٹھیک کہا، اگر اسی محاذ کے کسی افسر سے ملاقات ہو جائے تو صحیح بات معلوم ہو جانے کا امکان رہتا ہے۔" اس نے اس کی ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔

"اسی وجہ سے تو میں آپ کے پاس آئی ہوں۔"

اس نے امید بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

"کیا آپ تمام وارڈوں کا چکر لگا آئی ہیں؟"

"نہیں، میں صرف ان وارڈوں میں گئی جن میں فیروز پور سے لائے گئے افسران داخل ہیں۔" اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"شاید میں آپ کی کچھ مدد کر سکوں اگر آپ مجھے کچھ بتائیں۔" چوپڑہ نے کہا۔

"میں کیپٹن کیشیپ کے متعلق جاننا چاہتی ہوں بارہ میڈیم رجمنٹ کے کیپٹن کیشیپ۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی نظریں نیچے جھکا لیں۔ چونکہ اس کی نظریں نیچی تھیں اس لئے وہ یہ نہ دیکھ سکی کہ یہ سن کر کیپٹن چوپڑہ کے چہرے کی رنگت کس طرح اڑ گئی۔ اپنے صدمے پر قابو پانے کے لئے کیپٹن چوپڑہ نے کھانسنا شروع کر دیا۔

"کیا ہوا کیپٹن؟" وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی "میں ابھی ڈاکٹر کو بلاتی ہوں۔"

"نہیں مس کپور، ڈاکٹر کو بلانے کی کوئی ضرورت نہیں، مجھے ذرا سا پانی چاہیئے۔"

وہ پانی کا پورا گلاس غٹاغٹ پی گیا گہرے گہرے سانس لئے اور اپنے سامنے کھڑی ہوئی خاتون کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگا کیپٹن کیشیپ نے اسے اس کی تصویر دکھائی تھی۔ ان دونوں کی لڑائی سے

فوراً بعد منگنی ہونے والی تھی۔ اسے اپنے اوپر بڑا تعجب ہوا کہ پہلے ہی اس نے مس کپور کو کیوں نہ پہچان لیا تھا

"مس کپور! مہربانی کر کے بیٹھ جائیے۔" اس نے اس کو کھڑا دیکھ کر کہا۔ "میں آج زحمت ہی زحمت دے رہا ہوں۔" اس نے خود ملامتی کے انداز میں کہا۔

وہ بادل ناخواستہ اسٹول پر دوبارہ بیٹھ گئی۔ اس کی نظریں سوالیہ انداز میں چوہڑہ کے چہرے پر جمی تھیں۔

"میں کیپٹن کیشیپ سے واقف نہیں ہوں میرا تعلق دوسری رجمنٹ سے ہے۔" اس نے بات بنائی۔

وہ اسے حقیقت کیسے بتاتا۔"

کیا وہ کبھی بھی اسے سچی بات بتا سکے گا یا ہمیشہ کے لئے اس کو اپنے دل میں دبائے رکھے گا۔ ممکن ہے آئندہ کسی وقت تھوڑا تھوڑا کر کے اسے حقیقت حال سے آگاہ کرنے کا کوئی راستہ نکل آئے۔

وہ جانے کے لئے کھڑی ہو گئی۔

"شاید آپ کو ایک اجنبی زخمی کو دوبارہ دیکھنے کی فرصت نہ ملے مس کپور۔"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتی، لیکن اگر آپ چاہیں گے تو میں آجاؤں گی۔"

"میں آپ کو کیسے بتاؤں کہ مجھے آپ کے آنے سے کتنی خوشی ہوئی؟ لیکن شاید آپ کو فرصت نہ ملے پھر یہ کہ اسپتال شہر سے دور بھی ہے۔"

"آپ اس کی پرواہ نہ کیجئے۔ اس کا میں انتظام کر لوں گی۔" یہ کہہ کر وہ رخصت ہو گئی۔

اس کو یہ توقع نہ تھی کہ وہ اگلے دن یا اس سے اگلے دن اس کے پاس پھر آئے گی لیکن وہ اس کے پاس روزانہ پھولوں کے گلدستے اور کتابیں لے کر آتی تھی۔ وہ روزانہ اس کے پاس تقریباً ایک گھنٹہ بیٹھ کر کیشیپ اور اپنے متعلق باتیں کرتی، اپنی اور کیشیپ کی پسند اور ناپسند اور اپنے مستقبل کے منصوبوں کے متعلق کہتی رہتی۔ جب تک وہ اس کے پاس بیٹھتی وہ اپنے آپ کو ایک کمینہ، دغاباز اور دھوکہ باز محسوس کرتا رہتا۔ اتنا نیچ کہ اس عورت کے جوتوں کو بھی چھونے کے قابل نہ تھا۔

"میں جب بھی وارڈ میں آتی ہوں تو آپ کی نظروں کو ہمیشہ دروازہ پر لگی پاتی ہوں کیپٹن چوہڑہ۔"

ایک دن اس نے چوہڑہ سے کہا۔

"میں آپ کا انتظار کرتا رہتا ہوں مس کپور۔"

"کیپٹن چوہڑہ! مہربانی کر کے مجھے یہ نہ بتایئے میں ایک عورت ہوں۔ اور مجھے یہ بتائے جانے کی ضرورت نہیں۔"

"کیا آپ کو یہ بات بہت نمایاں لگتی ہے؟"

"ہاں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آپ کو کسی بہت ہی مخصوص ہستی کا انتظار ہو۔"

"ہاں آپ ٹھیک کہتی ہیں۔"

"شاید میں آپ کے کچھ کام آسکوں..... آپ کا پیغام یا کوئی اور چیز اس تک پہنچا سکوں۔"

"نہیں، ایسا کرنے سے انتظار کا لطف اور اچانک ملاقات کا مزا باقی نہ رہے گا۔"

یہ سن کر وہ چُپ رہی۔

"وہ بالکل آپ ہی کی طرح ہے، اتنا ہی قد، ایسا ہی بدن، چلنے کا انداز بھی بالکل آپ جیسا ہے صرف بال مختلف ہیں۔ اس کے بال لمبے لمبے ہیں اور کاندھوں پر یوں ہی کھلے ہوئے پڑے رہتے ہیں اور اس کے بیضاوی چہرے سے کھیلتے رہتے ہیں۔" یہ کہتے وقت چوہڑہ کی آنکھوں میں ایک عجیب خواب آگیں حقیقت چھائی ہوئی تھی۔ "اس روز آپ کو دیکھ کر میں پہلے یہی سمجھا تھا کہ وہ آئی ہے۔ وینا، وینا سہگل —— جب پہلے دن آپ آئی ہیں۔"

اس نے جیسے سسکی سی لی۔ اس کو اتنا صدمہ پہنچا کہ اس کا پرس ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر گیا۔ چوہڑہ وینا کے خیال میں اتنا محو تھا کہ وہ اس بات کو نہ دیکھ سکا۔ اس نے اپنا پرس زمین پر سے اٹھایا اور ساکت و صامت اسٹول پر بیٹھ کر اس کی باتیں سنتی رہی۔

"وہ انڈین آئل کمپنی میں کام کرتی ہے۔ ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ شادی ہو جانے پر وہ اپنی ملازمت چھوڑ دے گی۔"

وہ سر کے درد کا بہانہ کر کے رخصت ہو گئی۔ اسپتال سے نکلتے ہوئے اسے بس وینا سہگل کا ہی خیال تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وینا سہگل جو پہلی غیر فوجی تھی جو لڑائی کے پہلے ہی دن موت کے آغوش میں چلی گئی تھی۔ ہوائی حملہ کا سائرن بجتے ہی ٹریفک میں ایک افراتفری پھیل گئی تھی۔ بلیک آؤٹ میں گاڑیاں بغیر روشنی کے چل رہی تھیں۔ ہر شخص کو گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ وینا ٹیکسی اسٹینڈ پہنچنے کے لئے پارلیمنٹ اسٹریٹ کو کراس کر رہی تھی کہ ایک تیز رفتار ٹرک اس کو کچلتا ہوا آگے نکل گیا۔ نیم اندھیرے میں ڈرائیور اسے دیکھ نہ سکا۔ جب ڈرائیور کو خبر ہوئی تو وینا دم توڑ چکی تھی۔

شمن کا دماغ بے کار ہوا جا رہا تھا! کیا وہ چوہڑہ کو وینا کے متعلق بتا دے۔ لیکن اس سے اس کو کتنا دُکھ ہوگا۔ وہ تو ویسے ہی زخمی ہے! نہیں —— وہ اس کے پاس اسی طرح جاتی رہے گی۔ اور اب جب کہ وہ وینا کے اور اپنے متعلق اسے سب کچھ بتا چکا ہے وہ اس کے پاس جانا کیسے چھوڑ دے۔ میرے نہ جانے سے وہ یہی سمجھے گا کہ میں اس سے کچھ چھپا رہی ہوں اور اس کے دماغ میں طرح طرح کے بُرے خیال وینا کے متعلق آنے لگیں گے۔ ہو سکتا ہے آخر میں اسے یہ بات بتا ہی دی جائے اور اس وقت اس صدمے کو جھیلنے کے لئے اسے میری موجودگی اور سہارے کی ضرورت ہوگی ہو سکتا ہے میں خود ہی کسی مناسب موقع پر مناسب انداز میں اس کو وینا کے متعلق بتا دوں۔

اوہ خدا! کاش میں وینا کو نہ جانتی ہوتی یا کیشیپ کے متعلق پوری معلومات کئے بغیر اسپتال نہ گئی ہوتی۔ یہ کیسا جہنم ہے؟..... اور اس نے اپنے ٹیس اٹھتے ہوئے سر کو اپنے دونوں ہاتھوں سے دبا لیا۔

کتابوں کی باتیں

کتاب: MUSLIMS IN FREE INDIA

مصنف: ڈاکٹر معین شاکر

ضخامت ۱۵۶ صفحات - قیمت بیس روپے

ناشر:

ڈاکٹر معین شاکر جو مانے ہوئے اسکالر اور سیکولرازم کے بڑے حامی ہیں ان کی پہلی تصنیف Khilafat to Partition ہے۔ یہ دوسری تصنیف Muslims in free India مزید اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ درحقیقت یہ فاضل مصنف کا غیر معمولی کارنامہ ہے جس نے ہندو مسلم مسئلے کو بڑے ہی سلجھے ہوئے انداز سے لوگوں کے سامنے پیش کیا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف ان لوگوں کے لئے ضروری ہے جو ہندو مسلم مسئلے پر سرسری معلومات چاہتے ہیں بلکہ ان کے لئے بھی جو ان دونوں فرقوں کے اختلافات کا گہرا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔

یہ کتاب تنقید نگاروں کے خیالات کا مجموعہ ہے درمیان میں یا آخر میں کہیں کہیں مصنف کے خیالات کا پتہ بھی چلتا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ کے دوران کہیں کہیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے مصنف نے مسلمانوں کی حمایت میں سب کچھ لکھا ہے لیکن جب بنظر غائر پڑھیں تو پتہ چلتا ہے کہ مصنف نے کسی کی حمایت نہیں کی ہے بلکہ زیادہ تر بڑے ہی تلخ انداز میں مسلمانوں کے نام نہاد لیڈر اور فرقہ پرست جماعتوں کو مسلمانوں کی پریشانیوں کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے اور انہیں مجرم قرار دیا ہے کہ ان جماعتوں کی وجہ سے قوم کو تکالیف کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

یہ کتاب آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت پر جامع طور پر روشنی ڈالتی ہے۔ ہند کی تقسیم اس وجہ سے عمل میں آئی تھی کہ دونوں فرقے اپنا اپنا حق پالیں اور یہ مسئلہ حل ہو جائے کہ کون کہاں رہے اور مذہبی تناؤ کی گنجائش نہ رہے۔ اس کے برخلاف نتیجہ بالکل ہی الٹا نکلا۔ اس تقسیم نے مسلمانوں کے لئے سیاسی، سماجی، معاشی اور ثقافتی مسائل کھڑے کر دیئے۔ اس نے انہیں تین حصوں یعنی مشرقی پاکستان مغربی پاکستان اور ہندوستان میں بانٹ دیا۔ تقسیم ہند سے مسلمانوں اور ہندوؤں کے تعلقات پر برا اثر پڑا۔ کیونکہ ہندوؤں نے یہ خیال کرنا شروع کیا کہ مسلمانوں کا وطن پاکستان ہے اور انہیں ہندوستان میں نہیں رہنا چاہیئے۔ مختصر یہ کہ ان تمام مسائل کے بارے میں ساری تفصیلات ہمیں اس کتاب میں ملتی ہیں۔

فاضل مصنف نے اس نازک مسئلہ کو غیر جانب داری کے ساتھ بڑے ہی اچھے انداز میں پیش کیا ہے جو قابل تعریف ہے۔

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ عموماً فسادات میں مسلمان ہی زیادہ تر جانی اور مالی نقصانات کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ محض تعصب اور پولیس کی غفلت اور لاپرواہی کا نتیجہ ہے۔ اس طرح نہ صرف وہ فسادات کا شکار ہوتے ہیں بلکہ ہر میدان میں چاہے وہ تعلیم کا میدان ہو یا نوکری کا ہر جگہ مذہب انہیں شکست دے جاتا ہے۔ کئی تعلیم یافتہ لوگ ان تمام حقائق کو جانتے ہوئے ان کو ظاہر کرنے میں ہچکچاہٹ سی محسوس کرتے ہیں۔ اس لئے کہ کہیں ان کے ماتھے پر کٹر مسلمان ہونے کا کلنک نہ لگے لیکن ڈاکٹر شاکر نے ان تمام حقیقتوں کو بڑے ہی نڈر انداز میں بیان کیا ہے۔

مصنف نے قومی مسئلہ پر پوری طرح روشنی ڈالی ہے اور کہا ہے کہ سیکولرازم ہی اس کا واحد حل ہے۔ مصنف نے بڑے ہی منصفانہ انداز میں اس بات کو ظاہر کیا ہے کہ قوموں میں پھوٹ ڈالنے والی اور نفرت پیدا کرنے والی صرف قومی پارٹیاں ہیں جو مختلف فرقوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکاتی رہتی ہیں۔ ان کا مقصد صرف سیاسی میدان میں اپنی جگہ بنانے کے سوا کچھ نہیں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس بات سے اختلاف کیا ہے کہ فسادات کی ذمہ داری صرف مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے برخلاف اس کے انہوں نے جن سنگھ اور آر۔ ایس۔ ایس کو فسادات کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت آر۔ ایس ایس کا نظریہ وستار یوجنا Vistar_Yojna ہے جس کے مطابق الگ الگ ذات پات کے لوگ ایک جگہ مل کر نہیں رہ سکتے۔

مصنف نے کھلے طور پر ان مسلم لیڈروں کی مذمت کی ہے جو دکھاوے کے طور پر مسلم قوم کی طرفداری کرتے ہیں اور یہ پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کی بہتری یا فلاح اور بہبود کے لئے لڑ رہے ہیں حالانکہ یہ تو محض اپنی پوزیشن بنائے رکھنے کے لئے اس مسئلے کو سلجھانے سے گریز کرتے ہیں اور مسئلہ کو جوں کا توں رکھتے ہیں انہوں نے کبھی مسلمانوں کے معاشی مسئلوں کو حل کرنے کی کوشش نہ کی جس کی وجہ سے مسلمان اب تک معاشی مشکلات میں گھرے ہوئے ہیں۔ ان لیڈروں نے مسلمانوں کو ہر بات سے لاعلم رکھا وہ ان حقیقتوں سے ناآشنا ہیں کہ ان کے مسائل کا واحد حل سیکولر آرگنائزیشن میں شرکت کرنا ہے۔ اس کو اپنانا ہے۔ اس طرح سے مسلم لیڈروں نے مختلف پارٹیاں مسلمانوں کی حمایت میں تیار رکھی ہیں جس کی وجہ سے ہندوؤں کو بھی اپنی الگ الگ پارٹیاں بنانے کے مواقع حاصل ہوئے ہیں۔

مصنف نے آگے چل کر یہ ثابت کیا ہے کہ محض اسکولوں کی کمی کے باعث اردو کی وقعت دن بدن گرتی جارہی ہے۔ صفحہ ۹۲ پر ڈاکٹر نے مرادآباد اور بارہ بنکی کی مثالیں پیش کی ہیں جہاں اسکولوں کی تعداد کے ساتھ ساتھ اردو سیکھنے والے طلبا کی تعداد بھی بڑھ گئی۔ مصنف نے اس بات کو ظاہر کیا ہے کہ دستور ہند کے تحت مسلمانوں کو ان کے حق سے محروم کیا

جارہا ہے انھیں اس بات کا حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی مادری زبان میں اپنے بچوں کو تعلیم دلوا سکیں ان علاقوں میں بھی اردو تعلیم نہیں دی جاتی جہاں مسلمان اکثریت میں پائے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر شاکر نے اس بات کا ذمہ دار حکومت کو ٹھہرایا ہے۔ اور یہ مسلمانوں کے ساتھ سراسر ناانصافی ہے جو اردو کے ساتھ برتی جارہی ہے یہاں تک کہ حکومت یو۔ پی اور بہار میں بھی اردو کو علاقائی زبان ماننے سے انکار کرتی ہے اور اس کا جائز حق دینے سے کتراتی ہے۔

ڈاکٹر شاکر نے مختلف ریاستوں کی تعلیمی پالیسی کی مذمت کی ہے جس کی وجہ سے سیکولرازم کو نقصان پہنچ رہا ہے اور یہ محسوس کی جارہا ہے کہ درسی کتابوں میں کئی اسباق ایسے ہیں جو نہ صرف اسلام کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہیں بلکہ بڑی حد تک غیر سائنٹفک ہیں۔ اس قسم کی غلط پالیسی مسلمانوں کو حکومت سے بدظن کررہی ہے اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ حکومت ان کا نام و نشان مٹا دینا چاہتی ہے۔ ساتھ ہی وہ یہ سوچ رہے ہیں کہ سیکولرازم سوائے اس کے کچھ نہیں کہ اکثریت کا مذہب اور تہذیب وتمدن اقلیت پر زبردستی لادا جائے۔

ہندوستانی دستور جمہوری حیثیت رکھتا ہے۔ ہر مذہب وملت کی تعریف کے ہر ایک کو برابر کے حقوق عطا کرتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی ذمہ لیتا ہے کہ اقلیت کی تہذیب وتمدن کا وہ ضامن ہے۔ ان تمام باتوں پر غور کرتے ہوئے مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ اپنے آپ کو اس سیاسی ماحول میں ڈھال لیں۔ مصنف یہ کہنے میں حق بجانب ہے کہ مسلم رہنما مذہب کی آڑ لے کر اپنے ذاتی مفادات کو فروغ دینا چاہتے ہیں۔

مصنف کا خیال ہے کہ اگر مسلمانوں میں سیکولر گروہ پیدا ہوجائے جو مسلمانوں کو دوسری قوموں کے ساتھ متحد کرے تب جاکر یہ مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔ اقلیتی فرقہ پرستی مسائل کو حل نہیں کرے گی بلکہ اس کے برخلاف یہ عمل ہندوؤں کو ان کے خلاف اپنی برگ میان تیز کرنے کی دعوت دے گا۔ اگر مسلمانوں کو اپنی مشکلات کا حل چاہیئے تو انھیں سیکولر فورسیس سے تعلقات بڑھانے ہوں گے تب ہی ان کا مستقبل شاندار بن سکتا ہے اور تب ہی ان کے دماغ سے یہ بات نکل سکتی ہے کہ وہ ہندوستان میں محفوظ نہیں ہیں،

ڈاکٹر شاکر نے بتلایا ہے کہ حکومت کو فسادات کے خلاف کوئی موثر قدم اٹھانا چاہیئے۔ فسادات کی وجہ سے ہندوستان کا جو سیکولرازم کا تصور ہے اس کو ٹھیس پہنچتی ہے اور یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان کا سیکولرازم برائے نام ہے۔ نہ صرف ہندوستانی مسلمان بلکہ دوسرے ممالک بھی ہندوستان پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ یہاں اقلیتیں محفوظ نہیں ہیں۔ انھیں فسادات کی وجہ سے ہندوستان کو رباط کانفرنس میں شرکت سے محروم رہنا پڑا تھا۔ یہی فسادات ہیں جو مسلمانوں کے خیالات کو بدل رہے ہیں۔ ان کا حکومت پر سے بھروسہ اٹھ چکا ہے۔ کیونکہ قانون ان فسادات میں مسلمانوں کا ساتھ نہیں دیتا، ان کی حفاظت نہیں کرسکتا۔

مصنف نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کا ایک غلط نظریہ یہ بھی ہے کہ ساری ہندو قوم مسلمانوں سے متنفر ہے حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے۔ مسلمانوں میں اتنی صلاحیت نہیں کہ وہ صحیح حالات کو سمجھ سکیں۔ وہ لوگ سیکولر فورسز میں شامل نہیں ہونا چاہتے اور اس مسئلے کو سماجی مسئلہ سمجھ کر اس کے حل کی کوشش نہیں کرتے۔ اس طرح یہ ایک کھلی دلیل ہے کہ ڈاکٹر شاکر نے مسلمانوں کو بھی قصوروار ٹھہرایا ہے اور ان کی غلطی کا احساس دلایا ہے۔

مختصر یہ کہ یہ کتاب مصنف کی غیر جانب داری کا کھلا ثبوت ہے۔ مصنف نے اس کی ترتیب میں بڑا ہی سنبھلا ہوا انداز اختیار کیا ہے اور بڑی توجہ سے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب کا ہر باب پُرکشش ہے اور پڑھنے والے کی توجہ کو اپنی جانب مبذول کرتا ہے اور ساتھ ہی حقیقت سے روشناس کرواتا ہے۔ ان ہی خوبیوں کی بنا پر ہندو مسلم ہر دو کے لئے یہ کتاب اہمیت رکھتی ہے۔

حاجی عبدالغنی

نام کتاب ——— کام سوتر
مصنف واتسائن۔ مترجم:۔ پریم پال اشک
ضخامت ۳۱۰ صفحات ——— قیمت چھ روپے
ناشر:۔ آزاد کتاب گھر، کلاں محل۔ دہلی ۶

اردو زبان کی بدنصیبی یہ ہے کہ اس میں جتنی کتابیں ادبی موضوعات پر شائع ہوئی ہیں اس کی عشر عشیر بھی غیر ادبی موضوعات پر نہیں ہوئیں یہی وجہ ہے کہ عام دلچسپی کے موضوعات پر اردو میں کتابوں کی تعداد غیر معمولی حد تک کم ہے۔

'کام سوتر' اس عہد کی یادگار ہے جب ہندوستان علمی وادبی اور تہذیبی وسماجی میدان میں دنیا کی رہنمائی کررہا تھا۔ اسی عہد میں جنسیات کا مطالعہ بھی انتہائی سائنٹفک انداز میں کیا گیا۔

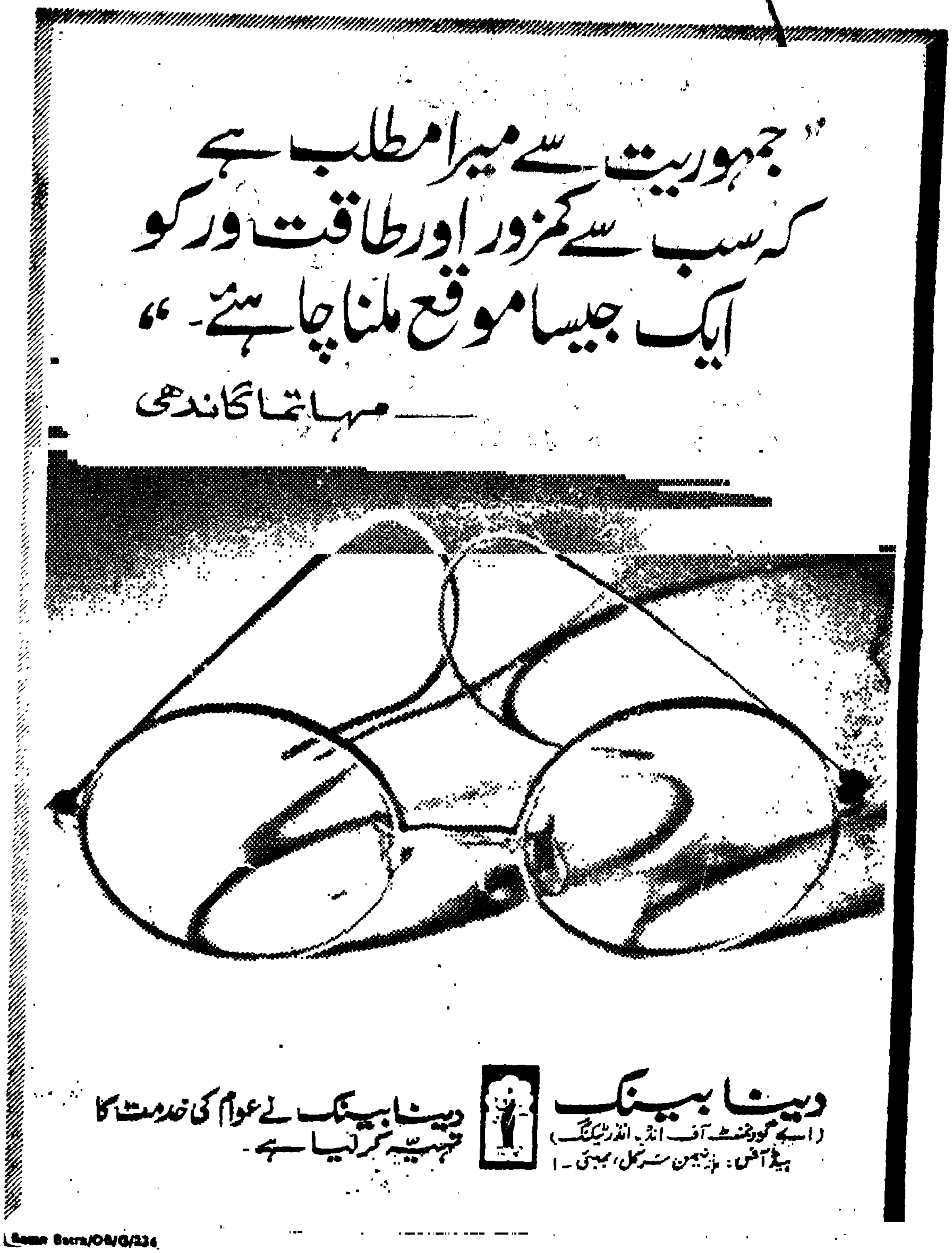
کام سوتر کے مصنف واتسائن کا عہد پانچویں اور چھٹی صدی کے دوران ہے۔ انھوں نے اس زمانے کے علم کے مطابق جنسیات کے تمام تر پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔ موضوع بہت مشکل ہے اگر الفاظ کا ذرا بے احتیاطی سے استعمال کیا جائے تو بات فحش ہوسکتی ہے۔ مگر مصنف کی خوبی یہ ہے کہ وہ ان تمام مشکل ترین مراحل سے انتہائی کامیابی کے ساتھ گزرا ہے اور کہیں بھی بات علمی سطح سے نیچے نہیں آنے پائی۔

اس کتاب کا ترجمہ دنیا کی بیشتر زبانوں میں ہوچکا ہے۔ مگر اردو ابھی اس بیش بہا خزانے سے محروم تھی۔ ہمیں پریم پال اشک صاحب کا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ انھوں نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اشک صاحب بنیادی طور پر اسکالر ہیں۔ رتن ناتھ سرشار اور غالب پر انھوں نے بہت اہم کام کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ترجمے میں وہ ہر لفظ کے استعمال میں بہت محتاط رہے ہیں۔ واتسائن کی طرح اشک نے بھی ہر مقام پر علمی سطح کو برقرار رکھا ہے۔

خلیق انجم

Regd. No. R.N. 16241/68

Regd. No. D-1820



Published and Printed by N.N. Pandey for Ekta Press (Printing Division of Qaumi Ekta Trust), **Registered Office** : 19-A, Theatre Communication Building, Connaught Circus, New Delhi-110001. Editor : **D.R.Goyal**

سیکولر ڈیموکریسی



شیخ عبداللہ سے خصوصی ملاقات

نوازش نامے

اردو ادیبوں کا مسئلہ

محترمی!

اردو زبان کی بقا اور ترقی کا مسئلہ سارے محبانِ اردو کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اور اس سلسلے میں ان کی جد و جہد بھی جاری ہے۔ اس سلسلے میں محبانِ اردو کی سرگرمیوں سے صاف ظاہر ہے کہ وہ حالات سے غیر مطمئن ہیں اور انھیں بدلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اردو انھیں پیاری ہے۔ وہ اسے زندہ اور باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ان کی توجہ زیادہ تر اس بات پر ہے اور ان کی صلاحیتیں بھی اس بات پر خرچ ہو رہی ہیں کہ اردو کو حکومت سے علاقائی زبان تسلیم کرا لیا جائے اور حکومت اردو کی ترقی کی ترقی کے مواقع فراہم کرے، یہ جد و جہد غلط نہیں بلکہ ضروری ہے اور اردو کے ہمدردوں کو اس کو پورا پورا حق حاصل ہے۔ اردو کی زندگی کے لئے یہ بنیادی ضرورتوں میں سے ایک ہے۔ لیکن یقینی طور پر یہی ایک مسئلہ نہیں ہے اور بھی ہیں۔ لیکن میں صرف ایک مسئلے کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں اور وہ اردو ادیبوں کا مسئلہ ہے۔

میں اسے تسلیم کرتا ہوں کہ اردو کے ادیبوں کا مسئلہ زبان و ادب کے دوسرے مسائل سے وابستہ ہے۔ اور شاید انھیں اور مسائل سے الگ کر کے بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن مجھے یہ کہنا ہے کہ اس مسئلے کی طرف توجہ بالکل ہی نہیں دی جا رہی ہے بلکہ اسے سرے سے نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ اور یہ ایسا مسئلہ ہے کہ حکومت کی امداد کے بغیر ہی بڑی حد تک حل کیا جا سکتا ہے۔

اگر آج کے اردو ادب کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو بہت ہی افسوس ناک صورت حال سامنے آتی ہے۔ اردو کا شاید ہی کوئی ادیب صرف قلم کے سہارے زندہ ہو۔ ان میں بڑی تعداد سرکاری یا غیر سرکاری ملازمتوں سے وابستہ ہے۔ چند ایک آزاد ہیں تو وہ بھی تجارتی اداروں سے منسلک ہیں۔ اور اپنی مرضی کا ادب وہ تخلیق نہیں کر سکتے۔ ان کا قلم بِک رہا ہے۔ کوئی ایسا ادیب نہیں جو محض اپنی تخلیقات کے سہارے زندہ ہو مطلب یہ کہ تجارتی اداروں سے وابستہ ادیب تو اداروں کے مفاد کے پیشِ نظر اپنی صلاحیتوں کو صرف کر رہے ہیں۔ اور جو غیر سرکاری اداروں میں ہیں انھیں اس کے لئے وقت ہی بہت کم ملتا ہے۔ ایسے حالات نہیں کہ وہ ملازمتوں سے کنارہ کش ہو کر آزادانہ طور پر لکھ پڑھ سکیں۔ ان کے اپنے مسائل ہیں اور وہ مجبور کرتے ہیں کہ جہاں اٹک گئے ہیں، اٹکے رہیں۔ اور دائروں کے اندر رہ کر جو کچھ بھی کر سکتے ہیں کریں۔ ظاہر ہے کہ اس صورت کو حکومت کی امداد سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ صرف اردو کے ہمدرد ہی اسے ختم کر سکتے ہیں۔ اور ایسا سازگار ماحول پیدا کر سکتے ہیں کہ جس میں اردو کے ادیب آزادانہ طور پر اچھا ادب پیدا کر سکیں۔

اس وقت عام طور پر اردو کے ادیب تین خانوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک جماعت وہ ہے جو سرکاری اداروں سے منسلک ہے، دوسری وہ جو غیر سرکاری اداروں مثلاً یونیورسٹیوں سے منسلک ہے اور تیسری وہ جو فلموں یا تجارتی رسالوں سے منسلک ہے چند ایک ایسے بھی ہیں جو آزاد ہیں یا اپنا خود ہی کوئی کام کرتے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان میں سے کوئی بھی حالات سے خوش نہیں۔ اور وہ اپنی راہ میں قدم قدم پر رکاوٹیں پاتے ہیں۔ اور اسی لئے اچھا ادب پیدا نہیں ہو رہا ہے حالانکہ بات ایسی نہیں کہ اردو کتابیں شائع نہیں ہوتیں یا رسالے نہیں شائع ہو رہے ہیں بلکہ بات صرف اتنی سی ہے کہ ملک کی تقسیم کے بعد جو افراتفری پیدا ہوئی اس نے ماحول کو پراگندہ کر دیا اور اس میں پست درجے کی تحریریں ادب کے نام پر بازار میں آگئیں آج اگر اعداد و شمار کا جائزہ لیا جائے تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ تقسیم ملک سے پہلے کے مقابلے میں کم کتابیں شائع نہیں ہوتیں اور نہ رسالوں کی تعداد میں کمی ہوئی ہے۔ بلکہ فرق صرف اتنا ہے کہ عام پڑھنے والوں کا مذاق گر گیا ہے اور عام لوگوں کے پست مذاق سے فائدہ اٹھا کر تجارتی منافع کمانے والے ناشروں نے ماحول کو اور بھی خراب کر دیا ہے اور اچھا ادب فروغ نہیں پاتا۔ اس کی وجہ سے اردو ادیبوں کے لئے مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔

اردو کا کوئی ادیب یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ آزاد رہ کر کچھ کام کرنا ہے اور محض اپنی تحریر ہی کے سہارے زندہ رہنا ہے۔ اگر آج جائزہ لیا جائے تو سارے ملک کے اندر سینکڑوں معیاری کتابوں کے مسودے پڑے ہوئے نو قت کا انتظار کر رہے ہیں اور حالات ایسے ہیں کہ شاید یہ مسودے اشاعت سے پہلے دیمک کی نذر ہو جائیں۔ ایسی حالت میں یہ امید رکھنا کہ کوئی اچھا ادب پیدا ہو، بڑی غلط بات ہے۔

اردو کی بقا اور ترقی کے سلسلے میں برابر جلسے ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن اس مسئلے پر بہت کم توجہ دی جاتی ہے کہ عام لوگوں کا مذاق جو روز بروز پست سے پست تر ہوتا جا رہا ہے۔ اسے کیسے سدھارا جائے، کوئی ایسا کام کیا جائے جس سے اچھی کتابیں زیادہ تعداد میں شائع ہوں اور پست درجہ کی کتابوں میں کمی ہو، اچھا ادب فروغ پا سکے۔ آج ادب کے نام پر جس قسم کی تحریروں کی اشاعت ہو رہی ہے ظاہر ہے اردو اس کے سہارے نہ زندہ رہ سکتی ہے اور نہ ترقی ہی کر سکتی ہے اور نہ اردو کے ادیب ہی زندہ رہ سکتے ہیں۔

ایسی حالت میں اگر حکومت ہند اردو کو علاقائی زبان تسلیم کرے اور دوسری سہولتیں بھی دے تو نتیجہ کیا نکل سکتا ہے؟ آج کی صورت حال میں اس سے بھی اضافہ ہوگا اور اردو ادب مزید انحطاط کا شکار ہوگا۔

ان چند سطروں کا مقصد یہ ہے کہ جب اردو

کی بقا اور ترقی کے مسئلے پر ہمدردانہ غور کریں اور اس کے لئے جدوجہد کریں تو اردو کے ادیبوں اور مصنفوں کو فراموش نہ کریں بلکہ ان کے مسائل پر بھی توجہ دیں۔ اگر اردو کے ہمدرد اس صورت حال کو بدل دیں تو بہت اچھے نتائج پیدا ہو سکتے ہیں اور حکومت کی امداد اور سہارے کے بغیر بھی اردو ادب ترقی کر سکتا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ اردو ادیب اور مصنف تو پراگندگی کا شکار ہوں اور اردو ادب ترقی کرے۔

سہیل عظیم آبادی

آپ اچھی کمپنی میں ہیں

مکرمی!

میں مسلم لیگ کا ترجمان "مستقیم" نہیں پڑھتا اس لئے مجھے تفصیل سے نہیں معلوم ہے کہ اس نے محترمہ سبھدرا جوشی اور "سیکولر ڈیموکریسی" کے بارے میں کیا لکھا ہے۔ لیکن اس کی جو عبارت آپ نے اپنے ماہِ اگست کے شمارے میں "..... یہ اندازِ گفتگو ....." کے زیر عنوان نقل کیا ہے اسے پڑھ کر مجھے یہ خیال ضرور ہوا کہ اگر ہندوستان میں کوئی ایسا فرد یا ادارہ ہے جو سبھدرا جوشی کی خدمتِ وطن سے ناواقف ہے یا جس کے نزدیک "سیکولر ڈیموکریسی" "مسلم آزاری" کا مرتکب ہو سکتا ہے تو اس کی ناواقفیت اور عقل و فہم کا ماتم ہی کیا جا سکتا ہے لیکن جب صورتِ حال کا زیادہ گہری نظر سے جائزہ لیا تو مجھے اس میں حیرت کی کوئی بات محسوس نہیں ہوئی بلکہ "مستقیم" کا یہ رویہ فرقہ پرست جماعتوں اور افراد کی ذہنیت اور روایات کے عین مطابق دکھا دیا۔ مہاتما گاندھی ہوں یا پنڈت نہرو یا مولانا ابوالکلام آزاد ـــــ یہ سب ہندو اور مسلمان فرقہ پرستوں کی نظر میں یکساں معتوب رہ چکے ہیں۔

حصولِ آزادی سے قبل فرقہ پرست مسلمان اپنا سب سے بڑا دشمن گاندھی جی کو سمجھتے تھے اور حصولِ آزادی کے بعد ہندو فرقہ پرستوں نے ان پر مسلم دوستی اور پاکستان نوازی کا "الزام" لگا کر انھیں گولی کا نشانہ بنا دیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو پر مسلم لیگی زعما نے کھلے بندوں یہ الزام لگایا تھا کہ وہ مسلم تمدن کی نشانی صرف ایک خاص طرز کا پائجامہ اور لوٹا قرار دیتے تھے اور ملک میں صرف دو طاقتیں مانتے تھے ـــــ انگریز اور ہندو اور اس طرح گویا مسلمانوں کے جداگانہ وجود کے منکر تھے۔ حالانکہ پنڈت جی نے اس بارے میں جو کچھ کہا یا لکھا تھا اس کا مفہوم اس سے قطعاً مختلف تھا جو اسے مسلم لیگیوں نے پہنانا چاہا۔ آج بھی کتنے مسلمان فرقہ پرست ہیں جو کہتے ہیں کہ پنڈت جی اپنے زمانۂ اقتدار میں مسلمانوں کے حق میں کہتے تو بہت کچھ رہے لیکن ان کے لئے کیا کچھ نہیں۔ اس کے برعکس ہندو فرقہ پرستوں کا کہنا ہے کہ پنڈت جی کا شیوہ صرف مسلمانوں کی دل جوئی اور ناز برداری تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان کی طرف سے پنڈت جی کے بارے میں یہاں تک کہا گیا کہ "ہندوستان میں صرف ایک نیشنلسٹ مسلمان ہے اور وہ جواہر لال نہرو ہے" گویا ان لوگوں کے نزدیک پنڈت جی کا ہندو ہونا ہی محلِ نظر تھا۔ مولانا آزاد کو مسلم فرقہ پرستوں نے ہمیشہ ہندوؤں کا زر خرید، شو بوائے اور نہ جانے کن کن گھٹیا ناموں سے یاد اور بدنام کیا۔ اس کے بخلاف ہندو فرقہ پرستوں کی رائے تھی کہ وہ کانگریس میں صرف مسلم مفاد کی نگرانی کے لئے شریک ہیں اور ان کا مقصدِ حیات مسلمانوں کو فائدہ پہنچانے کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے۔

یہ تو بڑے آدمیوں کی باتیں تھیں، ہم جیسے چھوٹے لوگوں کو بھی اس طرح کے تجربات دن رات ہوتے رہتے ہیں۔ ایک دفعہ ٹرین میں ایک مقامی جن سنگھی نیتا میرے ہم سفر ہو گئے تھے۔ دورانِ گفتگو میں ملک کے سیاسی حالات کی بات چل نکلی تو انھوں نے مجھ سے شکوہ کیا کہ آپ جہاں مسلم لیگ کی فرقہ پرستی پر اعتراض کرتے ہیں وہ ساتھ میں راشٹریہ سیوک سنگھ اور جن سنگھ کو بھی موردِ الزام قرار دیتے ہیں حالانکہ مسلم لیگ نے ملک کا بٹوارہ کرایا ہے، ہم نے کیا کیا ہے؟ اسی طرح اکثر مسلم فرقہ پرست اس بات پر معترض ہوتے ہیں کہ آپ ہندو فرقہ پرستوں کے ذکر کے ساتھ مسلم فرقہ پرستوں کا ذکر بھی ضرور کرتے ہیں اور اس بات کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ ہندو فرقہ پرست فرقہ وارانہ فسادات کراتے ہیں جب کہ ہمارا دامن اس طرح کی آلودگی سے یکسر پاک ہے۔

عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہندو اور مسلم دونوں طرح کے فرقہ پرست یہ چاہتے ہیں کہ موردِ الزام صرف دوسرے کو قرار دیا جائے اور انھیں یکسر نیک چلنی کے سرٹیفکیٹ سے نوازا جاتا رہے۔ جو کوئی اس کے خلاف کرتا ہے وہ اُن کے نزدیک معتوب قرار پاتا ہے۔ اس اعتبار سے اگر "مستقیم" نے محترمہ سبھدرا جوشی اور "سیکولر ڈیموکریسی" کے خلاف زبان طعن دراز کی تو کوئی اچنبھے کی بات نہیں کی اور اس پر آپ کو بجائے ناراض ہونے کے خوش ہونا چاہیئے کیونکہ انگریزی محاورے کے مطابق آپ اچھی کمپنی میں ہیں۔

ریاض الرحمٰن شروانی علیگڑھ

تازگی اور مہک

سلام مسنون!

"سیکولر ڈیموکریسی" کا قومی شاعری نمبر ۷۲ء اتفاقاً مل گیا۔ اس میں اب بھی وہی تازگی اور مہک ہے بلکہ میں کہوں گا کہ اس نمبر کے سارے مضامین اور نظموں کی تدوین دائمی ہے۔ جب کبھی اردو ادب کا مورخ قلم اٹھانا چاہے گا تو اُس کو اس میں بہت کچھ ملے گا۔ جی چاہتا ہے کہ اس کی ادبی محفل میں بھی حصّہ لوں۔ پتہ نہیں میری تخلیق پسند آئے گی بھی یا نہیں۔ تاہم ملاحظہ کے لئے دو نظمیں پیش ہیں۔ بشرط پسندیدگی کسی اشاعت میں جگہ دے سکتے ہیں۔ میری نظم بعنوان "ودھان سودھا" ماہ جولائی ۱۹۷۳ء کے "آجکل" کے شمارے میں آ رہی ہے اسے ضرور دیکھئے۔ امید ہے کہ آپ ضرور پسند کریں گے۔ کیونکہ ودھان سودھا کو آپ نے اچھی طرح دیکھا ہے۔ آپ اپنے تاثرات سے نوازئیے۔

ادیب۔ بنگلور

ماہنامہ

سیکولر ڈیموکریسی

ستمبر ۱۹۷۳ء

شمارہ ۲۲

فہرست

٭ ایڈیٹرز

سبھدرا جوشی

ڈی۔ آر۔ گوئیل

٭ جنرل منیجر

راجندر کمار

٭ بزنس منیجر

جی۔ ایل۔ ملہوترا

٭ دفتر کا پتہ

۸-۱۹ تھیٹر کمیونیکیشن بلڈنگ

کناٹ سرکس۔ نئی دہلی

٭ ٹیلی فون نمبر ۴۳۳۸۳

ہمارے نمائندے

٭ مسز کمل سانیال

۱۔ ڈوور روڈ کلکتہ

٭ شری ایم۔ این۔ صدیقی

نوبت ولا پلاٹ نمبر ۵۶۔۵۷

جوہو ولے پارلے ہاؤسنگ سکیم

نارتھ ساؤتھ روڈ نمبر ۱

آف ارلا برج اندھیری (ویسٹ)

بمبئی ۵۸ (اے۔ ایس)

٭ شریمتی خدیجہ عالم خوندمیری

۱۵/۱، ۱۱-۶-۱۲، سلیم نگر

حیدرآباد ۳۶

٭ ڈاکٹر معین شاکر

ڈپارٹمنٹ آف پولیٹکل سائنس

مرہٹواڑہ یونیورسٹی

اورنگ آباد

٭ شری بی۔ این۔ پانڈے

۱۳۸- آزاد سکوائر

ساؤتھ ملکہ

الہ آباد

٭ سردار سوہندر سنگھ سندھو

پی۔ این ۳۴/ لارڈ و والی روڈ

جالندھر

٭ سردار اقبال سنگھ

سیکٹر ۱۸-اے

کوارٹر نمبر ۵۹۳ چنڈی گڑھ

ہماری گذارش

سیٹھ کے لئے لمحۂ فکریہ

انڈین یونین مسلم لیگ کے صدر جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ یو۔ پی اسٹیٹ مسلم لیگ کی کرسیٔ صدارت پر بھی رونق افروز ہوگئے ہیں۔ کچھ لوگ اس کا یہ مطلب لگاتے ہیں کہ سیٹھ صاحب یو۔ پی میں ہونے والے انتخابات کو بہت اہمیت دے رہے ہیں۔ ایک دوسرا نظریہ یہ ہے کہ شیخ عبداللہ کے سیاسی افق پر نمودار ہونے سے بوکھلا گئے ہیں اور اپنے ہونے والے پیروکاروں کو ان کے سحر سے بچانے کے لئے سیٹھ صاحب نے خود اپنی صفوں کی سپہ سالاری کا بیڑا اٹھایا ہے۔ یو۔ پی سے واقفیت رکھنے والے حلقوں میں ایک تیسرا نقطۂ نظر بھی پایا جاتا ہے کہ یو۔ پی میں مسلم لیگ کی قیادت کے لئے کوئی ایسی شخصیت میسر نہیں آسکی جو مختلف عناصر کو جوڑ کر پارٹی کا ڈھانچہ کھڑا کرسکے۔ تینوں ہی باتیں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں۔

مسلم لیگ کے لئے یو۔ پی کے انتخابات کی اہمیت معمولی نہیں۔ اگر یو۔ پی میں لیگ ٹھکرا دی گئی تو اس کا مستقبل ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تاریک ہو جائے گا۔ کیرل میں بھی اس کے وقار کو دھکا لگے گا اور مسلم لیگ کا وہ عنصر جو کیرل سے باہر دیگر صوبوں میں لیگ کی سرگرمیوں کو پھیلانے کا مخالف ہے غالب آجائے گا اور سلیمان سیٹھ صاحب کی حیثیت اور اقتدار کو ضعف پہنچے گا۔ یہ بھی غیر ممکن نہیں کہ اس صورت میں ان کو سیاست سے ہی کنارہ کشی کرنی پڑے۔ یہ بات اب کھل کر سامنے آگئی ہے کہ کیرل میں لیگ کا ایک بہت بڑا حصّہ سیٹھ صاحب کی نئی پالیسی سے شدید اختلاف رکھتا ہے۔ ذمہ دار اور اندرونی واقفیت رکھنے والے کچھ لوگوں کا تو کہنا ہے کہ یونین مسلم لیگ کے جنرل سکریٹری سی۔ ایچ محمد کویا صاحب خود بھی اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ اسی کی سزا دینے کے لئے سلیمان سیٹھ صاحب نے ان کو کیرل کی وزارت سے علیحدہ کروا کر پارلیمنٹ میں بھیج دیا ہے۔ وہ تو شاید یہ بھی چاہتے تھے کہ ان کو آل انڈیا مسلم لیگ میں کوئی اہم جگہ نہ دی جائے لیکن اندرونی مجبوریوں کی وجہ سے انھیں جنرل سکریٹری بنانا پڑا۔ کویا صاحب اور ان کے ساتھیوں کا خیال ہے کہ سلیمان سیٹھ صاحب اپنی ذاتی اغراض کی خاطر مسلم سیاست کو ایسا موڑ دے رہے ہیں کہ جس سے ملک اور مسلمان دونوں کو نقصان ہوگا۔ ان حالات کے پیش نظر اگر صدر انڈین یونین مسلم لیگ یو۔ پی کی تنظیم اور یو۔ پی کے انتخابات کو اپنی زندگی اور موت کا سوال سمجھیں تو کوئی غیر قدرتی بات نہیں۔ صرف یو۔ پی کے مسلمانوں کو سوچنا ہوگا کہ ایک بار جناح صاحب کی خود پسندی کے خوفناک نتائج بھگتنے کے بعد کیا وہ کسی اور کو اسی طرح اپنی زندگیوں سے کھلواڑ کرنے کا موقع دیں گے۔

شیخ عبداللہ کے قومی سیاست میں حصّہ لینے سے سیٹھ صاحب کی لیڈرشپ کو خطرہ لاحق ہونا بھی قدرتی بات ہے۔ اگرچہ گذشتہ بیس سال سے شیخ صاحب ہندوستان کی مجموعی سیاست سے دور رہے ہیں لیکن اس بات سے کوئی بھی ذی ہوش شخص انکار نہیں کرسکتا کہ انھوں نے پچھلے چالیس برس کی ہندوستانی سیاست کے اتار چڑھاؤ کو اپنے قلب و ذہن پر جھیلا اور محسوس کیا ہے۔ انھوں نے فرقہ پرستوں کو بھی خوب پہچانا ہے اور جناحی جادو کا کامیابی سے مقابلہ بھی ہے۔ ان کے جذبۂ ایثار و قربانی اور ان کے پرخلوص عمل کا گہرا نقش سب کے دلوں پر ہے۔ میدان سیاست کی برائیوں، کوتاہیوں، غلط فہمیوں اور جگر سوز کاوشوں سے جو ان کی واقفیت ہے نئے دور کے جناحی طفل مکتب کیا سمجھیں گے۔ اپنے تمامتر تجربات کے بعد آج اگر وہ ملک کے ہندو مسلمانوں کو فرقہ وارانہ سیاست سے بچنے کی تلقین کریں تو ظاہر ہے ان کی بات کو اَن سنی کرنا ہوگا اور اگر ان کی بات سنی جائے گی تو جناب سلیمان سیٹھ کی کون سُنے گا؟ وہ لاکھ کہیں کہ شیخ صاحب کو اپنی سرگرمیاں وادیٔ کشمیر تک محدود رکھنی چاہئیں۔ لوگ جواب میں یہی کہیں گے کہ آپ کو بحرۂ عرب کا ساحل چھوڑ کر باقی ہندوستان میں اپنی سرمیاں پھیلانے کا جتنا حق ہے اُس سے کہیں زیادہ حق شیخ عبداللہ کو ہے۔ مؤخر الذکر کے سینے میں آپ سے زیادہ دردمندی اور ذہن میں زیادہ لمبے تجربے کی روشنی ہے۔ زبان کلچر اور مسائل کے نقطۂ نظر سے بھی دیکھا جائے تو شیخ عبداللہ سیٹھ صاحب کے مقابلے میں شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کے زیادہ قریب ہیں۔ شیخ صاحب کے حق میں جو سب سے بڑی بات جاتی ہے وہ یہ ہے کہ غیر مسلم حلقوں میں ان کو جو وسیع مقبولیت ہے اس سے مسلم مسائل کو قومی سطح پر سمجھانے اور حل کروانے میں جس قدر مدد مل سکتی ہے آتنی مسلم لیگ جیسی فرقہ وارانہ تنظیم سے نہیں مل سکتی۔ خطرہ اس کے برعکس یہ ہے کہ معاملات سلجھنے کی بجائے مزید اُلجھ جائیں گے۔

ان حالات کے پیش نظر اگر سلیمان سیٹھ صاحب ضرورت سے زیادہ ہاتھ پیر مارتے نظر آئیں تو ان کو الزام نہیں دینا چاہیئے۔ انھوں نے خود کو قائد ملت کہلوانا شروع کر دیا ہے اور خواب دیکھ رہے ہیں کہ عنقریب قائد اعظم کہلوائیں گے۔ لیکن ان کے خوابوں کی دنیا میں ایک تلخ حقیقت دخل انداز ہوگئی ہے۔ یو۔ پی میں مسلم لیگ کی آمد سے پہلے مسلم مجلس موجود تھی جس کے رہنما ڈاکٹر فریدی ان سے پہلے قائد ملت بننے کا اعلان کر چکے تھے۔ یو۔ پی میں ان کے مقابلے میں کسی بھاری بھرکم شخصیت کی ضرورت تھی۔ بصیر احمد خاں صاحب جن کو یو۔ پی میں مسلم لیگ کی تنظیم کا ٹھیکہ دیا گیا تھا صوبے کی حد تک مالکِ مطلق بن بیٹھے تھے۔ مسلم لیگ میں آنے سے پہلے بصیر صاحب مسلم مجلس کے ناظم اعلیٰ تھے۔ فریدی صاحب کو زِک پہنچانے کی حد تک تو وہ کار آمد تھے لیکن تنظیم کھڑی کرنے کے سلسلے میں ان کو زیادہ کامیاب ہونا مشکوک تھا۔ سیٹھ صاحب کے ساتھیوں نے انھیں سمجھایا کہ یو۔ پی کا کوئی بھی معتبر اور بااثر شخص ان کے ساتھ آنے کو تیار نہیں ہوگا۔ ان سے جب تنظیم میں باقاعدگی لانے کی بات کی گئی تو انھوں نے اپنے ہی ایک بھتیجا زاد بھائی کو صدر بنا دیا لیکن یہ کافی نہیں سمجھا گیا۔ سلیمان سیٹھ صاحب کا

خیال ہے کہ محض مسلم لیگ کے نام کا جادو اب نہیں چلے گا، تنظیم کا با اعتبار ہونا بھی ضروری ہے۔ لہٰذا انھوں نے خود کو داؤں پر لگا دیا ہے۔

سلیمان سیٹھ صاحب کی ان دنوں جو ذہنی حالت ہے اس کو دیکھتے ہوئے انھیں کسی قسم کا مشورہ دینا تو ایک طرح کی نادانی ہوگی۔ نہ جانے کس لالچ، کس مصلحت، کس غرض اور کس طاقت کے ایما پر یکایک اپنی کارکردگی اور اپنے نصب العین میں تبدیلی پر آمادہ ہوئے ہیں۔ مشورہ دینے والوں کو ان کا جواب غالباً تراجم کے علاوہ کچھ نہیں ہوگا۔ یہ بات ہم اس لئے کہہ رہے ہیں کہ ہم نے سیٹھ صاحب کو نہایت اعتدال و توازن سے غور و فکر کرتے بھی دیکھا ہے۔ جن دنوں کیرل میں کانگریس اور مسلم لیگ کی مفاہمت ہوئی ان دنوں وہ نہایت سنجیدگی سے اس بات پر بھی غور کر رہے تھے کہ مسلم لیگ کو ختم کر دیا جائے۔ وہ بڑے جوش اور سرگرمی سے کہا کرتے تھے کہ ہندوستان کے سیکولر کردار کو مضبوط کرنے کے لئے مسز گاندھی کی مضبوطی ایک شرط اور دلیل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور آج جو ہم ان باتوں کو دہرا رہے ہیں تو اس لئے کہ شاید وہ اپنے اس رویے سے دوچار ہو کر سوچنے لگیں کہ ان کا موجودہ رویہ ان کی اپنی اس زمانے کی یقین دہانیوں کے خلاف ہے۔ کیا ان کے اس رویے سے سیکولر طاقتوں اور ملک کے سیکولر کردار کو ضعف نہیں پہنچے گا؟

جب وہ مسلم لیگ کو ختم کرنے کی سوچ رہے تھے تب اور اب کے حالات میں کیا تبدیلی ہوگئی ہے؟ تقریروں میں وہ چاہے کچھ بھی کہیں لیکن وہ اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ جہاں تک مسلمانوں کے مفادات کا تعلق ہے حالات تب سے بہت بہتر ہیں۔ خشک سالی، گرانی اور اشیا کی کمی ہے تو سب کے لئے ہے ان کا مقابلہ کرنے کے لئے کچھ پالیسیاں وضع کی گئی ہیں جن سے اختلاف کا ابھی تک تو اظہار مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے نہیں ہوا۔ امورِ خارجہ کے متعلق بھی اعتراض کی گنجائش ان کو نظر نہیں آئی۔ مسلمانوں کے خصوصی مسائل میں سے مسلم پرسنل لا کے متعلق حکومت کی پالیسی تب سے اب زیادہ باعثِ اطمینان ہونی چاہیے۔ اردو پالیسی میں بھی خوشگوار اور مثبت تبدیلی دکھائی دے رہی ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مسئلے پر غور ہو رہا۔ مناسب اقدامات کرنے سے کسی کو انکار نہیں۔ معمولی اور فروعی اختلافات کی بنیاد پر ایسی روش اختیار کرنا جس سے سیکولر عناصر کے ساتھ مقابلہ ہو اور مسلم دشمن عناصر سے دوستی کہاں کی عقل مندی ہے؟

اور پھر اس بات پر بھی غور کرنا چاہیے کہ یوپی مسلم لیگ کی صدارت کے لئے اگر سیٹھ صاحب کو اپنے سوا کوئی نظر نہیں آتا تو یہ کاوش اور یہ تگ و دو بھی لاحاصل نہیں تو کیا ہے؟

پچھلے لوگ جنھوں نے مسلم مفادات کے جملہ حقوق بحق خود محفوظ کر لئے ہیں آجکل ان کو اندرا گاندھی سے بہتر ثابت کرنے میں مصروف ہیں۔ مستقبل کیا رنگ لاتا ہے، یہ تو وقت بتلائے گا۔ ابھی تو مرارجی بھائی خود فریبی اور افواہ بازی کی آزادی کے مزے لے رہے ہیں۔

شیشہ و تیشہ

...یہ اندازِ گفتگو...

ذکر ہے شری مرارجی بھائی ڈیسائی کے بیان کا جس میں انھوں نے مشتہر کرنے کی کوشش کی کہ پاکستان کے وزیر دفاع اور امورِ خارجہ عزیز احمد صاحب جب نمازِ جمعہ کے لئے دہلی کی جامع مسجد میں تشریف لائے تو وہاں پاکستان زندہ باد کے نعرے لگائے گئے۔ ان کے اس بیان پر روزنامہ پرتاپ نے ایک اداریہ سپردِ قلم کر دیا۔ معتبر ذرائع کے مطابق اس قسم کی کوئی اطلاع خفیہ پولیس کی طرف سے حکومت کو نہیں ملی۔ اخباری نمائندوں کی تعداد بھی اس روز جامع مسجد کے آس پاس کم نہیں تھی ان میں سے کسی نے یہ خبر نہیں چھاپی۔ اگر بالفرض نعرہ لگایا بھی جاتا تو کوئی مضائقہ نہ تھا آخر جب غیر ملکی سربراہ آتے ہیں تو ان کے استقبال کے لئے نعرے لگائے جاتے ہیں اور اخباروں میں ان کا تذکرہ بھی ہوتا ہے۔

مرارجی بھائی کے پاس کن ذرائع سے یہ خبر پہنچی اس کا حوالہ دینا انھوں نے ضروری نہیں سمجھا۔ شاید وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی مسکین صورت اور گاندھی جی کا حوالہ بار بار دینے کی ان کی عادت کو دیکھ کر ان کے منہ سے نکلی ہوئی ہر بات کو عوام دیو بانی سمجھیں گے۔ ان کو شاید یہ معلوم نہیں کہ عوام ان سے کس درجہ واقفیت رکھتے ہیں۔ ان کی ڈپٹی کلکٹری کے زمانے کے گودھرا کے فسادات سے لیکر احمد آباد کے فسادات تک ان کے بیانات اور کسی سے پوشیدہ نہیں اور اس کی بنیاد پر کوئی بھی کہہ سکتا ہے کہ مرارجی بھائی کا رویہ اقلیتوں کی جانب بدترین جن سنگھیوں سے مختلف نہیں۔ ان کے دماغ میں وہ تمام زہر آلود افسانے بھرے ہیں جو مسلم دشمن فرقہ پرست عناصر کے نظریات کا حصہ ہیں۔ مرارجی بھائی اسی رعونت اور طمطراق سے مسلمانوں سے وفاداری کا ثبوت مانگتے ہیں جس سے اٹل بہاری باجپئی یا بلراج مدھوک بھارتیہ کرن کی بات کرتے ہیں۔ کیا کیجئے گا اگر اس صورت حال پر کوئی "موسیرے بھائی" والی کہاوت یاد کر بیٹھے۔

افواہیں پھیلانا فرقہ پرستوں کا شیوہ رہا ہے اور قانون کی نظروں میں جرم لیکن اگر مرارجی بھائی یہ پیشہ اختیار کریں تو نہ وہ فرقہ پرستوں کے زمرے میں شمار ہونے کیلئے تیار ہوں گے نہ مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے ہوں گے۔ وہ کہیں گے میں گاندھی جی کی کانگریس میں رہا جواہر لال کے ساتھ منسٹر رہا اور اندرا گاندھی کی منسٹری میں ڈپٹی پرائم منسٹر ہوا مجھ کو فرقہ پرست یا مجرم قرار دینے والا کون ہے مجھے ایسی بات تب نہیں کہی گئی جب میں نے سری نگر یک جہتی کانفرنس کے وقت اندرا گاندھی کی بجائے اٹل بہاری باجپئی کی تائید کرنے کو ترجیح دی اور جب میں نے تاریخ دانوں کی تمام تر تحقیق و تعلیم کے خلاف اعلان کیا کہ ہندوستان کی غلامی کا عرصہ ایک ہزار سال سے زائد ہے۔

غالباً انھیں رجحانات کی وجہ سے اندرا گاندھی نے ۱۹۶۹ء میں ان کو خود ان کے الفاظ میں سڑے ہوئے بینگن کی طرح نکال پھینکا تھا۔ مرارجی بھائی کو اس حقیقت کے فراموش کرنے کا حوصلہ اسلئے بھی ملتا ہے کہ مسلم مجلس کے ڈاکٹر فریدی اور مسلم لیگ کے صدر سلیمان سیٹھ

شیخ عبداللہ سے خصوصی ملاقات



ہمارے خصوصی نامہ نگار کے قلم سے

دوسرے سیاستدانوں کے برعکس شیخ عبداللہ سے گفتگو کا کیف ہی کچھ اور ہے اور کیوں نہ ہو عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہوتا ہی ہے۔ شیخ صاحب کا لہجہ بلند بانگ اور پرشوکت ہے۔ وہ بنیادی اصولوں کی اصطلاح میں گفتگو کے عادی ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ مخاطب پر اعتماد نہیں کرتے وہ تو ایک کھلی کتاب ہیں جس کا جی چاہے دیکھ لے۔ البتہ ان کا طرز گفتار اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اُن سے پَرے جھانک کر دیکھا جاسکے۔

ان کی زندگی متنوع احساسات و جذبات سے منسوب ہے۔ شیریں، تند و ترش جذبے، امنگ، بیزاری، حزن و انبساط کے جذبات، وفاداری اور فریب کے رنگوں میں ملبوس دوستی اور تعلقات کے تجربے اور ناقابل تشریح و ناقابل شناخت رنگوں کے امتزاج پر مبنی احساسات سے ان کی زندگی معمور ہے۔ شیخ صاحب نے صداقت اور ایمانداری کے معیار مقرر کئے ہیں اور حتی الامکان ان کے مطابق زندگی بسر کرنے کی کوشش کی ہے وہ کہاں تک کامراں و کامیاب رہے اس کا تجزیہ تو مورخ ہی بہتر طور پر کرسکتا ہے لیکن ان کی کوششوں سے جو ناقابل فراموش خوش نما نقوش اُبھرے ہیں وہ شبہات سے بالاتر ہیں۔

انھیں دیکھ کر ملٹن اور اس کی ارفع سنجیدگی کی یاد آتی ہے۔ شیخ صاحب متنوع اور بوقلمون موضوعات کا احاطہ کرلیتے ہیں لیکن اس سے ہلکے پن کا احساس نہیں ہوتا یہاں تک کہ ان کی ژولیدگی اور جماعت بندی کے گرد بھی منور فلزاتی ہالہ موجود ہوتا ہے۔

شیخ صاحب نے کشمیر کی محدود سیاست سے نکل کر وسیع تر سیاسی افق کی تلاش کا فیصلہ کیا ہے اور اس فیصلے سے ملک کے گوشے گوشے میں سیکولر قوم پرست اور انسان دوست حلقوں میں جوش و مسرت کی لہریں دوڑ گئی ہیں سیکولر ڈیموکریسی بھی اس ولولہ انگیز مسرت کا شریک و سہیم ہے۔

شیخ صاحب سے متعدد اختلافات رہے ہیں اور مستقبل میں بھی اختلافات رہ سکتے ہیں کہ اس سے غالباً مفر بھی نہیں ہے لیکن سیکولرازم کے آدرشوں اور اصولوں پر ان کا جو مستحکم مستقل اور غیر متزلزل اعتماد ہے اور جو ان کے فکر و عمل سے مترشح ہے اس سے کوئی بھی دیانت دار شخص انکار نہیں کرسکتا۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور اخوت کے لئے انھوں نے جس ہمت اور جرأت کا مظاہرہ کیا ہے اس کی مثالیں شاذ و نادر ہی پیش کی جاسکتی ہیں وہ ایک سچے اور عبادت گزار مسلمان ہیں لیکن وہ اسلام کو اس کی صحیح انسان دوستی کے پس منظر میں دیکھتے ہیں، وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اسلام تمام بنی نوع انسان کو ایک دوسرے سے قریب تر لانے اور ان میں اخوت، ہم آہنگی، شعور اور امن کا داعی ہے اس لئے شیخ صاحب نے کبھی بھی دقیانوسی خیالات، رجعت پرستی اور احیا پرستی کی حوصلہ افزائی نہیں کی اور نہ ہی مذہبی جذبات اُبھار کر عوام سے کھیلنے یا سیاسی مفاد حاصل کرنے کے متعلق کبھی سوچا ہے۔ اس لئے جب انھوں نے قومی سیاست کے وسیع تر دائرے میں شمولیت کا فیصلہ کیا تو فطری طور پر ہم نے انھیں خوش آمدید کہا۔ اور ان سے ملاقات کی درخواست کی۔ ہم شیخ صاحب کے مشکور ہیں کہ انھوں نے نہایت خندہ پیشانی اور کشادہ قلبی کے ساتھ اثبات میں جواب دیا۔ یہاں یہ تذکرہ غالباً غیر مناسب نہ ہوگا کہ شیخ صاحب شری متی سبھدرا جوشی کی بے غرض ایثار و قربانی سے بے حد متاثر ہیں خاص طور پر ان کی فرقہ واریت مخالف تحریکوں اور سیکولر ڈیموکریسی کی بانی اور رہ نما ہونے کی حیثیت سے جو خدمات ہیں ان کی شیخ صاحب کافی قدر کرتے ہیں۔

راجدھانی میں شیخ صاحب کا حالیہ دورہ خاصہ مصروف پروگرام پر مشتمل تھا اس کے باوجود انھوں نے ہمارے لئے کچھ وقت نکال ہی لیا اور ہمیں اپنے کوٹلہ روڈ کی رہائش پر ۲۳ اگست کی صبح ملاقات کے لئے مدعو کرلیا۔ ان کی خواہش تھی کہ ملاقات مختصر سے مختصر ہو کیونکہ ان کے پاس وقت تھا ہی نہیں۔ ہم نے انھیں یقین دلایا کہ ضرورت سے زائد ایک لمحہ بھی صرف نہ ...

انھیں اسی دوپہر کو سری نگر کے لئے طیارگاہ جانا تھا اس کے باوجود انھوں نے سوالات سے سوا تو یعنی دو گھنٹے تک گفتگو کا موقع دیا اور جب جدا ہوئے تو ہم دونوں کو احساس تھا کہ ملاقات تشنہ رہی۔ دراصل

شیخ صاحب اور "سیکولر ڈیموکریسی" دونوں فرقہ واریت، رجعت پرستی، جارحانہ وطن پرستی اور علیحدگی پسندی کی قوتوں سے جنگ کے معاملے میں "ہم آدرش" ہیں۔ اس لئے "سیکولر ڈیموکریسی" کے نمائندے سے ان کی ملاقات محض ایک عام اخباری نمائندے سے گفتگو نہ تھی بلکہ دو دیوانوں کے مل بیٹھنے کا معاملہ تھا، دونوں کا مقصد افہام و تفہیم تھا، دونوں مسائل اور شخصیتوں تک رسائی کے طرز کی وضاحت کے خواہاں تھے۔ یہ مسائل ملک کے مستقبل کے لئے خاصے اہم ہیں لیکن ابھی تک ان کی طرف پوری توجہ نہیں دی جا سکی اس لئے جب ان مسائل پر یکساں اندازِ فکر کے حامل افراد مل بیٹھتے ہیں تو وقت کے مختصر ہونے کا احساس لابدی ہو جاتا ہے۔

شیخ صاحب سے یہ سرسری ملاقات دراصل ان طویل ملاقاتوں کے پیش خیمہ کی حیثیت رکھتی ہے جو فرقہ واریت سے رزم آرائی کے لئے گفتگو اور لائحہ عمل پر مبنی ہوں گی۔

شیخ صاحب قومی سیاست میں اپنی شمولیت کو کوئی نئی بات نہیں سمجھتے۔ نئے افق کی جستجو اور کل ہند قومی سیاست میں وسیع تر دائرہ ان کے نزدیک کوئی قابلِ تشریح معاملہ نہیں ہے۔ انھوں نے نہایت شد و مد کے ساتھ کہا کہ وہ ہمیشہ ہی سے قومی سیاست اور معاملات میں شریک اور پیش پیش رہے ہیں۔ انھوں نے تحریکِ آزادی میں حصہ لیا۔ اس کے آلام و مصائب سے دوچار ہوئے۔ کشمیر میں جاگیردارانہ تحریک کا مقابلہ کیا۔ ظاہر ہے ان سب کو قومی جد و جہدِ آزادی سے الگ نہیں کیا کیا جا سکتا۔ ملک کی آزادی مشترکہ قومیت اور متحدہ ہندوستان کے احساس کے ارتقا میں ان کی حیثیت جزوِ لازم کی ہے۔ آدرش جو ان کے رگ و پے میں جاری ہے اسی تکمیل کے لئے انھوں نے نیا کشمیر پروگرام کی تشکیل کی اور کشمیر کو نیا رنگ و روپ دے کر اس کی آرائش کی کوشش کی۔ وہ غالباً ہراول کے ان لوگوں میں تھے جو ملک کے تسلیم شدہ منصوبوں کو عملی جامہ دینے کی سعی کر رہے تھے۔

اگر شیخ صاحب کچھ عرصہ تک قومی سیاست سے الگ تھلگ رہے تو اس کے لئے بھی انھیں موردِ الزام نہیں قرار دیا جا سکتا۔ انھوں نے نہایت زور دار لہجہ میں کہا کہ ملک کے چند افراد کی ذہنیت نے انھیں گوشہ نشینی پر مجبور کر دیا تھا۔ لیکن وہ اچھی طرح یہ سمجھتے ہیں کہ شکوہ و شکایت یا اظہارِ افسوس سے کچھ حاصل نہیں۔ کسی بھی مقدس مقصد کے لئے مصائب و آلام برداشت کرنا ہی پڑتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ گاندھی جی نے تو اس کے لئے اپنی تمام متاعِ حیات ہی صرف کر دی۔ ان کے مقابلے میں بھلا میں نے کون سے مصائب جھیلے ہیں یا کیا کھویا ہے؟ انھوں نے خدا کا شکر ادا کیا جس نے انھیں حق و باطل کے ان جاں گسل امتحان سے کامران گزرنے کی قوت عطا کی اور وہ اپنے بنیادی عقائد یعنی سیکولرازم جمہوریت اور سماجی انصاف پر اٹل رہے۔ جب میں نے ان سے دریافت کیا کہ کیا آپ صورتِ حال میں کوئی اس طرح کی تبدیلی محسوس کرتے ہیں جس کی بنا پر یہ سمجھا جائے کہ آپ کی راہ میں پھر وہی دقیانوسی رجعت پرست مزاحم نہ ہوں گے؟ انھوں نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے کہا کہ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب افہام و تفہیم کی فضا پیدا ہوئی ہے۔ اور اس لئے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ عوام سے میرے رابطہ ملاقات اور حرکات و سکنات کو شکوک کی نگاہوں سے نہ دیکھا جائے گا۔

اسی ضمن میں انھوں نے ۱۹۶۸ء کے ایک واقعہ کا تذکرہ کیا میرٹھ میں جمعیۃ العلماء کا جلسہ تھا جس میں انھوں نے خطاب کیا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر چند لوگوں نے فرقہ وارانہ فساد کے لئے فضا ہموار کر لی اور الزام ان کے سر ڈال دیا۔ اس وقت کے وزیر اعلیٰ اتر پردیش نے انھیں ریاست کے دوسرے شہروں میں دورہ نہ کرنے کی ہدایت کی۔ انھوں نے توقع ظاہر کی کہ اب انھیں شاید ان حالات سے دوچار نہ ہونا پڑے گا انھوں نے اس کی بھی امید ظاہر کی کہ وہ ہندوستانی معاشرے میں ان آدرشوں کے لئے جذبات بیدار کرنے میں حصہ لیں گے جن پر ان کا ایقان ہے اور ان سیکولرازم اور جمہوریت پر مبنی آدرشوں کی توسیع کے لئے کوشش کریں گے۔ نہایت ہی اندوہ گیں لہجہ میں وہ بولے کہ اب سیاست عوامی خدمت نہیں رہی۔ سیاست داں حضرات نہایت تیزی کے ساتھ اقتدار اور دولت کی ہوس میں ان کا تعاقب کر رہے ہیں۔ نہایت ہی حیرت و استعجاب کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ کیا اس چوہے دوڑ کو ختم کرنے کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا جا سکتا؟ آئین میں ترمیم، بدعنوانیوں اور دیگر برائیوں کے خلاف عوامی تحریکوں میں اضافہ، قومی ہمدردی کے جذبات کی نشو و نما یا اس قسم کی کچھ دیگر باتیں سدباب نہیں ہو رہی ہیں

جس مسئلہ سے شیخ صاحب کا فطری طور پر تعلق یا دلچسپی ہے وہ فرقہ واریت ہے۔ ان کا خیال ہے کہ شک و شبہات اور غلط فہمیوں کی وہ خلیج جس نے دو عظیم فرقوں کو منقسم کر دیا اس کا سدباب ہونا چاہیئے۔ اس درد کا مداوا ضروری ہے۔ اس خلیج کو پاٹنا ناگزیر ہے۔ اس کے بغیر قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ ملک فروغ نہیں پا سکتا۔ لیکن اس کے لئے اولین شرط ہے۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کسی بھی فرقے یا طبقے کو الگ تھلگ خول میں سمٹ کر رہنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ اور نہ ہی پورے معاشرے اور ملک سے کٹ کر کوئی طبقہ یا فرقہ اپنی ترقی و فلاح کی کوششوں میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ شیخ صاحب کی تشخیص درست ہے۔

درخت جڑ پہ ہے قائم تو استوار بھی ہے
خزاں ہے اس پہ کبھی اور کبھی بہار بھی ہے

کوئی بھی فرقہ اگر اپنے قوم و ملک سے کٹ کر کچھ کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کی حیثیت بے جڑ کے پودوں کی سی ہے۔ شیخ صاحب کو یقیناً مسلم رہنماؤں سے مل کر یہ احساس ہوا ہوگا اور جیسا کہ انھوں نے کہا کہ مسلم فرقے کے دیگر لوگوں اور رہنماؤں سے گفتگو کر کے انھیں اندازہ ہوا ہے کہ وہ سب دل برداشتہ ہو چکے ہیں۔ مایوس اور دل شکستگی کے شکار ہو چکے ہیں اور اس پژمردگی کے ظلمات سے ایسے مسائل جنم لے رہے ہیں جو متعدی اور مزمن ہیں۔ مسلمانوں کو اس دلدل سے نجات دلانے

کی اشد ضرورت ہے۔ وقت کی آواز یہ ہے کہ وہ قومی زندگی میں اپنا مقام اور مرتبہ حاصل کریں اور اس کے لئے انھیں تعاون اور حوصلہ کی ضرورت ہے۔ مسلمانوں میں بددلی اور اذیت کوشی کے رجحانات کافی گہرے ہوگئے ہیں اور یہ رجحانات غیر مسلموں سے گہری بے اعتمادی کی صورت اختیار کر رہے ہیں۔

انھیں مشاہدات اور احساسات کی بنا پر وہ پہلے مسلمانوں میں کام کرنا چاہتے ہیں تاکہ ان کا اعتماد بحال ہوسکے۔ ان کی قنوطیت میں رجائیت کی روح پھونکی جاسکے تاکہ ان میں دوسروں پر بھروسے کی صلاحیت پیدا ہو۔

وہ بول رہے تھے اور مجھے غالب کا یہ شعر یاد آرہا تھا ؎

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد
ڈرتا ہوں آدمی سے کہ مردم گزیدہ ہوں

لیکن یہ احساس تو صحت مندانہ نہیں مریضانہ ہے۔ شیخ صاحب یہ جانتے ہیں۔ اسی لئے وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان قومی سیاست میں کھل کر حصہ لیں۔ ظاہر ہے مسلمان اپنے خود ساختہ خول تنہائی سے باہر آئے بغیر یہ کیسے دیکھ سکیں گے کہ جن مصائب، مشکلات اور بلاؤں سے وہ خوفزدہ ہیں وہ صرف انھیں کے لئے وقف نہیں ہیں ان سے دوسرے اہلِ مذاہب بھی دوچار ہیں اور خاص طور پر ہریجن۔ اسی لئے شیخ عبد اللہ مسلمانوں کو سیاسی اعتبار سے بلند مقام کرنے کے لئے انھیں ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر لانا چاہتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اسی طرح اقتصادی، تعلیمی اور معاشرتی سربلندی حاصل کی جاسکتی ہے۔

شیخ صاحب یہ ہرگز نہیں چاہتے کہ مسلمان بھی موجودہ مروجہ سیاسی جوہے دوڑ میں شریک ہوں یا کوئی الگ سیاسی جماعت بنالیں۔ ڈیڑھ اینٹ کی مسجدیں الگ بنانے والے سیاسی بازیگر مذہبی جذبات سے کھیل کر مسلمانوں کا استحصال کرنا اور اپنا سیاسی مفاد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ماضی میں بھی اس طرح کی سیاسی جماعتوں نے مسلمانوں کو الّو بنا کر اپنا مفاد حاصل کیا تھا اور اب پھر انھیں بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ شیخ صاحب کے خیال میں یہ فرقہ پرست سیاسی جماعتیں مسلمانوں کی لاش پر گدھ کی طرح منڈلا رہی ہیں۔ اسی لئے وہ فرقہ پرستوں سے کسی بھی قسم کے سمجھوتے کے خلاف ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ مسلمان فرقہ پرستوں کے نعرے کی مسکرات پی پی کر اس کے اس قدر عادی ہوگئے ہیں کہ فرقہ پرستوں سے فوری سمجھوتہ مسلم عوام سے رابطہ قائم کرنے کی راہ کا سب سے بڑا پتھر بن جائے گا۔ مسلمانوں کے طرز فکر اور رجحانات میں بتدریج تبدیلی اور لچک پیدا کی جاسکتی ہے اچانک نہیں۔ دراصل مسلسل فسادات اور سماجی و معاشی پس ماندگی نے ان میں امتیازی ذہنیت پیدا کر دی ہے۔ اور یہ اس قدر راسخ ہے کہ کوئی بھی فکری یا سیاسی جھٹکا ان کو منحرف نہیں کرسکتا۔

شیخ صاحب نے کہا کہ فرقہ واریت کے بڑھتے ہوئے رجحان کو روکنے میں حکام بھی معاون ہوسکتے ہیں انھیں مسئلے کو سمجھنا اور سمجھانا چاہیئے، پہل کرنا چاہیئے گرم جوشی کا مظاہرہ کرنا چاہیئے، فرقہ واریت پر قابو پانے اور فرقہ وارانہ احتجاج کی روک تھام کرنا چاہیئے اور انصاف کے نظم سے زیادہ انتظامیہ کو چاق و چوبند کرنا چاہیئے۔ فرقہ وارانہ بنیاد پر جو کچھ بھی ہوگا اس سے اشتعال اور جارحیت پیدا ہوگی۔

انھوں نے سمپردائکتا ورودھی کمیٹی کے کارناموں کی مثال دی اور کہا کہ اس تحریک نے سمدرا جوشی کی رہنمائی میں مسلمانوں کو تحریک دینے کی قابل تعریف کوشش کی ہے اور اس سے مسلمانوں میں بیداری اور خود اعتمادی پیدا ہوئی ہے لیکن نہایت ہی عجلت کے ساتھ مسلم یونیورسٹی ترمیمی قانون منظور کرکے حکومت نے مسلمانوں کے تمام فرقوں کو برانگیختہ کر دیا ہے۔ فی الحال اس سے بحث نہیں کہ یہ ردعمل ضروری اور مناسب ہے یا غیر ضروری سیاسی معاملات میں بھی لوگوں کے جذباتی تعلقات کا احترام کیا جانا چاہیئے۔

اس سوال پر کہ ان میں یہ سیکولر نقطۂ نظر کیسے پیدا ہوا؟ انھوں نے ماضی میں جھانکتے ہوئے کہا کہ انھوں نے یہ کسی فرد یا کتاب سے اخذ نہیں کیا۔ البتہ انھیں مہاتما گاندھی کی مثال سے تحریک ملی ہے اور وہ جواہر لال نہرو کے طرز فکر سے بھی متاثر ہوئے ہیں لیکن انھوں نے سیکولرازم کا سبق اسکول ہی کی زندگی میں سیکھا وہ جس معاشرتی فضا میں سانس لے رہے تھے اس نے انھیں یہ سمجھنے پر مجبور کیا تھا کہ وہ لوگ اس لئے بے انصافی کے شکار ہیں کہ وہ مسلمان ہیں۔ اس احساس کا پہلا ردعمل یہ ہوا کہ وہ مسلمانوں کو مسلم کانفرنس کے تحت منظم کرنے کے لئے ہمہ تن مصروف ہوگئے۔

عوامی رہ نما کی حیثیت سے انھوں نے پوری ریاست کا دورہ کیا۔ وہ کشمیر کے طول و عرض میں گئے اور اس دوران انھوں نے محسوس کیا کہ یہ جبر اور استحصال مذہب کی بنا پر نہیں تھا بلکہ یہ طبقاتی تھا۔ افسر بدعنوان اور بے رحم تھے جو مذہب کے احترام سے واقف نہ تھے۔ وہ مفاد پرست غریب عوام کو لوٹ رہے تھے۔ اور اس لوٹ، اس جور و استبداد میں ہر مذہب کے لوگ شریک تھے وہ اپنے ہم مذہبوں سے بھی کوئی رو و رعایت نہیں کرتے تھے۔ علاوہ ازیں بہت سے غیر مسلم نوجوان مثلاً ڈی۔ پی۔ دھر اور کلم وغیرہ بھی تھے جو انھیں کی طرح اس استبداد اور استحصال کے خلاف تھے۔

یہی تجربات و مشاہدات تھے جو ان کی تحریک میں سیکولر نقطۂ نظر کی صورت میں فروغ پاگئے اور مسلم کانفرنس نیشنل کانفرنس میں بدل گئی۔

شیخ صاحب کا خیال ہے کہ وہ اس تبدیلیٔ عمل کے واسطے سے جلد ہی ہندوستانی مسلمانوں کی رہنمائی کرسکنے میں کامیاب ہوں گے۔

ہماری خواہش ہے کہ وہ کامیابی سے ہم کنار ہوں۔



ہند پاک معاہدہ پر دستخط

۱۲ دنوں کی داستان

۱۷ اگست

۱۸ دنوں بعد کل پھر گفتگو شروع ہو گی۔ اسلام آباد کے ہشت روزہ مذاکرات جنگی قیدیوں پر مقدمات، اور بنگلہ دیش سے غیر بنگالیوں کی پاکستان میں منتقلی کی تعداد پر اختلاف کی بنا پر ناکام رہ گئے۔ اور تقریباً ڈھائی لاکھ افراد کی قسمت کا فیصلہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ یہ افراد اپنے وطن اور اپنے عزیزوں سے دور مصائب جھیل رہے ہیں۔ پائیدار امن کے لئے ان کی وطن کو واپسی ناگزیر ہے۔ ہند بنگلہ دیش اس کوشش میں مصروف ہیں لیکن پاکستان کیا اب بھی ان دونوں معاملات میں بے لچک رویہ اپنائے رہے گا؟ اس کا جواب کل صبح مل جائے گا اس سے پہلے بھی مل سکتا ہے۔

۹۰ منٹ کے دورہ ڈھاکہ سے ہکسر دو گھنٹے پہلے واپس آئے ہیں۔ اب موجودہ مذاکرات کے ضمن میں ہند بنگلہ دیش کا ایک مشترکہ اندازِ فکر ابھر آیا ہے۔ اخباری نمائندوں، کیمرہ والوں اور ریکارڈ کرنے والوں کا ہجوم طیارہ گاہ پر پاکستانی وفد کا منتظر ہے۔ طیارے کے انجن کی آواز رفتہ رفتہ نزدیک ہوتی جا رہی ہے پھر ۲ سیٹوں والا پاکستانی افواج کا طیارہ اتر آتا ہے۔ دس افراد پر مشتمل وفد کو ہکسر خوش آمدید کہتے ہیں۔ وفد کے ساتھ پاکستانی اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے دس نمائندے ہیں۔ کیمرے کے فلش چمک اٹھتے ہیں۔ عزیز احمد تین صفحات پر مشتمل بیان پڑھتے ہیں تقسیم کے لئے وہ کافی تعداد میں کاپیاں ساتھ لائے ہیں۔

"ایک سال پہلے میں یہاں آیا تھا۔ امن کے مشن پر پھر دہلی آکر میں بے حد مسرور ہوں"۔

شملہ معاہدہ کے بعد عزیز صاحب کی یہ دوسری آمد تھی۔ گذشتہ سال وہ جموں وکشمیر پر کنٹرول لائن کے معاملہ پر گفتگو کے لئے یہاں تشریف لائے تھے۔ انھوں نے اسلام آباد کی گفتگو کا حوالہ دیتے ہوئے کہا "وہاں گفتگو میں قابلِ قدر پیش رفت ہوئی تھی امید ہے کہ یہاں ہمارے درمیان معاہدہ ہو جائے گا"۔ ہکسر صاحب نے بھی اسی طرح کی توقعات کا ڈھاکہ میں اظہار کیا تھا۔

عزیز صاحب نے شملہ معاہدہ کے نفاذ کے سلسلے میں پاکستانی عزم مصمم کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اگر ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ اس وقت تک برصغیر کی صورت حال معمول پر نہیں آئے گی جب تک ۹۰ ہزار سے زائد پاکستانی شہری ہندوستانی خیموں میں مقید ہیں۔ تو کیا ہمارا موقف غیر منصفانہ ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ انھوں نے بنگلہ دیش میں پاکستانی خاندانوں عورتوں اور بچوں کی مشکلات کا کوئی خیال نہیں کیا اور نہ ہی ان بنگالیوں کے متعلق کچھ غور کیا جو پاکستان میں مصائب جھیل رہے ہیں۔ دراصل پاکستان کا نظریہ جانب دارانہ اور نسل پرستانہ ہے۔ ہند بنگلہ دیش مشترکہ پیش کش نے ان تینوں جماعتوں کے مسائل کے حل کی تجویز رکھی تھی۔ ہکسر صاحب نے بالکل ہی درست کہا تھا کہ انسان انسان ہے خواہ وہ وردی میں ہو، خواہ معمولی کپڑوں میں۔ مسز گاندھی نے یوم آزادی کے موقع پر اپنی تقریر میں کہا تھا کہ اگر آئندہ مذاکرات میں جنگی قیدی پاکستان واپس نہیں جا سکے تو اس کی تمام تر ذمہ داری پاکستان پر عائد ہو گی۔

عزیز احمد نے آج کہا کہ وہ ہندوستانی مسائل کے حل کے لئے یہاں آئے ہیں۔ انھوں نے ہند بنگلہ دیش مشترکہ پیش کش کے معروض کی تعریف کی۔ اس طرح غالباً پہلی بار پاکستان کے کسی سرکاری وفد نے ہند بنگلہ دیش مشترکہ پیش کش کے نقطۂ نظر کا خیرمقدم کیا۔

عزیز صاحب نے ایک اور معنی خیز اشارہ کیا وہ یہ کہ ہمارا ابھی خیال ہے کہ اس مسئلہ کو انسانی پس منظر میں ہی حل کیا جا سکتا ہے اسے سیاسی یا جنگی مسائل سے الگ ہی رکھنا چاہیئے اگر ہم نے اس نہج میں گفتگو کی تو مسائل کے حل میں دشواری نہ ہوگی۔

بنگلہ دیش نے اپنی طرف سے پہلے ہی دو موضوعات پر تطبیق کا مظاہرہ کر دیا تھا جو سنگِ راہ ثابت ہو چکے تھے وہ یہ کہ بنگلہ دیش میں مقیم پاکستانیوں کی تعداد کا تعین ایک غیر جانبدار ایجنسی کرے گی اور جنگی مجرموں پر مقدمے کے التوی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لئے کہ ابھی مقدمے کی تاریخ کا تعین ہی نہیں ہوا۔

صحافیوں نے اب سوالات کی بوچھار کر دی ایک نمائندے نے قیدیوں پر مقدمات کے استرداد کے متعلق شیخ صاحب کی مبینہ رضامندی کا حوالہ دیا جس کا عزیز صاحب نے خیرمقدم کیا اور کہا کہ اس سے مکسر صاحب اور ہمارے لئے معاہدے تک رسائی میں سہولت پیدا پیدا ہو جائے گی۔ اس کے بعد چند اور سوالات ہوئے ان کے جوابات دیئے گئے۔

پھر عزیز صاحب اور مکسر صاحب کار میں داخل ہوئے جس پر ہند و پاک کے جھنڈے لہرا رہے تھے کار اشوہوٹل کی طرف روانہ ہو گئی۔

آج صبح وزارت برائے بیرونی امور کے کانفرنس ہال میں گفتگو شروع ہو گئی ہمیں اچھے توقعات رکھنے چاہیئں۔

<u>۱۸ر اگست</u>

پہلے دن تین اہم انسانی مسائل پر گفتگو ہوئی مشاہدین کا اندازہ تھا کہ گفتگو میں پیشِ رفت ہو رہی



محبت کے حضور میں

دو موضوعات پر اختلاف گہرے ہیں پاکستانی چاہتے ہیں کہ وہ ۱۹۵ پاکستانی قیدیوں کے مقابلے میں ۲۰۳ بنگالیوں کو روک لیں اور ہندوستان چاہتا ہے کہ ۲۶۰۰۰ پاکستانی شہریوں کو جو ڈھاکہ کے لئے پریشانی کا باعث بنے ہوئے ہیں بلاتاخیر پاکستان واپس لے لے۔ دونوں وفود کے تمام ارکان دوران بحث حاضر رہے۔ گفتگو کا محور پاکستانی قیدیوں پر مقدمات اور بنگلہ دیش میں مقیم پاکستانی شہری تھے۔

کانفرنس ہال میں صبح کی نشست شروع ہوئی۔ وزیراعظم اپنے دفتر میں منتظر ہیں وفود نے آج ڈھائی گھنٹہ تک گفتگو کی۔ وزیراعظم کو گفتگو کے پہلوؤں اور مختلف نہج سے آگاہ کیا جاتا رہا۔

بیرونی امور کی وزارت کے گیٹ کے قریب اتفاقاً عزیز احمد کی ملاقات شیخ عبداللہ سے ہو گئی۔ شیخ عبداللہ وزیراعظم سے گفتگو کے بعد اپنی کار کے منتظر تھے دونوں گرم جوشی سے گلے ملے۔

"شیخ صاحب اب آپ کچھ زیادہ جوان نظر آ رہے ہیں۔" عزیز احمد نے کہا۔ شیخ صاحب جواب میں مسکرا کر رہ گئے۔

پھر مسٹر عزیز احمد پیلو مودی کی رہائش گاہ پر ظہرانہ کے لئے کار میں سوار ہو گئے۔ شاید یہ مسٹر بھٹو کی خواہش تھی۔

مسٹر مکسر اخبار نویسوں میں گھرے ہیں وہ کہتے ہیں "میں نے راولپنڈی میں جو یہ بیان تھا کہ پاکستانی رویہ قدرے منفی ہے اس پر عزیز احمد نے مجھے ٹوکا ہے۔" وہ اپنی وضاحت کر رہے ہیں۔ "وہ اس سے خاصے پریشان ہیں۔ میرا مقصد یہ ہرگز نہ تھا کہ راولپنڈی کی گفتگو قطعی نتیجہ خیز نہیں رہی۔ درصل یہ بہت حل تک بارآور تھی منفی سے میرا مطلب صرف یہ تھا کہ جس حد تک مجھے خلیج کم ہونے کی توقع تھی وہ نہ پوری ہو سکی۔"

وفود دو گھنٹوں کے لئے دوبارہ ملتے ہیں۔

اخبار نویس پیش رفت جاننا چاہتے ہیں۔ آغا شاہی کہتے ہیں کہ دونوں وفود اپنی اپنی صورت حال پر گہرائی سے تبصرہ کر رہے ہیں۔ اہم ترین مسائل پر فاصلہ کم ہونے کے امکانات روشن ہو گئے ہیں۔ ہم زیادہ سے زیادہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں اس کی توقع ہے کہ گفتگو نتیجہ خیز ہو گی۔ گویا پیش رفت ہوئی۔ ہندوستان اس کے لئے کوشاں ہے کہ وہ ایک ایسے معاہدے تک پہنچ جائے جو بنگلہ دیش کے لئے بھی قابلِ قبول ہو۔

شاید بات چیت تین چار دنوں جاری رہے گی۔ پاکستانی وفد کے چند ارکان آگرے جانے والے ہیں

اگر عزیز احمد ان کے ساتھ نہیں گئے تو شاید وہ کل کچھ مزید رسمی ملاقات کریں گے اور ہوسکتا ہے کہ وہ مسٹر بھٹو سے بھی رابطہ قائم کریں۔

آج مسٹر ہکسر پاکستانی وفد کے سربراہ کے اعزاز میں عشائیہ دے رہے ہیں۔

۱۹ اگست

آج مذاکرہ نہیں ہوا۔ پاکستانی وفد کے متعدد ارکان اور صحافی دید مناظر کے لئے آگرہ چلے گئے عزیز احمد آغا شاہی متعمد برائے امور خارجہ اور ڈائرکٹر جنرل عبدالستار رہ گئے ہیں۔ کل کی گفتگو کی روشنی میں اسلام آباد سے مزید ہدایات کے لئے رابطہ قائم کیا گیا مسٹر عزیز احمد تمام دن مصروف رہے۔

ہندوستانی وفد بنگلہ دیش سے رابطہ قائم کر رہا ہے کچھ ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ جنگی قیدیوں کے التوائے کا مسئلہ اب ناقابل تسخیر معاملہ نہیں رہا۔ لیکن دوسرے مسائل اب بھی اٹکے ہوئے ہیں۔ قومیت کے تصفیہ کے معاملہ میں کسی کو بھی مداخلت کی اجازت نہیں دی جا سکتی یہ دونوں ممالک کے معاہدے کے تحت ہی حل ہو سکتا ہے ....۲۶ ہزار غیر بنگالیوں کی پاکستان واپسی کا انحصار اسی پر نہیں ہونا چاہیئے۔ اس مسئلہ کی وجہ سے مذاکرات کی پیش رفت رک سکتی ہے۔

دوپہر میں چہل قدمی کرتے ہوئے عزیز احمد جانکیہ پوری گئے۔ انھوں نے اپنے ارکان وفد کو جو آگرے میں تھے جلد ہی آنے کی ہدایت کی۔ اہم مسائل پر گفتگو کے لئے مختصرات تیار کئے جانے والے ہیں۔ پیش رفت کس قدر تیز رو ہے اس کا اندازہ کل دوپہر کو ہو سکے گا۔

مسٹر عزیز احمد مسز اندرا گاندھی سے ملنا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے یہ حوصلہ افزا ثابت ہو۔

پیلو مودی نے عزیز احمد سے ملاقات کی۔

آغا شاہی اپنے قدیم ہم جماعت پروفیسر نور الحسن کے یہاں ظہرانہ میں شریک ہوئے۔

پھر آرام ملاحظہ، تیاریاں مشترکہ طور پر جاوی ہیں۔



شہید امن کے دربار میں۔ دست بہ دعا

۲۰ اگست

دوپہر سے پہلے مذاکرہ نہیں ہوا مسٹر عزیز احمد نے صبح یوجنا بھون میں ڈی۔ پی۔ دھر سے ۹۰ منٹ تک ملاقات کی۔ مسٹر ڈی۔ پی۔ دھر نے گزشتہ اپریل کو گفتگو شروع کی تھی۔ "ملاقات ایک دوسرے کے نقطہ نظر کو سمجھنے کی کوشش ہے" مسٹر ڈی۔ پی۔ دھر نے اظہار خیال کیا میں نے اس آدرش کی تکمیل کے لئے جو میرے گوشۂ دل سے بے حد قریب ہے کسی طرح کی دلچسپی اور تعاون کو فراموش نہیں کیا ہے۔ ہمارا آدرش یہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان بلکہ تمام برصغیر کے درمیان پائیدار امن اور دوستی استوار ہو" آغا شاہی اور حبیب بھی موجود ہیں

یوجنا بھون سے عزیز احمد ۰ منٹ کے لئے سورن سنگھ کے یہاں ساؤتھ بلاک گئے ہیں۔ ان کے درمیان کس طرح کی گفتگو ہوئی، یہ ظاہر نہ ہو سکا۔

دوپہر کو وفود میں ۵ منٹ کی مختصر ملاقات ہوئی۔ مسٹر ہکسر نے ایک صحافی کے جواب میں کہا کہ اگر میں یہ کہوں کہ کل بھی گفتگو ہوگی تو اسے پیش رفت نہیں کہا جا سکتا۔ مجھے توقع ہے کہ ہم کچھ نہ کچھ کریں گے۔

مذاکرہ اس مرحلہ میں ہے کہ دونوں فریق ایک دوسرے کے نقطہ نظر سے اچھی طرح واقف ہو چکے ہیں۔ اب داد و ستد کا سوال ہے۔ فی الحال مقدمہ ملتوی کیا جا سکتا ہے۔ بقیہ قیدیوں کو رہا کر دیا جائے۔ پاکستان ۲۰۳ بنگالیوں کو روکنے پر بضد ہے۔ وہ بنگلہ دیش کے پاکستانیوں کی واپسی کے سلسلے میں متعدد شرائط عائد کرنا چاہتا ہے۔ ہندوستان تعداد سے زیادہ "تعریف" پر زور دے رہا ہے۔ پاکستان کی ۲۰۳ بنگالیوں کو رکھنے کی ضد مذاکرات پر خراب اثرات ڈال سکتی ہے۔ وہ سختی کے ساتھ اس پر بضد ہے۔

دوپہر کو کسی نے یہ افواہ اڑائی کہ دونوں وفود جنگی قیدیوں سے متعلق کسی فیصلے پر پہنچ چکے ہیں۔

وفود کل بھی ملاقات کریں گے۔

آج شام عزیز احمد کو مسز گاندھی سے ملنا ہے۔ یہ ملاقات مذاکرات کے نتیجہ پر اچھے اثرات مرتسم کرنے کا باعث ہوگی۔

ہکسر کے اعزاز میں ظہرانہ دیا گیا۔

۲۱ اگست

مباحثہ کی رفتار بے حد سست ہے۔ وفود نے محض رسمی مباحثہ میں ۲ گھنٹے صرف کئے۔ آج کی میٹنگ مسز گاندھی کی رہائش گاہ صفدر جنگ روڈ پر ہوئی۔

مسٹر عزیز احمد نے مسٹر بھٹو کا زبانی پیغام

مسز گاندھی تک پہنچا یا اور انھوں نے غیر تحریری جواب بھی حاصل کر لیا۔ ۷۵ منٹ کی ملاقات میں وفود کے مقتدر ارکان نے شرکت کی۔ مسز گاندھی کی رہائش گاہ سے برآمد ہونے کے بعد عزیز احمد کافی سست نظر آئے اور متعدد سوالوں کے جوابات دینے سے انکار کر دیا۔ کار میں داخل ہوتے ہوئے انھوں نے کہا کہ میں اب لوگوں سے مزید کچھ نہیں بتاؤں کا مجھے پریشان نہ کریں۔ بہرکیف انھوں نے ملاقات کو خوشگوار اور مفید قرار دیا۔ ان کا لہجہ حسب معمول پر اعتماد اور مثبت تھا۔ ہم اب بھی آگے بڑھ رہے ہیں۔ ہم فیصلے سے قریب تر نہیں چلایا جائے گا۔

سورن سنگھ کے یہاں دعوت میں بھی تبادلۂ خیالات ہوا۔

باوثوق ذرائع کے مطابق ہندوستان نے بنگلہ دیش کی رضامندی سے یہ یقین دہانی کرائی کہ پاکستانی قیدیوں پر مقدمہ کے سوال کو تصفیہ کی راہ کا پتھر نہیں بننے دیا جائے گا۔

مسز گاندھی کا پیغام مسٹر بھٹو تک پہنچا دیا گیا پاکستانی وفد کو بدھ کو مذاکرے کے لئے غالبًا تازہ ہدایات مل گئیں۔



صدر جمہوریہ ہند کے ساتھ، عزیز احمد،

ہیں۔ صداقت سے قربت کی بہت سی صورتیں ہو سکتیں ہیں

متعدد نکات پر اختلافات کم ہوئے ہیں۔

دونوں وفود کو ابھی بہت سی رکاوٹیں دور کرنی ہیں چند مشاہدین کا خیال ہے کہ گفتگو کا تیسرا دور ناگزیر ہے۔ اگر اختلافات کل یا جمعرات تک ختم نہیں ہوئے۔

پاکستان ابھی تک اس تعریف کے تعین پر متفق نہیں ہو سکا ہے کہ بنگلہ دیش میں پاکستانی شہری کون ہیں۔ پاکستان کی تعریف کے مطابق بنگلہ دیش میں مقیم پاکستانیوں کی بہت بڑی تعداد غیر پاکستان قرار پائے گی۔ علاوہ ازیں مسٹر عزیز احمد نے ابھی تک اس کی یقین دہانی نہیں کرائی ہے کہ بنگالیوں پر مقدمہ

کسی پاکستانی ترجمان نے غیر ملکی نامہ نگاروں کو بتایا کہ مذاکرہ ٹھپ ہے راولپنڈی کے پہلے دور کی گفتگو سے بات آگے نہیں بڑھی ہے۔

۲۲ اگست

دونوں وفود معاملات اور تجاویز پر تنقیدی نظر ڈال رہے ہیں۔ یہ تجاویز سہ جہتی تبادلہ کے انسانی مسائل سے متعلق ہیں۔

یہ مسائل جمعرات یا جمعہ تک طے ہو جائیں گے اگر پاکستان نے آخری ساعت کوئی کوئی ایسی رخنہ اندازی نہ کی۔

غالبًا دونوں فریق جمعرات کو مجوزہ مذاکرے میں مسودوں کا تبادلہ کر سکتے ہیں۔ مذاکرہ کی رکاوٹیں ختم ہوتی معلوم ہوتی ہیں۔

آج صرف ایک بار ۹۰ منٹ کا مذاکرہ ہونے والا ہے۔ جب سے دوسرا دور شروع ہوا ہے پاکستان تین نکات پر اڑا ہوا ہے۔

۱۔ فی الحال ۱۹۵ قیدیوں پر مقدمات نہ چلائے جائیں۔

۲۔ صرف اسی وقت پاکستان ان ۲۰۳ بنگالیوں کو چھوڑے گا جب ان ۱۹۵ قیدیوں پر مقدمہ کا خیال ترک کر دیا جائے۔

۳۔ پاکستان صرف چند ہی نوع کے ان پاکستانیوں کو جو بنگلہ دیش میں ہیں قبول کرے گا۔ ان میں جو لوگ حکومت پاکستان کے ملازم ہیں، جن کے رشتہ دار وہاں ہیں اور جن کے والدین موجودہ پاکستان میں پیدا ہوئے تھے، بھی شامل ہیں۔

ہندوستان نے بنگلا دیش سے مشورے کے بعد ایک تعمیری فارمولا پیش کر دیا ہے جس کی اہم خصوصیات بنگلہ دیش کی ۱۹۵ قیدیوں کے التویٰ اور پاکستانی شہریوں کے جو بنگلہ دیش میں ہیں کی تعبیر تعداد کے لئے ایک غیر جانبداری ایجنسی کی پیش کش ہے بنگلہ دیش ۲۰۳ بنگالیوں کو پاکستان میں مستقبل میں سودے بازی کے لئے رہنے دینے پر تیار نہیں ہے۔

ملاقات کے بعد مسٹر عزیز احمد نے کہا کہ ہم اب بھی متعدد متبادل پر غور و فکر کر رہے ہیں جو ہمیں کسی تصفیہ کے قریب لا سکتے ہیں۔

دونوں وفود اپنی متبادل تجاویز کو اپنے اپنے وزیر اعظم تک پہنچانے والے ہیں ہندوستان کو بنگلہ دیش سے بھی رابطہ کرنا ہے۔ کل کا اجلاس تازہ ہدایات کے ساتھ شروع ہو سکتا ہے۔ یہ ہدایات دونوں حکومتوں اور بنگلہ دیش سے حاصل کی گئی ہیں۔

۲۳ اگست

عزیز احمد اور ان کے وفد کے دیگر مقتدر

(باقی صفحہ ۳۵ پر)

ارکان نے راج گھاٹ پر حاضری دی اور مہاتما گاندھی کو خراج عقیدت پیش کیا۔ آغا شاہی اور عبدالستار کے ساتھ وہ صدر گری سے بھی ملے۔ یہ رسمی ملاقات ۱۰ منٹ جاری رہی۔ صدر گری نے تینوں ممالک کی مساعی کو ایک تصفیہ تک پہنچنے کے لئے اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا۔

وفود کی دوپہر میں ملاقات ہوئی۔ ایک گھنٹہ کے مباحثہ کے بعد عزیز احمد نے اخبار نویسوں سے کہا کہ میں آپ کے لئے ایک طویل بیان کی تیاری کر رہا ہوں۔ حوصلے بلند ہیں مزید ایک گھنٹے کی گفتگو کے بعد انھوں نے فرمایا ہم کل پھر ملیں گے۔ فی الحال کوئی بیان نہیں دیا جائے گا۔

ہکسر صاحب نے پاکستانی اخبار نویسوں سے کہا کہ دونوں وفود نوٹ تیار کر رہے ہیں۔ جب یہ پوچھا گیا کہ کیا جمعہ کی ملاقات قطعی ہوگی۔ تو انھوں نے جواب دیا میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔

عبدالستار نے کہا کہ دونوں طرف سے اس کی کوشش ہو رہی ہے کہ معاہدہ کے لئے نقطۂ اتفاق تلاش کر لیا جائے۔

آج کی گفتگو نتائج پر پہنچنے کی توقع کے ساتھ شروع ہوئی لیکن جب انھیں درج کرنے کی باری آئی تو پاکستان نے چند رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔

گفتگو ایسے موڑ پر پہنچ گئی جہاں تمام خیالات کو ایک صورت دی جا رہی ہے لیکن پھر بھی قطعی شکل میں تصفیہ نہ ہو سکا اس لئے کہ دونوں طرف سے ایک دوسرے کی تجاویز میں ترمیم کے مطالبے ہوئے۔ پاکستان سے جو رہنما ہدایات آئیں ان کی وجہ سے پاکستانی وفد کے لئے کچھ اور دشواریاں پیدا ہو گئیں۔ اسلام آباد سے پھر رابطہ قائم کیا گیا۔

دونوں طرف یہ خیال مستحکم ہو گیا کہ بہر حال معاہدہ کیا جائے: کلی طور پر یا جزوی صورت میں۔

۲۴ اگست

عزیز احمد اور ان کے وفد نے مع پاکستانی صحافیوں کے جامع مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کی۔ پھر ہوٹل واپسی پر پاکستانی فضائیہ کا فوجی طیارہ آغا شاہی کو ملتان لے جانے کے لئے آ گیا۔ مسٹر بھٹو اپنے لاڑکانہ کے دورے کے بعد ملتان پہنچ چکے ہیں۔۔۔۔ کسی بھی وقت آغا شاہی واپس آ سکتے تھے۔

وفد دو گھنٹے اور تین منٹ تک مصروف گفتگو رہا۔ اپنے دلچسپ انداز میں ہکسر صاحب نے کہا کہ مسٹر آغا شاہی پاکستانی وفد کے رکن ہیں وہ پاکستان تشریف لے



بحران کے خاتمے کی کوشش

گئے ہیں وہ آئیں گے۔ وہ کچھ لے کر گئے ہیں اور کچھ واپس لے کر آئیں گے۔

بدھ کی شام کو گفتگو خوشگوار مرحلہ تک پہنچ گئی تھی پاکستان سے ہدایات کی وصولی کے بعد حالات بالکل ہی بدل گئے۔ شاید نہایت چالاکی سے پاکستان دباؤ ڈال کر کچھ اور چھوٹ چاہتا ہے۔ مسٹر بھٹو سے مشورہ کر کے آغا شاہی کل صبح یہاں پہنچنے والے ہیں نتیجہ کا انحصار اسی پر ہے۔

۲۵ اگست

آغا شاہی لاڑکانہ سے مشورہ لے کر واپس گئے ابھی تک مسٹر بھٹو ملتان نہیں جا سکے۔۔۔ واپسی کے

فوراً بعد آغا، عزیز احمد اور عبدالستار کے ساتھ سوئیس سفارت خانے میں ملاقات کرتے ہیں گفتگو کا مستقبل بہتر نظر نہیں آتا ایک ہی حوصلہ افزا بات ہے وہ یہ کہ ابھی تک گفتگو کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا۔ آج بات چیت ۵ بجے سے ۷ بجے تک چلتی رہی۔

مسٹر شاہی نے اخباری نامہ نگاروں کو بتایا کہ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ گفتگو کامیاب ہو گئی ہے، لیکن یہ کہنا ابھی قبل از وقت ہوگا کہ گفتگو ناکام ہو گئی۔

عزیز احمد نے کہا کہ ان کے ملک نے گفتگو کے لئے متعدد رعائتیں کی ہیں لیکن صرف ایک پارٹی کی رعائتوں سے ہی معاہدہ نہیں ہو سکتا۔

مسٹر شاہی نے بھی اسی طرح کی باتیں کیں اور کہا پاکستان یک طرفہ تصفیہ نہیں کر سکتا۔ مسٹر ہکسر پاکستانی رویئے سے مایوس ہوئے، انھوں نے کہا پاکستانی طریقۂ کار ہمیشہ ہی یہ رہا ہے کہ ان کا موقف درست ہے اور باقی سب غلط ہیں۔

۱۹۵ پاکستانی جنگی قیدیوں اور ۲۰۳ بنگالیوں کا معاملہ بھی کسی حل تک پہنچ سکتا تھا لیکن پاکستان اس پر زور دے رہا ہے کہ معاہدے میں یہ درج کیا جائے کہ ۱۹۵ پاکستانی جنگی قیدیوں پر مقدمہ نہیں ہوگا۔ اسی طرح پاکستان شہریوں کی بنگلہ دیش سے منتقلی کا معاہدہ بھی ممکن نہ ہو سکا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ آخر پاکستان

(باقی صفحہ ۳۵ پر)

فیصلہ کُن مذاکرات

ہمارے سیاسی مبصر کے قلم سے

گزشتہ سال شملہ میں جن امیدوں نے جنم لیا تھا تقریباً انیس سال بھر پاکستان کی روائتی ضد نے تشنۂ تکمیل رکھا۔ برصغیر کے امن سے لگاؤ کی وجہ سے ایک بار پھر ہند نے پہل کی۔ اور بنگلہ دیش کے تعاون واشتراک سے ۱۷ اپریل کو ایک مشترکہ پیش کش کے ذریعے گزشتہ جنگ سے پیدا شدہ انسانی مسائل کو سیاسی مسائل سے الگ کر دیا۔ مشترکہ پیش کش کسی وضاحت کی طالب نہ تھی لیکن پاکستان تین ماہ تک وضاحت کے تقاضے کرتا رہا۔ بات بالکل صاف اور سیدھی تھی۔ ۱۹۵ کو چھوڑ کر سبھی جنگی قیدی، پاکستان میں زبردستی روکے گئے بنگالی اور بنگلہ دیش میں مقیم وہ غیر بنگالی، جنھوں نے پاکستانی شہری ہونے کی بنا پر پاکستان جانے کا ارادہ ظاہر کیا ہے اپنے اپنے وطن لوٹ جائیں۔

بالآخر جولائی کے آخر میں بات چیت کا آغاز ہوا۔ تاکہ مشترکہ پیش کش کی بنیاد پر پیش رفت ممکن ہوسکے۔ اور لاکھوں انسان ذہنی کرب اور غریب الوطنی کے اندھیروں کی زد سے نکل سکیں۔ امید تو یہ تھی کہ اسلام آباد مذاکرات میں معاملہ طے ہوجائے گا لیکن پاکستانی موقف میں ضد کا عنصر غالب ہونے کی وجہ سے معاملہ اٹھارہ روز کے لئے ٹل گیا۔ ۱۸ اگست سے نئی دہلی میں بات چیت کا دوسرا دور قرار پایا۔ اسلام آباد مذاکرات کیوں نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئے۔ اس کے بھی کئی پہلو اور تشریحات نکل آئیں۔

روزنامہ نوائے وقت نے لکھا "ہمارے لئے یہ امر ناقابل فہم ہے کہ جب "انسانی مسائل" کو "سیاسی مسائل" سے الگ رکھا گیا تھا تو پھر مذاکرات پنڈی حسب توقع کوئی مثبت نتائج کیوں پیدا نہ کر سکے؟ "اعلانِ دہلی" میں پاکستانی جنگی قیدیوں کی واپسی، پاکستان میں بنگالیوں اور "بنگلہ دیش" میں پاکستانی شہریوں کے مسائل کا ذکر ہے۔ ان مسائل پر سیاسی مبصرین کے مطابق قریب قریب اتفاق رائے ہوچکا ہے، صرف جزیات اور تفاصیل طے کرنا باقی تھیں۔ پھر جب یہ مذاکرات خالصتاً "انسانی مسائل" پر غور کرنے کے لئے ہو رہے تھے تو فریقین نے طے شدہ "ایجنڈے" سے ہٹ کر سیاسی مسائل پر غور کس طرح شروع کر دیا؟ اور انسانی مسائل میں وہ کونسا مسئلہ ہے جو کوئی مثبت نتائج برآمد ہونے کی راہ میں رکاوٹ بن گیا؟ راولپنڈی کے مذاکرات میں بات کہاں تک بڑھی، اس بارے میں رازداری سے کام لیا جا رہا ہے۔ ہم حیران ہیں کہ دو ملکوں کے مابین انسانی مسائل پر بات ہوتی ہے اور ان لاکھوں کروڑوں انسانوں کو یہ بتانے کی زحمت گوارا نہیں کی جاتی کہ ان کے عزیز و اقارب کے "انسانی مسائل" کا اونٹ کس کروٹ بیٹھ رہا ہے۔ آخر یہ رازداری کیوں؟ اور اس اسرار کی وجہ کیا ہے؟ قوم کو صاف صاف کیوں نہیں بتایا جاتا کہ ان مذاکرات میں کیا ہوا اور آئندہ کیا کرنے کا ارادہ ہے؟"

(اداریہ۔ ۳ اگست)

روزنامہ امروز حکومتِ پاکستان کے زیر اثر ہے۔ اس نے مذاکرات کے نتیجہ خیز نہ ہونے کی ذمہ داری ہند پر ڈال دی ہے بلکہ الفاظ کے تیور ہند کے جذبۂ خیر سگالی اور خلوصِ نیت پر شک کرنے کی چغلی کھا رہے تھے۔

امروز کے اداریے کی تہہ میں جو جذبہ کارفرما ہے اس کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ صدق دلی کے فقدان اور احساسِ کمتری کا زنگ دوسروں میں عیب تلاش کر رہا ہے۔ ہندوستانی وفد انتہائی خلوص کے ساتھ مسائل کے حل کے لئے مسلسل خواہاں اور کوشاں رہا۔ پاکستان ہی نے دستِ تعاون کھینچے رکھا۔ پاکستانی ذہنوں میں ایک عجیب احساس پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ وہ یہ کہ پاکستان تو اصولوں پر کاربند ہے، ہند اسے اصولوں کا سودا کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ پاکستان جن پر اڑا بیٹھا ہے وہ اصول نہیں بلکہ سیاسی اغراض اور مصلحتیں ہیں انھیں لاکھ اصولوں کا جامہ پہنایا جائے وہ بہرحال رہیں گی وہی کہ جو وہ ہیں۔ اس کے علاوہ پاکستانی سیاست اور صحافت کے لئے یہ احساس اپنانا ضروری ہے کہ پاکستان سے کہیں زیادہ ہند کو اصول پیارے ہیں اور اسی وجہ سے وہ کسی بھی ملک کو اصولوں کا سودا کرنے پر مجبور ہونے کی بات سوچ بھی نہیں سکتا۔ جو قابلِ افسوس رویہ امروز نے اپنایا، کچھ اسی سے ملتا جلتا رُخ جناب عبدالماجد نے پاکستان ٹائمز کے ۱۴ اگست کے شمارے میں اپنے خصوصی مضمون میں اختیار کیا ہے۔ انھوں نے ہند پر سامراجی رجحانات کا الزام دیا ہے۔ اسی حقیقت کے باوجود کہ خود پاکستان کے وزیر مملکت برائے امور خارجہ اور پاکستانی وفد کے لیڈر جناب عزیز احمد نے اس بات کی تردید کی کہ مسٹر ہکسر نے مذاکرات کے دوران بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے اور اس کے اقوام متحدہ میں داخلے کے مسئلے نہیں اٹھائے بلکہ ان کا تذکرہ سہواً ہوا، پاکستانی اخبارات ہند کو یہ مسائل اٹھانے کا الزام دے رہے ہیں مسٹر ہکسر نے بھی ان الزام تراشیوں کی سخت مذمت کی ہے۔ بدقسمتی سے یہ سب پاکستان کے اس روایتی رجحان کی وجہ سے ہوا جس سے وہ اپنی تمام مشکلات اور خامیوں کے لئے ہند کو ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔

اُدھر بنگلہ دیش کے اخبارات نے اسلام آباد مذاکرات پر رائے زنی کرتے ہوئے پاکستانی ضد اور غلط موقف کو مذاکرات کے نتیجہ خیز نہ ہونے کی وجہ قرار دیا ہے "مارننگ نیوز" نے اپنے یکم اگست کے اداریے میں لکھا ہے کہ "جنگ کے اثرات کے خاتمے کے ذریعہ برصغیر میں کشیدگی کم کرنے کی ہر کوشش کو مسٹر بھٹو کی ضد تباہ کرتی رہی ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ یہ خیال خود پاکستان کے لئے نقصان دہ ہے مسٹر بھٹو اپنے سیاسی کردار اور اقتدار کی بقا کے لئے برصغیر میں کشیدگی کا بنے رہنا ضروری سمجھتے ہیں اسلام آباد مذاکرات کی ناکامی کی وجہ بھی یہی ہے۔"

"جن پد" (۲ اگست) اور "مت" (۲ اگست)

کی رائے ہے کہ "اسلام آباد مذاکرات پاکستانی حکمرانوں کے غیر معاون رویے اور ضد کی وجہ سے ناکام ہوگئے۔ ہند اور بنگلہ دیش کے رہنما بخوبی جانتے ہیں کہ گزشتہ ۲۶ سال میں کسی بھی پاکستانی حکمران نے سیدھی راہ اور صاف لب و لہجہ اختیار نہ کیا۔

پاکستانی اخبارات میں سے روزنامہ مشرق نے اس بات کو اسلام آباد مذاکرات کی سب سے بڑی کامیابی قرار دیا کہ ان کے ذریعے انسانی مسائل کو سیاسی مسائل سے الگ کر دیا گیا (۱۹ اگست)۔ جو خراج تحسین روزنامہ مشرق نے اسلام آباد مذاکرات کو پیش کیا ہے دراصل وہ ہند بنگلہ دیش مشترکہ پیش کش کا حق ہے جس کے ذریعہ ۱۷ اپریل کو ہی انسانی مسائل کو سیاسی مسائل سے الگ کر دیا گیا تھا۔

بات چیت کے دوسرے دور کے تذکرے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اُن وجوہ کی پہچان اور تعین کر لیا جائے جن کی وجہ سے اسلام آباد مذاکرات سے کوئی ٹھوس اور مثبت نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ ممتاز پاکستانی ہفت روزہ اخبارِ جہاں کے ۱۵ اگست کے شمارے میں جناب حبیب الرحمٰن راولپنڈی سے اپنے کالم "مرکزی دارالحکومت سے خط" میں چار وجوہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

(۱) شیخ مجیب الرحمٰن صاحب جنھیں مذاکرات کی نہج سے پوری طرح باخبر رکھا گیا تھا یہ چاہتے تھے کہ پاکستان کی طرف سے بنگلہ دیش کے تسلیم کئے جانے کی کوئی قطعی تاریخ مقرر کر دی جائے۔

(۲) اس بات کا اطمینان دلایا جائے کہ اقوام متحدہ میں بنگلہ دیش کے داخلے کی راہ میں کوئی نئی رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی۔

(۳) بنگلہ دیش میں موجود جن نام نہاد بہاریوں کو ڈھاکہ کے حکام پاکستان بھیجنا چاہتے ہیں ان کی تعداد و اقسام کے تعین کے سوال پر اختلاف رائے پیدا ہو گیا تھا

(۴) جن ۱۹۵ پاکستانی جنگی قیدیوں پر بنگلہ دیش کی حکومت مقدمہ چلانا چاہتی ہے ان کے بارے میں اگرچہ یہ تو طے ہو گیا کہ انھیں فی الحال بنگلہ دیش کے حوالے نہیں کیا جائے گا لیکن اس بات کی کوئی ضمانت نہیں مل سکی کہ ان کے خلاف سرے سے مقدمہ چلایا ہی نہیں جائے گا۔

پہلی دو وجوہ نے اسلام آباد مذاکرات کو شاید ہی متاثر کیا ہو کیونکہ ہند بنگلہ دیش مشترکہ پیش کش نے ان وجوہ کا جواز ختم کر دیا تھا۔ البتہ ان کا ذکر سہواً چل نکلا ہو ایسا ممکن ہے۔ جناب عزیز احمد نے اپنے بیان میں یہ اعتراف کیا ہے کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے اور اس کے اقوام متحدہ میں داخلے کے بارے میں اس وقت بات ہوئی جب کہ برصغیر کی کلی صورتِ حال پر غور ہوا۔ باقی دو وجوہ یقیناً اہم ہیں اور انھیں کے سبب مذاکرات دوسرے دور تک ملتوی ہوئے۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا مسئلہ غیر اہم ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ۱۷ اپریل کی مشترکہ پیش کش کے بعد یہ مسائل کے حل کے لئے شرط نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر پاکستان نے گزشتہ سال بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا ہوتا تو نہ صرف یہ کہ انسانی مسائل حل ہو چکے ہوتے بلکہ کشیدگی کو ختم کرکے مفاہمت کی راہیں استوار ہو چکی ہوتیں۔ جناب حبیب الرحمٰن نے اس موضوع کا ذکر انتہائی موزوں الفاظ میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں "دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ سے پیدا شدہ مسائل کو حل کرنے کے لئے اوّلیں ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیں تاکہ اس مسلم مملکت کے سربراہ کے ساتھ ہم بھول جاؤ اور معاف کر دو کے جذبے کے تحت براہ راست گفت و شنید کے ذریعہ باقی تمام امور طے کرنے کے قابل ہو جائیں۔ ہماری بدقسمتی ملاحظہ ہو کہ تقریباً ایک برس تک تو ہم یہ نعرہ لگاتے رہے کہ مجیب صاحب پہلے ملاقات کریں اور بعد میں بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کی بات کریں۔ مجیب صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے اور سترہ مہینے ضائع کرنے کے بعد ہمیں مجیب سے معاملات طے کرنے کے لئے بھارت کو اپنا پیامبر بنانا پڑا۔ ہم ہیں کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کر لینے پر بالآخر رضامندی کا اظہار تو کر چکے ہیں مگر وقت کے تعین کے سوال پر مزید غور و فکر فرمانا چاہتے ہیں اور ساتھ ہی یہ امید رکھتے ہیں کہ بھارت کے توسط سے ہی نئی دہلی میں ہونے والی بات چیت نتیجہ خیز ثابت ہوگی، گویا ہماری خارجہ پالیسی چلانے والوں کو بھارت پر اعتبار ہے اور مسلم بنگال پر بے اعتباری۔

موصول ہونے والی خبروں کے مطابق بات چیت کی وسعت کو دو الگ الگ دائروں میں تقسیم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگر جنگی قیدیوں اور شہری نظر بندوں کی واپسی کو پاکستان میں روکے گئے بنگالیوں کی واپسی کے ساتھ جوڑا جائے تو جنگی قیدیوں پر مقدمات اور بنگلہ دیش سے پاکستانیوں کے پاکستان لوٹنے کے سوالوں کو دوسرے دائرے میں رکھ کر غور کیا جائے۔ بقول مسٹر ہکسر یہ تجویز پاکستان کی طرف سے پیش کی گئی ہے جہاں تک پہلے دائرے کے مسئلوں یعنی ہند میں مقیم پاکستانی جنگی قیدیوں اور شہری نظر بندوں اور پاکستان میں روکے گئے بنگالیوں کی اپنے اپنے وطن واپسی کا سوال ہے اس میں کوئی دشواری پیش آنے کا اندیشہ نہیں۔ البتہ دوسرے دائرے کے مسئلے ہیں جو نئی دہلی مذاکرات کا اصل مرکز بنے ہوئے ہیں۔ پاکستان یہ چاہتا ہے کہ کسی طرح ان مقدمات کی رسوائی سے بچ سکے۔ مشرق کے ۱۹ اگست کے اداریے کا یہ اقتباس اس کا شاہد ہے "دہلی مذاکرات کامیاب اور نتیجہ خیز ہو سکتے ہیں لیکن اس کے لئے ابتدائی شرط یہ ہے کہ پاکستانی جنگی قیدیوں پر مقدمات کا ارادہ ترک کر دیا جائے۔ ہند اور بنگلہ دیش مناسب رویّہ اختیار کریں۔"

دہلی مذاکرات کے پہلے روز ہی ریڈیو پاکستان سے جو ہند تبصرہ نشر کیا گیا اس میں بنگلہ دیش کی فراخدلی اور اعلیٰ ظرفی کی قدر کرنے کی بجائے ایک مضحکہ خیز دلیل پیش کی گئی۔ بنگلہ دیش نے انسانی مسائل کو جلد حل کرنے کے لئے تسلیم کئے جانے کی شرط ہٹانا اور جنگی جرائم کے مقدمات کو محض ۱۹۵ جنگی قیدیوں تک محدود کرنا قبول کیا، اسے پاکستانی مبصر نے بنگلہ دیش کے موقف کی کمزوری قرار دیا ہے "دراصل نام نہاد جنگی مجرموں کی تعداد دو سو سے بھی کم کرکے ڈھاکہ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس مسئلہ پر اس کا موقف کمزور ہے۔ اس

افسوسناک مسئلے کے بارے میں ہند کا موقف انتہائی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ تمام جنگی قیدی ہند کے قبضے میں ہیں۔ جنگی قیدیوں پر مقدمات چلانے کی ڈھاک کی ضد کو رد کر کے ہند اس مضحکہ خیز ڈرامے کو ختم کر سکتا ہے۔

جنگی جرائم کے مقدمات کے بارے میں پاکستان کی تشویش اور فکرمندی سمجھ میں آتی ہے دنیا بھر میں بدنامی ہوگی اور پاکستانی عوام میں غم و غصہ پھیلے گا۔ لیکن اس معاملے میں ہند کچھ کر بھی تو نہیں سکتا۔ نہ وہ آزاد اور خودمختار بنگلہ دیش کے فیصلوں پر اثرانداز ہو سکتا ہے نہ ہی اسے ناراض کر سکتا ہے۔ ہند اور پاکستان کے دوستانہ تعلقات کے لئے ہند اور بنگلہ دیش کی دوستی کو قربان نہیں کیا جا سکتا۔ بنگلہ دیش کی رائے عامہ تاحال مقدمات چلانے کے حق میں ہے شاید اس لئے بھی کہ ابھی تک حکومت پاکستان نے بنگلہ دیش دشمن رویہ اختیار کر رکھا ہے۔ جوابی مقدمات کی دھمکیاں بھی پاکستان کی طرف سے دی جا رہی ہیں۔

دوسری بڑی رکاوٹ بنگلہ دیش سے پاکستان بھیجے جانے والے پاکستانیوں کی تعداد کا سوال ہے۔ شروع شروع مسٹر بھٹو ایک بنگالی کے بدلے ایک غیر بنگالی کو پاکستان لوٹنے کی اجازت دینے کی بات کرتے رہے۔ پھر رُخ بدلا تو ان غیر بنگالیوں کی آبادکاری بین الاقوامی ذمہ داری قرار دینے لگے، یہاں تک کہ ان بدنصیبوں کو امریکہ کینیڈا اور آسٹریلیا میں بسانے کی بھی تجویز بھی پیش کر گئے اول تو یہ کہ یہ لوگ خود کو پاکستانی کہتے ہیں دوسرے جب برصغیر کے مسلمانوں کے دارالامان' پاکستان کے دامن میں ان بدنصیب مسلمان غیر بنگالیوں کے لئے کوئی جگہ نہیں تو بنگلہ دیش انھیں رکھنے کی ذمہ داری کس جواز کی بنا پر قبول کرے؟ اس مسئلے سے متعلق پاکستانی موقف کس قدر کھوکھلا اور غیر منطقی ہے۔ جناب حبیب الرحمٰن کے تجزیہ میں دیکھئے "ربا نام نہاد بہاریوں کی تعداد کے تعین کا مسئلہ جن میں بنگلہ دیش ہمارے حوالے کرنا چاہتا ہے تو اس کے بارے میں جزوی اتفاق تو پہلے ہی ہو چکا ہے اور کُلّی اتفاق کے لئے کچھ مزید کشادہ دلی کے مظاہرے کی ضرورت ہے۔ اگر ہم ۲۵، ۳۰ ہزار کی بجائے لاکھ سوا لاکھ افراد کو جو خود کو پاکستانی شہری کہنے پر اصرار کرتے ہیں یہاں آنے کی اجازت دے دیں تو اس سے کوئی فرق اس لئے نہیں پڑے گا کہ پاکستان سے بھی بہرحال ڈیڑھ دو لاکھ بنگالی اپنے وطن واپس چلے ہی جائیں گے اور اس طرح حساب برابر ہو جائے گا ویسے بھی یہ عجیب سا لگتا ہے کہ ہم کشمیریوں فلسطینیوں اور دنیا بھر کے مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی جتاتے ہیں مگر ان لوگوں سے نظریں چرانا چاہتے ہیں جو پاکستان کی محبت میں اور پاکستانی شہری ہونے کے دعوے کی بنا پر پچھلے سترہ مہینوں سے کس مپرسی کے عالم میں بنگلہ دیش کے سرکاری کیمپوں میں پڑے ہوئے ہیں اور اس آس میں جی رہے ہیں کہ جن کی خاطر وہ برباد ہوئے ایک نہ ایک دن ضرور ان کی طرف محبت بھرے ہاتھ بڑھائیں گے۔"

(اخبارِ جہاں)

سرکاری اندازِ فکر کی ترجمانی جناب عبدالماجد نے پاکستان ٹائمز کے ۱۴ اگست کے شمارے میں کی ہے "بنگلہ دیش میں بہاریوں کی حالتِ زار پر پاکستانی دل خون کے آنسو بہاتے ہیں۔ پاکستان نے ان بہاریوں کو قبول کرنے کے لئے رضامندی ظاہر کی ہے جن کے خاندان پاکستان میں ہیں یا جو مشرقی پاکستان میں ملازمت یا بیوپار کے لئے گئے تھے سبھی بہاریوں کو آنے کی اجازت دینا پاکستان کے بس کی بات نہیں۔ جنگ سے متاثر مہاجرین کی آبادکاری کے مسئلہ پر پاکستان کے وسائل صرف ہو رہے ہیں۔"

ان الفاظ سے بو آتی ہے کہ پاکستانی خون کے آنسو یا تو نقلی ہیں یا پانی سے گئے گزرے۔ بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ اس مسئلہ سے متعلق پاکستانی موقف مصنوعی، بے جان اور غیر منطقی ہے۔ لیکن یہ مسئلہ اتنا اہم ہے کہ اسے ٹالا نہیں جا سکتا۔

نئی دہلی مذاکرات میں اس کے ہر پہلو پر غور کیا جا رہا ہے بلکہ متبادل حل بھی سوچے جا رہے ہیں۔

اِدھر بات چیت کا رُخ امید افزا نظر آتا ہے اور اُدھر پاکستان ٹائمز نے اپنے خصوصی نمائندے سید امجد حسین کے حوالے سے خبر دی ہے کہ ہند پاکستان مذاکرات میں جنگی قیدیوں پر مقدمات اور بنگلہ دیش میں مقیم بہاریوں کے مسئلوں کی وجہ سے تعطل پیدا ہو چکا ہے۔

(۲۱ اگست)

پتہ نہیں یہ سوچا سمجھا انداز ہے یا محض اتفاق ہے پاکستان کے سکریٹری برائے امور خارجہ وزیر اعظم بھٹو کے ساتھ صلاح مشورے کے لئے مذاکرات کی آخری منزل میں ملتان گئے۔ شاید اس میں سید امجد حسین کو تعطل نظر آیا ہو، حالانکہ بیشتر لوگ نئی دہلی مذاکرات سے اچھے نتائج کی توقع کرتے ہیں۔ امروز (۸ اگست) اپنے اداریے میں لکھتا ہے "بھارتی وفد کے لیڈر مسٹر پی۔ این ہکسر نے بھی ایک سے زائد مرتبہ اقرار کیا ہے کہ دہلی میں (اگست کے دوران ہونے والے مذاکرات یقیناً فیصلہ کن ہوں گے ہر وہ شخص جسے اس خطے میں دیرپا اور منصفانہ امن کے قیام کی قدر و قیمت کا احساس ہے اور جو برصغیر میں حالات کو معمول پر لانے میں ذرا سی بھی دلچسپی رکھتا ہے یہی چاہے گا کہ درپیش انسانی مسائل جلد حل ہوں۔"

جہاں تک ہند کا تعلق ہے اس نے ہر ممکن تعاون مذاکرات کی کامیابی کے لئے پیش کی ہے۔ وفود کی ملاقاتوں کے علاوہ جناب عزیز احمد کی ملاقات صدر گری اور وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی سے بھی ہوئی۔ مثبت نتائج برآمد کرنے کی کسی بھی کاوش سے ہند نے اپنا دستِ تعاون نہیں کھینچا۔

نئی دہلی مذاکرات کے نتیجہ خیز ہونے کے امکانات کافی روشن ہیں بشرطیکہ پاکستان سیاسی سودے بازی کے لئے تنگ نظر رویّہ اختیار نہ کرے۔ چونکہ ان مذاکرات کی کامیابی سے لاکھوں انسانوں کی مصیبتیں ختم ہو سکتی ہیں اور مستقبل کے لئے بھی برصغیر میں دیرپا امن کے قیام کی امید بھی ان مذاکرات سے وابستہ ہے اس لئے برصغیر کے عوام تہہ دل سے یہی چاہتے ہیں کہ نئی دہلی میں ہند پاکستان بات چیت کا یہ دوسرا دور قطعی اور نتیجہ خیز ہو لیکن اس منزل تک پہنچنے کے لئے پاکستان کے پُرخلوص تعاون کی ضرورت ہے۔

مسلم لیگ — ایک خطرہ

میر مشتاق احمد

قومی سیاست کے افق پر مسلم لیگ کا ظہور بدقسمتی اور مصائب کے بادلوں کے اکٹھا ہونے کے مترادف ہے اور خاص طور سے مسلمانوں کے لئے جن لوگوں نے ۱۹۴۷ء کے تاریک دنوں کا مشاہدہ کیا ہے وہ لیگ کی سیاست کے مضر اثرات سے لرزاں ہیں۔ تعصب اور نفرت کی آگ میں کتنے خاندان تباہ ہوگئے اور اس کی ذمہ داری جناح کی رہنمائی میں چلنے والی لیگ پر عائد ہوتی ہے کتنی مائیں اپنے بچوں سے بچھڑ گئیں، کتنی بہنیں اپنے بھائیوں سے جدا ہوگئیں، کتنی ہی بیویوں کے سہاگ اجڑ گئے، کتنے ہی دوست آشنا ایک دوسرے کے فراق میں تڑپ کر موت کی آغوش میں چلے گئے۔

مسلم لیگ کے لیڈر آج تقسیم پاکستان کے جرائم فراموش کر چکے ہیں اور باتیں بنا رہے ہیں۔ غالبًا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کا حافظہ کمزور ہے اور انھیں اسلام کے نام پر چاند تاروں والے سبز جھنڈے اور نعرۂ تکبیر سے بے وقوف بنا دیں گے۔ میں انھیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ حق و صداقت کے پیرو اب مزید بے وقوف نہیں بن سکتے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ کس طرح جناح اور ان کے حاشیہ برداروں نے انھیں راہ مستقیم سے ہٹا دیا تھا۔ مسٹر جناح نے مسلمانوں سے کہا کہ آزاد ہندوستان میں ان پر ہندو حکومت کریں گے۔ جناح نے کہا کہ گاندھی اور نہرو کی یقین دہانیوں کو بھول جاؤ اور اسے اچھی طرح سمجھ لو کہ اکثریتی فرقہ کی سچی ترجمان صرف ہندو مہاسبھا ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کو بتایا کہ ان کے لئے ایک الگ وطن جنت کی مانند ہوگا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد جب مسٹر جناح ہندوستان چھوڑ رہے تھے اور پاکستان کے گورنر جنرل کے عہدے پر متمکن ہونے کے لئے جا رہے تھے تو انھوں نے کہا کہ میں نے ہندوستانی مسلمانوں کو اپنی فہرست سے خارج کر دیا ہے۔

مسلمان ان رہنماؤں کو کبھی نہ بھولے ہوں گے جنھوں نے انھیں پہلے تو اپنی گرم گرم اور اشتعال انگیز تقریروں سے مشتعل کیا اور پھر تنہا چھوڑ کر پاکستان چلے گئے۔

غالبًا مسٹر سلیمان سیٹھ نے اُس قیامت کا نظارہ نہیں جو تقسیم کے بعد برپا ہوا۔ اسی لئے وہ جناح کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ وہ زہریلی اور گرم ہوا ملک کے مشرقی حصے میں نہیں گئی تھی۔ اس ضمن میں ہمیں کانگریس کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے جس کی سیاست نے فضا کو معتدل کر دیا۔

مسلمانوں کو اچھی طرح یاد ہوگا کہ جو لوگ آج مسلم لیگ کے خزانے کے مالک بنے بیٹھے ہیں انھیں ایک دہائی تک اپنے آرام دہ مکانوں سے باہر آکر مغربی ہندوستان کے مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرنے کا خیال تک نہیں آیا۔ مسلمان شاید اسے بھی نہ بھولے ہوں گے کہ انھیں اس تشدد اور ظلم و جور کی بھیانک آگ سے بچانے کے لئے صرف سیکولر ذہن کے ہندو ہی آگے بڑھے تھے۔ سندر لال نے الور، بھارت پور اور پنجاب کے مسلمانوں کی حفاظت کے لئے جنگ کی۔ سبھدرا جوشی (جو اُس وقت مس دتہ تھیں) اور اندرا گاندھی دو کم عمر عورتیں مہاتما گاندھی کی قوت اور ہمت سے متاثر ہوکر در در گھر گھر دوڑتی پھریں تاکہ دہلی میں مسلمان اپنے آبائی مکانوں میں رہ سکیں۔ جواہر لال نہرو نے بہار کے جلتے ہوئے علاقوں کا طوفانی دورہ کیا۔ اُس وقت انھیں یہ بھی یاد نہ تھا کہ وہ ہندوستان کے وزیر اعظم ہیں اور انھیں حفاظتی انتظام کے ساتھ سفر کرنا چاہیئے (میں ذاتی طور پر گواہ ہوں کہ جب کناٹ سرکس میں مسلمانوں کی دکانوں کے جلنے کی خبر سنی تو جواہر لال نہرو خالی ہاتھوں اس مشتعل ہجوم میں کود پڑے تاکہ انھیں منتشر کر دیا جائے) مردولا سارا بھائی گڑھ مکتیشور کے وحشی قاتل اور پاگل ہجوم سے اپنے چند بے غرض ساتھیوں سمیت جنگ آزما ہوئیں اور بے بس، قابلِ رحم مسلم عورتوں کی حفاظت کے لئے دیوار بن گئیں۔ اور پھر ان سب سے بڑے دیوتا سمان گاندھی نے نہ صرف مسلمانوں کی حفاظت کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا بلکہ اس کے لئے اپنی متاعِ حیات بھی لٹا دی۔ شری ڈی۔ کے۔ بروا نے بالکل درست کہا ہے کہ گاندھی کی شہادت انسانی تاریخ میں اس کی واحد مثال ہے جب ایک مذہبی آدمی نے دوسرے مذہب والوں کی حفاظت کے لئے اپنی جان دے دی، جس پر اسے یقین نہ تھا۔ صرف یہی مثالیں نہیں ہیں۔ میں نے تو صرف چند افراد اور واقعات کا تذکرہ کیا ہے۔ ہر شہر اور ہر گاؤں میں ایسے افراد تھے جنھوں نے اقلیت کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کے لئے اپنی زندگی کی پرواہ نہ کی بہت سے لوگوں نے اپنی زندگیاں قربان کر دیں۔ اس وقت مسٹر سلیمان سیٹھ خود ساختہ قائد ملت اور خود ساختہ مسلم مسیحا اور محافظ اسلام کہاں تھے؟ یہ سب بھول سکتے ہیں لیکن ہندوستانی مسلمان نہ ہی احمق ہیں اور نہ ہی ناسپاس۔ انھیں سب کچھ یاد ہے۔

مسلمانوں کو یہ بھی یاد ہوگا کہ آج سے دو سال قبل کیرل مسلم لیگ کے رہ نما اس پر زور دیا کرتے تھے کہ لیگ تقسیم پاکستان سے پہلے کی مسلم لیگ سے مختلف ہے اور یہ کہ کئی ہندوستان کے مسلمانوں کے مسائل اتری ہندوستان کے مسلمانوں کے مسائل سے مختلف ہیں اردو کی حفاظت کے لئے چلنے والی مہم میں انھوں نے کبھی شرکت نہ کی اور آج بھی کیرل سے لیگ کا کوئی اردو کا ترجمان نہیں نکلتا ہے۔ اگر کیرل میں کوئی شخص اردو جانتا ہے تو اس کا سہرا مسلم لیگ کے سر نہیں بندھتا ان لوگوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بھی کبھی کوئی دل چسپی نہیں لی۔ ان کا خیال ہے کہ علی گڑھ ان سے بہت دور ہے۔

جب کہیں فساد ہوتا ہے وہ اس پر توجہ بھی نہیں دیتے۔ سبھدرا جوشی، بی۔ این پانڈے اور ڈی۔ آر گوئل احمد آباد گئے اور انھوں نے مسلمانوں کی حفاظت کے لئے جنگ کی۔ لیکن خود ساختہ قائد ملت نے پارلیمنٹ میں بیان دینے کے سوا اور کچھ بھی نہیں کیا علاوہ ازیں انھوں نے ہمیشہ غیر فرقہ پرست ترقی پسند کردار کے خلاف احتجاج کیا حالانکہ خود وہ کانگریس اور کمیونسٹ کے اشتراک سے کیرل میں حکومت کر رہے ہیں۔

مسٹر سلیمان سیٹھ اینڈ کو آخر کس طرح سے یہ خیال کرتے ہیں کہ مسلمان یہ سب بھول جائیں گے اور انھیں اپنا مسیحا، اپنا محافظ سمجھ لیں گے۔ کیا ان سے مسلمان یہ نہیں دریافت کریں گے کہ اچانک انھیں اردو اور علی گڑھ سے کیسے محبت ہو گئی؟ جب کہ اس سے قبل انھوں نے کبھی اردو کی پرواہ نہ کی اور نہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی مدد کی۔ مسلم لیگ کا یہ رویہ چودھری چرن سنگھ کے رویے سے مختلف نہیں ہے جو جب تک حکمراں تھے اردو کو دباتے رہے اور پی۔ اے۔ سی کو مسلم یونیورسٹی کے کمپاؤنڈ میں تعینات کئے رہے اور آج اردو اور علی گڑھ کے لئے مگر مچھ کے آنسو بہا رہے ہیں اس لئے یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے کہ آج مسلم لیگ کے رہ نما چودھری چرن سنگھ کے بے حد قریب ہیں اور خفیہ ملاقاتیں ہو رہی ہیں۔ اس کے علاوہ دونوں میں ایک اور چیز بھی مشترک ہے اتر پردیش کے چیف منسٹر کی حیثیت سے چودھری چرن سنگھ نے شیخ عبداللہ کو میرٹھ فساد کے بعد ریاست کے دوسرے شہروں میں جانے سے روک دیا تھا اور مسلم لیگ کے صدر ہونے کی حیثیت سے سلیمان سیٹھ شیخ عبد اللہ کا ہندوستان میں داخلہ ممنوع قرار دینا چاہتے تھے (مسٹر سیٹھ نے شیخ کے قومی سیاست میں حصہ لینے پر مخالفانہ رویہ اختیار کیا ہے) جیسا کہ ظاہر ہے کہ میرٹھ فساد آر ایس۔ ایس نے کرایا تھا۔ اس میں جن سنگھ اور ہندو مہا سبھا شریک تھیں لیکن چودھری چرن سنگھ نے اس کا الزام جمعیۃ العلما اور شیخ عبداللہ پر عائد کیا تھا۔ مسلم لیگ کو جمعیت سے چڑھ ہے اور شیخ سے بھی۔ اور بالکل یہی حال چرن سنگھ کا ہے۔ کیا اب مسلم لیگ، آر۔ ایس۔ ایس ہندو مہا سبھا اور جن سنگھ کے سیاہ کارناموں کی طرف سے آنکھیں پھیر لینا چاہتی ہے۔ یہ ایک عجیب و غریب تصور معلوم ہوتا ہے لیکن بد قسمتی سے یہ حقیقت ہے۔ مسلم لیگ کے اخبارات پڑھئے یا ان کے رہ نماؤں اور دیگر افراد کی تقریریں سنئے ان میں ان جماعتوں اور افراد کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں ملے گا جو مسلمانوں کو برباد کر دینا چاہتی ہیں۔ ان کے قلم اور زبان کی پوری قوت مسز اندرا گاندھی اور مسز سبھدرا جوشی کے خلاف صرف ہو رہی ہے جن پر مسلمانوں کو اعتماد اور توقعات ہیں۔

آخر اس طویل خواب کے بعد مسلم لیگ نے کل ہند سیاست میں حصہ کیوں لینے کا فیصلہ کیا ہے؟ اس ضمن میں اگست ۱۹۷۳ء کے "سیکولر ڈیموکریسی" کا اداریہ قابل غور ہے۔ اس نے لکھا ہے:۔

"۲۵ برسوں تک الگ تھلگ رہنے کے بعد مسلم لیگ فرقہ پرستوں کی صف میں پھر کھڑی ہو گئی ہے یہ ظاہر ہے کہ جب تک فرقہ پرستی ایک فرقہ تک محدود رہتی ہے وہ پھل پھول نہیں سکتی۔ جن سنگھ نے اپنا اثر کھو دیا تھا اور خاص طور پر بنگلہ دیش کے ظہور کے بعد اس کے اثر میں بہت کمی ہو گئی تھی۔ اب بہت دنوں تک جن سنگھ مسلمانوں کے خلاف نفرت کی مہم جاری نہیں رکھ سکتی تھی لیکن لیگ نے انھیں تاریخی واقعات کا استعمال مسلم فرقہ کو پس ہمت اور مایوس کرنے کے لئے شروع کر دیا ہے۔"

ایسے وقت میں جب کہ فرقہ وارانہ تشدد کی شدت کمزور ہو رہی ہے مسلمانوں کے مسائل اور ان کے حل کے لئے فضا ہموار ہو رہی ہے اور قومی سطح پر حکومت اس کے حل کے لئے اقدام کر رہی تھی کہ لیگ سامنے آگئی اور فرقہ واریت کے رہوار کو مہمیز دے دیا۔ اس وقت تک وہ کہیں نظر نہیں آئی جب مسلمان تشدد کا شکار ہو رہے تھے اور اردو کو دو قومی نظریہ کی بنیاد پر نظر انداز کیا جا رہا تھا اور جن سنگھ ہندی کرن کی شرارت آمیز نظریہ کی تشہیر کر رہی تھی۔ جب تک آر ایس۔ ایس اور جن سنگھ کے خلاف جنگ جاری رہی یہ مسلم لیگی خاموش تھے اور کیرل و مدراس کی آرام گاہوں میں عیش کر رہے تھے۔ جب جنگ جیت لی گئی تو وہ مسٹر جناح کا جھنڈا لے کر سامنے آگئے۔ یہ مسلمانوں کی فلاح کے لئے کیا کریں گے یہ تاریخ بتائے گی۔ اس لئے کہ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے مسلمان خاص طور پر جن سنگھ کی فرقہ پرستی اور جارحانہ وطن پرستی سے اچھی طرح واقف ہیں۔

اپنے شریک کار جن سنگھ کی طرح مسلم لیگ بھی مسلم پرسنل لا اور بندے ماترم جیسے مسائل پر زیادہ شور مچاتی ہے اور مسلمانوں کی غربت اور پس ماندگی کے حقیقی مسائل پر توجہ نہیں کرتی۔ وہ ایسا کیوں کرتی ہے؟ اسے سمجھنا مشکل نہیں ہے۔ اگر وہ سماجی و اقتصادی مسائل پر غور کریں گی تو دوسرے فرقوں سے مشترک مسائل پر بھی روشنی ڈالنی ہوگی اور اس طرح انھیں دونوں فرقوں کے درمیان خلیج کو بڑھانے کا موقع نہیں ملے گا اور وہ اشتعال پیدا کرنے والے مسائل نہ اٹھا سکے گی۔ اگر چہ مسلم لیگ کہتی ہے کہ اس

کا مقصد دوسرے فرقوں میں مسلمان کے متعلق خیرسگالی کے جذبات کو فروغ دینا ہے لیکن اس کی تمام حرکتیں اس مقصد کے برعکس ہیں۔ انھیں جواہر لال نہرو، اندرا گاندھی اور سبھدرا جوشی جیسے لیڈروں اور سامپردائکتا ورودھی کمیٹی اور جمعیۃ العلماء ہند کو گالیاں دے کر مسلمانوں کے درمیان کتنی مقبولیت ہوگی اس کا پتہ انھیں خود چل جائے گا۔

ایسی صورتِ حال میں مسلم لیگ مداخلت کرر ہی ہے جب اس کے تقسیم ہند کے پہلے کے نظریات اور عمل پوری طرح ظاہر ہو چکے ہیں۔ دو قومی نظریئے جس کی جناح اور ان کے رفیقوں نے تشہیر کی تھی بنگلہ دیش کے ظہور سے اپنی موت آپ مر چکا ہے۔ اگر مسلم لیگ مسلم عوام کی سچی دوست تھی تو ان کے وطن میں جو خود اس نے بنایا تھا مسلمانوں کے درمیان امتیاز نہ ہوتا، اور اس کے نتیجہ میں مشرقی پاکستان کے لوگوں کے جذبات اس قدر شدید نہ ہونے کہ ان کا استحصال ہو رہا ہے اور بنگالی مسلمان اس فیصلے تک پہنچنے پر مجبور نہ ہوتے کہ وہ بنگلہ دیش کو ایک خود مختار مطلق العنان ملک کی حیثیت سے پاکستان سے علیحدہ کرلیں۔ ۲۵ سالہ تجربات نے انھیں یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا کہ سیکولر پالیسی فرقہ وارانہ سیاست سے افضل ہے۔

بہت پہلے اسی وقت مسلم لیگ کی سیاست کا کھوکھلا پن ظاہر ہو چکا ہے جب پاکستانی مسلمانوں نے پاکستان کی تشکیل کے فوراً بعد مسلم لیگ کو مسترد کر دیا تھا۔

اب اس کا بھی اچھی طرح احساس ہو چکا ہے کہ تصادم اور مقابلہ کی پالیسی جسے جناح نے تقسیم سے پہلے بڑھایا اور جسے پاکستان حکمراں نے حلقوں نے باقی رکھا اضطراب کا باعث بنا ہے۔ جن لوگوں نے مسلمانوں کے لئے ایک جنت کی تخلیق کا وعدہ کیا تھا وہ ایک آئین تک نہ دے سکے جو عوام کو مساوات کی ضمانت دیتا۔ آج پاکستانی حکمراں بھی یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ اگر انھیں ترقی کرنی ہے اور دنیا کے موجودہ تنازع البقا میں انھیں باعزت طور پر زندہ رہنا ہے تو انھیں تصادم اور مقابلہ کی پالیسی کو ترک کرنا ہوگا اور امدادِ باہمی کے رجحان کو اختیار کرنا ہوگا۔ ہندوستانی قیادت آزادی سے قبل سے ہی باہمی امداد پر زور دے رہی ہے۔ گاندھی اور نہرو کے خیالات شملہ معاہدے میں اور دہلی معاہدہ میں تحسین و توصیف کا باعث ثابت ہو چکے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہندوؤں سے فرقہ وارانہ قوتیں بالکل ہی علیحدہ ہونے پر مجبور ہو گئی ہیں۔ آر۔ ایس۔ ایس اور جن سنگھ اب اپنے دفاع کی کوشش میں مشغول ہیں۔ اب وہ مسلمانوں کے ہندوستانی کرن کے شرانگیز نظریہ کی تبلیغ و تشہیر کرنے کی ہمت نہیں رکھتیں۔ اب وہ مسلمانوں سے قومی وفاداری کا مطالبہ کرنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتیں۔

اس نئی صورت حال کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ فرقہ وارانہ تشدد کے واقعات اچانک ہی بہت کم ہو گئے ہیں۔ اگر ہم آج کی صورت حال کا پانچ برس پہلے کی صورت حال سے موازنہ کریں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ وہ فرقہ وارانہ تشدد جو مسلمانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو پر خطرے کی تلوار بن کر لٹک رہا تھا اب بسترِ مرگ پر ہے۔ آخر یہ کس طرح ہوا؟ صورت حال میں یہ تبدیلی اس لئے نہیں آئی کہ مسلمانوں نے اپنی کوئی علیحدہ مسلم لیگ جیسی سیاسی تنظیم بنالی تھی بلکہ اس تبدیلی کی وجہ وزیر اعظم اندرا گاندھی کی قیادت میں سیکولر قوتوں کا فرقہ وارانہ شرانگیزیوں کے بانیوں پر وار ہے۔ ۱۹۶۹ء سے مسز اندرا گاندھی نے ان لوگوں کے خلاف زبردست مہم شروع کر دی تھی جو مسلم فرقہ کے خلاف شک و شبہات اور نفرت کی فضا پیدا کرتے ہیں اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے لڑانے کی سازش کرتے ہیں۔

اردو صرف مسلمانوں کا مسئلہ نہیں ہے۔ ہر فرقہ کی ضرورت ہے۔ ہر فرقہ نے اس کی نشو و نما میں حصہ لیا ہے۔ فرقہ پرست سیاست نے بدقسمتی سے اردو کو ایک فرقہ سے جوڑ دیا۔ حالانکہ یہ وسیع ترانسانیت کی حامل زبان ہے۔ مسلم لیگ اور جن سنگھ جیسی جماعتیں ہم آواز ہو کر کہتی ہیں کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ موجودہ صورت حال کا ایک خوشگوار پہلو یہ ہے کہ یہ رابطہ جو بدقسمتی سے قائم ہو گیا تھا اب ٹوٹ رہا ہے اور اردو کے معاملے میں ہر سیکولر ذہن اور جماعت غور و فکر پر آمادہ ہے اور یہ احساس عام ہو رہا ہے کہ اردو کے ساتھ بے انصافی ہوئی ہے اور اس کو اس کا صحیح مقام ملنا چاہیئے۔ اردو کو اس کا جائز مقام دینے کے سلسلے میں اقدامات ہوئے ہیں۔

اس کے علاوہ اقلیتوں اور کمزور طبقات کو اقتصادی زندگی میں مناسب مقام کے حصول کے لئے سہولتیں فراہم کی جا رہی ہیں۔

بے انصافی اور امتیازی سلوک اب روا رکھنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ اب بالعموم معاشرہ اور بالخصوص حکومت اس طرح کی کوشش کر رہی ہے جس سے اقلیتوں کو سماجی، سیاسی اور اقتصادی زندگی میں مناسب مقام مل سکے گا۔ اس کا مقصد محض بے انصافی کا خاتمہ نہیں ہے بلکہ معاشرہ کی ہمہ جہت ترقی کے لئے یہ لازمی ہے۔

اس ضمن میں مسز گاندھی نے جو قوم کو بنیادی اصول دیئے ہیں وہ قابل غور ہیں۔ ہمہ جہت اقتصادی ترقی پر زور دیا جا رہا ہے۔ اور خاص طور پر کمزور طبقات کو اوپر اٹھانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ سوشلزم کی پالیسی مفاد پرست طبقۂ اُمرا کے لئے قابل قبول نہیں ہو۔ لیکن اس سے غریب عوام اپنے روشن مستقبل کی ضمانت سمجھتے ہیں۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مسلمانوں کا شمار بھی اسی زمرے میں ہے جو سوشلسٹ پالیسیوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو مسلمانوں کی علیحدہ تنظیم کی بات کرتے ہیں۔ انھیں یہ ثابت کرنا چاہیئے کہ مسلمانوں کا مفاد غریب طبقات کے مفاد سے کس طرح الگ یا مختلف ہے۔ انھیں یہ بھی ثابت کرنا چاہیئے کہ جو لوگ سوشلزم کی پالیسیوں پر عمل پیرا ہیں ان کی مخالفت سے مسلمانوں کا بھلا ہوگا۔

مسلم لیگ اور اس طرح کی دیگر جماعتیں ان

حقائق کو پرسنل لا اور مسلم یونیورسٹی کے مسئلے پر شور وغل مچا کر دبا دینا چاہتے ہیں۔ پرسنل لا کے سوال پر وزیر اعظم نے بار بار یہ یقین دہانی کرائی ہے کہ اس معاملے میں اس وقت تک مداخلت نہیں کی جائے گی جب تک خود اس فرقہ کی طرف سے اس کی خواہش نہ ظاہر کی جائے۔ ظاہر ہے مسلم لیگ اور مسلم مجلس ان یقین دہانیوں کا اعتماد نہیں کرتیں۔ اس لئے کہ اس مسئلہ پر وہ گورو گولوالکر کے بیانات کا خیر مقدم کر چکی ہیں۔ یہاں میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگر گولوالکر نے مسلم پرسنل لا کے معاملے میں مسلمانوں کے حق کی حمایت کی تو اس لئے نہیں کہ اُن کو اِس فرقہ سے محبت ہے بلکہ اس لئے کہ ہندوستان میں سیکولر مسلمان کی وجہ سے کسی بھی فرد کے لئے یک رنگی کی وکالت ناممکن بن گئی ہے۔ اگر مسلمانوں نے سیکولر قوتوں کی قدر وقیمت اور ان کے کارناموں کی اہمیت پر توجہ نہیں دی تو یہ ایک نہایت ہی افسوسناک بات ہوگی۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے معاملے میں بھی غیر مناسب رویہ اختیار کیا جا رہا ہے۔ اور اگر قانون میں مناسب تبدیلی نہیں ہوئی تو اس کی وجہ بھی محض مسلم لیگ جیسی فرقہ وارانہ جماعت ہے۔ اس لئے کہ اس نے غیر مناسب مطالبات کئے اور اشتعال و مظاہرے کی زبان میں گفتگو کی۔ اس مسئلہ پر مسلم لیگ کی پکار کو معصومانہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

لیگ کے رہنماؤں نے لیگ کو جمہوری تنظیم کی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی اور یہ بتانے کی کوشش کی کہ یہ ترقی پسند سیکولر قدروں کی ترویج کے لئے کوشاں ہے اور مختلف فرقوں میں ہم آہنگی پیدا کرنا چاہتی ہے۔ مسلم لیگ کی اس احمقانہ چال کو معین شاکر اور ایس۔ اے۔ مغربی جیسے محققین نے فاش کر دیا ہے انھوں نے بتایا کہ مسلمانوں کو فرقہ وارانہ خطوط پر چلانے کی کوشش کی گئی جس سے متعدد علاقوں میں فرقہ وارانہ بدامنی پیدا ہوئی۔ اس کی تمام حرکتیں اور پروگرام فرقہ وارانہ ارتکاز کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

طبقات سے پرے تمام مسلمانوں کی واحد نمائندگی کا دعویٰ غیر جمہوری ہے اور فرقہ وارانہ انداز فکر پر مبنی ہے۔ مسلم لیگ دونوں فرقوں کی سیکولر قوتوں کو کمزور کرتی ہے اور جارحانہ ہندو فرقہ پرستی سے لڑنے والی سیکولر قوتیں بھی کمزور ہو جاتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلم لیگ اقتدار میں حصہ بٹانا چاہتی ہے۔ خواہ اس کے لئے اپنے فرقہ کے مفاد کو کتنا ہی نقصان پہنچے۔ اگر ایسی بات نہیں ہے تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ شیو شینا جیسی معروف مسلم مخالف اور فسطائی تنظیم سے ہاتھ کیوں ملا رہی ہے؟ مسلم لیگ شمال میں جن سنگھ سے بھی ہاتھ ملانے پر آمادہ ہے اور ظاہر ہے جن سنگھ ملک میں مسلم کلچر کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ یہ حالت کا نہایت ہی عجیب وغریب طنز ہے کہ مسلم لیگ سمیت تمام مسلمان جماعتیں فرقہ پرست رہنماؤں کو ہندو فرقہ کا نمائندہ سمجھتی ہیں اور سیکولر ہندوؤں کو قابل اعتنا نہیں سمجھتیں۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آخر مسلم جماعتیں اندرا گاندھی کی یقین دہانی پر یقین کرنے کے بجائے گولوالکر کے بیان کو کیوں اہمیت دے رہی ہیں۔ مسلم جماعتوں کے اخبار و رسائل کا مطالعہ اس کا مظہر ہے کہ وہ ہندو فرقہ پرستوں کی حرکات وسکنات کو زیادہ نمایاں کرتے ہیں اور اسی طرح فرقہ پرست ہندو جماعتیں بھی مسلمان فرقہ پرستوں کو زیادہ نمایاں مقام دیتی ہیں۔ ان سب باتوں سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو ان سیکولر قوتوں پر کوئی بھروسہ نہیں ہے جو اس کے لئے کوشاں ہیں کہ دونوں فرقے اپنی اپنی خصوصیات کے ساتھ مل جل کر ملک میں رہیں اور ترقی کریں۔

بلاشبہ مسلم لیگ جن سنگھ کے معاون کی حیثیت سے عمل پیرا ہے۔ اس لئے کہ اس کا اثر کم ہو رہا ہے اور اب مسلم لیگ کی وجہ سے اسے بڑھنے میں سہولیت ہوگی لیگ کی حرکتیں سیکولر مخالف اور سوشلسٹ مخالف ہیں۔ دراصل مسلم لیگ اور جن سنگھ کی حرکات اور مفادات مشترک ہیں۔ آزادی سے قبل کے واقعات سے ثابت ہے کہ دونوں فرقہ پرست جماعتوں کو سامراجیت کی حمایت حاصل تھی۔ آج بھی سامراجی قوتیں خاص طور پر امریکی سامراج مسز اندرا گاندھی سے بے حد خفا ہے اس لئے کہ انھوں نے اس کے دباؤ پر جھکنے سے انکار کر دیا تھا جس طرح برطانوی سامراج نے فرقہ پرستوں کو آزادی کی تحریک کمزور کرنے کے لئے استعمال کیا تھا بالکل اسی طرح امریکی سامراج ہندوستانی کے بڑھتے ہوئے قدم کے لئے فرقہ پرستوں کو زنجیر بنانا چاہتا ہے۔

مسلم لیگ وہی احمقانہ رویہ اختیار کر رہی ہے جو اس کا پرانا شیوہ رہا ہے۔ وہ سیکولر قوتوں کے خلاف غلط فہمی اور غلط خوف پیدا کر رہی ہے اس سلسلے میں مستقیم کی شرانگیز مثال پیش کروں گا جس کا مظاہرہ اس نے سبھدرا جوشی کے خلاف کیا۔ کیا اس ملک میں کوئی بھی شخص سبھدرا جوشی یا ان کی تنظیم پر یہ الزام لگا سکتا ہے کہ ان کا مقصد کسی بھی اقلیت کو اپنے فکر یا الفاظ سے نقصان پہنچانا ہے۔ یہ درست ہے کہ وہ تمام فرقوں کے لئے نیک خواہشات رکھتی ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ یہ سب امن وچین سے رہیں، لیکن خاص طور پر اقلیتوں کو انصاف دلانے کے لئے کوشاں ہیں جس طرح "مستقیم" نے اِن پر کیچڑ اُچھالا ہے وہ نہایت ہی غیر منصفانہ ہیں۔ یہ مثال ہی یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ وہ کس طرح کا پروپیگنڈہ کر رہے ہیں۔ اس طرح کی بھی خبریں ملی ہیں کہ مسلم لیگ نوجوانوں کو تشدد کی تلقین کر رہی ہے۔ یہ ایک خطرناک چال ہے جس سے پوری قوم کو خطرہ پہنچ سکتا ہے۔ لیکن یہ اقلیتی فرقہ کے لئے زیادہ خطرناک ہے۔ میں مسلم فرقہ اور خاص طور پر اپنے نوجوان دوستوں سے درخواست کروں گا کہ وہ ان بھیانک تبدیلیوں سے خبردار رہیں اور قوم کے مختلف طبقات کے درمیان خلیج بننے کا باعث نہ بنیں۔ مسلم لیگ کی سیاست کی بنیاد پر نظر رکھتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ اس کے ساتھ دوست کا نہیں دشمن کا سا برتاؤ کرنا چاہیئے۔

قومی یک جہتی کے لئے طریقۂ عمل

ڈی۔ آر۔ گوئل

قومی یک جہتی کونسل کا احیا ہو رہا ہے۔ وزارت داخلہ کی تشکیل شدہ اسٹیرنگ کمیٹی نے وزیر اعظم کی صدارت میں کل اپنی نشست کی۔ سرکار نے وزیر اعظم سے اتفاق کیا کہ قومی یک جہتی کو غیر سیاسی جماعتوں کی قومی سطح پر منصوبہ بند کرنا چاہیئے۔ وزرائے اعلیٰ سے کہا گیا کہ وہ اپنی ریاستوں میں قومی یک جہتی کے فروغ کے طریقوں پر روشنی ڈالیں اور روئیداد پیش کریں۔ چار یا چھ ہفتوں کے بعد اسٹیرنگ کمیٹی پھر ملے گی اور تجاویز پر غور و خوص ہوگا۔ کونسل کی ترتیب دستور اور لائحہ عمل کے بارے میں بھی فیصلے کئے جائیں گے۔

کیا قومی یک جہتی کونسل اپنے مقاصد کے حصول میں کامیاب ہوگی۔ ماضی کے تجربات اس ضمن میں ہماری رہ نمائی کرتے ہیں۔ یہ کوئی نیا تجربہ نہیں ہے۔ کونسل ۱۹۶۱ء میں بنی۔ اس وقت اتر پردیش اور مدھیہ پردیش میں فرقہ وارانہ فسادات کا دار و دورہ تھا۔ متعدد ذیلی کمیٹیاں تشکیل دی گئی تھیں جنھوں نے وسیع پیمانے پر عوامی رہ نماؤں سے تفصیلی گفتگو کی۔ رپورٹیں تیار کی گئیں۔ اس کے بعد ۱۹۶۸ء تک قومی یک جہتی کونسل کے سلسلے میں کوئی آواز نہیں سنی گئی۔ ۱۹۶۸ء کے فرقہ وارانہ فسادات کی تیز لہروں نے پھر رہ نماؤں کو چوکنا کر دیا۔ سری نگر میں ایک جلسہ ہوا۔ مفید مباحثے ہوئے، مسائل کے حل کے لئے متعدد باتوں پر غور و خوض ہوا اور ایک اسٹینڈنگ کمیٹی تشکیل دی گئی جس کا مقصد موقع موقع سے حالات کا جائزہ لینا اور ان پر تبصرہ کرنا تھا۔ اس حقیقت سے قطع نظر کہ کونسل کے احیا کا متفقہ طور پر تمام سیاسی جماعتوں اور عوام نے خیر مقدم کیا۔ اس کا اثر بہت ہی ناکافی ہوا۔ اس کی کم اثری کا ثبوت اس وقت واضح ہو گیا جب مہاتما گاندھی کی سرزمین میں گاندھی صدی کے موقع پر فسادات پھوٹ پڑے۔

کونسل احمد آباد المیہ کی روک تھام یا زخمی دلوں پر مرہم رکھنے کے لئے کچھ نہ کر سکی۔ پھر ایک متفقہ طور پر منظور شدہ بیان کے مطابق کل جماعتی مہم شروع کرنے کی کوشش کی گئی لیکن یہ کوشش ناکام ہو گئی۔ کسی جماعت کے مہم کی اساس پر اپنے تحفظات تھے تو کسی کو یہ خیال کہ اس بنیادی اختلاف کی وجہ سے معاملہ نہیں سکتا۔ ناکامی کا یہ سلسلہ جلگاؤں اور بھونڈی کے فسادات تک چلتا رہا۔

پھر ایسا معلوم ہوا کہ وزیر اعظم کا پیمانۂ صبر بھی لبریز ہو گیا ہے۔ کسی ایک پارٹی یا کل پارٹی کونسل کا انتظار کئے بغیر انھوں نے فرقہ وارانہ قوتوں پر زبردست حملے شروع کر دیئے۔ پارلیمنٹ کے اندر اور باہر انھوں نے زبردست مہم شروع کر دی اور فرقہ پرستوں کی مذمت کی جس کا بہت ہی اچھا اثر ہوا۔ جیسے ہی وزیر اعظم نے فرقہ پرستی کی ظلمت پرست قوتوں پر ضربیں لگائیں کونسل کو اپنے مقاصد میں ناکامی کا احساس شدید ہو گیا اور اسے وزیر اعظم کے رویئے سے روشنی ملی۔ ایک ایسی فضا پیدا ہو گئی کہ فرقہ پرستوں کو کونے کھدروں میں چھپنے پر مجبور ہونا پڑا۔ عوام نے اقلیتوں اور کمزور طبقات کی دشواریوں اور مصائب کا احساس کیا اور اسے ہمدردانہ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی جس کی وجہ سے اقلیتوں اور کمزور طبقات میں نیا اعتماد پیدا ہوا۔ یہ اسی فضا کا کرشمہ ہے کہ راجستھان اور بہار میں مسلمان وزرائے اعلیٰ نظر آتے ہیں اور کوئی فرقہ پرست زور و شور سے اعتراض کرنے کی جسارت نہیں کر پاتا۔

قومی یک جہتی کونسل کے منصوبہ کی ناکامی یا کامیابی کے امکانات کا جائزہ اسی پس منظر میں لیا جا سکتا ہے۔ کیا اسے وہی رویہ اختیار کرنا چاہیئے جو اندرا جی نے کیا۔ یہ رویہ نہ صرف فرقہ پرستی بلکہ ذات پرستی اور علاقائیت پرستی کے خلاف بھی اختیار کیا جانا چاہیئے۔ کیا کونسل اور اس کی دستوریہ پر کچھ اور آگے بڑھ سکتی ہے تاکہ ہر جگہوں کے خلاف بھیانک تشدد کو لگام دیا جا سکے۔ کیا کونسل کے ممبران زبان اور علاقہ کی بنا پر معمولی سیاسی مفاد کے حصول کے لئے برپا انتشار اور بدامنی کے خلاف جنگ کریں گے۔

اسٹیرنگ کمیٹی کے سیاسی جماعتوں کے گذشتہ رویوں کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاید ایسا نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ کل ہر شخص اس سے متفق تھا کہ قومی یک جہتی کے معاملے میں سیاست کو ٹانگ اڑانے کی اجازت نہیں دی جانی چاہیئے لیکن اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ ہر بات کا ہر شخص کے نزدیک مختلف تصور ہے۔ اور یہ اختلافات کسی مثبت قدم کے اٹھانے میں مانع ہوتے ہیں۔ وزیر اعظم کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ صدیوں کی پروردہ منافرت صرف آزادی آ جانے سے یا صرف حکومت کی کاروائیوں سے نہیں ختم ہو سکتی۔ ان سماجی رجحانات کے خاتمے کے لئے کونسل ہر جماعت سے تعاون حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس کی حوصلہ افزائی ہوگی لیکن جن جماعتوں کی بنیاد ہی فرقہ پرستی اور منافرت پر ہے ان کے ضمن میں اصل دشواریاں ہیں۔ جب تک اس طرح کی جماعتوں کی پرواہ کئے بغیر کونسل آگے نہیں بڑھے گی اسے خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوگی۔

(باقی صفحہ ۲۶ پر)

بھارت

یہ زندگی ہے کہ آئینہ خانۂ احساس،
ہزار روپ، یہ خوشبوئیں، ذائقہ یہ صدائیں
اِس ایک ذات کی عظمت کے کتنے مظہر ہیں

خود اپنی ذات پہ نازاں ہے خالقِ عالم
بصد طمانیت و حسن و لذّتِ تخلیق
فرازِ کوہِ شعورِ وطن پہ رقصاں ہے
وہ کوہ جس پہ مزیّن ہے برف نفس کشی
ریاضتوں کے سنہرے چمن کِھلائے ہوئے

اسی کے نور سے تابندہ ہے بساطِ شفق
ہر اک جمال کا حاصل اسی کا حسن و جمال
ہر ایک راز میں پنہاں اسی کا رازِ نہاں
ہر ایک رنگ میں ہے اس کی جلوہ سامانی
کرن کرن میں وہی جلوہ ریز و رقصاں ہے
اسی کے واسطے سارے دیدۂ حیراں
ہزار قوسِ قزح ہیں فضا میں نور افشاں

اُبھر رہا ہے مرے نکتہ رس تخیل میں
ہزار شان سے چہرۂ وطن کی عظمت کا
مری نگاہ میں ہے یوں جمال روحِ وطن
طلوع جیسے ہوں اک ساتھ سینکڑوں سورج

مرا وطن ہے وہ بھارت وہ ارضِ نکہت و نور
جہاں خدائے صداقت بھی ایستادہ ہے
کنول کے پھول پہ اک پیکرِ یقیں بن کر
سنہرے ہالے میں روشن ہے اس کا روئے حسیں

وہ جاوداں ہے ازل بھی وہی ابد بھی وہی
وہی ہے حسن، جنوں بھی وہی، خرد بھی وہی
وہ جس کی بنسی کی ہر تان نغمۂ تخلیق
جگا کے روح وہ فردوسِ زندگانی کی
بکھیرتا ہے فضا میں حیات کے نغمے
محبتوں کے ترانے، ثبات کے نغمے

سمترانندن پنت (ہندی)



درشن

برس رہی ہیں مسلسل فضائے عالم میں
صداقتوں کی شعاعیں، نجات کی کرنیں
جبینِ وقت و زمانہ انھیں سے ہے روشن
انھیں کے دم سے یہ دنیا ہے رشکِ صد فردوس

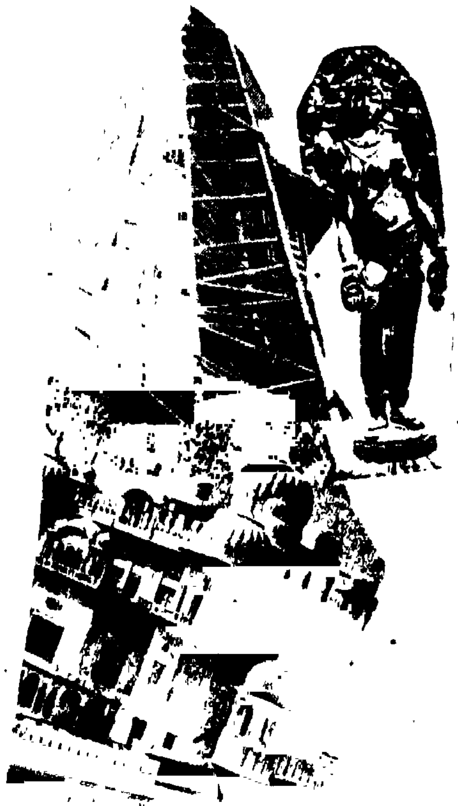
زمیں پہ آج بلاؤں کا ہو رہا ہے نزول
شکارِ تشنگی و اضطراب ہے انساں
تڑپ رہے ہیں گھروندوں میں صبوکے لاغر جسم
وہ بھوک پیاس کی شدت سے ہوکے بے قابو
درندگی پہ اُتر آئے ہیں بحالِ نزار
دلوں میں بغض و عناد و حسد ہے، نفرت ہے
بھٹک گئے ہیں رہِ راست سے محبت کی
عجیب دور میں انسان آج پہنچا ہے
کہ اپنے آپ سے بیگانہ ہو گیا ہے وہ
خود اپنی روح کی دنیا سے بے خبر ہو کر
بھٹک رہا ہے وہ ذہنی خلا کے عالم میں
عروجِ عقل نے اس کو کیا ہے رو بہ زوال

کہ موت ڈھالتا ہے آج وہ مشینوں میں
جو کل پیمبرِ تعمیر تھا زمانے میں
رہی ہے مائلِ تخریب جنتِ امکاں
ہزاروں سال کی تہذیب، علم، سچائی
خلوص، حسن، وفا، دل کشی و رعنائی
کھڑے ہیں آج سبھی موت کے دوراہے پر

قریبِ مرگ ہے دنیا، یہ جاں بلب دنیا
حیاتِ تازہ اسے کون دے سکے گا بھلا؟

مجھے یقیں ہے وہ بھارت ہے صرف بھارت ہے
جو اس جہاں کو نیا سوز و ساز بخشے گا
جو اپنی روح کی اک لازوال قوت سے
کرے گا دہر کو آسودۂ جمالِ حیات
جو اس کو امن کے نغموں کی تازگی دے گا
جو اس کو پیار کے پھولوں کی دلکشی دے گا

مترجم:۔ رفعت سروش





(قومی یک جہتی کیلئے طریقۂ عمل۔ بقیہ صفحہ ۲۳ کا)

قومی یک جہتی کے فروغ کے دو پہلو ہیں پہلے کا تعلق حکومت کی کاروائیوں سے ہے جس کے لئے رہنما اصول سری نگر کی نشست میں طے کردیئے گئے تھے۔ ان تجاویز کے نفاذ کی راہ میں حائل دشواریوں پر بحث ہونی چاہیئے اور رکاوٹیں دور کی جانی چاہیئے وزیر اعظم نے ایک بہت ہی اہم نکتہ اٹھایا ہے۔ وہ یہ کہ فرقہ وارانہ تشدد اور چھوا چھوت جیسے جرائم کے خلاف مرکزی حکومت کیا کیا کرسکتی ہے۔ ریاستی وزیر اعلیٰ کو اس نقطہ پر غور کرکے ایک فیصلہ کرنا چاہیئے۔

جب عوامی مہم شروع ہوگی اس وقت حقیقی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ شری گجرال کا یہ کہنا بالکل درست تھا کہ اسے عوامی تحریک بنانی چاہیئے لیکن ایسی جماعتوں کی بنا پر عوامی تحریک کیسے چل سکتی ہے جن کا متعدد معاملات پر گہرا اختلاف ہے اور وہ قومی یک جہتی کے فروغ کے لئے مختلف نقطۂ نظر رکھتی ہیں اس کے علاوہ ہمارا ماضی کا تجربہ یہ ہے کہ مفاد پرست نفاق پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسے بڑھاتے ہیں اور سماجی بے انصافی اور عدم مساوات کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں ایسے مفاد پرستوں کی نمائندہ جماعتیں عوامی تحریک کو کامیاب نہیں ہونے دیں گی۔ قومی یک جہتی کی راہ میں حائل ان دشواریوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ قومی یک جہتی کی کامیابی کے لئے وسیع النظری کے ساتھ بنیادی آدرشوں پر اتفاق ضروری ہے۔ سیاسی جماعتوں کا بے قاعدہ اجتماع اس مقصد کے حصول میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ کونسل ماضی کی کمزوریوں کو دور کرسکتی ہے۔ اگر اس کے شرکا یکساں طرز فکر کے حامل ہوں۔

اگر حکومت کوئی ایسا کام نہیں کرسکتی جس میں تمام نقطۂ نظر کی نمائندگی نہ ہو تو بہتر ہے کہ رضاکارانہ اور غیر سرکاری اداروں پر اس کی ذمہ داری چھوڑ دی جائے۔ (بشکریہ آل انڈیا ریڈیو)

سامپردائکتا ورودھی کمیٹی کی سرگرمیاں

دہلی کے فسادات کے متعلق ایک سرکولر

آل انڈیا سامپردائکتا ورودھی کمیٹی کے جنرل سکریٹری نے کمیٹی کی سبھی شاخوں کو ایک سرکولر بھیجا ہے اور تشدد پھیلائیں۔ ابھی حال ہی میں جو ہندو پاک سمجھوتہ ہوا ہے

اہم اطلاعات

نمبر۱۔ فرقہ واریت مخالف نیشنل کنونشن کے لئے ۱۶ر، ۱۷ر اور ۱۸ر نومبر کی تاریخیں مقرر کی گئی ہیں کنونشن لکھنؤ میں ہوگا۔ محترمہ (ڈاکٹر) راجندر کماری باجپئی کی صدارت (چیئرمین شپ) میں مجلس استقبالیہ تشکیل پاگئی ہے۔ حسب بالا تاریخوں میں سے کسی ایک دن کنونشن میں خطاب کے لئے وزیر اعظم نے اپنی رضامندی ظاہر کردی ہے۔

آل انڈیا سامپردائکتا ورودھی کمیٹی نے ہر ریاست کی کمیٹی کو نیشنل کنونشن میں شرکت کی دعوت دے دی ہے۔ ریاستی کنونشن کا انعقاد نیشنل ایگزیکٹو کی نشست میں مقررہ شیڈول کے مطابق ہوگا۔

ریاستوں سے توقع ہے کہ وہ اپنا کوٹا پورا کریں گی۔ ریاستی اکائیاں کو اپنی ہفتہ وار رپورٹیں بھیج دینی چاہئیں۔ ممبر بنانے اور سیکولر ڈیموکریسی کی خریداری کی مہم تیز کردینی چاہیئے

نمبر۲۔ کرناٹک اسٹیٹ سامپردائکتا ورودھی کمیٹی اپنی کانفرنس ۲۹ر اور ۳۰ر ستمبر ۱۹۷۳ء کو کررہی ہے۔ اسٹیٹ کمیٹی کے معتمد عمومی جناب جاگیردار کی رہنمائی میں تیاریاں شروع ہوچکی ہیں۔

نمبر۳۔ یو۔پی اسٹیٹ سامپردائکتا ورودھی کمیٹی لکھنؤ میں نوجوانوں کا تربیتی کیمپ ۲۷ر اگست سے ۲ر ستمبر تک کے لئے منظم کرچکی ہے۔ کیمپ کو فرقہ وارانہ اتحاد کے کاز کے عظیم شہید گنیش شنکر ودیارتھی کے نام سے منسوب کیا تھا۔ اسے گنیش شنکر ودیارتھی یوتھ کیمپ برائے قومی یک جہتی سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس ہفت روزہ کیمپ میں ریاست کے ۱۶ اضلاع سے ۴۶ نوجوان شامل ہوئے کیمپ کا افتتاح یو۔پی کے گورنر جناب اکبر علی خاں نے کیا۔ مرکزی وزیر برائے دفاعی پیداوار شری ودیا چرن شکلا نے آخری اجلاس کو خطاب کیا اور شرکا میں اسناد تقسیم کئے۔

(سیکولر ڈیموکریسی کے اکتوبر کے شمارے میں کیمپ سے متعلق تفصیلی رپورٹ شائع کی جائے گی)

جس میں انھیں ہوشیار رہنے کی ہدایت کی ہے کیوں کہ فرقہ پرست عناصر فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا کرنے کی سازش کررہے ہیں۔ دہلی کے حالیہ کچھ حادثات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ یہ عناصر ہوسکتا ہے کشیدگی پیدا کریں اس سے فرقہ وارانہ عناصر میں مایوسی پھیل گئی ہے مسلم لیگ مسلم مجلس اور اسی طرح کی دیگر جماعتیں عوام میں سرگوشیاں کررہی ہیں کہ شریمتی اندرا گاندھی اور جن سنگھ میں کوئی

(باقی صفحہ ۴۲ پر)

رشید الدین خاں

سیکولرازم: فرقہ وارانہ جہت

ہندوستان میں جدید اصولوں پر قومی تعمیر کا عمل بڑی حد تک انقلاب کے تین بڑے عوامل پر منحصر ہے۔ یہ عوامل ہیں، جمہوریت، سوشلزم اور سیکولرازم۔ آسان لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہی تین عناصر ملک میں سیاسی اقتصادی اور سماجی انقلاب لانے کے خاص ذرائع ہیں۔

جمہوریت کا مقصد نئے ہندوستان کے سیاسی ڈھانچے کو اس طرح بدلنا ہے کہ سیاسی سرگرمیوں میں سماج کے ان طبقوں اور گروہوں کو بھی شریک کیا جائے جو اب تک ملک کے سیاسی تانے بانے سے الگ رہے تھے۔ ہندوستانی شہریوں کو ہمہ گیر طور پر سیاسی دھارے میں لانے کا مطلب اس قدیم سرزمین میں عوام کے اشتراک سے ایک نئی سیاسی ثقافت کی تخم ریزی کرنا ہے۔

سوشلزم کا لفظ ہندوستان میں اکثر و بیشتر جن معنوں میں استعمال ہوتا ہے وہ یہ ہیں کہ ملک میں مرکزی منصوبہ بندی ہو اور رسل و رسائل کے خاص خاص ذرائع اور چند بھاری صنعتیں سرکاری انتظام میں چلائی جائیں۔ کبھی کبھی اس اصطلاح کا مطلب ہوتا ہے نجی تجارت کی آزادی کے نظریہ کی نفی، زمین کے مالکوں کے غیر محدود اختیارات کا خاتمہ، ایسے زمین مالکوں کی ان زمینوں سے بے دخلی جو خود کاشت نہ کرتے ہوں اور نجی سرمایہ کی بے روک ٹوک بڑھوتری پر پابندی اور صنعت کے سرکاری اور نجی شعبوں کے درمیان ایک ایسا رشتہ قائم کرنا جس کے تحت اقتصادی معاملات میں سرکاری شعبہ کی بالادستی برقرار رہے۔

اور چیزوں سے قطع نظر ہمیں اس مقالے میں تیسرے آلۂ انقلاب یعنی سیکولرازم کو فرقہ واریت کے پھیلاؤ کے پس منظر میں دیکھنا ہے۔

۲

نئے ہندوستان کی تعمیر میں سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھنے والے سیکولرازم کے تصور کو زیادہ اچھی طرح سمجھنے کے لئے اس نظریہ کے کم از کم دو پہلوؤں پر غور کرنا ضروری ہے۔ ایک وہ تاریخی پس منظر اور حالات جنھوں نے آج کے دور میں اس نظریئے کی ضرورت پیدا کی ہے اور دوسرا پہلو ہے اس نظریئے کی سیاسی تعبیریں۔

اگر اس تاریخی پس منظر کا مطالعہ کیا جائے جس میں سیکولرازم ہمارے جدید ذہن رکھنے والے قوم پرستوں کا نصب العین بنی تو ہم ایک ایسے چیلنج سے دوچار ہوں گے جس کا واحد حل سیکولرازم ہی ہے۔ جدوجہد آزادی کے آخری مرحلے میں فرقہ وارانہ شناخت نے خاصا زور پکڑ لیا۔ جس کا نتیجہ ملک کی تقسیم کی صورت میں نکلا اور گویا ایک طرح سے اس اصول کو تسلیم کر لیا گیا کہ مذہب ہی قومی انفرادیت اور بالآخر ملت کی واحد کسوٹی ہے اور اس طرح پاکستان کے قیام نے برصغیر کی سیاست میں ایک نامعقول روش کو جنم دیا۔ یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان کے ٹکڑے ہو جانے اور بنگلہ دیش بن جانے سے اس غیر معقول روش کا ایک حد تک سدھار ہو گیا ہے۔ بہرحال ۱۹۴۷ء میں پاکستان بننے کے بعد یہ ڈر پیدا ہوا تھا کہ کہیں ہندوستان کو ایک ہندو اسٹیٹ بنانے کی مانگ نہ کی جانے لگے۔ واقعہ یہ ہے کہ آزادی حاصل ہونے کے بعد غالب اکثریت والی کانگریسی حکومت کا ایسا غلغلہ بلند ہوا کہ اس میں آر۔ ایس۔ ایس اور ہندو مہا سبھا کے انتہا پسند عناصر کی کچھ پیش نہ گئی۔

ہندوستان میں سیکولرازم کے نظریاتی حیثیت سے تین پہلو ہیں۔

۱۔ مذہبی بنیادوں پر قائم ہونے والی حکومت، جیسے پاکستان کے نظریہ کی نفی۔

۲۔ یہ اعلان کرنا کہ مذہب ایک فرد یا جماعت کا نجی معاملہ ہے اس لئے حکومت کی نظر میں تمام مذاہب یکساں طور پر محترم ہیں اور یہ کہ حکومت کے کاموں اور پالیسیوں پر اس کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا اور ـــــ

۳۔ ہندوستان کے تمام لوگوں کے مکمل اتحاد کا اعلان اور یہ کہ ذات اور عقیدے سے قطع نظر ہندوستانی جمہوریہ کے تمام شہری حکومت کی نظر میں برابر ہیں۔

یہ بات کہ پہلے اس اعلان اور بعد میں اس پر عملدرآمد کے لئے کتنی زبردست تیاری کرنی پڑی، یہ ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے کہ فرقہ واریت کا چیلنج کتنا زبردست ہے۔

ہندوستان میں سیکولرازم کی اہمیت اور وقت کے تقاضوں سے اس کی مکمل مطابقت کو سمجھنے کے لئے ہم کو اپنے زمانے کے ہندوستانی سماج کی ہیئت کو سمجھنا پڑے گا۔

۳

اگر کوئی ایسا مذہبی نظام ہے جو دنیا کے تمام مذہبی نظاموں سے مختلف ہے تو وہ ہے 'ہندوازم'[1]۔ مزے کی بات یہ ہے کہ 'ہندوازم' اور 'ہندو' الفاظ ہندوستان کی کسی بھی زبان کے الفاظ نہیں ہیں۔ ہندو لفظ کا استعمال ایرانیوں، ترکوں اور مغلوں نے اس ملک کے باشندوں کے لئے کیا اور اس لئے 'ہندوازم' کا لفظ ہندوستانیوں کے مذہبی نظام اور سماجی اور تہذیبی اقدار کے اظہار کے لئے استعمال ہونے لگا جواہرلال نہرو کی تصنیف "ڈسکوری آف انڈیا" کے ایک برمحل

اقتباس سے اس مسئلہ پر اچھی طرح روشنی پڑ سکتی ہے۔

"لفظ ہندو ہمارے قدیمی ادب میں کہیں بھی نہیں ملتا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ پہلی بار اس لفظ کا استعمال ایک ہندوستانی کتاب آٹھویں صدی عیسوی میں ہوا۔ یہ ایک تانترک تصنیف ہے اور لفظ ہندو کو ایک قوم کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے نہ کہ کسی خاص عقیدے سے تعلق رکھنے والے فرقہ کے لئے۔ لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہ لفظ بہت قدیم ہے اور "اوستا" اور قدیم فارسی میں ملتا ہے اور اس لفظ کا استعمال اس وقت بھی اور بعد میں مغربی اور وسطی ایشیا کے لوگ بھی ہندوستان کے ضمن میں کرتے رہے ہیں یا یوں کہہ لیجئے کہ ہندوستان کے باشندوں کے ضمن میں جو دریائے سندھ کے دوسری طرف رہائش رکھتے تھے یہ لفظ استعمال ہوتا تھا۔ اس لفظ کا ماخذ ہے 'سندھو'۔ جو دریائے سندھ کا پرانا نام بھی ہے اور نیا بھی، سندھو ہی سے 'ہندو' اور 'ہندوستان' کے لفظ بنے ہیں اور انگریزی کے 'انڈوس' (Indos) اور انڈیا بھی اسی لفظ سے مشتق ہیں۔ مشہور چینی سیاح آئی سنگ جو ساتویں صدی عیسوی میں ہندوستان میں وارد ہوا تھا۔ اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے کہ شمالی قبائل یا وسط ایشیا کے رہنے والے ہندوستان کو ہندو (Hsin-tu) کہتے ہیں۔" آگے چل کر وہ لکھتا ہے "لیکن یہ عام نام نہیں ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ہندوستان کے لئے سب سے موزوں نام 'شریفوں کا ملک' یا 'آریہ دیش' ہے۔ مذہب کے ضمن میں ہندو کا لفظ کافی تاخیر سے استعمال ہونا شروع ہوا۔"

ہندوستان میں مذہب کے لئے قدیمی لفظ 'آریہ دھرم' ہے۔ دھرم کا مفہوم مذہب کے روایتی اور محدود مفہوم سے بہت زیادہ وسیع ہے۔ دھرم کا لفظ جس مصدر سے نکلا ہے اس کے معنی میں متحد رکھنا۔ اس کا اطلاق دراصل کسی چیز کی انتہائی اندرونی ہئیت اور اس کے اندرونی وجود کے قانون پر ہوتا ہے۔ یہ ایک اخلاقی تصور ہے جس میں ضابطۂ اخلاق، راست بازی اور انسان کے فرائض اور ذمہ داریوں کا پورا نظام شامل ہے۔ آریہ دھرم میں وہ تمام عقاید (ویدک اور غیرویدک) جو ہندوستان میں پیدا ہوئے، شامل ہیں اس لفظ کا استعمال بدھوں اور جینوں نے بھی کیا اور انھوں نے بھی جو ویدوں کو مانتے تھے۔ مہاتما بدھ اپنے مسلک نجات کو آریہ پتھ کہا کرتے تھے (صلہ ۵۲-۵۳)۔

یہ ظاہر ہے کہ 'ہندوازم' اپنے زیادہ حقیقی معنوں میں سماج میں زندگی بسر کرنے کا ایک نمونہ ہے جس کے کارگر درجات ذات اور ذیلی ذاتیں (جاتی) ہیں۔

مماثلت معقولیت کی بدترین دشمن رہی ہے۔ یونانیوں نے غیریونانیوں کو یونانی فلسفوں کی روشنی میں سمجھنے کی جو غلطی کی عربوں نے، جو ان کے جانشین اور سابقہ علم کے روایت بردار تھے غیرعربی دنیا کو اسلامی عربی نقطۂ نظر سے سمجھنے کی کوشش کرکے اس کا اعادہ کیا۔ مثلاً اسلام اگر ایک آسمانی دین ہے، ایک صحیفہ، ایک پیغمبر اور حیات مابعد پر یقین کا دین، تو ہندوازم کو بھی ایک آسمانی یا غیرآسمانی دین ہونا چاہیئے لیکن سامی مذہبی نظریے کے تحت یہودی، عیسائی، اسلامی ترکیب کے مطابق اسے بہرحال ایک دین ہی ہونا چاہیئے۔ اسی طرح اگر عیسائیت کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کی ایک کلیسائی تنظیم ہو تو ہندوازم کے لئے بھی یہ ضروری قرار پایا کہ اگر اس کی کوئی معبدی تنظیم نہ بھی ہو تو کم سے کم دکھاوے کے طور پر کچھ ہو۔ اس نقطۂ نظر کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم ہندوازم کو واضح اور صحیح طور پر نہ سمجھ سکے اور اس کی مخصوص اور اصلی ہئیت ہماری نظروں سے اوجھل رہی۔ ہندوازم اصل میں مذہب کے سامی تصور کے مطابق کوئی مذہب ہے ہی نہیں یعنی یہ کہ ہر دین کے پاس ایک نازل شدہ صحیفہ، ایک یا ایک سے زیادہ پیغمبر، ایک مقدس کلیسائی نظام اور کٹھ ملائیت جو بدعت کو شناخت کرسکے، ہونا ضروری ہے۔ ہندوازم میں کٹرپن اور بدعت کوئی دو چیزیں نہیں ہیں کیونکہ یہ دین کے معین اور محدود معنوں میں دین ہے ہی نہیں۔ نہ ہی اس کا کوئی معبدی نظام ہے جو کسی ایسے الٰہی کلام کی بنیاد پر، جو کسی پیغمبر پر نازل ہوا ہو، استوار کیا گیا ہو۔ اس چیز نے ہندو مت کو ایک ایسی لچک اور ایک روایتی لیکن اتنی وسیع بنیاد دے دی ہے کہ اس میں ہندوستانی کلچر اپنی کلیت کے ساتھ سما سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوازم کا احیا قدیم کلچر، علامات، اقدار، طرز فکر و عمل، روایتی طور پر سیدھی سادھی زندگی بسر کرنے کے اسلوب کے احیا کی شکل اختیار کرلیتا ہے یہ کسی خاص دین کے احیا کی شکل اختیار نہیں کرتا کیونکہ یہاں کسی نازل شدہ صحیفہ اور کامل و واضح دین کا وجود ہی نہیں ہے۔ ان معنوں میں ہندوازم کو ہندوستان کے روایتی سماجی نظام، کلچرل اساس، نظام اقدار، اور گیان دھیان کا ایک مظہر کہہ سکتے ہیں۔ اس طرح یہ ایک ایسا سماجی اور کلچرل نظام ہے جو نہ صرف ان لوگوں کے وجود کا ایک حصّہ ہے جو ہندوازم کے ماننے والے ہیں بلکہ ان لوگوں کا بھی جو دوسرے مذاہب کو مانتے ہیں۔ ان عمرانی معنوں میں (میرے دوست مجھے غلط نہ سمجھیں) ہندوستان کا مسلمان اپنے رویہ، نظریات کچھ سماجی قدروں اور رسوم و رواج کے اعتبار سے بنیادی طور سے ایک ہندو سے مختلف ہے۔ یہ بات اس وقت اور بھی واضح ہو جاتی ہے جب ہم اسلام کی فطرت اور دنیا کے دوسرے حصوں میں رہنے والے مسلمانوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ مسلمانوں کا ہندوؤں کے ساتھ محبت، نفرت کا رشتہ اس وجہ سے ہے کہ وہ ہندوازم کی سماجی تہذیبی قدروں کے اثرات سے ماورا نہیں ہو سکتے۔ وہ کبھی کبھی اپنے اس تہذیبی ورثہ کو اسلام پر اپنے عقیدے سے تطبیق دینے کی کوشش کرتا ہے لیکن بعض اوقات وہ ان کے ظاہر سے آشفتہ خاطر ہو جاتا ہے اور ان تضادات کے ہم آہنگ نہ ہوسکنے کا فرضی خوف اس کے ذہن پر آسیب کی طرح چھا جاتا ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں ایسا ایک لمحہ اس وقت آیا تھا جب ان کے چند بااثر لوگوں نے تنگ نظر سیاسی مصلحت بینی کے پیش نظر مایوسی اور نامعقولیت کے رویہ کو معقولیت پر غالب آنے دیا اور اس طرح مشترکہ طور پر زندگی گزارنے کے امکانات کو ہی ختم کر دیا اور ایک اسلامی مملکت قائم

کرنے کے جنون میں اپنے آپ کو ہندوستانی وحدت سے خارج کر لیا۔ اس مایوسی کے معیار کا دعویٰ تھا کہ یہ سیاسی علیحدگی نہ صرف مسلمانوں کے لئے بے شمار نعمتوں کے حصول کا سبب بنے گی بلکہ ان کو ہندو کلچر کے پنجے سے بھی چھٹکارا دلا دے گی لیکن وہ یہ نہیں سمجھے تھے کہ کلچر اور ثقافت کوئی ایسی شے نہیں جس سے کسی مذہبی عقیدہ کی طرح محض چھٹکارا پایا جا سکے یا خواہش کر کے چھٹکارا حاصل کیا جاسکے بلکہ یہ ایک بہت ہی تہہ دار اور گہری چیز ہے۔ اس لئے یہ حقیقت کتنی سبق آموز ہے کہ اگرچہ مسلمانوں کا ایک حصہ ہندو تہذیب کے خلاف اپنی جدوجہد کے نتیجہ میں ایک دوسری مملکت یعنی پاکستان کو قائم کرنے میں تو کامیاب ہو گیا لیکن اس مملکت کو اس کے اس بنیادی تصور کے مطابق نہ بنا سکا کہ اس کی اساس شریعت پر ہو گی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ مملکت ایک عام دنیاوی سیکولر آٹوکریسی بن کر رہ گئی۔ بنگلہ دیش کا حالیہ قیام نظری طور پر اس نظریہ کی نفی ہے جس پر پاکستان قائم کیا گیا تھا۔

۴

پہلے دو قومی نظریے کی نامعقولیت پر غور کریں گے۔

"دو قومی نظریہ پیش کرنے والوں کا کہنا تھا کہ غیر منقسم ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دونوں متوازی قومیتیں ہیں اور اس بنا پر جو جہاں اکثریت میں ہو اس کو وہاں اپنی خود مختار ریاست بنانا چاہئے اس طرح گویا پاکستان غیر منقسم ہندوستان کا مسلم اکثریت کا علاقہ تھا۔ اس طریق استدلال میں تین بنیادی غلطیاں تھیں۔

۱۔ محض مذہب، قومیت اور قوم پروری کی اساس نہ بن سکتا ہے اور نہ کبھی بنا ہے۔

۲۔ اگر غیر منقسم ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو ایک واحد قوم سمجھ لیا جائے تو ہندوستان میں بچے ہوئے مسلمان (اور پاکستان میں بچے ہوئے ہندو) تقسیم کے بعد غیر ملکی ٹھہرے جن کو شہریت کا حق صرف پاکستان (یا پاکستان کے ہندوؤں کو ہندوستان) میں حاصل ہو سکتا تھا۔ یا پھر ان کو اقلیتی فرقہ سمجھا جاتا جس کو نہ تو سیاست میں مساوی حقوق حاصل ہوتے اور نہ ملکی حکومت اور قانون سازی میں کوئی آواز ہوتی۔

۳۔ اگر مسلمانوں کی اس نام نہاد قوم پروری کے مطالبات کی تسکین ان علاقوں میں پاکستان کی تشکیل سے ہی ہو سکتی تھی جو مسلم اکثریت کے علاقے تھے جیسے پنجاب، سرحد، سندھ، بلوچستان اور مشرقی بنگال۔ تو اس کو یوں نہ سمجھا جائے کہ یہ علاقائی مقاصد کے حصول کے لئے علاقائی نہ کہ مذہبی ذرائع کا استعمال۔

محض بحث کی خاطر یہ دلیل دی جا سکتی ہے کہ اگر مملکت اور قوم ہم معنی الفاظ ہیں تو اگر بنگلہ دیش نے ایک طرف پاکستان سے الگ ہو کر دو قومی نظریہ کو غلط ثابت کر دیا تو دوسری طرف پاکستان اور ہندوستان دونوں سے اپنی آزادی کا اعلان کر کے یہ بھی ثابت کر دیا کہ وہ نہ صرف پاکستان سے الگ ایک قوم ہے بلکہ ہندوستان سے بھی الگ ہے۔ اور یہ کہ برصغیر میں کم از کم تین قوموں کا وجود ہے ہندوستان پاکستان اور بنگلہ دیش۔ لیکن اگر قوم اور مملکت کو ہم معنی الفاظ فرض نہ کیا جائے (اور فی الواقع یہ ہم معنی ہیں بھی نہیں کیونکہ عرب ایک قوم ہوتے ہوئے بھی ۱۸ خود مختار مملکتوں میں منقسم ہیں اور روس کے اندر ایک مملکت ہوتے ہوئے بھی مختلف قومیں موجود ہیں اور پھر افریقہ کی ۳۸ مملکتیں "قومی مملکتیں" نہیں) تو پھر تین متبادل نمونے اور پیش کئے جا سکتے ہیں۔

۱۔ یا تو ہم سارے برصغیر کو باستثنا بھوٹان نیپال، سکم اور سیلون ایک قوم فرض کر لیں۔ یا

۲۔ کچھ ایسے بھی یکرنگ گروپ ہیں جو زبان، کلچر، سماجی رجحانات، نفسیاتی ساخت، اقتصادی نظام، مذہب اور عقیدہ جیسے معلوم عوامل کے ذریعہ جن سے کسی قوم کی شناخت ہوتی ہے الگ پہچانے جاتے ہیں لیکن اس شناخت میں کوئی ایک عنصر نہیں بلکہ کئی عناصر مل کر فیصلہ کن ثابت ہوتے ہیں (مثلاً بنگالی قوم، پٹھان قوم، تامل قوم، جو زیر نظر معاملہ میں بنگلہ دیش اور ہندوستان، پاکستان اور افغانستان اور ہندوستان اور سیلون میں پھیلی ہوئی ہیں) یا

۳۔ نیشن یا قومیت کی اصطلاح برصغیر کی صورت حال اور سماجی گروپ بندی کے سیاق میں یا تو غیر معمولی طور پر محدود ہے یا پھر اتنی ہی مبہم ہے اس لئے اس نظریہ سے صرف نظر کر کے مختلف گروپوں کی زبان، کلچر، علاقہ اور مذہب کی بنیاد پر تشکیل کے مسئلہ کو لیجئے۔

لیکن یہ بات بہر حال ثابت ہو چکی کہ ہر تین نمونوں میں اور ایک الگ اور خود مختار بنگلہ دیش کے وجود سے یک قومی نظریہ اگر پوری طور پر تباہ نہیں بھی ہوا تو بری طرح متزلزل ضرور ہو گیا ہے۔ اس لئے اوپر کی بحث سے جو صحیح نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ لفظ نیشن کا مفہوم اتنا غیر واضح ہے کہ وہ ہندوستان کی سیاست کی کلیت کی عکاسی نہیں کر سکتا۔ ہندوستان کی تعمیر نو کا عمل دراصل ایک متحد اور ہم آہنگ سیاسی معاشرے کی تشکیل کا عمل ہے۔ اس کا تجربہ سوئٹزرلینڈ میں بھی ہو چکا ہے اگرچہ ذرا چھوٹے پیمانے پر ہوا لیکن وہاں ایسے عناصر جو مرکزیت اور ہم آہنگی سے گریز کرنے والے تھے نسبتاً زیادہ شدید تھے۔ سوویت یونین میں بھی کچھ اسی قسم کا تجربہ ہوا ہے۔ بہت بڑے پیمانے پر اور ایک غیر لچک دار آمرانہ یا لوجی اور ایک پارٹی کی حکومت کے نظام اور ایک ایسے آئینی ڈھانچے کی بنیاد پر جس کی بہت سی خصوصیات ہندوستان کے سیاسی نظام سے مختلف ہیں۔

۵

ہندوستان میں فرقہ واریت کے خاص آلۂ کار ہندو اور مسلمان میں (ہر ایک دوسرے کے لئے اور سیکولرازم پر یقین رکھنے والوں کے لئے دونوں) اس لئے ان تاریخی حقائق سے صرف نظر کرنا مناسب نہ ہو گا جن کی بنا پر ہندوازم اور اسلام اپنی ہزار سالہ ہمسائیگی اور ساتھ ساتھ رہنے کے باوجود دو الگ الگ واضح اور مستقل

اکائیوں کی طرح بڑھتے رہے جس کا نتیجہ پانیکر کے الفاظ میں "دو متوازی سماجوں کی تخلیق" کی صورت میں نکلا۔ اور بجائے امتزاج کے افتراق پلے پڑا۔ یہ صحیح اس طرح متوازی خطوط پر چلنے کے باوجود بہت سی باتوں میں ہم خیالی پیدا ہوئی اور بعض معمولی ردو بدل بھی ہم آہنگی کے خیال سے کیا گیا لیکن عرب قومیت میں مسلمان عیسائی امتزاج یا جاپان کی بدھ شنٹو یک جہتی جیسی چیز ہندوستان میں پیدا نہ ہوسکی۔ حالانکہ ہندوستان کے مسلمانوں کی غالب آبادی ہندوستانی نسل سے ہی تعلق رکھتی تھی۔ اسلام سے اپنی مڈبھیڑ کے دوران جو مسلمانوں کے ہندوستان کو فتح کو لینے کے نتیجے میں پیدا ہوئی جن کا اپنا ایک دنیاوی نقطۂ نظر تھا اور سماجی تعمیر نو کے اپنے الگ اصول تھے۔ ہندوؤں کے لئے جو دینی معاملے میں ان سے مختلف تھے۔ سماجی طور پر ٹکڑے ٹکڑے تھے اور سیاسی طور پر منتشر تھے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ہندوستان میں پیدا ہونے والے مسلم سماج کا تختہ الٹ دیں۔ اسلام کے لئے بھی یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ہندو سماج کو اکھاڑ پھینکے۔ جو پورے برصغیر پر چھایا ہوا تھا اور جس کی جڑیں بہت گہری تھیں اور جو ہندوستان کے کلچر، نظام اور کھیتی کے گرد گھومتے ہوئے اقتصادی نظام، سب پر محیط تھا اور اس طرح ملک کی شخصیت کا ایک جزو لاینفک بن گیا تھا۔

ہندو روایات کی مکمل نفی اور اپنے تجارتی اور قصباتی رجحانات کی وجہ سے اسلام ہندوستان کی اندرونی تہوں یعنی اس کے ہزاروں گاؤں تک نہ پہنچ سکا۔ ایسے گاؤں جو بقول مارکس "ایک خود کفیل ترقی پذیر سماجی مملکت اور ناقابل تغیر قدرتی ہیئت میں بدل گئے تھے۔

ملک کے بہت سے حصوں میں مسلمان بادشاہوں کا ... سالہ دور حکومت اور دہلی کے پایۂ تخت پر ان کی مسلسل حکمرانی بھی ہندوستان کو مسلمان نہ بنا سکی۔ زرتشتی ایران، قبطی مصر، عیسائی البانیہ اور غیر مہذب ترکوں کی مثالوں کے بالکل برعکس۔ نہ ہندوستان سے اسلام کا قوت کے بل بوتے پر اس طرح اخراج ہوا جیسے اسپین سے ہوا تھا اور نہ ہندو دھرم کے مہاساگر میں اس طرح مل سکا جیسے بدھ اور جین متوں کے ساتھ ہوا۔ نہ اسلام کو اس طرح برداشت کیا گیا جیسے سکھ اور عیسائی مذہب کو نہ ہی وہ ہندوستان کے ذیلی کلچر اور اس کی علامتوں سے اس طرح ہم آہنگ ہوسکا جیسا کہ انڈونیشیا میں کامیابی کے ساتھ ہوا۔

ہندو دھرم کو موجودہ زمانے میں جو فرقہ وارانہ شکل دے دی گئی ہے وہ اس کی روایتی بنیاد سے بالکل ہم آہنگ نہیں جو ذات پات کے نظام پر مرکوز ہے۔ برطانوی قانون، آریہ سماج جیسی مذہبی اصلاح کی تحریکیں، فرقہ وارانہ بنیاد پر مسلمان کے متحد ہوجانے کا ڈر اور سیاسی میدان میں فرقہ وارانہ ہندو رہنماؤں کی کارستانیاں ۔۔ ان سبھی نے مل کر اس کو وہ رنگ دیدیا ہے جس کی اصل ہندوازم میں کوئی گنجائش نہیں ۔ ہندوستان میں ابلاغ و ترسیل کے آلہ کی صورت میں فرقہ واریت کا فروغ جن وجوہات کی بنا پر ہوا وہ یہ ہیں:۔

فرقہ وارانہ "قلعہ بندیوں" میں سیاست کا عملاً داخل کیا جانا، برطانیہ کی سیاسی اصلاحوں کے پردے میں جن کا مقصد فرقہ واریت کی بنا پر نمائندگی اور مرکزی صوبائی اور مقامی جماعتوں کے الگ الگ انتخاب کرانا تھا۔ اس کے علاوہ پھیلتے ہوئے شہری علاقوں میں سیاسی اقتدار کے مرکزوں کے پیدا ہوجانے سے جہاں کسی خاص فرقہ کے ساتھ وابستگی ذات برادری سے زیادہ اہم سمجھا جانے لگا۔ (مدراس اور کیرالا اس سے مستثنیٰ رہے)

فرقہ واریت کو شہ ملی۔ اسی کے ساتھ ساتھ شہروں میں ہونے والی سیاسی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے پچاس سالہ دور میں سیاسی سودے بازی کے لئے کسی ایک فرقہ کے لوگوں کی مکمل حمایت حاصل کرنے کے لئے فرقہ واریت کا استعمال ایک مرکزی نقطے کے طور پر ہونے لگا جس پر جس مقصد کے لئے چاہو اس فرقہ کے تمام افراد کو جمع کرکے اپنا کام نکال لو۔

لیکن ہندوستانی سیاست میں فرقہ وارانہ جہت کی پیدائش اور افزائش کے ساتھ ایک اصلاحی رو جس کو قوم پرور سیکولر سیاست کہہ سکتے ہیں' کا وجود بھی عمل میں آیا جس کا مقصد پوری قوم کو ایک رشتہ میں پرونا اور اس میں جمہوری اقدار اور عناصر کو بڑھاوا دینا تھا۔ جدوجہد آزادی کے آخری مرحلہ میں خاص رسہ کشی سیکولرسٹوں اور فرقہ وارانہ علیحدگی پسندوں کے درمیان تھی۔ یہ رسہ کشی بغیر ہار جیت کے ملک کی تقسیم پر ختم ہوگئی۔ اس طرح فرقہ وارانہ علیحدگی پسند عناصر پاکستان میں جمع ہوگئے اور سیکولرسٹ عناصر ہندوستان میں رہ گئے۔ یہ بات ہندوستان اور پاکستان کی داخلہ اور خارجہ پالیسیوں کے اختلاف اور اس اختلاف کے اسباب و علل کو سمجھنے میں بھی معاون ثابت ہوسکتی ہے۔

نتیجہ کے طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان میں سیکولرازم ایک آدرش بھی ہے اور ایک حقیقت بھی۔ ظاہر ہے اس آدرش تک رسائی حاصل کرنے میں ہمیں پوری طرح کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ ملک میں اس بات پر مکمل اتفاق ہے کہ قومی سیاست میں سیکولرازم کو ایک فعال اور مثبت عنصر کے طور پر جلد سے جلد داخل کرنے کے لئے مستقل جدوجہد کی جانی چاہیئے۔ ہندوستان میں سیکولرازم ایک ترقی پذیر حقیقت ہے جو قوم کی جمہوری تعمیر کے تکلیف دہ عمل سے گزر رہی ہے۔ ہمارے سامنے جو دوسرے اور مقاصد ہیں وہ بھی اسی طرح حاصل ہوں گے۔ جدید اصولوں پر قومی تعمیر کے اعلیٰ اور سماجی انقلاب کے عمل کے طور پر سیکولرازم کی تین جہتیں ہیں۔

۱۔ مختلف فرقوں کے درمیان سیاسی ہم آہنگی کا عمل (جیسے مذہب کی بنیاد پر مختلف فرقوں مثلاً ہندو، مسلمان، عیسائی اور سکھوں کے درمیان ہم آہنگی)

۲۔ کسی فرقے کے اندرونی نظام میں انقلاب کا عمل (جیسے ذات پات کے نظام پر قائم ہندو فرقہ میں) اور (۳) ملک میں ایک عام تبدیلی کی سمت، طریقہ اور ذریعہ بننا تاکہ ملک میں ایک سائنسی کلچر اور عقلیت پسند مزاج کو فروغ دیا جاسکے۔

بے ثبوت

شین مظفر پوری

دولت کمانے کے لئے لالہ مُرلی دھر برسوں پاپڑ بیلتے رہے۔ مگر بات وال روٹی سے آگے نہ بڑھ سکی۔ محنت سے دولت کس نے حاصل کی ہے جو وہ کر لیتے۔ اس کے لئے تو عقل اور اسکیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر لالہ جی محنت پر زیادہ اور عقل پر کم زور دیتے رہے۔ محنت بھی کوئی رائگاں جانے والی چیز نہیں ہوتی۔ لالہ جی روٹی کپڑے سے تو خوش تھے، مگر اتنے پر انھیں صبر نہیں تھا۔ ان کی آنکھوں کے سامنے کتنے ہی چھوٹے چھوٹے آدمی فرش سے عرش پر جا پہنچے تھے۔ مگر لالہ جی جہاں تھے وہیں رہ گئے۔

چار افراد کا چھوٹا سا کنبہ تھا۔ میاں بیوی، ایک لڑکا اور ایک لڑکی ــــــ خیر سے لڑکی بیاہی جا چکی تھی تو اب وہ تین ہی رہ گئے تھے۔ لڑکا کالج میں پڑھ رہا تھا اس لئے وہ اور بھی فکرمند تھے کہ اس کے مستقبل کے لئے اب تک کچھ نہیں کر پائے تھے۔ کبھی کبھی وہ بڑے فکرمند ہو کر للائن سے کہا کرتے "اپنا مہندر بی۔ اے پاس کر کے نکلے گا تو کون سا کاروبار اس کے حوالے کریں گے؟ نوکری کرنے کا ہمارے خاندان میں رواج نہیں۔ پھر نوکری کر کے پائے گا کیا؟ پُرکھوں کا چھوڑا ہوا مکان ہے کسی دن اس کو بھی گروی رکھ دے گا۔ نوکری کرنے والوں کا کچھ یہی حال دیکھتے ہیں۔ آگے پڑھانا نہیں ہے۔ بے کار وقت اور پیسہ برباد کرنا ہے۔ کاروبار کے لئے بی۔ اے تک پڑھ لینا بھی ضرورت سے زیادہ ہی ہے۔ مگر اس کو کاروبار کرنے کے لئے پیسہ کہاں سے دوں گا؟ اس آٹے کی چکی کو لے کر کیا جھک مارے گا؟"

لالہ جی نے تھک ہار کر دو تین سال سے آٹے کی چکی لگا رکھی تھی۔ آٹا پیسنے اور آٹا بیچنے کا یہ دھندہ دس پندرہ روپے روزانہ سے زیادہ نہیں دے پاتا تھا۔ گرانی کے دور میں اتنی سی رقم کی حقیقت ہی کیا تھی۔ جیسے تیسے کر کے پانچ سات ہزار کی رقم کاروبار میں لگانے کے لئے بچائی بھی تھی تو وہ لڑکی کی شادی کی بھینٹ چڑھ گئی۔ وہ تو اچھا ہوا کہ لالہ جی نے چکی پہلے سے خرید کر لگا رکھی تھی ورنہ وہ رقم بھی لڑکے والوں کے نیگ لگ جاتی۔

لالہ جی کو اپنے دولت مند نہ ہونے کا سب سے زیادہ احساس لڑکی کے شادی کے موقع پر ہوا تھا۔ دان جہیز کی کمی پر جب لڑکے والوں نے ناک بھوں چڑھائی تو ایک ہمدرد پڑوسی نے لالہ جی سے کہا تھا "ہم نے سمجھا تھا لالہ جی کے گانٹھ کے پورے ہوں گے، تبھی بیاہ کی ٹھانی ہے۔ مگر تم نے تو اپنی ہیٹی کرانے کے ساتھ ساتھ برادری کی ناک بھی کٹوا دی۔ ہزار دو ہزار کے لئے ہم مر تو نہ گئے تھے۔ اتنے ہی کی کمی سے ساری کرکری ہوئی ہے۔"

لالہ جی نے اس کے جواب میں کہہ تو دیا کہ انھوں نے چادر دیکھ کر پاؤں پھیلائے تھے۔ مگر پڑوسی کی بات دل کو لگ گئی۔ بات کو پی گئے اور دل میں دولت حاصل کرنے کا دبا دبا سا جذبہ پیٹرول کی آگ کی طرح بھڑک اٹھا۔ ان کا پڑوسی لالہ پربھو دیال پندرہ بیس سال پہلے دس پندرہ روپے کے کھلونے لے کر فٹ پاتھ پر بیٹھا کرتا تھا۔ پھر اس نے نہایت معمولی پونجی سے منہاری کی ایک چھوٹی سی دکان کر لی۔ جس کی بکری آٹھ دس روپے سے زیادہ نہ رہتی ہوگی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے مارکیٹ میں مال کے اُلٹ پھیر کی دلالی شروع کر دی۔ آج کا لالہ پربھو دیال لاکھوں میں کھیل رہا تھا۔ کئی بلڈنگیں کھڑی کر لی تھیں اور طرح طرح کے کاروبار کھول لئے تھے۔ آج وہ ہزار دو ہزار کی بات اس طرح کرتا تھا جیسے دو چار آنے کی بات ہو۔

اس واقعہ سے لالہ مُرلی دھر کو اتنی عبرت ہوئی کہ دولت حاصل کرنے کا ان پر بھوت سوار ہو گا۔ لڑکی کی شادی سے فراغت پانے کے بعد لالہ مُرلی دھر نے نئے حوصلے اور نئے ارادے کے ساتھ اپنے 'چکی گھر' میں قدم رکھا۔ سب سے پہلے یہ طے کیا کہ محنت سے کم اور عقل سے زیادہ کام لیں گے۔ کیونکہ آدمی محنت زیادہ کرنے لگ جائے تو عقل کو اپنے کمالات دکھلانے کی مہلت نہیں ملتی۔ اس نئے فیصلے کا پہلا اثر یہ ہوا کہ لالہ جی کو آٹا پیسنے سے کم اور آٹا بیچنے سے زیادہ دل چسپی ہو گئی۔ اور کیوں نہ ہوتی

جتنی دیر میں گاہک کے لئے آٹا پیس کر وہ آٹھ دس آنے کماتے تھے اتنی ہی دیر میں اپنی دکان کے لئے آٹا پیسنے میں ایک ڈیڑھ روپیہ کا فائدہ تھا۔ گاہک تو خالص گیہوں پسواتا اور مزدوری دے دیا کرتا تھا۔ مگر لالہ جی نے خالص گیہوں کے آٹے کو صحت و زندگی کے لئے نقصان دہ قرار دے دیا تھا۔ اس لئے وہ گیہوں میں جَوا اور جَو میں باجرہ وغیرہ پھینٹ کر صحت اور زندگی کے لئے وٹامن بڑھا دیا کرتے تھے۔ پھر اس میں کسی کا نقصان تو تھا نہیں پبلک کا پیٹ تو اس آٹے سے بھی بھرتا ہی تھا۔ اور لالہ جی کے خیال میں کسی کو نقصان پہنچائے بغیر فائدہ اُٹھانا کوئی پاپ نہیں تھا۔

اب لالہ جی کی آمدنی بڑھنے لگی اور روز بروز بڑھتی ہی گئی۔ گنتی کے دنوں میں آمدنی دُگنی تگنی تک جا پہنچی۔ چکی میں بوریوں کے ڈھیر بھی اونچے ہوتے رہے دو نوکر بھی بڑھ گئے اور باہر "مرلی دھر فلور ملز" کا بورڈ بھی لگ گیا۔ کام تیزی سے پھیلنے لگا۔ چھوٹے لالہ مہندر کو بھی کچھ وقت چکی میں دینا پڑتا تھا۔ دولت کا نسخہ لالہ جی کے ہاتھ آچکا تھا اس لئے وہ چھوٹے لالہ کو ترغیب دینے لگے کہ پڑھنا چھوڑ دے مگر یہ بات للائن اور چھوٹے لالہ کو منظور نہیں تھی۔ کیونکہ اب بی۔ اے کرنے کو دن ہی کتنے رہ گئے تھے۔ بس چند مہینے اور تھے۔

مہندر کے بی۔ اے میں فیل ہونے کا وقت آتے آتے لالہ جی نے دوسری چکی لگانے کی ضرورت محسوس کی۔ لالہ جی اپنے کام دھندے اور حساب کتاب میں اتنے بے سُدھ رہنے لگے تھے کہ ایک ہفتے کے بعد انھیں یہ بھی یاد نہ رہا کہ چھوٹے لالہ نے اپنے بی۔ اے پاس کرنے کی خبر سنائی تھی یا فیل ہونے کی۔ اس کا احساس اس وقت ہوا جب للائن نے سفارش کی کہ مہندر کو ایک سال کا موقع اور دیا جائے تاکہ وہ بی۔ اے کرلے۔

لالہ جی الجھن کے انداز میں بولے "کیا ایک بار بی۔ اے پاس کر لینا کافی نہیں ہے کہ پھر اسی کا نام لیتی ہو۔"

للائن کو لالہ کی اس بدحواسی کی ادا پر ترس آگیا۔ کچھ ایسا ترس جو بیتے دنوں میں وہ لالہ جی پر کھاتی رہی تھی۔ آمدنی کی ترقی دیکھ کر للائن میں کبھی کبھی رومانٹک موڈ کی لہر اٹھ جاتی تھی۔ وہی موڈ اس وقت بھی تھا اور وہ بیتے دنوں والی ہی البیلی مسکان بھر کر بولی "جب سُدھ بُدھ کا یہ حال ہے تو کسی دن مجھے ہی نہ بھلا بیٹھو۔ چھوٹے لالہ نے بی۔ اے نہیں پاس کیا ہے فیل ہوا ہے۔"

لالہ جی کچھ سوچ کر بولے "اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ سرسوتی جی ناراض اور لکشمی جی مہربان ہیں۔ پھر سرسوتی جی کو منانے میں وقت ضائع کرنے کی بجائے لکشمی جی کے آشیرواد کیوں نہ لی جائے۔ میں تو اب بی اے، وی۔ اے کے چکر میں پڑنے والا نہیں، کام بہت بڑھ رہا ہے۔ دوسری چکی لگانی ہے مشین کا ایڈوانس دے چکا ہوں۔ بغل والے بھڑ بھونجے کی دوکان دو ہزار روپے دے کر خالی کروا رہا ہوں۔ یہ سارا کام مجھ اکیلے کے بس کا نہیں۔ مہندر کو ساتھ لگنا ہی پڑے گا۔ ایسا ہی شوق ہے تو وہ اپنے بیٹے کو بی۔ اے سے بھی آگے پاس کرالے گا۔ میرا بیٹا تو بی۔ اے فیل ہی بھلا۔"

لالہ جی کا یہ فیصلہ آخری تھا۔

اس فیصلے نے مہندر کی آرزوؤں پر پانی پھیر دیا۔ یہ آرزوئیں بی۔ اے پاس کرنے کی نہیں بلکہ ایک لڑکی کے ساتھ ساری زندگی بی۔ اے میں پڑھتے رہنے کی تھیں چھوٹے لالہ نے باپ سے چوری چھپے ایک غیر کاروباری مشغلہ پیدا کر لیا تھا یعنی اپنے کالج کی ایک لڑکی روپا سے دل لگا لیا تھا۔ لالہ مرلی دھر کا بیٹا اور رومان لڑائے ایہ تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ مگر ولی کے گھر میں شیطان اسی طرح پیدا ہوتا ہے۔

روپا تھرڈ ایئر کی طالبہ تھی۔ اب پاس ہوکے فورتھ ایئر میں آگئی تھی۔ مہندر کی اس سے بڑی خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی تھی! ایک کے فیل اور دوسرے کے پاس ہونے سے ایک ندی کے دو کناروں کے ملنے کے زیادہ امکانات پیدا ہوگئے تھے۔ فیل ہونے کی خوشی میں اس نے ایک ہوٹل میں روپا کی نہایت ہی پر تکلف دعوت بھی کی۔ اور آئندہ ایک ساتھ پاس اور فیل ہونے کے عہد و پیماں ہوئے۔

جب ماں کی دال نہیں گلی تو مہندر نے باپ کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔ مگر دل کا حال کہہ سنایا۔ کیوں کہ بیٹا ہو یا بیٹی، اس قسم کے نازک معاملات میں ماں ہی آڑے آیا کرتی ہے، بشرطیکہ وہ نازک بات ماں کی پسند پر پوری اترتی ہو۔ روپا کے معاملے میں للائن کی ناپسندیدگی کا سوال ہی نہیں تھا۔ اس میں وہ ساری خوبیاں تھیں جو ایک اچھی بہو میں عام طور پر ہوا کرتی ہیں بلکہ دو باتیں سوا تھیں۔ ایک یہ کہ وہ لکھ پتی کی بیٹی تھی اور دوسرے یہ کہ وہ مہندر سے ہیشنگی محبت کرنے لگی تھی للائن کو تو شک تھا کہ روپا کے والدین اس رشتے کو منظور بھی کریں گے یا نہیں۔ کیونکہ وہ لاکھوں میں کھیلنے والے لوگ تھے اور لالہ مرلی دھر نے بلندی کے زینے پر ابھی پہلا ہی قدم رکھا تھا۔ پھر بھی للائن نے بیٹے کو مایوس نہ کیا۔

مہندر نے ماں کی روایتی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دھمکی دے دی "چاہے جس طرح ہو، جس قیمت پر ہو، میری شادی روپا سے ہونی ہے نہیں تو میں کنوارا ہی مروں گا یا پھر......"

ماں نے جھٹ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا "ارے للّا! یہ کیا انٹ شنٹ بکتا ہے۔ کہہ تو دیا کہ یہ مجھ پر چھوڑ دے۔ میں کوئی راستہ نکالوں گی۔ تو، بابو جی کے ساتھ کام دھندے میں جی لگا۔ مگر خبردار لالہ جی کو اس بات کی بھنک بھی نہ ملے۔ تو روپا سے ملنا جلنا چھوڑ نہیں سکتا تو کم کر دے۔ اس کے پتا گردھاری لال جی کو میں جانتی ہوں۔ سیدھے بھلے آدمی ہیں۔ ان کے منیم جی اپنی بھگوتی ماسی کے دیور ہیں......"

لالہ جی کے کھنکارنے کی آواز پر ماں بیٹے کی گفتگو بند ہوگئی۔ وہ صبح کے گئے اب شام کو تھکے ماندے گھر لوٹے تھے۔ مہندر پر نظر پڑتے ہی بگڑ گئے "میں دوپہر سے تیری راہ تک رہا اور تو یہاں گھر میں گھسا بیٹھا ہے۔ تیری ماں کو بھی خیال نہ ہوا کہ تجھے وہاں بھیجے۔ یہی لچھن رہے تو چل چکا دھندا۔"

کوئی جواب نہ پاکر لالہ جی ٹھنڈے پڑ گئے اور بولے "وہ بغل والی دکان خالی کرادی ہے۔ کل راج لگاکر ٹھیک ٹھاک کرا کے پرسوں نئی چکی لگا دی ہے۔ بھگوان کی دیا سے ہر کام بنتا نظر آرہا ہے۔ مگر بھگوان اکیلے کچھ نہیں کرتا۔ اس کا ہاتھ بٹانا پڑتا ہے۔"

اس کے بعد لالہ جی نے بڑی محبت کے ساتھ بیٹے کو زمانے کی اور زندگی کی اونچ نیچ سمجھائی اور بتایا کہ زندگی بنانے کا اچھا موقع بار بار نہیں آتا۔ جو موقع پر سوئے، سارا جیون روئے۔ ساری باتیں مہندر کی سمجھ میں ٹھیک ٹھیک آگئیں۔ بس روپا نے ٹیک کر کچھ گڑبڑ کر رکھی تھی۔ باپ کی زندگی کا مقصد دولت حاصل کرنا اور بیٹے کی زندگی کا مقصد پہلے روپا، اس کے بعد دولت۔

چونکہ قسمت نے ساتھ دینا شروع کردیا تھا اس لئے مٹی کو ہاتھ لگانے سے سونا بن جاتی تھی۔ روپا والی بات بھی بنتی ہی نظر آنے لگی تھی۔ گردھاری جی کے منیم کو بلاکر لالہ جی نے اشاروں اشاروں میں بات چلائی تو اندازہ ہوا کہ تھوڑے انتظار اور لگاتار کوشش سے لالہ گردھاری لال کو شیشے میں اتارا جاسکتا تھا۔ جب یہ آس بندھی تو کاروبار میں مہندر کے دل و دماغ نے تیزی دکھانی شروع کی۔ نیا خون، نیا دماغ۔ وہ لالہ جی سے بھی آگے نکل گیا۔ ایک سال کے اندر ہی لالہ جی کی آمدنی کئی ہزار روپے ماہوار تک جا پہنچی اور کاروباری حلقے میں وہ بھی ایک چڑھتا سورج سمجھے جانے لگے۔

لالہ جی کی خوش قسمتی سے ان ہی دنوں ملک میں غذائی قلت غیر معمولی حد تک پہنچ گئی۔ بازاروں میں بھلا یمانی کے سوا کوئی اور چیز خالص نہیں مل رہی تھی۔ حکومت خوراک کی قلت دور کرنے کے لئے ہنگامی سطح پر انتظامات کرنے میں مصروف تھی۔ لالہ مرلی دھر بھی اس مہم میں اپنے طور پر حکومت کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ پہلے تو وہ گیہوں میں صرف جوار، باجرہ وغیرہ ملاکر پیسا کرتے تھے۔ مگر جب دیکھا کہ حکومت اور قوم زیادہ پریشان ہے تو انھوں نے سوچا، کیوں نہ مٹی اور املی کی گٹھلی تک کو گیہوں کے ساتھ پیس ڈالا۔ گیہوں کی جن بوریوں کو حکومت کے بے وقوف افسران ناقابلِ استعمال قرار دے کر دریا برد کر دینے کا حکم دے دیا کرتے، لالہ جی کسی نہ کسی ترکیب سے ان بوریوں کو بھی خرید لیا کرتے۔ انہیں یہ گوارا نہیں تھا کہ اناج کا ایک دانہ بھی ضائع جائے، چاہے وہ سڑا ہوا ہی کیوں نہ ہو۔ مگر لالہ جی قوم کی خدمت اتنی خاموشی اور صفائی سے کر رہے تھے کہ دائیں ہاتھ کی خبر بائیں ہاتھ کو نہیں ہوتی تھی۔ سرکاری دشمنوں نے دوبار ہاتھ بھی ڈالنا چاہا تو ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے منہ کی کھا کے رہ گئے۔

لالہ جی کے حوصلے بہت بڑھ چکے تھے۔ کاروبار دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا تھا۔ ایک سال پورا ہوجانے کے بعد انھوں نے غلے کی ایک چھوٹی سی آڑھت بھی کھول ڈالی۔ مہندر ان کا داہنا ہاتھ بن چکا تھا۔ باپ بیٹے کے منہ سے خون لگ چکا تھا۔ ایک دن لالہ جی نے بیٹے کو عقل کی ایک بات بتائی۔

لالہ جی نے کہا "اس کاروبار میں قدم قدم پر دشمن گھات میں بیٹھے ہیں۔ کون جانے کس دن کیا ہو جائے۔ میرا خیال ہے کہ تم کوئی سائڈ بزنس بھی شروع کردو۔ ایک میں کچھ گڑبڑ ہوئی تو دوسرا چالو رہے گا۔ یہ زمانہ بے کار بیٹھنے کا نہیں۔"

مہندر نے باپ کا مفید مشورہ مان لیا۔ سائڈ بزنس کی ایک اسکیم پہلے ہی سے اس کے ذہن میں موجود تھی اور اس سلسلے میں اس نے بہت سی معلومات بھی حاصل کرلی تھیں۔ یہ اسکیم اس کے ذہن میں اس دن آئی تھی جب وہ ایک بیمار دوست کو دیکھنے اسپتال گیا تھا۔ غلہ اور آٹے کے بزنس میں تو پھر بھی بہت کچھ لگتا تھا مگر اب جو سائڈ بزنس اس کے ذہن میں تھا اس میں ہلدی پھٹکری لگے بغیر رنگ چوکھا آتا تھا۔

یہ وہ دن تھے جب روپا سے اس کی شادی کی بات کھل کر چل پڑی تھی۔ لالہ گردھاری لال نیم راضی ہو چکے تھے اور پکی زبان دینے کے لئے روپا کے امتحان کے نتیجے کا انتظار کر رہے تھے جس میں تھوڑے ہی دن رہ گئے تھے۔ منیم جی نے بڑی ہوشیاری سے یہ کام کیا تھا کیونکہ انھیں یہ بھی فخر حاصل ہونے والا تھا کہ اس رشتے کے بعد وہ لالہ گردھاری لال کے رشتہ داروں میں شمار ہوں گے۔ لالہ گردھاری لال کے کوئی بیٹا تھا نہیں۔ صرف دو لڑکیاں تھیں۔ بڑی لڑکی کا شوہر ان کے ایک کاروبار کا منیجر تھا۔ اور روپا کے لئے بھی انھیں ایک ایسے ہی شوہر کی تلاش تھی۔ مہندر کی ہونہاری اور کاروباری سوجھ بوجھ کا چرچا وہ سن ہی چکے تھے۔ پھر بھی کچھ سوچ وچار کرنے کو روپا کے امتحان کا بہانہ بناکر مہلت لے لی تھی۔

جب ستارے کی چال اچھی ہو تو بگڑی ہوئی بات بھی بن جاتی ہے۔ ایک طرف تو مہندر کے شروع کئے ہوئے بے نام و نشان سائڈ بزنس میں دھن برسنے لگا، اور دوسری طرف روپا سے اس کا بیاہ بڑی دھوم دھام سے ہوگیا۔ مہندر کو اب اور کیا چاہیئے تھا۔ دل بھی آباد، دنیا بھی آباد۔

اپنے بے نام و نشان بزنس میں مہندر نے اتنا کمانا شروع کیا اور اس کے خفیہ طور پر تیار کئے ہوئے مال کی اتنی مانگ بڑھی کہ لالہ مرلی دھر نے اس کو پرانے دھندے سے چھٹکارا دے دیا۔ روپا کے قدم اور بھی مبارک ثابت ہوئے۔ باپ نے جہیز میں زمین کا ایک بڑا سا پلاٹ دے دیا تھا جس پر مہندر نے ایک شاندار چار منزلہ عمارت کی نیو ڈال دی۔ ملک میں قلت اور گرانی کا زور جوں جوں بڑھ رہا تھا، مہندر اور لالہ مرلی دھر کی قسمت کا ستارہ توں توں روشن ہوتا جاتا تھا۔

روپا کو مہندر سے کبھی کبھی یہ شکوہ رہنے لگا کہ وہ گھریلو زندگی میں بہت کم وقت دیتا ہے۔ بیوی شادی کے کچھ رومانی اور جذباتی تقاضے ہوتے ہیں جن کا احساس تو مہندر کو ضرور تھا مگر ان کو پورا کرنے کے لئے اسے فرصت کم ہی ملتی تھی۔ روپا کو اس نے بہلاوا دے رکھا تھا کہ کاروبار کا یہ زور شور کچھ دنوں کے بعد جب ختم ہو جائے گا تب وہ اس کے ساتھ جی بھر کے فرصت کی زندگی گزارے گا۔

روپا "فرصت کے دنوں کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی کہ ان ہی دنوں نزدیک ہی کے دوسرے شہر

میں رہنے والے ایک دوست نے دونوں کو اپنی بہن کی شادی میں بلا بھیجا۔ شرکت ضروری تھی۔ مہندر نے تو صرف روپا کو بھیجنا چاہا مگر وہ مچل گئی کہ دونوں چلیں گے اور کم از کم دو ہفتے باہر گزاریں گے۔ چونکہ وہ پہلے بچے کی ماں بھی بننے والی تھی اس لئے اور بھی مہندر نے اس کا دل رکھنا ضروری سمجھا چنانچہ دونوں روانہ ہو گئے۔

مہندر کے دوست نے پڑوس کے مکان میں ان دونوں کے لئے ایک علیحدہ کمرے کا بندوبست کر دیا تھا۔ جس دن پہنچے تو دونوں تھکے ماندے تھے۔ کھاپی کر بستر پر ڈھیر ہو گئے۔ آدھی رات گئے روپا نے پیٹ میں سخت تکلیف محسوس کی۔ درد سے بے چین ہو کر اس نے مہندر کو جگانا چاہا تو بستر کو خالی پایا۔ درد اتنی تیزی سے بڑھا کہ وہ بے چین ہو کر کروٹیں بدلنے لگی اور کراہتی ہوئی آواز میں مہندر کو پکارا۔

"ارے تم کہاں چلے گئے میں مر رہی ہوں۔ ہائے رام"۔

مہندر باتھ روم کی طرف سے لپکا "ارے تم کو کیا ہو گیا میں تو خود ہی دست کے مارے پریشان ہوں دسویں بار باتھ روم میں گیا ہوں۔ شاید سفر اور دن بھر کی بھاگ دوڑ سے معدہ گڑبڑ ہوا ہے"۔

روپا بے چین ہو کر ہاتھ پاؤں کھینچتے ہوئے کھنچی ہوئی آواز میں بولی "میرے تو پیٹ میں سخت درد ہے مروڑ پہ مروڑ اٹھ رہا ہے۔ کچھ کرو مہندر، کچھ کرو ———— فوراً ——— میں مر جاؤں گی"۔

یہ کہتے ہوئے گویا روپا رو پڑی۔ مہندر کا دھیان فوراً دوسری طرف گیا ——— مگر ابھی تو چھ سات مہینے ہی گزرے تھے ——— ہو سکتا ہے کوئی خرابی کی بات پیدا ہو گئی ہو۔ مہندر تابڑتوڑ دستوں سے کمزور ہو جانے کے باوجود ڈاکٹر کا انتظام کرنے کو باہر لپکا مگر چند ہی قدموں کے بعد چکرا کر بیٹھ گیا۔

دوسرے دن شام کو سرکاری اسپتال میں روپا اور مہندر کی لاشوں کا پوسٹ مارٹم ہو رہا تھا۔ آپریشن تھیٹر کے باہر لالہ گردھاری لال اور لالہ مرلی دھر اپنے اپنے پریوار کے ساتھ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے ان کے گرد بہت سارے لوگ جمع تھے۔ اس جوڑے کی ایسی ناگہانی موت پر دل میں ہوک اٹھ رہی تھی اور آنکھیں اشک بار تھیں۔ اور جتنے منہ اتنی باتیں تھیں۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے ظاہر ہوا کہ دونوں کی موت زہریلی غذا اور نقلی دوا کے سبب واقع ہوئی تھی۔ مگر اس بات کا کوئی ثبوت نہیں تھا کہ اس شادی میں آٹے کی جو بوریاں سپلائی ہوئی تھیں وہ مرلی دھر فلور ملز کی تھیں اور ان دونوں کی جان بچانے کے لئے جو انجکشن استعمال ہوئے وہ خود مہندر لالہ کی سائڈ بزنس والی دواساز کمپنی کے تیار کردہ تھے۔

بقا کی موت

یوسف اعظمی

دستِ فطرت کی حنا بندی ہوئی جن ہاتھوں
اپنی آنکھوں کے اندھیروں میں کہیں ڈوب گئے
روشنی گھلتی ہے آنکھوں کے سیہ حلقوں میں
چاندنی پر ہے، نہ ہے صبح کی ساعت پہ یقیں
لمحہ لمحہ میں بدلتا ہے نگاہوں کا جہاں
دل کو معلوم نہیں درد کا حاصل کیا ہے
اپنی نظروں کا کنارا ہے، اُفق کا آنچل
کوئی آواز نہیں آج اُفق کے اُس پار
آج ہر ایک صحیفہ کی جبیں برہم ہے
پردۂ وقت پہ چلتے ہیں، غموں کے سائے

وہ امانت تو میرے سینے کا اک بوجھ بنی
دستِ تہذیب میں پلتی ہے فنا کی گرمی
جس نے فطرت کے نظاروں کو دیئے پیراہن
اپنے ہی جسم کی پوشاک لئے پھرتا ہے
دستِ فطرت کی حنا، خون کی تہذیب کا غم
وہ جو ڈوبے گا، کسی موڑ سے ٹکرائے گا
کون سی آنکھوں میں غم کی ہو چتا کیا معلوم

نیچ

آوارہ سلطانپوری

شہر میں رہتی ہے سب کو گاؤں والوں کی تلاش
دور ہوں تو آدمی ڈھونڈھیں گے اپنے شہر کا
دوسرے ملکوں میں سنتے ہی وطن والے کا نام
دوڑ کر جاتے ہیں اس کو دیکھنے کے واسطے
اس محبت میں کوئی آڑے کبھی آیا نہیں
اس حقیقت کو کسی انسان نے جھٹلایا نہیں
میں سمجھ پایا نہیں اب تک کہ آخر آدمی
"ساتھ رہتے ہیں تو اتنے "نیچ" ہو جاتے ہیں کیوں"

(ہند و پاک معاہدہ پر دستخط- بقیہ صفحہ ۱۵ کا)

نے کونسی رعایت دی ہے۔ فی الوقت مذاکرہ میں تعطل معلوم ہوتا ہے۔ بشرطیکہ کوئی ڈرامائی اور معنی خیز واقعہ نہ ظہور میں آجائے۔

۲۶ر اگست

کوئی خاص بات ہوئی ہے۔ معاہدے کے لئے بھرپور کوشش ہو رہی ہے۔ ۹۰ منٹ کے لئے آج صبح پاکستانی وفد کے بزرگ ارکان سردار سورن سنگھ سے ملے۔

مسٹر بکسر پر عزیز احمد کے بیان پر تبصرے کے لئے زور ڈالا جا رہا ہے لیکن وہ اس نازک مرحلے میں کسی تنازعہ میں نہیں پڑنا چاہتے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر ضرورت ہوئی تو میں مناسب موقعہ پر یہ بتاؤں گا کہ پاکستان نے مختلف اوقات میں کون کون سی کروٹ لی ہے۔

اپنی رہائش گاہ پر مسز گاندھی نے ہندوستانی اور پاکستانی وفود کے بزرگ ارکان سے ۳۰ منٹ تک بات چیت کی۔

پھر ۱۵ منٹ کے لئے مسز گاندھی نے دونوں

پاکستان کا ۸۰۰۰۰ میں سے صرف ۲۶۰۰۰ پاکستانیوں کو بنگلہ دیش سے پاکستان واپس لینے پر بضد ہونا ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔

پاکستان مدعی ہے کہ اس کے پاس جامع تجاویز ہیں۔ ان پر کل بات چیت ہوگی۔ سوموار کا مباحثہ فیصلہ کن ہوسکتا ہے۔ پاکستانی وفد کو اسلام آباد ۲۸ر اگست تک چلا جانا ہے۔ کل کھل کر مباحثہ ہونے والا ہے۔

۲۷ر اگست

آج پوری طرح سے بحث ہوئی ہے۔ چھ گھنٹوں سے زائد کے دو اجلاس ہوئے۔ معاہدہ کا مسودہ تیار ہو رہا ہے۔ جن خطوط پر معاہدے نے قطعی شکل اختیار کی ہے اسے بے حد خفیہ رکھا جا رہا ہے۔ قیاس آرائیوں اور پیش قیاسیوں کا زور شور ہے۔ ۱۹۵ پاکستانی جنگی قیدیوں پر مقدمے کا التوی اور بقیہ قیدیوں کی واگزاری، ۲۰۳ سمیت تمام بنگالیوں کی پاکستان سے بنگلہ دیش کا واپسی اور بنگلہ دیش سے معینہ مدت کے اندر پاکستان شہریوں کی قابل لحاظ تعداد کا جو مخصوص زمروں کے کے ذیل میں آتے ہیں پاکستان کو منتقلی معاہدے کے اساس

وفود کو مباحثہ کا موقع دیا۔ اس کے بعد مسٹر بکسر نے عزیز احمد اور ان کے رفیقوں کے ایوان غالب میں غالب کے متعلق موسیقی پر مبنی ایک تمثیل دیکھنے کی دعوت دی۔

ہوسکتے ہیں۔ مزید پاکستانی شہری مقیم بنگلہ دیش کے پاکستان منتقلی کا معاملہ ملتوی کر دیا گیا ہوگا۔ یہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے بعد دونوں ممالک بعد میں طے کریں گے اگر جنگی قیدیوں کا معاملہ ایک بار طے ہو جاتا ہے تو پھر تسلیمی کوئی مشکل بات نہ ہوگی۔ شاید مسٹر بھٹو کا ایسا ہی خیال ہے۔

۲۸ر اگست

دوسرے دور کی گفت وشنید کا یہ ۱۲واں دن ہے۔ عزیز احمد کی یہ پیش کش کہ وہ وطن کی واپسی کو مزید ایک دن کے لئے التوی میں ڈال دیں گے گفتگو کے لئے تیرہویں دن بھی فراہم کر دے گا۔ تیرہ کو منحوس سمجھا جاتا ہے تو ہم پرست چاہتے ہیں کہ کل گفتگو نہ ہو۔

دراصل کچھ ایسی علامتیں نظر آئیں کہ جن سے پتہ چلتا ہے کہ تینوں حکومتوں نے معاہدے کا مسودہ گزشتہ رات تیار کر لیا ہے۔ مرکزی کابینہ کی سیاسی امور سے متعلق کمیٹی آج صبح بیٹھ چکی ہے۔ پاکستانیوں کو بھی غالباً ہدایات مل گئی ہیں ڈھاکہ سے قطعی جواب کا انتظار ہے۔

جواب آچکا ہے۔ سیاسی امور سے متعلق کمیٹی پھر بیٹھتی ہے اور اب مسودے کی رسمی منظوری کے لئے پوری کابینہ کا اجلاس ہو رہا ہے۔

دونوں وفود سات منٹ سے دو گھنٹے تک کے لئے ملاقات کرتے ہیں۔ معاہدے کے صفحات ٹائپ ہو رہے ہیں انہیں قطعی اور آخری ترمیم کی جا چکی ہے صحافیوں پر نتیجہ ظاہر ہے پانچ منٹ پہلے پانچ بیرے شام کی چائے کے لئے لڈو لائے ہیں۔ یہ روز آنہ کے ناشتے سے قدرے انحراف ہے آل انڈیا ریڈیو کی چھ بجے شام کے خبرنامے سے پتہ چلتا ہے کہ "معاہدہ مکمل ہے اور کسی بھی ساعت اس پر دستخط ہوسکتے ہیں"۔

سات بجکر پانچ منٹ پر آخری فیصلہ کن لمحہ

کانفرنس میز پر



بارگاہ الٰہی میں

آجاتا ہے مسٹر پی۔ این۔ ہکسر اور مسٹر عزیز احمد معاہدے پر دستخط کر دیتے ہیں۔ اس طرح ..... ہزاروں عورتوں اور بچوں کی زندگی کے لئے نیا باب شروع ہوتا ہے جو ہندوستان پاکستان اور بنگلہ دیش میں برس مہینے سے اپنے وطن کو واپسی کے منتظر ہیں۔ شملہ سمجھوتہ کے بعد یہ سب سے اہم قدم ہے جو برصغیر کی صورت حال کو معمول پر لانے کے لئے اٹھایا گیا۔

کل چھ بجے دہلی، راولپنڈی اور ڈھاکہ سے معاہدے کو بیک وقت نشر کیا جائے گا۔ اپنی مختصر تقریر میں مسٹر ہکسر نے بنگلہ دیش کے وزیر اعظم کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ شیخ صاحب کی تطبیق کے بغیر کوئی بھی معاہدہ نہیں ہو سکتا تھا عزیز احمد نے برصغیر کے تینوں سربراہوں کی نیک خواہشات ذکاوت اور دور اندیشی کی تعریف کی اور کہا کہ اس معاہدے کا کریڈٹ انھیں تین عظیم رہنماؤں کو ملنا چاہئے میرا خیال یہ ہے کہ برصغیر کا ہر ملک اتفاق اور دوستانہ تعلقات کا خواہاں ہے اور پائیدار امن کے قیام کی جانب تیزی سے پیش قدمی کرنا چاہتا ہے

تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۵ پاکستانی قیدیوں پر مقدمات ملتوی ہو گئے ہیں۔ ۲۰۳ بنگالیوں سمیت (جن پر پاکستان مقدمہ چلانا چاہتا ہے، سبھی بنگالی بنگال کو واپس ہو جائیں گے اور اس تعداد میں بنگلہ دیش سے پاکستانی شہری پاکستان چلے جائیں گے سہ جہتی تبادلہ آبادی ایک ساتھ ہوگی اور اس عظیم انسانی کارنامے کی تکمیل میں تقریباً تین مہینے لگ جائیں گے۔

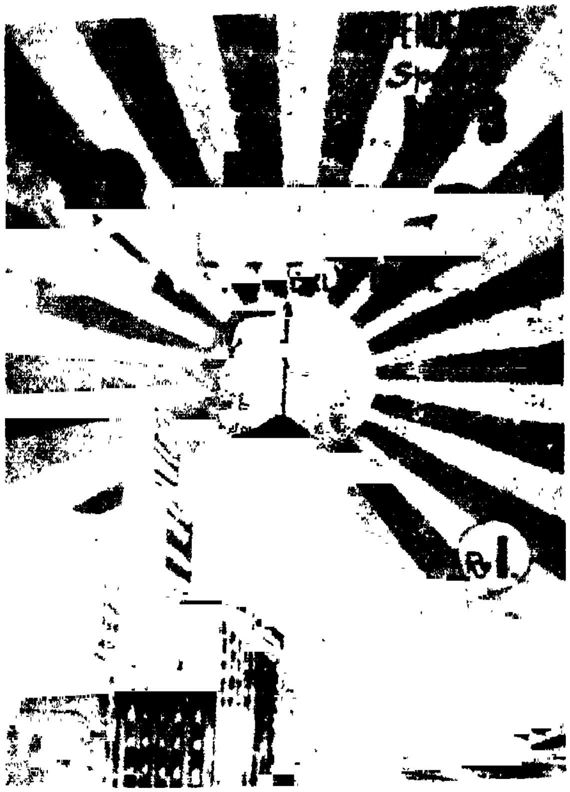
پاکستانی وفد وطن کو واپس پرواز کر گیا۔ وہ اپنے ساتھ وافر مقدار میں سپاری، پان اور بیگم اختر کی غزلیں لے گئے لیکن یہی سب کچھ نہیں ہے وہ اپنے ساتھ ہندوستانی عوام کی پر خلوص آرزوئیں اور نیک خواہشات بھی پاکستانی عوام کے لئے لے گئے تاکہ برصغیر میں پائیدار امن قائم ہو سکے۔

انسانی مسائل کے حل کے لئے ہند و پاک مذاکرات کا دوسرا دور جو گیارہ دنوں پر مشتمل تھا اسے مصیبت زدہ انسانوں نے آفریں کہا۔ یہ ابھی شروعات ہے لیکن پائیدار امن کا مقصد ابھی پورا نہیں ہوا۔ ویسے اب یہ امر محال نہیں معلوم ہوتا۔

انجام یقیناً بخیر اور خوشگوار ہوا ہے



عہدوں پہ ثبت مہر



تنہائی پسندی سے علیحدگی پسندی کی طرف

("ریڈینس" کے خاص نمبر کی روشنی میں)

بدنصیبی سے پچھلے ۲۵ سالوں میں ایک عام خیال یہ ہوگیا ہے کہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں نے صرف مسلم لیگ کی حیثیت سے حصہ لیا تھا۔ اور چونکہ مسلم لیگ ملک کی تقسیم کی ذمہ دار ہے اس لئے تاریخ جنگ آزادی کے اُس حصے فراموش کر دینا ہی مناسب ہے۔ آج نئی نسل شاہ اسمٰعیل شہید سے لیکر حسرت موہانی تک تمام قوم پرست مسلم رہ نماؤں کو بھول بیٹھی ہے۔ اشفاق اللہ خاں جیسا جانباز اور آزادی کی لگن میں پھانسی پر چڑھ جانے والا قوم پرست بھی تاریخ کی ستم ظریفی کا شکار ہوگیا ہے۔ پاکستان میں بھی ان قوم پرست مسلمانوں کا نام لینا جرم قرار پایا اور ہندوستان میں بھی یہ فرقہ پرستانہ رویئے کی نذر ہوگئے۔

"ریڈینس" نے اپنے آزادی نمبر میں ہندوستان کے ان مسلم رہ نماؤں کے کردار کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ جنھوں نے دوسرے فرقوں کے شانہ بشانہ ہندوستان کی تحریک آزادی میں نمایاں حصہ لیا تھا۔

اس کے آزادی نمبر میں پہلا مقالہ اے۔ کے۔ سوز صاحب کا ہے جنھوں نے بالکل صحیح کہا ہے کہ جنگ آزادی میں مسلمانوں کے رول کو غیر اہم ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ ایسا کیوں ہوا اور ایسا کون لوگ کر رہے ہیں۔ ان کے اس تجزیئے سے اتفاق کرنا ناممکن ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اکثریتی فرقے کے نہ صرف فرقہ پرست بلکہ سیکولر مزاج لوگ بھی اس سازش میں برابر کے شریک ہیں۔ ناواقفیت یا تعصب پر مبنی ہے یا پھر سیکولر عناصر پر یہ الزام محض ایک مخصوص سیاسی عقیدے کی وجہ سے لگایا جا رہا ہے۔ یہ کام دونوں فرقوں کے فرقہ پرست کر رہے ہیں اگر جن سنگھ اور آر۔ ایس۔ ایس طرح طرح سے یہ ثابت کر رہی ہیں کہ جنگ آزادی میں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں ہے تو مسلم لیگ بھی یہ ثابت کر رہی ہے کہ تحریک آزادی میں قوم پرست مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

"ریڈینس" کے موجودہ شمارے کے مطالعہ سے ایک اور خوشگوار احساس پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ اب جماعت اسلامی اور "مخلص فرقہ پرستوں" کے رویئے میں غیر محسوس ہی سہی۔ لیکن تبدیلی ہوئی ہے اور اس کا مظہر "ریڈینس" کا سرورق ہے۔

یہ سرورق اس کی علامت ہے کہ اب تنہائی کے خود ساختہ خول سے نکل کر باہر کی اس فضا میں سانس لینے کی تڑپ پائی جاتی ہے جہاں سبھی سانس لیتے ہیں۔ اگر واقعی مسلمانوں کے وہ افراد جو ڈیڑھ اینٹ کی مسجدوں سے باہر نکلنے کے لئے تیار نہ تھے باہر آکر مشترک مسائل پر ترقی پسند اور سیکولر افراد اور جماعتوں سے اشتراک عمل کریں تو ملک و قوم کے لئے نیک شگون ہوگا۔ یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ غیر مناسب نہ ہوگا کہ اس خوشگوار تبدیلی کا تعلق کچھ نہ کچھ ملک کی موجودہ فضا سے ہے۔ وہ فضا جہاں اکثریت میں بھی یہ عام احساس پیدا ہوگیا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ مسلسل زیادتیاں ہوتی رہی ہیں اور انھیں دور ہونا چاہیئے۔ ظاہر ہے اس فضا کی تشکیل میں ترقی پسند قیادت اور سیکولر جماعتوں اور افراد کی کوششوں کا خاصہ دخل ہے ورنہ اس سے پہلے اس ملک میں ایسے بھی لوگ تھے جو مسلمانوں کے نام تک سننے کے لئے تیار نہ تھے۔ ان کی مسلمانوں سے نفرت نقطۂ عروج پر تھی۔ حالانکہ جن مسلمانوں کے "کارناموں" کی وجہ سے ان میں تنفر کا احساس شدید ہوا تھا خود ان کے غور و فکر کا انداز بھی "ویسا" ہی تھا نفرت سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔ یہ سیدھی سادی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ نفرت کی اس تاریک فضا میں محبت کی کرنیں پھیل رہی ہیں۔ لیکن باعث تشویش یہ ہے کہ ایک بار پھر امن و آشتی کی فضا پر اپنے زہریلے تیروں سے لیس ہوکر فرقہ پرست حملہ آور ہیں۔ خواہ وہ ہندو فرقہ پرست ہوں خواہ مسلم فرقہ پرست دونوں سرگرم عمل ہو رہی ہیں یہ خطرے کی زبردست علامت ہے۔

بہرکیف ریڈینس کا یہ خاص نمبر خاصی اہمیت کا حامل ہے۔

پروفیسر عبدالمغنی کا مقالہ خاصہ متوازن ہے۔ انھوں نے وہابی تحریک سے لے کر آزادی تک کی اہم تحریکوں کا مختصر جائزہ لے کر یہ ثابت کیا ہے کہ جنگ آزادی کی ہر اہم منزل پر دوسرے اہل مذہب کی طرح مسلمان بھی پیش پیش رہے ہیں۔ ان کا یہ کہنا درست ہے کہ وہابی تحریک کو قدامت پرست مسلمانوں کی ایک مذہبی تحریک کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہابی تحریک کے علمبردار علماء تھے۔ اور اس کی بنیاد مذہبی جذبات تھی لیکن اول تو بنیادی طور پر یہ سامراجی حکومت کے خلاف ایک تحریک تھی۔ دوسرے اس عہد میں اس تحریک کے لئے کوئی اور صورت اختیار کرنا مشکل بات تھی۔ کانگریس تحریک میں جوش و خروش اس وقت آیا جب اس نے خلافت تحریک کو اپنایا۔ خلافت تحریک میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی مولانا ابوالکلام آزاد، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری اور مسٹر محمد علی جناح کے کارناموں کو بہ آسانی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان کی مکمل آزادی کا نعرہ سب سے پہلے مسلم سیاسی جماعتوں اور مسلم رہ نماؤں نے لگایا۔ ۱۹۲۹ء میں لاہور میں جو کانگریس کا اجلاس ہوا تھا۔ اس میں باقاعدہ طور پر پہلی بار مکمل آزادی کا مطالبہ کیا گیا حالانکہ اس سے پہلے کانگریس ہی کے ایک اجلاس میں مولانا حسرت موہانی یہ مطالبہ کر چکے تھے۔ جماعت اسلامی کانگریس میں شامل مسلمانوں کو اپنانے لگے تو اسے خوش خبری ہی سمجھنا چاہیئے۔

ایس اوصاف سعید یوسفی کے مقالے کی بنیاد اس نظریہ پر ہے کہ ہندوستان کی تقسیم کی ذمہ داری تمام مسلمانوں پر نہیں ہے بلکہ چند مسلمان رہ نما، برطانوی سامراج اور کانگریس کے بعض رہ نماؤں کے غلط اندازے اس کے ذمہ دار ہیں۔ اوصاف صاحب نے اس خیال کو مدلل طریقے سے پیش کیا ہے مصنف کے بعض دلائل سے اختلاف ممکن ہے لیکن بنیادی خیال سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ملک کی تقسیم کی ذمہ داری اُن چند رہ نماؤں پر زیادہ ہے جو ذاتی مفاد کے لئے سب کچھ قربان کرنے کو تیار تھے۔ پچھلے ۲۵ سالوں سے فرقہ پرست مسلمانوں کو اس غلطی کے لئے معتوب کرتے رہے ہیں۔ جس کی ذمہ داری ہرگز ان پر نہیں۔ ضرورت ہے کہ تاریخ کے اس پہلو کو زیادہ مفصل اور زیادہ مدلل طریقے سے پیش کیا جائے کیونکہ فرقہ پرستوں کی الزام تراشیاں اتنی خطرناک نہیں جتنی خطرناک یہ حقیقت ہے کہ خود زیادہ تر مسلمانوں نے اس الزام کو قبول کر لیا ہے اور احساس جرم میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ ہمیں مسلمانوں اور مسلم لیگیوں میں فرق کرنا چاہیئے۔ بدقسمتی سے واصفی صاحب بھی اس غلطی سے بچ نہیں پائے۔

کے۔ ایم۔ یوسف اور شیخ عبدالغفار کا موضوع بھی وہی ہے جو پروفیسر عبدالمغنی کے مقالے کا ہے۔ ان دونوں نے بھی تاریخی واقعات پیش کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں نے جنگ آزادی میں برابر کا حصہ لیا ہے شیخ عبدالغفار نے قدرے تفصیل سے تاریخی واقعات پیش کئے ہیں "جنگ آزادی کے مسلم شہیدوں کی ایک نامکمل فہرست" کے عنوان سے وہابی تحریک سے لے کر ۱۹۴۶ء تک ان مسلمانوں کے نام دیئے ہیں جنھوں نے جنگ آزادی کی تحریک میں جام شہادت نوش کیا تھا۔ اگرچہ یہ فہرست خاصی طویل ہے لیکن جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے یہ نامکمل ہے۔ اس میں سینکڑوں ناموں کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

"برما میں انقلابی سازش" کے عنوان سے "جہانِ اسلام" میں شائع ہونے بعض مضامین کے حصے نقل کئے ہیں۔ جہانِ اسلام قسطنطنیہ سے ۱۹۱۴ء میں نکلا تھا۔ یہ عربی، ترکی، ہندی اور اردو میں نکلتا تھا۔ اردو کا حصہ پنجاب کے رہنے والے ایک صاحب ابوسعید ترتیب دیتے تھے۔ "برما سازش" ہردیال، مہندر پرتاپ، ریشمی رومال تحریک وغیرہ کے بارے میں بہت اہم معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

شرقی عثمانی نے "مسلمان اور عوامی تحریکیں" کے عنوان سے ایک مقالے میں ان مسلمانوں کا ذکر کیا ہے جنھوں نے مختلف مزدور تحریکوں کی رہ نمائی

اداریئے میں کہا گیا ہے کہ اکثریت اور اقلیت کے درمیان ایک غیر معمولی فاصلہ پیدا ہو گیا ہے۔ یہ فاصلہ دونوں فرقوں کو بربادی کے راستے پر لے جائے گا۔ ہم چاہتے ہیں کہ فاصلے کو دور کریں اور ایک دوستی وارتباط، خلوص و محبت اور میل ملاپ کی فضا پیدا کریں گوپال متل صاحب نے اپنے مقالے میں ہندو مسلم فسادات کا ذکر کیا ہے لیکن انھوں نے یہ بتلانے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ اندرا جی کے زمانے میں ہر سال ان فسادات کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے۔ اردو کے حق میں بھی فضا پہلے سے بہت بہتر ہے۔ اتنا تو ہوا کہ یو۔پی اور بہار نے ہر پرائمری اسکول میں ایک اردو استاد کا تقرر تسلیم کر لیا ہے۔ یو۔پی حکومت نے اس سلسلے میں عملی اقدام بھی کئے ہیں۔ مسلم لیگ جن مسائل کو پیش کر کے مسلمانوں کے جذبات بھڑکاتی ہے۔ گوپال متل صاحب نے بھی ان ہی پر اظہار خیال فرمایا ہے۔ انھوں نے اردو، فسادات اور علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے مسائل ہی تک خود کو محدود رکھا ہے۔

ایک بات قابلِ غور ہے کہ "ریڈینس" کے خاص نمبر میں مسلمانوں کے رول کے بارے میں جس تحقیق کا ذکر کیا گیا ہے وہ نہ جماعت اسلامی کی کوشش کا نتیجہ ہے نہ کسی اور اس نوعیت کی جماعت کی کاوش ہے۔ یہ تحقیق سیکولر تحریک کے ایک رکن پروفیسر شانتی مئے رائے کی ہے۔ نمبر میں اگر ان کے علاوہ ڈاکٹر تاراچند، پنڈت سندر لال، شری بشمبر ناتھ پانڈے وغیرہ کی تحریروں کے حوالے بھی دیئے جاتے تو بہتر ہوتا۔ غالباً سیکولر تحریک کے اس رول کا اعتراف ابھی "ریڈینس" کو گوارہ نہیں۔

بہرکیف اس جملہ معترضہ سے قطع نظر "ریڈینس" کا یہ خاص نمبر خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ اور اس کا مظہر بھی ہے کہ کچھ لوگ تنہائی پسندی سے نکل کر علیحدگی پسندی کی حد تک آگئے ہیں۔

اردو کا مستقبل

شیریں رضوی

شیریں رضوی کا زیرِ نظر مضمون نہایت فکر انگیز ہے۔ اسی لئے ہم اسے معاصر "عزائم" سے اخذ کر کے معاصر مذکور کے شکریہ کے ساتھ قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ ہمیں مضمون کے بعض حصوں سے اختلاف ہے۔ مثلاً یہ کہ اردو مسلمانوں ہی کا مسئلہ نہیں ہے۔ اس ضمن میں ہم "سیکولر ڈیموکریسی" اردو نمبر ۱۹۷۲ء کے اداریہ کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرانا چاہیں گے۔ اردو کے مسئلے سے کئی مسئلے منسلک ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اس مسئلے کو خاص طور پر اردو و ہندی مسئلے کا جو حل گاندھی جی نے پیش کیا تھا وہ آج بھی بہترین حل ہے۔ (ادارہ)

موجودہ زمانے میں کوئی زبان اگر حکومت کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی نہیں تو کم از کم ہمدردانہ توجہ اور منصفانہ رویہ کے بغیر ترقی نہیں کر سکتی —— یہ اپنی جگہ بالکل درست ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جو زبان تحفظ اور بقا کے لئے صرف حکومت کی طرف دیکھنے کی عادی ہو جاتی ہے اور عوام کے ساتھ اس کا رابطہ ٹوٹ جاتا ہے وہ بھی زندہ نہیں رہتی۔ جب تک کسی گروہ کو خواہ وہ مذہبی ہو یا لسانی خود اپنی ذمہ داریوں کا احساس نہیں ہوتا، وہ ان سے حسن اور خوبی کے ساتھ عہدہ برآ نہیں ہوتا حکومت اس کے مطالبات پورے کرنے میں کیوں کر دل چسپی لے سکتی ہے۔

ہماری زبان، اردو کو آج جس المیئے کا سامنا ہے اسے اسی سیاق و سباق میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس کے حق میں حکومت کی بے التفاتی کی داستان جس جس طرح دہرائی جاتی رہی ہے اس کی بد نصیبی اور خستہ حالی کا چرچہ جس شدت کے ساتھ کیا جاتا رہا ہے، اس کے مقابلے میں عملی جد و جہد آج بھی برائے نام ہے۔ صرف حکومت سے مراعات حاصل کر لینے اور سرکاری دفاتر و عدالتوں میں اردو رائج کرا لینے کی کوششیں ہی سب کچھ نہیں ہو سکتیں اگرچہ ان کوششوں کی اہمیت سے بھی انکار نہیں ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر عوام کو جن کا رجحان اردو کی طرف سے تقریباً ہٹتا جا رہا ہے اور ادبی نقطۂ نظر سے ان کی دل چسپی ختم ہوتی جا رہی ہے۔ اس طرف راغب کرنا قدرے دشوار طلب تھا۔ انھیں متاثر کرنے کا کوئی وسیلہ بھی ہونا ضروری تھا تاکہ وہ اردو کے مستقبل کو اس درجہ تاریک نہ سمجھیں —— مگر معاملے کے یہاں تک پہنچتے پہنچتے اردو زبان کی بنیادیں ابھی خاصی کمزور پڑ چکی ہیں۔ جب تک کہ اس بنیادی کمزوری کو دور نہیں کیا جاتا اور اس کی ابتدائی تعلیم پر خصوصی توجہ نہیں دی جاتی۔ سرکاری دفاتر اور عدالتوں حتیٰ کہ یونیورسٹیوں کی بھی اردو اطمینان بخش نہیں ہو سکتی ہے۔

زبان سرکاری دفاتر میں نہیں گھروں اور بازاروں میں پرورش پاتی اور پروان چڑھتی ہے۔ دفاتر اور عدالتوں وغیرہ کا کام زبان کی ترقی پر توجہ دینا اور اسے سدھارنے کی کوشش کرنا نہیں ہے۔ سرکاری محکموں سے تعلق رکھنے والے کارکنوں اور افسران کے لئے اردو سے واقفیت حاصل کرنے پر اصرار کرنا درست ہے لیکن جب ہم ہی اپنی مادری زبان سے بخوبی واقف نہ ہوں ہمارا املا اور تلفظ درست نہ ہوتا ہو، سرکاری جد و جہد سے کیا حاصل ہوگا؟

زبان کی تعلیم جس طرح گھروں میں دی جاتی ہے تعلیم گاہوں میں بھی ممکن نہیں۔ بچہ جس وقت سے بولنا شروع کرتا ہے اس کی تعلیم کی ابتدا، اسی وقت سے ہو جاتی ہے۔ پھر جب وہ اپنے بڑوں کو آپس میں گفتگو کرتے، دوستوں سے ہنسی مذاق کرتے، نوکروں کو ڈانٹتے یا جھڑکتے سنتا ہے تو خود بھی اثر قبول کئے بغیر نہیں رہتا اس طرح گفتگو کے ڈھنگ، لہجہ کے اتار چڑھاؤ، الفاظ کے معنی اور نوعیت سبھی سے فطری طور پر واقف ہوتا چلا جاتا ہے اس کی زبان خود بخود سدھرتی اور وسیع ہوتی رہتی ہے لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے کہ گھروں میں زبان کی درستگی اور شائستگی کا خیال رکھا جائے اور اردو جس کس مپرسی کے عالم سے اس وقت گزر رہی ہے اس کے لئے تو اور بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ ان کے بچوں کی مادری زبان بھی حقیقتاً یہی رہے اور ایسا نہ ہو کہ مردم شماری کے رجسٹروں میں تو ان کی مادری زبان اردو درج کرا دی جائے لیکن عملاً وہ ایسی زبان بولیں جو اردو کو منہ چڑھانے والی ہو۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو بولنے والوں کی تعداد ہندی بولنے والوں کی بہ نسبت زیادہ ہی ہے خود ہندی والے اردو کے بیشتر الفاظ استعمال کرتے اور بولتے رہتے ہیں۔ یہی نہیں، ان میں اردو کی غزلوں اور نظموں سے دل چسپی دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے اس طرح وہ ہندی میں ترجمہ شدہ اردو کی کتابوں سے اپنے ذوق کی تسکین کرتے رہتے ہیں۔ اس ضمن میں ہندی والوں کی یہ خواہش بھی علم میں آئی کہ اردو کا رسم الخط بدل کر دیوناگری کر دیا جائے۔ جب کہ اردو کی بے شمار خصوصیتیں اس کے رسم الخط کی ہی مرہونِ منت ہیں اس میں ایک نمایاں خصوصیت تو اس کا صوتی آہنگ ہے یعنی بعض الفاظ جن کی آواز ایک ہوتی ہے وہ معنی اور املا میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتے ہیں اسی طرح اور بھی کئی خوبیاں اس سے وابستہ ہیں جو کہ ہندی رسم الخط میں بدل جانے کی صورت میں اپنا حسن اور توازن کھو بیٹھیں گی۔ اس لئے اردو دوستوں کو چاہیئے کہ اسے اسی رسم الخط میں قبول کریں اور اپنی نئی

نسلوں کو بھی اس سے بیٹنے نہ دیں۔ محض تھوڑی سی کاوش انھیں کامیابی کی راہ پر لا سکتی ہے ـــــ اس کے علاوہ فلموں میں دیئے جانے والے گیتوں اور مکالموں میں جو شہرہ اردو گیتوں اور مکالموں کا ہو گیا ہے وہ ہندی گیتوں اور مکالموں کو بھی آج تک نصیب نہیں ہوا۔ ان سب باتوں سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ اردو عوام اور خواص سبھی کی محبوب زبان ہے لیکن جب کوئی "غالبِ خستہ" کو "گالب کھستہ"، "اقبال" کو "اِکبال" اور "غزل" کو "گزل" کہتا ہے تو زمانہ کی ستم ظریفی کا احساس اور شدید ہو جاتا ہے پھر بالائے ستم یہ ہے کہ ندرتِ تلفظ کے یہ نمونے خود اردو والوں میں روز بروز عام ہوتے جا رہے ہیں اور آج بھی شاید اردو گھرانوں کے پانچ فی صدی لڑکے، لڑکیاں بھی صحیح اردو لکھنے اور بولنے پر قدرت نہیں رکھتے۔

یہ اردو کی بدنصیبی ہی تو ہے کہ حکومت تو اس کے ساتھ سوتیلی ماں والا برتاؤ کر ہی رہی ہے، خود اس کی محبت کا دم بھرنے والے بھی اپنا حق ادا نہیں کر رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی کوششیں حکومت کی بارگاہ میں درخواستیں گزارنے اور حقوق کا مطالبہ کرنے تک محدود کر رکھی ہیں۔

وہ اپنے بچوں کے لئے اردو تعلیم کی اہمیت کو نظر انداز کر رہے ہیں کیونکہ اس کا فی زمانہ ان کے مستقبل کے خوابوں سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس طرح وہ خود اردو کے لئے کسی طرح کی قربانی دینے پر آمادہ نہیں ہیں ورنہ قابلِ تعریف معرکہ تو یہی ہوتا کہ وہ ہر قسم کے خوف اور جھجک کو بالائے طاق رکھ کر محض اپنی مادری زبان کے لئے صدق دلی سے کچھ کر گزرتے اور اگر اس میں انھیں خدانخواستہ کچھ خسارہ اٹھانا پڑ جاتا تو بھی ماتھے پر شکن نہ آتی، جیسا کہ فیض کہتے ہیں ـــ

جو رُکے تو کوہِ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

مگر محبانِ اردو میں خود اعتمادی کی اتنی کمی نظر آتی ہے۔ ان کے عمل کے قویٰ مضمحل ہو گئے ہیں۔

تعمیری صلاحیتیں کمزور پڑ گئی ہیں ورنہ اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ جو کام ان کے کرنے کا ہے اسے چاہتے ہیں کہ حکومت انجام دے۔

اردو کا مسئلہ ایک زبان کا مسئلہ ہے سیاست کا مسئلہ نہیں ہے۔ سیاسی طریقوں سے حل کرنے کی کوششیں اسے اور زیادہ اُلجھا دیں گی۔ اسی وقت ہم دیکھ رہے ہیں کہ کوئی پارٹی اردو کے معاملے کو اپنا معاملہ بنانے کو تیار نہیں ہے، اس لئے کہ اس کو اندیشہ ہے کہ اگر اس نے ایسا کیا تو اکثریت اس سے ناراض ہو جائے گی جس کے قبضے میں اَسّی فی صدی ووٹ ہیں۔ ایک جمہوری نظامِ حکومت میں کوئی پارٹی اقلیت کو اُس کا حق دلانے کی خاطر اکثریت کی ناگواری مول لینا پسند نہیں کرے گی اور ہم ہیں کہ اس فریب میں روز بروز خود کو اور زیادہ مبتلا کرتے جا رہے ہیں کہ انتخابی دباؤ ڈال کر فلاں فلاں پارٹیوں کو اپنی حمایت پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ دانش مندی کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہم اردو کے سوال کو اکثریت اور اقلیت کے جھگڑوں سے جہاں تک ممکن ہو، الگ کرنے کی کوشش کریں اور اپنی نئی نسلوں کو اردو کے لئے اور اردو کو نئی نسلوں کے لئے محفوظ کرنے پر اصل توجہ صرف کریں۔ اگر ہم میں سے ہر ہر شخص طے کرلے کہ وہ روزانہ آدھ گھنٹہ اپنے بچوں کو اردو پڑھایا کرے گا تو اردو کی لڑائی جیتنے میں سیاسی مہم بازی سے کہیں زیادہ مدد ملے گی۔ لیکن ہمارا مزاج جذباتی بن گیا ہے اور ٹھوس کام ہمارے لئے کشش نہیں رکھتے۔

ابھی تو آزادی کو صرف ایک نسل گزری ہے لیکن اردو کے معاملے میں کیا صورت حال ہے؟ جن لوگوں کی مادری زبان اردو ہے کیا ان کے گھروں کا یہ حال نہیں ہے کہ:

۱۔ بچے اردو پڑھنا لکھنا نہیں جانتے وہ اپنی ہی زبان سے اجنبیت کا برتاؤ کرتے ہیں۔

۲۔ نئی نسل کا 'ش، ق'، تک درست نہیں ہے۔

۳۔ جن اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا انتظام ہے وہاں بھی اردو گھرانے کے بچے دوسرے مضامین کو اس پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ والدین نے چونکہ ان کی ابتدائی اردو کی تعلیم کی طرف توجہ نہیں دی اور وہ ہندی کے حروف سے آشنا ہوتے ہیں اس لئے انھیں اردو ایک مشکل مضمون نظر آتا ہے۔

۴۔ لڑکیاں آپس میں خط و کتابت ہندی میں کرتی ہیں اور گھر کا حساب کتاب اور دھوبی کے کپڑے وغیرہ بھی ہندی میں لکھنا پسند کرتی ہیں۔ حد یہ ہے کہ مجالس میں لڑکیاں ہندی میں مرثیئے وغیرہ لکھ کر لاتی اور پڑھتی ہیں۔

یہ سب اس لئے ہے کہ اردو نوازوں نے پریس اور پبلک پلیٹ فارم سے اردو کے خلاف کی جانے والی بے انصافی کا پرچار تو کیا، لیکن خود اپنے گھروں میں اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا، اردو کو زندہ رکھنے کی اس امانت کو دوسروں تک پہنچانے کی بطور خود کوئی کوشش نہیں کی۔ اگر اسی طرح دو ایک نسلیں اور گزر گئیں تو اردو زبان جس میں مختلف تہذیبوں کی روایات موجود ہیں، اپنی تمام تر ادبی صلاحیتوں کو کھو کر محض ایک بولی بن کر رہ جائے گی۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ سرکاری اور سیاسی محاذ پر تو جد و جہد کو جاری رکھا جائے لیکن جو اصل محاذ ہے یعنی گھر اور خاندان اس پر بھی اس کو زندہ رکھنے کی سنجیدگی سے کوشش کی جائے۔ ورنہ اگر مستقبل میں حکومت نے اردو کے جائز حقوق تسلیم بھی کر لئے تو اردو جاننے والے کہاں سے آئیں گے؟

اس لحاظ سے اردو کا مستقبل حکومت سے کہیں زیادہ خود اردو والوں کے ہاتھ میں ہے محض ہنگامہ آرائی سے کوئی کام نہیں بنتا۔ ہمیں تعمیری ذہن پیدا کرنا چاہیئے۔ شکوہ و شکایت کسی مسئلے کا حل نہیں ہے۔ اگر محبانِ اردو اپنے بچوں کو اردو پڑھانے کا انتظام نہیں کرتے تو کوئی سیاسی جد و جہد یا کانفرنسیں اور میمورنڈم اردو کو نہیں بچا سکیں گے۔

کتابوں کی باتیں

ادراکِ معنی ——— طیب انصاری

قیمت چھ روپے، صفحات ۱۹۲

ناشر:- ولا اکیڈیمی، عزیز باغ۔ سلطانپورہ، حیدرآباد ۲۴

طیب انصاری کے مضامین کا پہلا مجموعہ تحریر و تنقید کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ادراکِ معنی ان کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا دوسرا مجموعہ ہے۔ پیش لفظ ہی میں انھوں نے پڑھنے والے کو چونکانے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں" ترقی پسندی کا دور پورا ہو چکا ہے۔ ادب کو اس نظریہ کا وسیلہ بنانے سے اس نظریہ کو ضرور فائدہ پہنچا۔ لیکن ادب کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچا۔ اس کے زیرِ اثر جو ادب تخلیق ہوا وہ بہت جلد بھلا دیا جائے گا۔"

میں اُن کے اِس بیان سے نہ چونکا اور نہ ہی مجھے اس پر کوئی اعتراض ہے۔ ہر شخص کو اپنی ذاتی رائے رکھنے کا حق ہے۔ لیکن جب مخدوم پران کا مقالہ پڑھا تو میں واقعی چونک گیا۔ مخدوم ہندوستان کے صفِ اول کے ترقی پسند شاعروں میں تھے۔ ان کی تمام شاعری کی بنیاد کمیونزم کے فلسفوں پر تھی۔ ان کے بارے میں طیب صاحب لکھتے ہیں:" مخدوم کا کلام اردو ادب کا قابلِ قدر سرمایہ اسی وجہ سے کہلائے گا کہ اس کے کلام میں نغمگی کے ساتھ ساتھ انسانی محبت اور انسانی عظمت کا احساس بھی موجود ہے......"

مارکس کے نقطۂ نظر اور طرزِ فکر پر بار بار غور کیا جا سکتا ہے لیکن مارکس اور مارکسی مفکروں کی انسان دوستی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مخدوم کے اندازِ فکر پر ہم کڑی تنقید کر سکتے ہیں لیکن اس کے جذبۂ انسانیت سے انکار ممکن نہیں۔ یہی انسانیت کا جذبہ اس کا مقصد بھی ہے۔ مخدوم فن میں مقصد کو اہمیت دیتا ہے۔ وہ فن کو انسان کی فلاح کے لئے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ ترقی پسندی کی اس سے زیادہ تعریف تو خود ترقی پسند بھی نہیں کر سکتا۔ پھر طیب صاحب کس کے مخالف ہیں۔

پیش لفظ ہی میں طیب صاحب فرماتے ہیں "غالب کی شاعری ہماری ذہنی بے چارگی اور بیماری کی علامت ہے۔ ہماری زوال پسندی کا آئینہ ہے۔ غالب کی شاعری تو طوائف کی زبان تھی۔ اس خوبصورت اور حسین شاعری نے زوال پسندوں کو شکست سے ہمکنار کیا ہے۔ تھپک تھپک کر سلا دیا ہے"۔

طیب صاحب کو پہلے مغلوں کے زوال کی تاریخ کا بغور مطالعہ کرنا چاہیئے۔ پھر یقیناً وہ غالب کو اتنا عظیم فن کار ثابت نہیں کریں گے کہ انھوں نے پوری قوم کو تھپک تھپک کر سلا دیا اور قوم سو گئی۔

خلیق انجم

مشینوں کا شہر ——— کرشن چندر

صفحات ۱۸۴۔ قیمت ۴ روپے

ناشر:- نصرت پبلشرز۔ وکٹوریہ اسٹریٹ۔ لکھنؤ

"ناول "مشینوں کا شہر" کارل چپیک کے مشہور ڈرامہ R.U.R. سے ماخوذ ہے، میں نے وہی کردار لئے ہیں۔ وہی پلاٹ، ناول میں ڈھالنے کے لئے البتہ اس میں کہیں کہیں تبدیلی کرنا پڑی ہے۔ مگر جہاں تک ہو سکا ہے میں نے کوشش کی ہے کہ اصل سے انحراف نہ ہو۔

آج سے تقریباً نصف صدی قبل کارل چپیک نے جو سائنسی پیش گوئیاں کی تھی اور جس طرح ان کی سمت اور نہج واضح کی تھی ان کا ایک خوفناک نقشہ آپ کو اس ناول میں ملے گا اس صدی میں اس کی ابتدا ہو چکی ہے کیا اگلی صدی میں یہ ابتدا اسی انجام کو پہنچے گی جس کی طرف کارل چپیک نے اشارہ کیا ہے!

ممکن ہے انسانی تہذیب ایک نئی کروٹ لے اگر ایسا ہوا تو یہ ایک تہذیبی اور سیاسی فیصلہ ہوگا جس کے آثار ابھی تک دکھائی نہیں دیتے۔" کرشن چندر

اس کتاب میں جو کچھ کہا گیا ہے اس پر حسبِ بالا سطور میں کرشن چندر خود نے بہترین تبصرہ کر دیا ہے اب رہی کچھ فکر و فن کی باتیں مثلاً یہ کہ یہ کتاب ناول بھی کہی جا سکتی ہے یا نہیں۔ ظاہر ہے ناول کے نصابی یا درسی معیار کے مطابق تو یقیناً یہ کتاب ناول کے معیار پر پوری نہیں اترے گی لیکن اس سے قطع نظر کہ یہ کتاب ناول ہے یا نہیں۔ اگر صرف یہ دیکھا جائے کہ دنیائے ادب میں اسے کوئی مقام ملنا چاہیئے یا نہیں تو بلا جھجک یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک عمدہ فن پارہ ہے۔

عمدہ اس اعتبار سے کہ نہ صرف بغیر کسی اکتاہٹ کے قاری اسے شروع سے آخر تک پڑھ لیتا ہے بلکہ نہایت دل چسپی کے ساتھ پڑھتا ہے اور محظوظ ہوتا ہے۔

اس عدم بوریت اور دل چسپی کا سبب صرف کرشن چندر کا اسلوب نہیں ہے بلکہ اس کتاب کا مواد بھی پُرکشش ہے اور اس مواد کو فن کے سانچے میں نہایت ہی عمدہ طریقے سے ڈھالا گیا ہے۔ شروع سے آخر تک کتاب کسی" زندہ پرکشش" اور "مکمل" انسان" کی طرح قاری کے فکر و نظر کے لئے باعثِ تسکین ہوتی ہے۔ اس کے تجربات میں اضافہ کرتی ہے۔ ایسے زریں اور نایاب تجربات سے روشناس کرتی ہے جو انسانی زندگی اور بنی نوع انسان کو تازگی، توانائی اور شادابی عطا کرتے ہیں۔ قاری کے ذہن سے تنگ نظری، رجعت پرستی، مشین نوازی اور حرص و ہوس کے وہ تمام جرثومے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں جن کی وجہ سے دنیا جہنم بنتی جا رہی ہے۔

بہت سارے ادبی شہ کاروں کی طرح کرشن چندر کی یہ کتاب بھی کسی مخصوص صنف سے تعلق نہیں رکھتی اسے ناول اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں ناول کی بنیادی صفت یعنی وہ "کیفیت" نہیں ہے جو ناول کو دوسرے اصنافِ ادب سے ممیز کرتی ہے اس لئے مشینوں کا شہر کو کسی صنف میں قید کئے بغیر پڑھنا چاہیئے اور ضرور پڑھنا چاہیئے۔

اب رہی کتابت و طباعت اور کاغذ کی باتیں تو وہ سب ٹھیک ہیں اور اگر یہ چیزیں خراب ہوتیں تب بھی میں یہ کتاب خریدنے اور پڑھنے کا مشورہ دیتا۔

بشیر احمد

(ساسپردائکتا اور ودھی کمیٹی کی سرگرمیاں۔ بقیہ صفحہ ۲۶ کا)

فرق نہیں ہے کیونکہ پاکستان کو توڑنے کی ذمہ داری دونوں پر ہے۔ ابھی حال ہی کے مذاکرے میں سرکا نے جو دوراندیشی اور انسانیت کا مظاہرہ کیا ہے اس سے ان فرقوں کے لئے دشواریاں پیدا ہو گئی ہیں۔

دوسری طرف جن سنگھ یہ سوچتی ہے کہ اس وقت عوام کے درمیان مسلمان مخالف، پاکستان مخالف آوازیں اٹھانے کا ماحول نہیں ہے کیونکہ شری متی اندرا گاندھی نے جنگ کے بعد پرامن طریقہ سے جن مقاصد کو حاصل کیا ہے اس کی عوام نے تعریف کی ہے۔ جن سنگھ کے رہنما آج کی دشواریوں کے لئے جس طرح واویلا مچا رہے ہیں اس ضمن میں شری متی اندرا گاندھی کی ان باتوں کو یاد کیا جا رہا ہے جن کے متعلق انھوں نے ان دنوں عوام کو خبردار کیا تھا وہ یہ کہ جنگ کے بعد دشواریاں کافی بڑھ جائیں گی۔

اس برصغیر میں امن اور خیر سگالی کا جو ماحول تیار ہوا ہے ہو سکتا ہے اسے برباد کرنے کے لئے فرقہ وارانہ عناصر کشیدگی اور تشدد کی فضا پیدا کریں۔

دہلی میں اس طرح کی کوششوں کے کچھ اشارے ابھی حال ہی میں ملے ہیں۔ سمجھوتے پر دستخط ہونے کے ایک ہفتے کے اندر ہی جن سنگھ نے اس شہر کو فرقہ واریت کی آگ میں جھونکنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں اس کی تکنیک وہی پرانی ہے۔

سوموار کی شام کو چھیڑ خوانی کا ایک واقعہ ہوا۔ اس کا مقابلہ اس طرح سے کیا جانا چاہیئے تھا جیسا کہ اس طرح کے دیگر جرائم میں کیا جاتا ہے لیکن جن سنگھ کے لوگوں نے اسے فرقہ وارانہ رنگ دینے کی کوشش کی۔ انھوں نے اس طرح کی افواہ پھیلائی کہ مجرم کو پولیس نے گرفتار نہیں کیا۔ انھوں نے حوض قاضی پولیس اسٹیشن کے قریب ایک بھیڑ اکٹھی کر لی۔

محترمہ سبھدرا جوشی جو کہ اس علاقہ سے پارلیمنٹ میں نمائندگی کرتی ہیں یہ خبر سن کر وہاں پہنچیں جن سنگھیوں کو یہ پتہ تھا کہ محترمہ جوشی ان کے ارادوں کو ناکام کرنے کے لئے تنہا کافی ہیں اس لئے انھوں نے شریمتی جوشی کے خلاف نعرے لگانے شروع کئے انھیں جسمانی گزند پہنچانے اور ان کی کار میں آگ لگانے کی بھی کوشش کی۔

اس دوران کانگریسی کارکن اور ان کے حمایتی بھی وہاں جمع ہو گئے۔ محترمہ جوشی سے جن سنگھیوں کا خراب برتاؤ دیکھ کر فطری طور پر انھیں غصہ آیا۔ کانگریسی کارکنوں کے تیور خراب دیکھ کر جن سنگھی بھیڑ کھسک گئی۔

سبھدرا جوشی نے پولیس اور دیگر حکام سے بات کی اور کہا کہ اس جرم کو ایک جرم کی طرح دیکھنا چاہیئے اور اس بات سے ہوشیار رہنا چاہیئے کہ فرقہ وارانہ عناصر اسے فرقہ وارانہ فساد کے لئے بہانہ نہ بنا سکیں۔ انھوں نے سامپردائکتا ورودھی کمیٹی اور کانگریس کے سبھی کارکنوں کو بیدار رہ کر جن سنگھ کی افواہوں کا مقابلہ کرنے کو کہا۔

ایک دوسری جگہ آر۔ایس۔ایس کے کارکنوں نے قریب سے گزرتے ہوئے ایک کانگریسی کارکن کو پیٹنے کی کوشش کی۔ آر۔ایس۔ایس کی اس حرکت کو دیکھ کر کانگریس کے کچھ اور کارکن آ گئے اور انھوں نے آر۔ایس۔ایس کی غنڈہ گردی کی مخالفت کی۔ اپنے منصوبوں میں ناکام ہونے کے بعد آر۔ایس۔ایس نے اپنے کچھ سینئر لوگوں کو جمع کیا اور ایک کانگریسی کارکن کی دکان پر حملہ بول دیا۔ پولیس کو جب اس کی خبر دی گئی تو وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔

اس طرح کے حادثات کے اشارے اور جگہوں میں بھی ملے ہیں۔ ان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ عناصر آئندہ انتخاب کے بارے میں اپنے اندازوں سے مایوس ہو گئے ہیں اور اس بات سے ناامید ہو کر کہ وہ جمہوری طریقوں سے انتخاب میں کامیاب نہیں ہو سکتے بدامنی پھیلانا چاہتے ہیں۔

سبھی سیکولر عناصر کا یہ فرض ہے کہ ان مایوس فرقہ پرستوں کے خلاف ایک ساتھ کھڑے ہوں سامپردائکتا ورودھی کمیٹی کا یہ فرض ہے کہ وہ فرقہ پرستوں کی ان حرکتوں کے خلاف عوام کو ہوشیار اور بیدار کریں۔ انھیں سبھی سوشلسٹ اور جمہوری عناصر کو ایک ساتھ لانے کے لئے پہل کرنی چاہیئے۔ فرقہ پرست جماعتوں اور تنظیموں پر گہری نظر رکھنی چاہیئے اور ان کا مقابلہ کرنے کے لئے انتظامیہ کی بھی مدد لینی چاہیئے۔ اگر اس بات کا خدشہ ہو کہ انتظامیہ کے افراد مدد نہیں کر رہے ہیں یا فرقہ وارانہ عناصر سے ملے ہوئے ہیں تو اس کی رپورٹ فوراً اعلیٰ حکام سے کرنی چاہیئے۔ کمیٹی کو اس سے ہوشیار رہنا چاہیئے کہ اس کا رویہ بامقصد ہو، سبھی حادثوں کے بارے میں مرکزی کمیٹی کو باخبر کیا جانا چاہیئے۔



گنیش شنکر ودیارتھی یوتھ کیمپ برائے قومی یک جہتی، لکھنؤ کا ایک منظر

بزم سوالات

سیکولر ڈیموکریسی کے آئندہ شمارہ سے ہم ایک نیا سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔ "بزم سوالات" کے عنوان کے تحت قارئین جتنے سوالات چاہیں دریافت کر سکتے ہیں۔

سوالات سیکولر ڈیموکریسی کے مزاج کو ذہن میں رکھ کر ہی کئے جائیں۔ ہر سوال کے نیچے جواب کے لئے جگہ چھوڑ دینی چاہیئے۔

خوب سے خوب تر کی طرف

"سیکولر ڈیموکریسی" میں آپ کو کیا پسند ہے اور کیا ناپسند؟

خوب سے خوب تر بنانے کے لئے اس میں کون کون سی تبدیلیاں لائی جائیں؟

ہم آپ کی آراء کے منتظر ہیں۔

خاص نمبر

"سیکولر ڈیموکریسی" کا نومبر ۱۹۷۳ء کا شمارہ خاص نمبر ہوگا۔

ادبا سے گذارش ہے کہ وہ جلد سے جلد اپنے مضامین دفتر کو ارسال کر دیں۔

ایجنٹ حضرات اپنے آرڈر اور مشتہرین اشتہارات جلد سے جلد بھیج دیں۔

(منیجر)

ہم اس وقت پانچویں پنجسالہ پلان کی تفاصیل مرتب کر رہے ہیں۔ مختلف شعبوں میں ملک کو خودکفیل بنانے کے لئے جو کام کرنا باقی ہے، اس پلان کا بڑا مدعا اسے پورا کرنا، ملک کے غریب ترین طبقوں کی سماجی بہبود کے پروگرام کو فروغ دینا، اور پیداوار کی جو صلاحیتیں پہلے ہی وجود میں آ چکی ہیں ان سے پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنا ہے۔

ہمارے سماجی پروگراموں میں بے زمین افراد کے لئے مکانوں کی تعمیر کے لئے جگہ مہیا کرنے، کم بارش کے علاقوں میں چھوٹے کسانوں کے لئے قرضے اور کھیتی باڑی کی ضروری اشیاء فراہم کرنے، گندی بستیوں کے علاقوں میں بہتر مکانات کا انتظام کرنے، مزید دیہات میں بجلی کی سہولتیں مہیا کرنے، پڑھے لکھے بیروزگاروں کے لئے روزگار کی اسکیمیں عمل میں لانے اور فیملی پلاننگ کی طرف زیادہ توجہ دینے کے پروگراموں کو اہمیت دی جائے گی۔

——— اندرا گاندھی

پردھان منتری

خودکفالت

کی طرف بڑھتے قدم



davp 73/247

انکم ٹیکس دہندگان!

محکمہ انکم ٹیکس کی طرف سے

مستقل کھاتہ نمبر

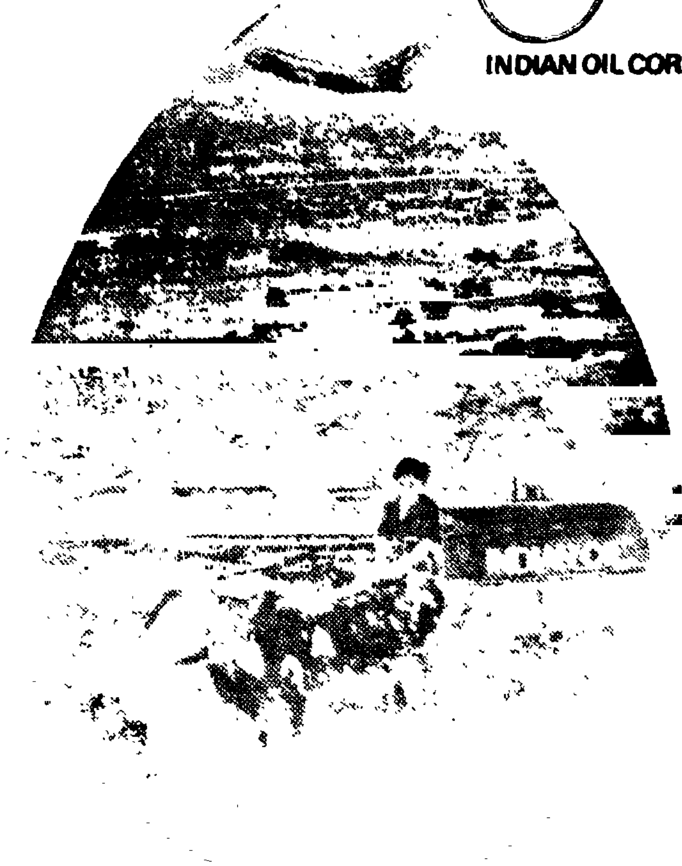
ہر ٹیکس دہندگان کو الاٹ
کیا گیا ہے تاکہ ادائیگیوں کے چالانوں،
گوشواروں اور دوسری خط وکتابت
کا صحیح ڈھنگ سے ریکارڈ رکھا
جا سکے اور انھیں فائل
کیا جا سکے۔

اگر غلطی سے آپ کو دو مستقل کھاتہ نمبر الاٹ ہو گئے ہیں، یا کوئی بھی نمبر الاٹ نہیں کیا گیا، تو از راہ کرم اپنے انکم ٹیکس افسر/کمشنر انکم ٹیکس سے کہیں کہ وہ آپ کے دوسرے نمبر کو منسوخ کر دیں، یا کوئی نمبر الاٹ کریں۔

از راہ کرم اپنے گوشواروں، چالانوں وغیرہ پر اپنے مستقل کھاتہ نمبر کا صحیح طور پر حوالہ دینا نہ بھولیں۔ اس سے جہاں آپ محکمے کی مدد کریں گے، وہاں محکمہ بھی آپ کی بہتر خدمت انجام دے سکے گا۔

جاری کردہ:
ڈائرکٹوریٹ آف انسپکشن
(ریسرچ، اسٹیٹسٹکس اینڈ پبلیکیشن)
نئی دہلی

davp 73/161



قومی ایکتا ٹرسٹ کی تین اہم کتابیں

بنگلہ دیش میں بارہ دن
(عتیق صدیقی)

اردو میں بنگلہ دیش پر یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جو اخباری یا کتابی مطالعے پر نہیں بلکہ عینی مشاہدے پر مبنی ہے۔ یہ ایک ایسے مصنف کے تاثرات ہیں جو بنگلہ دیش کے مسائل پر گہری نظر رکھتا ہے۔

حال ہی میں عتیق صدیقی بنگلہ دیش گئے تھے۔ اور دو ہفتے قیام کرکے وہاں کے حالات کا انھوں نے غائر مطالعہ کیا۔ بنگلہ دیش کے وزیروں اور لیڈروں ہی سے نہیں، عام لوگوں سے بھی انھوں نے ملاقاتیں کیں اور جو کچھ دیکھا یا سنا اُسے نہایت دلکش انداز میں بے کم و کاست قلم بند کر دیا۔ مصنف کے کمالاتی انداز بیان نے اس رپورتاژ کو آج کے بنگلہ دیش کی جیتی جاگتی تصویر بنا دیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اردو کے بہترین رپورتاژوں میں اس کا شمار ہوگا۔ طباعت آفسٹ۔

- - - - - - - - - - - - - - -

متحدہ قومیت اور اسلام
مولانا حسین احمد مدنی

تحریک آزادی کے پیچھے جو ایک خیال اور جذبہ کارفرما تھا وہ یہ تھا کہ ہندوستان کے تمام باشندے بلا لحاظ مذہب و ملت ایک قوم ہیں اور ان کو اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کا حق ہے۔

اس تحریک اور جدوجہد کے دوران ایک مشترکہ جہتی و قومیت پیدا ہوا۔ انگریز کے حواریوں نے اس کے خلاف جذبات بھڑکانے کی کوشش کی۔ راشٹریہ سویم سیوک سنگھ اور ہندو مہاسبھا نے تحریک شروع کی کہ ہندوستان کی قومیت ہندو قومیت ہی ہوسکتی ہے جو ہندو نہیں وہ اس ملک کا شہری یا قوم پرست نہیں ہوسکتا۔ اس کے مقابلے میں مسلمانوں میں بھی ایسے لیڈر پیدا ہوئے جنھوں نے کہنا شروع کیا کہ مسلمان تو کسی ایسی قومیت کا حصہ ہو ہی نہیں سکتے جس میں غیر مسلم بھی شامل ہوں۔ مسلم لیگ نے اعلان کیا کہ مسلمان علیحدہ قوم ہیں اس لئے مسلمانوں کے لئے الگ ملک بننا چاہیئے۔

مسلم لیگ کے علاوہ ایک دوسرا خیال جماعت اسلامی نے پھیلایا کہ مسلمان تو کسی بھی قومیت سے متعلق نہیں ہوسکتے۔ انھوں نے مسلمانوں کو سمجھانا شروع کیا کہ قومیت کا تصور ہی غیر اسلامی ہے اور مغرب کی پیداوار ہے۔ اسی طرح جمہوریت بھی غیر اسلامی نقطۂ نظر ہے مسلمانوں کو ان سے الگ رہنا چاہیئے۔

یہ خیالات ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے لئے بھی خطرناک تھے اور تمام ملک کے لئے بھی ضرر رساں۔ اس بات کو بہت سے مسلم قائدین نے سمجھا اور مسلمانوں کو صحیح صورت حال سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔ ان میں مولانا حسین احمد مدنی پیش پیش تھے۔ اس مسئلے پر انھوں نے متحدہ قومیت اور اسلام کے نام سے ایک کتابچہ لکھا ہے جو پچھلے پچیس تیس سال سے نایاب تھا۔ افادیت کے پیش نظر اسے دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔ صفحات ۷۸، طباعت آفسٹ، قیمت ڈیڑھ روپیہ۔

- - - - - - - - - - - - - - -

جلتا شہر کراہتی راتیں
اظہار اثر

ایک شہر .... جو تاریکیوں اور گناہوں کے آغوش میں سسک رہا تھا......!

ایک شہر جس کے آسمان پر عسکری سیاست کی دھند چھائی ہوئی تھی۔

ایک دنیا ..... جو آگ اور خون کے در و دیوار میں جینے والوں کی حسرتیں سمیٹے ہوئے سُلگ رہی تھی

جسموں کی عریانی اور سنسناتی ہوئی گولیوں کے درمیان ..... بھڑکنے والے ان شعلوں کی پراسرار داستان

...... جو شہر اور کراہتی راتوں کی ہزاروں داستانوں کو چھپائے ہوئے تھے

اسرار، ہیبت اور عصری سیاسی شعور سے بھرپور ایک جاسوسی ناول جسے اظہار اثر نے پراسرار ناولوں کے ایک نئے تجربے کی صورت میں تخلیق کیا ہے۔

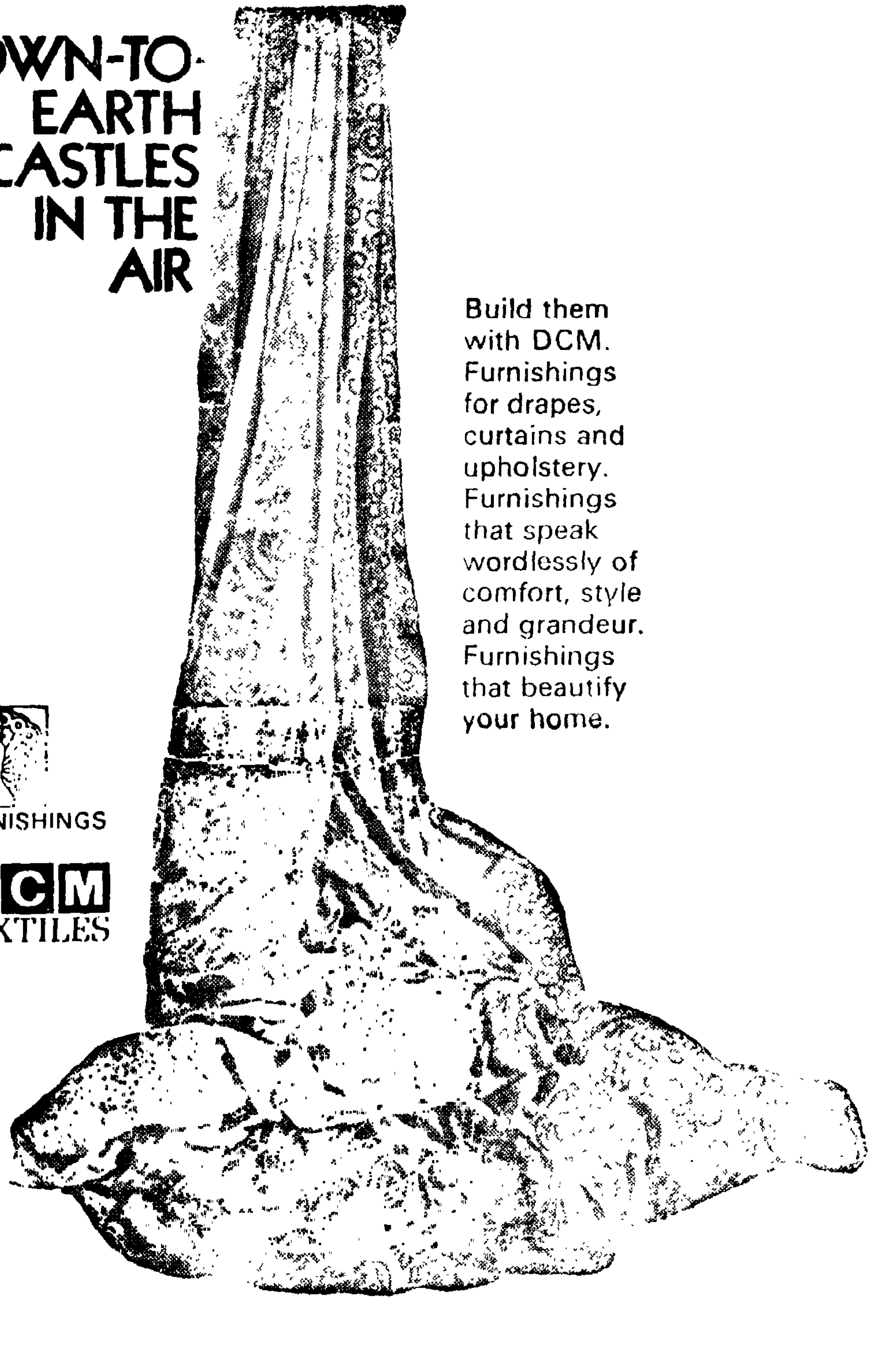
صفحات ۱۲۸، طباعت آفسٹ، قیمت ڈھائی روپے

۱۵- بلونت رائے مہتہ لین نئی دہلی

ایس۔ ایس۔ چ۔۔۔ نے قومی ایکتا ٹرسٹ کے لئے راکیش آفسٹ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔
رجسٹرڈ آفس:- ۸-۱۹۔ تھیٹر کمیونیکیشن بلڈنگ کناٹ سرکس نئی دہلی۔ ایڈیٹر:- ڈی۔ آر۔ گوئل


اکتوبر ۱۹۷۳ء
شمارہ ۲۳۵
م ہوا: پردہ ... پر گاندھیائی سچ

DOWN-TO-EARTH CASTLES IN THE AIR



Build them with DCM. Furnishings for drapes, curtains and upholstery. Furnishings that speak wordlessly of comfort, style and grandeur. Furnishings that beautify your home.

FURNISHINGS

DCM
TEXTILES

11 OCT

نوازش نامے

بلاعنوان

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ!

شروع راہِ محبت وہیں سے ہوتی ہے
جہاں سے پڑنے لگیں پاؤں ڈگمگاتے ہوئے

میں آپ کے محبت اور شرارت میں ڈوبے ہوئے خط سے بے انتہا محظوظ ہوا۔

آپ "سیکولر ڈیموکریسی" والوں کے پاس بخیریت تمام پہنچ گئے۔ میں انھیں اس دور میں بہت غنیمت سمجھتا ہوں۔ ورنہ جگر مرادآبادی مرحوم نے جن تلخ حقیقتوں کو پیش کیا تھا ان کا رنگ اور گہرا ہوتا جگر نے کہا تھا۔

دل کی جراحتوں سے کھلے ہیں چمن چمن
اور اس کا نام فصلِ بہاراں ہے آجکل

ہے "زخمِ کائنات" جو "ہندو" ہے اِن دنوں
ہے "داغِ زندگی" جو "مسلماں" ہے آجکل

"جمہوریت" کا نام ہے "جمہوریت" کہاں
"فسطائیت" حقیقتِ عریاں ہے آجکل

جگر مرحوم سے بہت پہلے جب ہندوستان "ہوم رول" کا خواب دیکھ رہا تھا چکبست آنجہانی نے صاف اعلان کر دیا تھا کہ

دیر و حرم میں کوئی نہیں اپنی راہ پر
ہندو نئے نئے ہیں، مسلمان نئے نئے

اور میری ایک غزل کا یہ شعر بھی اچھی خاصی مقبولیت کا حامل ہے ––

سیکولر ڈیموکریسی

نہ بتخانوں میں نام اس کا، نہ کعبہ میں نشاں اس کا
بتاؤ جنسِ الفت ظالمو آخر کہاں رکھ دی

"مذہب" جب اخلاق، محبت، انسانیت، رواداری، نفع رسانی اور بے لوث خدمتِ خلق کو بالائے طاق رکھے تو اس کی افادیت ختم ہو جائے گی اس لئے وہ مٹ جائے گا یا اس کو اپنی شکل تبدیل کرنی ہوگی، اور عبوری دور میں الیکشن لڑنے کے سوا اس کا کوئی کام نہ ہوگا۔

"سیاست" جب مذاہبِ عالم کے پیش کردہ معارف انسانیت اور مسلّمہ "اخلاق اقدار" یا "اتھیکل ویلوز" کو اپنے مزعومہ "میٹریل ویلوز" کا خادم ادنیٰ سمجھے تو "دیو استبداد" جمہوری قبا میں پاکوب ہوگا۔

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے کہ آزادی کی ہے نیلم پری

اگرچہ "سیکولر ڈیموکریسی" کے اربابِ فکر و نظر نے اس نکتہ پر اب تک اپنے قلب و دماغ کی نشاندہی نہیں فرمائی مگر انھیں یقین ہے کہ

شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز
اس چمن کی ہر کلی دردآشنا ہو جائے گی
آ ملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
بلبلوں کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی

میں "مردِ مسلماں" کی حیثیت سے ان کے اس "یقین" کی داد دیتا ہوں جو بقول اقبال "بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی" ہے۔ اور آپ سے بھی میری گذارش یہی ہے کہ یہ "یقین" پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے۔

یہ صحیح ہے کہ "جن سنگھ" فضائے نفرت و عناد ہی میں سانس لے کر زندہ رہ سکتی ہے صحت مندانہ موسم محبت کی بادِ نسیم کا ایک جھونکا بھی اس کے نہاں خانہ قلب و دماغ کو چھوتا ہوا گزر جائے تو آکاش بانی سے اس کی اچانک موت کی خبر نشر ہو جائے گی۔

یہ بھی صحیح ہے کہ میرے محترم اور جان کے برابر عزیز بھائی جناب سلیمان سیٹھ کی "مسلم لیگ" مسلمانوں کی "واحد نمائندہ" بھی ہے اور دو درجن سے زائد غیر نمائندہ مسلم جماعتوں سے مصافحہ اور معانقہ مسلم مسائل کے حل کے لئے عین ایمانی فراست بھی سمجھتی ہے۔ اسے ملک کی تقسیم کے بعد "ٹو نیشن تھیوری" یا "دو قومی نظریہ" کی فرسودہ گالی سے کوئی واسطہ نہیں۔ وہ قطعاً "نئے ہندوستان" میں "نئی مسلم اقلیت" کے "نئے مسائل زندگی" کی "فطری پیداوار" ہے۔ لیکن مرحوم قائدِاعظم مسٹر محمد علی جناح کی "اصلی اور حقیقی وارث" بھی وہی ہے

آ کے سجادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد
نہ رہی دشت میں خالی مری جا میرے بعد

ہندوستان کے سیاسی عجائب خانہ میں "مسلم لیگ" کا وجود "جن سنگھ" سے زیادہ قیمتی ہے۔

قیمتِ خود "تختِ دہلی"
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

اب رہا یہ سوال کہ "جن سنگھ" اور "مسلم لیگ" کے درمیان جا بجا "سمجھوتہ" کیوں ہو جاتا ہے؟ اس کا جواب بہت مشکل تھا اگر پچھلی جنگِ عظیم میں "ہٹلر" اور "اسٹالین" کے واقعہ "سمجھوتہ" کا "اسٹالین گراڈ" کی "زینہ بہ زینہ" لڑائی کی شکل میں اپنی دست بدست یادگار تاریخ کے خون آلود صفحات کو نہ دے چکا ہوتا۔ "جن سنگھ" اور "مسلم لیگ" کی صلح تعجب خیز یقیناً ہے پریشان کن ہرگز نہیں۔

یہ اقامت ہمیں پیغامِ سفر دیتی ہے
زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے

جب ان ستم ظریفانہ سیاسی احوال و ظروف کا جائزہ لیتا ہوں تو "سیکولر ڈیموکریسی" کو چرچل کی "V" وی پاتا ہوں۔

"سیکولرازم" –– "ڈیموکریسی" –– اس کے اقسام –– "مسلم اقلیتی کردار" –– اس کے حدود اربعہ مسلم اقلیت کے تہذیبی، تمدنی، لسانی اور اقتصادی مسائل –– کانگریس اور اس کا مرکزی رول –– ان تمام پیش پا افتادہ باتوں کے لئے میرے دوسرے خط کا انتظار کیجئے جو ممکن ہے کچھ طویل ہو۔

میں ہفتوں سے بیمار ہوں اس حال میں بھی "مشقِ سخن" جاری ہے۔ آپ مجھ سے سننا چاہتے ہیں جزاک اللہ عمرے دراز باد۔ میں بھی آج کل صرف سنانے کی موج میں ہوں۔

نغمہائے شوق کو اے دل غنیمت جانئے
بے نوا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

محترم گوئل صاحب محترمہ سبھدرا جوشی صاحبہ اور جملہ قدر دانانِ واقف کو گرمجوشانہ سلام و نیاز پیش کر دیں۔ اگر آپ چاہیں تو یہ خط شائع کر سکتے ہیں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" حق اپنا مسلک تحریر و تقریر ہے۔

آپ کا
شاہ فضل امام عظیم آبادی

خصوصی مضمون

محترم!

"سیکولر ڈیموکریسی" ملا۔ شکریہ

یوں تو مکمل شمارہ ہی آپ کے اصولوں کا نمونہ ہے لیکن "شیخ عبداللہ سے خصوصی ملاقات" خصوصی مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔ شیخ صاحب نے ہندوستانی سیاست میں شامل ہونے کی وجوہات ظاہر کی ہیں وہ کسی طرح بھی حلق سے نہیں اترتی ہیں۔ ابھی کچھ ہی دن قبل اخباروں نے اس خبر کو خوب اُچھالا تھا کہ شیخ عبداللہ نے وصیت کی ہے کہ "مرنے کے بعد ان کی لاش کو بحرِ عرب میں غرق کر دیا جائے کیونکہ وہ ایسی سرزمین میں دفن ہونا پسند نہیں کرتے جو غلام ہے۔" اگر واقعی یہ الفاظ شیخ صاحب ہی کے ہیں تو کیا کسی ایسے ہندوستانی پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے جو خود کو غلام سمجھتا ہو؟

شیخ صاحب کشمیریوں کے لیڈر تھے۔ وہ کشمیریوں کے لئے کیا کر سکے؟ پہلے ان کا فلسفہ سیاست "علیحدگی پسند" قسم کا تھا۔ برسوں وہ اس مہم میں لگے رہے اور اب ان کا اندازِ فکر یکسر بدل گیا۔ کیا ان سے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ آگے چل کر یہ اندازِ فکر بھی تبدیل نہ ہو گا؟ ایک جگہ وہ فرماتے ہیں کہ "انھیں مہاتما گاندھی کی مثال سے تحریک ملی اور وہ جواہر لال نہرو کے طرزِ فکر سے بھی متاثر ہوئے"۔ جہاں تک مہاتما گاندھی کی تحریک کا سوال ہے تو انھوں نے قوم کے تمام لیڈروں کو پہلے اپنا ہم خیال بنایا۔ اس کے بعد قوم کے قائد کی حیثیت سے تحریک کی ابتدا کی۔ اگر شیخ صاحب مہاتما گاندھی کے نقشِ قدم پر چلنا چاہتے ہیں اور "مسلمانوں کو سیاسی اعتبار سے بلند مقام کرنے کے لئے انھیں ایک پلیٹ فارم پر لانا چاہتے ہیں"۔ تو سب سے پہلے ان کو چاہیئے کہ مسلم لیڈروں سے مل کر ان سے آپسی اختلافات ختم کر کے یکجا کرنے کی کوشش کریں۔ دس کروڑ مسلمانوں کو یکجا کرنے کے مقابلے میں "چند" مسلمانوں کو یکجا کرنا بہت آسان ہے۔ مسلم لیگ، مسلم مجلس، جماعت اسلامی اگر یکجا ہو جائیں تو مسلم عوام بھی آسانی سے یکجا ہو سکتے ہیں۔ اگر شیخ صاحب نے ان جماعتوں کو یکجا کرنے کے بجائے براہ راست مسلم عوام کو یکجا کرنے کی کوشش شروع کی تو نتیجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہ ہو گا ایک جماعت اور پیدا ہو جائے۔ جب بھی کسی قوم کو یکجا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو سب سے پہلے اس قوم کے فرقوں کو متحد کیا جاتا ہے۔ فرقوں کو متحد کئے بغیر کوئی قوم یکجا نہیں کی جا سکتی۔ اِس وقت مسلمان بھی مختلف "سیاسی فرقوں" میں بٹے ہوئے ہیں ان کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کے لئے ان "فرقوں" کو ختم کرنا ضروری ہے۔ اگر شیخ صاحب ڈاکٹر فریدی اور سلیمان سیٹھ وغیرہ سے مل کر ان تمام لیڈروں کو متحد کر سکیں تو ان کا کام نہایت آسان ہو جائے گا۔ اور ان کو بہت سے مددگار بھی مل جائیں گے۔

دوسرے وہ جواہر لال نہرو سے متاثر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ جواہر لال نہرو مرحوم سے انھوں نے ہمیشہ اختلاف کا اظہار کیا ہے اور یہی وجہ تھی کہ نہرو کے دور میں ان کی عمر کا زیادہ حصہ نظر بندی میں گزرا۔

شیخ صاحب کی پرانی زندگی کے بعد ایک دم ہندوستانی سیاست میں قدم رکھنے کے بارے میں، ایک غیر کانگریسی لیڈر نے اپنے تاثرات ان الفاظ میں پیش کئے"..... بیگم اندرا گاندھی یہ اچھی طرح جان گئی ہیں کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کا اعتماد کھو چکی ہیں۔ دوبارہ اقتدار حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ روٹھے ہوئے مسلمانوں کو کسی طرح وقتی طور پر (الیکشن کے لئے) منا لیا جائے۔ اور اس کام کے لئے وہ شیخ عبداللہ کو لائی ہیں"۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ یہ خیال غلط ہے یا درست لیکن اس باب میں قارئین "سیکولر ڈیموکریسی" کے خیالات جاننا چاہتا ہوں۔ اور اگر شیخ صاحب خود اس باب میں کچھ کہہ سکیں تو ہندوستانی مسلمانوں کے ذہن ان کی طرف سے صاف ہو سکتے ہیں اور شیخ صاحب کی آواز پر لبیک کہنے میں ان کو شاید پھر کوئی تامل نہ ہو۔

بصیر نعیمی۔ پیلی بھیت

حکومت کی توجہ

مکرمی و محترمی!

آپ کے اخبار "سیکولر ڈیموکریسی" کے اگست کے شمارہ میں "اتر پردیش میں اردو کی تیز رفتار ترقی" کے عنوان سے اردو کے لئے حکومت کی رعایتیں اور خدمات کا علم ہوا۔ اس سلسلے میں مجھے آپ سے گزارش کرنی ہے کہ آپ ڈگری سطح پر اردو کی تعلیم کی سہولتوں کے سلسلے میں ضلع فیض آباد کی طرف حکومت کی توجہ مبذول کرائیں اور اسے اُن اضلاع کی فہرست میں شامل کروائیں جہاں اردو پڑھانے کے لئے مالی امداد دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ واضح ہو کہ ہمارے شہر فیض آباد میں جو شجاع الدولہ کے دور سے اب تک اردو شعر و ادب کا ایک بہت ہی اہم اور تاریخی مرکز رہا ہے ڈگری سطح پر اردو کی تعلیم کی سہولت حاصل نہیں ہے۔ یہاں ایک ہی ڈگری کالج ہے اور افسوس ہے کہ اس کے تنگ نظر ذمہ دار اردو کے درجات کھولنے کے لئے تیار نہیں ہیں اور ہر سال ۴۰، ۵۰ طلبا اپنے اردو جیسے پسندیدہ مضمون کو بی۔ اے میں چھوڑ کر دیگر مضامین لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔

قمر اعظم۔ بلیا

ماہنامہ

سیکولر ڈیموکریسی

اکتوبر ۱۹۷۳ء

شمارہ ۲۳

شرح

سالانہ دس روپے

ششماہی چھ روپے

قیمت- [redacted]
ایک روپیہ

دفتر کا پتہ
A-19۔ تھیٹر کمیونی کیشن بلڈنگ
کناٹ سرکس۔ نئی دہلی

ٹیلی فون نمبر ۴۳۳۸۳

ہماری گذارش

نفرت کی دوکانیں نہ کرائیے

جَو بوکے کوئی گیہوں نہیں اُگا سکتا، نفرت سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔ یہ ایک سیدھی سادی حقیقت ہے لیکن اس دنیا میں بہت سے لوگ ہیں جو اس حقیقت پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں اس لئے کہ اس کے بغیر ان کا کاروبار چل ہی نہیں سکتا، ان کی دوکان چمک ہی نہیں سکتی ہے۔ نفرت کے یہ سوداگر یک جہتی اتحاد، تنظیم، پیار، اخوت جیسی قدروں پر یقین نہیں رکھتے۔ اصلی دواؤں کے نام پر نقلی زہریلی دواؤں کا کاروبار کرنے والے انسانیت دشمن تاجر چند سکوں اور عارضی عیش کے لئے خود اپنے پیاروں کے رگوں میں زہر اتار دیتے ہیں۔ مذہب، رنگ، نسل، زبان، کلچر، جغرافیائی حالات کے نام پر بنی نوع انسان کے درمیان تقسیم اور تفریق پیدا کرنے والے یہ عیّار لوگ اپنے زہریلے پروپیگنڈے سے معصوم اور بدحال عوام کو گمراہ کرتے ہیں اور اس طرح خود عوام کو تقسیم کر کے اپنا اُلّو سیدھا کرتے ہیں۔

تمام فرقہ پرست جماعتیں یہی کرتی ہیں۔ وہ اس خیال کی ترویج کرتی ہیں کہ ہمیں متحد اور منظم ہو کر دوسرے فرقہ کا مقابلہ کرنا چاہیئے، ہم برتر ہیں، ہم افضل ہیں، دوسرے تمام لوگ ہمارے دشمن ہیں مخالف ہیں ——— حالانکہ یہ عیّار لوگ جانتے ہیں کہ یہ دور قبائلی طرز فکر کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس دور میں ترقی، فلاح، عروج اور سکون وچین حاصل کرنے کے طریقے قبائلی دور کے طریقوں سے مختلف ہیں۔ اب انسانوں کے پاس اتنی قوت اتنی ذہانت، اتنی عقل، اور اتنی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے کہ اگر وہ اب بھی خود کو زندہ رکھنے کے لئے دوسروں کو مارنا ضروری ہے کہ انداز میں سوچتا رہا تو پھر نہ وہ خود زندہ بچے گا اور نہ دوسرا۔ اس لئے آج جیو اور جینے دو کا انداز اپنانے پر دنیا مجبور ہے ——— لیکن انسانیت کے عیار دشمن عوام کو بتاتے ہیں تم الگ ہو، وہ الگ ہیں۔ تم اور وہ ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ وہ تمہارے ساتھ اس لئے زیادتی کرتے ہیں کہ تم مسلمان ہو اور وہ ہندو ہیں۔ اسی طرح ہندوؤں کو بتایا جاتا ہے کہ مسلمان تمہارے اور ملک کے وفادار نہیں ہیں۔ وہ بڑے گھٹیا لوگ ہیں، بڑے ظالم اور گندے ہیں۔ اس پروپیگنڈے کا یہ اثر ہوتا ہے کہ معصوم ذہنوں پر، کچے ذہنوں پر، اقتصادی، تعلیمی، اور معاشرتی طور پر پس ماندہ لوگوں پر اس کا زیادہ اثر ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے شمالی حصے میں نفرت کے یہ سوداگر زیادہ کامیاب ہیں۔

۱۹۴۷ء سے پہلے بھی تمام فرقہ پرست جماعتوں کے پھلنے پھولنے کے لئے یہیں کی زمین سازگار سمجھی جاتی تھی۔ انھیں علاقوں میں شدھی اور تبلیغ کی تحریکیں چلیں، انھیں علاقوں میں فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ چلا، انھیں علاقوں میں ملک کی تقسیم کی تجویز پیش کی گئی اور اس کے لئے قربانیاں دی گئیں۔ حالانکہ ان قربانیوں کا جو نتیجہ نکلا وہ آج ۲۶ برسوں کے بعد اتنا نمایاں ہے کہ ہر شریف آدمی اسے دیکھ کر شرم سے اپنی نگاہیں نیچی کر لیتا ہے۔ اتنا سیاہ، اتنا خوفناک، اتنا المناک ثمرہ اس تقسیم کا ہو سکتا ہے اس کی طرف پہلے بھی لوگوں نے اشارے کئے تھے مگر کون سنتا ہے فغان درویش۔

لیکن اس سے فغان درویش کا کیا ہوا وہ آج بھی روشن ہے، منور ہے، نکہت بیز ہے۔

۲۶ برسوں تک شمالی ہند میں ایک طرف فرقہ پرستی نمایاں طور پر سرگرم رہی۔ لیکن سیکولر اور ترقی پسند قوتیں ان پر چوٹ کرتی رہیں، ان کو کمزور کرتی رہیں، ان کے خاتمے کے لئے کوشش کرتی رہیں۔ اور چوں کہ خود ان کا بھی کوئی مد مقابل نہ تھا اس لئے کمزور ہوتی رہیں، اس لئے کہ اس زہریلے ناگ کے لئے جوابی فرقہ پرستی کا دودھ ضروری ہے اس غذا کے بغیر یہ زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہ سکتی اور اسے ان برسوں میں کوئی مقوی غذا نہیں ملی۔ اس لئے اب قریب المرگ تھی کہ اچانک کچھ ایسے لوگوں کو جو دنیا میں خود کو سر بلند رکھنے کے لئے سب کچھ جائز سمجھتے ہیں، جو پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو پر یقین رکھتے ہیں یہ خیال آیا کہ یہ ناگ مر گیا تو پھر اس سرزمین پر اس کے مفاد کو تقویت پہنچانے والا سب سے آلۂ کار ٹوٹ جائے گا اس لئے اسے زندہ رکھنے کے لئے نفرت کا جوابی فرقہ پرستی کا انجکشن دینا ضروری ہے اور اس طرح اچانک مسلم لیگ شمالی ہند میں نمودار ہوئی۔ اور اس پس ماندہ علاقہ کے بدحال لوگ جو اقتصادی بدحالی، مسلم لیگ کے سیاہ کارناموں اور اس کے لیڈروں کے فریب، مسلسل فسادات، خوف اور احساس کمتری اور دیگر تاریخی و سیاسی اسباب سے پہلے ہی شکستہ حال تھے ان کے لئے مسلم لیگ پھر اپنا جال پھیلا رہی ہے۔ انھیں اتحاد، تنظیم اور اسلام کے خوبصورت نام پر رجعت پرست، فرقہ پرست اور ملک و قوم دشمن عناصر کے ہاتھ مضبوط کر رہی ہے۔ ہندو فرقہ پرستوں کو اس کا موقع فراہم کر رہی ہیں کہ وہ مسلمانوں کے خلاف زہر پھیلائے اس لئے کہ بنگلہ دیش کے ظہور کے بعد ان ہندوؤں کے ذہن میں بھی جو فرقہ پرستی کے مسموم اثرات سے متاثر تھے۔ یہ بات صاف ہونے لگی تھی کہ اصل مسئلہ اقتصادی ہے۔ تمام دنیا کے انسانوں کو بہتر سے بہتر زندگی گزارنے کی خواہش ہوتی ہے اور وہ

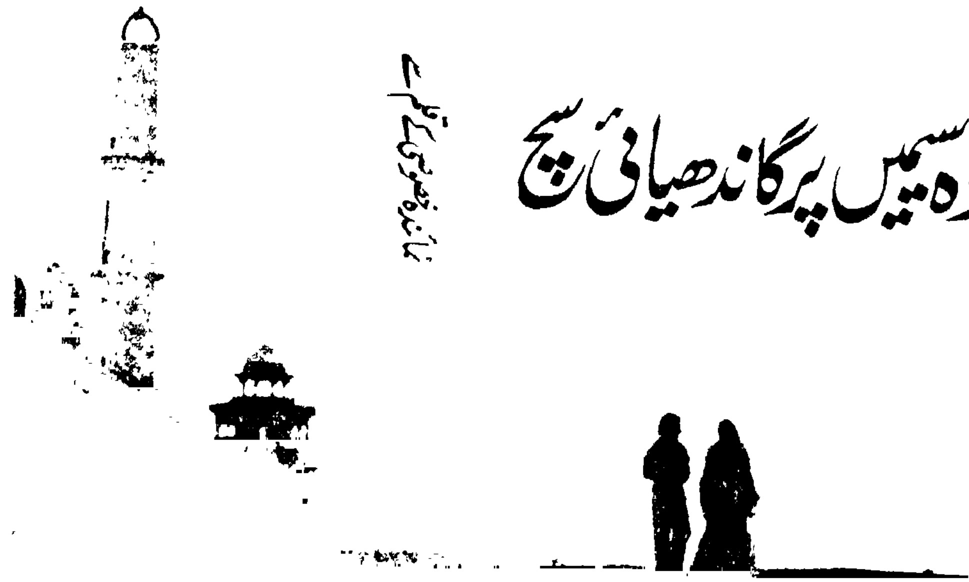
اس کے لئے کوشش کرتا ہے۔ جو لوگ دوسروں کا حصہ خود ہڑپ کر لینا چاہتے ہیں ان کا کھیل یہ ہے کہ مذہب، زبان اور دیگر ناموں پر انسانوں میں تفریق پیدا کی جائے تاکہ وہ لڑیں، ایک دوسرے سے مل جل کر اپنے مخالفین سے، اپنے دشمنوں سے جنگ نہ کریں۔ اور خود یہ نفرت کے بیوپاری رنگ، نسل، ذات، مذہب اور زبان کی پرواہ کئے بغیر ایک دوسرے سے شیر و شکر ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالیں دوسروں کا استحصال کرتے ہیں۔ یہ ایک سیدھی، صاف اور واضح حقیقت ہے اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ شمالی ہند کے ذہین اور تعلیم یافتہ نوجوان بغیر کسی امتیاز مذہب زبان، فرقہ پرست قوتوں سے جنگ آزما ہوں۔ مسلم نوجوانوں، دانشوروں اور سمجھدار لوگوں کو خاص پر مسلم لیگ کے فتنے کا سر کچلنا چاہیئے اور ہندو جوانوں، دانشوروں اور سمجھدار لوگوں کو جن سنگھ اور دیگر ہندو فرقہ پرستوں کو ختم کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اس سلسلے میں ایک دوسرے سے تعاون کرنا چاہیئے۔

غیر مسلم اردو ادیبوں کی کانفرنس

ہندوستان میں جہاں بہت سے خوفناک تماشے ہوئے، جہاں بہت سی غلط باتیں مروج ہوئیں وہیں اس غلط خیال کی بنیاد بھی رکھی گئی کہ زبان کا تعلق مذہب سے ہے اور اس کا سب سے زیادہ نقصان ہوا اردو کو ہوا۔ اردو جو ہند اسلامی کلچر کا بہترین تحفہ ہے۔ صدیوں تک ہندی اور غیر ہندی تہذیبوں کے اتصال اور اتحاد کا شیریں ترثمرہ ہے جسے تعلیم یافتہ مسلم اور ہندو گھرانوں میں عبادت، محبت اور تہذیب کی زبان کی حیثیت حاصل تھی۔ جسے شمالی ہند کے مقبول ترین اور محبوب ترین کا درجہ حاصل تھا۔ جسے آج بھی تلطف و تعشق کی زبان کی حیثیت سے برتا جاتا ہے جو ہندوستانی زبانوں میں پہلی بار کسی یونیورسٹی کا ذریعۂ تعلیم قرار پائی تھی۔ جس کے گیتوں، نغموں اور نعروں سے ہندوستان کا کونا کونا گونجتا رہتا ہے وہی اس نفرت کا نشانہ بنی اور سیاسی جماعتوں اور فرقہ پرستوں نے اسے اپنی ہوس کے لئے قربان کر ڈالنے کی کوشش کی اور وہ لوگ جو اردو سمجھ بھی نہیں سکتے تھے اردو کی محافظت کے مدعی بن گئے۔ اس طرح اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دے دیا گیا۔ حالاں کہ گجرات، تامل ناڈ، مہاراشٹر، بنگال اور دیگر ایسے صوبے جن کی زبان اردو نہیں ہے وہاں کے مسلمانوں کی مادری زبان اردو نہیں تھی اور نہ ہے، مشرقی بنگال میں اردو کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ اس کا روشن ثبوت ہے لیکن فرقہ پرستوں نے اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دیا اور پھر اردو کے خلاف اردو میں ہی محاذ کھول دیا گیا۔ ہندی اور پنجابی کی لڑائی ہندی اور پنجابی سے زیادہ اردو میں لڑی گئی۔ جنگ آزادی کے سورماؤں نے دار و رسن پر اردو کے اشعار پڑھتے وقت کبھی یہ نہیں سوچا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے آریہ سماج نے اپنے عقیدے کے پرچار کے لئے اردو کو ذریعہ بناتے وقت یہ کبھی نہیں سوچا کہ اردو تو صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ گرو نانک مہاراج نے گروبانی کے اظہار کے وقت یہ کبھی نہیں سوچا کہ اردو تو صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ زبانیں تو ہوا، پانی، فطرت اور علم کی طرح سبھوں کا سرمایہ ہوتی ہیں ان کی حفاظت سبھوں کا فرض ہے۔

اور اسی نقطۂ نظر کے تحت اردو کے غیر مسلم ادیبوں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ ایک کانفرنس کریں گے۔ یہ کانفرنس لکھنؤ میں ۱۷، ۱۸، ۱۹ نومبر کو ہونے جا رہی ہے۔ یہ کانفرنس فرقہ پرستوں کے لئے منہ توڑ جواب کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کانفرنس ان کے اس پروپیگنڈے کا سدباب کرے گی کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ یہ عوام پر اس حقیقت کو نمایاں کرے گی کہ اردو کے بہترین ناقدوں کی نمایاں صف میں ہندوؤں کے نام کتنے زیادہ اور کتنے نمایاں ہیں۔ یہ انھیں بتلائے گی کہ محققین میں مالک رام کی کیا حیثیت ہے یہ انھیں بتائے گی کہ افسانہ نگاروں میں کرشن چندر کا قد اور بیدی کا سر کتنا بلند ہے نئے لکھنے والوں میں کتنے قد آور ہندو ادیب ہیں۔ یہ انھیں بتائے گی کہ پنڈت دتاتریا کیفی بابائے اردو عبدالحق سے زیادہ ہی اردو سے محبت کرتے تھے۔ یہ انھیں بتائے گی کہ اردو کے سب سے زیادہ چھپنے والے اخبارات و رسائل کے مالکان میں کتنے ہندو ہیں یہ انھیں بتائے گی کہ اردو کا سب سے بڑا اور پہلا چھاپہ خانہ ایک ہندو نے ہی کھولا تھا۔ یہ انھیں بتائے گی کہ اردو کے لئے بھوک ہڑتال کر کے ایک ہندو ہی نے جام شہادت پی ہے۔ یہ انھیں بتائے گی کہ ہندوستان میں آزادی کے بعد ہندو ہی اردو کے حقیقی محافظ رہے ہیں۔ اس لئے کہ یہ زبان ان کی ہے ان کے ماؤں، بہنوں بچوں اور محبوباؤں کی زبان ہے۔ یہ زبان ان کی زندگی ہے اس لئے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے وہ جھوٹ بولتے ہیں۔

مجھے نہیں معلوم کہ اردو کے غیر مسلم ادیبوں کی کانفرنس کا مقصد کیا ہے لیکن میرے لئے اور ہر اس شخص کے لئے جسے ذرا بھی شعور ہے یہی کافی ہے کہ اردو کے غیر مسلم ادیبوں کی کانفرنس ہو رہی ہے اگر اس کانفرنس نے کانفرنس کے سوا اور کچھ بھی نہیں کیا حالانکہ توقع ہے کہ یہ بہت کچھ کرے گی تو بھی یہ مبارک قدم ہے اور اس کے لئے اس کے بانیوں کو داد ملنی چاہیئے۔



گرم ہوا: پردہ سیمیں پر گاندھیائی سچ

نمائندہ خصوصی کے قلم سے

فلم گرم ہوا کا موضوع کافی دردناک ہے۔ تقسیم ہند کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں پر جو کچھ بیتی ہے یہ فلم اس المناک اور تکلیف دہ صورت حال کی بہترین تصویر کشی کرتی ہے۔ اس کی تعریف کرتے ہوئے سردار جعفری نے ستیو کو لکھا کہ اس موضوع کی تصویر کشی کر کے تم نے اس ہمت کا مظاہرہ کیا ہے جو تم سے پہلے کسی دوسرے سے نہیں ہو سکا تھا شاید یہ پہلی فلم ہے جو ہندوستانی پردۂ فلم پر اس طرح جذبات سے بھرپور دور رس سماجی و قصلوی اثرات پر مبنی دستاویز پیش کرتی ہے۔

یہ ایک سیدھے سادے ایماندار مسلم گھرانے کی فلم ہے۔ اس خاندان کو قیام پاکستان کے تلخ تجربات سے جس طرح دوچار ہونا پڑا ہے وہ وعظ و پند کو تحریک دینے کے کافی مواقع فراہم کرتا ہے۔ ویسے اس فلم میں مبالغہ اور غلط بیانی کے کافی خطرات پوشیدہ ہیں۔

یہ فلم روٹی، نیچا نگر، دھرتی کے لال، ہم لوگ دو بیگھہ زمین اور گرم کوٹ کی یاد تازہ کرتی ہے اور ناظر سنیو کی فلم کے خلوص اور توازن کی تعریف کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

ہر صاحب ضمیر و قلب کے لیے یہ فلم بہت زیادہ متاثر کن ہے۔ اس میں تقسیم ہند کے بعد کی وہ صورت حال نظر آتی ہے جو یہ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ عیار، علیحدگی پسند، سیاست دانوں نے مسلمانوں کو کس کس طرح فریب دیا ہے یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ ہندوستان کی وہ قدریں جن پر ہمیں فخر ہے کس طرح مجروح ہوئی ہیں اور فرقہ پرست سیاست نے انھیں کس درجہ نقصان پہنچایا ہے۔ دین و مذہب سے پرے ہر انسان جسے انسانی صفات عزیز ہیں ان افراد کے خلاف بغاوت اور نفرت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے جو اس صورت حال کے ذمہ دار ہیں۔

بلاشبہ یہ فلم ریاکار لوگوں کے لئے نہیں ہے اے پدمسی تھیٹر ہدایت کار اور ناقد کا یہ تبصرہ بالکل صحیح ہے کہ ریاکار سچائیوں کا سامنا کرنے سے ڈرتے ہیں۔ اسی لئے روزنامہ "مدرلینڈ" نے اس فلم کو قوم مخالف اور پاکستان نواز قرار دیا ہے۔ بدقسمتی سے جن سنگھ کا ترجمان یہ نہیں جانتا کہ پاکستان پر ہندوستان کی برتری فرقہ پرستی پر سیکولرازم کی برتری ہے۔ اسی سیکولرازم سے گاندھی اور نہرو میں یہ اعتماد پیدا ہوا کہ انھوں نے اپنے مقلدین کی کمزوریوں کا جائزہ لینے اور اسے ختم کرنے کی کوشش کی۔

گرم ہوا کو سمجھنے اور محظوظ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ انسان گاندھی جی کی کاوشِ امن اور امن و شانتی کے قیام کے لئے ان کی گفتار و اعمال سے واقف ہو جس کا مظاہرہ انھوں نے نواکھالی سے نئی دہلی تک کیا تھا۔ لیکن آر۔ایس۔ایس، جن سنگھ اور مسلم لیگ کا ذہن گاندھی جی کے راستے پر نہیں چل سکتا۔ دراصل ان فرقہ پرست جماعتوں کا ذہن ہندوستانی اذہان کی نمائندگی کی اہلیت نہیں رکھتا۔

گرم ہوا کا نفس مضمون اس قدر گہرے اثرات کا حامل ہے کہ تبصرہ نگار یا صاحب نظر فلم دیکھنے کے بعد اس کی خصوصیات بھول جاتا ہے اور اس کا ذہن ان انسانی مسائل کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے جو اس فلم کا موضوع ہیں۔ ناظرین کی نظروں میں وہی واقعات گھومتے رہتے ہیں اور وہ اس فلم کے خالق کو بھول جاتا ہے یہ ہدایت کاری کا کمال ہے۔ لیکن اس فلم کے متعلق لکھتے ہوئے ان کے فنکاروں کو تو بہر حال پیش نظر رکھنا ہی ہوگا۔

اس فلم کا سب سے قابل تعریف پہلو اس کی

ہدایت کاری ہے۔ اسی ہدایت کاری نے مرحوم بلراج ساہنی جیسے فنکار کے دوش بدوش دوسرے فنکاروں کو کام کرنے کا تحریک دی۔ یہ فلم اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ یہ اس عظیم ہندوستانی فرزند کی آخری فلم ہے جسے ان کا بلند ترین شاہکار کہنا غیر مناسب نہ ہوگا۔ بلراج ساہنی نے اس فلم میں اپنی روح نچوڑ کر رکھدی ہے۔ فلمی دنیا کے دیگر حساس فنکاروں میں صرف اسد کے بینگل اور جلال آغا کے نام شامل ہیں۔ جلال آغا اس فلم کے ہدایت کار ہیں اور یہ ان کی پہلی فلم ہے۔ ایسی حالت میں یہ فلم "ون مین شو" بن کر رہ سکتی تھی اس لئے بھی اس کے امکانات تھے کہ تمام فلم سلیم مرزا (بلراج ساہنی) کے کردار کے گرد گھومتی ہے لیکن ایسا ہوا نہیں۔ پورے اعتماد و یقین کے ساتھ اس کا ہر کردار اپنے قدموں پر کھڑا معلوم ہوتا ہے۔ اس کا کریڈٹ مکالمہ نگار کیفی اعظمی کو بھی ملتا ہے انھوں نے ایسے مکالمے لکھے ہیں جو ذہن پر گہرے نقوش مرتسم کرتے ہیں اور ہدایت کار تو داد کا مستحق ہے ہی۔

اس فلم کی کامیابی کا راز کیا ہے؟ اس کا پتہ فنکاروں سے گفتگو کے بعد بہ آسانی چل جاتا ہے اس فلم میں فنکاروں نے پوری توجہ اور محنت سے کام کیا ہے۔ اس فلم کی کہانی کا قصہ بھی دلچسپ ہے یہ کوئی تحریری کہانی نہ تھی بلکہ اسے ایک دن یوں ہی عصمت چغتائی نے سنائی اور بات آگے بڑھی فنکاروں کی دلچسپی بھی بڑھتی گئی اور انھوں نے کام شروع کر دیا۔ اس وقت کسی نے یہ نہیں سوچا تھا کہ فلم اس قدر دلدوز ہوگی۔ البتہ ان میں سے کچھ لوگوں کا یہ خیال ضرور تھا کہ یہ فلم متنازعہ ہو سکتی ہے۔ تھری ایم ایم یونٹ کے ہر فنکار نے اسے خالص فنکارانہ نقطۂ نظر سے دیکھا۔

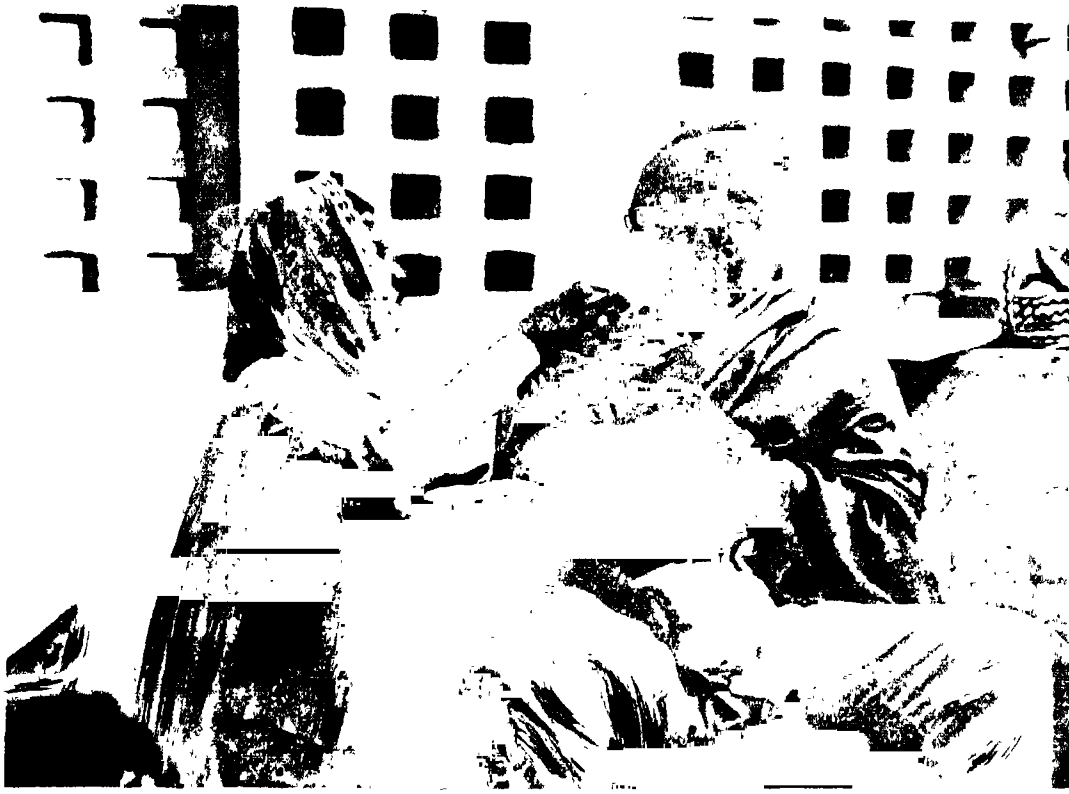
اس رپورٹر نے ستیو، شمع زیدی، اور گیتا وغیرہ فنکاروں سے بات چیت کی ان میں سے کسی نے بھی یہ جاننے کے باوجود کہ فلم کی کافی مخالفت ہوئی ہے اس سے متعلق کسی اختلاف کا مظاہرہ نہیں کیا۔ نہ ہی انھوں نے ان عظیم خیالات کی باتیں کیں جن کے باعث یہ فلم شروع کی گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک نغمہ کی طرح تمام چیزیں ان کی روح میں اتر گئی ہیں۔ اس فلم کی شوٹنگ محض ۴۵ دنوں میں مکمل ہوگئی جو ایک ریکارڈ کی حیثیت رکھتی ہے۔

شمالی ہندوستان کے شہروں میں جو ماحول تھا جب گاندھی جی نے قیام امن اور شانتی کے لئے اپنی زندگی قربان کر دی، اسے نہایت ہی پر اثر لیکن حقیقی رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ سلیم مرزا کا عقیدہ اس شہادت کے اثرات پر کافی متاثر کن ہے لیکن کہانی اس کے گرد گھومتی ہے کہ کس قدر بدامنی، اضطراب اور تلخی اب بھی باقی ہے۔ دانشورانہ چابکدستی نے مصنف کو جذباتی الجھنوں کو فلم میں آنے سے روک دیا ہے گاندھی جی کے بعد جو کچھ ہوا اسے بھی بہت ہی خوبی سے فلمایا گیا ہے۔ یہ ثر ولیدگی قومی جدوجہد کو متاثر کرتی ہے جو فرقہ واریت اور دیگر برائیوں کے خلاف کی گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ فرقہ واریت بار بار اپنا سر ابھارتی ہے۔

ملک کی تقسیم صرف زمین کا بٹوارہ نہ تھی ہندو پاک میں بٹ گیا بلکہ اس نے عوام کے دلوں کے درمیان ایک گہری لکیر کھینچ دی۔ وہ خاندان جو صدیوں سے پہلے ایک دوسرے کے دوست تھے دشمن اور مخالف بن گئے۔ اس کو نہایت ہی خوبی سے فلم میں



جمیلہ اور سلمیٰ کاظم کی جدائی سے غمگین آمنہ کو تسلی دیتے ہوئے۔



آمنہ اور سلیم مرزا صرف باپ بیٹی ہی نہیں بلکہ ایک دوسرے کے شریک غم و مسرت بھی ہیں
سلیم مرزا بیٹی کے ہاتھوں سے چائے کا پیالہ لیتے ہوئے

دکھایا گیا ہے جب سلیم مرزا سیٹھ پونم چند سے قرض مانگتا ہے تو وہ جواب میں کہتا ہے "مرزا جی میں نے آپ کی آدھی رات میں بھی سیوا کی ہے اور بغیر کسی لکھا پڑھی کے، مگر اب ہمارے بھائی روکتے ہیں اگر میں آپ کو کچھ دے دوں تو ہمارے خاندان میں جھگڑا ہو جائے گا"۔ سلیم صورت حال کو سمجھتا ہے اور یہ کہتے ہوئے چلنے لگتا ہے کہ "نہیں نہیں! میری وجہ سے خاندان میں لڑائی نہیں ہونی چاہیئے۔ میرے حساب کی وجہ سے تو کم از کم یہ ہونا ہی نہیں چاہیئے۔"

سلیم مرزا ایک معمر تاجر ہے جس کے یہاں پشتہا پشت سے جوتہ سازی کا کاروبار ہوتا تھا۔ شمالی ہند میں تقسیم سے پہلے چمڑے کا کاروبار روایتی طور پر مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھا اس لئے کہ ہندوؤں کو مذہبی بنا پر کاروبار سے عار تھا۔

تقسیم ہند کا سانحہ ہوا، اور چمڑے کی تجارت ماند پڑ گئی۔ سلیم کے بہت سے ہم پیشہ حضرات نے ترک وطن کر دیا۔ یہاں تک کہ اس کا بڑا بھائی حلیم مرزا (دینا ناتھ زتسی) جو مسلم لیگ کا ایک چھوٹا سا لیڈر تھا وہ بھی پاکستان چلا گیا۔ وہ اپنے تمام خاندان کو بھی پاکستان لے جانا چاہتا تھا لیکن سلیم نے اسے پسند نہیں کیا۔ اس کا خیال تھا کہ یہاں کوئی خاص خطرہ نہیں ہے اور تجارت بھی ڈھنگ سے چل رہی ہے۔ اس کے علاوہ اس کی بوڑھی ماں بھی اپنی سسرال اور اپنے آباؤ اجداد کا گھر چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوئی۔

حلیم مرزا انھیں مطمئن نہ کر سکا اور مایوس ہو کر اپنے بیوی اور بیٹے کاظم سمیت سرحد کے پار چلا گیا۔ بات یہ طے ہوئی کہ جیسے ہی کاظم کو کوئی اچھی نوکری ملے گی حلیم کی بیوی اسے لے کر آگرہ آجائے گی۔ کاظم (جمال ہاشمی) جس نے بڑی مشکلوں سے بی۔اے پاس کر لیا تھا اس کی منگنی سلیم کی لڑکی آمنہ (گیتا) سے طے ہو چکی تھی۔ لیکن نہ تو کاظم ہی واپس آیا اور نہ ہی اس کی ماں۔ انھوں نے پاکستانی شہریت اختیار کر لی۔

ان کا جدی مکان حلیم کے نام تھا اس لئے اسے مہاجروں کی جائیداد قرار دے کر ایک شرنارتھی تاجر اجمانی (اے۔ کے۔ ہنگل) نے اس کے حصول کی درخواست کی اور سلیم مرزا اور اس کے خاندان کو نزدیک کے دوسرے چھوٹے مکان میں منتقل ہونا پڑا۔

کچھ دنوں کے بعد کاظم مرزا کو پانچ برسوں کے لئے کناڈا کا اسکالرشپ مل گیا۔ کناڈا جانے سے پہلے وہ آمنہ کو دیکھنے کے لئے اس قدر بے قرار تھا کہ وہ سرحد پار کر کے آگرہ آگیا۔ آمنہ کی ماں نے اسے ایک سنہرا موقع سمجھا اور شادی کی تیاریاں زور شور سے شروع کر دیں۔

اسی دوران سلیم کی خاندانی تجارت مندی ہو گئی اس لئے کہ حلیم مرزا ہجرت کر گیا تھا۔ بینکوں کو یہ شک تھا کہ سلیم مرزا بھی ان کی رقم لے کر پاکستان بھاگ سکتا ہے۔ اس لئے انھوں نے قرض دینے سے انکار کر دیا۔ اس کے علاوہ سندھیوں اور پنجابیوں نے چمڑے کی تجارت پر قبضہ کر لیا۔ مرزا سلیم بزدل بھی تھا اور ایک ایسے زمانے کا فرد معلوم ہوتا تھا جو گزر چکا تھا۔ اپنے تجارتی رقیبوں سے مقابلہ کرنے کو وہ



کسی حالت میں تیار نہ تھا اس لئے اس کی مالی حالت دن بدن گرتی چلی گئی۔

آگرہ شو مینو فیکچرس ایسوسی ایشن نے محسوس کیا کہ آگرہ کو برآمد شدہ چمڑے کا حسب ضرورت کوٹا نہیں مل رہا ہے اس لئے اس نے یک روزہ ہڑتال کا فیصلہ کیا۔ سلیم اور اس کے لڑکے باقر نے ان سے تعاون نہیں کیا۔ جب ہڑتال کامیاب ہو گئی تو انھوں نے آگرے کو ملنے والے کوٹے سے اپنا حصہ لینا چاہا لیکن انھیں ان کا حصہ دینے سے ایسوسی ایشن نے انکار کر دیا اس لئے کہ انھوں نے ہڑتال میں حصہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ باقر سوچنے لگا کہ ..... ان کے ساتھ یہ اس لئے ہو رہا ہے کہ وہ مسلمان ہیں اور ایسوسی ایشن کی اکثریت ہندوؤں پر مشتمل ہے۔ بہر حال وہ اپنے خاندانی تجارت سے غیر مطمئن تھا۔ یہ ہڑتال اور اس کا نتیجہ اسے یہ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا کہ اسے بھی اپنے چچا کے نقش قدم پر چل کر پاکستان چلا جانا چاہیئے۔

سلیم کے رشتہ داروں میں، اس کے بہنوئی فخر الدین (یونس پرویز) کو بھی ملک چھوڑنا پڑا۔ لیکن اس کا سبب کچھ اور تھا۔ اس نے ضرورت سے زیادہ سامان منگوانا شروع کر دیا تھا اور اس کو سنبھال نہیں پا رہا تھا۔ ایک بار اس نے سلیم کو بھی اندر ہی اندر نقصان پہنچانے کی کوشش کی تھی لیکن آخرکار اسے بھی پاکستان بھاگنا پڑا اس لئے کہ اس نے اپنے ایک گاہک کو کافی تعداد میں خراب مال سپلائی کر دیا۔ گاہک نے اسے عدالت میں جانے کی دھمکی دی اور کہا کہ اسے پوری رقم جو اس نے پیشگی دی ہے لوٹا دی جائے۔ فخر الدین کے بس سے یہ بات باہر تھی وہ اپنے قرض خواہ سے تنگ آکر بھاگ نکلا۔ اس کا بیٹا شمشاد جس کی منسوب آمنہ سے طے ہو چکی تھی اسے بھی اپنے والد کے ساتھ پاکستان چلا جانا پڑا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ آمنہ سے شادی کرنے کے لئے واپس آئے گا اور اسے بھی اپنے ساتھ لے جائے گا۔

فخر الدین اور اس کے خاندان کی پاکستان روانگی سے چند ہی دنوں پہلے سلیم کی ماں (بدر بیگم) فوت ہو چکی تھی مرتے وقت اس نے خواہش کی کہ اسے اس کی سسرال میں لے جایا جائے۔ اجانی نے خوشی کے ساتھ اس کی اجازت دے دی اور وہ اپنی حویلی میں سکون کے ساتھ موت کی وادی میں چلی گئی۔

سلیم مرزا کی تجارت روز بروز گرتی جا رہی تھی وہ باقر کی مدد کے بغیر تجارت سنبھال نہیں سکتا تھا۔ اس کا دوسرا لڑکا سکندر بی۔ اے کے آخری سال میں تھا لیکن اسے اپنے خاندانی پیشہ سے کوئی دلچسپی نہ تھی وہ کسی فرم میں کام کرنا چاہتا تھا۔

ایک دن معمول کے مطابق سلیم مرزا اپنے کارخانے جا رہا تھا کہ اس کے تانگے کی ایک ٹھیلے سے ٹکر ہو گئی۔ ٹھیلے والا زخمی ہو گیا اور اس کا سامان برباد ہو گیا۔ تانگہ ڈرائیور اور ٹھیلے والے میں جھڑپ ہو گئی اور فوراً ہی ایک مجمع اکٹھا ہو گیا۔ چونکہ فریقین کا تعلق دو فرقوں سے تھا اس لئے افواہوں اور پروپیگنڈے نے اسے فرقہ وارانہ رنگ دے دیا اور اس طرح ایک فساد پھوٹ پڑا اور سلیم مرزا کی دوکان میں بھی آگ لگا دی گئی۔





مرزا کو گھر لایا گیا اور اس کے سر کی مرہم پٹی کی گئی۔ لیکن معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوا کسی نے یہ افواہ اڑا دی کہ مرزا ہی فساد کا محرک ہے مرزا کو پولیس اسٹیشن تفتیش کے لئے لایا گیا۔ لیکن اس کوئی الزام ثابت نہ ہو سکا اور اسے چھوڑ دیا گیا۔

اس تمام عرصہ میں آمنہ کو شمشاد کی کوئی خبر نہیں ملی۔ پھر اچانک ایک دن پاکستان سے شمشاد کی ماں پہنچ گئی۔ اس کی آمد کا مقصد لڑکی اور بہو کے لئے جہیز کا سامان خریدنا تھا۔ آمنہ کو اس آمد سے بڑی مسرت ہوئی۔ اس نے نہایت ہی گرم جوشی سے جہیز کے سامان کی خریداری میں حصہ لیا۔ لیکن جب آمنہ کی ماں نے شمشاد کی ماں سے شادی کی تاریخ طے کرنے کو کہا تو اس نے نہایت رکھائی سے جواب دیا کہ اس کے بیٹے کی شادی تو پاکستان میں ہی ہو رہی ہے اس لئے آمنہ سے شادی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں

ہوتا۔ جب آمنہ کی ماں نے دریافت کیا کہ آخر پہلے انھوں نے کیوں بات کی اور اب اسے کن اسباب سے ختم کر دیا؟ تو اس نے کہا کہ شمشاد کی بہن کی جس جگہ منسوب ہوئی ہے وہاں لڑکے کے والدین کی شرط یہ ہے کہ یہ شادی اس وقت ہو سکتی ہے جب شمشاد لڑکے کی بہن سے شادی کرے۔

شمشاد کی شادی کی یہ جانکاہ خبر آمنہ کے لئے ناقابل برداشت تھی اور وہ صدمہ کی تاب نہ لاکر چل بسی۔

مسلسل حادثات سے سلیم مرزا چور چور ہو گیا۔ پھر بھی جب اس کی بیوی نے کہا کہ اس ملک میں ان کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے اور انھیں بھی پاکستان چلنا چاہیئے تو سلیم نے انکار کر دیا۔

البتہ اس کا چھوٹا لڑکا سکندر (فاروق شیخ) نے پاکستان جانے کے متعلق سوچ رہا تھا اس لئے کہ اس نے بی۔ اے کر لیا تھا اور بہت دنوں تک نوکری کی تلاش کے باوجود کہیں ملازمت نہیں ملی تھی۔ پھر بھی اس نے ملک چھوڑنے کا حتمی فیصلہ نہیں کیا تھا لیکن ایک دن پانی سر سے اونچا ہو گیا ہوا یہ کہ اسے شومار کیٹ میں ہی پاکستانی جاسوس قرار دے کر پکڑ لیا گیا اور اس پر کسی تاجر نے کوئی توجہ نہیں دی۔ سکندر نے اس واقعہ کے بعد پاکستان جانے کا قطعی فیصلہ کر لیا اور تانگے پر سامان لدوا کر اسٹیشن کی طرف روانہ ہوا۔ راستہ میں مظاہرین کے ایک جلوس کی وجہ سے اسے رک جانا پڑا۔ مظاہرین کے ہاتھوں میں گتے کی تختیاں تھیں جن پر روزگار روٹی اور بہتر تعلیم کے مطالبات درج تھے۔ سکندر کو تانگے پر لدا پھندا دیکھ کر کسی نے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے سکندر نے اسے جواب دینے کے بجائے اپنے والد سے کہا کہ اب اس نے پاکستان جانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے اور پھر وہ جلوس میں شامل ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک سلیم مرزا مظاہرین کو گزرتے دیکھتا رہا پھر اس نے بھی اس میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

لوگوں میں اور خاص طور پر متوسط طبقے میں اپنی خامیاں پوشیدہ رکھنے اور سماجی برائیوں پر پردہ ڈالنے ...... کا رجحان پایا جاتا ہے۔ اسی لئے کچھ لوگ چھوا چھوت کی خامی کو محسوس نہیں کرتے۔ شوہر اپنے گھر پر بیوی کی پٹائی کرتا ہے اور اپنے دوستوں سے کہتا ہے کہ اس کا یہی حشر ہونا چاہیئے لیکن اس کا کھلے عام اعتراف نہیں کرتا۔ اس طرح کچھ لوگ اس حقیقت کا سامنا کرنے کی جرأت نہیں رکھتے جن سے مسلمان دوچار ہیں اور یہ بھی سننا نہیں چاہتے کہ تقسیم کے بعد ان کے لئے بلاؤں کے دروازے کھل گئے ہیں اگرچہ ان کی بہت سی مشکلات دور کر دی گئی ہیں، لیکن وہ نفسیاتی دیواریں، جو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ابھر گئی ہیں اسے ابھی توڑنا باقی ہے اور اس کی راہ میں مسلمانوں کی چند نا اہلیتیں بھی رکاوٹ بنی ہوئی ہیں۔

جب گاندھی جی نے ان رکاوٹوں کے کھڑی کئے خلاف آواز اٹھائی اور امن و شانتی قائم کرنے اور انسانی اچھائیوں کو عام کرنے کی وکالت کی تو انھیں ان لوگوں نے گالیاں دیں جو سیاسی طور پر مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان خلیج میں اپنا مفاد دیکھتے تھے۔ گاندھی جی کو مسلم نواز اور پاکستان



بے روزگار نوجوانوں کے ساتھ سکندر مرزا۔ نوکری نہ ملنے کے باوجود وہ اسی ملک میں رہنا چاہتا ہے



سلیم مرزا کی اس عظیم الشان حویلی پر حلیم مرزا کے پاکستان جانے کے دباؤ کے باعث اجنبی کا قبضہ ہوگیا۔

حمایتی قرار دیا گیا اور جس شخص نے انھیں گولی کا نشانہ بنایا وہ ذہنی طور پر اس پروپیگنڈے سے مطمئن تھا۔ اسی طرح کی آوازیں 'گرم ہوا' کے خلاف بھی اٹھائی جارہی ہیں۔ اسے قوم مخالف اور پاکستان نواز کہا جارہا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ آپ مسلمانوں کی دشواریوں کے متعلق بولتے ہیں لیکن پاکستان کے ہندوؤں کے متعلق کچھ نہیں کہتے۔ ان کی پریشانیوں کے خلاف کوئی کیوں نہیں آواز اٹھاتا؟ جو لوگ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں انھیں یہ معلوم نہیں ہے کہ ہم ہندوستانی اس لئے غلطیاں نہیں کرسکتے کہ پاکستان غلطیاں کرتا ہے۔ یہ تو چہرہ بچانے کے لئے ناک کاٹ لینے کی بیوقوفی کے مترادف ہوگا۔ جس کو بھی تاریخ کا ذرہ بھر شعور ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ چوتھائی صدی گزرنے کے بعد ہندوستان پاکستان سے زیادہ مضبوط اور مستحکم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان نے فرقہ پرستی سے اوپر اٹھ کر کام کیا ہے۔ اور ہم یہ اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ حقائق کا سامنا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں جہاں تک، دنیا میں امیج بنائے رکھنے کا سوال ہے درست سچائیوں پر مبنی حقیقت زیادہ داد حاصل کرتی ہے اور اس کا اثر بھی دیرپا ہوتا ہے۔ بنگلہ دیش کے معاملہ میں پاکستان نے حقائق کو چھپانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا ہندوستان کو بدنام کرنے کی کوشش کی لیکن کیا پاکستان کو کامیابی حاصل ہوئی؟ جب ہندوستان کے باہر لوگ 'گرم ہوا' دیکھیں گے اور انھیں معلوم ہوگا کہ یہ فلم ہندوستانیوں نے بنائی ہے (اور وہ بھی ایک آنکھ برہمن۔ نے) اور حکومت ہند کے ایک امدادی ادارے (فلم فی نانس کارپوریشن آف انڈیا) کے تعاون سے بنائی ہے اور حکومت ہند کے فلم سنسر بورڈ نے اسے تمام دنیا میں نمائش کی اجازت دی ہے تو انھیں پاکستان کا ہندوستانی مسلمانوں کے متعلق جو رویہ ہے اور ہندوستانی حکومت اور معاشرہ ان کے متعلق کس طرح سوچتا ہے اس کا بخوبی علم ہو جائے گا۔ کچھ لوگ پاکستان کے رویہ کو اختیار کرنا چاہتے ہیں اور ہندوستان کے حقیقت پسندانہ رجحان کے باوجود وہ رجحان جس کا اس فلم میں مظاہرہ ہوا ہے اپناتے ہیں یہ لوگ قوم کی خدمت نہیں کر رہے ہیں۔

یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ فلم ان تلخ یادوں کو پھر تازہ کر رہا ہے جو عہد رفتہ کا قصۂ پارینہ بن چکے ہیں۔ اب حالات میں کافی تبدیلیاں آگئی ہیں اور اس کا باعث پارلیمانی ڈیموکریسی کا عمل ہے یہ ڈیموکریسی بالغ اور مشترکہ رائے دہندگی کی بنیاد پر قائم ہے لیکن نفسیاتی رکاوٹیں جو اس وقت پیدا کی گئی تھیں اب بھی قومی یکجہتی کے لئے سد راہ بنی ہوئی ہیں۔

ایک مسلم نوجوان جس نے ان تجربات کا مشاہدہ نہیں کیا وہ اس ذہنی فاصلہ کو سمجھ نہیں سکتا جو ان کے اسکول کے ہندو ساتھی، کارخانے کے ہندو ہم پیشہ اور ان کے درمیان ہے۔ اس طرح ایک پرانے زمانے کا ہندو بھی اسے بمشکل سے ہی پسند کرسکتا ہے وہ ہمدردانہ طور پر سمجھتا ہے کہ یہ تنہائی پسندی اور خوف کیوں ہے اور یہ باہمی تفریق سیکڑوں غلط فہمیاں پیدا کرتی ہے اور یہ وقتاً فوقتاً کراہیت آمیز موڑ تی رہتی ہے۔

ایک متوازن عام صحت مند فرد کی حیثیت سے کوئی بھی اپنے جسمانی عضوبات سے انکار نہیں کرسکتا ایک صحت مند، پر اعتماد اور ترقی پسند معاشرہ وقتاً فوقتاً اپنی نفسیات کا جائزہ لینا پسند کرتا ہے۔ اس سے اپنی صفائی کا موقع ملتا ہے۔ 'گرم ہوا' ہمیں اپنے معاشرے کے جائزے اور ان کی خامیوں کو دور کرنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ کوئی بھی شخص خواہ وہ ہندو

ہو خواہ مسلمان یہ نہیں چاہے گا کہ سلیم مرزا، آمنہ، سکندر اور بوڑھی دادی اماں کو ان دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے جس کا سامنا انھوں نے کیا۔ اور اگر وہ نہیں غیر ضروری مصائب سے بچایا جاسکا تو اب کوئی دوسری مسلم لیگ نہ پیدا ہوگی اور نہ پاکستان کا مطالبہ ہوگا کوئی دوسرا حلیم مرزا نہ ہوگا اور نہ فخرالدین جو اپنے خاندان کو اجاڑنے کا باعث بن سکے

ہندوستانی مسلمانوں کے مصائب کا ایک اہم سبب تقسیم ہند ہے۔

تقسیم کے جہنم سے گرم ہوا آئی اور اس نے کتنے ہی سر سبز و شاداب درختوں اور پودوں کو جھلس کر راکھ کر دیا۔ صرف ایک ایسا تانگہ والا ہی اس سے محفوظ ہو سکتا ہے جس کے دماغ میں عقل نہیں ہے اور وہ بھی اس لئے کہ اسے اب زیادہ رقم حاصل ہوگی یہ بہت ہی قابل غور ہے کہ وہ پاکستان جانے کے متعلق سوچتا بھی نہیں ہے گریہ وہ دوسروں سے کہتا ہے "جب خدا نے پاکستان بنا دیا ہے کوئی یہاں کتوں کی موت کیوں مرے؟" اس کے فرضی جنت کا تصور اس وقت واضح ہو جاتا ہے جب وہ کہتا ہے کہ "پاکستان میں صرف اونٹ اور بیل گاڑیاں ہوں گی اور اسکا آبائی پیشہ گھوڑا گاڑی چلانا ہے



آمنہ اداسی کی تصویر

وہ دشواریاں جو حلیم مرزا کی وجہ سے پیدا ہوئیں جو اس کا مدعی تھا کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے زمین پر نائب خدا کا درجہ رکھتا ہے اور پھر وہ پاکستان بھاگ گیا اور اس کے متعلق ذرا بھی نہیں سوچا کہ ان لوگوں پر کیا گزرے گی جن کو وہ اپنے پیچھے چھوڑ جا رہا ہے۔ یہی فرار ہے جس نے سلیم مرزا کو مجبور کیا اور اس کی بوڑھی ماں کو اس کے سسرالی مکان سے جدا کیا اور آمنہ کو جذباتی دھچکا لگا جب کاظم اسے چھوڑ کر پاکستان چلا گیا۔

فخرالدین ایک انتہائی شاطر اور مکار شخص ہے۔ وہ اپنے فرقہ وارانہ جرائم کو چھپانے کے لئے اپنے جسم پر کانگریس کا لبادہ چڑھا لیتا ہے اور گرفت میں آنے تک غیر قانونی دھندہ چلانے کی کوشش کرتا ہے اسی کی وجہ سے مسلمانوں کی ساکھ خراب ہوتی ہے اور انھیں قرض ملنا مشکل ہو جاتا ہے لوگ ان کا دیا ہوا قرض مار لیتے ہیں۔

ایک دن وہ بھی تھا جب وہ اور اس کی بیوی سلیم مرزا اور جمیلہ سے ان کی لڑکی آمنہ کا ہاتھ اپنے لڑکے شمشاد کے لئے مانگا کرتے تھے لیکن جب وہ پاکستان پہنچ گئے تو نہ صرف اپنا ماضی ہی فراموش کر بیٹھے بلکہ ساری قدروں کو بھی طاق میں رکھ دیا۔ یہاں تک کہ اپنے لڑکے شمشاد کی شادی بھی دوسری جگہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اختر جو اپنے بھائی کے بچے کی طرف سے سنگدلی کی حد تک لاپرواہ ہے، کون اس کی ستائش کرے یہ باتیں پاکستان مخالف نہیں ہیں، لیکن ان کی روشنی میں ان لوگوں کے چہرے ضرور دیکھے جاسکتے ہیں، جنھوں نے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا اور جن کے لئے وہ کسی بہشت سے کم نہ تھا۔ یہ کہنا بعید از حقیقت نہیں ہوگا کہ ایسے ہی لوگ پاکستان کے مقدر کا المیہ تھے۔ جو لوگ آمنہ کے المیہ کے ذمہ دار ہیں وہ بھی اسی طرح مکار اور خود غرض ہیں حالانکہ وہ مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں مگر پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔

تمام مسلمان برے نہیں ہوتے سلیم مرزا اس کی ماں، آمنہ اور سکندر بھی مسلمان ہیں۔ ان میں سے دو بٹوارے کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ بقیہ دو پاکستان جانے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اسی طرح تمام ہندو بھی برے نہیں ہوتے۔ اجمانی سیٹھ بھی ایک ہندو ہے جو سلیم مرزا کو اپنی مدد کی پیش کش کرتا ہے جب اس کی فیکٹری جل کر تباہ ہو جاتی ہے ——

سب سے اہم حصہ نوجوانوں کا رویہ ہے۔ پرانے لوگوں کی طرح جن میں بیشتر فرقہ وارانہ احساسات سے الگ ہیں۔ وہ بے روزگاری میں بھی ایک دوسرے کے دکھ درد کو چائے کی طرح بانٹ لیتے ہیں۔ ان میں سے ایک جب سکندر پر طنز کرتا ہے کہ وہ پاکستان جا کر کوئی روزگار کیوں نہیں حاصل کر لیتا، تو دوسرا اس کی مزاحمت کرتے ہوئے سخت لہجے میں کہتا ہے کہ تلاش روزگار کے لئے دوسرے بھی غیر ممالک کو جاسکتے ہیں۔ یہ تمام نوجوان فرقہ وارانہ نکتہ چینیوں کے مخالف ہیں۔ اپنی دال روٹی کے لئے جدوجہد کرتے ہیں۔ اپنے مشترکہ مسائل کے حل کے لئے اجتماعی کوششیں کرتے ہیں۔ سلیم مرزا جس نے بڑے بڑے نقصانات اٹھائے ہیں۔ وہ سوچتا ہے کہ ان پریشانیوں سے اسے نجات مل سکتی ہے، لیکن دوسرے حقائق جب سامنے آتے ہیں تو اسے سینے میں دم گھٹتا محسوس ہوتا ہے۔

یہ بات کسی بے ترتیب دماغ میں ہی پیدا ہو سکتی ہے کہ یہ خوبصورت، متاثر کن اور نفیس محسوسات پر مبنی کہانی فرقہ وارانہ رجحان کی ترجمانی کرتی ہے۔ یہ کہانی دراصل گاندھی جی کے پیغام کو گاندھی جی کے انداز میں پیش کرتی ہے ہندوستانی عوام یقیناً گوڈسے کے وارثوں کی باتوں میں نہیں آئیں گے۔

جنگی قیدیوں نے سنتے پر دھلی میں جو سمجھوتہ ہوا اس سے پاکستان کے لاکھوں گھروں میں گھی کے چراغ جل اٹھے۔ ایک بار پھر اس بات کا ثبوت مل گیا کہ ھندوستان پاکستان کے تئیں دوستی اور مصالحت کا رویہ رکھتا ھے۔ یہ پالیسی ھی نہیں بنیادی اصول ھے جس کا اظہار ۱۷ دسمبر ۱۹۷۱ء میں یکطرفہ جنگ بندی سے ہوا۔ ۱۹۷۲ء میں شملہ معاھدہ اس کا آئینہ دار تھا اور ۱۹۷۳ء کا دھلی معاھدہ اس کی تصدیق کرتا ھے۔

پاکستان کی سیاست اور پاکستانی حکمرانوں کی سیاسی روایت کا یہ عجیب و غریب المیہ ھے کہ وہ ھندوستان کو اس صورت میں سمجھنے سے قاصر رہتے ھیں۔ اسی لئے صدر بھٹو یا تو ان معاھدوں کو اپنی چالاکی اور ھندوستانی سربراھوں کا بدھو پن قرار دیتے ھیں یا اپنی سو بدل کر اس ملک کے خلاف زھر پاشی شروع کر دیتے ھیں۔ یہ بات تو غالباً ان کی سمجھ میں آ چکی ھے کہ جنگجویانہ تقابل سے پاکستان کو کچھ حاصل نہیں ہو سکتا لیکن مصالحت دوستی صلح اور رواداری کے آداب سیکھنا ابھی باقی ھے۔ سیکولر سیاست کی خوبیاں ابھی ان کے ذھن میں نہیں آئیں۔ پاکستانیوں کی ذھنی نشو و نما ان کے خیال کے مطابق ابھی قبائلی درجہ ارتقا سے آگے نہیں بڑھی۔ اسی لئے وہ ھتھیاروں کی دوڑ کو اقتصادی ترقی سے زیادہ اھمیت دیتے ھیں۔

اچھا ہو اگر پاکستان کے ارباب اقتدار اپنے عوام کے احساسات و جذبات کا صحیح اندازہ کر لیں۔ اس مضمون میں شامل اقتباسات اس بات کی عکاسی کرتے ھیں کہ پاکستان کے عوام ھندوستان کے موقف کو اپنے حکمرانوں سے بہتر سمجھتے ھیں اور غریبی و جہالت کے خلاف لڑائی میں ھندوستانی عوام کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑا ہونا چاہتے ھیں۔ دیکھنا یہ ھے کہ عوام پاکستان کی سیاست پر کس حد تک اثر انداز ہو سکتے ھیں۔

دہلی سمجھوتہ اور پاکستان

ہمارے سیاسی مبصر کے قلم سے

دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ نے برصغیر کے جن انسانی مسائل کو جنم دیا تھا انھیں حل کرنے کے لئے ہند اور پاکستان بالآخر سمجھوتے کی منزل تک پہنچے۔ اور نئی دہلی میں ہوئے اس سمجھوتے کے تین ہفتے بعد اس پر عمل درآمد کا سلسلہ شروع بھی ہو گیا۔ ستمبر کے آخر تک بنگلہ دیش سے ۲۰۰۰ پاکستانی، پاکستان سے ۲۰۰ بنگالی اور ہند سے ۱۶۸۰ جنگی قیدی اور شہری اپنے اپنے وطن لوٹ جائیں گے۔ جس تیز رفتاری سے اس تبادلے کے انتظامات مکمل کئے گئے ہیں وہ ہندوستانی خلوص کا آئینہ دار ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ تبادلے کے تمام مرحلے طے ہونے تک خاصا وقت لگ جائے گا لیکن یہ بات بھی کم باعث اطمینان نہیں کہ سمجھوتہ پر عمل درآمد کا آغاز بلا تاخیر ہو گیا۔

یہ الگ بات ہے کہ حکومت پاکستان نے حسب عادت اسے بھی تاخیر کا نام دے کر ہندوستان کو الزام دینے کی راہیں تلاش کرنا شروع کر دی ہیں۔ بدقسمتی سے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں وزیراعظم بھٹو نے بھی شملہ سمجھوتہ اور دہلی سمجھوتہ کے عہد و پیمان فراموش کر کے پرانے گلے شکووں کی طویل داستان چھیڑنے کی سعی کی۔

دہلی سمجھوتہ ایک لحاظ سے شملہ سمجھوتہ سے بھی زیادہ اہم ہے۔ شملہ میں مصالحت کے لئے اصول طے کئے گئے تھے۔ نئی دہلی میں بات چیت کے طویل دور کے بعد انسانی دلوں اور اُداس گھروں میں آس کے اجالے بھرنے کی کوشش کی گئی۔ ۲۱-۲۰ ماہ جو درد و دلدار ترستے رہے انھیں ۲۹ اگست کی شام نے خوشی کے چراغ بخشے۔ "تو رحم سے کراچی تک لاکھوں گھر اداسیوں کی زد سے نکل آئے۔ سمجھوتہ کی خبر ملتے ہی جنگی قیدیوں کے لواحقین کی بے تابیوں کا یہ عالم تھا کہ اپنے عزیزوں کی مزید ایک دن کی جدائی بھی اب گوارا نہ تھی۔ گلی گلی یہ کہا جا رہا تھا کہ ہمارے نوے ہزار جنگی قیدی لوٹ آئیں گے اور خدا نے چاہا تو ۱۹۵ قیدی بھی جلد لوٹ آئیں گے کسی نے یہ بھی کہا کہ دہلی سمجھوتہ پاکستانی ڈپلومیسی کی شاندار فتح ہے۔ ایک مورخ کی نظر میں یہ سمجھوتہ اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ ویٹ نام امن سمجھوتہ۔ اس سمجھوتے کے طفیل پاکستان، ہند اور بنگلہ دیش کے لاکھوں لوگوں کی زندگیوں سے بھوک اور غریبی کے اندھیرے چھٹنے لگیں گے۔ یہ ایک ماہر اقتصادیات کا قیاس ہے۔ لاہور میں تو ۱۹۵ قیدیوں کے بارے میں بھی اطمینان کا اظہار کیا گیا ہے جن پر بنگلہ دیش انسانیت کے خلاف جرائم کی بنا پر مقدمے چلانا چاہتا ہے۔ عوامی حلقوں کا تاثر یہ ہے کہ بالآخر شیخ مجیب ان مقدموں کا خیال ترک کر دیں گے۔ اس کے ساتھ ہی ان حلقوں میں یہ احساس زوروں پر ہے کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے مخالفوں کو بیکار کی ضد چھوڑ کر اس مسئلہ کو حقیقت پسندانہ نظر سے دیکھنا چاہیئے۔

عوامی تاثرات

دہلی سمجھوتے سے متعلق پاکستان میں عوامی تاثر کا آئینہ دار وہ بیان ہے جو جنگی قیدیوں کی واپسی کی قومی اسمبلی نے سمجھوتہ کی خبر ملتے ہی جاری کیا۔ کونسل

کی صدر بیگم کرنل علی نے اس بیان میں کہا جنگی قیدیوں کی واپسی کی خبر نہایت خوش آئند ہے اور آج ہمارے سر عجز و انکسار سے اللہ تعالیٰ کے حضور میں جھک گئے ہیں جس نے ہمیں اپنے عزیزوں کی طویل جدائی کا صدمہ برداشت کرنے کا حوصلہ دیا اور اب ہماری دعاؤں کے بدلے اپنے فضل و کرم سے ہمیں وہ دن دکھایا جب بچھڑے ہوئے خاندان پھر ایک ہو جائیں گے۔"

پاکستانی جنگی قیدیوں کی سب سے زیادہ تعداد جہلم اور اس کے بعد چکوال کی ہے۔ اس علاقے میں دہلی سمجھوتہ کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا کیونکہ اسی کے طفیل بے شمار مرجھائے ہوئے چہرے فرطِ مسرت سے کھل اٹھے۔ کچھ ایسا ہی عالم ضلع کیمبل پور کا تھا جہاں اس معاہدے کی بدولت ۲۱۰۰۸ جنگی قیدیوں کے لوٹنے سے ہزاروں خاندان سکھ کی سانس لیں گے۔ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے سیکرٹری جنرل سید گل عباس رضوی اور پاکستان کسان پارٹی کے صدر چودھری شیر محمد کبوہ، چودھری سلطان سکندر اور پی پلز اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے رہنما محمد منشا چودھری نے اپنے ردعمل کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے "اگر بھارت اور پاکستان" کچھ دو اور کچھ لو" کے اصول پر عمل پیرا ہو کر معاہدے کرتے رہے اور اسی طرح تمام مسائل حل ہوتے گئے تو بھارت اور پاکستان یک جان دو قالب بن جائیں گے۔"

" اس سمجھوتہ سے جہاں دکھی اور غم زدہ گھرانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے وہاں برصغیر میں امن، سلامتی اور خوشحالی کے امکانات بھی روشن ہو گئے ہیں۔" (سلیم مجاہد)

جہلم سے 'نوائے وقت' میں اسلم بیدل کا خط شائع ہوا ہے" پاکستان اور بھارت میں انسانی مسائل پر حالیہ سمجھوتہ دراصل امن پسندی، تدبر اور دوراندیشی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔" (یکم ستمبر)

پاکستان ٹائمز میں بھی اس سمجھوتے سے متعلق خطوط شائع ہوئے ہیں۔ ۴ ستمبر کے شمارے میں لاہور سے امانت اللہ شیخ نے اپنے خط میں لکھا ہے" دہلی سمجھوتے سے امید ہے کہ کدورت، بدگمانی اور نفرت کے غبار دونوں ملکوں کی فضاؤں سے چھٹ جائیں گے۔ اس سے ایسے خوشگوار تعلقات استوار کرنے میں مدد ملنی چاہیئے جو عوام کو دکھوں سے نجات دلا سکیں۔ جو لوگ ہندوستان کے خلاف محاذ آرائی کی باتیں کرتے ہیں وہ برصغیر کے عوام کی بھیانک غریبی سے چشم پوشی کر رہے ہیں۔ ایسے مشکل اور تکلیف دہ دور میں یہ سمجھوتہ یقیناً ایک بہت بڑی کامیابی ہے۔"

دہلی معاہدے کا خیر مقدم دنیائے تعلیم میں بھی ہوا ہے۔ طلبا کے رہنماؤں سلیم شیخ، مختار احمد، آغا حسن قزلباش اور سید مرتضیٰ زیدی کی رائے میں معاہدہ برصغیر کے عوام کے لئے خوشی، امن اور خوشحالی کا پیغام ہے۔ پاکستان کے مرحوم وزیراعظم حسین شہید سہروردی کی صاحبزادی بیگم اختر سلیمان نے بھی دہلی سمجھوتے کا خیر مقدم کیا ہے۔ پاکستان۔ ہند کلچرل سوسائٹی کی صدر ڈاکٹر عالیہ امام نے ہند پاکستان اور بنگلہ دیش کے رہنماؤں کو ان کے تدبر اور جذبۂ امن کے لئے خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ ان کی نظر میں دہلی سمجھوتہ نتیجہ خیز اہمیت کا حامل ہے۔ کسان عوامی محاذ کے صدر مولانا اسمٰعیل ذبیح کی رائے میں دہلی سمجھوتہ پاک بھارت تعلقات کو معمول پر لانے، ۱۹۷۱ء کی جنگ سے پیدا شدہ مسائل کے حل اور دوسرے تمام تنازعات طے کرنے میں سنگ میل ثابت ہو سکتا ہے۔

عوامی علما پارٹی کے صدر مولانا ارشاد الحق تھانوی دہلی سمجھوتہ کو برصغیر کے تینوں وزرائے اعظم کے تدبر اور فراست کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے امید ظاہر کی ہے کہ اب برصغیر سے نفرت اور سرد جنگ کے بادل چھٹ جائیں گے۔" دہلی سمجھوتہ پاکستان، ہند بنگلہ دیش کے مابین خلوص و خیر سگالی کی صبح نو کا پیامبر ہے۔ اگر مصالحت اور مفاہمت کا یہ جذبہ سلامت رہا تو پورے برصغیر میں امن اور خوشحالی کے دور کا آغاز ہو سکے گا۔" (مسیحی رہنما جوشوا فضل الدین)

ایسے ہی بے شمار اقتباسات اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ پاکستان کی عوامی زندگی نے دہلی سمجھوتہ کو نہ صرف سکون اور اطمینان کی نظر سے دیکھا ہے بلکہ اسے پانچ لاکھ انسانوں کے دکھوں کا اختتام اور خوشیوں کے نئے دور کا آغاز قرار دیا ہے۔ سب سے زیادہ خوشی انھیں اس بات کی ہے کہ نوّے ہزار جنگی قیدی مستقبل قریب میں اپنے عزیزوں کے درمیان ہوں گے۔

پاکستان کی سیاسی زندگی میں حکمران جماعت پی پلز پارٹی اور قیوم مسلم لیگ کے رہنماؤں نے جگہ جگہ دہلی معاہدہ کا پرجوش خیر مقدم کیا ہے۔ اپوزیشن سے صرف نیشنل عوامی پارٹی، جمعیۃ العلمائے اسلام اور پاکستان سوشلسٹ پارٹی نے اس معاہدے کو قابلِ تحسین قرار دیا ہے۔ متحدہ جمہوری محاذ کی تحریک اور پاکستان کی داخلی سیاست میں کشیدگی کے باوجود ان جماعتوں کی طرف سے دہلی معاہدے کے بارے میں مثبت رد عمل کا اظہار یقیناً خوش آئند ہے۔

یہ بات حوصلہ افزا ہے کہ ان دو جماعتوں نے پاکستانی سیاست کی پیچیدگیوں کی گرد سے اپنی تجزیاتی نظر کو محفوظ رکھا ہے اور اپنے آدرشوں کو سیاسی مصلحتوں کی خاطر قربان نہیں کیا۔

اپوزیشن کی ان دو جماعتوں کے سوا باقی کی جماعتیں کسی نہ کسی انداز سے دہلی سمجھوتہ کی مخالفت کرتی ہیں۔ ایک سیاسی بیان البتہ حیران کن ہے۔ جماعت اسلامی راولپنڈی کے جنرل سیکرٹری فخر الدین بٹ نے دہلی سمجھوتہ کو ایک مثبت اقدام قرار دیا ہے جس سے جنگی قیدیوں کو آزاد فضا میسر ہو سکے گی۔ ان کی رائے میں حکومت پاکستان نے گزشتہ جنگ سے پیدا شدہ مسائل کو اس سمجھوتہ کے ذریعے حل کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ (ڈان یکم ستمبر)

یہ خیالات اور احساسات فخر الدین بٹ صاحب کے ذاتی تو ہو سکتے ہیں لیکن جماعت اسلامی کے یقیناً نہیں ہیں کیونکہ امیر جماعت اسلامی میاں طفیل محمد کی رائے اس سے بہت مختلف ہے۔ وہ کہتے ہیں:۔

" پاکستان اور بھارت کے معاہدے میں پاکستان

نے ان تمام شرطوں کو مان لیا ہے جو ۱۷ اپریل کو بنگلہ دیش اور بھارت کے مشترکہ اعلامیہ میں پیش کی گئی تھیں سمجھوتہ میں ساڑھے چار ماہ کی تاخیر سے پاکستان کو سوائے اس کے کچھ نہیں ملا کہ اس کے پچاس قیدی شہید کر دیئے گئے چنانچہ اس معاہدے کو پاکستان کی کامیابی قرار نہیں دیا جا سکتا۔" (پریس کانفرنس۔ نواب شاہ)

جماعت اسلامی پاکستان کے امیر میاں طفیل محمد کی طرح تحریک استقلال کے سربراہ ایئر مارشل (ریٹائرڈ) اصغر خاں کی بھی رائے ہے کہ بھارت اور پاکستان کے درمیان سمجھوتہ بھارت کی شرائط پر ہوا ہے۔ اس قسم کا سمجھوتہ بہت پہلے ہو سکتا تھا۔

پاکستان جمہوری پارٹی نے دہلی سمجھوتے کو قومی مفاد کے منافی قرار دیا ہے۔ اس کی رائے میں یہ سمجھوتہ انتہائی مایوس کن ہے اور اس میں پاکستان کی عزت و وقار اور سالمیت کا سودا کیا گیا ہے۔ اس سمجھوتے کے ذریعہ پاکستان نے حقیقتاً بنگلہ دیش کے وجود کو تسلیم کر لیا ہے۔ غیر بنگالیوں کی محدود تعداد پاکستان لانے کی حامی بھر کر ان محب وطن بنگالیوں کو فراموش کر دیا گیا ہے جو آج بھی بنگلہ دیش میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے ہیں۔ پاکستان نے اب جو معاہدہ کیا ہے وہ ڈیڑھ سال پہلے بھی کیا جا سکتا تھا۔ اس طرح بالواسطہ طور پر مسز اندرا گاندھی کی یہ بات درست ثابت ہو رہی ہے کہ پاکستان خود اپنے قیدیوں کو واپس لینے سے گریز کر رہا ہے۔

اخباروں کی نظر میں

دہلی سمجھوتے کا پاکستانی صحافت کے آئینہ میں عکس تقریروں اور بیانات میں کارفرما تصور سے یقیناً بہتر ہے کچھ دھندلے اور سیاہ دھبے اس میں بھی کہیں کہیں آ گئے تو ہیں لیکن بہت کم کم۔ اکثر اخبارات نے اس سمجھوتے کے مثبت نتائج اور برصغیر کے تقاضوں کا ذکر کیا ہے۔ ممتاز ہفت روزہ اخبار جہاں نے اپنے اداریہ میں اسے امن کی فتح قرار دیا ہے۔ "۱۷ اپریل کو بنگلہ دیش اور بھارت کے مشترکہ اعلان پر پاکستان نے جو وضاحت طلب کی تھی اس سلسلے میں ہونے والے مذاکرات کے نتیجے میں ایک سمجھوتہ عمل میں آ گیا ہے۔ یہ بلاشبہ امن کی فتح ہے۔۔۔۔۔۔ اس معاہدے میں کس نے کیا کھویا کیا پایا ــــ یہ بات دیکھنے کی نہیں ہے، کیوں کہ پاکستان کے ہاتھ میں کچھ نہیں تھا۔ یہ مذاکرات خالصتاً مسائل پر ہوئے تھے۔ اس لئے ان پر اسی زاویے سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ۱۹۵ کے علاوہ باقی تمام جنگی قیدی واپس آ جائیں گے۔ فی الحال ان پر مقدمے ملتوی کر دیئے گئے ہیں۔ تقریباً ۷۰،۸۰ ہزار غیر بنگالیوں کو پاکستان آنے کا موقع ملے گا۔ ڈیڑھ لاکھ کے قریب بنگالی اپنے گھروں کو واپس جا سکیں گے۔ ان لوگوں کی منتقلی سے یقیناً کشیدگی کم کرنے میں مدد ملے گی۔ ابتدا میں یہ لوگ جو واقعات سنائیں گے ان سے یقیناً کچھ تلخیاں پیدا ہوں گی۔ لیکن خود ان لوگوں کا اپنے اپنے گھروں میں واپس جانا ہی کشیدگی میں کمی کا سب سے بڑا سبب ہوگا۔" (۲ ستمبر)

مدیر اخبار جہاں کا اندازہ بہت حد تک صحیح ہے۔ دراصل دہلی سمجھوتہ پر دستخط ہوتے ہی پاکستانی اخبارات کے اداریوں میں ردعمل، تاثر اور نتائج اور قیاس ابھرنے لگے۔ ۳۰ اگست کی صبح امروز نے لکھا ہے کہ "پاکستان اور ہندوستان کا تازہ سمجھوتہ یقیناً خیر مقدم کا مستحق ہے۔"

جذبۂ امن قابل صد مبارکباد ہے لیکن تاخیر کے سلسلے میں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ یہ ہند کی وجہ سے نہیں ہوئی۔ پاکستان نے کیا کیا رخ اختیار کئے ان کا سبھی کو علم ہے۔ دہلی سمجھوتہ کے تین ہی ہفتے بعد وزیر اعظم بھٹو نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں جو رخ اپنایا ہے وہ مایوس کن ہے۔

اس کے مقابلے میں نوائے وقت کے ردعمل کے جھٹکے کے علاوہ خواہ مخواہ نظریاتی اساس کے ذکر کو اس معاملے میں گھسیٹ لیا گیا ہے۔

پاکستان ٹائمز نے اپنے اداریے میں لکھا۔

یہ تقاضا پرانا اور بے محل ہے کیونکہ حکومت ہند اور ہند کے عوام نے خلوص دل سے بار بار یقین دلایا ہے اس سے زیادہ کیا بھی کیا جا سکتا ہے۔

'پاکستان ٹائمز' نے اپنے اداریے میں انسانی پہلو اجاگر کئے ہیں۔ 'ادھر ڈان' نے اپنے اداریے میں تنگ نظر قومی تعصبات سے احتراز کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ 'مارننگ نیوز' نے اس سمجھوتے کی تشکیل اور تعمیری انداز فکر کو سراہا ہے۔ راولپنڈی سے 'نیو ٹائمز' تینوں ملکوں کو افسوسناک ماضی اور برصغیر کے عوام میں نفاق کا بیج بونے والے نظریات کو فراموش کر دینے کا مشورہ دیتا ہے۔

ان خیالات کے برعکس پاکستانی صحافی ایچ کے برکی نے پاکستان ٹائمز میں اپنے کالم میں ایک انوکھی دلیل پیش کی ہے۔ لکھتے ہیں "حکومت ہند کو سنجیدہ بات چیت اور ایک جزوی معاہدے پر دستخط کرنے کا فیصلہ غالباً اس لئے کرنا پڑا کہ اسے اس بات کا خدشہ تھا کہ اس کے نمائندوں کو الجیریا کی ناوابستہ ممالک کی کانفرنس اور بعد میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں سخت نکتہ چینی کا سامنا کرنا پڑے گا۔" برکی صاحب کا ذہن اپنی روایتی ہند دشمنی کا شکار رہا۔ اس کے مقابلے ایک دوسرے ہند مخالف صحافی زیڈ اے سلیری نے البتہ اپنے انگریزی مضمون میں دہلی سمجھوتے کو خوش آئند قرار دیا۔

دہلی سمجھوتے کے بارے میں پاکستانی عوام، سیاسی رہ نماؤں اور اخبارات کا ردعمل مجموعی طور پر امید افزا اور حوصلہ کن ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ خلوص سے خلوص پیدا ہوتا ہے اور نفرت سے نفرت۔ امید ہے کہ پاکستانی عوام اور ان کے رہ نما بھرپور اور پرخلوص تعاون کریں گے۔ اس شمع کا اجالا برصغیر کے مستقبل کے خوابوں کی تعبیر ہو سکتا ہے۔

کاش! وزیر اعظم بھٹو کے دل و ذہن میں اس حقیقت کا احساس پیدا ہو سکے۔

اقبال اور نظریۂ پاکستان

چھتاری کمپاؤنڈ
رسل گنج۔ علی گڑھ

اقبال اور تصور پاکستان (مطبوعہ مئی ۱۹۷۳ء) پر بیگم شاہدہ کلیم کا مضمون یک طرفہ مطالعہ پر مبنی ہے۔ آج ضرورت اس کی ہے کہ اقبال کا تقابلی مطالعہ کیا جائے۔

ہم رشتہ مضمون صرف ان کے سیاسی افکار پر مبنی ہے۔ بقیہ پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا ہے۔

آپ کا نیاز مند
آفتاب احمد

"آفتاب احمد کا مضمون متنازعہ لیکن خیال انگیز ہے اس لئے اسے شریک اشاعت کیا جا رہا ہے۔ اقبال کے خیالات واضح ہیں لیکن ان کے اِن خیالات کو ہی سب کچھ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اقبال ایک اچھے شاعر تھے۔ اردو کے نظم نگار شاعروں میں خاص پر ان کا مقام بہت بلند ہے۔ اقبال پر گفتگو کرتے وقت بالعموم اس بات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ وہ شاعر بھی تھے اور مفکر بھی، لیکن ان کے افکار پر ان کے شاعرانہ مزاج کا گہرا اثر تھا۔ ویسے ان کی شاعری بھی ان کے افکار سے اثر انداز ہوئی لیکن شاعر کی حیثیت سے زیادہ بلند مرتبہ ہیں۔"

ادارہ

علامہ اقبال (۱۸۷۶۔۱۹۳۸ء) نسلی اعتبار سے کشمیری برہمن تھے ان کے جدِ اعلیٰ تقریباً دو سو سال قبل مسلمان ہوئے تھے۔ ان کی فلسفیانہ شاعری کا سارا اثاثہ قرونِ وسطیٰ کے تہذیبی تصورات کی بنیاد پر مغربی تفکرات سے مرکب تھا۔ صحیح معنوں میں وہ نیتشے کی طرح عہد وسطیٰ کے منّاد تھے جس کا کربہ انھوں نے اِن الفاظ میں کیا۔

مہر روشن چھپ گیا اٹھی نقاب روئے شام
شانۂ ہستی پہ ہے بکھرا ہوا گیسوئے شام
منظر حرماں نصیبی کا تماشائی ہوں میں
ہم نشین خفتگان کنج تنہائی ہوں میں

ان کے کلام میں اس محروم الارث طبقے کے لئے ایک پر قوت پیغام تھا جو اپنی سیاسی عظمت و اقتدار کی بحالی کے لئے ایک "مردِ کامل" کی جستجو میں تھا۔ یہ طبقہ مغرب کی غلامی پر تو قانع تھا لیکن مغربی تہذیب کو قبول کرنے سے کترا رہا تھا۔ ان کے افکار میں ہزار تضاد ہوں لیکن منبع فکر ایک ہی ہے اور وہ ہے "مذہبِ اسلام"۔ ان کا ابتدائی کلام جذبات وطنیت سے معمور ہے۔ یورپ سے واپسی کے بعد ان پر مابعد الطبیعاتی نظامِ فکر غالب تھا۔ ان کی سیاسی زندگی کا آغاز ۱۹۰۸ء میں انجمن کشمیری مسلمانان کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے شروع ہوا جس کے صدر خان بہادر خواجہ اللہ بخش تھے۔ ۱۹۰۸ء میں آنریبل نواب بہادر خواجہ محمد سلیم اللہ خاں آف ڈھاکہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسہ میں شرکت کے لئے امرتسر آئے ہوئے تھے۔ اقبال نے نواب بہادر کی خدمت میں انجمن کشمیری مسلمانان کی جانب سے فارسی زبان میں ایک سپاسنامہ پیش کیا جس میں نواب بہادر سے انجمن کی سرپرستی قبول فرمانے کی درخواست کی گئی تھی۔ منشا یہ تھا کہ ان کے ذریعہ سے کشمیری مسلمانوں کی مشکلات کا حل نکالا جائے۔ سپاسنامہ کا آخری پیراگراف قابلِ غور ہے۔

"ما ازاں خیر خواہی دولت برطانیہ کہ از طریق عمل جناب ظاہر و ثابت شدہ است و مے شود برخود مے نازیم ..... و بدرگاہ خداوند کریم دعائے مے کنیم کہ حکومت برطانیہ را بر جادۂ مستقیم برقرار داد۔"[1]

ان کا یہ سیاسی اندازِ فکر آخر وقت تک قائم رہا انھوں نے برطانوی ملوکیت کی تو مخالفت کی لیکن ۱۹۲۲ء میں نائٹ ہڈ کا اعزاز بھی بصد خوشی قبول کر لیا۔ اصلاً وہ برطانوی ملوکانہ نظام کے اس درجہ مخالف نہیں تھے جس قدر وہ "مغربیت" کے مخالف تھے۔ انکی مغربیت پر تنقید کو برطانوی نظام استعماریت پر تنقید سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ "مغربیت" یا "فرنگی تہذیب" سے ان کی مراد وہ انقلابی تصورات تھے جو مغربی نظام کے ساتھ ہندوستان آئے تھے مثلاً جمہوریت، اشتراکیت اور ان کے ساتھ وابستہ نیشنلزم، وطنیت و دیگر مدنی تصورات۔ انھوں نے ایک جگہ لنین کی تعریف کی تو دوسری جگہ مسولینی میں بھی ان کو ندرت نظر آگئی۔ اور مزدور کی حکومت کو "حیلہ پرویزی" کہہ گزرے۔ وہ وطنیت و قومیت سے بے انتہا بیزار تھے انھوں نے "اسرار خودی" میں نیتشے اور برگساں کے فلسفیانہ نظریات کو رومی تصوف میں سمونے کی کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عجمی فلسفہ پر مغربی دانش (طبقاتی تصورات میں لپٹی ہوئی) غالب آگئی۔ "وطنیت" و "قومیت" سے بیزاری کو مسلم بورژوازی نے اپنے اغراض و مقاصد

---

[1] ماخوذ از مجلہ بزم اقبال لاہور ۱۹۵۶ء جلد چہارم

نوٹ:۔ ۱۹۰۸ء میں لاہور میں ایک تقریر میں انھوں نے مسلمانوں کو حکومت برطانیہ سے مکمل وفاداری کا مشورہ دیا تھا حدیث بخاری کے حوالے سے یہ کہا تھا کہ عیسائی حکومت پر تنقید حکم رسول کے خلاف ہے۔

فیض کا الوداعیہ

فیض احمد فیض



نہ اب ہم ساتھ سیرِ گل کریں گے
نہ اب مل کر سرِ مقتل چلیں گے
نہ اب دشتِ جنوں کی شامِ محفل
نہ گل گشتِ بہاراں کی صبحِ رنگیں
حدیثِ دلبراں باہم کریں گے
نہ خونِ دل سے شرحِ غم کریں گے
نہ لیلائے سخن کی دوست داری
نہ غم ہائے وطن میں اشکباری
سنیں گے نغمۂ زنجیر مل کر
نہ شب بھر مل کے چھلکائیں گے ساغر
بنامِ شاہدِ نازک خیالاں
بیادِ مستیٔ چشمِ غزالاں
بنامِ انبساطِ بزمِ رنداں
بیادِ کلفتِ ایامِ زنداں
صبا اور اس کا اندازِ تکلم
سحر اور اس کا آغازِ تبسم
فضا میں ایک ہالہ سا جہاں ہے
یہی تو مسندِ پیرِ مغاں ہے
سحر گہ اب اسی کے نام ساقی
کرو اب ختم دورِ جامِ ساقی
بڑھا دو شمعِ محفل بزم والو
پیو اب ایک جامِ الوداعی
پیو اور پی کے ساغر توڑ ڈالو

بنّے بھائی

"سجاد ظہیر کی موت سے کتنے لوگوں نے محسوس کیا کہ یہ ان کے سرپرست کی موت ہے۔ اس کا جواب وہ سینکڑوں سوگوار چہرے ہیں جو خاموش ہیں اور خاموشی سے رو رہے ہیں۔

سجاد ظہیر کی موت پر کتنوں نے کیا کیا لکھا اور کیا کیا لکھیں گے اس کا تصور بہ آسانی کیا جاسکتا ہے لیکن سجاد کی موت پر فیض نے جو مرثیہ کہا ہے اس کا جواب شاید ہی ہوسکے۔

فیض کی یہ نظم حالی کے مرثیہ غالب اور غالب کے مرثیہ عارف سے بلند مرثیہ ہے۔

دراصل یہ ایسا مرثیہ ہے جو شاعر نے خود اپنی موت پر کہا ہے۔ یہ مرثیہ پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی شخص کسی ویرانے میں تنہا اور افسردہ کھڑا ہے اور اس کے تمام رفیق، احباب، آشنا اس سے جدا ہو چکے ہیں۔ خود اس کا وجود ــــــــ جدائی کے زخموں کو سہتے سہتے اس قدر شکستہ ہو چکا ہے کہ اب "جام الوداعی" کی تلاش میں ہے۔

"جام الوداعی" سجاد ظہیر کی موت پر فیض کا بہترین خراج عقیدت و محبت ہے۔"

ادارہ

بنّے بھائی

سہیل عظیم آبادی

انسان مرجاتا ہے لیکن اس کے کارنامے زندہ رہتے ہیں، خوبیاں یاد آتی ہیں اور جاننے والوں کے دلوں کو تڑپا جاتی ہیں۔ بنّے بھائی اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ موت کے بے رحم ہاتھوں نے اُن کو اُن کے ہزاروں بزرگوں، عزیزوں اور دوستوں سے چھین لیا۔ لیکن ان کی یاد لوگوں کے دلوں سے نہیں نکل سکتی جو لوگ انھیں جانتے ہیں وہ انھیں بھول نہیں سکتے۔

میں میٹری کولیشن کا طالب علم تھا تو "انگارے" کی اشاعت سے سارے ملک میں جیسے زلزلے کے جھٹکے سے محسوس ہوئے۔ چند نوجوان ادیبوں نے ایسے افسانے لکھے تھے جو اس وقت کے افسانوی ادب میں بم کی طرح لگے۔ اردو دنیا میں احتجاج کا طوفان سا اٹھ کھڑا ہوا۔ افسانے لکھنے والوں کو ملحد، بے دین اور باغی کہا گیا۔ افسانے لکھنے والوں پر مقدمہ چلانے، انھیں سزائیں دینے اور کتاب کی ضبطی کے مطالبے ہوئے سارے ملک میں کتاب کے خلاف تحریک چل پڑی۔ آخر یہ کتاب ضبط کر لی گئی۔

انگارے کے افسانہ نگاروں میں ایک نام سید سجاد ظہیر کا بھی تھا۔ اس طرح سید سجاد ظہیر ادبی دنیا میں ایک طوفان اپنے ساتھ لے کر آئے۔ اور ان کی ساری زندگی طوفانوں سے کھیلتے گزری۔ سید سجاد ظہیر کا بزرگوں نے پیار سے پکارنے کا نام بنّے رکھا تھا۔ اردو میں جاننے والوں کے حلقے میں وہ بنّے بھائی کے نام سے مشہور ہوگئے۔ خاص کر جو لوگ ان سے عمر میں چھوٹے تھے وہ انھیں بنّے بھائی کے نام سے پکارتے تھے۔

برطانوی دور حکومت میں دولت مند گھرانوں کے لڑکے آئی سی ایس کی تیاری، بیرسٹری اور دوسری اونچی تعلیم کے لئے انگلستان بھیج دیئے جاتے تھے۔ بنّے بھائی بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلستان بھیج دیئے گئے تھے اور بیرسٹر بن کر آئے لیکن انھوں نے وکالت کا پیشہ باضابطہ اختیار نہیں کیا۔ بلکہ ہندوستان آتے ہی ملکی سیاست کے طوفان میں کود پڑے۔ بنّے بھائی جیسے حساس آدمی کے لئے اس سے الگ رہنا ممکن بھی نہیں تھا۔ ہندوستان کی غلامی اور انگریزوں کی لوٹ کھسوٹ کو انھوں نے دیکھا اور سمجھا تھا۔ اور اس سے زیادہ وہ یہ کہ ان کا سیاسی شعور بیدار ہو چکا تھا۔ انگریزی حکومت کی شاطرانہ چالوں کو انگلستان میں رہ کر انھیں زیادہ سمجھنے کا موقع ملا تھا اور وہ اپنے سیاسی خیالات کے لحاظ سے کمیونسٹ بن چکے تھے۔

بنّے بھائی سے میری ملاقات پہلی بار ۱۹۳۸ء میں ہوئی۔ کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے وہ پرجوش کارکن تھے اور ترقی پسند مصنفین کے سکریٹری۔ اپنی سیاسی سرگرمیوں کے سلسلے میں وہ پٹنہ گئے تھے۔ کانگریس سوشلسٹ پارٹی اپنا ہفتہ وار اخبار "جنتا" جاری کرنے والی تھی۔ اور اس کا افتتاح تھا۔ اخبار کا افتتاح بنّے بھائی کے والد بزرگوار سر وزیر حسن نے کیا تھا۔ سر وزیر حسن انگریزی حکومت کے خطاب یافتہ اور اودھ چیف کورٹ کے چیف جسٹس رہ چکے تھے۔ لیکن بڑے وطن پرست اور ترقی پسند انسان تھے۔ انھیں ہندوستان کی آزادی بڑی عزیز تھی اور وہ قومی اتحاد کے بڑے علم برداروں میں تھے۔

بنّے بھائی سے یہ ملاقات بہت مختصر تھی، میں نے لکھنا شروع کر دیا تھا اور ترقی پسند مصنفین کی تحریک سے میری دلچسپی بھی تھی۔ اس لئے قدرتی طور پر اس تحریک کے رہنما کے لئے میرے دل میں احترام کا جذبہ بھی تھا لیکن پھر بھی ان سے قریب نہیں ہو سکا تھا۔ ایک تو اس لئے کہ بنّے بھائی الٰہ آباد میں رہتے تھے۔ دوسرے وہ بے حد مصروف آدمی تھے۔ ان کا تعلق ادبی تحریک سے بھی تھا اور ملک کی سیاست سے بھی۔

ملکی سیاست میں بھی انھوں نے مثبت انداز میں حصہ لیا۔ مجھے اس وقت ان کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ وہ گرفتار کر لئے گئے۔ ایک ہنگامہ سا پیدا ہو گیا۔ سر وزیر حسن کا اثر انگریزوں پر تھا۔ انھوں نے کچھ کوشش کی۔ اور بنّے بھائی رہا کر دیئے گئے۔ یہ عجیب بات تھی۔ گرفتاری کے کچھ ہی دیر بعد ان کو رہا کر دیا گیا تھا۔ بات یہ مشہور ہوئی کہ سر وزیر حسن نے اس بات کی ذمہ داری لی ہے کہ بنّے بھائی آئندہ سیاست میں، یا کم از کم سرگرم سیاست میں حصہ نہیں لیا کریں گے۔ بنّے بھائی سے ایک اخبار نویس نے ان کی رہائی کے بعد یہ سوال بھی کر دیا۔ اخباروں میں خبر آئی۔ بنّے بھائی نے اخبار نویس کو جواب دیا تھا "میں اپنی ذمہ داری کو سمجھتا ہوں۔ اگر میرے والد بزرگوار نے کوئی اس قسم کا وعدہ کر لیا ہے تو اسے پورا کرنے کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے۔ میں نے حکومت سے کوئی ایسا وعدہ نہیں کیا ہے اور آئندہ بھی میں اپنے خیال کے مطابق سیاست میں حصہ لیتا رہوں گا۔"

یہ واقعہ شاید ان کی پہلی گرفتاری کا ہے۔

بعد میں تو گرفتاری اور جیل بے معنی چیزیں بن کر رہ گئیں۔ سیاسی سرگرمیوں سے وہ ایک دن کے لئے بھی الگ نہیں ہوئے۔ بار بار گرفتاریوں اور قید و بند کی صعوبتوں کا مقابلہ کرتے ہی رہے۔

لیکن سجے بھائی کا اصل کارنامہ ترقی پسند ادبی تحریک کی تنظیم اور قیادت ہے۔ ان کی قیادت میں ترقی پسند ادبی تحریک نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کی۔ تحریک جب شروع ہوئی تو ٹیگور نے اس کے لئے دعائیہ الفاظ کے ساتھ اپنا پیغام بھیجا۔ پہلا منشور شائع ہوا تو اس پر پنڈت جواہر لال نہرو، بابائے اردو مولوی عبدالحق منشی پریم چند اور نیاز فتحپوری کے دستخط تھے۔ سجے بھائی نے بڑی جانفشانی سے ملک کے ہر زبان کے ترقی پسند ادیبوں کو ایک پلیٹ فارم پر لاکر بٹھادیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یورپ کے مطلع پر فاشزم کے تباہ کن بادل چھارہے تھے۔ جرمنی اور اٹلی کے ڈکٹیٹر ساری دنیا کو دھمکارہے تھے اور ہندوستانی ادیبوں کے سامنے اپنے ملک کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانے کا مسئلہ تھا۔ اس تحریک نے ہندوستان کی ہر زبان کے ادب میں بڑی جان پیدا کردی۔ آزادی کی لڑائی کے لئے ادب کو بھی کامیاب حربے کی طرح استعمال کیا جانے لگا۔ ادب میں وسعت اور توانائی پیدا ہوئی۔ رومانیت ختم ہوئی، حقیقت پسندی کو فروغ ہوا۔ صدیوں کے توہمات کی جڑیں کھوکھلی ہوگئیں۔ ان کی جگہ ادب میں زندگی کی تلخ حقیقتیں اور ان تلخ حقیقتوں سے جنگ کا جذبہ پیدا ہوا۔ صحت مند قدروں سے ادب روشناس ہوا۔ یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اس تحریک نے نئے لکھنے والوں میں سماجی اور سیاسی شعور پیدا کیا۔ اور ہندوستانی ادب کو زندگی کے نئے گوشوں سے روشناس کرایا۔ ادب صرف تفریح اور ذہنی تعیش کی چیز نہیں رہ گیا بلکہ لوگوں نے سمجھا کہ ادب بھی ہماری سماجی زندگی کا ایک ضروری جزو ہے۔ ادب کو یہ حیثیت ترقی پسند مصنفین کی تحریک نے دلائی۔ اور اس تحریک کی رہ نمائی سجے بھائی کے ذمہ تھی۔ ان کا یہی کارنامہ انھیں صرف اردو ادب کی تاریخ ہی نہیں بلکہ ہندوستانی ادب کی تاریخ میں زندہ رکھے گا۔

لیکن سجے بھائی کی زندگی صرف ادب تک ہی محدود نہیں تھی، ملکی سیاست میں بھی انھوں نے ہمیشہ آگے بڑھ کر حصہ لیا۔ اور بار بار قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ ان کی زندگی میں ادب اور سیاست کی روش کچھ اس طرح تھی کہ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا تھا کہ ان کی شخصیت زیادہ ادبی تھی یا زیادہ سیاسی۔

کب، آخر کب

دیش ہمارا اونچا ہوگا ؟

ہندی، اردو، پنجابی کب

دودھ میں شکر ہوجائیں گی ؟

بھارت ماں کی ممتا

کب پروان چڑھے گی ؟

کب انمول انوپ رتن

ساہت کے ہم

چرنوں میں بھینٹ کریں گے ؟

(سجاد ظہیر کی نظم "آج رات" سے اقتباس)

سجے بھائی اپنے سیاسی خیالات کے لحاظ سے کمیونسٹ تھے۔ اور کمیونسٹ پارٹی کے اہم رہ نماؤں میں تھے۔ ذاتی طور پر نہایت مہذب، خوش اخلاق اور خوش کلام انسان تھے۔ ان کے چہرے پر ہر وقت سنجیدہ سی مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ اختلافی مسائل پر بھی گفتگو کرتے وقت ان کی زبان سے کوئی ایسا لفظ نہیں نکلتا تھا جو مخاطب کے لئے تکلیف کا سبب بن جائے۔ بڑوں کا احترام اور چھوٹوں کے ساتھ شفقت برتنے میں مشرقی، بلکہ اودھ کی روایت کے قائل تھے۔ چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ جب زیادہ خوش ہوتے تو مسکراہٹ پھیل جاتی تھی اور جب غصہ ہوتے تھے تو مسکراہٹ چہرے سے غائب ہوجاتی تھی۔ لیکن ان کا غصہ کبھی ایسا نہیں ہوتا تھا کہ سخت الفاظ زبان سے نکلیں۔

سجے بھائی اگر چاہتے تو بڑے اطمینان اور آرام کی زندگی گزار سکتے تھے۔ لیکن وہ جیسے طوفانوں سے کھیلنے اور اپنے خیالات کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے کو پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنے لئے ایسی زندگی پسند کی جس کی راہ میں کانٹے ہی کانٹے تھے تکلیفیں تھیں پریشانیاں تھیں۔ وہ کمیونسٹ پارٹی کے ممبر تھے۔ سارا وقت پارٹی کے کاموں میں صرف کرتے تھے۔ دوسرے رفیقوں کی طرح سادہ زندگی گزارتے تھے۔ ان کی زندگی خاندان کے دوسرے افراد سے بالکل ہی مختلف تھی لیکن کبھی ان کی زبان پر حالات کا شکوہ نہیں آیا۔ سخت سے سخت وقت میں بھی ان کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلتی رہی۔

ملک کی تقسیم کے بعد وہ پاکستان چلے گئے۔ بیوی بچے ہندوستان ہی رہ گئے۔ پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی کی تنظیم کی ذمہ داری ان پر ڈالی گئی تھی۔ وہاں کے حالات بے حد ناسازگار تھے جب تک کام کرتے رہے روپوشی کے عالم میں رہے اور جلد ہی گرفتار کرلئے گئے۔ راولپنڈی سازش مقدمہ میں انھیں پھنسادیا گیا۔ فیض احمد فیض بھی ان کے ساتھ گرفتار ہوئے تھے۔ ان لوگوں پر پاکستانی حکومت کا تختہ اُلٹنے کا الزام تھا۔ مقدمہ چلتا رہا اور وہ پاکستانی جیلوں میں بند رہے۔ اس دوران انھیں کتنی تکلیف اٹھانی پڑی اور کیسی کیسی آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ یہ طویل داستان ہے۔ انھیں قید تنہائی کی سزا ملی اور اسی کمرے میں بند رکھا گیا جس میں شہید بھگت سنگھ کو رکھا گیا تھا شاید پاکستان کی حکومت انھیں خوف زدہ کرنا چاہتی تھی لیکن وہ اپنے عزائم میں پہاڑ کی طرح اٹل رہے۔

میں نے ۱۹۵۳ء میں ایک ماہانہ رسالہ پٹنہ سے جاری کیا تھا "تہذیب"۔ اس زمانے میں وہ ملتان جیل میں تھے۔ میں نے رسالہ اُن کو بھیج دیا۔ رسالہ پاکر وہ بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے بہت طویل اور محبت بھرا خط وہاں سے لکھا۔ وہ خط "تہذیب" کی اگلی ہی اشاعت میں شائع کر دیا گیا تھا۔ اس خط میں ادب سے متعلق باتیں تھیں، مشورے تھے۔ لیکن اپنے جیل میں رہنے کی شکایت نہیں تھی۔ سارے خط میں کوئی ایسا لفظ نہیں تھا جس سے شکوے کی بو بھی آتی۔ خط ایسا تھا جیسے وہ اپنے گھر سے اور بڑے آرام کی حالت میں لکھ رہے ہوں۔ مسلسل قید و بند کی حالت میں بھی یہ صبر و شکر بڑے جگر والوں کا کام ہے۔

پاکستان کی حکومت راولپنڈی سازش کے ملزموں کو مجرم ثابت نہیں کر سکی اور سب رہا کر دیئے گئے۔ رہائی کے بعد بنّے بھائی ہندوستان آگئے۔ اور کمیونسٹ پارٹی کی سرگرمیوں میں مشغول ہو گئے۔ انھوں نے دوبارہ ترقی پسند مصنفوں کی انجمن کو زندہ کرنا چاہا۔ لیکن کچھ لوگوں کی مسلسل غلطیوں کی وجہ سے انجمن میں وہ توانائی باقی نہیں رہی تھی جو پھر اسے پہلے کی طرح سرگرم کر دیتی۔ اسی زمانے میں مجھے اور میرے جیسے بہت سے غیر کمیونسٹ ترقی پسندوں کو بنّے بھائی سے شکایت ہو گئی۔ انھوں نے حیدرآباد کے ماہنامہ 'صبا' میں ایک مضمون لکھا۔ یہ مضمون ڈاکٹر وحید اختر کے مضمون کے جواب میں تھا۔ میں نے اس مضمون کے جواب میں ایک مضمون لکھا۔ لیکن ان دنوں میں آل انڈیا ریڈیو میں ملازم تھا اور ضابطے کے مطابق مجھے افسرانِ بالا کی اجازت کے بغیر ایسا مضمون لکھنا نہیں چاہیئے تھا جو بحث کا سبب بن جائے یا ۔ ۔ ۔ ۔ جو سیاسی ڈھنگ کا ہو۔ مجھے یہ پسند نہیں آیا کہ لکھوں میں اور اس کی اشاعت کے لئے محکمہ سے اجازت لوں۔ وہ مضمون میرے پاس شاید اب بھی کاغذات کے انبار میں پڑا ہو۔ شاید یہ ۱۹۶۰ء کی بات ہے۔ میں چاہتا تھا کہ بنّے بھائی جان جائیں کہ ان سے اختلاف کیا جا سکتا ہے ـــــ اتفاق کی بات کہ وہ کسی پروگرام کے سلسلے میں ریڈیو اسٹیشن آ گئے۔ وہ ہمیشہ کی طرح بڑی محبت سے ملے۔ میں ریڈیو اسٹیشن پر ان سے کسی بحث میں اُلجھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے ان کو اپنے کوارٹر میں لے آیا۔ چائے پلانے کے بعد میں نے وہ بحث چھیڑ دی۔ واقعہ یہ ہے کہ مجھے بنّے بھائی کے مضمون سے کسی قدر تکلیف پہنچی تھی۔ انھوں نے ان ادیبوں پر طنز کیا تھا جنھوں نے سرکاری ملازمتیں کر لی تھیں۔ میرے خیال میں ان کا طنز کرنا جائز نہیں تھا۔ میری شکایت سن کر وہ مسکرائے اور بولے "پھر تم نے جواب کیوں نہیں لکھا؟"

میں نے اپنا مضمون انھیں دے دیا۔ وہ پڑھتے رہے اور مسکراتے رہے۔ مضمون ختم کر کے انھوں نے مسکراتے ہوئے مضمون واپس کر دیا اور بولے "اس میں تو کوئی ایسی بات نہیں جس سے معلوم ہو کہ تم نے غصے میں لکھا ہے۔" میں نے کہا "میں نے اصولی باتیں کہی ہیں۔ غصّہ کرنے سے کیا حاصل؟" وہ بولے "آج کل کے نوجوان تو ذرا سی بات پر شمشیر بے نیام ہو جاتے ہیں۔" میں نے کہا "اب میں نوجوان کہاں ہوں۔"

بات ایسی نہیں تھی۔ میرے مضمون میں بعض جملے یقینی سخت تھے اور میں غصے میں لکھ گیا تھا۔ حالاں کہ اگر وہ جملے نہ بھی لکھتا تو مضمون میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ لیکن بنّے بھائی نے بات ٹال دی اور اس کے بعد ان سے بار بار ملاقات ہوئی لیکن انھوں نے کبھی اس مضمون کا ذکر بھی نہیں کیا۔

بنّے بھائی سے میری آخری ملاقات گذشتہ مئی میں ہوئی۔ انجمن ترقی اردو کی مجلس عاملہ کا جلسہ علیگڑھ میں تھا۔ اس سے ایک ماہ پہلے میرا انتخاب ہوا تھا اس لئے تو انھوں نے مبارکباد دی۔ اور مسکرا کر بولے "میں مبارکباد کا خط نہیں لکھ سکا۔ تم اس کا خیال نہ کرنا۔" پھر مجلس عاملہ کے لئے ایک آدمی کا انتخاب کرنا تھا شاید برادرم ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے میرا نام پیش کیا۔ دوسری طرف سے کسی نے بنّے بھائی کا نام پیش کر دیا۔



سجاد ظہیر عرف بنّے بھائی

جگہ ایک ہی تھی۔ میں نے فوراً اپنا نام واپس لے لیا۔ اور وہ منتخب ہو گئے۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائے اور چپ ہو رہے۔ انجمن کی ادبی کمیٹی میں بھی جگہ خالی تھی۔ اس کے لئے بنّے بھائی نے میرا نام پیش کر دیا۔ میں چن لیا گیا۔ پھر وہ مجھے دیکھ کر مسکرائے۔

جلسہ ختم ہو گیا۔ اور ہم لوگ گیسٹ ہاؤس میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ بنّے بھائی نے مسکرا کر کہا "مجلس عاملہ کے لئے تمہارا نام پیش ہوا تھا تو تم نے واپس کیوں لے لیا؟ ذرا دلچسپی رہتی۔ مجھے بھی معلوم ہوتا اور تمہیں بھی، کہ کتنے لوگ کس کو پسند کرتے ہیں۔" میں اس کا کیا جواب دیتا۔ چپ ہو رہا۔ اور وہ مسکراتے رہے۔ علی گڑھ سے ہم لوگ ساتھ ہی دہلی آئے۔ وہ پھر ترقی پسند مصنفوں کی انجمن کو منظم کرنا چاہتے تھے اس کے لئے بولے تھے کہ یورپ سے واپسی کے بعد کام شروع کریں گے۔ لیکن وہ ہندوستان زندہ واپس ہی نہیں آئے۔

ہر انسان میں خوبیاں اور کمزوریاں ہوتی ہیں ان میں بھی ہوں گی۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کی موت سے ملک کو، ملک کی تہذیب کو، ادب کو اور سیاست کو ایسا نقصان پہنچا ہے جس کا ازالہ مدتوں نہ ہو سکے گا۔ ع

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

گاندھی جی کی باتیں

(ادارہ)

"میں نوع انسانی کی بنیادی ایکتا اور برابری میں یقین رکھتا ہوں اس لئے کیونکہ میں مانتا ہوں کہ ایشور اور اللہ ایک ہی ہیں۔ وہی سب کا ایشور ہے اس لئے میں نہیں مانتا کہ اس ایک اللہ کے بندوں میں اونچ نیچ کا کوئی فرق ہو۔ جب وہ نیک دن آئے گا کہ ریلوے اسٹیشنوں پر "ہندو چائے" اور "مسلم چائے" کی آوازیں نہ سنائی دیں گی۔ تب اسکولوں و کالجوں میں ہندوؤں اور غیر ہندوؤں کے الگ الگ نہ کمرے ہوں گے اور نہ تب فرقہ وارانہ اسکول و کالج ہوں گے اور نہ الگ الگ مذہب والوں کے لئے الگ الگ اسپتال۔"

"میری یہ دلی خواہش ہے کہ انسان، انسان کے بیچ ایسا بھائی چارہ قائم ہو جس میں ہندو، مسلمان، عیسائی، پارسی اور یہودی سب ایک طرح شامل ہوں کیونکہ مجھے دنیا کے سب بڑے بڑے مذاہب کی بنیادی سچائی میں یقین ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ سب مذہب ایشور کے دیئے ہوئے ہیں اور ان لوگوں کے لئے ضروری تھے۔ جنہیں یہ ایشور سے ملے۔ مجھے اس بات کا بھی یقین ہے کہ اگر ہم الگ الگ مذہبوں کی کتابوں کو ان مذہبوں کے ماننے والوں کی نگاہ سے پڑھیں تو ہمیں پتہ چلے گا کہ سب مذہبوں کی جڑ ایک ہی ہے۔"

"میں یہ نہیں چاہتا کہ میرے مکان کے چاروں طرف بڑی بڑی دیواریں کھڑی ہوں اور سب طرف کی کھڑکیاں ٹھونس ٹھونس کر بند کر دی گئی ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے مکان کے چاروں طرف سب ملکوں کی تہذیبیں کھلی ہوا کی طرح پوری آزادی کے ساتھ بہتی رہیں، پر میں یہ نہیں چاہتا کہ کوئی ہوا میرے پیر اکھاڑ دے۔"

"جنتا ہی نے مجھے مہاتما کا خطاب دیا تھا اور جنتا ہی اب مجھے یہ نئے خطابات (محمد گاندھی، جناح داس) دے رہی ہے۔ جنتا کے ان تحائف کا میں بڑی چاہ سے سواگت کروں گا۔"

"دنیا کے سبھی مذہبی معلمین نے سچائی کا جو عظیم پیغام دیا ہے میں اس پر یقین رکھتا ہوں میں برابر یہ دعا کرتا رہتا ہوں کہ برا بھلا کہنے والوں کے تئیں میرے دل میں ذرا میل نہ آئے۔ اگر قاتل کی گولی کا شکار بن کر مجھے اپنی جان کی بازی لگانی پڑے تب بھی میرے ہونٹوں پر رام کا ہی نام نہ ہو۔ زندگی کی آخری گھڑی میں اگر میرے ہونٹوں پر اپنے قاتل کے تئیں غصہ یا پھٹکار ہو تو میں چاہوں گا میرا نام بزدلوں کی فہرست میں لکھا جائے۔ دنیا ایسے لوگوں سے بھری پڑی ہے صرف میری ہی موت سے یہ ثابت ہوگا کہ میں محمد گاندھی ہوں، جناح داس ہوں، ہندو دھرم کا دشمن ہوں یا ہندو دھرم کا پیرو اور اس کا محافظ۔ ہمیں بدلے کی بھاؤنا کو دل سے نکال دینا چاہیئے۔ بدلے کو خدا پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ ہمیں نہ خدا سے انکار کرنا چاہیئے نہ اس کے کام اپنے اوپر لینے چاہئیں۔ جس دیش میں ہمالیہ کا سایہ ہو، جس دیس کی دھرتی کو گنگا جمنا کی پاک دھارائیں سیراب کرتی ہوں۔ اس دیش میں کیا ہم باہمی تشدد کے ذریعے ایک دوسرے کو ملیامیٹ کریں گے۔ میری یہ دعا ہے کہ خداوند تعالیٰ مجھے ایسا برا دن دیکھنے کے لئے زندہ نہ رکھے اور نہ میں وہ شرمناک نظارہ دیکھوں کہ اس باہمی تشدد سے لوگوں کی حفاظت کرنے کے لئے ہمیں انگریزوں کی مدد لینی پڑے۔"

آخری جنم دن ۲ اکتوبر ۱۹۴۷ء

"میں یہ پوچھتا ہوں کہ کیا مسلمانوں کے لئے یہاں ایک سورج ہے اور ہمارے اور آپ کے لئے کوئی دوسرا سورج ہے۔ سورج تو سب کے لئے ایک ہی ہے گنگا بہتی ہے تو یہ نہیں کہتی کہ خبردار کوئی مسلمان میرا پانی نہیں پی سکتا۔ بادلوں سے جب پانی برستا ہے تو بادل یہ نہیں کہتے کہ ہم برستے تو مسلمانوں کے لئے، پارسی عیسائیوں کے لئے نہیں بلکہ ہم تو صرف ہندوؤں کے لئے برستے ہیں۔ بھارت کی سرکار صرف ہندوؤں کے لئے ہے ایسا نہیں ہے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ قرآن کہو، گیتا کہو سب ایک ہیں۔ لباس الگ الگ ہیں۔ عربی زبان میں لکھو تو پیچھے اس کو کہو قرآن ہے، ناگری رسم الخط میں سنسکرت میں لکھو تو کہو وید ہے۔ دونوں کو اگر سمجھ کر پڑھو تو دونوں میں بنیادی باتیں ایک ہیں۔"

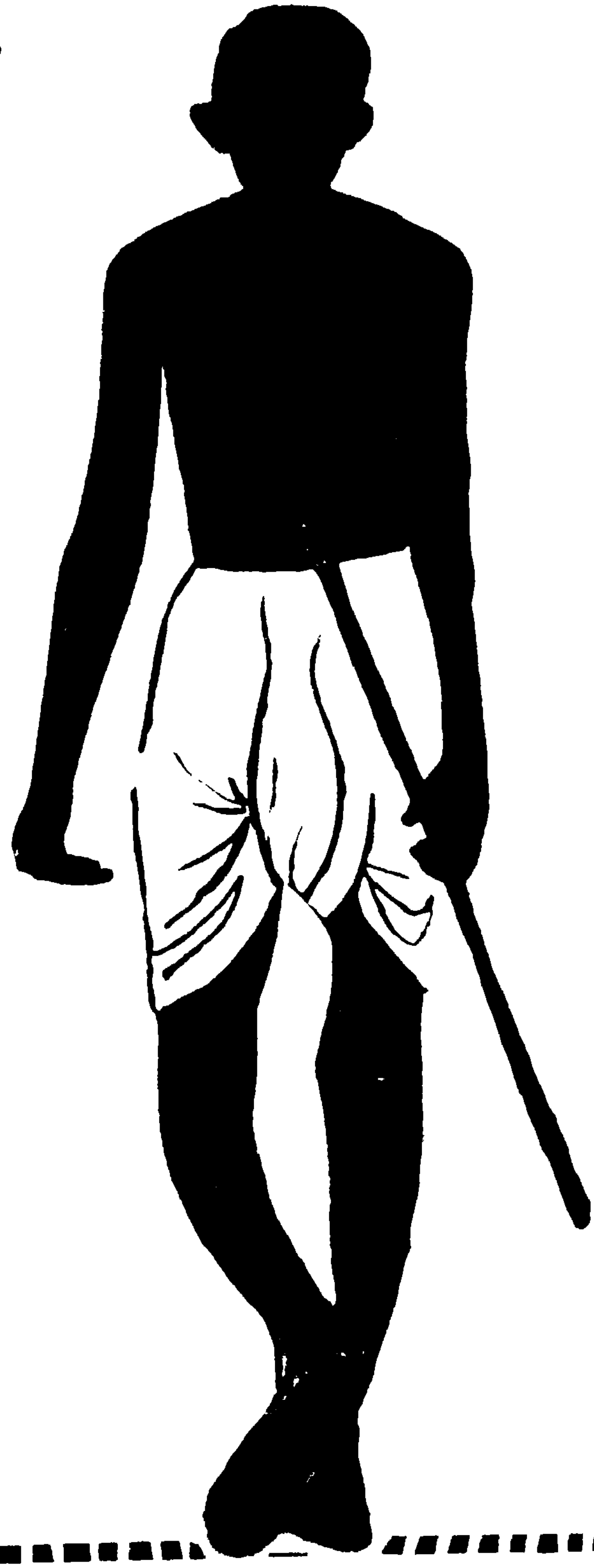
"آج میرا جنم دن ہے لیکن میرے لئے تو آج یہ ماتم کا دن ہے۔ میں آج تک زندہ پڑا ہوں۔ اس پر مجھے خود حیرت ہوتی ہے، شرم آتی ہے۔ میں وہی ہوں جس کی زبان سے ایک بات نکلتی تھی تو کروڑوں اسے مانتے تھے۔ پر آج تو میری کوئی سنتا ہی نہیں۔"

"جب سے میں ہندوستان آیا ہوں میں نے تو وہی کیا ہے جس سے ہندو، مسلمان ایک بنیں۔ دھرم سے نہیں، لیکن سب بھائی بھائی کی طرح رہیں، لیکن آج تو ہم ایک دوسرے کو دشمن کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ کوئی مسلمان کیسا ہی شریف ہو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی مسلمان شریف ہو ہی نہیں سکتا۔ جب ایسی دماغی کیفیت ہو تو ہندوستان میں میرے رہنے لائق کہاں جگہ ہے؟ میں ایسے ہندوستان میں زندہ رہ کر کیا کروں گا؟ آج ۱۲۵ سال زندہ رہنے کی میری بات چھوٹ گئی۔ ... ۱۰۰ سال کی بھی چھوٹ گئی اور ۹۰ سال کی بھی۔ آج

(باقی صفحہ ۲۹ پر)

مردہ روحوں کا مسیحا

کیلاش ماہر



زمیں کی کوکھ سے سابرمتی کی لہروں سے
کرن وہ پھوٹی جو تاریخ میں درخشاں ہے
جہاں غروب نہ ہوتا تھا آفتاب کبھی
دیارِ جبر و تشدد میں زلزلہ آیا
سمندروں سے پرے آفتاب ڈوب گیا!

زمین کی کوکھ سے پھوٹی وہ روشنی کی کرن

یہ دیوتاؤں کی دھرتی، پیمبروں کا وطن
کنول کا پھول مقدر تھا، ذہن کی خوراک
لہو کا رقص تھا، دار و رسن کی شہنائی

وہ معجزہ ہوا مُردوں نے کروٹیں بدلیں
وہ صور پھونکا کہ صدیوں کی نیند ٹوٹ گئی
حیات طوق و سلاسل کے غم سے چھوٹ گئی

سبھی سے گرمئ الفت، سبھی سے رشتۂ درد
غلام روحوں کی بستی میں وہ مسیحا تھا
پجاریوں نے جسے بُت بنا کے توڑ دیا!

خون کی صدا

شہزاد اختر

رات گھنی ہے
ریت کے بوڑھے پیڑ پہ بیٹھا کب سے میں یہ سوچ رہا ہوں
...میں نے اس کو قتل تو کر ڈالا ہے..... لیکن
خون کی ان چھینٹوں کو ابھی تک دھو نہ سکا ہوں
جو اس کی شہ رگ سے اڑ کر
میرے دامن اور چہرے پر پھیل گئی ہیں
اک اک انگلی آگ ہے اب تک
زہر ہے اس کے خون کی اک اک آوارہ آواز!

ریت کے بوڑھے پیڑ کے نیچے
کالے کالے ناگ مجھے للچائی نظر سے گھور رہے ہیں
دن کے زرد اُجالے میں
جب ناگ کہیں چھپ جائیں گے..... تب
میں بھی ریت کے پیڑ سے نیچے آ کر
پھر سے کوئی میٹھا چشمہ..... یا اک تلخ سمندر
ڈھونڈوں گا
کہ
خون
کی
اس
زہریلی
صدا
سے
پیچھا
چھوٹے!



مسلم عبادت گاہوں کی حفاظت

غزلیں

منظرؔ سلطان پوری

پایا نہیں سکون اُجالوں کی چھاؤں میں
جو روشنی کے ڈر سے چھپے ہیں گپھاؤں میں

خوشیوں کے ہر مکان میں جب لگ چکی ہے آگ
ڈھولک بجائیں بیٹھ کے اب غم کی چھاؤں میں

امن و سکوں کے شہر کی کیا بات ہے جناب!
ہوتا ہے روز ایک نیا قتل گاؤں میں

ممکن نہیں قبول دعائیں ہوں آج کل
باقی نہیں خلوص رہا جب دعاؤں میں

شاید اسی کا نام بلندی ہے اِن دنوں
اُٹھتا ہے ہر طرف جو دھواں سا فضاؤں میں

منظرؔ خلا میں کس لئے گم ہو رہے ہیں لوگ
شاید کہیں سکون چھپا ہے ہواؤں میں

نجات

الماس احمد

یہ سیہ رات مہیب سناٹے
لپک لپک کے مری سمت بڑھتے آتے ہیں
مرے وجود کے ڈسنے کو بے قرار سے ہیں
تھکی تھکی سی امیدیں مری شریکِ سفر
کھڑی ہیں ہات پسارے کہ اب بھی کہیں
انھیں عمیق اندھیروں کو چاک کر دے گی
وہ روشنی کی کرن جو نظر نہیں آتی
ابھی تو جسم و جاں کے اک ایک پیکر میں
مرے وجود کا پندار جاگزیں سا ہے
ابھی وہ آخری لمحہ کہ جس کو جانِ عزیز
سپرد کر دوں اور پھر نجات ملے
مرے وجود سے کچھ دور دور رہتا ہے

خوش فہمی

عبدالقادر ادیب

بے چھت کے مکانوں میں
پلتے ہیں ہواؤں پر
مرتے ہیں ہواؤں سے
جینے کا ہُنر جن کو
آتا ہی نہیں لیکن
بے سُر کے ترانوں پر
سب کچھ وہ لُٹاتے ہیں

مُرلی کی تان سن کر
بنسی میں جذب ہو کر
عرفاں کا نور بن کر
بنسی پہ چھا گیا ہے

نادان ہیں بھولے ہیں
کچھ لوگ ہیں ایسے بھی

احمد تنویرؔ

مسلی کلیوں کا ماتم بہت ہو چکا، کھلتی کلیاں چھپانے کی کوشش کرو
برق چمکی ہے کالی گھٹاؤں کے گھر، اب تو گلشن بچانے کی کوشش کرو
پیار بہنوں کا ہو یا کسی ماں کا ہو، پیار دیوی کا ہو یا کہ دلبر کا ہو
ہیں مقدر میں سب کے ہی رسوائیاں، ان کی عظمت بچانے کی کوشش کرو
لاکھ مندر میں پوجا کریں بھی تو کیا، لاکھ مسجد میں سجدہ کریں بھی تو کیا
اپنے گھر میں ہی سڑتی ہوئی لاش ہے، اس کو چادر اوڑھانے کی کوشش کرو
زندگی چار دن کی ہے بس دوستو، میٹھی بولی ہی بولو فقط دوستو
بھول جاؤ وہ نفرت، وہ شکوے گلے، دل سے دل کو ملانے کی کوشش کرو
گھپ اندھیرا ہوا کارواں لُٹ گیا، آج تنویرؔ تنہا کدھر جاؤ گے
راہ ڈھونڈو گے کیسے اندھیرے میں تم، اپنا دل ہی جلانے کی کوشش کرو

تقلید کا غلط مفہوم



انجم عثمانی

اپریل کے شمارے میں انجم عثمانی کا مضمون 'مشکل یہیں سے' عنوان کے تحت شائع ہوا تھا۔ یہ نیا مضمون بھی ایک طرح سے اسی سے متعلق ہے۔ دونوں مضامین میں متنازعہ لیکن خیال انگیز باتیں ہیں۔ اور خیال انگیزی کو "سیکولر ڈیموکریسی" بہرحال پسند کرتا ہے۔ مضمون کا لب ولہجہ ذرا سخت ضرور ہے لیکن شاید اس مضمون کے لئے یہ ضروری بھی تھا۔ ادارہ

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ماضی میں مسلمانوں کے علم وفضل، ان کی بلند کرداری اور تہذیبی ترقی میں ان کے دینی مدرسوں کا نمایاں رول رہا ہے لیکن اس سے بھی انکار نہیں کہ موجودہ دور میں مدرسوں سے وابستہ مسلمانوں کا یہ مخصوص گروہ اپنا مقام کھو چکا ہے، اپنا اعتبار گنوا چکا ہے اور وقت کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ آج ان کی یہ حالت کیوں ہے؟ جس گروہ کے افراد نے وقت کے مشکل ترین مسئلوں کا بہترین حل دنیا کے سامنے پیش کیا تھا وہ گروہ آج خود ایک سوالیہ نشان کیوں بنتا جا رہا ہے؟

اس سوال پر اگر انصاف اور کھلے ذہن کے ساتھ غور کیا جائے تو اس کی دو بڑی وجہیں نظر آئیں گی۔ ایک یہ کہ اس حلقہ میں طلبا کا غلط مفہوم مروج ہو گیا ہے۔ دوم زندگی کے نئے مسائل سے یہ علقہ ناواقفت اور فکری و ذہنی جمود کا شکار ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس طرز پر جس تعلیمی نظام کو اسلاف قائم کر گئے ہیں وہ نظام ان کے دور میں تو اس زمانے کے حالات کے عین مطابق تھا مگر موجودہ دور کے تقاضوں کے اعتبار سے اس میں بہت سی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔

اس میں تو شک نہیں کہ احکام قرآن اور احادیث کے خلاف مدرسوں کا نظام قائم نہیں کیا جا سکتا، یقیناً تمام تعمیر ان ہی بنیادوں پر استوار ہونی چاہئے جو قرآن وحدیث نے متعین کر دی ہیں لیکن تعمیر روایتی انداز کی ہو یہ کیا ضروری ہے؟ یہ صحیح ہے کہ مدرسوں کے نصاب کا ماخذ قرآن وحدیث ہی ہوں لیکن ان کو سمجھانے اور پڑھانے کا طرز دقیانوسی ہو، یہ کیا ضروری ہے؟ بڑی مشکل یہ ہے کہ وہ لوگ جو نئے حالات میں خود کو ڈھال نہیں سکتے۔ وہ اندھی تقلید میں مبتلا رہتے ہیں جس سے ترقی کی راہ میں بڑی رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں یہ کور نظر مقلد نہیں سوچتے کہ جس طریقہ کی ہم رٹ لگائے ہوئے ہیں وہ بھی کبھی نیا طریقہ تھا اور وقت وحالات کے مطابق اس کو ترتیب دیا گیا تھا۔ کیا مدرسوں کی موجودہ شکل قرآن وحدیث کا متعین کرنا ہے؟ کیا تعلیم کے اوقات، مدت اور طریقہ تعلیم اور نصاب وغیرہ بھی احادیث اور آیات قطعیہ کا حکم رکھتے ہیں؟ کہ ان میں تبدیلی ناممکن قرار دی جائے اگر نہیں تو پھر ان چیزوں میں مفید تبدیلیوں کے نام سے بھی ناک بھوں کیوں چڑھایا جاتا ہے؟ کسی نے ذرا بھی اس نظام میں سدھار کی بات کی اور اس خود ساختہ رہبر طبقہ نے اس کو بہکا ہوا، جدید یا، حتیٰ کہ بعض مرتبہ دہریہ تک قرار دیا۔

اسلاف کی تقلید یقیناً مفید ہے لیکن اسی حد تک کہ اپنے بزرگوں کی سی محنت، ان کی کاوش، خلوص، صبر، استقلال اور ان کا سا حصول علم میں انہماک پیدا کریں۔ نہ یہ کہ ہمارے بزرگ جو کچھ کر گئے ہیں اس پر فخر کریں، اور انہی کے کئے ہوئے پر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں۔ ...... یقیناً روشن ماضی کو بھلایا نہیں جا سکتا، یقیناً مستقبل کی روشنی کے لئے ماضی کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ اسلاف کے علمی، تہذیبی اور قومی کارناموں کو ذہن میں رکھنا چاہیئے لیکن یہ نہ ہونا چاہیئے کہ اسلاف کے متعین کئے ہوئے خطوط کے علاوہ باقی سب خطوط اور ترقی کی تمام نئی راہوں کو بیکار سمجھا جائے اور جدید علوم، ضروریات، مسائل اور ایجادات سے آنکھیں بند رکھی جائیں۔ یہ مراد ہرگز نہیں کہ اسلاف کے سنہرے کارناموں کو بھلا دیا جائے بلکہ یہ کہ اب مسائل بہت کچھ بدل چکے ہیں۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اس نظام پر پھر حدیث وقرآن کی روشنی میں نظر کی جائے مدرسوں کے نظام کا ازسرنو جائزہ لیا جائے۔ نصاب کو پھر اس طور پر ترتیب دیا جائے کہ موجودہ مسائل کا قابل عمل حل ممکن ہو سکے۔

مثلاً موجودہ نصاب میں معقولات (RATIONALISAM) کا اکثر حصہ اب تک اسی زمانے کے مسائل سے متعلق چلا آ رہا ہے جو موجودہ نسل کے لئے کہانی بن چکے ہیں۔ دنیا مریخ اور چاند تک پہنچ رہی ہے۔ سائنس کی جدید تر معلومات نے قدیم مفروضات اور فرسودہ خیالات کی دھجیاں بکھیر دی ہیں اور یہاں ابھی تک یہی بحث ہو رہی ہے کہ زمین گھومتی ہے یا آسمان۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ طلبار کو جدید تر معلومات فراہم کی جائیں۔ سائنس وہیئت کی نئی کتابیں کورس میں داخل ہوں تاکہ طلبا اس میدان میں جاہل ثابت نہ ہوں۔

یہی حال حساب (ریاضیات) کا ہے مدرسوں میں یہ برائے نام ہے اور وہ بھی سینکڑوں سال پرانا نتیجہ

یہ کہ طلبا ضرب تقسیم سے آگے نہیں بڑھ پاتے۔ ادب (لٹریچر) میں بھی یہی صورت حال ہے ادب کا معیار طرز اور اس کے اسلوب (اسٹائل) اور اقدار میں نمایاں تبدیلیاں واقع ہو گئی ہیں۔ طرز خطاب بدل گیا ہے لیکن یہاں ابھی تک "انشائے فارغ" سے ہی فراغت نہیں۔ یہی حال جغرافیہ کا ہے کہ بہت سے مدرسوں میں تو ہے ہی نہیں اور اگر کہیں ہے بھی تو بہت فرسودہ اسلئے کہ اب جغرافیائی پوزیشن بہت کچھ بدل چکی ہے۔

تاریخ (ہسٹری) بھی اسی کیفیت میں مبتلا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ مدرسوں کے طلبا تاریخ عالم سے تو کیا واقف ہوتے مکمل طور سے تاریخ اسلام ہی سے واقف نہیں ہو پاتے۔

رہی زراعت (ایگری کلچرل) تجارت اور صنعت تو یہ سرے سے فہرست ہی میں نہیں ہیں۔ اس صنعتی دور میں صنعت سے تغافل اور تہی دامنی بھلا کہاں کی عقل مندی اور دانائی ہے؟ یقیناً مدرسوں میں ایسے شعبے ہونے چاہئیں جہاں سے ایک مولوی ایک اچھا صنعت کار ہو کر نکلے۔

اسی طرح کورس کے طویل اور مختصر ہونے کا معاملہ ہے۔ موجودہ کورس اتنا طویل ہے کہ اگر اس کو مکمل طور پر پڑھا جائے تو عمر کا بہت بڑا حصہ اس میں لگ جاتا ہے۔ موجودہ کورس کیونکہ صدیوں پرانا ہے اس لئے اسی وقت کے لحاظ سے ہے کہ جب لوگوں کے پاس فرصت تھی۔ معاشی اور دیگر مسائل اس قدر پیچیدہ تھے اور نہ ہی اس بات کی اہمیت تھی کہ اس نصاب کے بعد کچھ اور بھی حاصل کیا جائے لیکن موجودہ دور میں یہ صورت حال باقی نہیں ہے بلکہ آج مصروفیات بڑھ گئی ہیں۔ اب حالات عام طور پر اس کی اجازت نہیں دیتے کہ اس قدر لمبا کورس پڑھا جائے اور اس کے بعد کسی اور جانب توجہ کی جائے (جو کہ موجودہ صورت میں معاشی کفالت کے لئے ضروری ہے) یا تو یہ کہ نصاب اس قدر جامع ہو کہ اس کو پڑھ چکنے کے بعد اقتصادیات کے لئے بھی کسی اور علم کی ضرورت نہ رہے (اور یہ جب ہی ممکن ہے کہ جب نصاب میں صنعت وحرفت کو نمایاں مقام حاصل ہو) یا یہ ہو کہ کورس اتنا مختصر ہو کہ اس کے بعد بھی بہت سا وقت اور ہمت بچ رہے مثلاً اگر ایسا طریقہ کار اختیار کیا جائے جس سے پورے ملک کے مدرسوں میں یکساں کورس مروج ہو جائے اور موجودہ دور کے اعتبار سے تمام مسئلوں اور ضرورتوں کو سامنے رکھ کر احادیث وقرآن کی روشنی میں شعبے قائم کئے جائیں تو اس طرح پورے ملک کے مدرسے باعتبار نظام بھی ایک ڈوری میں پرجائیں گے اور جب نئے نصاب میں تمام علوم کو خاطر خواہ مقام حاصل ہوگا اور ان کی تعلیم اس طریقے پر ہوگی کہ طلبا روایتی فارغ نہ بن کر اس دور کے مسائل کے عالم بھی بن سکے گا۔ تو مولوی ایک محدود میدان کا آدمی نہیں بلکہ ہمہ گیر نظام سے نکلا ہوا ایک ہمہ گیر انسان ہوگا، جس کی دوڑ مدرسوں اور مسجدوں تک ہی نہیں ہوگی بلکہ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں دینوی اور دنیاوی دونوں اعتبار سے کارآمد انسان ہوگا۔

ان تمام صورتوں کے سامنے آنے سے قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اب تک ایسا نظام کیوں قائم نہیں کیا گیا؟ صورت حال یہ ہے کہ ہمارے یہاں اس طبقہ کے صاحب اثر واقتدار افراد تین قسم کے ہیں

۱۔ وہ لوگ جو ایسی باتوں پر غور کرنے کی نہ صلاحیت رکھتے ہیں اور نہ ضرورت سمجھتے ہیں (جن کو مصلحتاً صاحب اقتدار بنایا گیا ہے)۔

۲۔ وہ افراد جو مخلص ہیں اور یقیناً متقی و پرہیزگار بھی اور موجودہ مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں مگر گوشہ نشین ہیں اور اپنی جنت سیدھی کرنے کے علاوہ اجتماعی نظم کے سدھار کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے۔

۳۔ وہ لوگ ہیں جن کے سامنے یہ سب مسئلے ہیں لیکن جو اس وجہ سے کہ نئے نظام کے لئے مزید محنت، خلوص اور قابلیت درکار ہوگی اور جس نام نہاد تقوے و بزرگی اور اسلاف کی تقلید کے نام پر دھاندلے بازی سے انھوں نے دولت، شہرت اور کرسی حاصل کر رکھی ہے۔ اس دھاندلے بازی کا پردہ اس نئے نظام میں پاش پاش ہو جائے گا اس لئے ان مسائل کا تذکرہ نہیں کرتے اور جانتے بوجھتے اپنی چالاکیوں سے قوم کو بیوقوف بنائے ہوئے ہیں۔

دراصل یہ تیسری قسم کے افراد ہی تقلید کا غلط معیار اور پیروی کا غیر صحیح مفہوم اپنے مفادات کی خاطر قائم کئے ہوئے ہیں اور دن رات اس کی تلقین کر کے اپنی جیبیں اور پیٹ بھر رہے ہیں اور بدنصیبی یہ کہ اپنی چالاکیوں سے عوام کے مذہبی طبقہ پر اپنا تسلط آج بھی یہی لوگ جمائے ہوئے ہیں۔ ان سے جب کہا جاتا ہے کہ وقت بدل چکا ہے۔ حالات کا دھارا فرسودہ نظاموں کو برداشت نہیں کرتا ہے تم لوگ صاحب اقتدار ہو مدرسوں کا نظام ایسا کیوں قائم نہیں کرتے کہ ان سے وابستہ حلقوں کی معاشیات بھی سدھرے اور اخلاق بھی؟ تو یہ لوگ بپھر جاتے ہیں اور اسے اپنے اقتدار پر حملہ قرار دیتے ہیں۔ ایسی باتیں کرنے والے کو نالائق جدید یا وغیرہ کے طعنوں سے نوازتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم سے پہلے لوگ جو نظام قائم کر گئے اسے کیسے بدلا جا سکتا ہے۔ دلیل یہ کہ اسلاف کیا (خدانخواستہ) بیوقوف تھے کہ انھوں نے یہ نظام بنایا؟ کیا ہم ان سے زیادہ سمجھدار ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح وہ فعّال اور سوجھ بوجھ رکھنے والے حسّاس افراد کو بزعم خود قائل کرتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ کہ یہ لوگ نہ اسلاف کے صحیح پیروکار ہیں اور نہ ہی یہ ان کی روایات کے حامل بلکہ اسلاف پرستی کے پردہ میں اپنا پیٹ بھر رہے ہیں، اپنی جیبیں بھاری کر رہے ہیں، مذہب کے نام پر اپنی دکانیں سجا رہے ہیں، مدرسوں کے نام پر تجارت کر رہے ہیں۔ اس پر طرّہ یہ کہ جگہ جگہ اعلان کرتے پھرتے ہیں کہ اس بحرانی دور میں کہ جب افراد کی اور پیسوں کی کمی ہے، ہم ہی ہیں جو اپنی جان پر کھیل کر اسلاف کی روایات کو زندہ رکھے ہوئے ہیں، ہم ہی ہیں کہ جو بھوکے پیاسے ان مدرسوں کو چلا رہے ہیں۔ جب کہ حالت یہ ہے کہ پورے ملک میں ہزارہا کی تعداد میں

مدرسے ہیں، لاکھوں کی طلبا کی تعداد ہے اور کروڑوں روپیہ ان پر صرف ہو رہا ہے۔ اگر حساب کیا جائے (جس کے لئے یہ کبھی تیار نہ ہوں گے) تو کمی نہ افراد کی ملے گی اور نہ دولت کی، بلکہ اخراجات کی بے جا زیادتی اور بے ایمانی کا کرشمہ نظر آئے گا۔ ہمدرد مسلمان مختلف قسم کی انفرادی و اجتماعی مشکلات میں گھرے ہونے کے باوجود اپنا پیٹ کاٹ کر دولت اور جگر گوشے ان کے حوالے کر دیتے ہیں اور یہ خود غرض افراد ان کو صحیح اسلامی تعلیم دینے کے بجائے بچھڑی ہوئی اور جامد شئے بنا دیتے ہیں۔ کون کہتا ہے کہ روپے کی کمی ہے؟ جتنے روپے عوام ان مدرسوں پر خرچ کر رہے ہیں ان ہی کو اگر خلوص، ایمانداری اور حسن انتظام سے خرچ کیا جائے تو اتنی ہی دولت میں قوم کے بہت سے کام نمٹ سکتے ہیں اور عمدہ، قابل، تعلیم یافتہ اور لائق فخر نسل پروان چڑھ سکتی ہیں۔ لیکن یہ ایسا کبھی نہ ہونے دیں گے۔ انھیں معلوم ہے کہ اصلاح کی تحریک ان کی بدعنوانیوں اور ان کے ذہنی جمود کا بھانڈا پھوڑ دے گی۔ اس لئے اسلاف کی تقلید کا ڈھونگ رچائے ہوئے ہیں ورنہ اسلاف یہ کب اور کہاں کہہ گئے تھے کہ تم اپنی آنکھوں پر پٹی باندھے رکھنا، زمانہ چاہے کہیں سے کہیں پہنچ جائے تم جوں کے توں رہنا اور اس طرح اسلام کو محدود اور اسلامی تعلیم کو اگلے وقتوں کی چیز بنا دینا۔ اسلاف نے تو ہمیشہ وقت کے مسائل کا حل قرآن کی روشنی میں دنیا والوں کے سامنے پیش کر کے ثابت کیا ہے کہ اسلامی تعلیم اور اس کا ہمہ گیر نظام ہر دور میں نیا ہے۔ وقت کے ہر مسئلے کا قابل عمل حل ہے۔ اسلاف سمجھتے تھے کہ اسلام کسی بھی فرد کو نہ صرف یہ کہ زندگی کی دوڑ میں پیچھے نہیں رکھنا چاہتا بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں ہر شخص کو ترقی پذیر دیکھنا چاہتا ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ لوگ قدامت پرستی اور تقلید کے غلط مفہوم کو صحیح تقلید اور اسلاف کی روایات کے احترام کا نام کیوں کر دیتے ہیں؟ اور ان کی اس خود غرضی کو تحفظ اقدار اور تحفظ مذہب کا نام کس طرح دیا جائے؟ یہ خود غرضی کوتاہ فہمی، فکری جمود اور تقلید کا غلط معیار نہیں تو اور کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ افراد جو صحیح طور پر قوم کی کچھ ذمہ داری اپنے اوپر سمجھتے ہیں وہ خلوص کے ساتھ میدان عمل میں آئیں اور کسی تعلق، کسی اقتدار اور ان نام نہاد بزرگوں کی پرواہ کئے بغیر، اسلامی تہذیب و تعلیم کا وقار قائم رکھنے کے لئے مدرسوں کے موجودہ نظام میں حالات کے تقاضوں کا لحاظ رکھتے ہوئے صالح اور مفید تبدیلیاں لائیں تاکہ مولوی اور مولویت کے دامن کے یہ بدنما داغ دھل سکیں اور مدرسوں کے ذریعہ اسلامی نظام و تہذیب کی صحیح شکل سامنے آسکے۔

(گاندھی جی کی باتیں۔ بقیہ صـ۲۳ کا)

"۱۵ اگست کو ہمیں آزادی مل گئی۔ لیکن وہ میرے خوابوں کی آزادی نہیں ہے۔ میں اسے آزادی نہیں مانتا۔ میرے خوابوں کی آزادی ملی ہی نہیں۔ یہ کیسی آزادی ہے کہ اس میں ہندو، مسلمان کو اپنا دشمن سمجھتا ہے اور مسلمان، ہندو اور سکھ کو۔ ہم دنیا میں کسی کو اپنا دشمن بنانا نہیں چاہتے اور نہ کسی کے دشمن بننا چاہتے ہیں۔ یہ ہے میرے خوابوں کی آزادی ایسی آزادی ابھی نہیں آئی۔ کیا ہمارے بھائی بھائی آپس میں دشمن بنیں گے؟ اگر ہم اوپر اٹھنا چاہتے ہیں تو ہمیں بھائی بھائی بن کر رہنا ہوگا۔ بغض اور نفرت بھری ہے۔ آج ایشور کی نگاہ میں دونوں ہی گناہ گار ہیں، جو ہندو کریں وہ مسلمان کو برا لگے اور جو مسلمان کرے وہ ہندو کو برا لگے تو وہ سچی آزادی کیسے ہو سکتی ہے؟"

"جو برائی کرتا ہے، وحشیانہ بات کرتا ہے۔ وہ جنگلی بن جاتا ہے، جاہل بن جاتا ہے۔ تو کیا میں بھی جاہل اور جنگلی بنوں۔ پاکستان والے جاہل بنیں تو کیا یہاں کے ہندو اور سکھ بھی جاہل بن گئے، تب ایک جاہل دوسرے جاہل کو کیا کہے۔ تو میں تو آپ سے یہ کہوں گا کہ ہندوستان کے ہندو، سکھ، مسلمان، ہندوازم، سکھازم اور اسلام کو بچانے کا کام کریں۔ ہم شریف بنیں تو پاکستان کے مسلمانوں کو بھی شریف بننا پڑے گا، یہ دنیا کا قانون ہے۔ اس قانون کو کوئی بدل نہیں سکتا، یہ آپ کو ایک ایسا بوڑھا آدمی بتا رہا ہے جس نے مذہب پر عمل کیا ہے جس نے ہر ایک کی بھلائی کرنے کی کوشش کی ہے، جس نے زندگی ۷۹ سال میں بہت تجربہ حاصل کیا ہے، میں کوئی آنکھ بند کر کے دنیا میں نہیں گھوما۔ جنوبی افریقہ جیسے جنگلی ملک میں میں صرف ایشور کے سہارے ہی رہ سکا، اس لئے میں آپ کو اپنے تجربے سے بتا سکتا ہوں کہ یہ ہمارا کام نہیں کہ ہم برائی کا بدلہ برائی سے دیں، برائی کا بدلہ ہم بھلائی سے دیں یہ سچی انسانیت ہے۔ جو بھلائی کا بدلہ بھلائی سے دیتا ہے وہ تو بنیا بن گیا اور جھوٹا بنیا۔ میں کہتا ہوں کہ میں بنیا ہوں، مگر سچا بنیا۔ آپ جھوٹے بنیے نہ بنیں۔ سچا انسان وہ ہے جو برائی کا بدلہ بھلائی کر کے دیتا ہے۔ یہ میں نے بچپن میں سیکھا ہے اور لمبے تجربے سے سیکھ سکا ہوں کہ یہ سچی بات ہے، اس لئے میں آپ سے کہتا ہوں کہ برے کا بدلہ ہم بھلا بن کر دیں۔"

"مجھے شرم کے ساتھ یہ منظور کرنا پڑتا ہے کہ آج ہمارا گھر پھوٹ کا اکھاڑہ بن گیا ہے۔ بزدلی اور خوف کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کا گلا کاٹنے دوڑتے ہیں، مسلمانوں کی ہندوؤں پر جو بے اعتمادی ہے اس کی جڑ میں بھی وہی بزدلی اور بے بنیاد خوف ہے اپنی پوری تاریخ میں اسلام نے لاثانی بہادری اور امن کا ثبوت دیا ہے اس لئے مسلمانوں کے لئے یہ کوئی سچی فخر کی بات نہیں ہے کہ وہ ہندوؤں سے ڈریں، کیا ہم اتنے گر گئے ہیں کہ خود اپنی ہی پرچھائی سے ڈریں؟"

قومی ایکتا ٹرسٹ کی چند مطبوعات

- فرقہ پرستی کے خلاف
  جمہوریت کی آواز
  (راجیہ سبھا میں بل کی منظوری)
  قیمت:۔ ۶۰ پیسے

- علیگڑھ مسلم یونیورسٹی (ترمیمی بل) ۷۲ء ۱۹
  لوک سبھا میں بحث (حصہ اول)
  قیمت:۔ ۳۰ پیسے

- علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (ترمیمی بل) ۱۹۷۲ء
  راجیہ سبھا میں بحث
  قیمت:۔ ۷۵ پیسے

- فرقہ پرست تنظیموں پر پابندی
  لوک سبھا میں بل کی منظوری
  قیمت:۔ ۷۰ پیسے

- شملہ سمجھوتہ اور اس کی اہمیت
  وزیر اعظم اندرا گاندھی کی لوک سبھا میں تقریر
  قیمت:۔ ۲۵ پیسے

- علیگڑھ مسلم یونیورسٹی ترمیمی بل
  (حقائق کی روشنی میں)
  ڈاکٹر نورالحسن و ڈی۔ آر۔ گوئل
  قیمت:۔ ۷۰ پیسے

- علیگڑھ مسلم یونیورسٹی ترمیمی بل
  خلیق انجم
  قیمت:۔ ۵۰ پیسے

- دو گاؤں کی کہانی
  (اتر پردیش کے نوناری اور سمبھی کے فسادات کا ایک جائزہ)
  این۔ کے۔ سنگھ
  قیمت:۔ ۲۵ پیسے

- ریاستوں کی نئی تنظیم اور
  جن سنگھ کی موقع پرستی
  از۔ لتا پنت
  قیمت:۔ ۲۵ پیسے

- علیگڑھ مسلم یونیورسٹی (ترمیمی بل) ۱۹۷۲ء
  لوک سبھا میں بحث (حصہ دوم)
  قیمت:۔ ۵۰ پیسے

- سامپردائکتا درودھی کمیٹی کی
  دستاویزات
  قیمت:۔ ایک روپیہ

- فرقہ پرستی مٹائیے
  پارلیمنٹ میں پر زور مطالبہ
  قیمت ایک روپیہ

- شملہ سمجھوتہ! ایک سنگ میل
  وزیر اعظم اندرا گاندھی کی راجیہ سبھا میں تقریر
  قیمت:۔ ۵۰ پیسے

- راجدھانی میں
  فرقہ پرستوں کی شرمناک سازش
  ڈی۔ آر۔ گوئل
  قیمت:۔ ۵۰ پیسے

- مسلم لیگ — ایک خطرہ
  میر مشتاق احمد
  قیمت:۔ ۲۵ پیسے

- آر۔ ایس۔ ایس کا کالا سایہ
  بنارس یونیورسٹی پر
  این۔ کے۔ سنگھ
  قیمت:۔ ۲۰ پیسے

ملنے کا پتہ:۔ ۸۔ ۱۹، تھیٹر کمیونی کیشن بلڈنگ۔ کناٹ سرکس، نئی دہلی ۱

(اقبال اور نظریہ پاکستان۔ بقیہ صفحہ ۱۸ کا)

کے لئے استعمال کیا جس نے مسلم بورژوا قوم پرستی کو جنم دیا۔

ان ایام میں ایک نیا معاشرہ 'وطنیت و قومیت' کے ترقی پسند افکار سے سرشار آگے کی جانب بڑھ رہا تھا نئی تہذیب نے پرانے عقائد کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا تھا ہندو کی روایت پرستی نے تسکین قلب کے لئے گاندھی کو باپو مان لیا تھا لیکن مستقبل کی تعمیر کے لئے جواہر لال کو منتخب کیا۔ ہندو نے بڑی خاموشی سے مذہب و سیاست کو دو خانوں میں تقسیم کر دیا۔ مذہب موجودہ صنعتی دور کے دیچیدہ مسائل کا حل پیش نہیں کرتا تھا اس لئے نئے طبقوں کے لئے ایک چیستاں یا روایت کی حیثیت میں رہ گیا۔ مسلم طبقہ اشرافیہ کے ذہن میں تاریخ کا ایک دھندلا شعور موجود تھا جو ان کو یہ بتاتا تھا کہ مذہب نے ساربانوں کو شہنشاہ بنا دیا اور دنیا کی دولت قدموں میں بکھرنے لگی۔ مسلم متوسط طبقہ کو مذہب کی ضرورت تھی۔ اس ضرورت کے پیش نظر اس بات کی بھی ضرورت تھی کہ مذہب کو پھر سے سنوارا جائے اور موجودہ عہد کے تقاضوں سے ہم آہنگ بھی کیا جائے۔ سر سید اور سید امیر علی وغیرہ نے اسلام کی نئی تعبیریں کرکے اسلام کو بورژوازی کے سانچہ میں ڈھال دیا تھا۔ علامہ اقبال نے اسلام کو نوع انسانی کی خدمت سے واپس لے لیا اور "نیابت الٰہی کی جگہ نیابت ملی" کو دی جس کی قیادت "مرد کامل" کے ہاتھ میں تھی۔ اقبال کا مرد کامل، نیتشے کا "فوق البشر" تھا جو عوام کو بیوقوفوں کا غول کہتا تھا۔ واضح رہے کہ جب اقبال "مرد کامل" کی تعبیر کر رہے تھے ہندو "مرد کامل" پیدا کر چکا تھا۔ ہیڈگے گوار نے ۱۹۲۲ء میں راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ جیسی نیم فاشسٹ جماعت کی بنیاد قائم کی۔ اقبال کا شاہین مسلم بورژوا تھا جس کو وہ یہ تلقین کرتے تھے۔

جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر
وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

وہ سماجی اصلاح کے لئے متاع تیموری اختیار کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ یہ جملہ تصورات ایک ہی سمت میں لے جا رہے تھے یعنی مسلم قومیت کا جذبہ۔ مسئلہ قومیت پر اپنے مدراس لیکچرز (۱۹۰۹ء) میں انھوں نے فرمایا۔

"ملت اسلامیہ کی رکنیت مقام پیدائش یا سلسلہ نسب سے متعین نہیں ہوتی ہے اس کے لئے عقیدہ کا اتحاد پہلی شرط ہے۔ ہندوستانی مسلمان کی اصطلاح خواہ کتنی ہی موزوں ہو لیکن شرائط اسلام کے پیش نظر منفی اصطلاح ہے چونکہ اسلام اپنی ماہیئت کے اعتبار سے ماورائے مکان، و زماں ہے اس لئے تصور قومیت ہمارے لئے محض ایک ضمنی مطمح نظر تھا جس کی بنیاد علاقائی نہیں ہے۔ چونکہ اوسط درجہ کے انسان کو اظہار قومیت کے لئے مادی مرکز کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے مسلمان کا مرکز قومیت حرم پاک کعبہ ہی ہو سکتا ہے تاکہ مسلم قومیت حقیقی و مثالی جوہر سے ہم آہنگ ہو سکے۔"[۱]

ایک دیگر مضمون میں اور زیادہ واضح الفاظ میں فرماتے ہیں:۔

"کہ جب میں نے یہ محسوس کیا کہ قومیت کا تخیل جو نسل و وطن کے امتیازات پر مبنی ہے اسلام پر بھی حاوی ہوتا جاتا ہے اور جب مجھے یہ نظر آیا کہ مسلمان اپنے وطن کی عمومیت و قومیت کے عقیدے میں پھنسے جاتے ہیں تو بہ حیثیت ایک مسلمان، اور محب نوع کے میں نے اپنا فرض سمجھا کہ میں ارتقائے انسانیت میں انھیں ان کے اصلی فرض کی طرف توجہ دلاؤں۔" ...... [۲]

(۱۹۲۷ء میں) علامہ اقبال جب پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے ممبر تھے تب بھی انھوں نے مسلم لیگی طرز اختیار کیا مثلاً پنجاب اسمبلی میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ سرکاری ملازمتیں مقابلے کے امتحانوں کے بعد ہی پُر کی جائیں علامہ اقبال نے اس تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ

"حکومت نے رنگ و نسل کا امتیاز اٹھا دیا ہے اور اس طرح وہ آسامیاں جو پہلے برٹش افسروں کو ملتی تھیں اب ہندو اور مسلمانوں کے حصہ میں آتی ہیں لیکن میں اپنے دوستوں کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ حکومت نے اس معاملہ میں بڑی سخت غلطی کی ہے۔ اگر برٹش افسروں کی تعداد میں اضافہ کر دیا جائے تو میں اس کا خیر مقدم کروں گا۔"[۳]

کسی قدر حیرت کا مقام ہے کہ حکیم الامت وہ نسخہ تجویز فرما رہے تھے جو برطانوی استعمار پرستوں نے تیار کیا تھا۔ وہ ہم وطنوں پر بیرونی آقاؤں کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہندوستانی تحریک آزادی کے رہ نماؤں کے مقابلہ میں ان کے تعلقات مسلم جاگیری طبقہ سے زیادہ قریب رہے۔ مسلم رجعت پسندوں کے سرخیل سر آغا خاں سے ان کے تعلقات تا زیست استوار رہے۔

علامہ اقبال کے سیاسی پیمانے وہی تھے جو کٹر رجعت پرستوں کے ہوتے ہیں۔ ۱۹۲۸ء میں مسلم لیگ نے سائمن کمیشن کو اپنی یادداشت بھیجی تو اس میں ایک وحدتی Unitary صوبائی نظام کی تجویز پیش کی۔ اس تجویز کے خلاف اقبال نے احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ "مسلم لیگ کو مکمل صوبائی خود مختاری کا مطالبہ کرنا چاہیئے تھا۔" اقبال کا ذہن عرصے سے مسلمانوں کے لئے جداگانہ ریاست کے قیام کے لئے کام کر رہا تھا۔ جداگانہ قومیت پر ان کے اصرار میں جداگانہ ریاست کا مطالبہ موجود تھا۔ وہ ایک عرصہ تک 'ملت اسلام' کو 'ماورائے مکان و زماں' کہتے رہے اور نظریۂ وطنیت کی مخالفت کرتے رہے۔ یہ وہ دور تھا جب وہ مسلمانوں میں جداگانہ قومیت کے احساسات کو نظریہ کا جامہ پہنا رہے تھے۔ تحریک خلافت میں جاگیری قیادت پارہ پارہ ہو گئی اور اس کی جگہ مسلم بورژوا نے حاصل کی تو اس نے ان تمام نظریات کو بھی اپنا لیا۔ اس کے بعد اقبال نے ۱۹۳۰ء کے مسلم لیگ کے اجلاس الٰہ آباد میں نظریۂ تقسیم کا تصور پیش کیا۔ انھوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں جو الفاظ استعمال کئے وہ جداگانہ ریاست

[۲] A.P. Karuna Karan
Continuity and Change
in Indian Politics.

[۳] دلی سے اقبال تک صفحہ ۱۱۱۔ ڈاکٹر سید عبداللہ
[۴] اقبال اور سیاست ملی صفحہ ۱۸۵ رئیس احمد جعفری کراچی

کے قیام کی جانب ہی اشارہ کرتے تھے :۔

" اسلام کے نزدیک ذاتِ انسانی بجائے خود ایک وحدت ہے وہ مادے اور روح کی کسی ناقابلِ اتحاد ثنویت کا قائل نہیں۔ مذہب اسلام کی رو سے خدا اور کائنات کلیسا اور ریاست اور روح اور مادہ ایک ہی کُل کے مختلف اجزاء ہیں ...... اسلام اب بھی ایک زندہ قوت ہے جو ذہنِ انسانی کو نسل و وطن کی قیود سے آزاد کرسکتی ہے ...... لہٰذا مسلمانوں کا مطالبہ کہ ہندوستان میں ایک اسلامی حکومت قائم کی جائے بالکل حق بجانب ہے۔ میری رائے میں مختلف ملتوں کو فنا کئے بغیر ان سے ایک متعافق اور ہم آہنگ قوم تیار کی جائے تاکہ وہ آسانی کے ساتھ اپنے ان ممکنات کو جو ان کے اندر مضمر ہیں عمل میں لاسکیں ...... میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ، بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے خواہ یہ ریاست سلطنتِ برطانیہ کے اندر حکومتِ خود اختیاری حاصل کرے خواہ اس کے باہر۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ شمالی مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو آخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنی پڑے گی۔ قسمت بنگالہ یا اس قسم کے دوسرے اضلاع کو الگ کر دینے میں جن میں ہندو آبادی کا غلبہ ہے اس کی وسعت اور انتظامی مشکلات میں اور کمی ہو جائے گی" ......

یہ خطبہ بہت طویل ہے اس لئے بہ نظر اختصار چند اہم اقتباسات پیش کئے گئے ہیں۔ 'منظم اسلامی ریاست' کے صاف معنی جداگانہ ریاست کے نہیں ہیں تو اور کیا ہو سکتے ہیں؟ جہاں تک مکمل آزادی کے تصور کا تعلق ہے اس قسم کا ریزولیوشن مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے پیش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مؤیدین اقبال کا یہ دعویٰ کہ ان کے ذہن میں ہندوستان سے علیحدہ ریاست کے قیام کا تصور نہیں تھا محض خوش فہمی پر مبنی ہے۔ ان حضرات کی یہ خوش فہمی بھی دور ہو جانی چاہیئے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں کہ ان سے دوران گفتگو میں اقبال نے واضح طور پر کہا کہ :۔

" جو قوم اپنا ملک نہیں رکھتی وہ اپنے مذہب و تہذیب کو بھی برقرار نہیں رکھ سکتی۔ دین و تہذیب حکومت، و شوکت ہی سے زندہ رہتے ہیں۔ اس لئے پاکستان ہی مسلم مسائل کا واحد حل ہے اور یہی اقتصادی مشکلات کا بھی حل ہے"۔ [۵]

ان الفاظ پر غور کیا جائے "دین و مذہب" حکومت و شوکت ہی سے زندہ رہتے ہیں"۔ یہ الفاظ قدامت پسند جاگیردار کے ہی ہو سکتے ہیں۔ ماورائے زمان و مکان' اسلام کو 'شجر ممنوعہ وطن کی ضرورت بھی آگئی اور تبلیغ کے بجائے حکومت و شوکت حیاتِ اسلام کے لئے ضروری قرار دے گئے۔ واضح رہے کہ جب اقبال افغانستان گئے تھے تو محمود غزنوی کے مزار کو دیکھ کر ان پر رقت طاری ہو گئی تھی۔ قطب الدین ایبک کی مسجد یا ہسپانیہ کے محلات، اسلامی شان و شوکت کے پُرہیبت منظر ہیں اسلامی دور کے محلات کے نقوش اگر عظمت کی علامت ہیں تو ساتھ ہی چشم حقیقت بین کے لئے وحشیانہ جبر و استحصال کی بھی شہادت پیش کرتے ہیں جس کا عوام شکار رہے۔ ان کے نقوش میں ہندوستان کے آرٹ کے ساتھ عوام کا خون بھی نمایاں ہے۔

جناح عرصہ دراز تک نظریۂ پاکستان کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے رہے۔ انھوں نے چودھری رحمت علی کی تجویز کو جب "طفلانہ تصور" کہہ کر مسترد کر دیا تو اقبال نے جناح کو کئی خط لکھے اور تجویز کو منظور کرنے کے لئے آمادہ کیا۔ ۱۹۳۸ء میں مولانا حسین احمد مدنی سے اپنی دہلی کی تقریر میں نظریۂ قومیت پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ فرمایا تھا کہ اقوام اوطان سے بنتی ہیں ادیان سے نہیں"۔

مسلم لیگی پریس نے جو طوفان برپا کیا وہ تو تھا ہی لیکن اقبال اس قدر برہم ہوئے کہ مولانا کے بیان کی خدمت میں یہ بیان جاری کیا۔

"کیا اچھا ہوتا کہ اگر میری خاطر نہ سہی تو عامتہ المسلمین کی خاطر ناموس سے گزر کر قرآنِ حکیم کی طرف مولانا رجوع کر لیتے اور اس خطرناک غیر اسلامی نظریہ کو مسلمانوں کے سامنے رکھنے سے پیشتر خدائے پاک کی نازل کردہ مقدس وحی سے بھی استشہاد فرما لیتے"...... اور پھر یہ شعر لکھا۔

قلندر جز دو حرف لا الٰہ کچھ نہیں رکھتا
فقیہہ شہر قارون ہے لغت ہائے حجازی کا اقبال

علامہ اقبال پُرجوش Revivalist احیاء پرست تھے۔ احیائی تحریک کا ایک ہی مقصد ہوتا ہے کہ وہ عوام کے ذہنوں کو حالات حاضرہ سے ماضی کی جانب موڑ دے اور ان کو ایک دلدل میں دھکیل دے جس میں وہ اس وقت تک پھنسے رہیں جب تک مخصوص مفاد Vested Interests کے طبقے اپنے مقاصد کی تکمیل میں کامیاب نہ ہو جائیں۔ ۱۵ اگست، ۱۹۴۷ء کے دوسرے دن ہی متحدہ قومیت کے نظریہ کے خلاف اسلام کی رٹ   عدم پیروی میں خارج ہوئی یا کالعدم کر دی گئی اور بڑے سے بڑا غالی صاحبِ ایمان متحدہ قومیت پر ایمان لے آیا۔ کس قدر عجیب و غریب بات ہے کہ ہندوستانی مسلمان اقبال کو شاعرِ مشرق کہتا ہے اور جھومتا ہے لیکن مشرقی بلادِ اسلامیہ میں رابندرناتھ ٹیگور کو مقبولیت حاصل ہے۔ اب پاکستان نے زور مار کر اقبال کو روشناس کرایا ہے۔

ایک بڑی تعداد اقبال کو فلسفی بھی کہتی ہے وہ یہ نہیں سمجھتے کہ فلسفی معارف اسرار کائنات ہوتا ہے اس کا علم قبائلی نہیں ہوتا۔ وہ تنگنائے مذہب میں کائنات کا تصور نہیں کرتا۔ اقبال بلاشبہ عظیم شاعر تھے انھوں نے جو کچھ بھی لکھا وہ مسلمانوں کے ایک محدود طبقہ کے لئے محدود نقطۂ نظر سے لکھا اور ان کے علم کی کائنات اسی طبقہ کے کام آئی۔ اقبال کا مقابلہ خلیل جبران، رابندرناتھ ٹیگور، قاضی نذرالاسلام سے کیا جائے تو ندی اور لامحدود وسعتوں میں بٹنے والے آبشار کا بیّن فرق نظر آتا ہے۔

[۵] نقوشِ اقبال۔ مولوی شمس تبریز خاں، مولانا ابوالحسن علی ندوی کی عربی کتاب روائع اقبال کا اردو ترجمہ صلا

دھندہ

عبدالبصیر نعیمی

ہوٹل کے ایک کیبن میں رام سنگھ اور دلاور خاں بیٹھے خیالوں میں غرق سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہے تھے کیبن دھوئیں سے بھر گیا تھا۔ کچھ دیر کے بعد رام سنگھ نے جیب سے ڈائری نکالی اور ورق گردانی کرنے لگا۔ دلاور خاں بھی متوجہ ہوگیا۔ رام سنگھ کی نظریں ایک ورق پر تھم گئیں۔ وہ سرگوشیانا انداز میں بڑبڑایا "احمد آباد میں تو دو بار کام چل نہیں سکا۔ ویسے بھی ایک شہر میں پہلی ہی بار میں اچھا دھندہ ہوتا ہے۔ بنگال میں تو کام ہو ہی رہا ہے۔ اتر پردیش کے چند مقامات کی فہرست بنائی ہے یہاں پر آسانی سے دھندہ ہوسکتا ہے۔"

"ہوں۔" دلاور خاں نے سر ہلاتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے۔ ایک تو یہ علاقہ ہی دھندے کا علاقہ ہے دوسرے یہاں الیکشن بھی ہونے والا ہے۔ ایک دو سیاسی جماعتیں بھی ہماری مددگار بن سکتی ہیں۔"

"ہاں موقع بہت اچھا ہے۔" رام سنگھ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "جنتا سمجھدار ہوتی جارہی ہے۔ دوسرے یہ سالی ایکتا کمیٹیوں نے بیڑا ہی غرق کر کے رکھ دیا ہے۔ سب سے اچھا دھندہ تیوہاروں پر ہو جاتا تھا مگر اب کوئی بھی اپنا تیوہار خراب کرنے پر تیار نہ ہوگا۔ اس وقت تو سیاسی جماعتیں اپنی پوزیشن بنانے کے چکر میں ہیں۔ بھگوان نے بہتر موقع دیا ہے مگر سوال یہ ہے کہ کس شہر میں بہتر دھندہ ہوسکتا ہے؟"

"تمہاری نظر میں کون سا مقام ہے؟" دلاور خاں نے سوال کا جواب سوال سے دیا۔

"بیوپاری نقطۂ نظر سے علی گڑھ، مرادآباد، چندوسی، بریلی، پیلی بھیت......" رام سنگھ کچھ سوچنے لگا۔

"مجھے تو ان شہروں سے زیادہ امید نہیں ہے۔" دلاور خاں نے کہا۔

"تو پھر؟" رام سنگھ مجسم سوالیہ نشان بن گیا۔ دلاور خاں نے کیبن کی لکڑی کی دیواروں کی طرف دیکھا اور پھر آگے بڑھ کر رام سنگھ کے کان میں دھیرے سے کچھ کہا۔ رام سنگھ کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ "واہ میرے شیر کیا مقام بتایا ہے۔ تجھے تو وزیر ہونا چاہیئے تھا۔" رام سنگھ نے بتیسی نکال کر کہا۔

"تو پھر جلدی کرلو۔ خدا نے چاہا تو وارے نیارے ہوجائیں گے۔" دلاور خاں نے اپنی تعریف سے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"بھگوان نے چاہا تو ایسا ہی ہوگا۔" رام سنگھ نے سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل دیا۔

اتر پردیش کے ایک شہر میں، مندر کا پجاری صبح کو جب مندر کا دروازہ کھولنے گیا تو دروازہ پر ایک گٹھری پڑی دیکھ کر چونک اٹھا۔ اس نے چیلوں کو آواز دی۔ چیلے آنکھیں ملتے ہوئے اپنی کوٹھری سے باہر نکلے۔ پجاری نے گٹھری کی طرف اشارہ کیا۔ ایک چیلا آگے بڑھا۔ جیسے ہی اس نے گٹھری کھولی "ہرے رام ہرے رام" کہتا ہوا اُلٹا بھاگا اور پجاری کے چرنوں میں گر پڑا۔ گٹھری کھل چکی تھی اور اس میں بڑا گائے کا سر صاف نظر آرہا تھا۔ "ہے رام"۔ پجاری نے گھبرا کر آنکھیں بند کرلیں۔ بھگوان کے درشن کے لئے بہت سے ہندو آکر پجاری جی کے پیچھے کھڑے ہوگئے تھے۔ انھوں نے مندر کے دروازے پر گائے کا کٹا ہوا سر دیکھا تو غصہ سے کانپ اُٹھے "یہ کام مسلمان ملیچھوں کا ہے۔" یہ آواز رام سنگھ کی تھی۔

رام سنگھ بھیڑ سے باہر آیا اور مندر کے زینے چڑھ کر اور چبوترے پر کھڑا ہوگیا "مسلمان ہمارا دھرم بھرشٹ کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے گئوماتا کا سر کاٹ کر مندر کے دروازے پر ڈالا ہے۔ وہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ہم میں کتنا دم ہے۔ کیا ہم اپنے دھرم کی رکھشا بھی نہیں کرسکتے؟ یہ مسلمان ہمارے بھارت کے ٹکڑے کرچکے ہیں ان کو پاکستان مل گیا پرنتو یہ اب بھی بھارت میں رہ کر ہمارا کھاتے ہیں، ہمارا پہنتے ہیں۔ پھر بھی یہ ہندو جاتی سے گھرڑاں کرتے ہیں۔ یہ ہندو جاتی کے شترو ہیں۔ یہ رہتے بھارت میں ہیں، کھاتے بھارت میں ہیں اور ساتھ دیتے ہیں پاکستان کا، عرب دیشوں کا۔ آج انھوں نے ہندو جاتی کی شرم کو، شکتی کو للکارا ہے۔ ہم اس کا منہ توڑ جواب دیں گے۔ ہم ملیچھوں کو بتادیں گے کہ ہم اب بھی رانا پرتاپ ہیں، شیواجی ہیں۔ ہم خون کی ندی بہا دیں گے۔ چلو..... مارو....." رام سنگھ مسلمان محلہ کی طرف دوڑا۔ اس کے پیچھے ہندو نوجوانوں کی بھیڑ بھی اُدھر کو دوڑ پڑی۔

دوسری طرف دلاور خاں مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑا کہہ رہا تھا "مسلمانوں کا خون سرد ہوچکا ہے ایک وہ مسلمان تھے جنھوں نے اپنی آن اور جوشِ جہاد سے مغلوب ہوکر اہلِ کفار کی صفیں الٹ دیں۔ ایک آج کا مسلمان ہے کہ اس کی عزت سرِ بازار لٹ رہی ہے اور وہ محوِ خواب ہے، اس کی غیرت کیا ہوئی؟ اس کی شجاعت کہاں گئی؟ اسلام پر قربان ہونے کا جذبہ کہاں گیا؟"

"ہوا کیا بھائی؟" ایک معمر مسلمان نے پوچھا۔

"تم پوچھتے ہو۔ ہوا کیا؟" دلاور خاں نے زہریلے لہجہ میں کہا "ہندوؤں نے ایک مسلمان لڑکی کو پکڑ لیا، اس کے ساتھ زنا بالجبر کیا، اس کے پستانوں کو چھری سے کاٹ لیا۔ لڑکی کا جرم یہ تھا کہ وہ مسلمان تھی۔ لڑکی نے دم توڑ دیا ہے مگر اس کی روح اب بھی

(باقی صہ۳ پر)

سکے قیام کی جانب ہی اشارہ

"اسا"

ایک وعدہ

نفرت کی موت

(ڈائیلاگ ہی ڈائیلاگ میں مکمل کہانی)

شمیم اختر

"گوپال"

"ہاں! اختر"

"ایک بات کہنا چاہتا ہوں"

"کہو"

"میں الگ رہنا چاہتا ہوں"

"ا ــــ لگ"

"ہاں"

"نہیں احمد! یہ نہیں ہوسکتا۔ دنیا ہم پر ہنسیگی"

"گوپال! مجھے دنیا کی پرواہ نہیں میں علیحدہ رہنا پسند کروں گا"

"یار! ذرا سمجھو۔ پاس پڑوس، رشتہ دار، عزیز دوست مذاق اڑائیں گے کہ ہمیشہ ساتھ رہے لیکن آج کیوں الگ الگ ہوگئے"

"جہنم میں جائیں اڑوس پڑوس والے، مجھے بھی جینے کا حق ہے میں کوئی بھیک نہیں مانگ رہا ہوں مجھے سامنے والے گھر میں رہنے کا پورا پورا حق ہے"

"اب بھی سوچ لو"

"اچھی طرح سوچ لیا گوپال! تم اسی گھر میں رہو اور میں سامنے والے مکان میں رہوں گا۔

"تمہیں کسی نے بھڑکایا ہے، کسی دغاباز کی باتوں میں آکر غلط قدم اٹھا رہے ہو۔ دونوں اکھٹے رہتے ہیں، کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا کیونکہ ہم دونوں ایک ہیں اور ایک سے بھلے دو، اور ہم دو کی شکستی کو آج تک کوئی ناش نہ کرسکا"

"گوپال! ان فضول باتوں کا وقت نہیں ہے میں جو فیصلہ کرلیتا ہوں اس پر اٹل رہتا ہوں"

"افوہ! اتنا غصہ۔ یار میرے غصہ تو نہ کرو اب مجھے معلوم ہوا کہ اس کم بخت مائیکل نے تمہیں ورغلایا ہے کیونکہ کل رات کو وہ تم سے گھنٹوں باتیں کررہا تھا مائیکل تو کچھ دن کا مہمان ہے وہ جلد چلا جائے گا اور تم اس کی غلط باتوں میں آگئے"

"ہاں! ہاں! تمام دنیا نے بہکایا ہے۔ بھلا میرا تمہارا کیا ساتھ؟ تم گوشت نہیں کھاتے، میں تلک نہیں لگاتا، تم مسجد میں نہیں جاتے میں مندر نہیں جاتا میں گیتا نہیں پڑھتا تم قرآن نہیں پڑھتے"

"لیکن احمد! ہمارے تمہارے آباؤ اجداد تو ہمیشہ ہر معاملے میں شریک رہے۔ غم میں، خوشی میں کھانے پینے میں، دھارمک تقریبوں میں' ہم دونوں کے بڑوں کے بغیر کوئی کام پورا نہیں ہوتا تھا۔ یہ واقعہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ تمہارے دادے ابا نے میری موسی کو بیٹی بنا کر کتنی دھوم دھام سے شادی کرائی تھی"

"ہاں معلوم ہے۔ تمہارے نانا جان نے بھی تو میری خالہ جان کو گود لیا تھا اور انھوں نے ہی شادی کرائی تھی"

"پھر اب یہ رنجش اور اختلاف کیوں؟"

"زمانہ بدل چکا ہے گوپال! اب رام اور رحیم ایک جگہ نہیں رہ سکتے۔ دریا کے کنارے ایک دوسرے سے نہ ملتے ہیں اور نہ کبھی مل سکیں گے"

"احمد جانے سے پہلے سوچ لو۔ ہمارے تعلقات پہلے کی طرح قائم رہنے چاہئیں"

"اب تعلقات کیا؟ میل ملاپ کیا؟ خیر پھر بھی کوشش کروں گا۔ اچھا خدا حافظ گوپال"

"اچھا احمد میرے بھائی میرے دوست بھگوان تجھے سکھی رکھے"

"ہاں یہ لان میرا ہے اور کیا تیرے باپ کا ہے؟"

"احمد اس میں لڑنے کی کیا بات ہے؟ کسی کو بلا کر فیصلہ کرالو"

"لو وہ مائیکل ادھر ہی آرہا ہے وہ ہمارا فیصلہ کرا دے گا"

"مائیکل بھائی! احمد کہتا ہے کہ یہ لان میرا ہے اور میں کہتا ہوں میرا ہے۔ اس میں میں نے سبزیاں اگائی ہیں چاروں طرف ہریالی ہی ہریالی ہے احمد تو سبزیاں کھاتا بھی نہیں، پھر یہ اپنا حق کیوں جما رہا ہے؟"

"ارے جب چیزیں تقسیم ہوئی ہیں تو پھر لان بھی تقسیم ہوگا"

"لان کسی قیمت پر تقسیم نہیں ہوگا۔ میں نے اس میں ہزاروں روپیوں کی زعفران لگائی ہے اور سیب کا باغ لگایا ہے"

"تیری تو ایسی تیسی۔ لے ابھی آدھے لان پر قبضہ کرتا ہوں۔ ہمت ہو تو روک کر دکھا"

"احمد ــــ احمد"

"یہاں کیسے آیا۔ تیری یہ مجال؟"

"اس وقت میں پریشان ہوں۔ اس پاگل چن چی نے مجھ سے جھگڑا کیا اور میرے کھیتوں پر قبضہ جما بیٹھا"

"میں کیا کروں؟"

"تم اسے سمجھاؤ کہ کھیتوں کو خالی کرکے چلا جائے"

"میں کون ہوں اس سے کہنے والا تم جانو تمہارا کام جانے۔ تم نے بھی لڑائی کی ہوگی ورنہ اس کا دماغ خراب تھا کہ قبضہ کرلیتا"

"احمد! میں سخت الجھن میں گرفتار ہوں۔ لیکن تم اب بھی ناراض ہو۔ بھگوان کے لئے میری سہائیتا کرو، ورنہ وہ دوسری چیزیں بھی ہتھیا لے گا"

"ہاں ہاں ناراض ہوں اور یہ ناراضگی کبھی ختم نہیں ہوگی۔ کانٹے کانٹے ہوتے ہیں وہ پھول نہیں بن سکتے۔ تم میرے لئے کانٹا ہو، جب بھی پھول کے لئے ہاتھ بڑھایا کانٹا چبھا، جب بھی بھلائی کی تم نے دھوکہ دیا۔ کیا کیا جتاؤں؟ کیا کیا بتاؤں؟ بہتر یہ ہے کہ یہاں سے چلے جاؤ۔ میری آنکھوں میں خون اتر رہا ہے۔"

"مائیکل کو گئے عرصہ بیت گیا لیکن تو نے اسی کے نقشِ قدم پر چل کر میرے گھر کو آگ لگائی۔ میرے باغات اور لہلہاتے کھیت برباد کرائے۔ لان پھر سے اجاڑ دیا۔ سیب اور زعفران کی فصل تباہ کرائی۔ آخر تجھے کیا ملا؟ بھائیو! اس سے پوچھو ایسا کیوں کیا؟ پہلے میرے گھر میں چوروں، بدمعاشوں کو گھسایا اور پھر خود بھی گھس آیا۔"

"گوپال ہوش کی بات کر کہیں ایسا نہ ہو کہ میں تیری اینٹ سے اینٹ نہ بجا دوں پہلے تو نے میری چوکھٹ پر قبضہ جمانا چاہا اور میرے آدھے لان کو تو نے ہی جہنم بنایا اور پھر اس پر کہتا ہے کہ میں نے جھگڑا کیا۔ ٹھانٹ صاحب! یہ الٹی سیدھی بکواس کر رہا ہے۔ اس کی باتوں میں نہ آنا۔ یہ جھوٹا ہے۔"

"بھائی کوگن! اِدھر آیئے اور دیکھیے پہل احمد نے کی ہے۔ اس بات کے بہت سے ثبوت اور گواہ ہیں اِس نے یہاں تک کہا کہ ایک سو دن تک لڑوں گا۔"

"ہاں! ایک سو کیا ایک ہزار دن تک لڑ سکتا ہوں۔ مجھ میں اتنی ہمت ہے۔ تجھ جیسے مکاروں کو تو چند منٹ میں فنا کر سکتا ہوں۔ جانسن صاحب! اس گوپال کے بچے سے کہیئے کہ یہاں سے دفع ہو جائے۔"

"گوپال اپنے گھر جاؤ اور احمد تم بھی واپس جاؤ اور اُجڑے گھروں کو پھر سے ٹھیک ٹھاک کرو۔ دیکھو آگ کی لپٹیں اب تک اٹھ رہی ہیں ان کو بجھاؤ۔ آپس میں لڑنا جھگڑنا بُری بات ہے۔"

"اس گوپال کے بچے نے میرے گھر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"اس میں میرا کیا دوش ہے؟ اس نے گھر والوں کے ساتھ نوکروں جیسا سلوک کیا اور انھوں نے تنگ آکر زبردستی مکان کا آدھا حصہ الگ کر کے اس میں آرام و چین سے رہنا شروع کر دیا۔"

"نہیں اس نے گھر کے چند آدمیوں کا ساتھ دیا، ان کو بہکایا حتیٰ کہ وہ مجھ سے نفرت کرنے لگے اور وہ میرے خلاف ہو گئے۔"

"احمد بکواس نہ کر، تیرے کہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ ان تمام لوگوں کو معلوم ہے کہ تو نے انکو پریشان کیا اور ان کے ساتھ سوتیلی ماں کا سلوک کیا۔ یقین نہ آئے تو خود پوچھ لو ان سب لوگوں سے۔"

"کیوں ہیٹ بھائی، کوگن بھائی، جکسن اور سہاتو بھائی جان کیا یہ بات صحیح ہے؟"

"ہاں۔"

"اُف میرے خدا! میرے گھر کے دو حصے ہو گئے۔ لیکن سہاتو بھائی آپ نے تو کل مجھ سے کہا تھا کہ گوپال کی غلطی ہے اور میں گھر کے ٹکڑے ہونے نہیں دوں گا۔"

"مجھے افسوس ہے احمد! حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔"

"یار کوگن! وہ دونوں پھر سے تعلقات بڑھا رہے ہیں۔"

"ڈیئر جکسن! یہ تو بُرا ہوگا۔ ہماری سالوں کی بنائی اسکیم فیل ہو جائے گی۔"

"یار چن چی مجھے کوگن اور جکسن کی بات پر یقین نہیں آتا۔"

"نہیں ہیٹ! یقین نہ آئے تو آؤ سب چلو میرے ساتھ، لو وہ ——— وہ دیکھو اُدھر بائیں طرف دونوں بھولے بھالے پہاڑی پر کس مزے سے ایک دوسرے سے گلے مل رہے ہیں۔"

"مارو یار! یہ تو گلے بھی مل گئے اب کیا ہوگا؟"

"پہلے سے کہاں سو رہے تھے اب پچھتانے سے کیا فائدہ؟"

"فائدہ تو بہت ہو گیا کوگن جکسن اور چین بھائی۔ بہت پہلے لاڈلے بیڈمنٹن کو بھیج کر پہلے گوپال کے گھر میں آگ لگا کر اس کو بٹوا دیا اور پھر احمد کے گھر کے ٹکڑے کرا دیئے۔ فکر نہ کرو دوستو! گوپال کے لان میں کسی دن گھس کر سیب اور زعفران چرا لیں گے۔ اور یہ یقینی بات ہے کہ گوپال کو احمد پر شک ہوگا اور دونوں پھر لڑ پڑیں گے۔"

"نہیں! ہم آپس میں کبھی نہیں لڑیں گے۔"

"شاباش! میرے بھائی احمد مجھے تم سے یہی امید تھی۔ کاش ہم نہ لڑتے، اب دیکھو نا دونوں کو اپنی حالت سنبھالنے کے لئے کتنا وقت لگے گا۔"

"گوپال اب چن چی کے بچے کی تو ایسی تیسی۔ اب ہیٹ، کوگن اور جکسن کو منہ نہ لگانا۔ آخر وہ اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں؟"

"تیرے وچار بہت سندر ہیں۔ بھگوان کرے ہم ہمیشہ یوں ہی گھل مل کر رہیں تاکہ کوئی ٹیڑھی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھ سکے۔"

"آج سے ہم بھائی بھائی! گوپال وعدہ کرو۔"

"میرا وچن گیتا کی قسم۔"

"تو پھر آؤ گلے مل کر ایک دوسرے میں سما جائیں۔"

سامپردائکتا ورودھی کمیٹی کی سرگرمیاں



تصویر: گورنر اکبر علی خاں کی افتتاحی تقریر

قومی یک جہتی کے لئے یوتھ کیمپ۔ لکھنؤ

یو۔پی فرقہ واریت کمیٹی کے تحت لکھنؤ میں قومی یک جہتی تربیتی یوتھ کیمپ کا نظم کیا گیا۔ اس کا مقصد سائنٹفک انداز میں نوجوانوں کو تربیت دینا تھا کہ وہ فرقہ پرست، رجعت پرست قوتوں کا سماجی اور سیاسی محاذوں پر مقابلہ کر سکیں۔ اس ہفت روزہ کیمپ میں تقریباً سو نوجوانوں اور طلبا، ورکرس نے شرکت کی۔ کیمپ قیصر باغ بارہ دری میں ہوا۔ ڈاکٹر راجندر کماری باجپئی صدر یو۔پی سامپردائکتا ورودھی کمیٹی نے اسے منتظم کیا تھا۔ اس کیمپ کے روح رواں شری این۔این۔پانڈے چیف کنوینر تھے۔

شری اکبر علی خاں، گورنر یو۔پی نے اپنی افتتاحیہ خطبے میں کہا کہ "فرقہ واریت انسانیت مخالف طرز فکر ہے۔ اس کا ہندوستان جیسے ملک میں کوئی مقام نہیں ہوسکتا جہاں بنی نوع انسان سے محبت اور ان کی خدمت جیسے بنیادی انسانی اقدار خاص طور پر کمزور اور پس ماندہ افراد سے محبت اور ان کی خدمت قدیم زمانے سے تاریخی روایت کا جزو رہی ہیں۔ عصر حاضر میں مہاتما گاندھی نے انھیں اقدار کی توسیع کی کوششیں کیں۔ جواہر لال نہرو اور لال بہادر شاستری نے بھی بنی نوع انسان سے محبت اور کمزور طبقات کو اوپر اٹھانے کی تلقین و تبلیغ کی۔ بابائے قوم مہاتما گاندھی نے نہ صرف یہ کہ تمام زندگی اس کی تبلیغ کی بلکہ اپنے اسی نظریۂ حیات کی حفاظت کے لئے وہ شہید بھی ہوئے۔ اب اس ملک کے لوگوں پر اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ مخلصانہ طور پر گاندھی جی کے ان آدرشوں اور عمل پر مکمل قومی یک جہتی کے قیام کے لئے عمل کریں۔ فرقہ واریت اور علاقائیت کمزور طبقات کو خاص طور پر نقصان پہنچاتی ہیں۔"

انھوں نے کہا کہ "جو جماعتیں فرقہ واریت کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں آخر انھیں کیا حاصل ہوتا ہے؟ غالباً اس کا حاصل لوگوں کے درمیان دشمنی پھیلانے کے سوا اور کچھ نہیں ہے"

انتظامیہ کی طرف سے گورنر نے یقین دہانی کرائی کہ حکومت یہ طے کر چکی ہے کہ فرقہ پرستی، رجعت پرستی، ذات پرستی اور علیحدگی پسندی کی قوتوں سے اچھی طرح نپٹ لیا جائے گا۔ گورنر نے مزید کہا کہ وہ جمہوری وجود کی سیکولر اساس پر حملہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتے۔ انھوں نے کہا کہ کیمپ بالکل بروقت ہو رہا ہے۔ اس لئے کہ ابھی فرقہ پرست اور رجعت پرست قوتیں بہت زیادہ سرگرم ہوگئی ہیں اور وہ ایک بار پھر قومی یک جہتی کو اس طرح دعوت رزم دے رہی ہیں جس طرح مہاتما گاندھی کے آخری ایام میں دعوت رزم دیا تھا۔

مسز سبھدرا جوشی، صدر آل انڈیا سامپردائکتا ورودھی کمیٹی نے میٹنگ کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ دنیا کے کسی بھی مذہب سے فرقہ واریت کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ تو ایک قبائلی طرز فکر ہے جو انسان میں حیوانی خصلتیں بیدار کر دیتا ہے۔ جو قوتیں اپنے مفاد کے لئے اس کا استعمال اور استحصال کرتی ہیں وہ قوم کی دشمن ہیں۔ انھوں نے کہا کہ فرقہ واریت کا چیلنج سامپردائکتا ورودھی کمیٹی نے قبول کر لیا ہے۔ انھوں نے توقع ظاہر کی کہ یہ کیمپ دوسروں کے لئے مثال بنے گا۔

مسز راجندر کماری باجپئی نے اپنے صدارتی تقریر میں فرقہ واریت اور گروہ بندی کے دوہرے دشمن سے جنگ پر زور دیا۔ انھوں نے سیکولر قوتوں کو مضبوط بنانے پر بھی زور دیا تاکہ سماجی انصاف عام ہوسکے۔ انھوں نے کیمپ لگانے کے مقصد کی وضاحت کی اور اس یقین کا اظہار کیا کہ جن جوانوں نے یہاں شرکت کی ہے وہ مختلف ضلعوں میں پھیل جائیں گے اور لوگوں کو انھیں خطوط پر تعلیم دیں گے جن کی انھیں یہاں تربیت ملی ہے۔

شری ڈی۔ آر۔ گوئل، جنرل سیکریٹری آل انڈیا سامپردائکتا ورودھی کمیٹی نے کہا کہ فرقہ واریت مہاتما گاندھی کی شہادت کے بعد تقریباً دس برسوں کے لئے ماند پڑ گئی تھی لیکن اس کے بعد اس کا نفرت انگیز ہیولہ پھر ابھر رہا ہے۔ ۱۹۶۹ء کے اواخر میں مسز اندرا گاندھی نے اس کے خلاف پوری قوت سے اعلان

جنگ کیا۔ یہ کیمپ اسی سمت میں آگے بڑھنے کی ایک کوشش ہے۔ انھوں نے توقع ظاہر کی کہ اس کیمپ میں شریک ہونے والے نوجوان فرقہ پرستی کی عفریت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کریں گے۔

۱۰ ستمبر کو کیمپ کے آخری دن دفاعی پیداوار کے وزیر مملکت مسٹر وی۔ سی۔ شکلا نے خطاب کرتے ہوئے نوجوانوں سے کہا کہ وہ فرقہ واریت کے خلاف پوری قوت سے جنگ آزما ہوں تاکہ ملک اس عفریت کی گرفت سے آزاد ہو سکے۔ انھوں نے نوجوانوں کو آگاہ کیا کہ جو بھیانک اور نفرت انگیز خطرہ سر ابھار رہا ہے ممکن ہے وہ ملک کی قومی یک جہتی کے تار و پود بکھیرنے میں کامیاب ہو جائے۔

جن نوجوانوں نے سات دنوں تک اس کیمپ میں تربیت حاصل کی ہے ان کے لئے نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ فرقہ واریت بیرونی قوتوں کی پیداوار ہے۔ ملکی سیاست کی رگوں میں اسے انھیں قوتوں نے داخل کیا ہے۔ سفید فام آقاؤں نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ یہ زہر ملک و قوم کی رگوں میں اس طرح داخل ہو جائے کہ قوم تباہ ہو جائے۔ جزوی طور پر وہ اپنی سازش میں کامیاب رہے۔ اگر انھیں کامیابی نہ ہوتی تو آج ملک کا یہ نقشہ نہ ہوتا، ملک تقسیم نہ ہوتا اور خون کا دریا نہ بہتا۔

انھوں نے تقسیم کے بعد کے سانحوں پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ نوجوانوں کو یک جہتی کے لئے کوشش کرنی چاہیے اور فرقہ پرست قوتوں سے لڑنے کی اپنی ذمہ داری محسوس کرنی چاہیے۔ اس لئے کہ یہ قوتیں اب پھر سر ابھار رہی ہیں۔ اس کے لئے سر توڑ کوششیں کر رہی ہیں۔ مسٹر شکلا نے کیمپ کے شرکا سے کہا کہ شہروں اور دیہاتوں میں فرقہ پرستی کے خلاف فضا بنانی ہے اور لوگوں کے ذہن سے فرقہ پرستی کا زہر نکالنے کی کوشش ہونی چاہیے۔ اس لئے کہ یہ زہر ذہنوں میں جڑ پکڑ رہا ہے۔ انھوں نے شرکا سے کہا کہ اپنے گھروں کو جا کر آپ قومی زندگی میں پھیلے ہوئے اس زہر کو نکالنے کی کوشش کریں اور فرقہ پرستوں کے پروپیگنڈے کا منہ توڑ جواب دیں۔

شری کملا پتی ترپاٹھی، سابق وزیر اعلیٰ یو۔ پی نے بھی آخری دن کیمپ کے شرکا سے خطاب کیا۔ انھوں نے کہا کہ قوم کی بنیاد جمہوریت، سوشلزم اور سیکولرازم پر قائم ہے۔ جب تک یہ بنیاد مضبوط ہے کوئی بھی قوت خواہ وہ کتنی ہی بدترین اور جارح ہو قومی یک جہتی کو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

یہ کیمپ گنیش شنکر ودیارتھی راشٹریہ یکتا



ڈاکٹر راجندر کماری باجپئی محترمہ سبھدرا جوشی کے ساتھ

یو واشور (قومی اتحاد یوتھ کیمپ فرقہ وارانہ امن کی بحالی کے لئے شہید ہونے والے گنیش شنکر ودیارتھی کے نام منسوب کیا گیا تھا) قیصر باغ بارہ دری میں لگایا گیا تھا۔ یہاں نوجوانوں کو فرقہ پرستوں کے چیلنج کا مقابلہ اور فرقہ وارانہ مسائل سے نپٹنے کی تربیت دی گئی۔ انھیں قومی ارتقا کے متعلق تعلیم دی گئی۔ انھیں اس کی بھی تربیت دی گئی کہ کس طرح عوام کو فرقہ پرستوں کی سازش سے باخبر کریں اور طاغوتی قوتوں کے خلاف متحد ہوں۔ طلبا کو سوال و جواب پر مبنی طریقے پر تربیت دی گئی۔ طلبا کو تربیت دینے کا یہ ایک مناسب ترین طریقہ سمجھا جاتا ہے۔ تربیت یافتگان میں اسناد بھی تقسیم ہوئے۔

کیمپ نے عوام اور پریس میں خاصی مقبولیت حاصل کی۔ اخبارات نے کیمپ کے تفصیلی حالات شائع کئے۔ بعض اخبارات نے اداریے بھی لکھے۔ قومی آواز لکھنؤ نے اپنے ۱۹ اگست کے اداریے میں لکھا کہ کیمپ ضروری ہے۔

سہارنپور میں کشیدگی

لکھنؤ کیمپ ختم کرنے کے بعد ہم سہارنپور پہنچے اور سا پہر دانکتا و رودھی کی میٹنگ بلائی اور اس میں ایک اڈہاک ایگزیکیٹو تشکیل دی گئی مسٹر صغیر احمد کو کنوینر مقرر کیا گیا۔ یہ ایک جوان سیاسی کارکن اور روڈویز یونین کے جوائنٹ سیکریٹری ہیں۔ ہم لوگوں کی خواہش تھی کہ ان تمام دوستوں کو جمع کریں جنھوں نے کیمپ میں شرکت کی تھی لیکن یہ انتظامی معاملات ہیں جن کے بارے میں تفصیلی خط لکھ رہا ہوں۔ اس تحریر کا مقصد سہارنپور میں روز بروز بڑھتے ہوئے فرقہ وارانہ خطرات کی طرف توجہ مبذول کرانا ہے۔

ان دنوں سہارنپور غالباً ہندوستان میں سب سے زیادہ فرقہ وارانہ اثرات کی زد میں ہے۔ تمام فرقہ پرست جماعتیں مثلاً مسلم لیگ، جماعت اسلامی جن سنگھ اور لوک تانترک جن سنگھ نے اپنی سرگرمیاں یہاں تیز تر کر دی ہیں۔ وہ سازشوں میں مصروف ہیں۔ اور حالات سے پتہ چلتا ہے کہ کسی بڑے فساد کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شہر بلکہ تمام ضلع بارود کے ڈھیر پر ہے جو کسی بھی وقت بھک سے اڑ سکتا ہے۔ صورت حال کی سنجیدگی کا اندازہ مندرجہ ذیل حقائق سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

۱۔ محلہ رائے والا شاستری مارکیٹ میں کپڑے کی دکانیں ہیں۔ زیادہ تر مسلمان عورتیں یہیں سے کپڑے خریدتی ہیں اور انھیں قرض کی سہولتیں حاصل ہیں۔ بہت سی مسلمان بیوہ عورتیں ان کٹ پیسیوں کو کچھ کم قیمتوں پر فروخت کرتی ہیں اور اس طرح ان کا گزارہ ہوتا ہے۔ متعدد بار کئی عورتیں کپڑوں کی چوری میں پکڑی گئیں۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ چور مسلمان بھی ہیں اور ہندو بھی، اور دونوں کو

دوکاندار چوری کرتے ہوئے پکڑتے ہیں۔ لیکن اس معاملے کو لے کر مسلم لیگ نے شہر میں ہیجان پیدا کر دیا اور یہ پروپیگنڈہ کیا کہ ہندو مسلمان عورتوں کو بے عزت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بازار میں ہندو پنجابی دوکانداروں کی اکثریت ہے۔ اس لئے مسلمان عورتوں کو یہاں کپڑے کی خریداری چھوڑ دینی چاہیئے اور اس مقصد کے لئے مسلم لیگ نے بازار میں اپنے رضا کار مقرر کر دیئے جو ان عورتوں کو بازار آنے سے روکنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوکانداروں کی فروخت کم ہو گئی اور یہ ۲۰۰۰/- سے ۲۰۰/- روپے تک پہنچ گئی۔ فطری طور پر دوکانداروں نے مسلم لیگ کے اس کھیل کو ختم کرنے کی کوشش کی اور کشیدگی اور تصادم کی فضا پیدا کر دی۔ نتیجتاً پی۔ اے۔ سی کے جوان وہاں تعینات کر دیئے گئے اور بازار میں یہ افواہ گشت کرنے لگی کہ شہر میں فساد ہونے والا ہے۔

۲۔ ستمبر ۱۹۷۳ء کو صاحب گنج بازار میں ایک مسلم دکاندار اور مسلم خریدار کے مابین جھگڑا ہو گیا۔ اس جھگڑے کا باعث محض پانچ پیسے تھے۔ ایک ہندو نے مداخلت کی کوشش کی اور تب یہ جھگڑا دوسرا رخ اختیار کر گیا۔ پہلے تو معاملہ زبانی چلتا رہا پھر اس نے عملی شکل اختیار کر لی اور مسلمان نے دو ہندوؤں کے چھرا مار دیا۔ یہ واقعہ ۱۱ بجے صبح ہوا۔ زخمیوں کو اسپتال بھیج دیا گیا اور ملزم کو جو خود بھی زخمی تھا گرفتار کر لیا گیا۔ ایک بجے یہ افواہ اڑی کہ زخمیوں میں سے ایک کا انتقال ہو گیا تب جن سنگھیوں نے ایک جلوس کی شکل میں بازار آئے اور مطالبہ کیا کہ بازار بند کر دیا جائے۔ ان کا احتجاج غنڈہ عناصر کے خلاف نہ تھا بلکہ مسلم فرقہ کے خلاف تھا۔ تمام کھڑکیاں دفعتہً بند کر لی گئیں۔ جب میں نے سڑکوں کو دیکھا تو پتہ چلا کہ وہاں کوئی بھی دکان کھلی ہوئی نہیں ہے لوگ اِدھر اُدھر بھیڑ لگائے کھڑے تھے۔ لوگ سرگوشیاں کر رہے تھے اور ان کا موضوعِ گفتگو زیادہ تر یہ تھا کہ مسلمانوں نے رائے والا مارکیٹ میں ہندو دوکانداروں کا بائیکاٹ کر دیا ہے اور وہ ہندوؤں کو اپنے متشدد رویے سے برافروختہ کر رہے ہیں میں نے ایک آگ بجھانے والی گاڑی کو بھی تیزی سے گزرتے دیکھا جس سے پتہ چلتا تھا کہ کہیں بہت زبردست آگ لگی ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس آگ بجھانے والے دستے کو غلط خبر دی گئی تھی۔ یہ جگہ بہت زیادہ بھیڑ بھاڑ والی اور بے حد اہم ہے اس کے وسط میں جامع مسجد ہے۔ یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے دکان تقریباً ایک ہی تعداد میں ہیں۔ اس واقعہ کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ جب افواہ اڑی اور جلوس نکلا تو اس دن جمعہ تھا اور دو چار سو مسلمان اس مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے۔ حالانکہ فرقہ پرستوں کی خواہش کے مطابق سب کچھ نہ ہو سکا پھر اس لئے کہ انتظامیہ چاق و چوبند تھا لیکن یہ سکون عارضی معلوم ہوتا ہے اب بھی خطرے کی تلوار سروں پر لٹک رہی ہے۔

۳۔ ان دو حادثوں سے چند دنوں پہلے کچھ ہندو غنڈوں نے ایک مسلم لڑکی کے ساتھ رانی بازار میں چھیڑ خانی کی۔ رانی بازار کی اکثریت ہندو آبادی پر مشتمل ہے۔ اس واقعہ کو لے کر مسلم لیگ نے ایک عظیم الشان مظاہرہ کیا اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ ہندو دبے ہوئے مسلمانوں کو پریشان کرتے ہیں۔

۴۔ ۸ ستمبر ۱۹۷۳ء کو متالال کی لڑکی جو ڈگری کالج کی طالبہ ہے اپنے نشانہ بازی کی مشق کے دوران ایک مسلمان گاس کاٹنے والے زخم پہنچانے کا باعث بن گئی۔ زخم بہت ہی معمولی تھا اس پر بھی مسلم لیگ کو ایک مظاہرے کا موقع مل گیا۔

۵۔ سہارنپور میں مسلمانوں کا ایک دینی مدرسہ ہے یہاں مبینہ طور پر ایک مسلمان نے کسی ہندو لڑکی کو چھیڑ دیا اور دونوں فرقوں کے لوگوں نے اس جگہ کا حصار کر لیا، حالات کشیدہ ہو گئے لیکن پولیس کی سخت نظر اور نگرانی کے باعث یہ معاملہ آگے نہ بڑھ سکا۔

حسب بالا حالات سے ظاہر ہے کہ حالات کتنے گہرے ہیں اس پر طرہ یہ کہ گزشتہ ہفتہ لوک تانترک جن سنگھ نے چوک فاؤنٹین (جامع مسجد) میں میٹنگ کی، جس میں کسی مسٹر پٹیل نے مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے مسلم لیگ کو چیلنج کیا کہ اسے اپنا پاکستان سبز چاند تاروں والا جھنڈا دفتروں، گھروں اور تمام جگہوں سے پندرہ دنوں کے اندر اندر ہٹا دینا چاہیئے اگر ایسا نہیں ہوا تو لوک تانترک جن سنگھ خود ہی تمام جگہوں سے جھنڈے ہٹا دے گی۔ جواب میں مسلم لیگ نے ایک جلسہ کیا اور اس میں بصیر خاں نے تقریر کی۔ بصیر خاں جذباتی اور اشتعال انگیز تقریر میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ ان کی تقریر کے دوران نعرۂ تکبیر کی صدائیں بلند ہوتی رہیں اور ان نعروں کی گونج میں مخالفوں کو انتباہ کیا گیا کہ اگر جھنڈا ہٹا دیا گیا تو اس کا بہت خراب نتیجہ نکلے گا۔ اب لوگوں کو ۲۳ ستمبر ۱۹۷۳ء کا انتظار ہے اس تاریخ کو بلراج مدھوک سہارنپور آ رہے ہیں اور سنا جاتا ہے کہ جھنڈا ہٹاؤ مہم کا افتتاح انہیں کے ہاتھوں ہوگا۔ یہ بھی سنا گیا ہے کہ انہیں خوش آمدید کہنے کے لئے تقریباً دس ہزار لوگ اسٹیشن جانے والے ہیں۔ دوسری طرف مسلم مجلس بھی ۲۴ ستمبر کو اپنا جلسہ کر رہی ہے اس جلسہ میں ڈاکٹر فریدی تقریر کریں گے۔

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ان حالات میں فرقہ وارانہ فساد کی آگ بھڑک سکتی ہے اور تشدد و غارت گری کا بازار گرم ہو سکتا ہے۔

ہمیں خاموش شاہد کی حیثیت سے صرف حالات کا جائزہ نہیں لینا چاہیئے بلکہ اپنی پوری قوت اور صلاحیتوں کے ساتھ فرقہ وارانہ عناصر کے خلاف جنگ کرنی چاہیئے۔

سہارنپور ایک صنعتی شہر ہے۔ اور اگر فرقہ پرست عناصر یہاں فساد کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو رانچی اور احمد جیسی بھیانک اور خوفناک صورت حال پیدا ہو سکتی ہے۔ اس عفریت

سے مقابلے کے لئے ہم نے مندرجہ ذیل پروگرام مرتب کیا ہے۔

۱۔ لوگوں سے انفرادی طور پر رابط قائم کیا جائے۔ عوامی جلسے کئے جائیں اور جلوس نکالے جائیں۔

۲۔ سامپردائکتا ورودھی کمیٹی کا لٹریچر تقسیم کیا جائے اور "سیکولر ڈیموکریسی" کے مستقل خریدار بنائے جائیں۔

۳۔ پوسٹر اور کتابچے چھپوا کر تقسیم کئے جائیں اور انھیں دیواروں پر جابجا لگا دیا جائے۔

۴۔ طلبا اور دانشوروں کو منظم کیا جائے۔

اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے ہم دیگر مشوروں کا خیر مقدم کریں گے۔

راجستھان سامپردائکتا ورودھی کمیٹی

راجستھان کے شہر ٹونک میں فرقہ پرستوں نے اپنے پرانے طرز پر ایک معمولی سے واقع کو فرقہ وارانہ رنگ دینے کی ادھر متعدد کوششیں کی ہیں۔

۷ستمبر کو ساڑھے آٹھ بجے بارا کواکے نزدیک تحت کے مقام پر ایک رکشے والے سے اتفاقاً ایک بچی کو دھکا لگ گیا اور وہ بھاگ نکلا۔ اس علاقے کے اکثر و بیشتر دوکاندار جن سنگھ کے نظریات کے زیر اثر ہیں۔ اس لئے وہ معمولی حادثے پر بھی مسلمان رکشے والوں کی خاصی پٹائی کر دیتے ہیں۔ جب رکشا والا بھاگ نکلا تو ایک آر۔ ایس۔ ایس کا کارکن (جو کسی اسکول میں ٹیچر ہے) نے رکشہ والے کی تلاش شروع کر دی۔ اور اس نے دو گھنٹے کے اندر اندر ایک ایسے رکشے والے کو تلاش کر لیا جس نے پیلا ہاف پینٹ پہن رکھا تھا ٹیچر نے اس کی خاصی پٹائی کر دی اور وہ محض اس جرم میں کہ وہ گمشدہ رکشہ ڈرائیور جیسے لباس میں تھا۔

جب رکشہ والا اپنے محلہ میں گیا تو وہاں مسلم لیگ کی تحریک پر تقریباً آدھ درجن لوگ ٹیچر کو سبق دینے کے لئے روانہ ہوئے۔ اور اس کے نتیجہ میں ۸ستمبر کو لاٹھیوں کے تبادلہ کے دوران تقریباً ایک درجن افراد کے ہاتھ پیر ٹوٹ گئے۔ یہ تصادم فرقہ وارانہ کشیدگی اور فساد کی صورت اس لئے اختیار نہ کر سکا کہ خوش قسمتی سے کلکٹر نے پولیس کو ساتھ لے کر جائے وقوع کا معائنہ کیا اور حالات پر قابو پا لیا گیا۔

شام کو ہندوؤں نے اپنا سالانہ جشن "ڈولاس" منایا۔ یہ جشن بہت ہی پر امن رہا۔

لیکن رکشہ والا اور ٹیچر کے حمائتوں نے ۹ستمبر کو ہزاروں کی تعداد میں لاٹھیوں سے لیس ہو کر بارہ کنوا میں اکٹھا ہو گئے۔ مگر کلکٹر صاحبہ نے نہایت ہی دانشمندی سے مجمع کو کنٹرول کیا اور وہ اس وقت تک ہندوؤں اور مسلمانوں کے گروہوں کے درمیان رہے جب تک بے پورسے خاطر خواہ تعداد میں پولیس نہ آگئی۔ لیکن اس کی آمد سے کچھ ہی پہلے دونوں فرقوں نے ایک دوسرے پر لاٹھیاں چلانا شروع کر دیا تھا جس سے بہت سے لوگ مجروح ہوئے۔

اس قضیہ کے خاتمے کے لئے کلکٹر نے عورت ہونے کے باوجود اپنی حفاظت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے جو کارنامہ انجام دیا اس کے لئے ان کی تحسین ہونی چاہیئے لیکن اگر ۸ اور ۹ کے پہلے ہی حفاظتی اقدامات اور ذہانت کا استعمال کیا جاتا تو بہتر تھا۔

۹ستمبر کو تقریباً ۴ دوکانیں جلا دی گئیں تقریباً درجن بھر دوکانوں کا سامان جن کی مالیت کا اندازہ ۵۰،۰۰۰/- روپے لگایا جاتا ہے لوٹ لیا گیا۔ کل ملا کر تقریباً ایک لاکھ روپے کا نقصان ہوا۔

صورت حال کا ایک دوسرا بدنما پہلو یہ ہے کہ سیاسی جماعتوں نے اس حادثے کی روک تھام کے لئے کچھ بھی نہیں کیا۔ بائیں بازو کی پارٹیوں میں صرف کانگریس نے حرکت کی۔ جن سنگھ نے ہندوؤں میں ہیرو بننے کی کوشش کی اور مسلم لیگ نے مجاہد کا سہرا باندھنے کی کوشش کی۔ یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ ٹونک کا ایم۔ ایل۔ اے جن سنگھی ہے۔

کشیدگی کو برقرار رکھنے کے لئے جن سنگھ کے ترجمان سرکشا سمیتی نے شہر میں عام ہڑتال کرانے کی جبری کوشش کی لیکن سامپردائکتا ورودھی کمیٹی کے ارکان کی بروقت آمد اور مداخلت سے فرقہ وارانہ کشیدگی پھیل نہ سکی۔ شری شیو چرن ماتھر، شری غفار علی ایم۔ ایل۔ اے، دی بھوجوان وکیل اور گھاٹی گھاگی نے عوامی کارکنوں کو صورت حال پر قابو پانے کی اہمیت بتائی تب صورت حال پر قابو پایا جا سکا۔ ان لوگوں سے متاثر ہو کر کانگریس والے بھی فرقہ پرستوں کی چال اور سازش سے واقف ہو گئے اور اس طرح ہڑتال کامیاب نہ ہو سکی۔ اور صورت حال کو معمول پر لانے کی کوشش تیز ہوئی۔ شری رادھا کرشن گوئل، مہندر جی، شری بھایا، چیئرمین میونسپل کونسل اور دوسرے کانگریسی کارکن نے اس سلسلے میں کافی جدوجہد کی۔ سامپردائکتا ورودھی کمیٹی کے وفد کی کوششوں سے ۱۲ستمبر سے بازار کھل گئے اور جن سنگھی ایم۔ ایل۔ اے کی تمام کوششیں ناکام رہ گئیں۔ حالات کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ کانگریس کے ضلعی آقا بالکل ہی غیر متعلق رہے۔ ان میں سے کسی نے بھی ٹونک کا معائنہ نہیں کیا وہ جے پور میں ہی آرام فرماتے رہے۔

حسب بالا سطور سے ظاہر ہے کہ رکشہ سے اتفاقی ٹکر جیسے معمولی حادثے کو بھی فرقہ وارانہ فساد کی شکل دے دیا جاتا ہے اس لئے اس سے قبل کہ فرقہ وارانہ قوتیں ایک بار پھر عروج حاصل کریں، ہمیں چاہیئے کہ ان سے اچھی طرح نپٹ لیں تاکہ وہ اتحاد اور قومی یک جہتی کے لئے خطرہ ثابت نہ ہوں۔ اس کے لئے عوام کو متحد کرنا چاہیئے اور انھیں فرقہ واریت کے خطرے سے آگاہ کرنا چاہیئے تاکہ ہندوستانی عوام جمہوریت، سوشلزم اور سیکولرازم کی راہ پر آگے بڑھ سکیں۔ ہمیں رجعت پسند جماعتوں کی چالوں سے عوام کو خبردار کرنا چاہیئے۔

ہم تو تنہا ہی چلے تھے جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

نئی کتابیں

کتاب: بیاض ۔ بدیع الزماں خاور کی غزلوں کا مجموعہ
ناشر۔ پی۔ کے۔ پبلی کیشنز، ۳۰۷۲ پرتاپ اسٹریٹ گولا مارکیٹ۔ دریا گنج دہلی
صفحات ۱۰۴ قیمت چار روپے

کوکن کی سرزمین سے کچھ نثر نگار تو ضرور سامنے آئے ہیں لیکن نوجوان شاعروں میں داؤد غازی مرحوم کے بعد بدیع الزماں خاور غالباً پہلے شاعر ہیں جن کی آواز "ہاپوس" اور "سپاریوں کے باغات والے اس خوبصورت علاقے سے باہر بھی نمایاں طور پر سنائی دیتی ہے اور خاور کے لئے یہ ایک بڑی کامیابی ہے بدیع الزماں خاور کو اس بات کی کریڈیٹ بھی ملنی چاہیئے کہ کوکن جیسے علاقے سے تعلق رکھنے کے باوجود وہ شعر گوئی کے فن پر بھرپور نظر رکھتے ہیں اور ان کی غزلوں میں وہ سارے التزامات ہیں جو غزل کی روایت سے وابستہ ہیں لیکن زبان پر جو مقامی ماحول کا اثر پڑتا ہے، کہیں کہیں پر وہ اس سے دامن نہیں بچا سکے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ شعر:

دلِ امید زدہ کو پگھل کے دیر ہوئی
وفا کی راہ میں اب جان وتن کی بات چلے

یہاں "پگھل کے دیر ہوئی" غلط ترکیب ہے۔ فصیح زبان ہے "پگھلے ہوئے دیر ہوئی"۔ اسی لئے جب ایک جگہ وہ یہ دعوےٰ کرتے ہیں کہ:

میں اک معلمِ اردو زباں بھی ہوں خاور
نہیں ہے شاعری میرے لئے ہنر تنہا

تو بات کچھ جچتی نہیں۔

خاور صاحب جگہ جگہ یہ احساس دلانے کی بھی کوشش کرتے ہیں کہ وہ بہت بڑے شاعر ہیں۔ اور شاعری کی توسیع و ترقی میں ان کا بہت بڑا ہاتھ ہے لیکن ملک کے مردہ پرست لوگ ان کی قدر نہیں کرتے۔ ملاحظہ ہو:

فکر کو ہم نے عطا کی ہیں نئی رعنائیاں
دل کش و رنگین خاور شاعری ہم سے ہوئی

سچ بتاؤ خاور کے فن کو پوچھتے کیوں ہو
شاعری (سمجھتے ہو جب) ہنر نہیں یارو

شاید کوئی زمانے میں زندہ پرست ہو
اتنے ہی آسرے پہ جئے جارہے ہیں ہم

اس طرح کا احساس کم و بیش ہر شاعر کو ہوتا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ لیکن خاور صاحب جب ایک جگہ یہ فرماتے ہیں کہ:

ہمیں یہ ناز نہ کیوں ہو کہ نے نواز ہیں ہم
ہمارے ہونٹوں نے ایجاد نغمگی کی ہے

تو بڑی حیرت ہوتی ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ خود کو گوتا کیوں قرار دے رہے ہیں۔

"بیاض" کی بیشتر غزلیں پامال زمینوں اور موضوعات پر مبنی ہیں۔ اکثر غزلیں غالب کی زمینوں میں بھی کہی گئی ہیں۔ لیکن ان میں بھی بات بنی نہیں۔ اکثر غزلیں تو ایسی ہیں، جنھیں "بیاض" میں شامل نہ کرنا ہی بہتر تھا کیونکہ انھیں پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاعر نے "بیکار مباش شاعری کیا کر" کے پیشِ نظر محض رسمی خانہ پری کر لی ہے۔ مجموعی طور پر کوئی غزل ایسی نہیں ہے جس کے شعروں کے لئے تہہ میں اُترنے کی ضرورت پڑے۔ تمام اشعار عام طور سے سطح پر ہی تیرتے مل جاتے ہیں۔ لفظ "دار و رسن" پورے مجموعے میں کم از کم پچاس جگہ استعمال ہوا ہے۔ "فراقِ یار، خیالِ یار، صنم، میکدہ" وغیرہ الفاظ کی بھی بھرمار نظر آتی ہے۔ جب کہ سخت قسم کے ترقی پسند شاعر بھی ایسے الفاظ و تراکیب سے اب احتراز کرنے لگے ہیں ــــــ ان تمام خامیوں کے باوجود خاور کی شاعری غنیمت ہے جس کا احساس خود انھیں بھی ہے:

مآل کچھ بھی اس بے عمل زمانے میں
ہماری کوشش نا کام بھی غنیمت ہے

"بیاض" پر محمود سعیدی کا پیش لفظ بھی اچھا ہے۔ جذبہ وہی خیر مقدم کا سا ہے لیکن ذرا شدید ہوگیا ہے۔ کیونکہ جب وہ شاعر کے خیر مقدم کے لئے آگے بڑھتے ہیں تو جذبے کی یہی شدت انھیں شاعر سے بہت آگے لے جاتی ہے اور کافی آگے نکل جانے کے بعد جب انھیں یہ احساس ہوتا ہے کہ شاعر بیچارہ بہت پیچھے رہ گیا ہے، تو واپس آکر محض اپنی خفت مٹانے کے لئے یہ فتویٰ صادر کر دیتے ہیں:

"ہم عصر شاعری کی یکسانیت سے پریشان قاری کے لئے خاور کی یہ غزلیں تسکینِ ذوق کا سامان فراہم کریں گی"۔

پتہ نہیں "تسکینِ ذوق" سے ان کی مراد کیا ہے؟ یا ممکن ہے یہ جملہ لکھتے وقت وہ یہ بھول گئے ہوں کہ آج کی شاعری اپنے قاری سے بھی وسیع تر مطالعے کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس معیار کو قطعی نہیں پہنچتی۔۔۔۔۔۔ انتخاب کرنے کے بعد کتنے ہی اشعار ایسے ضرور نکل آتے ہیں جن میں تازگی ملتی ہے مثلاً:

میرے اندر سے کسی ڈوبتے انساں کی طرح
کون جانے مجھے آواز دیا کرتا ہے

زندگی کم نہیں صحرا کے سفر سے خاور
آگ ہے پاؤں تلے، سر پہ پگھلتا سورج

ہوئے بلند مثالِ غبار ہم، ورنہ
یہ حادثات ہمیں زیرِ دام کر لیتے!

اک نفس کو رکھتی ہیں گرم کتنی امیدیں
دل کو اَن گنت جذبے بے قرار کرتے ہیں

کتاب کا سرورق دو رنگوں میں ہے اور اچھا ہے کتابت بھی بُری نہیں۔ طباعت، لیتھو کے لحاظ سے عمدہ ہے اور اس مناسبت سے قیمت بھی معقول ہے۔

شہزاد اختر

کتاب۔ چوپٹ راج۔ نوعیت۔ سیاسی طنزیہ
مصنف۔ فکر تونسوی ________ ضخامت۔ ۱۵۲
قیمت۔ چھ روپے ________ سالِ طباعت۔ ۱۹۷۳ء
ملنے کا پتہ:۔ لاجپت رائے اینڈ سنز مارو و بازار دہلی

"عام" ادیبوں اور طنز و مزاح نگاروں میں ایک نمایاں فرق یہ ہوتا ہے کہ آخر الذکر کے تجربات فنی مراحل سے اچھی طرح گزرنے کے بعد ایک ایسی تخلیق کی صورت اختیار کرتے ہیں "جو" وار "کرتی ہے چبھتی ہے اور فرحت بخشتی ہے۔ اگر تخلیق خالص طنز یا خالص مزاح پر مبنی نہیں ہے (اور عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے) تو اس کا مطالعہ قاری کو اس طرح "مجروح" یا "مضروب" کرتا ہے کہ اس میں تکلیف اور راحت دونوں جذبات بہ یک وقت بیدار ہوتے ہیں اور بالعموم ہونٹوں سے کراہ یا نفرت آمیز ہنسی نکل پڑتی ہے۔ دراصل طنزیہ تخلیق جو ہنسی ہونٹوں پر لاتی ہے اس کے پسِ پشت کرب و کراہ کا ایک بحرِ ناپیدا کنار موجود ہوتا ہے۔

مزاح نگار یا طنز نگار کی شخصیت کے گلخن میں کوئی بھی تجربہ ایک بالکل ہی برعکس تجربہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ حالانکہ وہی تجربہ عام آدمیوں کے یہاں عام تجربہ ہوتا ہے۔ مثلاً جو تجربات میر کے اشعار کو "آہ" بناتے ہیں وہی تجربات سودا کے اشعار کو "واہ" میں بدل دیتے ہیں۔ میر کو تکلیف ہوتی ہے تو روتے ہیں۔ سودا کو تکلیف پہنچتی ہے تو وہ تڑپ اٹھتے ہیں اور فوراً قلمدان طلب کرتے ہیں۔ لیکن دونوں میں ایک بات مشترک ہے وہ یہ کہ دونوں ہی اپنے ذاتی غم کو آفاقی بنا دیتے ہیں۔ اور ذاتی تجربہ جتنا زیادہ آفاقی ہوتا ہے فن پارہ اتنا ہی عمدہ ہوتا ہے۔

فکر تونسوی نے اپنی کتاب "چوپٹ راج" میں ذاتی تجربات کو بہت حد تک آفاقی بنا دیا ہے۔ دیباچہ میں انھوں نے لکھا ہے:

"میں نے اپنے احمقانہ دور میں جس حسین تصور کو اپنی زندگی کا حصہ بنا لیا تھا وہی میری نظروں کے سامنے تہس نہس ہونے لگا، تو میرے اندر وہی سیدھا سادہ کھلان ایک بچہ بن کر جاگ اٹھا اور مجھ سے پوچھنے لگا کہ تم تو کہتے تھے ڈیموکریسی میں عوام کی طرف سے عوام کی خاطر، عوام پر حکومت کی جاتی ہے مگر یہاں تو ڈیموکریسی کا کچھ اور ہی مطلب نکل آیا؟"

میں نے اپنے اندر بیٹھے ہوئے معصوم بچے کو بہلاتے ہوئے کہا "میں اس اور" کے خلاف ایک کتاب لکھوں گا اور پھر یہ کتاب وہ لوگ پڑھیں گے جو ڈیموکریسی کو جان بوجھ کر راستے سے بھٹکا رہے ہیں اور پھر یہ کتاب ان کے لئے مشعل راہ ثابت ہوگی" ______ یہ کتاب میری معصومیت کی لاش کا نوحہ ہے"۔

لیکن یہ نوحہ آنسوؤں کی زبان میں نہیں پڑھا جاتا بلکہ تبسم کی زبان میں پڑھا جاتا ہے یہی فکر تونسوی کا کمال ہے۔

فکر تونسوی نے اس کتاب کو منسوب کیا ہے "اس بے وقوف کے نام، جو میرے اندر ہے اور جسے موت نہیں آتی"۔

کتاب میں اکثر جگہوں پر یہ کرب، یہ دکھ، یہ غم، یہ احساسِ شکست اور غصہ، نفرت اور حقارت مزاح اور طنز کے پردے سے باہر چھلک پڑتا ہے لیکن یہ فن کار کی مجبوری ہے۔ یہی مجبوری چوپٹ راج اور طنز و مزاح کے شاہکاروں کے درمیان پردہ بن گئی ہے پھر بھی چوپٹ راج اردو کی طنزیہ و مزاحیہ تصنیفوں میں صفِ اول کی ممتاز ترین کتاب ہے۔ (دوسری ہندوستانی زبانوں کے متعلق اس لئے نہیں کہہ سکتا کہ ان سے اچھی طرح واقف نہیں ہوں۔)

شروع سے آخر تک یعنی سرورق سے تمت تک انداز تحریر مزاحیہ ہے اور اس مزاح کے ساتھ طنز کی آمیزش بھی ملتی ہے جس کی وجہ سے تحریر میں شگفتگی اور چبھن دونوں عناصر کا خوشگوار امتزاج نظر آتا ہے۔

یہ کتاب دراصل عہدِ حاضر کی طنز و مزاحیہ سیاسی تاریخ ہے اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے اردو ادب کی تاریخ میں نمایاں مقام رکھتی ہے لیکن تاریخ ہر دور میں یکساں نہیں رہتی۔ یہ جیسے جیسے پرانی ہوتی ہے فرسودہ ہوتی جاتی ہے جب کہ ادب جیسے جیسے کہنہ ہوتا ہے خوب سے خوب تر ہوتا جاتا ہے۔

اس کتاب کا ہیرو چوپٹ راجہ ہے۔ یہ چوپٹ راجہ ایک سمبل ہے۔ اسے آٹوکریسی ورثے میں ملی ہے لیکن اس کے باوجود وہ ڈیموکریٹ ہے۔ اس کی رگوں میں وہی لہو دوڑتا ہے جو حکومت کرنے والوں کی رگوں میں دوڑا کرتا ہے۔ جب ڈیموکریسی آتی ہے تو اس لہو کو ایک دھچکا سا لگتا ہے لیکن وقت کے ڈیموکریٹ اس آٹوکریٹ کو سہارا دیتے ہیں کیونکہ وہ دانشمند لوگ ہیں اور جانتے ہیں کہ اگر ایک آٹوکریٹ کی گردن کٹ گئی تو ہر آٹوکریٹ کی گردن کٹ جائے گی۔ آٹوکریسی کو چیلنج دینے والے خود بھی ان ڈائرکٹ آٹوکریٹ ہیں وہ ڈیموکریسی کا لبادہ اوڑھ کر چوپٹ راج کو گھُڑکیاں بھی دیتے ہیں اور ساتھ ہی کان میں چپکے سے یہ بھی کہہ دیتے ہیں۔ "دنیا بھر کے آٹوکریٹ ایک ہیں اس لئے صرف کپڑے بدل لو جسم وہی رہنے دو۔

چوپٹ راجہ بدھو نہیں ہے کوئی آٹوکریٹ بدھو نہیں ہوتا۔ اس کا مقصد عوام پر حکومت کرنا ہوتا ہے، چاہے آٹوکریسی کے توسط سے کرے چاہے ڈیموکریسی کے توسط سے، جب عوام آٹوکریسی کا تختہ الٹ دیتے ہیں تو چوپٹ راجہ کو ذرا بھی غم نہیں ہوتا۔ وہ جھٹ ڈیموکریٹ ہو جاتا ہے"۔

چوپٹ راجہ کی تصویر میں کتنے ہی سیاسی رہنماؤں کی صورت نظر آتی ہے یہ راجہ جیسا کہ فکر نے کہا

(باقی [illegible] پر)

آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس

آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس کا دوسرا سالانہ اجلاس امسال ۱۷، ۱۸، ۱۹ نومبر کو لکھنؤ میں منعقد ہو رہا ہے۔ اس کا پہلا اجلاس گذشتہ سال پٹنہ میں ہوا تھا۔

کانفرنس کا افتتاح وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کریں گی۔ مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات اندر کمار گجرال بھی جلسے سے خطاب کریں گے۔

اس موقع پر ایک مشاعرہ بھی ہوگا جس کا افتتاح گورنر یو۔پی اکبر علی خاں اور صدارت وزیر اعلیٰ بہار جناب عبدالغفور کریں گے۔

آل انڈیا اردو اخبارات کی سہ روزہ نمائش بھی ہوگی جس میں اردو صحافت کے آغاز سے اب تک کے اخبارات و رسائل کی نمائش ہوگی۔

نمائش کا افتتاح مرکزی وزیر شری ہیم وتی نندن بہوگنا کریں گے۔ شیخ عبداللہ، مسٹر یونس سلیم، شری اشوک مہتہ، مس ان سراجیو تریائے یاسو، کلدیپ نیر (ایڈیٹر اسٹیس مین) کی شرکت کے قوی امکانات ہیں۔

صدر مجلس استقبالیہ عشرت علی صدیقی کے اندازے کے مطابق تین سو مندوبین کی شرکت متوقع ہے۔

اجلاس کی مختلف نشستوں کی صدارت عبدالماجد دریا آبادی، مولانا عثمان فارقلیط، خوشتر گرامی، زکریا اسعدی، اسحاق علمی، جناب محمد سلیم، عابد علی، رنبیر، یوسف دہلوی، آر۔کے۔ کربجیا، شمیم احمد شمیم کریں گے۔

سلیم عمر۔ لکھنؤ

(چوکھا دھندہ۔ بقیہ ص۱۳ کا)

انتقام کے لئے تڑپ رہی ہے۔ آج ایک مسلمان لڑکی کے ساتھ یہ ہوا ہے کل ہماری ماؤں، بہنوں کی عصمت سر بازار تار تار کی جائے گی اور ہماری غیرت کیا یوں ہی سوتی رہے گی۔۔۔۔۔؟"

"نہیں۔۔۔۔ نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔"

مجمع سے کئی آوازیں ابھریں۔ "ہم اپنی بہن کا انتقام لیں گے۔"

"تو پھر دیر کس بات کی ہے۔۔۔۔ ہم کافروں کو بتا دیں گے کہ ہم محمد بن قاسم ہیں ہم محمود غزنوی ہیں۔"

کچھ دور بھیڑ کو اپنی طرف آتے دیکھ کر دلاور خاں چونک اٹھتا ہے وہ ایک دم چیختا ہے "دوڑو کافر آگئے۔۔۔۔۔ مارو۔۔۔۔ بچ کر نہ جانے پائیں۔"

اور دونوں فرقوں میں تصادم ہوگیا۔

ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ایک دوسرے کے خون سے اپنی پیاس بجھا رہے تھے۔ مکانوں اور دکانوں سے دھوئیں کے بادل اٹھ رہے تھے۔ بچے اور بوڑھے قتل ہو رہے تھے۔ عورتوں کی عصمتیں لٹ رہی تھیں اور نفرت کا دیوتا اپنا بھیانک منہ کھولے خونی رقص کر رہا تھا۔ پولیس آئی مگر ناکام، پی۔اے۔سی آئی مگر کچھ نہ کر سکی۔ ملٹری آئی اور جیل کے بوسیدہ کمروں کی آبادی بڑھ گئی۔ نہ جانے کتنے بچے یتیم ہوگئے، کتنی عورتیں بیوہ ہوگئیں، کتنی گودیں سونی ہوگئیں، کتنے لوگ دانہ دانہ کو محتاج ہوگئے۔ شہر میں کرفیو لگا دیا گیا۔

ان سب سے دور ایک کمرے میں رام سنگھ اور دلاور خاں بیٹھے سگریٹ پھونک رہے تھے۔

"بڑا چوکھا دھندہ ہوگیا۔" رام سنگھ نے کہا۔ دلاور خاں نے زانو پر رکھی اٹیچی کو تھپتھپایا اور پھر کمرہ مشترکہ قہقہوں سے گونج اٹھا۔ لیکن قہقہہ لگانے والے بہر حال انسان تھے اس لئے کچھ اداس بھی تھے مگر کیا کرتے یہ تو ان کا دھندہ تھا

(کتابوں کی باتیں۔ بقیہ ص۲۱ کا)

ہے، ایک علامت ہے۔ اور فکر نے نہایت بے باکی کے ساتھ اس علامت کے واسطے سے کتنے ہی چہروں کو بے نقاب کر دیا ہے۔ اس عمل میں طنز کے نشتر اور مزاح کی فرحت کے ساتھ غصہ اور جھلاہٹ بھی ہے اور یہ جھلاہٹ بعض اوقات جمہوریت سے بھی خفا ہو جاتی ہے اور فکر یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ "دنیا میں ڈیموکریسی کی یہی ٹریجڈی رہی ہے کہ شاہیت اپنا روپ بدل کر ڈیموکریسی کی مالک بن جاتی ہے اور جس عظیم کاز کے لئے مفکروں، فلاسفروں اور انقلابیوں نے عوام کے اندر خودی کو بیدار کیا اسی کو موقع پرست شاہیت فوراً اپنا لیتی ہے۔ صرف یہی نہیں فکر اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں" عوام کے حکم سے عوام کا گلا کاٹنے والے عوام کے قاتلوں کو ڈیموکریٹ کہتے ہیں۔"

ڈیموکریسی اور ڈیموکریٹ کے متعلق فکر نے جو کچھ اپنے انداز میں لکھا ہے وہ لاجواب ہے اور طنز و مزاح کے لئے لازمی مبالغہ اور تجربہ کے باوجود یہ بالکل درست ہے لیکن یہاں ایک کمی ہے وہ یہ کہ ایسا کیوں ہے؟ اس عظیم کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے اس کے پیچھے اسباب ہوتے ہیں اور اگر اسباب پر غور کیا جائے تو تکلیف کا احساس کم ہو جاتا ہے۔ ڈیموکریٹ اور ڈیموکریسی کا جو آدرش فکر کے ذہن میں ہے وہ آدرش ہے اور اس تک رسائی کے لئے صدیاں درکار ہیں انسان پہلے ایک خواب دیکھتا ہے اور پھر اس خواب کی تعبیر کے لئے کوشش کرتا ہے۔ ابھی ہندوستان میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی یہاں ڈیموکریسی اپنے ابتدائی مرحلہ میں ہے اور ابتدائی مرحلہ میں فطری طور پر یہی ہونا چاہیئے پہلے شہنشاہ ڈیموکریٹ کا بھیس بدلتا ہے پھر وہ رفتہ رفتہ ڈیموکریٹ ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اقتدار عوام کے ہاتھوں میں بہت دنوں کے بعد آتا ہے۔

اس کتاب کی بے شمار خوبیوں کے باوجود ایک خامی یہ ہے کہ فکر نے اپنے ذاتی تکلیف کو آفاقی بنانے کی کوشش کم کی ہے۔ یہ ذاتی معاملہ اگر ذاتی نہ رہتا تو بہتر تھا۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ فن پارہ ذاتی تجربہ کا اظہار ہے لیکن اظہار کے بعد بھی فن پارہ میں فنکار کی ذات نمایاں ہو تو عیب نظروں میں کھٹکتا ہے۔ کتاب کا مطالعہ کئی اعتبار سے "مفید" اور "ضروری" ہے۔ بشیر احمد

بچت کرنے کا ایک اور طریقہ

ڈاکخانے کی دو سالہ ٹائم ڈیپازٹ اسکیم

ڈاکخانے کی نئی دو سالہ ٹائم ڈیپازٹ اسکیم کے تحت لوگ خود یا منظور شدہ ایجنٹوں کے ذریعہ بھارت کے ڈاکخانوں میں رقم جمع کرا سکتے ہیں۔

شرح سود 7 فیصد ہے۔ سود کی رقم ہر سال ادا کی جائے گی۔ اس پر انکم ٹیکس لگے گا لیکن ٹیکس کی رقم ادائیگی کے وقت ہی نہیں کاٹی جائے گی۔ البتہ دوسرے منظور شدہ کھاتوں کی طرح اس اسکیم کے تحت ملنے والا سود بھی 3,000 روپے کی حد تک ٹیکس سے مستثنیٰ ہوگا۔ یہ دو سالہ ڈیپازٹ، کھاتے کی مدت کے دوران تین سالہ ڈیپازٹ میں منتقل کئے جا سکتے ہیں۔

نئی اسکیم پر یکم اگست 1973ء سے عمل شروع ہو چکا ہے۔

آج بچائیے اور اپنا مستقبل روشن بنائیے

تفصیلات کیلئے درج ذیل پتے پر لکھیئے:-

نیشنل سیونگز کمشنر (بھارت سرکار)
پوسٹ بکس 96، ناگپور

یا

متعلقہ ریاست کی راجدھانی میں متعین

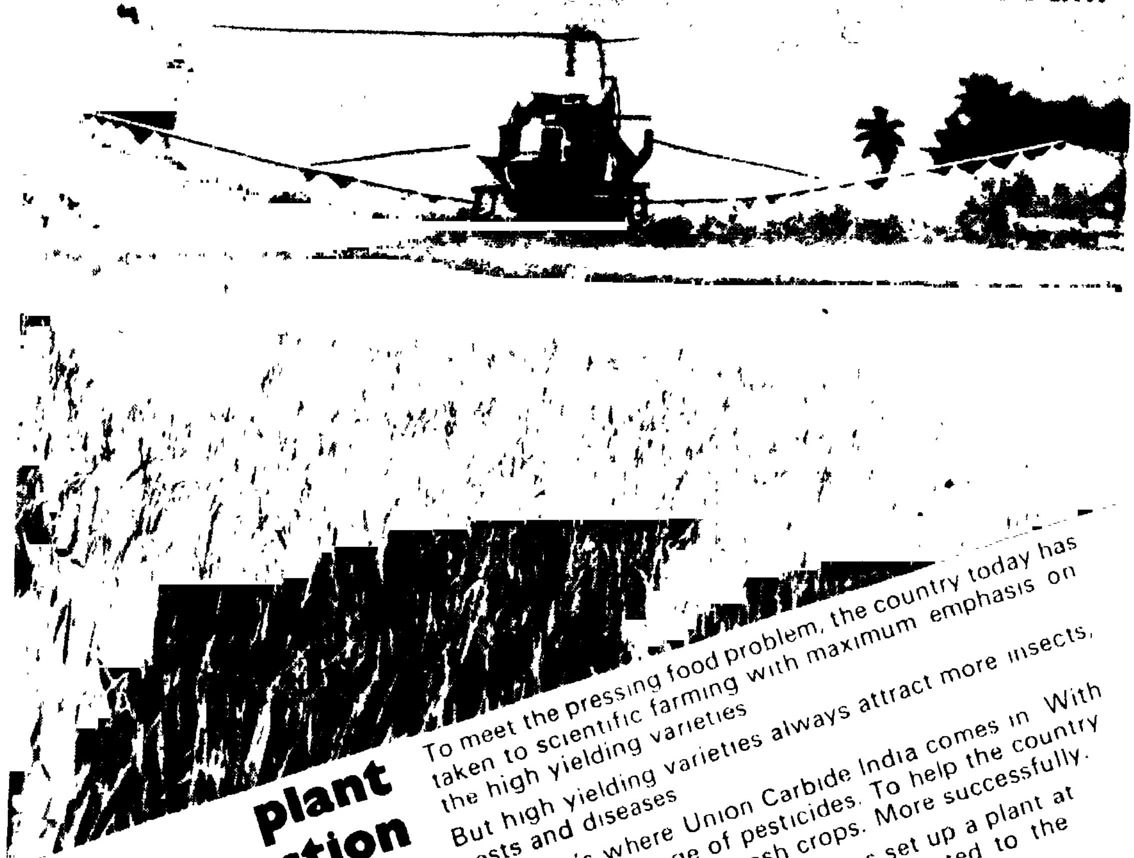
ریجنل ڈائریکٹر، نیشنل سیونگز
(بھارت سرکار)

davp 73/213



تار کے پتے میں
پانچ الفاظ مفت
TELEGRAM
آپ جو تار بھیج رہے ہیں اگر اس میں پتہ لمبا ہے تو آپ گھبرائیں نہیں۔
ایسی حالتوں میں پتے کے پہلے پانچ الفاظ پر پیسے لئے جاتے
ہیں اور باقی پانچ الفاظ مُفت بھیجے جاتے ہیں۔
پتے میں دس سے زیادہ جتنے الفاظ ہوں ان پر
بھی پیسے لئے جاتے ہیں۔
براہ مہربانی شہر کے نام کے بعد پن کوڈ بھی لکھیے۔
اس پر کوئی پیسہ نہیں لیا جاتا۔
یاد رکھیے پورا اور صحیح پتہ لکھنے سے آپ کا تار
جلدی پہنچے گا۔
محکمہ ڈاک و تار
davp 73/173

a step towards more food...



plant protection chemicals for the high yielding varieties

To meet the pressing food problem, the country today has taken to scientific farming with maximum emphasis on the high yielding varieties.

But high yielding varieties always attract more insects, pests and diseases.

And that's where Union Carbide India comes in. With an extensive range of pesticides. To help the country grow more food and cash crops. More successfully.

In fact, Union Carbide India has set up a plant at Bhopal for developing pesticides suited to the local conditions to meet farmers' needs.

With scientific expertise acquired over the years through continued research and development, Union Carbide India is today contributing in the many areas of the country's growth.

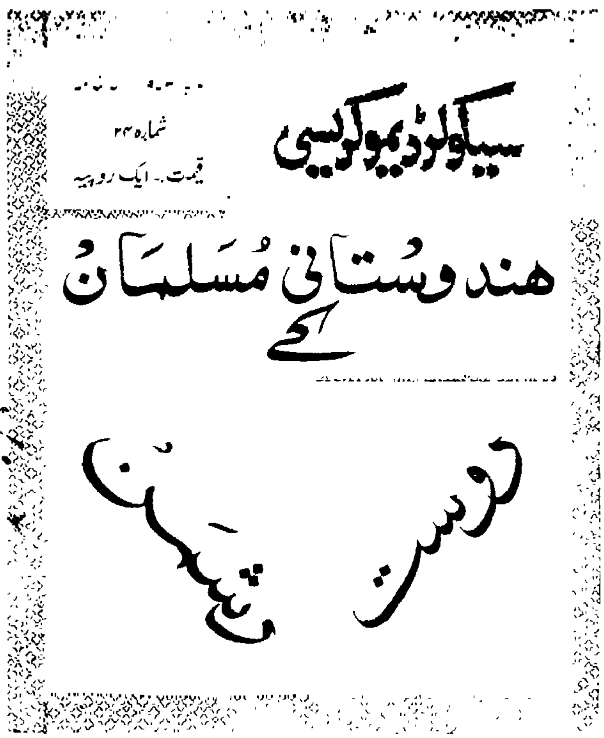
UCCM 013 a

UNION CARBIDE

participating in the nation's needs

Regd. No. R.N. 16241/68 Regd. No. D-1820

TWO OUTSTANDING ANNUALS



ہندوستانی مسلمان آج کل دوستوں کے جُھرمٹ میں
پریشان بیٹھا ہے۔ سیاسی مصلحت کو سامنے رکھ کر یار لوگوں
نے وہ سماں باندھا ہے کہ ع

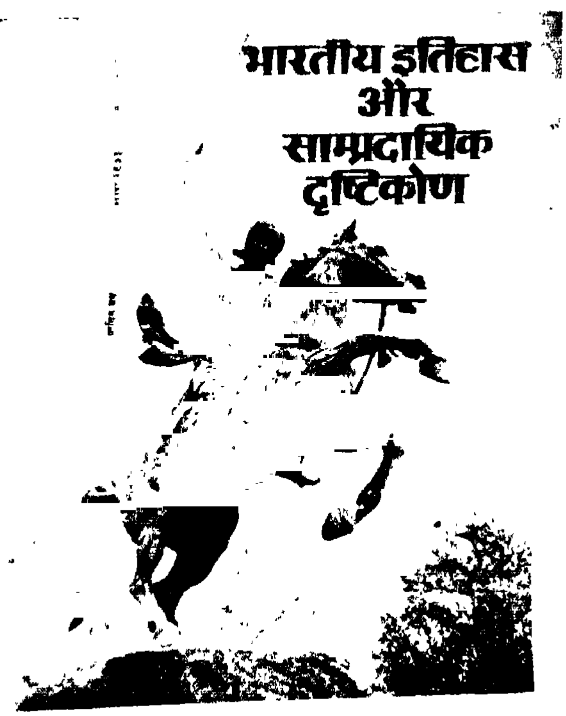
ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی

والا معاملہ ہو رہا ہے۔ یہ بڑھ کر 'عزتِ سادات بھی گئی'
تک نہ پہنچے اس کے لئے لازمی ہے کہ تجزیاتی شعور سے
کام لیا جائے۔ سیکولرڈیموکریسی سالنامہ جُھرمٹ میں
چھپے چہروں سے پردے ہٹائے گا۔

- भारतीय इतिहास पर सही और तथ्य परक दृष्टिकोण पेश करने वाले विद्वत्तापूर्ण लेख—प्रसिद्ध इतिहासकारों, अनुसंधानकर्ताओं और विचारकों द्वारा
- साम्प्रदायिक तत्वों के साजिश पूर्ण दृष्टिकोण का पर्दाफाश
- विशेषांक की सामग्री केवल पढ़ने की ही नहीं बल्कि संजो कर रखने की वस्तु होगी
- अपने अंक को आज ही सुरक्षित कराइए

संम्पर्क : सेक्यूलर डेमोक्रेसी

१९-ए, थियेटर कम्यूनिकेशन बिल्डिंग, कनॉट सर्कस, नई दिल्ली



این۔ این پانڈے نے قومی ایکتا ٹرسٹ کے لئے ... پرکیشن آفسٹ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔
رجسٹرڈ آفس:- A-۱۹، تھیٹر کمیونی کیشن بلڈنگ۔ کناٹ سرکس، نئی دہلی

سیکولر ڈیموکریسی

قومی ایکتا ٹرسٹ کی تین اہم کتابیں

بنگلہ دیش میں بارہ دن
(عتیق صدیقی)

اردو میں بنگلہ دیش پر یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جو اخباری یا کتابی مطالعے پر نہیں بلکہ عینی مشاہدے پر مبنی ہے۔ یہ ایک ایسے مصنف کے تاثرات ہیں جو بنگلہ دیش کے مسائل پر گہری نظر رکھتا ہے۔ حال ہی میں عتیق صدیقی بنگلہ دیش گئے تھے۔ اور دو ہفتے قیام کرکے وہاں کے حالات کا انھوں نے غایر مطالعہ کیا۔ بنگلہ دیش کے وزیروں اور لیڈروں ہی سے نہیں، عام لوگوں سے بھی انھوں نے ملاقاتیں کیں اور جو کچھ دیکھا یا سُنا اُسے نہایت دل کش انداز میں بے کم و کاست قلم بند کر دیا۔ مصنف کے صحافتی اندازِ بیان نے اس رپورتاژ کو آج کے بنگلہ دیش کی جیتی جاگتی تصویر بنا دیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اردو کے بہترین رپورتاژوں میں اس کا شمار ہوگا۔ طباعت آفسٹ۔

متحدہ قومیت اور اسلام
مولانا حسین احمد مدنی

تحریکِ آزادی کے پیچھے جو ایک خیال اور جذبہ کارفرما تھا وہ یہ تھا کہ ہندوستان کے تمام باشندے بلا لحاظِ مذہب و ملّت ایک قوم ہیں، جس کو اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کا حق ہے۔ اس تحریک اور جدوجہد کے دوران ایک جذبۂ یک جہتی و قومیت پیدا ہوا۔ انگریز حواریوں نے اس کے خلاف جذبات بھڑکانے کی کوشش کی۔ راشٹریہ سویم سیوک سنگھ اور ہندو مہاسبھا نے تحریک شروع کی کہ ہندوستان کی قومیت ہندو قومیت ہی ہو سکتی ہے جو ہندو نہیں وہ اس ملک کا شہری یا قوم پرست نہیں ہو سکتا۔ اس کے مقابلے میں مسلمانوں میں ... مسلمان تو کسی ایسی قومیت کا حصہ ہو ہی نہیں سکتے جس میں غیر مسلم بھی شامل ہوں۔ مسلم لیگ نے اعلان کیا کہ مسلمان ... قوم ہیں اس لئے مسلمانوں کے لئے الگ ملک بننا چاہیئے۔ مسلم لیگ کے علاوہ ایک دوسرا خیال جماعت اسلامی نے پھیلایا کہ مسلمان تو کسی بھی قومیت سے متعلق نہیں ہو سکتے۔ انھوں نے مسلمانوں کو سمجھانا شروع کیا کہ قومیت کا تصور ہی غیر اسلامی ہے اور مغرب کی پیداوار ہے۔ اسی طرح جمہوریت ... نقطۂ نظر سے مسلمانوں کو ان سے الگ رہنا چاہیئے۔ یہ خیالات ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے لئے بھی خطرناک تھے اور تمام ملک کے لئے بھی ضرر رساں۔ اس بات کو بہت سے مسلم قائدین نے سمجھا اور مسلمانوں کو صحیح صورت حال سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔ ان میں مولانا حسین احمد مدنی پیش پیش تھے۔ اس مسئلے پر انھوں نے متحدہ قومیت اور اسلام کے نام سے ایک کتابچہ لکھا ہے جو پچھلے پچیس تیس سال سے نایاب تھا۔ افادیت کے پیشِ نظر اسے دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔ صفحات ۸۰، طباعت آفسٹ، قیمت ڈیڑھ روپیہ۔

جلتا شہر کراہتی راتیں
اظہار اثر

ایک شہر .... جو تاریکیوں اور گناہوں کے آغوش میں سسک رہا تھا.....!

ایک شہر، جس کے آسمان پر عسکری سیاست کی دھند چھائی ہوئی تھی۔

ایک دنیا ..... جو آگ اور خون کے در و دیوار میں جینے والوں کی حسرتیں سمیٹے ہوئے سُلگ رہی تھی

جسموں کی عریانی اور سنسناتی ہوئی گولیوں کے درمیان ..... بھڑکنے والے ان شعلوں کی پُراسرار داستان

...... جو شہر اور کراہتی راتوں کی ہزاروں داستانوں کو چھپائے ہوئے تھے

اسرار، ہیبت اور عصری سیاسی شعور سے بھرپور ایک جاسوسی ناول جسے اظہار اثر نے پُراسرار ناولوں کے ایک نئے تجربے کی صورت میں تخلیق کیا ہے۔

صفحات ۱۲۸، طباعت آفسٹ، قیمت ڈھائی روپے

۱۵۔ بلونت رائے مہتہ لین نئی دہلی

نوازش نامے

حصہ شعر و ادب میں اضافہ

جناب رفعت سروش، سمترانندن پنت کی ہندی نظم 'بھارت درشن' کا ترجمہ نہایت حسین پیرائے میں پیش کرکے پنت جی کی شاعرانہ عظمت سے اردو حلقہ ادب کو روشناس کرانے میں صد فی صد کامیاب رہے ہیں۔ میرے خیال میں "سیکولر ڈیموکریسی" میں حصۂ شعر وادب کے اضافے کی مزید ضرورت ہے کیونکہ قلم کار کی آواز وقت کی آواز ہوتی ہے اور ہر معرکہ عمل میں شاعر وادیب کا قلم پیش پیش رہتا ہے۔ پرچے کے حسن واہتمام نے پیش نظر قلم کار کی تخلیق کے ساتھ مختصر تعارف بھی شائع ہونا چاہئے اور اگلے شمارے کی اشاعت کا اقتباس بھی شائع ہونا لازمی ہے۔

زار غازی پوری۔ ۲۴ پرگنہ

چھوٹی سی درخواست

مکرمی تسلیم!

ایک چھوٹی سی درخواست یہ ہے کہ ہمارا کیمپ اب تک پاکستان روانہ نہیں کیا گیا اور نہ آئندہ ایک ماہ کے اندر ہمارے جانے کی امید ہے۔ لہٰذا نومبر کا خاص شمارہ اسی کیمپ کے پتہ پر بھیجدیں تو نہایت ممنون ہوں گا۔ شکریہ

سید مظفر عالم ہاشمی

قیدی نمبر ۴۷۴۴۳/۲، بلاک نمبر ۲

انسانیت کا شاعر

مدیر محترم۔ سلام مسنون!

اکتوبر کے شمارے میں آفتاب احمد کے مضمون "نظریۂ پاکستان اور اقبال" کے متعلق کچھ باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

ایسا لگتا ہے کہ مضمون نگار نے اقبال کی شاعری اور افکار کو ایک کھلے ذہن اور وسیع نقطۂ نظر کی بجائے ایک محدود ذہن اور تنگ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

اقبال کو آج نئی نظر اور نئے زاویوں سے دیکھا جا رہا ہے جس سے اقبال کی ایک نئی دلکش تصویر ابھر رہی ہے۔ حال ہی میں اقبال صدی کے موقع پر سری نگر میں اقبال سے متعلق ایک نمائش کے رسم افتتاح پر کشمیری لیڈر شیخ عبداللہ نے کہا:

"قوم پرستی اور سیکولرازم انھوں نے اقبال ہی سے سیکھا۔ جب انھوں نے ۱۹۳۱ء میں کشمیر مسلم کانفرنس تشکیل دی تو اقبال نے ان سے کہا کہ غیر مسلمین کو شامل کرکے تحریک کو اور وسیع کریں۔ اس کے بعد ۱۹۳۹ء میں مسلم کانفرنس کے نیشنل کانفرنس میں تبدیل ہوجانے میں اقبال کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔"

انھوں نے مزید کہا:

"یہ سراسر ناانصافی ہے کہ اقبال صرف پاکستان یا صرف مسلمانوں کے شاعر تھے۔ دراصل وہ پوری انسانیت کے شاعر تھے۔"

اسی موقع پر مرکزی وزیر آئی۔ کے گجرال نے کہا "اقبال کی شاعری عمل کا پیغام دیتی ہے۔ اقبال کے مذہبی افکار ہماری ہندوستانی قوم پرستی میں حائل نہیں ہوتے۔"

آج ملک کی تقسیم ایک حقیقت بنکر ہمارے سامنے آئی ہے۔ ہم اسے کسی طرح بھی نظرانداز نہیں کرسکتے۔ آج اس بات کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان حائل خلیج کو پاٹ دیا جائے۔ ایسے وقت میں پرانے زخموں کو کریدنا عقلمندی نہیں ہے۔

نسیم احمد۔ ہُبلی

چودھری چرن سنگھ اور اردو

مکرمی!

بھارتیہ کرانتی دل کے رہنما چودھری چرن سنگھ نے اپنی حالیہ پریس کانفرنس میں اردو زبان کے متعلق جس رائے کا اظہار کیا ہے وہ انتہائی افسوسناک اور قابل مذمت ہے۔ اخباری رپورٹ کے مطابق انھوں نے ارشاد فرمایا کہ "اردو کو دوسری زبان کا درجہ کسی قیمت پر بھی نہیں دیا جاسکتا کیونکہ ہندوؤں کی اکثریت اس کے خلاف ہے۔" (یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ چودھری صاحب نے عوام کی اکثریت نہیں کہا بلکہ "ہندوؤں کی اکثریت" کہا ہے۔

اردو کے خالص لسانی مسئلہ کو فرقہ وارانہ رنگ دینے اور اسی مسئلہ کو ہندو مسلم سوال بنانے کی کوشش کرنا محض اس حقیقت کی عکاسی کرتا ہے کہ ہمارے ملک میں چرن سنگھ قسم کے لیڈروں میں فرقہ واریت کا زہر کس درجہ بھرا ہوا ہے اور وہ کس قدر تنگ نظر واقع ہوئے ہیں۔

یہ وہی چودھری چرن سنگھ ہیں جو ابھی کل تک بظاہر اردو اور مسلمانوں کے غم میں گھلے جاتے تھے اور سادہ لوح مسلمانوں کی ایک تعداد بھی ان کو اپنا بہی خواہ بلکہ نجات دہندہ سمجھنے لگی تھی۔ بہرحال چودھری صاحب نے اردو کے خلاف زہرافشانی کرکے اپنے اندرونی جذبات کی بروقت ترجمانی کردی اور اپنے اصلی رنگ میں ظاہر ہوگئے۔ امید ہے کہ اتر پردیش کے نہ صرف اقلیتی بلکہ اکثریتی طبقے کے لوگ بھی ایسے تنگ نظر اور فرقہ پرست شخص کو برسر اقتدار نہ آنے دیں گے اور کبھی ایسا موقع ہی نہیں آئے گا کہ اب اس قسم کے فیصلے کرنا چرن سنگھ کے دائرہ اختیار میں ہوگا۔

محمد سلیم قدوائی

شعبۂ سیاسیات مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

دفتر کا پتہ
A-19 تھیٹر کمیونی کیشن بلڈنگ
کناٹ سرکس۔ نئی دہلی

ٹیلی فون نمبر ۴۲۳۸۳

ماہنامہ
سیکولر ڈیموکریسی

دسمبر ۱۹۷۳ء
شمارہ ۲۵

شرح
سالانہ: دس روپیہ
ششماہی: [illegible]
قیمت فی پرچہ: [illegible]

ہماری گذارش

جب برژنیف آئے......

کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری برژنیف پانچ دن کے دورے پر نئی دہلی آئے تو عوام نے ان کا بڑھ چڑھ کر سواگت کیا۔ سوویت یونین کے لیڈر کے لئے محبت کے جذبات محض ہندوستانی مہمان نوازی کی بات نہیں تھی۔ گذشتہ پندرہ برس کے تجربے سے ہم نے محسوس کیا ہے کہ جب بھی موقع آیا ہے سوویت یونین نے سچے دوست کی طرح ہندوستان کا ساتھ دیا ہے آزادی حاصل کرنے کے بعد ملک کو مہذب دنیا کی اگلی صفوں میں لانے اور سائنس وصنعت کے میدانوں میں غلامی کے دنوں کا دیا ہوا پچھڑا پن دور کرنے کے لئے جس قسم کی کوششوں کی ضرورت تھی وہ سوویت مدد کے بغیر ممکن نہیں تھیں۔ نہ انگریزوں کو نہ امریکیوں کو اس بات میں دلچسپی تھی کہ ہندوستان بنیادی صنعتوں کی تعمیر میں کوئی پیش قدمی کر سکے۔ ان کی طرف سے کبھی اس بات کی ہمت افزائی نہیں ہوئی کہ ہندوستان فولاد اور تیل جیسی مصنوعات کے کارخانے لگائے۔ خود ہندوستان میں جو تیل کے ذخیرے موجود تھے اور بعد میں سوویت یونین اور دیگر سوشلسٹ ممالک کی مدد سے کھوج نکالے گئے۔ ان پر لاعلمی کا پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ غالباً اس لئے کہ برٹش اور امریکن تیل کمپنیوں کی اجارہ داری کو ٹھیس نہ پہنچے اور ہمارا ملک تیل کی

سپلائی کے لئے ان پر منحصر رہے۔ آج کے حالات پر غور کرتے ہیں تو یہ خیال ناگزیر ہے کہ اگر ہم نے تیل کمپنیوں کے حینگل کو ڈھیلا نہ کیا ہوتا تو آج ہم اس آزادی سے عرب ممالک کے حق پرستانہ حقوق کے لئے آواز نہ اُٹھا سکتے جس آزادی سے آج اُٹھا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ تیل پر منحصر مختلف صنعتوں مثلاً کیمیائی کھاد اور بجلی وغیرہ کے معاملے میں بھی ہم دوسروں کے دست نگر ہوتے۔ اسی طرح فولاد کے کارخانوں کا سلسلہ ہندوستان میں تب شروع ہوا جب سوویت یونین نے پہل کر کے بھلائی میں کارخانہ بنا کر دیا۔ مشینیں بنانے اور دواسازی کے کارخانوں کا بھی یہی قصہ ہے دوسرے الفاظ میں ہندوستان کی آزادی کو اقتصادی پہلو سے مضبوط کرنے میں سوویت یونین کا نمایاں حصہ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے ملک کا سربراہ جب ہمارے ملک میں آتا ہے تو اس کا غیر معمولی خیر مقدم ہوتا ہے۔ یہ صرف دوستداری اور مہمان نوازی کا ہی نہیں حب الوطنی اور دیش بھگتی کا بھی تقاضا ہے۔

لیکن شومئی قسمت دیکھئے کہ جو پارٹی خود کو دیش بھگتی کا اجارہ دار سمجھتی ہے وہ اس تقاضے کو پورا کرنے سے کتراتی ہی نہیں بلکہ اس کے خلاف طرز عمل اختیار کرتی ہے۔ سیکولر ڈیموکریسی کا ہمیشہ سے یہ خیال رہا ہے کہ جن سنگھی جو دوسروں کو حب الوطنی کا درس دینے کی کوشش کرتے ہیں ہر ایک کے ہندیانے کا نعرہ لگاتے ہیں خود ان جذبات سے سراسر بے بہرہ ہیں۔ اس کا ثبوت بار بار ملتا رہا ہے۔ تحریکِ آزادی کے دوران جن سنگھ کی ماں راشٹریہ سویم سیوک سنگھ نے تحریک آزادی کو کمزور کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ آزادی آئی تو اس صدی کے عظیم ترین انسان اور آزادی کی جنگ کے سپہ سالار کے خلاف ایسا ماحول بنایا کہ ملک اس کی زندگی اور رہنمائی سے محروم ہو گیا۔ اس کے بعد چین نے ہندوستان کی سرحدوں پر حملہ کیا تو ان لوگوں نے ہندوستانی مزاحمت کے نشان جواہرلال نہرو پر یلغار شروع کر دی۔ بنگلہ دیش کے دنوں میں بھی ان کا رویہ ایسا تھا جس سے اس تحریک کا رنگ روپ بگڑ کر فرقہ وارانہ رنگ اختیار کرے۔ اس فرقہ وارانہ تعصب کے تحت یہ لوگ ہندوستان کو عربوں کی حق پرستانہ تحریک حریت کی مخالفت پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسرائیلی فاشزم کی حمایت کا دم بھرتے ہیں۔

جن سنگھ کے اس روایتی کردار کو دیکھتے ہوئے کوئی حیرانی کی بات نہیں کہ برژنیف صاحب کے دورے پر ان کا ردِ عمل ملک کے عوام سے مختلف ہوا۔ برژنیف اس ملک کے سربراہ تھے جس نے ہندوستان کو سامراج وادی مغرب کے مقابلے میں سر اونچا کرنے میں مدد کی۔ جن سنگھ جو اوّل برٹش اور اور اب امریکی سامراج کا پروردہ ہے۔ ان کا خیر مقدم کرنے میں پیش قدمی کیسے کر سکتا تھا؟ اور پھر حال ہی میں عرب اسرائیل جنگ کے دوران اسرائیل کے دانت کھٹے کرنے کے لئے سامان جنگ بھی روس نے دیا تھا۔ عربوں کی حمایت روس کر رہا ہے جس کی وجہ سے وہ امریکی سامراج کی ریشہ دوانیوں کا مقابلہ کر رہے ہیں تو پھر اسرائیل دوست عرب دشمن جن سنگھی برژنیف کو کیونکر پسند کر سکتے ہیں۔

ایک اور دلچسپ بات یہ دیکھنے میں آئی کہ عربوں کی حمایت اور اپنی اسلام پرستی کا ڈھنڈورہ پیٹنے والی مسلم لیگ اور مجلس بھی روس مخالفت میں جن سنگھ کے شانہ بشانہ کھڑی نظر آئیں۔ کند ہم جنس با ہم جنس پرواز والا معاملہ صاف نظر آتا ہے۔ فرقہ پرست نام کسی بھی مذہب کا لے کر چلیں ان کا نقطۂ نظر اور کردار ایک ہی ہوتا ہے۔ آج کل اندرا گاندھی کی مخالفت کو انھوں نے جزو عقیدہ بنا رکھا ہے۔ اسی لئے روس کی مخالفت پر وہ کمربستہ ہیں۔ شاید اگر روس ہندوستان کی اور عربوں کی مدد نہ کرتا تو وہ زیادہ خوش ہوتے کیونکہ وہ امریکہ سے بہت خوش نظر آتے ہیں اور امریکہ کے قریب آتا ہوا کمیونسٹ چین بھی ان کو روس سے زیادہ دلنواز لگتا ہے۔ ان کے طرز عمل سے ہندوستان کو نقصان ہوتا ہے۔ عربوں کو زک پہنچتی ہے۔ حق و انصاف کو ضعف پہنچتا ہے۔ اس سے ان کو کوئی غرض نہیں۔

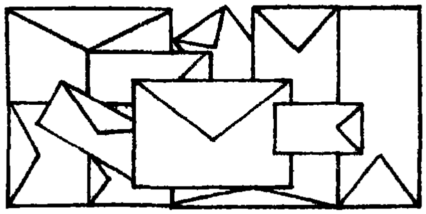
اسی لئے جب ہندوستانی عوام نے برژنیف صاحب کا خیر مقدم کیا تو یہ پارٹیاں اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا کر کھڑی رہیں اور ہندوستانی عوام کا مذاق اڑانے کی ناکام کوشش کرتی رہیں۔ لاکھوں لوگ لال قلعہ کے میدان میں برژنیف اور اندرا گاندھی کی تقریریں سننے کے لئے آئے تو جن سنگھی اخبار مدر لینڈ نے ان کو بھاڑے کے ٹٹو کہا۔ ہم کو اس سلسلے میں دو سال پہلے کی بات یاد آئی۔ الیکشن کے دنوں میں ایک جن سنگھی امیدوار نے ایک رکشا کرائے پر لینا چاہا تو رکشے والے نے اس کو بٹھانے سے انکار کر دیا۔ اور کہا "جب اندرا گاندھی نے بنک اپنے ہاتھ میں لئے اور ہم لوگ اُسے مبارکباد دینے گئے تھے تو آپ لوگوں نے ہمیں بھاڑے کے ٹٹو کہا تھا۔ آج آپ ذرا بھاڑے کے ٹٹوؤں کا مزہ چکھ دیکھئے۔"

وہ وقت قریب ہے جب یہ فرقہ پرست عناصر اپنے کئے کا پھل پائیں گے لیکن ہمارا خیال ہے کہ یہ لوگ انتخابات میں جیتنے کے لئے تو حصہ لیتے ہی نہیں۔ انھوں نے سامراج کی چاکری اختیار کر رکھی ہے۔ اسی کو بجاتے ہیں۔ وہی خدمت یہ لوگ اس وقت بجا لانے کی کوشش کر رہے تھے جب برژنیف نئی دہلی کے دورے پر آئے۔

•••

سامپردائکتا ورودھی کمیٹی کی سرگرمیاں

صدر سامپردائکتا ورودھی کمیٹی کا مراسلہ



از طرف

سُبھدرا جوشی
چیئرمین آل انڈیا سامپردائکتا ورودھی کمیٹی

ساتھیو!

حال ہی میں راجستھان اسٹیٹ سامپردائکتا ورودھی کمیٹی کی طرف سے بلائی گئی کنوینشن کے سلسلے میں جے پور جانے کا اتفاق ہوا۔ کنوینشن ختم ہونے کے بعد شام کے کھانے کے لئے کمیٹی کے پریزیڈنٹ شری شیو چرن ناتھ کے یہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے قریب ہی راجستھان یونی ورسٹی کی ایک پروفیسر بیٹھی تھیں انھوں نے مجھ سے سوال کیا:

"دو سال پہلے بھی ایسی ہی کنوینشن ہوئی تھی آپ نے وہ بھی دیکھی اور اب کی بار بھی حصہ لیا۔ آپ نے کوئی اندازہ کیا کہ ان دو سالوں میں تحریک میں کچھ تبدیلی ہوئی ہے کیا؟"

سوال نہایت مناسب اور بروقت تھا اور غالباً تحریک سے متعلق ہر شخص کے دماغ میں اٹھتا ہوگا۔ مصروفیت کی وجہ سے اگر کسی کے ذہن میں نہ بھی اٹھا ہو تو ہم سب کو اس پر غور کرنا چاہیئے، مرکزی کمیٹی کو بھی۔ پردیش کمیٹیوں کو بھی۔ جہاں تک راجستھان کا تعلق ہے جو میں نے محسوس کیا اُن کو بتلایا۔ سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ اس بار جو لوگ کنوینشن میں شامل ہوئے سامپردائکتا ورودھی کمیٹی تحریک سے بہتر واقفیت رکھتے تھے۔ اپنے اپنے علاقوں میں کام کا ذاتی تجربہ رکھنے والوں کی تعداد بھی کافی تھی۔ اودے پور ڈونگر پور، جودھپور، ناگورا اور ٹونک میں جب فرقہ وارانہ تناؤ کے حالات پیدا ہوئے اور خطرے پیدا ہوئے کہ تناؤ بڑھ کر تشدد کی صورت اختیار کر سکتا ہے تو مقامی ورکروں نے حالات کو سدھارنے میں حصہ لیا۔ اسٹیٹ کمیٹی کی طرف سے بھی بروقت امداد اور حوصلہ افزائی ہوئی۔ انھوں نے اپنے کام میں جو کامیابی حاصل کی اس سے پیدا شدہ اعتماد کی جھلک ان کی بات چیت میں ملتی تھی۔

آل انڈیا سامپردائکتا ورودھی کمیٹی کے جنرل سکریٹری جنھوں نے کنوینشن کی تیاری اور دوروزہ بحث کو غور سے دیکھا تھا پاس ہی بیٹھے تھے۔ انھوں نے میرے مشاہدے کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ جن لوگوں نے بحث میں حصہ لیا ان کی تقریروں اور دو سال پہلے کی کنوینشن میں ہوئی تقریروں میں خاص فرق تھا اس بار صاف محسوس ہوتا تھا کہ تقریر کرنے والے محض تقریر کی خاطر تقریر نہیں کر رہے تھے۔ ان کے الفاظ میں تجربے کی طاقت تھی۔ تحریک کے مختلف پہلوؤں پر بھی مندوبین غور کرکے آئے دکھائی دیتے تھے۔ لہٰذا سطحی بحث کم تھی عملی بات چیت زیادہ تھی۔ سرکاری مشینری کی تنقید میں بھی مثبت پہلو جھلکتا تھا۔ جہاں جہاں افسران نے اچھا کام کیا اس کی داد دی گئی۔ اسی سے یہ بھی ہوا کہ ساتھیوں نے ذاتی یا جماعتی و سیاسی اختلافات کو بحث میں مخل نہیں ہونے دیا۔ جہاں کہیں تنقید میں صحت و دلیل نظر آتی تھی اس کو نہایت فراخدلی اور خندہ پیشانی سے قبول کیا جاتا تھا۔ ان تمام باتوں سے یا تاثر لیا جا سکتا ہے کہ راجستھان میں تحریک صحیح سمت میں جاری ہے۔

پچھلے کچھ مہینوں سے خبریں مل رہی ہیں کہ آر۔ ایس۔ ایس نے اپنی سرگرمیاں آدی باسی علاقوں میں خاص طور سے تیز کر دی ہیں۔ گجرات میں جو فسادات ہوئے ان میں آدی باسیوں کو استعمال کیا گیا۔ ان کو جن طریقوں سے بھڑکایا جاتا ہے اس کو سمجھنا چاہیئے۔ آدی باسیوں کو ہمیشہ اپنے مذہبی عقائد سے محبت رہی ہے لیکن اس محبت کی وجہ سے وہ کبھی متعصب نہیں ہوئے۔ ان کے دلوں میں دوسرے مذہبوں کے ماننے والوں کی ہمیشہ عزت رہی ہے۔ لیکن جب سے آر۔ ایس۔ ایس نے اپنی مختلف قسم کی سماجی اور مذہبی فرنٹ تنظیموں کے ذریعے ان میں اپنا عمل دخل شروع کیا ہے ان میں یہ خیال پیدا کیا جا رہا ہے کہ غیر ہندو لوگ یعنی عیسائی اور مسلمان ان کے دھرم کے لئے خطرہ ہیں۔ ان لوگوں کے بارے میں یہ بھی پرچار کیا جاتا ہے کہ یہ ان کی عورتوں کو بری نظر سے دیکھتے ہیں جس سے آدی باسیوں کے جذبات مشتعل ہوتے ہیں۔

جے پور میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا لیکن سب کو یہ احساس تھا کہ اس طرف ہماری تحریک کا دھیان نہیں گیا۔ گورنمنٹ بھی اس نئی صورت حال سے غافل نظر آتی ہے۔ میرا اپنا تجربہ ہے کہ رورکیلا اور جمشید پور میں جب آدی باسیوں کو بھڑکا دیا گیا تو فسادات کی آگ بہت تیز ہو گئی اور اس پر قابو پانا

مشکل ہوگیا تھا۔ اس لئے سبھی لوگوں کو آدی باسی علاقوں کو فرقہ واریت کے زہر سے بچانے کے لئے خاص کوشش کرنی چاہیئے۔

گزشتہ ماہ میں نے لکھا تھا کہ کنوینشن دسمبر کے تیسرے یا چوتھے ہفتہ میں ہوگی۔ ٹھیک تاریخوں کا اعلان کرنے میں تاخیر کی ایک وجہ یہ ہوئی کہ وزیراعظم کی تاریخ شمولیت حاصل نہیں ہوسکی تھی۔ آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ تاریخیں اب آخری طور پر طے ہوگئی ہیں۔ کنوینشن اب ۱۱ سے ۱۳ جنوری ۱۹۷۴ء تک ہوگی۔ وزیراعظم ۱۲ جنوری کو خطاب کریں گی۔ کنوینشن لکھنؤ کی بجائے میرٹھ میں ہوگی۔

اترپردیش کے مغربی اضلاع کے ساتھیوں کی رائے ہے کہ فرقہ واریت کا چیلنج ان علاقوں میں ہی سب سے زیادہ ہے۔ اگر فرقہ واریت مخالف لوگوں کا اجتماع میرٹھ، مرادآباد وغیرہ کسی جگہ پر ہو تو ان علاقوں میں جن لوگوں نے فرقہ واریت کے خلاف مہم شروع کر رکھی ہے ان کو تقویت پہنچے گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان علاقوں میں کمیٹیاں خوب بن گئی ہیں ممبرسازی بڑے پیمانے پر ہوئی ہے۔ ممبران نے لٹریچر تقسیم کیا ہے۔ اور سیکولر ڈیموکریسی کے خریدار بڑی تعداد میں بنائے ہیں۔ یہ سب کام بڑی تیزی سے چل رہا ہے۔ اس کام کے لئے ہندو اور مسلم نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد سامنے آئی ہے۔ یہ نوجوان بجا طور پر فخر کرسکتے ہیں کہ فرقہ وارانہ جماعتوں کی کوششوں کے باوجود انھوں نے ماحول کو پراگندہ ہونے سے بچایا ہے۔ سہارنپور میں نہایت جانفشانی سے کام کرکے ہمارے ساتھیوں نے مسلم لیگ اور جن سنگھ کی مشترکہ کوششوں کو ناکام بنایا۔ ان تمام ساتھیوں کے خیالات اور رائے کو مدنظر رکھتے ہوئے میرٹھ میں کنوینشن کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ تمام پردیش کمیٹیاں زیادہ سے زیادہ ڈیلی گیٹ لانے کی کوشش کریں گی کمیٹیوں کو یہ بھی کوشش کرنی چاہیئے کہ اترپردیش کی کمیٹی کی مدد کے لئے چندہ بھی فراہم کریں۔ استقبالیہ کمیٹی جو سووینیر نکال رہی ہے۔ اس میں اشتہارات دلوا کر بھی مدد کی جاسکتی ہے۔ جو لوگ کسی قسم کی امداد کرنا چاہیں وہ مرکزی دفتر سے تفصیلات منگوا سکتے ہیں۔

ڈیلی گیٹوں کے انتخاب میں خاص خیال رکھنا چاہیئے۔ نوجوان آگے آرہے ہیں۔ ان کو زیادہ سے زیادہ موقع دینا چاہیئے۔ اگرچہ ساتھ ہی ساتھ ہی ان کو یہ بھی ذہن نشین کروا دینا چاہیئے کہ اس تحریک میں شامل ہوکر عہدے اور اقتدار کی بجائے اصول اور آدرش کے حصول کے لئے جدوجہد کرنی ہوگی۔ نوجوانوں میں آدرش واد یا اصول پرستی کا مادہ قدرے زیادہ ہوتا ہے۔ وہ اس بات کو بہتر سمجھ سکیں گے۔ ان کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیئے۔

کنوینشن کے پروگرام کے بارے میں تفصیلی خط ہی آپ کو الگ سے بھیجا جا رہا ہے۔ تب تک تیاری شروع کردینی چاہیئے۔ بحث کے لئے خاص موضوعات ہوں گے:

۱۔ تعلیمی اداروں میں فرقہ واریت کے اثرات۔
۲۔ ٹریڈ یونین تحریک اور فرقہ واریت۔
۳۔ فرقہ وارانہ فسادات کی نوعیت اور انسداد۔

ان میں حصہ لینے کے لئے تجربہ کار ساتھیوں کو تیار ہوکر آنا چاہیئے۔ جو ساتھی اپنے مطالعہ، مشاہدہ اور تجربے کی روشنی میں مضامین پڑھنا چاہیں وہ ۲۲ دسمبر تک اپنے مضامین مرکزی دفتر میں بھیج دیں تاکہ ان کو بانٹنے کا انتظام ٹھیک طرح سے کیا جاسکے۔

آپ کی ساتھی

سبھدرا جوشی

• • •

میرٹھ میں

فرقہ واریت کے خلاف

نیشنل کنوینشن

۱۱ سے ۱۳ جنوری ۱۹۷۴ء تک

وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی

خطاب کریں گی

ملک بھر سے فرقہ واریت کے خلاف لڑنے والے مجاہدین حصّہ لیں گے

زندگی کے مختلف شعبوں میں فرقہ واریت کے اثرات کا جائزہ لینے اور اس زہر کو ختم کرنے کے لئے سیمینار۔ اس کے علاوہ نمائش، مشاعرہ اور کوی سمیلن کے پروگرام بھی ہوں گے۔ تفصیلات کے لئے راجندر کماری باجپئی (وزیر خوراک و سپلائی) اترپردیش۔ صدر مجلس استقبالیہ۔ ۱۰ ودھان سبھا مارگ لکھنؤ سے رابطہ قائم کیجئے

ہریانہ میں سامپردائکتا وِرودھی کمیٹی کی کانفرنس

(رپورٹ)

پہلا ہریانہ پردیش سامپردائکتا وِرودھی کانفرنس ۱۰ر۱۱ر نومبر کو ہرگولال دھرم شالہ کینٹ میں ہوا۔ ۱۰ر نومبر شام کو آل انڈیا سامپردائکتا وِرودھی کمیٹی کے جنرل سکریٹری شری ڈی۔ آر۔ گوئل نے ڈیلی گیٹ سیشن کا افتتاح کیا۔ پردیش کمیٹی کے صدر شری طیب حسین ایم۔ پی نے صدارت کی۔ ڈیلی گیٹ سیشن میں امرت کور جونیجہ، پروفیسر سوری اور جناب قاری محمد اسحاق نے ہندو مسلم اتحاد کی علامت گرو نانک دیوجی کی یوم پیدائش کے موقع پر اپنا خراج عقیدت پیش کیا۔

۱۱ر نومبر کی صبح جناب ماتھورام ایم۔ پی نے سامپردائکتا اور سیاست، تاریخ، تعلیم، اخبارات وغیرہ کے موضوعات پر ایک سے می نار کا افتتاح کیا۔ جناب او۔ پی بہل کانفرنس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے تشریف فرما تھے۔

مشہور مجاہد آزادی جناب سردار ستان سنگھ نے صدارت کی اور اسٹیج کا نظم جناب اجے کمار ایڈوکیٹ نے چلایا۔ اس میں خاص مقرر گاندھی میموریل کالج کے طلبا جناب ایل۔ سی۔ سود، سی۔ ایم کے گرلس کالج سرسہ کی پرنسپل محترمہ سدیش چوپڑا، یاسین میموریل کالج نوح کے پروفیسر محمد جاوید اور کروکشیتر یونیورسٹی کے ایل۔ ایل۔ بی کے متعلم شری ست پال سینی تھے۔

۱۱ر نومبر کو دوپہر بعد محترمہ سبھدرا جوشی کی صدارت میں کھلا اجلاس شروع ہوا۔ اطلاعات و نشریات کے ریاستی وزیر شری اندر کمار گجرال اس کے مہمان خصوصی تھے۔ پہلے شری ملک اوم پرکاش ایڈووکیٹ نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ ریاستی منصرم سریندر ملیش نے ہریانہ پردیش سامپردائکتا وِرودھی کمیٹی کی رپورٹ پڑھی۔ کھلے اجلاس کے مقرر تھے حصار کے میڈیکل طالب علم لکھمی نارائن، کالکا کے رمیش روبی، سرسہ کے شری گرومکھ سنگھ شاہ اور پلول کے پروفیسر تی رام ریاستی مجلس عاملہ کے ممبر شری ستیش چند اگروال (رہتک) شری منی رام سوڈا (ڈبالی)، شری پتامبر سنگھ ایڈوکیٹ (کروکشیتر)، اور شریمتی کملیش سنبھروال (چنڈی گڑھ) نے کھلے اجلاس میں مندرجہ ذیل چار تجاویز پیش کیں جو متفقہ طور پر منظور کر لی گئیں۔

۱۔ ہمارا آج کا یہ اجلاس حکومت ہند سے درخواست کرتا ہے کہ وہ سامپردائکتا کو تحریک اور اشتعال دینے والے سیاسی، سماجی اور ثقافتی عناصر اور تنظیموں پر قانونی پابندی کا اعلان کرے۔

۲۔ ہمارا یہ اجلاس حکومت ہند سے درخواست کرتا ہے کہ وہ سامپردائکتا کو تحریک دینے والے سبھی تربیت دینے والی تنظیموں کا انودان بند کر کے ان کی تسلیمی رد کر دے۔

۳۔ ہماری یہ کانفرنس ہریانہ سرکار سے درخواست کرتی ہے کہ وہ جمہوری بنیادوں پر ریاست میں پنجابی اور اردو کو مناسب مقام دے۔

۴۔ ہماری یہ کانفرنس ہریانہ کی حکومت سے درخواست کرتی ہے کہ وہ ریاست کے ہریجنوں کے مطالبات پر ہمدردی کے ساتھ غور کرے۔

کھلے اجلاس میں مقامی گاندھی میموریل کالج اور ایس۔ ڈی کالج کے طلبا اور طالبات نے کورس میں گیت گایا۔ اسٹیج کا انتظام پروفیسر امرت ساگر مہاجن نے کیا۔ کانفرنس کا تمام انتظام راج کنول جاجا کے ہاتھ میں تھا۔

اس کانفرنس میں ریاست ہریانہ کے مختلف مقاموں سے ۴۵ نوجوان نمائندے اور تقریباً ۵۰ مقامی نمائندے شامل ہوئے۔ نمائندوں میں زیادہ تر طلبا، اساتذہ، وکیل، صحافی اور ٹریڈ یونین کے کارکن تھے۔ نمائندوں کی اوسط عمر کا اندازہ تقریباً ۲۵ برس لگایا جاتا ہے۔

...

"جن یگ" پر فرقہ پرستوں کا حملہ

(نمائندہ سیکولر ڈیموکریسی)

۲۰ر نومبر کی صبح تقریباً ۱۱ بجے تھے کہ اچانک جھنڈے والان سے شائع ہونے والے اشتراکی روزنامہ "جن یگ" کے دفتر کے سامنے ڈی۔ ٹی۔ سی کی دو بسیں ڈی۔ ایل۔ پی ۲۷ اور ڈی۔ ایل۔ پی ۳۲ آکر رکیں۔ ان سے تقریباً ۵۰ لڑکے ہاتھوں میں لاٹھیاں، سوڈا واٹر کی بوتلیں لئے اترے اور جن یگ کے دفتر پر یلغار کر دیا۔

اِن لڑکوں کا تعلق آر۔ ایس۔ ایس اور جن سنگھ جیسی فسطائی تنظیموں سے تھا۔ ان لڑکوں نے آفس میں گھسنے کی کوشش کی۔ لیکن حملہ ہوتے ہی نیو ایج پریس کی مشینیں رک گئیں۔ سارے مزدور باہر نکل آئے۔ وہ ابھی حالات کو سمجھ بھی نہ پائے تھے کہ حملہ آوروں نے دفتر کے باہر گیٹ پر کھڑے کارکنوں کو دھکا دینا چاہا لیکن پی پلس پبلی شنگ ہاؤس اور نیو ایج پریس کے کارکنوں نے ان کے حملے کو ناکام کر دیا۔

سنگھی غنڈوں نے جاتے جاتے احاطے میں کھڑی سائیکلوں اور دیگر سواریوں کو بھی نقصان پہنچایا۔ پریس کو انھوں نے پہلے ہی اپنا نشانہ بنایا تھا۔ سڑک پر کھڑے ہوکر انھوں نے خشت باری شروع کر دی اور سوڈا واٹر کی بوتلیں پھینکیں۔

پولیس کو فون کیا گیا۔ پھر آدمی بھیجا گیا۔ تب جا کر پانچ منٹ کا راستہ ۴۵ منٹ میں طے کر کے تین چار پولیس والے آئے۔ فون نمبر ۱۰۰ سے بھی کوئی مدد نہ مل سکی۔

پولیس کو آتا دیکھ کر موقعۂ واردات سے حملہ آور غنڈے بھاگ نکلے۔ نیوایج پریس اور پیپلس پبلی شنگ ہاؤس کے چھ کارکنوں کو حملہ آوروں کے حملے کا شکار ہونا پڑا۔ انھیں کافی چوٹیں آئیں اور ایک کارکن کے سر پر ۴ ٹانکے لگائے گئے۔

پولیس نے بھاگتے ہوئے غنڈوں میں سے آٹھ کو گرفتار کر لیا لوڈی۔ ٹی سی کی دونوں بسوں کو تھانے لے گئی۔ حملہ آوروں نے ان میں سے ایک بس کے شیشے بھی توڑ ڈالے تھے۔

تھانے میں تفتیش حال پر ڈرائیوروں نے بتایا کہ حملہ آوروں کو بسوں میں لے جانے کے احکام انھیں "اوپر" سے ملے تھے۔

بس نمبر ڈی۔ ایل۔ پی ۳۲ کے ڈرائیور نمبر ۲۲۱۹ اور کنڈکٹر نمبر ۴۶۶۷ وقت سے بیس منٹ پہلے شاہدرہ سے مدراس ہوٹل کے لئے ۱۱ سی کے روٹ پر چلے۔ اس کے کچھ دیر بعد بس نمبر ڈی۔ ایل۔ پی ۲۷۷ ڈرائیور نمبر ۴۳۰۳، کنڈکٹر نمبر ۵۶۷ اکرشن نگر کے لئے چلے۔

مدراس ہوٹل اور کرشن نگر کے درمیان چلائی جانے والی بسوں کو جب آخری بس اسٹاپ کے روٹ سے باہر لے جایا گیا تو راستے میں پڑنے والے تھانوں میں بس روک کر پولیس کو خبر کیوں نہیں کی گئی۔ یہ ایک راز ہے۔

اگر یہ بسیں زبردستی شاہدرہ بس اسٹینڈ سے لے جائی گئیں تو اس کی خبر ڈی۔ ٹی سی کے اعلیٰ حکام اور پولیس کو کیوں نہ ہو سکی؟

بعد میں پتہ چلا کہ شاہدرہ بس اسٹینڈ کے سپروائزر نے اپنے افسروں سے پوچھ کر ان بسوں کو وقت سے پہلے چلانے کی اجازت دی تھی۔ سوال یہ ہے کہ اس نے پولیس کی مدد کیوں نہیں لی؟ اگر شک نہیں تھا تو حکام سے اس نے اجازت کس لئے مانگی؟ اس سے معاملہ اور سنجیدہ ہو جاتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ حملہ پہلے سے منصوبہ بند تھا اور اس میں سنگھ اور ڈی۔ ٹی سی کے حکام کی ملی بھگت تھی۔ سنا گیا ہے کہ ۲۰ر نومبر کی رات کو شیام لال کالج کے پرنسپل سینی نے طلباء کے ساتھ گفتگو کی تھی۔ "جن یگ" پر حملے کے بعد اس میں آئندہ کے لئے لائحہ عمل طے کیا گیا تھا۔

"جن یگ" نے کچھ دن پہلے شیام لال کالج میں انھیں سینی اور آر۔ ایس۔ ایس و جن سنگھ کی رہ نمائی میں چلنے والے کالج چھاتر سنگھ کی سازش کا پردہ فاش کیا تھا اور دوسرے اخباروں میں جن سنگھ اور آر۔ ایس۔ ایس کے جھنڈے والان میں واقع دین دیال شودھ سنستھان پر نگر نگم کے مکان ٹیکس کی ۹ لاکھ ۶۵ ہزار روپے کے معاملے کا بھانڈہ پھوڑا تھا۔

"جن یگ" پر حملے کے دوسرے دن بعد سنگھی غنڈوں نے شاہدرہ میں ہنگامہ کیا، بس جلا دی اور ریل کو نقصان پہنچایا، تھانے پر حملہ کیا اور اصطبل کی گھاس میں آگ لگا دی۔ پولیس گھنٹے بھر تک پٹتی رہی۔ اس کے بعد اس نے دفاع کے لئے دو راؤنڈ گولیاں چلائیں، ۲۹ آنسو گیس کے گولے چھوڑے۔ پولیس کے سات آدمی ایس۔ ڈی۔ پی اور ایس۔ ڈی۔ ایم مجروح ہوئے۔ اس کی تحقیقات کے احکام جاری کر دیئے گئے ہیں۔

دہلی یونیورسٹی کے کالجوں کے اسٹوڈنٹ یونین کے صدر، یونیورسٹی اسٹوڈنٹ یونین کی مجلس عاملہ اور مرکزی کمیٹی کے ممبران نے "جن یگ" پر حملے کی مذمت کرتے ہوئے یونیورسٹی اسٹوڈنٹ یونین کی قیادت پر الزام لگایا کہ اس نے مجلس عاملہ اور مرکزی کمیٹی کے ممبران سے مشورہ کئے بغیر تحریک چلانے کا یک طرفہ فیصلہ کر لیا۔

یہ جن سنگھ اور آر۔ ایس۔ ایس کی نفرت انگیز سیاست کی تازہ مثال ہے۔ آزادی کے بعد مہاتما گاندھی کے قتل سے لے کر ملک بھر میں فرقہ وارانہ فسادات کے ذریعہ اس نے سیکولر ہندوستان کی تصویر مسخ کرنے کی سازش کر رکھی ہے۔

دہلی ایڈمنسٹریشن میں اپنے عہد میں جن سنگھ نے آر۔ ایس۔ ایس کے لوگوں کو تعلیمی اداروں میں کافی بڑے پیمانے پر نوکریاں دلوائی تھیں اور اب یہ مفاد پرست جن سنگھ اور آر۔ ایس۔ ایس کے لئے کام کر رہے ہیں۔

فسطائیوں کی گھناؤنی حرکت نئی نہیں ہے۔ آر۔ ایس۔ ایس ہٹلر فاشزم کا ہندوستانی روپ ہے اور وہ کشت و خون اور تشدد پر یقین رکھتی ہے۔ دراصل یہ نیم فوجی تنظیم ہے جو پردہ میں رہ کر جن سنگھ کو حرکت میں لاتی رہتی ہے۔

کسی بھی ملک میں فاشزم اسی طرح ابھرتا ہے ۱۹۳۷ء میں ہی گرو گولوالکر نے ہندوستانیوں کو ہٹلر کے راستے پر چلنے کی ہدایت کی تھی۔

آل انڈیا سامپردائکتا ورودھی کمیٹی کی صدر شریمتی سبھدرا جوشی (ایم پی) نے اس حملے کی سخت مذمت کرتے ہوئے کہا کہ جن سنگھ جیسی تنظیم اور اس کے خیالات سے پورا ملک واقف ہے۔ وہ ترقی پسند قوتوں سے خائف ہیں اس لئے ان پر حملہ کرتے ہیں سوویت رہنما بریژنیف کی آمد سے ان میں جو بے چینی پیدا ہوئی ہے یہ حملہ اسی کا اظہار ہے۔

اس حملے کی کئی ممبران پارلیمنٹ، وکلا، صحافی اور جوانوں و مزدوروں نے سخت مذمت کی ہے۔

وزیر اعظم نے بھی اس حملہ کا پارلیمنٹ میں تذکرہ کیا۔

•••

تصویروں کا خوف

ہمارے سیاسی مبصر کے قلم سے



پاکستانی جنگی قیدیوں اور نظر بند شہریوں کی واپسی کی خبر کے بعد لاہور کے لئے ۱۹۷۳ء کی اہم ترین خبر امرتسر ٹیلی ویژن کے افتتاح سے متعلق تھی۔ امرتسر ٹیلی ویژن اہل لاہور کے لئے اُس امرت کے چشمہ سے کم نہیں کہ جس کے پھوٹنے کی آرزو وہ برسوں سے کرتے رہے ہیں۔ اس کی ایک جھلک پاکستانی اخبارات کے دامن میں ملتی ہے۔ روزنامہ "امروز" لاہور کے ۴ر اکتوبر کے شمارے میں محمد بدر منیر لکھتے ہیں۔

"شہر میں بالعموم مال روڈ کی ٹی۔وی کی دکانوں پر بالخصوص خریداروں کا زبردست ہجوم ہے۔ جن کے پاس ٹی۔وی ہے وہ طاقتور اینٹینا خرید رہے ہیں اور جو محروم ہیں وہ ٹی۔وی اور اینٹینا دونوں کی طرف متوجہ ہیں اور خریدار صرف لاہور ہی کے نہیں بلکہ گوجرانوالہ اور سیالکوٹ سے بھی آرہے ہیں.......

مال روڈ کے ٹی۔وی فروشوں کے مطابق گذشتہ تین چار دنوں میں ٹی۔وی اور اینٹینا کی فروخت سے بلا مبالغہ تین ساڑھے تین لاکھ روپے کی بیافت ہوئی ہے۔ یہ بھی سنا گیا ہے کہ راولپنڈی اور لاہور سے اتنی ہی مسافت پر واقع شہروں میں رہائش پذیر افراد لاہور میں ٹیلیویژن رکھنے والے رشتہ داروں کی فہرست مرتب کر رہے ہیں تاکہ وقتاً فوقتاً ان کی میزبانی سے استفادہ کیا جاسکے بسوں، تانگوں، رکشوں، فٹ پاتھوں اور چائے خانوں میں بھی زیادہ تر اسی مسئلے پر تبادلہ خیال سے چراغ روشن ہیں۔ دانشور، فلمساز اور مالکان سینما بھی ٹی۔وی کی اس لہر کا شکار ہیں۔"

روزنامہ "نوائے وقت" کی رپورٹ میں ایک اور دلچسپ پہلو اُجاگر ہوتا ہے" ہوٹلوں کے مالکان نے عوام کے شوقِ دید سے فائدہ اٹھانے کے لئے اپنا کاروبار چمکانا شروع کر دیا ہے۔ یہ مالکان شام گئے اپنے ہوٹلوں میں یا ان کے باہر ٹی۔وی سیٹ نصب کر دیئے ہیں۔ بعض ریسٹورانوں کے مالکان نے امرتسر ٹیلی ویژن کے اس اعلان کے پیش نظر کہ کل بھارتی فلم دکھائی جائے گی، باقاعدہ شامیانے اور کرسیوں کا انتظام کیا۔" (۵ر اکتوبر)

لیکن اس کے ساتھ ہی چند ایسے ذہن جن کا کھانا پہننا، اوڑھنا، بچھونا نظریہ ہے وہ خاصی تکلیف میں ہیں۔ یوں تو بلا وجہ تکلیف میں ہیں لیکن وہ بچارے بھی کیا کریں جس دو قومی نظریے کے سینے پر انھوں نے قدم جما رکھے ہیں اور جسے وہ پاکستان کے وجود کی بنیاد سمجھتے ہیں اس نظریے کی ریت پاؤں تلے سے کھسکتی جارہی ہے۔ ٹی۔وی سیٹ پر اُبھرنے والی تصویروں کا خوف انھیں کھائے جا رہا ہے اور وہ جس لمحہ جس جگہ موقع ملتا ہے چلانے لگتے ہیں "بھارت نے پاکستان پر نئی یلغار کر دی ہے ـــــ ثقافتی یلغار"۔ یہ الفاظ تقریروں، قراردادوں اور اداریوں کو پہنائے گئے ہیں۔ اس توقع کے ساتھ کہ روایتی ہند دشمنی کے نعروں سے اہل لاہور کو امرتسر ٹی۔وی سے متنفر کیا جاسکے۔ یہ الگ بات ہے کہ وقتی طور پر اس "یلغار" کا ذکر کچھ ذہنوں کو متاثر کرنے کے علاوہ شور کی نوعیت حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ لیکن اس جذباتی شور کا جواب بھی اپنے دلائل کے ساتھ برابر سنائی دے رہا ہے "نوائے وقت" لاہور کے اداریے "بھارت کی تازہ یلغار" کا یہ اقتباس نفرت اور نظریے کے حامیوں کی برہمی کا مظہر ہے۔

"جس وقت امرتسر میں ٹی۔وی قائم کرنے کا اعلان کیا گیا، پاکستان کے قومی حلقوں نے اسی وقت یہ محسوس کر لیا تھا کہ اب ہمیں بھارت کی تازہ یلغار کا سامنا کرنا پڑے گا اور تہذیب و ثقافت، امن و آشتی، بھائی چارے اور ایک قومیت کے گمراہ کن نظریات پھیلا کر برصغیر کی تقسیم کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی جائے گی امرتسر میں بچاس ساٹھ میل کا حلقہ اثر والے ٹی۔وی اسٹیشن کے قیام کا مقصد ہی یہ تھا کہ پاکستان کے بازوئے شمشیر زن ـــــ پنجاب کے دل ـــــ لاہور پر پروپیگنڈے کی یلغار کی جائے اور پاکستان کے اساسی نظریات پر ان کے ایمان کو کمزور کیا جائے.......مقصد یہ ہے کہ پروپیگنڈے کے ذریعے لوگوں کی "برین واشنگ" کے بعد جب بھارتی فوج باقاعدہ حملہ کرے تو عوام کی طرف سے کوئی مزاحمت نہ ہو۔"

"کچھ اسی انداز کی فکرمندی کا اظہار سرکاری اخبار "امروز" نے کیا ہے۔" آٹھ نو برس پاکستانی ٹی۔وی کے پروگرام ہند کے شہری دیکھتے رہے۔ نہ تو کسی اخبار، ریڈیو یا رہنما نے اس کا ذکر کیا اور نہ ہی ان پروگراموں کو دیکھنے کی وجہ سے ہندوستانی دلوں میں اپنے دیش سے پیار میں کمی آئی بلکہ ہماری کئی ریاستوں کے لوگوں کو شاید یہ خبر بھی نہیں کہ ہند کے کسی علاقے میں پاکستانی ٹی۔وی دیکھی جاسکتی ہے لیکن امرتسر ٹی۔وی کے آغاز ہی سے پاکستانی پنجاب کا ایوان اسمبلی لرز اٹھا۔ اس میں ۴ر اکتوبر کو احتجاجی قرارداد منظور کی اور صوبائی وزیر اور ایوان کے ڈپٹی لیڈر حنیف رامے نے پاکستانی عوام سے اپیل کی کہ وہ بھارت

کا ٹی۔وی دیکھنے سے گریز کریں۔ حنیف رامے صاحب کی اپیل پر "امروز" نے "رضا کارانہ پابندی کی ضرورت" کے عنوان سے اداریہ لکھ ڈالا۔

"حکومت کے لئے بھی ممکن نہیں ہے کہ وہ سرحد پر ایسی دیوار کھڑی کر دے کہ آل انڈیا ریڈیو امرتسر ٹی۔وی کی لہریں یہاں نہ پہنچ سکیں ——— اپنے نشریاتی اور ٹی۔ وی پروگراموں کو زیادہ سے زیادہ بہتر بنانے کی راہ البتہ ہمیشہ کھلی ہے لیکن ہمارے پروگرام خواہ کتنے ہی بہتر ہو جائیں، بھارتی پروگراموں کی اپنی جاذبیت بہرحال رہے گی۔ ایسی صورت میں بھارت کی پروپیگنڈہ مہم کا توڑ صرف ایک ہی ہے جس کی نشاندہی صوبائی وزیر مالیات جناب حنیف رامے نے کی ہے۔۔۔۔۔ بھارتی پروپیگنڈہ کار اپنے پروپیگنڈے کو قابل قبول بنانے کے لئے یقیناً لتا منگیشکر کے گانوں، بمبئی کی فلموں اور قوالیوں وغیرہ پر زیادہ سے زیادہ زور دیں گے اور دے رہے ہیں۔ ہمارے محب وطن عوام میں اتنی نظر ہونی چاہیئے کہ وہ اس جال کو دیکھ لیں اور چند لمحات کی تفریح کے لئے دور رس قومی مفادات کو خطرے میں نہ ڈالیں۔"

وزیر اطلاعات ونشریات مولانا کوثر نیازی نے "العلم" کی ۲۲ ویں سالگرہ کی تقریب میں کہا "اس بات پر شور مچانا کہ امرتسر ٹی۔وی سے پاکستان پر ثقافتی حملہ ہوگا قطعی بے بنیاد ہے۔ ہندوستانی ثقافت اسلامی ثقافت کے لئے کوئی چیلنج نہیں۔ اگر اس کے باوجود بعض لوگ مُصر ہیں کہ بھارتی ثقافت حملہ آور ہوگی تو اس صورت میں دانشوروں اور اہل علم لوگوں پر ذمہ داری ہوگی کہ وہ عوام کو اسلامی ثقافت کی اہمیت اور نظریہ پاکستان سے آگاہ کریں۔" (امروز ۲۵ اکتوبر)

مولانا بیچارے انجانے میں کم سے کم یہ اعتراف تو کر ہی گئے کہ پاکستان کی ۲۶ سالہ زندگی میں عوام آج بھی اسلامی ثقافت کی اہمیت اور نظریہ پاکستان سے آگاہ نہیں ہیں۔

مولانا کوثر نیازی کے انداز فکر کی تائید سرکاری روزنامہ امروز نے "ثقافتی یلغار" کے زیر عنوان اداریے نوٹ سے کی۔

مولانا کوثر نیازی لاکھ برتری کے دعوے کریں حقیقت تو عوامی ذہنوں سے جھلکتی ہے۔ اخبارات میں چھپے خطوط سے صاف ظاہر ہے کہ پاکستان کی نظریاتی بنیادیں ریت پر کھڑی ہیں۔

"کیا یہ پاکستان سے باہر کے رہنے والے ہیں جو مال روڈ سے کاروں، تانگوں اور رکشوں پر لاکھوں روپیہ کے اینٹینا اور ٹی۔وی سیٹ خرید کر گھر لے جا رہے ہیں۔ یہ ہماری ہی قوم کے غیرت مند افراد ہیں جو ٹی۔وی سیٹ کو سڑک پر لگا کر لوگوں کو بھارتی فلمیں دکھا رہے ہیں۔ یہ ہم ہی ہیں کہ ہوٹلوں میں ٹی۔وی پر بھارتی فلم دکھا کر ایک روپیہ فی کپ چائے فروخت کر رہے ہیں۔ یہ ہم ہیں جو شام چھ بجے سے لے کر رات نو بجے تک امرتسر لگائے بیٹھے آنے والی فلموں کے ٹریلر دیکھتے ہیں۔" (بدیع الزماں صدیقی۔ لاہور)

"ریڈیو، ٹی۔وی کی دکانوں پر افراتفری مچی ہوئی ہے۔ ہر جگہ ہندوستانی فلموں کا تذکرہ ہو رہا ہے۔"
(محمد اسلم۔ گوجرانوالہ)

امرتسر ٹی۔وی کے پروگراموں کی سطح کا مزید ذکر کئے بغیر پاکستانی طنز نگار منو بھائی کے کالم "گریبان" کے دو رنگ دل چسپ ہیں۔ پہلا رنگ ۱۹ اکتوبر کا ———

"ہندوستان نے یہ فتنہ (امرتسر ٹی۔وی) ہمارے دو قومی نظریئے کو غلط ثابت کرنے کے لئے کھڑا کیا ہے پاکستان کی حکومت کو اس سازش کا جواب دینا چاہیئے اور بہترین جواب یہ ہے کہ پاکستان میں امرتسر ٹی۔وی دیکھنے پر پابندی لگا دی جائے بلکہ گھروں سے ٹیلی ویژن سیٹ اٹھا لئے جائیں۔ ایک ایسے ملک میں جہاں لوگ بناسپتی گھی بھی نہیں خرید سکتے، چائے میں چینی بھی نہیں ڈال سکتے عید پر نئے کپڑے بھی نہیں خرید سکتے، ٹیلی ویژن کیا ضروری ہے؟۔۔۔۔۔ حکومت کو چاہیئے کہ وہ لاہور کے تمام شہریوں کی چھتوں سے اینٹینے اتار دینے کا حکم دے۔ اس طرح لوگ امرتسر ٹی۔وی کے پروگرام نہیں دیکھ سکیں گے۔" یہ تمام مشورے منو بھائی کو فیروز دین کشاڈرائیور نے دیئے جو امرتسر ٹی۔وی سے اس لئے نالاں ہے کہ اس کی وجہ سے لاہور کے سینما ہال خالی رہتے اور فیروز دین کو سواری نہیں ملتی۔

منو بھائی کی طنز نگاری کا دوسرا رنگ دیکھنے سے پہلے اس خبر کا ذکر ضروری ہے جو ۱۹ نومبر کو امروز میں چھپی ہے۔ اس خبر کے مطابق آج کل ہندوستانی فلم کی نمائش کے روز لاہور میں سینماؤں کی آمدنی پر تقریباً پچاس فیصد اثر پڑتا ہے۔ گیلری اور باکس کی آمدنی ۷۰ فیصد اور اسٹال کی آمدنی ۵۰ فیصد کم ہو جاتی ہے۔ ہندوستانی فلم اکثر ½ ۷ سے ½ ۱۰ بجے تک چلتی ہے جس سے پاکستانی فلموں کے دو شو پر اثر پڑتا ہے فلم ڈسٹری بیوٹر کا کہنا ہے کہ جب امرتسر ٹی۔وی اسٹیشن نے شروع میں ہندوستانی فلموں کی نمائش شروع کی تو لاہور میں سینماؤں کی آمدنی پر اس سے بھی زیادہ اثر پڑتا تھا۔

اب منو بھائی کی تحریر کے دوسرے رنگ کو لیں جس میں انھوں نے نئے نشریاتی چیخ و پکار کا چیلنج قبول کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"سب سے اہم سوال یہ ہے کہ بھارتی فلموں کے گانے سن کر کتنے پاکستانی ہیں جو جذبہ حب الوطنی سے محروم ہو گئے ہیں یا پاکستان کے دشمن ہو گئے ہیں یا وطن چھوڑ کر ہندوستان چلے گئے ہیں؟ مشکل یہ پیش آ رہی ہے کہ ہم غیر ملکی فلموں کو اپنی ثقافت کے لئے چیلنج سمجھتے ہیں مگر اپنی فلموں کو اپنے لئے چیلنج نہیں سمجھتے شرمیلا ٹیگور کو دیکھ کر ہماری قومی غیرت جاگ اٹھتی ہے مگر اسلام پورہ چوک میں ایک بدنما، بھیانک اور غلیظ مگر جوان بھکارن کا پھولا ہوا پیٹ دیکھ کر ہماری قومی غیرت آنکھیں پھیر لیتی ہے۔ ہم ٹائم میگزین کی دریدہ دہنی پر شور مچا دیتے ہیں مگر اپنے یہاں جو کچھ چھپ رہا ہے اسے پڑھتے ہی نہیں۔ فکر تونسوی کی فرضی موت پر امرتسر ٹی۔وی کا پروگرام ہمارے لئے نشریاتی چیلنج بن جاتا ہے مگر باقی صدیقی، مختار صدیقی، اور تنویر نقوی کی موت ہمارے لئے کوئی چیلنج نہیں رکھتی۔" (امروز۔ ۱۲ نومبر)

امرتسر ٹی۔ وی کو تبصرہ نگار پروفیسر محمد عثمان نشریاتی چیلنج نہیں سمجھتے۔ اپنے کالم "فکر و تاثر" میں ان کے دلائل یہ ہیں۔

" اول' امرتسر ٹی۔ وی کے عمومی پروگرام اس قدر پست معیار اور مایوس کن ہیں جس قدر کہ ہمارے اپنے ٹی۔ وی کے پروگرام گذشتہ تین چار سال سے چلے آرہے ہیں۔ دوم' امرتسر ٹی۔ وی پر جو بھارتی فلمیں دکھائی جاتی ہیں ان کو دیکھتے ہوئے قدم قدم پر غالب کا یہ شعر یاد آتا ہے ؎

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

جو بھارتی فلمیں میں نے امرتسر ٹی۔ وی پر دیکھی ہیں ان سے زیادہ پست، بے معنی اور اُکتا دینے والی فلمیں شاید دنیا بھر میں اور کوئی نہیں بنا سکتا۔ ان فلموں کی کہانی بے ربط، مکالمے خام اور بچکانہ، اور اداکاری مضحکہ خیز ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بھارت سے سنجیدہ اداکاری اور اعلیٰ زندگی کے قریب تر موضوعات مفقود ہو چلے ہیں اور اس کا کاروباری ذہن جسم کی بے جان نمائش اور جنسی لذت کی تحریک کے ساتھ اسی طرح سمجھوتہ کر چکا ہے جو مغرب کا طرۂ امتیاز ہے"۔

(امروز۔ ۲۶ر اکتوبر)

۱۸ر اکتوبر کو "نوائے وقت" میں پاکستان آرٹسٹس کے اس اجلاس کی خبر چھپی جس میں راولپنڈی اسلام آباد ٹی۔ وی سنٹر پر "پاکیزہ" کی نمائش کے سلسلے میں تحقیقات کے مطالبے کی قرارداد کا ذکر ہے۔ ۱۴ر اکتوبر کی رات کو ٹرانسمیشن کے بعد اسلام آباد ٹی وی سنٹر کے کنٹرول روم میں پاکیزہ دکھائی گئی۔ اس وقت پارکنگ شیڈ میں ڈیڑھ سو کے قریب پرائیویٹ کاریں موجود تھیں اور کنٹرول روم اور اسٹوڈیو تماشائیوں سے بھرا ہوا تھا ——— اس خبر سے صاف ظاہر ہے کہ یہ فلم امرتسر سے جب نشر کی گئی تو اسے لاہور میں ریکارڈ کر لیا گیا۔

اگر لاہور کے ٹی۔ وی کے شائقین کا تاثر بھی وہی ہوتا تو پروفیسر محمد عثمان کی نشریات سے متاثر ہو کر پاکستان فلم پروڈیوسرز ایسوسی ایشن کو وہ ہنگامی اجلاس نہ بلانا پڑتا جس میں غیر ملکی ثقافتی حملے کا دندان شکن جواب دینے کی خاطر لاہور ٹی۔ وی سے مکمل تعاون کی پیش کش کی گئی اور ٹی۔ وی پروگراموں کو بہتر اور مقبول بنانے کے لئے نسیم اثقلین اور راجہ غضنفر کی خدمات بطور صلاح کار پیش نہ کی جاتیں۔ نہ ہی لاہور میں دو روزہ آل پاکستان فلم کنونشن منعقد کئے جانے کی ضرورت محسوس کی جاتی اور نہ ہی ایسی تحریروں کی اشاعت کی ضرورت پڑتی جیسی کہ امروز ۹ر نومبر میں شائع ہوئی۔

" اس مرحلہ پر جب کہ عوام امرتسر ٹی۔ وی سے بھارتی فلموں کی طرف مائل ہوگئے ہیں پاکستانی فلموں کے معیار کو بلند کرنا از حد ضروری ہو گیا ہے۔ اگر امرتسر ٹی۔ وی سے اچھی فلمیں دکھائی جانے لگیں تو ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ ہم عوام کو روک سکیں یا سیاسی اور مذہبی جذبات کے تحت "ثقافتی یلغار" کا نعرہ لگانا شروع کر دیں۔ یہ مسلّمہ امر ہے کہ بھارتی فلموں کا معیار بہت بلند ہوتا ہے اور اگر عوام نے اس طرح مفت تفریح حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا تو پھر پاکستانی صنعت کا "خدا حافظ ہے"۔

۱۴ر نومبر کے امروز میں "ثقافتی یلغار" کا نعرہ لگانے والوں کے خلاف دو بے باک آوازیں بلند ہوئی ہیں۔

" جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ امرتسر ٹی وی دیکھنا ہماری غیرت کے خلاف ہے وہ غلط کہتے ہیں۔ لوگوں نے تو شکر کیا ہے کہ اچھے پروگرام دیکھنے کو ملیں گے۔ ہمارے ٹی۔ وی کے پروگرام روز بروز پست تر ہو رہے ہیں۔ پرانی سے پرانی اور گھسی پٹی فلم ٹی۔ وی پر دکھائی جاتی ہے اور لگتی بھی ہے تو ساڑھے دس بجے۔ پھر کون دیکھنا پسند کرے گا؟ انگریزی پروگراموں کی بھرمار ہے جو چھ بجے شروع ہوتے ہیں اور رات گئے تک لگے رہتے ہیں۔ ایسے میں اگر لاہور کے عوام امرتسر ٹی۔ وی نہ دیکھیں تو کیا کریں؟" (نگہت سیما۔ سرگودھا)

" لوگوں کا امرتسر ٹی۔ وی دیکھنا ہمارے ٹی۔ وی کے بور اور ناقص پروگراموں سے اکتاہٹ کا ردعمل ہے۔ ہمارے ہاں کے پروگرام معیاری اور دلچسپ ہوں تو کسی کو کیا پڑی ہے کہ وہ امرتسر لگاتا پھرے"۔

(اختر حیات۔ لاہور)

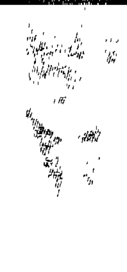
بات ختم کرنے سے پہلے نوائے وقت کے طنز و مزاح کے کالم سرراہے کا ایک اقتباس دیکھ لیا جائے۔

" ہم سے اگر کوئی پوچھے تو لاہور ٹی۔ وی اور امرتسر ٹی۔ وی میں کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ کہاں لاہور ٹی وی کی حسین و جمیل عمارت میں لاکھوں روپے کی لاگت سے قائم ہونے والا جدید ترین اسٹیشن جہاں لاکھوں روپے کا صرف "میک اپ" کا سامان پڑا ہے اور کہاں امرتسر کے مضافات کی ایک ٹوٹی پھوٹی عمارت کے دو کمروں پر مشتمل بھارتی اسٹیشن ——— البتہ عقل کے معاملے میں امرتسر والے لاہور والوں سے کچھ بہتر واقع ہوئے ہیں اور لاہور شہر میں لاہور اسٹیشن سے اس کے ناظرین چھین رہے ہیں ——— اب دیکھئے نا لاہور ٹی۔ وی کے مجموعی وقت کا بیس فیصد تو اشتہارات کی نذر ہو جاتا ہے تیس فیصد انگریزی فلمیں دکھلانے میں اُٹھ جاتا ہے۔ باقی پچاس فیصد وقت میں "برین واشنگ" کا پروگرام اور حکومت و حکومتی پارٹی کا پروپیگنڈہ ہوتا ہے۔

ان تمام اقتباسات کی روشنی میں ایک حقیقت واضح ہوتی ہے کہ امرتسر ٹی۔ وی کو "ثقافتی خطرہ" سے تعبیر کرنے والے وہی ذہن ہیں جو ہمیشہ سے سنسنی خیز اور جذباتی سیاست کا حربہ استعمال کر کے نہ صرف پاکستان کے اندرونی ماحول میں کشیدگی پیدا کرتے رہے ہیں بلکہ برصغیر کے امن کے ساتھ کھلواڑ کر رہے ہیں۔

حالانکہ امرتسر ٹی۔ وی بنیادی طور پر پنجاب کے عوام کے لئے تفریح اطلاع اور تعلیم کے فروغ کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ اس کے پروگرام پاکستانی عوام بھی دیکھ سکتے ہیں ورنہ پاکستانی عوام، وہاں کی سیاست اور ثقافت خصوصی طور پر پیش نظر تھی نہ ہے۔

• • •



قومی یکجہتی کی پیشکش

پروفیسر محمد محسن

برصغیر ہند مختلف کلچر، مختلف مذاہب، مختلف زبانوں، مختلف جغرافیائی حالات، مختلف آب و ہوا اور جانے کتنے مختلف عناصر کی آماج گاہ ہے۔ جو لوگ ہندو، ہندی، ہندوستانی کا نعرہ بلند کرتے ہیں ان کے خیال میں اس دیس کے سارے کلچر، سارے مذاہب اور ساری زبانوں کا فرق یکسر مٹا کر اگر سبھوں کو ایک کلچر، ایک مذہب اور ایک زبان میں ضم کر دیا جائے تو ملک کے اندر اتحاد و یگانگت کی فضا بآسانی پیدا کی جاسکتی ہے۔

بادی النظر میں یہ بات آسان معلوم ہوتی ہو لیکن حقیقت میں اس طرح کی یکسانیت حاصل کرنا اسی حد تک ناممکن ہے جیسے پنجاب سے کیرل تک اور آسام سے مہاراشٹر تک سارے ملک کی آب و ہوا، سارے لوگوں کا رنگ روپ، سب کے رہن سہن کا ڈھنگ ایک ہی جیسا بنا دیا جائے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کلچر، زبان اور مذہب کے اختلافات کو دور نہ کیا جائے تو پھر قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی کا وجود کس طرح قائم ہو سکے گا۔

جہت کے لغوی معنی "سمت" کے ہیں اور سمت کا تعلق کسی نہ کسی شئے یا منزل سے ہوتا ہے۔ یکجہتی کا مطلب ہوا ایک سمت یعنی ایک منزل کی طرف رخ کر لینا۔ قومی یکجہتی کا مفہوم یہی ہوگا کہ قوم کا ہر فرد قومی حیثیت سے ایسے رستہ پر گامزن ہو جائے جو ایک سمت یعنی ایک منزل کی طرف لے جاتا ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ منزل قومی فلاح و بہبود کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ گویا قومی یکجہتی کے وجود کے لئے لازم ہے کہ قوم کا ہر فرد قومی مفاد کو اپنے ذاتی مفاد پر ترجیح دینے کا عادی بن جائے۔ تاکہ افراد کے ذاتی اغراض و مقاصد کے اندر ٹکراؤ پیدا نہ ہو۔ ذاتی مقاصد کی راہیں جداگانہ ہوں گی اور ان راہوں کی منزلیں بھی مختلف ہوں گی لیکن اگر ذاتی مفاد کو قومی مفاد کا پابند کر دیا جائے تو پھر ذاتی مفاد کے رستے الگ الگ سمت کو نکلتے ہوئے بھی بالآخر ایک ہی رستہ میں شامل ہو جائیں گے جس کی منزل ملک کا مفاد ہوگی۔ ایسی صورت میں قومی یکجہتی محض خواب نہیں رہ جائے گی بلکہ ایک جیتی جاگتی حقیقت بن سکے گی۔

آج بدقسمتی سے ملک کے اکثر و بیشتر افراد کا میدان فکر و عمل اپنے ذاتی آغراض سے آگے نہیں بڑھ پاتا۔ ہر شخص اپنی فلاح و بہبود کے سامنے ملک کے فلاح و بہبود کو پس پشت ڈالنے پر آمادہ نظر آتا ہے۔ ہم "جے ہند" کا نعرہ لگاتے وقت گلے کا سارا زور صرف کر دیتے ہیں لیکن جب اپنے ذاتی غرض کا معاملہ درپیش ہوتا ہے تو پھر ہمیں اس کی مطلق پرواہ نہیں ہوتی کہ ہمارے اقدام و عمل سے ملک کی سالمیت اور وجود کو تقویت پہنچے گی یا ان کی بنیادیں ڈھیلی ہو جائیں گی قومی یکجہتی کے وجود میں سب سے بڑی رکاوٹ ہماری یہ تنگ نظرانہ خود غرضی ہے جس دن ہم اپنی ذاتی فلاح و بہبود کو ملک کی فلاح و بہبود سے وابستہ کرنے کے عادی ہو جائیں گے اسی دن قومی یکجہتی ایک حقیقت بن جائے گی۔

قومی یکجہتی کے علاوہ ہم کبھی کبھی جذباتی ہم آہنگی کا خواب بھی دیکھتے ہیں۔ بعض لوگ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ چونکہ مذہب کا تعلق عقیدے سے ہے اور عقیدے پر جذبے کا اثر حاوی ہوتا ہے اس لئے جذباتی ہم آہنگی اس وقت نہایت آسانی سے وجود میں آسکتی ہے جب ملک کے سارے افراد ایک ہی مذہب کے رشتے میں بندھ جائیں لیکن حالیہ واقعات کی روشنی میں یہ خیال بھی محض بے معنی ہو جاتا ہے۔ بنگلہ دیش میں ایک ہی مذہب سے وابستگی رکھنے والے بنگالی اور غیر بنگالی جس جذباتی غیر آہنگی اور انتشار کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔ وہ ابھی کل کی بات ہے۔ خود ہندوستان کے اندر باوجود مذہبی یگانگت کے آسامی اور بنگالی ایک دوسرے کے ساتھ جذباتی تناؤ کی خطرناک مثال پیش کر چکے ہیں ان واقعات کے سامنے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ محض ایک مذہب کے پیرو ہونے سے جذباتی ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکتی۔ جذباتی ہم آہنگی اس وقت وجود میں آسکتی ہے جب وطن کی محبت کا جذبہ قوم کے ہر فرد کے دل میں اپنا گھر بنالے۔ جب وطن کا ہر باسی اپنے ہر ہم وطن کے ساتھ تلطف و رواداری، ربط و اختلاط کا پُر خلوص اور باعمل اظہار کرنے پر قادر ہو جائے۔ وہی کنبہ جس کے افراد ایک دوسرے کے ساتھ محبت کے رشتے میں منسلک رہتے ہیں ایک چھوٹے دائرے کے اندر جذباتی ہم آہنگی کا زندہ نمونہ پیش کرتا ہے۔ کنبہ کے ہر فرد کے دل میں ایک دوسرے کے لئے دردمندی کا جذبہ موجزن رہتا ہے۔ ایسے ہی کنبہ کے اندر ہمیں یکجہتی کی مثال بھی ملتی ہے۔ کنبہ کا ہر فرد سارے کنبہ کی فلاح و بہبود کی فکر میں لگا رہتا ہے کنبہ کے کسی ایک فرد پر جب مصیبت آتی ہے تو کنبہ کا ہر فرد اس کے دکھ درد میں شریک ہونے کے لئے مضطرب رہتا ہے۔ جذباتی ہم آہنگی کے وجود کے لئے ضروری ہے کہ پورا ملک ایک مربوط و مخلوط کنبہ کی زندہ مثال پیش کرنے لگے جس طرح کنبہ کے افراد ہر طرح کا خارجی اور داخلی فرق رکھتے ہوئے بھی اپنے دلوں میں ہر وقت باہمی مہر و عنایت، خلوص و دردمندی کے جذبات مشتعل رکھتے ہیں۔ اسی طرح باوجود کلچر، مذہب اور زبان کے فرق کے ملک کے سارے باشندے ایک دوسرے کی ترقی و بہبود کا پاس اپنی ذاتی ترقی و بہبود سے کسی طرح کم نہ کر کے ایک دوسرے کا دل اپنی

مٹھی میں کرلیں۔

باوجود کلچر، مذہب اور زبان کے فرق کے جب بھی ہمارا دیس کسی بیرونی دشمن کے جارحانہ اقدام کی وجہ سے خطرہ سے دوچار ہوگیا ہے تو قومی یک جہتی اور جذباتی ہم آہنگی کی فضا خود بخود رونما ہوگئی ہے لیکن یہ کبھی تادیر قائم نہ رہ سکی۔ وجہ یہ ہے کہ اس طرح کی یک جہتی ملک کے بہبود کے لحاظ سے کم اور ذاتی بربادی اور ہلاکت کے خوف سے زیادہ پیدا ہوتی ہے اس کی بنیاد باہمی الفت و رواداری نہیں بلکہ دشمنی کا مشترکہ خوف اور دشمنی سے مشترکہ نفرت ہوتی ہے اس ہنگامی خطرے کے دور ہوتے ہی ہم پھر اندرونی اختلاف اور جذباتی انتشار کے شکار بن جاتے ہیں۔

یہ بات مُسَلّم ہے کہ قومی یک جہتی اور جذباتی ہم آہنگی کا وجود کلچر، مذہب اور زبان کا فرق رہتے ہوئے بھی قائم ہوسکتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ایک ایسا ماحول تیار کریں جس کے اندر ملک کے سارے کلچر، سارے مذاہب اور ساری زبانوں کو باہمی رواداری اور مروت کی حیات بخش آب و ہوا میں پھلنے پھولنے کا یکساں موقع میسر ہو۔ سارے اختلافات کے باوجود ملک کی پاسداری اور وطن کی محبت کے مشترکہ میلانات ہم سب کو ایک ہی سمت موڑ دیں اور قومی حیثیت سے ہم سب ایک ہی منزل کی طرف قدم بڑھانے لگیں۔ ہم جب ملک کے مختلف کلچر، مذاہب اور زبانوں کی نشو و نما، ترقی و ترویج کی بات سامنے لاتے ہیں تو اقلیتوں کا مسئلہ ہمارے روبرو کھڑا ہو جاتا ہے۔ ہمارے ملک کا نظام جمہوری ہے اور جمہوری نظام میں اکثریت کے کلچر، مذہب اور زبان کو کسی خطرے سے دوچار ہونے کا اندیشہ پیدا ہونے کے امکانات نہیں ہوتے۔ لیکن اقلیت کو اس خطرہ کا احساس اکثر پیدا ہو جاتا ہے جو کبھی کبھی حق بجانب بھی ہوتا ہے اور جو قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی کے راستہ میں روڑا بن جاتا ہے۔ اس لئے جب تک اس احساس کو مٹانے کا سامان نہ پیدا ہو قومی یک جہتی اور جذباتی ہم آہنگی کا وجود پوری طرح قائم نہیں ہوسکتا۔ مسلم اقلیت کو جو اس ملک کی سب سے بڑی اقلیت ہے ملک کی آزادی کے بعد اس خطرہ کا شدید احساس پیدا ہوگیا ہے۔ اسے اس بات کا خوف ہونے لگا ہے کہ ملک کے حالات ایسے بنتے جا رہے ہیں کہ اس کے کلچر، مذہب اور زبان کی حفاظت اور بقا کا سامان باقی نہ رہ سکے گا۔ اس کی اقتصادی پستی روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے اور اگر اس کی معاشی گراوٹ کو روکنے کی کوئی صورت نہ پیدا ہوئی تو اسے بہت جلد اپنے کلچر و زبان اور عجب نہیں کہ اپنے مذہب سے بھی دستبردار ہونا پڑے گا۔ پیٹ کی مار سب سے بڑی مار ہوتی ہے جس سے بچنے کے لئے آدمی ہر طرح کی اخلاقی اور ثقافتی قدروں سے ہاتھ دھو لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کئی بڑی ریاستوں میں اردو مسلم اقلیت کی مادری زبان ہے۔ اور اسے یقین ہے کہ اردو زبان کی ترویج و ترقی کے ساتھ ہی اس کا کلچر اور اس کا مذہب محفوظ رہ سکتا ہے۔ یہ خیال بڑی حد تک درست بھی ہے۔ مسلمانوں کے سارے ثقافتی کارنامے اور ان کی ساری مذہبی روایات اردو زبان میں قلم بند ہیں۔ اگر اردو زبان فنا ہو جائے گی تو پھر یہ سارے کارنامے اور ساری روایات بھی ناپید ہو جائیں گی اور اس طرح ان کے کلچر اور مذہب کی بنیادیں کھوکھلی ہو جائیں گی۔

خوش قسمتی سے موجودہ حالات اتنے سنگین نہیں باقی رہے ہیں۔ اکثریت کے اکثر ارباب فکر و دانش کو مسلم اقلیت کے اس احساس سے ہمدردی ہونے لگی ہے اور وہ بیشتر صورتوں میں اسے حق بجانب سمجھنے لگے ہیں۔ حکومت کو بھی اس کا احساس ہوتا جا رہا ہے اور مسلمانوں کی شکایتوں کا ازالہ کرنے کی پیش کش حکومت کی طرف سے ہونے لگی ہے۔ مرکزی حکومت کی طرف سے ریاستی حکومتوں کو ہدایت دی جا رہی ہے کہ مسلمانوں کو ان کی آبادی کی مناسبت سے ملازمتیں دینے کی کوشش کی جائے۔ اردو زبان کی ترویج و ترقی کا سامان کیا ہے۔ مسلمانوں کے دوسرے مطالبات کی طرف بھی حکومت ہمدردانہ توجہ دینے لگی ہے مثلاً مسلم یونیورسٹی کے ترمیم شدہ ایکٹ کی تنسیخ جس نے مسلم اقلیت کے قبضے سے اس ادارے کے نکل جانے کا سامان تیار کر دیا ہے۔ مسلم پرسنل لا کو کل ہند پرسنل کوڈ کے پابند بنانے سے احتراز وغیرہ وغیرہ۔ اردو کی ترویج و ترقی کے لئے مرکزی حکومت نے فروغ اردو کے نام سے ایک کمیٹی بنائی ہے جس کے صدر وزیر نشر و اشاعت شری گجرال ہیں۔ گجرال کمیٹی نے مختلف ریاستوں کا دورہ کر کے اردو کے متعلق مسلمانوں کی شکایتیں توجہ کے ساتھ سنی ہیں۔ ریاستی حکومتوں خصوصاً اتر پردیش اور بہار کو فہمائش کی گئی ہے جن لڑکے لڑکیوں کی مادری زبان اردو ہے ان کی ابتدائی تعلیم کے لئے اردو میڈیم پرائمری اسکول مناسب تعداد میں قائم کئے جائیں اور ان میں اردو کے اساتذہ کی تقرری کی جائے۔ ہر ہائی اسکول میں منجملہ اور مضامین کے اردو زبان کی تعلیم کا بھی انتظام کیا جائے تاکہ جو بھی اردو پڑھنا چاہے اسے کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ ابھی تک ایک قید چلی آ رہی تھی کہ جب تک اردو پڑھنے والے چالیس طلبا اسکول میں نہ ہوں اردو کی تعلیم کا نظم لازمی نہیں ہوگا یہ قید اب مسترد کر دی گئی ہے۔ چنانچہ ہر ہائی اسکول میں اردو ٹیچر کی تقرری کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ مسلمانوں کا مطالبہ اردو کو سرکاری زبان بنانے کا بھی ہے حکومت کے لئے اس میں مشکلات ہیں لیکن دفتروں میں اردو کے رواج کی سہولتیں مہیا کرنے کی آمادگی کا اظہار حکومت کی طرف سے ہو چکا ہے۔

اردو کی بقا کے لئے حکومت نے جن سہولتوں کو مہیا کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میرے خیال میں اردو کے توسط سے ابتدائی تعلیم کا انتظام ان میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ اگر ہمارے سارے بچے اور بچیاں اپنی زندگی کے پہلے پانچ سال یعنی چھ سے گیارہ تک کے سپرد ہو تو انھیں عمر بھر کے لئے اردو زبان سے وابستگی پیدا ہو جائے گی۔ ان کی بنتی ہوئی شخصیتوں میں ان روایات اور اس کلچر کے عناصر جو مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہیں کچھ اس طرح رچ بس جائیں گے کہ پھر دنیا

کا کوئی سیاسی اور اقتصادی انقلاب ان کی جڑیں کمزور نہیں کرسکے گا۔ ضرورت ہے کہ ہمارے اہل علم و دانش ایسی درسی کتابیں تصنیف و تالیف کرنے میں لگ جائیں جن کے مواد ہمارے کلچر اور مذہبی روایات اور ہمارے ادبی شاہ کاروں سے حاصل کئے گئے ہوں ابتدائی تعلیم کا حقیقی مقصد حصول علم و فن نہیں ہوتا۔ اس کی اصل غرض صحت مندانہ رجحانات، پسندیدہ عادات درد مندانہ جذبات اور صالح نظریات کی ایسی استوار بنیادیں تعمیر کرنی ہیں جن پر ثانوی تعلیم یا کالج یا یونیورسٹی کی تعلیم کے بعد معاشی فراغت کے ساتھ ساتھ انسان دوستی، رواداری، انصاف پسندی، ایثار اور خدمت کی بلند و بالا عمارتیں کھڑی کی جاسکیں حصول علم و فن کی ضرورت ثانوی تعلیم سے پوری کی جاتی ہے اور یہ ثانوی تعلیم کسی بھی زبان میں دی جائے تو اس کے نتیجوں میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ جس وقت انگریزی تعلیم کا دور شروع ہوا تھا ہمارے بچے مکتبوں میں یا خانگی طور پر اردو فارسی کی تعلیم حاصل کر لیا کرتے تھے جس کے ساتھ ساتھ انھیں دینیات کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ اس کے بعد وہ اسکول میں داخل ہو کر سارے علوم و فنون کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگریزی زبان کا ہی سہارا لیا کرتے تھے۔

ہمارے سربراہوں کی اس وقت ایک بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ جلد از جلد ان بچے اور بچیوں کے اعداد و شمار کا تعین کریں جن کی مادری زبان اردو ہے اور جن کے والدین انھیں اردو سے وابستہ رکھنا چاہتے ہیں۔ اس ضمن میں ہمیں ایک تلخ حقیقت گوارہ کرنا ہے۔ اس دیس میں ایک اچھی تعداد ایسے غیر مسلموں کی ہے جنھیں خاص طور سے اردو علم و ادب سے شغف رہا ہے اور جو اردو کی ترویج و ترقی کے لئے ہمارے دوش بدوش سرگرم عمل ہیں لیکن ان کے گھروں کے بچے، بچیوں کی شاید ایک فی صد تعداد صرف اتنا ہی نہیں کہ اردو کے ذریعہ ابتدائی تعلیم حاصل نہیں کر رہی ہے بلکہ اردو سے محض نا آشنا رکھی گئی ہے۔ ان کے بچوں کی مادری زبان اردو ہوتے ہوئے بھی ان کے والدین انھیں اردو لکھنا پڑھنا سکھانے سے گریز کر رہے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر ہم صرف مسلمان بچے بچیوں کے اعداد و شمار پر اکتفا کریں تو کوئی غلطی نہ ہوگی۔ جہاں تک اتر پردیش کا تعلق ہے شاید اس طرح کے اعداد و شمار تیار کئے جاچکے ہیں لیکن بہار میں میری دانست میں ابھی تک یہ کام نہیں ہوا ہے۔ بہار کی پوری آبادی تقریباً ساڑھے پانچ کروڑ ہے جس میں مسلمانوں کی آبادی لگ بھگ ساٹھ لاکھ ہے۔ اس میں چھ سے گیارہ سال کی عمر کے بچے بچیوں کی تعداد تقریباً چھ لاکھ ہوگی جو ریاست کے مختلف حصوں میں کہیں زیادہ اور کہیں کم تعداد میں بٹی ہوئی ملے گی۔ ہمیں اس علاقائی اعتبار سے بھی تعداد و شمار کا تعین کرنا ہوگا۔ اس کے بعد ہم یہ جان سکیں گے کہ ہمیں کتنے اردو میڈیم ابتدائی اسکول کی ضرورت کہاں کہاں ہے تاکہ ہمارے سارے بچے، بچیاں اپنی عمر کے پہلے پانچ سال تک اردو کے توسط سے تعلیم حاصل کرسکیں۔ اس اندازے کے بعد ہی ہم افسرانِ صیغۂ تعلیم سے رابطہ پیدا کرکے انھیں اتنی تعداد میں اردو میڈیم اسکول کے قیام پر آمادہ کرسکیں گے۔

سب سے اہم کام تو اردو میڈیم اسکولوں کا قیام ہے جس کی طرف ہمیں سب سے پہلے توجہ کرنی ہے اس کے علاوہ ثانوی تعلیم یا کالج یا یونیورسٹی کی تعلیم کی سطح پر بھی منجملہ اور مضامین کے اردو زبان کی تعلیم کا کس حد تک انتظام ہے۔ اس کے متعلق بھی ہمیں اعداد و شمار اکٹھا کرنا چاہیئے تاکہ ہر ثانوی اسکولوں میں خواہ وہ سرکاری ہو یا غیر سرکاری اور ہر کالج میں خواہ اس کا انتظام یونیورسٹی کے سپرد ہو یا گورننگ باڈی کے اردو زبان کی تعلیم کے لئے پوری سہولت موجود ہونے کا مطالبہ کرنے میں ہمیں آسانی ہو۔ ریاست کی یونیورسٹیوں سے بھی ہمارا مطالبہ ہونا چاہیئے کہ اردو کا علیحدہ ڈپارٹمنٹ قائم کیا جائے اور اردو میں ایم۔ اے کی تعلیم اسی کے سپرد ہو۔

میرا خیال ہے کہ اگر یہ ساری سہولتیں ہمیں حاصل ہو جائیں تو پھر اردو زبان اور اسی کے ساتھ ہمارا کلچر اور ہمارے مذہب کی حفاظت کا پورا سامان ہوسکے گا۔ ہماری معاشی حالت کی سدھار میں بھی اس سے ایک گونہ مدد ملے گی۔ چھ لاکھ بچے بچیوں کی اردو میڈیم سے ابتدائی تعلیم کے لئے ہمیں تقریباً چودہ پندرہ ہزار اردو داں ٹیچروں کی ضرورت پڑے گی جس سے ہمارے ان نوجوانوں کی معاشی ضرورت جو میٹرک سے آگے تعلیم حاصل کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے خاصی تعداد میں پوری ہوسکے گی۔ اسی طرح اگر ریاست کے اندر اس وقت ڈیڑھ یا دو ہزار سرکاری و غیر سرکاری ثانوی اسکول ہیں تو اسی تعداد میں اردو داں گریجویٹ ٹیچر کی کھپت کا سامان ہو جائے گا۔ مرکزی حکومت نے ریاستی حکومتوں کو اس بات کی بھی ہدایت کی ہے کہ مسلمانوں کو ان کی آبادی کے اعتبار سے ملازمتوں میں جگہ حاصل کرنے کی سہولتیں دینی چاہیئے۔ ہمارے سربراہوں کو اس طرف بھی توجہ کرنی ہے۔ اس کے لئے بھی بغیر اعداد و شمار کے کوئی کام حقیقت میں نہیں ہوسکتا۔ سرکاری یا پرائیویٹ اداروں میں ملازمتوں کی ہر سطح پر اعداد و شمار کی فراہمی کے بعد ہی ہم اس سلسلہ میں حکومت یا پرائیویٹ اداروں کے انتظامیہ کی فرد گذاشت پر احتجاج کرسکتے ہیں۔

یہ ایک فال نیک ہے کہ ملک کی سب سے بڑی اقلیت کے ساتھ سماجی انصاف و رواداری کی پیش کش کرکے حکومت نے قومی یک جہتی اور جذباتی ہم آہنگی کے قیام کے لئے ایک صحیح قدم اٹھایا ہے۔ حکومت اور اکثریت کے کچھ اہل الرائے اور سربراہ، ملک کی دوسری اقلیتوں کے ساتھ بھی سماجی انصاف و رواداری کے برتاؤ پر اصرار کرنے میں دریغ نہیں کر رہے ہیں۔ چھوت چھات کے جھگڑے، ہریجنوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنے کے رجحانات کو قلع قمع کرنے کی فکر تیزی سے زور پکڑ رہی ہے۔ اس پس منظر میں ہمیں امید ہے کہ قومی یک جہتی اور جذباتی ہم آہنگی کا وجود ہمارے قبضۂ قدرت میں آجائے گا۔

•••

سنگھ خودکشی کی راہ پر

ڈی۔ پی۔ وکاس

[illegible]

دنیا کی تاریخ میں جس قدر جوش وخروش اور متاثرکن انداز سے ہٹلر کا خیر مقدم ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر یہ فیشن سا چل پڑا تھا کہ لوگ ہٹلر کی غلط کار اور انسانیت کش کرتوتوں کو بھی عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگے تھے

لیکن اصلیت بہت دنوں تک چھپی نہیں۔ خوف، وہم اور تخیلی ومن گھڑت آدرشوں پر مبنی تصوراتی محل زیادہ دنوں تک ٹک نہیں سکتے۔ انسانیت کی لاش پر تعمیر شدہ محل ریت کی دیوار ثابت ہوتے ہیں۔ یہ اٹل صداقت ہے۔ صاحب فکر ایسے عارضی فتح کے موقع پر بھی ہوا کے رخ پر نہیں بلکہ صداقت کی سمت میں دیکھتے ہیں۔ ہاں یہ بات دوسری ہے کہ اکثریت اس صداقت سے دور ہوتی ہے۔ اس لئے دور اندیش مفکروں کو پتہ تھا کہ انسانیت سے دور تانا شاہ ہٹلر کا زوال یقینی ہے۔

اس سال جس تیزی سے اس کا زوال ہو رہا ہے اسے دیکھتے ہوئے یہ کہنا مشکل نہیں کہ یہ سال اس کے لئے سخت منحوس ثابت ہوگا۔ ویسے تو یہ عمل مرکزی مجلس عاملہ کی گروہ بازی کی وجہ سے کئی سال سے ہو رہا ہے اور گولوالکر کی حیثیت اس میں محض ایک تماشائی کی رہ گئی تھی۔ اور ان کے لئے عزت واحترام کی نمائش محض اس لئے ہو رہی تھی کہ سوئم سیوک گمراہ ہوتے رہیں۔ گولوالکر نے بے بس ہوکر کئی بار سنگھ کے کارکنوں کے درمیان کہا کہ اب ہم اسی طرف بڑھ رہے ہیں جو یقینی طور پر زوال کا راستہ ہے۔ اقتصادی اجارہ داری اور اخلاقی زوال ہمیں ختم کر دے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ گروجی یہ محسوس کرتے تھے کہ ان کی کوئی سنتا نہیں ہے۔

شری گولوالکر کی موت کے بعد سنگھ میں شکست وریخت کا عمل اور بڑھ گیا اور اس کا اثر اب عام سوئم سیوکوں تک بھی پہنچ گیا ہے۔ پہلے ہی سے سنکڑوں کارکن بیزار ہیں لیکن مطلق العنانیت اور اپنی شخصیت کے قتل کے باوجود اس میں تھے وہ اب کھل کر سامنے آگئے ہیں اور اس طرح سنگھ کی جڑیں تیزی سے کمزور ہو رہی ہیں۔

ایک ایسا طبقہ ہے جو سنگھ کے تخیلی آدرشوں سے متاثر ہوکر اس کے پاس آیا ہے۔ اس طبقہ میں قوت عمل اور انقلاب کی خواہش تھی۔ اسی کی قوت پر سنگھ تیزی سے آگے بڑھ گیا تھا لیکن تھوڑی ہی دیر میں اس نوجوان طبقے کا ذہن پریشانیوں اور مایوسیوں کا شکار ہوکر الگ ہوگیا۔ سنگھ کے عام سوئم سیوکوں کے درمیان انتظام والنصرام کے نام پر ایسا ماحول بن گیا تھا کہ بڑے سے بڑے ترقی پسند کارکن کو نکال دینا بھی ان کے لئے معمولی سی بات تھی اور اس کے خلاف کچھ بھی بولنے پہلے سر پاگل یا ذہنی عدم توازن کا شکار قرار دے کر سنگھ سے نکال دیا جاتا تھا۔ ملک بھر

میں ایسے سینکڑوں کارکن خاموش بیٹھے تھے اور یہ کھیل جاری تھا۔

اس سلسلے میں بسنت راؤ اوم، مولی چند شرما وغیرہ کا اخراج بھی جب ان کی قبر نہ کھود سکا تو بیریٹ ڈی کا سفر طویل ہوگیا اور سنگھ کے تاناشاہوں نے ایک اصول بنالیا کہ بڑی سے بڑی شخصیت کو نکال دینے اور فطری قتل کر دینے سے بھی اس تنظیم کا کچھ نہیں بگڑ سکتا۔ یہ لازوال اور مطلق ہے۔

شاید اسی لئے انھوں نے تنظیم کے نام پر تاناشاہی کو بھی مات کر دینے والے اصول بنائے اور اسی نام پر اس تنظیم پر سب کچھ نچھاور کر دینے والے مخلص لوگوں کو بھی جھٹکنا شروع کر دیا۔ اس ضمن میں سنگھ اور اس کی دیگر شاخوں کو زندگی دینے والے پروفیسر بلراج مدھوک کو نکالنے کی انھوں نے سازش کی لیکن ان کے ذاتی اثر و رسوخ کی وجہ سے وہ ڈرتے بھی تھے اس لئے پوری تنظیم میں ان کے خلاف عام بیزاری اور نفرت کی لہر پھیلانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ خود سنگھ کے دیگر رہ نماؤں کی کمزوریاں بھی نمایاں ہوتی گئیں۔ آخر انھوں نے جھلا کر بلراج مدھوک کو نکال باہر کیا۔

نئی تنظیم کے بعد واضح طور پر سنگھ اور جن سنگھ دونوں میں تنظیم کے نام پر لادی گئی تاناشاہی اپنی موت آپ مرنے لگی۔ دونوں تنظیموں کے لوگوں نے محسوس کیا کہ سینکڑوں مخلص اور قربانی کرنے والے جوانوں کو بے وقوف بنایا جا رہا ہے اور انکے کارناموں پر پانی پھیرا جا رہا ہے۔ اس لئے اب خاموشی ترک کر کے ایک زبردست ٹکر لی جائے۔ اور اسی لئے سینکڑوں رضاکاروں نے بلراج مدھوک سے اپیل کی کہ سنگھیوں کا پردہ فاش کیا جائے۔

اس کے نتیجہ میں ملک بھر میں نہ صرف سنگھ اور جن سنگھ میں زوال شروع ہو گیا ہے بلکہ یہی وجہ ہے کہ یہ تاناشاہ اپنے انداز فکر میں تبدیلی لانے پر مجبور ہوگئے ہیں۔

وہ سارے لوگ جو ان کے استحصال اور غیر اخلاقی حرکتوں سے بیزار تھے۔ ان تنظیموں سے نکلنے لگے ہیں۔ سنگھ کے نئے سرسنچالک بالا صاحب دیورس نئے حقائق کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے انداز فکر اور پالیسی میں تبدیلیاں لانے پر مجبور ہیں اور اس نقطۂ نظر سے انھوں نے اعلان کیا ہے کہ سنگھ کا جن سنگھ سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن اس سے بھی سنگھ کی شکست و ریخت میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ نئے سنچالک نے یہ بھی اعلان کیا ہے کہ سنگھ کے ارکان کو کسی بھی سیاسی تنظیم میں شامل ہونے کی آزادی ہے۔ حالانکہ انھیں بالا صاحب دیورس کے منصوبے سے سنگھ کے سینکڑوں مبلغین تنظیمی سکریٹریوں کی صورت میں جن سنگھ میں کام کر رہے ہیں لیکن موقع پرستی اور اپنی ہی گدی کے خاتمہ کے خوف سے انھیں یہ جھوٹ بولنے میں بھی کوئی جھجک نہیں ہوئی کہ ہمارا جن سنگھ سے کوئی تعلق نہیں۔ کیا شری دیورس بتائیں گے کہ ان مبلغین کو تنظیمی سکریٹریوں کی صورت میں جن سنگھ میں کیوں گھسایا جا رہا ہے؟

لیکن بالا صاحب دیورس کا یہ اعلان بھی سنگھ کو زوال سے نہ بچا سکا کیونکہ سنگھ کے سوئم سیوک اچھی طرح جانتے تھے کہ انھیں بالا صاحب دیورس کی ہدایت پر جن سنگھ میں مطلق العنانیت لادی گئی تھی انھیں کے اشارے پر پروفیسر بلراج مدھوک کو نکالا گیا اور اب یہی یہ اعلان کر رہے ہیں کہ ہمارا جن سنگھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور سوئم سیوک کسی بھی سیاسی جماعت میں جا سکتے ہیں۔ سمجھوتا واد اور موقع پرستی کی بدترین مثال ہے۔

سنگھ کے لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ رہنما آج تک کسی بھی سمجھوتے سے دور رہے ہیں اور حکام شاہی کی طرح اپنے ہر حکم کو لادتے رہے ہیں۔ اس لئے اس اعلان اور ابن الوقتی و موقع پرستی سے سنگھ کی عزت بڑھنے کے بجائے اور گھٹی ہے اور ان کے زوال کا اور واضح ثبوت فراہم ہو گیا ہے۔ سنگھ اور جن سنگھ کی نشستوں میں رہ نماؤں سے پہلی بار کھلے عام اس زوال کے لئے ذمہ داری اور سمجھوتے واد کے بارے میں سوالات پوچھے جانے لگے ہیں۔ تنظیم کا جادو بھی انھیں چپ نہ کرا سکا۔ اس لئے ان رہ نماؤں نے نشست کرنی ہی ترک کر دی ہیں۔ جن سنگھ کے یہاں بھی یہی عالم نظر آتا ہے۔

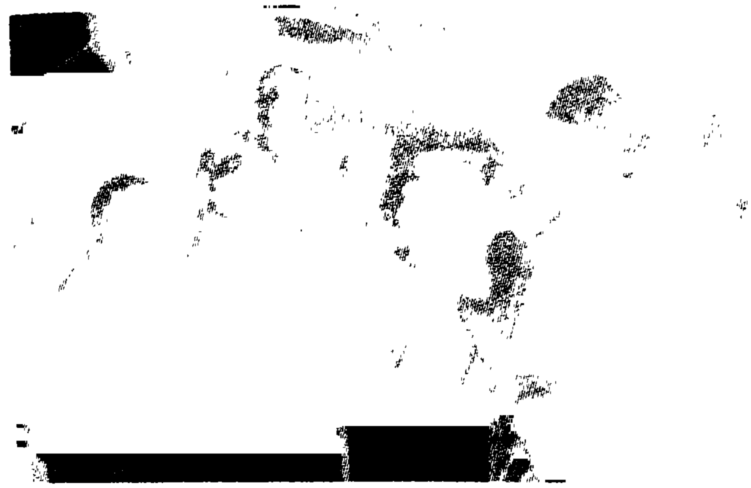
بے اصول، بے آدرش اور تخیلی تنظیم کو انھوں نے صرف نقلی نظم و ضبط کے نام پر ہی ٹکا رکھا تھا۔ اس زوال سے ان عناصر کا دیوالہ نکل گیا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ نشستوں میں، تذکروں میں بات چیت میں سنگھ کے سوئم سیوک اب ان کی اخلاقی زندگی پر بھی تبصرے کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کھوکھلے احترام کی بنا پر ٹکے ہوئے اوپری طبقہ میں کھلبلی مچ گئی ہے اور مبلغین اب پریشان ہیں۔ اس طرح پورا وقت دے کر سنگھ کے مبلغ کی صورت میں کام کرنے والے لوگوں میں پہلی بار ایسی اخلاقی کمزوری آئی ہے کہ وہ بھاری تعداد میں واپس لوٹ رہے ہیں۔ اس عمل کو دیکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ سال سے نئے پرچارک بالکل نہیں آ سکیں گے۔

اس زوال کا سنگھ کے اقتصادی ڈھانچے پر بھی گہرا اثر پڑ رہا ہے۔ مطلق العنانیت اور مبلغ طبقہ کی اخلاقی کمزوریوں اور عیش پسندانہ زندگی کے باعث اس برس ہزاروں سوئم سیوکوں نے دکشنا کے طور پر روپے نہیں صرف پھول دیئے ہیں۔ اس سے پریشان ہو کر سنگھ کے نئے سرسنچالک نے حکم جاری کر دیا ہے کہ گرو دکشنا کے سادھن پر انحصار نہ کر کے مختلف ذریعوں سے سنگھ کے ارکان کے پاس جا کر چندہ اکٹھا کریں اور مختلف اسمارکوں کے نام پر یہ چندہ اکٹھا ہونا شروع ہو گیا ہے۔ اس طرح عقیدت کے دوسرے قلعہ پر زبردست حملے سے بھی زوال کی رفتار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

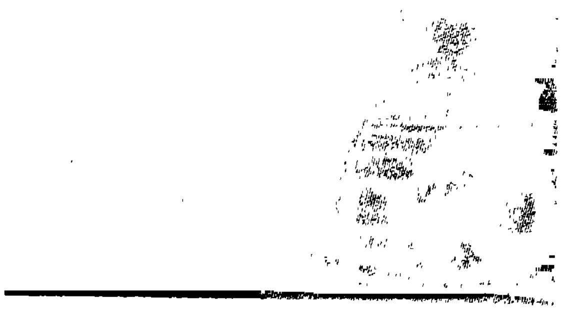
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا

مسٹر لیونڈ برژنیف کے دورۂ امن کی کہانی
تصویر کی زبانی

Shamshad Ali



لیونڈ برژنیف پالم ہوائی اڈے پر

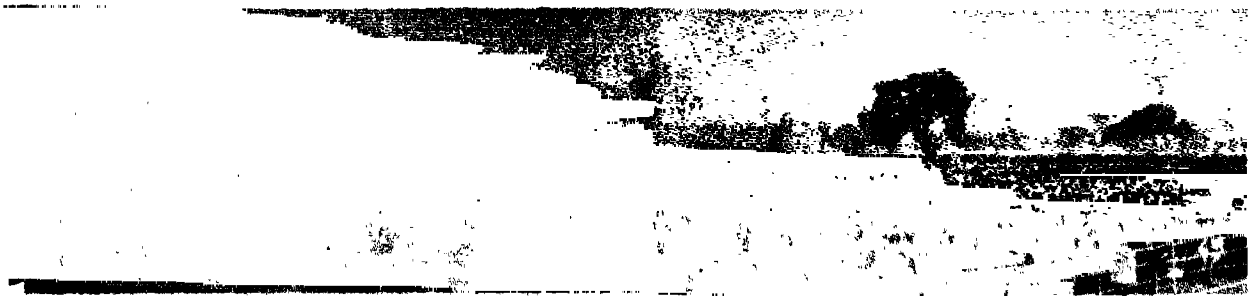


ہندوستانی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے ساتھ



صدر سے ملاقات

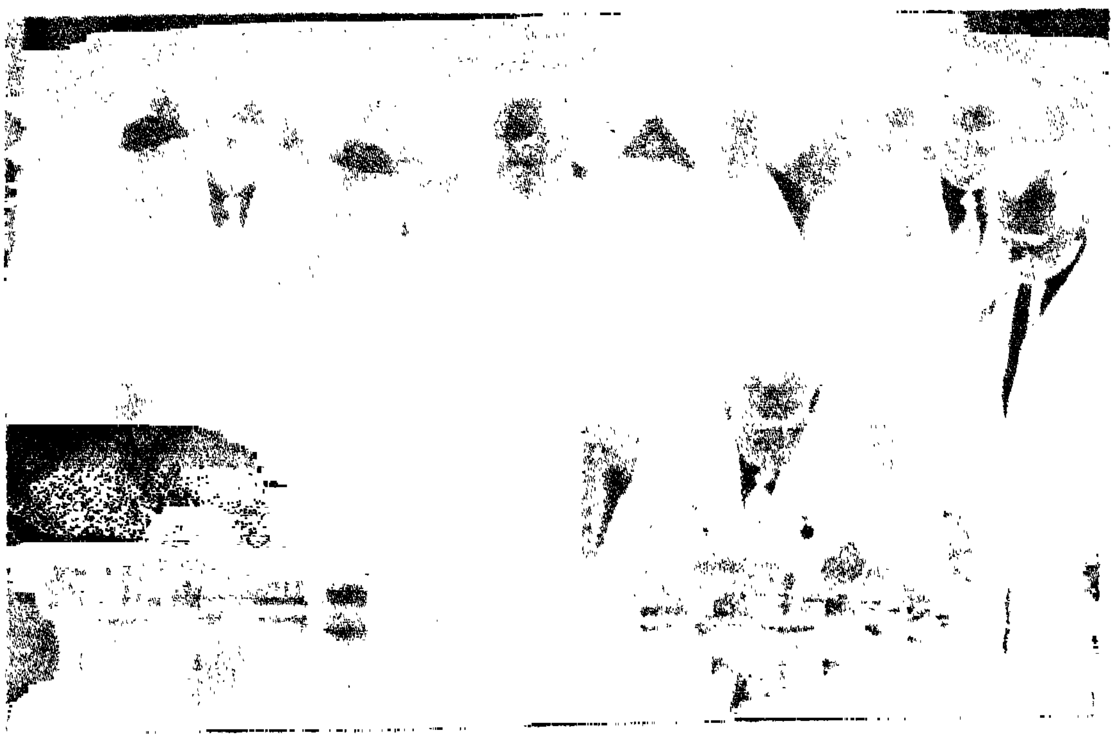
بزرنیف۔ لال قلعہ میدان میں عوام کے درمیان



مذاکرات کی میز پر



معاہدہ پر دستخط کرتے ہوئے



ایک استقبالیہ کے چند مناظر

۱۷ نومبر کو وزیراعلیٰ یو۔پی شری ہم وتی نندن بہوگنا کے اعزاز میں آل انڈیا سامپردائکتا ورودھی کمیٹی نے اپنے دفتر ۱۵۔ بلونت رائے مہتہ لین (رہائش گاہ شریمتی سبھدرا جوشی صدر آل انڈیا سامپردائکتا ورودھی کمیٹی) میں ایک استقبالیہ دیا۔ یہ استقبالیہ صرف اس لئے نہیں دیا گیا تھا کہ شری بہوگنا یو۔پی جیسی ریاست کے وزیراعلیٰ کے مسند پر جلوہ افروز ہوئے ہیں بلکہ انھیں یہ استقبالیہ اس لئے دیا گیا تھا کہ شری بہوگنا کا آدرش ہمارے آدرش سے ملتا جلتا ہے وہ بھی فرقہ واریت کے سخت خلاف ہیں۔ شری بہوگنا مرکزی وزیر تھے تو انھوں نے سرکاری تقریبات کے آغاز میں کسی بھی مذہبی رسم کی ادائیگی کو ممنوع قرار دے دیا۔ شری ہیم وتی نندن بہوگنا سامپردائکتا ورودھی کمیٹی کے ہم آدرش ہیں اور ہمارے لئے یہ مسرت کی بات ہے کہ ہمارا ایک ہمخیال یو۔پی جیسی ریاست کے وزارت اعلیٰ کے عہدے پر فائز ہوا ہے۔ ذیل میں اس استقبالیہ کے چند مناظر ہم اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں تاکہ وہ بھی اس مسرت میں شریک ہوں۔



آل انڈیا سامپردائکتا ورودھی کمیٹی کی صدر شریمتی سبھدرا جوشی شری بہوگنا کو پھولوں کا گلدستہ پیش کرتے ہوئے۔



آل انڈیا سامپردائکتا ورودھی کمیٹی کی چیرمین شریمتی سبھدرا جوشی و جنرل سکریٹری شری ڈی۔آر گوئل، شری بہوگنا کا استقبال کرتے ہوئے

خیر مقدمی تقریب میں شری بہوگنا تقریر کرتے ہوئے





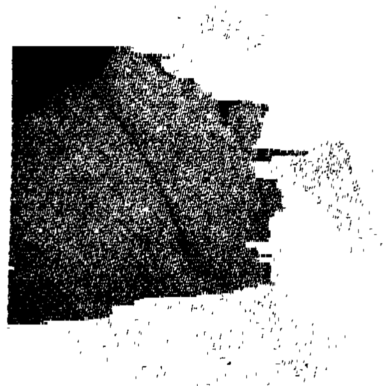
اتر پردیش سامپردائکتا ورودھی کمیٹی کے صدر شری این۔ این پانڈے شری بہوگنا کو سیکولر ڈیموکریسی اور کمیٹی کی دیگر مطبوعات پیش کرتے ہوئے۔

سلام مچھلی شہری کی مفارقت پر

آٹھواں سوال

پھر اٹھی کوہ ندا سے آواز
پھر کوئی نام کہیں حرف مکرّر ٹھہرا
پھر کئی لفظوں نے سینوں میں گھٹن کی محسوس
کئی الفاظ خلا پا کے کہیں چیخ اٹھے!

سمتیں خاموش ہیں ــــ راہیں چپ ہیں
لفظ بے چین ہے گونگی ہے کتاب
نقشے گمراہ ہیں ......
منزل کا نشاں کیا دیں گے



سلام مچھلی شہری مرحوم

کون بتلائے گا اس عفریت کے مسکن کا پتہ
جو اک اک لمحہ
اک اک پل میں
ہزاروں الفاظ
کھا کے بھی سیر نہیں ہو پاتا

اور ..... کچھ اور ...... کی آواز دیے جاتا ہے
کون توڑے گا اس آواز کا سربستہ طلسم
کوئی حاتم بھی نہ کر پائے گا پورا یہ سوال!

عبداللہ کمال

سلام مچھلی شہری کی

دو غزلیں اور ایک نظم

دو غزلیں

اب عیادت کو مری کوئی نہیں آئے گا — پھر ہوں بیمار کسی کو نہ یقیں آئے گا
غم مسلسل ہو تو احباب بچھڑ جاتے ہیں — اب نہ کوئی دل تنہا کے قریں آئے گا
اپنے خوابوں کے دریچوں میں جلالو شمعیں — اور یہ سوچ لو اک ماہ جبیں آئے گا
تم نہیں ہو تو نئی نسل اسے دیکھے گی — انقلاب آئے گا آنا ہے یہیں آئے گا
اب تو خود اپنے عزائم پہ بھروسہ کرلے — کام کوئی بھی نہ اے قلب حزیں آئے گا
روز پوجا کے نئے پھول سجاتا ہے سلام
جانے کب کس کا خدا سوئے زمیں آئے گا

۵ر نومبر ولنگڈن نرسنگ ہوم۔ نئی دہلی

وہ چشم ناز مری سمت یوں اٹھی ہے کہ ہائے — اک ایسی چوٹ دل زار پر لگی ہے کہ ہائے
کبھی ہنسی تھی رخ گل پہ دیکھ کر شبنم — ابھی تلک مری پلکوں پہ وہ نمی ہے کہ ہائے
تمام شہر بظاہر حسین ہے لیکن — تمام شہر میں کچھ ایسی بے بسی ہے کہ ہائے
مجھے بھی دیکھ کے محفل میں یوں تو ہیں مغرور — بظاہر ایسا اک انداز بے رخی ہے کہ ہائے
میں چھیڑتا تو ہوں ہر بار اک نیا نغمہ — صدائے ساز کچھ ایسی دبی دبی ہے کہ ہائے
سمن شراب شب ماہ تو کے جھرمٹ میں — قسم شراب کی ایسی بھی اک پری ہے کہ ہائے
سنا گیا تھا بہت آج شادماں ہے سلام — مگر جو دیکھا تو کچھ ایسی خامشی ہے کہ ہائے
وہ اور ہوں گے جنھیں میکدہ مبارک ہے — مرے لئے تو وہ انجام مے کشی ہے کہ ہائے
یہی کہا تھا کہ تم شہر دل کی ملکہ ہو
بس اتنی بات پہ کچھ ایسی برہمی ہے کہ ہائے

۱۲ر نومبر ولنگڈن نرسنگ ہوم۔ نئی دہلی

ایک نظم

وہ ۱۱ر مئی سن ۷۲ء تھی جب میں
تجھے نوچ کر پھینک بیٹھا تھا اپنے گلے سے
میں اس کامیابی سے خوش تھا
مگر آج پھر تو گلے تک مرے آگئی ہے
کوئی ہار بن کر
۷۳ء کے یہ جون کا ہے مہینہ
کلنڈر میں تاریخ ۲۸ کی ہے
مری رآبعہ اور متی کا کہنا ہے
اس بار تو اس لئے آگئی ہے
کہ ڈسنا ہے مجھ کو
شراب، اے مری جانی پہچانی ناگن
مجھے سوچنا ہے
کہ جو شخص تجھ سے کترا رہا ہے
جو اپنے مسائل سے ہارا ہوا ہے
جو باغی تھا لیکن
خداؤں کے چرنوں تلے آگیا ہے
میں اس کے گلے تک دوبارہ نہ جاؤں
اگر اس کو گھر کی بقا کی تمنّا ہے
میں دل کی تمنّاؤں کو توڑ دوں
اور پوچھوں
کہ وہ ایک مدت سے
"شنکر" کا
اور "ناگ دیوتا" کا بھی اک
پجاری رہا ہے

۲۸ر جون ۷۳ء

سلام مچھلی شہری

سہیل عظیم آبادی

۱۹ر نومبر کو ونگڈن نرسنگ ہوم میں سلام مچھلی شہری کا انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر ۶۵ سال تھی۔ ادھر ڈیڑھ دو سال سے ان کی صحت خراب رہتی تھی۔ جگر اور گردوں کے مرض نے ان کو کمزور بنا دیا تھا۔ سلام کی موت اردو ادب کے لئے بڑا المناک حادثہ ہے۔

۱۹۳۸ء میں پٹنہ سے ایک ماہوار رسالہ ہندوستانی جاری ہوا تھا۔ اس کے ایڈیٹر عبدالباقی خاں جامعی مرحوم تھے۔ وہ الگ ہوگئے تو اس کی ذمہ داری میرے سپرد کی گئی اسی زمانے میں سلام سے خط وکتابت شروع ہوئی۔ یہ زمانہ سلام کی شاعری کے آغاز کا زمانہ تھا۔ ان کے خطوط لمبے ہوتے تھے اور ان میں کم عمروں کی بے چینی بھری ہوتی تھی۔ ایک ایک لفافے میں تین اور چار نظمیں ہوتی تھیں اور خطوں میں وہ ساری باتیں لکھ جاتے تھے، جو اس وقت ان کے دماغ میں آجاتی تھیں۔ آج تو جدید شاعری کے نام پر ہر اُلٹی سیدھی تحریر کو بھی شاعری کہہ دینا آسان ہے۔ مگر وہ زمانہ ایسا نہیں تھا۔ شاعری کے قاعدے قوانین اور سارے لوازمات کی پابندی بے حد ضروری تھی۔ سلام کی نظموں میں بڑا نیاپن ہوتا تھا۔ کبھی کبھی تو اتنا زیادہ نیاپن ہوتا تھا کہ قدامت پسند لوگ منہ بنا لیتے تھے لیکن ان نظموں میں رس ہوتا تھا، شگفتگی ہوتی تھی غنائیت ہوتی تھی، شعریت ہوتی تھی اور شاعری کے سارے لوازمات ہوتے تھے۔ سلام کی شاعری کی انھیں خوبیوں نے جلد ہی لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا اور وہ کم عمری میں ہی ملک گیر شہرت کے مالک ہوگئے تھے۔

سلام فطرتاً سادہ طبیعت کے آدمی تھے۔ ان کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ زمانہ سازی، داؤں پیچ اور تکڑم بازی زندگی کے آخری دن تک نہیں سیکھ سکے۔ ان کے دل میں جو بات ہوتی تھی، وہ زبان پر آجاتی تھی چنانچہ ان کے خطوں میں بھی یہ بات ہوتی تھی چھوٹی چھوٹی باتیں اور ایسی باتیں جن کا لکھنا ضروری نہیں ہوتا، بلکہ ایسی باتیں بھی جن کو لکھنا نہیں چاہیئے جس سے وہ ملتے تھے خلوص اور بے ریائی کے ساتھ ملتے تھے۔ اپنی ساری باتیں کہہ جاتے تھے۔ اپنا سکھ دکھ، اپنی خوشیاں اور پریشانیاں اپنی کامیابیاں اور ناکامیاں۔

سلام غریب گھر میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنے شوق اور اپنی محنت سے تعلیم حاصل کی۔ سلام کی بڑی تمنا تھی کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔ لیکن غریبی نے قدم روک دیئے۔ اور انھیں کالج کی پڑھائی ترک کرکے یونیورسٹی لائبریری میں ملازمت کرنی پڑی۔ سلام کو یہ ملازمت بالکل پسند نہیں تھی۔ بالکل غیر شاعرانہ کام تھا۔ الماریوں سے کتابیں نکالنا، رجسٹر بھرنا، لڑکوں کو دینا، اور لڑکوں سے کتابیں لے کر رجسٹر میں وصول کا نشان بنانا اور کتابوں کو ان کی جگہ رکھوانا۔ کتنا غیر شاعرانہ کام تھا۔ لیکن سلام یہ غیر شاعرانہ کام کرنے پر مجبور تھے۔ باپ غریب تھے اور سلام بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ باپ کے بعد ذمہ داری ان پر عائد ہوتی تھی۔ اپنا مستقبل بنانے کے لئے وہ گھر والوں کو تکلیف میں دیکھنا اور رکھنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ وہ بے حد جذباتی آدمی تھے اور گھر کے ہر فرد سے گہرا جذباتی لگاؤ رکھتے تھے۔ اپنے ایک خط میں سلام نے ایسی ہی باتیں لکھی تھیں۔ ایک ایک لفظ سے بے چینی اور بے بسی کا اظہار ہوتا تھا۔ لیکن ہمارے سماج میں ہزاروں بلکہ لاکھوں نوجوانوں کے دلوں میں ان کی تمنائیں دم توڑ دیتی ہیں، سلام کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ پھر سلام آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہوگئے۔ وہ اسکرپٹ رائٹر ہوگئے اور لکھنا ہی ان کا کام ہوگیا۔ اس نئی ملازمت سے سلام خوش تھے کم سے کم غیر شاعرانہ کام نہیں تھا — لیکن دوسروں کی ہدایت پر لکھنا، غیر شاعرانہ ہو جاتا ہے۔

ریڈیو کی ملازمت میں سلام نے بہت کچھ لکھا غزلیں، نظمیں، ڈرامے، فیچر اور طنزیے۔ ریڈیو کی ملازمت نے ان کی زندگی میں کچھ آسانیاں بھی پیدا کیں۔ لیکن ان کی صلاحیتوں کو دیمک کی طرح چاٹتی بھی گئیں۔ ان کو ایسی چیزیں بھی لکھنی پڑتی تھیں، جو وہ لکھنا نہیں چاہتے تھے اور ایسے وقتوں میں بھی بیٹھ کر لکھنا پڑتا تھا، جب لکھنے کو دل بالکل نہیں چاہتا تھا۔ لیکن جھک مار کر کام پورا کرنا ہوتا تھا۔ اس طرح سلام کو بہت سی فضول چیزیں بھی لکھنی پڑیں۔ سلام نے کئی بار اس کی شکایت کی۔ اسے وہ لکھنا نہیں بلکہ مزدوری کرنا سمجھتے تھے۔ ملازمت کا مطالبہ انھیں پورا کرنا پڑتا تھا۔ اکثر ایسے لوگوں کی ہدایت یا حکم پر انھیں لکھنا پڑتا تھا، جو خود نہیں سمجھتے تھے کہ وہ کیا لکھوانا چاہتے تھے۔ جو یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ شعر کیا ہے اور ڈرامہ کیا ہے۔ لیکن وہ اونچی کرسیوں کے مالک تھے اور ان کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ سلام کو حکم دیں اور ان کی مرضی کے خلاف اپنی مرضی کے مطابق ان سے چیزیں لکھوائیں۔ یہ وقت بڑے کرب کا ہوتا ہے اور سلام کو ایسے کرب کے عالم سے بارہا گزرنا پڑا اور سرکاری ملازمت کے دوران ہر حساس آدمی کو گزرنا پڑتا ہے۔

ملازمت کی ابتدا میں سلام کو کافی دنوں تک لکھنؤ میں رہنا پڑا اور وہیں انھیں شراب پینے کی لت لگ گئی۔ شراب نوشی میں انھوں نے کبھی احتیاط نہیں برتی وقت اور مقدار کی قید باقی نہیں رہی۔ جیسی بھی ملی اور جتنی بھی ملی پی گئے۔ زیادہ پینے کی وجہ سے بدنامی بھی اٹھائی اور تکلیفیں بھی برداشت کرنی پڑیں اور زہر آہستہ آہستہ اپنا کام کرتا رہا۔ ان کا جگر اور گردے خراب ہو گئے، صحت بگڑ گئی لیکن سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ سلام کو لوگوں نے سنجیدگی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اور ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کی طرف لوگوں نے دھیان

(باقی ص ۳۱ پر)

پدم شری

سلام مچھلی شہری

دیر سے چٹان پر بیٹھا سوچ رہا ہوں کہ یہ زندگی کتنی سستی اور قابل رحم ہے۔ اس مضبوط چٹان سے اگر کوئی ظالم مجھے دھکیل دے تو میں بھی دریا کی تیز لہروں اور اس کے بھنور میں پھنس کر چند منٹ بعد موت کو اپنا ہمراز بنالوں۔ جس طرح وہ جو ابھی معصوم سا جانور پانی پینے آیا تھا۔ اپنی تشنہ لبی بجھانے کی بجائے دفعتاً موت کی پیاس بجھا بیٹھا۔ پاؤں پھسلا تو گہرے پانی میں ہاتھ پاؤں مارتا چلا گیا اور آخرش زندگی ہار گئی اور پھر وہ بھولا سا جانور ساکت و جامد پانی پر چت لیٹا آرام سے تیرتا چلا جا رہا تھا ——— اور جیسے ہی یہ خبر ملی کہ ہسپتال میں تین چار ماہ پڑے پڑے سلام مچھلی شہری دنیا کو چھوڑ گئے تو یوں لگا جیسے زلزلہ آگیا ہو۔ دفعتاً ان کی وہ گفتگو یاد آگئی جب اسپتال جانے سے قبل آل انڈیا ریڈیو سروس کے کمرے میں وقت کے عظیم شاعر سلام صاحب نے مجھ سے کہا تھا۔ "شمیم! اس سگریٹ کے دھوئیں کی مانند میں اور میری زندگی بھی بھٹک رہی ہے:

"جناب! خیر تو ہے آپ تو آرام سے کرسی پر براجمان ہیں؟"

"شراب کیا چھوڑ دی کہ حیات کا ساتھ ٹوٹتا دکھائی پڑتا ہے۔ یہ دیکھو دوائیوں کی شیشیاں اور گولیاں کمبخت ایک عذاب لگ گئی۔ جسم و جان کو پیتی رہتی تھی تو جب بھی جینا مشکل تھا۔ اور ترک کر دی تو اب بھی ستائے جاتی ہے۔ میرے جسم کے اعضا مجھ سے روٹھ گئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ان شیشیوں کی بجائے وہی رنگین پانی پلاؤ۔ اب وہ پانی تو روز محشر تک چکھنا تو کیا سونگھنا بھی گوارہ نہ کروں۔ مگر یہ جسم روز بروز گرتا ہی جاتا ہے کہیں ایسی نیند نہ آئے کہ اٹھ نہ سکوں۔"

سلام دنیا چھوڑ کر چلے گئے۔ بیسویں صدی میں ان کا مقام اپنی انفرادیت کا حامل تھا۔ نظم گوئی میں ایک نیا موڑ ایک اچھوتا انداز فکر صریحاً قابل ستائش ہے۔ ان کی نظم "مشورہ" کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ ایک اور نظم "نیا سال نیا خیال" میں جس خوب صورتی اور جذباتی انداز سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ادب کی جان ہے۔ نظم میں ایک جیتے جاگتے احساس کو اُجاگر کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ سلام صاحب کی سوچ اور ان کا تخیل اتنا بلند تھا کہ بعض دفعہ گمان ہوتا تھا کہ اس نظم کا خالق کتنا عظیم اور منفرد شخصیت کا مالک ہوگا۔ "پھول اور کانٹے" حالانکہ بچوں کے لئے کہی ہے لیکن آخری دو سطور میں زندگی و موت کے تجسس کو نمایاں کرکے کمال کر دیا ہے

زندگی ایک درد ایک نغمہ بھی ہے
پھول کی آغوش میں ایک کانٹا بھی ہے

بے جھجک اور بے تکلفانہ ماحول میں بولتے تھے اور حجابات یارانہ چھپائے تو چھپائے نہ بنے کے مصداق روداد غم دوراں اور فسانہ گردش وقت سناتے تو لگتا جیسے حیات کو نئی تقویت و توانائی مل رہی ہو۔ ۱۹۷۳ء میں پدم شری کا شاندار اعزاز حاصل کیا۔ یہ مرتبہ اردو شعراء میں ابھی چند کو ہی ملا ہے۔ سال رواں کے شروع سے ہی ان کی صحت برابر گرتی چلی گئی کچھ تو ان کی لاعلمی و لاپرواہی کو دخل رہا۔ کچھ مے نوشی اور کچھ احساس ذمہ داری نے ان کو تندرستی کے بارے میں سوچنے کا کم موقع دیا۔ سلام صاحب کا پروقار و بااخلاق رویہ ان کا شیریں، شائستہ چہرہ اور دل و دماغ کو جھنجھوڑنے والا کلام اردو زبان کے لئے اثاثہ عظیم سے کم نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا سرمایہ بے پناہ ہے جس کو نقرئی سکوں کی جھنکار بھی کم تر نہیں بنا سکتی۔ "مشورہ" میں ان کے تخیلات کی حقیقت کچھ یوں بھی ہے۔

بار بار آئینہ کے سامنے آیا نہ کرو ٭ بعض آئینے بھی جان دار ہوا کرتے ہیں
وہ جو سینہ سے لگالیں گے تو پھر کیا ہوگا
اپنی سکھیوں کو بھی ہر خواب بتایا نہ کرو ٭ ان کے سینوں میں بھی کچھ خواب
خواب سے خواب مزالیں گے تو پھر کیا ہوگا

پدم شری سلام مرحوم کے دو شعر جو اپنی تعریف خود کر رہے ہیں۔

جب بھی سوچا میرے خوابوں کی دلہن آئی ہے
پالکی بن کے میرے سامنے ——— نے لگے

کلی کھلے گی ستارے ضرور چمکیں گے ٭ یہ اور بات ہے کہ شکریہ ادا نہ کرو

اتنے بڑے شاعر کا پیار و مدارج، اپنائیت، خلوص، اخلاق کہاں ملے گا اور یہ زندگی کتنی سستی اور قابل رحم ہے ——— یہی سب کچھ دیر سے چٹان پر بیٹھا سوچ رہا ہوں۔

تجھ سے بچھڑا ہوں تو سفینہ میں اتر آیا ہے
ایسا سناٹا کہ پیڑ کا پتہ نہ ہلے

•••

ریل اور سماج

یوگیش کمار

ریل

ڈبہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ بمشکل دو بھاری بھرکم آدمیوں کے درمیان بیٹھنے کی اجازت ملی۔ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ ٹانگیں کہاں ہیں اور دھڑ کہاں؛ ٹٹولنے پر بھی پورے جسم سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ذرا کھسکنا شروع کیا تو بائیں ہاتھ کا "سانڈ" خشمگیں نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ ایک تو جگہ دی دوسرے ہلتے بھی ہو۔ کافی تلاش کے بعد معلوم ہوا کہ ایک ٹانگ دائیں بازو والے "سانڈ" کی رانوں تلے پڑی ہے اور دوسری سامنے کی سیٹ پر بیٹھی مارواڑن کی گود میں سہمی سمٹی رکھی ہے۔ وائل کی دھوتی کے چکروں میں لپٹا مارواڑی اوپر والی سالم سیٹ پر تنہا قبضہ جمائے لیٹا تھا، نہ جانے کیوں لال پیلا ہونے لگا۔ ہماری اکلوتی ٹانگ کسی کی گود میں ہو جائے کسی کے سر پر اس کی بلا سے۔ خواہ مخواہ عورتوں کی طعنے دینے لگا۔ شرم و حیا کا اتنا پاس تھا تو بیوی کو بریک میں بک کروا دیا ہوتا۔

مجھے محکمہ ریل کے افسران پر غصہ آنے لگا۔ آئے دن کرایوں میں دوگنی چوگنی بڑھوتری کرتے رہتے ہیں۔ یہی ذرا مرادآباد تک جانا ہو تو دس کے نوٹ سے پان کے دام بھی نہیں لوٹاتے۔ ادھر بھیڑ کا یہ حال ہے کہ برسات کے دنوں میں بھی پسینہ چھوٹ رہا ہے اور جو گاڑی اسٹیشن پر رکی تو وہ گھٹن محسوس ہوئی کہ گلا رُندھ گیا بدبو کے مارے ناک پھٹ گئی۔ اور یہ دیہاتی بھائی اتنے زور سے چھینکتے ہیں کہ لگتا ہے کہ ساون کی بھولی بھٹکی بدلی برس گئی ہو۔ شکر ہے کہ گاڑی چلی۔ مگر یہ بھی کچھ کم مصیبت نہیں۔ پتہ نہیں ہندوستانی ریلیں چلتی ہیں یا پھر پُھدکتی کودتی رہتی ہیں۔ سارے جسم کو زنجیروں میں کس دو، مگر کیا مجال جو ایک منٹ بھی جم کر بیٹھ سکو۔ بس لٹو کی طرح گھومتے رہو۔ اتنا گھومو کہ کولہوں میں ٹیسیں اُٹھنے لگے۔ دماغ جھلا جائے اور یہ بھی یاد نہ رہے کہ گاڑی چڑھنے سے پیشتر بابو نے مرادآباد کا ٹکٹ دیا تھا یا جہنم آباد کا۔ ریل گاڑی کا سفر مصیبت سے کم نہیں۔

سماج

مجھے ڈیڈی پر غصہ آنے لگا۔ مفت میں پریشان کیا۔ امتحان سے ابھی ابھی فرصت ملی تھی۔ سوچا تھا کشمیر جاؤں گا مگر ڈیڈی نے کشمیر کا چکمہ دے کر مرادآباد دھکیل دیا۔ ڈیڈی کے بھتیجے کی شادی تھی۔ ہوتی رہے میری بلا سے۔ شادیوں میں ہوتا ہی کیا ہے۔ گئے سال سُمترا کا جو بیاہ ہوا تھا وہ دھاندلی مچی تھی کہ شرم کے مارے بے ایمان لیڈروں کی گردنیں بھی جُھک جائیں۔ محلے بھر کی بوڑھیوں کی فوج جمع ہو گئی تھی پوپلے گڈھوں کو دیکھ کر جی متلا اٹھا تھا۔ رات کو اس قدر زور کے خراٹے گونجتے تھے کہ بھوکے گیدڑوں کا شور و غوغا بھی ماند پڑ گیا تھا۔ اور یہ بوڑھے قبر میں پاؤں لٹکائے ہوئے ہیں مگر شادی بیاہ پر دعوت ہو تو خوشی کے مارے کپڑوں بغیر الٹا کھڑا ہو جائیں۔ اُپدیش دیتے تھے جنس بری بلا ہے۔ اس سے دور رہو۔ دس پانچ جوان عورتیں بھی تھیں مگر سبھی کو اپنے شوہروں کی فکر لاحق تھی۔

اور جو رات آئی تو دبی رکی سانسیں پُھس پُھسائیں۔ مصنوعی کھانسیاں، کانوں میں انگلیاں ٹھونسو، سو بار کہا ہمیں دوزخ میں نہ دھکیلو، شادی والے گھروں سے دور رکھو۔ مگر کون سنتا تھا۔ بہت کچھ سہنا پڑا۔ اور جب واپس لوٹے تو ڈالڈا کے لڈوؤں کے ساتھ کھن کھن کرتی کھانسی بھی لائے۔

ریل گاڑی

ڈبے کے کونے میں بیٹھے ایک مسافر نے باپ کی گالی نکالی۔ اور مجھے سن کر ایسا قلبی سکون میسر ہوا جیسے کسی تماشائی کو متواتر آدھ گھنٹہ اشتہاری سلائڈیں دیکھنے کے بعد فلم کے شروع ہونے پر ہوتا ہے۔ میں دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ کوئی میرے ڈیڈی کو بھی متواتر آدھ گھنٹہ گالیاں نکالتا رہے، موٹی موٹی، مغلظ، ماں بہن کی۔ جیسے پولیس والے شریف آدمیوں کو نکالتے ہیں کہ بس کانوں میں بھنبھناتی رہیں یوں ہی خیال آتا ہے کہ اگر ہم باپ داداؤں کو گالیاں دیتے رہتے تو ریل گاڑی چھوڑ سماج کی گاڑی بھی نہیں رکے گی۔

سماج

میرا چچازاد بھائی نریندر بدمعاش نہ جانے کون سے بل بوتے

پر بیاہ کرانے چلا تھا۔ اول درجے کا غنڈہ۔ کالج میں ہڑتالیں کروانے کے سوا کام ہی کیا تھا۔ دو دفعہ اسکول میں پتنگ کٹ چکی تھی۔ خدا خدا کرکے بی۔ اے میں پہنچا تو پروفیسر کو پیٹ دیا۔ بھلا لڑکا نالائق ہو تو استاد کیا کرے۔ نمبر کہاں سے دے گا۔ میاں جی چاروں میں اڑ گئے اور اوپر سے دھونس جمائی "پاس نہ کیا تو جھونپڑی جلا دوں گا۔" دُبلا پتلا پروفیسر نانوے پونڈ کا ڈھانچہ، ہڈی پسلی ایک ہوئی تو لنگڑ دین ہو گیا۔ اور نریندر بدمعاش بی۔ اے کر گیا۔

سمترا کی شادی پر بھی خوب دھما چوکڑی مچائی تھی۔ آنکھوں میں بلا کی کشش ہے۔ ہونٹ بھاری بھاری اور ان پر حاوی نوکیلی مونچھیں، خاصی مردانہ اور ملٹری کی وردی، ایسی چکنی چپڑی باتیں کرتا کہ ایک آدھ تو جھانسے میں آئی گئی ہو گی۔ اندر کی بات خدا جانے۔ یہ کماؤ شوہروں کی بیکار بیویاں چکنی مٹی ہوتی ہیں۔ کیا معلوم کون پٹخنی کھا گئی ہو۔ شادی والا گھر دیکھنے والے دیکھ لیتے۔ مگر بات دل میں رکھتے ہیں۔ سوچتے ہوں گے کہ وہ بھی اس حمام کے ننگے سادھو ہیں، سماج کے منہ پر کرارے تھپڑ لگاؤ مگر داغ دکھائی نہ دے۔ تبھی تو بوڑھے کہتے ہیں "جنس بری بلا ہے اس سے دور رہو۔"

ریل گاڑی

ریل کے ڈبے کے مسافر دو گروہوں میں بٹ گئے تھے اور ان کے درمیان ملکی سیاست پر گرما گرم بحث چل نکلی تھی۔ بمشکل سے پتہ چل پایا کہ کون سا شخص کون سی پارٹی کی حمایت کر رہا ہے۔ کیونکہ ان میں سے بیشتر بیک وقت ایک ہی خیال کی حمایت بھی کرتے اور مخالفت بھی۔ چند ایک غیر جانب دار بھی تھے یا پھر نیوٹرل گاؤدی۔ جدھر ہوا کا رخ دیکھا اُدھر کے ہو لئے۔ مضمون بھی بدلتے جا رہے تھے بات سیاست سے چل کر ریل گاڑیوں کی رفتار پر جا پہنچی تھی۔

"یہ ریلیں بہت سست رفتار ہیں۔ آج چلو تو قیامت پر منزل ملتی ہے" ایک نوجوان مسافر بولا۔

"نہیں جی آپ غلط کہتے ہیں۔ ہندوستانی گاڑیاں تو بہت تیز چلتی ہیں۔" ایک بزرگ مسافر نے اختلاف ظاہر کیا۔

"گاڑی کو تیز رفتار نہیں ہونا چاہیئے۔"

یہ مسافر بھی بزرگ تھے۔ اسی بیاسی کا سن۔ بینائی کمزور تھی اور گرم کپڑوں کے لباس سے ظاہر ہوتا تھا کہ جوڑوں کے درد کے مریض ہیں۔

"آپ تیز رفتار کے خلاف کیوں ہیں؟" نوجوان نے سوال کیا۔

"زندگی چھوٹی ہے بہت مختصر۔ زیادہ جدوجہد باعث تکلیف ہے اور تیز رفتار۔۔۔۔۔۔"

"یہ متعصب ہے کیونکہ یہ آپ کو چھوٹی سی زندگی میں بہت زیادہ اور بہت جلد کام کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ ہے نا؟" نوجوان نے بزرگ مسافر کا فقرہ مکمل کر دیا۔ اور بزرگوار جھلا اٹھے۔

"لاحول ولاقوۃ! کیا ناخلف چھوکرا ہے۔ بزرگوں کی بات کاٹتا ہے۔"

"بات نہیں کاٹتا۔ رفتار تیز کر رہا ہوں۔" نوجوان نے جواب دیا۔

"ہاں۔ ہاں۔" ایک غیر جانب دار نے حمایت کی۔

"نہیں۔ نہیں۔" دوسرے غیر جانب دار نے مخالفت کی۔

سماج

سمترا کی شادی پر بھی ایک بحث ہوئی تھی۔ مجھے معاً پرانا واقعہ یاد آ گیا۔ خوب بیٹھک جمی تھی۔ بڑے بوڑھے تھے اور جوان بھی۔ نریندر بدمعاش بھی تھا اور واسنتی بھی موجود تھی یہ میری چچازاد بہن ہے اور نریندر کی بھی۔ بلا کی شرمیلی واقع ہوئی ہے۔ بمشکل میٹرک تک جا پائی تھی۔ چچا نے خاصا زور ڈالا کہ لڑکی کو بی۔ اے تک پڑھایا جائے۔ مگر واسنتی گھریلو ہے۔ کالج کی تڑاک بھڑک راس نہ آئی۔ بہتیرا سر پٹخنے پر بھی نتیجہ صفر نکلا۔ آخر کار گوبر کی راکھ سے پیتل کی تھالی مانجھنا شروع کر دیا۔ اور آج تک یہی کرتی ہے۔ واسنتی سے زیادہ ستھرے برتن گھر بھر میں کوئی نہیں مانجھتا۔ واسنتی بزرگوں کی آنکھوں کا تارا تھی۔ اسے تو یہ نصیحت بھی نہیں ملی "جنس بری بلا ہے اس سے دور رہو۔"

ایسے موقعوں پر بحث ہی کیا ہوتی ہے۔ جی ملانے والی جل بھن کر کوئلہ ہو جاؤ، سلگتے رہو، چین نہ آئے۔ ننھی ننھی بچیاں خدا جھوٹ نہ بلائے، کمبختوں کو ٹھیک طرح ناک صاف کرنا نہیں آتی تھی۔ ماں باپ کی نگاہوں میں جوان تھیں اور چھوکرے جن کے گال سنگ مرمر سے زیادہ چکنے دیکھتے دیکھتے بالغ ہوئے جاتے۔ بمبئی والے ماموں جان کہہ چکے تھے "میرا ابیشک کھڑ ہونگ ہو چلا کوئی لڑکی ڈھونڈو۔" لکھنؤ والی خالہ کو اپنی دس سالہ بیٹی کی فکر لاحق تھی "موئی روز بروز بڑھتی جائے۔ آج کرتہ سیا کل جسم پر نہیں بیٹھتا۔ عجائب ہے، یہ لڑکی۔ دیکھو تو کوٹھے

تک جا پہنچی ہے"۔ اور لڑکے ہیں کہ ڈھونڈے نہ ملیں اور جو ملتے ہیں تو ناکارہ۔ دھوبی کے کتے نہ گھر کے نہ گھاٹ کے۔ کوئی چمنی پر سجا کر رکھنے ہیں۔ کم سے کم ایک ہزار نقد تنخواہ پاتا ہو۔ اب بھلا آج کل کی مہنگائی میں کون اپنا کماؤ سپوت ایک مریل چھوکری پر قربان کرے گا۔ ادھر مائیں ہیں کہ تلی بیٹھی ہیں" میں تو اپنی شششما کے لئے ایک ہزار والے سے کم پر نظر بھی نہ ڈالوں"۔ تجارت ہونے دو لیکن جنس کی بات نہیں ہونی چاہیئے۔

" آج کل ٹھیک لڑکا ملتا ہی کہاں ہے ؟"

کھنہ انکل نے فیصلہ دے دیا۔ مگر شرما انکل ٹھٹھہ مار کر ہنس دیئے انھوں نے شادی نہیں کی تھی اس لئے خاندان میں وہ سکی چاچا کے نام سے پکارے جاتے تھے بولے" لڑکا نہ ہوا کوہ نور کا ہیرا ہو گیا۔ جو تلاش کرنے چلو۔ ہندوستان کی آبادی ساٹھ کروڑ ہے اور نہیں تو دس پانچ کروڑ لڑکے ہوں گے کوئی سا پکڑ لو"۔ دہلی والی پھوپھی ناراض ہو چلی تھیں۔ ان کی پانچ یا چھ جوان بیٹیاں تھیں جن کی شکلیں بھی یوں ہی سی تھیں پھوپھی نے ابھی ابھی موٹے شیشوں کی عینک لگوائی تھی۔ مگر ان کی بینائی بقدر کمزور تھی کہ ان کو لڑکا تو کیا ہاتھی بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ قدرے مایوس ہو کر بولی" تو پھر اس کا علاج کیا ہے؟"

نریندر بدمعاش بھی کھڑا تھا پرلے درجے کا منہ پھٹ۔ نہ کہنے کی بات سب سے پہلے کہتا شیطان کی زبان پائی تھی مگر گھوڑے کی لگام نہیں تھی۔ آتی بڑی بزرگوں کی فوج کے سامنے اعلان کیا" اچھا تو یہ ہے کہ لڑکے لڑکیوں کی خاندان میں شادیاں ہوں"۔

چند لمحوں کے لئے ہنستی کھیلتی نکل کر سانپ سونگھ گئے۔ ایک تکلیف دہ خاموشی طاری ہو گئی۔ شائد اس نے بزرگوں کے ذہنوں پر جمی روایات کی مٹی کھرچ ڈالی تھی اور پھر واسنتی کے پتا جی نے ڈانٹ پلائی" بیوقوف کہیں کا جو منہ میں آتا ہے بک دیتا ہے"۔

" سوچ سمجھ کر بات کیا کرو"۔ میرے ڈیڈی نے بھی بُرا بھلا کہا تھا۔ ممی بولی" اگر چچا ماموں کی اولادیں آپس میں شادی کرتی جائیں تو بھائی بہنوں کا رشتہ ہی کیا رہا۔ آدمی جانور تو نہیں"۔

" آدمی جانور ہی ہے چاچی"۔ نریندر اپنی بات پر ڈٹا رہا تھا۔

نریندر کی بات سن کر واسنتی کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ وہ وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔

" یہ جھوٹ ہے"۔ واسنتی کی ماں نے احتجاج کیا۔

" نہیں سچ ہے"۔ سکی انکل بولے۔

" ہاں جھوٹ ہے"۔ میرے ڈیڈی چیخے۔

ریل گاڑی

ریل ویران جنگل میں آکر کھڑی ہو گئی تھی۔ پوچھا گیا بات کیا ہے۔ جواب آیا کہ سگنل نہیں ہوا۔ " سگنل کیوں نہیں ہوا ؟"

" سگنل میں بزرگ آدمی شائد سو رہا ہے"۔ نوجوان نے کہا۔

وہ بزرگ مسافر بھی اونگھ رہا تھا۔ نوجوان کی بات سن کر ہڑبڑا کر جاگ گیا اور کہا" تم کافی منہ پھٹ ہو۔ طعنہ زنی تمہاری خصلت ہے"۔

" خصلت سبھی کی ہوتی ہے اور سبھی خصلتوں میں کوئی نہ کوئی عادت بھی۔ مثلاً آپ ہی کو لے لیا جائے"۔

" مجھے کیا ہے ؟" بزرگ مسافر اور نوجوان میں ٹھن چلی تھی۔

" یہی کہ گاڑی رکی ہوئی ہے اور آپ مطمئن ہیں"۔

" تم بہت بدتمیز ہو"۔ بزرگ مسافر نے براہ راست گالی دی۔

سماج

بدتمیز تو نریندر بدمعاش بھی تھا۔ اسی رات چارپائی پر آکر بیٹھ گیا تھا۔ فقط پاجامہ پہن رکھا تھا اس کے چوڑے چکلے سینے کے بال دیکھ کر مجھے چڑیا گھر کا بن مانس یاد آ گیا تھا مگر جالندھر والی بھابی کا کہنا ہے" نریندر کے بال بہت پیارے ہیں"۔

میں نے اس سے آنے کا مقصد بھی دریافت نہیں کیا تھا۔ دراصل لاشعوری طور پر میں نریندر سے حسد کرتا ہوں۔ وہ میرا ہم عمر ہے۔ اس کی تعلیم مجھ سے کم ہے لیکن وہ میری نسبت زیادہ مقبول تھا۔ بولا تھا" یہ چچا جان تو یوں ہی ناراض ہو گئے۔ نریش بھئی تم بتاؤ میں نے کچھ غلط کہا تھا؟"

مجھے نریندر کی بات سے اگر مکمل اختلاف نہیں تھا تو پھر میں اس سے اتفاق بھی نہیں رکھتا تھا اس لئے گول مول جواب دیا" بڑے لوگوں کی روایات ہیں۔ ان کے لئے وہ مناسب نہیں۔ تمہیں ان کا......"

" تم بڑے گھامڑ ہو"۔ نریندر بولا تھا" بھلا ایک آدمی اپنی

چچازاد بہن سے شادی کیسے تو کونسا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری تمہاری تو کیا دہلی والی پھوپی کو بھی سب مصیبتوں کا حل مل جائے اور وہ بھی یوں چٹکیوں میں"۔

اتنی بڑی بات اس نے چٹکی بجا کر کہہ دی تھی اور سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے بولا تھا "مغربی ممالک کے لوگ ایسا کرتے ہیں تو ہم کیوں نہیں کر سکتے؟ اگر وہ جنگلی نہیں تو ہم کیوں جانور کہلانے لگے؟"

"مگر ہمارا کلچر ان سے الگ ہے"۔ میں نے بمشکل بات کہی تھی مگر نریندر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ میری پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے بولا تھا "کلچر کی بات رہنے دو۔ یہ ہمارے تمہارے کہنے کرنے سے نہیں بگڑتا سنورتا۔ کلچر انسان کی مجبوری اور ضرورت کے سوا کچھ نہیں۔ اور انسان کی مجبوری و ضرورت خود بخود اسے توڑتا جوڑتا رہے گا اور سچ تو یہ ہے کہ جتنا تم کلچر کلچر کا نعرہ لگاؤ گے اتنی بغاوت ہوگی۔ اس سے پہلے کہ انقلاب آئے کیوں نہ ہم تم کوئی اصلاحی قدم اٹھا لیں"۔

مجھے نریندر جیسے بدمعاش آدمی سے اس قسم کی مدلل بحث کی قطعی امید نہ تھی۔ لیکن وہ از حد سنجیدہ تھا اور میں خود بخود ایک احساس کمتری میں مبتلا ہو گیا تھا۔ واسنتی ادھر سے گزر رہی تھی میں نے نریندر سے پیچھا چھڑانے کے لئے کہہ دیا "واسنتی کی رائے لے لو شاید یہ تم سے متفق ہو"۔

نریندر ایک تمسخر آمیز ہنسی ہنس دیا۔ اور نریندر کا ٹھکا سن کر واسنتی اس قدر خوف زدہ ہوئی کہ وہاں سے تیز تیز قدم اٹھاتی بھاگ گئی تھی۔

ریل گاڑی

گاڑی ابھی تک اسٹیشن سے دور جنگل میں کھڑی تھی گھٹن کے مارے جان لبوں پر آگئی تھی۔ نوجوان مسافر نے باپ کی گالی دی اور میں نے اپنے باپ کو۔ ایک مسافر ہلک بولا "یہ سور کی بچی اسٹیشن پر رکتی تو کم از کم آدمی اتر کر پانی تو پی سکتا تھا بیچ ویرانے میں۔۔۔۔۔"

"اسٹیشن اتنی آسانی سے نہیں ملا کرتے"۔ نوجوان بولا "سست رفتار گاڑیاں ہمیشہ جنگلوں میں کھڑی ملتی ہیں"۔

"یہ لڑکا بھی ایک معمہ ہے"۔

بزرگ نے تنگ آکر ترش کلامی کی بجائے طعنہ پر اکتفا کی۔

سماج

میرے ڈیڈی بھی ایک معمہ ہیں۔ ان کی باتیں میرے پلے نہیں پڑتیں۔ نریندر ان کا بھتیجا ہے۔ کوئی میرا تو نہیں۔ ان کے بھتیجے کی شادی تھی۔ کوئی میری تو نہیں۔ تو پھر ڈیڈی خود کیوں نہیں آئے۔ مجھے کیوں دھکیلا۔ اور بیسیوں بہانے بھی پیش کر دیئے۔ دفتر سے چھٹی نہیں ملتی۔ تمہاری ماں کی طبیعت خراب ہے۔ ساجو کی پڑھائی کا حرج ہوگا۔ سفر کافی تکلیف دہ چیز ہوتی ہے۔ کہیں بوڑھی ہڈیاں راستے میں چٹک گئیں تو تمہارا کیا جائے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔ اوپر سے بدرانہ حق بھی جتا دیا۔ مگر میں بھی اول درجے کا ضدی ہوں۔ اٹک گیا اسی گاڑی کی طرح ڈیڈی نریندر کی شادی پر چلنے کو انکار کر دیتے تھے تو میں کیوں جاؤں۔ مجھے کیا پڑی ہے جو دوسروں کی مصیبتیں اٹھاؤں۔ اپنی کیا کم ہیں گنوانے پر آؤں تو اکیسویں صدی شروع ہو جائے۔

ریل گاڑی

نہ معلوم یہ گاڑی کب تک رکی رہے گی۔ ڈبے میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ ننھے بچے گرمی کے مارے ہڑبڑانے لگے۔ وہ مارواڑن اپنے خاوند سے جھگڑا کرنے لگی۔ سارا راستہ اوپر کی سیٹ پر مزے سے سوتا رہا تھا اور بیوی بے چاری پرائے مردوں کے درمیان پاؤں سکیڑے جکڑ کر بیٹھی تھی، اور یہ لو گاڑی نہیں چلے گی' کوئی پکارا۔ گارڈ بابو لال جھنڈی اٹھائے بے مطلب اِدھر سے اُدھر چکر لگا رہا تھا۔ بزرگ مسافر بھی گرم کپڑوں میں اُبل گیا۔ اس کے گلے میں بلغم جمع ہو گئی تھی اس نے کھڑکی کی طرف نشانہ باندھا مگر نشانہ چوک گیا۔ نوجوان اس قدر اُتاولا ہو گیا کہ اس نے غصہ میں بند پنکھے کے تیلیوں والے پنجرے پر گھونسہ تان مارا۔ پنجرا جوں کا توں سلامت تھا۔ مگر ہاتھ زخمی ہو چکا تھا، خون بھی بہہ اٹھا۔ بزرگ مسافر نے کہا "یہ کیا کر رہے ہو؟"

"گھونسے چلانے کا وقت آگیا ہے"۔ نوجوان نے جواب دیا۔

اور میں سوچنے لگا کہ لوگ ٹھہری ہوئی چیزوں سے نفرت کیوں کرنے لگے ہیں۔ جب کبھی جمود کے آثار نمودار ہوتے ہیں لوگ واویلا مچانے ہیں۔ جوہڑ کا پانی کوئی نہیں پیتا۔ ہر ایک بہتی ندی کی طرف بھاگتا ہے۔ ڈیڈی نے چلنے سے انکار کیا تو میں سارا راستہ گالیاں نکالتا رہا ہوں۔ گاڑی نہیں چلی تو کس طرح بوڑھے

(باقی صــ پر)

بچے جوان سے اپنی نفرت کا اظہار کیا ہے اور جو یہ ہمیشہ کے لئے رکی رہی تو شاید لوگ پاگل ہو جائیں گے۔

سماج

مجھے سچ مچ غصہ آگیا تھا اپنی ممی پر اور ڈیڈی پر بھی۔ میں تو نریندر کی شادی پر جانے کو قطعی تیار نہیں تھا لیکن ممی مجبور کرنے لگیں بولیں "چلے جاؤ۔ کون پرائے گھر جانا ہے نریندر کی ہی تو شادی ہے"۔

"ڈیڈی کیوں نہیں جاتے؟" میں نے الٹا سوال کیا۔

"بزرگ ٹھہرے۔ انھیں ذرا شرم آرہی ہے۔"

"شرم کس بات کی؟" میں نے وجہ دریافت کی۔

"بیٹا۔ زبان کی بات ہوتی تو بھی کچھ تھا لیکن اب تو۔۔۔۔۔"

ممی نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"اب تو کیا؟"

"اب تو۔۔۔۔۔ پیٹ کی بات ہوگئی ہے۔ بھاگ کر کہاں جائیں۔ موا مانس کا لوتھڑا اٹک جو گیا"۔

میں کچھ نہ سمجھا۔ پوچھا "کیا اٹک گیا ہے؟"

ممی ہچکچا رہی تھی جیسے وہ لوتھڑا ان کے گلے میں اٹک گیا ہو بمشکل کہا "واسنتی کے ہوگیا ہے نا۔ تبھی نریندر سے رشتہ ٹھہرا ورنہ بہن بھائی کی۔۔۔۔۔۔"

ریل گاڑی

چیختی ہوئی سیٹی کی آواز سنائی دی اور انجن کے منہ سے دھوئیں کے کالے نکلنے لگے۔ گاڑی ایک دھچکے کے ساتھ حرکت میں آگئی۔ بزرگ مسافر شاید ٹیک لگائے سو رہا تھا۔ ایک اچانک حرکت پر چونک اٹھا۔ پوچھا "یہ کیا ہوا؟"

"سگنل ہوگیا ہے"۔

اور گاڑی سباٹے سے چل پڑی۔ بزرگ مسافر نے کھڑکی سے باہر سر نکال کر گاڑی کی رفتار کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

"بہت تیز چل رہی ہے۔ اُلٹ گئی تو"۔ بزرگ مسافر فکر مند تھا۔

"تو کیا ہوا۔ ہوا تو آرہی ہے"۔ نوجوان ٹھنڈی ہوا کے فرحت بخش جھونکوں سے لطف اندوز ہو کر مسکرا رہا تھا۔

•••

(سلام مچھلی شہری۔ بقیہ صفحہ ۱)

نہیں دیا۔ کچھ حاسدوں نے ان کی غلطیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا اور ان کو نقصان اٹھانا پڑا۔

سلام میں آخری وقت تک بچپن کا سا بھولا پن باقی رہا۔ وہ ذرا سی بات میں خوش اور ذرا سی بات میں رنجیدہ ہو جاتے تھے۔ لیکن بچوں کی طرح جلد ہی خوشی اور رنج کو بھول جاتے تھے۔ ان پر خوشی کا اثر زیادہ دیر رہتا تھا اور رنج کا۔ سلام نے مجھے ہمیشہ بڑا بھائی کہا اور سمجھا۔ اور چھوٹے بھائی کی طرح ملتے رہے۔ میں نے کبھی کوئی سخت بات کہہ دی (خاص کر ان کی شراب نوشی کے سلسلے میں) تو میرا بھی مان گئے لیکن جب دوبارہ ملاقات ہوئی تو وہ اس بات کو بھول چکے ہوتے تھے۔

سلام بڑے بے ریا انسان تھے اپنی کمزوریوں کو بھی نہیں چھپا سکتے تھے۔ ایسی غلطی وہ بار بار کرتے تھے اور ان کے مخالف لوگ ان کی اس کمزوری کا فائدہ اٹھاتے تھے۔ ان کو نقصان بھی اٹھانا پڑتا تھا مگر وہ اپنی طبیعت سے مجبور تھے۔

پچھلے سال سلام کو حکومت کی طرف سے پدم شری کا اعزاز دیا گیا۔ اتفاق کی بات کہ جب یہ اعزاز انھیں ملا تو دو تین دن کے بعد ہی میں دہلی پہنچا۔ میں نے انھیں مبارکباد نہیں دی۔ تو انھوں نے رنجیدہ ہو کر کہا "سہیل بھائی تم نے مجھے مبارکباد نہیں دی۔ حالانکہ میرے سارے دوستوں اور بزرگوں نے مبارکباد دی ہے"۔

میں نے جواب میں کہا "سلام تم کو اعزاز ملا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ سخن فہمی عالم بالا معلوم شد"۔

سلام میرا منہ تکنے لگے۔ میں نے اپنے جملے کی وضاحت کی کہ اس معاملے میں بھی تمہارے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔ تم سے کم تر درجہ کے شاعروں کو اس سے بڑا اعزاز مل چکا ہے۔ سلام ہنس پڑے۔ اور بولے اتنا تو اقرار کرنا ہوگا کہ کچھ تو سخن فہمی آگئی ہے۔ سلام پدم شری کا اعزاز ملنے سے خوش تھے۔ لیکن اگر یہ اعزاز سلام کو نہیں بھی ملتا تو ان کی شاعرانہ حیثیت میں کوئی کمی نہیں آتی۔

سلام کچھ لاابالی طبیعت کے آدمی تھے اور غیر سیاسی آدمی تھے۔ سیاست پر باتیں بھی نہیں کرتے تھے۔ لیکن سیاسی معاملات میں ان کا دماغ بہت صاف تھا۔ بڑی شدت کے ساتھ سیکولر کردار کے انسان تھے۔ اور انسان کی عظمت کے قائل تھے۔

۸ نومبر کو میں دہلی میں تھا معلوم ہوا کہ سلام بیمار ہیں اور آپریشن ہونے والا ہے تو میں ملنے گیا۔ مضمحل اور کمزور تھے۔ میں نے انھیں دلاسا دیا اور یقین دلایا کہ اچھے ہو جاؤ گے۔ وہ میری باتیں سنتے رہے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میری باتوں کا ان کو یقین نہیں آرہا تھا میں انھیں دلاسا دے رہا ہوں۔ آخر وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ ۱۹ نومبر کو وہ اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔

سلام کے ساتھ کسی سطح پر انصاف نہیں ہوا اب بھی ان کی تحریروں کا بڑا ذخیرہ آل انڈیا ریڈیو کی عالی شان عمارت کے کسی کونے میں پڑا ہوگا۔ اس کی کوئی امید نہیں کہ ان کو نکال کر ان کی چیزیں ایسے لوگوں کے حوالے کر دی جائیں گی جو ان پر کچھ کام کر سکیں۔

سلام نے اردو ادب کو بہت کچھ دیا ہے اب یہ کام دوسروں کا ہے کہ انھوں نے جو کچھ چھوڑا ہے اس کی چھان بین کریں اور اس کی قیمت کا تعین کریں۔

••

کون کہتا ہے، عبد الحق گیلانی سے
کہیں خاں کے سر پر بال آتا مگر نہیں

ظہیر ناصر

دوستی و دشمنی فلموں کے ذریعے

کشمیر کی برف پوش وادیاں ہوں یا راجستھان کا گرم موسمی ماحول۔

کیرالا کے ساحلی علاقے ہوں یا آسام کی بھیگی بھیگی فضا۔

تامل ناڈ میں ہندی مخالف جذبہ پایا جاتا ہو یا مہاراشٹر میں شیو سینا نعرہ لگاتے "مہاراشٹر مراٹھوں کے لئے"؛

غرض یہ کہ پورے ہندوستان میں جو کشمیر سے راس کماری تک پھیلا ہوا ہے۔ جس چیز نے اپنی اہمیت اور افادیت کا لوہا منوایا ہے وہ ہے اردو ہندوستانی زبان کی فلمیں۔

ہندوستان جیسے غریب اور ترقی پذیر ملک میں فلمیں ہی وہ واحد سستی، تفریح کا ذریعہ ہیں جو غریب ہندوستان کو تفریح کے چند "پرسکون لمحات" مہیا کرتی ہیں۔ ہندوستانی فلمیں آج ہر ہندوستانی کے لئے ایک اہم "ضرورت" بن چکی ہیں۔

ملک کی آزادی سے قبل ہر بات ہندو مسلم کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی مسلم لیگ کا پھیلایا ہوا دو قومی نظریہ زہر کی طرح پورے ملک میں پھیل چکا تھا، کچھ فلم ساز بھی اس لعنت کا شکار ہوئے۔ لیکن آفریں ہے اُن فلم سازوں پر جنھوں نے اس سیاسی بازیگری کے دوران بھی محبت، امن اور بھائی چارگی کی شمعیں روشن رکھیں۔

وی۔ شانتارام ہمارے ملک کے بزرگ فلم ساز اور ہدایت کار ہیں۔ موصوف نے ہمیشہ معیاری اور اچھوتی فلموں کی تخلیق کی۔ ان کی فلموں سے برہنگی اور عریانیت کی وبا اسی طرح دور رہی جس طرح دوسرے (تاجرانہ ذہن رکھنے والے) فلم سازوں کی فلموں سے اخلاقی قدریں دور رہی ہیں۔

وی۔ شانتارام نے آزادی سے قبل ایک فلم "پڑوسی" کے عنوان سے بنائی تھی۔ اس فلم میں ہندو مسلم اتحاد کو جس خوبصورتی سے انھوں نے پیش کیا تھا وہ تو اپنی جگہ بے مثال تھا، لیکن شانتارام نے دو پڑوسیوں منظر خاں اور جاگیردار کو فلم میں جس انداز میں پیش کیا وہ شانتارام کے انسان دوست ہونے کا سب سے بڑا عملی ثبوت تھا۔ وی شانتارام کی فلم پڑوسی میں منظر خاں جو پٹھان تھے ہندو بنے تھے اور جاگیردار نے جو مہاراشٹرین ہندو ہیں مسلمان کا رول ادا کیا تھا فلم میں ہندو مسلم اتحاد کے نعرے بلند نہیں کئے گئے تھے بلکہ وی۔ شانتارام نے اپنے باکمال فن سے یہ ثابت کر دیا تھا کہ ملک کی سلامتی اسی میں ہے کہ ہندو اور مسلمان ایک ہو کر رہیں، پڑوسیوں کی طرح رہیں۔ فلم پڑوسی کے منظر خاں اور جاگیردار کی طرح وی۔ شانتارام کے بعد محبوب خاں نے فلم سازی میں جو عزت و شہرت پائی وہ اپنی ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے محبوب خاں نے اپنے ابتدائی دور ہی سے خوبصورت اور معیاری فلموں کی تخلیق کی۔ لیکن یہاں جس فلم کا تذکرہ کرنا مقصود ہے وہ فلم بھی جنگ آزادی کی جدوجہد کے دوران بنائی گئی تھی۔ حالانکہ فلم کا موضوع تاریخی تھا ہندو مسلم اتحاد کا جذبہ محبوب صاحب میں کس قدر تھا اس کی واضح مثال فلم "ہمایوں" ہے۔ فلم حالانکہ بابر اور ہمایوں کی کہانی تھی لیکن فلم کا وہ حصہ جس میں بابر ایک ہندو راجہ چندر موہن کی بیوی کو بیٹی بناتا ہے اور جنگ جیت کر بھی منہ بولی بیٹی وینا کی ریاست کو بحال کر دیتا ہے ہندو مسلم اتحاد کی واضح تصویر کشی کرتی تھی۔ اسی فلم کے ایک حصہ میں بابر کے انتقال کے بعد جب دوسرے راجہ مہاراجہ اور نوابین ہمایوں کے خلاف متحدہ محاذ بنانے کی اور مغل شہنشاہیت کا تختہ پلٹنے کا منصوبہ بناتے ہیں تو وہی ہندو راجہ "چندر موہن" سب کی مخالفت کرتا نظر آتا ہے۔

اے۔ آر۔ کاردار کی فلم "شاہ جہاں" میں بھی ہندو مسلم دوستی کی خوب صورت عکاسی کی گئی تھی۔ فلم کی کہانی کے مطابق شاہ جہاں کے ایک درباری وزیر جیدے مرزا کے انتقال کے بعد اس کی بیٹی روبی کی پرورش ایک ہندو سردار جوالا سنگھ کرتا ہے۔ جب روبی کی خوب صورتی کے چرچے عام ہو جاتے ہیں تو شاہ جہاں

ارجوالاسنگھ سے کہتا ہے "جوالاسنگھ روحی اتنی حسین
خوب صورت ہوگئی کبھی تم نے اس کے بارے میں
چا"۔

جوالاسنگھ جواب دیتا ہے "عالم پناہ! جب
ے روحی جوان ہوئی ہے میں نے اس کے صرف پیر
یے ہیں چہرہ نہیں"۔ اس کے بعد شاہ جہاں نے جو
لمہ ادا کیا وہ غالباً ہندوستانی فلموں کی تاریخ میں
دو قوم کو سب سے بڑا نذرانۂ تحسین کہا جا سکتا ہے۔
اہ جہاں نے جوالاسنگھ کے سوال کے جواب میں کہتا
جوالاسنگھ سلام ہے اُس قوم پر جس میں تم نے جنم لیا"۔

کے آصف کی فلم "پھول" میں بھی ہندو مسلم
اد کی موثر ترجمانی کی گئی تھی۔ فلم میں پرتھوی راج مرحوم
ایک مسلمان نواب کا رول ادا کیا تھا جو ہندو عورت
یا کو منہ بولی بیٹی بنا لیتے ہیں۔ اس میں دعا کی شکل
ں ایک گیت پیش کیا گیا تھا جس نے ہندو مسلم اتحاد
ں خوب صورت عکاسی کی تھی۔

وہنا جو مسلمان ہے گیت کا ایک بول "اے رحمت
ری" اور ثریا جو ایک ہندو ہے "اے کرشن مُراری"
اتی ہیں اور اس طرح ایک ہی وقت میں دو مختلف
ہوں کی دو صورتیں ایک ہی گیت سے اپنے خدا اور
نے بھگوان کی رحمتوں کی طالب ہوتی ہیں۔

محبوب مرحوم نے اپنی اولین فلم "تقدیر" میں
سلمانوں کی غربت اور پست حالی کا ذمہ دار دو قومیت
سلم لیڈر شپ کو دیا تھا اور آج اس فلم کو بنے ہوئے
ریباً چوتھائی صدی ہو گئی لیکن تقدیر میں محبوب مرحوم
مسلمانوں کو جو ہدایات دی تھیں افسوس مسلمانوں نے
سے یکسر نظر انداز کر دیا۔

محبوب مرحوم کی "روٹی" اور "عورت" (جو بعد
ں مدر انڈیا کے ٹائٹل سے بنی) بھی مکمل ہندوستانی
یں تھیں۔ ان فلموں کا پیغام صرف ہندوستان کی
رحدوں تک محدود نہ رہا بلکہ ان کی بازگشت دنیا میں
نی گئی۔ محبوب مرحوم سچے اور محب وطن ہندوستانی تھے
کے آصف مرحوم کی "مغل اعظم" میں ارجن سنگھ

(اجیت) کے کردار کو کون بھلا سکتا ہے جو انار کلی کی
حفاظت کے لئے اپنی جان کی بازی لگا دیتا ہے۔

معیاری فلمیں بنانے والوں میں ایک بزرگ
فلم ساز اور ہدایت کار خواجہ احمد عباس ہیں جنہوں نے
اپنے ابتدائی دور ہی سے ہمیشہ صحت مند اور خوبصورت
فلموں کی تخلیق کی۔ خواجہ احمد عباس کی فلم "دھرتی کے
لال" انگریز حکمرانوں کے ہندوستان دشمن، نام نہاد
بنگال قحط سے متعلق تھی۔ یہ وہ دور تھا جب ہندوستانی
فلموں میں سطحی اور عامیانہ کہانیاں پیش کرنے کا رجحان
پایا جاتا تھا لیکن خواجہ احمد عباس کا قلم کبھی "فلمی چکا چوند"
سے متاثر نہیں ہوا۔ خواجہ احمد عباس کی لکھی ہوئی کہانی
"آوارہ" وہ پہلی فلم تھی جس نے ہندوستانی فلموں کے
لئے غیر ملکوں خصوصاً سوویت روس میں ہندوستانی
فلموں کے پرستار پیدا کئے۔

عباس کی فلم "پردیسی" وہ اولین فلم تھی جو
ہند اور روس کے اشتراک سے بنی اور جس میں نرگس
کے مقابل کے ایک روسی اداکار نے ہیرو کا رول ادا
کیا تھا۔ ہند اور روس کی دوستی کا یہ ایک عملی ثبوت تھا
عباس کی گولڈ میڈل یافتہ فلم "شہر اور سپنا" میں بڑے
شہروں میں رہائشی مکانوں کی قلت کی خوبصورت
عکاسی کی گئی تھی۔

سورگباش بمل رائے بھی اچھوتی اور معیاری
فلموں کے خالق مانے جاتے ہیں۔ "کابلی والا" بمل رائے
کی ایک خوب صورت فلم تھی جس میں سورگیہ بلراج ساہنی
نے ایک پٹھان کا ناقابل فراموش کردار ادا کیا تھا اگر
اس فلم کو ہند افغان دوستی کا پہلا موثر فلمی قدم کہا
جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ بمل رائے کی ایک اور فلم "پرکھ"
میں سماج میں پھیلی ہوئی گندگی کی خوب صورت عکاسی
کی گئی تھی لیکن اس فلم میں فلم ساز نے صرف گندگی پیش
نہیں کی تھی بلکہ اس کا خوب صورت حل بھی پیش کیا تھا
"سجاتا" میں بمل رائے نے چھوت چھات کے موضوع پر
ایک نہایت حسین فلم کی تخلیق کی تھی۔

راج کپور کی فلم "جاگتے رہو" ایک رات کی
کہانی تھی لیکن ایک ہی رات میں کیا کچھ ہو جاتا ہے یہ
سب وضاحت سے دکھایا گیا تھا۔

بی۔ آر۔ چوپڑہ کی فلم "دھرم پُتر" ہندو مسلم
ایکتا کی خوبصورت عکاسی کی گئی تھی۔

موہن کمار کی فلم "امن" میں ایٹمی جنگ کی
تباہ کاریوں کی عکاسی کی گئی تھی اور امن کے حصول کی
کوششوں پر زور دیا گیا تھا۔

"ایک کے بعد ایک" اور "پریوار" فیملی پلاننگ
پر خوب صورت فلمیں ثابت ہوئیں۔

سنیل دت کی "مجھے جینے دو" میں مسلمان
طوائف (وحیدہ رحمان) اور ڈاکو سنیل دت کی محبت
فلم بینوں کے لئے ایک پیغام کی حیثیت رکھتی تھی۔

جیمنی کی "پیغام" میں مالکان اور مزدوروں
کے درمیان کشمکش کی وضاحت کی گئی تھی۔

"جہاں پیار ملے" میں فرقہ وارانہ فسادات
کے محرکات کیا ہوتے ہیں اس کی خوبصورت عکاسی کی
گئی تھی۔ دیو آنند کی "ہرے راما ہرے کرشنا" میں
کے نقصانات اور نئی نسل کی گمراہی کو خوبصورت
انداز میں فلمایا گیا تھا۔

"پھول اور پتھر" اور "درپن" میں بالترتیب
مینا کماری اور وحیدہ رحمان کو مندر، مسجد، گرجا، اور
گورودوارے کے سامنے دعائیں کرتے ہوئے دکھایا
گیا تھا۔

"میرے محبوب" اور "میرے حضور" حالانکہ مسلم
سماجی فلمیں تھیں لیکن ان فلموں میں جس طرح ہندو
کیریکٹرز پیش کئے گئے اور دُکھ سُکھ کے ساجھی بنے وہ
فلم بین ایک مدت تک یاد رکھیں گے۔

اور اب چند اُن فلموں کا تذکرہ جنھوں نے
دشمنی، نفرت اور دلآزاری کی تدبیریں پیش کیں۔

دیو آنند کی بحیثیت ہدایت کار اولین فلم
"پریم پجاری" کی کہانی ہند پاک ۱۹۶۵ء کی جنگ سے
متعلق تھی۔

منوج کمار کی "اُپکار" سبز انقلاب پر ایک

خوب صورت فلم تھی لیکن فلم کے ایک گیت میں جس میں جنگ آزادی کے پروانوں کا تذکرہ کیا گیا تھا اس میں کسی بھی مسلمان کا نام شامل نہیں کیا گیا۔ اس کی شکایت فلمی پریس نے بھی کی اور ایمپک کے چیرمین اے۔ ایم طارق نے بھی اس کا شکوہ کیا۔

فلم "ایک نظر" میں طوائف نادرہ کا نام آمنہ رکھا گیا اور غیر فلمی پریس نے اس نام پر احتجاج کیا۔

"پربھات" میں طوائف کا نام سیتا اور دلال کا نام رام رکھا گیا۔ فلم کی نمائش کے بعد جب ملک بھر میں اس مذموم حرکت پر احتجاجات ہوئے تو فلم ساز نے نام تبدیل کئے۔

فلم "قیمت" ہند عرب دوستی کے لئے خطرہ بن سکتی ہے کیونکہ اس فلم میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح ہندوستانی فلمیں اسمگل کر کے عرب ریاستوں میں پہنچائی جاتی ہیں۔ کئی تاریخی فلمیں جن میں شیواجی اور مہارانا پرتاپ کی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے ان میں ایسے کریکٹرز پیش کئے گئے جو ہندو مسلم ایکتا کے لئے مُضر ثابت ہو سکتے ہیں۔

آئی۔ ایس۔ جوہر جو سستی شہرت حاصل کرنے کے لئے کچھ بھی کرنے کے لئے تیار رہتا ہے ان معاملات میں پیش پیش رہتا ہے۔ مثلاً "گوا کی جدوجہد آزادی" کے دوران اس نے ایک فلم "جوہر محمود ان گوا" بنائی جس میں دکھایا گیا کہ دو مسخروں نے ایک خوبصورت لڑکی کے سہارے گوا آزاد کرا لیا جب کہ تاریخ گواہ ہے کہ گوا کو غیر ملکی قبضے سے آزاد کرا لینے کے لئے ہزاروں انسانوں نے جانوں کی قربانیاں دیں۔ ۱۹۶۵ء کی ہند پاک جنگ کے بعد جوہر نے ایک اور کارنامہ کر دکھایا اس نے "جوہر ان کشمیر" بنا کر ہندوستان کی بہادر افواج کی توہین کی اور ایک دل آزار گیت گا کر مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو مجروح کیا۔ بنگلہ دیش کی جدوجہد آزادی پر بھی اس نے ایک بے ہودہ فلم "جے بنگلہ دیش" بنائی جس میں مکتی باہنی کے جوانوں کا مذاق اڑایا گیا۔ ایک ملک جو اپنی آزادی کی جنگ میں مصروف تھا "جے بنگلہ دیش" ان کی تحریک کے خلاف ایک گھناؤنی سازش کی حیثیت رکھتی تھی یہی وجہ ہے کہ جب اس فلم کی نمائش ہوئی اور حکومت کی توجہ اس فلم کے نقصان دہ اثرات کی طرف مرکوز ہوئی تو اس کی نمائش پر پابندی عائد کی گئی۔

فلموں کے ذریعہ محبت اور نفرت کی اس ملی جلی کیفیات کا مکمل اندازہ اس وقت تک نہیں لگایا جا سکتا جب تک ہم اپنی بیشتر فلموں کے ان چند کریکٹرز کا حال بیان نہیں کریں جو عموماً ہر ہندوستانی فلموں میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔

مثال کے طور پر عربی لباس پہنے ہوئے کرداروں کو اکثر اسمگلر دکھایا جاتا ہے۔

عیسائیوں کو غیر قانونی دھندوں میں اُلجھا ہوا دکھایا جاتا ہے۔

سکھوں کو دانستہ طور پر مزاحیہ انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔

مسلمانوں کو شیروانی پہنا کر عموماً طوائف کے کمروں میں بیٹھا دکھایا جاتا ہے۔

پہاڑی علاقوں کے باشندوں کو عموماً بیوقوف دکھایا جاتا ہے۔

کیا ان تمام شیریں و تلخ حقائق کے باوجود ہم فخر سے کہہ سکتے ہیں کہ ہماری فلمیں ملک میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور میل ملاپ میں کوئی اہم رول ادا کر سکتی ہیں۔ میرے خیال سے ایسا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اچھی چیز کا اثر اتنی جلدی مقبول نہیں ہوتا جتنا بری چیز کا۔ اگر ہمارے فلم ساز وی۔ شانتارام، محبوب، کے۔ آصف اے۔ آر۔ کاردار، سورگباشی بمل رائے اور خواجہ احمد عباس کے نقش قدم پر چل کر فلموں جیسے "عوامی ذریعہ اظہار" کو عوام کی بہبودی اور فرقہ وارانہ یکجہتی کا وسیلہ بنائیں تو یقیناً یہ خوشگوار تبدیلی عوام میں پیدا کریں گے کیونکہ موجودہ فلموں کی بے راہ روی، عریانیت اور برہنگی سے عام فلم بین اُکتا چکے ہیں۔

• • •

سیکولر ڈیموکریسی

ایک ماہنامہ جو کہ

ترقی پسند رجحانات کا آئینہ دار ہے

اور

فرقہ واریت کا دشمن ہے۔

باقاعدہ خریدار بن کر یک جہتی کو تقویت پہنچائیں۔ قیمت :- ایک روپیہ

پتہ :- منیجر سیکولر ڈیموکریسی"
A-19، تھیٹر کمیونی کیشن بلڈنگ
کناٹ سرکس۔ نئی دہلی

مضمون نگاروں سے

مضمون نگاروں سے درخواست ہے کہ وہ حاشیہ چھوڑ کر کاغذ کے ایک طرف لکھیں۔

غیر طلبیدہ مضامین کے ساتھ مناسب ڈاک ٹکٹ ہونا چاہیئے ورنہ مسودہ کی واپسی کا ذمہ دار ادارہ نہ ہوگا۔

"سیکولر ڈیموکریسی" میں شائع ہونے والی غیر مطبوعہ تخلیقات پر معاوضہ بھی دیا جاتا ہے۔

منیجر

سیکولرازم، سوسائٹی اینڈ لو اِن انڈیا

مصنّف
محمد غوث

ترجمہ و تلخیص
ب - ا

دوسری قسط

"ہمارا مقصد قارئین کو صحت مند خیالات سے روشناس کرانا ہے۔ اس لئے اچھی چیز جہاں بھی نظر آئے ہم اسے قارئین کی خدمت میں پیش کر دینا چاہتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر کے تحت گذشتہ شمارے سے ہم محمد غوث کی انگریزی کتاب " سیکولرازم۔ سوسائٹی اینڈ لو اِن انڈیا " کا ترجمہ اور تلخیص قسط وار پیش کر رہے ہیں۔

دوسری قسط کتاب کے دو ابواب کی تلخیص پر محیط ہے تیسری قسط جنوری کے شمارے میں شائع ہوگی۔ صفحات کی کمی کے باعث ہم پوری کتاب کی تلخیص ایک ساتھ شائع نہ کر سکے۔ قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔" ادارہ

آزادی کے بعد فرقہ واریت کی نشوونما

فرقوں کے تعلقات پر تقسیم ملک کا نہایت ہی ناشگوار اثر ہوا۔ جن مسلمانوں نے پاکستان کی حمایت کی تھی وہ تو بدحواس تھے جنھوں نے گاندھی اور نہرو کی حمایت کی تھی وہ بھی ہندوؤں کا رویہ دیکھ کر متوحش تھے شک اور بے اعتمادی کی فضا میں مسلمانوں کی تعلیمی اور اقتصادی پس ماندگی انھیں غیر محفوظ ہونے کا احساس دلا رہی تھی۔ عام مسلمانوں کو پاکستانی قرار دیا جا رہا تھا اور پاکستان کی تمام غلط کاریوں کا مسلمانوں کو جواب دہ سمجھا جاتا تھا۔ پاکستان کی حرکتوں خصوصاً کشمیر پر حملے نے ہندوؤں کے جذبات تلخ تر کر دیئے تھے۔ سیاسی جماعتیں مذہبی بنیادوں پر اپنے گروہ تیار کر رہی تھیں۔

سیاسی جماعتوں کی ہندوستان میں اسقدر کثرت تھی کہ وہ حکمراں جماعت پر اثر انداز ہو ہی سکتی تھیں اس لئے انھوں نے حکمراں جماعت پر دباؤ ڈالنے کے لئے عوام کو حربہ بنایا اور ایوانوں کے مسائل گلیوں میں حل کرنے کی کوشش کی حکومت بھی عوامی دباؤ کے سامنے جھکنے پر مجبور تھی۔ رفتہ رفتہ حکومت اس کی عادی ہو گئی اور زیادہ سے زیادہ پرامن عوامی مظاہروں کے مقابلے میں چھوٹا سا پر تشدد مظاہرہ حکومت کی نظر میں اہم بنتا چلا گیا۔

بہت ساری سیاسی جماعتوں نے اپنی سینائیں بنالیں اور ان سے دباؤ کا کام لینے لگیں حال ہی میں جب ایک مسلح مظاہرہ میں پولیس کی گولیوں سے ایک آدمی مر گیا تو پارلیمنٹ میں سوشیلا نائر رونے لگیں۔

دیگر ممبران نے سخت ملامت کی اور علالتی تحقیقات کا مطالبہ کیا۔ نہ تو کسی نے پولیس کی مدافعت کی اور نہ ہی ایس ایس۔ پی کے مسلح مظاہرے کی مذمت کی۔

آزادی کے بعد مذہبی احیا پسندی کا رجحان جنون کی حد تک پہنچ گیا۔ مذہبی معبدوں میں بھیڑ زیادہ ہونے لگی۔ ہندو تقریبات پر کئی کئی دنوں بلکہ بعض اوقات ہفتوں ہری کتھا کہی جانے لگی اور مندروں سے سڑک تک لوگوں کا ہجوم ہونے لگا۔ نصاب کی کتابوں میں ہندو مذہب کی کہانیاں بھری جانے لگیں۔ آل انڈیا ریڈیو ہر صبح مذہبی نغمے الاپنے لگا اور ہری کتھائیں بھی نشر کی جانے لگیں۔

آزادی کے بعد کا پہلا کمبھ میلا مذہبی احیا پسندی کا سب سے بڑا نشان تھا پچاس لاکھ سے زیادہ افراد نے گنگا میں اشنان کیا۔ سومنات کی مرمت کی گئی۔ جونا گڑھ کی ریاست سے اس مندر کو کافی زمین مل گئی۔ اس کی تعمیر میں وزراء نے سرگرم حصّہ لیا۔ سرکاری افسران اور سرکاری عملے اور سامانوں کا اس کی مرمت میں استعمال ہوا۔ صدر جمہوریہ نے بھی اس کے افتتاح کے موقع پر شرکت

کی۔ سرکاری دفتروں میں دیوی دیوتاؤں کی تصاویر لگائی گئیں۔ چند دفتروں میں مندر بھی بنائے گئے گاؤ کشی پر پابندی اور سنسکرت کی اسکولوں میں لازمی تعلیم کا مطالبہ زور و شور سے شروع ہوا۔

مسلمانوں میں بھی مذہبی احیاپسندی کا جوش پیدا ہوا۔ مگر ان کی احیاپسندی دفاعی اور فرار انگیز تھی۔ وہ یہ سمجھنے پر مجبور تھے کہ اب مذہب ہی ان کی نجات کا ذریعہ رہ گیا ہے۔

مذہبی احیاپسندی کے علاوہ ذات پرستی کی وبا بھی تیزی سے پھیلنے لگی۔ برسراقتدار ذات کے لوگوں نے اپنے ذات کو طرح طرح سے فائدہ پہنچانے کی کوشش کرنے لگے۔ مختلف ذاتوں کے درمیان تلخی، نفرت اور غصہ کی دیوار مضبوط ہوتی گئیں۔ ذات پرستی کی بنا پر لیڈرشپ کی دوکانیں چمکائی جانے لگیں۔ بہت سارے گاؤں کے مکھیا اپنے یہاں محض اس لئے اسکول کھولنے سے احتراز کرنے لگے کہ اس طرح ادنیٰ لوگ پڑھ لکھ کر ایک صاحب مرتبہ ہو جائیں گے۔ اچھوتوں کی حوصلہ افزائی کے پروگرام کو اونچی ذات والوں نے فسخ کرنے کی کوشش کی۔ سیاسی جماعتیں جن میں کانگریس سب سے آگے ہے۔ ذات اور فرقے کے تعصبات سے فائدہ اٹھانے کے لئے ان کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتی رہیں۔ نہرو نے اپنی سوانح میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کانگریس کے بہت سے رہنما فرقہ پرست تھے لیکن اپنے چہرے پر قوم پرستی کا نقاب چڑھا رکھا تھا۔ سوشلسٹ اور کمیونسٹ پارٹیوں نے بھی سیکولر اصولوں پر دل سے عمل نہیں کیا۔ ان کے علاوہ بہت ساری جماعتیں تو صرف مذہبی منافرت کی بنا پر زندہ تھیں اور وہ ان کی حوصلہ افزائی کرتی تھیں۔ ہندو مہاسبھا نے فرقہ واریت کو ایک نعمت قرار دیا۔ اب آر۔ ایس۔ ایس اور جن سنگھ ہندو فرقہ پرستی کا سرچشمہ بنی ہوئی ہیں۔ اسی طرح مسلم لیگ مجلس مشاورت، جماعت اسلامی اور اکالی دل مسلم اور سکھ فرقہ پرستی کی نقیب ہیں۔

گولوالکر نے قومیت کی تعریف کرتے ہوئے جرمنی نسلی افتخار کی توصیف کی اور جرمنوں کا یہودی نسل کے صفایا کو کارنامہ گردانتے ہوئے انھوں نے اس سے ہندوستانیوں کو سبق سیکھنے کا مشورہ دیا۔ انھوں نے جمہوریت کی تضحیک کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان ہندو ملک ہے اور اسے ہندو راشٹر کی خوبیاں اور عظمت کے حصول کی کوشش کرنی چاہیئے۔ گولوالکر کے خیال میں محب وطن وہی ہو سکتا ہے جو ہندو نسل اور ہندو قوم کی عظمت کا خواہاں ہے اور ان کا حصول اپنا مقصد حیات قرار دیتا ہے۔ ان کے علاوہ سب کے سب ملک کے دشمن اور لٹیرے ہیں۔ اس لئے تمام غیر ہندوؤں کو ہندو کلچر اور ہندی زبان اختیار کر لینا چاہیئے۔ ہندو مذہب اور اس کے کردار کا احترام کرنا چاہیئے۔

مسلمانوں اور عیسائیوں کے متعلق ان کا خیال ہے یہ کہ مذہب کی تبدیلی کے باعث قوم کی محبت اور پرستش بھول گئے ہیں۔

وہ ہندو مسلم اتحاد کے قائل نہیں۔

وہ مسلمانوں کو ہندوؤں میں ضم ہونے کا مشورہ افضل سمجھتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ تمام ہندوستان میں مسلمان اس طرح کی تیاریاں کر رہے ہیں کہ اگر ہندوستان اور پاکستان میں تصادم ہو تو پاکستان کی مدد کریں۔

وہ عیسائیوں کو سازشی قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عیسائی دیوی دیوتاؤں کو برا کہتے ہیں۔ تاکہ ہندو قومیت کا جذبہ برباد ہو جائے۔ اور یہ کہ انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ مل کر ہندوستان کے خلاف سازش کر رکھی ہے۔

آر۔ ایس۔ ایس ہندو، ہندی، ہندوستان کا نعرہ بلند کرتی ہے۔

اس نے مسلح غنڈوں کی جماعت تیار کر لی ہے۔ وہ اپنی سبھاؤں میں مسلمانوں کے خلاف ہر طرح کی نفرت پھیلاتے ہیں۔

وہ مسلمانوں کو مندر شکن اور بت شکن، ہندو حکومت کے خاتمے، ہندو کو تاراج کرنے، قومی تحریک کے ساتھ فریب کرنے، سامراجیوں کا ساتھ دینے اور تقسیم ملک کا مجرم قرار دیتے ہیں۔

وہ سیکولرازم کے سخت خلاف ہے پھر بھی کانگریس کے کتنے ہی رہنما اس کی سرپرستی کر رہے ہیں۔

نہرو کی موت کے بعد شاستری نے آر۔ ایس ایس اور جن سنگھ کو دہلی کا سول ڈیفنس سنبھالنے کا موقع دیا۔ حالانکہ اندرا گاندھی نے اس پر احتجاج کیا تھا۔ مگر ان کی کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ بہت سی پارٹیوں نے آر۔ ایس۔ ایس سے سازباز کی، اور جن سنگھ کے ساتھ متحدہ محاذ بنایا۔ حالانکہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ جن سنگھ آر۔ ایس۔ ایس کا سیاسی بازو ہے۔ مدھوک نے ہندوستانی قومیت میں لکھا ہے "سیکولرازم مسلمانوں اور نامکمل ہندوستانی عناصر کو چھپانے کے لئے ایک نقاب ہے۔ اس کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ قومی کلچر اور قومی معاشرے یعنی ہندو معاشرہ کا مفاد نظرانداز کیا جا رہا ہے اور خالص قدیم ہندوستانی قومیت کو کچلا جا رہا ہے۔"

آر۔ ایس۔ ایس اور جن سنگھ مسلمانوں کے ہندوستانی کرن کا مطالبہ کرتی ہیں۔ مدھوک کا کہنا ہے کہ فسادات کی اس وقت تک حکمرانی رہے گی جب تک کہ مسلمانوں کا ہندوستانی کرن نہیں ہو جاتا۔ صرف یہی نہیں وزیر داخلہ چوہان اور وزیر اعظم اندرا گاندھی کا بھی ہندوستانی کرن ہونا چاہیئے۔ اگر نہرو اور اشوک کا ہندوستانی کرن ہو گیا ہوتا تو ہمارے مصائب کا یہ عالم نہ ہوتا۔

ان کا خیال ہے کہ اسلام کی تشریحات کے مطابق ہندوستان دارالحرب ہے جسے دارالاسلام میں بدلنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اس لئے اسلام کا ہندوستانی کرن ہونا چاہیئے اور اسے جدید شکل دینی چاہیئے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مسلمانیت ختم ہونی چاہیئے اور مسلمانوں کا ہندوستانی کرن ہونا چاہیئے۔

آر۔ایس۔ایس اور جن سنگھ کے نزدیک ہندوستانی کرن کا مطلب ہندو کرن ہے اور مسلمانوں کے مسئلہ کا حل یہودی کے مسئلہ کی طرح ہی وہ حل کرنا چاہتے ہیں۔

مسلمانوں کی اکثریت نے آزادی کے بعد سے کانگریس کی ہی حمایت کی لیکن مسلمانوں میں بہت سی فرقہ وارانہ تنظیمیں موجود ہیں۔ کیرالا میں کانگریس اور کیمونسٹ نے مسلم لیگ کے ساتھ متحدہ وزارت بنائی اور اس میں بھی اسے ڈی۔ایم۔کے کی سرپرستی حاصل رہی۔ اب لیگ آہستہ آہستہ اپنے ہاتھ پیر پھیلا رہی ہے۔

تیسرے عام انتخاب کے دوران اُتر پردیش میں مسلمانوں نے پس ماندہ طبقات کی جماعت ری پبلکن سے تعلق استوار کیا پھر تمام مسلم جماعتوں پر مشتمل ایک مسلم مجلس مشاورت بنائی جس کا مقصد فرقہ واریت، فرقہ وارانہ فسادات کا سدباب اور مسلمانوں کے سماجی اور ثقافتی مفاد کی حفاظت تھا۔ اس نے کانگریس کی مخالفت کسی بھی غیر کانگریسی جماعت کی حمایت کی۔ بشرطیکہ وہ اس کے منشور کی حمایت کریں۔ اس انتخاب میں اتر پردیش میں کانگریس اکثریت نہ لا سکی۔ لیکن کانگریس مخالفت کا سب سے زیادہ فائدہ جن سنگھ نے اٹھایا اور جن سنگھ ایک خاصی بڑی تعداد کے ساتھ متحدہ وزارت میں شریک ہوئی جن جماعتوں نے مجلس کے منشور کی حمایت کی تھی وہ اپنے وعدے ایفا نہ کر سکیں۔ اس کے بعد جو وزارت ختم ہوئی اور وسط مدتی چناؤ ہوا تو مجلس نے جن سنگھ کے مقابلے میں کانگریس کی حمایت کی۔

پارلیامانی انتخاب میں کانگریس نے مسلم لیگ اور مشاورت سے معاہدہ کیا اور ان کے لئے چند سیٹیں چھوڑ دیں۔ فی الحال مسلم لیگ کیرالا کی کانگریس کمیونسٹ متحدہ محاذ میں شریک ہے اور اندرا گاندھی فرماتی ہیں کہ کیرل کی لیگ سیکولر ہے اور دوسری جگہ کی فرقہ پرست۔

جماعت اسلامی نیم سیاسی اور نیم مذہبی جماعت ہے۔ یہ ۱۹۴۱ء میں وجود میں آئی۔ اس کے بانی ابوالاعلیٰ مودودی ہیں۔ اس جماعت کا مقصد ہندوستان میں اسلامی نظام حیات کا قیام ہے۔ چونکہ اسلام میں دین و سیاست جدا نہیں ہیں اس لئے جماعت بھی سیاست میں حصہ لینے پر مجبور ہے۔ لیکن وہ موجودہ غیر اسلامی طرز سیاست میں شامل نہیں ہو سکتی۔ وہ غیر مسلموں کو مسلم طرز حیات اختیار کرنے کی دعوت دیتی ہے تاکہ ہندوستان میں مسلم نظام سیاست قائم ہو سکے۔ اس کے بعد ہی وہ ہندوستان کی سیاسی زندگی میں حصہ لے سکتی ہے اور اس کے تمام ترقیاتی پروگرام میں حصہ لے سکتی ہے۔

جماعت سیکولرازم کو ریاست کی پالیسی کی حیثیت سے تسلیم کرتی ہے اس لئے کہ یہ مذہبی بنیاد پر امتیاز کی اجازت نہیں دیتی لیکن یہ سیکولرازم کے گہرے فلسفیانہ نظریات کو تسلیم نہیں کرتی ـ اسے یہ بنیادی طور پر مغربی اور غیر مذہبی نقطۂ نظر کی حامل قرار دیتی ہے۔ اس لئے کہ سیکولرازم خدا اور اس کے احکام کو زندگی کا ذاتی معاملہ قرار دیتی ہے جو جماعت کے نزدیک غیر اسلامی ہے۔ جماعت کے ممبر انتخاب میں حصہ نہیں لے سکتے۔ وہ آئین کی حمایت کرنے کو بھی تیار نہیں ہے۔ اس لئے کہ آئین عوام کی حکومت کی داعی ہے جب کہ جماعت کے نزدیک حکومت صرف خدا کی ہو سکتی ہے۔ جماعت کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اگر ہر شخص یہ کہنے لگے کہ وہ اسی وقت سیاست میں حصہ لیں گے جب یہاں مذہبی طرز عمل اختیار کیا جائے اور صرف اسی قومی پروگرام کی حمایت کریں گے جسے مذہب کی حمایت حاصل ہو تو اس وقت اقلیت کا کیا حال ہوگا۔ گولوالکر ایسی پالیسی کی وکالت کرتے ہیں۔

جماعت کے بانی مولانا مودودی مسلم سیکولرازم کے منکر ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ صرف اسلامی ریاستوں میں ہی مسلمان بستے ہیں۔ جو ظاہر ہے صحیح نہیں ہے۔ یہ تو درست ہے کہ بہت سے ممالک میں مسلمان ہیں لیکن اسلامی ریاست کہاں ہے؟

مولانا مودودی کہتے ہیں کہ اگر کسی سیکولر حکومت کی ریاستی پالیسی کو مسلمان عوامی پالیسی اور طرز حیات قرار دیتے ہیں تو وہ مسلمان باقی نہیں رہ سکتے۔ جماعت کے نزدیک صرف مذہبی نظام حکومت وہ خواہ ہندو ہو، عیسائی ہو یا بدھ، قابل قبول ہے۔ یہ نہایت عجیب و غریب نظریہ ہے۔ اس لئے کہ سیکولر حکومتوں میں مسلمان برابر درجے کے شہری حقوق اور مراعات کے حقدار ہوتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ مذہبی حکومتوں میں ان کا درجہ وہ نہیں ہو سکتا۔ دراصل مولانا مودودی اور گولوالکر دونوں اقلیتوں کو مساوی درجہ دینے پر تیار نہیں ۔ گولوالکر شہریت کو صرف ہندوؤں تک محدود رکھنے کے قائل ہیں۔ مودودی غیر مسلموں سے جزیہ لینے پر مُصر ہیں۔ اس کے باوجود مودودی مسلمانوں کو سیکولر ڈیموکریسی کی بہ نسبت مذہبی حکومت کے لئے جدوجہد کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ ہندوستانی سیکولرازم مذہب کا مخالف نہیں ہے۔ مسلم فرقہ وارانہ تنظیمیں علیحدگی پسندی کو بڑھاوا دے کر اپنا اُلّو سیدھا کرنا چاہتی ہیں۔ ان کا خیال خام ہے کہ اکثریتی فرقہ واریت کا اقلیتی فرقہ واریت سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔

دونوں فرقوں کی فرقہ وارانہ جماعتیں فرقہ واریت کی ترقی اور سیکولرازم کے خاتمہ کے معاملہ میں اتفاق کرتی ہیں۔ حالات کا طنزیہ پہلو یہ ہے کہ اگر سیکولرازم ختم ہوا تو اقلیتوں کو ہی خسارہ ہوگا۔ ان کے لئے سیکولرازم کا کوئی بدل نہیں ہے اور فرقہ واریت کا مقابلہ سیکولرازم کی تلوار سے ہی کر سکتے ہیں انھیں ہندوستانی سیکولرازم کی بنیاد مضبوط کرنی چاہیئے اور اس ضمن میں سیکولر ہندو ہی ان کے معاد

کی حفاظت کر سکتے ہیں فرقہ پرست مسلمان، عیسائی، سکھ پارسی اور ہندو نہیں۔

فرقہ وارانہ فساد کی سماجیات

مذہبی احیا پسندی، شک و شبہات، نفرت اور بے اعتمادی کی وجہ سے دونوں فرقوں کے درمیان خلیج وسیع تر ہو گئی ہے۔ سیاسی جماعتیں ووٹروں کی وفاداری، مذہب اور ذات پات کی طرف موڑ کر ملک میں تناؤ اور کشمکش کی فضا میں اضافہ کر رہی ہیں۔ آئین سازوں کا یہ خیال کہ مشترکہ انتخاب کو مروج کر کے وہ فرقہ واریت پر ضرب لگائیں گے سیکولر مقاصد کو تقویت پہنچائیں گے اور معاشرے کو سیکولر بنا سکیں گے شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ آئین کی دفعہ ۱۹ (۱) (سی) جس کے تحت تعلقات کی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے۔ اس کا برعکس نتیجہ نکلا ہے یعنی اس کی وجہ سے فرقہ واریت میں اضافہ ہو رہا ہے اس لئے کہ اس نے فرقہ وارانہ جماعتوں اور تنظیموں پر ریاست کو پابندی لگانے سے روک دیا ہے۔

آئین کی تشکیل سے پہلے رائے دہندگان بتدریج علیحدہ حلقوں میں تقسیم ہو گئے تھے تاکہ وہ فرقہ وارانہ بنیاد پر رائے دے سکیں، فرقہ وارانہ انداز میں سوچ سکیں۔ فرقہ وارانہ انتخابی تقریریں سن سکیں نمائندوں کو فرقہ وارانہ بنیاد پر منتخب کر سکیں اور اپنے مطالبات فرقہ وارانہ انداز میں پیش کر سکیں۔

مرکزی وزارت داخلہ کی ایک رپورٹ کے مطابق ۱۹۶۰ء سے فرقہ واریت کی صورت اور بد تر ہو گئی اور ۱۹۶۴ء میں اس نے بد ترین صورت اختیار کر لی۔ ۱۹۵۴ء سے ۱۹۶۰ء تک فرقہ وارانہ فساد رو بہ زوال تھے۔ سب سے کم فسادات پچاس سے بھی کم ۱۹۵۸ء، ۱۹۵۹ء اور ۱۹۶۰ء میں ہوئے۔ ۱۹۶۱ء میں حالات بالکل ہی برعکس ہو گئے۔ ۱۹۶۴ء میں مغربی بنگال، بہار اور اڑیسہ میں بے طرح فسادات ہوئے اور اس کا سبب مشرقی پاکستان میں فرقہ وارانہ فساد کو قرار دیا گیا۔ ۱۹۶۵ء کے ہندو پاک تصادم کے دوران صرف چند ہی علاقوں میں فساد ہوئے۔ ۱۹۶۶ء واقعات میں کچھ بہتری نظر آئی لیکن اس کے باوجود تعداد کے اعتبار سے یہ زیادہ اور بہت بڑے حلقے پر محیط تھے۔ ۱۹۶۸ء میں ۳۴۶ فسادات ہوئے۔ ۱۹۶۹ء اور ۱۹۷۰ء میں بھی کچھ ایسے ہی حالات رہے۔ ۱۹۷۱ء میں علیگڑھ میں زبردست فسادات ہوئے۔ تلی چری اور گلبرگ میں جنوری اور مارچ ۱۹۷۲ء میں فسادات ہوئے۔

۱۹۴۷ء میں فسادات کی شدت کے کئی اسباب تھے جن میں سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ ۱۹۶۰ء سے نہرو کی قوت میں کمی آتی گئی اور ۱۹۶۲ء میں بہت زیادہ کمی آ گئی۔ نہرو کے بعد فرقہ واریت کے لئے دیوار بننے والا کوئی مقتدر رہ نما نہ تھا۔

۱۹۶۴ء میں مشرقی پاکستان میں فسادات ہوئے جس کے باعث بہت سے پاکستانی ہندو ہندوستان بھاگ آئے۔ جن سنگھ اور آر۔ ایس۔ ایس نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ نہرو کے جانشین شاستری نے آر۔ ایس۔ ایس اور جن سنگھ کو سر پر چڑھا رکھا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں اپنی کی تکمیل میں پوری آزادی حاصل ہو گئی۔

۱۹۶۵ء میں پاکستان کے دونوں تصادموں کے دوران ہندوستانی عوام بیدار ہوئے لیکن ہندوؤں کی جنگ جوئی میں بھی توانائی آئی۔ چوتھے عام انتخاب میں کانگریس کو ان علاقوں میں شکست ہوئی جہاں جن سنگھ با اثر تھی اور اس شکست کے لئے جزوی طور پر مسلمان ذمہ دار تھے۔ اس نے اتر پردیش، بہار اور مدھیہ پردیش میں متحدہ وزارت بنائی اور آر۔ ایس۔ ایس کو قوت اور اثر بڑھانے کا موقع ملا۔ مجلس مشاورت کے اثر و نفوذ نے بھی انھیں فائدہ پہنچایا۔

عجیب اتفاق ہے کہ جہاں جہاں جن سنگھ اور آر۔ ایس۔ ایس کا داخلہ ہوا وہاں وہاں فرقہ وارانہ تشدد پیدا ہوا۔ فسادات میں جو کچھ ہوتا ہے وزیر اعظم اس سے بخوبی واقف ہیں۔ جبلپور میں ایک مسلم نے ایک ہندو لڑکی کے ساتھ زنا بالجبر کیا، رُڑکیلا میں افواہ اڑی کہ ایک مسلمان نے پاکستانی پناہ گزیں کو زہر دے دیا۔ آگمرے میں دو کانداروں کے درمیان تصادم ہوا۔ کریم گنج اور میو میں ایک مسلمان لڑکے نے ایک ہندو لڑکے کو پیٹا۔ اندور اور احمد آباد میں ایک مسلمان غنڈے کا ایک ہندو غنڈے کو قتل، جائی باسا، کٹک رانچی، بھونڈی، ناندیڑ، جگدل اور پوری میں مذہبی جلوس پر خشت باری، ناگپور میں ایک بدمست اور ایک مسلمان حجام میں ۵ پیسوں کا تنازعہ اورنگ آباد میں مسلمان لڑکے سے ایک گائے کا معمولی طور پر زخمی ہو جانا، کماری پت میں ہولی میں رنگ پھینکنے پر اعتراض اور باجا بجانے والے جلوس پر حملہ، احمد آباد میں ایک مسلمان گروپ اور سادھوؤں میں جھگڑا جس سے ایک مندر کے بیرونی دروازے کے شیشے کو معمولی سا نقصان ہوا یہ سب واقعات محض معمولی اور ناقابل اعتنا ہیں لیکن یہ سب بھیانک فسادات کا سبب بنے ہیں اس سے انکار نہیں کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان خلیج ہے لیکن ان فسادات کا سبب محض یہ خلیج نہیں ہو سکتے۔ کوئی بھی شخص ان جماعتوں اور تنظیموں کو نظر انداز نہیں کر سکتا جن کا مفاد فساد میں پوشیدہ ہے۔ یہ زہریلی افواہیں اڑاتے ہیں، فضا خراب کرتے ہیں، تصادم بڑھاتے ہیں غلط فہمی پیدا کرتے ہیں اور لوگوں کو انتقام پر آمادہ کرتے ہیں۔ روڑکیلا میں فسادات سے پہلے ہی آر ایس ایس تیار تھی جن سنگھ اسٹیشن پر لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ اشتعال پیدا کر رہا تھا، غلط کہانیاں سنا رہا تھا۔ جب کسی انسان دوست مسلمان نے پناہ گزینوں کو کچھ کھانے کی چیزیں دیں تو افواہ اڑائی گئی کہ اس نے ان میں زہر ملا دیا ہے۔ بس فساد شروع ہو گیا۔ میرٹھ میں آر۔ ایس۔ ایس نے ایک ہفتہ تک اپنا کیمپ لگایا۔ فساد سے کچھ دنوں پہلے گولوالکر نے میرٹھ کا دورہ کیا۔ بھاؤ صاحب دیوراس مشرقی ہندوستان کے آر۔ ایس۔ ایس کے مبلغ نے دو مہینوں کے لئے میرٹھ میں اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا۔ گولوالکر نے آتشیں تقریریں کیں۔

(باقی آئندہ)

عرب حمایت کنونشن کی تجاویز

نئی دہلی۔ ۲۵ نومبر۔ عرب حمایت کنونشن نے آج "عرب اسرائیلی تنازعہ کا صحیح صورت حال بتلانے اور عرب موقف کی حمایت میں تندہی کے ساتھ رائے عامہ تیار کرنے کے لئے ایک مستقل تنظیم قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ قرارداد مسٹر ڈی۔ آر۔ گوئل' ایڈیٹر سیکولر ڈیموکریسی نے پیش کی۔ اور اس کی حمایت مولانا سید اسعد مدنی صدر جمعیۃ علماء ہند نے فرمائی۔ وزیر خارجہ مسٹر سورن سنگھ نے کنونشن کا افتتاح کیا۔ انھوں نے حکومت ہند کے موقف کی وضاحت کی اور کہا کہ ہم عربوں کی اس لئے حمایت کر رہے ہیں کہ ان کے ساتھ بے انصافی ہوئی ہے خطبۂ استقبالیہ ایم۔ آر۔ شروانی نے پڑھا جس میں انھوں نے عربوں کی جرأت مندی کو خراج تحسین ادا کیا۔

کنونشن ایوان غالب میں منعقد ہوا جس میں ہندوستان کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے تقریباً ایک ہزار نمائندوں اور دیگر سرکردہ حضرات نے شرکت فرمائی۔

صدارت کے فرائض ابتدا میں مسٹر کے۔ ڈی مالویہ اور بعدازاں مسز سبھدرا جوشی نے انجام دیئے۔

تجاویز کا متن

تجویز نمبر ۱

۱۔ عرب کاز کی حمایت میں یہ ہندوستانی کنونشن مغربی ایشیا کی صورت حال پر گہری تشویش کا اظہار کرتا ہے صیہونی اسرائیل آج بھی اپنی ضد پر قائم ہے اور اس خطے میں امن خطرہ سے باہر نہیں۔

۲۔ اس صورت حال کو پیدا کرنے کی تمام تر ذمہ داری صیہونی ذمہ داروں پر ہے جنھوں نے مغربی سامراج واد کی مدد سے اول فلسطین کے باشندوں کو ملک بدر کیا اور اب اس خطے کے عرب ممالک کے امن اور دفاع کے لئے خطرہ بنے ہوئے ہیں۔ مغربی ایشیا میں آج جو صورت حال ہے وہ صیہونی جارحیت کا نتیجہ ہے جو کہ اب بھی جاری ہے۔ حالانکہ سیکورٹی کونسل بار بار ریزولیوشن پاس کر چکی ہے کہ اسرائیل عرب علاقوں کو خالی کر دے۔ دنیا بھر کے حریت پسند عوام نے مناسب طور پر اسرائیل کے اس رویئے کو فسطائی رو یہ قرار دیا ہے اور اس کی مذمت کی ہے۔

۳۔ حکومت ہند نے عرب کی حمایت کی جو پالیسی اختیار کی ہے یہ کنونشن اس کی پرزور حمایت کرتا ہے اور امید کرتا ہے کہ ہند عرب تعاون مزید بڑھے گا اور گہرا ہوگا۔

۴۔ سوویت روس اور دیگر سوشلسٹ ممالک نے عربوں کی جو ٹھوس امداد اور حمایت کی ہے اس کی بھی یہ کنونشن تعریف کرتا ہے۔ اس امداد اور عرب یک جہتی کا ہی نتیجہ ہے کہ یورپ کے بہت سے ممالک کو بھی عرب کاز کی حقیقت سمجھ میں آئی ہے۔ ایشیا اور افریقہ کے بھی بہت سے ممالک عربوں کی حمایت پر کمربستہ ہوگئے ہیں۔ اس طرح اسرائیل اور ان کی پشت پناہ امریکی سامراج دنیا میں سب سے الگ تھلگ ہوگئے ہیں۔

۵۔ یہ کانفرنس ساری دنیا کے آزادی پسند عوام اور بالخصوص ہندوستانی عوام سے اپیل کرتی ہے کہ وہ صیہونی فسطائیت اور امریکی سامراج کو شکست دینے کے لئے اپنی جدوجہد تیز تر کر دی ہے۔ ساری دنیا کی رائے عامہ اپنا پورا زور کے لئے صرف کرے کہ نہ صرف اسرائیلی جارحیت کا خاتمہ ہی ہو بلکہ فلسطینی عربوں کے ساتھ انصاف ہو۔ صرف یہی شکل ہے جس کے ذریعے مغربی ایشیا میں امن قائم ہو سکتا ہے۔

۶۔ یہ کنونشن حکومت ہند سے یہ پرزور مطالبہ کرتی ہے کہ تنظیم برائے آزادیٔ فلسطین کو فلسطینی عوام کا جائز نمائندہ تسلیم کرے اور اس کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں اسرائیلی قونصل خانے کو بند کیا جائے۔

تجویز نمبر ۲

۱۔ عرب موقف کی حمایت میں ہندوستانی عوام کی یہ کانفرنس ملک کے بعض فرقہ پرست عناصر کی ان کوششوں پر اظہار تشویش کرتی ہے جو عرب اسرائیلی مسئلہ کو مذہبی رنگ دینے کے لئے کی جا رہی ہیں۔

۲۔ عرب اسرائیلی تنازعہ بنیادی طور پر ایک سیاسی مسئلہ ہے اور یہ ایشیائی عوام کی یک جہتی کو کمزور کرنے کے لئے سامراجی سازش کا نتیجہ ہے۔ موجودہ دور میں جب کہ براعظم ایشیا میں آزادی اور جمہوریت کا شعور بیدار ہو رہا ہے اس وقت وہ اپنا قدم جمانے کے لئے یہ سازشیں کر رہے ہیں۔

۳۔ جو لوگ فرقہ وارانہ رنگ دے کر اس تنازعہ کی نوعیت کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلا رہے ہیں وہ دانستہ یا نادانستہ طور پر سامراجیوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔

۴۔ یہ کانفرنس ایسے عناصر سے اپیل کرتی ہے کہ وہ اس شر پسندی سے باز رہیں ساتھ ہی ہندوستان کے عوام سے اپیل کرتی ہے کہ وہ اس پروپیگنڈہ سے گمراہ نہ ہوں اور عرب موقف کو جو آزادی، جمہوریت اور امن موقف ہے یعنی جن آدرشوں کو ہم عزیز رکھتے ہیں ان کی حمایت اور تائید جاری رکھیں۔

۵۔ یہ کانفرنس عرب اسرائیل تنازعہ کی صحیح صورت حال بتلانے اور عرب موقف کی حمایت میں تندہی کے ساتھ رائے عامہ تیار کرنے کے لئے ایک مستقل تنظیم قائم کرنے کا فیصلہ کرتی ہے اور صدر محترم اور تیاری کمیٹی کو اس تنظیم کی تشکیل کا اختیار دیتی ہے۔

• • •

عرب حمایت کنونشن کی تقریریں

وزیر خارجہ مسٹر سورن سنگھ نے کہا کہ "ہم اگر عربوں کی حمایت کرتے ہیں تو اس لئے کہ ان کے ساتھ بے انصافی ہوئی۔ آزادی سے قبل بھی ہمارے رہنما مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو اور مولانا آزاد وغیرہ عربوں پر کئے گئے ظلم و زیادتی کے خلاف آواز اٹھاتے رہے ہیں۔ ہندوستان نے ہمیشہ مظلوموں کے حق میں آواز اٹھائی ہے"

مسٹر فخرالدین علی احمد (وزیر خوراک) نے کہا کہ حکومت ہند نے مشرق وسطیٰ کے بارے میں جو پالیسی اختیار کی ہے اس کی پورے ملک کی طرف سے حمایت کی جارہی ہے۔ اس کنونشن سے حکومت کے ہاتھ مضبوط ہوں گے۔

مسٹر شنکر دیال شرما (صدر کانگریس) نے ایک پرزور اور مؤثر تقریر فرمائی اور یہ بتاتے ہوئے کہ کانگریس ۱۹۳۷ء سے عربوں کی حمایت کرتی رہی ہے کہا کہ جبر کے ساتھ قبضہ کئے جانے والے علاقوں کو واپس کرنے کے بعد ہی امن قائم ہو سکتا ہے۔ آپ نے عربوں کی حمایت کو انسانیت کی حمایت بتایا اور کہا کہ ہم اصول کی حمایت کر رہے ہیں اس لئے یہ عربوں پر کوئی احسان نہیں ہے۔

مسٹر دیوکانت بروا نے کہا کہ یہ مسلمان اور یہودی کی جنگ نہیں ہے جیسا کہ ہندوستان میں بعض فرقہ پرست جماعتیں پروپیگنڈہ کر رہی ہیں۔ یہ لڑائی امن عالم خصوصاً ایشیا کے امن کی جنگ ہے حق و انصاف کے لئے جنگ ہے۔ ہم اصول پسند ہیں اور عربوں کے ساتھ ہیں ہم اگرچہ امن چاہتے ہیں لیکن اگر اسرائیل عربوں کے خلاف پھر جارحیت کا مرتکب ہوا تو اس کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔

شیخ عبداللہ کی تقریر

آخر میں شیخ عبداللہ نے اپنی تقریر میں کہا کہ اگر آج امریکہ اسرائیل کی مدد کر رہا ہے تو اس کی بہت سی وجوہ موجود رہیں گی وہ اس کی مدد کرتا رہے گا آپ نے بتایا کہ امریکی اقتصادیات اور پریس پر یہودیوں کا غلبہ ہے۔ جب تک یہ غلبہ رہے گا امریکی اسرائیل کی حمایت کرنے کے لئے مجبور ہیں۔

مسٹر مقیم الدین فاروقی نے کہا کہ "وہ فرقہ پرست اور رجعت پسند طاقتیں قابل مذمت ہیں جو عربوں کے معاملہ میں گمراہ کن پروپیگنڈہ کر رہی ہیں اور یہ کہہ رہی ہیں کہ عربوں پر دباؤ ڈال کر ان سے جنگ بند کرائی گئی۔

مسٹر ڈی۔ آر گوئل (ایڈیٹر سیکولر ڈیموکریسی) نے پیش کی۔ انھوں نے قرارداد کی وضاحت کرتے ان فرقہ پرستوں کی سخت الفاظ میں مذمت کی جو مشرق وسطیٰ کے معاملہ کو ایک غلط رنگ میں پیش کرتے ہیں اور کہا کہ یہ ایک سیاسی معاملہ ہے۔

حضرت مولانا اسعد مدنی (صدر جمعیۃ علماء ہند) نے اس قرارداد کی حمایت کرتے ہوئے کہا کہ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم عربوں کی امداد کے سلسلے میں عملی قدم اٹھائیں اور ایک عملی قدم یہ ہے کہ عرب موقف کی حمایت میں تندہی کے ساتھ کام کرنے کے لئے ایک مستقل تنظیم قائم کی جائے۔

•••

کتابوں کی باتیں

نام کتاب :- نجات کے بعد
نوعیت :- قومی اور مسائلی نظمیں
صفحات :- ۱۰۸
قیمت :- ۳ روپے
مصنف :- یوسف ندیم
ناشر :- سروج پبلشرز، ۵۳ سروج نگر، یوسف گوڑہ
حیدرآباد — ۵۰۰۰۴۵

اوج یعقوبی، انور رشید، حسن فرخ، شمس کنول احسن علی مرزا، خلیق انجم، پنڈیا وامن راؤ، احمد باقی، مسز مایا کھنہ، راجے بریلوی، رحمت علی، عثمان شیدا، شفیع اقبال، اور ساز عثمانی کی یوسف ندیم اور نجات کے بعد سے متعلق تحریروں کے بعد یوسف ندیم کی تخلیقات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ پہلی نظم ہے "سبھاش چندر بوس"۔ اس کے بعد تقریبا اہم نظمیں ہیں۔ ان نظموں کے علاوہ قطعات اور مختلف اشعار ہیں۔ اور آخر میں ایک مضمون ہے "قومی اتحاد وقت کی ایک اہم ضرورت"۔

اس مجموعہ کی سب سے قابل توجہ چیز یہ ہے کہ اس میں زیادہ تر موضوعات نئے اور اچھوتے ہیں یا کم از کم اردو میں ان پر زیادہ نہیں لکھا گیا۔ انداز تحریر میں بھی دل کشی اور تازگی ہے، ندرت اور جاذبیت ہے۔

حالانکہ ان نظموں میں سے بیشتر ہنگامی موضوعات پر ہیں لیکن ان میں صحافت کا رنگ گہرا نہیں، ادبیت کی چاشنی اور حسن جا بجا موجود ہے۔ مثال کے طور پر ان کی یہ نظم
ارض بنگلہ کی ہے
بنگلہ بندھو کی ہے ـــــ کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

روِد پدما کی موجیں بپھرنے لگیں
ہر لہر نوح کا ایک طوفان بنی
مصر کا نیل بھی منفعل منفعل
ہاں مگر
حیف صد حیف غرقاب موسیٰ ہوئے
اور فرعون اے دوستو!

سات سو کوس کے فاصلے پر کھڑا
شکل یحییٰ بنا مسکراتا رہا
روح چنگیز کی ـــ ٹکا خاں بن گئی
بے نہایت کا ظالم کا ایک سلسلہ
جور کا ایک نشان
جورِ زنداں مجیبوں سے ملتی رہی
بنگلہ بندھو کی ہے
ارض بنگلہ کی ہے

اس اقتباس سے یوسف ندیم کی شاعرانہ خصوصیات ظاہر ہیں۔ یہ خصوصیات ہیں تازگی، جوش، ندرت، صداقت، جوانی، تجربات کا کچا پن، کہیں کہیں صحافتی رنگ کی جھلک۔ خلوص اور اوق الفاظ کا استعمال۔ لیکن یہ الفاظ یوسف کے یہاں عیب نہیں بلکہ حسن بن گئے ہیں۔

یوسف کے یہاں کوئی ذہنی الجھن یا کومپلکس نظر نہیں آتا۔ وہ قومیت کے نشے میں سرشار ہیں۔ لیکن ان کی قومیت پر رجحان نہیں ہے ایک سچی صحت مند قومیت پر ان کا ایمان ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ دوسرے بھی ان کے اس نظریئے پر ایمان لائیں۔ لیکن اس کے لئے وہ تشدد کا راستہ اختیار نہیں کرتے۔

یوسف ندیم کی زبان پر شکوہ تو ہے لیکن نہیں بالکل اسی طرح ندیم کے خیالات اور تجربات میں صداقت اور جوش تو ہے لیکن گہرائی نہیں۔ البتہ چھوٹی عمر میں ندیم نے جتنے تجربات حاصل کئے ہیں اور انھیں جس طرح شاعری کا روپ دیا ہے وہ کتنے ہی شاعروں کی عمر بھر کی کمائی سے افضل ہے۔

مجموعی طور پر یہ مجموعہ اس قابل ہے کہ اسے خریدا جائے اور بار بار پڑھا جائے۔ اس کی اشاعت سے اردو کے سرمایہ شعر میں یقیناً ایک خوش گوار اضافہ ہوا ہے۔

علی جواد

خوراک

ضائع نہ کریں

دوسرے کئی
لوگوں کو خوراک کی
ضرورت ہے۔

گھروں، پارٹیوں، ہوٹلوں اور
کلبوں میں کھانا ضرورت کے مطابق
ہی لیجئے۔
بچوں کو بھی یہی سکھائیے۔
اس طرح آپ اپنا پیسہ بچائیں گے
اور ملک کا بھی۔



**دانہ دانہ
قیمتی ہے
اسے ضائع نہ کریں**

davp 73/329

دہلی ڈیولپمنٹ اتھارٹی

کی طرف سے

دس ہزار مکانات کی پیش کش

کمزور طبقے کے لئے مکانات کی اسکیموں کے تحت:-

پشچم پوری (مادی پوری)کالکاجی (فیز I)کالکاجی (فیز II)اور مدن گیر (جنتا کٹیگری) لارنس روڈ (چترنجن نگر) جنک پوری راجوری گارڈن، وزیرپورا ورسن لائٹ کالونی (کم آمدنی گروپ) ـــــ جنک پوری؛ منیرکا، مالویہ نگر، وزیرپور اور راجوری گارڈن (متوسط آمدنی گروپ)

مندرجہ بالا تینوں کٹیگری کی درخواستیں صرف اُنہی اصحاب سے لی جائیں گی جو کہ ڈی۔ڈی۔اے میں رجسٹر شدہ ہیں۔

علاوہ ازیں نئو فلیٹ مالویہ نگر میں بھی ان اصحاب کے لئے برائے الاٹمنٹ ہیں جن کے پاس دہلی میں اپنا کوئی مکان یا کوئی پلاٹ نہیں ہے۔ ان مکانوں کے لئے ان سے درخواستیں لی جائیں گی۔

ان اسکیموں کی تفصیلات ایک کتابچے میں شائع کی گئی ہیں!

ہر کٹیگری میں پندرہ فیصد فلیٹ شیڈول کاسٹ/شیڈول ٹرائبس کے لئے مخصوص ہیں۔

دیگر کٹیگریز کے لئے بھی کچھ فلیٹ مخصوص کئے گئے ہیں جن کے متعلق تفصیلات کتابچے میں دے دی گئی ہیں۔

اِن مکانوں کی تعمیر میں جو باتیں مدنظر رکھی گئی ہیں وہ ہیں بچت، افادۂ استعمال، حسنِ تعمیر، اور صحت مند ماحول۔

اِن رہائشی کالونیوں کے لئے جن میں یہ مکان تعمیر کئے گئے ہیں۔ سات سو دوکانیں بنائی گئی ہیں اور کئی پارک، مصنوعی جنگلات اور نئے قدرتی مناظرات بھی شامل کئے گئے ہیں۔ ہماری کوشش یہی رہتی ہے کہ مناسب قیمت کے اندر ایک متناسب اور خوشنما شہری نشوونما کا خیال رکھا جائے۔ اس طور پر صرف فوری ضروریات ہی پوری نہیں کی جاتیں بلکہ مستقبل میں نئی ضروریات کی تکمیل بھی ہمارے مدِنظر رہتی ہے۔



تار کے پتے میں
پانچ الفاظ
مفت
TELEGRAM
NEW DELHI 110001
آپ جو تار بھیج رہے ہیں اگر اس میں پتہ لمبا ہے تو آپ گھبرائیں نہیں۔
ایسی حالتوں میں پتے کے پہلے پانچ الفاظ پر پیسے لئے جاتے
ہیں اور باقی پانچ الفاظ مفت بھیجے جاتے ہیں۔
پتے میں دس سے زیادہ جتنے الفاظ ہوں ان پر
بھی پیسے لئے جاتے ہیں۔
براہ مہربانی شہر کے نام کے بعد پن کوڈ بھی لکھئے۔
اس پر کوئی پیسہ نہیں لیا جاتا۔
یاد رکھئے پورا اور صحیح پتہ لکھنے سے آپ کا تار
جلدی پہنچے گا۔
محکمہ ڈاک و تار
davp 73/173

سامپردائکتا ورودھی کمیٹی کی چند مطبوعات

- فرقہ پرستی کے خلاف
  جمہوریت کی آواز
  (راجیہ سبھا میں بل کی منظوری)
  قیمت:- ۶۰ پیسے

- علیگڑھ مسلم یونیورسٹی (ترمیمی بل) ۱۹۷۲ء
  لوک سبھا میں بحث (حصہ اول)
  قیمت:- ۳۰ پیسے

- علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (ترمیمی بل) ۱۹۷۲ء
  راجیہ سبھا میں بحث
  قیمت:- ۵۰ پیسے

- فرقہ پرست تنظیموں پر پابندی
  لوک سبھا میں بل کی منظوری
  قیمت:- ۱۰ پیسے

- شملہ سمجھوتہ اور اس کی اہمیت
  وزیر اعظم اندرا گاندھی کی لوک سبھا میں تقریر
  قیمت:- ۲۵ پیسے

- علیگڑھ مسلم یونیورسٹی ترمیمی بل
  (حقائق کی روشنی میں)
  ڈاکٹر نورالحسن و ڈی۔ آر۔ گوئل
  قیمت:- ۲۰ پیسے

- علیگڑھ مسلم یونیورسٹی ترمیمی بل
  خلیق انجم
  قیمت:- ۵۰ پیسے

- دو گاؤں کی کہانی
  (اتر پردیش کے نوناری اور بھمنی کے فسادات کا ایک جائزہ)
  این۔ کے۔ سنگھ
  قیمت:- ۲۵ پیسے

- ریاستوں کی نئی تنظیم اور
  جن سنگھ کی موقع پرستی
  از۔ لتا پنت
  قیمت:- ۲۵ پیسے

- علیگڑھ مسلم یونیورسٹی (ترمیمی بل) ۱۹۷۲ء
  لوک سبھا میں بحث (حصہ دوم)
  قیمت:- ۵۰ پیسے

- سامپردائکتا ورودھی کمیٹی کی
  دستاویزات
  قیمت:- ایک روپیہ

- فرقہ پرستی مٹائیے
  پارلیمنٹ میں پرزور مطالبہ
  قیمت ایک روپیہ

- شملہ سمجھوتہ: ایک سنگ میل
  وزیر اعظم اندرا گاندھی کی راجیہ سبھا میں تقریر
  قیمت:- ۵۰ پیسے

- راجدھانی میں
  فرقہ پرستوں کی شرمناک سازش
  ڈی۔ آر۔ گوئل
  قیمت:- ۵۰ پیسے

- مسلم لیگ — ایک خطرہ
  میر مشتاق احمد
  قیمت:- ۲۵ پیسے

- آر۔ ایس۔ ایس کا کالا سایہ
  بنارس یونیورسٹی پر
  این۔ کے۔ سنگھ
  قیمت:- ۲۰ پیسے

ملنے کا پتہ:- آل انڈیا سامپردائکتا ورودھی کمیٹی۔ ۱۵، بلونت رائے مہتہ لین نئی دہلی

Regd. No. R.N. 16241/68 Regd. No. D-1820

Another Bumper Issue

SECULAR DEMOCRACY

(ENGLISH)

ANNUAL—1974

TO BE OUT ON

REPUBLIC DAY

CONSISTENT WITH THE PAST TRADITION THIS NUMBER WILL BE A LANDMARK; THOROUGHLY DOCUMENTED STUDIES CLARIFYING MANY COBWEBS WOVEN BY COMMUNAL HISTORIANS

AGENTS SHOULD BOOK THEIR ORDERS IN ADVANCE

SPACE BOOKING FOR ADVERTISERS ON

FOR PARTICULARS WRITE TO

MANAGER, SECULAR DEMOCRACY
19-A, Theatre Communication Building
Connaught Circus, New Delhi-110001.
Phone : 43383

این۔این پانڈے نے قومی ایکتا ٹرسٹ کے لئے راکیش آفسٹ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

آزادی نمبر ۱۹۷۴
شمارہ ۲۳۴
قیمت ایک روپیہ

ہندوستان

اور

فاسزم

پرائم منسٹر اندرا گاندھی سے خاص انٹرویو

بڑھتے ہوئے

داموں کو

روکنے کے لئے

آپ اتنا تو کرسکتے ہیں

—— اپنی ضرورت سے زیادہ سامان نہ خریدیں۔
جن کے پاس فالتو روپیہ ہے وہ تو کسی بھی دام پر چیزیں خرید سکتے ہیں۔
لیکن کوئی بیوپاری صرف ایسے لوگوں کے سہارے بھاؤ
نہیں بڑھا سکتا۔ اس کے لئے اصل اہمیت تو
آپ کی گاہکی کی ہے۔
بد دیانت بیوپاری کو نیچا دکھانے کے لئے خواہ مخواہ
کی خریداری بند کیجئے۔
صرف وہی شے خریدیئے جس کے بغیر گزارہ نہیں۔
بڑھتے ہوئے داموں سے گھبرا کر
ضرورت سے زیادہ سامان ہرگز نہ خریدیں۔
آپ ایسا کریں گے تو مہنگائی یقیناً گھٹے گی۔

صرف لازمی اشیاء خریدیئے

davp 74/179


Phone 325961 (5 Lines) Grams: "KHAZANCHI" (Mandvi) Bombay
THE BOMBAY MERCANTILE CO-OPERATIVE BANK LTD.
ENCOURAGES YOU IN RAISING YOUR STANDARD OF LIVING AND HELPS IN ACQUIRING ON-CONVENIENT TERMS THE FOLLOWING:
DOMESTIC ARTICLES
ACQUIRE ON EASY TERMS
WASHING MACHINES
STEEL CUPBOARDS
REFRIGERATORS
CEILING FANS
RADIOS
WINDOW TYPE AIR CONDITIONERS
SEWING MACHINES
TABLE FANS
ALL KINDS OF BANKING BUSINESS TRANSACTED
K. B. MOHAMEDALLY ALLABUX
CHAIRMAN
ZAIN G. RANGOONWALA
MANAGING DIRECTOR


SNIALON
the fascinating new nylon fibre
Emerging on the scene shortly
In collaboration with Italviscosa
Eastern Trading for the expertise of
SNIA VISCOSA of Italy, one of
the most modern nylon plants will
add a production of 1800 tonnes of the
finest SNIALON yarn to meet India's
fast growing needs. Very shortly you will
see India's best textile mills
giving you fabrics made
with SNIALON
THE BARODA RAYON CORPORATION LTD

ماہنامہ

سیکولر ڈیموکریسی

اگست ۱۹۷۴ء

شمارہ ۳۳

دفتر کا پتہ
۸: ۹۔ ٹیلیکمیونیکیشن بلڈنگ
کناٹ سرکس۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ٹیلیفون نمبر ۸۲۳۳۴۳

خطرے کی دستک

آزادی کی ۲۷ ویں سالگرہ پر جب ہم حالات حاضرہ پر نظر ڈالتے ہیں تو پس منظر میں فاسزم کے نزدیک آتے ہوئے قدموں کے نشانات صاف نظر آتے ہیں۔ لال قلعہ پر سے وزیر اعظم نے تقریر کرتے ہوئے اس بات کی شکایت کی ہے کہ ہمارے عوام معمولی معمولی باتوں پر بے پناہ خوشی کا یا زبردست مایوسی کا اظہار کرتے ہیں۔ ابھی دو سال پہلے کی بات ہے کہ اس ملک کا ہر فرد خوشی سے شادیانے بجا رہا تھا اور اندرا گاندھی کی تعریف کے گیت گا رہا تھا۔ لیکن آج وزیر اعظم کو ملک کی ہر تکلیف اور مصیبت کے لئے وہی لوگ ذمہ دار ٹھہرا رہے ہیں: آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ تضاد کس بات کی نشاندہی کرتا ہے؟ ان سوالوں کے جوابات قوم اور ملک کے مفاد میں ہیں اور ان سے منہ نہیں موڑا جا سکتا۔

اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ آج ایک شہری کو بے انتہا مصائب کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ قیمتیں آسمان کو چھو رہی ہیں، کوئلہ، تیل، بجلی، غرض یہ کہ زندگی کے پہیے کو چلانے والی ہر ضروری شے نایاب ہو گئی ہے۔ ہر گھر شکایتوں اور تکلیفوں کی آماجگاہ بن گیا ہے۔ نہ تو بس کا سفر آسان ہے نہ ریل کا۔ ایک ہی شہر میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنا پہاڑ کھودنے کی طرح مشکل ہو گیا

ہے۔ کالجوں کے سامنے بے کاری کا بھوت منہ کھولے کھڑا ہے اور کالجوں و اسکولوں کے اندر نہ تو نصابی کتب ملتی ہیں اور نہ ہی اساتذہ کو طلبہ کو پڑھانے میں کوئی دل چسپی رہ گئی ہے۔ ٹیلی فون ہیں سو ہر وقت بیمار رہتے ہیں، نل ہیں سو ہر وقت پانی دینے کی بجائے سیٹیاں بجاتے ہیں۔ دراصل ہندوستان کا شہری ایسے پریشان کن حالات سے گزر رہا ہے جہاں امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی۔ وقت جیسے جیسے گزر رہا ہے ویسے ویسے ان کی غربی بڑھتی جا رہی ہے۔ شہر کے یہی باشندے سیاسی زندگی میں سب سے زیادہ شور و غل مچانے کی اہلیت رکھتے ہیں، اور سیاسی اسٹیج پر اہمیت بھی۔ ہندوستان دراصل ایک دیہی ملک ہے اسی لئے گو کہ شہری باشندوں کے کسی فیصلے سے سیاسی جماعتوں کے دھارے یہاں نہیں بدلتے۔ لیکن اُن کی مایوسی بہت نمایاں شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ان کا غصہ چونکہ سیاسی جماعتوں کی انتخابی مہم کے لئے فیصلہ کن نہیں ہوتا اسی لئے بے انتہا شدید ہوتا ہے اور ایسے ہی لوگ فاسزم کی عمارت کے لئے چونے، گارے، اینٹ اور سیمنٹ کا کام کرتے ہیں۔

ہمارا امتیازی حیثیت رکھنے والا طبقہ انہی شہریوں میں سے نکلتا ہے کیوں کہ دیہات کے اسّی فیصدی لوگ تعلیم کے افادے سے محروم ہیں۔ یہی لوگ میدان عمل میں کام کرنے والے سماجی یا سیاسی کارکنوں پر انگلی اٹھاتے ہیں اور وزراء پر بھی یہ الزام لگانے سے نہیں چوکتے کہتے ہیں کہ ترقی کا صحیح راستہ لوگ نہیں اپناتے۔ لیکن جب اس طبقے سے کسی مسئلے کا حل دریافت کیا جائے تو بھوں سکیڑ کر وہ منہ پھیر لیتا ہے یا پھر ایسے الفاظ و اصطلاحات کا استعمال کرتا ہے جو کہ کہیں سے اُدھار لئے گئے ہوں اور جن کا روزمرہ کی زندگی سے کوئی واسطہ نہ ہو ہندوستان اس طبقے سے اپنے مسائل کے حل کی کتنی امید کر سکتا ہے!

لیکن اس شور و غل مچانے والے طبقے کے علاوہ بیش تر آبادی ان لوگوں کی ہے جو کہ دھرتی کے سینے پر ہل چلاتے ہیں اور چراغ کی روشنی میں رات گزارتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ان عوام اور اُس خصوصی طبقے کے درمیان فرق بڑھ گیا ہے لیکن تعداد میں کہیں زیادہ ان لوگوں کی معاشی حالت اتنی خراب نہیں ہوئی ہے۔ گو کہ عوام کے اِس بڑے حصے کو بھی شکایات ہیں۔ زمین کی حد اختیار کی تقسیم، مکانوں کی قلت، پانی کی کمی، اور سب سے بڑھ کر چھوا چھوت کی بیماری ان کے سامنے موجود ہے۔ یہ لوگ جمہوریت سے مایوس نہیں ہیں۔ "ان کی ووٹیں خریدی جا سکتی ہیں۔" یہ خیال صرف شہر کے لوگوں کے دماغوں کی اُپج ہے۔ اگر وہ حکومت کرنے والی جماعت کے خلاف ووٹ نہیں دیتے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ حزب مخالف اُن کے لئے کوئی ایسا پروگرام بھی پیش نہیں کرتی جو کہ حاکم جماعت کرتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مسلمان آج بھی اپنے کو غیر محفوظ محسوس کرتا ہے اور فسادات کی لعنت اب بھی پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ مسلمانوں میں بھی شہری طبقہ ہی شور و غل مچاتا ہے اس لئے یہ طبقہ بھی اوروں کی طرح انہی مصائب کا شکار ہوتا ہے اور اس کی مایوسی ان کے مسئلوں پر توجہ دینے سے دور ہو سکتی ہے۔

آج معاشی مشکلات کے اس دور میں یہ پس منظر جاننا اسی سوال کا جواب دینے کیلئے ضروری ہے کہ کیا ہندوستان میں جمہوریت زندہ رہ سکتی ہے؟ فاشسٹ عناصر دروازے پر کھڑے دستک دے رہے ہیں اور یہی وہ خوفناک خبر ہے کہ اگر اس وقت اپنی قوتوں کو یکجا کر کے مقابلہ نہ کیا گیا تو دروازہ ٹوٹ جائے گا، ملک کی یک جہتی ختم ہو جائے گی اور مختلف علاقوں میں ڈکٹیٹرانہ حکومت کا دور دورہ شروع ہو جائے گا۔ تاریخ اس بات کی تنبیہہ کرتی ہے کہ فاسزم جب تک دراصل برسرِ اقتدار نہ آ جائے اپنے خطرناک پنجوں کو چھپائے رکھتی ہے۔ ہٹلر اور مسولینی کی شخصیتیں اس بات کی شاہد ہیں۔

جمہوریت کی حفاظت کے لئے قوتوں کو یکجا کرنے کی ذمہ داری سب سے زیادہ کانگریس پر عائد ہوتی ہے۔ جمہوری اقدار کی خاطر پنڈت نہرو اور اندرا گاندھی نے نہ تو مخالفین کی آوازوں کا گلا گھونٹا، نہ ہی کبھی ڈکٹیٹرانہ قوت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اب تک کانگریس نے اپنی اس ذمہ داری کو پوری طرح نہیں نبھایا ہے۔ کانگریسی ذاتی بغض و حسد اور باہمی جھگڑوں میں الجھے رہے ہیں، بجائے اس کے کہ بنیادی مسئلے کی طرف توجہ دیں۔ عوام تک اُس نظریے اور اس سیاسی پیغام کو جو کہ کانگریسی رہنماؤں نے سوچا تھا پہنچانے کے لئے پرخلوص اور ایماندار کارکنان کا کوئی گروہ تیار نہیں کیا گیا ہے۔ ۱۹۶۹ء کے بعد جوان خون کو کانگریس میں لانے کی مہم بھی ایک کاغذی خوش خیالی ہو کر رہ گئی ہے۔ عام آدمی کے ساتھ رابطے کا کوئی سلسلہ قائم نہیں ہوا ہے۔

جن سنگھ، آر ایس ایس اور اُن کے دوسرے معاون جو کہ جمہوریت پر یلغار کر رہے ہیں ان کے ساتھ جمہوریت پسند قوتوں کو نمٹنا ہے۔ ایسی جماعتوں کو جمہوری ڈھانچے میں برابر کا حصہ دار سمجھنا ایک غلطی ہے۔ تجربہ بار بار یہی ثابت کر رہا ہے۔ ان جماعتوں کے فروغ کے لئے خود کانگریسیوں کا ردِ عمل بھی جزوی طور پر ذمہ دار ہے۔ بائیں بازو کی طاقتوں کو آج یہ غور کرنا ہے کہ کہیں وہ بھی صرف متوسط طبقے کی نعرے بازی تو نہیں اپنا رہیں، کہیں وہ میری پبلک میں سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کا رول تو نہیں ادا کر رہیں! حزب مخالف کا فرض یا طریقۂ عمل صرف حکومت کی مخالفت ہی نہیں ہوتا ہمارا خیال تو یہ ہے کہ فاسزم کے خلاف کانگریس اور بائیں بازو کی پارٹیوں کا ایک محاذ ہونا چاہیئے اگر ایسا ہو سکا تو آج کے ہندوستان کا باشندہ ہی نہیں بلکہ مستقبل کی نسلیں ان کی شکر گزار ہوں گی کہ انھوں نے قومی ترقی کے لئے صحیح راستہ اپنایا۔

• • •



وزیراعظم اندرا گاندھی
سے خصوصی ملاقات

ہندوستان کے سیاسی افق پر

فاشزم

سیکولر ڈیموکریسی:۔ اندرا جی۔ حال میں ہندوستان کے سیاسی حلقوں میں فاشزم فاشسٹ رجحانات اور فاشسٹ طاقتیں الفاظ کا استعمال بہت ہو رہا ہے۔ آپ کی تقریروں میں بھی یہ ذکر آیا ہے۔ گذشتہ ماہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے جو سیاسی ریزولیوشن پاس کیا ہے اس میں بھی فاشسٹ رجحانات اور فاشسٹ طاقتوں کا حوالہ دیا گیا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے ہندوستان میں جمہوریت کو فاشزم سے خطرہ کتنا گہرا اور کس نوعیت کا ہے؟

پرائم منسٹر:۔ ہمارے ملک میں اس لفظ فاشزم کا استعمال بہت ناپ تول کر نہیں کیا جاتا۔ اس کا جنم گو اٹلی میں ہوا تھا لیکن ہم لوگ جب فاشزم کا ذکر کرتے ہیں تو اس کے معنی یہ نہیں کہ یہاں پر بالکل ویسے ہی حالات موجود ہیں جنھوں نے فاشزم کو جنم دیا تھا۔ ہمارے دماغ میں جرمنی کی مثال زیادہ رہتی ہے۔ اور ہمارا اشارہ عام طور سے ہماری سیاسی زندگی میں پھیلے کچھ رجحانات کی طرف ہوتا ہے اور ان حالات کی طرف ہوتا ہے جو ان سے پیدا ہوتے ہیں۔

کم از کم میرا جہاں تک تعلق ہے میں اس کو کسی نپی تلی اصطلاح کے طور پر استعمال نہیں کرتی۔ تھوڑے سے لوگ جب زیادہ لوگوں یا سماج کے بڑے حصے پر اپنی مرضی یا خیالات کو ٹھونسنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس کے لئے یہی اصطلاح سب سے موزوں اور قریب دکھائی دیتی ہے۔

اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مناسب طریقہ کیا ہونے چاہئیں اس بات کی یہ لوگ پرواہ نہیں کرتے۔ تشدد، غلط پروپیگنڈہ، بے بنیاد الزامات وغیرہ اچھے ہتھیار یہ لوگ استعمال کرتے ہیں۔ ان کی نہ کوئی بنیادی وچار دھارا ہے نہ پالیسی ہے نہ پروگرام۔ فوری طور پر جس چیز سے کام نکل جائے اسی کو ٹھیک سمجھتے ہیں اپنا لیتے ہیں۔

سیکولر ڈیموکریسی:۔ مسولینی بھی کہا کرتا تھا کہ پالیسی اور پروگرام بے معنی باتیں ہیں۔ اصلی چیز تو عزم ہے۔

پرائم منسٹر:۔ کیسا عزم؟ عزم کس مقصد کے لئے؟



سیکولر ڈیموکریسی:۔ مسولینی کا کہنا تھا کہ راشٹر واد کی عظمت کو قائم کرنے کا عزم۔ لیکن ہم اپنے حالات کی جانب آئیں۔ پچھلے دنوں ہمارے ملک میں ایک مانگ سننے میں آئی ہے۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ اسمبلی کے چنے ہوئے ممبروں کو استعفیٰ دینے کے لئے زبردستی مجبور کرنے کی کوشش کی گئی۔ آپ کے خیال میں کیا یہ فاسزم نہیں ہے؟

پرائم منسٹر:۔ جیسا میں نے پہلے کہا فاشسٹ رجحانات سے تشدد پیدا ہوا ہے۔ یہ جو مانگ ہے کہ اسمبلیاں توڑ دی جائیں اور تھوڑے سے لوگ اپنی مرضی دوسروں پر تھوپنے کے لئے جو زبردستی کرتے ہیں وہ بھی تو تشدد ہی ہے۔ آج کل جو قیمتیں بڑھ رہی ہیں اور جس کے کارن لوگوں کو بہت تکلیف ہے اور لوگوں میں بے چینی ہے اس سے مسئلے کچھ دھندلا گئے ہیں۔ فاشسٹ لوگ ان حالات کے پیچھے اپنے مقاصد کو چھپا لیتے ہیں۔

لیکن صحیح بات یہ ہے کہ فاشسٹ تو ان حالات کے پیدا ہونے سے بہت پہلے سرگرم تھے اگرچہ یہ لوگ بہت زیادہ سامنے نہیں آتے تھے۔ مثال کے طور پر آر۔ ایس ایس کو لیجئے ان کے کام کرنے کے طریقوں پر غور کیجئے۔ ان کے کچھ لیڈر تو کھلے طور پر ہٹلر کی اور اس کی لیڈرشپ کی تعریف کرتے ہیں جس طرح سے ہٹلر نے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی اسے یہ لوگ اپنے ملک کے لئے مثال مانتے تھے۔ ماڈل کے طور پر پیش کرتے تھے۔

یہ بھی سمجھنے کی بات ہے کہ ان کی پشت پر ان کی مدد میں وہی طبقے ہیں جو یورپ میں فاسزم کے حامی اور مددگار تھے پھر ان کا راشٹر واد کا نظریہ بھی جو ویسا ہی تنگ نظر اور کٹر پنتھی ہے۔

یہ لوگ، یہ رجحانات جمہوریت کے لئے ہی نہیں ملک کیلئے خطرناک ہیں۔ ان سے ملک کمزور ہوتا ہے عوامی اتحاد کو چوٹ پہنچتی ہے۔

سیکولر ڈیموکریسی:۔ اقتصادی مشکلات کی بات اٹھتی ہے تو یورپ کے اس اقتصادی بحران کا خیال آتا ہے جس کے نتیجے کے طور پر بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں یورپ ممالک کے اندر فاسزم کا عروج ہوا۔ اس وقت جو دنیا میں اور ہندوستان میں بحرانی حالات ہیں اس کی وجہ سے کیا آپ کے خیال میں فاسزم یہاں کامیاب ہو سکتا ہے؟

پرائم منسٹر:۔ اس وقت کے یورپ کے حالات اور آج کے حالات کو ایک جیسے نہیں کہا جا سکتا۔ ہمارے ملک میں ترقی ہوئی ہے ہم آگے بڑھے ہیں۔ اور ترقی جب ہوتی ہے تو مشکلیں بھی آتی ہیں۔ بنگلہ دیش کے جو واقعات ہوئے ان کی وجہ سے ہماری مشکلوں میں کچھ اضافہ بھی ہو گیا۔ ہمیں کئی لاکھ شرنارتھیوں کو کھلانا پلانا پڑا اور انتظام کرنا پڑا۔ اس کے بعد جنگ ہم پر تھوپ دی گئی۔ اس کے بعد ایک دم سوکھا پڑ گیا۔ اس سب کے اوپر بین الاقوامی سکّے کا بحران اور پھر ایندھن کا کرائسس۔

ہم نے بھی غلطیاں کی ہیں اور ہندوستان جیسے بڑے ملک میں جہاں قسم قسم کے مسائل ہیں۔ غلطیاں ہونا ناگزیر بھی ہے۔ حالات پر قابو پایا جا سکتا ہے اور ہم قابو کر بھی سکے بھی مشکلات اس لئے ہیں کہ پے در پے ہمارے اوپر آ پڑیں اور ہمیں سنبھلنے کا وقت نہیں ملا۔

سیکولر ڈیموکریسی:۔ اور فاشسٹ طاقتیں ان حالات کا فائدہ اٹھانا چاہتی ہیں اور انہیں مزید الجھانے کی کوشش میں ہیں۔

پرائم منسٹر:۔ یہ اسی وقت کی بات نہیں۔ یہ لوگ ہمیشہ ایسا کرتے ہیں۔ جب ہم نے گیہوں کی تھوک تجارت اپنے ہاتھ میں لی تو انھوں نے کسانوں سے ایک طرح کی بات کی اور شہر والوں سے دوسری طرح کی۔ کسانوں سے کہا کہ وہ سرکار کے ہاتھوں غلہ نہ بیچیں اور شہر والوں سے کہا کہ سرکار مناسب دام پر غلہ مہیا کرنے کا انتظام نہیں کرتی اور دونوں کو یہ بھی بتایا کہ ان کو جو بھی تکلیف یا مشکل ہے اس کی وجہ تھوک بیوپار کا سرکاری کنٹرول ہے۔ ہماری اس پالیسی کو ناکام بنانے کے لئے انھوں نے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کئے۔ بعد میں جب ہم نے یہ پالیسی بدلی تو یہی لوگ ایک اور زبان میں بات کرنے لگے۔ ان لوگوں نے ہی بیوپاریوں کی وکالت کی تھی اور بیوپاریوں نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔

یہ لوگ سرکار کے اقتصادی میدان میں کچھ بھی کرنے کے خلاف ہیں چاہے وہ اقدام عوام کی بھلائی اور قومی بہبودی کے لئے کتنا بھی ضروری کیوں نہ ہو۔ سبھی جانتے ہیں کہ ان لوگوں نے ہمیشہ پبلک سیکٹر کی مخالفت کی ہے۔

سیکولر ڈیموکریسی:۔ آپ کے کہنے کا مطلب ہے کہ یہ لوگ سوشلزم کے مخالف ہیں چاہے زبان سے سوشلزم کا نام رٹتے ہوں جیسے جرمنی میں نازی پارٹی کرتی تھی کہ ایک طرف تو پوسٹر لگائے "سرمایہ داری مردہ باد" کے اور دوسری طرف اپنے سرمایہ دار سرپرستوں کو کہہ دیا کہ اس قسم کی بات سوشلسٹوں اور کیمونسٹوں کا اثر زائل کرنے کے لئے ضروری ہے۔

پرائم منسٹر:۔ ہٹلر کا نیشنل سوشلزم، سوشلزم سے بالکل مختلف تھا۔

ہندوستان میں ہم نے ابھی تک سوشلزم کی جانب پیشقدمی نہیں کی ہے۔ ہم نے صرف ایک حد تک سرمایہ داری کو دبانے کی کوشش کی ہے۔

سیکولر ڈیموکریسی:۔ کیا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ سوشلزم کی جانب کسی قسم کی پیشقدمی کے امکانات ہی ختم کرنا چاہتے ہیں؟

پرائم منسٹر:۔ میں تو یوں کہوں گی کہ یہ لوگ سرمایہ داری کی حمایت پوری طرح کرتے ہیں یہ لوگ اس وقت ہر مقام پر چاہے وہ آرتھک میدان ہو یا سوشل کلچرل ان بیوپاری اور دوسرے لوگوں کی مدد اور حفاظت کرتے ہیں جن کے مفادات اور اثر یہاں موجود ہیں۔ ان تمام باتوں میں یہ لوگ بنیادی طور پر موجودہ نظام کو بنائے رکھنا چاہتے ہیں اور تبدیلی کے مخالف ہیں۔ جن سنگھ کی ہی مثال لیجئے۔ آپ کو تو یاد ہوگا ان لوگوں نے ہندو کوڈ بل کی کس طرح مخالفت کی تھی۔

کوئی پارٹی یا کوئی لوگ اگر ہماری پالیسی کو صحیح نہ سمجھتے ہوئے اور ہماری مخالفت کریں تو ہمیں اس میں ہرگز کوئی اعتراض نہیں۔ اعتراض کی بات تو مخالفت کا طریقہ اور انداز ہے۔ وہ لوگ واقعات سے دور ہٹ کر ہر قسم کا جھوٹ پھیلاتے ہیں۔ ہندو کوڈ بل کی مخالفت کرتے ہوئے انھوں نے عوام میں جاکر کہا کہ اس سے تو بہن بھائیوں کی شادیاں ہونے لگیں گی۔ کتنی بھدی اور بدتمیزی کی بات ہے۔ اسی طرح جب فیملی پلاننگ کی مخالفت کرتے ہیں تو دلیل دیتے ہیں کہ اس سے تو مسلمانوں اور دوسرے کم گنتی والے لوگوں کی تعداد ہندوؤں کے مقابلے میں بہت بڑھ جائیگی۔

اب ہندی کے سوال کو لیجئے۔ ہم سب چاہتے ہیں کہ ہندی تال میل کی زبان بنے اور اس کے لئے اس کی ترقی بھی چاہتے ہیں۔ لیکن ان لوگوں نے، جن سنگھ والوں نے اور دوسروں نے جس طرح آندولن کیا اور جارحانہ نعرے لگائے اس سے دکشن میں اور پوربی ریاستوں میں ہندی کی مخالفت شروع ہو گئی۔ اس طرح ان لوگوں نے ہندی کو نقصان پہنچایا۔

سیکولر ڈیموکریسی:۔ یہ پارٹیاں جس طرح سے سمجھوتے کرتی ہیں اس سے بھی ہٹلر کے سمجھوتوں کی یاد آتی ہے۔

پرائم منسٹر:۔ ان لوگوں کا طرز عمل منفی ہے۔ سرکار کو کمزور کرنے کے لئے یہ کسی سے بھی ہاتھ ملانے کو تیار رہتے ہیں۔

سیکولر ڈیموکریسی:۔ کچھ دانشور حلقوں میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ جرمنی میں فاسزم کا عروج اس لئے ہوا کہ وہاں اجارے دار سرمایہ داری بہت ترقی کر چکی تھی۔ ہندوستان میں اس کی ترقی اسقدر نہیں ہوئی۔ اس لئے یہاں فاسزم کا کوئی خطرہ نہیں۔ آپکا کیا خیال ہے؟

پرائم منسٹر:۔ ممکن ہے یہاں سرمایہ داری ویسی نہ ہو لیکن یہاں بھی اس کی طاقت کافی ہے اور وہ فاشسٹ طاقتوں کی بھرپور امداد کرتے ہیں۔ ان کی جڑیں جمی ہوئی ہیں اور وہ اپنی گرفت کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ اپنے فائدے کے لئے یہاں کے سرمایہ دار کسی کو بھی مدد دینے کے لئے تیار رہتے ہیں بائیں بازو کے لوگوں کو بھی! اس پہلو کو بھی ہمیں ذہن میں رکھنا چاہیئے۔

سیکولر ڈیموکریسی:۔ دلیل یہ ہے کہ ہندوستانی سرمایہ داری اور سامراجی سرمایہ داری میں تنازعہ ہے اور اس تنازعے کی وجہ سے وہ جمہوری طاقتوں کی امداد کرتے ہیں۔

پرائم منسٹر:۔ سامراجی سرمایہ داری سے ان کا تنازعہ ضرور ہے لیکن اس سے بھی زیادہ ان کی لڑائی اس دھارے سے ہے جو ان کو کمزور کرتی ہے ان کو سماج وادی وچار اور طاقت کو پھاڑنے میں زیادہ دلچسپی ہے۔ اسی مقصد کے تحت وہ سب سے ہاتھ ملاتے ہیں۔ غیر ملکی سامراج وادیوں کے ساتھ اور ملک کے اندر فاشسٹوں کے ساتھ یہ پہلے بھی ہو چکا ہے۔

سیکولر ڈیموکریسی:۔ کیا یہ کہنا درست ہوگا کہ فاسزم کا بدترین اور شدید ترین مظاہرہ ۱۹۶۹ء کے بعد دیکھنے میں آیا جب ہندوستانی سیاست میں ایک انقلابی تبدیلی کے آثار نمودار ہوئے تھے؟

پرائم منسٹر:۔ یہ طاقتیں اور یہ رجحانات اور ان کے مظاہر ہمیشہ ہی رہے ہیں۔ البتہ ۱۹۶۹ء کے بعد انھوں نے اپنی طاقت کو اکٹھا کیا اور اس کے بعد غرض پرست سرمایہ دار طبقوں سے ان کی امداد بھی زیادہ اور بڑے پیمانے پر شروع کر دی۔

سیکولر ڈیموکریسی:۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ امریکہ اور برطانیہ جیسی سامراجی طاقتیں اور چین جیسے ممالک بھی ان تحریکوں کی پشت پر ہوں؟

پرائم منسٹر:۔ ہوسکتا ہے۔ لیکن میں تو یوں کہوں گی کہ دنیا میں کچھ ایسی طاقتیں ہیں جو نہیں چاہتیں کہ ہندوستان کا تجربہ کامیاب ہو۔ اس قسم کی سبھی طاقتیں ہمارے ملک میں ان رجحانات کو طاقت پہنچاتی ہیں جو ہمارے ملک کو کمزور کرتی ہیں۔

سیکولر ڈیموکریسی:۔ ہندوستان کے تجربے سے آپ کی مراد کیا ہے کہ اس ملک میں بالغ رائے دہندگی کا حق بھی عوام کو ملکی آزادی کے ساتھ ساتھ ملا کیوں کہ دنیا کی تاریخ میں یہ بات پہلی بار

ہوئی ہے؟

پرائم منسٹر:- یہی نہیں کہ آزادی اور جمہوریت ساتھ ساتھ نمودار ہوئیں بلکہ یہ بھی کہ ہم جمہوریت کو سماجی تبدیلی کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ یہ بات کچھ لوگوں کو پسند نہیں۔ اس سے غرض پسندوں کو چوٹ پہنچی ہے اور وہ اس کی مخالفت کرتے ہیں، وہ اس تجربے کو ناکام بنانا چاہیں گے۔

یہ لوگ جن کی غرض موجودہ نظام سے جُڑی ہوئی ہے سب سے زیادہ خطرناک ہیں۔ عام لوگ بھی موجودہ نظام کو برقرار رکھنے میں دل چسپی لیتے ہیں وہ بھی کئی معاملوں میں تبدیلی سے گھبراتے ہیں خاص طور سے سماجی معاملوں میں تبدیلی سے۔

سیکولر ڈیموکریسی:- عام لوگوں سے آپ کی مراد کیا متوسط طبقہ ہے؟ اس طبقے سے ہر جگہ فاسزم اٹھا ہے ٹھیک نہیں کیا؟ لیکن کیا آپ مزدور طبقے کو بھی اس میں شامل کرتی ہیں؟

پرائم منسٹر:- متوسط طبقہ اور منظم مزدور طبقہ جس کی مخصوص اغراض پیدا ہو چکی ہیں۔

سیکولر ڈیموکریسی:- مزدور طبقے کا منظم حصہ غالباً اوپر کے دس فیصدی آمدنی والے لوگوں میں شامل ہے اور شاید اسی وجہ سے پرولتاری کی پرانی تعریف سے باہر ہوگا؟

پرائم منسٹر:- آپ چاہیں تو ایسا بھی کہہ سکتے ہیں۔

سیکولر ڈیموکریسی:- اب جب آپ یہ سمجھتی ہیں کہ فاشسٹ طاقتوں کو خطرہ موجود ہے تو آپ یہ بتائیے کہ کونسی طاقتیں ان کے خلاف صف بستہ ہو رہی ہیں یا کی جا رہی ہیں؟

پرائم منسٹر:- اول تو سماج کے کمزور طبقے ان کے خلاف ہیں۔ وہ بہت اچھی طرح منظم نہیں لیکن وہ فاشسٹ طاقتوں کے خلاف ہیں جب بھی کبھی ایسی ٹینشن ہوتے ہیں تو ان کو سب سے زیادہ مشکل ہوتی ہے۔

سیکولر ڈیموکریسی:- اگر آپ بُرا نہ مانیں تو کچھ سوالات کانگریس کے بارے میں بھی کروں؟

پرائم منسٹر:- کیوں نہیں۔

سیکولر ڈیموکریسی:- فاسزم کے مخالف لوگوں کو متحد کرنے کیلئے کانگریس کیا کر رہی ہے؟

پرائم منسٹر:- کانگریس ان کے سامنے پروگرام رکھنے کی کوشش کرتی ہے ان طبقوں میں کام کرنے کے لئے کانگریس ورکروں کی تربیت کا بھی فیصلہ ہوا ہے۔ عوام سے رابطہ بڑھانے کیلئے بھی کوشش ہوتی ہے اور پھر پارٹی فاشسٹ طاقتوں کے اصلی مقاصد کو بے نقاب کرتی ہے۔

سیکولر ڈیموکریسی:- کیا جو کچھ کانگریس پارٹی کر رہی ہے اسے آپ کافی سمجھتی ہیں اس چیلنج کے مقابلے میں؟

پرائم منسٹر:- کافی تو نہیں ہے، کانگریس کو ابھی زیادہ سرگرم اور مستعد ہونے کی ضرورت ہے۔

سیکولر ڈیموکریسی:- کیا کانگریس کی اس کمزوری کی وجہ اندرونی جھگڑے اور نااتفاقی ہے؟

پرائم منسٹر:- کوئی بھی تنظیم کبھی اتنی متحد نہیں ہوتی جتنی ہم کانگریس سے امید کرتے ہیں سبھی پارٹیوں میں حسد اور آپسی مقابلے ہوتے ہیں لیکن اگر یہ احساس رہے کہ کسی بڑی چیز کا بڑے آدرش کا یا بڑے چیلنج کا سامنا ہے تو آپ کو ان ذاتی اور گروہی باتوں سے اوپر اٹھنے میں مدد ملتی ہے۔ تب یہ باتیں دوسرے درجے پر آجاتی ہیں۔

سیکولر ڈیموکریسی:- ظاہر ہے کہ کانگریس جمہوریت کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ کیا یہ رجعت پرست اور فاشسٹ چیلنج کا مقابلہ کرنے کیلئے دیگر جمہوریت پسند طاقتوں کو قریب لانے کے لئے کوئی پیش قدمی کر رہی ہے؟

پرائم منسٹر:- ہم نے ہمیشہ کہا ہے کہ جو لوگ ہماری پالیسی اور ہمارے پروگرام کو پسند کرتے ہیں ہم ان کی مدد کا سواگت کرتے ہیں۔ آج جو سنکٹ ہمارے سامنے ہے یہ کافی گہرا ہے اور جو لوگ مستقبل سے دل چسپی رکھتے ہیں ان کو اس سے فکرمند ہونا چاہیئے۔ جب تک ہم بدلیں نہیں، ہمارا مستقبل نہیں بن سکتا۔ جو لوگ تبدیلی میں یقین رکھتے ہیں ان کو متحد ہونا چاہیئے۔ آج کی کچھ بھی مشکلات ہوں، ہم مستقبل کو نظرانداز نہیں کر سکتے۔

سیکولر ڈیموکریسی:- دوسری پارٹیوں کا کیا رویہ رہا؟

پرائم منسٹر:- تبدیلی کے لئے اس کوشش میں تمام بائیں بازو کی پارٹیوں کو مدد کرنی چاہیئے تھی۔ لیکن ان میں سے کچھ تو ایسی ہیں جو دائیں بازو والوں سے جا ملی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا ان کو اس سے کیا فائدہ ہوگا۔ ان کی پارٹی کے حساب سے بھی ان کو کیا فائدہ ہوگا سوائے اس منفی قسم کی تسلی کے کہ کانگریس کو کمزور کر دیا۔

سیکولر ڈیموکریسی:- آخر میں ہم آپ سے درخواست کریں گے کہ آپ اپنی طرف سے ہمارے قارئین کو اور عوام کو کوئی سندیش دیجئے۔

پرائم منسٹر:- ہم بہت مشکل حالات سے گزر رہے ہیں۔ اور اس سے میرا

مطلب صرف اقتصادی مشکلات نہیں۔ میرا اشارہ اس سماجی ہلچل کی طرف ہے جو سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی سے پیدا ہوئی ہے۔ دو متضاد چیزیں ہمارے سامنے ہیں ایک طرف تو سائنس کی عظیم فتوحات ہیں اور دوسری طرف استحصال کا نظام ہے۔ کچھ لوگ محض فوری مفادات میں الجھ جاتے ہیں اور مستقبل کے عظیم امکانات کو بھول جاتے ہیں۔

حالات کے کچھ مثبت پہلو بھی ہیں۔ بڑی طاقتوں کے درمیان صلح اور سمجھوتے کا ماحول ہے۔ اس نشیب و فراز کے باوجود یہ ایک اچھی بات ہے اور مثبت پہلو ہے۔ لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ بین الاقوامی حالات تغیر پذیر ہیں اور ہمیں پوری مستعدی سے کام لینا چاہیئے۔

ہر شخص کو ان تمام حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے سرِ رن کا فیصلہ کرنا چاہیئے۔ کانگریس کو کمزور کرنے کی کوشش میں اگر ملک کمزور ہو جائے تو سب کا نقصان ہوگا۔ خوشحال ملک میں ایسی بات ہو تو زیادہ حرج نہیں ہوتا۔ وہاں پر کچھ غیر ذمہ داری بھی چل جاتی ہے، زیادہ نقصان نہیں کرتی۔ ابھی ہندوستان میں اس کا اثر کروڑوں لوگوں کی زندگی پر پڑتا ہے۔ جمہوریت کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔

جمہوریت کے ہمہ گیر معانی کے علاوہ ہم چاہتے ہیں کہ سب لوگ ملک کے فیصلوں میں اور تعمیر میں حصہ لیں۔ یہاں حکمراں پارٹی مخالفین کو اپنا کام کرنے کی پوری آزادی دیتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی مخالفوں پر بھی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ حکمراں پارٹی کو بخوبی کام کرنے دے۔ مخالفین کو ایسا طرزِ عمل اختیار کرنا نہیں چاہیئے جس سے پارلیمنٹ میں منظور شدہ پالیسی اور پروگرام پر عمل درآمد کرنے میں رخنہ اندازی ہو۔

بہت سے ایجی ٹیشن جو آج کل چل رہے ہیں وہ عوام کی توجہ اصل مسائل سے دور لے جانے والے ہیں۔ عوام کی توجہ مسائل سے ہم نہیں، یہ لوگ ہٹا رہے ہیں۔ آج کل کے ایجی ٹیشن کہنے کو تو مہنگائی کے خلاف ہیں لیکن کیا ان سے مہنگائی کم ہو رہی ہے۔ پیداوار اور تقسیم کے سلسلے میں رکاوٹ پیدا کر کے یہ لوگ اُلٹا مہنگائی بڑھا رہے ہیں۔ ان کی وجہ سے عوام کو بے حد مصیبت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

مجھے ہندوستان کے عوام پر پورا یقین ہے۔ وہ ان باتوں کو سمجھتے ہیں۔ حالات کے چیلنج کا ہم کو مل کر مقابلہ کرنا ہے اور ان طاقتوں کو شکست دینی ہے جو ہمیں ہمارے راستے سے گمراہ کرنا چاہتی ہیں اور جو ہمارے قومی اقدار کو پامال کرنا چاہتی ہیں۔ اور ہم ایسا کریں گے۔

ہم حال کا مقابلہ حوصلے اور عزم کے ساتھ کریں گے تاکہ ہم ایک تابناک مستقبل کی تعمیر کر سکیں۔

• • •

امن کا پھول

(ہمارا پہلا ایٹمی تجربہ)

سکندر علی وجد

ایک ہیبت سی فضا پر طاری
سخت، ہیجان زمیں کے دل میں
حرفِ حق
گونج اٹھا!
وجد میں صبح کے سورج کی شعاعیں رقصاں

ریگ زاروں سے صبا خوش خبری لائی ہے!
اک نئے دور کا آغاز ہوا
امن کا پھول کِھلا

دور پہنچی ہے چٹکنے کی صدا پُر خوشبو

آج خوشیوں کا، امیدوں کا سہانا دن ہے
یہ فلاکت کے اندھیرے میں سنہرا دن ہے
یوں تو ہر دن ہے نیا دن، یہ نرالا دن ہے

جن کے ماتھے سے بہا خون، پسینا بن کر
جن کی آنکھوں نے سویرے کو اُجالا بخشا
جن کی محنت نے جگر چیر دیئے ذرّوں کے

اور یہ فتحِ مبیں
جس کے اشارے سے ہوئی ہے...
سب کو
تہنیت اور سلام

خوشنما خواب، جو آہستہ جو دیکھا تھا کبھی
اس کی تعبیر سے روشن ہے گلستانِ وطن
سارے ہمسایوں سے کہہ دو کہ یہاں
دوستی اور مروّت کی بہار آئی ہے
خوف و نفرت کے غلط نقش مٹا دو تم بھی
زندگی، مہر و محبت کے سوا کچھ بھی نہیں!

(بشکریہ "قومی راج")

ایک شکستہ خواب

آر ایس ایس کی حقیقت

ریندر ناتھ پنڈت

تقریباً تین ماہ ہوئے راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ کے بارہ اہم ممبران کی لکھنؤ میں ایک پرائیویٹ نشست ہوئی۔ زیر بحث مسئلہ یہ تھا کہ پچھلے تجربے کی روشنی میں آر ایس ایس کے کام کو جاری رکھا جائے یا نہیں اور دوسرا یہ کہ بہت سے ممبران کے دماغ میں تنظیم کے رہنماؤں کی نیت کے متعلق جو شک وشبہات پیدا ہو چکے تھے ان پر غور کیا جائے۔

اس بیٹھک میں آر ایس ایس کو شیطانی قوت کا نام دیا گیا اور یہ طے ہوا کہ آئندہ اس کو کسی قسم کی مدد بہم نہ پہنچائی جائے اور اس فیصلہ پر فوراً عمل شروع کر دیا جائے۔ بات چیت کے دوران قابل ذکر بات یہ رہی کہ شرکت کرنے والوں نے اس امر پر بے حد تاسف کا اظہار کیا کہ ان کے ہی ایما پر بہت سے نوجوان لڑکے اس تنظیم میں داخل ہو گئے۔ اسی پس منظر میں بیٹھک میں اس مصنف سے اصرار کیا گیا کہ وہ ذاتی مشاہدات کی بنا پر آر ایس ایس کی اندرونی کارروائیوں کے متعلق اپنے تجربات کو قلمبند کرے۔

یہ کتابچہ جو کہ اسی فیصلہ کے بعد تحریر کیا گیا آر ایس ایس تحریک کی اس نظریاتی بنیاد پر تنقید نہیں ہے جو کہ اس کے بانی کے ذہن میں رہی ہوگی بلکہ اس میں نمایاں طور پر جو الزام لگایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ سنگھ کا اصل مقصد ہندو وکاز کی حمایت کرنے سے کہیں مختلف ہے۔ در اصل یہ صرف ایک فریب ہے ـــــ صرف ایک نعرہ ہے جو کہ اس لئے بلند کیا گیا ہے تاکہ تمام ملک

محب وطن پرست ہندو نوجوانوں کی قوت کو اپنے حصول مقاصد کیلئے استعمال کیا جا سکے۔ یہ وہی نوجوان ہیں جن میں سے بیشتر اگر اس جماعت کے رہنماؤں کی اصل منشا سے واقف ہو جائیں تو ان سے کسی قسم کا واسطہ رکھنے کے لئے رضامند نہ ہوں۔

اس قسم کی تحریر کی خصوصی نوعیت اور ذاتی تجربہ کی اہمیت کی وجہ سے اس کتابچے میں ضمیر شخصی کا استعمال کثرت سے کیا گیا ہے۔ عموماً یہ طرز تحریر ان لوگوں کے شایان شان ہے جو کہ یا تو سماجی حیثیت سے بلند مرتبہ ہوں یا بطور مصنف ان کا سکہ جما ہوا ہو۔ اسی وجہ سے اس مصنف کو اس امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے جو کہ یوں بھی ظاہر ہی ہے کہ ان سطور کا لکھنے والا نہ تو کوئی بڑا مصنف ہے نہ ہی سماج کا اہم رکن۔

باب اول

ایک مشن کی ناکامی

جس وقت امیدوں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے اور سکون برہم ہو جاتا ہے تو صبر کا دامن چھوٹ جاتا ہے اور عموماً پرانے رفیقوں کی اچھی باتوں کے لئے بھی تحسین کے الفاظ نہیں نکلتے۔ اس حقیقت کے پیش نظر یہ امر تعجب خیز ہے کہ بہت سے ایسے لوگ جو کہ پہلے راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ کے ساتھ منسلک رہے ہیں لیکن بعد ازاں اس سے قطع تعلق کر چکے ہیں ابھی تک افسوس کے ساتھ اس رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ یہ تنظیم ہمارے ملک کو عظیم بنا سکتی تھی اگر اس کے رہنماؤں کے قول اور فعل میں مطابقت ہوتی۔ ایک وقت ایسا تھا جب کہ ان کے قول اور فعل میں ہم آہنگی موجود تھی۔ جو کچھ وہ کہتے تھے اس میں دکھاوے کا عنصر نہیں تھا بلکہ ان کے الفاظ ایک ایسی معیاری مثال تھے جن کے زیر اثر مجھ کے ابتدائی دور میں بہت سے ذہن تشکیل پاتے تھے۔ دراصل سنگھ ایک ایسی اعلیٰ قامت تنظیم تھی جس کا مقصد ایثار، حسن تربیت اور محبت کی جیتی جاگتی مثالوں کے ذریعہ ہمارے سماج کے معیار کو بلندیوں تک پہنچانا تھا۔

آر ایس ایس کے بانی مبانی ڈاکٹر کیشو راؤ ہیڈ گوار نے اپنی تنظیم کے لئے کوئی صاف، جامع اور مکمل نظریہ نہیں چھوڑا۔ انھوں نے وقتاً فوقتاً جو کچھ زبانی کہا ہے اسی میں سے دانشوران نے اس تحریک کی نظریاتی بنیادوں کا تانا بانا تیار کیا ہے۔ لیکن اس وجہ سے اس جماعت کے کام میں کوئی رکاوٹ نہیں آئی ہے کیونکہ اس کا نمایاں مقصد عملی کام اور سوئم سیوکوں کے کردار پر زور دینا ہی رہا ہے۔ اس ضمن میں جو کامیابی حاصل ہوئی تھی اس کی وجہ سے اور اس کے پر اثر طریقۂ تنظیم کے پیش نظر یہ یقین ہو چلا تھا کہ آر ایس ایس تقویت حاصل کرے گی اور بالآخر بہتر افراد کی ایک نئی سماج تعمیر کرنے کے اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گی۔

یہ ایک ایسا خواب تھا جو کہ ہمارے ملک کے بہترین نوجوانوں کی نگاہوں کے سامنے گھومتا تھا۔ مغربی بنگال میں جب کہ راقم الحروف نو برس ۱۹۴۸ء میں آٹھ کا لڑکا ہی تھا یونیورسٹی کے بہت سے ذہین طلبا اس میں پہلے سے کام کر رہے تھے — ان میں سے کم از کم دو ایسے تھے جنھوں نے سندی امتحانوں میں اول پوزیشن حاصل کی تھی۔ یہ خوش خیالی کا ایک ۔۔۔ جادو ہی تھا جس کے زیر اثر انھوں نے تعلیم سے قطع تعلق کر کے اس وقت جیل جانا پسند کیا تھا جب کہ انھیں امتحان کے لئے بیٹھنا تھا۔ لیکن اس جماعت کے مرکز میں جو گھن لگ چکا تھا وہ اب تیزی کے ساتھ اس کے محیط تک پہنچ رہا تھا اور ایک سمجھدار نوجوان کی آنکھوں سے یہ بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی۔

اس سال ۲۰ جون کو میں نے پہلی مرتبہ آر ایس ایس کے سرسنگھ چالک شری ایم۔ ایس۔ گولوالکر سے یہ شکایت کی تھی کہ اسکے اراکین اس کے مبینہ عظیم مقاصد سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ میں پہلے ہی سنگھ میں ان دو شخص سے مشورہ کر چکا تھا جو کہ اس معاملے میں میرے ہم خیال تھے۔ طے یہ کیا گیا کہ کم از کم کچھ شکایتوں کی طرف سربراہ کی توجہ دلائی جائے اور اس کے نتیجہ کے طور پر جو رد عمل ہو اس پر نگاہ رکھی جائے۔ ہمارے چند دوست اب بھی اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ سرسنگھ چالک مکمل طور پر ان سب نیک مقاصد پر اعتقاد رکھتے تھے اور کیونکہ ان کی تکمیل کے خواہاں تھے۔ اس لئے اگر پوری صورت حال سے انھیں آگاہ کیا جائے تو وہ ثابت قدمی کے ساتھ طرز عمل کی اصلاح کے لئے فوری اقدامات کریں گے۔ پھر بھی کچھ معاملات ہمارے سامنے ایسے تھے جن کے متعلق اس خوش فہمی کی گنجائش نہیں تھی۔ ہم سب کو ان کے متعلق کوئی علم تھا اور ہماری کوشش کا جو نتیجہ نکلنا تھا اس کی ہم پیشگوئی کر سکتے تھے لیکن امید نے ابھی تک ساتھ نہ چھوڑا تھا۔ علاوہ ازیں ہم یہ محسوس کرتے تھے کہ ہمارے اور باقی لوگوں کے مفاد میں بھی یہ بات تھی کہ ہمارے آخری فیصلہ کی وجوہات کافی صاف طور پر سب کے سامنے آ جائیں اور ہم بعد ازاں واقعات کی بنا پر اس کا جواز پیش کر سکیں۔

دریں حالات میں نے اپنے دستخط کے ساتھ ایک طویل خط روانہ کیا جس میں اہم شکایات کا تذکرہ کیا گیا تھا گو کہ طرز و زبان کے لحاظ سے اس میں وہ اعتدال برتا گیا تھا جس کی جماعت کے رکن سے توقع کی جا سکتی تھی۔ شکایتوں کے علاوہ کچھ دیگر اہم سوالات بھی اٹھائے گئے تھے جن کا تذکرہ میں بعد میں کرنا چاہتا ہوں۔ سنگھ میں ۔۔۔ کے سلسلے میں اس خط میں تحریر کیا گیا تھا۔

"اس ضمن میں ۔۔۔ [illegible]

علاوہ اس قسم کی حیات کو متاثر کر رہا ہے جو کہ اس تنظیم کی عظمت کی بنیاد ہے جیسا کہ اب تک ہمارا یقین رہا ہے جو سوئم سیوک کی انفرادی خصوصیات جن پر اس کی توجہ مرکوز ہونی چاہیئے وہ ہیں دوسرے سوئم سیوکوں کے ساتھ برادرانہ محبت قربانی کا جذبہ اور ڈسپلن میں اعتقاد۔

جہاں تک برادرانہ رواداری کا تعلق ہے ہم دیکھتے ہیں کہ یہ جذبہ عام سوئم سیوکوں میں بدرجہ اتم موجود ہے لیکن جیسے جیسے عہدیداران کی فہرست میں اوپر جاتے ہیں اسی تناسب سے بتدریج اس جذبہ کا فقدان نظر آتا ہے۔ پرخلوص بھائی چارے کی جگہ میکانکی تعلقات کو ترجیح دی جاتی ہے اور ادھیکاری (راہنما) اپنے ماتحتین کے ساتھ حکمانہ ڈھنگ سے برتاؤ کرتے ہیں۔ "یہ میرا حکم ہے" اور اسی نوعیت کے الفاظ اب کچھ عرصے سے اکثر استعمال کئے جاتے ہیں اور شاید ادھیکاریوں کے دلوں سے شفیق جذبات مفقود ہو گئے ہیں اور وہ اب اکثر ایک دوسرے کی حرکات پر نظر رکھتے ہیں ——— کبھی کبھی حاسدانہ بھی۔ صوبائی ہیڈ کوارٹر یعنی نواس میں بھی پورا ماحول شک و شبہ سے پراگندہ ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ میری توقع کے برخلاف مخلصانہ رویہ کا دکھاوا بھی سرے سے غائب ہو چکا ہے۔ سنگھ میں بہت سے رہنما خصوصاً صوبائی سطح کے ادھیکاری، دوسروں کے متعلق کچھ زیادہ دلچسپی بھی نہیں رکھتے۔

جہاں تک قربانی کے جذبہ کا سوال ہے عموماً (پرچارکوں میں خصوصاً) یہ جذبہ شاذ و نادر ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس صوبہ میں کبھی کبھی خوراک اور پوشاک کے معاملہ میں ان پرچارکوں میں خود غرضی اپنے عروج پر دیکھنے کو ملتی ہے۔ کچھ کو یہ شکایت ہے کہ ذاتی وظیفوں وغیرہ کے معاملہ میں دوسروں کے ساتھ خاص عنایت و لحاظ داری روا رکھی جاتی ہے۔ جہاں تک بڑھیا پوشاک کا سوال ہے اس کے لئے ہوس چھوٹے پرچارکوں تک ہی محدود نہیں ہے۔ یہاں پوروانچل پرچارک (جو کہ مغربی بنگال، آسام اور اڑیسہ کے مشرقی علاقوں کے ناظم ہیں) اس ضمن میں اپنے رویہ کے ذریعہ سب سے گھٹیا مثال پیش کر رہے ہیں۔ وہ آج کل موٹر کار کے علاوہ کسی طرح دفتر سے باہر قدم نہیں رکھ سکتے اور اگر کبھی کلکتہ سے باہر جانے کا موقعہ آ جائے تو وہ اکثر ہوائی جہاز سے ہی سفر کرتے ہیں۔ ان کی پوشاک گھر سے باہر بیش قیمت کھدر اور قیمتی ریشمی کپڑے کی بنی ہوئی ہوتی ہے۔

مزید براں اپنی رہائش کے چھوٹے بیش قیمتی تبدیلیوں کے بہت سے رہنماؤں کو ستانا شروع کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مختلف صوبوں میں سنگھ کی ترقی کے ارتکاز بحیثیت ہوں نے اس معاملہ میں ہمارے کچھ بہت سے کارکنان کے رویوں پر بہت برا اثر ڈالا ہے۔ یہاں کلکتہ شہر میں یہ جنون اس قدر [illegible] کہ اگر کچھ پرچارکوں نے جماعت کے خرچ سے اپنے

تاہم کے لئے شعر بنگالی میں چھپوا لئے ہیں۔ ان میں سے چند ایک نے تو انگریزی اور ہندی میں الگ الگ چھپوا کر تیار کرا لئے ہیں۔

ان سب باتوں کے علاوہ سب سے خراب بات یہ ہے کہ کچھ پرچارکوں کے خلاف اخلاقی گراوٹ کے بھی شدید الزامات لگائے گئے ہیں جن میں شدید ترین الزام غیر فطری جنسی جرائم کا ہے جس کے شکار چھوٹی عمر کے سوئم سیوک بیان کئے جاتے ہیں۔ ایک واقعہ کا مجھے ذاتی علم ہے جبکہ ایک نامی گرامی پرچارک نے "سواستکا" (مغربی بنگال میں سنگھ کا ایک ہفت روزہ جریدہ) سے متعلق ایک سودے میں اپنی ذات کے لئے پیسہ وصول کرنے کی کوشش کی۔ پیسوں کے گھپلے کے کچھ اور الزامات بھی سنائی دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ صوبے کی تنظیم بھی الزام سے بری نہیں رہ سکی ہے اور کہا جاتا ہے کہ بستو ہارا سہایتا سمتی کے پیسوں کو خرد برد کیا گیا ہے اور بیجا تصرف میں لایا گیا ہے۔ پوروانچل پرچارک بذریعہ ہوائی جہاز سفر کرتے ہیں اور ان اخراجات کو سمتی برداشت کر رہی ہے۔ ۱۱۰۰ روپے مالیتی کا ایک ٹائپ رائٹر خریدا گیا ہے، ۱۰۰۰ روپے کا ایک کیمرہ اور ۲۰۰۰ روپے کی قیمت کا ایک مائیکروفون۔"

میں اس میں یہ بھی ذکر کر سکتا تھا کہ اہم پرچارک ٹرین میں صرف فرسٹ یا سیکنڈ کلاس میں ہی سفر کرنا پسند کرتے ہیں اور مہنگی و پرتکلف رسٹوران گاڑی میں جانے اور کھانا نوش فرمانے ہیں۔ میں شری گولوالکر کو اس بات کی یاددہانی بھی کرا سکتا تھا کہ اہم شہروں اور قصبوں میں جہاں کہ وہ جاتے ہیں ان کی خیر مقدمی تقریبوں میں کتنا زیادہ پیسہ خرچ ہوتا ہے حالانکہ مقامی چند لوگوں کو اس امر کے لئے پھسلا کر تیار ضرور کیا جاتا ہے کہ وہ ان تقریبوں کے انعقاد کی اپیلوں میں اپنے نام شامل کرنے کی اجازت دے دیں۔

اس بحث میں پڑنے کی بجائے کہ میں کیا کیا اور کہہ سکتا تھا شائد زیادہ کارآمد بات یہ ہو کہ میں بتاؤں کہ آخر میرے اس خط کا نتیجہ کیا نکلا۔ اس کے نتائج حسب ذیل تھے:

۱۔ شکایتوں کی میری اس فہرست میں سے کسی شکایت کا کوئی جواب موصول نہ ہوا ——— نہ تعجب نہ تشویش نہ افسوس۔

۲۔ وہ مراٹھی پرچارک جو کہ اس خود غرض اور بد اخلاق گروہ کا سرغنہ تھا جس نے بہت سے کم عمر لڑکوں کو خراب کیا تھا (اور جس کی وجہ سے بہت بڑی تعداد میں لڑکے اس جماعت سے ناطہ بھی توڑ چکے تھے) کلکتہ سے باہر نہیں بھیجا گیا بلکہ اس کے خاندان کے افراد کو کلکتہ لے آیا گیا اور ان سب کے خرچ کے لئے بجٹ کی ایک اور رقم [illegible] کی۔

۳۔ میری شکایتوں سے متعلق صوبائی شاخ کے دفتر کو خبردار کر دیا گیا اور اسے صلاح دی گئی کہ وہ میرے ساتھ اور نزدیکی رابطہ قائم رکھنا شروع کر دے۔

دو ماہ پیشتر جب کہ مغربی بنگال میں صوبے کے کاریہ واہ یعنی سیکریٹری کے کام کو سنبھالنے سے میں نے انکار کر دیا تھا اسی وقت سے کسی اور مناسب آدمی کی تلاش شروع کی جا چکی تھی۔

باب دو

"گوروجی" گولوالکر

جس وقت ڈاکٹر ہیڈگوار صاحب بستر مرگ پر پڑے ہوئے تھے ان کے گرد ان کے ساتھی جمع تھے۔ ان میں شری ایم۔ ایس۔ گولوالکر بھی موجود تھے جن کو کہ ہیڈگوار نے اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔ اسی مجمع کی موجودگی میں شری گولوالکر نے اپنے مضطرب رہنما کو ان الفاظ کے ساتھ اطمینان دلانے کی کوشش کی تھی "آپ کوئی فکر نہ کریں۔ اطمینان رکھیں۔ آپ اس یقین کے ساتھ آنکھیں موند سکتے ہیں کہ میں اپنی پوری طاقت کے ساتھ سنگھ کے کام کو سنبھالوں گا۔"

آج یہ معلوم کرنا ناممکن ہے کہ آیا آر ایس ایس کے بانی کو اس یقین دہانی کے بعد سچ مچ سکون نصیب ہو گیا تھا یا نہیں۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ شری گولوالکر کو اس وقت سے اب تک یہ خیال رہا ہے کہ وہ اپنے گورو کے مشن کو سنبھالنے میں کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔ کچھ باتیں ایسی ہیں کہ جن کی وجہ سے گولوالکر کی اس خود اعتمادی کا کافی حد تک جواز بھی موجود ہے۔ اول تو یہ کہ پرانے طریقوں پر کاربند رہنے کی وجہ سے سنگھ کی مقبولیت میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا اور مہاتما گاندھی کی موت کے روز تک اسے کسی ایسے مرحلے سے نہیں گزرنا پڑا جس میں اس کے رہنماؤں کی صلاحیتوں کا امتحان ہو جاتا۔ دوم یہ کہ ڈاکٹر ہیڈگوار کی رحلت کے بعد وہ محبت و احترام جو انکے ساتھیوں اور پیروکاروں کے دل میں ان کے لئے تھا وہ فوراً ہی ان کے جانشین کی جانب رجوع کر گیا کیونکہ ڈاکٹر صاحب کے وہی سب سے معتبر ساتھی تھے۔ اس کے علاوہ ان کے وفادار پیروکاروں کا احترام حاصل کرنے میں شری گولوالکر کے لئے دو بہت ہی عجیب باتیں بڑی مددگار ثابت ہوئیں۔ ایک تو ان کی لمبی داڑھی اور بڑے بڑے سر کے بال اور دوسرے ان کا مراٹھی لقب "گوروجی" جس کے باعث ان کے غیر مراٹھی پیروکاروں کی بہت بڑی تعداد کو یقین ہو گیا تھا کہ گولوالکر کو اس ملک میں عوام کے ایک بہت بڑے طبقے نے اپنا گورو تسلیم کر لیا ہے ـــــ یہ ایک ایسا خام خیال تھا جس کی گولوالکر نے جان بوجھ کر کبھی تردید نہیں کی۔

آر ایس ایس میں سرسنگھ چالک کا عہدہ سنبھالنے کے ابتدائی چند سالوں تک گولوالکر عاجزی و متانت کی تصویر بنے رہے۔ وہ اپنی ذاتی ضروریات میں محتاط رہتے تھے۔ نہایت ہی سادہ قسم کے کپڑے زیب تن کرتے تھے اور ڈاکٹر ہیڈگوار کی مانند ہمیشہ تیسرے درجے کے ڈبے میں سفر کرتے تھے۔ لیکن جیسے جیسے سنگھ کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا رہا ہے گولوالکر کے اطوار میں نمایاں تبدیلی آتی رہی ہے۔ آج ۴۵ سال کی عمر میں گولوالکر اپنی پتلی ناک پر سونے کے فریم کا چشمہ رکھتے ہیں، کلائی میں سونے کی رسٹ واچ پہنتے ہیں اور ان کے ریشمی سلے کرتے میں سونے کے بٹن لگے ہوتے ہیں۔ یہ سب رہن سہن کسی بڑے زمیندار کے لئے بھی رشک کا باعث ہے۔ اُن کے دائیں ہاتھ کی پہلی تین انگلیوں میں جواہرات سے جڑی سونے کی انگوٹھیاں ان کی خوبصورتی میں چار چاند لگاتی ہیں۔ ان کی دھوتیاں بہت بڑھیا، مہین اور مہنگے کپڑے کی بنی ہوتی ہیں اور چند دھوتیوں میں ایک انچ چوڑی کامدانی کی کناری ہوتی ہے۔ باہر نکلتے وقت بھی انہیں عادت ہے کہ وہ اپنے کاندھے پر ایک ملائم آسمانی رنگ کا تولیہ ڈالے رکھتے ہیں۔

جسمانی طور پر گولوالکر ایک دُبلے پتلے آدمی ہیں۔ اگر آپ ان کی صحت کے متعلق اُن سے دریافت کریں تو وہ فوراً جواب دیتے ہیں "میں کبھی بیمار نہیں پڑتا۔ میں نے ایشور کے پاس اپنی صحت کا بیمہ کرا رکھا ہے۔ اور وہ ایسی کمپنی ہے جس کے دیوالیہ ہونے کا کبھی کوئی خطرہ نہیں ہے۔" کچھ عرصہ پہلے یہ بیان کیا جاتا تھا کہ وہ ہٹھ یوگ کے آسنوں کی ورزش روزانہ کرتے ہیں۔ اگرچہ اب ان کی صحت کی دیکھ بھال کے لئے ایک ڈاکٹر لگاتار ان کے ساتھ دن رات رہتا ہے۔ اُن کے نزدیک بیٹھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انکی پھیپھڑوں کی ہڈیوں میں کسی شدید مرض کے اثرات سرایت کر چکے ہیں جس کی وجہ سے ٹانگیں سیدھی نہ رکھ سکنے کی علامات نمایاں ہوتی جا رہی ہیں۔ اس بات کا سب کو علم ہے کہ کلکتہ کے ایک ڈاکٹر نے ان کے لئے پینسلین کا علاج تجویز کیا تھا۔ اس واقعہ کے بعد سنگھ کے دائرے میں اس موضوع پر کسی قسم کا تذکرہ ممنوع ہے اور اس معاملہ میں مزید کوئی اطلاع فراہم نہیں کی جا سکی ہے۔ مزید برآں گولوالکر شدید قسم کی بے خوابی کے مرض میں مبتلا ہیں اور رات کو بغیر دوا کی مدد کے ان کو نیند آنا بے انتہا مشکل ہو جاتا ہے۔

اپنی دوسری کامیابیوں کے علاوہ گولوالکر اپنے باقی مراٹھی ساتھیوں سے تعلیم کے میدان میں بھی بہت آگے ہیں۔ انگریزی زبان پر ان کو اچھی خاصی دسترس ہے اگرچہ کبھی کبھی وہ انوکھے اور غیر عام فہم الفاظ و محاورات کو استعمال کرنے کا لالچ چھوڑ نہیں پاتے۔ وہ بہت عمدہ ہندی بولتے ہیں جن میں سنسکرت کے الفاظ

کئے ہوئے الفاظ کی کثرت ہوتی ہے اور ان کا تلفظ بالکل صحیح ہے۔ اپنی انتھک کوشش سے انھوں نے انسانی چہرے اور نام یاد رکھنے میں جو مہارت حاصل کی ہے وہ تعجب خیز ہے۔ وہ گھنٹوں تک بہت قابلیت کے ساتھ ثقافتی و تمدنی مضامین پر بات چیت کرسکتے ہیں خصوصاً سنگھ کے نظریہ کی خوب وضاحت کرسکتے ہیں اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ اس تذکرے میں ان کی اپنی کوئی نئی جدّت نہیں ہوتی۔

ذاتی برتاؤ کے معاملہ میں بھی گولوالکر پر انگلی اٹھنا ایک مشکل کام ہے سوئم سیوکوں کے درمیان ان کی مقبولیت کا بڑا سبب یہ بھی ہے کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ بھی جو کہ ان کو اپنا رہنما تسلیم کرتے ہیں بالکل برابری کا سلوک کرتے ہیں۔ اتنی ذمہ داری سر پر ہونے کے باوجود یہ ایک تعجب خیز بات ہے کہ وہ غیر معمولی طور پر ہنس مکھ انسان ہیں اور مزاح ان کی طبیعت کا جز ہے۔ خالی اوقات میں لوگوں کے ساتھ مذاق کرتے ہوئے انھیں ہمیشہ دیکھا جاسکتا ہے۔

درحقیقت ان کی طبیعت کی شوخی کے پس پردہ ایک ایسی تیز اور بینی آنکھ اور فراست پوشیدہ ہے جس کو آسانی سے نہیں بھانپا جاسکتا۔ گولوالکر کی شخصیت میں جنسی محبت کے عنصر کا اندازہ اس وقت لگایا جاسکتا ہے جب کہ وہ "محبت اور باہمی ربط" کا ذکر بار بار اپنی بات چیت میں کرتے ہیں اور کبھی بار گلے مل کر و سینہ سے لگا کر اس جذبہ کا اظہار کرتے ہیں۔ حال ہی میں ایک خط میں انھوں نے اپنا افسوس ظاہر کیا تھا کیونکہ وہ اپنے کلکتہ کے قیام کے دوران مجھ سے گفتگو کے لئے وقت نہیں نکال سکے تھے۔ انھوں نے لکھا تھا کہ انھیں یہ علم نہیں تھا کہ مجھے ان سے کچھ بہت اہم بات چیت کرنی ہے۔ خط کے آخر میں انھوں نے کچھ ہمدردانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے بتایا تھا کہ "جیسا کہ تم جانتے ہو میں ہمیشہ ہی ایسے موقعوں کے لئے اپنا دوپہر کا کھانا چھوڑ سکتا ہوں، اور کچھ وقت اکیلے میں نکال سکتا ہوں۔ ایسا میں اس روز بھی کرسکتا تھا" گو کہ کلکتہ کے اس روز کے ان کے پروگرام کے متعلق مجھے پورا علم تھا مجھے معلوم تھا کہ دوپہر کو بارہ بجے کے بعد انھوں نے اپنا کھانا نوش کیا اور بعد ازاں تین بجے تک سوئے۔ وہ آسانی سے یہ لکھ سکتے تھے کہ وہ اپنا سونے والا وقت گفتگو کے لئے وقف کرسکتے تھے۔ لیکن یقیناً انھیں یہ خیال آیا ہوگا کہ ایسا لکھنا ایک سادھو کی طرح رہنے والے آدمی کیلئے مناسب نہیں رہے گا۔ جہاں تک میرا خیال ہے حقیقت یہ ہے کہ مشرقی خطہ کے سربراہ جو کہ ان کے دائیں بازو ہیں یہ نہیں چاہتے تھے کہ میری ان سے ملاقات ہو کیونکہ میں ان کے خلاف کچھ شکایتیں کرچکا تھا۔

شری گولوالکر کے متعلق ایک اہم سوال جو اٹھتا ہے اور جس کا جائزہ لیا جانا چاہیئے وہ یہ ہے کہ کیا وہ روحانی رجحانات رکھنے والے انسان ہیں؟ سنگھ کے لوگ فوراً اس کا جواب "ہاں" کہہ کر دیں گے۔ سنگھ کے رہنما عموماً یہ کہتے ہیں اور سوئم سیوک یہ اعتبار کرتے ہیں کہ آر ایس ایس میں شامل ہونے سے پیشتر ہی گولوالکر نے اپنی زندگی راماکرشنا مشن کی خدمت کے لئے وقف کردی تھی۔ وہ یوگ کا ابھیاس کرتے ہیں، بہت کم کھاتے ہیں اور ایک درویشانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔

آج یہ بتانا مشکل ہے کہ راماکرشنا مشن کے زیر اثر شری گولوالکر درحقیقت کس حد تک سنیاسی بننے کے لئے قدم اٹھا چکے تھے۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ جب کبھی وہ کلکتہ آتے ہیں تو وہ بیلور مٹھ میں ضرور جاتے ہیں۔ جہاں تک یوگ کے ابھیاس کا تعلق ہے اگر وہ یہ کرتے بھی ہوں تو اس پر باقاعدہ عمل کرنے کے لئے ان کے پاس وقت نہیں ہوسکتا۔ دہلی میں ایک پریس کانفرنس میں انھوں نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ ایک بالغ آدمی جتنا کھانا عموماً کھاتا ہے وہ اس کی چوتھائی مقدار ہی اپنے کھانے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اُن کے مداح تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ وہ صرف ایک وقت ہی کھانا تناول کرتے ہیں۔ لیکن میرا اپنا تجربہ یہ ہے کہ دو مرتبہ ناگپور میں وہ ہمارے ساتھ بیٹھے ہیں اور دوپہر کا کھانا ۱۲ بجے و رات کا کھانا ۹ بجے کھایا ہے اس کے علاوہ حسب معمول اوقات پر چائے و ناشتہ بھی لیا ہے۔

اس کے باوجود یہ دعویٰ کرنا شائد صحیح نہیں ہے کہ اس طرح کی عام روزمرّہ کی زندگی گزارنے میں اور روحانی زندگی میں کوئی تضاد ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ شری گولوالکر جہاں بھی ہوں اپنی روزانہ کی پوجا پرارتھنا کے لئے وقت نکال لیتے ہیں ــــ میرا خیال ہے اس عادت کو وہ باقاعدگی کے ساتھ بہت عرصہ سے قائم رکھے ہوئے ہیں۔

روزمرّہ کی ان پابندیوں یا ان کے علاوہ دیگر اقسام کی رسومات (جو کہ وہ ادا کرتے ہوں اور جن کا مجھے علم نہ ہو) کے باوجود شری گولوالکر کی روحانیت کے متعلق جو بات شک و شبہ کو جنم دیتی ہے وہ ان کی حد درجہ کی اِنا ہے۔ یہی اِنا ہڈی پسلی کے اس انسان کی بہت سی کمزوریوں کی جڑ ہوتی ہے۔ آر ایس ایس کے سربراہ میں خود پسندی کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہے۔ کیونکہ ان کی اپنی جماعت میں کوئی شخص ان کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے کی ہمت نہیں کرسکتا۔ اس لئے وہ بڑی فراخدلی کے ساتھ اپنے ماتحت ساتھیوں پر بہت سی باتوں کا فیصلہ بلا خطر چھوڑ سکتے ہیں۔ لیکن اگر وہ کسی سوال پر اپنی رائے کا اظہار کردیں یا کسی طریق عمل کے متعلق اپنا فیصلہ صادر کردیں تو ان کے لئے یہ اپنی عزت کا سوال بن جاتا ہے کہ اس پر عمل درآمد ہو۔

چونکہ پبلسٹی کے نشہ کے سرور کا تجربہ انھیں حال ہی میں ہونا شروع ہوا ہے، سنگھ کے رہنما کو اپنی فوٹو کھنچوانے کا شوق لگ چکا ہے اور سابقہ سربراہ ڈاکٹر ہیڈگوار کی مثال کے بالکل برعکس وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ان

کی تصویروں کی اشاعت دور دور تک ہو۔ چین سال پیشتر جب کر وہ کلکتہ کا دورہ کر رہے تھے کچھ پرچارک ان کے لئے کہیں سے ایک سنہری سنگھاسن لے کر آئے اور دفتر کی عمارت کے صحن میں ایک کونے میں اس کو رکھ دیا۔ اپنے بہترین کپڑے زیب تن کرنے کے بعد گولوالکر اس پر بیٹھ گئے اور اس کے دونوں طرف دو پرچارک ان کے باڈی گارڈ کی طرح کھڑے ہو گئے۔

جس وقت ایک تیسرے پرچارک نے ان کی تصویر کھینچنے کے لئے اپنا کیمرہ تیار کیا ہی تھا کہ ایک مقامی سوئم سیوک دفعتہً وہاں آگیا اور اس نے یہ سب تماشہ ہوتے دیکھ لیا۔ اس نوجوان نے وہاں اسی وقت ایک مشکل کھڑی کر دی۔ اُس نے اِن پرچارکوں کو چیلنج کیا کہ "وہ کھل کر بتلائیں کہ کیا وہ ہمارے گورو جی کو ایک راجہ بنانا چاہتے ہیں؟" اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ حسب توقع تھا۔ جماعت نے اپنا ایک مخلص سوئم سیوک ہاتھ سے گنوا دیا لیکن جماعت کے سربراہ نے نہ تو وہ سنہری سنگھاسن ہاتھ سے جانے دیا نہ ہی فوٹو کھنچوانے کا وہ موقعہ۔

جب لوگ ان کی تعریف کرتے ہیں تو گولوالکر خوش ہوتے ہیں کئی مرتبہ تو بے حد عامیانہ خوشامد بھی ان کو ناپسند نہیں آتی۔ اگست ۱۹۴۹ء میں مختلف صوبوں کے تقریباً تیس نمائندے اُن سے ناگپور میں ملے تاکہ آر ایس ایس کے لئے دستور کے مسودہ کے متعلق بات چیت کی جائے اور پھر اسے منظور کرا یا جائے۔ اس مسودے میں ایک دفعہ اِس قسم کی تھی کہ سرکاریواہ (جنرل سکریٹری) کیندریہ کاریہ کاری منڈل یا مرکزی مجلس عاملہ کو نامزد کرے۔ جس وقت اس دفعہ کو منظور کر لیا گیا تو ایک شخص نے کہا کہ "اب سرکاریہ واہ کا عہدہ کانگریس کے صدر کے ہم پلّہ ہو گیا"۔

اس پر شری گولوالکر نے مزاحیہ انداز میں کہا "اچھا تو اب میں اس سارے سلسلہ سے مکمل طور پر باہر ہو گیا"۔ فوراً ہی ایک پرچارک نے بڑے خوشامدانہ انداز میں وضاحت کی "اب آپ مہاتما گاندھی کا رتبہ حاصل کر چکے ہیں"۔

گولوالکر اس فقرے پر بے انتہا خوش ہوئے لیکن یہ محسوس کر کے کہ کہیں وہ اپنی خوشی کو پوشیدہ رکھنے میں ناکامیاب ہو جائیں انھوں نے زور سے ہنسنا شروع کر دیا اور اس کے جواب میں اپنی طرف سے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ اس نئے زُمرے میں سربراہ کا کیا رتبہ ہوگا یہ اب سب کی سمجھ میں آگیا تھا۔ نیا دستور سرسنگھ چالک کو صرف ایک آئینی بلند ترمرتبہ دیتا ہے لیکن اس کا ذکر بڑے خوشامدانہ اور احمقانہ انداز میں آر ایس ایس فلسفی اور رہبر کے القاب سے کرتا ہے۔

۱۹۴۷ء میں اتنی بلندیوں سے آر ایس ایس کے اس قدر زوال کے لئے گولوالکر کی انا بھی بہت حد تک ذمہ دار ہے۔ اس سال سے قبل سنگھ کی پالیسی یہ رہی تھی کہ وہ کہیں بھی ارادتاً اپنی قوت کا مظاہرہ کر کے غیر ضروری طور پر مشکلات کو دعوت نہیں دیتا تھا لیکن اس سال نومبر میں اس انداز کو بدل دیا گیا۔ دستور ساز اسمبلی کا ہند کی راجدھانی میں اجلاس ہو رہا تھا۔ خوش و خرم کانگریسی ممبران، شاد ممبرانِ اسمبلی اور متحیر بین الاقوامی سفیر نئی دہلی میں ہر طرف مصروف نظر آ رہے تھے اور آئین کی ہر دفعہ کو جو کہ دستور میں شامل کرنے کے لئے ایوان میں پیش ہوئی تھی کانگریس کا حامی اخبار سورج پریس بڑی شان و شوکت کے ساتھ شائع کر رہا تھا۔ کانگریس کے نظریئے کے مطابق نئے ہندوستان کی تعمیر کی تیاریوں کا بڑا زور شور تھا۔ گولوالکر جو یہ سب کچھ فاصلہ سے دیکھ رہے تھے اچانک بغیر اعلان کئے دہلی پہنچ گئے۔ اور راجدھانی کے بیچوں بیچ پنجاب، یو پی، اور دہلی کے ہزاروں باوردی سوئم سیوکوں کی بہت بڑی ریلی کے سامنے انھوں نے تقریر کی۔ دہلی شہر کی تقریباً تمام اہم شخصیتوں کو مدعو کیا گیا تھا کہ وہ اس تماشے کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔

اس واقعہ سے ایک سنسنی پھیل گئی۔ جہاں کانگریس کے ممبران اسمبلی اور مقامی کارکنان غصہ سے لال پیلے ہو رہے تھے وہیں ان کے رہنماؤں کے دماغوں پر تشویش و اضطراب کے بادل چھا گئے تھے۔ آر ایس ایس آخر کرنا کیا چاہتی ہے؟ اس کے اتنے سوئم سیوک ملک کی راجدھانی میں کیوں جمع ہو رہے ہیں؟ کیا مقابلہ و کشمکش کے لئے یہ سب تیاری مکمل کی جا رہی ہے؟ پورے روز دستور ساز اسمبلی کے اجلاس میں ہی تشویش کن سوالات ممبران کے ذہن میں گھومتے رہے اور اس دوران گولوالکر اپنے آدمیوں کے درمیان گھرے بیٹھے رہے اور اپنے ساتھیوں کے منہ سے اس قسم کے خوشامدانہ الفاظ سن کر خوش ہوتے رہے۔ "اب ان کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ اصل رہنما کون ہے اور کس کی پشت پر اتنی زبردست قوت موجود ہے"۔

اب کانگریس جماعت کی قومی پیمانے پر پروپیگنڈہ مشینری حرکت میں آنی شروع ہوئی اور اس نے جہاد چھیڑ دیا۔ سنگھ کو ایک فاشسٹی تنظیم کا لقب دیا گیا اور جب چند ماہ بعد گاندھی جی کا قتل ہوا تو اس بھیانک کام کیلئے آر ایس ایس کو مجرم گردانا گیا گو کہ حکومت کا ہر فرد یہ جانتا تھا کہ سب کے سب اس ضمن میں دروغ بیانی سے کام لے رہے ہیں۔

ایک بات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ اہم ریلی صرف ذاتی انا کی تسلی کے لئے منعقد کی گئی تھی۔ اس تماشے کو عملی شکل دینے سے پیشتر گولوالکر نے یہ غور نہیں کیا تھا کہ اگر اتنا عظیم مظاہرہ بالآخر کسی تصادم کی شکل اختیار کر لے گا تو وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیں گے یا نہیں۔ اسی لئے یہ امر تعجب خیز

نہیں ہے کہ جس وقت چیلنج کی گھڑی سامنے آگئی تو ان کی ہمت نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ یہ بات آج ہر فرد کے علم میں ہے کہ اُس وقت نسگھ پر جتنے حملے کئے گئے ان کو وہ چپ چاپ برداشت کرتا رہا اور ان کے اثرات سے وہ آج تک سنبھل نہیں پایا ہے آئندہ بھی شائد ہی کبھی سنبھل سکے۔

شری گولوالکر کے بارے میں ایک بہت اہم سوال جوکہ قابل غور ہے وہ ان کے ذاتی کردار کا ہے۔ اگر اس سوال کا جواب دو ٹوک ان کے خلاف یا حق میں سیدھا سادہ دیا جاسکتا تو مجھے اس سوال کے اٹھانے کا مجاز ہی نہیں ہوتا کیونکہ اس جماعت کے ساتھ میرے پچھلے ڈھائی برس کے تعلق کے دوران آر ایس ایس سربراہ کے ساتھ میرا ذاتی رابطہ بہت کم مرتبہ ہی ہوا ہے۔ بلاشبہ میں نے ایک ایسے شکست خوردہ و برہم مراٹھی پرچارک کے متعلق یہ سنا ہے کہ وہ گولوالکر کا موازنہ سنگھ کی ایک بدنام زمانہ شخصیت کے ساتھ کرتے ہیں لیکن اس قسم کی تہمتیں جوکہ سنی سنائی باتوں پر مبنی ہوتی ہیں مسلّم شہادت کا درجہ نہیں پاسکتیں۔ اسی وجہ سے مجھے صرف اسی سوال پر بحث کا مجاز ہے آیاکہ آر ایس ایس کے سربراہ کیا ہیچ شک و شبہ سے اس قدر بالاتر ہیں کہ ان کے متعلق اس نوعیت کا سوال اٹھانا ہی اپنے آپ میں قابل مذمت ہے۔

ناگپور کی مذکورہ میٹنگوں میں سے ایک میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ سوئم سیوی کا سنگھ بھی قائم کیا جائے۔ دیگر تجاویز کی طرح یہ تجویز بھی جماعت کے ہائی کمانڈ کی طرف سے سامنے آئی تھی۔ تجویز یہ تھی کہ آر ایس ایس کے ہم پلہ صرف عورتوں کی ایک تنظیم کی بنیاد بھی ڈالی جائے اور اس تنظیم کی کچھ عہدیدار عورتیں ہی آر ایس ایس کے سربراہ کے ساتھ رابطہ قائم رکھیں اور وقتاً فوقتاً ان سے ہی ذاتی طور پر ہدایتیں حاصل کریں۔ شری گولوالکر نے خود ہی اس بات کا انکشاف کیا کہ ایک "معقول شخصیت" یعنی ایک مراٹھی لڑکی نے ان کے ساتھ اس مقصد کے لئے بات چیت کی ہے۔ انھیں نے یہ بھی کہا کہ چند وجوہات کی بنا پر وہ اس مرحلہ پر اس عورت کا نام نہیں بتانا چاہتے معمول کے بالکل برعکس گولوالکر نے خود فیصلہ لینے کی بجائے میٹنگ میں اس تجویز پر رائے مانگنا مناسب سمجھا۔ شرکت کرنے والے ممبران میں سے بیشتر نے اس کے حق میں اپنی رائے کا اظہار کیا کیونکہ ان کا خیال یہ تھا کہ عورتوں کے محاذ پر کمیونسٹوں کی تحریک کو کمزور کرنے کا یہ صحیح نسخہ ہے۔ ایک آواز مخالفت میں اٹھی۔ اعتراض کرنے والے صاحب مسٹر بھڑے تھے جوکہ آر ایس ایس کی پونا شاکھا کے ناظم تھے۔ فوراً ہی وہ اپنی جگہ پر کھڑے ہوگئے اور تیس سیکنڈ میں ہی بڑی تیزی سے مراٹھی زبان میں اپنا اعتراض بتا کر اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ اس خفیف سی تقریر کے جوش نے سب کو حیرت میں ڈال دیا۔ فطرتاً یہ شخص خاموش اور شانت طبیعت کا مالک تھا۔ اس کی عمر تقریباً ۵۰ سال تھی اور اس کی اس چھوٹی سی تقریر میں غصہ و خفگی کی لہر خوب نمایاں ہوکر سامنے آئی تھی۔ اسے شری گولوالکر کا عورتوں کے ساتھ سیدھا رابطہ ہونے پر سخت اعتراض تھا اور اس کا خیال تھا کہ جو کچھ اب تک ہوچکا تھا وہی کافی قابل مذمت ہے تین اور چار آوازوں نے ایک ساتھ سوال کیا "کیوں؟" اس نے اس پر صرف اتنا جواب دیا "میں اور کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا لیکن اپنی رائے نہیں بدلوں گا۔"

کسی کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ معاملہ اس طرح پیچیدگی اختیار کرلے گا۔ اسی وجہ سے بہت سے لوگ تیزی سے آگے آگئے اور اس کا بازو پکڑ کر یا اس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ کر اس سے اپنا اعتراض واپس لینے کی ضد کرنے لگے۔ لیکن اس کے باوجود بھڑے بلا حرکت اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ اس کے چہرے پر اب بھی غصہ کی غیر معمولی سختی نمایاں تھی اور اس کی آنکھیں مضبوطی کے ساتھ اپنے پاؤں کے انگوٹھے پر جمی ہوئی تھیں۔ یہ خاموشی اس قدر ناقابل برداشت تھی کہ اس سے گھبرا کر گوروجی نے اپنی طرف سے ایک مزاحیہ جملہ کہا "انھیں اس بات کا خوف ہے کہ میں کہیں لڑکیوں کے ساتھ محبت میں گرفتار نہ ہو جاؤں۔" یہ کہہ کر وہ شرارت بھری نظر پھینکتے ہوئے اچانک مسکرا دیئے۔

ایک ایسے شخص کے چہرے پر جس کا اتنے لوگ احترام کرتے ہوں یہ مسکراہٹ کا انداز کچھ عجیب سا معلوم ہورہا تھا۔ مجھے اس مسکراہٹ سے شدید صدمہ پہنچا۔ جذباتی سطح پر میرے ذہن میں وہ دبلا پتلا داڑھی سے آراستہ چہرہ تقدس و پاکیزگی کی عظیم بلندیوں کا آئینہ دار تھا۔ میں خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ اس چہرے کی رگ پیشیاں اور ہونٹوں پر وہ مونچھیں اس قسم کا شرارت آمیز انداز بھی اختیار کرسکتی تھیں۔ اس نظارے نے میرے تحت الشعور کی گہرائیوں میں کہیں کوئی گہری چوٹ لگائی۔ کیونکہ بعدازاں بہت دنوں تک جب کبھی میں نے کسی پاک و متبرک چیز کے بارے میں سوچا وہ چہرہ اور اس کا انداز فوراً میرے ذہن میں ابھر کر سامنے آگیا اور وہی سین میرے پیچھے سائے کی طرح لگا رہا۔ یہاں تک کہ تقدس کا نظریہ خود مجھے بالکل خیالی اور حقیقت سے دور محسوس ہونے لگا۔

لیکن یہ تو میں اپنے اصلی مضمون سے کچھ بھٹک گیا۔

غلط فہمی یا پرواز تخیل کے علاوہ بھی شری گولوالکر کے کردار کے متعلق ایک بات ایسی ہے جس کی وجہ سے ان کی پختگی کردار کے متعلق اعتقاد متزلزل ہوا ہے وہ بات یہ ہے کہ وہ کچھ مشتبہ چال چلن کے مراٹھی پرچارکوں کے ساتھ بے انتہا نرمی کا برتاؤ کرتے ہیں جب کہ درحقیقت وہ لوگ اس قسم کے ہیں کہ کچھ فعلوں کو دیکھتے ہوئے ان کو گریبان سے پکڑ کر بالکل باہر نکال دینا چاہیئے۔ وہ لوگ گولوالکر کے پرانے واقف کار ہیں اور اس جماعت کے اہم

رہ نماؤں کو اوپر سے نیچے تک خوب اچھی طرح جانتے ہیں جب ایسے لوگوں کی شدید ترین غلطیوں کو نظر انداز کیا جاتا ہے تو نظر بین آدمیوں کے ذہن میں ایک شک پیدا ہوتا ہے کہ گو لوا لکر در حقیقت ان لوگوں کے ساتھ نپٹنے کی جرأت نہیں رکھتے بالکل اسی طرح جیسے کہ وہ کچھ پرچارکوں کی شان و شوکت کو نہیں روک سکتے اور ان کے خلاف سخت کارروائی کرنے کی ہمت نہیں رکھتے کیونکہ خود بھی وہ اسی نمائش اور آرائش کے مرض میں مبتلا ہیں۔

باب تین

تیسری مرہٹہ سلطنت

میرا ایک ایسا دوست جو کہ میری سنگھ میں شرکت کے لئے بہت حد تک ذمہ دار تھا اس سال کے شروع میں کلکتہ آیا تھا تاکہ وہ سنگھ کے ہفت روزہ جریدہ "سواستیکا" کو اپنے چارج میں لے لے۔ اپنے ضلع میں وہ آر ایس ایس کا سب سے سرگرم کارکن رہ چکا تھا۔ وہ صوبے کے ہیڈ کوارٹرس میں تقریباً تین ماہ تک رہ کر سنگھ کے رہ نماؤں کی کارروائیاں بڑے نزدیک سے دیکھ چکا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس جماعت میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو کہ اس کے اعتماد کو اب برقرار رکھ سکے۔ اس کے برعکس اس میں بہت سی ایسی باتیں موجود ہیں جو کہ سماجی کارکنان پر سے کسی کا بھی اعتبار اٹھا دینے کے لئے کافی ہیں۔ اس باب کا چونکا دینے والا عنوان ان صاحب کے دماغ کی جدت کا نتیجہ ہے وہ اب شمالی ہندوستان میں آر ایس ایس کی تنظیم کو "تیسری مرہٹہ سلطنت" کے عنوان سے یاد کرتے ہیں۔ مرہٹوں کی پہلی سلطنت کی بنیاد شیواجی نے ڈالی تھی اور دوسری کا بانی باجی راؤ اوّل تھا۔

سابقہ دس سال کے تجربہ کا میرا نتیجہ یہ ہے کہ آر ایس ایس پر مرہٹہ بالادستی کے بہت سے الزامات لگائے جا سکتے ہیں اور وہ مختلف نوعیت کے ہیں۔ ان سب کی تفصیلات میں جانے کے بجائے جن میں سے بہت سی گہرائی سے دیکھنے پر شک و شبہ پر ہی مبنی کہلا سکتی ہیں گو کہ ان کو غیر ممکن نہیں گردانا جا سکتا۔ بہتر یہ ہے کہ پہلے کچھ بنیادی واقعات کا ذکر کر دیا جائے۔

آر ایس ایس کے نئے "جمہوری" آئین کے تحت بھی اس تنظیم کا سربراہ ایک مرہٹہ ہی ہے جس کو اس عہدے سے کسی بھی جمہوری طرز کی رائے شماری کے ذریعہ ہٹایا نہیں جا سکتا اور جسے اس طرح کا تیقن ہوتا ہے کہ وہ ہر بات کو کاٹ سکتا ہے یا ہر فیصلے کو منوا سکتا ہے۔ سربراہ یعنی سرسنگھ چالک کو اپنا جانشین نامزد کرنے کا حق ہے اور جب تک کوئی معجزہ ہی نہ ہو جائے وہ بہرحال اپنے بعد جانشینی کے لئے کسی دوسرے مراٹھی شخص کا ہی انتخاب کرے گا۔

سرکاریواہ یعنی جنرل سکریٹری ایک مرہٹہ ہیں اور اس طرح دیگر تمام عہدیداران جو کہ تعداد میں سات یا آٹھ ہیں ماسوا چند ایک کے سب کے سب مرہٹہ ہیں مستثنیٰ صرف شری مہاویر ہیں جو کہ مرحوم بھائی پرمانند کے فرزند ہیں۔ بھائی پرمانند پنجاب کے ایک مشہور رہ نما رہے ہیں۔ آر ایس ایس میں شری مہاویر بودھک پرمکھ کے عہدے پر ہیں۔ ان کا کام یہ ہے کہ وہ تنظیم کے تحت جو مذاکرات و مباحثے ہوتے ہیں ان کی سربراہی کریں۔ وہ خود بھی ایک پروفیسر ہیں اور اپنے صوبے کے سوئم سیوکوں پر ان کا کافی اثر ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک وہ ایک مراٹھی پرچارک کی زیر نگرانی صوبہ کے معاون پرچارک تھے۔ ان کے اس عہدے کی وجہ سے سنگھ کے سربراہوں کو کچھ پریشانی تھی جس کی وجہ سے انھیں اب مرکزی تنظیم میں بھیج دیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ عزت و مرتبہ کے لحاظ سے ان کو ایک بڑا عہدہ عطا کیا گیا ہے لیکن ہر مقام پر عملی کاموں سے ان کا جو براہ راست تعلق تھا وہ ختم کر دیا گیا ہے۔ اپنے موجودہ عہدے میں انھیں دوسرے صوبوں میں دورہ کرنے کا کوئی موقعہ نہیں مل سکتا۔ جب کہ میں دو بار میٹنگوں میں شرکت کے لئے ناگپور گیا تو وہاں ان سے ملاقات نہیں ہوئی کیونکہ وہ وہاں آئے نہیں تھے۔

آر ایس ایس کی مرکزی انتظامیہ کو کیندریہ کاریہ کاری منڈل کے نام سے پکارا جاتا ہے اور اس کے تمام اراکین کو جنرل سکریٹری ہی نامزد کرتا ہے۔ کم از کم اب تک اس نامزدگی کے نتیجہ کے طور پر مراٹھی ممبران کی بہت بڑی اکثریت ہی اس میں آتی رہی ہے۔ اس نامزدگی کے لئے جو فارمولا عمل میں لایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ تمام عہدیداران، اہم پرچارک اور سب صوبوں کے سنگھ چالک ہی اس انتظامیہ میں نامزد کئے جاتے ہیں اس فارمولے کے تحت مہاراشٹر، کرناٹک، برار، بمبئی شہر اور دیگر ایسے چھوٹے علاقوں کو بھی صوبے ہی میں گردانا جاتا ہے اور ان سبھی جگہوں سے مرکزی انتظامیہ میں مراٹھی سنگھ چالک ہی نامزد ہو کر آتے ہیں۔

غیر مراٹھی صوبوں کے متعلق مجھے تفصیل سے علم نہیں ہے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ وہاں سے چند غیر مراٹھیوں کو بھی نامزد کیا جاتا ہوگا۔ جہاں تک مغربی بنگال کا سوال ہے سنگھ چالک کے انتخاب کو غیر معین عرصہ کے لئے ملتوی کر دیا گیا ہے کیونکہ "آج کل کوئی مناسب آدمی اس عہدے کے لئے دستیاب نہیں ہو سکا ہے"۔ ایسے صوبوں میں جہاں کہ ابھی کم اثر ہے اور ممبران کی تعداد ایک [illegible] ہے مثلاً اڑیسہ

اور آسام میں، کوئی سنگھ چالک نہیں ہے۔ اسی وجہ سے کیندریہ کاریہ کاری منڈل میں ان کو نمائندگی نہیں مل سکی ہے۔

اب جہاں تک "اہم پرچارکوں" کا سوال ہے وہ کم و بیش صرف مراٹھی پرچارک ہی ہیں۔ اس فارمولے کے تحت آر ایس ایس کی مرکزی انتظامیہ میں ملک کے تمام صوبوں کی نمائندگی صرف نام کے لئے ہے اور اس کی تشکیل میں غیر مراٹھیوں کا حصہ اتنا ہی ہے جتنا کہ ناگپور اور پونا کی میونسپل کمیٹیوں میں دیگر شہروں کے باشندوں کا ہو سکتا ہے۔

کیندریہ کاریہ کاری منڈل کے بعد کیندریہ پرتی ندھی سبھا کا وجود ہے۔ اس سبھا کی حیثیت ویسی ہی ہے جیسی کہ انڈین نیشنل کانگریس میں اے آئی سی سی کی۔ اس میں کل نمائندوں کی تعداد آج کل ۲۰۰ و ۳۰۰ کے درمیان ہے جن میں مراٹھیوں کی مکمل اکثریت ہے۔ یہ سب ان صوبوں سے آئے ہیں جہاں کہ انتخاب برائے نام ہے اور درحقیقت وہ نامزدگی کا ہی دوسرا نام ہے۔ لیکن اگر کچھ عرصہ بعد دیگر صوبے بھی اس سارے کھیل کو سمجھ لیں گے تو اِن نمائندوں کا منتخب ہو کر آنا بہت مشکل ہو جائے گا اور مراٹھی صوبوں میں نمائندوں کی تعداد کی خاطر جو ہیر پھیر کا طریقہ استعمال کیا جائے گا وہ دوسرے صوبوں میں کئی نئی پیچیدگیاں پیدا کر دے گا۔ شاید ذہن میں اس خدشہ کی موجودگی کے باعث ہی گولوالکر نے پرتی ندھی سبھا کے پہلے اجلاس میں ہی یہ فرمایا تھا کہ "آئین کو اپنا غلام بنانا چاہیئے بجائے اس کے کہ ہم خود آئین کے غلام بن جائیں۔" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ حکم نامہ کم از کم کچھ عرصہ کے لئے تو اپنا جادو قائم رکھے گا۔

پرچارکوں کا یہ گروہ ہی آر ایس ایس کے آہنی بازوؤں کا کام کرتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے ذریعہ مرکز اپنی پالیسی پر عمل درآمد کراتا ہے۔ پورے ملک میں سنگھ کے تمام اہم مرکزوں میں وہی سربراہوں کا کام انجام دیتے ہیں۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت کے دور میں تمام سول سروس کے افسران یوں تو برابر تصور کئے جاتے تھے لیکن عملی طور پر انگریز افسران اور ہندوستانی افسران میں بہت بڑا فرق موجود تھا اسی طرح آر ایس ایس کی تنظیم میں ہر جگہ مراٹھی پرچارکوں کے ہاتھ میں ہی ساری طاقت مرکوز ہے۔ صوبوں کے ناظموں کی حیثیت سے صرف مراٹھیوں کو ہی منتخب کیا جاتا ہے گو کہ ابھی کچھ عرصہ ہوا کچھ مجبوریوں کے تحت مغربی بنگال کے معاملہ میں اس پالیسی کو نظر انداز کر دیا گیا۔ سنگھ کے اوپری سطح کے رہنماؤں کی رائے یہ ہے کہ مغربی بنگال میں سنگھ کی موجودہ کمزوری کی وجہ سے پورے ملک میں سنگھ کی کارروائیوں پر برا اثر پڑ رہا ہے اور چونکہ ایک بنگالی پرچارک کا صوبے کے ناظم کی حیثیت سے تقرر وہاں اس

کام کو آگے بڑھانے میں مددگار ثابت ہوگا اس لئے نام نہاد ناظم کے طور پر وہاں ایک بنگالی پرچارک مقرر کر دیا گیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ مغربی بنگال میں ایک اہم مراٹھی شخصیت کو مشرقی زون کے منتظم کے عہدے پر فائز کر دیا گیا ہے جس کا صدر مقام کلکتہ طے کیا گیا ہے۔ عملی طور پر اس کا نتیجہ یہ ہے کہ صوبہ کا ناظم ایک ناکارہ اکائی بن گیا ہے کیونکہ اسے اس امر کا علم ہے کہ وہ چھوٹے سے چھوٹا کام بھی بغیر پورو انچل پرچارک کے حکم کے پورا کرانے کا اہل نہیں ہے۔ پورو انچل پرچارک مقرر کرنے کے بعد ہائی کمانڈ نے آسام کے ناظم کی حیثیت سے ایک پنجابی پرچارک کو نامزد کر دیا ہے گو کہ اس سے پیشتر آسام میں اس قسم کا کوئی پرچارک موجود نہیں تھا۔ آسام میں آر ایس ایس کے ممبران کی تعداد نفی کے برابر ہے۔ اسی وجہ سے یہ طے کیا گیا ہے کہ وہاں بلا خوف و خطر ایک غیر مراٹھی کو نامزد کیا جا سکتا ہے۔ مزید برآں پنجابی پرچارک بھی آخرش پورو انچل پرچارک کے تحت ہی تو کام کرے گا۔

آر ایس ایس کی شاخوں کی تنظیموں میں سنگھ چالک اور کاریہ واہوں کے عہدے انتظامیہ چالاکیوں کے بڑے شاندار نمونے پیش کرتے ہیں۔ ان عہدوں پر تعینات رہنماؤں کے پاس کسی قسم کی طاقت موجود نہیں ہے۔ ہر جگہ ان عہدوں پر مقامی آدمیوں کو ہی مقرر کیا گیا ہے۔ عوام کے سامنے آر ایس ایس کے نمائندوں کی حیثیت سے ان کو ہی رہنماؤں کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ وہ جلسوں سے خطاب کر سکتے ہیں اور ریلیوں میں سلامی لے سکتے ہیں اور اس طرح بڑی ہوشیاری کے ساتھ ان کے پس پشت مراٹھی پرچارکوں کو نگاہوں سے اوجھل رکھا جاتا ہے گو کہ اصل طاقت ان مراٹھیوں کے ہاتھوں میں مرکوز ہوتی ہے۔

ایسے غیر مراٹھیوں کو عوام کے سامنے پیش کرنا جن کے ہاتھ میں اصل طاقت موجود نہیں ہے سنگھ کے ہر دائرۂ عمل میں ایک اصول کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ جگہ کی کمی کے باعث میں ایک مثال پر ہی اکتفا کروں گا۔ مغربی بنگال میں آر ایس ایس نے بستو ہارا سہائتا سمیتی قائم کی۔ ایک بنگالی کو اس کا صدر منتخب کیا گیا، دوسرے کو اس کا جنرل سکریٹری اور تیسرے کو اس کا خزانچی۔ ان کے علاوہ دو مراٹھی نوجوان اور مقرر کئے گئے جن میں ایک کو آفس سکریٹری بنایا گیا اور دوسرے کو جوائنٹ سکریٹری۔ سمیتی نے اپنے روپیہ کو جمع کرنے کے لئے ایک بنک میں کھاتہ کھولا (جس میں اس وقت سات لاکھ روپیہ سے زائد اکٹھا ہو چکا ہے) اور ساتھ ہی یہ قاعدہ بھی بنا دیا گیا کہ اس کھاتے سے تین افراد کے پینل (Panel) میں سے کم از کم دو افراد کے دستخط ہونے پر ہی کوئی پیسہ نکالا جا سکتا ہے

اس پینل میں صدر اور خزانچی شامل نہیں کئے گئے ہیں۔ غرض یہ کہ یہ ان تین افراد پر مشتمل ہے (۱) مراٹھی آفس سکریٹری (۲) مراٹھی جوائنٹ سکریٹری، اور (۳) وہ بنگالی جنرل سکریٹری جس کے بارے میں بتایا جا چکا ہے کہ وہ ہر معاملے میں صدر کے ناظم کے ماتحت ہے اور بدیں وجہ وہ سب سے کم خطرناک غیر مرہٹہ ممبر سمجھا جا سکتا ہے۔

سنگھ کے صوبے کے دفاتر ایسے "محفوظ ایوانات" تصور کئے جاتے ہیں جہاں کہ غیر مراٹھی آدمیوں کے پاؤں جمانے کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی جاتی۔ ناگپور سے زیادہ سے زیادہ تعداد میں مراٹھوں کو لایا جاتا ہے اور ان دفاتر میں مقیم کر کے کچھ کام سونپ دیا جاتا ہے۔ ان کا اصل کام یہ ہوتا ہے کہ وہ طاقت کو اپنے ہاتھوں میں رکھیں اور دوسروں پر کڑی نگاہ رکھ سکیں۔ مقامی غیر مراٹھی پرچارکوں کو ضلعوں میں بھیج دیا جاتا ہے تاکہ وہ وہیں رہ کر کام کریں۔ دفتر اور رسد کا منتظم ہمیشہ ایک مراٹھی پرچارک ہی ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا خاکہ غیر مراٹھی صوبوں کے مرکزی دفتروں کا ہے لیکن یہ ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ ناگپور میں کل ہند مرکزی دفتر کے ہر شعبہ میں کلی طور پر مراٹھیوں کا ہی بول بالا ہے۔ آج کی تاریخ تک کسی بھی حیثیت میں ایک بھی غیر مراٹھی کو وہاں مقرر نہیں کیا گیا ہے اور غیر مراٹھی لوگ وہاں صرف اسی وقت داخل ہو سکے ہیں جب کہ کسی میٹنگ میں شرکت کے لئے ان کو ایک یا دو روز کی دعوت دی گئی ہو۔ وہاں دفتر کے معاملات گہرے راز کی باتیں ہیں اور وہ راز اتنی اہمیت رکھتے ہیں کہ کسی بھی صورت میں یہاں تک کہ تکلفاً بھی ان کے افشاں ہونے کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا۔

سنگھ کے ممبران اور اس کے ہمدرد حلقوں میں یہ خیال عام ہے کہ مستقبل کے لئے سنگھ کے پاس کچھ خاص منصوبے تیار ہیں اور ان میں سے سب سے اہم یہ ہے کہ پورے ہندوستان میں سیاسی اقتدار اس کے ہاتھوں میں آ جائے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس تنظیم کے بہت سے نچلی سطح کے اراکین قبل از وقت یہ اٹکلیں لگاتے رہتے ہیں کہ اس وقت کون کون سے مراٹھی رہنما کس کس اعلیٰ عہدے پر قابض ہوں گے۔ لیکن اونچی سطح کے رہنما اس قسم کے خیالی پلاؤ پکانے میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتے۔ وہ اس سے کہیں زیادہ ٹھوس کام کی طرف متوجہ رہتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ وہ مرہٹہ اراکین کو اہم کاموں کے لئے تیار کرتے رہتے ہیں، چاہے وہ اس کام کے لئے اہل ہوں یا نہ ہوں۔ ناگپور میں نمائندوں کی میٹنگوں میں اہم تجاویز کا مسودہ تیار کرنے کے لئے اور ان کو اجلاس میں پیش کرنے کے لئے گولوالکر نے جس شخص کو چنا ہے وہ اکولا کا ایک وکیل مسٹر سونی ہے۔ اس کی عمر ۵۰ سال کی ہے اور میں بذات خود اس شخص کو اس کی خوش اخلاقی کی وجہ سے بہت پسند کرتا ہوں۔ لیکن وہ اس اہم کام کے لئے کوئی مشہور ہستی نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ملک گیر شہرت کے مالک کاہن چند گوپال داس (جو کہ پہلے کراچی میں مقیم تھے) اور الہ آباد کے بیرسٹر نریندرجیت سنگھ جیسے وکیلوں کے سامنے یہ فعل بڑا طفلانہ لگتا ہے۔ وہ دونوں خاموشی سے یہ سب تماشہ دیکھتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ صحیح دانشوروں کی فہرست میں گنے جا سکتے ہیں اور جب وہ تقریر کرتے ہیں تو تعلیم یافتہ لوگ اس سے مستفید ہوتے ہیں۔

گولوالکر اس بات سے بخوبی واقف ہیں اس لئے وہ بڑی مضبوط ضد کے ساتھ سونی کو سامنے پیش کرتے ہیں جب کہ گولوالکر نے پہلی بار ان کا جلسہ میں تعارف کرایا تو انھوں نے فرمایا "یہ ہستی برار میں سب سے تیز قانونی دماغ کی مالک ہے"۔

یہ الفاظ اس وقت بہت ہی کھوکھلے معلوم ہو رہے تھے بعد ازاں جب میں نے اس سارے معاملہ پر غور سے سوچنے کی کوشش کی تو میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ آر ایس ایس اگر کبھی بھی اس ملک میں برسر اقتدار آ گیا تو سونی اس ملک کا اعلیٰ مشیر قانونی ضرور مقرر کیا جائے گا۔

اگرچہ سنگھ کا یہی طرز عمل ہے اور وہ اس سے کبھی نہیں ہٹے گا۔ لیکن اس کے رہنما اور چھوٹے پرچارک اس بات پر زور دیتے ہوئے کبھی نہیں تھکتے کہ سنگھ مختلف صوبوں کے ہندوؤں کے درمیان کوئی امتیاز نہیں کرتا اور اس سوال پر سنگھ میں مکمل اتفاق اور اتحاد موجود ہے۔ اس قسم کے پروپیگنڈے کا (جس کی حقیقت تجربے سے معلوم کی جا سکتی ہے) اثر یہ ہے کہ جو شخص اس بات کا اشارہ بھی کرتا ہے کہ تمام معاملوں میں مراٹھی اصحاب کو ترجیح دی جاتی ہے وہ فوراً نظروں سے گر جاتا ہے اور کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ سنگھ میں خلوص اور محبت کے جذبے کو مجروح کر رہا ہے۔ بے انتہا افسوس کے ساتھ (جو کہ مکمل طور پر بناوٹی ہوتا ہے) پرچارک ایسے شخص پر صوبائی تعصب کا الزام لگاتے ہیں اور اس قسم کا ماحول پیدا کرتے ہیں جیسے کہ وہ آدمی اپنے صوبے کے لئے کچھ خاص رعایتیں مانگ رہا ہو۔ اس قسم کے مکروہ پروپیگنڈے کا ہی یہ اثر ہے کہ بہت سے ایماندار ممبران بھی یہ بات صاف صاف کہنے سے جھجکتے ہیں کہ صوبائی تعصب درحقیقت سنگھ کے رہنماؤں کے عمل سے جھلکتا ہے نہ کہ ان اعتراضات سے جو کہ ان رہنماؤں کے اس منصوبہ بند فعل کے خلاف اٹھائے جاتے ہیں۔

اس سلسلے میں ایک دلچسپ سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا ان نچلی سطح کے پرچارکوں کو مختلف خطوں میں حکومت کرنے کے لئے بھیجتے وقت

ان کے فرائض کی نوعیت کے بارے میں خاص ہدایتیں دی جاتی ہیں۔ اگر یہ طریقہ اختیار کیا جاتا تو یہ یہ احمقانہ قدم ہوتا۔ مراٹھی پرچارکوں کو اس بات کی آزادی ہوتی ہے کہ وہ صوبائی ناظموں کی رہ نمائی میں روزمرہ کے تجربے سے طور طریقہ و عمل طے کریں وہ پہلے سے مقررہ علاقوں میں جاتے ہیں خود حالات کا مشاہدہ کرتے ہیں اور سبق حاصل کرتے ہیں۔ لیکن عموماً یہ ہوتا ہے کہ وہ مقامی حالات سے واقف ہونے کے بعد اپنی ہی ایما پر مراٹھی برتری کا پروپیگنڈہ شروع کر دیتے ہیں اور ان صوبوں کا مذاق اڑاتے ہیں جو کہ ہمت، فراست، تعلیم یا دیگر باتوں میں مرہٹہ رہنماؤں پر سبقت رکھتے ہیں۔ کچھ تو اس حد تک بڑھ جاتے ہیں کہ وہ ان کے رسم و رواج، خاندانی رہن سہن، وہاں کی عورتیں اور ان کے حسن و چال چلن تک پر تنقید کرنے سے باز نہیں آتے۔

اس قسم کے مباحثوں میں سنگھ کے بڑے رہ نما کبھی شرکت نہیں کرتے گو کہ جب بھی موقعہ ملتا ہے تو وہ ایک بات کا ذکر کرنا نہیں بھولتے بار بار وہ یہ ضرور دہراتے ہیں کہ "اتنے مراٹھی افراد نے اپنے گھروں کو چھوڑ دیا ہے اور شاندار مستقبل کو ٹھوکر مار دی ہے صرف اس لئے کہ وہ دیگر صوبوں کے ہندوؤں کو منظم کر سکیں"۔ وہ اس بات کی طرف اشارہ کرنا بھی نہیں بھولتے کہ ماضی میں بھی بھارت میں ہندو راشٹر قائم کرنے کے لئے ایسے مراٹھیوں نے بڑی عظیم قربانیاں دی ہیں۔ ایسے موقعوں پر صرف خوش اخلاقی کی وجہ سے بہت سے اصحاب ان قربانیوں کی حقیقی نوعیت کا تجزیہ اور ان کے پیچھے کارفرما اصل جذبے کا ذکر کرنے سے دریغ کرتے ہیں وہ اس حقیقت کی طرف بھی توجہ نہیں دلاتے کہ شیواجی کے عظیم نصب العین "ہندوی سوراج" کی شکل بعد ازاں مراٹھی تسلط کی ننگی ہوس نے کس طرح مسخ کر دی تھی۔

تکلیف دہ فرض کے زیر اثر میں نے بیشتر اس امر کا انکشاف کیا ہے کہ کس طرح سنگھ کے عظیم رہ نما اور تپے تپائے پرچارک اپنی روزمرہ کی زندگی میں سنگھ کے اصولوں کو بالائے طاق رکھتے جا رہے ہیں جب میرے سامنے پہلی مرتبہ اس قسم کی کچھ مثالیں آئی تھیں تو میں سوچ میں پڑ گیا تھا کہ ایسے لوگ جنھوں نے اپنی زندگی کو ایک عظیم مشن کے لئے وقف کر دیا تھا کس طرح اتنی آسانی سے اصولوں کو ترک کر دیتے ہیں۔ آج جب کہ میں بہت نزدیک سے اس مراٹھی تسلط کے جذبے کی نوعیت کو سمجھ سکا ہوں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھے اس کا سبب معلوم ہو گیا ہے۔ مراٹھی پرچارک جو کہ آج "تیسری مرہٹہ سلطنت" کے نصب العین کے حامی ہیں شاید اپنے دل میں سوچتے ہیں کہ عظیم اور شاندار اصولوں سے چپکے رہنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اپنے اصل ارادوں کو پوشیدہ رکھنے کے لئے جن چالاکیوں کا سہارا سنگھ کے رہ نما لیتے ہیں۔ آخرش اس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ اصولوں کے لئے ان کی عقیدت مفقود ہونے لگتی ہے اور آج حالت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ اگر ضرورت پڑے تو ان میں سے بیش تر رہ نما کسی بھی اصول کا گلا گھونٹ سکتے ہیں بشرطیکہ یہ فعل منظر عام پر نہ آئے۔

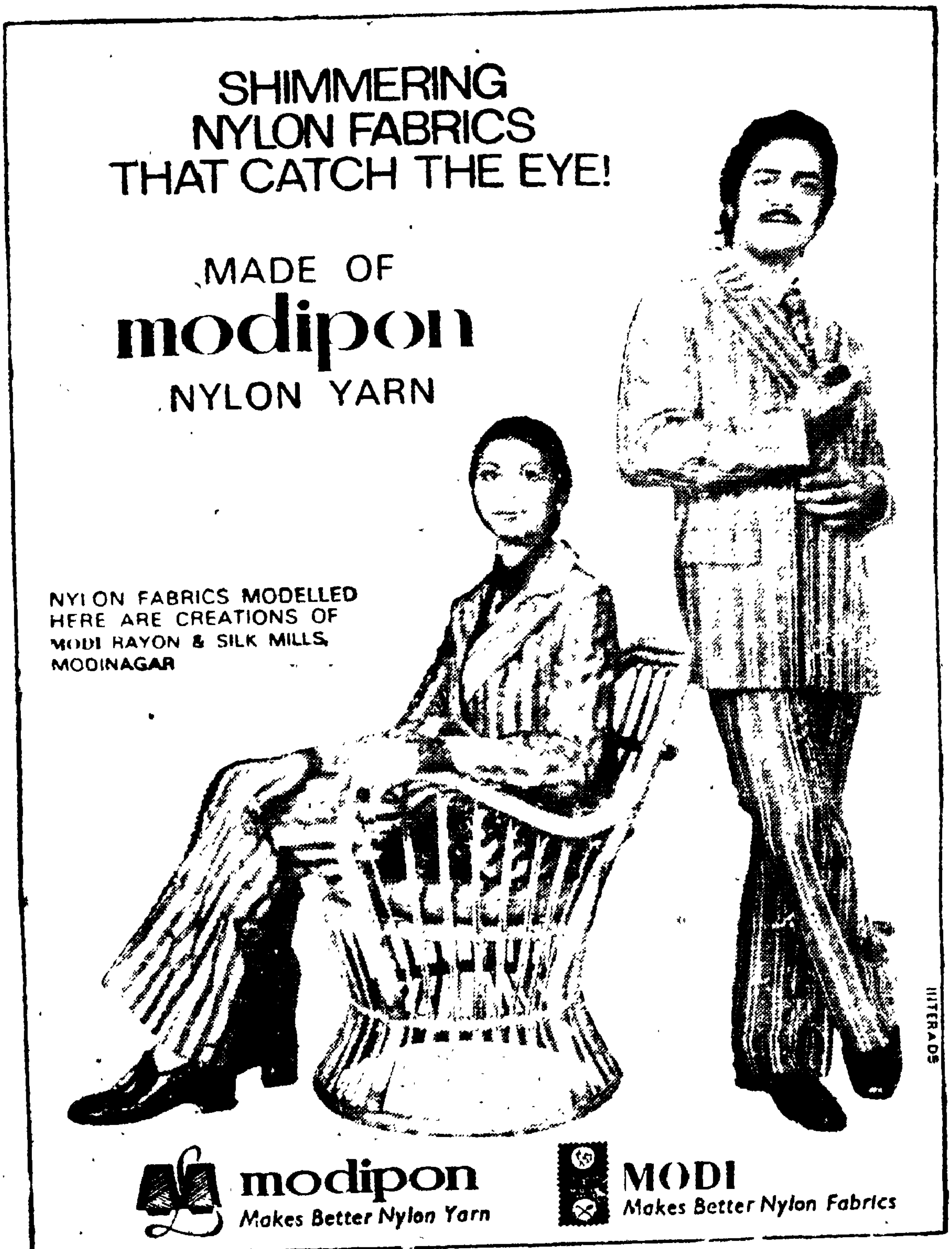
اسی سلسلے میں ایک سوال ابھی باقی ہے۔ کیا مرہٹوں کے ہاتھوں میں مکمل طاقت کے مرکوز ہونے کا سنگھ کے رہ نماؤں کے پاس کوئی جواز موجود ہے؟ میں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ وہ اس سلسلے میں کوئی صفائی پیش نہیں کرتے اور جس وقت آپ یہ سوال ان سے کرتے ہیں وہ آپ کی طرف سے اپنی توجہ فوراً ہٹا لیتے ہیں۔ دراصل وہ اس سے زیادہ کچھ کر بھی نہیں سکتے کیونکہ حقیقت پورے طور پر ان کی کسی صفائی کے بغیر ہی آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔

آر ایس ایس کے سربراہ کو میں نے جو پہلا خط تحریر کیا تھا اس میں دیگر باتوں کے علاوہ یہ الزام بھی بہت صاف الفاظ میں عائد کیا تھا اور پوچھا تھا کہ اس کو غلط ثابت کرنے کے لئے سنگھ کیا صفائی پیش کر سکتا ہے گو کہ میں نے اس میں اس الزام کو اس طرح پیش کیا تھا جیسے کہ یہ میری طرف سے نہیں ہے بلکہ سنگھ کے خلاف دوسرے لوگ ایسا الزام لگاتے ہیں اور اس لئے اس کا مناسب جواب انھیں دیا جانا چاہئے۔ میں نے تحریر کیا تھا:۔

"ان الزامات کے سلسلے میں خصوصاً آخری الزام کے متعلق میں سمجھتا ہوں کہ یہ اشد ضروری ہے کہ اہم سوئم سیوکوں کے پاس مناسب جواب ہونا چاہئے تاکہ جب ان کے سامنے یہ سوال پیش کیا جائے تو وہ خاموشی اختیار نہ کریں اور اگر ایسا نہیں کیا گیا تو مخلص سوئم سیوکوں کے خلاف بدنامی کا موقعہ دوسروں کے ہاتھ آ سکتا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ جواب اس نوعیت کا ہو کہ لوگوں کے بہت بڑے مجمع کی اس سے تسلی ہو سکے لیکن وہ جواب ایسا ہونا چاہئے، وہ کسی ہمدرد دوست کی ذاتی تشفی ضرور کر سکے۔"

شری گولوالکر نے تحریری طور پر جواب دینے سے گریز کیا اور خواہش ظاہر کی کہ وہ اس معاملہ میں مجھ سے اس وقت گفتگو کریں گے جب کہ میں ان سے ملاقات کروں گا۔ انھوں نے لکھا:۔

"خطوط اور جوابی خطوط کبھی بھی رو برو بات چیت کا بدل ثابت نہیں ہو سکتے۔ اور تمہیں تو علم ہے کہ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ ایک دوسرے سے کھل کر بات کریں اور تبادلۂ خیالات کے ذریعہ اس وقت تک باہمی مفاہمت، خلوص اور آپسی محبت کے پہلو تلاش کرتے


SHIMMERING
NYLON FABRICS
THAT CATCH THE EYE!
MADE OF
modipon
NYLON YARN
NYLON FABRICS MODELLED
HERE ARE CREATIONS OF
MODI RAYON & SILK MILLS,
MODINAGAR
modipon
Makes Better Nylon Yarn
MODI
Makes Better Nylon Fabrics

ہیں جب تک کہ ہم اپنے اپنے جداگانہ وجود کو بھلا نہ دیں اور تقسیم کرنے والے عوامل کو ختم کرکے اپنے اندرونی اتحاد کو حاصل نہ کر لیں۔"

اتنے اونچے فلسفیانہ نصب العین کو حاصل کرنا تقریباً ناممکن ہے لیکن اس کا اعلان اس مسئلے کو ٹالنے کے لئے گولوالکر کے لئے کارآمد تھا جس کی طرف ان کو متوجہ کرنا میرا اصل مقصد تھا۔ شائد انھوں نے جو کچھ تحریر کیا اس سے مراد یہ تھی کہ جب دو دلوں میں یگانگت موجود ہو تو باہمی اختلاف رائے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ خیر حقیقت میں ایسا ہو یا نہ ہو لیکن میں نے جو خط لکھا اس میں میری دلچسپی یہ تھی کہ معلوم کروں کہ مراٹھیوں کے ہاتھوں میں پوری طاقت مرکوز کرنے کی سنگھ کی پالیسی کا وہ کیا جواز پیش کر سکتے ہیں۔ اسی خیال سے میں نے ایک خط اور لکھا اور اس مرتبہ زیادہ صاف صاف لفظوں کا استعمال کیا۔

"پرم پوجیہ گوروجی !

مجھے ابھی ابھی آپ کا خط ٹھیک وقت پر ملا ہے لیکن یہ میری بدقسمتی ہے کہ میرے سامنے جو مشکلات ہیں ان کے حل کے لئے اس خط سے کوئی مدد نہیں مل سکی۔

آپ کا خط موصول ہونے کے بعد میں نے اور لوگوں سے ان لائنوں پر گفت و شنید کی، جن کی طرف آپ نے اشارہ کیا تھا۔ یعنی کہ میں نے کہا کہ جب دو دلوں میں باہمی ربط و محبت موجود ہو تو باقی سوالوں کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہ جاتی۔ اس بات کو سن کر ان کا جواب حسب ذیل تھا؛

سوئم سیوکوں کے درمیان باہمی محبت اور خلوص کی کبھی بھی کمی نہیں رہی ہے۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ رہ نماؤں کی طرف سے جوابی محبت کا جب اظہار ہوتا ہے تو ہمیشہ اس شکل میں ہوتا ہے کہ مرہٹہ لوگوں کو ہی ذمہ داری اور بھروسہ والے کاموں کے لئے منتخب کیا جاتا ہے؟"

شری گولوالکر کا ارادہ مجھ سے بحث کرنے کا نہیں تھا اور اس سے بچنے کے لئے انھوں نے مجھ پر یہ الزام لگایا کہ میں نفاق کے جذبات کا شکار ہو گیا ہوں جیسے کہ میرا مقصد اپنے صوبے کے کاز کو آگے بڑھانے کا رہا ہو۔ انھوں نے مجھے لکھا:

"میرے عزیز ہریندر، تمہارا ۱۳ تاریخ کا خط مجھے موصول ہو گیا۔ میں نے بہت یقین کرنے کی کوشش کی کہ صوبائی تعصب کا سنگھ پر الزام کچھ دیگر لوگوں کی طرف سے لگایا جا رہا ہے اور تم اس کی تردید کرنے کی کوشش کر رہے ہو جس میں تمہارے کہنے کے مطابق تمہیں مشکل پیش آ رہی ہے۔ لیکن اس موجودہ خط کو پورا پڑھنے کے بعد مجھے رنج کے ساتھ یہ یقین ہو گیا ہے کہ اصل میں یہ غلط فہمی تمہارے ہی ذہن میں موجود ہے۔ چاہے دوسروں کے دماغ میں یہ بات ہو یا نہ ہو۔ تمہارے جیسا نیک شخص اس غلط فہمی کا شکار ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب ہمارے بُرے دنوں کا آغاز ہو رہا ہے اور ہمیں کڑے امتحانوں میں سے گزرنا پڑے گا۔ لیکن ہم نے عہد کیا ہے کہ اس قدیم ملک کے عوام کو متحد کریں گے پھر کامیابی یا ناکامی کو ایشور کے ہاتھوں میں چھوڑ دیں گے اور جب تک ہمارا دل و دماغ اور شعور کسی صوبے کی بالادستی یا اس قسم کی بے ہودہ باتوں سے صاف ہے' ہمارا اپنا من شانت ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ تم اس نفاق کی عامیانہ ــــ بے حد عامیانہ بیماری سے محفوظ رہو گے کیونکہ اسی مرض نے پچھلے ہزار سال سے ہماری قوم میں گھن لگا رکھا ہے اور اب یہی مرض ہماری اس ٹمٹماتی ہوئی شمع کو بجھانے کے درپے ہے۔"

ان کے ۰۰۳ الفاظ پر مشتمل اس خط میں اسی قسم کی باتیں لکھی ہوئی تھیں۔ میں اسے پڑھ کر سکتہ میں آ گیا۔ پھر بھی اپنی کوشش کو جاری رکھنے کے خیال سے میں نے طے کیا کہ سب سے پہلے میں گولوالکر کے "نفاق" والے الزام کا جواب دوں اور پھر دیکھوں کہ اس کا ردعمل کیا ہوتا ہے۔

اسی کے پیش نظر میں نے انھیں ایک تیسرا خط لکھا اور افسوس ظاہر کیا کہ میری پچھلی چٹھی کی وجہ سے ان کے ذہن میں ایک غلط خیال پیدا ہو گیا اور میں نے انھیں صاف لکھا کہ یہ رائے میری اپنی نہیں تھی بلکہ دوسروں کی تھی۔ ان کی تسلی کے لئے میں نے ایسے دو اشخاص کے نام بھی لکھ دیئے۔ میں نے مزید یہ بھی یقین دلایا کہ میرا سنگھ کے ساتھ تعلق ابھی عرصہ تک چلنے والا ہے، غالباً ابھی کئی سالوں تک۔ جہاں تک انھوں نے اپنے جواب میں میرے سوال کو ٹالنے کی کوشش کی تھی، میں نے انھیں لکھا؛

"یہ تو پبلک خدمت کی زندگی کا ایک حصہ ہے کہ کچھ لوگ ہمارے مقاصد کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے رہیں گے اور اگر سنگھ کے کچھ کاموں کی وہ جانچ پڑتال کرتے ہیں یا ان پر سخت تنقید کرتے ہیں تو ہم ادھر سے آنکھیں نہیں موند سکتے اور یہ بہانہ نہیں کر سکتے کہ ہمیں ان سب کا کوئی علم نہیں ہے یا ہم نے تو ایسا نہیں سنا۔ آپ نے فرمایا ہے کہ جب تک ہمارا ضمیر صاف ہے ہمیں اس امر کی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے کہ لوگ ہمارے متعلق کیا سوچتے ہیں۔ صاف بات تو یہ ہے کہ میں اس قسم کے رویّہ سے متفق نہیں ہوں۔"

اس کے بعد ہماری خط و کتابت بند ہو گئی کیونکہ گولوالکر نے اس خط کا کوئی جواب ارسال نہیں کیا۔

اب مجھے اس بات کا اشتیاق پیدا ہوا کہ ایسی گفتگو میں سنگھ کے رہ نماؤں کے سامنے جب یہ سوال آتا ہے تو وہ اس کا کیا جواب دیتے ہیں۔ ایک روز میں نے پور وانچل پرچارک سے اس بات کی وضاحت چاہی

کہ وہ اس الزام کا جوکہ کچھ لوگ سنگھ پر عائد کرتے ہیں کیا جواب دے سکتے ہیں۔ اس بات پر اس رہ نما کا فوری ردعمل یہ ہوا کہ اس نے کہا "دیکھئے میں اس قسم کے لوگوں سے نبٹنا جانتا ہوں۔ میں نے مرہٹوں کے شدید ترین مخالف علاقوں میں کام کیا ہے مثلاً ہندی مرکزی صوبے (مہاکوشل) میں وہاں پر تو لوگ مجھ پر پتھر پھینکتے تھے۔ لیکن میں نے وہاں کام جاری رکھا۔ اور اسی علاقہ کو اپنا ایک مضبوط قلعہ بنا دیا۔"

"یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن اس الزام کے جواب میں آپ کیا بتانا چاہتے ہیں؟"

اس نے کہا "میرے تو خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتا کہ کوئی اس قسم کا الزام لگا سکتا ہے، اصل میں یہ کسی شیطانی دماغ کی اُپج ہے۔"

"مراٹھیوں کو ہی ہر جگہ ذمہ داری کے عہدے کیوں دیئے گئے ہیں؟"

"یہ تو صرف اتفاق ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں۔"

اب مجھے معلوم ہوگیا کہ یہاں سربراہ کی طرح ہی ایک اور آدمی بھی ہے جوکہ یہ سمجھتا ہے کہ اس سوال کا کوئی خاطر خواہ جواب نہیں ہے۔

باب چار

سنگھ کا طریقۂ عمل

اگر آپ کے ساتھ آر ایس ایس کے کسی مراٹھی پرچارک کی ملاقات ہوجائے جوکہ خود کو بی۔اے، ایم۔اے یا ایم۔اے۔ بی۔ ایل، سند یافتہ ظاہر کرے تو اس سے پیشتر کہ آپ اس کی بات کو صحیح مان لیں، بہتر یہ ہوگا کہ آپ اس سے اس کی اسناد کے متعلق دریافت کریں۔ کیونکہ یہ عین ممکن ہے کہ اس شخص نے میلوں دور سے بھی کبھی ایسے ادارے کی شکل نہ دیکھی ہو جو کہ یہ سندیں تقسیم کرتا ہے۔ یہی بات نہیں ہے کہ وہ شخص ہی بلاجھجک اس قسم کے جھوٹے دعوے کر سکتا ہے بلکہ اس کے ساتھ کام کرنے والے ساتھی بھی اسکے بیان کی تائید فوراً ہی کر سکتے ہیں۔ پرلطف بات یہ ہے کہ اس دعوے کی سچائی کے متعلق کہ وہ بہت بڑا عالم فاضل ہے اور اپنی یونیورسٹی کا بہت ذہین طالب علم رہا ہے اگرچہ سنگھ کی خاطر اس نے اپنے سارے کیرئر کو قربان کر دیا، آپ کے پاس صحیح معلومات حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے سوائے اس کے کہ اس شخص کی ذہنی قابلیت سے اس کے جھوٹ کا پتہ لگا سکیں۔ آج سنگھ میں اس طرح کے جھوٹے دعوے کرنا کوئی عیب اس وقت تک تصور نہیں کیا جاتا جب تک کہ دوسرے سوئم سیوکوں کو اس کا علم نہ ہو جائے کیونکہ تنظیم کے وقار کی خاطر یہ ضروری سمجھا جاتا ہے کہ اس کے کچھ لڑکے بہت اونچی تعلیم حاصل کئے ہوئے نوجوان تصور کئے جائیں۔

اسی طرح سے دوسرے صوبوں میں کام کرنے والے بیشتر مراٹھی پرچارک یہ دعوے کرتے ہیں کہ وہ برہمن ہیں جب کہ وہ اس ذات سے متعلق ہی نہیں ہوتے اور خدا جانے اِس جھوٹ سے انہیں حاصل کیا ہوتا ہے۔

جہاں تک ان جھوٹے دعوؤں کا تعلق ہے پرچارک اس بات کا دھیان رکھتے ہیں کہ مقامی لوگوں کو خصوصاً چھوٹے سوئم سیوکوں کو حقیقت کا علم نہ ہونے پائے۔ علاوہ ازیں دوسری قسم کے اور جھوٹ، فریب و مکّاریاں ایسی بھی ہیں جن کا سہارا بنا ایک پلک بھی جھپکائے لیا جاتا ہے جب بھی ایسا کرنا سنگھ کے مفاد میں ہوتا ہے۔ ریلوں میں بلاٹکٹ سفر کرنا اور ڈاک خانوں سے کسی اور شخص کے نام منی آرڈر کو جھوٹے دستخط کرکے حاصل کر لینا جائز تصور کیا جاتا ہے اور اگر کوئی باضمیر معترض ایسے فعلوں کے خلاف شکایت کرے تو اس پر دھیان نہیں دیا جاتا۔ آپ زیادہ سے زیادہ ایسے شخص کی طفلانہ حرکت پر رحم کھا سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ عملی میدان میں اتنا نیک آدمی مناسب نہیں ہو سکتا۔ دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اصولوں کے معاملہ میں اِس آدمی کا نظریہ غلط ہے کیونکہ ہندوؤں میں پیدا ہونے والی سب سے عظیم شخصیت شیواجی نے اپنے نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے اکثر چالاکیوں کا سہارا لیا تھا۔ سنگھ کے مخالفین کو بے وقوف بنانا یا پروپیگنڈے کی خاطر بڑے سے بڑا جھوٹ بولنا بھی معیوب نہیں سمجھا جانا چاہیئے۔ ۱۹۴۸ء میں خود میں بھی سنگھ کی خاطر بہت سا غلط پروپیگنڈا پھیلانے کے لئے ذمہ دار رہا ہوں۔ اُن دنوں میں کلکتہ میں سنگھ کے ہفتہ واری جریدے کا مدیر تھا۔ دیگر باتوں کے علاوہ میں نے اس میں یہ بھی تحریر کیا تھا کہ سنگھ کے اراکین کی کل تعداد ۵۰ لاکھ سے زائد ہے۔ یہ تعداد آر ایس ایس کے سب سے بڑے رہ نماؤں میں سے ایک نے "اسٹیٹس مین" اخبار کے ایک رپورٹر کے سوال کا جواب دیتے ہوئے اُس روز بتائی تھی جب کہ دہلی میں سنگھ کی پہلی بڑی ریلی کا انتظام کیا گیا تھا۔ آر ایس ایس کے آدمیوں کی راست گوئی پر مکمل اعتبار کرنے کی وجہ سے (جس کا پروپیگنڈا میں نے اخبار کے ذریعہ خوب کیا تھا) میں کبھی یہ شک بھی نہ کر سکتا تھا کہ سنگھ کے ممبران کی اصل تعداد اس کی ہر دل عزیزی کے دنوں میں بھی کبھی پانچ لاکھ تک بھی نہ پہنچ سکی تھی۔ اسکے بعد سے تو اب یہ تعداد کتنی تیزی کے ساتھ نیچے گری ہے کہ اگر میں اصل تعداد بیان کروں تو مجھ پر تعصب اور دشمنی کا الزام لگایا جائے گا۔ سنگھ کے پاس ایک چالاک کارگر ہتھیار جس کا وہ بہت استعمال کرتا ہے یہ ہے کہ بڑے آدمیوں کی خوشامد کی کمزوری کا فائدہ اٹھایا جائے اور اس کے ذریعہ اپنی جان پہچان اور اثر کا دائرہ وسیع تر کیا جائے۔ سیاست دان اور کاروباری

آدمی، وکلاء اور ڈاکٹر صاحبان، معلم اور یونیورسٹی کے طلبا، سرمایہ دار اور مزدور تھا ـــــ غرض یہ کہ اِن میں سے کوئی بھی ایسا شخص نہیں ہے جسے آر ایس ایس کے ممبران سے خطاب کرنے کا اعزاز نہ دیا جاتا ہو۔ اُن سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ ہندو تہذیب کے موضوع پر تقریر کریں لیکن اگر وہ یہ نہ چاہیں تو وہ دنیا کے کسی بھی مسئلے، سوال اور موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں چاہے وہ تقریر مریخ پر انسانی آبادی کے متعلق ہو یا ان کی پسند کا کوئی بھی احمقانہ مضمون ہو سننے والوں کو تو صرف سامنے بیٹھ کر سننے کا اس وقت تک دکھاوا کرنا ہوتا ہے جب تک کہ مقررہ شدہ وقت کے آخری لمحہ تک مقرر چیختا چلاتا رہے۔

اس منصوبہ بند تماشے کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس بولنے والے کی بڑی تسلی ہو جاتی ہے اور سنگھ کو ایک بالکل نیا ہمدرد حاصل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سنگھ آج اس بات کا دعویٰ کر سکتا ہے کہ ان کے ہمدردوں کی فہرست میں ایسے عجیب اقسام کے لوگوں کے نام شامل ہیں جن کا ذاتی قابل اعتراض کردار یا غیر مانوس نظریہ بھی اس ہمدردی کے راستہ میں حائل نہیں ہوتا۔

ابن الوقتی کا یہ اصول جو کہ دراصل مراٹھی دماغ کی روائتی چالاکی سے اخذ کیا گیا ہے۔ سنگھ کے فلسفہ کا اب ایک لازمی جز سا بن گیا ہے۔ جب کبھی یہ اصول مخالف عناصر کو رام کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے اس کا فائدہ ضرور حاصل ہوا ہے۔ لیکن اخلاقی اصولوں کو اس طرح بالائے طاق رکھنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بتدریج اس نسخہ کو مناسب اور غیر مناسب موقعہ پر استعمال کرنے کا فرق زائل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ خوشامد کے ہتھیار سے باہر کے لوگوں کو بے وقوف بنانے میں کامیابی ہوتی رہتی ہے اس لئے یہی ہتھیار اب اسی مہارت کے ساتھ خود اپنے سوئم سیوکوں پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

پچھلے سال جب کہ آر ایس ایس کے نئے دستور کو پاس کرنے کے لئے دیگر صوبوں کے نمائندے ناگپور میں جمع ہوئے تو ہائی کمانڈ نے ان میں سے ہر گروپ کے علیحدہ علیحدہ فوٹو کھینچنے کا حکم صادر کیا اور پہلا تاثیران تصاویر کے ہاف ٹون بلاک تیار کرائے گئے۔ چونکہ میں بھی ایک نمائندے کی حیثیت سے وہاں موجود تھا مجھے بھی کیمرے کے سامنے دو منٹ تک بُت بن کر بیٹھنا پڑا اور اس کے بعد دن میں بہت دیر تک اسی خاموش غیر ساکت انداز میں بیٹھ کر دستور کو پاس ہوتے ہوئے دیکھنے کی رسم سے گزرنا پڑا۔ جب یہ سب کام ختم ہو چکا تو اس کے پانچ یا چھ روز بعد آر ایس ایس کے مرکزی اخبار نے اپنا خصوصی شمارہ شائع کیا۔ جن میں ہماری تصاویر چھاپی گئیں اور ان کو بڑی نمایاں جگہ دی گئی۔ ان تصاویر کے نیچے موٹے لفظوں میں تحریر کیا گیا تھا "آر ایس ایس آئین کے معمار"۔

اس کا مطلب صاف تھا۔ مقصد دراصل یہ تھا کہ ثابت کیا جائے کہ سنگھ پر کوئی ڈکٹیٹر حکومت نہیں کر رہا بلکہ تمام صوبوں کے نمائندے جمہوری طریقہ پر عمل کرتے ہوئے اپنا دستور تیار کرتے ہیں۔ ہر شخص اس سفید جھوٹ کو سمجھتا تھا لیکن تنظیم کے مفاد کے خیال سے خاموش رہا۔ لیکن مجھے جہاں تک محسوس ہوتا ہے یہ خاموشی اس لئے بھی تھی کیونکہ زیادہ تر شرکا نیم خواندہ ہونے کی وجہ سے یہ وہم و گمان بھی نہ کر سکتے تھے کہ انھیں دستور پاس کرتے ہوئے تصویروں کے ذریعہ شائع ہونے کی عزت مل سکتی ہے اسی وجہ سے ہر آدمی نے اپنے ضمیر کو تھپک کر سُلا دیا تھا اور خاموشی اختیار کر لی تھی اگرچہ ایمانداری کے ساتھ ہر آدمی اپنے دل میں جانتا تھا کہ اس دستور کا مسودہ تیار کرنے میں اس کا اتنا ہی ہاتھ ہو سکتا ہے جتنا کہ اگر کوئی کہے کہ لنکا کے وزیراعظم کا اقوام متحدہ کا چارٹر بنانے میں ہاتھ رہا ہے۔

اس سال کے آغاز میں جب کہ بستو ہارا سہایتا سمتی کی کلکتہ میں تشکیل کی گئی تو ایک روز مجھ سے کہا گیا کہ مجھے سمتی کا خزانچی منتخب کیا گیا ہے۔ جس وقت میں نے کسی قسم کے فنڈ سے اپنا تعلق قائم رکھنے سے انکار کیا تو مجھے صاف طور پر بتا دیا گیا کہ میرا دراصل اس عہدے کے کام سے عملی طور پر کوئی واسطہ نہ ہوگا۔ مجھے تو اپنے نام کو استعمال کرنے کے لئے انھیں اجازت ہی دینی ہوگی۔ چونکہ اب مجھے یہ نمایاں طور پر ظاہر ہو چکا تھا کہ اس طریقہ سے صرف خوشامد کے ذریعہ مجھے خوش کیا جا رہا ہے میں نے اس بات کو منظور نہیں کیا۔

لیکن یہ طریقہ صرف میرے ہی واسطے خصوصاً استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ دراصل سنگھ اب اس قسم کے کاموں کا عادی ہو چکا ہے۔ صوبوں میں کاریہ واہ (سکریٹری) اور سنگھ چالک (پریزیڈنٹ) کے عہدے اس عظیم فریب کی مثالیں ہیں جو کہ سنگھ خود اپنے ممبران کو دیتا رہتا ہے۔ مزید براں دیگر طریقے اور بھی ہیں جن کے ذریعہ ہر مقامی فرد کے مقابلہ میں ایک رقیب کھڑا کر دیا جاتا ہے تاکہ دونوں میں سنگھ کے ساتھ وفاداری ثابت کرنے کا مقابلہ چلتا رہے اور ساتھ ہی ساتھ ایک دوسرے کے خلاف اس امر کی جاسوسی بھی جاری رہے کہ کون کام میں ڈھیل ڈال رہا ہے۔ اگر کوئی پہلے سے طے شدہ خطوط پر چلنے سے گریز کرتا ہے تو اسے دھیرے دھیرے اہم کاموں سے دور کر دیا جاتا ہے اس کے سپرد کوئی کام نہیں کیا جاتا اور ہر جگہ اس کے خلاف کانا پھوسی کی ایسی مہم کا آغاز ہو جاتا ہے کہ وہ خود بخود جماعت کو چھوڑ دیتا ہے۔ ایسی حالت

میں بھی سنگھ کے سربراہ یہی کہتے رہتے ہیں کہ "باہمی محبت اور آپسی خلوص ہی ہمارے کام کی بنیاد ہیں۔"

یہ حقیقت کہ سنگھ کے رہ نماؤں کی طرف سے اپنائے گئے مندرجہ بالا اطوار بھی جوان سوئم سیوکوں کی آنکھیں نہیں کھولتے شائد اس وجہ سے ہے کہ ان رہ نماؤں کی دیدہ دلیری اور غلط کاموں میں جھجک وشرم کا فقدان نوجوانوں کو فریب میں مبتلا رکھتا ہے۔ لیکن کیونکہ کمزور سے کمزور دماغ میں بھی بلآخر کسی روز اصلیت کا راز کھل کر ہی رہتا ہے اسی وجہ سے شاید سن بلوغ تک پہنچتے پہنچتے بیش تر سمجھدار لڑکے ہمیشہ کے لئے سنگھ کو خیرباد کہہ دیتے ہیں۔ لیکن جس وقت تک ان کو حقیقت کا پتہ نہیں چلتا وہ اس جماعت کے کام کو آگے بڑھانے میں مدد دیتے رہتے ہیں اور اس کی تعداد میں بھی اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ اسی لئے سنگھ کے سربراہ ان نوجوانوں کے چھوڑ کر چلے جانے کے بعد بھی ممبران کی تعداد کے معاملے میں بے فکر ہی رہتے ہیں۔

یہ بات اگرچہ تعجب خیز ہے لیکن سنگھ اپنی فہرست میں ایسے بہت سے آدمی لینے پسند نہیں کرتا جو کہ ذہین اور ایماندار دونوں ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سنگھ کے رہ نما اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ایک نہ ایک روز وہ یقیناً چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ ساتھ ہی اس قسم کے لڑکے بے کار اور بے ایمان لڑکوں کے برعکس سنگھ کے دیگر لوگوں میں بے چینی پھیلانے کا باعث بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ سنگھ کی اصل قوت تو وہ لوگ ہیں جو کہ مایوس و مغلوب ہونے کے باوجود کسی بھی وجہ سے اس تنظیم کو چھوڑ نہیں سکتے۔ آر ایس ایس ایسے ممبران پر بھروسہ کرتا ہے کیونکہ وہ آسانی سے باہر نہیں نکل سکتے۔ ایسے ہی لوگوں پر وہ مہربانی کرتا رہتا ہے اور اپنے اس کاروبار میں ان کو چھوٹے بھائیوں کی طرح شریک کر لیتا ہے تاکہ وہ سنگھ کے کاموں میں مددگار ثابت ہو سکیں۔

باب پانچ

جہالت کا مسکن

بیش تر آر ایس ایس کے رہ نماؤں میں جو بات مشترکہ طور پر پائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ بحث و مباحثہ نہیں کر سکتے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ ایسا کرنا ان کی فطرت کا ایک حصہ ہو یا ممکن ہے کہ اس کا سبب یہ ہو کہ وہ دوسروں کو صلاح اور حکم دینے کے عرصہ سے عادی ہو چکے ہیں اور وہاں ان کو وجوہات دینے اور وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی ہے۔ خیر وجہ جو بھی ہو، بیرونی دنیا کے لوگوں سے تھوڑے عرصہ واسطہ پڑتے ہی ان کو یہ علم ہو جاتا ہے کہ مخالف رائے رکھنے والے افراد کے ساتھ یا اعتراضات کا جواب دیتے وقت یہ کمی ان کے لئے بڑی تکلیف دہ اور رکاوٹ پیدا کرنے والی ثابت ہوتی ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر زیادہ تر سنگھ کے رہ نماؤں نے اپنی ذہنی ساخت میں وہ غیر صحت مند عنصر پیدا کر لیا ہے جسے "ہٹھ دھرمی" کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے —— اس سے مراد یہ ہے کہ وہ جو بھی رائے رکھتے ہیں اسے اٹل اور ناقابل ترمیم تصور کرتے ہیں اور کسی کے سمجھانے بجھانے سے اس میں تبدیلی کے لئے کبھی تیار نہیں ہوتے۔ چونکہ اس قسم کے رویئے سے دوسروں کے نقطۂ نگاہ کو نہ سمجھنے کی عادت پڑ جاتی ہے اسی لئے یہ بات بالکل صحیح ہے کہ لاعلمی اور کم فہمی ایک ڈکٹیٹر کے ذہن کی خصوصیت ہوتی ہے۔ گولوالکر صاحب کی کتاب "ہماری قومیت کی تعریف" میں سے اخذ مندرجہ ذیل الفاظ کو دیکھئے:

"ہماری قدیمی تاریخ کے متعلق مغرب کے مورخین کی قابل رحم لاعلمی ایک بڑی دل چسپ بات ہے۔ ہندوستان میں بچہ بچہ اس حقیقت سے واقف ہے کہ سنسکرت ادب کے باقی مہاتی والمیکی رامائن کے مصنف ہیں اور یہی سنسکرت زبان کا سب سے پہلا ادبی شاہکار ہے۔ مہابھارت تو اس سے کہیں بعد تحریر کی گئی ہے۔ یہاں ہر بچہ کو اس بات کا بھی علم ہے کہ رامائن کی کہانی ایک ایسی شخصیت سے متعلق ہے جو کہ مہابھارت کے کرداروں سے کہیں پہلے یہاں موجود تھی —— اس سب کے باوجود مغربی تاریخ داں فرماتے ہیں کہ مہابھارت رامائن سے پہلے کی کتاب ہے۔"

اب جہاں تک مغرب کے مورخین کا سوال ہے انھیں اس امر کا بخوبی علم ہے کہ ہندوستان میں ہر شخص یہ یقین کرتا ہے کہ رامائن مہابھارت سے قدیم کتاب ہے اور اسی وجہ سے انھوں نے بہت سے ایسے واقعات اور دلیلیں پیش کی ہیں کہ یہ یقینی غلط ہے۔ یہ نقطۂ نظر اگرچہ آج بھی بہت سے مشہور ہندوستانی اور دانش وروں کو منظور نہیں ہے پھر بھی مزید چھان بین کی گنجائش تو رکھتا ہی ہے لیکن کسی کی برسوں کی کاوشوں اور واقعات کی کھوج کو غلط ثابت کرنے کے لئے یہ کہنا کہ بچہ بھی اس سے مخالف بات کا حامی ہے کوئی اچھی دلیل نہیں ہے۔ علاوہ ازیں بیرون ملک سے آنے والی ہر بات کو ناقابل یقین قرار دینا شری گولوالکر کے پاس سب سے بڑی دلیل رہی ہے اور اس کو وہ فہم و فراست کے بدل کی جگہ بڑی صفائی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ انھی کی مانند ان کی تنظیم بھی مدلل بحث سے بچنے کے لئے اسی قسم کی بات لگاتار دہراتی رہتی ہے۔ پچھلی مرتبہ جیل سے رہائی کے بعد گولوالکر کو اخباری نمائندوں کے بہت سے سوالوں کے جواب دینے پڑے تھے۔ جب کمیونسٹوں کے متعلق ان کی رائے دریافت کی گئی تو انھوں نے

صرف اتنا ہی کہا کہ ان کو یہ پسند نہیں ہے کہ کوئی بھی بیرونی نظریہ اس ملک میں کامیابی حاصل کر سکے۔

میں نے بحث و مباحثے سے سنگھ کے خوف کا بھی ذکر کیا ہے۔ عملی طور پر یہ خوف اتنا بڑا ہے کہ اس جماعت کے رہ نما اتنی ہمت بھی نہیں کر سکے کہ سنگھ اپنے نظریاتی اصولوں کو ایک واضح شکل دے کر اپنے ان اخبارات کے ذریعہ جو کہ سنگھ نے مختلف صوبوں میں جاری کئے ہوئے ہیں عوام کے سامنے پیش کر سکے۔ ایک واضح شکل دینے کے معنی یہ ہوں گے کہ ایک جامع نظریہ سامنے آ جائے گا اور دوسروں کو آسانی سے اس پر تنقید کا موقع مل سکے گا اس طرح کسی بھی مخالف سے بحث و مباحثہ کی گنجائش پیدا ہو جائے گی جس کی وجہ سے دائرۂ بحث ان باتوں تک پہنچ جائے گا جن کے متعلق پہلے سے غور ہی نہیں کیا گیا اور اس کا کیا نتیجہ ہو یہ کوئی بھی نہیں بتا سکتا۔

بیشتر سادہ لوح انسانوں کے دماغوں میں یہ خیال موجود رہتا ہے کہ سوچ بچار، بحث و مباحثہ اور مطالعۂ دماغ کو ان حدوں تک لے جا سکتا ہے جہاں پہنچ کر نتائج خوشگوار نہیں ہو سکتے۔ سوئم سیوک آزادانہ طور پر کچھ سوچ سکیں، اس بات کو سنگھ قطعی ناپسند کرتا ہے اور اس کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ گو کہ سنگھ کے رہ نما یہ بات صاف صاف کہنے سے جھجکتے ہیں لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ اگر نوجوان لڑکوں کے دماغ اس طرح سوچنے لگیں تو سنگھ کے رہ نما اس سب کو فضولیات کا نام دے کر اس کی مذمت کریں گے۔

حال ہی میں گوولکر کے دست راست شری بالا صاحب دیورس کلکتہ تشریف لائے تھے۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ سنگھ میں سب سے قابل آدمی ہیں اور غالباً گوولکر کے وہی جانشین بھی بنیں گے۔ جب وہ کلکتہ پہنچے تو انھیں بتایا گیا کہ کچھ سوئم سیوکوں کے ذہن میں سنگھ کے مستقبل کے پروگرام کے متعلق شکوک موجود ہیں اور معاشی سوالات پر سنگھ کے نظریے پر بھی ان کے کچھ اعتراضات ہیں۔ اس کے بعد دیورس نے کلکتہ میں اہم سوئم سیوکوں کے ایک مجمع سے خطاب کیا۔ ہندو تہذیب کی عظمت کے متعلق تقریباً ایک گھنٹہ بولنے کے بعد وہ آخرکار اس بات پر آئے جو کہ سنگھ کی سب تقریروں میں دہرائی جاتی ہے۔ وہ بات وہ الفاظ پر مشتمل یہ صلاح تھی "کام بڑھاؤ" یعنی سنگھ کے کام کو وسعت دو جس کا صاف مطلب صرف یہ تھا کہ نئے نئے سوئم سیوکوں کو لا کر بھرتی کر دو۔ جو کچھ انھوں نے فرمایا وہ کچھ اس طرح سے تھا:

"اپنے کام کو کرتے رہو۔ اس سلسلے میں شکوک کو کام کے راستے میں حائل نہ ہونے دو۔ مجھے علم ہے کہ بہت سے لوگوں کے دماغ میں کچھ سوالوں کے متعلق شکوک موجود ہیں۔ لیکن میری صلاح یہ ہے کہ جب بھی کبھی شک یا شبہ کی کیفیت ہو تو ان کو جھٹک کر ایک طرف کر دو اور نئے جوش کے ساتھ فوراً اپنے کام میں لگ جانے کا فیصلہ کر لو۔"

جن کے ذہن میں شکوک موجود تھے انھیں اب صاف طور پر معلوم ہو گیا کہ ان کے سوالوں کا سنگھ کے پاس کیا جواب ہے۔

پچھلے سال کمزوری کے کسی لمحہ میں آر ایس ایس کے ایک صوبائی ناظم نے مجھ سے دریافت کیا کہ 'سوشلزم' اور 'کمیونزم' میں کیا اختلاف ہے۔ جب اس نے یہ سوال کیا تو ایک لمحہ کے لئے تو میں تعجب سے اس کا چہرہ دیکھتا ہی رہ گیا۔ سنگھ میں وہ ایک ایسے بڑے صوبے کا نگراں تھا جہاں کہ نوجوان بہت سے معاملوں میں اس کی طرف رہ نمائی کو دیکھیں گے۔ یہ بڑی تعجب کی بات تھی کہ خود اپنے ہی ماتحت نوجوانوں کی نفرت سے وہ اب تک کس طرح بچا رہا ہوگا۔ لیکن دھیرے دھیرے نزدیک آنے کے بعد مجھے یہ علم ہو گیا کہ سنگھ کے بڑے سے بڑے رہ نماؤں میں سے کوئی بھی اس قسم کا سوال پوچھ سکتا ہے۔ اگر پوچھتا نہیں تو صرف اس لئے کہ وہ اس ناظم کی مانند صاف گو نہیں ہوتا۔

ایک بات جو مجھے آر ایس ایس کے سلسلے میں ضرور بتانی ہے وہ یہ ہے کہ آر ایس ایس کا رکن عموماً اخبار اس وقت تک اٹھا کر نہیں دیکھتا جب تک کہ اس کی اپنی جماعت کے بارے میں کوئی خبر نہ چھپی ہو۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ لاعلمی کا یہ دائرہ وسیع تر ہوتا جاتا ہے اور اس کے رہ نماؤں کو اس کی ذرہ بھر بھی فکر نہیں ہے۔ شاید یہ ٹھیک بھی ہے کیوں کہ علم و دانش کا ان کے نظریہ "کام بڑھاؤ" سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

خیر اخبارات پڑھنے کا کچھ فائدہ ہو یا نہ ہو سنگھ کو اس بات میں دلچسپی ضرور ہے کہ اس کے اپنے پروپیگنڈے کے لئے اس کے پاس اپنے اخبار موجود ہوں۔ اسی سلسلے میں سنگھ کے ایک رہ نما کے دماغ میں جو سب سے حسین خیال پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ بجائے اتنے سارے اخبارات نکالنے کے سنگھ کو اس معاملہ کی جڑ کو ہی پکڑنا چاہیے یعنی اپنی ایک خبر رساں ایجنسی قائم کرنی چاہیے اور اس کے ذریعہ ملک کے سارے اخباروں کو متاثر کرنا چاہیے۔ اسی رائے پر عمل کرتے ہوئے ایک خبر رساں ایجنسی جاری کر دی گئی۔ کلکتہ میں اس کا دفتر کھولنے سے پہلے سنگھ کے ایک اہم رہ نما نے میری رائے جاننا چاہی کیونکہ میں بھی ایک صحافی تھا۔ میں نے بڑے سخت لفظوں میں اس تجویز کی مخالفت کی۔ اس نے پوچھا "کیوں؟ ہم اس قسم کی خبریں دیں گے جو کہ دوسری ایجنسیاں کسی سیاسی یا فرقہ وارانہ نظریے کے تحت ارسال نہیں کرتیں۔" میں نے جواب دیا کہ اس بنا پر کوئی ایجنسی چل نہیں سکتی۔ تقریباً ایک گھنٹے تک میں کوشش کرتا رہا کہ وہ صاحب میرا نقطۂ نظر سمجھیں اور اس کے بعد میں نے یہ کوشش چھوڑ دی۔ ایجنسی شروع کی جا چکی ہے اور اس کے نتائج اظہار پذیر

والے لوگوں سے بھی پوشیدہ نہیں ہیں یہ تمام بات اتنی غلط ہے اور اس کی ایسی ہوائی رپورٹیں اتنی بیکار ہیں کہ ایک مرتبہ تو میں نے کھیج کر یہ بھی کہہ دیا کہ اس سے پہلے کہ لوگ اس ایجنسی کی ارسال شدہ خبروں کو پڑھنے کو تیار ہو جائیں۔ ہمیں اس ملک کے سارے باشندوں کو آر ایس ایس کا ممبر بنانا پڑے گا۔

ابھی کچھ عرصے سے آر ایس ایس کے رہنما سیاست میں حصہ لینے کے سوال پر بھی غور کر رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگوں کا خیال تو یہ ہے کہ اس مقصد کے لئے دوسری جماعت قائم کی جائے جب کہ دوسرے لوگوں کی رائے یہ ہے کہ سنگھ خود ہی ایک سیاسی نوعیت کی پارٹی کی شکل اختیار کر لے۔ پچھلے سال ناگپور میں ایک پرائیویٹ میٹنگ میں اس سوال پر غور کیا گیا تھا۔ آخری فیصلہ تو حسب معمول گورو گولوالکر صاحب کی طرف سے ہی آنا تھا۔ جتنے لوگ وہاں موجود تھے ان میں سے تین کو چھوڑ کر (شری کاہن چند گوپال داس، شری بھاؤ راؤ دیورس جو کہ یو۔پی کے ناظم تھے اور راقم الحروف) سب کی رائے یہی تھی کہ سنگھ کو کسی نہ کسی شکل میں سیاست میں حصہ لینا ہی چاہیئے۔ اس سوال کے نشیب و فراز پر ابھی بحث جاری ہی تھی کہ اچانک پلڑا سیاست سے علیحدہ رہنے والے حامیوں کے حق میں بھاری ہو گیا۔ یہ دہلی کے سنگھ چالک لالہ ہنس راج گپتا کے ایما پر ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ سنگھ ان کو بھارت کی راجدھانی کی مرکزی سیاست کا ماہر تصور کرتا تھا۔ انھوں نے میٹنگ میں ایک من گھڑت کہانی سنائی وہ یہ کہ وقت آ گیا ہے جب کہ مرکزی حکومت کے رہنما یہ سوچنے لگے ہیں کہ ملک میں جو مشکل سوال درپیش ہیں اور جو نازک وقت سامنے نظر آ رہا ہے اس کا مقابلہ کرنے کے وہ رہنما اہل نہیں ہیں اور اسی وجہ سے وہ سنجیدگی کے ساتھ اس بات پر غور کر رہے ہیں کہ آر ایس ایس کے رہنماؤں کے ہاتھوں میں باگ ڈور سونپ دی جائے۔ انھوں نے بڑی خود اعتمادی کے ساتھ یہ بتایا کہ ان کی اطلاع کے مطابق ایک یا دو ہفتہ میں ہی اس قسم کا دعوت نامہ موصول ہونے والا ہے۔ انھوں نے رائے ظاہر کی کہ اس سلسلے میں مرکز میں بات چیت شاید شروع بھی ہو چکی ہے گو کہ وہ یقین کے ساتھ یہ بھی بتا نہیں سکتے۔

شری گولوالکر پر ان کی اس بات کا بڑا اثر ہوا۔ انھوں نے فرمایا کہ سنگھ سے برسر اقتدار آنے کے لئے کہا جائے یا نہ کہا جائے لیکن یہ یقینی ہے کہ جلد ہی اقتدار حاصل کرنے کے لئے کمیونسٹوں کے ساتھ ایک سخت لڑائی (جو کہ صرف لفاظی بحث تک محدود نہ رہے گی) شروع ہونے ہی والی ہے انھوں نے فرمایا کہ ایسے موقعہ کے لئے سنگھ کو جلد سے جلد اپنی جماعت کو تیار کر لینا چاہیئے۔ پارلیمانی سیاست کا سوال پس پشت چلا گیا اور گولوالکر نے ایک اپیل کی جو کہ ہتھیار بند جہاد کا نعرہ معلوم ہوتی تھی۔ انھوں نے کہا "تیاری کرو۔ خوب تیاری کرو۔"

اس سارے خیالی پلاؤ کا کیا نتیجہ نکلا۔ یہ بات بذات خود کوئی اہم نہیں ہے لیکن اس بات سے ایک چونکا دینے والا جو نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ آدمیوں اور حالات کے جائزے کے معاملہ میں اس جماعت کے رہنماؤں کی کتنی کم سوجھ بوجھ ہے۔ اس باب کو ختم کرنے سے پہلے میں ایک واقعہ کا اور ذکر کروں گا۔

یہاں میں یہ بات بتانا مناسب سمجھتا ہوں کہ سنگھ کے سیاست کے میدان میں اترنے کی میری مخالفت کی خاص وجہ یہ تھی کہ میری رائے میں اس کام کے اہل اس جماعت میں کوئی آدمی نہیں تھا۔ میں نے یہ بات اس میٹنگ میں صاف الفاظ میں کہہ بھی دی۔ لیکن جو بات میں دیکھتا تھا مگر جو میں نے کہی نہیں وہ یہ حقیقت تھی کہ سنگھ کے رہنماؤں میں (جس فہرست میں مہر مراٹھیوں کا نام تو آتا ہی نہیں) ایک بھی شخص اس قابل نہیں تھا کہ صرف ۱۵ آدمیوں کی کمیٹی کی کارروائی تک قاعدہ کے ساتھ چلا سکے۔

اکتوبر ۱۹۴۸ء میں گولوالکر دہلی آئے تھے تاکہ وہ کانگریس کے رہنماؤں اور وزرا، کے ساتھ آر ایس ایس پر پابندی ہٹانے کے سوال پر بات چیت کریں۔ ظاہر ہے کہ ان کو اس میں نمایاں کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ وزیر اعظم نہرو سختی کے ساتھ اپنی رائے پر قائم تھے اور وہ سنگھ کے سربراہ کے ساتھ دوبارہ ملاقات تک کے لئے رضامند نہیں ہوئے تھے۔ صوبوں میں مایوسی کا ایک ماحول چھانا شروع ہو چکا تھا کہ اچانک صوبوں کے ناظموں کی طرف سے مرکز کا ایک چونکا دینے والا حکم نامہ جاری کیا گیا۔ ہم سے یہ کہا گیا کہ ہم شری گولوالکر کے نام جتنے خط ممکن ہوں لکھ کر بھیجیں۔ وہ خطوط سب سوئم سیوک لکھیں، دوستوں سے لکھوائیں، اپنے بزرگوں سے لکھوائیں اور روانہ کریں۔ ان خطوں میں اس قسم کا مضمون تحریر ہونا چاہیئے۔

"پرم پوجیہ گورو جی!

ہمیں یہ دیکھ کر بے حد تکلیف ہوتی ہے کہ آج ہمارے ملک میں بے ایمانی اور بے انصافی کا بول بالا ہے جس کے لئے ہمارے رہنما ہی ذمہ دار ہیں۔ ہمارا سماج بڑی تیزی کے ساتھ بکھرتا جا رہا ہے اور ملک تباہی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایسے مصیبت کے دور میں ملک نجات کے لئے آپ کی طرف دیکھ رہا ہے۔ یہ ہماری آپ سے سچے دل کے ساتھ درخواست ہے کہ آپ خود اپنا آخری بار بلا تاخیر یہ فیصلہ کریں کہ آپ قوم کی باگ ڈور کھلے عام اپنے ہاتھوں میں سنبھالیں اور اس مقصد کے لئے برسر اقتدار آ جائیں۔"

ہمیں راز داں بنا کر یہ بھی بتایا گیا کہ منصوبہ یہ ہے کہ اس طرح

کا انتظام کیا جائے کہ ان خطوں میں کچھ کسی نہ کسی طرح کانگریس کے بڑے رہ نماؤں اور اونچے سرکاری افسروں کے ہاتھوں تک پہنچ جائیں۔ امید یہ تھی کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کانگریسی رہ نماؤں کو جب یہ علم ہو جائے گا کہ عوام کی طرف سے ایسا مطالبہ کیا جا رہا ہے تو وہ پابندی ہٹانے کے چھوٹے سے سوال کو لے کر اپنے اقتدار کو کھونے کا خطرہ مول نہیں لیں گے۔

فرمانبردار نیک سوئم سیوکوں کی حیثیت سے ہم سب نے ایسے خطوط لکھ کر روانہ کر دیے لیکن ہم تعجب ضرور کرتے رہے کہ اس کا وہ نتیجہ کیسے نکلے گا جو کہ سنگھ والے چاہتے تھے۔ اپنے وقار کو ٹھیس لگنے کی وجہ سے کہ ملاپن گولوالکر صاحب یہ بھی سمجھنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے کہ یہ تمام ترکیب بالکل طفلانہ حرکت تھی۔ وہ یہ بھی نہیں سمجھ رہے تھے کہ اگر نہرو اور ان کے ساتھی ان خطوط کے مضمون کو صحیح مان بھی لیں تو ان کی طرف سے کسی بھی ایسی تحریک کو دبانے کی ہی امید کی جا سکتی ہے۔ لیکن سربراہ کی انا پھر اس کے سامنے آکھڑی ہوئی ان کو دوبارہ گرفتار کیا گیا، ناگپور جیل میں بھیج دیا گیا اور انھیں اس حد تک ذلت اٹھانی پڑی کہ انھیں مجبور ہو کر آر ایس ایس کا ایک تحریری آئین بنانے کا اقرار کرنا پڑا۔

کامیابی کا اس قسم کا سہرا اپنے سر بندھوانے کے بعد سنگھ دوبارہ اس بات پر غور کر رہا ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کو اپنا بینامی دار بنا کر ان سے اتحاد کرلے اور آنے والے انتخابات میں کود پڑے۔ جہاں تک آج کے حالات کے پیش نظر مستقبل کے متعلق کوئی پیشین گوئی کی جا سکتی ہے تو وہ یہی ہو سکتی ہے کہ سنگھ کو بری طرح شکست کا منہ دیکھنا پڑے گا اور عوام کے سامنے اس کا کل کاروبار ننگا ہو جائے گا اور پھر اس مرتبہ جس والنٹیروں کی تعداد پر وہ اتنا غرور کرتا ہے اس کا یہ آخری ہتھیار بھی کھنڈا پڑ جائے گا۔ وہ کامیاب ہوں یا ناکامیاب، لیکن اس مرتبہ اس کے رہ نما اپنے کھوکھلے پن کو چھپا نہیں پائیں گے۔ اگر انھوں نے انتخابات کے ڈرامے میں عوام کے سامنے خود کو اسٹیج پر پیش کر دیا۔

باب ۴

رجحانات و میلانات

اس سال کے شروع میں ایک دن صبح مجھے ایک خاص کام کے لئے پارٹی کے تین ممبران کے ساتھ جانے کے لئے کہا گیا۔ راستہ میں مجھے معلوم ہوا کہ ہم لوگ مشہور و معروف متقی ہستی لالہ کرم چند تھاپر کے پاس آر ایس ایس کی طرف سے ملاقات کرنے کے لئے جا رہے ہیں۔ ہمارا کام صرف اتنا تھا کہ اس شخص کے ساتھ متعارف ہو جائیں۔ میرے ساتھیوں میں سے دو تو مراٹھی برہمن تھے اور

تیسرے ایک پنجابی سوئم سیوک تھے جن کے ذریعہ لالہ جی سے ملاقات کرنا طے ہو سکا تھا۔ میں نے خیال کیا کہ شاید تھاپر صاحب ہمیں کچھ روپیہ دینے والے ہیں۔ لیکن کیونکہ ابھی چند منٹوں میں ہی ان سے ذاتی ملاقات ہونے والی تھی اس لئے میں نے اس کے متعلق کوئی سوال نہیں کیا۔

لالہ کرم چند کے مکان پر ہم تقریباً ۱۵ منٹ تک ایک کمرے میں بیٹھے انتظار کرتے رہے تاکہ ہم نے جو تین چٹیں اپنے نام لکھ کر ان کے پاس بھیجی تھیں ان میں سے کسی کو پڑھ کر وہ ہمیں اندر بلائیں گے۔ چونکہ ہم میں سے ایک نے بھی صبر کا دامن نہیں چھوڑا تھا اس لئے آخر کار ہمیں اس کروڑپتی سے ملاقات کا شرف حاصل ہو گیا۔ وہ چند دوستوں کے ساتھ عمارت کے دوسری طرف صحن میں آرام فرما رہے تھے۔ لالہ جی ایک آرام کرسی پر تشریف رکھتے تھے پہلو بھر پہلے انھوں نے ہمارا خیر مقدم کیا اور جب ہم نے اپنا تعارف کرایا تو وہ نیم باز آنکھوں سے سب کچھ سنتے رہے۔ تقریباً چار یا پانچ منٹ تک ہم سنگھ اور دیگر امور کے متعلق بات چیت کرتے رہے۔ شاید یہ سوچ کر کہ وہ کیا بات کریں مسٹر تھاپر نے اپنی دل چسپی کے مضمون پر بات کرنا شروع کی "خیر اب آپ کو مزدوروں کے درمیان کام شروع کرنا ہے اور ان کو صحیح راستہ پر لگانا ہے"۔

ہم نے بلا جھجک جواب دیا "جی ہاں۔ ہم نے ان کے درمیان اپنا کام شروع کر دیا ہے"۔

لالہ جی نے فرمایا کہ آج دراصل متوسط طبقہ کو مدد کی اشد ضرورت ہے۔ ہم نے یہ بات تسلیم کی۔ لالہ جی نے اپنے شکوک کا اظہار کیا اور فرمایا کہ جب تک سیاست میں ہم لوگ کھل کر شرکت نہ کریں شاید کوئی کام نہیں ہو سکتا۔

اس پر میں نے احتیاط کے ساتھ اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ سنگھ کم از کم استحکام قائم رکھنے والی قوت کی شکل میں اپنا فرض ادا کرے گا۔ وہ سیاست میں حصہ لے یا نہ لے سنگھ اس بات کا خیال رکھے گا کہ پھوٹ ڈالنے والی اور نراجیت پھیلانے والی قوتوں پر قابو رکھا جائے۔

میں نے کہا کہ ابھی پچھلے دنوں ہی جب شہر میں مارواڑیوں پر حملہ کیا گیا تھا تو آر ایس ایس کے آدمیوں نے ایک جلوس نکالا تھا تاکہ یہ فساد روکا جا سکے۔

انھوں نے جواب دیا "اچھا۔ خوب"۔

یہ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اس مضمون میں اور زیادہ دل چسپی لینے کے بجائے وہ اب اکتا گئے تھے۔ انھوں نے جواب دیا "ٹھیک ہے آپ اچھا کام کر رہے ہیں اسے جاری رکھئے۔ یہ بات ہر ایک کے لئے مفید ہے"۔

اب ہم دھیرے سے اپنی جگہ سے اٹھے اور ان کی نیک خواہشات کے اظہار کے بعد واپس لوٹ آئے۔ راستہ میں ہم میں اس پر اتفاق نہیں تھا

سکا کہ بات شروع کرنے کا جو ڈھنگ اختیار کیا گیا وہ کیسا تھا؟ اور اس بات پر قیاس آرائیاں کرتے رہے کہ کون سے ایسے الفاظ استعمال کرنے چاہیئے تھے جو انھیں بہتر طور پر خوش کر سکتے ۔ مجھے اب علم ہوا کہ ہماری ملاقات کا مقصد یہ تھا کہ تھاپر صاحب کو اس امر کے لئے تیار کرایا جائے کہ گورو جی کے کلکتہ کے دورے کے وقت وہ اپنے مکان پر ٹھہرنے کے لئے گورو جی کو دعوت دیں. لیکن بد قسمتی سے معاملہ اتنا آگے بڑھا ہی نہیں کہ یہ تجویز ان کے سامنے پیش کی جاسکتی۔

سنگھ اور اس کے سربراہ ہمیشہ اس بات کو بہت اہمیت دیتے ہیں کہ جب بھی گورو جی کسی شہر یا قصبہ کا دورہ کریں تو ان کے ٹھہرنے کا بندوبست وہاں کے سب سے امیر آدمی کے مکان پر کیا جائے چاہے وہ سنگھ کا ممبر ہو یا نہ ہو۔ پہلے اپنے کلکتہ کے دوروں کے وقت گولوالکر صاحب سنگھ کے دفتر میں ہی قیام پر اکتفا کرتے تھے لیکن جیسے جیسے سنگھ کا رسوخ مارواڑی طبقہ میں بڑھتا گیا سنگھ کے سربراہ کو بڑے بازار میں شاندار مکانوں کے اندر قیام کے لئے جگہ ملنے لگی۔ ایسے ہر موقعہ پر یوں تو کلکتہ کے متوسط طبقہ کے معمولی خاندانوں نے درخواست کی تھی کہ ان کو مہمان نوازی کا شرف دیا جائے لیکن ہر مرتبہ ان کو بیٹھے تھپتھپا کر کسی طرح ٹال دیا گیا۔

ایک ایسے آدمی کے لئے جو کہ آر ایس ایس میں کسی اقتدار کے عہدے پر پہنچنا چاہتا ہو اور قدرت نے اسے مارواڑی خاندان میں پیدا نہ کیا ہو، صرف دولت ہی اس کے لئے سہارا ثابت ہوسکتی ہے۔ اگر یہ الہ دین کا چراغ اس کے ہاتھ لگ گیا ہے تو سر سنگھ چالک اس کے ذاتی دوست بن سکتے ہیں اور بڑے سے بڑے پرچارک بھی اس کے قدموں میں لوٹ سکتے ہیں چاہے ان کا مقصد واقفیت پیدا کرنے کے سوائے کچھ اور نہ بھی ہو۔

اپنے مبینہ نظریاتی اصولوں کے ڈھنڈورہ پیٹنے کے باوجود کوئی بھی جماعت مستقبل میں آگے چل کر کونسی راہ عمل اختیار کرے گی اس کی پیشین گوئی بہت مشکل ہوتی ہے۔ پھر بھی کسی جماعت کی اندرونی حالت کو دیکھ کر اس کے ارادوں کے متعلق قیاس آرائی کی جاسکتی ہے۔ تجارتی پیشہ لوگوں کی جماعت اکثر ہمیشہ ایک ایسے شخص کو صدر بناتی ہے جو کہ دوسرے ہم پیشہ لوگوں سے زیادہ دولت مند ہوتا ہے اور کسی بھی ٹریڈ یونین کی تنظیم میں رہبری ہر حال میں اسی کے سپرد کی جاتی ہے جو کہ سب سے زیادہ جدوجہد کر سکتا ہے اور دوسروں کی خاطر اپنے مفاد کی قربانی دے سکتا ہے۔ تنظیموں کی ساخت اور ان کی کمیٹیوں کی تشکیل اسی وجہ سے مستقبل کی اس تصویر کی نمائندگی کرتی ہے جو کہ ان کے ذہن میں ہوتی ہے۔ اگر اس کسوٹی پر آر ایس ایس کو کسا جائے تو ہم یہ نتیجہ نکالیں گے کہ آر ایس ایس کے ہاتھوں میں اقتدار کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک خاص علاقہ کے لوگوں کے ہاتھ میں رہبری کی باگ ڈور آجائے گی اور ان میں بھی ایک مخصوص ذات کے اصحاب قوت حاصل کر سکیں گے جن پر ملک کے دولت مند طبقہ کا مکمل اثر ہوگا۔

جہاں تک "سرمایہ داری" کا سوال ہے یہ سنگھ کے لیڈر رہی ہیں جن کا کردار اور عمل مندرجہ بالا نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اگر ان سے دریافت کیا جائے کہ سنگھ سماج میں کس قسم کے معاشی رشتے قائم کرنے کا حامی ہے تو ہر ممکن طریقہ سے اس سوال کا سیدھا جواب دینے سے کترانے کی کوشش کی جائے گی۔ ایک مرتبہ سنگھ کے ایک اہم رہنما سے جب یہی سوال پوچھا گیا تو انھوں نے اس مشکل ترین مسئلہ کا کیا خوب حل بتایا ہے ذرا ملاحظہ کریئے انھوں نے فرمایا کہ ہندوستان میں تو 'سرمایہ داری' کا کوئی مسئلہ ہے ہی نہیں۔ کیونکہ یہاں کوئی ایسا فرد ہی نہیں ہے جس کو سچ مچ سرمایہ دار کہا جاسکے۔

کچھ دیگر سنگھی اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ سنگھ ملک کی معاشیات کے متعلق کوئی منصوبہ نہیں بناتا کیونکہ اس کا مقصد تو یہ ہے کہ موجودہ سماج کے کردار میں تبدیلی لائی جائے۔ اور جب ایک مرتبہ سماج میں مرد اور عورتیں اپنے ذاتی مفاد سے بلند ہو کر سوچنا شروع کر دیں گے تو عام مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔ ٹھیک ہے لیکن اس کام کے لئے کئی صدیاں نہیں تو کئی نسلیں تو ضرور چاہئیں۔ اور اگر اسی دوران سنگھ ملک میں برسر اقتدار آگیا تو فوری اس مسئلہ کا کیا حل نکالے گا؟ ظاہر ہے کہ تمام گفتگو اس سوال کے کرتے ہی ختم ہو جاتی ہے۔

حال ہی میں ایک اہم سوئم سیوک نے مشرقی خطہ کے ناظم کو یہ چیلنج کیا کہ سنگھ کے خلاف مندرجہ ذیل الزام کا جواب دے۔

"سنگھ کے حلقوں کے ساتھ معمولی سی واقفیت بھی یہ ظاہر کر دیتی ہے کہ دیگر باتوں کے علاوہ سنگھ کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ملک میں سیاسی اقتدار اس کے ہاتھوں میں آجائے لیکن سنگھ کبھی یہ نہیں بتاتا کہ آخر اس قوت کو حاصل کر کے سنگھ اسے کس طرح استعمال کرنا چاہتا ہے۔ اس کی صرف دو وجوہات ہوسکتی ہیں پہلی تو یہ کہ سنگھ نے کوئی منصوبہ بنایا ہی نہیں کہ اگر وہ برسر اقتدار آگیا تو کیا راہ عمل اختیار کرے گا۔ ظاہر ہے کہ اگر یہی بات ہے تو یہ بے انتہا خطرناک صورت حال ہے۔ دوسری یہ کہ اس کے ارادے اصل میں اتنے برے ہیں کہ سنگھ ان کو خود اپنے ممبران کو بتانے کی ہمت نہیں کرتا۔"

اس الزام کا تسلی بخش جواب اسی وقت دیا جاسکتا ہے جب کہ یا تو مکمل صاف گوئی سے کام لیا جائے یا غیر معمولی ذہانت کے ساتھ کسی طرح سے

بھی تسلی کر دی جائے۔ سنگھ کے رہ نما ان دونوں باتوں میں بالکل کورے ہیں اسی وجہ سے سنگھ کے ارادے اور اس کے نظریاتی اصول آج بھی مبہم ہیں اور ہر قدم پر جس جس مرحلے کا سامنا ہوتا جاتا ہے، جزوی طور پر اسی کا فوری حل کر لیا جاتا ہے۔

مارکسزم کے ایک مشہور نقاد نے سوویت روس کی موجودہ کمیونسٹ حکومت پر اعتراض کرتے ہوئے وہاں کے سربراہوں سے متعلق ایک اہم حقیقت لوگوں کے سامنے پیش کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سماج و اقتصادیات کی منصوبہ بندی کن خطوط پر کی جائے اس بات کی وضاحت کئے بنا ہی کارل مارکس اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ علاوہ ازیں عملی سیاست کے ان اولین اصولوں کے متعلق بھی جن کو سامنے رکھ کر اشتراکی حکومت کام چلا سکے، انھوں نے کچھ نہیں بتایا۔ اس نظریے کے بانی کی طرف سے جو یہ کمیاں باقی رہ گئیں ان کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اسٹالن آج اس میدان میں جو بھی قدم اٹھاتے ہیں اسے اس ملک میں سو فی صدی "مارکسی" درجہ دے دیا جاتا ہے چاہے وہ قدم صرف ان وقتی حالات کے پیش نظر اٹھایا گیا ہو جن کا مارکس کو کبھی وہم و گمان بھی نہ رہا ہو۔

آر ایس ایس کے معاملہ میں تو یہ تنقید کہیں زیادہ سچ ہے۔ اس تنظیم کے بانی اپنے نظریاتی پہلو کی وضاحت میں ایک لفظ بھی تحریر کئے بنا رحلت فرما گئے اور اب جو افراد اس کے سربراہ ہیں وہ اپنا حق سمجھتے ہیں کہ اس خلا کو وہ جس طریقے سے بھی چاہیں وقتاً فوقتاً پر کرتے رہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ یہ رہ نما جن پالیسیوں پر عمل کرتے ہیں اس کو تحریک کے کچھ بنیادی اصول بنا کر پیش کر دیتے ہیں اگر چہ ان میں سے بیشتر پالیسیاں درحقیقت خالص موقع پرستی کی پیداوار ہوتی ہیں۔

اب آخر میں سنگھ کی فرقہ پرستی کے متعلق بھی کچھ بات کر لی جائے۔ ایک وقت ایسا بھی تھا جب کہ اس ملک میں بہت سے لوگوں کے دماغ میں یہ خوف موجود تھا کہ ایک بار برسر اقتدار آنے کے بعد آر ایس ایس ہندوستان میں یقیناً ہندو راج قائم کرے گا۔ ایک ایسے شخص کیلئے جو کہ سنگھ کے رہ نماؤں کی ذہنیت سے کچھ واقفیت رکھتا ہے یہ سوال بذات خود مہملیت سے کوسوں دور ہے۔ سنگھ کے رہ نما ہندو تہذیب اور ہندو راشٹر کے نام کا کتنا ہی ڈھنڈورا پیٹتے رہیں اس تنظیم کا بنیادی مقصد فرقہ وارانہ نہیں ہے۔ وہ مقصد اس سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ یہ بدترین صوبہ پرستی ہے جو کہ سوچے سمجھے ارادوں پر مبنی ہے اور ایک پر خطر نوعیت کے دور رس منصوبہ کے تحت کارفرما ہے۔ یہ صوبہ پرستی اس قسم کی ہے کہ اس کے رد عمل کی صورت میں مکمل ہندوستان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔

پھر بھی بہت سے ایسے افراد ہیں جن کا یہ یقین ہے کہ آر ایس ایس کا ایک بنیادی نظریہ شدید ترین ہندو پرستی ہے اور اسی وجہ سے یہ جماعت کسی صورت میں کسی بنا پر بھی اس نظریہ میں ترمیم کرنے کو تیار نہیں ہو سکتی۔ لیکن سنگھ کا جو رویہ اب تک دوسری ہندو فرقہ پرست جماعتوں کے ساتھ رہا ہے اور جس آسانی کے ساتھ بغیر ایک انگلی بھی اٹھائے اس جماعت نے ملک کو تقسیم ہونے دیا ہے اس بنا پر اس کے اس ہندو پرست نظریہ پر شک ہونے لگتا ہے۔ کم از کم اتنا تو کہا ہی جا سکتا ہے کہ جس ہندو راشٹر اور بھارت ماتا کی قسمیں آر ایس ایس کے آدمی صبح و شام کھاتے رہتے ہیں وہ اس کے ایسے بنیادی اصول نہیں ہیں جن کی خاطر کبھی سنگھ اپنے وجود کو بھی خطرے میں ڈالنے کو تیار ہو سکتا ہے۔

بلاشک سنگھ کے لئے کچھ باتیں، وقار کا سوال بھی بنی ہوئی ہیں جنھیں ہم چاہیں تو اس کے بنیادی اصول کہہ سکتے ہیں۔ ان میں سے ایک تو "بھگوا دھوج" یا کیسری رنگ کا جھنڈا ہے کم از کم جس کی جانب سنگھ کے ہر سوئم سیوک کی وفاداری ضرور موجود ہوتی ہے۔ مجبور ہو کر پچھلے سال سرسنگھ چالک کو قوم کے جھنڈے اور ایک جماعت کے جھنڈے کے درمیان فرق کو تسلیم کرنا ہی پڑا اور اس طرح پہلی مرتبہ سوئم سیوکوں نے ترنگے جھنڈے کے سامنے بھی سر خم کیا۔

دوسرا بنیادی اصول ہے "ایکا چالک انو ورتتو" یعنی ایک رہنما تسلیم کرنے کا اصول۔ اس کو صرف ظاہرہ طور پر خیرباد کہہ دیا گیا جبکہ سنگھ نے ایک تحریری دستور کو تسلیم کر لیا کیونکہ اس کے معنی یہ ہوئے کہ سرسنگھ چالک اپنی تمام قوت سے دستبردار ہو گئے۔

مندرجہ بالا امر کے بالکل برعکس جماعت میں مراٹھیوں کی بالادستی کے سوال پر سنگھ کا رویہ کوئی تبدیلی منظور کرنے کو تیار نہیں ہے باوجودیکہ سردار ولبھ بھائی پٹیل جیسی ہستی نے ان پر اس بات کا الزام عائد کیا ہے۔ میرا پختہ یقین ہے کہ اس سوال پر سنگھ جھکنے کے لئے کبھی تیار نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہی وہ بات ہے جو کہ سنگھ کے رہ نماؤں کو ایک "کاز" یعنی بامعنی مقصد کی طرح محسوس ہوتی ہے اور جس کے بغیر سنگھ بالکل بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ سنگھ کے رہ نما اس بات پر بضد ہو کر قائم رہیں گے چاہے انھیں ایک صوبے کے بعد دوسرے صوبے سے اپنا اثر ختم بھی کرنا پڑے اور صرف اپنے ہی صوبہ میں اثر باقی رہنے پر اکتفا کرنا پڑے۔ وہ اس وقت تک انتظار کرنے کو تیار رہیں گے جب کہ دوبارہ انھیں مناسب موقع ملے اور وہ اپنے جال میں نئے سرے سے پھر معصوم لوگوں کو پھنسا کر اپنا شکار بنا سکیں اور ایک بار پھر اپنی وہی دوکانداری چلا سکیں۔ ۔ ۔

تابش عظیم آبادی

جشنِ آزادی

بلاؤ ماہ جبینوں کو رقص فرمائیں
شراب ناز نگاہوں سے اپنی چھلکائیں
فضا میں زلفِ معطر کو اپنی لہرائیں
جو بے قرار ہیں وہ بھی قرار پاجائیں
خوشی مناؤ رفیقو! ہے جشنِ آزادی

کلی کلی متبسم بہار ہے آج
جو گل فسردہ ہیں ان پہ بھی کچھ نکھار ہے آج
دل و نگاہ پہ لوگوں کو اختیار ہے آج
خوشا بہار کہ جلوہ ہی خود شکار ہے آج
خوشی مناؤ رفیقو! ہے جشنِ آزادی

سلام ان پہ جو مرتے رہے چمن کے لئے
جنھوں نے جان دی آزادیٔ وطن کے لئے
چڑھے جو دار پہ نسرین و نسترن کے لئے
تمام جد و جہد تھی اسی چمن کے لئے
خوشی مناؤ رفیقو! ہے جشنِ آزادی

رہے نہ آقا زمانے میں اور نہ کوئی غلام
زمین والو مبارک یہ آسماں کا پیام
ہے شادمانی کی حاجت بڑھاؤ جام پہ جام
حدیثِ جشن میں تابش فسردگی ہے حرام
خوشی مناؤ رفیقو! ہے جشنِ آزادی

حفیظ فضا

مطلعِ انوار

(۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے نام)

کتنا بوجھل تھا گراں بار تھا شب کا افسوں
دیدۂ انجم و مہتاب بھی خوابیدہ تھے
شبِ خوں بستہ کے قدموں میں رکھے
گل و گلزار پہ چھائے تھے خزاں کے سائے
شاخ در شاخ تھے سہمے ہوئے غنچوں کے جگر
نغمے معدوم تھے ٹوٹے ہوئے تھے ساز کے تار
کہیں پھولوں کا تعطر تھا نہ کلیوں کی شمیم
تھی فضاؤں میں سمائی ہوئی بارود کی بو
اتنی خاموشی تھی جیسے کسی مدفن کا سکوت
گھٹ چکا تھا قالبِ احساس کی چیخوں کا خروش
رقص فرما تھا ہر اک سمت ہراس
قید کی، ظلم کی، معیاد نہیں تھی کوئی
جبر کی، جور کی، فریاد نہیں تھی کوئی
درد کے پنجۂ خونیں میں تھی جکڑی ہوئی زیست
اسی ماحول کی اُمڈی ہوئی تاریکی میں
جگمگا اٹھی "اک آواز کی جوت"
جو تھی زخموں کے لئے دستِ مہرباں کی طرح
ایک انسان کی آواز کہ تھا جس میں نہاں
روحِ آزادیٔ اربابِ وطن کا جذبہ
ہمنوا جس کا تھا اک "تازہ رو خوش رنگ گلاب"
پھر کئی ایک صداؤں سے فضائیں لرزیں
تیز رو، برق صفت، کتنے قدم آگے بڑھے
خونِ دل روشنیٔ فکر و نظر ساتھ لئے
رہ نوردانِ رہ امن و سلام
تیرگی کانپ اٹھی خیمۂ شب تھرایا
بہہ گیا رات کی نبضوں کا لہو
اور اتر آئی سحر مطلعِ انوار لئے

فرضی خطرات کے بھنور

سیاسی مبصر کے قلم سے

پچھلے تین چار ہفتوں سے پاکستان سے ایک سہمی اور بوکھلائی ہوئی آواز سنائی دے رہی ہے، جو بے سمت بے سمت غیر موجود خطرات کی نشان دہی کر رہی ہے۔ ابھی اسے مغربی سرحد پر خطرہ نظر آتا ہے، ابھی مشرقی سرحد پر — تو کبھی دونوں پر۔ ابھی اسے مغربی سرحد پر فوجوں کا اجتماع دکھائی دیتا ہے تو کبھی مشرقی سرحد پر۔

یہ ڈری ہوئی آواز وزیر اعظم بھٹو کی ہے جو ان کے خود ساختہ خوف کے گنبد سے آ رہی ہے۔ کبھی کبھی تو اس سہمی ہوئی آواز کو سن کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ بھٹو صاحب اپنے ہی گھر کے آئینہ خانہ میں خود اپنا عکس دیکھ کر ڈرے جا رہے ہیں۔ ان کی ذہنی حالت کا یہ عالم یا تو کسی نفسیاتی بیماری کی وجہ سے ہے یا یہ محض ان کی سیاسی اداکاری ہے جس کے نمونے ان کی داخلی سیاست کی اسٹیج پر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ایک لحاظ سے ان کا قصور بھی نہیں، کیونکہ پاکستان کی (۲۷) سالہ مختصر تاریخ میں پاکستانی سیاست کبھی بھی تعمیری نہیں رہی گو کہ ڈرامائی ضرور رہی ہے۔

ہندوستان سے خطرے کا ناٹک تو پاکستان کے حکمرانوں کا بوسیدہ سیاسی ہتھیار رہا ہے، اب انھیں افغانستان سے بھی خطرہ نظر آ رہا ہے۔ ستم تو یہ ہے کہ بھٹو صاحب کو اب ایران سے بھی خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ آخر ایران کیوں ہتھیار جمع کر رہا ہے؟ اگر پاکستانی حکمرانوں کی یہی ذہنی حالت رہی تو انھیں جلد ہی خلیج کی ریاستوں سے بھی خطرہ نظر آنے لگے گا، کیوں کہ وہ بھی تو ہتھیار جمع کر رہی ہیں — شاید وہ دن بھی دور نہیں جب پاکستانی حکمران یہ چلانے لگیں کہ انھیں ساری دنیا سے خطرہ ہے۔ ایسی حالت میں وہ خدا جانے کیا کر بیٹھیں۔

اپنی سرحد پر ہندوستان اور افغانستان کی فوجوں کے اجتماع کے بارے میں جو ڈرامہ بھٹو صاحب کر رہے ہیں اس کا آغاز جس انداز سے انھوں نے کیا ہے اس سے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ داخلی سیاست کی اسٹیج سے مایوس ہو کر اب وہ برصغیر کی اسٹیج پر ایک بار پھر اُتر آئے ہیں۔ کسی بھی ملک کی سرحد پر غیر ملکی فوجوں کا اجتماع انتہائی سنگین صورت حال ہوا کرتی ہے۔ ایسی حالت میں قومی اور بین الاقوامی سطح پر بہت سے اقدامات کرنے ہوتے ہیں۔ لیکن بھٹو صاحب کا انداز سیاست دیکھئے کہ نہ تو انھوں نے اپنی پارٹی کو بتایا نہ ہی اپوزیشن کو مطلع کیا اور نہ ہی اپنے عوام کو۔ کراچی "صورت حال سے باخبر کیا۔ پاکستانی سرحدوں پر فوجی نقل و حرکت کی اہم خبر انھوں نے سب سے پہلے نیویارک ٹائمز کے نمائندے جیمز کلیریٹی کو سنائی تاکہ سب سے پہلے امریکی آقاؤں کو خبر ہو اور وہاں سے اسلحہ آنا شروع ہو جائے۔ بھٹو صاحب ۸ جولائی کو کلیریٹی کو بتاتے ہیں "آج میں نے اپنی مسلح افواج کے سربراہوں اور دوسرے لوگوں سے بہت طویل مشورے کئے کیونکہ فوجوں کی کچھ نقل و حرکت اور کچھ تعیناتی ہوئی ہے۔ سیالکوٹ سیکٹر کے نزدیک کشمیر میں اور دوسرے مقامات پر بھارتی فوج کی محسوس نقل و حرکت دیکھنے میں آئی ہے۔ شمالی علاقوں یا مغرب میں اور ڈیورنڈ لائن کے ساتھ ساتھ بھی فوجوں کی کچھ نقل و حرکت ہوئی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کل جنگ چھڑ جائے گی یا جنگ چھڑنے والی ہے۔ یہ نقل و حرکت حال ہی میں ہوئی ہے اور آپ پہلے غیر ملکی ہیں جنھیں میں یہ اطلاع دے رہا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ نقل و حرکت ایک بڑے مقصد کی جانب اشارہ کرتی ہے اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں وہ مقصد یہ ہے کہ ہمارے اوسان خطا کر دیئے جائیں اور اس کی آڑ میں کشمیر کے بارے میں کوئی اعلان کر دیا جائے۔ ہو سکتا ہے بھارت محض دانت دکھانا چاہتا ہو یا یہ ظاہر کرنا چاہتا ہو کہ مذاکرات کا سلسلہ منقطع ہونے پر وہ کتنا برہم ہے۔ بین الاقوامی قوتیں ابتک پاکستان کے خلاف کام کر رہی ہیں۔ ۱۸ مئی کو بھارت نے ایٹمی دھماکہ کیا۔ افغانستان کے صدر روس گئے اور ایک مشترکہ اعلانیہ کے ساتھ واپس آئے جس میں پاکستان اور افغانستان کے سیاسی اختلافات پر تبصرہ کیا گیا تھا اور یہ فرقہ وارانہ مسئلہ پاکستان میں ایک دم بھڑک اٹھا۔ آخر اس وقت کیوں بھڑکا؟ اس مسئلہ کے سلسلہ میں ایجی ٹیشن کرنے والے کچھ لوگ حال ہی میں بھارت سے آئے ہوئے ہیں یا بھارت کے ساتھ ان کے بنیادی رابطے اب تک قائم ہیں۔"

اپنے اس انٹرویو میں وزیر اعظم بھٹو نے امریکہ سے اسلحہ کی سپلائی کی بحالی کے لئے بار بار تقاضا کیا ہے اور کچھ اس انداز سے کیا ہے، کہ ایسا لگتا ہے کہ بلا وجہ خطرے کا سائرن بجانے کا ایک بڑا مقصد امریکی اسلحہ حاصل کرنا ہے لیکن اصل مقصد تو کچھ اور ہے۔ پاکستان کے اندرونی حالات انھیں ایسے موڑ پر لے آئے ہیں کہ ایسے حربے استعمال کرنے کے علاوہ ان کے لئے کوئی راستہ نہیں ہے پاکستانی اخباروں میں سرحدوں پر فوجوں کے اجتماع کی سرخیاں جمیں تو لوگوں میں تشویش ہونا اور پھیلنا قدرتی ہے۔ ملک کا وزیر اعظم کہتا ہے تو ٹھیک ہی کہتا ہو گا۔ وہ بے چارے کیا جانیں کہ حقیقت کیا ہے کس طرح انھیں اُلو بنایا جا رہا ہے۔

کراچی کے ممتاز ہفت روزہ "اخبار جہاں" کے ۲۴ جولائی کے اداریہ میں اسی تشویش کی طرف اشارہ ہے۔ "ان بیانات سے قدرتی طور پر قوم میں سنسنی پھیل گئی ہے اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ کیا برصغیر کے عوام کی قسمت میں جنگ کا ایندھن بننا ہی لکھا ہوا ہے۔ آج کل کی جنگ صرف فوج ہی نہیں لڑتی عوام بھی لڑتے ہیں۔ جب ان سے مکمل طور پر رابطہ رکھا گیا ہو۔ انھیں پوری طرح تیار کیا گیا ہو۔" اسی اداریے میں جنگوں کے لاحاصل اور بے سود ہونے کا ذکر کرتے کرتے بات جنگ کی تیاری تک پہنچا دی جاتی ہے "یہ حقیقت بھی

ہمیں جان لینی چاہیئے کہ آج کل کے زمانے کی جنگوں سے مسائل حل نہیں ہوتے ہیں بلکہ اور پیچیدہ ہو جاتے ہیں خالص روایتی قسم کی جنگیں ـــــ جن میں پروٹوکول کا خیال رکھا جاتا ہے، فائر بندی پر ختم ہو جاتی ہیں۔ پھر مذاکرات کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ہم تو اس بات پر زور دیتے آئے ہیں کہ پاکستان کے مخصوص جغرافیائی حالات میں جہاں پڑوس میں دوستوں کی تعداد کم ہے دشمنوں کی زیادہ ہے۔ ہمیں دفاعی اور اقتصادی دونوں تیاریوں پر زور دینا چاہیئے۔"

پاکستان کی داخلی سیاست اس قدر جذباتی نوعیت کی ہے کہ ذراسی بات ہوئی اور نعرے لگنے لگے، بازو لہرانے لگے۔ یہ بھی نہیں سوچیں گے کہ ذرا غور کرلیں، واقعی کوئی مسئلہ ہے بھی یا نہیں۔ شملہ سمجھوتہ ہو جانے کے بعد بھی جہاں ہند کا ذکر آجائے تو ہند دشمن عناصر کھل کھیلتے ہیں۔ اِدھر بھٹو صاحب نے فوجوں کے اجتماع کا شوشہ چھوڑا اور اُدھر اداریئے تحریر ہو بھی گئے۔ "نوائے وقت" (۱۲ر جولائی) نے لکھا "ہمیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ سقوط مشرقی پاکستان کے المیہ کے بعد رہے سہے پاکستان کے خلاف سازشوں اور داخلی اضطراب و ہیجان کے پیش نظر پاکستان کے دشمنوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ داخلی انتشار و خلفشار نے پاکستان کو کمزور کر دیا ہے اور اس میں مدافعت و مقابلہ کی سکت نہیں رہی، چنانچہ بھارت اور اس کے ایجنٹ سامنے آگئے ہیں اور ان ایجنٹوں کی باتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے جیسے خدا نخواستہ پاکستان ٹوٹ رہا ہے یا کسی بھیانک طوفان سے دوچار ہونے والا ہے۔"

"نوائے وقت" اپوزیشن کا اخبار ہے اس کے لہجہ کی تلخی اس کی روایتی ہند دشمنی کی وجہ سے ہے "امروز" تقریباً سرکاری اخبار ہونے کی وجہ سے بھٹو صاحب کے ذہن و زبان کی ترجمانی کرتا ہے۔ "یہ تلخ حقیقت ایک بار پھر نمایاں ہوئی ہے کہ ہندوستان بقائے باہم پر آمادہ نہیں اور مسائل کے پرامن اور منصفانہ تصفیئے پر یقین نہیں رکھتا، ورنہ تنازعۂ کشمیر کو سلجھانے کا یہ طریقہ اختیار نہ کرتا، جس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ مفاہمت کی جو فضا، شملہ معاہدے کے سبب استوار ہونے لگی تھی، مکدر ہو جائے، برصغیر ایک بار پھر کشیدگی، محاذ آرائی اور تصادم کی آماجگاہ بن جائے۔ ہندوستانی فوجوں کی نقل و حرکت کے ساتھ ڈیورنڈ لائن پر افغان افواج کا اجتماع بڑا معنی خیز ہے۔ اس سے وزیر اعظم بھٹو کے خدشات کی تصدیق ہو جاتی ہے"

(۱۴ر جولائی)

تشویش اور فکرمندی کا جو ماحول مسٹر بھٹو پیدا کرنا چاہتے تھے اس کے لئے ریڈیو اور اخبارات ان کے خاصے کام آئے۔ یوں کہنے کو حکومت پاکستان اور اس کے وزیر اطلاعات مولانا کوثر نیازی پریس کی آزادی کے دعوے کرتے نہیں تھکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو اخبار یا جریدہ بھٹو حکومت کے انداز سے الگ سوچ کا بھرم رکھتا ہے اس کی زبان بندی کا انتظام کر دیا جاتا ہے۔ ایسے اخبار کی اشاعت پر پابندی، چھاپہ خانہ پر مہر بند تالہ اور مدیر اور مالک جیل کی سلاخوں کے پیچھے ـــــ ایسے واقعات وہاں اکثر سننے کو ملتے ہیں لہٰذا سرحدوں پر فوجوں کے اجتماع کا جو شوشہ بھٹو صاحب نے چھوڑا اس پر "پاکستان ٹائمز" اور "ڈان" نے بھی اداریئے لکھ مارے۔ "ڈان" کے اداریئے کا اقتباس پاکستانی وزیر اعظم کی بازگشت ہے "حالانکہ مسٹر بھٹو نے بہت بڑی سازش کی نشاندہی کی، لیکن انھوں نے یہ اشارہ بھی دیا کہ فوجوں کے اجتماع کے پیچھے کوئی منحوس اور سنگین مقصد بھی ہو سکتا ہے۔ فوجوں کا اجتماع ایک ایسا خطرناک اقدام ہے جسے کوئی بھی ملک نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ایک بار ٹکڑے ٹکڑے ہونا ہی کافی ہے۔ پاکستان کے دوستوں اور ایسے ممالک کے لئے جو قوموں کی علاقائی سالمیت اور عالمی امن کے اصولوں میں یقین رکھتے ہیں ان کے لئے لمحۂ فکریہ ہے کہ وہ ہند کے ایٹمی دھماکے کے فوراً بعد کئے جانے والے اس سنگین اقدام کا نوٹس لیں۔ پاکستان کے دوست اس سلسلے میں کچھ کر سکیں یا ایسا کرنے میں ناکام رہیں، پاکستانی عوام کی ذمہ داری تو واضح ہے ہی۔" (۱۳ر جولائی)

آخری پاکستانی جنگی قیدی لیفٹیننٹ جنرل اے۔ اے۔ کے نیازی نے مسٹر بھٹو کی طرف سے جنگی جنون کی فضا تیار کرنے کی کوششوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک بیان داغ دیا ہے جو نوائے وقت میں چھپا ہے۔ نیازی صاحب کا کہنا ہے کہ ان کی شکست کا اصل سبب مقامی عوام کا عدم تعاون تھا "میری کمان کی تین ڈویژن فوج جس نے سابقہ مشرقی پاکستان میں جنگ کی تھی وہ پھر مادر وطن کی خدمت کرنا چاہتی ہے اور ذلت کا داغ دھو ڈالنا چاہتی ہے"۔ نیازی نے ایسے بیان کے لئے یہی وقت کیوں چنا؟ ظاہر ہے کہ بھٹو حکومت جنگی جنون پیدا کرنے کے نفسیاتی عمل کو پراثر بنانے کے لئے ایسے بیانات کی تشہیر چاہتی ہے اور اس سلسلے میں نیازی نے نمک خوار کا حق چکایا۔

ہند نے دو برس پہلے شملہ میں ماضی کی تلخی کو ختم کرکے خوش گوار تعلقات کے نئے باب کا آغاز کرنے کے لئے ایک معاہدہ پر دستخط کئے اور تاحال اُس عہد کو نبھاتا چلا آرہا ہے۔ دستخط تو بھٹو صاحب نے بھی کئے تھے لیکن دن میں ایک آدھ مرتبہ کسی نہ کسی بہانے وہ تصادم کی بات کر ہی لیتے تھے۔ پرانی عادت ہے اُن کی، چھوٹنے میں نہیں آتی۔ ان کے کئی ذمہ دار ساتھی آج بھی بدلہ لینے کی باتیں کرتے پھر رہے ہیں۔ جولائی کے آغاز میں سرگودھا میں جان باز فورس کے ایک دستہ کی پاسنگ پریڈ سے خطاب کرتے ہوئے پاکستانی پنجاب کے وزیر زراعت بریگیڈیئر صاحب داد خاں نے کہا "جب تک شکست کا بدلہ نہیں لے لیتے اس وقت تک پاکستان کا کوئی بھی شہری چین کی نیند نہیں سو سکتا۔" (امروز۔ ۵ر جولائی) یہ تو بھٹو صاحب کی فوجوں کے اجتماع کی کہانی سے بھی پہلے کی بات ہے۔ اس قسم کی بچکانہ اور جذباتی باتوں سے بھٹو صاحب اور ان کے ساتھی کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں؟

س سلسلے میں پاکستانی مبصر مرغوب صدیقی کے ایک مضمون کا اقتباس کافی دلچسپ ہے۔ گو وہ مشورہ یہ دے رہے ہیں کہ پاکستان کو بنگلہ دیش کے پیچھے بھاگنے

کی بجائے احتیاط سے کام لیتے ہوئے بنگلہ دیش کو لفٹ نہیں دینی چاہیئے، لیکن ذہن میں بنیادی خیال ہند اور پاکستان کے درمیان ایک اور جنگ کے امکانات پر مرکوز ہے" سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بنگلہ دیش پاکستان سے تعلقات استوار کرنے کی بات کیوں کرتا ہے۔ راقم کی نظر میں یہ سب روس اور بھارت اور بنگلہ دیش کی ملی بھگت ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ روس اور بھارت پاکستان کو بنگلہ دیش کی خندق میں پھنسا کر اسکو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ اگر تجارت شروع ہوگئی تو پاکستان کا بے شمار روپیہ اور سامان بنگلہ دیش میں پھنسایا جا سکتا ہے جو بعد میں اور خصوصاً پاکستان اور بھارت کے تعلقات کی خرابی یا اُن کے درمیان جنگ کی صورت میں خرد برد کیا جاسکتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پاکستان کو روس، بھارت اور بنگلہ دیش کے اس مشترکہ جال میں نہیں پھنسنا چاہیئے ورنہ کبھی پھر بھارت سے جنگ ہوئی تو پاکستان کا مال اسباب اور تجارتی اور فضائی جہاز سب ایک دفعہ پھر بھارت کے قبضہ میں ہوں گے۔" (نوائے وقت۔ ۲۰ جولائی)

اس اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ پاکستان میں ایسے ذہن یقیناً ہیں جو ایک اور جنگ کے خواہاں ہیں۔

حمید اصغر نجیب نے ایک خصوصی مضمون میں " پاکستان کے خلاف بیرونی جارحیت کے خطرے کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے" پاکستانی سرحدوں پر بھارتی فوجوں کے اجتماع سے ایک مرتبہ پھر جنگ کے آثار نمایاں ہونے لگے ہیں، اس مرتبہ چونکہ بھارت نے اپنے مربی دوست روس کی مدد سے افغانستان کو بھی پاکستان کے مد مقابل لا کھڑا کیا ہے اس لئے پاکستان کے لئے ایک سنگین تر صورت حال پیدا ہوگئی ہے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمیں اپنے دشمنوں کے بارے میں صحیح علم ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارا اصل دشمن بھارت ہے اور اسے دنیا کی ایک بڑی طاقت روس کی عملی امداد حاصل ہے۔ بھارت اب ایک ایٹمی طاقت بن چکا ہے۔ اس کے اعلیٰ اور جدید ترین ہتھیاروں کو مد نظر رکھ کر ہی پاکستان کو اپنی پالیسی مرتب کرنی چاہیئے۔ بلاشبہ حالات بہت ہی نامساعد ہیں۔" یہ مضمون جن کی ایما پر لکھا گیا انھیں پہچاننا مشکل نہیں ہے۔ یہ وہی عناصر ہیں جن کی ایما پر اس فرضی خبر کی تشہیر کی گئی۔" ہندوستان اور افغانستان نے پاکستان کے خلاف" کامن فرینڈز آپریشن" کے نام سے ایک منصوبہ تیار کیا ہے اس منصوبے پر عمل درآمد شروع ہوگیا ہے اور ہندوستانی فوجوں کو تین دن کے نوٹس پر تیار رہنے کا حکم دیدیا گیا ہے۔"

(امروز ۔ ۱۴ر جولائی)

اس مضحکہ خیز خبر کو پڑھ کر سوائے مسکرانے کے کیا کیا جاسکتا ہے۔ ہند میں کسی بھی سطح پر نہ جنگ کا ذکر ہو رہا ہے نہ فوجوں کا۔ جانے پاکستانی ذہنوں کی زرخیزی ایسی خبریں کہاں سے تراش لاتی ہے۔ اب دیکھئے صوبائی اسمبلی کی ممبر مس ناصرہ کھوکھر مسٹر بھٹو کے منصوبے سے بھی ایک قدم آگے بڑھ گئیں۔ ۱۵ر جولائی کو پاکستان نیشنل سینٹر راولپنڈی میں تقریر کرتے ہوئے مشورہ دیا کہ جنگ کو برصغیر کی حدود سے بھی باہر پھیلا دیا جائے، فرماتی ہیں" ہمارے ہمسائے بھارت اور افغانستان جن جن حربوں سے پاکستان کو ختم کرنے پر تلے ہوئے ہیں وہ نہ صرف ہمارے ملک کے لئے خطرہ ہیں بلکہ تمام دنیا کے امن پسند ملکوں کو خطرے کی دعوت دیتے ہیں۔"

عین ممکن ہے کہ یہ مشورہ بھٹو صاحب کے اشارے پر دیا گیا ہو کیونکہ مسٹر بھٹو ایک ایسی شخصیت ہیں جو امن کے دور میں ماند پڑتی ہے اور جنگ اور تصادم کی فضا میں نکھر آتی ہے۔ یہ بات ان کی داخلی اور خارجی دونوں سیاسی میدانوں میں دیکھنے میں آتی ہے۔

ابھی ان کے ملک میں جمہوریت کا جنم ہوا ہی ہے۔ کئی داخلی مسائل ہیں جو جمہوری حل کے طالب ہیں مسائل کی پیچیدگیوں سے گھبرا کر جنگ کی راہ اختیار کرنے سے یا جنگ کا ہوا کھڑا کرنے سے تو مسائل حل نہیں ہو جائیں گے۔ پاکستان کی داخلی حالت کسی سے چھپی نہیں ہے اس کا ایک عکس" اخبار جہاں" کے ۱۷ر جولائی کے اداریے میں ہے" جیسی کیسی بھی ہے جمہوریت ہے تو سہی اس کا کسی نہ کسی حد تک باہر بڑا اچھا اثر پڑا ہے۔ اس وقت ملک کے مختلف حصوں میں جو حالات ہیں وہ کسی سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔ ایک بار پھر بحران کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ ان بحرانوں کے مختلف فریق بحران کو ختم کرنے کی بجائے انھیں اور سنگین بنا رہے ہیں عوام ہمیشہ خوف و ہراس میں مبتلا رہتے ہیں ـــــ ایک مسئلہ بلوچستان کا ہے، یہ بھی انتہائی سنگین مسئلہ ہے اس مسئلے کے حل میں تاخیر سے ملک کے سیاسی حالات بھی متاثر ہو رہے ہیں اور بیرون ملک بھی بہت بُرا اثر پڑ رہا ہے ہمارے سیاسی حالات دوسرے ملکوں کی نسبت خراب ہیں کئی جگہ سیاسی انتشار ہے۔ انتشار سیاسی ہے اس لئے اس کا حل بھی سیاسی ہو سکتا ہے۔"

جن مسائل کی طرف اخبار جہاں نے اشارہ کیا ہے انھیں سے بھاگ کر مسٹر بھٹو جنگ و تصادم کا ہوا کھڑا کر رہے ہیں اپنے اگلے اداریے یعنی ۲۴ر جولائی کو اخبار جہاں نے یوں تو مسٹر بھٹو کو ہمدردانہ مشورہ دیا ہے لیکن اسی سے ان کی اداکاری بھی بے نقاب ہوگئی ہے " ایسے حالات میں وزیر اعظم کا دارالحکومت میں رہنا دوست دار الحکومتوں سے رابطہ رکھنا، فوجی صورت حال کا جائزہ لینا، فوجی اور سیاسی منصوبہ بندی کرنا قومی اعتبار سے زیادہ اہم ذمہ داریاں ہیں۔ وزیر اعظم کو ویسے بھی ایسے حالات میں خاموشی سے اپنی حکمت عملی ترتیب دینی چاہیئے۔ وزیر اعظم جیسی اہم شخصیت کے بیانات اور الفاظ بہت قیمتی ہوتے ہیں۔ ان کا زیادہ استعمال اچھا نہیں ہوتا۔"

مسٹر بھٹو کی چال کو بھرپور انداز میں بے نقاب کرنے کے لئے خان عبدالولی خاں نے اسلام آباد میں پریس کانفرنس سے خطاب کیا (۱۷ر جون)" داخلی مسائل سے عوام کی توجہ ہٹانے کے لئے حکومت نے سرحدوں پر ہمسایہ ملکوں کی افواج کی نقل و حرکت کا ہوا کھڑا کیا ہے اگر سرحدوں پر صورت حال سنگین ہے تو عوام کو اعتماد میں کیوں نہیں لیا جاتا؟ اگر واقعی ملک کو خطرہ ہے تو پارلیمنٹ کا خاص اجلاس بلا کر موجودہ حال پر غور کیوں نہیں کیا جاتا؟ درحقیقت موجودہ حکومت پنجاب سندھ

بلوچستان اور سرحد میں سیاسی جنگ ہار چکی ہے۔ اس لئے عوام کی توجہ اصل مسائل سے ہٹائی جا رہی ہے"۔

اور جب بھٹو حکومت کو پارلیمنٹ کا اجلاس بلانا ہی پڑ گیا تو مولانا شاہ احمد نورانی نے بحث کے دوران اس ڈھونگ کو مزید بے نقاب کیا "بہتر یہ تھا کہ وزیراعظم اس اہم صورت حال کے بارے میں پارلیمنٹ کو بتلاتے یا عوام سے خطاب کرتے، مگر انھوں نے ایک غیر ملکی نامہ نگار کو انٹرویو دیا۔ اگر ملک خطرے میں ہے تو بلوچستان سے فوج کو کیوں نہیں بلایا گیا سیاسی قیدیوں کو رہا کیوں نہیں کیا گیا۔ اگر خطرہ ہے تو وزیراعظم دارالحکومت میں کیوں نہیں رہتے وہ پاک فضائیہ کے طیارے میں لاڑکانہ کیوں گئے ہیں؟ ایسے وقت میں تو ایک ایک طیارے کی اپنے اڈے پر ضرورت ہوتی ہے"۔

بھٹو صاحب کے ڈھونگ کا بے نقاب ہونا شاید ان کے لئے اتنی صدمہ کی بات نہ ہو جتنی یہ کہ ان کی چال داخلی اور بین الاقوامی دونوں سطحوں پر ناکام رہی بھٹو صاحب شاید اس کا اعتراف کرتے ہوئے جھجکیں لیکن زیڈ۔ اے سلیری نے ایسے اعتراف کے لئے کوئی کسر بھی نہیں چھوڑی۔ نوائے وقت (۲۱ جولائی) میں وہ لکھتے ہیں "خواہ وہ ہند کے ایٹمی دھماکے کے خلاف احتجاج ہو یا ہماری سرحدوں پر ہندوستان اور افغانستان کی فوجوں کے اجتماع کے بارے میں واویلا ——— دونوں میں سے کسی پر بھی دنیا نے دھیان نہیں دیا۔ . . . اگر ہند اور پاکستان کے مذاکرات ناگزیر ہیں جیسا کہ مسٹر عزیز احمد کی تقریروں سے لگتا ہے تو اس صورت میں پیشگی شرائط کے شور سے عالمی توجہ حاصل نہیں کی جا سکتی۔ حکومت کو چاہیئے کہ مفروضات کو چھوڑ کر حقائق پر توجہ دے ورنہ مسلسل بحران اور کشیدگی کا یہ ماحول بنا رہا تو قومی اعصاب اس طرح تباہ ہوں گے کہ سچی ضرورت پڑنے پر بھی کچھ بن نہ پڑے گا"۔

ذوالفقار علی بھٹو کتنے بھی ہوشیار اور ذہین کیوں نہ ہوں، ایسے جادوگر تو وہ ہیں نہیں کہ اپنے جادو سے اپنی سرحدوں پر ہندوستان اور افغانستان کی فوجیں کھڑی کر لیں۔ اگر واقعی کھڑی ہو جاتیں تو بھٹو صاحب صوبہ سرحد، لاڑکانہ اور بلوچستان میں ٹہلنے کے لئے کیسے جا سکتے تھے۔ ہو سکتا ہے بھٹو صاحب کچھ اس انداز سے جھوٹ بول سکتے ہیں کہ اُس پر سچ کا گمان ہو لیکن وہ ہمیشہ کے لئے سچ ہی نظر آئے ایسا ممکن نہیں ہے۔ ایٹمی طاقتیں، بنگلہ دیش، عالمی ادارے ——— سبھی کے در کھٹکھٹائے بھٹو صاحب نے، جنگ کا فرضی خطرہ بھی کام نہ آیا ——— اب لگتا ہے کہ بادل نخواستہ بھٹو صاحب کو ہند کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑے گا۔ کیا کریں بے چارے! روٹھ کر بھی دیکھ لیا، کوئی منانے ہی نہیں آیا۔ لہٰذا خود ہی مان جانا پڑے گا اتنے اہم لیڈر پر کوئی یقین بھی تو نہیں کرتا۔ بھٹو صاحب کو وہم بھی نہ تھا کہ رائے عامہ اس قدر سیانی اور سمجھدار ہو جائے گی، ورنہ وہ کوئی اور داؤ استعمال کرتے۔

• • •

THE FERTILIZER CORPORATION OF INDIA LIMITED

India's biggest undertaking in the field of fertilizer Industry, the Fertilizer Corporation of India Limited, is one of the largest producers of plant nutrients in the world.

HOW BIG IS FCI ? FCI's five functioning units at Sindri (Bihar), Nangal (Punjab), Trombay (Maharashtra), Gorakhpur (U.P.) and Namrup (Assam) have the installed capacity of half a million tonnes of plant nutrients. This will rise to over two million tonnes when additional six plants under construction go on stream.

CATALYST KNOW-HOW—FCI is one of the few organisations in the world to develop and produce a complete range of fertilizer catalysts, so vital to the industry.

TOTAL FERTILIZER TECHNOLOGY—Backed by its intensive Research & Development efforts, FCI has now developed its own know hows, design and engineering capability and can execute six to eight modern fertilizer plants at a time from the blue-print to the final commissioning stage.

MARKETING SET-UP—With a vast network of sales outlets and promotional activities, FCI now serves about 80 per cent of the country.

The Quests of Man, I

THE POETRY OF ALGEBRA



"Out of a swarm of bees, one-fifth part settled on a Kadamba blossom; one-third on a Silindhra flower; three times the difference of those numbers flew to the bloom of a Kutaja; one bee which remained, hovered about in the air. Tell me, charming Woman, the number of bees?"

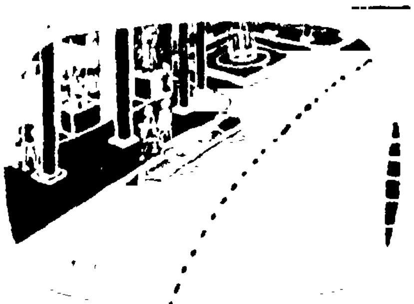
Sir M. Monier Williams, Indian Wisdom

How India gave the world the logic of indeterminate equations.

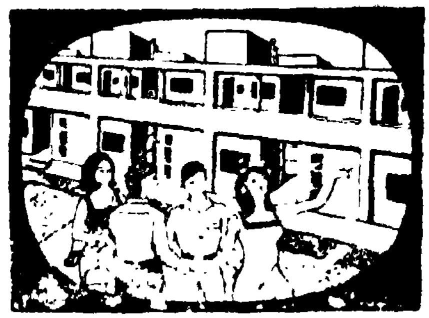
History owes a debt to three mathematicians of 1500 years ago who developed Algebra to give meaning to the meaningless. Bhaskara, who originated the radical signs. Brahmagupta, who created the symbols. Aryabhata, who worked out the first equations. Original thinkers, these men expanded man's horizon in his unending search for knowledge. A search that continues today in new directions with newer tools... among them, a machine that helps man in more ways than any other invention in history: the Computer. We are proud IBM Computers, India's first, and data processing equipment are helping the nation harness its huge potential to "transform the lives of its millions".

IBM

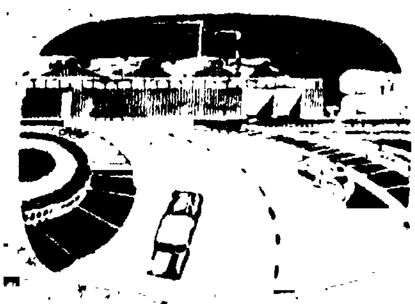
THE GREAT DEVELOPMENT PANORAMA



1. Delhi Development Authority is engaged in the transformation of the National Metropolis.
2. A massive social housing programme for the weaker sections has already made a headway. About 25,000 flats in different residential areas have been released and over 7,000 more have been planned.



3. Houses are given away to the community service personnel (dhobis, barbers, domestic servants and cobblers etc.) at subsidised cost. Allotment of Janta Houses to the people of Delhi (income not exceeding Rs. 3,000 per year) has been taken in hand in a big way.
4. Residential plots are developed and given away to the people for building houses. About 30,000 plots which include about 20,000 residential and over 6,000 commercial, have been developed.



5. For rehabilitating the squatters, Resettlement colonies in different parts of Delhi have been developed and over 50,000 families have been rehabilitated.
6. Under the beautification scheme hundreds of new parks have been laid in different areas which not long before were squalid slums. As many as 5 lakh tree saplings have been planted on road sides and other green areas of Delhi.

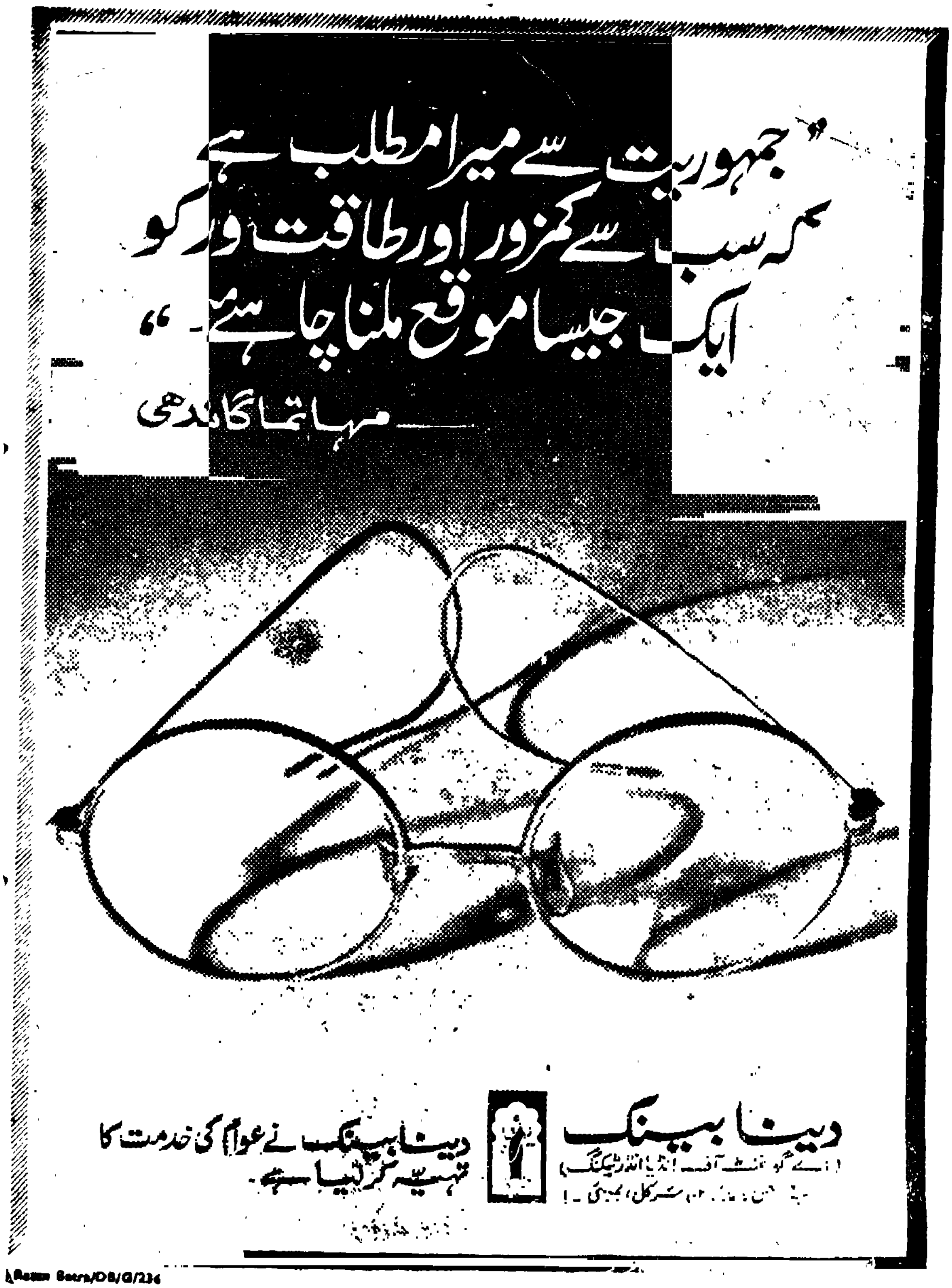


7. A new subzi mandi has been developed in Azadpur. A big cycle market has been constructed at Jhandewalan.
8. Modern Shopping centres at Kalkaji and Pusa Road and an Inter-state Bus Terminal near Kashmere Gate have been set up. Two major truck terminals have been developed at G. T. Road and Rohtak Road areas.



DELHI development authority

Issued by
THE PUBLIC RELATIONS MANAGER



Bom Beta/DB/G/236

Regd. No. R.N. 16241/68 Regd. No. D—(C) 391

SECULAR DEMOCRACY

HINDI & URDU

ANNUAL NUMBERS IN NOVEMBER

MAIN FEATURES :

HINDI : Short Story Competition

Short stories based on the theme of national integration are being invited. Six top stories will be given awards and they will be published in the Annual Number. The prizes are : I Prize : Rs. 250/-, II Prize : Rs. 150/-, III Prize : Rs. 100/-, THREE CONSOLATION PRIZES OF Rs. 50/-EACH.

ENTRIES are invited upto October 10. Decision of the Editorial Board will be final.

URDU : It will be IQBAL NUMBER.

Special articles by Iqbal scholars discussing his views on life, art, poetry and politics.

It will be a unique compendium on the poet during the IQBAL CENTENARY YEAR.

Besides it will carry the usual features which make SEC ULAR DEMOCRACY a unique magazine.

Ideal opportunity for Advertisers.

Agents should book orders in advance.

Manager
SECULAR DEMOCRACY
19-A, Theatre Communication Building,
Connaught Circus, New Delhi-110001.
Phone : **43383**

این۔این پانڈے نے قومی ایکتا ٹرسٹ کے لئے رائیٹر آفسٹ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔
جنرل آفس :۔ A-19، تھیٹر کمیونی کیشن بلڈنگ، کناٹ سرکس، نئی دہلی۔ ایڈیٹر:۔ ڈی۔آر۔گوئل